حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مُرتّب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا محمد ساجد صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

بیت السلام

بیت السلام......اسلام کی ابدی صداقتوں اور سدا بہار تعلیمات سے معاشرے کو روشناس کرانے کیلئے قائم کیا گیا ایک اشاعتی ادارہ ہے

اغراض و مقاصد

- علماء اسلام کی گرانقدر علمی تالیفات و تصانیف کو عصر حاضر کے جدید طباعتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے زیور طبع سے آراستہ کرنا، تا کہ اسلاف کا ایمان افروز تحریری سرمایہ نئی نسل کو منتقل ہو سکے۔
- اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور فروغ کیلئے اہل علم و دانش کی جدید تخلیقات و تحقیقات کو سلیقے اور ڈھنگ سے شائع کرنا۔
- معاشرے میں امن، انصاف، علم و تحقیق، قومی یکجہتی و باہمی احترام کے جذبات کو فروغ دینا۔

امید ہے کہ! اس سفر میں آپ کی رہنمائی اور دعائیں بیت السلام کے ساتھ رہیں گی

عبدالصبور علوی
مدیر بیت السلام کراچی

بیت السلام
پبلشرز کراچی پاکستان

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی فون: 021-32711878 موبائل: 0321-3817119
e-mail: baitussalam_pk@yahoo.com

انتساب

خطباتِ حکیم الاسلام

کی ترتیب وتدوین کے اس ذرہ بے مقدار کو اپنے اس صاحب عزیمت وعظیم المرتبت استاذ مستقیم الاحوال بزرگ عارف ربانی کے نام منسوب کرتا ہوں جو زندگی بھر خدمت قرآن حکیم میں مصروف عمل رہے اور طالبان قرآن کریم کی ایک دنیا ان سے اکتساب فیض کرتی رہی، بالآخر چالیس برس کی عظیم جدوجہد کے بعد اسی مسند پر جان جاں آفرین کے سپرد کردی، جہاں روز اول درس قرآن کریم کیلئے تشریف فرمائے ہوئے تھے میری مراد مجدد القرأت، استاذ الاساتذہ شیخ العرب والعجم، عارف باللہ سیدی ومولائی حضرۃ الحاج القاری رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرہٗ (خلیفہٗ ارشد حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ) سے ہے جن کے فیض صحبت، بے پایا عنایات اور خصوصی ادعیہ سے بندۂ ناچیز یہ کام کر پایا۔

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

عارف ربانی حجۃ القرأ، شارح شاطبی حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحبؒ کا

مکتوب گرامی

پیارے عزیز قاری محمد ادریس صاحب نورک اللہ بعلمہ وعوفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ بخیریت ہوں، مرض میں نہ اضافہ ہے اور نہ افاقہ، اللہ پاک سے احباب کی مخلصانہ دعاؤں کی بدولت صحت وقوت کا امیدوار وطلب گار ہوں، الحمدللہ سب نمازیں حرم شریف میں ہورہی ہیں، کبھی کبھی عمرہ بھی نصیب ہوجاتا ہے۔ ذہنی سکون، طبعی بشاشت میسر ہے۔ فللہ الحمد والشکر آپ کی مساعی حسنہ کے ثمرات خطبات حکیم الاسلام جلد اول مکمل سنے، بے حد لطف آیا۔ اللہ پاک حکیم الاسلام دامت برکاتہم اور جامعین خطبات کو اپنی شایانِ شان دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ یہ ایک مبارک اور عظیم کام کررہے ہیں، ان مواعظ، خطبات کا مقصود یعنی رجوع الی اللہ ورسولہ صحیح معنی میں امت مسلمہ کو عطا ہو۔

میرے پیارے! آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ اعراب سے معریٰ ہیں، طبع ثانی میں صحیح اعراب لگادیئے جائیں کہ پڑھنے والے سب حافظ وعالم نہیں ہوتے آج کل خطبات ج ۲ سُن رہا ہوں وعظ ''راہ اعتدال، ص: ۴۰ میں'' ھن ام الکتاب کا ترجمہ شاید لکھنے سے رہ گیا ہے طبع ثانی میں اس کو بھی پورا کردیا جائے۔

(تمام احباب کو بہت بہت سلام اور چھوٹے بچوں کے لئے پیار ودعا پیش ہوں، اس پرچہ کی دعائیں اللہ پاک سب کے حق میں قبول فرمائیں۔)

دعوات فتحیہ

حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو اور پورے خاندان کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو کامل عافیت وراحت اور سکون واطمینان کے ساتھ رکھ کر جملہ ضروریات اپنے غیبی خزانے سے پوری فرماتے رہیں اور آج سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک بے شمار، بے حساب، حلال، بابرکت، باوسعت رزق بھی آپ حضرات کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو عطا فرماتے رہیں، نیز آپ حضرات کو اور ہم سب کو آخرت کی فکر وشوق دنیا کی فکر وشوق سے کروڑ درجے زیادہ نصیب فرمائے، نیز موت اور خاتمے کے دن کو ہم سب کے لئے کروڑوں عیدوں سے بڑھ کر خوشی کا دن بنادیں، نیز ہماری قبروں کو اپنی رحمت سے جنت کا باغ بنادیں اور دوزخ کے گڑھے نہ بنائیں اور سب کی تمام پریشانیوں کو راحتوں سے اور بیماریوں کو شفائے کامل عاجل مستمرہ سے اور مشکلات کو آسانیوں سے اور رنجوں اور غموں کو خوشیوں سے اور قرض داریوں کو سبکدوشیوں سے اور تنگیوں کو فراخیوں سے آن کی آن میں اور دم کے دم میں بدل دیں۔

آمین یارب العٰلمین .بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

از: احقر کاتب السلام علیکم وعرض دعا قبول ہوں

بقلم عبدالقادر بن محمد متقی عفی اللہ عنہما

۱،۳،۱۹۸۲ (بعد عصر حرم نبوی شریف)

کلمات تبرک

الحمدلولیہ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ

اما بعد ...... برکۃ السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نام نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے۔ علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہل علم، خطباء، آئمہ مساجد اور مقررین ومبلغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے۔ عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہوگیا۔

الحمدللہ بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسودہ بنظر عمیق دیکھا، اور متعدد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ وفوق کل ذی علم علیم.

عزیزم مولوی حافظ قاری محمد ادریس سلمہٗ (فاضل خیر المدارس، ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب، موجودہ شکل میں منظر عام پر آگئی۔ دل سے دعاء ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمہٗ کی اس محنت وجانفشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے، اور اپنی جناب خاص سے اس کا اجر بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل، صحت وعمر میں برکت نصیب فرما کر خلوص وللّٰہیت کے ساتھ مزید برمزید خدمت دین متین کے مواقع فراہم فرمائے، اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ (آمین) وھو یھدی السبیل

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حرف سپاس

ناسپاسی ہوگی اگراس مجموعہ صدرنگ کا سرنقطۂ آغاز اس بزرگ ومہربان شخصیت کوقرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں مجھے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کردیا، تشکر وامتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک ایسی ہی شخصیت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت وعظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکت اسلوب کا تقاضا کرتا ہے، اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلہ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کی علمی رہنمائی اور عملی شفقت وعنایت سے ہی میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستہ پند وحکمت کو مرتب کرسکوں۔ دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہٗ بتصدق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظل عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے اور اپنی جناب خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایان شان اجر وثواب سے خوش وقت اور شادکام فرمائے اور اس کوشش ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ (آمین)

محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ

حیاتِ طیبؒ......ایک مختصر خاکہ

- ......۱۳۱۵ھ جمادی الثانی، پیدائش، (تاریخی نام مظفرالدین اور اصلی نام محمد طیب رکھا گیا)
- ......۱۳۳۷ھ تکمیل درس نظامی
- ......۱۳۵۰ھ خرقہ خلافت از حضرت تھانویؒ
- ......۱۳۳۷ ابتدائے تدریس (جو ۱۳۴۳ھ تک جاری رہی)
- ......۱۳۴۸ھ سے "اہتمام دارالعلوم دیوبند" کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کردی گئیں۔
- ......۱۳۶۰ھ ماہنامہ رسالہ "دارالعلوم" کا اجراء
- ......۱۳۶۸ھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لئے حضرت قاری صاحب کا بحیثیت رکن انتخاب
- ......۱۳۹۲ھ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے حضرت مہتمم صاحب کا بطور صدر انتخاب۔
- ......۱۴۰۰ھ دور اہتمام کا آخری سال، دارالعلوم کے اہتمام سے علیحدگی۔
- ......۱۴۰۳ھ (۶ شوال/ ۱۷/ جولائی ۸۳ء) وفات حسرت آیات
- ......تصنیفات و تالیفات کی تعداد ۵۹
- ......دیگر تحریری مواد کی تعداد ۱۷۹ (مقدمات تقریظات اور ملفوظات و مواعظ کی صورت میں)
- ......تقریباً ۳۶ کتب اور رسائل میں آپ کا تذکرہ

مقدمہ

از

ابن الحسن عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام گرامی محتاج تعارف نہیں وہ ازھر ہند دار العلوم دیوبند کے نصف صدی تک صدر و مہتمم رہے، انہوں نے اپنے دور میں دار العلوم کو ترقی وشہرت کے بام عروج تک پہنچایا، ان کا دور دار العلوم دیوبند کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں دار العلوم کا فیض ہندوستان کے کونے کونے سے لیکر دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلا اور اس دور میں دار العلوم سے نکلنے والے رجال کار نے ایک عالم کو سیراب کیا۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک باکمال عالم دین، ایک مدبر رہنما و منتظم اور خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسرے اوصاف کے ساتھ ساتھ قوت بیان کا وصف بھی عطا فرمایا تھا۔ وہ ایک شیریں بیان خطیب وواعظ اور دل کی گہرائیوں تک اپنی آواز اتارنے والے مبلغ وداعی تھے، وہ دھیمے اور سبک رفتار اسلوب میں سچائیوں اور صداقتوں کے دریا بہاتے اور دلوں کے خشک کھیتوں کو سیراب کرتے چلے جاتے، ان کے اس وصف سے متعلق حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حق تعالیٰ شانہ، نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان وبیان کا خاص انداز اور افہام تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلاتکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ حقائق وواقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور علوم وھبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔ حضرت مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب کیا ہوگا اور بعض

اوقات ایک ایک دن کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر و خطابت کی نوبت بھی آئی لیکن ان کی ہر تقریر کا موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف واسرار کے ایسے گل ولالہ بکھیرتے کہ حقائق و معارف کے چمنستان میں نئی بہار آجاتی۔ ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو بلا تکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرمارہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں، اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ "کیا بات ہے؟" پیش کیا کہ یہ انکار کے لئے بھی ہے اور اقرار کے لئے بھی، استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی، داد و تحسین کے لئے بھی ہے اور تحقیر و تقبیح کے لئے بھی، شاباش اور آفرین کے لئے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لئے بھی۔ الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک "کیا بات ہے؟" کی تشریح ہوتی رہی اور حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے۔ اور مجمع سحر بیان سے عش عش کر رہا تھا۔ حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع بھی ہوتی رہیں۔ حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہ (خطیب مسجد غفوریہ، حسن پروانہ کالونی ملتان) نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے "خطبات حکیم الاسلام" کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں اور اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرت کی جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئیں ہیں وہ سب شائع کر دی گئیں تو امت کے لئے حقائق و معارف اور "کلمات طیبات" کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔" (شخصیات و تاثرات، جلد ا، صفحہ: ۲۱۵)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی وصف بیان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ تکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر،

دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے۔ جوش وخروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی، اور قلب ودماغ کو نہال کر دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیر وزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی، اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔ لاہور میں ایک صاحب، علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے، طرح طرح کی بدعات میں مبتلا، بلکہ ان کو کفر وایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے، اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا، یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا، اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آ گیا، دل نے اندر سے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہو سکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آگے موم ہو چکا تھا، میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی، اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ، اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا۔'' (نقوش رفتگان: صفحہ ۱۹۳)

اللہ جل شانہ اپنے نیک بندوں کے آثار وخدمات کی حفاظت کے لئے لوگوں کو مسخر کر دیتے ہیں اور وہ ان آثار وخدمات کی حفاظت کیلئے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو وقف کر دیتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند کے مدیر و مہتمم ہونے کی حیثیت سے حضرت حکیم الاسلام کو دنیا کے مختلف خطوں میں جانے اور وہاں دین اسلام کی دعوت وتبلیغ کی صدا لگانے کا موقع ملا، ان کے یہ خطبات ومواعظ کہیں قلم وقرطاس کے ذریعے اور کہیں ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ ہوتے رہے۔

حضرت مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری مدظلہ کے دل میں اللہ جل شانہ نے ان مواعظ وخطبات کو جمع کرنے اور کتابی شکل میں لانے کا داعیہ پیدا فرمایا اور انہوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگی کے ماہ وسال وقف کئے، وہ قرآن کریم کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ برسوں اس عظیم کام میں لگے رہے اور یوں امت کے لئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات ومواعظ کا قیمتی اثاثہ محفوظ کر گئے...... حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ خطبات، اسلام کے عقائد وعبادات، معاشرت ومعیشت، اخلاق واعمال، تہذیب وتمدن اور تاریخ وروایات کی تشریحات وحکمتوں کا گنج ہائے گراں مایہ ہیں......

مولانا قاری محمد ادریس صاحب صاحب کی مرتب کردہ ان خطبات کی اب تک شائع ہونے والی جلدوں میں مندرجہ ذیل ایک سو بیس خطبات وموضوعات آ گئے ہیں:

1 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد اول......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ تک ② مقام نبوت اور اس کے آثار ومقاصد ③ کتاب خداوندی اور شخصیات مقدسہ ④ معجزہ علمی ⑤ جہلائے عرب سے مقام صحابیت تک ⑥ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ⑦ حیٰوۃ طیبہ ⑧ فلسفہ علم ⑨ وعظ یوسفی

2 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد دوم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① معارف القرآن ② رحمۃ للعالمین ③ بیت اللہ الکریم ④ عبادت وخلافت ⑤ اخلاص فی الدین ⑥ صحبت صالح ⑦ راہ نجات ⑧ راہ اعتدال ⑨ مقصد حیات ⑩ فلسفہ موت ⑪ اسلام میں تصور آخرت ⑫ فضیلت یوم الجمعہ ⑬ سنت حضرت خلیل علیہ السلام ⑭ حقیقت نکاح۔

3 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد سوم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① ذکر اللہ ② معرفت باری تعالیٰ ③ رضائے الٰہی ④ طریق اصلاح ⑤ تعارف اہل حق ⑥ تسکین فطرت ⑦ ادب اور اختلاف رائے ⑧ حقوق مالیہ ⑨ خطبہ طیبہ۔

4 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد چہارم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① مقصود بعثت ② یاد حق ③ نبوت وملوکیت ④ ثمرات علم ⑤ عمل صالح ⑥ انسانی زندگی کا نصب العین ⑦ پرسکون زندگی ⑧

سیرت اور صورت ⑨ شعب الایمان ⑩ تعلیم وتبلیغ ⑪ تبلیغی جماعت اور اصلاح ⑫ جماعتی تبلیغ ⑬ فضیلت النساء ⑭ پیغام ہدایت ⑮ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ⑯ اسلامی تمدن ⑰ درس ختم بخاری ⑱ اظہار تشکر۔

5 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد پنجم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① شان بعثت ② عناصر سیرت ③ اسلام عالمی مذہب ہے ④ انسانی فضیلت کا راز ⑤ مقصد نعمت ومصیبت ⑥ افادات بخاری (حصہ اول) ⑦ افادات بخاری (حصہ دوم)

6 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ششم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① علمی معجزہ ② خلافت تجوید ③ نجوم ہدایت ④ آغاز بخاری ⑤ تعلیم وتدریس ⑥ تاثیر الاعمال ⑦ آداب دعاء ⑧ الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم ⑨ سائنس اور اسلام۔

7 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ہفتم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① خطبہ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند ② اساس توحید ③ حج بین الاقوامی عبادت ④ اہمیت تزکیہ ⑤ جواہر انسانیت ⑥ ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج ⑦ تعلیم نسواں ⑧ افادات علم وحکمت۔

8 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ہشتم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں خطاب ② موتمر اسلامی قاہرہ میں خطاب ③ عالمی موتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب ④ تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار ⑤ مذہب اور سیاست ⑥ مسلم پرسنل لاء ⑦ اسلام اور آزادی ⑧ عروج وزوال ⑨ تیونس اور مراکش کی جدوجہد آزادی ⑩ آئینہ خدمت جمیعۃ علمائے ہند ⑪ نصاب تعلیم کی تدوین ⑫ تصویر سازی کی مذہبی اور تمدنی حیثیت ⑬ اشتراک مذہب ⑭ دنیا وآخرت ⑮ عالم اصغر ⑯ افادات علم وحکمت۔

9 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد نہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① اساسی عبادات ② اہمیت نماز ③ رمضان اور اس کے مقاصد وبرکات ④ فضیلت تقویٰ ⑤ اسلام میں عید کا تصور ⑥ محبت ومعیت ⑦ تعلیم جدید ⑧ مرکز سعادت ⑨ امتیاز دارالعلوم ⑩ آزادی ہند کا خاموش رہنما ⑪ اکابر دیوبند اور آزادی ہند ⑫ حدیث پاکستان ⑬ امارت شرعیہ ⑭ الواعظ ⑮ اظہار تعزیت ⑯ جامع مذہب ⑰ افادات علم وحکمت۔

10 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد دہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① نبی امی علیہ الصلوۃ والسلام ② راہنمائے انقلاب ③ عظمت حفظ ④ آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب ⑤ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام ⑥ تکمیل انسانیت ⑦ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ⑧ افادات علم وحکمت۔

11 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد یازدہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① فلسفہ نماز ②

---

① پارہ:۲۲،سورۃ الاحزاب،الآیۃ:۴۰-۴۸۔

تفسیر سورۃ ملک ③ افادات علم وحکمت۔

12 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد دوازدہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① تفسیر سورہ قلم ② آثار صحبت

ان خطبات میں بیان ہونے والی احادیث وروایات پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے، خطبات کے مرتب مولانا قاری محمد ادریس صاحب مدظلہ کی سوانح پر نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ ان کا حق ہے، حضرت قاری ہوشیار پوری صاحب ہمارے بزرگ استاد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں، مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین مدنی کے شاگرد اور دارالعلوم کراچی کے ہردل عزیز استاذ تھے، وہ ہرفن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، مجھ ناکارہ پر ان کی خصوصی شفقت نظر اس لئے تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولوی حبیب الرحمٰن تکرار کی جماعت میں میرے ساتھ تھے، ایک بار نماز مغرب کے بعد جب مسجد میں تکرار کی جماعتیں لگ گئیں تو حضرت تشریف لائے، مجھے بلا کر فرمایا، ہم عمرے کے لئے جارہے ہیں، آپ حبیب کے ساتھ محنت کریں، ہم آپ کے لئے وہاں جاکر دعا کریں گے......ان کا یہ جملہ آج تک کانوں میں رس گھول رہا ہے اور جو تھوڑی بہت خدمتِ دین کی توفیق مل رہی ہے یہ ان رجالِ باصفا اساتذہ اور بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے! حضرت قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب نے ہمارے کہنے پر اپنے جو حالات بھیجے ہیں وہ نذر قارئین ہیں:

> ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی ترتیب وتدوین محض اور محض فضل خداوندی کا مظہر اور ایک نااہل کی ستاری کے علاوہ اس کی تعبیر میرے لئے ممکن نہیں۔تاہم اس کی نسبت سے قارئین'' خطبات'' مجھے جانتے ہیں، شکل وشباہت سے شناسائی نہیں۔آپ کے حسب ارشاد اپنے احوال کے سلسلہ میں چند حروف لکھ دیتا ہوں، اس لئے کہ اصل کام ہے نہ کہ نام۔
>
> خاندانی پس منظر......میرے والد گرامی مرحوم نے ایک کاشت کار گھرانے میں آنکھ کھولی تاہم گھر کی فضا مذہب کے قریب اور دین دار تھی اور اہل حق سے گہرا تعلق تھا، اسی جذبے کی وجہ سے دادا مرحوم حاجی شیر محمد صاحب نے اپنی اولاد کے لئے دینی تعلیم دلوانے کا راستہ چنا۔والد مرحوم نے مختلف مدارس میں پڑھا، گوجرانوالہ کے کسی مدرسہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے کہ وہاں سے تعلیم حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند بڑے درجات کے اسباق کے لئے حاضری کا شرف نصیب ہوا۔داخلہ امتحان حضرت اقدس شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کے سپرد ہوا'' ہدایہ اولین'' میں سے کسی مقام کا انتخاب کر کے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:'' یہاں سے یہاں

تک مطالعہ کر کے لاؤ۔'' والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ تعلیمی زمانہ میں مجھے کاپیوں سے دلچسپی کم اور نفسِ کتاب سے مناسبت زیادہ تھی، چنانچہ میں نے مطالعہ کرلیا اور عرض کیا کہ: ''حضرت! میں حاضر ہوں۔'' فرماتے تھے کہ جب میں نے عبارت پڑھی تو حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''کافی ہے، مزید ضرورت نہیں۔'' اندازِ عبارت سے داخلہ مرحمت فرمانے کا فیصلہ فرمالیا تھا۔

الحمدللہ! اس کے بعد والد گرامی ان طلباء کرام کی فہرست میں شامل ہو گئے، جن کے لئے'' منجانب اللہ القا' وانتخاب'' کے مبارک الفاظ حلقہ' دیوبند میں مصروف ومتعارف ہیں۔

۱۹۴۷ء میں دورۂ حدیث شریف شیخ الاسلام حضرت محترم شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی، والد صاحب مرحوم کے ہم درسوں میں چند نمایاں حضرات یہ ہیں:

۱......حضرت اقدس صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان محترم ومکرم مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ العالی۔

۲......حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب نور اللہ مرقدہٗ۔

۳...... برادر محترم جناب مولانا مفتی خالد محمود صاحب زید مجدہم، مدیر اقرأ روضۃ الاطفال پاکستان کے والد گرامی حضرت محترم مولانا عبدالمجید صاحب سکھروی مرحوم۔

دارالعلومِ دیوبند میں ختم بخاری شریف کے موقع پر ہمارے نانا مرحوم داعی کبیر حضرت محترم مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب ہوشیار پوری جو کہ خاتم المحد ثین حضرت اقدس مولانا علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید نیز حضرت اقدس امام القراٗ قاری محی الاسلام عثمانی نور اللہ مرقدہ (استاذ محترم حضرت اقدس شاطبیٔ وقت قاری فتح محمد صاحب نور اللہ مرقدہ) کے بھی شاگرد رشید تھے۔

ان حضراتِ اہل اللہ سے تعلق کی بنا پر دنیوی رسوم ورواج سے طبیعت میں بہت تنفر تھا، چنانچہ بخاری شریف کے اختتامی سبق کے موقع پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اس سال تکمیل کرنے والے طلباء کرام میں اگر'جٹ'' برادری کا کوئی طالب علم آپ کے ہاں سند فراغت حاصل کر رہا ہو تو میں چاہتا ہوں کہ اپنی بچی کا نکاح اسی مبارک مجلس میں اس سے کردوں۔''

آسمانی فیصلوں کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے، والد مرحوم کا نکاح دارالعلوم دیوبند کے

دارالحدیث میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا اور اس پر تقریر فرمائی کہ: ''لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں کے کام نہیں ہوتے، مولویوں کے کام تو اس طرح آسانی ہوتے ہیں۔''

بہرحال یہ ''خاندانی جوڑ'' خالص دینی بنیادوں پر تھا، اس میں کوئی دنیوی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ چنانچہ اس کا ثمر یہ نکلا کہ نانا مرحوم کی نسبت سے ہمارے گھرانے میں ''شغف بالقرآن الکریم'' اور حفظ وقرأت کا اس قدر چرچا ہوا اور فضا تیار ہوئی کہ والدہ مرحومہ کے بعد بھی ان کی تمام اولاد قرآن حکیم کی تعلیم وتعلم میں بفضلہ تعالیٰ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد آئندہ نسل بھی حفظ وضبط کے ساتھ ساتھ قرأت عشرہ تک حاصل کر چکی ہے۔ والد مرحوم کی نسبت سے شعبہ کتب سے مناسبت ہوئی اور الحمدللہ! ہم چار بھائی عالم ہیں اور درجۂ کتب سے تھوڑی بہت شد بد رکھتے ہیں۔

چنانچہ والد صاحب مرحوم نے پاکستان آکر حضرت فخر الفقہاء مولانا خیر محمد صاحب مرحوم (بانی جامعہ خیر المدارس ملتان) کی زیرنگرانی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بورے والا، جہانیاں کے مدارس میں کچھ وقت پڑھانے کے بعد فیصل آباد کے پسماندہ علاقہ ''ماموں کانجن'' میں تقریباً بائیس سال پڑھایا۔ مشکوٰۃ کے بعد یہاں کے طلبا کرام جامعہ خیر المدارس ملتان میں دورۂ حدیث شریف کرتے، ازاں بعد دارالعلوم کورنگی کراچی میں بیس سال سے زیادہ تدریس سے وابستہ رہے۔

میری پیدائش ملتان شہر میں ہمارے نانا مرحوم کے گھر اندرون حرم گیٹ ۱۹۵۱ء بوقت سحر ہوئی، نانا مرحوم جس مسجد (بیری والی مسجد حرم گیٹ) میں نماز کے لئے جاتے تھے، وہاں اعلان کروا کر دعا کروائی۔ نیز والد گرامی مرحوم نے میرا نام اپنے استاذ محترم کی محبت میں ''محمد ادریس'' رکھا کہ ان کی ابتدائی شفقت دارالعلوم دیوبند کے مبارک قافلہ میں شرکت کا سبب بنی تھی۔ والد مرحوم اپنے تدریسی سلسلہ میں مدرسہ عربیہ احیاء العلوم ماموں کانجن (فیصل آباد اس وقت لائل پور) میں تشریف لے گئے اس لئے ابتدائی تعلیم حفظ قرآن کریم وہاں ہوئی، اس وقت وہاں یہ حضرات جامعہ خیر المدارس کے توسط سے تشریف لاتے تھے، حسب مقدور ان سے قرآن کریم پڑھا:

۱......قاری محمد یعقوب صاحب ملتانی۔

۲......قاری محمد دین صاحب مرحوم جو بلوچستان کے تھے، والد صاحب مرحوم کے کتب

میں شاگرد بھی تھے، بہت بلند پایہ مدرس تھے، چھوٹے بچوں کے لہجہ اور تصحیح حروف میں امتیازی خصوصیات رکھتے تھے۔ (چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ خیر المدارس نے ان کو پھر اپنے ہاں بلوالیا اور عرصہ دراز تک خیر المدارس میں ایک منجھے ہوئے استاذ کی طرح خیر المدارس پر اپنی جان نچھاور کی اور اچھے اچھے حفاظ تیار کر کے شعبہ گردان میں بھیجے)۔

۳......محترم حضرت حافظ اللہ بخش صاحب ملتانی۔

۴......اور ان کے شاگرد حافظ فیض بخش صاحب مرحوم۔

ان سے تکمیل قرآن کریم کے بعد خیر المدارس ملتان میں مقری اعظم حضرت اقدس مولانا قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہ کے درجہ ضبط و تجوید میں بذریعہ قرعہ اندازی داخلہ مل سکا اور حسب ہدایت ڈاک کارڈ لے کر شوال المکرم ۱۳۷۸ھ میں حضرت اقدس کے اقدام عالیہ میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ یہاں کے تعلیمی معیار تک پہنچنے کے لئے دو سال ضبط میں صرف ہوئے، ہمارے رفقاء کرام میں خود صاحبزادہ محترم قاری محمد عبید اللہ بن قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

شعبہ تحفیظ سے فراغت کے بعد والد مرحوم نے اپنی نگرانی میں ماموں کانجن میں کتب کا آغاز کرایا، ان دنوں مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ درجہ کتب کے ابتدائی مدرس کی حیثیت سے حسب ارشاد حضرت بانی جامعہ خیر المدارس ملتان جلوہ افروز تھے، والد مرحوم صدر مدرس تھے اور دیگر اساتذہ کرام بھی تھے۔

اس لئے تقسیم اسباق کے مطابق علم صرف حضرت اقدس لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی، اجرأ صرف اور صرف میں بندہ کو دو حرف آنے لگے۔ البتہ نحو کے اسباق زیادہ تر والد صاحب مرحوم سے پڑھے، ہدایہ النحو، کافیہ اور شرح جامی والد مرحوم سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لئے والد مرحوم نے بندہ کو جامعہ خیر المدارس میں داخلہ دلوایا۔ اس وقت کے اکابر میں ہدایہ اولین حضرت اقدس مولانا محمد شریف صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ مہتمم جامعہ کے پاس، شرح جامی حضرت شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد (بانی جامعہ امدادیہ، فیصل آباد) کے پاس پڑھی۔

شرح جامی کا امتحان حضرت اقدس بانی جامعہ خیر المدارس نے خود لیا اور میرے سے

الف لام کی اقسام پوچھیں، مجھے شرح جامی از بر اس لئے تھی کہ میں پہلے والد صاحب مرحوم کے پاس پڑھ کر آیا تھا اور یہاں نظم جماعت کی وجہ سے دوبارہ اس کا پڑھنا ضروری تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے استفسار پر جب میں نے اس کی تمام اقسام اچھی طرح سنادیں تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا: ''توں کتھوں آیاں؟'' (تم کہاں سے آئے ہو؟)، میں نے عرض کیا: ''ماموں کانجن سے۔'' فرمانے لگے: توں مولوی شفیع کا منڈا؟ (آپ مولانا محمد شفیع صاحب کے بیٹے ہو؟)، میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمانے لگے: ''تاایں وسداپیا'' (اسی لئے صحیح بتارہے ہو)۔ میری یادداشت کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس میں ۵۲ نمبر دیئے، مع انعامی ۲ نمبرات۔ اس لئے کہ اس وقت درجہ کتب میں ۵۰ نمبر آخری حد ہوتے تھے۔ ۴۰ سے کم ہوجاتے تو طالب علم ناکام شمار ہوتا تھا۔

اس کے بعد اگلے سال دارالعلوم عیدگاہ کبیر والا میں داخلہ لیا، اس وقت یہاں اجلہ علماء رونق افروز تھے، معقولات اور فنون کی کتب کا بڑا چرچا تھا اور حقیقی تھا، بغیر کسی پابندی اور ضوابط کے طلباء کرام میں بڑا تعلیمی انہماک اور ذوق مطالعہ تھا، یہاں حضرت اقدس علامہ صوفی محمد سرور صاحب زید مجدہم (حال جامعہ اشرفیہ لاہور) کے پاس مختصر المعانی، جلالین شریف اور حضرت العلام مولانا ظہور الحق صاحب مرحوم کے پاس حسامی اور دیوانِ حماسہ پڑھیں، مولانا محمد امین صاحب کے پاس متنبی اور مقامات حریری پڑھیں، اور اس سے آئندہ برس مشکوٰۃ شریف حضرت اقدس محدث جلیل مولانا عبدالمجید صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم (بانی جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا، حال امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان) کے پاس اور ہدایہ رابع بھی انہیں سے پڑھا۔ نیز بیضاوی شریف اور ہدایہ ثالث حضرت العلام شہنشاہ تدریس مولانا منظور الحق صاحب مغفور کے پاس پڑھیں اور حضرت العلام مولانا علی محمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم کبیر والا کے پاس توضیح وتلویح اور مسلم الثبوت پڑھیں۔ یہاں موقوف علیہ کے سال سہ ماہی امتحان کے موقع پر بندہ کی الحمدللہ پہلی پوزیشن آئی اور اساتذہ کرام کی نظر عنایت نصیب ہوئی۔

آئندہ سال دورۂ حدیث شریف کے لئے کبیر والا سے ایک بڑی تعداد جامعہ خیر المدارس ملتان آگئی، یہ ناکارہ بھی اس میں شامل تھا، چنانچہ یہاں بخاری وترمذی

حضرت العلام جامع المعقول والمنقول مولانا محمد شریف کشمیری صاحب مرحوم کے پاس، مسلم شریف حضرت اقدس مولانا مفتی محمد عبداللہ ڈیروی صاحب مرحوم کے پاس، سنن ابی داؤد حضرت العلام فقیہ جلیل مولانا مفتی عبدالستار صاحب مرحوم کے پاس، طحاوی شریف حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کے پاس، سنن نسائی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے پاس اور ابن ماجہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے پاس پڑھی۔ اس تمام تر تفصیل کے بعد بندہ نے بھی ''مولوی'' بن کر ۱۳۹۳ھ میں سند فراغت وتکمیل جامعہ خیر المدارس سے حاصل کر لی جبکہ قاری الحمد للہ پہلے ہی بن چکا تھا۔

مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے ساتھ ہمارا ایک دیوار کے اشتراک کے ساتھ ۱۲ سال ہمسایہ داری کا یادگار اور محبت بھرا تعلق رہا) کے قلم نے ہمارے سامنے اپنے سفر کا آغاز کیا اور خوب یاد ہے کہ بعض اوقات آسان مسائل وعنوانات پر حضرت والا مشق کیا کرتے تھے اور ہم طلبا دور دور سے ان کی نشست وبرخاست کے انداز اور قلم وقرطاس کے ساتھ انہماک کے طریقے دیکھا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ''ماڈرن اسلام'' کے فتنہ نے حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اندر چھپے ہوئے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کو جگا دیا اور ان کا قلم سیاہی کی بجائے تلوار کی چمک لے کر باطل کے سامنے نمایاں ہوا، ماہنامہ ''بینات'' میں آپ کے مضامین کو جگہ ملنی شروع ہوئی اور حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی جوہر شناس طبیعت نے حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ہاں بلا کر اپنا ہم نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا ہم کام بھی کر لیا، حضرت کو دیکھ کر مجھے لکھنے کا شوق ہوا اور ملتان میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت میں مہینے کے تقسیم کردہ ایام میں کراچی سے تشریف لایا کرتے تھے، ان دنوں بندہ نے حضرت والا سے اصلاح مضامین لی اور اسی سے ترتیب وتدوین اور قلم پکڑنے کی معمولی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔

حضرت اقدس مقری اعظم قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کردہ نسبتِ قرآن کی وجہ سے الحمد للہ شعبۂ تحفیظ رشید آباد کالونی میں پڑھایا پھر شش ماہی امتحان کے بعد مسجد غفوریہ لکڑ منڈی چوک ملتان میں بطور خطیب، امام ومدرس قرآن کریم تقرر ہوا۔

یہاں طلبا ندارد تھے، چند ماہ کے انتظار اور طویل دعاؤں کے بعد طلبا کا رجوع ہوا تو یہاں جگہ کم پڑ گئی اور ہمارے بڑے ماموں حاجی محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے اپنی صابون فیکٹری کے ساتھ تقریباً ۲۱ مرلہ جگہ خریدی ہوئی تھی جو فیضی روڈ علی ولی کالونی میں تھی، انہوں نے وہ جگہ مسجد غفوریہ کے احباب کرام اور نا کارہ کے سپرد کی۔ الحمدللہ! یہاں تحفیظ القرآن الکریم کے نام سے مدرسہ ۱۴۰۱ھ میں قائم ہوا۔ الحمدللہ! اپنے علاقے میں مرکزی حیثیت کے ساتھ پاکستان کے دور دراز علاقوں سے طلبا کرام کا رجوع ہوا اور تکمیل کر کے حسب ہمت تعلیم وتعلم میں مشغول ہیں۔

شعبہ حفظ سے جو طلبا کرام فراغت حاصل کرنے کے بعد درجہ کتب میں داخلہ لینے کے لئے دیگر مدارس میں جاتے تو ہم لوگوں کو بڑی حسرت ہوتی ''کاش ہمارے پاس جگہ ہوتی تو ہم ان طلبا کرام کو خود پڑھاتے'' چنانچہ ایک مرتبہ میرا ایک جامعہ میں جانا ہوا تو میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہمارے حفاظ طلبا کرام اس جامعہ میں ۴۱ ہیں۔ بہر حال والد گرامی مرحوم کا بہت اشتیاق اور بڑی تمنا تھی کہ تحفیظ کے ساتھ ساتھ شعبہ کتب بھی قائم کیا جائے۔

بڑے ماموں صاحب مرحوم علی ولی کالونی میں اپنی فیکٹری بیچ کر پیر کالونی میں چلے گئے، وہاں فیکٹری کے لئے جگہ لی تو وہاں اہلِ بدعت کی مساجد کی وجہ سے اپنے صحیح عقیدہ کے مطابق نماز پڑھنے اور بچوں کے لئے تعلیم وتعلم کی نیت سے جگہ خرید لی جو اس وقت دو کنال چھ مرلہ پر مشتمل تھی، پھر ۱۹۹۶ء میں احقر کے سپرد کی ہم نے آہستہ آہستہ اپنے رفقاء کرام سے مشاورت کر کے مزید خریداری کی جو الحمدللہ اس وقت تک ۴۵ کنال ہو چکی ہے۔ اس جگہ کو ہم نے جامعہ دارالعلوم رحیمیہ کا نام دیا، آج الحمدللہ! جامعہ میں ۱۵۰۰ طلباء وطالبات شاخوں سمیت پڑھ رہے ہیں، شعبہ تحفیظ میں تقریباً پندرہ درس گاہیں، دورۂ حدیث شریف کے مکمل اسباق ہیں اور شعبہ تخصص فی الافتاء بھی بحمدللہ جاری ہے۔

الحمدللہ! اس وقت تک جامعہ سے تکمیل کرنے والے کل حفاظ کی تعداد ۲۵۰ ہو چکی ہے، جس کے پیچھے نسبت رحیمی کی کارکردگی اور اعجاز قرآنی ہے اور فضلا درس نظامی کی تعداد ۳۰۷ ہے، بہر حال یہ سب کچھ حق تعالیٰ، شانہ کا کرم، اساتذہ کرام کی توجہات

اور والدین مرحومین کی دعاؤں کا مظہر ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس حضرات کی دعائیں، چونکہ دائمی ہوتی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ اس سلسلہ تعلیم وتعلم کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ انشاء اللہ مزید ترقیات وبرکات سے سرفراز فرمائیں گے۔

''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی بارہ جلدوں کی ترتیب وتدوین میں ''ربع صدی'' سے زیادہ وقت صرف ہوا، اس لئے کہ تقاریر وخطبات دستیاب نہیں تھے بالتدریج جیسے مواد ملتا گیا، اسی سے جلد تیار کی جاتی رہی، اس لئے جلد نمبر کے حساب سے مجموعہ تیار ہو کر اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔ ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے مجموعہ کے تیار ہونے میں دراصل ایک روحانی قوت کا کرشمہ تھا، اولاً اس میں حضرت العلام حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور خاندانی علمی وجاہت پھر دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے دنیا بھر کی شہرت واحترام نے اسے پذیرائی بخشی۔

ثانیاً ہمارے شیخ الشیخ مقری اعظم قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں نے اثر دکھایا، جب میرے پاس صرف چار تقاریر مرتب تھیں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا سفرِ ملتان ہوا، مدینہ طیبہ سے آمد ہوئی تھی ''زہے قسمت'' مسجد غفوریہ میں آمد مبارک ہوئی۔ بندہ نے یہ تقاریر مرتب شدہ پیش خدمت کیں اور عرض کیا کہ: ''ان پر دم فرمادیجئے یہ بارگاہ عالی خداوند قدوس میں قبول ہوجائے۔'' چنانچہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے دم فرمایا، دوسری درخواست حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہ پیش کی کہ: ''مجموعہ بہت کم ہے، آپ ازراہ کرم یہ دعا فرمادیں کہ تقاریر بڑی تعداد میں مل جائیں اور مجھے اس سلسلہ میں سفر نہ کرنا پڑے اور تعلیمی طور پر درس گاہ کا ناغہ اور حرج نہ ہو۔'' یہ بات چونکہ حضرت والا کے مزاج عالی کے مطابق تھی تو بہت خوشی ہوئی۔ ایک ایسا منظر بن گیا جس میں بعض اوقات اہل اللہ سے کوئی غیر اختیاری جذبہ کے تحت دل کی گہرائیوں سے دعا نکل جاتی ہے، اور الحمد للہ! بندہ نے اس کا مشاہدہ کیا کہ دنیا بھر سے مجھے کیسٹیں دستیاب ہوئیں، مگر اس کے لئے مجھے سفر نہیں کرنا پڑا، ظاہری سبب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے برادر محترم مولانا قاری محمد رفیق صاحب مقیم جدہ اور برادر محترم جناب مولانا قاری سیف الدین صاحب مقیم ریاض سعودیہ اس کا ذریعہ بنے تاہم ان حضرات کے علاوہ بھی بہت سی تقاریر دستیاب ہوئیں۔ پھر حضرت والا سے اس ناکارہ کا مسلسل رابطہ رہا،

حرمین شریفین سے حضرت دعائیں دیتے رہے، ان ادعیہ مبارکہ سے یہ قبولیتِ عامہ نصیب ہوا اور الحمدللہ! اب تک اس کتاب کو علمی دنیا میں استحکام نصب ہوا۔

اب عزیز محترم عبدالصبور علوی سلمہ، تخریج وتحقیق کے ساتھ اعلیٰ معیار پر طباعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مساعی کو قبول ومنظور فرمائے اور ہم سب کے لئے نجات اُخروی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین (حضرت مولانا قاری) محمد ادریس ہوشیار پوری) مدیر وبانی جامعہ دارالعلوم رحیمیہ، ملتان

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات ومواعظ میں احادیث وروایات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے، وعظ ونصیحت اور تقریر وخطابت میں عموماً احادیث کریمہ کی صحت کے اس معیار کو بسا اوقات برقرار نہیں رکھا جاسکتا جس کا محدثین کرام اہتمام کرتے ہیں اور خود حضرات محدثین کے نزدیک فضائل کے باب میں بعض شرطوں کے ساتھ ضعیف احادیث کو بھی بیان اور ذکر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات میں اس طرح کی احادیث پائی جاتی ہیں، احقر نے چند سال قبل جب ان خطبات کا مطالعہ کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان موثر خطبات ومواعظ کی احادیث کریمہ کی تخریج اصل مصادر اور مراجع سے ہونی چاہئے۔ بعض احادیث موضوع ہوتی ہیں، واعظین ان کو بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ کسی صحابی یا تابعی کے قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے پیش کر دیا جاتا ہے، علم حدیث کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ کسی حدیث موقوف یا مقطوع کو حدیث مرفوع کی صورت میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ عام خطباء اور مقررین کو ان احادیث کی تحقیق ومراجعت کا موقع نہیں ملتا اس لئے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات وتقریروں میں بیان کردہ احادیث وروایات کے محدثانہ طرز ومعیار پر تحقیق ہو جائے، اصل مراجع ومصادر سے ان کے حوالے نقل کئے جائیں اور ان روایات کی صحت وضعف کی حاشیہ میں وضاحت کر لی جائے اور اگر کوئی حدیث موضوع ہے تو اس کی بھی نشاندہی ہو جائے تاکہ منبر ومحراب کے منصب کے حاملین، ان احادیث وروایات کو ان کی اصل حیثیت کی روشنی میں بیان کریں...... حضرت حکیم الاسلام کے ان خطبات کو اللہ جل شانہ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی ہے اور برصغیر کے علاوہ اردو دنیائے اسلام میں یہ بکثرت پڑھے اور سنے جاتے ہیں، اس وقت دنیا کے اکثر خطوں میں دین اسلام کا جو کام ہو رہا ہے واسطہ بالواسطہ، اس میں ازھر ہند دارالعلوم دیوبند کا فیض شامل ہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دارالعلوم دیو

بند کے فضلاء اور منتسبین کا ایک جال بچھا ہوا ہے، وہ مدارس و مکاتب، مساجد و خانقاہوں، جہاد و ابلاغ اور دعوت و تبلیغ کی جماعتوں اور مراکز کی شکل میں دین کی مختلف جہتوں پر کام کر رہے ہیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دار العلوم دیو بند کے نصف صدی تک روح رواں رہے ہیں، انہوں نے یہ خطبات بھی دنیا کے مختلف حصوں میں ارشاد فرمائے ہیں اور اللہ جل شانہ نے انہیں ایک ہمہ گیر قبولیت عطا فرمائی ہے۔

برادر محترم عبدالصبور صاحب کو اللہ جل شانہ نے جدید طباعتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اکابر کی کتابیں چھاپنے اور عام کرنے کا ذوق عطا فرمایا ہے، خطبات حکیم الاسلام پر تخریج احادیث و روایات کی تحقیق کی ضرورت کو جب میں نے محسوس کیا تو ان سے کہا کہ اس عظیم کتاب کا تخریج و تحقیق شدہ ایڈیشن لانے کی ضرورت ہے، یہ آج سے تقریباً بارہ تیرہ سال قبل کی بات ہے انہوں نے اس کے لئے عزم کیا اور مختلف محقق علمائے کرام سے ان خطبات کی تخریج و تحقیق کرائی اور اس پر انہوں نے زر کثیر صرف کیا، وہ مستقل میرے رابطے میں رہے اور ہونے والا کام بھی مجھے دکھاتے رہے، درمیان میں کچھ رکاوٹیں بھی پیش آئیں اور زندگی کے جھمیلے کام کی رفتار کو روکتے رہے لیکن بالآخر یہ کام الحمد للہ مکمل ہو گیا اور ان بلیغ و عظیم خطبات کا تخریج شدہ ایڈیشن درج ذیل خصوصیات کے ساتھ آ گیا:

1......ان خطبات میں موجود تمام احادیث و روایات کی اصل مراجع سے تخریج کر دی گئی ہے۔

2......ان روایات کی صحت و ضعف کی حاشیہ میں وضاحت کر دی گئی ہے۔

3......بعض احادیث زبان زد عام ہیں لیکن وہ موضوع ہیں، ان خطبات میں بھی کہیں ایسی احادیث آ گئی ہیں تو اُن کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

کسی حدیث موقوف یا مقطوع کو حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا گیا ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

4......تمام احادیث پر اعراب (زبر، زیر، پیش) لگا دیئے گئے ہیں تا کہ تلفظ میں غلطی کا امکان کم ہو۔

5......ان خطبات میں جتنی قرآن پاک کی آیات ذکر کی گئی ہیں اُن سب کی تخریج (یعنی سورت و آیت نمبر کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

6......تمام قرآنی آیات پر اعراب لگا دیئے گئے ہیں۔

7......متن کی تصحیح کی حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے اور اُس کے پروف مختلف علماء سے متعدد بار پڑھوائے

گئے ہیں۔

اللہ جل شانہ اس محنت کو قبول فرمائے، ان خطبات کا نفع عام اور تمام فرمائے اور اسے سب محنت کرنے والوں کے لئے اس دن کا ذخیرہ بنائے جس دن نہ مال وزر کے انبار کام آئیں گے، نہ دوست واحباب اور اولاد واحفاذ کا ہجوم...... **یوم لا ینفع مال و لا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم.**

و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وعلی آله وصحبه اجمعین.

تقریظ

عارف کبیر، حجۃ القرآ، شارح شاطبی

حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحبؒ

حامداً و مصلیاً

امابعد...... ماشاءاللہ قاری ادریس صاحب بڑا تعمیری کام کر رہے ہیں۔ اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تقریریں طبع کرانے کا انتظام کر رہے ہیں، اب تک چار تقریریں تو مکمل کر چکے ہیں، اسی طرح اور تقریروں کی بھی تلاش میں ہیں۔ خدا کرے، بہت سی تقریریں حضرت موصوف کی مل جائیں اور یہ اصلاحی ذخیرہ کافی ووافی جمع ہو جائے۔

اللہ پاک مولوی ادریس صاحب کے لئے بھی اس کو آخرت کی کامیابی کا بہترین ذریعہ بنائے اور اہل علم وعامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کے ارشادات سے مستفیض فرمائے اور ان کے ارشادات کو دنیا وآخرت کے لئے مشعل راہ بنائے۔ (آمین ثم آمین) بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہٗ مہاجر مدنی مدینہ منورہ

حال وارد ملتان۔ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ

تقریظ مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت اقدس محترم ومکرم مولانا محمد یوسف لدھیانوی (شہیدؒ)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب، طیب اللہ ثراہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حکمت قاسمی کے وارث وامین تھے، وہ اپنے ''خطبات ومواعظ'' میں حکمت کے موتی رولتے تھے، اور ایسے عجیب وغریب لطائف ومعارف کا دریا بہاتے تھے جو عام طور سے کتابوں میں نہیں ملتے، اس لئے بجا طور پر انہیں ''حکیم الاسلام'' کا خطاب حاصل تھا۔

عزیز محترم جناب مولانا الحاج الحافظ قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ اللہ تعالیٰ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات حکمت کی جمع وتدوین کا شوق نصیب فرمایا، موصوف نے حضرت مرحوم کے خطبات کی کسٹیں تلاش کرنے اور انہیں کاغذ پر منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا، ماشاء اللہ وہ اپنی مہم میں کامیاب ہوئے۔

''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے چھ جلدیں مرمت کر کے شائع کر چکے ہیں، اس سلسلے کی یہ ساتویں جلد ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، حق تعالیٰ شانہ ان کے اخلاص وللّٰہیت میں مزید ترقی عطا فرمائیں، ان کی اس محنت کو شرف قبول نصیب فرما کر دارین میں مثمر برکات بنائیں، اور ان خطبات کے قارئین کو بھی اس صدقۂ جاریہ سے منتفع فرمائیں۔ **بحرمة سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد ن النبی الامی صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہ واتباعہٖ وبارک وسلم واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین**

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

(۱۷،۴، ۱۴۱۰ھ)

مبارک تقریظ

استاذ المحترم حضرت اقدس مولانا عبدالمجید صاحب زیدت معالیہم

شیخ الحدیث جامعہ باب العلوم کہروڑ پکا ضلع ملتان

عزیز القدر قاری محمد ادریس صاحب! عافانی اللہ وایاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ...... حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب! رفع اللہ درجاتہ فی الجنۃ، کے خطبات علم وعرفان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا مندر ہیں، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ حکیم الاسلام کے مواعظ حسنہ سے ان کی حیات میں کتنے نفوس جہالت کی ظلمات سے نکل کر نور ہدایت کی طرف آئے جب بھی ان کے مواعظ کا مجموعہ طبع کرا کر آپ نے بھیجا تو آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، آپ نے ان جواہرات کو محفوظ کر کے ان کے افادہ کو عام وتام کر دیا، حکیم الاسلامؒ کی روح یقیناً آپ سے خوش ہوگی اور یہ نسبت طیبہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ اور مقبولیت عند اللہ کا باعث ہوگی۔

حکیم الاسلام کے خطبات تعریف وتوصیف سے بالاتر ہیں دعاء کرتا ہوں اللہ تعالیٰ صاحب مواعظ کے درجات بلند کرے اور متوسلین دیوبند پر آپ کے احسان کا اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں بدلہ دے۔

ایں دعاء از من جملہ جہاں آمین باد

محبّ حکیم الاسلام خاکپائے علماء دیوبند

عبدالمجید

باب العلوم کہروڑ پکا ضلع ملتان

تقریظ مبارک

مخدوم العلماء

حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب مدظلہم

خلیفہ ارشد حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد..... اکابراولیاء اللہ کے ارشادات وفرمودات روحانی زندگی کی بقاروترقی کے لئے عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اوران کی عدم موجودگی میں ان کی صحبت ومعیت کے قائم مقام ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا:

یک زمانہ صحبت با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

آج کے پرفتن دور میں اس چیز کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔علوم ظاہریہ کی تکمیل کے باوجود تکمیل باطن کے بغیر انسان کی انسانیت اُجاگر نہیں ہوسکتی۔اور تکمیل باطن کے سلسلہ میں بزرگان دین کے اقوال وملفوظات اور مواعظ وخطبات نسخۂ اکسیر ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اوردارالعلوم دیوبند کی نسبت سے ان کی خدمات جلیلہ سے پوراعالم اسلام آگاہ اورایک زمانہ آشنا ہے۔آپ کے ارشادفرمودہ مواعظ کو عام مواعظ کی نسبت ایک خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے جہاں عامۃ الناس آپ کے مواعظ طیبہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہاں اہل علم بھی خصوصیت سے بہرہ درہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عزیز القدر قاری محمد ادریس سلمہٗ کو جزائے خیر نصیب فرمائے۔انہوں نے حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے مواعظ کو یکجا کردیا اور جگہ جگہ مفید عنوانات کے اضافے سے مرتب کردیا۔

اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت وترقی نصیب فرمادے۔اوراس محنت کو قبول فرما کراپنی رضا کا ذریعہ بنائے۔اوردین ودنیا میں کامیابی کا ذریعہ بنا کرنجات آخرت کا وسیلہ بنائے۔

آمین یارب العالمین. بجاہ سیدالمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندہ: محمد شریف جالندھری

مہتمم مدرسہ خیرالمدارس رجسٹرڈ ملتان شہر

تقریظ مبارک

جانشین اکابر حضرت مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری زید مجدہم

رئیس جامعہ خیر المدارس ملتان، وناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

''اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا''

ممتاز خطیب

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

بدوِ شعور سے جن ہستیوں کے متنوع کمالات اور ہمہ جہت دینی خدمات کے باعث اُن کی عظمت و رفعت اور محبت کے نقوش ہمیشہ کے لئے دل میں جاگزیں ہو کر رہ گئے ماضی قریب کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سرفہرست ترجمانِ علوم قاسمیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب قاسمی قدس سرہٗ کی ذاتِ گرامی ہے۔ بلا تشبیہ جس طرح امام الانبیاء، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے اقدس کی زیارت سے مشرف ہونیوالے بعض سعیدُ الفطرت بے اختیار پکار اُٹھے کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہوسکتا، اسی طرح حضرت قاری صاحبؒ کی معصومیت آپ کے باطنی تقویٰ وطہارت کی ترجمان تھی۔ ہمارے استادِ محترم جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث جامعہ خیر المدارس ملتان) فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت قاری محمد طیّب صاحبؒ کی زندگی گناہ صغیرہ کی آلودگی سے بھی پاک نظر آتی ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے بے شمار اِمتیازی خصوصیات سے نوازا تھا۔ آپؒ بیک وقت ایک عظیم خطیب، ادیب، محقق، مدبر، محدّث، مفسر، متکلم، مصنف اور شیخ کامل تھے۔ آپؒ کی تقاریر حقائق ومعارفِ شریعت اور اسرار ورموز طریقت کا دِل نشین مجموعہ ہوتی تھیں۔ تخلیق و ایجاد مضامین اور عام واقعات سے علمی نکات ومعارف کا استنباط حضرت قاری صاحبؒ کے ایسے اوصاف تھے جن میں کوئی خطیب ومقرر آپ کے ساتھ شریک نہیں، دقیق مضامین اور اہم اسلامی مسائل پر دو دو، تین تین گھنٹے مسلسل روانی اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح خطاب فرماتے تھے کہ سننے والے جھوم اٹھتے۔ برصغیر میں ایک سے ایک بڑھ کر خطیب ومقرر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی جادو بیانی سے بے شمار قلوب کو مسخر کیا۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، امیر شریعت سیّد عطاء اللہ بخاریؒ، سیّد سلیمان ندویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علاّمہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ جو مشہور ومعروف ہیں۔ ان عظیم خطباء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب قدس سرہٗ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ کی تقریر میں دریاؤں کے جوش وخروش کے بجائے سمندر جیسی روانی اور سکون ہوتا تھا جو سامع کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسے قادر الکلام اور بے مثال خطیب عام مجمع میں بیٹھ کر حضرت قاری صاحبؒ کی تقریر سُنتے ، سر دھنتے اور یہ کہہ کر داد دیتے کہ ''یہ قاری طیّب نہیں قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی ہے''۔ (رحمہما اللہ تعالیٰ) تقریر اور خطابت کا ملکہ خُداداد ہوتا ہے۔ اس میں کسب کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیاّض ازلی نے حضرت قاری صاحبؒ کو اس نعمت سے خوب خوب نوازا تھا۔

احقر کے لئے یہ سرمایہءِ سعادت ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ ایک مرتبہ ملتان سے لاہور تک سفر میں قدم بوسی کی نعمت میسّر آئی۔ دورانِ سفر حضرتؒ نے ایک نظم بھی مکمّل فرمائی۔ پاکستان میں ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے نام سے حضرت قاری صاحبؒ کے پُر حکمت مواعظ و خطبات کو مربوط کتابی شکل میں پیش کرنیکی سعادت و سبقت حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیارپوری زید مجدہم کے حصّہ میں آئی۔ آپ جامعہ خیر المدارس کے فاضل اور اساتذۂ خیر المدارس کے منظورِ نظر اور بالخصوص والد گرامی حضرت محترم مولانا محمد شریف صاحب جالندھریؒ کی ان پر خصوصی عنایت اس وقت شروع ہوئی جب خطبات کا سلسلہ منظر عام پر آنا شروع ہوا۔ اس لیے کہ آپ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ خطبات کی جمع و تدوین حضرتِ حکیم الاسلام کی وساطت سے دارالعلوم دیوبند کی علمی خدمت ہے۔ خوشی ہے کہ یہ سعادت جامعہ خیر المدارس کے ایک فاضل کے حصّہ میں آئی۔ اس طرح آپ کا شمار خیر المدارس کے ان فضلاء کرام میں ہوتا ہے، جن کی تالیفی کاوشوں کو اہل علم میں پذیرائی اور قبولیت عامہ نصیب ہوئی۔ اس ناچیز کو متعدد غیر ملکی اَسفار میں جگہ جگہ خطباتِ حکیم الاسلام کی جِلدیں نظر آئیں اور مرتب موصوف کے فاضل خیر المدارس ہونے کے ناطے میری مسرت دو چند ہوگئی، ہندوستان میں تو اس کے ابتدائی تعارف بلکہ صاحبِ خطبات حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ کی خدمت عالیہ میں اوّلین دو ۲ جِلد اپنے ہاتھوں سے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جس کی تفصیل خطبات کی جِلد ۶ کے پیشِ لفظ میں موجود ہے۔ اس عظیم سلسلہ کی بارہویں جِلد اس وقت قارئین سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے، جو قاری صاحب موصوف کی ہمت و محنت کے علاوہ صاحب خطباتؒ سے ان کی گہری محبت و عقیدت اور قلبی وابستگی کی دلیل ہے۔ احقر نے ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ کے سفرِ حج میں صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کو بتایا کہ بحمد اللہ ''خطبات حکیم الاسلام'' کی بارہویں جِلد بھی طباعت کے آخری مراحل میں ہے، حضرت نے انتہائی مسرّت کا اظہار فرمایا اور خُوب دُعائیں دیں۔ حضرت قاری صاحبؒ کی ان تقاریر کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے ۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

جو حضرات ان خطبات کا مطالعہ کر چکے ہیں یا آئندہ کریں گے وہ ان کی قدر و منزلت کا خود ہی اندازہ لگائیں گے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ان خطبات کو حضرت صاحبِ خطبات کے لیے صدقہ جاریہ بنائیں اور جامعِ

خطبات محترم ومکرّم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم کی اس پُرخلوص محنت کو قبول فرمائیں۔ (آمین)

اسی طرح ان کے قائم کردہ ''دارالعلوم رحیمیہ'' ملتان جو جامع خیر المدارس کے شعبۂ قراءت وتجوید کے صدر المدرسین، استاذ القراء حضرت اقدس قاری ومُقری شیخ رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرّہٗ کے نامِ نامی سے منسوب ہے اور ان کی علمی یادگار ہے۔ اہلِ مدرسہ کی دعوت کے علاوہ بحیثیت ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ، مدرسہ میں متعدد بار حاضری ہوئی۔ الحمد للہ مدرسہ کے نظم ونسق کو بہتر سے بہتر پایا۔ بفضلہٖ تعالیٰ اَب دورۂ حدیث شریف بھی ہو رہا ہے۔ بہت دعائیں ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ادارہ کو اکابر کے طرز وفکر کے مطابق نُورِعلم پھیلانے کی توفیق خاص مرحمت فرمائے۔ اور قبولیت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

تقریظ مبارک

از: حضرت العلام مولانا

مفتی عبدالستار صاحب مدظلہ العالی (خیر المدارس ملتان شہر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً امابعد...... دعوت الی اللہ فریضۂ نبوت ہے۔ حضرت انبیاء علیہم السلام کے دعوت الی اللہ پر مشتمل مواعظ کا ایک حصہ ہمیشہ کے لئے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا ہے، تاکہ لوگوں کی ہدایت کا باعث ہو۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد اُمت کے کاملین مشائخ عظام وعلماء کرام اپنے اپنے ظرف واستعداد کے مطابق اس میراث نبوت میں سے حصہ پاتے ہیں۔ اللہ پاک ان کے کلام، ملفوظات ومکتوبات کے ذریعہ اپنی مخلوق کو ہدایت بخشتے ہیں۔ زندگیوں میں انفرادی واجتماعی انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ مردہ دلوں میں زندگی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ بند دل ہدایت ربانی کے لئے کھل جاتے ہیں۔ لکھوکھا اندھے، بینا، اور بہرے، شنوا ہو جاتے ہیں۔ کفر وشرک، بدعات ومعاصی کی ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں، ایمان ویقین اور اتباع سنت کے انوار سے قلب وقالب جگمگا اٹھتے ہیں۔ دعوت الی اللہ اور نالہائے صبحگاہی کی تاثیرات معاشرہ میں ضرور ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

عارروی فرماتے ہیں:

گر نبودے نالۂ نے را ثمر   نے جہاں را پر نکروی از شکر

تاریخ شاہد ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر بصدقہ وفیض ختم نبوت، دعوت الی اللہ کا یہ کام مسلسل جاری ہے، اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی دین جو کچھ امت کے پاس موجود ہے۔ یہ اسی تعلیم وتبلیغ اور اہل اللہ کے نالہائے صبحگاہی کا ثمرہ ہے۔

بسلسلہ وعظ ودعوۃ الی اللہ کی ایک کڑی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے حکیمانہ مواعظ وخطبات ہیں، جو آپ نے مختلف مواقع پر نہ صرف پاک وہند بلکہ حرمین شریفین افریقی ممالک یورپ تک میں ارشاد فرمائے اور تشنگان علوم ومعارف نبویہ کو سیراب فرمایا۔

جن حضرات کو موصوف کے حکیمانہ خطبات سننے کا کبھی اتفاق ہوا ہے۔ وہی اس کی حقیقت کو جان سکتے ہیں کہ آپ کا بیان علمی، ادبی، عملی، اخلاقی، روحانی ومعنوی اعتبار سے کتنا اعلیٰ ہوتا ہے۔ سنا ہے، کہ خیر المدارس جالندھر کے سالانہ جلسہ میں جب حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کا بیان ہوتا، تو حضرت شاہ عطاء اللہ

صاحب بخاری نور اللہ مرقدہ اسٹیج سے نیچے سامنے بیٹھ کر عجیب والہانہ شان سے آپ کا بیان سنا کرتے ، اور مخصوص انداز میں داد دیتے اور فرماتے: ''یہ طیب نہیں بول رہا بلکہ حضرت قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی ہے''

حضرت قاری صاحب مدظلہم کے ایسے سینکڑوں مواعظ و خطبات ہوں گے جو سامعین نے سُنے ۔ اور فضا میں تحلیل ہو گئے ، اور بہت سے مواعظ کو بعض خوش قسمتوں نے ٹیپ بھی کیا۔ لیکن ان کے افادہ عوام کی صورت نہ تھی ، کیوں کہ یا ہوا میں منتشر ہیں یا ٹیپ میں بند۔ اللہ پاک نے فاضل نوجوان عزیز مکرم جناب قاری محمد ادریس صاحب سلمہ کے قلب میں ان کے جمع و اشاعت کا داعیہ پیدا فرمایا۔ چنانچہ اپنے طبعی ضعف اور ذمہ فرائض کے باوجود اس اضافی بارگراں کو اپنے ذمہ تو کلاً علی اللہ لے لیا۔ موصوف نے نہ معلوم کہاں کہاں سے مواعظ کی کیسٹیں جمع کیں ۔ پھر ان کو کاغذوں پر منتقل کیا ، ترتیب کے دوران موقعہ بہ موقعہ مفید عنوانات کا اضافہ فرمایا۔ اور پھر بہترین کتابت و طباعت سے مزین کر کے یہ نادر تحفہ ہدیۂ ناظرین کیا۔ موصوف کی اس مساعی جمیلہ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ اللہ پاک آن عزیز کی اس محنت و جانفشانی کو قبول فرما کر خلعت رضا و سعادت دارین سے نوازیں ۔ (آمین)

فقط

امیدوار دُعاء

بندہ: عبدالستار عفا اللہ عنہ

تقریظ سعید

حضرت محترم مولانا محمد عابد صاحب زید مجدہم

اُستاذِ تفسیر جامعہ خیر المدارس ملتان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِالْاَ نْبِیَاءِ وَخَاتَمِ الْمُرْسَلِیْن

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اَمَّا بَعْدُ! حق جلّ شانہٗ کے اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات پر قابل رشک قسم کے انعامات ہیں جن میں سے خاص طور پر یہ بھی ہے کہ ہر دور میں علماء ربانیین حق کی ترجمانی اور دفاع کچھ ایسے طور پر کرتے رہے ہیں جو عالمِ انسانیت کے لئے مستقل طور پر ایک ذخیرۂ خیر ہے۔ گذشتہ صدی میں حق جل شانہٗ نے برصغیر میں اکابر اہلِ سُنت والجماعت علماءِ دیوبند کو اس شرف سے خُوب نوازا جس کے اثرات پُورے عالَم میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین قرنِ اوّل کے قافلے کے کچھ بچے ہوئے نُورانی لوگ تھے جنہوں نے نامساعد حالات کے باوجود وہ خدمات سرانجام دیں کہ اس کے اجمالی تذکرہ کے لئے بھی کئی دفتر چاہئیں۔

دین کا صحیح فہم، اتباعِ سُنت، اعتماد علی السلف، جامعیتِ دین کا اعتقاد، خلقِ خدا پر شفقت اور اس کی رہنمائی کے لئے ایسی تدابیر سوچنا اور اختیار کرنا، جیسے ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے بارے میں کرتا ہے، جیسی بے شمار صفات سے اللہ پاک نے اُن کو نوازا ہُوا تھا۔ یقیناً عمارت میں معمار کے ذوق و مزاج کو دخل ہوتا ہے، تصنیف اپنے مُصنّف کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے، اسی طرح کوئی ادارہ اور مدرسہ اس کے بانی کے فکر و مزاج کا مظہر ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند سے علم و عمل، رشد و ہدایت کے جو چشمے اُبلے بلاشبہ اس میں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے اخلاص و فراست کا بھی بڑا حصہ ہے، اللہ پاک نے اپنے کرم سے آپ کی اولاد کو بھی اس نعمت سے نوازا، چنانچہ آپ کے نبیرہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ نے مسند اہتمام کے حوالہ سے دارالعلوم دیوبند کی نہیں، میں نے غلط کہا، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے وہ اسلام کا ایک درخشندہ باب ہے...... ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ نے ایک بار فرمایا میں نے دو آدمی بڑے عجیب دیکھے ہیں، ایک حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ اور دوسرے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ، حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس میں ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے علوم کی بارش ہو رہی

ہے، جبکہ حضرت قاری صاحبؒ کی محفل میں معارف برس رہے ہوتے تھے، چنانچہ آپ جب کسی موضوع پر بیان شروع فرماتے تو کچھ ایسا دلنشین انداز ہوتا کہ سامعین مسحور ہو جاتے اور ایسے معارف وحقائق بیان کرتے کہ سبھی بزبانِ حال یوں کہتے: "وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ" اللہ پاک جزائے خیر نصیب فرمادیں حبیب محترم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم مدیر دارالعلوم رحیمیہ ملتان کو جنہوں نے حضرت قاری صاحب مرحوم کی آخری حیات میں ان جواہر کو لڑیوں میں پرو کر ہار بنانا شروع کیا، چنانچہ جلد اوّل و دوم آپکی حیات میں آ گئی تھی، اور آپ کی نگاہِ ناز سے بھی مشرف ہوئی۔ حضرت مرحوم کی کرامت اور مرتّب زید مجدہم کی سعادت ہے کہ خطبات کا یہ شجرہ طیبہ خوب پھلا پھولا حتیٰ کہ پورے عالم میں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، تقبل اللہ تعالیٰ۔

اس وقت آپ کے سامنے خطباتِ حکیم الاسلام کی بارہویں جلد ہے جو سورہ قلم کی تفسیر پر مشتمل ہے، اہلِ ذوق ان شاءاللہ اس جلد سے خوب مستفید ہونگے، حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ ایک خاص شان و مقام رکھتی ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد رحمہ اللہ القرطبی نے اپنی زندہ جاوید تفسیر "الجامع آلاحکام القرآن میں سورۃ "ن" کے بارے میں بڑے عجیب وغریب حقائق بیان فرمائے ہیں، فرماتے ہیں حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے کہ "ن" رحمٰن کا آخری حرف ہے۔ ①

حضرت امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ "نَهْرٌ مِّنْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهٗ نُوْنٌ". نون جنت کی نہروں میں سے ایک نہر ہے۔ ② ابو العاسیہ کا قول ہے کی وہ اللہ پاک کے اسماء حسنیٰ میں سے نصیر، نور، ناصر، کا پہلا حرف ہے۔ ③ بہر حال یہ اشارات سُورۃ "ن" کی اہمیت اور عظمت کی نشاندہی کر رہے ہیں، ان شاءاللہ قارئین اس قسم کے لطائف و معارف سے اس جلد کے مطالعہ کے دوران خوب لطف اندوز ہوں گے۔

اس شجرہ طیبہ کے پھلنے پھولنے میں جناب مرتب حضرتِ اقدس مولانا قاری محمد ادریس صاحب مدظلہٗ کے اخلاص اور جُہد کا بنیادی حصہ ہے۔ کہ: خطباتِ حکیم الاسلام کو الحمد للہ علمی حلقوں میں استقرار ملا۔ اسی طرح موصوف نے چند سال قبل بفضلہ تعالیٰ "دارالعلوم رحیمیہ" کے نام سے ملتان میں حضرت اقدس مقریء اعظم شیخ القراءُ مولانا قاری رحیم بخش صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے منسوب ان کی علمی یادگار کے طور پر ایک ادارہ قائم کیا، جس میں بفضلہ تعالیٰ اَب دورۂ حدیث شریف تک درجہ کُتب بھی جاری ہے۔ شعبہ حفظ تو الحمد للہ پہلے ہی مستحکم تھا۔ سینکڑوں حُفاظ کرام اس مدرسہ سے اخذِ فیض کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ① زمانۂ طالب علمی سے حضرت قاری صاحب زید مجدہم اور فقیر، ہم درس، ہم فکر و ہم خیال ہونے کے ساتھ روحانی طور پر بھی ایک شیخ سے بیعت ہوئے۔

حضرتِ اقدس شیخ التفسیر مولانا محمد عبداللہ صاحب بہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہوئے اور ان کی زیرِ تربیت رہنے کا موقع نصیب ہوا حضرت اقدسؒ نے نگاہ کرم فرماتے ہوئے ایک رمضان المبارک کی تراویح میں خود پیچھے کھڑے ہوکر حضرت قاری صاحب کا قرآن کریم سنا، حضرت اقدسؒ نے تمام طلباء میں امتحان لے کر موصوف کا نسبتِ رحیمی سے اِنتخاب فرمایا تھا اور ختم قرآن کریم کے موقع پر اپنی مستعمل دستار عطا فرمائی تھی۔ ظاہر ہے ان حضراتِ اکابر کے عطایا رسمی ہدایا نہیں ہوتے۔

ان حضراتِ اکابر کی توجہات کی برکت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے محض اپنے فضل وکرم اور بالخصوص ان کے والد ماجد حضرتِ اقدس مولانا محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ جنہوں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے دورۂ حدیث کی سند حاصل کی۔ نیز ختم بخاری کے موقع پر دارالحدیث دیوبند میں علمانہ وطلباء کے برگزیدہ ومبارک اجتماع میں آپ کا نکاح حضرت مدنیؒ نے نہایت سادگی اور طالب علمانہ لباس میں پڑھایا۔ اور خیر وبرکت کی دعا فرمائی تھی۔

حق تعالیٰ شانہٗ ان سے دین کا کام لے رہے ہیں۔ میرے اصرار پر حضرت قاری صاحب زید مجدہم اپنے والد ماجد کے حالات قلمبند کر کے خطباتِ حکیم الاسلام میں دے رہے ہیں تا کہ جس شخصیّت نے خطباتِ حکیم الاسلام کی گیارہ (۱۱) جلدوں میں راہنمائی کی ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات میں آجائے۔

بہرحال اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں دُعا ہے کہ حضرت محترم مرتب زید مجدہم کے علم وعمل، اخلاص وتقویٰ اور عمر میں بے انتہا برکات عطا فرمائے اور ان کی اس سعی کو سعئ مشکور فرمائے۔

ایں دعاء از من واز جُملہ جہاں آمین باد

اظہار عقیدت

محترم ومکرم حضرت والعلام مولانا محمد اسحٰق خانصاحب زیدت عنایاتہم

(رکن اسلامک مشن متحدہ عرب امارات، دبئی، وسرپرست اعلیٰ جمعیت اہل سنت والجماعت متحدہ عرب امارا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ اشرف الانبياء وسيد المرسلين نبينا محمد وعلىٰ اٰله وصحبه اجمعين. وبعده...... دین اسلام، دین دعوت وتبلیغ ہے، کیونکہ یہ دین ساری دنیا کو کفر وشرک اور ضلالت وغوایت کے مختلف اندھیروں سے نکال کر توحید وسنت کی روشنی میں لانے اور راہ حق پر ڈالنے کے لئے آیا ہے، اسی لئے اللہ پاک، اپنے پیغمبر علیہ السلام کو واشگاف الفاظ میں تبلیغ حق کا حکم دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے: **یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته. (الأية)**

''اے پیغمبر! (بلاکم وکاست) پہنچادو وہ پیغام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آپ کے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اور اگر بالفرض آپ نے ایسے نہ کیا تو آپؐ نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔''

اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: **بلغوا عنى ولو اٰية** (پہنچادو میری طرف سے اگرچہ وہ ایک آیت ہی ہو'۔ اسی لئے امت مسلمہ امت دعوت وتبلیغ کہلاتی ہے اور سلف وخلف میں بے شمار ایسی مقدس وپاکیزہ ہستیاں گذری ہیں جنہوں نے دعوت وتبلیغ کے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، انہی مکرم ومحترم ہستیوں میں سے ایک ہستی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند انڈیا(کی بھی ہے، جن کو قدرت کی فیاضیوں نے علم وفضل کی بیکرانیوں کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی حلاوت ولطافت سے بھی بطور خاص نوازا تھا، گھنٹوں آپ کے بیان سے بڑے بڑے مجمعوں پر ایک سحر طاری ہوجایا کرتا تھا اور دنیا ہمہ تن گوش بن جایا کرتی تھی۔

اس پر مزید یہ کہ آپ کے اخلاص اور صدق دروں کے باعث یہ سب سرمایہ کیسٹوں کی شکل میں محفوظ بھی ہوگیا، دبئ میں راقم آثم کو ہندوستان کے بعض ثقہ حضرات نے سنایا کہ بمبئی میں ایک ادارہ صرف حضرت قاری صاحب مرحوم ومغفور کی کیسٹوں کی حفاظت وترویج کے لئے قائم کیا گیا ہے جس میں حضرت مرحوم کی سترہ ہزار کیسٹوں کا ذخیرہ جمع کرلیا گیا ہے۔

سبحان اللہ اتنا قبول عام اور اس طرح تحفظ شاید ہی پورے برصغیر ہندو پاک کے دوسرے کسی بھی خطیب کو نصیب ہو سکا ہو، یہ آپ کے اخلاص وللّٰہیت کا بین ثبوت ہے۔ (فرحمه الله رحمة واسعة)

اپنے ملتان کے حالیہ مختصر دورے کے دوران مجھے محترم مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہٗ نے بتایا کہ آپ ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی ساتویں جلد ترتیب دے رہے ہیں، اور وہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے تو مجھے اس سے دلی خوشی بھی ہوئی، اور حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حکیمانہ خطبات کی اس مقبولیت ومحفوظیت کا تعجب انگیز احساس بھی، اس ضمن میں موصوف نے راقم آثم سے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے فرمایا تو راقم آثم نے کیف ما اتفق نہایت جلدی میں یہ کچھ اُلٹے سیدھے نقوش حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دلی تعلق اور قلبی عقیدت کی بناء پر اور رضاءِ الٰہی کے حصول کے لئے سپردِ قلم وقرطاس کر دیئے، اللہ پاک قبول فرمائے، اور محترم قاری صاحب موصوف اور ان کے رفقاءِ کرام کی ان مساعی جمیلہ کو بارآور فرمائے، جو وہ اس کارِ خیر میں فرما رہے ہیں۔ (آمین ثم آمین) وصلى الله تعالىٰ علىٰ نبينا محمد وعلىٰ اٰله وصحبه وسلم

محمد اسحٰق خان (عفاالله عنه بحاوفاه)

نزیل ملتان، پاکستان

تحریر ۱۸،۱۱،۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲،۶،۱۹۸۹ء

بروز جمعرات بوقت پونے گیارہ بجے شب

گرامی قدر اخی فی اللہ حضرت محترم مولانا قاری ابوانس عطاء اللہ بخاری صاحب زید مجد ہم

امام خطیب النور مسجد، ایف بلاک وریئس مدرسہ نزہتہ الظہور (شمالی ناظم آباد کراچی)

علم وحکمت کی کہکشاں

بِاسْمِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی

محترم ومکرم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری دامت برکاتہم العالیہ کی زیرنظر کتاب ''خطبات حکیم الاسلام جلد۱۲'' اسی سلسلۃ الذہب کی تازہ ترین کڑی ہے جس میں اس عظیم المرتبت، عبقری شخصیت، جواکابر علماء دیوبند کے سچے جانشین، علوم ومعارف کے پاسبان، روایات اسلاف کے امین، حُبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار، اقلیم علم کے تاجدار، اپنے دَور کے عمدہ قاری، جید حافظ، صاحب علم وکمال، کامیاب معلّم، نامور متکلّم، محدّث کبیر، عالمی خطیب، شگفتہ قلم مصنف، نکتہ دان فلسفی، مردم شناس مُربی، لطائف واسرار، حقائق ومعارف پرگلفشاں، ایسے کہ چمنستانِ ادب وحکمت اور گلستانِ فصاحت وبلاغت میں بہار آجائے۔ مادرعلمی دیوبند کی انتظامی خدمت پرساٹھ برس تک چمکنے والا ستارہ، نبیرہ حجۃ الاسلام، حضرتِ اقدس مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وہ خطبات اور تقاریر و مقالات کے بکھرے ہوئے وہ ذخائر، حکمت ونکات کے وہ موتی جواب تک منظم تحریروں میں دستیاب نہیں تھے۔ حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری دامت برکاتہم نے صفحۂ قرطاس پراپنے قلم کے ذریعے ان کو نظم وترتیب کے ساتھ یکجا کرتے ہوئے ایسی کہکشاں سجائی ہے جس کے سامنے نظام شمسی کی کہکشاں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے کہ نظام شمسی کی کہکشاں صورتوں اور رنگوں کے تعارف کا ذریعہ ہے جس کی بُنیاد مادہ ہے۔ اور علم وحکمت کی کہکشاں جائز وناجائز، عدل وظلم کا امتیاز، باہمی اجتماعی وانفرادی حقوق کی حدود اور مقاماتِ قلب وباطن کی صحت وفساد میں صحیح سمت متعین کرنے کا نام ہے جو ظاہر ہے نظامِ شمسی سے ممکن نہیں۔ اس لئے ہوشیار پوری صاحب، کی سجائی ہوئی کہکشاں اپنی چمک دمک، روشنی، حرارت، نور، تابندگی اور تاریکیوں کو منور کرنے میں بے مثال ہے۔ موصوف مکرم، میرے مشفق ومہرباں استاذِ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے لائق اور ہونہار فرزند ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت منظّم، کامیاب مدرس بہترین قلم کار اور عالمِ باعمل ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی دولتِ علم سے نوازا ہے جس کے بارے میں شیخ رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

علم را بردل زند بارے بود

اس علم نے کیسی ''یاری'' نبھائی؟۔ انہیں ایسا توشۂ آخرت فراہم کرنے میں معاونت کی جس پر ہم جیسے ٹوٹا

چھوٹا لکھنے والے رشک کرتے ہیں۔ میں جب ہوشیار پوری صاحب کے تصنیفی سرمائے پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنی نام نہاد تحقیق وتنقید، تبصرہ وجائزہ قطعی بے کار اور ہیچ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے جو راستہ منتخب کیا وہ جہاں ان کی نیک نیتی اور خلوص کا مظہر ہے وہاں شہرت وتعریف اور مال وزر سے ان کی بے نیازی پر دال ہے۔ بااین ہمہ!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

خداوند کریم اُن پر مہربان ہے۔ عُمر بھر درس وتدریس اور مدرسہ کے انتظامی امور کے لئے سارا دن ''چکی کی مشقت'' اٹھانے کے ساتھ ساتھ ''مشقِ سخن اور مشق قلم'' جاری رکھنا کس قدر صبر آزما اور جان لیوا کام ہے۔ اس کا اندازہ شاید عام قاری بلکہ بہت سے اہلِ قلم بھی نہیں کر سکتے بقول شخصے:

انہیں کا ہے یہ کام، جن کے حوصلے ہیں سوا

غیر معمولی مصروفیات کے اس عالم میں انہوں نے جس استقلالِ مزاج کے ساتھ اور جس خاموشی وتندہی سے اور: ع

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''

کا مصداق بن کر اپنا کام جاری رکھا، ہمارے ہاں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، انہوں نے جہاں اپنی عاقبت کا زادِراہ فراہم کیا ہے وہاں ہم جیسوں کے لئے رُشدو ہدایت کی جُوت جگائی ہے۔ ممتاز علماء کرام اور مُستند مؤلفین نے ان کی تصانیف کی صحت واستناد پر صاد کیا ہے اس بارے میں میرا کچھ کہنا ''چھوٹا مُنہ اور بڑی بات'' ہوگی۔ یہ چند بے ربط سطور محض تعمیلِ ارشاد کے طور پر کہی جا رہی ہیں ورنہ میں خود کو اس موضوع پر کچھ کہنے یا لکھنے کا اہل نہیں پاتا۔ یہ اُن کی ذرّہ نوازی ہے اور اس عنایت کے لئے میں تہہ دِل سے ان کا ممنون وسپاس گذار ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی دینی خدمات اور مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطاء کرے۔ (آمین ثم آمین)

فقط دُعائے خیر کا طالب
ابوانس عطاء اللہ بخاری

تقریظ مبارک

حضرت اقدس محترم ومکرم مفتی محمد وجیہہ صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث دارالعلوم مظاہر العلوم ٹرسٹ لطیف آباد نمبر ۹ حیدرآباد سندھ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مکرم ومحترم مولانا قاری حافظ محمد ادریس صاحب دامت برکاتہم نے خطبات حکیم الاسلام کو جمع فرمانے اوراس کی اشاعت کا جو کام انجام دیا ہے یہ دین کی ایک اہم خدمت ہے جس کی دس جلدیں آ چکی ہیں اور دو جلدوں کے مسودے تیار ہیں۔ بکھرے ہوئے موتیوں اور جواہرات کو جمع کر کے ایک ذخیرۂ علمی اُمت مسلمہ کے سامنے پیش فرما کر ایسی خدمت انجام دی جیسا کہ منتشر صحائف قرآن کو جمع کر دیا گیا۔ یہ علمی ذخیرہ اگر اس کی کھوج نہ لگائی جاتی تو ضائع ہو جاتا۔ اس علمی ذخیرہ سے بہت فائدہ پہنچا اور پہنچتا رہے گا۔ (ان شاء اللہ) جو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کیلئے صدقۂ جاریہ ہے۔ اور مولانا قاری محمد ادریس صاحب کیلئے بھی اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور درجات عالیہ سے نوازیں اور مزید خطبات اور جامع خطبات کو جزائے خیر عظیم عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

احقر العباد: محمد وجیہہ غفرلہ
دارالعلوم مظاہر العلوم لطیف آباد نمبر ۹
حیدرآباد سندھ ۳۰ رجب ۱۴۱۸ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ جلد اوّل

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

أَمَّا بَعْدُ!

خدماتِ قاسمؒ وطیبؒ کی جھلک...... الحمدللہ ''خطباتِ حکیم الاسلام'' ایک عرصہ کی محنت ومشقت اور جد وجہد کے بعد مرتب ہوئی اور بسیار سعی وکاوش سے کتابت وطباعت کے مراحل سے بخیر وخوبی گذر کر منظر عام پر آئی، حکیم الاسلام حضرت مولانا جناب قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ جس خانوادۂ علمی سے تعلق رکھتے ہیں اس کی شہرت ایسی ہمہ گیر ہے کہ حضرت موصوف کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُمت مسلمہ بالعموم اور اہل سُنت والجماعت کا عظیم طبقہ بالخصوص جس عظمت وتقدس اور احترام کی نگاہ سے اسے دیکھتا ہے وہ کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ میری مراد حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور حضرت حکیم الاسلام قاری طیبؒ صحیح معنوں میں ''ماہتاب قاسمی'' ہیں۔

حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ نے دُنیائے اسلام کے لئے بالعموم اور برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص جو قابل قدر اور گرانمایہ خدمات سرانجام دی ہیں، اور افق ہند پر چھائے ہوئے کفر وضلالت کے بادل جس طرح انکی آہِ سحر گاہی اور اخلاص وللّٰہیت کی بدولت چھٹے ہیں، اس سے تاریخ کا ایک بہت بڑا اور زرّیں باب مرقوم ہے۔ اربابِ بصیرت اور تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ان نامساعد حالات سے بخوبی واقف ہے جن میں اسلام کے چراغ کو گل ہونے سے بچانے کیلئے وہ غیر مسلم طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اور ایسی مجاہدانہ قربانیاں پیش کیں جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائیں گی۔ اور پھر اپنے بعد اپنا تربیت یافتہ ایک مستقل طبقہ چھوڑا جو آج تک ان کے اس مقدس مشن کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور ہر طرف سے اُسے خدا کی نصرت وحمایت حاصل ہو رہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند جو بظاہر ایک ادارہ ہے۔ جہاں علومِ دینیہ کی درس وتدریس کا سلسلہ صبح وشام جاری ہے۔ طالبانِ علم کی تشنگی کا سامان ہوتا رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے دل میں جو مسلمانانِ ہند کے اجتماعی مفاد اور اسلام کے لئے تڑپ تھی، اس اجتماعی مفاد کے حصول کی خاطر آپ نے اپنی تحریک اور مشن کو علم کی چادر اوڑھادی تھی..... الحمدللہ وہ آج تک اسی راہ پر سرگرم عمل ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ اس ادارہ نے علم وفضل میں کیا عروج پایا؟ اور دنیائے اسلام میں کیا

مقام پایا اور کیا کیا خدمات سرانجام دیں؟ اس کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا یا مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیائے اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کوئی صاحبِ علم، دین کے کسی شعبہ میں کسی خدمتِ دینی میں لگا ہوا ہے وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ دارالعلوم دیوبند کا ہی فیض یافتہ ہے۔ دارالعلوم کا فیض پُرتاثیر ایسا ہمہ گیر ہے کہ صدیوں اس کے اثرات انشاء اللہ باقی رہیں گے۔ حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ نے گو اپنے کو مٹائے رکھا لیکن جس کو اللہ پاک عزت وشرف سے نمایاں کرنا چاہیں تو وہ مشیت ایزدی کے تحت ہو کر ہی رہتا ہے الحمد للہ وہ اپنے علمی کارہائے نمایاں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں اور جس عشق ومحبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اتباعِ دین کے ساتھ انہوں نے زندگی گزاری، کہا جاسکتا ہے کہ ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کا وہ حقیقی مصداق ہیں۔ آج اس دارالعلوم کو قائم ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے وہ اسی آب وتاب سے اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ کفر کی حرکات گو اس پہ خندہ زن ہوں مگر نورِ نبوت کا چراغ بھی اس کو مل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرات اکابر دیوبند سے جو کام لیا ہے اس کے ظاہری وسائل کم اور حقیقی وروحانی وسائل اسمیں بطور اصل عنصر کے شامل رہے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ اس دور میں علومِ قاسمی کے سچے وارث اور امین ہیں۔ ان کے اندازِ بیان سے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کی تقاریر جو میرے پاس پہنچیں تو اس جذبے کے ساتھ کہ علوم چند اشخاص کی حد تک نہیں رہنے چاہئیں بلکہ ان کو عام ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان تقاریر کو ایک کتابی شکل دینے پر آمادگی ہوئی اور ان تقاریر کو پڑھنے والے.... مجھے امید ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کریم، ابن کریم، ابن کریم کی شان کے حامل ہیں۔ اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نور اللہ مرقدہ کا قائم کردہ ''دارالعلوم'' نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا ان کے زیر اہتمام جس حسن وخوبی سے چل رہا ہے کہا جاسکتا ہے کہ روحِ قاسمی قالبِ طیّب میں جلوہ گر وجلوہ آراء ہے۔

حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کی تقاریر بالمشافہ سُننے کا اتفاق کم ہی ہوا اور پاکستان میں حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری بھی ہوتی ہے تو پروگرام کچھ اس نہج سے بنتے ہیں کہ عامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب کے علوم ومعارف سے استفادہ کا موقع کم ہی ملتا ہے، جہاں اس میں حکومت کے مروّجہ اصول وضوابط آڑے آتے ہیں اور حضرت قاری صاحب چند مخصوص مقامات (مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، دارالعلوم کراچی، خیر المدارس ملتان اور دارالعلوم اکوڑہ خٹک) کے علاوہ آزادانہ طور پر ہر جگہ نہیں پہنچ سکتے، وہاں خود عامۃ الناس میں معتقدین، متوسلین اور اکابر دیوبند سے متعلقہ ایک مستقل طبقہ اپنی گراں بار مصروفیات اور دینی مشاغل کے پیشِ نظر نیز ہوش رُبا گرانی کے باعث اپنے اندر ہمت وسکت نہیں پاتا کہ وہ اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر برابر مسافرت میں شریک رہ سکے

اور حضرت قاری صاحب کے نکتہ رس اور حکیمانہ اندازِ تکلّم سے فیض یاب ہو سکے۔ (قاری طیب صاحبؒ اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں)۔

آج کے دور میں اصلاحی جلسوں کی تقاریر کا ''رُخ'' بھی کچھ اس ڈھب کا ہو گیا ہے کہ تقریر کے اختتام پذیر ہونے کے بعد حاضرین میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں اصلاح کے علاوہ باقی سب کچھ مل جاتا ہے۔ سیرت طیبہ کے نام پر منعقد ہونے والی بڑی بڑی مجالس میں بھی سیرت کے علاوہ باقی بہت کچھ مل جائیگا مگر سیرت ہی مفقود ہوگی۔

خطباتِ حکیم کی خصوصیات...... حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے خطبات میں جہاں عوام کے لئے اصلاحی افادیت ہے وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اسلام کو ایک اجتماعی نظام حیات ماننے کی بجائے ''اسلام ہر ایک کا ذاتی وشخصی مذہب ہے'' کے فلسفہ کا قائل ہے اسے بھی دعوتِ فکر ہے۔ اندازِ بیان نہایت شستہ، سنجیدگی اور متانت سے بھرپور، روانی اور تسلسل کا شاہکار ہے جو دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ بیان میں قصص وواقعات، قرآن حکیم کی آیات کی بے نظیر تفسیر احادیث کی بہترین تشریح، حکایات وتمثیلات اور حکیمانہ نکات کی خوب سے خوب آمد ہوتی ہے۔ سامعین اکثر دم بخود محوِ وعظ ہوتے ہیں۔ اہل علم بات بات پہ سر دُھنتے ہیں۔ اور مجمع پر ایک سناٹے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ كَأَنَّ عَلٰى رُؤُوسِهِمُ الطَّيْرَ ۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ اپنی انہی خصوصیات کے باعث مجلس وعظ سے جب مخاطب ہوں تو انکی تقریر حشو وزوائد اور مکررات سے مبرّا ہوتی ہے اور تحریر نُما تقریر ہوتی ہے۔ تاہم سلسلہ کلام بہر حال تحریر سے کچھ مختلف ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ بندہ نے پورے خطبات کو لفظ بلفظ قلم بند کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے تاہم تحریر میں لاتے وقت کچھ جملوں کی نوک پلک ضرور سنواری ہے اور اسمیں بھی مقدور بھر یہی کوشش رہی ہے کہ حضرت قاری صاحب کے الفاظ میں ہی جملوں کی نشست وبرخاست کو درست کر دیا جائے۔ اب حضرت قاری صاحب کے مواعظ سے مستفیض ہونے والے اصحاب ہی اس بات کا فیصلہ کر پائیں گے کہ کس حد تک مجھے کامیابی ہوسکی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کی شخصیت یا ان کے خطبات ومواعظ کے بارے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے تاہم یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب میں اگر کوئی حسن وخوبی نظر آئے تو اسے حضرت قاری صاحب کی خطابت کا ایک حصہ سمجھا جائے اور جو اس میں نقص وکمی محسوس ہو تو اسے راقم آثم کی طرف منسوب فرمادیں، جس پر راقم بصد ندامت معذرت خواہ ہے۔

بندۂ ناچیز: محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد دوم

حامدا لله العظيم ومصليا على رسوله الكريم

اما بعد ......خطبات حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے سلسلہ کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے۔اہل علم کی طرف سے جلد اول کی پذیرائی اور مقبولیت نے دوسری جلد کی ترتیب کو میرے لئے آسان تر کردیا۔اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جلد دوم ضخامت میں بڑھ گئی۔(مجموعی طور پر اس میں چودہ (۱۴) خطبات شامل کئے گئے ہیں)

حضرات علمائے دیوبند شریعت وطریقت دونوں کے جامع ہیں۔ جہاں یہ تعلیم شریعت کے لئے حجت تسلیم کئے جاتے ہیں، وہاں تزکیۂ باطن کے لئے بھی رہبر کامل مانے جاتے ہیں۔اس لئے ان کے ہاں سے دونوں چشمے جاری ہیں۔تزکیہ باطن کے لئے جہاں اذکار ومجاہدے بتلائے اور کرائے جاتے ہیں اسی سلسلہ میں تذکیر وتبلیغ بھی ایک مؤثر حیثیت رکھتی ہے۔اس لئے ایک طرف یہ انما بعثت معلما کا پرتو نظر آتے ہیں تو ساتھ بلغوا عنی ولو ٰیۃ کی عملی تفسیر بھی نظر پڑتے ہیں۔

تاثیر وعظ کا تعلق الفاظ سے نہیں جذبات قلب سے ہے۔اور جذبات قلب کی اصلاح ''پیش مرد کاملے پامال شو'' کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔اس لئے خطبات کا یہ مجموعہ جہاں علمی لطائف ونکات کا حامل اور ہر قسم کے رطب ویابس سے پاک ہے، وہاں اصلاح باطن اور تزکیۂ قلوب کے نسخۂ اکسیر بھی ہے۔اس لئے یہ کہنا بے جا اور مبالغہ نہ ہوگا کہ اس مجموعیہ سے جہاں علماء، فضلاء اور خطباء بھر پور استفادہ کرسکتے ہیں۔ وہاں راہ سلوک واحسان کا طلاب اپنی تشنگی کا ساماں بھی کرسکتا ہے۔ جہاں ایمان ویقین سے بہرہ ور دیندار اس کی لذت وشیرینی سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔وہاں عقل وفلسفہ اور جدید روشنی کا بھٹکا ہوا خیرہ چشم ومرعوب بھی اپنے آئینہ قلب کو جلا بخش سکتا ہے۔

قحط الرجال کے اس دور میں بزرگان دین کے ملفوظات ومواعظ ان کی صحبت کے قائم مقام ہیں۔جن کو پڑھتے رہنے سے قلب میں نورانیت اور عمل صالح کا جذبہ زندہ رہتا ہے۔ورنہ حوادث زمانہ نے ایمانی چنگاری کو زائل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔اس لئے یہ صحبت ومعیت کا بہترین بدل بھی ہیں اور حفاظت ایمان کا ذریعہ بھی۔

جغرافیائی حدود حائل ہونے کے باعث میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ میں جلد اول ودوم کے مسودات حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کرسکتا، اوران سے نظر ثانی کی درخواست کرتا۔البتہ استاذ الاساتذہ امام القرآت آیۃ من اٰیات اللہ حضرت مولانا القاری المقری فتح محمد صاحب دامت برکاتہم، مہاجر مدنی سے بذریعہ

مکتوب چند اقتباسات ارسال کر کے تحسین وتائید حاصل ہوئی۔ اور پاکستان کے جید اور ممتاز و مستند علماء اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں اس مسودہ کو پیش کر کے ان سے اس بارے میں کچھ لکھنے کی درخواست کی، جسے انہوں نے منظور فرمایا۔ چنانچہ مخدوم العلماء حضرت مولانا محمد شریف صاحب مدظلہٗ خلیفۂ ارشد حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ (مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان) اور اسوۃ الصلحاء حضرت العلام مولانا مفتی عبدالستار صاحب زید مجدہم (خیر المدارس ملتان) نے مختلف مقامات سے پڑھا اور تحسین فرمائی۔ نیز کتاب کے بارے میں کلمات تبرک ارقام فرمائے، جو کتاب میں شامل کر دیئے گئے۔

علاوہ ازیں والد محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہٗ (استاذ دار العلوم کراچی) نے بالاستیعاب پورے مسودے کا مطالعہ فرمایا، اور قابل اصلاح عبارت کی نشاندہی فرمائی۔ خصوصاً احادیث کی عبارت نقل کرنے میں احتیاط سے کام لیا گیا۔ اس کے باوجود بندے کا علم ناقص ہے خطاء کا احتمال باقی ہے۔ اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اہل علم اس کی اصلاح فرما دیں اور بندہ کو بھی مطلع فرمائیں۔ بندہ اس کا شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس اظہار حقیقت کے بغیر چارۂ کار نہیں کہ اس مجموعہ کی تمام تر خوبیاں علوم قاسمی کے حامل اور وارث وامین کے لئے زیبا ہیں۔ اور بندہ کی حیثیت محض ایک نااہل مرتب کی ہے۔ اور بس

من ہیچم وکم زہیچ بسیارے   وزہیچ کم ازہیچ نیاید کارے

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جلد دوم میں بیشتر تقاریر کیسٹز سے لی گئی ہیں، جو مختلف مقامات پر ریکارڈ کی گئیں۔ اس سلسلہ میں بندہ برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہٗ اور مولانا قاری سیف الدین صاحب زید مجدہٗ (مقیم سعودی عرب) کا خاص طور پر شکر گزار اور ممنون ہے کہ انہوں نے بندۂ ناچیز کو یہ تقاریر مہیا فرمائیں۔ اور جلد اول کی طرح اس مجموعہ میں بھی تعاون فرمایا۔ میں ان دو حضرات کے حق میں کلمات تشکر و امتنان کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ حقیقی صلہ تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی دے سکتے ہیں۔

بہر حال یہ مجموعہ حاضر خدمت ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے فضل وکرم سے اس کو شرف قبولیت سے نواز کر اس کے منافع کو عام وتام فرما دیں۔ اور ہم سب کے لئے دین ودنیا کے لحاظ سے خیر وبرکت، صلاح وفلاح اور ذریعۂ نجات اخروی بنائیں۔ (امین یارب العٰلمین. بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم.)

چشم دارم کہ دہد رقم مرا حسن قبول   آنکہ دُرّ ساختہ است قطرۂ بارانی را

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

۲۹ر رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ / یکم اگست ۱۹۸۱ء

پیش لفظ جلد سوم

حامداً اللہ العظیم ومصلیاً علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ واتباعہٖ اجمعین. اما بعد ...... اس کارخانۂ کون ومکان کی تمامتر زینت وآرائش اوراس میں رکھے گئے بے شمار خزائن اس انسان کے لیئے بنائے گئے ہیں اوراے انسان تو اپنے خالق کے لئے بنایا گیا ہے: ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ. (الحدیث)

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے جو مقصود بعثت انبیاء علیہم السلام ہے۔ مگر انسان اس کو فراموش کر چکا اور جن کا وہ مخدوم تھا، ان کو مخدوم بنا کر راہ راست سے بھٹک گیا۔ تعلیم انبیاء علیہم السلام نے اسے فکر ونظر اور قلب ودماغ کے لحاظ سے اس کائنات سے اتنا اونچا بنایا تھا کہ اس ساری دنیا کی حقیقت کو یہ فرمایا۔ کہ ایک مچھر کے پر برابر اس کی وقعت نہیں۔ اور خالق انسان کی یہ صدا اس کو سُنائی ''تو میرے لیئے ہے'' اوراس دنیا کی کوئی چیز تیرا بدل نہیں''۔ بلکہ فرمایا گیا کہ تیرے اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال وافعال کا صلہ ایسا تیار کیا گیا ہے۔ کہ کسی انسان نے دیکھا سنا تو کیا ہوگا، اس کا ادنیٰ تصور بھی قلب بشر پر نہیں گزرا الغرض، ترغیب وترہیب، انذار وتبشیر اور تبلیغ وتذکیر کے ذریعے اسے متوجہ کیا گیا۔ کہ دنیا کی یہ چندروزہ زندگی لہو ولعب اوراس کی زیب وزینت متاع الغرور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور متاع زندگی صرف کرنے کے بعد بھی تیرے بنائے ہوئے منصوبے تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اس کائنات سے مقصود خالق کائنات کا تعارف تھا۔ مگر انسان اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو کر رہ گیا۔ بلکہ خود انسان کا وجود اس کے لیئے دعوت فکر ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون. حصول معرفت کی بجائے یہ خدا فراموشی سے زیادہ خود فراموش بن گیا۔ نہ اس کے سامنے اس زندگی کا کوئی نصب العین ہے اور نہ زندگی کے بعد آنے والے دور کا کوئی خاکہ ہے، نہ اس کا ثواب عقاب اور جزا وسزا مد نظر ہے۔

انسانیت کے سب سے بڑا محسن حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقدس وبرگزیدہ طبقہ ہے جس نے انسان کو ابدی راحتوں اور حقیقی نعمتوں کی راہ پر گامزن کیا اور اسے اس کا نصب العین یاد دلایا اور کس شان سے یاد دلایا۔ لااسئلکم علیہ اجرا. نیز حیات مابعد الموت سے روشناس کرایا۔ جس سے نہ صرف اس کی یہ زندگی بھی صبر وشکر، عفو ودرگزر، ورع وتقویٰ، زہد وقناعت اور سجدۂ وعبادت جیسے اعمال صالحہ واخلاق حمیدہ میں ڈھل گئی۔ بلکہ

اس زندگی کو اپنانے والے دنیا سے جاتے ہوئے اہل دنیا سے بطور شہادت کہہ گئے :فزت برب الکعبۃ.

بہر حال امن وآشتی، سکون واطمینان اور راحت وچین کے الفاظ نہیں۔ان کے حقائق ومعارف اور ان کی سچی کیفیات ومصادیق انبیاء علیہم السلام کے دامن رحمت اور ان کی تعلیمات میں پوشیدہ ومضمر ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد آنے والے دور کے لیئے فرمایا گیا۔ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا اور العلماء ورثة الانبیاء. وراثت علوم وکمالات نبوت بعد از ثبوت نسبت ملتی ہے جیسا کہ وراثت دنیا بعد از ثبوت نسبت حاصل ہوتی ہے۔علماء ربانی اور مشائخ حقانی نے اس ورثۂ نبوت کو خوب سے خوب پھیلایا۔نہ اس میں حصول منفعت کو پیش نظر رکھا، نہ مضرت کے اندیشوں کو خاطر میں لائے، نہ حب مال وجاہ انہیں زیر کرسکی، نہ بادشاہوں کی پیش کشیں ان کی استقامت میں لرزہ پیدا کرسکیں۔ان کا مسلک یہ رہا۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم ۔۔۔ با میر خان بگوئے کہ روزی مقدر است

بلکہ اس دنیا کی بے حقیقتی ودولت کا اس طرح برملا اظہار کیا۔

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیم روز را بیک جونمی خرم

قلب انسانی کا اس معراج پر پہنچنا یہ بلا تعلیم انبیاء علیہم السلام کے ممکن نہیں۔اور باطن کی بادشاہی اس دنیا کی محبت کو دل سے نکالے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ۔۔۔ ایں خیال ست ومحال است جنوں

اور قلب کی جب اصلاح ہوجاتی ہے۔پھر قالب سے نکلنے والے اعمال بھی اعمال صالحہ کہلاتے ہیں اور دربار خداوندی میں وہ باقیمت ہوجاتے ہیں۔

آج کے سائنسی دور میں جب کہ اعمال کی قیمت دل سے نکل چکی ہے۔انسان میں شرافت ودیانت عنقاء ہوگئی اور اخلاقی اقدار پامال ہوگئیں۔جہاں اس کے اور اسباب ہوں گے۔وہاں ایک بڑا سبب خود سائنس کے اسباب وسامان ہیں۔

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت ۔۔۔ احساس مروت کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہ بھی ناانصافی ہوگی کہ ساری ذمہ داری اسباب وسامان پر ڈال دی جائے اور ان کو مصرف میں لانے والے انسان سے چشم پوشی کرلی جائے۔ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے آدمی خدا تک پہنچ سکتا لیکن بات وہی ہے کہ ان کے استعمال کا طریقہ کار بھی تعلیمات نبویہ سے معلوم ہوسکے گا۔پھر ساری دنیا دین بن جائے گی ورنہ دین بھی دنیا ہوکر رہ جائے گا۔جو بغیر روح محض ایک لاش ہے۔جس کی کسی معاشرے میں کوئی قیمت نہیں چہ جائیکہ آخرت یا دربار خداوندی میں اس کی قیمت ہو؟ اور اس پر اجر وثواب کی اُمید رکھی جائے۔

حضرات اہل اللہ انہی تعلیمات کے حامل ہیں اور انہی تعلیمات کے ذریعہ الحمدللہ ایک زمانہ روشن ہے۔آپ

کے ہاتھوں میں موجود کتاب ''خطبات حکیم الاسلام'' کی تیسری جلد ہے اور اس میں اس چشمۂ فیض کے مدیر و مہتمم کے خطبات و مواعظ جمع ہیں۔ جس ادارے کے نور علم سے پورا عالم جگمگا رہا ہے جہاں اہل اللہ بھی پیدا ہوتے ہیں اور مدرس و معلم بھی قومی راہنما اور مبلغ و مصلح بھی ان مواعظ و خطبات میں کہا کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لئے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

الحمد للہ ناظرین کرام پہلی دو جلدیں دیکھ چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس جلد کو بھی شرف قبولیت بخش کر اس کے منافع کو عام و تام فرمادیں گے اور جہاں حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے لئے ذخیرۂ آخرت اور باعث اجر و ثواب ہوگی۔ وہاں خود قارئین کرام کے دینی فوائد بھی اس سے پورے ہوں گے۔ نیز خطباء دائمہ کے لیے یہ تحفۂ گراں مایہ ثابت ہوگی۔

اس جلد کے تمام مسودے پر گرامی قدر حضرت والد ماجد صاحب دامت برکاتہم نے بھی نہایت محنت و عرق ریزی سے نظر ڈالی اور پورا مسودہ بنظر عمیق دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس جلد میں خطبۂ طیبہ کے علاوہ جتنی تقاریر آئی ہیں، وہ سب ٹیپ ریکارڈ سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ خطبۂ طیبہ انڈیا کا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں وہ اہم خطبۂ صدارت ہے جو حضرت حکیم الاسلام مدظلۂ نے جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور ضلع شاہ آباد آرہ و بہار، انڈیا، کے سترہویں جلسۂ سالانہ منعقدہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ کو ارشاد فرمایا تھا برائے افادہ من وعن ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ سے سننے میں غلطی ہوسکتی ہے تصحیح میں غلطیاں رہ جاتی ہیں کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں کم از کم علمی غلطی نہ رہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر پڑے تو حضرات اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اسے حضرات حکیم الاسلام مدظلۂ العالی کی ذات والا ستودۂ صفات کی طرف منسوب نہ فرمادیں، بلکہ اسے مرتب کی نااہلیت پر محمول فرمایا جائے اور اس سے مطلع فرمایا جائے، بندہ اس پر شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس کتاب کی تدوین میں اپنے ان قابل احترام بزرگوں کا ذکر خیر اور ان کا اظہار تشکر ضروری خیال کرتا ہوں، جنہوں نے مجھے تقاریر کی کیسٹز مہیا فرمائیں یعنی برادر محترم حضرت مولانا قاری سیف الدین صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہما ان حضرات کی بدولت کیسٹز میں محفوظ مواد کتابی شکل میں منظر عام پر آسکا، اللہ تعالیٰ ان ہر دو حضرات کو بہت بہت جزائے خیر نصیب فرمادے اور اپنے دربار عالی سے اپنی اور ان کی شایان شان اجر جزیل عطا فرمادے اور تادم آخر اپنی رضا کے ساتھ خدمت کلام اللہ کی توفیق نصیب فرمادے اور شرف قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندۂ ناچیز محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد چہارم

اما بعد ...... حضرات اہل اللہ کے خطبات ومقالات اوران کے سوانح وتذکرے دل کی دنیا کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہیں، دل سے دنیا کی محبت زائل ہوجائے اورحق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت ومحبت سے دل معمور ہوجائے، اس کے لئے اصل تو اہل اللہ کا فیض صحبت ہے جس علم وعمل میں رسوخ پیدا ہوتا ہے، علم کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے اور مقصود علم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، قولب کا زنگ دور ہوکر امراض باطنیہ کا احساس ہونا شروع ہوجاتا ہے اور یہی احساس ان کے ازالہ کا ذریعہ بن کر زینۂ ترقی ثابت ہوتا ہے۔ آج کے جدید دور نے صحبت ومعیت کی اہمیت کو حسی مثالوں سے اس طور پر نمایا کردیا ہے کہ اب اس کا انکار گویا واقعات کو جھٹلانا ہی نہیں بلکہ خود اپنی عقل وخرد کی ناکامی کا اعتراف بھی ہے، جیسے آم کو لیموں یا کسی اور پھل کی قلم لگادی جائے تو آم کی صورت گو دہی رہے جو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے اُسے روز اول سے ودیعت کی گئی ہے، تاہم اس کا ذوق باطن اوراندرونی مزہ دہ ہوگیا جو لیموں کے باطن کا تھا۔

اہل اللہ کے قلوب سے اپنے قلب کی پیوندکاری سے اھل اللہ کا ذوق وشوق اوران کی باطنی کیفیات دل میں منتقل ہونا شروع ہوجاتی ہیں اوراسی صحبت کے اثرات سے انسان کا قلب وقالب بدلتا چلا جاتا ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے: **یا ایھا الذین امنوا تقوا اللہ و کونوا مع الصادقین** ...... اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے جو کہ مقصود ہے اور حصول مقصود کا آگے سہل راستہ ہے کہ: ’’سچے لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ‘‘ گویا تقویٰ کے حصول کا ذریعہ صادقین کی معیت ہے۔

چونکہ قرآن حکیم ابدی کتاب ہے اس کے تمام اوامر ونواہی بھی ابدی ہیں، تو اہل صدق کی معیت اختیار کرنے کا حکم بھی ابدی اوردائمی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل صدق وصفا کا وجود مسعود ہمیشہ ہوگا، ورنہ حکم کے پورا کئے جانے کی کوئی صورت نہیں، الغرض اہل صدق ہمیشہ تھے اور ہمیشہ ہوں گے، ہاں اس جنس گرانمایہ کی قلت وکثرت ہوسکتی ہے اوراہل طلب کو ڈھونڈنے سے کیا کچھ نہیں مل سکتا؟

بہرحال صحبت صالحین کی اس قدر اہمیت ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا چھوٹے سے چھوٹا عمل پوری امت کے تمام اعمال پر اسی لئے بھاری ہے کہ وہ صحبت نبویؐ سے ایسے باطنی کمالات حاصل کر

چکے ہیں کہ جس کیفیت اور حسن استغراق سے وہ حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ قدس میں عجز و نیاز کا اظہار کر پاتے ہیں، وہ کسی ایسے شخص کے لئے ممکن ہی نہیں جس نے صحبت نبویؐ سے حصہ نہ پایا ہو، اسی کو تو کہا ہے کہ ''وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا'' اسی مسیحائی اعجاز کا ظہور تھا کہ دنیا کے جس خطے کی طرف ایک صحابیؓ بھی نکل گئے تو دنیا کی دنیا بدلتی چلی گئی، یہی قلب کی وہ دولت ہے جس کے سامنے دنیا کا کوئی فکر، فکر نہیں رہتا اور پوری دنیا کے بارے میں (متاع الدنیا قلیل) کی قلبی و حقیقی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور فقر میں شاہی کرنے والا انسان اپنی صفات میں ملکوت کو شرما دیتا ہے کہ

نے تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے　　　جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

دنیا کے جاہ و جلال سے حجاب غرور اُٹھ جاتا ہے اور مردار بکری کی دینار و درہم سے خرید کو معیوب سمجھنے والا انسان اپنی زندگی کے سرمایہ سے دنیا و مافیہا کی خرید پر آمادہ نہیں ہوتا کہ

نرخ بالا کن ، ہنوز ارزانی

صبر و توکل، زھد و غناء ورع و تقویٰ کی وہ شمع قلب میں فرد زاں ہو جاتی ہے کہ وہ زبان حال سے کہتا ہے:

من دلق خود بافرشاہاں نمی دھم　　　من فقر خود بملک سلیماں نمی دھم

از رنج فقر درد لے گنجے کہ یافتم　　　ایں رنج را براحت شاہاں نمی دھم

اسی خزانے کا مالک جذب و شوق اور قانیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے　　　ایک ڈھیر ہے یاں خاک کا اور آگ دبی ہے

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ ایک مقام پر فیض صحبت کی اسی تاثیر و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

''صحبت اولیاء میں ایک خاص بات قلب میں ایسی پیدا ہو جاتی ہے جس سے خروج عن الاسلام کا احتمال نہیں رہتا، خواہ گناہ اور فسق و فجور سبھی کچھ اس سے وقوع میں آویں، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاوے، مردودیت تک کبھی نوبت نہیں پہنچتی، برخلاف اس کے ہزار برس کی عبادت میں بذاتہ یہ اثر نہیں کہ وہ کسی کو مردودیت سے محفوظ رکھ سکے، چنانچہ شیطان نے لاکھوں برس عبادت کی لیکن وہ اس کو مردودیت سے نہ روک سکی، یہی معنی ہیں اس شعر کے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی چیز جو مردودیت سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے ہزارہا سال کی اس عبادت سے بڑھ کر ہے جس میں یہ اثر نہ ہو'' نیز ایک اور مقام پر فیض صحبت اور اگر وہ میسر نہ ہو تو اس کے لئے بدل کیا ہو، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

''کمال اسلام کے لئے ضرورت ہے علم اور ہمت کی اور تیسری چیز ایک اور ہے جس سے علم وہمت میں قوت پیدا ہوتی ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے، یہ عجیب چیز ہے جس سے اس مردہ جسم میں روح پر جاتی ہے اسی کو کہا ہے کہ:

مقام امن دمے بے غش و رفیق شفیق ۔ گرت بدام میسر شود زہے توفیق

اگر ہمیشہ میسر نہ ہو تو گاہے گاہے سہی، جب بھی موقع ہو۔

ایک اور چیز اس کے قائم مقام بھی ہے کیونکہ جب مرداریدمیسر نہ ہو تو صدف سے ہی کام نکال لیا جاتا ہے اس کا بیان اس شعر میں ہے:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است ۔ صراحی مے ناب وسفینہ غزل است

یعنی بزرگوں کے تذکرے اور حالات جن میں برقی اثر ہے کہ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو ان کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مستعد ہو ہی جاتا ہے ان میں بھی صحبت کی سی برکت ہے، اگر صحبت میسر نہ ہو تو اسی کو اختیار کرو بہت کام دے گی۔
(الاسلام الحقیقی، ص:۹۲)

بہر حال ان مواعظ وخطبات سے ان شاء اللہ جہاں علمی نکات واسرار آپ کے سامنے آئیں گے وہاں روحانی رموز ودقائق بھی حل ہوں گے، اس دور صدف میں صحبت اہل اللہ کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے ان انوار وبرکات سے بھی حصہ وافر پائیں گے۔

دادیم تراز گنج مقصود نشان ۔ گرمانر سیدیم شاید تو برسی

بہرحال خطبات حکیم الاسلام کی چوتھی جلد اس وقت آپ کے زیر ملاحظہ ہے مختلف موضوعات پر مواعظ جمع ہیں، مضامین کے لحاظ سے ہر وعظ انفرادیت کا حامل اور اپنی نوعیت میں ندرت رکھتا ہے، آج سے ۴ سال قبل جو مواعظ طیبہ کی جمع وترتیب کا سلسلہ شروع کیا تھا اب چوتھی جلد کی شکل میں اس کا مجموعہ آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے۔

آغاز سفر میں ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ خطبات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ان کا پھیلاؤ اس قدر ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کم ہمتی کو دیکھوں تو بات اب بھی سمجھ سے بالاتر ہی نظر آتی ہے کہ آخر یہ کام کیسے سرانجام پایا؟ محسن اساتذۂ کرام اور مخلص احباب کرام کی دعائیں شامل حال رہیں تو یہ کام ہوسکا، اس لئے جو کچھ بھی آپکو نظر آرہا ہے اس کو ہرگز اس بندۂ عاجز کی محنت کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اپنی دعوات صالح کا ثمرہ خیال فرمادیں۔

اور اس کا اصل سبب تو حضرت العلام حکیم الاسلام مدظلۂ العالی کا اخلاص وللھیت ہے جس کی قبولیت کا یہ مظہر ہے، حق تعالیٰ شانہٗ ہم سب کیلئے اس کا نافع بنائیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلۂ کے ارشاد فرمودہ خطبات الحمدللہ ہر لحاظ سے جامع ہوتے ہیں، ایسے علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی خطبات ومواعظ پر عنوان قائم کرنا مجھ ایسے بے بضاعت کے لئے نہایت مشکل کام تھا مگر بفضلہ تعالیٰ سرانجام پایا۔ بایں ہمہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عنوانات قائم کرنے میں جس نزاکت اسلوب کو ملحوظ رکھنا چاہیے

تھا وہ ''ذوق ادب'' سے خالی ہونے کی بناء پر نہ رکھ سکا قارئین کرام کو خطبات کے علمی مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے جو خوش کن کیفیات حاصل ہونگی خدا نہ کرے کہ اس میں ترتیب عنوانات ان کے ذوق سلیم کے لئے بارگراں ثابت ہو۔ اپنی سعی وکوشش کی حدتک حسن ترتیب کا خیال رکھا ہے مگر پھر بھی کمی کا رہ جانا امر لازم ہے:

فدایت دیدہ ودل رسم آرائش ازمن مپرس خراب ذوق گل چینی چہ داند باغبا نیہا

اپنے احباب مخلصین حضرت الحاج مولانا القاری المقری سیف الدین صاحب مدظلہٗ مقیم مکہ مکرمہ اور حضرت الحاج مولانا قاری ومقری محمد رفیق صاحب مدظلہٗ مقیم جدہ (سعودی عرب) کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خطبات کی تمام جلدوں کے لئے بھرپور مواد مہیا فرمایا۔ اور اس طرح یہ عظیم علمی سرمایہ منظر عام پر آسکا، اپنے برادر عزیز قاری محمد قاسم عزیز سلمہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ بھی اس سلسلہ میں اپنی ذاتی مصروفیت کے باوجود تعاون فرماتے رہے حق تعالیٰ شانہٗ ان تمام حضرات کے درجات بلند فرمادیں اور ان کو بہت بہت اجر وصلہ نصیب فرمادیں۔ اور ان خطبات ومواعظ کو شرف قبولیت نصیب فرمادیں۔ امین ثم امین یارب العٰلمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰہ والتسلیم الف الف مرۃ.

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ / مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد پنجم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ واتباعہٖ اجمعین. اما بعد......

خطباتِ حکیم الاسلام جلد پنجم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکرادا کروں، کم ہے، **اللھم لا احصی ثناء علیک کما اثنیت علیٰ نفسک. اللھم لک الحمد کالذی تقول وخیرا مما نقول.** خطبات کی ترتیب کا جب آغاز ہوا تھا تو جلد اول کی ترتیب کے بعد اپنے محدود وسائل کے پیش نظر بندہ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اپنے اکابر واساتذہ کرام کی دعاؤں سے یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ اہل علم میں مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنے بندوں میں مقبول بنایا، امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے فضل عظیم اور دریائے کرم کے صدقے اپنے جناب اقدس میں اسے قبول فرما کر آخرت کی نجات کا ذریعہ بنادیں گے **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز**

ہمارے سلسلۂ قرآن حکیم کے جد امجد حضرت اقدس عارف باللہ شیخ القراء مولانا قاری فتح محمد صاحب (مہاجر مدنی) قدس اللہ سرہٗ نے تو اس ناکارہ کی اس قدر حوصلہ افزائی وعزت فرمائی کہ حضرت والاؒ کی شفقتوں کے اظہار کے لئے بندہ کے پاس الفاظ نہیں جب کبھی بھی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، بااہتمام دریافت فرماتے خطبات کی مزید جلد آئی، اور اتنا شغف رکھا کہ چاروں جلدیں اہتمام کے ساتھ اپنی مجالس میں سنیں، جلد چہارم کے بعد بھی دریافت فرمایا کہ اور جلد آئی، بندہ نے عرض کیا پہلے بھی آپ کی دعاؤں سے سب کچھ ہوا، آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے، انشاء اللہ آجائیگی، الحمدللہ حضرت اقدس کی دعاؤں سے پانچویں جلد تو آپ دیکھ رہے ہیں، مگر افسوس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا، اور میں جلد حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ کو اپنے مدارج قرب میں بہت زیادہ ترقیات سے نوازے آمین!

بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے یہ کام جاری رہا اور انشاء اللہ ابھی جاری ہے اسی طرح اپنے عظیم محسن استاذ حضرت اقدس شیخ القراء قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں ایک بار حاضری ہوئی

فرمانے لگے۔ بھائی! میں تو آپ کو روزانہ یاد کرتا ہوں، آپ پتہ نہیں یاد کرتے ہو یا نہیں؟

آپ کے اس فرمان پر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی بہت زیادہ ہوئی پھر ارشاد فرمایا: ''بھائی! وہ آپ کی ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی جلد میرے تکیے کے نیچے رکھی ہے جب رات کو (تدریس سے فارغ) ہو کر گھر جاتا ہوں تو اسے دیکھتا ہوں''۔

پھر فرمایا: ''بھائی! زندگی میں سب یاد کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں حقیقی محبت کا پتہ تو مرنے کے بعد چلتا ہے اس وقت کون یاد رکھتا ہے۔''

حضرت اقدسؒ کا اشارہ اس طرف (جو میں سمجھ سکا) چونکہ کتاب کا انتساب حضرت والا کی طرف تھا کہ اب تو آپ محبت کا اظہار کر رہے ہو مرنے کے بعد بھی یاد رکھنا، مراد حضرتؒ کی یہ تھی اس وقت آدمی کو دعاؤں میں یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے، یہ حضرتؒ کی کمال تواضع تھی، ورنہ کجا بندۂ نابکار اور کجا میری دعاء، ان حضرات اکابر کے اس تذکرہ خیر و برکت سے خود خطبات اور مرتب خطبات سے جو انکی محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ خطبات کی اہمیت اور مرتب کے لئے نجات کی سند ہے، ایفائے عہد اور تعمیل حکم کے لئے خود بھی حضرت اقدسؒ کے ہے دعا گو ہوں اور تمام قارئین کرام سے بھی ملتجی ہوں۔

اسی طرح حضرت اقدس شیخ القراء قاری فتح محمد صاحبؒ اگرچہ وصال فرما گئے مگر اب بھی حضرت والا کا خط مبارک برائے حصول برکت اور ''دعوات فتحیہ'' کو اسی طرح جزو کتاب بنایا جا رہا ہے جس طرح ان کی حیات مبارکہ میں تھا، اللہ تعالیٰ ان سب اکابر کو ہماری طرف سے بہت جزائے خیر نصیب فرمائے آمین!

بہر حال ان حضرات اکابر کی دعاؤں نے بہت کام دیا، علاوہ ازیں اور بہت سے اکابر اور خطبات کے قارئین کرام نے بہت دعاؤں سے نوازا، امر واقعہ یہ ہے کہ یہ اکابر کی دعاؤں اور قارئین خطبات کے دعاؤں کا ثمرہ ہے اور بس!

پانچویں جلد کی ترتیب کے سلسلہ میں جو مطبوعہ تقاریر حاصل ہوئیں وہ بھی شامل کی گئیں، لیکن بعض جگہ کچھ ناگزیر تبدیلی کرنی پڑی، بالخصوص بعض عنوان بدلنے پڑے اور ان کو خطبات کے اس طرز کے موافق کیا گیا جو قارئین کرام کے پہلی چار جلدوں کے مطالعہ کی وجہ سے ایک خاص ذوق بن گیا تھا بایں ہمہ بندہ ادارہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک پشاور، اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مبلغ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت بہاولپور کا بھی تہہ دل سے بھی شکر گزار ہے کہ انہوں نے یہ تقریر بہم پہنچائی۔

اسی طرح اپنے برادر محترم جناب مولانا محمد رفیق صاحب انور نعمانی (مقیم مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفا و کرامۃ) کا تہہ دل سے شکر گزار اور ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے پانچویں جلد کا خاصا مواد مہیا کیا اور پانچویں جلد میں ان کی طرف سے بہت ہی زیادہ معاونت ہوئی، اس تبلیغی سلسلہ میں جس پاکیزہ جذبے سے انہوں نے معاونت کی

ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور دارین میں اس کا بدلہ نصیب فرمائے آمین!

خطبات حکیم الاسلام کی پانچویں جلد کے منظر عام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، ظاہری طور پر جہاں مواد کا نہ ملنا باعث تاخیر ہوا، وہاں یہ بھی سبب بنا کہ میری اہلیہ محترمہ کا بچے کی ولادت کے چند روز بعد انتقال ہو گیا اور ذہنی سکون جو ترتیب و تالیف کے کام کیلئے لازمہ ہے، نہ رہا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے، قارئین با تمکین سے ان کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اور یہ استدعا بھی ہے کہ خطبات کی چھٹی جلد کی تکمیل کیلئے دعاؤں سے یاد فرمائیں، احسان و کرم ہوگا۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ

پیش لفظ جلد ششم

نحمدهٗ ونصلی علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ اٰله وصحبه ومن تبعهم باحسان الیٰ یوم الدین. امابعدُ...... حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل وکرم اوران کی بے پایاں عنایات سے خطبات حکیم الاسلام کی جلد ششم حاضر خدمت ہے۔الحمدللہ پہلی پانچ جلدوں کومقبولیت حاصل ہوئی، منظر عام پر آنے کے بعد مسلسل اشاعت ہورہی ہے،اور متعدد ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے، قارئین خطبات کی اسی دلچسپی کے باعث بندہ کا بھی حوصلہ بڑھتا رہا،اورالحمدللہ یہ سلسلہ چل رہا ہے، جلد ششم بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہٗ کی نابغۂ روزگار شخصیت کواللہ تبارک وتعالیٰ نے ایجاد کلام اورحسن بیان کی خوبیوں سے بہت نوازا ہے۔اوران کے بحرآفرین خطبات کو سننے والے بلامبالغہ لاکھوں انسان آج بھی موجود ہیں بیان کی خوبی حقیقت یہ ہے کہ دیدنی ہے نہ کہ شنیدنی، جس کاتعلق بطورخاص کیفیت بیان سے ہے۔اس لئے وہ کاغذ وقلم کی دسترس سے باہر ہےاوراس کا مصداق ہے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ۔۔۔ لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ اپنے ذوق تقریر کے بارے میں خود ہی رقمطر ہیں:

تحریر وتقریر میں مجھے دلچسپی لڑکپن سے ہی تھی۔اسے بڑھانے اورترقی دینے نیز اس لائن پر سفر کرانے میں میرے اکابر پیش پیش رہتے تھے، میری طالب علمی کے دور میں حضرۃ الاستاذ علامہ محمد انورشاہ کشمیریؒ جو مجھے اپنے ساتھ پنجاب کے ایک تبلیغی دورہ میں لے گئے، بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے اجتماعات میں میری تقریریں کرائیں، یہ واقعہ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کا ہے،لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملتان کے ایک جلسہ میں میں اس طرح شریک ہوا کہ بارش میں کپڑے بھیگ چکے تھےاور میں نے ستر پوشی کے لئے ایک بڑا سا کمبل اپنے بدن پر لپیٹ رکھا تھا، نہ سر پرٹوپی تھی اور نہ پیر میں جوتا،اسی ہیئت سےاس میں اس بڑے اجتماع کے سامنے آگیا۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے مجمع کوخطابت کرتے ہوتے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ:''یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں مستقبل کے ایک بہت بڑے مقرر ہیں، ہرگز یہ خیال نہ کیجئے کہ فقیروں کی طرح کمبل پوش ہیں توان کے پاس کچھ نہیں بلکہ یہ سمجھے کہ اس گدڑی میں لعل بھی مخفی ہے۔''

یہ حضرت استاذ مرحوم کی حوصلہ افزائی تھی، ورنہ کہاں ایک معمولی سا طلب علم اور کہاں لعل ویاقوت ایسی اکابر

تو میرے مربی تھے۔

۱۹۴۹ء کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ملک کے تعلیمی مسائل پر لکھنؤ میں ایک کانفرنس طلب کی، اس میں احقر کو بھی تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا آزادؒ نے میری تقریر کی جو تحسین فرمائی وہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ غرض میری زندگی کا ایک بڑا حصہ تینوں براعظموں کے طویل سفروں میں گذرا ہے اور حق تعالیٰ نے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائی، برما، حجاز، افغانستان، عدن، جرمنی، جنوبی افریقہ، لیبیا، روڈیشیا، مدغاسکر، حبشہ، زنجبار، سری لنکا، ایسٹ افریقہ، رے یونین، کویت، لبنان، اردن، فرانس، اور انگلستان اور بہت سے ممالک میں مجھے بار بار آنے جانے اور وہاں مذہبی اور علمی سوسائٹیوں میں شرکت کا موقع ملا ہے، میں جہاں تک حق تعالیٰ کے اس فضل وکرم پر ہزاروں ہزار شکریہ ادا کرتا ہوں اور عہدہ برآ نہیں ہوسکتا کہ ان لاکھوں بندوں تک مجھے اسلام، ایمان انسانیت اور دیوبند کے مسلک کے تحت اخوت درودادری کا پیغام پہنچانے کی توفیق عطا ہوئی وہیں اس اعتراف پر بھی مجبور ہوں کہ اپنے اساتذہ اور مربیوں کی نظیر شاذ ونادر ہی کہیں دیکھنے میں آئی، جن سے میری علمی اور اخلاقی تربیت کا تعلق رہا ہے۔''

جس طرح آپ نکات ومعارف اور لطائف وحقائق کو بزبان اردو بلا تکلف بیان فرماتے ہیں اور گھنٹوں کے بیان میں بھی کچھ تامل نہیں ہوتا، تسلسل اور حلم ووقار کے ساتھ گو''مرقوم مقالہ'' پڑھتے چلے جارہے ہیں، اسی طرح آپ کو عربی اور فارسی میں تقریر وبیان پر بھی کامل دسترس حاصل تھی، چنانچہ عرب ممالک اور افغانستان میں آپ بزبان عربی وفارسی بلا تکلف فصیح وبلیغ تقاریر فرماتے رہے، اور علم وعرفان کی بارش برساتے رہے، جس کا آپ ان مشاہدات وتاثرات سے بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں، جو آپ کی گوناگوں فضائل ومناقب کی حامل تاریخی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تذکرہ نگار اور اہل قلم حضرات نے صفحات تاریخ میں رقم کئے ہیں۔

''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کے مرتب: محترم جناب سید محبوب رضوی صاحب آپ کے انداز خطابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: علمی سلسلے میں درس وتدریس کے علاوہ فن خطابت اور تقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی، اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سنی جاتی تھیں، اہم سے اہم مسائل پر بھی دو، دو تین، تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے سے آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلف نہیں ہوتا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں آپ اپنے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص طور پر مقبول ہیں، اور بعض معرکۃ الآراء تقریریں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع بھی ہوچکی ہیں، ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو، ان کی رواں رواں اور دلکش تقریر جب علم کے گہرے سمندر سے گذرتی تھی تو لہروں کا سکوت قابل دید ہوتا تھا۔

جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاسوں میں آپ کے خطبات صدارت بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے

تھے آپ کی علمی تقریروں سے ایک خاص حلقہ اثر پیدا ہوا۔ بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔

۱۳۵۳ھ میں بسلسلہ سفر حجاز آپ نے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کے صدر کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں جو تقریر فرمائی اس نے سلطان کو بہت متاثر کیا، سلطان ابن سعود نے شاہی خلعت اور بیش بہا قیمت کتب کے عطیہ سے اعزاز بخشا۔

دوسرے بیرونی ممالک میں افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، عدن، کویت، حجاز، حبش، مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے تھے، جہاں اپنی اردو، عربی، اور فارسی کا لوہا منوایا۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم ناظم جمیعت علماء ہند کا آپ کے بارے میں مشہور مقولہ ہے کہ اب تک مہتممین دارالعلوم دیوبند ثوابت تھے اور مولانا قاری محمد طیب صاحب سیارہ ہیں۔

آپ کو ہر جگہ سپاسنامے دیے گئے، اور لوگوں کو دارالعلوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے مسلک کی اشاعت ہوئی، دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی تھی وہ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ تھی، ان کمالات کی وجہ سے ملک و بیرون ملک میں آپ کو ایک خاص امتیازی مقام حاصل تھا، عام تبلیغی دوروں کے علاوہ جب دیوبند میں قیام ہوتا تو عصر سے مغرب تک عمومی مجلس کا معمول رہتا تھا جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے اور تبلیغ واصلاح ہوتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی سفر و حضرت میں جاری رہتا تھا، آپ کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع ہے، جو ہند اور بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۳۳۶ھ سے ہر جمعہ کو جامع مسجد دیوبند میں تقریر کا معمول تھا، جو تقریباً بیس بائیس برس تک جاری رہا، بعد میں کثرت اسفار کی وجہ سے متروک ہو گیا اور تقریریں ملک گیر ہو گئیں۔

۱۳۵۳ھ میں جب کہ شاہ ابن سعود مرحوم پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ بال بال بچ گئے، ہندوستان کے وفد نے فضلاء و عمائدین کی طرف سے مبارک باد کا جلسہ فندق مکہ میں منعقد کیا گیا جس کا صدر مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بنایا گیا تھا علماء ہندوستان کے وفد نے شاہ ابن سعود کو مبارک باد پیش کی اس موقع پر آپ نے ہی عربی کی مختصر تقریر کے بعد جلسہ تبریک کی تجویز پڑھ کر سنائی تھی۔

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ بمبئی نے جس میں تمام فرقوں کے علماء اور تمام مؤثر تنظیموں کے سربراہ شریک تھے، آپ کو اپنا صدر منتخب کیا اس سلسلے میں دو مرتبہ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے آپ کو دعوت دے کر بلایا اور پرسنل لاء کے موضوع پر گفتگو کی، بہرحال ملک وقوم میں آپ کا ایک خاص علمی وقار قائم تھا، کئی اکیڈیمیاں آپ کی تالیفات کی طباعت واشاعت کا کام انجام دے رہی ہیں۔

مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں متعدد مرتبہ شریک ہو چکے تھے اور پوری دنیا میں تبلیغی دورے فرما چکے تھے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند)

ماہنامہ بینات کراچی کے مدیر حضرت اقدس مولانا محمد یوسف صاحب زید مجدہم، حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات خطابت کو تحریر فرماتے ہیں، جس میں انہوں نے خصوصیت سے خطبات حکیم الاسلام کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام و تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں، حقائق و واقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معرفت وہبیہ کا طوفان آمڈ آیا ہے۔

حضرت قاری صاحب مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب فرمایا ہوگا، اور بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر و خطابت کی نوبت بھی آئی، لیکن ان کی ہر تقریر کا ہر موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف و اسرار کے ایسے گل و لالہ بکھیرتے کہ حقائق و معارف کے چمنستان میں نئی بہار آ جاتی، ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے مشکل سے مشکل مسائل کو بلا تکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

ایک موقعہ پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا، بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنیٰ بھرے جاتے ہیں، اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ''کیا بات ہے؟'' پیش کیا کہ یہ انکار کیلئے بھی اور اقرار کے لئے بھی، استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی، داد و تحسین کے لئے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لئے بھی۔

الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک ''کیا بات ہے'' کی تشریح ہوتی رہی ارو حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے اور مجمع سحر بیان سے عش عش کر رہا تھا۔

حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں، حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ خطیب مسجد غفوریہ حسن پروانہ کالونی ملتان نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں اور اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرت جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئی ہیں وہ سب شائع کر دی گئیں، تو امت کے لئے حقائق و معارف اور ''کلمات طیبات'' کا ایک عظیم ذخیرا فراہم ہو جائے گا۔ بہر حال حضرت قاری صاحبؒ کی عبقری شخصیت گوناگوں فضائل شیخ طریقت، بے

بدل خطیب، صاحب طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے، حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلفؒ کے امین تھے قدرت فیاض نے حسن و جمال اور فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عقل و دانش، فہم و فراست، حلم و وقار، حسن تدبیر اور نظم ونسق کی بے پناہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام وتفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلاتکلف بولتے تھے اور خطاب فرماتے تھے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے اور علوم وہبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔

نیز بندہ کے نام ایک مکتوب گرامی میں بھی تحریر فرمایا: محمد یوسف لدھیانوی (ماہنامہ بینات نیوٹاؤن کراچی)

عزیز مکرم جناب مولانا قاری محمد ادریس صاحب سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ..... پرسوں آپ کی کتاب ''خطبات حکیم الاسلام'' محمد سعید سلمہٗ نے دی، اس کا ابتدائیہ پڑھا اور جستہ جستہ مقامات سے اصل کتاب بھی پڑھی، حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور توفیق مزید سے نوازیں، آپ نے بہت مفید کام کیا ہے اور بڑی محنت سے کیا ہے، یہ ان شاء اللہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا، دعوات صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام: محمد یوسف ۷/۴/۱۴۰۱ھ

ماہنامہ البلاغ کے مدیر اور سپریم کورٹ کے جج حضرت مولانا محمد تقی عثمانیؒ صاحب زید مجدہم (استاذ حدیث دارالعلوم کراچی) حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے انداز خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو وعظ وخطابت کا ایک ایسا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت قاری صاحب کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش وخروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پرتکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محفوظ اور مستفید ہوتے تھے مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے، جوش وخروش نام کو نہ تھا لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب ودماغ کو نہال کر دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا، جو انسان کو زیر وزبر کرنے کی بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا، حضرت قاری صاحب نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی

اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔

بہر حال برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

عالی جناب پروفیسر احمد سعید صاحب تھانویؒ ایم اے، آپ کے حسن خطابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام اور درس وتدریس کے علاوہ تبلیغی واصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں، جو ناقابل فراموش ہیں، آپ کو فن خطابت اور تقریر میں یدطولیٰ اور خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی، اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں اہم سے اہم اسلامی مسائل پر دو دو تین تین گھنٹے مسلسل اور بے تکلف تقریر کرنے اور ٹھوس علمی مواد پیش کرنے میں آپ کو کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، حقائق واسرار شریعت کھولنا اور تخلیق وایجاد مضامین آپ کا خاص حصہ تھا، جسے آپ کے اکابر واساتذہ بھی تسلیم کرتے تھے، تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص تسلی حاصل کرتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آپ کی تقریریں خصوصی طور پر مقبول ہوئیں، آپ کی معرکۃ الآراء تقریریں خود یونیورسٹی نے شائع کی ہیں، جیسے ''سائنس اور اسلام'' ملک کے علمی طبقوں میں آپ کو مدعو کیا جاتا تھا، اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس میں آپ کی گونج نہ پہنچی ہو۔

بمبئی وغیرہ جیسے اہم شہروں میں آپ کی علمی تقریروں سے دارالعلوم کا ایک خاص حلقہ پیدا ہو گیا، ان علمی واصلاح تقریروں کا وددیینکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ چکا تھا، بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے کافی اثرات اونچے حلقوں میں پہنچ چکے تھے۔

۱۳۵۳ھ میں بسلسلۂ سفر حجاز جب کہ آپ دوسرے حج کے لئے روانہ ہوئے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں باریاب ہوئے، اور آپ کی تقریر عربی میں ہوئی، سلطان نے جواباً شکریہ کی تقریر کی، اور بوقت رخصت شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب دینیات سے اعزاز بخشا، اسی سفر میں مدینہ منورہ کے المدرسۃ الشرعیہ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر بھی آپ کی عربی تقریر قابل ذکر ہے، جو مختلف عربی ممالک کے مجمع میں ہوئی اور بہت پسند کی گئی تھی۔

۱۳۷۸ھ میں آپ کا سفر افغانستان علمی خدمات کی ایک مستقل تاریخ ہے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند اور حکومت افغانستان کے درمیان علمی وعرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا اور حکومت افغانستان کے مہمان ہوئے، وہاں کے علمی حلقوں نے آپ کا خیر مقدم کیا کابل کی انجمن

ادبی اعلیٰ سرکاری سوسائٹی جمعیت علماء افغانستان، مجلس قانون ساز وغیرہ اداروں نے آپ کو تقریر کے لئے مدعو کیا۔ آپ نے فارسی زبان میں برجستہ تقریریں کیں، جس سے تمام حلقے متاثر ہوئے، اسی طرح بیرونی ممالک میں برما، کینیا، جنوبی افریقہ، زنجبار، روڈیشیا، ری یونین، مدغاسکر، حبشہ، مصر، شام، اردن، عراق، ایران، پاکستان وغیرہ میں آپ کی علمی تقریروں نے عوام وخواص کو بے حد متاثر کیا، عام تعلیمی خدمات کے سلسلے میں حکومت افغانستان کی خواہش پر آپ نے کابل کی تمام یونیورسٹیوں کا معائنہ فرمایا اوران کے بارے میں اپنی تفصیلی رائے پیش کی، جسے حکومت نے استحسان کی نگاہ سے دیکھا۔

۱۳۵۹ھ میں والی ریاست قلات، بلوچستان اور ریاست بہاولپور پنجاب کے وزیر تعلیم نے آپ کو نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے مدعو فرمایا۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ مدرسہ بورڈ آسام، پنجاب یونیورسٹی الہٰ آباد یونیورسٹی اور جامعہ نظامیہ حیدرآباد نے آپ کو دینیات کے پرچوں کا ممتحن قرار دیا۔

غرضیکہ آپ پوری دنیا کے بہترین خطیب اور بین الاقوامی طور پر ایک عظیم اسکالر تسلیم کئے جاتے تھے، اور ہندوستان و پاکستان کے ہر خطہ میں پہنچ کر آپ نے تقریر وخطابت کے ذریعے اسلامی مقاصد کی اشاعت اور مسلک دارالعلوم دیوبند کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا، پاکستان میں متعدد بار تشریف لائے اور جامعہ اشرفیہ لاہور، خیر المدارس ملتان، دارالعلوم کراچی، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار جامعہ رشیدیہ ساہیوال، اور راولپنڈی و پشاور کے دینی مدارس میں اپنی علمی تقاریر سے لاکھوں افراد کو منور کیا، اور ہزاروں کی اصلاح فرمائی، مغربی ممالک میں ہزاروں افراد کو مشرف بہ اسلام کیا، اور آج دنیا بھر میں لاکھوں عقیدت مند پھیلے ہوئے ہیں۔

گرامی قدر حضرت محترم مولانا پروفیسر محمد اشرف خان صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں کہ: ان کا دعوت وارشاد کا میدان بھی آفاقی تھا، اور طرز اصلاح وتربیت اشرفی، مواعظ وخطبات کا انداز البیلا، اچھوتا، دلکش اور ہر طبقہ کے لئے دل آویزی وتاثیر، قاسمی حکمت کی گہرائی اوران کے اپنے اخلاق کی شیرینی ونرمی، پائی جاتی ہے، زبان خلق نے انہیں ''حکیم الاسلام'' کے نام سے پکارا اور حق یہ ہے کہ ان کی تصنیفات اور مواعظ وخطبات نے اس خطاب کی توثیق کردی۔ ماہنامہ البیان پشاور (ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ)

حضرت اقدس مولانا تاج محمود صاحب مرحوم (فیصل آباد) فرماتے ہیں: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے پوتے، ایک جید عالم دین، بلند مرتبہ فقیہ، بے شمار کتابوں کے مصنف، قادر الکلام خطیب اور ملت اسلامیہ کے ممتاز حکیم وفلسفی تھے، نصف صدی سے زائد تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اعلیٰ رہے اور اس دوران انہوں نے دنیا کی اس مشہور علمی اور دینی درس گاہ کو چار چاند لگادئے، حضرت قاری صاحبؒ بے شمار خوبیوں اور اوصاف کا مجموعہ تھے، لیکن حق تعالیٰ نے انہیں زبان وبیان پر جو

ندرت اور قدرت عطا کر رکھی تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے، وہ جب بھی کسی موضوع پر تقریر کرنے بیٹھتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے دل و دماغ کا کنکشن عالم بالا میں کہیں جڑ گیا ہے، وہ بولتے کیا تھے موتی رولتے تھے اور ان کا بیان سن کر بے ساختہ زبان سے نکلتا تھا کہ ''لفظ لفظ ٹپکتا ہے عرش سے'' آپ نے بڑے بڑے جلسوں اور اجتماعات میں اپنی بے مثال حکیمانہ تقریریں کیں اور اس مقصد کے لئے پاکستان اور بھارت کے چپے چپے پر سفر کرتے رہے، بلکہ پوری دنیائے اسلام نے ان کے قدموں کا تیمن اور ان کی میزبانی کا مجد حاصل کیا۔ آپ کی تقاریر، مواعظ ایسے سلجھے ہوئے ہوتے کہ آپ بے ڈھب جذبات کا شکار ہوئے بغیر روانی اور تسلسل سے بولتے جاتے تھے، موضوع کی مناسبت سے مسلسل عجیب وغریب مثالیں، حکایات، واقعات قرآن وحدیث اور عقلی ونقلی دلائل پیش کرتے جیسے کہ مقالہ وغیرہ پڑھ رہے ہوں۔

آپ کی ہر بات سامعین کے ذہنوں میں اترتی جاتی اور قلب ودماغ میں بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تقریر فرمارہے تھے جس میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی پہنچ گئے، شاہ صاحب کچھ دیر تو خاموش بیٹھے رہے اور یہ عظیم الشان خطاب سنتے رہے، مگر پھر یک دم وجد کی سی حالت طاری ہوگئی، بے اختیار نعرۂ تکبیر بلند کیا، اور چند منٹوں کی اجازت لے کر مائیکروفون پر آ کھڑے ہوئے، اور اپنے دو شعر حضرت قاری صاحب کی نذر کرتے ہوئے قاری صاحب کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بار بار ان اشعار کو پڑھتے رہے۔

یہ تھا قاری صاحب کی تقریر کا اثر، کہ امیر شریعت جیسا بے مثال خطیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الغرض حضرت قاری صاحب مرحوم فن خطابت کے شہنشاہ تھے اور آخر دم تک اپنے فن خطابت سے دنیائے اسلام کو محظوظ فرماتے رہے، ساری عمر تبلیغ دین کی خدمت میں مصروف رہے، اس کے ساتھ ساتھ دار العلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کے مہتمم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، سچ یہ ہے کہ اب حضرت قاری صاحبؒ جیسا مہتمم دار العلوم کو ملنا مشکل ہے۔ (لولاک فیصل آباد)

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب رشیدی نور اللہ مرقدہٗ حضرت حکیم الاسلامؒ کے حسن بیان کو داد دیتے ہوتے لکھتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نسیم صبحگاہی محوخرام ناز ہو، وہ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ان کے انداز تکلم میں جوئے آب رواں کی نغمگی تھی جو فردوس گوش بن جاتی تھی، ان کے لب ولہجہ میں حدی خوانوں کا سوز اور ان کی گفتگو میں نو دمیدہ غنچوں کی مہک تھی، جو دماغوں کو معطر کرتی اور دلوں کی دنیا میں ہلچل برپا کردیتی، وہ ہماری عظمت رفتہ کی حسین وجمیل یادگار تھے۔ (الرشید ساہیوال)

علاوہ ازیں اور متعدد مواقع ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر وبیان کا موقع دیا، اور اہل علم آپ کے

ندرت بیان اور جودت فکر پر داد و تحسین دیتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جو اپنے وقت میں تحریر و تقریر کے لحاظ سے یکتائے زمانہ اور نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، کی زیر صدارت سرکاری عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں کونسل ہال لکھنؤ میں کانفرنس کا اہتمام کیا گیا، حضرات علماء دیوبند بھی اس میں شریک ہوئے، جن کی قیادت حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرما رہے تھے

اس موقع پر آپ نے بیان فرمایا: مولانا آزاد مرحوم جیسے عظیم خطیب بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان سن کر جھوم اٹھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا وہ بیان آج بھی تاریخ خطابت کا زرین باب اور انمول شاہکار ہے۔

تعلیم جدید سے متاثر طبقہ آپ کے علم و حکمت سے بھرپور بیان کو بڑی وقعت و اہمیت کے لحاظ سے ''سماع قبول'' کے طور پر سنتا، اور اس طرح آپ کے حکیمانہ بیانات سے ان میں اسلام سے لگاؤ اور محبت و گرویدگی بڑھتی۔

علی گڑھ یونیورسٹی جو ہندوستان میں علم جدید کا مرکز اور منبع ہے، اور دارالعلوم دیوبند سے اس کو نظریاتی تقابل بھی رہا اس میں آپ نے بعض انتہائی بلند اور وقیع عنوانات پر تقاریر کیں، آپ کے بیان اور اسلوب بیان سے بڑے بڑے پروفیسرز انگشت بدنداں رہ گئے، اور ان میں یہ احساس اجاگر ہوا کہ حقیقی علم کیا ہے، اور جسے ہم نے علم کا نام دے رکھا اس کی حقیقت کیا ہے۔

اعتراف حقیقت کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بعض تقاریر کو شائع چنانچہ جلد ششم میں بھی آپ کی ایک تقریر کو جو ''سائنس اور اسلام'' کے نام سے موسوم ہے، شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔

مزید بھی ایسی تقاریر کی جستجو اور تلاش جاری ہے جو اپنے مواقع بیان کے لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل تھیں تاکہ انہیں خطبات حکیم الاسلام کی سلسلہ وار جلدوں میں ترتیب دیا جاسکے، اور دنیائے علم اس سے بھرپور استفادہ کرسکے۔ (وھو المستعان)

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا امتیاز خطابت یہاں بھی قائم رہا اس کے بارے میں ''ذکر طیب'' میں (سوانح حیات حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ صاحب بخاری) نے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان کی دعوت پر پھر پاکستان تشریف لائے، حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام بنایا تھا، اور اس میں دنیائے اسلام کی نامور علمی شخصیتوں کو دعوت دی گئی تھی، ہندوستان سے اس پروگرام میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی پاکستان تشریف لائے، پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل میں تاخیر کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ وزیراعظم

پاکستان کی طرف سے دے گئے استقبالیہ اور سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس ہی میں شریک ہو سکے، جب کہ کانفرنس کا افتتاح حضرت حکیم الاسلام ہی کے عظیم الشان خطاب سے ہونا تھا حضرت حکیم الاسلام نے سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس سے خطاب فرمایا اور آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا۔

پاکستان نے جو یہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد کی ہے میں پاکستان کو توجہ دلاتا ہوں کہ اس بین الملکی کانفرنس کے پیش نظر اتحاد باہمی کے جو مبارک اور خوش آئند اثرات ونتائج ہیں، ان میں اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ پڑوسی ممالک کا زیادہ حق ہے کہ ان کو اتحاد کے جذبہ سے پاکستان زیادہ سے زیادہ اپنے سے قریب کرے، اور ان پڑوسی ممالک میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہندوستان ہے۔

حضرت نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھی ارشاد فرمایا کہ پاکستان نے عالمی اتحاد کے سلسلہ میں دو عظیم الشان اقدامات کئے ہیں، ایک سربراہ کانفرنس اور دوسری سیرت کانگریس جو عالمی اتحاد کا موجب ہوگی۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو کراچی میں منعقد کئے گئے سیرت کانگریس کے استقبالیہ میں جو شہر کراچی کی طرف سے دیا گیا تھا، انتظام کرنے والی سیرت کمیٹی نے حضرت حکیم الاسلام سے درخواست کی کہ وہ مہمانوں کا شکریہ ادا کریں۔ حضرت نے کلمات ترحیب وتشکر پیش کرتے ہوئے یہ دلچسپ بات ارشاد فرمائی کہ اس کانگریس کے مہمان خصوصی عرب ممالک کی مؤقر شخصیتیں ہیں، جن کی مہمانی کا شرف عجمیوں کو حاصل ہے، اور عجم ہونے کے رشتہ سے پاکستان اور ہندوستان دونوں برابر ہیں، اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک میزبان کی حیثیت سے ہندو پاکستان دونوں کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں اور عرب مہمانوں کے لئے سپاس گذار ہوں۔

سیرت کانگرس کے اختتامی اجلاس میں سیرت کمیٹی کی طرف سے حکیم الاسلام کو چاندی کے منقش خول میں جو ایک مخملی بکس کے اندر تھا ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا، جس میں دار العلوم دیوبند کی اور حضرت کی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یوں تو تمام پاکستان ہی مہمانوں کا شکر گذار ہے، لیکن اہل پاکستان کو سب سے زیادہ دو شخصیتوں نے متاثر کیا ہے ایک حرم مکہ کے امام شیخ عبداللہ بن السبیل اور دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب شیخ الجامعہ دار العلوم دیوبند۔

جب حضرت اقدس اس اختتامی اجلاس سے باہر تشریف لانے لگے تو عوام کے زبردست ہجوم نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ عوام حضرت حکیم الاسلام کی تقریر سننے آئے تھے، جس سے اب تک محروم رہے ہیں، اس لئے ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک اس جلسہ میں حضرت ممدوح کی کوئی مفصل تقریر نہ ہو۔

چنانچہ قاری زاہر قاسمی صاحب نے لوگوں کو اطمینان دلایا اور جلسہ دوبارہ جمایا گیا اور ساٹھ ستر ہزار افراد کے ایک زبردست اجتماع میں حضرت کی تقریر ہوئی، جو ایک تاریخی اہمیت کی تقریر تھی۔

خطبات کی تین جلدیں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہی طبع ہو چکی تھیں، تاہم صرف اول، دوم جامعہ خیر المدارس ملتان کے مہتمم برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب زید مجدہم کی وساطت سے ہندوستان حضرت والا کی خدمت میں پہنچائی جاسکیں، انہوں نے میری طرف سے عرض کیا کہ ان خطبات کے بارے میں کچھ تحریر فرمادیجئے۔

ارشاد فرمایا: میں اپنی ہی تقریروں کے بارے میں خود ہی کیا لکھوں؟

تاہم بعد میں حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلۂ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کی نیابت اہتمام کی ذمہ داری ادا کررہے تھے، سے خط لکھوا کر بھیجا، اس کا فوٹو شامل کتاب کیا جارہا ہے، اس خط میں خصوصیت سے ''مقصد خطبات'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مکرمی جناب مولانا محمد ادریس صاحب زیدت افضالکم!

سلام مسنون...... جناب کا گرامی نامہ اور احقر کی تقریروں کی دو جلدیں موصول ہوئیں مشاء اللہ آپ نے جس ضرورت سے ان کو شائع کیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح و درست ہے، کہ خود حضرت حکیم الاسلام مدظلۂ کا مزاج اختلافی امور میں الجھنا نہیں بلکہ اتفاقی امور پر امت کو جمع کرنا ہے۔

حضرت والا جلدوں کی ترسیل کے لئے شکریہ ادا فرماتے ہیں اور دعاء گو ہیں کہ حق تعالیٰ ان تقریروں کو صاحب تقریر، مخاطبین، سامعین اور قارئین سب کیلئے نفع بخش بنائے، جزاکم اللہ، اس وقت حضرت والا سفر میں تشریف لے گئے ہیں، بطور رسید یہ عریضہ بیرنگ ارسال ہے کہ اس وقت ترسیل جواب کی یہ ہی ایک صورت سامنے ہے۔

امید ہے کہ مع الخیر ہوں گے۔ (والسلام) خورشید عالم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مکرمی جناب مولانا محمد ادریس صاحب

سلام مسنون...... جناب گرامی نام اور احقر کی تقریروں کی دو جلدیں موصول ہوئیں ماشاء اللہ آپ نے جس ضرورت سے ان کو شائع کیا ہے وہ اپنی جگہ جحم و درست پر کہ خود حضرت حکیم الاسلام مدظلہ (غور طلب)

الحمد للہ! خطبات کی اشاعت ہندوستان میں بھی ہوئی، اور بڑے پیمانے پر اسے پذیرائی حاصل ہوئی، قارئین و ناظرین کرام سے بندہ کی خصوصیت سے التجاء واستدعاء ہے کہ اس کی قبولیت کے لئے بہت اہتمام سے دعاء فرمادیں تو ان کا مجھ پر احسان ہوگا کہ اصل چیز قبولیت ہے۔

قارئین خطبات کو یہ جان کر یقیناً مسرت ہوگی کہ ساتویں جلد ترتیب کے آخری اور کتابت کے ابتدائی مراحل میں ہے، انشاء اللہ جلد منظر عام پر لانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

جلد ششم کی ترتیب کے سلسلہ میں اخی الکریم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلۂ جدہ (سعودیہ) کا

بہت زیادہ تعاون شامل حال رہا، ان کی جدوجہد سے کیسٹوں میں محفوظ یہ علمی سرمایہ حاصل ہوسکا، جو بعد میں کاغذ پر منتقل ہوا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت زیادہ جزائے خیر نصیب فرمائے، اور ہم سب کو قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

اہل علم کی خدمت میں یہ استدعاء ہے کہ اگر اس مجموعے میں کوئی علمی غلطی نظر پڑے تو اسے بندۂ نابکار کی طرف نسبت کرتے ہوئے اطلاع فرمائیں تو احسان عظیم ہوگا۔ (تقبل اللہ منا ومنکم)

بندۂ نابکار: محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

۲۷ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ / مطابق ۱۶ مارچ 1989ء

پیش لفظ جلد ہفتم

حامداللہ العظیم ومصلیا علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین. امابعد...... خطبات حکیم الاسلام کے سلسلے کی ساتویں جلد بحمد اللہ تعالیٰ آپ کے پیش نظر ہے، اس سلسلہ کی افادیت وقبولیت جو پردۂ غیب سے ظہور پذیر ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ مجھ ایسا بندۂ نابکار تو کم از کم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، ہر جلد کے اختتام پر نئی جلد کا مواد میسر نہیں ہوتا تھا، لیکن جب نئی جلد کی ترتیب کا کام شروع ہوا، مواد مہیا ہوتا جتا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تکمیل کے مراحل آجاتے، فللہ الحمد، خطبات کے قارئین کرام جو اہل علم و فضل بھی ہیں اور علم دوست احباب بھی ان کی دعائیں بہت ہی زیادہ شامل حال رہیں۔

الحمد للہ! خطبات ومواعظ کے سلسلہ میں ان خطبات کو وہی مقام ملا جو خود صاحب خطبات حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کا ہے، پاکستان میں اس کی اشاعت کا سلسلہ روز افزوں ہے اور حال ہی میں ایک محترم دوست، جو کتابوں کی طباعت واشاعت کا بہت ذوق رکھنے والے ہیں، ہندوستان تشریف لے گئے تو ان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں چار کتب خانوں سے خطبات حکیم الاسلامؒ شائع ہورہی ہے، بایں ہمہ مانگ بڑھ رہی ہے۔ جس طرح یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے لئے ایک سلسلہ جاریہ ہے اور اس کا دینی فائدہ ان شاء اللہ ان کی ذات گرامی کو یقیناً پہنچ رہا ہوگا، اسی طرح مرتب خطبات کے لئے بھی یہ ایک بڑی دینی سعادت ہے اور امید ہے کہ آخرت میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر قبولیت کا معاملہ فرمائیں گے، جو دنیا میں ظاہر ہورہا ہے، دنیا میں قبولیت ظاہری اندازوں سے بڑھ کر ہوئی ہے تو آخرت میں دنیوی اندازوں سے بڑھ کر ہوگی، کیونکہ آخرت ہی درحقیقت فضل خداوندی کا مظہر ہے، اور دنیا تو اس کا پرتو اور نمونہ ہے۔ (وما ذٰلک علی اللہ بعزیز)

مواعظ طیبہ کے اس مجموعہ میں ایک اہم خطبہ ''اجلاس صد سالہ دارالعلوم (دیوبند) کا خطبۂ استقبالیہ'' ہے جو اس لحاظ سے خصوصی امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ دارالعلوم کی ایک مختصر تاریخ اور اس کے قیام کے اغراض ومقاصد، عوامل ومحرکات اور خدمات وکارکردگی کا ایک مختصر جائزہ بھی ہے۔

نیز اکابر علماء کرام اور صلحاء امت جو اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تقویٰ بھی ہوں کہ ایسے حساس بین الاقوامی اجتماع، جو قوموں کی تاریخ میں چشم فلک بار بار نہیں دیکھا کرتی، کے سامنے پڑھا گیا، اس خطبہ کا یہ امتیاز ہے، نہ صرف خطبات کے سارے مجموعہ میں یہ شرف امتیاز صرف اسی خطبۂ طیبہ کو حاصل ہے بلکہ خود حضرت حکیم

الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی نے زندگی میں لاکھوں کے اجتماع سے خطاب کیا ہوگا، مگر سامعین کا یہ اجتماع انفرادیت کا حامل تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں کہ تمام تر جلدوں میں موجود مواد کا بیشتر حصہ کیسٹوں سے لیا گیا ہے، اور کیسٹوں کو جمع کرنے میں جو جد و جہد اور انتھک کوشش برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب (حال مقیم جدہ، سعودیہ) مدظلہ نے خصوصی طور پر سرانجام دی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی کا حصہ ہے، اور یہ اس تعلق و محبت کا مظہر ہے جو ان کو حضرات علماء دیوبند سے عموماً اور حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات ستودہ صفات سے خصوصاً ہے۔

اس سلسلے کے منظر عام پر آنے کے بعد دیگر احباب نے بھی کرم فرماتے ہوئے کیسٹز مہیا کیں، جن کا اجمالی طور پر تذکرۂ خیر و برکت شامل اشاعت ہوتا رہا، افادات علم و حکمت کے نام سے آپ کے سامنے آنے والا علمی مواد بھی کیسٹز سے لیا گیا ہے، یہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی کراچی آمد کی یادگار ہے، اس کی تاریخ و مقام تو معلوم نہیں ہوسکا، تاہم ایک دورے کے موقع پر آپ نے چندروز پاکستان میں قیام فرمایا تو مغرب کے بعد مجلس کا اہتمام ہوتا، جس میں شہر کے اطراف و اکناف سے علماء کرام اور علم دوست احباب شرکت فرماتے، کوئی صاحب سوال کرتے اور حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی وھبی خصوصیت کی بناء پر اس کے جواب میں علم و حکمت کے موتی بکھیرنا شروع فرمادیتے، چونکہ سوال کرنے والا شخص مجمع میں ہوتا تو اس کا سوال ریکارڈ نہیں ہوسکا دھیمی آواز میں کچھ نہ کچھ سنائی تو دیتا ہے مگر مکمل طور پر نہیں، اس لئے سوالات کا سلسلہ نہیں رکھا گیا بلکہ صرف وہ علمی جوابات جو حضرت حکیم الاسلامؒ نے بیان فرمائے ان کو شامل کتاب کرلیا گیا، اور عنوانات قائم کردیئے گئے ہیں، جس کے بعد جواب سے مفہوم ہونے والا سوال از خود متعین ہوجاتا ہے اور سوال کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی، افادات علم و حکمت کا ایک معتدبہ حصہ خطبات کی ساتویں جلد میں شامل کیا جارہا ہے اس سلسلہ کا بقیہ حصہ ان شاء اللہ آٹھویں جلد میں شامل کیا جائے گا۔

اگرچہ یہ مواعظ نہیں ہیں، جس کو خطبات کے سلسلہ میں منسلک کیا جائے، لیکن بوجوہ ان کو اس سلسلے میں داخل کرلیا گیا، اس سے اصل غرض تو یہ ہے کہ شائقین خطبات تک یہ تمام علوم بھی پہنچ جائیں، نئے نام سے کتاب مرتب کی جاتی تو تعارف کے بعد بھی شاید وہ افادیت سامنے نہ آتی جو اس طور پر معلوم ہوتی ہے۔ نیز بعض سوالات کے جوابات اتنے طویل ہیں کہ وہ بجائے خود ایک مستقل ''خطبہ طیبہ'' کی حیثیت رکھتے ہیں، علاوہ ازیں جوابات کا جو خاص اسلوب بیان ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی رعایت رکھتے ہوئے اسے اختیار کیا گیا ہے، اس لئے وہ علمی ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہے جو تقریر و بیان میں بھی کارآمد ہے۔

بہر حال ''افادات علم و حکمت'' کے نام سے یہ تمام تر موجود مواد بھی مرتب شدہ صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ آپ قدر افزائی فرمائیں گے۔

بقیہ تقاریر حسب معمول جمع کر کے عنوانات قائم کر دیئے گئے ہیں، اس وقت خطبات حکیم الاسلامؒ کی آٹھویں جلد زیر ترتیب ہے، اور تقریباً یکصد سے زائد صفحات کتابت بھی ہو چکے ہیں، کوشش یہی ہے کہ جلد ۸ مراحل تکمیل سے گذر کر جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، مگر اس میں آپ کے تعاون دعاء کی از حد ضرورت ہے، یہ جو کچھ ہے قارئین خطبات ہی کی دعاؤں کا مظہر ہے اور بس اللہ تبارک وتعالیٰ قبولیت کاملہ سے نوازے اور ان خطبات کو ہم سب کیلئے صلاح وفلاح اور خیر وبرکت کا باعث بنائے۔ (آمین ثم آمین) بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

والسلام: بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ/ ۲۷، اکتوبر ۱۹۸۹ء/ بروز جمعۃ المبارک

پیش لفظ جلد ہشتم

حامداللہ العظیم ومصلیا علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ الہٖ وصحبہٖ اجمعین.

امابعد:

خطبات حکیم الاسلام کے سلسلہ کی آٹھویں جلد اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے، پہلی جلدوں کی نسبت اس جلد کو یہ امتیاز وخصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بہت سی وہ تقاریر آ گئی ہیں جو سیاسی مضامین پر مشتمل ہیں، سیاسی مسائل ہر دور کے جذباتی اور نفسیاتی طور پر احساس نزاکت کے حامل رہے ہیں، عام طور پر اس میدان میں کام کرتے ہوئے افراط وتفریط کے شکار ہونے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے، مثبت پہلو پر کام کرنے کے باوجود بعض اوقات فریق مخالف کی طعن وتشنیع سے صراط مستقیم پر قائم رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے، علماء کرام میدان سیاست میں آئیں تو بے شک سیاست دین کا اہم شعبہ ہے مگر اس میدان میں آنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علماء کرام کے مقام کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریوں میں کمی آ جاتی ہے بلکہ ایک گونہ اس میں اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔

اہل علم کی سیاست اور عوام الناس اور ان کے رہنماؤں کی سیاست اور طریق سیاست میں کھلا امتیاز اور بین فرق ضروری ہے۔

بعض اوقات احتجاجی جلسوں اور کانفرنسوں سے خطاب کرنا ہوتا ہے، جذبات سے مغلوب لوگون کے جذبات سے کھیل کر ان کو مزید اشتعال میں لانا اور بہر صورت فریق مخالف کو زیر کرنا یہ اہل علم کی شایان شان نہیں، اس لئے ایسے مواقع پر اہل علم کو اپنا امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے، حجت وبرہان اور قوت استدلال سے بات میں وزن پیدا کرنا عق وفہم کا راستہ ہے جو ہر ذی شعور کا حق ہے اور یہی اہل علم کی شان ہے۔

یہ عرض کرنا بے جانہ ہوگا علماء کرام کے طبقہ سے ہٹ کر جو لوگ سیاست میں حصہ لیتے ہیں وہ اس میں مذہبیت کے عنصر کو غالب رکھنا تو درکنار اس کو خارج کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے اس میں جھوٹ فریب، غلط بیانی، وعدہ خلافی چالبازی، ڈپلومیسی اور قول وفعل کا تضاد روزمرہ کا عامل معمول ہے، اس لئے قطع نظر اس کے کہ حق کیا ہے، اس کو دیکھنے کی بجائے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ جو لوگ چاہتے ہیں وہ کہنا خواہ وہ ضمیر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو آج کی سیاست کا بنیادی اصول ہے۔

اس کے بالمقابل حاملین مذہب اولا یہ دیکھتے ہیں کہ حق کیا ہے بس اس کو کہنا ضروری خیال کرتے ہیں،

خواہ لوگ اس کو اچھا نہ سمجھیں، گویا ان کے پیش نظر، حق تعالیٰ کی رضا ہے، عوام الناس کی رضا نہیں ہے، اس لئے اپنے علم ودانست کے مطابق جس کو وہ حق جانتے ہیں حق تعالیٰ کی مسؤلیت کے پاکیزہ جذبۂ خوف سے اسی کو کہتے ہیں، بالفاظ دیگر پانی کی رو کے ساتھ تیرنا بہت آسان ہے، مگر اس کے مخالف سمت تیرنا بہت مشکل ہے، لیکن اہل حق اور علم پر جب یہ ذمہ داری آئے تو وہ اس کو بھی بکمال شان نبھاتے ہیں۔

ملکوں کی تاریخ میں صدی نصف صدی کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی، ماضی قریب میں جمعیت علماء ہند نے سیاسی طور پر کس کردار کی پختگی کا اظہار کیا، آزادئ ہند سے قبل، تقسیم ہند اور آزادئ ہند و پاک کے ہنگاموں میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور مسلمانوں کی کس طرح راہنمائی کی ہے، اس کا اندازہ آپ ان خطبات صدارت اور اُن تقاریر سے کرسکیں گے جو حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے جمعیت علماء ہند کے زیر اہتمام منعقدہ جلسوں میں ارشاد فرمائے۔

ان خطبات میں جہاں نظریات کی پختگی نظر آئے گی وہاں اہل علم کی سیاسی طور پر شان امتیاز، ان کی گفتگو، طرز تکلم، مسائل پر نظر، ان کے حل کا طریق کار اور اس سب کچھ کے ساتھ مذہبیت کا عنصر نمایاں نظر آئے گا۔

نیز انداز فکر اور پروگرام میں صرف اقتدار وحقوق سے متعلقہ سیاست ہی کو پیش نظر رکھنا کافی نہیں سمجھا گیا، چنانچہ ان خطبات ومقالات میں آپ دیکھیں گے جہاں حکومت سے گفتگو ہے اور بہت سے مسائل میں اظہار مذمت اور غم وغصہ کا حکومت کو ہدف بنایا گیا وہاں عامۃ الناس کی معاشرت کی اصلاح اور ان کی اخلاق کی نگہداشت کا پروگرام بھی شامل ہے، برطانوی اور سیکولر حکومت کی موجودگی میں مسلمان بچوں کا تعلیمی مستقبل کیا ہوگا؟ ان کا ظاہر وباطن اسلام وایمان سے کیسے مانوس اور معمور ہو؟ وہ مذہب کو ایک حقیقت جان کر کیسے قبول کریں؟ اور اس پر کیسے قائم رہیں، ان تمام امور پر ان خطبات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

الغرض علماء کی سیاست میں جہاں دینوی معاملات سامنے ہوتے ہیں وہاں آخرت کی بہبود اور اس کا پروگرام بھی ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔

مذہب کی بنیاد پر ہی کی جانے والی سیاست سے مستحکم اور پائیدار قومی انقلاب آئے ہیں، ہمارے اکابر مذہب کی للّٰہیت کے ساتھ جہاں بھی گئے اپنے اثرات چھوڑ کر آئے، اور اگر خدانخواستہ مذہب کو سیاست سے خارج کردیا جائے تو کم از کم علماء ایسی سیاست سے بزد آزما ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ اپنے الفاظ میں ''مذہب کی سیاست میں کیا اہمیت ہے؟'' ذیل کے واقعہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال، دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر (۱۹۶۵) شروع ہون سے ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! مک کے

حالات بہت نازک اور خراب ہیں میں نے کہا جی ہاں، اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا ہاں سبب بھی اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا ہاں سبب ہے۔ کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں، آپ ہیں سیاسی اور برسر اقتدار انسان، آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ تو اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہیے گا۔ اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں، تو میں نے کہا سن لیجئے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے۔ دنیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ جلد نہم

حَامِدًا لِلّٰهِ الْعَظِيْمِ، وَمُصَلِّيًا عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ امّا بعد.

سلسلۂ خطبات حکیم الاسلام کی نویں جلد اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ جو حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کے علوم وھبیہ کا ایک جدید و حسین مرقع ہے۔

الحمد للہ پہلی تمام جلدوں کو قبول عام نصیب ہوا اور اس قدر قلبی اشتیاق سے اظہار پسندیدگی کیا گیا جس کا حاشیۂ خیال میں بھی واہمہ نہ گزرا تھا۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی زندگی کا ایک طویل دور اہتمام دارالعلوم (دیوبند) کے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں گزرا۔ اس لئے دارالعلوم کے امور ذمیہ کے سلسلہ میں سفر جزو زندگی رہا۔ آپ رحمہ اللہ نے نصف صدی سے زائد حصہ پر محیط اس سفر کو تبلیغی واصلاحی مقاصد، نیز دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے تعارف کا ذریعہ بنایا اور دنیا بھر کے گوشے گوشے میں جانا ہوا۔ ان اسفار میں ہونے والے ''خطبات ومواعظ'' کے قلمبند کرنے کا اہتمام کیا جاتا تو آج ایک ''عظیم علمی ذخیرہ'' اکابر دارالعلوم کی تصانیف میں امتیازی مقام کا حامل ہوتا۔

اور شاید یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہ ہو کہ وہ اپنی تعداد میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ''مواعظ اشرفیہ'' کے قریب قریب تو ضرور ہوتا، ماہنامہ دارالعلوم کی وہ فائلیں جس میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے اسفار کی ماہانہ تفصیل بحیثیت مہتمم دارالعلوم درج کی جاتی، اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔ تاہم اس حد تک کہنے کی اب بھی گنجائش ہے کہ اکابر دارالعلوم میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خطبات ومواعظ کے بعد اور کسی بزرگ کے خطبات اتنی تعداد میں مدون ہو کر منظر عام پر نہ آسکے جس قدر حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے ہیں۔

اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج کے حسی، مشاہداتی اور عقلی واستدلالی دور میں یہ خطبات اہل علم اور عامۃ الناس کے لئے یکساں مفید ثابت ہوئے۔ اہل علم اور خطباء کرام اس سے مواد لے کر بات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ اور عامۃ الناس ان کی سہولت وآسانی سے محظوظ ہوتے ہیں، بالخصوص آج کے دور میں اردو ادب کا ذوق آشنا طبقہ جہاں ان سے اپنے ادبی ذوق کی تسکین حاصل کر پاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن وفہم میں

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تعبیر وتفہیم کا خاص انداز کہ بڑے بڑے علوم کو آسان پیرائے میں سمجھادیا گیا، بہت ہی مفید اور موثر ثابت ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے ''علوم قاسمیہ'' کو اردو ادب کا وہ جدید لباس پہنادیا جو آج کے دور کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر تیار کیا گیا ہو، اس لئے جب ان خطبات کو بیان کیا جاتا ہے تو سامعین کا قلب ودماغ ان کو اپیل کرتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بناپر ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی پذیرائی میں مسلسل اضافہ ہے اور طلب مزید جاری ہے۔

اسی بناپر مرتب نے اس بات کا بطور خاص اہتمام رکھا کہ جو تقریر یا کوئی علمی نکتہ جو حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی طرف منسوب ملا، اُسے جمع کر دیا گیا اور اہل علم کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اسی اہم ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ''افاداتِ علم وحکمت'' کا سلسلہ بھی جاری کیا گیا۔

اسفار میں ہونے والی اصلاحی وتبلیغی تقاریر کے علاوہ خطبۂ جمعہ بھی آپ رحمہ اللہ کا معمول تھا۔ تقریر جمعہ کی وہ نوعیت نہ تھی جو آج کل بالخصوص ہمارے ملک میں رواج پذیر ہے۔ بلکہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد محض تقریر ہی سننے کے لئے دلی اشتیاق سے لوگ بیٹھتے اور آپ کا بیان ہوتا۔ بیان کی جاذبیت اور کشش کا یہ عالم ہوتا کہ اس میں دارالعلوم سے علماء صلحاء اور طلباء کرام کے علاوہ اہل شہر بھی بکثرت شرکت کرتے۔

چنانچہ دارالعلوم دیو بند کے استاذ سابق اور جامعہ خیر المدارس ملتان شہر (پاکستان) کے صدر المدرسین جامع المعقول والمنقول شیخ الحدیث حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ نے اس خطبۂ جمعہ کے متعلق تاثرات کا اس موقع پر اظہار فرمایا جب صاحب خطبات حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ، کا سانحۂ ارتحال پیش آیا اور جامعہ خیر المدارس ملتان میں اجلاس تعزیت منعقد ہوا۔

فرمایا کہ: دارالعلوم میں عام طور پر یہ معروف ومشہور تھا کہ حضرت اقدس خاتم المحدثین علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ کے ہاں علوم کا ورود ہوتا تھا کہ درس حدیث میں تمام علوم پر کمال دسترس اور بالغ نظری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک ہی درس میں گویا تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ کسی فن سے متعلق ذرا کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی تو غیر اختیاری طور پر بہتے ہی چلے گئے۔ اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے ہاں معارف کا ورود وہبی طور پر ایسے مربوط انداز میں ہوتا کہ دعویٰ کے ثبوت میں دلیل اور استدلالی طرز میں تقریر کا منفرد انداز ایک عجیب سماں پیدا کر دیتا۔ سامعین ایسی محویت سے اسے قبول کرتے کہ ان کے عقلی اشکالات بھی مرتفع ہوجاتے۔ اور ساتھ ساتھ روحانیت سے بھی محظوظ ہوتے۔

عام طور پر فلسفیانہ انداز تقریر سے سامعین طبیعت کا بار اور گرانی محسوس کرتے ہیں مگر یہاں روحانیت وعقلیت کا حسین امتزاج اس کو ایک روح پرور کیف ونشاط میں تبدیل کر دیتا۔ اسی لئے آپ کی تقریر سے لوگ ''تحیر معرفت کی دولت'' سے جھولیاں بھر کر جاتے۔

دارالعلوم دیو بند کی مرکزیت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔اسی لئے اطراف عالم سے حصول علم کی غرض سے تشنگانِ علوم اپنی سیرابی کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور علوم قرآن ونبوت سے سرفراز اور بامراد ہوکر دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے ممنونِ احسان ہوکر لوٹتے ہیں۔الغرض ایک عالَم کا عالَم اپنی تشنگی کا سامان کرتا ہے اور برابر کرر ہا ہے۔مگر یہ چشمۂ خودرو بفضلہٖ تعالیٰ روبہ ترقی ہے۔اوراہل علم یہاں خدمت خلق کی ایک لائق صد تحسین اور قابل ہزار تقلید ایسی مثال قائم کئے ہوئے ہیں جس کی نظیر عالَم میں ملنا مشکل ہے۔حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے طلب علم کی نیت سے آنے والوں کے لئے علمی خدمت کے علاوہ ان کی ضروریات سے متعلق انتظامی امور بھی سرانجام دیئے۔اور انسانی زندگی کا ایک طویل اور حسین وزریں باب رقم کیا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے ترجمان کی حیثیت سے عالم اسلام کے علاوہ امریکہ،افریقہ اور برطانیہ۔الغرض بلاامتیاز وتخصیص ملک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ''تبلیغ علوم'' کی عظیم خدمت کا فریضہ بھی آپ نے ادا کیا۔

آپ کے زیرِ نظر خطبات ایسے ہی مواقع کے ارشادات وفرمودات کی صدائے بازگشت ہیں جو قلم وقرطاس سے گزرکر اصلاح احوال کیلئے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔اور تعمیر مستقبل کے سلسلہ میں آنے والی نسل کے لئے ''ذخیرۂ علم وحکمت''۔

اللہ تعالیٰ خطبات کے اس سلسلۃ الذہب کو صاحب خطبات،مرتب ناکارہ اور جملہ قارئین کرام کے لئے دین ودنیا کے لحاظ سے صلاح وفلاح اور آخرت کے لئے ذریعہ نجات بنائے اور کامل قبولیت سے نوازے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

فیضی روڈ ملتان شہر،فون نمبر ۶۳۲۱۶ — مطابق ۲،اکتوبر ۱۹۹۱ھ بروز بدھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ جلد دہم

حَامِدًا لِلّٰہِ الْعَظِیْم، وَمُصَلِّیاً عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ امّا بعد.

خطبات حکیم الاسلام جلد دہم بحمد اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں میں ہے، تقاریر و مواعظ کے سلسلہ میں جو مواد میسر آسکا وہ ہدیہ قارئین کرام کر دیا گیا۔ تاہم ابھی اس قدر منتشر مواد موجود ہے کہ ان کو جمع کیا جائے تو مزید کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مقدور بھر سعی و کاوش سے جو ہو سکا وہ پیش خدمت کر دیا گیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس کرم سے سلسلۂ خطبات کو یہاں تک پہنچایا اللہ تعالیٰ اسی فضل سے قبول فرماتے ہوئے مزید مواد مہیا فرما دیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ مزید جلد بھی پیشِ خدمت کی جائے گی۔

جلد دہم میں شامل ایک اہم تقریر ''اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام'' دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ سے حاصل ہوئی جو تقاریر یا خطباتِ صدارت مطلوب تھے ان کے حصول کے لئے مہتمم دار العلوم حضرت محترم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ حضرت والا نے کتب خانہ دار العلوم میں ان کو تلاش کرایا۔ تو صرف یہی تقریر مل سکی۔ اس سلسلہ میں حضرت موصوف نے جو کاوش فرمائی اس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذمہ داری کے جس منصب پر آپ ہیں، اس کے پیشِ نظر اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس کام کو سرانجام دینا محض للّٰہیت کے جذبے سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس جذبے کا بدل شکریے کے کوئی رسمی الفاظ ادا نہیں کر سکتے، تاہم دعا مسنون اس کے لئے مکافاتِ احسان کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہے۔

فجزاکم اللہ احسن الجزاء

اس سلسلہ کی تفصیل کچھ عرض کر دی جائے تو وہ جہاں اکابر کے علو ظرف اور ہمت عالی کا مظہر ہوگی وہاں ہم چھوٹوں کے لئے مشعل راہ اور لائق تقلید بھی ہوگی۔

جو تقاریر طلب کی گئی تھیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ جلسۂ احتجاج بسلسلہ آزادیٔ فلسطین۔ (بمبئی)

۲۔ جمعیت علماء دینی تعلیمی کانفرنس۔ (دہلی)

۳۔ دینی تعلیمی کانفرنس جمعیت العلماء سہارنپور (۱۳۸۰ھ)

۴۔ بچھرایوں ضلع مراد آباد کا اجلاس جمعیت العلماء صوبہ یو، پی

۵۔ جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی دوعظیم اجلاس ۱۳۶۳ھ و ۱۳۶۴ھ (۱۳۶۴ھ) کی یہ تقریر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے فراہم فرمائی۔)

۶۔ اسی طرح اس حدیث مسلم کی شرح جس میں فرمایا گیا:

جہنم سال میں دو مرتبہ سانس لیتی ہے جو ماہنامہ نقش دیو بند بابت ماہ جولائی، اگست، دسمبر ۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی جستجو جاری ہے۔

کاش! اگر یہ تمام تقاریر دستیاب ہو جاتی ہیں تو ایک جلد خطبات کی اور تیار ہو جائے۔ یہاں اس کو نقل کرنے سے مقصود بھی یہی ہے کہ اگر کسی صاحب علم کے پاس یہ مواد ہو یا کسی جگہ اس کی راہنمائی ہو سکتی ہو تو مطلع فرمائیں۔ ان شاء اللہ اس کے حصول میں ہر ممکن سعی کی جائے گی اور اس کو قارئین خطبات کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

بہر حال دار العلوم عریضہ ارسال کیا گیا حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی طرف سے جو جواب آیا اس کی نقل کتاب کی زینت بنا دی گئی۔

اس سلسلہ میں بندہ نے لکھا کہ جو تقاریر دستیاب ہو جائیں اس کی فوٹو کاپی کر کے بذریعہ ڈاک بھیج دی جائے اور جو اس کا خرچ ہو اس سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ وہ ادا کر دیا جائے گا۔

چنانچہ ایک تو حضرت والا نے یہ زحمت اٹھائی کہ تقریر تلاش کے بعد بھجوائی اور اس سلسلہ میں تاخیر کی وجہ لکھی اور صفائی معاملات کے پیش نظر اس کا پورا خرچہ لکھ بھیجا۔

(حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیو بند کا خط)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ جلد یازدہم

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَبَعْدُ!

خطبات حکیم الاسلامؒ کی گیارہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی کا جتنا شکرادا کیا جائے کم ہے، بالخصوص اس لیے کہ اگر کوئی باصلاحیت نہ ہو، پھراس سے کچھ ہو جائے، تو اس کے ذمہ شکر اور زیادہ ہو جاتا ہے...... بندہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کی ترتیب وتدوین کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، یہ جو کچھ ہے محض فضل خداوندی سے وجود میں آیا......

قارئین خطبات اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی شخصیت وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہے جسے حق تعالیٰ شانہٗ نے دارالعلوم دیوبند ایسی شہرہ آفاق علم وعمل اور کردار واخلاق کی یونیورسٹی کی مسند اہتمام پر فائز رکھا۔ آپ کا دوراہتمام ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ علمی لحاظ سے یہ کتنی بڑی خدمت اور سعادت ہے، اہل علم سے مخفی نہیں۔ بجاطور پر قلبی وجدانی کیفیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست • تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ ثُمَّ الْحَمْدُلِلّٰهِ، احقر کو بعض اوقات یہ مسرت کے لمحات نصیب ہوتے رہتے ہیں، جب یہ سوچتا ہوں کہ خطبات حکیم الاسلامؒ کی ترتیب وتدوین جہاں حضرت حکیم الاسلامؒ کے علوم ومعارف کی خدمت ہے، وہاں یہ دارالعلوم دیوبند کی بھی خدمت ہے......اور حجۃ الاسلام آیت من آیات اللہ حضرت مولنا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے معارف وحکم کا نسل نو کے لیے تعارف کا ذریعہ بھی ہے۔

الحمدللہ اس ناکارہ نے ان آنکھوں کو مسرور ہوتے ہوئے اور قلوب کو احساسِ شکر سے لبریز ہوتے ہوئے بارہا مشاہدہ کیا، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فیض علم حاصل کیا اور ان حضرات کے دل مین ان خطبات کی قدر ومنزلت ہے اور بہت سے حضرات کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ خطباتِ حکیم الاسلامؒ کی وجہ سے عرصہ سے آپ سے اشتیاق ملاقات تھا نیز یہ کہ:

''خطبات حکیم الاسلام کی وجہ سے غائبانہ تعارف تو آپ سے پہلے ہی تھا۔ اب ملاقات بھی ہوگئی......ایسے حضرات کے اظہار محبت کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ ان کو الفاظ کا جامہ پہنایا جاسکے.....

بہت سے مقتدر دینی راہنما جو ملکوں ملک سفر پر رہتے ہیں اور خطاب و بیان سے ان کی زندگی عبارت ہے، نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ ہم نے فلاں ملک میں آپ کی خطبات دیکھی ...... اور یہ بندہ نے بھی دیکھا کہ جلسۂ عام یا جمعہ کے خطبہ میں حضرات مقررین اس کتاب سے استفادہ کر کے تقریر کر رہے ہیں...... فَالْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ......

اخبارات میں ان کی تقریر انہی خطبات کے اقتباسات پر مشتمل ہوتی ہے، اہل علم کی ایک کثیر تعداد انہی خطبات سے علمی استفادہ کر رہی ہے اور اگلی جلد کی منتظر رہتی ہے.... گیارہویں جلد ایسے حضرات کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس میں الحمد للہ سورۂ ملک کی پوری تفسیر ہے جو عجیب وغریب علوم و معارف پر مشتمل ہے۔...

حضرتِ اقدس حکیم الاسلامؒ نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ ماہ رمضان المبارک قیام بمبئی میں فرمایا، تو روزانہ اسی سورۃ کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرماتے جسے بڑے اہتمام سے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا۔ بندہ کو یہ ریکارڈ شدہ مواد دوبئی سے برادر محترم مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب خانگڑھی نے حضرت اقدس حکیم الاسلامؒ کے تلمیذ رشید اور خاص ارادت مند حضرت محترم مولانا عبدالمتین صاحب منیری زید مجدھم سے حاصل کر کے بھیجا، جس پر بندہ تہ دل سے ان کا شکر گزار اور ممنون احسان ہے۔ الحمد للہ وہ تمام تر تفسیری مواد جلد نمبر ۱۱ میں مرتب ہو گیا۔

ازاں بعد احقر کے بہت ہی محبّ و مہربان رفیق حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب جدہ (سعودیہ) نے سورۂ قلم کی تفسیر پر مشتمل ۱۰ کیسٹس دیں، جو آج کل لکھی جارہی ہیں، اس طرح بارہویں جلد اپنے مراحل آغاز میں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کو بہت جزائے خیر نصیب فرمائے اور علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کا پورا پورا اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کے لیے قبولیت کاملہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

نیز اس ناکارہ کے لیے جلد نمبر ۱۲ کی تکمیل آسان فرمائے۔ آمین۔ الحمد للہ خطبات کا یہ مجموعہ ہندوستان میں بھی شائع ہوا، اللہ تعالیٰ توفیق مزید سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

بندہ کو کراچی میں ہندوستان سے شائع شدہ ایک جلد ہاتھ لگی اور یہ دیکھ کر تعجب اور حیرت ہوئی کہ جس ادارہ نے اس کو شائع کیا، اس نے یہ انتہائی زیادتی کی کہ احقر کا لکھا ہوا پیش لفظ اھداء، انتساب، کلمات تحسین اور اپنے اساتذۂ کرام کی تقریظات، اور شروع کتاب سے تقریباً پچیس تیس صفحات انہوں نے غائب کر دیئے اور اپنی طرف سے نیا پیش لفظ کسی اور شخصیت کے نام انتساب یہ سب کچھ اپنی طرف سے لکھ کر کتاب کو شائع کر دیا۔ دینی کتب کا شائع کرنا جہاں ایک لحاظ سے دینی خدمت ہے وہاں کاروباری منفعت بھی ہے۔ ایسے حضرات سے گذارش ہے کہ آپ کتاب کی اشاعت کریں، مگر یہ صحیح نہیں کہ علمی طور پر کتاب میں قطع و برید کی جائے۔ یہ نہ صرف شرعی طور پر مستحسن نہیں بلکہ علم وادب اور تصنیف و تالیف کی لائن میں کوئی اچھا تاثر نہیں۔ اگر آپ نے اشاعت کرنی ہی تھی تو کم از کم مرتب اور اس کے اساتذۂ کرام، نیز متعلقین کو تو قارئین کرام کی دعاؤں سے محروم نہ فرماتے......

ان حضرات کو جیسے اپنے اساتذۂ کرام سے تعلق خاطر ہے اور اپنے نسب کے لحاظ سے بڑوں سے محبت ہے

یہی حق دوسروں کے لیے بھی وہ تسلیم کرلیں تو اس میں ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہے.....لیکن جو طرز عمل اختیار کیا گیا، دوسرے ملک میں رہتے ہوئے ان سے کوئی براہ راست گلہ شکوہ نہیں، تاہم وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرح کے طرز فکر سے عقیدت و محبت کے شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں.....کیا احقر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے لیے جو ان خطبات میں علمی رہنمائی فرماتے رہے قارئین خطبات سے دعا چاہے.....اگر یہ حق صحیح ہے تو پھر خطبات سے ان کے تذکرے کو محور کر دینا زیادتی نہیں؟.........اسی طرح جن اساتذہ کرام کے سامنے بیٹھ کر علم اور اہل علم سے شد بد نصیب ہوئی اگر ان کی طرف خطبات کی ترتیب و تدوین کا انتساب کر کے اپنے قلبی جذبات کی تسکین کی جائے یا ان کے کلمات تقریظ کو کتاب کی زینت بنایا جائے.....مگر کوئی بھی ادارہ اس کو ختم کر کے اپنی طرف سے یہ تأثر دے کہ گویا کتاب مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے اور اس کے ابتدائی احوال لکھ کر وہ اس کو سند اور حجت دے رہے ہیں جبکہ واقعہ ایسا نہ ہو، تو یہ قرین انصاف نہیں ہے۔

اس لیے ان حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ممکن ہو تو خطبات کی ترتیب کے لیے مواد فراہم کر کے تعاون فرمائیں، جو ان کا منصب ہے، اگر تعاون نہیں فرما سکتے.....جیسا کہ اب تک انہوں نے نہیں کیا، تو کم از کم یہ زیادتی بھی نہ فرمائیں، خطبات کو شائع کرنا چاہیں تو بلا کم و کاست اور قطع و برید کے شائع فرمائیں، امید ہے کہ وہ ان جذبات و احساسات کے اظہار کو محسوس نہ فرمائیں گے۔

جلد نمبر ۱۱ کے منظر عام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ بندہ شعبۂ تحفیظ میں مدرس ہے.....مگر ایک عرصہ سے ارادہ تھا کہ شعبہ کتب بھی قائم کیا جائے، تو گذشتہ (۲) دو سال سے بندہ اس کوشش میں لگ گیا، چنانچہ دار العلوم رحیمیہ ① کے نام سے ایک نئے ادارہ کی بنیاد ڈالی گئی، اس کے لیے قطعۂ ارض خرید کیا گیا۔

الحمد للہ اب دار العلوم رحیمیہ کی بنیاد مضبوط ہو گئی، شعبہ کتب اور شعبہ تحفیظ دونوں اس میں قائم ہو گئے ہیں کسی بھی نو آغاز مدرسہ کے ابتدائی مراحل میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ انہی حضرات کے سامنے ہیں جو اس مرحلہ سے گزرتے ہیں گذشتہ (۲) برس کی اس مسلسل مشغولیت نے تحریری کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا.....لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ اس وقت دار العلوم رحیمیہ میں شعبۂ کتب کے پانچ درجات قائم ہو گئے ہیں اور شعبہ کتب میں داخل ہونے والے تمام تر طلبہ حفاظ کرام ہیں، اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا، ایک مربوط تعلیمی نظام قائم ہو گیا، تقریباً ۱۷ اساتذۂ کرام الحمد للہ دار العلوم رحیمیہ اور اس کی شاخوں میں شب و روز طلبۂ کرام کی خدمت میں منہمک ہیں۔

حضرات قارئین کرام سے دلی التجا ہے کہ وہ اس نو آغاز دار العلوم رحیمیہ کو اپنی دعاؤں میں خصوصیت سے یاد فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرات اکابر سے اسے ایک نسبت خاص عطا فرمائے اور مقام قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

خطبات کے قارئین کرام سے ایک انتہائی دردمندانہ گذارش ہے کہ احقر کے والد محترم حضرت اقدس مولانا محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ، ۲۲ شوال المکرم ۱۴۱۶ھ کو وصال فرما گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ، خطبات کی

حسن ترتیب وتدوین میں جہاں ان کی دعائیں شامل حال رہیں وہاں ان کی علمی وعملی شفقتیں بھی ساتھ رہیں۔آج یہ سایۂ رحمت ہمارے پورے خاندان سے اٹھ گیا...قارئین خطبات سے ان کے علو درجات کے لیے دعاؤں کا خواہاں ہوں......امید ہے کہ وہ کرم فرمادیں گے۔

والسلام

قاری محمد ادریس

بانی ومدیر دارالعلوم رحیمیہ، چوک شاہ عباس

سورج کنڈ روڈ، پیر کالونی نمبر ۱ ملتان شہر

فون نمبر: ۲۳۲۲۰۲

۲۳۱۷۴۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ دوازدہم

حَامِدًا لِلّٰهِ الْعَظِيْمِ وَمُصَلِّيًا عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَ بَعْدُ!

خطبات حکیم الاسلام کے سلسلہ کی جلد نمبر ۱۲ آپ کے ہاتھوں میں ہے ان خطبات ومواعظ کی ترتیب و تدوین کے ابتدائی مرحلہ میں حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ گذری تھی کہ یہ سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ اتنا طویل ہو جائیگا۔ چونکہ فضلِ خداوندی کے متوجہ ہونے کیلئے دلیل اور قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس حق جل واعلیٰ کی کرم فرمائی کا یہ مشاہدہ وظہور ہے کہ وہ ہر ناممکن العمل کو اپنے ارادۂ مبارک سے ممکن فرما سکتے ہیں۔ جوں ہی خطبات دستیاب ہوتے رہے ان کو سلسلہ میں پرویا جاتا رہا، موضوعاتی ترتیب کو ملحوظ رکھنا اسی لئے مشکل تھا۔ گویا جمع شدہ مواعظ کی یہ ترتیب نہیں ہے بلکہ ہر میسّر آنے والے خطبہ کو زیر ترتیب جلد میں پیش کر دیا گیا اور جلدوں کا نمبرات سے تعارف ہوتا رہا۔ جلد نمبر ۱۲ میں الحمدللہ سورہ قلم پ ۲۹ کی مکمل تفسیر ہے۔ احقر کی معلومات کی حد تک اس سُورۃ کے تمام مضامین پہلی مرتبہ منصۂ شہود پر آرہے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام نَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ کی تمام مطبوعات بحمداللہ بندہ کے پاس موجود ہیں۔ بندہ کے ناقص علم کے مطابق اس سُورۃ کی تفسیر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے لبریز خصوصیات کے ساتھ پہلے نگاہ سے نہیں گذری۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام اس رائے سے اتفاق فرماتے ہوئے اسے مزید اشتیاق ومحبت سے پڑھیں گے۔

بارہویں جلد کے سلسلے میں برادر محترم جناب مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری زید مجدہم نے کرم فرمایا کہ جامعہ خیر المدارس کے بارے میں حضرتِ اقدس حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے جو مشاہدات وتاثرات وقتاً فوقتاً اپنی آمد کے بعد کتابُ الرّائے میں لکھے وہ سب عطا فرما دیئے، جو بارہویں جلد کی زینت بن رہے ہیں۔ یہ تاثرات ان دو بزرگ اور زیرک تاریخی شخصیّات کے باہمی تعلّق اور دواداروں کے سربراہوں کی اس رفاقت کا تذکرہ ہے جو علومِ نبوّت کی درسگاہوں کے ذمّہ دار ہیں۔ میری مُراد دارالعلوم دیوبند اور جامعہ خیر المدارس ہے۔ اس میں خیر المدراس کی عہد بہ عہد ترقی کی منازل طے کرنے کا تدریجی تذکرہ ہے۔ بے شک یہ تاثرات خاص خیر المدارس کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے قلمبند فرمائے، تاہم منظر عام پر آنے سے اس کی افادیت مزید ہوگئی۔ حضرت مہتمم جامعہ زید مجدہم نے ''کرم بر کرم'' یہ فرمایا کہ ممتاز خطیب کے عنوان سے خطبات کی جلد ۱۲ کے

لئے ایک وقیع تحریر سپرد قلم فرمائی جس میں صاحب، اور مرتّبِ خطبات سے متعلق تذکرہ خیر و برکت فرمایا۔ ناکارہ مرتّب ان کی اس کرم فرمائی کا دِل و جان سے شکر گزار و ممنون احسان ہے۔

اسی طرح میرے عظیم محسن اور مخلص بھائی حضرت مولانا ابوانس عطاءُاللہ بخاری زید مجدہم نے ''علم و حکمت کی کہکشاں'' کے عنوان سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی ہمہ پہلو شخصیّت پر مختصر انداز میں بہت ہی جامع، وقیع اور دلآویز تحریر ارسال فرمائی جو زینتِ کتاب ہے۔ اسی طرح دیرینہ رفیق و کرم فرما برادر محترم حضرت مولانا محمد عابد صاحب زید مجدہم نے سورۂ قلم کی خصوصیات کے سلسلے میں جلد۱۲ کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

یہ ناکارہ ان ہر دو حضرات کا تہہ دل سے سپاس گذار اور دعاء گو ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دارین میں اس کی بہتر سے بہتر ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ اس ناکارہ کو حضرت شہیدِ اسلام، حضرت اقدس لدھیانویؒ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ ماموں کانجن کے ابتدائی دورِ تدریس میں احقر نے بالخصوص علم صَرف حضرتِ شہیدؒ سے حاصل کیا اور ان کے ماہرانہ طرز تدریس کی وجہ سے نہایت سہل الحصول انداز میں پڑھا۔ پھر جب حضرت شہیدؒ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوّت سے وابستہ ہوئے اور ملتان درتز میں قیام تھا تو گاہے گاہے یہ ناکارہ حاضرِ خدمت ہوتا تھا۔

خطبات کی ترتیب وتدوین کے اس دور میں جب تین جلدیں منظرِ عام پر آئیں تو حضرت حکیم الاسلامؒ کے وصال کا سانحہ پیش آیا۔ آپ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات کے سلسلہ میں جو شذرہ ''بیّنات'' کراچی کے لئے لکھا تو اسی ذیل میں یہ چند کلمات بھی تحریر فرمائے۔ ''حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلّمہٗ (خطیب مسجد غفوریہ پروانہ کالونی ملتان) نے حضرتؒ کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتّب کی ہیں۔ اگر یہ محنت وجستجو جاری رہی اور حضرتؒ کی جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئیں وہ سب شائع کر دی گئیں تو اُمّت کے لئے حقائق و معارف اور ''کلماتِ طیّبات'' کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو جائے گا'' (مقالات یوسفی (۱۶۔۲۱۵) الحمدللہ! حضرت اقدسؒ کی حسبِ خواہش حق تعالیٰ شانہٗ نے فضل فرمایا کہ بارہویں جلد منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ اور جلد ۱۳ کی ابتدا کی جا رہی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت شہیدِ اسلامؒ اور دیگر قارئین کرام کی دعاؤں کی وجہ سے فضل و کرم کا معاملہ فرمائے اور سابقہ جلدوں کو قبول فرما کر نئی آنے والی جلد کے لئے آسانی فرمائے۔ (آمین)

مرتب ناکارہ

قاری محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

جمعۃ المبارک ۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

خادم دارالعلوم رحیمیہ ملتان

محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ" اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا......اِلٰى قَوْلِهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾" ①

بزرگانِ محترم! یہ جلسہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، جلسہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے منعقد کیا گیا ہے۔ گویا اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کیا جائے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کا ذکر عینِ عبادت ہے اور اللہ کے نزدیک بڑی بھاری طاعت اور قربت ہے اور سارے کمالات و برکات کا سر چشمہ ہے اس لئے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ایک نعمت ہے جو مسلمانوں کو عطا کی گئی۔ تو میں اس وقت میلادِ نبوی ہی کے بارے میں چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں گذارش کروں گا اور اسی مناسبت سے یہ چند آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں، جو آپ کے سامنے ابھی پڑھی گئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میلاد کے سلسلے میں...... آپ بھی چونکہ ولادت کا ذکر سننے کے لئے آئے ہیں، ولادت کا ذکر بھی کروں لیکن میں ایک ولادت کی بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو ولادتوں کا ذکر کروں گا۔

ولادتِ نبوی جسمانی اور روحانی ...... ممکن ہے آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ ولادت تو ایک ہی ہوتی ہے، پیدائش ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے تو دو ولادتیں کیسی؟ لیکن میری گزارشات کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقتاً نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو ہی ولادتیں ہوئیں۔ ایک ولادت باسعادت تو ۱۲ یا ۸ ربیع الاول کو علےٰ اختلاف الاقوال ہوئی اور ایک ولادت حضور کی چالیس برس کے بعد ہوئی، یعنی روحانی ولادت...... جب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے دنیا میں ظاہر ہوئے۔ ۱۲ ربیع الاول کو ولادتِ جسمانی ہوئی اور چالیس برس بعد

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰-۴۸۔

ولادتِ روحانی ہوئی جس کو ہم نبوت سے تعبیر کریں گے۔

۱۲ ربیع الاول کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال دنیا میں ظاہر ہوا اور چالیس برس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال دنیا میں ظاہر ہوا۔ تو ایک جمال کی حیثیت سے ولادت ہے اور ایک کمال کی حیثیت سے ولادت ہے۔ دونوں ولادتوں میں ہمارے لئے ان کا ذکر عینِ عبادت اور طاعت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں جمال ظاہر ہونا یہ بھی عالم کیلئے عظیم ترین نعمت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال دنیا میں ظاہر ہونا یہ اس سے بھی بڑی نعمت ہے جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی ہے تو جمالِ محمدی وہ بھی ایک ایسی امتیازی شان ہے کہ دنیا میں اتنا بڑا جمیل اور صاحبِ جمال پیدا نہیں ہوا جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمال والے تھے اور اتنا بڑا با کمال بھی کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا کہ کمال والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ تو دونوں ولادتیں امتیازی شان رکھتی ہیں، نہ ولادتِ جسمانی کی نظیر ہے اور نہ ولادتِ روحانی کی نظیر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو ہمارے سامنے ظہور ہوا محمد بن عبداللہ کا اور چالیس برس کے بعد ظہور ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔ اُس وقت آپ ابن عبداللہ کی حیثیت سے دنیا میں آئے اور چالیس برس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے۔

ولادتِ روحانی کے بارے میں عامۃ الناس کا طرزِ عمل...... عام طور سے لوگ ولادتِ جسمانی کو اہمیت دیتے ہیں اور اسی ولادت کے ذکر کو ''ذکرِ میلاد'' کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ذکر میلاد کا ابتدائی درجہ ہے۔ حقیقی درجہ وہ ولادت ہے جو چالیس برس کے بعد ہوئی، اس لئے کہ پہلی ولادت میں ہمارے لئے عمل کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اور دوسری ولادت میں ہمارے لئے عمل کے نمونے موجود ہیں جس سے ہم سعادت حاصل کر سکتے ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی ولادت جمال کی ہوئی کہ چہرہ مبارک ایسا تھا، انگلیاں ایسی تھیں، بال ایسے تھے، خونچیں ایسی تھیں، بدن اور قد و قامت یہ تھا۔ اس میں ہمارے لئے کوئی نمونۂ عمل نہیں ہے۔ خوشی کی تو انتہائی چیز ہے کہ ہمارے پیغمبر کو اللہ نے وہ جمال اور موزونیت عطا فرمائی کہ عالم میں ایسا حسن و جمال کسی کو نہیں دیا گیا۔ خوشی اور فخر کا موقع ہے لیکن عمل کا نمونہ کچھ نہیں...... یہ نہیں ہے کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ تھے ہم ویسے ہاتھ بنالیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنگ مبارک تھا ہم اپنا رنگ ویسا کرلیں۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قد و قامت تھا ویسا ہم اپنا قد و قامت بنالیں۔ اس میں عمل کا نمونہ ہمارے لئے نہیں ہے خوشی کا موقع ضرور ہے، جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے جب آپ ظاہر ہوئے اس میں سامنے یہ چیز ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان ایسا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ یہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہ تھا، نماز ایسی، روزہ ایسا، حج ایسا اور جہاد ایسا تھا...... اس میں ہمارے لئے نمونۂ عمل ہے، جیسی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہم بھی ویسی نماز پڑھیں، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزے رکھے ہم بھی ویسے روزے رکھیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کیا ہم بھی ویسا ہی حج کریں، جس طرح

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی گھریلو معاشرت تھی ہم بھی ویسی ہی معاشرت بنائیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جماعتی زندگی تھی ہم بھی ویسی ہی زندگی بنائیں۔ اس میں عمل کا نمونہ ہے میرے خیال میں یہ جو پہلی ولادت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے یہ اس لئے ہے کہ اس میں کرنا کرانا کچھ نہیں پڑتا کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، خوش ہو لیے یا زیادہ سے زیادہ خوش ہو کے مٹھائی بانٹ لی اور خود ہی کھا بھی لی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ولادتِ روحانی ہی اصل مقصود ہے......اور دوسری ولادت سن کر ذمہ داریاں بڑھتی ہیں کہ ہمیں مسلمان بننا پڑے گا، ہمیں یہ کام یوں کرنا پڑے گا، زندگی کا نمونہ ایسا بنانا پڑے گا۔ عمل کرنا لوگ نہیں چاہتے، اس لئے دوسری ولادت کا تذکرہ نہیں کرتے اور اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور پہلی ولادت میں عمل کا نمونہ نہیں خوشی خوشی کا موقع ہے اس لئے اس کو زیادہ اختیار کرتے ہیں، ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے یہ ذکر عبادت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا میں آئے ایسے ہی اس کا ذکر بھی عبادت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس طرح نماز پڑھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس طرح حج کیا، حضور نے اس طرح جہاد کیا، بلکہ یہ اس سے بھی بڑی عبادت ہے۔ اس میں ہمارے لئے سعادت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ جبکہ اُس میں محض خوش ہونے کا موقع ہے۔ مگر بہر حال یوں تو دونوں ولادتوں کا ذکر ہمارے حق میں عبادت ہے اگر چہ پہلی ولادت مقدمہ ہے اور دوسری ولادت مقصود ہے کیونکہ اگلا مقصود ظاہر کرنا تھا اس لئے ولادتِ جسمانی سامنے رکھی گئی تا کہ ولادتِ روحانی کا موقع آجائے تو پہلی ولادت تمہید اور دوسری ولادت اصل مقصود ہے۔ رسالت ونبوت کو دنیا میں لانا تھا اس لئے ذاتِ اقدس کو پیدا کیا گیا مگر تمہید ہو یا مقصد ہو، ہے دونوں کا ذکر طاعت اور عبادت۔ اس لئے تھوڑا تھوڑا ذکر میں دونوں قسم کی ولادتوں کا کروں گا۔

جمالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم......تو میں نے عرض کیا کہ پہلی ولادت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جمال ظاہر ہوا۔ جسم مُبارک ایسا تھا، رنگ ایسا تھا، قد وقامت ایسا تھا، چال ڈھال ایسی تھی۔ یہ بھی امتیازی چیز تھی کہ پورے عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں: ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، سُرخ حُلّہ پہنے ہوئے، سرخ چادر اور سرخ ہی لنگی۔ لیکن محدثین اور شراح حدیث اس کی تفصیل کرتے ہیں کہ وہ ساری سرخ نہیں تھیں، سرخ اس لئے کہا گیا کہ اس پر دھاریاں سرخ پڑی ہوئی تھیں جبکہ کپڑا سفید تھا، سفید زمین کے کپڑے میں سرخ دھاریاں تھیں۔ یمن سے چادریں آیا کرتی تھیں بعض سیاہ دھاریوں کی، بعض سرخ دھاریوں کی، بعض سبز دھاریوں کی۔ تو اس دن یمن سے سرخ دھاری کی کوئی چادر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہی پہنے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا، چاندنی کھل رہی تھی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف رکھتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا کبھی چہرۂ مبارک کو اور کہتا تھا کہ ان میں کون زیادہ حسین ہے؟ آخر مجھے فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ چاند میں وہ

حسن و جمال نہیں جو چہرۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر حسن و جمال ہے اس لئے چاند سے ہٹ کر میری نگاہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر جم جاتی تھیں۔ ① اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیسی صورتِ زیبا دیکھی تھی۔

صحابہؓ کی عادت مبالغہ کی نہیں تھی۔صحابہ کرام سے زیادہ سچا اس عالم میں دوسرا نہیں پیدا ہوا۔اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ اس امت میں جو بھی بڑے سے بڑا قطب،غوث اور ابدال پیدا ہوا وہ صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔صحابہ سب کے سب متقی،عدول،پاکباز اور پارسا ہیں،ان سے بڑھ کر مقدس طبقہ اس امت میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔قرآن وحدیث نے جس طبقے کی برگزیدگی کی شہادت دی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے،اس لئے ان کے ہاں شاعریت نہیں تھی،مبالغہ آرائی نہیں تھی۔جو کچھ کہتے تھے اپنے اللہ کو سامنے رکھ کر حقیقت کہتے تھے۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کوئی شاعری اور مبالغہ نہیں کیا بلکہ اصل حقیقت بیان کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسی پاک صورت پہلے کبھی دیکھی نہ آئندہ دیکھیں گے۔ ② یہ کوئی مبالغہ یا شاعری نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے اور اس کے متعلق صحابہ کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ عشاقِ رسول محبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا تھے اور جو فانی ہو محبت میں وہ تو کہا ہی کرتا ہے،وہ اچھی چیز ہی کہے گا، وہ تو محبت ہی کی بات کرے گا،تعریف ہی کی کہے گا لیکن قرآن کریم میں بھی اس کی شہادت موجود ہے۔جب اللہ کے کلام سے کوئی چیز اخذ کی جائے تو قرآن ذمہ دار بن جاتا ہے،پھر اس میں شاعریت کا کوئی شائبہ یا شوشہ باقی نہیں رہتا تو قرآن کریم میں بھی اس کا ماٰخذ موجود ہے اور سمجھنے والے اس کے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔تو پہلے میں قرآن کا واقعہ بیان کردوں اور پھر اس واقعہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو اخذ کیا ہے اس کو عرض کروں گا۔

حسنِ یوسف علیہ السلام...... حدیث میں فرمایا گیا کہ یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ حسین دنیا میں گذرے ہیں۔اور خود فرمایا حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جب اللہ نے حسن و جمال پیدا کیا تو آدھا حُسن ساری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا۔ ③ تو حسن و جمال میں کوئی شک نہیں،جب حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو اس سے بڑھ کر شہادت نہیں ہوسکتی کہ یوسف علیہ السلام سے زیادہ کوئی حسین نہیں،حُسن ان کا اُونچا تھا،ان پر زلیخا عاشق ہوئی ہیں،جو بادشاہِ مصر کی بیوی تھیں اور صرف زلیخا ہی عاشق نہیں تھیں بلکہ مصر کی تمام بیگمات اپنے دلوں کو یوسف علیہ السلام کے عشق میں کھوئی ہوئی تھیں لیکن زلیخا نے چونکہ انہیں خریدا تھا اور کنعان کے قافلے نے آکے زلیخا کے ہاتھ انہیں بیچ دیا تھا اس لئے یوسف علیہ

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی الرخصة فی لبس الحمر للرجال ج:١٠ ص:٦.

② الشمائل المحمدیة للترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول الله ﷺ ج:١ ص:٧.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء ص:٧٠٥ رقم:٤١١.

السلام گویا زلیخا کے مملوک تھے، دوسری طرف جا نہیں سکتے تھے تو بیگماتِ مصر لاکھ عشق کریں مگر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں تو انہوں نے ایک ڈھنگ اختیار کیا کہ زلیخا پر طعنے کسنے شروع کئے، کہ دیکھو زلیخا کیسے تھوڑے دل کی عورت ہے جو اپنے غلام پہ عاشق ہوگئی ہے، اسے شرم نہیں آتی، بادشاہ کی بیگم ہے اور غلام پر عاشق؟ یہ طعنے دینے کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ زلیخا کا دل اتر جائے اور کسی طرح یوسف علیہ السلام کو ہم قبضا ئیں...... زلیخا اس سے ہٹ جائے تو اس پر ہم قابض ہوں، تو یہ مقصد تھا طعنے دینے کا۔ زلیخا بھی سمجھ گئی اور روز روز کے طعنے سُنتے سُنتے تنگ آ گئی، آخر اس نے ایک دن ارادہ کیا کہ میں ایک دفعہ ان سارے طعنوں کا جواب دے دوں تو اس نے بیگمات مصر کو چائے کی پارٹی دی۔ چائے کا لفظ میں نے اس لئے کہا کہ کھانے کے سوا جو پارٹی ہوتی ہے چائے کی کہلاتی ہے، چاہے اس زمانے میں چائے ہو یا نہ ہو، مگر بہر حال وہ پارٹی تھی، کھانے کی نہ تھی، بلکہ وہ تفریحی پارٹی تھی اور کچھ تفکّہ کی چیزیں اس میں رکھی گئی تھیں، پھل فروٹ وغیرہ بہتر سے بہتر چنے گئے تھے، بہر حال ملکہ تھیں بادشاہ کی بیگم تھیں تو اس کے ہاں کیا کمی تھی! بڑا دستر خوان سجایا، پھل، فروٹ، مٹھائیاں اور جو اس زمانے کے تکلفات تھے سب رکھے گئے۔ پھل کاٹنے کے لئے چھریاں رکھی گئیں اور بیگماتِ مصر کو دعوت دی گئی، تمام وزراء زادیاں، امیر زادیاں اور انکی بیگمات آئیں اور خوب اپنا اپنا بناؤ سنگھار کر کے عمدہ لباس اور زیورات پہن کر آئیں۔ مقصد یہ تھا کہ شاید یوسف کی نظر پڑ جائے، مجھے ہی پسند کر لے، ہر بیگم یہ چاہتی تھی تو انتہائی آراستہ پیراستہ ہو کر بہترین زیورات اور لباس پہن کر جمع ہوئیں۔ دستر خوان سجایا گیا، جب زلیخا نے دستر خوان پر سب کو بٹھلایا تو یوسف علیہ السلام کو ایک کمرے میں چھپا دیا اور کہا جب میں کہوں تو باہر آئیں پہلے باہر نہ آئیں۔ یوسف علیہ السلام اندر بیٹھ گئے۔ خیر بیگماتِ مصر بیٹھیں، قرآن کریم میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا کہ: ﴿ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ﴾ ① بیگماتِ مصر نے زلیخا کو طعنے دینے شروع کئے کہ اپنے غلام پر عاشق ہوگئی، شرم آنی چاہئے ﴿ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ ② ہم تو اسے گمراہ سمجھتے ہیں بھلا غلام پر بھی عاشق ہونے کے کوئی معنی ہیں! ﴿ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ ﴾ ③ جب زلیخا نے پہچان لیا کہ طعنہ دینا محض اس لئے ہے کہ میرا دل اتر جائے یوسف سے اور یہ یوسف پہ قابو پالیں ﴿ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً ﴾ ④ تو دستر خوان تیار کیا، پھل فروٹ سجائے ﴿ وَاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا ﴾ ⑤ ہر ایک کے سامنے ایک ایک چھری رکھ دی کہ پھل کاٹیے اور کھائیے۔ جب انہوں نے چھریاں ہاتھ میں لیں اور پھلوں کو تراشنا شروع کیا۔ ایک دم یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ باہر آ جائیں۔ یوسف علیہ السلام باہر آئے، ان کا حسن و جمال دیکھنا تھا کہ بیگمات اتنی مبہوت ہوئیں کہ آپے سے باہر ہوگئیں، بجائے پھل کاٹنے کے کسی نے انگلی کاٹ لی، کسی نے خونچہ کاٹ لیا، کسی نے بازو کاٹ لیا، سب لہولہان ہوگئیں اور یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھ کر انہیں اپنے آپ کا ہوش نہ رہا۔ جب

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۰. ② ایضا ③ ایضاً، الآیۃ: ۳۱. ④ ایضا ⑤ ایضاً.

یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بہت بھاری اور بڑا سمجھا اور ہوش وحواس کھو بیٹھیں اور ہاتھ کاٹ ڈالے ﴿وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَاھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَآ اِلَّامَلَکٌ کَرِیْمٌ﴾ ① اور کہا کہ واللہ یہ بشر نہیں، کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اترا ہے۔ یہ حسن و جمال بشر میں کہاں ہے! یہ خوبصورتی، یہ نزاکت، یہ قدِ رعنا اور یہ زیبائش!!! یہ کہاں بشر ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی فرشتہ ہے۔ جب تعریف میں رطب اللسان ہوئیں تو زلیخا نے کہا: یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیا کرتی تھیں، میں نے تو نہ کبھی انگلی کاٹی اور نہ ہاتھ کاٹا، تم کو کیا مصیبت آئی کہ تم نے انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ میرے ساتھ روز یوسف ہیں مگر میں اپنے آپے میں ہوں، تم نے ایک نظر دیکھا اور آپے سے باہر نکل گئیں۔ تو جب تمہاری یہ حالت ہے اگر میری یہ حالت ہوگئی ہے تو طعنے کی کونسی بات ہے؟ تمہیں طعنے دینے پر شرم آنی چاہیے کہ میں غلام پر عاشق ہوگئی، پھر تم کیوں عاشق ہوئیں؟ تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ اب بے چاری بیگمات چپ ہوگئیں، اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں، پھر کسی کی زبانِ طعن و تشنیع نہیں کھلی، زلیخا چھوٹ گئیں اور ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ہوگیا۔ یہ تو وہ واقعہ بیان ہوا جو قرآن کریم نے یوسف علیہ السلام کے حسن کے بارے میں بیان کیا۔

حسن یوسف علیہ السلام پر جمالِ محمدی علیہ السلام کا تفوق...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیا فرماتی ہیں؟ مجھے وہ سنانا ہے، مذکورہ واقعہ تو اس کے لئے تمہید تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ بیگماتِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تھا تو ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اگر میرے محبوب کو دیکھتیں تو دلوں کے ٹکڑے کر ڈالتیں، یہ گویا صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرق بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال سے زیادہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حدیث میں فرمایا کہ آدھا حسن پوری دنیا کو دیا گیا اور آدھا یوسف علیہ السلام کو، تو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اس سے مُستثنیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ساری دنیا کے مجموعے کو حسن دیا گیا اتنا تنہا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حسن دیا گیا اور یوں وہ یوسف علیہ السلام سے بھی بڑھ کر ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کہاوت صحیح ہے کہ بیگماتِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو انگلیاں کاٹ ڈالیں، میرے محبوب کو دیکھ پاتیں تو دل صحیح سالم نہ رہتے بلکہ دلوں کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔ اس سے جمالِ محمدی کا اندازہ ہوا۔ یوسف علیہ السلام کے بارے میں ''حسن'' کا لفظ استعمال کیا ''فَاِذَا قَدْ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ'' ② آدھا حسن پوری دنیا کو دیا گیا (اور آدھا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ''جمال'' کا لفظ استعمال کیا گیا، جمال برتر ہوتا ہے حسن پر۔ حسن کہتے ہیں قد و قامت کی موزونیت کو کہ ہر عضو اور ہر جوڑ بند اپنی جگہ اتنا مکمل ہو کہ نگاہیں نہ پھریں، وہاں سے ہٹنے نہ پائیں، وہ حسن نظروں پر مجموعی طور پر قابو پالے۔ تو حسن کہتے ہیں رنگ کی سفیدی اور ظاہری نقشے کے اچھے ہونے کو اور جمال کہتے ہیں مجموعۂ قد کے تناسب کو، اعضاء

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء ص: ۷۰۵ رقم: ۴۱۱.

کے جوڑ بند کے درست ہونے کو اور اپنی اپنی جگہ موزوں ہونے کو، انگلی دیکھو تو معلوم ہو کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ناک دیکھو تو معلوم ہو کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ہر ہر عضو اتنا موزوں، اتنا کامل کہ اس سے آگے کمال کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اسے کہتے ہیں جمال۔ تو جمال فائق ہے حسن کے اوپر، بڑھا ہوا ہے حسن سے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے جمیل کا لفظ بولا گیا، حسین کا لفظ نہیں بولا گیا "اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ" اللہ خود بھی جمیل ہے جمال والے کو پسند بھی کرتا ہے۔① یہ نہیں کہا گیا کہ "اِنَّ اللّٰهَ حَسِيْنٌ يُحِبُّ الْحُسْنَ" اللہ حسن والا ہے حسن والے کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ حسن کہتے ہیں حسن صورت کو اور جمال کہتے ہیں جمال ذات کو کہ ذات بالکل موزوں اور مناسب ہے اور حسن کے معنی صورت اور اچھا رنگ ہیں۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمال دیا گیا تھا، اس لئے احادیث میں جہاں آپ کے جمال کا ذکر ہے تو ان میں آپ کے ایک ایک عضو کی تعریف ہے، بال ایسے تھے، دندان مبارک ایسے تھے جیسے موتی پروئے ہوئے ہوں، بال نہ بالکل لٹکے ہوئے نہ بالکل خمیدہ، کچھ لٹکے ہوئے کچھ گھنگھریالے، تو لٹکے ہوئے بھی اور چھلے دار بھی۔ بالکل لٹکے ہوئے بال ہوں تو یہ حسن نہیں سمجھا گیا، اور بالکل لٹکے ہوئے نہ ہوں بلکہ چھلے چھلے پڑے ہوئے ہوں تو یہ بھی حسن نہیں سمجھا گیا۔ گھنگھریالے بھی ہوں اور پھر کچھ لٹکے ہوئے بھی ہوں کہ دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو اسے جمال کہتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لینے کے لئے آپ نے دست مبارک دراز فرمایا، چادر مبارک اتر گئی اور بغلیں کھلیں تو فرماتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چاندی کی کوئی شفاف چیز رکھی ہوئی ہو کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔② گردن کے متعلق تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے عاج کی ہو یعنی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ہو، اس قدر صاف اور ستھرا اس کا رنگ تھا۔ تو جس چیز پر نگاہ پڑ جاتی تھی نگاہ ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ بہر حال احادیث میں آپ کا سراپا ذکر کیا گیا ہے اور شمائل پر مستقل کتابیں لکھی گئیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُخِ زیبا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قد و قامت اور سراپا کی تعریف بھی کی گئی ہے امام ترمذیؒ نے ایک مستقل کتاب شمائل ترمذی کے نام سے لکھی ہے، اس میں وہی احادیث ذکر کی گئی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال کا اور حسن کا ذکر ہے، جو مستقل روایتوں کا ذخیرہ ہے۔

سیرت کی حقیقت اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... تو بہر حال ۱۲ ربیع الاول کو ایک ذاتِ مقدس کو اللہ نے نمایاں کیا کہ اس سے زیادہ حسین و جمیل نہ پہلے عالم میں پیدا ہوئی تھی نہ بعد میں پیدا ہوگی، ایک کامل نقشہ انسانیت کا ایسا پیش کیا گیا کہ اس سے زیادہ حسین و جمیل نقشہ دوسرا نہیں ہے اور یہ تو قاعدہ کی بات ہے کہ جیسا سانچہ ہوتا ہے ویسی ہی اس میں چیز ڈھلی ہوتی ہے، سانچہ مکمل ہے تو جو چیز ڈھلے گی وہ بھی مکمل ہوگی۔ سانچہ اگر بے

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبر وبيانه، ص: ٦٩٣ رقم: ٢٦٥.

② الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب رفع اليدين في الدعاء، ص: ٤٨١ رقم: ٢٠٧٤.

پینڈ کا ہے تو جو اس میں ڈھالو گے وہ بھی بے پینڈ کا ہوگا تو جب سراپا، قد وقامت اور نقشہ وقالب مکمل تھا تو حقیقت بھی تو اتنی ہی مکمل آنی چاہئے تھی، اس لئے جیسے جمال بے نظیر تھا، ویسے ہی کمال جو اس میں بھرا ہوا تھا، وہ بھی بے نظیر تھا، اس کمال ہی کا نام سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اسی کمال سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائل پیدا ہوئے، تو ایک ہے شمائل، شمائل کہتے ہیں ظاہری اوصاف کو، اور خصائل کہتے ہیں باطنی خصلتوں کو، یعنی اخلاق کو، عادات کو، کمالات کو۔ تو جب شمائل اعلیٰ ہوں گے تو خصائل بھی اعلیٰ ہوں گے۔ نقشہ بے نظیر تھا، تو جو چیز ڈھلی ہوئی تھی وہ بھی بے نظیر تھی، جیسے صورت اعلیٰ تھی ویسے ہی سیرت بھی اعلیٰ تھی۔ اس واسطے میں نے عرض کیا صورت خود مقصود نہیں ہوتی، صورت سیرت کے دکھلانے کا آئینہ ہوتی ہے۔ صورت پہچاننے کا ذریعہ ہوتی ہے، کسی شخص کو دیکھ کر جب آپ اس کو پہچان لیتے ہیں تو صورت دیکھ کر ہی اصلیت پہچانتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے یعنی اس کی حقیقت کیسی! اس کی عادات کیسی اور اس کی باتیں کیسی ہیں! تو پہلا ذریعہ پہچاننے کا صورت ہے، تو ذریعۂ تعارف ہے صورت۔ حقیقت میں جو چیز پہچاننے کی ہے وہ صورت کے اندر ڈھلی ہوتی ہے اور اس کا نام سیرت ہے۔ تو صورتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہچاننے کا وسیلہ بنی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ولادتِ جسمانی ذریعہ بنی ولادت روحانی کے پہچاننے کا تاکہ اس ذات کو ظاہر کیا جائے۔ اس ذات سے دنیا کے لئے پھر کمالات نمایاں ہوں تاکہ دنیا ان کمالات پر چل کر خود سعادت حاصل کرے، تو اصل چیز سیرت ٹھہر جاتی ہے۔

سیرتِ مقدسہ اور عصمتِ انبیاء کا جزوِ اوّل...... سیرتِ مقدسہ میں سب سے پہلا جز جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کا آتا ہے وہ عصمت ہے۔ اہل سنت والجماعت اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نبوت ملنے سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں ...... یعنی وہ پہلی زندگی میں بھی گناہ نہیں کر سکتے اور نبوت ملنے کے بعد تو معصومیت نمایاں ہے، پھر تو گناہ کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اگر نبی کی زندگی میں کوئی ادنیٰ گناہ کا بھی تصور ہو تو پھر اس کی زندگی نمونہ نہیں بن سکتی، جو لوگ اس کے مطابق عمل کریں گے احتمال ہوگا کہ یہ چیز غلطی سے کی ہو، یہ چیز ممکن ہے...... گناہ ہو، تو چونکہ امتی کے لئے نبی کی زندگی قول وفعل میں نمونہ بنتی ہے، ہر شخص نبی کے قول وفعل پر عمل کرنے کا پابند ہے، تو یہ جبھی کر سکتے ہیں کہ جب ہر قول وفعل اتنا پاک اور مقدس ہو کہ اس میں نافرمانی کا شائبہ تک نہ ہو، کسی گناہ کا شائبہ نہ ہو، کسی معصیت کا احتمال نہ ہو، اگر نبی کی زندگی میں گناہ اور معصیت کا احتمال ہو گیا تو زندگی بے اعتبار ہو جائے گی۔ پھر وہ نمونہ اور تقلید کے قابل نہیں رہے گی۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ معصوم پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے گناہ نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کے معصوم ہونے کی فطری وجہ...... انبیاء سے گناہ کیوں نہیں ہو سکتا! اسکی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو انبیاء علیہم السلام کی طینت اور مادہ اتنا پاک رکھا جاتا ہے کہ اس کے اندر گناہ کی کھپت نہیں ہوتی۔ حدیث میں نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: کہ انبیاء علیہم السلام پیدا تو کئے جاتے ہیں مٹی سے، لیکن ان کی مٹی میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہوتا ہے۔ ترابِ جنت (جنت کی مٹی) سے ان کا بدن بنایا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب جنت کی مٹی کا عنصر شامل کر دیا گیا اور دنیا کی مٹی معمولی درجہ میں ہے، غالب حصّہ وہ ہے جو جنت کی مٹی ہے تو جنت کی مٹی سے...... پاک مٹی دوسری نہیں ہوسکتی، اِس خاک کے اندر کدورت ہے اور اُس خاک کے اندر طہارت اور پاکیزگی ہے، لطافت اور نورانیت ہے۔ تو گویا انبیاء علیہم السلام جنتی الاصل ہوتے ہیں، ان کی اصل جنت کی ہے، ہماری اصل اس دنیا کی ہے۔ ہم اپنی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ گناہ کی لذتوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام اپنی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ پاکی، طہارت، نیکی اور تقویٰ و تقدّس کی طرف بڑھتے ہیں۔ مثل مشہور ہے "كُلُّ شَيْئٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ" ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے، جو اصلیت ہوتی ہے اس میں وہ ظاہر ہوتی ہے۔ تو انبیاء میں اصلیت جنت کی مٹی ہے اس لئے دنیا میں رہ کر بھی ان کا قلب رجوع رہتا ہے جنت کی طرف، دنیا کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا۔ اپنی اصل کی طرف جاتے ہیں۔ تو جنت کی مٹی چونکہ پاک ہے، اس واسطے نیک طینت ہونے کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے اندر گناہ کا تصور تک نہیں ہوتا۔ جب تصور ہوگا پاکی کا ہوگا، اسی لئے نبی کی طبیعت اتنی پاک بنتی ہے کہ طبیعت کو جب بھی آزاد چھوڑ دیں خیر ہی کی طرف جائے گی، اصلاح ہی کی طرف جائے گی، نیکی ہی کی طرف چلے گی...... کبھی شر کی طرف نہیں جائے گی، نیک عمل ہی کی طرف جائے گی۔ آپ کے عرف میں کہاوت ہے جو آدمی نیک ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "بہت نیک طینت آدمی ہے" یعنی معلوم ہوتا ہے مٹی بہت اچھی ہے کوئی برائی کا کام کرتا ہی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جوہر اگر پاک ہو تو پھر اس سے افعال بھی پاک ہی سرزد ہوں گے۔ اور جوہر میں اگر کدورت ہو تو افعال میں بھی کدورت ہوگی۔ تو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں جنت کی مٹی شامل ہوتی ہے اور غلبہ اسی کا ہوتا ہے اس واسطے ان کی سیرت اتنی پاک ہوتی ہے کہ طبیعت پاک بنتی ہے، نبی کی طبیعت کو جب چھوڑا جائے تو خیر کی طرف ہی چلے گی، بدعملی کی طرف نہیں جائے گی۔ رُخ ہی طبیعت کا یہ ہے تو انبیاء علیہم السلام چونکہ نیک طینت اور پاک طینت ہوتے ہیں اس لئے طبیعت بھی پاک ہوتی ہے۔ اس طبیعت سے جو بھی وہ عمل کریں گے نیک ہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت جو اترتی ہے تو نبی کی طبیعت پر اترتی ہے...... جتنے افعال انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں وہ افعال ہی شریعت بنتے ہیں۔ نبی کا کہا ہوا اور کیا ہوا ہی تو شریعت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہہ دیا وہ نمونہ اور شریعت بن گیا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بات کریں اس طرح تم بات کرو، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوتے تھے...... اس طرح آپ کو سونا چاہیے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا کھاتے تھے...... اس طرح آپ کو کھانا کھانا چاہیے، جس طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنستے تھے آپ کو بھی یوں ہی ہنسنا چاہیے۔ یہ ہنسنا، بولنا، کھانا اور پینا طبیعت ہی کے افعال ہیں اور جب حضور کے یہ سارے افعال نمونہ ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ شریعت نبی کی طبیعت کے اوپر اترتی ہے، جو نبی کہہ دے وہ شریعت، جو کر کے دکھلا دے وہ شریعت، تو جب تک طبیعت اتنی مقدس اور پاک نہ ہو کہ اس میں برائی کا شائبہ نہ ہو تو شریعت کیسے بنے گی؟ اس لئے نبی کی طبیعت پر شریعت اترتی ہے اور نبی کی عقل پر علم اُترتا ہے کہ اس طبیعت سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ شریعت ہو جاتے ہیں اور علم کے بارے میں نبی کے اقوال جو ہوتے ہیں وہ وحی ہوتے ہیں کیونکہ عقل کامل پر وحی آتی ہے تو علم بھی انبیاء علیہم السلام کا کامل، عمل بھی کامل تو...... بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم ہیں: اولاً تو اس لئے کہ طبیعت پاک پیدا کی گئی؟ اس لئے کہ جوہر پاک رکھا گیا، جنت کی پاک مٹی سے انبیاء کے بدن کو بنایا گیا کہ جب بھی وہ چلے گا نیکی کی طرف چلے گا، اولاً تو اس وجہ سے معصومیت آتی ہے کہ گناہ کی طرف نبی کی طبیعت رجوع ہی نہیں ہو سکتی، یہ فطری بات ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السّلام کا دوسرا جزو...... دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اللہ کے جلال اور جمال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان کا قلب ہر وقت اللہ میں منہمک اور اس کی محبت میں غرق ہوتا ہے اور اتنی کامل محبت حاصل ہوتی ہے کہ گویا ہر وقت وہ حق تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کے دربار میں اگر آپ جائیں اور نگاہوں کے سامنے بادشاہ ہو کیا اس وقت آپ کو تصور آئے گا کہ آپ اس بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کریں؟ جب کہ بادشاہ کی عظمت سامنے، اقتدار سامنے اور شاہی تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا ہے تو نافرمانی کرنا تو بجائے خود ہے...... آپ کی یہ بھی جرأت نہ ہوگی کہ نگاہ ادھر ادھر بھی پھیریں۔ ادب کے ساتھ نگاہ نیچی رہے گی۔ بادشاہ سامنے موجود ہے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں تو جب ایک معمولی بادشاہ کے مشاہدہ کا اثر انسان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ نہ بے ادبی کر سکتا ہے اور نہ ہی شاہی دربار میں گستاخی کر سکتا ہے، نہ نافرمانی کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ جس ذات کو ہو اور ہر وقت رہے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی پر آمادہ ہو! کس طرح ممکن ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے یا منشاءِ حق کے خلاف کرے۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام مشاہدہ کے سبب سے بھی معصوم ہوتے ہیں تو ایک معصومیت آتی ہے جوہر (مٹی) کی پاکی کی وجہ سے، دوسری معصومیت آتی ہے مشاہدۂ حق کی وجہ سے کہ اللہ کا جلال و جمال سامنے ہے، ہر وقت اللہ کے سامنے ہیبت زدہ ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں! آپ کو یقین ہے کہ سنکھیا سے موت آتی ہے۔ انسان کبھی جرأت نہیں کر سکے گا کہ سنکھیا کھالے۔ جہالت سے یا لاعلمی سے کھالے تو کھالے، لیکن اگر علم ہے کہ سنکھیا سے موت آتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سنکھیا ہے تو آدمی اس سے دور چلے گا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کا دھواں میرے ناک میں چلا جائے اور میں موت کے قریب ہو جاؤں۔ اس لئے کہ آپ کو علم ہے کہ سنکھیا موت لانے والا ہے حالانکہ آپ نے تجربہ نہیں کیا کہ سنکھیا کھا کے دیکھا ہو اور آدمی کا انتقال ہوا ہو اور انتقال کے بعد دوبارہ پتہ چل گیا ہو، تو تجربہ عملاً نہیں ہے محض دوسروں سے سننے پر یقین ہے۔ تو جب دوسروں کے سننے پر یقین ہو جائے اور آدمی اس پر بھی کھانے کے لئے آگے نہ

بڑھے تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو سنی سنائی نہیں، بلکہ اللہ کے جلال و جمال کا آنکھوں دیکھا یقین ہے اور وہ مشاہدہ کر رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور اپنے بھی یقین کے خلاف کریں!۔

تو دو باتیں ہوئیں ایک یہ کہ طینت (مٹی) پاک ہے اس کی وجہ سے نبی کی طبیعت کبھی شر کی طرف نہیں جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مشاہدۂ حق ان کے سامنے رہتا ہے۔ ہر وقت اللہ کی عظمت، اس کا قہر، اس کا جلال، اس کی رحمت اور اس کی شانِ جلال و جمال آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے، گویا نبی ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ تو شاہی دربار میں رہ کر بادشاہ کی خلاف ورزی اور بادشاہ کی نافرمانی کا تصور نہیں آسکتا، پھر کیسے ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہ کی طرف چل پڑیں!۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا جزوِ سوم...... اور تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ اوّل تو طینت پاک، پھر مشاہدہ حق اور اس کے ساتھ ساتھ حفاظتِ خداوندی بھی شامل ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت بشریت کے تقاضے سے طبیعت مائل بھی ہو جائے تو اللہ کی حفاظت ہوتی ہے کہ نبی گناہ کر نہیں سکتا اور اس کی زندگی پاک رہتی ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ زلیخا نے جب سات کمرے بنوائے اور یوسف علیہ السلام کو اندر بلایا اور تمام کمروں کے تالے لگوا دیئے تو اس کے بعد اپنی بات اور مقصد سامنے رکھا۔ قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ [1] کہ زلیخا نے بھی ارادہ کیا اور یوسف علیہ السلام نے بھی۔ یعنی بتقاضائے بشریت وسوسہ کے درجہ میں ایک چیز دل میں آئی، فرمایا ﴿لَوْلَآ اَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [2] ہوسکتا تھا کہ یوسف مبتلا ہو جائیں یعنی ارادہ کرلیں، عملاً تو نہیں کر سکتے تھے، مگر ارادۃً۔ مگر خدا نے حفاظت کی کہ وسوسہ سے بھی دور رہے۔

یوسف علیہ السلام کی وسوسے سے حفاظت کا طریقہ...... یہ حفاظت کیسے ہوئی؟ حدیث میں ہے ممکن تھا کہ یوسف علیہ السلام کے دل میں خواہش کا وسوسہ پیدا ہو...... لیکن جو چھت کی طرف نگاہ اٹھائی تو یعقوب علیہ السلام کا چہرۂ مبارک چھت پہ نظر پڑا جو دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی یوسف علیہ السلام بھاگے۔ وہاں سات دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ جس دروازے پر پہنچے تالا ٹوٹا گیا، دروازہ کھلا آگے پہنچے...... وہ بھی دروازہ کھلا، آخر ساتوں کمروں سے باہر آگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے انبیاء علیہم السلام کی طینت پاک ہے اور جیسے مشاہدۂ جلال و جمال کی وجہ سے حق تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کر سکتے، اسی طرح حفاظتِ خداوندی بھی شاملِ حال ہوتی ہے کہ اگر بمقتضائے بشریت کوئی بات وسوسہ کے درجہ میں آئے تب بھی وہ عمل نہیں کر سکتے، اللہ ان کو محفوظ رکھتا ہے۔

قبل از نبوت بھی نبی معصوم ہوتا ہے، حضور کا ایک شادی میں شرکت کا واقعہ...... حدیث میں ہے کہ آپ نے خود اپنا واقعہ بلکہ دو واقعے ارشاد فرمائے، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ نبوت سے پہلے بھی نبی معصوم ہوتے

---

[1] پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴. [2] پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴.

ہیں تو حفاظتِ خدا وندی کی مثال دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ میری عمر چودہ سال کی تھی، مکہ میں قریش میں کوئی شادی تھی اور شادی بڑے گھرانے میں تھی، تو ناچنے گانے کا بھی کچھ سامان تھا۔ جب دولت بڑھتی ہے تو اسی قسم کی خرافات لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ مفلسی رہے اور کچھ دولت کم ہو تو سیدھا سادھا شادی بیاہ کا معاملہ ہو جاتا ہے، لیکن دولت بڑھتی ہے تو طغیانی اور سرکشی بھی بڑھتی ہے۔ اگر حق تعالیٰ حفاظت نہ فرماویں اور کسی کے دل میں صلاحیت نہ ہو تو دولت آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ تو وہاں بھی یہ ہوا کہ دولت مند گھرانہ تھا، ہونا تو یہ تھا کہ روٹی کی سوجھتی، سوجھی یہ کہ شادی میں کچھ رنگ ہو، کچھ ناچ ہو، کچھ تعیش ہو اور کچھ کھیل تماشے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ قریش کے ہم عمر نوجوان کچھ لڑکے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا: چلو وہاں شادی ہے اور قریش کی برادری ہے ہم بھی شادی میں چلیں۔ یہ تفصیلات تو آپ کے سامنے نہیں تھیں کہ وہاں ناچ رنگ ہوگا، مگر یہ تھا کہ بہر حال تھوڑی بہت کچھ رنگ رلیاں ہوں گی تو لڑکپن کے زمانے میں اس طرف طبیعت کا میلان ہو جانا کوئی عجب بات نہیں ہے۔ دس بارہ برس کے بچوں نے کہا کہ ہم بھی شادی میں شریک ہوں اور وہاں کھیل تماشے بھی ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ساتھ چلا گیا، کھیل تماشے شروع ہونے کا وقت رات کا تھا، جیسے ہمارے ہاں بھی ان کاموں کے لیے عشاء کے بعد رات کا وقت ہوتا ہے، تو عشاء کے بعد ناچ رنگ تھے تو فرماتے ہیں کہ میں جا کے بیٹھ گیا، ابھی پروگرام شروع نہیں ہوئے تھے کہ مجھ پر اتنی شدید نیند طاری ہوئی کہ بیٹھنا میرے قبضہ میں نہ رہا اور میں سو گیا۔ ساری رات سوتا رہا مجھے خبر نہیں کہ ناچ ہوا یا گانا ہوا اور رنگ رلیاں منائی گئیں یا کیا قصہ ہوا! پوری رات اللہ نے میری حفاظت کی اور جب میں اٹھا ہوں تو سُننے میں آیا کہ بہت باجے گاجے بجے، بہت گانے باجے بجائے گئے، بہت ناچ رنگ ہوئے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لیکن مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ (1) یہ تھی حفاظتِ خداوندی۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ارادے سے بھی نہیں گئے تھے کہ وہاں ناچ رنگ میں شریک ہوں گے مگر یہ ضرور تھا کہ کچھ کھیل تماشہ ہوگا تو بارہ تیرہ برس کی عمر میں کسی کھیل تماشے کے لئے بچہ جائے یہ کوئی بری چیز نہیں ہوتی، اتنا قلب مبارک میں آیا کہ کچھ کھیل تماشہ ہے لیکن کھیل ناجائز قسم کا تھا، اس لئے کہ اس میں باجے تھے۔

مزامیر کی ممانعت اور دف کی اجازت کی توجیہ...... اور حدیث میں مزامیر کی ممانعت فرمائی گئی ہے اگر اجازت دی گئی ہے تو دف کی اجازت ہے، کہ نکاح ہوا اس میں دف بجا دی تو اس میں کچھ تعیش نہیں ہوتا بلکہ کانوں کو اور بھی تکلیف ہوتی ہے راحت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ جبکہ ستار میں یا ہارمونیم میں تعیش اور غفلت کی بات ہوتی ہے، وہ دف کے اندر نہیں ہوتی۔ مگر وہاں مقصود حقیقت میں دف بجانا بھی نہیں وہ تو اعلان مقصود ہوتا ہے کہ نکاح ہو

---

(1) اخبار مكة للفاكهي، ج: ۴، ص: ۳۹۵، رقم: ۱۶۶۱، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: تاریخ الاسلام للامام الذهبیؒ، مقدمة باب ماعصم من امر الجاهلية، ج: ۱ ص: ۱۶۔

دف بجادو تا کہ اعلان ہو جائے تو بہر حال دف اور چیز ہے، باجے گانے اور چیز ہیں کیونکہ شرعاً ممنوع ہیں۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ نے میری حفاظت کی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ باجا بجا ہے یا ناچ گانا ہوا ہے۔ ایک تو یہ واقعہ ہے جس سے واضح ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی جیسے طینت پاک ہے جس کی وجہ سے وہ گناہ نہیں کرتے اور جیسے انہیں مشاہدہ ہوتا ہے؛ اللہ کے جلال و جمال کا جس کی وجہ سے گناہ نہیں کرتے، ویسے ہی اللہ کی حفاظت بھی شامل حال ہوتی ہے۔ اگر کبھی بشری تقاضے سے وسوسہ بھی قلب میں آئے تو اللہ کی حفاظت گناہ ہونے نہیں دیتی اس کی نظیر ایک تو یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

قبل از نبوت بیت اللہ کی تعمیر کا واقعہ...... دوسرا واقعہ پیش آیا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف غالباً ۲۵ برس کی تھی، مکہ مکرمہ میں ایک سیلاب آیا اور مکہ چونکہ نشیب میں ہے، چاروں طرف پہاڑ ہیں، بارشیں تو بہت کم ہوتی ہیں مگر جب زیادہ ہوتی ہیں تو سارا پانی حرم میں آجاتا ہے اور بیت اللہ بالکل بیچ میں ہے گہرائی میں تو سیلاب آیا اور بیت اللہ کے اندر پانی داخل ہو گیا، جس کی وجہ سے دیواروں کے اندر کا چونا بھی نکل گیا، بنیادیں گر گئیں، ایسا ہو گیا گویا پتھر اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے، مصالحہ باقی نہیں رہا، اندیشہ تھا کہ دیواریں گر جائیں۔ قریش نے ارادہ کیا کہ بیت اللہ کی ازسرِ نو تعمیر کریں، اس کے لئے چندہ جمع ہوا مگر اس زمانے کے قریش باوجودیکہ شرک میں مبتلا تھے اور انتہائی بدعملیوں کا شکار تھے، لیکن اللہ کے گھر میں مشتبہ مال لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو ڈکیتی بھی مارتے تھے سود اور سٹہ وغیرہ بھی کرتے تھے، جائز و ناجائز ہر طرح کی کمائی تھی۔ لیکن باوجود اس شرِ نفس کے...... ان میں یہ احساس تھا کہ خدا کا گھر پاک کمائی کا مستحق ہے، اس میں کوئی مشتبہ کمائی نہیں آنی چاہیے۔ تو چندہ لینے دینے میں یہ عہد کیا گیا کہ مال ڈکیتی کا نہ ہو، سود کا نہ ہو اور بیواؤں کا نہ ہو، کمائی وہی ہونی چاہیے جو خالص حلال کے ذریعے ہو جو ہم اپنی تجارت کے ذریعے اور زراعت کے ذریعے کماتے ہیں۔ اس کو لے کر جو چندہ جمع کیا گیا تو وہ اتنا نہیں ہو سکا کہ بیت اللہ کی تعمیر ابراہیمی بنیادوں کے اوپر کی جائے۔ تو اسے گوارا کیا کہ پوری تعمیر نہ ہو حطیم کا حصہ چھوڑ دو، حطیم کو چھوڑ کر پھر بیت اللہ کی تعمیر کرو تو چندہ کافی ہو جائے گا۔ چنانچہ آج بھی وہ حصہ حطیم کا چھوٹا ہوا ہے۔ جو حج کر کے آئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ جو بیت اللہ شریف کے متصل ایک گول دائرہ سا بنا ہوا ہے، جس میں حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ علیہما السلام کی قبریں ہیں، اس کے درمیان اور بیت اللہ کے درمیان میں تقریباً پونے دو گز کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، وہ بھی بیت اللہ کا حصہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جو خود بنا (تعمیر) کی تھی اور تعمیر بنائی تھی اس میں وہ حصہ بھی بیت اللہ کے اندر شامل تھا، لیکن قریش کا چندہ اتنا نہیں ہو سکا کہ پوری بناءِ ابراہیمی پر تعمیر کر دیں، اس لئے اس حصہ کو چھوڑ دیا اور چھوڑ کر خالص کمائی سے بیت اللہ کو تعمیر کر دیا (۱)۔ یہ تو تھی نیک بات کہ پاک کمائی لگنی چاہیے اللہ کے گھر میں مشتبہ کمائی نہ لگے۔

مگر ایک حرکت جہالت کی بھی تھی، آخر تھے تو جہلائے عرب ہی، کوئی اسلام کی روشنی تو آئی ہی نہیں تھی۔ انہوں

نے یہ سوچا کہ بیت اللہ کی ہم تعمیر کریں اور ان کپڑوں میں کریں جن میں رات دن گناہ کرتے ہیں، جن میں رات دن معصیتیں کرتے ہیں، سیاہ کاریاں کرتے ہیں، ان کپڑوں کے اندر کیسے تعمیر کریں! الہٰذا ننگے ہوکر تعمیر کرو تا کہ بالکل پاکی کے ساتھ تعمیر ہو۔ یہ جہالت کا شوشہ تھا، اس واسطے کہ بالکل ننگا ہونا تو بے حیائی کی بات تھی۔ تو اگر لباس میں کوئی ناپاک حرکت کی تھی کہ کوئی گناہ کیا ہے تو ننگا ہونا بھی تو گناہ میں شامل ہے۔ تو ایک گناہ سے بچے تو دوسرے گناہ کی طرف آ گئے۔ بقول شخصے کہ ''کنوئیں میں سے نکلے تو کھائی میں جا گرے'' انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم جو گناہ کرتے ہیں تو ان کپڑوں میں تھوڑا ہی کرتے ہیں، اس بدن میں کرتے ہیں تو پھر کھال کو بھی کھینچ دینا چاہیے کہ اس کھال سے کیسے بیت اللہ کی ہم تعمیر کریں اور اس بدن سے کیسے کریں جس میں ہم گناہ کرتے ہیں۔ آخر کپڑوں نے بے چاروں نے کیا قصور کیا تھا کہ بدن تو گناہ کر کے پاک کا پاک اور کپڑے ہو گئے ناپاک! اس میں ہم نے چوری کی تھی اور ڈکیتی ڈالی تھی! بھئی کپڑے کا کیا قصور؟ قصور تو تمہاری کھال کا اور تمہارے گوشت پوست کا ہے، اُسے کھینچتے اور اُسے بدلتے...... مگر یہ جہالت کی کہ بولے: ننگے ہو جاؤ، اس لئے کہ کپڑوں نے گناہ کیا ہے تو کپڑوں کو پھینک دو۔

حضور کی حفاظت کا واقعہ...... چنانچہ برہنہ ہو کر تعمیر شروع کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں آیا تو قریش نے کہا: اے محمد! تم بھی شریک ہو جاؤ تعمیر میں، یہ مقدس کام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ مگر قریش نے کہا: دیکھو ننگے ہو جاؤ، برہنہ ہو جاؤ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا۔ شریعت تو نہیں اتری تھی کہ یہ مسئلہ معلوم ہوتا کہ ستر کہاں تک ہے، کتنے بدن کو چھپانا واجب ہے اور کتنے کو نہیں؟ مگر نبی کی طبیعت میں ہی، فطرت میں ہی پاکی ہوتی ہے، سلامتی ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ میں برہنہ ہو جاؤں۔ مگر قریش نے زور دیا کہ نہیں! جب تمہارے سارے عزیز بلکہ بزرگ لوگ بھی سب برہنہ ہو کر تعمیر میں لگے ہوئے ہیں! تمہاری عمر تو ابھی چھوٹی ہے، ابھی تم لڑکپن میں ہو، اپنے بزرگوں کی تعمیل کرو۔ فرماتے تھے میں نے کچھ ارادہ بھی کیا کہ جب یہ سب اس طرح ہیں تو میں بھی برہنہ ہو کر تعمیر کروں، میں اس ارادے اور خیال ہی میں تھا اور گویا میں نے ابھی لنگی پر ہاتھ ڈالا ہی تھا تو اچانک مجھ پر اس زور کی غشی طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر گیا، جیسے کوئی پٹخ دیتا ہے زمین کے اوپر اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا! افاقہ اس وقت ہوا جب تعمیر مکمل ہو چکی تھی، لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ الغرض حق تعالیٰ نے مجھے برہنہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ ① تو برہنگی فی الحقیقت ایک معصیت کی شان ہے، ستر کا کھل جانا معصیت کی شان ہے۔ اسلام میں مرد کا ستر رکھا گیا ہے ناف سے لے کر گھٹنوں تک۔ اس حصّہ بدن کو چھپانا واجب ہے، نماز کے اندر اس حصّہ میں سے کوئی حصّہ کھل جائے گا تو نماز نہیں ہوگی، چاہے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو نماز نہ ہوگی، اس لئے کہ یہ حصۂ بدن واجب الستر ہے۔ عورت کا ستر گردن سے ٹخنوں تک ہے اس حصہ بدن سے کوئی حصہ اگر کھل جائے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔

① تاریخ الاسلام للامام الذهبی ،مقدمة، باب ماعصم من امر الجاهلية، ج: ۱ ص: ۱۰۶.

تہذیبِ مغرب کی تباہ کاریاں...... آج کل تو ہماری بہنیں جو لباس پہنتی ہیں...... بازو ہیں تو وہ الگ کھلے ہوئے، گلے الگ کھلے ہوئے، سینے کا حصہ الگ کھلا ہوا تو ایسے لباس میں نماز مطلقاً نہیں ہوتی (بشرطیکہ ہماری بہنیں نماز پڑھیں اور جو نماز کے قریب ہی نہ جائیں تو......؟) ان کی آرائش زیبائش ممکن ہے ہو جائے، لیکن اللہ کے ہاں کوئی تقریب یا قرب وطاعت اس میں نہیں ہوتی...... جب کہ یہ حصۂ بدن کھل جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: بہت سی عورتیں زمانے میں پیدا ہوں گی جو کَاسِیَاتٌ ہوں گی عَارِیَاتٌ ہوں گی، لباس پہنے ہوئے ہوں گی اور پھر بھی ننگی ہوں گی، لباس ہوگا بدن پر اور پھر بھی برہنہ ہوں گی، مَائِلَاتٌ مُمِیْلَاتٌ خود بھی مائل ہوں گی اجنبی مردوں پر اور ان کو بھی مائل کریں گی اپنے اوپر، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ عورتیں جنت میں داخل نہیں کی جائیں گی۔ ① اس لئے کہ انہوں نے فتنے کا دروازہ کھول دیا، دنیا کو جہنم میں دھکیلنے کا انہوں نے ارادہ کر لیا تو دو لفظ فرمائے گئے کاسیات عاریات لباس پہن کر پھر بھی ننگی ہوں گی۔ اس کی تین صورتیں ہیں کہ لباس پہنے ہوئے بھی ہوں پھر بھی ننگی ہوں۔

برہنگی کی تین صورتیں اور مادر زاد برہنگی کا فیشن...... پہلی صورت تو یہ ہے کہ لباس ہی نہ ہو؛ یعنی بالکل عریانی ہو، یہ بھی آج کل فیشن چلا ہے۔ یہاں مشرق میں تو نہیں آیا مگر یورپ میں اور جرمنی وغیرہ میں یہ فیشن آیا تھا اب معلوم نہیں باقی ہے یا نہیں۔ لیکن میں آج سے تیس برس قبل کی بات کر رہا ہوں کہ ایک مستقل احاطہ بنوایا گیا تھا جس کا نام "ایوانِ فطرت" رکھا گیا، اس میں وہ لوگ داخل ہو سکتے تھے جو بالکل برہنہ ہوتے تھے۔ کوئی لباس ان پر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ننگے رہو، فطرتاً پیدا بھی ننگے ہوئے تو اب کیوں کپڑے پہنتے ہو؟ وہاں کی گورنمنٹ نے یہ انتظام کیا کہ ان کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ یہ عنایت کی گورنمنٹ نے کہ ان کے لئے احاطہ بنوا دیا، جو وہاں داخل ہوتا تھا ان پر پابندی ہوتی تھی کہ لباس سے داخل نہ ہوگا تو وہاں تو کَاسِیَاتٌ کا کوئی سوال ہی نہیں کہ کس پر لباس ہوگا! وہاں تو عَارِیَاتٌ ہی عَارِیَاتٌ ہیں، عریانی ہی عریانی ہے۔

لیکن حدیث جو بیان کر رہی ہے وہ: کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ ہیں کہ لباس پہنے ہوئے اور پھر بھی ننگی۔ اس کی تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ لباس ناقص اور نا تمام ہو، یعنی لباس پہنا ہے مگر بازو کھلے ہوئے ہیں، لباس پہنے ہوئے ہے مگر سینہ کھلا ہوا ہے، لباس پہنے ہوئے ہے مگر کمر کھلی ہوئی ہے، لباس پہنے ہوئے ہے مگر پنڈلی کھلی ہوئی ہے، تو کَاسِیَاتٌ بھی کہا جائے گا کہ لباس پہنے ہوئے ہے مگر پھر بھی ننگی ہیں، اس لئے کہ ستر کھل گیا تو عَارِیَاتٌ بھی کہا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لباس پہنے ہوئے ہو وہ گردن سے لے کر ٹخنوں تک پورا ہو، مگر وہ اتنا باریک ہو کہ لباس سے سارا بدن نظر آ رہا ہو، کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں، لباس پہنے ہوئے ہیں مگر پھر بھی برہنگی اور

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب النار یدخلها الجبارون والجنة ... ج:۴ ص:۱۲۹۱.

عریانی ہے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس بدن پر ہے اور پورے بدن پر ہے اور وہ باریک بھی نہیں ہے، موٹا لباس ہے مگر اتنا چُست ہے بدن کے اوپر کہ بدن کی حیثیت پوری نمایاں ہے، جیسے آج کل کے بعض مہمل پائجامے دیکھے گئے ہیں جنہیں عورتیں پہنتی ہیں، یہاں سے لے کر وہاں تک بالکل بدن کے اوپر لپٹے ہوئے ہیں، جیسے کہ پونچھڑے کے اوپر کپڑا لپیٹ دیا گیا ہے۔ خدا جانے اس طریقہ میں کیا حسن و جمال ہے؟ جب لباس میں عریانی آ گئی تو سارے بدن پر چھا گئی...... سوچنے کی ضرورت ہی نہیں کرتے کہ اصلیت اور اپنی ذات کے لحاظ سے یہ کام بھلا ہے یا بُرا ہے، اک فیشن ہے بس چلنا چاہیے۔ دین کے بارے میں کوئی تقلید کر لے تو طعن کرتے ہیں کہ یہ تقلید کر رہا ہے بے شعوری سے عمل کر رہا ہے اور دنیا کے بارے میں رات دن تقلید ہے کہ ایک صدا امریکہ سے یا برطانیہ سے چلی...... آنکھ بند کر کے لوگوں نے اس کے اوپر عمل کیا تو کون سی اس میں تحقیق کرتے ہیں؟ کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نقصان ہے! کچھ نہیں بس فیشن چلنا چاہیے، تو یہی لباس چل پڑا کہ یہاں سے لے کر وہاں تک ٹانگوں سے رانوں تک پاجامہ لپٹا ہوا ہو تو اگرچہ کپڑا تو موٹا ہے مگر بدن کی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ غرض تین صورتیں ہوئیں کہ باوجود لباس کے پھر ننگا پن نمایاں ہو یا تو لباس ناتمام ہو کہ اس سے کچھ بدن ڈھکا ہوا تھا کچھ کھلا، یا لباس پورے بدن پر ہے مگر نہایت باریک کہ جس سے بدن جھلک رہا ہو، یا لباس پورے بدن پر ہے موٹا بھی ہے مگر چست اتنا ہے کہ بدن کی حیثیت نمایاں ہے۔ یہ سب کَاسِیَاتٌ اور عَارِیَاتٌ کے حکم میں ہیں۔ تو عورتوں کا لباس ایسا ہونا چاہئے کہ بدن نہ جھلکے، اگر باریک ہو تو کم از کم نیچے کوئی ایسا کپڑا ہو کہ جس سے بدن چھپ جائے یا اوپر ہی کوئی باریک کپڑا پہن لے اور اتنا چست بھی نہ ہونا چاہیے کہ بدن کی پوری حیثیت نمایاں ہو بلکہ ایسا کچھ فراخ ضرور ہو کہ بدن کی حیثیت بھی نمایاں نہ ہو اور بدن ڈھلکے بھی ناں۔

ستر اور حجاب میں فرق...... وجہ اس کی یہ ہے کہ عریانی سے شریعت نے روکا ہے ایک حصّہ بدن کھولنے کی اجازت دی ہے اور ایک حصّہ کی...... کسی حالت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ جس حصہ کو کھولنے کی اجازت دی ہے اور اس کے کھلے ہونے کی حالت میں نماز ہو جاتی ہے، وہ چہرہ ہے اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ نماز میں ہاتھ پیر ڈھانپنا عورت پر ضروری نہیں ہے یہ حصے کھلے رہیں تو نماز ہو جائے گی لیکن گردن سے لے کر ٹخنوں تک کا کوئی حصّہ نہیں کھلنا چاہیے، یہ ستر کا حصّہ ہے۔ جیسے مرد میں ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصّہ ستر ہے جو نہیں کھلنا چاہیے۔ اب آگے جو عورت کے لئے پردہ ہے وہ حجاب کہلاتا ہے وہ ستر میں داخل نہیں ہے، کوئی اجنبی آ گیا تو نقاب ڈال لیا ورنہ ضروری نہیں ہے یا اجنبی دور اور بعید ہے کہ پہچان ممکن نہ ہو تو بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے تو حجاب کا تعلق دوسروں سے ہے اور ستر کا تعلق اپنی ذات سے ہے، حجاب جب ہوگا جب کوئی اجنبی دیکھنے والا ہوگا اور ستر ہر صورت میں ہوگا کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو ہر صورت میں حصّہ ستر چھپانا ضروری ہوگا۔ نماز میں یہ حصہ کھل جائے گا تو نماز نہیں ہوگی۔

بہر حال عریانی اور ننگے پن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو جس شریعت میں عریانی کو برا کہا گیا اس شریعت

کے لانے والے پیغمبر کیسے عریاں ہو سکتے تھے! کیسے بدن کو ننگا کرتے! تو آپ کی فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ برہنہ نہ ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے ارادہ نہیں کیا، محض کچھ وسوسے کے درجے میں ایک چیز قلب میں آئی تو حفاظتِ خداوندی شامل ہوگئی اور پھر اس طرح سے میں گرا ہوں کہ جیسے کسی نے پٹخ دیا ہو۔ یہ تھی حفاظتِ خداوندی۔

انبیاء میں عصمت جبری نہیں بلکہ ارادی ہے...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی سیرت میں بنیادی چیز عصمت اور معصومیت ہے یعنی گناہ سے پاکیزگی، تو نبوت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام گناہ نہیں کرتے اور نبوت کے بعد بھی۔ اور گناہ نہ کر سکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حق تعالیٰ مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ نہ کر سکیں اور معاذ اللہ انبیاء میں کوئی ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ کمال تو یہ ہے کہ انبیاء اپنے ارادے سے بچیں، یہ کمال ہے، مجبور ہو کر بچنا یہ کمال میں شامل نہیں ہے۔ تو اس کی صورت میں نے عرض کی کہ انبیاء اپنے ارادے سے ہی معصیت سے بچتے ہیں مگر معصیت کا ارادہ کر نہیں سکتے کیونکہ ان کے جوہروں میں معصیت کی طلب نہیں ہے جب مٹی پاک رکھ دی تو برائی کی طلب کہاں سے پیدا ہوگی؟ اور اس کے ساتھ ساتھ جب انہیں اللہ کی ذات وصفات کا مشاہدہ ہے گویا ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر ہیں تو پھر برائی کا ارادہ کرنے کی ہمت کیسے ہوگی! معصیت کا ارادہ کیسے کر سکتے ہیں! اور تیسری چیز کہ اگر بتقاضائے بشریت بھی وسوسے کے درجے میں کوئی بات دل میں آئے تو حفاظتِ خداوندی انہیں گناہ کرنے نہیں دیتی، اس لئے ان کی زندگی معصوم اور پاک رہتی ہے۔

حضور کی حفاظت خداوندی کا ایک اور واقعہ...... حدیث میں ہے کہ جب آپ کے اوپر وحی آئی تو وحی آنے کے کچھ عرصہ بعد وحی کا انقطاع ہوگیا۔ اسے ''فترت کا زمانہ'' کہتے ہیں کہ وحی منقطع ہوگئی اور چند دن وحی آنا بالکل بند ہوگئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر ایک انقباض اور قبض طاری ہوا اور طبیعت اس درجہ بے چین رہتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھتے تھے کہ اب زندگی بے کار ہے۔ جب وہ جلال و جمال سامنے آکر چھپ گیا تو اب زندگی بے کار ہے، اس کے بغیر زندگی کوئی چیز نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خودکشی کا ارادہ کیا کہ بس میں اپنے آپ کو ختم کرلوں۔ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ میں چلا تا کہ پہاڑ سے اپنے کو گرالوں، تو چلنے کے وقت ہی اچانک آواز آئی: ''یا محمد!'' دیکھتا ہوں تو کہنے والا نظر نہیں آتا، ادھر آواز نے متوجہ کیا اور میں اس فعل (خودکشی) سے رُک گیا۔ بعد میں پھر ارادہ کیا کہ اپنے کو گرادوں یہ بھی کیا زندگی ہے! نہ وہ مشاہدہ، نہ وہ جمال اور نہ وہ تجلیات، سامنے کچھ بھی تو نہیں، کیا فائدہ اس زندگی کا! پھر ارادہ کیا کہ اپنے آپ کو گرادوں۔ پھر آواز آئی اور کسی نے بازو تھام لیا کہ کیا کرتے ہو؟ پھر میں رک گیا مگر نظر کوئی نہیں آیا۔ اس کے بعد ایک دن پھر ارادہ کیا کہ اپنے کو ختم کرلوں...... تو حضرت جبریل علیہ السلام کی صورت ظاہر ہوئی

اوراصلی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا۔ (۱)

معصیت کوذریعۂ تبلیغ بنانااصولِ تبلیغ کے خِلاف ہے...... یہی ہے وہ حفاظتِ خداوندی، خودکشی چونکہ اس دین کے اندرناجائزاورممنوع تھی اور بعد میں پیغمبر ہی ارشادفرمانے والے ہوئے کہ خودکشی حرام ہے، توپہلے کیسے اس کاارتکاب کرسکتے تھے! یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی داعی، کوئی واعظ اور کوئی نصیحت کرنے والاکوئی نیکی کراناچاہے مگر یوں سمجھے کہ نیکی کا کام تب ہی کراسکوں گا جب اتنی کچھ برائی کرالی جائے گی، کیونکہ لوگ بغیر برائی کے جمع نہیں ہونگے، جیسے باجے گاجے اور ہارمونیم سے لوگوں کومناسبت ہے تو کچھ باجے گاجے اور ہارمونیم رکھ لیں کہ اس حیلے سے لوگ جمع ہوجائیں گے پھرمیں وعظ سناؤں گا تو معصیت کوتبلیغ کاذریعہ بنانایہ تونہایت ہی مضرچیز ہےاس لئے کہ آپ جب ایک دفعہ باجابجاچکےاورلوگوں کوجمع کرلیااوراب جولوگوں کومنع کیاتووہ کہیں گے جناب آپ نے کیوں بجایاتھا؟ توکسی ایسی معصیت کونیکی کاذریعہ بناناجوناجائزاورممنوع ہے...... یہ تبلیغ کی حکمت کے خلاف ہے۔ یہ تو اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لینے والی بات ہے۔ آج دین کے کسی مسئلہ میں تساہل کیااورڈھیل دے دی، کل کواگرکوئی فتوی پوچھے گاتویہ جواب دینے کاہمارامنہ نہیں ہوگا کہ یہ ناجائز ہے، وہ تو کہیں گے یہ چیزکل آپ نے بھی کی تھی، اب آپ کہتے پھریں کہ کل یہ مصلحت تھی تواس کاکچھ فائدہ نہیں۔ مسئلہ کے مقابلہ میں مصلحت کوئی چیزنہیں ہوتی۔ سیدھاسادھا مسئلہ ہےاس پرعمل کیاجائے، کاہے کی مصلحت! مصلحت یہی کہ اللہ نے یہ حکم دیاہےاس پرعمل کرواوربس۔

توجناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ آئندہ حکم دینے والے تھے کہ ناچ گانا ممنوع ہے، خودکشی کرنا حرام ہے تو خودکبھی بھی اس کاارتکاب نہیں فرماسکتے تھے۔ وسوسے کے درجہ میں ایک بات آئی بلکہ وہ بھی خیالِ گذراں کے طورپر...... توفوراً حفاظتِ خداوندی شاملِ حال ہوگئی۔ اپنے نبی کوایسی چیزوں سے بچایاکہ کل نصیحت کرنے کامنہ رہے۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، کوئی گناہ صغیرہ اورکبیرہ نہیں کرسکتے اگرادنیٰ درجہ کا بھی گناہ سرزدہوجاتاتودوسروں کونصیحت کرنے کامنہ نہ رہتالوگ کہتے کہ آپ کی پہلی زندگی تو یہ ہے ساری رنگ رلیاں آپ مناچکے ہیں پھرآخرہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں؟ ہم کوبھی تھوڑابہت گناہ کرنے دیجیے ہم بھی کل کوبچ جائیں گے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچ گئے۔ یہ تہمت تھی اوراسی تہمت سے بچانے کے لئے اللہ نے اپنے انبیاءکواتنامقدس پیداکیاکہ نبوت سے قبل بھی ان سے گناہ سرزدنہیں ہونے دیااوربعدازنبوت بھی۔ توانبیاءعلیہم السلام کی زندگی کاسب سے بنیادی پتھراورپہلی اینٹ عصمت اورمعصومیت ہے جس سے انکی زندگی مقدس بن جاتی ہے، اس کے بعدوہ اب جوکام کریں گے وہ اسوۂ حسنہ ہوگا، نمونہ ہوگااورامت کوحکم کیاجائے گاکہ تم بھی اس کے اوپرچلو۔ اس لئے نبی کی زندگی میں معصیت کاکوئی شائبہ نہیں ہوتا، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کاگناہ نہیں ہوتا۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میلادِمبارک کی بنیادی چیزدرحقیقت عصمت ہے جوولادت سے شروع

(۱) السمط الثمین فی فضائل امهات المؤمنین، باب فضائل خدیجة رضی اللہ عنها، ص: ۵۳.

ہوتی ہے، چالیس برس جو نبوت سے قبل کے ہیں وہ بھی معصومیت کے ہیں اور ۲۳ برس جو بعد کے ہیں وہ بھی معصومیت کے ہیں۔ اس طرح سے ۶۳ سال کے اس طویل عرصہ میں ادنیٰ درجہ کی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس پر انگلی رکھی جاسکے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غیر مُسلموں کی شہادت، ایک واقعہ ...... یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اپنے بلکہ غیر مسلم بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جو تاریخ دان انصاف سے غور کرتے ہیں اور نبوتوں کی زندگی سے من جملہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں، انہوں نے شہادتیں دی ہیں کہ دنیا میں ایسا کامل و مکمل انسان جس کی زندگی پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

لکھنؤ میں آج سے چند برس پہلے کا واقعہ ہے ایک جلسۂ سیرت ہوا۔ ''فردوسِ ادب'' ایک بڑی انجمن ہے وہ ہر سال لکھنؤ میں جلسہ کرتی ہے، سیرتِ طیبہ سننے کے لئے بڑا اجتماع ہوتا ہے، کوئی پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ آدمی جمع ہوتے ہیں، جہاں تک نگاہ جاتی ہے آدمی آدمی نظر آتے ہیں، اکثر مجھے بلاتے رہتے ہیں، مگر فرصت نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ میری شرکت ہوئی۔ آدمیوں کا سمندر معلوم ہوتا تھا۔ تو انہوں نے ''کے ایم منشی'' جو کہ یوپی گورنمنٹ کے گورنر تھے اور ہیں یہ ہندو...... ان کو بھی دعوت دی اور صدارت بھی انہیں کی رکھی۔ ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی، شرکت کی دعوت دینا تو ٹھیک ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات سنیں۔ لیکن ایک مقدس جلسہ کی صدارت یا اس میں ایسی توقیر کسی مقدس ہستی کیلئے ہونی چاہیے غیر مسلم کے لئے موزوں نہیں، کسی مسلم یا نیک کی ہی ایسی توقیر ہونی چاہیے، اس میں اس شخصیت کی طرف میلان اور جھکاؤ بھی ہوتا ہے، چنانچہ اگر توقیر بھی کی جائے تو مسلم ہی کی کی جائے، اس لئے کہ جلسہ کا مقصد اسلام پیش کرنا ہے تو اسلام (والے) ہی کی عظمت نمایاں ہونی چاہیے۔ پیش کر رہے ہوں آپ اسلام اور تعظیم...... نمایاں ہو غیر اسلام یا غیر مسلم کی! یہ اصول کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ ہاں سیرت کے جلسوں میں شرکت کی دعوت سب کو دی جائے، تاکہ غیر مسلم پیغمبر کے حالات کو سنیں اور دین کی طرف ان کی توجہ ہو۔ الغرض انہوں نے دعوت دی...... مگر کے ایم منشی نے معذرت کی اور کہا مجھے کام زیادہ ہے فرصت نہیں ہے کہ میں آسکوں اور مزید کہا کہ باوجود یکہ میرے دل کا تقاضا ہے کہ اس مقدس جلسے میں شریک ہوں مگر کام اتنا پڑا ہوا ہے کہ مجھے کان کھجانے کی فرصت نہیں ہے، ہاں میں اپنا پیغام لکھ کر بھیج دیتا ہوں جو میری طرف سے شریک ہونے والا میرے پیغام کو پڑھ کر سنا دے گا۔ پچیس تیس ہزار کے مجمع میں وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا یوپی کا گورنر تھا اور مذہبا ہندوؤں میں سے تھا۔ اس کے پیغام کے دو جز تھے پہلا جز تو یہ تھا کہ:

ہم تاریخی اعتبار سے اس بات کا یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ دنیا میں اتنا کامل اور مکمل انسان کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ان کی زندگی پر کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ حصہ کمزوری کا ہے۔ جس پہلو کو دیکھو مقدس اور کامل ہے؛ گھریلو زندگی کو دیکھو تو اعلیٰ درجہ کی مقدس، جماعتی زندگی کو دیکھو تو ہر برائی سے

مبرّا اور منزہ، اجتماعی زندگی کو دیکھو تو خیر و برکت کی زندگی، تنہائی کی زندگی کو دیکھو تو خیر و برکت کی زندگی۔ غرض اجتماعی و انفرادی، سونے کی، جاگنے کی، ہنسنے کی، بولنے کی اور ہر پہلو کی زندگی بے مثال ہے۔ کوئی پہلو زندگی کا ایسا نہیں ہے جس میں ادنیٰ درجے میں کوئی طعنہ دیا جا سکے یا ادنیٰ درجے میں کوئی اعتراض کیا جا سکے۔ اور بعض لوگ جو پھر بھی اعتراض کرتے ہیں تو ایسے لوگ اعتراض کرنے کو تو خدا پر بھی کر دیتے ہیں۔ دہریئے تو خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے تو اس بد طینتی کا تو کوئی علاج نہیں۔ لیکن انسان جب اپنی انسانیت کے ساتھ غور کرے اور عقل سے سوچے اور تاریخ کو سامنے رکھے تو وہ لازماً اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی کامل اور مکمل ہستی ہیں کہ کہیں ادنیٰ درجہ کے طعن و ملامت کی گنجائش نہیں، یہ تو پہلا جز تھا۔ اور دوسرا جز پیغام کا یہ تھا کہ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلام کے اصولوں پر بنایا ہے اسلام کے اصولوں کو سامنے رکھ کر بنایا ہے جس نے آپس کی اونچ نیچ ختم کر دی، چھوت چھات ختم کر دی، نسلی امتیازات ختم کر دیے، رنگ و روپ کا کوئی فرق نہیں رکھا، ملک والوں کے سب کے حقوق برابر ہیں، راستہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے ترقی کرے، جس کا جی چاہے آگے بڑھے، اب کوئی خود کسی کے آڑے آ گیا وہ بات الگ ہے یا تعصبات کیوجہ سے کوئی کسی کا راستہ روک دے وہ انفرادی دوڑ ہے، وہ اشخاص کی بد طینتی ہوگی اور قانون کا نقصان نہیں کہلائے گا۔

اسلام ابدی اور عالمگیر قانون ہے...... دوسرا جز انہوں نے یہ لکھا کہ ہم فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملک کا قانون اسلام کو سامنے رکھ کر بنایا ہے، گویا مسلمانوں کے لئے بڑی عبرت کا موقع ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے قانون بنانے میں اگر بنیاد ہاتھ لگی تو اسلام ہی کی بنیاد ہاتھ لگی۔ اس زمانے میں انصاف دینے والا اگر کوئی قانون ہے تو وہ اسلامی قانون ہے اور دوسرے قوانین اس دور میں نہیں چل سکتے، نجات اسی قانون کے اندر منحصر ہے وہی سامنے آئے گا تو نجات ہوگی۔ آج اگر ہم چھوت برتنے لگیں تو دنیا تو بین الاقوامی ہوگئی ہے کہیں ہوائی جہازوں کا سفر، کہیں ریلوں کا سفر...... وہاں آپ چھوت چھات کریں گے، دوسرے کے سائے سے بھی بچیں گے تو سوال یہ ہے کہ آپ جہاز میں تشریف کیسے لائے؟ دوسرے ملک میں کیسے جا رہے ہیں؟ وہاں تو لوگوں کے سائے ملیں گے تو اگر بعض اقوام کا سایہ بھی ناپاک ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیا تھی؟ تو دنیا بین الاقوامی ہوگئی اور انٹرنیشنل ہوگئی ہے آج اس کے اندر چھوت چھات چل سکتی ہے اور نہ نسلی امتیازات چل سکتے ہیں، جو چلانے والے ہیں وہ بالآخر ندامت کے ساتھ اسلام کی طرف رجوع کریں گے، آج کی دنیا میں وہ لوگ چل نہیں سکتے، انہیں دنیا ہی کے ساتھ چلنا پڑے گا۔

ہندوؤں کے ہاں چھوت چھات کی بیماری...... میں کہتا ہوں کہ ہندوؤں کے مذہب میں بنیادی چیز چھوت چھات تھی، ان کے ہاں برہمن پر غیر برہمن کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیے ورنہ ناپاک ہو جائے گا، برہمن غیر برہمن کے ہاتھ کا کھا نہیں سکتا، غیر برہمن کا کھانے کو ہاتھ لگ جائے تو برہمن کے لئے وہ نجس ہو گیا، لہٰذا وہ دور سے کھانا

دے گا کہ سایہ بھی نہ پڑے، ہندو غیر ہندو میں فرق، غیر ہندو کا سایہ پڑ جائے تو چیز ناپاک ہوگئی، وہ دور سے کھانا دیں گے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ یہ چھوت چھات ہے جس کے چھوڑنے پر آج دنیا مجبور ہے اور وہی لوگ ناکام ہوئے جو بنیادی طور پر اس مذہب کے حامل تھے۔ خود گاندھی جی جن کے ہاں بھنگی نجس العین کا درجہ رکھتا ہے تو خود انہوں نے بھنگی بستی میں قیام کیا تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ اب بھنگی غیر بھنگی کا فرق نہیں چل سکتا۔ اب تو دنیا میں رائے شماری اور فرد شماری ہے۔ ہر عاقل بالغ ملک کے اندر ایک درجہ رکھتا ہے، وہاں اونچ نیچ یا امتیازات کی کوئی کھپت نہیں ہے، ہمارے ہاں یوپی کے وزیر اعظم تھے گورنر گملا پنڈت۔ ان کا یوپی کا دورہ ہوا، ہمارے دیوبند کے قریب ایک گاؤں رن کھنڈی ہے، دورے میں وہ گاؤں بھی شامل تھا تو ان کا پروگرام چھپا۔ پروگرام یہ تھا کہ رن کھنڈی میں آ کے مندر کے ایک چمار کے گھر میں ٹھہریں گے اور اس کے گلاس میں دودھ پئیں گے تاکہ یہ بتلا سکیں کہ آج نسلی امتیازات ختم ہو چکے ہیں، آج وہ چلنے والے نہیں ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں صدیق وفاروق کی عظمت...... انگریز کے دور میں جب ابتداء میں کانگریس گورنمنٹ قائم ہوئی جو کہ عارضی تھی لیکن بعد میں پھر مستقل ہوگئی، اس وقت گاندھی جی نے ایک مضمون لکھا تھا جو انڈیا کے اخبارات میں چھپا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر ہمارے ہندوستانی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں اور ہمارے منسٹرز عالمگیر عظمت چاہتے ہیں تو انہیں صدیق وفاروق کا نمونہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ روم اور شام کی حکومتیں ان کے قدموں میں گریں۔ لیکن ان کے پیوند لگے کپڑے چھوٹے اور نہ جو کی روٹی چھوٹی، نہ فقر وفاقہ چھوٹا اور نہ ان کے زہد وقناعت میں کوئی فرق آیا تو اگر ہمارے کانگریسی منسٹرز چاہتے ہیں کہ دنیا میں وقار حاصل کریں تو صدیق وفاروق کا نمونہ اختیار کریں تو...... کتنی عبرت کی چیز ہے کہ آج غیر مسلموں کو بجز مسلمانوں کی زندگی کے اور کوئی نمونہ نہیں ملتا، نمونہ ملا تو وہی صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما۔ اپنی قوم میں انہیں کوئی ایسا نمونہ نظر نہیں پڑا کہ وہ قوم کو نصیحت کرتے کہ فلاں کی زندگی پر چلو۔ انہیں مستند طور پر کسی اور قوم میں بھی کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں پڑی جو تاریخی طور پر سامنے آئے اور ان کو اپنی مثال پیش کرنے کے لیے مجبور کر سکے، اگر نمونہ ملا بھی تو صدیق اکبر کا نمونہ، فاروق اعظم کا نمونہ، علی المرتضیٰ کا نمونہ اور عثمان غنی کا نمونہ ملا رضی اللہ عنہم اجمعین...... جس سے اندازہ ہوا کہ غیر مسلم بھی سمجھتے ہیں کہ یہی شخصیتیں مقدس تھیں جن کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

احوالِ صحابیت سے عصمتِ نبوی پر استدلال اور درجاتِ عصمت...... تو جس ذات بابرکات کے خدام ایسے تھے کہ آج دنیا ان کا نام لے کر کہتی ہے کہ ان کا نمونہ اختیار کرو تو خود اس ذات بابرکات کا نمونہ کیا ہوگا! خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات بابرکات کا کیا مقام ہوگا! حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر پھل کڑوا ہے تو کہیں گے درخت بھی خراب ہے اگر پھل کانٹے دار ہے تو کہیں گے درخت بھی بُرا، پھل شیریں ہے تو کہیں گے درخت بھی عمدہ تو درخت پہچانا جاتا ہے اپنے پھل سے جس

ذات کے پھل ایسے تھے جیسے صدیق اکبر، فاروق اعظم اور ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم۔ ان کو اپنے جیسا نمونہ بنا کر پیش کیا۔ جس کے بنائے ہوئے افراد ایسے تھے خود وہ ذات کیسی ہوگی! جس درخت کے پھل ایسے تھے تو اس درخت کی شاخ کیسی ہوگی......تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں سب سے پہلے بنیادی چیز جو آتی ہے وہ عصمت اور معصومیت ہے اس کے بعد آگے اسوۂ حسنہ آتا ہے۔ اگر معاذ اللہ گناہ کا شائبہ نبی کی زندگی میں پایا جائے تو زندگی امت کے لئے نمونہ نہیں بن سکے گی۔ اس سے واضح ہوگیا کہ نبی کی زندگی میں گناہ کی کوئی سبیل نہیں، ممکن نہیں کہ نبی سے گناہ سرزد ہو جائے تو نبی کی ہر نقل وحرکت پاک ہوگی اور شریعت بننے کے قابل ہوگی۔ اس کے بعد درجہ آتا ہے اخلاق کا، اس کے بعد اعمال کا اور پھر احوال کا۔ یہ معصومیت کے درجے ہیں تاکہ جب اخلاق سامنے آجائیں تو وہ بھی خرابی سے معصوم ہوں، اعمال سامنے آئیں تو ہم کہہ سکیں کہ یہ بھی پاک تھے......ان میں بھی عصمت تھی لہٰذا ان کا نمونہ اختیار کرو۔ احوال سامنے آئیں تو ان میں بھی عصمت تو وہ بھی معصوم تھے اس لئے انہیں اختیار کرو تو پہلے عصمت، اس کے بعد اخلاق، پھر اعمال، پھر احوال، پھر اقوال اور پھر پوری زندگی آتی ہے اور ان میں بھی بنیادی درجہ اخلاق ہی کو حاصل ہے۔ (معصومیت کے ساتھ) انبیاء علیہم السلام کے اخلاق وہ ہوتے ہیں کہ دنیا میں ان کی کوئی نظیر اور مثال پیش نہیں کی جاسکتی وہ اخلاق ربانی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ پیغمبر کو اپنے اخلاق کا نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں تو پیغمبر کا ایک ایک خلق اللہ کے اخلاق کی مانند ہوتا ہے، گویا اگر اخلاق ربانی کو مجسم کرنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات بن جائے گی، وہ اخلاق ربانی کا نمونہ ہوگا۔ علم، صبر، شجاعت، سخاوت اور زہد......آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک چیز مثالی ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ کی ادنیٰ سی جھلک......حدیث میں ہے کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللهِ اَجْوَدَ رِيْحاً مُرْسَلًا" ① عام حالات میں تو سخاوت تھی ہی لیکن رمضان شریف کے بارے میں تو کہا گیا کہ آپ کی سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے نسیم صبح چلتی ہے۔ صبح کی ٹھنڈک اور ہوا ہر گھر میں، ہر قلب میں اور ہر دماغ میں پہنچتی ہے، اس سے فرحت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی کوئی گھرانہ ایسا خالی نہیں ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت کے آثار اس گھر تک نہ پہنچتے ہوں، آپ کی داد ودہش عام ہوتی تھی، ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال تقسیم فرماتے اور اشیاء تقسیم فرماتے تھے۔ "اَجْوَدَ رِيْحاً مُرْسَلًا" چھوٹی ہوئی ہوا سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت تھی، ہوائیں اتنی نہیں پھیلتی تھیں جتنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت پھیلتی تھی۔

سخاوت اس وقت کامل ہوگی جب زہد کامل ہوگا اگر دنیا کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہوگا تو دوسرے کو دینا طبیعت گوارا نہیں کرے گی۔ اس لئے ایسا آدمی شریعت پر عمل کرنے کے لئے دنیا کی ہر چیز سے بالاتر ہوگا کہ سارا مال نکل جائے

① الصحيح لمسلم، كتاب الفضائل، باب كان النبي صلى الله عليه وسلم اجود الناس بالخير من الريح المرسلة، ص: ۱۰۸۹ رقم: ۲۰۰.

تب بھی پرواہ نہ ہوگی ، یہ جب ہوگا جب زہد کامل ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام کے زہد سے بڑھ کر کس کا زہد وقناعت ہوسکتا ہے ! اور پھر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زہد وقناعت ...... اس کی تو کوئی حد ونہایت ہی نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مغرب کی نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے، اذان ہوچکی تھی صفیں درست ہوچکی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصلّی پر تشریف لائے تکبیر بھی ہوچکی تھی قریب تھا کہ نیت باندھ لیں لیکن ایک دم گھبرا کر گھر تشریف لے گئے اور کچھ منٹ وقفہ کرنے کے بعد واپس تشریف لائے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھائی۔ نماز پوری ہونے کے بعد حضراتِ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تکبیر ہوجانے کے بعد خلافِ معمول گھر تشریف لے گئے، کچھ دیر لگی اور بعد میں تشریف لائے یہ کیا بات تھی؟ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک دینار رکھا ہوا ہے؛ اس زمانے کی اشرفی جو ہمارے ہندوستانی سکے کی قیمت میں اڑھائی روپے سمجھ لیجیے؛ تو گھر کے طاق میں دینار رکھا ہوا تھا جب میں نیت باندھنے لگا تو مجھے یاد آ گیا اور نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ رات گذر جائے اور اس کے گھر میں سونا چاندی ہو اسی لئے میں گھبرا کر گھر گیا اس کو صدقہ کیا اور گھر کو پاک کیا پھر آ کر تمہیں نماز پڑھائی (1) ظاہر ہے کہ یہ زہد وقناعت تو انبیاء ہی برت سکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت وخصلت اپنانا ہر کسی کا بس نہیں ...... آج لوگ کہتے ہیں کہ سیرت کا جلسہ کرو۔ سیرت کہتے ہیں عادت وخصلت کو، تو کس کی جرأت ہے کہ انبیاء کی ان عادات کی پیروی کرے تو سیرت نبی کی ذاتی زندگی کا نام ہے۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہ انبیاء کی ذاتی زندگی پر چل سکے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بس میں نہیں ہوا کہ سب حضور کی ذاتی زندگی پر چل سکیں ایک دو چل سکے ہیں ورنہ عام صحابہ قانونِ شریعت پر چلتے رہے ہیں اور اسی میں ہماری بھی سعادت ہے۔ یہ حوصلہ کرنا کہ ہم ہُو بہُو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں اور قدم بہ قدم چلیں ...... یہ ہماری مجال نہیں ہے۔ خاص اولیاء اللہ میں سے تو کوئی چل سکتے ہیں اور رہی ہماری بات! ہم اگر شریعت کے دائرے میں ہی رہیں تو یہی ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر آدمی حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے یہ اس زمانے کا جنید وشبلی ہے۔ آج کا جنید وشبلی پہلے کا سا نہیں ہوسکتا کہ ایک مستحب کا ترک نہ ہو اور ایک مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔ آج کا بڑا مقدس شخص وہی ہے جو فرائض ادا کرتا رہے اور حرام سے بچ جائے، بس اس سے زیادہ کوئی کامل نہیں۔ فتنے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اس زمانے میں آدمی یوں چاہے کہ میں زندگی صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی طرح گذاروں تو یہ ممکن نہیں ہے، نہ زمانے کے حالات ہیں اور نہ ہمارے اندر طاقت ہے، نہ ہی ہمیں حوصلہ کرنا چاہیے۔ بس حوصلہ کی بات یہ ہے کہ شریعت کے دائرے سے باہر نہ نکلے، ناجائز چیزوں کا ارتکاب نہ کرے، جائز چیزوں کی حدود کے اندر رہے اور مشتبہ اور حرام سے بچ جائے بس اتنا کافی ہے، ورنہ انبیاء کی زندگی پر تو اکابر اولیاء اللہ بھی نہ چل سکے۔

---

(1) السنن للنسائي، كتاب السهو الرخصة للامام في تخطي رقاب الناس ج: ۵ ص: ۱۹۲.

عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ کا واقعہ...... تاریخ میں ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ کے دس دس ہزار مریدین ایک وقت میں جمع رہتے تھے اور لنگر سے کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ ایک دن تشریف لائے اور باورچی خانے کو دیکھا جہاں ان دس ہزار کا کھانا پکتا تھا۔ فرمایا کیسا کھانا ملتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: گوشت روٹی، کبھی دال بھی ہوتی ہے اور کبھی چاول بھی۔ فرمایا: اللہ اکبر! ہم یہاں اس لئے بیٹھے ہیں کہ نبی کی سُنتوں کو رائج کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو کی روٹی کے سوا کوئی چیز نہیں کھائی اور ہم یہ گوشت روٹی اور دال کھا رہے ہیں! چنانچہ حکم دیا بند کر دو یہ سب چیزیں اور وہی جو کی روٹی کھلاؤ۔

اور جو کی روٹی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے ہوتی تھی تو وہ جَو بھی چکی کا پسا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو جَو کھاتے تھے وہ تو ایسا تھا کہ پتھر کی رکابی میں جَو ڈال کے اسے پتھر سے کوٹ لیا وہ ٹکڑے ہو گئے پھونک ماری تو بھوسہ اڑ گیا (اسی سے کھاتے تھے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور یہ جَو بھی مہینے میں دو تین مرتبہ نصیب ہوتی تھی ورنہ فاقے پہ فاقے! ایک ایک مہینہ گذر جاتا تھا کہ گھرانۂ نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا۔ ① تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ ہم یہاں نیابت کے لئے بیٹھے ہیں، گویا نائبِ رسول اللہ کی گدّی ہے اور ہم یہ مزے اڑائیں! سب کو جَو کی روٹی دی جائے۔ چنانچہ یہ سب چیزیں بند کر دی گئیں؛ گوشت، دال اور چاول وغیرہ سب ختم ہو گئے۔ جَو کی روٹی اور زیتون کا تیل دیا جانے لگا۔ ظاہر بات ہے کہ روحانیت تو الگ چیز ہے لیکن معدہ بھی تو جَو کی روٹی کا تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے ہاضمے خراب ہو گئے، کسی کو دست آنے لگے، کسی کو بخار آ گیا۔ تو آدھے سے زیادہ لوگ بیمار ہو گئے۔ ذکر اللہ کی جو مجلسیں تھیں وہ سُونی ہونے لگیں، کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے اور کوئی بخار میں مبتلا ہے۔ خانقاہ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ حضرت شیخ نے تین دن کے بعد فرمایا کہ ذکر اللہ کی آوازیں کیوں نہیں آتیں؟ عرض کیا گیا کہ حضرت نے حکم دیا تھا کہ گندم کی روٹی بند کر دی جائے اور جَو دیئے جائیں۔ گوشت دال بند کر دی جائے اور زیتون کا تیل کافی ہے، اس سنت کے مطابق چلو۔ اس پر عمل کیا گیا...... لوگ اس روٹی کو ہضم نہیں کر سکے برداشت نہیں کر سکے، سب کے سب بیمار ہو گئے۔ اب یہ سارے حجروں میں بیمار پڑے ہوئے ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ ذکر اللہ وغیرہ سب ختم ہو گیا تو حضرت شیخ جیلانیؒ نے کانوں کو ہاتھ لگا کے فرمایا: ہم نے گستاخی کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتی زندگی کی پیروی کا حوصلہ کیا۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے یہ انبیاء ہی کے ظرف تھے، وہ اس چیز کو برداشت کرتے تھے۔ ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ جائز کے دائرے میں رہیں ناجائز سے بچیں۔ پھر حکم دیا کہ گوشت روٹی پکے، وہی چیزیں جو پکتی تھیں پکائی جائیں، ہمارے پیٹ اس قابل نہیں ہیں کہ وہ جَو کی روٹی برداشت کریں۔

سیرت کے نام جلسہ کرنے کی نزاکت...... تو حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی ذاتی زندگی جس کا نام سیرت ہے

① كتاب الجوع لابن ابی الدنیاص: ۳.

اس پر عمل کرنا یہ ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں تو بعض اوقات کہا کرتا ہوں کہ سیرت کے نام سے جلسہ کرنا بعض دفعہ تو ڈر لگتا ہے کہ یہ بے ادبی کی بات نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کا جلسہ ہوگا، سیرت بیان ہوگی اور کیوں ہوگی! تا کہ ہم سیرت پر عمل کریں۔ ہم لوگ کہاں اس قابل ہیں کہ سیرت پر چلیں! کیا آپ میں اور ہم میں......اور سب کے ساتھ میں اپنے کو بھی کہتا ہوں کہ ہم میں یہ جُرات ہے کہ گھر میں جتنا سونا چاندی ہو، بیوی سے لیکر سب صدقہ کردو کہ میرا گھر پاک ہو جائے؟ اسلئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصلّی پر نماز نہیں پڑھائی جب تک گھر کو سونے سے پاک نہیں کیا، کیا کسی میں جُرات ہے؟ کوئی نہیں کرسکتا۔ کیا کسی میں یہ جُرات ہے کہ آج سے جَو کی روٹی شروع کردے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نہیں کرسکے۔ ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے؟ تو بہر حال سیرت کا نام لے کر جلسے کرنا بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بے ادبی میں داخل نہ ہو جائے!۔ جلسہ ہونا چاہیے......اصلاحی جلسہ، وعظ وتقریر کا جلسہ۔ سیرت کے جلسہ کے معنی ہیں کہ ہم سیرت پر عمل کریں گے۔ حالانکہ شریعت تو ہم سے نبھتی نہیں، ناجائز چیزوں میں تو ہم مبتلا ہیں اور ہم عمل کریں گے سیرت کے اوپر......آرزو تو کرو مگر......اپنی بساط کو دیکھ کر آرزو کرو۔ یہ کہ ہم بالکل قدم بہ قدم سیرت پہ چلیں گے یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا زہد وقناعت میں ٹھیک رسول اللہ کے نقشِ قدم پر چلنے میں دوسروں پر سختی فرمانا

......تو بہر حال میں عرض یہ کررہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زہد وقناعت کو دنیا برداشت نہیں کرسکتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم تک برداشت نہ کرسکے، ایک آدھ گنے چنے صحابہ ہیں جنہوں نے ٹھیک حضور کی ذاتی زندگی پر عمل کیا؛ جیسے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، ان کا مذہب یہ تھا کہ اس وقت کا کھانا ہے تو شام کا کھانا جمع کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ذخیرہ ہے اور کنز میں داخل ہے۔ یہ تو خزانہ ہوگیا جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے کہ اگر کنز اور خزانہ بنایا تو جہنم میں اس سونے چاندی کے مال کو پگھلا کے جہنمی مالک کو داغ دیا جائے گا تو یہ ان کا ذاتی مذہب تھا کہ اس وقت کا کھانا ہے تو رات کے کھانے کی فکر جائز نہیں ہے، یہ توکّل کے خلاف ہے۔ اگر ایک لباس بدن پر ہے تو دوسرا لباس رکھنا جائز نہیں ہے، یہ بھی توکّل کے خلاف ہے۔ تو صحابہ میں یہ ایک نمونہ ہے دوسرے برداشت نہیں کرسکے۔ چنانچہ ملکِ شام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور شام کا متمول ملک......تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دسترخوان پہ کئی کئی کھانے ہوتے تھے۔ لباس میں بھی عمدگی اور ایک لطافت پیدا ہوگئی تھی۔ مکان بھی ذرا اچھے بن گئے تھے اور یہ کوئی ناجائز بات بھی نہیں تھی، کیونکہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ" ① یعنی اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، دولت دے تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ اس کے اثرات بھی اس کے اوپر دیکھیں، ڈھنگ کا کھانا اور ڈھنگ کا پہننا ہو، پھٹے حال سے نہ رہے، خراب خستہ حال نہ رہے۔ تو منشاءِ خداوندی یہ ہے کہ نعمت دی جائے تو اس کا اثر بھی بدن کے اوپر آنا

① السنن للترمذی، کتاب الأدب، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری......ص: ۱۹۴۳ رقم: ۲۸۱۹.

چاہیے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اگر اچھا لباس پہنا اچھی غذائیں کھائیں تو معاذ اللہ کوئی ناجائز کام نہیں کیا، ان سے زیادہ مقدس کون ہے! مگر ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی کے گھر پہنچے اور دیکھا کہ دستر خوان بچھ رہا ہے اور دو کھانے رکھے ہیں...... بس لاٹھی لے کر کھڑے ہو گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستر خوان پر کب دو کھانے تھے؟ تم نے یہ کیسے رکھ لیے؟ ہٹاؤ ان کو۔ یہ نہیں تھا کہ فقط نصیحت کر دیتے، لاٹھی لے کے مار کٹائی شروع کر دیتے تھے کہ اس کھانے کو ہٹاؤ، کسی کے گھر اگر دو چار کپڑے اندر رکھے ہوئے ہیں تو لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں کب زائد کپڑے تھے جو تم نے رکھے ہوئے ہیں صرف وہ کپڑے رہنے چاہئیں جو بدن کے اوپر ہیں۔ یہ صندوق میں کیوں دو جوڑے رکھے ہیں...... پھر لاٹھی مار کے حکم دیتے تھے کہ نکالو اور ان کو صدقہ کرو۔ آخر لوگ تنگ آ گئے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ انہوں نے تو سب کی زندگی تلخ کر دی ہے! اب سب تقویٰ کے اس انتہائی مقام کو کیسے پہنچیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام تھا۔ اور کس طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی کی پیروی کریں! آپ انہیں حکم دیجیے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ شریعت میں توسّعات (گنجائشیں) ہیں، اگر کوئی مالدار ہے زکوٰۃ دے دے گا تو مال پاک ہو گیا، یہ نہیں ہے کہ وہ سارا مال جا کے سمندر میں بہا دے تو پاک ہو گا۔ کسی کے پاس دو جوڑے کپڑے ہیں؛ پرانے ہوں یا نئے، فقیروں کو بھی دے دیئے خود بھی پہن لیے بس پاک ہو گئے۔ اب یہ کہ کوئی اچھا کپڑا پہننے ہی نہ پائے یہ تو شریعت کا معارضہ ہے، شریعت تو گنجائش دے اور یہ گنجائش نہیں دیتے! آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ آپ شہر چھوڑ دیں اور جنگل میں قیام کریں۔ ①

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکالیف دوسرے انبیاء سے بڑھی ہوئی ہونے کی توجیہ

......تو اسلام خُلقِ عظیم سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے زور سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صبر، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحمل، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت وغیرہ...... یہ وہ اخلاقِ ربانی تھے جنہوں نے واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے پیغمبر اور اس کے رسول ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معجزات اور پھر وحی کے ذریعہ آنے والے علوم یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ذریعے قلوب کے اندر ایمان پیدا ہوتا ہے اور لوگ دین کی طرف آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کسی نبی کو کسی قوم سے وہ اذیتیں نہیں اٹھانی پڑیں جو مجھے جھیلنی پڑی ہیں اور جتنی تکلیف مجھے پہنچی ہے، اتنی تکلیف کسی نبی کو نہیں پہنچی ② حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو زیادہ تکلیف پہنچائی گئی، ساڑھے نو سو برس تبلیغ فرمائی اور قوم ان کا مذاق اڑاتی رہی۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے تکلیفیں پہنچیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں۔ پھر کیوں فرما رہے ہیں کہ جتنی اذیتیں مجھے پہنچیں وہ کسی کو نہیں پہنچیں؟ اس کی بناء (وجہ) یہ

① اس سے آگے تقریر کا کچھ حصہ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ ۱۲ منہ ② حلیۃ الاولیاء، مالک بن انس، ج: ۳ ص: ۱۱۶۔

ہے کہ اذیت جب زیادہ پہنچتی ہے جب شفقت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی آپ کو کسی سے محبت ہوگی اس سے اگر آپ کو تھوڑی بھی تکلیف پہنچے گی تو زیادہ محسوس ہوگی کیونکہ اسے تکلیف پہنچانے کا حق نہیں تھا، میں تو اتنی محبت کروں اور یہ ایذاء پہنچائے، اگر دشمن آپ کو گالیاں بھی دے آپ خیال بھی نہیں کرتے، لیکن اگر آپ کا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو گھر سے نکال دیں گے اور انتہائی صدمہ پہنچے گا کیونکہ اس سے یہ توقع نہیں تھی، کہ جس پر اتنی شفقت اور رحمت ہو وہ تکلیف پہنچائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چونکہ امت کے حق میں بے حد شفقت تھی اور بے حد رحمت تھی اس لئے ان کی اذیت دگنی اور تگنی ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لگتی تھی کہ میں تو اتنا شفیق اور یہ میرے ساتھ یہ برتاؤ کریں، تو شدّتِ شفقت کیوجہ سے اذیت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

اسی لئے حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ ذرا سی اس شفقت میں کمی کریں، اتنی زیادہ شفقت نہ کریں کہ اخیر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی بھگتنی پڑے۔ فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ ① شاید آپ اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کر ڈالیں گے کہ یہ کیوں نہیں مسلمان ہو جاتے۔ آپ ان کو چھوڑ دیجئے، تبلیغ کر دیجیے، نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا کیوں دُکھ اٹھاتے ہیں، لیکن غایتِ رحمت کیوجہ سے دُکھ اٹھاتے تھے، انتہائی شفقت اور خُلُقِ عظیم کیوجہ سے اس درجہ رحیمانہ اخلاق تھے کہ حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ اتنی شفقت بھی نہ کریں کہ خود آپ کو تکلیف پہنچے۔

خاتَم النبیّین کا مطلب..... تو حاصل یہ نکلا کہ (نبی میں) صبر ہو، سخاوت ہو اور شجاعت ہو۔ چونکہ آپ خاتَم الانبیاء ہیں اس واسطے اخلاق میں بھی خاتَم الاخلاق ہیں کہ اخلاق کا وہ درجہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا، علم کا جو درجہ دوسرے انبیاء کو دیا گیا اس سے دُگنا چوگنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو مقامِ علم ہے وہ مقام دوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا۔ جو مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال کا ہے وہ دوسرے انبیاء کو نہیں دیا گیا...... اس لئے اور انبیاء علیہم السلام فقط نبی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں تھے بلکہ خاتَم النبیّین تھے۔ اور خاتَم النبیّین کا مطلب یہ ہے کہ نبوت، علم اور اخلاق کے جتنے مراتب ہیں وہ سب آپ کی ذات بابرکات کے اوپر ختم ہو چکے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے کمالات کے منتہاء ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر آ کر سب کمالات کی انتہاء ہوگئی تھی۔ گویا اب کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں رہا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی آئے اور اس درجہ کو لے کر چلائے اور تبلیغ کرے۔ آپ کی ذات بابرکات کے اوپر سارے مراتب ختم کر دیے گئے، اس لئے آگے نہ نبوت کی ضرورت تھی اور نہ شریعت کی ضرورت تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین خاتَم الادیان تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب خاتَم الکُتُب تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت خاتَم الشرائع تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۳.

خاتم الانبیاء تھی۔ تو ختم نبوت کیوجہ سے ہر چیز کا انتہائی مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا؛ علم کا، اخلاق کا اور سارے کمالات کا کیوں کہ نبوت ختم ہو چکی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔

نبوت رحمت ہے تو اس کا ختم ہونا زحمت ہے، اشکال اور اس کا جواب...... ممکن ہے کوئی شخص یہاں شبہ کرے کہ نبوت ختم ہو چکی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے کوئی نبی نہیں تو نبوت تو سب سے بڑی رحمت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا تو ہزاروں نبی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آنے چاہئیں تھے مگر معاذ اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو رحمت نہیں زحمت بن گئے کہ نبوت جیسی رحمت کا دروازہ ہی بند ہو گیا کہ نبی آنے ختم ہو گئے، تو یہ رحمت کہاں ہوئی معاذ اللہ! یہ تو زحمت ہوگئی۔ اس لئے آپ کے رحیم ہونے کا تقاضا ہے کہ نبوت کا دروازہ کھلا رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہزاروں نبی آنے چاہئیں۔ بعض ایسے لوگوں نے جو خود چاہتے تھے کہ ہم نبی بن جائیں مگر بن نہیں سکے۔ اتفاق سے دعوے بھی بہت کچھ کیے مگر نبوت پچھی نہیں۔ قطعِ نظر اس کے کہ نبوت ختم ہو چکی تھی مل نہیں سکتی تھی...... پھر بھی اس کا دعویٰ ان کی ذات پر پھبا ہی نہیں۔ جیسے بعض لوگ ٹوپی اوڑھ لیتے ہیں اور ان کو اچھی نہیں لگتی، اسی طرح کوئی چہرہ تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ کوئی لباس پہن لے پھب جاتا ہے اور کوئی ایسا بھدّا ہوتا ہے کہ لباس بھی اس کے اوپر بھدّا ہو جاتا ہے۔ تو قطعِ نظر نبوت ختم ہونے یا نہ ہونے کے...... نبوت ان کی ذات پر پھبی نہیں اور چسپاں نہ ہو سکی، مگر انہوں نے نبوت کے دعوے کرنے کے لئے یہ شبہ پیدا کیا کہ نبوت عظیم رحمت ہے اور جو نبوت کا دروازہ بند کرے وہ رحمت کہاں رہا؟ وہ تو زحمت بن گیا تو دروازہ کھلا رہنا چاہیے، نبی آتے رہنے چاہئیں۔ یہ شبہ ممکن ہے کسی کے ذہن میں ہو یا ڈالا جائے اس کے لئے جواب عرض کرتا ہوں۔

جواب...... حاصل یہ ہے کہ ختمِ نبوت کا معنی قطعِ نبوت کا نہیں کہ نبوت قطع ہوگئی اور دنیا سے منقطع ہوگئی بلکہ ختم نبوت کے معنی تکمیلِ نبوت کے ہیں، یعنی نبوت کامل ہوگئی اور چیز کے کامل ہونے کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ آئے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے رات کا وقت ہے اور ستارے چمکنے شروع ہوئے، غروب کے بعد ایک چمکا، دوسرا، تیسرا، ہزار، لاکھ، کروڑ، دس کروڑ...... حتیٰ کہ سارا آسمان جگمگا اُٹھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے اور چاند بھی نکلا ہوا ہے تو چاند ستارے نور پھیلا رہے ہیں لیکن رات نہیں جاتی، دن نہیں ہوتا، رات کی رات رہتی ہے۔ سب نے مل کر کتنی روشنی دی مگر رات موجود ہے اور رات نہیں جاتی۔ آفتاب کے آنے کا جب وقت ہوا تو ابھی نکلا نہیں تھا صرف پو پھٹی تھی کہ بس صبح صادق نے اطلاع دیدی کہ آفتاب آ رہا ہے۔ بس خبر آنی تھی کہ اندھیرا غائب ہونا شروع ہوا اور دنیا میں چاندنا ہو گیا۔ ایک ہی ستارے (یعنی سورج) نے آکے سارے جہاں کو چمکا دیا۔ یعنی وہ تو لاکھوں کروڑوں مل کر روشنی ڈال رہے تھے مگر رات کو زائل نہیں کر سکے، دھکا نہیں دے سکے، رات کی رات ہی رہی۔ اور ایک ستارہ ایسا نکلا کہ اس نے آکے ساری رات کو دھکیل دیا۔ پورے عالم میں چاندنا ہو گیا۔ اگر آفتاب

یوں کہے کہ: "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" میں نے سارے انوار کو ختم کر دیا، سارے انوار میری ذات پر ختم ہیں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں اور نہ اب کوئی نیا ستارہ آنے والا ہے اس لئے کہ میں اتنا کامل نور لے کے آیا ہوں کہ اب کسی ستارے کی حاجت نہیں۔ جو موجود تھے ان کا بھی نور ماند پڑ گیا، ان کے نور بھی غائب ہو گئے اور اب وہ نمایاں ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آفتاب نے ستاروں کا نور چھین لیا ہے۔ وہ تو منوّر ہیں مگر آفتاب کی تیزی اور چمک کے سامنے ان کی چمک ماند ہے، وہ نظر بھی نہیں آتے۔ ایسے وقت میں آفتاب یوں کہے: "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" کہ میں ہوں خاتمِ انوار، سارے انوار اور ساری چمکیں مجھ پر ختم ہو گئی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب نور کا کوئی ایسا درجہ باقی نہیں ہے کہ اب کوئی اور ستارہ آئے اور نور پھیلائے۔ اب مغرب کے وقت تک میں اکیلا ہی کافی ہوں کسی ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں یہ دن ہی ختم ہو جائے، یہ جہاں ہی ختم ہو جائے تو یہ بات الگ ہے۔ لیکن جب تک یہ دن موجود ہے کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے۔ اس لئے کہ انوار میری ذات کے اُوپر ختم ہو گئے۔ تو کیا آفتاب کے "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" کہنے کا یہ مطلب ہوگا کہ نور ختم ہو گیا! نور مٹ گیا دنیا سے! اندھیرا چھا گیا! یا یہ مطلب ہوگا نور کے ختم ہونے کا کہ نور کے مراتب ختم ہو گئے، کامل ہو گئے...... اب کسی دوسرے ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں، دوسری چمک کی حاجت نہیں ہے۔ تو ختمِ انوار کے معنی قطعِ انوار کے نہیں بلکہ تکمیلِ انوار کے ہیں کہ نور کامل ہو گیا اور اب کسی اور نور کی ضرورت نہیں ہے۔

آفتابِ نبوت کا طلوع...... اسی طرح سمجھ لیجیے کہ نبوت ایک آسمان ہے۔ سب سے پہلے نور کا ستارہ حضرت آدم علیہ السلام کا چمکا اور اس نے آ کے نور پھیلایا، اس کے بعد نوح علیہ السلام کے نور کا ستارہ چمکا، پھر حضرت ہود علیہ السلام کا، پھر حضرت صالح علیہ السلام کا اور ﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا﴾ ① پھر پے در پے انبیاء علیہم السلام آنے شروع ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام آ رہے ہیں، موسیٰ علیہ السلام آ رہے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں سے آ رہے ہیں۔ گویا آسمانِ نبوت ستاروں سے بھر گیا مگر دنیا میں چاندنا نہ ہوا، یعنی دن نہ نکلا۔ رہی رات کی رات۔ پھر فاران کی چوٹیوں سے صبح صادق علیہ السلام کا طلوع ہوا۔ اس نے خبر دی کہ آفتابِ نبوت آنے والا ہے۔ ابھی آیا نہیں تھا خبر آئی تھی کہ دنیا میں چاندنا پھیلنا شروع ہو گیا۔ ستارے گُل ہونا شروع ہو گئے اور آفتاب نے نکلتے ہی اعلان کیا کہ اب میں آ چکا ہوں، اب کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے۔ میرا نکلنا ہی کافی ہے، پوری دنیا کے لئے اب میں کافی ہوں۔ نبوت ختم ہو گئی یعنی مراتبِ نبوت میری ذات پر منتہی ہو گئے، کامل ہو گئے۔ مزید نبوت کو پھیلانے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں اور اب کسی کو نبی بنا کر نہیں لایا جائے گا۔ اب میری نبوت غروبِ آفتاب تک کام کرے گی...... یہاں تک کہ صبح قیامت طلوع ہو جائے اور یہ دن ختم ہو جائے۔

① پارہ: ۱۸، سورة المؤمنون، الآية: ۴۴.

اس کے بعد اللہ کو اختیار ہے دنیا بنائے یا نہ بنائے یا سب کو جنت میں رکھے۔ مگر جب تک یہ دنیا قائم ہے میں آفتاب ہوں، میرا نور کافی ہے، میرے بعد بڑے بڑے لوگ آئیں گے...... مگران کے راستے سے بھی میری ہی نبوت کا نور چمکے گا۔

انوارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ظہور کی صورتیں ...... محدثین آئیں گے تو ان کے راستہ سے میری نبوت کا نور ظاہر ہوگا، فقہاء آئیں گے؛ ابوحنیفہ، مالک، شافعی رحمہم اللہ وغیرہ...... ان سب کے اندر سے میرے انوار ظاہر ہوں گے، خود ان کا کوئی نور نہیں ہوگا۔ صوفیائے کرام آئیں گے؛ جنید، شبلی اور بایزید بسطامی وغیرہ...... ان کی ذات کا کوئی نور نہیں ہوگا، سب سے میری ہی نبوت کا نور چمکے گا۔ کسی طبقے سے میرے علم کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے اخلاق کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے زہد وقناعت کا نور نمایاں ہوگا۔ سب میرے انوار کو ظاہر کریں گے اور ایک میری نبوت قیامت تک کافی ہوگی۔ اس کے لئے آئینے آتے رہیں گے، ان میں سے وہ نور چھنتا رہے گا چمکتا رہے گا، دنیا کو روشنی ملتی رہے گی۔ نبوت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ نبوت کے سارے درجات میرے اوپر ختم ہوگئے۔ تو یہاں ختم نبوت کا یہ معنی لینا کہ نبوت کا دروازہ بند ہوگیا یہ دنیا کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ نبوت مکمل ہوگئی ہے اور وہی کام دے گی قیامت تک...... نہ یہ کہ نبوت منقطع ہوگئی ہے اور دنیا میں اندھیرا پھیل گیا ہے۔ نہ علم رہا اور نہ اخلاق رہے تو یہ معنی نہیں کیا گیا۔ اس لئے دھوکے میں نہ پڑا جائے، ختمِ نبوت کے معنی قطع نبوت کے نہیں، بلکہ کمالِ نبوت اور تکمیلِ نبوت کے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر مراتبِ نبوت ختم ہوگئے ہیں اب جتنے بھی مجدد آئیں گے، محدث آئیں گے، آئمہ آئیں گے، صلحاء وشہداء آئیں گے اور مجاہدین آئیں گے...... سب کے اندر ایک ہی نور کام کرے گا۔ سب پیکر ہوں گے اور ان سب پیکروں سے ایک ہی کا نور ظاہر ہوگا، ہوں گے وہ کمالاتِ نبوت۔ تو گویا ''ایک ذات'' اللہ نے ایسی پیدا کی کہ اس کے انوار وبرکات سے پچھلوں کو نبوتیں ملتی چلی گئیں، اگلوں کو ولایتیں ملتی چلی گئیں...... پہلے نبی بنتے گئے، بعد والے ولی بنتے چلے گئے، تو ولایت بھی وہیں سے چلی، نبوت بھی وہیں سے چلی۔ تو اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک نکتۂ خیر ہیں کہ پچھلے انبیاء کی نبوتیں درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت سے مستفیض ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت سے فائدہ اٹھاتے رہے اور بعد میں آنے والے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کمالات سے ولی، مجدد اور محدث بنتے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت درجۂ کمال پر ہے...... فلاسفہ کہتے ہیں کہ آفتاب کا ہی نور درحقیقت ستاروں میں کام کرتا ہے، چاند میں اپنا ذاتی نور نہیں ہے۔ ستاروں میں اپنا نور نہیں ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ذات (سورج سے) صیقل شدہ ہیں، آفتاب کا جہاں مقابلہ ہوا ان میں چمک پیدا ہوگئی۔ تو درحقیقت اولیاء اللہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم آئینوں کی مانند تھے، وہ چمک لیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نور کی۔ نبوت آج بھی آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی کام کر رہی ہے۔ کوئی اور نبوت نہیں ہے وہی نبوت ہے جو چل رہی ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں اور ختمِ نبوت کے معنیٰ کمالاتِ نبوت کی انتہاء اور تکمیل نبوت کے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو لا کر نبوت کے تمام مراتب ختم کر دیے گئے۔

نبوت کی دو بنیادیں ہیں...... اور نبوت کی دو ہی بنیادیں ہیں: ایک کمالِ علم اور ایک کمالِ اخلاق، تو علم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلیٰ اور اخلاق بھی اعلیٰ۔ علم تو ایسا کہ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں أُوتِيتُ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ① اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کر دیے گئے ہیں، میرے سینے میں بھر دیئے گئے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے فرمایا ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ ② اے نبی! ہم نے آپ کو ان چیزوں کی تعلیم دی جو آپ پہلے سے نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔ اور اخلاق کے بارے میں فرمایا ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ ③ آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں۔ یعنی اخلاق کا جو انتہائی مرتبہ ہے وہ آپ کو دیا گیا ہے۔ تو جب علم بھی انتہائی اور اخلاق بھی انتہائی ہے ...... بس یہی دو بنیادیں ہیں نبوت کی، تو پھر نبوت بھی انتہائی ہوگئی اور یوں آپ خاتم النبیین ہیں۔ تو ختم نبوت میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پوشیدہ ہے۔

ابتدائی درجہ عصمت اور معصومیت کا ہے، اس کے بعد اخلاق کا ہے، اس کے بعد اعمال کا ہے اور اس کے بعد احوال کا ہے۔ تو میں نے کچھ روشنی ڈالی عصمت کے اوپر، کچھ روشنی ڈالی اخلاق کے اوپر، اعمال اور احوال کا باب بہت وسیع ہے...... اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے وقت تنگ ہو گیا ہے، اخیر ہو گیا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ اب اس تقریر کو ختم کیا جائے۔

قرآن ہی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے...... اور کون ہے جو سیرت کی ساری چیزیں بیان کر سکے، اس واسطے کہ سیرت کے بارے میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ تو فرماتی ہیں کہ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق ہے۔ جسے اخلاق دیکھنے ہوں قرآن دیکھ لے۔ ④ تو قرآن کے عجائبات قیامت تک تمام نہیں ہوں گے تو سیرت کے عجائبات کہاں سے تمام ہو سکتے ہیں! قیامت تک لاکھوں بیان کرنے والے بیان کرتے جائیں پھر بھی سیرت مکمل بیان نہیں ہو سکتی۔

اختتامِ تقریر...... اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ اب بیان ختم کروں، میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ: ﴿مَا كَانَ

---

① روح المعاني عن القسطلاني، سورة الكهف، الآية: ٨٢ ج: ١١ ص: ٣٨٠.

② پاره: ٥ سورة النساء، الآية: ١١٣.

③ پاره: ٢٩، سورة القلم، الآية: ٤.

④ مسند احمد، حديث السيدة عائشة رضي الله عنها ج: ٥٠ ص: ١١٦.

مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ﴾ ① محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں یعنی نسبی رشتہ نہیں ہے، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی روحانی رشتہ کے باپ ہیں اور مادی اور نسبی رشتے کے باپ نہیں ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ ② میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں یعنی روحانی باپ۔ تو جیسے اولاد ماں باپ سے تربیت (جسمانی پرورش) پاتی ہے تو روحانی اولاد روحانی ماں باپ سے تربیت (روحانی پرورش) پاتی ہے۔ تو میں روحانی باپ ہوں اور سارا عالم میرے زیر تربیت ہے اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ روحانی باپ ہو یا مادی باپ وہ ایک ہی ہوا کرتا ہے، دو دو باپ کسی کے نہیں ہوا کرتے۔ تو میں چونکہ روحانی باپ ہوں اس لئے ایک ہوں تو میرے بعد کوئی اور باپ آنے والا نہیں ہے۔ میری اُبُوَّت اتنی مکمل ہے کہ وہ تربیت کے لئے کافی ہے: ﴿وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ﴾ ③ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اب نبوت کا یا باپ ہونے کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ نبوت کے درجہ میں کوئی روحانی باپ بن جائے، نبوت ختم ہو چکی۔ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ نبوت کو ایک محل سمجھو جس کی تعمیر ہو رہی تھی جسکی آخری اینٹ میں ہوں۔ میں نے قصرِ نبوت کو مکمل کر دیا۔ ④ اب کوئی انتظار کی حالت باقی نہیں ہے اب نہ باہر سے کوئی چیز آئے گی نہ اندر سے باہر جائے گی۔

خلاصۂ بیان ...... بہر حال چونکہ جلسہ کا موضوع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میلادِ مبارک تھا تو ایک میلاد جسمانی کا ذکر کیا اور زیادہ تفصیل میلادِ روحانی کی کی کیونکہ ہماری سعادت کا تعلق میلادِ روحانی سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت سے ہے اور رسالت کے اخلاق، اعمال اور احوال سے ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں نے زیادہ کی اور اسی لئے یہ آیت پڑھی تھی کیونکہ وہ ساری تفصیلات اس آیت میں تھیں لیکن چھپی ہوئی تھیں اور وہ آیت ختم نبوت کے بارے میں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی کمالات اسلئے ہیں کہ آپ کی نبوت انتہائی تھی اور اس واسطے آپ کے انتہائی علم واخلاق کا ذکر بھی آیا، اس لئے ختمِ نبوت کا ذکر بھی آیا۔ اور چونکہ ختمِ نبوت کا ذکر کرنا تھا تو آیت وہ پڑھی جس میں ختم نبوت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسی سے یہ سیرت شروع کی۔ اب وقت زیادہ ہو گیا ہے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس پاک اور عظیم الشان پیغمبر کی زندگی اور نقشِ قدم پر چلنا نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے نبی پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے اور ہم کو سچا اور سیدھا مسلمان بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

---

① پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰. ② السنن لابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب کراھیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ، ص: ۱۹۲۳ رقم: ۸. ③ پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰.
④ الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین ج: ۱۱ ص: ۴۰۴.

مقام نبوت اور اس کے آثار و مقاصد

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!......قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ① . وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ. اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ. ②

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس دنیا میں ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جب اس کی ضد سامنے آتی ہے تو اصل چیز گویا واضح ہو جاتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے اس دنیا کو اضداد پر قائم کیا ہے۔ یہ عالم بھی عالمِ اضداد ہے جو بھی کمال اس دنیا میں لایا گیا اس کے مقابلے میں اس کمال کی ایک ضد ضرور رکھی گئی ہے تا کہ وہ کمال کھل جائے اور واضح ہو جائے، خواہ وہ کمال مادی ہو یا روحانی ہو...... ضد سے خالی نہیں ہے۔ اس دنیا میں اگر نور رکھا گیا ہے تو نور کے مقابلے میں ظلمت بھی رکھی گئی ہے۔ تا کہ ظلمت کے تقابل سے نور کو لوگ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر دنیا میں چمکتا ہوا دن لایا گیا ہے تو اس کے مقابلے میں ظلمانی رات بھی رکھی گئی ہے تا کہ دن کی خوبیاں رات کے تقابل سے واضح ہو جائیں۔ اگر اسلام لایا گیا تو اس کے مقابلے میں کفر رکھا گیا تا کہ اس کی ٹکر سے اسلام کی خوبیاں اور قوتیں واضح ہوں۔ اگر ایک طرف اخلاص لایا گیا تو اس کے مقابلے میں نفاق رکھا گیا تا کہ نفاق کے مقابلے سے اخلاص کے کمالات کھل جائیں۔ اگر صدق رکھا گیا تو صدق کے مقابلے میں کذب اور جھوٹ بھی رکھا گیا تا کہ کذب کے مقابلے سے صدق کی خوبیاں واضح ہوتی رہیں۔ اسی طرح چلتے رہیے علم رکھا گیا تو اس کے مقابلے میں جہالت رکھی گئی۔ اخلاق لائے گئے تو اس کے مقابلے میں بداخلاقی لائی گئی تو ہر خوبی کے مقابلہ میں خرابی ضرور رکھی گئی ہے۔

عالمِ اضداد میں اشیاء کے تقابل کی حکمت ...... اور یہ اس لئے ہے تا کہ جب خوبی اور خرابی کا مقابلہ ہو تو

① السنن لابن ماجة، كتاب السنة، باب فضل العلماء ...... ص: ۱۹۱ ۲۴۹ رقم: ۲۲۹.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها. ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸.

خوبی کی قوتیں کھل جائیں۔ بغیر مقابلہ اور تقابل کے کسی کمال کی خوبی کھلتی نہیں ہے۔ جب تک علم کو آپ جہالت سے ٹکرائیں گے نہیں اس وقت تک علم کے مخفی گوشے واضح نہیں ہوسکتے۔ اگر علم کے مقابلے میں اعتراضات نہ کئے جائیں اور سوالات نہ کئے جائیں جو جہل پر مبنی ہوتے ہیں تو جواب سے جو علم کے کمالات کھلتے ہیں وہ چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے علم کو ٹکر دی جاتی ہے جہل سے، کبھی اعتراضات کی صورت سے، کبھی شبہات کی صورت سے اور کبھی الزامات کی صورت سے تاکہ جواب دینے والے جواب دیں تو اس کے مخفی گوشے کھل جائیں۔ قرآن کریم میں بھی اسی لئے فرمایا گیا کہ: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ﴾ ① نہیں، بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تاکہ باطل کے ٹکراؤ سے حق کی مخفی قوتیں نمایاں ہوں اور کھلتی رہیں۔ تو اس دنیا میں اضداد بھی ہیں اور اضداد کا ٹکراؤ بھی ہے۔ بغیر ٹکراؤ اور تصادم کے کمالات کی خوبیاں واضح نہیں ہوتیں۔

مثلاً دو پہلوان ہیں اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں لیکن ان میں کشتی اور ٹکر نہ ہو تو ٹکراؤ کے بعد جو مخفی قسم کے داؤ پیچ کھلتے ہیں وہ چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے پہلوان کو پہلوان سے ٹکرایا جاتا ہے تاکہ فن کی مخفی قوتیں واضح ہوں۔ ہر جگہ آپ یہی دیکھیں گے...... اس واسطے اس عالم کو ظلمانی بنایا گیا اور نورانی بھی بنایا گیا تاکہ ظلمت اور نور کے تقابل سے نور کی اصلیت اور اس کی قوت کھلے۔

اندھیروں میں آفتاب...... سب سے زیادہ ظلمت اور اندھیرے کا زمانہ اس دنیا میں وہ تھا کہ جس کے خاتمہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کی بعثت سے پہلے کا دور انتہائی ظلمت کا دور تھا، انتہائی اندھیری کا دور تھا۔ کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو اس زمانۂ جاہلیت میں موجود نہ ہو۔ جہالت کی برائیاں الگ، بداخلاقی کی برائیاں الگ، بدعملی کی برائیاں الگ، بداعتقادی کی برائیاں الگ، غرض جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ سب کی سب ایک زمانے میں جمع ہوگئی تھیں اور وہ زمانہ: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ② کا مصداق تھا کہ ظلمت در ظلمت اور پے در پے اندھیریاں دنیا کے اندر چھائی ہوئی تھیں۔ اسی لئے حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: "اِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ اِلٰى قُلُوْبِ بَنِىْ اٰدَمَ فَمَقَتَ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ اِلَّا غَيْرَ اَهْلِ الْكِتٰبِ" ③ اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضب آلود نگاہ سے دیکھا، عرب کو بھی عجم کو بھی۔ یعنی کہیں خیر باقی نہیں رہ گئی تھی، ہر جگہ ظلمت ہی ظلمت تھی، ہر جگہ برائی ہی برائی پھیلی ہوئی تھی سوائے چند اہل حق کتابیوں کے جو پہاڑوں میں اور گھاٹیوں میں پڑے ہوئے تھے اور بستیوں میں ان کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ تو کلیتہً دنیا میں ایسا دور تو کبھی نہیں آیا کہ حق سرے سے باقی ہی نہ رہے۔ یہ دنیا قائم ہی حق کے اوپر ہے۔ باطل محض

---

① پارہ :۱۷، سورة الانبياء، الآية:۱۸. ② پارہ :۱۸، سورة النور، الآية:۴۰.

③ الصحيح لمسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها اهل الجنة، ص: ۱۱۷۴ رقم: ۷۲۰۷.

ہوتو دنیا اسی دن تباہ کردی جائے گی۔ تو ایسا کوئی دور نہیں آیا کہ حق سرے سے دنیا میں نہ رہے یہ ضرور ہوتا ہے کہ حق مخفی ہو گیا، مغلوب ہو گیا، کم ہو گیا، لیکن رہا ضرور۔

تو اس دور میں یہ کیفیت تھی فرمایا کہ ''اِلَّا غَیْرَ اَھْلِ الْکِتٰبِ'' سوائے چند اہلِ کتاب کے جو بیچارے گرد آلود اور بہت ہی پھٹے پرانے حال میں پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے اپنے دین کو بچائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے دنیا قائم تھی، اگر دنیا میں اتنا حق بھی نہ ہوتا تو یہ (دنیا کا) خیمہ اُکھڑ جاتا۔ حدیث شریف میں جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ'' قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا دنیا کے اندر موجود رہے گا، جب ایک بھی نہ رہے گا اسی وقت قیامت قائم کردی جائیگی۔ ① تو قیامت عالم کی موت کا نام ہے یعنی موت نہیں آئے گی جب تک حیات کی ذرا بھی رمق باقی رہے گی اور اس عالم کی حیات اللہ کا ذکر اور اس کا نام ہے۔ تو ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود رہے گا تو قیامت نہیں آئیگی، جب ایک بھی نہیں رہے گا وہی وقت عالَم کی موت کا ہوگا۔ اس لئے آدم علیہ السلام سے لیکر قیامِ قیامت تک کوئی دور ایسا نہیں آیا اور نہ آئے گا جس میں حق کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ بس جب دنیا کو ختم کرنا ہوگا تب حق کا نشان مٹ جائے گا باطل ہی باطل رہ جائے گا۔ تو اس زمانۂ جاہلیت میں جب باطل انتہا کو پہنچ گیا تھا، جب ظلمتیں انتہا کو پہنچ گئی تھیں......تب بھی گنے چنے اہلِ کتاب یعنی اہلِ حق موجود تھے، جو پہاڑوں میں پڑے ہوئے تھے۔ بستیوں سے الگ چھپے ہوئے تھے، وہ اللہ کا نام لیتے تھے جس کی وجہ سے یہ (دنیا کا) خیمہ کھڑا تھا۔ عام حالت ظلمت کی تھی تو اللہ نے بنی آدم کے قلوب پر نگاہ کی ''فَمَقَتَ عَرَبَھُمْ وَعَجَمَھُمْ'' غضب آلود نگاہ سے دیکھا عرب کو بھی عجم کو بھی۔ قلوب کے اندر خیر باقی نہیں تھی ظلمت ہی ظلمت تھی۔ ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ان اندھیریوں میں غیرتِ خداوندی جوش میں آئی کہ اس ظلمت میں چاندنا کیا جائے تو فاران کی چوٹیوں سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ہاتھ میں سورج تھا اور ایک ہاتھ میں چاند۔ دو روشن چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھیں، ایک چمکتا ہوا سورج اور ایک چمکتا ہوا چاند۔ کیونکہ اس ظلمت کو دور کرنے کے لئے دو قسم کی روشنیوں کی ضرورت تھی، دُھری روشنی کی ضرورت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لائے کہ دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور بائیں ہاتھ میں چاند۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ وہ یہ سورج ہوگا جو آسمان پر چمکتا ہے اور یہ چاند ہوگا جو رات کو چمکتا ہے۔ ان چاند و سورج کی کوئی حیثیت اور وقعت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت کے سامنے ان انوار کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

آپ کا اعلانِ تبلیغ اور عرب قوم کا طرزِ عمل......انکی تو کُل حیثیت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنة و صفة نعیمها، باب الصفات التی یعرف بها اهل الجنة، ص: ۱۱۷۴ رقم: ۷۲۰۷.

جب راہِ حق کی دعوت دی اور پورا عرب دشمن ہو گیا تو قریش نے مل کر ابو طالب کو واسطہ بنایا اور کہا: خدا کیلئے اپنے بھتیجے سے کہہ دو کہ وہ جو چاہے ہم سے لے لے مگر ہمارے بتوں کا برائی سے نام نہ لے، ہمارے دین کی تضحیک نہ کرے، وہ جو چاہے ہم سے لے لے۔ تم اپنے بھتیجے کو سمجھا دو ورنہ پھر اس کے بعد ہمارے اوپر ذمہ داری نہیں رہے گی۔ تو ابو طالب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: کہ اے میرے بھتیجے! قوم نے مجھے وکیل بنا کے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں قوم کا پیغام تیرے پاس پہنچا دوں اور وہ یہ ہے کہ تو نے۔ وہ دعویٰ کیا ہے اور دعوت دینا شروع کی ہے اگر تیرا مقصد یہ ہے کہ کچھ پیسے روپے جمع ہوں، سونا چاندی جمع ہو...... تو تیری قوم اس کے لئے تیار ہے کہ پورے ملک کا سونا جمع کر کے تیرے قدموں میں ڈال دیا جائے، اگر حسن و جمال مقصود ہے تو قریش کی بیٹیاں حاضر ہیں جس کو تو چاہے قبول کر لے، اگر سرداری مطلوب ہے تو آج سے ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ تجھے پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیں اور ہم تمہارے سامنے رعیت کی حیثیت سے آ جائیں...... جو تمہارا مقصد ہو کر لو مگر خدا کے لئے ہمارے معبودوں کو جو ہم نے بنا رکھے ہیں ان کو برا بھلا مت کہو اور ہمارے دین کے بارے میں کوئی برا کلمہ استعمال مت کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے چچا! کہہ چکے جو تم نے کہنا تھا؟ قوم کا پیغام سنا چکے؟ ابو طالب نے کہا: ہاں سُنا چکا۔ فرمایا کہ میری طرف سے تم انہیں کہہ دو کہ اے میری قوم! تم اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج لا کر رکھ دو اور ایک ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دو تب بھی میں یہ کلمہ کہنا نہیں چھوڑوں گا جو میں زبان سے نکال چکا ہوں...... بس یا تو میں اپنی جان ختم کر دوں گا یا دنیا میں اس کلمہ کو پھیلا کر رہوں گا۔ تو اس چاند سورج کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کُل یہ حقیقت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ دونوں بھی آ جائیں تو میں اپنا کلمہ چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ یعنی وہ کلمہ جس کو میں لے کر کھڑا ہوا ہوں جو توحید و رسالت کا بیان ہے، اس کے مقابلے میں اس چاند و سورج کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ① تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں جو تشریف لائے تو ہاتھ میں یہ چاند سورج نہیں تھا۔ اس چاند سورج کی تو کوئی وقعت اور حقیقت ہی نہیں ہے۔ میری مُراد سورج اور چاند سے کیا ہے......؟ آپ اس شان سے آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب موجود تھی جو سورج سے زیادہ روشن تھی اور بائیں جانب ''قلبِ محمدی'' تھا جس میں اخلاق کی نورانیت بھری ہوئی تھی۔ تو ایک طرف آفتاب کہ جس کی روشنی علم خداوندی تھی، یعنی قرآن کریم جو اس علم سے لبریز ہے۔ اور ایک طرف اخلاق محمدی کی روشنی تھی جو قلب نبوت میں بھرے ہوئے تھے۔ تو دو چیزیں آپ لے کر آئے تھے ایک چمکتا ہوا علم اور ایک چمکتے ہوئے اخلاق۔ ایک روشن کتاب اور ایک روشن دل۔

بنیادِ نبوت...... اور یہ اس لئے کہ بہر حال حکماء و فلاسفہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ چاند میں خود اپنی روشنی نہیں ہوتی۔

---

① الابانة الکبریٰ، ج: ۱۰ ص: ۶۴.

بلکہ سورج اس کے مقابلہ میں آتا ہے سورج ہی کی روشنی اس میں سے ہو کر گزرتی ہے تو وہ ٹھنڈی بن جاتی ہے۔ وہی سورج کی تیز روشنی تھی جب چاند میں آتی ہے تو وطن کی اور موقع کی خصوصیات کی وجہ سے اسمیں ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے آگ کو اگر کسی خاص وطن سے اور موقع سے گزارا جائے تو وہ برودت کے آثار پیدا کرتی ہے۔

یہی آپ کی بجلی جو پاور ہاؤس سے چلتی ہے اگر آپ اس کو کسی مشین کے اندر لگا دیں تو وہ آگ ہے (ہیٹر وغیرہ)، اس میں تیزی ہے، اسمیں گرمی اور حدت ہے، ہاتھ لگا دیں تو آپ کے ہاتھ کو پکڑ لے گی اور جلا دے گی لیکن یہی بجلی اگر اس کو ریفریجریٹر کے ذریعہ سے نمایاں کریں تو یہی بجلی ٹھنڈی ہو جاتی ہے، پھل رکھ دو تو ٹھنڈے ہوں گے، کھانا رکھ دو تو ٹھنڈا ہوگا۔ یہ وہی آگ ہے جو پاور ہاؤس سے چلتی ہے لیکن مقام اور موسم کی خصوصیت کی وجہ سے اسمیں ٹھنڈک کے آثار پیدا ہو گئے۔ تو ایک چیز ایک جگہ آگ ہوتی ہے جو قابل تحمل نہیں ہوتی اور وہی چیز دوسرے مقام میں لا کے رکھی جائے تو قابل برداشت ہو جاتی ہے۔

تو اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب یعنی علمِ خداوندی اتنا بالا اور اُونچا تھا کہ مخلوق اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی مگر جب اسی علمِ الٰہی کو قلبِ نبوت سے گزارا گیا اسمیں اعتدال کی روشنی پیدا ہو گئی۔ اس میں ٹھنڈک اور برودت آ گئی جو قابل قبول بن گئی تا کہ دنیا اس سے استفادہ کر سکے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں اس شان سے تشریف لائے کہ آپ کے ایک ہاتھ میں سورج تھا یعنی اللہ کی روشن کتاب اور ایک ہاتھ میں چاند تھا یعنی اخلاق نبوت اسمیں بھرے ہوئے تھے اور اسمیں روشنی بھی تھی۔ تو ایک علم اور ایک اخلاق۔ یہ چیزیں آپ لے کر آئے۔ آپ دیکھیں اور غور کریں کہ نبوت کی بنیاد دو چیزوں کے اوپر ہے ایک علمی کمال اور ایک عملی کمال۔ یہی دونوں چیزیں ہیں جو تمام کائنات کی سعادت ہیں۔ علمِ کامل اور عمل کامل، اگر علم نہ ہو روشنی نہیں ہو سکتی، راستہ نظر نہیں آ سکتا، منزل مقصود سامنے نہیں آ سکتی اور اگر اخلاق نہ ہوں تو راستہ کے اوپر چلنے کی قوت پیدا نہیں ہو سکتی، اخلاق قوت مہیا کرتے ہیں، علم راستہ نمایاں کرتا ہے تو عالم کا علم اس کو چلا نہیں سکتا، صرف راستہ دکھلانا علم کا کام ہے، چلنا آدمی قوت سے ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تب منزلِ مقصود پر آدمی پہنچتا ہے۔ تو اس لئے علم کی بھی ضرورت پڑتی ہے عمل کی بھی تو نبوت کی بنیاد دو چیزیں ہیں: ایک علمی کمال اور ایک اخلاقی کمال۔

کمالِ علم وعمل کی کُل چار قسمیں ہیں...... اسی واسطے قرآن کریم میں کمالِ علم اور کمالِ عمل کے لحاظ سے چار نوعیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ ① جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ کن لوگوں کے ساتھ ہوگا؟ وہ نبیوں کے، صدیقوں کے، شہداء کے اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ تو چار قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک نبی، ایک صدیق، ایک شہید اور ایک صالح۔ غور کیا جائے تو یہ چاروں

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۶۹۔

قسمیں علم اور عمل کے لحاظ سے مزید دو قسمیں ہیں۔ علم کی بارگاہ کی دو قسمیں ہیں نبی اور صدیق اور عمل کی بارگاہ کی بھی دو قسمیں ہیں شہید اور صالح۔ پہلی قسم: یعنی علم اولاً نبی کے قلب پر آتا ہے کہ نبی علم کے لحاظ سے اصل ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ تو صدیق اور تصدیق یہ بھی علم کی ایک قسم ہے۔ نبی گویا نبأ سے ہے جس کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ اور صدیق کے معنی تصدیق کنندہ کے ہیں اور تصدیق خود علم کی قسم ہے تو حاصل یہ نکلا کہ نبی اور صدیق یہ علم کے دو افراد ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ نبی علم میں اصل ہے اور صدیق تابع ہے۔ بالذات اور اصل علم کے لحاظ سے نبی ہے اور تابع ہونے کی حیثیت دیکھی جائے تو وہ صدیق کی ہے۔ تو صدیق نبی کے تابع ہوتا ہے اس لئے علم کے دو افراد ہو گئے؛ ایک نبی اور ایک صدیق۔ عمل کے بھی دو ہی افراد ہیں ایک شہید اور ایک صالح۔ شہید اصل ہوتا ہے عمل میں اور صالح اس کے تابع ہوتا ہے۔ شہید اسے کہتے ہیں جو اللہ کے راستے میں فقط خواہشات ہی نہیں بلکہ اپنے نفس کو بھی ختم کر دے۔ جو جان تک اللہ کے راستے میں لگا دے وہ شہید ہے اور صالح اس کو کہتے ہیں جو نیکی کا راستہ اختیار کر لے یعنی نفس کی خواہشات کو پامال کرتا رہے جو اللہ کی مرضی کو آگے رکھے اسے صالح کہتے ہیں۔ تو شہید اگر جان دے کر فضا ہموار نہ کرے صالحین کی صلاح چل نہیں سکتی۔ صالحین اپنی صلاح پر جبھی قائم رہیں گے جب فضا پُرامن ہو فتنے نہ ہوں اور امن قائم ہو۔ اگر دنیا میں فتنہ پھیلا ہوا ہے تو نمازی کو نماز کی ہوش رہے گی نہ تلاوت کرنیوالے کو تلاوت کا ہوش رہے گا، نہ درود پڑھنے والے کو درود کا ہوش رہے گا تو شہداء اپنی جان دے کر فضا صاف کرتے ہیں تاکہ صالحین اپنی صلاح کو برت سکیں۔ اس لئے اعلیٰ ترین عمل شہید کا ہوتا ہے، صالح اس کے تابع ہوتا ہے تو عمل میں شہید اصل ہے اور صالح اس کے تابع۔ علم میں نبی اصل ہے صدیق اس کے تابع ہے۔ تو ایک علم کا کمال ہے اور ایک عمل کا کمال ہے۔ تو دو فرد علم کے ہیں اور دو فرد عمل کے ہیں، نبی اور صدیق علم کے فرد ہیں، ایک اصل اور ایک تابع۔ اور شہید اور صالح عمل کے افراد ہیں: ایک اصل اور ایک تابع۔ یہ دو چیزیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ دنیا کے اندر سعادت کی بنیاد دو ہی چیزیں ہیں ایک علم اور ایک عمل۔ تو نبوت کی بنیاد درحقیقت یہی دو چیزیں ہیں انبیاء علیہم السلام ایک علمی کمال لے کر آتے ہیں اور ایک عملی کمال جن کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں۔

عمل کی بنیاد اخلاق ہیں...... اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں اگر اندر اخلاق نہ ہوں عمل سرزد نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے اندر شجاعت کے اخلاق موجود ہیں تو حملہ آوری، ہجوم اور اِقدام کے افعال آپ سے سرزد ہوں گے، اگر آپ کے اندر سخاوت کا مادہ اور خُلق موجود ہے تو داد و دِہش، دینا اور غریبوں کے ہاتھ پہ رکھنے کے افعال آپ کے ہاتھ سے نمایاں ہوں گے، اگر بخل کا مادہ موجود ہے تو آپ عطاء نہیں کریں گے، اگر بزدلی کا مادہ موجود ہے تو آپ پیچھے کو ہٹیں گے۔ تو اندر کا مادہ فعل کو حرکت دیتا ہے۔ اسی اندرونی مادے کو جو فعل کو حرکت میں لایا اخلاق کہتے ہیں تو جیسے اخلاق ہوں گے ویسے اعمال سرزد ہوں گے تو عمل کی قوتیں درحقیقت اخلاق ہیں لیکن اخلاق اپنا کام کر نہیں

سکتے جب تک کہ راستہ نظر نہ آئے، علم راستہ دکھاتا ہے۔ تو دو ہی چیزیں کمالات کی بنیاد ہوگئیں ایک علم اور ایک اخلاق۔ علم راہ دکھلائے گا اور اخلاق اس پر چلائیں گے، اخلاقی قوت آدمی کو اس پر دوڑائے گی۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ریل گاڑی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ انجن دوڑتا ہے اور ہزاروں لاکھوں من بوجھ والی لوہے کی گاڑی کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے جاتا ہے، مگر انجن کے چلنے اور منزل تک پہنچنے کی شرط کیا ہے؟ ایک تو یہ کہ اس کے سامنے لائن بنی ہوئی ہو، لوہے کی لائن اس کے سامنے بچھی ہوئی ہو، جس پر انجن کو اتارا جا سکے اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے اندر اسٹیم کی طاقت بھری ہوئی ہو، آگ اور پانی کو جمع کر کے بھاپ کی طاقت اس کے اندر بھر دی جائے۔ تو اگر لائن بچھی ہوئی نہ ہو تب بھی انجن نہیں چل سکتا اور لائن بچھی ہوئی ہو مگر انجن کے اندر اسٹیم کی طاقت نہیں ہے تب بھی انجن نہیں چل سکتا۔ لائن پر انجن کھڑا ہوا ہے مگر اندر نہ آگ ہے نہ پانی اور بھاپ کی طاقت پیدا نہیں ہوتی تو دھکیل دھکیل کے آپ اسے کہاں تک چلائیں گے؟ ہزاروں آدمی مل کر دھکا دینے لگیں گے تو یہ بالشت بھر چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا۔ تو جب تک انجن کے اندر چلنے کی طاقت نہ ہو تو نہیں چل سکتا۔ اور اگر اندر طاقت بھری ہوئی ہے مگر لائن بچھی ہوئی نہیں ہے تو جتنا زور سے چلے گا زمین میں دھنستا چلا جائے گا، منزلِ مقصود پر کبھی نہیں پہنچے گا۔ تو منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دو ہی شرطیں ہیں کہ لائن بھی بچھی ہوئی ہو اور اس لائن پر چلنے کی قوت بھی موجود ہو اور اسٹیم کی طاقت بھی ہو تب چلے گا۔ اور چلے گا تو پھر ایسا چلے گا آپ اس کے ساتھ ہزار ہا من لوہا اور ہزار ہا من بوجھ جوڑ دیں سب کو گھسیٹ کر منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ ہزاروں ڈبے، ہزاروں انسان، ہزاروں اشیاء اور سامان سب کو گھسیٹ گھساٹ کے منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ اس لئے دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

شریعت اور طریقت کا حسین امتزاج ...... تو ٹھیک اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر انسان مثل انجن کے ہے، اس میں بھی دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ اس کے سامنے کھلا ہوا چلنے کا سیدھا راستہ، اسے منزل سامنے نظر آئے اور ایک اس کے اندر چلنے کی طاقت موجود ہو، تو وہ سیدھا راستہ جس پر چل کر یہ منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی کا نام صراطِ مستقیم ہے اور شریعت حقہ ہے ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ (1) یہ ہے میرا سیدھا راستہ، اس کا اتباع کرو اس کی پیروی کرو۔ تو وہ راستہ جس پر آدمی چلے گا اس کا نام شریعت ہے لیکن راستہ سامنے ہو، محض نظر آ جائے، مگر اندر چلنے کی طاقت نہ ہو تو آدمی چل نہیں سکے گا۔ وہ اندر کی طاقت کیا ہے؟ وہ اخلاق کی قوت ہے...... جس کو طریقت، ریاضت اور مجاہدہ سے پیدا کرتی ہے، پھر عشقِ نبوی کی وہ آگ پیدا ہوتی ہے جو ہر مسلمان کے اندر سلگ رہی ہے تو آگ اور اسٹیم اسے اس راستے کے اُوپر دوڑاتی ہے۔ اگر راستہ سرے سے نہیں ہے چلنے کی کوئی شکل نہیں ہے اور نہ اندر عشقِ محمدی موجود ہے نہ عشقِ خداوندی موجود ہے تو اس میں چلنے اور دوڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ تو شریعت کا علم راستہ دکھلاتا ہے اور طریقت کی ریاضت چلنے کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ جب دونوں

(1) پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۴.

چیزیں جمع ہوتی ہیں تو پھر ایسے آدمی صرف خود ہی نہیں چلتے بلکہ ان کے پیچھے ہزاروں انسانوں کو جوڑ دو وہ سب کو گھسیٹ کر منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان میں اس کی طاقت ہوتی ہے۔ تو دو طاقتوں کی ضرورت ہے ایک شریعت کی طاقت اور ایک طریقت کی طاقت۔ طریقت اخلاق بنائے گی اور شریعت راستہ دکھلائے گی: ﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ﴾ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان کے لئے مدرسہ کی بھی ضرورت ہے اور خانقاہ کی بھی ضرورت ہے۔ اگر مدرسہ نہ ہو اور تعلیم نہ ہو تو علم سامنے نہیں آسکتا اور اگر خانقاہ نہ ہو اور اخلاق درست نہ ہوں تو چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو جمع کیا جائے جب جا کے آدمی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

مولویت اور صوفیت میں جنگ کیوں؟...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ جو آجکل مولویوں اور صوفیوں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے پچھلوں کی جنگ تو ایسی نہ تھی۔ اگر حقیقی معنوں میں ایک سچا عالم ہو تو صوفی کا اس سے زیادہ قدردان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر سچا درویش اور صوفی ہو تو عالم کا اس سے زیادہ قدردان کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر علم بھی ناتمام ہو اور عشق بھی ناتمام ہو تو یہ اس کا مدِّ مقابل ہو گا وہ اس کا مدِّ مقابل ہو گا۔ یہ لڑائی اب بعد کے لوگوں میں چلی ہے، پہلے کے کاملین میں کبھی لڑائی پیدا نہیں ہوئی۔

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی محفلِ سماع اور حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا احتساب

......حضرت سلطان المشائخ وسلطان الاولیاء خواجہ نظام الدین دہلویؒ آپ جانتے ہیں کہ کتنے بڑے پائے کے عالم ہیں، درویش ہیں، صوفیاءِ چشتیہ میں اُن کا آفتاب کا سا مقام ہے۔ ایک روشن دل اللہ نے ان کو عطاء فرمایا تھا۔ بہت بڑی ذات ہے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اُس زمانے میں جبکہ حضرت خواجہ کے فیوض وبرکات سے دنیا مالا مال ہو رہی تھی، اخلاقی دولتیں کما کما کے لے جا رہی تھی...... اسی زمانے میں حکومت کی طرف سے حکیم ضیاء الدین سنامی رحمۃ اللہ علیہ جو کوتوال اور محتسب تھے اس کی نگرانی کرتے تھے کہ کوئی بداخلاقی یا خلافِ شرع حرکت نہ کرنے پائے۔ کسی کو بھی دیکھا کہ بدعات میں مبتلا ہے یا خلافِ شرع امور میں مبتلا ہے فوراً گرفتار کرتے تھے۔ پھر حکومت کی جانب سے احتساب ہوتا تھا اور سزائیں دی جاتی تھیں۔

پہلے تو یہ واقعہ سُناؤں کہ دونوں کا مقام کیا ہے؟ حضرت سلطان المشائخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یارانِ طریقت بیٹھے ہوئے تھے اور سماع ہو رہا تھا مگر سماع کی صورت باجے گاجے کی نہیں تھی جو مُحقِّق مشائخ ہیں ان کے ہاں مزامیر اور باجے گاجے نہیں ہوتے۔ سماع کے معنیٰ یہ تھے کہ خوش آوازی سے پڑھنے والا کوئی نعت پڑھ رہا تھا کوئی غزل پڑھ رہا تھا جس میں اربابِ احوال کے قلوب کی گرہیں کُھل جاتی تھیں، گُتھیاں کُھل جاتی تھیں تو خوش آوازی سے کوئی پڑھنے والا مغنی پڑھ رہا تھا اور سب پر حالات طاری ہو رہے تھے اور کیفیات طاری ہو رہی تھیں۔ اس لئے کہ سماع حضراتِ صوفیاء نے حظِّ نفس کے لئے نہیں سُنا۔ جب قبض طاری ہو تو قبض کو دفع کرنے کا ایک

علاج ہے ایک معالجہ ہے کوئی غذا نہیں ہے کہ رات دن کھائی جائے۔

محض ایک علاج ہے معالجہ کے طور پر اسے استعمال کرتے تھے تو انقباض رفع کرنے کے لئے یارانِ طریقت جمع تھے اور جائز حدود میں سماع ہو رہا تھا اس میں "مزامیر" نہیں تھے، باجے گاجے نہیں تھے مگر ظاہری طور پر بظاہر ایک ایسی چیز تھی کہ خلافِ شرع مجمع نظر آتا تھا۔ یا اس درجہ کی چیز تھی کہ یہ تو خواص ہیں مگر ان کے اس فعل کو دیکھ کر عوام کہیں باجے گاجے بھی استعمال نہ کرنے لگ جائیں۔ تو حکیم ضیاء الدین سنامیؒ نے آکر اس کو روکنا چاہا اور ڈانٹ کر کہا کہ خلافِ شرع امر بند کرو مگر وہاں ہوش کسے تھا جو سُنتا، وہاں تو سب اربابِ احوال تھے اپنے اپنے حال میں غرق، لہٰذا کسی نے نہ سُنا۔ حکیم ضیاء الدینؒ نے دیکھا کہ کوئی سُنتا نہیں...... سمجھ گئے کہ صاحبِ حال لوگ ہیں، یہ نہیں کہ کوئی بغاوت یا تمرّد کر رہے ہیں، بلکہ واقعی حال میں غرق ہیں تو اوّل تو اتمامِ حجت کے لئے زور سے کہا کہ بند کرو اس سماع کو، لوگوں میں اس سے فتنہ پھیلے گا، وہاں کون سُنتا تھا۔ سارے صاحب حال تھے تو حکیم ضیاء الدینؒ نے حکم دیا کہ خیمے کی طنابیں کاٹ دو، جب خیمہ ان کے سر پر گرے گا جب یہ سماع کو بند کریں گے۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر طنابیں کاٹ دیں، مگر وہ خیمہ ہوا کے اوپر قائم رہا۔ ساری رسیاں کٹ گئیں خیمہ نہیں گرا۔ اب بے چارے حکیم ضیاء الدینؒ صاحب کیا کریں! امر بالمعروف بھی کر دیا اور تغییر بالید بھی کر دی کہ ہاتھ سے اس چیز کو مٹانا بھی چاہا مگر نہیں مٹی، اس واسطے کہ وہ تو سچے لوگ سن رہے تھے سب کے سب اربابِ حال تھے۔ اب یہ دیکھا کہ کسی طرح نہیں بن پڑی تو یہ خیال ہوا کہ کہیں سپاہیوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہی امرِ حق ہے، یہ خواہ مخواہ ہم سے امرِ حق کا مقابلہ کرا رہے ہیں تو کہا دیکھو کہ یہ سارے بدعتی ہیں اور بدعت میں مبتلا لوگ ہیں مگر اس وقت یہاں سے چلو، اس وقت یہ غرق ہیں، کسی دوسرے وقت میں امر بالمعروف کریں گے۔ چنانچہ اپنے سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے گئے اور خیمہ اسی طرح کھڑا رہا۔ تو سماع کی یہ کیفیت تھی تو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے مُریدین اور جو بیٹھنے والے تھے چونکہ سارے سچے تھے، اربابِ حال تھے، اور سماع کسی حظِ نفس کے لئے نہیں تھا بلکہ ترقیٔ مدارج کے لئے یا رفعِ قبض کے لئے تھا۔ اس سچائی کی وجہ سے خیمہ اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ اپنی جگہ درست تھے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی ڈانٹ ڈپٹ اپنی جگہ درست تھی۔ اس واسطے کہ وہ نظامِ شریعت کے قائم کنندہ تھے، انکی حیثیت پولیس اور فوج کی تھی۔ تو پولیس کا کام یہی ہے کہ قانون کے خلاف کوئی چیز دیکھے تو فوراً ڈانٹ ڈپٹ کرے۔

حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مقام...... اس کے ساتھ ساتھ دوسری کیفیت یہ تھی کہ جب حکیم ضیاء الدینؒ کی وفات کا وقت آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور اطلاع کرائی کہ جا کے حکیم ضیاء الدین سے عرض کیا جائے کہ نظام الدین مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے تو حکیم صاحب نے اندر سے جواب بھجوایا کہ روک دو، میں بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ خواجہ نظام الدینؒ نے جواب بھجوایا کہ عرض کر دو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔ اسی وقت حکیم ضیاء الدینؒ نے

اپنی پگڑی بھیجی کہ اسے بچھا کے خواجہ صاحبؒ اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے کے ساتھ قدم رکھیں ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحبؒ نے پگڑی کو اُٹھا کے سر پہ رکھا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے اور اس شان سے تشریف لے گئے، آ کر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی موجودگی ہی میں حکیم ضیاء الدینؒ کی وفات کا وقت آ گیا اور خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ الحمد للہ حکیم ضیاء الدینؒ کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا ہے کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

اپنے اپنے فرائض پہ دونوں قائم ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی پگڑی بھیجتے ہیں کہ جوتیوں سمیت قدم رکھ کے آئیں، ان کا یہ حال ہے کہ اسے سر کے اوپر رکھا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے، میرے لئے سعادت ہے تو اِدھر ولی کامل ہیں جو طریقت میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور اُدھر عالم ربانی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کو پہچانتے ہیں اگر معاذ اللہ دونوں ناقص ہوتے...... وہ ان کے مقابل آتے اور وہ ان کے مقابل آتے۔ دنیا میں جھگڑا فتنہ پھیلنا شروع ہو جاتا تو کاملین کا فرق یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عظمت کو پہچانتے ہیں ایک دوسرے کی بڑائی اور بزرگی کو مانتے ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام...... انہیں حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت خواجہ صاحب کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو کسی نے ایک شعر پڑھا، خواجہ صاحبؒ پر وجد طاری ہوا اور کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔ حکیم ضیاء الدینؒ نے دامن جھٹک کر کہا: بیٹھ جاؤ! خبردار! شریعت کی عظمت کو سامنے رکھو۔ خواجہ صاحبؒ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر کسی نے شعر پڑھا، خواجہ نظام الدین پر پھر وجد طاری ہوا پھر کھڑے ہو گئے تو حکیم ضیاء الدینؒ نے پھر دامن تھاما کہ بیٹھ جاؤ، آدابِ شرعیہ کو سامنے رکھو پھر بیٹھ گئے۔ تیسری دفعہ پھر کسی نے شعر پڑھا اور پورے وجد کے ساتھ خواجہ نظام الدین کھڑے ہوئے اور رقص کرنے لگے تو حکیم ضیاء الدینؒ بھی کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کے گردن جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو حکیم ضیاء الدینؒ سے پوچھا گیا کہ پہلے دو دفعہ میں تو تم نے دامن جھٹک کر خواجہ صاحبؒ کو بٹھالیا اور تیسری دفعہ جب وہ کھڑے ہوئے تو تم بھی ان کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اگر بھلائی تھی تو پہلے کیوں روکا تھا؟ اور بُرائی تھی تو تیسری بار میں ہاتھ باندھ کے کیوں ساتھ ہو گئے؟ تو حکیم ضیاء الدینؒ نے جواب دیا کہ پہلی دفعہ جب خواجہ صاحبؒ کھڑے ہوئے تو انکی روح کو عروج ہوا، آسمانِ دنیا تک روح پہنچی، یہاں تک میری رسائی تھی میں پکڑ لایا اور کہا کہ تم فرشی ہو! بندگی کی صورت اختیار کرو، ایسا عروج مت اختیار کرو جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، وہاں سے پکڑ لایا۔ دوبارہ عروج ہوا تو پھر حضرت خواجہ صاحبؒ کی روح ساتویں آسمان تک پہنچی، میری بھی وہاں تک رسائی تھی تو پھر پکڑ کے لایا کہ اپنی حد پر قائم رہو زیادہ عروج میں مت آؤ۔ تیسری دفعہ عروج ہوا تو تجلیاتِ الٰہیہ سامنے تھیں...... میں بھی ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا، میں بدعتی کی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ تجلیاتِ الٰہیہ کے

سامنے کھڑا ہوا تھا۔

صوفیاء کیلئے علماء کی ذمہ داری......اس سے اندازہ ہوا کہ حکیم ضیاء الدین خود بھی صاحب باطن تھے مگران کو شریعت کے نظام کو قائم رکھنے، اس کی بقاء اور اس کے استحکام کا کام سپرد تھا تو علماء کی مثال پولیس جیسی ہے اور صوفیاء کی مثال ہے جیسے مقربانِ بادشاہی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے دربار میں ہر وقت حاضر ہیں۔ تو بادشاہ کے دربار میں لوگ بعض اوقات ایسی بے تکلفی کی باتیں کرتے ہیں کہ باہر آ کے وہ باتیں نہیں کر سکتے۔ بادشاہ کی موجودگی میں بے تکلفانہ کر گزرتے ہیں لیکن وہی باتیں اگر سڑک پر آ کر کریں گے تو پولیس کے آگے جوابدہ ہونگے۔ وہ چلاّتے رہیں کہ ہم تو مقربانِ بادشاہی ہیں۔ پولیس کہے گی کہ بادشاہ کی مجلس میں جا کے جو چاہے کرو، منظر عام پر جب آؤ گے تو قانون کی پابندی کرنے پڑے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم قانون کی حفاظت کریں، جب تم مقامِ قرب میں پہنچو اور بادشاہی دربار میں موجود ہو تو جو تمہارا جی چاہے کرو وہ قانون سے بالاتر چیز ہے لیکن جب آؤ گے سڑک پر، جب آؤ گے میدان میں، جب آؤ گے لوگوں میں......تو یہاں قانون کی پابندی کرنا پڑے گی۔ ہم نہیں جانتے کہ تمہارا کیا حال ہے! کچھ بھی ہو مگر ہم قانون کے سپاہی ہیں تو علماء کی مثال پولیس جیسی ہے اور صوفیاء مقربانِ شاہی ہیں تو وہ اپنی بے تکلفی میں کچھ بھی کریں لیکن باہر آ کر کریں گے تو شریعت کے نظام کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

سماع کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط کا واقعہ......میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند جو صرف عالم ہی نہیں تھے عارف کامل بھی تھے، ربانی بھی تھے، درویش بھی تھے، صاحبِ کشف و کرامات اور اولیاء اللہ میں سے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دفعہ خلیجے میں تشریف لے گئے۔ خلیجے میں حضرت کے بہت سے مریدین اور متوسلین تھے تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب جو حضرت کے شاگردوں کے شاگرد تھے، ان کے دیوان خانے میں عصر کے بعد حضرت کی مجلس ہوئی، چار پانچ سو آدمی حضرت کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، جنہوں نے مجھے یہ واقعہ سُنایا ان کا نام حاجی امیر شاہ صاحبؒ ہے، یہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص خدام میں سے تھے، مخصوص متوسلین میں سے تھے، انہوں نے واقعہ بیان کیا کہ حضرت کی مجلس تھی تو اس مجلس میں اچانک ان کا بھتیجا آ گیا۔ رنگ مست خان اس کا نام تھا، گلا نہایت بہتر پایا تھا، موسیقی کا بڑا بھاری استاذ تھا اور امیر شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اس کی حالت یہ تھی کہ ایک دفعہ ہم دوست احباب جمع تھے، کچھ کھانے پکانے کا سامان ہو رہا تھا تو کچھ دوست گوشت دھو رہے تھے کچھ پیاز کاٹ رہے تھے اور کچھ لوگ پانی کے گھڑے بھر رہے تھے یعنی سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے تو رنگ مست خان آ گیا اور اس نے آ کر مکان کے دروازے میں داخل ہوتے ہی حافظ شیرازیؒ کی یہ غزل شروع کی کہ:

غلام نرگسے مستے کہ تاج دارانند　　　خرابِ بادۂ لعلے کہ ہوشیار انند

کہتے تھے کہ اس شان سے پڑھی ہے کہ ایسا سماں بندھا کہ جس کا چاقو پیاز میں تھا وہ پیاز ہی میں رہ گیا، جس کا

ہاتھ گھڑے پر تھا تو گھڑے پر رہ گیا، جو سل بٹے پر مصالحہ پیس رہا تھا اس کا ہاتھ بٹے پر رہ گیا جیسے معلوم ہو کہ سب پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی، لوگوں نے اپنے ہوش گم کر دیئے تو اس کی آواز اس غضب کی تھی۔

امیر شاہ صاحب مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں یہ رنگ مست خان آ گیا اور حضرت کی چار پائی پر پائنتیوں آ کے بیٹھ گیا۔ حضرت سرہانے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب کہتے تھے کہ میرے پھوپھا نے حضرت کی پشت سے رنگ مست خان کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ شروع کر دے۔ اس نے یہ غزل شروع کی کہ:

غلام نرگسے مستے کہ تاج دارانند

لیکن مست ''غلام نرگسے مستے'' تک آیا اور آگے چپکا ہو گیا اس کے بعد میرے پھوپھا نے حضرتؒ کی پشت سے پھر اشارہ کیا کہ بھئی پڑھتا کیوں نہیں؟ اس نے پھر غزل شروع کی، اب کے ''غلام نرگسے'' تک آیا پھر چپ ہو گیا۔ پھر میرے پھوپھا نے گھورا کہ پڑھتا کیوں نہیں؟ تو پھر اس نے لے باندھ کر یہ شروع کی اب کے صرف ''غلام'' کہہ کر رک گیا اور چپ ہو گیا...... یہاں تک کہ مجلس برخاست ہو گئی۔ تو امیر شاہ صاحب کہتے تھے کہ میرے پھوپھا نے کہا کہ کم بخت! اس دن تو تو نے اس طرح پڑھا کہ سماں باندھ دیا اور معلوم ہوا کہ سب پر سکتہ طاری ہو گیا ہے آج تجھ پر کیا مصیبت آئی تھی؟ اس نے کہا جو مجھ پر مصیبت آئی وہ تم نے نہیں دیکھی۔ کہا کیا مصیبت آئی؟ کہا کہ پہلی دفعہ جب میں غلام نرگسے مستے تک پہنچا ہوں تو حضرت نانوتویؒ کا ہاتھ بڑھا اور میری زبان پکڑ لی اب میں کیا کرتا چپ ہو گیا، پھر تم نے گھورا پھر میں نے شروع کیا، اب کے ''غلام نرگسے'' تک آیا تو حضرت کا ہاتھ پھر بڑھا اور میری زبان پکڑ لی، میں مجبور ہو کر چپکا ہو گیا تیسری دفعہ تم نے گھورا، پھر شروع کیا اب کے ''غلام'' کہنے پایا تھا کہ پھر زبان پکڑ لی۔ انہوں نے کہا: کہ ہم نے تو نہیں دیکھا! کہا: خدا کی قسم تینوں دفعہ ہاتھ بڑھا اور میری زبان کھینچ لی۔ یہ تو اس نے کہا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خان صاحب کو (یعنی امیر شاہ صاحب) کو خطاب کر کے ایک جملہ فرمایا...... جس سے ان لوگوں کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے، فرمایا: کہ خان صاحب جس طرح سے میں ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں اسی طرح مجھ پر مولویت کا دھبہ بھی لگا ہوا ہے، اس کی رعایت کرنا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے۔ اب اگر یہ غزل اس طرح سے ہو جاتی تو کہنے والے یوں کہتے کہ مولوی بھی گانے بجانے کے اندر مشغول ہو گئے یہ کوئی نہ دیکھتا کہ کونسی جائز حد تھی اور کونسی ناجائز حد تھی!۔

جائز اور مشتبہات میں خواص کی ذمہ داری...... تو خواص کو بہت سی جائز چیزیں بھی ترک کرنا پڑتی ہیں، اس بناء پر کہ کہیں عوام اس سے آگے نہ مبتلا ہو جائے۔ عوام کی خاطر بعضی جائز چیزیں ترک کر دینا پڑتی ہیں...... احتیاط سمجھ لیں، تقویٰ سمجھ لیں، بہر حال چھوڑ دینی پڑتی ہیں جیسے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَّبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِه ①

① الصحيح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ص: ٦ رقم: ٢.

حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام چیزیں بھی کھلی ہوئی ہیں، حلال و حرام کے بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، ان میں حلال ہونے کا شائبہ بھی موجود ہے اور حرام ہونے کا شائبہ بھی موجود ہے۔ متقی وہ ہے جو ان مشتبہات سے بچ جائے، جو بچ کر جائیگا وہ اپنے دین کو ہر بُرائی سے بری کر لے جائیگا۔ تو مشتبہات سے بچنا یہ تقوی کا ایک شعبہ ہے اور کاملین مشتبہات سے تو ضرور بلکہ بعض جائز چیزوں سے بھی بچ جاتے ہیں کہ لوگ حرام میں نہ مُبتلا ہو جائیں۔

عوام کو مکروہات سے بچانے کیلئے علماء کا جائز کو ترک کرنا...... امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اثر نقل کیا ہے اور اس کو حدیثِ مرفوع کہا ہے، سند جس درجے کی بھی ہو مگر بہر حال ایک چیز ہے جو قواعد شرعیہ کے بالکل مطابق ہے اور وہ اثر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب علماء جائزات کے حصول کی فکر میں پڑ جائیں گے تو عوام مکروہات کا ارتکاب کریں گے، جب علماء مکروہات کا ارتکاب کریں گے تو عوام حرام میں مبتلا ہوں گے اور جب علماء حرام چیزوں میں مبتلا ہوں گے تو عوام کفر میں مبتلا ہوں گے۔ اس واسطے سب سے زیادہ احتیاط خواص کے لئے ضروری ہوتی ہے کہ وہ عوام کی خاطر اور ان کو بچانے کی خاطر مکروہات تو مکروہات بعض جائز چیزوں کا بھی ترک کر دیں تا کہ ان کے جائزات کے ارتکاب کرنے سے عوام مکروہات کا ارتکاب نہ کرنے لگ جائیں تو حضرات اہل اللہ کی شان یہ تھی کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ جس طرح میں صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مجھ پر مولویت کا دھبہ بھی لگا ہوا ہے اس کی رعایت رکھنا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے۔ اگر یہ غزل آج ہو جاتی تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں تھا یہاں کوئی باجے گاجے نہیں تھے کوئی ہارمونیم نہیں تھا، کوئی ستار وغیرہ نہیں تھا۔ خوش آوازی سے ایک بات ہوتی مگر بہر حال مجلس مولوی کی تھی عوام یہ کہتے کہ گانا بجانا ہو رہا ہے وہ پھر اپنے لئے ستار بھی جائز کر لیتے۔ اس واسطے یہ اہل اللہ اتنی احتیاط برتتے ہیں۔

مقامِ علم و مقامِ اخلاق...... تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مقام دو ہی ہیں: ایک علم کا مقام ہے اور ایک اخلاق کا مقام ہے۔ علم راستہ دکھلاتا ہے اخلاق چلنے کی قوت پیدا کرتے ہیں، دونوں چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تب آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ تو نبوت بھی درحقیقت دو ہی بنیادوں پر قائم ہے ایک کمالِ علمی ایک کمالِ اخلاقی، یہی دو چیزیں انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں اور یہی بنیادِ نبوت ہیں۔ جب یہ بنیادِ نبوت کا معیار ہوئی تو اس سے خود سمجھ لیجئے کہ جو ذاتِ اقدس کمالِ علم میں اس رتبہ پر پہنچ جائے کہ اس رتبہ پر اور کوئی نہ پہنچا ہوا ہو اور اخلاقی کمال میں اس مقام پر پہنچ جائے کہ کوئی اس مقام پر بھی نہ آیا ہو تو وہی نبی سب سے بڑا نبی ہوگا، اس لئے کہ معیارِ نبوت جو کچھ تھا وہ اسمیں حدِ کمال پر آیا ہوا ہے۔

ذاتِ نبوی میں شانِ علم...... جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھا جائے تو علم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ“ مجھے اگلوں کے اور پچھلوں کے تمام علوم عطاء کر دیئے گئے ہیں۔ جتنے پچھلوں کو علوم دیئے گئے...... تمام انبیاء جو جو علوم لے کر آئے ہیں

وہ سارے علوم میری ذات میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تو اگلوں کے علوم یعنی انبیاءِ سابقین کے سارے علوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں اور پچھلوں کے علوم بھی یعنی قیامت تک جو آنے والے ہیں؛ علماء، فضلاء اور حکماء وغیرہ ان سب کے علوم بھی۔ ظاہر بات ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پروردہ ہیں، وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم سے ہی مستفیض ہیں، وہ تو ہیں ہی آپ کے علوم، آپ ہی کی جوتیوں کے صدقے سے عالم عالم بنے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی جوتیوں کے صدقہ سے صدیق صدیق بنے، تو وہ تو ہیں ہی آپ کے علوم۔ لیکن بتلایا گیا کہ پچھلے انبیاء کے جو علوم ہیں وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع کر دیئے گئے ہیں کہ جتنے اگلوں کے علوم تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں جمع ہیں اور جتنے پچھلوں کے علوم تھے وہ بھی ایک ذات میں جمع ہیں۔ تو ایک عظیم نکتۂ خیر اللہ نے پیدا کیا کہ اگلے اور پچھلے سارے علوم اس میں جمع کر دیئے گئے،

ذاتِ نبوی میں اجتماعِ علوم کی محسوس مثال...... تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محسوس مثال علم کے لحاظ سے ایسی ہوگی جیسے کہ آپ اپنے اندر دیکھتے ہیں کہ چہرے پر آنکھ ہے تو آنکھ بھی عالم ہے مگر صورتا، رنگ کو دیکھے گی اور صورت وغیرہ کو پہچانے گی۔ آوازوں کا پہچاننا یہ آنکھ کا کام نہیں، ہاں کان ہیں وہ آوازوں کا علم حاصل کرتے ہیں کہ آواز اچھی ہے یا بُری، بلند ہے یا پست، تو کان آوازوں کے عالم ہیں، وہ صورتیں نہیں دیکھتے۔ ناک خوشبو اور بدبو کی عالم ہے وہ سونگھ کر بتلا دے گی کہ گلاب کا پھول ہے اور چنبیلی کا پھول ہے، لیکن ناک یہ چاہے کہ گلاب کی شکل دیکھ لے...... یہ ناک کا کام نہیں ہے۔ زبان کا کام یہ ہے کہ وہ ذائقہ بتلائے کھٹا ہے یا میٹھا، یا نمکین ہے زبان کو اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تو آوازیں سُن لے تو زبان کا یہ کام نہیں ہے۔ تو اس چہرے میں آنکھ بھی موجود، کان بھی موجود، زبان بھی موجود اور ناک بھی موجود۔ دوسرے لفظوں میں گویا یوں کہا جائے کہ یہ علماء کی ایک بستی ہے اور ہر فن کا عالم الگ الگ ہے۔ آوازوں کا عالم کان ہے، صورتوں کی عالم آنکھ ہے، ذائقوں کی عالم زبان ہے، خوشبو اور بدبو کی عالم ناک ہے۔ یہ سارے علماء ہیں اپنے اپنے موضوع کا علم رکھتے ہیں۔ اور یہ اللہ کی صناعی اور حکمت ہے کہ اسی ایک بالشت کے چہرے میں ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں۔ کان میں اور آنکھ میں زیادہ سے زیادہ فرق ہے دو تین انچ کا، کان اور آنکھ میں کوئی زیادہ فاصلہ...... میل دو میل کا نہیں ہے کہ کان آنکھ کے کاموں میں دخل نہ دے سکے، کان کو یہ موقع نہیں ہے کہ وہ آنکھ کا کام سرانجام دے۔ ملے ہوئے ہیں مگر اپنی حدود سے باہر قدم نہیں لے جا سکتے۔ تو ہر ایک اپنے اپنے علمی کام میں مشغول ہے۔ لیکن یہ سارے علوم کان، ناک، آنکھ، زبان کے...... یہ خدا تعالیٰ نے حسِ مشترک میں جمع کر دیئے ہیں؛ جس کو ''اُمُّ الدِّ مَاغ'' کہتے ہیں۔ دماغ کا یہ جو ابتدائی حصہ ہے اس میں سارے علوم جمع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ آنکھ سے دیکھتے ہیں تو آنکھ تو دیکھ کر فارغ ہو جاتی ہے لیکن صورت دماغ میں موجود رہتی ہے۔ اگر آنکھ میں صورت رہتی ہے تو پھر آنکھ نے اپنا کام جو ختم کیا تھا اور آنکھ پر پردہ آگیا تھا تو صورت ماند ہو جانی چاہیے تھی، لیکن جس چیز کو آپ نے دیکھ لیا ہے دیکھنے کے بعد بھی آپ آنکھ بند کریں تب بھی

صورت آپ کے سامنے موجود رہتی ہے تو یہ کوئی خزانہ ہوگا جس میں یہ صورت جمع ہو جاتی ہے، وہی دماغ کا خزانہ ہے۔

آپ نے روٹی چکھ لی اور ذائقہ معلوم کر لیا لیکن جب کھانے پینے کا کام ختم ہو گیا تب بھی ذائقہ کا ایک اندازہ آپ کے قلب میں موجود ہے۔لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں دستر خوان پر اتنے برس ہوئے میں نے کھانا کھایا تھا گویا اب تک وہی ذائقہ زبان میں موجود ہے تو یہ احساس کیسے ہے اب تک..... کیا یہ ذائقہ ابھی تک موجود نہیں ہے؟ کسی ذائقہ کا یاد رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ ذائقہ موجود ہے، کہ زبان نے ذائقہ چکھ لیا اور چکھ کر خزانے میں پہنچا دیا وہاں موجود ہے۔آنکھ نے صورت کو دیکھ لیا اور صورت کو لے جا کے خزانے کے اندر جمع کر دیا، وہاں ساری صورتیں جمع ہیں اب جب آپ کا جی چاہے آپ انہیں دیکھ لیں۔آپ نے اگر دِلّی کی سیر کی ہوگی جامع مسجد دیکھی ہوگی، لال قلعہ دیکھا ہوگا تو دیکھا تو ایک دفعہ تھا لیکن اگر دن میں دس بار اپنے ملتان میں بیٹھ کر دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار   اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

بس جہاں گردن جھکائی پوری جامع مسجد سامنے موجود، پورا لال قلعہ سامنے موجود، تو کہیں تو جمع ہے..... تبھی تو سامنے ہو جاتا ہے، یقیناً اندر موجود ہے۔تو یہ سارے حالات اندر کی کارگزاریاں ہیں اور جو کچھ انکی معلومات ہیں وہ آپ کے ذہن میں یا دماغ میں جمع ہیں تو یہ ام الدماغ ہے۔یہ اُن سارے حالات کا مجموعہ ہے، اسمیں دیکھنے کی طاقت بھی ہے، سُننے کی طاقت بھی ہے، چکھنے کی طاقت بھی ہے اور خوشبو بدبو کے ادراک کی طاقت بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ سارے جب اپنا کام کر گذرتے ہیں تو ان کے محسوسات دماغ کے اندر جمع رہ جاتے ہیں تو خزانہ اصل ہوا، بلکہ غور کیا جائے تو دیکھنے میں آنکھ اصل نہیں ہے بلکہ دماغ ہی دیکھنے میں اصل ہے۔دماغ متوجہ ہوتا ہے تب آنکھ دیکھتی ہے اگر دماغ متوجہ ہی نہ ہو آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔کُھلے بندوں آپ بازار چلے جائیں جہاں تماشے ہو رہے ہوں جب آپ واپس آئیں گے تو دوسرا بھائی کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑے تماشے ہو رہے تھے، آپ کہیں گے کیسا تماشہ؟ وہ کہے گا: یہ سب جلوس تھے اور رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں..... لیکن آپ کہتے ہیں: میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا، وہ کہے گا: بندۂ خدا! آپکی آنکھ کھلی ہوئی تھی کہ نہیں؟ تو آپ یہی کہیں گے کہ اوہو! میں اپنے دھیان میں ہی غرق رہا مجھے پتہ ہی نہیں چلا کیسا جلوس، معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے، آپ کا دل دیکھنے والا ہے، دل متوجہ نہیں تھا تو آنکھوں سے آپ کو کچھ نظر نہیں آیا تو اصل میں دیکھنے کا خزانہ اندر موجود ہے، چکھنے کا خزانہ اندر موجود ہے اور سُننے کا خزانہ اندر موجود ہے، یہ کان اور ناک وغیرہ محض آلات ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کی خدانخواستہ آنکھ پھوڑ دی جائے تو دماغ میں اس سے خلل نہیں آتا، کان نہ رہیں تو دماغ میں نقصان نہیں ہوتا لیکن دماغ پر لاٹھی ماردی جائے تو آنکھ بے کار، پاؤں بھی بیکار اور ناک بھی بے کار پھر کوئی حواس اس کے اندر باقی نہیں رہے گا۔اس لئے کہ جب خزانہ ٹوٹ گیا جہاں سے فیض پہنچ رہا تھا تو کان، ناک، آنکھ تو سب بے کار ہو گئے۔لیکن اگر آنکھ، کان اور ناک باقی نہ رہے تو دماغ کا کوئی نقصان نہیں، اس واسطے کہ وہ اصل خزانہ ہے۔

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو غور کیجئے کہ اس عالَم میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ ہر نبی کا ایک مخصوص علم ہے، ہر نبی کو کچھ خصوصی علوم عطاء کئے گئے ہیں، لیکن دین ایک ہی دیا گیا۔ مگر دین کے بتلانے اور سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو مختلف علوم دیئے گئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء وصفات کا علم دیا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① یوسف علیہ السلام کو ملک گیری اور خوابوں کی تعبیر کا علم دیا گیا: ﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ② حضرت خضر علیہ السلام کو علم لَدُنی دیا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کا علم دیا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ﴾ ④ سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر کا علم دیا گیا کہ پرندوں کی بولیاں جانتے تھے: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑤ ہر نبی کا ایک مخصوص علم ہے۔ تو سارے انبیاء ایسے ہیں کہ کوئی آنکھ ہے، کوئی ناک ہے اور کوئی کان ہے، مختلف علوم کے حامل ہیں۔ لیکن جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال اُمّ الدماغ کی ہے کہ سارے حواس کا علم لاکر اس دماغ میں جمع کر دیا گیا ہے۔

دماغ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے یا دماغ ہی نہ رہے تو آنکھ، ناک اور کان وغیرہ کچھ نہیں رہتا لیکن اگر آنکھ، کان اور ناک باقی نہ رہیں تو دماغ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تو سارے انبیاء گذر چکے ہیں مگر دماغ اسی طرح قائم ہے۔ لیکن خدانخواستہ دماغ نہ ہوتا تو نہ آنکھ رہتی، نہ کان رہتے اور نہ ناک رہتی، کوئی چیز نہ رہتی۔ تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم درحقیقت خزانۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفاد اور نکلے ہوئے ہیں۔ اصل نکتۂ خیر حق تعالیٰ کی جانب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے فیضان سے انبیاء میں نبوتوں کے علوم آئے یعنی سبب آپ بنائے گئے ہیں۔ آپ کے ذریعہ سے اور آپ کے سبب سے انبیاء علیہم السلام کو علوم عطاء فرمائے گئے ہیں۔

نبی الانبیاء پر ایمان لانے کیلئے انبیاء کو پابند کیا گیا ...... حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''خصائص کبریٰ'' میں یہ حدیث نقل کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں: ''اَنَا نَبِيُّ الْاَنْبِيَاءِ'' اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں میں نبیوں کا نبی ہوں، میں نبیوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے اور کہا ہے کہ تم اس نبی پر ایمان لاؤ، فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ⑥ اللہ نے نبیوں سے عہد لیا، کیا عہد لیا؟ کہ جب میں تمہیں کتاب بھی دوں، حکمت بھی دوں، نبوت بھی عطا کروں اور پھر وہ رسول عظیمُ الشان ...... کونسا؟ وہ جو تم سب کی تصدیق کرے، جو کچھ میں نے تمہیں علوم دیئے ہیں ان سب کی تصدیق کرے تو تمہارا کام کیا ہوگا؟ ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ کہ تم اس کے اوپر ایمان

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۳۱۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۱۔ ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۶۵۔
④ پارہ: ۱۷، سورۃ الأنبیاء، الآیۃ: ۸۰ ⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔ ⑥ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱۔

لاؤ، اگر زمانہ پاؤ تو ایمان لے آؤ اور نہ پاؤ تو اپنی قوموں کو ہدایت کرو کہ ایمان لائیں، یہ بھی تمہارا ایمان لانا ہے۔ جس سے اندازہ ہوا کہ آپ پر ایمان لانے کا نبیوں کو پابند کیا گیا ہے۔

اصل الاصل ایمان صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ اصل میں ایمان نبی کا ہوتا ہے۔ مؤمن جو ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمارا ایمان نبی کے ایمان کا عکس ہوتا ہے۔ ہم تم جو مؤمن ہیں اصلی مؤمن نہیں ہیں، اصلی مؤمن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کے طفیل سے ہم ساروں پر ایمان کا عکس پڑ گیا تو ہم تم بھی مؤمن نظر آنے لگے۔ بالاستقلال ہمارا ایمان نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے تابع محض ہے کیونکہ اصل حقیقی مؤمن آپ ہیں اور آپ کے ایمان کی چمک اور روشنی جس پر پڑ گئی وہ مؤمن کہلانے لگا تو اصل میں ایمان کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ ہمارے ایمان کا وجود تابع ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے وجود کے۔

بالکل اسی طرح جیسا کہ آفتاب نکلے اور مختلف دھوپوں کے ٹکڑے آپ دنیا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں کوئی گول ہے، کوئی چوکور ہے، کوئی مثلث ہے اور کوئی مربع ہے تو اگر دھوپ سے پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ تو یوں کہے گی کہ آفتاب کا جز اور آفتاب کا ایک حصہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خود اصلی وجود کچھ نہیں، وجود تو آفتاب کا ہے اس کی وجہ سے میرا وجود بھی نظر آتا ہے۔ میں خود آفتاب سے کٹ کر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ میرا وجود اسی وقت تک قائم ہے جبتک کہ میں آفتاب کی کرنوں سے وابستہ رہوں۔ اگر میں اس سے کٹ جاؤں تو میرا وجود ختم ہو جائے۔

تو مؤمن کے ایمان کا وجود اصل میں نبی کے ایمانی وجود کے تابع ہے۔ تو جب انبیاء علیہم السلام مؤمن بنائے گئے اور ہدایت کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ تو ایسی صورت بن گئی کہ حقیقی ایمان صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اور آپ کے فیضان سے پھر انبیاء علیہم السلام کو بھی ایمان عطاء کیا گیا۔ لہٰذا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و ایمان کا ''نکتۂ خیر'' ہیں۔

تو اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اگلوں کے...... یعنی سارے انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے ہیں وہ میرے سینے میں جمع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضان سے دوسروں کو پہنچائے گئے ہیں۔ آپ حسِ مشترک اور امّ الدماغ ہیں۔ اور انبیاء مثل آنکھ، ناک اور کان کے ہیں۔ جس کسی کو بھی کوئی علم ملا...... اس علم کا فیض یہاں سے پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں: ''عُلِّمَ آدَمُ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا کَمَا عُلِّمْتُ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا'' آدم علیہ السلام کو سارے اسماء و صفات کا علم دیا گیا جیسا کہ سارے اسماء و صفات کا مجھے علم عطا کیا گیا ہے۔ ①

① کنز العمال، ج: ۱۲ ص: ۱۸۵، رقم: ۳۴۵۸۸ (الدیلمی عن ابی رافع)

تعبیرِ خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ علمی...... حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیرِ خواب کا علم دیا گیا اور قرآن کریم میں متعدد واقعات خواب کی تعبیر کے آئے ہیں جو یوسف علیہ السلام سے وابستہ ہیں۔ یہ بڑا عجیب علم ہے لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھا جائے تو آپ نے فقط خوابوں کی تعبیر ہی نہیں دی بلکہ فنِ تعبیر کے اصول بھی بتلا دیئے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمّت کے اندر بڑے بڑے مُعَبِّر بن گئے۔ تعبیرِ خواب کے امام پیدا ہو گئے، بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ تو یوسف علیہ السلام نے تعبیریں بتلائیں اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خواب کی تعبیر کے اصولِ کُلّی بتلائے۔ اس سے تعبیر دینے والے تیار ہو گئے جو کہ لاکھوں کی تعداد میں گذرے ہیں۔ یہ ایک مستقل علم اور فن بن گیا۔

تعبیرِ خواب کے عجائبات

واقعہ ۱: خواب میں آگ دیکھنا...... امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا کہ جلدی جا اور اپنے گھر سے بال بچوں اور سامان کو نکال دے، تیرا گھر گر پڑے گا۔ یہ گیا، جلدی جلدی سامان نکالا، بیوی بچوں کو نکالا، ساری چیزیں باہر نکالیں آخر چند گھنٹے کے بعد سارا مکان اوپر سے نیچے آن پڑا۔ تعبیر ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہو گئی۔ کوئی پانچ چھ ماہ کے بعد پھر ایک شخص آیا اور اس نے کہا: کہ حضرت! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں! فرمایا: چارپائی کے نیچے کھدائی کر! تجھے سونا ملے گا۔ کھدائی کی تو دیکھا کہ لاکھوں روپے خالص سونا، زرِ سُرخ ملا اور وہ شخص مالدار ہو گیا۔

لوگوں نے امام ابن سیرینؒ سے عرض کیا کہ ایک شخص نے یہی خواب دیکھا آپ نے اس کا تو گھر گروا دیا اور دوسرے نے وہی خواب دیکھا تو اُسے خزانہ دلا دیا۔ ایک نے کیا قصور کیا تھا اور دوسرے نے کونسا انعام کا کام کیا تھا، خواب تو ایک ہے! فرمایا کہ پہلے نے گرمی کے موسم میں خواب دیکھا تھا اور گرمی میں چارپائی کے نیچے آگ دیکھنا یہ انہدامِ بنیاد کی دلیل ہوتی ہے تو میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر جائے گا۔ دوسرے نے یہ خواب دیکھا سردی کے موسم میں اور سردی میں چارپائی کے نیچے آگ انتہائی نعمت اور خوشگوار چیز ہوتی ہے اور اس کی آگ کی صورت سونے کی صورت کے مشابہہ ہوتی ہے تو میں نے تعبیر دیدی کہ سونا ملے گا۔ تو گویا فنِ تعبیرِ خواب کے اصول ہیں انہیں اصولوں کی رو سے تعبیریں منقح ہو جاتی ہیں واضح ہو جاتی ہیں۔

واقعہ ۲: امام مالکؒ کا خواب اور ابن سیرین کی تعبیر...... انہی ابن سیرینؒ اور امام مالکؒ کا زمانہ ہے۔ امام مالکؒ جلیل القدر امام ہیں، تابعی بھی ہیں اور صاحبِ مذہب ہیں۔ امام مالکؒ کی حالت یہ تھی کہ مدینہ منورہ سے انتہائی محبت تھی اور مدینہ کی محبت میں غرق تھے۔ درحقیقت محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھی، اس کی وجہ سے امام مالکؒ کو مدینہ کی ایک ایک چیز عزیز تھی، مدینہ کی زمین کا ایک ایک ذرّہ عزیز تھا اور یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے

میں مدینہ کی زمین میں دفن ہو جاؤں۔ اس ڈر کی وجہ سے نفلی حج ادا نہیں کرتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر میرا انتقال نہ ہو جائے۔ یہ چاہتے تھے کہ یہیں انتقال ہو اور یہیں دفن ہو جاؤں۔ جی چاہتا ہے حج نفل ادا کرنے کو مگر اس ڈر کی وجہ سے نہیں جاتے تھے۔

ایک دن خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دربار ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دربار میں حاضر ہیں تو بڑے درد والتجاء سے عرض کیا اور بڑی لجاجت سے کہا: کہ یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کر لے اور اسی ڈر کے مارے حج نفلی نہیں ادا کرتا کہ مدینہ سے باہر جا کے کہیں میرا انتقال نہ ہو جائے اور مدینہ سے باہر دفن نہ کر دیا جاؤں تو مجھے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ ابھی عمر کے کئی برس باقی ہیں تو ہر سال نفلی حج ادا کر لیا کروں گا۔ اس لئے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ اُٹھا کر اس طرح پانچ انگلیاں سامنے کر دیں اور ادھر انکی آنکھ کھل گئی۔

امام مالکؒ حیران کہ پانچ انگلیوں سے مراد آیا یہ ہے کہ پانچ ماہ تمہاری عمر کے رہ گئے ہیں! یا پانچ برس مراد ہیں! یا پانچ دن مراد ہیں! یا پانچ ہفتے مراد ہیں! میں نے عمر کی مدت پوچھی تھی آپ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں...... اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ ہفتے مراد ہیں! پانچ ماہ مراد ہیں! یا پانچ برس!۔

اس لئے ایک آدمی کو ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا تا کہ اس خواب کی تعبیر پوچھ کر آئے مگر یہ تاکید کر دی کہ نام نہ لینا کہ مالک نے یہ خواب دیکھا ہے، یوں کہنا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے، میرا نام نہ لیا جائے، ذکر نہ کیا جائے۔ یہ خادم ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ایک نیک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس نے پوچھا کہ میری عمر کتنی باقی رہ گئی ہے؟ آپ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں تو اس خواب دیکھنے والے نے تعبیر پوچھی ہے۔ امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا: اس شخص نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔ فرمایا: کہ یہ خواب بہت بڑا عالم ہی دیکھ سکتا ہے، جاہل تو جاہل معمولی علم کا آدمی بھی یہ خواب نہیں دیکھ سکتا، یہ خواب کسی بڑے عالم کا خواب ہے اور مدینہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ تو کیا مالک رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ اب یہ چپ ہو گیا فرمایا: کہ جاؤ اس سے اجازت لے کر آؤ آکر بتاؤ! تب میں تعبیر بتلاؤں گا وہ شخص واپس آ گیا۔ اس نے جا کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا: کہ حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں، اس واسطے (نام ظاہر کرنے کی) اجازت دے دیجیے! فرمایا: اچھا میرا نام لے دو۔ اس نے آ کے نام لے دیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خواب دیکھا ہے۔

فرمایا کہ امام مالکؒ ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے یہ چھوٹے موٹے عالم کا کام نہیں تھا کہ یہ خواب دیکھتا۔ فرمایا: جا کر امام مالک کو تعبیر بتلا دو کہ تم نے اپنی عمر پوچھی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ انگلیاں دکھلائیں...... تو نہ پانچ

برس مراد ہیں، نہ پانچ مہینے مراد ہیں، نہ پانچ ہفتے مراد، بلکہ اشارہ ہے حدیث کی اس روایت اور قرآن کی اس آیت کی طرف ھِیَ مِنْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا اللہُ ① کہ کسی کی موت کا وقت ان پانچ چیزوں میں سے ہے کہ جن کا علم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ② اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم کہ کب آئے گی، کسی کو پتہ نہیں دیا گیا کہ کب آنے والی ہے اور بارش کی اصلیت وحقیقت کہاں سے ہے، اس کا بتدائی سرچشمہ کون ہے، کہاں سے چلتی ہے؟ اللہ کے سوا دوسروں کو پتہ نہیں ہے۔ اسباب کے درجے میں ہم کچھ پتہ چلالیں کہ مون سون آئے گا وہ برسے گا اور بادل بنیں گے......لیکن خود مون سون کیسے بنا! اس کے اوپر کا سرچشمہ کیا ہے اور اصل کی اصل کیا ہے! کس طرح پانی کی تکوین ہوئی؟ یہ سب اللہ ہی جانتا ہے۔

﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ﴾ اور ان اصولوں سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ لڑکا بنے گا یا لڑکی بنے گی......لڑکا ہوگا یا لڑکی! کسی جدید خبر گش سے کسی کو معلوم ہو جائے! یہ ممکن ہے، لیکن ان اصولوں کی اطلاع کہ لڑکا اور لڑکی رحمِ مادر میں کس طرح بنتے ہیں! یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ کسی شخص کو پتہ نہیں ہے کہ کل کس زمین میں وہ دفن کیا جائیگا! تو امام مالک کو کہہ دینا جاکے، کہ پانچ انگلیوں سے پانچ دن، پانچ سال یا پانچ مہینے مراد نہیں ہیں بلکہ پانچ اصول مراد ہیں کہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ کس زمین میں کون دفن ہوگا! کس زمین میں کس کا انتقال ہوگا!۔ تو امام ابن سیرینؒ نے یہ تعبیر دی اور فرمایا کہ امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں، اس واسطے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہ علمی جواب دیا ہے کہ ہر عالم اس خواب کی تعبیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیریں دی ہیں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآن وحدیث کی رُو میں تعبیر کے اصول قائم کر دیئے کہ جس سے تعبیر خواب ایک عظیم فن بن گیا اور اس سے بڑے بڑے امام بن گئے۔ بڑی بڑی کتابیں اس فن کے اندر لکھی گئیں۔ امام ابن سیرینؒ کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیریں اور اصولوں کو ایک کتاب کے اندر جمع کیا گیا ہے۔ دو بڑی ضخیم جلدیں ہیں "تَاْثِیْرُ الْمَنَامِ فِیْ تَعْبِیْرِ الْمَنَامِ" اس میں ہزاروں خوابوں کی تعبیریں ذکر کی گئی ہیں اور وہ اصول ذکر کیے گئے ہیں جن کے ذریعے خواب کی تعبیریں نکالی جاتی ہیں۔ ③ تو ابن سیرینؒ بڑے امام ہیں ان کے بعد بڑے بڑے علماء اور بھی گزرے جو بہترین تعبیریں دینے والے ہیں۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام، ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۴۸.

② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

③ یہ کتاب اردو میں ترجمہ ہو کر تعبیر الرؤیا کے نام سے اسلامی کتب خانوں میں عام دستیاب ہے۔

واقعہ۳: نواب صدیق کا حضور کی امامت کرنا...... قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے، مشہور تھے کہ ادھر تعبیر دی اور ہاتھ کے ہاتھ تعبیر کے مطابق واقعہ پیش آ جاتا۔ ان کے زمانے میں ایک شخص نے خواب دیکھا جو ایک نوجوان اہل حدیث تھا اس نے خواب دیکھا۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا زمانہ ہے اس زمانے میں قاضی محمد ایوب صاحب بھوپال کے قاضی القضاۃ ہیں۔ ان کے دفتر میں وہ نوجوان اہل حدیث ملازم تھا۔ قاضی صاحب دورے پر گئے بھوپال سے کوئی چالیس میل کے فاصلہ پر پڑاؤ تھا۔ اس نے خواب دیکھا اور قاضی صاحب کے پاس آ کے ذکر کیا کہ حضرت میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ نماز کیلئے ایک بہت بڑی جماعت کھڑی ہوئی ہے، لاکھوں آدمی ہیں، صفیں بندھی ہوئی ہیں اور صفِ اولیٰ میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور نواب صدیق حسن خاں امامت کرا رہے ہیں۔ یہ میں نے خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر کیا ہے؟

تو وہ نوجوان یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اسمیں اشارہ ہوگا نواب صدیق صاحب کی کسی فضیلت کی طرف! کسی منقبت، بزرگی اور بڑائی کی طرف...... جو امامت کرا رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا: کہ کیا واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے؟ کہا کہ حضرت واقعی! فرمایا: کہ اگر واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ بھی چُپ کا ہو گیا، اس کے ذہن میں جو بات تھی تعبیر اس کے برعکس آئی کہ اگر واقعی ایسے دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خاں فوت ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر بعد اطلاع آئی کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے ان کی بیماری چل رہی تھی۔ سب لوگ دوڑ گئے اور ماتمی جنازہ بن گیا، تین دن ریاست کی طرف سے ماتم رہا۔ تین دن کے بعد یہی اہل حدیث نوجوان قاضی صاحب کے پہنچا کہ حضرت تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوئی، جیسے تعبیر دی تھی وہ واقعہ ہو گیا...... لیکن آپ نے خواب کی یہ تعبیر کیسے سمجھی؟ ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب کی کوئی بڑائی، کوئی عظمت اور کوئی فضیلت ظاہر ہوگی، ان کو امام کے درجے پر دکھلایا گیا تھا؟ لیکن آپ نے بالکل برعکس تعبیر دی، یہ تعبیر آپ نے کیسے سمجھی؟۔

سُبحان اللہ! عجیب اصول بیان کیا ہے، فرمایا: کہ میں نے اس سے یہ تعبیر سمجھی کہ نبی کی موجودگی میں کسی کو امامت کا حق نہیں ہے، اگر نماز میں نبی کے آگے کوئی ہوگا تو جنازہ تو ہو سکتا ہے زندہ نہیں ہو سکتا...... کہاں پہنچا دماغ؟ یہ تعبیر اصول کو سامنے رکھ کر دی تو بڑے بڑے مُعَبِّر اس اُمّت کے اندر گذرے ہیں۔

واقعہ۴: یعقوب نانوتوی کا خواب اور قاسم نانوتوی کی تعبیر...... اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانئ دارالعلوم دیوبند بھی فنِ تعبیر خواب میں مشہور تھے کہ اُدھر تعبیر دی اِدھر واقعہ ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہو جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ عقلی دلائل بھی ہوتے۔ دلائل سے تعبیر دیتے کہ اس خواب کی تعبیر یہی ہونی چاہیے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور فقط عالم ہی نہیں تھے عارف باللہ اور کامل اولیاء اللہ میں سے تھے اور صاحبِ کشف و کرامت لوگوں میں سے تھے۔ وہ فرماتے

ہیں کہ میں نے ایک خواب دیکھا اور اپنے بھائی مولانا نانوتوی صاحب کی خدمت میں خواب پیش کیا۔ نانوتہ میں ہی خواب دیکھا، جامع مسجد میں نماز پڑھی اور حضرت نانوتوی سے عرض کیا کہ بھائی صاحب! میں نے خواب دیکھا ہے تعبیر کچھ سمجھ نہیں آئی۔

خواب یہ ہے کہ میں اپنے گھر سے چلا تو میں نے اپنے ساتھ دنبے کی شکل کا بھینسا دیکھا، جیسے بڑا...... بھینسا ہوتا ہے، ایسا وہ دنبہ ہے، وہ میرے مدّ مقابل آیا اور میرا راستہ روک لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینگ پکڑ لئے، میری اور اس کی کشاکشی ہو رہی ہے کبھی وہ مجھے دو گز دھکیل کے پیچھے کر دیتا ہے اور کبھی میں زور لگا کے اسے دھکیل دیتا ہوں اور وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ غرض اسی طرح کی کشاکشی ہوتی رہی...... اسی کشاکشی میں اس نے میری بائیں ران پر سینگ مارا تو دو تین قطرے خون کے نکل پڑے اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر انہوں نے عرض کیا: اس کی کیا تعبیر ہوگی؟ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حضرتؒ نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ''بنی اعمام'' میں کسی چھوٹی بچی کا انتقال ہو جائے گا۔ یہ تعبیر دے ہی رہے تھے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں فلاں صاحب کے جو بچی پیدا ہوئی تھی اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ فرمانے لگے لیجیے بھائی صاحب! تعبیر بھی آ گئی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی حیران، عرض کیا: کہ حضرت! تعبیر تو واقعی ہو گئی، مگر آپ اس سے کیسے سمجھے کہ ''بنی اعمام'' میں سے، چچا تایاؤں کی اولاد میں سے ایک بچی کا انتقال ہو جائے گا؟۔

تب حضرت نے اس کے دلائل بیان کرنا شروع کئے۔ یعنی خواب کا مسئلہ ہے اور اسے دلائل سے ثابت کر رہے ہیں۔ فرمایا: کہ آپ نے ایک دُنبے یا مینڈھے کو دیکھا جو بھینسے کی شکل میں ہے! پھر فرمایا: حدیث میں فرمایا گیا ہے: کہ موت کو قیامت کے دن مینڈھے کی شکل میں مُتشکّل کیا جائیگا اور جنت و دوزخ کے درمیان میں لاکر اس کو کھڑا کیا جائیگا۔ جنت والوں کو منادی کی جائیگی کہ سب جنت کی شہرِ پناہ پر آ جاؤ تو جنت والے ڈریں گے کہ کہیں جنت سے ہمیں نکالا تو نہیں جا رہا! ڈرتے ڈرتے شہر پناہ کے اوپر آ جائیں گے۔ پھر جہنم والوں کو منادی کی جائے گی کہ تم بھی شہر پناہ کے اوپر آ جاؤ! تو وہ اس توقع میں خوش ہو کر آئیں گے کہ شاید ہمیں جہنم سے نکلنے کی اجازت ہو جائے۔ تو دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں گے بیچ میں ایک مینڈھا کھڑا کر دیا جائیگا۔ پوچھا جائے گا: کہ اے اہلِ جنت اور اہلِ نار! جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ کہیں گے کہ: یہ موت ہے۔ اس لئے کہ سب کو سابقہ پڑ چکا ہوگا تو یہی...... مینڈھے کی شکل میں موت ہوگی، جس سے سلبِ روح ہوتی ہے۔ پھر اس مینڈھے کو ذبح کر دیا جائے گا، فرمایا جائے گا کہ اب موت کو موت آ چکی ہے۔ اے اہلِ جنت! اب موت کا کوئی سوال نہیں، جنت میں ابدالآباد کی زندگی بسر کرو۔ اور اے اہلِ جہنم! اب موت کو موت آ گئی ہے، ابدالآباد تک تم اسی جہنم میں رہو۔ تو جنت والوں کو اتنی خوشی ہوگی کہ اگر موت کو موت نہ آ گئی ہوتی تو شاید شادیٔ مرگ سے وہ مر جاتے اور جہنم والے اتنے حسرت زدہ ہوں گے کہ اگر موت کو موت نہ آ گئی ہوتی تو شاید حسرت و غم میں مر جاتے۔ بہر حال حضرتؒ نے مولانا

یعقوب کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ: موت کو مینڈھے کی شکل دی جائے گی اور آپ نے مینڈھے کو دیکھا اور سینگ پکڑ کر مقابلہ کیا تو آپ کا یہ مقابلہ موت سے ہوا۔ فرمایا: خواب کی تعبیر کا پہلا جز تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ عرب میں عربی زبان میں جب بھی قبیلوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو جدّی رشتوں کو بطن کہتے ہیں، یعنی پیٹ کا حصّہ۔ دادا پردادا وغیرہ یہ بطون کہلاتے ہیں اور بنی اعمام یعنی چچا تائے کے لڑکے، ان کو فخذ سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی ران کا حصّہ۔ تو فرمایا کہ آپ کا موت سے مقابلہ ہوا اور مقابلہ میں موت کا سینگ آپ کی ران میں لگا اس سے میں سمجھا کہ بنی اعمام میں موت واقع ہوگی، جدی رشتہ والوں سے کوئی نہیں مرے گا بلکہ چچا تائے کے رشتہ والوں میں سے کوئی مرے گا اور فرمایا کہ بائیں ران سے خون نکلا تو اس سے میں سمجھا کہ مرنے والی لڑکی ہوگی کیونکہ لڑکی بائیں جانب کی پیدائش ہے اور فرمایا کہ خون کے صرف دو تین قطرے نکلے اس سے میں سمجھا کہ کوئی چھوٹی عمر کی بچی ہوگی۔ ان سارے مقدمات کو ملا کر میں نے تعبیر دی اور وہ ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوگئی۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہ صرف کتنے خوابوں کی تعبیریں ہی ارشاد فرمائی ہیں بلکہ قرآن وحدیث میں ایسے اصول ارشاد فرمائے ہیں جس سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تعبیر دینے والے پیدا ہوگئے اور یہ ایک مستقل فن بن گیا۔

واقعہ ۵: تعبیرِ خواب میں مولانا قاسم نانوتویؒ کی باریک بینی ...... وہ بات یاد آگئی تو اسے بھی کہہ دوں پھر آگے چلوں۔ حضرت نانوتویؒ کی ہی خواب کی تعبیر کا ایک اور واقعہ بھی یاد آگیا۔ مولانا محمد منیر صاحبؒ جو حضرتؒ کے بھائی تھے۔ وہ ایک دن تشریف لائے کہ بھائی صاحب! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ خواب یہ ہے کہ بریلی کی جانب سے کچھ بطخیں اُڑتی ہوئی آئیں اور میرے مکان پر آکر اُتر گئیں اس کی کیا تعبیر ہوئی؟

حضرت نے فرمایا کہ بھائی جان! اگر آپ مٹھائی کھلائیں تو ہم آپ کو بیس روپے مہینہ کی ملازمت دلا دیں اور اگر مٹھائی نہیں کھلاتے تو پھر گیارہ روپے مہینہ کی ملازمت، انہوں نے کہا کہ حضرت میں مٹھائی کھلاؤں گا۔ تو فرمایا کہ: اس کی تعبیر یہ ہے کہ بریلی میں بیس روپے ماہوار پر تمہاری نوکری ہو جائے گی۔ یہ تعبیر دی چار پانچ دن کے بعد مولانا محمد منیر صاحبؒ کے پاس ان کے کسی عزیز کا خط آیا کہ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ پر کچھ معاشی تنگی ہے، خرچہ نہیں چل رہا تو میں نے فرضی طور پر آپ کے نام کی ایک درخواست دیدی اور وہ قبول ہوگئی، بیس روپے مہینہ کی ملازمت آپ کی ہوگئی ہے آپ چلے آئیں۔ وہ حضرت نانوتویؒ کے پاس آئے کہ وہ جو تعبیر دی تھی ...... تو واقعی بیس روپے کی ملازمت مل گئی ہے۔ مگر اول تو یہ عرض ہے کہ آپ نے اس خواب سے یہ تعبیر کیسے سمجھی؟

تو حضرتؒ نے واقعی عجیب دلیل بیان کی، فرمایا کہ: تم نے بریلی سے بطخیں آتی ہوئی دیکھیں، اس سے تو میں یہ سمجھا کہ بریلی کی طرف سے رزق حلال آئے گا اور تمہارے گھر میں رزق آگیا۔ پھر بطخوں کو تم نہیں لائے از خود آئیں اس سے میں یہ سمجھا کہ بلا طلب کے تمہاری ملازمت ہو جائے گی تو یہ بھی صحیح نکلا کہ تم نے درخواست بھی نہیں

دی تھی۔ اب یہ کہ ملازمت بیس روپے مہینہ کی ہو یا گیارہ روپے کی ہو! تو فرمایا: اس میں صورتِ حال یہ ہے کہ "بـــط" کا لفظ عربی میں تو مشددہ ہے، یعنی ایک ب اور دو ط سے اور فارسی میں یہ مخفف ہے ایک ب اور ایک ط سے۔ تو فارسی میں بط کہتے ہیں اور عربی میں بطّ کہتے ہیں۔

اب تعبیر دینے والے کو یہ اختیار ہے کہ فارسی کا لفظ لے لے یا عربی کا تو اگر میں فارسی کا بط لے لیتا تو اس میں ایک ب اور ایک ط ہے تو ب کے عدد دو اور ط کے عدد نو ہیں تو نو ۹ اور دو ۲ ملکر گیارہ ہوئے۔ اور عربی کا بطّ لیتا تو ایک ب اور دو ط ہوئیں تو ب کے دو، ایک ط کے نو اور دوسری ط کے بھی نو...... تو نو اور نو ملکر اٹھارہ، اٹھارہ اور دو بیس ہو گئے۔ معبر کو اختیار ہے کہ وہ فارسی کا بط لے یا عربی کا بطّ لے لے۔ اس واسطے میں نے یہ تعبیر دی تھی۔ یہ باریک بینیاں اسوقت تک نہیں ہوسکتیں جب تک تعبیرِ خواب کے اصول ذہن کے اندر نہ ہوں تو تعبیرِ خواب میں علم کی بھی ضرورت ہے، موسم کی پہچان کی بھی ضرورت ہے اور اعداد وشمار کے جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ شریعت نے قرآن وحدیث میں بہت سے اصول قائم کر دیئے ہیں اور یہ ایک مستقل فن بن گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات بابرکات میں علوم کی کثرت...... تو انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے وہ حدِ کمال کیساتھ جمع ہوکر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں ...... خواہ تعبیرِ خواب کا علم ہو، خواہ مَنْطِقَ الطَّيْر پرندوں کی بولیوں کا علم ہو اور خواہ اسماء وصفات کا علم ہو...... یہ سب علوم اسی ذات بابرکات میں جمع کر دیئے گئے ہیں اور آپکے بعد جو علماء آنے والے ہیں وہ آپ ہی کے در کے فیض یافتہ ہونگے، وہ تو عالم ہی اسلیئے ہونگے کہ آپکا فیض پہنچ رہا ہے۔ تو ایک ذات بابرکات میں سارے علوم کا ایک جھمگٹ ہے۔ جس خصوصیت سے آپکو علم دیا گیا وہ اوروں کو نہیں ملا تو اور انبیاء کی حقیقت فقط انبیاء کی ہے وہ صرف نبی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتَم الانبیاء ہیں اور ختمِ نبوت کے معنی منتہاءِ نبوت کے ہیں کہ نبوت کی انتہا ہوگئی۔

یعنی سارے درجاتِ نبوت اس ذاتِ اقدس کے اُوپر پورے ہوگئے۔ ظاہر بات ہے کہ جو خاتَم النبیین ہوگا وہ تمام اوصاف وکمالات میں بھی خاتَم ہوگا۔ تو خاتَم العلوم بھی آپ کو کہا جائے گا کہ تمام علوم کے درجات آپکے سینے میں جمع کر دیئے گئے۔ آپ کو خاتَم الاخلاق بھی کہا جائے گا کہ اخلاق کے سارے نمونے اور کمالات آپکی ذات بابرکات میں جمع کر دیئے گئے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ جب نبوت کا معیار اور مقامِ نبوت کی کسوٹی کمالِ علم اور کمالِ اخلاق ہے تو جس کا علم سب سے بڑا ہوگا اس کی نبوت بھی سب سے بڑی ہوگی۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا علم سب سے بڑھ کر بھی ہے اور سب پر حاوی بھی ہے، تمام علوم کے آپ جامع ہیں اور پھر آپ کے جو مخصوص علوم ہیں وہ الگ ہیں۔ اس لئے علم میں آپ سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور اسی واسطے آپ کو انبیاءِ سابقین کے لئے مُصَدِّق کہا گیا کہ آپ ان کی نبوت کی اور ان کے علوم کی تصدیق کرنے

والے ہیں اور تصدیق وہی کیا کرتا ہے جو پہلے سے علوم جانتا ہو، جو کسی چیز سے واقف نہ ہو وہ تصدیق نہیں کیا کرتا بلکہ وہ تو سلام کیا کرتا ہے تاکہ کسی کو علم نہ ہو جائے کہ یہ علم نہیں رکھتا۔ اور یہ کہنا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے اس چیز کو جانتا ہے تو آپ کو ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ (1) کہا گیا ہے کہ اے پیغمبرو! جو تمہیں علوم دیئے جائیں گے ان کی تصدیق کرنیوالے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے تو تصدیق کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ سارے علوم آپ کے اندر جمع تھے۔

اس کی شرح اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْن کی حدیث نے کردی یعنی مجھے اگلوں اور پچھلوں...... سب کے علوم عطاء کر دیئے گئے ہیں۔ جب آپ کی ذات بابرکات علوم میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہے تو نبوت میں بھی سب سے بڑا مقام ہوگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا نبی دوسرا نبی نہیں ہوسکتا، آپ ہی کو خاتم النّبیین بننا چاہیے تھا، آپ ہی نبیوں کے سردار بننے والے تھے اور آپ ہی کو نبی الانبیاء کہا گیا۔ تو ایک رکن مقامِ نبوت کا کمالِ علم ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے اُونچے تھے تو آپ کا مقام نبوت بھی سب سے اونچا ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اخلاق...... اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اخلاق میں بھی سب سے اونچا مقام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطاء کیا گیا اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو مقام سب سے آخری اور اونچا ہوتا ہے تو نیچے کے سارے مقامات اس میں جمع ہوتے ہیں مثلاً آپ یوں کہیں کہ فلاں آدمی ''بخاری'' پڑھا ہوا ہے تو بخاری آدمی کب پڑھے گا؟

پہلے میزان ومُنْشَعِب پڑھے، پھر قدوری پڑھے، پھر شرح وقایہ پڑھے اور پھر ہدایہ وغیرہ پڑھے...... تب جا کے بخاری پڑھے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جسے بخاری آگئی اسے میزان بھی آگئی، اسے منشعب بھی آگئی، اسے شرح وقایہ بھی آگئی اور ہدایہ بھی آگئی، نیچے کی ساری کتابیں آگئیں۔ لیکن جو میزان پڑھ چکا ہے ضروری نہیں کہ اسے بخاری بھی آجائے تو نیچے کی چیز جاننے سے اوپر کی چیز کا جاننا ضروری نہیں مگر جو اوپر والی چیز کو جان جائے تو نیچے کی ساری چیزیں جان جائے گا۔

قرآن وحدیث کی رُو سے اخلاق کی کُل تین قسمیں...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اخلاق کا اعلیٰ مقام دے دیا گیا تو اس کے نیچے جتنے مقامات تھے وہ خود بخود اس میں آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامعِ اخلاق بھی ہیں۔ اور وہ کس طرح سے......؟ وہ یہ کہ ہم نے جہاں تک غور کیا تو قرآن واحادیث سے اخلاق کی تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں؛ ایک اخلاقِ حسنہ، ایک اخلاقِ کریمانہ اور ایک اخلاقِ عظیم۔ خُلقِ حَسَن، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خطاب فرمایا کہ: یَا خَلِیْلِیْ! حَسِّنْ خُلُقَکَ! اے میرے خلیل! اپنے اخلاق کو حسن بناؤ۔ اگرچہ کفار کے ساتھ معاملہ پڑے تب بھی اخلاقِ حَسَنہ سے پیش آؤ۔ اس سے معلوم

(1) پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

ہوا کہ ایک خُلُقِ حَسَن ہے جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔

ایک خُلُقِ کریم ہے جسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ لِأُ تَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (1) میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ کریمانہ اخلاق کو مکمل کر کے تمہارے سامنے پیش کر دوں۔ اور ایک خُلُقِ عظیم ہے جو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذاتی خلق ہے، جس کو قرآن میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (2) اے نبی! آپ خُلُقِ عظیم کے اوپر ہیں۔ تو تین قسمیں نکلیں، ان تینوں میں فرق کیا ہے؟ خلق حسن ابتدائی درجہ ہے، خلق کریم درمیانہ درجہ ہے اور خلق عظیم انتہائی درجہ ہے۔

اخلاقِ حَسَنہ کی تشریح...... خُلُقِ حَسَن کہتے کسے ہیں؟ عدل کامل کو یعنی آپس کے معاملہ میں کوشش کرو کہ اس میں حدِّ اعتدال سے نہ گزرو۔ اگر آپ کو خدانخواستہ کوئی ایک تھپڑ مار دے تو آپ بھی اتنے ہی زور سے تھپڑ مار دو جتنی زور سے اس نے مارا تھا تو کہا جائے گا کہ آپ خُلُقِ حَسَن کے اوپر ہیں لیکن اگر آپ تھپڑ کے جواب میں مکّہ مارتے تو کہا جاتا کہ بڑے بداخلاق آدمی ہیں، اس نے تو تھپڑ ہی مارا تھا آپ نے مکّہ مار دیا، تعدّی کی اور زیادتی کی تو تعدّی اور ظلم سے بچ جانا یہ خُلُقِ حَسَن ہے۔

یعنی عدل کے اوپر قائم رہنا اور بال برابر اس چیز کا پورا پورا بدلہ دے دینا یہ خُلُقِ حَسَن کا مفہوم ہے۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی کو ایک روپیہ دیا ہے اور آپ خواہش مند ہیں کہ بدلے میں وہ بھی مجھے ایک دے تو یہ خُلُقِ حَسَن کی بات ہے اور اگر آپ یوں کہیں کہ میں تو دوں ایک اور اس سے وصول کروں پانچ، تو کہا جائیگا کہ یہ بداخلاقی کی بات ہے، یہ زیادتی کی بات ہے۔ تو خُلُقِ حَسَن کا حاصل اعتدال اور معاملات کا عدل ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر کوئی شخص کسی کے اوپر حملہ کر دے اسکی آنکھ پھوڑ دے تو اسے بھی حق حاصل ہے کہ حملہ کر کے آنکھ پھوڑ دے مگر ایک ہی پھوڑے دو نہیں پھوڑے، دو پھوڑے گا تو کہا جائے گا کہ ظالم ہے۔ تو غرض خُلُقِ حَسَن کا حاصل یہ ہے کہ اَدل بَدل ہو تو پورا پورا ہو، عدل کے مطابق ہو اور انصاف کے مطابق ہو اس سے گزرنا بداخلاقی ہے

اخلاقِ کریمہ کی تشریح...... دوسرا درجہ خُلُقِ کریم کا ہے اسمیں اَدل بدل تو نہیں ہوتا، اس میں ایثار ہوتا ہے کہ دوسرا زیادتی کرے آپ اسے معاف کر دیں۔ ایک نے تھپڑ مارا آپ نے کہا مجھے حق تو تھا بدلہ لینے کا مگر اس احمق اور بے وقوف سے کیا بدلہ لوں، جائیں معاف کرتا ہوں۔ یہ کریمانہ خُلُق ہے۔ دوسرے نے گالی دی آپ کو بھی حق تھا کہ اتنی زیادتی آپ بھی کرتے لیکن آپ نے معاف کر دیا تو یہ ایثار کا درجہ ہے اس کو خُلُق کریم کہیں گے۔

اخلاقِ عظیمہ کی تشریح...... اور تیسرا درجہ خُلُقِ عظیم ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو نہ صرف یہ کہ آپ معاف بھی کر دیں بلکہ اُلٹا اس کے ساتھ احسان بھی کریں، یہ خُلُقِ عظیم کہلاتا ہے۔ جس کو حدیث

---

(1) السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب الشهادات، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها ج: ١٠ ص: ١٩١. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ١ ص: ٥٨. (2) پاره: ٢٩، سورة القلم، الآية: ٤.

میں فرمایا گیا کہ: صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَکَ وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ اِلَیْکَ ① جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے تم جوڑنے کی کوشش کرو اور جو تمہارے ساتھ بُرائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرنے کی کوشش کرو یہ خُلُقِ عظیم کہلاتا ہے اور یہ خُلُق جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

سابقہ شریعتوں اور شریعتِ محمدی کے درمیان اخلاق کا موازنہ...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خُلُقِ حسن کی تعلیم دی یعنی مکمل عدل واعتدال کی۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ② ہم نے تورات میں فرض کر دیا تھا اور لاگو کر دیا تھا کہ اَدل بَدل ہوگا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑ دے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی دانت توڑ دو تمہاری کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑ دو انتقام لینا تورات میں واجب کیا تھا معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ ③ سخت شریعت تھی تو ناک کا بدلہ ناک، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت، اور کوئی زخم لگائے تو تم بھی زخم لگاؤ برابر سرابر تو یہ خلق حسن تھا جس کی تعلیم موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دَور ہے، انہوں نے خُلُقِ کریم کی تعلیم دی۔ یہاں مذہب عیسوی میں تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو نہ یہ کہ تم بدلہ نہ لو بلکہ بایاں گال بھی سامنے کر دو کہ بھائی! ایک تھپڑ اور مارتا چل۔ یہ ایثار کی بات ہے کہ بدلہ نہیں لیا بلکہ معاف کر دیا بلکہ اپنے کو پیش کر دیا کہ لے اور مار لے...... اگر تیری خوشی اسی میں ہے اور تیرا جی اسی میں ٹھنڈا ہوتا ہے تو مار تھپڑ! میں کھانے کے لئے تیار ہوں، تیرا دل ٹھنڈا ہونا چاہیے۔ یہ ایثار کی تعلیم ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جامع تعلیم دی۔ وہ یہ کہ نہ تو یہ فرمایا: کہ تم پر بدلہ لینا واجب ہے اور نہ یہ فرمایا: کہ تم پر معاف کرنا واجب ہے، بلکہ دونوں چیزیں جمع کیں اور ساتھ میں اعلیٰ مقام بھی پیش کر دیا اور فرمایا کہ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ④ برائی کا بدلہ برائی ہے، تمہیں حق ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم بھی برائی کرو۔ کوئی تمہیں

---

① کنز العمال ج: ۳ ص: ۳۵۹ رقم: ۶۹۲۹. حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: قال ابن الرفعة فی المطلب: لیس فیه الا انقطاع الیٰ انه یقوی بالآیة، وفیما قال نظر لان فی اسنادہ الحسین بن زید بن علی وقد ضعفه ابن المدینی وغیرہ دیکھئے: التلخیص الحبیر، کتاب الاقرار ج: ۳ ص: ۴۷۹. ② پارہ: ۶، سورة المائدة، الآیة: ۴۵. ③ مذکورہ آیت کا بقیہ تتمہ ہے: فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ...... الخ یعنی جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس (کے گناہوں) کے لیے کفارہ ہوگا اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔ قرآن پاک میں ایک اور جگہ ایسے ہی حکمیہ الفاظ امت محمدیہ کے لیے بھی نازل ہوئے ہیں: اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا۔ تو شریعت موسوی میں بھی مظلوم پر بدلہ لینا فرض نہیں تھا بلکہ اس کے لیے باعثِ کفارہ تھا جیسے حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتنا کہنے پر اکتفاء فرمایا کہ اے میرے ماں جائے بھائی! میرے سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر نہ کھینچ! اور مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے۔ ہاں اگر مظلوم حاکم کے پاس جائے تو حاکم کو بدلہ دلوانا فرض تھا، دیت ان کے ہاں مشروع نہ تھی یہ فقط امتِ محمدیہ کا خاصہ ہے۔ ④ پارہ: ۲۵، سورة الشوریٰ، الآیة: ۴۰.

تھپڑ مارے تم بھی تھپڑ مارو جو مُکّہ مارے تم بھی مُکّہ ماردو، برائی کا بدلہ برائی ہے، بدلہ لینے کا حق تمہیں حاصل ہے لیکن آگے فرمایا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ ① اوراگر تم معاف کردو تو اللہ کے ہاں بڑے بڑے درجے ملیں گے تو دونوں حق دیدیئے: انتقام لینے کا حق بھی اور معاف کردینے کا حق بھی۔

اس واسطے کہ اسلام دنیا کی ہر قوم کے لئے پیغام ہے اس میں نرم مزاج قومیں بھی شامل ہیں اور سخت مزاج بھی۔ اگر یہ تعلیم دی جاتی کہ انتقام لینا تمہارے اوپر واجب ہے تو بیچاری نرم خُو قومیں جیسے مشرقی بنگال کے رہنے والے ان میں سے کوئی بھی اسلام قبول نہ کرتا کہ اس خُونخوار مذہب کو کون قبول کرے! کہ اگر کوئی تھپڑ مارے تو تمہارے اوپر بھی فرض ہے کہ تم بھی تھپڑ مارو! کوئی لاٹھی مارے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاٹھی مارو! یہ تو بڑا سخت مذہب ہے اوراگر یہ تعلیم دی جاتی کہ معاف کرنا واجب ہے تو شاید جو پٹھان ہے وہ ایک بھی اسلام قبول نہ کرتا کہ اس بزدلانہ مذہب کو کون قبول کرے کہ بھئی اگر کوئی مارے تو دوسرا گال بھی پیش کردو، کیوں بھئی کس لئے! ہم اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ تو دونوں طرح کی قوموں کو جان کر اسلام نے دونوں قوموں کو یہ حق دیئے کہ برائی کا بدلہ برائی سے لے لینا یہ بھی حق ہے اوراگر معاف کردے تو اجر وعزیمت کی بات ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلُق عظیم ...... اوراگر معاف کردینے کے بعد اس کے ساتھ خیر خواہی بھی کرے تو یہ خُلُقِ عظیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق ہے۔ جس کو ایک موقع پر قرآن کریم نے فرمایا کہ: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ ② اے پیغمبر! یہ تو ہم نے کوٹ کوٹ کر رحمت تمہارے قلب کے اندر بھری ہے، اس سے تمہارے قلب میں نرمی اور لینت ہے، رأفت اور ترس کھانا ہے۔ اگر آپ سخت گیر ہوتے تو یہ جو پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں سب بھاگ جاتے اور کوئی پاس نہ پھٹکتا۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں نرمی اور رحمت ورأفت بھردی تو اس کا تقاضا کیا ہونا چاہیے پہلا مقام آپ کا یہ ہے کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی برائی کرے تو آپ ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ③ معاف کردیں، بدلہ بالکل نہ لیں، یہ ہے آپ کی شان۔ آگے فرمایا کہ فقط یہی نہیں، اس سے بڑھ کر آپ کا مقام ہے کہ کوئی برائی کرے تو نہ صرف معاف کردیں بلکہ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ④ اس کے لئے دعائے مغفرت بھی کریں، وہ باغی ہوگیا آپ اس کے لئے دعا مانگیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وسعتِ ظرف ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حوصلہ ہونا چاہیے تو پہلا درجہ یہ کہ معاف کردیں، دوسرا درجہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مغفرت کی دعا بھی کرنی چاہیے۔ اور تیسرا درجہ ایک اور آگے بتلایا گیا کہ یہ بھی آپ کی شان کے اندر ہے اور آپ کا مقام اس سے بھی زیادہ بلند ہے، وہ کیا ہے؟ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ⑤ ان برا بھلا کہنے والوں سے بُلا کر مشورہ بھی کریں تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اپنا سمجھا۔ تو وہ تو کررہے ہیں برائی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۴۰۔ ② ③ ④ ⑤ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

اپنا بنا رہے ہیں، وہ تو دے رہے ہیں گالیاں، آپ ان کو دعائیں دے رہے ہیں، یہ خُلُقِ عظیم ہے۔

تو جو خلقِ عظیم کا مالک ہوگا خلقِ حسن بھی اس کے نیچے آ گیا، خلقِ کریم بھی اس کے نیچے آ گیا، اس لئے کہ جب اعلیٰ مقام حاصل ہے تو درمیان کا اور ادنیٰ مقام بھی حاصل ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اخلاق کا بھی وہ نمونہ دیا گیا ہے کہ سارے اخلاقی نمونے اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔

مقامِ نبوت کے آثار...... تو علم کا تو وہ مقام کہ سارے علومِ نبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کر دیئے گئے۔ اخلاق کا وہ مقام کہ سارے پیغمبروں کے اعلیٰ اخلاق جمع کر دیئے گئے اور یہی دو چیزیں بنیادِ نبوت تھیں؛ کمالِ علم اور کمالِ اخلاق تو جب یہ دونوں چیزیں اعلیٰ طریق پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں تو آپ کی نبوت سب سے زیادہ اونچی نبوت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ نبوت اتنا بڑا اور اونچا مقام ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں "لِیْ مَعَ اللہِ وَقْتٌ لَایَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَانَبِیٌّ مُرْسَلٌ" ① ایک وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے وہ قرب حاصل ہوتا ہے، وہ نزدیکی مجھے میسر آتی ہے کہ وہاں تک نہ کوئی مقرب فرشتہ پہنچا اور نہ کوئی نبی مُرسل پہنچا، جہاں تک اللہ کے ہاں میری رسائی ہے۔ تو بہر حال اس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ نبوت واضح ہوا۔

اس مقامِ نبوت کے آثار کیا ہیں؟ ان آثار کو ان دو حدیثوں میں بیان کیا گیا جن کو میں نے خطبہ کے شروع میں تلاوت کیا تھا، دو غرضیں آپ نے اپنی بعثت کی بیان کیں، دو مقصد بیان فرمائے۔ وہ کیا ہیں؟ ایک یہ کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا اور دوسرے بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں دنیا میں تاکہ تعلیم دے کر دنیا میں علم پھیلاؤں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تکریم کر کے سب کو با اخلاق بنا دوں، تو جو دو رکن مقامِ نبوت کے ہیں علم اور اخلاق، انہی دو کے پھیلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے یہی بعثت کی غرض و غایت ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن مسجدِ نبوی میں تشریف لائے تو صحابہ کے دو گروہ تھے ایک ایک طرف اور ایک ایک طرف۔ ایک گروہ تو مسئلے بیان کرنے میں لگا ہوا تھا، علمی مسائل میں مصروف تھا کہ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، مسئلہ یہ ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام! الغرض علمی باتیں ہو رہی تھیں اور ایک جماعت عبادت اور زہد وتقویٰ میں مشغول تھی، کوئی تلاوت میں مشغول تھا، کوئی درود پڑھنے میں مشغول تھا، عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کِلَا کُمَا عَلَی الْخَیْرِ تم دونوں جماعتیں خیر پر ہو، یہ عبّاد اور

---

① حضرات صوفیاء اس حدیث کو اکثر ذکر کرتے ہیں یہ حدیث رسالہ قشیری میں مذکور ہے لیکن ان الفاظ کے ساتھ: لی وقت لا یسعنی فیه غیر ربی علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں ویشبه ان یکون معنی ماللترمذی فی الشمائل ولا بن راھویة فی سنده عن علی فی حدیث طویل. دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف المیم ج: ۱ ص: ۱۹۰.

زُہّاد کی جماعت بھی خیر پر ہے اور یہ علماء و فضلاء کی جماعت بھی خیر پر ہے، مگر فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا بھائی! میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جو مسئلے مسائل کا تذکرہ کر رہی تھی۔ تو نبوت کی سب سے بڑی غرض و غایت تعلیم ہے، جس سے علم دنیا کے اندر پھیلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم معلم بن کر آئے اور دنیا کے اندر آپ نے علم پھیلایا اور لوگوں کو عالم بنایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزۂ علمی دیا گیا...... ظاہر ہے کہ علم اللہ کی صفت ہے، بندہ کی صفت نہیں۔ اس علم کو پھیلانا گویا بندہ کو خدا سے وابستہ کرنا ہے چونکہ آپ تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے، تو سب سے بڑی نبوت آپ کی، اور سب سے بڑی تعلیم بھی آپ کی، اسی واسطے آپ کو معجزہ بھی ''علمی'' دیا گیا یعنی ہزاروں معجزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی ملے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے، جو علمی معجزہ ہے۔ اس علمی معجزہ نے سب کو تھکا دیا اور عاجز کر دیا کہ کوئی اس کی نظیر نہ لا سکا۔ قرآن نے چیلنج بھی کئے اور فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ① اگر سارے جن اور انسان مل جائیں اور ایک دوسرے کی مدد پر کھڑے ہو جائیں کہ اس قرآن کی نظیر لے آئیں تو وہ نہیں لا سکتے، یہ ناممکن ہے۔ تنزّل کر کے کہا کہ سارے قرآن کی نظیر نہیں تو کم سے کم دس سورتیں ہی بنا لائیں ﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ② کفار نے یہ الزام دیا تھا کہ یہ تو افتراء کردہ کلام ہے، یہ تو تہمتیں باندھ رکھی ہیں تو فرمایا گیا کہ یہ تہمت ہے تو اسی قسم کی تہمتیں تم بھی باندھ لاؤ، دس ہی صورتیں بنا لاؤ۔

پھر اور زیادہ تنزّل کیا کہ: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ ③ دس سورتیں تو تم نہ لا سکے، ایک ہی سورت بنا لاؤ جو قرآن جیسی ہو کہ اس کا اسلوبِ بیان بھی وہی ہو، فصاحت و بلاغت بھی اعجازی ہو، اسمیں علوم بھی اتنے ہی بھرے ہوئے ہوں، اسمیں لطائف و حِکَم بھی بھرپور ہوں، تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ۔ اور اس سورت میں بھی یہ قید نہیں لگائی کہ سورۂ بقرہ جیسی سورت ہو جو ایک ہی سورت اڑھائی پارے کی ہے بلکہ: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ جیسی چھوٹی سی سورت لے آؤ جو ایک سطر سے بھی کم میں آ جاتی ہے۔

پھر اور تنزل کیا کہ: ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ ④ سورت تو سورت ہے ایک آیت اور ایک بات ہی قرآن جیسی بنا لاؤ مگر نہیں لا سکے تو لوگوں نے لڑائیاں لڑیں، گالیاں دیں، برا بھلا کہا لیکن یہ صاف صورت کیوں نہ اختیار کی کہ اس کی نظیر بنا کے پیش کر دیتے، سارے جھگڑے ختم ہو جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو سب سے بڑا معجزۂ علمی قرآن ہے اور معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ دنیا تھک جائے مگر مثل نہ لا سکے...... اس کو معجزہ کہتے ہیں۔

علمی معجزہ دیئے جانے کی حکمت...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ علمی ہے، اگرچہ عملی

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۸۸. ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۳.
③ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳۸. ④ پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۳۴.

معجزے بھی ہزاروں دیئے گئے۔لیکن پچھلے انبیاء کو صرف عملی معجزے دیئے گئے؛عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی دیا گیا،موسیٰ علیہ السلام کو عصاء موسیٰ اور ید بیضاء دیا گیا،ابراہیم علیہ السلام کو نارِ خلیل کا معجزہ دیا گیا،یوسف علیہ السلام کو قمیصِ یوسف کا معجزہ دیا گیا کہ ان کا کُرتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈالا گیا تو ان کی بینائی لوٹ آئی، آنکھیں واپس آگئیں،داؤد علیہ السلام کو "اِلَانَۃُ الْحَدِیْد" کا معجزہ دیا گیا کہ لوہے کو ہاتھ میں لیتے تو موم کی طرح سے پگھل جاتا تھا مختلف انبیاء کو مختلف عملی معجزات دیئے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے عملی معجزات سینکڑوں دیئے گئے تھے مگر سب سے بڑا معجزہ علمی دیا گیا تھا وہ قرآن کریم ہے اور اس کا اثر کیا ہے؟

یہ قاعدہ کی بات ہے جب دنیا سے کوئی عامل رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ساتھ ہی رخصت ہوجاتا ہے،عمل باقی نہیں رہتا،جب عامل گیا تو عمل بھی گیا۔لیکن اگر عالم دنیا سے رخصت ہوجائے تو علم رخصت نہیں ہوتا وہ باقی رہتا ہے......ابد تک باقی رہتا ہے۔تو معجزہ درحقیقت نبوت کی دلیل ہے تو انبیاءِ سابقین کے معجزات عملی تھے جب وہ دنیا سے تشریف لے گئے ان کے معجزات بھی چلے گئے تو کسی کی نبوت کی دلیل آج تک دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علمی معجزہ دیا گیا اور علم عالم کے جانے سے ختم نہیں ہوتا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے مگر دلیلِ نبوت آج تک موجود ہے،اس لئے نبوت بھی موجود ہے۔اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے تحت آجاؤ اور ان کی شریعت پر عمل کرو اس لئے کہ جب وہ نبوت موجود نہیں اور یوں موجود نہیں کہ دلیلِ نبوت موجود نہیں اس لئے ہم نبوتِ موسوی کیلئے چیلنج نہیں کرسکتے،ان کی شریعت پر عمل کے لئے بھی نہیں کہہ سکتے لیکن نبوتِ محمدی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ نبوت موجود ہے......تو ان کی شریعت پر عمل کرو،اس لئے کہ اس کی دلیل موجود ہے اور وہ قرآن ہے جو کہ علمی معجزہ ہے،آج بھی اس کا چیلنج اسی طرح موجود ہے جیسے پہلے تھا۔

حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عجیب تعبیر......تو سب سے بڑی چیز آپ کو علمی معجزہ دیا گیا آپ کی ذات بابرکات میں علم رچایا گیا۔حدیث میں ہے کہ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِيْ ① سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا تو یہاں یہ نور مراد نہیں جو چاند سورج کا حسی نور ہوتا ہے،یہ تو اس نور کے مقابلے میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور ہے،بہت کم درجے کی چیز ہے۔وہ نور تو حقیقتِ محمدی ہے جو علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے،اس کے اندر اصل علم ہے۔گویا علم رگ وپے میں رچایا گیا اور استعدادِ علمی رچائی گئی ہے،تو حقیقتِ محمدیہ درحقیقت علم ہے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں بھی علم بھرا گیا،معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا،امت بھی آپ کی علمی امت بنائی گئی۔

کثرتِ تصنیف امتِ محمدیہ کی خصوصیت اور اندلس و بغداد کے کتب خانوں کا حال......یہی وجہ

① علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں: وقد اشتهر بين القصاص حديث "اول ماخلق الله نوري" وهو حديث لم يثبت بهذا المعنىٰ وان ورد غيره موافقا له في المعنىٰ. دیکھئے: الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعة ج: ۱ ص: ۴۲.

ہے کہ قرآن کی برکت ہے کہ امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خصوصیت ہے، دنیا کی کسی امت میں وہ تصانیف نہیں ملیں گی جو اس امت میں ملیں گی، کتب خانے بھر دیئے، ہزار دو ہزار لاکھ دو لاکھ نہیں کروڑوں کتابیں آج تک موجود ہیں اور مدت سے چلی آرہی ہیں، مصر کے کتب خانے، اندلس کے کتب خانے......

جب وہاں اندلس میں انقلاب آیا اور مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور عیسائیوں نے غلبہ پالیا تو تعصب میں آکر عیسائیوں نے یہ چاہا کہ ان کا لٹریچر، ان کا ادب اور ان کا سب علمی ذخیرہ فنا کر دیا جائے تاکہ ان کا وجود باقی نہ رہے تو ایک مستقل عملہ اندلس کی حکومت نے مقرر کیا تاکہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔ ایک عورت نے اندلس کی تاریخ لکھی ہے اس میں وہ لکھتی ہے کہ اندلس کے کتب خانوں کو ضائع کرنے کے لئے ایک مستقل عملہ اندلسی حکومت نے مقرر کیا تاکہ مسلمانوں کا ادب اور علم باقی نہ رہے اور اس پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے، مستقل انچارج آفیسر رکھا...... تو پچاس برس میں جا کر سب کتب خانے ضائع ہو سکے ہیں۔ تو ایک ایک ملک کے اتنے کتب خانے تھے۔ یہ مسلمانوں کی تصنیف و تالیف نہیں تھی تو اور کیا تھا؟

بغداد کے اوپر تاتاریوں کا جب سیلاب آیا ہے اور خلافت تباہ ہوگئی اور پارہ پارہ ہوگئی تو بغداد جو دجلہ کے کنارے پر ہے اور دجلہ بہت بڑا دریا ہے، جس کا پل مسلمانوں نے توڑ دیا تھا۔ تاتاریوں نے جب بغداد کو فتح کرلیا تو صرف ایک کتب خانہ مسلمانوں کا لوٹ کر اس کی کتابیں دجلہ میں بھر کر سڑک بنائی گئی...... وہ بہت چوڑی سڑک بنائی گئی وہ اتنی چوڑی سڑک تھی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر گذر سکتی تھیں۔

یہ صرف ایک کتب خانے کی کتابیں تھیں جس سے دجلہ کا پل بنایا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان کی سیاہی بہہ کر جو پانی میں گھلی ہے تو ایک مہینے تک علماء کو لکھنے کے لئے دوسری روشنائی کی ضرورت نہیں تھی، دجلہ کا پانی روشنائی کا کام دیتا تھا تو جس قوم کے ایک ملک کے ایک شہر کے صرف ایک کتب خانے کا یہ حال ہو تو اندازہ کیا جائے کہ بغداد میں کتنے کتب خانے ہوں گے! اندلس میں کتنے ہوں گے! حجاز میں کتنے ہوں گے! مصر میں کتنے ہوں گے!۔ خود آپ کے پاکستان میں کتنے کتب خانے ہیں! بہت سے کتب خانے وہ ہیں سندھ وغیرہ میں جن کو آج تک کیڑا اچاٹ رہا ہے، ان کتابوں کو کوئی پڑھنے والا اور لکھنے والا نہیں ہے...... ہزاروں کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں، ذخیرے کے ذخیرے ہیں، یہ سب علماءِ اسلام کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب کی سب کتابیں قرآن حکیم کی شرح ہیں۔ ہر کتاب کے شروع میں کوئی نہ کوئی آیت ہے جس سے مضمون کو شروع کیا گیا ہے۔ تو قرآن کریم اتنا عظیم علمی معجزہ ہے کہ لاکھوں کتب خانے بن گئے، لاکھوں افراد عالم بن گئے کوئی حد کتابوں اور کتب خانوں کی باقی نہ رہی۔

قرآن معجزہ نما بھی ہے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معجزۂ علمی دیا گیا تو جس ذاتِ اقدس کا علم اتنا بڑا...... تو اس کی نبوت کتنی بڑی ہوگی! اس کی تعلیم کتنی بڑی ہوگی! تو فرمایا کہ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں معلم بنا کر بھیجا گیا

ہوں تو تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے ذریعے دی۔ اس قرآن نے دنیا بھر کے اندر علم پھیلایا جس سے بڑے بڑے علماء تیار ہو گئے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں بلکہ معجزہ نما بھی ہے۔ معجزے بناتا بھی ہے اس لئے کہ قرآن پر چل کر ہی تو خواجہ معین الدین اجمیریؒ خواجہ اجمیری بنے اور اکابر اولیاء اللہ اسی پر چل کر اولیاء اللہ بنے تو قرآن درحقیقت نہ صرف خود معجزہ ہے بلکہ معجزہ نما بھی ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت چلتا ہی رہے گا۔ تو اتنے علوم آپ کی ذات بابرکات میں رکھ دیئے گئے جو تا قیامت ختم ہونے کو نہیں آئیں گے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے علوم ہیں جو علماء، صوفیاء، محدثین اور فقہاء کے ذریعے ظاہر ہو رہے ہیں۔

حضور کا ایک ایک صحابی پورا پورا جہان تھا...... علم کا تو یہ عالم تھا اور تربیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تھی کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار اور بعض روایات میں اس سے زیادہ ایک لاکھ ۴۴ ہزار کا عدد آیا ہے تو ایک لاکھ چوالیس ہزار نمونے بنا کے رکھ دیئے۔ کسی مربی اور معلم کی یہی خوبی سمجھی گئی ہے کہ اپنے شاگرد کو اپنے جیسا بنا دے تو ایک ایک کو ایسا بنایا کہ ایک ایک امت اور جہان کے برابر بن گیا، ایک ایک صحابی پوری امت بن گیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھو تو پوری اُمت، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو پورا جہان، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو اکیلے ہی پورا عالَم اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو ایک ہی فرد پورا جہاں۔

حدیث میں ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ نے پوری اُمّت ایک پلڑے میں رکھی اور مجھے ایک پلڑے میں تو میرا پلڑا جھک گیا، میرا ایمان اور علم و عمل ساری اُمّت سے وزن دار ثابت ہوا۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایک پلڑے میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بٹھایا گیا اور دوسرے پلڑے میں ساری اُمّت کو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا، علم و عمل اور اخلاق کے لحاظ سے وہ پوری اُمّت سے وزن دار ثابت ہوئے۔ پھر اس پلڑے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بٹھایا گیا اور ساری اُمت دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا۔

تو صدیق، فاروق رضی اللہ عنہم اور دوسرے ایسے نمونے بنائے کہ ایک فرد جہانوں کے برابر ثابت ہوا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض تعلیم اور فیضِ تربیت تھا۔ تو صدیق اکبر و فاروق اعظم و عثمان غنی، علی المرتضیٰ، خالد سیف اللہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود وغیرہم رضی اللہ عنہم ...... یہ تو وہ چند ہیں جن کے نام زبان پر آ گئے ہیں ورنہ ایک ایک صحابی کو دیکھا جائے تو اُمّت کے سارے اقطاب اور بڑے بڑے غوث جمع ہو جائیں لیکن پھر بھی صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ تو جو اخلاص، معرفت اور للّٰہیت ایک صحابی کے قلب میں جمع تھی اس کا نمونہ غیر صحابی کے قلب میں موجود نہیں ہو سکتا، صحابہ نے نہ صرف اپنی زندگی کو تج دیا تھا بلکہ زندگی کی غرض و غایت ہی دین بن گیا تھا۔

عشقِ رسول میں ایک صحابی کا اپنی آنکھیں اور کان گنوانا...... حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے: ایک صحابی ہیں جو عوام صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں کوئی علماء اور فقہاء میں ان کا شمار نہیں ہے کھیتی باڑی کرتے تھے ہل چلا رہے تھے کہ کسی شخص نے جا کر خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ بس ہل چھوڑ کے دعاء کے لئے

ہاتھ اُٹھائے کہا کہ اے اللہ! یہ میری آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کا دیدار کریں، یہ میرے کان اس لئے تھے کہ تیرے نبی کا کلام سنیں...... جب آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) دنیا میں نہیں تو میری آنکھیں ختم کر دے اور میرے کان بھی ختم کر دے، اَب نہ بینا رہنا چاہتا ہوں اور نہ شُنوا۔ تھے مستجاب الدعوات ......اسی وقت نابینا ہو گئے اور اسی وقت بہرے بھی ہو گئے اور پھر مرتے دم تک نہ کسی کی صورت دیکھی اور نہ کسی کی آواز سنی۔ تو گویا انہوں نے اپنی بینائی اور شنوائی کا، آنکھ اور کان کا مقصد اللہ کے رسول کا کلام سُننا اور ان کا جمالِ مبارک دیکھنا بنالیا تھا اور یہی ان کی غرض و غایت تھی۔

تو جس قوم کا یہ حال ہو کہ ادنیٰ ادنیٰ فرد......جس کا علماء میں بھی شمار نہ ہو، وہ اس درجہ معرفت، للّٰہیت اور اخلاص کامل پر ہو کہ سارے بدن کی قوتوں کی انتہائی غرض نبی ہی ہو تو اس سے بڑھ کر اور کون نمونے تیار کر سکتا ہے! تو ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے بنا دیئے۔ یہ تعلیم اور تکمیل اخلاق کا اثر تھا جس صحابی کو دیکھو علم و عمل کا ایک مجسمہ معلوم ہوتا ہے، ایثار اور زہد و قناعت کا ایک مجسمہ نظر آتا ہے۔ قلوب کی یہ رفتار اُمت کے اور کسی طبقے میں نہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں تھی۔

صحابہ کرام قرآن کی رُو سے ہمیشہ کیلئے مقدس ہیں......اسی لئے قرآن کریم نے من حیث الطبقہ اگر کسی طبقے کی تقدیس بیان کی ہے تو وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ پورے کے پورے طبقے کو مقدس قرار دیا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ① یہ تو سابقین اولین مہاجرین و انصار تھے اور جو بعد میں ملتے گئے مہاجرین و انصار کے ساتھ، ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ طبقے کے طبقے کے ساتھ اللہ تعالیٰ رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اُس طبقے کے ساتھ کبھی رضامندی ظاہر نہیں فرما سکتے جس طبقے کے اندر کھوٹ موجود ہو یا ان میں کوئی خرابی موجود ہو اور اعلان کر رہے ہیں قرآن کے اندر اور قرآن قیامت تک رہنے والی چیز ہے تو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کا وعدہ بھی قیامت تک رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے اُترنے کے بعد کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں آ سکتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی فرق پڑ سکے، وہ برگزیدہ ہی رہیں گے اور تا قیامت پسندیدہ ہی رہیں گے...... ورنہ قرآن کی آیت غلط ثابت ہو گی تو من حیث الطبقہ جس طبقہ کی تقدیس کی ہے اور بزرگی بیان کی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہیں فرمایا ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾ ② یہ بزرگ لوگ ہیں (یعنی) خدا کے فضل اور احسان سے۔ تو اللہ تعالیٰ جن کو بزرگ کہے انکی بزرگی میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟

کوئی یوں کہے: صاحب! پہلے تو ایسے ہی تھے مگر بعد میں معاذ اللہ ان میں کچھ نفاق پیدا ہو گیا تھا تو قرآن کریم

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۷-۸۔

نے اس کی بھی تکذیب و تردید کردی فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴾ ① یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پہلے ہی جانچ لیا تھا امتحان لے لیا تھا یہ پرکھے پرکھائے لوگ ہیں۔ تو جن کو خدا پرکھ لے ان میں کھوٹ نہیں آسکتا ورنہ پرکھ غلط ثابت ہوگی تو بہرحال طبقے کے طبقے کو مقدس کہنا یہ صرف حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم و عمل کا نمونہ ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ ② میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کسی کی اقتداء کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ کہیں فرمایا: اَللّٰہَ اَللّٰہَ اِفِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ مِنْ بَعْدِیْ غَرَضًا ③ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کو ہدف نہ بناؤ، ان پر ملامت نہ کرو، ان پر اپنی جانب سے تنقید مت کرو اور ان کے بارے میں خدا سے ڈرو! تقویٰ اختیار کرو۔ تو بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم و عمل کا نمونہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، اتباعِ سنّت کے اندر غرق تھے کہ ان کے عمل کو دیکھ کر نبی کی سنتوں کا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاشرت کا پتہ چل جاتا تھا۔

تو دو غرضیں بیان فرمائی گئیں اور میری تقریر کا حاصل بھی یہ نکلا کہ ایک تو مقامِ نبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کس مقام کی تھی اور علم و عمل کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا، علم و اخلاق کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا اور ایک یہ کہ نبوت کے مقاصد اور غرض و غایت کیا تھی، تو ان دو حدیثوں سے وہ غرض و غایت ظاہر ہوئی کہ وہ تعلیم علم اور تربیتِ اخلاق تھی۔

اُمتِ محمدیہ کبھی ہلاک نہیں ہوسکتی......اور پھر تیسری چیز یہ کہ اس تعلیم و تربیت کے آثار کیا تھے جو نمایاں ہوئے؟ وہ اس طرح کہ علم و عمل کے لاکھوں نمونے پیدا ہوگئے اور وہ نمونے صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ آخِرُہٗ ا ④ میری اُمت کی مثال اس بارش جیسی ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بارش کا پہلا حصہ زمین کے لئے فائدہ مند ہوگا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ مطلب یہ ہے کہ خیریت اول سے لے کر اخیر تک امت میں گھومتی ہوئی موجود ہے: اول بھی خیر، بیچ بھی خیر، اخیر بھی خیر۔ مگر مراتب کا فرق رہے گا، فرقِ مراتب الگ چیز ہے مگر نفسِ خیریت اور نفسِ ہدایت وہ پوری اُمت میں مشترک ہے، اخیر میں بھی اعلیٰ نمونہ ملیں گے، وسط میں بھی اعلیٰ نمونے ملیں گے اور ابتداء

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔ ② مسند عبد بن حمید، احادیث ابن معرؓ ج: ۲ ص: ۴۰۲۔ علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیھقی واسندہ الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء بأیھم اقتدیتم اھتدیتم۔ دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲۔ اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف "التلخیص الحبیر" میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الجیر، باب ادب القضاء ج: ۵ ص: ۴۹۸۔

③ السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب فی من سب اصحاب النبی، ص: ۲۰۴ رقم: ۳۴۶۲۔

④ المعجم الاوسط للبطرانی، من اسمہ سیف ج: ۸ ص: ۳۳۸ رقم: ۳۸۰۲۔

میں بھی ملیں گے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کَیْفَ تُھْلَکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُھَا وَالْمَھْدِيُّ وَسَطُھَا وَالْمَسِیْحُ آخِرُھَا ① وہ اُمت کیسے ضائع ہوسکتی ہے جس کی ابتداء میں میں ہوں اور انتہاء میں مسیح علیہ السلام اور بیچ میں حضرت مہدی علیہ السلام ہوں۔ یہ اُمت ضائع ہونیوالی نہیں ہے۔

کبھی فرمایا: "لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مَّنْ خَاذَلَھُمْ وَلَامَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللهِ" ② میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ باقی رہے گی (چاہے چھوٹی ہو) جو منصور من اللہ ہوگی حق پر قائم رہے گی، وہی کچھ کرتی رہے گی جو کچھ میں نے کیا، وہی کچھ کہتی رہے گی جو کچھ میں نے کہا ہے، وہی اس کا نعرہ ہوگا جو میرا نعرہ ہے۔ انہیں کوئی رسوا کرنیوالا رسوا نہیں کرسکے گا ذلیل کرنیوالا ذلیل نہیں کرسکے گا۔

کبھی فرمایا: اس اُمت میں خلف الرشید سے خلف الرشید پیدا ہوتے رہیں گے، اخلاف پیدا ہوتے رہیں گے وہ کیا کریں گے؟ تحریف کرنے والوں کی تحریفات کو مٹادیں گے، مبطل اور باطل پسندوں کی دروغ باطنیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی جاہلانہ تاویلات کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور حق کو حق اور باطل کو باطل نمایاں کریں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث میں اطلاع دی کہ خیریت منحصر نہیں ہے کہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ختم ہوگئی...... ہمیشہ اہل خیر آتے رہیں گے ہمیشہ اخلاف رشید پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ اُمت آفتابوں ماہتابوں سے بھری ہوئی ہے تو آثار نبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتے ہیں کہ نبی کے زمانے میں بھی نمونے پیدا ہوئے اور ابدالآباد اور قیامت تک کی اطلاع دیدی کہ پیدا ہوتے رہیں گے: اِنَّ اللهَ یَبْعَثُ لِھٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِاْةِ سَنَةٍ مَنْ یُّجَدِّدُلَھَا دِیْنَھَا ③ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر مجدد بھیجتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے اور لوگوں نے جو اس میں خلط ملط کردیا ہوگا اس کو نکھار کر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ تو صدی کے سرے پر الگ وعدے کئے، صدی کے اندر رہ کر اخلاف الرشید پیدا ہونے کے الگ وعدے کئے گئے، پوری اُمت کے اندر عالم وقت کے الگ وعدے کئے گئے تو یہ امت مجموعی حیثیت سے، طبقاتی حیثیت سے اور زمانے کی حیثیت سے خیر سے بھری ہوئی ہے۔ تو یہ آثارِ نبوت ہیں کہ ہر دور کو خیر سے لبریز کردیا، ہر زمانے کو خیر سے بھردیا تو یہ وہی کرسکتا ہے جس کا مقام نبوت سب سے زیادہ بلند ہو جس کے علم اور اخلاق سب سے زیادہ اونچے اور بڑھ کر ہوں اور جس کے پیدا کردہ نمونے ایسے ہوں کہ کسی پیغمبر کو وہ صحابہ نہ ملے ہوں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملے ہوں، کسی پیغمبر کو وہ جاں نثار نہ ملے ہوں جو آپ کو عطا کئے گئے ہوں۔

حاصل تقریر...... بہرحال یہ تو مجھ سے میرے بعض بزرگوں نے فرمایا تھا ورنہ دراصل میرے ذہن میں تو دوسرا

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، ج: ١١ ص: ٣٤٢.

② السنن لابن ماجه، كتاب السنة، باب اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ص: ٢٤٧٧ رقم: ٦.

③ السنن لابی داود، كتاب الملاحم، باب مايذكر فی قرن المأة، ص: ١٥٥٣ رقم: ٤٢٩١.

مضمون تھا جو عرض کرنا تھا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ میں زیادہ تر طلباء کو خطاب کروں گا طلباء کے فرائض پر۔ اس کے ذیل میں دوسرے لوگ بھی فائدہ اُٹھالیں گے، اس واسطے کہ ساری اُمت تو طلباء نہیں ہے، سارے طالبانِ علم نہیں ہیں، ایک خاص طبقہ طلباء کا ہے تو ارادہ تو میرا یہ تھا کہ طلباء کے فرائض اور طلباء کی خصوصیات اور ان کے اخلاق ذکر کئے جائیں...... لیکن جلسہ میں آتے وقت بعض عزیزوں نے فرمایا کہ اگر مقام نبوت اور مقاصدِ نبوت کے بارے میں کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے تو شاید زیادہ بہتر ہوگا اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے۔

تو میں نے دو حدیثیں تلاوت کیں ان دو حدیثوں میں مقاصدِ نبوت اور بعثت کی غرض وغایت بھی واضح ہوگئی اور چونکہ یہ غرض وغایت انتہائی اونچی تھی اس لئے مقامِ نبوت پر بھی روشنی پڑگئی اور پھر جب آثارِ نبوت سامنے آئے تو اس سے نبوت کی عظمت اور بڑائی ......اور واضح ہوئی۔ اس لئے میں نے تین باتیں عرض کیں: مقام نبوت، مقاصد نبوت اور آثار نبوت اور اس کے بارے میں یہ چند جملے عرض کیے جو اس وقت ذہن میں تھے۔

اللہ تعالیٰ اس امت کو اپنے پیغمبر کا متبع بنائے اس لئے کہ اتباع ہی میں علم اور اخلاق نصیب ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ امت اپنے پیغمبر سے کٹ جائے، اگر اس سلسلہ سے جو علم واخلاق کا چلا آ رہا ہے یہ اُلٹ کر کٹ جائے تو یہ اُمت علم سے بھی محروم ہو جائے گی اور اخلاق سے بھی۔ علم نبی کے دامن کے سوا کہیں نہیں ملے گا، اخلاقِ فاضلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کے سوا کہیں نہیں ملیں گے۔ تو ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کو سنبھال لیں، دامن پکڑ لیں، وہ کہیں ہو...... مگر آپ گرد وغبار سمجھ کر اس کو جھٹکیں نہیں، دامن کو اگر گرد لگ جائے تو لگی رہنی چاہیے کہ یہ میرے ہی مقام اور مکان کی گرد ہے، میرے ساتھ وابستہ رہے گی۔ تو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جائیں گے دامن جائے گا، یہ گرد وغبار بھی وہیں جائیگا تو دامن سے وابستہ ہو جایئے، یہی سب سے بڑی بات ہے۔

اصل بنیادی چیز وابستگی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریل گاڑی میں سب سے اونچا فرسٹ کلاس کا ڈبہ سمجھا گیا ہے جس میں بڑے بڑے لوگ تموّل کے اعتبار سے یا اپنے کمال کے اعتبار سے سفر کرتے ہیں۔ اسی فرسٹ کلاس میں ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ ہوتا ہے جسے سرونٹ کلاس کہتے ہیں، سرونٹ کلاس میں نہ ڈبے ہوتے ہیں نہ برقی پنکھے ہوتے ہیں، نہ کوئی سامانِ راحت ہوتا ہے، وہ تھرڈ کلاس ہے مگر لگا ہوا اور جڑا ہوا فرسٹ کلاس سے ہے، اس میں ملازمین بیٹھتے ہیں اس کی وابستگی کا اثر یہی ہے کہ جہاں جاکے فرسٹ کلاس رُکے گا وہیں جاکے ملازمین کا سرونٹ کلاس رُکے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آقا کے ملازم کے ڈبے کو روک دو، سرونٹ کلاس روک دو بلکہ جہاں آقا اُتریں گے ملازم بھی وہیں اُترے گا اور جس کوٹھی میں آقا کا قیام ہوگا اس میں ملازمین بھی حصہ لیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ جگہ جوتیوں میں ملے...... مگر ملے گی اسی کوٹھی کے اندر، ملازمین باہر نہیں نکالے جائیں گے۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عالَم کے فرسٹ کلاس میں سوار ہیں اور ہم سارے سرونٹ ہیں تو جہاں آقا کی سواری جنت

کے مقام میں جائے گی وہیں یہ بندے اور غلام بھی ساتھ جائیں گے ...... بشرطیکہ وابستگی رہے تو وابستگی قائم رکھنا یہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ علم بھی آقا سے وابستگی سے آئے گا اور اخلاق بھی۔ اسی سے کٹ گئے تو نہ علم باقی رہے گا نہ اخلاق تو اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم تعلیم نبوت سے مستفیض ہوں، اخلاقِ نبوت سے مستفید ہوں اور حق تعالیٰ شانہ دنیا وآخرت میں ہماری اس خصوصیت کو قائم رکھے اور دنیا کو ہمارے سے استفادہ کا موقع دے اور ہمیں کتاب وسنت اور علماء ربّانی سے استفادہ کا موقع عطاء فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّاتِنَا مَآ اَحْیَیْتَنَا وَاجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَآ اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَاغَایَۃَ رَغْبَتِنَا اَللّٰھُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

کتابِ خداوندی اور شخصیتِ مقدسہ
ہدایت کیلئے دونوں ضروری ہیں

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ...... ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَامَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ ①

احوالِ واقعی...... آپ حضرات کی دعوت پر میں دارالعلوم (دیو بند انڈیا) سے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اس ملک (پاکستان) میں حاضر ہوا اور آپ حضرات سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا، سعادت بھی میسر آئی اور اس کا موقع ملا کہ ہم اپنی بساط کے مطابق آپکو فائدہ پہنچائیں اور آپ سے فائدہ حاصل کریں۔ گویا ہماری یہ مجلس ایک دینی مجلس ہے جس کا مقصد افادہ اور استفادہ، فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا ہے، نیز دینی منافع کو ترقی دینا ہے تا کہ ہم لوگ صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور کج راستوں سے بچ کر پھر اسی راستے پر چلیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا ہے۔

دین کی تاریخ کا اصولِ مُسلّم کہ کتاب کے ساتھ معلم بھی آئے...... دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور دنیا سے زیادہ دین کی تاریخ کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہدایت کے دو طریقے مقرر فرمائے ہیں۔ دونوں جمع ہوتے ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ہوتی ہے، دونوں نہ ہوں تو کلیۃً گمراہی رہتی ہے اور دونوں میں سے ایک نہ ہو تو راستہ ٹیڑھا رہتا ہے۔ جب دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ملتی ہے۔ ایک قانونِ خداوندی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے قلوبِ مبارکہ پر آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ نے کتابیں اتاریں۔ تو ایک چیز تو قانونِ الٰہی ہے جو منزل من اللہ ہے،

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵.

دوسری چیز وہ شخصیتیں ہیں جنکے ذریعہ سے اس قانون کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس قانون کے احکام معلوم ہوتے ہیں، احکام کی علتوں کا اور بنیادوں کا پتہ چلتا ہے، مسائل کے دلائل کا علم ہوتا ہے اور اس کے لئے شخصیتیں اتاری گئیں۔

تو ہدایت کے یہی دو طریقے ابتداء سے لے کر آج تک رہے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ نے تیس صحیفے نازل فرمائے لیکن صحیفوں کے ساتھ آدم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی بھیجا تا کہ وہ جا کر ان صحیفوں کے مطالب کو سمجھائیں، ان کے احکام پر لوگوں کو مطلع کریں۔ اگر صحفِ ابراہیم علیہ السلام آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بھیجے گئے تا کہ ان صحیفوں کا مطلب سمجھائیں، ان کے مطالب اور معانی دنیا کے آگے پیش کریں اور حق تعالیٰ کی جو مرادات ہیں کہ فلاں آیت کا یہ مطلب ہے، فلاں آیت کی یہ مراد ہے، اس مراد پر لوگوں کو مطلع فرمادیں۔ اگر توراۃ آئی تو موسیٰ علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔

انجیل آئی تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔ اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس بھی دنیا میں بھیجی گئی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم کے حقائق سمجھائیں اور مراداتِ ربانی بتلائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار فریضے مقرر فرمائے گئے، جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (1) حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ ہی وہ ذات بابرکات ہے کہ جس نے امیوں میں رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

تلامذۂ خدا اور اساتذۂ انسانیت ...... رسول ایسے جو خود بھی اُمّی، کسی مکتب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھے ہوتے ...... اس لئے کہ وہ دنیا کو علم دینے کے لئے آتے ہیں، دنیا سے علم لینے کیلئے نہیں آتے۔ حق تعالیٰ براہ راست انکو علم دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام براہ راست حق تعالیٰ شانہ کے تلمیذ اور شاگرد ہوتے ہیں تو جو اللہ سے فیضان حاصل کریں وہ دنیا سے علوم کا فیضان حاصل نہیں کر سکتے تو انبیاء علیہم السلام علم لینے کیلئے نہیں دینے کیلئے آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی انبیاء کی تعلیم کا ذکر ہے تو حق تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ ہم نے ان کو تعلیم دی ہے، آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (2) اللہ نے آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دی، تمام چیزوں کے نام سکھلائے۔ اسی طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خصوصیت سے تعبیر

(1) پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ (2) پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔

خواب کا علم دیا گیا فرمایا ﴿وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ نے آپکو تاویل احادیث کی تعلیم دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَأْسِكُمْ﴾ ② ہم نے ہی تو زرہ سازی کا علم آپ کو دیا ہم نے ہی تو آپ کو سکھلایا تا کہ تم کو لڑائی (کے ضرر) سے بچائے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ ہم نے خزانۂ غیب سے آپ کو علم عطا کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ④ اللہ نے آپکو تعلیم دی ان چیزوں کا علم دیا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ کا بہت بڑا فضل اور انعام ہوا جو اپنے خزانۂ غیب سے علم عطاء کیا اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ⑤ اے پیغمبر! ہم نے آپکی طرف اپنی روح کی وحی کی ہے، علم کو روحِ خداوندی کہا گیا ہے، اسی روح سے اقوام زندہ ہوتی ہیں، کوئی قوم جہالت سے زندگی حاصل نہیں کر سکتی، جس قوم نے زندگی پائی ہے دنیا کی زندگی دنیوی علوم سے اور آخرت کی زندگی اخروی علوم سے ہی پائی ہے۔ زندگی بہر حال علم کے تابع ہے، جہالت سے نہ دنیا چل سکتی ہے نہ آخرت چل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے علم کو روح بتلایا کہ اسی سے اقوام کی زندگی ہے۔

اور فرمایا ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ﴾ ⑥ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو جانتے ہی نہ تھے کہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے! آپ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ایمان کے معنیٰ کیا ہیں! ہم نے اپنی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں ایک نور ڈالا، علم کی روشنی ڈالی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ تو ہر جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے اپنے کو ان کا استاذ ظاہر کیا اور انبیاءؑ کو شاگرد ظاہر کیا ہے۔ تو جو حضرات بلا واسطہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ دنیا کے شاگرد کیسے بن سکیں گے! وہ تو دنیا کے استاذ بنیں گے۔

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کا پانچ برس کی عمر میں استاذی کا واقعہ..... حضرت مسیح علیہ السلام کی عمر پانچ سال کی تھی ان کی والدہ ماجدہ نے پڑھنے کیلئے مکتب میں بھیجا۔ استاذ کے سامنے بیٹھے تو استاذ نے کہا کہ: کہو الف! فرمایا: الف کے کیا معنی ہیں؟ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ: تُو پھر مہملات (بے معنی چیزوں) کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو استاذ بنا ہے تو جو چیز بتلائی ہے اس کے معنی بھی بتلا اور جس چیز کے معنی نہیں اس کی تعلیم کیسی! وہ تو جاہلانہ تعلیم ہوگی۔ اب وہ استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ عجیب قسم کا شاگرد آیا ہے کہ اس نے میرے اوپر سوالات قائم کر دیئے ہیں! تو استاذ نے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ الف کے کچھ معنی ہیں؟ فرمایا کہ: ہاں! معنیٰ ہیں۔

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۶. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۰. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۶۵.
④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۱۳. ⑤ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲. ⑥ پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

استاذ نے پوچھا تجھے معلوم ہیں؟ فرمایا کہ: ہاں معلوم ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا معنیٰ ہیں؟ فرمایا کہ اپنی استاذی کی جگہ چھوڑ! یہاں شاگردوں کی لائن میں بیٹھ تب بتلاؤں گا۔ استاذ جگہ چھوڑ کے آیا اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا پھر آپ نے الف کے معنیٰ بتلائے اور توحیدِ خداوندی، عظمتِ خداوندی اس طرح ثابت کی کہ استاذ حیران تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کے استاذ براہِ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اس لئے وہ عالَم کے استاذ ہیں اور وہ کسی کے شاگرد بننے کے لئے نہیں آتے۔

قانونِ ہدایت ...... تو ہدایت کیلئے اللہ نے ایک قانون رکھا اور قانون کے ساتھ ایک شخصیت رکھی تاکہ اس قانون کے مطالب اور مراداتِ خداوندی لوگوں کو سمجھائیں۔ قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اسی اصول پر نازل کی گئیں۔ قرآن قانونِ حق بن کر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات معلم بن کر آئی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دو جماعتیں بیٹھی ہوئی تھیں، ایک جماعت نوافل میں، تسبیح میں، تہلیل میں اور تکبیر میں یعنی ذکر و عبادت میں مصروف تھی اور ایک جماعت علمی مسائل کا تذکرہ کر رہی تھی کہ یہ چیز جائز ہے، یہ ناجائز، یہ حلال، یہ حرام وغیرہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: كِلَا كُمَا عَلَى الْخَيْرِ دونوں جماعتیں خیر پر ہیں، جو عبادت اور زہد میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے، جو علمی مسائل میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے مگر فرمایا کہ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں تو دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جہاں مسائل کا تذکرہ ہو رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری حیثیت معلم کی ہے تاکہ دنیا کو علم سے آشنا کروں اور دنیا میں علم کی روشنی پھیلاؤں تاکہ جہالت ختم ہو تو ایک طرف ذاتِ اقدس آئی اور ایک طرف قرآن کریم آیا۔

قرآن کریم واحد اللہ کا کلام ہے...... اسکے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے اتارے گئے یعنی اور کتابوں کو ہم مجازاً ''کلام اللہ'' کہہ سکتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں کلام اللہ صرف قرآن کریم ہے اس لئے کہ کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے، اس کا تکلم کرے...... تو توراۃ کا تکلم نہیں ہوا بلکہ توراۃ کو الواح پر لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا گیا تو اسے کتابِ خداوندی تو کہیں گے کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے، مجازاً کلام اللہ کہہ سکتے ہیں، حقیقی معنوں میں نہیں۔ انجیل کو حق تعالیٰ نے لکھ کر بھی نہیں دیا، تکلم بھی نہیں فرمایا بلکہ حضرت مسیحؑ کے قلبِ مبارک پر اُتارا، اسے مضمونِ خداوندی تو کہیں گے، کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ کلام وہی ہے جس کا تکلم ہو۔

قرآن کریم وہ ہے جس کا اوّل سے لے کر آخر تک حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا ہے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا تو اللہ تعالیٰ سے تکلم واقع ہوا۔ تو کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے اور لکھ کر دیدے تو وہ مجازاً کلام ہے۔ اسی طرح دل میں کوئی چیز ڈال دے تو وہ بھی مجازاً کلام کہلائے

گا، اِس کو مضمون کہیں گے اور اُس کو کتاب کہیں گے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ قرآنِ کریم کا تکلم فرماتے تو اسکی عظمت سے ملائکہ پر بے ہوشی طاری ہوتی تھی...... جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوش میں رہتے تھے، مگر کچھ مدہوش سے اور بے خود سے وہ بھی ہو جاتے تھے، جب ہوش میں آتے تو ملائکہ ان سے پوچھتے ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ﴾ ① اب تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو وہ فرماتے: ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ ② حق فرمایا اور وہ بلند و بالا ہے عظمت والی ذات ہے۔ تو حق تعالیٰ نے ہر ہر آیت کا تکلم کیا ہے۔

اس واسطے کہ ''کلام اللہ'' اسے ہی کہتے ہیں کہ الفاظ بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں اور معانی بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں۔ ہم نہ الفاظ میں مُوجد ہیں (اور نہ ہی معانی ومطالب میں اور) ہم تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مُوجد نہیں ہیں، آپ الفاظِ قرآن کے ناقل ہیں، اسی طرح سے معانی کے اندر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ناقل ہیں اور ہم سب بھی ناقل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر جو معانی ڈال دیئے انہیں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کے آگے پیش فرمایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ مدعی نہیں بلکہ امانت کے ساتھ ناقل ہیں۔ تو امانتِ کاملہ کے ساتھ الفاظِ الٰہی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچا دیئے اور معانیٔ خداوندی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچا دیئے۔

کتابِ قانون کے الفاظ و معانی کی حفاظت...... چنانچہ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ جب وحی نازل ہوئی تو ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رٹنے لگتے اور بار بار اس کو پڑھتے تا کہ بھول نہ جائیں تو حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ③ زبان کو حرکت نہ دیں، جلدی نہ کریں، یہ جو خطرہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھول جائیں گے اس کے لیے فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ④ ہم گارنٹی دیتے ہیں ہمارے ذمہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں اس کو جمع بھی کر دیں گے اور آپ سے پڑھوا بھی دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا فکر نہ کریں...... جمع کرنا، محفوظ کرنا، پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔

حق تعالیٰ نے وہ ذمہ پورا فرمایا۔ یہ الفاظ کا ذکر ہے اس لئے کہ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ﴾ فرمایا ہے تو قرأت لفظوں کی ہوتی ہے، معنی کی نہیں ہوتی، معنی کی تفہیم کی جاتی ہے قرأت نہیں کی جاتی۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ⑤ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے تو یہاں تک الفاظ کی حفاظت کی گارنٹی دی، معلوم ہوا کہ الفاظِ خداوندی محفوظ ہیں ان میں کوئی ردّ و بدل ممکن نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔
④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

آگے معانی کا قصہ تھا تو معانی کے بارے میں بھی فرمایا ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ ① پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا بیان کرنا تو بیان لفظوں کا نہیں ہوا کرتا معانی کا ہوا کرتا ہے، کھول کھول کر معانی بیان کئے جاتے ہیں ، پڑھوانے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں۔ تو الفاظ کی گارنٹی بھی دی گئی معانی کی گارنٹی بھی دی گئی۔ ان میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوسکتا۔

کتاب کے ساتھ استاذ کی ضرورت کی وجہ...... تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی کے بارے میں بھی امین ہیں، بلاکم وکاست آپ نے وہ معانی بیان فرما دیئے۔ الفاظ کو اس لئے نازل کیا گیا کہ حقائق الفاظ ہی میں چھپے ہوتے ہیں۔ لفظ کا ذرا ردو بدل ہو جائے...... معنی کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ الفاظ تو بعد کی چیز ہیں ایک لفظ ہو لب ولہجہ بدل جائے تو معانی بدل جاتے ہیں اور کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان میں ایک جملہ ہے ”کیا بات ہے“ یہ معمولی سا جملہ ہے ہر شخص بولتا ہے، اس کے کئی معنی آتے ہیں اور ہر معنیٰ کا تعلق لب ولہجہ اور طرزِ ادا سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی کیا بات ہے؟ سب سمجھیں گے کہ میں نے سوال کیا ہے کہ بھئی کیا بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ کیا قصہ ہے؟ اور اگر میں یوں کہوں کہ (واہ!) کیا بات ہے...... ! اب آپ کیا سمجھے؟ قطعاً یہ نہیں سمجھے کہ میں نے سوال کیا ہے، بلکہ یہ سمجھے ہوں گے کہ میں نے بڑائی بیان کی ہے، تفخیم شان بیان کی ہے کہ فلاں چیز تو بہت بڑی ہے، کیا بات ہے اور اگر لہجہ بدل کے (حقارت آمیز انداز میں) یوں کہوں کہ کیا! بات ہے! اب آپ کیا سمجھے؟ بڑائی نہیں سمجھے ہونگے! بلکہ یہ سمجھے ہوں گے کہ میں حقارت بیان کر رہا ہوں، یہ تحقیر کیلئے ہے اور اگر لب ولہجہ بدل کے (تعجب خیز لہجہ میں) یوں کہوں کہ کیا بات ہے! اب آپ کیا سمجھے؟ نہ سوال سمجھے، نہ تفخیم شان سمجھے اور نہ تحقیر شان! بلکہ آپ تعجب اور حیرت سمجھے۔ ایک ہی جملہ ہے اور کئی معنی پر دلالت کی۔ بس لب ولہجہ کے بدلنے سے معانی بدل گئے۔

اب فرض کیجئے اگر میں یہ جملہ خط میں لکھ کر آپ کو بھیج دوں تو لفظ تو خط میں آجائیں گے مگر لب ولہجہ اور طرزِ ادا تو کاغذ میں نہیں آئے گا یا تو متکلم خود آکے لب ولہجہ سے سمجھائے یا اپنا کوئی قاصد بھیجے کہ وہ ادا کر کے بتلائے کہ یہ مراد ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز نہ ہوئی فقط کاغذ سامنے ہوا تو آپ کے نفس پر جو کیفیت غالب ہوئی وہ معنیٰ آپ سمجھ لیں گے، اور وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی آپ کی مراد ہوگی۔ لفظ آپ متکلم کے لیں گے معنی اس میں اپنے ڈالیں گے۔ یہ تلبیس ہو جائے گی، التباس ہو جائے گا کہ لفظ اللہ کے لے لیے اور معانی اپنے ڈال دیئے۔ تو جس طرح سے ہر زبان میں عرف اور طرزِ ادا سے معانی بدل جاتے ہیں، قرآن کا بھی تو ایک عرف ہے اس میں بھی لب ولہجے اور طرزِ ادا سے معانی بدل جاتے ہیں، ذرا لہجہ بدل دو معانی کچھ کے کچھ ہو گئے۔ ذرا لفظوں کی مراد میں فرق سمجھ میں آگیا معانی بدل گئے۔

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔

مرادِ باری تعالیٰ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی نہ سمجھ پائے ...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ ابتدائے اسلام میں حکم یہ تھا کہ روزہ افطار کر کے پھر رات بھر کھانے کی اجازت نہیں تھی گویا سحری نہیں کھاتے تھے بلکہ رات اور دن کا بھی روزہ تھا، بس ایک دفعہ کھانا پینا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگوں پر بھاری گزرا، تحمل نہیں ہوسکا، برداشت سے باہر ہوگیا تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمائی اور فرمایا: کہ اللہ نے تمہارے ضعف کو دیکھ لیا ہے اب نیا حکم ہے: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تم تحمل نہیں کر سکتے لہٰذا رات بھر کھاؤ پیو آرام کرو...... یہاں تک کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان لیا جائے اور ممتاز ہو جائے...... اس وقت روزے کی نیت کرو۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دو ڈورے لئے ایک کالا اور ایک سفید اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے۔ اب اس کو دیکھتے رہتے تھے جب تک اندھیرا رہتا کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق گزرے ہوئے تیس منٹ گزر چکے ہوتے، صبح صادق کے بعد کچھ نہ کچھ تاریکی رہتی ہے، کچھ اندھیرا ہوتا تھا، کالے اور سفید ڈورے میں تمیز نہیں ہوتی تھی، لہٰذا تکیہ اٹھایا دیکھ لیا، ابھی دونوں میں تمیز نہیں...... بس پھر کھا رہے ہیں حالانکہ صبح صادق ہو چکی ہوتی۔

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچی تو فرمایا کہ اے عدی! تم کیا کرتے ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ تو میں نے دو ڈورے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں دیکھتا رہتا ہوں (اور کھاتا رہتا ہوں)۔ فرمایا کہ: اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ رات دن دونوں اس کے اندر سما گئے! بندہ خدا! خیطِ ابیض سے مراد صبحِ صادق کی سفیدی اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے، یہ روئی کا ڈورا مراد نہیں ہے۔ ② تو لغت کے لحاظ سے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ غلط نہیں سمجھے تھے لغۃً تو خیط روئی کے دھاگے کو کہتے ہیں، لُغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے اور عمل بھی صحیح کیا مگر حق تعالیٰ کی وہ مراد نہیں تھی، اس سے مراد رات اور دن ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مراد بتلائی تب ان کے روزے صحیح سمجھے گئے۔

قرآن کا اپنا عرف ...... اس سے اندازہ ہوا کہ قرآن کریم کو محض لغت اور عرف کے بل بوتے پر نہیں سمجھا جاتا قرآن کریم لغتِ عرب میں نازل ہوا ہے، لیکن بہت سے الفاظ میں قرآن کریم نے اپنے معانی ڈالے ہیں، لغوی معنی مراد نہیں بلکہ وہ معنی مراد ہیں جو عرفِ شریعت میں ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے اس کے معنی رحمت اور دعاء کے ہیں۔ بس گھر میں بیٹھے آدمی پانچ وقت دعاء کر لے مسجد میں حاضری کی کیا ضرورت ہے! بس نمازی ہوگیا لیکن اس

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الصوم، باب بیان الدخول فی الصوم...... ص: ۸۵۲ رقم: ۲۵۳۳۔

طرح نماز نہیں ہوگی۔لغۃً تو صحیح ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعاء مانگنے کے ہیں مگر مرادِ متکلم وہ نہیں تھی بلکہ مراد افعالِ خاصہ ہیں کہ یوں نیت باندھو، یوں ہاتھ اٹھاؤ، یوں رکوع کرو، یوں سجدہ کرو تو اس مجموعے کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔یا مثلاً حج کا لفظ ہے، حج کے معنیٰ لغت میں قصد کرنے کے ہیں تو گھر میں بیٹھ کے قصد کرلیا اور حاجی ہو گئے! کیا ضرورت ہے کہ ڈیڑھ دو اور چار ہزار روپے خرچ کر کے حجاز پہنچے! لغت کے لحاظ سے تو ''حج'' ہو گیا اور حاجی بن گئے۔مگر لغوی معنی مراد نہیں، مرادی معنی دوسرے ہیں۔تو قرآن میں لفظ لغتِ عرب کا ہے معنی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے ڈالے ہیں کہ چند مخصوص افعال کا نام حج ہے، صرف قصد کرنے کا نام حج نہیں ہے۔ہم لغت کو رد نہیں کرتے مگر اصطلاح یہی ہے گویا عرفی اصطلاح ہے اور اس کو منقول اصطلاحی کہتے ہیں کہ لفظ تو لغتِ عرب کا ہے مگر کسی اپنے معنی کی طرف منقول کرلیا ہے۔اگر استاذ بتلانے والا نہ آئے تو آدمی وہی سمجھے گا جو لغت کے معنی ہیں...... جب تک معلم آ کر تعلیم نہ دے مرادِ ربانی سامنے نہیں آئے گی۔

ضرورتِ مُعلّم...... یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھیجا گیا کہ قرآن کے معنی سمجھائیں محض لغوی معنی مراد ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ضرورت نہیں تھی حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم بیت اللہ کی چھت پر رکھ جاتے اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! تم مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفاء ہے اپنا علاج خود کرلیا کرو مگر دنیا میں یہ اصول نہیں ہے کہ طب کی کتابیں دیکھ کر آدمی علاج کرے، جب تک طبیب اور معالج نہ ہو کتاب اصول بتلادے گی، موازین بتلادے گی، مقداریں بتلادے گی نفسیات کو تو نہیں پہچانے گی، موسم کو نہیں پہچانے گی یہ تو طبیب ہی نبض پر ہاتھ رکھ کر پہچانے گا کہ مرض ٹھنڈا ہے یا گرم ہے، مرض ٹھنڈا ہوا تو گرم دوائیں دے گا مرض گرم ہوگا تو ٹھنڈی دوائیں دے گا۔تو بغیر طبیب کے معالجہ ناممکن ہے یہ بدنی معالجہ ہے وہ روحانی معالجہ ہے، وہاں بدنی اطباء کی ضرورت ہے یہاں روحانی اطباء کی ضرورت ہے۔بغیر طبیب کے نہ بدن اچھا رہ سکتا ہے اور نہ بغیر طبیب کے آدمی کی روح اچھی رہ سکتی ہے دونوں جگہ معالج کی ضرورت ہے تو قرآن نسخۂ شفاء ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام حکماء بنا کر بھیجے گئے ہیں وہ اطباءِ روح ہیں جو روح کے نشیب و فراز جان کر نسخہ تجویز فرماتے ہیں اور علاج کرتے ہیں۔

صحیح عنوان اور الفاظ کی ضرورت، عرفی شاعر کا واقعہ...... بہر حال الفاظ کی ضرورت اس لئے تھی کہ الفاظ ہی کے اندر معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔لفظ اور لہجہ بدل جائے تو معانی ختم ہو جاتے ہیں، عنوان میں معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔آپ عنوان کا لفظ ذرا بدل دیں معانی بدل جائیں گے۔

آپ نے نام سُنا ہوگا عرفی انوری ایران کا بہت بڑا شاعر گزرا ہے۔اس نے بادشاہ کی شان میں قصیدہ پڑھا تو بادشاہ نے خوش ہو کر ایک نہایت اعلیٰ عربی گھوڑا انعام میں اسکو دیا، زین، لگام وغیرہ سونے چاندی سے مرصع اور گھوڑا بھی بڑی اعلیٰ نسل کا تھا۔انوری گھوڑا لیکر گھر آیا، بے چارہ غریب آدمی تھا گھوڑے کو یہاں گھاس بھی میسر نہ آئی، شاہی اصطبل میں ہوگا تو معلوم نہیں دودھ جلیبیاں کھاتا ہوگا، دانے کہاں کھاتا ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ رات ہی رات گھوڑے

بیچارے کا انتقال ہو گیا۔اب انوری کو فکر ہوئی کہ بادشاہ کو اطلاع تو ہو جائے گی۔اگر کل اطلاع ہوئی (اور آج میں نے از خود نہ بتلایا) تو بادشاہ بلا کے کہے گا کہ اس نے شاہی عطیہ کی قدر نہیں کی ،لہٰذا اس کی گردن اڑا دی جائے تو میں بھی گیا گھوڑا تو گیا ہی۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں خود ہی جا کے کیوں نہ اطلاع کر دوں تو گھوڑے کے مرنے کی اطلاع دی مگر ایسے اچھے عنوان سے کہ ایک گھوڑا اور انعام میں لیکر آیا۔کس خوبصورتی سے اطلاع دی اور کہا کہ:

شاہ اسپے بانوری بخشید — بادِ صرصر بہ گرد اونہ رسید

بادشاہ نے انوری کو ایک گھوڑا انعام میں دیا وہ گھوڑا ایسا تھا کہ ہوائیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں اتنا تیز دوڑتا تھا کہ آندھی پیچھے رہ جاتی تھی اور گھوڑا آگے نکل جاتا تھا اتنا تیز رفتار تھا، آگے رفتار کی تیزی کو بیان کیا ہے:

ایں چنیں تیز بود در رفتار — درشباشب بعاقبت می رسید

اتنا تیز رفتار تھا کہ رات کے رات ہی دنیا کا عالم طے کر کے آخرت میں جا پہنچا، اس کی تیز رفتاری کی کوئی انتہا ہے!۔بادشاہ کو ہنسی آ گئی اور کہا کہ اس کو ایک گھوڑا اور دیدو اور اگر یوں کہتا کہ حضور جو مجھے گھوڑا دیا تھا وہ مرگیا تو حکم یہ ہوتا کہ اسے بھی مار دو کمبخت نے شاہی عطیہ کی ناقدری کی ہے۔تو عنوان کا فرق ہے کسی اچھے اسلوب سے خبر دی تو انعام پایا، برے اسلوب سے خبر دیتا تو اس سے انتقام لیا جاتا ہے۔

اگر کوئی اپنے باپ کا تعارف یہ کہہ کر کرائے کہ یہ قبلہ میرے والدِ بزرگوار ہیں، باپ خوش ہوگا کہ بیٹا سعادت مند ہے، باپ کی عظمت کو برقرار رکھتا ہے اور اگر یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہے تو باپ اگر کچھ ناخوش نہیں ہوگا تو خوش بھی نہیں ہوگا، یوں سمجھے گا کہ بھدّا ہے، بے وقوف ہے، اس کو تمیز نہیں ہے، باپ کی عظمت کو کچھ جانتا ہی نہیں اور اگر یوں کہہ کر تعارف کرائے کہ یہ میری ماں کا خصم ہے تو باپ اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرے گا۔حالانکہ بات غلط تو نہیں کہی، ماں کا خصم تھا تب تو صاحبزادے پیدا ہوئے، خصم نہ بنتا تو صاحبزادے کہاں سے پیدا ہوتے؟ تو بات صحیح کہی مگر عنوان بھدّا تھا اور غلط تھا اس واسطے زجر و توبیخ اور سزا کا مستحق ہوا۔

اسلوب بیان...... تو عنوان کے اندر مضامین چھپے ہوتے ہیں، الفاظ کا تو اسلوب بیان ہوتا ہی ہے اور شاعر تو واقعی اسلوب بیان ہی کی روٹی کھاتے ہیں، وہ اشعار کو نظم کرتے ہیں تو اعلیٰ مضمون کو اچھی تمثیل و تشبیہ میں ذکر کرتے ہیں۔لوگ واہ! واہ! کرتے ہیں، داد دیتے ہیں۔ایک ہی مضمون ایک شاعر بیان کرتا ہے اور اسی مضمون کو دوسرے درجے کا شاعر بیان کرے تو وہ زیادہ انعام لے جائے گا اور یہ کم لے گا۔حالانکہ بات دونوں نے ایک ہی کہی تو شاعر تو طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کا کھاتے ہیں۔مجھے اس پر یاد آیا، ہماری اردو زبان کا محاورہ ہے ''آنکھ سے آنکھ لڑ جانا'' یہ محبت ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھ سے آنکھ لڑ گئی یعنی محبت قائم ہو گئی تو استاذ ذوق نے جو مانا ہوا شاعر ہے اس محاورہ کو ایک شعر میں نظم کیا ہے، کہتا ہے کہ:

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا — کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

یہ آنکھیں تو لڑنے میں مصروف ہیں مجھے اپنے دل کا خوف ہے۔ آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی! مجھے ڈر ہے دل کا! کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا۔ آنکھیں تو لڑیں گی اور یہ مارا جائے گا گرفتار ہو جائے گا۔ اس واسطے مجھے دل کا فکر ہے تو بڑی خوبصورتی سے آنکھ لڑنے کے محاورے کو اس نے نظم کر دیا اور اس شعر کو لوگ واقعی ضرب المثل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک ہندو شاعر نے ادا کیا ہے مکند رام اس کا نام ہے، اس نے اس مضمون کو بڑھا دیا اور بہت نازک خیالی دکھلائی وہ کہتا ہے کہ:

دل کی نہیں تقصیر مکند! آنکھیں ہیں ظالم — یہ جاکے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

دل کا بالکل کوئی قصور نہیں ہے یہ تو آنکھیں ظالم ہیں، یہ سارا قصور ان آنکھوں کا ہے کہ یہ جا کے لڑیں اور دل گرفتار ہوا تو محاورہ ایک تھا، ایک شاعر نے ایک انداز سے ادا کیا، ایک نے ایک انداز سے، ذرا سا عنوان بدلا مضمون کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کو اپنے ہی الفاظ میں نازل کیا ہے کیوں کہ اگر بندے اپنے الفاظ میں ادا کریں گے تو تغیر وتبدل لازمی ہے اور جب الفاظ میں تغیر ہوگا معانی کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے حالانکہ معانی میں بھی اُمت امین ہے، لفظوں میں بھی امین ہے اپنی طرف سے ایجاد نہیں کر سکتی۔

معانیٔ قرآن...... بہر حال حق تعالیٰ نے الفاظ میں بھی حفاظت کی گارنٹی دی کہ ہم اس کو محفوظ رکھیں گے اور معانی میں بھی اس کی گارنٹی دی اور معانی...... ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ ① وہ بیان ہیں کہ اللہ کی مرادات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ادا فرمایا، وہ بھی وحی ہے، جس کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ تو حدیث قرآن کا بیان ہے، قرآن کی اولین تفسیر حدیث مبارک ہے، اگر حدیث پر اطلاع نہ ہو آدمی کبھی مفسر نہیں بن سکتا۔ حدیث نبوی اوّلین تفسیر ہے جو قرآن کا بیان ہے، فرمایا گیا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾۔ ② اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تا کہ آپ کھول کھول کر اس کی مرادات اور معانی بیان کریں۔ تو ذکر کو نازل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبین قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر جو معانی اترتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ بیان کرتے تھے، تو بیانِ مراد در حقیقت حدیث رسول سے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال سے قرآن کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے کیلئے بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ کریں تو ایک وصیت کی، فرمایا: کہ خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا، سنت سے دلیل پیش کرنا (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال واعمال اور احوال سے)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تعجب ہوا عرض کیا امیر المؤمنین! قرآن تو وہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسول نے مجھے دعا دی ہے، فرمایا: اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ ③

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباسؓ ج: ۱۲ ص: ۱۰۰۔

اے اللہ! ابن عباس کو کتاب اللہ کی تعلیم دے اور اس کی حکمت ان کے قلب میں ڈال دے، تو میں تو حکمت قرآن کا حامل ہوں اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ اس سے استدلال نہ کروں، اس کی کیا مصلحت ہے؟ فرمایا قرآن کے جملے ذی وجوہ ہیں، اصولی جملے ہیں، آپ اپنے طور سے آیت کے ایک معنیٰ بیان کریں گے، فریق مخالف اسی آیت کا دوسرا معنیٰ بیان کردے گا۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق واضح نہیں ہوگا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول اور فعل سے جب آپ دلیل پکڑیں گے اس میں بولنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

قرآن کے معانی میں خود رائی ......تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کر کے دکھلایا اور جو ارشاد فرمایا وہ بیانِ قرآن ہے اور بیانِ قرآن ہی حدیث ہے۔ انکارِ حدیث کر کے کبھی بھی آدمی قرآن کی مراد نہیں سمجھ سکتا۔ منکرینِ حدیث اسی لئے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن سے اپنی من مانی مرادیں نکالتے رہیں، حدیث بریک لگاتی ہے کہ یہ مراد نہیں ہوسکتی یہ مراد ہے۔ وہ آزادی چاہتے ہیں...... جو چاہیں مطلب لے لیں، جو چاہیں مراد لے لیں۔ حدیث ان کا راستہ روکتی ہے اس لئے وہ انکار کر گزرتے ہیں۔ ان کا انکارِ حدیث خود غرضی پر مبنی ہے...... جب تک حدیث موجود ہے قرآن میں اپنی من مانی کاروائیاں نہیں کر سکتے۔ حدیث کا انکار کر کے جو چاہے کرلیں پھر وہ دین نہیں رہے گا...... وہ تو آراء کا مجموعہ ہوجائے گا، وہ قیاسات اور آراء ہوں گی اور رائے قرآن میں معتبر نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ① جو قرآن میں رائے زنی کر کے معانی نکالے اُسے جہنم میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ سے ہم اپنے اپنے مطالب نکالیں، میں کہتا ہوں ان کو تو اپنے ایجاد کردہ مطالب نکالنے کا کیا حق ہوگا! خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہ نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کبھی نہیں کیا کہ جب قرآن کی کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ بھائی! اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہوسکتے ہیں، ایک یہ بھی اور ایک یہ بھی اور زمانے کے مناسب یہ معنی ہیں، لہٰذا یہ معنیٰ لے لو۔ ایسا نہیں کیا، الفاظ آگئے تو اس کے بعد آپ منتظر رہتے کہ اللہ اس کی مراد بیان فرمادیں وہ اُمت کے سامنے بیان کردوں۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کسی آیت کا معنیٰ پوچھا تو فرمایا: حق تعالیٰ نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھایا جب وحی آگئی بیان ہوگیا تب فرمایا اللہ نے یہ فرمایا ہے اور اس کی یہ مراد ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کو رائے زنی کا حق نہیں تو زید، عمرو اور بکر کو قرآن میں رائے زنی کا کیا حق ہوگا! اور وہ کیا رائے دیں گے اور اس کا اعتبار اور وقار کیا ہوگا! وہ تو دیوار پر مار دینے کے قابل ہوگی۔ تو اصل چیز قرآن کے الفاظ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور مرادات ہیں۔ ان مرادات کو سمجھانے کیلئے انبیاءؑ آئے، اسی کا نام تعلیم ہے۔ تو دو چیزیں ہوئیں: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اور ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم میں الفاظ بھی بیان کردیئے اور ان کی مرادات بھی

---

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب من قال فی القرآن... ص: ۱۹۴۸. ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

بیان فرمادیں۔تو تلاوت بھی ہوگئی اور تعلیم بھی ہوگئی یہاں تک کہ لوگ سمجھ گئے کہ مراد یہ ہے۔

تعلیمِ حکمت ...... یہ ٹھیک ہے کہ مراداتِ خداوندی سمجھ گئے ،مگر انسان کے ساتھ نفس بھی لگا ہوا ہے اور عقلی احتمالات بھی لگے ہوئے ہیں ،کل کو یہ احتمال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یہ معنیٰ بھی اس آیت کے اندر داخل ہوں اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ معنی بیان کئے ہیں مگر آیت کے عموم میں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں تو یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے،تو ممکن تھا کہ احتمالات میں الجھ کر اصل مرادات بھی کھودیں۔اس لئے ایک تیسری چیز اور فرمائی کہ پیغمبر تلاوتِ آیات، تعلیمِ مرادات کے بعد حکمت کی بھی تعلیم دیں (اور حکمت کی دو قسمیں ہیں) حکمتِ نظری تو یہ ہے کہ مراد سمجھا دو اور حکمت عملی یہ ہے کہ عمل کا نمونہ کر کے دکھلایا جائے۔تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط حکم ہی نہیں دیا مراد بھی سمجھائی اور عمل بھی کر کے دکھلایا کہ عمل کا نمونہ یہ ہوتا ہے۔جب نمونہ سامنے آیا تو سارے احتمالات ختم ہو گئے تو یہ بات متعین ہو گئی کہ یہی معنیٰ ہیں اور یہی مراد ہے، جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر کے دکھلایا ہے۔

اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ " صلوا کیف ما اتفق "لوگو! نماز پڑھ لیا کرو جس طرح تمہارا جی چاہے۔بلکہ فرمایا: "صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ "اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔① حج کا حکم دیا تو خود حج کر کے دکھلایا کہ یوں حج کرو اسی طرح سے تمام چیزیں ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو......اس کے نمونے دکھلائے ، دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہو......اس کے عملاً نمونے دکھلائے ،شادی میں کیا کرو......اس کے عملی نمونے دکھلائے ،غمی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آئی اس کا بھی نمونہ پیش فرمایا، گھریلو زندگی کا نمونہ پیش فرمایا، اجتماعی زندگی کا نمونہ پیش فرمایا......تو کوئی عملی اُسوہ ایسا نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش نہ کر دیا ہو۔

تو قرآن پاک علوم کا جامع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اعمال کی جامع ہے۔جو قرآن کہتا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کر کے دکھلاتے ہیں وہی قرآن کہتا ہے۔اگر ہم یوں کہیں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن اتارے ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن جو ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔وہ قرآن علم کا مجموعہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات عمل کا، اخلاق کا اور کمالات کا مجموعہ ہے۔

اس لئے اگر فقط قرآن سامنے ہوتا تو دس احتمالات نکلتے لیکن جب عمل کا نمونہ سامنے آ گیا اور سندِ صحیح کے ساتھ ہم تک پہنچ گیا اب کسی کو دوسرا احتمال پیدا کرنے کی مجال نہ رہی۔آیت کا مفہوم علمی اور عملی طور پر متعین ہو گیا۔تین باتیں ہوئیں آیات کی تلاوت یہ تو قانون کے الفاظ محفوظ کر دیئے کیونکہ الفاظ پر ہی معانی کا مدار ہوتا ہے، قانون ساز مجلسیں دنیا میں بیٹھتی ہیں تو ایک ایک لفظ پر ایک ایک ہفتہ لڑائی ہوتی ہے کہ یہ لفظ رکھا جائے تا کہ یہ مفہوم ادا ہو کیونکہ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة. ج:٣ ص:٧ رقم:٥٩٥.

ذرا لفظ بدل گیا تو مفہوم بدل جائے گا تو ایک ایک لفظ پر قانون ساز مجلسیں بحثیں کرتی ہیں، ہفتہ ہفتہ لگ جاتا ہے، برسہا برس میں قانون کی کتاب تیار ہوتی ہے، بہت سے دماغ آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں جو چیز نکھر کر سامنے آتی ہے پھر وہ لفظوں میں بند کی جاتی ہے تا کہ ان لفظوں کے اندر وہی معنی آئیں جو مراد ہیں۔ قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے وہ ہماری کسی مجلس کا بنایا ہوا تو ہے نہیں کہ ریزولیشن پاس کرلیا کہ اس کو آیت سمجھ لیا کرو کہ یہ آیت ہے، وہ بندوں کی تجاویز نہیں ہیں، وہ اللہ کا کلام ہے تو لفظ بھی اترے اور وہی لفظ اترے جن میں اللہ کی مرادات چھپی ہوئی ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ بھی تلاوت کئے اور دوسری چیز معانی الگ سمجھائے، عمل کر کے بھی دکھلایا لیکن ایک بات اور باقی تھی کہ آیت کے لفظ بھی آ گئے معانی بھی آ گئے، مراد بھی سامنے آ گئی لیکن اگر دل میں کجی اور ٹیڑھا پن باقی ہے تو ہر چیز آدمی غلط سمجھے گا۔ جب دل میں زیغ اور الٹا پن ہے تو کتنا ہی صحیح معنی بیان کرو اوندھا ہی سمجھے گا، اس لئے کہ اس کی سمجھ ہی اوندھی ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن میں نصرانی زیغ لیکر اترے تو ہر لفظ سے نصرانیت کا طریق معلوم ہوگا کہ سارے قرآن میں نصرانیت ہی بھری ہوئی ہے، ہر لفظ سے وہی نکلتی ہوئی نظر آئیگی اگر یہودی ذہنیت لیکر آئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر آیت میں سے یہودیت نکل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس کے عموم سے وہ وہی فائدہ اٹھائے گا جو اس کے دل کے اندر ہے اور دل ٹیڑھا ہے تو تیسری چیز ہے تربت۔

تزکیۂ قلوب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تربیت...... اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں الفاظ پیش کئے جائیں معانی پیش کئے جائیں عمل کا نمونہ دکھایا جائے، وہاں دلوں کو بھی مانجھا جائے تا کہ ٹیڑھ بالکل نکل جائے اور قلب کے اندر استقامت پیدا ہو۔ اس کیلئے مجاہدے کی، ریاضت کی، کثرتِ ذکر کی اور کثرتِ نوافل کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ قلب کا تعلق اللہ سے صحیح قائم ہو اور جو چیز اُتر کر آئے وہ صحیح طور پر آدمی کے دل میں آئے، دل اُلٹا نہ ہو کہ اوندھی چیز سمجھ میں آئے...... اسی کو ﴿وَیُزَکِّیْهِمْ﴾ ① میں بیان فرمایا گیا کہ نفوس کا تزکیہ کرو اور نفوس کو مانجھو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نفوس کو مانجھا بھی اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا تزکیہ کیا۔ مکہ کی زندگی درحقیقت تزکیہ کی زندگی تھی مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیرہ برس گزرے ہیں۔ اس میں یہ حکم تھا کہ اگر تم پر کوئی سختی بھی کرے تو جواب مت دو، کوئی مارے تو چپ رہو، کوئی گالیاں دے تو جواب مت دو، بس اتنا کام ہے کہ کلمۂ حق کہتے رہو...... باقی مقابلہ، مناظرہ اور مجادلہ مت کرو۔ قرآن میں فرمایا گیا: ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ﴾ ② درگذر کرو، مقابلہ مت کرو دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾ ③ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوتوال بنا کے نہیں بھیجا گیا داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے اگر حق کے راستہ میں سختی آئے تو اُسے آپ جھیلیں: ﴿فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ④ آپ صبر کریں جس طرح اولوالعزم انبیاء نے

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۸۵.

③ پارہ: ۳۰ سورۃ الغاشیۃ: الآیۃ: ۲۲. ④ پارہ: ۲۶ سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵.

صبر کیا ہے۔ مار کا جواب مارسے، لاٹھی کا جواب لاٹھی سے اور گالی کا جواب گالی سے نہ دیں، صبر و تحمل اختیار کریں۔

تو پہلا مجاہدہ تو یہی تھا کہ اڑی کڑی جھیلو! سختیاں سہو! اور اُف تک نہ کرو۔ اولاً اس سے قلوب منجھے، پھر انہی حضرات کو ریاضتیں کرائیں، رات کو نوافل میں مصروف، دن کو تسبیح و تہلیل میں مصروف اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس کی نگرانی فرماتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی رات کی زندگی کیسی ہے! دن کی زندگی کیسی ہے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو گھومتے تھے کہ کسی گھر کے اندر سے کوئی بُری آواز تو نہیں آرہی! ان کی گھریلو زندگی صحیح ہے یا غلط ہے!۔

حضور کا شیخین کو اعتدال کا حکم...... حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو ترقُّب کے طور پر (گویا نگرانی کے طور پر) اُٹھے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر سے گزر ہُوا تو وہ قرآن کریم اتنا آہستہ پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سننا بھی مشکل تھا گویا بہت ہی آہستہ آہستہ۔ آگے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکان آیا تو وہ اتنے زور سے پڑھ رہے تھے کہ سارا محلّہ گونج رہا تھا گویا بہت زور سے۔ صبح کو دونوں دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ فرمایا: اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! ''لَا اَدْعُوْ اَصَمَّ وَلَا غَائِبَ '' میں اُسے پکار رہا تھا جو غائب بھی نہیں ہے اور بہرہ بھی نہیں ہے۔ میں تو پروردگار کو سُنا رہا تھا جو ہر وقت حاضر و ناظر ہے مجھے چلّانے کی کیا ضرورت ہے! ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ ① میں آہستہ ہی تو پڑھ رہا تھا اور اللہ تو دل کی کھٹک کو بھی سنتا ہے، مجھے چلانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا چلّا کے کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے اپنی شان کے مطابق جواب دیا کہ: اُطْرِدُ الشَّيْطَانَ وَاُوْقِظُ الْوَسْنَانَ سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ چونکہ وہ أَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ ہیں تو وہی شدت ان کے عمل میں بھی ہے۔ یہ اَرْحَمُ اُمَّتِيْ بِاُمَّتِيْ اَبُوْ بَكْرٍ ہیں ان کے ہاں رحمت، دھیماپن اور نرمی چھپی ہوتی ہے تو انہوں نے اپنی شان کا جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو کچھ بلند کردو اور اے عمر! تم ذرا پست کرو تا کہ اعتدال قائم ہو جائے، افراط تفریط سے عمل بچ جائے۔ ② یہ جائز ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا زور سے پڑھنا بھی جائز ہے اور آہستہ بھی۔ یہ دلوں کی کَلیں درست کرنے کا مسئلہ تھا کہ دل کی رفتار اعتدال پر آجائے نہ افراط ہو نہ تفریط، نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ اس لئے کہ اسلام کا اصول ہی یہ ہے کہ اخلاق میں اعتدال، اعمال میں اعتدال، عقائد میں اعتدال...... الغرض ہر چیز میں اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔

ہر عمل میں اعتدال...... اعمال کے بارے میں فرمایا: لَا تُشَدِّدُوْا فَيُشَدِّدَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ③ اعمال میں شدت مت اختیار کرو کہ اللہ بھی تم پر شدت کرنے لگے۔ اور پھر کسی شدت کا مطالبہ ہو اور نباہ نہ سکو اور گناہگار بنو تو تشدد

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ ۵۵۔ ② مسند احمد، ومن مسند علی ابن ابی طالبؓ ج: ۲ ص: ۳۲۹، رقم: ۸۲۳.

③ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد، ج: ۱۳ ص: ۷۵۷ رقم: ۴۲۵۸، ولفظہ: فیشدد علیکم.

مت کرو، اطمینان اور درمیانہ چال کے ساتھ عمل کرو۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا مسجد میں عبادت کیا کرتی تھیں تو ایک رسی چھت میں لٹکا دی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے فرمایا یہ کیسی ہے؟ عرض کیا گیا: اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا عبادت کرتی ہیں جب نیند آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا پکڑ لیتی ہیں تا کہ نیند میں جھونکے نہ کھائیں۔ اور عبادت میں مصروف رہیں فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب نیند آئے پڑ کے سو رہو: لَاتَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ نیند میں کمی مت کرو جتنی عادتِ طبعی ہے اسے پورا کرو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اعمال میں اعتدال رکھو اتنا دوڑ کے مت چلو کہ آگے جا کر ٹھوکر لگے اور گر جاؤ اور پھر چلنے کے قابل نہ رہو۔ دوسری جگہ فرمایا: ''سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَيْئٌ مِنَ الدُّلْجَةِ ''① نرمی سے چلتے رہو۔ درمیانی چال چلتے رہو کچھ دن میں اللہ کی عبادت کرو، کچھ رات میں اللہ کا نام لے لیا کرو مگر اتنا جس کو نباہ سکو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اصول بیان فرمایا: ''خَيْرُ الْاَعْمَالِ مَادِيْمَ عَلَيْهِ وَاِنْ قَلَّ ''② بہترین عمل وہ ہے جس پر ہیشگی ہو چاہے وہ تھوڑا ہو۔ بہت سا عمل کیا اور تھک کر مہینہ بھر بیٹھ گیا تو وہ غلط ہے اور تھوڑا کیا اور اتنا سست کیا کہ اصل مقصد بھی ادا نہ ہوا...... دونوں چیزیں افراط ہیں یا تفریط ہیں۔ اسی لئے حکم ہے درمیانی چال چلو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر نیند آئی ہے تو اسکی کیا ضرورت ہے کہ رسی تھام کر عبادت کرو، رہبانیت اختیار کرو بلکہ اعتدال کے ساتھ چلو، نیند آئے تو پڑ کے سو رہو، جب آنکھ کھلے پھر اللہ کا ذکر کرو، یادِ خداوندی کرو۔ تو بہر حال اسلام میں اعتدال ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نگرانی فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ ذرا آواز پست کر لو، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ذرا اونچی کرو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔ یہ جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا جو شرع کا موضوع ہے یہ دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی۔

دردِ دل کا علاج...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دل کی تربیت اور تزکیہ بھی فرماتے تھے۔ دلوں میں کھٹک پیدا ہوتی تو فوراً علاج فرماتے تھے، اس کا جائز و ناجائز سے تعلق نہیں تھا، قلب کی کیفیات سے تعلق تھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ہم میں ایمان باقی نہیں ہے اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں تو ایمان اور عمل دونوں کا خانہ درہم برہم ہو گیا ہے تو عمل مقبول نہیں ہوگا (اس لئے عمل کرنے کا کیا فائدہ! گویا عمل میں تعطّل پیدا ہوا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کیا ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ایمان باقی نہیں رہ سکتا؟ فرمایا: کیا وسوسہ ہے؟ عرض کیا دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ؟ زمین کس نے بنائی؟ جواب ملتا ہے: اللہ نے بنائی۔ سوال ہوتا ہے کہ آسمان کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے: اللہ نے بنایا۔ چاند اور سورج کس نے بنائے؟ کہ اللہ نے بنائے۔ ان سارے جوابات سے دل میں ایک

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المدومة علی العمل، ص: ۵۴۳ رقم: ۶۴۶۳.

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومة علی العمل، ص: ۵۴۳ رقم: ۶۴۶۲.

اصول پیدا ہوتا ہے کہ ہر موجود کیلئے مُوجد کی ضرورت ہے، ہر بنی ہوئی چیز کیلئے کوئی بنانے والا ہونا چاہیے۔ بغیر بنانے والے کے شئی نہیں بنے گی تو ہمارے دل میں یہ خطرہ آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے پھر اس کو کس نے بنایا؟ (نعوذ باللہ منہ) اور جب یہ دل میں وسوسہ آ گیا تو کہاں ایمان باقی رہا!۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علاج فرمایا اور ایک منٹ میں علاج ہو گیا فرمایا کہ: یہ جو وسوسہ آتا ہے اسے اچھا سمجھتے ہو یا بُرا؟ عرض کیا کہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے، یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا: ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ یہی تو کھلا ایمان ہے۔ ① وہ ایمان ہی تو بتلا رہا ہے کہ یہ وسوسہ بُرا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو دل وسوسوں کو قبول کرتے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ایمان نہیں رہا...... حالآنکہ ایمان تھا تو اس وسوسہ کو بُرا جانا، ایمان نہ ہوتا تو کبھی بھی بُرا نہ جانتے۔ یہی ایمان کی علامت ہے جیسے کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ ② نیکی کر کے دل میں خوشی ہو اور بدی کر کے طبیعت میں انقباض پیدا ہو تو تم مؤمن ہو۔ اگر نیکی کر کے خوشی نہ ہو اور بدی کر کے کدورت نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان نہیں ہے، عادت پڑی ہوئی ایک رسم ہے، وہ عملِ صالح نہیں ہے۔ تو اصل چیز یہی ہے کہ قلب درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا: وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ ③ انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا (گاجر اور صنوبری شکل کا) ہے اگر وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے اور وہ دل ہے اور وہ غلط ہے تو نیت بھی غلط، عمل بھی غلط، ارادہ بھی غلط، جذبات بھی غلط...... ہر چیز اول سے لے کر آخر تک غلط ہوتی چلی جائے گی۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا موضوع دل اور فلاسفہ کا موضوع دماغ تھا...... اس واسطے انبیاء علیہم السلام نے قلبِ انسانی کو اپنا موضوع ٹھہرایا ہے کہ قلب کو درست کر لو تا کہ سارا انسان درست ہو جائے جیسا کہ فلسفیوں نے اپنا موضوع دماغ ٹھہرایا ہے کہ عقل درست کر دو تو دنیا کی زندگی بن جائے گی۔ آدمی چاہے برباد ہو جائے وہ عقل سے کام لیتے ہوئے محض اسی کو درست کرتے ہیں تو عقل سے آدمی کچھ آرائش اور کچھ زینت کر لے گا لیکن عقل سے قلوب سنور جائیں یہ ممکن نہیں قلوب تو ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے سنبھلیں گے، قلوب کو سنوارنا عقل کا کام نہیں ہے۔

فلسفیوں نے عقل کو موضوع ٹھہرایا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دل کو موضوع ٹھہرایا۔ وہ دل درست کرتے ہیں تا کہ سارا انسان درست ہو جائے اور فلاسفہ دماغ درست کرتے ہیں۔ اس سے دماغ درست ہو جاتا ہے قلب

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان ،باب الوسوسة فی الایمان ،ص: ۳۵۲۵.

② مسند احمد، حدیث ابی امامة الباهلیؓ ج:۴۵ ص: ۱۴۰ رقم: ۲۱۱۴۵.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان،باب فضل من استبرأ لدینه، ص : ۶ ، رقم: ۵۲.

چاہے برباد ہو، قلب کے اخلاق چاہے تباہ ہو جائیں، اعمال برباد ہو جائیں، اس سے انہیں غرض نہیں بس عقل کی سوچی ہوئی زینتیں اور آرائشیں باقی رہ جائیں، لیکن ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا نہ دنیا بنتی ہے نہ آخرت بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے ہر اگلے نے پچھلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی ہے اور کہا کہ میرے اوپر اس وقت تک ایمان نہیں بنے گا جب تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے، حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر تمام انبیاء پر جب تک ایمان نہ ہو...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں تو مجھ پر بھی ایمان نہیں۔ چنانچہ اعلان فرمایا کہ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ② کہہ دو اور علی الاعلان پکار کر کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اللہ نے جو ہم پر نازل کیا اس پر اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر اور جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لائے۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ③ ہم ان میں تفریق نہیں کرتے یکساں طور پر سب کو اللہ کا حقانی فرستادہ جانتے ہیں۔ تو ہر نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی اور پھر ہر آنے والے نے اپنے بعد آنے والے کی پیشین گوئی کی کہ اس کی بات ماننا ورنہ مجھے بھی نہیں مانا۔ تو یہ ایک عجیب سلسلہ ہے کہ اگلے پچھلوں کی تصدیق کر رہے ہیں اور پچھلے اگلوں کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اور اس کے بالکل برعکس فلاسفہ میں سے جو اگلا آتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا نظریہ درست ہے پچھلے سارے احمق تھے، انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ ایک نے کہا کہ زمین حرکت کرتی ہے، سورج حرکت نہیں کرتا، پچھلے لوگوں نے کہا تھا کہ زمین ساکن ہے، وہ غلط کہتے تھے وہ احمق تھے، تو انکی تحمیق کی اور اپنا نظریہ ثابت کیا۔ کسی نے کہا کہ عالم قدیم ہے اور جس نے کہا کہ حادث ہے وہ احمق تھا۔ کسی نے کہا کہ حادث ہے اور قدیم کہنے والا احمق تھا۔ تو ہر ایک دوسرے کی تحمیق اور تجہیل کرتا ہے اس کے معنیٰ ہیں کہ سارے احمق ہیں اور سارے جاہل ہوں گے۔

جب ہر ایک دوسرے کو احمق بتلا رہا ہے تو دانش مند کون باقی رہا؟ اُس کے نزدیک یہ احمق، اِس کے نزدیک وہ احمق۔ تو فلسفہ کیا ہوا یہ تو حماقتوں کا مجموعہ ہو گیا گویا ہر ایک دوسرے کو جھٹلا رہا ہے تو ایک مسلمان کا مدار تصدیق پر ہے تکذیب پر نہیں ہے اور تصدیق ہی ایمان کا نام ہے گویا ایمان ماننے کا نام ہے، نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، نہ ماننے کو تو کفر کہتے ہیں اور ماننے کا تعلق قلب سے ہے، اسی واسطے حضرات انبیاء علیہم السلام نے قلوب کا سلسلہ اختیار کیا کہ قلب کو درست کیا جائے۔

اُمّت کے فرائض ...... بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چار فریضے عائد کئے گئے: تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ اسوہ اور تزکیۂ نفوس۔ یہ پوری اُمت بحیثیتِ مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۶. ② ایضاً

ہے۔ یہی چاروں فریضے اس پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ اس کا فریضہ ہے کہ پہلے تلاوتِ آیات کرے، قرآن کی آیات کے الفاظ پڑھ کر سنائے، ایسے مدارس ہوں جن میں قرآن کے الفاظ سکھلائے جائیں، خواہ ناظرہ پڑھائیں یا حفظ پڑھائیں مگر قرآن کے الفاظ محفوظ رہیں کیونکہ انہی الفاظ میں معانی ہیں۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ امت میں معلمین بھی ہوں تاکہ وہ تعلیم دیں۔ اس واسطے کہ دین کے بارے میں رائے معتبر نہیں۔ قرآن ہو یا حدیث...... وہ نقل کی جائے گی اور سلف کے دائرے میں محدود رہ کر قرآن کے معنی متعین کئے جائیں گے۔ اگر سلف کا دامن چھوٹ گیا اور رائے زنی آ گئی تو ہوائے نفس پیدا ہوگی۔ نفس میں آزادی پیدا ہوگی تو آدمی دین کا متبع نہیں رہے گا نفس کا متبع بن جائے گا۔ اس واسطے ہوائے نفس سے روکنے کیلئے اس کی ضرورت ہے کہ تعلیمِ مراد بیان کی جائے کہ اللہ کی یہ مراد ہے اور یہ بغیر تعلیم کے نہیں حاصل ہو سکتی۔ معلم کہتے ہی اس کو ہیں جو مرادات اور مطالبِ خداوندی کو بیان کردے۔

اسی کے ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ عمل کا نمونہ بھی کر کے بتلائے۔ ہم آج جو نماز پڑھتے ہیں محض اس لئے صحیح نماز پڑھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو دیکھتے ہیں اگر پڑھنے والوں کا نمونہ سامنے نہ ہوتا کبھی نماز صحیح نہ پڑھتے فقہ کی آپ ساری کتابیں دیکھ لیں رکوع سجدے کے معنیٰ معلوم کر لیں اس وقت تک نماز پڑھنی نہیں آئے گی جب تک نمازیوں کی ہیئت سامنے نہیں ہوگی، اس ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اگر آپ محض کاغذوں سے نماز اخذ کریں گے تو دس ہزار قسم کی نماز ہو جائے گی کیونکہ عقلیں مختلف ہیں، اپنی اپنی عقل سے جو جس کی سمجھ میں آ گیا اسی پر عمل کرے گا۔ تو نماز کے ہزاروں ڈھنگ بن جائیں گے۔ ایک دین کے لاکھوں دین بن جائیں گے۔ اس لئے ان بیانات کا پابند ہونا پڑے گا جن سے اسوہ اور عملِ نبوی متعین ہو، اسی کی پیروی کرنا پڑے گی۔ اسی طرح مرادات میں پیروی کرنی پڑے گی۔ رائے کا دخل نہیں ہوگا۔ اگر قرآن کے محض الفاظ کو سامنے رکھ لیں اور کوئی معلم و مربی نہ ہو تو ضروری نہیں کہ ہم مرادِ ربانی سمجھ جائیں بلکہ آپ کے نفس میں جو کیفیت غالب ہوگی وہی معنیٰ آپ سمجھیں گے تو لازمی ہے کہ آپ متعین طریق پر وہی سمجھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو سمجھایا ہے...... وہ وہ ہے جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو سلف اور آئمہ کو سمجھایا ...... آپ بھی وہی سمجھیں گے تو ٹھیک، ورنہ اس کے بغیر آپ مراداتِ ربانی تک نہیں پہنچ سکتے۔

کتاب اور شخصیت دونوں ضروری ہیں...... تو کتاب کی بھی ضرورت ہے، لیکن نہ محض کتاب کافی ہے نہ محض شخصیت کافی۔ اگر شخصیت تنہا ہو اور کتاب اللہ سامنے نہ ہو تو شخصیتوں پر ذاتی احوال بھی تو گزرتے ہیں، ان ذاتی احوال میں کچھ ان سے دائرۂ قانون سے باہر افعال بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے سارے افعال کو ہم شریعت تسلیم کر لیں تو شریعت اور غیر شریعت مخلوط ہو کر رہ جائے گی، اصلی دین باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح غلط اقوال اور احوال ہیں مثلاً ایک شخص صاحبِ حال ہے، اس حال میں اس نے ایک وجد یہ کلمہ کہا اپنے نزدیک وہ سچا

ہے، حال بھی درست ہے مگر وہ قانون نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو تلقین کریں۔ قانون وہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔

اگر منصور رحمۃ اللہ علیہ نے اَنَـا الْـحَقُّ کہا تو یہ کوئی قانون نہیں کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہا جائے کہ لوگو! تم بھی "اَنَا الْحَقُّ" کہا کرو حالانکہ ہم یہ کہیں گے کہ منصور کا دعویٰ حق ہے کیونکہ وہ فنافی اللہ کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے اور فنا کے مقام پر پہنچ کر اپنا نفس اوجھل ہوتا ہے اپنے نفس میں بھی نگاہ کرتے ہیں تو جلوۂ خداوندی ہی نظر آتا ہے ایسے میں کوئی اَنَا الْحَقُّ کہے تو اس کے سامنے اس کا نفس ہی نہیں۔ اَنَا تو وہاں ہے ہی نہیں وہاں تو انت ہی انت ہے آپ ہی ہیں جہاں کہیں ہیں۔

ہر چہ دیدم در جہاں غیرِ تو نیست ـــــ یا توئی ، یا خوئے تو یا بوئے تو

میں دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہوں تیرے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی یا تیری ذات ہے یا "خوئے تو" تیری صفات ہیں یا بوئے تو تیرے افعال ہیں، ان سے دنیا آباد ہے۔ تو اس مقام پر جو پہنچ جائے اس کا نفس بھی ختم ہو جاتا ہے دنیا بھی ختم ہو جاتی ہے اور جلوہ حق ہی بس سامنے رہ جائے گا۔ وہ باہر دیکھے گا تو کہے گا: اَنْتَ الْحَقُّ اپنے اندر دیکھے گا تو اَنَا الْحَقُّ کہے گا تو وہاں (منصور کے ہاں) "اَنَا" اپنے لئے نہیں ہے، نہ "اَنْتَ" دوسروں کیلئے ہے۔ وہ تو حق کا اظہار کرتا ہے تو منصور کی زندگی کو ہم بھی سچی سمجھتے ہیں، لیکن وہ قانون نہیں ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر آپ تلقین کریں۔ قانون تو صرف شریعت ہے، جس کی تلقین کی جائے گی۔ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے اور شریعت قانونِ عام کا نام ہے۔ ہر کس و ناکس کیلئے جو پیغام ہے وہ شریعت ہے۔ شخصی احوال میں جب آپ اس حال میں پہنچ جائیں گے تو ہم آپ کو سچا جانیں گے، آپ کی عظمت کریں گے اس حال کو بھی سچا جانیں گے مگر اسے قانون بنا کے پیش نہیں کریں گے، ہر شخص کا حال الگ الگ ہے، ایک کا حال دوسرے کیلئے حجت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال قانونِ عام شریعت ہے، اسٹیج پر اسی کو پیش کیا جائے گا۔ زید، عمرو، بکر اپنے حال کو پیش نہیں کر سکتے...... صرف قولِ پیغمبر پیش ہو گا اور افعالِ پیغمبر پیش ہونگے، وہی شریعت ہیں، کسی اور کا قول وفعل شریعت نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی میرا حال ہے اور صحیح ہے تو اللہ کے ہاں مقبول ہوں، حال غلط ہے اللہ کے ہاں نا مقبول۔ بہر حال وہ پھر بھی شخصی بات ہوتی ہے قانونی بات نہیں ہوتی۔ اس واسطے قانون کی ضرورت پڑی اور قانون کے ساتھ شخصیت کی بھی۔ تو محض شخصیت ہو تو شخصیتوں کا مذاق ہو جائے، خاندان پرستی اور شخصیت پرستی شروع ہو جائے گی اور شخصیت سے جو سرزد ہو جائے وہ شریعت بن جائے گا، شریعت غیر شریعت مخلوط ہو جائے گی۔ اس لئے شخصیتوں کے حال کیلئے "کتاب اللہ" کسوٹی ہے اس پر پرکھ لو، اگر اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے مطابق نہیں ہے تو سکوت اختیار کرو۔

تو شخصیت اور کتاب دونوں کی ضرورت ہے پیغمبر کی بھی ضرورت ہے اور قانونِ الٰہی کی بھی ضرورت ہے۔ نہ

محض قانون کافی، نہ محض ذات کافی ہے۔ پیغمبر کی ذات تو معصوم ہے لیکن بعد میں جو ذوات آئیں گی وہ تو معصوم نہیں ہیں، غلط فہمی بھی لگی ہوتی ہے، غلط احوال بھی لگے ہوتے ہیں...... جب یہ ساری چیزیں شریعت بن جائیں گی تو شریعت اور غیر شریعت خلط ملط ہو جائے گی، دین کے اوپر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس لئے شخصیتوں کو کتاب کے معیار پر پرکھیں گے اور کتاب کے معانی شخصیتوں سے سمجھیں گے اسی طرح سے دین چلے گا۔ اور صحیح ہدایت پر لوگ پہنچیں گے۔

کیا صحابہ کرام اور اولیاء اللہ معیارِ حق ہیں...... تو میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر قیامت تک ہدایت کے یہی دو طریقے مقرر کئے ہیں ایک قانون خداوندی اور ایک شخصیت جو کہ مقبول شخصیت ہو اور وہ انبیاء کی شخصیتیں ہیں جو کہ معصوم ہیں۔ اولیائے کرام کی عظمت واجب ہے، گو وہ معصوم نہیں مگر خاص مقربین اور اولیاء اللہ محفوظ ضرور ہوتے ہیں، من جانب اللہ ان کی حفاظت کی جاتی ہے، ان کو من جانب اللہ برائی سے روکا جاتا ہے، اگر نفس لے بھی چلے تو اللہ تعالیٰ اس طرف انہیں جانے نہیں دیتے، حفاظت خداوندی شامل حال ہوتی ہے...... مگر اس کے باوجود امکان ہے کہ ان کا عمل غلط ہو جائے اور جب امکان آ گیا تو قطعیت نہ رہی اور دین قطعی حکم کا نام ہے، ظنی اور امکانی چیز کا نہیں۔ اس لئے انبیاءؑ کی حد تک تو بات صحیح ہے کہ ان کا جو قول وفعل ہے وہ شریعت ہے لیکن دوسرے لوگوں کے حق میں یہ بات نہیں ہے کہ ان کا ہر قول وفعل شریعت بنا دیا جائے۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریعت کا معیار تو نہیں ہیں کہ وہ شریعت بنا دیں، وہ شریعت بنائیں گے تو نہیں، البتہ شریعت کے متبع ہیں تو شریعت کے حق میں تو معیار نہیں کہ وہ شریعت بننے لگیں۔ لیکن فرقوں کے حق میں اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں معیار قرار دیا ہے، فرقوں کا حق وباطل صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ پرکھا جائے گا، حدیث میں فرمایا گیا: ''اِفْتَرَقَتْ بَنُوْ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً'' بنی اسرائیل بہتر فرقوں پر بٹ گئے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹے گی، كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً سب کے سب عقائد کی وجہ سے اہل جہنم بنیں گے، صرف ایک ہی فرقہ حق پر رہے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ وہ کون ہوں گے؟ فرمایا: مَا اَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَاَصْحَابِيْ [1] جس طریقہ پر آج میں ہوں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم قائم ہیں وہی فرقوں کے حق وباطل پہچاننے کا معیار ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے ساتھ شامل کیا یعنی جس سے فرقوں کے حق میں معلوم ہو کہ کون سا فرقہ باطل ہے یا حق ہے؟ اس کیلئے نبی کریم کی ذات بھی معیار ہے اور آپ کی ذاتِ عالی کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی معیار ہیں۔

[1] السنن للترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الامة ج: ۹ ص: ۲۳۵ رقم: ۲۵۶۵.

اس لئے پہلی چیز ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی فرقے کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ہے یا نہیں! اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے تو یقیناً وہ باطل ہے لہٰذا پہلی بات تو یہ ہوئی اس لئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ '' ① جو میرے ساتھ محبت کرے گا اس محبت کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت آئے گی جو میرے ساتھ بغض رکھے گا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی اُسے بغض پیدا ہوگا اور عام لفظوں میں فرمایا کہ ''حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِيْمَانِ وَبُغْضُ الْعَرَبِ مِنَ النِّفَاقِ '' ② نسبت کی وجہ سے عربوں کی محبت ایمان کی علامت ہے اور ان کا بغض نفاق کی علامت ہے۔ بہرحال فرقوں کے حق میں پہلی بات یہ دیکھیں گے کہ ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ہے یا نہیں! اگر نہیں ہے تو کہیں گے یہی باطل ہونے کی علامت ہے تو محبت لازمی ہے، اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے تو وہ فرقہ حق نہیں بن سکتا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہمارا تعلق محض تاریخی نہیں ہے کہ انہوں نے سنداً دین کی روایتیں ہم تک پہنچا دیں اور ہم نے قبول کرلیں۔ گویا وہ محض چٹھی رساں نہیں ہیں کہ انہوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے وہ پوری امانت اور دیانت سے پہنچا دیا اور اس سے زیادہ کوئی کام نہیں کیا، ایسا نہیں! یہ تو تاریخی واسطہ ہوا، صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہمارا تعلق عشقی اور محبتی ہے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم عاشق ہیں اور عاشق کا کام یہ ہے کہ اپنے محبوب کے اندر محو ہو، وہ محبوب کے اوپر تنقید نہیں کرے گا کہ یہ کام غلط کیا! یہ حسن و جمال غلط ہے! یہ چیز اس کی صحیح نہیں ہے!...... وہ عاشق ہی کیا ہوا جو ایسا ہو! صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عشقی تعلق ہے، محض تاریخی تعلق نہیں ہے۔

اس واسطے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم فرقوں کے حق و باطل کے پہچاننے میں معیار بنیں گے پھر دیکھا جائے گا کہ ان کے عقائد صحابہ رضی اللہ عنہم کے عقائد کی مانند ہیں کہ نہیں! مطابق ہیں تو حق پر ہیں، اگر نہیں ہیں تو باطل پر ہیں۔ اس حد تک صحابہ رضی اللہ عنہم معیار ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے شریعت تو نہیں بنتی کہ وہ بنا دیں کہ یہ شریعت ہے البتہ فرقوں کے حق میں صحابہ رضی اللہ عنہم کسوٹی ہیں۔ اس پر نقد اور تبصرہ کر کے ہم پہچان لیں گے کہ یہ حق ہے یا باطل ہے۔ تو جو صحابہ سے عداوت رکھے گا وہ بھی باطل، جو بغض رکھے گا وہ بھی باطل، جو گالم گلوچ کرے گا وہ بھی باطل ہے، تو ایسے تمام فرقے باطل پرست ہوں گے اور جو عشق و محبت کرے اور عظمت کرے...... وہی فرقہ حق پر ہوگا۔

صحابہ کا کمالِ تقویٰ...... اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ ③ تمام صحابہ

---

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی من سب اصحاب النبی ﷺ ج: ۱۴ ص: ۱۶.

② الحدیث اخرجه البیهقی فی الشعب ولفظه: حب العرب ایمان وبغضهم نفاق، ج: ۴ ص: ۱۴۲.

③ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، ج: ۱ ص: ۲۴۷.

رضی اللہ عنہم متقین اور عادل ہیں۔قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، کہیں فرمایا: ﴿رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، کہیں فرمایا: ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾ ② اللہ نے پہلے ہی جانچ لیا تھا انکے دلوں کو کہ یہ تقویٰ شعار ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمال تقوی کی شہادت قرآن نے دی ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کسی صحابی سے کوئی غلطی ہو جائے......حتیٰ کہ عوام صحابہ رضی اللہ عنہم سے معصیت بھی ہوسکتی ہے مگر یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ایک متقی آدمی بھی گناہ کرسکتا ہے، وہ گناہ تقویٰ کے خلاف ہے جس کی جڑیں دل میں جمی ہوئی ہوں، دل میں تقویٰ جما ہوا ہو......باہر سے یا گردوپیش کے حالات میں مبتلا ہو کر گناہ کر گزرے اور اندر سے دل میں نفرت کی اور توبہ کی، دل سے نادم ہوا تو یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقویٰ باطن کی شہادت قرآن نے دی ہے، اگر کوئی عملی غلطی ہو جائے تو ان کے تقویٰ میں ذرّہ برابر فرق نہیں پائیں گے ،قرآن کریم میں خود فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ ③ وہ لوگ متقی ہیں اگر شیطان کا کوئی گروہ انہیں چھو جاتا ہے اور کسی گناہ پر مائل کرتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں کہ یہ شیطان کہاں آ گیا، لاحول پڑھتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ شیطان چھو تو سکتا ہے اور اپنا اثر بھی ڈال سکتا ہے مگر پھر بھی کہا گیا کہ یہ لوگ متقی ہیں۔تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقویٰ باطن کی شہادت اللہ نے قرآن میں دی ہے، عمل میں کوئی غلطی ہو تو اس کا امکان ہے لیکن کوئی بُرا عمل بدنیتی سے کریں یہ نہیں ہے، تقویٰ موجود ہے لہٰذا خطاء اجتہادی ہوگی۔

صحابہ کی باہمی جنگیں باعثِ اجر و ثواب ہیں......حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو جنگ ہوئی ہم کہتے ہیں خطاءِ اجتہادی تھی اور اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيْبُ مجتہد خطاء بھی کرسکتا ہے صواب بھی کرسکتا ہے۔خطاء کرے تو ایک اجر ملے گا اور صواب کرے گا تو دوہرا اجر ملے گا۔تو معصیت پہ تھوڑا ہی اجر ملتا ہے، معلوم ہوا کہ خطاءِ اجتہادی معصیت نہیں ہے ورنہ اجر نہ دیا جاتا۔تو مجتہد ہر صورت میں اجر کا مستحق ہے۔تو صحابہ رضی اللہ عنہ سے مسائل میں خطاءِ اجتہادی واقع ہوئی ہے۔جنگیں بھی ہوئی ہیں، مناظرے بھی ہوئے، مباحثے بھی ہوئے......مگر تقویٰ باطن دونوں جگہ قائم ہے۔خطاءِ فکری اور خطاءِ اجتہادی ہوگی۔اور خطاءِ اجتہادی پر بھی اجر ملتا ہے تو ان کی خطاء کو معصیت کہنا یہ ضال اور گمراہ ہونے کی علامت ہے۔

بہر حال بات دور چلی گئی میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا۔کہ یہ امت بحیثیت مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے۔پیغمبر کے جو چار کام تھے وہی کام امت کو کرنا چاہئیں؛ تعلیم کتاب (بمعنی تلاوتِ آیات)، تزکیۂ نفوس، تعلیم

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸. ② پارہ ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۰۱.

عمل، تعلیمِ اسوہ۔اور تلاوت آیات یہ ساری امت کا فرض ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرے اور کرائے، ناظرہ ہو یا حفظ مگر الفاظِ قرآن سامنے رہیں۔اور معانی ومضامین اس حد تک ضروری ہیں جس سے ہم دین سمجھ کر دیندار بن سکیں۔سب کا عالم بننا ضروری نہیں ہے وہ فرضِ کفایہ ہے ہزار دو ہزار میں ایک بھی عالم بن جائے وہ کافی ہے۔ ہاں ساری امت عالم سے خالی ہو جائے ایک بھی عالم نہ ہو پھر سارے گنہگار ہوں گے تو سب کا عالم بننا ضروری نہیں مگر سب کا دیندار بننا ضروری ہے اور دیندار بننے کیلئے اتنی معلومات لازمی ہیں جس سے ہم روزمرہ کے عمل کو درست کر سکیں۔ہم نماز کیسے پڑھیں! زکوٰۃ کس طرح ادا کریں! روزہ کس طرح رکھیں! حج کے کیا فرائض ہیں! کیا واجبات ہیں! کیا سنتیں ہیں...... اتنی معلومات لازمی ہیں، بچوں کیلئے بھی تعلیم کا اتنا اہتمام ضروری ہے، خواہ وہ مدرسہ کی صورت میں ہو یا سوسائٹی کی صورت میں ہو یا خود تلقین کی صورت میں ہو۔

تعلیم وتربیت کے درجات......تو اعلیٰ ترین صورت تو تعلیم ہے کہ معلم اپنی صحبت اور معیت میں رکھ کر اُسے سمجھائے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگے تا کہ وہ تقوئ شعار بنیں، اعلیٰ طریق یہی ہے اور یہی طریق انبیاء علیہم السلام کا ہے۔صحابی کو صحابی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ صحبت یافتہ ہے اور اسی لئے استاذ شاگرد کی اصطلاح سلف صالحین میں یہی تھی؛ اصحابِ ابی حنیفہؒ، اصحابِ محمدؒ، اصحابِ شافعیؒ...... یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ صحبت یافتہ بھی ہیں انہوں نے محض کتاب نہیں پڑھی بلکہ معیت سے قلب کا رنگ قلب تک بھی پہنچا ہے۔

کتابِ الٰہی قرآن میں فرمایا گیا ہے:﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ ①
تو اعلیٰ طریق تعلیم وتدریس ہے، اس سے ادنیٰ درجہ لٹریچر ہے، بشرطیکہ اسکا سمجھانے والا بھی کوئی ہو، لٹریچر میں آزادمت ہو کہ جس کا جو جی چاہے سمجھ لے، اس کو بھی سمجھانا پڑے گا اگر وہ اردو یا انگریزی میں ہوگا آپ کے ہاں انگریزی میں نہیں ہے مگر اردو میں بہت سے ایسے رسالے چھپ گئے ہیں جن میں عقائد کے، اخلاق کے، ایمان کے ابواب کا تفصیلی ذکر ہے۔اس زبان میں تراجم ہیں ان کا مطالعہ ہو اور ان کی تفہیم بھی ہو۔اس سے بھی نیچا درجہ گو وہ بھی ضروری ہے ماں باپ کی تلقین ہے۔اس لئے کہ بچے کو جو ابتداً تلقین کریں گے وہ پتھر کی لکیر بنے گی، بڑھاپے تک اس عمل کی عادت باقی رہے گی، تو ماں باپ کی تلقین اصل ہے۔ماں کی گود تو بچہ کیلئے پہلا مدرسہ ہے، اگر ماں ہی کی گود علم سے خالی ہے تو بچے تک کیا چیز پہنچے گی؟ باپ خود بھی مسائل سے خالی ہے تو بچے تک کیا علم پہنچے گا؟

نئی نسل کی تربیت کا راز......اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ فکر آپ کی بجا ہے کہ ہماری نسلیں خراب نہ ہوں، ان میں ایمان باقی رہے...... یہاں (پاکستان میں) ہر جگہ میں نے یہ فکر دیکھا اور اس سے بڑی خوشی ہوئی، امریکہ میں جگہ جگہ شہروں میں جہاں جانا ہوا یہ فکر ہر ایک کے دل میں ہے کہ میری نسل کسی طرح دین پر باقی رہے، کوئی ایسی تدبیر ہو......تو میں نے کہا یہ بہت بڑا انعام خداوندی ہے کہ دلوں کے اندر یہ فکر ہے اور اس فکر کا ہونا بڑی نعمت

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۸۔

ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ فقط اولاد کا فکر نہ ہونا چاہیے اپنی بھی تو فکر ہو جو حرکتیں تمہاری ہوں گی اس کی بچے نقل اتاریں گے۔ بچے میں بالطبع نقالی کی عادت ہے آپ نمازیں پڑھیں گے وہ بھی رکوع سجدے کرنے لگے گا، آپ بولیں گے وہ بھی اسی طرح بولنے کی مشق کرے گا، گالی والی دیں گے تو وہ آپ کو بھی گالی دینے لگے گا۔ دیہات میں ہم کبھی جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ بھئی بچہ کیسا ہے؟ تو دیہاتی کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے! اب گالی والی دینے لگا ہے!۔ تو ان کے ہاں دیہات میں گویا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بچہ گالی دینے لگے۔ اس لئے کہ ماں باپ کو گالی دینے کی عادت ہے تو اولاد میں بھی وہی عادت آئے گی۔ تو یہ فکر بالکل صحیح ہے کہ اولاد درست رہے، مگر یہ فکر جب مکمل ہوگی کہ اپنی بھی تو فکر کریں، ہم بھی تو درست رہیں۔ ہماری درستی سے اولاد درست ہوگی، ہم خراب ہیں تو اولاد بھی خراب رہے گی: ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ''لوگ اپنے بادشاہوں کا طریق اپناتے ہیں تو گھر کے ملوک و بادشاہ تو یہی ماں باپ ہی ہیں، جو ان کی پرورش ہوگی وہ اولاد کی پرورش ہوگی: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے قاعدہ کے بموجب جتنی رعایا ہے وہ تو بادشاہ کے طریق پہ چلتی ہے حکومت میں جو چیز پسندیدہ ہے عوام بھی اسے پسند کریں گے، تو گھر کی حکومت ماں اور باپ کے ہاتھ میں ہے جو انہیں پسند ہوگا بچے بھی وہی پسند کریں گے۔ تو یہ فکر صحیح ہے کہ بچے دین پر قائم رہیں، اس کیلئے لازمی ہے کہ کچھ تلاوت ہو اور کچھ تعلیم مقاصد بھی ہو، کچھ عملی نمونے بھی ہوں اور کچھ دلوں کا مانجھنا بھی ہو، رات دن کی تلقین بھی ہو روک ٹوک بھی ہونی چاہیے تو تب کہیں کچھ بات بنتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ لَا تَرْفَعْ عَصَا اپنی اولاد سے کبھی لاٹھی مت اٹھاؤ، مطلب یہ کہ وہ تمہاری نگرانی میں رہیں چاہے وہ بڈھے بھی ہو جائیں تب بھی تلقین جاری رکھو۔ ﴿وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ①

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کیے۔ آیت جو میں نے پڑھی تھی اس آیت میں بہت سے علوم اور مضامین ہیں مگر نہ تو میں سارے مضامین ایک مجلس میں بیان کرسکتا ہوں اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ سارے مضامین مجھے معلوم بھی ہوں یہ بڑے علماء کا کام ہے، مگر جتنے مضامین ہیں میں وہ بھی نہیں ادا کرسکتا۔ اس لئے میں نے اجمالی طور پر آیت کی ایک سرسری تفسیر کردی اور راستہ بتادیا کہ اس راستہ پر آپ کو چلنا ہوگا۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطاء فرماوے، حق تعالیٰ ہمارے دین اور دنیا دونوں کو درست فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستہ پر قائم رکھے۔

''وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵.

معجزۂ علمی

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس جلسہ کا موضوع جیسا کہ ابھی آپ کے سامنے عملاً بھی ظاہر ہو گیا یہ ہے کہ دارالعلوم اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلباءِ کرام کو سند دی جائے اور انعام تقسیم کیا جائے تا کہ دارالعلوم کی کارگزاری سامنے آجائے اور اس دارالعلوم کے معاون جو تعاون کر رہے ہیں اس تعاون کا نیک ثمرہ آپ کے سامنے آجائے۔ دوسرے لفظوں میں جلسہ کا موضوع قرآن کریم نکلتا ہے کہ قرآن عظیم کے سلسلہ میں اس کی برکات وثمرات سامنے بھی آئیں اور انہیں بیان بھی کیا جائے۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں چند گزارشات قرآن کریم کے بارے میں اور اس کی نسبت سے دارالعلوم اسلامیہ کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں، حق تعالیٰ مدد فرمائے! اس لئے کہ میں بہت زیادہ کمزور بھی ہوں، ضعیف بھی ہوں، کچھ علیل بھی ہوں اور علم کے لحاظ سے بے حد قلیل بھی ہوں...... مگر علّت اور قلّت کے باوجود جتنا کچھ حق تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور جتنا کچھ آپ حضرات کی توجہات کی برکت شامل حال ہوگی تو ممکن ہے کہ چند کلمات گزارش کر سکوں۔

کلام کی عظمت کے چار معیار...... پہلے اتنی بات سمجھ لیجیے کہ کسی بھی کلام کی عظمت یا وُقعت اس کے متکلم سے پیدا ہوتی ہے جس درجے کا متکلم ہوگا کلام کرنے والا ہوگا اسی درجہ...... کلام کی عظمت اور کلام کی وُقعت بھی آپ کے سامنے آئے گی۔ عربی کی ایک مثل مشہور ہے "قَدْرُ الشَّهَادَةِ بِقَدْرِ الشُّهُوْدِ" "شہادت کی عظمت شاہدوں سے قائم ہوتی ہے۔ اگر شاہد عادل ہے، سچا اور صحیح ہے تو اس کی شہادت بھی سچی۔ اور شاہد میں اگر کھوٹ ہے تو اس کی شہادت کا بھی وہی درجہ ہوگا۔ تو کلام کی عظمت اور وُقعت بھی متکلم ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ جس درجے کا متکلم ہوتا

① پارہ ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

ہے اسی درجے کا اس کا کلام بھی سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اگر دو کلام کرنے والوں کا کلام مشترک ہو تو مگر ایک متکلم گھٹیا درجے کا آدمی ہے تو اس کے کلام کی وُقعت بھی کچھ گھٹ جاتی ہے اور اسی کلام کو کوئی بڑا آدمی کہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ کلام کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے چند چیزیں طبعی طور پر ضروری ہیں جن سے کلام عظیم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی چیز علم اور فضل ہے۔ اگر کلام کرنے والا عالم اور باخبر ہے تو اس کے کلام میں علم ہوگا اور اس کی خبر سے اس کے علم کی وسعت واضح ہو جائے گی تو پہلی چیز کلام کے لئے علم اور خبر ہے، یہ ضروری ہے۔ جاہل آدمی اگر کلام کرے تو اس کے کلام سے وہی جاہلانہ کلمات اور وہی جاہلانہ حرکات سرزد ہوں گی، لوگ پہچان جائیں گے کہ بولنے والا کوئی جاہل ہے جسے بولنے کا طریقہ نہیں آتا، بھدّا کلام کرتا ہے۔ تو کلام کی وقعت کے لئے سب سے پہلی چیز جو ضروری ہے وہ علم اور خبر ہے۔ دوسری چیز دانش اور فہم ہے کہ کلام کرنے والے میں عقل بھی ہو، فہم بھی ہو، دانش مندی بھی ہو۔ اگر بے وقوف آدمی کلام کرے اور کلام ہو وہی جس میں علم اور خبر ہے مگر اس کی بے وقوفی کی وجہ سے کلام بھدّا بن جاتا ہے، مؤثر نہیں رہتا...... تو قلوب پر بھی اثر نہیں کرتا۔ تیسری چیز منصب اور مقام ہے کہ کلام کرنے والا اگر صاحبِ حیثیت ہے، اس کی عرفی حیثیت اونچی ہے تو کلام بھی اونچا ہو جائے گا۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ کلام اگر نقل ہو کر پہنچے تو اس کی سند اور تاریخی حیثیت مضبوط ہو، اگر سند نہ ہو، راوی صحیح نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کلام کا پہنچنا مشکل ہو جائے گا، پہنچے گا تو ناتمام پہنچے گا۔ تو بہرحال طبعی طور پر چار چیزیں ضروری ہیں؛ علم و خبر، دانش و فہم، منصب و مقام اور صحتِ سند اور استناد۔ اسی لئے کم علموں کے کلام کی طرف لوگ کم توجہ کرتے ہیں مثلاً اگر کوئی بچہ بولے تو اس کے کلام میں تھرتھراہٹ بھی ہوگی، لفظ بھی ناتمام ہوں گے اور سننے والے ہنسیں گے مگر کہیں گے کہ بھئی بچہ ہے! بے چارہ بولنا نہیں جانتا۔ نہ اسے علم ہے، نہ اسے خبر ہے تو کلام بھی اسی درجہ کا بے وقعت ہو جائے گا۔ چاہے بچے کو آپ شاباشی دیدیں گے اور آپ اس کے تو تلانے کو کہیں گے کہ ماشاء اللہ خوب بولتا ہے! وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ہوگا، یہ نہیں کہ کلام کی کوئی عظمت آپ کے دل میں بیٹھ رہی ہے۔

اگر علم ہو مگر ناقص ہو تب بھی کلام ناقص ہو جاتا ہے عورتوں کا کلام عموماً بے ربط سا ہوتا ہے اس لئے کہ ان کے اندر نقصانِ علم بھی ہے اور نقصانِ عقل بھی ہے اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ، اگر کوئی عورت عالم بنے فاضل بنے تو اور بات ہے جیسے کہ اسلام میں بہت سی عورتیں عالم و فاضل ہوئی ہیں، محدث بھی گذری ہیں، ادیب بھی گذری ہیں مگر وہ ہزاروں میں ایک دو ہوتی ہیں، عام طور سے ان میں نقصانِ علم، نقصانِ دین اور نقصانِ عقل ہوتا ہے اسی لئے کلام میں بھی نقص آتا ہے۔

عورتوں کا کلام بے وقعت ہونے کی وجہ...... یہی وجہ ہے کہ خاوند بیوی میں جب لڑائی ہوتی ہے بیوی بھی مقابلہ پر بولتی ہے اور خاوند بھی بولتا ہے، مگر بیوی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے اور خاوند حجتیں پیش کرتا ہے، دلیلیں پیش کرتا ہے مگر اُس کی وہی ایک رٹ ہوتی ہے، جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي

الْحِلْيَةِ وَهُوَفِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① جو بچپن سے زیورات کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے تو اس کے قلب کے اندر سونا چاندی زیادہ گھسا ہوتا ہے، علم اور خبر اس کے اندر زیادہ نہیں ہوتی۔ ذرا سی بچی ہے اس کے کان چھید دیئے اس کو بالیاں پہنا دی جاتی ہیں اور ذرا بڑی ہو تو ناک چھید دیئے تو اس میں ''سونے کی لونگ'' اور ''کیل'' ٹھونک دی جاتی ہے اور ذرا بڑی ہوئی تو گلے میں چاندی کا طوق ڈال دیا جاتا ہے اور ذرا بڑی ہوئی اور شادی ہوئی تو ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں پڑجاتی ہیں، چھلّے ڈال دیے جاتے ہیں، گلے میں ہنسی ڈال دی جاتی ہے...... غرض سر سے پیر تک سونے اور چاندی میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے! اس لئے اس کی تمام تر ہمت اور تمام تر شوق اور رغبت سونے اور چاندی کی طرف ہوتا ہے۔ مردوں کو تو یہ روگ عورتوں ہی سے لگتا ہے۔ اگر مرد مجرد (غیر شادی شدہ) ہو وہ سونے چاندی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ بہر حال جب دل میں سونا چاندی گھس جائے تو اس میں علم کی گنجائش کم ہوتی ہے اور عقل کی گنجائش بھی کم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ...... جن کا ذکرِ خیر آپ سنتے رہتے ہونگے، ایک جملہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو روپے پیسے کے دلدادہ تھے تو فرمایا کہ: ''دست زر آلود ایں قدر بدبومی کند'' جس ہاتھ کو سونا چاندی لگتا ہے تو اس میں کچھ سیاہی بھی آجاتی ہے اور کچھ بو بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں یہ چاندی کا روپیہ چلتا تھا اور سونے کی گنیاں چلتی تھیں جب گننے بیٹھتے تھے تو دس بیس گننے کے بعد انگلیوں پر سیاہی آجاتی تھی اور اس میں پھر بو بھی پیدا ہو جاتی تھی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''دست زر آلود ایں قدر بدبومی کند قلب زر آلود چہ قدر بدبو خواہد کرد'' ہاتھ کو سونا لگ جاتا ہے تو اتنی بدبو ہو جاتی ہے اور جس دل میں یہ سونا لگ جائے تو کس قدر بدبو پیدا ہو جائے گی!۔ تو حقیقتاً عورتوں کے دلوں میں سونا اور چاندی گھس جاتا ہے اس لئے کہ شروع سے اخیر تک اسی کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں تو علم اور دانش کی طرف قدرتاً ان کی توجہ کم ہوتی ہے۔ وہ کلام کریں گی اس میں روپے پیسے کا ذکر زیادہ ہوگا۔ اس میں قرآن کا تو ذکر ہی نہیں ہوگا اس لئے کلام بھی ناتمام ہوگا مؤثر بھی نہیں رہے گا۔ تو کلام کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ علم بھی صحیح ہو اور...... کامل ہو تو سبحان اللہ! اس کی خبر اور نصیحت بھی صحیح ہو اور کامل ہو تو کلام میں بھی اسی درجہ کمال پیدا ہو جائے گا۔

کلام کے اندر حقیقتِ متکلم جلوہ گر ہوتی ہے...... حقیقت یہ ہے کہ کلام کے اندر خود متکلم جلوہ گر ہوتا ہے اگر متکلم کے اوصاف دیکھنے ہوں تو اس کا کلام سن لیا جائے، کوئی شاعر شعر خوانی کرے گا ہر شخص پہچان لے گا کہ شاعر آدمی ہے، اس کے کلام سے علم، ادب اور لغت یہ چیزیں سرزد ہوں گی، کوئی شیخ کلام کرے گا تو اس سے معرفت، علم اور عرفانِ الٰہی سرزد ہوگا اور سب پہچان لیں گے کہ کلام کرنے والا عارف ہے، اسی طرح اگر کوئی عالم کلام کرے گا تو کلام سے پہچان لیا جائے گا کہ اس کے قلب کے اندر علم ہے، اس کے لفظ لفظ سے علم ٹپکتا ہے تو کلام میں دراصل

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

خود متکلم جلوہ گر ہوتا ہے، جسے متکلم کو دیکھنا ہو اس کے کلام کو دیکھ لے اس سے وہ نمایاں ہو جائے گا۔

زیب النساء شہزادی ...... اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء بہت بڑی شاعرہ تھی، ذہین اور ذکی بھی تھی، جب شاہی دربار میں مشاعرے ہوتے اور شعراء اپنا کلام سناتے تو زیب النساء کا کلام بھی سنایا جاتا تھا اور وہ عموماً تمام شعراء کے کلام پر فائق ہو جاتا تھا، لوگ سر دھنتے تھے اور اس کی بڑی داد دیتے تھے۔ اورنگ زیب کا ایک درباری تھا، اس کی زبان سے نکلا کہ کاش! میں زیب النساء کو دیکھ لیتا! اس لئے کہ اچھا کلام سن کے قدرتاً جی چاہتا ہے کہ متکلم کو دیکھیں۔ اس کی زبان سے نکلا کہ کاش میں زیب النساء کو دیکھ لوں! مگر اول تو بادشاہی محل اور اوپر سے پردے کا رواج! کوئی آج کا دور تھوڑا ہی تھا کہ بے پردگی اور عریانی پھیلی ہوئی ہو، پردہ بھی تھا، عورتیں مخفی رہتی تھیں تو دیکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ درباری عاقل خان کا یہ مقولہ زیب النساء کو پہنچ گیا۔ اس نے کہا میرے دیکھنے کی بڑی آسان صورت ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا کہ:

در سخن مخفی منم، چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح چھپی ہوئی ہوں جس طرح گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہوتی ہے، اگر خوشبو کا ادراک کرنا ہے تو گلاب کی پتی کو دیکھ لو خوشبو خود بخود سامنے آجائے گی تو میں اپنے کلام میں چھپی ہوئی ہوں جسے مجھے دیکھنا ہو میرے کلام کو دیکھ لے میں اس میں جلوہ گر ہو جاؤں گی۔ تو حقیقتاً دیکھنے کی چیز صورت نہیں ہوتی، حقیقت ہوتی ہے، صورت تو ایک عارضی چیز ہے، وہ محض تعارف کا ذریعہ بنتی ہے اصل چیز انسان کے لئے حقیقت ہے۔

سیرت سازی کی ضرورت ...... تو دانش مند کا کام یہی ہوگا کہ صورت کے سنوارنے کی بجائے سیرت کو سنوارے، وہی انسان کی حقیقت ہے اور رہ گئی صورت! وہ تو چندروزہ بہار ہے، آدمی جب بوڑھا ہوتا ہے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے، وہ رنگ و روغن ہی نہیں رہتا جو جوانی کے زمانے میں تھا، بڑھاپا ہی صورت کی رنگینی کو کھو دیتا ہے، بڑھاپا بھی نہ آئے کچھ غم لگ جائے، کچھ فکر لگ جائے یا کوئی بیماری لگ جائے اس سے بھی سارا رنگ روپ زائل ہو جاتا ہے، صورت باقی رہتی اور نہ رنگ رہتا ہے تو صورت حقیقت میں قابل التفات نہیں ہے اصل چیز سیرت ہے۔ ہمارے نوجوان بھائی خصوصی طور پر رات دن صورت کے سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں گو اس کو درست کریں، بنائیں، سنواریں لیکن حقیقت میں یہ اپنی کوتاہی ہے، جتنی محنت صورت کے سنوارنے پر کرتے ہیں اگر سیرت کے سنوارنے پر کریں تو کہاں سے کہاں پہنچیں! تو آپ صورت کو سنوارنے کی کیا فکر کرتے ہیں اور اس کو کیا سنواریں گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، جس کا کام ہی یہ ہے کہ بگڑے، اسے کہاں تک آپ سنواریں گے! روز گھنٹے دو گھنٹے صورت سنوارنے میں صرف کریں گے شام کو بگڑ جائے گی پھر اگلے روز بیٹھ کر کے گھنٹہ بھر صرف کریں پھر بگڑ جائے گی، اسے کہاں تک آپ سنواریں گے وہ تو پیدا ہی بگڑنے کے لئے ہوئی ہے۔

ایک شیخ کا اپنے صورت پرست مرید کا علاج کرنا ...... وہ کسی بزرگ کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ

میں لوگ اللہ اللہ اور ذکر اللہ کے لئے آیا کرتے تھے اور خانقاہ کا کام جاری تھا۔ ایک روز ایک صاحب داخل ہوئے، شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، مقصد یہ تھا کہ اپنے قلب کی اصلاح کریں تو شیخ کے ہاں کا طریقہ یہ تھا کہ عام مریدین کا کھانا ان کے گھر پکتا تھا ایک باندی متعین تھی، کھانا تیار ہونے کے بعد وہ حجرہ درحجرہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی۔

وہ باندی حسب معمول آئی اور اس نے آ کے کھانا بانٹنا شروع کیا، باندی جب نئے مُرید صاحب کے حجرے میں آئی تو باندی کچھ قبول صورت تھی، ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق پیدا ہو گیا۔ اب وہ جب آتی یہ اسے بیٹھ کے گھورتے، شیخ کو پتہ چل گیا کہ اس کی طبیعت باندی کی طرف مائل ہوئی ہے، رات دن اس کی فکر میں ہے وہ ذکر اللہ تو گیا اپنی جگہ! وہ صورت شکل میں اُلجھ کے رہ گئے ہیں۔ شیخ کو معلوم ہو گیا تھا مگر یہ حضرات اہل اللہ زبان سے زیادہ علاج نہیں کرتے، تدبیر سے علاج کرتے ہیں تو شیخ نے تدبیر کی کہ اُن کے دل سے اس صورت کی محبت نکل جائے۔ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ایک دست آور دوائی منگوائی، جمال گھوٹہ ہو گا یا املتاس وغیرہ وہ اس باندی کو کھلایا اور ایک جگہ متعین کر دی کہ قضائے حاجت کے لئے وہاں جا کے بیٹھے، ایک کنڈا رکھ دیا اور ایک قدمچہ رکھ دیا۔ صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آئے وہ رنگ روغن ختم ہو گیا اور ہڈیاں اوپر نکل آئیں، بھیانک سی صورت بن گئی۔

شیخ نے فرمایا: کہ کھانا لے کے اس مرید کے پاس جا اور جو معاملہ وہ کرے اس کی مجھے اطلاع دینا وہ حسبِ معمول کھانا لے کر آئی، یا تو وہ انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ باندی آئے تو ذرا گھوریں، آنکھوں کو سینکیں...... اب جو آئی، صورت اس کی بھیانی، بجائے خوبصورتی کے زردی منہ پر چھائی ہوئی، ہڈیاں نکلی ہوئیں، اسے بڑی نفرت پیدا ہوئی اور اس نے منہ پھیر لیا اور کہا کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے! وہ بے چاری چلی گئی اور شیخ سے جا کر اس نے سارا حال عرض کیا کہ آج تو یہ معاملہ رہا۔ فرمایا کہ: الحمد للہ علاج ہو گیا، شیخ آئے اس مرید کی انگلی پکڑی کہ ذرا میرے ساتھ تشریف لے چلئے، وہ جو حجرے میں قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں وہ دستوں کی نجاست پڑی ہوئی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ نے کہا: یہ آپ کا معشوق ہے، اسے لے جایئے بڑی حفاظت سے اس نجاست کو رکھ لیجیے، اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی آپکو تو اس سے محبت تھی، جب تک یہ اس کے پیٹ میں رہی آپ عاشق رہے، دلدادہ رہے، یہی تو نکل گئی اور کیا چیز نکلی! جو آپ کی محبت ختم ہو گئی تو آپ کو نجاست سے محبت ہے باندی سے محبت نہیں ہے، یہ ہے آپ کا محبوب، اسے اٹھا کر لے جایئے وہ شرمندہ ہوئے اور دل سے وہ ساری چیز نکل گئی۔

سیرت باقی اور صورت فانی ہے...... تو حقیقت یہ ہے کہ صورت کی محبت تو نجاست کی محبت ہے۔ محبت اصل میں سیرت کی ہوتی ہے کہ آدمی میں علم ہو، معرفت خداوندی ہو، تعلق مع اللہ قائم ہو جس سے سیرت بنتی ہے، وہ چیز محبت کے قابل ہے۔ یہ گوشت پوست کی محبت حقیقی محبت نہیں یہ تو نجاست کی محبت ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ محبت کے قابل سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو تو جتنا آپ سنواریں گے وہ تو بگڑ کر ہی رہے گی، سیرت البتہ ایسی چیز

ہے کہ جب حق تعالیٰ دیدیتے ہیں تو وہ اس دنیا میں بھی قائم ہے برزخ میں بھی قائم ہے آخرت میں جا کے بھی قائم رہے گی وہ بگڑنے والی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ سیرت کے اندر کمالاتِ خداوندی جلوہ گر ہوتے ہیں اور اللہ کا کمال زائل ہونے کے لئے نہیں ہے وہ تو ابدی ہے، برقرار رہے گا تو جس میں اللہ کا کمال آجائے تو وہ بھی پائیدار چیز ہے، صورت انسانی کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان تغیر کا پتلا ہے تو صورت بھی متغیر ہوتی رہتی ہے۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کلام کے اندر متکلم جلوہ گر ہوتا ہے تو...... متکلم کی صورت جلوہ گر نہیں ہوتی اس کی سیرت اور حقیقت جلوگر ہوتی ہے اس سے آدمی پہچان سکتا ہے کہ یہ متکلم کس درجے کا آدمی ہے۔

کلام کو چار چیزوں سے متصف ہونا چاہئے ...... تو سب سے پہلی چیز جو ہے وہ علم اور تبحر ہے دوسری چیز دانش اور فہم کہ وہ ہو تو کلام میں عظمت پیدا ہوتی ہے اور تیسری چیز منصب اور مقام ہے اگر متکلم باحیثیت ہے تو کلام بھی باحیثیت ہوگا اگر اس کی حیثیت گری ہوئی ہو تو کلام کی کوئی وقعت نہیں ہوگی، ایک کلام میں کروں یا آپ کریں کوئی وقعت نہیں اور وہی بات ایک صدر جمہور یہ کہہ دے تو دنیا میں اس کا اثر ہوتا ہے، سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے ملکوں کے منصوبے بن جاتے ہیں۔ وہی جملہ آپ نے کہا اور وہی جملہ ملک کے وزیر اعظم نے کہا اس کے اثرات دوررس ہوتے ہیں، دنیا گیر ہوتے ہیں۔ یہ منصب اور مقام کا اثر ہے چونکہ منصب بڑا ہے اس لئے زبان سے نکلا ہوا کلام بھی بڑا ہو جاتا ہے اور منصب گھٹیا ہے یا بے منصب آدمی ہے تو کلام کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ کلام جب ہم تک پہنچے تو صحیح سند کے ساتھ پہنچے اشتباہ نہ رہے کہ معلوم نہیں متکلم نے کلام کیا ہے یا نہیں پورا کلام پہنچا ہے یا ادھورا پہنچا ہے، اس کی تاریخی حیثیت مضبوط ہونی چاہئے تو یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔

کلام اللہ کی عظمت شان ...... جب یہ بات مسلم اور یہ اصول طے شدہ ہے کہ جس کا علم جتنا بڑا ہوگا کلام بھی اتنا بڑا ہوگا، جس کا منصب اور مقام بلند تر ہوگا کلام بھی اتنا ہی بلند ہوگا، جس میں عقل اور فہم رچا ہوا ہوگا اس کا کلام بھی اتنا ہی اُونچا ہوگا...... اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اللہ رب العزت کی ذات...... علم کے لحاظ سے دیکھی جائے تو علم اس کا لامحدود، کہیں اس کی حد نہیں ہے، آپ صرف سامنے کی چیز کو دیکھ سکتے ہیں اس کے سامنے حاضر غائب سب حاضر ہیں، وہ جس طرح سے ایک بادل کی گرج کو سنتا ہے اسی طرح سے زمین کی تہہ میں اگر چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چل رہی ہے تو اس کی کھسکھساہٹ بھی سنتا ہے، وہ سمیع وبصیر ہے، آپ زبان سے کوئی بات سن لیں گے جان لیں گے وہ دلوں کے مخفی رازوں کو جانتا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (1) اسے دلوں کی کھٹک کا بھی علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا خطرات گذر رہے ہیں تو اس کا علم لامحدود، وہ ظاہر اور باطن پر حاوی، اس لئے اس کا کلام بھی ظاہر و باطن پر حکمران ہوگا اور اتنا جامع کلام ہوگا کہ اس سے زیادہ جامعیت نہیں ہوسکتی، اس میں فصاحت بھی ہوگی بلاغت بھی اعجازی ہوگی، بداعت بھی اعجازی ہوگی، تو فصیح بھی اعلیٰ، بلیغ بھی اعلیٰ اور بداعت بھی اس میں

(1) پارہ: ۱۱، سورۃ ھود، الآیۃ: ۵۔

اعلیٰ ترین ہوگی، اس کی کوئی حد و نہایت نہ ہوگی۔

فصاحت ...... فصاحت کی مثال تو ایسی ہے جیسے آپ کپڑا سلوائیں تو سب سے پہلے تو کپڑے کو دیکھا جائے گا کہ اس کا مادہ بھی صحیح ہے یا نہیں، اگر کپڑے کا مادہ صحیح ہے، سوت نہایت عمدہ ہے، ریشم نہایت عمدہ ہے تو کہیں گے کہ کپڑا نہایت اعلیٰ ہے۔ یہ کپڑے کی ذات ہے اس کو کہنا چاہیے کہ یہ فصاحت ہے کہ کلام کے اندر الفاظ نہایت بامحاورہ ہوں، کلام کے اندر لفظوں میں کوئی منافرت نہ ہو کہ کان اس کے سننے سے اکتا جائیں، کانوں پر بار گذرے، بلکہ ایسا ہو کہ کان میں کلام پہنچا اور دل میں اتر گیا اور حقیقت منکشف ہوگئی۔ تو کلام کے اندر لفظ بھی اعلیٰ ہوں کہ کوئی پیچیدگی بھی نہ ہو اور سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو...... اتنا سلیس ہو کہ فوراً قلب میں اتر جائے اور اتنا جامع ہو کہ سارے حقائق اس میں چھپے ہوئے ہوں، یہ تو فصاحت ہے۔

بلاغت ...... ایک یہ کہ کپڑا بدن کے مطابق سلا ہوا ہے، کپڑا تو بہت اعلیٰ ہے مگر درزی بھدّا تھا، اس نے نہایت غلط سیا، جب آدمی پہن کر نکلتا ہے تو لوگ کپڑوں کو تو دیکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ وضع قطع نہایت بھدّی ہے تو اس سے کپڑے کی خوبیاں بھی غلط ہو جاتی ہیں تو کپڑے کا بدن کے مطابق ہونا یہ بمنزلہ بلاغت کے ہے۔

بداعت ...... پھر اس کپڑے کے اوپر کوئی رنگ، کوئی نقش ونگار اور رنگینی اعلیٰ ترین ہو تو اسے کلام بدیع کہتے ہیں یعنی اس کی بداعت بھی اعلیٰ ہے تو کلام اپنی ذات سے بھی اعلیٰ، سننے والے اور مخاطبین کے مزاج کے بھی مطابق اور اس کے اندر مرصع و مسجع اور مقفّٰی ہونا یہ بھی داخل ہے تو فصیح بھی ہوا، بلیغ بھی ہوا اور بدیع بھی ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام ...... جب کہ اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ کمال کے منبع ہیں تو ان کے کلام کے اندر یہ ساری چیزیں انتہائی طور پر جمع ہونی چاہیے، ایسا اعجازی ہو کہ کوئی بشر ایسا کلام نہ کر سکے۔ اس لئے کہ بشر کا علم محدود ہے تو کلام کی بھی جامعیت کم ہوگی، اللہ کا علم لامحدود ہے تو کلام بھی اتنا جامع ہوگا کہ قیامت آجائے مگر اس کے نیچے سے علم ختم نہیں ہوسکتا۔ ہر چیز کا حکم اس میں موجود تو حق تعالیٰ کا کلام جامع ترین ہوگا، فصیح ترین ہوگا، بلیغ ترین ہوگا، بدیع ترین ہوگا اور اعجازی بھی ہوگا۔

معجزہ کی حقیقت ...... تو قرآن کریم حقیقت میں معجزہ ہے۔ معجزے کے معنی یہی ہیں کہ تمام دنیا عاجز آجائے مگر اس جیسی چیز نہ لا سکے۔ حق تعالیٰ میں جتنی صفتیں ہیں وہ سب اعجازی ہیں کہ کوئی غیر خدا انہیں نہیں لاسکتا اور نہ بنا سکتا ہے۔ اللہ نے آسمان بنایا، زمین بنائی، چاند سورج بنائے وغیرہ وغیرہ۔ چاند سورج تو چاند سورج ہیں آپ اس کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی بنائی ہوئی نہیں ہے، یہ کسی ایسے حکیم کی بنائی ہوئی ہے کہ اس کی حکمت کی کوئی انتہا نہ ہو۔ آسمان اور چاند سورج تو اپنی جگہ ہیں یہ زمین ہے جو رات دن آپ کے قدموں میں پامال ہے۔ اس کا ایک ذرہ آپ پیدا نہیں کر سکتے اس زمین سے کام تو لے سکتے ہیں کہ ذروں کو جوڑ کر آپ چیزیں بنالیں اور ایجادات کرلیں لیکن ایک ذرّہ پیدا کرلیں ...... یہ آپ کے بس میں نہیں ہے تو جو زمین آپ کی اصل ہے

ہر وقت آپکے سامنے ہے، ہر وقت اس پر آپ چلتے پھرتے ہیں، اس کا ایک ذرہ نہیں بنا سکتے، یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے اور اس ذات کا بنایا ہوا ہے جس کا علم لامحدود ہے، قدرت لامحدود ہے، اقتدار لامحدود ہے۔ تو جتنی چیزیں اللہ کی صنعتیں ہیں وہ سب معجزات ہیں ساری دنیا ان کے بنانے سے عاجز ہے۔

تمام تر تخلیقات معجزاتِ خداوندی ہیں ...... ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے تو کیا ماں بناتی ہے اس کو؟ ماں کو تو یہ خبر نہیں کہ ہو کیا رہا ہے! باپ بناتا ہے! تو باپ کو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کارخانہ قدرت کا کام جاری ہے، بچہ بن رہا ہے اور صورت بنائی جا رہی ہے، یہ اسی کی صنعت ہے کہ پانی کے قطرے پر نقاشی کر دے۔ آپ پانی پر تصویر نہیں کھینچ سکتے لیکن اللہ کی یہ قدرت ہے کہ ایک قطرۂ ماء کے اوپر تصویر کھینچ دیں۔ اس نے صورت بنائی اور نقش بنائے، نہ ماں کچھ کر سکتی ہے نہ باپ۔ اس واسطے کہا جائے گا کہ خالق حق تعالیٰ ہیں، لیکن سببِ تخلیق یہ مرد اور عورت ہیں۔ تو باپ بھی خالق نہیں، ماں بھی خالق نہیں، خالق صرف ایک اللہ ہے لیکن اس نے اپنی تخلیق کو دنیا میں اسباب کے ذریعے نمایاں کیا۔

مرد و عورت کو سبب بنایا جس سے بچہ پیدا ہوا تو وہ خالق نہیں ہیں، سبب تخلیق ہیں۔ اسی واسطے ایک موقع پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ﴿ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ﴾ (1) یہ ان کو تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں، تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں، یک زمیندار ہے زمین میں منوں مٹی کے نیچے دانہ ڈال دیتا ہے، اس منوں مٹی کے اندر اس بیج کو پھاڑنا اور اس میں سے کونپل نکالنا یہ کس کا کام ہے، یہ کاشتکار کر سکتا ہے؟ کاشتکار کو کچھ پتہ نہیں وہ تو دانہ ڈال کر الگ ہو گیا اور دانہ بھی اس کا بنایا ہوا نہیں ہے، وہ بھی اللہ ہی کا بنایا ہوا ہے، اس کا کام اتنا ہے کہ زمین میں ڈال دے، اب زمین کے اندر قدرت کی جو مشینیں چل رہی ہیں کہ وہ دانہ پھٹتا ہے، اس میں سے کونپل نکلتی ہے، درخت بنتا ہے...... یہ صرف اسی اللہ کا کام ہے۔ تو کہا جائے گا کہ درخت کے خالق حق تعالیٰ ہیں کاشتکار نہیں ہے، اسے اپنی تخلیق کے ظاہر کرنے کا سبب بنایا ہے۔

منوں مٹی کے نیچے سے ایک کونپل اوپر کی طرف چلتی ہے وہ اتنی نرم و نازک ہے کہ آپ اس کو دو انگلیوں میں مسل دیں لیکن وہی بڑھتے بڑھتے اتنا عظیم تناور درخت ہو جاتا ہے کہ کسی پر گر پڑے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ اس میں غور یہ کرنا ہے کہ درخت کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ نیچے کی طرف جائے، پتے کو آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے کو جائے گا، شاخ کو آپ چھوڑ دیں تو اوپر کی طرف نہیں جائے گی وہ نیچے کی طرف آئے گی۔ یہ اس کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے کہ کونپل نکلی اور اوپر کی طرف جا رہی ہے، اس کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے مگر یہ اوپر کی طرف جا رہی ہے اور ایک عظیم درخت بن جاتا ہے۔ تو طبیعت کے خلاف مجبور کر دینا یہ بندے کے بس کی بات نہیں ہے خالق ہی کے بس میں ہے۔ تو یہ دلیل ہوگی کہ اس کو پیدا کرنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں کاشتکار اور انسان پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

---

(1) پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹.

اس کی طبیعت کے اوپر حق تعالیٰ حکمرانی کر رہے ہیں، چاہے نیچے کی طرف لے جائیں، چاہے اوپر کی طرف۔ بہر حال جاندار پیدا ہو یا درخت پیدا ہو یا پتھر پیدا ہو...... پیدا کرنا اسی کا کام ہے۔ بندہ سبب بن جاتا ہے اور سبب تخلیق خود خالق نہیں ہوتا، خالق وہی ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے جتنے عجائبات پیدا فرمائے ہیں ان کے خالق وہی ہیں۔ ان میں سے آپ صنعت سے اور ایجاد سے تصرفات کر کے چیزیں نکالتے رہیں اس کی قدرت آپ کو اللہ نے دی ہے، مگر یہ قدرت بھی اسی کی بخشی ہوئی ہے، خود آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ اگر آپ نے عقل سے کچھ چیزیں ایجاد کر لیں تو سوال یہ ہے کہ عقل کہاں سے آئی! آپ نے خود تو اپنے اندر نہیں ڈال لی! وہ بھی اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے، پھر اس عقل کو وہاں تک پہنچا دینا کہ یوں چیز بن جائے! یوں ایجاد ہو جائے! یہ بھی آپ کا کام نہیں۔

تمام امور کا انجام اللہ کی ذات ہے...... آپ جب ایجاد کرتے ہیں تو جو ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے دل میں ارادہ کس نے ڈالا؟ پھر اللہ ہی کی طرف آپ کو رجوع کرنا پڑے گا تو ارادہ، قدرت اور اختیار اگر انسان دکھلاتا ہے تو وہ اللہ ہی کا بخشا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ① اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے افعال کو بھی وہی پیدا کرتا ہے تمہارے اندر قدرت نہیں ہے کہ اپنے افعال کو خود پیدا کر لو اور خالق افعال کہلاؤ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے بندے کو اپنی خبر نہیں اسے اپنے افعال کی کیا خبر ہوگی؟ تو ہر چیز کی انتہاء حق تعالیٰ شانہ پر ہوتی ہے۔

اگر آپ یوں کہیں کہ فلاں مکان میں آگ لگ گئی! کہیں گے کہ کیوں لگ گئی؟ آپ کہیں گے کہ چراغ جل رہا تھا اور چوہے نے بتی کھینچ لی اور وہ بتی سامان کے اوپر آ کر گر پڑی وہ بھی جل گیا۔ وہ سوال کریگا کہ بتی نیچے کیوں آئی کہ چوہے نے سامان پر ڈال دی! چوہے نے کیوں ڈالی...... اسکے دل میں ایک خیال آیا، کیوں آیا خیال؟ آگے کہیں گے کہ بھائی قدرتی بات ہے، اللہ نے خیال ڈال دیا تو انتہاء...... اللہ پر جا کر ہوگئی اور سب وسائل ختم ہو گئے

آپ کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا اچھا عالم ہے کیوں عالم ہے؟ اس کے استاذ قابل تھے انہوں نے پڑھایا لکھایا، بھائی استاذوں کے پڑھانے لکھانے سے یہ کیسے عالم بن گیا! انہوں نے محنت کی، تربیت کی، برسہا برس لگائے عالم بن گیا، اس نے محنت کیوں کی؟ اس کے دل میں یہی جذبہ آیا، کیوں یہ جذبہ آیا؟ بھائی اللہ نے پیدا کر دیا۔ پھر انتہاء جا کے اللہ پر ہوگئی۔ کہیں سے چلو، اخیر میں جا کے حق تعالیٰ شانہ پر انتہاء ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ میں ظاہر کر دیا کہ ﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ ② ہر چیز کی انتہاء تیرے پروردگار پر ہوگی ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ ③ ہر جاندار چیز اللہ کی طرف رجوع کرے گی۔

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ الصّٰفّٰت، الآیۃ: ۹۶.

② پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۴۲.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۸.

سارے امور کو سمیٹو جا کے حق تعالیٰ کے اوپر انتہاء ہو جائے گی۔ آپ اور ہم موجود ہیں، کیوں موجود ہیں؟ اس لئے کہ دو موجودات (ماں باپ) ملے تو پیدا ہو گئے، بھائی! کیوں ملے؟ ان کے دل میں جذبہ آیا، کیوں جذبہ آیا؟ کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا، پھر اخیر اللہ ہی کی طرف انتہاء ہو گئی تو کہیں سے آپ چلیں جا کر انتہاء حق تعالیٰ کے اوپر ہو گی۔ تو جتنے بھی کمالات دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں، جتنی بھی ایجادات ہیں خواہ انسان کرے یا کوئی کرے، انتہاء جا کے اللہ کے اوپر ہو گی کہ وہیں سے یہ خیر چلی اور دنیا کے اندر پھیل گئی تو تمام چیزوں کے مرجع الامور اللہ ہی کی ذات بابرکات ہیں۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ خواہ تخلیق ہو، خواہ تصدیق ہو، خواہ ہدایت ہو اور خواہ کوئی استاذ کسی کو پڑھائے انجام کار یہی نکلے گا کہ اللہ نے ہدایت دے دی۔

ہدایت بھی اس کی طرف سے آئے گی، تخلیق بھی اس کی طرف سے آئے گی، اس لئے کہ کمالات کا منشاء تو وہی ہے۔ تو کلامِ خداوندی جامع ہے، اس لئے کہ وہ معجزہ ہے۔ دنیا سپر ڈال دے گی لیکن اس کی ثانی نہیں لا سکے گی، جیسا کہ دنیا عاجز ہو کر سپر ڈال دے گی مگر زمین کا ذرہ نہیں بنا سکتی، دنیا عاجز آ جائے گی آفتاب کی ایک کرن نہیں بنا سکتی، ستارے کا ایک جز نہیں بنا سکتی، آسمان کا ایک جز نہیں بنا سکتی...... اس لئے کہ یہ سب معجزہ ہے اور اللہ کا فعل ہے تو یہ افعال کے معجزے ہیں اور اسی طرح قرآن کریم کلام کا معجزہ ہے۔ تو جیسے وہاں دنیا عاجز ہے...... یونہی کلام لانے سے بھی عاجز ہے کہ کوئی ایسا جامع کلام جو قیامت تک کی جزئیات پر حاوی ہو، وہی کر سکتا ہے جس کا علم قیامت تک حاوی ہو اور ہر چیز اس کے سامنے مستحضر اور حاضر ہو تو قرآن کریم صرف کلام نہیں بلکہ معجزہ بھی ہے یعنی دنیا اس کے سامنے عاجز ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں لا سکتا۔

کلامِ خداوندی صرف قرآن پاک ہے دوسری سماوی کتب نہیں...... اور ظاہر بات ہے اگر غور کیا جائے تو کلام صرف قرآن مجید ہی ہے۔ یعنی اور کتابیں بھی آسمان سے آئیں، توراۃ بھی آئی، زبور بھی آئی، انجیل بھی آئی اور قرآن کریم بھی آیا لیکن کلام خداوندی اگر کہا جائے گا تو وہ صرف قرآن پاک کو کہا جائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کہتے ہیں ''مَایَتَکَلَّمُ بِہٖ'' کو کہ کلام کرنے والا جس کا تکلم کرے وہ کلام ہے، اگر آپ لکھ کر بھیج دیں اسے مجازی طور پر کلام کہیں گے، بولے نہیں لکھ کر دے دیا اسے متکلم کی کتاب تو کہا جائے گا کلام نہیں کہا جائے گا، کلام مجازاً کہیں گے تو توراۃ حق تعالیٰ نے نازل کی، اس کے ساتھ کلام نہیں فرمایا، تختیاں لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئیں...... تو توراۃ کو کتابِ خداوندی تو کہیں گے، کلام مجازاً کہیں گے حقیقی معنی میں کلام نہیں گے اس لئے کہ تکلم نہیں فرمایا۔

انجیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قلبِ مبارک پر بطور مضمون کے القاء فرمایا، تکلم نہیں فرمایا، اسے مضمون خداوندی کہیں گے، کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے، کلام اگر کہا جائے گا تو مجازاً کہا جائے گا۔ تو کلام وہ ہے جس کے ساتھ بولنے والا بولے۔ قرآن کریم وہ ہے جس کے ساتھ حق تعالیٰ نے تکلم کیا ہے، اس کو بولے ہیں۔ قرآن کریم

میں خود فرمایا گیا کہ ﴿نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى﴾ ① اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم تلاوت کرتے ہیں تم پر فرعون کے واقعہ کی خبر۔ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾ ② یہ اللہ کی آیتیں ہیں جس کی ہم تلاوت کر رہے ہیں تمہارے سامنے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ کوئی آیت بھیجتے تھے کلام فرماتے تھے تو وہ کلام سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام سنتے تھے اور اس کی عظمت سے بے ہوش ہو جاتے تھے یعنی اپنے آپے میں نہیں رہتے تھے، تمام آسمان والے فرشتے اس کی عظمت سے مغلوب اور مدہوش ہو جاتے تھے اور بعد میں پوچھتے تھے کہ ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ﴾ ③ تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ اس وقت جبریل کہتے تھے کہ ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ ④ اللہ نے یہ فرمایا تو قرآن کریم کا حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا اس لئے صحیح معنی میں کلام اللہ وہی ہے جس کا تکلم کیا جائے اور وہ قرآن کریم ہے۔

قرآن کریم کتابِ خداوندی بھی ہے......اور ساتھ میں وہ کتاب بھی ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اسے لوحِ محفوظ میں لکھ بھی دیا ہے۔ تو کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی ہے۔ لوحِ محفوظ میں تو بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہے، جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف ''کوہِ قاف'' کے برابر تھا۔ تو جیسا کلام کرنے والا اور جیسا کاتب ہوگا ویسی کتابت بھی ہوگی۔ اللہ کی ذات لامحدود تو قلم بھی اس کا اعلیٰ ہوگا۔ حروف بھی اس کے اتنے چوڑے ہوں گے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تو بڑے بڑے موٹے موٹے حرفوں میں لوح محفوظ پہ لکھا گیا۔ اور احادیث میں فرمایا گیا کہ باریک حرفوں میں بھی اس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا ہے تو وہ باریک حرفوں میں بھی لکھا ہوا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ کلام کو موٹے حرفوں میں چھاپیں تو بھی آپ حق تعالیٰ شانہٗ کا اتباع کر رہے ہیں کہ انہوں نے بھی بڑے بڑے اور موٹے حرفوں میں لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے اور اگر آپ نے چھوٹے حرفوں میں چھاپا تو حمائل بن گئی اور اس کی بھی نظیر ہے کہ اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر باریک باریک حرفوں سے اس طرح لکھا گیا کہ وہ حمائل ہی تھی۔ اور آپ لوگوں نے اس کو عکسی قرآن میں اور زیادہ باریک کر دیا اور وہ اتنی سی ڈبیا میں آجاتا ہے کہ جیب میں رکھ لو، بہت ہی چھوٹی قسم کی حمائل۔ تو مسلمانوں نے کلام خداوندی کے جتنے نقشے ہو سکتے ہیں وہ سارے تیار کر دیئے......موٹے حرفوں میں بھی اور باریک حرفوں میں بھی۔

ایک عجیب نمونۂ قرآن...... بڑوتہ میں میں نے ایک قرآن شریف دیکھا ہے، وہاں کی جامع مسجد میں وہ محفوظ ہے، اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً ساڑھے تین گز ہے اور چوڑائی دو گز ہے۔ ایک بڑی میز پر پندرہ سپارے رکھے ہوئے ہیں جو چھت تک پہنچ گئے ہیں اور دوسری میز پر پندرہ سپارے دوسرے رکھے ہوئے ہیں۔ خدا جانے کاتب

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳. ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۲.
③ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳.

کو کیا سوجھی ہوگی! کونسا قلم لیا ہوگا! یعنی تقریباً چار چار انگشت چوڑے اس کے حروف ہیں تو چھت تک وہ قرآن شریف آ گیا۔ تو مسلمانوں نے قرآن کریم کے لکھنے میں کوئی نمونہ نہ چھوڑا، چوڑے حروف، باریک حروف، پتلے حروف، عکسی حروف ہر قسم کے نمونے مہیا کر دیئے۔ تو قرآن کریم کو حق تعالیٰ شانہ نے لکھا بھی ہے کلام بھی فرمایا۔

کلماتِ قرآن کی طرح مُرادِ ربّانی بھی من جانب اللہ متعین ہے...... قرآن کے حروف کے اندر جو معانی اور مضامین ہیں وہ بھی حق تعالیٰ نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر القاء فرمائے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ظاہر آیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس آیت کے نیچے یہ معنی کھپ سکتے ہیں اور زمانے کے مطابق اس آیت سے یہ مضمون نکل سکتا ہے لہٰذا مرادُاللہ یہی ہے! یہ نہیں ہوتا، کلماتِ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اترے تو لغوی معنی تو آپ سمجھتے ہی تھے لیکن ''مرادِ ربانی'' کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتظار فرماتے رہتے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے مطلع فرمادیں کہ میرا مقصد اس آیت سے یہ ہے، پھر اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کلام میں ارشاد فرماتے تھے کہ یہ قرآن ہے اور یہ اس کی تفسیر ہے، اپنے ذہن سے غور نہیں فرماتے تھے کہ اس آیت کے نیچے کتنے مضامین کھپ سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے، مراد بتلانا بھی اللہ کا کام ہے کہ اس کلمہ سے میرا یہ مطلب ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم لغتِ عرب پر اترا، لغوی طور پر تو ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ظاہر الفاظ کا یہ مطلب ہے لیکن مرادِ ربانی کیا ہے! تو وہ بالکل الگ چیز ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ قرآن نے لغت سے لئے ہیں لیکن معنی اس میں اپنے ڈالے ہیں، مراد اس کی اپنی ہے، مثلاً لفظِ ''صلوٰۃ'' ہے تو صلوٰۃ کے لغوی معنی دعاء کرنے کے ہیں، قرآن کریم نے صلوٰۃ کا لفظ لیا لیکن اس میں معنی اپنے ڈالے ہیں یعنی افعالِ خاصہ کہ یوں نیت باندھو، یوں ہاتھ باندھو، یوں رکوع کرو، یوں سجدہ کرو یہ مرادِ ربانی ہے۔ لفظِ صلوٰۃ سے دعاء مانگنا مراد نہیں ہے جو کہ لغوی معنی ہیں۔ تو لغوی معنی اگرچہ اپنی جگہ ہیں لیکن عرفی معنی اپنی جگہ ہیں جو مرادی معنی ہے۔

یا مثلاً حج کا لفظ ہے، لغتِ عرب میں حج کے معنی قصد کرنے کے ہیں تو آدمی نے گھر بیٹھ کے قصد کرلیا، بس حاجی ہوگیا! کیا ضرورت پڑی کہ ایک کثیر مقدار روپیہ خرچ کر کے پاکستان سے عربستان جائے، ملک سے بے ملک ہوتا پھرے! گھر میں بیٹھ کر قصد کرلے حاجی بن جائے گا!۔ تو لغوی معنی مراد نہیں بلکہ مرادی معنی مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں تو حج سے عبادتِ خاصہ مراد ہے، صرف قصد کرنا مراد نہیں۔ تو لغت کو قرآن نے لیا ہے مگر عربی زبان میں اپنا مضمون اس کے اندر ڈالا ہے۔ اس کو منقولِ لغوی یا منقول اصطلاحی کہتے ہیں، اس طرح کی اصطلاحات ہیں۔ بہرحال قرآن کریم محض لغت پر نہیں اترا بلکہ اس کے ''معنیٔ مرادی'' وہ ہیں جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر القاء فرمائے ہیں۔ اگر محض لغوی معنی مراد ہوتے تو پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ حق تعالیٰ قرآن کریم کو بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دیتے اور اعلان حضرت جبریل کر دیتے کہ ''تم سب لوگ مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفاء ہے، لے جاؤ اپنا اپنا علاج خود کرلیا کرو! جس طرح تمہیں سمجھ میں آجائے''

یوں نہیں کیا بلکہ قرآن اتارا اور پیغمبر کو بھیجا تا کہ وہ اس کی مراد بتلائیں، اس کے معانی اور مطالب سمجھائیں تو لغت اور چیز ہے، ادیب ہونا اور چیز ہے اور علم دوسری چیز ہے۔ محض ادب دانی کے بل بوتے پر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک قرآن دانوں کے پاس بیٹھ کر روایات واحادیث سے وہ معانی نہ سمجھ لئے جائیں جو سندِ متصل کے ساتھ ان تک پہنچے ہیں تب تک مرادِ ربانی معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔

لُغتِ عرب سے بدرجۂ کمال واقفیت کے باوجود مرادِ ربانی از خود متعین نہیں کی جا سکتی ...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، جب قرآن کریم کی یہ آیت روزہ کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① کہ رات کو کھاتے پیتے رہو جب تک کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ لیا جائے، یعنی رات کی تاریکی ختم ہو کر صبح صادق نمایاں نہ ہو جائے اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ جب صبح صادق نمایاں ہو کر پو پھٹے کھانا پینا بند کر دو اور روزے کی نیت کر لو۔ تو صبح صادق کو خیطِ ابیض سے تعبیر کیا اور خیطِ اسود سے رات کی تاریکی کو تعبیر کیا۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جب یہ آیت آئی تو انہوں نے خیط کے لغوی معنی لیے جو ڈورے کے ہیں، لہٰذا انہوں نے دو ڈورے ایک کالا اور ایک سفید لے کر دونوں تکیے کے نیچے رکھ لیے اور پھر انہیں دیکھتے رہتے ...... جب تک اتنا چاندنا نہ ہو جاتا کہ الگ الگ ان کی پہچان ہو جائے کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق ہوئے تیس منٹ، آدھ گھنٹہ ہو چکا ہوتا، اس لئے کہ صبح صادق کے بعد بھی بہت دیر تک اندھیرا رہتا ہے، صورت بھی نہیں پہچانی جاتی، تو انہوں نے دونوں ڈورے رکھ لئے اور دیکھتے رہتے جب پوری طرح سے دونوں ممتاز ہو جاتے تب کھانا پینا بند کرتے اور روزے کی نیت کرتے حالانکہ صبح صادق کو گذرے تیس منٹ ہو چکے ہوتے۔

یہ خبر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: عدی! تم روزے کے لئے سحری کے بارے میں کیا کام کرتے ہو؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ② کھاتے پیتے رہو جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ لیا جائے تو میں نے تکیے کے نیچے دو ڈورے رکھوا دیئے ہیں اور دیکھتا ہوں جب اتنا چاندنا ہو جائے کہ دونوں ڈورے الگ نمایاں ہوں تو روزے کی نیت کر لیتا ہوں! حضور نے فرمایا: اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ! کہ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ خیطِ ابیض اور خیطِ اسود اس کے نیچے آ گئے۔ بندۂ خدا! خیطِ ابیض سے مراد صبح صادق ہے اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے تو تیرا تکیہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ دن اور رات دونوں اس کے نیچے سما گئے ③ تب انہیں معلوم ہوا کہ لغوی معنی مراد نہیں، اصطلاحی معنی مراد ہیں، شریعت کی مراد

---

① پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۸۷. ② پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۸۷.

③ الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب بيان ان الدخول في الصوم يحصل..... ص: ۸۵۲.

لغوی دھاگہ نہیں بلکہ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔تو لغوی معنی اور ہیں۔ایک لغت دان قرآن کولغت کے بل بوتے پرحل کرے گا تو دونوں دھاگوں کواٹھا کے رکھ لے گا چاہے روزہ ہو قبول کہ نہ ہو،لیکن جس نے علمِ قرآن حاصل کیا،مرادِ ربانی کوان احادیث کے ذریعے،جو مستند علماء کے ذریعے منتقل ہوئی ہوں،سمجھا......اسے معلوم ہوجائے گا کہ مراد یہ ہے وہ مراد نہیں ہے۔ہر زبان میں کچھ لغت ہوتی ہے،کچھ عرف ہوتا ہے،لغوی معنی اور ہوتے ہیں اور عرفی معنی اور ہوتے ہیں۔اگر آدمی اہل عرف میں نہ رہے تو نہ زبان کا لطف حاصل ہوگا نہ زبان کے محاورے معلوم ہوں گے بس ڈکشنری سے دیکھ کر پتہ چلالیا کرے گا اس سے زبان نہیں آتی۔

اردو دانی میں مولانا غلام رسول کا ایک لطیفہ......ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے''کریلا اور نیم چڑھا''تو ہمارے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ صوبہ سرحد(کے علاقہ)بفہ کے رہنے والے تھے۔بہت بڑے جلیل القدر عالم اور دارالعلوم(دیوبند)میں تمام بڑے علماء مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ،حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ یہ سارے بزرگ اُن کے شاگرد اور وہ سب کے استاذ تھے اور تھے صوبہ سرحد کے،لہٰذا اردو بولنا زیادہ نہیں آتی تھی،بس ایسے ہی بولتے تھے جیسے سرحدی لوگ بولا کرتے ہیں۔ایک دعوت میں ان سب بزرگوں کا اجتماع ہوا،حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے ان کے بڑے بھائی حکیم مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ صاحب بھی تھے۔تو مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میاں مولوی غلام رسول!چالیس برس ہوگئے تمہیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے،مگر تمہیں اردو بولنا نہ آئی!مولانا کو آیا غصہ،کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو میں لغوبے کار سمجھتا ہوں،اس لئے بولتا نہیں ہوں۔خیر وہ سب ہنس پڑے تو حکیم محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں''کریلا اور نیم چڑھا''اب مولانا سوچ میں پڑ گئے!کہنے لگے کہ:عطف نے کام خراب کردیا،یہ جو''اور''بیچ میں ہے،اگر یہ نہ ہوتو معنی ظاہر ہیں۔کہا:کہ اچھا تم عطف نکال دو''کریلا نیم چڑھا''۔کہنے لگے:معنی ظاہر ہے:کریلا آدھا کچا آدھا پکا،یہ معنی ہیں۔یعنی کریلا اردو کا لیا،نیم فارسی کا لیا،چڑھا ہندی کا لیا۔تینوں کو ملا کے انہوں نے ایک مضمون بنالیا کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔سارے ہنس پڑے تو مولانا کو بڑی حیرت ہوئی کہ ہنستے کیوں ہیں میں نے مضمون بیان کردیا ہے۔تب عرض کیا گیا کہ حضرت لغوی مطلب مراد نہیں،عرفی مطلب مراد ہے۔عرف میں ہے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی برائی میں مبالغہ کرنا ہوتا ہے کہ کریلا اپنی ذات سے کڑواتھا ہی،نیم پر چڑھ گیا تو کڑواہٹ اور بڑھ گئی۔مقصد یہ ہوتا ہے کہ چیز اپنی ذات سے بھی بری اور احوال بھی بُرے پیش آگئے،تو برائی در برائی جمع ہوگئی،یہ مطلب ہے۔یہ مطلب نہیں ہے کہ کریلے کو نیم پر ٹانگ دو آدھا کچارہ جائے آدھا پکارہ جائے۔یہ آپ نے لغت کے بل بوتے پر مضمون گھڑ دیا یہ مراد نہیں ہے۔تب مولانا کو واضح ہوا کہ واقعی میں پوری طرح اردو نہیں جانتا۔

یا جیسا کہ ہمارے ہاں لغت میں محاورہ ہے کہ ''سونے پر سہاگہ'' سونے پر سہاگہ کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ''سہاگے کو بیٹھ کر سونے پر چھڑک دو'' بس سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ لیکن مراد یہ نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب کسی خیر کے اندر مبالغہ کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ ''سونے پر سہاگہ'' یعنی سونا تو اپنی ذات سے اعلیٰ ہی تھا، سہاگہ چھڑکنے سے اور زیادہ کندن بن گیا اور زیادہ چمک پیدا ہوگئی۔ تو مبالغہ فی الخیر مقصود ہوتا ہے، یہ ہیں مرادی معنی۔ لغوی معنی تو یہ ہیں کہ سونے کے اوپر سہاگہ چھڑک دیا جائے یہ مراد نہیں۔ ہر زبان میں ایسے محاورے ہوتے ہیں، فارسی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ ''شخص آب در سوار کرد'' فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔ لغوی معنی یہ ہیں کہ ٹوکری رکھ کے لوٹے سے اوپر پانی ڈال رہا ہے۔ مراد یہ نہیں ہے، مراد یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی عبث کام ہوتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نہیں تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے، گھڑے میں ڈالتا تو کوئی بات ہوتی، یہ بے کار اور بے نتیجہ ہے، ٹوکری کے نیچے سے نکل جائے گا۔ تو مرادی معنی اور ہیں اور لغوی معنی اور ہیں۔

ایک انگریز کا اردو میں مہارت کے دعویٰ کی قلعی کھلنا...... ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک یورپین کلکٹر تھا اور اردو اچھی جانتا تھا اردو میں ہی کچھ شاعری بھی کرتا تھا اس کے ذہن میں یہ تخیل پیدا ہوگیا کہ میں اردو پر پورا قادر ہوگیا ہوں اور ہندوستانی بھی ایسی اردو نہیں بول سکتے جیسی میں بولتا ہوں۔ ان کے ہاں میر منشی اور پیش کار منشی نہال احمد صاحب تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، وہ یورپین ان کے آگے دعوے کیا کرتا تھا کہ ''ویل تم اردو نہیں جانتا ہم جانتا ہے'' یہ خون کے گھونٹ پی کے بیچارے چپکے ہو جاتے، پیش کار تھے کچھ کہیں تو ممکن ہے ملازمت سے برخواست کردے۔ فرمانے لگے: میں خاموش رہتا، اگلے دن صاحب نے پھر کسی بات پر دعویٰ کیا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اُردو جانتا ہوں اور میز پر مُکہ مار کے کہا کہ میں تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہوں۔

انہیں بڑا غصہ آیا، انگریز نے ایک مکہ مارا تھا انہوں نے میز پر دو مکے مارے اور کہا کہ صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو! تم کیا جانو اردو کیا چیز ہوتی ہے؟ سات سمندر پار سے آئے ہو، ہماری مادری زبان ہے ہم جانتے ہیں۔ صاحب کو بڑا غصہ آیا اس نے کہا کہ کونسی چیز ایسی ہے جو میں نہیں جانتا؟ انہوں نے کہا کہ اچھا اس محاورے کے معنی بتلایئے کہ ''اگر میں صاحب بہادر سے فلاں بات پوچھوں تو ''بغلیں جھانکتے رہ جائیں''؟ صاحب تو واقعی بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے یوں جھانک لیا! یوں جھانک لیا! بس ختم۔ انہوں نے کہا کہ بس یہی آپ کی اردو دانی ہے! یہ مطلب نہیں۔

کہنے لگا: اور کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ اردو جانتے ہیں، خود سمجھئے اس کا کیا مطلب؟ صاحب بولے: کہ اچھا ہم تین دن میں ڈکشنری دیکھ کے آپ کو بتلائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ تین دن نہیں آپ کو سات دن کی مہلت ہے آپ دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں، لغت کی

کتابیں دیکھنا شروع کیں، مگر وہ تو محاورہ تھا تو ساتویں دن آ کر کہا کہ: ویل پیش کار! ہمیں تو کسی ڈکشنری میں اس کے معنی نہیں ملے، کیا ہیں اس کے معنی؟ کہا کہ پہلے اقرار کیجیے کہ آپ جاہل مطلق ہیں! آپ اردو نہیں جانتے تب میں بتلاؤں گا۔ اب یہ کہنا پرسنالٹی (وقار) کے خلاف تھا کہ صاحب میں جاہل مطلق ہوں! خیر انہوں نے دبے لفظوں میں کہا کہ اچھا ہم لاعلم ہیں، تم بتلاؤ! تب انہوں نے کہا کہ بغلیں جھانکنا تحیُّر کی طرف اشارہ ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ ہوتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ یہ معنی نہیں کہ ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا، یہ لغت ہے۔ محاورہ میں وہ معنی ہیں۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زبان میں بہت سے محاورات ہیں کہ ان کا مطلب لغت کچھ بتلاتی ہے عرف کچھ اور بتلاتا ہے تو جب تک آدمی اہل عرف میں نہ رہے اس زبان کے محاورات کو نہیں سمجھ سکتا نہ زبان کی لطافت کو سمجھ سکتا ہے۔

مرادِ ربانی کا تعین کس طرح ہوسکتا ہے...... تو قرآن کریم بھی بہر حال اللہ کا ایک خاص کلام ہے، خاص زبان ہے، اس کا بھی ایک عرف ہے، اسے لغت کے پیمانے سے ناپنا اور ڈکشنریاں دیکھ کر اس کے مضامین کو پھاڑنا...... اس سے مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مراد جبھی سمجھ میں آئے گی جب متکلم خود ہی بتلائے کہ یہ میری مراد ہے۔ آپ اندازہ تو کیجیے کہ دو آدمی ہیں ایک ماں کے پیٹ میں انہوں نے پیر پھیلائے (ایک ماں سے پیدا ہوئے) حقیقی بھائی ہیں، سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی، جب تک وہ اظہار نہ کرے کہ میں یہ چاہتا ہوں۔ تو دو انسان جو ایک جنس کے ہیں ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہیں۔ ایک کا مافی الضمیر دوسرا نہیں سمجھتا جب تک دوسرا اظہار نہ کرے تو اللہ رب العزت جو نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمِ مطلق ہے۔ یہ بلا اللہ کے بتلائے کیسے اللہ کی مرادات کو سمجھ لے گا جب تک کہ حق تعالیٰ خود نہ فرمائیں کہ میری مراد یہ ہے۔

اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا، اس پر اپنا کلام اتارا، الفاظ بھی اتارے، معانی بھی اتارے تو آپ قرآن پاک کے الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ آپ موجد اور مخترع نہیں ہیں جیسا کہ الفاظ...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود نہیں بنائے، اللہ کے نازل کردہ ہیں اسی طرح ان الفاظ کے معانی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اختراع نہیں فرمائے۔ بلکہ اللہ نے القاء کئے ہیں تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سمجھ میں مرادِ ربانی آئی تو مرادات کو بتلانے والی چیز حدیث ہے اور حدیث کو جب تک قرآن سے نہ ملایا جائے قرآن کے معانی اور مطالب نہیں سمجھے جاسکتے۔ جب تک اللہ کی بتلائی ہوئی مراد پیغمبر کی زبان سے ادا نہ ہو اور پیغمبر کے قول وفعل سے نمایاں نہ ہو مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلقہ فرائض...... تو حدیث درحقیقت قرآن کا بیان ہے، جب تک اسے نہ ملاؤ مرادات ربانی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کو بھیجا تو چار فرائض نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمائے۔

فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾ ① ہم نے امیّوں میں رسول بھیجا جوامی ہے اس کا پہلا کام یہ ہے کہ اللہ کی آیات کو تلاوت کرے، یہ تو آپ نے الفاظ پہنچا دیئے، من وعن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امانت کے ساتھ وہ الفاظ جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر وحی کے ذریعے اتارے وہ پہنچا دیئے تو ایک فریضہ تو ادا ہو گیا جو تلاوتِ آیات ہے گویا قانونِ خداوندی کی نص آپ نے پہنچادی۔

اب اس لفظ کے معنی کیا ہیں! تو دوسرا لفظ فرمایا گیا: ﴿وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم بھی دے۔تو تعلیم میں استاذ الفاظ نہیں رٹایا کرتا، الفاظ کے معانی بیان کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا کام یہ ہے کہ معانی اور مرادات سمجھائیں، یہ تعلیم میں آتا ہے۔

تیسری چیز فرمائی: ﴿وَالْحِکْمَةَ﴾ ③ حکمت کی تعلیم دیں اور حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمتِ نظری اور ایک حکمتِ عملی۔ایک فکری حکمت کہ حقائق بیان کئے جائیں ایک عملی حکمت کہ عمل کا نمونہ پیش کیا جائے تو تعلیم میں حکمتِ نظری تو آ گئی، مرادات ربانی سمجھادی گئیں اب آگے عمل کا نمونہ رہ جاتا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف معانی نہیں سمجھائے بلکہ عمل کر کے بھی دکھلایا تاکہ دوسری کسی چیز کی گنجائش نہ رہے اور متعین ہو جائے کہ اللہ کی مراد یہی ہے۔قرآن جو کچھ کہتا ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھلا دیا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمل کرتے ہیں وہ قرآن کے اندر ہوتا ہے۔تو قرآن میں قال ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حال ہے، وہ جو کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہیں وہ قرآن کہتا ہے۔تو قول وعمل میں پوری مطابقت ہے جو اللہ کا قول ہے اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے۔

اگر ہم یوں کہہ دیں تفنن کے طور پر کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن نازل کئے تھے، ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن ہے جو ذات بابرکات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔تو قرآن درجۂ قال میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل درجۂ حال میں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی کچھ کرتے ہیں جو قرآن میں ہوتا ہے تو عمل سے مراد متعین ہو جاتی ہے پھر جانبِ مخالف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

قرآن کی بجائے حدیث سے مناظرہ کرنے کی حضرت علیؓ کی ابن عباسؓ کو تاکید ...... یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلہ کے لئے بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا سنت سے دلیل پیش کرنا۔یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وعمل سے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ: امیر المؤمنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن فہمی کی دعاء دی

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② ایضاً ③ ایضاً۔

ہے اور فرمایا ہے کہ: اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ① اے اللہ! ابن عباس کو اس کتاب کا علم بھی دے اور اس کی حکمت بھی اس کے قلب میں ڈال دے، تو جو میرا اصل مضمون ہے اسی سے آپ مجھے روک رہے ہیں کہ اس سے دلیل نہ پکڑوں اور عوام کے سامنے قرآن سے حجت نہ پیش کروں، سُنت سے پیش کروں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اَلْقُرْاٰنُ ذُوالْوُجُوْهِ ② قرآن چونکہ دستورِ اساسی ہے اس کی ایک ایک آیت بڑی جامع اور کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے، کئی کئی معنی لغت کے اندر سے آسکتے ہیں، تم اگر قرآن سے حجت پیش کرو گے تو فریقِ مخالف اس آیت سے ایک دوسرا مضمون لیکر پیش کر دے گا کہ اس کا یہ مطلب ہے، تو عوام پر حق و باطل واضح نہیں ہوگا وہ کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ تو دونوں کا حق مشتبہ ہوگا حق و باطل کا فیصلہ نہیں ہوگا لیکن اگر سنت سے دلیل پیش کرو گے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و عمل سے، اس میں جانبِ مخالف کی گنجائش نہیں ہے تو حق واضح ہو جائے گا کہ حق یہی ہے، اس لئے سنت سے دلیل پیش کرنا۔ تو قرآن کریم ذی وجوہ ہے ایک ایک آیت کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے، لغت اس کا انکار نہیں کرتی لیکن مرادی معنی وہ ہیں جو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارے ہیں کہ اس آیت سے ہمارا مطلب یہ ہے۔

جب وہ مراد سامنے آئے گی مطلب متعین ہو جائے گا اور وہ مراد بغیر حدیث کے پیش کئے نہیں آسکتی، بغیر سنت کے معلوم نہیں ہوسکتی۔ تو سنت قرآن کریم کا بیان ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ حدیث کا انکار کر دیتے ہیں! کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں...... تو حدیث کا انکار کر کے وہ قرآن کو کیسے مانتے ہیں؟ قرآن کے لفظ ہی تو مطلوب نہیں معانی بھی تو مطلوب ہیں اور معانی حدیث بیان کرے گی۔ (لہٰذا انکارِ حدیث سے معانیٔ قرآن سمجھ نہیں آسکتے۔)

ایک منکرِ حدیث کے ساتھ کچھ لمحاتِ سفر...... میں ایک دفعہ یہیں پاکستان میں کراچی سے لاہور آرہا تھا، ریل کا سفر تھا۔ اسی گاڑی میں ایک صاحب سوار ہوئے جو اَپڈیٹ (ماڈرن) قسم کے آدمی تھے، انہوں نے اس قدر نیازمندی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا اور اتنی خدمت کی کہ ذرا میں لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو فوراً پانی بھر کے لائیں اور کسی چیز کا اشارہ بھی کروں سمجھ جائیں اور وہ لا کر رکھ دیں، بہت بڑی خدمت کی، خیر کئی گھنٹے تک وہ بے چارے محبت سے خدمت کرتے رہے۔

میرے دل میں قدر ہوئی کہ بھئی بالکل ہی جدید تعلیم یافتہ اور نوفکر آدمی اور اس طالب علم کے آگے اس قدر محبت سے پیش آئے، بڑی دل میں قدر ہوئی، وہ تھے اصل میں منکرِ حدیث۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے انکارِ حدیث (کی بحث و تمحیص) کے اوپر لائیں۔ اس لئے خدمت کو انہوں نے پیش خیمہ بنایا اخیر میں انہوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا اور احادیث پر کچھ اعتراضات کرنے شروع کئے کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں، ایک تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔

تو میں نے کہا: آپ کسی چیز کو مانتے بھی ہیں؟ کہنے لگے قرآن کو۔ میں نے کہا قرآن کا قرآن ہونا آپ کو کیسے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباسؓ ج: ۲۲ ص: ۲۳۷ رقم: ۶۷۲۸۔ ② کنز العمال، ج: ۱، ص: ۵۵۱۔

معلوم ہوا؟ کیا آپ پر وحی آ گئی تھی کہ یہ قرآن ہے، کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگے اللہ کے رسول کے ارشاد سے۔ میں نے کہا: وہ ارشاد ہی تو حدیث ہے، تو قرآن کا قرآن ہونا تو حدیث پر موقوف، حدیث کا آپ انکار کر دیں گے تو کونسی شرط ہے قرآن کے قرآن ہونے کی؟ کیسے آپ انکار کرتے ہیں؟ تو وہ چپ ہو گئے۔

کہنے لگے کہ دل سے تو حدیث کا انکار واقعی مشکل ہے، باقی حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ بعض قابل اعتبار نہیں، تو میں نے کہا: جنس کو تو آپ نے مان لیا، آپ مُصر کیوں ہیں کہ حدیث کی قسمیں ہیں، میں نے کہا: جہاں تک حدیث کی قسمیں ہیں، محدثین نے خود ان کی صراحت کی ہے کہ ہر حدیث کا ایک درجہ نہیں ہے، جو حدیث متواتر ہے اور تواتر سے ثابت ہے وہ مورثِ یقین ہے، اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا انکار۔ قرآن کی ایک آیت کا آدمی انکار کر دے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، حدیث متواتر کے انکار سے بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ دوسرے درجہ کی حدیث حدیثِ مشہور ہے وہ اگر مورثِ یقین نہیں تو ظن غالب کی مورث تو ہے ہی، ظن غالب تو پیدا ہو گا۔ اور ظن غالب پر ہزاروں احکام کا مدار ہے تو وہ بھی حجت ہو گی۔ تیسرا درجہ خبرِ واحد کا ہے وہ اگر ظن غالب نہیں تو مطلق ظن تو پیدا کرتی ہے اور ظن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے احکام ظن اور گمان پر مبنی ہیں جیسے بعض جگہ آدمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا لیکن حکم دیکھنے جیسا لگا تا ہے، وضو میں پیروں کا دھونا ضروری ہے اور ذرا بھی جگہ خشک رہ جائے وضو نہیں ہو گا، لیکن کیا آپ ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایڑی دُھل گئی ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ ہی نہیں سکتے، بس ظن غالب ہی تو ہوتا ہے کہ پیر دھل گیا، اس ظن غالب پر شریعت بھی حکم دیتی ہے کہ ہاں دھل گیا وضو ہو گیا تو بہت سے احکام کا مدار ظن پر بھی ہوتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے تو وہ بھی حجت کی شان رکھتی ہے۔ آپ کا گمان جب فعل کے جائز ہونے پر حجت بن جاتا ہے تو حدیث اگر ظن پیدا کرے تو وہ کیوں حجت نہیں بنے گی! تو میں نے کہا یہ تو خود محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ہر حدیث ایک درجے کی نہیں ہے تو جنسِ حدیث کو آپ نے مان لیا، اقسام حدیث وہ قابل اعتراض ہیں! تو خود محدثین ہی ان کی تقسیم کرتے ہیں، اب آپ کو اعتراض کیا ہے؟ کہنے لگے: اب تو کچھ اعتراض نہیں، میں نے کہا: اب تو حدیث کا انکار نہیں کر دیں گے؟ کہنے لگے: نہیں اب نہیں کروں گا تو الحمد للہ لاہور آتے آتے ان کا خیال درست ہو گیا۔

قرآن کا قرآن ہونا حدیث کے اُوپر موقوف ہے...... بہر حال قرآن پاک کا ماننا حدیث کے ماننے پر موقوف ہے، حدیث کا انکار کرنا یہ خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ قرآن کے لفظ آپ مان لیں گے مگر معانی میں حدیث کو ماننا پڑے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ لفظوں میں بھی آپ کو ماننا پڑے گا اللہ کے رسول ہی کا تو ارشاد ہے کہ یہ آیت خدا کی بھیجی ہوئی ہے تو لفظِ قرآن بھی حدیث سے ہی آپ نے مانے۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی ارشاد فرمایا ہمیں کیا خبر تھی کہ قرآن کے یہ لفظ ہیں اور یہ معانی ہیں تو لفظوں کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف، معانی کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف، مرادِ ربانی کا سمجھنا بھی حدیث پر موقوف۔ تو منکرِ حدیث سب سے پہلے منکرِ قرآن ہے وہ قرآن

ہی کونہیں مانتا اس لئے قرآن کے نہ ماننے پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ حدیث کا انکار کردو۔ درحقیقت قرآن کا انکار مقصود ہے کہ یہ دنیا سے اٹھ جائے۔

حجیتِ فقہ......تو مقصد یہ تھا کہ قرآن اصل ہے اوراس کا بیان حدیث ہے۔ پھراس بیان کی تشریحات اور معارف ہیں جو فقہ میں مدون ہو گئے ہیں۔ تو بنیادی طور پر حجت قرآن ہے، دوسرے درجہ پر حجت حدیث ہے جو قرآن کو قرآن ثابت کرتی ہے، بہت سے احکام بلا واسطہ قرآن سے نکل رہے ہیں بہت سے وہ ہیں جو اس کی کلیات سے نکلتے ہیں، مجتہدین ان کلیات میں چھپے ہوئے مضامین کو نکال کر اپنے اجتہاد و بیان سے باہر پیش کر دیتے ہیں تو بالواسطہ وہ چیز قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔ فقہ کے مسائل بھی درحقیقت قرآن ہی کے مسائل ہیں فرق اتنا ہے کہ ان مسائل کے نکالنے پر ہم اور آپ قادر نہیں ہیں جن کو اللہ نے اجتہاد کا ملکہ دیا ہے وہ قادر ہیں وہ نکال کے ہمارے آگے پیش کر دیتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا واقعہ...... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ حرم شریف میں بیٹھے ہوئے تھے، بیت اللہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، تو قلب میں علم کا ایک جوش پیدا ہوا، علم کا دریا امڈا، فرمایا کہ: آج جو مسئلہ پوچھو گے میں قرآن سے جواب دوں گا ایک شخص نے آ کے عرض کیا کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ حرم میں جیسے سانپ بچھو کو پناہ نہیں ہے ،تتیات بھڑ وغیرہ کو بھی قتل کر سکتے ہیں، تتیات کو بھی پناہ نہیں ہے وہ بھی قتل کئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو یہ کہتے ہیں کہ سانپ اور بچھو کو تو حرم میں مار سکتے ہیں لیکن بھڑ اور تتیات کو نہیں مار سکتے انہیں بھی حرم کے اندر امن دیا گیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ تتیات اور بھڑ حرم کے اندر ماری جا سکتی ہیں، تو ایک شخص نے سوال کیا کہ قرآن میں کہاں ہے کہ تتیات اور بھڑ کا قتل حرم میں جائز ہے؟

فرمایا تو نے قرآن نہیں پڑھا! قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ: ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو لا کے دیں اسے قبول کر و جس کو روک دیں اس سے رک جاؤ، کیا یہ آیت ہے؟ کہا: جی ہاں! آیت ہے۔ فرمایا: قرآن نے جو فرمایا: وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ رسول لا کے دے اسے قبول کر لو اور جس سے رسول روک دیں اس سے رک جاؤ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد قرآن کی اس آیت سے حجت ثابت ہوا کہ جو رسول فرما دیں اس کو مان لیں تو قرآن کی رو سے حدیث حجت ہوئی اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اِقْتَدُوْا اِهْتَدَيْتُمْ مِنْ بَعْدِيْ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ میرے بعد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرو ② تو قرآن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننا واجب ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا حکم ماننا واجب ٹھہرا اور حضرت عُمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: يُقْتَلُ الزُّنْبُوْرُ فِي الْحَرَمِ تتیات بھڑ حرم کے اندر ماری جا سکتی ہیں تو بواسطۂ قرآن یہ حکم ثابت ہو گیا۔

---

① پارہ: ۲۸ سورۃ الحشر، الآیۃ: ۷۔ ② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمرؓ ج: ۱۲ ص: ۱۲۱۔

تو بعض احکام قرآن سے بلاواسطہ نکلتے ہیں، بعض بواسطۂ حدیث نکلتے ہیں، بعض احکام بواسطۂ اجتہاد و بیان نکلتے ہیں۔ انجام کار یہ سب احکام قرآن ہی کے سمجھے جائیں گے واسطہ بلاواسطہ کا فرق ہوگا۔ تو فقہ و حدیث وغیرہ کا انکار کر کے آدمی فی الحقیقت قرآن کا بھی انکار کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کو وہ ہی مان سکتا ہے جو پہلے سنت کو مانے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل کو مانے۔

تو بہرحال بات اس پر چلی تھی میں دور چلا گیا کہ قرآن کریم حق تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے اور مکتوب بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے لکھا بھی ہے تکلم بھی فرمایا ہے۔ حقیقی معنوں میں کلام ہے تو...... وہ قرآن ہے۔ تورات کتاب اللہ ہے کلام اللہ اسے مجازاً کہیں گے اور انجیل وہ مضمونِ خداوندی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القاء کر دیا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اسے ادا کر دیا تو اس کی شان ایسی ہے جیسی حدیث۔ تو حدیث بھی تو وحی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر القاء کی گئی لیکن الفاظ آپ کے ہوتے ہیں اور مضمون حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، تو انجیل بمنزلۂ مضمونِ خداوندی کے ہے اور تورات بمنزلہ کتاب اللہ کے ہے، تکلم ان کے ساتھ نہیں ہوا۔

کلامِ خداوندی انمِٹ کیوں ہے؟...... قرآن وہ ہے کہ محض کتاب کے طور پر نہیں اُتارا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے کلام بھی کیا ہے تو صحیح معنی میں اگر کلام ہے تو وہ قرآن کریم ہے اور ظاہر بات ہے کہ کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹتا نہیں، وہ قائم رہ جاتا ہے۔ اللہ کا کلام تو اللہ ہی کا کلام ہے...... آپ جو بولتے ہیں وہ بھی نہیں مٹے گا وہ جم کر محفوظ ہو گیا اور قیامت کے روز ایک ایک لفظ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس فضا میں کلام محفوظ ہوگا فضا میں کلام محفوظ ہوتا ہے۔ اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے۔ اگر فضا کے اندر کلام محفوظ نہ ہو تو ریڈیو کے ذریعے کس چیز کو پکڑ کر آپ تک پہنچاتے ہیں، مشینوں کے ذریعہ آپ اس کلام کو کھینچتے ہیں جو فضا کے اندر محفوظ ہے اور لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں، تو اگر کلام زبان سے نکل کر فنا ہو جایا کرتا تو ریڈیو کی ایجاد نہ ہوتی، اور کلام آپ تک نہ پہنچتا، تو وہ فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے، فضا سے مشینوں کے ذریعے منتقل کر لیتے ہیں، تو کلام بندہ کرے تو مٹنے والا نہیں ہے ایک ایک لفظ اس کا محفوظ ہے ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ① کوئی ایک لفظ کوئی ایک قول جو زبان سے نہیں نکالتے مگر تاکنے والا اس کو تاک لیتا ہے، محفوظ کرنے والا محفوظ کر لیتا ہے۔ تو فضا کے اندر یہ سارے کلام محفوظ ہیں۔

حتیٰ کہ سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم ریڈیو اور سائنسی ترقی کے ذریعے ایک نہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ کلام سنوا دیں گے جو انہوں نے حواریوں کے سامنے بطور خطبہ دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جتنے کلام اب تک انسانوں نے کئے ہیں وہ سب فضا میں محفوظ ہیں، ہم امتیاز نہیں کر سکتے، شور کی صورت میں اس کلام کو سنتے ہیں مگر ہے محفوظ، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ مشینوں کے ذریعے کلاموں کو متمیز کر دیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۱۸۔

ہے، یہ فلاں کا کلام ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم تمہیں حضرت مسیح علیہ السلام کا خطبہ ایجادات کے ذریعہ سے سنا دیں گے۔ تو بہر حال کلام محفوظ ہے مٹنے والا نہیں تو بندے کا کلام جو بولنے کے بعد مٹ نہیں سکتا تو خدا جس کلام کا تکلم کرے، وہ کیسے مٹے گا؟

آپ کے کلام کو تو فضا گھیر لیتی ہے لیکن اللہ کا کلام جب چلتا ہے تو فضا کو گھیر لیتا ہے، فضا خود اس کلام میں محفوظ ہے، وہ مٹنے والا نہیں ہے، حتیٰ کہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر یہ لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کرو تو تصور یہ باندھا کرو کہ یہ میں نہیں بول رہا، کلام حق تعالیٰ کا ہے زبان میری حرکت کر رہی ہے، لیکن یہ صوتیہ لفظ اللہ کی طرف سے اُتر رہے ہیں۔ تو فرمایا کہ اس کی مشق کرتے رہو، پڑھتے ہوئے ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے کان میں آواز آئے گی کہ تم نہیں پڑھ رہے ہو حق تعالیٰ کی آواز ہے، وہ پڑھ رہے ہیں اور جب یہ مشق ہو جائے گی تو: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ① ہمارا نبی ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتا ہم وحی کرتے ہیں، تو بولتا ہے تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے، کلام اللہ کا ہوتا ہے، اترتا ہے زبان کے اوپر الفاظ کے واسطہ سے۔ تو اگر کوئی بندہ متبع رسول ہو فنائیت کا مرتبہ اختیار کرے اور اس تصور میں غرق ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کی برکت سے امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ تلاوت خود کر رہے ہیں مگر ان کے کان میں آواز آ رہی ہے کہ اوپر سے پڑھا جا رہا ہے، محض زبان میری ہے جو حرکت کر رہی ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ ② تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے جب بندہ کا کلام زبان سے نکل کر نہیں مٹ سکتا وہ برقرار ہے اور باقی رہے گا تو اس کی حفاظت گویا طبعی اور قدرتی ہے تو حق تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ③ ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو یہ محفوظ رہنے والی چیز ہے، کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔

سابقہ کتب کیوں مٹ گئیں اور قرآن کیوں مٹنے والا نہیں؟...... فرق اتنا ہے کہ سابقہ کتب کی حفاظت کا ذمہ دار امتوں کو قرار دیا گیا تھا کہ تورات کی حفاظت تم کرو، انجیل کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور زبور کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور وہ انجام نہیں دے سکیں، لفظوں میں بھی فرق کر دیا، معانی میں بھی فرق کر دیا، تحریف لفظی اور تحریف معنوی سب کچھ کر دیا جس سے کلام متغیر ہو گیا تو ضرورت پڑی کہ کوئی مستند کلام بھیجا جائے، سابقہ کتب کو تو ان امتوں نے ضائع کر دیا...... اس لئے کہ حفاظت ان کے ذمہ تھی اور وہ نبھا نہیں سکے جبکہ قرآن آخری کتاب ہے قیامت تک اب کوئی نیا کلام دنیا میں آنے والا نہیں ہے تو اگر وہ بھی آپ کے سپرد کر دیا جاتا اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو تورات وانجیل کا حشر ہوا کہ وہ بدل گئیں اور یہ قیامت تک رکھنا تھا۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳-۴۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۔

③ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

اس کے علاوہ اس لئے بھی حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے کہ ہم نے یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو اول تو فطری طور پر کلام ضائع نہیں ہوسکتا ہے مگر آپ کے قلوب سے ضائع ہوسکتا تھا تو حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا، سینکڑوں بچے آپ کے مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ میں تعلیم پا رہے ہیں، قرآن حفظ کر رہے ہیں، انہیں کچھ خبر نہیں کہ قرآن کیا چیز ہے! کچھ پتہ نہیں اس کے اثرات کیا ہیں! بس حفظ کر رہے ہیں تو حق تعالیٰ ہی تو حفاظت کر رہے ہیں، ان بچوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں، اگر بوڑھے حفظ کیا کرتے تو وہ حفاظت بوڑھوں کی طرف منسوب ہوجاتی کہ بھائی! بوڑھے آدمی سمجھدار ہیں۔ قرآن کی حفاظت کے لئے یاد کر رہے ہیں لیکن بچوں میں تو یہ جذبہ نہیں، یہاں محض حفاظتِ خداوندی ظاہر ہو رہی ہے کہ ہم حفاظت کر رہے ہیں جو بچوں کے ذریعے سے قرآن کو محفوظ رکھا ہے۔ اور معانی کی حفاظت علماء کے ذریعے کی اور فرمایا کہ:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① یہ آیات بینات ہیں جن کے حقائق اور مضامین اہل علم کے سینوں میں ڈالے گئے ہیں۔ وہ وہاں محفوظ ہیں، مٹ نہیں سکتے، حفاظت گاہ ایسی چیز کو قرار دیا گیا کہ نہ وہاں چور پہنچ سکتے، نہ ڈاکو پہنچ سکتے، نہ کوئی خائن پہنچ سکتے، وہ دلوں میں محفوظ ہیں، وہاں چوروں کی رسائی ہی نہیں ہے، اگر لوہے کے صندوقوں میں معانی محفوظ کئے جاتے تو ممکن تھا کہ لوگ صندوقوں کو دریا برد کر دیں، ممکن تھا زمین میں دفن کر دیں، ممکن تھا کہ زمین صندوقوں کو بھی گلا دے اور اوراق بھی گلا دے، کوئی چور چوری کر کے لے جائے تو قرآن ضائع ہوجاتا۔ تو نہ صندوق میں حفاظت کی، نہ الماریوں میں، بلکہ اہل علم کے سینوں میں حفاظت کی، جہاں نہ چور پہنچ سکتا ہے نہ ڈاکو۔ یہ حفاظتِ خداوندی ہے کہ بچوں اور علماء کے ذریعے سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا ہے تو یہ اسبابِ حفاظت ہیں، حفاظت کرنے والے وہی ہیں، جیسے خالق وہ اللہ ہیں سبب تخلیق آپ ہیں، درخت بنانے والے وہ ہیں سبب کاشتکار کو بنادیا۔ تو حفاظت کرنے والے قرآن کے وہ ہیں سبب حفاظت آپ کو بنادیا۔ یہ آپ کی سعادت ہے جو بھی سبب بن جائے۔ یہ انگلی کاٹ کے شہیدوں میں داخل ہونا ہے، محفوظ تو رہنا ہی ہے یہ کلام، مٹنے والا تو ہے نہیں، آپ ذریعہ بن جائیں تو ہماری سعادت ہے ورنہ رہے گا محفوظ، تو بہرحال کلام خداوندی معجزہ ہے نہ اس کی کوئی مثل لاسکتا ہے نہ اسے کوئی ضائع کرسکتا ہے۔

قرآن کی دو سندیں، سند باطنی...... جہاں تک اس کی سند کا تعلق ہے وہ بھی حق تعالیٰ نے ایسی مستحکم بنائی ہے کہ اس میں خلل اندازی ممکن نہیں۔ قرآن کی سند کے دو درجے ہیں ایک اللہ سے نبی تک اور ایک نبی سے ہم تک۔ ایک باطنی سند ہے اور ایک ظاہری سند ہے۔ باطنی سند تو یہ ہے کہ اللہ نے کلام کیا جبریل علیہ السلام نے سنا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کو سنایا اور ان) کے قلب مبارک پر لاکے اتار دیا تو جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کا تعلق ہے وہ تو منبائے اخلاص ہے، کمالات کا منبع ومخزن ہے، وہاں سے ہر چیز انتہائی امانت کے

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹.

ساتھ سرزد ہوگی، اس میں معاذ اللہ کوئی غلط چیز شامل نہیں ہو سکتی۔ تو حق تعالیٰ شانہ تو امین ہی ہیں، اب بیچ میں نازل فرشتہ ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ بے چارہ معصوم ہے، للہٰذا ہمارا کلام تمہیں قبول کرنا پڑے گا، دباؤ سے نہیں منوایا بلکہ جبریل کے اوصاف بیان کئے جو ناز لوں کے اوصاف ہوتے ہیں، تا کہ تم عقلی اور فنی طور پر یہ سمجھ سکو کہ یہ راوی غلط قسم کا راوی نہیں ہے بلکہ جتنے اصولِ روایت ہیں وہ سب اس کے اندر پائے جاتے ہیں، ورنہ یہ فرمادیتے کہ کلام ہمارا ہے اور ہمارا فرشتہ لے کر آتا ہے جب آئے گا ماننا پڑے گا کوئی وجہ نہیں کہ انکار کرو، یہ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ راوی کو پرکھ لو، اس کے اوصاف کو دیکھ لو، راویوں کے اوصاف اس میں پائے جائیں تو قبول کرو، نہ پائے جائیں تو نہ قبول کرو تو جبریلؑ کے اوصاف بیان کئے ہیں، سورۂ "اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ" میں یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ﴾ ① یہ ایک رسول کا قول ہے یعنی حضرت جبریل کا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک لے کر آئے تو اول تو رسول کہنے سے جبریلؑ کی امانت ظاہر ہوتی ہے اس لئے کہ اللہ نے انہیں قاصد بنایا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت اپنا قاصد، اپنا سفیر اسے نہیں بنا سکتی جس میں ذرہ برابر بغاوت کا کوئی شائبہ ہو۔ حکومت اپنا سفیر اسی کو بنائے گی جو حکومت کی پالیسی کا محافظ ہو، حکومت کے قانون کا دل وجان سے دلدادہ ہو، ذرّہ برابر خیانت نہ کرے، حکومت کا جو منشا ہے اس کو دنیا کے آگے پیش کر دے، تو اوّل تو کسی کو قاصد بنا دینا، یا سفیر بنانا یہ خود قابلِ اعتماد ہونے کی دلیل ہے۔ جب حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہمارا قاصد ہے، ہمارا رسول ہے، تو قاصد کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو اس کے اوپر اعتماد ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں قابلِ اعتماد شخصیت ہیں جنہیں سفیر کے درجے کا اعتماد حاصل ہے۔

سندِ قرآن پر اعتراضات کے جوابات ...... لیکن آدمی کہہ سکتا تھا کہ قاصد تو بنایا مگر قاصدوں میں بعض دفعہ کھوٹ ہوتا ہے، کچھ بدل بھی جاتے ہیں ممکن ہے کلام کو بدل دیں یا اس کے منشاء کو بدل دیں۔ تو ایک جملہ آگے فرمایا کہ: ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ﴾ ② وہ فقط رسول ہی نہیں ہیں بلکہ کریم النفس بھی ہیں، بزرگی کے آثار ان میں رچے ہوئے ہیں تو بزرگ آدمی کیسے جھوٹ بولے گا! ایک ادنیٰ صالح کو جسے آپ بزرگ کہتے ہیں کبھی آپ کو شبہ بھی نہیں گزرتا کہ یہ جھوٹ بولے گا تو فرشتہ معصوم ہو کر جھوٹ بول دے وہ بھی اللہ کے اوپر بزرگ بن کر یہ ناممکن ہے تو فرمایا کہ رسول کا قول ہے، رسول بھی کریم ہے، کرامت والا ہے جس میں بزرگیاں رچی ہوئی ہیں۔

مگر کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی، کریم النفس بھی سہی لیکن بے چارہ ضعیف ہے، دبّو قسم کا آدمی ہے، جہاں کسی نے تلوار دکھائی بدل گیا کہ یہ نہیں یہ مطلب تھا، جان بچانے کے لئے جھٹ مطلب کو بدل دیا تو اگر کوئی بزرگ ہو، ہو بے چارہ ضعیف النفس، تو اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دباؤ سے کلام بدل دے یا مضمون کو بدل دے تو جبریلؑ میں بھی ممکن ہے ضعف ہو جو ایسے کلام کو بدل دیں۔ اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿اِنَّہٗ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔

﴿لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِي قُوَّةٍ﴾ ① طاقتور ہے، دَبُّو قسم کا آدمی نہیں کہ کسی کے دباؤ ڈالنے سے بات بدل دے۔ تو حضرت جبریلؑ کی طاقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی قوم کی جب بستیاں اٹھا کر آسمان پہ لے جا کے پٹخ دیں تو اتنا طاقت ور کسی سے دب کر غلط بات کہہ سکتا ہے! کون اس کے اوپر دباؤ ڈال سکتا ہے! تو فرمایا گیا کہ رسول بھی ہے، بزرگ بھی ہے، کریم النفس بھی ہے اور طاقت ور بھی ہے، دَبُّو قسم کا آدمی نہیں ہے کہ دباؤ ڈالنے سے کسی کی بات مان لے یا بات کو بدل دے۔

لیکن اس پر بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی، کریم النفس بھی سہی اور طاقتور بھی سہی مگر سننے میں بھی تو غلطی ہو سکتی ہے، دور سے آواز آ رہی ہے، معلوم نہیں کیا سن لیا ہو؟ کہا کچھ تھا...... اور سننے میں آ گیا کچھ، کوئی پاس اور قریب ہو تو بے شک یہ ممکن نہیں ہے کہ غلطی ہو، مگر ایک شخص نے دور سے سنا ہے تو کتنا ہی نیک نیت ہو سماعت میں تو فرق آ سکتا ہے، کچھ کا کچھ سن لے! اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ ② کہ مقام عرش کے پاس مقیم ہے کہیں دور نہیں ہے اس لئے ممکن نہیں ہے کہ سماعت میں غلطی ہو وہیں تو اس کا مقام ہے وہ تو ہمارے ہاں کا حاضر باش ہے جو ہم کہتے ہیں بلا واسطہ وہ سنتا ہے، ممکن نہیں کہ غلطی کرے۔ تو اتنے اوصاف بیان فرما دیئے۔

اس کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ صاحب! بے شک رسول بھی ہے، کریم النفس بھی ہے، طاقت ور بھی ہے، عرش کے پاس مقیم بھی ہے، لیکن پوزیشن کچھ معمولی قسم کی ہے لوگ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے، کوئی باحیثیت ہو، کوئی منصب اور مقام اس کے پاس ہو تب تو بات قابل اعتبار ہوتی، ایک بات کہہ دے ایرا غیرا نتھو خیرا تو اس کی کیا وقعت ہوگی؟ کوئی پوزیشن، منصب اور حیثیت ہونی چاہیے۔ تو ایک جملہ اور بڑھایا کہ مُطَاعٍ سید الملائکہ ہیں، سارے ملائکہ سلام اللہ علیہم کے سردار ہیں۔ تو جو سارے معصوموں کے سردار ہوں اور ان کے اوپر انہیں والی بنایا گیا ہو ان کی عصمت میں کیا کمی رہ سکتی ہے! جو سارے فرشتوں کے مخدوم و مطاع ہوں ان کے کلام میں غلطی کیسے ممکن ہے! تو رسول بھی ہے، کریم النفس بھی ہے، طاقتور بھی ہے، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہے، سننے میں بھی غلطی نہیں ہے اور مُطاع و سید الملائکہ بھی ہیں۔

لیکن اس کے بعد پھر ایک شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ سارے اوصاف سہی مگر نسیان اور بھول چوک ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے، ممکن ہے بھول کے کچھ کا کچھ کہہ دیا ہو، یا ارادتاً کچھ کمی بیشی کر دی ہو کہ بھئی وقت کے مناسب یہ ہے، لہٰذا اس کی یہ تاویل کر دو، زمانہ حال کے لوگ ہیں، پرانے زمانے کے لوگوں کے محاوروں کو سمجھیں گے نہیں کوئی محاورہ ہی بدل دو تو آگے ایک اور جملہ بڑھایا کہ: ﴿ثَمَّ أَمِيْنٍ﴾ ③ وہ نہایت امانتدار ہے، ممکن نہیں کہ لب و لہجے میں بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹-۲۰۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔

کوئی فرق کرے، ممکن نہیں ہے کہ الفاظ میں فرق کرے یا معانی میں فرق کرے۔ اب یہ سارے اوصاف ظاہر ہے کہ راویوں کے ہیں۔ تو حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجبور ہو کر اور دب کر مانو کہ یہ قرآن ہے بلکہ بصیرت سے اسے قبول کرو کہ اس کے راوی کیسے ہیں سند میں تو کوئی غلطی نہیں۔

پیغام رسانی میں جھوٹ اہل کفر بھی عیب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ اہل ایمان...... سند میں کوئی غلطی ممکن نہیں اوّل تو یہ ہمارا قاصد ہے جو کہ خود معتمد علیہ ہونے کی دلیل ہے پھر اپنی ذات سے بزرگ اور کریم النفس بھی ہے تو کریم النفس لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ یہ تو کمال ایمان کی بات ہے میں تو کہتا ہوں کفار بھی اپنی حیثیتِ عرفی سنبھالنے کے لئے اس کی رعایت کرتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں چاہے دنیاداری کے مجمع میں ہوں۔

ابوسفیان ہرقل کے دربار میں...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام جب عظیم روم کے نام پہنچا ہے تو ہرقل نے کہا کہ عرب کے کچھ لوگ آئے ہوں تو ان کو ذرا جمع کر دو، میں ان کے حالات پوچھوں جنہوں نے دعوائے نبوت کیا ہے۔ تو اس کے سامنے عربوں کا وفد پیش ہوا اس وفد کی قیادت ابوسفیان کر رہے تھے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ انہیں آگے کھڑا کیا باقی جو عرب تھے انہیں پیچھے کھڑا کیا گیا اور ہرقل نے کہا کہ میں تمہارے قائد سے سوال کروں گا اگر یہ صحیح کہے گا تو تم سب کی طرف سے صحیح تسلیم ہوگا اگر غلط کہے تو تم لوگ ٹوک دینا۔

ابوسفیان سے ہرقل نے چند سوالات کئے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کبھی اس (مدعیِ نبوت) شخص کا تم پر جھوٹ ثابت ہوا؟ کبھی عمر بھر میں کوئی غلط بات کہی ہو؟ اگر کبھی ایک جھوٹ بھی ثابت ہو تو یہ کہہ سکیں گے کہ دعویٰ نبوت میں وہ غلط ہے۔ تو ابوسفیان کہتے ہیں کہ اب مجھ کو کشش و پیچ ہوئی اس لئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانتے تو تھے نہیں، ہو سکتا تھا کہ دُور کا فاصلہ ہے، شام میں بات چیت ہو رہی ہے کوئی غلط بات منسوب کر دیتے کہ ہاں صاحب! فلاں بات غلط ثابت ہوئی ہے، لیکن انہوں نے دل میں کہا: اگر میں نے ایک جھوٹ بول دیا تو میری جو حیثیتِ عرفی ہے وہ ختم ہو جائے گی، اس لئے مجھے سچ بولنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ: ہم نے کبھی جھوٹ کے اوپر تجربہ نہیں کیا۔ گنجائش اتنی نکلی کہ اکثر کی تو بات یہی ہے باقی میرے آنے کے بعد جھوٹ بول دیا ہو تو یہ الگ بات ہے، اس کے سوا کوئی جملہ نہیں کہہ سکے۔ ① تو ابوسفیان کو کفر کے باوجود اس کی رعایت ان کے ذہن میں تھی کہ کوئی جھوٹ کا کلمہ نہ نکلے ورنہ میری حیثیتِ عرفی بگڑ جائے گی۔

تو ایک کافر جب پیغام رسانی میں جھوٹ بولنے کو عیب سمجھتا ہے تو ایک مؤمن کیسے عیب نہیں سمجھے گا اور مؤمن بھی فرشتہ جو ایمان کی حدِ کمال کے اوپر ہو، وہ کیسے جھوٹ بولے گا! وہ کیسے امانت میں خیانت کرے گا! تو حق تعالیٰ نے دباؤ نہیں ڈالا کہ چونکہ ہم بھیجتے ہیں لہٰذا ماننا پڑے گا نہیں! بلکہ جسے بھیج رہے ہیں اس کے احوال کو دیکھو، اس کے اوصاف کو دیکھو، وہ اوصاف پر پورا اترتا بھی ہے کہ نہیں تو اللہ تعالیٰ تو بے عیب ہے، منبعِ کمال ہے، وہاں تو غلطی

① الصحیح للبخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم، ص: ۱ رقم: ۷.

کا امکان ہی نہیں، بیچ میں امکان تھا تو فرشتے کے اوصاف بیان کئے کہ وہ راوی غلط نہیں ہوسکتا۔

کلام اللہ کو تین امانتوں نے گھیر رکھا ہے...... اب تیسری ذات وہ ہے جس پر کلام اترا وہ پیغمبر ہیں۔ پیغمبر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو سارے انبیاء کے کمالات کا نچوڑ اور سارے کمالات کا منتہاء ہیں، کوئی کمال ایسا باقی نہیں ہے کہ کسی اور نبی کو لاکر اسے پورا کرایا جائے۔ ایک نبی میں وہ سارے کمالات جمع کردیے گئے اور قیامت تک ایک ہی آفتاب کی روشنی باقی رہے گی، ان پر وہ کلام اُترا تو نبی معصوم، فرشتہ معصوم، اور حق تعالیٰ منبع کمالات۔ تو مروی عنہ جس سے روایت چلی (اللہ تعالیٰ) وہ بے عیب، فرشتہ جو کلام لے کر آیا وہ بھی معصوم وامانت دار اور جس پیغمبر پر لے کر آیا وہ سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن کی عظمت میں کلام نہیں۔ اللہ کے ناموں میں ایک نام امین ہے تو اللہ الامین کی طرف سے کلام اترا اور جبریل کا لقب بھی امین ہے، کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امین کہتے ہیں۔ تو امین نے کلام کیا، امین لے کر آیا اور امین کے اوپر اترا۔ تین (اعلیٰ درجے کی) امانتوں میں اوپر سے نیچے تک گھِرا ہوا ہے، پھر اس میں غلطی کا احتمال کیا ہے! پھر بھی اگر آدمی نہ مانے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ نے کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا، اوصاف بیان کردیے ہیں کہ ان اوصاف کا راوی غلط نہیں ہوسکتا، اس لئے ماننا چاہیے، آدمی کے دل میں انصاف ہو تو مانے گا۔

سندِ کلام اللہ میں ذاتِ نبوت کا مقام...... اب آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی ہے تو آپ کے اوصاف شروع کئے۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ نبی ہیں مان لو۔ بے شک اگر نبی کہہ کر منواتے تو ماننا پڑتا کیونکہ نبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ جھوٹ سے بری اور بالا ہو۔ مگر آپ کے بھی اوصاف بیان کئے فرمایا: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ① جن پر یہ کلام اترا ہے کوئی جنونی تھوڑے ہی ہیں، یہ تو خود سرچشمۂ عقل ہیں اور یوں جنون کی نفی کردی۔ اب رہا یہ کہ عقلمند کیوں نہ کہہ دیا، بجائے اس کے کہ جنون کی نفی کردی جائے...... یوں کہہ دیا جاتا کہ آپ بہت بڑے عقل مند ہیں، یہ نہیں فرمایا؟ اس لئے کہ عقل مند کہنے سے شبہ ہوتا: آیا فلسفیوں میں سے کوئی فلسفی ہیں؟ جب کہ نبی اور فلسفی میں بونِ بعید ہے، عقل مند ثابت کرنے کے معنی یہ تھے کہ آپ کو فلسفی ثابت کیا جائے اور نبوت وفلسفہ میں بُعد ہے، اس لئے جنون کی نفی کردی یہ کہ کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں! باقی یہ ہے...... عَلٰی سَبِیْلِ التَّنَزُّلِ جب کسی بڑے آدمی کا کلام منوایا کرتے ہیں جس کے سب اوصاف مسلّم ہوں تو یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کام کرنے والا کوئی دیوانہ تھوڑا ہی ہے، اس کی بات مانتا کیوں نہیں! تو جنون کی نفی درحقیقت ساری برائیوں کی نفی ہے تو آپ کی یہی شان بیان فرمائی کہ: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ② اب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے جو روایت سنی ہے وہ انہی سے سنی بھی ہے یا محض اپنے تخیل سے معاذ اللہ کچھ کہہ دیا ہے! تو فرمایا کہ: صرف سنی ہی نہیں ہے بلکہ راوی کو دیکھا بھی ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ ③ تو صرف سماع ہی نہیں

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۲. ② ③ ایضاً الآیۃ: ۲۳.

دیدار بھی ثابت ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ نے اصلی صورت میں دیکھا ہے تو اب جب راوی کو دیکھا بھی ہو، اس کی بات سنی بھی ہو اور پاس بیٹھ کر سنی ہو..... تو سنانے والا بھی امین، سننے والا بھی امین، بھیجنے والا بھی امین، امانتوں میں گھرا ہوا کلام اور راوی اور مروی عنہ دونوں صاحبِ کمالات، تو اب خطاء کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے! اب خواہ مخواہ عناد سے کوئی انکار کرے تو کرے! لیکن اصول کی رُو سے انکار جائز نہیں ہے۔ تو جبریل کو دیکھا بھی ہے، اس سے کلام سُنا بھی ہے تو سماع و دیدار کے ساتھ روایت کر رہے ہیں۔

اب یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ بات تو ساری سچی سنی اور واقعی پورا کلام لے لیا مگر آگے کہنے میں ذرا بخل ہے کہ بھئی! ہر ایک کو میں اپنا علم کیوں دوں! بہت سے صاحبِ کمال ہوتے ہیں کہ فن آتا ہے مگر سکھلاتے نہیں کہ کہیں دوسرا میرا ہمسر نہ ہو جائے! میں ہی تنہا اور یکتا رہوں! ہزاروں آدمی اپنے اپنے کمالات کو قبر میں لے گئے اور دنیا میں ان کا نشان بھی نہیں۔ بڑے بڑے اطباء بہترین نسخے اپنے سینے میں رکھ کر لے گئے! کسی کو نہیں بتلائے..... تو گویا صاحبِ فن نے بخل برتا، ممکن ہے یہاں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہو تو فرمایا گیا: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ ① غیب کی چیزیں پہنچانے میں وہ بخیل نہیں۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ غائب کی چیزوں کو آگے پہنچایا جائے تا کہ ہر چیز کی تمہیں ہدایت ملے۔ اب یہ ممکن تھا کہ کوئی یوں کہتا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درست سنا تھا مگر ممکن ہے کہ شیطان نے بیچ میں کوئی کلمہ ملا دیا ہو تو وہ خلط ملط ہو گیا ہو آگے اس کی بھی نفی فرمادی کہ: ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ﴾ ② تو شیطان کا کیا دخل! جب قرآن کی وحیٔ خداوندی چلنی شروع ہوئی تو شیطان کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک جاتے تھے، ملائکہ کی کبھی کبھار کوئی بات سن کر اس میں سو جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو پیش کر دیتے تھے، کوئی ایک آدھ بات سچی بھی نکل آتی تھی تو لوگ معتقد ہو جاتے تھے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ شیطان آسمان پر اس طرح جاتے تھے اور کچھ جھوٹ ملا کے دعویٰ کیا کرتے تھے لیکن ان کے راستے بند کر دیے گئے کہ اب تک تو آسمانوں کے دروازوں سے چڑھتے تھے اب چڑھ بھی نہیں سکتے خلط ملط تو وہ کیا کرتے، تو شیطان کا دخل بھی نہیں ہے۔

کلام بھی امین کا ہے اور پہنچانے والا بھی امین، امین بھی ایسا کہ کلام کے پہنچانے میں بخیل بھی نہیں بلکہ پہنچانے کا خود اس نے حکم دیا ہے: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً" ③ ایک جملہ، ایک بات اور ایک آیت بھی میں کہہ دوں تو دوسروں تک پہنچادو۔ بخل مت کرو اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو نصائح ارشاد فرمائیں اس میں صاف واضح طور پر فرمایا کہ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ④ جو حاضر ہے وہ غائبین کو میرا پیغام پہنچادے تو

---

① پارہ: ۳۰، سورة التكوير، الآية: ۲۴. ② ايضاً، الآية: ۲۵.

③ الصحيح للبخاری، كتاب احاديث الانبياء، باب ذكر عن بنی اسرائيل، ص: ۵۸۲ رقم: ۳۴۶۱.

④ الصحيح للبخاری، كتاب الحج، باب الخطبة فی ايام منیٰ، ص: ۱۳۶ رقم: ۱۷۳۹.

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا اہتمام کیا اور ایک ایک روایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی...... امت تک پہنچائی۔ تو بہر حال قرآن پاک کی سند کا ایک باطنی درجہ ہے کہ وہ اللہ سے چلی فرشتہ پر آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی، وہ سند بے عیب اور بے غبار ہے۔

سندِ ظاہری...... اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح پہنچائیں؟ اُمت کو تو آپ نے پہنچایا اور انتہائی امانت، دیانت اور سخاوت کے ساتھ پہنچایا کہ ایک ایک لفظ، زبر، زیر حتیٰ کہ صوت اور آواز تک بھی پہنچادی، پھر صحابہ رضی اللہ عنہ نے اسی اہتمام سے تابعین کو پہنچایا، تابعین نے اسی اہتمام سے تبع تابعین کو پہنچایا، انہوں نے اپنے اَتباع کو پہنچایا...... یہاں تک کہ وہ کلام ہم تک پہنچ گیا۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن میں (روایت کرنے والا طبقہ) تو اتر طبقہ ہے، ایک ایک آدمی روایت نہیں کرتا بلکہ ہر زمانے میں لاکھوں لاکھوں آدمی روایت کرتے آرہے ہیں اور محض روایت نہیں بلکہ ان کے سینوں میں بھی محفوظ ہے اور صرف سینوں میں محفوظ نہیں بلکہ وہ قرآن کے ساتھ حمائل بنے ہوئے ہیں کہ جو ذوق قرآن کا ہے وہ اہل علم نے اپنا ذوق بنالیا ہے۔ تو قرآن کا ذوق بھی پیدا کیا اس لئے کھوٹ کی، غلطی کی، خیانت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سندِ قرآن پر قانوناً بھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا...... تین چار آدمی مل کر اگر کوئی بات کہیں تو ہم قانوناً ان کی بات ماننے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور یہ لاکھوں کروڑوں ہر زمانے میں جو قرآن پڑھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو، وہ تو سینوں میں محفوظ ہے اور حفاظت کا یہ حال ہے کہ اس کی سورتیں گنی ہوئی ہیں، نہ زیادتی ممکن نہ کمی ممکن، علامات اور آیات بھی اس کی گنی ہوئی کہ قرآن میں کتنی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں کے حروف الگ گنے ہوئے ہیں کہ اتنے حروف ہیں، کل آیتوں کے اعراب تک گنے ہوئے ہیں کہ اتنے زبر، اتنے زیر، اتنے پیش، اتنے تشدید اور اتنے جزم۔ اس حفاظت کیساتھ کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر کمی بیشی ہو یا کوئی جرأت کرے کہ ایک آدھ لفظ بڑھادے یا اس میں سے گھٹادے، کوئی ایک آدھ ہی ایسا احمق اور بے وقوف ہوگا جو تبدیلی کرے، مگر امت اسے نہیں مانے گی اور اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔

جیسے ایک صاحب کاتب تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جو چیز ان سے نقل کروائی جاتی اس میں اپنی طرف سے کچھ گھٹاتے بڑھاتے ضرور تھے، لوگ بچتے تھے کہ فلاں کاتب کو کوئی مسودہ وغیرہ مت دینا، وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کردیتا ہے۔ تو قرآن شریف انہیں لکھنے کو دیا گیا کہ بھئی! اس کی نقل کردو اور یہ کہہ دیا گیا کہ دیکھو یہ اللہ کا کلام ہے اس میں کمی بیشی ممکن نہیں، کوئی لفظ گھٹانا بڑھانا نہیں، اگر تم نے گھٹایا بڑھایا تو تم جہنمی بن جاؤ گے۔ قرآن تو غلط نہیں ہوگا پھر صحیح ہوجائے گا مگر تمہاری عاقبت خراب ہوجائے گی وہ کہنے لگے: صاحب! یہ کلام خداوندی ہے، اس میں کمی بیشی کیسے کرسکتا ہوں، یہ تو لوگوں کے کلام میں...... میں اپنی مرضی سے کچھ گھٹا بڑھا دیتا ہوں۔ خیر انہوں نے لکھا، لکھ کر لائے تو بہت خوش قلم، پوچھا: کہ بھئی! گھٹایا بڑھایا تو نہیں؟ کہا: نہیں بالکل نہیں! بھلا خدا کا کلام ہے، اس

میں کیسے کمی زیادتی کر سکتا ہوں، ہاں تھوڑی سی کمی بیشی میں نے کر دی ہے وہ یہ کہ قرآن کے اندر کہیں فرعون کا نام کہیں ہامان کا نام اور کہیں قارون کا نام تھا، یہ نام کیسے؟ یہ بڑے بڑے فُسّاق! بھلا قرآن اور اس میں کافروں کا ذکر، ہاں بس میں نے ان کے نام مٹا کے کہیں آپ کا نام، کہیں آپ کے والد ماجد کا نام لکھ دیا اور کہیں آپ کے دادا کا نام۔ بس اتنا تو کیا اور کچھ نہیں کیا۔ تو ایسا کوئی احمق ہو تو کچھ گھٹا بڑھا دے وہ اپنی عاقبت خراب کرتا ہے کوئی مانتا نہیں ہے۔ ہزاروں پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے تحریف کرنا چاہی ہوگی مگر وہ مٹ چکے ہیں ان کا نام ونشان تک نہیں قرآن اسی طرح اپنی جگہ ہے۔

حدیث از روئے قرآن محفوظ ہے...... حدیث کے انکار کرنے والے بہت سے پیدا ہوئے۔ پہلے وضاعین (احادیث کو وضع کرنے والے) پیدا ہوئے۔ انہوں گھڑ گھڑ کے حدیثیں ملائیں تا کہ اصل حدیث پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔ محدّثین کرام کو اللہ جزائے خیر دے! انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا اور ایسے اصول وضع کر دیے، ایسے کانٹے ہاتھ میں دے دیئے کہ ممکن نہیں غلط روایت صحیح حدیث میں مل جائے۔ کانٹے سے پہچان سکتے ہیں۔ تو قرآن بھی محفوظ اور حدیث بھی محفوظ۔ اور اللہ نے اس کا وعدہ دے دیا ہے ایک تو یہ فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ہم نے قرآن اتارا اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ حدیث بھی محفوظ ہے کیونکہ وحی جب اترتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے جلدی جلدی رٹنا شروع کرتے تا کہ بھول نہ جائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ رہ جائے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ② اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دو! جلدی مت کرو! یہ جو آپ کو خطرہ ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں تو اس کا وعدہ دیا کہ: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ یہ ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کے سینے میں جمع بھی کر دیں گے اور پڑھوا بھی دیں گے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں بلکہ آپ سنتے رہیں۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ④ جب ہم (بواسطہ فرشتہ روح الامین) قرآت کیا کریں آپ سنتے رہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کے قلبِ مبارک میں جمع کر دیں۔ کوئی غلطی ممکن نہیں اور نہ صرف جمع کر دیں گے بلکہ آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے، اُسی طرح سے ادا بھی کرا دیں گے۔ تو قرآن ظاہر بات ہے کہ اپنے لفظوں کے لحاظ سے محفوظ ہو گیا، ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ﴾ ⑤ سے اللہ نے گارنٹی دے دی، جَمْعَهٗ کے لفظ سے یہی مراد ہے کہ جمع بھی کر دیں گے۔ تو جمع تو لفظ ہی کئے جاتے ہیں۔ وَقُرْاٰنَهٗ اور پڑھوا بھی دیں گے۔ تو لفظ ہی پڑھے جاتے ہیں معنی پڑھے نہیں جاتے تو لفظوں کے جمع ہونے کی گارنٹی دی اور یہ کہ آپ کی زبان سے ادا بھی کرا دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع بھی کر دینگے۔ اب رہ گئے آگے معانی! کہ اس کا مطلب کیا؟ اس سے مراد کیا؟

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹. ② پارہ: ۲۹ سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶. ③ ایضاً، الآیۃ: ۱۷.
④ ایضاً، الآیۃ: ۱۸. ⑤ ایضاً، الآیۃ: ۱۷.

اس کی بھی گارنٹی دی، فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ① پھر ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کر دینا بھی ہے کہ مراد کیا ہے! اور مطلب کیا ہے!۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی، اس کے معانی کی ذمہ داری بھی حق تعالیٰ نے لی تو لاکھ کوئی تحریف معنوی کرے، جاہلانہ تاویلات کرے لیکن وہ چلنے والی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی حفاظت شامل حال ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ'' ② آپ نے وعدہ دیا کہ امت کے اندر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، وہ کیا کریں گے؟ وہ علمِ خداوندی اور جو آیت و روایت ان تک پہنچی ہیں ان میں غلو کرنے والوں کے غلو کا پردہ چاک کر دیں گے کہ یہ معنی محبت و عداوت اور غلو کی وجہ سے لیے گئے ہیں، باطل پسندوں اور باطل پرستوں کی جو دروغ باطنیاں ہیں انہیں وہ کھول کر رکھ دیں گے، وہ اغلاط عیاں ہو کر دنیا کے آگے آجائیں گی۔ یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے معانی میں خلط ملط کر دیں۔ لوگ جاہلانہ تاویلات کتنی کریں لیکن پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا، لفظوں اور معانی دونوں میں کوئی تحریف ممکن نہیں، دونوں کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے۔

قرآن علمی معجزہ ہے...... تو قرآن کریم کا ایک وصف تو ثابت ہوا کہ وہ معجزہ ہے، اس کی کوئی نظیر نہیں لا سکتا، اس کی کوئی مثل نہیں بنا سکتا، وہ جامعیت کوئی پیدا نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ جامعیت علم سے متعلق ہے اور بندے کا علم جامع تو کیا ہوگا! پورا علم بھی نہیں: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ③ لوگ اس کے علم کو نہیں لا سکتے مگر وہ جتنا چاہے دے دے اتنا لے لیں گے۔ تو اول تو وہ علم عطائی اور پھر وہ بھی قلیل۔ سب سے زیادہ علم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے کہ آپ اعلم الخلائق ہیں، اعلم البشر ہیں دنیا میں علم کے اندر آپ کا کوئی مثل نہیں ہے لیکن آپ خود فرماتے ہیں کہ اللہ کے علم کے سامنے میرے علم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اتھاہ سمندر کے کنارے پر ایک چڑیا چونچ ڈالے اور اس کو کچھ تری لگ جائے! وہ نسبت ہے میرے علم کو اللہ کے علم سے۔ تو جب علمِ خداوندی کے سامنے اعلم الخلائق کے علم کا یہ حال ہے تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ تو جس کا علم اتنا جامع ہوگا اس کا کلام معجزہ ہی ہوگا دوسرے کا کلام معجزہ نہیں ہو سکتا کہ اس جیسا کلام نہ لا سکے تو پہلی چیز تو یہ ثابت ہوئی کہ وہ معجزہ ہے۔

قرآن دلیلِ ختمِ نبوت بھی ہے...... دوسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ وہ فطرتاً محفوظ ہے کیونکہ کلام وہی ہے دوسری کتابیں کلام نہیں اور کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹ نہیں سکتا۔ وہ جو (فضاء) کے اوپر حاوی ہے، خلا کے اندر محفوظ ہے۔ تو محفوظ ہونا بھی معجزہ ہے، دنیا کی کسی قوم کے ہاتھ کسی پیغمبر کا کوئی معجزہ موجود نہیں ہے۔ ایک امت اسلامیہ ہے جس کے ہاتھ میں معجزہ موجود ہے اور معجزہ نبوت کی دلیل ہوتی ہے، معجزے سے ہی

① پارہ: ۲۹ سورة القيامة، الآية: ۱۹۔ ② السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الشهادات، باب الرجل من اهل الفقه ج: ۱۰ ص: ۲۰۹۔ مشكوة المصابيح، كتاب العلم، الفصل الاول ج: ۱ ص: ۵۳ رقم: ۲۴۸۔ ③ پارہ: ۳، سورة البقرة، الآية: ۲۵۵۔

پہچانا جاتا ہے کہ یہ نبی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چاند کے دوٹکڑے کردیئے تو پہچانا گیا کہ آپ پیغمبر ہیں، خلافِ عادت جو کام آپ کے ہاتھ پر ہوا دنیا وہ کام نہیں کرسکتی۔ ہزاروں معجزات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ظاہر ہوئے۔ تو معجزہ دلیلِ نبوت ہوتی ہے، جس سے نبی کو پہچانا جاتا ہے لیکن پچھلے انبیاء علیہم السلام کو جتنے معجزات دیئے گئے اس سے ہزاروں گنا زائد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیئے گئے مگر وہ عملی معجزات تھے اور عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب عامل دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے تو پچھلے انبیاء کرام کو معجزات عملی دیئے گئے تھے تو جب وہ دنیا سے پردہ کر کے چلے گئے ان کے معجزات بھی ختم ہو گئے۔ تو نبوت کی دلیل باقی نہ رہی عصاءِ موسیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی دلیل تھی، آج نہ عصاءِ موسیٰ موجود ہے نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت، عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، ان کی نبوت کی یہ دلیل تھی آج نہ مسیح علیہ السلام ہیں اور نہ احیاءِ موتی موجود، دلیلِ نبوت موجود نہیں۔ یوسف علیہ السلام نے قمیص بھجوادیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دو، بینائی واپس آجائے گی! آج نہ قمیص یوسف ہے نہ حضرت بینا ہوسکتے ہیں، گویا وہ معجزہ موجود نہیں جو ان کی نبوت کی دلیل تھی۔ جتنے معجزات تھے وہ سب انبیاء کے ساتھ رخصت ہو گئے کیونکہ وہ عملی تھے اور عامل کے جانے سے عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر علم ہے تو عالم کے دنیا سے اٹھنے سے اس کا علم ختم نہیں ہوتا، ہزاروں علماء چلے گئے مگر ان کا علم محفوظ ہے۔ اپنے علم کے پردے میں آج بھی وہ علماء زندہ موجود ہیں اور ان کے علم کی دلیل موجود ہے کیونکہ ان کا علم کتابوں میں مدوّن ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جہاں ہزاروں علمی معجزات دیے گئے ان میں سب سے بڑا معجزہ کلامی وعلمی ہے جو قرآن مجید ہے اور اس کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کی طرف دنیا کو دعوت دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نبوت کی دلیل موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرف دنیا کو دعوت نہیں دی جاسکتی کیونکہ ہمارے ہاتھ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرف نہیں بلایا جاسکتا اس لئے کہ ہمارے سامنے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ سب معجزات ختم ہو چکے، لیکن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے معجزہ اور نبوت کی دلیل معجزہ قرآنی ہے، یہ محفوظ ہے اور بحفاظتِ خداوندی محفوظ ہے تو وہ دعوت بھی محفوظ ہے۔ آج اگر دعوت دی جائے گی تو قرآن کی طرف دی جائے گی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کی طرف دی جائے گی، اسلامی شریعت کی طرف دی جائے گی کیونکہ اس کی دلیل موجود ہے۔ اگر کوئی شبہ کرے گا! اعتراض پیش کرے گا! تو قرآن نے سب چیزوں کی کفالت دی ہے، دلائل موجود ہیں، ہر شبہ کو رفع کیا ہے، ہر اعتراض کا جواب اس میں موجود ہے، ہر مُفسِدہ کی اصلاح کی ہے، گویا مکمل طور پر: شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔

نفاق کے سوا حجت وبرہان سے مسلمانوں میں اختلاف ڈالنا ممکن نہیں ...... یہی وجہ ہے کہ یہود ونصاریٰ نے مقابلے کیے، تیغ وسنان سے مقابلے کیے، جنگیں لڑیں، مشرکین کو کھڑا کیا مگر غالب نہیں آئے۔

مسلمانوں سے نہ صرف تیغ وسنان سے مقابلے کئے بلکہ حجت وبرہان سے بھی مقابلے کئے تو قرآنی حجتوں کے مقابلے میں کوئی حجت نہیں پیش کر سکے، عاجز آ گئے اور اخیر میں پھر نفاق کا طرز اختیار کیا کہ مسلمان بن کر مسلمانوں میں نفاق پھیلاؤ۔ یہ تدبیر ان کی البتہ کارگر ہوئی۔ پھر دو پارٹیاں بن گئیں اور مسلمانوں کی جو وحدت تھی وہ پارہ پارہ ہو گئی۔ تو منافق بن کر مسلمانوں میں نفاق ڈالا جا سکتا ہے لیکن حجت وبرہان اور دلیل کی رُو سے کوئی چاہے کہ اختلاف ڈلوادے...... ممکن ہی نہیں ہے۔ حجت قوی موجود ہے، ہر باطل دلیل رد کی جا سکتی ہے دلیل وبرہان سے۔ مختلف قوموں نے مقابلے کئے مگر عاجز آ گئیں! نہیں چل سکیں۔ تب یہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی بھی حجت وبرہان سے عاجز نہیں ہوگا خواہ دنیا کی اقوام کیوں نہ جمع ہو جائیں۔

آج بھی ایک اور دس کی نسبت ہے بلکہ ایک آتا ہے تو سو کو سبق دیتا ہے، آج تک یہ چیز موجود ہے۔ تو تیغ وسنان سے مقابلہ کیا مگر نفاق کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس امت میں بہت سے منافق ہوں گے جو واقع میں ایمان نہیں رکھتے ہوں گے دعویٰ ایمان کا کریں گے جیسے واقع میں نبوت ناممکن ہے مگر اس امت میں تیس دجال کذاب پیدا ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے تو نفاق سے ممکن ہے پارٹی بنا دی جائے مگر حقائق اور حجت وبرہان سے نہیں ہو سکتی، تیغ وسنان سے نہیں ہو سکتی۔ تو قرآن کریم معجزہ بھی ہے اور دلیلِ نبوت بھی ہے۔ کلام خداوندی بھی ہے جو اٹل اور محفوظ ہے تو اعجازی کلام خود معجزہ اور دلیل نبوت ہے، اس لئے قیامت تک اس کی دعوت جاری رہے گی اور محفوظ بھی ہے کہ حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے بچوں کے ذریعے اور بوڑھوں کے ذریعے حفاظت کرائی، امت میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے کہ بچوں کو تو خیر حفظ کرایا خود بڑھاپے میں بھی حفظ کیا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا حفظِ قرآن کا واقعہ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب پہلا حج کیا تو کراچی کے راستہ سے کیا تھا۔ اس زمانے میں اسٹیمر نہیں تھی، بادبانی جہاز تھے۔ باد بان باندھ دیا گیا تو کشتی چل رہی ہے، ہوا جب مخالف چلی لنگر ڈال دیے، جس سے کشتی کھڑی ہو جاتی تھی۔ پانچ پانچ چھ چھ مہینے میں جدّہ پہنچتے تھے۔ تو حضرت بھی بادبانی جہاز میں سوار ہوئے اور رمضان شریف آ گیا۔ گویا شعبان میں چلے تھے، کشتی کے اندر رمضان آ گیا اور اتفاق سے کوئی حافظ نہیں! تراویح: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے ہوئی تو حضرت کو بڑی غیرت آئی کہ اڑھائی تین سو آدمی جہاز میں موجود اور تراویح میں قرآن کریم نہ سنایا جائے! ایک بھی حافظ نہیں! بس اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے سورتیں یاد ہیں۔ اسی دن قرآن یاد کرنے بیٹھے، روز ایک سپارہ حفظ کرتے، رات کو تراویح میں سنا دیتے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ اس طرح سے محفوظ ہو جانا کہ بوڑھے بوڑھے بھی اس کو یاد کر لیں اور ذہن کے اندر اتر جائے، یہ بھی معجزہ ہے۔ آپ کسی کتاب کو جو لمبی چوڑی کتاب ہو، دلچسپ بھی ہو، کوئی پانچ سو ہزار صفحات کا ناول ہو، بیس دفعہ بھی رٹیں گے تو نہ اس کے الفاظ یاد ہیں نہ اس کے معانی، قصے کہانیاں بھی یاد نہیں رہیں گے۔ روز کا مشاہدہ ہے: قرآن یاد کرتے ہیں تو سینوں میں اترتا جاتا ہے، یہ

بھی معجزہ ہے۔ یہ اس کے اندر طاقت ہے کہ وہ قلوب میں محفوظ ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عینِ فطرت کے مطابق ہے۔ فطری چیزوں کو فطرت خود جذب کرتی ہے۔ تو قرآن کریم جب پہنچتا ہے تو فطرتیں قبول کر لیتی ہیں چاہے شعور بھی نہ ہو تب بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو امت میں بچے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں اربوں پیدا ہوں گے جو حافظ ہوں گے اور واقعۃً ہوئے ہیں اور بعد میں جوان ہو کر بھی حافظ رہے، بوڑھے بوڑھوں نے بھی قرآن یاد کیا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حفظِ قرآن کا واقعہ...... حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو انگریزوں نے ۱۳۶۲ھ میں گرفتار کیا تو جیل میں کوئی اور مشغلہ نہیں تھا قرآن کریم یاد کرنا شروع کر دیا اور تقریباً دو ثلث یا ایک پارہ یاد کیا اور روزانہ اسے تراویح میں پڑھا کرتے تھے۔ تو مولانا مرحوم کی عمر ستر پچھتر سال کی تھی اور اس عمر میں یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ جو اس کی طرف متوجہ ہو وہ خود اس کے قلب کے اندر آ جاتا ہے اگر خود بے اعتنائی کرے تو وہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔

قرآن بے اعتنائی سے جاتا رہتا ہے...... حدیث میں قرآن کو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ رسیاں باندھ باندھ کے رکھو گے تو چلے گا، ذرا ڈھیل دو گے تو وہ تمہارے پاس سے چلا جائیگا۔ اس لئے کہ غنی کا کلام ہے محتاج تم ہو۔ تمہیں ہزار دفعہ اس کی ضرورت پڑے تو پڑے۔ وہ محتاج نہیں کہ خواہ مخواہ تمہاری طرف آئے۔ اگر ذرا تم نے ڈھیل کی تو تمہارے دل سے نکل جائے گا۔ تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے اس میں خود غناء (بے پرواہی) موجود ہے۔ ہم محنت کریں۔ یہ اس کا فضل ہے کہ وہ ہمارے اندر آ جاتا ہے اور پیوست ہو جاتا ہے، جزوِ نفس بن جاتا ہے اور بے دلی کریں تو بھاگ جاتا ہے۔ تو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی۔ بہر حال اس کے اندر احکام بھی ہیں معانی بھی ہیں معارف بھی ہیں علل بھی ہیں، یہ اسی اعجاز کا ثمرہ ہے کہ امت پوری کی پوری محافظِ قرآن بن گئی۔

کثرتِ تصنیف اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے...... قرآن کا یہ اعجاز بھی ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اتنی تصانیف دنیا کی کسی امت میں نہیں ہوئیں جتنی اس میں ہیں ملکوں میں کتب خانے بھرے پڑے تھے۔ اور ہر کتاب کو دیکھو وہ قرآن کی کسی ایک ایک آیت کی تشریح و تفسیر ہے۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں، مصر کے کتب خانوں کو دیکھو...... سو برس سے مصری حکومت چھاپتے چھاپتے عاجز ہو گئی مگر مصر شہر کی کتابوں کا عشر عشیر بھی ابھی نہیں چھپ سکا۔

تاتار نے جب مسلمانوں پر قبضہ کیا اور بغداد کی خلافت کو تہ و بالا کیا ہے تو مسلمانوں نے پُل توڑ دیا تھا تاکہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے تو صرف ایک کتب خانہ جو دریا کے قریب تھا۔ تاتاریوں نے اس پر قبضہ کیا اور اس کی کتابیں دریا میں ڈال کر اُس پار تک اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ تین گاڑی برابر گذاری جا سکتی تھیں اور پھر روشنائی جو گھلی ہے تو ایک مہینہ تک دجلہ کا پانی' سیاہ چلتا رہا۔ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء کو دوات میں روشنائی ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی دجلہ کا پانی دوات میں بھرتے تھے اور اس سے قلم چلتا تھا، اتنی سیاہی پھیل گئی تھی۔ یہ ایک کتب خانے کا

حال ہے کہ جس سے تاتاریوں نے پل بنادیا اور ایسے ہزاروں کتب خانے بغداد میں موجود تھے۔

اندلس کے اتنے کتب خانے تھے کہ جب مسلمانوں کا قبضہ اٹھا اور پھر عیسائیوں نے قبضہ کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کے لٹریچر کو تباہ کرو، جب تک یہ لٹریچر باقی ہے ان میں روح ایمان باقی رہے گی تو عیسائی حکومت نے مستقلاً ارادہ کیا کہ مسلمانوں کے کتب خانے تباہ کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک مستقل عملہ بنایا گیا جو سارے کتب خانوں کو آگ لگادے، جلادے اور تلف کردے۔ اس کا ایک انچارج آفیسر مقرر کیا تو لکھتے ہیں پچاس برس میں اندلس کے کتب خانے کہیں مٹ سکے ہیں۔ حکومت نے زور لگا کے پورے پچاس برس میں جا کے اندلس کے کتب خانوں کو ختم کیا ہے۔

یہ صرف قرآن کے طفیل تھا۔ ہر ایک کتاب کسی آیت کی شرح تھی، ہر کتاب کسی آیت کی تفسیر تھی تو کثرتِ تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اس کی تصنیف کو دیکھ کر دنیا کی امتیں آج مصنف بنی ہیں ورنہ اگر وہ اپنی ذات سے مصنف تھیں تو تورات اور انجیل کے شباب کے زمانے میں کتنی کتابیں تصنیف ہوئیں، زبور کے شباب کے زمانے میں کتنے کتب خانے بھرے گئے، کوئی نشان نہیں۔ یہ قرآن ہی کے زمانے میں کیوں مصنف بنے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہی طفیل ہے کہ مسلمانوں کے مواعظ، ان کی تقریریں، ان کی شعلہ بیانی غیر شعوری طور پر اقوام عالم میں اثر کرتی رہی اور ان میں اتنی طاقت پیدا کی۔ اس لئے آج وہ مصنف بنے اور تصنیفیں کیں اور امت محمدیہ (علیٰ صاحبھا الف الف تحیۃ وسلام) کے مصنف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کو کتب خانوں سے بھر دیا۔

قرآن کو چھوڑنے کا نتیجہ اعجازی قوت سے محرومی ...... تو قرآن کریم کلامی معجزہ ہے اس کے اعجازی اثرات ظاہر ہو رہے ہیں اور یہ صرف معجزہ نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی بہت سے معجزات اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ آج امت کے اندر اس تیرہ سو برس میں بہت سے اکابر پیدا ہوئے، ہر طبقے میں اہل علم پیدا ہوئے، صوفیاء میں دیکھو تو جنید و شبلی اور سری سقطی رحمہم اللہ وغیرہ ہزار ہا اہل تصوف گزرے ہیں، محدثین میں دیکھو تو امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ اور اسی طرح سے کتنے محدث گذرے ہیں، فقہاء میں دیکھو تو امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ کتنے آئمہ گذرے، متکلمین میں دیکھو تو کتنے آئمہ گذرے ہیں، ہر فن کے اندر اہل علم اور اہل کمال پیدا ہوئے اور ان کے ذریعے سے علماء کے کمالات ظاہر ہوئے، وہ علوم لا کے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آ گئیں۔ یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ جس نے لوگوں کے اندر اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہو جائیں گے، امت کی طاقت ختم ہو جائے گی ...... اسی کی طرف لوٹیں گے تبھی جا کر امت کی شوکت بازیاب ہوگی۔ تو قرآن کریم محفوظ اور معصوم ہے اور حق تعالیٰ نے اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی صورتیں ...... جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہو گیا، اس نے الفاظ کو محفوظ کیا، ہر دور میں لاکھوں حافظ تھے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے، علماء کا طبقہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے معانی کو

محفوظ کیا اور کتابیں لکھیں۔ کتابوں سے لاکھوں کتب خانے بھر دیے۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے صوفیاءِ کرام کا طبقہ کھڑا ہوگیا، انہوں نے وہ وہ حقائق اور معارف بیان کئے کہ دنیا ان کے معارف کو دیکھ کر حیران ہوگئی گویا ایک مستقل طبقے نے اس کے معارف کی حفاظت کی، قرآن کریم کے رسم الخط کے لئے بھی ایک مستقل طبقہ علماءِ رسم الخط کھڑا ہوگیا کہ ایک ہی طریقے سے قرآن لکھا جائے دوسرے طریقے سے نہیں۔

مثلاً رحمٰن کا لفظ ہے رحمٰن کا لفظ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ میم کے ساتھ الف ملاؤ اور نون الگ لکھو جیسے ''رحمان''، لیکن قرآنی رسم الخط یہ ہے کہ میم کے ساتھ نون ملا کے میم کے اوپر کھڑا زبر لکھے جیسے ''رحمٰن''۔ تو اس کے خلاف لکھنا جائز نہیں، وہی لکھنا پڑے گا۔ تو علماء رسم الخط کھڑے ہوگئے جنہوں نے قرآنی رسم الخط کی حفاظت کی۔

اب اس کی طرزِ ادا کا مسئلہ تھا تو قرّاء اور مجوّدین کو اللہ نے کھڑا کر دیا کہ اسی لب و لہجے کو یعنی جس انداز سے عرب پڑھتے ہیں وہی انداز اختیار کرو۔ تو انہوں نے تصحیحِ مخارج، اداءِ کلمات حتیٰ کہ صوت (آواز) تک محفوظ کرنے کی کوشش کی کہ عجمی انداز سے قرآن کو نہ پڑھا جائے، مزامیر کے انداز سے نہ پڑھا جائے بلکہ اسی انداز سے پڑھا جائے جس انداز سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پڑھا، تابعین نے پڑھا اور آج تک پڑھا جاتا آرہا ہے: ''اِقْرَؤُوا الْقُرْاٰنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ'' ① کہ قرآن کو عرب لہجے میں پڑھو، فرمایا گیا نیز فرمایا گیا کہ: ''حسنوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا'' ② خوش آمیزی اور درد آمیز آواز سے قرآن کو پڑھو اس سے قرآن کا حُسن بڑھتا ہے۔

قرآن سے غیر مسلم بھی متاثر ہوتے ہیں...... واقعی یہ بات ہے کہ اگر صحیح انداز پر صحیح دردِ دل سے پڑھنے والا ہو، کفار تک متاثر ہوتے ہیں، جو سمجھتے تک نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں! اس انقلاب سے پہلے انڈیا میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس کے صدر تھے تو مولانا محمد علی (مرحوم) فطرتاً جری انسان تھے اور ان میں بہادری کی ایک شان تھی، لاکھ دو لاکھ آدمی کا مجمع تھا تو مولانا نے کھڑے ہوکر کہا کہ جلسہ کی ابتداء قرآن شریف سے ہوگی۔ تو لوگوں نے کہا صاحب! سیاسی جلسہ ہے وہ بھی کانگریس کا! ہندو مسلم سب جمع ہیں، یہاں قرآن کا کیا کام! اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو پنڈت کہیں گے کہ ہم بھی آسوب پڑھیں گے، پادری صاحب کہیں گے کہ میں بھی انجیل پڑھوں گا، یہودی کوئی کھڑا ہوگا تو کہے گا میں بھی تورات پڑھوں گا۔ فرمانے لگے سب کو اجازت دوں گا کہ سب پڑھیں مگر شروعات آیتِ قرآن کریم سے ہوگی۔ وہ سب چپکے ہوگئے۔ قاری ابراہیم رشید عرب تھے مولانا نے انہیں آواز دی، انہیں بلایا، حیدرآباد میں جو جامع مسجد ہے جس کا نام مکہ مسجد ہے اس کے وہ خطیب تھے۔ تو اوّل تو عرب پھر بڑے جہری الصوت، بڑے خوش آواز، عربی انداز سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔

---

① شعب الایمان، فصل فی ترک التعمق فی القرآن، التاسع عشر من شعب الایمان ج:٦ ص:١٧٥. ② شعب الایمان للبیهقی، التاسع عشر من شعب الایمان، فصل فی تحسین الصوت بالقرائة ج:٥ ص:١٥٧، رقم:٢٠٧٤.

مولانا مرحوم نے فرمایا: کہ آپ پڑھو! قاری ابراہیم صاحب نے سورۃ الصف کے دونوں رکوع کوئی آدھ گھنٹہ سے زیادہ میں تلاوت کیے۔ وہ تلاوت کر رہے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا لوگوں کے سروں کے اوپر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں حس وحرکت ہی نہیں۔ بہت سے غیر مسلم ہندوؤں کی بھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کچھ نہیں سمجھتے تھے مگر آنسو جاری تھے۔ تو قرآن کریم صحیح طور پر کوئی پڑھنے والا ہو، مجوِّد ہو، اچھی تجوید سے پڑھے تو کفار تک متاثر ہوتے ہیں، مؤمن کا تو کہنا ہی کیا ہے! تو قرآن کی طرزِ اداء کے لئے بھی مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس کا نام مجودین اور قراء ہے، وہ اسی انداز سے آج تک چل رہے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمیں حضرت قاری سراج احمد صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ اللہ نے ان کے ذریعے دارالعلوم الاسلامیہ کو قائم کیا جہاں سینکڑوں قاری پیدا ہوئے۔ اس مدرسہ کے قائم ہونے سے پہلے پنجاب بہت دفعہ میری حاضری ہوئی تو امام (مسجدوں) میں کچھ صحیح نہیں تھے، بس پنجابی انداز میں قرآن کریم پڑھتے تھے وہی لب ولہجہ تھا تو اس میں وہ لطف نہیں ہوتا تھا لیکن اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد دیکھا جگہ جگہ مدارس میں بہترین قاری پیدا ہونے لگے ہیں اور ہر جگہ عمدہ قرآت موجود ہے، گویا ایک فیض عام ہو گیا۔

اور قاری عبدالمالک صاحب کا بالآخر فیضانِ عام ہوا، ہندوستان میں بھی ان کا فیضان عام تھا اور یہاں آ کر بھی ان کا فیضان عام ہوا، آج پاکستان میں سینکڑوں قراء موجود ہیں بلکہ قرأت کے مقابلے ہونے لگے ہیں کہ کون زیادہ اعلیٰ درجے کا پڑھتا ہے اور بین الاقوامی مقابلوں میں بھی یہاں کے قراء جانے لگے اور یہاں سے باہر جا کر وہ اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوئے۔ یہ انہی مدارس کا طفیل ہے تو ہمیں حضرت قاری صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک مینار قائم کیا کہ آج سینکڑوں قاری اور مجود پیدا ہو گئے اور آپ نے یہ جو پچاس ساٹھ آدمیوں میں سندیں تقسیم کیں یہ قاری ہو کر نکلے تو ایک ایک آدمی اگر دس دس کو بھی تیار کرے تو پانچ سو ہزار آدمی تو انہی سے تیار ہو جائیں گے۔ دیا یوں ہی جلتا رہے گا۔ تو قرآن کا فیضان الفاظ کا الگ ہے، لب ولہجے کا الگ ہے، معانی کا الگ ہے، حقائق کا الگ ہے، تفسیرات کا الگ ہے، حکمتوں کا الگ ہے اور ہر پہلو کی حفاظت کے لئے اللہ نے ایک طبقہ کھڑا کر دیا۔ اسی کو فرمایا کہ: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① کہ ہم نے ہی قرآن اتارا ہے ہم ہی اسکی حفاظت کرینگے تو انہوں نے جو قرآن اتارا ہے تو فقط مضمون نہیں اتارا الفاظ بھی اتارے ہیں اور لفظ ہی نہیں بلکہ آواز بھی اُتاری ہے۔

خلفائے خداوندی محافظین قرآن کے القابات...... حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ایسی آواز سنتا ہوں کہ كَاَنَّهَا صَلْصَلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ ②

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ ج: ۱ ص: ۱ رقم: ۲.

جیسے چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچو تو اس سے ایک جھنجھناہٹ اور گونج کی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس قسم کی آواز سنتا ہوں۔ اس سے پھر الفاظ بنتے ہیں اس سے پھر معانی القاء ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن میں صوت کا بھی دخل ہے، فقط لفظ ہی نہیں کہ قلب کے اوپر آ گئے بلکہ سنائے گئے اور جب سنائے جائیں گے تو بہر حال لب ولہجہ بھی ہوگا، اس لب ولہجے کی حفاظت کے لئے اللہ نے مستقل طبقہ کھڑا کر دیا، وہ مجودین کا طبقہ ہے تو حقیقت میں یہ خلفائے خداوندی ہیں۔

اصل پڑھنے والے حق تعالیٰ ہیں تلاوت کرنے والے وہ ہیں، حافظِ قرآن وہ ہیں۔ قرآن میں خود فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ہم نے اتارا ہم ہی حافظ ہیں تو اپنے کو حافظ کہا۔ نیز فرمایا: ﴿نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ﴾ ② اے پیغمبر! ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا اصل میں تلاوت کنندہ حق تعالیٰ ہیں اور فرمایا ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ اے پیغمبر! جب ہم قرأت کریں تو سنتے رہا کریں۔ معلوم ہوا کہ قاری بھی حق تعالیٰ ہیں تو قاری بھی وہ، تلاوت کنندہ بھی وہ، حافظ بھی وہ۔ یہ اس کا فضل ہے کہ جو حفظ کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ آج سے جو لقب ہمارا تھا تمہارا بھی ہے، کوئی قرأت سیکھ لیتا ہے تو فرماتے ہیں کہ قاری تو ہم ہیں لیکن آج سے ہم نے اپنا لقب تجھے دے دیا، اسی طرح تلاوت کرنے والے ہم ہیں مگر جب تم تلاوت کر رہے ہو تو تم بھی یہ لقب استعمال کر سکتے ہو۔

اہلِ جنت کے خدائی القابات...... تو سرکاری القاب آپ کو دے دیئے، خود وہ حافظ تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حافظ کہا، خود تالی تھے آپ کو بھی تالی کہا، خود قاری تھے آپ کو بھی قاری کہا، یہ اس کا فضل ہے کہ اپنے القاب بندے کو عطا کر دیے ورنہ بندوں کے الفاظ ممتاز ہوتے ہیں، مثلاً پریذیڈنٹ یا صدرِ جمہوریہ یا وزیرِ اعظم کا اگر کوئی دعویٰ کرنے لگے کہ میں وزیرِ اعظم ہوں مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ تو کدھر سے وزیرِ اعظم ہے! تجھے قانون کی رو سے لفظ بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہیں، کوئی کہے کہ میں صدرِ جمہوریہ ہوں تو مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ صدرِ جمہوریہ ایک ہی تو ہے تو کدھر سے ہو گیا! تو سرکاری القاب کوئی اختیار نہیں کر سکتا جب تک سرکار ہی لقب یا خطاب نہ دے دے۔ پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ لقب تو اپنے سرکاری ہیں اور تمہیں دے دیے گئے کہ جب تم اس مقام پر پہنچو تو تم بھی حافظ، تم بھی قاری، تم تالی، تم سب کو وہ لقب دیں گے یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے، جنتوں میں پہنچ کر ہر جنتی کو القاب دیئے جائیں گے جو اللہ ہی کے نام سے ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنت والوں کو نشاط میں لانے کے لئے حق تعالیٰ خط و کتابت کریں گے ملائکہ خطوط لے کر آئیں گے، جس میں مزاج پرسی حالات کا پوچھنا اور حالات کا بتلانا بھی ہوگا۔ اگر کسی کے پاس وزیرِ اعظم کا خط پہنچ جائے تو اپنی پوزیشن بڑھانے کے لئے اخبارات میں چھاپے گا کہ میرے نام وزیرِ اعظم کا خط آیا ہے، پریذیڈنٹ کا خط آئے تو اخبارات میں چھاپ دے گا تا کہ میری عزت دوبالا ہو کہ پریذیڈنٹ نے مجھے خط لکھا ہے

① پارہ: ۱۴، الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

اگر قدیم زمانے کے شاہی فرامین کسی کے گھر میں ہوں تو وہ آج تک فخراً کہتا پھرتا ہے کہ میرے خاندان میں شاہی فرمان چلا آ رہا ہے، ان کا خط موجود ہے، تو بادشاہوں کے یہ خطوط آئیں تو فخر کا یہ عالم ہے اور اللہ میاں کا خط آئے تو فخر و مباہات کی کیا انتہا ہوگی، اور اس نشاط کی کیا انتہا ہوگی جو اہلِ جنت محسوس کریں گے تو حق تعالیٰ خطوط بھیجیں گے۔ ملائکہ علیہم السلام چٹھی رساں (ڈاکیے) کے طور پر خطوط لے کر آئیں گے۔ ان خطوط کے لفافے کے الفاظ کیا لکھے ہوں گے؟ لکھا ہوا ہوگا کہ: مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے۔ تو عزیز رحیم اللہ کا لقب ہے اور اہل جنت کو دے دیں گے مگر یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھنے والے کو دنیا میں ہی وہ لقب دیدیں گے جو اُن کا اپنا لقب ہے کہ ہم حافظ تو تم بھی حافظ، ہم قاری تو تم بھی قاری، ہم تالی (تلاوت کنندہ) تو تم بھی تالی۔ تو حقیقت میں مجودین خلفائے خداوندی ہیں، ان کو خلافت عطا کی گئی ہے، کسی کو علم کی خلافت ملی، کسی کو اخلاق کی خلافت ملی، انہیں کلامِ خداوندی کی خلافت ملی کہ اللہ متکلم ہیں تو یہ بھی متکلم تو اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوسکتا ہے۔

حافظوں کا عنداللہ مقام...... حدیث میں فرمایا گیا کہ جو شخص اپنے بچے کو قرآن حفظ کرائے گا تو قیامت کے اولین و آخرین کے مجمع میں اس کے باپ کو تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے سارا عالمِ محشر منوّر ہو جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن یاد کرایا اور کلامِ خداوندی کو اس کے سینے میں ڈالا، گویا اس کی تاج پوشی ہوگی۔ ①

دنیا میں کسی بادشاہ کی تاج پوشی ہوتی ہے تو اہل شہر جمع ہو جاتے ہیں، معززین شہر اکٹھے ہو جاتے ہیں بہت سے بہت...... صوبے کے افراد جمع ہو جاتے ہیں اور بہت ہوئے تو ملک کے افراد اور اگر بہت ہی بڑا بادشاہ ہے تو بین الاقوامی طور پر وہ دعوت دے گا کہ تاج پوشی کا اعزاز ہے آپ سب آ جائیں۔

تو دوسرے ممالک کے سربراہ بھی شریک ہوں گے، بڑا جلسہ ہوگا لیکن ایک ہی زمانے میں ہوگا اور قیامت میں وہاں اولین و آخرین، آدم علیہ السلام کی ساری اولاد...... اتنا بڑا جلسہ ہوگا کہ دنیا میں تو ممکن ہی نہیں تو ساری اولادِ آدم ہوگی اور تاج پہنانے والے حق تعالیٰ ہیں جو اس باپ کو تاج پہنائیں گے جس نے اپنے بچے کو حفظ کرایا تھا جس کی روشنی سے پورا عالمِ محشر منور ہوگا گویا بتلایا جائے گا کہ اس نے دنیا میں قرآن کریم کی روشنی پھیلائی تو اب تاج بھی وہ دیا جا رہا ہے، جس کی روشنی پورے عالمِ محشر میں پھیلے گی۔ تو دنیا میں یہ خلفائے خداوندی ہیں اور آخرت میں یہ تاج پوش بادشاہ بنیں گے۔ جس کو حفظ کرا دیا اس سے زیادہ اس کی فضیلت اور اس کی بڑائی اور کیا ہوسکتی ہے!۔

اور حفظ کرنے والے جب کہ ان کی ادا بھی صحیح ہو اور اسی لب و لہجے سے ہو جو عربوں کا لب ولہجہ ہے پڑھیں تو

① السنن لأبی داؤد، کتاب الصلاة، باب ثواب تلاوة القرآن، ج:۴ ص:۲۴۶ رقم:۱۲۴۱۔

اس سے قرآن کریم کا اور زیادہ حسن بڑھ جاتا ہے: فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَةَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا ① تو بہر حال ہمارے قاری صاحب، قاری صاحب نے جن مجودین کو رکھا وہ مجودین، اس کی اعانت کرنے والے، تمام معاونین اور انتظام کرنے والے سارے منتظمین ...... یہ سب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی محنتوں کا نچوڑ آج ان کے سامنے آیا ہے۔ جن بچوں پر ان حضرات نے محنت کی آج وہ قابل بن کر اور مجود بن کر آپ کے سامنے آئے اب وہ تجوید وقرآن کو دنیا میں پھیلائیں گے تو نور پھیلے گا اور روشنی پھیلے گی، یہی ذریعۂ ہدایت بنے گی۔

دین ودنیا کی ترقی کا داعی قرآن کریم ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے: لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا اس امت کے اوّل طبقے کی اصلاح جس چیز سے ہوئی تھی، اسی سے اس امت کے آخری طبقے کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے، اور وہ ہے قرآن۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے کتب خانے میں قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں تھی، اسی نے ان کی اصلاح کی، اسی سے وہ اونچے بھی ہوئے اور بالا بھی۔ آج بھی مسلمان اگر بالا ہونا چاہتے ہیں تو اسی کو پکڑیں! اس کے پکڑنے کو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ''مُلّاں'' بن جائیں گے، ترقی کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ یہ محض ایک مہمل خیال ہے۔ ترقی کا داعی تو قرآن کریم ہی ہے۔ اس نے دین اور دنیا دونوں سکھلائے، اس نے علم وکمال کے ساتھ شوکت دینا، حکومتیں قائم کرنا، نظامِ مملکت چلانا بھی سکھایا، قوت عسکری بھی قائم کی، جابجا احکام ہیں کہ مسلمان عسکری قوت پیدا کریں، مسلمان سپاہی بنیں، مسلمان عالم بنیں اور علم اور معرفت کیساتھ سپاہیانہ زندگی، سیاسی زندگی، شوکت کی زندگی، اقتدار کی زندگی بھی سکھلائی تو یہ غلط خیال ہے کہ قرآن کریم سیکھیں گے تو ترقی سے رہ جائیں گے۔ اصل ترقی تو یہی ہے۔ نیز دیکھا جائے تو اصل حکومت اللہ کی ہے۔ اس لئے اصل حکومت قرآن کی ہے۔ یہ قانونِ فطری ہے، اس کی حکومت ہوگی تو فطرت کے مطابق ہوگی۔ اس کے خلاف ہوگی تو وہ غیر فطری ہوگی اور اس میں نقصانات، فسادات اور ہنگامے پیدا ہوں گے۔ اس لئے جتنا اس کی حکومت کو رائج کیا جائے...... رائج کرنے والے بھی خدا کے ہاں محترم بنیں گے، جو اس قانون کو لائیں گے ان کی عظمت بھی اس دنیا میں بڑھ جائے گی اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے تو قرآن کریم تنزل نہیں سکھلاتا، پستی نہیں سکھلاتا بلکہ ترفّع سکھاتا ہے اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔

جب تک یہ (قرآنی) ہوا قلوب میں بھری رہی مسلمان بلند وبالا رہے۔ جب یہ نکل گئی مسلمان پست ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی مثال ہے جیسے گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے۔ تو اگر آپ اسے زمین پر دے کر ماریں تو دس گنا اوپر کو اچھلے گی، اوپر کو جائے گی، نیچے نہیں رہے گی، اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے، وہ نیچے نہیں ٹکنے دے گی اور اگر سوئی گھسا کے ہوا نکال دو تو جہاں ڈال دو گے پھس سے پڑی رہ جائے گی، پھر اس میں اٹھنے کی سکت نہیں۔

① شعب الایمان للبیھقی، التاسع عشر من شعب الایمان، فصل فی تحسین الصوت بالقرآن ج: ۵ ص: ۱۵۷ رقم: ۲۰۷۴.

تو قرآن کریم نے جو ہوا اور شوکت بھری تھی جب تک بھری رہی......اقوام نے انکو دبانا چاہا، زمین پر پٹخنا چاہا، جتنا پٹختے گئے، مسلمان اتنا ہی اوپر کو اُٹھے۔ نہ صرف خود اٹھے بلکہ دنیا کو بلند کر دیا۔لیکن جب ہوا نکال دی، کسی نے سوئی ماردی وہیں پھنس سے ہو کے رہ گئے۔تو مسلمان دنیا کی اصلاح کے لئے آیا ہے اور اصلاح جبھی کرے گا جب اصلاحیت ان کے اندر رچی ہوئی ہو۔ یہ بھک بھکا بن کر نہیں آیا کہ دنیا کی اقوام سے بھیک مانگے کہ ہمیں تمدّن کی بھیک دے دو، معاشرت اور رہن سہن کی بھیک دے دو۔ یہ تو دنیا کو سچا رہن سہن سکھلانے کے لئے آیا ہے۔تو مسلمان سائل نہیں بلکہ مُعطی ہے۔اگر یہ دنیا سے تمدّن و معاشرت کی بھیک مانگے تو یہ اپنی توہین کرتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اس معاشرت کو جو فطری ہے اور اس سیاست کو جو فطری ہے دنیا کے اوپر لاگو کرے، دنیا کو اس کی طرف لائے رکھے۔ مسلمان یوں کہیں کہ ہم اسلام کو چلانا چاہتے ہیں اور اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت کو چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ مبارک باد کے بھی مستحق ہیں اور سب کا فرض ہے کہ ان کا احترام کریں، اس لئے کہ اصل احترام اللہ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، اس سے جو تمسّک کرے گا (اس کا ساتھ لے گا) وہ بھی قابل احترام بن جائے گا۔

اختتام......! بہرحال اس مدرسہ نے بحمد اللہ اس بیس پچیس سال کے اندر جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ثمرہ ہے کہ آج اتنے لوگ جمع ہیں اور قرآن کریم کے پروانے بنے ہوئے ہیں اور اس کے نمونے سامنے آرہے ہیں۔تو حق تعالیٰ بانی کو بھی اور منتظمین کو بھی اور معاونین کو بھی جزائے خیر نصیب فرمائے! تو میں ان بچوں کے لئے مبارک باد پیش کرنے بیٹھا تھا......یہ میرے اور آپ کے بچے ہیں۔ان الفاظ سے میری مبارکباد پیش ہے۔حق تعالیٰ اس مدرسہ کو قائم ودائم رکھے اور پاکستان نیز باہر کے لوگوں کو اس سے منوّر فرمائے آمین! ان الفاظ پر میں ختم کرتا ہوں۔

ایک درخواست آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں، اُمید ہے کہ قبول کی جائے گی بیان ہوا......بہرحال آپ نے توجہ سے سنا اور میں معمولی طالب علم کہہ ہی کیا سکتا تھا! جو طالب علمانہ باتیں آئیں آپ نے بہرحال سنیں اب اخیر میں درخواست یہ ہے کہ اس عرض معروض سے بہرحال آپ کے اور ہمارے قلوب مل گئے ہیں، ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں، قلوب مل گئے ہیں اس لئے مصافحہ کی تکلیف نہ فرماویں۔ میں اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا تحمل نہیں کر پاتا، اس لئے کہ آپ ایک ایک دفعہ ہاتھ ملائیں گے تو مجھے بیس ہزار دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا۔میرے اندر اتنی طاقت نہیں، اس واسطے مصافحے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں، بس دعائے خیر سے یاد رکھیں، یہ ہمارے لئے کافی ہے۔اب جلسہ کی بقیہ کاروائی ان شاء اللہ پوری ہوگی۔

''وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

جہلائے عرب سے مقام صحابیت تک

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَنَدَنَـا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ، یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ، وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥﴾صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (1)

مقصد بعثتِ انبیاء علیہم السلام...... بزرگانِ محترم! دنیا کی اقوام جب مشکلات اور پریشانی میں مبتلا ہوتی ہیں اور ایسی مصیبتیں انہیں گھیر لیتی ہیں، کہ نہ جانے کا راستہ باقی رہتا ہے نہ ٹھہرنے کا، دلوں میں بھی امن باقی نہیں رہتا اور دلوں کا سکھ اور چین اٹھ جاتا ہے رات دن پریشانی اور آفات کا سامنا رہتا ہے، اس سے عیش میں بھی خلل اور زندگی کے اندر سکون بھی ندارد...... جب ایسے حالات میں اقوام مبتلا ہوئی ہیں، تبھی اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے، انہوں نے آ کر اقوام کو مشکلات سے نجات دلائی۔ دنیا میں انبیاءؑ کا آنا محض اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ مسجدوں میں نماز پڑھوادیں، یا سفرِ حج پڑھادیں یا اور عبادات ادا کروادیں، یہ مقصودِ اصلی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیوی مشکلات اور مصائب کا خاتمہ کرنا، انسانوں میں امن وسکون پیدا کرنا، حقوق کی ادائیگی کرانا...... یہ سب انبیاء علیہم السلام کے فرائض میں سے ہے، جہاں وہ آخرت کی مشکلات سے نجات دلاتے ہیں وہیں دنیا کی مشکلات سے بھی نجات دلاتے ہیں اور اقوام نجات پاتی ہیں، جو ان کے نقشِ قدم پر چل پڑا اس نے نجات پالی، جو نہ چلا وہ مشکلات میں گھر گیا اس نے دنیا وآخرت دونوں کھودی۔

بنی اسرائیل کی ذلت...... بہر حال انبیاء علیہم السلام کا آنا دنیا اور آخرت دونوں کیلئے ہوتا ہے، فقط آخرت کیلئے نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل جب فرعون کی ڈالی ہوئی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی اور اس

(1) پارہ:۱۸، سورۃ النور، الآیۃ:۵۵.

درجہ اس نے بنی اسرائیل کو پریشان کر دیا کہ بالکل اچھوت بنا کے چھوڑا، نہ دنیوی عزت رہی نہ دینی، ذلیل ذلیل خدمات پر انکو مامور کیا جاتا تھا۔ وہ قوم جو انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھی وہ پس ماندہ قوم بن گئی جن کے بارے میں فرمایا گیا تھا: ﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① دنیا جہانوں پر ہم نے ان کو برگزیدہ بنایا، وہ قوم اس درجہ مبتلائے مشکلات اور پریشان حال ہوئی کہ نہ اس کا دنیوی چین باقی رہا نہ آخرت اسکے سامنے رہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو خدا کے راستہ پر ڈالا اور ہدایت کی، پھر ایک وقت آیا کہ فرعون کے مصائب سے نجات ہوئی، فرعون خود غرق ہوا، بنی اسرائیل برسر اقتدار آئے اور دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی۔

پھر بنی اسرائیل پر ایک دور آیا جس میں یہ قوم پھر مبتلائے مصائب ہوئی۔ یہ حضرت دانیال علیہ السلام کا زمانہ تھا انہوں نے نصیحت کی، راہ حق بتلائی اور فرمایا اگر تم راہ حق پر نہیں چلو گے پھر مشکلات میں مبتلا ہو گے، انجام بخیر نہیں ہوگا۔ قوم نے تسلیم نہیں کیا، رات دن کا عیش و تعیش اور رات دن کی عیاشی میں مبتلا رہے۔ دانیال علیہ السلام نے نصیحت کی، راہ حق دکھلائی، قوم نے نہیں مانا تو بختِ نصر ان پر مسلط ہوا اور اس نے پوری قوم کو تاخت و تاراج کیا، پوری قوم کو تباہ و برباد کیا، ستر ہزار کے قریب بنی اسرائیل قتل ہوئے اور ستر ہزار کے قریب بنی اسرائیل کو مشکیں باندھ کر غلام بنا کر لے گیا، بیت المقدس کو بھی تباہ و برباد کیا۔ اس طرح ایک بڑی عظیم الشان قوم اپنی بدعملی کی وجہ سے دنیا ہی میں تباہ و برباد ہو گئی، آخرت کی خبر تو خدا جانے، بخت نصر گرفتار کر کے ساتھ لے گیا۔ حضرت دانیال علیہ السلام بھی گرفتار ہوئے، جب قوم کی مشکیں کسی گئیں تو حضرت دانیال علیہ السلام جو پیغمبر تھے انکی بھی مشکیں کسی گئیں ان کو بھی قید کیا گیا۔ دانیال علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اسی دن سے تمہیں ڈراتا تھا..... تم بھی مبتلا ہوئے مجھے بھی مبتلا کیا۔ قوم نے اس وقت ندامت کا اظہار کیا اور کہا کہ بے شک ہم سے غلطی ہوئی، اب آپ ہمارے لئے دعا فرمادیں! انبیاء علیہم السلام کی شفقت تو بے پایاں ہوتی ہے باوجودیکہ قوم کی وجہ سے وہ خود بھی مشکلات میں مبتلا ہوئے مگر پھر بھی تسلی دی اور فرمایا کہ تم اللہ کے راستہ پر آجاؤ تمہیں نجات مل جائے گی۔

بالآخر قوم جیل خانوں میں ڈالدی گئی بختِ نصر کا یہ واقعہ لانبا ہے وہ مجھے سنانا نہیں ہے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ دانیال علیہ السلام بھی جیل خانے میں ڈالے گئے؛ اگرچہ ان کی بزرگی، تقدس اور خداترسی کو دیکھ کر جیل کے حکام بھی متاثر ہوئے، جیلر بھی معتقد ہو گئے، ہزاروں قیدیوں کی جیل کے اندر اصلاح ہو گئی۔ بالآخر چند سال گزرنے کے بعد وقت آیا کہ بنی اسرائیل کا اقتدار پھر لوٹا، بیت المقدس میں بھی دوبارہ ان کی حکومت قائم ہوئی، پھر وہ دوبارہ برگزیدہ قوم بن گئی۔ غرض ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصائب و مشکلات سے چھڑوایا، دوسری دفعہ حضرت دانیال علیہ السلام نے چھڑوایا اور مصائب و مشکلات سے نجات دلائی۔

دور جاہلیت کا اجمالی خاکہ..... یہی صورت آخر میں آ کر عرب کے لوگوں کی ہوئی۔ اسلام سے قبل ہر قسم کی

① پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۱۶۔

مصیبتوں میں یہ قوم مبتلا تھی۔ جہالت کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز کو جانتے تھے، مگر خدا کو نہ جانتے تھے، ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، مگر خدا کی عبادت سے محروم تھے، خانہ کعبہ کے اردگرد مطاف میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے، طواف کرتے جاتے تھے اور تین سو ساٹھ بُتوں کی پوجا کرتے جاتے تھے۔ دو بڑے بڑے بُت خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے تھے اندر جاتے تھے تو ان دو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ مسجد بیت الحرام سے باہر نکلتے تھے تو ہر شخص کے گھر میں ایک ایک بُت رکھا ہوا تھا، اسکی پوجا کرتے تھے، گھر سے سفر میں جاتے تھے تو بت کو جیب میں ڈال کر لیجاتے تھے کہ ممکن ہے خدا راستے میں نہ ملے پوجا کس کی کریں گے تو اسے جیب میں ڈال کر لیجاتے تھے، وہاں اس کی پوجا کرتے اور اگر کسی جگہ بیٹھ گئے اور کوئی زیادہ خوشنما پتھر نظر آ گیا تو پہلے کو جیب میں سے پھینک دیا اور دوسرے کو سامنے رکھ کر اسکی عبادت شروع کر دی۔ غرض ہر خاندان کے ہر فرد کا خدا اجُدا اجُدا تھا اور سفر کا الگ، حضر کا الگ تھا، پوجنے والے تعداد میں اتنے نہ تھے جتنی خداؤں کی تعداد تھی، پوجنے والے تو چند لاکھ تھے جبکہ خدا کروڑوں بنا رکھے تھے۔ ان کی یہ حالت تو جہالت کی تھی، بداخلاقی کا یہ عالم تھا کہ زنا کاری، ڈکیتی رات دن کا مشغلہ تھا۔ مختلف قسم کے نکاح تجویز کر رکھے تھے، ہوسنا کی کے بہت سے طریقے تجویز کر رکھے تھے، نام ان کا نکاح تھا۔ اگر کسی عورت کا خاوند بدصورت ہوتا تو قانوناً اسے اجازت تھی کہ وہ کسی حسین و جمیل مرد کے پاس چلی جائے۔ اگر اس سے اولاد ہو گئی تو اُسی کالے بدصورت ہی کی اولاد ہو گی کسی دوسرے کی اولاد نہیں ہو گی، ایک عورت بے محابا گورے آدمی کے پاس چلی جاتی تھی کہ میرا خاوند کالا اور بدصورت ہے۔ زنا کاری الگ تھی اور نکاح کے نام سے الگ زنا کاری ہوتی تھی، شراب انکی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور پیدا ہوتے ہی بچے کے حلق میں ٹپکائی جاتی تھی، ڈکیتی، زنا کاری اور شراب کاری بھی تھی۔ پھر لڑائی جھگڑے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناچاقی ہو جاتی تھی، پھر اسمیں قومی اور خاندانی عصبیت نے اثر کیا، اگر دو خاندانوں میں جنگ چھڑ گئی تو مرنے والے نصیحت اور وصیت کر کے جاتے تھے کہ لڑائی بندمت کرنا...... کبھی خاندان کی ناک کٹ جائے۔ ایک ایک لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس چلتی تھی۔ بے دردی اور قساوتِ قلبی کا یہ عالم تھا کہ سب سے زیادہ محبوب اولاد ہوتی ہے، لیکن ان کے ہاں یہ صورت ہوتی تھی کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو باپ اپنے ہاتھ سے اسے زمین میں زندہ دفن کر دیتا تھا، اسے عار آتا تھا کہ میرا کوئی داماد کہلائے، میرے گھر میں کوئی دوسرا آدمی آئے، بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اگر چار بیٹے ہیں اور رزق کی تنگی ہے تو باپ دو جوان جوان بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا کہ میرے پاس چار آدمیوں کے کھلانے کو نہیں ہے دو کو روٹی دے سکتا ہوں۔ تو قساوتِ قلبی کا یہ عالم تھا جس کو قرآن کریم نے فرمایا کہ ﴿وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ﴾ ① اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے مت قتل کرو، رزّاق تو ہم کرتے ہیں تم کہاں سے دنیا کے رزّاق بنے ہو؟ رزق کی ذمہ داری تو ہم پر ہے۔ تو بے رحمی کا یہ عالم تھا کہ جو اپنی اولاد کو ذبح کرتے تھے دوسرے

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۱.

خاندان والوں پر وہ کیا رحم کر سکتے تھے؟ اور دوسرے ملک کے مسافروں پر تو وہ کیا ہی رحم کر سکتے ؟ تو ڈکیتی، مار دھاڑ، قتل وغارت اور بدامنی پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، نہ ان کا کوئی نظام تھا، نہ ان کا کوئی بادشاہ اور امیر مقرر تھا، دنیا کی قومیں ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں، کوئی کہتا تھا: اونٹوں کے چرانے والے، کوئی کہتا تھا: مینگنی میں کھیلنے والے، کوئی کہتا تھا: گندگیوں میں بسر کرنے والے، یہ اس قوم کے القاب تھے۔ تو عرب کی قوم دنیا کی متمدن قوموں میں سب سے زیادہ ذلیل قوم سمجھی جاتی تھی۔ ان کے اندرونی اخلاق بھی بُرے، اعمال بھی بُرے، توحید بھی ندارد، شرک میں مبتلا، غیر منظم، رات دن کے مصائب میں بھی مبتلا، دنیا کی قومیں ان پر چھاپہ مارتی رہیں، کبھی رومیوں نے چھاپہ مارا تو کبھی فارسیوں نے، ہر ایک کی غلامی انہیں قبول کرنی پڑتی تھی اور وہ جھکنے پر مجبور تھے۔ تو گویا حقیقی معنی میں نہ دن میں چین تھا، نہ رات میں، دلوں کے اندر بھی کوئی سکھ اور آرام نہیں تھا، ایک بدیشی قوم تھی اور یہ مجموعی کیفیت تھی۔ تو دنیا کے اعتبار سے بھی مشکلات میں مبتلا اور آخرت کے اعتبار سے بھی کھوئی ہوئی قوم تھی۔

مقصدِ بعثتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)...... اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی، ان ظلمتوں میں فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اس کی لمبی لمبی کرنیں پڑیں، حجاز پر ہی نہیں بلکہ حجاز کے پورے ماحول اور دنیا کے سارے ممالک پر پڑیں۔ آپ نے تشریف لا کر پروگرام بتلایا کہ یہ قوم مشکلات سے کیسے نکلے! آپ نے اپنی بعثت کی غرض وغایت کیا ظاہر فرمائی؟ دو باتیں جو دو حدیثوں میں بتائی گئی ہیں ظاہر فرمائیں، فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ① میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ تمہیں تعلیم دوں اور علم سکھاؤں، تمہاری جہالت دور کروں۔ دوسری حدیث میں یہ فرمایا کہ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ② میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ تمہارے اخلاق کو پاکیزہ بناؤں، تمہارے سامنے پاک اخلاق کا نمونہ پیش کروں اور اعلیٰ ترین اخلاق پر تمہیں لا کر کامل مکمل قوم بناؤں۔ گویا دو اغراض ظاہر فرمائیں انہی دو چیزوں کے اندر قوم کا علاج پوشیدہ تھا ساری مشکلات اور مصائب کا ذریعہ دو چیزیں بنی ہوئی تھیں: ایک قوم کی جہالت دوسرے قوم کی بداخلاقی، یعنی ان میں علمی قوت فنا ہوگئی تھی، تعلیم ندارد کے طور پر تھی، عملی قوت بھی فنا ہوگئی تھی کیونکہ اخلاق ندارد تھے۔

عرب کی پس ماندہ قوم کو عروج کیسے ملا؟...... جب دنیا کی کوئی قوم برباد ہوتی ہے تو انہی دو قوتوں کی بنا پر تباہ ہوتی ہے کہ علم نکل کر اسمیں جہالت آجائے اور پاکیزہ اخلاق نکل کر اسمیں بداخلاقی پیدا ہو جائے۔ جب یہ دو عنصر جہل اور ظلم کسی قوم میں آئیں گے، تو وہ قوم کبھی پنپ نہیں سکتی۔ اور جب کسی قوم میں علم اور عدل آئے گا تو وہ قوم کبھی پست نہیں رہ سکتی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض وغایت یہ دو چیزیں ظاہر فرمائیں

① السنن لابن ماجة، کتاب السنة، باب فضل العلماء ...... ص: ۱۹۱ ۲۴۹ رقم: ۲۲۹.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها. ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸.

کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں بھیجا گیا ہوں تا کہ اخلاق کے اعلیٰ ترین نمونے تمہارے سامنے رکھوں اور تمہیں ایک اخلاقی قوم بنادوں۔ اسی واسطے قرآن کریم کی جو سب سے پہلی آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ یہ تھی: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ ① آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں عبادت میں مشغول تھے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ اِقْرَاْ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ میں تو پڑھا ہوا نہیں کہ کچھ پڑھ سکوں۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنے سینے سے چمٹایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اور اتنے زور سے دبایا کہ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَھْدُ میرے اوپر مشقت گزرنے لگی، یوں معلوم ہوا جیسے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی، اس طرح سے مجھے دبایا اور پھر فرمایا اِقْرَاْ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں کس طرح پڑھوں؟ پھر دوبارہ انہوں نے سینے سے لگ کر دبایا پھر میرے اوپر مشقت گزری یوں معلوم ہوا جیسے پسلیاں ٹوٹ جائیں گی، اس کے بعد الگ کر کے فرمایا اِقْرَاْ، تین دفعہ اِقْرَاْ فرمایا اور آپ نے تین دفعہ ہی فرمایا: مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن تیسری دفعہ دبانے کے بعد اِقْرَاْ کہا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ گویا سب سے پہلا اسلام کا حکم یہ تھا کہ پڑھو پڑھنے لکھنے کا حکم تھا اور اس کے بعد فرمایا کہ ﴿اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○﴾ اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے قلم سے تعلیم دی ہے ② یہ لکھنا تھا، تو پڑھنا اور لکھنا دو چیزوں کا حکم کیا گیا یہ دونوں بنیادیں ہیں قوموں کی ترقی کے لئے۔

مگر کونسا علم پڑھو ایک تو دنیوی علوم ہیں جن سے آدمی روٹی پکانا، مکان بنانا، کرسیاں بنانا، بہتر سامان بنانا سیکھ جائے، معاشرتی چیزیں ہیں، علم اس کا نام نہیں، اس کا نام تجربات، صنعت وحرفت اور دستکاری ہے۔ انبیاء علیہم السلام دستکاری یا صنعت وحرفت سکھلانے کے لئے نہیں آتے۔ یہ تو انسان کی طبعی صفت ہے دنیا میں کوئی نبی نہ آئے تب بھی انسان مکان بنا سکتا ہے روٹی پکا سکتا ہے کپڑا بنا سکتا ہے پہن سکتا ہے تو نبوت کا مقصد معاشرتی چیزوں کی تدابیر سکھلانا نہیں ہے، یہ تو انسان کی طبیعت ہے خود بخود کرتا ہے اور جتنا کرتا ہے بڑھتا چلا جاتا ہے بہتر سے بہتر چیز بننے لگتی ہے، خوشنما نمونے اور ڈیزائن اپنے تجربے اور طبیعت سے پیدا کرتا رہتا ہے اس کا نام علم نہیں اس کا نام صنعت وحرفت، دستکاری اور صناعی ہے اس کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے، اس کے ضروری ہونے سے انکار نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱-۵. ② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص: ۱ رقم: ۳.

علوم طبعیہ کمالِ انسان نہیں ......لیکن یہ چیزیں انسان کے طبعی علوم ہیں اور طبعیاتی علوم انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، ہر جاندار میں ہیں دنیا کا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو اپنے رہن سہن کا ڈھنگ نہ جانتا ہو۔ایک چڑیا گھونسلہ بناتی ہے اس کا وہی مکان ہے، ایک درندہ بھٹ بنا کے رہے گا اس کا وہی مکان ہے ۔تو پرندے چرندے اور درندے سب ہی رہتے ہیں (تو اپنے لئے موزوں مکان ہر جاندار بنا ہی لیتا ہے) کھانا ہے ظاہر بات ہے کہ سب جانوروں میں مشترک ہے، ہر ایک نے اپنی اپنی غذا کو پہچان رکھا ہے، اپنی اپنی غذا استعمال کرتے ہیں اور اس کے لئے کمانے کو بھی جاتے ہیں۔ چڑیا اپنے گھونسلے سے نکل کر کھیتوں میں جاتی ہے، دانہ چگتی ہے اس کے دل میں اللہ کی طرف سے الہام ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے کچھ نہیں ملے گا، محنت کرنی پڑے گی تب چار دانے ہاتھ آئیں گے۔شیر اپنے بھٹ سے نکلتا ہے اپنی غذا تلاش کرتا ہے اور خون پیتا ہے اس کے دل میں یہی الہام ہوتا ہے کہ تیری غذا بکری میں ہے یا ہرن میں ہے۔تو کوئی جانور خون پیتا ہے، کوئی جانور گوشت کھاتا ہے کوئی دانہ چگتا ہے، ہر جانور کے دل میں اللہ نے ایک الہام ڈالا ہے اور اس کی طبیعت کے مناسب غذا مہیا کی ہے وہ جاتا ہے محنت کرتا ہے کھاتا ہے۔

اگر انسان بھی محنت کرے کھائے پیئے تو زیادہ سے زیادہ اس نے حیوانیت کا حق ادا کر دیا۔اگر اسی کا نام علم ہے تو پرندے بھی عالم، درندے چرندے بھی علماء، سب کے سب ان چیزوں کو جانتے ہیں، سب کے سب عالم ہوتے تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو علم کہا جائے اور انسان یوں کہے کہ میں اشرف المخلوقات ہوں اور میں عالم ہوں اور میرا علم یہ ہے۔یہ علم تو جانوروں کے پاس بھی ہے، شہد کی مکھی کتنا عمدہ مکان بناتی ہے، ہر پہلو سوراخ بناتی ہے۔ آپ پرکار سے بھی مشکل سے بنا سکیں گے وہ اپنے منہ سے بے تکلف بناتی ہے کہ ہر ہر سوراخ برابر ہے۔

پھر اس میں تنظیم کیسی ہے کہ بعض خانوں میں شہد بھرا ہوا ہے، یہ گویا قوم کی غذا ہے، بعض میں بچے پرورش پا رہے ہیں، بعض میں ماں باپ رہتے ہیں۔ان کا ایک امیر مقرر ہے جس کا نام یعسوب ہے، ساری مکھیاں اس کی اطاعت کرتی ہیں جہاں وہ بیٹھتا ہے وہیں بیٹھتی ہیں اور شہد کا چھتہ لگاتی ہیں غرض ان کے اندر سیاست اور تنظیم بھی ہے اور امیر کا انتخاب و تقرر بھی ہے، امیر کی اطاعت اور تقسیمِ عمل بھی ہے کہ اتنے حصے میں غذا، اتنے حصے میں قوم اور اولاد، اتنے حصہ میں ماں باپ رہیں گے۔تو اگر آپ نے ملت کی تنظیم ہی کر لی ہے، اچھا گھر بنا لیا اور نظامِ عمل سے کھانے پینے کے تمام معاملات درست کر لئے تب بھی زیادہ سے زیادہ وہ کام کر سکے جو شہد کی مکھی بھی کر لیتی ہے۔ اس کا نام نہ علم ہے نہ کمال ہے یہ تو ایک تجرباتی اور طبعی چیز ہے جو ہر انسان اور حیوان کرتا ہے تو حاصل یہ ہے کہ طبعیاتی علوم اپنے اپنے درجہ کے مطابق حیوانات میں بھی موجود ہیں اگر انسان میں بھی آجائیں تو یہ ایسے بڑے کمال کی بات نہیں کہ انسان اپنے کو اشرف المخلوقات کہے۔

حیوانات میں دفعیہ امراض کا شعور ...... آپ کہیں گے ہم بیمار ہوتے ہیں ہمارے پاس علمِ طب ہے، ہم مطب کرتے ہیں، دوائیں تجویز کر کے علاج کرتے ہیں (یہ صرف انسان ہی کر سکتے ہیں ہر جاندار تو ایسا نہیں کر سکتا

اس لئے انسان اشرف المخلوقات ہوا) میں کہتا ہوں کہ حیوانات میں بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق علم طب موجود ہے، اگر چہ حیوان ہے مگر بیمار ہوتا ہے اور دفعیہ کرتا ہے۔

بندروں کی چالاکی کا واقعہ...... مجھے یاد آیا کہ میں راجپوتانے گیا میرے بعض عزیز وہاں ملازم تھے ہندوؤں کی ریاست تھی۔ بندر چونکہ ان کے ہاں مقدس جانور سمجھا جاتا ہے اس لئے اس کو مارنے کی ممانعت تھی۔ جانور یہ ایسا ہے کہ نقصان بہت زیادہ کرتا ہے، ہمارا مکان ذرا کھلا رہ جاتا تو کہیں کپڑا لے گیا کہیں برتن لے گیا۔ اور کمبخت یہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسمیں یہ نہیں ہے کہ کپڑا لے جا کے پھینک دے بلکہ مُنڈیر پر سامنے بیٹھ کر دکھا دکھا کے پھاڑے گا جیسے کسی کو چڑا رہا ہو، ایذاء رسانی بھی اس کے اندر عجیب ہے کہ طبیعت میں کوفت ہوتی تھی، جلن بھی پیدا ہوتی تھی مگر مارنے کی ممانعت تھی۔ چھپ چھپ کر ہم نے دس بیس بندر مار بھی دیئے، مگر وہ تو ہزاروں کا کنبہ تھا پہاڑی مقامات ہیں، ہزاروں بندر تھے تو ہم نے یہ ارادہ کیا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ سو پچاس بندر یکدم مریں تاکہ ان کو کچھ تو عبرت ہو اور ہمارے نقصان میں کچھ کمی کریں۔ ہم نے کچھ پیسوں کا زہر سنکھیاں خریدا اور آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور ایک ٹوکرا بھر کے چھت کے اوپر روٹیوں کا پھیلا دیا اور خیال یہ تھا کہ بندر آتے ہی وہ روٹیاں کھانا شروع کریں گے اور زہر چڑھے گا تو مرتے جائیں گے اور ہم بہت خوش ہوں گے کہ ہم نے انتقام لے لیا۔

مگر بڑا چالاک بہت ہی سیانا جانور ہے کچھ بندر آئے انہوں نے دیکھا کہ چھت کے اوپر روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں تو انہیں حیرت ہوئی کہ روٹیاں بکھری تو رہتی نہیں اس کے اندر کوئی بات ہے اور بجائے اس کے کہ وہ روٹیوں پر ٹوٹ پڑتے انہیں کھاتے...... وہ اُسے دیکھتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر روٹیوں کو دیکھتے ہیں گویا زبانِ حال سے یہ سوال تھا کہ یہ بات کیا ہے؟ روٹیاں پھیلی ہوئی کیوں پڑی ہیں؟ یہ عادت کے خلاف ہے دو چار منٹ کے بعد تین چار بندر چلے گئے ہم سمجھے کہ ہماری تدبیر فیل ہوگئی انہوں نے جا کر اپنے قبیلے اور خاندان میں کوئی اطلاع کی ہوگی تو دس بیس بندر بہت موٹے موٹے آئے اور آ کر بیٹھ گئے انہوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا روٹی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا وہ اُسے دیکھتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے ہم سمجھ گئے کہ ہماری تدبیر دھری رہ گئی۔ یہ کمبخت کچھ سمجھ گئے کہ ان روٹیوں میں کچھ ہے اس کے تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ سو ڈیڑھ سو کے قریب بندروں کی ایک قطار...... اسمیں بڑے موٹے موٹے بندر جیسے قوم کے چوہدری ہوتے ہیں وہ جمع ہوئے اور روٹیوں کے اردگرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے، گویا گول میز کانفرس منعقد ہوئی کہ اسمیں غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پڑی ہیں، اس میں بھید کیا ہے؟ یہ عادت کے خلاف ہے، ایک آگے بڑھا اس نے روٹی کو توڑا اور سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا اس نے بھی روٹی کو توڑا اور سونگھا چار پانچ نے اسی طرح کیا انہوں نے اشاروں میں کچھ کہا ہوگا تو وہ سمجھ گئے اور دوسرے سب بھی وہاں سے بھاگ گئے۔ اب ہمیں یقین ہوگیا کہ ہماری تدبیر فیل ہوگئی اور یہ سمجھ گئے ہیں تو ارادہ کیا کہ روٹیاں وہاں سے اٹھوالیں، وہ روٹیاں کسی کام کی بھی نہیں تھیں، ان میں تو زہر ملا ہوا تھا سوائے اس کے

کہ انہیں دفن کیا جاتا اس کے علاوہ وہ نہ کھانے کی نہ کھلانے کی تھی۔

اس کے بعد کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے تو دواڑھائی سو بندروں کی قطار دوڑی ہوئی چلی آرہی ہے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ہرے ہرے پتوں کی ایک ایک ٹہنی ہے، آئے آکر انہوں نے روٹیوں کے اردگرد بیٹھ کر روٹیوں کے ٹکڑے کیے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کیے جتنی بندروں کی تعداد تھی۔ روٹیاں پچاس تھیں بندر دوسو کے قریب تھے تو اتنے ٹکڑے کر دیئے کہ ہر ایک بندر کو ایک ٹکڑا آسکے۔ ''بندر بانٹ'' عرف میں مشہور ہے۔ سب نے مل کر ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے وہ پتے چبالئے اور دندناتے ہوتے چلے گئے، نہ کمبخت کوئی گرا، نہ مرا اور نہ بے ہوش ہوا۔

تو جنس کے اعتبار سے اگر آپ اطباء ہیں تو ان میں بھی اطباء ہیں، آپ جڑی بوٹی جاننے والے ہیں تو وہ بھی جاننے والے ہیں تو طبیب ہونا یا علم طب حاصل کرنا یہ بدن کی اصلاح کا علم ہے بدنی اصلاح جانور بھی کرتے ہیں یہ تو کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کہا جائے۔

ایک شبہ کا جواب...... اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! ہم تو بہت اعلیٰ اعلیٰ نہایت بہترین کپڑے پہنتے ہیں پچاس پچاس روپے گز کے، باریک میں باریک کپڑا اور موٹے میں موٹا کپڑا...... تو میں کہتا ہوں کہ خدا نے جانوروں کے بدن پر ایسی کھالیں پیدا کر دی ہیں، شیر کو دیکھو وہ زرد رنگ کے بوٹوں کا کمبل اوڑھے ہوئے ہے، میلا بھی نہیں ہوتا، آپ کا کپڑا تو ہر دوسرے ہفتے میلا ہوگا، دھلنے جائے گا اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں تو پھر آپکے کپڑوں میں کیا کمال باقی رہ گیا! یہ بھی دیکھئے مکڑی جال بناتی ہے گویا سفید سا ایک خیمہ تانتی ہے، پھر اسمیں بیٹھتی ہے وہ اتنا چکنا ہوتا ہے کہ آپ کے مانچسٹر کی ململ اتنی صاف اور چکنی نہیں ہوتی جتنا اس کا خیمہ صاف ہوتا ہے۔ بُنتی کہاں سے ہے؟ کوئی مشین اس کے پاس نہیں ہے، محض اپنے منہ اور ہاتھ سے بُنتی ہے اور اتنا صاف بُنتی ہے کہ آپ اس سے بہتر بناوٹ نہیں کر سکتے اور خیمہ بنا کر اس میں رہتی ہے۔ تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہو گیا کہ ہم کپڑا بُننے والے ہیں، ہمارے پاس بہترین مشینیں ہیں، وہ بلا مشین کے بہترین بُن کر خیمہ لگا لیتی ہے۔ تو کوئی چیز طبعیاتی امور میں ایسی نہیں ہے جو جانوروں کے اندر نہ ہو۔ تو میرا مطلب یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام یہ علوم لیکر نہیں آئے، یہ علوم تو طبعیاتی ہیں، رہن سہن کھانے پینے، پہننے وغیرہ کے جتنے بھی علوم ہیں یہ اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر حیوان میں موجود ہیں، یہ انسان کی خصوصیت نہیں کہ وہ ان پر فخر کر سکے۔

باعث فخر علم کونسا ہے؟...... پھر آخر خصوصیت کیا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کاہے کیلئے آتے ہیں؟ خیمہ بنانا بتلانا یا تعمیریں سکھلانا یہ ان کا کام نہیں ہے، ان کا کام روحوں کی اصلاح کرنا، مخلوق کو سچے راستہ پر ڈالنا اور بچھڑے ہوئے بندوں کو خدا سے ملانا ہے تاکہ علم آنے لگے اور ان کے اندر اخلاق ربانی پیدا ہوں، صحیح معنی میں انسانیت آئے۔ تو انبیاء علیہم السلام آدمی بنانے کیلئے آتے ہیں، اس کے لئے اس علم کی ضرورت ہے جس سے روح اور قلب درست ہو۔ جس سے بدن سنور جائے وہ علم تو حیوانات میں بھی ہے، اسمیں انبیاءؑ کی ضرورت نہیں ہے، انبیاء کے علم کا

موضوع وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، جس سے انسان کی روح میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اللہ کی ذات وصفات کا علم، اس کے احکام کا علم، اس کی شریعتوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا علم ہے جس سے آدمی آدمی بنتا ہے۔ یہی علم ہے جو انبیاء علیہم السلام لیکر آتے ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝﴾ ① کہ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ یہ قرآن پاک کی پہلی آیت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرو جس میں رب کا نام پہلے آئے، رب کا تعارف ہو اگر آپ نے پہاڑوں کا، زمینوں کا، درختوں کا اور جانوروں کا تعارف حاصل کرلیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، تعارف تو اپنے خدا کا کرنا چاہیے کہ خدا کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں، اس کی شانیں کیسی ہیں، اس کے احکام کیسے ہیں، اس کا دیا ہوا قانون کیسا ہے، یہ چیزیں جانوروں کو نہیں انسانوں کو دی گئی ہیں، اسی علم کی بناء پر اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور اپنا نائب بنایا ہے کہ وہ میرا علم لے کر آرہا ہے محض علم نہیں بلکہ وہ علم عقلوں سے بھی بالاتر ہے اور عقلیں بھی اسی سے درست ہوتی ہیں، یہ علم دے کر انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ تو نبی آکر انسان کو انسان بناتے ہیں ان میں علم اور اخلاق پیدا کر کے انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

عرب قوم پر علوم ربانی کا اثر...... عرب کے لوگوں میں جتنی بداخلاقی اور جہالت پھیلی ہوئی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطاب کے بعد جب قوم نے آپ کی بات پر لبیک کہا اور علم حاصل کرنا شروع کیا، قرآن کریم نور بن کر ان کے دلوں میں سما گیا اور انکے اخلاق کو اونچا بنادیا اس وقت جوان کی حالت پلٹی ہے تو تیرہ برس کے اندر وہ کیفیت ہوئی کہ انہوں نے بڑے بڑے سلاطین کے تخت الٹ دیئے، دنیا میں انقلاب بپا کردیئے، حکومتیں تہہ وبالا ہوگئیں ان کا عروج واقتدار پوری دنیا کے اندر پھیل گیا، آدھی دنیا پر ان کا پرچم لہرانے لگا، پچاس سال کے اندر نصف دنیا کے اوپر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، محض اس قرآن اور اخلاق کی بدولت اور محض ان علوم ربانی کی بدولت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیکر تشریف لائے تھے، آپ نے اس درجہ ان کے قلوب کو مصفّٰی کیا کہ وہ لوگ جو ایک پیسے کے اوپر جان دیتے تھے لوگوں کا مال لوٹنے کیلئے ڈکیتیاں کرتے تھے، وہ اتنے غنی بنے کہ دنیا کے خزانے ان کے قدموں پر گرے، خود رکھنے کی بجائے وہ اسے لٹاتے تھے ان کا دل غنا سے بھر چکا تھا، تو وہ مال کو خادم جان کر استعمال کرتے تھے مال کو مخدوم نہیں جانتے تھے، انہوں نے مال ودولت کو قبلہ نہیں بنایا تھا دولت کو اپنا خادم جانتے تھے اتنا دلوں کے اندر غنا پیدا ہو چکا تھا۔

علی وجابر رضی اللہ عنہما کی دنیا سے بے رغبتی...... حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیت المال میں گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے فرمایا کہ یَا دُنْیَا غِرِّیْ غَیْرِیْ ② اے دنیا دھو کہ کسی اور کو دیجیو، ہم تیرے دھوکے اور فریب میں آنے والے نہیں ہیں، ہم تجھے چاہنے والے نہیں ہیں۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱. ② حلیۃ الاولیاء، علی بن ابی طالبؓ ج: ۱ ص: ۸۱. الشریعۃ للآجری، ج: ۳ ص: ۱۱۹۶.

تقسیم شروع کر دو، لاکھوں روپیہ رات بھر میں غرباء اور مساکین کو لٹایا گیا یہ تو بیت المال کا قصہ تھا۔

لیکن کیفیت یہ تھی کہ غالباً حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں یہ لکھ پتی صحابہ میں سے تھے، امراء صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہے ایک دن حضرت گھر تشریف لائے تو طبیعت اداس اور منقبض تھی بیوی نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے؟ فرمایا اداس اور بے چین ہو رہی ہے، بیوی نے کہا کیا بات ایسی پیش آئی؟ فرمایا خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے، طبیعت پر بوجھ بڑھ رہا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں پریشانی ہو رہی ہے، ہمارا تو خزانہ خالی ہو تو تب پریشانی ہوتی ہے ان کا زیادہ بھر گیا تھا اس لئے پریشانی تھی۔ بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ پھر اس میں بے چین ہونے کی کونسی بات ہے، غرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیں، کہنے لگے بات تو ٹھیک ہے، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا تقسیم شروع کرو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا غریبوں، بیواؤں، یتیموں، مسافروں اور مسکینوں کو دیا گیا صبح کو جو حساب لگایا گیا تو چھ لاکھ روپیہ رات بھر میں تقسیم ہوا۔ صبح آ کے بیوی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کیسی عمدہ تدبیر بتلائی، میری طبیعت ہلکی ہوگئی یہ وہ لوگ تھے جو ایک ایک پیسے کے اوپر جان لیتے اور جان دیتے تھے آج ان میں یہ غناء پیدا ہوا کہ ایک آدمی ایک رات میں چھ چھ لاکھ روپیہ لٹاتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔ یہ غناء کہاں سے پیدا ہوا؟ اخلاق کے اندر یہ بلندی کیسے آئی؟ یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض صحبت تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اور قرآنی تعلیم کا اثر تھا جو روح بن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر رچ گیا تھا یہ کیفیت تو مردوں میں تھی۔

مال سے متعلق عورتوں کی فطری طبیعت ...... مردوں میں تو پھر بھی منہ دیکھے سخاوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کو فطری اور طبعی طور پر دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس واسطے کہ عورت تو زیوروں کے جھنکار میں پرورش پاتی ہے، اسی میں اس کی زندگی گزرتی ہے، بچی ہوتی ہے تو پیدا ہوتے ہی چھ مہینے کے بعد اس کے کانوں میں سوراخ کر کے سونا ٹھونس دیا جاتا ہے، ناک میں سوراخ کیا اس میں (سونے کی) کیلیں ٹھونک دیں اور عورت ہے کہ خوش ہے۔ اگر اس کے بدن کو چھلنی کر دیا جائے اور وعدہ دیدیا جائے کہ سونے کی کیلیں ٹھونکیں گے تو بلاشبہ تیار ہو جائے گی کہ بدن چھلنی کر دیا جائے اور سونے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں۔ تو طبعی طور پر محبت ہوتی ہے اس لئے کہ بچپن سے زیورات کی جھنکار میں رہتی ہے جس کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ وہ تو زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے صبح وشام اس کو زیور کا شغل ہے تو سونے اور چاندی کی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب خاوند کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو خاوند تو حجت پیش کرتا ہے دلیلیں پیش کرتا ہے، وہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے بیان میں چل نہیں سکتی، اس لئے کہ جس قلب کے اندر سونا چاندی رچ جائے وہاں علم کا رہنا مشکل ہے تو بیان اور علم کے اندر کمزور ہوتی ہے۔

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

بہر حال عورتوں کے اندر مال، زیور اور سونے چاندی کی طمع زیادہ ہوتی ہے مردوں میں اتنی نہیں ہوتی، مرد تو عورتوں کے مبتلا کرنے سے مبتلا ہوتا ہے۔ شادی کرنے سے پہلے مرد کے وہ جذبات نہیں ہوتے جو شادی کرنے کے بعد ہوتے ہیں وہ آتی ہیں اور راستہ بدل دیتی ہیں مرد میں ایک قسم کا غناء ہوتا ہے مگر عورت میں نہیں ہوتا۔

کسی ساہوکار کا قصہ مشہور...... وہ کسی ساہوکار کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے بیوی سے یہ کہا کہ وہ ذرا سل کا بٹہ میرے پاس اٹھالا (سل کا بٹہ جس سے مصالحہ پیسا جاتا ہے) تو اس نے اپنی نزاکت دکھلائی کہ میرے سے کیسے اٹھے گا؟ میں نازک اندام ٹھہری اور یہ سل کا بھاری پتھرا تنے وزن کا، مجھ سے کیسے اٹھے گا؟ وہ ساہوکار بڑا گھبرایا کہ اس نزاکت کے ساتھ میرا گزر کیسے ہوگا، میں تو کسان آدمی ہوں میری بیوی تو ایسی ہونی چاہیے جو محنت مزدوری کر سکے، کچھ بوجھ اٹھا سکے، یہ دو سیر سل کا بٹہ اٹھانا اسے بھاری ہو رہا ہے میرے گھر میں اس کا کیسے گزر ہوگا؟ مگر تھا وہ بھی ہوشیار، شام کو وہ آیا اور چپکے سے سل کا بٹہ اٹھا کے لے گیا اور اس کے اوپر سونے کا پتر چڑھوا کے ایسا کرا دیا جیسے وہ سونے کا بنا ہوا ہے، گھر آیا اور بیوی سے کہا کہ میں اڑھائی سیر کا بڑا عمدہ زیور بنوا کر تیرے واسطے لایا ہوں اور مضبوط ایسا کہ دادا برتے، تو پوتا بھی برتے اس کے گھسنے کو کوئی صورت نہیں اور وہ میرے پاس ہے وہ اب شوق میں بے تاب ہے کہ جلدی سے اسے کھولے اور وہ ساہوکار ہے کہ شوق تو اسے دلا رہا ہے مگر کھولتا نہیں ہے کہنے لگا تو اسے پہنے گی؟ کہنے لگی یقیناً پہنوں گی، تھا تو وہ سل کا بٹہ لیکن اس پر پتر چڑھوایا اور سونے کی زنجیر بھی اس میں ڈلوا کے لایا تھا اس نے نکالا تو بڑی بے تابی سے اس نے گلے میں ڈالا اور دن بھر پہنے ہوئے پھر رہی ہے، کام کاج بھی کر رہی ہے، ساہوکار نے کہا کہ یہ زیور اچھا ہے؟ بوجھ تو نہیں لگتا؟ کہنے لگی کہ نہیں بالکل بوجھ نہیں لگتا، کہنے لگا کمبخت یہ وہی پتھر تو ہے جو تجھ سے کل نہیں اٹھتا تھا اور آج گلے میں ڈالے ہوئے پھر رہی ہے، محض اس لئے کہ اس پر سونے کا نام آ گیا ہے۔

تو سونے اور چاندی کی محبت میں عورت غرق ہوتی ہے اور وہ مرد کو بھی مبتلا کرتی ہے، مگر یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض صحبت تھا کہ عورتوں کو بھی آپ نے اتنا غنی بنا دیا تھا کہ ان کے قلوب سونے اور چاندی سے بالاتر ہو گئے تھے۔

عائشہؓ کی سخاوت...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مکہ مکرمہ کے حاکم بنائے گئے خزانے کی بوری بھر کر اسمیں سونا چاندی، اشرفیاں اور روپوں سے اچھی طرح بھر کے اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بطور ہدیہ بھیجی، صدیقہ عائشہؓ نے باندی سے فرمایا کہ میں اتنی دولت کیا کروں گی غریبوں میں تقسیم کر دو باندی نے تقسیم کرنی شروع کر دی۔ دن بھر میں وہ ساری بوری ختم ہو گئی لاکھوں روپے کا سونا چاندی تھا وہ سب ختم ہو گیا شام کو باندی نے کہا: ام المؤمنین تین دن سے آپکے اوپر فاقہ ہے آپ نے بھی اس میں سے کچھ روپے

رکھ لئے ہوتے! فرمایا: اری جا بے وقوف! پہلے سے نہ کہا کہ میں بھی دو چار روپے رکھ لیتی جب بوری ختم ہوگئی جب تو نے کہا۔ تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر تین دن سے فاقہ ہے اسی کو یاد کر کے دو چار روپے رکھ لیتیں گویا اتنا استغناء قلب میں پیدا ہو چکا تھا کہ بوری رکھی ہے اور تین دن سے فاقہ ہے مگر دھیان نہیں جاتا کہ اسمیں سے کچھ اپنے لئے رکھ لیں۔ تو جب عورتوں کے قلوب ایسے بن گئے تھے تو اندازہ کیجئے مردوں کے قلوب کیسے ہوں گے!۔

نجومِ ہدایت کی دنیا و آخرت...... دنیا کی اقوام اگر نمونہ بھی پیش کرتی ہیں تو انہی بزرگوں کا نمونہ پیش کرتی ہیں آپ نے اخبارات میں دیکھا ہوگا غالباً جب ہندوستان میں کانگریس کی عارضی گورنمنٹ بنی ہے تو گاندھی جی نے اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا کہ اگر ہمارے کانگریسی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں ان کا سر اونچا رہے تو وہ صدیق رضی اللہ عنہ وعمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اختیار کریں، جن کے قدموں میں دنیا کے خزانے ڈالے گئے، ملکوں کی دولتیں آئیں اس کے باوجود نہ ان کے پیوند لگے کپڑے چھوٹے اور نہ جو کی روٹی چھوٹی، نہ زیتون کا تیل چھوٹا، نہ ان کے ہاں بہت زیادہ مرغن کھانے تھے، نہ اعلیٰ ترین فرنیچر تھے، نہ لباس تھے تو اگر ہمارے کانگریسی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں تو وہ صدیق رضی اللہ عنہ وعمر وفاروق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اختیار کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضِ صحبت کا ایسا اثر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ایسی معیاری زندگیاں بنا دیں کہ دنیا کی دوسری اقوام بھی ان کو نمونہ بنا کر پیش کریں۔ یہ صرف تعلیم قرآن کا اور اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا اثر تھا تو علم اور اخلاق کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ جو قوم دنیا کی ساری قوموں میں پس ماندہ اور پست تھی وہ اتنی اونچی بنی کہ ساری دنیا کی قومیں ان کے سامنے نیچی بن گئیں وہی زمانہ تھا جس کو زمانۂ جاہلیت کہا جاتا تھا۔ وہی زمانہ ہے اس کو تعلیم قرآن کی بدولت خیر القرون کہا جانے لگا جن لوگوں کو جہلائے عرب کہا جاتا تھا ان کی بداخلاقیاں بیان کر کے لوگ ملامت کرتے تھے اب تعلیمِ قرآن کی بدولت جب صحابہ کا ذکر آتا ہے تو لوگ رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ کہتے ہیں۔ یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم، تربیتِ اخلاق اور فیضِ صحبت کا ہی اثر تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو قوم کو اتنا اعلیٰ بنا دیا کہ جو قوم کی مشکلات تھیں سب ختم ہوگئیں، جو پس ماندگی تھی وہ ساری ختم ہوگئی، جس قصے میں قوم مبتلا تھی وہ قصہ سارے کا سارا ختم ہوگیا دنیا میں برسرِ اقتدار آگئی اور آخرت تو ان کی بنی ہوئی ہی تھی آخرت ان کی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرماتے ہیں: اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ① میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں

① مسند عبد بن حمید، احادیث ابن عمرؓ، ج:۲ ص:۴۰۲. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه البیهقی واسنده الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء بأیهم اقتدیتم اهتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف ''التلخیص الحبیر'' میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الجیر، باب ادب القضاء ج:۵ ص:۴۹۸.

جس ستارے کی روشنی میں چل پڑو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ جس صحابی کا دامن تھام لو گے ہدایت پا جاؤ گے تو ایک ایک صحابی معیار بن گیا یا تو وہ جہلائے عرب تھے یا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنے۔ یا ان کا راستہ قابلِ نفرت تھا یا ایسا بنا کہ عالم کیلئے باعث ہدایت بن گیا۔ اور فرمایا: لَا تَسُبُّوا اَصْحَابِیْ ① میرے صحابہ کی شان میں کوئی گستاخی مت کرو، کوئی کلمۂ توہین مت کہو اس لئے کہ ان کا ایک (مُدّ) صدقہ کرنا تمہارے اس صدقے سے بہتر ہے جو جبل اُحد کے برابر سونا دو، وہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے، ان کا سیر ڈیڑھ سیر جو کا صدقہ کرنا تمہارے پہاڑ برابر سونا صدقہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

اس لئے کہ ان کے قلوب میں للّٰہیت واخلاص ہے جو ان کے قلوب میں پیدا کیا گیا وہ بعد والوں کو میسر آنا مشکل ہے غرض سارے صحابہ کو ستاروں کے مانند فرمایا یہ تو صحابہ کرام ہیں خلفائے راشدین کے بارے میں فرمایا کہ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ ② میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنتوں کو لازم پکڑو۔ دس صحابہ کا نام لے کر مُبَشَّرٌ بِالْجَنَّةِ فرمایا اور جنت کی بشارتیں دیں فرمایا: اَبُوْبَکْرٍ فِی الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِی الْجَنَّةِ وَعُثْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَعَلِیٌّ فِی الْجَنَّةِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِی الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِی الْجَنَّةِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ۔ ③

تو دس صحابہ کرام کا نام لے کر نام بنام فرمایا کہ یہ جنتی ہیں تو آخرت ان کی یہ ہے اور دنیا کے لئے مقتداء اور نمونہ ہیں۔ دنیا میں جنت کی بشارت دے دی گئی اور دنیا کے اعتبار سے ان کی حکومت کا یہ عروج ہے کہ ان کا اقتدار قائم ہوا تو ان کا نام سن کر ان کی ہیبت اور ان کے رعب وجلال سے سلاطینِ دنیا کے پتّے پانی ہوتے تھے۔

اس وقت آپ اور ہم جس حالت میں اب ہیں اسلام لانے سے پہلے وہ لوگ اس سے بدرجہا بری حالت میں تھے لیکن انمیں انقلاب بپا ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر ان کی دین دنیا کی مشکلات کو ختم کر دیا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ④ اس امت کے آخر کی اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس چیز سے اس امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی تو امت کے اول طبقے کی اصلاح قرآن کریم، اس کی تعلیم اور اسی کے دیئے ہوئے اخلاق سے ہوئی تھی انہی چیزوں سے آج بھی امت کی اصلاح ہو سکتی ہے جس چیز سے امت کے اول حصہ کی مشکلات ختم ہوئیں تھیں اسی چیز سے امت کے آخر کی مشکلات بھی ختم ہو سکتی ہیں خواہ وہ کسی خطے کے رہنے والوں ہوں، ہند میں یا سندھ میں یا امریکہ وافریقہ اور ایشیا میں ہوں، جہاں مشکلات ہیں وہ ختم جبھی ہوں گی جب ان کا راستہ صحیح ہو جائے گا اور اسی لائن پر آجائیں گے جس لائن پر جناب

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی ﷺ لو کنت متخذا خلیلاً......ص: ۲۹۹ رقم: ۳۶۷۳۔ ② السنن لابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین المهدیین ج: ۱ ص: ۴۹ رقم: ۴۲۔ ③ السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنه، ص: ۲۰۳۷ رقم: ۳۷۴۷۔ ④ شرح العقیدة الطحاویة، مقدمة ج: ۱ ص: ۹۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ڈالا تھا۔

پاکیزہ اخلاق سے پاکیزہ اعمال واحوال سرزد ہوتے ہیں......تو انبیاء علیہم السلام، خصوصیت سے سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی مشکلات کو ختم کرنے کے لئے تشریف لائے اور اس کے لئے دو ہی طریقے اختیار فرمائے ایک تعلیم اور ایک تربیت، تعلیم کے ذریعہ علم پہنچایا تا کہ لوگوں کے دلوں میں روشنی پیدا ہو، اندھیرے ختم ہو جائیں اندھیروں میں کوئی قوم ترقی کی طرف نہیں چل سکتی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے علم کی روشنی بہم پہنچائی۔

دوسری چیز تھی قوتِ عمل، وہ اخلاق سے پیدا ہوتی ہے ان کے اخلاق درست کئے، قلب کے اندر جو مادے ہیں جب تک وہ درست نہیں ہوتے عمل درست نہیں ہو سکتا۔ ہر عمل پر قلب کے اندر ایک مادہ ہے اگر وہ مادہ سامنے نہ ہوتا وہ عمل سامنے نہ آتا مثلاً داد و دہش اور فقیر کو دینا ہے، جب تک قلب کے اندر سخاوت کا مادہ نہیں ہوگا داد و دہش کے افعال ظاہر نہیں ہوں گے۔ یہی حملہ آوری ہے دوسروں کے اوپر ہجوم کر کے جانا ہے جب تک شجاعت کا مادہ نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ مصائب کے اندر ضبطِ نفس ہے، واویلے سے بچنا، جب تک صبر کا مادہ نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ برائی کو دیکھ کر آدمی شرما کر بیٹھ جائے بُرائی کے پاس نہ جائے جب تک حیا کا مادہ اور خلق نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ تو قلب کے اندر اخلاق کی مثال ایسی ہے کہ جیسا بیج ہوتا ہے ویسی شاخ نکلتی ہے ویسا ہی پھل لگتا ہے تو جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اعمال ہوتے ہیں اور جیسے اعمال ہوتے ہیں پھر ویسے ہی احوال وانجام اور ثمرات بھی نکلتے ہیں اسلام سے پہلے چونکہ اخلاق بُرے تھے تو برے افعال سرزد ہوتے تھے بُرے احوال سامنے آتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر قلب کو درست کیا اخلاق کو صحیح کر دیا تو پاکیزہ اخلاق سے پاکیزہ افعال سرزد ہونے لگے، پاکیزہ اعمال سے پھر پاکیزہ نتائج اور ثمرات بھی سامنے آنے لگے۔

حصولِ منزل کیلئے شریعت وطریقت دونوں ضروری ہیں......آدمی کے جب تک اخلاق درست نہ ہوں اعمال صحیح نہیں ہو سکتے، اور اخلاق درست ہوں لیکن علم نہ ہو تو عمل کا راستہ نظر نہیں آ سکتا تو دونوں چیزیں لازمی ہیں کہ علم کا راستہ بھی سامنے ہو منزل بھی سامنے ہو اور چلنے کی طاقت بھی ہو جب تک دونوں چیزیں جمع نہیں ہوں گی نہ آدمی چل سکے گا نہ منزل مقصود تک پہنچ سکے گا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ریل گاڑی دیکھی ہوگی کہ انجن کے پیچھے جب ڈبے جوڑ دیئے جاتے ہیں تو وہ انہیں لیکر چلتا ہے لیکن انجن چلتا کیوں ہے؟ دو باتیں ہیں جن سے وہ چلتا ہے اور منزل مقصود پہنچتا ہے۔ پہلی چیز تو اس کے سامنے لائن بچھی ہوئی ہونی چاہیے اگر لائن نہیں ہوگی تو انجن چل ہی نہیں سکتا، تو سب سے پہلی چیز تو لوہے کی لائن ہے تا کہ وہ اس پر دوڑ کر چلے، دوسری چیز انجن کے اندر اسٹیم بھری ہوئی ہونی چاہیے اس کے اندر آگ پانی بھی ہو۔ آگ پانی نہ ہو تو کم سے کم کوئی بجلی پاور ہو جس سے اسٹیم اور گیس بنے تا کہ وہ چلے۔ تو ایک اندر اسٹیم اور آگ ہونی چاہیے اور دوسرے سامنے لائن بچھی ہوئی ہونی چاہیے جب دونوں چیزیں جمع ہوں گی تو انجن

چلے گا اور اتنی زور سے چلے گا کہ مہینوں کی مسافت دنوں میں طے کر یگا اور دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرے گا۔ نہ صرف خود چلتا ہے بلکہ اس کے پیچھے جتنی گاڑیاں جوڑ دی جائیں منوں وزن کا لوہا جوڑ دیں سب کو گھسیٹ کر لے جائے گا اور منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔ یہ کب؟ کہ لائن بھی ہے اور اسٹیم بھی ہے، لیکن اگر آپ لائن ہی نہ بچھائیں تو اگر چہ اندر اسٹیم بھر دیں اسے چھوڑ دیں گے تو جتنا چلے گا زمین میں دھنستا چلا جائے گا منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا اور اگر اسٹیم بھری ہوئی نہ ہو اور لائن بچھی ہوئی ہو تو دھکیل دھکیل کے آپ اس کو کہاں تک چلائیں گے قریب تک چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر ہزاروں آدمی دھکیلیں گے تھوڑا چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گا تو منزل مقصود تک پہنچنے کی شرط یہی ہے کہ اندر آگ بھی بھری ہوئی ہو اور لائن بھی ہو وہ اندرونی طاقت ہے جس سے وہ دوڑتا ہے اور وہ سامنے راستہ ہے جس کے اوپر دوڑے گا۔ تو دونوں چیزیں ہونی چاہیے ایک راہ ہو، دوسرے چلنے کی قوت بھی ہو۔

ٹھیک اسی طرح ہر مؤمن و مسلم کو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک انجن کی مانند ہے اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے لائن بھی سیدھی ہو اور اندر آگ بھی پڑی ہوئی ہو۔ جو سیدھی لائن ہے اس کا نام شریعت ہے ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ ① سیدھا راستہ جو اللہ تک پہنچانے والا ہے، اخلاق ربانی اور اعمال صالحہ تک پہنچانے والا ہے، انجام درست کرنے والا ہے اسی کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے یہ تو راستہ ہوا اور اندر عشق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آگ ہونی چاہیے، اللہ کی محبت کی آگ اندر بھری ہوئی ہو کہ جس کے جذبے میں آدمی دوڑتا ہوا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ہوں گی تو ایک مؤمن مسلم منزل مقصود تک پہنچے گا اگر اس کے سامنے شریعت کا راستہ ہی کھلا ہوا نہیں تو اللہ تک کیسے پہنچے گا؟ اور اگر راستہ سیدھا ہے مگر محبت کی آگ اندر بھری ہوئی نہیں ہے تو پھر چلے گا کیسے؟ اگر محبت کی آگ اندر بھری ہوئی ہو اور راہِ شریعت سامنے نہ ہو تو جتنا چلے گا زمین میں دھنستا ہوا چلا جائے گا اور اگر اندر آگ نہ ہو اور شریعت کی لائن بچھی ہوئی ہے مگر چلنے کا جذبہ نہیں، عمل کا کوئی داعیہ نہیں ہے تو وعظ کہہ کہہ کر منت کر کر کے آپ کہاں تک چلائیں گے، آج کسی نے وعظ کہہ دیا نماز پڑھ لی پھر بیٹھ رہے برسوں کو پھر کسی نے تقریر کی دو تین دن نماز پڑھ لی پھر سُست ہو گئے، اس طرح منزل مقصود تک تھوڑا ہی پہنچے گا وہ تو اندر داعیہ اور جذبہ ہونا چاہیے کہ ہزاروں روکنے والے ہوں پھر بھی نہ رُکے۔ تو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک سیدھی لائن وہ شریعت ہے اور ایک اندر آگ وہ اخلاق ہیں تو اخلاقی قوت چلنے پر آمادہ کرتی ہے اور راہ کی قوت سیدھے راستہ پر چلاتی ہے علم سیدھا راستہ ہے اور اخلاق یہ چلنے کی قوت ہے۔ محض علم منزل مقصود تک چلا سکتا تو بڑے سے بڑا عالم بن جائے مگر اندر اخلاق ہی درست نہ ہوں کبھی راہ شریعت پر نہیں چل سکتا اور اخلاق درست ہو جائیں مگر راستہ معلوم نہ ہو تو من گھڑت طریق پر چلے گا خود گمراہ ہوتا جائے گا اور لوگوں کو بھی گمراہی پہ ڈالتا جائے

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۴.

گا اس لئے شریعت کی بھی ضرورت ہے اور طریقت کی بھی ضرورت ہے شریعت راہ بتلائے گی اور طریقت اخلاق وقوت پیدا کرے گی۔

تعلیم وتربیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ......اسی کیلئے اسلام میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں: ایک تعلیم جو علماء کرام مدارس میں بیٹھ کے سکھلاتے ہیں حلال وحرام یا جائز وناجائز بتلاتے ہیں۔ گویا راستہ دکھلاتے ہیں اور دوسرے تربیت جو صوفیائے کرام کرتے ہیں وہ قلب کے اندر قوت پیدا کرتے ہیں اور آگ لگاتے ہیں تاکہ اس کے زور سے آدمی آگے چلا جائے گویا قلب میں اتباع شریعت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

تو اگر آدمی نے پڑھ لکھ تو لیا مدرسہ میں جا کر تعلیم پائی مگر اخلاق درست نہ کئے، حرص وتکبر ایذا رسانی اسمیں موجود ہے تو وہ علم اور زیادہ وبال بن جائے گا وہی علم مخلوق کو ستانے اور پریشان کرنیکا ذریعہ بنے گا۔ اور اگر اخلاق درست ہوگئے کہ نہ ایذاء رسانی کا جذبہ ہے نہ حرص وتکبر ہے، اچھے اخلاق ہیں مگر ان کو نمایاں کرنے کا راستہ سامنے نہیں ہے تو پھر بدعات میں گرفتار ہوگا، من گھڑت راہیں تجویز کرے گا، بناوٹی راہ ہوگی تو پھر بھی منزل مقصود تک نہ پہنچے گا۔ تو علم اور تصوف دونوں کی ضرورت ہے۔ شریعت کی بھی ضرورت ہے اور طریقت کی بھی، تعلیم کی بھی ضرورت ہے اور تزکیۂ نفس کی بھی، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں چیزیں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیلئے کیں، ایک طرف تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنی آیات کی تعلیم دیتے تھے آیات کے مطالب بیان فرماتے تھے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال اور یہ حرام ہے اور دوسرے تربیت کی، صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال کی نگرانی کی کہ یہ کرتے کیا ہیں، راتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاگ جاگ کر دیکھتے تھے کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کیا عمل کر رہے ہیں دن کو دیکھتے تھے اور روک ٹوک ہوتی تھی۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگرانی شروع فرمائی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم عمل کیسے کرتے ہیں تو آپ نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں مگر اتنا آہستہ کہ کوئی کان لگا کے سنے تو مشکل سے سُننے میں آئے ورنہ تلاوت کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مکان میں زور زور سے تلاوت کر رہے ہیں، سارا محلہ ان کی آواز سے گونج رہا ہے۔ صبح کو جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! آپ اتنا آہستہ قرآن شریف کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کر بھی مشکل سے سُنائی دیتا تھا؟ عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب، ہر وقت حاضر وناظر ہے اور ہر وقت سننے والا ہے یعنی اللہ رب العزت، تو مجھے زیادہ شور مچانے کی کیا ضرورت تھی! میں غائب کو تھوڑا ہی سُنا رہا تھا میں تو شنوا اور دیدہ کو سنا رہا تھا، بہرے کو نہیں سنا رہا تھا تو مجھے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے عمر آپ اتنا چلا چلا کر قرآن کو کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاَطْرِدُ

الشَّیْطَانَ. میں اس لئے زور سے پڑھ رہا تھا کہ شیطان کو بھگا رہا تھا اور سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا کہ تم بھی قرآن شریف پڑھو اور نماز ادا کرو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! آپ آواز کو کچھ اونچا کرو اور اے عمر! آپ آواز کو ذرا دھیما کرو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے ① تو یہ جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ قلب کی تربیت تھی اور قلب کا راستہ صحیح کرنا تھا کہ اعتدال کے ساتھ چلو تو جہاں آپ حلال و حرام بتلاتے تھے وہیں آپ قلوب کی راہ بھی درست فرماتے تھے تو جہاں آپ یہ فرماتے تھے کہ اس طرح نماز پڑھو، اس طرح روزہ رکھو، اس طرح حسن معاشرت سرانجام دو وہاں قلوب کی اصلاح بھی فرماتے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے وساوس کا علاج...... ان عملوں کے کرنے میں اگر وسوسے آنے لگیں اور اس سے عمل خراب ہونے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسوسوں کا علاج بھی فرماتے۔ حدیث میں ہے ایک دفعہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں اور اتنے آتے ہیں کہ بس انتہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا بیان کریں ایسے برے وسوسے آتے ہیں کہ زبان پر ہی لانے کو جی نہیں چاہتا! وسوسے یہ آتے ہیں کہ دل میں سوالات کا ایک سلسلہ پیدا ہوتا ہے دل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنایا آسمان کس نے بنایا؟ جواب دل سے یہ ملتا ہے کہ اللہ نے بنایا ہے چاند، سورج ستارے انسان اور حیوان کس نے بنائے؟ جواب ملتا ہے اللہ نے بنائے ہیں۔ ان سارے جوابات سے ہمارے ذہن میں ایک کلیہ بنتا ہے کہ ہر موجود کے لئے موجد کی ضرورت ہے ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے جو موجود ہوگا اس کا بنانے والا کوئی تو ضرور ہوگا۔ یہ سلسلہ جب دل میں آتا ہے تو دل میں یہ سوال بھی آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے اس کو کس نے بنایا؟ اللہ میاں کا خالق کون ہے؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ وہ بھی موجود ہے تو جب ہمارے دل میں یہ وسوسہ آ گیا کہ اللہ کا خالق کون ہے؟ تو ہمارا ایمان کہاں رہا؟ اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل سے معطل ہو گئے، بعضوں نے عمل ترک کر دیا، کہ عمل کیا کریں جب ہمارے اندر ایمان ہی موجود نہیں، اس لئے کہ جب ہمیں یہ خیال آ گیا کہ اللہ کا بھی کوئی بنانے والا ہے، خالق کا بھی کوئی خالق ہے، اب ایمان کہاں رہا؟ ایمان تو جب ہے جب یوں سمجھے کہ وہ سب کا خالق ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے وہ خود بخود ہے یہ ایک وسوسہ تھا اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یا یہ سمجھے کہ ہمارے اندر ایمان نہیں رہا اور جب ایمان نہیں رہا تو عمل معطل ہو گیا تو عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو ایک روگ ہے کہ قلب کے اندر ایمان ہے ہی نہیں جب ایمان نہیں تو عمل بے کار ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلا دیا کہ ایمان موجود ہے اور اس کے موجود ہونے کی وجہ سے ہی تم وسوسوں کو برا جان رہے ہو۔ ②

---

① مسند احمد، ومن مسند علي بن ابی طالبؓ ج: ۲ ص: ۳۲۹ رقم: ۸۲۳.

② الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الوسوسة في الايمان، ج: ۱ ص: ۳۲۵ و مسند احمد، مسند ابي هريرةؓ ج: ۱۷ ص: ۶۸.

اگر ایمان نہ ہوتو ہزاروں وسوسے آتے ہیں آدمی کبھی ان کو بُرا نہیں سمجھتا بلکہ ان تخیلات کو یوں سمجھتا ہے کہ بڑی حکمت کی بات ہے جو میرے ذہن میں آئی، اس پر غرور اور گھمنڈ کرتا ہے کہ میرا خیال تو ایسا ہے کہ دنیا سے گزر کر خدا تک بھی پہنچ جاتا ہے آسمانوں تک بھی جاتا ہے تو وہ فخر کرتا ہے اس لئے کہ ایمان ندارد ہے مگر چونکہ ایمان ہے اس لئے تم ان وسوسوں کو بُرا جان رہے ہو یہ کیسے خیال گزرا کہ ایمان نہیں رہا یہ سن کر ایسا ہو گیا جیسے پردہ اٹھ جاتا ہے اور معلوم ہوا کہ ایمان ہے ہمارا خیال غلط تھا۔

لہٰذا ہمیں عمل کرنا چاہیے عملی زندگی پھر ویسی بن گئی جیسے پہلی تھی ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی حلال وحرام یا جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ تو دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی، دل کی راہ درست کر دی وسوسے نکال کر آپ نے ایک سیدھی راہ دکھلا دی۔ اصطلاحِ شریعت میں اسی کا نام "تزکیۂ نفس" ہے یعنی نفس کو مانجھ کر برے تخیلات اور برے وسوسوں سے صاف کرنا بعضے وسوسے ایمان کو کھو دیتے ہیں بعضے آدمی کو اعمال سے بیکار بنا دیتے ہیں بعضے نیکی سے ہٹا دیتے ہیں ان وسوسوں کا قلب سے نکالنا یہ محض علم کا کام نہیں ہے کہ جائز وناجائز بتلا دیا جائے بلکہ یہ تربیت کا کام ہے صرف ہمت کا کام ہے کہ دلوں کو صحیح راستوں کے اوپر لگانا، زبان سے، اعمال سے، دعا سے اور ہمتیں باندھنے سے۔ یہ چیز بھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔

تعلیمِ خداوندی کے بغیر خدا تک رسائی ممکن نہیں...... تو دو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تھیں ایک تعلیم اور دوسرے تربیت، تعلیم سے علم پہنچایا، تربیت سے قلوب کے اندر قوت پیدا کی۔ اس قوت سے جب صحابہ رضی اللہ عنہم چلتے تھے اور صحیح لائن پر چلتے تھے تو منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے تھے اب ظاہر بات ہے کہ جب قوم میں علم نہ رہے تزکیہ نفس نہ رہے، تربیت اخلاق نہ رہے، علم کا نام بھی صفر ہو جائے کہ مسائل کا علم نہ ہو اخلاقی راہیں بھی بند ہو جائیں، یہ الگ چیز ہے کہ اپنی نیکی یا سلامت روی سے آدمی گناہوں میں مبتلا نہ ہو، مگر جب تک تعلیم نہ پائیں راستہ تو نہیں کھل سکتا، اور اللہ تک پہنچنے کا راستہ تو جب تک اللہ ہی کی طرف سے تعلیم نہ ہو جب تک انسان خدا تک کیسے پہنچے گا؟ اور جب اس راستہ پر چلنے کی قوت جو کہ اخلاقی قوت ہے وہی نہ ہو تو آدمی چلے گا کیسے؟ اگر ہر آدمی ایسا بن جائے دوسرے لفظوں میں قوم کی قوم ہی ایسی ہو جائے۔ تو اندازہ کیجئے کہ قوم کتنا گرے گی کتنا پست ہو گی اور اس پر اغیار کس طرح سے مسلط ہوں گے اور کس طرح سے وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو گی تو پریشانیوں کا ایک علاج تو مادی ہے جو کہ اسباب کے درجہ کی چیز ہے اس سے انکار نہیں وہ اپنی جگہ ہونا چاہیے وقتی تدبیریں ہونی چاہئیں انسان کرتا ہے لیکن بڑی تدبیر، ان چھوٹی تدبیروں کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ نگاہ خدا پر رہے، توکل اور بھروسہ اسی پر ہو تو پھر اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اگر انسان اپنے بل بوتے پر تدبیر کرے اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع نہ ہو تو مدد نہیں آئے گی فرمائیں گے حق تعالیٰ تو ذمہ دار ہے جو تیرا جی چاہے کرتا رہ لیکن اگر آدمی ساری تدابیر کرنے کے بعد اللہ پر معاملہ کو چھوڑ دے کہ اے اللہ! میرے کرنے کا کام اتنا تھا میں نے کر لیا اب آگے آپ

جانیں آپ کا کام جانے تو پھر غیب سے مدد شروع ہوگی کہ جتنا انسان کی استطاعت اور قدرت ہے وہ تدبیر کر کے بالآخر اللہ کی طرف رجوع کرے، تبھی حق تعالیٰ سے معاملہ صاف ہوتا ہے تدبیر تو اتنی ہی کرے گا جتنی اس کی قوت ہے لامحدود قوت تو نہیں ہے کہ ساری تدبیریں کر جائے جتنی بساط ہے اسی قدر تدبیر کر کے بالآخر اسے اللہ کے حوالہ کرے گا جس کی قوت لامحدود ہے اور اخیر تک کی بات کو جانتا ہے اس کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔

بساط کے مطابق جدوجہد ضروری ہے...... حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو بادشاہ وقت نے اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف (اور مرضی الٰہی کے مطابق) فتویٰ دیا تھا تو حکم دیا کہ شیخ کو جیل بھیج دو۔ جیل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ جہاں جمعہ کا دن آیا تو صبح سے غسل کی تیاری کرتے تھے غسل کیا اور جیل میں جو بھی ان کے کپڑے تھے خود دھو کے صاف کر لیتے اور جب جمعہ کی اذان ہوئی تو جمعہ کی نماز کیلئے چلتے، مگر جیل کا دروازہ بند ہے، دروازہ کے قریب پہنچ کے واپس آتے اور آ کے ظہر کی نماز پڑھ لیتے۔ ہر جمعہ کو حضرت شیخ کا یہی معمول تھا لوگوں نے عرض کیا جب آپ کو معلوم ہے کہ آپ باہر نکل نہیں سکتے آپ کی قید کی مدت ختم نہیں ہوئی تو آپ پر جمعہ واجب ہی نہیں پھر اس کی کیا ضرروت ہے کہ آپ جمعہ کی نیت سے کپڑے بدلیں اور پھر جمعہ کے قصد سے چلیں دروازہ پر پہنچیں تالے کو ہاتھ لگا کے واپس آئیں اور آ کر ظہر پڑھیں آپ پہلے ہی نماز ظہر کیوں نہیں پڑھ لیتے؟ فرمایا کہ میں بھی یہ جانتا ہوں کہ میں تالا نہیں کھول سکتا، جیل سے باہر جا کر جمعہ کی نماز ادا نہیں کر سکتا مگر جمعہ کی ادائیگی میں جتنا میرے امکان اور قوت میں ہے اتنا تو فعل ادا کر دوں، اور جہاں میری قوت سے خارج ہو میں اللہ کے حوالہ کر کے چلا آؤں اور یہ عرض کر دوں کہ یا اللہ جیل کے دروازے تک آ جانا تو میری قوت میں تھا وہ میں نے کر لیا اب آگے میری قوت سے خارج ہے آگے آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ آپ کر دیں میری نیت تو یہی ہے کہ میں آپکے حکم کی تعمیل کروں میں آپ کے حکم پر راضی ہوں۔

شیخ الہندؒ کا جذبہ...... تو یہ صورت ہونی چاہیے کہ جتنی تدبیر بس میں ہو اتنی کر لینی چاہیے اس سے آگے اللہ پر چھوڑ دے کہ یہ آپ ہی کے قبضہ میں ہے آپ ہی کرنے والے ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ مجھے یوں حکم دیں کہ! اے محمود حسن! تم آسمان پہ چلے آؤ تو ظاہر بات ہے کہ انسان تو آسمان پر نہیں پہنچ سکتا لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں نہیں پہنچ سکتا میں کہوں گا حاضر ہو رہا ہوں اور آسمان پر پہنچنے کیلئے یہ تجویز کروں گا کہ جو دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ ہے اس پر جا کے چڑھوں، چاہے مجھے دس مہینے کا سفر کرنا پڑے، اور اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو سب سے اونچا درخت ہوگا اس پر چڑھوں گا اس کے اوپر چڑھ کے عرض کروں گا یہاں تک تو میرے قبضہ میں تھا آگے میرے بس میں نہیں اب آپ مجھے آسمان پر پہنچا دیں تو فرمایا کہ گھر بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ میں آسمان پر کیسے پہنچوں گا جتنا آدمی کے بس میں ہو اتنا کرے آگے اللہ کے حوالے کرے۔

تو یہی صورت دین اور دنیا کی تدبیروں میں ہوتی ہے کہ جتنا انسان کے بس میں ہے وہ تدبیر کرے اور اس کے

بعد اللہ کے حوالہ کرے اپنے کو اپنا ذمہ دار نہ سمجھے کہ سارے کام میں اپنی تدبیر سے نکال لوں گا ہر جگہ انسان کی تدبیر نہیں چلتی جہاں چلتی ہے انجام دے لے۔ نماز کا حکم ہے فرض کیجئے آپ خدانخواستہ مسجد میں جانے سے معذور ہیں تو دروازے تک چلیں آگے چلنے سے معذوری کا اظہار کر دیں کہ یا اللہ آگے نہیں چل سکتا تو جتنی قوت تھی وہ تو آپ نے صرف کر دی لیکن اگر چارپائی پر بیٹھ کر ہی کہہ دیں کہ میں تو مسجد تک نہیں جا سکتا، یہ معتبر نہیں ہوگا۔ اپنی بساط کے مطابق جدوجہد ضروری ہے۔ تو دین کی پیچیدگیاں ہوں یا دنیا کی مشکلات جتنی جدوجہد اپنے سے بن پڑے اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر اسکو انجام دیا جائے ازاں بعد اللہ کو برتر سمجھا جائے اور ان کے سامنے عرض کر دے کہ میں تو اتنا کر سکتا تھا، آگے آپکے بس میں ہے آپ کو قدرت ہے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سکھلایا جہاں تک ان کے بس میں تھا وہ جدوجہد کرتے تھے، جان تک دینے میں دریغ نہیں کرتے تھے غرض قوم جب بھی دینی اور دنیوی مشکلات میں مبتلا ہو تو سب سے پہلے قرآنی تعلیمات کی روشنی کی طرف رجوع کیا جائے قرآن حکیم ایسی مشکلات میں کیا حکم دیتا ہے؟ اس کو پڑھا جائے، پڑھنے والوں سے سنا جائے، ان کے سامنے معاملے کو رکھا جائے، دنیوی معاملہ ہو یا اخروی۔ آخر حضراتِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کس طرح کامیاب ہوئے؟ تو تدبیریں تو لکھی پڑی (موجود) ہیں وہی ہمیں حاصل کرنی چاہئیں، اگر دل کے اندر الجھن ہے عبادت کا راستہ اختیار کرے، اگر دنیا کی الجھن ہے صحیح معاشرت کا راستہ اختیار کرے، روحی الجھن ہے تو اخلاق کی پاکیزگی کا راستہ اختیار کرے مگر ہر ایک کی کچھ تدبیریں ہیں نہ گھر بیٹھے اخلاق درست ہوتے ہیں اس کیلئے بھی کچھ محنت کرنی پڑتی ہے نہ گھر بیٹھے عبادات ہوتی ہیں ان کے لئے بھی کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں نہ گھر بیٹھے معاشرت درست ہوتی ہے اس کیلئے بھی کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں تو ساری تدبیریں قرآن کریم میں بتلا دی گئی ہیں اور جامع تعلیم دی گئی ہے۔

غیر مسلم اقوام کا اعتراض...... اسلام پر تو دشمنوں کا الزام ہی یہ تھا کہ یہ بہت بڑا جامع مذہب ہے اسمیں ہر قسم کی ہدایت موجود ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر مکہ کے ایک مشرک نے طعن کیا اور کہا کہ تمہارا نبی تمہیں ہر قسم کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ ہگنا اور موتنا بھی سکھاتا ہے گویا تحقیر کے ساتھ کہا کہ دین میں تو بڑی بڑی باتیں ہونی چاہیے تمہارے دین میں تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہیں۔ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر تعجب کیا ہے بے شک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں ہر ہر چیز سکھلاتے ہیں حتیٰ کہ استنجاء کے آداب تک ہمیں بتلاتے ہیں جو بہت حقیر چیز ہے مگر اس کی بھی تعلیم دی ہے، نَهَانَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ وَّلَا بِبَوْلٍ ① ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم استنجاء کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کر کے بیٹھیں وَنَهَانَا اَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ ② اور استنجاء کیلئے ہم تین ڈھیلے

① الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب الاستطابة، ص: ٢٢٣ رقم: ٦٠٦. ② ايضاً.

لیں سنت طریق یہی ہے اس سے کم نہ لیں، جس ملک میں ڈھیلا نہ ہوا نمیں جو چیز بھی استعمال میں آسکتی ہے وہی استعمال کی جائے، بعض جگہ کاغذ استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی زیر بحث ایک مسئلہ ہے کہ کاغذ سے استنجاء کیا جائے یا نہیں جائز ہے یا ناجائز منشاءِ سوال یہ ہے کہ کاغذ کے اوپر تو علم کی باتیں، قرآن اور حدیث بھی لکھا جاتا ہے، کیا اس کو آلودہ کیا جائے؟

کاغذ بھی مختلف طریقوں سے بنتے ہیں، بعض کاغذ بنائے ہی اس مقصد کیلئے جاتے ہیں کہ وہ استنجاء کرنے میں کام آئیں اور جن جگہوں یا مواقع پر پانی بھی موجود نہ ہو مٹی بھی موجود نہ ہو تو اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔ تو جو کاغذ ہی اسی کیلئے مخصوص ہوں انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کپڑے ہیں بعضے کپڑے پہننے کے ہیں، بعضے اوڑھنے کے لئے ہیں، بعض بچھانے کے لئے ہیں جو بچھانے کیلئے ہیں انہیں پہن نہیں سکتے! جو پہننے کے لئے ہیں انہیں بچھا نہیں سکتے، اپنے اپنے موقع پر انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے تو غرض سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا بے شک ہمارے نبی کریم ہمیں ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ استنجاء کے آداب بھی بتلاتے ہیں تو دین اسلام پر تو اعتراض ہی یہ تھا کہ وہ بڑا جامع مذہب ہے ہر چیز کی تعلیم اس میں موجود ہے تو ایسے جامع دین کی قوم ہو اور وہ عاجز آئی ہوئی ہو کہ ہم کیسے راستہ طے کریں حالانکہ سارے راستے بتادیئے گئے ہیں، وجہ یہ ہے کہ تعلیم پاتے ہیں اور نہ علم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اسلام کو مٹانے کے ذمہ دار مسلمان خود ہیں...... دنیا میں کوئی مذہب باقی نہیں رہ سکتا جب تک اس کی تعلیم باقی نہ رکھی جائے جس مذہب کی تعلیم مٹ جاتی ہے وہ مذہب بھی باقی نہیں رہتا یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اسلام کو ابدی مذہب بنایا ہے جو قیامت تک مٹنے والا نہیں ہے لیکن ہم نے اس کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اس لئے کہ جب اسکی تعلیم کو سرے سے ختم کر دیا جائے اور مذہب کی بقاء تعلیم پر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں اُسے ختم کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ طبقات ایسے ضرور رہیں گے جو علم اور اخلاق کو محفوظ رکھیں گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَ لَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللهِ ① میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہیگا ایک جماعت حقہ رہے گی جو وہی کہتی رہے گی جو میں کہہ رہا ہوں، اور وہی کام کریگی جو میں کر رہا ہوں، وہی عقیدہ رکھے گی جو میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ تو قیامت تک ایک جماعت ضرور قائم رہے گی جو امرِ حق کو پہچانتی رہے گی یہ بھی فرمایا کہ فرقے پیدا ہونگے اور اختلافات بھی پیدا ہونگے متعدد جماعتیں بھی ہوں گی، مگر ساتھ ساتھ ایک حق کا طبقہ بھی رہیگا تو دین نہیں مٹے گا اصلیت ہمیشہ قائم رہے گی جہاں گمراہ کرنیوالے ہوں گے وہاں ہدایت بخشنے والے بھی ہوں گے۔ تو یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دین ختم نہیں ہوگا مگر اسباب کے درجہ میں ہم نے اس کے ختم کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تو یہ ہماری کوتاہی ہے حق تعالیٰ شانہ نے جو وعدہ دیا ہے کہ ایک جماعت حقہ قائم رہے گی تو پھر ہمارا فرض ہے کہ اسی

---

① السنن للترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء في الئمة المضلين ج:٨ ص:١٧٢.

جماعت حقہ کی پیروی میں ہم بھی قرآن وحدیث اور فقہ کی صحیح تعلیم حاصل کریں تا کہ امت مسلمہ اپنے مزاج کے مطابق آگے بڑھ سکے۔

مسلم اقوام اپنے مزاج پر چل کر ترقی کر سکتی ہیں...... دنیا کی ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے یہود و نصاری کا ایک مزاج ہے، مشرکین کا ایک مزاج ہے، مسلمانوں کا بھی ایک مزاج ہے یہ جب بھی ترقی کریں گے اپنے مزاج کے مطابق چل کے کریں گے۔ اگر ایک قوم دوسری قوم کی نقالی کرنے لگے کہ جیسے آج کا مزاج ہے میں بھی اس طریق پہ چلوں وہ نہیں چل سکے گی، اس لئے کہ طبعی طور پر اس کا مزاج یہ نہیں ہے تو ہر ایک قوم کو اپنی بنیاد پر اپنی عمارت اٹھانی چاہیے اگر دوسرے کی بنیاد پر آپ نے تعمیر اٹھائی تو وہ کل کو کہہ سکتا ہے کہ اپنا ملبہ اٹھا کے لے جاؤ زمین میری ہے بنیاد میری ہے اس لئے اپنی بنیاد پر اپنی عمارت اٹھانی چاہیے اپنی قومی تعمیر اپنی ہی خصوصیات پر ہو جو اسلام نے بتلائی ہیں اور وہ بغیر علم کے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ تو دنیا میں جامع ترین مذہب اسلام ہے زندگی کے ہر شعبہ میں اس نے مکمل تعلیم دی ہے کھانے، پہننے اور سونے کے اس نے طریقے بتلائے ہیں رہن سہن کے ڈھنگ بتلائے ہیں، صلح و جنگ کے طریقے بتلائے ہیں، حکومت کرنے کے طریقے بتلائے ہیں، نظام ملت کے طریقے بتلائے ہیں مگر وہ جبھی تو سامنے آئیں گے جب آدمی علم حاصل کرے۔ حدیث کے ہزاروں ابواب ہیں، فقہ کے ہزاروں ابواب ہیں، ہر باب میں زندگی کے موڑوں کا تذکرہ ہے، عبادت معاشرت اور سیاست کے الگ الگ باب ہیں، مقدموں کے فیصلہ کرنے کا باب الگ ہے، جنگ و جہاد کا الگ ہے، کھیل کا باب الگ ہے جس باب کو آپ کھولیں گے اسمیں مفصل احکام نکلیں گے، تو جامعیت جبھی پیدا ہوگی، جب آدمی اس کی تعلیم پائے، تربیت حاصل کرے۔

حصول تعلیم و تربیت کا سہل طریقہ...... اور تعلیم پانے کا طریقہ ظاہر بات ہے کہ علماء کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس عالم نہیں ہے تو آپ کہیں سے بلائیں اور اس سے تعلیم حاصل کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم میں سے چند افراد دوسری جگہ بھیجیں تا کہ وہ علم حاصل کر کے آئیں اور آ کر اپنی قوم کی اصلاح کریں تو خواہ باہر سے کوئی عالم آئے یا اپنے میں سے بھیج کر اسکو عالم بنوائیں دونوں صورتوں میں ایک صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ میں تو کہتا ہوں ہر خاندان اور گھر میں اگر پانچ بچے ہوں تو آپ چار کو دنیوی تعلیم پڑھوائیں اور کم از کم ایک کو دینی تعلیم کیلئے وقف کر دیں اگر گھر میں ایک بھی دین کا جاننے والا ہوگا وہ سب کی اصلاح کر دیگا اور راہ درست کر دے گا، لیکن اگر گھر کا گھر ہی غلط راستہ پر پڑ گیا تو پھر اصلاح کی توقع مشکل ہوگی، تو ایک کو کم از کم ایسا ضرور رکھیں جو دینی تعلیم کا حامل ہو یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر ہر شخص عالم بنے لیکن "ضروریات دین" کا علم حاصل کرنا تو ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، روزمرہ کے دینی اعمال، فرائض پنجگانہ، زکوٰۃ، حج اور روزہ یہ فرائض ہیں ان کا علم ہونا فرض ہے اسی طرح یہ کہ میں مسلمان کیوں ہوں؟ مسلمان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اسلام و ایمان کے معنی کیا ہیں؟ نیکی اور اخلاق کے کیا معنی ہیں؟ یہ اجمالی باتیں تو ہر ایک پر فرض ہیں لیکن تفصیلی طور پر عالم

بننا یہ ہر ایک پر فرض نہیں ہے یہ تو سو میں ایک بھی بن گیا تو انشاء اللہ وہ سب کی اصلاح کردے گا پانچ سو میں سے ایک ہی ہو جائے تو کافی ہے ایک خاندان میں ایک عالم بھی ہو جائے تو سب کی اصلاح کر سکے گا۔

قومی مشکلات کا اجمالی حل......تو جناب رسول اللہ نے اپنا وظیفہ یہی بتلایا کہ ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ '' میں اخلاق کی تکمیل کیلئے آیا ہوں۔ تو یہی فریضہ اُمت کا بھی ہونا چاہیے کہ امت معلم بنے، اپنے لئے بھی اور غیروں کے لئے بھی، مربئ اخلاق بھی ہو، اپنے لئے بھی اور غیروں کیلئے بھی۔ اس کے ہاں مدارس بھی ہونے چاہئیں اور اس کے ہاں تربیت گاہیں بھی ہونی چاہئیں، مدارس کے ذریعہ سے علم پھیلے گا اور تربیت گاہوں کے ذریعہ اخلاق درست ہوں گے۔ تو پوری قوم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کرے جن کے ذریعہ دینی معلومات حاصل ہوں اور وہ پڑھیں اس انداز پر کہ قوم کے ایک ایک بچے کو ضروریاتِ دین کا علم ہو جائے برس دن میں ہو، چھ مہینے میں ہو، دو برس میں ہو مگر وہ لگیں اور اتنا علم ضرور حاصل کرلیں۔ اور بڑا علم حاصل کرنے کے لئے بڑے مدارس ہیں وہاں بھیج دیا جائے پوری بستی میں سے، پورے گاؤں میں سے ایک آدھ چلا جائے کافی ہے اور وہ یہاں آکر اصلاح کرے، تو اسکے بغیر قوم کی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں، یہ گویا ایک اجمالی تدبیر ہے، تفصیلات تو اسکی زیادہ ہیں کہ مشکلات کی نوعیت کیا ہے اس کا علاج کیا ہونا چاہیے؟ جس قسم کی مشکل ہے تو اسی قسم کا علاج پوچھا جائے وہ تو ہے لمبا قصہ وہ تو جبھی ہوگا جب کوئی معلم و مربی سامنے ہو اور وہ مشکلات اس کے سامنے پیش کی جائیں، وہ اس کا حل بتائے، جزوی طور پر بالا جمال یہی ہے کہ تعلیم سے علم ہو اور تربیت سے اخلاق ہوں تو قوم پلٹ جائے گی بہت سی مشکلات کا حل تعلیم سے ہوتا ہے بہت سی مشکلات کا حل نیکی تقوئی اور نیک اخلاقی سے ہوتا ہے تو حل ہو جائے گا۔

تو میں نے اس لئے یہ دو حدیثیں پڑھی تھیں کہ انبیاء قوموں کی مشکلات رفع کرنے کے لئے آتے ہیں اور سید الانبیاء بھی اپنی قوم کی اور اپنی امت کی مشکلات ہی رفع کرنے کے لئے تشریف لائے، اور تشریف لانے کی غرض وغایت دو باتیں ظاہر کیں تعلیم دینا اور تربیت کرنا، اس سے خود بخود نکل آیا کہ مشکلات کا حل انہی دو چیزوں کے اندر ہے تعلیم وتربیت میں۔ آپ نے تعلیم وتربیت کی تو اس قوم کیلئے حل نکل آیا جو صدیوں سے مشکلات میں مبتلا تھی اور اس کے بعد بھی یہی ہوتا رہا کہ جب امت پر مصائب پڑے جبھی کوئی اہل علم کھڑا ہوا جبھی علم نے راہنمائی کی جبھی اخلاق نے راستہ دکھایا اور چلایا تو قوم کی مشکل حل ہوگئی آج بھی اسی طرح مشکل حل ہوگی۔

یہ چند باتیں تھیں جو اس وقت ذہن میں تھیں وہ میں نے عرض کیں ان دو حدیثوں کو پیش نظر رکھا جائے جتنا آپ سوچیں گے، انشاء اللہ اس میں سے مشکلات کا حل نکلے گا اللہ تعالیٰ ہماری ساری مشکلات کو رفع فرمائے اور حق تعالیٰ شانہ ہمارا راستہ درست فرمائے، علم وعمل کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارے اخلاق درست فرمائے، آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

قرآن حکیم کی عملی تفسیر

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا .

اَمَّا بَعْدُ!

جہانوں کا دستورِ حیات...... بزرگانِ محترم! سرکارِ دو عالم فخرِ بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں، وہ کسی شخص واحد کا دستورِ زندگی نہیں، بلکہ جہانوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا انسانی زندگی کی دشواری اور ہمواری کے لئے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نا معلوم کہاں تک جا پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین و آسمان اور فضاء و خلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اس کے تدین کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم و اصلاح کے لئے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون و اطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

ذاتِ نبوی میں علومِ قرآنی کا ظہور...... اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ① کے بارے میں جب حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ علیہ السلام کی اس خلقِ عظیم کی سیرت و اخلاق کے سلسلہ میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ ② آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق و سیرت قرآن ہی تو ہے اور قرآن کے بارے میں خود حضرت صاحبِ سیرت علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ: وَلَا تَنْقَضِيْ

① پارہ: ۲۹، سورۃ: القلم، الآیۃ: ۴. ② مسند احمد، حدیث السیدۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا ج: ۵۰ ص: ۱۱۶.

عَجَآئِبُهُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ ① اس قرآن کے عجائبات (علوم ومعارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دل اکتا جائیں)۔

اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منتہی ہونے والے نہیں فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں لامحدود عجائبات علمی ہیں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں گویا ایک علمی قرآن ہے اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں ایک دوسرے پر من وعن منطبق ہیں پس قرآن کا کہا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے، اس لئے قرآن حکیم کی یہ ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرت مقدسہ کے عملی پہلو ہیں۔ پس قرآن میں جو چیز ''قال'' ہے وہی ذات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ''حال'' ہے اور جو قرآن میں نقوش ودال ہیں وہی ذات اقدس میں سیرت واعمال ہیں، اسی لئے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں مشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی علمی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس لئے قرآن حکیم کے مختلف مضامین سے اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ علیہ السلام کے عقائد ہیں۔ اور احکام کی آیتیں آپ علیہ السلام کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا استدلال ہیں۔ اور تشریع کی آیتیں آپ کا حال، قصص وامثال کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں۔ اور کبریائے حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی نیابت۔ اخلاق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی حسن معیشت ہیں۔ اور معاملات کی آیتیں آپ علیہ السلام کا حسن معاشرت۔ توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی خلوت ہیں۔ اور تربیتِ خلق اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی جلوت۔ قہر وغضب کی آیتیں آپ علیہ السلام کا جلال ہیں۔ اور مہر ورحمت کی آیتیں آپ علیہ السلام کا جمال، تجلیاتِ حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کا مشاہدہ ہیں۔ اور ابتغاءِ وجہ اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کا مراقبہ۔ ترک دنیا آپ علیہ السلام کا مشاہدہ ہیں۔ احوالِ محشر کی آیتیں آپ علیہ السلام کا محاسبہ۔ نفیٔ غیر کی آیتیں آپ علیہ السلام کی فنائیت ہیں۔ اور اثبات حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی بقائیت۔ انا اور انت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں۔ اور ھُـوَ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی غیوبت۔ نعیم جنت کی آیتیں آپ علیہ السلام کا شوق۔ اور جحیم نار کی آیتیں آپ علیہ السلام کا ہم وغم۔ رحمت کی آیتیں آپ علیہ السلام کی رجاء ہیں۔ اور عذاب کی آیتیں آپ علیہ السلام کا خوف، انعام کی آیتیں آپ علیہ السلام کا سکون واُنس ہیں۔ اور انتقام کی آیتیں آپ علیہ السلام کا حزن، حدود وجہاد کی آیتیں آپ علیہ السلام کا بغض فی اللہ۔ نزول

① شعب الایمان للبیهقی، ج:۴، ص: ۴۹۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفیه مسلم بن ابراهیم الهجری وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۷ ص: ۱۶۴. امام حاکم فرماتے ہیں: هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه لصالح بن عمر دیکھئے: المستدرک للحاکم، کتاب فضائل القرآن، باب اخبار فی فضائل القرآن جملة ج:۵ ص: ۱۰۴.

وحی کی آیتیں آپ علیہ السلام کا عروج ہیں۔ اور تعلیم و تبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول، تنفیذِ اوامر کی آیتیں آپ علیہ السلام کی خلافت ہیں۔ اور خطاب کی آیتیں آپ علیہ السلام کی عبادت ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کسی بھی نوع کی آیت ہو وہ آپ علیہ السلام کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقامِ نبوت کی تعبیر ہے اور آپ علیہ السلام کی سیرت اس کی تفسیر، جس سے صدیقہؓ کے اس زریں مقولہ وَ کَانَ خُلُقَهُ الْقُرْآنُ ① سے قرآن اور ذاتِ اقدس کی کامل تطبیق، اور صدیقہ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے اگر قرآن کے علمی عجائبات بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتے تو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اگر قرآن علمی طور پر تاقیامت اپنے شاخ در شاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرت جامع بھی تا یوم حشر اپنے شاخ در شاخ عملی اسوؤں سے اقوامِ عالم کی تکمیل و تسکین کی کفیل رہے گی۔

سیرت کی بنیاد...... اس توجیہ و استدلال کے سلسلہ میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے، جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں اور مطالبِ خداوندی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر قرآن حضور علیہ السلام کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے اور اس لئے کتبِ حدیث کے ہزاروں ابواب و فصول درحقیقت سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب و فصول ہیں جن میں سے گزر کر ہی آدمی اقلیمِ سیرت میں داخل ہو سکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن و حدیث سیرتِ مقدسہ کی تعبیر ہیں۔ اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کے مضامین کی ترتیب میں اولیت ایمان و عقائد کو اور پھر عبادات کو دی گئی ہے۔ فاتحۂ قرآن کو بھی اولاً ذاتِ حق، پھر اس کی ربوبیتِ عامہ، پھر رحمتِ عامہ، اور پھر مالکیتِ عامہ اور پھر عبادت و استقامت سے شروع کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کو لو تو اس کی ابتداء بھی ایمان بالغیب اور نماز و انفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے۔ بہر حال قرآن میں اولیت عقائد اور عبادات کو دی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے اسی طرح عموماً کتبِ حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب و فصول کی ابتداء ہے کتاب الایمان، پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، اور کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد اخلاق، معاملات، نکاح، طلاق، میراث، ہبہ، اوقاف پھر مسائلِ معاش، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، ملازمت اور پھر ان معاملات کے نفاذ کے لئے قضا، تعزیرات و کفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لئے آخر میں خلافت و امارت اور جہاد و سیاست کے ابواب لائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب ہیں۔ لیکن اس ترتیبِ نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیبات

① مسند احمد، حديث السيدة عائشة رضي الله عنها ج: ٥٠ ص: ١١٦.

نمایانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس وبنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں۔ خود حضور علیہ السلام نے بھی اسلام کی اساس وبنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ، شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَحَجِّ الْبَیْتِ اِنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ①

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ مُـحَـمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر استطاعت ہو۔ جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرۃ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں اور انتظامی اور سیاسی ابواب اس کے محافظ ہیں جو بعدیت کا درجہ رکھتے ہیں کہ یہ بر وتقویٰ اور دیارِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل سے محفوظ رہے اور دنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظامِ سیرتِ نبوی میں رخنہ ڈالنے کی جرأت نہ ہو۔ قرآن کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامت عبادت ودیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین وسیاست اور فتوح ممالک کو اس کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

فرمایا: ﴿اَلَّـذِیْـنَ اِنْ مَّـکَّـنّٰـھُـمْ فِـی الْاَرْضِ اَقَـامُـوا الـصَّـلٰـوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَـوْا عَـنِ الْمُنْکَرِ﴾ ② اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی سلطنت دیدیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، پاکیزہ امور کا امر کریں گے اور منکرات سے باز رہیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ دین ودیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا لیکن قہر وسیاست اور جہاد وجنگ سب کو نہیں دی گئی جہاں ضرورت سمجھی ...... دی گئی ورنہ نہیں دی گئی۔ حضور پاک علیہ السلام نے بھی اعلان نبوت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تربیت دی، وہ یہی ایمان باللہ، مبدا ومعاد، توحید ورسالت اور سزاء وجزا کے عقیدے تھے اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کیلئے عبادت وریاضت اور زہد وتقوی کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں۔

سیرتِ مقدسہ کا اساسی رنگ ...... اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا اساسی اور غالب رنگ عبادات اور تقدس ہے اور وہ دنیا کے سارے معاملات کو اسی عباداتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے یعنی اس کا طبعی رخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دنیا اور دنیا کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادت انجام دیں جن میں رضائے الٰہی ویادِ خداوندی کی روح کارفرما ہو وہ کچھ بھی کریں اللہ کے لئے کریں، نفسانی انداز اختیار کرنے کی بجائے ربانی راہ اختیار کریں اور ان کا ہر عمل مجاہدہ وجہاد یعنی عبادت ہو، عادت نہ ہو جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ بنی الاسلام علیٰ خمس، ص: ۲ رقم: ۷.

② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱.

اعلائے نفس نہ ہو، حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیل پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے اسلام کا نام دیا، فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ① کہہ دو ابراہیم کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العلمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس کا امر کیا گیا ہے اور میں ہی (اس امت میں) پہلا مسلم ہوں۔ یہی تفویض مطلق اور عبدیت کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت تھی جسے آپ علیہ السلام نے اپنی دعاء میں کھولا ہے، فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ② اے اللہ میں تیرے ہی لئے اسلام لایا اور تیرے اوپر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حَکَم مانا اور تیری ہی طرف میں جھگڑا لے گیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا ہے تو تفویض کے عجیب عجیب عنوانات ان کی زبانوں پر جاری ہوتے ہیں حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہٗ پر یہ کیفیت غلبہ کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رباعی پڑھتے تھے اور سجدہ میں گر جاتے تھے پھر وہی پڑھ کر سجدہ میں جا پڑتے جس کے راوی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرہ ہیں:۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بہ زیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ، نہ کونین توئی — از بہر تو میرم واز برائے تو زیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اسوے ہمہ وقت جس روح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکر الٰہی تفویض مطلق اور عبادات خداوندی کی روح تھی، گویا اسی کے لئے اس پاک زندگی کا لمبا چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا تھا کہ اس میں یہ ذکر و فکر کی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کی پاک زندگی کا ہر لمحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکر آخرت سے بھرپور تھا۔ ذکر عام کے بارے میں حدیث ہے کہ ”کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ“ ③ آپ علیہ السلام ہر لمحہ ذکر الٰہی میں لگے رہتے تھے اور فکر دائمی کے بارے میں ارشاد حدیث ہے کہ کَانَ دَآئِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔ ④

سیرت طیبہ کی روح...... پس آپ علیہ السلام کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست، نہ

① پارہ:۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۳۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الجمعۃ، باب التھجد باللیل ص: ۸۷ رقم: ۱۱۲۰۔ ③ السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الرجل یذکر اللہ تعالیٰ علی غیر طھر ج:۱ ص:۲۷۔
④ الشمائل للترمذی، باب کان رسول اللہ ﷺ متواصل الاحزان، ج:۱ ص:۲۵۵ رقم:۲۲۳۔

غلبہ وقہر تھی نہ تسلط واستیلا، نہ تعیش تھی نہ تزئین، نہ آرائش تھی نہ زیبائش، نہ راحت طلبی وآسائش...... بلکہ سرافگندگی، نیازکیشی، عبودیت اور طاعت وعبادت تھی جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی اور جو کچھ بھی زندگی کی نقل وحرکت تھی وہ اسی فکرِ دائمی اور ذکرِ دوامی کے رنگ میں تھی۔قرآن حکیم نے اسی ذکر وفکر کے مجموعہ کو دانائی کہا اور ''اولوالالباب''یعنی عقلمندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① (دانشمند) وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ میں۔

پس قرآن حکیم کی رو سے محض مفکر بھی دانش مند نہیں جب کہ وہ ذاکر نہ ہو اور محض ذاکر بھی پورا دانشمند نہیں جب کہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو حقیقی دانشمندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی عقل بھی ہو، اور عشق بھی ہو محبت بھی ہو اور ہوش بھی۔پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت اسی ذکر وفکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی جہاں آپ کی عبادت ان دونوں روحوں کا مظہر تھی، وہیں آپ علیہ السلام کی سیاست بھی ان دونوں روحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلیفہ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی کررہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصلہ فرمارہے ہیں، جہاد کے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کررہے ہیں، حدود وقصاص کا اجراء بھی ہورہا ہے، فتوحاتِ ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے، صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرر کئے جارہے ہیں۔یہ سب کچھ ہورہا ہے مگر صحنِ مسجد میں ذکر اللہ اور فکرِ آخرت کے ساتھ کیا جارہا ہے۔یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادت الٰہی کے رنگ میں تھا، ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر روح عبادت کی اس میں کارفرما تھی اور روح اور ڈھانچہ میں کامل مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس روح کے حسب حال تھا اور روح ڈھانچہ کی مثال۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان وعبادت اور ذکر وفکر تھا جس میں عقل وعشق، محبت وبصیرت، مادیت اور ملکیت، امارت ومسکنت، خلافت وعبادت کا کامل اجتماع اور امتزاج تھا کہ ایک سے دوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے فکر نہیں بنا سکتی تھی حتی کہ آپ علیہ السلام غزوات اور جنگوں میں بہ نفسِ نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ قیادت بھی فرماتے لیکن یادِ الٰہی اور عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں ادا ہوتی تھی۔عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دعائیں پڑھتے ہوئے آپ علیہ السلام لشکروں کی قیادت فرماتے جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا اور عین لڑائی میں جب کہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی بلکہ اس کی مدت متعین ہوتی تھی۔

---

① پارہ:۴،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۱۹۱.

آ گیا عین لڑائی میں گر وقت نماز ۔ قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قومِ حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان وعبادت تھا جس کے لئے دوسرے شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی ہوتی تھی۔

سیرت جامعہ کا عجیب خلاصہ......اب اس سیرت جامع کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ یہ سیرتِ مقدسہ اصولاً زندگی کے تین شعبوں پرمبنی ہے ❶ تعلق مع اللہ ❷ تعلق مع الخلق ❸ تعلق مع النفس۔

تعلق مع النفس کے سلسلہ میں پاکدامنی و پاک نفسی، عفت وعصمت، حیاء وانکساری، غیرت وحمیت، ہمت وشجاعت، صبر وسماحت، حلم وضبط، اعتماد وتوکل، زہد وقناعت، مجاہدہ وریاضت، تحمل شدائد ومصائب اور خداترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاق حمیدہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فطرتِ صالحہ کا خمیرہ تھے۔

اور تعلق مع الخلق کے سلسلے میں خدمتِ خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت، اعانت، جود وسخا، ایثار وعفو، راحت رسانی اور کف اذیٰ (ایذاء رسانی سے بچنا)، عفو ودرگذر، محبت وشفقت وسوزی وہمدردی، تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ وغیرہ آپ علیہ السلام کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔

اور تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت وریاضت، مجاہدہ ومراقبہ، کسرِ شہوت ولذت، تقرب وانابت، توبہ واستغفار، تہجد وشب بیداری، ذکر وفکر وغیرہ آپ علیہ السلام کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔ لیکن ان تینوں تعلقات میں "تعلق مع اللہ" ہی دونوں تعلقات کی استواری کی روح تھی جو نفس وخلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے اگر نفس انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔

از روئے مشاہدہ سیرت طیبہ کی ضرورت......آج بھی جو اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں تو طرح طرح کی مہلک لغزشوں سے دنیا فتنہ وفساد کا گھرانہ بنی ہوئی ہے۔ آج یورپ میں عقل وفہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی نہیں، سیاسی تعلقات کی ہمہ گیری اور ان کی تدابیر کی کمی نہیں حتیٰ کہ صرف انہی بین الاقوامی تعلقات کے لئے متحدہ کونسل یو، این، او (U.N.O) بھی قائم ہے جس میں رات دن ممالک کے باہمی معاملات زیرِ غور آتے رہتے ہیں، خانگی زندگی کے لئے تربیتوں کے بے انتہاء ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لئے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں لیکن اس کے باوجود انہی کے اقراروں اور اعلانوں سے یہ ہی واضح ہوا ہے کہ گھر اور باہر سے سُکھ اور چین مفقود ہے۔ یہی نفوس کہ جن کی طمانیت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، امن واطمینان کی ہوا تک سے کوسوں دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لئے نہیں کہ فقدانِ اسباب ہے۔ اسباب تو سب مہیا ہیں بلکہ مسبب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خداپرستی، خوفِ آخرت اور مالک

الملک کے سامنے جوابدہی کا فکر معدوم ہے۔ اعتقاداً یا عملاً جو ان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا جس سے ان نفوس میں یہ جذبۂ انقیاد واتباعِ حق کے بجائے خودرائی اور خود بینی کے جراثیم پرورش پائے ہوئے ہیں۔ مدار کار غرورِ نفس ہے، یقینِ حق نہیں جس کے تحت خود غرضیوں اور قومی، نسلی اور وطنی تعصبات کی آگ سلگ رہی ہے اور اس سے تمدنی، سیاسی اور اقتصادی اونچ نیچ کی مہلک وباءِ سکون وامن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا ان کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے لیکن دلوں میں ان سے تنفر کے جذبات لئے ہوئے اور ان کی جبری قیادت کا جواء بھی سروں سے اتار پھینکنا چاہتی ہے یہ محبوبیت کا فقدان اسی خداپرستی کے نہ ہونے سے رونما ہوا جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کی ہمواری کے رہنا ممکن نہیں۔

اسی لئے حضرت صاحبِ سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرتِ مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطۂ حیات ارشاد فرمایا ہے کہ: مَنْ اَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللهِ اَصْلَحَ اللّٰهُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ ① جس نے اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ درست کرلیا اس کے درمیان اور خلق کے درمیان خود اللہ تعالیٰ معاملہ درست فرمادیتا ہے۔ اس لئے اگر آج ہم اس سیرت پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں تو اس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے ان کی روح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی کو بنانا ہوگا جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مقدسہ کا اساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

سیرتِ طیبہ سے بیگانگی کا نتیجہ...... اب اگر ہم سیرت، عبادت واخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہوکر مثلاً محض قہر وسیاست اور اقتدار وغلبہ کی سیرت کو مطمع نظر بنالیں جس میں یہ اخلاقی روح نہ ہو تو یہ کوری سیاست ملک عضوض ''کٹکھنی بادشاہی'' ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت ظلم وستم، زبردستی اور زبردستی آزادی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہ عامہ کو مقصد زندگی ٹھہرالیں جس میں خداترسی اور اخلاقی قدریں نہ ہوں تو وہ کوری خود غرضی، نمود ونمائش اور شہرت پسندی ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح وذم سے بالاتر ہوکر غناواستغناء کی دولت نصیب نہ ہوسکے گی۔

پھر اس کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہوکر محض عبادت اور خلوت گزینی اختیار کریں گے تو نہ صرف ہم تعاون باہمی کی ان تمام قوتوں سے محروم ہوجائیں گے جو مدنیت کی روح اور اجتماعیت کی اساس ہیں اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت نہیں انجام پاسکتی جو سیرت پاک اور طبیعت اسلام کے تقاضے ہیں بلکہ اس قید تنہائی میں گلّے سے الگ ہوکر کسی وقت نفس وشیطان کی مکاری سے پناہ نہیں پاسکیں گے جنہوں نے خلوت گزیں اور راہبوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

---

① كنز العمال ج: ۱۵ ص: ۷۹۸ (الديلمي عن قدامة بن عبدالله بن عمار له صحبة).

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمت نفس بلا خدا ترسی نفسانیت ہے، انقطاعی عبادت بلا خدمت خلق رہبانیت ہے اور ریاست بلا عبادت ملوکیت واستبدادیت ہے اور ظاہر ہے کہ رہبانیت حضور علیہ السلام کی سیرت ہے نہ ملوکیت نہ نفسانیت اور نہ ہی انانیت آپ علیہ السلام کی سیرت ہے۔ کیونکہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتیں ایسے ہی اپنی روح سے الگ ہو کر اس روح کے خلاف خود رو نقشوں اور رسوم کے اجزائے سیرت بھی نہیں کہلائی جاسکتیں کہ انہیں جزوی سیرت ہی کہا جاسکے البتہ جب اس خدمت خلق اور خدمت نفس کے خانوں میں اخلاق وعبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور سب اجزاء اپنے اپنے نقشوں کے ساتھ عبادت کے محور پر جمع ہو جائیں تو پھر اس جامع سیرت کا عکس پیدا ہو جائے گا جس کا نام لے کر ہم اس کا کام کرنا چاہتے ہیں اب اسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رہبانیت نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت بلکہ ربانیت کہیں گے جس میں انسان اپنی نقل وحرکت کا مرجع ومحور اپنے رب کو بنالے گا۔

پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکار دو عالم دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامع ترین سیرت ہے جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ اور محکوم کی الگ، اس میں دیانت بھی ہے خدمت بھی ہے اور عنایت بھی، اور ان سب عناصر کے امتزاج سے سیرت صالحہ کا یہ حاصل نکل آتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں مگر ان پر عقل کی حکومت ہو عقلی نظریات بھی ہوں مگر ان پر وحی الٰہی کی نگرانی ہو آزادئ ضمیر بھی ہو مگر اس میں حق کے ساتھ تقلید ہو۔ غرض نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز پامال نہ ہو سکے، سب کے تقاضے کارفرما ہیں مگر ہر ایک کی نقل وحرکت کا محور طاعتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندیٔ حق سے آزاد نہ ہوں پس اسی جامعیت اور اعتدال کامل کا نام سیرتِ مقدسہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

سیرتِ جامعہ کی عملی پیروی کی ضرورت...... آج مگر ہم لوگ اپنے نونہالوں کے لئے سچے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اونچے پیمانے کے دیندار اور خدا پرست ہوں جن میں رواداری، بے قاعدگی بداعتقادی اور اصولِ آزادی نہ ہو، ان کی نگاہ خدا پر ہو اور اسی پر بھروسہ اور اعتقاد رکھتے ہوں اور دوسری طرف وہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات ومعاملات میں دیانت صداقت وراست گوئی وراست بازی ہو، شخصی مفاد کے غلبہ کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد ان پر غالب ہو ایک طرف وہ مساجد ومدارس کی زینت ہوں اور دوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں میں فروغ پا رہا ہو۔ ایک طرف ان کی خلوت گاہیں یادِ الٰہی سے بھرپور ہوں اور دوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر ان کی عدل گستری سے معمور ہوں۔ ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوشحال وخوش مال ہوں اور دوسری طرف اہلِ ملک ان کی طرف رجوع ہو کر نہ صرف ان سے عزت مندانہ تعلقات ومعاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھے بلکہ ان کے مثالی معاملات سے بھی درس لیں۔

تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرتِ جامع کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انہیں دستیاب نہیں ہو سکتی، حق تعالیٰ شانہ اپنے پیغمبر کی سیرتِ مقدسہ اور اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانے اور اس کے بھرپور اتباع کرنے کی توفیق نصیب فرماوے آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حیاتِ طیّبہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ①

زندگی ایک مقدس امانت...... بزرگانِ محترم! اس وقت قرآن شریف کی ایک آیت میں نے تلاوت کی ہے، جس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان کی سعادت اور اس کی ترقی کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے، جسکی کچھ تشریح اسوقت آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ پہلے آیت کا ترجمہ سن لیجئے...... حق تعالیٰ فرماتے ہیں "جس نے بھی نیکی کی اور عمل صالح اختیار کیا، مرد ہو یا عورت، تو ہم اس کو ایک نہایت ہی پاکیزہ زندگی عطاء فرمادیں گے جو حیات طیبہ ہوگی، صاف اور اعلیٰ ترین زندگی اور اس کی اس نیکی پر ہم بہت اجر و ثواب بھی اس کو عطاء کریں گے"۔

نیکی کرنے پر دو وعدے کئے گئے ہیں: ایک پاکیزہ زندگی کا اور ایک اجر کا۔ اسے یوں سمجھئے کہ مستعار زندگی جو چنددن کی ہمیں دی گئی ہے، حقیقت میں ہمارے پاس ایک امانت ہے، اس امانت کو اگر نباہنا ہے تو ایمانداری کے ساتھ اس کو مالک کے سپرد کردینا ہے، اس لئے کہ اس زندگی کے ہم خود مالک نہیں ہیں، نہ ہم نے بنائی، نہ پیدا کی، نہ از خود اس کو ختم کرسکتے ہیں۔ دینے والے بھی حق تعالیٰ ہیں اور لینے والے بھی وہی۔ تو جس کے ہاتھ میں لینا اور دینا ہے وہی مالک قرار دیا جاسکتا ہے، ہمارے بلا ارادہ زندگی آ گئی، بلا ارادہ ہم سے چھین لی جائے گی۔ لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے، اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے۔ تو محض ایک مستعار زندگی کو ہم کس طرح گزاریں۔

زندگی کا مادہ...... تو ہماری زندگی کا ایک مادہ ہے اور ایک اس کی صورت ہے۔ زندگی کے مادے کو بھی سمجھ لیا جائے اور اس کی صورت کو بھی۔ آگے اسی زندگی کے بارے میں بہت سی صورتیں آئیں گی مگر مادہ ایک ہی رہے گا

① پارہ:۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ:۹۷.

اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی مثلاً گارا ایک ہے اسی گارے سے برتن بھی اور دیگر سب سامان بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ سب گارے کی شکلیں ہیں، مادہ مشترک رہے گا، اینٹ میں بھی گارا، بلڈنگ میں بھی گارا اور برتنوں میں بھی گارا، ایک ہی مادہ پر مختلف شکلیں آتی ہیں۔ اسی طرح زندگی جو ہمارے لئے ترقی یا تنزل کا باعث ہوتی ہے اخیر تک اس میں ایک ہی مادہ موجود رہتا ہے اور یہ مادہ دو چار چیزیں ہیں سب سے پہلی چیز کھانا پینا ہے اسی سے مدارِ زندگی ہے اگر نہ کھائے پیئے تو اسے مردہ کہا جائے گا: ﴿جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ﴾ وہ بدن جو کھانا نہیں کھاتے......اس کے بعد پہننا اور اوڑھنا ہے پھر رہنا سہنا یعنی مکان بنانا ہے جس میں ہم اپنی زندگی اور اپنے رشتے کو محفوظ کر سکیں، اس کے بعد موانست اور انس باہمی سے زندگی بڑھانا ہے جس کو تمدن، تعاون، توالد اور تناسل کہیں گے یہی چار چیزیں کھانا پینا، اوڑھنا، رہنا سہنا اور باہم مل جل کر رہنا یہ بنیادی چیزیں ہیں، جن سے ہماری زندگی بنتی ہے اور یہی چار چیزیں آئندہ لوٹ پوٹ کر آتی ہیں اس میں کچھ اسباب اور وسائل ہیں اصل میں چار ہی چیزیں ہیں۔

کھانے پینے کیلئے غلہ کی کاشتکاری وغیرہ کی ضرورت ہے الغرض ایک لمبا دھندا ہے جس سے ہمیں چار دانے سُپرد ہوتے ہیں، اس کے لئے بازار بنتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں یہ خرچ کرتا اور کماتا ہے۔ تو کھانا پینا اصل تھا اس کی ضرورت سے بازار قائم کئے جائیں گے اور اسی کی خاطر پیشہ حاصل کیا جائے گا تو زمین، بازار، پیسہ، کھانے، پینے، رہنے سہنے کے اسباب میں سے ہوئے۔ اسی طرح آپ امن وسکون قائم کریں، باہمی لین دین کریں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ باہمی لین دین سے زندگی کے اسباب آسانی سے حاصل کئے جاسکیں اور کھانے پینے، رہن سہن کی ضرورت میں سے آسمان بھی ہے جس سے پانی برسے، آفتاب بھی ہے جو گرمی پہنچائے، ہوا بھی ہے جو زندگی قائم رکھے۔ تو یہ لمبا چوڑا کارخانہ اس لئے ہے کہ چار دانے چار کپڑے اور مکان ہمیں میسر آجائے، تو پورا عالم ہمارے لئے خدمت کر رہا ہے۔

انسانی زندگی کا دورِ اوّل حیوانیت......تو انسان کی زندگی کا پہلا دور یہ ہے کہ اس کا تمام تر مقصد کھانا پینا ہوتا ہے، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی کھانے پینے کے لئے چلاتا ہے، جہاں ماں نے اس کے منہ میں دودھ ڈالا وہ چپکا ہو گیا، معلوم ہوا اس کا شور مچانا غذا کیلئے تھا اگر وہ نہ چلاتا تو ماں کو خبر نہ ہوتی، اگر بچہ نہ روتا تو ماں کی چھاتی میں دودھ جوش نہیں مارتا بچہ کا رونا ایک فریاد ہے، ماں کی مامتا اور محبت جوش میں آتی ہے اور جوش سے دودھ جوش میں آتا ہے اور دھاریں پھوٹتی ہیں تو سب سے پہلے پیدا ہوتے ہی نہ کپڑا مانگتا ہے نہ مکان۔ پھر گرمی سردی ستاتی ہے تو چلاتا ہے اور ماں کپڑا اوڑھاتی ہے، معلوم ہوا کہ سردی گرمی ستا رہی تھی۔ زیادہ کپڑے لاد دیئے پسینہ آ گیا تو چلانے لگا تو ماں کے دل میں الہام ہوتا ہے کہ اب اسے گرمی ستا رہی ہے یہ کپڑے اتار دیتی ہے اور پنکھا جھلنے لگتی ہے تو پہلی ضرورت تھی کھانے کی، دوسری لباس، تیسری گرمی اور سردی اور دھوپ سے بچنے کیلئے مکان کی اور ذرا بڑا ہو گیا، کچھ ہوش آ گیا تو اس میں انس ومحبت کا مادہ بھی آ گیا اب چھوٹے بچوں کو اپنے لئے تلاش کرتا ہے، کسی بچے کو

آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ بڑے بوڑھوں کی صحبت میں بیٹھے گا یا وہ علماء وصلحاء کی مجلس کو تلاش کرے گا کہ وہاں جا کر بیٹھ جائے، نہیں بلکہ اپنے ہم عمروں سے کھیل میں لگے گا۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

ہر چیز اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے جوان جوانوں کی طرف، بوڑھا بوڑھوں کی طرف مائل ہوگا، معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اُنس موجود ہے، وہ جانوروں کی طرح بھٹوں اور گھونسلوں میں نہیں رہ سکتا، ایک آبادی بنا کر رہتا ہے، شہری زندگی قائم کرتا ہے تاکہ اُنس ومؤانست آتی رہے کیونکہ انسان انس سے مشتق ہے:۔

وَمَاسُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا لِاَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

عربی کا شاعر کہتا ہے کہ انسان کا نام انسان اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں انس ہے اور قلب کے معنی لوٹ پوٹ کے ہیں۔ قلب ہر وقت متحرک رہتا ہے اس میں خیالات الٹتے پلٹتے رہتے ہیں اس تَقَلُّب کی وجہ سے اسے قلب کہنے لگے، اگر بچے کو آپ تنہائی میں ڈالیں تو چلائے گا اور اس کے ساتھ کوئی بیٹھ گیا اور کسی سے بولنے لگا تو چپکا ہو جائے گا، معلوم ہوا کہ اس میں انس کا جذبہ ہے وہ ابھر رہا تھا، اس کا علاج مل گیا تو خاموش ہو گیا۔

یہ چار چیزیں ہی زندگی کا مادہ ہیں اور لوگوں کا یہ مقصود زندگی ہے اس زندگی کا نام ہم حیوانی زندگی رکھیں گے یعنی حیوانیت کا تقاضا ہے کہ کھائے پیئے۔ آپ نے چوپایوں کو دیکھا ہوگا کہ جب بھی آپ گائے بھینس کو دیکھیں گے چر رہی ہیں یا پھر ہگ رہی ہیں اور پھر کھانے لگی ہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں ۲۴ گھنٹے جانور کا کام کھانے کا ہے بھینس کو آپ پالیں گے تو ایک مستقل آدمی رکھنا پڑے گا کہ اس کی پرورش کرے رات بھر کھڑے کھائے گی کچھ آنکھ لگ گئی پھر جب جاگی تو کھانے لگی تو حیوان کا طبعی تقاضا کھانا پینا ہے، گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی حاصل کرنا یہ حیوانیت کا تقاضا ہے تو معلوم ہوا کہ انسان کی وہ زندگی جس میں کھانا پینا، رہنا سہنا ہی مقصد ہو وہ حیوانیت کی زندگی ہے۔ آپ جتنا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کھائیں گے، بہترین بلڈنگ بنائیں گے یہ سب حیوانیت کا تقاضا ہے۔ سانپ اپنے لئے بھٹ بنالیتا ہے، شیر اپنا ٹھکانہ اور چڑیا اپنا گھونسلہ بنالیتی ہے، چونٹیاں سوراخ تلاش کر لیتی ہیں، انسان بلڈنگ بنالیتا ہے کتنی اعلےٰ بلڈنگ کیوں نہ ہو حیوانیت کے دائرے سے نہیں نکلے گا تو بچہ ابتداء سے ہی ان چیزوں کو چاہتا تھا، یہ حیوانی زندگی تھی۔

انسانی زندگی کا دورِ ثانی عقل وشعور...... اب ذرا شعور آیا، دس برس کے بعد اس میں عقل کے مادے نے آنا شروع کر دیا ابھی تک اس کی زندگی طبیعت کے نیچے تھی اور طبع بشری جو چاہتی تھی وہی ہم کرتے تھے تو ہماری طبیعت حاکم اور ہم اس کے غلام اور محکوم تھے۔ فلاسفہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور واقع ہوتی ہے، اس کے اندر جذبات ہوتے ہیں شعور اور سمجھ نہیں ہوتی تو ایک جاہل بادشاہ طبیعت حکم دیتی ہے کہ کھاؤ، بھوک لگی ہم نے کھانا شروع کر دیا، چاہا پانی پینے کو ہم نے کہا: بہت اچھا، چاہا مکان بنالو ہم نے تعمیل شروع کر دی، تو ایک بے شعور حاکم کے

احکام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے کیوں کہ یہ سب طبیعت کے تقاضے تھے چودہ پندرہ برس بعد اب انسان کو شعور آنا شروع ہوا اور ہر چیز میں عقل سے غور کرنا شروع کیا اس میں سمجھ آئی۔ تو اس شعور و عقل کے بعد مادہ زندگی بدلتا رہے گا کل تک طبعی جذبہ سے کھا رہا تھا آج عقل نے اس میں لطافت پیدا کر دی۔

ایک اجتماعیت کا مادہ ہے اور ایک ظرافت کا جس کو "جمال پسندی" کہتے ہیں یعنی کھائے مگر ذرا خوشنما بنا کر کھائے، پہنے مگر ذرا عمدہ کر کے پہنے، رہے مگر ذرا بلڈنگ کو اچھا بنا کر رہے، اس کی طبیعت جب عقل کے نیچے آ جائے تو عقل پورا زور لگا کر مکان بنائے گی، ڈیزائن بھی اچھا ہو، گویا فنِ انجینئری پیدا ہوگا۔ کہ عمدہ عمدہ نمونے بنائے جائیں، کھانا طبعی تقاضا تھا مگر عقل نے چاہا کہ برتن بھی خوشنما ہوں کھانے کا رنگ بھی ذرا عمدہ ہو، نگاہوں کا سینکنا بھی مقصود ہو جاتا ہے، آج نوع بنوع کھانے بنتے ہیں۔ یہ سب عقل کا تقاضا ہے، طبیعت اس کے اندر کام کرتی ہے، عقل اس کو ذرا درست کر لیتی ہے کہ اس کی شکل بھی عمدہ بنے۔ آپ کیک بنائیں گے تو اس کا مادہ ایک ہی ہے مگر شکل الگ الگ بناتے ہیں، کسی کی چڑیا کی شکل بنادی، کسی کی پھول جیسی، اس میں رنگ بھر دیئے، موتی لگا دیئے کہ آنکھیں بھی دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔

اگر یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو مزہ پھر بھی پیٹ کا وہی رہتا۔ اگر آپ نے سردی سے بچنے کے لئے ایک موٹا سا کمبل اوڑھ لیا تو طبیعت کا تقاضا پورا ہو جائے گا مگر عقل کہتی ہے کہ اس کا رنگ بھی عمدہ ہو، اون بھی ذرا ملائم ہو، ذرا قیمتی ہو کہ دیکھنے والا کہے کہ بڑا آدمی ہے تو محض طبعِ بشری کا تقاضا تو ڈھانپنا تھا مگر عقل کا تقاضا اسے خوشنما بنانا ہے تو آج دنیا میں جو ڈیزائنوں کی افراط ہے کہ آپ کوٹھیاں نئی نئی طرز کی بنائیں، چھت بھی ایسی ہو، دیواریں ایسی ہوں پلاستر اور دیگر آلات ایسے ہوں، یہ ظرافت پسندی اور جمال ہے جو انسان میں رکھی گئی ہے، آج جو کپڑوں کے ہم نمونے دیکھتے ہیں کوئی مادہ نہیں چھوڑا جس سے کپڑے نہیں بنائے، روئی کے کپڑے تو خیر ہیں ہی، اون اور درختوں کی چھال، گتوں اور کاغذ کے کپڑے بنتے ہیں اور اب کانچ کے کپڑے بنانے پر غور ہو رہا ہے، جتنی جڑی بوٹیاں جنگل میں ممکن ہیں انسان نے غور کر کے سب کے مطابق طرز اور نقش ونگار بنالئے، جالدار کپڑے الگ، مشجر الگ، دنیا نے اتنے رنگ کے کپڑے کبھی نہیں دیکھے جتنے آج دیکھ رہے ہیں۔

یہ محض طبیعت کا تقاضا ہے جس میں عقل اور جمال پسندی کی آمیزش ہوگئی اگر نمونے کا حصہ چھوڑ دیا جائے تو گھونسلہ بنا کر جہاں چاہے رہ جائے، یہ سارے مسائل نمونہ کی خوشنمائی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں پینے کے لئے سوڈے کی دکان پر جائیں گے تو رنگ برنگ کا پانی دیکھیں گے کوئی سبز، کوئی سرخ، کوئی زرد، کوئی نارنجی، ذائقہ درست کرنے کے لئے تو سب ایک ہی ہیں مگر آدمی چاہتا ہے کہ جب میں پیوں تو آنکھوں کو بھی لذت ہو، ہاتھ کو بھی، زبان کو الگ لذت آ جائے اور سارے ذائقے جمع ہو جائیں، یہ چیز انسان میں ہے جانوروں میں نہیں رکھی گئی۔ جانور تو کھا پی کر ہضم کرے گا پیٹ میں بوجھ کر دے گا۔

حضرت آدمؑ کے زمانے میں گائے جس طرح کھاتی تھی آج دس ہزار سال بعد اسی طرح کھاتی ہے، جس طرح پہلے قضائے حاجت کر رہی تھی ایسے ہی اب کرتی ہے یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، تو جانوروں میں یہ مادہ ظرافت اور جمال پسندی کا نہیں ہے، جنات میں بھی نہیں ہے ویرانے میں رہتے ہیں، آج تک انکی کوئی بلڈنگ نہیں دیکھی گئی، چڑیا جانور کسی میں یہ مادہ نہیں، کسی نے درخت کو ٹھکانہ بنالیا کسی نے زمین کھود کر ڈیرہ بسالیا مگر یہ انسان ہے جو جمال پسندی میں دنیا بھر کے مادے خرچ کرتا ہے، مکان، کپڑا، کھانے کی شکلیں بھی عمدہ عمدہ تجویز کرتا ہے۔

مغل شاہِ ہند کا ایرانی شہزادے پر کھانے کے ذریعہ رعب ڈالنا...... ایران سے بادشاہِ ہندوستان کے پاس شہزادہ آیا مغلوں کی سلطنت کا زمانہ تھا تو شاہی باورچی کو حکم دیا گیا کہ کوئی نئی قسم کی چیز تیار کرو، تو ناشتے کیلئے ایک چیز تیار کی اور ایک بہت عمدہ خوانچہ میں رکھ کر لے آیا تو بہت عزت کے ساتھ بلا کر اسے حکم دیا کہ اسے دربار میں کھولدو...... کھولا تو معلوم ہوا کہ بھینسے کا کٹا ہوا سر رکھا ہے اور تازہ خون بہہ رہا ہے شہزادے کو بڑا تکدر ہوا اور حیرت زدہ ہوا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے، بادشاہوں کے پاس بھینسے کا سر لے آیا ہے اس نے کہا کہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نے کبھی اچھی چیز نہیں کھائی، اسے ذرا اپنے بادشاہ کو رعب دکھانا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک خاص قسم کی مٹھائی تیار کی گئی تھی، بھینسے کا سر تھا مگر اس کے اندر زبان ایک عجیب ذائقے کی مٹھائی تھی، دانت اور ذائقے کی مٹھائی تھی، اس کی کھال میں اور ذائقہ تھا، جب اس شہزادے نے چکھا تو حیران رہ گیا کہ عجب چیز ہے تو باورچی کو یہ حجت تمام کرنی تھی کہ تمہارے فرشتوں نے بھی کبھی اس قسم کے کھانے نہیں کھائے جو ہندوستان میں بنتے ہیں۔ یہ جمال پسندی تھی محض مٹھائی لا کے رکھ دیتے شہزادہ کھا پی لیتا اس مصیبت کی کیا ضرورت تھی کہ اس کو بھینسے کی صورت دی، اس کا گلا کٹا ہوا دکھایا کہ خون اس میں بہتا ہے فن کا کمال دکھانا تھا۔

ان فنی کمالات کیلئے آج دنیا میں مستقل کمپنیاں ہیں جن کا کام یہ ہے کہ میزوں کو سجائیں، سینکڑوں روپے محض انکو سجانے کے لئے بطور اجرت دیئے جاتے ہیں۔ تو طبع بشری تو کھانا پینا چاہتی ہے، عقل بشری چاہتی ہی کہ اسکے اندر خوشنمائی پیدا کی جائے۔ طبع بشری چاہتی ہے کہ کوئی ہمجولی مل جائے تو اس سے انس و محبت سے بات کی جائے اور عقل چاہتی ہے کہ بات کریں تو لہجہ بھی شائستہ ہو، کلام بھی مہذب ہو، بیٹھنے اٹھنے کا ڈھنگ بھی ذرا اچھا ہو۔

انسانی زندگی کا باشعور حکمران...... جب زندگی اس نوبت پر پہنچے اور کھانے پینے کو آپ عقل کے نیچے لے جائیں تو ہم اسے انسانی زندگی کہیں گے، کل تک یہ چیزیں طبیعت کے حکم میں تھیں آج وہ عقل کی محکوم بن گئیں، پہلے ایک جاہل بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا اور اب ایک باشعور حکمران کی حکمرانی کے نیچے آگئیں یعنی عقل کے، جس میں سوچ ہے اور سمجھ ہے۔

اس کے ساتھ ایک چیز اور بڑھ جاتی ہے وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ خود غرض بچہ یہ چاہے گا کہ میں کھالوں میرے بھائی بند کھا رہے ہیں یا نہیں، مثلاً اس کی بلا سے ایک کتا آجائے گا آپ ہڈی ڈالدیں گے وہ

کھائے گا دوسرے کتے کو ملے یا نہ ملے آپ سے کیا بلکہ دوسرا کتا تو لڑنے مرنے کو تیار ہو گا بلکہ سارے محلّہ کے کتوں سے لڑتا ہے، اسی طرح سے دیگر جانور بھی لڑتے ہیں کہ میری غذا دوسرے کے پاس نہ جائے۔ یہ حیوانیت کا تقاضا ہے کیونکہ طبع حیوانی بالطبع خود غرض واقع ہوتی ہے اپنا نفع چاہتی ہے دوسرے کا نفع نہیں لیکن جب عقل آ جاتی ہے تو وہ چاہتی ہے کہ عمدگی کے ساتھ میں بھی کھاؤں اور میرے بھائی بند بھی کھائیں تو عقل نے آ کر اجتماعی زندگی سکھلا دی۔ تو عقل نے دو باتوں کا اضافہ کیا ایک ظرافت یعنی جمال پسندی کا اور ایک اجتماعیت کا کہ جہاں ہمیں مل رہا ہے ہمارے بھائیوں کو بھی ملنا چاہیے، یہ بُری بات ہے کہ تنہا بیٹھ کر کھائیں اور دوسرے بھوکے رہیں۔ تو جب آدمی میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تو کہا جائے گا کہ یہ انسانی زندگی کے اندر آ گیا، مگر اس کا مادہ بھی وہی چیز ہے جو حیوانی زندگی کا تھا وہاں خود غرضی کیلئے استعمال ہوتی تھی عقل کے نیچے آ کر اجتماعی شان کیلئے استعمال ہونے لگی، اور سارے بنی نوع کا فائدہ ہونے لگا۔

اب اسی حالت میں انسانی تمدن لین دین تجارت اور زراعت قائم کرتا ہے تو اجتماعیت کی شان جمال پسندی اور بنی نوع کے فائدے کے لئے دیکھنا اور سوچنا، یہ بھی عقل کا کام ہے تو مادہ وہی رہا مگر اس کی شکل بدل جاتی ہے کیونکہ حکام بدلتے جاتے ہیں، اگر حاکم خود غرض ہے تو محکوم بھی خود غرض ہو گا اور اگر حاکم کے اندر جماعت پسندی اور جمال پسندی ہو تو محکوموں میں بھی یہی چیز آئے گی۔ جب عقل نے دائرۂ حکومت سنبھالا تو سارے افراد بنی آدم کا فائدہ اس میں ہو گا یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ میں بھی راضی رہوں میرے بھائی بند بھی راضی رہیں۔ مثل مشہور ہے ''نہ تنہا ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے نہ روتا ہوا'' کسی جماعت کے ساتھ مل کر ہنستا ہے تو ہنسی ہے اور جماعت کیساتھ ہی روتا ہے تو رونا بھی ہے۔

انسانی زندگی کا تیسرا دور ایمان کی حکومت...... اب انسانی زندگی کو ذرا ایک قدم اور بڑھا دیجئے کہ طبع بشری کھانے پینے سے محض نفس کی رضا چاہتی تھی جب عقل آ گئی تو اب بنی نوع کی رضا سامنے آ گئی کہ میرے سارے بھائی بند بھی راضی ہوں اگر کسی کے اندر ان تمام افعال میں یہ چیز بھی پیش نظر ہو جائے کہ تنہا میں راضی نہ ہوں نہ تنہا میرے بھائی بند راضی ہوں بلکہ میرا خدا بھی راضی ہو تو اب یہ ایمانی زندگی شروع ہو گئی، وہی چیزیں اب ایمان کی حکومت کے نیچے آ گئیں جو اب تک عقل اور طبیعت کی حکومت میں تھیں۔

عقل انسانی جماعت پسندی اور مفاد عامہ کی رہبری کرتی تھی لیکن جب ایمان کی روشنی آئی تو اب یہ فکر پڑی کہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو سوچے کہ کھانا اس طرح سے کھاؤں کہ میرا خدا بھی راضی ہو، لباس پہنوں تو اسے اس طرح سے پہنوں کہ میرا خدا بھی راضی رہے، ایسا لباس نہ پہنوں جو اس کی منشاء کے خلاف ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ ''بنی آدم میں مردوں کے لئے ریشم کا کپڑا پہننا حرام ہے'' (۱) ریشم کا کپڑا پہننے سے نفس اور بھائی بند تو راضی

---

(۱) السنن للترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء في الحرير والذهب ج: ٦ ص: ٣٢٥.

ہو جائیں گے کہ بڑا عمدہ لباس پہنا ہے مگر اللہ میاں راضی نہیں۔ تو عقل اور نفس تو راضی ہو گئے مگر خدا راضی نہیں ہوئے۔ تو ایمان کی حکومت میں آ کر آدمی سوچتا ہے کہ کون سا لباس جائز ہے کون سا ناجائز! کون سا حلال اور کون سا حرام!...... حدیث میں فرمایا کہ سونے کا استعمال مردوں کیلئے حرام ہے کسی نے سونے کی انگوٹھی پہن لی تو قطعاً ناجائز ہے، حرام ہے، فرمایا: حِلْيَةُ اَهْلِ النَّارِ ① اہل جہنم کا زیور ہے، یہ آگ کی طرف لے جائے گا، البتہ سونے کے بٹن کے بارے میں شریعت نے اجازت دی ہے لیکن اس وجہ سے کہ اس کو لباس کے تابع سمجھا گیا ہے جیسے لباس پر زری کا کام کیا جائے تو بٹنوں کو کپڑوں کے حکم میں پھول بوٹوں کی شکل میں سمجھا گیا ہے، مگر بٹن کی بھی ایک مقدار ہے کہ وہ تین ماشے سے زیادہ نہ ہو بہت زیادہ وزنی پہنے گا تو یہ ہوسنا کی ہوگی اس کے ساتھ فقہاء یہ بھی قید لگاتے ہیں کہ اگر بٹن کا استعمال ہو تو بدن سے نہیں لگانا چاہیے بلکہ کسی کپڑے سے سی کر پہنا جائے تاکہ براہ راست سونا بدن سے مس بھی نہ کرے، لباس کے اوپر سلا ہوا ہو اتنی قیود کے ساتھ اجازت دی گئی ہے تو جب آدمی ایمانی زندگی اور ایمانی حکومت کے نیچے آئے گا تو ایک بٹن بھی سامنے آئے گا تو سوچے گا کہ کس طرح...... جائز ہے کس طرح نہیں؟ کتنا پہنوں کتنا نہ پہنوں؟ محض عقل تو اجازت دیدے گی کہ پانچ پانچ تولے کے بٹن پہن لو۔ چاہے تو ہار اور کنگن بھی پہن لو، عقل نہیں روکے گی اس لئے کہ عقل زیادہ سے زیادہ نفس کی رضا چاہتی ہے یا انسان کی رضا رہی خدا کی رضا! تو اس کا تعلق تو ایمانی زندگی سے ہے۔

اسی طرح کھانا کھانے کے لئے آدمی بیٹھے گا تو غور کریگا کہ یہ خنزیر تو نہیں جو حرام ہے یہ فلاں جانور کا گوشت نہیں ہونا چاہیے، حرام چیز سے اس طرح بھاگے گا جیسے سنکھیا سے بھاگتا ہے اس لئے کہ سنکھیا مادی موت کا سبب ہے اور حرام چیز کھانا روحانی موت کا سبب بن جاتا ہے لیکن محض عقل ....! وہ تو ممانعت نہیں کرے گی چاہے سانپ کھائے، خنزیر کھائے، لیکن ایمان اجازت نہیں دیگا۔ اس واسطے کہ ہر گوشت ہر پوست میں ایک خاصیت ہے تو جیسے اطباء بری خاصیت کی اشیاء کے کھانے سے ممانعت کرتے ہیں، اطبائے روحانی حضرات انبیاء علیہم السلام بھی بری اشیاء سے روکتے ہیں ہر گوشت کی ایک خاصیت ہے۔ خنزیر کی طبیعت میں بے حیائی اور بے غیرتی ہے نجاست خور ہے غلاظت خور ہے، ایک خنزیر دوسرے ہم جنسوں پر جست (مباشرت) کرتا ہے تو ویسی گندگی اور وہی صورت اس کے کھانے والوں میں بھی آئے گی۔ غلاظت، کدورت، بے حیائی اور بے غیرتی جیسے اوصاف پیدا ہوں گے۔ درندوں کا گوشت شیر، بھیڑیا وغیرہ کا حرام قرار دیا گیا، کیوں کہ ان کے گوشت کے اندر درندگی کی خاصیت ہے تو ان چیزوں کا کھانے والا انسان اعلیٰ جانور بن جائے گا اور انسانیت ختم ہو جائے گی اس لئے شارع علیہ السلام نے ممانعت کر دی........ اور ایسے جانوروں کی اجازت دی جو اعتدال کی شان رکھتے ہوں تاکہ عدل پیدا ہو یہ خاصیت اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے کس مخلوق کو کیسا بنایا اس کا حق ہے کہ وہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں

① السنن للترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی خاتم الحدید ج:٦ ص: ٤٣١.

جانور حلال کیا فلاں حرام کیا:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ ①

حرام کیا گیا تم پر خنزیر اور مردار جس کی روح نکل جانے پر اسمیں روحانیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالص مادیت رہ جاتی ہے اور خالص مادیت ایک تعفن ہے، گندی چیز ہے۔ روح آ کر اس سے گندگی دفع کرتی ہے تو حق تعالیٰ جو شریعتوں کے بھیجنے والے اور ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں نے کس چیز میں کیا خاصیت اور جوہر رکھا ہے اور کیا نہیں، اسے حق ہے کہ وہ کہے فلاں چیز استعمال کرو فلاں مت کرو، تو جب آدمی ایمان (کی حکومت) کے نیچے آ جاتا ہے تو پھر اس میں کھانے، پینے، رہنے سہنے، اوڑھنے میں رضائے خداوندی پیش نظر رہتی ہے کہ اگر مالک اور محسن ناراض ہوتا ہے تو مجھے حق نہیں کہ کوئی ایسا کام کروں۔

اسی طرح نسل بڑھانے میں بھی یہی خیال رہے گا زنا سے بچے گا نکاح کی طرف آئے گا۔ اگر ایمانی زندگی نہ ہو محض عقل ہو تو عقل محض میں زنا بھی حلال ہے اور نکاح بھی۔ اس میں اس کا کوئی امتیاز نہیں کہ یہ نکاح اور وہ سفاح! تو طبع بشری میں محض نفس کی رضا پیش نظر ہوتی ہے عقل آ جائے تو مفادِ عامہ سامنے آتا ہے جسے ہم جمہوریت کہیں گے اور جمہوریت میں یہی ہوتا ہے کہ سب کی رائے لے لو اور سب کی خوشی حاصل ہو جائے اور جب ایمانی زندگی آتی ہے تو جمہور سے بالاتر ہو کر خدا کی رضا کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ راضی ہو جمہور راضی ہوں یا نہ ہوں سارے انسان ملکر بھی ناراض ہو جائیں تو یہ اُسے گوارا کرے گا اللہ کو ناراض کرنا گوارا نہیں کرے گا، پروردگار کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دیگا تو ایمانی زندگی کے اندر وہی تمام چیزیں ہیں جو اب تک استعمال میں آ رہی تھیں صرف شکل بدل گئی رضائے خداوندی کی شکل آ گئی کہ کس طرح مجھے میرے مالک نے حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ پانی پیو تو دائیں ہاتھ سے پیو، بائیں ہاتھ سے پیو گے تو شیطان شامل ہو جائے گا اور جب شیطان کا حصہ کھانے پینے میں آ گیا تو نفس پر شیطنت کے اثرات پڑیں گے۔ اگر دایاں ہاتھ کھانے سے آلودہ ہو اور مجبور ہے کہ گلاس بائیں ہاتھ میں لے تو کم سے کم دائیں ہاتھ کا کوئی حصہ لگا لیا جائے تا کہ دائیں ہاتھ سے پینا ثابت ہو جائے۔ اس واسطے فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شیاطین کا کام ہے اور دائیں ہاتھ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا۔ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَامُنَ ② جناب نبی کریم کو ہر شریف اور بہتر کام میں دایاں ہاتھ پسند تھا۔ لباس پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ دائیں آستین میں ڈالتے، پاجامہ پہنتے تو پہلے دایاں پیر دائیں پائنچے میں، کنگھی کرتے تو پہلے دائیں جانب، دانت مانجھتے تو پہلے دائیں جانب۔ تو دائیں جانب سے ابتداء حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو پسند ہے بائیں جانب سے نہیں اور دائیں جانب شریف سمجھی جاتی

---

① پارہ: ۶، سورة المائدة، الآية: ۳.

② السنن للنسائي، كتاب الزينة، باب الترجل ص: ۲۴۲۳ رقم: ۵۲۴۲.

ہے۔تو کثافت اور ذلالت کے امور شیاطین کو پسندیدہ ہیں اور ہر چیز کی پاکی اور صفائی انبیاء کو پسند ہے۔اسی طرح ایمانی زندگی کی وجہ سے کھانے پینے میں غور کرے گا کہ کھانا حلال کا ہو حرام کا نہ ہو اس واسطے کہ دینی توفیق کا تعلق اکلِ حلال سے ہے،لقمہ حرام جب پیٹ میں پہنچتا ہے تو دینی جذبات کی توفیق سلب ہو جاتی ہے،حلال پہنچتا ہے تو دین پر عمل اور محبت کے جذبات بھڑکتے ہیں اس لئے کہ دین بہر حال صاف چیز ہے اگر کسی شخص کی طبیعت نہایت پاکیزہ اور ستھری ہے اس کے سامنے اگر غلیظ آدمی کو پیش کرو تو منہ پھیر لے گا اور اگر اس کی طبیعت گندی ہے تو جتنی غلیظ چیزیں سامنے آئیں گی اس کیلئے اتنا ہی خوشی کا موقع ہوگا۔

دکن کے بادشاہ کی نفاست کا حال......دکن کے بادشاہ ''تانا شاہ'' تھے۔تانا شاہ تانا شاہی طبیعت کے تھے مشہور ہے طبیعت بہت زیادہ نفیس و نازک تھی۔جب دشمن نے دکن کے حملہ میں ان پر قبضہ کیا اور قیدی بنا کر فاتح کے سامنے پیش ہوئے تو تجویز ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہوں نے کہا کہ جب تم مجھے بہر حال واجب القتل سمجھتے ہو تو اس کیلئے تم زیادہ جدوجہد مت کرو میں آسان ترکیب بتائے دیتا ہوں،مزاج میں چونکہ حد درجہ لطافت تھی تو کہا کہ کسی غلیظ بھنگن عورت کو گندگی لیکر سامنے سے گزار دو تو میں ختم ہو جاؤں گا چنانچہ غلاظت کا ٹوکرا سامنے لایا گیا،بس وہیں دم نکل گیا تحمل نہیں کر سکے۔الغرض پاک و صاف اور نفیس طبیعت ستھری چیزوں سے خوش ہوتی ہے جو چیزیں پاخانہ میں پیدا ہوتی ہیں اگر انہیں باہر ڈال دو وہیں مر جائیں گی اس لئے کہ غلاظت ان کا طبعی تقاضا ہے اور صاف چیزوں پر ناپاک چیزوں سے مردنی چھا جاتی ہے تو ہر چیز میں اس کی طبیعت کے مناسب جو چیز ہے وہی آتی ہے اور جبھی وہ زندہ رہتی ہے۔اسی لئے ایمانی طبائع لقمہ حرام کو کبھی برداشت نہیں کرتی حتیٰ کہ مشتبہ لقمہ کو بھی۔

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا تقویٰ......ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کا تقویٰ اور طہارت مشہور ہے،فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ کا میرے ساتھ معاملہ ہے کہ اگر نادانستگی میں بھی کوئی مشتبہ لقمہ پیٹ میں چلا جائے تو فوراً قے آجاتی ہے تو انتہائی تقویٰ اور پاکیزگی بڑھتے بڑھتے حق تعالیٰ کا ایسا معاملہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ آدمی متقی بننے کی مشق کرے جب تقویٰ باطن نصیب ہو جاتا ہے تو پھر حق تعالیٰ خود حفاظت فرماتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا تقویٰ......حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنا ہی واقعہ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ اعظم گڑھ گیا،اس ضلع میں اسٹیشن سے چار میل چھوٹا سا گاؤں تھا،وہاں کے لوگوں نے مجھے بلایا،وہاں سے جب فارغ ہوا تو ریل رات کو گیارہ بجے جاتی تھی،سردی کا زمانہ تھا لوگوں نے کہا کہ سردی ہے اندھیری رات ہوگی بارشیں ہو رہی ہوں گی اس لئے رات کو جانے میں تکلیف ہوگی مناسب ہے کہ عصر کے وقت اسٹیشن پہنچا دیا جائے رات کو ٹرین آئے گی تو سوار ہو جائیں گے۔تو حضرت کو سوار کر کے اسٹیشن لائے جو بہت چھوٹا سا تھا،نہ ویٹنگ روم نہ مسافر خانہ۔دفتر کا ایک ہی کمرہ تھا اور اسی سے ملا ہوا مال گودام تھا،بوریاں وغیرہ وہاں بھرتے تھے۔اسٹیشن ماسٹر

تھا تو ہندو مگر بھلا آدمی تھا اس نے دو چار بوریاں ہٹائیں اور مصلّی کی جگہ بنائی کچھ آرام کی جگہ ہوگئی۔

پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ آرام سے بیٹھیں۔فرماتے تھے جب مغرب کا وقت ہوا تو میں نے نماز پڑھی اس کے بعد سنتیں اور اس کے بعد نفلوں کی نیت باندھ لی، وہ اسٹیشن ماسٹر ایک لیمپ لیکر آیا تا کہ روشنی ہوجائے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے معاً یہ خطرہ ہوا کہ مال گودام کیلئے گورنمنٹ نے کوئی لیمپ رکھا نہیں ہے، یہ محض ریلوے کا لیمپ میری وجہ سے لایا ہوگا تو میں گویا غاصب ٹھہرا، میرے لئے حق نہیں کہ اسے استعمال کروں، نماز میں ایک بے چینی شروع ہوگئی: کہ اے اللہ تو نے ہمیشہ مجھے مشتبہ چیزوں سے بچایا ہے۔یہ مشتبہ چیز آرہی ہے جس کا مجھے حق نہیں، اس لئے تو ہی بچانے والا ہے، فرماتے تھے کہ بمشکل میں نے دو رکعتیں ختم کیں اور اس نے لیمپ رکھا نہیں بلکہ لئے ہوئے کھڑا رہا، جب میں نے سلام پھیرا تو اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں یہ لیمپ لیکر آیا ہوں اور یہ اسٹیشن کا نہیں میرا ذاتی ہے، لایا اس لئے کہ اندھیرے کی تکلیف نہ ہو.....فرماتے تھے کہ میں نے اتنی دعائیں کیں اس کے حق میں کہ اتنی رعایت ہے، اس لئے اس نے خود محسوس کیا کہ مجھے (ریلوے کی لالٹین کا) حق نہیں تو اپنے گھر سے لایا۔تو طبیعت میں جب سلامتی ہو تو کافر کی بھی قدرت رہنمائی کرتی ہے بشرطیکہ مذہب کا جذبہ موجود ہو، اخلاقی قدریں اس کے اندر ہوں۔الغرض متقی جب تقوی تک پہنچ جائے تو ؎

می دہد یزداں مراد متقین

والا معاملہ ہوتا ہے حق تعالیٰ ایسے راستے پیدا فرمادیتے ہیں کہ مشتبہات سے بچ جائے مگر یہ جب ہی ہوتا ہے کہ تقویٰ باطنی کی عادت ڈالے، جو تقویٰ ظاہر کا ہے وہ تو یہ ہے کہ برا عمل نہ کرے، ناجائز نہ کرے ہر عمل جواز کی حد میں کرے اور ایک تقویٰ باطن ہے وہ زیادہ دقیق ہوتا ہے وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی، جب تک کہ اعلیٰ درجہ کا متقی نہ ہو۔

اپنی بیوی میں دوسری عورت کا خیال حرام ہے.....فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کوئی خوش رنگ شربت پینے بیٹھا ہے اور تصور یہ باندھا ہے کہ میں شراب پی رہا ہوں تو فرماتے ہیں کہ یہ گنہگار ہے اور اگر اس کی نیت کھل جائے تو حاکمِ وقت اسے سزا دے گا وہ شربت بھی اس کے حق میں مکروہِ تحریمی بن جاتا ہے، اس نے زبان سے اگر چہ شراب نہ پی مگر خیال سے پی لی، دل سے پی لی۔اسی طرح فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اس کے ہاتھ تھامے ہوئے ہے اور دل میں دھیان ہے کہ فلاں اجنبیہ عورت جس سے مجھے عشق ہے یہ وہی اجنبیہ عورت ہے اس کا فقط تصور باندھ لیا تو فرماتے ہیں کہ یہ باطنی طور پر حکم میں زانی کے ہوجائے گا۔اس کے حق میں تب جائز ہوگا کہ تصور بدل کر توبہ کرے۔تو دل میں تصورات بھی غلط طرح کے نہ ہوں بُرا تصور آئے گا تو آگے عمل شروع ہوتا ہے، برے جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں تو عمل بھی ناپاک ہوجائے گا اسے کہتے ہیں تقویٰ باطن کہ جذباتِ قلب بھی مصفی ومزکی ہوں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ

الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا......﴾ ① جولوگ تقویٰ کی عادت ڈالتے ہیں اگر ناگہانی طور پر کسی غلطی میں پڑ جاتے ہیں تو فوراً ان کی طبیعت میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور توبہ کر کے سنبھل جاتے ہیں، اس خیال سے بھی توبہ کرتے ہیں اس لئے کہ خیال سے ہی تو عمل پیدا ہوتا ہے اگر خیالات نہ روکے اور اجازت دیدے کہ جیسی رَوْ آئے تو چلتے رہو تو آدمی بہت سی بدعملیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اب یہ کتنی دقیق بات ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اجنبیہ عورت کے بچے ہوئے پانی سے اجنبی مرد کے لئے وضو کرنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ اسے خیال آئے گا فلاں عورت کا بچا ہوا پانی ہے اگر یہ دھیان بڑھ گیا تو ممکن ہے آگے بہت سے فسادات پیدا ہوں۔ حدیث میں فرمایا گیا: اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِهٖ ② تقویٰ قلب کے اندر ہوتا ہے جب قلب کے اندر آجائے گا تب عمل کے اندر پیدا ہوگا جب قلب میں ہی نہیں ہوگا تو قالب میں بھی نہیں ہے وہ کیسے متقی بن جائے گا! تو بہر حال جب ایمانی زندگی آجاتی ہے تو خیالات پر بھی کنٹرول کرنا ہوتا ہے کہ خیالات بھی ایسے نہ ہوں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ جیسے آپ کے ہاتھ پیر کو دیکھتے ہیں ایسے ہی اللہ دلوں کو بھی دیکھتے ہیں ﴿وَاللهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ③ اِنَّ اللهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ ④ تمہارے عملوں کو نہیں دیکھتا، دلوں کو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر نیت کیا ہے۔

قانونِ الٰہی کی منشاء......تو دنیوی بادشاہوں کا قانون صرف بدن پر لاگو ہوتا ہے لیکن خدائی قانون تو قلب پر بھی لاگو ہوتا ہے دنیوی سلطنتیں بدعملی سے روک سکتی ہیں کہ چور نے چوری کی اسے جیل بھیج دیا۔ ڈکیت نے ڈکیتی کی اُسے جیل بھیج دیا لیکن قلب تو نہیں بدل سکتا وہ تو خدا کی حکومت سے بدلے گا دنیوی حکومتیں افعال سے روکتی ہیں اور خدائی حکومت و قانون ان برے افعال کی نفرت دل میں ڈالتی ہے تو جب تک اخلاقی حالت درست نہ ہو آدمی صحیح معنوں میں آدمی نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری اور لازمی چیز ہے کہ اخلاقی حیثیت سے اس کے اندر بدعملی سے نفرت پیدا ہو جائے۔ تو شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ برے افعال پر پابندی عائد کی جائے تاکہ لوگ بدعمل نہ بنیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے اخلاق درست کئے جائیں تاکہ بدعملی سے لذت حاصل نہ ہو بلکہ نفرت پیدا ہو جائے۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کھانا، پینا، وہی سونا جاگنا وہی اٹھنا بیٹھنا، وہی مکان بنانا ان افعال پر طبیعت حکومت کر رہی تھی تو حیوانی زندگی بنی جب عقل حکومت کرنے لگی تو انسانی زندگی بنی اور خدا کی وحی حکومت کرنے لگی تو ایمانی زندگی بنی۔ انسانی زندگی کا جو مادہ تھا انہی افعال کو شائستہ اور بہتر بنا دیا۔ تو شریعت اسلام آپ کو کھانے پینے، تجارت و زراعت سے نہیں روکتی، حکمرانی کو نہیں روکتی مگر ان ساری چیزوں کو شائستہ بنا کر

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۰۱. ② الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله ج: ۴ ص: ۱۹۸۶. ③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۴. ④ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله. ج: ۴ ص: ۱۹۸۶.

رضائے خداوندی کا ذریعہ بنادے گی، تا کہ آپ کے قلب میں شائستگی پیدا ہو جائے تو اسلام جامع مذہب ہے، فقط نماز روزہ نہیں سکھلاتا بلکہ اس کا تعلق تختِ سلطنت سے بھی ہے، گھریلو زندگی سے بھی، میدانی اور جنگی زندگی سے بھی، صلح سے بھی اور جنگ سے بھی۔ کام وہی کرے گا جو انسانی زندگی میں ہوں مگر اس کا رخ دین کی طرف بدل دیتا ہے، قلب کا رخ ذرا سیدھا کر دو تو دین بن جائے گا۔

شیرِ خدا علیؓ کا اخلاص...... غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہنے ابوجہل کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے، خنجر اٹھایا تو ابوجہل نے نیچے سے حضرت علی رضی اللہ عنہکے مُنہ پر تھوک دیا حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً خنجر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے ابوجہل نے کہا: اے علی! میں تو تجھے بڑا دانشمند سمجھتا تھا اب تم دشمن پر قابو پا چکے تھے اور دشمن بھی ایسا جو نہ صرف تمہارا بلکہ تمہارے پیغمبر اور دین کا بھی دشمن ہے تو جو تمہارے نزدیک بدترین دشمن تھا، تمنے اس پر قابو پا کر چھوڑ دیا، اس سے بڑھ کر غیر دانشمندی کیا ہوگی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہنے جواب دیا کہ میں تجھ سے خدا کیلئے لڑنے آیا تھا جذبات نفسانی کی وجہ سے نہیں، تو نے جب منہ پر تھوکا تو نفس میں غیظ پیدا ہوا اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبہ سے قتل کرتا اور میری عبادت تباہ ہو جاتی، میں تو اللہ کیلئے لڑتا ہوں کہ تو اللہ کے دین کا دشمن ہے، اس کے کلمہ کو نیچا دیکھنا چاہتا ہے اگر میں اپنی ذات کیلئے قتل کرتا تو نفسانیت کا قتل کرتا للّٰہیت باقی نہ ہوتی۔

تو قتل وہی تھا، طبعی جذبے سے قتل کرتے تو نفسانی جذبہ ہوتا اور یہ ہوتا کہ محفوظ ہو جاتے لیکن ایمانی جذبے سے قتل کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خدا راضی ہو اور مجھے آخرت میں اجر ملے۔ پس جو کام انسان کرتا ہے تو وہ ہر کوئی کرتا ہے کافر کھاتا پیتا ہے، مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے، وہ لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے یہ بھی لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے، فرق کیا ہے! وہ بحیثیت مؤمن کے ہر کام کرے گا، لوجہ اللہ کرے گا، کافر وہی کام اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے کرے گا، مؤمن میں نفسانیت ختم ہو جاتی ہے وہ تو للہ فی اللہ کام کرتا ہے تو عمل میں فرق نہیں ہوتا نیت اور روح میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کا رخ زمین کی طرف ہے اور دوسرے کا عرش کی طرف۔ تو ایمانی زندگی فقط رخ بدلتی ہے، اعمال کو تبدیلی نہیں کرتی، نفس مہذب ہو جائے، تہذیب نفس اصل ہے تو یہ ایمانی زندگی کہلاتی ہے۔ تو اگر ہم کھانے پینے میں لگے رہیں اوڑھنے پہننے اور سنوارنے میں لگے رہیں تو حیوانیت سے آگے نہیں بڑھیں گے اور اگر قومی خدمت اور مفادِ عامہ کیلئے کچھ کیا تو زیادہ سے زیادہ انسان بن گئے لیکن مؤمن نہیں بنیں گے اور جب مؤمن بنیں گے تو ان سب چیزوں کو لوجہ اللہ کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ① اے ابراہیم مسلم بن جاؤ، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ اب تک کفر میں تھے اب اسلام قبول کر لیں، وہ تو پیغمبر اور ایمان کا سرچشمہ ہیں تو مسلم بننے کے معنی ہیں گردن نہاد ہونے کے یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو کہ جو کام کرو اپنے نفس کی رضا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱.

کیلئے نہ کرو۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! میں مسلم بن گیا، فرمایا گیا مسلم بن گئے تو اعلان کرو: ﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ② کہہ دے ابراہیم کہ میری نماز اور حج میرا مرنا جینا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ تو میں ان اعمال میں کسی کو شریک نہیں کرتا محض اللہ کی رضا کیلئے کرتا ہوں۔ مسلم بننے کے معنی یہی ہیں کہ کھانا پینا مرنا جینا لوجہ اللہ بن جائے تو ایمان آ کر اور زندگی نہیں سکھلاتا اسی انسانی زندگی کو مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

عرفانی زندگی، منشاء خداوندی کی حکومت ...... اور جب یہ مکمل ہو جاتی ہے تو اب اللہ کی رضا کیلئے لڑنا، مرنا اور جینا بھی ہے۔ اب جتنا بھی اللہ کے لئے کام کرے گا حق تعالیٰ کی معرفت اور پہچان بڑھ جائے گی اور جتنی پہچان بڑھتی جائے گی قربِ خداوندی نصیب ہوتا ہو جائے گا، ایمانی زندگی میں فقط عقیدہ تھا کہ مالک الملک ایک ہے اور اللہ کی رضا کیلئے کام کرتے ہیں اب فقط علم نہیں رہے گا جان پہچان ہو جائیگی اور اب منشاء کی پابندی کرنے لگے گا، اب تک تو قانون کی پابندی کر رہا تھا حکم ہوا نماز پڑھ لے کہا بہت اچھا! حلال اختیار کرو حرام چھوڑ دو، کہا: بہت اچھا! رشوت مت لو، بہت اچھا! جھوٹ مت بولو، کہا: بہت اچھا! تو جتنے احکام تھے ان کی پابندی کا نام ایمان اور اسلام ہے کہ خدا کے قانون کے نیچے زندگی بسر کرے۔ یہ ایمانی زندگی تھی لیکن ایک مرتبہ زندگی کا اس سے بھی اوپر تھا وہ یہ کہ ...... قانون کی پابندی کرتے کرتے آخر میں قانون ساز کے منشاء کی پابندی کرنے لگتا ہے اور قانون سے بالاتر ہو کر عمل کرتا ہے۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ کسی محبوب نے حکم دیا کہ بھئی اپنے باغ سے ہمیں پھول دیدو اور تم نے انکو پھول پہنچا دیا اور قانون سے بالاتر منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا باغ ہی اس کے سپرد کر دیا کہ پھول کیا ہے سارا باغ ہی حاضر ہے! اللہ نے مانگا کہ جو روٹی کھاتے ہو اس میں سے تھوڑا حصہ اللہ کے نام پر بھی دیدو تو منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا کھانا ہی اٹھا کر اللہ کے نام پر دیدیا یا خود روزہ رکھ لیا تو انسان ایسا جب کرے گا جبکہ حاکم سامنے موجود ہو جب سامنے موجود ہوگا تو حکم کا انتظار نہ ہوگا بلکہ وہ تو اسکی نگاہ و آبرو کو پہچان کر عمل کرے گا، اس کی منشاء اسکی پیشانی سے معلوم ہو جائے گی کہ یہ چاہتا ہے یہ نہیں۔

شاہوں کی مزاج شناسی ...... اورنگ زیبؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ان کا جو کمانڈر انچیف تھا اس نے فوجی سامان اسلحہ کی تیاری شروع کر دی اور فوج کے کانوں میں پھونک دیا کہ دکن پر جانا ہے تیار رہو تو کسی نے کمانڈر سے کہا کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے؟ کہا نہیں، بلکہ ایک دفعہ اورنگ زیب تخت پر بیٹھے ہوئے تھے میں کھڑا تھا تو مجلس میں دکن کا جو ذکر آیا تو بادشاہ نے نہایت تیز نگاہوں سے دکن کی طرف دیکھا! میں سمجھ گیا کہ دکن سے ان کے دل میں زنگ ہے تو ابھی تو حکم نہیں، ضابطہ میں تو پھر ہی ہوگا مگر میں نے اورنگ زیب کا منشاء پا لیا تھا تو اگر یہ عالمگیر سے

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔ ② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۳-۱۶۴۔

دور ہوتا تب تو انتظار کرتا کہ قانونی حکم پہنچے لیکن چونکہ سامنے کھڑا تھا تو اس کی نگاہ اور پیشانی سے پہچان گیا تو منشاء کی پابندی کرنا گویا پہچان پر عمل کرنا ہے اسکو معرفت اور عرفان کہتے ہیں۔ایک علم اور اعتقاد ہے جو غائبانہ ہوتا ہے اور ایک یہ کہ اللہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا اب قانون کا انتظار نہیں اب تو نگاہ و آبرو ہی مقصد بتلا دے گی، اس کو معرفت کی زندگی کہتے ہیں اور اس کا نام ہم عرفانی زندگی رکھیں گے۔

ایرانی شہزادے کا ایک واقعہ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس بادشاہ ہندوستان مہمان ہوا، انہیں لیموں کی ضرورت پڑی شہزادہ ایران کے باغ میں کھٹے لیموں تھے، خادم اجازت لینے آیا وہ سن کر منقبض ہوئے اور ترشروئی سے دیکھا اس نے باہر آ کر کہا کہ اجازت مل گئی لیموں توڑو کہا کہ بے وقوف اجازت کہاں ملی وہ تو کچھ بولے ہی نہیں اس نے کہا کہ جب شہزادے نے ترش نگاہوں سے دیکھا تو ہم سمجھ گئے کہ کھٹے لیموں کی اجازت دیدی گئی ہے تو پاس رہنے والے منشاء اور طبیعت میں اتنا دخل پالیتے ہیں خواہ لفظ سامنے نہ ہوں۔

تو انبیاء علیہم السلام واولیاء عظام جو معرفتِ خداوندی حاصل کر لیتے ہیں وہ اپنے ذوق سے ان چیزوں کو پا لیتے ہیں، جو منشاء خداوندی ہوتی ہیں، حالانکہ حکم ابھی نہیں ہوتا اور بہت سے اہل اللہ اور اولیاء کاملین کے قلب پر جو واردات ہوتے ہیں ان واردات سے ان کو منشاءِ خداوندی معلوم ہو جاتا ہے وہ شریعت کا قانون نہیں ہوتا تو اسکی تبلیغ نہیں کرتے مگر وہ خود کرنے پر پابند ہیں کیونکہ انہوں نے منشاء کو دیکھ لیا۔

حاجی امداد اللہؒ کا ادبِ غلافِ کعبہ ...... حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جو دار العلوم کی جماعت کے شیخ ہیں وہ مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تو عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہ پہنا، لوگوں نے کہا کہ شرعاً ناجائز ہے؟ فرمایا نہیں، پوچھا کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا: بیت اللہ کا غلاف سیاہ رنگ کا ہے، مجھے بے ادبی معلوم ہوتی ہے کہ اس رنگ کو قدموں میں استعمال کیا جائے یہ محض ایک ذوق اور منشاء کی بات تھی تو ادبی ذوق کے اندر بعض دفعہ آدمی وہ چیزیں کرتا ہے کہ قانون میں نہیں ہوتیں مگر اس کا ذوق کہتا ہے کہ مجھے اس طرزِ عمل پر جانا ہے، اسکو عرفانی زندگی کہتے ہیں۔تو اولیاءِ کاملین کی زندگی عرفانی ہوتی ہے کہ محض جائز و ناجائز ہی نہیں بلکہ جائز کے اندر بھی دیکھتے ہیں کہ منشاء اگر یہ ہو کہ کم سے کم کھاؤں تو ایسا کروں اور اگر یہ ہو کہ بالکل نہ کھاؤں تو میں فاقہ کروں۔

حضراتِ اولیاء کے مزاج ...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرات اہل اللہ جو فقر و فاقہ کو پسند کرتے ہیں تو شریعت نے یہ حکم نہیں دیا مگر بہت سے اولیاء کی زندگی ہے، جیسے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کہ ایک ایک ہفتہ فاقہ کا گزارتے تو یہ شرعی حکم نہیں تھا مگر شریعت بھیجنے والے کا منشاء ان کے حق میں یہی تھا کہ جب زیادہ سے زیادہ زہد بڑھ جائے تو زیادہ سے زیادہ درجات بلند ہوں گے۔حضرت شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ کو فاقہ سے بڑی محبت تھی اور دو دو ہفتے فاقے ہوتے تھے اور وہ ارادی فاقے ہوتے تھے یہ نہیں کہ مفلس اور تنگدست تھے، دولت تو ایسے لوگوں کے قدموں میں آ کر گرتی ہے۔تو شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر اُن کے گھر آئے، شاہ صاحب موجود

نہیں تھے تو گھر والوں کو پریشانی ہوئی کہ ہمارے گھر کے جو بڑے ہیں شاہ ابوالمعالی ان کے شیخ کی کس طرح خاطر مدارات کریں۔ شیخ سمجھ گئے کہ نہ دانہ ہے، نہ پانی تو ایک روپے کا غلہ منگوایا اور ایک تعویذ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اسے غلہ میں ڈال دو اللہ برکت دے گا۔ شیخ ایک ہفتہ ٹھہرے اور روزانہ کھایا جب چلے گئے تو وہ غلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا دو تین ہفتے کے بعد شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو دیکھا کہ دو دو وقت روٹی پک رہی ہے انہیں فقر وفاقہ سے محبت تھی تو فرمایا کہ کیا بات ہے فاقہ نہیں ہوتا، ہمارے پاس تو کچھ تھا نہیں دو وقت کی روٹی کہاں سے آ گئی تو بتلایا گیا کہ آپکے شیخ آئے تھے گھر میں فاقہ تھا تو انہوں نے خود ایک روپے کا غلہ منگوایا اور تعویذ لکھ اسمیں ڈالا، اس کی برکت ہے۔ کہا: اچھا تم بڑے گستاخ ہو میرے شیخ کے تعویذ کو غلہ میں ڈال دیا ہے، نکال کر لاؤ! میں اسے اپنے سر پر رکھوں اسے لیکر پگڑی میں باندھ لیا اور وہ غلہ اسی دن ختم ہو گیا۔ اب پھر فقر وفاقہ شروع ہو گیا۔

تو یہ کہیں شریعت کا حکم تھا کہ ہفتہ ہفتہ فاقہ کرو! مگر قانون بنانے والے کا منشاء محسوس کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ فقر وفاقہ کی زندگی ہوتا کہ درجات بلند ہوں، روحانیت ترقی کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں آتا ہے کہ دو دو مہینے گزرتے تھے کہ بیتِ نبوت میں دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ (اسودین) کھانے کو ایک ٹکڑا کھجور اور پانی پر گذر ہوتی تھی۔ تو قرآن کریم میں تو یہ حکم موجود نہیں تھا کہ آپ دو مہینے بالکل فقر وفاقہ سے رہیں، مگر قانون سے بالاتر ہو کر قانون بھیجنے والے کا منشاء آپ کے قلب مبارک پر روشن تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لذاتِ دنیا کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ دیں، وہ توجہ کریں تو حق تعالیٰ کی ذات کی طرف، علم وعرفان کی طرف۔ تو قانون ساز کے منشاء کو پا کر عمل کرنا اسے معرفت یا عرفانی زندگی کہتے ہیں۔ مگر اس عرفانی زندگی کا مادہ بھی وہی ہے جو حیوانی زندگی کا تھا وہی کھانا پینا، رہنا سہنا وہی سب کچھ اب منشاء خداوندی حاکم بن گیا۔ تو حیوانی زندگی میں طبیعت حاکم ہوتی ہے، جو ایک جاہل بادشاہ ہے جس کے تحت آدمی جانوروں کی طرح کھاتا پیتا ہے انسانی زندگی آتی ہے تو عقل حاکم ہو جاتی ہے اور عقل میں شعور ہوتا ہے تو ذرا سوچ سمجھ کے کھاتا پیتا ہے ایمانی زندگی آتی ہے تو وحی کی رہنمائی ہوتی ہے تو عفت اور پاکدامنی پیدا ہو جاتی ہے اور عرفانی زندگی جب آ جاتی ہے تو منشاء الٰہی انسان کے اوپر حکومت کرتی ہے اس وقت انسان کی زندگی نہایت بلند وبالا ہوتی ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام، اولیائے کاملین اور علماءِ ربانیین کی زندگی جس کے اندر دنیا ساری موجود ہے مگر حظِ نفس کا کوئی گذر نہیں، نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں، للّٰہیت کے جذبات کام کرتے ہیں، عداوت اور دوستی سب کچھ اللہ کیلئے ہوتی ہے نفسانی جذبات سے کچھ نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ فِی اللّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔ (1) جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کیلئے، ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے منشاءِ خداوندی اور اس کی

(1) السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه ج: ۱۲ ص: ۲۹۱.

رضا حاصل کرنے کیلئے گھر بار لٹادیا، قانون شریعت سے آگے ہوکر ساری چیزیں وقف کیں ورنہ حق تو صدقات واجبہ ادا کرنے سے بھی ادا ہوجاتا تو گویا عرفانی زندگی بسر کرنے والا اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے، اسے عرفانی زندگی بھی کہیں گے اور احسانی بھی: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ① اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اس مقام تک نہ پہنچ سکو تو کم از کم یہ کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے، یہ اکمل زندگی ہے۔

وحدانی زندگی مقامِ فنائیت...... اور جب اتنا قریب ہوجائے کہ گویا تمام اعمال محبوب کو دیکھ کر کررہا ہے تو اب یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف دیکھنے پر قناعت کرے، بلکہ چاہتا ہے کہ نہ صرف دیکھوں بلکہ معانقہ کروں، گلے لگوں۔ تو ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ اس معرفت واحسان کے بعد جی چاہتا ہے کہ مصافحہ کروں، حق تعالیٰ سے مل لوں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: لَا یَزَالُ یَتَقَرَّبُ عَبْدِیْ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی کُنْتُ سَمْعَہُ الَّتِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا ② بندہ نوافل پڑھتے پڑھتے مجھ سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ یعنی ظاہری اعضاء اس کے ہوتے ہیں قوتیں میری کام کرتی ہیں یہ گویا وہ مقام ہے کہ اپنے نفس کو مٹا کر ختم کردیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کردیا اور حق تعالیٰ کی ذات اور تجلیات کے اندر غرق ہوگیا لَا یَـــزَالُ یَتَقَرَّبُ عَبْدِیْ ... الخ جس کو یوں کہنا چاہئے، جو کسی شاعر نے کہا:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو میری جان بن گیا کہ میرے اندر سرایت کئے ہوئے، تُو میں بن گیا اور میں تو، وحدت پیدا ہوگئی تاکہ کہنے والا نہ کہے کہ میں کوئی اور ہوں اور تو کوئی اور، اس زندگی کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے کہ وحدت پیدا ہوگئی، اور یہ مطلب نہیں کہ بندہ خدا میں غرق ہوکر اس کا جز بن گیا، اللہ تعالیٰ جزئیت سے پاک ہے بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی نفسانی شہوات کو ختم کرکے مناسبت مع اللہ کے جذبات پیدا کردیئے کہ جو وہ کرتا ہے میں بھی کروں گا وہ جو چاہے گا میں بھی چاہوں گا۔ کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ فرمایا: اس شخص کا کیا حال ہوسکتا ہے کہ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چلتے ہوں! تو پوچھنے والے نے کہا اچھا آپ اس درجہ کے ہیں؟ فرمایا: ہاں الحمدللہ! میں تو اس مقام پر ہوں۔ اس نے کہا آخر کس طرح؟ تو فرمایا: اس طرح کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چلتے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کردیا ہے جو وہ چاہتا ہے وہ میں چاہتا ہوں اگر کوئی پیدا ہوتا ہے تو کہتا ہوں کہ الحمدللہ یہی بہتر تھا، اگر کوئی مرتا ہے تو کہتا ہوں الحمدللہ یہی مناسب تھا۔ میں کون ہوں اللہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام والاحسان، ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۹۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ص: ۱۵۸ رقم: ۲۰۲۱۔

کے خلاف رائے دینے والا کہ وہ تو مارے میں کہوں یہ زندہ رہے! تو سارا عالم میری مرضی پر چلنے لگا۔

ایک بزرگ شاہ دولہ کی رضا برقضائے الٰہی ...... ضلع انبالہ کے ایک بزرگ شاہ دولہ گزرے ہیں سائیں توکل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں تھے گاؤں میں بارش ہوئی جمنا چڑھ گئی کنارے پر گاؤں پڑتا تھا۔ طوفان آیا ایک دیوار تھی جس کی وجہ سے پانی کچھ رکا ہوا تھا اگر وہ دیوار نہ ہوتی تو سارا گاؤں غرق ہو جاتا، لوگ بیچارے پریشان ہو کر شاہ دولہ کی خدمت میں آئے کہ حضرت اللہ کے واسطے دعاء کریں طوفان سے گاؤں غرق ہو رہا ہے فرمایا: اچھا طوفان آ گیا چلو! پھاوڑا لیکر چلے، گاؤں والوں کا مجمع ساتھ تھا تو جو دیوار تھی (وقایہ یعنی محافظ) تھی شاہ دولہ نے وہ دیوار ڈھانا شروع کر دی۔ اب تو لوگ چلانے لگے کہ حضرت سارا گاؤں غرق ہوگا۔ فرمایا: ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' بھلا میں خدا سے مقابلہ کرنے آ سکتا ہوں؟ ...... تو یہ مقام جب نصیب ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپکو اللہ کی رضا میں فنا کر دے: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① بس جو اللہ چاہتا ہے، وہی تم بھی چاہو اس کے خلاف چاہ نہیں سکتے جس کو وہ مرضی اور پسندیدہ قرار دیں ہم بھی اُسے پسندیدہ قرار دیں تو کہا جائے گا کہ یہ شخص فنائیت کے مقام پر پہنچ گیا۔ فانی فی اللہ ہو گیا یہ نہیں کہ ایک جز بن گیا، یہ جزئیت اور بعضیت سے اللہ کی ذات پاک ہے، فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے تقاضوں کو ختم کر دے، خدا کی مشیت میں اپنے آپ کو غرق کر دے کہ جو...... ان کا منشاء وہ میرا منشاء، ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' اس کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے۔

یہاں بھی زندگی کا مادہ وہی ہے کھانا پینا، چلنا پھرنا، اوڑھنا پہننا لیکن وہ اس درجہ پر آ گیا کہ قانون سے بالاتر ہو کر محض منشاء کی پابندی میں غرق اور اس کی مرضی کے اندر فانی ہو جاتا ہے اسی موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ② غزوہ بدر کے اندر آپ نے کنکریاں پھینک کر ماریں تو جس کے دماغ پر کنکر پڑی وہ دماغ کو تو کیا پورے بدن کو، قلب وجگر کو پھاڑ کر رکھ دیتی تھی اور سارے بدن سے پار ہو کر گذرتی تھی تو کنکری میں اتنی طاقت تو نہیں ہوتی لیکن نبی کے اندر جذباتِ حق موجود ہیں ان کی طاقت سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے، نبی آلہ کار رہتا ہے اور خدائی قوتیں اس کے اندر کارفرما ہوتی ہیں۔ اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ﴾ وہ تو اللہ میاں مار رہا تھا اور جیسے فرمایا گیا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ③ ہمارا پیغمبر ہوائے نفس سے نہیں بولتا وحی سے بولتا ہے تو وحی تو کلام خداوندی ہے مطلب یہ ہے کہ زبان تمہاری کلام ہمارا ہوتا ہے، تمہارا ذاتی کلام بھی تمہارا نہیں زبان تمہاری روشنی ہماری ہے اور چراغ تمہارا ہے جس سے گھر روشن ہو جاتا ہے اور جیسے کہ دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ④ اے نبی! جو تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ تمہارے ہاتھ پر نہیں، اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳-۴۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۰۔

ہیں: ﴿یَدُاللهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب ہاتھوں کے اوپر ہے تو اس میں وحدت بیان کی گئی ہے، نبی کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہا، نبی کے کلام کو اپنا کلام کہا، نبی کے منشاء کو اپنا منشاء کہا یہ جب پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی زندگی آجائے۔

اہل اللہ کی زندگی کی جھلک...... تو میں نے پانچ زندگیاں آپ کے سامنے پیش کیں، ایک حیوانی زندگی، ایک انسانی زندگی، ایک ایمانی زندگی، ایک عرفانی زندگی اور ایک وحدانی زندگی۔ مگر ان پانچ زندگیوں میں جو دو ابتدائی زندگیاں ہیں وہ مبادی اور سبب کے درجے میں ہیں اور آخر کی دو زندگی ثمرہ کے درجے میں ہے اور بیچ کی زندگی جس کو میں نے ایمانی زندگی کہا وہ اصل مقصود ہے۔ زندگی بنانے کے لئے حیوانی بھی ضروری ہے مگر یہ زندگی اصل مقصود نہیں۔ ان ساری زندگیوں سے مقصود یہ ہے کہ یہ سارے کام رضائے خداوندی کیلئے ہوں اور یہ جو احسانی زندگی ہے کہ منشاء کو پالیا اور وحدانی زندگی یعنی فانی فی اللہ ہو گیا، یہ ثمرات کے درجے ہیں اور نتیجہ ہے۔ تو بیچ کی زندگی کیلئے دو نتیجے اور دو سبب ہیں، مقصود اصل بیچ کی زندگی یعنی ایمانی زندگی ہے جس کا نام شریعت اور اتباع شریعت ہے۔ اور قانون شریعت کی پابندی نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی ہم میں نہ ہوں۔ اس واسطے اصل مقصود ایمانی زندگی رہ گئی کہ میرا مرنا جینا اللہ رب العزت کیلئے ہو اس قانون کے تحت ہی ہو اسکو قرآن نے حیاتِ طیبہ قرار دیا ہے کہ جو شخص ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا مرد ہو یا عورت اسے ہم پاکیزہ زندگی عطاء کریں گے، یہ کیا ہوگی! اکلِ حلال کا جذبہ پیدا ہوگا، حرام خوری سے بچے گا، جتنا اس سے بچے گا حق تلفی سے بچے گا جتنا حق تلفی سے بچے گا امن کا ذریعہ بنے گا، محبوب القلب بنے گا، مبغوض نہ ہوگا۔ اگر ایک شہر میں سب کے سب حرام چیزوں کو چھوڑ کر خالص اپنے حق پر آجائیں غیر کی حق تلفی نہ کریں تو باہمی محبت اور حسن سلوک پیدا ہوگا اور شریعتِ اسلام کے اتباع ہی میں درحقیقت امن ہے جتنا اس سے ہٹو گے برائی پیدا ہوگی کیوں کہ حق تلفیوں سے نفرت اور برائی پیدا ہوتی ہے تو اصل بنیادی چیز جس سے کسی مملکت میں امن وسکون ہو وہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع ہے اور ان کی لائی ہوئی زندگی کی پیروی ہے ان کی سنتوں کا اتباع ہے۔ تو اس طرح اکلِ حلال کی عادت پیدا ہوگی پھر عبادت میں لذت پیدا ہوگی، محبت خداوندی کا ذائقہ انسان میں آجائے گا اور اس میں سرشار ہو کر دنیا ومافیہا کی دولتیں ہیچ نظر آئیں گی، جب باطن کی دولت انسان کو میسر آجائے تو سب دولتیں ہیچ بن جاتی ہیں۔

عبدالقادر جیلانیؒ کی ولایت...... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک ایک دن میں تین تین ہزار مہمان ہوتے تھے، بڑے بڑے ہال بھر جاتے تھے تو سنجر کے بادشاہ نے یہ پوچھا کہ شیخ کے ہاں مہمان داری زیادہ ہے، اس نے اپنے اوپر قیاس کیا حالانکہ وہ اللہ پر بھروسہ کر چکے تھے پریشانی کی کیا ضرورت تھی، تو ایک پورا صوبہ جسکا نام نیمروز تھا شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نام وقف کیا، شیخ کی ملکیت قرار دیکر پیپل کے پتے پر لکھ دیا کہ پورا صوبہ نیمروز آپکے نام کرتا ہوں، جسکی سالانہ آمدنی لاکھوں روپے ہوتی ہے۔ شیخ نے اس کا جواب فارسی کے دو شعر میں لکھا:

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۰۔

قرآن حکیم کی عملی تفسیر

چوں چترِ سنجری رخ بختم سیاہ باد — دردل بود اگر ہوسے ملکِ سنجرے

سنجر کے بادشاہ کا جو چتر ہے اسی طرح میرا منہ سیاہ ہو جائے اور میں بد بخت بن جاؤں اگر اس میں ذرا بھی ہوس آ جائے، تو میں سیاہ بخت بن جاؤں گا مجھے تمہارے صوبے کی ضرورت نہیں کیوں آگے اس کی وجہ بیان کی:

زآنگہ کہ یافتم خبراز ملکِ نیم شب — من ملکِ نیمروز بیک جونمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ آیا ہے یعنی آدھی رات کی عبادت اور نفلوں کی وہ لذت جو حق تعالیٰ کے جلال و جمال کے مشاہدے ہوتے ہیں تو نیمروز کے ملک کی جو کے برابر بھی وقعت نہیں رہی۔ تو اہل اللہ ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں، اہل اللہ کو یہ لذتیں ملتی ہیں تو وہ ان وقتی لذتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ (۱)

(اللہ تعالیٰ ہم سب کو حیوۃ طیبہ کی سعادت سے نوازے اور اتباع سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توفیق نصیب فرمائے اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے، آمین!)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱) یہ کیسٹ بھی یہاں آ کر ختم ہو گئی الحمدللہ اس تقریر
جس پر مرتب معذرت خواہ ہے۔

فلسفۂ علم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① (صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

تمہید...... بزرگانِ محترم! مجھے واقعی شرم محسوس ہورہی ہے کہ فضلاء علماء اور طلباء کے مجمع میں مجھ جیسا قلیل البضاعۃ آدمی کھڑے ہوکر خطاب کرے اور بیان کرے جہاں بحمد اللہ ایسے فضلاء موجود ہیں جن کو بلحاظ رتبے کے اپنے اساتذہ کرام کے درجے میں سمجھتا ہوں تو اس قسم کے مواقع پر لب کشائی کرنا کچھ بے ادبی معلوم ہوتی ہے اور شرم بھی محسوس ہوتی ہے لیکن امر مجبور بھی کرتا ہے تو میرا خطاب جس قدر بھی ہوگا وہ طلبہ سے ہوگا گو علم کے لحاظ سے آپ مجھ سے زیادہ ہیں آپ کا علم تازہ ہے تاہم ایک درجہ میں طالب علم ہونے کا نام ہے اور میں بھی طالب علم ہوں، اس واسطے خطاب کا حقیقی رخ طلباء کی طرف ہوگا اساتذہ کرام اس سے بالاتر ہیں۔ کس چیز میں خطاب ہوگا ظاہر ہے کہ خطاب کا موضوع خود ہی درس گاہ متعین کردیتی ہے یہ دارالعلوم ہے علم کا مرکز ہے اس لئے علم وتعلیم ہی کے سلسلہ میں چند کلمات گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

طلبِ علم طبعی جذبہ ہے...... پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان میں علم کا ذوق اور جذبہ فطری ہے یعنی پیدا کرائے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ انسان علم کو طبعاً مطلوب سمجھے ہوئے ہے ہر وقت اس کا جی چاہتا ہے کہ میرا علم بڑھتا رہے، علم کی زیادتی سے کبھی بھی وہ تھکتا نہیں ہے ہر وقت آپ کا جی چاہتا رہتا ہے کہ اچھی سے اچھی چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے اور آپ دیکھیں...... یہ طلب علم نہیں تو اور کیا ہے! جی چاہتا ہے کہ اچھے سے اچھے کلمات کان میں پڑتے رہیں...... یہ علم کی طلب نہیں تو اور کیا ہے کسی کا اخبار دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو کسی کا رسالہ دیکھنے کو صبح اٹھتے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

ہی ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ دیکھے اخبار کیا لکھتا ہے، یہ علم ہی کی طلب ہے، بازار میں کوئی جھگڑا ہو جائے، ہر طرف سے لوگ سڑک پر جمع ہو جاتے ہیں، جھگڑے میں شریک ہونے کے لئے نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کہ کیا قصہ ہے، کیوں ہوا ہے، بہر حال علم کی طلب طبعی ہے اور طبعیات کیلئے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، انسان کو بھوک لگتی ہے تو دلیل کے زور سے نہیں لگتی کہ آپ استدلالی قوتوں سے بھوک لگائیں بلکہ جب لگی ہوئی ہو تو لاکھ استدلال کریں وہ کبھی نہیں مٹ سکتی، پیاس دلیل سے نہیں لگائی جاتی طبعی طور پر لگتی ہے۔ انسان میں ایک جذبہ ہے اور اس جذبے کے اُبھرنے کے بعد اگر خلاف میں بھی دلائل قائم ہوں تو بھوک نہیں رکے گی..تو علم کی طلب بھی انسان میں طبعی ہے اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے سر سے لیکر پیر تک مجسم علم کی طلب بنا دیا، انسان کے ہر ہر ذرہ میں شعور موجود ہے پورے بشرے اور پوری جلد میں احساس موجود ہے، چھونے کی قوت موجود ہے جو سختی نرمی کا اور گرمی سردی کا علم حاصل کرتی ہے، تو سر سے پیر تک گویا انسان متعلم ہے، آنکھیں صورتوں کا علم حاصل کرتی ہیں، کان آوازوں کا علم حاصل کرتے ہیں، ناک خوشبو بدبو کا علم حاصل کرتی ہے، زبان ذائقوں کا علم حاصل کرتی ہے۔تو مختلف قسم کے علوم اور مشاعرِ ادراک انسان کے اندر موجود ہیں اور وہ ہر وقت ان اشیاء کی تسکین کا طالب رہتا ہے، آنکھ والا کبھی یہ نہ چاہے گا کہ میں نہ دیکھوں، کان والا کبھی یہ نہ چاہے گا کہ میں نہ سُنوں، یہی طلب ہوگی کہ سنوں بھی، دیکھوں بھی اور چکھوں بھی، تو ہر وقت علم کی طلب انسان کے اندر موجود ہے۔

انسان میں طلبِ علم کے آلات جن کو نمایاں تر رکھا گیا ہے......اور علم حاصل کرنے کے آلات اس کے اندر موجود ہیں، قَالَ تَعَالٰی: ﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ① ماں کے پیٹ سے تو آدمی ہنر لیکر نہیں آتا۔استعدادیں لیکر آتا ہے جوان مشاعر ادراک سے بڑھتا رہتا ہے، استعداد ابھرتی رہتی ہے، فعلیت میں آتی رہتی ہے اور ایک وقت میں جا کے انسان کامل عالم بن جاتا ہے بہر حال انسان مختلف قسم کے علوم کا مجموعہ ہے لیکن ان علوم کے مشاعر اور ان ادراکات کے مخزن زیادہ تر چہرے کے اندر موجود ہیں بینائی کی قوت آنکھ میں ہے، سماعت کی قوت کان میں ہے، شم کی قوت ناک میں ہے گویا علم کے سب بڑے بڑے مشاعر چہرے کے اندر موجود ہیں صرف ''قوتِ حس'' چھونے کی قوت سارے بدن میں پھیلی ہوئی ہے لیکن وہ اتنی یُعْبَأُ بِہٖ (قابل شمار) نہیں ہے جتنا کہ یہ دوسری طاقتیں ہیں.....یعنی چھونے کی قوت ایک تو بلید قوت (موٹی اور ظاہر) ہے وہ علم حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اس ملموس (چھوئے جانے والی شیء) کو معلوم کر کے سر پر نہ پٹخ دیا جائے، آپ جب تک کسی چیز کو چھو نہیں لیں گے اس کی سختی نرمی معلوم نہیں ہو سکے گی کیوں کہ اتنی بلید قوت ہے کہ دور سے علم نہیں حاصل کر سکتی جب تک کہ معلوم کو سر پر نہ چڑھا دیا جائے اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے۔

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

اسی لئے شاید حق تعالیٰ شانہٗ نے کفار کی بلادت کو ہدایت کے سلسلہ میں یوں واضح فرمایا ہے کہ ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ① اگر کاغذوں میں بھی کتاب لکھ کر دے دیں اور وہ ہاتھوں سے چھو بھی لیں تب بھی یہی کہیں گے کہ یہ سحر ہے یہ تو جادو ہے، پھر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یعنی ماسہ (چھونے والی) جیسی بلید قوت اس سے بھی یہ نابلد ہیں جاہل ہیں، اس سے بھی انہیں ادراک حاصل نہیں ہوتا جس کو قوتِ ماسہ سے بھی علم حاصل نہ ہو وہ باصرہ سے کیا علم حاصل کرے گا، وہ فؤاد (دل) سے کیا علم حاصل کرے گا! وہ سامعت سے کیا علم حاصل کرے گا تو سب سے زیادہ بلید قوت انسان کے اندر لمس و مس کی قوت ہے کہ جب تک معلوم سے ٹکرا نہ دیا جائے اس وقت تک اسے علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اُونچی قوتیں یہی دو تین نکلتی ہیں ایک سننے کی قوت، ایک دیکھنے کی، ایک سمجھنے کی۔ اسی واسطے قرآن کریم میں اکثر مواقع پر ان ہی تین قوتوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ② جہنم کیلئے ہم نے تیار کر رکھے ہیں بہت سے لوگ، وہ کیسے ہیں! ان کیلئے دل ہیں مگر سمجھنے کی طاقت نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھنے کی ان میں ہمت نہیں کہ کلمہ حق کو اور کلامِ حق کو یا معاملۂ حق کو دیکھیں، کان ہیں مگر سن نہیں سکتے۔ تو تین چیزیں ذکر کیں ایک کان، ایک آنکھ اور ایک قلب تو گویا قابل شمار اور قابل اعتداد یہی تین قوتیں ہیں، یہاں ماسہ کا ذکر نہیں کیا سمع بصر اور فؤاد سننا دیکھنا اور سمجھنا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ ③ تو سمع، بصر اور فواد کو جواب دہ قرار دیا گیا۔ یہ نہیں کہا کہ ہاتھ سے جواب طلب کیا جائے گا اگر طلب کیا بھی جائے گا تو ان کے واسطے سے۔ تو اکثر جگہ انہیں تین طاقتوں کو جمع کیا گیا ہے۔

اعضائے علم کی اعضائے عمل پر فضیلت ...... یہ تینوں چاروں طاقتیں انسان کے چہرے میں جمع ہیں اور چہرہ سب سے بلند اور بالا چیز ہے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ قوتِ علمیہ قوت عملیہ سے افضل ہے، جو علم کا مقام ہے وہ حسی طور پر بھی بلند رکھا گیا ہے، آنکھ کی طاقت پیروں میں نہیں رکھی گئی، سننے کی طاقت ہاتھ کی انگلیوں میں نہیں رکھی گئی، اللہ پاک قدرت دکھلانے کے لئے قیامت کے دن یہ ساری طاقتیں بدن میں بانٹ دیں گے مگر ان طاقتوں کا اصل موضوع چہرہ قرار دیا گیا ہے جو اتنا باعزت ہے کہ احترام کے وقت اسے چوما جاتا ہے، پیشانی چومتے ہیں، سامنے جھکتے ہیں، اسی لئے چہرے پر مارنے کی ممانعت ہے کہ چہرے پر مت مارو، حرمت کے خلاف ہے، بہر حال ایک معظم اور محترم ظرف ان کیلئے تجویز کیا گیا ہے، اس سے علم کی عظمت اور بزرگی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹۔ ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۶۔

کہ جب علم عظمت والی چیز ہے تو عالم عظمت والی چیز کیوں نہ ہوگی! اس لئے آنکھ عالم ہے وہ اوپر رکھی گئی، کان عالم ہے تو اوپر رکھا گیا، ناک عالم ہے تو اوپر رکھی گئی گویا یہ چہرہ یوں سمجھئے علماء کی ایک بستی اور دار العلوم ہے جس میں مختلف علوم رکھے ہوئے علماء جمع ہیں، کوئی صورتوں کا عالم، کوئی آوازوں کا عالم، کوئی ذائقے کا عالم، کوئی خوشبو کا عالم...... تو مختلف قسم کے علوم کے علماء جمع ہیں، جنہیں اوپر جگہ دی گئی ہے۔

انسان میں دوسرے اعضاء بھی ہیں مگر وہ مزدور قسم کے اعضاء ہیں ہاتھ پیر سے علم کا تعلق نہیں عمل کا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ آخرت میں جب کوئی عذاب دیا جائے گا تو یہ کہا جائے گا: ذٰلِکَ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ . تو کسب اور عمل ہاتھوں پیروں کی طرف منسوب کیا گیا تو ہاتھ اور پیر یہ مزدور قسم کے اعضاء ہیں، عالم قسم کے اعضاء نہیں گو مزدور میں بھی تھوڑا بہت علم تو ہوتا ہے بالکل پتھر تو وہ بھی نہیں ہوتا تو کچھ چھولے وغیرہ (لمس) کا علم ان کے اندر ہے، ہاتھ چھو کر کچھ پتہ چلا لیتا ہے، پیر چھو کر پتہ چلا لیتے ہیں مگر ان کی قوت ایسی معتد بہ قوت نہیں کہ اسکو مستقل علم والا شمار کیا جائے، تو مزدور کو بلکہ ہر کس و ناکس کو تھوڑا بہت تو علم ہوتا ہی ہے۔ اعلیٰ ترین علم جو قابل اعتداد اور قابلِ شمار ہو وہ وہی علم ہے جس کے علماء چہرے میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تو مزدور طبقہ نیچے ہے اور عالم طبقہ اوپر، اس کو فضیلت دی گئی اور اس کو مفضول قرار دیا گیا تا کہ اہلِ علم یہ سمجھ لیں کہ ہمارے پاس جو چیز ہے وہ انتہائی شرف کی چیز ہے وہ انتہائی عزت کی چیز ہے۔

علم کی عزت استغناء میں ہے...... اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی عزت کریں اور جتنی علم کی عزت کریں گے اتنا عالم کی عزت ہوگی جتنا وہ اپنے علم کی بے حرمتی کرے گا خود عالم کی بے حرمتی پیدا ہوتی جائے گی۔ اگر ایک عالم خود اپنے علم کی عظمت نہ کرے تو دوسروں کو کیا مصیبت پڑی کہ اس کے علم کی عزت کریں۔ پہلے اسے اپنے وقار کو سنبھالنا ہے جب وہ اپنے وقار کو محسوس کرے گا تو دنیا اس کے وقار کے آگے جھکنے کے لئے مجبور ہوگی۔ اور اگر وہ خود ہی علم کو ذلیل کرے تو پھر اس کی عزت کرنیوالا کوئی نہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ہارون الرشید نے فرمائش کی کہ امین اور مامون کو مؤطا پڑھا دی جائے اس کے لیے کب تشریف لائیں گے؟ فرمایا کہ علم کا یہ کام نہیں کہ وہ در بدر پھرے، علم کے طالب کا کام ہے کہ وہ اس کے پیچھے پھرے اور فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے، اگر تم ہی اس کا احترام نہیں کرو گے تو دنیا میں کوئی اس کا احترام کرنے والا نہیں ہوگا۔

تو عالم کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے علم کی عزت کو باقی رکھے اور وہ عزت استغناء ہے جتنا دوسروں کی طرف حاجت مندی اپنے اندر بڑھائے گا اتنا ہی علم کو بھی ذلیل کرے گا خود بھی ذلیل ہوگا اس کے اندر اگر طلب ہو تو صرف آخرت کی ہو دنیا کی نہ ہو۔

طالبِ دنیا کو دنیا بھی نہیں اور طالب دین کو دونوں ملتی ہیں...... دنیا طلب سے نہیں آتی بلکہ استغناء سے آتی ہے یہ سمجھ کا کھیل ہے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ جتنا طالب بنیں گے اتنی ہی دنیا آئے گی، اس کے اگر آپ

طالب بن گئے تو اس کے سامنے ذلیل ہو گئے دنیا آئی تو کیا ہوا آپ کو ذلیل کر کے آئی۔عزت داری یہ ہے کہ استغناء ہو پھر دنیا آئے اَتَتِ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں پر آئے۔

مجھے حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بانی دارالعلوم دیو بند ہیں کا واقعہ یاد آیا حضرت رحمۃ اللہ علیہ چھتہ کی مسجد میں تشریف رکھتے تھے، شیخ الٰہی بخش صاحب میرٹھی جو لکھ پتی لوگوں میں سے تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد تھے ملنے کیلئے آئے۔اور بہت بڑا ہدیہ لیکر آئے دو تھیلیاں جس میں اشرفیاں اور ہزاروں روپے کا مال تھا مگر دل میں یہ سوچتے ہوئے آئے کہ حضرت کو آج اتنا بڑا ہدیہ دوں گا کہ اب تک کسی نے نہیں دیا ہو گا۔تو اپنے ہدیہ کے اوپر ایک فخر کی کیفیت موجود تھی:۔

مگر پیش اہل دل نگہ دارند دل ۔۔۔ تانہ باشد از گماں بہ خجل

اہل اللہ کے سامنے دل تھام کے جانا چاہیے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں احساس پیدا کر دیتا ہے کہ فلاں کے دل میں کیا چیزیں کھٹک رہی ہیں وہ علاج بھی کرنا جانتے ہیں۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اسکا ادراک ہوا کہ انکے دل میں فخر و ناز کی کیفیت ہے، یہ بڑی چیز سمجھ رہے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجامت بنوا رہے تھے اب وہ بیٹھ تو سکتے نہیں تھے، جب تک کہ حضرت اجازت نہ دیدیں تو کھڑے رہے اور ہاتھ میں دونوں تھیلیاں ہیں، ان میں وزن تھا، کھڑا ہوا نہیں جاتا اور کپکپا رہے ہیں۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔تو حجامت بنواتے ہوئے چہرہ کو نیچے کر دیا، دیکھا ہی نہیں کون آیا! تجاہل عارفانہ کے طور پر، پھر دائیں طرف کو منہ پھیرا تو وہ پشت کی طرف سے چکر کھا کر دائیں طرف آئے تو آہستہ سے بائیں طرف منہ پھیر لیا، پھر وہ ادھر کو آئے تو ادھر کو منہ پھیر لیا۔غرض انکو اسی طرح چکر دیئے یہاں تک کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجامت سے فارغ ہو گئے، تب ان کی طرف دیکھا، انہوں نے سلام عرض کیا حضرت نے معمولی جواب دیا، رسمی مزاج پرسی کے بعد بیٹھ گئے اور وہ ہدیہ پیش کیا۔حضرت نے فرمایا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔انہوں نے کہا حضرت آپ کو ضرورت نہیں، ہمیں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔اگر حضرت قبول نہ فرمائیں یا حاجت مند نہ ہوں تو طلبہ کو تقسیم کر دیں۔فرمایا: کہ الحمد للہ! میری آمدنی ساڑھے سات روپے مہینے کی ہے اور میرے گھر کی ساری ضروریات اس میں پوری ہو جاتی ہیں۔اگر کبھی روپیہ آٹھ آنہ بچ جاتا ہے تو میں پریشان رہتا ہوں کہ کہاں رکھوں گا، کس طرح حفاظت کروں گا، کسے بانٹوں گا! میں حاجت مند نہیں ہوں آپ واپس لے جائیں۔انہوں نے کہا کہ حضرت طلباء کو تقسیم کر دیں، فرمایا کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں طلبہ کو بانٹوں! آپ ہی جا کر تقسیم کر دیں۔غرض انہوں نے مختلف عنوانوں سے چاہا کہ قبول فرمالیں مگر حضرت نے قبول نہیں فرمایا......لیکن اس زمانے کے رئیس غیرت دار تھے تو یہ غیرت آئی کہ یہ مال پھر اپنے گھر کو واپس کیسے لے جاؤں! تو وہاں سے اٹھے، مسجد کی سیڑھیوں پر حضرت کی جوتیاں پڑی ہوئی تھیں ان

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا، ص: ۱۲۸ رقم: ۴۰۹۵.

جوتیوں میں وہ روپیہ بھر کر روانہ ہوگئے۔ (غالباً جوتیوں کے اوپر نیچے روپے ڈال دیئے ہوں گے) حضرت اٹھے اور جوتیوں کی تلاش ہوئی، جوتے نہیں ملتے ادھر ادھر سب جگہ دیکھا، حافظ انوار الحق صاحب حضرت کے خادم تھے انہوں نے دیکھا اور عرض کیا کہ حضرت جوتیاں تو روپیوں میں دبی ہوئی یہاں پڑی ہیں۔ فرمایا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ! آئے اور آ کر ان جوتیوں کو جھاڑا جیسے مٹی جھاڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد جوتے پہن کر روانہ ہوگئے۔ وہ روپیہ مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا رہا۔ حافظ انوار الحق مرحوم ساتھ ساتھ تھے تھوڑی دور آگے جا کر مسکرا کر دیکھا تو حافظ جی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا حافظ جی دیکھا آپ نے! دنیا ہم بھی کماتے ہیں دنیا دار بھی کماتے ہیں فرق اتنا ہے کہ دنیا ہماری جوتیوں میں آ کر گرتی ہے، ہم ٹھوکریں مارتے ہیں اور دنیا دار دنیا کی جوتیوں میں جا کے سر رگڑتے ہیں، وہ ان کو ٹھوکریں مارتی ہے۔ تو کماتے ہم بھی ہیں دنیا دار بھی، فرق اگر ہے تو عزت اور ذلت کا فرق ہے، ''غناء'' اور ''احتیاج'' کا فرق ہے۔

دُنیا استغناء اور توکل علی اللہ سے ملتی ہے...... میں تو اس سے بھی زیادہ کہا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دنیا طلب کرے تو طالب نہ بنے تارک بن جائے تو دنیا آئے گی، طالب کے پاس مشکل سے آتی ہے بلکہ اس کو اور زیادہ ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو آدمی مستغنی ہو تو دنیا ذلیل ہو کر آئے گی، محتاج بنے گا تو خود ذلیل ہوگا۔ تو علم جیسی دولت ملنے کے بعد بھی اگر آدمی جھکے اور یہ خیال کرے کہ کل کیا کماؤں گا؟ کہاں سے آئے گا؟ کیا صورت ہوگی؟ تو اس نے تو انتہائی طور پر اپنے علم کو ذلیل کر دیا۔ اللہ نے دو کام رکھے ہیں: ایک اپنے ذمہ لیا ہے اور ایک آپ کے ذمہ ڈالا ہے، فرمایا کہ: ﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ ① آپ کے ذمہ یہ کام ہے کہ اپنے اہل وعیال کو دین کا امر کرو اور تم خود بھی اس کے اوپر جم جاؤ اور ہمارے ذمہ یہ ہے کہ تمہیں روٹی دیں گے محتاج نہیں رکھیں گے۔ عزت وشرف بھی دیں گے رزق میں ہر چیز آ جاتی ہے، ہر چیز تمہیں دیں گے۔ تو ایک کام اپنے ذمہ لیا اور ایک آپ کے ذمہ کیا، آپ نے تو اپنی ذمہ داری کی چیز چھوڑ دی اور اللہ نے جو اپنے ذمہ لی تھی اسے اختیار کر لیا کہ روٹی کہاں سے کھائیں گے، عزت کہاں سے ملے گی، تو اپنا فریضہ تو چھوڑ دیا اس سے تو یوں محروم ہوئے اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا اسے اختیار کر لیا۔ اللہ کے کام کو آپ نبھا نہیں سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ نہ وہ چیز رہی اور نہ یہ چیز رہی۔ تو طالب علم کے ساتھ اگر آدمی طالبِ دنیا بھی ہو تو نہ علم رہتا ہے نہ دنیا آتی ہے اور اگر علم محض کا طالب بن جائے تو دنیا ذلیل ہو کر آئے گی۔ آپ کے سامنے آپ کے سینکڑوں بزرگوں کی نظیریں موجود ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا مشکل وقت اور توکل علی اللہ...... دارالعلوم دیوبند قائم ہوا کس شان سے! ایک پائی ہاتھ میں نہیں۔ اہل اللہ کے قلب میں دیانۃً ایک جذبہ پیدا ہوا کہ دارالعلوم قائم کیا جائے۔ وہیں چھتے کی مسجد میں ہی

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۳۲۔

بیٹھے بیٹھے مدرسہ قائم ہو گیا۔انار کے درخت کے نیچے ایک استاذ اور ایک شاگرد بیٹھے ہوئے تھے،تو وہ مدرسہ ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہوا تھا آج بڑھتے بڑھتے اس میں ڈیڑھ ہزار طلبہ رہتے ہیں، پچاس ساٹھ استاذ رہتے ہیں، اصول میں یہ شرط رکھی ہے کہ مدرسہ کی مستقل آمدنی نہ بنائی جائے۔ نیز گورنمنٹ سے بھی امداد نہ لی جائے۔امداد کی طرف رجوع نہ کیا جائے، جب کہ ساڑھے چھ سات لاکھ روپے کا سالانہ خرچ ہے،حکومت کے اکاؤنٹنٹ دارالعلوم آئے ،انہوں نے پوچھا کہ دارالعلوم کا کیا خرچ ہے؟ میں نے کہا پچاس ہزار روپے ماہوار۔کہا کہ:خزانے میں کتنا ہے؟اس وقت کل پندرہ ہزار تھا میں نے بتایا:تو کہنے لگے اس ماہ کا خرچ کیسے چلے گا؟ میں نے کہا کہ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ کیسے چلے گا: یہ بتا سکتا ہوں کہ ضرور چلے گا۔اس نے کہا:یہ کیا بات ہوئی ؟ یہ تو کوئی اصول کی بات نہیں؟ میں نے کہا: یہ تو اصول سے بالاتر بات ہے،اصول کی بات نہیں۔اب اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ میں نے کہا:اسے ہمارے یہاں توکّل کہتے ہیں، کہنے لگے توکّل کیا چیز ہے؟ تجارت ہے کوئی زراعت ہے؟ میں نے کہا: توکّل یہ ہے کہ اللہ میاں دلوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ تم فلاں جگہ دو، میرا کام ہو رہا ہے تمہیں دینا پڑے گا۔وہ جھک ماریں گے اور آ کے دیں گے،ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم خوشامد کرتے پھریں تو مال عزت سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور ذلت سے بھی۔ایک فقیر اگر بھیک مانگنے جائے،اسے آپ ذلیل سمجھیں گے کہ میرے پاس سے مال لیتا ہے۔اور ایک بادشاہ بھی قوم کے پاس سے مال لیتا ہے،لیکن اسے کوئی ذلیل نہیں سمجھتا۔وہ بھی تو چندہ ہی لیتا ہے اسے کوئی ذلیل نہیں سمجھتا۔اس لئے کہ وہ استغناء کے ساتھ لیتا ہے، یہ احتیاج کے ساتھ لیتا ہے خود حضراتِ انبیاء علیہم السلام تبلیغی کاموں اور خیر میں ترغیب سے چندہ لیتے اور خرچ کرتے ہیں لیکن ان کی عزت اور شرف میں ذرّہ برابر فرق نہیں پڑتا۔حالانکہ (بظاہر وہ بھی) قوم سے مانگتے ہیں تو مانگنا مانگنا بھی برابر نہیں ایک حاجت مند اور ذلیل بن کر مانگنا ہے ایک غنی بن کر اور اپنے نفس کو بالاتر کر کے مانگنا اس میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔

رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے بندہ پر نہیں ......تو حق تعالیٰ نے علم کی عزت اور شرف کو قائم رکھنے کے لئے ایک حسی صورت اختیار فرمائی کہ علماء کی بستی چہرے کو بنایا جو سب سے اونچی ہے تا کہ اہل علم کا شرف واضح ہو جائے جو علم کی طرف منسوب ہیں وہ بالاتر ہیں ،ان کا کام جھکنا نہیں ہے۔اور اس کے امر کی یہ صورت اختیار فرمائی:﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ الخ﴾ ① ہمارے ذمہ ہے ہم رزق دیں گے تمہارا کام یہ ہے کہ تم علم کے طالب بنے رہو علم کے اندر لگے رہو۔تو میں نے دارالعلوم دیوبند کی نظیر پیش کی تھی تو آپ کا یہ مدرسہ (عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی ۵) بھی تو اسی کی نظیر ہے مولانا محمد یوسف بنوری (نور اللہ مرقدہٗ) کھڑے ہوئے ،وہ کوئی جاگیردار نہیں ہیں۔ان کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی اسی طرح آ کے بیٹھ گئے ایک پائی ہاتھ میں نہیں ہے، رہنے کو حجرہ نہیں، کتاب رکھنے کو جگہ نہیں لیکن بیٹھ گئے محض خدا کے بھروسہ پر، دنیا پر بھروسہ نہیں کیا تو اَتَتِ الدُّنْيَا وَهِيَ

① پارہ:۱۶،سورۃ طٰہٰ،الآیۃ:۱۳۲.

رَاغِمَةً ① تو ناک رگڑتی ہوئی دنیا آنی شروع ہوئی۔ آج لاکھوں کی عمارتیں بھی کھڑی ہیں، کتب خانہ بھی بن گیا کیا کہیں جا کے بھیک مانگی! انہیں اللہ سے بھیگ مانگی، اللہ میاں نے اپنی مخلوق کو متوجہ کر دیا۔ انہوں نے مجبور ہو کر جھک مار کر دیا...... اور دینا پڑے گا۔

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شکایت کی گئی کہ یہ خانقاہ گنگوہ میں بغاوت کا مرکز ہے اور یہ مولوی خانقاہ میں جمع ہو کر حکومتِ برطانیہ کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور افغانی حکومت کو ہندوستان پر چڑھانا چاہتے ہیں تا کہ برطانیہ حکومت کا تختہ الٹ جائے۔ سی، آئی، ڈی کا انسپکٹر مقرر ہوا اور وہ بھی ہندو مقرر کیا گیا تا کہ وہ بے لاگ بات کرے۔ وہ آیا اس نے خانقاہ کو دیکھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، ان لوگوں کو سازش سے کیا کام! انہیں مکروفریب سے کیا کام! یہ تو رات دن اللہ کے بندے بنے ہوئے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ مخبر نے یہ رپورٹ کیسے کی کہ یہ سازشی لوگ ہیں کیونکہ یہاں چوبیس گھنٹے سوائے ذکر اللہ کے کوئی کام نہیں، بہرحال وہ دیکھتا رہا سوچتا رہا، آخر کار ظاہر ہوا اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آ کر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے! فرمایا بھائی! دیکھ لو ہمارے ہاں کوئی چھپی ہوئی بات تو ہے نہیں، کوئی سازش نہیں جو بھی ہے وہ تمہارے سامنے ہے، اس پر اس نے مختلف سوالات کئے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے؟ فرمایا: توکل! اس نے کہا: توکل کیا چیز ہے؟ فرمایا: توکل یہ چیز ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، وہ خدمت کرتے ہیں تو یہ خانقاہ کا کام چل رہا ہے۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیسے چل رہا ہے، کوئی جاگیر نہیں، کوئی وقف نہیں، کوئی تجارت نہیں، آخر یہ چل کیسے رہا ہے، محض یہ خیال کر کے بیٹھ گئے کہ لوگوں کے دلوں میں آئے گا تو کام چلے گا لوگوں کے دلوں میں نہ آئے تو کیا ہوگا! غرض اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ توکل کیا چیز ہے ایک ہفتہ کے بعد جب وہ جانے لگا تو نہایت عقیدت مندی سے آ کر اس نے حضرت سے دعائیں چاہیں اور دس روپے نکال کر ہدیہ کے طور پر پیش کئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرا دل مجبور کر رہا ہے آپ اسے واپس نہ کریں۔ اگر آپ واپس کریں گے تو میرا دل دُکھے گا۔ میری نیازمندی کا تقاضا ہے کہ آپ قبول فرمالیں! فرمایا: آخر آپ سے کس نے کہا؟ کہنے لگا: کہا تو کسی نے نہیں، بس دل میں یہ آیا، فرمایا: یہی ہے وہ توکل جو کل تک آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تو توکل سب سے بڑی جاگیر ہے۔ مگر اسکا حاصل یہ ہے کہ احتیاج صرف اللہ کی طرف ہو۔ غیر اللہ کی طرف نہ ہو تو غیر اللہ خود بخود آ کے جھکے گا۔

علم کی ناقدری کرنیوالے سے اسلام کا شرف بھی چھن سکتا ہے...... ایک طالب علم کے ذہن میں یہ آنا کل کیا کریں گے، علم پڑھکر ہم روٹی کہاں سے کمائیں گے پیسہ کہاں سے ملے گا؟ یہ انتہائی احتیاج مندی اور ذلت نفس کی بات ہے جس کو اللہ علم کی دولت دے اور اس کی سوچ یہ ہو کہ روٹی کہاں سے آئے گی۔ ﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

﴿اَلَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ﴾ ① کا مصداق ہے کہ اعلیٰ اور شرف کی چیز پاس ہے پھر ادنیٰ کی طرف توجہ کر رہا ہے میں کہتا ہوں کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دنیا ملے گی۔ لیکن اگر وعدہ نہ ہوتا اور نہ کبھی ملتی صرف علم مل جاتا تو دنیا و مافیہا کی دولت میسر آ گئی تھی، کسی دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انتہائی ناقدر انسان ہے کہ اللہ اعظم ترین شرف دے اور پھر وہ ارذل ترین چیز کو اس کے مقابلہ میں چاہے یہ تو یہود کا سا قصہ ہو گیا کہ اللہ نے ''من وسلویٰ'' دیا انہوں نے کہا کہ ہمیں تو لعبل و پیاز چاہیے اس کے مقابلہ میں ذلیل چیزیں چاہئیں..... ایک عالم یا مطیع یا طالب حق کی یہ شان نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تو اس کے اوپر شرف و کمال خالص کرے اور وہ اس کے مقابلہ میں نقص وعیب اور بری اور گندی چیزوں کا طالب بن جائے..... یہ انتہائی بے قدری ہوتی ہے اس میں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں مسلم کا شرف بھی نہ چھن جائے۔ اس لئے کہ علم پاک چیز ہے پاک ہی ظرف میں بھرا جائے گا۔ جس ظرف کے اندر گندگی موجود ہو اور وہ غیر اللہ اور دنیا کا طالب بنا ہوا ہے تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے سونے کے ظرف میں نجاست بھر دی ہو..... تو محبت صرف ایک چیز کی رہے دنیا استعمال کی چیز ہے محبت کی چیز نہیں استعمال جتنا چاہے کرو محبت ایک ذات سے رہنی چاہیے جس کا آدمی طالب ہے تو علم کے شرف کے بعد کسی غیر علم کی طلب کرنا ایسا ہے جیسے ایک عالم طلب کرے کہ میں تو جاہل بن جاؤں تو بہتر ہے یہ کوئی دانش ہوگی؟ خدا علم دے اور وہ جہالت کو چاہے۔

تو بہر حال حق تعالیٰ شانہ نے اس چہرے کے اندر مشاعر ادراک رکھکر گویا اس طرف ایماء (اشارہ) کیا ہے کہ علم اونچی چیز ہے اور جو علم کی طرف منسوب ہوں وہ بھی اونچے بن کر رہیں (اور ان کے اونچے ہونے کا راز استغناء میں ہے دنیا طلبی میں نہیں) وہ نیچے بن کر نہیں رہ سکتے اس لئے کہ اللہ نے ان کو یہ شرف دیا ہے اور پھر علم، عمل سے کہیں زیادہ افضل ہے اسی لئے جو عملی اعضاء ہیں ان کو پست رکھا گیا یعنی ہاتھ کا رخ نیچے کی طرف ہے پیر کا رخ نیچے کی طرف ہے اور ناک کان کا رخ اوپر کی طرف جاتا ہے تو عمل والی چیزوں کو حسی طور پر بھی پست رکھا گیا۔ اور ان کی وضع بھی ایسی جیسے وہ پستی کی طرف جار ہے ہوں اور کان ناک آنکھ کو اونچا بنایا۔ کیوں کہ یہ علم کی طرف منسوب ہیں۔

اعضائے عمل اعضائے دولت سے افضل اور نمایاں ہیں...... اور عمل سے بھی زیادہ ادنیٰ درجہ کی چیز مال ہے یعنی علم عمل سے افضل ہے عمل دولت سے افضل ہے تو دولت سب سے زیادہ گری ہوئی چیز ہے اس واسطے کچھ اعضاء ایسے ہیں جو دولت کو جمع کرتے ہیں...... وہ معدہ اور جگر ہیں وہاں نجاست بھری رہتی ہے تو گویا ایک اعضاء ہیں اور ایک اعضائے عمل، یہ پھر بھی بہ نسبت معدے امعا (انتڑیاں) اور بنسبت مثانے وغیرہ کے عزت دار ہیں کیوں کہ معدے وغیرہ کے اندر تو نجاست اور گندگی بھری ہوئی ہوتی ہے اور یہ ان کے لئے لازمی ہے اگر یہ اعضاء (دولت) بھرے ہوئے نہ ہوں تو زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اگر معدے کے اندر سے یہ سب کچھ نکال لیا جائے تو آدمی ختم ہو جائیگا اس کی بھی (بقائے حیات کی خاطر) ضرورت ہے لیکن حق تعالیٰ نے اس کو مخفی رکھا۔ کیوں کہ گندی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۱.

چیز ہے لوگوں کے سامنے نہ آنی چاہیے، اس کو اندر رکھا۔

اعضائے دولت انکی حقیقت اور انکو مخفی رکھنے کی حکمت ...... ہاں البتہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ناک، کان اور آنکھ تو علماء ہیں اور ہاتھ پیر مزدور ہیں۔ اور وہ سرمایہ دار ہیں جو اندر چھپے ہوئے ہیں بحیثیت سرمایہ دار کے...... اللہ کسی اور سبب سے سرمایہ دار کو عزت دے وہ اور چیز ہے لیکن "مِنْ حَیْثُ اَنَّہٗ" (صرف اسی بنیاد پر کہ) سرمایہ دار بحیثیت سرمایہ دار ہونے کے وہ نجاست، کا محل ہے گندگی کا محل ہے کوئی بڑی چیز نہیں ہے باقی طہارت کا طریقہ بتلا دیا گیا کہ خود بھی پاک بنو اس مال کو بھی پاک کرو مثلاً زکوٰۃ رکھدی۔ صدقات رکھدیئے کہ مال کو پاک بناؤ.... تو معدے میں سب کچھ بھرا ہوا ہے لیکن فضلات نکالے جاتے ہیں۔ اب اگر فضلات نہ نکلیں تو معدہ بھی بگڑ جائے گا۔ تو اگر مال میں سے کچھ نہیں نکلے گا اور صرف سرمایہ دار کے پاس رہ جائے گا گویا وہ نجاست معدے میں ہی بھری رہے گی۔ تو معدہ بھی گیا انسان بھی گیا، سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس میں سے کچھ فضلات بھی نکلتے رہیں...... (یعنی ایک معینہ مدت کے اندر جو علامت صحت ہے۔ بصورۃ دیگر علامت مرض) تا کہ اس کے اندر پاکی پیدا ہو۔ یہ نہیں ہوگا تو سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ چھڑ جائے گی۔ معدہ الگ لڑے گا اور ہاتھ پاؤں الگ لڑیں گے (اور دماغ بھی، تو علماء علم بھی اس سرمایہ دار کی حرکت "دولت کا ناجائز اجتماع" کے الگ خلاف ہوں گے) اس لئے کہ جب فضلات کو نہیں نکالے گا تو بیماریاں پیدا ہوں گی تو ہاتھ بھی، پاؤں بھی اور دماغ بھی سب ہی چیزیں بیماری کا شکار ہوں گے۔ اس لئے ہاتھ بھی چاہتا کہ معدے میں سے کچھ نکلتا رہے، پیر بھی چاہتا ہے کہ معدے میں سے کچھ نکلتا رہے تو گویا یہ ایسی مثال ہے کہ زکوٰۃ دے دی گئی تو میل کچیل نکال دیا گیا، مال پاک ہو گیا۔

تو تین قسم کے اعضاء رکھے گئے۔ ایک اعضاء العلم، ایک اعضاء العمل اور ایک اعضاء الدولۃ، یا اعضاء المال، جن کے اندر سرمایہ جمع رہتا ہے سرمایہ دار کا کام یہ ہے کہ وہ زائد حصہ نکالتا رہے اور باقی حصہ جمع کرتا رہے۔ مزید زیادہ نکال دے تو طبیعت ہلکی رہے گی، لیکن فرض اتنا کیا گیا کہ موقع بموقع نکالے، ایک حد اعتدال کے اندر خارج کرے بالکل معدہ خالی کر دیا تو خالی خولی ہو کے کہیں ختم نہ ہو جائے۔ لیکن اگر تمہارے اندر کوئی دوسری قوت بھر دی جائے تو بے شک سب کچھ نکال دو وہ الگ چیز ہے کہ آدمی روحانی قوت سے زندہ رہنے لگے اور کھانا پینا ترک کر دے مگر یہ چیزیں ہیں۔

اصول اور قاعدے کی بات یہی ہے کہ بقدر ضرورت جمع رہے بقدر ضرورت نکلتا رہے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے جب یہ بند ہو جائے گا تو معدہ بگڑ جائے گا خلو محض ہوگا تو فنا طاری ہوگی، تو کچھ جمع رہے کچھ خلا رہے، دونوں چیزیں ہوں تب ہی صحت برقرار رہ سکتی ہے تو اعضاء العلم کو اونچا رکھا گیا اعضاء العمل کو پست رکھا گیا۔ اور اعضاء المال کو مخفی رکھا گیا کیونکہ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو نمایاں کیا جائے۔

''علم'' اللہ کی اور ''مال'' معدے کی صفت ہے......اب اگر ایک عالم کی آنکھ گندگی کو پسند کرنے لگے تو کیا یہ دانش کی بات ہوگی؟ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ آنکھ یوں چاہے کہ میں معدہ بن جاؤں میرے اندر نجاست بھر دی جائے۔ تو اللہ نے اس کو لطافت دی اور اس کو کمال دیا۔ اور وہ چاہتی ہے کہ میرے اندر عیب بھر جائے میرے اندر نقص بھر جائے......تو اللہ نے پاکی بھری ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میرے اندر گندگی بھر جائے۔ یہ تو عقل و دانش کے خلاف اور علم کے بھی خلاف ہے مودت کے بھی خلاف ہے اخلاقی طور پر بھی بری چیز ہے اور علمی طور پر تو ہے ہی۔

بہر حال حق تعالیٰ شانہ نے اہل علم کو عزت و عظمت بخشی ہے.....اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ''علم'' اللہ کی صفت ہے اور مال معدے کی صفت ہے تو اللہ کی ذات عالی اور صفات کمال......ظاہر ہے کہ ان سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوسکتی ساری بھلائیاں انہی کیلئے ہیں اور مال و دولت یہ معدے کی صفت ہے یہ روازنہ متغیر ہونیوالی چیزیں ہیں۔ نہ ان کیلئے بقاء ہے اور نہ ان کیلئے دوام ہے یہ ہمہ وقت علی شرف السقوط اور علی شرف الزوال رہتی ہیں ہر وقت افتاد کا شکار ہونے والی ہیں۔

اگر اللہ کی صفت کسی بندے کے اندر آئے گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنا نمائندہ بناتے ہیں کہ تو میری صفت کا حامل ہے اس کو دنیا کے اندر پھیلا اور وہ کہے کہ میں تو معدے کی صفت کا حامل بننا چاہتا ہوں میں تو گندگی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور اسے ہی پھیلانا چاہتا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ یہ عقل کا کھوٹ ہوگا اور یہ گویا اس منصب کو بٹا لگانے کا باعث ہوگا کہ جس منصب کے لئے اللہ نے اسے دارالعلوم میں جمع کیا کہ یہ طالب علم ہے اس کی سعادت اس کو کھینچ کر لائی ہے کہ ایک مرکز علم میں اس کو پہنچادیا، کیا اس کے لئے یہ شکر کا مقام نہیں ہے کہ اسے کسی سینما کا ملازم نہیں بنایا کسی تھیٹر کا کارکن نہیں بنایا، اپنی صفت اور اپنی اونچی صفات میں بھی جو اونچی صفت تھی یعنی علم کی صفت اس کا حامل بنا کر ایسی فکیٹری میں لا کر بیٹھادیا۔ جہاں علم کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ علم ہی کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کتنا بڑا شکر کا مقام ہے کہ اللہ نے آپ کو اپنے (علم کے) لئے منتخب کرلیا۔ اور ان کاموں کے لئے منتخب نہیں کیا جو گندگی کے کام ہیں۔ پاک کام کیلئے منتخب کیا۔ اس لئے اس شرف پر انسان جتنا بھی ناز کرے، شکر کرے اتنا ہی کم ہے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا. اَمَّا طَالِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضَى الرَّحْمٰنِ ، وَاَمَّا طَالِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ''. ①

''تو ایک علم ہے جو رضائے رحمٰن کی طرف لے جاتا ہے اور ایک مال ہے جو طغیان کی طرف لے جاتا ہے''

① المعجم الكبير للطبراني، باب العين، عبدالله بن مسعود الهدبي ج: ۹ ص: ۲۶. علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ امام بیہقی نے یہ روایت حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے: انه موقوف منقطع اور پھر حضرت انسؓ سے مرفوعاً یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: منهومان لايشبعان منهوم في العلم لايشبع منه ومنهوم في الدنيا لايشبع منها دیکھئے: المقاصد الحسنة حرف الميم ج: ۱ ص: ۲۲۷:

حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ دو چیزیں ہیں جنہوں نے ایک چھاتی سے دودھ پیا ہے کہ ایک سے دوسری جدا نہیں ہوسکتی اور وہ کونسی چیزیں ہیں ایک حکمت اور تقویٰ۔ اس لئے جب علم آئے گا تو خشیۃ اللہ بھی آئے گا خوف خداوندی بھی آئے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ علم ہو اور اللہ کا خوف نہ ہو تو علم آیا اس کے ساتھ تقویٰ بھی آیا۔ تقویٰ آیا تو اس کے ساتھ علم ہونا لازمی ہے اور فرمایا کہ مال و دولت اور طغیان یہ بھی ایک وطن کے دو باشندے ہیں جب دولت آئے گی تو سرکشی بھی بڑھے گی۔ بغاوت بھی بڑھے گی۔ الا یہ کہ آدمی مال کو شرعی طریق پر کمائے حلال طریق پر کمائے اور حلال طریق پر خرچ کرے، اس کے اندر سے انفاق فی سبیل اللہ کرتا رہے تو وہ تمرد اور طغیانی سے بچ جائے گا اس طریق پر بچ جائے تو بچ جائے لیکن مال میں اپنی ذات کے لحاظ سے تو طغیان و تمرد ہی ہے باقی شریعت نے ایسے اصول بتلا دیئے ہیں کہ عوارض کے طور پر اس میں پاکی پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی جب کوئی پاک کرنا چاہے ...... تو ایک اونچی چیز ہے ایک پست چیز ہے اللہ نے جس قوم کو اونچی چیز کیلئے منتخب کیا اسے تو اپنی قسمت کے اوپر ناز کرنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی صفت کے لئے اور اپنے کمال کے پھیلانے کے لئے ہمیں منتخب کرلیا۔

تحصیل علم اعجاز قرآن کے سبب سے اور طالب علم آلات خداوندی ہیں ...... یہ بھی درحقیقت قرآن کا اعجاز اور معجزہ ہے قرآن کریم کی شانیں بھی درحقیقت معجزہ ہیں یعنی اس کی حفاظت کے طریقے بھی معجزہ نما ہیں۔ اعجازی شانوں سے اس کی حفاظت کی جارہی ہے آج دنیا میں اس علم دین کے اوپر کوئی وعدہ نہیں نہ دولت کا نہ عزت کا، نہ کسی مرتبہ اور عزت و جاہ کا۔ اگر قرآن و حدیث کا بڑے سے بڑا عالم ہو تو کوئی وعدہ نہیں کہ اُسے ملک کا گورنر بنا دیا جائے گا یا پریزیڈنٹ بنا دیا جائے گا۔ بلکہ لوگ اس کو عیب لگاتے ہیں کیوں کہ اس علم کے پڑھے ہوئے نہ اس قابل ہیں کہ وہ ''مسٹر'' بنیں نہ ہی کسی اور دینوی صنعت و حرفت کا کام انہیں آئے۔ یہ انہیں (بطور طعنہ) کہا جاتا ہے یہ غلط ہو یا صحیح ہو یہ تو بات الگ ہے مگر کہا جاتا ہے تو اس علم کی تحصیل پر کوئی دنیوی وعدہ نہیں .... بلکہ اگر وعدہ ہے تو اس کا ہے کہ عزت کی بجائے کچھ لوگ طعن کریں گے۔ آپ کے اوپر مذاق کریں گے اگر وعدہ ہے تو اسکا تو ہے کہ آپ دولتمند ہونے کی بجائے کہیں مفلس نہ ہو جائیں اس کا تھوڑا بہت خطرہ ہے تو کسی دنیوی انعام کا خدائی وعدہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہاں آئے۔

تو کیوں تشریف لائے جبکہ کوئی وعدہ بھی نہیں۔ تو یہ آپ کو حفاظت قرآن کی سعادت کھینچ کر لائی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ''ہم نے قرآن اتارا، اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ یہ حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ جاؤ اور جا کر پڑھو چاہے دنیا نہ ملے تو دنیا نہ ملنا اس کی طرف التفات نہیں ہے ملنے کی چیز تو وہ ہے جس کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی کہ ہم اس کی

حفاظت کریں گے تو آپ لوگ (طلباء کرام) گویا جارحہ حق ہیں۔اور حق تعالےٰ شانہ کے گویا آلات کار ہیں آپ کے واسطے سے ان کے کلام کی دنیا میں حفاظت ہورہی ہے یہ بھی درحقیقت (قرآن کریم کا) معجزہ ہی ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور پھر بھی (بے لوث فوج درفوج) لوگ چلے آرہے ہیں تو قرآن بھی معجزہ ہے اوراس کی حفاظت کے طرق بھی (ہمہ پہلو) معجزہ ہیں۔

اشاعت قرآن بغیر وسائل زیادہ ہوتی ہے...... بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اسلامی حکومتوں کا بعض اوقات ختم ہونا یہ قرآن حکیم کی حفاظت کی دلیل ہے اگر مسلسل اور مستمر اسلامی دولتیں قائم رہتیں اور قرآن حکیم محفوظ رہتا تو لوگ طعن کرسکتے تھے کہ یہ سلطنت کی وجہ سے قائم ہوا ہے یہ شوکت کی وجہ سے قائم ہوا ہے یہ تلواروں کے زور سے قائم ہوا ہے لیکن عجب بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں تلواریں نہیں ہوتیں تو اسلام زیادہ پھیلتا ہے اور جب تلوار آجاتی ہے تو کم پھیلنے لگتا ہے اس سے یہ بتلانا منظور ہے کہ اسکی اشاعت، اسکی حفاظت نہ تلوار پر موقوف ہے نہ حکومت پر موقوف نہ جاہ وعزت پر موقوف یہ ہماری حفاظت پر موقوف ہے چاہے عزت کے ذریعے حفاظت کرائیں چاہے دولت مندی کے ذریعے سے حفاظت کرائیں دولت کا یہ خاصہ نہیں کہ وہ قرآن کی حفاظت کرے۔

یہ تو ہماری حفاظت کا اثر ہے اس حفاظت کیلئے جس قوم کو ذریعہ بنادیا جائے وسیلہ بنادیا جائے (جس کے حصہ میں یہ سعادت بغیر زور بازو آئے تو) اُسے اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے مگر ناز کے معنی فخر کے نہیں ناز کے معنی شکر کرنے کے ہیں کہ جتنا بھی شکر کرے کم ہے باقی فخر کی تو ممانعت کی گئی ہے اس لئے کہ فخر تو اپنی ذاتی چیز پر آدمی کرسکتا ہے تو یہ ہماری ذاتی ملک تھوڑا ہی ہے ہم تو خادم اور غلام بنائے گئے ہیں، تو امین کیلئے فخر زیبا نہیں ہے نہ تکبر انکے لئے سزاوار ہے، ہم تو امانت دار بنائے گئے ہیں۔ فقط مالک ہی کیلئے فخر زیبا ہے، اگر خزانچی کو کروڑوں اور لاکھوں روپیہ پر بٹھلا دیا جائے تو وہ کبھی فخر نہیں کریگا اسلئے کہ یہ اسکا تھوڑا ہی ہے الغرض فخر کرنے کی اجازت نہیں ہے بڑی سے بڑی دولت دنیوی ہو یا دینی...... یعنی ایمان سے بڑھکر کوئی دولت نہیں مگر اس پر بھی فخر کی اجازت نہیں، اسلام سے بڑھکر کوئی دولت نہیں، مگر تفاخر کی اس پر بھی اجازت نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے کہ ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① بہرحال اس کی اجازت نہیں کہ آپ اسلام وایمان پر فخر کریں۔ اللہ میاں پر احسان رکھیں کہ ہم آپ کے قرآن کی حفاظت کررہے ہیں اللہ کا احسان مانیے کہ اس نے حفاظت کیلئے آپ کو ذریعہ بنادیا۔ اس کے پاس کروڑوں ذرائع موجود ہیں۔ ان میں آپ کو منتخب کیا تو شکر کا مقام ہے فخر کا موقع نہیں۔

تو بہرحال میں یہ اس لئے عرض کررہا ہوں کہ جس علم کو آپ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں وہ علم فی نفسہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۷۔

شرف کی چیز ہے لیکن میں ابھی تک جتنی بات عرض کرسکا ہوں کہ یہ علم آنکھ کا ہو، یا کان کا ہو یا ناک کا ہو یا زبان کا ہو یہ سب محسوسات کے علم ہیں اس کو بھی اللہ نے عزت دی ہے لیکن محسوسات کا علم پھر ہیچ ہے اس کے اوپر ایک اور علم ہے (جس کو علم الٰہی کہا جاتا ہے جس طرح قلب محسوسات کا ادراک کرتا ہے اسی طرح علوم الٰہیہ کا بھی ادراک کرتا ہے)

قلب علوم حسیہ اور غیبیہ دونوں کا مدرک ہے......تو قلب فی الحقیقت علوم الٰہیہ غیبیہ اور حسیہ دونوں کا حامل ہے آنکھ، ناک کان یہ حسی علوم کے علماء ہیں۔ اور قلب میں دونوں شانیں رکھی گئی ہیں محسوسات کو بھی جانتا ہے اور مغیبات کو بھی جانتا ہے اس میں ایک دریچہ عالم غیب کی طرف کھلا ہوا ہے تو وہاں سے (علوم غیبیہ) اخذ کرتا ہے اور ایک دریچہ عالم شاہد کی طرف کھلا ہوا ہے تو وہاں سے بھی اخذ کرتا ہے تو قلب ایک جامع ترین چیز ہے محسوسات کا بھی عالم ہے اور مغیبات کا بھی بلکہ اگر غور کیا جائے تو ان محسوسات کے علم میں بھی اصل قلب ہے یعنی آنکھ ناک کان حقیقتاً عالم نہیں ہیں ان چیزوں کا عالم بھی قلب ہی ہے یہ سب آلات کار ہیں کبھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ آپ بازار میں چلے جارہے ہیں اور بڑے کھیل تماشے نکل رہے ہوں جب گھر آئے تو دوسرے شخص نے آپ سے کہا کہ آج تو بڑے بڑے تماشے بازار سے گزرے، آپ نے کہا کیسے تماشے؟ اس نے کہا میاں وہ ڈھول ڈھمکے بجتے جارہے تھے جلوس نکل رہا تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کوئی خبر نہیں کہ بندۂ خدا تمہاری آنکھ کھلی ہوئی تھی یا نہیں؟ آپ کہتے ہیں اُفّو! میں اپنے فلاں دھیان میں مشغول تھا مجھے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا تماشہ نکل رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آنکھ نہیں دیکھتی بلکہ دھیان دیکھتا ہے اگر دھیان متوجہ نہیں ہے تو آنکھ کھلی ہوگی تب بھی کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اور دھیان یہ قوت خیالیہ ہے یہی قوت متخیلہ وہ اندرونی قوت ہے جس کا حاصل یہ کہ اگر قلب دیکھنے کی طرف متوجہ ہوا تو آنکھیں دیکھیں گی۔ وہ متوجہ نہیں ہے تو کھلی رہیں گی لیکن کچھ نہیں دیکھ سکیں گی بعض اوقات آپ کسی مسئلہ کے اندر مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں اور گھنٹہ بج جائے۔ گھنٹہ بھی گزر گیا۔ آپ کو خبر ہی نہیں کہ گھنٹہ بجا دوسرا طالب علم کہتا ہے کہ بھائی گھنٹہ بج گیا ہے سبق کا وقت آ گیا ہے تو آپ جلدی سے اٹھتے ہیں کہ اچھا گھنٹہ بج گیا کہ جی ہاں اُفّو! میں اس وقت اس مسئلہ میں منہمک تھا مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ گھنٹہ بجا بھی ہے یا نہیں کوئی کان روئی تو نہیں دی ہوئی تھی مگر نہیں آواز اس لئے نہیں آئی کہ قلب ادھر متوجہ نہیں تھا۔

تو سننے والی چیز کان نہیں ہے بلکہ قلب ہے دیکھنے والی چیز آنکھ نہیں بلکہ قلب ہے اسی واسطے قرآن کریم میں کفار کی نسبت ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ ① انکی آنکھیں اندھی نہیں ہیں۔ بلکہ انکے دل مسخ ہو چکے ہیں، انکے دلوں کے اندر بوجھنے کی طاقت نہیں رہی ہے تو آنکھ تو کھلی ہوئی ہے پھر نہیں دیکھتی کان کھلے ہیں پھر نہیں سنتے اسلئے کہ وہ قلب کو متوجہ ہی نہیں کرتے ، تو محسوسات کا عالم بھی فی الحقیقت قلب ہے مگر شرف اسمیں یہ ہے کہ جیسے وہ محسوسات کا عالم ہے ویسے ہی مغیبات

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶.

کا بھی عالم ہے ویسے ہی الٰہیات کا بھی عالم ہے جیسے وہ فرش کی چیزیں لیتا ہے ویسے ہی وہ عرش کی چیزیں بھی لیتا ہے جیسے وہ شہود سے اخذ کرتا ہے ویسے ہی وہ غیب سے بھی اخذ کرتا ہے۔

قلب ''صفت کن'' کا بھی حامل ہے......تو جامع ترین عالم انسان کے اندر قلب ہے اس کو اللہ نے ساری کائنات کا بادشاہ بنایا۔ یہ ہاتھ اور پیر یہ سب اس کے خدام اور لشکر ہیں خدام کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے اگر ہے تو قلب کے اندر ہے اگر قلب یہ چاہتا ہے کہ میں فلاں جگہ چلوں۔ دل کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پیرو چلو! بس قلب میں آیا اور پیروں نے حرکت کرنی شروع کر دی قلب اگر چاہتا ہے کہ میں کسی چیز کو دیکھوں تو امر کرنے کی ضرورت نہیں قلب نے دیکھنے کا ارادہ کیا ملک اٹھ جاتی ہے اور آنکھ دیکھنا شروع کر دیتی ہے تو آنکھ، کان، ناک اس درجہ تابع فرمان ہیں کہ قلب میں تخیل پیدا ہوا اور انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا گویا قلب کے اندر ''کن فیکون'' کی طاقت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہو جا وہ ہوگئی کہنے کی ضرورت نہیں محض منشاء ہوا کہ ہو جائیں دیکھنے لگوں بس آنکھوں نے دیکھنا شروع کر دیا۔ تو اس درجہ تابع فرمان بنائے گئے ہیں۔

نظام دنیا کو فساد سے بچانا ہے تو علماء محسوسات کیلئے علماء مغیبات کا اتباع ضروری ہے......اس سے ایک نتیجہ یہ نکل آیا کہ علماء محسوسات جب تک علماء مغیبات کے تابع ہو کر نہیں رہیں گے دنیا کا نظام نہیں چل سکتا۔ اگر محض کان آنکھ ناک کو حاکم مطلق بنا دیا جائے اور قلب کو ان سے منقطع کر لیں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس لئے آنکھ کان کا علم جب ہی صحیح اور برقرار رہے گا کہ قلب کا علم آگے آگے ہو اور قلب کی حکومت ہو تو جو علماء غیبی علوم کے عالم ہیں جو علماء الہامات ربانی کے عالم ہیں اور جو علماء شرائع خداوندی کے عالم ہیں ان کو علماء محسوس کے اوپر حکومت کا مقام دیا جائے۔ تب ہی یہ علماء محسوس صحیح طور پر چل سکتے ہیں اس واسطے کہ محسوسات اسی قلب کے تابع ہیں تو حق تعالیٰ شانہ نے اگر آپ کو منتخب کیا تو مبصرات کے علم کیلئے نہیں کیا، مسموعات کے علم کے لئے منتخب نہیں کیا بلکہ علوم خداوندی اور قلبی علم کے لئے منتخب کیا جو تمام علوم کا حاکم ہے اور سب کے اوپر سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر قلب یہ چاہنے لگے کہ میں آنکھ بن جاؤں تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ حاکم یہ چاہتا ہے کہ میں محکوم بن جاؤں۔ مخدوم یہ چاہتا ہے کہ میں خادم بن جاؤں۔ یہ تو قلب موضوع ہے معاملہ برعکس ہو گیا اس کو منصب تو اونچا دیا گیا اور وہ نیچا بننے لگا۔ اس کا کام یہ ہے کہ اونچائی کو برقرار رکھے۔

تو اللہ نے آپ کو قلب بنایا ہے تو قلب کا جو مقام ہے اس کو جب تک آپ محفوظ نہیں رکھیں گے کام نہیں چل سکتا۔ اگر آپ نے اس مقام کو محفوظ رکھا تو کان ناک آنکھ سب آپ کے تابع ہو کر چلیں گے اور اگر آپ کے دل میں یہ لالچ ہوا کہ میں آنکھ بن جاؤں تو آنکھ فرمانبرداری چھوڑ دے گی وہ کہے گی کہ میں خود مستقل ہوں کہ قلب میری طرف جھکنے لگا غلام ومحتاج بن کے میری طرف متوجہ ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ اصل میں ہوں۔ تو علماء مغیبات اور علماء شرائع اگر ان علوم اور ان علماء کے سامنے جو محض محسوسات کے عالم ہیں جھکنے لگیں۔ خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ خواہ مبصرات

ہوں یا مسموعات ہوں خواہ وہ نئی نئی ایجادات کی چیزیں ہوں مگر لالچ کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں تو انہوں نے علم دین کو بٹا لگادیا کہ اسی علم کا تو فیض ہے کہ محسوسات سامنے آرہی ہیں اگر مغیبات کا علم منقطع ہو جائے تو محسوسات دنیا سے منقطع ہو جائیں یہ باقی نہیں رہ سکتیں۔اس لئے اہل علم کو ناز بھی کرنا چاہیے اور شکر بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں منتخب کیا اول تو علم کے دائرے میں لے آئے مزدور نہیں بنایا کہ ہم ٹوکری اٹھائیں، معدہ نہیں بنایا کہ نجاست جمع کریں بلکہ عالم بنایا کہ ہم دیکھیں، سنیں اور چکھیں اور محسوسات کے علم آگے بڑھائیں۔اس سے بڑھکر ہمیں ان علماء میں داخل کیا جو الٰھیات کے عالم ہیں۔خود محسوسات کے اوپر حاکم ہیں تو جو انتہائی مقام ہے وہ آپ کو مل گیا۔

اہل علم کی اصلاح کے بغیر عوام الناس کی اصلاح ممکن نہیں...... اس کائنات بدن میں انتہائی مقام قلب کا ہے اور اس کائنات آفاق میں اہل علم کا ہے گویا وہ بمنزلہ قلب کے ہیں تو قلب اگر فاسد ہو جائے تو ساری کائنات فاسد ہو جاتی ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:"اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَاصَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَافَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ"① تو قلب اگر ٹھیک رہے گا تو تمام اعضاء ٹھیک رہیں گے اگر قلب میں فساد آ گیا۔تمام اعضاء میں فساد آجائے گا..... تو اہل علم کا کام یہ ہے کہ وہ فساد سے دور بھاگنے کی کوشش کریں۔ان کا کام صلح پھیلانا ہے اور پھیلا کر دنیا کو رشد و ہدایت اور بھلائی کی طرف اور بزرگی کی طرف لانا ہے اگر وہ بھی عوام الناس کی طرح چند چیزوں، چند ٹھیکروں یا چند محسوس چیزوں کے طالب بننے لگیں تو انہوں نے اپنے وقار کو کھو دیا اور (انہوں نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں) ان کا کام یہ ہے کہ وہ قلب کے مقام کو باقی رکھیں اور سمجھیں کہ ہم کائنات کے قلب ہیں۔اس لئے اپنے کو فساد سے بچائیں اور اپنے کو صالح بنائیں۔ان کو دنیا کا امام بنایا گیا ہے اگر سارے مقتدی وضو کر آئیں اور امام کا وضو نہ ہو یا ٹوٹ جائے، کسی کی نماز نہ ہوگی۔سب کی نماز جبھی ہوگی جب امام بھی طاہر ہو۔امام پارسا اور پاک ہو۔جب اس کی پاکی ختم ہوگی تو دوسرے پاک بھی رہیں گے تو بھی ناپاک بن جائیں گے۔ان کی پاکی نامقبول ہوگی۔

آپ اس کائنات کے قلب ہیں۔اگر اسمیں طہارۃ ہے تو دنیا میں طہارۃ موجو ہے اگر اس میں خباثت آ گئی تو دنیا میں خباثت پھیل جائے گی۔دنیا میں نجاست عام ہو جائے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بچہ کو دیکھا کہ دوڑتا جارہا ہے آپ نے فرمایا کہ: میاں آہستہ چلو گر جاؤ گے۔ تو اس لڑکے نے جواب دیا کہ: آپ آہستہ (اور دیکھ کر) چلیں، اس لئے کہ اگر آپ گر گئے تو ساری قوم گر جائے گی۔ میرے گرنے سے تو صرف میں ہی گروں گا۔

تو یہاں عوام سے خوف نہیں خواص سے خوف ہے کہ ان کے فساد پر عوام کا فساد اور انکی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے اس واسطے اگر یہ صالح اور ٹھیک ہیں تو عوام بھی ٹھیک ہیں جب کبھی فتنہ پھیلا ہے عوام سے کبھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرألدینه ج: ۱ ص: ۵.

نہیں پھیلا۔ عوام تو بیچارے متبع ہیں۔ ان کے سامنے اللہ ورسول کا نام لو گے تو گردن جھکا دیں گے۔ اب نام لینے والا ہی خیانت کرے کہ اللہ ورسول کے نام سے اپنے ہی تخیلات پیش کرنے لگے۔ اس پردے میں اپنے دل کی اغراض پیش کرنے لگے تو یہ بیچارے عوام کا قصور نہیں اگر چہ ان کی تباہی کا وبال اس شخص کی گردن پر ہوگا۔

تو خواص کی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے اور خواص میں ناک کان آنکھ نہیں بلکہ قلب ہے تو جب اللہ نے آپ کو قلب بنایا آپ کو عالم کی اصلاح وفساد کا مدار ٹھہرایا تو بڑی ہی ناقص بات ہوگی کہ آپ ہی فساد کی طرف آنے لگیں۔ اور فساد کی طرف آنا یہی ہے کہ ایک عالی چیز کو چھوڑ کر سافل چیز کی طرف آپ کا ذہن جانے لگے۔ کہ پیسہ کس طرح آئے؟ راحت کس طرح ملے؟ یہ تو خود بخو ملے گی وعدۂ خداوندی ہے، کچھ تو اپنے اللہ کے وعدے پر اعتماد کرو۔ اس مقام پر بھی آ کر اگر آپ ایسا آدمی اللہ کے وعدوں پر بھروسہ نہ کرے تو عوام الناس سے کیا امید رکھی جائے کہ وہ اللہ کی ذات عالی کے فرسودہ وعدوں پر بھروسہ کریں۔

توکل علی اللہ سے ہر چیز ملتی ہے...... تو آپ کا سب سے بڑا کام توکل اور استغناء ہے اسی میں سب کچھ ہے۔ آپ کے لئے دین بھی ہے دنیا بھی چاہے تھوڑی ملے مگر ضرور ملے گی، ممکن ہے کہ آپ لکھ پتی یا کروڑ پتی نہ ہوسکیں لیکن سینکڑوں کروڑ پتی آپ کے قدموں کے سامنے سر جھکائیں گے۔ اگر چہ آپ کروڑ پتی نہیں تو کروڑ پتی بن جانا کوئی کمال کی چیز بھی تو نہیں کروڑ پتی کو اپنے سامنے جھکانا یہ کمال کی چیز ہے، اگر آپ کے پاس کار نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ساری دنیا کی کاریں آپ کی کاریں ہیں۔ جہاں گئے کار حاضر ہے پھر ہمیں کار کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جب ساری دنیا کی کاریں ہماری، ساری دنیا کی دولت ہماری، جہاں ضرورت ہے اللہ خود پوری کرتے ہیں۔ اس واسطے اس مقام پہ آ کے تو آدمی اللہ پر بھروسہ کرے، اس مقام پر آ کے بھی بھروسہ نہ کیا تو پھر اللہ پر بھروسہ کرنے مقام کون سا آئے گا؟

تو یہ مقام مقتضی ہے کہ اللہ پر پورا اعتماد کرے حق تعالیٰ کے اوپر پورا بھروسہ کرے، اور اپنے کو سونپ دے، کہ جب آپ نے مجھے اپنے کام میں لگا دیا ہے تو میرا نفس آپ کے حوالے ہے۔ ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ (1) تو اللہ تعالیٰ اس لئے بندے کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اگر دنیا میں بھی آپ اپنے کو کسی شخص کے حوالے کر دیں کہ میں تم پر اعتماد کرتا ہوں بس میں آپکے حوالے ہوں جو آپ کا جی چاہے کریں، سیاہ وسفید کے آپ مالک ہیں۔ تو اس شخص کو کبھی جرأت نہیں ہوگی۔ کہ آپ کے معاملہ میں خیانت کرے، مثل مشہور ہے کہ ''قدموں میں آ کے گرے ہوئے سانپ کو بھی آدمی نہیں مارتا'' جب وہ آ کے جھک جائے جو اتنا جھکنے والا ہو اس کے ساتھ احسان کرے، تو اللہ کے سامنے آپ جھکیں گے۔ اور وہ ضائع کر دیں یہ کبھی ممکن نہیں۔

(1) پارہ: ۲۴، سورۃ المؤمن، الآیۃ: ۴۴.

یہی تو وہ چیز ہے جس کو حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس وقت فرمایا تھا جب وحی آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر فرمایا: ''زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ'' مجھے کمبل اوڑھا دو، ''اِنِّیْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ'' مجھے اپنے نفس کے اوپر ہلاک ہو جانے کا ڈر ہے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ''کَلَّا وَاللہِ لَا یُخْزِیْکَ اللہُ اَبَدًا، اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ'' ① اس قسم کے جملے فرمائے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ اس وقت تک تو اسلام بھی پورا سامنے نہیں آیا تھا۔ مگر سلامتی فطرت سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایسا آدمی ضائع ہونے کے لئے پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو آپ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلیں اور اللہ آپ کو ضائع کر دے یہ کیسے ممکن ہے؟ نہیں ہو سکتا۔ ہاں کوئی بھروسہ نہ کرے تو اس کا کوئی علاج نہیں تو یہ بھروسہ اور اعتماد کا مقام ہے کہ جب اس لائن میں پڑ گئے تو پھر خدا پر بھروسہ کیجئے۔ غناء نفس پیدا کیجئے، ذلت نفس اس مقام کا خاصہ نہیں ہے ذلیل النفس وہ ہوتا ہے جس کے پاس عزت کی چیز نہ ہو۔ جس کے پاس علم جیسی عزت کی چیز ہے وہ کبھی ذلیل نہیں ہو سکتا۔

علم مع العبدیت کا خاصہ ارتقا ہے...... تو علم بلند ہونے کیلئے ہے پست ہونے کے لئے نہیں۔ آدمی میں علم کی ہوا بھری ہوئی ہو پھر پست ہو جائے یہ ناممکن ہے اگر لطیف چیز کثیف میں بھر دی جائے تو وہ پست نہیں ہوتی آپ گیند کے اندر ہوا بھر دیجئے پھر زمین پر دے ماریئے تو زمین سے کتنا زیادہ اوپر جائے گی۔ اور اگر ہوا نکال کر زمین پر ماریں گے تو وہ بیچاری پھس کر کے رہ جائے گی۔ اس کے اندر اٹھنے کی جرأت نہیں معلوم ہوا لطیف چیز کی طاقت ہوتی ہے تو طاقت تو علم ہے یہ جب بھری ہوئی ہو اور پھر آدمی زمین کی طرف جائے اور پٹخا رہے۔ معلوم ہوتا ہے یا تو وہ علم نہیں ہے یا وہ علم کو سمجھا ہوا نہیں اگر علم نہیں تو بے شک پٹخا جائے گا اور اگر علم ہے تو وہ اس کی قدر و قیمت کو نہیں جانتا۔ نہ اس کے استعمال کو جانتا ہے نہ اس کی عزت و آبرو کی اس کو قدر و منزلت ہے...... اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو وہ علم پست ہونے کے لئے نہیں ہو سکتا۔

علم کا خاصہ ترقی، اونچائی اور بڑھائی ہے بلکہ اسی وجہ سے انسان کے لئے عبدیت لازم کی گئی ہے اس لئے کہ محض علم اسے متکبر بنا دے گا علم نیچا دیکھنا نہیں چاہتا۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک عالم میں غرور بھی آ جائے، تکبر بھی آ جائے۔ بڑائی بھی آ جائے اس لئے اس کا علاج عبدیت میں رکھا گیا ہے۔ اور عبدیت کسی مرد کامل کے سامنے خود کو پامال کئے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ تو عبدیت ضروری ہوئی تا کہ علم کا غرور یا استکبار نہ رہے وقار کے درجہ میں علم رہ جائے اور عبدیت کے مواقع پر آ کے تواضع للہ پیدا ہو جائے۔ تو کبر کا علاج تواضع سے کیا گیا ہے اور ذلت نفس کا علاج وقار اور خودداری سے کیا گیا ہے۔ تو جب علم کے ساتھ عبدیت جمع ہوتی ہے تو علم کے آثار میں استکبار کے بجائے وقار پیدا ہوتا ہے اور عبدیت سے ذلت نفس کے بجائے تواضع للہ پیدا ہو جاتی ہے تو عالم حقیقی وہ ہے جو متکبر نہ ہو بلکہ باوقار

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص: ۱ رقم: ۳.

ہو۔ جو ذلیل النفس نہ ہو بلکہ متواضع ہو ایک طرف تواضع للہ ہو تو علم کے اندر توازن قائم ہو جائے گا اور اگر عالم کے اندر استکبار ہے تو عالم کیلئے فساد ہے اور اگر اسمیں تواضع کے بجائے ذلت نفس ہے تو بھی عالم کیلئے فساد ہے صاحب ہدایہ نے ایک موقع پر (جس کا ترجمہ یہ ہے) لکھا ہے کہ وہ عالم جس میں غرور نفس ہو متکبر ہو وہ عالم کیلئے فتنہ ہے اگر وہ اس علم سے جاہل رہتا تو بہتر رہتا۔ لیکن علم آیا اور اس کے ساتھ کبر ہے تو اس نے علم کو بٹہ لگایا۔ علم عالم میں فساد پھیلانے کا ذریعہ بن جائے گا اور اگر وہ جاہل ہے عامل بے علم ہے وہ بدعات و منکرات میں مبتلا ہوگا۔ وہ بھی فساد کبیر ہے تو علم کیلئے بھی ایک فتنہ ہے اس کا علاج عبدیت میں ہے اور عبدیت کیلئے بھی ایک فتنہ ہے اس کا علاج علم ہے جب تک یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں کام نہیں چلتا۔

علم بلا عبدیت اور عبدیت بلا علم کا نتیجہ...... اس کی نظیر دو امتیں موجود ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے اللہ نے دو امتیں پیدا کیں۔ ایک یہود اور ایک نصاری یہود کو علم دیا گیا۔ علم بھی تفصیلی۔ تورات کی شان بیان فرمائی گئی ہے کہ ﴿تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① ''اسمیں ہر چیز کی تفصیل ہے'' نہایت واضح شریعت ہے نہایت مفصل شریعت ہے تو تفصیلی شریعت دی گئی یعنی علم تفصیلی دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ لازم کیا گیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شخصیتوں کے آگے جھکتے رہنا۔ ان سے تمسک کرتے رہنا یہود نے کہا کہ: ''نَحْنُ رِجَالٌ وَّهُمْ رِجَالٌ'' یہ انبیاء بھی انسان ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کی اتباع کریں ہم میں تورات بھی موجود ہے عقل بھی موجود ہے۔ اپنی عقل کے ذریعہ تورات سے اخذ کریں گے اتباع کی ضرورت نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ جب عبدیت نکل گئی جو شخصیتوں کے آگے جھکنے سے پیدا ہوتی ہے تو خالص علم رہا تو اس سے کبر اور غرور پیدا ہو گیا، کبر اور غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ظنون اور اوہام کا مجموعہ ہو کر رہ گئے علم قطعی باقی نہیں رہا۔ تو یہود علم کے فتنے میں گرفتار ہوئے جن میں تکبر پیدا ہوا جس کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿سَأَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ﴾ ②

تو یہود علمی فتنے میں مبتلا ہوئے تو شکوک وشبہات میں ان کا علم رہ گیا۔ ان کا فہم درحقیقت وہم ہے جس کا نام انہوں نے فہم رکھ لیا۔ اس جہل کا نام انہوں نے علم رکھ لیا۔ اس لئے کہ منافع علم جب ان سے منقطع ہو گئے تو علم کہاں سے آتا۔ ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ③ علم تو اہل علم کے سینوں سے نکل کر ملتا ہے کاغذوں اور اوراق میں تو رسوم اور دوال ہوتے ہیں، ان رسوم اور دوال کے مدلولات اہل علم کے سینوں میں ہوتے ہیں جب وہ نفع بھی ان سے ختم ہو گیا تو علم کی صورت رہ گئی، اور محض صورت جس سے روح نکل جائے

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۵۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶۔
③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔

وہ لاشئی ہے چند دن کے بعد وہ گلتی ہے، پھٹتی ہے سڑتی ہے، نہ صورت رہتی ہے نہ حقیقت رہتی ہے تو یہود استکبار کے فتنے میں تباہ ہوئے ہیں ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ ① جو داور استکبار ان کی شان رہ گئی.. لہٰذا تباہ و برباد ہوئے۔

نصاریٰ عملی اُمت تھی۔ ان کو انجیل کے اندر عمل کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ تصوف کے زیادہ تر احکام تھے ترک لذت، زہد کامل وہ تصوف کی کتاب ہے وہ اس کتاب پر چلے، تو تصوف کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی شخصیتوں کی طرف جھکتا ہے تو نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام، احبار اور رہبان کی طرف جھکے اور اتنا جھکے کہ انہوں نے انجیل سے قطع نظر کر کے کہا کہ کتاب ناطق تو یہ بزرگان دین ہیں۔ اس کتاب ساکت کی اب ہمیں کیا ضرورت ہے جو یہ کہیں وہ شریعت، جو یہ کریں وہ شریعت اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگوں کے افعال و اعمال ان کے حق میں گویا شریعت بن گئے کتاب خداوندی سے منقطع ہو گئے اور ان لوگوں کے آگے اتنا جھکے تو اضع نہیں بلکہ ذلت نفس میں مبتلا ہو گئے اور جب ان لوگوں کے اعمال کو ہی شریعت سمجھا تو طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو گئے، منکرات میں مبتلا ہو گئے کوئی مغلوب الحال ہو تو اس کے عمل کو بھی شریعت سمجھا جو مغلوب عن الحال ہو اس کو بھی شریعت سمجھا۔ تو ان کیلئے غیر شریعت شریعت بن گئی۔ اور منکر و بدعت کا حاصل غیر شریعت کو شریعت بنانا ہی ہے تو نصاریٰ کی امت گویا بدعتی امت ہے حق تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ② تو وہ رہبانیت کا شکار ہو کر بدعات میں مبتلا ہوئے اور یہود علمی فتنہ کا شکار ہو کر استکبار میں مبتلا ہوئے تو ایک امت جحو د اور استکبار میں ماری گئی اور ایک امت ذلت نفس میں ماری گئی۔

﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِيَعْبُدُوْآ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ ③ تو یہ عملی فتنے میں گرفتار ہوئے اور وہ علمی فتنے میں مارے گئے۔

اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سابقہ اُمتوں کے اتباع کا جذبہ اور اس کے نتائج...... حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: تم یہود و نصاریٰ کی ہو بہو پیروی کرو گے چھوٹی بات میں اور بڑی سے بڑی بات میں، ④ عقائد میں، عمل میں، معاشرت اور معیشت میں حتیٰ کہ اگر وہ کوئی فعل منکر بھی کریں گے اور عبث کام کریں گے۔ اس میں بھی ان کا ساتھ دو گے۔ تو نصاریٰ اور یہود اہل کتاب کے یہ جو دو طبقے ہیں انمیں بھی فساد ہونا لازمی ہے تو امت میں دو طبقے پیدا ہو گئے، ایک طبقہ ہمارے اندر وہ ہے جو غرور نفس اور غرور علم میں مبتلا ہے اس کو اپنے علم کے اوپر گھمنڈ ہے وہ کہتا ہے "سلف کا اتباع کریں" اس کی ضرورت نہیں ہے قرآن وحدیث موجود ہے ہمارے اندر عقل بھی موجود ہے بلکہ ایک قدم اس سے بھی آگے کہ حدیث کی بھی ضرورت نہیں کہ بالآخر

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۴. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۷. ③ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۱. ④ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل ج: ۱۱ ص: ۲۷۲.

وہ ایک انسان کا ہی قول ہے، بس خدا کا قول ہمارے سامنے ہو اور ہماری عقل سامنے ہو (ہدایت کیلئے کافی ہے) یہ طبقہ یہود کے نقش قدم پر چل پڑا تو عجب و استکبار اور غرور نفس میں مبتلا ہوا۔ ان کا علم وہم کے درجے میں ہے ظنون اوہام اور تخیلات فاسدہ کا نام انہوں علم رکھ لیا (وہ اسی پر خوش ہیں) اور ایک جماعت وہ ہے جو یہ کہتی ہے کہ یہ بزرگان دین شیخ جنید رحمۃ اللہ علیہ وشبلی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی کتاب ناطق ہیں۔ اب کتاب ساکت کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں جو یہ کہیں وہ شریعت، جو یہ کریں وہ شریعت، اس قسم کے لوگ اکثر و بیشتر بدعات میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ اہل اللہ کے بہت سے اعمال غلبہ حال میں سرزد ہوتے ہیں جو خلاف شرع تو نہیں ہوتے لیکن وہ دقیق ہوتے ہیں جن کا رابطہ شریعت سے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے وہ سطح کو دیکھ کر عمل کرتا ہے تو بدعات کا شکار ہوتا ہے اسی واسطے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَآئِنَا فَفِيْهِ شِبْهٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا فَفِيْهِ شِبْهٌ مِّنَ النَّصَارٰى'' ① علماء میں بگاڑ آتا ہے تو وہ یہود کے نقش قدم پر جاتے ہیں۔ عجب و استکبار میں مبتلا ہوتے ہیں اور عبّاد و زہاد میں بگاڑ آتا ہے تو وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو وہ بدعات اور منکرات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اہل حق کی پہچان...... اہل حق کون ہیں؟ وہ ہیں جو نہ متکبر ہیں نہ ذلیل النفس ہیں۔ بلکہ وقور النفس اور متواضع النفس ہیں۔ وہ درمیان میں ہیں۔ جو کہ اہل سنت والجماعت ہیں جن کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ کا دامن ہے اور ایک ہاتھ میں اہل اللہ کا دامن ہے، نہ وہ کتاب اللہ کو تھام کر اہل اللہ سے مستغنی بنتے ہیں اور نہ اہل اللہ کا دامن سنبھال کر کتاب اللہ سے مستغنی بنتے ہیں علم وہاں سے حاصل کرتے ہیں، عمل اور عمل کے نمونے یہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ تو وہ ٹھیک صراط مستقیم پر قائم ہیں نہ افراط میں مبتلا میں نہ تفریط میں۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قلب سلیم وہ ہے جو نہ افراط میں ہو نہ تفریط میں قلب سلیم وہ ہے جس میں نہ غرور ہو نہ ذلت نفس ہو۔ وہ قلب صحیح معنوں میں بدن کے اوپر حکومت کریگا اور تمام اعضاء کو سیدھا چلائے گا۔ تو آپ جب کہ پورے عالم کا قلب ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے آپکو علم بھی دیا ہے اور علم کے ساتھ تواضع بھی دی ہے نیک مزاج شخصیتیں بھی دیں کہ آپ ان کا دامن پکڑیں۔ اپنی پاک کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہ اس کا دامن سنبھالیں تو اس دولت عظیم کے آجانے کے بعد پھر غیر کی دولت کی طرف متوجہ ہو کر آپ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہمارے پاس یہ نہیں ہمارے پاس وہ نہیں، کل کو کیا کریں گے یہ علم کی انتہائی توہین ہے مقام علم کی بھی انتہائی توہین ہے۔ آپ کو اپنا مقام سمجھ لینا چاہیے اور یہ بھی کہ آپکی حیثیت دنیا میں ہاتھ پیر کی نہیں اور نہ ہی آپ دنیا کے کان، ناک آنکھ ہیں بلکہ پورے عالم کے قلب ہیں۔

تھوڑا علم ''عبدیت کے'' ساتھ دوگنا اور مقبول ہو جاتا ہے...... اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ پورے وقار

---

① فیض القدیر، ج: ۵ ص: ۳۳۳.

کے ساتھ پوری ریاضت کے ساتھ اور پوری محنت کے ساتھ اپنے علم کے اندر متوجہ رہیں پورے ادب کیساتھ اپنے علم کو سیکھیں، اس واسطے کہ بے ادب آدمی کو علم حاصل نہیں ہوتا، طالب کو علم حاصل ہوتا ہے جو استاذ کی شان میں گستاخ ہوگا ہمیشہ علم سے محروم رہے گا جو متواضع رہے گا اگر چہ محنت بھی نہ کرے، محروم نہیں جاسکتا۔ دارالعلوم میں بہت سی نظیریں ہمارے سامنے ہیں۔ خود ہمارے ہم جماعت ہیں کوئی محنت نہیں کی ہمیشہ امتحانات میں فیل رہے مگر عقیدت و نیازمندی سے اساتذہ کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے اچھے ذی استعداد طالب علم وہ کام نہیں کررہے جو وہ قلیل الاستعداد مخلوق کی اصلاح کررہے ہیں۔ کچھ دعائیں ساتھ ہوجاتی ہیں۔ کچھ برکتیں ساتھ ہوجاتی ہیں تھوڑا علم بھی بہت ہوجاتا ہے تو عبدیت کے ساتھ وہ دگنا نظر آتا ہے اس کا کام دگنا ہوجاتا ہے اس سے نفع زیادہ ہوجاتا ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں کام قابلیت سے نہیں چلتا بلکہ مقبولیت سے چلتا ہے آپ اگر سرے سے قابلیت کے پیچھے لگ جائیں اور مقبولیت کے اسباب ترک کردیں گے کبھی دنیا میں نتیجہ خیز کام نہیں کریں گے، قابلیت زیادہ سے زیادہ کتابیں دیکھنے سے آجائے گی اور مقبولیت اخلاق کی اصلاح اعمال کی اصلاح توجہ الی اللہ اور انابت الی اللہ سے پیدا ہوگی اور مقبول بن کر آدمی جو کام کریگا وہ مقبول بنے گا جو نقل و حرکت کرے گا مقبول ہوگی۔ خاصان حق کی سب چیزیں مقبول ہوتی ہیں اور وہ ہزاروں برکات کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

مقربین کی لغزش بھی ہزاروں برکات کا پیش خیمہ ہوتی ہے...... حضرت آدم علیہ السلام کو آپ کہتے ہیں کہ ذراسی لغزش ہوگئی مگر وہ لغزش اور وہی غلطی ہزاروں برکات کا پیش خیمہ بن گئی تو

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

اہل اللہ کی غلطی اور لغزش بھی ہماری ہزاروں طاعات سے کہیں بہتر اور افضل ہوتی ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لیلۃ التعریس میں آنکھ نہ کھلی اور نماز قضا ہوگئی تو نظر بظاہر ادا کے مقابلہ میں قضاء لغزش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یہ نہ سرزد ہوتی تو قضا کے سینکڑوں علوم واحکام اور قضاء کی برکات مخفی رہ جاتے ہمارے سامنے کوئی اسوہ نہ آتا۔ تو بہر حال اہل اللہ کاملین مقبولین بارگاہ خداوندی ہیں ان کی اگر لغزش بھی ہو۔ وہ بھی ہزاروں برکتوں کا پیش خیمہ ہے تو آدمی خود مقبول بن جائے، ایک ایک فعل کو مقبول بنانیکی کوشش نہ کرے، خود مقبول بننے کی کوشش کرے۔

اسباب مقبولیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے...... تو زیادہ تر طلبہ قابلیت کے پیدا کرنے میں مبتلا رہتے ہیں میں اس سے انکار نہیں کرتا میں یہ نہیں کہتا کہ آج سے آپ مطالعے چھوڑ دیجئے، کتابیں نہ دیکھئے، تکرار ختم کردیجئے، یہ سب کچھ ہو مگر یہ اسباب قابلیت پیدا کرنے کے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اسباب بھی پیدا کیجئے جن سے مقبولیت بھی پیدا ہو، تادب اور اپنے اخلاق کی درستگی، اپنے اساتذہ کی اطاعت اور ساتھ ساتھ اپنے قلب کے اندر غناء اور استغناء جو علم کا خاص وصف ہے وہ پیدا کرنا ہوگا۔ اس صورت کے پیدا ہوجانے کے بعد اگر من بھر علم

ہوگا تو دس من ہو کے نمایاں ہوگا۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص شان استغناء ہے تبلیغ کیلئے جاتے ہیں تو فرماتے ہیں بلکہ عمل ہی نہیں حکم بھی ہے کہ آپ کہہ دیجئے۔ ﴿وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ①

آپ تو اس پر عمل کرتے ہی ہیں کہنے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی کہلایا گیا کہ اس مقام کا تقاضا یہ ہے اور اس مقام کی معرفت اور پہچان یہی ہے کہ اعلان کیا جائے کہ ہم تم سے پیسے کے طالب نہیں ہیں۔ ہم تم سے محنت اور خدمت کے طالب نہیں ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیسہ بھی آتا ہے اور خدمت بھی ہو جاتی ہے تو اپنے اندر استغناء پیدا کیا جائے، تادب پیدا کیا جائے اور اطاعت کی خو ڈالی جائے سرکشی نہ پیدا کیجائے، سرنگونی پیدا کی جائے اسلئے کہ جب ہم خاک میں سب خاکی النسل ہیں خاک کا کام یہ نہیں ہے کہ آسمان میں جاکے اڑے۔ وہ تو پامال رہے گی تب ہی اچھی رہے گی اگر خاک اڑ کے چلی تو جس پہ گرے گی لوگ دامن جھڑک دیں گے جس آنکھ پہ گرے گی لوگ لعنت بھیجیں گے۔

لیکن اگر جوتوں میں پامال رہے گی تو اس کے اوپر تیمم کریں گے، طاہر ہی نہیں بلکہ مطہر بھی سمجھیں گے، تو خاک کا کام یہ ہے کہ وہ خاک بن کر رہے۔ اگر آتشی بن کر رہے گی تو اس نے اپنا نسب نامہ ابلیس سے ملا دیا ابلیس کو کہا گیا ہے کہ ﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ ② تو ہم تو اولاد آدم ہیں، ابلیس کی اولاد نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ابلیس کے خصائل اختیار کریں آگ بن کے رہیں، خاک بن کے نہ رہیں اور جب خاک بنکے رہیں گے تو خاک وہ چیز ہے کہ پھول پھل اسی سے اُگتے ہیں۔ دنیا میں باغ و بہار کی رونق اسی سے ہے آج تک آگ نے کسی درخت کو نہیں اگایا۔ آج تک کسی آگ کے اندر سے کوئی دریا نہیں نکلا یہ کام مٹی کا ہے کہ خنکی بھی پیدا کرتی ہے پھول پھل پیدا کرتی ہے سکون بھی پیدا کرتی ہے ہاں آگ کو خادم کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً تاپ لیتے ہیں۔ لیکن اگر حدود سے گزرتی ہے تو لوگ اس کو بجھانے کی فکر کرتے ہیں کہ اس کمبخت کے اوپر پانی ڈالو ورنہ یہ تو جلا ڈالے گی۔ تو بہر حال جب ہم خاکی الاصل ہیں تو ہمارا کام خاک بن کے رہنا ہے اور خاک بن کر رہنے کے معنی تادب اور ادب مع اللہ ہی ہیں۔

ادب ہی گوھر علم ہے...... قرآن مجید میں جگہ جگہ ادب کو تعلیم دی گئی ہے فرمایا گیا ہے ﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ ③

بہر حال اس کا امر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آواز پست رکھو، حدیث میں آتا ہے

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۲۷۔ ② پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۷۶۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲۔

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہری الصوت تھے اور فطرتاً بلند آواز تھی لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اتنے آہستہ بولتے تھے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سننا پڑتا تھا کہ کیا فرما رہے ہیں اور فرماتے تھے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں زور کی آواز نہ نکل جائے اور میرے اعمال حبط ہو جائیں۔ تو اہل اللہ بعید سے بعید احتمالات کو زیرِ عمل لانا چاہتے ہیں۔ محض مدلولات کی فکر میں نہیں رہتے۔ بعید سے بعید محتمل ہوا سے بھی اپنے تقویٰ باطن کے تحت عمل میں لانا چاہتے ہیں بہرحال ادب سکھایا گیا کہ مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آواز بھی بلند نہ کرو بے ادبی سے مت بیٹھو بے وضو مت بیٹھو۔ قرآن کریم کو بے وضو ہاتھ نہ لگاؤ ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ① تو مساجد کا ادب الگ کعبۃ اللہ کا ادب الگ، شعائر اللہ کا ادب الگ ہے غرض جس چیز کو اللہ سے نسبت ہو جائے اسی کا ادب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ واجب اطاعت ہے اور واجب التادب ہے اس واسطے جو بھی اس کی طرف منسوب ہو گئے درجہ بدرجہ سب میں ادب آتا چلا جائے گا تو ہماری تادب کی بنیاد ادب کے اوپر ہے بے ادبی کے اوپر نہیں۔ ہے ہماری بنیاد اطاعت پر ہے بغاوت پر نہیں ہے ہماری بنیاد درحقیقت اعتراف قصور پر ہے کہ غلطی بھی کریں تو اس کو سنبھالنے کی کوشش اور فکر کریں کیونکہ ہم بڑے مقدس تو ہیں نہیں کہ کبھی غلطی ہمارے سے ہو ہی نہیں سکتی تو جب ادب تادب کی اطاعت اور سرنگونی کی خو پیدا ہو جائے گی تو اس وقت علم کا گوہر چمک کر نمایاں ہوگا۔ اور اگر گستاخی، بے ادبی اور بے تمیزی باقی ہی رہی تو علم ایسا رہے گا جیسے ایک چنگاری ہو اور اس پر راکھ پڑی ہوئی ہو کہ نہ اس کی چمک نمایاں ہوگی نہ اس سے کسی کو روشنی کی توقع ہوگی۔

اہل علم اور ان کی ذمہ داریاں...... تو یہ چند کلمات آپ حضرات کے سامنے جرأت کر کے میں نے اس لئے عرض کر دیئے کہ آپ حضرات کا مقام بہت بلند و بالا اور بہت ہی اونچا ہے آپ اللہ کا جتنا شکر کریں کم ہے کہ آپ کو ایسا رفیع مقام عطاء کیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جتنا اعلیٰ اور رفیع مقام ہوتا ہے اس کے حقوق بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں اس کے واجبات بھی اتنے ہی ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یا تو آپ اس میدان پڑے نہ ہوتے لیکن جب آ گئے ہیں تو حق ادا کرنا پڑے گا۔

حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر میں سے ہیں اور شاملی کے میدان میں امیر جہاد تھے اور جھنڈا بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان سے کسی نے کہا کہ: حضرت ہیں اپنے بچے کو قرآن حفظ کرانا چاہتا ہوں تو ہنس کہ فرمایا کہ کیوں؟ یعنی عمر بھر کی بیماری اس کو کیوں لگاتا ہے اس لئے کہ قرآن یاد کرائے گا تو عمر بھر لازم ہو جائے گا کہ یہ اس کو پڑھتا رہے یاد کرتا رہے بھولا تو آخرت میں اس پر مصیبت آئے گی۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن حفظ نہ کرو۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب قرآن حفظ کر کے میدان میں آؤ گے تو اس کے حقوق بھی لازم ہو جائیں گے اس کی تلاوۃ بھی لازمی ہوگی اور اس کا تحفظ بھی۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹.

اس بناء پر یا تو آپ اس میدان میں نہ آئے ہوتے اور جب آ گئے تو پھر اخلاقی جرأت سے کام لیکر اس مقام کے حقوق ادا کیجئے مقام تو یہ ہے اور حالت یہ ہے کہ بعض طلباء کے سامنے تو اگر کوئی امیر آ گیا تو وہ اپنی نگاہوں میں اپنے آپکو ضعیف اور ہیچ سمجھتے ہیں اور خود منفعل ہو جاتے ہیں تو گویا ان کے دل میں اپنی وضع قطع کی کوئی عظمت نہیں ہے اس شخص کی وضع قطع کی عظمت ہے جو سامنے ہے۔ جھینپ کے یہی تو معنی ہیں کہ میں ہیچ ہوں اور دوسرا مجھ سے بلند ہے اگر طالب علم کا مقام رکھتے ہوئے دوسرے کے آگے جھینپیں اور سمجھیں کہ یہ مقام اونچا ہے تو اس نے سارے حقوق کو تلف کر دیا اس کا تو یہ کام ہے نہ ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کرے نہ ناصح کی بے جا نصیحتوں کی پرواہ کرے۔ اس مقام کی عزت اور شرف کو سنبھالے۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ جب ایران فتح ہوا۔ تو بغداد تشریف لائے تو کھانا کھا رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ تو ہاتھ سے لقمہ زمین پر گر پڑا تو آپ نے لقمہ اٹھا کے مٹی جھاڑی اور صاف کر کے تناول فرمالیا۔ اس غلام نے کہا کہ: یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ متمدن ملک ہے فارسیوں کا ملک ہے یہ ایک لقمہ جو کہ گندہ ہو چکا تھا اور آپ نے اسکو اٹھا کر کھالیا......؟ تو حضرت حذیفہؓ نے جواب دیتے ہوئی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی...... بلکہ فرمایا: ''ءَاَتْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ'' کیا میں اپنے حبیب پاک کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں...... تو اس ایک سنت کی وہ عظمت تھی کہ پورے تمدن کی وہ عظمت ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ اس سنت کا وہ وقار ذہن میں تھا کہ پورے ایران اور خراسان کے تمدن کی کوئی پرواہ نہیں کی یعنی ملامت کرنیوالے ملامت کریں ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہمیں اپنے حبیب پاک کی سنت درکار ہے۔

تو جب تک یہ طمانیت اور اتنا اعتماد اور اتنا اطمینان سنت نبوی کے اوپر نہ ہو اس وقت تک ایک عالم نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں۔ اور نہ ہی وہ اپنے مقام کو برقرار رکھ سکا اس کا فرض ہے کہ ایک ایک سنت کی اتنی عظمت کرے کہ پوری دنیا و مافیہا کی اس کے قلب کے اندر وہ عظمت نہ ہو۔ پھر جا کے اس مقام کا حق ادا ہوگا۔

تو آپ ماشاء اللہ ان حقوق کو خوب سمجھتے ہیں۔ سب سے زیادہ سمجھتے ہیں، اساتذہ سامنے ہیں کتب سامنے ہیں۔ میری یہ ضرورت نہ تھی کہ میں اہل علم میں کھڑے ہو کر کچھ کہوں، لیکن بہر حال کہنے سننے کیلئے کوئی بڑا ہونا ضروری نہیں چھوٹا بھی اپنے بڑوں سے کہہ سکتا ہے ایک ناقص بھی تو ایک کامل کے سامنے کہہ سکتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تو عالم بشریت اور عالم کائنات میں کوئی نہیں لیکن آپ مشورہ اپنے چھوٹوں سے بھی فرماتے ہیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعض دفعہ رائے قبول بھی فرمالیتے ہیں۔ بعض دفعہ اس رائے کی توقیر بھی فرماتے ہیں۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی ہیں۔ اگر کسی سے مشورہ بھی نہ فرماتے تو کوئی ادنیٰ نقص اور کمی نہ رہتی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی ہیں اور ملھم من اللہ ہیں۔ مگر تعلیم اور اُسوہ حسنہ کے طور پر آپ نے چھوٹوں کو بھی موقع دیا کہ وہ بات کریں۔ ایک ناقص الاستعداد کو بھی علم دیا ہے کہ وہ ایک کامل الاستعداد

کے سامنے اپنا خیال ظاہر کرے، قابل قبول ہو تو قبول کیا جائے۔ نا قابل قبول ہو تو منہ پر مارا جائے۔

لیکن اگر وہ ناقل ہو تو ناقل کی بات تو ماننا ہی پڑے گی، ہاں اگر اپنی رائے ظاہر کرے تو حق ہے کہ آپ دیوار پہ دے ماریں۔ لیکن اگر وہ نقل کرے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا پھر تو اگر دیوار بھی نقل کرے گی تو اس کی بھی تو قیر کرنے پڑے گی اگر چہ دیوار جمادات میں سے ہے اور آپ ماشاء اللہ انسانات میں سے ہیں۔ اشرف المخلوقات میں سے ہیں لیکن اگر دیوار پر بھی نصیحت لکھی ہوئی ہو تو قبول کرنی پڑے گی جبکہ وہ نصیحت حق ہو.....تو آپ مجھے ایک دیوار ہی سمجھ لیجئے اور دیوار کیا سمجھ لیجئے ہم سب ہی واقعہ میں دیوار ہیں کیا ہمارا علم؟ کیا ہمارا فہم؟ کیا ہمارا عرفان؟ کوئی کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اپنے بزرگوں کا نام لیتے ہیں ان کے کچھ مقولے یاد ہیں وہ نقل کر لیتے ہیں ایک دفعہ ہمارے شیخ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کی مسجد میں وعظ فرما رہے ہیں تو محبت پیار میں طلبہ کو اکثر جاھلین فرمایا کرتے تھے۔ فرمایا کہ: جاہلین ہمیں تو روٹیاں بھی اس لئے ملتی ہیں کہ پیغمبر کے چند نام ہم نے یاد کر لئے ہیں۔ انہیں کہتے رہتے ہیں اس کے طفیل میں ہمیں بھی روٹی ملتی رہتی ہے......
تو کیا ہمارا علم؟ کیا ہمارا فہم صرف یہ کہ بزرگوں کے سُنے سُنائے کچھ مقالات یاد کر لئے کچھ انہوں نے کتابوں میں پڑھا دیا۔ تو کچھ کلمات یاد ہو گئے، تو ہم ناقل محض ہیں۔ ہماری ذات کا کیا کمال ہے؟ ذات جب آئے گی تو وہ قابل نفرت ہو گی۔ لیکن اگر نقل کے ساتھ کلام آئے گا تو وہ قابل عظمت ہو گا۔ اس لئے نصیحت کے قبول کرنے میں بڑے چھوٹے کا فرق نہیں سمجھنا چاہئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ اتنا بڑا علم آپ نے کہاں سے حاصل کیا فرمایا کہ: ''لِسَانٌ سَئُوْلٌ وَقَلْبٌ عَقُوْلٌ'' ① بہت زیادہ پوچھ گچھ کرنے والی زبان کی بدولت اور بہت زیادہ سمجھنے والے دل کی بدولت مجھے یہ علم حاصل ہوا۔

تو علم کے میدان میں اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے کہ کہنے والا چھوٹا ہے یا ناقص الاستعداد ہے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کا ذاتی قول ہے یا منقول ہے اگر منقول ہے تو واجب القبول ہے غیر منقول ہے تو پھر وہ غیر معقول بھی ہے اور اسکو قبول کرنا کوئی ضروری بھی نہیں ہے تو پھر جو اس میں غلطی ہے وہ اپنے نفس کی ہے اور جو خیر ہے وہ اللہ اور اسی کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور اہل اللہ کی طرف سے ہے اس واسطے اس کے قبول کرنے کی ہمیں توقع رکھنی چاہیے، حق تعالیٰ شانہ آپ کو اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور مقبولیت کے راستے عنایت فرمائے۔ اور انجام بخیر فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

① فیض القدیر، ج:۲، ص:۲۲۷.

وعظ یوسفی

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ٥ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگان محترم! مجھے اس وقت کوئی اپنا وعظ سنانا مقصود نہیں ہے، بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کا وعظ آپ کے سامنے نقل کرنا ہے اور وہ وعظ بھی گویا نقل در نقل ہے، یعنی اس وعظ کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنی کتاب مبین میں نقل فرمایا ہے، اس سے نقل کر کے میں آپ کو سناؤں گا تو وہ وعظ میرا نہیں ہوگا بلکہ پیغمبر کا وعظ ہوگا، جس کے ناقل حق تعالےٰ شانہ ہیں تو نقل بھی اعلیٰ ترین اور اعلیٰ پیمانے کی سچی، وعظ کہنے والے بھی پیغمبر، اس واسطے نقل بھی مکمل اور وعظ بھی مکمل، تو ایسی چیز کے نقل کرنے سے خود ہمارے لئے بھی برکت اور سعادت ہوگی بنسبت اس کے کہ ہم اپنے افکار و خیالات پیش کریں وہ چیز کیوں نہ پیش کریں جو اللہ کے ایک رسول نے ارشاد فرمائی ہے اور حق تعالےٰ نے اس کو نقل فرمایا ہے۔

یہ جلیل القدر پیغمبر جن کا وعظ مجھے اس وقت نقل کرنا ہے، کون ہیں؟ یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جن کی بہت سی بالکل امتیازی خصوصیات ہیں، ویسے تو سارے انبیاء علیہم السلام کامل اور مکمل ہوئے ہیں ان میں ادنی کی یا ذرہ برابر نقص نہی ہوتا لیکن ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ② بعض رسولوں کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے تو ان میں تفاضل ہے، ایک سے ایک بڑھ کر ہے بڑھیا تو سبھی ہیں مگر ایک سے ایک بڑھ کر بھی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیات...... تو یوسف علیہ السلام بھی انہیں انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں جن کو اللہ نے کچھ امتیازی خصوصیات دی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں سب سے پہلی خصوصیت تو اعلیٰ ترین نسب کی ہے اور وہ بھی سلسلہ وار، یعنی خود بھی جلیل القدر پیغمبر، ان کے والد بزرگوار بھی پیغمبر یعنی حضرت یعقوب

علیہ اسلام یعقوب علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی پیغمبر، یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی پیغمبر، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تو نسلاً بعد نسل چوتھی پشت تک پیغمبری کا سلسلہ چلا آیا تو ظاہر بات ہے کہ یہ خود مستقل ایک برکت ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث شریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی بندہ صلاح اور نیکی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی پشتوں میں نیکی ڈال دیتا ہے سات پشتوں تک نیک پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں تو جب اُمتیوں کا یہ عالم ہے کہ نیکی میں کوئی جم جائے تو اس کی سات پشتوں تک نیکی کا اثر جاتا ہے تو انبیاء علیہم السلام کی بڑائی اور بزرگی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ ان سے بڑھ کر دنیا کے اندر نیکی کرنے والا کون ہے؟

اور یہ بھی فرمایا گیا: اگر کوئی مسلم، مومن امت کا کوئی آدمی بدعمل ہوتا ہے تو اس کی نحوست ساتوں پشتوں تک جاتی ہے اور پھیلتی چلی جاتی ہے اس لئے مسلمان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر خدانخواستہ بدعملی برت رہا ہے تو سات پشت کو تباہ کر رہا ہے اگر خود تباہ ہو جائے تو چلو ایک برباد ہے لیکن ایسی بربادی کہ ساتویں پشت تک اولاد کو تباہ اور برباد کر دے۔ اس شخص پر کتنی بڑی ذمہ داری اور کتنا بڑا وبال ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: بدعمل پر میں لعنت کرتا ہوں اور اس لعنت کا اثر ساتویں پشت تک جاتا ہے۔ تو یہی صورت نیکی کی ہے، ایک صالح نیک آدمی دیانت، امانت، عبادت اور معاشرۃ صالحہ کا پابند ہے اس کی اولاد میں نیکی کا اثر آئے گا کہ اولاد در اولاد یہ سلسلہ چلے گا اگر خدانخواستہ بدی (کا ارتکاب) بھی ہوا، اولاد سدھر جائے گی، انجام پھر بھی آبائی نیکی کی وجہ سے صحیح ہو جائے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خاندانی کرامت...... تو انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی نیک ہے نہ کوئی صالح ہے نہ کوئی پارسا ہے، تو ان کی پشتہا پشت تک نیکی کا اثر جانا قدرتی بات ہے تو یوسف علیہ السلام خود بھی پیغمبر، ان کے والد پیغمبر، ان کے دادا پیغمبر انکے پردادا پیغمبر گویا چاروں پشتوں تک پیغمبری چلی آئی ہے جو نیکی کی جڑ بنیاد ہے۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت میں بیان فرماتے ہیں کہ: ''اَلْكَرِيْمُ ابْنُ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ'' (1) خود بھی کریم باپ بھی کریم دادا بھی کریم، پردادا بھی کریم۔ کرامت آبائی طور پر چلی آ رہی ہے تو وعظ کہنے والی وہ شخصیت ہے کہ جس کی خاندانی کرامت اور بزرگی پشتہا پشت سے چلی آ رہی ہے اور آگے بھی پشتہا پشت تک چلی، تو وعظ میں بھی کتنی نیکی، کتنی تاثیر ہوگی، اس لئے میں نے اس وعظ کا انتخاب کیا۔

پھر یہ کہ نسب ہی نہیں بلکہ نسبت بھی جو بڑوں کی نسبت ہے، وہ بھی آئی، پردادا پیغمبر تو پیغمبری کی نسبت ان کی اولاد میں آنی چاہیے، پھر ان کی اولاد میں، پھر ان کی اولاد میں، پھر ان کی اولاد میں تو جیسے نسب آیا ہے، ویسے نسبت

(1) السنن للترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ یوسف ج:١٠ ص:٣٨٥.

بھی آتی ہے...... اور سیرت کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا کیا پوچھنا، انبیاء تو وہ ہیں کوئی بُرائی ان سے سرزد نہیں ہوتی یہ اجماع ہے اور اہلسنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبیرہ اور صغیرہ گناہ سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔ پیغمبری کے بعد اور پہلے بھی تو گویا نیک ہی پیدا کئے جاتے ہیں ان کی طبیعت کی اُفتاد ہی نیک اور صحیح ہوتی ہے مخلی بالطبع ہو کر ان کو کدھر بھی چھوڑ دو، وہ نیکی ہی کی طرف جائے گی، بدی کی طرف مائل نہیں ہوگی تو انبیاء کی فطرت میں صلاح ہوتی ہے، ان کی طبیعتوں کے اندر رشد، بزرگی اور بڑائی ہوتی ہے۔

حالانکہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ طبیعت ہر انسان کی بے شعور ہے، طبیعت میں محض جذبات ہوتے ہیں۔ سمجھ نہیں ہوتی...... بھوک لگتی ہے، طبعی جذبہ ہے سمجھ کے بھوک نہیں لگتی، یہ نہیں ہے کہ آپ دلائل سے بھوک لگوائیں، بلا دلیل لگے گی، یہ طبعی جذبہ ہے بلکہ اگر اس کے خلاف دلیلیں قائم کریں گے جب بھی بھوک نہیں رکے گی، آپ طبیعت کو سمجھائیں کہ اس وقت کھانا بہت مضر ہے، بہت برا ہے ہرگز مت کھاؤ، یہ دلیل اور یہ دلیل طبیعت کسی کی نہیں مانے گی وہ تو یکلخت لگ جائے گی پیاس لگے گی تو لگے گی، دلائل سے نہیں لگتی بلکہ دلائل سے مٹتی بھی نہیں اور رکتی بھی نہیں، تو طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں شعور نہیں ہوتا جیسے میں نے عرض کیا کہ: بھوک سمجھ کے تھوڑا لگتی ہے سمجھدار کو بھی لگے گی ناسمجھ کو بھی، حکیم کو بھی بے وقوف کو بھی جو بالکل ایک حرف بھی نہیں جانتا اس کو بھی...... اگر سمجھ کر دلائل سے بھوک لگا کرتی تو جاہل کو کبھی بھوک نہ لگتی، اس لئے کہ وہ بے چارہ دلیلیں نہیں جانتا مگر اُسے بھی لگتی ہے تو بھوک پیاس اور جذبات طبعی سمجھ بوجھ کے محتاج نہیں ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی طبیعت اس رفتار سے پیدا کی جاتی ہے کہ وہ چلتی ہی نیکی کی طرف ہے کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ نبی کی طبیعت میں جب جذبہ اُٹھے گا خیر کا اُٹھے گا شر اور برائی کا کبھی نہیں اُٹھے گا تو تین اشخاص ہوتی ہیں انبیاء علیہم السلام کی، نسب و نسبت اعلیٰ اور پاک طبیعت)

یہی وجہ ہے کہ شریعت تو انبیاء کی طبیعت کے اوپر چلتی ہے جو وہ کہہ دیں وہ شریعت ہے جو کر گذریں وہ شریعت ہے، شریعت کے یہی تو معنی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کیا۔ لہٰذا اُمت بھی یہ کرے، وہ شریعت بن گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اس طرح پڑھی لہٰذا وہ شریعت ہے، آپ نے حج اس طرح کیا لہٰذا وہ شریعت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے یہ ارشاد فرمایا: وہی شریعت ہے تو نبی کا قول، فعل اور عمل شریعت بنتا ہے، اگر خدانخواستہ طبیعت میں کھوٹ ہو اور غلطی بھی سرزد ہو تو شریعت پر عمل باقی نہیں رہ سکتا، نبی کا کیا ہوا اور کہا ہوا شریعت ہوتی ہے اگر اس میں غلطی ہو جائے تو پھر دنیا کے انسانوں کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، ان کی طبیعت پاک ہوتی ہے وہ جب چلے گی بزرگی اور خیر و برکت کی طرف چلے گی، برائی کی طرف نہیں جائے گی، تو تمام ہی انبیاء کی یہ فطرت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں، صالح، مقدس اور برتر ہیں، کوئی ادنیٰ تصور بھی گناہ کا نہیں ہے تو جیسے نسب اعلیٰ ہے، نسبت اعلیٰ ہے ویسے سیرت بھی اعلیٰ ہے اس لئے کہ سیرت کہتے ہیں پاکیزہ اخلاق، پاکیزہ عادات، پاکیزہ عمل کو تو نبی سے بڑھ کر

کس کی پاک ہوسکتی ہے؟ نبی سے بڑھ کر کس کے اونچے اخلاق ہوسکتے ہیں؟ نبی سے بڑھ کر کس میں صلاح ہوسکتا ہے؟ تو سیرت بھی مقدس اور نسب ونسبت میں بھی اعلیٰ......

حضرت یوسف علیہ السلام کا خلقی حسن اور سیرت باطن......اور خصوصیت سے یہ بات ہے کہ صورت بھی اعلیٰ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو حسن و جمال دیا گیا، اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: جب اللہ نے دنیا کو حسن تقسیم کیا تو آدھا حسن و جمال تو کل عالم کو دیا آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا① تو حسن و جمال وہ تھا کہ لوگ دیکھ کر مبہوت ہو جاتے، اپنے آپے میں نہ رہتے تھے یہ کیفیت طاری ہوتی تھی آپ نے تو سُنا ہی ہوگا مشہور قصہ ہے۔

عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام......قرآن کریم میں بھی ہے کہ زلیخا عاشق ہوگئی تھی حضرت یوسف علیہ السلام پر، اور تھے آپ زرخرید غلام: ان کو مصر کے بازار میں خرید لیا تھا، بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا، کنوئیں والوں نے نکال کے کنعان کے بازار میں بیچ دیا، عزیز مصر نے خرید لیا تو گویا زرخرید غلام تھے مگر حسن و جمال غیر معمولی تھا اور بزرگی وتقدس نے اس پر اور بھی نورانیت پیدا کردی تھی، تو ایک تو خلقی اور صورت کا حسن و جمال پھر سیرت کی نورانیت، وہ بھی اس جمال میں چمکتی تھی تو وہ اور بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بن گیا، ہزاروں عشاق تھے مگر زلیخا بالکل فنا ہو چکی تھی مصر کے امراء وزراء کی جتنی بیگمات، بی بیاں اور بیٹیاں تھیں، انہیں زلیخا کے اوپر رشک اور حسد تھا وہ یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح سے زلیخا یوسف کو چھوڑ دے اور ہم اس پر قبضا ئیں یوں تو کہہ نہ سکتی تھیں کہ تو چھوڑ ہے ہم قبضا ئیں۔ یہ تو بے عزتی کی بات ہوئی زلیخا کو طعنے دیتی تھیں کہ بڑی بدعمل ہے غلام پر عاشق ہوگئی اسطرح ملامتیں کر کے چاہتی تھیں کہ کسی طرح یوسف علیہ السلام اس کے دل سے اُتر جائیں اور جب اس کا دل ہٹ جائے تو ہم قبضا لیں تو ظاہر میں تو ملامت کرتی تھیں کہ بڑی بے وقوف ہے غلام پر عاشق ہوگئی اور عاشق درحقیقت خود تھیں، یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام ہمارے قبضے میں آجائیں۔

زلیخا جب طعنے سُنتے سُنتے تنگ آگئی تو اس نے ارادہ کیا کہ میں ایک دن فیصلہ کردوں تاکہ یہ طعنہ زنی کسی طرح بند ہو، تو اس نے بیگمات مصر کو پارٹی دی اور پارٹی بھی ''ٹی پارٹی''......چائے ممکن ہے اس زمانے میں نہ ہو مگر چائے کے لوازم میں فروٹ میوے اور پھل ہیں وہ سب جمع تھے بادشاہ کی بیوی تھی دسترخوان سجایا.....جب ہمارے آپ کے دسترخوان پر اتنے کھانے ہوتے ہیں کہ دیکھتے ہی بھوک لگ جاتی ہے وہ تو بادشاہ کی ملکہ کا دسترخوان تھا، تو پھل پھول اور فروٹ بہت سجائے گئے کہ دسترخوان خود ایک زینت بن گیا۔

دسترخوان سجانے پر ایک حکایت......جیسے آج کے زمانے میں دسترخوان کا سجانا یہ بھی ایک مستقل فن ہے، یورپ میں مستقل کمپنیاں ہیں جو دسترخوان سجاتی ہیں ان کی فیس مقرر ہوتی ہے، ہزاروں روپے فیس کے دیے

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السماوات، ج: ۷۵، رقم: ۴۱۱.

جاتے ہیں کافی پہلے کی بات ہے کہ وائسرائے کی ہندوستان میں بمبئی کے سیٹھ نے دعوت کی تھی۔ لندن کی ایک کمپنی کو یہ آرڈر دیا گیا کہ وہ میز سجائے اور چائے کا سامان لگائے، تو اس نے کیک اور پیسٹریاں اس انداز کی بنائیں کہ ہندوستان بھر کی جتنی مشہور عمارتیں تھیں ان سب کے نقشے بنائے۔ دہلی کی جامع مسجد مجسم بنا کے کھڑی کر دی۔ مینار بھی بنے ہوئے ہیں گنبد بھی بنے ہوئے ہیں مصلے بھی بچھے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قمقمے لگا کے ان کے اندر بجلی کی روشنی بھی دوڑائی۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ دلی کی جامع مسجد کھڑی ہوئی ہے بس نمازیوں کے آنے کی دیر ہے آگرہ کا تاج محل اس کا کیک بنایا۔ وہی چار مینار، وہی گنبد، وہی نقش ونگار، وہی اس میں رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ مقبرہ آصف الدولہ، مقبرہ ہمایوں، ان سب کے مجسمے بنائے جو کہ وہ کیک پیسٹری تھے اور میز کے اوپر جو کہ دستر خوان تھا، وہ بھی عجیب گل کاری کی ہوئی تھی، غرض جب وائسرائے نے دیکھا کہ میز کیا ہے گویا ہندوستان جمع ہے اس کے اوپر ساری مشہور عمارتیں ہیں وائسرائے حیران ہو گیا۔ اس میز کے سجانے پر ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ وائسرائے آ کے بیٹھ گئے۔ اس غریب کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ کھانا رکھا ہوا ہے وہ سمجھے عمارتوں کی شکل میں میز سجائی ہے کھانا اب تھوڑی دیر میں آئے گا، جب دس پندرہ منٹ ہو گئے جتنا وقت دیا تھا وہ گذرنے لگا تو وائسرائے نے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھا کہ سیٹھ سے کہو کھانا منگوائیں سیکرٹری نے اشارہ کیا کہ دیر ہو رہی ہے میز تو بہت عمدہ سجی ہوئی ہے مگر کھانا بھی تو آنا چاہیے۔ اس نے کہا، یہی تو کھانا رکھا ہے جو عمارتیں ہیں وائسرائے حیران ہوا اور کھانا شروع کر دیا۔ اب مینار کو کھائیں تو اور ذائقہ، گنبد توڑ کے کھائیں تو اور ذائقہ مصلے توڑ کے کھائیں تو اور ذائقہ غرض تھوڑی دیر میں وائسرائے اور اُن کے اسٹاف نے ہندوستان کی ساری عمارتیں ختم کر دیں، اب ان کو یہ فکر تھی کہ یہ تو سب چیزیں میٹھی تھیں کوئی سلونی نمکین چیز بھی تو آئے، تو سیکرٹری کی طرف دیکھا، اس نے سیٹھ کی طرف دیکھا تو سیٹھ نے کہا یہ جو دستر خوان بچھا ہوا ہے یہ نمکین کھانا ہے اسے توڑ توڑ کے کھایا تو اس میں نمکینی کا ذائقہ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ: کچھ ایسا ذائقہ بھی ہو جو نمک اور مرچ کے ذائقہ کو نیچا کر کے ہضم کر دے جیسے چٹنی اچار ہوتا ہے تو اس نے کہا یہ میز جو رکھی ہوئی ہے چٹنی ہے تو میز کے پائے تختے سب توڑ کے کھا گئے۔

زلیخا کی دعوت ...... تو انسان کی فطرت میں جمال پسندی ہے کہ چیز کو استعمال کرے اور خوبصورت بنا کے استعمال کرے۔ تو یہ اس زمانے میں بھی تھی تو زلیخا نے دستر خوان سجایا اور اس میں رنگ برنگ کے پھل اور قسم قسم کے فروٹ یہ سب چیزیں رکھیں اور چھریاں بھی رکھیں کہ کاٹ کاٹ کر لوگ کھائیں اور استعمال کریں، تمام کھانے جمع کیے اور جتنی وہاں مصر کے وزراء کی بیبیاں، امراء کی بیبیاں اور بیٹیاں تھیں سب کی سب جمع تھیں۔ زرق برق لباس پہن کر اور سنگھار کر کے آئیں مقصد یہ تھا کہ یوسف ہمیں پسند کر کے زلیخا کو چھوڑ دے۔

دستر خوان سجایا پھل پھول چھریاں رکھیں اور کہا بسم اللہ کرو، کھانا شروع کرو، چھریاں لے کے انہوں نے پھلوں کو کاٹنا شروع کیا حضرت یوسف علیہ السلام کو چھپا رکھا تھا اور کہا جب تک میں اجازت نہ دوں تو آپ باہر نہ

نکلیں جب انہوں نے کاٹ کر کھانا شروع کیا تو یوسف علیہ السلام کو اشارہ کیا کہ باہر آجاؤ۔ باہر آنا تھا کہ ان کا جمال دیکھ کر ہر عورت اتنی مبتلا ہوئی کہ ہوش حواس کھو دیے اور بجائے پھلوں کے کاٹنے کے کسی نے اپنی انگلی کاٹ لی، کسی نے انگوٹھا کاٹ لیا، کسی نے بازو کاٹ لیا سب عورتیں لہولہان اور زخمی ہوگئیں۔ اور یہ کہا کہ۔ ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ① خدا کی قسم یہ کوئی انسان اور بشر نہیں معلوم ہوتا یہ تو کوئی فرشتہ ہے اللہ کا جو آسمان سے اتر آیا۔ اس لئے کہ ملکیت کی نورانیت بھی موجود حسن و جمال بھی موجود، جمال میں نورانیت اور چمک بھی موجود تو کہا واللہ یہ انسان معلوم نہیں ہوتا کوئی فرشتہ ہے۔ ان کی صورت اور جمال میں مائل ہو کر ہوش، حواس بھی گم ہوگئے اور بجائے پھلوں کے کاٹنے کے ہاتھ کی انگلیاں اور کھونچیں کاٹ لیں، کپڑے بھی خراب ہو گئے تو اس وقت زلیخا نے کہا کہ ﴿فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ﴾ ② یہی ہے وہ جس کے بارے میں مجھے ملامت کیا کرتی تھیں، تم نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لئے؟ اپنی انگلیاں کیوں کاٹ لیں؟ میں نے تو آج تک ایک انگلی نہیں کاٹی تم نے انگلیاں تک کیوں قلم کر دیں؟ یہ وہی تو غلام ہے جس کے بارے میں تم مجھکو طعنہ دیتی تھیں تمہیں شرم نہیں آتی۔ اب توبہ کر کے واپس ہوئیں کہ اب کچھ نہیں کہیں گی، زلیخا ہم پر غالب ہے، یہ تو ایسا محبوب ہے کہ سارے عالم کو عاشق بننا چاہیے، زلیخا بے چاری کا کیا قصور ہے؟ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نسب وہ اعلیٰ تھا، نسبت وہ اعلیٰ تھی، سیرت وہ اعلیٰ تھی، صورت بھی اعلیٰ تھی تو ایسی ذات مقدس جس کا نسب نسبت، سیرت اور صورت سب اُونچا ہو، اس کا وعظ جب پیش کیا جائے گا۔

تو وعظ بھی تو اونچا ہوگا کتنا عالی مقام ہوگا وہ کلام جو ایسی برگزیدہ شخصیت کی زبان سے نکلا ہو اور حق تعالیٰ شانہ حکایت فرمائیں کہ یوسف نے یہ وعظ کہا تھا تو اللہ میاں کو بھی پسند آیا۔ تو جو پیغمبر کہے۔ اللہ میاں پسند کرے اس کی نقل کیجائے تو اس سے بہتر وعظ نہیں ہوسکتا، اس واسطے مجھے کوئی اپنا وعظ کہنا نہیں ہے بلکہ ایسے جلیل القدر پیغمبر کا وعظ سنانا ہے جس کی شخصیت یہ ہے جو میں نے عرض کی ہے یہ وعظ کون سے موقع پر کہا گیا؟ یوسف علیہ السلام نے کب فرمایا؟ تو قرآن نے اس کا واقعہ بیان کیا ہے اسی وجہ سے مجھے یہ رکوع پڑھنا پڑا۔ ورنہ ایک دو آیت کافی تھیں مگر چونکہ واقعہ متعلق ہے اس واسطے میں نے کئی آیتیں پڑھیں۔

زلیخا کی آخری تدبیر...... اس کا واقعہ یہ ہوا کہ عزیز مصر بادشاہ مصر کے دو خادم تھے، ایک شراب پلانے والا، اور ایک دستر خوان بچھانے والا باورچی، گویا ایک مطبخ کا انچارج آفیسر تھا اور ایک شراب پلانے کا انچارج آفیسر تھا ان پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے کھانے میں زہر ملایا۔ بادشاہ کو یہ قتل کرنا چاہتے تھے ادھر حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب زلیخا عاشق ہو چکی زلیخا نے ہر چند چاہا کہ میری طرف حضرت یوسف علیہ السلام مائل ہوں مگر مائل نہیں ہوئے، وہ تو پیغمبر اور مقدس تھے تب اس نے یہ کیا کہ ایک بڑا عالیشان

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۲.

مکان بنوایا اور اس کو فرنیچر سے آراستہ کیا اس میں زرق برق لباس پہن کر خود بیٹھی، اس کے اردگرد ایک اور مکان اس کے آگے ایک اور کمرہ سات کمروں کے اندر جو ساتواں کمرہ تھا، اس کو سجایا اور نہایت ہی فاخرہ لباس پہن کر وہاں بیٹھی اور یوسف علیہ السلام کو وہاں بلوایا مقصد یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام پیغمبر سہی مگر ہیں تو انسان اور انسان میں جنسی جذبات ہوتے ہیں تو جب میرا حسن و جمال دیکھیں گے خلوت اور تنہائی میسر ہوگی تو طبعاً میلان ہو جائے گا اور تدبیریں تو بیکار ہوگئی تھیں یہ تدبیر آخری تھی کہ جذبات کو اکھاڑ جائے تو جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔ یوسف علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہیں دی۔ آپ کو حکم پہنچا کہ اندر پہنچو، وہ پہنچ گئے اور ملازموں کو یہ حکم دیا تھا کہ جب ایک کمرے میں داخل ہوں تو اس کا اندر سے تالا بند کر دو دوسرے میں داخل ہوں تو اسکا بھی تالا بند کر دو اور تیسرے میں بھی اور ساتویں کمرے میں خود بیٹھی جب آپ اس میں پہنچے تو اس کا بھی تالا بند ہو گیا اب تو بھاگنے کی جگہ بھی نہیں تو خلوت، زلیخا کا حسن و جمال، آرائش اور پھر بہر حال بشریت بھی ہے یہ ایسی تدبیر تھی اگر پیغمبر اور معصوم نہ ہوں تو پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

یوسف علیہ السلام پہنچے تو دوسرا حال دیکھا کہ بڑی زرق برق بیٹھی ہے زلیخا نے اپنا مطلب پیش کیا، قرآن کریم میں اس کو فرمایا گیا۔ ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ ① تو ممکن تھا کہ بشریت اکھڑی جاتی لیکن چونکہ اللہ کی حجتیں اور پیغمبر کی برکت کے آثار سامنے تھے اس لئے بچ گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی منجانب اللہ حفاظت..... بعض احادیث میں ہے کہ: حضرت یوسف علیہ السلام نے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو چھت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا جو دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہیں ② تو اللہ کی طرف سے حفاظت ہوتی ہے پیغمبروں کی طبیعت بھی پاک ہوتی ہے اور من جانب اللہ حفاظت بھی کیجاتی ہے۔

تو اس آیت کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام وہاں سے بھاگے۔ اب تالے لگے ہوئے تھے مگر یہ پیغمبر کا معجزہ تھا کہ جس تالے پر ہاتھ ڈالا وہ کھل کر گر پڑا۔ آگے گئے دوسرے تالے پہ ہاتھ ڈالا، وہ گرا، ساتوں تالے کھل کر گر پڑے اور آپ باہر آ گئے۔

اب زلیخا کو فکر ہوئی کہ یہ باہر جا کر سارا قصہ سنائیں گے تو میں بادشاہ کی بیوی بدنام ہوں گی...... تو پھر عورتوں میں مکاری تو ہوتی ہے ﴿اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ ③ شیطان کے لئے کہا گیا۔ ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ ④ شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے اور عورت کا مکر بہت قوی اور مضبوط ہے شیطان تو چھپ کر کرتا ہے یہ سامنے آ کے کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ اتار چڑھاؤں کی باتیں اس طرح کرتی ہیں کہ بڑے بڑے عقلمند بھی بے وقوف بن جاتے ہیں...... شادی غمی کی جتنی رسوم ہیں جب یہ مرد کرتے ہیں تو انہیں ملامت کی جاتی ہے کہ یہ

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴. ② تفسیر الطبری، سورۃ یوسف، ج: ۲۴ ص: ۲۳۷.
③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۸. ④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۷۶.

حرکتیں کیوں کرتے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ عورتیں نہیں مانتیں عورتیں ان کے اوپر حکام ہیں کہ آرڈر وہاں سے ہوتا ہے تعمیل کرنے والے یہ ہیں، یہ انہیں چلاتی ہیں بے چاروں کے پاس گنجائش نہیں ہوتی۔ آدمی مبتلا ہو جاتا ہے جیسے حدیث میں فرمایا گیا:

''مَارَأَیْتُ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ'' ① کہ یہ عورتیں کیا ہیں....؟ ہیں تو ناقص العقل مگر بڑے بڑے عقلمندوں کی عقل اُچک لیتی ہیں۔

زلیخا نے دیکھا کہ اب میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میں بدنام ہو جاؤں گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام اصلیت کھول دیں گے تو دوڑ کر خود بھی باہر آئی اور شور مچایا کہ یوسف علیہ السلام بہت برے ارادے سے آئے تھے۔ میں اگر نہ بچتی تو مجھے خراب کر دیا ہوتا۔ لوگ جمع ہو گئے اور اس نے شور مچایا کہ مجھے خدا نے بچایا ان کا ارادہ تو غلط تھا۔ معاذ اللہ، زلیخا کا خاوند بادشاہ مصر نے دیکھا میری بیوی شور مچاتی ہے اور الزام ان پر رکھتی ہے، اس کے دل میں نہیں بیٹھتی تھی مگر اس نے کچھ ایسے اتار چڑھاؤ سے تقریر کی کہ خود بادشاہ کے دل میں بھی آ گئی کہ ممکن ہے یوسف علیہ السلام نے بُرا ارادہ کرلیا ہو! بادشاہ کے حشم وخدم بھی جمع ہو گئے۔ غرض زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ میں تو بری ثابت ہوں۔ سارا الزام یوسف علیہ السلام پر آ جائے۔

حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبر کی برأت کرنی مقصود تھی، تو ﴿شَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ اَھْلِھَا﴾ ② ایک چھوٹا سا بچہ جسے کوئی عقل نہ شعور، اس نے کہا کہ دیکھو فیصلہ کی ایک صورت ہے بات کھل جائے گی کہ قصور یوسفؑ کا ہے یا زلیخا کا یوسف کا کرتہ دیکھو اگر آگے سے پھٹا ہوا ہے تو سمجھو کہ یوسف کا قصور ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو زلیخا کا قصور ہے یوسف جب بھاگے تو زلیخا نے کرتہ پکڑا تو وہ پیچھے سے پھٹ گیا تھا دیکھا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا بات کھل گئی کہ قصور زلیخا کا ہے یہ محض مبتلا کرنے کو اور اپنے کو بری ثابت کرنے کے لئے مکر وفریب کر رہی ہے ﴿اِنْ کَانَ قَمِیْصُہٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَھُوَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ۝ وَاِنْ کَانَ قَمِیْصُہٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَکَذَبَتْ وَھُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَہٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّہٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ﴾ ③ جب دیکھا گیا تو کُرتہ پیچھے سے پھٹ رہا تھا۔

تو انہوں نے کہا یہ تو زلیخا کی حرکت معلوم ہوتی ہے یوسف سچے معلوم ہوتے ہیں تب عزیز مصر نے معذرت کی کہ ﴿یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِکِ اِنَّکِ کُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِیْنَ﴾ ④ ''اے یوسف! درگذر کرو، شرارت زلیخا کی ہے معاف کرو، بات صاف ہو گئی''۔

حضرت یوسف علیہ السلام جیل کیوں کر گئے؟......عزیز مصر نے یہ سوچا اگر یونہی کہہ دیا تو میری بیوی تو بدنام ہو گئی، اس واسطے بدنامی سے بچنے کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل خانے میں بھیج دیا کہ دنیا پر واضح ہو کہ قصور

① الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم ج:۲ ص:۳. ② پارہ:۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ:۲۶. ③ پارہ:۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ:۲۷، ۲۸. ④ پارہ:۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ:۲۹.

یوسف علیہ السلام ہی کا ہے گھر میں اعتراف کرلیا کہ آپ کا کچھ قصور نہیں مگر پبلک کو دکھانے کے لئے جیل بھیجد یا تا کہ بادشاہ کی بیوی کے بارے میں پروپیگنڈہ غلط نہ ہو۔

جیل پہنچے تو دونو جوان بھی جیل پہنچے جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے، ایک بادشاہ کا باورچی تھا جو کھانا پکا تا تھا اور ایک شراب پلانے والا اس کا انچارج آفیسر تھا ان دونوں پر الزام یہ تھا کہ بادشاہ کو انہوں نے زہر دیا، وہ دونوں بھی جیل خانے میں آئے، یوسف علیہ السلام پہلے سے موجود تھے جیل پہنچ کر ان دونوں ملازموں نے خواب دیکھے جس کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا ہے ﴿قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا﴾ ① ایک نے دیکھا کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں ﴿وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ﴾ ② دوسرے نے دیکھا کہ میرے سر پر ایک ٹوکرا ہے اس میں روٹیاں رکھی ہوئی ہیں اور چیل کوے ان روٹیوں کو کھا کھا کر جا رہے ہیں دونوں ملازم یہ دونوں خواب لے کر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے اور کہا۔

تعبیر خواب ایک مستقل فن...... ﴿نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ﴾ ③ اے یوسفؑ آپ ہمیں خواب کی تعبیر دیں ﴿اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ ④ ہم آپ کو محسن جانتے ہیں آپ علیہ السلام کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ آپ عارف باللہ بھی ہیں کامل بھی ہیں بزرگ بھی ہیں اور عالم غیب سے آپ کا رشتہ بھی ہے خواب غیب کی چیز ہوتی ہے تو جس کا تعلق امور غیبیہ سے ہو وہی خواب کی تعبیر بہتر دے سکتا ہے اس پر غیب کے عالم منکشف ہوتے ہیں حدیث میں فرمایا گیا ہے "لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ" ⑤

دنیا میں نبوت ختم ہوگئی۔ میرے آنے کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ہاں مبشرات باقی رہیں گی یعنی سچے خواب باقی رہیں گے جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں سچے خواب نبوت کا ایک حصہ ہیں جو اکثر و بیشتر ایمان والوں کو نصیب ہوتے ہیں گویا وہ عالم غیب سے ایک رشتہ ہوتا ہے تو خواب چونکہ رموز میں ہوتی ہے، اشارے ہوتے ہیں اور ان اشاروں کو وہ لوگ زیادہ پہچانتے ہیں جن کو غیبی عالم اور معاملات سے مناسبت ہوتی ہے وہ بتلا دیتے ہیں کہ اس اشارہ کا یہ مطلب ہے۔ اس سے یہ واقعہ مراد ہے تو قرآن و حدیث میں اس کے اصول قائم کر دیے گئے تعبیر خواب کی ایک مستقل فن کی صورت اسلام میں ہوگئی۔ بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوئیں جس میں تعبیر خواب کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ بڑے بڑے امام پیدا ہوئے جنہوں نے خواب کی اعلیٰ ترین تعبیریں دی ہیں۔

ایک خواب اور اُس کی تعبیر...... ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ مشہور امام ہیں خواب کی تعبیر دینے کے امام سمجھے گئے ہیں ان کی کتاب "تَاْثِیْرُ الْاَنَامِ فِیْ تَعْبِیْرِ الْمَنَامِ" دو جلدوں میں بڑی ضخیم ہے اس میں اصول اور قواعد خواب کی تعبیر نکالنے کے بیان کئے گئے ہیں اس میں بڑے عجائبات ہیں۔

---

① ② ③ ④ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۶.

⑤ الصحیح للبخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات، ص: ۵۸۳ رقم: ۶۹۹۰.

بات یاد آ گئی۔ بات تو ذرا طویل ہو رہی ہے لیکن جب پر زبان پر آ جائے تو رُکنا بھی مشکل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ: حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے آگ کے انگارے دھک رہے ہیں کیا تعبیر ہے؟ فرمایا جلدی جاؤ اور گھر سے بیوی بچوں کو نکال دو... تیرا گھر گرنے والا ہے وہ دوڑا ہوا آیا گھر سے بیوی بچوں اور سامان کو نکالا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد پوری بلڈنگ آپڑی خواب کی تعبیر ہو بہو پوری ہوگئی چار پانچ مہینے کے بعد پھر ایک شخص آیا کہ حضرت میں نے خواب دیکھا ہے، فرمایا کہ: میری چار پائی کے نیچے انگارے دہک رہے ہیں وہی خواب جو پہلے نے بیان کیا تھا فرمایا جا کر کھدائی شروع کر خزانہ نکلے گا چار پائی کے نیچے سے لاکھوں روپے کی تعداد کا سرخ سونا نکلے گا، اس نے آ کر کھدائی شروع کی تو بڑی بھاری دیگ نکلی جس میں زر خالص اور سونے کے ٹکے بھرے ہوئے تھے لوگوں نے ابن سیرین سے عرض کیا کہ: خواب دونوں نے ایک دیکھا ہے ایک کا آپ نے گھر گروا دیا اور ایک کو لاکھوں روپے دلوا دیے، کیا بات ہے؟ فرمایا کہ: پہلے شخص نے جو خواب دیکھا تھا، وہ موسم گرما تھا۔ گرمی کے موسم میں چار پائی کے نیچے آگ ہونا یہ بنیاد کا منہدم ہونا ہے اس لئے میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا اور دوسرے نے یہ خواب سردی کے موسم میں دیکھا اور سردی میں چار پائی کے نیچے انگاروں کا ہونا یہ عظیم ترین نعمت ہے اور آگ کی صورت خالص سونے کی ہے تو میں نے یہ تعبیر دی کہ سونا نکلے گا تو خواب یکساں مگر تعبیر الگ الگ اس سے معلوم ہوا کہ خواب دیکھنے میں موسموں کو بھی دخل ہے یہ نہیں کہ خواب کے لفظ سُن کے جس طرح چاہیں تعبیر دیں، یہ تو ایک مستقل فن ہے اس میں موسموں کی بھی رعایت ہوتی ہے اور اصول کی بھی......

دوسرا خواب اور اس کی تعبیر...... حضرت قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قاضی القضاۃ تھے بھوپال میں اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) کا زمانہ تھا یہ اہل حدیث تھے اور بڑے عالم تھے ان کی بہت سی بڑی بڑی کتابیں اور تصانیف ہیں قاضی صاحب تعبیر میں بڑے مشہور تھے بڑے اعلیٰ درجہ کے معبر تھے، خواب کی جو تعبیر دیتے وہ ہاتھ واقعہ کی صورت میں آ جاتی۔

ایک نوجوان نے یہ خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑی جماعت نماز کے لئے کھڑی ہوئی ہے اور صف اولیٰ میں ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام ہیں نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ ہزاروں لاکھوں آدمی شریک ہیں اس کے ذہن میں یہ تھا کہ اس میں کوئی نواب صاحب کی فضیلت نکلے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کریں۔

قاضی صاحب نے فرمایا کیا واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے؟ بناوٹی تو نہیں؟ اس نے کہا نہیں حضرت واللہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے فرمایا کہ: اگر تو نے یہ خواب دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خان کا انتقال ہو چکا ہے، یہ اس کی تعبیر ہے، یہ کہہ رہے ہیں تھوڑی دیر میں سرکاری طور پر اطلاع آئی کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ہے عرصہ سے بیمار چلے آ رہے تھے ہاتھ کے ہاتھ تعبیر صحیح ہوگئی۔ اس پر ماتمی طریق سے جتنے سرکاری لوگ تھے، بھوپال کی

طرف دوڑ گئے کفن دفن میں شریک ہوئے تین دن رسمی طور پر ماتم رہا..... دفاتر بند رہے بہر حال ایک والی ملک تھے جب تین دن گذر گئے تو وہ نوجوان اہل حدیث خواب دیکھنے والا قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت تعبیر تو ہو بہو سامنے آگئی، مگر اس خواب سے آپ نے یہ تعبیر کیسے سمجھی؟ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ نواب صاحب کی اس میں بزرگی سامنے آگئی۔ یہ کیسے آپ سمجھے کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا........؟ تو کیا عجیب بات فرمائی، فرمایا کہ: نبی کی موجودگی میں کسی کو امام بننے کا حق حاصل نہیں ہے کہ آگے بڑھے، یہ نبی کا حق ہے، پھر بھی نبی کی موجودگی میں جو آگے ہوگا وہ جنازہ تو ہو سکتا ہے زندہ کو حق نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھے اس لئے میں نے یہ تعبیر دی کہ ان کا انتقال ہو گیا، زندہ ہو کر وہ نبی کے سامنے نہیں آسکتے، مردہ ہو کر جنازہ کی صورت میں آسکتے ہیں تو قواعد شرعیہ بھی خواب کی تعبیر دینے میں (ملحوظ) ہوتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا کہ: ہر کس وناکس کے سامنے خواب کا ذکر مت کرو، جو زبان سے نکلے گا وہی اس کی تعبیر ہو جاتی ہے ایسے شخص کے سامنے ذکر کرو جو اصول کے مطابق قواعد کے مطابق صحیح تعبیر دے، اور خواب دیکھنے والے کے حق میں بہتری ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر کیوں چاہی؟...... تو یہ بات ان دونوں ملازموں نے سمجھی کہ خواب ہم جیلر کے سامنے ذکر نہیں کرتے یہ جیل حکام خواب کی تعبیر کیا جانیں؟ ان کے سامنے ذکر نہیں کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر انوار نبوت برستے رہتے تھے، سب جانتے تھے کہ یہ مقدس ہیں وہ سمجھ گئے کر یہی تعبیر دے سکتے ہیں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے نہ کسی اور کا ذہن جا سکتا ہے اس لئے کہا کہ: ﴿نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ① آپ ہی تعبیر دیں اس لئے کہ آپ کی صورت پر ''احسان'' جھلک رہا ہے احسان کہتے ہیں اس طرح سے اللہ کی عبادت کرو گویا اللہ کو اپنی آنکھوں سے آدمی دیکھ رہا ہے یہ احسان ہے ہم آپ کو محسن جانتے ہیں آپ ایسے عابد ہیں کہ عبادت میں گویا اللہ آپ کے سامنے ہوتا ہے اتنا حضور قلب کیساتھ آپ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو جو ایسا بڑا عابد زاہد اور متقی ہو وہی خواب کی تعبیر دے سکتا ہے اس لئے آپ ہمیں تعبیر دیں۔

حکمت نبوت اور طریق تبلیغ...... اب آگے حکمت نبوت کا ذکر ہے تعبیر دینے بیٹھے مگر یہ نہیں کہا یہ تعبیر ہے، اس پر غور کیا کہ ان دونوں کے دل میں میری کچھ عقیدت پیدا ہوئی اور میرے ساتھ حسن ظن پیدا ہوا جبھی تو خواب کی تعبیر مانگنے آئے، اس عقیدت سے مجھے فائدہ اٹھانا چاہیے، کہ ان کے سامنے دین پیش کروں (ممکن ہے) یہ اس عقیدت مندی میں اسلام قبول کرلیں۔ تو نبی کو طمع یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح لوگ حق پر آجائیں ذرا سی گنجائش دیکھی تو فوراً تبلیغ کرنے کی نیت کی انہیں تبلیغ کرنے کے لئے حیلہ چاہیے۔ اس لئے کہ انہیں بے انتہاء شفقت ہوتی ہے جذبہ یہ ہوتا ہے کہ سارا عالم کسی طرح سے حق کے راستہ پر آجائے۔ تو دیکھا کہ ان دونوں کے دل میں میرا اعتقاد جم گیا ہے اس سے میں تھوڑا بہت فائدہ اٹھاؤں کیوں نہ تبلیغ کروں؟ تو خواب کی تعبیر دینے کی بجائے پہلا جملہ یہ

ارشادفرمایا: ﴿قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا﴾ ① میں تمہارے خواب کی تعبیر دوں گا اور دیر بھی نہیں لگاؤں گا اتنی جلدی تعبیر دوں گا کہ دوپہر کا کھانا نہیں آنے پائیگا.........توفرمایا: دل میں اشتیاق بڑھکر عقیدت بڑھ جائے تو جو میں کہنے والا ہوں دل میں اثر کرے گا یہ قاعدہ کی بات ہوتی ہے اگر کوئی شخص بے پرواہ ہوتو اس کے سامنے وعظ نہیں کرنا چاہیے اس کوفائدہ نہیں ہوگا جودل سے سننے کیلئے آئے اس کے سامنے کہنا چاہیے وعظ اس کے دل میں اترے گا اثر کریگا تو انبیاء علیہم السلام جب یہ دیکھ لیتے ہیں کہ دل میں صلاحیت پیدا ہوگئی ہے قبول حق کی استعداد آ گئی۔اس وقت وعظ کرتے ہیں تو کہا ان دونوں نوجوانوں میں استعداد ہے عقیدت ہے اس عقیدت کو اور زیادہ بڑھادیا اور وعدہ کیا کہ میں ضرور تعبیر دوں گا۔اور دوں گا بھی جلدی کو دوپہر کا کھانا نہیں آنے پائے گا۔اب وہ مطمئن ہو گئے۔لیکن اب بھی تعبیر نہیں دی وعدہ تو دیدیا جس سے اشتیاق پیدا کردیا۔

آگے فرمایا﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي﴾ ② یہ جو میں تعبیر دوں گا یہ محض میرا تخیل نہیں ہوگا کہ اختراع کر کے میں کچھ کہدوں بلکہ میرے پروردگار نے جو میرے اندر (تعبیر) خواب کا علم ڈالا ہے اس علم کی رو سے تعبیر دوں گا اس تعبیر کی رو سے خواب کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوگا۔اگر محض اپنے تخیل سے تعبیر دوں تو بہت ممکن ہے تعبیر واقع نہ ہو۔اس لئے یہ بھی اطمینان دلادیا کہ تعبیر دوں گا جلدی دوں گا۔اور علم النبی سے دوں گا جس کے اندر کوئی تردد اور شک کی گنجائش نہیں۔تو یہ وہ تعبیر ہوگی جو پروردگار نے میرے قلب میں القاءفرمائی ہے وحی کے ذریعہ یہ واقعہ مجھے بتلادیا ہے وہ واقعہ میں تمہارے سامنے پیش کردوں گا تو اور زیادہ شوق بڑھ گیا کہ بہترین جگہ ہم آئے ہیں سچے خواب کی سچی تعبیر مل جائے گی بات کھل جائے گی۔دل کی گرہیں کھل جائیں گی۔لیکن اب بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر نہیں دی اشتیاق اور شوق کو بڑھکا دیا تاکہ جو بات میں نے ان کو کہنی ہے اس کیلئے اور زیادہ شوق بڑھ جائے، تعبیر بعد میں دیکھی جائے گی۔اب وہ سراسر اشتیاق بن گئے کہ کسی طرح سے جلدی تعبیر دیدیں۔

اپنا تعارف اور فکر آخرت......اسکے بعد یہ فرمایا: ﴿إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ﴾ ③ میری شخصیت کو تم پہلے سمجھ لو میری پوزیشن جان لو کہ میں ہوں کون.........؟ اس واسطے کہ کتنا بھی اعلیٰ کلام ہو لیکن شخصیت کا اثر پڑتا ہے وہی ایک بات میں کہوں تو اسکی کوئی وقعت نہیں اور وہی بات اگر حکومت کا سربراہ پریزیڈنٹ اور سیکرٹری کہے تو دنیا میں شور مچ جاتا ہے سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے قیاس آرائیاں شروع ہوجاتی ہیں وہی جملہ اخبارات میں کہوں تو کوئی بھی نہیں سنتا۔اگر صدر جمہور یہ کہدیں تو دنیا میں پھیل جاتا ہے یہ شخصیت کی وجہ سے لوگ اثر لیتے ہیں، ایسے لوگ کم ہیں جو کلام کو دیکھ کر اثر لیتے ہیں کہ کلام حق ہے لہٰذا ہمیں متاثر ہونا چاہیے معمولی کلام بھی ہوگا تو شخصیت کی وجہ سے اعلیٰ کلام ہوجائے گا تو لوگ شخصیت کو دیکھتے ہیں اس لئے

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۷. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۷. ③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۷.

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ چاہا کہ جب میں تعبیر دے رہا ہوں تو تعبیر سے پہلے اپنی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی پوزیشن بتلا دوں تا کہ تم سمجھ لو کہ میں کون ہوں۔ تو میرے کلام کا تم پر اثر ہو۔

تو میں وہ ہوں کہ اِنِّیْ تَرَکْتُ الخ کہ میں اس ملت اور قوم کو چھوڑے رہوں۔ اس قوم کے مسلک و مشرب کو چھوڑ دے رہوں جو اللہ و رسول پر ایمان نہیں لاتی۔ نہ آخرت کو مانتی ہے نہ اس کے دل میں کوئی ایمانی جذبہ موجود ہے میں تو اللہ اس کے رسولوں کو بھی مانتا ہوں آخرت کا بھی قائل ہوں کہ مجھے ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور دنیا کی زندگی سے ہر ہر فعل عمل اور قول کا جواب دینا ہے میری زندگی کا حساب ہونا ہے مجھے اپنی آخرت کی فکر ہے تو میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو بےفکری قوم ہے جسے آخرت کی کوئی پرواہ نہیں وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں رہ لیا۔ کھالیا پی لیا عیش اڑالیا اور بات ختم ہوگئی۔

یہ جو کچھ عیش اڑایا جارہا ہے اس سے ایک دن سوال ہوتا ہے۔ ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ﴾ ① فرماتے ہیں حق تعالیٰ: ایک وقت آئیگا تم سے سوال کیا جائیگا کہ ان نعمتوں کا حساب دو جو دنیا میں استعمال کر کے آئے ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی اور گرمی کے زمانے میں ٹھنڈا پانی "نعیم" میں داخل ہے اس کا حساب ہوگا ② کہ تم نے اس نعمت کو استعمال کیا تو بدلے میں کتنے سجدے شکر کے ادا کئے، اتنے قطرے ٹھنڈے پانی کے استعمال کئے اس کے بدلے میں کتنا شکر ادا کیا ناشکری تو نہیں کی؟ کفران نعمت تو نہیں کیا تو گرمی میں ٹھنڈا پانی اور سردی میں گرم پانی بھی نعیم اور نعمت ہے تو اس سے اوپر کی نعمتوں، کا اندازہ کیجئے ان نعمتوں کے بارے میں کتنے سوالات ہوں گے؟ آخرت کی جب یہ فکر ہوتی ہے تو آدمی نعمتوں کے استعمال میں کچھ پابند ہوجاتا ہے کہ جو نعمتوں کا مالک ہے اس سے پوچھ کر کے استعمال کروں کہ کہاں تک جائز ہے اور کس حد تک نہیں ہے یہ فکر آخرت ہے۔

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: میری پوزیشن تو یہ ہے میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو بےفکری قوم ہے جس کے سامنے نہ آخرت ہے نہ اللہ کی ذات نہ رسول کی ذات، نہ قیامت کی پیشی اور حاضری کا خطرہ، مجھے تو آخرت کی بھی فکر ہے، اللہ کا بھی معتقد ہوں اس کے رسولوں کا بھی البتہ اس قوم میں سے نہیں جو اللہ و رسول اور آخرت کی منکر ہے اعتقاداً منکر ہے جیسے دھریہ قسم کے لوگ جن کا عقیدہ ہے ﴿مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ③ یہ زندگی تو یونہی چلی آرہی ہے، ختم ہوجائے گی مرجائیں گے تو دوسرے پیدا ہوجائیں گے، اور پیدا ہوجائیں گے تو وہ بھی مرجائیں گے لہٰذا عیش اڑالو، پھر دنیا میں آنا تو ہے نہیں ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تو یہ وہ کرسکتا ہے جو بےفکر ہو اور جسے یہ فکر ہو کہ میری پوری زندگی دھرائی جائے گی اور آخرت میں پائی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکاثر، الآیۃ: ۸. ② المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۴ ص: ۱۴۴، رقم: ۱۵۹۱۲.

③ پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۲۴.

سامنے آجائے گی۔ ذرہ برابر نیکی کی ہے تو وہ بھی سامنے پیش کر دی جائے گی ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴾ ① تو فرمایا کہ: میں تو ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آخرت کے منکر ہوں اعتقادی طور پر...... یا بعض لوگ آخرت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر عمل ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، بہت سے مومن مسلم بھی ہوتے ہیں جو ایمان کے درجے میں جانتے ہیں کہ آخرت ہے گی مگر قلب پر اثر نہیں ہے، ان کی زندگیاں بتلائی ہیں کہ بے فکری زندگی ہے انہیں بھول کے بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں مرنا ہے قبر میں جانا ہے، حشر میں جانا ہے اللہ کے سامنے کھڑے ہونا ہے گو اعتقاداً وہ منکر نہیں مگر عملاً وہ معاملہ ہے جو منکر کا ہوتا ہے تو یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے نفی فرمادی کہ میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو منکر ہے آخرت کی خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً...... میں عملاً بھی مان رہا ہوں اور اعتقاداً بھی تو اب تک خواب کی تعبیر نہیں دی یہ فرمایا کہ: خواب کی تعبیر دوں گا، جلد دوں گا، علم النبی سے دوں گا جو سچی بھی ہوگی اور میری پوزیشن کو سمجھ لو کہ میں اللہ، اس کے رسولوں اور یوم آخرت کا قائل ہوں منکرین میں سے نہیں ہوں۔ اب بھی خواب کی تعبیر نہیں دی بلکہ ایک اور جملہ ارشاد فرمایا......

فرمایا: ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ ② میری پوزیشن کو ذرا اور جان لو، یہ تو منفی بات تھی کہ ان میں سے تو میں نہیں ہوں، جو آخرت کے منکر ہیں تو پھر کن میں سے ہو...؟ اس پارٹی سے تو آپ کا تعلق نہیں لیکن کس پارٹی سے آپ کا تعلق ہے....؟ اب مثبت پہلو سے سمجھایا، فرمایا میں متبع، پیرو اور ماننے والا ہوں اپنے آباؤ اجداد کی بات کا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحٰق وحضرت یعقوب علیہم السلام کی بات کا یہ میرے آباء پیغمبروں کی مسند پر تھے، ان کے پاس اللہ کی وحی آتی تھی، جو دین لیکر یہ آئے تھے اسی دین کے اوپر میں ہوں اور دین کا پہلا مطلب یہ ہے کہ مبداء اور معاد کو مانے، مبداء اللہ کی ذات ہے کہ ہماری ابتداء یہاں سے ہوتی ہے اور معاد یعنی لوٹ کے کہاں جانا ہے وہ آخرت ہے اس آنے اور جانے کے بیچ میں زندگی کس طرح گزارے یہ شریعت ہے، تو یہ تین بنیادیں ہیں، جن پر ایمان ہوتا ہے اللہ کی ذات، آخرت اور بیچ میں شریعت، اگر اللہ کو نہیں مانتا تو دین کی بنیاد ہی قائم نہیں ہو سکتی، اللہ کو مانتا ہے لیکن آخرت کو نہیں مانتا تو بے فکری زندگی ہوگی۔ جی ہوا نہ ہوا برابر ہو گیا دونوں کو مانتا ہے شریعت کا قائل نہیں تو عمل نہیں کر سکتا۔ تو تینوں چیزیں لازم ہیں اس کے بغیر آدمی متبع حق نہیں بن سکتا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ارشاد کیا کہ: تم سمجھ لو کہ میں کس پارٹی سے متعلق ہوں، وہ جماعت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہے نسباً میں ان کی اولاد ہوں تو نسبتہً بھی ان کے راستہ پر ہوں۔

تین پیغمبروں کے اسمائے مبارکہ ذکر کرنیکی حکمت...... ایک پیغمبر کا ذکر نہیں کیا اکٹھے تین پیغمبروں کا ذکر کیا یعنی میرا راستہ وہ ہے جو نبیوں کے راستہ سے مسلسل چلا آرہا ہے اول تو ایک پیغمبر بھی غلطی پر نہیں ہو سکتا جب کہ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ ۷۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸۔

دو کا عدد وہ ہے جو بڑے بڑے مقدمات میں بھی فیصلہ کر دیتا ہے۔ ﴿وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ ① شرعی اصول کے مطابق اگر آپ مدعی ہیں تو دو سچ گواہ پیش کر دیں، دعویٰ ڈگری ہو جائے گا قاضی فیصلہ دے دے گا۔ تو جب دو عادل گواہوں کی گواہی سے مقدمات کے فیصلے ہو سکتے ہیں تو دو پیغمبروں کی گواہی سے ایمان کا فیصلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور جب دو سے بھی زیادہ تین ہوں تو خبر متواتر ہو جائے گی۔ پھر تو ویسے ہی انکار کی وجہ باقی نہیں رہتی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بتلا دیا کہ میں اس پارٹی میں سے ہوں اور اس پارٹی میں داخل ہوں جو پیغمبروں کا طبقہ ہے اب گویا ان دو قیدیوں کے دل میں عظمت جم گئی...... پہلے سے عقیدت لے کر آئے۔ شوق دلانے سے شوق بڑھ گیا اور یہ کہنے سے کہ وحی الٰہی سے تعبیر دوں گا اور زیادہ عقیدت پیدا ہو گئی اور یہ بتلانے سے کہ منکروں سے میرا تعلق نہیں برگزیدگی واضح ہو گئی اور یہ کہنے سے کہ پیغمبروں سے میرا تعلق ہے اور زیادہ رشد و کمال اور برکت نمایاں ہو گئی تو کتنا زیادہ اعتقاد پیدا ہو گیا ہو گا۔ ان دونوں قیدیوں کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو یہی اعتقاد پیدا کرنا مقصود تھا تاکہ آگے جو بات کہوں ان کے دل میں اترتی چلی جائے کوئی شک و شبہ نہ رہے یہ انبیاء علیہم السلام کا خاص طریقہ ہے کہ وہ اس طرح وعظ سے قبل دل میں صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں تاکہ ماننے میں رکاوٹ نہ رہے۔

نصیحت کے لئے متوجہ کرنا...... حدیث میں ایک واقعہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار تھے اور اس پر جو زین تھی اس زین پر میں بھی سوار تھا گویا ایک سواری پر دو سوار آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور میں اتنا قریب ہوں کہ بس بیچ میں ایک کھونٹی تھی جو زین پر لگی ہوئی ہوتی ہے، سواری پر آگے بیٹھے والا تو لگام پکڑتا ہے اور پیچھے بیٹھنے والا اس کو تھام لیتا ہے تاکہ گرنے نہ پائے تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زین پر اگلے حصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار تھے اور پچھلے حصہ میں میں تھا۔ تو آپ نے آواز دی یَا مُعَاذُ! اے معاذ میں نے عرض کیا لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! یا رسول اللہ میں حاضر ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یَا مُعَاذُ!'' میں نے عرض کیا: ''لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یا رسول اللہ میں حاضر ہوں تو تیسری مرتبہ فرمایا: ''یَا مُعَاذُ!'' میں نے عرض کیا: ''لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یا رسول اللہ میں حاضر ہوں، تب آپ نے وہ بات فرمائی جو ارشاد فرمانی تھی۔ ② یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت معاذ تو سواری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہوئے بیٹھے تھے صرف ایک دفعہ آواز دیں تو بات تھی دوبارہ سہ بار کس طرح آواز دیں؟ حالانکہ انتہائی قرب میں ہیں ایک سواری پر سوار ہیں اس طرح سے تین دفعہ پکارنے کا کیا مطلب......؟ علماء یہی لکھتے ہیں کہ تین دفعہ پکارا تاکہ توجہ اور شوق ہو کہ حضور کیا فرمانا چاہتے ہیں تو اس طرح دل میں شوق

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲. ② الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم ص ۱۰

پیدا کر دیا پھر آپ نے وہ بات فرمائی جو کہنی تھی، وہ دل میں اترتی چلی گئی تو یہ انبیاء علیہم السلام کی حکمت ہوتی ہے کہ دلوں کو ہموار کرنے کر لئے پہلے کچھ باتیں ایسی کرتے ہیں کہ دلوں میں شوق پیدا ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ چار پانچ جملے کہہ کے شوق کو بڑھا دیا، اعتقاد کو بھی اُونچا کر دیا۔ اس کے بعد وہ بات کہی جو کہنی تھی اور خواب کی تعبیر اب بھی ذکر نہیں کی..... تو وہ حیلے تلاش کرتے ہیں کہ کسی طرح حق بات ان تک پہنچا دیں آگے وہ بات فرمائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا درس توحید...... ﴿مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ﴾ [1] ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ شرک اختیار کریں۔ دو خدا مان لیں یا ایک ہی مان لیں مگر عملاً عبادت میں شریک کریں کہ کچھ خدا کی عبادت کریں اور کچھ غیر اللہ کی سامنے بت رکھے ہوں ان کے سامنے جھکیں اور یوں کہیں کہ یہ تو قبلہ کی مانند ہیں، ہم تو اللہ کے آگے جھکے ہیں اور بیچ میں بتوں کا واسطہ ڈال لیں یا یہ کہ خدا ایک ہی مان لیں مگر بہت سے اعمال میں بہت سی چیزوں میں دوسرے خدا کو تسلیم کر لیں کہ چھوٹے موٹے خدا علم دیتے ہیں، اولاد دیتے ہیں بڑا خدا بڑے کام کرتا ہے، آسمان زمین بنانا بڑے خدا کا کام ہے یہ بھی توحید نہیں تو خدا کی ذات یا صفات یا افعال میں کسی کو شریک کرنا یہ توحید کے خلاف ہے انبیاء علیہم السلام جو دین لے کر آئے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ جس کی عبادت کر رہے ہیں اس کی ذات بھی یکتا ہے نہ اس کا شریک ہے نہ ہمسر نہ برابری ہے اس کی صفات بھی لاشریک ہیں اس کی رحیمی کریمی سمع، بصر، قدرت اور حیات ایسی ایسی صفات بھی لامثال ہیں ہم میں حیات عارضی ہے، اس میں حیات اصلی ہے، اس کا وجود ذاتی ہے ہمارا وجود اس کا دیا ہوا ہے ہم چھوٹے افعال کرتے ہیں وہ فعل کرے تو آسمان بنا دے، زمینیں بنا دے جہاں بنا دے، ہم نہ زمین بنا سکیں نہ آسمان بنا سکیں، وہ چاہے چاند سورج ستارے بنا دے ہم ایک سورج بھی نہیں بنا سکتے تو موجد وہ ہے ہم موجد نہیں ہیں مصور وہ ہے ہم مصور نہیں ہیں۔

ہماری ایجاد کا حاصل جوڑ اور توڑ ہے یعنی دنیا کے دو مادوں کو ملا کر تیسری چیز بنا دی، ایجاد ہو گئی یا ایک چیز کی تحلیل اور تجزیہ کر کے صحیح اجزاء نکال دیے یہ ہماری ایجاد ہو گئی بنے بنائے مادوں کو جوڑتے رہنا توڑتے رہنا یہ ہماری ایجاد کا حاصل ہے انسان کوئی مادہ پیدا کر دیں آسمان و زمین بنا دیں یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے تو انسانی ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل ہے دو چیزوں کو جوڑ کر چیز بنا لینا یا جڑی ہوئی چیز کو کیمیائی طریق پر الگ کر لینا یہ ''ایجاد بندہ'' ہے اللہ کی ایجاد ہے کہ شئی نہیں ہے اور ازسرنو وجود دے دیا، زمین بنائی تو خود بخود بنا دی۔

آسمان اعلیٰ مثال کھڑے کر دیے اس کی صفات اس کے افعال بھی بے مثل جن کی کوئی نظیر نہیں وہ جانداروں کو پیدا کرتا ہے، ہم پیدا نہیں کرتے، ہم پرندہ بنا دیں گے اس میں پٹرول بھی بھر دیں گے اس کو اڑا دیں گے اس کے اندر حرکت بھی ہو جائے گی مگر حیات اور شعور اس میں نہیں ہوگا اور وہ حرکت بھی ہماری ہوتی ہے اس کی نہیں

ہوتی ہوائی جہاز کو ہم اڑاتے ہیں اور شکل ایسی بنادیتے ہیں جیسے مچھلی کی ہوتی ہے، وہ ہواؤں میں تیرتا ہوا جاتا ہے تو ہوائی جہاز بنایا اس میں پیڑول کی روح پھونک دی جس سے وہ حرکت کرنے لگا، مگر ہوائی جہاز میں کوئی عقل وشعور نہیں یہ حیات نہیں کہلائے گی اس سے زیادہ حیات تو ہم میں ہے وہ ہمارا بنایا ہوا ہے خود اس میں کوئی جان یا علم وادراک نہیں اور حق تعالیٰ جس کو بناتے ہیں اس میں شعور علم وادراک بھی دیتے ہیں تو اصل بنانے والے اللہ ہیں اور ہم نقل محض کرتے ہیں اور وہ بھی شکل کی ہم تصویر بناتے ہیں، صورت بناسکتے، صورت بناتے ہیں تو اس میں حقیقت نہیں ڈال سکتے تو اصل میں یہ کام اللہ کا ہے۔

بہرحال اس کی صفات بھی بے مثل عقل بھی بے مثل۔ اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (1) فرماتے ہیں حق تعالیٰ: کہہ دو کہ وہ ایک ہے اور ایک کے معنی یہ نہیں کہ ایک تو دوسرا ہے ایسے تو ہم بھی ہیں اس لئے کہ ہم اپنی ذات میں ایک ہی ہیں اور ہمارے اندر تو کوئی دوسرا نہیں احد کے معنی ایک کے نہیں یکتا کے ہیں، اس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں بے مثال اور بے ضد ہے کوئی اس کا کنبہ نہیں کوئی شریک نہیں اللہ الصمد اس کی شان یہ ہے کہ وہ صمد ہے صمد اسے کہتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں بندہ صمد نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اسے ہر ہر چیز میں اللہ کی احتیاج ہے، زندہ رہنے میں کھانے میں ارادہ کرنے میں اس کا محتاج ہے دیکھنے میں محتاج، بینائی نہ دے تو دیکھیں کیسے؟ تو مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک ہر قدم پر اللہ کے محتاج ہیں اور وہ کسی ذرے کا بھی محتاج نہیں نہ انسان کا نہ کائنات کا وہ چاہے تو جہاں بنادے چاہے تو انہیں مٹادے تو صمد اسے کہتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں اور وہ از خود موجود ہو۔ کسی کے دیے سے اس کا وجود نہ ہو تو فرمایا کہ: "لَمْ يَلِدْ" وہ پیدا نہیں ہوا کہ اس کے ماں باپ ہوں "وَلَمْ يُوْلَدْ" نہ اس سے کوئی پیدا کیا گیا کہ اس کی کوئی اولاد ہو جائے اس لئے کہ اولاد ماں باپ کے مشابہ ہوتی ہے نمونہ ہوتی ہے اور جب نمونہ بن گیا تو خدائی باقی نہ رہی خدا وہ ہے جس کا کوئی نمونہ نہ ہو مثال نہ ہو وحدہ لاشریک اگر اس کے اولاد ہو جائے تو اس کی مثال پیدا ہوگئی اگر وہ کسی کی اولاد ہے تو وہ مثال ہے دوسرے کی تو یہ بھی خدائی نہیں ہے۔

تو فرمایا: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ اس لئے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے وجود میں اصل کا محتاج ہوتا ہے ہم پیدا ہونے میں اپنے ماں باپ کے محتاج تھے ماں باپ نہ ہوتے تو ہم پیدا نہ ہوسکتے جو وجود میں دوسرے کا محتاج ہوگیا، وہ خدا کا کیا ہوگا؟ خدا تو کہتے ہیں اس کو جو ذرہ برابر محتاج نہ ہو، غنی مطلق ہو۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ نہ اس کا کوئی برابر ہے نہ اس کا کوئی کفو ہے یعنی اس کی بیوی اور رفیقہ حیات بھی نہیں ہے تو نہ بیوی نہ اولاد نہ اس کا باپ نہ وہ خود کسی کا باپ تو ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ میں توحید بتلائی جو ذات ایسی

---

(1) پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص۔

خالص ہو کہ ذات میں بھی یکتا صفات میں بھی یکتا اس کے ساتھ شریک کرنا کتنی بڑی بدعقلی کی بات ہوگی تو (حضرت یوسف علیہ السلام) نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ① ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں جو بے مثال ہے، اس کا کہاں کوئی شریک کہ اس کے ساتھ اُسے شریک کریں۔

ردِ عیسائیت پر ایک دلچسپ واقعہ...... مجھے واقعہ یاد آیا۔ دارالعلوم دیوبند کا ابتدائی دور ہے دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم کامل عارف باللہ صاحب کشف وکرامت تھے بڑے اکابر اولیاء میں سے تھے ان کے دور میں دارالعلوم کا ایک طالبعلم تھا۔ وہ کوئی منتہی نہ تھا کہ حدیث قرآن پڑھ رہا ہو ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ وہ کہیں ڈیرہ دون چلا گیا وہاں وعظ کہنے لگا، وہاں پر عیسائیوں کے بڑے بڑے چرچ اور اسکول وکالج بھی ہیں وہاں ایک پادری صاحب وعظ کہہ رہے تھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے یہ طالب علم بھی شریک ہوگیا، پادری صاحب کہہ رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کو وہ اپنے طور پر ثابت کر رہا تھا، طالب علم اس سے الجھ پڑا۔ طالب علم نے کہا یہ بالکل غلط ہے خدا کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے؟ اس نے دلائل دینے شروع کیے، اس نے دلائل توڑنا شروع کر دیئے مگر وہ پادری بڑا سمجھدار تھا یہ بے چارہ مبتدی طالب علم تھا، پادری کے سامنے چل نہ سکا، عوام پر اس کا بڑا برا اثر پڑا، عوام کو کیا خبر تھی کہ یہ طالب علم ہے وہ تو یہ سمجھے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک عالم ہے پادری نے اس کو ہرا دیا اور وہ پادری کے آگے بول نہ سکا۔ اب اس کی تحقیق کون کرتا کہ یہ شرح جامی پڑھتا ہے حدیث وقرآن پڑھا ہوا نہیں ہے۔

قریب میں ایک بھٹیارے کی دکان تھی وہ کھانا بیچتا تھا اس کو بڑی غیرت آئی اس نے کہا ہمارا دارالعلوم دیوبند اور بدنام ہو جائے، وہ دکان سے کود کے آگیا اور طالب علم کو ایک طرف کر دیا اور کہا مولوی صاحب یہاں سے ہٹ جاؤ یہ پادری جاہل ہے اور جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے عالم کا کام نہیں، اسے میں سمجھتا ہوں اس طالب علم کو بھی غنیمت معلوم ہوا کہ جان چھوٹی آرام تو پایا، وہ بے چارہ پریشان ہو رہا تھا۔ بھٹیارہ آگے آیا اور کہا ہاں جی پادری صاحب! کیا کہتے ہو؟ کہا: ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اچھا آپ یہ کہتے ہو وہ اللہ کے بیٹے ہیں؟ اللہ میاں ان کے باپ ہیں (بھٹیارے نے پوچھا) اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ پادری بولا، بے وقوف اللہ میاں کی عمر! اللہ میاں ازل ابد سے ہیں ان کی عمر کیسے معلوم ہو؟ عمر تو اس کی پوچھ جو پہلے نہ ہو بعد میں ہوگیا ہو اور پھر ختم ہو جائے فلاں تاریخ پیدا ہوا فلاں تاریخ انتقال ہوگیا یہ بیچ میں اس کی عمر ہے جو ازل سے ابدالآباد تک ہے اس کی عمر تھوڑی پوچھی جاتی ہے، یہ تو بڑی بے ادبی کی بات ہے بھٹیارہ نے کہا اتنی لمبی زندگی میں کتنی اولاد ہوئی؟ کہا: ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کہا: ”لاحول ولا قوۃ الا باللہ“ ارے میں بھٹیارہ باون (۵۲) برس کی عمر میں بارہ بچوں کو جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی لاکھوں کروڑوں اور اربوں کھربوں سال عمر اور ایک اولاد، بارہ

اولاد تو صرف میری ہوگئی، یہ ہٹے کٹے جوان سب سامنے پڑے ہوئے ہیں، اب پادری غریب کے پاس اس کا کیا جواب تھا، وہ کچھ کہنے لگا عوام نے کہا بھائی ٹھیک تو کہہ رہا ہے بٹھیارہ بے چارہ جب اتنی بڑی عمر ہے تو اربوں کھربوں سال اولاد ہونی چاہیے لے دے کے صرف ایک اولاد، یہ تو انسانوں میں بھی عیب کی بات سمجھی جاتی ہے کہ عمر تو ہو سو برس اور لے دے کے بچہ ایک پیدا ہو لوگ کہیں گے کس چکی کا کھایا تو نے؟ کوئی جان بھی ہے تیرے اندر یا نہیں؟ تو اتنی لمبی عمر ازل سے ابد تک، طاقت دیکھو تو لامحدود اور بیٹا کل ایک تو عوام پر اتنا اثر ہوا کہ لوگوں نے تالیاں پیٹ دیں کہ ہار گیا پادری اور وہ بے چارہ چلا رہا ہے کہ بات تو سنو لوگوں نے کہا تو جھوٹا ہے تیرے سے جواب نہیں بن رہا ہے غرض مسلمان مناظرہ جیت گئے اور اشتہار دے دیا کہ پادری صاحب ہار گئے اور مسلمان جیت گئے..... خیر مجھے بات یہ کہنی تھی کہ یہ واقعہ حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو مولانا نے فرمایا بیٹھیارنے یہ جواب بڑا عالمانہ دیا مگر اس کے پاس علمی الفاظ نہ تھے بات جو کہی وہ بڑی علمی ہے۔

تو فرمایا کہ: اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر اللہ کے لئے اولاد ہونا کوئی کمال کی بات ہے تو اللہ پاک کا ہر کمال لامحدود ہوتا ہے تو اولاد بھی بے انتہا ہوتی کہ کوئی گنتی نہ ہوسکتی، اور اگر اللہ کے لئے اولاد کا ہونا کمال نہیں تو ایک بیٹا ہوگا وہ بھی عیب ہوگا تو ایک اولاد سے بھی بری ہے تو فرمایا یہ مطلب تھا بٹھیارے کا مگر اس کے پاس علم کے لفظ نہیں تھے بے چارہ نے اپنے جاہلانہ انداز میں بات کہی مگر بات سچی کہی۔

تو اس کو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (1) کہ ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ جیسی برتر مقدس اور بے مثل ذات کے ساتھ شریک کریں، اعتقاد یا عبادت میں شریک کریں عبادت میں شریک نہ کریں تو افعال میں شریک کریں۔

آغاز شرک...... یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شرک کا انتہائی طور پر رد کیا ہے اور مذاہب جو حق ہیں ان میں بھی شرک کا رد ہے مگر اسلام نے فقط شرک کا ہی رد نہیں کیا بلکہ اسباب شرک کو بھی دفع کیا ہے تو اور مذاہب نے شرک کا مقابلہ کیا اسلام نے جتنے شرک کے اسباب تھے ان کا بھی مقابلہ کیا کہ شرک آنے ہی نہ پائے مثلاً تصویر ہے شرعاً اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ شرک کی ابتداء تصویر سے ہوتی ہے تو ہر تصویر سے منع کیا گیا کہ تصویر مت لو اور مت بناؤ اپنی تصویر...... ایک تو مجبوری کی بات ہوتی ہے کہ جب آپ حج کو جارہے ہیں، بغیر تصویر کے پاسپورٹ قابل قبول نہیں یہ آپ کا فعل نہیں آپ مجبور ہیں یا تو فرض ترک کردیں یا فرض کی ادائیگی کرنی ہے تو تصویر کھنچوانی پڑے گی بعض باتیں ممنوع ہیں جیسے جہاد ہو اور مجاہدین میں کچھ جہلاء ہوں وہ باجے گانے بجائیں تو اس میں علماء کو بھی شامل ہونا پڑے گا جہاد کا فریضہ نہیں چھوڑیں گے تو بعض صورتیں ہوتی ہیں۔ مجبوری کی مگر اس میں بھی جنس ممنوع رہتی ہے صرف بعض مخصوص صورتوں میں فقہاء نے جواز کا فتوے دیا ہے وہ مجبوری کی شکلیں ہیں جو پیش آتی

ہیں غیر جاندار کی تصویر میں کوئی حرج نہیں جیسے سبزی ہے پہاڑ ہے دریا ہے لیکن بلاضرورت بلا مجبوری خود بخود تصویر کا شوق رکھنا یہ شرک کی عادت پیدا کرتا ہے۔

یہیں سے شرک کا آغاز ہوا ہے قرآن کریم نے بتلایا ہے کہ سب سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم سے شرک شروع ہوا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں ہابیل اور قابیل میں سے قابیل نے اپنے بھائی کو ناحق قتل کیا تھا قابیل کی ساتویں پشت سے کفر ظاہر ہوا، اس قتل، ناحق پر اللہ نے لعنت کی تو اس کی نحوست کا اثر ساتویں پشت تک گیا تو قابیل کی نسل میں ساتویں پشت میں جا کر شرک پیدا ہوا اور جتنی قاتل قومیں ہیں وہ اکثر و بیشتر قابیل کی اولاد میں سے ہیں حضرت نوح علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے اس قوم میں پانچ بزرگ تھے، جن کا نام قرآن میں ہے۔

وَدّ ،سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر یہ پانچ صالح بندے تھے انکی مجالس میں بیٹھ کر قوم کا علم و ایمان تازہ ہوتا تھا ان کی ہدایت سے نیکی کی طرف توجہ ہوتی تھی جب ان بزرگوں کا انتقال ہوا قوم نے ماتم منایا کہ صالحین اٹھ گئے، اب کن کی مجلس میں جائیں اور کن سے ہدایات حاصل کریں۔شیطان نے دل میں یہ بات پھونک دی کہ وہ بزرگ تو چلے گئے اچھی صورت یہ ہے کہ ان کے بت بنا کر اپنی عبادت گاہوں میں رکھ لو، تا کہ ان کی شکلیں دیکھ کر تمہیں خدا یاد آئے اور دل میں ذکر اللہ پیدا ہوتا رہے، تو انہوں نے ان پانچوں بزرگوں کے بت تراشے اور مساجد وعبادت گاہوں میں رکھ دیئے مقصد یہ نہیں تھا کہ شرک کریں مقصد یہ تھا کہ ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلس یاد آ جائیں گی اور دل میں ایمان تازہ ہوگا تو ہم اچھی طرح عبادت کر سکیں گے۔

چنانچہ ابتداء کی نسل یہی کرتی رہی۔اس نے قطعاً بت پرستی نہیں کی بتوں کو تذکیر اور یاد دہانی کا آلہ بنایا۔ دوسری نسل جب آئی اس کے ذہن میں یہ معرفت نہیں تھی جو پہلی میں تھی تو اس نے کچھ کچھ ان بتوں کی تعظیم کی اور عبادت اللہ کی کرتے رہے۔تیسری نسل میں آ کر ان بتوں ہی کے سامنے سجدہ شروع ہو گیا منتیں مانی جانے لگیں، نذر و نیاز ہونے لگے اب خدا کو تو بھول گئے اور ان پانچ بتوں کے بندے بن گئے عبادت نیاز ان بتوں کی، ان کے سامنے سجدہ کرنا، ان سے مرادیں مانگنا ان سے اولاد کی خواہش کرنا اب یہ شروع ہو گیا۔یہی شرک کا آغاز ہے جس کی اصلاح کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا گیا تو بت پرستی کا آغاز تصویر سازی سے ہوئی! اس لئے اسلام نے سرے سے شرک کی جڑ اکھاڑ دی کہ مسلمان اس سے کوئی مناسبت پیدا نہ کرے کوئی مجبوری پیش آئے، عالم فتوے دے تو گنجائش ہے لیکن شوق اور شغف سے ممنوع ہے مکانات کی زینت تصویر بن جائے اور اخبارات کی بھی بن جائے اور اس درجے پر پہنچ جائے کہ چاقو پہ تصویر قلم پہ تصویر چمچے پر تصویر، لیٹر پر، تمغہ وسکہ پر تصویر یہ انتہائی طور پر تصویر سازی اور تصویر بازی ہے اس سے شریعت نے روک دیا اس لئے کہ یہ شرک کا سبب بنا ہے تو اسلام نے ان اسباب کو قطع کر دیا جن سے شرک کی طرف توجہ منعطف ہو۔

تصویر سازی پر ایک شبہ کا جواب......اب آپ یہ کہیں گے کہ مثلاً عیسائیوں میں تصویر سازی ہے مگر بت

پرستی نہیں ہے تو پھر تصویر سازی سے بت پرستی کہاں پیدا ہوئی؟ ہم بھی اگر گھر میں تصویریں ٹانگ لیں اور بت پرستی نہ کریں تو کیا حرج ہے....؟

اول تو یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ عیسائیوں میں بت پرستی نہیں حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصاویر گرجاؤں میں ہوتی ہے یہاں تو دیکھنے میں نہیں آئیں مگر ایسٹ افریقہ جانا ہوا، وہاں پر غالباً رومن کھیتولک پارٹی کے عیسائی زیادہ ہیں چرچ بھی بہت ہیں۔ ہر ہر گاؤں اور شہر میں چرچ ہے وہاں میں نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت جگہ جگہ بنا ہوا ہے تو جب وہاں سے گذرتے ہیں تو جھک کر گذرتے ہیں یہ عبادت نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر یہ کہ جو تصویر بنائی ہے یہ ضروری تو نہیں کہ بعینہ وہی صورت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تھی یہ تو فرضی طور پر بنالی کہ یہ بنا کے رکھ دو اور یہ فرض کرلو کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ورنہ اس کی کیا سند ہے کہ یہ بعینہ وہی شکل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت مریم علیہا السلام کی تھی اور جب نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صورت نہیں نام ہی نام ہے اسی کو قرآن نے فرمایا ہے۔

﴿اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ (۱) یہ بتوں پر نام رکھ لئے ہیں کہ یہ فلاں ہے حالانکہ یہ صورت ان فلاں کے مطابق نہیں ہے تو فرضی ناموں کی عبادت کر رہے ہو ہوائی عبادت ہے تمہارے سامنے نہ کوئی شخصیت ہے نہ کوئی معبود ہے اسماء اور نام رکھے ہوتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ﴾ (۲)

ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم شرک اختیار کریں اللہ کا سہیم اور شریک بنا کر اس کی عبادت کریں اور یہ بھی فرمایا کہ: یہ شرک سے بچنا عقل کا ثمرہ نہیں ہے یہ تو جب اللہ کا فضل ہوتا ہے تو آدمی اس برائی سے بچتا ہے محض عقل برائی سے نہیں بچا سکتی بڑے بڑے عقلمند بھی مشرک گزرے ہیں آج بھی شرک کرنے والے بڑے دانا بڑے عقلمند ہیں دنیا کی حکومتوں کے معاملات ان کی عقلوں پر طے ہوتے ہیں اور وہ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں بت پرستی میں مبتلا ہیں۔

توفیق خداوندی پر ایک واقعہ...... مجھے بات یاد آئی ایک صاحب کے ہاں ایک بوڑھا شخص ملازم تھا، اس کے آقا کی تو یہ حالت تھی کہ نہ کبھی مسجد میں گئے اور نہ کبھی کوئی سجدہ کیا۔ ایک دن آقا بازار گئے تو اس بوڑھے ملازم کو ساتھ لیا تا کہ جو سامان خریدیں وہ ملازم کے سر پر لاد دیں وہ گھر پہنچائے، راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، اذان ہوئی تو بوڑھے نے کہا، صاحب! میں تو نماز پڑھنے جاتا ہوں، وہ بڑے خفا ہوئے کہ یہ بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، نماز کے سوا اور بھی اسے کوئی کام رہ گیا ہے؟ وہ بے چارہ تلملایا اس نے کہا بہر حال صاحب آپ آقا ہیں جو چاہیں کہہ لیں مگر مجھے نماز تو پڑھنی ہے وہ نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا، ا

ورآقا مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوگئے، وہ مسجد کے اندر داخل نہیں ہوئے بوڑھے نے فرض ادا کئے اس کے بعد سنتوں کی نیت باندھی سنتوں کا سلام پھیرا تو آقا کو خیال آیا کہ اب آجائے گا اس نے اوابین کی نیت باندھ لی اب انہیں باہر کھڑے پریشانی بڑی مشکل سے صبر کیا جب دو رکعتوں پر سلام پھیرا تو زور سے کہا ارے بھائی جلدی سے آؤ اس نے کہا جی مجھے آنے نہیں دیتے یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی آقا پھر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

جب اس نے دوسری دو رکعتوں کا سلام پھیرا تو کہنے لگا جلدی کیوں نہیں آتا کہ ''جی مجھے آنے نہیں دیتے'' یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی، اب انہیں غصہ آرہا ہے کہ یہ عجیب بے ڈھنگا ملازم میرے کام کا حرج ہورہا ہے، وقت ضائع ہورہا ہے اور یہ کہے جارہا ہے کہ آنے نہیں دیتے جب چھ رکعت پر سلام پھیر تو اس نے کہا ''کون نہیں آنے دیتے''؟ اس نے کہا جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے تو حقیقت یہ ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ اپنے جذبے سے نہیں وہ خدا کی توفیق سے پڑھتا ہے اگر توفیق نہ دیں تو لاکھوں عقلمند مارے مارے پھرتے ہیں انہیں سجدہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی، تو سجدہ نہ کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ وہ سجدہ نہیں کررہا بلکہ اس سے کرایا نہیں جاتا اور جو سجدہ کررہا ہے وہ خود سے نہیں کررہا ہے اسے قبول کرلیا گیا ہے اس سے سجدہ کرارہے ہیں عبادتیں کرارہے ہیں تو عبادت کا چھوڑنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے عبادت چھوڑ دی، اس کی کیا مجال تھی کہ وہ چھوڑتا اسے قبول نہیں کیا گیا اسے دھتکار دیا گیا اس واسطے وہ عبادت نہیں کرتا اور جو کررہا ہے۔ وہ اپنی عقل اور جذبے کا ثمرہ نہ سمجھے یہ تو توفیق خداوندی ہے شکر کرے کہ وہ پکڑ نہیں کرتے تو اس بوڑھے نے ٹھیک کہا جو تجھ کو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتے، وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتے۔ تو یہ اس کی توفیق ہے ایک کو دے دی اس نے نماز پڑھ لی اور جس کو نہیں دی وہ نماز کا تارک ہوگیا تو آدمی نیکی کر کے کبھی غرور نہ کرے کہ میں نے نیکی کی ہے۔

غرور اعمال کو ضائع کردیتا ہے...... حدیث میں ہے اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی ہے میں نے روزہ رکھا ہے تو حق تعالیٰ فوراً جواب دیتے ہیں، نامعقول تو نے کیا کیا......؟ ارے جاہل قوت تو تجھے میں نے دی ارادہ تیرے اندر میں نے پیدا کیا طاقت تجھے میں نے بخشی تو نے کیا کیا...؟ اور اگر سب کچھ کر کے کوئی یوں کہتا ہے اے اللہ مجھ سے تو کچھ بھی نہ بن پڑا بس جو کچھ ہے تیرا فضل ہے اگر تو فضل نہ فرماتا میں نیت بھی نہ کر پاتا میں ارادہ وعمل بھی نہ کرسکتا۔ یہ تیرے کرائے کررہا ہوں میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تو اس کو سراہتے ہیں فرماتے ہیں ارادہ تو تو نے ہی کیا تھا نیت تو تو نے ہی کی تھی، مسجد تک تو تو ہی گیا تھا تو نے سب کچھ کرلیا تو جو خود کہتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہے اسے رد کردیتے ہیں اور جو سب کچھ کر کے کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میرے سے کچھ نہیں بن پڑا، فضل تھا...... حق تعالیٰ فرماتے ہیں بیشک فضل تو ہمارا تھا مگر کام تو نے کیا ارادہ تو نے کیا تو اس کی نیکی کو سراہتے ہیں تو اسلام میں جو کام چلتا ہے فضل خداوندی سے چلتا ہے عقل وجذبہ کام نہیں دیتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدَ کُمْ

عَمَلُهٗ'' تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ آخرت میں نجات فضل خداوندی سے ہوگی اس پر حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!'' یارسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ پیغمبر کا عمل کتنا وزنی اور کتنا عظیم ہوتا ہے تو آپ کا عمل؟ فرمایا: ''لَآ اِلَّآ اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ'' مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا ① جب تک اللہ ہی کا فضل شامل حال نہ ہو تو حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ بھی نجات و توفیق ہے فضل خداوندی سے ہے ہمارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب...... مگر بھائی ایسا مت کیجیو کہ جب نجات فضل خداوندی سے ہوتی ہے تو پھر آج سے عمل چھوڑ دیں عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جب فضل ہو جائے گا نجات ہو جائے گی عمل تو نجات نہیں دلائے گا۔

ایسا مت کرنا! بلاشبہ اللہ کے فضل سے نجات ہوگی ہمارے عمل سے نہیں مگر ہمارا عمل اللہ کے فضل کی علامت ہے عمل کرنے والا جب عمل کر رہا ہے تو یہ اللہ کا فضل متوجہ ہونے کی دلیل ہے عمل اگر چھوڑ دیا تو یہ علامت ہوگی کہ اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے تو نجات تو فضل سے ہوگی عمل سے نہیں ہوگی مگر عمل کا ہونا اللہ کے فضل کے متوجہ ہونے کی دلیل ہے بلا فضل ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے۔ ②

آدابِ دُعا...... اس کی حکمتوں اور اس کی شان کے پہچاننے والے انبیاء ہیں اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے توجہ دلائی کہ تمہارا کام یہ ہے کہ مانگو تو اللہ سے مانگو، حکمت اور ڈھنگ سے مانگو، اس طرح مت مانگو جو اس معبود کی شان کے مناسب نہ ہو۔ لاچی ماری بات وہاں نہیں چلتی، بے پرواہ کی بھی وہاں نہیں سنی جاتی ''لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ'' ③ دل کو متوجہ کر کے اللہ کو حاضر و ناظر اور اپنے کو بے چارہ سمجھ کر اور اس یقین کے ساتھ کہ لے کے ہٹوں گا، ویسے نہیں جاؤں گا، اس سے مانگے یعنی استغنا کے ساتھ نہ مانگے، اس طرح مانگنے سے ممانعت کی گئی ہے۔

''یَارَبِّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ'' اللہ میاں! اگر آپ چاہیں تو میری مغفرت کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تو نہیں چاہتا آپ کا جی چاہے تو بخش دیجئے گا مجھے تو آپ کی مغفرت کی ضرورت نہیں ہے تو یہ مانگنا ہے یا اپنے استغناء کا اظہار کرنا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ: ان شئت، اے اللہ اگر تو چاہے کا کیا مطلب؟ یوں کہو رَبِّ اغْفِرْلِیْ اے اللہ بخش دیجئے وہ تو جبھی بخشیں گے، جب چاہیں گے مگر تم کون ہو یہ کہنے والے کہ اگر آپ چاہیں اس کا مطلب تو یہ نکلا کہ میں تو نہیں چاہتا، آپ کا جی چاہے تو دے دیں نہیں تو میں مستغنی ہوں یہ مانگنے کا ڈھنگ نہیں اس سے تو

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومۃ رقم: ۵۹۸۲. ② یہاں تقریر کا کچھ حصہ فنی خرابی کے باعث ریکارڈ نہ ہو سکا اس لئے وہ ضبط تحریر میں نہ آسکا ﴿مَا کَانَ لَنَا اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸) کا بیان ہو چکا ہے آگے ﴿ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸) کا بیان ہے، درمیان میں رہ جانے والا حصہ زیادہ نہیں ہے، تاہم اس پر مرتب بھی معذرت خواہ ہے۔

③ السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۸۳.

غنا ملے گی مُراد تھوڑا ہی ملے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جیسے ایک اعرابی نے دعاء مانگی تھی "ارحمنی ومحمد اولاترحم معنا احداً" یا اللہ میری مغفرت کردے اور کسی کو نہ کی جیو پورے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا" ① بندہ خدا یہ کوئی مانگنے کا ڈھنگ ہے لامحدود رحمت کو سمیٹ کر تو نے صرف اپنے لئے کرلیا اور ساری دنیا کو محروم کردیا، اپنے لئے بھی مانگو مگر دوسروں کو کیوں محروم کرتے ہو......؟

یا جیسے ایک اور اعرابی نے دعا مانگی تھی "اَللّٰھُمَّ ھَبْ لِیَ الْقَصْرَ الْاَبْیَضَ فِی الْجَنَّۃِ" ② یا اللہ مجھے جنت میں سفید محل دیجیو وائٹ ہال مجھے عطا کردیجئے یہ دعا مانگی آپ نے فرمایا کہ: یہ کیا دعا ہے کہ وہ اس رنگ کا ہو کرسیاں ایسی ہوں فرنیچر ایسا ہو گویا اللہ میاں کو مشورہ دے رہے ہو، یہ مانگنے کا ڈھنگ نہیں ہے بہرحال دعاء کے آداب سکھائے گئے، انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مانگنے کے ڈھنگ کون جانتا ہے اس واسطے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: جو خالق ہے وہ حاکم بھی ہے اسی کے حکم کا اتباع کرنا پڑے گا مانگنے میں، سوال میں، استعانت میں مدد چاہنے میں بھی، اب یہ وعظ جو حضرت یوسف علیہ السلام نے سنایا تو ان دونوں جوانوں کے دل میں اثر کر گیا اور انہوں نے ایمان قبول کرلیا، یہی مقصد وعظ تھا۔

خواب کی تعبیر...... جب مومن بن گئے تو اب تعبیر بتلا دی کہ یہ خواب کی تعبیر ہے اور فرمایا: جس نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اس کی خطا معاف کی جائے گی وہ بدستور بادشاہ کا شراب پلانے والا رہے گا اور جس نے یہ دیکھا ہے کہ سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اور چیل کوے کھا کھا کے جارہے ہیں وہ باورچی ہے اس کو پھانسی دیجائیگی، چنانچہ یہی ہوا جیل سے دونوں لیجائے گئے اور عدلیہ میں پیش ہوئے تو ایک کو بخش دیا گیا اور بخش کر اس کی ملازمت بحال کردی گئی اور ایک کو پھانسی دے دی گئی مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد حاصل ہوگیا تھا کہ دونوں مومن ہوگئے تھے اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُ کُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّہٗ خَمْرًا وَّاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْکُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِہٖ . قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْہِ تَسْتَفْتِیٰنِ﴾ ③ ...... ایک کی خطا معاف اور ملازمت بحال کردی جائے گی اور ایک کو پھانسی ہوگی اور چیل، کوے اس کو نوچیں گے، بات پکی ہوگئی، اب ردّوبدل نہیں ہوگا جو تعبیر مانگتے تھے وہ ہوگئی۔

باہمی خیر خواہی میں آخرت کا تقدم...... تو تعبیر دی مگر درمیان میں اتنا وعظ اتنی نصیحت فرمادی کہ دلوں کا رشتہ

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب الارض یصیبھا البول ج: ۱ ص: ۲۶۲۔

② لم اجد ھذہ الروایۃ بھذا السیاق الا ان الامام ابا داؤد اخرجہ فی سننہ بلفظ: ان عبداللہ بن مغفل سمع ابنہ یقول: اللھم انی اسئلک القصر الابیض عن یمین الجنۃ، کتاب الطھارۃ، باب الاسراف فی الماء ج: ۱ ص: ۱۳۴۔

③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۴۱۔

درست فرمایا۔ دلوں میں ایمان پیدا کر دیا تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ وہ کلمۂ حق پہنچانے کے لئے حیلے تلاش کرتے ہیں...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کی طرف مبعوث ہیں آپ اور ساری اُمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے آپ کو حرص تھی کہ ساری دنیا اسلام قبول کر لے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شفقت سے چاہتے تھے کہ ایک ایک آدمی کلمۂ حق کا تابع بن جائے تو جب یہ ساری امت مل کر قائم مقام، تابع اور خلیفہ ہے اپنے پیغمبر کی تو ہمارا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی خیر خواہی میں ہر وقت مگن رہیں اور دنیا سے زیادہ ایک دوسرے کی آخرت کی خیر خواہی ہے کسی سے بُرائی سرزد ہوا سے پیار سے سمجھایا جائے، شفقت سے بتلایا جائے لڑائی کی صورت نہ پیدا کی جائے، سخت دلی سے نصیحت نہ کی جائے، وہ موثر نہیں ہوتی۔

طرزِ نصیحت کیسا ہو؟...... محبت اور اس جذبے سے نصیحت کی جائے کہ کسی طرح قبول کر لے بعض اس جذبے سے نصیحت کرتے ہیں کہ میرا فرض ادا ہو جائے یہ چاہے جہنم میں جائے یا جنت میں یہ نصیحت کا طرز نہیں انبیاء علیہم السلام اس طرح نصیحت نہیں کرتے وہ تو یہ چاہتے ہیں جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ کسی طرح مان جائے، کبھی لالچ دیتا ہے، کبھی گھورتا ہے، کبھی مارتا پیٹتا ہے، باپ کا یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ میں نصیحت کر دوں، اب یہ چاہے جنت میں جائے یا جہنم میں، چاہے بدنام ہو برباد ہو، مجھے پرواہ نہیں! وہ تو یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ سیدھے راستے پر آ جائے یہی انبیاء کی شان ہے وہ اپنے کو ذمہ سے بری کرنے کیلئے نہیں بلکہ مخلوق کو راہ ہدایت پر لانے کے لئے نصیحت کرتے ہیں تو کبھی ڈراتے ہیں کبھی پیار کرتے ہیں کبھی دنیا کا لالچ اور کبھی آخرت کی نعمتوں کا لالچ کہ کسی طرح بندہ مان جائے تو جو امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اس کا بھی یہی فرض ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے تا کہ امت کا راستہ صحیح ہو جائے، یہ نہ ہو کہ ہم کسی کو برائی میں دیکھیں اور کسی وقت بھی اُسے متنبہ نہ کریں ایسا ہو گا تو ساری امت کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث ہو گا، کسی نہ کسی وقت موقع پا کر شفقت سے سمجھا دیا جائے کہ بھائی تیرے اندر یہ برائی ہے اسے چھوڑ دو، وہ آج نہیں تو کل کل نہیں تو کبھی تو مانے گا تو مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے اور سختی سے بھی پیش نہ آنا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ بڑے ولی کامل محدث اور عالم کبیر گزرے ہیں مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے ایک نوجوان آیا۔ جلدی جلدی وضو کی تو پاؤں کے ٹخنے خشک رہ گئے، پیر دھوئے مگر ایڑیاں خشک رہ گئیں اور حدیث میں ہے کہ۔

"وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ" (1) جو ایڑی خشک رہ جائے گی جہنم میں جلے گی...... شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کی مگر کس عجیب طریق سے نصیحت فرمائی.... یہ نہیں کہا او نوجوان! تیری وضو نہیں ہوئی، جاؤ وضو کر اور

(1) الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من رفع بالعلم صوتاً ج: ۱ ص: ۱۰۵۔

تیری ایڑیاں جہنم میں جلیں گی.....فرمایا: بیٹا! ذرا میرے پاس آنا وہ نوجوان آیا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھا، فرمایا بیٹا میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور وضو کرنے میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایڑیاں خشک رہ جاتی ہیں اور حدیث میں فرمایا گیا ہے جو ایڑی خشک رہ جائے گی جہنم میں جلائی جائے گی۔ تو ذرا میرا پیر دیکھنا کہیں ایڑی خشک تو نہیں رہ گئی وہ نوجوان رو پڑا اور اس نے کہا حضرت آپ کی ایڑی تو کیوں خشک ہو یہ گناہ تو مجھ سے سرزد ہوا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا وضو مکمل کیا کروں گا،.......پھر چمکایا پیار کیا فرمایا: جزاک اللہ بارک اللہ سعادت مند نوجوانوں کا یہی کام ہوتا ہے اس کا دل بڑھ گیا......اور اگر یوں فرماتے او نوجوانو! جاؤ وضو کر تیری ایڑی جہنم میں جلے گی، وہ کہتا جناب، مجھے اپنی قبر میں سونا ہے تمہیں اپنی قبر میں اپنی فکر کریں میری فکر میں کیوں پڑے؟ میرے اوپر تو گذرے گی جلنے دو جہنم میں تمہیں کیوں درد اٹھ رہا ہے اس کا یہ جواب ہوتا۔ اور یہ شفقت کا جو طرز اختیار کیا تو اس کا جواب یہ تھا، رو کے ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا، تو نصیحت کرنے کا بھی ڈھنگ ہے محبت شفقت اور مخاطب کی ذہنیت پہچان کر اس کے مطابق بات کی جائے تو دل میں اثر ہوگا۔

تو حضرت یوسف علیہ السلام کے وعظ سے عبرت پکڑی جائے کہ ذرا سا موقع ملا تو فوراً نصیحت فرمائی اور دل میں ایمان اتار دیا یہی ہم سب کا فرض ہونا چاہیے کہ ذرا بھی ماننے کی استعداد اور صلاحیت دیکھیں تو کلمۂ حق کہنے سے نہ چونکیں مگر شفقت و حکمت کے ساتھ لاچی ماری والی بات نہ ہو، ورنہ اس کا برا اثر ہوتا ہے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ طریقہ بتلا دیا اور اس کو اللہ نے نقل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی وحی آئی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں تعلیم دے رہے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے ہمیں عبرت دلا رہے ہیں کہ دین کا پہنچانا فرض ہے مخلوق کے راستے کو درست کرنا فرض ہے جیسے جیل کے دو نوجوان بھٹکے ہوئے تھے۔

استعداد پیدا ہونے پر نصیحت کرنا......بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حافظ محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، ہمارے بھی عزیزوں میں سے تھے۔ نوجوانی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت ہو چکے تھے۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن یہ تھا چوڑی دار پائچوں کا پاجامہ ٹخنے ڈھکے ہوئے اور چست اچکن جو بالکل بدن کے اوپر چپکا ہوا ہو اور سر پر عمامہ اس پر گوٹا لگا ہوا اور ہاتھوں پر مہندی لگی ہوتی اور چاندی کے چھلے بھی پڑے ہوئے ڈاڑھی چڑھی ہوئی اور مونچھیں بڑی بڑی حافظ صاحب اسی لباس میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے اس میں بہت سی باتیں نا جائز ہیں ڈاڑھی چڑھانا ممنوع ہے ٹخنوں سے نیچا پائنچہ بھی شرعاً ممنوع ہے اور چوڑی دار پاجامہ تو بالکل عورتوں سے مشابہت پیدا کرتا ہے یہ بھی ممنوع ہے مگر حضرت فرماتے کچھ نہیں تھے اور علمی باتیں ہوتی رہتیں......لوگوں کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ حافظ صاحب اتنے منکرات میں بتلا ہیں حضرت سے بیعت بھی ہیں اور حضرت ان کو نصیحت نہیں کرتے ورنہ حکم تو یہ ہے کہ کسی منکر کو دیکھے تو نصیحت کرے، یہ تو معاذ اللہ مداہنت اور برائی پر سکوت ہے لیکن

حضرت اس کا انتظار کر رہے تھے کہ حافظ صاحب کے دل میں قبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جائے تب نصیحت کروں گا، استعداد پیدا ہو جانے سے پہلے نصیحت رائیگاں جاتی ہے تو چار چھ مہینے کے بعد حضرت کو اندازہ ہوا کہ اب ان کے قلب میں رقت اور نرمی پیدا ہو چکی ہے اب عقیدت پوری طرح گھر کر چکی ہے اب نصیحت کرنے کا موقع آ گیا ہے۔

تو نصیحت بھی کس انداز سے کی یہ نہیں فرمایا کہ بھائی کس برائی میں مبتلا ہو چھوڑ دو بلکہ فرمایا، بھائی حافظ جی! ہمیں تم سے محبت اور تمہیں بھی ہم سے محبت ہے تو ہم میں اور تم میں دوستی ہے تو ہم دوست ہیں اور دو وضع میں رہیں۔ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا یا آج سے ہم بھی ڈاڑھی چڑھانا شروع کر دیں اور چوڑی دار پاجامے پہنیں یا تم چھوڑ دو جو دوست ہوں ان کو ایک وضع پہ رہنا چاہیے، یہ غلط ہے کہ ہم مشرق جا رہے ہیں تو تم مغرب کو دل کے اندر عقیدت آ چکی تھی محبت غالب آ چکی تھی بس دو جملے کہنے کی دیر تھی جیسے قلعی گر کے پاس آپ جب برتن لے جاتے ہیں تو برتن لاتے ہی اسی پر رانگ نہیں مل دیتا پہلے اسے آگ پر رکھ کے تپاتا ہے اور مانجھتا ہے جب یہ منجھ کر صاف ہو جاتا ہے آگ کی گرمی سرایت کر جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اب اس کو چمکدار کرنے کا موقع آ گیا تو اس وقت رانگ لگا کر ذرا روئی پھیر دی اور پھر برتن چاندی جیسا چمک گیا اور اگر تپانے سے پہلے ہی رانگ ملے، تو ساری رانگ ختم ہو جائے گی برتن میں چمک نہیں آئے گی، اسی طرح سے دل کا برتن جب زنگ آلود ہو، اسے تپایا جاتا ہے اسے مانجا جاتا ہے تب تپا کر جب محبت وعقیدت اثر کر جاتی ہے ایک آنچ کی دیر ہوتی ہے ذرا ایک رانگ لگائی ہاتھ پھیرا اور قلب کا برتن چمک گیا تو حضرت نے یہ دیکھا اور وہ دو منٹ بھر میں چمک گئے، حافظ محمد احسن رو پڑے اور مجلس سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔ جتنے چوڑی دار پاجامے تھے وہ تو بیوی کو دیے کہ یہ اب تو پہنتی رہو، میرے تو اب یہ کام کے نہیں رہے اور پندرہ دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے جب تک کہ وہ مہندی کا اثر ہاتھوں پر سے گیا نہیں اور مہندی کی سرخی جاتی نہ رہی، چھلے بھی بیوی کو دیئے اور وہ جو عمامہ تھا اس کا گوٹا اتار کر اس کی ٹوپی بنوائی۔ ڈاڑھی جو چڑھی ہوئی تھی پندرہ بیس دن کے بعد وہ مقطع ڈاڑھی ہو گئی چوکنی ٹوپی اوڑھی، کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہنا۔ لانبہ کرتا پہن کر آئے اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑے عالم خواجہ خضر آ گئے ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھ کر فرمایا بھائی سبحان اللہ! کیسی نورانی شکل ہے کیسی ایمان کی تازگی برس رہی ہے، معانقہ کیا اور لپٹ گئے تو اثر ہو گیا تھا۔ نصیحت قبول کر لی اور اگر پہلے ہی کہتے کہ بہت بری بات ہے یہ ہے اور وہ ہے، وہ آنا بھی چھوڑ دیتے ملنا بھی چھوڑ دیتے تو بعض دفعہ استعداد پیدا ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے جب صلاحیت آ جاتی ہے بس پھر ایک آنچ کی دیر ہوتی ہے یہی کام ہمارا بھی ہونا چاہیے جو ہمارا بھائی کسی برائی میں مبتلا ہے تو سب کے اوپر اس کی خیر خواہی فرض ہے یہ فقط کسی عالم یا مولوی کے ذمہ نہیں ہے۔ ہر شخص کو امر بالمعروف بنایا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر بھی کرے۔

نصیحت کی زینت......اور نصیحت کی زینت یہ ہے کہ وہ تنہائی میں ہو بھرے مجمع میں کسی کو خطاب کر کے نصیحت کرنا اسے شرمندہ و رسوا کرنا ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس

مبارک میں صحابہ کرامؓ کا مجمع تھا۔ کسی کی وضوٹوٹ گئی، ریح خارج ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہماری مجلس میں کوئی بے وضو نہ بیٹھے وہ شخص جا کے وضو کرے جس کی وضو نہ ہو، اب اس بیچارے کو مجلس سے اٹھنا بھاری ہوگیا۔ اس لئے کہ اگر اٹھتا تو سب دیکھتے کہ جس کی وضوٹوٹی تھی وہ شرمندہ ہوتا اور نشانہ بنتا، اس سے نہ اٹھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: وہ شخص اٹھ جائے۔ اچھا یہ تھا جس کی وضو نہیں ہے۔ ہماری مجلس میں بے وضو نہ بیٹھے پھر بھی اٹھنے کی اس کو جرأت نہ ہوئی۔ پھر نہ اٹھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اجازت دیجئے ہم سارے کے سارے وضو کرلیں۔ جن کی وضو ہے وہ دوبارہ کرلیں ان کی وضو تازہ ہو جائے گی اور جن کی نہیں ہے ان کی وضو ہو جائے گی تو آپ نے اجازت دی اور سب نے اٹھ کر وضو کرلیا تو سب کا پردہ رہ گیا۔ تو بھرے مجمع میں اگر خطاب کر کے نصیحت کی جائے تو رسوائی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے یا تو تنہائی میں نصیحت ہو، اور اگر مجمع میں ہو تو کسی کا نام لے کر نہ ہو، کسی کو خطاب کر کے نہ ہو۔

مجمع میں نصیحت کا طریقِ کار..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی اگر کسی سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو فرماتے کہ مسجد میں جمع ہو جاؤ لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے، آپ اس طرح نہیں فرماتے کہ فلاں نے غلطی کی ہے فلاں سے یہ برائی سرزد ہوئی ہے بلکہ فرماتے "مَابَالُ اَقْوَامٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا" [1] لوگوں کو کیا ہوا ایسی ایسی حرکت کرتے ہیں ایسی ایسی برائیاں کرتے ہیں۔ کسی کا نام نہیں لیتے تھے تا کہ اس کو شرمندگی نہ ہو تو نصیحت میں یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کو خجل نہ کیا جائے، شرمندہ و رسوا نہ کیا جائے۔ محبت و شفقت پیار اور حکمت سے نصیحت کی جائے۔

نصیحت کرنا صرف علما کا کام نہیں...... تو یوسف علیہ السلام کے وعظ کا واقعہ سنایا کہ یہ فریضہ ہم پر بھی عائد ہوتا ہے جسے ہم چھوڑ چکے ہیں اب عام طور پر یہ ماحول پیدا ہو گیا کہ نصیحت کرنا صرف علماء کا کام ہے عام لوگوں کا کام نہیں ہے، یہ غلط ہے علما اپنی جگہ نصیحت کریں، عام لوگ اپنی جگہ ہر ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اپنی ذمہ داری پوری کرے اس کا ایک اثر تو یہ ہوگا کہ جب آدمی دوسرے کو برائی سے روکے گا تو کم از کم خود اس برائی میں کبھی مبتلا نہ ہوگا ورنہ اس کے دل میں خیال ہوگا کہ میں دوسرے کو کس منہ سے نصیحت کروں گا وہ کہے گا بھائی تم بھی اسی برائی میں مبتلا ہو۔ اس لئے جب انسان نصیحت کرنے کھڑا ہوگا پہلے اپنی اصلاح کرے گا اسے ڈر ہوگا کہ میں رسوا نہ ہوں تو خود کی نصیحت سے خود کو بھی اور دوسروں کو بھی نفع پہنچتا ہے۔ تو امر بالمعروف، نہی عن المنکر تبلیغ حق مسائل کا پہنچانا اور اپنے بھائیوں کو سمجھانا یہ ضروریات دین میں سے ہے اور ہر مومن مرد و عورت کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا وعظ سنایا۔ میرا وعظ ہوتا۔ ممکن ہے آپ کہتے ہم تو آپ کا وعظ نہیں سننا چاہتے لیکن جب پیغمبر کا وعظ سنایا گیا تو وہ تو سننا ہی پڑے گا، ماننا ہی پڑے گا، اس واسطے میں نے یہ وعظ نقل کیا اور اس کی کچھ

[1] احیاء علوم الدین ج:۴ ص:۲۴۵. علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں: اخرجہ ابو داؤد من حدیث عائشۃؓ دون قولہ "وکان لایعیرہ" ورجالہ رجال الصحیح

تشریح کی، اب میرے خیال میں وقت بھی کافی ہوگیا اور ان آیات کی بقدر ضرورت تشریح بھی ہوگئی۔

اور مقصد بھی سامنے آ گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دین کی نصیحت عام ہونی چاہیے۔اور یہ جب علم ہوگی جب علم ہوگا تعلیم عام ہوگی، تو اس وقت یہ چیز عام ہو جائے گی لیکن اس کا انتظار نہ کیا جائے۔ کسی کو ایک مسئلہ معلوم ہو وہ ایک ہی بیان کرے۔ کسی کو دو معلوم ہوں وہ دو ہی بیان کر دے۔ کسی عالم کو پچاس معلوم ہوں وہ پچاس بیان کر دے۔ مگر دین کا چرچا ہونا چاہیے جس کو آج کل کے زمانے میں پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔ مگر پروپیگنڈہ افواہی چیز کا بھی ہوتا اس لئے دین کے مسائل کا چرچا ہونا چاہیے۔اب میں ختم کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

معارف القرآن

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" أَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ) ① ...... صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔

بزرگانِ محترم!...... جلسہ کی مناسبت سے میں نے جو حدیث تلاوت کی اس کا مفہوم اور ترجمہ یہ ہے:
''تم میں سے وہ شخص بہترین ہے جو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتا، یا دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ خود پڑھتا ہے یا دوسروں کو پڑھاتا ہے''۔

خیر کی دو بنیادیں...... اس امت کے لئے سب سے پہلے جو چیز لازم کی گئی اور جس کو سراپا خیر قرار دیا گیا، وہ اللہ کی کتاب ''قرآن مجید'' ہے۔ جس کے متعلق احادیث میں: "اِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ" فرمایا گیا یعنی سراپا سچ، سراپا خیر اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت کے لئے: "وَاَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" ② کا اطلاق فرمایا گیا۔ یعنی بہترین سیرت، سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ دو بنیادیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، اول کتاب اللہ، دوم رسول اللہ۔ رسول تو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو وہ عنایت فرمایا جو خیر البشر ہیں، جو تمام بنی آدم اور تمام ملائکہ بلکہ پوری کائنات میں افضل ترین ہیں۔ اور کتاب اللہ قوانین خداوندی میں سب سے اعلیٰ ترین اور جامع و اکمل ترین قانون ہے۔ اس کی تعلیم و تعلّم کو بہترین مشغلہ قرار دیا گیا۔

بنیادوں کی خیر...... اور یہ انہی بنیادوں کی خیر ہے جو امّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جاری ہوئی، اسی سبب سے یہ امّت، خیر امّت کے لقب سے سرفراز ہوئی...... ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ③ تم ہی وہ بہترین امت ہو جس کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وجود بخشا گیا۔ گویا بنیادیں بھی خیر و برکت اور بنیادوں کے ذریعے

---

① الصحيح للبخارى، كتاب فضائل القرآن، باب خيركم من تعلم القرآن وعلمه...... ص: ۴۳۸.

② السنن للنسائی، كتاب الصلوة، باب كيف الخطبة، ج: ٦ ص: ٢٧. ③ پارہ: ۴، سورة آل عمران، الآية: ١١٠.

تربیت یافتہ امّت بھی خیرِ امّت، پھر یہ خیرِ مطلق چند طبقات پر حاوی ہوئی۔ تو وہ طبقات بھی کامل واکمل طریقہ پر باعثِ خیر بنے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ.'' ① زمانوں میں بہترین زمانہ میرا ہے، پھر اس سے ملا ہوا، پھر اس سے ملا ہوا۔

ان زمانوں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین فضیلت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو نصیب ہوئی اور قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس جماعت کو محترم اور مقدس قرار دیا وہ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا طبقہ ہے، جس میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ مطلق اس طبقہ کو ہی خیر فرمایا گیا۔ قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے اس طبقہ کی خیریت اور تقدس کو بیان فرمایا گیا، ارشاد ہوا: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ② جنہوں نے اسلام کی پہلی پکار پر لبیک کہا، وہ مہاجر ہوں یا انصار یا انکے سچے دل سے پیروی کرنے والے، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس میں جانبین کی باہمی رضا وخوشی بتائی گئی۔ تو یہ طبقہ مطلقاً خیرِ مطلق قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے خوش اور رضا وخوشی کا یہ اعلان چونکہ قرآن کریم کے ذریعے فرمایا گیا، جو دوامی کتاب ہے جس کا وجود قیامت تک باقی رہے گا بلکہ آگے جنت میں بھی جاری وساری رہے گا اور ایک لحاظ سے یہ ابدی کتاب ہے لہٰذا اعلانِ رضامندی بھی ابدی ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور وہر زمانہ میں ہوتا رہے گا اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خیر میں فرق پڑے، ورنہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اعلان عام نہیں رہے گا۔ اعلان کی عمومیت ہی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ابد تک راضی ہے اور راضی رہے گا، اس کی رضا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ سے راضی رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا۔

مشیتِ الٰہی بندہ کے تابع...... صوفیاءِ کرام کی اصطلاح میں اسی تعلق رضا کو نسبت کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے تابع ہو جائے اور اللہ تعالیٰ بندہ کی جو مرضیات ہوں ان سے خوش ہو۔ جانبین کی یہی رضا ''نسبت'' کہلاتی ہے۔ جس بندہ کو یہ نسبت حاصل ہو جائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عافیت میں رکھے تب راضی، بیماری ودکھ میں رکھے تب خوش، جو بھی تقدیر خداوندی ہو، بندہ اس پر مطلقاً رضا کا اعلان بھی کردے اور دل سے بھی راضی رہے اور جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر راضی ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی بندہ کی ہر منشاء پر راضی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ بندہ کا جو منشا ہو وہ پورا فرماتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی شان

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الشھادات، باب لایشھد علی شھادۃ جور اذا اشھد، رقم: ۲۴۵۷.

② پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰.

بھی عجیب ہے اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں اس قدر جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی ادھر اللہ نے فوراً پورا فرما دیا۔

اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ مشیتِ الٰہی بندہ کی مشیت کے تابع ہوگئی، جو بندہ چاہتا ہے وہی ہوجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ آپ کی جو خواہش ہوتی پوری ہوجاتی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا خیر تھے اسی طرح آپ کی خواہش بھی خیرِ مطلق ہوتی تھی۔ غیرِ خیر یا شر کی خواہش نبی کے ذہن کو چھو بھی نہیں سکتی۔ انبیاء کرام کے قلوب اتنے پاکیزہ، مقدّس اور صاف ہوتے ہیں کہ ان میں جو ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے، جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، خیر مطلق ہوتی ہے۔ جب وہ خیرِ محض ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی چلتی ہے اور خیر ہی کی پذیرائی ہوتی ہے۔ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی اور اللہ بندہ کی ہر خواہش پر راضی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر جدھر گھومتے ہیں، حق بھی ادھر گھومتا ہے۔ بظاہر تو صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جدھر مشیتِ خداوندی اور حق ہوتا ہے ہم ادھر ہی چلتے ہیں، اور یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمر گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی گھومتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک مقام تو مبتدی کا ہوتا ہے کہ وہ تابعِ مطلق ہوتا ہے۔ جدھر حق ہو، ادھر ہی گھوم جائے۔ اور ایک مقامِ منتہی کا ہوتا ہے۔ یہ مقام جانبین کی رضائے کامل سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ بندہ سے راضی اور بندہ اللہ سے راضی۔ اور یہ مقام پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا۔

خیرِ عمل...... اول پوری امت کو دیگر امم کے مقابلے میں خیر امت قرار دیا گیا، پھر اس خیریت کو "خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ" کے ذریعہ عہدِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا۔ اس کے بعد عہدِ صحابہ میں موجود مسلمانوں میں سے خیریت میں اس فرد کی ترجیح فرمائی گئی جو خود قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دے۔ یوں اس کی رغبت دلائی: "خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" [1] اس کو خیر العمل کہا گیا ہے۔ قرآن کریم خود بھی خیر، اس کو پڑھنے پڑھانے والے بھی خیر کے مستحق۔

حفاظتِ قرآن کریم...... ظاہر میں قرآن کریم دو چیزوں، الفاظ ومعانی کا مجموعہ ہے۔ اور یہ دونوں "مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ" ہیں، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ الفاظِ قرآن جب نازل ہوتے تھے، اسے جوں کا توں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ وحاضرین کو سنا دیتے تھے، کوئی لفظ کم کرتے نہ زیادہ۔ اس معاملہ میں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے اسی طرح معانی کے سلسلہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے۔ الفاظ کی طرح معانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت کا جو

[1] الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلم القرآن...... ص: ۴۳۸.

مقصد، مطلب و معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر القاء ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو روایت فرما دیتے، اپنی طرف سے کوئی معنی بیان نہیں فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین تھے اور معانی میں بھی امین۔ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے اور معانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ ان میں قیامت تک کوئی خلل نہیں پڑ سکتا۔ یہ الفاظ و معانی قیامت تک باقی رہیں گے۔ تحریف کرنے والے ہزار تحریف کریں مگر حق غالب ہی رہے گا الفاظ بھی باقی رہیں گے اور معانی بھی۔ خود قرآن کریم نے ہی اس کی گارنٹی دی ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ① ابتداءً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادتِ شریفہ تھی: جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی اس کو پڑھنے لگتے تا کہ الفاظ زبان پر چڑھ کر محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بھولنے کے خطرہ کے پیش نظر جلد جلد زبان کو حرکت نہ دیجیے! اس کے الفاظ آپ کے قلب میں جمانے اور زبان سے ادائیگی کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ گویا الفاظِ قرآن کی حفاظت اور یادداشت کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی کہ آپ کے قلب مبارک سے پڑھوا بھی دیں گے، نہ جمع میں کوئی غلطی ہوگی اور نہ پڑھنے میں کوئی چُوک ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ بھی تھا اور وعدہ بھی۔

عربی میں "عَلٰی" التزام کے لئے آتا ہے، جس چیز کو کوئی اپنے اوپر لازم کرتا اور اس کا ذمہ لیتا ہے، اس کی تعبیر عَلٰی سے کی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے: "عَلَيَّ اَلفُ دِرْهَمٍ" تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ پر لازم ہے کہ تم کو ایک ہزار روپیہ دوں، یہ میری ذمہ داری ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ② یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ الفاظِ قرآن آپ کے قلب میں جمع و محفوظ بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ گویا قرأت بھی دوامی ہے، جس میں کبھی کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا۔ اور جمع قرآن بھی دوامی ہے کہ اس میں تحریف ورد و بدل نہیں ہو سکتا۔ معانی پڑھے نہیں جاتے، سمجھے جاتے ہیں۔ تو یہاں "قُرْآنَهُ" فرما کر الفاظ پڑھانے اور زبان پر جاری کرانے کی ذمہ داری لی گئی۔ معانی سے متعلق یہاں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ قرآن کے لفظی معنی "پڑھانا" کے ہیں۔ معانی کی ذمہ داری ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ③ میں لی گئی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنی کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ پہلی آیت میں "قُرْآنَهُ" فرما کر الفاظ کی ادائیگی اور قرأت کی ذمہ داری لی اور اس آیت میں "بَيَانَهُ" فرما کر بیان کرنے اور سمجھانے کی ذمہ داری لی۔ خلاصۃً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے دونوں اجزاء الفاظ و معانی کی ذمہ داری لے لی ہے۔ یعنی قرآن پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کے معنی و مفہوم کو، جو قرآن کے موضوعات ہیں، سمجھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

قرآن اور بیانِ قرآن یعنی حدیث ...... اور یہ بیان ہی دراصل حدیث کہلاتا ہے اور حدیث ہی کے ذریعہ

① پارہ: ۱۴، الحجر، الآیۃ: ۹. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷. ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹.

سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی مقاصد کو واضح فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کے ساتھ بیانِ قرآن باقی نہ رہے تو لوگ کچھ کا کچھ مطلب لیں گے۔ ایک معنی کے ہزار معنی بنیں گے۔ قرآن کی اوّلین تفسیر حدیثِ نبوی ہے کہ قرآن مجید میں اس کو بیان بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ ① الفاظ جب آچکتے ہیں تو اس کے معانی بیان ہوتے ہیں۔ اس لئے بیان معانی پر صادق آتا ہے۔ الفاظ بیان نہیں کہلاتے۔ وہ تلاوت کئے جاتے ہیں، پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کے جو الفاظ آچکے ہیں اور ان کے جو معانی اور مراداتِ ربانی ہیں ان کو بیان کردینے کا نام "تبیین" ہے، یعنی واضح کردینا: ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّا سِ﴾ سے معلوم ہوا کہ حدیث، بیانِ قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک متن اتارا، جس کا نام قرآن مجید ہے اور اس متن کی ایک شرح اتاری، جس کا نام حدیث ہے۔ اسکی تاکید، لفظِ بیان سے کی اور اس سلسلے میں خود ذمہ داری لی: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ﴾ ② کہ بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے کئی معنوں میں ڈھل سکتی ہوتی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس طرح نہیں فرمایا کہ اس آیت کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں، ایک یہ ہوسکتے ہیں اور زمانہ کے مطابق فلاں معنی ہیں، لہٰذا یہ معنی مراد ہیں۔ بلکہ اس آیت کی مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر القاء فرماتے تھے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم مراد پر غور نہ فرماتے کہ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے، یہ مراد بھی نکلتی ہے۔ مرادِ ربانی روایت اور نقل سے حاصل ہوسکتی ہے، عقل سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ مراد کے دائرے میں رہ کر آپ عقل لڑائیں گے تو حکمتیں کھلیں گی اور وہ حکمتِ قرآن کہلائے گی۔ لیکن خود مراد کو عقل سے متعین نہیں کیا جاسکتا۔ مراد اللہ تعالیٰ ہی بیان فرمائے گا کہ اس آیت سے میرا یہ مطلب تھا۔ اگر مرادِ آیت عقل سے ہی متعین کی جاتی تو قرآن کئی اقسام کے ہوتے۔

جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب روزہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ ابتداء میں یہ حکم تھا کہ رات کو سو کر جب بھی آنکھ کھلے، اس وقت سے اگلے افطار تک بیچ میں کھانا پینا منع ہے۔ پھر اس میں تخفیف فرمائی اور ارشاد فرمایا: ﴿وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ③ یعنی صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق کا اجالا ظاہر ہو تو اب کھانے پینے سے رک جاؤ اور روزہ کی نیت کرو۔ اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے دو قسم کے دھاگے، کالے اور سفید تیار کرائے اور سرہانے رکھ لیے۔ جب سفید دھاگہ کالے سے تمیز ہوجاتا، تب کھانا پینا بند کرتے۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کے دھاگے تیار کرائے۔ اور تکیہ کے نیچے رکھ دیئے۔ ان کو دیکھتے رہتے ...... جب کالا دھاگا سفید دھاگہ سے بالکل ممتاز نظر آتا تو روزہ کی نیت کرتے۔ حالانکہ اس وقت صبح ہوئے خاصا وقت پندرہ بیس منٹ گزر چکا ہوتا۔ ان حضرات نے باعتبارِ لغت یہ

---

① پارہ: ۱۴، النحل، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹. ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

صورت اختیار کی تھی جولغوی اعتبار سے غلط بھی نہ تھی ۔مگر اللہ تعالیٰ کی چونکہ یہ مراد نہ تھی اس لئے سب کی دلجمعی نہ ہوئی اور معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: اے عدی! تم کیا صورت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ ① کے نازل ہونے کے بعد دو ڈورے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں، جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے کھاتا پیتا رہتا ہوں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عدی! تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے کہ اس میں دن رات چھپ گئے ۔کیونکہ کالے ڈورے سے رات مراد ہے اور سفید ڈورے سے مراد دن ہے۔دھاگوں کے ڈورے مراد نہیں۔ ② اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہاں لغوی معنی مراد نہیں۔

مرادِ قرآنی اور لغت......یہیں سے معلوم ہوا کہ لفظ کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک مرادی۔قرآن مجید اترا تو لغت عربی میں ہے لیکن ہر جگہ لغت مراد نہیں۔بعض جگہ قرآن کریم نے لغت تو زبان عرب سے لی مگر معنی اس کے اندر اپنے ڈالے اور وہی مرادی معنی کہلاتے ہیں۔

اب دیکھئے''صلوٰۃ'' کا لفظ ہے۔لغت عربی میں اس کے معنی دعا مانگنے کے ہیں۔ایک آدمی دعا مانگ لیتا ہے تو لغت کے لحاظ سے اس نے''صلوٰۃ''ادا کر لی۔یہاں باعتبار لغت رحمت بھیجنا اور دعا مانگنا تو صحیح ہے مگر اسے نماز پڑھ لینا کہنا صحیح نہیں، کیونکہ''صلوٰۃ''کے لفظ کی مراد یہ نہیں ہے۔اس سے مراد کچھ خاص اعمال وافعال ہیں کہ یوں نیت باندھو، اس طرح قیام کرو، رکوع وسجود کرو، یوں قعدہ میں بیٹھو وغیرہ۔اس مجموعہ کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔یہاں قرآن نے لفظ لغتِ عربی کا لیا ہے مگر معنی اپنے ڈالے کہ یہاں صلوٰۃ سے ہماری مراد یہ ہے۔اس مراد کی وضاحت کے بعد صرف دعا مانگنے کو نماز نہیں کہا جاسکتا اور آدمی ادائیگی نماز سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح لغتِ عرب میں''زکوٰۃ''کے معنی پاک کردینے کے ہیں۔آپ ہاتھوں پر پانی ڈال کر دھو کر پاک کرلیں، زکوٰۃ ادا ہوگئی۔یہ ہزاروں روپیہ کی زکوٰۃ نکالنے کے معنی کہاں سے نکال لیے۔لغت میں تو اس کا کہیں پتہ نہیں! یہاں بھی قرآن کریم نے زکوٰۃ کا لفظ تو لغتِ عرب سے لیا مگر اس کے معنی خود متعین کئے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال، اتنا روپیہ پیسہ ہو اور اس پر پورا سال بھی گزر جائے تو اس مال سے خاص مقدار کی رقم اللہ کی راہ میں نکالنا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔تو زکوٰۃ کے لغوی معنی جتنے بھی ہوں مگر مراد وہی عرفی معنی ہی ہیں، جو قرآن کریم نے مراد لئے ہیں۔اللہ جل شانہٗ نے بہت سے الفاظ لغتِ عرب کے لے کر ان میں اپنے معنی ڈالے ہیں، وہی مرادی معنی ہوتے ہیں۔معلم ان ہی معانی کو سمجھاتا، بتاتا اور ان ہی کی تعلیم دیتا ہے۔اگر مرادی معنی ضروری نہ ہوتے، لغوی معنی ہی کافی ہوتے تو اتنا کافی ہوتا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن مجید کا نسخہ لاتے، بیت اللہ کی چھت پر رکھ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان ان الدخول فی الصوم یحصل ج: ۵ ص: ۳۷۵.

دیتے اور اعلان کر دیتے: اے لوگو! تم روحانی مریض ہو یہ تمہارے لئے نسخہ شفاء ہے، تم زبان دان ہو، عربی سمجھتے ہو، اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اپنا علاج کرلیا کرو۔ پھر پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر مسائل کہیں بھی لغت سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، وہ لغت سے اللہ کی مراد کا تعین کر کے لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے اور اللہ کے نزدیک اس آیت کا کیا مطلب ہے۔

مقاصدِ بعثتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار وظیفے (چار کام) متعین ومقرر فرمائے۔ پہلا وظیفہ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ① یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اور امت تک ان کو پہنچائیں۔ آپ نے یہ وظیفہ پوری امانت کے ساتھ انجام دیا اور پورا قرآن امت کو سنایا، ان تک پہنچایا۔ اس کے بعد دوسرا وظیفہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم دو! تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے جو مطلب اور مراد متعین کی ہے، وہ انہیں سمجھائیں۔ آپ نے وہ معانی سمجھائے اور مراداتِ ربانی بیان فرمائیں۔ یہ تعلیم کا وظیفہ ہوا۔ جب نبی خود کوئی مراد متعین فرمادے تو اس کے اندر کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔ پھر تیسرا وظیفہ تعلیمِ حکمت بیان فرمایا ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حکمتیں بھی سکھلائیں۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمتِ نظری، حکمتِ عملی۔ بقاعدۂ بلاغت حکمتِ نظری تعلیم کے اندر ہی آ گئی۔ اس کے بعد لفظِ حکمت کے ساتھ حکمت کی تعلیم کا حکم دینے سے یہ متعین ہوگیا کہ اس سے حکمتِ عملی مراد ہے۔ اور وہ ''اُسوۂ حسنہ'' ہے، آپ کی مقدس سیرت ہے۔ آپ نے مراداتِ ربانی نہ صرف سنائیں اور ان کی تعلیم پر اکتفا فرمایا بلکہ عملی طور پر بھی انکا نمونہ پیش فرمایا۔ اب نہ کوئی خطرہ باقی ہے نہ خدشہ اور نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے۔

اگر صرف لفظوں سے لوگوں کو عمل متعین کرنے کو کہا جاتا تو ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ متعین کر لیتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ پر عمل بھی فرمایا اور ان مراداتِ ربانی کی ہیئت بھی دکھلا دی۔ اب اس میں کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کے متعلق جو عمل کر کے دکھلایا گیا، اسی کے مطابق عمل کرو: ''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ'' جس طرح مجھے نماز پڑھتے تم نے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو۔ میرا اسوہ وعمل تمہارے لئے نمونہ ہے۔ تم اپنی مرضی کے مطابق اس کی ہیئت متعین نہ کرو۔ میرا عمل اللہ کی مراد کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی ہیئت مطلوب ہے۔ اس کے بعد کوئی خدشہ، کوئی خلجان اس ہیئت کے متعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد چوتھا وظیفہ یہ بھی فرما دیا کہ لفظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنا دیں، معنی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھا دیں اور عمل کر کے بھی دکھلا دیں۔ مگر ان کے دلوں میں صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ ان معانی کو قبول

① ② ③ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعہ، الآیۃ: ۲.

کرلیں، اس ہیئت پر اعتقاد جمالیں۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے قلب کی صلاحیت کی، کہ ذہن بھی صحیح ہو ذہن صحیح نہ ہو، اس میں ٹیڑھ پن اور کجی ہو تو اوندھے معنی سمجھتا ہے، اس لئے بطور وظیفۂ چہارم فرمایا: ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ① ان لوگوں کے دلوں کو بھی مانجھ دیجیے۔ ان کے دلوں میں استعداد اور صلاحیت بھی پیدا کیجیے کہ جب اللہ کا کلام ان کے کانوں میں پڑے تو اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک وہی سمجھیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور عمل کی ٹھیک وہی ہیئت اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کا منشاء اور اس کا مطلوب ہے۔ محض لفظوں سے کوئی شخص عمل کا نمونہ اختیار نہیں کرسکتا، جب تک عملی نمونہ اس کے سامنے نہ ہو۔ اور عملی نمونہ کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک دل کی کدورات صاف کر کے، اس کو مانجھ کر پاک و مصفی نہ کر دیا گیا ہو۔

اسوۂ حسنہ کی ضرورت...... میں کہتا ہوں کہ روٹی پکانا بظاہر معمولی بات ہے۔ ہم اور آپ روزانہ گھروں میں روٹی پکتے دیکھتے ہیں۔ مگر آپ محض دیکھتے رہنے سے روٹی پکانے کا عمل نہیں کرسکتے، جب تک اس عمل کی مشق نہ کریں۔ پہلے آپ دیکھیں گے کہ پیڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس کو روٹی کی شکل کس طرح دی جاتی ہے، پھر اس کو توے پر کس طرح ڈالا جاتا ہے۔ جب آپ اپنے ہاتھ سے اس عمل کو دھرائیں گے، عملی طور پر اس کی مشق کریں گے، تب آپ کو روٹی پکانی آئے گی۔ محض بیٹھے دیکھتے رہنے سے آپ کبھی روٹی نہ پکا سکیں گے، روٹی پکانے کے عمل اور ہیئت کے دیکھنے سے۔ اوّل ہر عمل کی ہیئت دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ سے ہیئت ذہن نشین نہیں ہوا کرتی اور مشق کے بغیر عمل کی صورت ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ خیاطی ایک فن ہے۔ اس فن کی آپ ہزار کتابیں پڑھ ڈالیں، سوئی چلانی نہیں آئے گی۔ جب تک درزی کو سوئی چلاتے دیکھ نہ لیں، آپ سوئی نہ چلا سکیں گے۔ اسی طرح دنیا کی سب صنعتوں اور حرفتوں کا حال ہے کہ کوئی بھی صنعت بغیر سیکھے سکھائے نہیں آسکتی۔ جب تک سکھانے والا عملی نمونہ نہ دکھائے، محض الفاظ اسے صنّاع نہیں بنا سکتے۔

یہی حال دین کی صنعت کا بھی ہے کہ محض الفاظ اتار دینے اور ان کے معانی سمجھا دینے کے باوجود عمل کی ہیئت انسان کے ذہن نشین نہیں ہوسکتی، عملی نمونہ ضروری ہے تاکہ وہ الفاظ معانی کو صحیح عمل اور ہیئت پر منطبق کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو اسی لئے مبعوث فرمایا کہ وہ اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکامات کے الفاظ بھی سکھائیں، ان کے مفاہیم و معانی بھی بتائیں اور الفاظ و معانی سے جو عمل مطلوب ہے، اس کا نمونہ بھی انکے سامنے رکھیں اور اسی کے ساتھ ان کے ذہن کو بھی مصفّٰی اور منور کریں۔ اور ذہن سازی فرمائیں، تاکہ وہ کلام الٰہی کے اوندھے سیدھے معانی نہ سمجھیں اور پیغمبر نے جو نمونہ عمل ان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے گریز اور بے رغبتی نہ برتیں، بلکہ ذوق و شوق اور کشادہ دلی کے ساتھ اس نمونہ کو حرزِ جان بنالیں۔ اگر ذہن کی صفائی کے لئے الفاظ و معانی کافی ہوجایا کرتے تو انبیاء علیہم السلام کے لئے ''وظیفۂ تزکیہ'' لازم نہ کیا جاتا۔ ذہن کی

صفائی کے لئے خاص طرح کی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدات وریاضات کے ذریعہ اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کا تزکیہ فرمایا۔ ان کو مجلّٰی اور مزکّٰی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کو اللہ کا کلام سنایا جاتا تو ان پر وہی اثرات ظاہر ہوتے جو کلام اللہ کے اثرات ہیں۔

اللہ کا یہی کلام آپ عام مسلمان کو سنائیں، تو عملی طور پر معتقد ہوگا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی بے ادبی نہیں ہونی چاہئے، مگر اس سے آگے کے اثرات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اسکے برخلاف اللہ کا یہی کلام کسی عارف باللہ کو آپ سنائیں تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ اسلئے کہ اس کا دل منجھا ہوا ہے۔ مجاہدات وریاضات سے اس کا قلب روشن ہے۔ اسی روشنی میں کلامِ الٰہی کے جو اثرات وہ مشاہدہ کرے گا، عام مسلمان ایسا نہیں کر سکے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر اللہ کی کثرت، نماز کی ادائیگی، جہاد اور دیگر مجاہدات کے ذریعہ اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت فرمائی، ان کے قلوب کو مانجھا، مصفّٰی ومزکّٰی کیا اور ان کا رُخ بدل دیا۔ پہلے ان کا رُخ دنیا کی طرف تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش کی طرف ان کا رُخ کر دیا۔ پہلے وہ فرشی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے عرشی بنا دیا۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں، جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں، حقائق کے تحت معارف ہیں اور معارف میں کیفیات ہیں، جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں۔ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ ومعانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں، بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت وتزکیہ بھی ہے، جو الفاظ ومعانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق ومعارف کے ادراک کے قابل ہوں اور ان معارف کی کیفیت کا محل بھی بن سکیں۔

قرآن کے ساتھ اجتماعِ خیر...... اس تربیت وتزکیہ کا مدار مُربّی ومُزکّی کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس لئے کلام اللہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی بعثت بھی ضروری گردانی گئی۔ جہاں بھی کسی صحیفۂ الٰہی، یا کتاب اللہ کے نزول کا ذکر ہوا اسی کے ساتھ ساتھ اس صحیفہ یا کتاب کے نزول کے مورد، پیغمبر ورسول کا ذکر بھی لازماً ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی چار مشہور کتابیں چار پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ تورات کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام، زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام، انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن مجید کے ساتھ ہمارے پیغمبر رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ غرض کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ قانون تو آیا ہو مگر شخصیت نہ آئی ہو۔ اس لئے کہ دارومدار شخصیت پر ہوتا ہے، کاغذوں اور تختیوں یا ان پر کندہ حروف پر نہیں ہوتا۔ ان حروف والفاظ کی تلاوت شخصیت کرے گی اور ان کے معانی بھی شخصیت بتلائے گی اور نمونۂ عمل بھی شخصیت بنے گی۔ کسی کتاب کے اوراق تو نمونۂ عمل نہیں بنیں گے۔ دلوں کو مانجھنے، ان کو مصفّٰی ومزکّٰی کرنے کا کام بھی شخصیت انجام دے گی۔ کتابوں پر لکھے ہوئے یا تختیوں پر کندہ الفاظ تو دلوں کو نہیں مانجھیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر قانون

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ''خیر القرون'' ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیرِ مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذات اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گونا گوں خیریں یکجا اور مجتمع ہوگئی تو خیر الکتب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا: ''خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ'' ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، اردگرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی ...... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ (او کما قال علیه الصّلوٰة والسلام). ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان وزمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات وبرکات مخلوقِ خداوندی ہیں، مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطن خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ'' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے، باطنِ حق

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم...... ص ۴۳۸.

② الجامع الکبیر للسیوطی حدیث رقم: ۳۳۸۶. کنز العمال، ج: ۱ ص: ۳۲۱.

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

④ الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن ابی طالبؓ ج: ۱۲ ص: ۱۳۴.

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ وحروفِ قرآن کی جنت میں گل وگلزار سے تبدیلی...... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: "رَتِّلْ وَارْتَقِ" ① پڑھتا جا اور درجے چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی پھٹتی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر اسا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی بگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالم آب وگل میں موجود ہیں، خزانۂ علم وعرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ، گل وگلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون وراحت تھے اور انہیں علم وعرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنت نگاہ باغ و بہار اور لعل وجواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارۂ شادمانی ومسرت بنادیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور وقصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ و بہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ ج:۴ ص:۲۶۳۔

کی بجائے آج ایمان لا کر یہ جنت کیوں نہ حاصل کر لیں۔ جس مسلمان نے پورا قرآن حفظ کر لیا، اس نے گویا پوری جنت اپنے قلب میں سمیٹ لی۔ جب عالَمِ آخرت میں حرفوں اور لفظوں میں سمٹی ہوئی یہ جنت کھلے گی اور پھیلے گی تو وہ دیکھے گا کہ یہ تو قرآن حکیم تھا، جو اَب جنت بن گیا ہے۔ اس دنیا میں مؤمن اپنے اندر جنت لئے بیٹھا ہے لیکن چونکہ اس کی اصل شکل سامنے نہیں ہے، اس لئے اسے پتہ نہیں کہ کتنی عظیم چیز وہ اپنے اندر لئے بیٹھا ہے۔ جب آیتوں کی حقیقت کھلے گی اور وہ اپنی اصل شکل بدل کر سامنے باغ و بہار بنی نظر آئیں گی تو اس نعمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مؤمن اپنی ذات میں جنت ہے۔ قیامت میں اس کو جو چیز جنت کے نام سے ملنے والی ہے۔ وہ یہیں قرآنی الفاظ کی شکل میں اس کو عنایت کر دی گئی ہے۔ اب جو بھی یہاں قرآن پڑھ رہا ہے، وہ گویا جنت سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر ذخیرہ کر رہا ہے، وہی جنت جب کھلے گی تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ تو مجھے دنیا ہی میں مرحمت فرما دی گئی تھی۔ بہر حال قرآن حکیم حق تعالیٰ شانہ کے باطن سے وابستہ ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ اجر و ثواب کے حصول کا باعث بھی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیاں نامۂ اعمال میں ذخیرہ ہو رہی ہیں اور یہی قرآن جنت کے محلات و قصور، گل و گلستان بھی ہیں۔

غرض قرآن شریف کی عجیب شان ہے اسے پڑھو تو اس سے بہتر وظیفہ نہیں، اس کا علم سیکھو تو اس سے بڑھ کر کوئی علم نہیں، اسے دستورِ زندگی بناؤ تو اس سے بڑھ کر کوئی قانون نہیں، اگر اس کے حقائق کھولو تو اس سے بہتر حکمتیں نہیں، اگر اس کی کیفیات اپنے اوپر طاری کر لو تو اس سے بڑھ کر سکونِ قلب کوئی نہیں، نعمتوں کا جو تصور بھی کوئی قائم کرے، وہ سب کا سب اس کے اندر جمع ہے۔ جو یہاں علمی شکل میں ہیں، عالَمِ آخرت میں باغ و بہار کی شکل میں آ جائیں گی اور یوں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم ایک عظیم الشان اور حدِ نظر تک وسیع باغ ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہمہ اقسام خوشبوئیں موجود ہیں۔

تورات اور میدانِ حشر...... چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میدانِ حشر میں جب اقوامِ عالَم جمع ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ سے پوچھیں گے کہ وہ کتاب تورات کہاں ہے جو ہم نے تیرے اندر رکھی تھی؟ وہ عرض کرے گی کہ: وہ تو جبرئیل علیہ السلام لے گئے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام سے سوال ہوگا: لوحِ محفوظ سے تم تورات لائے تھے؟ وہ عرض کریں گے: جی ہاں لایا تھا۔ پھر سوال ہوگا: اسے کہاں لے گئے؟ وہ کہیں گے "تورات" کو میں نے موسیٰ کے قلب پر نازل کیا تھا۔ موسیٰ سے سوال ہوگا کہ جبرئیل علیہ السلام سے تم نے تورات سنی؟ وہ عرض کریں گے جی ہاں! تورات سنی اور اس کے معنی سمجھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: پھر آپ نے کیا کیا؟ موسیٰ عرض کریں گے: میں نے وہ تورات اپنی امت کو پہنچا دی۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہوگا: وہ "تورات" اب اپنی امت کو سنا کر دکھاؤ۔ آپ علیہ السلام پوری تورات وہاں تلاوت فرمائیں گے۔

دنیا میں تورات کے الفاظ پڑھے اور سنائے گئے، اس کے معنی سمجھائے گئے اور آج (قیامت) کی تلاوت

نے الفاظ ومعانی میں پوشیدہ حقائق مجسم شکل میں سامنے کردیئے ہیں، جس سے معلوم ہوا وہ ایک عظیم الشان باغ ہے۔ اوراس سے قلب پر عجیب وغریب کیفیات طاری ہورہی ہیں، حیرت انگیز انکشافات ہورہے ہیں۔ تو امت موسیٰ کے لوگ کہیں گے: یہ تورات تو ہم نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔ ہم وہاں الفاظ ومعانی کی افہام وتفہیم میں الجھے رہے۔ یہ حقیقت کہ تورات کیا ہے! آج ہم پر کھلی، پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے کبھی نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم اور میدانِ حشر...... اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوگا کہ قرآن آپ تک پہنچا تو آپ نے اس کا کیا کیا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرمائیں گے: جی ہاں! قرآن مجھ تک پہنچا اور اسے میں نے اپنی امت کو تلاوت وتعلیم کے ذریعہ پہنچا دیا۔ ارشاد ربانی ہوگا: اب یہاں بھی اس کی تلاوت کیجیے۔ (تاکہ اقوام عالم کے سامنے قرآنی الفاظ ومعانی کی حقیقتیں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوجائیں اور سب دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے کس طرح پورے عالم کا احاطہ کیا ہوا تھا)۔ حدیث شریف میں آتا ہے، تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منبر بچھایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہوکر قرآن کریم کی اول سے آخر تک تلاوت فرمائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے۔ جن لوگوں کو قرآن نہیں پہنچا، بحسرت ویاس کہیں گے: کاش! دنیا میں ہم کو یہ کتاب ملی ہوتی یہ تو بہت ہی عجیب وغریب کتاب ہے۔ اس کے اندر عجیب خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ تو دنیا میں الفاظِ قرآنی کی تلاوت کرنے، اس کے معانی کو سمجھنے سے دل پر جو روحانی کیفیات واثرات طاری ہوتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سے سب مجسم شکل میں آجائیں گے اور معلوم ہوگا کہ قرآن تو اتنا بڑا اور عظیم الشان باغ ہے، جس نے پورے عالم اور کائنات کا احاطہ کررکھا ہے اور اس میں سدابہار پھولوں اور رنگ برنگ بوٹوں کی دنیا آباد ہے، جن کی مہک بے مثال ہے۔

اس حقیقت کو عیاں دیکھ کر خود حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حیران ہوں گے کہ قرآن حکیم کا یہ رُخ تو ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے تلاوتِ قرآن کی کیفیات سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب پُر رہتے تھے، لیکن ان کیفیات کو آج جس شکل میں وہ مجسم دیکھ رہے ہیں، اس سے تو دنیا میں وہ بھی واقف نہ ہوسکے تھے۔ جلوہ حق کی موجودگی کے ساتھ، تمام انبیاء وملائکہ علیہم السلام اور تمام امتوں کے اجتماع میں جب قرآنی حقائق مجسم ہوکر سامنے آئیں گے تو حیرانگی کا عجیب عالم ہوگا۔ سارے لوگ گنگ ہوں گے۔ جن کو یہ نعمت نہیں ملی، ان کو حسرت ہوگی اور جن کو یہ نعمت ملی، ان کو افسوس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے بے خبر رہے اور اس کو پس پشت ڈال کر کتنا بڑا خسارہ اور محرومیاں سمیٹتے رہے۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کو بطور ورد پڑھو کہ اس سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں، اس کا علم سیکھو کہ اس سے بہتر کوئی علم نہیں، حکمتوں کی تلاش ہو تو اس میں غور وفکر کرو کہ حکمتوں سے بھرا ہوا، اس جیسا کوئی اور کلام نہیں، معارف کی جستجو ہو تو قرآن سے بہتر معارف کا ذخیرہ کہیں نہیں۔ اِنہی چیزوں کا یہ لفظی ومعنوی مجموعہ جب اپنی حقیقی

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن و ماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے ناآشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آ گئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضَوفشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیرِ مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیرِ مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیرِ مطلق۔ یہی بات اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: ''خَيْرُ كُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ'' ''قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے''۔

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ...... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان ''اویسیہ خاندان'' کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، من جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے ''یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔'' تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیمِ قرآن کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام ''اللہ بندہ'' تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: ''اللہ بندہ'' فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی! اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے: اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال و جواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ ''دنیا و مافیہا'' سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ و ریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے، نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے گاڑ دیتے تا کہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہو گیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کرلو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرا لیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔

یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ وخیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے "اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ" ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اَوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی...... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدّعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب کو اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ جیت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دُکھنے لگیں، دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آ گیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہو گیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہو گیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زیرک و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولیے بینائی واپس آ گئی ہے۔ بینائی

گئی کہاں تھی وہ تو موجود ہی تھی۔ آنکھیں کھول کر فرمایا: اللہ تمہیں جزائے خیر دے میری بینائی واپس آ گئی۔

ادھر لطیفہ یہ ہوا کہ دوسرے دن مولانا یعقوب کی مسجد کے سامنے نابیناؤں کا مجمع اکٹھا ہو گیا کہ مولانا کو ایسا پانی دم کرنا آتا ہے جس سے بینائی واپس آ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی علاج کے لئے آ گئے۔ مولانا نے ان سے کہا: بھائی! یہ ترکیب تو میں نے میاں جی کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ میرے پاس کوئی پانی وانی نہیں۔

برکاتِ قرآن حکیم...... قرآن حکیم کا شغل ایک مبارک شغل ہے۔ اللہ کی کتاب سے واسطہ رہے گا تو اس کے ذریعہ اللہ سے بھی واسطہ رہے گا۔ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راستہ سے کروڑوں بندگانِ خدا، خدا تک پہنچ بھی گئے۔ کسی کو نجات عطاء ہوئی، کوئی اس ذریعہ سے بلند درجات پر فائز ہوا۔ جس کا قرآن مجید سے جتنا گہرا واسطہ اور ربط رہا، اسی قدر بلندیٔ درجات حاصل ہوتی رہی۔ غرض کروڑوں انسان قرآن کریم کی بدولت فائز المرام ہو چکے ہیں اور کروڑوں اور ہوں گے ان شاء اللہ۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کریم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مجسّم شکل میں حاضر ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: آج میں تیری وجہ سے کتنوں کو بلند درجات پر فائز کرتا ہوں اور کتنوں کو پستی و گہرائی میں ڈالتا ہوں۔ جو تجھ پر عمل کرتے تھے، تیرے علم میں مشغول تھے، ان کے لئے رفعِ مراتب اور بلندیٔ درجات اور بہترین جزاء ہے۔ اور جو تجھ سے اعراض کرتے اور بھاگتے پھرتے تھے نہ انہوں نے تجھے پڑھا، نہ تیرے پیغامات پر عمل کیا، وہ آج پست و ذلیل ہوں گے، اس گریز کی سزا پائیں گے اور ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوں گے۔ "یَضَعُ بِهَا اَقْوَامًا وَيَرْفَعُ بِهَا اَقْوَامًا" (1) (اللہ تعالیٰ اس قرآن حکیم کے ذریعہ کچھ اقوام کو بلند اور کچھ کو پست کرتا ہے)۔

اس سارے بیان سے قرآن کے خیر مطلق ہونے کا بخوبی پتہ چل گیا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پڑھانے والا اور پڑھنے والا تو قرآن سے براہ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر خیر ہے ہی۔ اس کی اشاعت میں کسی درجہ کی مدد کرنے والا بھی اس خیر میں شامل اور برابر کا شریک ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر "کلمۂ خیر" کہنے والا بھی اس خیر میں داخل ہو گیا۔ غرض قرآن سے کسی بھی طور پر وابستگی خیر سے محروم نہیں رہنے دیتی۔ اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ خیر تو ساری قرآن پڑھنے پڑھانے والا سمیٹ کر لے گیا، باقیوں کے حصہ میں کیا رہا ایسا نہیں ہے، پڑھانے والے، جانی و مالی مدد کرنے والے، پڑھنے پڑھانے کے ذرائع قائم کرنے والے، ان کی خبر گیری کرنے والے۔ سب اسی خیر میں شامل و شریک ہیں۔ کوئی خیر سے محروم نہیں۔

حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مجلس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، علم کی گفتگو ہوتی ہے تو اس مجلس

(1) الحديث اخرجه الامام مسلم فی صحیحه، کتاب الصلوة، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه...... ولفظه: عن عمر رضی الله عنه أما ان نبیکم قدقال ان الله یرفع بهذا الکتاب اقواما ویضع بها آخرین...... ج: ۴ ص: ۲۵۲۔

کو لاکھوں کروڑوں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ مجلس کے اختتام پر جب فرشتے اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں تو ارشادِ ربانی ہوتا ہے: کہاں گئے تھے؟ اللہ تعالیٰ کا یہ سوال ناواقفی کا نہیں! کیونکہ ان کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، بلکہ بطورِ حکمت ہوتا ہے۔ ملائکہ علیہم السلام کہتے ہیں: آپ کے بندوں کی ایک مجلس میں گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس مجلس میں میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ وہ کہتے ہیں: آپ کے عذاب سے ڈر رہے تھے، آپ کی نعمتوں کے طالب تھے، جنت کے طالب اور عذابِ جہنم سے پناہ کے طالب تھے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کیا انہوں نے جنت دیکھ لی ہے، جو اس کے طالب تھے اور کیا انہوں نے جہنم کا عذاب چکھ لیا ہے، جو اس سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: انہوں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں آپ کے پیغمبروں نے جو ان کو بتایا، اس پر ایمان لا کر اور یقین کر کے یہ خواہش کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فرشتو! تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے افراد بھی شریک تھے، میں نے سب کی مغفرت کر دی، جو مانگتے تھے وہ دے دیا، جس سے پناہ چاہتے تھے، اس سے ان کو بچا لیا اور اس سے نجات دیدی۔ شرکاءِ مجلس کے لئے کتنی بڑی عجیب بشارت ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ: اے اللہ! اس مجلس میں سارے ہی تیرا ذکر کرنے والے تجھ سے انعام کی خواہش کرنے والے نہیں تھے۔ کئی تو مجمع دیکھ کر بطورِ تماشائیوں کے کناروں پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: وہ بھی اس مجلس خیر میں شریک قرار دیئے گئے، وہ بھی اس مغفرت میں داخل ہیں۔ اصل شریکِ مجلس ایسے لوگ ہیں کہ جن کے آس پاس کھڑے ہونے والا بھی محروم نہیں رہتا۔ ① تو قرآن کریم کا پڑھنا خود سراپا خیر ہے ہی، اس مجلس کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے والا بھی انشاء اللہ اس خیر سے محروم نہ رہے گا، چاہے وہاں وہ تعلیم و تعلّم کی غرض سے نہ بھی آیا ہو۔ یہ اتنی وسیع رحمت ہے کہ آس پاس والے بھی اس کے احاطہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کتنے مبارک ہیں وہ لوگ۔ جو قرآن کی تعلیم دینے اور اس کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں شب و روز منہمک و مشغول ہیں۔ اور کتنے خوش بخت ہیں وہ طالب علم۔ جو کلام اللہ پڑھنے اور سیکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مسرت کا موقع...... قرآن کی تعلیم کا آغاز و افتتاح امرِ واقع یہ ہے کہ نہایت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ ہم جتنا بھی اس پر خوش ہوں کم ہے۔ اس لئے کہ انسان کی خوشی کے دو ہی موقعے ہیں۔ ایک جب وہ کسی کام کی ابتداء یا افتتاح کرتا ہے، دوسرا جب وہ اس ابتدا کی انتہا کو پہنچتا ہے اور حصولِ مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ آپ جب کسی بچہ کو مکتب میں بٹھاتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں اور مٹھائی بانٹتے ہیں کہ زندگی کے ایک بڑے اور اچھے مقصد کی ابتدا ہو رہی ہے اور جب وہ بچہ عالم فاضل بن کر مقصد کی انتہاء پر پہنچتا ہے، تب بھی خوشیاں منائی جاتی ہیں، جلسے کیے جاتے ہیں، مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔ کوئی باغ لگاتا ہے تو خوشی مناتا ہے اور جب اس باغ

① الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل ج: ۲۰ ص: ۲۴.

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع...... تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء وانتہا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزار دی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود ومحبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، یہ غمی کی چیز کب ہوسکتی ہے غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ (1) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہارِ مسرت وخوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) (2) موت درمیانی پل ہے جو محبّ کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعث کرب ومَلال کیسے ہوسکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے وہ منقطع ہوگیا، اس سے محروم ہوگئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہر حال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہو جائے، اس کا حافظ وعالم ہو جائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

---

(1) کنز العمال، حرف المیم، ص: ۱۷۰. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: والدرھم والدینار مع المنافق وھمازا دہ الی النار... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰.

(2) لباب الحدیث للامام السیوطی، ج: ۱، ص: ۳۴. یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت وانتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صناع وکاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسبِ توقعات کامیاب گزار کر سلامتیٔ ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت تمنّائے موت...... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُ اللهِ" ② "اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنادے"۔ (اٰمِيْن ثُمَّ اٰمِيْن بِجَاهِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِيْمُ)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ③ "تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: "اِنَّا نَكْرَهُ الْمَوْتَ" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرمارہے ہیں، دعا بھی کررہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرمارہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد ومصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جسکے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

---

① پارہ ۲۸ :سورة الجمعة، الآية: ٦. ② المعجم الكبير للطبرانی، باب الحاء، شريح بن عبيد الحضرمی عن ابی مالک، ج:۳ ص: ۲۷۸. علامہ ہیثمی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفيه محمد بن اسماعيل بن عياش وهو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱۰ ص: ۳۰۹۔

③ الصحيح للبخاری، كتاب المرضیٰ، باب تمنی المريض الموت ج: ۱۷ ص: ۴۲۳، رقم: ۵۲۴۱.

سے مضامین احادیث بھی مختلف ہیں، ان میں باہم کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ غرض جس طرح ولادت خوشی کی چیز ہے، موت بھی خوشی کی چیز ہے۔

ابن قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریبِ مسرت...... تو جو بھی قرآن کریم کا آغاز کر رہے ہیں، ان کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی اور اس سے بڑھ کر اور کوئی تقریب کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کی تقریبات کا جو انداز تھا اور کون سی تقریب ان کی نظروں میں اہم تھی، اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ میرے جدِ محترم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ نے غالباً اپنی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب اس طرح کی کہ چپ چپاتے مسجد میں خود نکاح پڑھایا اور گھر آ کر لڑکے سے کہا: یہ تمہاری دلہن ہے، اسے لے جاؤ۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہیں تھا، سب حیران تھے۔ لیکن میرے والد محترم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ جب میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تو بڑی دُھوم دھام کی شاہانہ دعوت کی۔ جب سب لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے اور رخصت ہو گئے تو تنہائی میں مجھ سے فرمایا: میاں احمد! تم حافظ بھی ہو گئے، تمہاری عزت افزائی بھی ہو گئی، دعوت بھی ایسی دوبارہ نہ ہو گی۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا۔ لیکن یہ قرآن میں نے تم کو اپنے لئے پڑھایا ہے (تاکہ آخرت میں یہ میرے کام آئے) اس لئے والدِ محترم کا یہ معمول تھا کہ دو پارے روزانہ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے لئے تلاوت فرماتے تھے۔

بہر حال قرآن کریم کا آغاز بھی مبارک اور انجام بھی مبارک۔ آج افتتاح ہے۔ اس تقریب سے بڑھ کر کوئی تقریب نہیں۔ نہ اس خوشی سے بڑھ کر کوئی خوشی ہے۔ تقریبات تو شادیوں اور پیدائشوں کی بھی ہوتی ہیں، مگر اصل تقریب افتتاحِ قرآن ہی کی ہے۔ جس کا افتتاح بھی مبارک، انجام بھی مبارک، ایسے موقع و تقریب کی مبارکباد دینا بھی مبارک۔ تو ہماری حاضری آپ کو مبارکباد دینے کے لئے ہوئی ہے۔ آپ حضرات بہترین کام کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ حق تعالیٰ اس کا انجام، اس کی انتہا بھی بہترین فرمائے، جس طرح اس کا آغاز بہترین فرمایا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی برکات کا حصہ مقرر فرمائے اور آخرت میں بھی۔

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ ،وَاجْعَلْهُ لَنَا إِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ،اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَامِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَاجَهِلْنَا ، وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَاٰنَآءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رِضَاءَ قَلْبِيْ وَجِلَآءَ حُزْنِيْ ، فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ أَمْرِنَا ، وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ،غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ.وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ،بِرَحْمَتِكَ يَآأَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱) صَدَقَ اللهُ الْعَظِيْمُ.

اقسامِ نعمت...... بزرگانِ محترم! اس دنیا میں حق تعالیٰ شانہ کی نعمتیں اس درجہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ رحمتوں کی ایک بارش ہے، جیسے بارش کے قطرات کو آپ گننا چاہیں تو ساری دنیا کے انسان مل کر سعی کریں کہ آسمان سے کتنے قطرے ٹپکے ہیں۔ تو یہ آپ کے قبضے میں نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اللہ کی رحمتوں کی بارش دنیا پر ہے۔ اگر کوئی انسان گننا چاہے تو ان کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کر سکے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے دعویٰ فرمایا کہ: ﴿وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۲) اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تم انکا احاطہ نہیں کر سکتے، گن نہیں سکتے، آسمان کے ستاروں کا گننا ممکن ہے، بارش کے قطروں کا گن لینا ممکن ہے لیکن اللہ کی رحمتوں کا گن لینا، یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا جائے تو اصولی طور پر دو قسم کی نعمتیں ہیں، ان دو قسموں میں پھر کروڑوں اور اربوں نعمتیں ہیں مگر قسمیں دو ہیں۔ ایک ظاہری نعمتیں ہیں اور ایک باطنی نعمتیں ہیں۔ ایک نعمتیں وہ ہیں جن کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، ہمارے بدن کو لگ (چھو) سکتی ہیں، ایک نعمتیں وہ ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ بدن سے بظاہر انکی ٹکر بھی نہیں لگتی (چھو کر نہیں گزرتی)، لیکن عجیب نعمتیں ہیں، جن کو انسان اپنے ضمیر میں محفوظ کرتا ہے۔

ظاہری نعمت...... نعمتوں کے درجے میں سورج بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس سے روشنی چھن رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے، وہ نہ ہو تو ہم کام کاج نہیں کر سکتے، اس سے جو گرمی برس رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے، وہ نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غذائیں انسان کو اللہ نے لاکھوں دیں۔ ترکیبیں بتلا دیں کہ مختلف انداز سے جوڑ توڑ

---

(۱) پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷. (۲) پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۳۴.

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں ان کا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت ...... ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جانا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبت خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آ سکتا ہے، اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوٰۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ: یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔

امتحانِ محبّ، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے ...... اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ" ①

"تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو"۔

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔ اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آ رہی ہے، نہ اُٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آ ؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کر لیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم من الایمان، ج: ۱ ص: ۲۳.

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدا اور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آ گئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَھَا اللّٰہُ شَرَفًا وَّ کَرَامَۃً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز و اقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدا اور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آ جائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ: مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے تنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہو گا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دلا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند   زبانیاند و نانیاند وجانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگر کی

دوستی۔اس شاعر نے کہا ہے کہ تینوں کے تین ہی طریقے ہیں۔جو زبانی دوست ہیں،ان کے بارے میں کہتا ہے کہ ؎

بنانی نان بدہ از در بدر کن تلطف کن بیارانِ زبانی
ولیکن یارِ جانی را بدست آر مدارانش بگیری تاتوانی

یہ جو روٹی کے دوست ہیں،انہیں کچھ کھلا پلا دو اور اس کے بعد رخصت کرو۔ان کو دوست مت سمجھو،وہ آئے تھے،ان کو ٹکڑا مل گیا،بس ٹھیک ہے۔اور جو زبان سے کہتے ہیں کہ جناب کے دوست ہیں،تم بھی زبان سے کہہ دو جناب کا بہت بہت شکریہ! ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔نہ حقیقی معنی میں وہ دوست،نہ حقیقی معنی میں تم دوست۔وہ زبان کی بات ہے۔زبان سے وہ خوش کرنا چاہتے ہیں،تم بھی زبان سے خوش کر دو مگر اعتماد مت کرو،وہ دوست نہیں ہے۔

وہ جیسے کسی شاعر کا واقعہ ہے،وہ کسی امیر کے ہاں گئے تھے،اس نے قصیدہ لکھا اور امیر کی بڑی تعریف کی کہ آپ ایسے اور ایسے۔شاعری میں آدمی سچ کم بولتا ہے،جھوٹ زیادہ بولتا ہے۔شعر اچھا ہوتا ہی وہ ہے جس میں غلط بیانی زیادہ ہو اور جو سیدھی سیدھی بات کہہ دے،اس سے کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔تو مبالغہ اور بہت حد سے گزر کر بات کرنا،یہی ہوتا ہے۔شاعر حضرات خفا نہ ہوں،کبھی کبھی میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں،مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔تو شعر کہتے ہی اسے ہیں جس میں آدمی سچ کم بولے،جھوٹ زیادہ بولے۔تو اس شاعر نے قصیدہ لکھا،اس میں ایران توران کی ہانکی،آپ کی سلطنت تو ایسی ہے کہ آپ کے تخت کا پایہ آسمان پہ رکھا ہوا ہے اور آپ کے حسن و جمال کے آگے چاند بھی شرما رہا ہے اور ستارے بھی شرمندہ ہیں کہ ہمیں وہ حسن و جمال نصیب نہ ہوا،جو ان نواب صاحب کو نصیب ہے۔جب وہ قصیدہ پڑھ چکے،امیر نے کہا کہ: پرسوں کو آنا،دو ہزار روپیہ تمہیں (انعام) دیں گے،یہ بہت خوش ہو کر واپس ہوئے۔چونکہ بڑے آدمی نے وعدہ کیا تھا تو یقین بھی پورا تھا،آ کے پانچ سو روپے قرض بھی لے لیا اور بڑا اعمدہ اچکن بھی بنوایا،گھر میں مرغا اور بکرا بھی پک رہا ہے۔اس نے کہا پرسوں تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے،پانچ سو کا قرض ادا کر دیں گے،ڈیڑھ ہزار بچ جائے گا،بہت بڑی رقم ہو گی۔تو خوش خوش گھر میں چاندنا،کھانا اور پینا وغیرہ وغیرہ۔پرسوں وہ پہنچے،وہ امیر بیٹھے ہوئے تھے،انہوں نے جا کر سلام کیا،انہوں نے جواب بھی نہیں دیا،سرے سے گردن ہی نہ اٹھائی۔بہت دیر کھڑے رہے،آخر انہوں نے کچھ کھنکار کے کہا: حضور! میں حاضر ہوں،انہوں نے کہا: کون ہیں؟ حضرت! میں وہی شاعر ہوں جو آپ کی تعریف میں قصیدہ لکھ کے لایا تھا اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں آنا،دو ہزار دوں گا۔کہنے لگے: تم بڑے بے وقوف آدمی ہو،بھئی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا ہے،معنی کچھ نہیں تھے۔ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا معنی کچھ نہیں تھے۔نہ ان اشعار کے معنی تھے،نہ اس وعدہ کے معنی تھے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ جو زبانی جمع خرچ کے دوست ہیں آپ بھی ان کے ساتھ زبانی جمع خرچ کر دیں،مگر

اصل دوست وہ ہے جو سچا دوست ہو اور مصیبت کے وقت کام آئے۔

دوست آن باشد کہ گیرد دستِ دوست در پریشان حالی و در ماندگی

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دوست وہ ہے جو پریشان حالی میں آ کر دوست کا ہاتھ پکڑے۔ مگر ہاتھ پکڑنے کے وہ معنی نہیں، جیسے ایک صاحب نے پکڑے تھے۔ ان کے بھی ایک دوست تھے، انہیں اتفاق سے دشمنوں نے گھیر کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا، انہوں نے جلدی سے جا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے، اب وہ غریب رُکا ہوا ہے، آخر اس نے کہا کم بخت! کیا کر رہا ہے؟ میں پٹ رہا ہوں، میرے ہاتھ چھوڑ دے، میں بھی تو مقابلہ کروں، انہوں نے کہا: نہیں، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ: دوست وہ ہے جو مصیبت میں دوست کا ہاتھ پکڑے، میں نے بھی آ کے ہاتھ پکڑ لئے، اب وہ غریب اچھی طرح سے پٹ رہا ہے۔ تو یہ معنی ہاتھ پکڑنے کے نہیں ہیں، ہاتھ پکڑنے کے معنی مدد کرنے کے ہیں، کہ جب دوست پریشانی میں مبتلا ہو مدد کرے۔

تو جب دنیا کی دوستی میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ آڑے وقت میں آدمی دعوے کو سچا کر کے دکھائے کہ میں دوست ہوں تو دین کے معاملہ میں تو اور بھی زیادہ امتحان کی ضرورت ہے، جب اللہ کو یوں کہے کہ میں آپ کا دوست ہوں تو اگر حق تعالیٰ کوئی مصیبت ڈالیں، جب بھی یوں کہے کہ میں آپ کا نیازمند، غلام اور بندہ ہوں۔ تب کہا جائے گا کہ یہ سچا بندہ ہے۔ ورنہ نعمتیں برس رہی ہیں، اس میں کہے کہ میں بندہ ہوں یہ نہیں، نعمت چھن جائے اور پھر کہے کہ ویسا ہی بندہ ہوں جیسا پہلے تھا، جس حال میں آپ رکھیں میں خوش ہوں۔ تب کہا جائے گا کہ: یہ سچا بندہ ہے۔ تو محبتِ خداوندی ایک بڑی نعمت ہے، ایمان بھی نعمت، علم اور معرفت بھی نعمت، مگر یہ سب نعمتیں باطنی نعمتیں کہلاتی ہیں، جن کا قلب سے تعلق ہے۔ علم، ایمان اور محبت روٹی کی طرح سے نہیں ہیں کہ رکابی میں رکھ کر پیش کر دیئے جائیں، یہ قلبی دولت ہے۔ تو نعمت کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک مادی نعمت جو آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ ایک روحانی نعمت ہے، جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی مگر دل پہچانتا ہے کہ یہ نعمت ہے۔

اعلیٰ ترین نعمت اور حاصلِ کائنات...... ان تمام معنوی نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، جس کو اللہ نے بطور نعمت کے دنیا میں بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات بابرکات کے طفیل علم نصیب ہوا اور ایمان نصیب ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات بابرکات کی جوتیوں کے صدقے بندے کو اللہ کی محبت نصیب ہوئی، جس سے انسانوں نے اپنے خدا کو پہچانا، اپنی زندگیوں کے مقاصد کو جانا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طفیل ہے۔ اگر دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے، یہ عالم ظاہر نہ کیا جاتا، جیسے ایک حدیث میں ہے، گو وہ حدیث ضعیف ہے مگر معنی کے لحاظ سے وہ مقبول ہے۔ ابن کثیر المکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایۃ والنھایۃ'' میں یہ حدیث نکالی ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ جب ان کو پیدا کیا گیا اور ان میں روح ڈالی گئی تو سب سے پہلے ان کی نگاہ عرش کے اوپر پڑی، دیکھا کہ عرش کے پائے کے اوپر

لکھا ہوا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ.

آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ: یہ محمد رسول اللہ کون ہیں؟ فرمایا: تیری اولاد میں سے ہیں۔ میرے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر یہی ہیں۔ اور اے آدم! اگر مجھے ان کا پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا، تجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ ان کو دنیا کے اندر لانا ہے۔ ① تو ساری کائنات کا پھل درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ایک درخت لگائیں، دس برس اس کے اوپر محنت کریں، پانی دے رہے ہیں، دھوپ اور پالے سے بچا رہے ہیں پھر جا کے وہ تیار ہوا۔ کیوں آپ نے یہ درخت لگایا کیوں اس پر اتنی محنت کی، اس لئے کہ اس پر پھل آ جائے۔ اگر اس نے پھل دے دیا تو آپ کہیں گے محنت وصول ہوگئی۔ پھل نہ دیا تو کہیں گے محنت اکارت ہوگئی، ضائع ہوگئی۔ تو درخت سے مقصود پھل ہوتا ہے۔ پھل آ گیا تو سمجھو کہ درخت کے لگانے کا مقصود حاصل ہوگیا۔ یہ پوری کائنات ایک درخت ہے، اس کے مالک نے اس کو چھ ہزار برس میں بنایا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ ② ”تیرے پروردگار نے اس زمین و آسمان کی کائنات کو چھ دن میں بنایا“۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ③ ”اللہ کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے“۔ تو چھ دن میں بنانے کا یہ مطلب نکلا کہ چھ ہزار سال میں یہ کائنات تدریجی طور پر تیار ہوئی۔ اور وہ چھ دن ہفتے کے ہیں۔ یک شنبہ (اتوار) سے گویا کائنات شروع ہوئی ہے اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ ہفتہ کا دن فارغ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ دن چوبیس گھنٹے کا ہے لیکن اللہ کے ہاں یہ ایک سال کے برابر ہے۔ آخری دن جمعہ کا تھا، اس کی آخری ساعت میں جو غروبِ آفتاب کے ساتھ کا گھنٹہ ہے، آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ گویا چھ ہزار سال میں دنیا بنی اور اس میں آخری مخلوق جو ہے، وہ آدم علیہ السلام ہیں۔ اس لئے کہ آدم ہی کے لئے یہ ساری کائنات بنائی گئی، زمین، آسمان، چاند، ستارے سب اس لئے ہیں کہ آدم اس میں گزر بسر کر سکے۔ آسمان کی چھت ڈال دی، زمین کا فرش بچھا دیا، ستاروں کے قمقمے لٹکا دیئے، دریاؤں میں پانی رکھ دیا، زمین میں اُگانے کی صلاحیت رکھی، چوپائے اور جانور پیدا کیے جو انسان کے کام آئیں۔ جب مہمان کو بلاتے ہیں تو پہلے سامان سب مرتب کر دیتے ہیں، مکان، بستر، پلنگ، ملازم، کھانے کا سامان وغیرہ، تا کہ مہمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو آدم علیہ السلام کو لانا تھا، اس لئے پہلے گھر بنایا اور ساری چیزیں تیار کیں۔ جب دنیا مکمل ہوگئی تو آخیر ساعت میں آدم علیہ السلام کو لائے۔ گویا آدم ساری کائنات کا ایک شجرہ ہے۔ جیسے آپ نسب نامے کا شجرہ بناتے ہیں کہ باپ کا نام لکھا، انکے چار بیٹے، تو چار شاخیں نکلیں، پھر آگے اور شاخیں نکلیں، پھر آگے اور شاخیں نکلیں۔ اس کو نسب کا شجرہ کہتے ہیں۔ کائنات کے شجرہ

---

① البداية والنهاية لابن كثير، قال البيهقي: تفرد به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم من هذا لوجه وهو ضعيف والله اعلم ج: ١، ص: ٩١. ② پاره: ٨، سورة الاعراف، الآية: ٥٤. ③ پاره: ١٧، سورة الحج، الآية: ٤٧.

درخت کا پھل حضرت آدم ہیں۔ اور آدم کا جو شجرہ ہے اس میں آخری پھل جو مقصودِ اصلی ہے وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو ساری کائنات کا مقصودِ اصلی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نکل آئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لانا تھا اس لئے یہ سارا قصہ کیا گیا۔

مقصدِ کائنات عبدیتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے...... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں لائے گئے۔ اس واسطے کہ کائنات کو بنانے کا مقصد انسان کو لانا ہے اور انسان کا مقصد عبادت ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو یاد کرے۔ تو عبادت کے لئے یہ سارا قصہ کیا گیا، تا کہ اللہ کے آگے نیاز مندی، اس کے سامنے جھکنا اور گڑگڑانا ہو۔ اور آدم اور اس کی اولاد میں سب سے زیادہ مکمل عبادت، سب سے زیادہ اعلیٰ ترین عبادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کوئی عابد نہ پیدا ہوا اور نہ آئندہ پیدا ہوگا۔ آپ کی ذات کے اوپر مراتبِ عبادت ختم ہیں۔ بندگی اور عبودیت کی جتنی شاخیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائیں اتنی عالم میں کسی نے نہیں دکھائیں۔ یوں کہنا چاہئے: جیسے اللہ معبودیت میں وحدہٗ لاشریک ہے، معبودیت میں اس کی کوئی نظیر نہیں، وہ یکتا معبود ہے۔ عبدیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحدہ لاشریک ہیں، عبدیت میں کوئی آپ کی نظیر نہیں ہے۔ اللہ کے آگے جتنی مکمل عبدیت اور بندگی آپ نے پیش کی ہے عالم میں کسی نے نہیں پیش کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

''كَانَ يَذْكُرُ اللهَ عَلىٰ كُلِّ اَحْيَانِهٖ.'' ① ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے خالی نہیں تھا۔ ''كَانَ دَآئِمَ الْفِكْرَةِ حَزِيْنًا'' ② کوئی لحہ فارغ نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخرت کا غم طاری نہ ہو، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غم میں ڈوبا ہوا ہے اور فکر میں مبتلا ہے۔ یہ کیفیت تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے: یارسول اللہ! آپ تو وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے، تو تیں آپ کی بڑی عظیم تھیں، فرمایا: ''شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَالْوَاقِعَةُ'' ③ مجھے سورۂ ہود اور سورۂ واقعہ وغیرہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کے ہولناک مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر مجھ پر بڑھاپا طاری ہو گیا۔ تو کوئی لحہ آخرت کی فکر سے خالی نہیں تھا، کوئی لحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں تھا۔ قدم قدم کے اوپر اطاعت، ذکر اور عبادت ہے۔ تو عبادت کو جس مکمل طریق پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے پیش کیا ہے گویا وہ عبادت مقصود تھی، وہ عبادت نمایاں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے تو کائنات کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد پھر اس امت کی عبادتیں درکار ہیں، کہ یہ نبی کے نمونے پر چل کر اس نمونے کا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب تقضی الحائض ...... ج: ۲، ص: ۴.

② الشمائل للترمذی، باب کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متواصل الاحزان: ص: ۱۱۹.

③ الترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ الواقعۃ، ج: ۱۱، ص: ۱۰۶. امام ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا ہے اور علامہ البانی نے اس پر تحقیق فرما کر اس کو صحیح فرمایا ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۷ رقم: ۳۲۹۷.

پیغام دنیا کی اقوام کو پہنچا دیں۔ ورنہ مقصد تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پورا ہو گیا۔ اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ'' ① میں اور قیامت اس طرح سے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں، کہ میں ذرا آگے نکل آیا ہوں، قیامت پیچھے دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے کہ جب کائنات کا مقصد پورا ہو گیا تو اب اس کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جب درخت پھل دے کر فارغ ہو جائے اور آئندہ ایسا پھل بھی آنے والا نہیں پھر اسے کاٹ کے جلا دیتے ہیں کہ مقصد پورا ہو گیا۔ وہ پھل تھا جو ہم نے کھا لیا، تو اصل پھل آ گیا، مقصد پورا ہو گیا۔ اب کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

فرمایا کہ قیامت کی ہزاروں علامتیں ہیں۔ سب سے پہلی علامت دنیا میں میرا آنا ہے۔ سمجھو کہ دنیا کے خاتمے کا وقت قریب ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے برپا کرنے کا مقصد میرے آنے سے پورا ہو گیا۔ اب جب مقصد آ گیا تو اب دنیا کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دنیا اس لئے باقی رہے گی کہ میرا پیغام پوری دنیا تک پہنچ جائے۔ اور امت نمونہ بن کر دکھلائے کہ یہ ہے عبادت کا نمونہ، جس کے لئے دنیا قائم کی گئی۔ تو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سب سے بڑی نعمت ہے اور نعمتوں کی جڑ و بنیاد ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالَم کے لئے رحمت ہیں۔ پوری دنیا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا سبق دیا۔

اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے...... بعض غیر مسلموں نے یہاں مجھ سے سوال کیا کہ اسلام نے ہمیں نئی چیز کیا دی، جو ہم اسلام قبول کریں۔ ہم تو اپنے اپنے مذہب پر چل رہے ہیں۔ میں نے کہا: اسلام کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا، جو کل انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، وہی دین، اسلام لے کر آیا ہے۔ یہی اسلام ہے جو سارے انبیاء کا مذہب اور دین رہا ہے۔ یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی لے کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام انبیاء کا دین اسلام بتلایا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، ایک جگہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ' کہا میں مسلم بن گیا، فرمایا: اگر بن گئے ہو تو اعلان کرو: ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ''اے ابراہیم کہہ دو! میری نماز اور میرا حج، میرا مرنا اور جینا سب اللہ کے لئے ہے۔ مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے اور میں (آج کے دور میں) اول مسلم ہوں''۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف اسلام منسوب کیا گیا کہ وہ بھی مسلم تھے اور اسلام ہی لے کر دنیا میں تشریف لائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ ③ ''اے میرے پروردگار! مجھے مسلم بنا کر وفات دیجیے کہ مرتے دم تک میں اسلام پہ قائم رہوں''۔ یوسف علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہی ثابت ہوا۔ ابراہیم علیہ

① الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب بعثت انا والساعة.....، ج: ۲، ص: ۱۵۹.

② پاره: ۱، سورة البقرة، الآية: ۱۳۱. ③ پاره: ۱۳، سورة يوسف، الآية: ۱۰۱.

السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، فرمایا: ﴿وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ① کہ اے بیٹو! تمہارے لئے اللہ نے ایک دین پسند اور منتخب کیا ہے، سو تم مرنا بھی تو اسلام ہی کے اوپر مرنا، یہی تمہارا دین ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا دین بھی اسلام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا دین بھی اسلام ہے، جو خود قرآن نے نقل کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا کہ: ﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ② اے مسیح! آپ گواہ رہیں، ہم سب مسلمان ہیں۔ تو دین عیسوی بھی اسلام ہے۔ سلیمان علیہ السلام پر بلقیس جیسی ملکہ ایمان لائی تو کہتی ہے: ﴿اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ③ میں اس سے پہلے گناہگار تھی مگر اب میں اسلام لاتی ہوں سلیمان کے ہاتھ پر۔ تو سلیمان علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہے۔ غرض کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہے جس کی طرف اسلام منسوب نہیں کیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسلام لے کر آئے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ④ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ تو میں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے، جو سارے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے وہی دین ہے۔ نئی چیز کیا ہے؟

تکمیلِ دین ایک مستقل نعمت ہے...... ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ ⑤ میں نے دین کو مکمل نقشے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تو دین نیا نہیں ہے بلکہ تکمیل دین ہے کہ دین کے ہر ہر جز، ہر ہر اصول وفروع کو آپ نے اتنا مکمل کر دیا ہے کہ اب اس میں کمی زیادتی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ گویا دین، اسلام ہی چل رہا تھا، شریعتیں آ رہی تھیں۔ اس میں اضافے ہو رہے تھے، کمی بھی ہو رہی تھی، احکام منسوخ بھی ہوتے تھے، نئی نبوت آ کر نیا پروگرام دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پروگرام دیا وہ اتنا مکمل ہے کہ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ تو یہ تکمیل دین ہے، دین نیا لے کر نہیں آئے، دین وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے، شریعت مکمل لے کر آئے، جو پروگرام کہلاتا ہے، وہ نیا اور مکمل لے کر آئے۔ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جب کوئی بچہ پیدا ہو آپ اسے جو کُرتہ پہنائیں گے، وہ بالشت بھر کا ہوگا لیکن اس کے بعد جب وہ چھ مہینے کا ہوگا تو کرتہ ڈیڑھ بالشت کا ہوگا، اس کے بعد جب وہ آٹھ برس کا ہوا تو گز بھر کا کرتہ پہنے گا۔ بچہ تو وہی ہے بعینہٖ، جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، آٹھ برس پہلے بھی وہی تھا، چار برس پہلے بھی وہی تھا۔ کرتے بدل رہے ہیں، اس کی پیمائش بڑھ رہی ہے۔ بچہ وہی ہے۔ پھر چودہ برس کا ہوا تو سوا گز کا کرتہ ہو گیا اور جب تیس برس کا جوان ہو گیا جو نشو ونما کا انتہائی وقت ہے، اس وقت کرتے کی پیمائش بالکل آخری اور مکمل ہو گئی۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۲۔ ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۲۔ ③ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۴۴۔
④ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۔ ⑤ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳۔

اب گھٹنے بڑھنے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اب گھٹنا بڑھنا ختم ہوگیا۔ جتنا قد و قامت ہونا تھا، وہ ہوگیا، اب جو کرتے کی پیائش ہے، وہ مرتے دم تک ایک ہی رہے گی۔ اس میں اب کمی بیشی نہیں ہوگی۔

تو دین کو ایک بچے کی مانند سمجھو۔ آدم علیہ السلام جو دین لے کر آئے وہ یہی اسلام تھا، لیکن اس وقت یہ چھوٹا سا تھا، پیدا ہوا ہی تھا، اس کے لئے شریعت بھی چھوٹی رکھی گئی، بالشت بھر کا کرتہ اس کے لئے کافی تھا۔ عارضی طور پر وہ اس کے بدن کے اوپر پھب گیا۔ جوں جوں اسلام کا قد و قامت بڑھتا گیا شریعتیں یعنی کرتے بھی بڑھتے رہے۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے کی شریعت بہت مختصر اور معمولی سی تھی۔ حدیث میں ہے کہ ایک وقت کی نماز تھی اور وہ بھی مکمل صورت نہیں تھی، جو اب اسلام میں ہے۔ بس اللہ کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جاؤ، نیاز مندی سے کھڑے ہو جاؤ، یا اوندھے منہ لیٹ جاؤ، یہ کافی ہے۔ یہ قیام، رکوع، تشہد، قومہ، جلسہ اور یہ سجدہ، یہ چیزیں آدم علیہ السلام کی شریعت میں نہیں تھیں۔ جیسا دینِ اسلام تھا چھوٹا سا تھا، پیدائش ہی ابھی ہوئی تھی، ویسی ہی شریعت تھی۔ گویا لباس بھی اس کا چھوٹا تھا۔ جب اسلام کا قد و قامت بڑھا اور ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، شریعت بھی ذرا پھیل گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، دین کا قد و قامت بڑھا تو شریعت کا لباس بھی وسیع ہوا اور فرمایا: ﴿وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ﴾ ہم نے دین کے اندر بہت تفصیل کر دی۔ اور جب آخری زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آیا تو دین کا نشو و نما مکمل ہو کر جوان ہو گیا۔ اب جو شریعت کی پیائش ہے اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔ یہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے جب کوئی تعلیم پائے اور دوسری شریعتوں کا شریعت اسلام سے موازنہ کرے، بالکل زمین و آسمان کا بیّن فرق معلوم ہوتا ہے کہ اور شریعتوں کے احکام معلوم ہوتے ہیں جیسے بچے ہیں اور شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جوان ہیں کہ ان کا قد و قامت مکمل ہے۔

توحید کی تکمیل...... بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شریعت پیش فرمائی وہ دین کی تکمیل ہے، دین وہی ہے جو پہلے سے تھا مگر اس میں کمال پیدا ہو گیا۔ یعنی مثلاً توحید ہے، ہر نبی نے توحید کا عقیدہ سکھلایا، کسی نبی نے شرک کی تعلیم نہیں دی، سب نے یہی کہا کہ اللہ کو ایک جانو! لیکن توحید کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کو ایک جانو! اس کی ذات کو یکتا، اس کی شان یکتا، افعال یکتا، اس کو صفات و افعال کے لحاظ سے بھی یکتا جانو۔ ہر ہر چیز میں اسے یکتا سمجھنا چاہیے۔ جب اس کی ساری شانوں میں یکتائی ہے تو اتنے ہی حقوق قائم ہوں گے، پھر عبادتیں بھی اتنی ہی ہوں گی کہ قلب سے یوں عبادت کرو، زبان سے یوں عبادت کرو، قالب سے یوں عبادت کرو، اس لئے کہ جب اس کے حقوق بہت ہیں، اس کی شانیں بے حد ہیں، اس کے سامنے نیاز مندی کے سارے طریقے بھی مکمل ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام نے شرک سے روکا اور منع کیا لیکن اسلام نے فقط شرک سے نہیں روکا بلکہ شرک کے اسباب سے بھی روک دیا کہ وہ بھی منع ہیں، جن اسباب سے شرک کے پیدا ہونے کا وہم بھی ہو سکتا تھا، ان کو بھی رد کر دیا، جہاں شرک کا وہم بھی ہو سکتا تھا، اس وہم کو بھی ختم کیا۔

اسبابِ شرک کو بھی شریعتِ محمدی میں قطع کر دیا گیا...... حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طواف کر رہے تھے اور مطاف کے اندر ہزاروں آدمی طواف میں مشغول تھے۔ جو لوگ حج کر کے آئے ہیں انہیں معلوم ہے، بیت اللہ کے اردگرد سات پھیرے کئے جاتے ہیں۔ اس کو طواف کہتے ہیں۔ حجرِ اسود جنت کا ایک پتھر ہے، اس کو چوم کر پھیرا شروع کیا جاتا ہے اور اسی پر آ کر ختم کیا جاتا ہے، ہر پھیرے پر اس کی تقبیل کرتے ہیں (چومتے ہیں)۔ تو لوگ دوڑ رہے تھے، حجرِ اسود کے اوپر جھک رہے تھے اور عوام الناس حجرِ اسود پر زیادہ جھکتے ہیں۔ چاہے طواف ملے نہ ملے مگر اس کو چوما مل جائے۔ اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ لڑائی تک کی نوبت آتی ہے۔ تو لوگ ہجوم کر رہے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ بالکل ایسی حالت ہوگئی ہے، جیسے حجرِ اسود کی پوجا اور عبادت کر رہے ہوں۔ بس وہیں کھڑے ہو کر للکارا، ایک دم طواف رک گیا اور حجرِ اسود کو خطاب کیا، فرمایا: ''إِنِّیْ أَعْلَمُ أَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ ، لَوْ لَا اَنِّیْ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَبَّلَکَ مَا قَبَّلْتُکَ'' (1)

''میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے، نہ تجھ میں نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے چوما ہے تو میں کبھی تجھے نہ چومتا'' ہمارا نفع نقصان قطعاً تیرے قبضے میں نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے، مطلب یہ کہ اتباعِ سنت کے لئے چوم رہا ہوں، عبادت کے لئے نہیں۔ لوگوں کے خیالات درست ہو گئے۔ جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے یا سمجھنے کا اندیشہ تھا کہ شاید اسی پتھر کی عبادت مقصود ہو تو پھر بت پرستی اور خدا پرستی میں فرق کیا رہتا۔ چنانچہ اس طرز کو رد کر دیا۔ تو اتنے اتنے احتمالات کے اوپر اسلام نے روک ٹوک کی ہے۔ شرک تو بجائے خود شرک ہے، شرک کا وہم بھی پیدا ہو، اس کو بھی رد کرنے کی کوشش کی ہے۔

سترہ سامنے رکھنے میں شرک سے بچنے کی احتیاط...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ میدان میں نماز پڑھی، تو مسئلہ آپ کو معلوم ہے کہ سترہ سامنے رکھ لیتے ہیں، کوئی لاٹھی کھڑی کر لی، کوئی پتھر کھڑا کر لیا تا کہ آنے جانے والے نمازی کے سامنے نہ آئیں بلکہ اس کی وجہ سے باہر باہر سے چلے جائیں۔ مقصد یہ کہ نمازی کے آگے سے جو گزرے گا تو وہ جو بندے اور خدا کے درمیان رابطہ ہے وہ قطع ہو جاتا ہے، تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سترہ کھڑا کر لیا اور جانے والا سترہ سے باہر چلا گیا، اب قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے سنت طریقہ یہ ہے کہ کوئی سُترہ رکھ لو، لاٹھی رکھ لو یا پتھر رکھ لو۔ تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی سامنے سُترہ رکھا، ایک پتھر کھڑا کر لیا لیکن پتھر دائیں مونڈھے کے سامنے کھڑا کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ دائیں مونڈھے کے سامنے یا بائیں مونڈھے کے سامنے پتھر رکھو، بالکل ناک کے سامنے مت رکھو، فرمایا: ناک کی سیدھ میں رکھو گے تو کسی کو وہم ہوگا کہ کہیں پتھر کی تو عبادت نہیں کی جا رہی، اس وہم سے بھی بچو۔

تو یہاں پر اسبابِ شرک کو بھی رد کیا ہے، فقط شرک ہی کو رد نہیں کیا۔ ورنہ ظاہر ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب ماذکر فی الحجر الاسود، ج:۶ ص:۱۵۔

جو نماز پڑھ رہے تھے، ان کے قلب میں تو شرک کا وہم بھی نہیں تھا، جلیل القدر صحابی ہیں، ان سے زیادہ متبع سنت کون ہے یہ احتمال بھی نہیں ہوسکتا کہ معاذ اللہ! عبداللہ بن عمرؓ کے قلب میں کوئی شرک کا وہم تھا۔ لیکن صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہی، ناک کی سیدھ میں پتھر رکھنے سے شرک کی صورت بنتی تھی، اس صورت کو ختم کر دیا۔ تو بعید سے بعید احتمالات کو بھی قطع کر دیا کہ کسی طرح شرک قلب کے اندر گنجائش نہ پانے پائے، قلب اس سے بری رہے۔

بعض شرک چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ مدہم ہوتے ہیں...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اَلشِّرْکُ اَخْفٰی فِیْ اُمَّتِیْ مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ.'' ① اتنا باریک باریک شرک ہے جیسے ایک چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی کے چلنے کی آہٹ ہے۔ تو اس کے چلنے کی آواز نہیں آتی، اتنی باریک آواز ہوتی ہے کہ آپ اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ فرمایا: جتنی وہ باریک چلتی ہے شرک کی اس سے بھی زیادہ باریک چال ہے۔ بعض دفعہ آدمی شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ میں شرک میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مثلاً فرمایا: اگر کوئی شخص نماز پڑھنے لگے اور دل میں یہ جذبہ ہو کہ لوگ یوں سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے، تو فرمایا: ''اِنَّ الرِّیَاءَ شِرْکٌ'' ② ریاء خود شرک ہے۔ یہ خدا کی نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ بندے کی نماز پڑھ رہا ہے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لئے تاکہ یہ مجھے عبادت گزار سمجھیں۔ اب ریاء اور دکھلاوا کرنے والا ذہن میں تصور نہیں کرتا میں شرک کر رہا ہوں۔ اپنے نزدیک تو وہ خدا کی عبادت کر رہا ہے مگر حقیقتاً وہ خدا کی عبادت نہیں وہ تو دیکھنے والوں کی عبادت ہو رہی ہے، جن کو وہ دکھلا رہا ہے۔ تو ریاء بھی ایک شرک ہے مگر یہ ظاہری اور کھلا ہوا شرک نہیں۔

اور ایک شرک اس سے بھی زیادہ باریک ہے یعنی کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو اور پھر بھی شرک پیدا ہو جائے، اس کو عُجب کہتے ہیں۔ یعنی آدمی تنہا عبادت کر رہا ہے، دل میں غرور ہے کہ میں ایسی عبادت کر رہا ہوں کہ آج تک کسی نے نہیں کی۔ گویا میں ہی دنیا میں ایسی عبادت کرنے کو پیدا ہوا ہوں، فرمایا یہ بھی شرک ہے۔ یہ اپنے نفس کے لئے عبادت کر رہا ہے، خدا کے لئے نہیں۔ اس کے نفس میں غرور اور پندار پیدا ہو رہی ہے اور اپنے نفس میں بڑائیاں مار رہا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، اتنی بڑی عبادت کی۔ جب یہ خود خدا کے سامنے کھڑا ہو کے بڑا بننے لگا تو اُس کی بڑائی کا تو انکار کر دیا، اپنے نفس کو اُس کی بڑائی کی جگہ دے دی۔ یہ بھی شرک پیدا ہوا۔ اس تک کو اسلام نے قطع کیا ہے کہ جب تنہا کھڑا ہو تو عُجب اور خود بینی نہ ہو کہ اپنے کو دیکھ کر نماز پڑھے۔ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو تو لوگوں کے دکھلاوے کے لئے نہ پڑھے کہ وہ بھی شرک ہے۔ اگر ضرورت ہو تو سُترہ رکھو، اس کو بھی ایسے انداز سے

① المسند للامام احمد، احادیث ابی موسٰی الأشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ص: ۹۸. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ ابویعلی من روایة لیث بن ابی مسلم عن ابی محمد عن حذیفة ولیث مدلس وابو محمد ان کان هوالذی روی عن ابن مسعودؓ اوالذی رویٰ عن عثمان بن عفان فقد وثقه ابن حبان وان کان غیرهما فلم اعرفه، وبقیة رجاله رجال الصحیح دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۲۲۴. ② السنن للترمذی، ابواب النذور والایمان، باب ماجاء فی کراهیة الحلف...... ج: ۶، ص: ۱۳. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف الترمذی للالبانی ج: ۴ ض: ۳۵ رقم: ۱۵۳۵.

مت رکھو کہ وہاں شرک کی صورت بھی بن جائے، تو شرک کی صورت بھی درست نہیں، حقیقی شرک تو کیا درست ہوتا اور مذاہب نے بھی شرک کو رد کیا ہے مگر دور دور کے اسباب کو رد نہیں کیا۔ اسلام نے ان کو بھی رد کیا تاکہ توحید مکمل ہو کر دنیا کے سامنے آئے۔ وحدانیت کی تکمیل اسلام (یعنی شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) نے پیش کی ہے۔ صرف توحید پیش نہیں کی، توحید تو پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی پیش کر گئے، مگر اس توحید کو اتنا مکمل بنا دیا کہ ظاہر اور باطن میں شرک کی کچھ گنجائش باقی نہیں رہی۔

بت پرستی کی ابتداء...... اس مذہب میں تصویر حرام کی گئی کہ اس سے شرک کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تصویر ہی سے شرک کی ابتداء ہوئی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں پہلے شرک پیدا ہوا ہے۔ ان کی قوم میں پانچ بزرگ تھے، جب ان کا انتقال ہوا، قوم نے ان کے بت بنا کے عبادت گاہوں میں رکھ دیئے تھے کہ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کے ہمیں خدا یاد آئے گا، جیسے ان کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آتا تھا۔ پہلی نسل تو ان کو دیکھ کر خدا کو یاد کرتی رہی، ان کی عبادت انہوں نے نہیں کی، مگر جب دوسری نسل آئی، ان کے دلوں میں وہ علم و معرفت نہیں تھا، جو ان کے بڑوں میں تھا کچھ تعظیم انہوں نے مورتیوں کی شروع کی جو عبادت گاہوں میں رکھی ہوئی تھیں، کچھ خدا کی طرف جھکے۔ اب جب تیسری نسل آئی تو خدا کو تو بھول گئے اور ساری عبادت ان بتوں ہی کے لئے رہ گئی۔ یہیں سے شرک کا قصہ چلا۔ تو شرک کی ابتداء انہیں چیزوں سے ہوئی ہے۔ ابتداء میں تصویر رکھ لی گئی پھر وہ شرک کا ذریعہ بن گئی۔

اسی طرح سے دنیا کی قومیں بہکتی ہیں کہ کسی بزرگ نے غلبۂ حال میں کسی کام پر عمل کرلیا۔ بعد والوں نے اسے قانون بنا کر اسی پر عمل کرنا شروع کر دیا اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ تو انکے بزرگوں نے تصویر یاد دہانی کے لئے رکھی تھی، عبادت کے لئے نہیں۔ مگر بعد والوں نے ان کی صورت کو اختیار کرلیا کہ وہ بتوں کے آگے جھک رہے تھے۔ لہٰذا ہم بھی جھکیں۔ یہی صورتیں ہوتی ہیں اور اس طرح کہیں درختوں کی پوجا شروع ہو جاتی ہے، کسی بزرگ نے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کے عبادت کی ہوگی۔ اس کے ماننے والے معتقدین نے اس درخت کی عظمت شروع کی۔ انہوں نے فقط تعظیم کی، ان کے بعد والوں نے اس کو پوجنا شروع کر دیا۔ آج ہندوؤں میں پیپل کا درخت واجب العبادت ہے، اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ ان کا کوئی بزرگ پیپل کے درخت کے نیچے عبادت کرنے بیٹھا ہوگا۔ انہوں نے پیپل ہی کی عبادت شروع کر دی، وہی معبود بن گیا۔

حضرت عمر کا شجرۂ حدیبیہ کو کٹوانا...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس چیز کو سمجھا۔ حدیبیہ کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بیعتِ جہاد کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی، وہ وقت ختم ہو گیا۔ یہ واقعی اثر کی بات ہے کہ بزرگ اور اہل اللہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں، وہاں بھی برکت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو سید الاولین والآخرین کسی جگہ بیٹھیں اور وہاں برکت نہ ہو یہ ناممکن تھا۔ اس درخت کے اندر برکت پیدا ہوئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ شروع

کیا کہ جب ادھر سے گزرتے تو تبرکاً اس درخت کے نیچے دو رکعت نفل پڑھ کر جاتے۔ اگر نماز کا وقت نہ ہوا یا وقت مکروہ تھا تو کم سے کم وہاں بیٹھ کے کچھ تسبیح وتہلیل ہی کر لیتے، کہ برکت حاصل ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ آج تو یہ صحابہ ہیں، یہ تو عارفین ہیں، اللہ اور رسول کی پہچان ہے، یہ محض تبرکاً یہاں بیٹھتے ہیں، درخت کی پوجا کرنے نہیں بیٹھتے لیکن آئندہ نسلیں جو آنے والی ہیں، کیا خبر ہے، ان کے دل میں علم ومعرفت نہ ہو اور وہ اس درخت کی عظمت سمجھ کے اسی کی پوجا کریں۔ حکم دیا کہ: اس درخت کو کاٹ دو، درخت کٹوا دیا۔ صحابۂ کرام کو ناگوار ہوا کہ ایک بابرکت درخت کٹوا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تمہارے نزدیک بابرکت ہے۔ بعد والوں کے نزدیک یہی عبادت کا ذریعہ بنے گا اور کیکر کا درخت معبود بن جائے گا، پوجا شروع ہو جائے گی۔

دنیا کی اقوام اسی طرح سے بہکی ہیں، کہیں درخت معبود بنا، وہ اسی طرح سے کہ بزرگ نے وہاں برکت حاصل کرنے کے لئے قیام کیا۔ معتقدین ومتوسلین نے نیک نیتی سے اس چیز کی عظمت سے فائدہ اٹھایا۔ بعد والوں میں نہ وہ نیکی رہی، نہ وہ نیت رہی، انہوں نے اس چیز کو معبود بنالیا۔ یہیں سے شرک کی ابتداء ہوگئی۔

مولانا یعقوب نانوتوی اور گنگا جل کی حقیقت...... ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ جو عارفِ کامل، صاحبِ کشف وکرامت بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ تو مولانا کے مزاج میں کچھ مجذوبیت سی تھی۔ جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ آدھے باؤلے سے، آدھے عقلمند سے۔ اس طرح سے ایک جذب کا مادہ تھا، آنکھیں سرخ رہتی تھیں اور ایک کیفیت طاری۔ جس چیز کی لٹک لگ گئی وہ لگ جاتی تھی۔ ایک دن بیٹھے تھے یہ چیز ذہن میں آ گئی کہ اس کی تحقیق کرنی چاہئے کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے۔ ہندوستان میں یہ بڑا دریا ہے، ہندو گنگا کی پوجا کرتے ہیں، اس کے پانی کو بڑا باعظمت جانتے ہیں، اس کو سامنے رکھ کر پوجا کرتے ہیں، اس کی بڑی عظمت ان کے دلوں میں ہے، اس کو گنگا مائی کہتے ہیں کہ یہ ہماری ماں اور اصل ہے۔ جب وہ پانی لے کر گنگا سے چلتے ہیں جب تک پانی کندھے پر رہتا ہے تو جوتا نہیں پہنتے، زمین پہ بیٹھتے نہیں، کھڑے کھڑے اس کو لاتے ہیں۔ اتنی عظمت کرتے ہیں۔ تو مولانا مرحوم کے دل میں یہ ایک جذبہ پیدا ہوا کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے اور اس کے نکلنے کا کیا سبب ہوا ہے حالانکہ اس کی تحقیق ایک غیر ضروری بات تھی، مگر ایک لٹک لگ گئی تو رات کے بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کے گنگا کی تحقیق کے لئے روانہ ہو گئے۔

دیوبند سے گنگا چالیس میل کے فاصلے پر بہتی ہے، چالیس میل کے سفر کے ارادہ سے رات کو بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ صبح کو جب مولانا درس میں نہ آئے تو سارے دارالعلوم میں ڈھونڈ پڑی کہ مولانا کہاں! مولانا کا کہیں پتہ نہیں، طلبہ پریشان، مدرسین پریشان کہ ہمارا صدر مدرس کہاں گیا۔ آدمی بھیجے گئے، کسی کو نانوتے، کسی کو گنگوہ، مولانا کا کہیں پتہ نہیں۔ لوگ سب حیران بعضے تو رو پڑے کہ خدا جانے کیا گزری اور مولانا گنگا کی طرف سفر کر رہے ہیں، پورا ایک دن رات لگا، پورے چوبیس گھنٹے کا پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا

گاؤں ہے، جس کا نام گنگوتری ہے۔ اسی مناسبت سے گنگا اس کو کہتے ہیں۔ تو اس گاؤں میں پہنچے، جہاں سے یہ دریا نکل رہا ہے اور چشمہ ہے۔ وہاں مولانا نے سات دن قیام کیا، نماز میں اور تلاوت میں سات دن لگے رہے، رات دن کامل عبادت کی۔ چونکہ خود بھی بزرگ تھے تو حال منکشف ہوا کہ گنگا کیوں نکلی! کیا بات ہوئی۔

فرمایا: مجھ پر منکشف ہوا کہ جہاں سے گنگا نکلی ہے یہاں یا تو کسی نبی کی قبر ہے یا کسی نبی کے بیٹھنے کی جگہ ہے، اس برکت کے آثار ہیں، اس لئے چشمہ نکلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی قوم مبتلا ہے۔ تو گنگا کا چشمہ کسی پیغمبر کی دعا سے نکلا ہوگا، اس میں کچھ برکت کے آثار آ گئے۔ لیکن قوم نے جہالت سے اس پانی کو معبود سمجھ لیا۔ ابتداء میں اس کی تعظیم و وقعت کی ہوگی اور جب علم و معرفت دل میں باقی نہ رہا وہی معبود بن گیا، قابل پوجا بن گیا۔ اسی کے سامنے سجدے شروع ہو گئے۔ یہ امتِ مسلمہ پر اللہ کا رحم ہے کہ وہی نوعیت مکہ مکرمہ میں آبِ زمزم کی ہے، جو ہندو گنگا کی سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ کا فضل ہے آج تک آبِ زمزم کی پرستش کسی نے نہیں کی، نہ پوجا کی، نہ زمزم سامنے رکھ کر کسی نے سجدے کئے، عظمت و توقیر کرتے ہیں۔ شرعاً حکم ہے کہ پانی بیٹھ کر پیو، مگر یہ پانی تبرکاً کھڑے ہو کر پیو، یہ سب کچھ ہے۔ لیکن یہ کہ اس سے مسلمان مرادیں مانگتے ہوں، اے زمزم! ہمیں بیٹا دے۔ یا اے زمزم! روٹی دے، یہ کوئی نہیں کرتا، معبود نہیں جانتے۔ یہ محض اللہ کا اس امت کے اوپر فضل ہے، اس امت میں بھی برکت کی چیزیں آئی ہیں مگر پوجا اور عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات کو سمجھتے ہیں۔ غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے۔

وہ کیوں! اس لئے کہ اسلام نے نہ صرف شرک سے روک دیا، بلکہ شرک کے دور دور کے اسباب کو بھی قطع کر دیا ہے کہ شرک پیدا نہ ہونے پائے۔ اس لئے یہ امت کامل توحید پر قائم ہے۔ اگر اسلام اسبابِ شرک کو نہ روکتا تو ہم بھی انہیں چیزوں میں مبتلا ہوتے جس میں دوسری اقوام مبتلا ہوئیں، ہر درخت کو پوجتے، ہر پانی کو پوجتے، ہر پتھر کے آگے جھکتے۔ اور جہاں کچھ طبقات میں جہالت ہے وہ اب بھی ایسا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ لیکن مجموعی طور پر امت الحمدللہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ لوگ نادانی اور جہل کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر اصل دین جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے ہیں، وہ موجود ہے۔ وہ قیامت تک رہے گا۔ اصل دین میں فرق نہیں آئے گا۔ یہ اس کی برکت ہے کہ اسلام نے توحید کو لیا، شرک کو رد کیا اور شرک کے دور دور کے اسباب تک کو رد کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے سے ہی روک تھام شروع ہوگئی تھی۔

فاروقِ اعظم کے زمانہ میں ایک پیغمبر کی قبر سے پیشن گوئی کی کتاب کا نکلنا...... حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ دمشق میں ایک پیغمبر کی قبر تھی، وہ اتفاق سے کھلی، پانی برسنے سے یا کسی اور وجہ سے، اس میں سے ایک کتاب نکل آئی۔ اس کتاب میں کچھ قواعد ایسے لکھے ہوئے تھے کہ آئندہ کی کچھ خبریں اس سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ کسی آدمی نے اس کو پڑھ کر بتلایا کہ کل کو یوں ہوگا، پرسوں یوں ہوگا۔ اس سے لوگوں کے اندر فتنہ پھیلنا شروع ہوا اور اس شخص نے دعویٰ کر دیا کہ میں خود پیغمبر ہوں۔ دیکھو میں تین دن کے بعد کی بات بتا رہا ہوں کہ یہ

ہو گا، ہفتہ بعد یوں ہو گا۔اس کتاب سے دیکھ دیکھ کے اس قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔لوگوں میں فتنہ پھیلا۔فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع دی گئی تو مدینہ طیبہ سے مستقل شام کا سفر فرمایا اور بیت المقدس پہنچے۔اس شخص کو بلوایا گیا، کتاب اس سے لی گئی،اس کتاب میں کچھ قواعد کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں' وہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، وہ قیاسی ہوتی ہیں، جیسے ایک طبیب طب کے لحاظ سے پیشین گوئی کرے کہ فلاں مریض تین دن میں مرجائے گا، یہ کوئی غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو، قیاسی چیز ہے، ہو بھی سکتی ہے، نہیں بھی۔

بہت سے لوگ سیاسی پیشین گوئیاں کیا کرتے ہیں کہ دو برس کے بعد فلاں حکومت کا یہ حشر ہونے والا ہے۔وہ اپنے تجربات اور سیاسی قواعد سے پیشین گوئی کرتے ہیں۔وہ غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس کا یقین کرنا اور اس کا عقیدہ بنانا ضروری ہو۔ہر صاحبِ فن اپنے فن کے لحاظ سے کچھ پیشین گوئیاں کر دیتا ہے۔اسی طرح سے علماء نے کچھ قواعد لکھے ہیں،ان کے ذریعے سے بعد کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں، کچھ مستقبل کی چیزوں کا پتہ چل سکتا ہے۔اسلام نے ان چیزوں سے اس لئے روک دیا ہے کہ یہ قیاسی چیزیں ہیں، قطعی نہیں۔ان پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو جائے' ہو سکتا ہے اس کے خلاف ہو۔مؤمن کا کام یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھے۔جو خبر اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی ہے یقینی ہے باقی اور کوئی چیز قطعی اور یقینی نہیں ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ کتاب پیش کی گئی۔فرمایا: جہاں یہ قبر کھلی ہے وہاں گیارہ قبریں کھدوائی جائیں۔گیارہ قبریں کھدوادی گئیں اور اعلان کیا کہ جن پیغمبر کی نعش مبارک ظاہر ہوئی ہے اور وہ اوپر آ گئی ہے، ان کو دفن کیا جائے گا۔چنانچہ وہ قبر جو تھی اس میں سے نعش نکالی گئی اور رات کو جب تمام سو گئے تو کسی قبر میں دفن کر دیا اور کتاب بھی ان کے ساتھ دفن کر دی، اوپر سے ساری زمین برابر کر دی گئی۔لوگوں کو اب یہ پتہ نہیں چلا کہ کون سی قبر میں وہ کتاب دفن کی گئی ہے۔وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔یہ اس لئے پیش بندی کر دی کہ اگر وہ کتاب رہ جاتی تو لوگ اس سے فتنہ پھیلاتے،اس سے پیشین گوئیاں کرتے کہ ہم نبی ہیں، ہم پر الہام ہوا ہے، اس سے ختم نبوت کا انکار ہوتا۔تو دور سے پیش بندی کر کے اس سلسلہ ہی کو قطع کر دیا کہ لوگ پہنچنے ہی نہ پائیں۔بہر حال اس قسم کے اسباب کو رد کرنا، یہ اسلام نے توحید کی تکمیل کے لئے کیا ہے، تا کہ توحید مکمل ہو کے دلوں کے اندر آئے۔

اسبابِ معاصی بھی حرام ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ایسی تعظیم سے بھی روکا جس سے شرک کا واہمہ بھی پیدا ہو۔جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ جب سلام کرو تو جھک کے مت کرو۔مسلمانوں کا سلام ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ'' ہے۔یہ جھکنا جھکانا نہیں ہے، تھوڑا سا کوئی جھک جائے تو مضائقہ نہیں۔لیکن اگر اتنا جھک گیا کہ رکوع کی شکل پیدا ہو گئی تو اس شخص کو سزا دی جائے گی کہ اس نے عبادت کی شکل پیدا کر دی، حالانکہ انسان کے لئے عبادت نہیں رکھی گئی۔تو سلام میں رکوع کی شکل پیدا ہو جانا، یہ مکروہ تحریمی ہے،اس سے شرک کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔یہاں تک پیش بندی کی اور دور تک اسباب کو قطع کیا۔اسی طرح سے معاصی اور زنا میں بھی کیا گیا ہے

کہ زنا سے روکنا مقصود ہے لیکن اس کے روکنے کے لئے جو اسباب زنا تھے، ان کو بھی حرام قرار دیا۔ اجنبی عورت پر ارادے سے نگاہ ڈالنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ اس کو ہاتھ لگانا، یہ بھی ممنوع، اس کی آہٹ پر چلنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ حالانکہ اصل میں عورت کو دیکھنا کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، یہ بری بات نہیں ہے۔ برا فعل وہ ہے جس کو زنا کہتے ہیں۔ مگر چونکہ بسا اوقات یہ اصل فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے اس سے بھی روک دیا۔ فرمایا: عورت خوشبو لگا کر سڑک کے اوپر نہ نکلے۔ اس لئے کہ خوشبو ایک دعوت ہے کہ مجھے دیکھیں، خوشبو جب ناک میں پہنچے گی، لوگوں کی توجہات منعطف ہوں گی۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کی مثال زانیہ کی ہے، گویا زنا کر رہی ہے کہ زنا کی دعوت لوگوں کو دے رہی ہے، اس حد تک روک دیا گیا۔ تو باہر نکلنا یا خوشبو لگا کے نکلنا یا ایسے زیورات پہن کے نکلنا، جس کی آواز دوسروں کے کانوں تک پہنچے، ان سب چیزوں سے روکا۔ تاکہ اصل فعل سے آدمی رک جائے۔ روکنا زنا کا مقصود ہے۔ یہ چیزیں اپنی ذات سے ناجائز نہیں تھیں، اس لئے روک دی گئیں، کہیں ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''سدِّ ذرائع'' کہتے ہیں۔ یعنی وسائل کو روک دو، تاکہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچنے پائے۔ روکنا تو چوری کا مقصود ہے کہ دوسرے کا مال نہ لے، لیکن تاک لگانا، کسی مکان میں ٹوہ لینا، نقب لگانا، دیوار میں دیکھنا کہ اینٹ کہاں سے ٹوٹ سکتی ہے، مال اسباب کہاں رکھا ہوا ہے۔ اس سب دیکھنے کو ممنوع و حرام قرار دے دیا ہے۔ اس لئے کہ جو آج دیکھ رہا ہے وہ کل چوری بھی کرے گا، یہی چیزیں ذریعہ بنیں گی۔ تو چوری کو روکنے کے لئے جتنے اسباب اور دواعی تھے، ان سب کو ممنوع اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے: مَنْ اَتٰی سَاحِراً أو کَاھِناً أو عَرَّافاً فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ① جو جادوگر کے پاس گیا، اس نے شریعتِ محمدی کے ساتھ کفر کیا۔ حالانکہ جادوگر کے پاس جانا اپنی ذات سے کفر نہیں۔ اس لئے کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو اس نے توحید کا انکار نہیں کیا، نبوت، قیامت اور فرشتوں کا انکار نہیں کیا۔ ایمان کا تعلق تو ان چیزوں سے ہے۔ جب یہ ساری چیزیں موجود ہیں پھر کیسے کفر کیا۔ پھر فرمایا گیا اس لئے کہ جو آج کسی جادوگر کے پاس جائے گا تو سب سے پہلے تو جادو کی برائی دل سے نکلے گی، وہ جو دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ جادو کرنا حرام ہے، وہ حرمت دل سے نکلے گی۔ دوسرے دن جا کے وہ اسے یوں کہے گا کہ: ایک منتر مجھے بھی سکھلا دو، تو ایک منتر سیکھ لیا، تیسرے دن جائے گا تو خود منتر کرے گا اور چوتھے دن اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا اور کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے یہیں سے روکا کہ جادوگر کے پاس جانا ہی کفر کی چیز ہے۔ اس کو کہتے ہیں کسی عمل کی تکمیل کہ اس کے دور دور کے اسباب کو بھی روک دو تاکہ اصل برائی کے اندر مبتلا نہ ہونے پائے۔

روکنا شراب سے مقصود تھا، فرمایا: مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ۔ ② جس چیز کے زیادہ حصے میں نشہ

① مسند ابی یعلی، ج ۱۱ ص: ۱۶۶ رقم: ۵۴۸۰. مسند عبدالله بن مسعودؓ، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب ۳: ۹۸. ② السنن لابی داؤد، کتاب الأشربة، باب النهي عن المسكر ص: ۱۰۶ .

ہے،اس کا کم حصہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔یعنی شراب کا گلاس پینا حرام ہے تو ایک قطرہ چکھنا بھی حرام ہے۔اس کو نجس العین کہا گیا ہے، جیسے خنزیر نجس العین ہے کہ اس کی ذات ہی ناپاک ہے،اسی طرح شراب کو بھی فرمایا گیا کہ اس کی ذات اور جوہر بھی ناپاک ہے۔اس لئے فرمایا: ایک قطرہ بھی اسی طرح سے حرام ہے جس طرح سے ایک گھونٹ اور ایک جام پینا حرام ہے۔لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ شراب اس لئے حرام کی کہ نشہ لاتی ہے اور نشے میں آدمی کی عقل جاتی رہتی ہے مگر ایک قطرہ چکھنے سے تو نشہ نہیں پیدا ہوتا پھر یہ کیوں حرام ہے؟ وہ یہی وجہ ہے کہ جس نے آج ایک قطرہ پیا، وہ کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا پرسوں کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا وہ چوتھے دن جا کر شراب خور بن جائے گا۔تو شراب خور بننے سے روکنے کے لئے ایک قطرہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا تا کہ ابتداء سے آدمی رک جائے۔

پھر یہی نہیں کہ شراب کا ایک قطرہ یا ایک گھونٹ ہی پینا حرام ہے۔زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے جن میں شراب پی جاتی تھی۔جیسے اس زمانے میں بھی شراب پینے کے کچھ مخصوص برتن ہوتے ہیں جام اور صراحی، اس کے الگ ہوتے ہیں۔ایسے ہی زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے: حَنْتَمُ ،دُبَّاء ، نَقِیْر اور مُزَفَّت۔ ''دُبّـاء'' ایک خاص قسم کا کدّو ہوتا تھا، جس کو اندر سے کھرچ کر کھوکھلا کرتے تھے اور اس میں شراب رکھتے تھے، تو اس میں نشہ زیادہ پیدا ہوتا تھا۔اسی طرح سے نـقیر ایک خاص قسم کے درخت (کھجور) کی جڑ ہوتی تھی، اس کو کھود کر پیالہ بناتے تھے، اس پر روغن اور بہت عمدہ رنگ کر کے اس کو بیچتے تھے، اس میں شراب پی جاتی تھی تو وہ اچھی معلوم ہوتی تھی۔اسی طرح دوسرے برتن تھے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جس طرح سے شراب حرام ہے اسی طرح سے یہ چار برتن بھی حرام قرار دیئے گئے کہ ان میں پانی بھی مت پیو۔اس لئے کہ اگر پانی پینے بیٹھے، ممکن ہے شراب یاد آ جائے اور شراب کی طرف توجہ ہو جائے۔میرا مقصد یہ ہے کہ روکنا اصل، حرام فعل سے مقصود ہے، اس کے جتنے اسباب تھے دور دور تک، ان سے بھی روکا ہے تا کہ آدمی وہاں تک نہ پہنچنے پائے۔تو شرک ایک فتیح فعل تھا اس کو روکنے کے لئے اس کے جتنے اسباب تھے ان سے بھی روک دیا تا کہ انسان میں کمالِ توحید اور کمالِ تقویٰ پیدا ہو۔

یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ۔تو صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف یہی ہے کہ ہر گناہ کے سلسلہ میں جو فعل اصل مقصود ہوتا ہے وہ تو کبیرہ ہے اور جو اس کے اسباب ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہے۔زنا تو کبیرہ گناہ ہے عورت کو دیکھنا، بری نیت سے ہاتھ لگانا، اس کی طرف چل کے جانا یہ سارے گناہِ صغیرہ ہیں۔اگر خدانخواستہ وہ اصل فعل واقع ہو گیا تو یہ سارے گناہ لاد دے جائیں گے اور سب کا وبال چکھنا پڑے گا۔لیکن اگر یہ سارے افعال سرانجام دیئے اور اصل فعل سے بچ رہا تو یہ بھی سب معاف کر دیئے جائیں گے۔نیکیاں کرنے سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔تو شریعتِ اسلام نے فقط گناہ سے نہیں روکا بلکہ ان کے اسباب یعنی صغیرہ گناہ سے بھی روکا ہے۔تا کہ اس گناہ سے آدمی دور دور رہے۔یہ اصل میں دین کی تکمیل ہے کہ اصل مقاصد کو روکنے کے لئے اس

کے دواعی اور اسباب تک کو روکا اور مکمل قانون بنا دیا۔

اسبابِ فرائض پر اجر و ثواب ہے......اسی طرح سے جو فرائض ہیں ان میں اصل مقصود تو فرض ہے لیکن فرض کو انجام دینے کے لئے اسباب کا سلسلہ بچھا دیا۔ مثلاً اصل مقصود نماز ہے، یہ تو فرض ہے لیکن اس کے لئے شریعتِ اسلام نے کہاں سے سلسلہ چلایا۔ فرمایا گیا: اگر ایک شخص لحاف میں پڑا ہوا سو رہا ہے اور اذان ہوئی تو جب مؤذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' کہے، جبھی بستر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر یہ خیال ہوا کہ ابھی یہ اذان دے رہا ہے، ابھی پانچ منٹ اذان میں لگیں گے، اس کے بعد پندرہ منٹ نماز میں! ذرا اور سو جاؤں تو سوتے سوتے وہ آدھ گھنٹے سوئے گا، جماعت بھی قضا ہو جائے گی۔ مسجد میں جانا ہی نصیب نہیں ہوگا۔ تو وہاں سے پکڑا ہے کہ جب ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' کی آواز آئے، جبھی اٹھ کھڑے ہو جاؤ، آسانی اسی میں ہے۔ اس کے بعد آدمی نے وضو کیا، فرمایا گیا: جب آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے تو جس عضو کو آدمی دھوتا ہے، جو گناہ اس عضو سے کئے ہیں، وہ جھڑنے شروع ہوتے ہیں، ہاتھ سے گناہ کیا، جب ہاتھ دھوئے گا تو ناخنوں سے وہ گناہ جھڑیں گے۔ پیر دھوئے گا تو پیروں کے گناہ جھڑیں گے۔ کلی کرے گا تو منہ سے جو گناہ کئے ہیں، وہ جھڑیں گے۔ ناک میں پانی دے گا، تو ناجائز سونگھنے کے جو گناہ کئے ہیں، وہ جھڑیں گے: ''حَتّٰی یَخْرُجَ نَقِیًّا مِنَ الذُّنُوْبِ''۔ ① جب وضو کر کے اٹھے گا تو ایسا پاک ہوگا گویا اس نے وہ گناہ کئے ہی نہیں تھے۔ یہ سب پاکی نماز کے لئے کی جاری ہے۔ پھر فرمایا گیا: جب وضو کر کے آدمی چلا تو مسجد تک جانے میں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹا دی جاتی ہے۔ اب نیکیوں کا ایک ذخیرہ یہاں سے جمع ہوا۔ پھر فرمایا گیا: اگر مسجد میں بیٹھا ہے اور ابھی نماز نہیں ہوئی، دیر ہے اور یہ انتظار کر رہا ہے تو نماز کا انتظار کرنے والا نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہے۔ انتظار کے وقت میں اتنا ہی اجر دیا جائے گا جتنا کہ نماز پڑھنے میں دیا جاتا ہے۔ یہاں سے ایک اجر کا ذخیرہ مہیا ہوا۔ تو وہاں سے ثواب کے وعدے دینے شروع کئے کہ لحاف سے اٹھے تو اجر و ثواب، وضو کیا تو ایک ایک عضو دھونے پر ثواب، مسجد گئے تو ایک ایک قدم پر ثواب، مسجد میں انتظار کیا تو ایک ایک منٹ پر ثواب۔ حتیٰ کہ نماز کا وقت آ جائے۔ تو مقصود نماز کا ثواب دینا ہے۔ اس کے لئے ایک سلسلہ بچھا دیا کہ وہاں سے آدمی چل پڑے تاکہ نماز کے قضاء ہونے کا کوئی احتمال باقی نہ رہے۔

تو جیسے ناجائز چیزوں میں روکنے کے لئے اسباب تک کو روک دیا۔ یہاں فرائض کے ادا کرانے کے لئے کچھ اسباب بھی کروائے تاکہ آدمی مکمل طریق پر اپنے دین کو انجام دے۔ یہ بات مجھے اس پر یاد آ گئی کہ سوال اُس شخص نے یہ کیا تھا کہ اسلام نے کوئی نئی چیز ہمیں کیا لا کر دی۔ جو ہم اس کی طرف متوجہ ہوں؟ میں نے کہا کہ دین نیا نہیں لا کے دیا، دین تو وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اس دین کی تکمیل کر دی ہے۔ ہر ہر حکم کو اتنا مکمل کیا ہے کہ وہ مستقل ایک قاعدہ اور ضابطہ بن گیا۔ توحید کی تکمیل، نماز کی تکمیل، صدقات کی تکمیل، حج کی تکمیل حتیٰ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الطھارۃ، باب خروج الخطایا مع ماء الوضوء ج: ۲ ص: ۴۵.

کہ سونے اور جاگنے کے اوقات کو عبادت سے مکمل بنادیا۔ یہ چیز اسلام نے لاکردی ہے۔ اسی کی ہم دعوت دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں یہ چیز نہیں ملتی۔ اصل دین ملتا ہے، نیکی ملتی ہے۔ ہر مذہب کہے گا کہ: زنا مت کرو، بہت بری بات ہے۔ کوئی بھی اجازت نہیں دے گا، لیکن بچنے کے طریقے کیا ہیں؟ قانون کا ایک لمبا سلسلہ...... یہ نہیں ملے گا۔ ہر مذہب کہے گا کہ شراب مت پیو لیکن شراب کے لئے اسباب کیا ہیں جن سے شراب بنتی ہے اور جن میں پیتا ہے، ان سے اسلام نے روکا، ایسی صحبت مت اختیار کرو جس میں شراب کی رغبت پیدا ہو، ایسے اوباش لوگوں کے پاس بیٹھو بھی مت، جو تمہیں شراب پینے پر ڈال دیں اور تمہارے اندر رغبت پیدا کردیں۔ ایک ایک شق اور سبب کو روک دینا ہر حکم میں یہی دیکھتے ہیں۔ ہر حکم ایک مستقل قانون بنا ہوا ہے۔ یہ ہے تکمیلِ دین۔ یہ تکمیل جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہوئی۔ تو کامل دین ایک مستقل نعمت ہے، اور اس نعمت کے لانے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس واسطے آپ کا دنیا میں آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہدیہ...... اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے: **یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ** (1) میں اللہ کی ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ اللہ کا ایک ہدیہ جو بندوں کو ملا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ تو اتنی بڑی نعمت دی گئی کہ جتنی عالم کی نعمتیں ہیں سب اسی کے طفیل میں مل رہی ہیں۔ زندگی کی نعمت ملی، تب اسی کے طفیل ملی، جب آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اگر انہیں پیدا نہ کرنا ہوتا تمہیں بھی پیدا نہ کرتے! اگر آدم علیہ السلام کو پیدا نہ کرتے ہم اور آپ کہاں سے آجاتے! ہمارا وجود اور زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ پھر زندگی کے بعد جتنی کائنات میں نعمتیں ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو کائنات نہ بنتی۔ پس وہ نعمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوئیں۔ ہمیں کھانا پینا جو بھی نعمتیں مل رہی ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے مل رہی ہیں۔ اگر آخرت میں نعمتیں ملیں گی وہ ایمان کی وجہ سے ملیں گی، ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکے دیا، پھر یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ غرض دنیا سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک نعمتوں کا ایک سلسلہ ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ اس لئے اس نعمت کا جتنا بھی ناز کیا جائے وہ کم ہے اور جتنا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پہچانا جائے اتنا ہی کم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق بنیادی طور پر تین ہیں، جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔ عظمت یہ کہ آپ کو اتنا بڑا جانا جائے کہ کائنات میں کوئی بڑی ہستی نہیں ہے جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

---

(1) السنن للدارمي، المقدمة، باب كيف كان اول شأن النبي صلى الله عليه وسلم، ج: ١، ص: ١٧. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ١ ص: ٨٨٢ رقم: ٤٩٠.

دوسری چیز محبت ہے۔اگر محبت نہ ہوگی تو ایمان نصیب نہیں ہوگا۔آپ کا یہ حق ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کریں۔محبت کا یہ خاصہ ہے کہ فقط محبوب ہی محبوب نہیں ہوتا محبوب کی ادائیں بھی محبوب ہو جاتی ہیں۔جس سے محبت ہوتی ہے،تو آدمی یہ چاہتا ہے کہ میں صورت بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے۔میں چال ڈھال بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے۔میں رہن سہن کا ڈھنگ بھی وہ بنالوں جو میرے محبوب کا ہے۔محبوب سے جب محبت ہوتی ہے فقط محبوب سے نہیں ہوتی،اس کی ہر ایک ادا سے محبت ہو جاتی ہے،اس کا گھر بھی محبوب بن جاتا ہے۔جیسے مجنوں لیلیٰ کا عاشق بن گیا تھا،لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں لیلیٰ کے مکان کی ایک ایک اینٹ چومتا پھر رہا ہے۔لوگوں نے کہا کہ بھئی!اینٹ میں کیا رکھا ہے؟اس نے یہ شعر پڑھا۔

اَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى ... اُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارِ وَذَاالْجِدَارِ

میں لیلیٰ کے مکان سے گزرتا ہوں تو کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں کبھی اس کو،کبھی دہلیز کو،کبھی اس کے کواڑوں کو۔

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِىْ ... وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَ

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں۔مجھے اس سے محبت ہے جو ان اینٹوں کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔اس کی وجہ سے مجھے اینٹیں بھی عزیز ہوگئیں۔وہ محبوب ہے تو اس کا مکان اور کتا بھی محبوب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں محبوب ہیں تو مدینہ منورہ بھی محبوب ہے،اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیں محبوب ہے کہ وہ حضور کی مسجد ہے۔مدینہ کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب ہیں اور ہم انہیں اپنا مخدوم جانتے ہیں،اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی ہیں۔جب محبوب،محبوب ہے تو ادائیں بھی محبوب،ان سے جن کو نام لگ گئے ہیں یا ان کی نسبت لگ گئی ہے،وہ بھی سب محبوب بن گئے۔تو وہ وطن بھی،مکان بھی اور وہاں کے باشندے بھی سب محبوب۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا اکرام مدینہ میں گیارہ دن تک بول و براز سے رُکنا ......اور عظمت تو عظمت کرنے والوں نے کی۔ہم تو دعویٰ ہی دعویٰ کرتے ہیں۔حقیقی عظمت کرنے والے تو گزر گئے۔عظمت کرنے والے وہ تھے کہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ جب حج کرنے گئے ہیں تو تین دن ٹھہر کر مدینہ طیبہ سے واپس ہونے لگے، تمام اہل مدینہ نے آ کے راستہ روکا کہ ہم تو آپ کو نہیں جانے دیں گے۔لوگوں کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور محبت تھی۔سارے اہل مدینہ آ کے کھڑے ہوگئے کہ ابھی آپ اور رہیں،ہم نہیں جانے دیں گے۔ان کے کہے سے پھر رک گئے۔پانچ دن کے بعد پھر ارادہ کیا پھر اہل مدینہ نے آ کے روک دیا کہ ابھی نہیں جانے دیں گے۔بہت کہا!بہت معذرت کی۔مگر اہل مدینہ نے نہیں مانا،پھر رک گئے۔یہاں تک کہ کئی دفعہ ہوتے ہوتے گیارہواں دن آ گیا۔اب جانے کا ارادہ کیا پھر اہل مدینہ نے روکا تو کہا:اب میرے بس میں نہیں ہے رُکنا۔لوگوں نے عرض کیا:

حضرت! بس کی کیا بات ہے؟ فرمایا: گیارہ دن گزر گئے ہیں آج تک میں نے استنجاء نہیں کیا، ایک ہی وضو سے اتنے دن گزارے۔ اس لئے کہ میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ مدینۃ الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آ کر میں یہاں بول و براز کروں، اس زمین کو گندہ کروں۔ معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم کہاں پڑا ہوگا اور میں وہاں گندگی ڈالوں، یہ تھی حقیقی عظمت۔ ہم اور آپ اس عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا رتبہ اور حق تھا کہ گیارہ دن تک ایک وضو سے رہے۔ تب اہل مدینہ نے کہا کہ اب تو ہم جلدی رخصت کریں گے، لہٰذا جلدی رخصت کیا۔ تب جا کے استنجاء وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ خیر یہ تو ایک کرامت کا درجہ ہے، ہر ایک اس کو انجام نہیں دے سکتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اکرامِ مدینہ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرت کہلاتے ہیں۔ مدینہ سے بے حد محبت تھی اور یہ چاہتے تھے کہ مدینہ ہی میں میری وفات ہو جائے اور مدینہ ہی کی زمین مجھے قبول کرے۔ تو آخیر عمر ساری مدینہ میں گزار دی اور اس ڈر کے مارے حجِ نفل ادا کرنے نہیں جاتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر موت نہ آجائے۔ کیفیت یہ تھی، کہ جب تک مدینہ میں رہے ہیں، مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں ننگے پاؤں پھرتے تھے کہ معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک کہاں پڑا ہوگا میں جوتے لیکر وہاں سے گزروں! مجھے چاہیے تھا کہ میں سر کے بل چلتا مگر یہ میرے بس میں نہیں، کم سے کم جوتا تو پہن کے نہ چلوں۔ عظمتِ حقیقی یہ تھی جو ان اکابر نے کی ہے کہ ساری عمر مدینہ میں جوتے پہن کر نہیں چلے۔

آثارِ مدینہ نظر پڑتے ہی قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تڑپ اور بے خودی...... مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانیٔ دار العلوم دیوبند، جب حج کے لئے گئے ہیں تو مدینہ منورہ کے قریب ایک منزل آتی ہے، جس کو ''بیر علی'' کہتے ہیں۔ ذرا سی پہاڑی ہے، اس پر جب اونٹ یا کاریں چڑھتی ہیں تو ایک دم حرمِ (مدینہ) شریف کے مینار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے مدینہ منورہ تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ حاضر ہوئے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ اور سارے بزرگ۔ جب ''بیر علی'' پر پہنچے اور حرم کے مینار پر نظر پڑی تو حضرت مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بے تاب ہو کر ایک دم اونٹ سے کود ے اور ننگے پیر چل پڑے تھے۔ اور کچھ عاشقانہ اشعار زبان پر تھے جیسے معلوم ہو کہ اپنے ہوش میں نہیں۔ حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی ہیں کہ جب وہ چبھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چُھریاں چبھ رہی ہوں۔ اور لوگ بھی حضرت کو دیکھ کر کود پڑے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ دوسرے لوگ جو کودے، ہیں یہ نقالی کر رہے ہیں، اُن پر تو حال طاری ہے، وہ تو اپنے آپے میں نہیں، اُن کی یہ نقل نہیں اتار سکیں گے۔ چار پانچ میل اسی طرح ننگے پاؤں چلے، پیر لہولہان ہو گئے مگر انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ حقیقی عظمت تو اہل اللہ کی ہوتی ہے، جن پر عظمت کا حال طاری ہوتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہم اگر تھوڑی بہت نقل بھی اتار لیں۔ یہ بھی ہماری سعادت ہے، وہ حال تو حال والوں کا ہوتا ہے، ہم میں وہ حال کہاں۔

غرض مدینہ منورہ سے محبت کیوں ہے! اس لئے کہ صاحب مدینہ سے محبت ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن بنا تھا۔ جب وطن والا ہمارا محبوب ہے تو وہ وطن بھی محبوب، اس کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب، اس کا پانی اور اینٹ اینٹ بھی محبوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکِ شفاء، مدینہ کی مٹی تھوڑی تھوڑی تبرک کے طور پر لے کر آتے ہیں، اس کو گھر میں تبرکا رکھتے ہیں۔ اس واسطے کہ جس ذاتِ اقدس سے ہمیں محبت ہے، وہیں کی تو یہ مٹی ہے۔ یہ مٹی بھی ہمیں عزیز ہے، اس کا ایک ایک ذرہ بھی ہمیں عزیز ہے۔

مدینہ میں موت آنے کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فکر وکڑھن...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہ حال تھا کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مجھے موت مدینہ میں آئے۔ نفلی حج کرنا اس ڈر کے مارے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں باہر وفات نہ پا جاؤں۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خواب میں دیکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حاضر ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تا کہ اگر میری عمر زیادہ باقی ہو تو میں حج نفل کر لوں اور توقع رکھوں کہ لوٹ کے آ جاؤں گا اور مدینہ میں میرا انتقال ہو جائے گا۔ میں مدینہ کی زمین کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ میری عمر کے کتنے سال باقی ہیں۔ اگر دو تین سال باقی ہوں تو میں نفلی حج کر آؤں۔

یہ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ سامنے کر دیا کہ پانچ انگلیاں سامنے ہیں۔ پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھل گئی۔ حیران ہوئے کہ پانچ انگلیوں کا کیا مطلب ہے! آیا میری عمر کے پانچ برس، یا پانچ ماہ، یا پانچ ہفتے، یا پانچ دن باقی ہیں! کچھ سمجھ میں نہ آیا تو تعبیر خواب کے بڑے ماہر، امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو تابعی بھی ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر ہیں، خواب کی تعبیر ایسی دیتے ہیں کہ ادھر تعبیر دی اور ادھر ہاتھ کے ہاتھ واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس فن کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے کتاب لکھی ہے **"تاثیر الأنام فی تعبیر المنام"**۔ دو جلدوں میں ہے، اس میں بہت بڑے بڑے تعبیر خواب کے اصول بتلائے ہیں۔

ایک جیسے دو خواب اور مختلف تعبیریں...... ان کی بات پر یاد آیا۔ ان کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا: حضرت! میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں! فرمایا: جلدی جا، تیرا مکان گرنے والا ہے، بیوی بچوں اور سامان کو نکال لے۔ بے چارے نے جلدی جلدی سامان اور بیوی بچوں کو نکالا۔ دو تین گھنٹے کے بعد ساری بلڈنگ آپڑی۔ خواب کی تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ ظاہر ہو گئی۔ کوئی پانچ چھ مہینے کے بعد ایک اور شخص آیا اور عرض کیا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا جا کر چارپائی کے نیچے کھدائی کر، تجھے سونا ملے گا کھودنا جو شروع کیا تو لاکھوں روپے کا سونا نکلا، ایک خزانہ دبا ہوا نکلا۔

لوگوں نے امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! خواب تو دونوں نے ایک ہی دیکھا ایک کا تو آپ نے گھر گروا دیا اور ایک کو سونا دلوا دیا۔ فرمایا کہ: پہلے نے جو خواب دیکھا وہ گرمی کے زمانے میں دیکھا اور

گرمی میں چار پائی کے نیچے آگ کا ہونا، یہ گویا بنیاد کے منہدم ہونے کی علامت ہے۔لہٰذا میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا۔اور دوسرے نے یہی خواب سردی کے زمانے میں دیکھا اور سردی میں چار پائی کے نیچے آگ کا ہونا یہ بڑی خوشگوار نعمت ہے،اس سے بڑھ کر نعمت نہیں۔اور آگ کی رنگت سونے کے مشابہ ہے۔سومیں نے کہا: چار پائی کے نیچے سے سونا نکلے گا۔دونوں باتیں پوری ہوئیں۔

پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں......تو ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اس درجے کے امام تھے کہ ان کی تعبیر ہاتھ کے ہاتھ پوری ہوتی تھی۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا یہ خواب کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر پوچھی،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں،ایک شخص سے کہا اور فرمایا: تو اس کی تعبیر ابن سیرین سے پوچھ کے آ!مگر یہ مت کہنا کہ مالک نے یہ خواب دیکھا ہے،یوں کہنا کہ:ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔میرا نام مت بتلانا۔وہ شخص ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا اور کہا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے اور وہ یہ عرض کر رہا ہے کہ حضرت!یہ فرما دیجیے میری عمر کتنی باقی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھا دیں۔اس کی کیا تعبیر ہے؟

فرمایا: سچ بتلا یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا: جس نے دیکھا ہے اس نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔بس یہ سمجھ لیجیے ایک مسلمان نے دیکھا ہے۔فرمایا: یہ خواب کوئی بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔عوام الناس میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔پھر فرمایا: مدینہ میں امام مالک سے بڑا کوئی عالم نہیں،تو امام مالک نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا،اسے ممانعت تھی۔فرمایا: اچھا جاؤ!پوچھ کے آؤ،نام بتلانے کی اجازت لے کے آؤ۔اس نے آکر امام مالک سے عرض کیا: حضرت!وہ تو پہچان گئے کہ آپ ہی نے خواب دیکھا ہے مگر چونکہ اجازت نہیں تھی اس لئے میں نے کوئی حامی نہیں بھری،بس چپ ہو گیا۔فرمایا: اچھا جاؤ میرا نام بتلا دینا۔یہ آیا اور آکر ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ: واقعی امام مالک نے ہی وہ خواب دیکھا تھا اور آپ نے ٹھیک سمجھا تھا۔فرمایا: امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے،دوسرے کسی عالم کی مجال نہیں تھی۔کہہ دینا: اس کی تعبیر یہ ہے کہ حضور نے جو پانچ انگلیاں اٹھا کے دکھلائیں،اس سے نہ پانچ برس،نہ پانچ گھنٹے،نہ پانچ دن اور نہ پانچ ماہ مراد ہیں،بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ "هِيَ مِنْ خَمْسٍ لَايَعْلَمُهُنَّ اِلَّااللّٰهُ" موت اور زندگی کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ①:﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَافِي الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾② پانچ چیزیں اللہ نے ارشاد فرمائیں کہ قیامت کا علم اللہ ہی کو ہے کہ کب آئے گی!کس سن میں آئے گی!کسی کو اس کا علم نہیں دیا

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۴۸. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

گیا۔ حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں دیا گیا۔ اور یہ بارش کہاں سے آتی ہے! کیوں آتی ہے! کیا اسباب باطنی بنتے ہیں! کسی کو پتہ نہیں۔ ظاہری طور پر ہم آلات سے پتہ چلالیں کہ بادل اٹھے گا، مون سون اٹھے گا لیکن خود مون سون آج کے دن کیوں اٹھے گا! مون سون کو بنانے والی کیا چیز ہے! وہ کیا ہے اور وہ کیوں بناتی ہے۔ یہ سب علل اور بنیادی چیزیں اللہ ہی جانتا ہے، اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے۔ ہم ظاہری اسباب کا کچھ پتہ چلا سکتے ہیں مگر باطنی اسباب کا کچھ پتہ نہیں، وہی جانتا ہے۔ ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ ① ماں کے پیٹ میں کیا ہے! لڑکا یا لڑکی! اللہ ہی جانتا ہے۔ بعض دفعہ بزرگوں نے بتلا دیا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے، وہ شخصی طور پر ایک جزوی چیز بتلائی۔ کلی طور پر یہ علم کہ لڑکا کیوں بنتا ہے! لڑکی کیوں بنتی ہے! کیا اندرونی اسباب ہیں کہ اس دفعہ لڑکا بن گیا، اُس دفعہ لڑکی بن گئی۔ یہ اللہ ہی کے علم میں ہے۔ ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ ② اور کسی نفس کو یہ پتہ نہیں وہ کل کو کیا عمل کرنے والا ہے۔ کل جب آئے گی جبھی پتہ چلے گا۔ ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ ③ کسی نفس کو یہ پتہ نہیں کہ کونسی زمین میں اور کب اس کا انتقال ہوگا! تو فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پانچ انگلیاں دکھائیں، اس کا یہ مطلب ہے کہ کونسی زمین میں آپ کا انتقال ہوگا! یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

سب سے بڑی نعمت کے حقوق ...... تو بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالَم کے لئے محسن اعظم ہیں اور ساری نعمتیں آپ کے طفیل سے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پہچاننا یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق تین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم محبت کریں، آپ کی عظمت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور متابعت کریں۔ تو عظمت کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ عظمتِ حقیقی کرنے والے تو گزر گئے، لیکن ان کو دیکھ کر کچھ بھی کرلیں وہ بھی ہماری سعادت ہے۔ چلو جتنی ہی کرسکیں، ورنہ اصل عظمت تو یہ تھی کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بھر جوتا پہننا چھوڑ دیا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے گیارہ دن استنجا تک نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول میں رہ کر میں گندگی پھیلاؤں۔ دوسری چیز محبت ہے کہ اولاد و بنیاد کی محبت اس درجہ کی نہ ہو، یعنی جب اولاد و بنیاد سے مقابلہ پڑے تو ہم اللہ و رسول کی محبت کو ترجیح دیں۔ جب کسی حکم شرعی سے اولاد کی محبت سے مقابلہ پڑ جائے تو ہم حکمِ شرعی کو ترجیح دیں۔ مثلاً خدانخواستہ کسی کا بچہ بیمار ہوجائے تو مرد تو نہیں مگر عورتیں ٹونے، ٹوٹکے اور شرکیہ رسموں میں مبتلا ہوجاتی ہیں کہ شاید اچھا ہوجائے! جو خلافِ شرع ہوتا ہے۔ تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت سے محبت ہونی چاہیے۔ بچے سے اتنی محبت نہ ہو کہ ماں باپ شرکیہ امور سرانجام دینے لگیں کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ جان بچانے والا اللہ بزرگ و برتر ہے۔ جب اس کے قانون

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

کی پابندی کروگے ممکن ہے اسی کی برکت سے جان بچ جائے۔ بچے کی جان بچانے کے لئے شرکیہ امور انجام دینا، یہ اس کی دلیل ہے کہ خدا کی محبت گویا اتنی نہیں ہے جتنی بچے کی ہے۔ بچے کی محبت سامنے آئی تو خدا کے قانون کو چھوڑ دیا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کی جان کی شریعت کے مقابلے میں پرواہ نہ کی جائے۔ تو دوسرا حق یہ ہے۔ اور تیسرا حق متابعت ہے۔ جو قانون آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکے دیا ہے، اس کی پیروی اور اطاعت کریں۔ جو سنتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ان کی اتباع کریں۔ ایک ایک سنت کی پیروی میں جو نورانیت اور برکت ہے، ہم اپنی عقل سے ہزار قانون بنالیں، اس میں وہ خیر و برکت نہیں آسکتی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کی ادائیگی میں ہوسکتی ہے۔ تو ایک ایک سنت کی پابندی کرنا مثلاً پہننے میں، کھانے میں، پینے میں، چلنے پھرنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں...... اس انداز کو اختیار کرنے کی کوشش، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تھا۔ یہ ایک مستقل نعمت اور برکت ہے ، اسی کا نام متابعت ہے۔ ایک فرائض میں اتباع ہے جیسے نماز پڑھ لی، وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کے مطابق پڑھیں گے۔ روزہ رکھیں گے، وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طریقے کے مطابق ہوگا۔ یہ وہ فرائض ہیں جو ہمارے ذمے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اسی کے لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے، علم سیکھا جاتا ہے تو قدم بقدم چلنے کی کوشش کریں۔

مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قدم بقدم سنت پر چلنا...... میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو بزرگوں میں سے کسی نے خواب میں یوں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہزاروں کا مجمع پیچھے ہے اور بھی ہزاروں لوگ ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھا گیا، وہ بھی مجمع کے ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن مجمع تیزی سے جارہا ہے کہ جلدی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں اور مولانا آہستہ آہستہ دھیمی چال سوچ سوچ کے قدم رکھ رہے ہیں، جس کی وجہ سے مجمع سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں دوڑے جارہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے ہیں، جلدی پہنچیں اور کسی طرح زیارت نصیب ہو، جا تو آپ بھی رہے ہیں مگر قدم ٹٹول ٹٹول کے۔ فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم پڑا ہے، میں بھی وہاں قدم بہ قدم، قدم رکھوں، اس کے دیکھنے میں دیر لگتی ہے۔ اس لئے میں آہستہ چل رہا ہوں۔ الحمدللہ میرا ایک قدم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان سے الگ نہیں پڑا۔ ٹھیک اسی نشان پہ قدم رکھتا ہوا جارہا ہوں، اگرچہ دیر میں پہنچوں گا۔ گویا وہ ان کی اتباع سنت کی چیز تھی جو خواب میں دکھلائی گئی۔

اللہ پاک ہمیں اتباعِ سنت نصیب فرمائے...... مسلمان میں یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو اس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہو بہو نقشہ تم ہم نہیں اتار سکتے، ہماری ایسی قسمت کہاں! مگر

اپنا کام سعی اور جدوجہد کرنا ہے۔دل میں تڑپ پیدا ہو جائے۔اگر تڑپ پیدا ہوگئی تو ممکن ہے اللہ پوری پیروی نصیب کردے، ورنہ جتنی بھی نصیب ہو جائے! اس جذبہ کی وجہ سے ہمیں نجات ہونے کی توقع ہے۔تو تین حقوق ہیں، ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔محبت میں فنائیت ہوتی ہے کہ آدمی محبوب میں فنا ہو جائے۔متابعت میں قدم بہ قدم چلنے کا جذبہ ہوتا ہے۔کہ ایک ایک چیز میں پیروی نصیب ہو۔عظمت سے اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔اگر بڑائی دل میں نہ ہو تو عقیدت نہیں ہو سکتی۔اور عقیدت و اعتقاد نہیں ہوگا تو ایمان نہیں بنے گا۔اس واسطے ان تینوں حقوق کی ضرورت ہے۔تو میں نے آیت ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ① پڑھی تھی، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔تو عالموں کا وجود، ان کی نعمتیں اور ان کی ہستی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہی سے ہے۔جس امت کو ایسی بابرکت ہستی دی گئی ہو، وہ امت کتنی قسمت والی اور بانصیب ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی عطا کیا گیا۔تو امت پر نبی کے حقوق کا حق عائد ہوتا ہے۔تو محبت بھی ہو، عظمت بھی ہو اور متابعت بھی ہو۔محض محبت ہو کہ آدمی دعویٰ کرے کہ میں عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں...... مگر اطاعت نہ کرے، وہ محبت ناتمام ہے۔محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ اطاعت کرے، اطاعت دلیل ہے اور محبت دعویٰ ہے۔جب کہے گا کہ مجھے محبت ہے تو دلیل پوچھیں گے! تو کہے گا کہ: میں پیروی کر رہا ہوں۔کہا جائے گا کہ: بے شک یہ محبت ہے۔ایک شخص اپنے باپ سے کہے کہ مجھے آپ سے بڑی محبت ہے۔باپ کہے: مجھے حقہ پینے کی عادت ہے، ذرا حقہ بھر کے لاؤ۔تو کہے: صاحب! میں نے تو یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے، یہ کب کہا تھا کہ میں حقہ بھی بھر کے لاؤں گا، یا پانی بھی پلاؤں گا! باپ کہے گا: تو پھر محبت کیسی! محبت تقاضا کرتی ہے کہ جو میں کہوں وہ کر۔تو ہم نے دعویٰ کیا کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔محبت کا خاصہ ہے کہ اطاعت ہو۔اطاعت نہیں ہوگی تو دعویٰ محبت غلط ہوگا۔اسی کو حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''من احی سنتی فقد احبنی ومن احبنی کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ'' ② جسے میرے ساتھ محبت ہوگی وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور جو اطاعت کرے گا وہ جنت میں بھی میرے ساتھ ہوگا۔تو اصل بنیاد محبت ہے اور محبت کی علامت اطاعت ہے اور دل میں عظمت ہو۔تو آیت میں نے پڑھی تھی، اس کی روشنی میں یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں تاکہ حقوقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آ جائیں۔سارا دین اور اسلام اس لئے ہے کہ انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق پہچان لے۔دعاء کیجیے! اللہ تعالیٰ ہمیں اطاعت، محبت و عظمت اور عقیدت و اعتقاد کی توفیق عطا فرمائے اور سنت کی پیروی نصیب فرمائے اور ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً، اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷.

② السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع ج: ۹ ص: ۲۸۹.

بیتُ اللہ الکریم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿إِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ.Oفِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا.﴾ ① صَدَقَ اللہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

اوّلِ عالَم ...... بزرگانِ محترم!اس وقت ہم سب خدامِ دین بحمد اللہ اولِ عالم میں موجود ہیں۔ جو مرکزِ عالم بھی ہے، وسطِ عالَم بھی ہے اوراصلِ عالَم بھی ہے۔ میں نے یہ چار الفاظ مکہ مکرمہ کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ اولِ عالَم، اصلِ عالَم، مرکزِ عالَم اور وسطِ عالَم۔ یعنی سب سے پہلا مقام دین میں یہی ہے اور ہم سب کی اصل یہی ہے۔ اوراس عالَمِ شاہد کے بیچوں بیچ بھی یہی ہے اور مرکزِ عالَم بھی یہی ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں۔ اس میں بعض امور تو نصِ قطعی سے ثابت ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے اور بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں۔ یعنی اس بارے میں یا تو حدیث مرفوع ہے ہی نہیں یا ہمارے علم میں نہیں، لیکن آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بکثرت ملتے ہیں، جن سے یہ چاروں دعوے ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم نے تو ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ ﴾ ② خدا کا سب سے پہلا گھر جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے وضع کیا وہ بکہ میں ہے۔ خواہ بکہ کے معنی (مکمل شہر) مکہ کے ہوں یا بکہ کے معنی خاص اس موضع کے ہوں جس میں بیت اللہ الکریم واقع ہے اوراس کے اردگرد کو مکہ کہتے ہوں۔ یہ اختلافِ اقوال ہے۔ مگر بہرحال حاصل یہ نکلا کہ خدا کا سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ مکہ میں ہے، جس کا نام بیت اللہ الکریم ہے۔ یعنی قدرت نے جب ارادہ کیا کہ اس عالَم کو پیدا کیا جائے اور بنایا جائے تو اس میں سب سے پہلی وضع بیت اللہ کی واقع ہوئی، جیسا کہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پورے عالَم میں

---

① پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۹۶-۹۷. ② پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۹۶.

پانی ہی پانی تھا۔ یعنی عناصرِ اربعہ میں سے سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا فرمایا۔ جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں اور دوسری کائنات بنائی جائے تو اس پانی میں ایک وضع واقع ہوئی۔ پانی میں اتنی جگہ جہاں بیت اللہ واقع ہے، کا کچھ حصہ ابھرا ہوا تھا، جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے ،وہ بھر گیا۔ وہ بیت اللہ تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا تو پانی......اور بالخصوص سمندر کا پانی جب ٹکراتا ہے تو اس میں غِلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہوتی ہے، وہ سمندری جھاگ مثل پتھر کے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پانی نے ٹکرانا شروع کیا اور ٹکریں کھا کر اس میں غِلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوا۔ گاڑھے پن نے سختی اختیار کی اور ایک اینٹ کے برابر جگہ میں سختی پیدا ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اول زمین ایک اینٹ کے برابر بنی۔ تو زمین کی اصل یہی بیت اللہ ہے، اس کے بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور پھیلانا شروع کیا۔ وہ پھیلتے پھیلتے زمین بنتی گئی اور اس حد پر آ کر رک گئی، جس حد تک آج زمین ہے۔ کتنے دنوں میں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، قرآن کریم میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں۔ لیکن اس وقت مدت سے بحث نہیں کہ کتنی مدت تک زمین پھیلی، بہرحال زمین پھیلی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ بیت اللہ ساری زمین کی اصل ہے۔ یہیں سے ایک اینٹ کے برابر زمین پیدا ہوئی، وہیں سے پھیلی اور پھیلتے پھیلتے اس حد پر آ کر رک گئی، جس کو آج ہم زمین کہتے ہیں۔

ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے......گویا زمین کا اول حصہ وہ ہے جو بیت اللہ ہے۔ نیچے سے زمین شروع ہوئی، اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں، ہمیں اللہ نے اس مٹی سے پیدا کیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ''کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ خلق مِنْ تُرَابٍ'' ① تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ آدم کی اصل بھی مٹی ہے، ہم سب کی اصل بھی مٹی ہے۔ اسی لئے انسان کو مشتِ خاک اور مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ۔

قدرت خدا کی دیکھیں تو انسان کو دیکھئے! ———— کیا کیا تکلفات ہیں مشتِ غبار میں

ایک مٹھی بھر مٹی ہے اور کیا کیا تکلفات دکھائے، کتنا دنیا کو سجایا اور کہاں تک پہنچایا۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا اور مٹی کی اصل بیت اللہ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے۔ ایک عام اصول ہے: ''کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ'' ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر شاخیں ہیں تو وہ جڑ کی طرف رجوع کریں گی، پانی ہے تو وہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا، زمین ہے تو وہ مرکزِ ثقل کی طرف رجوع کرے گی، ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطرتاً دوڑتی ہے، اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر بیٹے کو باپ کی طرف کشش ہے تو آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھئی! باپ کی طرف رجوع کرو۔ کہیں نہ کہیں وہ تو رجوع

① شعب الایمان للامام البیہقی، ج: ۱۱، ص: ۲۳. حدیث حسن ہے. دیکھئے: غایة المرام ج: ۱ ص: ۱۸۹ رقم: ۳۰۹.

ہوگا، اس لئے خلقتاً وطبعاً تمام انسانوں کی بیت اللہ کی طرف رجوع ہے۔

لوگ بیت اللہ کی طرف کیوں کھنچتے ہیں...... بعض کے علم میں ہے کہ یہ ہماری اصل ہے اور بعض کے علم میں نہیں ہے، علم میں آ جائے تو پھر ان میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مثلاً کسی شخص کے اولاد ہوئی، بچہ پیدا ہوتے ہی باپ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، بچہ جوان ہوا، بڑی عمر کا ہوا۔ اب اگر باپ کہیں سامنے آئے گا تو طبعی کشش تو ہوگی، مگر یہ نہیں جانے گا کہ یہ باپ ہے، جب تک کہ پہچانوایا نہ جائے۔ بیٹا جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ، جس کی طرف طبعی کشش ہے تو طبعی چھوڑ کر وہ کشش عقلی بھی بن جائے گی، قدرتاً آدمی متوجہ ہوگا۔ تو فطرتاً ہر انسان جانتا ہے کہ یہ میری اصل ہے، اس کی طرف کشش ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے آ کر تعارف کرا دیا کہ جس اصل کی طرف انسانوں کی کشش ہے وہ یہی اصل ہے، مگر علم میں نہیں، کشش موجود ہے اور وہ تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ جن کے علم میں آ گیا، وہ ایمان لے آئے۔ انہیں کشش بھی ہے اور تشخص یعنی معرفت اور پہچان بھی ہے۔ غرض انسان کا بیت اللہ کی طرف خلقتاً رجوع ہے۔

چونکہ طبعی کشش تھی، حق تعالیٰ نے عقلی کشش بھی پیدا فرمادی کہ عبادت میں بھی اسی کو مرکز سمجھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً اس کی طرف رجوع نہ ہوتا تو لوگ زبردستی رجوع کرتے، کیونکہ فطری کشش نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اسی چیز کو مرکزِ عبادت بنایا جس کی طرف کشش بھی تھی۔ وہ طبعی کشش انسانوں کو اس کی طرف کھینچ کر لاتی ہے۔ اب یہ لاکھوں انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر اربوں کھربوں انسان جو ﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ ① ہر گھاٹی سے نکل نکل کر آ رہے ہیں۔ سفر کی سختیاں اٹھاتے ہیں، محنتیں اٹھاتے ہیں، خلافِ طبع باتیں برداشت کرتے ہیں مگر پھر بھی آتے ہیں۔ تو کوئی تو کشش ہے، وہ فطری کشش بھی ہے، شرعی کشش بھی ہے اور عقلی کشش بھی ہے۔ کئی کششیں جمع ہوگئیں۔ فطری تو یوں ہے کہ وہ ہماری اصل ہے اور عقلی یوں ہے کہ اصل کی طرف رجوع ہوتا ہی ہے، معقول بات ہے۔ اور شرعی یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعارف کرا دیا کہ یہی ہے وہ بیت اللہ جو تمہاری اصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گزرے، جنھوں نے آ کر بیت اللہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور جب انبیاء علیہم السلام نے طواف کیا تو یقیناً ان کی اقوام کے دلوں میں بھی یہ چیز ہوگی کہ یہ ہماری اصل ہے۔ یہ اصل صرف آپ ہی کی نہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں بلکہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کی اصل ہے۔

بیت اللہ کی حدود...... حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی ہے، ملائکہ علیہم السلام نے اس کی بنیادیں بھری ہیں اور بنیادیں بھی دس بیس، سو پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تحت الثریٰ تک بیت اللہ کی بنیادی بھری گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ فقط اس حصہ میں نہیں ہے جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے بلکہ تحت

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۷۔

الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا وہ سب بیت اللہ ہے۔اس طرح سے اوپر کی طرف جائیے تو عرش تک سب بیت اللہ ہی ہے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے، وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیت اللہ ہے اور ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے، وہ ساتویں آسمان کا قبلہ ہے۔تو ہر آسمان میں قبلہ ہے۔یہ ایسا ہے جیسے ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پرو دیئے جائیں تو ہر لٹو دوسرے لٹو کا محاذی ہوگا۔گویا بالکل سیدھ میں بیت اللہ ہے۔جیسے حدیث میں ہے کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ سیدھا بیت اللہ کی چھت پر آ کر گرے گا۔تو بیت اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے جو کعبہ شریفہ کی شکل میں موجود ہے، وہ ایک علامتی نشان ہے...... ورنہ بیت اللہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر آپ آسمانوں پر پہنچ جائیں اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھیں تو آپ کو الٹا نہیں لٹکنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو نیچے ہے، اسی طرح نماز پڑھیں گے جیسے زمین پر پڑھتے ہیں۔اس لئے کہ وہاں بھی بیت اللہ سامنے ہے اور اگر آپ کشتیوں کے ذریعے سے زمین کی بڑی تہ میں پہنچ جائیں تو وہاں آپ کو الٹ کے سجدہ نہیں کرنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو اوپر ہے۔آپ اسی طرح سجدہ کریں گے جیسے زمین پر۔تو بیت اللہ نیچے سے لے کر اوپر تک ایک کیل کی مانند ہے۔ایک نورانی لاٹ ہے جس کے اردگرد...... یہ سارے جہان چکی کے پاٹ کی طرح سے چکر کھا رہے ہیں، یہ بیچ میں ایک مرکز ہے۔

بیت اللہ میں اللہ کا عکس...... حق تعالیٰ نے اس کو مرکز بنا کر بغور دیکھا تا کہ اس کو وجود دیا جاسکے اور مرکز سے جو چیز چلتی ہے وہ چہار طرف برابر چلتی ہے۔اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچیں گے مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا اور برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے۔تو مرکز میں جو حرکت ہوتی ہے وہ پورے محیط میں ہوتی ہے۔وجود کو جب حرکت دی گئی کہ زمین کو پیدا کیا جائے تو اسی مرکز کو قدرتِ حق نے تاکا اور وجودی تجلی یہیں نازل ہوئی۔اس لئے بیت اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ وہ تجلی گاہِ ربانی ہے۔اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب الی الذات ہے وہ موجود ہے۔اسی تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔اس تجلی کو سجدہ کرنا عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔تجلی کے معنی فی الحقیقت عکس کے ہیں تو بیت اللہ آئینۂ جمالِ خداوندی ہے، جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے۔جو حرکت ذات کرتی ہے وہ عکس کرتا ہے سایہ بھی کرتا ہے، اگر ذات ہنس رہی ہے تو سایہ بھی ہنسے گا، اگر ذات چل رہی ہے تو وہ بھی چلے گا۔البتہ شدّت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ورنہ حرکت اور سکون وہ بھی وہی کرتا ہے جو اصل ذات کرتی ہے۔تو وہ تجلّی ربانی بیت اللہ میں اتری ہوئی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں۔اسے سجدہ...... عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔اس لئے کہ عینِ ذات اتنی لطافت میں ہے کہ کوئی سیدھ اور محاذات بن نہیں سکتی۔اگر محض ذات کو سجدہ کرایا جاتا تو تصورِ محض ہوتا، ظاہر میں اصلیت کچھ نہ ہوتی۔

لیکن ذات کا عکس جب اتار دیا گیا تو عکس کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کا عکس بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز

میں آ جاتا ہے۔آفتاب کو اپنے آئینے میں دیکھتے ہیں تو آئینہ زمین کا ایک حصہ ہے،اس حصہ کو سورج (جیسے کرہ) کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پورا آفتاب مع اپنی شکل وصورت کے اس میں موجود ہو جاتا ہے اور پھر جو کام اصل آفتاب کرتا ہے، وہی آئینہ کا آفتاب بھی کرتا ہے، آپ آئینے کو دوسرے آئینہ کے سامنے کریں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا، تیسرے کے مقابل رکھیں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا۔آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے گی...... چاہے آپ اندھیرے کوٹھے میں روشنی پہنچادیں۔اسی طرح آفتاب کا کام حرارت پہنچانا ہے، آئینوں کے ذریعے سے بھی وہی حرارت پہنچتی ہے، بس شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔تو جو کام آفتاب کا ہے وہی اس کا عکس بھی کرتا ہے۔

اس لئے عکس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔آفتاب کی ذات کو ٹکٹکی باندھ کر کوئی نہیں دیکھ سکتا ورنہ تو نگاہیں کھو دینی پڑیں گی۔آئینے میں جب آفتاب کا عکس آتا ہے تو دیکھ بھی سکتے ہیں، اس کی ہر جانب اور سمت کو آپ دیکھ سکتے ہیں، معائنہ کر سکتے ہیں۔تو عکس میں اور ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔عین ذات کو سجدہ کرنا، یہ ناممکن تھا، اس لئے کہ وہ غایتِ لطافت میں اور غیب در غیب میں ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کھایا کہ اپنا عکس، آئینۂ بیت اللہ میں اتار دیا تا کہ ایک حد تک محدود ہو جائے اور بندوں کی نگاہ اس حد تک جا سکے اور اس کی طرف جھک سکیں، ورنہ جھکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔یہ حق تعالیٰ کا فضل اور عنایت ہے کہ ذات اور تجلی کی نسبت سے اپنی وہ تجلی جو اقرب الی الذات تھی اتار کر بندوں کو سجدہ کا موقع دیا۔ورنہ کہاں ذاتِ باری تعالیٰ اور کہاں یہ بندے! وہ نورِ مطلق اور ہم ظلمتِ محض! بیچ میں ایک چیز تجلی کی اتار دی تا کہ سجدہ بھی کر سکیں، طواف بھی کر سکیں، عبادت بھی کر سکیں۔اور اس کی عبادت کو ذات کی عبادت قرار دیا۔

مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے...... بیت اللہ فی الحقیقت ہماری مادی اصل بھی ہے، روحانی اصل بھی ہے۔مادی اصل تو یوں ہے کہ زمین اسی سے بنی اور ہم سب زمینی مخلوق ہیں تو وہ ہماری مادی اصل ہوئی۔اور روحانی اصل یوں ہے کہ جب عبادت کریں گے تو انوارِ ربانی اسی کے ذریعہ سے ہمارے قلب میں آئیں گے، تو روحانی اصل بھی ہوئی۔اور جب یہ بیت اللہ تحت الثریٰ تک ہے اور اوپر عرش تک ہے تو میں کہتا ہوں کہ جہاں جہاں بیت اللہ ہے، اس کے اردگرد جو جو مخلوق ہے......اس سب کی اصل یہی بیت اللہ ہے۔فرق اتنا ہے کہ ہر وطن کے مناسب اس کی صورت بن جاتی ہے، زمین میں بیت اللہ ہے تو اس کی صورت اینٹ پتھر کی ہے، آگے آسمانوں میں جائے گا لطافت بڑھتی جائے گی، نورانیت بڑھتی جائے گی، عرش کے قریب پہنچ جائے گا تو نورانیت محضہ رہ جائے گی۔اس لئے کہ وہاں نوری مخلوق پیدا ہوئی، یہاں کثیف اور خاکی مخلوق پیدا ہوئی، مگر ہے سب کی اصل بیت اللہ۔اس لئے سب کا رجوع اس کی طرف ہے، ملائکہ علیہم السلام بھی اس کا طواف کرتے ہیں، انسان بھی طواف کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض جانور بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔اس لئے کہ سب پہچانتے ہیں کہ یہ ہماری اصل ہے۔

تو میں نے ایک تو عرض کیا تھا کہ وہ اولِ عالم ہے۔ تو واقعی وہ اول عالم ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ ① سب سے پہلے قدرت نے اسی کو بغور دیکھا اور حدیث میں فرمایا گیا ہے: جب زمین پھیلنی شروع ہوئی تو سب سے پہلے وہ پہاڑیاں پیدا ہوئیں جو مکہ کے اردگرد ہیں، پھیلتے پھیلتے اور پہاڑیاں بن گئیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب چاروں طرف زمین پھیلنا شروع ہوئی تو جس جس چیز میں جو جو خصوصیت تھی وہ چمک اٹھی۔ تو مدینہ منورہ بھی تو اسی میں آتا ہے، وہ بھی اوّلِ عالم ہے اپنے ماسوا کے لحاظ سے، اس لئے کہ مدینہ کے دائرہ کے باہر جو ہے، اس سے مدینہ مقدم ہے اور وہ مدینہ سے مؤخر ہے۔ تقدیم وتاخیر ہوتی چلی جائے گی۔ تو اصل جا کے سب کی بیت اللہ نکلتی ہے، اس لئے میں نے کہا وہ اول عالم بھی ہے، اصل عالم بھی ہے اور وسط عالم بھی ہے۔

بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت...... معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کوئی مرکزی جگہ ہے۔ جس میں قدرت نے تجلی ڈالی تاکہ چہار طرف انوار وبرکات برابر پھیلیں۔ اسی واسطے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''يَا اَهْلَ مَكَّةَ اَنْتُمْ فِيْ وَسَطِ مِنَ الْاَرْضِ.'' ''اے اہل مکہ! تم زمین کے بیچوں بیچ واقع ہوئے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ وسطِ عالم بھی ہے۔ اور مرکز ہوتا بھی وسط میں ہی ہے۔ دائرہ جبھی بنے گا جب بیچ میں مرکز ہو۔ پرکار کی ایک ٹانگ کو آپ مرکز پر رکھیں گے اور ایک ٹانگ گھمائیں گے، تبھی تو دائرہ بنے گا۔ اگر مرکز سے ٹانگ ہٹ جائے دائرہ بن نہیں سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اول بھی ہے، اصل بھی ہے، مرکز بھی ہے اور وسط و درمیان بھی ہے۔

بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت مکہ میں فرمائی۔ اور اللہ کی طرف سے اسلام اور جامع دین کی گویا پہلی دعوت مکہ سے چلی تاکہ مرکز سے دعوت چلے اور یکسانی کے ساتھ تمام عالم میں اس کی آواز پھیل سکے۔ اگر مثلاً بیت اللہ کو روس میں اور کاکیشیا کے پہاڑوں پر بنادیتے تو ساری دنیا کو مصیبت اٹھا کے وہاں جانا پڑتا اور اگر کہیں مغرب میں امریکہ کی طرف بنادیتے تو روس سے جو لوگ چلتے وہ لاکھوں مصیبتیں اٹھا کے پہنچتے، بہت سے پہنچ نہ سکتے۔ اللہ نے اسے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نرم اور گرم ہر ملک کا ہر انسان وہاں پہنچ سکے۔ مشقت سب پہ برابر پڑے اور اپنے مرکز کو پہنچ جائیں۔ جیسا کہ وسط ہونے کی وجہ سے آسانی ہے۔ اسی طرح مرکز سے جو چیز چلے گی اسے پھیلنے میں بھی آسانی ہوگی۔ حق تعالیٰ نے دعوت الی اللہ اور جامع دین کا کارخانہ مکہ سے شروع کیا اور اسلام کی پہلی دعوت مکہ سے شروع ہوئی۔

مرکزیت کی منتقلی...... وہیں سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی، اس کے بعد مدینہ مرکز بنا۔ یہ حق تعالیٰ کی مشیت اور شان ہے کہ اس نے کمالات کی' ظاہر ہوں یا باطن کسی کے ساتھ تخصیص نہیں رکھی۔ مثلاً یہ کہ علم ہوگا تو فلاں ہی خاندان میں ہوگا اور کسی میں نہیں ہوگا، روحانیت ہوگی تو فلاں ہی خاندان والے اس کے وارث ہونگے، دوسرے محروم رہیں گے، علم ہوگا تو فلاں ہی خطے میں ہوگا۔ بلکہ بنی آدم کے ہر طبقہ کو علم اور روحانیت سے

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

نوازا اور تمام زمین کے خطوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ تو اول مرکز مکہ بنا، اس کے بعد وہ مرکزیت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی۔ خلفائے راشدین کی حکومت وہاں قائم ہوئی۔ اور علم کے دریا اور نہریں وہاں سے جاری ہوئیں۔ اس کے بعد مرکزیت عراق کی طرف منتقل ہوئی، بغداد دارالخلافہ بن گیا، تو وہاں ہزاروں لاکھوں علماء تیار ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کی طرف مرکزیت منتقل ہوئی تو خراساں اور ماوراء النہر سے بڑے بڑے اجلہ علماء اور فضلاء تیار ہوئے۔ کبھی اسپین کی طرف علم منتقل ہو گیا، بڑے اکابر علماء اسپین میں پیدا ہوئے۔ کبھی فلسطین مرکز بنا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی ایک خطہ زمین کو خاص نہیں کیا کہ اسی میں اس کی برکت آئیگی۔ وہ مبداء فیاض ہے، اس کے لئے سب برابر ہیں۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی وہاں۔ اسی طرح سے خاندان بدلتے رہتے ہیں۔ کتنے عرصے بنی اسرائیل میں نبوت رہی، جب انہوں نے ناشکری و ناقدری کی تو اس خاندان بنی اسرائیل کو محروم کر کے بنی اسماعیل میں نبوت آ گئی اور ایک ہی نبوت ایسی آئی کہ ساری نبوتوں سے فائق تر ہوگئی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا فرمائے گئے اور بنی اسماعیل کو نوازا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات وکمالات بھی کسی ایک خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اول ہیں، تو صدیقیت کے ساتھ خلافت آئی، پھر فاروقیت کے ساتھ آئی، عثمانیت کے ساتھ آئی اور پھر علویت کے ساتھ آئی۔ ہر خاندان کو حصہ ملتا رہا اور ہر خطہ زمین مستفیض ہوتا رہا۔ کبھی مکہ مرکز ہے، کبھی مدینہ مرکز ہے، کبھی خراساں مرکز ہے، کبھی اسپین ہے، کبھی ماوراء النہر مرکز ہے اور کبھی ہندوستان مرکز ہے کہ مرکزیت منتقل ہوئی تو دہلی پہنچ گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے علم حدیث پھیلایا۔ پھر وہ دہلی سے ضلع سہارن پور کی طرف منتقل ہوگئی، بڑے بڑے اجلہ علماء اس میں پیدا ہوئے۔ تو مرکزیت کسی ایک خطے کے ساتھ خاص نہیں۔ مگر مرکز سب کا بہرحال ایک ہی رہے گا، مرکزیتِ حقیقی وہ صرف بیت اللہ کو حاصل ہے۔ وہیں سے علم اور کمالات کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔

برکت وہدایت کا گھر...... اس لئے فرمایا کہ: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① تو یہ گھر برکت والا بھی ہے اور ہدایت والا بھی ہے۔ برکت کا لفظ عام طور سے مادیات میں استعمال ہوتا ہے، چاہے روحانیت میں بھی استعمال کریں، مگر عام استعمال مادیات میں ہے۔ جیسے مثلاً بھائی! کھانے میں برکت ہوگئی، فلاں کی عمر میں برکت ہوگئی، فلاں کے کاموں میں برکت ہوگئی۔ تو برکت کا لفظ مادیات میں استعمال ہوتا ہے اور ہدایت کا لفظ معنویات میں استعمال ہوتا ہے۔ علم ہے، معرفت ہے اور کمالات معنویہ ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ برکت کا گھر بھی ہے اور ہدایت کا گھر بھی ہے۔ یعنی مادی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں، روحانی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

آیاتِ بینات...... ﴿فِيهِ آيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ﴾ ① آج یہاں لاکھوں انسان آئے ہوئے ہیں تو یہ کھلی کھلی نشانیاں ہیں کہ لاکھوں کو روٹی بھی مل رہی ہے، پھل بھی مل رہے ہیں۔ اس وادی غیر ذی زرع میں...... جہاں نہ سبزہ، نہ پانی، نہ نہریں، نہ باغات، لیکن ہر تازہ پھل میسّر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ: ﴿وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ② اے اللہ! اس گھر والوں کو رزق دے۔ اور رزق بھی کیا! فروٹ جو اعلیٰ ترین رزق ہے، یعنی تازہ پھل۔ اگر کہیں ملک شام میں دعا مانگتے تو اسباب طبعیہ کے مطابق دعا قبول ہوتی کہ وہاں پر تو پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں دعا مانگی، جہاں نہ سبزہ نہ پانی! لیکن دنیا بھر کے تازہ پھل موجود اور ہر ملک کے موجود، اور ہر شخص ان سے مستفید۔ دس بیس ہزار کا مجمع ہو، گرانی الگ ہو جاتی ہے، جھگڑے اور نزاعات الگ ہوتے ہیں، ﴿فِيهِ آيٰتٌ بَيِّنٰتٌ﴾ ③ کھلی کھلی نشانیاں ہیں، رزق بھی مل رہا ہے، جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔ اور لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ عرفات میں تو ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، جو چودہ پندرہ لاکھ آدمی ہوتے ہیں (اور یہ تعداد روز افزوں بھی ہے)۔ لیکن سانس کی آواز نہیں ہوتی، ہر شخص اپنے کام میں لگا ہوا ہے، ہر شخص اپنے مرکز کی طرف متوجہ ہے۔ کوئی آواز ہو، کوئی گفتگو ہو، کوئی جھگڑا ہو...... بالکل بھی نہیں۔ ایک ایسا سکونِ محض ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا جتنا میدان عرفات کے لاکھوں آدمیوں میں سکون ہوتا ہے۔ تو کیا یہ آیات بینات میں شامل نہیں ہے۔

قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی...... انسان میں دو ہی قوتیں ہیں، جن سے ساری معصیتیں پھیلتی ہیں، ایک قوتِ شہوانی اور دوسری قوتِ غضبی۔ ایک سے فواحش ومنکرات پھیلتے ہیں اور دوسری سے مار دھاڑ، جھگڑے اور ٹنٹے پھیلتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مطاف کے اندر عورت مرد مخلوط ہو کر طواف کرتے ہیں، کندھے سے کندھا لگ رہا ہے، صرف یہی نہیں کہ مرد کو ادھر توجہ نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت پیدا ہوتی ہے کہ عورت کیوں سامنے آ گئی۔ تو میں کہتا ہوں کہ ایک (باطل) جذبے کو سرد کر دینا، کیا یہ آیات بینات میں داخل نہیں ہے! یہ اللہ کی کھلی نشانی ہے ورنہ مرد کو عورت کی طرف طبعی کشش ہوتی ہے، لیکن سینکڑوں عورتیں موجود، کندھے سے کندھا، کمر سے کمر لگتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ رغبت نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت بھی ہوتی ہے کہ یہ کہاں بیچ میں آ گئی! اور ہماری طاعت وعبادت کے درمیان خلل انداز ہو گئی۔ تو دلوں کا بدل ڈالنا بلاشبہ آیات بینات میں داخل ہے۔

یہی قوت غضبی کا حال ہے، ورنہ اتنے جھگڑے جھیلے ہوتے کہ حکومت کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا، جگہ جگہ لڑائیاں ہوتیں، لیکن کہیں لڑائی نہیں، حتیٰ کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے، خلاف طبع امور پیش آ رہے ہیں۔ اور

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷.

② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۶.

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷.

لاکھوں آدمیوں میں مُتَفَقِّہ فی الدین علماء تو نام کو ہیں زیادہ تو جہلاء ہیں، لیکن جھگڑے کا نشان نہیں۔ اور یوں کبھی اتفاق سے ہو جائے تو بندہ بشر ہے، انسان ہے! کہیں ہو جائے، لیکن جتنا طبعًا ہونا چاہئے تھا، قطعًا اس کا نشان نہیں۔ تو قوتِ غضبی بھی ساکن ہے اور قوتِ شہوانی بھی ساکن ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ باطنی طور پر بھی امن کا گھر ہے۔ تو اندر بھی امن ہے اور باہر بھی امن ہے اور قلوب کے اندر بھی امن ہے۔ قلبی اور نفسانی قوتوں کو وہاں اتنا پامال کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں نہیں لگتیں۔ خدا کی ذات بابرکات کی اطاعت وعبادت اور روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ تو ﴿فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ﴾ ① میں رزق کا ملنا، جھگڑوں کا نہ ہونا بھی داخل ہے، شہوانی امور کا مٹنا اور نہ ہونا، یہ بھی داخل ہے۔ خالص قلبی اور قالبی امن ہے، باطنی بھی اور ظاہری بھی ہے۔ ﴿وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا﴾ ② جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا۔ تو امن فقط اسی کو نہیں کہتے کہ جان بچ جائے، امن اسے بھی کہتے ہیں کہ آدمی نفس سے بچ جائے، شیطان کے رذیلوں سے بچ جائے، نفس وشیطان کی مکاریوں سے بچ جائے۔ اور یہاں سبھی چیزوں سے بچاؤ ہو رہا ہے تو ''آیات بیّنات'' ظاہر میں بھی نمایاں، باطن میں بھی نمایاں۔ تو مکہ مکرمہ اور بیت اللہ اول عالم بھی ہے، مرکز عالم بھی ہے اور وسط عالم بھی ہے اور ہم سب کی اصل بھی ہے۔

وسطِ عالم میں ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت...... اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں پیدا فرمایا گیا، کہ یہ دین عالمی ہے مقامی نہیں ہے کہ کسی ایک خطہ اور قوم کے لئے ہو، پوری دنیا کے لئے ہے۔ تو پھر ایسی جگہ سے آواز اٹھائی جائے کہ چاروں طرف اس کی آواز برابری کے ساتھ پھیلے، وہ مکہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے ولادت باسعادت مکہ میں ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت الی اللہ شروع کی وہ مکہ سے شروع کی، ہر طرف اس کی آواز پھیلی۔ اگر کسی ایک جانب ہوتے تو وہاں دین کا غلبہ ہوتا اور دوسری طرف اندھیرا ہوتا۔ لیکن جتنا بھی دین پھیلا ہے بہر حال چہار طرف پھیلا ہے۔ کوئی ملک خالی نہیں جس میں اللہ کے نام لیوا موجود نہ ہوں۔

پھر اس کو وعدہ دیا گیا کہ ایک وقت آ رہا ہے کہ پورے عالم میں یہی ایک دین ہو جائے گا۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّآ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِیْلٍ ③ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر، نہ کوئی اینٹ پتھر کا گھر اور نہ کوئی کپڑے اور چمڑے کا خیمہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا، رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر مانے۔ جبر کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان گلے پر تلوار رکھیں گے کہ کلمہ قبول کرو، اس کی تو ممانعت ہے: ﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ﴾ ④ دین میں کوئی اکراہ (جبر) نہیں۔ ﴿اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ ⑤۔ اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ دین قبول کریں! تو دین جبری چیز نہیں۔ اس لئے اسلام میں اکراہ جائز

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷. ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷. ③ المستدرک للامام الحاکم، ج: ۱، ص: ۲۶۴. ④ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۶. ⑤ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الایۃ: ۹۹.

نہیں...... پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ ''بِــذُلِّ ذَلِیــلٍ''!!! یعنی دنیا میں چہار طرف دھکے کھا کھا کے اسلامی اصول مجبور کر دیں گے کہ انہیں میں پناہ لی جائے ،اس کے سوا پناہ گاہ کوئی نہیں رہے گی ، مجبور ہو کر سب اس کی طرف آئیں گے۔

ہر ایک کو اسلامی اصول بالواسطہ یا بلاواسطہ تسلیم کرنا...... بادشاہوں میں عموماً گدی نشینی ہوتی تھی ، خاندانوں میں اس کی وراثت چلتی تھی ، کئی کئی صدیوں تک ایک ہی خاندان حکومت کرتا تھا۔آج بین الاقوامیت غالب آئی تو بادشاہتیں اور اس کی حکومتیں ختم ہونا شروع ہو گئیں۔''انتخابِ اصلح'' کا اصول آیا کہ جو تم میں بہتر ہو اس کو امیر بناؤ۔یہ الگ چیز ہے کہ بہتری کا معیار کیا تجویز کیا گیا۔اسلام میں بہتری کا اصول یہ ہے کہ جو فاضل ہو، متقی ہو، متوجہ الی اللہ ہو وہ اصلح ہے ،جس کو خلیفہ کہتے ہیں۔لوگوں نے کہا: جو مالدار زیادہ ہو، یا کہا کہ جس کے ساتھ ووٹ زیادہ ہوں۔یہ تو الگ چیز ہے، الحاصل ''انتخاب اصلح'' کا اصول رائج کرنا پڑا۔جیسے کہ عرف عام میں مشہور ہے کہ سب بادشاہتیں ختم ہو جائیں گی ،بس دو بادشاہتیں باقی رہیں گی ،ایک انگلستان کی اور ایک جو تاش میں بادشاہ ہوتا ہے۔انتخابِ اصلح اسلام کا اصول نہیں تو اور کیا ہے! انتخاب اصلح یعنی صالح ترین امیر مقرر کرو۔اسلام نے یہ اصول دیا ہے۔وہاں نہ خاندانیت تھی ، نہ قبائلیت تھی۔باقی چاہے وہ اتفاق سے خاندانی بھی ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں، خاندان کی بالکل نفی نہیں کہ اچھے خاندان کی طرف جانا ہی نہیں۔اگر خاندان میں ہی کوئی اصلح پیدا ہو جائے ،کوئی صالح ترین فرد ہو تو سبحان اللہ! دونوں باتیں حاصل ہو جائیں گی۔مگر مقصودِ اصلی یہ ہے کہ امیر صالح اور مصلح ہو۔بہر حال انتخاب ہوا۔تو انتخابِ اصلح کا اصول آیا۔آج لوگ انتخاب کرنے پر مجبور ہیں۔انہیں اس کے علاوہ کہیں پناہ نہیں مل سکتی ،ایک سلسلہ چل پڑا۔

اسی طرح وراثت کا قصہ ہے۔بہت سی اقوام میں بیٹیوں کو وراثت نہیں ملتی تھی۔اسلام نے بیٹے اور بیٹیوں کا حق رکھا۔البتہ فرقِ مراتب ضرور قائم رکھے۔مگر جس طرح بیٹا باپ کا وارث ہے، بیٹی بھی وارث ہوگی۔بعض اقوام میں بیٹیوں کی بالکل وراثت نہیں تھی۔ہندوستان میں بعض قوموں کی عورتوں نے ایجی ٹیشن برپا کیا اور انہوں نے اسمبلی کے اردگرد دھاوا بولا کہ: جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں، اسی کی اولاد ہم لڑکیاں بھی ہیں۔کیا وجہ ہے کہ ہمیں میراث نہ ملے! آخر بالکل مجبور ہو کر گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑا اور وراثت میں ان کو حصہ دار بنایا۔اس قانون کے بنانے میں اقوام نے کدھر رجوع کیا! ان کے ہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کو لے کر اپنے الفاظ میں ادا کر دیا اور کیا کہا جائے گا!۔تو لوگ اسلام کا نام نہیں لیتے مگر اس کے اصول اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

ہندو گورنر کے ایم منشی کا تسلیمِ حق...... کے ایم منشی جو یوپی کا گورنر تھا،اس نے ایک جلسہ میں اپنا پیغام بھجوایا۔میں بھی اس جلسہ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔اس کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس نے معذرت کی کہ حکومت کے کام بہت پڑے ہوئے ہیں، میں نہیں آسکتا، میں اپنے بجائے اپنا پیغام بھیجتا ہوں۔سیرت کا جلسہ

تھا، وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا، اس کے دو جز تھے۔

پہلا جزیہ تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب اور فضائل اس نے بیان کئے اور ایسے بیان کئے کہ شاید کوئی مسلمان بھی اتنا نہ بیان کرے۔ اس نے کہا: دنیا میں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں تو وہ سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری کوئی نہیں، کامل اور مکمل ہستی ایک ہی پیدا ہوئی۔ یہ تو ابتدائی جز تھا۔ دوسرا جزیہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلامی اصولوں پر بنایا ہے ہم نے عدل قائم رکھا، مساوات قائم رکھیں، اقوام کے حقوق برابر رکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حقوق کو چور اور ڈاکو مارنے لگیں اور نہ پہچانیں، مگر قانون میں حقوق برابر رکھے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انکے ہاں اس قسم ...... کے اصول نہیں تھے آخر مجبور ہو کر اسلام کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں سے اصول لئے۔

گاندھی جی کا صدیق وفاروق کی حقانیت کے آگے سرنگوں ہونا...... ہندوستان میں جب کانگریس کی عارضی حکومت قائم ہوئی تھی تو گاندھی نے کہا تھا کہ: ''ہمارے وزراء اگر عالمی وقار چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ چھوت چھات کو ختم کریں، نسلی امتیازات کو ختم کریں، اونچ نیچ ختم کریں اور...... صدیق وفاروق کا نمونہ اختیار کریں''۔ گاندھی کی قوم نے برا مانا اور کہا کہ آپ کو صدیق وفاروق ہی کا نمونہ ملتا ہے! ۔ اس نے کہا:

''بھئی! کسی اور قوم میں تم نمونہ بتادو۔ جب نہیں ملا تو اب میں کس کا نام لوں! یہ ساری مثالیں انہوں نے ہی قائم کی ہیں کہ حکومت بھی قائم اور درویشی بھی قائم، دبدبہ بھی قائم اور ساتھ میں پیوندوں کی چادریں بھی قائم اور زہد و قناعت بھی قائم۔ تم کوئی حکومتیں مثال میں بتلادو کہ نظام عالم بھی قائم ہے اور سارے درویش کے درویش ہیں''۔

خلفائے راشدین نے کوئی سونے چاندی کے محل نہیں قائم کرائے، یہی سادہ زندگی جو عوام الناس کی تھی، وہی زندگی ان کی تھی۔ مگر پورے عالم میں دینِ حق کا ایک دبدبہ پھیلا دیا۔ تو قوم نے برا مانا کہ تمہیں یہی نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا جب نمونہ نہیں ہے تو میں کسے پیش کروں، تم برا مانو یا بھلا! بہر حال مطلب یہ ہے کہ لوگ اسلام کی طرف جھکیں گے، مسلمان ان کے گلے پر کوئی تلوار نہیں رکھیں گے کہ اسلام قبول کرو، بلکہ اصول مجبور کریں گے کہ اسلام کی طرف آؤ، زمانہ مجبور کرے گا۔ دوسری طرف پناہ نہیں ملے گی، انہیں اصول میں پناہ ملے گی۔ اس لئے کہ یہ فطری اصول ہیں، تو قبول کرنے کیلئے لامحالہ مجبور ہوں گے۔

فیضانِ نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا، فرمایا: ''لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ'' الخ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ نہیں رہے گا مگر اس میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا (1) ''فَیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر پورے عالم میں ایک دین ہو جائے گا۔

(1) المستدرک للامام الحاکم، ج: ۱، ص: ۲۶۴.

بعض حضرات شرّاح فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ: ''فَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ'' حدیث کا جز ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے مگر بہر حال مقولہ حق ہے کہ جب روئے زمین کے ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔

یہ مکہ کی آواز تھی، سارے عالم میں پھیلنی چاہیے تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی وہ آواز مرکز سے چہار طرف پھیلی اور اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ مگر وہ تکمیل کیفیت کے لحاظ سے تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ افراد تیار فرما دیئے، جو نبی تو نہیں تھے مگر آثارِ نبوت سب کے اندر موجود تھے۔ ''عُلَمَاءُ أُمَّتِيْ كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ......'' ① وہ انبیاء علیہم السلام تو نہیں تھے، مگر حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام کئے جو انبیاء کرتے ہیں۔ جو جس خطے میں پہنچ گیا اس خطے کو ایمان وعلم اور نور سے رنگ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تو بڑی ہے۔ آئمہ مجتہدین میں سے جو جہاں بیٹھ گیا اس نے اس خطے کو علم ومعرفت اور ایمان سے رنگ دیا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خراسان میں تھے، انکا مذہب پھیلا تو خراسان، ہندوستان، افغانستان میں حنفیت ہو گئی، اس راستے سے کروڑوں آدمی جنت میں پہنچ گئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ابتدائی قیام حجاز میں تھا اور وفات کے وقت مصر میں قیام تھا تو مصر وحجاز میں اکثریت شوافع کی ہے۔ غرض جو امام جہاں بیٹھ گیا اس نے علم وتفقہ اور کمالاتِ دینی سے اس خطہ کو رنگ دیا۔ تو یہ حضرات انبیاء نہیں تھے لیکن کام وہ کیا جو نبیوں کا کام تھا۔ ایک نبی آیا تو علاقہ کو ایمان سے بھر دیا۔ اس امت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام میں ایسے افراد پیدا ہوئے کہ کارہائے نبوت انجام دیئے۔ طاقت ایک ہی نبوت کی تھی اور وہ ہے ختم نبوت! اس کے نیچے آ کر علماء نے کام کیا۔ فیضان ایک نبوت کا ہے، اس کے تحت میں علوم وکمالات دنیا میں پھیلے...... اور پھیلتے ہی رہیں گے۔ تو عہدِ نبوت میں دین مکمل ہوا اور چہار طرف پھیلا...... مگر کیفیت کے لحاظ سے، کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ایسے نمونے تیار ہو گئے کہ شاید ہر صحابی کسی ایک نبی کی نسبت پر ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات جامع النّسب ہے اور آپ کی تربیت سے وہ نسبتیں آگے پھیلیں تو کیفیت کے لحاظ سے دین مکمل ہو گیا۔

مگر آواز مرکز کی یعنی مکہ کی تھی، اسے سارے عالم میں پھیلنا تھا، تو دورِ عیسوی میں اور دورِ مہدوی میں جو کہ آخری دو مجدد ہوں گے، اس وقت کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾ ② پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ اسلام واحد کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا اور اسلام سارے عالم میں پھیل جائے گا۔ تو کمیت یعنی تعداد کے لحاظ سے اخیر میں تکمیل ہو گی۔ کیفیت کے لحاظ سے پہلے تکمیل ہو چکی ہے۔ تو مکہ کی آواز

① علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: قال شیخنا ومن قبله الدمیری والزرکشی: انه لا اصل له، زاد بعضهم ولا یعرف فی کتاب معتبر دیکھئے: المقاصد الحسنة للسخاوی ج: ۱ ص: ۴۵۹. ② پارہ: ۹، سورة الانفال، الآیة: ۳۹.

جو مرکز سے اٹھی تھی بے اثر نہیں جا سکتی تھی، کیفاً بھی پہنچ گئی اور جب کمیت کے لحاظ سے پورے عالم میں دین واحد ہو گیا تو مقصد دنیا پورا ہو جائے گا کہ عبادت کا کارخانہ مکمل ہو چکا، اس کے بعد پھر قیامت کا دور ہے، چنانچہ یہ عالم ختم کر دیا جائے گا۔ میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مکہ سے اٹھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ خیر و برکت کے بعد پوری امت آپ کی قائم مقام ہے تو اس امت کا فرض بھی یہ ہے کہ اس آواز کو آگے بڑھائے اور مرکز سے چلائے۔

قاری طیب صاحب کے وفد کی شاہِ حجاز ملک عبدالعزیز سے ملاقات...... تقریباً انچاس برس کا عرصہ ہوا ہے، جب پہلی دفعہ یہاں (کعبہ مکرمہ میں) میری حاضری ہوئی ہے۔ اس وقت ملک عبدالعزیز بن سعود مرحوم زندہ تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا کہ مطاف میں ان پر کسی نے حملہ کیا، اللہ نے ان کو بچا لیا۔ تو ہندوستانی زعماء کی طرف سے مبارک بادی کا جلسہ منعقد کیا گیا کہ مَلِک کو مبارک باد دیں کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی اور آپ کو محفوظ رکھا۔ فندق مکہ میں یہ جلسہ ہوا۔ اور تقریباً تین چار سو کے قریب حضرات، جن میں علماء زعماء تجار اور امراء سب جمع تھے۔ اس حج کو لوگ حج العظماء کہا کرتے تھے۔ یعنی ہر ملک کے بڑے بڑے لوگ اس حج میں شریک ہوئے۔ خیر وہاں جلسہ ہوا تقریریں ہوئیں، تجویز پاس ہوئی اور ایک وفد گیارہ آدمیوں کا تیار کیا گیا، جس میں مفتی نعیم صاحب مرحوم لدھیانوی، حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری، مولانا آزاد سبحانی مرحوم وغیرہ گیارہ آدمی تھے اور انہوں مجھے رئیس الوفد بنا دیا کہ جا کر مَلِک کی خدمت میں تجاویز پیش کریں کہ کل جلسہ ہوا تھا، یہ اس کی کاروائی ہے۔ مَلِک نے اجازت مرحمت فرمائی اور بہت ہی توقیر و عزت کی۔

انہوں نے یہ فرمایا کہ: وہ جو گیسٹ ہاؤس ہے، مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ...... وہاں علما کو نہ بٹھایا جائے، اس لئے کہ وہاں میں آؤں گا تو علماء میری تعظیم کو کھڑے ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ خود ان کی تعظیم کروں، وہ میری تعظیم کو کھڑے نہ ہوں۔ لہٰذا محل میں جو ان کا اپنا کمرہ تھا اس میں بلوایا، تا کہ جب علماء آئیں تو میں تخت سے اتر کر ان کی تعظیم کروں چنانچہ ہم اندر پہنچے اور ملک اپنے شہ نشین سے اترے اور انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا، اپنا تعارف کرایا، خیر یہ کاروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد اخیر میں میں نے تجویز پیش کی کہ:

''اس وقت کوئی عیسائی حکومت ایسی نہیں، جس کے ہاں تبلیغی مشن نہ ہو۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس کی حکومتیں کروڑوں روپے اس پر خرچ کر رہی ہیں اور جگہ جگہ ملکوں میں تبلیغی مشن کے افراد پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر حکومتِ حجاز اس قسم کا اقدام کرے اور اسلامی تبلیغ کے لئے یہاں سے وفود روانہ کرے تو سارے مسلمانوں کے لئے ایک عزت افزائی کا سامان ہوگا، حکومت کی محبت بھی دلوں میں قائم ہو گی۔ اور اس آواز میں بھی اثر ہوگا۔ اور ہندوستان ...... جب وفد آئے گا...... تو میں نے عرض کیا: سارے علماء اس کی حمایت اور اسکے تعاون کے لئے کھڑے ہو جائیں گے جہاں جہاں آپ وفد بھیجیں گے''۔

یہ ہم نے تجویز پیش کی۔ ملک نے اس کو بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ بالکل مناسب تجویز ہے۔ مگر یہ کہا کہ ابھی اس کا وقت نہیں، اس لئے کہ مثلاً برطانوی حکومت ہے، ہم اسلامی تبلیغ کے لئے وفد بھیجیں گے۔ وہ کہیں گے اس میں کوئی سیاسی چال ہے، تو تبلیغ تو ایک طرف رہ جائے گی اور سیاسی قصے آ جائیں گے پھر اس میں کہیں شکوک وشبہات اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں۔ مگر تجویز معقول ہے وقت آ رہا ہے اس کے اوپر عمل درآمد ہوگا، وقت کا انتظار کیا جائے۔

ممکن ہے یہ چیز عمل میں بھی آ جائے، کچھ سننے میں آ بھی رہا ہے کہ یہ تجویز عمل میں آ رہی ہے۔ بہرحال وہ حکومت کا قصہ ہے۔ جس طرح حکومت نے حج کے سلسلے میں احسانات کئے ہیں، حرم شریف کی توسیع اور حج کے انتظامات کئے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک چیز ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت کی طرف توجہ ہو۔ مگر بہرحال جب تک حکومت متوجہ نہ ہو اس وقت تک علماء کا کام ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کو چلائیں اور اس کو مرکز بنایا جائے۔

اہلِ مکہ کے بجائے تبلیغی جماعت نے دین کا کام اٹھایا...... الحمد للہ ہماری تبلیغی جماعتوں نے اس کو مرکز بنالیا ہے۔ بہت سے افراد ہیں جو ہجرت کر کے یہاں آ گئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کام جاری ہے۔ دیہات تک میں کام پھیلا دیا ہے۔ باقی وہ احق تھے اسکے...... کہ یہ کام پھیلاتے۔ یہ کام اس کا مستحق تھا کہ یہ کام یہیں سے جاری ہو۔ برکت اور وسعت کا اس میں اثر ہے۔ مکہ کے لوگ جب باہر ملکوں میں پہنچیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ تو قلوب پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ جو جماعتیں پہنچتی ہیں اس میں عرب ہوتے ہیں تو ہندوستان والے اس سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں ایک نیت پیدا ہوتی ہے کہ بھئی جب عرب تک تبلیغ کرنے آ گئے تو ہم ہی بیٹھے ہیں، ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بھی تبلیغ کریں، اس کا اثر پڑتا ہے۔ بہرحال تبلیغی جماعت نے یہاں بھی اور دنیا کے ہر ملک میں بحمد اللہ مراکز قائم کئے۔ حجاز میں بھی مرکز قائم ہے، مدینے ومکہ میں بھی ہیں اور یہاں سے مضافات میں بھی جماعتیں جاتی ہیں اور بہت سے لوگوں کے اندر یہ سلسلہ پھیل گیا ہے۔ تو واقعی مکہ ہی اس کا احق تھا کہ یہیں سے آواز اٹھتی۔

شام مرکزِ سیاست ہے...... آج مکہ مکرمہ جس طرح بین الاقوامی عبادت گاہ ہے اسی طرح بین الاقوامی تجارت گاہ بھی بن گیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی چیز یہاں ملتی ہے اور کہیں ملے نہ ملے۔ تو بین الاقوامی تبلیغ گاہ بھی یہاں ہونی چاہیے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو اور چلے اور آثارِ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر دور میں عرب بھی کھڑے ہوں گے۔

انہی کے ہاتھوں پر قوت وشوکت کے ساتھ یہ چیز آگے بڑھے گی اور باطل قوتیں بھی انہی کے ہاتھوں ٹوٹیں گی۔ مہدی ہیں وہ بھی عربی ہیں اور حسنی ہوں گے، ان کے زمانے میں مغرب کی قوتیں ٹوٹیں گی، بیعت بھی انہی کے ہاتھ پر مکہ ہی میں شروع ہوگی اور وہ شام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔ اس لئے کہ وہ مرکزِ سیاستِ اسلام ہے۔ حجاز مرکزِ عبادت بتایا گیا ہے، عبادت کے لئے امن کی ضرورت ہے، فتنہ ہوتا ہے تو آدمی نہ تلاوت کر سکے نہ ذکر

کر سکے، عبادت کے لئے سکون ضروری ہے۔ جب اللہ نے اس کو مرکزِ عبادت بنایا تو امن کا بھی مرکز بنا دیا: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ ① . اور ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ ② . پھر اس کو امن گاہ بھی عالمی بنایا، اس لئے کہ یہ عبادت گاہ تھی اور عبادت فتنوں کے اندر نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانوروں اور درختوں تک کو پناہ ہے، بلکہ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں کاٹی جا سکتی۔ یہاں کے پتھر وغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی یہ پسندیدہ نہیں سمجھا گیا کہ آدمی اٹھا کر لے جائے کیونکہ یہاں امن ہے، محرم کے لئے شکار تک ممنوع ہے۔ تو جانوں کو بھی پناہ، مال کو بھی پناہ، یعنی امنِ کامل۔ جب اتنا امن ہے، تبھی عبادت کا کارخانہ یہاں چل سکتا ہے۔ اور سیاست کے لئے تعلقات، روابط، جوڑ توڑ اور اونچ نیچ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو عبادت کی خیر سلّا ہو جاتی۔ اسلام نے شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا ہے، حجاز مرکزِ عبادت ہے، اصل اصول وہی ہے۔ لیکن جب جنگ کرنی ہو، فوجیں بھیجنی ہوں تو وہ شام سے ہو۔ تو شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا۔

مصر مرکزِ عسکریت ہے...... اور مصر کو مرکزِ عسکریت قرار دیا کہ وہاں فوجی قوت جمع رکھو۔ شام اور حجاز کو مہاجر بنایا، کوئی ہجرت کرے تو شام میں اور حجاز میں کرے۔ مصر کو ہجرت گاہ نہیں بنایا، وہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اس لئے کہ فوج میں جو لوگ بھرتی ہوتے ہیں وہ ہجرت کر کے وطن چھوڑ کے تھوڑا ہی جاتے ہیں، وہ تو طاقت کو فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مصر کو فوجی طاقت بناؤ اور لوگ مدد پہنچائیں مگر ہجرتیں کر کے وہاں نہ جائیں۔ طاقت ان کے وہاں پہنچتی رہے۔

اس لئے کہ مصر درحقیقت یورپ کے لئے ایشیا کا دھانہ ہے، اور ایشیاء کے لئے یورپ کا دھانا مصر ہے۔ تو ادھر کے لئے ادھر دھانا اور ادھر کے لئے ادھر دھانہ۔ اس دھانے پر جو غالب ہوگا اسی کے اثرات غالب ہوں گے۔ اگر ایشیا مصر پر غالب ہے تو یورپ تک اثرات پہنچیں گے۔ اور اگر یورپ نہر سویز اور مصر پر غالب ہو گیا تو پورے ایشیا پر یورپ کے اثرات پہنچیں گے۔ اس لئے احادیث سے اشارے ملتے ہیں کہ مصر کو قوت گاہ بناؤ، مرکز عسکریت قرار دو، شام کو مرکزِ سیاست قرار دو، یہاں شام میں امن رہنا چاہئے، وہاں مصر میں جنگیں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس جنگوں کے بیچ میں رہا ہے، کبھی ہم غالب، کبھی یہودی غالب، کبھی نصرانی غالب، كُلَّمَا نَصَبَتْ حَرْبٌ نَصَبَتْ اُخْرٰى ایک جنگ ختم ہوتی ہے، دوسری چھڑ جاتی ہے۔ وہ مرکزِ عبادت بنتا تو عبادت کا کارخانہ کبھی نہ جم سکتا، رات دن جنگیں اور جوڑ توڑ رہتا۔ تو عبادت کا مرکز حجاز کو قرار دیا، اسے امن بخشا، سیاست کا مرکز شام کو قرار دیا کہ یہاں لڑتے مرتے رہو، جو بھی غالب آ جائے۔

اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے...... بہر حال دین کی تبلیغ، یہ بھی امن کی چیز ہے، بدامنی میں تبلیغ بھی مشکل ہوتی ہے، جیسے نماز پڑھنی مشکل۔ تو یہ ملکِ (حجاز) زیادہ احق ہے کہ یہ مرکزِ تبلیغ بنے۔ یہیں سے اللہ کے دین کی آواز اٹھے،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵ . ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۶۷.

جیسا کہ یہاں سے دین اٹھا ہے۔اور خدا کا شکر ہے کہ تبلیغی حضرات نے اس کو سمجھا ہے اور کام چل رہا ہے۔دیہات تک ان کے تعلقات اور روابط ہیں۔یہیں سے جماعتیں ہندوستان اور دوسری جگہ بھی جانے لگی۔تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کام میں شرکت کر کے قوت پہنچائیں،اس لئے کہ اس کی قوت سے ہماری قوت ہے۔اسلام کی قوت جو ہے وہ پھیلنے میں ہے،سکڑنے میں نہیں ہے۔اگر اسلام کو آپ کسی کوزے میں بند کر کے رکھ دیں وہ پھیل نہ سکے گا،اسلام کی اصلیت ختم ہو جائے گی،اسلام میں جامعیت اور پھیلاؤ ہی ہے،وہ جبھی اپنی اصلی صورت میں رہے گا جب کہ وہ دنیا کے اندر پھیلتا رہے۔"**لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِجَمَاعَةٍ**" اس کے اندر جماعتی رنگ رہنا چاہئے۔اگر یہ تبلیغی دین نہ ہوتا تو حجاز سے باہر نہ نکلتا،لیکن یہ ساری دنیا میں پھیلا ہے،یہ تبلیغ ہی کی برکت ہے۔اس لئے کہ جب یہ دین کا مرکز ہے تو تبلیغ کا مرکز بھی ہے۔اس کے لئے یہاں کے لوگوں کو زیادہ آمادہ کیا جائے کہ یہ دینی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دعوت الی اللہ کے لئے اٹھیں۔

اختتامیہ کلمات......اس واسطے میں نے یہ چند باتیں عرض کیں کہ مکہ کا اول عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ دین کے کاموں کی یہیں سے اوّلیت ہو۔اس کا مرکزِ عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہاں دین کی مرکزیت ہو۔اس کا اصل عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہیں سے چہار طرف آواز پھیلے۔

اس واسطے میں نے یہ چند چیزیں عرض کیں اور محض تعمیل حکم کے لئے عرض کیں،ورنہ میں کچھ بیمار بھی ہوں۔یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینہ اور مکہ میں ہماری جرأت تو بولنے کی ہوتی نہیں،اب زبردستی بڑے بلوائیں تو الگ چیز ہے۔مثل مشہور ہے کہ بڑا مارے بھی اور مار کر رونے بھی نہ دے۔حکم دیا کہ کرو تقریر! عذر بھی نہیں سنا جائے گا،اس لئے تعمیل حکم کے طور پر یہ چند باتیں عرض کیں،ورنہ کچھ علالت اور مقام کی ہیبت و عظمت کی وجہ سے نہ جرأت پڑتی ہے نہ ہمت ہوتی ہے۔یہ چند الفاظ بھی خود اپنی ہمت سے نہیں کہے کہ میری ہمت کام کر رہی ہو۔ممکن ہے آپ حضرات کی ہمت کام کر رہی ہو،ورنہ میں نے عرض کر دیا تھا: میرے میں جرأت نہیں،بہت سے لوگوں نے کہا کہ حرم شریف میں تقریر ہو جائے! میں نے کہا کہ تقریر کے بہت سے مواقع ہیں،حرم شریف ہماری تقریروں کے لئے نہیں،جو باعزم لوگ ہیں تقریر کریں،ہم جیسے طالب علموں کے لئے مناسب نہیں۔بہر حال تعمیل حکم کے طور پر یہ چند چیزیں عرض کیں تا کہ ایک تو مقامات کی برکت معلوم ہو جائے اور جو مقصد ہے،تبلیغ کا کام پھیلے،اس کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو جائے۔اللہ تعالیٰ اس کام کو بڑھائیں اور ہم سب کو اس کام میں لگنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔

"**اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ**"

عبادت وخلافت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْبِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ.اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ٥ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگانِ محترم!...... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ یہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی اور حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو نقل فرمایا، یہ پورا رکوع ہے جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں ہی کا ذکر ہے، ان کی نصائح میں ایک نصیحت یہ ہے جو اس وقت میں نے تلاوت کی۔ اس آیت کے سلسلہ میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی، اور نہ ہی آیت کی تفسیر کرنی ہے کہ وہ بہت لمبی چیز ہے، وقت اتنا نہیں ہے، اسی آیت سے ایک مضمون اخذ واستنباط کر کے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اور وہ دو مقاصد پر مشتمل ہوگا، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ انسان کو اللہ نے دنیا میں کیوں بھیجا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کی زندگی کے کیا مقاصد متعین ہیں؟ اور ہم ان مقاصد کو کس حد تک انجام دے رہے ہیں۔

تمہید...... ان دو مقاصد کی تفصیل سے پہلے ایک مختصری تمہید سمجھ لیجئے، تا کہ اس مقصد کا سمجھنا آسان ہو جائے، وہ یہ کہ یہ جو لمبی چوڑی کائنات آپ کے سامنے پھیلی پڑی ہے، جس میں بے انتہا طویل وعریض آسمان کا خیمہ تنا ہوا ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، زمین وآسمان کے بیچ میں ہزاروں قسم کی مخلوقات پھیلی پڑی ہیں، جمادات اور ان کی ہزاروں قسمیں، نباتات اور ان کی ہزاروں قسمیں، جانوروں کی ہزاروں قسمیں ہیں، دریا اور خشکی کے جانور، غرض جمادات، نباتات اور حیوانات یہ بہت سی انواع واقسام ہیں، جو زمین وآسمان کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں پھر آسمانوں کے اوپر ایک عظیم مخلوق ہے، جس کو ملائکہ کہتے ہیں وہ اتنے پھیلے ہوئے ہیں، جیسے حدیث میں ہے کہ:

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمٰن، الآیۃ: ۱۷.

آسمان میں چار انگلی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔ تو ان گنت ملائکہ اوپر پھیلے ہوئے ہیں، اس ساری کائنات اور مخلوقات کی انتہا عرش پر جا کر ہوتی ہے۔ عرش عظیم کے اوپر شریعت کسی مخلوق کا پتہ نہیں دیتی، وہاں خالق کی تجلیاں اور کمالات ہیں۔ صرف ایک مخلوق کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے ایک تختی اور لوح رکھی ہوئی ہے، اور وہ تختی زمین وآسمان سے بھی زیادہ بڑی ہے، اس پر لکھا ہوا ہے کہ ''اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' ① میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے رحمت آگے آگے چلتی ہے، غضب اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہے، اصل رحمت ہے، غضب اس کے تابع ہے، یہ ایک دستاویز لکھی ہوئی ہے، اس مخلوق کا تو نشان ملتا ہے باقی خالق کی تجلیات وکمالات اور اس کی صفات عرش کے اوپر پھیلی ہوئی ہیں تو زمینیں، آسمان وزمین کے درمیان فضا، آسمان، جنت، عرش اور کرسی پھر تجلیات ربانی کا یہ سلسلہ ہے، تو بڑی لمبی چوڑی کائنات ہے۔

انسان میں مخلوقات کے نمونے...... لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس ساری لمبی چوڑی کائنات کہ جو کرڑوں میلوں پر پھیلی ہوئی ہے، ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دیا آجکل کے سائنس دانوں کے قول کے مطابق چاند زمین سے ستر لاکھ میل دور ہے، جس تک جانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے، (اب تو ان کا دعوی ہے کہ وہ پہنچ بھی چکے ہیں) پھر اس سے کتنا اوپر آسمان ہے، پھر اوپر کتنے آسمان اور کتنی جنتیں ہیں، تو لاکھوں کروڑوں میل پر مشتمل ہے، لیکن جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کی جگہ میں آ گئی، اور وہ ڈیڑھ گز کی جگہ کیا ہے؟ وہ آپ ہیں ساری کائنات کو اللہ نے انسان میں جمع کر دیا، جس میں زمین بھی ہے، آسمان بھی ہیں، پہاڑ بھی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات بھی اس کے اندر جمع ہیں۔

انسان کو دیکھا جائے تو اس میں مٹی بھی ہے، پیدا ہی زمین سے ہوا، اسے مشت خاک ہی کہتے ہیں کہ ایک مٹھی خاک سے ہمارا بدن پیدا کیا گیا تو یہ ہمارا بدن زمین کا ایک تودہ ہے، روح نے اس مٹی کو سنبھال رکھا ہے روح نکلنے کے بعد پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے تو اصل میں مٹی ہے، اور اس زندگی کی حالت میں بھی اس سے مٹی نکلتی رہتی ہے، اگر آپ روزانہ غسل نہ کریں، تو جب بدن پہ ہاتھ پھیریں گے، بدن سے سیاہ بتیاں اتریں گی، وہ مٹی اور کوڑا کباڑ نہیں تو کیا ہے؟ تو بدن خاک کا ہے اور خاک ہی اس سے چھنتی ہے۔

اگر خارش ہو جائے، تو سارے بدن سے بھوسی سی جھڑتی ہے، جیسے مٹی جھڑ رہی ہو، تو آج بھی انسان مٹی کا تودہ ہے مرنے کے بعد یہ مٹی بکھر جاتی ہے، گویا انسان کے اندر زمین موجود ہے، اور وہی خاصیت اس زمین کی ہے، جو عام زمین کی ہے۔ اگر آپ اس میں غور کریں، آپ کی اس زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے ہزاروں چھوٹے بڑے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں یہ جو انسان میں ہڈیوں کا سلسلہ ہے یہ پہاڑیوں کی مانند ہے، کوئی بڑی، کوئی چھوٹی، کوئی لمبی، کوئی چوڑی، جیسے پہاڑ مختلف ہوتے ہیں۔ تو یہ ایک سلسلہ ہے جو اس میں پھیلا ہوا ہے، اسی طرح اگر آپ غور کریں، جیسے دنیا کی زمین میں درخت، گھاس اور نباتات اگتے ہیں، ہماری زمین میں بھی نباتات اگے

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب و کان عرشه علی الماء، ص: ۴۳۲.

ہوئے ہیں، کہ بہت ہی قریب قریب درخت ہیں، تو سر ایسا ہے، جیسے گھنا جنگل، کہ سینکڑوں درخت اس میں قریب قریب اگے ہوئے ہیں۔ کوئی زمین ایسی ہوتی ہے کہ اس میں درخت دور دور ہوتے ہیں۔ جیسے عام بدن کے اوپر رواں، یہاں بال دور دور ہیں، کوئی زمین کا حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہی نہیں ہوتا، ہتھیلیوں پر کچھ بھی نہیں اگتا، ناک کے اوپر کوئی بال نہیں اگتا تو اور کچھ حصہ وہ ہے کہ اس میں سر سے بال اگتے ہی نہیں غرض ہمارے بدن کی زمین میں مٹی، پہاڑ اور نباتات کا سلسلہ بھی ہے۔

اور اس میں حیوانات بھی ہیں آجکل کے ڈاکٹروں کی تحقیقات تو یہ ہیں کہ خون میں جراثیم (چھوٹے چھوٹے حیوانات) ملے ہوئے ہیں، جو خوردبین سے دکھلائی دیتے ہیں، ویسے نہیں بدن کے ہر حصے میں نئے نئے رنگ کے جانور ہیں، ان کے مجموعے سے خون بنا ہے، وہ مر جائیں تو انسان مر جاتا ہے، تو پورے بدن میں جراثیم پھیلے ہوئے ہیں جیسے آپ کی زمین میں مختلف صوبے ہیں، کسی صوبے میں خاص قسم کے جانور، کہیں اور قسم کے جانور، کہیں کچھ ہوتا ہے کہیں کچھ تو یہ ہاتھ اور پیر اس زمین کے صوبے ہیں، اس میں مختلف قسم کے جانور ہیں وہ حیوانات مختلف شکلوں کے ہیں، اس سے امراض بھی پیدا ہوتی ہیں، اگر ان جراثیم کو مار ڈالا جائے تو ان سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

انہی جراثیم سے زندگی بھی ہے، انسان کے مادے (خون) میں پھیلے ہوئے ہیں اور سر میں بھی تو کبھی جوئیں پڑ جاتی ہیں، آدمی ان کو پکڑتا ہے اور ناخن پر رکھ کر مارتا ہے یہ ایسے ہے جیسے جنگل میں مختلف جانور پھرا کرتے ہیں تو جیسے اسی زمین سے جانور پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں کھپ بھی جاتے ہیں بعض دفعہ معدے میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، وہ کیڑے ساری غذا کھاتے رہتے ہیں، انسان کمزور ہوتا رہتا ہے بدن کو نہیں لگتی، تو سر میں جوئیں اور معدے میں کیچوے پیدا ہو جاتے ہیں، زخموں میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں بہر حال انسان کی زمین میں مختلف حیوانات ہیں، جو چل رہے ہیں تو جیسی کائنات باہر کی ہے ویسی ہی ہمارے اندر کی کائنات بھی ہے، کہ زمین، پہاڑ، نباتات اور مختلف قسم کے حیوانات بھی، شکل وصورت سے بھی مختلف، پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔

پھر جیسے آپ کی اس دنیا میں وقت آنے پر بارشیں ہوتی ہیں، اس بدن میں بھی بارش ہوتی ہے جب گرمی آتی ہے تو پسینہ نکل رہا ہے، ایسے ٹپک رہا ہے، جیسے بارش ہو رہی ہو پھر جتنے قسم کے پانی زمین میں ہیں، اتنے ہی قسم کے انسان کے اندر ہیں، دنیا میں بعض جگہ پانی کے گرم چشمے نکلتے ہیں ہندوستان میں منڈیل کے ضلع میں بعض جگہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہیں، لوگ اس پانی کو ٹھنڈا کر کے غسل کرتے ہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے منوں آگ میں اسے پکایا گیا ہو بعضے چشمے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے ہیں سمندر کا پانی کڑوا ہے بعض جگہ پانی میں ترشی ہوتی ہے۔ انسان کے بدن کے اندر بھی ایسے ہی ہے منہ کے اندر اللہ نے میٹھا چشمہ جاری کر رکھا ہے، اگر منہ میں کڑوا پانی ہوتا، آدمی کی زندگی تلخ ہو جاتی تو نہایت شیریں قسم کے پانی کا چشمہ زبان سے بہہ رہا ہے اسی پانی کی مدد

سے غذا اندر پہنچتی اوراسی کی مدد سے ہضم بھی ہوتی ہے آنکھوں سے جوآنسو ٹپکتے ہیں، وہ نمکین پانی ہے، کبھی زبان پر آنسو کا پانی لگ جائے، تو نمک کا سا مزا آتا ہے تو آنکھوں کے اندر نمکین چشمہ جاری کر دیا ہے پتے میں دیکھو تو کڑوا پانی بھرا ہوا ہے، اس میں کڑوا چشمہ جاری ہے معدے کے اندر ترش پانی بھرا ہوا ہے، جس سے غذاء ہضم ہو رہی ہے پھر کہیں پاک پانی اور کہیں ناپاک مثانے میں ناپاک پانی بھرا ہوا ہے جسے پیشاب کہتے ہیں اور منہ میں پاک پانی بھرا ہوا ہے جسے لعاب کہتے ہیں، یہ نکلے کہ آدمی تھوکے، اس سے وضونہیں ٹوٹتا۔ پیشاب کا ایک قطرہ نکل آئے وضوٹوٹ جاتا ہے تو بدن میں پاک، ناپاک، ٹھنڈا، گرم، ترش اور میٹھا وکڑوا ہمہ قسم پانی موجود ہے برسات اس میں ہے کہ پسینہ ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، تو جواس کائنات میں ہے وہی انسان کے اندر ہے ساری کائنات انسان میں جاری ہے۔

یہاں اگر ہوائیں چلتی ہیں تو انسان میں بھی ہوائیں چلتی ہیں جیسے یہاں ٹھنڈی اور گرم ہیں، آپ جب سانس اندر کو لیتے ہیں، تو ٹھنڈی اور جب باہر کو لیتے ہیں تو گرم ہوا نکلتی ہے۔ جیسے دنیا میں بعض اوقات ہوا بند ہو جاتی ہے، آدمی دوڑا دوڑا پھرتا ہے کہ بھئی پنکھے چلاؤ، طبیعت گھبرا گئی، انسان کے بدن میں بھی بوجھ ہو جاتا ہے، معدے میں ہوا پھنس جاتی ہے، ڈاکٹروں کے پاس دوڑے دوڑے پھرتے ہیں کہ صاحب! کسی طرح سے ہوا نکال دو اگر ہوائیں بند ہو جائیں تو اندر بھی گھٹن ہوتی ہے تو انسان کے بدن میں پانی بھی ہے اور ہوا بھی اور چلنے کا ڈھنگ بھی وہی جو باہر کی زمین میں ہے۔ اسی طرح انسان کے بدن میں آگ بھی ہے کبھی آپ بدن پر ہاتھ رکھیں گے تو گرمی محسوس ہوتی ہے اگر بدن میں آگ نہیں تو یہ گرمی کا ہے کی ہے؟ اور اگر آدمی زور سے ہاتھ کو ملے، تو چنگاریاں سی نکلنے لگتی ہیں اور میل پھر دوڑ لیں، تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں آگ بھر گئی اگر اندر حرارت نہیں ہے، تو اندر کیا چیز ابلتی ہے تو آگ پانی، ہوا اندر موجود ہیں، اور ان کا عمل بھی جاری ہے۔

غرض یہ آپ کا بدن اس پوری کائنات کی طرح ایک دنیا ہے، جیسے اس میں اوپر آسمان ہے، اور نیچے زمین ہے آپ کے اندر سر آسمان کی مانند ہے اور نیچے پیر زمین کی مانند ہیں جیسے آسمان میں چاند سورج ہیں، جن کی روشنی سے آپ اس کائنات کو دیکھتے ہیں، انسان کی پیشانی پر چاند اور سورج کی طرح سے دو آنکھیں ہیں، ان میں روشنی نہ ہو، کائنات نظر نہیں آتی تو چاند، سورج اور روشنی بھی ہے پھر حکومت کا ایک نظام بھی قائم ہے ہاتھ اور پیر یہ قلب کے خادم ہیں، قلب کا ذرا اشارہ ہو، ہاتھ پیر چلنے لگتے ہیں تو پوری کائنات جیسے باہر منظم ہے، اسی طرح اندر بھی ہے قلب حاکم بادشاہ اور ہاتھ پیر اس کے خدام ہیں غرض تفصیل کہاں تک عرض کی جائے انسان کے اندر ہوا، برسات، آگ مٹی، پہاڑ، سبزہ، جانور اور موت وحیات بھی ہے سارا قصہ وہی ہے جو کائنات کے اندر ہو رہا ہے انسان کی ایک صورت یہ ہے جس کا آپ نے مشاہدہ کیا اور مثال دیکھی کہ آسمان سے زمین تک جتنے درجے کائنات کے ہیں، وہ سب اس کے اندر موجود ہیں یہ اللہ کی صناعی ہے کہ جس کائنات کو لاکھوں، کروڑوں میل میں پھیلایا ہے، جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کے انسان میں ساری کائنات کو جمع کر دیا اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ انسان حقیقت جامعہ ہے،

یعنی اتنی جامع حقیقت ہے کہ وہ سارے کمالات اس کے اندر جمع ہیں جو پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

انسان میں خالق کائنات کے نمونے...... پھر یہی کہ اس میں فقط کائنات ہی کے نمونے ہوں غور کیا جائے تو خالق کائنات کے نمونے بھی انسان ہی میں جمع ہیں ایسے نمونے جمع ہیں کہ اگر ہم انہیں سامنے رکھیں تو ان نمونوں سے خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور کمالات سب عیاں ہو جائیں ہمیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں اگر ہم اپنے اندر غور کریں، تو خدائی کمالات بھی ہمارے اندر سے ابھریں گے۔

آپ غور کیجئے کہ آپ کے بدن کی یہ ساری کائنات کس چیز سے سنبھلی ہوئی ہے، یہ روح ہی سے سنبھلی ہوئی ہے، اگر روح نکل جائے، تو ساری کائنات بکھر جائے۔ مٹی بکھر کر مٹی میں جا ملے گی، پانی پانی میں، آگ، آگ میں اور ہوا، ہوا میں مل جائے گی، ساری کائنات ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ روح ایک مدبر اعظم ہے، جس نے قیومیت کر رکھی ہے ساری کائنات کو سنبھال رکھا ہے ہم اس کو سامنے رکھ کر دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ جب ہماری کائنات بدن کو سنبھالے رکھنے کے لئے ایک قیوم کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پوری کائنات کا ایک مدبر اعظم ہے، جس نے پوری کائنات کو سنبھال رکھا ہے تو خدا کے وجود پر دلیل ہمیں اپنے اندر سے مل جاتی ہے۔

آپ غور کیجئے آپ کا بدن سرخی مائل ہے چہرے پر سرخی اور بالوں پر سیاہی ہے تو بدن پر کہیں سفیدی، کہیں سرخی، کہیں سیاہی، غرض بدن پر مختلف رنگ ہیں یہ سارے رنگ روح کی وجہ سے قائم ہیں، لیکن روح کا کوئی رنگ نہیں، وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے اسی طرح سے ہم کہیں گے کہ اس کائنات میں ہزاروں رنگ ہیں انسان کے مختلف رنگ ہیں درخت سبز، پھول سرخ ہیں ان سارے رنگوں کو اس روح اعظم نے سنبھال رکھا ہے جس کو ذات خداوندی کہتے ہیں اور خود ہر رنگ سے بری و بالا ہے، لیکن ہر رنگ کو جلوہ دے رکھا ہے تو خدا کے وجود کی دلیل اپنے اندر سے ملتی ہے۔ نیز اس پر غور کریں کہ آپ کے اس بدن کے اندر کسی کو جانے کا موقع دیا جائے اور آپ کے اندر گھس کے وہ خوب سیر کرے آپ اس سے پوچھیں کہ بھئی! روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے، ہاتھ پیر، دماغ یا دل میں؟ وہ یوں کہے گا کہ مجھے تو ہر ہر ذرے میں روح کا جلوہ نظر آتا ہے۔

میں (کسی خاص عضو کی طرف) اشارہ نہیں کر سکتا، کہ روح وہاں بیٹھی ہے جب روح اعظم اور جلوہ خداوندی ہر جگہ پھیلا ہوا ہو اور اشارہ نہ کیا جا سکے کہ وہاں ہے، یا یہاں ہے، اس میں کون سے تعجب کی بات ہے؟ یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ سمت اور جہت میں نہیں انگلی سے اس کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی جہت اور سمت میں مقید ہے وہ لامحدود ذات ہے، مگر اس نے اپنا نمونہ روح کو بنا دیا کہ روح کو آپ کسی خاص عضو میں مقید نہیں بتا سکتے ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو بدن کے بعض حصوں سے خاص تعلق ہے جلوہ تو ہر جگہ ہے۔

مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔ روح کو جو تعلق قلب سے ہے، وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے، وہ پیٹ سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قلب میں سوئی بھی چبھو دی جائے، تو آدمی مرنے کو ہو جاتا ہے۔ روح دوڑنے لگتی ہے

کہ میں نہیں ٹھہرتی۔ دماغ کو توڑ دیا جائے، روح باقی نہیں رہے گی۔ ہاتھ پیر کو کاٹ لیا جائے، روح باقی رہے گی۔ اگر چہ آدمی ناقص ہو جائے گا۔ ناخن اور بال کاٹ دو تو کوئی اذیت نہیں ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے روح کو جو تعلق قلب سے ہے، دوسرے اعضاء سے وہ تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں اللہ کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے وہ آپ کی مسجدوں سے نہیں ہے اور جو آپ کی مسجدوں سے ہے۔ وہ آپ کے گھرانوں سے نہیں ہے۔ جو آپ کے گھرانوں سے ہے وہ ویران جنگلوں سے نہیں ہے۔ تو جلوہ ہر جگہ ہے، مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیت اللہ کے بارے میں اگر کوئی گستاخی کا کلمہ بھی کہہ دے تو پورے عالم میں شور مچ جاتا ہے، جیسے عالم تباہ ہونے کے قریب آ گیا۔ مسجد پر اگر کوئی حملہ کر دے، تو اس مقام کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل جاتی ہے، اگر آپ کے گھر پر کوئی حملہ کر دے تو آپ اور آپ کے خاندان والے پریشان ہوں گے۔

یہ نہیں کہ سارا شہر بے چین ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے اللہ کو جو تعلق ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور سارے انسان بے چین ہو جائیں گے۔ مسجد اور عام گھروں سے وہ تعلق نہیں۔ تو تعلق درجہ بدرجہ ہے مگر جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لئے اللہ کے جلوے اور اس کی تجلیات کا ہر جگہ موجود ہونا اور اس کے تعلقات میں فرق مراتب ہونا، آپ کو اپنے اندر سے اس کی دلیل مل جاتی ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

نیز آپ غور کریں کہ آپ روح سے زندہ ہیں۔ تو ایک روح سے زندہ ہیں، یا دو روحیں کام کر رہی ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی روح ہے۔ اگر دو روحیں ہو جائیں، بدن پھٹ کر خراب ہو جائے، ایک روح کہے گی میں بدن کو بھوک لگانا چاہتی ہوں، دوسری کہے گی میں ہرگز نہیں چاہتی۔ ایک روح کہے گی سردی لگنی چاہئے، دوسری روح کہے گی گرمی لگنی چاہئے۔ تو روحوں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ بدن کی تربیت کون کرے گا؟ بدن خراب خستہ ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی روح کام کر سکتی ہے۔ دو روحیں ہوں تو بدن کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔

یہی صورت اس کائنات کی ہے کہ: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ ① اگر کائنات میں دو خدا ہوں تو کائنات چل نہیں سکتی۔ ایک خدا کہے گا میں فلاں کو بیٹا دینا چاہتا ہوں، دوسرا خدا کہے گا میں اس کو بانجھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک کہے گا میں فلاں قوم کو عزت اور دوسرا کہے گا کہ میں اس کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ دونوں خداؤں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ کائنات کون چلائے گا؟ یہ بات الگ رہی کہ دو خدا ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر معاذ اللہ مان لیا جائے تو کائنات برقرار نہیں رہ سکتی۔ جیسے بدن میں دو روح ہوں۔ کائنات بدن باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ایسا ہوگا جیسے ایک میان میں دو تلواریں ڈال دیں اور ایک شیروانی میں دو آدمی گھس جائیں، شیروانی پھٹے گی نہیں تو اور کیا ہوگا؟ تو ایک کائنات یا پچاس مخلوقات ایک ہی خالق سے چلتی ہیں۔

اور اگر یوں مان لیا جائے کہ دونوں خدا آپس میں صلح کر لیں۔ معلوم ہوا ایک دوسرے سے دب گیا، تو جو

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۲.

ذلیل ہو، وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا وہ ہے جو سب چیزوں پر غالب اور قوی ہو، جو لڑائی سے بچنے کے لئے دوسرے سے کہے کہ صلح کرلو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے سے خوف موجود ہو، جس میں خوف ہو، وہ خدا تھوڑا ہی ہے۔ خدا وہ ہے کہ سارے اس سے ڈریں، وہ خود ڈر اور خوف سے بالاتر ہو۔ تو نہ صلح کے اصول کو سامنے رکھ کر اور نہ فساد کو سامنے رکھ کر دو جب خدا نہیں مانے جا سکتے، تو اللہ کی توحید اور یکتائی کی دلیل آپ کے اندر سے آپ کو مل رہی ہے۔ آپ کو باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود آپ کے اندر اللہ کی ذات توحید، اس کی یکتائی، اس کی صفات کے سب نمونے آپ کے اندر سے نکل آتے ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ بے شک کائنات میں کوئی مدبر اعظم ہے۔ اور یہ تخیل کہ معاذ اللہ خدا نہیں ہے۔ اور کائنات خود ہی چل رہی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میرے اندر روح نہیں ہے۔ یہ بدن ایسے ہی چل رہا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اس کائنات کے اندر خدا کا منکر ہے، اسے اپنے اندر کی روح کا بھی انکار کرنا چاہئے۔

اور جس طرح سے آپ کی روح، بدن کے خطے خطے سے واقف ہے۔ آپ کے اندر شعور ہے کہ وہ جانتی ہے کہ یہ میرا ناخن، بال، پیٹ ہے، نیز یہ کہ اس وقت پیٹ میں گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ یہ اسے علم ہوتا ہے۔ اس وقت پیٹ اچھا ہے، تو کائنات بدن کے ذرے ذرے سے روح واقف ہے اگر واقف نہ ہو، تو نظم کیسے چلائے، اگر روح کو پتہ ہی نہ چلے کہ بخار چڑھ رہا ہے، تو دور کرنے کی اسے فرصت کہاں ہوگی؟ اسی طرح اس کائنات کے ذرے ذرے کا علم اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ نہ جانیں کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے۔ ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ ① جو پیدا کر رہا ہے، کیا وہ معاذ اللہ لاعلم ہوگا؟ پیدا کرنے والا ہی مخلوق کے ذہن، صفات اور احوال کو جانتا ہے، تو اللہ کے لامحدود علم کی نظیر ہمارے اندر موجود ہے۔ تو اللہ نے انسان کو ایسا جامع بنایا کہ اگر وہ اپنے اندر خدائی کمالات دیکھنا چاہے تو اپنے آئینے کے اندر دیکھ لے۔ اس کو سارے خدائی نمونے نظر آجائیں گے۔

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ ② ہم عنقریب حق کی نشانیاں انسانوں کو ان کی جانوں کے اندر بھی دکھلائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ اللہ ہی حق وثابت ہے اور وہی کائنات کا چلانے والا ہے۔ تو منطقی دلیلیں الگ رہیں، یہ مشاہدے کی دلیلیں ہیں کہ آدمی اپنے اندر غور و فکر کر کے خدائی کمالات کو پہچان لے۔ میرے عرض کرنے کا حاصل یہ نکلا کہ خالق اور مخلوق کے نمونے سارے ہمارے اندر موجود ہیں۔ تو انسان ایک عجیب چیز نکلی، کہ اس میں دونوں نمونے جمع ہیں۔

نمونۂ کائنات ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ...... اس واسطے انسان پر دو ہی فرائض عائد ہوں گے، ایک ایسا فریضہ جو مخلوق ہونے کے مناسب اور ایک فریضہ ایسا جو خالق کے نمونوں کے مناسب ہے۔ نمونہ مخلوق ہونے کا فریضہ کیا ہے؟ جس مخلوق کو خدا وجود دے، وہ اپنی پیدائش میں بھی خالق کی محتاج ہے اور بقا میں

---

① پارہ: ۲۹، سورة الملک، الآیة: ۱۴. ② پارہ: ۲۵، سورة حم سجدہ، الآیة: ۵۳.

بھی۔تو ہر قدم پر ہم خدا کے محتاج ہیں،محتاج کا کام غنی کے سامنے کیا ہوتا ہے؟محتاج کا کام یہ ہے کہ وہ غنی کے سامنے جھکے اوراس کے آگے سجدہ کرے۔اس لئے کہ اگر ہمارے پاس سب کچھ ہو،تو ہمیں اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ہم تبھی حاجت مندی اس کے سامنے لے جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ موجودنہیں۔

ایک فقیر آپ سے تبھی سوال کرے گا کہ اس کے پاس دولت نہ ہو،اگراس کے پاس دولت ہو،اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ تومحتاج ہاتھ پھیلاتا ہے،غنی نہیں۔زندگی ہمارے قبضے میں نہیں تھی۔ہم نے ہاتھ پھیلایا کہ اے اللہ! ہمیں زندگی عطا کر،اس نے دے دی۔زندگی آنے کے بعداس کا باقی رکھنا ہمارے قبضے میں نہیں،اگر ہمارے قبضے میں ہوتا،تو ہم کبھی نہ مرتے۔مگر مرنا پڑتا ہے۔معلوم ہوا ہمارے ہاتھ میں زندگی نہیں۔ہم دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہمارے زندگی طویل کردے۔عملی دعا مانگتے ہیں۔یعنی ان اسباب کواختیار کرتے ہیں جن سے زندگی باقی رہے،کھاتے،پیتے،دوائیں استعمال کرتے ہیں۔یہ عملی دعا ہے۔اورزبان سے بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں زندہ رکھ۔یہ کیوں مانگتے ہیں؟ محتاجگی ظاہر کرنے کو،کہ وہ غنی ہے،ہم محتاج ہیں۔محتاج کا کام جھکنا ہے۔تو مخلوق خالق کی محتاج ہوتی ہے۔اس کا فریضہ ہے کہ وہ جھکے۔

اور جھکنا بھی معمولی درجے کانہیں،بلکہ انتہادرجے کا جھکنا ہے،یعنی ایسی ذلت ظاہر کرے،کہ ایسی ذلت کسی کے آگے ظاہر نہ کرسکے۔اسلئے کہ خالق وہ ہے کہ اس کی عزت کی کوئی انتہاء نہیں۔تواس کے سامنے ذلت بھی ایسی پیش کرنی چاہئے کہ اس ذلت کی بھی کوئی انتہاء نہ ہو۔اس انتہائی ذلت کو پیش کرنے کا نام،اسلام کی زبان میں عبادت ہے۔عبادت غایت تذلل کو کہتے ہیں۔اوراگرآپ غورکریں تو یہ انتہائی ذلت آدمی نماز میں ہی ظاہر کرسکتا ہے کسی اورعبادت سے ظاہر نہیں کرسکتا۔اس لئے کہ انتہائی تذلل کی جتنی شانیں ہیں،وہ ساری نماز کے اندر موجود ہیں۔نوکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑے ہونا۔پھراتنی ذلت پر قناعت نہیں،رکوع کرکے گردن جھکادی،اورزیادہ ذلت کا اظہار کیا پھراسی پر قناعت نہیں،سب سے زیادہ عزت کی چیز انسان میں ناک اور پیشانی ہے،اسے سجدے میں جاکرزمین پر رگڑتا ہے۔کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں۔پھراسی پر بس نہیں،اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں۔پھر اسی پر بس نہیں،اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ ! مجھے نیکی دے، رزق دے، وغیرہ وغیرہ۔بھیک مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہوتی۔توسجدے کے بعد اخیر میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔تو مقصود یہ نکلا کہ مخلوق اپنے خالق کے آگے جھکے۔انتہائی ذلت کا اظہار کرے،اوروہ نماز کے اندر ہوتی ہے۔تو نماز کا فریضہ عائد ہوا،جس سے آدمی عبادت کرسکتا ہے،نماز کے سوا عبادت حقیقۃً عبادت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے عبادت کی جاسکے عبادت کے معنی انتہائی ذلت پیش کرنے کے ہیں،یہ نماز ہی میں ہے اورکسی عبادت میں نہیں ہے۔مثلاً آپ زکوٰۃ یا صدقہ دیں،یہ حقیقی طور پر عبادت نہیں،اس میں ذلت کا اظہار تھوڑا ہی ہے،اس میں اللہ کے

ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے، کہ جیسے اللہ مخلوق کو دیتا ہے، آپ بھی غریب کو دیتے ہیں۔ تو دینا اور احسان کرنا ذلت نہیں، بلکہ انتہائی عزت کی بات ہے، یہ خدائی کام ہے، تو زکوٰۃ وصدقہ دینا اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ چونکہ اللہ نے حکم دیا، ایسا کرو، تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں عبادت کی شان پیدا ہوگئی۔ ورنہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔

اسی طرح آپ روزہ رکھیں۔ روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ اس لئے کہ روزے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کھانے، پینے اور بیوی سے بے نیاز۔ سب سے مستغنی۔ تو یہ شان اللہ کی ہے کہ کھانے، پینے اور بیوی سے بری وبالا ہے۔ اللہ سے مشابہت پیدا کرنا، یہ ذلت کی بات تھوڑی ہی ہے۔ تو روزہ عین عزت ہے، پھر بھی روزہ عبادت بنا، اس لئے کہ حکم ہے کہ روزہ رکھو، تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ ہم سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں، لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں، کیونکہ سچ بولنا اللہ کا کام ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا﴾ ① اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا﴾ ② اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ جو سچ بولے، وہ ذلت کا کام تھوڑا ہی کر رہا ہے۔ وہ تو انتہائی عزت کے مقام پر ہے۔ عبادت اس لئے بنا کہ حکم خداوندی ہے کہ سچ بولو، جھوٹ مت بولو۔ تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں شان عبادت پیدا ہوگئی۔ ان تمام چیزوں میں کوئی چیز اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ یہ نیت اور مقاصد کی وجہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ لیکن نماز میں جتنے افعال ہیں، ان میں اپنی ذات کی وجہ سے اظہار ذلت ہے۔ کھڑے ہونا، جھک جانا، سجدہ کرنا، دعائیں کرنا، بھیک مانگنا سب ذلت کا اظہار ہے، اس لئے اپنی ذات سے جو چیز عبادت ہے، وہ صرف نماز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نماز اللہ نے فقط انسان پر نہیں، کائنات کے ذرے ذرے پر فرض کی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ﴾ ③ ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح پہچان لی۔ معلوم ہوا اور درخت، پہاڑ، جانور، سبھی نماز پڑھتے ہیں۔ سب پر نماز واجب ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انسان کو خطاب کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں عقل ہے اور مخلوقات کو خطاب نہیں کیا گیا۔ مگر بنایا ایسے گویا وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ جیسے علماء لکھتے ہیں کہ جتنے درخت ہیں، ان کی نماز میں قیام ہے، رکوع وسجدہ نہیں۔ گویا ایک پیر پر کھڑے ہوئے نماز میں مصروف ہیں۔ رکوع سجدے کی اجازت نہیں ہے۔ چوپائے، جو چار پیروں سے چلتے ہیں، انکی نماز میں رکوع ہے۔ ان کو ایسی ہیت سے اللہ نے بنایا، کہ وہ ہر وقت رکوع میں ہیں، سجدہ قیام ان کی نماز میں نہیں ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح بنایا، جیسے آدمی تشہد میں بیٹھتا ہے۔ گویا پہاڑ زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے التحیات میں مصروف ہیں، ان کی نماز میں قعدہ ہے۔ قیام، رکوع، سجدہ نہیں ہے۔ حشرات الارض جیسے سانپ بچھو، ان کی نماز میں سجدہ ہے نہ رکوع ہے نہ قیام۔ یہ گویا ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے اللہ کے سامنے سجدے میں مصروف ہیں۔ چاند، سورج یا آجکل کے قول کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ یہ گردش سے اللہ کی عبادت کر رہے ہیں۔ حرکت دوری ان کی نماز ہے۔ اسی طرح سے جنت و

دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت یہ سوال کر رہا ہے اے اللہ! قیامت کے دن مجھے بھر دیجئے۔ میرے محلات خالی نہ رہیں۔ جہنم بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ اور اللہ کا وعدہ ہے، قیامت کے دن دونوں کو بھر دیا جائے گا۔ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ جب تک نہیں بھریں گے، جہنم پکارتا رہے گا۔ ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ' هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ.'' چاند، سورج، پہاڑ، دریا، مٹی، سب جھونک دیئے جائیں گے۔ پھر بھی وہ کہے گا ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ.'' جب ان سب چیزوں سے نہیں بھرے گا، تو حدیث میں ہے حق تعالیٰ جہنم کے منہ پر پیر رکھ دیں گے، جیسا پیر ان کی شان کے مناسب ہے۔ اس وقت کہے گا کہ بس! بس! اب میں بھر گیا اور وعدہ پورا ہو گیا۔

جنت میں سارے جنتی داخل ہو جائیں گے۔ پھر بھی اس کے شہر اور بستیاں خالی رہ جائیں گی، تو ایک مستقل مخلوق پیدا کی جائے گی۔ جس سے جنت آباد کی جائے گی۔ تو جنت وجہنم کی نماز دعا مانگنا ہے۔ فرشتوں کی نماز صف بندی ہے، کہ صفیں باندھ کر کھڑے رہیں۔ انسان اور بالخصوص مسلمان کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دیں۔ درختوں کا سا قیام، چوپایوں جیسا رکوع، حشرات الارض جیسا سجدہ، جنت وجہنم جیسی دعا پہاڑوں جیسا تشہد، فرشتوں کی سی صف بندی اور چاند وسورج یا زمین کی گردش بھی نماز میں ہے۔ اس واسطے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں۔ دو تین یا چار رکعت کی ہے۔ آپ ایک رکعت پڑھ کے کیا کام کرتے ہیں؟ جو کام پہلی رکعت میں کیا تھا، وہی کام دوسری، تیسری اور چوتھی میں کرتے ہیں۔ وہی الحمد سورت اور تسبیحات وغیرہ۔ اس لئے گردش اور دوران نماز کے اندر ہے۔

جیسے انسان کو اللہ نے ایک جامع حقیقت بنایا، عبادت بھی جامع دی۔ آپ کی عبادت میں ساری کائنات کی عبادتیں جمع ہو گئیں۔ اس سے دین کا کمال بھی واضح ہوتا ہے۔ پچھلے ادیان میں ایسی نمازیں نہیں تھیں۔ کسی قوم کو فقط سجدے، کسی کو فقط قیام' کسی کو فقط رکوع کی نماز دی گئی۔ لیکن اسلام کی نماز میں ساری قوموں کی نمازیں جمع ہیں۔ ساری اقوام اور ساری مخلوقات کی نمازیں جمع ہو گئیں، تو نماز ایک جامع ترین عبادت ہے، بلکہ نماز ہی عبادت ہے، اور چیزیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن جاتی ہیں، تو انسان پر ایک فریضہ جو عائد ہوتا ہے، وہ نماز کا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ مخلوقات کے سارے نمونے اپنے اندر رکھتا ہے، تو سارے نمونوں کی ذلت وعبادت اللہ کے سامنے پیش کر دینا، اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا ایک مقصد تو عبادت ہے۔

نمونہ کمالات خداوندی ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ...... اب یہی انسان جیسے مخلوق کے نمونے رکھتا ہے، خالق کے نمونے بھی رکھتا ہے۔ اس پر یہ فریضہ بھی عائد ہوا کہ جو کام خالق کرتا ہے، یہ بھی وہ کرے۔ خالق کا کام کیا ہے؟ اپنی مخلوق کو پالنا، اس کی تربیت کرنا، اس کو ہدایت کرنا، اس نے رزق پیدا کیا، تاکہ مخلوق پلے، اس نے مخلوق کو تعلیم دی، تاکہ اپنے بھائیوں پر رحم کرے یعنی، جیسے میں رحم کرتا ہوں۔ جیسے میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں تم اپنے بھائیوں کو دکھاؤ۔ جیسے میں تمہاری تربیت کر رہا ہوں تم بھی اپنے بچوں اور عیال کی تربیت کرو۔ یعنی میری

طرف سے نائب بن کر وہ کام کرو، جو میرے کام ہیں۔ میں مدبر ہوں، تم بھی تدبیر کرو۔ میں موجد ہوں، تم بھی دنیا میں ایجادیں کرو، میرا کام ہدایت دینا ہے، تم بھی دنیا کے لئے ہادی بنو۔ میرا کام احکام جاری کرنا ہے، تم بھی میرے نائب بن کر احکام جاری کرو۔

حاصل یہ نکلا کہ ایک فریضہ انسان پر عبادت کا اور ایک فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے۔ ایک طرف جھک کر عبادت کرے گا اور ایک طرف تخت خلافت پر بیٹھ کر اللہ کا نائب بن کر اس کی کائنات میں تصرفات کرے گا۔ ملکوں کو فتح کرے گا۔ دنیا میں ہدایت پھیلائے گا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ یہ اللہ کا کام ہے، لیکن نائب بن کہ یہ بھی کرے گا۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ کے نائب بن کر آتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کائنات کے مربی ہیں۔ تو انبیاء بھی مخلوق کی روحوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اللہ معلم ہے جو انبیاء کو تعلیم دیتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں، تاکہ دنیا میں علم پھیل جائے۔ اللہ کے احکام جاری کرتے ہیں۔ قصاص لیتے ہیں، شراب خوری پر درے لگاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے اولین نائب ہیں۔ پھر انبیاء کے نائب ان کے صحابہ ہوتے ہیں، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نائب تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں۔ تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے نائب تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں۔ اخیر تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ علماء ربانی، مشائخ حقانی اور سچے درویش وصوفی، جو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے سلطنت بھی کر کے دکھائی، خلافت کی گدی پر بیٹھ کر ملکوں کو بھی فتح کیا، مگر ملکوں پر اس لئے قبضے نہیں کئے کہ ان سے کچھ کھانا پینا مقصود تھا، اس لئے فتح کیا تاکہ مخلوق کو سیدھے راستے پر چلائیں۔ انکو خدا کے قانون پر چلائیں۔ انہوں نے اللہ و رسول کے نائب بن کر وہ کام کئے جو اللہ کا منشاء تھے۔ دن بھر خلافت کے کام سرانجام دیتے، جب وقت آتا تو مسجد میں جاکے سجدے کرتے اور عبادت کا کام سرانجام دیتے، تو ایک طرف عبادت اور ایک طرف خلافت کر رہے ہیں۔

اس لئے صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکادے اور عبادت میں آگے بڑھے، کہ اس کی ناک، پیشانی، ہاتھ، پیر، اس کی روح اور خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے۔ یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا، یہ عبادت ہے، دوسرا فریضہ یہ ہے کہ تخت خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصد زندگی ہے بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

ہمارے سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا، تو سب سے پہلے ملائکہ سے یہی بات فرمائی: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ ① میں زمین میں اپنا ایک نائب اتارنے والا ہوں۔ آدم علیہ السلام نائب کس چیز میں تھے؟ عبادت میں نائب نہ تھے، عبادت اللہ کا کام تھوڑا ہی ہے، وہ تو معبود ہے۔ عبادت سے بری ہے، عابد نہیں ہے۔ لیکن عالم کو درست رکھنے، اس کی تربیت اور اصلاح کے لئے خلافت دی، مگر یہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔

خلافت وہ انجام دے گا، جو پہلے عبادت کر کے اپنے آپ کو درست کرے۔ پہلے اللہ کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق درست کرے اپنے اندر نیاز مندی اور بندگی کی شان پیدا کرلے۔ اس میں تواضع وخاکساری وللھیت بھی ہو، نہ غرور وتکبر رہے، نہ حرص ولالچ رہے، بلکہ اس میں غنا اور ایثار ہو۔ مخلوق کی خدمت کا جذبہ اس میں ہو۔ یہ جذبات عبادت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ عبادت کر کے جب جذبات پیدا ہو گئے۔ اب وہ نائب خدا بن گیا، اب وہ دوسروں کی اصلاح کرے گا۔ تو مقصد زندگی دو چیزیں نکل آئیں۔ ایک عبادت دوسرے خلافت۔

تکمیل ایمان کے لئے عبادت وخلافت دونوں ضروری ہیں...... اسی واسطے ایمان کے دو رکن فرمائے گئے: ''اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ'' ترجمہ:...... ''اللہ کے امر کی تعظیم کرنا، اس کے سامنے جھک جانا۔ دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت اور اس کی خدمت کرنا''۔ دونوں باتوں سے مل کر ایمان بنتا ہے۔ ایک شخص چوبیس گھنٹے مسجد میں رہے، مخلوق چاہے جیئے یا مرے، اسے کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا آدھا ایمان ہے۔ اور ایک شخص رات دن مخلوق کی خدمت میں انجمنوں کے ذریعے لگا ہوا ہے۔ مگر مسجد میں جانے کا نام نہیں لیتا اس کا آدھے سے بھی کم ایمان ہے۔ اس لئے کہ خلافت کا کام تو انجام دیا مگر عبادت چھوڑ دی۔ انسان مکمل تب ہوگا جب ایک طرف عابد وزاہد ہو اور ایک طرف خلیفہ خداوندی ہو۔ ایک طرف وہ کام کرے جو مخلوق کے کرنے کا ہے، وہ عبادت ہے۔ ایک طرف وہ کام کرے جو خالق کا ہے، وہ تربیت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے، راتوں کو دیکھو تو تہجد پڑھتے پڑھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ورم آجاتا تھا۔ دنوں میں دیکھو تو مخلوق کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہدایت وتبلیغ فرما رہے ہیں۔ دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط جاری فرما رہے ہیں، جن میں اسلام کی دعوت دی جارہی ہے۔ سفر فرما رہے ہیں، کبھی طائف میں ہیں، کبھی مدینہ میں ہیں، تاکہ خلق خدا نیک راستے پر آجائے۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ مسجد نبوی میں جس طرح سے آپ نماز پڑھتے، اسی طرح سے آپ مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے، مسجد میں جیسے عبادت ہوتی، ویسے ہی درس وتدریس کے ذریعے تعلیم بھی ہوتی، یہ خلافت کا کام تھا۔ نماز پڑھنا، تلاوت کرنا، سجدے کرنا، یہ عبادت کا کام تھا۔

یہی شان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہے کہ ایک طرف تخت خلافت پر بیٹھ کر مخلوق خدا کی اصلاح، ایک طرف بورئے اور چٹائی پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے عجز ونیاز سے سر جھکا دینا۔

فارس میں جب جنگ ہوئی ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد کل تیس یا تینتیس ہزار تھی۔ فارسیوں کا تین لاکھ کا لشکر تھا، پھر فارس کی فوجیں کیل کانٹے سے مسلح وردیاں، غذائیں اور رسد ان کی باقاعدہ۔ یہ تو اہل فارس کی شان۔ اور ادھر صحابہ کرام محض درویشوں کا ایک لشکر۔ وردی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس کرتہ ندارد ہے، تو کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے، کسی کے پاس لمبا کرتہ، کسی کے سر پر پگڑی نہیں تو رسی باندھ رکھی ہے، کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کسی کے ہاتھ میں تلوار، کسی کے ہاتھ میں خنجر۔ ہتھیار، لباس نہ غذائیں کچھ بھی باقاعدہ نہیں درویشوں کا لشکر

ہے۔مگر کیفیت یہ تھی۔لاکھوں فارسی آتے تھے جب صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے شیروں کی طرح پڑتے تھے وہ بلیوں کی طرح سے بھاگتے تھے،اور یہ غالب تھے۔پورے فارس میں ایک تہلکہ مچ گیا۔فارس کا سب سے بڑا سپہ سالا ررستم تھا۔آپ نے رستم پہلوان کا نام سنا ہوگا،وہ کمانڈرانچیف تھا،اس نے تمام سرداروں اور لیفٹننٹوں کو جمع کیا اور کہا کہ یہ غضب کی بات ہے کہ ہمارا لشکر تین لاکھ،اور عرب کے بدو،کل تیس ہزار،پھران کے پاس سامان باقاعدہ نہیں، ہمارے پاس سامان باقاعدہ،انہیں مدد نہیں پہنچ رہی،ہمارے پیچھے پورا ملک ہے۔یہ ہمارے ملک میں حملہ کرنے آئے ہیں۔انکا ملک دوررہ گیا،یہ ہمارے ملک میں گھرے ہوئے ہیں،مگراس کے باوجود حملہ کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھوکے شیر ہیں اورتم فارسی اس طرح سے بھاگتے ہو جیسے لومڑیاں بھاگتی ہیں۔آخر کیا وجہ ہے؟تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔سرداروں نے کہا اے رستم!اگر آپ سچی بات پوچھیں،ہم بتلادیں،مگر ہماری جان کی بخشش کردی جائے،امان دیا جائے کہ ہمیں قتل تو نہیں کیا جائے گا۔اس نے کہا تمہاری جان کوامان دی جاتی ہے۔

اب سرداروں نے مل کرکہا،اے رستم!یہ مٹھی بھرعرب تیرے ملک پر غالب آکر رہیں گے،انہیں کا قبضہ ہوگا،انہی کی حکومت ہوگی۔پورا ایران ان کے تحت میں آئے گا۔یہ نہیں ہاریں گے،تم ہاروگے۔رستم نے کہا کیوں؟انہوں نے کہا۔اس وجہ سے کہ انکی شان یہ ہے۔''هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ''دن بھریہ گھوڑے کی پشت پرسوار جہاد میں مصروف ہیں اور رات میں مصلے کی پشت پرسوار ہیں،اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے مالک!ہم میں کوئی طاقت نہیں،طاقت والا تو ہے،ہم تیرے سپاہی ہیں،تو اگر ہمیں فتح دے گا،تو ہم فتح یاب ہوجائیں گے۔تو ہمیں شکست دے گا،شکست کھاجائیں گے۔ہمارے اندرکوئی طاقت اور قوت نہیں۔قوت وسلطنت تیری ہی ہے۔تو رات بھر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔عجز ونیاز سے سرزمین پر رگڑتے ہیں اوردن کوگھوڑے کی پشت پرسوار ہوتے ہیں۔

اوران کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایسے بزرگ ہیں،جس گاؤں میں جاتے ہیں،اگرکھیتیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں تو سرسبز ہوجاتی ہیں۔یہ دوسروں کی بیٹیوں کی ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں،جیسے اپنی بہو بیٹیوں کی کرتے ہیں۔اور اے رستم!تیرا یہ لشکر،شرابیں یہ پیتے ہیں،جس گاؤں میں جاپڑتے ہیں،بہو بیٹیوں کی عزتیں برباد ہوجاتی ہیں۔ جس کھیتی اور باغ میں پہنچ جاتے ہیں۔پھل اجڑ جاتے ہیں۔کھیتیاں سب برباد ہوجاتی ہیں،یہ اثرات تیری فوج کے ہیں۔اور یہ افعال ان کی فوج کے ہیں۔تو غلبہ تجھے ہوگا یا انہیں ہوگا؟راتوں کو مصلے کی پشت پر یہ عبادت میں مصروف اوردنوں کوگھوڑے کی پشت پرسوار،اللہ کے نائب بن کر یہ دنیا کی اصلاح کے درپے۔تو درحقیقت رستم اوراس کے سرداروں نے پہچانا کہ ان بزرگوں میں یہی دو چیزیں تھیں۔ایک طرف یہ عبادت میں کامل اورایک طرف خلافت میں کامل۔ایک طرف سرنیاز اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے،ایک طرف اس کی مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں سفرکر رہے ہیں۔جومفسد سامنے آتا ہے،اس کوراستے سے ہٹاتے ہیں،تا کہ دین پہنچ سکے اورلوگ دین پرغور کرسکیں۔

بہر حال جب مقصد زندگی عبادت اور خلافت نکلا، سب سے بڑے عابد دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور سب سے بڑے اللہ کے نائب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ان کی امت کو بھی سب سے بڑا عابد اور سب سے بڑا نائب خداوندی بننا چاہئے۔ یہ امت اس لئے آئی ہے کہ رات دن عبادت میں مصروف رہے اور رات دن اللہ کی نائب بن کر اللہ کی مخلوق کی اصلاح کرے۔ یہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اٹھے۔ اپنی زندگی اور موت کا یہ مقصد قرار دے میں چاہے جیوں یا مروں، مگر خدا کا نام اونچا ہو، تو اللہ اس قوم کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ ذلت و رسوائی جب ہوتی ہے جب کوئی خدا کے نام کو چھوڑ کر اپنی برتری چاہے، اپنے عیش کو آگے رکھے۔ خدا کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی۔ اس پر دشمن اور اقوام مسلط کی جاتی ہیں، جو اس کو غلامی میں بھی جکڑ کر بند کرتی ہیں۔ لیکن جو کہے مجھے ملک و دولت مقصود نہیں، مجھے اللہ کا نام اونچا کرنا ہے۔ میری دولت، میری جان اور خاندان اس کے لئے وقف ہے، اس نصب العین کے تحت زندگی ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی، موت ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی۔ انسان کو اصل میں عزت کی زندگی کے لئے اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں ذلیل ہونے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ تو سب سے بڑے خلیفہ خداوندی اور عابد خداوندی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسے وہ سردار انبیاء ہیں، یہ امت امتوں کی سردار بنائی گئی۔ اس کو خیر امت اور افضل الامم کہا گیا، مگر افضلیت کیوں؟ کھانے پینے اور دولت کی وجہ سے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا کام یہ ہے کہ یہ دنیا کی قوموں کی اصلاح کرے۔ دنیا کی قوموں میں جو کھوٹ ہے اس کو رفع کرے اور اگر یہ دنیا کی قوموں کی نقالی کرنے لگے کہ جو کھوٹ انکے اندر ہے، وہ اپنے اندر لے لے، تو پھر یہ اصلاح کیا کرے گی؟ اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ دوسری قومیں اس پر غالب آئیں گی، یہ غالب نہیں آسکتی۔ یہ ایک چیز سے غالب آسکتی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمہ خداوندی کو اونچا کرنے کا نصب العین لے کر چلے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ تم دنیا کی قوموں پر دولت سے غالب نہیں آسکتے، دولت دوسروں کے پاس زیادہ ہے، تعداد میں تم دنیا پر غالب نہیں آسکتے۔ اہل باطل کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے اور رہے گی۔ تم اگر دنیا کی قوموں پر غالب آؤ گے تو اخلاق محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غالب آؤ گے۔ کردار سے غالب آؤ گے، دین کو لے کر اٹھو گے تو غالب آؤ گے۔ اس لئے سب سے بڑھ کر تمہارے پاس حجت دین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں۔ اگر آپ کسی سے بحث کریں اور یوں کہیں کہ میری عقل یوں کہتی ہے، دوسرا کہے گا میری عقل تم سے زیادہ ہے، میری عقل یوں کہتی ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ہم خادم ہیں، ہمیں یہ حکم پورا کرنا ہے، دنیا کی ہر قوم چپ ہو جائے گی، اس سے آگے اب حجت نہیں ہے۔ آگے پھر زور اور طاقت ہے، تو جس قوم کے ہاتھ میں خدا کا نام ہو اور خدا کی نائب بن کر آئے۔ وہ حجت میں بھی اور انجام میں بھی غالب ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کے بعد خلافت ربانی کا کام شروع کیا اور اسلام کی دعوت دی، تو پورا مکہ، حجاز اور ساری قوم آپ کی دشمن تھی۔ عزیز اقرباء دشمن۔ صرف تین آدمی مسلمان ہوئے۔ بوڑھوں میں

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورتوں میں حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، باقی سارا خاندان دشمن۔لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ پورے استقلال کے ساتھ اس کلمہ کو لے کر چلے۔تو قوت مکہ والوں کے ہاتھ میں تھی۔تعداد ان کی زیادہ تھی۔تیرہ آدمی جب مسلمان ہوئے،تو دارارقم میں اندر سے زنجیر لگا کے نماز پڑھی جاتی تھی۔خطرے کی وجہ سے مسلمان باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ناداری اور مفلسی کا یہ عالم تھا، کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، ہم دارارقم میں بند تھے۔رات کو بارہ بجے میں پیشاب کرنے کے لئے باہر نکلا، صفا کی پہاڑی پر بیٹھا، پیشاب کیا، دھار جو پڑی تو ایسی کھنکھناہٹ کی آواز آئی جیسے کاغذ کے اوپر دھار گرتی ہے۔میں نے پیشاب کرنے کے بعد ٹٹولا۔معلوم ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر پیشاب گر رہا تھا، اس چمڑے کے ٹکڑے کو لائے اور پانی سے پاک کیا، کئی وقتوں کے بھوکے تھے۔اس چمڑے کو منہ میں ڈالا، جس سے تسلی ہوئی کہ میں بھی کچھ کھا پی رہا ہوں۔یہ مفلسی اور ناداری کی کیفیت تھی۔تو تعداد مسلمانوں کی تیرہ اور مشرکین مکہ کی تعداد کہیں زیادہ۔افلاس کا یہ عالم کہ کھانے کو نہ ملے، خزانے سارے انکے ہاتھ میں ہیں۔مگر اس کے باوجود زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اس کلمہ کو اونچا کرنا ہے۔ہم خواہ مٹیں یا رہیں۔تیرہ برس کے بعد پورا مکہ اور پورا حجاز اسلام میں داخل ہوا۔یہی قوم جو اقلیت میں تھی، اکثریت میں آ گئی، وہ قوم جو بے شوکت تھی، ساری شوکتیں اس کے ہاتھ آ گئیں اور جو قومیں شیر بنی ہوئی تھیں، وہ اس کے سامنے جھک گئیں۔اللہ کا نام لے کر کھڑے ہونے میں جب استقلال وثبات دکھلائے، تو دنیا کی قومیں جھک جاتی ہیں۔ہمیں دوسری قوموں کی دولت وعزت نہیں چھیننی۔ہمیں تو خدا کا نام پہنچانا ہے۔چاہے ہم مرجائیں، مگر یہ کلمہ قبول کرو۔اگر اس شان سے چلیں گے، دنیا کی قومیں ممنون ہوں گی۔

حدیث میں فرمایا گیا: جب کوئی قوم میرے قانون کی خلاف ورزی کرتی اور گناہوں میں ملوث ہوتی ہے، میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں ان کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دیتا ہوں۔وہ سزائیں دیتی ہیں۔یہ درحقیقت میری طرف سے وہ قومیں جلاد بن کے کھڑی ہوتی ہیں، تاکہ معصیت چھڑادیں۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر یہ چیز تمہیں ناگوار ہو کہ دنیا کی قومیں تم پر غالب آئیں اور تمہیں سزائیں دیں، ان کے بادشاہوں کو برا مت کہو، میرے سے معاملہ درست کرلو۔میں عداوت کی بجائے انکے دلوں میں محبت ڈال دوں گا۔آج جو قومیں نفرت کرتی ہیں۔کل کو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائیں گی۔دشمنی کرنے کی بجائے تمہاری خادم بن جائیں گی، قلوب تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔جب آدمی اللہ کا نائب بن کے اس کے کام کے لئے کھڑا ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اس کی عداوت پر ہی کمربستہ رہے؟ ایک نہ ایک دن عداوت ختم کردینی پڑے گی۔مگر شرط یہی ہے کہ نہ ہمیں دوسروں کا اقتدار چھیننا ہے نہ دولت چھیننی ہے۔نہ کسی قوم سے حسد ہے۔ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس نیک اور صالح بن جاؤ۔ہم نمونہ بن کے سامنے آئیں۔اگر ہم کہیں کچھ اور نمونہ دوسرا پیش کریں، دنیا ہماری بات کو کبھی نہیں مانے گی۔کہنے کی ضرورت

نہیں۔کر کے دکھلانے کی ضرورت ہے۔دنیا جھک جائے گی۔

اخلاقی قوت سے ہی انسان اونچا ہوسکتا ہے......حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں، تو سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔مؤرخین لکھتے ہیں سندھ کے بازاروں سے جب صحابہ گزرے، تو ہزاروں لوگوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا اور کہا کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہوسکتے۔ان کے چہروں پر سچائی برستی ہے۔انکا کردار اور چہرہ مہرہ سب اسلام کا مبلغ تھا۔ہم اپنے کردار سے دنیا کی اقوام کو اسلام سے نفرت دلا رہے ہیں۔دنیا کی اقوام ہمارے عمل کو دیکھ کر اسلام کو سمجھتی ہیں۔جب وہ ہمارے اعمال کو دیکھتی ہیں، کہتی ہیں کہ ایسے اسلام کو سلام ہے، اسے قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہم اسلام کے مبلغ کیا ہوئے، ہم خود اسلام کی تبلیغ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی درست کریں، ہمیں علم و تعلیم اور اسلامی اعمال سے واقفیت ہو۔جہالت کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم اونچی نہیں ہوسکتی۔انسان کے لئے ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔تو تعلیم بھی ہو اور اخلاق درست ہوں۔ہم میں صبر وتحمل، بردباری، حیاء، غیرت، حمیت، جذبہ خدمت ایسے اخلاق ہوں۔جب یہ اخلاق اور علم ہوگا تو ایسی قوم کبھی نیچے نہیں رہ سکتی۔یہ علم اور اخلاق ایک قوت ہے جو انسان کو گرنے نہیں دیتی۔یہ انسان کو اونچا بنا دیتی ہے۔یہ جب نکل جاتی ہے تو کوئی چیز آدمی کو اونچا نہیں کرسکتی۔جیسے ربڑ کی گیند میں ہوا بھری ہوئی ہے۔اگر اسے آپ زمین پر زور سے پٹخ دیں تو اتنا ہی اوپر جائے گی۔اس لئے کہ اس میں ہوا کی قوت بھری ہوئی ہے۔وہ نیچا نہیں دیکھ سکتی۔اگر ہوا نکال دیں، وہ پھس سے ہو کے وہیں رہ جائے گی۔ایک مسلمان کو مثل گیند کے سمجھو۔اس میں جب تک دین اور علم واخلاق کی ہوا بھری ہوئی ہے۔اگر اس کو کوئی زمین پر پٹخے گا بھی یہ اوپر ہی جائے گا۔اور اگر یہ روح اس کے اندر سے نکل گئی پھر جس قوم کا جی چاہئے، اسے تھپیڑ مارے اور نیچے گرا دے۔ہوا کی طاقت تو اس میں ہے نہیں۔اس لئے ہوا اندر ہی بھرنی چاہئے جس سے اندر طاقت آئے۔اور طاقت روح سے آتی ہے، پھر روح کی طاقت علم واخلاق سے، اسی سے آدمی کو خلافت کا مقام ملتا ہے۔اسی سے انسان کے اندر عبادت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔جب تک کسی چیز کا مقصد پورا نہ ہو۔اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے۔مثلاً مدرسہ ہے، اس کا مقصد تعلیم ہے۔اگر تعلیم نہ ہو، مدرسہ بے کار ہے۔گھر کا مقصد رہن سہن ہے، اگر اس میں رہن سہن نہ ہو گھر بنانے کا فائدہ کیا؟ بازار کا مقصد یہ ہے کہ سامان ملے، اگر سامان نہ ملے تو بے کار ہے۔اگر انسان کا مقصد عبادت وخلافت ہے۔جب یہ مقصد نہ ہو، یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔اگر مقصد پورا کر رہا ہے تو وہ زندگی کا ثبوت دے رہا ہے۔

مسلمان کا دنیا میں مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے......دنیا کی اقوام کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔کسی کا مقصد دولت، کسی کا روٹی، کسی کا اقتدار۔اسلام اور مسلمان کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے، کہ میں رہوں یا نہ رہوں خدا کا نام اونچا ہونا چاہئے۔میں اللہ کا نائب بن کے آیا ہوں۔میں تو اسی کے نام کا ڈھنڈورچی ہوں۔جب تک

آپ اللہ کے نام کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ اللہ کی حکومت کی قوت آپ کی پشت پر رہے گی۔ جب اسے چھوڑیں گے، قوت ختم ہو جائے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادشاہ جب کوئی قانون نافذ کرتا ہے، تو قانون کو گورنروں کے پاس بھیجتا ہے۔ گورنر کمشنر کے پاس اور کمشنر کلکٹر کے پاس اور کلکٹر تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے۔ اور تحصیل دار کیا کرتا ہے؟ وہ بھنگی بلاتا ہے ڈھول اس کے گلے میں ہوتا ہے اسے کہتا ہے کہ اس قانون کی منادی کر دے۔ تو بھنگی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ معمولی اس کی تنخواہ ہوگی۔ لیکن جب سرکاری قانون کی منادی کرتا ہے، گورنمنٹ کی پوری قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت آپ اس کے گلے میں سے ڈھول نکال کر تھپڑ ماریں، پوری گورنمنٹ مدعی بن جائے گی۔ کیونکہ تم نے گورنمنٹ کے قانون کی منادی کرنے والے کی توہین کی، گویا گورنمنٹ کی توہین کی۔ مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ تو بھنگی کی کوئی قوت نہیں۔ اصل قوت گورنمنٹ کی ہے۔ جب ایک مسلمان منادی بنے گا اور اللہ کا بھنگی بن کر اس کے قانون کو دنیا میں پکارتا پھرے گا، اس حالت میں اگر اس کی کوئی توہین و تذلیل کرے، وہ گویا خدا کی گورنمنٹ کی توہین کر رہا ہے۔ اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔ وہ کبھی نیچا نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں آپ اپنے کو اونچا بنائیں گے، تو ہماری قدر و قیمت نہیں۔ ہمیں جس کا جی چاہے نیچا دکھا دے۔ مگر جب خدا کی روح بھری ہوئی ہو، اسے لے کر چلیں تو اسے کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ تو بات وہ کرنی چاہئے جس سے ہم میں طاقت پیدا ہو۔ ہماری طاقت نہیں ہے۔ ہماری طاقت تو اللہ کے نام اور کام میں ہے۔ جو آیت کریمہ میں نے پڑھی، اس میں زندگی کے دو مقصد بتلائے۔ ایک عبادت اور دوسرے خلافت۔ عبادت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا۔ ﴿يٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ ① حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں اے میرے بیٹے! نماز قائم کر، نماز ہی چونکہ اصل میں عبادت ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن۔ اللہ کے آگے اپنی ذلت پیش کر، اسی میں تیری عزت اور رفعت و سربلندی ہے۔ تو یہ فریضہ عبادت کا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات فرمائی: ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② معروف کا امر کر اور منکر سے ممانعت کر۔ یعنی دنیا میں نیکی پھیلاؤ اور برائیاں مٹاؤ۔ دنیا کی قوموں کو اچھے کاموں کی عادت ڈالو، برے کاموں سے روکو۔ فحش و بے حیائی کو مٹاؤ، بے غیرتی و بے حمیتی کا دنیا سے خاتمہ کرو۔ حیاء ایثار، سخاوت، مروت اور شجاعت، ان اخلاق کو دنیا میں پھیلاؤ، تا کہ اللہ کی طاعت و عبادت دنیا میں پھیلے اور بغاوت ختم ہو۔ اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا۔ امر بالمعروف یعنی نیکی کا آرڈر دینا۔ نہی عن المنکر، برائی سے روک دینا۔ اصل میں یہ کام اللہ کا ہے، وہ سب سے بڑا امر فرمانے والا اور برائیوں کو روکنے والا ہے۔ مگر اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا، کہ تم میری طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ تو اس سے خلافت دنیا بھی ثابت ہوئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا

① پارہ: ۲۱، سورة لقمان، الآية: ۱۷. ② پارہ: ۲۱، سورة لقمان، الآية: ۱۷.

عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر ہم ان مسلمانوں کو طاقت واقتدار اور بادشاہت دے دیں۔ تو ان کا مقصد کیک پیسٹری کھانا نہیں ہوگا۔ ان کا مقصد اللہ کی ترجمانی ہوگا۔ یہ نمازوں کا نظام قائم کریں گے، صدقات پر دنیا کو مائل کریں گے۔ اچھی باتوں کا آرڈر جاری کریں گے برائیوں کو دنیا سے روکیں گے، یہ ان کا کام ہوگا۔ معلوم ہوا سلطنت دینے کا بڑا مقصد امر بالمعروف کا نظام قائم کرنا اور منکرات کو دنیا سے مٹانا ہے، اس کا نام خلافت ہے۔

قربانی سے نصب العین دنیا میں پھیلتا ہے...... ظاہر بات ہے جب مسلمان امر بالمعروف اور نصیحت لے کر کھڑا ہوگا۔ ساری دنیا نہیں مانا کرتی، کچھ دوست بن جاتے ہیں، کچھ دشمن۔ مبلغ کے سامنے مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کتنی گستاخیاں کی گئیں، اس میں صبر وتحمل، عالی ظرفی اور بڑے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آگے فرمایا گیا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ﴾ ② اور اس راستے میں جتنی مصیبتیں آئیں، ان کو جھیلنے کی عادت ڈالو اور اپنے اندر صبر وتحمل پیدا کرو، جس قوم میں صبر وتحمل اور برداشت آ گئی۔ وہ قوم کامیاب ہے۔ چاہے وہ ابتدا میں تکلیف اٹھائے۔ مگر چند دن کے بعد غلبہ اسی کا ہوگا۔ تو تین چیزیں فرمائی گئیں۔ عبادت وخلافت کا نظام اور اخلاق کا نظام، کہ صبر وتحمل اور اولوالعزمی ہو جو آدمی ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جائے۔ کسی نے گالی دے دی، بس لڑنے مرنے کو تیار، کسی نے اشارہ ہی کیا تو مکا دکھانے کو تیار، وہ کبھی کام نہیں کر سکتا۔ کام وہ کرے گا کہ قتل کی بھی دھمکیاں ہوں، دولت بھی چھین لی جائے، غلامی کی بھی دھمکی دی جائے۔ مگر وہ پرواہ نہ کرے، کہ یہ چیزیں مجھے مقصود نہیں مجھے تو اللہ کا نام بلند کرنا ہے۔ فاقہ کروں یا کچھ کروں مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے وہ کبھی نیچا نہیں ہو سکتا۔

اس واسطے اس آیت کی روشنی میں میں نے یہ تین باتیں عرض کیں۔ ایک عبادت درست ہونی چاہئے۔ ایک خلافت کا جذبہ ہونا چاہئے اور ایک اخلاق اور کردار درست ہونا چاہئے۔ تب جا کے قوم کی زندگی بن سکتی ہے، اگر عبادت اور خلافت کا جذبہ نہ ہو، اخلاقی قدریں بھی نہ ہوں آخر پنپنے اور زندہ رہنے کی صورت کیا ہے؟

روٹی زندگی نہیں، زندگی انسان کا کردار اور نصب العین ہے۔ وہ ہوگا تو قوم زندہ ہے۔ آج دنیا میں جتنی قومیں بڑھ رہی ہیں، وہ کھانے پینے سے نہیں، یہ تو آثار میں سے ہے، خود ہی آ جاتا ہے۔ اصل نصب العین ہے، جو قوم کوئی مقصد لے کر کھڑی ہوئی اور وہ اس مقصد کی خاطر قربانیاں دے، وہ بڑھے گی اور اقتدار پائے گی۔ ہم کوئی بھی مقصد نہ رکھیں۔ بس کھا پی لیا اور سو گئے۔ یہ کوئی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ مقصد ہے تو ہر جانور بھی یہ مقصد لئے ہوئے ہے، تو پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان تو کوئی کمال لے کر آیا ہے۔ جامع تو اتنا کہ ساری مخلوقات اور خالق کے کمالات کے نمونے موجود اور مقصد صرف روٹی۔ اتنا اعلیٰ کردار لے کر آئے اور

---

① پارہ: ١٧، سورة الحج، الآية: ٤١. ② پارہ: ٢١، سورة لقمان، الآية: ١٧.

مقصد اتنا پھسپھسا، جو ہر جانور کو بھی میسر۔ جیسا جامع ہے ویسا ہی مقصد بھی ہونا چاہئے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ ایک طرف عبادت ہو، یعنی اللہ کا سچا بندہ اس کے نام پر مر مٹنے والا۔ اور ایک طرف اس کا نائب کہ اس کا خلیفہ بن کر پوری دنیا میں اصلاح کا پیغام پہنچانے والا۔ اور اس میں مضبوط اتنا کہ جو مصیبت آئے، اسے خوشدلی سے جھیلنے کو تیار، ایسے افراد اور ایسی قومیں ہمیشہ بلند و بالا ہوتی ہیں۔ غور کیا جائے جو تین چیزیں میں نے پیش کی ہیں یہ قوم کی برتری اور سر بلندی کا پیغام ہیں۔ تفصیلات اس کی بہت ہیں۔ وہ تعلیم اور غور فکر سے معلوم ہونگی، مگر اصولاً یہی تین چیزیں ہیں جس سے قومیں بڑھتی ہیں۔ ایک صحیح نصب العین کہ سچا عابد اور دوسرا نصب العین کہ سچا خلیفہ ربانی اور تیسرا کہ سچا اخلاقی نمونہ رکھنے والا اس سے انشاء اللہ برتری ہوگی۔

یہ آیت ہے تو دو تین لفظوں کی، مگر اس نے بڑا عظیم پروگرام پیش کر دیا ہے اور یہی اللہ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ میرا آپ کا کلام نہیں خدا کا کلام ہے کہ وہ لفظ فرمائے جاتے ہیں۔ اور علوم کے دریا اس کے اندر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا کھودے جاؤ، نکالتے جاؤ۔ جتنا غرق ہوتے جاؤ موتی نکالتے جاؤ۔ اس لئے قرآن کریم کو معجزہ کہا گیا۔ جیسے سمندر میں موتی اور ہزاروں جواہرات بھرے ہوئے ہیں مگر کوئی غوطہ لگانے والا اور نکالنے والا ہونا چاہئے، جس میں دم اور سانس ہو کہ نیچے پہنچے، موتی نکال کے لائے اور جو دم توڑ دے گا، وہ تو اپنی جان کھو کے آئے گا، موتی تو کیا نکال کے لائے گا؟ جو تیراکی کے فن سے واقف نہ ہو، تو وہ جائے گا جان کھو کر ہی آئے گا۔ تیراکی کا فن سیکھ کر پھر سمندر میں گھسا جائے، تو موتی نکالتا ہے۔ قرآن حکیم ایک سمندر ہے اور اس میں تیرنے کا فن تعلیم ہے۔ علم سیکھ کر جب آدمی اس میں گھسے گا تو ہزاروں موتی اور علم کے جواہرات نکلیں گے، قرآن کے معجزہ ہونے کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک لفظ ہوتا ہے اور کوزے کے اندر ہزاروں دریا بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں اس کی تفسیر کروں تو کتنے ہی دن چاہئیں، تفسیر پھر بھی پوری نہیں ہوگی۔ اس لئے بالاجمال یہ تین مقاصد نکال کر پیش کئے، ان کی تفصیلات کے لئے لمبی مدت کی ضرورت ہے بالاجمال ان مقاصد کو یاد رکھ کے اپنی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہئے کہ کس حد تک ہم ان مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اگر پورا نہیں کر رہے، تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ معلوم کر کے انہیں زائل کیا جائے۔ اس واسطے میں نے یہ تین چیزیں پیش کیں۔ امید ہے کہ آپ حضرات ان تینوں پر وقتاً فوقتاً غور کریں گے اور اپنی زندگی کو بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کامیابی دے گا۔ ہزاروں مسائل کا اس میں علاج ہے۔ ہزاروں مصائب دنیوی و اخری کا حل اسی کے اندر ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے کہ ہم اپنے پروردگار کے کلام پر چلنے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی کو قرآن و حدیث میں ڈھالیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نصیب فرما وے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖٓ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ .

اخلاص فی الدین

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ لَاشَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

طریق سنّت پر عمل سے عادت بھی عبادت بن جاتی ہے...... بزرگان محترم! حق تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس پر ہم کو فخر ہے لیکن ہم کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اسلام کا کیا معنی ہے؟ اس لئے مختصر سے وقت میں اس کا معنی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دو لفظ "عادت اور عبادت" سنے ہوں گے۔

عادت تو ان کاموں کو کہا جاتا ہے جو ہم روزمرہ (کی زندگی میں) کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، دوستوں سے ملنا، گھریلو زندگی، اجتماعی زندگی اور ایسے ہی جتنے طبعی افعال ہیں ان کو عادت کہا جاتا ہے۔ اور عبادت یہ ہے کہ انہی (مذکورہ بالا) افعال کو طریق سنت کے مطابق کیا جائے اور یہ جو ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسجد میں جانا تو عبادت ہے لیکن گھر میں رہنا عبادت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ اگر ہم گھریلو معاملات میں بھی سنت طریقہ پر عمل کریں گے تو وہ بھی عبادت ہو جائیں گے۔ صرف نیت کی ضرورت ہے یہی روزہ ہے اگر ایک آدمی بلا نیت سارا دن بھوکا رہے تو کوئی ثواب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر روزے کی نیت کرے تو تھوڑی نیت کی تبدیلی سے یہی عبادت بن جاتی ہے۔ تو اگر ہم ساری دنیا کو دین بنالیں تو کتنا اچھا سودا ہے اور اگر ہم نیت کے ذرا سے فرق سے دین کو دنیا بنالیں تو کتنا مہنگا سودا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ: اگر ایک آدمی "بِسْمِ اللّٰهِ" سے کھانا شروع کرے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا" پر ختم کرے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صرف نیت کرنے سے اتنا بڑا اجر ملا کہ دنیا تو بنی ہی

① پارہ:۸، سورہ الانعام، الآیۃ: ۱۶۱-۱۶۳۔

لیکن دین بھی ساتھ ہی بنا۔اسلام چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی کاموں کو دین بنادیا جائے۔ ①

حدیث میں ہے: ''اَلسِّوَاکُ مِطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ'' ② مسواک کرنا منہ کی صفائی کا ذریعہ اور خوشنودی الٰہی کا باعث ہے۔تو مسواک کرنا دنیا بھی ہے۔(جب کہ محض یہی نیت ہو کہ دانت اچھے ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا بھی سبب ہے اس لئے دین بھی ہے۔احادیث میں ہے کہ: آپ بہت مسواک فرماتے تھے۔نمازوں کے اوقات، تہجد کے وقت اور اکثر اپنے دوستوں سے فارغ ہوکر مسواک فرماتے تھے۔حتیٰ کہ مرض وفات میں بھی آپ نے مسواک کی طرف دیکھا تھا۔تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سمجھ گئیں کہ آپ کرنا چاہتے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسواک دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک فرمایا، پھر وہی مسواک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی کیا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باقی ازواج مطہرات پر اس بنا پر فخر کیا کرتی تھیں کہ آپ کا لعاب مبارک میرے حلق میں گیا اور آپ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میری گود میں تھا۔

اسلام کا ہر عمل دو حیثیت کا حامل ہے...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! آپ اس قدر کثرت سے مسواک کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ملائکہ علیہ السلام سے میری گفتگو ہوتی ہے اور ان کو بو سے نفرت ہے۔ایسے ہی اسلام کے ہر عمل میں ایک راستہ دنیا کی طرف اور ایک راستہ دین کی طرف جاتا ہے''۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عیادت کے لئے ایک نوجوان حاضر ہوئے۔جب واپس جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انکو بلاؤ۔جب ان کو بلایا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''يَـا اَخِـيْ اِرْفَعْ ثَوْبَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰى لِثَوْبِکَ وَاَرْضٰى لِرَبِّکَ'' ③ اے بھائی! (ٹخنوں سے نیچے جو آپ کا کپڑا ہے اس) اپنے کپڑے کو اوپر اٹھاؤ، کیونکہ اس سے کپڑا بھی صاف رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں۔ (تو کپڑے کی صفائی بھی ہے اور رضائے خداوندی بھی ہے، عمل ایک ہے لیکن دونوں حیثیتیں اس میں بھی ہیں)

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔ان میں سے ایک ''اَلْـمُسْبِـلُ'' ازار کو نیچے کرنے والا بھی ہے ④ (ٹخنوں سے ازار کا نیچا ہونا علامت تکبر ہونے کے باعث غضب خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔اس لئے ازار کا اوپر ہونا اگرچہ اس سے صفائی بھی رہتی ہے لیکن اللہ کی رضا کا ذریعہ بھی ہے) تو ہر عمل میں حیثیتیں دو ہی ہیں، آپ کو جو ثواب ملتا ہے وہ آپ کے تعیین

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الأطعمة ،باب مایقول اذافرغ من الطعام،ص: ۱۰۱.

② الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب سواک الرجل الصائم، ج:۷،ص:۱۸.

③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفان، ج:۱۲ ص:۳۵.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الإیمان ،باب بیان غلظ تحریم الإسبال، ج:۱، ص:۲۲۷.

حیثیت ہی پر تو ملتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ''وَفِی بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ.'' ① تمہاری شرمگاہوں میں بھی صدقہ ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: ''اَیَاْتِیْ اَحَدُنَا شَھْوَتَهٗ وَلَهٗ فِیْھَا اَجْرٌ''؟ یعنی ہم میں سے کوئی اپنی شہوت کو پورا کرے تو اس میں بھی اسکے لئے اجر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہی پانی اگر حرام موقع میں ڈالتا تو گناہ نہ ہوتا؟ جب اس نے حرام سے اجتناب کیا تو یہی عبادت ہوگی۔ تو شہوت کے پورا کرنے میں بھی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک محض شہوت رانی اور ایک یہ ہے کہ اجتناب عن الحرام کی نیت سے شہوت کو پورا کیا جائے۔ تو اس حیثیت کے متعین کرنے کی وجہ سے وہ عبادت بن گئی۔

اتباع حکم ہی عبادت ہے...... حاصل یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض گناہوں کی بھی اگر شریعت کی طرف سے اجازت مل جائے تو وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن صلح اور دفع فتنہ کے لئے واجب ہے۔ تو یہ عبادت میں شامل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ عبادت کسی کام کے کرنے کا نام نہیں بلکہ حکم ماننے کا نام ہے۔ (اسی لئے باوجود اس کے کہ ایک چیز اپنی ذات کے لحاظ سے درست ہوتی ہے مگر شریعت حقہ خلاف حکم ہونے کے باعث اس کے نتائج کو غلط قرار دیتی ہے مثلاً) جب نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے تو پڑھنا عبادت ہے اور جب روکا جائے تو عبادت نہیں۔ جیسا کہ تین اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ان اوقات میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ ایسے ہی روزہ ایک عبادت ہے لیکن جب اس سے روکا جائے تو عبادت نہیں۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، کیونکہ اس سے روکا گیا ہے۔ اس طرح سچ کہنا عبادت ہے لیکن اگر سچ کہنے سے فتنہ و فساد بڑھے تو ناجائز ہے۔ جیسے غیبت کرنا جو کہ واقع میں تو سچ ہوتا ہے۔ (کیونکہ خلاف واقعہ بموجب حدیث بہتان ہے) لیکن شریعت نے اس سچ سے منع فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادت حکم ماننے کا نام ہے (کسی خاص فعل یا قول کا نام نہیں) اور حکم دینے والے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ کس جگہ حکم دینا مناسب ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ کیونکہ اکڑ کر نہ ہی تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بندہ ہے، بندگی کے لئے آیا ہے۔ اس کی مشیت (اس کا چلنا پھرنا) بھی بندگی ہی ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا﴾ ② یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ غرض اترا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ جہالت کی علامت ہے۔ اور اکڑ کر وہی چلتا ہے جو اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے۔ ایک متکبر آدمی بہت اکڑ کر چل رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ بھی آرہے تھے، جن کی چال سے تواضع اور عاجزی ٹپک رہی تھی۔ تو اس بزرگ نے کہا کہ بھائی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکاة، باب بیان ان اسم الصدقة...... ج:۵، ص:۱۷۷.

② پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۶۳.

اکڑ کر نہ چلو تو اس کو غصہ آیا اور کہنے لگا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟ تو یہ شخص اگر اپنے مال میں مست تھا تو وہ بزرگ اپنی کھال میں مست تھے۔ انہوں نے فرمایا، جانتا ہوں تم کون ہو اور تمہارا تعارف یہ ہے کہ:

"اَوَّلُکَ نُطْفَۃٌ وَّاٰخِرُکَ جِیْفَۃٌ وَّاَنْتَ تَحْمِلُ بَیْنَھُمَا قَذْرَۃً" یعنی تیری ابتدا تو اس پانی سے ہوئی جو بدن کو لگ جائے تو پلید ہو جائے، کپڑے کو لگ جائے تو ناپاک ہو جائے اور بدن سے نکلے تو غسل واجب ہو۔ اور انتہا میں تو ایک مردار ہے اور ان دونوں حالتوں کے درمیان گندگی اٹھائے پھرتا ہے۔ تو اس شخص کو اپنی حقیقت نظر آئی، توبہ کی اور کہا:

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی ۔۔۔ مرابا جانِ جاں ہمراز کردی

انسان کی ذات میں کوئی کمال نہیں ...... کمال درحقیقت جو بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تو گندگی ہی ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں عقل بھی نہیں ہوتی۔ فخر تو انسان اس وقت کرے جب اس کی ذات میں کوئی کمال ہو۔ ورنہ فخر کرنا جہالت ہے۔

انسان کا سب سے بڑا کمال ایمان ہے۔ لیکن اس پر غرور کرنا ٹھیک نہیں، شکر کرنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی توفیق دی۔ ورنہ جیسے دنیا میں سینکڑوں کفار پھرتے ہیں۔ اگر ہمیں بھی انہیں میں سے کر دیتے تو ہماری کیا مجال تھی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّاتَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ یعنی اپنے اسلام کا احسان اللہ پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے ایمان کی توفیق بخشی۔

منّت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی ۔۔۔ منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کے خادم کو بادشاہ پر احسان نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ اس کی خدمت کر رہا ہے، بلکہ اس کو بادشاہ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے اسی کو خدمت کے لئے چن لیا ہے (ورنہ بادشاہ کے ہزاروں لوگ خدام بننے کی خواہش رکھتے ہیں)

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان کو اکڑ کر نہیں چلنا چاہئے لیکن اگر اکڑ کر چلنے کا خود حکم دیں تو یہ عبادت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ حج کرتے وقت طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل (اکڑ کر چلنا) کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ عبادت بن گئی۔

گر طمع خواہد زما سلطانِ دیں ۔۔۔ خاک برفرق قناعت بعد ازیں

معلوم ہوا جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت ہو جاتی ہے۔ پس یہی عبادت عادت ہے اور یہی عادت کے ساتھ عبادت ہے۔

اسلام کا سہل راستہ ...... اگر انسان نماز پڑھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹہ لگتا ہے تو گویا سوا گھنٹہ عبادت ہوئی۔ لیکن اسلام ایک ایسا (سہل اور آسان) راستہ بتاتا ہے کہ ہر ایک کام عبادت بن جائے۔ چنانچہ کھانا، پینا،

سونا تمام عبادت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس نیت سے انسان سوئے کہ میں اٹھ کر تہجد پڑھ سکوں یا بیت الخلاء میں اس لئے جائے کہ گندگی نکل جائے اور طبیعت میں نشاط پیدا ہو تو فراغت سے عبادت کر سکوں۔ روٹی اس نیت سے کھائے کہ اس سے قوت پیدا ہو تو اللہ کی عبادت کروں۔ تو یہ ساری چیزیں عبادت بن جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ: ''مَنْ قَادَاَعْمٰی اربعین خطوۃ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ'' ① یعنی جس نے اندھے کو لاٹھی پکڑ کر چلایا تو اس کے اگلے پچھلے تمام صغائر (چھوٹے گناہ) معاف ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی جنازہ اٹھانا ایک طبعی امر ہے۔ ثواب نہ بھی ہو تو بھی انسان اٹھاتا ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ: جو شخص جنازے کے چاروں پاؤں کو کندھا دے تو اس کو چالیس نیکیاں ملتی ہیں۔ مردہ کو دفن کرنا ایک امر طبعی ہے۔ لیکن اتباع سنت کی نیت سے کیا جائے تو عبادت ہے۔ یتیم پر شفقت تو ہر ایک کو ہوتی ہے لیکن لوجہ اللہ کی جائے تو عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آئیں تو اس کو اتنی نیکیاں ملتی ہیں۔

عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں...... اور عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ ایک اخلاص یعنی خالص اللہ کے لئے ہو۔ ریا یا شہرت کے لئے نہ ہو۔ اور حظ نفس کے لئے بھی نہ ہو۔ عبادت میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ پس ہر عبادت میں توحید کا رنگ ہونا چاہئے۔ اگر نماز پڑھی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ روزہ رکھا جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ نذر مانی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسرے کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔

مشرکین کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّاذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ﴾ ② یعنی کفار نے کھیتوں اور جانوروں میں تقسیم کی ہوئی تھی کہ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور یہ حصہ ان کے دوسرے معبودوں کا ہے۔ پس یہ عبادت مشترک ہوئی اور مشترک عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَآءِ مِنَ الشِّرْكِ ③

کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوسرے حصے کو بھی تو ہی رکھ لے مجھے تیری عبادت کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی اگر خیرات دی جائے تو چھپا کر دینی چاہئے۔ ہاں اگر کسی دینی مصلحت

① المعجم الکبیر للإمام الطبرانی، ج: ۱، ص: ۳۶۲ علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواہ الخطیب عن ابن عمر، قال المناوی: وفیہ عبدالباقی ابن قانع اوردہ الذھبی فی الضعفاء واوردہ الذھبی فی المیزان عن ابن عباس رفعہ بلفظ: من قاد مکفوفا اربعین ذرا عادخل الجنة، وقال فی سندہ عبداللہ بن ابان الثقفی لایعرف وخبرہ منکر باطل دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۶۹۔

② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۳۶۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الزھد، باب من اشرک فی عملہ غیر اللہ، ص: ۲۵۴۔

کے لئے اظہار ہو تو یہ بھی اچھا ہے۔ مثلاً اس نیت سے مشہور کر کے دے تا کہ دوسرے بھی دینے لگیں تو بہتر ہے۔ ورنہ اصل میں صدقہ کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اس طرح دیا جائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو۔ اور جو کچھ مانگا جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہی مانگا جائے۔ حدیث میں ہے کہ: اگر انسان کا تسمہ ٹوٹ جائے اور اس کو ٹھیک کرانے کے لئے پیسے بھی موجود ہوں تو جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے مانگنا چاہئے۔ اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ نافع حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ چیزیں اسباب نفع ہیں اور اسباب نفع پر خاصیت کا مرتب ہونا عقلاً ضروری نہیں۔ مثلاً آگ پر جلانے کا مرتب ہونا ضروری نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت بدل دے تو یہی پانی کا کام دے سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں پھینکا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے جلانے کی خاصیت چھین لی، تو آپ علیہ السلام صحیح سالم رہے۔ ایسے ہی روپیہ سبب نفع تو ہے لیکن نافع نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس سے اس کی خاصیت چھین لیں تو بے کار ہے۔ ایسے یہی تلوار گلا کاٹنے کا سبب تو ہے لیکن خود نہیں کاٹتی۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری کو پھیرا، لیکن اس نے کاٹا ہی نہیں۔ یہی پانی آب حیات ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ① لیکن یہی پانی قبطیوں کے لئے سبب موت بن گیا۔ اسی پانی سے بنی اسرائیل کیلئے راستے بن گئے اور ایک ایک قبیلہ ایک ایک راستے سے گزرنے لگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ڈبونے کی خاصیت اس سے سلب کر لی اور قبطیوں کو اسی پانی میں ڈبو دیا۔ ماں باپ انسان کے لئے خالق نہیں۔ سبب تخلیق ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہے تو بدوں اس سبب کے پیدا کر دے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بدوں ماں باپ کے پیدا کیا۔ البتہ ''عادۃ اللہ'' یوں ہی جاری ہے کہ اولاد میاں بیوی دونوں سے ہوتی ہے۔ سینکڑوں کیڑے مکوڑے بدوں ماں باپ کے صرف گندگی جمع ہونے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ﴾ ② اور کاشتکار سے فرماتے ہیں: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ③ اور اگر ظاہری طور پر کاشت کار ہی بوتا ہو تو بونے کے لئے اعضاء، اسباب، بیج اور پھر بیج کا اگنا سب ہی تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حقیقت میں نافع اور ضار اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

اللہ کی عبادت کیوں کی جائے؟...... اور عبادت نافع اور ضار ہی کی ہوتی ہے۔ اسباب نفع وضرر کی نہیں ہوتی۔ یہی دھوکہ دوسری قوموں کو لگا تو کوئی سورج کو سجدہ کرنے لگا تو کوئی درخت کو۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ نفع تو ہر چیز

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۰۔

② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹۔

③ پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴۔

میں موجود ہے۔ پس تمام عبادتیں (جانی و مالی ہمہ قسم) اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہونی چاہئیں۔ نہ غیر اللہ کی نذر مانی چاہئے۔ نہ غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے اور نہ رکوع کیا جائے۔ البتہ جو چیزیں جائز ہیں ان کی تعظیم جائز ہے۔ حضرات انبیاء نے بھی یہی تعلیم دی ہے فرمایا گیا: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ ① یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ اور میری اتباع کرو اور حضرات انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام کی شان تو یہ تھی کہ اگر تکلیف ہوتی تو شکوہ بھی اللہ تعالیٰ سے کرتے تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام گم ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللهِ﴾ ② یعنی میں اپنے غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام انہی کی مرضی سے گم ہوئے ہیں اور انہیں کی مرضی سے ملیں گے۔

حدیث شریف میں ہے: ''اِذَا اسْتَعَذْتَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ.'' ③ یعنی جب تو پناہ پکڑے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ۔ اور جب تو مدد چاہے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ۔ مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعا کی تو پہلے ولادت کے تمام اسباب کے نہ ہونے کا ذکر فرمایا چنانچہ فرمایا: کہ اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور جب ہڈیوں تک کمزوری پہنچ گئی ہو تو گوشت اس سے اوپر ہوتا ہے، وہ بطریق اولیٰ کمزور ہوگا۔ یہ تو اندرونی حالت تھی۔ اور باہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرا سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا۔ لیکن اے اللہ! میں تجھ سے مانگ کر کبھی نامراد نہیں گیا۔ اور اولاد طلب کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں۔ ان سے مجھے ڈر ہے کہ یہ میرے مشن کو چلا نہیں سکیں گے۔ اور تربیت و ہدایت نہیں کریں گے۔ پھر فرمایا کہ: میری بیوی بانجھ ہے۔ اس میں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں۔ گویا اولاد کی صلاحیت نہ خاوند میں نہ بیوی میں اور نہ رشتہ داروں سے تعلیم و تربیت کی امید، جو میرے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

بعد ازاں فرماتے ہیں اے اللہ! ایسا بیٹا دے جو میرا وارث ہو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی وراثت مال نہیں ہوتا بلکہ علم الٰہی ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے: ''اِنَّ الْاَنْبِيَآءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ'' ④ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دعا کرے تو تردد نہ کرے بلکہ عزم کے ساتھ کرے۔ جیسا کہ ایک بدوی حج کو آیا تو بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا: ''يَا رَبَّ الْبَيْتِ يَا رَبَّ الْبَيْتِ جِئْتُكَ وَاَهْلِيْ فِي الْبَيْتِ اِلَّا تَغْفِرْلِيْ فَاغْفِرْلِيْ.''

پھر دعا کے بعد بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعینہ وہی چیز مل جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ اس سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی دیر سے بھی ملتی ہے جیسا کہ بیٹا باپ سے کچھ پیسے مانگے تو باپ نہ دے اور کچھ دن گزرنے کے

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ النوح، الآیۃ: ۳۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۶۔ ③ المستدرک علی الصحیحین للإمام الحاکم ولفظہ: اذا سئلت فاسئل اللہ، واذا استعنت فاستعن باللہ، ج: ۳، ص: ۳۷۷۔

④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۹۔

بعد دے۔ بیٹا کہے کہ جب میں نے مانگے تھے اس وقت تو آپ نے دیئے نہیں تھے تو باپ کہتا ہے کہ بیٹا اس وقت تو بیمار تھا اگر میں تمہیں پیسے دے دیتا تو تو ایسی چیزیں کھاتا جن سے تمہاری صحت بگڑتی۔ (بلاشبہ) ایسے ہی اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی مال مانگے تو بعض اوقات مال نہیں ملتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچ ہے۔ اگر اس کو مال دیا گیا تو یہ اور زیادہ معاصی میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن جب مفلس ہو جاتا ہے اور معاصی سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیٹا ساری زندگی مانگتا رہتا ہے باپ کچھ بھی نہیں دیتا۔ لیکن جب بیٹا بڑا ہو جائے تو باپ اس کو خزانہ دے دیتا ہے۔ بیٹا کہتا ہے کہ آپ نے ساری زندگی تو مجھے کچھ دیا نہیں باپ کہتا ہے کہ میں دیتا رہتا تو تو سارا مال ضائع کر دیتا۔ تو جتنا مجھ سے مانگتا رہا میں جمع کرتا رہا۔ اور آج اتنا خزانہ ہو گیا ہے۔ ایسے ہی انسان کی دعا بعض اوقات ساری زندگی قبول نہیں ہوتی۔ لیکن قیامت میں نیکیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہوگا تو یہ انسان کہے گا کہ اے اللہ! میں نے تو اتنی نیکیاں نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو دنیا میں دعائیں کرتا رہا۔ میں ان کو تیری آخرت کے لئے جمع کرتا رہا۔ چنانچہ یہ تیری دعائیں ہیں۔ اس لئے انسان کو دعا سے کبھی تنگ نہیں ہونا چاہئے۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو بھی دعا کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ'' ① دعا عبادت کا مغز ہے۔ مغز کو چھوڑ کر محض چھلکے پر اکتفا کرنا کون سی دانش مندی ہے؟

غیر اللہ میں سے کس کی تعظیم ضروری ہے؟

...... اور دعا و طلب صرف اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہئے۔ لیکن جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائیں ان کی تعظیم بھی ضروری ہے۔ مثلاً حضرات انبیاء کی تعظیم ضروری ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔ اور قرآن مجید کی تعظیم بھی ضروری ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بیت اللہ المکرّم کی تعظیم کرنی چاہئے کہ قضاء حاجت کے وقت اس کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے، کیونکہ وہ جہت صلوٰۃ ہے لیکن معبود نہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئے تو حجر اسود کو بوسہ دینے کا موقع نہ ملا۔ اور اس وقت ایسی حکومت تو نہ تھی کہ بذریعہ پولیس آپ کے سامنے سے سب کو ہٹا دیا جاتا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے لاٹھی کو حجر اسود کے ساتھ لگا کر اس کو بوسہ دے لیا۔ اور حجر اسود سے خطاب کر کے فرمانے لگے: ''اِنِّیْ اَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ لَوْلَا اَنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَکَ مَا اَقَبَّلْتُکَ'' ② یعنی میں خوب جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو ضرر دے سکتا ہے اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تجھے بوسہ دے رہے ہیں تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ حدیث میں ہے: ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے میں نے قیصر و کسریٰ کو دیکھا کہ لوگ ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ میں

---

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، ج: ۱۱ ص: ۲۲۰.

② الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب تقبیل الحجر، ج: ۶، ص: ۳۷.

نے خیال کیا کہ اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اس لئے کہ عبادت وسجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ذات عالی کے لئے مخصوص ہے۔ کسی اور کی نہ عبادت ہے نہ کسی کو سجدہ ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام نے خود بھی تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ① یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو کتاب اور نبوت دے۔ پھر وہ نبی کہنے لگے کہ میری عبادت کرو، اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرو۔ تو حاصل اخلاص کا یہ ہوا کہ تمام عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرنی چاہئے۔

قبولیت اعمال کے لئے اخلاص کے ساتھ اتباع نبوی ضروری ہے...... دوسرا اصول یہ ہے کہ عمل میں اتباع کی شان موجود ہو۔ ہر فعل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے۔ جو عبادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے نمونہ پر ہوگی، وہ مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ ظہر کی چھ رکعتیں پڑھے تو یہ عند اللہ مقبول نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے خلاف ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ روزہ مغرب تک تو ہوتا ہی ہے۔ میں آج عشاء کے وقت افطار کروں گا۔ تو یہ قبول نہیں۔ نیز نمونے بنانے کی ضرورت نہیں بلکہ نمونے بنے ہوئے موجود ہیں۔ کیونکہ دین کامل اور مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں ہر قسم کی ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ بعض مشرکین حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ تمہارا نبی تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ: ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم فارغ ہوتے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کریں اور نہ ہی پیٹھ کریں۔ تو جب حدیث میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں تو اور کس چیز کی کمی ہوگی۔ اس لئے جتنا اخلاص کم ہوتا جائے گا اتنا شرک بڑھتا جائے گا اور جتنی اتباع میں کمی ہوگی اتنی ہی بدعات داخل ہوتی جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی ہمارے سامنے نمونہ کے لئے موجود ہے۔

سیر حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے صرف اسوۂ محمدی ہی موجود ہے...... یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے دنیا کی کوئی قوم اپنے مقتدا کی سیرت دنیا کے سامنے پیش نہیں کرسکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گھریلو زندگی کا آج ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ صرف مسلمان ہی یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹۔

کھانے، پینے، سونے، غرض زندگی کے ہر کام کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

چین میں آٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم تشریف لے گئے اور وہاں جا کر تجارت شروع کر دی۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ دیانتدار تھے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ ''اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُم عَدُوْلٌ'' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں۔ دیانتداری سے وہاں تجارت شروع کی تو تمام بازار ٹھنڈا پڑ گیا۔ تاجروں نے حکومت کے پاس شکایت کی کہ یہ لوگ عرب سے آئے ہیں اور ملک لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ تمام دولت نکال کر عرب میں لے جائیں گے۔ اس شکایت کا ردعمل یہ ہوا کہ ایک کمیشن صرف اس مقصد کے لئے بنا اور وزیر اعظم خود اس کے صدر بنے۔ اور آ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہنے لگے: ''تم ہمارے ملک کو ویران کرتے ہو اس لئے تم یہاں سے نکل جاؤ''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ: آپ کے تاجروں نے غریبوں کو لوٹ رکھا تھا جب ہم نے دیانتداری سے کام شروع کیا تو ان کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا اور حسد کی وجہ سے شکایات لے کر آپ کے ہاں پہنچے ہم تو آپ کے ملک کو آباد کرنے آئے ہیں۔ ویران کرنے نہیں آئے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہم کو بہر حال شکایت ہے اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اگر ہمارا قصور ہو تو ہم اقرار کرنے کے لئے تیار ہیں اور بلا قصور تم نکالنا چاہتے ہو تو ہماری طرف سے اعلان جنگ ہے۔ رعایا نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حکومت دب گئی۔ انہی آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ (تو نیت کی درستگی اور دیانت کی وجہ سے آٹھ نفوس قدسیہ پر مشتمل یہ چھوٹا سا گروہ اپنی زندگی کا مقصد اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنا چکا تھا۔ اتنی بڑی تعداد پر غالب آیا اور رہتی دنیا تک اپنے انمٹ نقوش چین پر ثبت کر دیئے۔ آج بھی توحید کی آواز چین کے در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے)

توحید کی قوت اور شرک کی بے بسی...... ایران پر چڑھائی کے لئے جب مسلمانوں کا لشکر گیا تو راستے میں دریا آ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر سے فرمایا کہ جس خدا کے بندے ہو اسی کے قبضہ قدرت میں یہ دریا ہے۔ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور تیرتے ہوئے دریا کو عبور کر گئے۔ ایک صحابی کا پیالہ دریا میں گر پڑا، دوسروں نے کہا کہ اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر پیالہ میرا ہو تو یہ نہیں ڈوبے گا۔ (اللہ اس کی حفاظت فرماویں گے) چنانچہ دریا کی موجوں نے پیالے کو دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ جب وہ صحابی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو پیالہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں قلب کے قوت سے ہوتی ہیں اور قلب کی قوت توحید سے پیدا ہوتی ہے۔ شرک سے دل میں تذبذب آ جاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ شرک کا واہمہ تھا نہ بدعت کا شبہ۔

• حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آٹھ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر ماہان آرمنی عیسائی کے مقابلہ میں

تشریف لے گئے۔ ماہان ارمنی حضرت خالد سے کہنے لگا، میں تو سمجھا تھا کہ مسلمان عقلمند ہیں لیکن تم تو احمق ہو کہ اتنے آدمیوں کو لے کر ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ کے لئے آ گئے۔ مجھے تمہارے نوجوانوں پر رحم آتا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ماہان! تو کمانڈر انچیف بن کے آیا ہے یا واعظ بن کر آیا ہے؟ تو اگر لڑنا نہیں چاہتا تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ میں لڑائی نہیں کر سکتا۔ ماہان کو غصہ آیا تو فوجوں کو لڑنے کا حکم دے دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو کفار میں گھس جانے کا حکم فرمایا راوی کہتے ہیں کہ سات گھنٹے تک لڑائی ہوئی آخر کفار شکست کھا کر بھاگ گئے مسلمان صرف سات شہید ہوئے اور عیسائیوں کے تیرہ ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آدمی جب دین کے لئے لڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد فرماتے ہیں۔ اور ہمت تو صرف توحید سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مشرک میں یہ جان نہیں کہ وہ اتنی قوت پیدا کر سکے حاصل یہ کہ ایک طرف اخلاص کامل اور دوسری طرف اتباع کامل کی ضرورت ہے، آج مسلمانوں میں شرک و بدعات داخل ہو رہی ہیں۔ اس لئے آج ذلت کی بھی یہ حالت ہے کہ خدا کی پناہ۔

اقوام عالم کی اصلاح کا ذمہ دار مسلمان ہے...... اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے سے حسن ظن رکھنا چاہئے، بدظنی سے بچنا چاہئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ضروری ہے لیکن کسی کو رسوا نہیں کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ اے اللہ! میں اس مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں، جو دوستی کا دعویٰ کرے لیکن جب میری بھلائی دیکھے تو اس کو دفن کر دے اور جب میری برائی دیکھے تو اس کو افشاء کر دے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''لَنْ یَّصْلُحَ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِہٖ اَوَّلُھَا'' اس امت کے آخر میں فتنہ وفساد رونما ہونے کی اصلاح قطعی طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ امت اس راستہ پر نہ آ جائے گی جس راستہ پر امت کا پہلا طبقہ تھا۔ اور امت کی اصلاح پہلے اخلاص کامل اور اتباع کامل سے ہوئی تھی۔

آج مسلمان یہ شکایت کرتے ہیں کہ مجھے فلاں سکھ نے ایذا پہنچا دی، فلاں ہندو یا عیسائی نے مجھے تکلیف دی۔ میں کہتا ہوں کہ تمام اقوام عالم کی برائیوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے معلم تھے۔ جب معلم درست ہوں تو دوسرے خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے: ''اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی'' (1) اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن ہم اسلام کے دائرے میں ہی نہ آئیں تو ہم پست ہوں گے۔ ورنہ اسلام میں پستی نہیں ہے۔

بندہ کو اپنی مرضی ختم کر دینی چاہئے...... تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نیت تبدیل کرنے سے عادت عبادت بن جاتی ہے۔ ایک شخص نے ایک مکان بنوایا اور اس میں روشندان بھی لگائے۔ بن جانے پر اپنے شیخ کو بلوایا۔ انہوں

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، ج: ۵، ص: ۱۳۹.

نے پوچھا کہ یہ روشندان کس لئے بنوائے ہیں؟ اس نے عرض کی ہوا آنے کے لئے بنوائے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! اگر یہ نیت بھی کر لیتے کہ اذان کی آواز آئے گی ثواب بھی ہوتا اور ہوا بھی اس سے بند نہ ہوتی۔ کیونکہ نیت تو ان چیزوں کے لئے ضروری ہے جو نیت پر موقوف ہیں تو ثواب تو نیت پر موقوف ہے لیکن ہوا کا آنا نیت پر موقوف نہیں۔ پس ہر کام میں ثواب کی فکر ہی ہونی چاہئے اور اللہ کی رضا کی طلب ہونی چاہئے۔ عبداللہ (اللہ کا بندہ) کا معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کے موافق کام کرے۔

کسی شخص نے ایک غلام سے پوچھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو کچھ مولا کھلائے گا۔ اس نے کہا کہ پیئے گا کیا؟ غلام نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پلائے گا۔ اس نے پوچھا کہ تو پہنے گا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پہنائے گا۔ اس شخص نے کہا کہ اللہ کے بندے تیری بھی کچھ مرضی ہے یا نہیں؟ غلام نے جواب دیا کہ اگر اپنی مرضی ہوتی تو غلام نہ ہوتا۔

آیت متعلقہ بیان...... جو آیت میں نے پڑھی تھی اس میں اسی اخلاص اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ابراہیم! کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا، میرا جینا، سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اسی ملت ابراہیمیہ کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ① یعنی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس امت کو خود امت مسلمہ فرمایا ہے: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اور اسلام کے معنی اطاعت اور سونپ دینے کے ہیں۔ اسلام کا اقرار کرنے کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد نہ کرنا غداری ہے پسندیدگی کا بھی اظہار اور ناپسندیدگی کا بھی اظہار یہ اجتماع ضدین ہے۔

نام کے اور کام کے مسلمان...... پنجاب کے ضلع انبالہ میں ایک بزرگ جمنا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ دریا کو طغیانی آئی تو وہ گاؤں بھی غرق ہونے لگا۔ لیکن ایک دیوار کی وجہ سے کچھ بچاؤ تھا۔ لوگ ان بزرگ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی حضرت شاہ صاحب! گاؤں غرق ہونے لگا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غرق کرنے سے بچائے۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پھاوڑا لیا اور جو دیوار باقی تھی اس کو بھی توڑنے لگے۔ لوگوں نے کہا حضرت یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولا'' تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرانا چاہتے ہو؟ اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ یہ بستی ڈوب جائے تو بندہ کو بطریق اولیٰ کہنا چاہئے کہ یہ بستی ڈوب جائے۔

اسی طرح ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی کے موافق دو جہاں کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اس نے کہا کہ دونوں جہاں کا کاروبار آپ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں: اس طرح کہ دونوں جہاں کا کاروبار اللہ کی مرضی کے موافق چل رہا

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۸.

ہے۔اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں ایسا فنا کر دیا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی میری مرضی ہے۔

نازم بچشم خود کہ روئے تو دیدہ است　　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

عوام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ زمین کاشت کر رہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنی تو وہیں کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے اللہ مجھے آنکھیں اس لئے عزیز تھیں کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وفات پا گئے تو ان آنکھوں کے ساتھ اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا۔بس اسی وقت وہ صحابی رضی اللہ عنہ نابینا ہو گئے۔یہ تو بہر حال صحابی تھے۔ان کا تو مقام ہے ہی۔اس کے علاوہ اولیاء اللہ میں ایسے بزرگ ہوئے ہیں،امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے،ان کے شیوخ میں سے ایک شیخ ہیں جب وہ بازار نکلتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تھے۔لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حافظہ بہت قوی دیا ہے جو چیز سنتا ہوں یاد ہو جاتی ہے۔چاہتا ہوں جن کانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنوں،ان کانوں میں کوئی دوسری آواز نہ پڑے۔یہ لوگ کام کے مسلمان تھے۔ہم تو نام کے مسلمان ہیں۔

آج اگر چہ ہم ان جیسے تو نہیں ہو سکتے بلکہ جو بزرگ ہمارے قریب زمانے کے ہیں ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔مثلاً جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔لیکن ہم کم از کم ان کے راستہ پر تو چل پڑیں۔وہ تو دوڑتے جاتے ہیں ہم چلیں تو سہی۔ہم بھی کبھی نہ کبھی انشاء اللہ منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔اور بغیر سلف صالحین کے نقش قدم پر چلے دین و دنیا نہیں ملتی۔

بہر حال دین و دنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاص کامل اور اتباع کامل پیدا کرے۔یہی دو چیزیں کلید نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔جو بھی کامیاب ہوا وہ اسی طریق پر چل کر ہوا اور جو راستہ سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا۔اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے۔آمین

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

صُحبتِ صالح

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (١)

کثرتِ علم کے باوجود بے عملی کثرت سے ہے...... بزرگانِ محترم! یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے۔اس میں حق تعالیٰ نے ایک بہت اہم مضمون بیان فرمایا ہے۔جس پر انسان کی دینداری کی بقا موقوف ہے۔اگر کوئی دیندار بننا چاہے تو اس کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔یہ مشاہدہ ہے کہ آج کل تقریروں، جلسوں اور لٹریچر کی کمی نہیں۔لیکن اسکے باوجود مسلمانوں کی دینی حالت تنزلی میں ہے۔صرف دین ہی نہیں بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی تنزلی کا شکار ہیں۔آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔کیونکہ جب تک اسبابِ مرض معلوم نہ ہوں، اس وقت تک مریض کا علاج ناممکن ہے۔اب دین میں کمی اس وجہ سے تو نہیں کہ کم علمی ہو۔کیونکہ اس زمانے میں علم کے ذرائع اشاعت جتنے موجود ہیں وہ پہلے کبھی موجود نہ تھے۔اسی طرح آج جو جلسے ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں ایک ہزار دو ہزار آدمی تو معمولی بات ہے اور بعض جگہ تو لاکھوں تک بھی شرکت ہوتی ہے۔بلکہ آج کل تو تمام دنیا اک جلسہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ایک شخص ریڈیو میں بولتا ہے مشرق و مغرب تک اس کی آواز پہنچتی ہے اور صرف دنیوی باتیں ہی نہیں بلکہ ترجمے اور تفسیریں بھی مختلف ممالک میں سنی جاتی ہیں۔آپ کا ریڈیو پاکستان روزانہ ترجمہ قرآن مجید نشر کرتا ہے۔اور مسائل تو بچہ بچہ جانتا ہے۔لیکن اس کے باوجود دین میں وہ پختگی نہیں جو پہلے زمانوں میں تھی۔دوسرا ذریعہ نشرِ علم کا قلم ہے۔آج کے زمانے میں اس کی بھی کمی نہیں۔قلم کی علماء نے دس قسمیں لکھیں ہیں۔پہلی قلم لوحِ محفوظ والی قلم ہے۔جس کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ ”خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ: اُكْتُبْ قَالَ مَآ اَكْتُبُ؟ قَالَ اُكْتُبْ مَا كَانَ وَمَايَكُوْنُ.“ (٢)

(١) پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹. (٢) السنن لابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر، ج: ۱۲ ص: ۳۰۹، رقم: ۴۰۷۸. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۲۰۰ رقم: ۴۷۰۰.

اور ایک قلم وہ ہے جس سے روزانہ کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جب عرش کے قریب پہنچے، تو قلموں کی کھسکھساہٹ سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کس چیز کی آواز ہے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ: یہ دفتر ہے جس میں مخلوق کے واقعات کو لکھا جاتا ہے اور ایک ایک انسان دن میں لاکھوں حرکتیں کرتا ہے۔ معلوم نہیں وہ دفتر بھی کتنا بڑا ہوگا۔

ایک قلم وحی ہے۔ وہ یہ کہ وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے۔ اسی قلم پر ہمارے دین کی بقا موقوف ہے۔ ایسے ہی اگر حدیث کی کتابت نہ ہوتی تو اتنی کتب بھی ہمارے پاس موجود نہ ہوتیں۔ پس یہ ذخیرہ احادیث اور قرآن کریم قلم کے ذریعہ ہی محفوظ کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج ہم نماز، روزہ، حج وغیرہ کے احکام پمفلٹوں میں شائع کرتے ہیں۔

ایک قلم تصوف ہے۔ جس کے ضروری مسائل اور تزکیہ نفوس کے طریقے محفوظ کئے جاتے ہیں۔ اور ایک قلم سیاست ہے، جس سے تمام سیاسی معاملات محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ دین کے سلسلہ میں آج جتنی قلمکاریاں ہیں، وہ پہلے کسی زمانہ میں نہ تھیں۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: دنیا میں کوئی قوم تصنیف میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابیں محفوظ ہیں۔ اندلس کے کتب خانوں کے متعلق ایک عیسائی عورت اپنی کتاب "حَاضِرُ الْاُنْدَلُسِ وَغَابِرِهَا" میں لکھتی ہے کہ: تعصب میں آ کر عیسائیوں نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ کتب خانوں کو جلائے یا دریا برد کر دے۔ وہ عورت لکھتی ہے کہ پچاس برس تک یہ مہم جاری رہی۔ تاتاریوں نے حکومت بغداد کے کتب خانوں کو دریا میں ڈال دیا۔ تو وہ ایک بڑا پل بن گیا۔ تاریخ کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک ماہ تک دریا کا پانی سیاہ رہا۔ جب ایک کتب خانہ کی یہ حالت تھی تو باقیوں کا کیا حال ہوگا۔ انجیل کے شباب کے زمانہ میں بھی عیسائی اتنے کتب خانے نہ بنا سکے اور نہ ہی یہودی تورات کے شباب کے زمانہ میں ایسے کتب خانے بنا سکے۔ اور آج بھی جو انہوں نے تصانیف کی ہیں اور موجودہ یورپ کی ترقی انہیں مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔ وہیں سے یورپ کے لوگ پڑھ کر آئے اور اپنے ملک میں علم پھیلایا۔ اسی کی برکت ہے کہ آج عیسائی اس قابل ہیں کہ تصنیف کر سکیں اور ان کو اقرار ہے کہ یہ مسلمانوں کے فیض سے ہے۔

ماحول کا اثر...... الغرض مسائل کی اشاعت کثرت سے ہے لیکن اس کے باوجود دین مسلمانوں میں نہیں پھیلتا۔ اور نہ ہی سلف کی طرح ایمان میں مضبوطی ہے اور نہ ہی ہمارا دل ایسا ہے کہ اعمال صالحہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری معاشرت غیر اسلامی ہے۔ اور ماحول بھی غیر اسلامی بن گیا۔ دارالعلوم دیوبند میں دو ہزار کا عملہ ہے۔ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی بے نمازی ہو۔ اذان ہوتی ہے سب کے سب ہر طرف سے دوڑتے ہیں۔ یہ تمام ماحول کا اثر ہے۔ ورنہ وہاں کوئی نماز کے متعلق کہنے والا نہیں ہوتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ہر کام پہلے ریا ہوتا ہے، پھر عادت ہوتی ہے، پھر عبادت ہو جاتی ہے ۔چنانچہ حدیث میں ہے: ''مُرُوْا صِبْیَانَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا.'' ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور مار کر نماز پڑھاؤ جب کہ دس سال کے ہو جائیں''۔ ①

یہ مار کر نماز پڑھانا حقیقی نماز نہیں، کیونکہ وہ ڈر کے مارے پڑھتا ہے، یہاں تک کہ سجدہ کرتے ہوئے بھی ایک آنکھ سے دیکھتا رہے گا۔ جب دیکھا کہ باپ نہیں ہے بھاگ جائے گا۔ لیکن جب اس کو عادت پڑ گئی اور ساتھ ساتھ کچھ علم آ گیا، تو خیال کرے گا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ تو یہی عبادت بن جائے گی۔

عارف رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

بہر دنیا بہر دین و بہر نام　　　　اللہ اللہ کردہ باید و السلام

اس لئے نمازی کو اس وجہ سے نہیں رکنا چاہئے کہ شاید یہ ریا ہو۔

ظاہر کا اثر باطن پر...... حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو فقہ کے امام ہیں۔ مگر ان کا مذہب مدون نہیں ہوا۔ وہ فرماتے ہیں: ''طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَاَبٰی اَنْ یَکُوْنَ اِلاَّ لِلّٰہِ.'' ② ''ہم نے علم غیر اللہ کے لئے طلب کیا لیکن علم تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہا''۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی عورتوں کا سا لباس پہن لے، تو چند دن کے بعد اس کا دل یہ چاہے گا کہ وہ کلام بھی عورتوں کی طرح کرے، بلکہ تمام حرکات و سکنات عورتوں جیسی کرے۔ اسی طرح اگر کوئی بتکلف علماء کا سا لباس پہن لے تو وہ مخلوق کی خاطر بہت سے گناہوں سے بچے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی درویشوں کا سا لباس پہن لے، تو اس کا اثر بھی قلب پر پڑے گا۔ اگر کفار کا سا لباس پہننا شروع کر دے تو چند دنوں میں دیگر افعال بھی کفار کی طرح ہی کرنے لگے گا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ: ''فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا'' ③ یعنی اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لو۔ مقصد یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ظاہری افعال کا اثر حقیقی افعال کا سا مرتب ہوتا ہے۔ رونے کی شکل بنانے میں وہی اجر و ثواب ملے گا، جو حقیقۃً الحاح و زاری پر ملتا ہے۔ بہر حال ظاہر کا اثر نہ صرف باطن پر مرتب ہوتا ہے، بلکہ ایک درجہ میں عند اللہ بھی بلحاظ اجر و ثواب اس کا اعتبار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ حنین سے واپس آ رہے تھے، راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ کیا، کفار کے بہت

---

① المسند للإمام احمد، ج: ۱۳، ص: ۴۴۰. اس حدیث کو علامہ البانی صحیح فرمایا ہے۔ صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۱۶ ص: ۱۲۰ رقم: ۷۴۷۳. ② المسند لابن الجعد، ج: ۱، ص: ۲۰۳.

③ السنن لابن ماجه، كتاب اقامة الصلوة، باب في حسن الصوت بالقرآن، ص: ۲۳۵.

سے بچے مسلمانوں کے لشکر کے پاس جمع ہو گئے، ان میں حضرت ابومحذورہ بھی تھے۔ جب مؤذن نے اذان کہی تو ان بچوں نے بھی نقل اتارنا شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ان کو پکڑ کر لاؤ۔ سب بچے تو بھاگ گئے مگر حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ ان میں سے کچھ بڑے تھے۔ انہیں بھاگتے ہوئے شرم آئی وہ نہ بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ان کو حاضر کیا گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اب اسی طرح نقل اتارو۔ اور کہو اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے کہہ دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ'' انکو تامل ہوا۔ کیوں کہ اس میں توحید کا اقرار تھا۔ لیکن دبے لفظوں سے کہہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کہو: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ '' ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ کہہ دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ.'' ۔ اس میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو زیادہ تامل ہوا۔ کیونکہ توحید کے تو کسی درجہ میں مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔ (المسند للامام احمد، احادیث ابی محذورہ، ص: ۳۹۱) ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِلَّاشَرِيْكًا هُوَلَكَ'' ①

اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ: ﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ﴾ ② یعنی اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کو اور اس کے بڑے عرش کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ توحید کے تو کسی درجہ میں قائل تھے۔ تو توحید کے کلمات کہنے میں اس قدر تامل نہ ہوا۔ لیکن رسالت کے وہ منکر تھے اور سارا جھگڑا رسالت کے نہ ماننے پر تھا۔ اس لئے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ پہلے چپ ہو گئے۔ لیکن پھر دبے لفظوں میں کہا ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ. '' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زور سے کہو تو ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے زور سے دوسری مرتبہ بھی کہا۔

ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے یہ اذان اسلام کی حالت میں نہیں کہی تھی۔ محض نقالی تھی۔ لیکن اس کا اثر دل پر اتر گیا۔ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! اب تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوں۔ اب اذان میں شوافع احناف کے خلاف ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ترجیع صفت اذان میں سے ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ تعلیم تھی۔ یہ فقہاء کے اختلاف ہیں۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے جب ظاہر سے اسلام کا اقرار کیا تو اس کا اثر دل میں بھی اتر گیا۔ اور اسلام قبول کر لیا۔ اس لئے نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ: اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنالو۔ پس اگر نماز کو جی نہ بھی چاہے تو بھی نماز نہ چھوڑنی چاہئے۔ مگر یہ ماحول سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ماحول اچھا ہو تو بچے بھی نمازی بن جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مطالبہ پاکستان کے وقت بچوں کے کھیل بھی جلسے اور جلوس بن گئے تھے کیونکہ اس وقت ماحول ہی ایسا تھا۔

حضرت مولانا انورشاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک نوجوان طالب علم آیا۔ اور جلدی سے نماز

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۰، ص: ۱۲۶ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۸۶، ۸۷.

پڑھ کر چل دیا۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تو نے نماز اچھی طرح سے کیوں نہ پڑھی؟ اس کے منہ سے نکلا کہ حضرت میں چھوٹی کتابیں پڑھتا ہوں۔ حضرت کو غصہ آیا اور فرمایا کہ یہ اعمال تو ماں باپ سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ ان میں کتابوں کی ضرورت نہیں لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ماں باپ بھی ایسے ہی ہوں۔ اگر عیسائی ذہنیت کا ماحول بن جائے تو دل اسی طرف مائل ہونے لگے گا۔

تربیت میں ماحول کا اثر...... حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ ایک شادی کے سلسلے میں تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ تو خیال ہوا کہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) صاحب کی زیارت بھی کرلوں۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوگیا، کہ یہ فطرت سلیمہ رکھتے ہیں۔ تو آپ نے پوچھا کہ آپ کسی سے بیعت بھی ہوئے یا نہیں؟ آپ نے کہا کہ نہیں۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پھر مجھ سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں اس شرط پر بیعت ہوں گا کہ آپ مجھے ذکر و شغل کا حکم نہ فرمائیں گے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو بیعت ہونے کو کہا ہے شغل کا تو میں نے کہا ہی نہیں اور وعدہ بھی فرمایا کہ آئندہ بھی نہیں کہوں گا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمایا اور یہ فرمایا کہ دو تین دن یہاں ٹھہر جاؤ۔ آپ وہیں تھانہ بھون میں تین دن ٹھہرے جب رات کے وقت اڑھائی تین بجے دیکھا کہ سب لوگ اٹھ کر تہجد ادا کر رہے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شرم آئی انہوں نے بھی اٹھ کر تہجد پڑھی۔ پھر جب لوگوں کو ذکر و شغل میں دیکھا، آپ بھی ذکر میں مشغول ہوگئے۔ دوسرے دن پھر یہی حالت ہوئی۔ تیسرے دن خود بخود خوشی سے تہجد پڑھی اور ذکر و شغل میں مشغول ہوگئے۔ تیسرے دن حضرت کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ نے تو سب کچھ ہی کرا دیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تھوڑا ہی کہا تھا۔ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ اب آپ جا سکتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ اب تو میں نہیں جاتا۔ چالیس دن وہاں ٹھہرے اور اس تھوڑے عرصہ کے بعد خلافت لے کر واپس ہوئے۔ بس یہ عبادت پہلے ریا تھی، پھر عادت ہوئی، پھر عبادت ہوگئی اور ساتھ ہی خلافت بھی مل گئی۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جب میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ ایک دفعہ میرا گنگوہ جانا ہوا وہاں ذکر و شغل کا ماحول تو تھا ہی۔ گنگوہ کی مسجد میں بہت سے دھوبی کپڑے دھوتے تھے، وہ جب کپڑے کو مارتے تو اِلَّا اللہ کی ضرب ساتھ کہتے۔ یہ ماحول کا اثر تھا ورنہ ان کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ مقولہ مشہور ہے۔

"ہر چہ درکان نمک رفت نمک شد"

بس ماحول کا اثر یہی ہے۔ جو نیک ماحول میں ہوگا، اس کا بھی اثر ضرور ہوگا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ایک ماحول تھا کہ جو بھی اس میں آتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور ان کا ماحول بھی بہت قوی تھا۔ حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ تھا۔ امت کا اجماع ہے کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" وہ

معصوم تو نہیں تھے لیکن محفوظ تو ضرور تھے۔امت کا اتفاق ہے کہ کوئی شخص کتنا بڑا غوث اور قطب بن جائے لیکن ادنیٰ صحابی کو نہیں پہنچ سکتا۔اس لئے کہ جو ماحول ان کو میسر آیا وہ کسی کو میسر نہ آسکا۔ایسے ماحول سے ابوجہل جیسا بد بخت ہی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔اور جبری طور پر تو وہ بھی مؤمن تھا۔چنانچہ اپنے گھر میں کہتا تھا کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیں، پھر ان کی غلامی کرنی پڑے گی۔اسی سے ان کو عار تھی۔بہر حال اگر ایک گھرانہ یہ عہد کرے کہ ہم گناہ چھوڑ دیں گے،تو ان کے ماحول میں جو داخل ہوگا۔انہی کی طرح ہو جائے گا۔

قول وفعل میں مطابقت کا اثر......حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سندھی ایک سیاسی مفکر تھے۔روس کے انقلاب میں وہیں تھے۔فرماتے تھے کہ:اسٹالن سے ملا اور اسلامی نظام اور اس کے اصول مع دلائل اس کے سامنے رکھے۔تو اسٹالن نے کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور اگر دنیا میں کوئی نظام جاری ہوا تو اسلام ہی جاری ہو کر رہے گا۔لیکن یہ بتایئے کہ اس کا کوئی عمل دنیا میں بھی موجود ہے......اس پر مولانا خاموش ہو گئے۔تو آج دنیا قول کو نہیں دیکھتی بلکہ فعل کا مطالبہ کرتی ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:’’فَمَنْ وَّافَقَ قَوْلُهٗ فِعْلَهٗ فَنَجَا وَمَنْ لَّمْ يُوَافِقْ قَوْلُهٗ فِعْلَهٗ فَقَدْ هَلَکَ‘‘ ① یعنی جس آدمی کا قول اس کے فعل کے موافق ہوا،نجات پا گیا اور جس کا قول فعل کے موافق نہ ہوا،وہ ہلاک ہو گیا۔آج اسلامیہ جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔لیکن دنیا اس قول کو نہیں دیکھتی بلکہ عمل کو دیکھتی ہے۔اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے عملی نقشہ پیش کریں۔ایک شخص بڑے سے بڑا عالم ہو۔لیکن جب تک وہ اپنے کہے کے مطابق عمل نہ کرے،اس کو اپنے قول کا خود بھی تذبذب رہتا ہے۔

ماحول قوانین حکومت سے بھی بڑھ کر ہے......حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے والوں میں نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام تو تھا ہی۔مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ بھی قانون تھا کہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا موجب نہیں ہوگا۔چنانچہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک دفعہ کسی صاحب کا ایک رومال گر پڑا۔لیکن کسی نے وہاں سے نہ اٹھایا اور تین دن تک پڑا رہا۔ماحول کی وجہ سے کسی کو چرانے کی ہمت نہ ہوئی،اسی وجہ سے حجروں کو تالا لگانے کا دستور ہی نہیں تھا۔

حجاز کی حکومت ہے۔وہاں بادشاہ کا جذبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو۔اب ایک عورت زیور پہن کر سفر کرتی ہے۔تو اس کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا۔تلواروں اور بندوقوں سے دلوں میں ڈر پیدا نہیں ہوتا۔پولیس اور ہتھیاروں کی کمی نہیں۔لیکن دنیا میں فسق وفجور کی کثرت ہو رہی ہے۔

ہم حج پر گئے تو دیکھا کہ چند بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں۔ایک شخص نے پولیس میں جا کر خبر دی کہ فلاں جگہ دو کھجوروں کی بوریاں پڑی ہیں۔پولیس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ان میں کھجوریں ہیں؟ معلوم ہوا کہ تو نے ٹٹول کر دیکھی تھی؟ اور چرانے کا موقع تلاش کرتا رہا۔لیکن موقع نہیں ملا۔اس شخص کو اس پر بھی سزا ملی۔

① مختصر تاریخ دمشق، ج:۴،ص:۴۰۲.

ہندوستان میں مختلف میلے ہوتے ہیں، مسلمان بھی ہندوؤں کو دیکھ کر میلے کرنے لگے ہیں۔ان میں ہر طرح سے فسق و فجور اور چوریاں ہوتی ہیں۔لیکن مکہ مکرمہ میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور کبھی چوری نہیں ہوتی۔مکہ والے کبھی چوری نہیں کرتے۔میں یہ نہیں کہتا کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔لیکن یہ ضرور ہے کہ غلبہ دیانت کا ہے۔مگر چور کا ہاتھ ایک دفعہ کاٹا جائے تو برسوں تک چوری سے نجات ملتی ہے۔اسلامی حدود رجم اور قطع ید وغیرہ کو وحشیانہ سزا کہنا انہی سے ہوسکتا ہے جن کے نزدیک زنا یا چوری کوئی غیر وحشی فعل ہیں۔ادیان سماویہ میں زنا سے بڑا کوئی جرم نہیں تھا۔ایک عورت کے زنا کرنے سے سارا خاندان بدنام ہوجاتا ہے۔شہرت پر الگ دھبہ آتا ہے اور نسل کا بھی اختلاف ہوتا ہے۔تو یہ فعل بھی تو وحشی ہے اگر وحشی فعل پر وحشیانہ سزا ہو،اس میں کیا جرم ہے؟ طرہ تو یہ ہے کہ آجکل قانون میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔کہ صرف جبراً زنا کرنا ہی جرم ہے۔فریقین کی رضا ہوجائے تو جرم ہی نہیں۔ بہرحال ان چیزوں کا ماحول کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال کو تو روک سکتے ہیں لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھلا سکتے۔زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی۔جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت و معیت سے نصیب ہوتی ہے۔

غیبت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾ ① ''کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے'' تو غیبت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو کہ نجس ہے۔لیکن غیبت سے بچے گا کب؟ جب دل میں معاصی سے نفرت ہوگی۔ورنہ حکومت کا قانون تو یہاں نہیں لاگو ہوگا۔جھوٹ کے بارے میں حدیث شریف ہے کہ: انسان جب جھوٹ بولتا ہے،اس کے منہ میں ایک بدبو پیدا ہوجاتی ہے اور فرشتہ اس کی وجہ سے اس سے دور ہوجاتا ہے۔جب وہ جھوٹ ختم کرلیتا ہے تو وہ واپس آجاتا ہے۔گویا فرشتے کو معصیت سے نفرت ہے۔اسی طرح انسان میں جب ملکوتی صفات آتی ہیں۔وہ بھی معاصی سے متنفر اور بیزار ہوجاتا ہے تو یہاں حکومت کی طرف سے احتساب نہیں ہے۔جس کی بنا پر جھوٹ سے بچے لیکن دل میں معاصی سے نفرت آچکی ہے اس لئے جھوٹ سے بھی بچے گا اور معاصی سے بھی بچے گا۔مشرکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ ② یعنی مشرکین (اعتقادی طور پر) نجس اور ناپاک ہیں۔معلوم ہوا کہ شرک اور ایسے ہی دوسرے معاصی معنوی نجاستیں ہیں۔آدمی جس طرح ظاہری نجاست کی آلودگی سے بچتا ہے اور دور بھاگتا ہے۔اسی طرح جن کا باطنی احساس زندہ ہے وہ معنوی نجاستوں سے بچتے ہیں۔اور اپنے باطنی احساس سے ان نجاستوں کو پہچانتے بھی ہیں۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آرہا تھا کہ راستے میں ایک عورت پر نظر پڑ گئی۔تو

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۲۔ ② پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۲۸۔

یہ نظر تو گناہ نہیں تھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ:"اَلنَّظْرَةُ الْاُوْلٰی لَکَ وَالثَّانِیَةُ عَلَیْکَ" ① یعنی پہلی نظر میں کوئی گناہ نہیں اور دوسری میں گناہ ہے۔ لیکن اس شخص نے قصداً دوسری دفعہ بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ:"مَا لِلرِّجَالِ یَاْتُوْنَنَا وَفِیْ قُلُوْبِهِمْ اَثَرُ الزِّنَا" یعنی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کے دلوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے قلب اور روح کا حاسہ تیز تھا جس سے یہ گناہ نظر آ گیا تھا اور وہ تیز کیوں تھا؟ اس لئے کہ آپ کو صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میسر تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ گناہ نظر آ جاتے تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب مسجد میں آتے اور لوگ وضو کرتے ہوتے تو آپ نظر نیچی کر لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا: حدیث شریف میں ہے کہ جب انسان وضو کرتا ہے تو اس کے اعضاء کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں، جب کلی کرتا ہے تو منہ کے گناہ جھڑتے ہیں۔ جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ جھڑتے ہیں۔ تو فرمایا کہ: جب گناہ جھڑتے ہیں، مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس سے مجھے بدظنی پیدا ہوتی ہے تو میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں تا کہ گناہ کا علم نہ ہو اور بدظنی پیدا نہ ہو۔ جن کی روحانیت قوی ہوتی ہے ان کو معاصی نظر آ جاتے ہیں۔

محاسبہ آخرت کی دنیا میں صورت مثالی...... اور قیامت میں تو اعمال بھی سب کو نظر آنے لگیں گے۔ حدیث میں ہے کہ: قیامت میں انسان کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم اور دوسرے اعمال کی صورت مثالی۔ اعمال کی صورت مثالی کی مثال یہ ہے کہ دیوان غالب اب چھپا ہے۔ تو غالب نے جس شعر میں جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر کے نیچے اس کی تصویر کھینچ کر اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ حدیث میں علم کی صورت مثالی دودھ بتائی گئی ہے اور نماز کی صورت مثالی حسین عورت اور سخاوت کی صورت مثالی ایک عظیم الشان درخت بتائی گئی ہے۔ جس کے سایہ میں سخی آدمی بیٹھے گا، جیسا کہ اس کی سخاوت سے دنیا میں غریبوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ تو اعمال صالحہ کی صور مثالیہ ہیں۔ اسی طرح اعمال سیئہ کے بارے میں بھی حدیث میں ہے کہ: جو شخص مالدار ہو اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا وہ خزانہ سانپ کی شکل میں متشکل ہوگا۔ اور اس مال دار کے گلے کا طوق بن جائے گا جو اس کو کاٹے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں' کیونکہ مال کی ظاہری صورت بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس کا تصور بھی دل کو خوش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کے پاس اگر مال ہو وہ اسے خرچ بھی نہ کرتا ہو تو چوری ہو جانے پر اس کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور اگر ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے مثلاً چوری کی جائے تو اس میں ایک قسم کا زہر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس پر سزا ہوتی ہے۔ اس لئے اس عمل بد (یعنی عدم اداءِ زکوٰۃ) کو سانپ کی شکل دی گئی۔ حاصل یہ ہے کہ ہر عمل کو اس کے اوصاف کے مطابق شکل دی جائے گی۔ اور یہی صفات مذمومہ اگر خود آدمی میں راسخ ہو جائیں تو آخرت

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب مایؤمر به من غض البصر، ج: ۶، ص: ۵۴، رقم: ۱۸۳۷۔

میں بھی آدمی پر اس کا پرتو پڑتا ہے۔ دیکھنے میں وہ صحیح، شکل وصورت کے لحاظ سے آدمی ہی کے لباس میں ہے۔ مگر حقیقت آدمیت اس میں نہیں ہوتی۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بینائی دی ہے وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عارف باللہ، صاحب کشف وکرامت تھے۔ جب بغداد کی مسجد میں داخل ہوتے تو منہ پر نقاب ڈال لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ: جب میں مسجد میں جاتا ہوں تو کوئی کتا نظر آتا ہے اور کوئی خنزیر نظر آتا ہے تو میں منہ پر نقاب ڈال لیتا ہوں تاکہ مسلمانوں سے بدظنی پیدا نہ ہو۔ یہ ایک الگ عالم ہے جو اہل اللہ پر مخفی نہیں۔ وہ خوب واقف ہیں۔ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ــ مقاماتِ آہ وفغاں ابھی اور بھی ہیں

اس جہان کی ایجادات نے اس صورت مثالی کو سمجھنا تو اب اور بھی آسان کر دیا ہے۔ چنانچہ سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D) کے محکمے کے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعے سے وہ ہر خفیہ بات کو معلوم کر لیتے ہیں اور تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مجرم کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ امریکہ میں فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ بھی اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیں گے۔ جب تک پہلے اس کو تمام زندگی کا ریکارڈ نہ دے دیں گے۔ اور پھر تمام اعمال کی صورت مثالیہ صف کی صورت میں اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ (جیسے کہ آج کل ٹی وی میں اعمال بعینہٖ موجود و متشکل باقی رہتے ہیں)

حدیث شریف میں ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے پر کوئی نیک عمل کیا ہوگا۔ نماز پڑھی ہوگی تو وہ ٹکڑا گواہی دے گا۔ اور جس ٹکڑے پر کوئی گناہ کیا ہوگا، تو وہ ٹکڑا بھی گواہی دے گا کہ اس نے فلاں گناہ میرے اوپر کیا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ملائکہ علیہم السلام بھی گواہی دیں گے۔ اس سے بڑھ کر تمام اعضاء میں قوت گویائی دے دی جائے گی۔ اور زبان سے یہ قوت سلب کر لی جائے۔ تو جس عضو سے جو کام کیا ہوگا، وہ خود گواہی دے گا کہ اس نے فلاں کام میرے اوپر کیا ہے۔ اتنی حجتوں کے بعد اس کو انکار کی ہمت نہ ہوگی اور خود زبان حال سے اقرار کرے گا کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ پھر خواہ اللہ تعالیٰ معاف ہی فرمادیں یا سزا دیں۔ لیکن معافی اقرار گناہ کے بعد ہوگی۔

ترتیب اصلاح...... دلوں کو متقی بنانا دین کا کام ہے۔ اور یہ ماحول کے بہتر ہونے سے ہوتا ہے اور اس کی ابتداء اپنے گھر سے کرنی چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یہ فرمایا گیا: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ① یعنی اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ جب گھر نیکی کا نمونہ بن گیا پھر حکم فرمایا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ② تو آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا اور ایمان لانے کو تبلیغ کی۔ جن میں کچھ سعادت تھی، وہ متوجہ ہوئے اور ایمان قبول کر لیا اس کے بعد فرمایا: ﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ ③ وحی

① پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۱۴۔
③ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۷۔

آپ کی طرف اتاردی گئی تا کہ آپ مکہ والوں کو اوراردگرد والوں کو ڈرائیں۔ پھر فرمایا ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ ① تا کہ آپ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔ چنانچہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام بادشاہوں کی طرف خطوط لکھے، اور ایمان کی تبلیغ کی۔ بس اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ اصلاح کی ابتدا پہلے اپنے گھر سے کرنی چاہئے۔ نیکی بدی میں انسان ایک بھیڑ چال ہے۔ بارہا کا میرا مشاہدہ ہے کہ اگر مجلس میں ایک نے مصافحہ کیا تو تمام ہی شروع ہو جاتے ہیں ایسے ہی اگر ایک ابتداء کرے تو دوسروں سے بھی تمام بری عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ اور ترتیب بھی یہ ہونی چاہئے کہ اولاً گناہوں کو چھوڑنا چاہئے، پھر نیکیوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور گناہوں میں بھی پہلے کبائر کو، پھر صغائر کو چھوڑنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اور اس نے عرض کیا کہ حضور ایمان تو لاتا ہوں مگر جتنے برے کام کرتا ہوں ان سب کو چھوڑ نہیں سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم صرف جھوٹ کو چھوڑ دینے کا وعدہ کرتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں۔ اور خوشی خوشی یہ وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر پھر جب گناہ کا خیال آتا تو محاسبہ کا خیال پہلے آتا۔ چنانچہ جب شراب پینے چلا تو خیال ہوا کہ یہ فعل چھپے گا نہیں۔ یا جھوٹ بولوں گا۔ یا پھر حد لگے گی اور رسوائی ہوگی۔ جب چوری کا جذبہ پیدا ہوا تو بھی خیال ہوا کہ چوری چھپے گی نہیں، خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔ کیونکہ جھوٹ نہ بولنے کا سچا عہد کر کے ایمان قبول کیا تھا۔ تو اس عہد سے تمام ہی گناہ از خود چھوٹ گئے۔ چنانچہ یہ تینوں گناہ اس سے چھوٹ گئے صبح کو حاضر ہوا تو عرض کی۔ یا رسول اللہ! آپ نے چھڑائی تو ایک برائی اور چھوٹ گئیں ساری برائیاں۔ طبیب کامل مختصر سا نسخہ ہی تجویز کیا کرتا ہے۔ جس سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور بیعت ہو گیا۔ کہنے لگا کہ مولوی جی! آپ نے پوچھا ہی نہیں میں تو افیون بھی کھاتا ہوں۔ تو آپ نے حرام کہہ کر افیون نہیں چھڑائی بلکہ فرمایا کہ: جتنی افیون کھاتے ہو، بیس روز تک اس سے نصف کھایا کرو۔ پھر بیس دن اس سے نصف کھایا کرو۔ کرتے کرتے انشاء اللہ تعالیٰ چھوٹ جائے گی۔ لیکن وہ آدمی پکا تھا۔ جب سنا کہ یہ حرام ہے تو ایک دم ہی چھوڑ دی۔ خانقاہ سے چلا گیا۔ اور بیمار ہو گیا، خوب دست جاری ہوئے چھ ماہ تک بیمار رہا۔ آخر صحت ہوئی تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پانچ روپے بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت چونکہ غریب آدمی سے کچھ لیتے نہیں تھے واپس کر دیئے۔ اس نے کہا کہ حضرت میں چھ ماہ میں پانچ روپے کی افیون کھاتا تھا تو میرا نفس خوش ہوا کہ اچھا ہوا پانچ روپے بچ گئے۔ میں نے کہا یہ پانچ روپے اب نفس کے لئے نہیں ہیں، اب یہ افیون چھڑوانے والے کو ہی دینے ہیں۔ پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں سے کچھ تھوڑا سے لے لیا۔

اصلاح کا عزم..... آج ساری مصیبت ہی یہ ہے کہ اصلاح کا عزم ہی نہیں ہوتا۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ماحول

بہتر نہیں۔ماحول کوئی ایسی بارش تو نہیں جو آسمان سے برسے۔آخر ماحول کا بہتر بنانا بھی تو عزم ہی سے ہوتا ہے ؎

تو ہی اگر نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

ہر یکے ناصح برائے دیگراں۔شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے نفس سے ہمیشہ بدظنی رہے اور اپنے سوا ہر ایک سے حسن ظن ہو۔اور دنیا نے اس کے برعکس کیا ہوا ہے۔دہلی کے آخری تاج دار بادشاہ ظفر ان سے سلطنت چھن گئی۔آخر عمر میں صوفی ہو گئے تھے۔وہ کہتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر — رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر

پڑی جب اپنی برائیوں پہ نظر — تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

تو میں نے عرض کیا کہ دین کا اثر اس وجہ سے کم نہیں کہ علم نہیں، بلکہ معاشرہ خراب ہے۔اس لئے پہلے ماحول اور معاشرہ کی اصلاح کرنے چاہیے۔

آج خیر خواہی سے اسلامی نظام کا مطالبہ ہو رہا ہے اور حکومت بھی خیر خواہی سے اس کو نافذ کرنا چاہتی ہوگی۔ لیکن تمام کام قانون سے نہیں ہوتے۔زنا کا اعلان حکومت تو نہیں کر رہی۔یہ جو زنا ہو رہے ہیں یہ ماحول کی خرابی سے ہیں۔اسی طرح چوری دیکھ لیجئے آج بھی چوری، زنا قانوناً جرم ہے گویا اسلامی نظام اگر مکمل طور پر نافذ نہیں، بعض اسلامی قوانین تو آج بھی نافذ ہیں۔اس کے باوجود زنا، چوری آج بھی ہو رہے ہیں۔اگر کل اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور معاشرت ایسی ہی رہی تو بھی زنا چوری ہوتے رہیں گے اس لئے تمام کام حکومت پر ہی نہیں چھوڑنا چاہئے۔کم از کم جتنے اجزا اسلامی قانون کے نافذ ہیں ان پر تو عمل کرنا چاہئے۔ان پر بھی عمل نہیں۔

میں نے یہ آیت پڑھی تھی جس میں صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ صحبتِ صالح اختیار کرنے کا بھی حکم ہے۔اس لئے اہل علم اور درویش صوفیاء کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی ہے۔اگر انسان جائے تو خوشبو لے کر آتا ہے اگر چہ عطر نہ خریدے۔اور بُری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی ہے۔اگر آدمی جائے اور کچھ نہیں تو دھواں اس کو ضرور پہنچے گا۔اگر چہ کپڑے نہ جلیں۔بہر حال نیک صحبت اور صالحین کی معیت اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔بقدرِ ضرورت آیت کی تشریح ہو گئی۔اب میں ختم کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ خاتمہ نصیب فرماوے اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے۔(آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

راہ نجات

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ، وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ. وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ. وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ. (۱) صَدَقَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

تمہید...... میرے محترم بھائیو اور بہنو!...... یہ ایک حدیث ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ کہ انسان کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی، انہی باتوں میں منحصر ہے۔ انہی چند اصولوں کی اس وقت مجھے تشریح کرنی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر وقت میں ان کی کچھ ضروری شرح آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔

آدمی کی نجات اس کے اندرونی جوہر سے ہے...... پہلے اتنا اصول سمجھ لیجئے کہ انسان کو جو کچھ بھی نفع پہنچتا ہے، وہ جبھی پہنچتا ہے، جب کوئی خوبی اور بھلائی اس کے نفس میں آ جائے۔ نفس کے اندر پیوست ہو جائے۔ باہر کتنی ہی خوبیاں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن وہ انہیں اپنے اندر نہ لے، اس کے لئے نفع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ ایک باغ ہے اس میں قسم قسم کے پھول مہک رہے ہیں اور خوشبوؤں سے فضا بھری ہوئی ہے، لیکن آدمی ناک بند کر کے بیٹھ جائے اور کوئی خوشبو اندر نہ جانے دے، اس کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ دنیا میں خوشبوئیں بھری ہوئی ہیں، بھری رہیں، اسے نفع جب پہنچے گا جب خوشبو اندر پہنچے اور دماغ اس سے مستفیض ہو۔ اگر دنیا کے اندر ہزاروں خوب صورت اور خوش رو نوجوان پھر رہے ہوں، بہتر سے بہتر حسن و جمال کا نقشہ سامنے ہو، مگر ایک آدمی آنکھ بند کئے بیٹھا ہے، اسے کچھ پتہ نہیں کہ کون خوب صورت ہے کون بدصورت؟ تو اس کا دل نہ عشق سے آشنا ہو گا، نہ محبت سے

(۱) دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات، ج: ۱، ص: ۲۰۰.

آشنا ہوگا، نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکے گا۔ دنیا کے فضا میں ہزاروں نغمے گونج رہے ہوں، بہتر سے بہتر آوازیں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن اس کے کان میں سننے کی قوت نہیں ہے، یا اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے، کوئی نغمہ اس کے کان میں نہیں پہنچتا، اسے اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا۔ کتابوں میں ہزاروں مسائل لکھے ہوئے ہوں، علم پھیلا ہوا ہو لیکن اس کے دل کا دروازہ بند ہو، علم اندر نہ پہنچے، اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ایمان بھرا ہوا ہو، لاکھوں مؤمن موجود ہوں، لاکھوں اولیاء موجود ہوں اور اگر نبوت کا زمانہ ہو، تو نبی بھی موجود ہو، مگر وہ اپنے دل کے دروازے بند کردے، نہ ایمان کو اندر داخل ہونے دے، نہ علم و معرفت کو، اسے انبیاء و اولیاء کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اتنی بات آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آدمی کی نجات اور اس کا نفع، اس کے اندرونی جوہر سے ہے۔ باہر کی چیز کو جب تک اندر نہ داخل کرے، اسے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کے لئے کوئی عزت کا سامان ہوسکتا ہے۔

اصل کمال وہی ہے جو انسان کی ذات میں ہو...... آپ نے نام سنا ہوگا حکیم سقراط کا۔ یہ یونان کا ایک بڑا حکیم گزرا ہے۔ فن طب کا یہ موجد ہے۔ اس فن کو اس نے مرتب کیا ہے۔ غرض بہت بڑا طبیب، حکیم، فلسفی اور عالم ہے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ رات اور دن جنگلوں میں، پہاڑوں میں اور باغات میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرنے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ گل بنفشہ کی کیا خاصیت ہے، ملٹھی کی کیا خاصیت ہے، فلاں بوٹی کیا نفع پہنچائے گی اور کسی چیز کو کھا کر دیکھ رہا ہے اور کسی کو سونگھ کر دیکھ رہا ہے۔ غرض محقق تھا۔ دن بھر اسی میں گزارتا تھا۔

یہ ایک دفعہ، دن بھر کا تھکا ماندا شہر میں آیا۔ شہر میں آ کر کسی دکان پر بیٹھا، تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ بادشاہ وقت کی سواری نکل رہی تھی۔ جلوس آرہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا، سامنے سے فوجیں، سپاہی، نقیب اور چوب دار گزر رہے تھے۔ ہٹو اور بچو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر یہ بے چارا اتنا سویا ہوا تھا، خدا جانے کتنے دنوں کا جاگا ہوا ہوگا، اس کی آنکھ نہ کھلی یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آئی۔ تو بادشاہ کو بڑا غصہ آیا، کہ یہ بڑا بد تہذیب آدمی ہے۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، میری سواری آرہی ہے اور یہ پیر پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے۔ اور سو رہا ہے، کوئی ادب اس کے اندر نہیں ہے۔ بادشاہ نے غصے میں اپنے ہاتھی یا گھوڑے سے اتر کے اس کے ایک ٹھوکر ماری اور کہا او بے ادب! جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ یہ بے چارہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ جیسے سویا ہوا آدمی جاگنے کے وقت آنکھیں ملا کرتا ہے۔ بادشاہ نے پھر ڈانٹ کر کہا ارے نامعقول! تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اس نے بڑے اطمینان سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! یہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اسی لئے آنکھیں مل رہا ہوں۔ اور اب تک میں اتنا جان چکا ہوں کہ آپ شاید جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ زمین پر پیر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ چونکہ آپ نے ٹھوکر ماری ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی بھیڑیا شیر آ گیا ہوگا، کوئی جنگل کا درندہ ہے۔

بادشاہ کو اور زیادہ غصہ آیا کہ اب تک یہ ٹانگیں پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا تھا اب اس کی زبان بھی میرے سامنے پھیل گئی ہے۔ ایسی بدتہذیبی کے کلمات۔! بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا، ارے احمق، جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہ وقت ہوں۔ اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ اتنے خزانے میرے قبضے میں ہیں۔ تاج شاہی میرے سر پر ہے۔ قباء شاہی میرے کندھے پر ہے۔ اتنی فوجیں کھڑی ہوئی ہیں۔ اتنے ملک میرے تحت میں ہیں۔ اور تو میرے ساتھ گستاخی کر رہا ہے؟

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ: آپ نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لئے تاج شاہی کو پیش کیا، قباء کو پیش کیا، قلعوں کو پیش کیا، پیسوں اور روپوں کو پیش کیا، ملکوں کو پیش کیا۔ ان میں سے ایک چیز بھی تو آپ کے اندر کی نہیں ہے۔ یہ تو باہر کی چیزیں ہیں۔ اس میں تیرا کیا کمال ہوا۔ اگر چاروں طرف سونا پھیلا ہوا ہے اور تیرے دل میں جہالت کی گندگی بھری ہوئی ہے، اس میں تیرا کیا کمال نکلا؟ تو نے بہترین لباس پہن رکھا ہے اور دل جہالت و بداخلاقی سے بھرا ہوا ہے۔ تو لباس سے تجھے کیا فائدہ پہنچا؟ یہ تو باہر کی چیز ہے۔ تو نے جتنی چیزیں پیش کیں، قلعہ یا فوج، ان سے تو نے اپنا فخر پیش کیا۔ یہ سب چیزیں تیرے باہر کی ہیں۔ اپنے اندر کی بات بتلا، کہ تیرے اندر کیا کمال ہے؟ جس کی بنا پر تو دعویٰ کرتا ہے۔ اگر تیری عزت پیسے سے ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے اگر کوئی پیسہ چھین کر لے جائے تو تو بے عزت ہو گیا۔ عزت ختم ہو گئی۔ تیری عزت اگر تاج سے ہے، تو کسی نے تاج اتار لیا، یا تو رات کو میز پر رکھ کر سویا، تو تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ تاج سر پر نہیں رہا۔ لباس اتار دیا تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ عزت تو کھونٹی پر ٹنگ گئی۔ تیری عزت اگر ان چیزوں پر ہے، تو یہ سب چیزیں تیرے سے باہر باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کا جوہر کون سا ہے؟ اور کہا کہ اگر تجھے فخر کا یا شیخی کا دعویٰ ہے تو یہ تاج بھی اتار، لباس بھی اتار، یہ قلعہ اور فوج بھی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ کر دریا میں میرے ساتھ کود پڑ اور وہاں اپنے کمالات دکھلا، کہ تیری ذات میں کون سا جوہر ہے، تب تو میں سمجھوں گا کہ تو با کمال ہے تو نے تو کمال میں باہر کی چیزیں پیش کر دیں۔ ان میں ایک چیز بھی تیرے اندر نہیں اس میں تیرا کوئی کمال نہیں۔ اب بادشاہ بے چارہ شرمندہ، کیا جواب دے اس کا، بادشاہ چپ ہو گیا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا سقراط نے یہ بتلایا کہ انسان کا کمال اندر کے جوہر سے حاصل ہوتا ہے۔ باہر کے جوہر سے اس کا کمال نہیں۔ سونا اگر اچھا ہے، اس سے آپ کی اچھائی تو ثابت نہیں ہوگی۔ کپڑا اگر بہت بے نظیر ہے، کپڑے کی خوبی ثابت ہوئی، آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوئی۔ محل اور بلڈنگ اگر بہت اعلیٰ ہے، تو وہ خوب اور اچھی نکلی، لیکن آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ خوبی وہ ہے جو انسان کے نفس کے اندر پیوست ہو۔ ایسا کمال ہو کہ اگر آپ زمین کے اوپر رہیں تو بھی باکمال۔ زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے، تب بھی باکمال، لباس پہن لیں، جب بھی باکمال۔ لباس اتار دیں، جب بھی باکمال۔ کمال اپنے اندر ہونا چاہئے۔ باہر نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ یہ تو ایسا ہو جائے گا جیسے فن نحو کا امام سیبویہ تھا۔ عربی گرائمر کا بہت بڑا عالم

گزرا ہے، بڑے اونچے درجے کا امام سمجھا گیا ہے۔ جب یہ تعلیم پاتا تھا۔ تو استاذ جو تقریریں کرتے تھے، یہ نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اور اتنی بڑی ایک کاپی اس نے بنائی کہ کئی سیر کے کاغذات تھے، جس میں تمام یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں۔ تو طالب علمی کے زمانے کی وہ کاپیاں اور نوٹ بکیں اس کے پاس لپٹے ہوئے رکھے تھے، اتفاق سے روٹی جو لینے گیا، تو اس دستر خوان میں جس میں روٹیاں تھیں، اسی میں اس نے وہ کاغذ بھی لپیٹ دیئے۔ کتا جو آیا، روٹی لے کر چلا، تو وہ کاغذات بھی پوٹلی میں ساتھ لے گیا۔ اب یہ چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور کتا آگے آگے جارہا ہے۔ لوگوں نے کہا سیبویہ! کہاں جارہا ہے؟ اور کہاں بھاگ رہا ہے؟ اس نے کہا، کتا میرا علم لے کر چلا گیا، اس کے پیچھے جارہا ہوں۔ لوگوں نے کہا: کمبخت! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا لے کر بھاگ جائے۔ اس نے کہا، واللہ باللہ میری تو عمر بھر کی کمائی اس میں تھی، جو کتا لے جارہا ہے۔

تو جیسے سیبویہ نے سارا علم کتے کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہی تھی، اسی طرح اگر آدمی کے اندر کوئی کمال نہ ہو، تو اسے کتا بھی لے کر بھاگ جائے گا۔ شیر بھی لے کر بھاگ جائے گا، بھیڑیا بھی لے جائے گا، دشمن بھی لے جائے گا وہ کمال ہی کیا ہوا کہ دوسرا لوٹ کر لے جائے اور آدمی کورا رہ جائے۔ کمال وہ ہے کہ انسان کے نفس میں ہو۔ ہزار آفتیں آئیں مگر وہ باکمال رہے۔ ہزار مصیبتیں آئیں۔ دشمن چڑھ آئیں، مگر وہ باکمال بنا رہے کمال اس کے نفس میں پیوست اور چھپا ہوا ہو، وہی اصل کمال ہے۔

دل ایک عجیب کیمیا ہے...... آپ نے مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام تو سنا ہوگا، بہت بڑے عارف کامل ہیں، مثنوی لکھی ہے، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۔

ہست قرآن در زبان پہلوی

گویا فارسی زبان میں اللہ نے ان سے قرآن لکھوا دیا۔ بہر حال بہت بڑے تصوف کے امام گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ اس واقع سے عبرت دلانی مقصود ہے۔ اس کو آدمی اگر غور سے سنے اور تدبر کرے۔ اس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوگی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم لڑائی ہوگئی۔ رومیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم بڑے صناع، دستکار ہیں اور بہترین صنعتیں بناتے ہیں، ہمارے ہاتھ میں حکمت ہے۔ بلڈنگیں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بناتے ہیں کپڑا بھی بہتر سے بہتر بناتے ہیں، برتن وغیرہ، غرض ہر سامان بہتر بناتے ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم سب سے زیادہ صناع ہیں۔ ہم سے بڑا دستکار اور ماہر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی، جھڑپ شروع ہوئی۔ دونوں میں سے ہر ایک کہتا ہے کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ اتنی جھڑپ ہوئی کہ آخر مقدمہ بادشاہ وقت کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے کہا کہ جھگڑا کیا ہے؟ رومیوں نے کہا کہ ہم بڑے صناع، دستکار اور ماہر ہیں، چینیوں نے کہا کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ بادشاہ نے کہا دعویٰ سے کام نہیں چلتا، اپنی اپنی صنعت بنا کر دکھلاؤ۔ ہم مقابلہ کر کے سمجھیں گے کہ کون زیادہ تم میں ماہر ہے۔ بادشاہ نے ایک بہت بڑا ہال بنوایا اور بیچ میں پارٹیشن

کر کے ایک دیوار کھڑی کر دی اور رومیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تو تم اپنی صنعت دکھلاؤ گویا نقاشی کرو اور چینیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تم اپنا کام دکھلاؤ، اس کے بعد میں ہم ایک دوسرے کے کام کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے، جس کا کام اعلیٰ ہوگا، اسے ڈگری دیں گے، اسے پاس کریں گے۔

چنانچہ مکان میں ایک طرف رومیوں نے اپنی دستکاری دکھلانی شروع کی اور ایک طرف چینیوں نے۔ چینیوں نے تو یہ کیا کہ دیوار کے اوپر پلاستر کر کے رنگ برنگ پھول، بوٹے اور بیلیں ایسی بنائیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باغ و بہار ہے، ساری دنیا کے چمن اور گلشن اسی دیوار کے اندر آ گئے ہیں۔

رومیوں نے کیا کیا؟ ایک پھول نہیں بنایا، ایک بوٹا نہیں بنایا، دیوار پر پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا اور اسے مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکا دیا کہ دیوار بالکل آئینہ بن گئی۔ جب دونوں اپنے کام سے فارغ ہوئے، تو بادشاہ کو اطلاع کی کہ ہم نے اپنی اپنی دستکاری بنالی ہے اور محنت کر کے اپنے کاموں کا نمونہ تیار کیا ہے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر فیصلہ دیجئے کہ کس کی صنعت زیادہ اعلیٰ ہے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوار بیچ میں سے ہٹادی جائے، جو پارٹیشن کے طور پر درمیان میں قائم کی تھی۔ دیوار کا ہٹانا تھا کہ چینیوں نے جتنے بوٹے بنائے تھے وہ سب کے سب ادھر نظر آنے لگے، کیوں کہ دیواریں تو صیقل ہو چکی تھیں۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو پھول پتے اُدھر بنے ہوئے ہیں، وہ ادھر بھی نظر آ رہے ہیں، جو رنگ اُدھر لگے ہوئے تھے، وہ اِدھر بھی ہیں۔ بلکہ ادھر یہ زیادہ دیکھنے میں آیا کہ ادھر کے پھول پتوں میں چمک بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ رومیوں کی صنعت بڑھ گئی، چینی ہار گئے، اس لئے رومیوں نے اپنی صنعت بھی دکھلائی اور ان کی بنی بنائی صنعت کو چھین کر اپنا کر لیا، تو دوگنی صنعت ہوگئی۔ لہٰذا رومی کامیاب ہیں۔ ہم انہیں پاس کرتے ہیں اور چینی فیل ہو گئے۔ ان کی صنعت کوئی بڑی صنعت نہیں نکلی۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ مثال دے کر کہتے ہیں کہ: اے عزیز! تو بھی رومیوں کی صنعت اختیار کر، چینیوں کی مت کر، تو اپنے دل کو مانجھ کر صیقل کر کے ایسا آئینہ بنا لے کہ دنیا کے سارے نقش و نگار تجھے گھر کے اندر بیٹھے ہوئے دل کے اندر نظر آئیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ　　　تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ ای درِ دل کشا بچمن درآ

بڑے ستم کی بات ہے کہ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر کبھی اس باغ میں کبھی اس چمن میں کبھی اس بوٹے پہ کبھی اس پتی پر پھر رہا ہے۔ تو اگر رومیوں کی صنعت اختیار کر کے دل کو مانجھ لے یہ ساری پھول پتیاں گھر بیٹھے تجھے دل ہی میں نظر آئیں گی اور ساری دنیا تیرے دل میں چمک اٹھے گی۔ دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت پیدا کر تو اللہ میاں کے ہاں تو بھی پاس ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دل اللہ نے بڑی عجیب کیمیا بنائی ہے۔ باہر کی چیزیں آدمی چھان کر اندر لے آئے تو

اس کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔اور باہر چمن کھلے رہیں اور دل اندر سے خالی رہے۔اس کے لئے نہ نجات کی صورت ہے نہ نفع کی صورت تو اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو مانجھے صیقل کرے، آئینہ بنائے۔

قلب کے دو دروازے ......اللہ نے انسان کے دل میں دو دروازے رکھے ہیں، ایک دروازہ کھلتا ہے، تو اسے عرش کی چیزیں نظر آتی ہیں اور ایک دروازہ کھلتا ہے تو اسے فرش کی چیزیں نظر آتی ہیں۔دل میں، آنکھ، کان، ناک کے راستہ سے جب آدمی دیکھے گا، تو ظاہری چمک دمک، پھول بوٹے سب نظر آئیں گے۔اور ان آنکھ، کان، ناک کے دروازوں کو بند کر کے دل کے اندر کے دروازے کھولے گا، تو عرش کی چیزیں نظر آئیں گی، وہاں کے علوم اور کمالات اترنے شروع ہوں گے، تو قلب کے اندر دونوں راستے ہیں۔اگر اوپر کے دروازے بند کر دو گے، صورتیں، شکلیں نظر پڑیں گی۔نیچے کا دروازہ بند کر دو گے، حقیقتیں کھلنی شروع ہو جائیں گی۔دل میں دونوں قسم کی صلاحتیں موجود ہیں۔اعلیٰ ترین صلاحیت یہ ہے کہ آدمی اوپر کی چیز کو جذب کرے، علم خداوندی کو، کمالات کو، معرفت خداوندی کو، اخلاق ربانی کو اور ملائکہ کی صفات کو جذب کرے، تو صحیح معنی میں کامل انسان اور کامل بشر بنے گا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اندر کی صنعت پیدا کرو۔باہر کی صنعت کے اوپر فریفتہ ہونا مت سیکھو، باہر کی چیزیں بھی اگر لوگے، وہ بھی جبھی کام دیں گی۔جب اندر کچھ جوہر موجود ہو اور اگر اندر خالی ہے، تو باہر کی چیزیں نفع نہیں دے سکتیں۔اس واسطے اپنے دل کو صاف کر کے اسی طرف آنا پڑے گا۔

علم روشنی اور غلبہ کا ذریعہ ہے ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایسی ہی بنیادی چیز کا ذکر فرمایا ہے کہ: جس سے انسان کا اندرون روشن ہو، قلب میں روشنی اور آراستگی پیدا ہو۔آپ نے فرمایا: ''اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ '' سارے انسان تباہ و برباد ہونے والے، سب ہلاک ہو جانے والے ہیں، اگر بچیں گے تو اہل علم بچ سکتے ہیں، یعنی جہالت میں انسان کی نجات نہیں ہے۔علم میں انسان کی نجات ہے، دنیا کا علم ہو، یا دین کا علم ہو، علم ہی سے راستہ نظر پڑسکتا ہے۔جہالت سے راستہ نظر نہیں پڑتا۔جہالت فی الحقیقت ایک اندھیری ہے اور علم فی الحقیقت ایک چاندنا ہے تو چاندنے میں راستہ نظر پڑا کرتا ہے، اندھیرے میں راہیں نظر نہیں پڑتیں، جہالت میں نہ دنیا کی بھلائی سامنے آسکتی ہے نہ آخرت کی بھلائی۔

آج دنیا بھی اگر بجی ہوئی ہے اور آراستہ ہے، تو وہ بھی انسان کے علم کی وجہ سے سج رہی ہے اگر آخرت درست ہے، وہ بھی انسان کے علم ہی کی وجہ سے درست ہے۔آج یہ آپ کا شہر جگمگا رہا ہے، لاکھوں قمقمے بجلی کے روشن ہیں، شہر میں چاندنا ہے۔کوٹھیاں اور بنگلے روشن ہیں۔چاندنا آپ کے علم کا ہے، بجلی کا نہیں ہے۔اگر آپ علم وسائنس کی قوتیں استعمال نہ کرتے۔تو نہ قمقمہ بنتا، نہ بجلی اور قمقمہ نہ ہوتا تو یہ گھر اور شہر روشن نہ ہوتا۔علم نے قمقمہ بنایا، بجلی کو دریافت کیا اور علم نے یہ صناعیاں کیں، اس کی وجہ سے روشنی ہوئی۔تو درحقیقت یہ علم کا چاندنا پھیلا ہوا ہے، اگر انسانوں میں جہالت ہوتی، فن سائنس کو نہ جانتے، یہ چاندنا سامنے نہ آتا۔یہ چھت میں آپ کو جو چمک نظر

آ رہی ہے۔ یہ آپ کے علم کی چمک ہے، بجلی کی نہیں ہے۔ بجلی تو خود آپ کے علم سے آئی ہے۔

جہالت ذریعہ مغلوبیت ہے...... یہی علم کی قوت ہے جو انسان کو اونچا بناتی ہے۔ اور دنیا کے اوپر غالب کرتی ہے۔ اگر جہالت ہو تو آدمی مغلوب ہو جاتا ہے۔ زمین بیچاری علم نہیں رکھتی، رات دن جوتیوں میں پامال ہے، جانور علم نہیں رکھتے، رات دن آپ کی غلامی میں مبتلا ہیں کسی جانور کے کندھے پر آپ نے ہل رکھا ہے، اس سے کھیتی باڑی کرا رہے ہیں، کسی جانور کی پشت پر زین کس رکھا ہے اور انسان سوار ہوا پھر رہا ہے۔ گھوڑا طاقت میں انسان سے چوگنی طاقت رکھتا ہے۔ مگر انسان کے آگے دبا ہوا ہے اس لئے کہ غریب کے پاس علم کی قوت نہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے جانوروں کو علم نہیں دیا، عقل نہیں دی۔ اگر کہیں گھوڑے اور بیل میں عقل آ جاتی اور انسان اس پر زین کسنے لگتا، گھوڑا کہتا کہ ٹھہر جائیے، پہلے دلیل سے ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سوار ہونے کا حق ہے۔ میں کیوں نا آپ پر سوار ہو جاؤں؟ اور میں کیوں نہ زین کس دوں؟ تو دو گھنٹے تو مناظرہ ہوتا۔ معلوم نہیں بحث میں کون جیتتا۔ کون ہارتا، نہ سواری ہوتی، نہ کھیتی باڑی ہوتی۔ تو شکر کرو کہ اللہ نے انہیں جاہل بنایا اور انہیں عقل نہیں دی۔

اس سے اتنی بات بھی معلوم ہوئی کہ کہیں جہالت بھی نفع دیتی ہے، محض علم ہی نفع نہیں دیتا۔ اگر دنیا میں جاہل نہ ہوں تو غلامی کرنے والا کوئی نہ ہو اور جب غلام کوئی نہ ہو، تو آقا کی آقائی کیسے کام دے گی؟ لیڈروں کی لیڈری جبھی چلتی ہے۔ جب پبلک جاہل ہو۔ اگر سارے پڑھے لکھے عالم بن جائیں تو لیڈر کام نہیں کر سکتا۔ بے چارے لیڈروں کی عزت تبھی بنتی ہے، جب پبلک میں جہالت ہو۔ تو جانوروں سے فائدہ جبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب جانوروں کے اندر عقل و شعور نہ ہو۔ ان میں شعور ہوتا، تو نہ کھیتی ہوتی، نہ سواری ہوتی، نہ حشم و خدم ہوتا۔ بہر حال ان تمام چیزوں پر انسان نے غلبہ پایا ہے، وہ بدن کی طاقت سے نہیں پایا۔ بدن میں تو طاقت میں گھوڑا، بیل ہم سے زیادہ ہے، وہ غلبہ علم اور عقل کی طاقت سے پا رکھا ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک حکایت عورتوں سے سنی تھی، واللہ اعلم قصہ واقعی ہے یا فرضی۔ واقعہ اگر فرضی بھی ہو تو مثال دینے اور عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے۔ وہ قصہ ہم نے یہ سنا تھا اپنی ماں بہنوں سے جو انہوں نے نصیحت کے لئے سنایا تھا کہ ایک شیر کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ دیکھو بیٹا! ہر ایک سے ملنا، ہر ایک کے پاس جانا۔ اس انسان کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، اگر کہیں اس کے پاس چلے گئے تو تم خطا اٹھاؤ گے، مصیبت میں مبتلا ہو گے، وہ شیر صاحب جو سارے جنگل کے بادشاہ تھے، انتقال فرما گئے۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے ''یعنی شیر کا بچہ'' ولی عہد بنے۔

شیر کا بچہ تجربہ نہیں رکھتا تھا، جوان ہوا، مگر عقل تو آتے آتے ہی آتی ہے۔ کیسی بھی عقل ہو، جانور ہونے کی یا انسان ہونے کی ہو، عمر گزرنے کے بعد آتی ہے۔ بچہ ہر ایک کا ناتجربہ کار ہوتا ہے، جانور کا ہو یا انسان کا ہو۔ تو شیر کے بچے کا بچپن تھا باپ تو اٹھ گیا، شیر کا انتقال ہو گیا۔ اس شیر کے بچے نے کہا کہ میرے باپ نے کہا تھا کہ تو انسان

کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، دیکھنا تو چاہئے انسان ہوتا کیا ہے؟ اور میرا باپ بہت ڈر رہا تھا، میرا باپ تو سارے جنگل کا بادشاہ تھا، اتنی طاقت والا تھا، وہ بھی ڈر رہا تھا، انسان معلوم نہیں کوئی دس گز لانبا ہوگا، بیس گز کا ہوگا، کیا چیز ہوگی انسان؟ دیکھنا تو چاہئے، تو جو پاس کے حالی حوالی تھے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو بڑوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ باپ نے کہا کہ انسان کے پاس بھی مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، تم ارادہ مت کرو، کہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اس نے کہا نہیں بھائی کم سے کم ایک دفعہ دیکھنا تو چاہئے کہ یہ انسان کیا چیز ہے۔

باپ کی نصیحت نہیں مانی اور انسان کو دیکھنے کی خاطر چلے۔ اتفاق سے سب سے پہلے گھوڑے پر نظر پڑی کہ چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہا ہے۔ شیر کے بچے نے سمجھا کہ یہی انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ باپ تو ڈیڑھ گز لانبا تھا اور یہ تو بہت ڈیل ڈول کا ہے، میرا باپ جو ڈرتا تھا، یہ اس سے دوگنا چوگنا ہے واقعی ٹھیک ڈرتا تھا۔ تو گھوڑے کے قریب جاکے ڈرتے ڈرتے اس نے کہا کہ جناب ہی کا نام انسان ہے؟ گھوڑے نے کہا کس ظالم کا نام لیا۔ میرے سامنے انسان کا نام مت لینا' وہ تو بڑی ظالم چیز ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ میں بہت ڈیل ڈول کا ہوں مگر انسان میری کمر پر زین کستا ہے، اس پر سوار ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے۔ میری پیٹھ پر کوڑے پڑتے ہیں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہوں، انسان ہے کہ مارتے مارتے باز نہیں آتا۔ تو سب چیزوں کا ذکر کرنا، مگر اس ظالم انسان کا نام مت لینا، یہ بڑی مصیبت کی چیز ہے۔ شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! انسان کتنے ڈیل ڈول کا ہوگا۔ یہ ایسا لانبا چوڑا جانور، یہ بھی انسان سے ڈر رہا ہے اور میرا باپ بھی ڈرتے ڈرتے مر گیا، کیا چیز ہوگی انسان؟ اور آگے چلے تو اتفاق سے اونٹ نظر پڑا۔ اس نے کہا یہ ہوگا انسان۔ کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔ گردن ادھر کو جا رہی ہے، کمر ادھر کو جا رہی ہے۔ ٹانگیں ادھر کو نکل رہی ہیں۔ بس یہی انسان ہوگا۔ یہ تو گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے۔ اس نے قریب جا کر اونٹ سے کہا، کیا آپ ہی کا نام انسان ہے؟

اس نے کہا ارے: ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ'' کس ظالم چیز کا نام لے دیا۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے، اس کا نام میرے سامنے مت لینا، اس واسطے کہ میں تو اکیلا ہوں۔ میرے علاوہ میرے سوسو بھائی بند اور ناک میں نکیل، جو آگے جا رہا ہے۔ اس کی دم میں پچھلے کی نکیل بندھی ہوتی ہے اس طرح سوسو کی قطاریں ہوتی ہیں اور انسان کا ایک بچہ ہمیں ہنکاتا ہے ہم گڑگڑاتے ہیں بل بلاتے ہیں مگر ایک بچہ ہنکا کر لے جاتا ہے سو اونٹ کی بھی ایک انسان کے آگے نہیں چلتی۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کا نام میرے سامنے مت لینا۔ شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! کتنی بڑی چیز ہوگا۔ یہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا، یہ بھی ڈر رہا ہے، گھوڑے نے تو اپنی مصیبت بیان کی۔ اس نے تو اپنی برادری کی مصیبت بیان کی کہ سو اونٹ مل جائیں، تب بھی انسان کے ایک بچے سے عاجز ہیں۔ پھر یہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی نظر پڑ گیا، اس نے کہا یہ انسان ہوگا، اس لئے کہ اچھے خاصے چار ستونوں پہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ چھت پڑی ہوئی ہے۔ اس پر ایک بڑا حوضہ رکھا ہوا ہے۔ یہ انسان ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے جا کر کہا، کہ جناب ہی کا

نام انسان ہے؟ آپ ہی کو آدمی کہتے ہیں۔

اس نے کہا، ارے "اَسْتَغْفِرُ اللہ" کس مصیبت کا نام لے لیا، میرے سامنے اس کا نام مت لے، یہ بڑی ظالم چیز ہے، میرے ڈیل ڈول پر مت جانا، قدوقامت میرا اونچا نظر آ رہا ہے کہ ایک عمارت سی کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ایک انسان کا بچہ میری پشت پر سوار ہوتا ہے، لوہے کا ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ذرا میں چیخا، اس نے میرے سر پر لوہے کا ہنٹر مارا، میں چنگھاڑتا ہوں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ گھوڑے کے منہ میں تو لگام بھی ہوتی ہے۔ میرے سر پر بے لگام ہی سوار ہوتا ہے، تو نہ لگام، نہ نکیل، مگر انسان کے سامنے میں مجبور ہوں۔ شیر نے کہا، یا اللہ! انسان کیا چیز ہوگی، جو ملتا ہے ڈرتے ڈرتے ملتا ہے، جو ملا وہ کانپ رہا ہے کہ انسان بڑی ظالم چیز ہے۔

آگے چلا تو اتفاق سے ایک بڑھئی کا بچہ دس برس کا، وہ ایک بڑا بھاری شہتیر چیر رہا تھا اور بہت بڑا آرہ اس میں ڈال رکھا تھا، اسے چیرے جا رہا تھا اور جتنا وہ چیر چکا تھا، اس میں ایک کھونٹی ڈال دی تھی، تا کہ اوپر نیچے نہ ہل سکے۔ تو شیر کو یہ وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان بھی ہوسکتا ہے، وہ دیکھ کر آیا تھا، اونٹ کو گھوڑے کو اور ہاتھی کو اور سب کو دیکھا کہ انسان سے ڈر رہے ہیں۔ تو وہ اس بچے سے تھوڑا ہی ڈر سکتے ہیں۔ اسے وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان ہوگا۔

مگر تحقیق کے لئے اس سے پوچھا کہ انسان کہاں ملے گا؟ بڑھئی نے کہا کہ انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا اچھا تو تو انسان ہے؟ آدھ گز کا اتنا سا بچہ؟ کہا جی ہاں، انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا: "لا حول ولا قوۃ" میرا باپ بڑا بے وقوف تھا، جو تجھ سے ڈر رہا تھا، میں ایک چپت میں تیرا کام تمام کردوں گا اور شیر نے یہ کہہ کر اٹھایا پنجہ۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا بھئی یہ تو شیر ہے۔ اب موت آ گئی۔ اگر اس نے ایک طمانچہ بھی مار دیا، میں تو ختم ہو جاؤں گا، تو تدبیر سے کام کرنا چاہئے، بڑھئی کے بچے نے کہا کہ آپ تو جنگل کے بادشاہ ہیں، میں کیا چیز ہوں آپ کے آگے۔ آپ بڑی طاقت والے۔ مگر ایک کام ہے جو میں نہیں کرسکتا، آپ ہی جیسا طاقت ور کرسکتا ہے اگر آپ اس کام کو انجام دے دیں؟

شیر نے کہا، ہاں بتلاؤ، کیا کام ہے؟ کہا یہ شہتیر جو میں نے چیرا ہے بڑی مصیبت سے اسے چیرتے چیرتے یہاں تک لایا ہوں۔ اوپر میں نے کھونٹی لگا رکھی ہے۔ اب وہ کھونٹی مجھ سے نکلتی نہیں، آپ اگر اس میں ہاتھ ڈال کے یہ کھونٹی نکال دیں، تو بڑا کام ہوگا۔ اس نے کہا یہ کونسا بڑا کام ہے، میں ابھی نکالتا ہوں۔ تو شیر نے دونوں ہاتھ اس میں دیئے، بڑھئی کے بچے نے چپکے سے وہ کھونٹی نکال دی، دونوں پھٹے برابر ہوئے تو شیر صاحب پھنس گئے؟ اور چیں چیں کر رہے ہیں، نکلا جاتا نہیں اور وہ بڑھئی کا بچہ کھڑا ہوا ہنس رہا ہے۔ دیکھ لیا انسان کو؟ اب وہ شیر ہے کہ پھنس رہا ہے، نہ نکل سکتا ہے نہ جاسکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ان دونوں پھٹوں کے اندر پھنس گئے وہ کھونٹی نکل گئی اور بڑھئی کے بچے نے ہنسنا شروع کیا۔ اس وقت شیر کے بچے نے کہا کہ واقعی جو اپنے ماں باپ کی نصیحت نہیں مانتا، وہ اسی ذلت وخواری کا شکار بنتا ہے۔ گویا عورتوں نے ہمیں یہ قصہ عبرت دلانے کے لئے سنایا تھا کہ اپنے بڑوں کی نصیحت

ماننی چاہئے۔ جو اس نصیحت کے خلاف کرتا ہے، وہ یوں ذلت میں مبتلا ہوتا ہے اور مصیبت کا شکار ہوتا ہے۔

مجھے اس سے یہ سنانا مقصود ہے کہ بڑھئی کے اتنے سے بچے نے جو شیر پر قابو پایا۔ اور ہاتھیوں پر قابو پایا، اونٹوں اور گھوڑوں پر قابو پایا، وہ بدن کی طاقت سے قابو نہیں پایا۔ بدن کی طاقت اونٹ کی انسان سے زیادہ ہے۔ اگر اونٹ بلا ارادہ انسان پر گر پڑے تو انسان پس کر رہ جائے، چکنا چور ہو جائے۔ ہاتھی اگر کسی انسان پر آ پڑے، تو انسان تو بے چارہ پس کے رہ جائے۔ کچھ بھی طاقت نہیں۔ تو بدن کی طاقت سے انسان غالب نہیں آیا۔ علم اور عقل کی طاقت سے غالب آیا ہے۔ وہ طاقت آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ وہ دل میں رہتی ہے۔ انسان کی انسانیت فی الحقیقت اس طاقت میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن ہمارا بہت ڈیل ڈول کا ہو جائے، پہلوان بن جائیں اور اندر عقل نہ ہو، ہم غلبہ نہیں پا سکتے، انسان کا غلبہ تو علم و عقل اور فضل و کمال سے ہے۔

انسانی عقل و شعور کی قوت ...... یہ جو ساری دنیا عاجز ہے۔ شیر نے بھی کہا کہ انسان کا نام مت لو، بھیڑیئے نے بھی کہا، یہ اس کی عقل سے ڈر رہے تھے، بدن سے نہیں ڈر رہے تھے، آج یہ مشینیں چل رہی ہیں۔ مشین لگا دی اور پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھر پس پس کر اس میں چونا بن رہے ہیں۔ تو نہ پہاڑ کی پیش چلتی ہے، نہ درختوں کی پیش چلتی ہے۔ ساری چیزیں کٹ رہی ہیں دنیا ہے کہ پسی جا رہی ہے، انسان کے آگے عاجز ہے، انسان کھڑا ہوا ہے، کہیں چکی بنا دی کہیں مشین بنا دی۔ زمین کے خزانے انسان نے نکال نکال کے استعمال کئے اور زمین بے چاری چوں نہیں کر سکتی۔ اب آپ کے افریقہ میں جگہ جگہ سونے کی کانیں ہیں۔ ہزار فٹ گہرے غار کھود کر گویا انسان نے زمین کا جگر نکال لیا، مگر زمین کچھ بھی نہیں بول سکتی۔ سونا اس کا نکال باہر کیا۔ چاندی اسکی نکالی، ہیرے اس کے نکال ڈالے۔ انسان کے آگے سب چیزیں عاجز ہیں اور یہ تصرف کر رہا ہے، یہ بدن کا تصرف نہیں، یہ علم و عقل کا تصرف ہے۔ تو سائنس انسان کے بدن سے نہیں، انسان کے دماغ سے پیدا ہوئی، عقل سے نکلی، دنیا میں جتنی سجاوٹ ہے جتنی زینت اور آرائش ہے، وہ انسان کے علم کی ہے۔ آخرت جتنی منور ہوگی، وہ انسان کے علم سے منور ہوگی، عمل سے منور ہوگی۔ بدن کے ڈیل ڈول سے منور نہیں ہوگی۔

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام ...... حدیث میں ہے کہ: معراج کی شب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہنچے ہیں تو ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے جس کو بیت المعمور کہتے ہیں۔ انسان کا قبلہ مکہ میں ہے جس کو بیت اللہ اور کعبہ محترمہ کہتے ہیں۔ اس میں آپ لوگ طواف وسجدے کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ استقبال قبلہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے۔ فرشتے اس میں طواف کرتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ روزانہ ستر ہزار فرشتہ طواف کرتا ہے اور آج جنہوں نے طواف کیا ہے اب ابد الا باد تک انہیں نوبت نہیں آئے گی، اگلے دن پھر ستر ہزار، اس سے اگلے دن پھر ستر ہزار ابد تک اسی طرح نئے نئے ستر ہزار آتے رہیں گے، اور طواف کرتے رہیں گے، پھر چھٹے آسمان

میں اس کی سیدھ میں دوسرا قبلہ ہے۔ چھٹے آسمان کے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ پانچویں آسمان میں اس کی سیدھ میں اور قبلہ ہے، اس کا وہاں کے لوگ۔ غرض ساتوں آسمانوں میں اوپر نیچے ایک سیدھ میں قبلے ہیں۔ حدیث میں ہے اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر ڈالا جائے، تو ٹھیک بیت اللہ الکریم کی چھت پر آ کر گرے گا، اس سیدھ میں ہے۔ اصل میں قبلہ یہ محل اور مکان ہے، عمارت قبلہ نہیں ہے اگر عمارت نہ بھی رہے۔ معاذ اللہ اس کو ڈھا دیا جائے، نماز جب بھی ادھر ہی کو منہ کر کے پڑھنی پڑے گی۔ اس واسطے کہ قبلہ ان پتھروں کا، یا اس مکان کا نام نہیں ہے، بلکہ اس موضع اور محل کا ہے، جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے اور ساتویں زمین سے لے کر ساتویں آسمان تک ایک ہے، وہی قبلہ ہے۔ وہ ایک کلی ہے جس کے اردگرد ساتوں آسمان اور زمینیں گھوم رہی ہیں۔

اسی لئے اگر آپ فضا میں جائیں، پچاس ہزار نہیں پچاس لاکھ فٹ بلندی پر جائیں، تب بھی رخ ادھر ہی کو کرنا پڑے گا، کیونکہ قبلہ کی فضا یہاں سے آسمانوں تک ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک لاکھ میل اوپر پہنچ کر آپ نیچے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے۔ سامنے رخ کریں گے، کیونکہ نیچے سے اوپر تک وہ ایک کیل ہے جو درحقیقت اوپر تک چلی گئی ہے۔ وہی کعبہ محترم ہے۔ اس محل اور مقام کا نام کعبہ ہے، عمارت کا نام نہیں ہے۔ تو فرشتوں کا کعبہ ساتویں آسمان پر ہے۔ چھٹے آسمان والوں کا قبلہ چھٹے آسمان پر ہے، پانچویں والوں کا پانچویں پر، اسی طرح سے قبلے ہیں۔

اسی طرح جو یہ زمین پر قبلہ ہے، اس کی سیدھ میں نچلی زمین پر بھی قبلہ ہے۔ اس کے سیدھ میں اس کے نیچے کی زمین پر۔ سات زمینیں ہیں، سات آسمان ہیں۔ تو نیچے سے اوپر تک قبلہ ہے۔ بہر حال ساتویں آسمان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، جو بیت المعمور کی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ جگہ غالباً اس لئے دی گئی کیونکہ دنیا میں انہوں نے بیت اللہ الکریم کی تعمیر کی ہے۔ تو جیسا عمل تھا، ویسی جزا سامنے آئی۔ ساتویں آسمان پر بیٹھنے کے لئے بھی انہیں بیت اللہ دیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ: ''اَلْجَنَّةُ قِيْعَانٌ'' جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے۔ ① اس میں کوئی چیز بنی ہوئی نہیں، جو بھی محلات اور باغات ہوں، وہ تمہارے لئے کچھ نہیں۔ تم جب کوئی عمل کرو گے۔ تمہیں جب ہی ان محلات کا استحقاق پیدا ہوگا۔ تم اپنی جنت خود بناؤ گے، بنی بنائی جنت تمہاری نہیں ہے، خود تمہیں بنانی پڑے گی، جیسے عمل کرو گے، ویسا ہی وہاں ثمرہ مرتب ہو جائے گا، جیسی نیکی کر کے بھیجو گے، ویسی ہی وہاں جزاء مہیا ہو جائے گی۔ تو تم یہاں بیٹھ کر جنت بناؤ، جب جا کے تمہارا مقام جنت میں ہوگا۔ تم نے کچھ عمل نہ کیا اور تم یہ امید لگائے بیٹھے رہے کہ

---

① الجامع للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل التسبیح.... ج: ۱۱ ص ۳۶۵، رقم: ۳۳۸۴. حدیث حسن ہے، دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۱ ص: ۱۰۴ رقم: ۱۰۵.

جنت میں محلات ملیں گے، تم نے بنائے ہی نہیں، تو ملیں گے کہاں سے؟ تم خود تعمیر کرو گے، جب تمہیں ملیں گے''۔

دنیا میں ہر انسان معمار ہے...... ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف بزرگوں میں سے تھے اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ مولانا میں کچھ تھوڑی سی مجذوبیت کی شان تھی، جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ کوئی لٹک لگ گئی، کوئی بات لگ گئی، بس اسی طرف چل پڑے۔ یہ کچھ عادت تھی۔

ایک دن رات کو بیٹھے اور لٹک لگی، یہ دعا مانگنا شروع کی، کہ یا اللہ! مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ اب کیوں دے دے تین لاکھ، کاہے کیلئے دیدے، بس کچھ نہیں۔ آدھی رات گزر گئی دعا مانگتے مانگتے۔ یا اللہ مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ مجذوب جو ٹھہرے، تو مجذوبیت میں ایک بڑ ہاتھ لگ گئی۔ اور دعا شروع کر دی۔ تین چار گھنٹے گزر گئے، رات کے دو بج گئے۔ اسی دعا مانگنے کی حالت میں بیٹھے ہی بیٹھے مولانا کو نیند آ گئی۔ تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا محل سفید رنگ کا ہے، کئی میلوں میں چلا گیا ہے اور بالکل ایسا جیسے انڈا سفید ہوتا ہے۔ گویا اعلیٰ قسم کا وہائٹ ہال بنا ہوا ہے۔ اور اس کے اوپر دیواروں کے کناروں پر بڑے بڑے موتی لگے ہوئے ہیں، جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ تمام محل کے ارد گرد چاندنا پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں سورج لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کو محل بہت پسند آیا۔ ہزاروں لوگ وہاں پھر رہے ہیں۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہ بھائی! یہ محل کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا محل ہے اور یہ جنت ہے۔ اور جنت میں یہ اللہ نے انکا مکان بنایا ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ اس میں داخل ہونا چاہا۔ تو دربانوں نے روک دیا کہ ابھی داخلہ کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا جب داخل ہوں گے۔ بڑا پسند آیا سبحان اللہ! بڑا عجیب محل ہے، جس کے باہر اتنی چمک دمک ہے، تو اندر کیسے کیسے سامان ہوں گے۔ ایک طرف کو جو گئے تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک موتی ندارد۔ وہ موتی ٹوٹا ہوا ہے اور وہاں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ سارے محل کے ارد گرد تو چاندنا اور روشنی اور کونے میں ایک موتی نہیں ہے، وہاں اندھیرا، مولانا نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں موتی لگایا ہی نہیں گیا، یا تھا اور نہیں رہا۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ نہیں تھا تو، ابھی ٹوٹا ہے۔ کیوں ٹوٹ گیا؟ کہا کہ: مولانا محمد یعقوب صاحب اللہ تعالیٰ سے تین لاکھ روپے مانگ رہے تھے، تو حکم ہوا کہ محل کا ایک موتی توڑ کے بھیج دو، یہ تین لاکھ سے زیادہ قیمت کا ہے۔ تو وہ توڑ کر بھیج دیا گیا۔

اب مولانا کی آنکھ کھلی۔ اب دوسری دعا مانگنا شروع کی یا اللہ! مجھے نہ تین لاکھ چاہئے نہ تین ہزار چاہئے نہ تین سو چاہئے۔ اگر میری جنت کے محل کی اینٹیں توڑ توڑ کر میرے دنیا کے مکان کی تعمیر ہوئی تو میری آخرت تو ویران ہو جائے گی۔ مجھے یہاں نہیں چاہئے میں تو وہیں لوں گا۔ اب یہ دعا شروع کر دی کئی گھنٹے اسی میں لگ گئے کہ مجھے تین لاکھ نہیں چاہئے میں نہیں لینا چاہتا پھر آنکھ لگی۔ دیکھا تو پھر وہی محل ہے۔ اب جو کنارے پہ گئے تو وہ موتی لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولانا نے مانگتے مانگتے یہ عرض کر دیا کہ اس وقت یہ مجھے نہیں چاہئے۔ موتی پھر لگا دیا گیا۔ مجھے یہ

بات اس پر یاد آ گئی کہ جنت کی تعمیر تو ہم کرتے ہیں۔ اگر ہم تعمیر نہ کریں۔ وہاں اندھیرا پڑا رہے گا۔ بلاشبہ اللہ نے جنت میں بڑی بڑی نعمتیں بنائی ہیں۔ مگر ہمارے حق میں کچھ نہیں جب تک ہم کچھ کر کے نہ جائیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زمین میں سونا بھی ہے چاندی بھی ہے۔ مگر آپ کے حق میں کچھ بھی نہیں جب تک محنت کر کے مشین نہ لگائیں۔ مشین لگاؤ پھر نکالو سونا ایک شخص گھر میں بیٹھا رہے چاہے ساری زمین میں سونا بھرا ہوا ہو اس کے لئے کچھ نہیں۔ یہ تو کہا جائے گا کہ افریقہ سونے سے بھرپور ہے مگر ملے گا اسے جو محنت کرے گا یہ نہیں کہہ سکتے کہ افریقہ میں سونا نہیں۔ تو جنت میں سونے اور چاندی کے محلات ہیں مگر ملیں گے تب جب آپ یہاں محنت کریں گے۔

حدیث میں ہے کہ: جنت میں ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے۔ ملائکہ اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ تعمیر کرتے کرتے ایک دم تعمیر رک جاتی ہے۔ دوسرے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم تعمیر کر رہے تھے رک کیوں گئے؟ وہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں عمل کر رہا تھا ہم اس کے لئے مکان بنا رہے تھے اس نے عمل کرنا چھوڑ دیا۔ میٹریل بھیجنا چھوڑ دیا ہم نے تعمیر روک دی۔ تو درحقیقت جنت کی تعمیر آپ یہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہر انسان معمار ہے۔ کوئی دنیا میں بیٹھ کر جہنم بنا رہا ہے کوئی جنت بنا رہا ہے۔ اپنی اپنی محنت کر رہا ہیں۔ مگر جو کچھ کرے گا اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ تو مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ دعا روک دی اور کہا کہ: مجھے وہ موتی نہیں چاہئے۔ اس واسطے کہ اگر میری آخرت دنیا میں مل گئی آخرت میں کچھ نہیں رہے گا۔ تو اصل چیز محنت اور کمال ہے وہ ہوگا تو وہاں ملے گا ورنہ نہیں۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ اَلْجَنَّةُ قِيْعَانٌ جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے، اس میں تمہارے لئے کوئی چیز نہیں۔ جتنا کرلو گے، وہ تمہارے لئے ہو جائے گا، ورنہ اس میں کچھ نہیں۔ تو جو کچھ آدمی کو ملتا ہے، اپنی محنت سے ملتا ہے، تمنائیں کرنے سے نہیں ملتا۔ دنیا کو دارالکسب بنایا گیا ہے، جو محنت اٹھائے گا، وہ پالے گا۔ اگر آپ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر محنت نہ کریں، آپ پیسے لے کر گھر نہیں آ سکتے۔ اگر کاشت کار کھیت پر جا کر محنت نہ کرے، تو چار دانے لے کر اپنے گھر نہیں آ سکتا۔ اگر ایک صناع محنت نہ کرے، برتن نہ بنائے، بازار میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا تو محنت کی جگہ ہے، جو کرے گا، وہ پائے گا۔ جو نہیں کرے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔

سب سے زیادہ محنت طلب، ایمان کا علم ہے...... سب سے بڑی چیز جو انسان کے لئے محنت طلب ہے وہ علم ہے۔ علم ہی سے دنیا میں اور آخرت میں بھی چاندنا ہے۔ سائنس کا علم ہوگا، تو دنیا سجے گی۔ ایمان کا علم ہوگا، تو آخرت سجے گی۔ دنیا کا سجانا بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مگر بھائی! اس کو اگر سجاؤ گے بھی، تو ایک دن ختم ہو جائے گی، اس لئے اگر سارا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا، یہ تو ہاتھ سے چھننے والی ہے، تو پھر سرمایہ اس چیز میں کیوں نہ لگایا جائے، جو باقی رہنے والی ہے۔ بقدر ضرورت اس میں لگاؤ۔ بقایا سرمایہ اس میں لگاؤ جس کی ابدالآباد تک ضرورت ہے۔

کیسی حکمت کی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی۔ فرمایا: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا. وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا'' (1) ''دنیا کے لئے اتنی محنت کرو، جتنا دنیا میں رہنا ہے۔ آخرت کے لئے اتنی محنت کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے''۔ دنیا میں رہنا ہے پچاس برس، چالیس برس، دس بیس برس، آخرت میں ابدالآباد تک کے لئے رہنا ہے، تو کم سے کم وہاں کی محنت زیادہ ہونی چاہئے۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ آپ یہاں کے لئے کچھ نہ کریں۔ نہیں یہاں کے لئے آپ سب کچھ کریں۔ رہنے کے لئے گھر بھی بنائیں، کپڑا بھی بنائیں، کھائیں بھی، مگر سارا سرمایہ اسی میں نہ لگائیں۔ کچھ سرمایہ آگے کے لئے بھی چھوڑیں۔ کرنا دھرنا تو وہاں ہے سب کچھ، اس واسطے جب تک وہاں کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی، وہاں کا کام نہیں بنے گا۔ اور وہاں کی سب سے بنیادی چیز علم ہے۔ جب تک وہ قلب کے اندر نہیں ہوگا، چاندنا نہیں پیدا ہوسکتا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ.'' ''سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں، تباہ ہوجانے والے ہیں، مگر علم والے بچیں گے''۔

جو اہل علم ہیں ان کے لئے نجات ہے۔ جہالت کے ساتھ نجات نہیں ہے۔ جاہل کو بھی اگر نجات ملتی ہے، تو کسی عالم کے ساتھ لگ کر ملتی ہے۔ اگر مزدور کو بھی کچھ ملے گا تو وہ کسی سرمایہ والے سے ملے گا۔ جب اس کی نجات بنے گی۔ سرمایہ دار وہ ہے جو اپنے علم اور قابلیت سے دکان پر بیٹھ کر لاکھوں روپے کی کمائی کر رہا ہے۔ وہ اپنے علم کے زور سے پل رہا ہے۔ جو بے چارے علم نہیں رکھتے، وہ اس کے ساتھ لگ گئے ہیں، تو ہزار پانچ سو کی روزی اس کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ مگر انجام یہی نکلا کہ ان کی سمجھداری اور قابلیت سے دولت پیدا ہوئی ہے، جہالت سے پیدا نہیں ہوئی۔ دنیا کی بات ہو یا آخرت کی، دونوں چیزیں ہیں علم سے متعلق۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ''تمام انسان ہلاک ہونے والے ہیں، علم والے بچیں گے''۔

علمِ محض کار آمد نہیں...... مگر علم والے بھی غرّہ نہ کریں، علم والے بھی ناز نہ کریں کہ بس ہمارے لئے تو نجات ہے، نہیں۔ دوسرا جملہ بھی فرمایا: ''وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ.'' ''علم والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ بچیں گے وہ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں''۔

اگر عمل نہ ہو، تو علم محض کوئی کار آمد چیز نہیں ہے، بلکہ اور زیادہ وبال بن جاتا ہے۔ علم جب کار آمد بنتا ہے، جب اس کا استعمال کیا جائے، اس کو عمل میں لایا جائے۔ علم محفوظ بھی جبھی رہتا ہے جب عمل میں آئے۔ اگر آپ ایک علم سیکھ لیں، لیکن استعمال میں نہ لائیں، چند دن کے بعد بھول جائیں گے۔ کام کے اندر لاتے رہیں، وہ ذہن کے اندر حاضر رہے گا، محفوظ رہے گا۔ ہم تو اپنا تجربہ آپ سے عرض کرتے ہیں۔ اور غالباً ہر طالب علم کو یہی تجربہ ہوگا کہ جن مسائل پر ہمارا عمل ہے، انکا علم محفوظ ہے اور جن مسائل پر عمل کی نوبت نہیں آتی، وہ یاد ہی نہیں رہتے۔ مثلاً

(1) دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات، ج: ۱، ص: ۲۰۰۔

نماز کے مسائل جو ہیں، اگر آپ پوچھیں تو شاید میں فوراً بتلا دوں۔ لیکن اگر حج کے مسائل پوچھیں گے تو ذرا کتاب دیکھنی پڑے گی۔ اس لئے کہ ہر روز عمل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ عمر میں ایک مرتبہ حج کرلیا۔ یاد ہی نہیں رہتے۔ اور اگر بیع وشراء کے مسائل پوچھیں اس میں تو شائد ایک مسئلہ بھی بے کتاب دیکھے بتانا مشکل ہوگا، اس لئے کہ خرید و فروخت کی نوبت تو کبھی آتی ہی نہیں۔ جو یہ یاد رہے کہ یہ بیع باطل ہے، یہ بیع فاسد ہے۔ یہ بیع اچھی ہے۔ یہ بیع مکروہ ہے اس لئے کہ ان مسائل پر ہمارا عمل نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کو اگر مسائل معلوم ہو جائیں۔ آپ کو نسبت عالم کے بیع وشراء کے مسائل زیادہ یاد رہیں گے۔ کیوں کہ رات دن آپ کو سابقہ پڑے گا۔ جن مسائل پر عمل ہوتا رہتا ہے، ان کا علم محفوظ رہتا ہے اور جن مسائل پر عمل نہ ہو، علم محفوظ نہیں رہتا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم محض کارآمد نہیں ہے، جب تک اس کا استعمال نہ ہو، جس پر عمل نہیں، وہ علم بیکار ہے، بلکہ وہ اور اللہ کی طرف سے زیادہ حجت بن جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: قیامت کے دن علماء کی ایک جماعت کو بلایا جائے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے، ہم نے تمہیں علم دیا اور بڑا علم دیا، بلکہ کئی کئی قسم کے علوم دیئے۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟۔ وہ عرض کریں گے، ہم نے مسائل بتائے، ہم نے نصیحت کی، ہم نے کتابیں تصنیف کیں۔ فرمایا، کیں مگر کیوں کیں؟

''لِيُقَالَ اِنَّکَ عَالِمٌ'' تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے۔ تو وہ ہوگئی۔ وہ چیز مل گئی جس کے لئے تم نے محنت کی تھی۔ مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟ اس قسم کے علماء کو گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ علم ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اس کے اوپر عمل نہیں تھا۔ تو علم محض بیکار ہے۔ جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو، بلکہ احادیث کے دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو بے چارے بے پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر کچھ نہ کچھ نیکی کرتے ہیں۔ ان کی نجات جلدی ہو جائے گی، علماء کی دیر سے ہوگی۔ اس واسطے کہ عالم سے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ تو یہ بات بھی جانتے تھے۔ پھر اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ یہ مسئلہ معلوم تھا، اس پر کیوں نہ عمل کیا؟ اور جو بے چارہ بے پڑھا لکھا ان پڑھ تھا، اس سے اجمالاً کہا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا حضور پڑھی تھی۔ زکوٰۃ دی تھی؟ جی ہاں دی تھی۔ اچھا جاؤ جنت میں۔ اس لئے کہ نہ زیادہ علم نہ زیادہ عمل، اس لئے زیادہ علم بھی ایک مصیبت کی چیز ہے، مواخذہ بڑھ جاتا ہے۔ (1)

آپ کے سامنے کوئی بے وقوف سا سیدھا سادھا، آدمی آجائے، تو ایک آدھ بات پوچھ کے آپ کہیں گے، جاؤ چھٹی اور جو ذرا سمجھ دار ہے، جو کچھ زیادہ بولتا ہے، اس سے سوالات بھی زیادہ کریں گے۔ امتحان لینے والا جب بیٹھتا ہے، اگر کوئی طالب علم سیدھا سادھا بے وقوف سا ہے، ایک دو موٹی بات پوچھی، نمبر دے دیئے، جاؤ تمہیں پاس کر دیا۔ اور اگر کوئی ذکی ہے، بولتا زیادہ ہے۔ ممتحن اس سے زیادہ سوالات کریں گے، کہ یہ بات تم نے

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار ج: ۱۰ ص: ۹ رقم: ۳۵۲۷۔

کیوں کہی؟ اور یہ کیوں کہی؟ اس کے نمبر مشکل سے آتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے کہ ''عَلَيْكُمْ بِدِيْنِ الْعَجَائِزِ'' ''بوڑھیوں کا دین اختیار کرو''۔

پرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں جو ہیں، وہ اپنے دین پر چل رہی ہیں، نہ ان کے دل میں شک ہے نہ شبہ، نہ زیادہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پکا دین ہے۔ ایسا دین اختیار کرو، جس میں نہ شکوک ہوں نہ سوالات ہوں۔ جلدی سے نجات مل جائے۔ زیادہ علم وبال بن جاتا ہے، اگر اس پر عمل نہ ہوا اور اگر عمل ہوا، پھر اس میں شک نہیں کہ ترقی بھی بڑی ہے، درجات بھی بڑے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: محض علم پر غرہ مت کرو۔ علم کارآمد نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ اور اس کا استعمال نہ ہو، تو دو چیزیں فرمائی گئیں کہ آدمی کی نجات جہالت میں نہیں بلکہ علم میں ہے اور محض علم میں نہیں ہے بلکہ عمل میں ہے۔

بڑا عمل بلا اخلاص معتبر نہیں...... پھر آگے ایک بات اور ارشاد فرمائی: ''وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ'' عمل کرنے والے سب تباہ و برباد ہیں، ان کے عمل کو بھی نہیں پوچھا جائے گا۔ عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد، بچیں گے کون؟ مخلصین، جو اپنے عمل میں خلوص رکھتے ہیں، للّٰہیت رکھتے ہیں۔ دکھلاوے کے لئے عمل کرے، وہ وبال کی چیز ہے۔ شہرت پسندی کے لئے عمل کرے، وہ تباہی کی چیز ہے۔ خالص خدا کی رضا کے لئے عمل کرے، کارآمد ہوتا ہے، اسی پر انسان کی نجات ہے۔

تو فرمایا: لوگوں کی نجات شکل وصورت سے نہیں ہوگی، علم سے ہوگی۔ پھر فقط علم سے نہیں ہوگی، عمل سے ہوگی، پھر فقط عمل سے نہیں ہوگی، اخلاص سے ہوگی، للّٰہیت سے ہوگی۔ دورخے پن سے عمل کرے کہ خدا کو بھی خوش کرلوں اور کچھ بندوں کو بھی خوش کرلوں۔ وہ عمل معتبر نہیں ہے۔ فقط اللہ کی رضا کے لئے ہو، وہی عمل معتبر ہوگا، ورنہ نہیں ہوسکتا۔ تو فرمایا کہ: ''وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ'' ''عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے''۔ اگر کسی عمل کی شکل وصورت بڑی ہو، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو، تباہی کا ذریعہ ہے۔ اور چھوٹا سا عمل ہو، بالکل معمولی سا ہو، مگر خلوص اور للّٰہیت ہو، تو وہ عمل نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث میں خلوص کی تین مثالیں فرمائی گئیں اور تین ہی مثالیں حدیث میں بلا خلوص کے عمل کی فرمائی گئیں۔ اور نتائج الگ الگ۔

ابھی جیسے میں نے ایک حدیث کا جز سنایا، کہ علماء کی ایک جماعت بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ اپنا احسان جتلائیں گے کہ ہم نے تمہیں قسم قسم کے علم دیئے، تم نے کیا کیا؟ کہیں گے، ہم نے نصیحت کی۔ ہم نے درس وتدریس کیا۔ ہم نے تبلیغ کی، ہم نے تصنیف کی، فرمائیں گے، کیں مگر کیوں کی؟ ''لِيُقَالَ اِنَّكَ عَالِمٌ'' تاکہ دنیا میں شہرت ہوجائے کہ تم بڑے عالم تھے، تو فَقَدْ قِيْلَ۔ وہ شہرت ہوگئی تمہارا مقصد مل گیا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ یہاں تمہارے لئے اب کیا ہے؟ انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔ ①

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارة، باب من قاتل للریاء والسمعة استحق النار ج: ١٠ ص: ٩ رقم: ٣٥٢٧.

حدیث میں ہے کہ: مالداروں کی ایک جماعت بلائی جائے گی، جن کو لاکھوں کی رقم اللہ نے دی تھی۔ حق تعالیٰ احسان جتلائیں گے۔ ہم نے تمہیں لکھ پتی، کروڑ پتی بنایا، لاکھوں کا مال دیا۔ اور ایک ہی قسم کا نہیں۔ نقد الگ دیا، باغات الگ دیئے، بلڈنگیں الگ دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا۔ وہ کہیں گے، ہم نے صدقہ کیا، خیرات کیا۔ ہم نے یتیموں کو، بیواؤں کو دیا۔ فرمایا، دیا مگر کیوں؟ لِيُقَالَ اِنَّکَ جَوَّادٌ. تاکہ دنیا میں شہرت ہو کہ تم بڑے سخی داتا ہو۔ بڑے دینے والے ہو۔ تو وہ تو ہو چکی شہرت۔ ہم سے کیا چاہتے ہو؟ یہ جماعت بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈالی جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: ایک جماعت شہیدوں کی بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے ہم نے تمہارے بدنوں میں طاقت دی۔ تمہیں پہلوانی کے بدن دیئے۔ تم میں قوتیں دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟ عرض کریں گے کہ: ہم نے جہاد کیا، ہم نے جانیں لڑا دیں۔ ہم نے گردنیں کٹا دیں، خون بہا دیا۔ فرمائیں گے یہ کیا، مگر کیوں؟ لِيُقَالَ اِنَّکَ جَرِئٌ. تاکہ دنیا میں تمہاری شہرت ہو کہ تم بڑے بہادر ہو، تم بڑے جواں مرد تھے۔ فَقَدْ قِيْلَ وہ شہرت ہوگئی۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟ اس جماعت کو بھی اوندھے منہ یہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علم سے تبلیغ کرنا، کتنا بڑا عمل ہے، پیغمبروں کا عمل ہے، مگر اکارت ہوگیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ سخاوت کتنا بڑا عمل ہے صدقہ خیرات لاکھوں کروڑوں دیا۔ اتنا بڑا عمل ہے بے کار ہوگیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ شہرت پسندی کا جذبہ تھا۔ جہاد کتنا بڑا عمل ہے کہ آدمی نے جان تک دیدی۔ مگر عمل مقبول نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ تو عمل کا ڈھانچہ کام نہیں دیتا جب تک عمل کے اندر جان نہ ہو، روح نہ ہو، روح اخلاص اور خلوص ہے اس سے عمل میں جان پیدا ہوتی ہے، اگر جان نہ ہو، تو مردہ لاش کتنی ہی موٹی ہو پہلوانوں جیسی ہو، وہ تو دفن کرنے کے قابل ہوتی ہے، کارآمد نہیں ہوتی۔ کارآمد جبھی ہے جب اس کے اندر جان اور روح ہو۔ تو عمل کی شکل کتنی ہی بڑی ہو، اگر اس میں اخلاص کی روح نہیں ہے، خلوص کی روح نہیں ہے، وہ عمل کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔ تو بڑے بڑے اعمال کی تین مثالیں آپ نے سنیں۔ جو خلوص نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہوئے۔

چھوٹا عمل خلوص کی وجہ سے ذریعہ نجات ہے...... تین مثالیں حدیث میں چھوٹے چھوٹے اعمال کی بیان کی گئیں۔ کوئی بڑے عمل نہیں تھے۔ خلوص کی وجہ سے نجات کا ذریعہ بنے۔ حدیث میں ہے کہ: تین آدمی سفر کے لئے نکلے، چند میل دور نکلے تھے کہ زور کی بارش آئی۔ سامان کچھ پاس تھا نہیں۔ تو انہوں نے کہا بھائی بارش شدید آ گئی، پہاڑ میں قریب یہ غار نظر آ رہا ہے، اس میں چھپ کر بارش سے بچو، جب بارش تھم جائے گی، پھر اس غار سے اپنا سفر شروع کریں گے، تو تینوں مل کر اس کے اندر اتر گئے، وہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں بیٹھ گئے۔ حدیث میں ہے کہ: جب بارش شدید ہوئی تو اوپر سے ایک بڑی چٹان اور پتھر جو منوں وزن کا تھا۔ رڑکا، تو وہ ٹھیک اس غار کے منہ کے اوپر آ کر رک گیا۔ اور غار کا منہ بند ہوگیا۔ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ تینوں نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہماری موت کا وقت آ گیا ہے۔ اس لئے کہ چٹان کو ہلا نہیں سکتے۔ اس کا ہٹنا ممکن نہیں۔ کوئی صورت نہیں۔ دو وقت کا

ہمارے پاس کھانا پینا ہے۔کھاتے پیتے رہیں گے۔اس کے بعد سسک سسک کر مرنا اور جان دینا ہے۔چنانچہ مرنے کے ارادے سے بیٹھ گئے۔غم انکے دلوں پر چھا گیا، آنسو جاری۔اب بے چارے کچھ نہیں کر سکتے۔جب ایک دن گزر گیا اور وہ کھانا بھی ختم ہونے لگا اور یقین ہو گیا کہ اب ہماری موت لازمی ہے۔تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ بھئی! مرنا تو ہے ہی، کوئی تدبیر ہی کرنی چاہئے۔دوسروں نے کہا بھئی تدبیر کر بھی کیا سکتے ہیں۔یہ تو منوں وزن کی چٹان ہے، نہ اسے ہلا سکتے ہیں، نہ اسے توڑ سکتے ہیں۔سوائے اس کے کہ مریں اور کیا کریں گے۔اس نے کہا نہیں، میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہے۔کم سے کم وہی کر لو۔دونوں نے کہا کہ بھئی! کیا تدبیر ہے؟ اس نے کہا مادی تدبیر تو ہے نہیں۔کہ کسی پھاوڑے سے پتھر کو توڑ دیں۔یہ تدبیر نہیں بلکہ روحانی تدبیر ہے۔اور وہ یہ کہ ہم تینوں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں۔اگر کسی کی زندگی میں کوئی نیک عمل ایسا ہوا ہے، جس میں کامل خلوص اور للّٰہیت تھا۔اس عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔یہ تو ہم کر سکتے ہیں۔سب نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔اب باری باری سب نے اپنے اعمال پیش کرنے شروع کر دیئے۔

ایک کھڑا ہوا اور اس نے کہا اے اللہ! تو دانا اور بینا ہے، تو جانتا ہے کہ میں ایک غریب آدمی تھا۔میرے ہاتھ پلے کوئی پیسہ نہیں تھا مگر صورت حال یہ تھی کہ میرے پاس ایک بکری تھی، اسی کے دودھ پر میرا گزر تھا۔تو میں یہ کیا کرتا تھا۔کہ میری ایک ماں تھی، بیوی تھی، چند بچے تھے۔میں بکری کا دودھ نکالتا اور رات کو سب سے پہلے دودھ اپنی ماں کے سامنے پیش کرتا کہ اس کا حق مقدم ہے۔یہ بڑی بوڑھی ہے، اس کی وجہ سے ہم میں اس کا حق مقدم ادا ہونا چاہئے۔تو وہ دودھ اس کے سامنے پیش کرتا۔جب وہ پیٹ بھر لیتی اور دودھ بچ جاتا تو اس میں سے بچوں کو پلاتا اس میں سے بچ رہتا تو بیوی کو پلاتا اس میں سے بچ جاتا تو اخیر میں میں پیتا تھا، کبھی نہیں بچتا تھا تو میں فاقہ کر لیتا تھا، مگر ان کے حقوق کو مقدم سمجھتا تھا۔

ایک دن میں دودھ لے کر آیا۔ذرا دیر ہو گئی، تو میری ماں کی آنکھ لگ گئی۔میں اس کی پائنتیوں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا کہ جب بھی اس کی آنکھ کھلے گی، میں دودھ کا پیالہ پیش کروں گا۔بچے رو رہے تھے بلک رہے تھے، ان کا حق مقدم نہیں، ماں کا حق مقدم ہے۔میں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا۔آدھی رات کہیں اس کی آنکھ کھلی، جب کہ بچے سو چکے تھے۔آدھی رات گزر چکی تھی۔اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر کہا کہ دودھ! میں جھٹ پیالہ لے کر پہنچا، اس نے دودھ پیا اور مجھے بڑی دعائیں دیں، جو بچا میں نے بیوی اور بچوں کو پلایا، جو کچھ بچا تو میں نے بھی پی لیا۔اے اللہ! یہ جو میں نے عمل کیا، اس میں کوئی دورخی نہیں تھی، کوئی دکھلاوا اور سناوا نہیں تھا، صرف تیری رضا کے لئے میں نے یہ عمل کیا تھا، اگر واقعی تیرے ہاں میرا یہ عمل خلوص کی وجہ سے قبول ہوا۔تو اے اللہ! اس مصیبت سے ہمیں نجات عطا فرما۔حدیث میں ہے کہ: ایک تہائی پتھر ہٹ گیا اور غار کا منہ کھل گیا۔اب دوسرا کھڑا ہوا، اس نے کہا، اے اللہ! تو جانتا ہے۔دانا بینا ہے، میں ایک مزدور قسم کا آدمی تھا، کچھ روپیہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔میرے

ایک چچا کی بیٹی تھی، جو بڑی حسین وجمیل تھی۔ مجھے اس کے ساتھ عشق پیدا ہوا۔ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا تھا، اس لئے کہ میرے ہاتھ پلے کچھ بھی پیسہ نہ تھا اور وہ ذرا بڑے گھرانے کی تھی۔ میں نے اس کے سامنے تنہائی میں جا کر اپنا مقصد پیش کیا۔

مطلب یہ تھا کہ میں بدکاری میں مبتلا ہوں۔ اس نے کہا میری ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک ہزار گنی یا ایک ہزار پونڈ کی تھیلی جب تو لا کر دے گا۔ تب میں اس بدعملی پر آمادہ ہو سکتی ہوں۔ ورنہ نہیں۔ میں نے جا کر مزدوری کی محنت کی کئی برس دن میں جا کر کوئی ایک ہزار گنی جمع کی۔ اور وہ سونے کے ٹکوں کی تھیلی بھر کر میں لے آیا، اور تنہائی میں اس عورت کو بلایا۔ اور میں نے کہا کہ تیری یہ شرط پوری کر دی اور یہ ایک ہزار گنیوں کی تھیلی سامنے موجود ہے، اب تجھے انکار کرنے کی ضرورت نہیں، اس نے کہا بے شک اب میں انکار نہیں کر سکتی، شرط پوری ہوگئی۔ میں نے پورا ارادہ کیا کہ میں بدعملی اور سیاہ کاری میں مبتلا جاؤں۔

جب میں پوری طرح آمادہ ہوا، اس عورت نے کہا اے شخص! ''اِتَّقِ اللهَ'' اللہ سے ڈر، یہ جو تو بدعملی کرنا چاہ رہا ہے، قیامت کے دن کھلنے والی ہے مجھے اور تجھے اللہ کے آگے جواب دینا ہے۔ خدا سے ڈر اور تقویٰ اختیار کر۔ تو میرا دل لرز گیا اور کانپ گیا۔ میں اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا میں نے یہ ہزار گنی چھوڑی۔ اور ہمیشہ کے لئے توبہ کرتا ہوں، میں کبھی بدی کا ارادہ نہیں کروں گا۔ تو محض تیرے ڈر کی وجہ سے اے اللہ میں چھوڑ کر چلا آیا۔ بدعملی سے بچا اور وہ ہزار گنی بھی میں نے چھوڑی، اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد سامنے نہیں تھا محض تیری رضا کے لئے میں نے یہ کام کیا۔ اگر تیرے ہاں مقبول ہوا تو ہمیں نجات دے حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر اور سرک گیا۔ دو تہائی غار کا منہ کھل گیا۔ اب تیسرا کھڑا ہوا، اور اس نے کہا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بھی ایک غریب آدمی تھا۔ کھانے پینے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میرے ایک دوست نے سفر کا ارادہ کیا اور سو روپے میرے پاس امانت رکھوائے اور یہ کہا کہ جب میں سفر سے واپس ہوں گا، میری امانت واپس کر دینا اور تجھے اجازت ہے کہ تو میرے عدم موجودگی میں خرچ کر لینا۔ جب میں آؤں گا تو دے دینا' کیونکہ امانت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس روپے رکھوائے جائیں، تو بعینہ انہیں روپوں کا واپس کرنا ضروری ہے۔ وہی نوٹ بعینہ واپس کرنے پڑیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ انہیں خرچ کر کے یا بدل کر نوٹ دے دے اور سو روپے پورے کر دے۔ سوائے اس کے کہ رکھوانے والا اجازت دے دے کہ تم خرچ کر سکتے ہو، جب تو آپ خرچ کر سکتے ہیں، بدلے میں نوٹ دے سکیں گے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو بعینہ اسی چیز کا واپس کرنا واجب ہے، جو آپ کے پاس رکھوائی گئی تھی۔ تو اس شخص نے سو روپے امانت رکھوائے اور ساتھ ہی اجازت دے دی، کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔ اے اللہ! میں نے انہیں خرچ کیا، ان سو روپے سے میں نے چند بکریاں خریدیں۔ بکریوں کا دودھ بیچنا شروع کیا، تو اس کی رقم آنی شروع ہوئی۔ اس رقم سے کچھ اور بکریاں خریدیں، ان بکریوں کا دودھ بڑھا تو اور خریدیں۔ تو نقد بھی جمع ہونا شروع ہوا۔ بکریوں کا گلہ بھی

بڑھ گیا۔اس نقد سے پھر میں نے گائے خریدی،تو گائے کا گلہ بڑھنا شروع ہوا،اور بڑھا تو میں نے اونٹ خریدے غرض گائے،بیل،بکری،اونٹ اور بہت سا سامان جمع ہوگیا۔

پھر میں نے کچھ جائیداد خریدی،کھیت خریدے،باغات خریدے،اس سے لاکھوں روپے کی آمدنی شروع ہوگئی۔جب دس پندرہ برس گزر گئے،تو لاکھوں روپے میرے پاس جمع ہوگئے،تو اس شخص نے کہا بھائی میرا سو روپیہ واپس کرو۔تو میں بجائے اس کے کہ سو روپیہ دے دیتا،میں نے ساری تجوریاں پیش کیں،سارے جانور پیش کئے، سارے باغات پیش کئے،کہ یہ ہے تیری امانت،اس نے کہا کہ میری امانت تو سو روپے تھی۔یہ لاکھوں روپے تو نہیں تھے۔میں نے کہا کہ لاکھوں روپے ان سو روپے سے ہی بنے ہیں۔یہ لاکھوں روپے بھی تیرے ہی ہیں۔اس لئے کہ سو روپیہ تیرا تھا۔اس نے کہا نہیں مجھے سو چاہئے۔لاکھوں نہیں چاہئے۔میں نے کہا یہ لاکھوں بھی تیرے ہی ہیں۔آخر میں نے اس کو قبضہ دلا دیا۔اور ساری بلڈنگیں،سارے باغات اور سارے چوپائے سپرد کردیئے۔اور میں پھر وہی بھک منگا بن گیا۔پھر وہی فاقہ مستی ہوگئی۔ایک پائی میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔اے اللہ! میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا۔میں نے اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔اگر یہ عمل تیرے ہاں مقبول ہے تو ہمیں نجات دے۔حدیث میں ہے کہ جو ایک تہائی چٹان رہ گئی تھی وہ بھی سرک گئی،غار کا پورا منہ کھل گیا اور انہیں نجات ہوئی۔یہ باہر آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

دیکھئے سخاوت،تبلیغ،شہادت اور علم پڑھانے جیسا عمل بے کار ہوگیا۔جہنم سے نہیں بچا سکا۔اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے اعمال کہ ماں کا حق ادا کیا۔وہ تو فرض،واجب ہے،ادا کرنا ہی ہے۔اسی طرح زنا کاری سے بچ گیا،وہ تو اس کا فرض ہے زنا سے بچنا،اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا،اسی طرح سے امانت سپرد کردی،اس کے فرائض میں تھا کہ امانت سپرد کرتا۔کوئی بڑا کام نہیں کیا۔یہ چھوٹے چھوٹے اعمال تھے مگر خلوص سے کئے تو دنیا میں نجات کا سبب بن گئے اور اللہ کے ہاں مقبولیت کا سبب بن گئے۔

اللہ اگر عمل قبول نہ کرتا۔تو یہ نجات نہ ہوتی،اور چٹان نہ ہٹتی۔تو خدا کے ہاں بھی مقبولیت ہوئی،دنیا میں بھی نجات ملی،حالانکہ عمل بالکل حقیر سے تھے لیکن خلوص تھا۔اور وہ بڑے بڑے تین اعمال تھے۔وہ جہنم سے نہیں بچا سکے،اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا۔تو اصل بنیادی چیز اخلاص ہے۔خلوص سے جو عمل ہوگا،وہی اللہ کے ہاں قبول ہوگا،اس لئے کہ خلوص عمل کی روح ہے۔کسی چیز کے ڈھانچے کی قیمت نہیں ہوتی،اس کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔لاش کی قیمت نہیں،جاندار میں جان کی قیمت ہوتی ہے۔

تو عمل کا ڈھانچہ مقبول نہیں۔کتنا ہی بنا سنوار کے نماز پڑھیں۔نیت یہ ہو کہ لوگ ہمیں نمازی کہیں،وہ کوئی مقبول چیز نہیں ہے۔منہ پر مار دینے کے قابل ہے۔بنیادی اور اساسی چیز انسان کے لئے خلوص،للّٰہیت اور اخلاص ہے اللہ کی رضا کے لئے عمل کرنا ہے،مخلوق کے دکھاوے کے لئے عمل کرنا یہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔اس لئے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ'' ''عمل کرنے والے بھی سب کے سب برباد ہیں۔خلوص والے بچیں گے،جنہوں نے سچائی اوراخلاص سے عمل کیا''۔

گویا تین بنیادی چیزیں فرمائی گئیں کہ: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' انسان ہلاکت اور بربادی سے بچنے والے نہیں ہیں مگر علم والے بچیں گے۔علم اور عمل ہی نجات کا ذریعہ بنے گا،خلوص،للّٰہیت نجات کا ذریعہ بنے گا۔گویا علم بھی ہو،اس کے ساتھ عمل ہو،اس کے ساتھ اخلاص بھی ہو،تب جاکے نجات کا ثمرہ پیدا ہوگا۔

غروراخلاص کوختم کردیتا ہے.....مگر اخلاص کے بعد ایک چیز اور ارشاد فرمائی: ''وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ'' خلوص ہوتو آدمی غرہ نہ کرے، اترائے نہیں کہ میں نے بڑے خلوص سے عمل کیا،مرتے دم تک خطرہ ہے،جب خاتمہ اخلاص پر ہوجائے،تب اطمینان کرے کہ اب نجات ہوئی ہے۔ورنہ خاتمہ سے پہلے پہلے اگر کہیں اتراہٹ پیدا کی،کہیں دل میں کبروغرور آ گیا کہ میں بڑا مخلص ہوں سارا عمل ختم ہوجائے گا۔سب عمل نامقبول ہوجائے گا۔تو اخلاص اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک انسان کے اندر خدا پر بھروسہ کرنے کا جذبہ نہ ہو۔نازو اتراہٹ نہ ہو،کبر اور غرور نہ ہو کہ میں کوئی چیز ہوں۔میں نے کوئی عمل کیا۔

مدارنجات،صرف اللہ کا فضل ہے..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ارشادفرمایا،حدیث میں آتا ہے کہ: بنی اسرائیل میں ایک شخص عابد زاہد تھا۔رات دن اللہ کی یاد میں لگا رہتا تھا۔اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں عمل کرتا ہوں،محنت بھی کرتا ہوں،مگر بہرحال بیوی ہے، بچے ہیں،کھیتی باڑی ہے،کمائی ہے،کچھ نہ کچھ اس میں بھی وقت لگانا پڑتا ہے،کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ سارے جھگڑے ختم ہوں اور چوبیس گھنٹے میں خدا ہی کی یاد میں لگا رہوں۔اس زمانے کی شریعتوں میں یہ بات جائز تھی؛اب کی شریعت میں یہ بات جائز نہیں ہے،اس زمانے میں یہ جائز تھا کہ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہاڑ کی چٹان پر چلا جائے،تو اس شخص نے رہبانیت اختیار کی اوروہ یہ کہ بیوی بچے اور مال ودولت کو چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ کا ایک ٹیلہ تھا،وہاں جاکے چھپرڈالا،کہ یہاں بیٹھ کے اللہ کی عبادت کروں گا،اب یہاں نہ بیوی سامنے ہوگی،نہ اولاد وتجارت نہ دکان سامنے ہوگی۔بس میں ہمہ تن اپنے خدا کو یاد کروں گا،وہاں بیٹھ گیا۔

اب کھانے پینے کے لئے تو چاہئے؟ اللہ نے اس کے لئے یہ سامان کیا کہ اسی کڑوے سمندر میں ٹیلے کے اوپر نہایت میٹھا چشمہ نکل آیا اور اسی سے ٹھنڈا پانی بہہ پڑا۔اوراسی ٹیلہ کے اوپر انار کا درخت اگا یا،جس کو بڑے بڑے انار لگنے لگے اور بڑا میٹھا اور بہت ہی قوی قسم کا انار۔اس عابد کا کام یہ تھا کہ روز ایک انار کھالیتا اور ایک کٹورا پانی کا پی لیتا۔اور صبح وشام اللہ کے ذکر میں مصروف۔نہ رات کو سونا،نہ دن کو آرام کرنا بس دن بھی اور رات بھی اللہ کے ذکر میں مصروف پانچ سو برس اس عابد نے اسی طرح گزارے ہیں کہ ایک کٹورا پانی کا اور ایک انار روز اور چوبیس گھنٹے خدا کی یاد اور عبادت۔مرتے وقت اس نے اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! جب تو نے مجھے عمر بھر عبادت کی توفیق دی اور پانچ سو

برس عبادت میں لگے' میری موت سجدہ کی حالت میں ہو اور میرے بدن کو تو قیامت تک محفوظ رکھ تا کہ میں قیامت تک تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں۔ بقیہ زمانہ بھی گویا میں نماز ہی میں لگا ہوا رہوں۔ جب میرا بدن قیامت تک سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے میں قیامت تک نماز ہی پڑھتا رہا۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ عین سجدہ کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں آج تک اس کا بدن اس پہاڑ کے ٹیلے پر محفوظ ہے۔ لیکن اللہ نے اس کے اردگرد بڑے بڑے گنجان درخت پیدا کر دیئے ہیں۔ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہیبت پیدا کردی، اس لئے کہ اگر لوگ جاتے اور دیکھتے کہ ایک مردہ سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو بڑا فتنہ پھیل جاتا، کوئی پوجا پاٹ شروع کر دیتا، کوئی اس کی عبادت شروع کر دیتا۔ اللہ نے مخلوق کو بچانے کے لئے بڑے بڑے عظیم درخت اگا دیئے، ان کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا اور اندھیرے سے وہاں ایک ہیبت پیدا ہوئی، تو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، اس لئے نگاہوں سے وہ قصہ اوجھل ہے۔ اس طرح سے اس عابد نے پانچ سو برس گزارے ہیں۔

حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ: مرنے کے بعد اس کی پیشی ہوئی حق تعالیٰ کے سامنے، حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے میں نے تجھے اپنے فضل وکرم سے بخشا اور ملائکہ سے فرمایا کہ: جنت کے اعلیٰ مقامات میں اس کا نام لکھ دو اور اس کا داخلہ جنت میں منظور ہے اور جہنم سے اس کو بچا دیا گیا۔

اس عابد کے دل میں خطرہ یہ پیدا ہوا کہ پانچ سو برس تو میں نے محنت کی، بیوی، بچوں کو چھوڑا، شہر کو چھوڑا، اور اب بھی انہوں نے اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا۔ کم سے کم میری تسلی کے لئے ہی کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دی۔ اب بھی اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا۔ گویا میں نے ان کے سامنے کچھ کیا ہی نہیں، یہ ایک وسوسہ پیدا ہوا، عقیدہ تو کفر کا تھا، لیکن وہ عقیدے سے بری تھا مگر دل میں ایک خطرہ گزرا، ﴿إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ ① وہ تو دلوں کی کھٹک سے واقف ہے۔ وہ تو دلوں کے خطروں کو جانتے ہیں۔ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہوا، حق تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا۔ بجائے جنت میں لے جانے کے اس عابد کو جہنم کی طرف لے جاؤ، جہنم میں داخل نہیں کرنا، مگر اتنی دور کھڑا کر دو کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، وہاں لے جایا گیا۔ ایک دم جو جہنم کی طرف سے گرم ہوا اور لپٹ آئی ہے اور اس کے بدن کو لگی' تو تمام بدن میں کانٹے پڑ گئے۔ پیاس پیاس چلانا شروع کیا، جیسے معلوم ہو کہ اس کا اندر بالکل خشک ہو گیا، تری باقی نہیں رہی، جہنم میں جل کر تو کیا کیفیت ہوتی، اتنی دوری پر ہے، جہنم کی لو اور اک لپٹ لگی۔ سارا بدن لکڑی کی طرح خشک ہو گیا۔

حدیث میں ہے ایک ہاتھ نمایاں ہوا، جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا کہ اے خدا کے بندے! یہ پانی مجھے دینا، وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، آواز یہ آئی، کہنے والا تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، پانی تو ملے گا، مگر اس کی قیمت ہے۔ مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا کیا قیمت ہے؟ آواز یہ آئی جس نے پانچ سو برس خالص عبادت کی

ہو۔ وہ عبادت اگر کوئی دے تو اس کے بدلے میں ایک کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے اور بڑی خالص عبادت ہے۔ اس میں کوئی نفاق شامل نہیں۔ اس نے وہ پانچ سو برس کی عبادت پیش کی، بدلے میں کٹورا مل گیا، پی کر ذرا اس کے دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا: اس کو واپس لاؤ، واپس لایا گیا، اس کی پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے! تیرے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت تو ادا ہوگئی اور وہ قیمت تو نے از خود تجویز کی کہ پانچ سو برس عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی ہے۔ وہ تو ہم دے چکے، معاملہ برابر ہوگیا، تو نے پانچ سو برس کی عبادت دی۔ ہم نے ایک کٹورا پلایا اور وہ تو نے خود تجویز کی کہ یہ قیمت ہے ہم نے نہیں کہا تھا۔ لہٰذا اس سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اب حساب دے، وہ جو دنیا میں تو نے لاکھوں کٹورے پانچ سو برس میں پیئے، ان کے بدلے میں کیا عبادت لے آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ یہ تو دانہ اور پانی تھا۔ وہ جو تو نے ہماری ہوا کے ذریعے سانس لئے ہیں، جس سے تیری زندگی قائم تھی۔ اب ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے، اور وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے نور پیدا کیا تھا، جس سے تو اچھے اور برے کو دیکھتا تھا۔ ایک ایک تار نگاہ کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ کتنی عبادتیں کیں اور وہ جو تیرے دل میں توفیق و ارادہ پیدا کیا تھا اس کے بدلہ کیا لے کر آیا؟۔ تو طاقت ہم نے دی۔ ارادہ تیرے قلب میں ہم نے پیدا کیا۔ توفیق ہم نے دی، دانہ پانی ہم نے پیدا کیا، تیرے بدن میں جان اور ہمّت ہم نے پیدا کی، اور پھر بھی تجھے دعویٰ ہے کہ میں نے کچھ کیا، اور میرے کئے کے بدلے میں کچھ ملے۔ ارے یہ تو ہمارا کیا کرایا ہے، تو نے کیا کیا جس کے بدلے میں تو چاہتا ہے تجھے صلہ ملے۔ لیکن اگر کیا تو اب حساب دے، یہ عابد تھرا گیا، اور کہا: ''یا اللہ! بے شک نجات آپ کے فضل سے ہوتی ہے، کسی کے عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل کی یہ قدر و قیمت ہے کہ پانچ سو برس کی عبادت کرے، تو وہ ایک کٹورا پانی کے برابر بھی نہیں''۔ اور وہ بھی اللہ کا فضل ہے، اگر وہ توفیق نہ دے، آدمی عبادت نہیں کرسکتا۔ بدن میں جان بھی ہو سب کچھ ہو، مگر دل میں ارادہ ہی پیدا نہ ہو۔ ارادہ بھی ہو مگر ہمّت نہ ہو، کسل اور سستی بڑھ جائے، وہی توفیق دیتے ہیں، وہی ہمت دیتے ہیں، تب تو آپ سجدے کرتے ہیں۔ وہ ہمت نہ دیں تو سجدہ کیسے کریں؟ تو غرہ اور اترانے کے کیا معنی؟ ادھر کی ہی ساری چیزیں ہیں۔

ہر عمل توفیقِ خُداوندی سے ہی وجود میں آتا ہے...... وہ ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ ایک لکھ پتی آدمی تھا، اس کے ہاں ایک ملازم تھا، تو وہ لکھ پتی، ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں تھا، کہ نماز کہتے کسے ہیں۔ اور یہ جو بوڑھا ملازم تھا، وہ بڑا پکا نمازی، فرض ہی نہیں سنتیں بھی، اور پچاسوں نفل پڑھ کے بھی دم نہ

لے۔ یہ رات دن کو ستے کہ اسے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، جب دیکھو بوڑھے کو تو نماز۔ یہ نماز ہی نماز کا رہ گیا۔ایک دن اس کے آقا بازار میں کچھ سامان لینے گئے اور ملازم سے کہا کہ ہمارے ساتھ چل۔ بوڑھا ساتھ ہو گیا۔ راستے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ بوڑھے نے کہا صاحب؟ میں تو جاتا ہوں مسجد میں نماز پڑھنے، آقا نے چلا کر کہا کہ کمبخت جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، ارے تجھے اور بھی کوئی کام نماز کے سوا رہ گیا۔ خیر کہا کہ جا اچھا، جلدی سے پڑھ کے آ۔اب آقا صاحب مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو گئے۔ وہ مسجد میں داخل ہوا، جماعت کے ساتھ نیت باندھ لی، جب فرض پڑھ لئے، تو اس کے بعد سنتیں پڑھیں، اب یہ آقا کھڑے ہوئے ہیں۔ان کا جی گھبرایا۔ کہ جلدی آئے۔ بازار کا وقت نکلا جا رہا ہے، سنتیں پڑھ کے اس نے اوابین کی نیت باندھ لی۔اب ان کے دل میں غصہ اور گھٹن، کہ اس کمبخت کو اس کی بھی خبر نہیں۔اب خدا جانے کب تک نفلیں پڑھے گا، جب اس نے نفلوں سے سلام پھیرا، اس نے دوسری نفلوں کی نیت باندھنے کا ارادہ کیا، تو انہوں نے چلا کر کہا ارے کمبخت! آتا کیوں نہیں۔؟ تو جواب میں بوڑھے نے کہا کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر بوڑھے نے پھر نیت باندھ لی۔ یہ گھٹ کے کھڑے ہوئے، اب بڑے خشوع وخضوع سے دو رکعتیں پڑھیں۔ پانچ دس منٹ میں سلام پھیرا، اور بوڑھا پھر نیت باندھنے کے لئے کھڑا ہونے لگا تو، انہوں نے چلا کے کہا کہ او منحوس! آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی، اب یہ اور غم وغصہ میں جب چھ پوری ہو گئیں اور پھر لگا کھڑا ہونے۔تو انہوں نے کہا کہ آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے کہ بھئی کون نہیں آنے دیتا؟ کہ جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے۔ تمہیں وہاں روک رکھا، مجھے یہاں روک رکھا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا اسے پڑھنے نہیں دیتے۔اس کو دھتکار دی ہے۔ بندہ کی کیا مجال تھی وہ اللہ سے گریز کرے اور بھاگے۔اور جب توفیق دیتے ہیں، تو آپ کا نہ بھی جی چاہے تب بھی آپ نماز پڑھیں گے، تب بھی آپ روزہ رکھیں گے، وہ دل میں اترائے نہیں، کہ میں نے کچھ کیا ہے، شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی، ہزاروں بندے ہیں جنہیں توفیق نہیں ہوتی تو توفیق ملنا یہ خود مستقل نعمت ہے، اللہ نے توفیق دے دی۔

تو اصل یہی ہے کہ نجات ہمارے عمل سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوگی، مگر بھئی اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے نماز صفر ہو جائے کہ نجات اللہ کے فضل سے ہوگی۔ مگر فضل کی علامت یہ ہے کہ آپ عمل کر رہے ہیں۔تو یہ عمل کرنا علامت ہے کہ فضل آپ کی طرف متوجہ ہے، اگر عمل نہ کرتے، تو یہ اسکی علامت تھی کہ فضلِ خداوندی آپ کی طرف متوجہ نہیں ہے، تو عمل ضروری ہے، کیونکہ وہ فضلِ خدا کی علامت ہے، نجات بے شک اللہ کے فضل سے ہوگی۔

جو عبادت ہی صُورۃً ہو تو اس پر اِترانا کیا؟......غرض تعلیم یہ دی گئی کہ کتنا بھی عمل کرے، مگر غرہ نہ کرے، ناز نہ کرے کہ میں نے کیا ہے، شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی، میرے اندر کچھ کرنے کی قوت نہیں تھی،

ملائکہ علیہم السلام قیامت کے دن یوں کہتے ہوئے ہوں گے "مَاعَبَدْنٰکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَ مَا عَرَفْنٰکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ". "اے اللہ! ہم نے کوئی حق تیری عبادت کا ادا نہیں کیا۔ ہم تجھے پہچان بھی نہیں سکے جیسے پہچاننے کا حق ہے"۔

ہم اب تک جاہل اور لاعلم ہیں، تیرے کمالات کا اب تک بھی ہم اندازہ نہیں کر پائے۔ تیری ذات بہت بڑی ہے۔ تو فرشتے جو لاکھوں برس سے عبادت کر رہے ہیں، وہ بھی یہ کہیں گے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکے ہم ایک پچاس، ساٹھ برس کی عمر لے کر آئے اور اس میں بھی چودہ برس لڑکپن کے نکال دو، اس میں عبادت فرض نہیں ہوتی 'اور اخیر کے دس پندرہ برس بڑھاپے کے نکال دو، جس میں آدمی معطل ہو جاتا ہے، مشکل سے تیس پینتیس برس رہ جاتے ہیں، وہ اس میں بھی سارے اوقات نماز کے نہیں ہیں، چوبیس گھنٹے میں سے بھی ہم بیس گھنٹے سونے اور اپنا مال و دولت کمانے میں لگاتے ہیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے میں لگاتے ہیں اور اس پر بھی لگے غرہ کرنے کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے، یہ بڑی نادانی کی بات ہوگی، ہم تو کچھ بھی نہ کر سکے، جب لاکھوں برس عبادت کرنے والے ملائکہ جو نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ سوتے ہیں، نہ غفلت میں ہیں، وہ کہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکے، اور ہماری یہ چند منٹ کی عبادت، اور عبادت بھی حقیقی نہیں، عبادت کی صورت بنا رکھی ہیں، کھڑے ہوئے اللہ کے سامنے ہیں، اور دل میں وسوسے بھرے ہوئے ہیں، دل میں کہیں یہ ہے کہ جلدی سے دو رکعت پوری ہوں، تو دکان پہ جاؤں، سودا بیچنے کا حرج ہو رہا ہے، تاکہ جلدی پہنچ جاتا، آج شنبہ کا دن ہے، گاہک زیادہ آئیں گے، یہ نماز جلد سے جلد ختم ہو، تاکہ پیسے کماؤں، یہ صورت اور تصویر عبادت کی ہم نے بنائی، عبادت نہیں ہے، یہ تو اللہ کا فضل اور انعام ہے کہ وہ اسے عبادت مان لیں، ورنہ یہ عبادت اس قابل نہیں کہ اسے قبولیت نصیب ہو، یہ محض ان کا فضل ہے، اور ان کا مفتی فتویٰ دے دے کہ ہاں ہوگئی نماز، تو اترانے کا، اور غرہ و غرور کا کوئی موقع نہیں ہے، بلکہ جتنا بھی ہو، آدمی شکر ادا کرے کہ میرے پروردگار نے مجھے توفیق دے دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لَنْ يُنْجِيَ اَحَدَ كُمْ عَمَلُهٗ. "تم میں سے کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ اللہ کا فضل نجات دلائے گا"۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا: "وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ." "یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائیگا؟ فرمایا: "لَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ." "مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ ہی کا فضل دستگیری نہ کرے"۔ اور مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے، میرا عمل بھی نجات دلانے والا نہیں ہے۔ فضلِ خداوندی ہی نجات دلانے والا ہے۔ ①

حق تعالیٰ کے سامنے اعترافِ قصور ہی شکر ہے...... جب انبیاء علیہم السلام بلکہ سردارِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام جن سے بڑھ کر مخلوقات میں کوئی نہیں ہے، فرمائیں کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ اللہ ہی کا فضل

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومۃ علی العمل، ص: ۱۱۹.

نجات دلائے گا، تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنے کسی عمل پر ناز کرنے لگیں، ہم کسی عمل پر اترائیں کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ بندہ کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا، خدا کی ثناء خوانی یہی ہے، ہم سے کچھ ثناء خوانی ممکن نہیں، نہ ہم اللہ کی پوری تعریف کر سکتے ہیں، نہ پوری پوری عبادت کر سکتے ہیں، نہ ہم شکر ہی ادا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ عاجزی اور قصور کا اعتراف کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ (۱) واقعی انبیاء علیہم السلام ہی اللہ کے کلام کو سمجھتے ہیں، جیسے سمجھنے کا حق ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! شکر میں ضرور ادا کروں گا، جب آپ ارشاد فرما رہے ہیں، میرا فرض ہے کہ میں تعمیل کروں، اور میں ضرور ادا کروں گا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، تو اس کے ادا کرنے کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، تو توفیق ایک نعمت بن گئی، پھر اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہئے، ہر نعمت سے پہلے تو نعمت نکلتی ہے، شکر ادا کروں تو کس طرح، میں تو شکر کی ابتدا بھی نہیں کر سکتا آپ کے شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

جواب آیا حق تعالیٰ کی طرف سے کہ اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو یہی شکر کی ادائیگی ہے، اس کے معنی شکر ادا کرنے کے ہیں، اس لئے کہ حقیقی معنی میں کوئی ہمارا شکر ادا نہیں کر سکتا، شکر، نعمت کے مقابلے میں ہے، اور نعمتیں غیر محدود ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور ہمارا دماغ بھی محدود، ہماری قوتیں بھی محدود، الفاظ و آواز بھی محدود، تو ہم شکر ادا کریں گے، تو اس میں حد لگی ہوئی ہوگی اور نعمتوں کی کوئی حد نہیں، تو لامحدود کا شکر محدود ادا کیسے کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اپنی ہار مان لے، قصور کا اعتراف کرے، اپنے عجز کا اقرار کرے، یہی ہے فی الحقیقت شکر کی ادائیگی کہ آدمی اپنی عاجزی مان لے، کہ میں بالکل عاجز ہوں، اللہ کے ہاں تو سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ اپنے نفس کا قصور مان لے، کون ہے جو اس عبادت کا حق ادا کر سکے لاکھوں برس عبادت کر کے جب ملائکہ کہیں گے ہم کچھ نہیں کر سکے ہم کیا چیز ہیں جو ہم کہیں کہ ہم نے عبادت کر لی، ہماری عبادت یہی ہے کہ جو حکم ہے اس کی پوری طرح تعمیل کر کے یوں کہیں، کہ یا اللہ! قصور ہوا ہے، ہم پوری طرح کچھ نہیں کر سکے، آپ معاف کر دیں، بس یہی ہماری عبادت ہے، یہ جبھی ہوگا، جب آخرت کا فکر چڑھا ہوا ہو، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ'' سب انسان تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خُلوص والے، علم والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خُلوص والے اور خُلوص والے خطرے میں ہیں جب تک خُلوص کے اوپر موت نہ ہو جائے، خاتمہ جب ایمان پر ہو جائے، جب مطمئن ہو کہ ہو گئی نجات۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے مرتے دم تک خدانخواستہ کوئی بات پیش آ جائے، دل میں ایمان نہ رہے، دل ہی ایمان سے ہٹ جائے، عمل کی توفیق چھن جائے، بہت سے لوگ دیکھے گئے ہیں کہ پوری زندگی نیکیوں میں گذاری، مرنے کا وقت آیا

(۱) پارہ: ۲۲، سورة السبأ، الآية: ۱۳.

تو لہو ولعب اور بری باتوں میں مبتلا ہو گئے، بہت سے دیکھنے میں آئے ہیں کہ پوری زندگی تو بری باتوں میں گذاری، خاتمہ کے وقت ایسی اچھی زندگی ہوئی کہ رات دن طاعت اور عبادت، اور بہترین خاتمہ ہوا، تو آدمی غرہ نہ کرے معلوم نہیں، خاتمہ کیسے ہونے والا ہے، تو فرمایا گیا: ''وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ'' ''مخلصین خطرہ میں ہیں''۔ خطرہ جب ٹلے گا، جب موت آجائے گی، اب اطمینان کا وقت آیا، کہ اس چیز سے نجات پاگئے۔

روحانی زندگی کے عناصرِ اربعہ...... نجات کے گویا چار اصول فرمائے گئے، ایک علم، ایک عمل، ایک اخلاص، اور ایک اپنی آخرت کی فکر، یہ چار بنیادیں ہیں، جس سے آدمیت بنتی ہے، انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے اگر انسان میں علم نہ ہو، جہالت ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے، جہالت سے نجات نہیں مل سکتی اگر علم آگیا، روشنی آگئی، مگر عمل نہیں ہے، تو گویا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا، بلکہ وبال بن جائے گا، اگر علم کیساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کیساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ علم بھی بے کار ہے، نجات نہیں دلائے گا، اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے، مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے، کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بے کار ہے وہ ختم ہو گیا، چار چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی، علم، عمل خلوص، اور فکر۔ تین چیزیں اس میں قلب کی ہیں اور ایک چیز ہاتھ پیر کی ہے، علم بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، اخلاص اور للّٰہیت کا جذبہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، آخرت کا خوف اور خطرہ یہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، ہاتھ پیر صرف عمل کرتے ہیں، دل کا عمل فی الحقیقت علم، خلوص اور تفکر ہے یہ تین چیزیں قلب میں ہوں، اور ایک باہر، تب آدمی آدمی بنے گا، اس کی نجات کا سامان ہوگا۔ یہ گویا ایسا ہے جیسے آپ کا بدن چار چیزوں سے بنا ہے، آگ، پانی، مٹی، ہوا یہ نہ ہوں تو بدن ختم ہو جائے گا، اور اگر یہ چار چیزیں نہ ہوں، تو روح ختم ہو جائے گی۔

اصل بنیادی چیز صحبت اور معیت ہے...... انسان کی حقیقی زندگی ان چار چیزوں سے ہے۔ علم درسگاہوں میں، مکاتیب میں اور علماء کے پاس ملے گا، عمل عمل کرنے والوں کی ہیئت دیکھ کر ملے گا، خلوص ملے گا، مخلصوں کی جماعت میں بیٹھ کر فکر پیدا ہوگا، متفکروں کی جماعت میں بیٹھ کر، غافل لوگوں میں رہ کر فکر نہیں پیدا ہوتا، وہ تو اور غفلت میں مبتلا کر دیں گے، بدعمل لوگوں کی صحبت ہوگی وہ تو بدعملی پیدا کریں گے عمل کہاں سے آئے گا؟ جاہلوں کی صحبت رہے گی، جہالت ملے گی عمل کہاں سے آجائے گا؟ تو سب سے بڑی بات صحبت ومعیت ہے جس سے علم، عمل، اخلاص اور تفکر پیدا ہوتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

نیکوں اور سچوں کی صحبت اختیار کریں گے تو سچائی آئے گی بروں کی صحبت اختیار کریں گے، لہو ولعب اور کھیل کود کے جذبات پیدا ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نیک صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے عطار کی دکان، جو عطر بیچتا ہو،

کہ اس کی دکان پر جاکے آپ عطر نہیں خریدیں گے تو کم از کم خوشبو تو آ ہی جائے گی، دماغ تو معطر ہو ہی جائیگا فرحت تو پیدا ہو ہی جائیگی، اور بری صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے لوہار کی دکان، کہ کچھ بھی نہیں ہوگا، آگ کا کوئی پتنگا ہی لگ جائیگا، کچھ دھواں ہی چڑھ جائیگا، بدبو پیدا ہو جائیگی، تو کچھ تکدر، کدورت اور انقباض ہی لے کر آئیں گے، نیک لوگوں کے پاس جب جائیں گے، کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، تو ان کے ایمان کی گرمی قلب میں کچھ نہ کچھ گرمی پیدا کردے گی، اللہ کی طرف توجہ بڑھ جائے گی، کچھ آخرت کی طرف توجہ بڑھ جائیگی، کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلے گا، دل کی گرہیں ہی کھلتی چلی جائیں گی، عمل کا راستہ ہی صاف ہو جائیگا نیک کی صحبت میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچے گا، اور برے کی صحبت میں بیٹھ کر برائی کی طرف طبیعت چلے گی۔

اور اس دنیا میں بری صحبت جلدی اثر کرتی ہے، نیک صحبت دیر میں اثر کرتی ہے، بروں کے پاس بیٹھ کر تو اگلے ہی دن برا بن جاتا، اور نیکوں کے پاس بیٹھ کر کہیں مہینے بھر میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے، تو دنیا میں بدی جلدی اثر کرتی ہے، نیکی دیر میں اثر پیدا کرتی ہے، اس واسطے نیک صحبت آدمی کی زیادہ چاہئے، بری صحبت سے زیادہ سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، اصل بنیادی چیز صحبت و معیت ہے، کہ آدمی اچھا ماحول تلاش کرے، اچھے نیک لوگوں میں رہنے کا جذبہ پیدا کرے۔

اب یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ نیک لوگ علماء ہی ہوں، نیک وہ ہے، جو اللہ کے راستے پر پڑا ہو، چاہے وہ بڑا عالم نہ ہو، معمولی مسئلے جانتا ہو، مگر مخلص ہو للہیت ہو، بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ علم کا تو نشان نہیں، لیکن نیکی اور تقوی اس درجہ میں بڑھا ہوا کہ بڑے بڑے علماء کو نصیب نہیں، تو بعض مرتبہ عمل کی دولت صحبت سے نصیب ہوتی ہے، صحبت یافتہ لوگ بڑے پکے دیندار ہوتے ہیں، بعضے علماء میں بھی وہ دین نہیں ہوتا جو بزرگوں سے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتا ہے، ان کا دین مضبوط ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی صحبت میسر ہو تو وہ کیمیا ہے، انسان کے دل میں پھر دین گھر کر لیتا ہے، اور آدمی دیندار بن جاتا ہے، تو تاکید کی گئی ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

صحبت و معیت کی ثمرات...... حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''سَبۡعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظِلِّهٖ يَوۡمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ.'' ① ''سات قسم کے لوگ ہوں گے کہ قیامت کے دن ان کو عرش کے سائے میں جگہ دی جائے، گی جب کہ کوئی سایہ بجز اللہ کے سائے کے نہ ہوگا''۔

ان میں سے ایک کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ کون ہوں گے: ''رَجُلَانِ تَحَابَّا فِى اللّٰهِ'' ''وہ دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی اور دوستی اختیار کی'' اور یہ معاہدہ کیا کہ بھائی ہم اس لئے دوستی کرتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کریں اگر نماز میں سستی کروں، تو تم مجھے کھینچ کے لے جانا، اور سزا دینا کہ خبردار! جو تو نے نماز چھوڑی اگر تم سستی اختیار کرو گے، تو میں تمہیں لے جاؤں گا، اگر تم نے تلاوت قضا کی تو میں

① الصحیح للبخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترک الفواحش، ج: ۲، ص: ۷۴.

تمہارے سر پر مسلط ہوں گا، کہ تلاوت کرو قرآن کریم کی اور میں سستی کروں تو تم، تو ہم ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کے لئے دوستی کریں گے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ان میں سے جب ایک انتقال کرے گا اور وہ اللہ کی رضا میں اور مقام کریم میں داخل ہوگا، بہشت بریں میں جائے گا، تو دعا کرے گا کہ اے اللہ! میں فلاں دوست کی دوستی کی وجہ سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوں، میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر پہنچا، اس کا خاتمہ بھی ایمان پر فرما، اس کی دعا قبول ہوگی۔ تو دونوں جنتی بنیں گے، صحبت و معیت ہی سے تو یہ بات ملی، نیک صحبت اختیار کی، دونوں کے لئے نجات کا ذریعہ ہوگئی۔

اور یہی صورت اس کے برعکس سمجھ لیجئے اگر دو آدمی اس لئے دوستی کریں کہ بھئی! سینما میں ایک ساتھ جایا کریں گے، تھیٹر میں ساتھ جایا کریں گے، فلاں برائی میں ساتھ جایا کریں گے، چار آدمیوں نے مل کے دوستی کرلی کہ چوری کیا کریں گے، لوگوں کی جیبیں کترا کریں گے، یہ بھی آپس میں دوستی ہوگئی یہ بھی صحبت ہے، مگر یہ صحبت و معیت بدعملی کے لئے ہے اس لئے اگر ایک جہنم میں جائے گا تو وہ کہے گا خدا کرے وہ پہلا دوست بھی جہنم میں آئے، اسی کی وجہ سے میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں، یہ دونوں چیزیں اپنا اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتیں، تو علم اتنا اثر نہیں پیدا کرتا، جتنی صحبت اثر پیدا کرتی ہے، تو بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی سچا ماحول تلاش کرے، نیک لوگوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہو، کبھی نہ کبھی یہ چیز کارآمد ثابت ہوتی ہے، کبھی نہ کبھی اس کا اثر پڑتا ہے، بہرحال اس حدیث میں چار باتیں بتلائی گئیں، علم، عمل، اخلاص، اور فکر اس کے بغیر آدمی آدمی نہیں بنتا، اس میں جوہر نہیں پیدا ہوتا، وہ کھاتا پیتا ایک حیوان ہوگا، خوبصورت سہی کہ اور کوئی جانور اتنا خوبصورت نہیں، جتنا انسان ہے، مگر ہے جانور، جب علم اور عمل آئے گا تو کہیں گے، اب یہ جانور نہیں، اب اس میں انسانیت آگئی، یہی انسان اور حیوان میں فرق کی چیز ہے، اس واسطے سب سے بڑی توجہ مسلم قوم کو بالخصوص تعلیم کی طرف کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ علم کا جوہر پیدا ہو، جہالت سے کوئی قوم دنیا میں آج تک نہیں پنپی، یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری قوم مولوی بنے سب کے سب عالم بنیں، یہ نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ لازم، لیکن یہ ہر ایک پر فرض ہے کہ اتنا علم سیکھ لے کہ اپنے دین پر چل سکے، یہ معلوم ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں، اور مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ اور اسلام کے کیا ارکان ہیں، جن کے کرنے سے آدمی مسلمان رہتا ہے، یہ بے شک لازم اور واجب ہے، اس کے بغیر نجات کی صورت نہیں ہے، تو سب سے بڑی چیز ادھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، کہ تعلیم عام ہو، دین کا ایک چرچا ہو، اور چرچا اس کے بغیر نہیں ہوا کرتا، کہ تعلیم عام ہو۔

ہمارے ہاں مدارس میں، جیسے ابھی مولانا صاحب نے دارالعلوم دیوبند پر یہ تبصرہ کیا، اور یہ کہ وہاں کے فضلاء نے جگہ جگہ مدارس قائم کئے، تو ہزاروں کی تعداد میں مدارس ہیں، کوئی قصبہ خالی نہیں، اور اس تقسیم ملک کے بعد سے تو تقریباً یو، پی میں کوئی بڑا گاؤں بھی خالی نہیں رہا۔ جس میں لوگوں نے مدارس قائم نہیں کر دیئے ہزاروں کی تعداد میں دیہات اور گاؤں میں مدارس ہیں، تو علم کا اور مسئلے مسائل کا ایک چرچا ہے، اور دیہات کے لوگ

چونکہ بیچارے سادہ ہوتے ہیں، کوئی چالاکی، عیاری ان میں ہوا نہیں کرتی، ان میں جب علم آتا ہے تو سیدھا سیدھا اپنا عمل کرتے ہیں، کوئی فرق اور نفاق ان میں نہیں ہوتا علم وہاں زیادہ اچھا اثر کرتا ہے، جہاں دلوں کی صفائی اور سادگی ہوتی ہے۔ تو دیہاتی اتنے مسائل جانتے ہیں کہ چھوٹا موٹا مولوی انکے سامنے چل نہیں سکتا۔ اگر ذرا مسئلہ کی غلطی کر جائے تو کہیں گے مولانا صاحب! تمہاری بات تو سر آنکھوں پر، مگر کہی بات غلط، مسئلہ تو یہ ہے، ہم نے فلاں بڑے مولوی صاحب سے سنا تھا۔ فوراً دیہاتی غلطی بتلائے گا، اور مولوی کو ماننا پڑے گا، تو وہ صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے اور دل کی سچائی کی وجہ سے بہت سے مسائل جانتے ہیں، یہ جب ہوا، جب تعلیم کا چرچا ہے، قصبوں میں، شہروں میں دیہات میں دین پھیلا ہوا ہے۔

گناہ کا جمع ہونا بُرا ہے...... عمل کی کوتاہی ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے، کچھ مجھ میں کوتاہیاں ہیں، کچھ آپ میں غلطیاں ہیں ہر ایک کچھ نہ کچھ بتلا ہے، مگر علم اور فکر تو صحیح رہنا چاہئے، تا کہ جب عمل کی توفیق ہو، تو ہم عمل کر گذریں، اور اگر علم ہی صحیح نہیں تو جی بھی چاہے گا عمل کو تو راستہ صحیح نہیں ملے گا، اس لئے قلب کے اندر علم رہنا چاہئے، کوتاہی اللہ معاف کرنے والا ہے، بہر حال انسان بشر ہے اور بشر بھی ایسا جو بھول چوک سے مرکب ہے، بھول بھی ہوتی ہے، نفسانیت کا مادہ اس میں ہے، غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، گناہ بھی ہو جاتا ہے، گناہ کا علاج اللہ نے توبہ بتلایا، جب تم گناہ کرو، ہاتھ کے ہاتھ توبہ کرلو، فرمایا گیا: اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ ① گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، تو گناہ ہو جانا کوئی جرم نہیں، یہ تو انسان میں مادہ ہے، گناہ کا جمع رہنا بُرا ہے، کہ آدمی توبہ نہ کرے، توبہ کی، تو روز کا روز کھاتہ صاف ہوتا رہے گا، تو آدمی اپنا کچا چٹھا روزانہ درست کرتا رہے۔ جب ادھر سے کوئی اکاؤنٹنٹ حساب لینے والا آئے گا تو کھاتے آپ کے درست ہوں گے، آپ کہیں گے، دیکھ لیجئے اور اگر کوئی کلرک ایسا غافل ہے کہ اس کے حساب میں غلطیاں ہیں اور وہ سست پڑا ہوا ہے کہ جب اکاؤنٹنٹ نے بجائے ایک مہینہ بعد کے بیسیویں دن آ کے کہا، لاؤ حساب، وہ سارا غلط پڑا ہوا تھا، اس نے اسی وقت حکم دیا، معطل یا برخواست، اس کی تنخواہ ضبط، اب حیران بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

موت کا کوئی وقت معین نہیں...... انسان کے عمل کا کھاتہ کھلا ہوا ہے، جب موت کا وقت آئے گا، اسوقت کچا چٹھا درست کرلیں گے، یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے، نہ بیمار ہونا شرط ہے، ہزاروں انسان عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں، نہ بیمار ہوئے نہ کچھ، رات دن ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی آج ہمارے سے مل رہا ہے، کل ہم سن رہے ہیں کہ اس کا انتقال ہو گیا، تو موت کیلئے بڑھاپا آنا ضروری نہیں ہے، کمزور ہونا ضروری نہیں، بڑے بڑے قوی بھی مر جاتے ہیں، جوان ہونا ضروری نہیں بچے بھی مر جاتے ہیں، تو موت بچپن میں بھی آتی ہے، جوانی میں بھی آتی ہے، بڑھاپے میں بھی آتی ہے، بیماری میں آتی ہے، بلا بیماری سے

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۲، ص: ۱ ۳۰.

بھی آتی ہے، یہ خیال کرنا کہ مرنے کے قریب توبہ کرلوں گا۔ یہ شیطان کا محض ایک دھوکہ ہے، کسی کو کیا خبر ہے کہ موت کا وقت کب آنے والا ہے۔ اور کیا ضروری ہے کہ آدمی کے اوپر بڑھاپا آوے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، جوان زیادہ مرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ مجمعوں میں، بازاروں میں، درباروں میں دیکھیں تو بوڑھے کم نظر پڑیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے، اگر سارے بڑھاپے کو پہنچ کر ہی مرا کرتے تو بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی، سفید ڈاڑھیاں زیادہ نظر پڑتیں، مرتے ہی نہ جب تک بڑھاپے کی عمر کو نہ پہنچتے مگر بڑھاپے کو پہنچنے ہی نہیں پاتے، پہلے ہی مر جاتے ہیں اس لئے بوڑھوں کی تعداد کم نظر پڑتی ہے، جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔

تو اس دھوکے میں رہنا کہ جب بڑھاپا آئے گا، اس وقت توبہ کرلیں گے بس اب چلنے والے ہیں، یہ غلط ہے، کیا خبر ہے کسی کو بیماری آئے نہ آئے۔ روز کا روز اپنا حساب صاف کرتے رہنا چاہئے، یہ نہ آدمی سمجھے کہ اخیر میں توبہ کروں گا، اور جب اس نے اخیر میں کہا کہ کل کروں گا، کل کو ممکن ہے یہ کہے کہ کل کروں گا، تیسری کل آئی تو اس نے کہا نہیں کل کو کروں گا، بس کل میں کل ساری عمر گذر جائے گی، موت کا فرشتہ سامنے آجائے گا، اور اس وقت توبہ کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔

حدیث میں ہے کہ: بعض لوگ ملک الموت سے کہیں گے اے ملک الموت! ذرا سا وقفہ دے دو کہ میں توبہ کرلوں فرمائیں گے ملک الموت کہ: مرے پچاسیوں قاصد تیرے پاس پہنچے، جب تو نے توبہ نہیں کی، اب میں اخیر میں آ گیا ہوں، تو تجھے توبہ کی سوجھ رہی ہے، وہ کہے گا میرے پاس تو آپ کا کوئی قاصد نہیں آیا؟ ملک الموت کہیں گے، ایک دو نہیں میں نے تو بیسیوں قاصد تیرے پاس بھیجے انہوں نے تجھے نہیں سمجھایا، وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں آیا تو ملک الموت کہیں گے تجھ پر بڑھاپا نہیں آیا؟ ارے بڑھاپا میرا ہی تو قاصد ہے جو خبر لے کر آیا تھا کہ موت کا وقت اب قریب ہے، کیا تیری ڈاڑھی اور سر میں سفید بال نہیں آئے؟ یہ سفید بال میرے ہی تو قاصد تھے بتلا رہے تھے کہ اب موت کا وقت قریب آ گیا ہے، کیا تیرے پوتے اور نواسے نہیں پیدا ہوئے؟۔ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی تو قاصد تھے، جو بتلا رہے تھے کہ اب قبر میں جانے کا وقت قریب آ گیا ہے، جب اتنے قاصدوں پر بھی تو نہ سمجھا، اور توبہ نہ کی، تو میں آخری قاصد ہوں، میرے بعد کوئی قاصد آنے والا نہیں۔ اب کون سا موقع ہے توبہ کا۔؟ اب تو گذر گیا وقت، جو کچھ ہونا تھا، ہولیا۔

مقامِ عبرت...... میں اس لئے عرض کرر ہا ہوں کہ جو کچھ کرنا ہو، جلدی سے کرلے اس لئے کہ وقت کم ہے، کسی کو اپنی عمر کا پتہ نہیں، سال بھر جو ہمارے سامنے موجود تھے، آج وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں، آج جو ہیں ان سے کیا خبر کون رہے گا کون نہیں رہیگا تو روز موت کا بازار گرم ہے آنے والے آرہے ہیں جانے والے جار ہے ہیں، اس میں آدمی آنکھ بند کئے غفلت میں پڑا رہے، یہ دانش مندی کے خلاف بات ہے، روزمرہ کا قصہ سامنے گذر رہا ہے۔

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش   اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

نہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کر دیا وہ کرو میں یہ کہتا ہوں جو کرنا ہو جلدی کرو، اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے، ہم میں سے کسی کی آدھی عمر گذر چکی ہے کسی کی آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے، کوئی موت کے قریب پہنچ چکا ہے، کوئی قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہے روزانہ سلسلہ آنے والوں کا، جانیوالوں کا بھی جاری ہے، آخر پھر عبرت کا کون سا وقت آئے گا، جب اتنی چیزیں دیکھ کر عبرت نہ پکڑے؟ تو کیا ملک الموت کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے گا، یا موت جب سر پر آ کھڑی ہوگی، جب عبرت پکڑے گا؟ اس لئے ابھی سے عبرت پکڑ لینی چاہئے، اور سمجھ لینا چاہئے کہ وقت آ رہا ہے، اس کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہے۔

اُخروی غذا بھی حاصل کرنی چاہئے...... اس کے لئے سب کچھ کرنے میں پہلی چیز ہے کہ اللہ کی رضا کا علم اور معرفت حاصل کر لیں، کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہے، کن چیزوں سے ناخوش ہے، کونسا راستہ ہے جس پر چل کر اس کو خوشی ہوگی، کونسا راستہ ہے جس پر چل کر وہ ناراض ہوگا، وہ علم آپ کو شریعت سے معلوم ہوگا، وہ سائنس اور فلسفہ میں نہیں ملے گا، وہ ہیئت اور اقلیدس میں نہیں ملے گا، وہ قرآن وحدیث میں ملے گا کہ جس سے اللہ کی رضا اور نارضائی کا پتہ چلے، اس کی خوشی و ناخوشی کا پتہ چلے، تو اس علم کو حاصل کیجئے جس سے آخرت میں کچھ کام چلے، اور آخرت کا دروازہ کھلے، یہ جتنی نعمتیں ہیں، یہ یہیں کے لئے آرام دہ ہیں، یہ قبر میں آرام نہیں دیں گی، ہم یہاں بہترین مسہری اور گدے، تکیے پر لیٹ جائیں مگر قبر میں آرام دینے کے لئے یہ گدے، تکئے آرام نہیں دیں گے، وہاں کی چیز اعمالِ صالحہ ہے، وہاں کا گاؤ تکیہ نیکی ہے وہاں کا گاؤ تکیہ روئی، اون اور پلاسٹک کا نہیں ہے، وہاں دوسری چیزیں ہیں، یہاں روٹی، چاول اور غذاؤں سے پیٹ بھر جائیگا، قبر میں یہ چیزیں غذا نہیں بن سکتیں وہاں عمل صالح کی غذا کام آئے گی، وہاں بستر بھی ہوگا تو عمل کا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب میت سچا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام تھا، میرے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ایک منادی ندا کرے گا ''اَنْ صَدَقَ عَبْدِیْ'' بندے نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ ''فَـاَفْـرِشُوْهُ مِنَ الْـجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْالَـهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا مِّنَ الْجَنَّةِ.'' [1] ''اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ، اس کے لئے جنت کا لباس بھی دو، اس کے لئے جنت کے دروازے بھی کھولو''۔

ہوائیں بھی اس کے لئے وہیں سے آنی چاہئیں، تو وہاں کی غذائیں اور نعمتیں دوسری ہیں، اس عالم کی دوسری ہیں جہاں اللہ نے یہاں کی غذائیں دیں، کچھ وہاں کی غذاؤں کے بھی فکر کرنے ضرورت ہے، یہاں تھوڑا بہت فکر تھا، وہاں کے لئے زیادہ فکر کی ضرورت ہے، مگر ہم نے الٹا قصہ کیا، کہ یہاں کی فکر زیادہ ہے وہاں کی ذرہ

---

[1] السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب فی المسئلة فی القبر، ج: ۱۲، ص: ۳۶۸. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۲۵۳ رقم: ۴۷۵۳.

برابر نہیں ہے، یہاں ہر آسائش کا خیال ہے، وہاں کی آسائش کا خیال نہیں ہے، کم سے کم تھوڑا بہت وقت کچھ ادھر بھی لگانا چاہئے، اب موت کا بھی دھیان کر لینا چاہئے، تو پہلی چیز تو علم ہے کہ اللہ کی خوشی اور ناخوشی معلوم ہو، دوسری چیز راستہ ہے جو عمل صالح ہے کہ اس راستہ پر چل کر ہم پروردگار کے قریب ہوتے جائیں، تیسری چیز قلب کے مقامات ہیں، سب سے بڑی چیز اسمیں اخلاص اور خلوص ہے، کہ قلب کی راہ ہماری درست ہو جائے اور اس سے بھی بڑی چیز فکر ہے کہ آخرت کی دھن لگی ہوئی ہے، غفلت میں آدمی نہ گذارے۔

مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ہے...... مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ہے، غافل پیدا نہیں کیا گیا، مسلم وہ ہے جو فکر مند ہو، ہر وقت اسے ایک فکر چڑھا ہوا ہو۔ حدیث میں ہے کہ: ''**اَلْکَافِرُ یَاْکُلُ بِسَبْعَةِ اَمْعَاءٍ، وَالْمُؤْمِنُ یَاْکُلُ بِمِعٍ وَّاحِدٍ**''۔(1) ''کافر سات انتڑیوں سے کھاتا ہے اور مؤمن ایک انتڑی سے کھاتا ہے''۔

تو مؤمن کی غذا کم ہوتی ہے، کافر کی غذا زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سائز کے دو آدمی لیں، ایک مسلم اور ایک غیر مسلم، وہ زیادہ کھائے گا، یہ کم کھائے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر کے قلب میں فکر نہیں ہے، اور مؤمن کے قلب میں آخرت کا فکر لگا ہوا ہے، کتنے سے کتنا ہی بدعمل مسلم ہوگا، جب اندر ٹٹولو گے تو کچھ نہ کچھ فکر آخرت ضرور ہوگا، لکھ پتی ہے، مگر وہ پوچھ رہا ہے، مولانا یہ چیز جائز ہے، ناجائز ہے، یہ جائز ناجائز کیوں پوچھتا ہے؟ موت کی فکر لگی ہوئی ہے جبھی تو پوچھتا ہے، اگر اسے فکر نہ ہو کیا ضرورت تھی پوچھنے کی یہ کہنا کہ یہ معاملہ میں نے کیا ہے یہ حرام تو نہیں ہے؟ ناجائز تو نہیں ہے؟ کر بھی رہا ہے، مگر فکر چڑھی ہوئی ہے، اگر فکر نہ ہوتی سوال نہ کرتا، کوئی مؤمن ایسا نہیں ہے، جس کے اندر تھوڑا بہت آخرت کا فکر نہ ہو، اور جب فکر ہوتی ہے، تو کھانا بھی کم ہو جاتا ہے، عیش بھی کم ہو جاتی ہے، یہ کتنے ہی عیش میں مبتلا ہو، لیکن اسی درجہ کا غیر مسلم لیا جائے، وہ پانچ گنے عیش میں ہوگا، یہ ایک گنے عیش میں ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں پھر بھی ایک فکر چڑھا ہوا ہے، کہ وقت آنا ہے، حساب دینا ہے، اسے اس کا کوئی فکر نہیں۔

فکرِ آخرت کو چمکانے کی ضرورت...... تو فکر کا مادہ اللہ نے رکھا، جو ہر مؤمن کے ایمان کے ساتھ دل میں لگا ہوا ہے مگر ذرا اسے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے ایمان ہر ایک میں ہے، مگر عمل سے ذرا اسے چمکانے کی ضرورت ہے اسی طرح سے اس تفکر کو بھی چمکانے کی ضرورت ہے، فکر اس وقت تک چمکتا نہیں، جب تک خلوص نہ ہو، خلوص چلتا نہیں جب تک عمل کا جذبہ نہ ہو، عمل بنتا نہیں، جب تک علم نہ ہو، تو علم، عمل خلوص اور فکر ضروری ہے۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے عرض کیں، کہ تعلیم میں بھی بہت کوتاہی ہو رہی ہے، تعلیم کی مردوں کو اور عورتوں کو بھی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ اپنے عمل اور اخلاص کی، اور فکر کی بھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ چاروں چیزیں نہیں ہوگی، تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے، تباہی ہی تباہی ہے، نجات ان چار چیزوں میں ملے گی، تو فرمایا گیا،

---

(1) السنن للترمذی، ابواب الاطعمة، باب ماجاء ان المؤمن یاکل فی معیً واحدٍ، ج: ۶، ص: ۴۸۶۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ روایت حسن صحیح ہے۔

لوگ تباہ برباد ہیں بچیں گے علم والے، علم والے تباہ و برباد ہیں بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے، خلوص والے تباہ و برباد ہیں بچیں گے فکرر کھنے والے، یعنی غفلت سے نجات نہیں ہوگی، ہلاکت ہوگی۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے اس حدیث کی روشنی میں عرض کیں، امید ہے کہ آپ حضرات ان باتوں پر غور کریں گے اور وقتاً فوقتاً سوچیں گے دماغ میں یہ باتیں گھومیں گی تو اس کا فکر رکھیں گے کہ کس طرح سے اس حدیث پر ہم عمل کریں، کس طرح سے ہم اپنی انسانیت کو اجاگر کریں، تو سوچتے رہنا چاہئے اور فکر رکھنا چاہئے کہ ہم عمل کا کوئی نقشہ بنائیں، ایک آدمی ایک ہی نقشہ بناتا ہے، چار مل کر بناتے ہیں، تو ذرا نقشہ اچھا کھلا بڑا بن جائیگا اور قوم مل کر بنائیگی تو بڑا بہتر نقشہ بنے گا، سارے ہی عمل میں لگ جائیں گے، اس لئے بس اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو مردوں اور عورتوں کو نیکی کی، عمل کی، خلوص وللّٰہیت کی اور فکر کی توفیق عطا فرماوے، دنیا میں بھی نجات عطا فرماوے، اور آخرت میں بھی نجات عطا فرماوے آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

راہِ اعتدال

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿هُوَالَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُمُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّااللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّابِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِرَبِّنَا.وَمَايَذَّكَّرُاِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾.صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. (1)

بزرگانِ محترم!...... پہلے اس آیت کا ترجمہ سمجھ لینا چاہئے''اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی کتاب یعنی قرآن مجید نازل فرمایا اس میں بعض آیات تو محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی اِتباع کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کے لئے یا ان کی تاویلیں کرنے کے لئے اور حالانکہ ان کی تاویلیں اللہ ہی جانتا ہے اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے تمام ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت حاصل نہیں کرتے مگر عقل والے''۔

(پھر دعا کی تعلیم دی گئی) اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا۔ بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت نصیب فرمائی اور اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما۔ بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔(دوسری دعا) اے اللہ! تو تمام لوگوں کو جمع کرنے والا ہے۔ ایک ایسے دن جس میں کوئی شک نہیں بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

شانِ نُزول...... یہ تو آیات کا تقریباً لفظی ترجمہ ہوا۔ ان آیات میں ایک ایسا اصول بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دین محفوظ رہے گا۔ اس کا بیان کرنا میرا مقصد ہے۔ لیکن اس سے پہلے آیات کا شانِ نزول بھی سن لیں کیونکہ شانِ نزول سے آیات کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نصاریٰ نجران کی ایک جماعت

(1) پارہ:۳،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۷۔

مدینہ منورہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مناظرہ کے لئے آئی۔ ان میں عبدالمسیح، ابوحارث، بن علقمہ تینوں موجود تھے۔ ان میں عبدالمسیح بڑا مدبر تھا اور ابوحارث بہت ذہین اور ذکی تھا۔ اس کا حافظہ بہت قوی اور علم بہت وسیع تھا تورات وانجیل پر اس کی نظر تھی۔ تمام گرجاؤں کا لاٹ پادری اور اپنے مذہب کا قائد تھا۔

عقیدۂ نصاریٰ کی تردید...... ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ اور اسی مسئلہ میں وہ مناظرہ کے لئے آئے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ ''اللہ تعالیٰ حَیّ یعنی خود زندہ ہے اور قَیُّوْم یعنی زندگی کو تھامنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام پر فنا آئی اور اپنی زندگی کو وہ نہ سنبھال سکے وہ دوسرے کا اِلٰہ کیسے بن سکتا ہے؟'' نیز آپ ایک لامحدود زمانہ تک خود وجود میں نہ آئے اور اِلٰہ تو وہ ہونا چاہئے جو خود موجود ہو اور ہر زمانہ میں موجود ہو۔ یعنی ازل سے ابد تک۔ تو جو ایسا نہیں وہ خدا نہیں ہوسکتا۔

اور دوسری جگہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ﴾ ① یعنی حضرت عیسیٰ اور مریم علیہا السلام دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کے محتاج تھے اور جو کھانے پینے کا محتاج ہو وہ زمین کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلہ اس سے پیدا ہوتا ہے اور سورج کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلہ کی اصلاح اس سے ہوتی ہے۔ اس لئے عناصر اربعہ حتی کہ بیل اور چارہ وغیرہ نباتات کا بھی محتاج ہے اور حاجت مندی اور خدائی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت ''صَمَدْ'' ہونا بھی ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور تمام کائنات اس کی محتاج ہو۔ جب عیسائیوں سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا وہ آیات متشابہات میں چھڑ گئے اور کہنے لگے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب میں ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں موجود ہے۔ ﴿وَکَلِمَتُہٗ﴾ و ﴿رُوْحٌ مِنْہُ﴾ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جز ہیں۔ (بہرحال وہ اصل بات کا جواب نہ دے سکے، پھر آیات متشابہات کے بارے میں کلام کرنے لگے)۔

آیات کی دو اقسام...... ایسی آیات کے بارے میں کچھ تفصیل اور وضاحت ضروری ہے جو اس طرح سے ہے کہ آیات کی دو قسمیں ہیں۔ محکمہ اور متشابہہ۔ محکمہ وہ آیت ہے جو بیّن المراد ہوں اور اس کا معنی پوری طرح واضح ہو، خواہ لغتہً معنی ہی ایک ہو یا مختلف ہوں۔ تو دوسرے قواعد سے ایک کی تعیین ہو جاتی ہو۔

اور متشابہہ وہ آیت ہے جس کی مراد واضح نہ ہو۔ مثلاً اس کے کئی معانی ہوں اور ایک کی تعیین نہ ہوسکتی ہو۔ یا ایک ہی معنی ہو، لیکن اس مقام پر صحیح نہ آتا ہو۔

اب یہاں ایک طریقہ تو اہل فتن کا ہے کہ محض اپنی رائے سے ایک معنی متعین کر لیتے ہیں۔ خواہ وہ محکمات کے خلاف ہو اور دوسرا طریقہ اہل حق کا ہے کہ متشابہات کا رجوع محکمات کی طرف کریں، جو معانی محکمات کے ہوں انہی پر متشابہات کو بھی محمول کریں۔ اس طریق پر دین میں کسی قسم کی تفریق پیدا نہیں ہوتی اور اگر پہلے طریقے کو

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٧٥.

اختیار کیا جائے تو چونکہ ہر شخص کی عقل ورائے مختلف ہے، اس لئے مذہب میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ کیونکہ آیت ﴿وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ سے بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے کی گنجائش نکلتی ہے اور اس کو دوسری آیات پر محمول کیا جائے تو بیٹا نہ ہونے کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ اب صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کا، آیات متشابہہ کو آیات محکمات پر محمول کیا جائے اور آیت محکم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ ① یعنی عیسیٰ علیہ السلام تو ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام کیا۔ اور بندہ ہونا اُلوہیت کے منافی ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ ② یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر فرمایا کہ ہو جا پس ہو گئے۔ اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے مخلوق ہونے کی تصریح فرماتے ہیں اور مخلوق واِلٰہ میں منافات ہے۔

صفاتِ خُداوندی کے بارے میں نُصوصِ متشابہہ کا حکم...... جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت متشابہہ ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی آیاتِ متشابہات ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ ③۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا بظاہر منہ ثابت ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ ④ یہاں اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ثابت ہوتی ہے۔ غرض انسان کے تمام اعضاء ثابت ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رحم اور امانت دونوں اللہ تعالیٰ کی کوکھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے کہ "اے اللہ! جو ہم کو ملائے یعنی صلہ رحمی کرے تو اس کو ملا اور جو ہم کو قطع کرے، تو بھی اس کو قطع کر"۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ایک حدیث میں ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو بہت اچھی صورت میں دیکھا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا، تو اس کی ٹھنڈک میرے دل کو محسوس ہوئی اور ایک حدیث میں ہے کہ تمام مخلوق کے قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں۔

اب ان نصوص کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم مان لیا جائے اور ایک صورت یہ تھی کہ ان کو آیاتِ متشابہات پر محمول کیا جائے۔ بعض تو یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم ہیں۔ جیسے ہمارا جسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم بہت بڑا ہوگا۔ یہ مجسمہ کہلائے۔ اور بعض نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ جسم کے مشابہہ ہیں۔ یہ مشبہہ کہلائے اور ایک فرقہ کہنے لگا کہ الفاظ ہی بے معنی ہیں ان کا کوئی معنی مفہوم ہی نہیں۔ یہ معطلہ کہلائے۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۵۹۔

② پارہ: ۳ سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۹۔

③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۵۲۔

④ پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۲۔

اہل سنت والجماعت نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تمام صفات ثابت ہیں، لیکن ان کی کیفیات ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ ① نیز ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ ② کی تفسیر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْکَیْفُ مَجْهُوْلٌ وَّالْاِیْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ.'' ③ اوران اعضاء کی طرح عوارض انسانیہ کا اثبات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے نصوص میں ملتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اَنَا الرَّزَّاقُ فَهَلْ مَنْ یَسْتَرْزِقُنِیْ اَنَا الْمَلِکُ فَهَلْ مَنْ یَّسْئَلُنِیْ اَنَا الْغَافِرُ فَهَلْ مَنْ یَسْتَغْفِرُنِیْ.'' ④

ایک اور حدیث میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو تین جگہ ہنسی آتی ہے۔ ایک اس وقت جب کہ صفِ اول لینے کے لئے نمازی دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے اس وقت جب کہ پچھلی رات کو خاوند اٹھے اور اپنی بیوی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور وہ بھی بیدار ہو کر نماز پڑھے۔ یا بیوی اٹھے، خاوند کے منہ پر چھینٹے مارے اور وہ اٹھ کر نماز پڑھے۔ تیسرے اس وقت جب کہ جہنم سے سب سے پیچھے جو شخص نکالا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں تمنائیں ڈالیں گے۔ چنانچہ وہ کہے گا کہ اے اللہ! میرا چہرہ آگ سے پھیر دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر چہرہ پھیر دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا؟ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیرا اعتبار نہیں، تو حلف اٹھا، کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا۔ وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا پھر اس کا چہرہ آگ سے پھیر دیا جائے گا۔ جب وہ جنت کی فضا کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ میں تو ابھی تکلیف ہی میں ہوں اس لئے پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جہنم سے نکال دے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ''وَیْلَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَآ اَغْدَرَکَ.'' (تیری بربادی ہو، بہت عہد شکن ہے؟) پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اور تو کچھ نہیں مانگے گا۔ تو وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کو اللہ تعالیٰ جہنم سے نکال دیں گے اور گھٹنوں کے بل نکلتے ہوئے کہے گا کہ ''تَبَارَکَ الَّذِیْ نَجَّانِیْ مِنْهَا.'' پھر جب نہرِ حیات کو دیکھے گا، پھر اپنے آپ کو تکلیف میں پائے گا تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے اس نہر تک پہنچا دیا جائے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ''وَیْلَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَکَ.'' پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر وہاں پہنچا دیا جائے، پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔ وہ حلف اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کو نہر تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ اس نہر میں نہائے گا تو سیاہ اور جلا ہوا جسم روشن چاند کی طرح ہو کر نکلے گا۔ اور وہ خیال کرے گا کہ جتنا انعام میرے اوپر

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۱۱.

② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵

③ نظم الدرر، ج: ۱ ص: ۴۹۲.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء فی نصف اللیل، ص: ۳۸۹.

ہوا، وہ کسی پر بھی نہیں ہوا۔ پھر جب جنت کے دروازے دیکھے گا جن میں ہر ایک کی مسافت اتنی ہوگی جتنی مکہ مکرمہ اور عدن کے درمیان ہے، یہ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے اور ساتھ ہی جنت کی شفاف دیواروں سے اندر کی چیزیں دیکھے گا، تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ''وَيْلَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَكَ.'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر تمہیں وہاں بھیج دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔ تو قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اس کو جنت کے دروازے کے قریب ہی پہنچا دیا جائے گا۔ پھر جب جنت کی نعمتوں کو دیکھے گا تو یہی خیال کرے گا، کہ میں تو تکلیف میں ہوں۔ تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر دیجئے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''وَيْلَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَكَ.'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو ایک دنیا جتنا ملک جنت میں دیا گیا، وہ شخص جنت میں جگہ نہ پائے گا۔ تو پھر حاضر ہو کر کہے گا کہ جگہ تو کہیں بھی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو دو دنیا جتنا ملک دیا۔ پھر واپس جائے گا، تو جگہ اور زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گا تو وہی عرض کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ تمہیں تین دنیا جتنا ملک دے دیا۔ وہ دیکھے گا تو جگہ بہت تنگ ہو چکی ہوگی۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا ''اَتَسْتَهْزِئُنِیْ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' آپ جل جلالہ تو میرے سے مزاح فرما رہے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہنسی آئے گی اور فرمائیں گے کہ جا تمہیں دس دنیا جتنا ملک دے دیا۔ پھر جب واپس جائے گا تو اس کو اپنی جگہ نظر آئے گی۔ ① معلوم ہوا کہ جو شخص آخر کو جنت میں داخل کیا جائے گا اس کو دس دنیا جتنا ملک دیا جائے گا۔ اور حدیث سے اللہ تعالیٰ کا ہنسنا بھی معلوم ہوا۔ تو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ایسی صفات تو ثابت ہیں اور کیفیت کا علم نہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نصوصِ متشابہہ کا حکم......اور جیسے متشابہہ الفاظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی صفات پر کیا گیا، ایسے ہی بعض انبیاء کے متعلق بھی الفاظِ متشابہہ کا استعمال فرمایا گیا۔ تو ان میں طریق اعتدال یہ ہے کہ ایسی آیات کو محکمات پر محمول کیا جائے۔ ایسے ہی چونکہ نصوص میں تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغائر اور کبائر سے منزہ ہوتے ہیں۔ اگر بعض انبیاء سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جو بظاہر بہتر معلوم نہ ہوتا ہو تو وہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ نبی جو کچھ کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی کرتا ہے۔ اگر عقل سے معانی متعین کئے گئے تو یہیں سے گمراہی شروع ہو جائے گی اور ایک نیا مذہب نکل آئے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اختلاف کنندہ تو وہ ہیں جو اہل سنۃ و الجماعت سے کٹ کر ایک فرقہ بنا لیتے ہیں اور جنگ کرنے والے بھی حقیقت میں اہلِ بدعت ہی ہوتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں الفاظِ متشابہہ کا حکم......اور انبیاء علیہم السلام کی طرح ہی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم خود غرضی اور بے دینی سے بمراحل دور تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ

بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راضی ہونے کا اعلان فرمادیا' جو قیامت تک کے لئے ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا. سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرَاۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ﴾ ② پہلے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق لفظ "مَعَہٗ" نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان کا سلسلہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل ہے منقطع نہیں ہے اور ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ﴾ سے ان کے بغض فی اللہ کی تعریف فرمائی اور ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ سے ان کے حب فی اللہ کا ذکر فرمایا۔ اور یہ صفات بغیر دین کامل ہوئے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اور پھر ﴿تَرٰھُمْ الخ﴾ میں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ رکوع وسجود میں مشغول رہتے ہیں اور ہر وقت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ پہلی کتب میں بھی ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ گویا آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مقبول عند اللہ ہونے کی شہادتیں دی گئیں اور قرآن مجید میں بھی ان کے مقبول ہونے کی شہادتیں موجود ہیں جو قیامت تک باقی رہیں گی۔ پس اگر ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بظاہر نامناسب ہو، تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے اعلان کو دیکھتے ہوئے مناسب تاویل کی جائے۔ مثلاً اگر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے لفظ کذب استعمال کیا ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ ان کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی اور نہ یہ کہ وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے مناسب حال کذب کے معنی کی تعین کی جائے گی اور وہ خطاء اجتہادی سمجھی جائے گی، جس میں اُن کو ایک نیکی ملے گی، مواخذہ پھر بھی نہیں ہوگا۔

اولیاء اللہ کے کلمات کے بارے میں مسلکِ حق...... جیسا کہ حضرت منصور رحمہ اللہ علیہ نے "اَنَا الْحَقُّ" کہا تو صرف ان کلمات کو دیکھ کر ان کے حق ہونے میں گستاخی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ ان کی تمام زندگی کو دیکھ کر ان کے مناسب "اَنَا الْحَقُّ" کا معنی بیان کیا جائے گا۔ اور اصل یہ ہے کہ صوفیاء کرام کے نزدیک ایک درجہ فنا فی اللہ کا ہوتا ہے حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ اس قدر فانی فی اللہ ہوچکے تھے کہ اَنَا سے مراد ذات متکلم نہیں بلکہ ذاتِ حق تھی۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد انا اور انت کا مصداق ایک ہوجاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے: مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ. (میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے) واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ آپ رحمۃ اللہ علیہ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی، تو آپ کے منہ سے نکلا مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ. جب افاقہ ہوا تو مریدین نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے تو

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰.

② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

آج کلمہ کفر صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے مجھے کیسے چھوڑ دیا؟

پھر دوسری دفعہ آپ پر ایسی ہی حالت طاری ہوئی، تو مریدین نے حضرت کو مارنا شروع کیا۔ لیکن معاملہ یہ تھا کہ مارتے پیر صاحب کو تھے اور لگتی ان کو خود تھی۔ چنانچہ وہ بے چارے بدحال ہو گئے۔ جب حضرت بایزید کو افاقہ ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ مریدین نے عرض کی کہ آج بھی آپ سے وہی ''کلمۂ کفر'' نکلا تھا، اس لئے ہم آپ کو مارنے لگے تو وہ ہمیں لگتی تھی۔ جس سے ہمارا یہ حال ہو گیا۔

حضرت بایزید نے فرمایا: بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ مریدین نے بتلا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کلمہ تو عین ایمان ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ملک تو میں اور بقیہ ساری کائنات ہے۔ اور میرا ملک خود اللہ تعالیٰ ہے، جس میں میں ہر وقت سیر کرتا ہوں تو یقیناً میرا ملک اللہ تعالیٰ کے ملک سے بڑا ہے۔

اب یہاں بھی اہل زیغ کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی اس قدر تعریف کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں گے اور یا قرآن وحدیث کے ظواہر پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ کی توہین کریں گے۔ اور ایک ''اعتدال'' ہے۔ وہ یہ کہ قواعدِ قرآن وحدیث بھی اپنی جگہ پر صحیح رہیں اور اولیاء اللہ کے کلام کا بھی ان کی زندگی کے مطابق معنی بیان کیا جائے اور یہ ''طریق حق'' مفرّط اور مفرط کو نصیب نہیں ہوتا، بلکہ اعتدال پسند آدمی کو نصیب ہوتا ہے۔

حضرت نظامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا عجیب واقعہ...... اس پر ایک واقعہ مولانا فخر الدین نظامی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا، جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے، چودہ برس کی عمر میں ہی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ بہت خوبصورت تھے، جب آپ مسجد میں تشریف لاتے تو لوگ دیکھنے کے لئے سڑک کے کنارے پر جمع ہو جاتے۔ تو آپ جس کی طرف دیکھتے'' وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ آپ فرماتے کہ اور گھور کر دیکھو۔

وہ واقعہ یوں ہے کہ آپ کے ایک مرید نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کی تمنا ہے اس کے لئے کوئی وظیفہ بتا دیجئے جس سے اللہ تعالیٰ کی زیارت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ نماز فرض ترک کر دو۔ مرید کو بہت تعجب ہوا کہ نماز فرض کیسے ترک کردوں؟ تین دن کے بعد حاضر ہوئے اور پوچھا کہ حضرت! اللہ کے دیدار کی تمنا ہے، کوئی وظیفہ بتا دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں وظیفہ تو بتلا دیا کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ وہ پھر بھی واپس چلا گیا۔ دو تین دن کے بعد حاضر ہوا، اور وہی عرض کی، تو آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ آخر وہ مزید چلے گئے۔ فرض چھوڑنے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ لیکن سنتیں چھوڑ کر سو گئے خواب میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیات ہوئی، آپ نے فرمایا کہ۔ ''اللہ کے بندے ہم نے کیا قصور کیا کہ ہماری سنتیں چھوڑ دیں''۔

اسی وقت جلدی اٹھے، وضو کر کے توبہ کی اور سنتیں ادا کیں۔ صبح کو یہ واقعہ حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر فرض چھوڑتے تو اللہ تعالیٰ خود تشریف لاتے اور فرماتے کہ فرض کیوں چھوڑتے ہو؟

یہاں بھی دو راستے نکلتے ہیں۔ایک یہ کہ اولیاء اللہ کی ہر بات کو قرآن وحدیث سے قطع نظر کرتے ہوئے مِنْ و عَنْ تسلیم کرلیا جائے۔اور ایک یہ کہ قرآن مجید کے قواعد اپنی جگہ صحیح رہیں اور اولیاء اللہ کے کلام کے بھی مناسب معانی بیان کئے جائیں۔

اہل اللہ کی دو اقسام...... حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو ریاضت ومجاہدات سے اللہ تعالیٰ تک پہنچتے ہیں۔اور ایک وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خود ہی چن لیتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔تو جو مجاہدات سے اللہ تک پہنچیں ان کو صوفیاء کی اصطلاح میں مرید کہتے ہیں۔اور جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں ان کو مراد کہتے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص تو اپنی دیانت، خلوص اور خدمت کی بناء پر اتنی ترقی کرے کہ بادشاہ اس کو اپنا نائب بنادے۔اور ایک وہ لڑکا ہے جس کو بادشاہ خود چن لے اور اس کے لئے مربی مقرر کردے جو اس کی تربیت کریں۔اگر وہ نہ پڑھے تو اسے زبردستی پڑھائیں۔زبردستی اس کی تعلیم وتربیت ہو۔

حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو جنت میں جانا نہیں چاہتے۔لیکن ان کو زنجیر سے باندھ کر لایا جاتا ہے کہ انہیں جنت میں جانا پڑے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ ①
"یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں خود بخود اپنی طرف چن لیتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کو راستہ بنادیتے ہیں"۔پس قرآن مجید کی اصطلاح میں جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں اور ان کو مجتبے اور جو مجاہدات سے واصل ہوں ان کو منیب کہتے ہیں۔حضرت حاجی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص (حضرت نظامی کے مرید باصفا) مرید نہیں تھے بلکہ مراد تھے۔اگر یہ نماز نہ پڑھتے تو اللہ تعالیٰ خود آ کر پڑھواتے۔اور حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کی نماز چھوٹ نہیں سکتی۔

اہلِ استقامت کا حال...... پس اللہ کی تعظیم کی بناء پر قرآن میں تاویل بھی گمراہی ہے اور قرآن مجید کے ظاہر قواعد پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ پر تنقید کرنا بھی گمراہی ہے۔اور ایسے لوگوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کے گھمنڈ میں رہتے ہیں اور جن کو اپنے علم پر غرور اور فخر نہیں ہوتا وہ کسی بات کو اگر نقل بھی کرتے ہیں تو موجد ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ متبع ہونے کی حیثیت سے نقل کرتے ہیں۔

اس پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔وہ یہ کہ ایک دفعہ آپ بہت خوش معلوم ہو رہے تھے۔تو حاضرین نے کہا کہ حضرت آج بہت خوش معلوم رہے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے۔آپ نے فرمایا کہ بتیس سال سے دل میں ایک رائے تھی۔اس کو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔کیونکہ متقدمین سے کسی کا قول نہیں ملتا تھا اور آج

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۳۔

ایک تابعی کا قول نظر آیا۔جس سے اس رائے کی تائید ہوئی، اس وجہ سے خوشی ہوئی۔اہل استقامت کا یہی حال ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ہاتھ کتاب اللہ میں ڈال رکھا ہے اور ایک ہاتھ بزرگوں کے دامن میں۔اور یہ چیز جب نصیب ہوتی ہے جب انسان عارفین سے وابستہ ہو۔آج دنیا میں ایک طبقہ ہے جس نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اولیاء کرام کی اتنی تعظیم کی کہ ان کی ہر بات کو مذہب بنا دیا۔اگر ایک بزرگ نے سماع کیا جوان کی ایک خصوصی حالت تھی۔تو اس کو بھی شریعت میں داخل کر دیا گیا۔

یہود اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو چھوڑا۔حتی کہ ان کی توہین بھی کی اور بعض کو قتل بھی کیا اور صرف کتابوں کو ہاتھوں میں رکھا اور جو مطلب اپنی خواہش کے مطابق ہوا، وہ لے لیا۔اس سے ان میں غرور پیدا ہوا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَايَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ﴾ ① ''میں پھیروں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں تو ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں اس کو راہ نہ ٹھہرائیں اور اگر راستہ گمراہی کا دیکھیں تو اس کو راہ ٹھہرائیں۔یہ اس لئے کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان سے بے خبر رہے''۔

اس غرور کی اصلاح جب ہو سکتی ہے جب اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔اور نصاریٰ اس لئے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو کلیتہً چھوڑ دیا اور انبیاء علیہم السلام کو حتیٰ کہ احبار و رہبان کو بھی معبود بنا لیا۔یہ افراط و تفریط گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔اس لئے اصل اعتدال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو بھی چھوڑا نہ جائے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ میں رہے۔

محض حروفِ قرآن کافی نہیں...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّتِيْ.'' ② ''میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے۔گمراہ نہیں ہو گے ایک اللہ کی کتاب۔اور دوسری اپنی سنت (طریقِ عمل)''۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ③ ''البتہ تحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے''۔اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے حروف کافی نہیں، بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بھی ضرورت ہے۔تقویٰ کی کیفیت قلوب سے قلوب کی طرف آتی ہے، کاغذات

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶.

② المؤطا لمالک، کتاب الجامع، باب النھی عن القول بالقدر، ص: ۳۷۱.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

سے نہیں آتی۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پوری طرح مٹی بھی نہیں ڈالی تھی کہ ہم نے اپنے دلوں کو "منکر" (یعنی اوپرا) پایا۔ حالانکہ علم اور کتاب اللہ موجود تھی۔ اگر نہیں تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود موجود نہیں تھا۔ اس لئے کتاب اللہ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی ضرورت ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ." ① "جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح تم بھی نماز پڑھو"

کیونکہ عمل کا نقشہ آپ ہی کو معلوم تھا۔ حالانکہ صلوٰۃ کا لغوی معنی صرف دعا ہے۔ اور یہ معنی صحابہ بھی جانتے تھے۔ لیکن یہ معنی اللہ تعالیٰ کے مطلوب نہیں تھے۔ ایسے آپ نے وضو کر کے دکھایا۔ چنانچہ ایک ایک دفعہ اعضاء کو دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ایسا ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتے۔ اور پھر اعضاء کو دو دو دفعہ دھویا اور فرمایا کہ جو شخص ایسا وضو کرے گا، اس کو دو اجر ملیں گے، پھر اعضاء کو تین تین دفعہ دھویا اور فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وضو ہے۔

ایسے ہی حج کا حکم دیا تو حج کر کے دکھلایا۔ معاشرت کی تعلیم دی تو وہ کر کے دکھلائی۔ حالانکہ ان کے لغوی معانی سب کو معلوم تھے لیکن وہ معانی شرعاً مطلوب نہیں تھے۔ لہٰذا شخصیتوں کو چھوڑ کر صرف لٹریچر پر کفایت کرنے سے دین نہیں سیکھا جا سکتا۔

عقل محض سے دین فہمی کا انجام...... کیونکہ ہر شخص کی عقل مختلف ہے اور عقل کے مطابق ہی عمل کیا جائے۔ تو دین میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا لٹریچر اور بزرگوں سے وابستگی دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا طریقہ ہے اور جو لوگ شخصیتوں کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھیں گے۔ وہ عمل صحیح سے محروم رہیں گے اور جو عمل کرتے بھی ہیں تو بھی انہیں شخصیتوں سے لیا گیا ہے۔

میں نے مشکوٰۃ شریف حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ ایک طرف تو آپ احادیث کا ترجمہ کراتے تھے اور دوسرے آپ رکوع اور سجدہ کر کے کیفیت بھی بتلا دیتے تھے۔ میں نے عرض کی حضرت! اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی، تو آپ نے بھی رکوع اور سجدہ کی کیفیت عمل کے ساتھ بتلائی۔ میں نے عرض کی حضرت اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ انہوں نے بھی اسی ہیئت سے رکوع اور سجدہ بتایا۔ میں نے عرض کی

حضرت یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ ایسے ہی شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے اور ان سے اسی ہیئت کی سند رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کوئی مر جاتا تو چھ مہینے تک رونے کی وصیت کرتے' اور رونے والی عورتیں نہ ہوتیں تو کرایہ پر رونے والی جاتیں، جو چھ مہینے تک روتیں تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ مرنے والا بہت بڑا آدمی ہے جس پر چھ ماہ تک ماتم ہوتا رہا۔ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رونے کی ہیئت بنا کر مجھے بتایا پھر فرمایا کہ شاید تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ہیئت بتلائی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ شاید تم کو یہ خیال ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایسے ہی ہیئت بتلائی تھی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک پہنچتا ہے۔

دین فہمی کے لئے اشخاص بھی ضروری ہیں...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سند بہت بلند تھی۔ ایک دفعہ سہارن پور کے سفر میں آپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے فرمایا: کہ چونکہ میری سند عالی ہے، اس لئے تم مجھ سے اجازت حدیث لے لو، لیکن شرط یہ ہے کہ سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے عرض کی بہت اچھا، لیکن اتفاق سے میں وہاں نہ جاسکا اور ایک سال گزر گیا۔ پھر میں نے وعدہ کیا، لیکن کچھ عرصہ گزر گیا اور میں نہ جاسکا۔ آخر آپ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کا ارادہ فرمایا تو میں یہ سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا: کہ تم کو وقت پر خیال آیا۔ دو تین سفر ابھی باقی تھے۔ پھر آپ نے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مرحوم کو فرمایا کہ حدیث کی تمام کتابیں لے آؤ۔ وہ تمام کتابیں لے آئے۔ بعض کا اول آخر پڑھا اور بعض کا اول آخر مجھ سے پڑھایا اور فرمایا: کہ میں تم کو بھی اس عمل کی اجازت دیتا ہوں۔ اسی طرح دین کا سمجھنا اشخاص پر موقوف ہے، ورنہ عبارت سے بعض اوقات صرف ترجمہ بھی سمجھ نہیں آتا۔ مثلاً ''کیا بات ہے'' ایک جملہ ہے اس کو اگر ایک خاص لہجہ سے ادا کیا جائے تو یہ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور تفخیم شان' تحقیر شان اور تعجب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معنی مراد کی سمجھ الفاظ سے نہیں آتی۔ بلکہ لب ولہجہ سے آتی ہے۔ اس طرح لٹریچر کے ساتھ عمل کی ہیئت کی بھی ضرورت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب آیات ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سیاہ دھاگہ اور ایک سفید دھاگہ اپنے تکیئے کے نیچے رکھ لیا۔ صبح تک

① پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

کھاتے پیتے رہتے اور دونوں دھاگوں کو بھی دیکھتے رہتے۔ جب کافی روشنی ہوئی اور دونوں دھاگے ممتاز ہونے لگتے تو آپ کھانا پینا بند کر دیتے۔

جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ.'' ① ''یعنی تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے جس کے نیچے صبح صادق اور صبح کاذب دونوں آ گئیں''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ سیاہ دھاگے سے مراد صبح کاذب اور سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔

اب حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی معنی سمجھا جو لغوی تھا۔ لیکن شرعاً وہ معنی مطلوب نہ تھا اور وہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد تھی۔ ایسے ہی قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے، اس کا لغوی معنی دعا ہے۔ حالانکہ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔ حج کا معنی قصد کرنا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔ پس جیسے قرآن مجید کا ماننا ضروری ہے۔ ایسے ہی ان کو تنقید سے منزہ سمجھنا ضروری ہے، جن کے واسطے سے قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے اور جن کے تقویٰ کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی۔ ان سے راضی ہونے کا اعلان بھی فرمایا۔ اور جن کے متعلق فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک آدمی آیا۔ جو قدریہ خیال کا تھا۔ تو آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا۔ اور فرمایا کہ تو نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مطلب کے خلاف کہا ہے۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے کے سامنے ایک حدیث بیان کی کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو تو آپ کے بیٹے نے کہا چونکہ یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہم ضرور عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کریں گے۔ واقع میں یہ بات صحیح تھی، لیکن چونکہ یہ حدیث کا مقابلہ تھا۔ اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تم سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے پیش کرتے ہو۔ چلے جاؤ۔ میں ساری عمر تمہارا منہ نہ دیکھوں گا ② چنانچہ بہت سفارشیں کرائیں، لیکن ساری عمر اپنے لڑکے کا منہ نہیں دیکھا اور ان حضرات کا آپس میں اگر کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس میں اتنی خیر ہوتی تھی کہ ہماری صلح میں بھی نہیں ہوتی۔

لوگوں کی دو اقسام...... غرض آیات کی دو قسمیں بیان کی گئیں۔ اور لوگوں کی بھی دو قسمیں بیان کی گئیں۔ فرمایا گیا کہ جن کے قلوب میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی عقل سے رکیک تاویلیں کرتے ہیں۔ پس ان معانی کی تعیین میں سلف صالحین کی اتباع ضروری ہے اور ان کو تنقید سے بالاتر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ صحابہ کو مقتدا بھی مانتے ہیں پھر ان پر تنقید کیسے کرتے ہیں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتی۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ کلوا واشربوا...... ص: ۴۵۱.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصلوة، باب خروج النساء الی المساجد، ج: ۲، ص: ۴۴۰.

اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک کتاب لکھ کر مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نقل کرنے کے لئے دی۔ اس میں ایک جگہ کتابت کی غلطی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بوجہ غایت ادب نہ تصحیح کرتے ہیں نہ ہی اس کو اس طرح غلط لکھنے کی جرات ہوئی جب تحریر ختم ہوئی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضرت! اس لفظ کی سمجھ نہیں آئی۔ تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ عین کی بجائے ہمزہ لکھ دو۔ پھر آپ نے تصحیح فرمائی۔

بہر حال ان اقسام کے بیان کے بعد زیغ سے بچنے کی دعا کی تعلیم ہے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا اور کجی سے بچنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر موقوف ہے۔ اس لئے طلب رحمت کی دعا بھی تعلیم فرمائی اور جب ہدایت نصیب ہو جائے تو اس کا تھامنا اور سنبھال کر رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے موت کا استحضار ضروری ہوا، اس کے خوف سے ہدایت کو دانتوں میں مضبوط پکڑا جائے۔ اور یہ چیز تربیت سے، اصلاح سے آتی ہے، جو بزرگوں کی صحبت میں ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بیٹا بن کر سب نے کھایا، باپ بن کر کسی نے نہیں کھایا۔ اس لئے انکساری اور بزرگوں کی خدمت ضروری ہے۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تواضع کی یہ حالت ہے کہ قیامت کے دن کہیں گے "مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ." اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ." ①

آدم علیہ السلام سے ایک اجتہادی خطاء ہوئی تھی۔ اس پر بھی انہوں نے عاجزی اور زاری کی اور فرمایا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ ② اور ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی کی اور بجائے معافی مانگنے کے تکبر کیا۔ اس کا علاج سوائے اہل اللہ سے تعلق کے مشکل ہے۔

قال را بگذار ، مرد حال شو ‏ ‏ ‏ ‏ پیش مردے کاملے پامال شو

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تواضع اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک انسان یہ خیال نہ کرے کہ میں نصرانی کے کتے سے بھی بدتر ہوں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بندہ جب دعوے سے کہتا ہے کہ میں نے عبادت کی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قوت تو میں نے ہی دی تھی، اعضاء تو میں نے دیے تھے، پھر تو نے کیا کیا؟ اگر بندہ تواضع اختیار کرے اور کہے کہ اے اللہ! سب کچھ تیری رحمت سے ہوا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اولاً حرکت تو تو نے ہی کی تھی، ارادہ تو نے ہی کیا

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقول فی الرکوع، ج:۳، ص:۳۶.
② پارہ:۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ:۲۳.

تھا، چل کرتو تو ہی آیا۔ گویا اس کو بلند فرماتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ کِبْرٍ.'' ① ''یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں ﴿﴾ پستی سے سر بلند ہو اور سرکشی سے پست

بارش، پتھر اور مٹی دونوں پر برابر پڑتی ہے۔ لیکن پتھر کو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور مٹی سے قسم قسم کی اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیات کی قسمیں بیان کیں اور لوگوں کی اقسام بھی بیان کیں اور ایمان کی حفاظت کا طریق بھی بتادیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں، وقت بھی کافی ہوگیا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖۤ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ ج: ۱ ص: ۲۴۷.

مقصدِ حیات

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ. حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ﴾ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! دنیا میں انسان جب بھی کوئی حرکت کرتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی دانش منداور عقلمند انسان کی حرکت بلا مقصد نہیں ہوتی۔ آپ جب مسجد کی طرف آنے کے لئے حرکت کرتے ہیں تو نماز مقصد ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اپنا گھر چھوڑتے ہیں اور محنت مشقت اٹھا کر مسجد میں آتے ہیں۔ ایک طالب علم اسکول، مکتب یا مدرسہ کی طرف جاتا ہے تو محض حرکت مقصود نہیں ہوتی، بلکہ حرکت سے تعلیم مقصود ہوتی ہے، اسے پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ اس لئے وہاں جاتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنے شیخ کے پاس خانقاہ کی طرف جاتا ہے، تو اس حرکت کا مقصد اخلاقی تربیت ہوتی ہے کہ میرے نفس کی اصلاح ہو جائے۔ محض حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ آپ ریل سے سفر کر کے کسی جگہ کے لئے حرکت کریں تو کوئی نہ کوئی اسٹیشن ضرور ہوگا جہاں آپ کو اترنا ہوگا جو آپ کی منزل مقصود ہوگی۔ بلا مقصد کے حرکت دیوانوں اور مجنون آدمی کا کام ہے۔ دانش مند جب بھی کوئی حرکت کرے گا، اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ اور وہ مقصد اس کے عقلمند ہونے پر دلالت ہوگی ورنہ اس کو بے وقوف کہیں گے۔ غرض یہ عقلی اور حسی قاعدہ ہے کہ کوئی حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ حرکت سے وہ منزل مقصود ہوتی ہے جس کی طرف آدمی جاتا ہے۔

سفرِ انسانی کی ابتداء وانتہاء...... اس اصول کے پیشِ نظر آپ غور کریں تو زندگی بھی ایک حرکت ہے ایک طرف سے آپ چلے ہیں اور ایک طرف جا رہے ہیں۔ اور یہ کوئی چھوٹی موٹی حرکت نہیں کہ دس بیس میل کا سفر

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸.

کرلیا، بلکہ ایک لامحدود حرکت ہے جو دور تک جانے والی ہے اور بہت پہلے سے ہوئی ہے۔

آپ تو یہ سمجھے ہوئے ہوں گے کہ جب ہم ماں کے پیٹ سے نکلے تو حرکت شروع ہوئی۔نہیں ایسا نہیں بلکہ ماں کا پیٹ تو ایک اسٹیشن ہے۔حرکت اوپر سے آ رہی ہے۔اس جگہ جو انسان کی حرکت ہوتی ہے۔یہ ''عالمِ اَلَسْتُ '' سے چلی ہے جس کو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا اور احادیث نے اس کی تفسیر بیان کی تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی کمر پر داھنا ہاتھ مارا، جیسا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب اور اس کی جناب کے لائق ہے۔ہم جیسا ہاتھ تو نہیں ہے۔ہمارا ہاتھ تو جسمانی ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔تو جیسا ہاتھ اس کی جناب کے لائق اور شان کے مناسب ہے ویسا ہی ہاتھ مراد لینا چاہئے۔تو داھنا ہاتھ مارا تو آدم علیہ السلام کی کمر سے ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جنتی ہونے والی تھی اور قیامت تک آنے والی تھی۔اس کے بعد بایاں ہاتھ مارا تو ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جہنمی ہونے والی تھی۔تو نیک اور بد سارے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکل آئے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک وادی میں جمع کیا، اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے تھے کا ایک مجمع تھا۔کوئی صف بندی نہیں تھی کہ ترتیب ہو۔بلکہ کسی کا منہ کسی کی طرف کسی کی پشت کسی کی طرف اور کسی کا مونڈھا کسی کی طرف، ایسے ہجوم میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے جن کے منہ آمنے سامنے تھے ان میں تو محبت قائم ہوگئی اور جن کی پشتیں ملی ہوئی تھی ان میں عداوت قائم ہوگئی اور جن کے پہلو ملے ہوئے تھے ان میں کچھ محبت اور کچھ عداوت۔یہی وجہ ہے کہ ایک انسان مشرق کا اور ایک مغرب کا، ایک ایشیاء کا اور ایک افریقہ کا، کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔لیکن جب جمع ہوتے ہیں تو ان میں دیرینہ محبت معلوم ہوتی ہے۔حالانکہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ وہی عالم الست کا اثر ہے۔تو فرمایا گیا: '' اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ. '' ① روحیں جمع کر دیں گئیں وہی آپس میں محبتیں اور عداوتیں قائم ہوگئیں، جو دنیا میں آ کر ظاہر ہوئیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے پیٹ میں دو بچے پاؤں پھیلاتے ہیں۔دونوں حقیقی بھائی ہیں۔لیکن آپس میں عداوت، کشمکش اور کسی وجہ سے مناسبت نہیں وہ اس سے لڑتا ہے اور یہ اس سے لڑتا ہے۔اور دو اجنبی اس طرح ملتے ہیں جیسے حقیقی بھائی ہیں۔یہ ازل سے ہی کسی میں محبت اور کسی میں عدوات ڈال دی گئی۔اس طرح سے یہ روحیں وہاں جمع کی گئیں۔

یہ بھی حدیث میں فرمایا گیا کہ: وہاں جوڑیاں بھی قائم کردی گئیں۔جس کا جس سے نکاح ہونے والا تھا، وہ عورت اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔گویا وہیں تقرر کر دیا گیا کہ یہ زوج اور زوجہ بنیں گے۔تو اس طرح سے لوگوں کی جوڑیاں بنا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ان سب کو حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا اور بلا واسطہ حق تعالیٰ نے ان

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب الارواح جنود مجندة، ج: ۱۱، ص: ۱۱۷.

سب سے کلام فرمایا اور سب کو اپنا جمال دکھلایا۔ جس سے ہر ایک کے دل میں اپنے مالک کی محبت قائم ہوگئی۔ اور یہ فرمایا کہ: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ① ''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟''۔

حدیث میں ہے کہ: سب انسان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اس کا کیا جواب دیں، سب سے پہلے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بَلٰی۔ ''بے شک آپ ہمارے ربّ ہیں''۔

آپ کا فرمانا تھا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ کلمہ نکلا بَلٰی' بَلٰی بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے بول سے سب انسانوں کے دل میں ڈال دیا گیا۔ اور تمام انسان بولے کہ بَلٰی، بَلٰی، بَلٰی بے شک آپ ہمارے پروردگار ہیں۔ گویا سب سے پہلے معلم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے سب انبیاء علیہم السلام بولے اور انبیاء علیہم السلام کے بولنے سے تمام انسانوں تک یہ تعلیم پہنچ گئی۔

تو سب نے اللہ کے مالک ہونے اور رب ہونے کا اقرار کیا اور اس کی ربوبیت کو مانا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اس عہد کو یاد رکھنا دنیا میں جب جاؤ گے تو اس عہد کو بھولنا نہیں ہم انبیاء علیہم السلام کو بھیجیں گے، جو آ کر تمہیں یاد بھی دلائیں گے۔ پھر اپنی زندگی صحیح کر کے کل کو ہمارے سامنے آنا اور عہد کو دل میں رکھ کر لانا۔ یہ مت کہنا کہ ہمیں تو کسی نے کچھ بتلایا ہی نہیں تھا، ہم کو کسی نے تعلیم ہی نہیں دی تھی۔ ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ.﴾ ② ''قیامت کے دن یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ ہم تو غافل تھے۔ نہ کسی کو رب جانتے تھے نہ کسی کو مالک وخالق۔ ہمیں یہ کسی نے بتلایا ہی نہیں تھا''۔

تو فرمایا کہ: ہم اپنا ''رب ہونا'' بتلا رہے ہیں۔ اور ہم سب کے باپ آدم علیہ السلام کو اللہ نے گواہ بنایا اور فرمایا کہ آدم! میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ربوبیت کا اقرار ان سب کے دل میں ڈال دیا۔ زمین کو گواہ کیا آسمان کو بھی گواہ کیا، کہ ہم نے تمہیں تعلیم دے دی اور جمال دکھلا کر اپنی محبت بھی پیدا کر دی اور سوال کا جواب دلا کر اپنی ربوبیت کا اقرار کرا لیا کہ میں تم سب کا رب ہوں اور یہ کہ تم غافل نہیں ہو۔

یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان اپنے دل میں ایک جمال محسوس کرتا ہے کہ میرا مالک اور خالق کوئی ضرور ہے۔ ''اور ہے بھی ایک''۔ یہ انسان کو سمجھ آتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی فطرت میں اقرار موجود ہے۔ ہر ایک کے اندر عشق ومحبت خداوندی ڈلی ہوئی ہے، جسے ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام آ کر اسے دعوت دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ محبت کو کس طرح ظاہر کیا جائے۔ اس ربوبیت کے اقرار کو کس عمل سے نمایاں کرے۔ وہ تعلیم دے کر اس کی تفصیل کر دیتے ہیں۔ اجمالاً ہر ایک انسان کے دل میں یہ جذبہ موجود ہے۔

احوالِ برزخ...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ: آپ کا یہ سفر وہاں سے شروع ہوا تھا، وہاں سے یہ

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲.

② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲.

حرکت ہوئی آدم علیہ السلام کی اولاد ہوئی پھر اولاد کی اولاد اور آگے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ انسان اپنے اپنے والد کی پشتوں میں منتقل ہوتے رہے۔ تو پہلی منزل جہاں سے انسان چلا ہے وہ آدم علیہ السلام کی پشت ہے اور پھر اپنے باپ در باپ کی طرف منتقل ہوا۔ اس کے بعد پھر ہر انسان اپنی اپنی ماں کے پیٹ کی طرف منتقل ہوا۔ نو مہینے وہاں قیام کیا۔ یہاں اسے غذا ملی کچھ اسے سمجھایا گیا، نو مہینے کی مدت گزار کر گاڑی آگے چلی، پھر دنیا کا اسٹیشن آ گیا۔ پھر دنیا میں کسی کی عمر چالیس برس، کسی کی پچاس برس، کسی کی ساٹھ اور سو برس اور کسی کی دو سو برس۔ پہلی امتوں کی بارہ بارہ سو، اٹھارہ سو برس عمریں ہوئیں۔ اب عمریں کم ہو گئیں۔ تو انسان آتے رہے اور اپنی اپنی عمر کے مطابق قیام کرتے رہے۔ جب دنیا میں اس کی عمر ختم ہوئی تو عالم برزخ میں پہنچ گیا، جس کو قبر کہتے ہیں۔ اور قبر یہ نہیں جس کو ڈیڑھ گز کا گڑھا بتلایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی علامت ہے۔ وہ ایک مستقل جہاں ہے جس کو برزخ کہتے ہیں، جو دنیا اور آخرت کے بیچ میں ہے۔ اس کا تعلق کچھ دنیا سے ہے اور کچھ آخرت سے ہے۔ مرنے والا بالکل دنیا میں بھی نہیں رہتا اور بالکل آخرت میں بھی نہیں پہنچتا، بلکہ بیچ بیچ میں رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: قبر میں جنت کی کچھ کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں اور آدمی جنت میں اپنے مقام کو دیکھ لیتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ: "یَـا رَبِّ اَقِـمِ السَّـاعَةَ " ① اے اللہ جلدی قیامت کر دے تاکہ اس مقام کریم تک پہنچ جاؤں۔ وہاں سے خوشبوئیں آتی رہتی ہیں اس میں "بہ مست" رہتا ہے۔ تو آخرت بھی سامنے ہے اور دنیا بھی سامنے ہے کہ کوئی ثواب پہنچائے تو پہنچ جاتا ہے۔

قبر پر زیارت کے لئے کوئی جائے تو حدیث ہے کہ قبر کی زیارت کا ادب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے میت کی طرف منہ کرے میت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے۔ تو ادھر اس کا رخ جنت کی طرف ہے اور ادھر اس کا رخ دنیا کی طرف ہے۔ وہاں سے ہوائیں آ رہی ہیں، ادھر سے دعائیں اور ثواب پہنچ رہا ہے۔ خود اہل برزخ بھی دنیا والوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ: مرنے والے کو جب نعمتیں ملتی ہیں اور قبولیت ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ! جتنے میرے عزیز اور مسلمان بھائی ہیں اس وقت تک انتقال نہ کریں جب تک انہیں توبہ نصیب نہ ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے گناہوں سے معافی نہ چاہ لیں۔ تاکہ پاک صاف ہو کر یہاں پہنچیں جیسے تو نے مجھے پہنچایا ہے۔ تو ہر ہر میت اہل دنیا کے لئے دعا کرتی ہے اور دنیا والے میت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْهُم وَارْحَمْهُمْ." اے اللہ ان کی مغفرت فرما کر ان پر رحم فرما "اَعْلِ دَرَجَاتِهِمْ فِي الْفِرْدَوْسِ." ان کے درجات فردوس میں بلند فرما۔ تو ہم ان کے لئے دعا گو ہیں۔ وہ ہمارے لئے دعا گو ہیں۔ ان کی دعاء کا ہدیہ ہم تک پہنچتا ہے اور ہمارے ثواب کا ہدیہ ان تک پہنچتا ہے۔

---

① المسند للامام احمد، ج: ۳۷، ص: ۴۹۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب باالتعلیق للالبانی ج: ۳ ص: ۲۱۹.

اس واسطے فرمایا گیا کہ: میت پر رونے کی ضرورت نہیں۔ روئے دھوئے تو تب جب ہمیشہ کے لئے جدائی ہو۔ یہ چند دن کی جدائی ہے۔ ہم بھی وہیں پہنچ جائیں گے، جہاں وہ پہنچا ہے۔ تو زیادہ رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ قبر پہ جاکے آپ ثواب پہنچائیں ان کو مل گیا۔ انہوں نے دعا کا ہدیہ بھیجا وہ آپ کو مل گیا۔ تو یہ کیا جدائی ہوئی؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا کوئی عزیز ہندوستان چلا جائے تو وہاں سے خط کی بھی آمدورفت ہے، ہدیہ بھی جاتا ہے۔ سلام وکلام بھی پہنچتا ہے۔ اس لئے آدمی روتا نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جب جی چاہے گا مل لوں گا اور آدمی کی ملاقات تو گویا ہوتی ہی رہتی ہے۔

اس واسطے فرمایا گیا کہ: میت پر اتنا رونا دھونا کہ آدمی نوحہ، بیان، بکاء کرے، ماتم کرنے لگے، گریبان پھاڑ ڈالے، رخسار نوچ ڈالے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا بھی اظہار ہے۔ اور بے وقوفی بھی ہے۔ اتنا تو تب روئے جب یہ بات ہو کہ اب کبھی ملنا نہ ہوگا۔ یہ چند دن کی جدائی ہے پھر ملاقات ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ جس کو ہم قبر کہتے ہیں وہ ڈیڑھ گز کی جگہ نہیں ہے وہ دراصل عالم برزخ ہے، جو اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیا جیسے لاکھوں عالم اس میں بن سکتے ہیں، تو انسان عالم برزخ کی طرف منتقل ہو گیا اور جب بھی منتقل ہوتا ہے ترقی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی کمر سے جب نکلا تو حدیث میں ہے کہ: تمام انسان چیونٹیوں کی طرح تھے۔ ماں کے پیٹ میں آیا تو قدوقامت بڑھ گیا، غذا بھی ملنے لگی۔ دنیا میں آیا تو قدوقامت اور بڑھ گیا۔ غذا بھی بڑھ گئی۔ وہاں حیض کا خون ملتا تھا یہاں صاف دودھ ملنے لگا۔ مٹھائیاں عمدہ غلّے، ترکاریاں، پھل، پھول اور فروٹ ملنے لگے۔ ماں کے پیٹ میں یہ نہ تھے وہ تنگ جہان تھا۔ جبکہ دنیا میں ماں کے رحم جیسے کروڑوں جہان بن سکتے ہیں۔

اب انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ: تم آہستہ آہستہ ترقی کے عالم میں پہنچ رہے ہو۔ اس کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے اور وہ اتنا بڑا ہے، کہ دنیا جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں اور وہ عالم برزخ ہے۔ وہاں نعمتیں اور راحتیں بھی ہوں گی۔ دنیا میں اگر بے چین رہے گا مگر ایمان تھا تو قبر کے اندر راحت ملے گی۔

حدیث میں ہے کہ: جب سوال وجواب قبر میں ہو چکے گا۔ اور منکر نکیر کو سب کا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام تھا۔ میرے پیغمبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو غیبی آواز پیدا ہوگی کہ ''اَنْ صَدَقَ عَبْدِیْ.'' میرے بندے نے سچ کہا۔ ''فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ اَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْالَهٗ بَابًا مِّنَ الْجَنَّةِ.'' اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دو۔ جنت کے فرش بچھاؤ جنت کا لباس بھی دو۔ اور ''وَيُوَسَّعُ لَهٗ قَبْرُهٗ مَدَّ بَصَرِهٖ.'' قبر اتنی وسیع کر دی جاتی ہے کہ جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے میدان ہی میدان نظر آتا ہے۔ آسمان تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے زمین سے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ قبر میں ہر انسان کو اتنا بڑا عالم ملے گا جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے۔ تو عالم برزخ میں دنیا جیسے لاکھوں عالم بن جائیں معلوم ہوا کہ انسان

ترقی کی طرف ہے۔ ①

برزخ میں پہنچ کر پھر انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ: ایک اور عالم آنے والا ہے جو اس سے بھی بڑا ہوگا۔ اور وہ محشر ہے۔ اس عالم کی کل عمر تو چند صدیوں کی ہوگی۔ اس عالم کا پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ ایک دن میں سارے اولین و آخرین انسان جمع ہونگے اسکے بعد پھر انبیاء علیہم السلام نے فرمایا کہ: ایک اور عالم آنے والا ہے جس کا نام جنت ہے وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ عالم برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں۔ اس لئے عالم برزخ میں ایک آدمی کو اتنا حصہ ملتا ہے جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے اور جنت میں ادنیٰ جنتی کو جو حصہ ملے گا اس دنیا کے دس گنا کے برابر ہوگا۔ تو اندازہ کیجئے جنت کتنا بڑا عالم ہے۔

تو انسان ''عالم الست'' سے چلا، عالم رحم میں آیا۔ عالم رِحم سے چلا، عالم دنیا میں آیا، عالم دِنیا سے چلا، عالمِ برزخ میں آیا۔ عالمِ برزخ سے منتقل ہوا، عالمِ محشر میں پہنچا۔ عالم حشر سے منتقل ہوا، جنت میں پہنچا۔ اور جنت میں روزانہ ترقی ہوگی، نئے نئے عالم انسان پر کھلیں گے' عجائبات ظاہر ہوں گے۔ طرح طرح کی نعمتیں نمایاں ہوں گی۔ اس لئے کہ انسان میں تجدد پسندی کا جذبہ ہے کہ نئی نئی چیزیں اس کے سامنے آنی چاہئیں۔ اگر ہمیشہ پرانی چیزیں رکھی رہیں، آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔ اگر روز پلاؤ کھانے کو ملے تو دوسرے دن جی گھبرا جائے۔ کسی دن دال، کسی دن چاول، کسی دن پلاؤ، روز نئی چیز ہو تو انسان کی طبیعت بہلتی رہتی ہے۔ اور روز ایک ہی غذا ہو، چاہے وہ اعلیٰ ہو تو بھی آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔

اس واسطے دنیا میں موٹر کاریں ہیں، ہر سال ان کا نیا ماڈل تیار کیا جاتا ہے۔ مکانات کے نقشے بدلتے رہتے ہیں۔ کل کچھ اور رنگ کا مکان تھا۔ آج اور رنگ کا۔ آج کل امریکن اسٹائل مکان چلے ہیں۔ ان کا کچھ اور ہی نمونہ ہے۔ سو برس کے بعد دنیا میں معلوم نہیں کیا نمونہ بن جائے۔ تو یہ انسان کی فطرت ہے کہ نئی نئی چیز سامنے آئے۔ جنت کی نعمتیں کتنی ہی پر لطف ہوں لیکن اگر ایک ہی قسم کی نعمتیں ہوتیں اور ابدالآباد تک رہتیں، تو آدمی گھبرا جاتا اس لئے روز نئے نئے سامان ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ: جنت میں ایک عالیشان محل ہے۔ جس میں انسان مقیم ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو نگاہ اٹھاتا ہے اب تک معلوم تھا کہ سبز رنگ ہے۔ دوبارہ جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اب سرخ ہوگیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نگاہ کی معلوم ہوگا کہ زرد رنگ ہوگیا۔ تو محلات کے رنگ نئے نئے آتے رہیں گے۔ نئے نئے جہان کھلتے رہیں گے۔ نئی نئی نعمتیں سامنے آتی رہیں گی۔ اور نشاط پہ نشاط پہنچتا رہے گا۔ معلوم ہوا کہ جنت میں بھی حرکت ہی رہے گی۔ اور ختم ہونے والی نہ ہوگی بلکہ عروج ہوتا رہے گا گویا اصل ترقی وہاں ہوگی۔

بہر حال مجھے ان ترقیات کی تفصیل بیان کرنا نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ انسان حرکت میں ہے۔ اب بھی آپ حرکت میں ہیں۔ قبرستان میں بھی حرکت میں رہیں گے۔ جنت میں جا کر عالم متعین ہو جائے گا۔ مگر نعمتوں

اور لذائذ کی ترقی جاری رہے گی تو اتنی لمبی حرکت کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ تھوڑی سی حرکت گھر سے مدرسہ اور خانقاہ تک کی جائے تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ چند گھنٹوں کی حرکت ہوتی ہے یہ تو ہزاروں برس کی حرکت ہے۔ تو اتنی طویل حرکت ہو اور بلا مقصد ہو۔ یہ عقل بالغ نہیں مانتی۔ عقل سلیم یہ قبول نہیں کرے گی کہ: انسان ایسے ہی بے کار حرکت کر رہا ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اللہ نے اسے عبث و بے کار پیدا نہیں فرمایا۔

زندگی کی حقیقت...... بلکہ یہ آپ کی زندگی، یہ خود ایک مستقل حرکت ہے، جو آدمی کے اندر بہت دور تک چلتی رہے گی۔ جب تک آدمی کا بدن حرکت کرتا رہے گا، کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ جب حرکت ختم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ آدمی مر چکا ہے۔ قلب حرکت کرتا رہے، کہتے ہیں کہ قلب زندہ ہے۔ اگر قلب کی حرکت ختم ہو جائے، تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تو حرکت بند ہو جانے کا نام موت اور حرکت کے جاری رہنے کا نام زندگی ہے۔ انسان کی آنتیں جب تک حرکت کرتی رہتی ہیں فضلات خارج ہوتے رہتے ہیں، آدمی تندرست رہتا ہے۔ اگر آنتیں حرکت نہ کریں، ان میں غذا پڑی رہے، قبض ہو جاتا ہے، وہی موت کا پیش خیمہ ہے۔ تو آنتیں، دل، جگر اور دماغ سب حرکت میں ہیں، حتیٰ کہ عقل انسانی بھی حرکت میں ہے۔ آدمی اس سے کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ پرسوں کیا ہوگا؟ گویا ہر وقت دماغ حرکت میں ہے۔ اگر حرکت بند ہو جائے، کہا جائے گا کہ فلاں آدمی بے وقوف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عقل نہیں۔ تو ایک ایک قوت اور عضو حرکت کرتا رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو نہ صرف انسان بلکہ زندگی بھی حرکت میں ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: انسان ازلی تو نہیں کہ ہمیشہ سے تھا، مگر ابدی ضروری ہے کہ پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں۔ ابدالآباد تک زندہ رہے گا۔ جگہیں بدلتی رہیں گی ایک عالَم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے عالَم میں۔ تو مکان اور جہاں بدلتے رہیں گے اور انسان باقی رہے گا۔

کیا مقصدِ زندگی خورد و نوش ہے؟...... تو اس قدر طویل زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مقصد بھی اتنا طویل ہونا چاہئے جتنا لمبا سفر ہے۔ سفر تو ہزاروں برس کا ہو اور مقصد معمولی سا ہو، وہ اس کے اوپر چسپاں نہیں ہوگا۔ مقصد اتنا اونچا اور بلند ہونا چاہئے جو اس کی لمبی عمر کے مناسب ہو، جتنا ہی بڑا سفر اتنا ہی بڑا اور شن ہونا چاہئے۔ تو وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے اور اتنا لمبا سفر اختیار کیا؟

فرض کیجئے یہ مقصد ہو کہ بس آپ روٹی کھا لیجئے۔ یہ بھی ایک مقصد ہے کہ کچھ پیسے جمع کیے، کچھ روٹیاں کھائیں کچھ مزے اڑائے۔ بس آدمی ختم ہو گیا۔ تو اتنا لمبا سفر اور اس کے لئے مقصد صرف روٹی۔؟ (كَلَّا وَ حَاشَا) روٹی تو جانور بھی کھاتے ہیں۔ پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ جو گائے، بھینس، بکری ہیں وہ سب اس مقصد کو ادا کر رہی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات اتنی بلند مخلوق اور اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ کہ روٹی

کھالے اور ختم ہو جائے۔(یا ایسے اسباب و وسائل میں زندگی گنوا دے جن کا نتیجہ بہر صورت روٹی ہو۔ مثلاً تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ، یا باقی اسباب معاش جو روٹی کو نتیجہ کے طور پر میسر کرتے ہوں) یہ کوئی اہم مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ اہم مقصد ہوتا تو جو اس مقصد کو زیادہ عمدگی سے انجام دیتا، وہ اشرف المخلوقات ہونا چاہئے تھا۔ وہ انسان نہیں ہوسکتا۔ اس لحاظ سے ہاتھی بھینس اور گائے وغیرہ اشرف المخلوقات بنتے۔ انسان نہ بنتا۔ یہ اتنا نہیں کھا سکتا جتنا یہ جانور کھاتے ہیں۔ اگر کھانے کے لئے بیٹھ جائے تو ہاتھی کے برابر نہیں کھا سکتا۔ نہ پیٹ اتنا ہے نہ ہاضمہ اس جیسا ہے۔ اس لئے اس طویل زندگی کا مقصد ظاہر ہے کہ وہ روٹی تو نہیں ہوسکتی۔ اتنی لمبی چوڑی حرکت کی زندگی، کیا محض اللہ نے اس لئے دی کہ چند لقمے کھالئے جائیں۔ یہ تو عارضی سی بات ہے پھر یہ کہ کھانے کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ بدن باقی رہے۔ اس کے باقی رہنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر مقصد کی تلاش شروع ہوگئی۔ تو روٹی اگر مقصد بنتی، وہ مستقل چیز بنتی، حالانکہ وہ بدن کے پالنے کا ذریعہ ہے۔ پھر سوال اپنی جگہ قائم، کہ روٹی بدن کے پلنے کا ذریعہ ہوتی۔ پھر بدن کے پلنے سے کیا مقصد؟

اور اگر فرض کیجئے روٹی مقصد ہو بھی تو اتنی لمبی چوڑی عمر اور یہ مقصد؟ یہ مقصد تو پھر جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ جانور بھی آخر کھاتے پیتے ہیں۔ اگر آپ نے کھا پی لیا تو کونسا کمال کیا؟

آپ کہیں گے صاحب ہم تو پلاؤ، زردہ اور مرغ کھاتے ہیں۔ جانور تو یہ نہیں کھاتے۔ میں کہتا ہوں کہ جانور کیوں مرغ نہیں کھاتے۔ کیا بلی مرغی نہیں کھاتی اور شیر، گائے کو نہیں پھاڑ کھاتا؟ آپ نے گائے کا گوشت کھالیا تو کیا کمال کیا؟ بھینسا وہ بھی کھالیتا ہے آپ بھی کھالیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مصالحہ نہیں ڈالتا تو مصالحہ ڈالنا بھی کون سے کمال کی بات ہے؟ مصالحوں سے تو بلکہ گوشت کا اصل ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ صحیح طور پر گوشت کو پکایا جائے۔ تھوڑا سا نمک مرچ ملا کے کھالیا گوشت کا اصل ذائقہ رہے گا۔ یہ مصالحوں کی بھرمار سے تو اصل ذائقہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہوائی جہاز کا کھانا بڑا اچھا ہوتا ہے۔ وہ گوشت کو خاص طریق سے پکاتے ہیں۔ نہ اس میں نمک، نہ مرچ، نہ مصالحہ۔ ترکاری سامنے رکھ دی۔ نمک مرچ ڈالو اور کھالو۔ اس طرح ترکاری کی اصل مٹھاس قائم رہتی ہے اور ہم اتنے مصالحے بھر دیتے ہیں کہ ترکاری کی اصل مٹھاس اور حلاوت ختم ہو جاتی ہے۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بھی مرغ کھایا اور بلی نے بھی مرغ کھالیا۔ اس نے اصل ذائقہ چکھا آپ نے بدلا ہوا۔ آپ تو گھاٹے میں رہے اور اس نے اصل گوشت کھایا۔ یہ کون سا کمال ہے؟ اگر یہ کمال ہوتا، پھر بلی بھی اشرف المخلوقات ہوتی۔ تو کھانا کوئی مستقل کمال نہیں۔ کھانا ضرورت کے لئے ہے تاکہ بدن باقی رہے اور کھانا کھاتے ہوئے انسان کا جی گھبراتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ کام زیادہ ہے کھانا وانا تو ہوتا ہی رہے گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کو اصل مقصد نہیں سمجھتے ہیں۔ تو کھانا کوئی اہم چیز نہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایسا طریقہ ہاتھ لگ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم کام کرتے رہیں، تو شاید کھانے کی طرف رخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات

ہے کہ بلا کھائے پیئے زندگی باقی نہیں رہتی۔

مجھے اس پر اپنے بزرگوں کی ایک حکایت یاد آ گئی۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جو میرے دادا بھی ہیں،ان کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی جنہوں نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔وہ یو۔پی میں سہارن پور کے ایک قصبے میں آئے اور آ کر انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلمانوں کا عالم میرے مقابلے میں مناظرہ کرنے کے لئے آئے۔اور یہ بھی اعلان کیا، کہ کسی چھوٹے موٹے عالم سے میں مقابلہ نہیں کروں گا۔مولبی کاسم (مولوی قاسم) کو بلاؤ۔ان سے مقابلہ کروں گا۔حضرت اس زمانے میں کچھ بیمار تھے مگر وہاں کے خدام نے لکھا کہ حضرت یہ صورت حال ہے اس لئے آپ ہی کو آنا ہوگا کیونکہ اس نے تو اعلان اور چیلنج کیا ہے کہ مولبی کاسم سے مناظرہ ہوگا۔اسی بیماری کی حالت میں حضرت تشریف لے گئے۔وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو آئیں گے نہیں۔جب حضرت پہنچ گئے تو جناب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جان کس طرح چھوٹے، بھاگوں کس طرح؟

منشی نہال احمد صاحب،حضرت کے خادم خاص تھے۔یہ بڑے ذہین وذکی تھے۔حضرت نے ان کو پنڈت جی کے پاس بھیجا کہ آپ جا کے مناظرہ کی شرائط طے کریں کہ کن احوال اور شرائط پر مناظرہ ہوگا۔کیا صورت اختیار کی جائے گی تا کہ پھر مناظرہ ہو سکے۔منشی صاحب پہنچے تو پنڈت جی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔انہوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں پنڈت جی تشریف رکھتے ہیں۔وہاں ایک بہت بڑی پرات (تھال) جس میں بہت سا حلوئی پوری،ترکاری اور بہت کچھ۔غرض دس پندرہ سیر وزن کا ملبہ اس کے اندر بھرا ہوا۔وہ لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کی خوراک تو نہ تھی،انہیں خیال گذرا کہ کمرے میں ایک آدمی تو نہیں ہوگا۔ایک آدمی آخر کتنا کھالے گا؟ پنڈت جی کے اعزاز میں بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔اس لئے یہ انتظار میں کمرہ سے باہر بیٹھے رہے۔کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ پرات آئی، وہ بالکل خالی تھی،وہ یہی سمجھے کہ کئی آدمی ہوں گے ایک آدمی تھوڑا اتنا کھا سکتا ہے۔اس کے بعد ان کو بلایا گیا، دیکھا کہ پنڈت جی اندر اکیلے بیٹھے ہیں۔یہ حیران ہوئے کہ ایک آدمی پندرہ بیس سیر کا ملبہ کس طرح کھا سکتا ہے؟ دل میں خیال کیا کہ جس کمرہ مین پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ممکن ہے اس میں کوئی دروازہ دوسری طرف ہو۔لوگ کھا کے ادھر سے نکل گئے ہوں،مگر وہاں تو کوئی دروازہ نہیں تھا۔یہی ایک دروازہ تھا جس سے یہ خود داخل ہوئے تھے۔پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ پنڈت جی کے ساتھ کسی اور نے بھی کھانا کھایا ہے۔لوگوں نے کہا کہ نہیں اور تو کوئی شریک نہیں تھا۔اب یہ حیران ہوئے کہ یہ ایک آدمی ہے یا آدمی سے باہر کوئی خاص قسم کا انسان یا جانور ہے جو اتنا کھا گیا (کہ خدا کی پناہ)۔

جب واپس آئے،انہوں نے حضرت کو شرائط بتلائیں۔اس کا سنانا تو مقصود نہیں ہے۔لیکن جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بات چیت کر چکے تو باہر آ کے اپنے ہمجولی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور

مولانا محمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت کے شاگرد اور ان کے ساتھ تھے، سے بات کی کہ بھائی مجھے تو ایک فکر پیدا ہو گیا ہے، بڑی پریشانی ہوگئی اور اس کا حل بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ سب ساتھی متوجہ ہوئے کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ پریشانی یہ ہے کہ جب مناظرہ ہوگا، حضرت انشاء اللہ جیتیں گے، اس لئے کہ حق پر ہیں اور مناظرہ علم میں ہوگا تو علم میں ہمارے حضرت سے بڑا کوئی عالم ہم نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ہی غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ لوگ ہنس کے چپ ہو گئے۔ شدہ شدہ بات حضرت کے پاس پہنچ گئی۔

حضرت نے انہیں بلایا۔ اور فرمایا منشی جی! آپ نے کیا بات کی؟ یہ بے چارے بہت گھبرائے اس لئے کہ مذاق کی بات تھی۔ اپنے دوستوں میں کردی۔ اب اپنے شیخ کے آگے خاموش۔! کہیں تو کیا کہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ: جو تم نے کہا ہے میں سن چکا ہوں۔ ذرا تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں تا کہ تمہیں جواب بھی بتلا دوں۔ اس لئے کہ تم نے یہ ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور حل طلب ہے۔ تو مجھے اس کا حل بھی بتلانا ہے۔ مگر اپنی زبان سے کہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت میری زبان سے یہ نکلا تھا، کہ اگر علم میں مناظرہ ہوا تو انشاء اللہ ہمارے حضرت غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ اس لئے کہ پنڈت تو بیس سیر کا ملبہ کھا جائے گا اور آپ سے آدھی چپاتی بھی نہیں کھائی جائے گی۔

حضرت نے فرمایا کہ: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک ہنسی کا جواب ہے اور ایک حقیقی اور تحقیقی جواب ہے۔ ہنسی کا الزامی جواب یہ ہے کہ کیا سارے مناظروں کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں تم لوگ کس کام کے لئے ہو؟ اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا۔ میں تم کو آگے کر دوں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ: تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ کھانے میں مناظرہ ہو تو کون جیتے گا؟۔ فرمایا کہ کھانا بھائم اور جانوروں کی علامت ہے، تو مناظرہ بہیمیت اور جہالت میں ہوتا ہے یا علم میں؟۔ فرمایا اگر بہیمیت میں مقابلہ ہوا تو ہم پنڈت جی کے مقابلے میں بھینسے، ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ ان کے مقابلہ میں جتنا کھاتے ہو؟

اور فرمایا کہ: تمہارے دل میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟۔ فرمایا اس کے لئے بھی ہم تیار ہیں کہ کھانا کھلانے کے بعد پنڈت جی بھی ایک کمرے میں بند کر دیئے جائیں اور ہمیں بھی بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد نکلیں جو زندہ ہوگا، وہ حق پر ہوگا۔ تو کھانا یہ بہائم کی عادت ہے جو جہالت کا سرچشمہ ہیں۔ اور نہ کھانا، یہ فرشتوں کی عادت ہے، جو علم کا سرچشمہ ہیں۔ اور مناظرہ علم میں ہوا کرتا ہے جہالت میں نہیں ہوا کرتا، جہالت میں مناظرہ ہوا تو جانوروں کو مقابلہ میں پیش کریں گے۔ علم میں مناظرہ ہوا تو ہم مناظرہ کریں گے۔

یہ بات اس پر یاد آ گئی تھی کہ انسان جب اشرف المخلوقات ہے تو کھانا کھانا اس کی کوئی ایسی خصوصیت نہیں

ہے کہ انسان ہی کھاتا ہو۔انسان سے زیادہ بھینسا بھی کھا سکتا ہے۔تو انسان کی زندگی کا یہ مقصد تو نہیں ہو سکتا کہ وہ روٹی کھالے۔اور مقصد حاصل ہو گیا۔اور اس لئے اتنا لمبا سفر کہ آدم علیہ السلام کی کمر سے نکلے۔ماں کے پیٹ میں آئے۔دنیا میں آئے اور مقصد یہ ہو کہ کچھ کھاپی لے۔یہ کیا مقصد ہوا؟ یہ کوئی اہم چیز نہیں، یہ تو بہیمیت کی علامت ہے۔گو انسان میں بہیمیت ہے اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ کھائے پیئے۔وہ بھی اچھا کھاتا پیتا ہے۔خوشنما بنا کے کھاتا پیتا ہے۔مگر مقصدِ زندگی یہ نہیں ہو سکتا۔

روحانی قوت کی کرشمہ سازیاں...... ملائکہ علیہم السلام زندہ ہیں۔وہ کون سا گوشت روٹی کھاتے ہیں؟ ذکر اللہ ہی سے تو زندہ ہیں۔اصل زندگی ذکر اللہ کا نام ہے۔چونکہ ہم اس کوچے سے واقف نہیں، ذکر اللہ کی کوئی کیفیت ہمارے قلب میں نہیں اس لئے ہم غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ زندگی کھانے پینے کا نام ہے ورنہ اصل میں زندگی محبوب کا نام لینا ہے کہ آدمی محبوب کا نام لے۔

اگر دنیا میں کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور محبوب چلا جائے۔وہ فراق و ہجر میں رو رہا ہے، پریشان ہو رہا ہے۔روتے روتے ضعیف ہو گیا ہے۔بالآخر چارپائی کو لگ گیا۔اچانک اس نے کہا، اوہ تیرا محبوب آ گیا۔ایک دم اٹھ کر بیٹھ جائے گا کہ کہاں ہے؟ یہ جو ایک دم جان آ گئی یہ کہاں سے آئی کیا کوئی روٹی کھالی تھی۔؟ کوئی پانی پیا تھا؟ محبوب کا نام ہی تو سامنے آیا۔معلوم ہوا کہ زندگی کی قوت درحقیقت محبوب کا وصال ہے، روٹی اور کپڑا یہ زندگی کی قوت نہیں ہے یہ تو عوارض میں سے ہے۔کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ

ہر چند کہ پیر و خستہ و ناتواں شدم   ہردم نگاہ بروئے تو کردم بس جواں شدم

میں بوڑھا بھی ہو گیا، خستہ و کمزور بھی ہو گیا، ناتواں بھی ہو گیا۔مگر جب تیرے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ایک دم جواں ہو جاتا ہوں، قوت آ جاتی ہے اس لئے کہ محبوب کا جمال جب دل میں کھپ جاتا ہے تو قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

دنیا میں آدمی جب ان چھوٹے چھوٹے محبوبوں کی قوت سے زندہ ہوتا ہے، اگر کسی کے دل میں اللہ کی محبت سما جائے تو اس کی زندگی کا کیا ٹھکانہ؟۔انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں اس لئے ان کی زندگی کی قوت محبوب کا نام اور اس کا ذکر ہے۔روٹی پانی سے انبیاء علیہم السلام زندہ نہیں ہیں۔ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔انبیاء علیہم السلام اگر ایک حبہ (دانہ) بھی نہ کھائیں، تو بھی ان کی زندگی میں فرق نہیں پڑ سکتا۔وہ اپنی عبدیت ظاہر کرنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور امت کے لئے سنت قائم کرنا مقصد ہوتا ہے۔کیونکہ اگر وہ عمل کر کے نہ دکھائیں ہم کس طرح سے کھائیں پیئیں؟ ہمارے لئے نمونہ کیا بنے؟ تو اسوہ حسنہ کے طور پر کھاتے ہیں۔زندگی کی بقاء کے لئے نہیں، وہ اللہ کے ذکر سے ہے۔

آج اگر ہمیں یہ مقام میسر آ جائے کہ ہم بھی ذکر اللہ سے زندہ رہ سکیں تو کبھی روٹی کی طرف رخ بھی نہ

کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے۔ ذکر اللہ سے ہم ناواقف، غلط فہمی میں مبتلا کہ زندگی روٹی سے قائم ہے اس لئے روٹی کی طرف لپکتے ہیں۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرے دادا، جنہوں نے دار العلوم دیوبند قائم کیا۔ اولیائے کاملین میں سے تھے، نے وفات سے دو مہینے پیشتر یہ فرمایا کہ ''بحمد اللہ مجھے زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ محض اِتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں، ورنہ حاجت نہیں''۔

یعنی ذکرِ خداوندی دل ودماغ کے اندر اتنا رچ چکا ہے کہ اب اسی سے زندہ ہوں۔ پھر بھی اِتباعِ سنت کے لئے کھاتے تھے، تاکہ اس پر بھی اجر وثواب مل جائے۔ اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا طریقہ آ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم زندہ رہیں۔ کبھی کھانے پینے کی طرف دھیان نہ کریں۔ کون اس مصیبت میں پڑے کہ صبح سے شام تک چولھا جھونکو۔ اور کھیتی کرو، وہاں سے غلہ آئے، وہ پسے، ایک مصیبت ہے۔ جب ہم اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا ضرورت اس مصیبت میں پڑنے کی؟

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول تو روٹی مقصد نہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اور اگر کسی درجہ میں ہوتا بھی تو یہ مقصد جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ انسان کو آخر اتنی بڑی زندگی کیوں دی گئی؟ یہ حقیر چیز ہے اور زندگی بڑی عظیم چیز ہے۔ عظیم چیز کے اوپر ایسا تھوڑا سا مقصد مرتب ہو۔ یہ حکمت خداوندی کے خلاف ہے۔

اصل میں کھانے کو چھوڑنا یہ کمال کی علامت ہے۔ کھانا کمال کی علامت نہیں انبیاء علیہم السلام بھی بقدر ضرورت کھاتے پیتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ تھی کہ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے، کھانے کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی، ہر وقت جہاد میں مشغول ہیں۔ بعض کے پاس بغل میں چند ٹکڑے پڑے ہوتے، وہ کھا لیتے تھے۔ اور بعض کے پاس وہ چند ٹکڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ کھجور کی چند گٹھلیاں ہی پڑی ہوتی تھیں جب بھوک نے بہت ستایا، بس وہ منہ میں ڈال کے نفس کو بہلا دیا کہ ہم بھی کچھ کھا لیں۔ ورنہ وہ کھانے کی کیا چیز ہوتی ہے۔ کھانا تو یہ تھا اور محنت اور جدوجہد یہ کہ چوبیس گھنٹے گھوڑے کی پشت پر سوار ہیں اور جہاد میں مصروف ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ کر رہے تھے۔ تو کمال انکا سمجھا جائے گا۔ جنہوں نے کھانا ترک کیا۔ کھانا کھانا کوئی کمال کی چیز نہیں۔ اہل کمال جتنے بھی ہیں، وہ کم ہی کھاتے تھے۔ اس لئے انبیاء نے کم کھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کم کھایا۔ حتی کہ اولیاء اللہ نے بھی کم کھایا۔

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ جو چشتیہ سلسلہ کے مشائخ میں سے ہیں، وہ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے، چالیس برس سے روزے رکھ رہا ہے اور کوئی روزہ نہیں چھوڑتا۔

شرّاح لکھتے ہیں کہ یہ خود حضرت شیخ قطب عالم ہی ہیں۔ تو چالیس برس تک پوری غذا کل یہ تھی کہ ایک بادام یومیہ کھاتے تھے۔ اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کو جب ذکر اللہ میں مشغول ہوتے، تو شہر میں اس طرح آواز

گونجتی تھی کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے پر ذکر کر رہے ہیں۔ یہ قوت کھانے کی نہ تھی یہ روحانی قوت تھی جو ذکر اللہ سے پیدا ہوتی تھی۔

اور حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وِصال رکھنا شروع کیا روزہ پر روزہ، بعض صحابہ نے بھی آپ کو دیکھ کر صوم وصال شروع کر دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ'' ① تم میں مجھ ایسا اور میری مثل کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے میرے اندر طاقت ہے۔ تو وہ کیا چیز کھلائی جاتی تھی؟ آسمان سے کوئی زردہ، پلاؤ اور بریانی کی رکابیاں نہیں اترتی تھیں۔ وہ ذکر اللہ کی طاقت تھی جو رگ و پے میں رچ بس گیا تھا اور سرایت کئے ہوئے تھا۔ یہ مادی قوت نہ تھی۔ اگر ساری عمر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لقمہ بھی استعمال نہ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں فرق نہیں آ سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے کھایا پیا ہے، تاکہ امت کے لئے نمونہ بن سکے۔ امت کے لئے راستہ بنے، جائز و ناجائز کا پتہ چلے، ورنہ کھانے کی محتاجگی نہیں تھی۔ حاصل یہ نکلا کہ کھانا پینا کمالی نہیں ہے۔ کھانے کو ترک کرنا کمال ہے۔ دنیا بھی اسی کو کمال سمجھتی ہے۔ اگر ایک شخص بہت کھاتا ہے تو کوئی خیال بھی نہیں کرے گا۔ اگر آپ کسی سے کہیں میں بہت باکمال ہوں اس لئے کہ میں بہت کھاتا ہوں تو وہ کہے گا۔ یہ کون سے کمال کی بات ہے؟ سبھی کھاتے ہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص نظر پڑے جو ہفتہ عشرہ تک کھانا نہیں کھاتا مخلوق اس کے پیچھے ہولے گی کہ معلوم ہوتا ہے ولی اللہ ہیں۔ معلوم ہوا دنیا بھی نہ کھانے کو کمال سمجھتی ہے۔ دنیا کے نزدیک کمال بھی کھانے کو ترک کرنا ہے۔ کھالینا یہ کمال نہیں۔ اسی لئے روزے کو اصل عبادت فرمایا گیا۔ روزہ میں ترک طعام ہے کھانا تو نیت سے عبادت بنتا ہے، اپنی ذات سے عبادت نہیں اور روزہ رکھنا یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اللہ کے ہاں بھی مقبولیت نہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے، کھانے سے نہیں ہوتی۔

تو اللہ والوں نے بہت ترک فرمایا ہے ہم تم اللہ والے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم صبح سے شام تک کھاتے رہتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ الگ، دوپہر کا کھانا الگ، شام کا الگ اور رات کا الگ۔ اور وہ اتفاق سے چار دفعہ کھانے کے بعد گنجائش نہیں ہوتی۔ ذرا بھی اور گنجائش ہوتی تو ایک دفعہ کا اور اضافہ کر لیتے۔ بہرحال یہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ کمال کھانے کو ترک کر دینا ہے۔ تو اتنی بڑی زندگی کا مقصد متعین کرنا ہوا اور وہ ہو کھانا، یہ تو آپ بھی کمال نہیں سمجھتے اسی واسطے یہ اتنی لمبی حرکت کی منزل مقصود روٹی نہیں بن سکتی۔

کیا مقصدِ زندگی عزّت واقتدار ہے؟...... پھر آخر کیا مقصد ہے؟ ہوسکتا ہے آپ کہیں دنیا میں اس سفر کا مقصد روٹی نہیں ہے، مگر کرسی، عزت، آبرو، جاہ واقتدار اور منزلت ہو۔ یہ روٹی سے بہرحال اونچے درجے کی چیز ہے آدمی اپنی عزت بچانے کی خاطر پیسہ اور روٹی داؤ پہ لگا دیتا ہے، تاکہ آبرو پر حرف نہ آئے، تو آبرو روٹی سے

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب التنکیر لمن اکثر الوصال، ج:۷، ص: ۱۷.

زیادہ اونچی چیز ہے۔

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ زندگی کا مقصد یہ عزت بھی نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے کہ جس کو آپ عزت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آپ کو اچھا سمجھیں بس یہی تو عزت ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ دوسرے یہ خیال کریں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی عزت خیالی چیز ہے۔ کسی نے خیال کرلیا کہ آپ بڑے ہیں تو بڑے بن گئے۔ کسی نے خیال نہ کیا، تو آپ چھوٹے کے چھوٹے رہ گئے۔ تو ایک بے بنیاد چیز ہے جس کا نام عزت ہے، خیالی چیز ہے۔ اور پھر خیال بھی دوسرے کا، اپنا نہیں۔ اگر اپنا خیال ہوتا، چلو صبح سے شام تک یہ خیال کئے بیٹھے رہتے کہ ہم بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے باعزت ہیں۔ یہ تو خیالی چیز ہے اور خیال بھی دوسرے کا، جس پر ہمیں قبضہ حاصل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا اگر خیال کئے بیٹھا رہے تو بڑے، ہوں گے اور اگر اس نے خیال یہ کرلیا کہ آپ بڑے نہیں، بس آپ حقیر ہوگئے۔ تو عزت ایک بے بنیاد چیز ہے، ایسی عزت، محض خیالی پلاؤ ہے اور کچھ نہیں۔

عزت فی الحقیقت اللہ کے ہاں مقبول ہونے کا نام ہے۔ عزت کسی کے خیال کر لینے کا نام نہیں ہے، اللہ جس کو قبول کرلے، وہ عزت ہے۔ جس کو رد کردے، وہ بے عزت ہے۔ عزت و ذلت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے اگر بندے سے عزت کرائیں تو اس کی خوشامد کرتے پھریں۔ تو ذلیل تو پہلے ہی تھے۔ اب ہاتھ جوڑتے پھریں کہ حضور میری عزت کی جائے۔ کیونکہ عزت سے پہلے ذلت ہے، اب خوشامد کے بعد اور ذلیل ہوگئے، عزت تو کیا ہونی تھی؟

اور اگر آپ ڈنڈا لے کر کہیں کہ میری عزت۔ وہ آپ کے ڈنڈا رسید کرے گا، کہ تو میری عزت کر۔ یہ تو پہلے سے زیادہ تذلیل ہوجائے گی۔ تو عزت نہ انسان کے دبانے سے ملتی ہے نہ خوشامد سے ملتی ہے۔ عزت خدا کی طرف سے ملتی ہے، جب کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، یا ان کا فرمانبردار بنے، وہ قبول کرلیں گے، ان کے قبول کرنے سے انسانوں میں مقبولیت پیدا ہوگی۔ یہ اصل عزت ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کسی سے راضی ہوتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی ہوجا۔ جبرئیل علیہ السلام راضی ہوجاتے ہیں تو آسمان میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں بندہ میرے ہاں مقبول بن گیا ہے (جو قبولیتِ خداوندی کی علامت ہے)۔ لہٰذا تم بھی اسے مقبول بناؤ، پھر سارے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں۔ سب فرشتوں میں اس کی عزت قائم ہوجاتی ہے۔ ان ملائکہ کے اثرات زمین کے ملائکہ کے اوپر پہنچتے ہیں، وہ بھی عزت کرنے لگتے ہیں۔ زمین کے ملائکہ کے اثرات اولیاء اللہ کے قلوب پر پڑتے ہیں۔ تو اللہ والے بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور جتنے لوگ اہل اللہ سے وابستہ ہیں، نیک ہیں، پھر ان کی وجہ سے عوام میں عزت آجاتی ہے، الغرض اس شخص کی مقبولیت پوری امت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ مقبولیت کب ہے؟ کہ پہلے اس کو اللہ مقبول بنائے، پھر

دوسروں کے اندراس کی مقبولیت پیدا ہوگی۔تو عزت یہ ہے کہ اللہ کسی کو مقبول فرمالے،اس سے راضی ہو جائے۔ انسان خیال باندھے کہ فلاں عزت والا ہے۔یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔تو عزت بنیاد والی کیا ہوگی؟ ورنہ دنیا میں انسانوں کی عزت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ ایک لیڈر کی ہے۔پبلک میں اس کی مقبولیت ہوئی تو گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور کل جو پبلک خفا ہوئی اور بدلی تو گلے میں جوتیوں کے ہار ڈال دیئے۔بے چارا بے عزت پھر رہا ہے۔اب اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔یہ کوئی عزت نہیں ہے۔عزت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ کسی کو عزت دے۔حق تعالیٰ قبول فرمالیں تو ہی عزت ہے۔اور حق تعالیٰ تب ہی قبول فرماتے ہیں،جب کوئی نیکی اختیار کرے۔ماُمورات کرے اور بدی سے بچے بدعمل و بدکار کبھی باعزت نہیں ہوسکتا۔تو اصل عزت نیکی ہے۔حق تعالیٰ کے سامنے جھکنے میں اور اس کی اطاعت میں ہے۔نہ یہ کہ لوگوں کے خیال میں آ جائے کہ یہ باعزت ہیں۔یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔اس لئے کہ کل ہے،پرسوں کو نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ زندگی کی اتنی لمبی چوڑی حرکت اس کا مقصد نہ تو روٹی بن سکتی ہے اور نہ کرسی اور عزت بن سکتی ہے۔اس لئے کہ روٹی بہائم کی علامت ہے اور اقتدار پسندی یہ خیالی چیز ہے۔تو زندگی تو حقیقی ہو اور اس کا مقصد محض خیالی ہو۔یہ بے جوڑ بات ہے۔سمجھ میں آنے والی نہیں ہے،حکمتِ خداوندی کے بھی خلاف ہے۔

مقصد زندگی قرآن کریم کی روشنی میں...... تو یہ دونوں مقصد نہیں بن سکتیں۔تو آخر مقصد کیا ہونا چاہئے۔ لمبی زندگی کا مقصد بھی،خود اتنا لمبا ہونا چاہئے جو زندگی کے ساتھ آخرت تک جائے۔یہ دونوں باتیں،روٹی اور کرسی لمبا مقصد نہیں۔اس لئے کہ روٹی آپ اس وقت تک کھائیں گے،جب تک دنیا میں موجود ہیں اور جب قبر میں پہنچ گئے تو روٹی تو رہ گئی اور زندگی آگے تک جارہی ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی آگے تک جاری ہے اور مقصد پہلے ہی ختم ہوگیا۔تو یہ مقصد کیسے بنے گا؟ اس طرح دنیا کا جاہ واقتدار تخیل اور خیال سے ہوتا ہے وہ بھی کوئی پائیدار چیز نہیں ہے۔جب انسان ختم ہوگیا اور یہاں سے منتقل ہوگیا،تو عزت بھی ختم ہوگئی۔ایک بادشاہ جب انتقال کر جاتا ہے،وہ اپنا سارا اقتدار دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔قبر میں اس کا اقتدار ساتھ نہیں جاتا۔اب زندگی باقی ہے اور حکومت ختم ہوگئی۔تو یہ اقتدار کیسے مقصد حیات بن سکتا ہے کہ زندگی تو آگے جارہی ہے اور مقصد پیچھے رہ گیا۔اس لئے نہ روٹی،نہ عزت واقتدار اور حکومت مقصد بن سکتی ہے،بلکہ صرف ایک چیز مقصد بن سکتی ہے،اس مقصد کو قرآن کریم نے پیش کیا۔فرمایا:﴿وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِيَعْبُدُوْنِ﴾ (۱) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اسی لئے پیدا کیا وہ میری عبادت اور اطاعت کریں''۔

انسان کی خِلقت اور پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے۔اگر ایک انسان عبادت میں لگ گیا۔اس نے زندگی کا مقصد پورا کرلیا عبادت میں نہ لگا،زندگی رائیگاں چلی گئی۔مقصد پورا نہ ہوا۔تو قرآن حکیم نے مقصد بتلایا کہ زندگی

(۱) پارہ:۲۷،سورۃ الذاریات،الآیۃ:۵۶.

کا مقصد فی الحقیقت اطاعت خداوندی اور عبادت خداوندی ہے۔ عبادت خداوندی ہوگی تو عزت بھی حاصل ہوگی۔ بھوکے نہیں رہو گے، روٹی بھی ملے گی۔ اصل مقصد یہ ہے۔ یہ مقصد کیوں ہے؟ اس لئے کہ روٹی اگر مقصد ہوتو عمر تو بہت آگے تک جارہی ہے اور روٹی قبر کے کنارے پر ختم ہوگئی۔ وہ مقصد کیا ہوا جو پوری عمر پر مرتب نہ ہو۔ مقصد وہ ہے کہ جب تک عمر چلے، مقصد بھی چلتا رہے۔ وہ مقصد، مقصد نہیں بن سکتا کہ عمر تو آگے تک چلے اور وسیلہ قبل از وقت ختم ہو جائے۔ اسی طرح سے خیالی عزت بھی قبر سے آگے نہیں جاسکتی۔ جب قبر میں ہم پہنچ گئے، کوئی ہمارے لئے (بڑے ہونے کا) خیال باندھے نہ باندھے، ہمارے لئے برابر ہے۔ وہاں تو اپنے عمل کا امتیاز ہوگا۔ وہاں یہ تھوڑا ہی دیکھا جائے گا کہ پبلک ہمارے لئے کیا خیال لئے ہوئے ہے؟ یہ نہیں دیکھا جائے گا۔

اَبدی زندگی کا اَبدی مقصد...... اور اگر اطاعت وعبادت مقصد ہو تو یہ فی الحقیقت لمبا چوڑا مقصد ہے جو پوری عمر پر مرتب ہوتا ہے کہ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے عبادت اس کے ساتھ رہے گی۔ قبر میں جب پہنچے گا، جب بھی عبادت موجود ہوگی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے تو فرمایا گیا کہ: ”**اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ.**“ ① ”انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں“۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”**کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی یُلَبِّیْ.**“ میں موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ”لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ“ کہتے ہوئے میدان عرفات کی طرف جارہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام حج بھی کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ②

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا، کہ وہ اونٹنی پر سوار ہیں اور وہ حج کررہے ہیں۔ اس اونٹنی کا لگام اون اور صوف کا ہے۔ ③ حدیث میں ہے کہ: آپ علیہ السلام نے طواف فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی طواف میں ساتھ تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص ”مَرْبُوْعُ الْقَامَةِ“ یعنی چوڑا سینہ اور بہت موزوں قد اور سرخ وسفید چہرہ جیسے گلاب کا پھول ہوتا ہے اور اتنا تروتازہ گویا ابھی حمام میں غسل کر کے نکلے ہیں کہ بالوں سے ابھی پانی ٹپک پڑے گا۔ اتنا شاداب اور تروتازہ اور نہایت حسین وجمیل چہرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون طواف کررہے ہیں؟ کہا یہ حضرت عیسی علیہ السلام مسیح اللہ ہیں معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام طواف بھی کرتے ہیں، لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے میدان عرفات میں بھی جاتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ قبر میں ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ ④

---

① المسند لابی یعلیٰ الموصلی، ج:۷، ص: ۴۴۵. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج:۲ ص: ۱۲۰ رقم: ۶۲۱ .

② شعب الایمان للامام البیهقی، ج:۹، ص: ۳۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب ج:۲ ص:۴۵۷ رقم: ۲۹۵۸.

③ شعب الایمان للامام البیهقی، ج:۹، ص: ۳۱.

④ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم، ج: ۱۱، ص: ۲۵۵.

تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو ذکر اللہ اور عبادت صراحتہ احادیث سے ثابت ہے۔ ہمارے آپ کے لئے اور عامتہ المومنین کیلئے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پیر سے عبادت کرتے ہیں۔ مگر ہاں ایک عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ عبادت ہم قلب سے کرتے ہیں۔ بدن تو رہتا نہیں۔ انبیاء کا تو بدن بھی محفوظ ہے، وہ تو بدن سے عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا بدن تو مٹ جاتا ہے۔ اس لئے بدنی عبادت نہیں رہے گی مگر روحی عبادت ہم بھی کرتے ہیں اور وہ قلب کے جذبے اور تخیل کی عبادت ہے۔ اس لئے کہ بدنی عبادت تو جب کریں جب بدن ہو۔ یہ عمل کا آلہ ہے۔ جب بدن نہیں رہے گا۔ آگے صرف روح ہی رہ جائے گی، روح عمل نہیں کرسکتی، مگر جذبات کی عبادت کرسکتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ: جب منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور دو تین سوال کرتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون ہے؟ وَمَا دِیْنُکَ؟ تیرا دین کیا تھا؟ وَمَنْ نَبِیُّکَ؟ تیرے نبی کون تھے؟ توحید رسالت اور شریعت، ان تینوں کا سوال ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا جب ملائکہ علیہم السلام مؤمن سے کہیں گے کہ ''مَنْ رَّبُّکَ''؟ تیرا پروردگار کون تھا؟ تو بموجب حدیث مؤمن کو جو اس وقت، وقت دکھلایا جائے گا۔ وہ ایسا ہوگا جیسے سورج غروب ہونے کو ہے اور دھوپ میں زردی چھا چکی ہے، دن ختم ہو چکا اور مغرب آنے والی ہے۔ ''یُتَمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ.'' قبر میں سورج کی صورتِ مثالی دکھلائی جائے گی۔ تو فرشتوں کے جواب میں یہ بندہ مؤمن کہے گا ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' میاں پرے ہٹو وقت تنگ ہو گیا ہے۔ میری نماز قضا ہونے کو ہے مغرب آ جائے گی۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے ''رب'' کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو یہ تو رب کی عبادت کرنے کو ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ بہر حال ہماری ڈیوٹی ہے جو انجام دینی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ جواب حق دے گا اس کا چہرہ اور عمل ہی بتلا رہا ہے۔ ①

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے وہاں بدنی عبادت تو نہیں کرسکتے، مگر تخیل کی عبادت تو کریں گے جذبہ یہ ہوگا تبھی ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' کہیں گے کہ میاں پرے ہٹو، نماز پڑھنے دو۔ اس پر فرشتے کہیں گے کہ اب نماز کا وقت نہیں یہ تو عالم برزخ ہے وہ جو نماز پڑھنے کی تکلیف دی گئی تھی، وہ دنیا میں دی گئی تھی۔ برزخ اور عالم آخرت میں یہ تکلیف نہیں دی گئی۔ اس وقت اسے پتہ چلے گا کہ یہ سورج کی صورت مثالی ہے۔ حقیقی دن نہیں ہے میں تو قبر کے اندر ہوں۔

مگر ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' کون کہے گا؟ جس نے دنیا میں نماز پڑھنے کی عادت ڈالی ہو۔ اگر دنیا میں نماز سے بے پرواہ رہے گا تو اس کی زبان سے ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' نہیں نکل سکے گا، کہ مغرب کا وقت آ رہا ہے اور مجھے نماز پڑھنے دو۔ اس لئے کہ زندگی میں روزانہ اصلی مغرب کی نماز کا وقت آتا تھا اور اسے نماز کی پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ تو جو یہاں بے پرواہ تھا، وہاں بھی بے پرواہ رہے گا۔ جسے یہاں پرواہ تھی، وہاں جا کر بھی پرواہ دار بنے گا۔ حدیث

---

① المصنف لعبدالرزاق، ج:۳، ص:۵۶۷. روایت حسن ہے، دیکھئے: ظلال الجنة ج:۲ ص:۱۱۶ رقم: ۱۷۱ باب فی القبر.

میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری''۔ اگر زندگی ذکر و عبادت میں گزاری ہے تو موت کے وقت بھی ذکر و عبادت کا ہی دھیان ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا جب بھی ذکر کا دھیان ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ: اگر کوئی حاجی میدان عرفات میں یا منی میں ''لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ'' کہتے ہوئے مرگیا۔ جب وہ میدانِ محشر میں قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک لبیک جاری ہوگا۔ ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ'' ①

وہ یہی سمجھے گا کہ میدان عرفات میں جارہا ہوں۔ آگے جاکے پتہ چلے گا کہ یہ تو میدان محشر ہے، میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر زبان سے لبیک کیوں نکلا؟ اس لئے کہ لبیک کہتے ہوئے انتقال کر گیا تھا اور لبیک کہتے ہوئے انتقال کیوں کیا؟ اس لئے کہ زندگی بھر یہ جذبہ تھا کہ کسی طرح حج کروں۔ تو جس حالت پر آدمی زندگی گزارتا ہے۔ اس حالت پر موت آتی ہے، قبر سے اٹھتے ہوئے بھی وہی حالت ہوگی۔ معلوم ہوا ذکر اللہ اور عبادتِ خداوندی وہ چیز ہے کہ دنیا میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ اور میدان محشر میں بھی ساتھ۔ اور جنت میں بھی ساتھ رہے گی حدیث میں ہے کہ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ اہل جنت کو تسبیح الہام کی جائے گی۔ بلا ارادہ سانس کیساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا۔ ارادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو یہ تکلیف نہیں دی جائے گی کہ تم بیٹھ کے ذکر اللہ کرو، عبادت کرو، نمازیں پڑھو، وہ تو عیش کی جگہ ہے، ہر وقت راحت ہوگی مگر ان کے دلوں میں الہام کیا جائے گا ''پاس انفاس'' جیسے ہوتا ہے، جو صوفیائے کرام نے ذکر بتلایا ہے، ذکر اللہ کی وہ صورت ہوگی۔ ہر وقت سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا، اصل غذا وہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی لیکن کھانے پینے کی محتاجگی نہیں ہوگی۔ تفریح طبع کے لئے کھائیں پئیں گے بھوک کی تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ جنت میں تکلیف کا کوئی نشان نہیں۔ ②

تو عبادت خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی، میدانِ محشر میں پہنچی اور جنت تک پہنچ گئی۔ یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے۔ اگر زندگی اَبدی ہے تو عبادت بھی اَبدی ہے۔ کھانا پینا اَبدی نہیں، یہ تو قبر تک ختم ہوگیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہوگا اور اگر کچھ کھانا پینا ہوگا بھی تو وہ ذکر اللہ ہی ہوگا۔ جنت میں کھانا پینا ہوگا، مگر محتاجگی نہیں ہوگی۔ اصل محتاجگی ذکر اللہ کی ہوگی اور وہ زبان پر جاری رہے گا۔

دنیوی زندگی کی روح...... زندگی کا مقصد بنانے کے اگر کوئی چیز لائق ہے تو وہ عبادات خداوندی ہے ذکر حق اور اطاعتِ خداوندی ہے۔ یہ چیز ہے جس سے انسان، انسان بنتا ہے۔ اکبر الہ آبادی ایک بڑے شاعر گزرے ہیں۔ جن کا ''لسان العصر'' لقب تھا۔ انہوں نے دو شعر کہے ہیں ۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الحج ،باب التلبية، ج: ۵، ص: ۴۴۵.

② الصحيح لمسلم، كتاب صفة نعيم الجنة وا هلها، باب في صفات الجنة واهلها... ج: ۱۳، ص: ۴۷۲.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جاتا ہے، راحت بھی گزر جاتی ہے۔ نہ یہ ابدی نہ وہ ابدی۔ تو اکبر نے کہا کہ مرنا جینا سب کے لئے ہے اور رنج و راحت وقتی چیز ہے۔ آتی ہے گزر جاتی ہے، لیکن ان اشعار میں مقصدِ زندگی نہیں آیا۔ یہ تو آ گیا کہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ سوال یہ ہے کہ پھر کا ہے کی طرف توجہ کرو؟ مقصدِ زندگی پھر کیا ہے؟ تو میں نے تین اشعار بڑھا دیئے ہیں اور ان میں مقصد ظاہر کیا گیا ہے۔ اکبر کے تو یہ (مندرجہ بالا) دو شعر ہیں۔ میرے دو شعر اکبر ہی کے مطابق ہیں کہ جن کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں۔

رہ گیا عزّ و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یہ خیالی چیز ہے، یہ لائق توجہ نہیں۔ اور۔

قابل ذکر ہی نہیں خورد و نوش یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ بہیمی کی علامت ہے۔ جانور بھی کھاتے ہیں۔ ہم بھی اسی کو کھا رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہے جو گلے پڑی ہوئی ہے۔ تو یہ مقصد نہیں۔ آگے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ۔

مقصد زندگی ہے اطاعتِ حق نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

اصل مقصد یہ ہے اطاعتِ خداوندی نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں اسی کو فرمایا گیا میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا، مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ نہیں۔ فرمایا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَـــأْكُـلُـوْنَ﴾ ① میں نے اس لئے پیدا کیا کہ خوب کھائیں، خوب مزے اڑائیں۔ یا یوں فرمایا ہو کہ اِلَّا یُعَزَّوْنَ یہ عزتوں کا خوب خیال باندھیں بلکہ فرمایا اِلَّا لِيَعْبُدُوْن. فقط میری عبادت کریں۔ آگے فرمایا میں ان سے رزق نہیں مانگتا، یہ ہوں کہ وہ عبادت کریں۔ اور فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰـهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ② رزق دینے والے ہم ہیں۔ طاقتوں کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

مطلب یہ کہ ایک کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں۔ ایک تم اپنے ذمے لو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہماری عبادت کرو۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تمہیں رزق دیں۔ تم عبادت کرنا ترک کرو گے ہم روٹی دینا ترک کر دیں گے۔ ہم تمہیں محتاج و مفلس کر دیں گے گویا، مقصدِ زندگی محض اور محض اطاعتِ حق ہے۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸.

شبہ کا جواب...... یہاں ممکن ہے کوئی سوال کرے اور سوال وہی کرسکتا ہے، جو قرآن شریف پڑھا ہوا اور قرآن شریف کے کچھ مقاصد اس کے سامنے ہوں کہ صاحب! قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد جانوروں کا بھی ہے۔ وہ بھی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① وئی چیز عالم میں ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ درخت اور اس کی شاخیں، آسمان وزمین، چاند وسورج سب اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ زبان سب کی الگ الگ ہے۔ تسبیحیں سب کی الگ الگ ہیں۔ مگر ہیں سب تسبیح میں مشغول۔ اب اگر کوئی فرانسیسی زبان میں اللہ کی یاد کرنے لگے، ہم نہیں سمجھیں گے۔ کوئی فارسی زبان میں مناجات کرنے لگے۔ غیر فارسی دان نہیں سمجھ پائے گا۔ کوئی عرب، عربی زبان میں دعا کرنے لگے۔ ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ جب ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان نہیں سمجھتے جو انسان اپنے بھائی بندوں کی زبان نہ سمجھے، وہ اگر جانوروں کی زبان نہ سمجھے تو تعجب کی کیا بات ہے؟ قرآن میں یہی تو فرمایا گیا کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ② تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ ان کی زبان الگ ہے، تمہاری زبان الگ ہے۔ پرندہ بظاہر تو سیٹیاں بجا رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ شیر دھاڑ رہا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لے رہا ہے۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لیتا ہے۔ شیر کی زبان دھاڑنا اور چنگھاڑنا ہے مگر وہ بھی تسبیح۔ اور پرندوں کی زبان سیٹیاں بجانا ہے۔ تم سیٹیاں سمجھتے ہو حقیقت میں تسبیح وتہلیل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے ہمیں واقف کر دے، تب ہمیں پتہ چلے گا کہ یہ تو وہی حمد وثناء کر رہے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ کبھی تار گھر میں ٹیلی گراف دینے کے لئے گئے ہوں گے۔ تو آپ نے تار لکھ کر آفیسر کو دے دیا، اس نے جو مشین پر ہاتھ رکھ کر پیتل کا جو کھٹکا ہوتا ہے اس کو حرکت دی تو وہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ شروع کی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بڑا احمق آدمی ہے، میں نے اسے کہا تھا کہ بھائی تار دے دے اور یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کھٹا کھٹ میں ہی سارے علوم اور معلومات دوسرے ملک پہنچ رہی ہیں۔ ظاہر میں کھٹا کھٹ معلوم ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذریعے سے جو خبر یا پیغام دیا ہے، وہ دوسرے ملک پہنچ رہا ہے۔ دیکھنے میں کھٹا کھٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح سے پرندہ ظاہر میں تو سیٹی بجاتا ہے مگر حقیقت میں وہ تسبیح کرتا ہے اللہ نے اسے شعور دیا ہے وہ عبادت کرتا ہے، جس طرح سے ہم تار کی اس آواز کو محض آواز ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے کہ اگر ہم اس فن کو جان لیں تو یہ کھٹا کھٹ نہیں، علوم ہیں۔ بالکل اسی طرح جانوروں کی بولی ہے اگر ہم کسی طرح سے سیکھ جائیں، تب ہمیں پتہ چلے کہ یہ حمد وثناء میں مصروف ہیں۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴.

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے پرندوں کی بولیوں کا علم دیا تھا، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ ① سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اے لوگو! ہمیں جانوروں کی بولیوں کی تعلیم اللہ کی طرف سے دی گئی ہے۔ کوئی جانور بولتا تھا، فرماتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے حدیث میں جانوروں کی تسبیحات بیان کی گئی ہیں کہ تیتر یہ تسبیح پڑھتا ہے۔ پندرہ مثالیں بیان کی گئیں۔ تیتر بولتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ." "جیسا کروگے ویسا بھروگے"، جیسی کرتوت ہوگی ویسے ہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ یہ اس کی تسبیح ہے۔ ②

حدیث میں ہے کہ: بعض ملائکہ علیہم السلام کی یہ تسبیح ہے "سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَزَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَآئِبِ" ③ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو چوٹیوں اور مینڈھیوں سے زینت دی۔ عورتوں کے لئے چوٹی اور مینڈھی رکھنا حسن ہے اور مرد کے لئے ڈاڑھی رکھنا حسن ہے۔ ہر ایک کا حسن الگ الگ ہے۔ مردانہ حسن ڈاڑھی سے اور زنانہ حسن چوٹی اور مینڈھیوں سے ہے۔ غرض بعض ملائکہ علیہم السلام کی تسبیح یہ ہے۔ تو مختلف طریقوں سے پرندے، چرندے اور درندے بلکہ ہر مخلوق کسی نہ کسی طرح کی تسبیح میں مشغول ہے۔ تو کوئی قرآن کریم پڑھنے والا ممکن ہے یہ سوال کرے کہ آپ نے انسان کو اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی زندگی کا مقصد عبادت اور ذکر اللہ بتایا ہے۔ وہ جانور، کنکریاں اور پتھر بھی کرتے ہیں، پھر انسان نے کیا کمال کیا جو ذکر اللہ اور عبادت کر لی؟ جیسے آپ نے یوں کہا تھا کہ گدھا، گائے اور جانور بھی کھانا کھاتے ہیں اگر انسان نے کھالیا تو کیا بڑی بات ہے؟ قرآن کریم کی رو سے ہم کہیں گے ذکر و اطاعتِ خداوندی جانور بھی کرتے ہیں اگر انسان نے کر لی تو کون سا کمال کیا؟ یہ کون سا بڑا مقصد ہے؟ تو ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ جانور بھی تسبیح و عبادت کرتے ہیں مگر وہ ارادی عبادت نہیں، وہ ارادہ سے عبادت نہیں کرتے یہ ان کی طبیعتوں کی فطرت کا تقاضا ہے، جیسے مشین چلتی ہے تو مشین ارادہ کر کے نہیں چلتی، ارادہ چلانے والے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سمجھ کر کہ یہ عبادت ہے اور اس کا ثمرہ نکلے گا۔ یہ عقل و شعور جانوروں کو نہیں دیا گیا۔ ارادی عبادت صرف انسان کرتا ہے، تو غیر اختیاری عبادت پر اجر و ثواب کچھ نہیں ملے گا۔ ارادہ اور اختیار سے کی ہوئی عبادت پر اجر و ثواب ملتا ہے اور انہیں افعال پر ترقی مدارج ہوتی ہے اور جو بلا ارادہ خود بخود ہو، اس پر نہ کوئی اجر و ثواب، نہ ہی ترقی مدارج کا وعدہ۔

حاصل یہ نکلا کہ جانور بھی عبادت کرتے ہیں مگر وہ غیر ارادی عبادت ہے، اس میں اختیار کا دخل نہیں۔ یہ ایک طبعی تقاضا ہے۔ جیسے ہم طبیعت کے تقاضے سے کھاتے پیتے ہیں، عقل و شعور سے نہیں کھاتے بھوک جو لگتی ہے تو

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔ ② تفسیر القرطبی، ج: ۱۳ ص: ۱۶۵۔ ③ یہ حدیث نہیں ہے، علامہ عجلونی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه الحاكم عن عائشة وذكره في تخريج احاديث سند الفردوس للحافظ بن حجر في اثناء حديث بلفظ: ملائكة السماء يستغفرون لذوائب دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۱ ص: ۴۴۴.

دلائل سے تھوڑا ہی لگتی ہے کہ آپ بیٹھ کر عقل سے سمجھیں کہ اس وقت مجھے بھوک لگنی چاہئے۔ اس میں یہ برکات اور یہ فوائد وغیرہ ہیں۔ لیکن بھوک جب لگے گی تو آپ لاکھ دلیل سے اسے روکنا چاہیں وہ تب بھی لگ کر رہے گی۔ جیسے انسان بے ارادہ کھاتا اور پیتا ہے اور اس پر اجر وثواب نہیں ایسے ہی اگر کوئی بے ارادہ عبادت کرے اس پر بھی کوئی اجر وثواب نہیں۔

انسان ارادہ، عقل وشعور سے اور اپنے معبود کو پہچان کر عبادت کرتا ہے اور اس کی یہ شان ہے، اس کے یہ کمالات ہیں اور یہ اس کی صفات ہیں، پھر حق عائد ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں۔ مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے مالک کو یاد کروں۔ دلائل سے سوچ کر، سمجھ کر، ارادہ اور اختیار سے عبادت کرتا ہے۔ کبوتر، کتا، بلی اس شعور سے عبادت نہیں کرتے۔ سیٹیاں بجانا ان کی طبیعت کے تقاضے کی تسبیح ہے۔ اس واسطے یہ فرق ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں حاصل یہ نکلا کہ اتنی لمبی چوڑی زندگی کا مقصد ارادی عبادت ہے، جو جانوروں کو میسر نہیں۔

دوسرے شبہ کا جواب...... مگر ایک سوال پھر بھی شاید آپ کے ذہن میں پیدا ہو کہ اچھا صاحب! یہ ہم نے مان لیا کہ جانور ارادی عبادت نہیں کرتے، یا اختیاری عبادت صرف انسان کرتا ہے، مگر ملائکہ علیہم السلام تو ارادہ سے عبادت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے معبود کو پہچان کر شعور سے عبادت کرتے ہیں اگر انسان نے عبادت کر لی تو کیا کمال کیا؟ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو فرشتے بھی کر رہے ہیں۔ پھر سوال وہیں کا وہی رہ گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ملائکہ علیہم السلام ارادہ سے عبادت کرتے ہیں، اختیار سے عبادت کرتے ہیں۔ لیکن ارادے کی کی ہوئی عبادت ہی ان کے نفس کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ ان میں گناہ کا مادہ نہیں، وہ برائی کر ہی نہیں سکتے، وہ جب کریں گے نیکی ہی کریں گے، جب کریں گے عبادت ہی کریں گے۔ تو وہ بھی ان کی طبیعت کا تقاضا ہوا فرق اتنا ہے کہ جانور طبیعت کے تقاضے سے بلا ارادہ عبادت کرتے ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام طبیعت کے تقاضے سے ارادی عبادت کرتے ہیں۔ تو دونوں جگہ طبیعت کا تقاضا ہے، فرشتوں کی طبیعت میں گناہ کا مادہ نہیں اور شر کا مادہ نہیں کہ وہ مقابلہ کر کے عبادت کریں، بس وہ عبادت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے، نفس چاہتا ہے کہ میں آرام سے پڑ کے سوؤں وہ کہتا نہیں لحاف اتار کے جا کر اپنے رب کی عبادت کر، سردیوں کے زمانے میں نفس کا تقاضا یہ ہے کہ گرم گرم لحاف میں پڑا رہے۔ مگر انسان اس گرمی کو چھوڑ کر لحاف کو اتار کر وضو کرتا ہے اور اسے ٹھنڈے گرم کی خبر نہیں، ہوا میں چل کر مسجد کی طرف آتا ہے، مسجد میں آنے کے بعد بھی اونگھ آ رہی ہے مگر پھر بھی وہ عبادت کرتا ہے۔ تو اس کی عبادت اپنے نفس کے مقابلے میں ہے۔ فرشتے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت نہیں کرتے۔ فرشتوں کے نفوس تو پاک ہیں۔ ان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ عبادت کرو۔ فرق ہو گیا۔ تو یہ عبادت زیادہ قابلِ قدر ہے جو اپنا مقابلہ کر کے کی جائے۔ اس لئے کہ طبعی تقاضوں کے مطابق کئے ہوئے کام زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہوتے۔

اگر آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑے اعلیٰ درجہ کا انسان ہوں اس لئے کہ میں روٹی کھایا کرتا ہوں۔لوگ کہیں گے کہ بھائی یہ کونسا کمال ہے؟ یہ تمہاری طبیعت کا تقاضا ہے،تم اسے پورا کرو گے ہی کوئی ایسا کام بتاؤ کہ تم نے اپنے نفس کے خلاف کر کے کیا ہو؟ اور اگر کسی کی نسبت یہ معلوم ہو کہ فلاں صاحب ایک ہفتے تک کھاتے ہی نہیں۔ دنیا پیچھے دوڑ پڑے گی کہ صاحب کوئی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔دنیا ہے کہ جھکی جا رہی ہے کیوں۔؟ اس لئے کہ نفس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔نفس کا تقاضا کھانا ہے اور وہ ایک ایک ہفتہ کھانا نہیں کھاتے تو کھانا کمال نہیں، نہ کھانا کمال ہے۔اس لئے فرشتہ اگر عبادت کرتا ہے تو نفس کے خلاف نہیں۔وہ ایسا ہے، جیسے ہم نے روٹی کھالی۔اگر طبیعت کے خلاف کر کے عبادت ہوتی تو کمال تھا اور قابل قدر تھا۔معلوم ہوا کہ انسان کی عبادت فرشتے کی عبادت سے زیادہ قابل قدر ہے۔وہ طبیعت کے تقاضے پورا کرتا ہے۔یہ طبیعت کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے۔اپنے کو پہلے ختم کرتا ہے پھر عبادت کرتا ہے۔یہ زیادہ قابل قدر ہے۔

گویا اس لمبی چوڑی زندگی کا مقصد یہ نکلا کہ عبادت ہو۔ارادی ہو اور نفس کی مخالفت کے ساتھ ہو۔یہ کام انسان ہی کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا اس واسطے فرمایا کہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں۔ایسی عبادات جو ارادی ہو اور نفس کی مخالفت سے ہو۔تو انسان کی عبادت ہی کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ملائکہ علیہم السلام اور دیگر مخلوقات سے بڑھی ہوئی ہے اور افضل ہے۔بہر حال مقصد زندگی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے، وہ صرف عبادت اور اطاعت خداوندی ہو سکتی ہے۔

طاعتِ خداوندی مقصدِ زندگی کیوں ہے؟......اس کی بناء اور حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، یہ سب آپ کے کام کی ہیں، چنانچہ سب آپ کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔زمین بھی آپ کے کام میں لگی ہوئی ہے۔سورج بھی آپ کے کام میں لگا ہوا ہے۔دریا بھی آپ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔الغرض کائنات کا ہر ذرہ اس کا خادم ہے اور حضرت انسان مخدوم ہے۔

اس لئے کہ انسان کی زندگی کا دارو مدار ان چیزوں پر ہے، ان میں سے ایک بھی نہ رہے، تو انسان باقی نہ رہے گا۔اگر سورج بالکل ہٹا دیا جائے، زندگی ختم ہو جائے گی۔نہ سورج نکلے گا، نہ چاند ہو گا، نہ حرارت اور گرمی باقی رہے گی۔انسان باقی نہیں رہ سکتا، زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔اسی طرح اگر دنیا میں سے ہوا کو کھینچ لیا جائے، ایک لمحے کے لئے بھی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا، سانس ہی نہیں چل سکتا۔تو زندگی ختم ہوگئی۔''عَلٰی هٰذَا الْقِيَاسِ'' دنیا میں پانی نہ رہے اور ایک قطرہ بوند بھی کسی کو نہ ملے، تو بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔غرض آگ، پانی، مٹی، ہوا، زمین سورج اور ستارے وغیرہ ذلک ان میں سے اگر ایک چیز بھی ختم کر دی جائے، انسانی زندگی ختم ہو جائے گی۔معلوم ہوا کہ ہر چیز انسان کے کام کی ہے، انسانوں کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔لیکن انسان خود ان میں سے کسی

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

کے بھی کام کا نہیں ہے۔ اگر سارے انسان ختم ہو جائیں۔ سورج کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اگر ایک بھی انسان باقی نہ رہے۔ زمین اسی طرح قائم رہے گی۔ آسمان اسی طرح قائم رہے گا۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ رہے۔ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور سارے انسان ختم ہو جائیں، ان چیزوں کا کچھ نہیں جاتا۔ معلوم ہوا کہ ساری چیزیں تو انسان کے کام کی ہیں۔ مگر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے۔ آخر دنیا کے کروڑوں انسان ختم ہو گئے اور یہ سب کچھ اسی طرح موجود ہے۔

انسان صرف اللہ کے کام کا ہے:..... انسان ان میں سے کسی کے کام کا بھی نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساری چیزیں انسان کے کام کی ہیں۔ آخر انسان کس کے کام کا ہے؟ جواب اس کا یہی ہے کہ جب انسان مخلوقات میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے، خالق کے کام کا ہوگا۔ اور خالق کا کام یہ ہے کہ اس کے سامنے اس کی اطاعت کرے، اس کے سامنے نیاز مندی برتے، عبادت کرے اور جھکے۔ تو انسانی زندگی کا مقصدِ اصلی نکل آیا جو اطاعت اور عبادتِ خداوندی ہے۔ اسی لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ کھانے اور پینے کا نظام قائم کیا گیا۔ کیونکہ انسان اس وقت تک عبادت نہیں کر سکتا۔ اس لئے غذائیں، پانی اور ہوا کو پیدا کیا۔ اسی طرح جب تک چاند نا نہ ہو، عبادت نہیں کر سکتا، اللہ نے سورج چاند کو پیدا کر دیا۔ درخت، جانور پہاڑ، پیدا کر دیئے۔ یہ سب کچھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان یہ سب کچھ استعمال کر کے تیار ہو جائے اور اپنے اللہ کی عبادت کرے۔ الغرض یہ سارے انتظامات انسان کے لئے اور انسان اپنے مالک کے لئے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص گھوڑا پالے۔ تو گھوڑے کے لئے اصطبل بنائے گا اور اصطبل کے لئے ایک سائیس رکھے گا، جو گھوڑے کی خدمت کرے گا۔ گھاس دانہ اس کے لئے مقرر کرے گا، اس کے لئے ملازم رکھے گا۔ یہ سارا گھوڑے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

اور گھوڑا کس کے لئے؟ صرف مالک کی سواری کے لئے۔ اگر سواری کے وقت گھوڑا شرارت کرنے لگے اور سواری کا کام نہ دے، گھوڑا کس کام کا؟ وہ تو گولی ماردینے کے قابل ہے۔ مالک کہے میں نے سارے انتظامات اس کے لئے کئے اور اس کو اپنے لئے رکھا۔ اگر میرے ہی کام کا یہ نہیں، تو یہ رکھنے کے قابل کہاں؟ اس لئے جب گھوڑا ختم ہو جائے گا، مالک اصطبل کو، سائیس کو، ملازم وغیرہ کو از خود ختم کر دے گا۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں گھوڑے کے لئے تھیں اور گھوڑے کا مقصد تھا کہ مالک کو سواری کا کام دے۔ جب وہ مقصد پورا نہیں ہوگا، گھوڑا بھی ختم، اصطبل بھی، سائیس بھی ختم۔

ہم اور آپ اس اصطبل میں موجود ہیں۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک اصطبل بنایا، جس میں غذائیں رکھیں۔ اصطبل کی چھت بھی بنائی، پھر اس میں آگ ہوا وغیرہ سب کچھ رکھا۔ یہ سب کچھ آپ کے لئے اور آپ کو اس لئے کہ مالک کی عبادت کریں۔ اگر انسان عبادت نہیں کرے گا، تو وہ گولی ماردینے کے قابل ہے۔ اور اگر سارے ہی

مل کر عبادت چھوڑ دیں، تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے، یہ اصطبل بھی ڈھا دیا جائے گا، اور اس میں جو سامان کھانے پینے کا ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے گا، اور اسی کا نام قیامت ہے۔

فرمایا گیا کہ قیامت اشرارِ خلق پر قائم ہوگی۔ ان لوگوں پر جو بدترین خلائق ہوں گے، جنہیں اچھے برے کی تمیز نہیں ہوگی، برسرِ بازار برائیاں کرتے پھریں گے جیسے جانور اور بہائم ہوتے ہیں۔ اللہ کی کوئی قدر قلوب میں باقی نہیں رہے گی۔ جب اس طرح کے انسان بن جائیں گے تو انسان ختم کر دیئے جائیں گے۔ آسمان بھی اٹھا دیا جائے گا زمین بھی ختم کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ جب تخلیقِ انسانی سے مقصدِ خداوندی ہی پورا نہیں ہوتا، پھر یہ چیزیں بھی بیکار ہیں۔ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اگر وہ مالک کے کام کا ہے تو ساری چیزیں برقرار ہیں۔ اگر وہ اپنے مالک کے کام کا نہیں، یہ ساری چیزیں ختم کر دی جائیں گی۔

عقلی اعتبار سے عبادتِ خداوندی کی ضرورت...... آپ اللہ سے لو لگائیں تو یہ ساری کائنات آپ کی خدمت کرے گی، لیکن اگر آپ اپنے مالک کو چھوڑ کر اس کائنات سے لو لگائیں تو مالک کا کیا بگڑے گا، وہ یہ چاہے گا کہ یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔

بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی صاحبِ جمال عورت سے نکاح کرے۔ بڑی شائستہ، مہذب اور حسین وجمیل ہو۔ اس کے لئے ایک عمدہ بلڈنگ تیار کی، تا کہ یہ عورت آرام کر سکے۔ بلڈنگ میں کچھ فراش مقرر کئے تا کہ وہ اس کو جھاڑیں اور صاف کریں۔ باورچی مقرر کئے تا کہ دو وقت کھانا پکائیں، تو اس نے یہ خیال کیا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، اس لئے ایک لمبا چوڑا تاج محل قائم کیا۔ بڑی لمبی چوڑی اور عالیشان بلڈنگ قائم کی۔ یہ سب کچھ کا ہے کے لئے؟ صرف بیوی کے لئے۔ اور بیوی کا ہے کے لئے؟ صرف خاوند کے لئے۔

اگر یہ بیوی خاوند کی بجائے کسی نوکر سے ملاقات شروع کر دے۔ یا اس محل میں باہر سے کوئی آدمی آنے لگے تو خاوند پر کیا گزرے گی؟ وہ کہے گا یہ بیوی طلاق دینے کے قابل ہے، بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے، اس نے تو میری آبرو ختم کر دی، تو وہ بیوی کو ختم کر دے گا۔ جب بیوی ختم ہو جائے گی، بلڈنگ کو کیا کرے گا؟ اسے بھی ختم کر دے گا اور جب بلڈنگ ہی نہ رہی، فراش کو رکھ کر کیا کرے گا؟ باورچی وغیرہ کس کام آئیں گے؟ یہ تو ساری چیزیں بیوی کے لئے تھیں۔ جب بیوی کو طلاق دے کے نکال دیا، ان چیزوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ یہ قصہ کب ہوگا؟ جب بیوی اپنے خاوند کی ہونے کی بجائے کسی دوسرے کی بننے لگے۔ فراشوں سے ہاتھ ملانے لگے، نوکروں سے آشنائی کرنے لگے، ایسے میں یہ بیوی نکال دینے ہی کے قابل ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اللہ نے انسان کو بڑی مخلوق بنایا۔ اللہ کو انسان سے اس سے بھی زیادہ محبت ہے، جتنی کہ ایک خاوند کو بیوی (بلکہ ماں کو بچے) سے ہو سکتی ہے۔ اس کی ضرورت کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے ایک بڑی بلڈنگ تیار کی اور آسمان کا خیمہ قائم کیا۔ اور زمین کا فرش بچھایا۔ ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ

فِرَاشًا﴾ ① ''زمین کو ہم نے تمہارے لئے فرش بنایا''۔﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ ② ''آسمان کو تمہارے لئے محفوظ چھت بنادیا''۔ روشنی کی ضرورت تھی تو چاند سورج کے بلب لٹکادیئے، تاکہ کائنات کے اندر روشنی ہو۔ کاروبار کے لئے تیز روشنی کی ضرورت تھی تو دن میں سورج نکال دیا۔ رات کو ہلکی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے تو چاند ستارے نکال دیئے۔ ان میں روشنی بھی ہے مگر آنکھوں میں چمک نہیں پیدا کرتی۔ تو رات میں دھیمی اور دن میں تیز روشنی رکھی۔ دن کاروبار کے لئے اور رات آرام کے لئے ہے۔ فرمایا﴿وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ ③۔ رات کو سکون کے لئے بنایا گیا، تاکہ آرام کیا جاسکے۔﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ ④۔ دن کو کام کاج کے لئے بنایا۔ تاکہ کارخانے لگا کر کام کریں، تو اس میں تیز روشنی رکھی۔ رات کو دھیمی روشنی رکھی۔ پانی کی ضرورت تھی، سو ہر طرف دریا بہادیئے۔ بارش سسٹم الگ قائم کیا تاکہ پانی ہر وقت ملتا رہے۔ مخلوق کو تکلیف نہ ہو۔ زمین کو فرش بنایا۔ یہ فرش بھی ہے اور گودام بھی ہے اس لئے کہ غذائیں اسی میں سے نکلتی چلی آرہی ہیں۔ گندم، چاول اور بے شمار نعمتیں بھی۔ تو یہ فرش اور بچھونا بھی اور ساتھ ہی گودام بھی کہ اس میں سارے غلے رکھے ہوئے ہیں۔ ساری ترکاریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بارش سسٹم بھی اسی میں ہے۔ دریا بھی اسی میں ہیں۔ پھر پانی آسمان میں نہیں ہے۔ زمین کے اندر ہے اور زمین کے بھی اوپر نہیں ہے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو۔ سورج کی روشنی تھی۔ گویا وہ ایک لالٹین اور چراغ ہے جس سے انسانوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ ایک گھڑی بھی جس سے صحیح اوقات معلوم ہوتے ہیں، جس روز سے اس کے مالک نے اس کو بنایا ہے۔ صحیح ٹائم دیتی چلی آرہی ہے۔ آج تک کبھی اس میں خرابی پیدا نہیں ہوئی اور ایک ہیٹر بھی جس سے گرمی پہنچ رہی ہے تو سورج ایک ہے مگر منافع اس کے بے شمار ہیں۔ اسی طرح زمین ایک ہے مگر اس کے منافع بے شمار ہیں۔

یہ سارا قصہ اس لئے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو، کھانے کو ملے، پینے کو ملے، ہوا ملے، تاکہ اس کے کام کاج میں کوئی خلل نہ پڑے۔ مگر یہ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اور انسان اپنے مالک کے لئے ہے، تاکہ اس کی اطاعت وعبادت کرے۔ اس لئے کہ سب کچھ دینے والے وہ ہیں اور محسن وہ ہیں۔ اس احسانِ عظیم کا بھی تقاضا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

عبادت وطاعت کا عام مفہوم...... اور پھر عبادت وطاعت کے مفہوم کو اتنا عام رکھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہوسکتی ہے اور اسے ایک مخصوص انداز کے ساتھ متعین نہیں کیا بلکہ اس کو اتنا آسان کردیا کہ مسلمانوں کی خدمت کرنا، دوستوں کی خدمت کرنا یہ بھی اللہ اللہ کرنا ہے۔ جو طاعت وعبادت میں داخل ہے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۲۔
③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۶۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ النبأ، الآیۃ: ۱۱۔

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم حج کو گئے تو اس سال وہاں ہیضہ بہت پھیلا، چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس حج کے موقع پر ہزاروں حجاج بے چارے اسی بیماری میں مبتلا تھے اور میرا یہ کام تھا کہ ایک کو دوا پلا رہا ہوں، تو ایک کے لئے کھانا لے کے آ رہا ہوں۔ بس خدمت میں لگا ہوا، نہ طواف کر سکتا تھا، نہ حرم میں حاضری ہو سکتی تھی۔ اتنا کام رہ گیا کہ کبھی کسی کو دوا پلا رہا ہوں تو کسی کو لوٹے میں پانی وغیرہ دے رہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض اسی پریشانی میں تھا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت حاجی حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے حال کی شکایت کی کہ حضرت میرا آنا نہ آنا تو برابر ہو گیا۔ کہ میں نہ تو طواف کے قابل، نہ مدینہ منورہ جانے کے قابل میرے ہاتھ میں تو بس دوا کا پیالہ ہے، اور بیماروں کے پاس پڑا ہوں۔ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح سے انگلی دبائی اور فرمایا۔ بیٹا یہ کیا بات کہی آپ نے؟ حج اور طواف بھی عبادت ہے، مگر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خدمت کرنا ہے، یہ عبادت ہے، تو اجر و ثواب اس سے کہیں زیادہ ملے گا جتنا حج اور طواف میں ملتا۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

آدمی اپنے دل کو قابو میں لائے کہ یہ سب سے بڑا حج ہے، تو فرمایا کہ حج کا فریضہ ادا کر لیا ہے۔ اب ان بیماروں کی خدمت کرو، ہزار طواف سے بڑھ کر اجر و ثواب ملے گا۔ جو طواف میں نہیں ملے گا۔ گویا بتلایا کہ عبادت فقط صدقہ اور نماز میں نہیں ہے۔ عبادت کی بہت سی شاخیں ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دار العلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور مولانا رفیع الدین صاحب جو سب سے پہلے مہتمم ہیں۔ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں اور صاحبِ کشف و کرامت بھی ہیں، اول الذکر دونوں حضرات بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی آئے، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تواضع کی اور عرض کیا کہ حضرت آپ بھی کھائیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرا تو روزہ ہے۔ نفلی روزہ تھا۔ غروبِ آفتاب میں کوئی دس منٹ باقی تھے، انہوں نے فرمایا کہ حضرت کھائیے۔ اللہ اس میں آپ کو زیادہ اجر دے گا۔ بس فوراً بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ روزہ توڑ دیا، حضرت فرماتے تھے کہ مجھے اس تعمیلِ حکم میں جو اجر ملا ہے اگر میں ہزار روزے بھی رکھتا تو وہ اجر و ثواب نہ ملتا، جو اس وقت روزہ توڑنے میں ملا۔

تو عبادت فقط نماز روزہ میں نہیں ہے، عبادت کھانے، پینے میں بھی ہے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے میں بھی ہے۔ گویا اللہ فقط مسجد میں نہیں ملتا۔ گھر میں بھی ملتا ہے۔ دستر خوان پر بھی ملتا ہے۔ ہر جگہ آدمی اللہ کا جمال دیکھ سکتا ہے، جبکہ سچی نیت سے چلے اور طریقِ شریعت کے مطابق چلے۔ اِتباع کا جذبہ لے کر چلے۔ تو ہر چیز اس کے لئے طاعت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اِسلام دنیوی معاملات سے روکنے کے لئے نہیں آیا..... حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ یہ ساری دنیا تمہارے لئے ہے اور تم اپنے مالک کے لئے ہو۔ مملوک کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کے سامنے نیاز مندی سے جھکے اور اطاعت کرے۔ جب آدمی اس میں مضبوط ہو جائے گا تو کوئی بھی دنیا کا کام کرے، اس میں خیر و برکت ہوگی۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کاروبار نہ کرو۔ دنیوی معاملات ترک کردو۔ اپنے تحفظ کی شکلیں اختیار نہ کرو۔ سب کچھ کرو مگر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کرو۔ عابد اور بندے بن کے کرو۔ یہ سمجھ کر کہ اسباب میں کچھ نہیں رکھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ہم نے یہ اسباب اختیار کئے ہیں۔ تو دینِ اسلام صرف درست کرنے کے لئے آیا ہے۔ آپ کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لئے نہیں آیا قلب کا رخ اللہ کی طرف پھیر لو اور کام ساری دنیا کے کرو۔ وہ خیر بنتے چلے جائیں گے۔ مسلمان کی شان یہ ہے، کہ دل بیار، دست بکار۔ دل مالک میں لگا ہوا ہے اور ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے کاروبار میں بھی برکت ہے، یہ عبادت ہی شمار ہوگی۔

تو اسلام کاروبار اور تجارت و زراعت کو روکنے کے لئے نہیں آیا۔ سب چیزوں کی اجازت دی مگر یہ کہ میرے ساتھ تعلق قائم کر کے میرے حکم کے مطابق چلو۔ اس لئے اسلام آیا ہے۔ اگر اپنے نفس کے حکم کے مطابق چلو گے تو نفس تو ہر ایک کا آزاد اور باغی ہے۔ ظاہر ہے اس سے نہ دنیا بنے گی نہ آخرت۔ اگر یہ ساری چیزیں حکمِ خداوندی کے تحت کریں تو اس میں خیر و برکت ہوگی۔ دنیا بھی بنی اور آخرت بھی بنی۔

تو دین کا کام قلب کا رخ درست کرنا ہے جب وہ درست ہو جائے گا، سارا راستہ درست ہوتا چلا جائے گا اور اگر خدانخواستہ وہ غلط ہوگا، سارے کام غلط ہوں گے۔ مثلاً آپ سفر میں جائیں اور دو چار ہزار میل کا سفر کیا، لیکن رخ بدل گیا تو جتنا سفر کرتے جاؤ گے منزلِ مقصود سے دور ہٹتے چلے جاؤ گے۔ تو سفر کی تیاری میں تو آپ نے کمی نہیں کی۔ روپیہ بھی خرچ کیا۔ سامان بھی لیا، لیکن بجائے اِدھر کے اُدھر چل پڑے۔ جانا تھا آپ کو نیروبی اور راستہ فرانس کا اختیار کر لیا اور اپنے دل میں یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ نیروبی جا رہا ہوں، جتنا چلو گے نیروبی سے دور ہوتے جاؤ گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ راستہ بھی چلو، روپیہ بھی خرچ کرو۔ مگر منزل متعین کر لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف چلنا ہے۔ آخرت کی طرف چلنا ہے۔ رخ صحیح کر لو ساری دنیا دین بنتی چلی جائے گی۔ اور رخ اللہ تعالیٰ سے پھیر لو۔ ساری چیزیں وبال بنتی چلی جائیں گی۔ خیر و برکت تو اس میں کیا ہوگی؟ اسلام کا کام راستہ درست کرنا اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہے اور یہی حاصلِ عبادت ہے، جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو فرمایا ﴿مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں اور عبادت کا مفہوم عام قرار دیا۔ اس لئے کھانا، پینا، سونا جاگنا بھی عبادت ہے۔ جب کہ منزلِ مقصود ہماری ذات کو ٹھہرا دیا جائے۔ بس مقصود یہ ہے کہ مسلمان کی منزل اللہ ہو۔ وہ ہر کام کرتا جائے، خدا کی طرف چلتا

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

جائے اس کا ہر کام باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ اور فرمایا: ﴿مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ﴾ ① ترجمہ: ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ہمیں رزق پہنچاؤ، تم ہمیں روٹی کھلاؤ، ہم تو غنی ہیں۔ روزی کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے وہ دینے والا ہے۔ ہم روزی نہیں مانگتے۔ تمہاری نیاز مندی چاہتے ہیں، روزی ہم دیں گے۔

اللہ اور بندہ میں معاہدہ...... تو ایک کام اللہ نے اپنے ذمہ لیا اور ایک کام بندہ کے ذمہ لگایا، اپنے ذمہ یہ کیا کہ ہم رزق دیں گے، عزت دیں گے۔ تمہارے ذمہ یہ کیا کہ تم عبادت کرو۔ نیاز مندی برتو۔ اب تم اپنا کام چھوڑ دو گے، وہ بھی اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ اس لئے جو عبادت ترک کر دے گا، تو روزی اور عزت، جو دیا جا رہا تھا، اس کو بھی بند کر دیا جائے گا۔ اگر اسی کام میں لگے رہے جو آپ کے سپرد کیا گیا، پھر وہ اپنا کام انجام دیں گے، گویا معاہدہ ہے۔ لیکن جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد پورا کرنا نہیں رہ جاتا۔ آج جو مسلمان پریشان ہیں کہ ہمارا غلبہ ختم ہو گیا، اِقتدار ختم ہو گیا۔ حاسدین ہم پر چھا گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے اپنا کام چھوڑ دیا، انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔

اور انہوں نے اس لئے نہیں چھوڑا کہ انکے خزانے میں کوئی کمی تھی۔ معاہدہ تھا کہ یہ کام تمہیں کرنا ہوگا اور یہ ہم کریں گے، جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد باقی نہیں رہے گا۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ آپ نے اطاعت کا عہد چھوڑ دیا، انہوں نے رزق دینے کا عہد چھوڑ دیا۔ رزق فقط روٹی کو نہیں کہتے۔ رزق، روٹی، عزت، اقتدار اور طمانیتِ قلب یہ سب کچھ اس میں آتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہم سب پریشان ہیں۔ روٹی ہمیں کھا رہی ہے اور ہم روٹی کو کھا رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس واسطے کہ وہ جو اطمینان قلب والی روزی تھی، وہ ملنا بند ہو گئی۔ وہ ہم سے چھین لی گئی۔ اس لئے چھین لی گئی کہ ہم نے عہد شکنی کی۔ تو یہ عہد یاد دلانے ہی کے لئے چند آیتیں پڑھی تھیں اور یہ وہی آیتیں ہیں جو اس عہد سے متعلق ہیں۔ یہیں سے آپ نے زندگی شروع کی ہے۔ یعنی عہد ''اَلَسْتُ'' سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ ② ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' میں تمہارا پالنے والا نہیں ہوں؟ تمہیں روزی اور عزت دینے والا نہیں ہوں؟ یہ ساری چیزیں رب میں داخل ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا اور سب نے کہا کہ ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ ③ ''کیوں نہیں بے شک آپ ہی رب ہیں''۔ سب کچھ آپ ہی ہیں۔ تو فرمایا ﴿شَھِدْنَآ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ﴾ ④ ''فرمایا کہ تم بھی گواہ رہو۔ کہیں قیامت کے دن یوں کہہ دو کہ ہمیں تو یہ بات ہی نہیں بتلائی''۔ ہم کس کی عبادت کرتے؟ کس کو رب مانتے؟ اس لئے ہم نے بتلا دیا اور سمجھا دیا۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲. ③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲. پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲. ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۳.

﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ ① ''یہ بھی مت کہنا کہ جو ہمارے پچھلے تھے وہ بہت برائیاں کر گئے۔ان کی وجہ سے ہمیں پتہ نہیں تھا''۔کسی کی برائی سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا،خود جو برائی کرے گا۔اس کی اس کو سزا ملے گی۔تو یہ نہ کہنا کہ ''اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا'' ہمارے ماں باپ نے شرک اور بت پرستی کی تھی،ہم تو بعد میں تھے،ہمیں کیوں پکڑا جاتا ہے۔جواب میں ہم بتلاتے ہیں کہ ماں باپ کی وجہ سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔جیسے ماں باپ سے عہد لیا تھا،تمہارے سے بھی عہد لیا تھا، ایک ایک فرد سے عہد لیا تھا۔انہوں نے اگر عہد شکنی کی تھی تو تم نے کیوں کی؟ قیامت کے دن یہ عذر نہیں چلے گا کہ پچھلوں کی برائی نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ہمیں تو کچھ پتہ نہیں تھا،ہم غفلت میں رہے۔

تو ہماری زندگی عہد الست سے چلی ہے۔جہاں اقرارِ ربوبیّت کیا تھا،اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں خالق اور مالک ہوں۔مجھے یاد رکھنا اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام آئے۔یہ روز کی تقریریں اور وعظ اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے ہیں،کہ یہ عہد بھول نہ جانا۔اس لئے جب بندہ اس عہد پر پکا رہے گا۔اور اس کے مطابق چلے گا،تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے عہد کو پورا کریں۔

بس یہ چند باتیں آیت کے تحت میں مجھے گزارش کرنی تھیں۔وقت زیادہ ہو گیا ہے۔اور بقدرِ ضرورت آیات کی تشریح بھی ہو گئی ہے۔اب دعا کیجئے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسنِ اخلاق،عبادت،ریاضت اور توجہ اِلی اللہ کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① پارہ:۹،سورۃ الاعراف،الآیۃ:۱۷۳۔

اِسلام میں تصورِ آخرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَـعْدُ !...... بزرگانِ محترم! دنیا اور آخرت دو چیزیں ہیں۔ آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے یہ تصوّر باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے اور دنیا یہ ہے، یہ غلط ہے۔ بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہمارا کام ہے یہی کھانے پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال، انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالَم ہے اور دنیا ترک کرو تب جا کے آخرت میں پہنچو گے۔ دنیا میں رہ کر اس میں سے آخرت نکالنا، یہ دانش مند کا کام ہے۔ یہ جو آپ نماز روزہ کرتے ہیں بدن ہی سے تو انجام دیتے ہیں، بدن زمانے میں ہے یا مکان میں ہے، تو اس میں سارے دنیوی ہی افعال ہیں۔ اس سے جنت بن رہی ہے۔ جنت اس نماز سے ہی تو نکلی جو آپ نے بدن سے سرانجام دی۔ آخرت کوئی الگ تو نہیں تھی۔

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ہزاروں نیکیاں لکھی گئیں، وہ ہزاروں نیکیاں جنت ہی تو ہیں۔ آپ کی اس دنیا ہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ افعال صحیح ہو کے آئیں، جنت یہیں سے بن جائے گی۔ افعال غلط ہو کے آئیں، تو جہنم یہیں سے بن جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانا ایک طبعی فعل ہے بھوک لگے گی تو آدمی خواہ مخواہ کھائے گا، لیکن اس نیت سے کھانے بیٹھے کہ قوت پیدا ہوگی تو عبادت کروں گا۔ اور "بِسْمِ اللّٰہِ" سے شروع کرے اور "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کَثِیْرًا" پر کھانا ختم کرے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔ حالانکہ کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے، گناہوں کا بخشا جانا یہی تو آخرت ہے اس لئے آخرت دنیا ہی میں ہوئی۔

حدیث میں ہے کہ دو بھائیوں نے مصافحہ کیا اور قلبی محبت سے کیا۔ دونوں کے منہ پر مسکراہٹ آ گئی اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ فرماتے ہیں کہ ہاتھ جدا نہیں کرنے پائیں گے کہ پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ایک

طبعی فعل انجام دیا مگر اس سے مغفرت ہوگئی بہرحال اس دنیا ہی سے ہماری آخرت نکلتی ہے۔

آخرت کے بارے میں اِسلام اور دیگر مذاہب کا فرق ...... یہیں سے دوسرے مذاہب اور اسلام میں فرق پڑ جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت دنیا سے بالکل الگ تھلگ کوئی چیز ہے۔ جب تک ترک دنیا نہیں کروگے آخرت نہیں ملے گی۔ مثلاً ہندو مذہب ہے، اس میں سنیاس لیتے ہیں کہ گھر بھی ترک کیا بیوی بچے بھی ترک کئے اور جا کر کسی کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت بن گئی۔

عیسائیوں کے ہاں ترکِ لذّات ایک مستقل موضوع ہے، کہ گرجا میں آدمی داخل ہو جائے اور یہ عہد کرلے کہ میں نکاح نہیں کروں گا۔ کسی سے ملنے بھی نہیں جاؤں گا۔ بالکل ترکِ دنیا کر کے ایک کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت ملی۔

اسلام نے ان سب چیزوں کو رد کر دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے بتایا کہ گوشے میں بیٹھ جانا پہاڑوں میں بیٹھ جانا، سمندر کے کناروں پر اپنے آپ کو گرا دینا، اس سے آخرت نہیں بنتی۔ دنیا میں رہ کر، لوگوں میں رہ کر، ان کی اڑی کڑی جھیل کر اصلاح کی کوشش کرے، اس سے آخرت بنے گی، اسی کھانے اور پینے سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ تم کھانا پینا چھوڑ دو۔ قرآن حکیم نے حکم دیا ﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے بنائی ہیں، انہیں استعمال کرو اور اعمالِ صالح اختیار کرو۔ جتنی نیت سچی ہوگی اسی میں سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو اور جنگل میں جا بیٹھو، تب آخرت بنے گی۔

اسی طرح لباس ہے تو بعض مذاہب میں ترکِ لباس ہے۔ صرف لنگوٹا باندھو فرض لباس بھی ترک کیا۔ اسلام نے ناجائز قرار دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ گوشہ گیری ہے یہ اسلام میں نہیں ہے لباس پہنو، موٹا پہنو، اچھا پہنو، نیت اچھی رکھو۔ اسی سے آخرت نکلے گی۔ تو کھانا پینا، رہنا سہنا، مکان بنانا، اس سے اسلام نے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ تھوڑی بہت زینت اور طبیعت کے موافق کرنے سے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا اس سے یہی چیزیں آخرت بنیں گی۔ تو اور مذاہب میں تو یہ کہ ترکِ دنیا سے آخرت بنتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر نیت صحیح کرنے سے آخرت بنتی ہے۔ انہی اَفعال میں سے آخرت بنے گی۔

اب مکان ہے۔ گیاہ میں ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے ہاں خدا رسیدہ وہ ہے جس کا نہ گھر ہو نہ در ہو۔ صبح کے وقت ان کے ہاں ایک لشکر نکلتا ہے۔ وہ گھر گھر کھانا مانگتے ہیں ان کے ہاں کھانا دانا نہیں پکتا، کسی نے بھیک دے دی، کھا لیا۔ اسلام نے اسے ممنوع قرار دیا کہ یہ کام نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے، بلکہ باوقار رہے۔ تو کھائے بھی، پیئے بھی، پہنے بھی، طیبات کو استعمال کرے اور نیت یہ رکھے کہ اپنی آخرت کے لئے کر رہا ہوں۔ حکمِ خداوندی ہے تعمیلِ حکم کر رہا ہوں۔ وہی چیز اجر کا ذریعہ بنے گی۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ بھک منگے بن جاؤ۔ دنیا کماؤ، اس سے اپنی خدمت کرو اور کسبِ حلال کو فرض قرار دیا۔ تجارت کرو۔ یہ راستہ دکھلایا نہ یہ کہ سب چیزیں

چھوڑ کر پہاڑ کے گوشے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ اعضاء کو مفلوج کر دو تو آخرت بن جاتی ہے۔ مثلاً ہاتھ اونچا کر دیا، وہ خشک ہو گیا اور وہ یہ سمجھے کہ اب آخرت بنی، اسلام نے کہا یہ لغویت ہے، اس سے آخرت کا کیا تعلق؟

یا بولنا چھوڑ دیا اس سے سمجھتے ہیں کہ آخرت بنی۔ اسلام نے کہا کہ یہ آخرت کیسی کہ ایک قوت کو ضائع ہی کر دیا۔ قوت سے کام لینے کا نام آخرت ہے نہ کہ قوت کو معطل چھوڑ دینے کا نام آخرت ہے۔

میرا ایک دفعہ ''گیاہ'' میں جانا ہوا' تو وہاں ایک بہت بڑا اور اونچا مندر ہے۔ اس میں بدھ کی تصویریں ہیں۔ اس کے بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ دیکھا کہ بدھ کا ایک بہت بڑا بت ہے اور لوگ اس کے ارد گرد گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ بہت سے پجاری چراغ جلا کر جا رہے ہیں۔ میں نے ایک پجاری سے پوچھا۔ اس گھی کو تم کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کوئی آدمی کھاوے گا تو اس کے بدن میں قوت پیدا ہو گی اسے کیوں خواہ مخواہ ضائع کر رہے ہو۔ اب وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ میں سمجھا کہ یہ بہرہ ہو گا میں نے ذرا زور سے کہا۔ وہ پھر بھی دیکھ رہا ہے جواب کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اور زور سے کہا' تو لوگوں نے مجھ سے کہا کیوں اپنا زور صرف کر رہے ہو۔ یہ جواب نہیں دے گا، ان کے ہاں چپ رہنا ایک عبادت ہے۔ یہ شخص چالیس برس سے نہیں بولا اور یہ پچاس برس سے نہیں بولا۔ تو زبان ایک قوت ہے اس کو ضائع کر دینے کا نام عبادت نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اس قوت سے ہی تو آخرت کماؤ گے۔ قوت ضائع کر دی، آدمی ناقص رہ گیا تو آخرت بھی ناقص۔ زبان کو استعمال کرو، تلاوتِ کلام پاک میں ، درود شریف پڑھنے میں اور عبادت میں لوگوں کی اصلاح میں نیک مشورے دینے میں اور سچی باتیں کہنے میں۔ اس میں قوت کو استعمال کرو۔ تو آخرت بنے گی۔ نہ یہ کہ قوت کو ختم کر دو اور بیکار بیٹھ جاؤ۔ اس سے تو بدی بنے گی۔

ہاتھ ہے آپ اس کے ساتھ مصافحہ کریں گے، اجر ملے گا۔ آخرت بنے گی۔ قرآن کریم کو ہاتھ لگائیں گے، اجر ملے گا۔ بیت اللہ شریف کو چھوئیں گے، اجر ملے گا، ہاتھ ہو گا جبھی تو اجر ملے گا۔ اور اگر ہاتھ کو اٹھا کر خشک کر دیا، قوت بھی ختم اور اجر بھی ختم ہو گیا۔ تو جتنے اجر و ثواب کے راستے تھے وہ سارے بند ہو گئے۔

اس طرح پیر کو مفلوج کر دیا۔ پیر ہو گا تو مسجد کی طرف جائیں گے دوستوں کے گھر بھی جائیں گے عبادت گاہوں میں بھی جائیں گے مجالسِ وعظ میں بھی جائیں گے۔ اس سے اجر و ثواب کے ڈھیر ملیں گے اور جو پیر کو کلہاڑا مار کے ختم کر دیا تو نہ مجلس رہی نہ مسجد کی طرف جانا رہا، نہ حج رہا۔ وہ کیا خاک اجر ملا؟

تو تمام مذاہب نے یہ کہا ہے کہ دنیا ترک کرو، تب آخرت ملے گی۔ بدن کو کھو دو تو آخرت ملے گی۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت پیدا کرو۔ ترکِ دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی نعمتوں کو چھوڑ دو۔ ہاں اس میں مبالغہ مت کرو۔ غلومت کرو۔ حد سے مت گزرو۔ اعتدال کے ساتھ استعمال کرو۔ اس سے اپنا بھی کام چلاؤ۔ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کی بھی خدمت کرو۔ تمہاری آخرت بنے گی۔ تو یہ نیت پر اور افعالِ اختیاری پر ہے کہ مرضی

خداوندی کے مطابق وہ افعال ہوں گے تو دنیا ہی آخرت بنے گی۔

افعالِ دنیوی کے بارے میں اسلام کا نظریہ...... اب دنیا کے بڑے افعال سونا، جاگنا، کھانا، پینا، رہنا، سہنا اور مکان بنانا۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے نعمت شمار کیا ہے فرمایا ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ ① اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرے اس نے جو پاکیزہ غذائیں اور لباس دیئے ہیں۔ کون ہے جو انہیں حرام کرے؟ ممانعت فرمادی کہ انہیں حرام مت قرار دو۔ البتہ حدود بتلادیں کہ ریشم کا کپڑا ہے۔ مرد کے لئے ناجائز عورت کے لئے جائز۔ زیوارت میں سونا، چاندی عورت کے لئے جائز۔ مرد کے لئے ناجائز تو حدود بتلادیں ان حدود میں رہ کر استعمال کئے جاؤ۔

مکان ہے اس کے بارے میں اللہ نے احسان جتلایا اور فرمایا کہ ﴿وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ ② اللہ نے تمہارے گھروں میں تمہارے لئے سکون اور سکونت رکھی ہے۔ گھر بناؤ، استعمال کرو۔ اور پھر آگے کپڑوں کا بھی گھر ہوتا ہے۔ یعنی کپڑے کا خیمہ۔ اور چمڑوں کا گھر بھی ہوتا ہے۔ یعنی چمڑے کا خیمہ، پتھر اور اینٹ کا گھر ہوتا ہے۔ ساری قسمیں گنوا کے احسان جتلایا۔ احسان اسی پر جتلاتے ہیں جو نعمت ہوتی ہے۔ مصیبتوں پر تو احسان نہیں جتلایا جاتا۔ مکانوں کو اللہ نے نعمت قرار دیا۔ تو کون ہے جو اللہ کی نعمتوں کو رد کرے؟ حدود میں رہ کر انہیں استعمال کرو۔ مبالغہ اور غلو نہ کرو۔ ایک عام شریعت میں جو راحت کے سامان ہیں۔ انہیں آدمی اپنے لئے مہیا کرے تو کھانا ہو، لباس ہو۔ بلکہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ "إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ يَرٰى أَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ" ③ اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس بندے پر دیکھے۔ تو ڈھنگ کا کھانا ہو، ڈھنگ کا پہننا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو یہ نہیں کہ پھٹے حال میں آدمی رہ رہا ہے۔ کوڑے کباڑ میں کھڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی نہ ستھرائی مکان بنانے کا حکم دیا، صفائی ستھرائی کا حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا اپنے گھروں کے صحن چوک بھی صاف رکھو، دالان کو صاف رکھو۔ سڑک تک کو صاف رکھو۔ لباس کی صفائی کا حکم دیا۔ صفائی اور ستھرائی اسلام کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ چیزیں چھڑائی نہیں گئیں حدود بتلادی گئیں کہ ان سے آگے نہ گزرو۔ تو ہماری آخرت اسی دنیا ہی سے نکلتی ہے۔ اس بدن ہی سے تو آخرت پیدا ہوگئی۔

اَعمالِ ایمانی کی خوشبو...... حدیث میں ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام روح کھینچنے کے لئے آتے ہیں تو ہاتھ پیروں کو سونگھتے ہیں کہ اس میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے۔ اعضاء کو سونگھتے ہیں۔ کیونکہ ایمانی افعال سرانجام دینے سے بدن میں خوشبو ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ آخرت میں محسوس ہو جائے گی۔

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۲۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰۔

③ السنن للترمذی، ابواب الادب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری، ج: ۱۰، ص: ۲۰۔

حدیث میں ہے کہ ''خُلُوْفُ فَمِ الصَّآئِمِ اَطْيَبُ عِنْدَاللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ'' ① روزے میں جب آدمی نہیں کھاتا تو منہ میں ایک قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک یہ منہ کی بو مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یہاں تو یہ بدبو ہے، وہاں یہ خوشبو۔ وہ خوشبو درحقیقت روزے کی ہے اور روزے میں خوشبو ایمان سے ہے۔ ورنہ ایمان نہ ہو تو روزہ فاقہ ہے۔ وہ ایمان ہی کی خوشبو ہے ملائکہ علیہم السلام بدن میں سے اسی خوشبو کو سونگھتے ہیں کہ کتنی خوشبو آ رہی ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوگا کہ آدمی کے ساتھ اعمال نہیں ہیں اور ملائکہ علیہم السلام نے بھی سمجھ لیا کہ یہ جہنم کے لائق ہے اور وہ ملائکہ آ گئے جو کفار کی روح قبض کرتے ہیں۔ ان کی شکلیں ہیبت ناک ہوں گی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اس کے بدن میں داخل کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پنڈلی سے ایک عمل چپکا ہوا تھا۔ اس نے کسی موقع پر ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' کہا ہے۔ نیکی ہاتھ لگ جاتی ہے تو ملائکہ رحمت کہیں گے کہ تم ہٹو ہم اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ اعمال اسی بدن ہی میں سے سرزد ہوئے۔ پنڈلی میں سے عمل نکلے گا جگر میں سے نکلے گا ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدمی دل کی قوت سے عمل کرتا ہے، تو دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کے کوئی عمل کرے تو گردوں کی طاقت سے آدمی کھڑا ہوتا ہے، اس عمل کا اثر گردوں پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑی بے جگری سے لڑتا ہے، خوب اس نے جہاد کیا۔ اس عمل کا تعلق جگر سے ہوگا۔ تو ہر عضو سے خاص اعمال متعلق ہیں۔ اور ملائکہ وہ پہچانتے ہیں۔ تو انہیں اعضاء میں اعمال کی تلاش کریں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کا عمل پنڈلی میں چھپا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ صاحب نیکی ہے۔ ملائکہ عذاب اس کی روح قبض نہیں کر سکتے۔ ہم اس کی روح قبض کریں گے۔ تو اسی عمل اور بدن ہی سے آخرت بنی۔

دربارِ خُداوندی کی پہلی پیشی...... اور یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد مؤمن کی روح آسمانوں پر چڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلے آسمان پر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور ستر ہزار ملائکہ علیہم السلام کے ہجوم کے ساتھ استقبال ہوتا ہے۔ ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ قطار کے بیچ میں سے اعزاز و اکرام کے ساتھ گزرتی ہے۔ پھر آسمانِ دوم کے مقربین اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر آسمانِ سوم کے مقربین اس کا استقبال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عرش پر پہنچ جاتا ہے۔ اور وہاں روح سجدہ کرتی ہے حق تعالیٰ ابتدائی خطاب ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ فرماتے ہیں، کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ کیا لے کے آیا؟

ایک عالم ہیں ان کی وفات ہوئی۔ تو بعض عارفین پر ان کا حال منکشف ہوا۔ حق تعالیٰ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو ڈانٹ کر فرمایا۔ کیوں آیا؟ کیا لے کر آیا؟ انہوں نے کہا میں ڈیڑھ سو قرآن شریف ختم کر کے لایا ہوں۔ فرمایا ایک بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے روزے رکھے، فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے تہجد پڑھے۔ فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ اب یہ حیران کہ کیا چیز پیش کروں اور ادھر سے مطالبہ کہ کیوں آیا؟ اخیر میں انہوں نے کہا کہ میں آپ کی رحمت کا

① الصحيح للبخاری، كتاب الصوم، باب فضل الصوم ج:٦ ص:٤٥٧.

سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ نہیں! فرمایا: اب بات ٹھکانے کی کہی۔ میری رحمت تیرے اوپر واجب ہوگئی۔ کسی وقت یہ نیت کی ہوگی وہ جا کر کام آ گئی۔

وسعت مغفرتِ خداوندی...... تو آدمی اپنے قلب کے رخ کو صحیح رکھے۔ عملی کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں ہر ایک میں کچھ نہ کچھ گناہ، بڑا ہو یا چھوٹا، ضرور ہوتا ہے۔ سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کے وہ تو معصوم ہیں۔ نبی کے بعد کوئی ایسا نہیں جس سے کوئی ذلّت یا خطا نہ ہوتی ہو اسی کو ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَاَیُّ عَبْدٍلَکَ لَا اَلَمَّا'' (۱) یا اللہ جب آپ کو بخشنا ہی ہے تو سارے گناہ کیوں نہیں آپ بخش دیتے۔ کون بندہ ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، آپ کے سامنے سارے گنہگار ہی ہیں۔

اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: فرمایا: ''رَبِّ مَغْفِرَتُکَ وَاسِعٌ مِّنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ'' (۲) اے میرے پروردگار تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت وسیع ہے۔ کہاں تک گناہ کروں۔ ہزار برس بھی کروں گا تو محدود ہوں گے۔ اور تیری رحمت کی کوئی حد ہی نہیں۔ میرے گناہوں کی تیری رحمت کے سامنے کیا قدر و قیمت ہے۔ نیز میرے عمل محدود ہیں۔ بلکہ کوئی چیز نہیں مگر تیری رحمت ان سے بہت وسیع ہے۔

توبہ کا راستہ نہ ترک کیا جائے...... بہر حال کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس سے کوئی غلطی اور خطا نہ ہوئی ہو۔ انبیاء علیہم السلام اس سے بری ہیں۔ اسی واسطے فضل ہی پر مدار ہے۔ تو جب فرماویں گے، جبھی مغفرت ہوگی۔ نیت اپنی یہ ہونی چاہئے کہ آدمی حق تعالیٰ پر بھروسہ کرے جب خطاء ہو توبہ کرے۔ گناہ سرزد ہوا فوراً توبہ کرلے تاکہ کھاتہ صاف ہوتا رہے۔ اصل چیز نیت ہے کہ آدمی کا رخ صحیح ہونا چاہئے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حدیثِ قدسی ہے کہ: اے بندے اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی اتنی (گناہوں سے کہیں بڑھ کر) مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو اصل چیز عظمتِ خداوندی ہے۔ آدمی وہ قائم رکھے جو وفادار ہوتا ہے وہ غلطی بھی کرتا ہے تو آقا کہتا ہے کہ اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اگر گناہ سرزد ہو، فوراً توبہ کرے۔ تاخیر ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ اگر گناہ کیا اور دل پہ جم گیا۔ پھر گناہ کرتا رہا۔ پھر توجہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ گناہ کے بعد معافی مانگ لے۔ اس سے قلب زنگ آلود نہیں ہوتا اور معصیت ڈھل جاتی ہے۔

---

(۱) السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ والنجم، ج: ۱۱، ص: ۹۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن الترمذی ج: ۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۳۲۸۴.

(۲) شعب الایمان للبیہقی، ج: ۱۵ ص: ۱۵۸. امام بیہقیؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال ابو عبداللہ: رواتہ مدنیون لایعرف واحد منهم بجرح.

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک آدمی نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور ندامت ہوئی تو کہا۔ ''یَارَبِّ''! ابھی یہ نہیں کہا کہ میری مغفرت کر دیجئے، فقط ''یَارَبِّ'' کہا۔ فوراً حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اَیَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یُّؤَاخِذُهٗ'' اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کرے گا۔ فرمایا: اگر یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ مغفرت مانگے۔ اس سے پہلے ہی مغفرت کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہی کہ اس کی مغفرت ہوگئی۔ آ کر پھر وہی گناہ کیا جو پہلے کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اس لئے آدمی سے جب غلطی ہو، فوراً توبہ کر لے، بس معاملہ صاف ہوگیا۔ (1)

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے راستے پر لگا ہوا آدمی ٹھوکر لگی، گر پڑا۔ اٹھا، کپڑے جھاڑ کر پھر چلنا شروع کر دیا۔ پھر گر پڑا پھر چلنا شروع کر دیا۔ بالآخر منزل تک پہنچ جائے گا اور جس نے گرتے ہی راستہ ہی بدل لیا۔ وہ نہیں پہنچے گا۔ تو راستہ نہ چھوڑا جائے۔ جس وقت گناہ سرزد ہو، توبہ کرے، ایک نہ ایک دن منزل پالے گا۔ اسی لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا ''سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَیْءٌ مِّنَ الدُّلْجَةِ'' (2) راستے پر لگے رہو۔ اعتدال کے ساتھ چلتے رہو، منزل کھوٹی مت کرو کہ منزل چھوڑ کے کسی سبزہ زار کے اوپر بیٹھ گئے۔ کسی باغ میں بیٹھ گئے بلکہ راستے پر چلتے رہو۔ ایک نہ ایک دن پہنچ جاؤ گے۔

توبہ کی قوت...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور شیطان کی دشمنی ٹھن گئی تو شیطان آدم علیہ السلام کا حاسد اور فریبی دشمن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تاجِ خلافت پہنا دیا گیا۔ جنتوں کے وعدے دیئے گئے۔ تو شیطان کو فکر ہوئی، اس نے کہا یا اللہ! آدم بہر حال میرا دشمن ہوگیا، میں اس کا دشمن اس کے پاس عقل بھی ہے اور اسباب ہدایت بھی ہیں۔ یہ تو میرا ناطقہ بند کر دے گا۔ کچھ قوت مجھے بھی دے دیجئے گا کہ میں اس پر غالب رہوں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: ''ہم نے تجھے اکثریت کی قوت دی''۔ آدم علیہ السلام کا اگر ایک بیٹا ہوگا، تو تیرے دس بیٹے ہوں گے۔ اس کے سو ہوں گے، تیرے ایک ہزار ہوں گے۔ تو ہمیشہ اکثریت میں رہے گا۔ یہ ایک ارب ہوں گے تو، تو دس ارب ہوگا۔ مگر وہ بھی بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے دیکھا کہ بعض دفعہ تو اقلیت بھی اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اکثریت ہی کا غلبہ ہو۔ اس نے عرض کیا۔ یا اللہ! بے شک میں اکثریت میں ہوگیا۔ لیکن اگر طاقت ور اقلیت ہو، وہ تو اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ اس لئے مجھے اور طاقت دیجئے۔ فرمایا: تجھے یہ طاقت دیتے ہیں کہ تو آدم کے بدن میں اس طرح سرایت کر سکے گا جیسے خون رگوں میں دوڑتا ہے۔ کہنے لگا۔ ''اب میں اسے پچھاڑ سکوں گا''۔ اس لئے اس کے اندر گھس کے قلب میں وسوسے ڈالوں گا، دماغ کو خراب کروں گا۔ اور جو چاہے

(1) الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: یریدون ان یبدّلوا کلام اللہ ج: ۲۳ ص: ۲۶.

(2) الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومة، ج: ۲۰، ص: ۹۹.

اندر جا کے کروں گا۔ اب مجھے طاقت مل گئی۔ اور وہ مطمئن ہو گیا۔

اب حضرت آدم علیہ السلام کو فکر پڑی کہ اس کمبخت کی یہ طاقت کہ میرے اندر گھس جائے، میرے اندر تو یہ طاقت نہیں کہ اس کے اندر گھس سکوں تو یہ غالب رہے گا اور سب کو جہنمی بنا دے گا۔ مجھے بھی تو کوئی قوت دیجئے۔ (میں بھی اس کا مقابلہ کر سکوں؟) حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''آدم کو بھی ہم ایک طاقت دیتے ہیں کہ شیطان کی ہزار برس کی کارروائیاں ایک دم میں سب ملیامیٹ ہو جائیں گی۔ اور وہ ایسے چت ہو گا کہ چاروں شانے لگ جائیں گے''۔ کفر تک کرلو، توبہ نصیب ہو، ایک منٹ میں سارا کفر ختم ہو جائے گا۔ جس نے سو برس کفر کرایا۔ تم نے ایک سچی توبہ کی۔ وہ سارا سو برس کا کفر ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری کارستانیاں ختم ہو جائیں گی۔ تو توبہ میں اتنی بڑی طاقت ہے کہ شیطان بھی اس سے عاجز ہے۔ اس لئے آدمی توبہ نہ چھوڑے۔ ذرا سی بات ہوئی فوراً توبہ کرے۔ بلکہ اِستغفار کو مستقل تسبیح کے طور پر پڑھے۔ کم از کم سو دفعہ روزانہ استغفار کرے۔ ''أَسْتَغْفِرُ اللهَ تَعَالٰی رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' ① سو دفعہ پڑھ لے۔ سو گناہ نہیں کرے گا مگر سو استغفار ہو جائیں گے۔ تو اس کے گناہ ختم ہوتے رہیں گے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، صرف دس منٹ کی بات ہے۔ صبح کی نماز کے بعد اگر سو دفعہ استغفار پڑھ لے۔ تو کوئی محنت نہیں مشقت نہیں۔ دن بھر میں آدمی سو گناہ نہیں کرتا، مگر توبائیں (توبہ کی جمع) سو ہو گئیں۔ انشاء اللہ سب گناہ ختم ہو جائیں گے۔

بہر حال قلب کا رخ صحیح رکھے اِعتدال کے ساتھ چلتا رہے۔ جب گناہ ہو معافی مانگ لے۔ ایک نہ ایک روز منزل پر پہنچ جائے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے۔ حسنِ اخلاق نصیب فرمادے اور خاتمہ بالخیر فرمادے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

① السنن الکبریٰ للبیهقی، ج: ۵، ص: ۲۸۶.

فضیلتِ یوم الجمعہ

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! میں اس وقت اپنی بعض مصروفیات کے وجہ سے آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا۔ اس کے علاوہ کچھ تعب تھکاوٹ وتکان بھی ہے۔ رات تقریباً دو اڑھائی گھنٹے بیان ہوا۔ اس وقت بھی ایک گھنٹہ کے قریب ایک نکاح کی مجلس میں بیان ہوا۔ اب کچھ بیان کرنے کی ہمت نہیں۔ لیکن چونکہ اعلان ہو چکا ہے، اس کا بھی احترام ضروری ہے۔ اسے واسطے تھوڑا سا وقت آپ حضرت کا لوں گا۔

سب سے پہلے سوال موضوع کا ہے کہ کس موضوع پر بیان کیا جائے اور میرے لئے یہ مستقل کام ہوتا ہے کہ کون سا موضوع منتخب کیا جائے۔ اس وقت سب سے بہتر موضوع وہی ہے جس کے لئے ہم اور آپ حاضر ہوئے ہیں اور وہ ہے نماز جمعہ، جو بہترین عبادت اور بہترین قربت بھی ہے۔

ایک حدیث...... اسی سلسلہ میں مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں اور وہ باتیں اپنی نہیں ہوں گی۔ بلکہ ایک حدیث شریف جو ذہن میں آ گئی اسی کو بیان کرنا ہے اور اس کا ترجمہ کرنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے، اس شان سے کہ ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس آئینہ کے وسط میں ایک سیاہ نقطہ تھا، جو بالکل ممتاز تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے جبرئیل! یہ سیاہ نقطہ کیسا ہے؟ اور یہ آئینہ کیسا ہے؟''

میدان مزید...... فرمایا کہ یہ سیاہ نقطہ مزید ہے۔ جس کے معنی زیادتی کے آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ الآیۃ: ۹.

فرمایا کہ مزید کیا ہے؟ عرض کیا یارسول اللہ! یہ جنت میں ایک میدان ہے اور جنت کے بالائی حصہ میں ہے۔ یعنی اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سب سے اوپر کا حصہ جو عرش کے نیچے ہے۔ اس میں ایک میدان ہے جو بالکل سفید ہے اس کی گھاس بھی سفید، درخت سفید، غرض ہر چیز سفید اور شفاف ہے۔ اور عرض کیا کہ یہ اتنا بڑا میدان ہے کہ ہزار ہا برس مجھے گھومتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ اب تک پوری طرح اس کی کنہ (اور حقیقت) کو نہیں پا سکا۔ ①

حدیث میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو اصل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ اس شان سے کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور مشرق سے کر مغرب تک ساری فضا ان کے بدن میں گھری ہوئی تھی۔ چھ چھ بازو تھے۔ سورج سے زیادہ روشن تاج ان کے سر پر تھا۔ اندازہ کیجئے کہ وہ میدان کتنا بڑا ہوگا جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ہزار ہا برس سے گھوم رہے ہیں لیکن ابھی تک پورا نہیں کر سکے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میدان کی غرض و غایت کیا ہوگی؟ عرض کیا کہ دربار خداوندی منعقد ہونے کا موقع ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کے منبر اس میدان میں بچھائے جائیں گے۔ گول دائرے کی شکل میں نور کے منبر ہوں گے۔ ہر نبی علیہ السلام کے منبر کے پیچھے امت کی کرسیاں ہوں گی۔ اور وہ پورا میدان ان بیٹھنے والوں کی کرسیوں سے بھر جائے گا۔ دنیا میں جتنا جس کو تعلق نبی اور دین سے تھا، اتنا ہی وہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگا۔ اور وہ کرسیاں اس شان سے ہوں گی کہ ایک کے دیکھنے میں دوسرا حائل نہیں ہوگا، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا، بڑی بڑی مجالس میں کرسیاں اس ترتیب سے بچھاتے ہیں۔ اگلی صف ذرا نیچی تا کہ ہر شخص بے تکلف سامنے اسٹیج کو دیکھ سکے۔ اس انداز سے کرسیاں بچھائی جائیں گی۔ میدان کے کناروں پر کرسیاں نہیں ہوں گی۔ بلکہ کچھ غالیچے، کچھ فانوس ہوں گے۔ اس طرح سے میدان بھر جائے گا۔ اب گویا دربار بن گیا کہ چہار طرف انبیاء علیہم السلام کے منبر ہیں، ان کی پشت پر کرسیاں ہیں۔ بیچ میں حق تعالیٰ شانہٗ کی کرسی آئے گی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ②

حدیث شریف میں اس کرسی کی عظمت و بڑائی بیان فرمائی گئی کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک میدان میں ایک چھلہ پڑا ہوا ہوتا ہے، اتنی عظیم کرسی ہے۔ آخر جس بادشاہ کی یہ کرسی ہے اس کی بڑائی اور عظمت کے مناسب اس کی شان ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کرسی و تخت پر بیٹھتے نہیں۔ وہ جسم سے بری اور صورت سے منزہ ہیں۔ لیکن ان کی صفت ''ملک'' بادشاہ ہے۔ چنانچہ بادشاہت کے جتنے لوازم ہیں، وہ سب جمع کئے گئے تختِ سلطنت بھی ہے جس کا نام عرشِ عظیم ہے۔ عرش مثل قُبّہ کے ہے جو ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور ڈھانپے ہوئے ہے۔ عرش کے اوپر رحمت کی تجلی مستوی ہے۔ فرمایا گیا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾

① تفسیر القرطبی، ج: ۲۲ ص: ۳۶۸. ② پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵.

تو عرش کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے اور عرش کائنات پر چھایا ہوا ہے۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے۔یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق قائم کیا ہے، وہ رحمت کے ساتھ ہے، غضب کے ساتھ نہیں۔غضب اگر سامنے آجائے تو مخلوق کا پتہ بھی نہ چلے۔رحمت ہی نے سنبھال رکھا ہے۔تو رحمت کی تجلی عرش پر مستوی ہے۔اس رحمت سے احکام پھوٹتے ہیں۔ہدایت ورہنمائی، کتبِ سماوی، قوانینِ خداوندی اور قضاو قدر سب وہیں سے چلتی ہیں۔جیسے ملک کی تمام تجاویز واحکامات تختِ سلطنت سے جاری ہوتے ہیں۔اسی طرح عرشِ عظیم سے تختِ سلطنت قائم کیا گیا۔عرش کے نیچے عظیم سمندر ہے جس پر عرش قائم ہے۔اس سمندر کے نیچے سو جنتیں ہیں۔ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔سو جنتوں کے نیچے پھر آسمان تہہ بتہہ ہیں اور اس کے نیچے پھر ہفت زمین تہہ بتہہ ہیں۔یہ کائنات کا ایک (عجیب) سلسلہ ہے کہ نیچے زمین، اوپر فضا، اس کے اوپر آسمان، اس کے اوپر جنتیں، اس کے اوپر سمندر اور اس کے اوپر عرش عظیم۔عرش پر پہنچ کر مخلوق کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔تو عرش اور جنتوں کے درمیان میں یہ میدان ہے۔جس کی عظمت و بڑائی یہ ہے کہ اس میں دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ بیچ میں کرسی حق بچھائی جائے گی۔ ①

میدانِ مزید میں اہلِ جنت کی حاضری......تمام اہلِ جنت اس دربار میں شرکت کے لئے اپنی اپنی سواریوں پر پہنچیں گے، ان کی سواریوں کی یہ شان آئی ہے کہ بعض تخت ہوا پر سوار ہوں گے، اُڑتے ہوئے تخت ہوں گے۔اور مختلف قسم کی سواریاں ہوں گی جن کے ذریعے اہل جنت پہنچیں گے اور ایسا وقت آئے گا کہ کل دربار منعقد ہوگا۔تمام اہلِ جنت جمع ہوں گے۔اور انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے منبروں پر ہوں گے۔بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہوگی جب سارا دربار جم جائے گا تو اب بندے محسوس کریں گے کہ اب تجلّیاتِ حق کا ظہور ہو رہا ہے۔گویا کرسی پر حق تعالیٰ کی تجلی مستوی ہے! حدیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح چرچرائے گی، جیسے بوجھ سے دب کر کوئی چیز ٹوٹنے کے قریب ہوتی ہے۔وہ ہیبت حق کا بوجھ ہوگا، کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔ ②

حدیث میں فرمایا گیا کہ داؤد علیہ السلام کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا۔اتنی پاکیزہ آواز تھی کہ جب وہ مناجات پڑھتے تو چرندو پرند ان کے اردگرد جمع ہو جاتے اور محو ہو جاتے۔انسان تو بجائے خود جانوروں پر بھی ایک غنودگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا جائے گا کہ ان تمام درباریوں کو اپنے مضمون سے مستفیض کریں۔حضرت داؤد علیہ السلام اس اعجازی خوش آوازی سے مناجات ومضامین پڑھیں گے کہ اہل جنت پر کیف طاری ہو جائے گا، جس طرح شراب طہور کا وعدہ فرمایا گیا۔

ملائکہ علیہم السلام کو فرمایا جائے گا کہ تقسیم کرو، یہ شرابِ طہور دنیا کی شراب جیسی نہیں ہوگی۔دنیا کی شراب میں

① تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۱۲۶.

② تفسیر الطبری ص:۳۶۸.

تلخی ہوتی ہے، اس میں شیرینی ہوگی۔ دنیا کی شراب سے عقلیں جاتی رہتی ہیں۔ اس سے عقلوں میں تیزی اور معرفت وبصیرت پیدا ہوگی۔ وہ سکر اس سکر کے مشابہہ ہوگا جو حضرات صوفیاء پر کثرت ذکر سے معرفت کا ایک نشہ سا طاری ہوتا ہے۔ اور ایک استغراق ہوتا ہے اس میں ان پر اَحوال وعلوم اور مواجید منکشف ہوتے ہیں۔ گویا دنیا میں جو معرفت کا سکر دیا گیا تھا، جنت میں ''شراب طہور'' اس کی صورتِ مثالی ہوگی۔ اسی طرح سے عقلوں پر کیف طاری ہوگا۔ روحوں میں بھی کیف بڑھے گا۔ معرفتِ خداوندی اور بصیرت بڑھتی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ علم کی احتیاج...... اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ''سَلُوْنِیْ مَاشِئْتُمْ'' (1) جو جس کا دل چاہے مانگے، طلب کرے۔ سب کو خطاب عام فرمایا جائے گا۔ تو سب مل کر عرض کریں گے کہ کونسی نعمت ہے جو آپ نے عطاء نہیں فرمادی۔ ہمیں ساری نعمتیں مل چکی ہیں۔ بس ہماری درخواست یہ ہے کہ اپنی رضا ہمیں عطاء فرمادیجئے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے یہ نعمت مل چکی اگر میں راضی نہ ہوتا تو تمہیں اس مقام پر گھسنے نہ دیتا۔ میں راضی ہوں اور ایسا راضی ہوں کہ ابدالآباد تک کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ مقام تمہیں مل چکا۔ کچھ اور مانگو۔ حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں مل گئی۔ اس وقت سب مل کر علماء کے طرف رجوع کریں گے۔ ان سے استفتاء کریں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں؟ ہمارے علم کے اعتبار سے تو ہر نعمت مل چکی ہے۔ گویا علم اور اہل علم کی احتیاج وہاں بھی باقی رہے گی۔ لوگ دنیا میں علماء سے مستغنی ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حاجت مندی وہاں بھی قائم رہے گی۔ وہ کسی کی ذات کی احتیاج نہیں ہوگی۔ وہ علم کی احتیاج ہوگی۔ اور ابدالآباد تک آدمی علم کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ جیسے ذات لامحدود ہے، اس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ انسان کتنے ہی بڑے مقامات طے کرلے، پھر بھی لامتناہی مقامات رہتے ہیں جن کی طلب رہے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قطعہ ہے جو وہ پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ جوں جوں مجھے زمانہ ادب سکھاتا ہے۔ مجھ پر میری عقل کا نقصان وارد ہوتا ہے، جو ادب کا مقام طے کیا تو سمجھ میں آیا کہ اب تک میری عقل نے یہ نہیں پایا تھا۔ اس مقام تک میری عقل ناقص ہے۔ پھر اگلا مقام طے ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اب تک میری عقل نہیں پاسکی تھی۔ اس طرح جوں جوں مقام ادب آتے رہے میری عقل کا نقصان مجھ پر واضح ہوتا رہا اور جیسے جیسے مراتبِ علم بڑھتے رہے۔ میری جہالت مجھ پر واضح ہوتی رہی۔ جب کسی علم کے مقام پر پہنچا، معلوم ہوا کہ اب تک میں اس سے جاہل تھا۔ مراتبِ علم کھل رہے ہیں تو میرے نفس کی جہالت کے مقامات بھی میرے نفس پر کھل رہے ہیں۔

لامحدود تک انسان جاہل اور محدود تک عالم ہوتا ہے، جو ہمیں معلومات ہیں وہ محدود ہیں۔ اور جو غیر معلوم چیزیں ہیں، وہ لامحدود ہیں۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ علم، انسان جتنا بھی پڑھتا جائے، چاہے وہ علم کے کروڑوں مقامات ہوں، پھر بھی ان گنت مقامات باقی رہیں گے، کیونکہ لامحدود کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لئے

---

(1) تفسیر القرطبی ج:۲۳ ص:۱۶.

میں نے عرض کیا کہ علم کی محتاجگی دنیا میں ہی نہیں، جنت میں بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ صفتِ خداوندی وہاں پہنچ کر محدود نہیں بن جائے گی۔ علم اور معرفت کے مقامات وہاں بھی لامحدود رہیں گے۔ تو لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ ساری نعمتیں مل گئیں کونسی چیز باقی ہے جو ہم مانگیں؟ علماء مل کر ایک مشورہ دیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے جو طلب کرو، وہ نہیں ملی اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ اپنا جمالِ مبارک دکھادے۔ دیدارِ خداوندی ابھی تک باقی ہے۔ یہ نعمت ابھی تک نہیں ملی۔ قرآن مجید میں وعدہ فرمایا گیا۔ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ ① بہت سے چہرے تر وتازہ اور شاداب ہوں گے، جو اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ جیسے کفار کے بارے میں دھمکی دی گئی ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ ② یہ (سیاہ چہرے والے) وہ لوگ ہیں کہ ان کے اور پروردگار کے درمیان حجابات حائل ہوں گے۔ یہ زیارت نہیں کرسکیں گے، انکے لئے ابدی محرومی ہوگی۔

تو دیدارِ خداوندی کا وعدہ دیا گیا۔ اس وعدے کا ظہور وہاں ہوگا۔ علماء مشورہ دیں گے کہ ایک نعمت رہ گئی ہے، وہ طلب کریں۔ ''اور وہ ہے دیدارِ خداوندی''۔ تو سب مل کر یک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ ہمیں یہ نعمت عطاء فرمادیجئے، اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ اسی کی تمنا میں ہم نے عبادتیں کیں۔ عمریں گزاردیں۔ مشاہدہ حق اصل مقصود تھا۔ اب اس مقام پر مشاہدہ نہ ہوا تو اور کون سا مقام ہوگا جہاں مشاہدہ حق ہوگا۔ درخواست قبول کرلی جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ صرف ایک حجابِ کبریائی اور عظمت کا باقی رہے گا۔ باقی سب حجاب اٹھ جائیں گے اور بندے اپنے خدا کو دیکھیں گے۔ اس شان سے کہ سمت ہے، نہ جہت ہے، نہ رنگ ہے اور پھر مشاہدہ ہو رہا ہے اور دیکھ رہے ہیں۔ یہ اس مزید کا موضوع ہے جس کا نام ''میدان مزید''۔ گویا درباری مقام ہے۔ یہ ایک حدیث ہے جس کا میں نے ترجمہ اور تفسیر آپ کے سامنے عرض کی۔ ③

دنیا میں ''میدان مزید'' کی مثال ...... یہ جنت میں میدانِ مزید ہے۔ اور ہفتے میں ایک بار اجتماع ہوگا۔ جب دربار ختم ہوگا تو اللہ تعالیٰ اہل جنت کو فرمائیں گے ''جاؤ اپنے اپنے مقامات پر''۔ اہل جنت واپس ہوں گے۔ جنت میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔

دنیا میں اس دربار کی مثال جمعہ کو رکھا گیا ہے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ دربارِ خداوندی ہے، جو دنیا میں منعقد ہوتا ہے۔ خطیب اور امام وہ نائب حق ہوتا ہے، جیسے کہ تجلّیاتِ ربانی کرسی پر ہوتی تھیں۔ یہاں خطیب منبر پر بیٹھتا ہے گویا وہ نمائندہ حق ہے اور خطبات کی تجلی اس میں ظہور کررہی ہے۔ اس لئے کہ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ انکے بعد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اس لئے حدیث میں آپ فرماتے ہیں ''اَنَا قَآئِدُهُمْ وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ'' ④ قیامت کے دن میں ہی ساری امتوں کا قائد اور میں ہی خطیب ہوں گا۔ میں ہی ان کے سامنے خطبہ دوں گا۔ تو

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۲۲-۲۳. ② پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۱۵.

③ تفسیر الطبری، ص: ۳۶۸. ④ سنن الدارمی، المقدمۃ، باب ما اعطی النبی من الفضل ج: ۱ ص: ۵۷.

انبیاء علیہم السلام اس تجلی کے بارے میں جو خطبات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے، نمائندگانِ حق ہیں۔ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ اس دنیا میں ان کا نمائندہ امام اور خطیب ہوتا ہے۔

خطبہ جمعہ کے آداب، عام خطبات سے زیادہ ہیں...... یہی وجہ ہے کہ عام مواعظ اور خطبوں کے جو آداب ہیں۔ اس خطبے کے آداب ان سے ممتاز ہیں۔ فرمایا گیا: ''**اِذَا خَـرَجَ الْاِمَـامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ**''
① خطبہ کے لئے جب امام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو، تو اب نہ سلام وکلام جائز ہے نہ نوافل پڑھنی جائز ہیں۔ صرف یہ کام ہے کہ امام کو خطبہ کی حالت میں دیکھو فرمایا گیا جو کنکریوں سے کھیلنے لگا، اس نے لغو حرکت کی۔ مکروہ کا ارتکاب کیا۔ عام وعظوں میں اگر کوئی کنکری اٹھالے، کوئی کراہت نہیں۔ لیکن خطبہ جمعہ میں اگر کنکریوں سے، یا چٹائی کے تیلوں سے کھیلنے لگے، اس پر نکیر کی گئی ہے۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز بھی جائز نہیں۔ تلاوتِ قرآن مجید بھی جائز نہیں درود شریف جیسی طاعت بھی جائز نہیں۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس وقت خطیب کو دیکھا جائے۔ اس کے خطبہ پر کان لگائے جائیں، جو زیادہ سے زیادہ اس کو دیکھنے کی عادت ڈالے گا، اسے میدانِ مزید میں زیادہ سے زیادہ حق تعالیٰ کا دیدار میسر ہوگا، وہاں تجلیاتِ حق سامنے ہوں گی۔ ②

اس لئے فرمایا گیا کہ جمعہ میں جو اذان سے پہلے اول وقت آ گیا۔ صف اولیٰ میں اسے جگہ ملی۔ وہ ایسا ہے۔ جیسے ایک اونٹ قربانی کا ذبح کر دیا۔ اس کے بعد اس سے کم درجہ ہے کہ گائے ذبح کی پھر اس سے کم درجہ ہے کہ بکرا ذبح کیا۔ اس کے بعد جو آیا وہ ایسا ہے کہ اس نے مرغی ذبح کی۔ جب امام خطبہ کے لئے کھڑا ہو گیا، تو ملائکہ علیہم السلام اپنے صحیفے لپیٹ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر درجات عالی کا کوئی مقام نہیں رہتا کہ اس میں نام لکھا جائے۔ ایسے میں جو آئے گا، بس اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اور جو یہاں صف اولی میں ہوگا وہاں بھی انبیاء علیہم السلام کے پیچھے صف اُولیٰ میں جگہ پائے گا، جو یہاں جتنا پیچھے ہو جائے گا، وہاں بھی اتنا ہی پیچھے ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر لگا تار تین جمعے چھوڑ دیئے، بلا کسی شرعی یا طبعی عذر کے، تو ظن غالب یہ ہے کہ پھر اسے عمر بھر جمعہ پڑھنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ جب تک سچی توبہ نہ کرے اور رجوع نہ کرے۔ تو جمعہ کی نماز بھی بے شک فرض ہے مگر عام فرائض سے اس میں کچھ زیادہ خصوصیت ہے۔ اور وہ خطبہ عام خطبوں سے بڑھ کر ایک نئی شان رکھتا ہے، جو امتیازی شان ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ ظہر کے چار فرض ہیں۔ جمعہ کے دو ہوتے ہیں دو فرضوں کے قائم مقام یہ دو خطبے ہوتے ہیں جو امام کھڑے ہو کر دیتا ہے۔ اسی لئے ان خطبوں کے آداب عام خطبات سے زائد ہیں کہ امام کو دیکھو، تلاوت

---

① تفسیر حقی، ج: ۴، ص: ۳۶۴. امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: اس کو حضورﷺ کی طرف منسوب کرنا کھلا وہم ہے یہ صرف امام زہری کا مقولہ ہے۔ دیکھئے: التمر المستطاب، باب صلاۃ الجمعہ ۶۲۵۔ نیز دیکھئے: نصب الرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ، باب صلاۃ الجمعہ ج: ۳ ص: ۳۶۴۔ ② تفسیر ابن کثیر، ج: ۱ ص: ۱۲۶.

مت کرو، عبادت بھی نہ کرو۔ بڑی عبادت یہ ہے کہ خطبہ سنو اور امام کو دیکھو۔ گویا یہ دو خطبے بمنزلہ نماز کے ہیں، تو چار رکعتیں ہو جاتی ہیں، اس شان سے کہ دو رکعتیں جمعہ کی اور دو رکعات ان خطبوں کے قائم مقام۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اس جمعہ کو دنیا میں میدان مزید کا نمونہ اتارا ہے۔ اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یَوْمُ الْمَزِیْدِ" ہے۔ اس لئے "یَوْمُ الْمَزِیْدِ" کہا گیا کہ یہ جنت کا میدان اس دنیا میں ہے۔ جنت میں جا کر میدان مزید وہاں کی شان کے مطابق ہوگا۔ تو ساری دنیا کے جمعے اور جامع مسجدیں مل کر میدان مزید کا دنیا میں ایک نقشہ ہیں۔ ان کے مجموعوں کو اٹھا کر آخرت میں لے جائیں گے اور یہ خطبے اوپر جنتوں میں پہنچائے جائیں گے۔ تو وہاں کے دربار خداوندی کا یہاں ایک نمونہ ہے۔ اسی واسطے جمعہ کو "سَیِّدُ الْاَیَّامِ" کہا گیا ہے کہ تمام دنوں کا سردار ہے۔ ①

حق تعالیٰ کا انتخاب...... حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَایَشَآءُ وَیَخْتَارُ﴾ ② تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے اپنے لئے چھانٹ لیتا ہے۔ سات آسمان بنائے، ساتویں کو پسند کیا، منتخب کر لیا، وہ مقبول زمین ہے جنتوں کی بنیاد ہے ساتویں آسمان پر جنتوں کا علاقہ ہے جو مقام کریم ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ③ ساتویں آسمان پر ہے، جو جبرئیل علیہ السلام کا مقام ہے اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ٥ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی﴾ ④ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی" کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی" ساتویں آسمان پر ہے۔ سدرہ کے پاس مقام جنت ہے تو جنتیوں کا علاقہ ساتویں آسمان سے شروع ہوتا ہے۔ سرکاری مہمان خانہ اسی میں بنا دیا گیا ہے۔ سات زمینیں پیدا کیں، تو اوپر کی زمین منتخب کی کہ وہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے، اور ساتویں زمین کی تہہ میں جہنم ہے، جیسے جنت سات آسمانوں سے بالاتر ہے، جہنم سات زمینوں سے نیچے ہے۔

قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا۔ آسمان توڑ دیئے جائیں گے تو جنتیں نمایاں ہو جائیں گی۔ زمینیں ختم کر دی جائیں گی تو جہنم نیچے سے نمایاں ہو جائے گی ﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ٥ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ﴾ ⑤ جہنم دھونکا دیا جائے گا اور جنتیں سامنے کر دی جائیں گی، زمینوں اور آسمانوں کے بیچ میں جو پردے حائل ہیں یہ سب توڑ پھوڑ کر برابر کر دیئے جائیں گے، تو زمینوں میں اوپر کی زمین کو اپنے لئے پسند کیا اور آسمانوں میں اوپر کے آسمان کو پسند کیا۔ پیدا کئے سات اور منتخب کر لیا ایک جنتیں سات پیدا کیں اور اپنے لئے جنت الفردوس کو پسند کیا، جو

① السنن لابن ماجه، كتاب اقامة الصلوة والسنة فيها، باب في فضل الجمعة، ج:٣ ص:٣٨٥. ② پارہ:٢٠، سورة القصص، الآية:٦٨. ③ الحديث اخرجه مسلم في صحيحه ولفظه: وهي في السماء السادس و اليها ينتهي مايعرج به من الارض... كتاب الايمان، باب في ذكر سدرة المنتهى، ج:١، ص:٤٠٥. ④ پارہ:٢٧، سورة النجم، الآية: ١٤، ١٥. ⑤ پارہ:٣٠، سورة التكوير، الآية: ١٢-١٣.

انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے اور سب سے اوپر جنت ہے۔ پہاڑ اللہ نے ہزاروں بنائے طور سیناء کو پسند کر لیا کہ اسے اپنی تجلی گاہ بنایا۔ دنیا میں اس کے شہر ہزاروں لاکھوں ہیں مگر "بلد الامین" کو پسند کر لیا جس میں حرم واقع ہے یعنی "مکۃ المکرمۃ" زمین کے ٹکڑے کروڑوں بنائے۔ سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا وہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں۔

ہمارے علماء لکھتے ہیں کہ وہ ٹکڑا عرش سے بھی افضل ہے اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عرش کو حق تعالیٰ سے نسبت ہے، مگر حق تعالیٰ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے پاک ہیں۔ اور وہ ٹکڑا جو قبر مبارک ہے اس کو بدن مبارک لگا ہوا ہے اور جس حصہ زمین کو بدنِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم چھو جائے وہ یقیناً عرش سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ عرش کو چھوئے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ وہ جسم سے بری وبالا ہیں۔ صرف ایک نسبت ہے اور یہاں نسبت نہیں بلکہ اتصال وملاپ ہے تو زمین کے ٹکڑے ہزاروں بنائے یہ زمین منتخب کر لی اور یہ ٹکڑا منتخب کر لیا۔

راتیں سات بنائیں اور "لَيْلَةُ الْقَدْرِ" کو پسند کر لیا اور فرمایا کہ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ ① لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ گویا ہزار مہینے جو شخص رات دن عبادت کرے، اس محنت سے جس مقام پر پہنچے گا، اگر لیلۃ القدر کو زندہ کیا، تو اس مقام پر ایک رات میں پہنچ سکے گا۔ تو لیلۃ القدر کو اپنے لئے پسند کر لیا۔ اسی طرح سے سات دن بنائے ان میں اپنے لئے یوم الجمعہ کو پسند کر لیا کہ ہمارے دربار کا دن ہے۔

جنت کا موسم...... جنت میں بھی اسی دن دربار ہوگا، حالانکہ جنت میں رات اور دن نہیں۔ وہاں تو یکساں ایک وقت رہے گا۔ وہاں سورج کی گردش نہیں ہے کہ رات اور دن بنیں۔ رات اور دن کا بننا۔ کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں، کبھی رات اور کبھی دن، یہ گردشِ آفتاب کے آثار ہیں۔

حدیث میں ہے جنت میں عرش کا چاندنا ہوگا۔ عرش کی نورانیت یکساں پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس نورانیت کی تمثیل اور تشریح دی گئی ہے کہ گرمی کے زمانہ میں صبح صادق کے بعد سورج نکلنے سے پہلے جب ٹھنڈی روشنی اور دودھ سا چاندنا ہوتا ہے، جنت میں روشنی کی یہ نوعیت نہ ہوگی کہ آدمی دھوپ میں نہ بیٹھ سکے۔ روشنی بھی ہے، ٹھنڈی بھی ہے، بردوسلام بھی ہے مگر تیزی نہیں ہے، وہ خوشگوار ہے، نگاہوں کو بھانے والی اور یکساں رہے گی، وہاں نہ رات ہے نہ دن ہے، نہ سونا ہے، بلکہ جاگنا ہی جاگنا ہے۔ اس لئے کہ سوجانا تھکن اور غفلت کی علامت ہے۔ وہاں تعب و تکان نہیں کہ آدمی پڑ کے سوجائے۔ وہاں تو رات دن کا عیش ہے اور رات دن کی بادشاہت ہے اس لئے نہ رات ہے نہ دن تعب [illegible] تو رات رکھی جاتی کہ آرام سے سوجاتے۔ جب تکان نہیں تو رات کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یکساں دن رہے گا۔

سَيِّدُ الْأَيَّامِ...... پھر یہ جو فرمایا گیا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ یعنی جنتی تمہارے یہاں

① پارہ: ۳۰ سورۃ القدر، الآیۃ: ۳۔

ایک ہفتہ کی مسافت و مدت ہوتی ہے اتنی مدت کا حساب لگالو۔ اتنے اتنے وقفے کے بعد دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ وہ ہفتے میں ایک بار سمجھ لیجئے اس لمحے کا نام مزید رکھا گیا ہے۔ دنیا میں ساتویں دن کا نام " یَوْمٌ مَّزِیْدٌ" رکھ دیا، جو دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ اس لئے اس کو "سَیِّدُ الْاَیَّامِ" فرمادیا گیا کہ یہ سب سے پاکیزہ، سب سے بڑا اور بہترین دن ہے۔ جتنے بھی عظیم واعظم امور ہیں وہ اسی دن میں ظاہر ہوئے فرمایا گیا۔ "فِیْهِ جُمِعَ طِیْنُ اٰدَمَ"

"جُمُعَۃٌ" اس کا مادہ (ج،م،ع) ہے۔ جامعیت کی شان جمعہ میں موجود ہے۔ منتشر چیزوں کو ایک جگہ جمع کردینا، بکھری ہوئی چیزوں کو ملا دینا یہ جمعہ کا مادہ ہے، جتنی بھی بڑی بڑی چیزیں منتشر تھیں، وہ اس دن میں جمع کی گئیں، آدم علیہ السلام کی مٹی جو پوری زمین سے لی گئی، وہ جمعہ کے دن ہی جمع کی گئی اوران کا پتلا بنایا گیا۔

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام جس دن جنت میں داخل کئے گئے، وہ جمعہ کا دن تھا۔ جنت سے زمین پر لائے گئے، وہ بھی جمعہ کا دن تھا، صحف آدم علیہ السلام آسمانوں سے اتارے گئے، وہ دن بھی جمعہ کا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں تفسیر بتلائی گئی اور حدیث میں زیادہ شرح ہے کہ چھ دن میں اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تیار کیا اور اس کے چھ دن تمہارے چھ ہزار سال کے برابر ہیں. ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ①

تو چھ ہزار سال میں کائنات تیار ہوئی۔ گویا اتوار سے بنی شروع ہوئی اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ اس میں زمین بچھائی گئی، پھر آسمان بنائے گئے، پھر زمین میں قوتیں رکھی گئیں، پھر جمادات ونباتات پیدا کئے گئے، پھر آسمانوں میں ستارے پیدا کئے گئے، اس کی تفصیلات آئی ہیں۔ جب ساری کائنات بن کر تیار ہوگئی، تو جمعہ کی آخری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا یہ زمین کا فرش بچھایا گیا، آسمان کا خیمہ تانا گیا، چاند ستاروں کے انڈے لٹکائے گئے۔ دریا جاری کئے گئے، غذائیں جمع کی گئیں۔ یہ کس کے لئے تھیں؟ "وَاِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ" ②

ساری دنیا انسان کے لئے بنائی گئی، انسان معبود کے لئے بنایا گیا۔ آپ جب کسی کو مہمان بلاتے ہیں تو پہلے آپ کوٹھی منتخب کرتے ہیں، وہاں مہمانداری کا سامان کرتے ہیں، کھانے کا، پینے کا، رہائش کا، جب سب کچھ مہیا ہوتا ہے تب کہتے ہیں کہ تشریف لائیے، تو مہمان آتا ہے۔ ساری چیزیں اس کے استعمال میں آتی ہیں۔ تو آدم علیہ السلام ساری دنیا کے مہمان ہیں، ان کو لانے سے پہلے ساری دنیا مکمل کردی گئی۔ زمین کو فرش بنادیا گیا، آسمان کو چھت بنادیا گیا، سورج اور چاند کے چراغ لٹکائے گئے تاکہ روشنی ہو اور پھر عجیب طریقے سے زمین کو گودام بنادیا، اس میں سے غذائیں نکل رہی ہیں، زمین کو واٹرورکس بنادیا، جس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ ایک صندوق

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۷. ② شعب الایمان للبیھقی، التاسع والثلوثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت ج: ۲۲ ص: ۶ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں یہ روایت منقطع ہے۔ دیکھئے تخریج احادیث الاحیاء، ج: ۷، ص: ۲۶۲.

بنا دیا، جس میں سے لباس بھی نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ تو زمین ساری ضروریات کا ذخیرہ ہے حتی کہ زندگی کا بھی اور موت کا بھی۔ اس سے آدمی پیدا ہوتا ہے اس میں کھپ جاتا ہے۔ ﴿مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى﴾ ①

''جمعہ'' میں شانِ جامعیت...... تو زمین ہماری قرارگاہ بھی ہے، ہماری موت گاہ بھی ہے، ہماری دنیا بھی ہے ہمارا برزخ بھی ہے۔ ساری چیزیں جمع کر دیں گئیں۔ اس کے بعد آخر میں آدم علیہ السلام لائے گئے تو جمعہ کا دن تھا۔ آخری ساعت تھی جس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ جمعہ کے دن میں ایک ساعت ہے وہ اگر کسی پر گزر جائے تو اس میں جو دعا مانگتا ہے یقیناً قبول ہوتی ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہی وہ ساعت ہے جس میں آدم علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آئی تو جتنے بڑے بڑے امور ہیں، سب اسی دن واقع ہوئے ہیں۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش، آدم علیہ السلام کی مٹی کا جمع کرنا' آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارنا۔ تو اس دن کو آدمی سے کوئی خاص مناسبت ہے اور ایام بھی انسانوں کے لئے ہیں۔ مگر جمعہ کے دن ولادت، موت و حیات و جمعیت اور جنت سے نزول ہوا۔ دنیا میں آئے تو صورۃً نُزول ہوا، حقیقۃً عروج ہوا۔ اس لئے کہ دنیا میں نہ آتے تو خلافت نہ پاتے، ظاہر میں تو نیچے اتارے گئے اور حقیقت میں اس عمل گاہ کے ذریعے سے جب انسان نے عمل کرنے شروع کئے تو بڑے بڑے مراتب اور درجات بلند ہوئے۔ تو معنوی طور پر انسان بلند ہوا۔ ظاہری طور پر اسے نیچے اتارا گیا۔ تو وہاں کھلا ہوا حسی ورود تھا، یہاں حسی نزول اور معنوی خلافت کا تاج رکھا گیا۔ انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے علمائے ربانی پیدا ہوئے۔ ہر ایک کے جوہر ظاہر ہوئے تو دنیا مظہرِ کمالات ہے۔ دنیا نہ ہوتی تو کمالات کا ظہور نہ ہوتا۔ اگر یہ ساری اولاد جنت میں پیدا ہوتی تو بادشاہوں کی طرح بسر کرتی۔ رات دن کھانے پینے اور عیش اڑانے میں لگے رہتے۔ لیکن دنیا میں لاکر مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ تا کہ ان مصائب کے توڑ اور دفعیہ کے لئے انسان کے اندر جو ہر نمایاں ہوں۔ مصیبت رکھی گئی تا کہ دفاع کی طاقتیں کام میں آئیں۔ اقوام کو اقوام کے مقابلہ پر ڈالا گیا، تا کہ شجاعتوں کا ظہور ہو، صبر و تحمل کا ظہور ہو۔ جنت میں نہ جنگ ہوتی نہ لڑائی ہوتی، نہ دفعیہ کی تدبیریں سوجھتیں، نہ صبر و تحمل کام آتا۔ انسان کے بہت سے جوہر چھپے ہوئے رہ جاتے۔ دنیا کو ان کے لئے ظہور گاہ بنایا گیا۔ تو آدم علیہ السلام ظاہراً تو جنت سے نیچے اتارے گئے جو نزول ہوا، حقیقت میں عروج ہوا کہ جب تک دنیا میں نہ آئیں کمالات کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ قیامت بھی قائم ہوگی تو جمعہ کے دن ہوگی۔ جس میں اولین و آخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن میں جامعیت کا مادہ موجود ہے۔ آدم علیہ السلام کی بکھری ہوئی مٹی یوم جمعہ میں جمع کی گئی۔ جو کمالات چھپے ہوئے تھے، وہ جمع ہو کر جمعہ کے دن نمایاں ہوئے۔ قیامت ہوگی تو کروڑوں اربوں انسان زمینوں میں چھپے پڑے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۵.

جمع ہوں گے، جمعہ کا دن انہیں جمع کر دے گا۔ غرض اس میں جامعیت کی شان ہے۔

تو دنیا میں جمعہ لایا گیا تا کہ انسان جیسے اس کی تکوینی طور پر چیزیں جمع ہوئی ہیں، اپنے ارادے سے جمعیت کی شان اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی جمع ہونا سیکھیں قلوب کی یکسانی سیکھیں، قلوب کا میل ملاپ اور اتحاد سیکھیں۔ اختلاف سے بچیں گروہ بندیوں سے بچیں اس کے لئے جمعہ کو نمونہ بنا دیا گیا۔ کہ شکلیں مختلف، عقلیں مختلف، رنگ مختلف، مگر سب آ کر جمعہ کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ دیہات کے قصبوں کے لوگ اور محلوں کے بھی ایک جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ باوجود اختلاف مزاج کے پھر ان میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جمعہ ہی کی برکت ہے۔ جب ہفتہ میں ایک دن جمع ہونا سیکھ لیا تو بقیہ ایام میں بھی ان کے لئے جمع ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ ان میں اجتماع کی خو پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر انسان اس وقت جہنم میں ہے، اس سے نکلنے کی تدبیر...... جمعہ کا دن اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے کہ باہمی میل ملاپ اور محبت پیدا ہو، باہمی یگانگت پیدا ہو۔ تمہارے اندر اتحاد باہمی ہو۔ مگر اس کے ذریعہ کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ① امام خطبہ دیتا ہے، وہ قرآن پڑھتا ہے۔ نماز میں بھی قرآن پڑھا جاتا ہے، وہ اللہ کی رسی ہے جس کو پکڑنے کے بعد آدمی اوپر پہنچے گا۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن اللہ کی رسی ہے۔ جو آسمان سے لے کر زمین تک لٹکا دی گئی، جس نے مجھ تک آنا ہو، اسی رسی کو مضبوط تھام لے، جب ہم رسی کھینچیں گے، جو اس میں لٹک جائے گا وہ لٹک کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ آسمان سے نیچے کی جگہ سارا علاقہ جس میں ساتوں زمینیں شامل ہیں۔ یہ سب جہنم کا علاقہ ہے۔ قیامت کے دن اسی میں جہنم تپے گی۔ اسی میں آگ، اسی میں سانپ اور بچھو اور اسی میں وہ سارے عذابات ہوں گے۔ تو ہم اور آپ گویا اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ قرآن کی رسی ٹانگ دی گئی جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہو، وہ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے، جو نہیں پکڑے گا، اسے جہنم میں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود بخود جہنم کے اندر موجود ہے۔ اس سے نکلنے کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ اللہ کی رسی ہے۔ وہ رسی ٹوٹ نہیں سکتی۔ البتہ اگر کوئی مضبوط نہ پکڑے تو چھوٹ سکتی ہے۔ تو پوری قوت کے ساتھ اس کو مضبوط تھام لیا جائے۔ اس روز بھی قرآن پورے شہر کے آگے پڑھا جاتا ہے۔ تا کہ لوگ پیغام خداوندی سن کر اس سے وابستہ ہوں اور اپنے اندر اجتماعی شان پیدا کریں۔

جُمعہ یوم اِمتحان...... جمعہ کا دن گویا عبرت وموعظت بھی ہے اور ایک امتحان بھی ہے۔ یہ امتِ مرحوم جمعہ کی وجہ سے امتحان میں کامیاب ہوئی، امتحان میں کامیابی کی فضیلت اس کو حاصل ہوئی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے اقوام کا امتحان لیا۔ یہود سے کہا کہ تم عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو، جو ہمارے علم

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

میں متعین ہے۔انہوں نے ''یَوْمُ السَّبْتِ ''مقرر کیا۔شنبہ کا دن کہ ہفتہ کے دن بجز طاعت وعبادت کوئی کام مت کرو۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہود سے فرمایا،اے یہود! ''یَوْمُ السَّبْتِ '' کا احترام کرو۔جب دعوے کرتے ہو کہ وہ مقدس دن ہے تو اس کی تقدیس کرو۔

نصاریٰ سے کہا گیا کہ تم بھی ایک دن طے کرو، جو ہمارے علم میں طے شدہ ہے۔ دیکھتے ہیں تم پہنچتے ہو یا نہیں؟۔نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کے لئے تجویز کیا۔اسی میں ان کے لئے عبادت فرض کر دی گئی۔

مسلمانوں سے کہا گیا تم بھی ایک دن منتخب کرلو۔تو ہمارے پیغمبر (فِدَاہُ رُوْحِیْ وَاَبِیْ وَاُمِّیْ)صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا دن منتخب فرمایا۔فرمایا یہی ہمارے علم میں طے شدہ تھا۔تو اس وقت کو وحیِ خداوندی سے مناسبت دی گئی۔اب پوری امت اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے، جو اللہ کے علم میں طے تھا، وہی طے پا گیا۔

حق فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ گھومتا ہے...... جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی کہ پچھلی امتوں میں کچھ محدث ہوتے تھے۔جن سے حق تعالیٰ کلام فرماتا۔میری امت میں وہ حضرت عمر ہیں۔فرمایا گیا کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے۔یہ نہیں کہ جدھر حق گھومتا ہے عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں۔گویا اس درجہ فاروق اعظم سراپا صدق اور حق بن چکے ہیں کہ جدھر وہ گھومتے ہیں حق بھی ادھر گھوم جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بارہ، تیرہ [illegible]ں میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، وہی آسمان سے وحی اتری۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَکَانَ عُمَرَ'' ①

اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی اور میرے بعد کوئی نبی آتا، تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔لیکن چونکہ دنیا میں نبوت باقی نہیں، اسی واسطے کوئی نبی نہیں ہوگا۔مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں صلاحیت ہے کہ اگر دنیا میں نبی آنے والا ہوتا تو وہ نبی بنائے جاتے۔یعنی ان کے ذوق کو ذوقِ نبوت سے مناسبت تھی، وحی سے مناسبت تھی۔رائے وہ قائم کرتے تھے جس پر وحی آنے والی ہوتی تھی۔وحی ان کے معاون بن کر اترتی تھی۔مخالف بن کر نہیں اترتی تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں سے یہ عظیم فضیلت ہے کہ ان کے ذوق کو وحیِ خداوندی سے کامل مناسبت تھی۔

مجموعہ امّت میں ذُوقِ نبوت...... مجموعی طور پر یہ امت مل کر اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔تو مجموعہ امت میں بھی نبوت کا ایک خاص ذوق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کی قائم مقام ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعتِ اصلیہ لے کر آئے امت نے اجتہاد سے وہ مسائل قرآن وحدیث سے نکالے، اور لا (LAW) اور قانون کی شکل میں پیش کئے۔پہلے وہ مسائل نہیں تھے اس امت کے مجتہدین کے علم میں آئے تو انہوں نے قرآن سے نکال کر پوری شریعت کو گلدستہ بنا کر پیش کر دیا۔اگر پیغمبر پر وحی اتری تھی تو اس امت کے مجتہدین پر الہامِ ربانی منکشف ہوا۔وہ اصلی شریعت لے کر آئے۔انہوں نے اس شریعت میں سے شریعت وضع کی، گویا پیغمبر کے قائم مقام

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ج: ۱۲، ص: ۱۴۶.

ہو گئے، کہ جیسے پیغمبر شرائع لائے تھے، اس امت کے مجتہدین بھی شرائع لے کر آئے اور شریعتیں پیش کیں، مگر وہ شریعتیں اصل شریعت میں سے نقل تھی۔ اس لئے علماء لکھتے ہیں کہ ''اَلْقِیَاسُ مُظْھِرٌ لَامُثْبِتٌ''۔

مجتہد جو قیاس کر کے اجتہاد کرتا ہے تو قیاس کسی مسئلہ کو ثابت نہیں کرتا بلکہ ظاہر کر دیتا ہے۔ مسئلہ شریعت میں پہلے ہی ثابت شدہ ہے۔ مجتہد کا اجتہاد اسے شریعت کے اندر سے نکال کر لاتا ہے۔ ہم میں اور آپ میں وہ فہم نہیں کہ ہم نکال لیں؛ مجتہدین کو وہ فہم دیا گیا کہ وہ نکال کر پیش کر دیتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کنواں ہے اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ڈول رسی جس کے ہاتھ میں ہے پانی وہی نکالے گا۔ گویا مجتہد کا اجتہاد بمنزلہ ڈول رسی کے ہے کہ وہ قوت سے کھینچتا ہے اور پانی کو نالیوں میں، نہروں میں اور جنگلوں میں بہا دیتا ہے جس سے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔

امّتِ محمدیہ کی مثال ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری لائی ہوئی شریعت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے شدید قسم کی بارش اتری اور موسلا دھار پانی زمین پر برسنا شروع ہوا۔ پانی آ کر پڑا تو زمین کے تین حصے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا نہایت پاکیزہ نہایت عمدہ تھا، اس نے پانی کو جذب کیا۔ اور جذب کر کے طرح طرح کے پھل اور پھول چمن اور رنگ رنگ کے باغ لگائے اور دنیا کو بہار بنا دیا۔ ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ کچھ اگا تو نہیں سکا، مگر اس نے بارش کے پانی کو جمع کر لیا۔ بڑے تالاب بھر دیئے کہ لوگ اس سے پانی لے جاتے ہیں، سیراب بھی ہوتے ہیں، تو وہ زمین اگر پھل پھول نہ نکال سکی، تو اس نے پانی جمع کر لیا۔

اب تیسرا ٹکڑا ایسا تھا کہ وہ چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو جذب کر سکا نہ جمع کر سکا۔ پانی آیا اور بہہ کر ادھر ادھر نکل گیا اور وہ خالی رہ گیا۔ فرمایا اس طرح سے وحی کا پانی اترا، تو قلوب کی دنیا تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک وہ قلوب جنہوں نے وحی الٰہی اور علمِ ربانی کے پانی کو جذب کیا، یہ طبقہ فقہاء اور علماء ربانی کا تھا۔ دوسرے وہ قلوب جنہوں نے جذب تو نہ کیا مگر پانی جمع کر لیا، یہ طبقہ حفاظ اور محدثین کا تھا۔ تیسرے وہ قلوب جن پر کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ طبقہ کفار کا ہے۔

علمائے امتِ محمدیہ کی خدمات ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصل شریعت لے کر آئے اور اس امت کے مجددین و مجتہدین نے اس شریعت میں سے مسائل استنباطیہ نکالے۔ ان پر وحی تو نہیں آتی تھی۔ مگر ان کے قلوب پر الہام ہوتا تھا۔ انبیاء علیہ السلام کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر ہوئے، ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا۔ گو حدیث ضعیف ہے مگر علماء اس حدیث سے جگہ جگہ استدلال کرتے رہتے ہیں کہ میری امت کے علماء ایسے ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کے پیغمبر۔ ① یعنی پیغمبر تو نہیں ہوں گے، مگر کام وہ کریں گے جو پیغمبروں نے کیا۔ ان کے کام کی نوعیت وہ ہوگی جو انبیاء علیہ السلام

① اس کی کوئی اصل نہیں۔ یہ حدیث نہیں ہے۔ دیکھئے المقاصد الحسنة ص: ۲۰۷۔

کے کام کی تھی، جیسے ایک نبی جس خطے میں آتا ہے تو اس خطے کو ایمان سے رنگ دیتا ہے اور لوگ مؤمن بنتے چلے جاتے ہیں۔ عالم و عارف بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس امت کے علماء ربانی اور مجتہدین وہ ہیں کہ ایک عالم ربانی جہاں بیٹھ گیا، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال گیا۔ ہزاروں کو ایمان سے رنگ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں پورا ہندوستان تو کیا، پاکستان (بنگلہ دیش) افغانستان اور پورا ترکستان حنفی۔ ایک عالم ربانی، ایک مجتہد اٹھا، کروڑوں کے ایمان کو درست کیا۔ کروڑوں کو جنت تک پہنچا دیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مکہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی عمر مکہ میں گذاری آخیر عمر مصر میں اور ون میں وفات پائی تو حجاز تقریباً سب کا سب شافعی ہے۔ ایک عالم ربانی اترا، اس نے ملکوں کو ایمان سے رنگ دیا اور لاکھوں متبع شریعت پیدا کئے۔ جتنے حنابلہ ہیں وہ کثرت سے ادھر ہیں، مغربی ممالک میں زیادہ مالکیہ ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور ادھر ہوا اور علماء پیدا ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ عبداللہ بن مبارک، امام نووی، امام اسحٰق رحمہم اللہ علیہم یہ سب وہ ہیں جو صاحبِ مذہب تھے، اب یہ الگ چیز ہے کہ یہ مذاہب ختم ہو گئے۔ ان چار مذاہب کو قبولِ عام ہو گیا۔ یہ کوئی ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے۔ یہ منجانبِ اللہ ہے جیسے صوفیاء کرام کے سلاسل تو بہت سے ہیں لیکن قبولِ عام زیادہ تر چار سلسلوں کو ہوا۔ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ نقشبندیہ تو یہ قبولیت منجانب اللہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس امت میں ہزاروں آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جن کی روشنی سے دنیا مستفید ہوئی جہاں ایک بیٹھ گیا، کروڑوں کے ایمان درست ہو گئے۔

آفتابِ عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے علماء، انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہوں گے، یعنی پہلی امت میں جو کام نبی علیہ السلام سے چلتا تھا۔ اس امت میں ختم نبوت کے طفیل وہ کام مجددین اور علماء سے چلے گا۔ گویا ایک ہی نبوت اتنی قوی ہوگی کہ اور نبوتوں کی قوت باقی نہیں رہے گی۔ جیسے مثلاً رات ہو جائے، تو آسمانوں پر ہزاروں ستارے طلوع کرتے ہیں۔ اربوں کھربوں ستارے۔ جدھر دیکھو ستارے۔ کروڑوں ستارے روشنی دار جمع ہیں مگر رات کا دن نہیں بنتا۔ ہے رات کی رات، یعنی تاریکی کلیتہً زائل نہیں ہوتی، ٹیوب لائٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ رات سے دن ہو جائے۔ لیکن جونہی آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد ہوتی ہے ابھی پو پھٹی ہے۔

آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ صبح صادق نے خبر دی کہ آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم جو روشنی کا بادشاہ ہے، آ رہا ہے۔ آمد کی خبر تھی کہ ستارے بھی غائب، رات بھی غائب اور دن نمودار ہونا شروع ہو گیا اور جب سورج آتا ہے۔ تو سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں یہ نہیں کہ ستاروں کا نور چھن گیا بلکہ اتنا ماند پڑ گیا کہ مدھم ہو جاتا ہے کیونکہ سورج کے نور میں کوئی امتیازی طور دکھلائی نہیں دیتا اگر آفتاب یوں کہے کہ میرے بعد کوئی ستارہ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ نور کا خزانہ ہوں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی حاجت باقی نہیں۔ سارا دن گزر جائے گا، میری روشنی کام دیتی رہے گی۔ میدانوں میں میری دھوپ پڑے گی۔ اس سے کام

لے اگر کوئی میدان میں نہ آ سکے، تو گھر کے دروازے کھول دے۔ اس میں بھی چاندنی پہنچ جائے گی اور اگر کوئی تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ہے تو کم از کم کچھ دمک چمک ہی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے بھی کام کر سکتا ہے۔ تاریک سے تاریک کوٹھڑی میں میری روشنی پہنچے گی۔ دن میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی آنکھوں کا نین سکھ ہی بن جائے کہ دن میں بھی بجلیاں جلائے اس کا تو کوئی علاج نہیں، ورنہ سورج نے ہر روشنی سے مستغنی کر دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں۔ یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام طلوع ہوئے۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں نبی تھے۔ نبی اسرائیل میں چار چار ہزار نبی ایک وقت میں آئے۔ تو آسمانِ نبوت پر آدم علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ نوح علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام آئے۔ موسیٰ وعیسیٰ (علےٰ نبینا وعلیہم والسلام) آئے مگر رہی رات، دن نہیں نکلا۔ جونہی آفتابِ نبوت کی بشارت دی گئی۔ پو پھٹی اور صبح صادق ہوئی، یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے پانچ سو برس پہلے آ کر کہا۔ ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ ① میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کا نام نامی احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔

صبح صادق کا نمایاں ہونا تھا کہ قلوب میں جگمگاہٹ شروع ہوگئی۔ اسی جاہلیت کے دور میں دل توحید و رسالت کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ جہالتیں رفع ہونا شروع ہوئیں۔ اور جب فاران کی چوٹیوں سے آفتاب طلوع ہوگیا تو جس دل میں ذرا سی بھی استعداد تھی، اس میں نور داخل ہوا اور روشنی آنی شروع ہوئی۔ قیامت تک یہ دن لمبا دن ہے، جو ہزاروں برس کا ہوگا۔ جیسے کہ اب بارہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے تو صبح صادق تو گھنٹے سوا گھنٹے کی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا دن اتنی بڑی صبح صادق۔ یہ دن چونکہ ہزاروں برس کا تھا، تو اس کی صبح بھی پانچ سو برس کی ہوئی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک تک۔ اس کے بعد قیامت تک دن ہوگا۔ اگلی صبح قیامت کا دن ہوگا۔ تو قیامت کی صبح تک اب آفتاب عالم تاب کی روشنی کافی ہے، کسی اور ستارے کی ضرورت نہیں۔ یہی ایک ستارہ (آفتاب) پورے عالم کو نور پہنچائے گا اور پہنچا رہا ہے۔

مختلف صورتوں میں ایک ہی نور...... اس کی روشنیوں کے ظہور مختلف ہیں۔ مجددین میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ علماء ربانی میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ صوفیائے کرام میں اسی کی روشنی کا ظہور ہے۔ کسی نے عالم باطن کھولا، کسی نے عالم ظاہر کھولا۔ کسی نے مسائل شرعیہ پیش کیے۔ کسی نے مسائل باطنیہ پیش کئے۔ کسی نے نفس کی الجھنیں دور کیں۔ کسی نے مکائدنفس پر روشنی ڈالی۔ کسی نے فضائل اخلاق پیش کئے اور رذائل اخلاق کو دھکا دیا۔ ایک ہی نور ہے جو مختلف صورتوں سے کام کر رہا ہے اور یہ پوری امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔

① پارہ ۲۸ سورۃ الصف، الآیۃ: ۶.

امّتِ محمد یہ سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا...... فرمایا دیا گیا: ''لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلٰلَةِ۔'' ① میری پوری امت مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ فرقے، گروہ بندیاں ہوں گی۔ مگر ایک فرقہ ناجیہ ضرور ملے گا، وہ وہی کرے گا جو میں کرر ہا ہوں، وہی کہتا رہے گا جو میں کہہ رہا ہوں، وہی باتیں پیش کرے گا جو میں کرر ہا ہوں فرمایا: اس امت میں ہر صدی پر ایک نہ ایک مجدد آتا رہے گا۔ جماعت کی شکل میں ہو یا فرد کی شکل میں، مختلف خطوں میں مختلف مجدد ہوں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ امت کیسے ضائع ہوسکتی ہے جس کے اول میں تو میں ہوں اور آخر میں مسیح علیہ السلام آسمان سے نزول کریں گے اور بیچ میں حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ ② وہ امت کیسے ضائع ہوگی؟ جس میں اتنے بڑے بڑے مجدد پیدا ہوں گے۔ تو صدی پر وعدہ کیا، مجموعہ امت پر (عدم گمراہی کا) وعدہ کیا۔

پھر صدی کے اندر ہر دن کے لئے بھی وعدہ ہے، فرمایا اس امت میں ہمیشہ سلف سے خلف علم حاصل کرتے رہیں گے، جو اَخلاف رشید ہوں گے۔ وہ اسلاف سے علوم لیتے رہیں گے۔ اور اس علم کے ذریعے غُلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ ان کے غلو کو کھول کر رکھ دیں گے۔ اور کم عقلوں اور جاہلوں کی تاویلات کا پردہ چاک کر کے قرآن وحدیث کا اصل روپ پیش کر دیں گے۔ جس سے روز بروز دین نکھرتا رہے گا۔ تو مجموعی طور پر امت حق پر مجتمع ہے۔ ہر صدی پر مجدد آئیں گے صدی کے اندر علماء پیدا ہوں گے، امت ضائع نہیں ہوگی۔ تو پوری امت مجموعی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے اور جتنے کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں وہ اس امت میں بٹے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت آیات کی، تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہو گیا، جو تلاوت کرر ہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیمات کتاب کیں، تو علماء اور فقہاء کا طبقہ کھڑا ہو گیا۔ جس نے کتاب کی تعلیم شروع کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم حکمت دی، اسوہ حسنہ پیش کیا، تو صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہو گیا، جس نے وہی کردار اور کریکٹر بنا کر دکھلا دیا اور لوگوں کو اس پر چلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیہ نفس کیا۔ تو صوفیا نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ریاضت ومجاہدے کے اصول مرتب کئے اور امت کی تربیت کی۔ ③

جو فرائض پیغمبر کے تھے، وہ ''بجنسہٖ'' آج بھی باقی ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ علماء میں بہت سی خطائیں ہوں، بہت غلطیاں بھی ہوں، بہر حال وہ معصوم تو نہیں، لیکن حق منقطع ہو جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان کے بیان کردہ مسائل پر چلیں ان کے ذاتی کردار سے قطع نظر کریں اگر کوئی برائی ہے تو ذات کے لئے چھوڑ دیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کا زریں مقولہ...... حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، ج: ١١ ص: ٤٤٢.

② جامع الاصول من احاديث الرسول، فضل المؤمنين والمسلمين ج: ٩ ص: ٦٧٧٢.

③ الابانة الكبرىٰ لابن بطة، ج: ١ ص: ٣٧.

سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی آدمی ایسا نہیں جس میں صرف خیر ہی خیر ہو اور کوئی ایسا نہیں جس میں شر ہی شر ہو۔ خیر بھی ہے شر بھی ہے بھلائی بھی ہے برائی بھی ہے۔ نیکی بھی ہے بدی بھی ہے۔ دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر ایک نیکی سے فائدہ اٹھائے اور اس کی بدی اس کے لئے چھوڑ دے۔ کہ تو جانے اور تیرا خدا جانے۔ تو پوری امت فرشتہ دکھائی دے گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ سب خیر ہی خیر ہے۔ آج ہم ہر شخص کے شر کو لیتے ہیں اور خیر کو دھکا دے دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری امت میں شر پھیلی ہوئی ہے، وہ ساری خیر ماند پڑ گئی۔ تو دانشمندی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اس میں شر ہے وہ خدا کے حوالہ کرو۔ تم سے اس کے شر کا سوال نہیں ہوگا، اسی سے سوال ہوگا وہ نمٹے گا۔ تم اس کی خیر کو اپناؤ۔ (ہو سکے تو اس کے لئے دعا ہی کردو)۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی صفات ہیں کہ ان کا چلنا پھرنا کہنا سننا، سب حجت ہے۔ ہر گناہ، ہر برائی سے معصوم ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بعد اور کوئی معصوم نہیں، اولیاء اللہ محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود محفوظیت کے امکان ہوتا ہے کہ غلطی سرزد ہو جائے اور ہوتی رہتی ہے۔ تو آپ کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ ان کی کمزوریوں پر نظر کریں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو علم ان کے اندر سے نکل رہا ہے، وراثت کے طور پر اس کو اختیار کریں اور ان کی برائی کو ان پر چھوڑ دیں، یا اگر خیر خواہی کا جذبہ ہو تو آپ تنہائی میں ادب سے کہیں کہ یہ غلطی ہے آپ اسے چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے ممنون ہوں گے۔

حسنِ ظن اختیار کرنے کی ضرورت...... لیکن ہر شخص کی برائیوں کو اچھالنا، اس سے پوری قوم کو رسوا کر دینا ہے۔ فرمایا گیا: ''ظُنُّوا بِالْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا۔'' مؤمنوں کے ساتھ حسن ظن اختیار کرو۔ حسن ظن کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ بدظنی کے لئے جب تک کوئی دلیل نہیں ہوگی، بدظنی کی اجازت نہیں۔ یہ فرض ہے کہ ہر شخص حسن ظن رکھے۔ جب ایسے دلائل ہی مہیا ہو جائیں کہ برائی پیدا ہوگئی تو بے شک بدظنی قائم کرے۔

اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اسے اچھالتے پھریں، نصیحت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور فرمایا ''اے اللہ! میں مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ میری ہر نقل و حرکت کی رقیب بنی رہیں، اگر بدی سامنے آئے اسے اچھال دیا، نیکی سامنے آئی اسے دفن کر دیا۔ ایسے مکار دوستوں سے میں پناہ مانگتا ہوں''۔ ہمیں اور آپ کو ایسا دوست نہیں بننا چاہئے۔ بلکہ کسی کی نیکی سامنے آئے تو اسے اچھال دو۔ بدی سامنے آئے تاویل کر دو۔ پیار و محبت سے سمجھا دو، نصیحت کرو۔ نہیں مانتا تو خدا کے حوالے کرو۔ وہ جانے اس کا خدا جانے۔ پھر بھی اس میں کوئی نیکی ہے، علم کی بات ہے تو اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ہر جگہ سے آدمی حصولِ خیر کرتا رہے...... مولانا حبیب الرحمٰن، حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن تھے جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم رہے تھے۔ وہ بڑے بلا کے ذہین تھے۔ ان کی ذکاوت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ان کی ذکاوت و ذہانت عجائبات تھی۔ شروع عمر جوانی میں کوئی برائی ایسی نہیں جو ان سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ یعنی جوا تک کھیلا، غصب کیا۔ دوسرے کا

مال و دولت جھپٹ لیا۔ یہ واقعہ ہے کہ علمی استعداد اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دیوبند تشریف لاتے تو طلباء مٹے ہوئے تھے۔ ان کے علم کی وجہ سے ان پر قربان تھے۔ اسٹیشن سے شہر کی طرف آ رہے ہیں۔ طلباء کے ہاتھوں میں ہدایہ ہے، ہدایہ کا سبق ہو رہا ہے۔ اور طلباء پیچھے پیچھے ہیں۔ دیوبند میں پہنچے بازار میں بنیا رہتا تھا۔ بلاّ اس کا نام تھا۔ بہت جواری تھا۔ اس کے مکان کے نیچے بنیے کو آواز دی۔ وہ سامنے آیا تو کہا کہ "تو پٹ لے گا جوتا، یا چت لے گا" اس نے کہا پٹ۔ بس جوتا پھینکا وہ چت گرا دس ہزار کی شرط ٹھہری دس ہزار لے کر آگے روانہ ہوئے بنیا ہار گیا۔ اور ساتھ ساتھ سبق بھی ہو رہا ہے۔

ایک دفعہ ایک بنیے سے قرض لیا۔ بیس ہزار روپے کی دستاویز لکھ دی۔ دستخط کر دیئے۔ میعاد طے ہوگئی کہ برس دن بعد ادا کریں گے۔ برس دن بعد، بنیے نے مانگا کہ میرا روپیہ کہا کیسا روپیہ؟ کہا کہ حضرت وہ جو آپ نے لیا تھا۔ فرمایا مکار! ہم نے کب لیا تھا۔ اس نے کہا صاحب دستاویز لکھی ہے۔ کہا غلط ہے۔ کوئی دستاویز نہیں، بھاگ جا یہاں سے۔ اس نے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ دستاویز اس کے پاس تھی۔ مولانا کے اس پر دستخط تھے۔ کہا کہ انہوں نے بیس ہزار روپیہ مجھ سے لیا اور دستاویز جج کی میز پر رکھ دی۔ مولانا نے کہا کہ حضور میں بھی دستاویز دیکھ سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا دیکھو تمہارے لئے تو حجت ہے۔ تو اس نے اس طرح سے وہ کاغذ پکڑایا کہ اوپر کا سرا تو جج کے ہاتھ میں نیچے جہاں ان کے دستخط تھے، دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ خدا جانے انگوٹھے میں کوئی مسالہ لگا کر گئے تھے، کیا صورت تھی۔ اس طرح سے اس کو پکڑ کر مسلا ہے۔ کہ جب کاغذ میز پر رکھا، وہ دستخط غائب تھے، سادہ کاغذ تھا۔ مولانا نے کہا کیا یہ دستاویز آپ کو بنیے نے دی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ جعلی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر تو دستخط نہیں، گمنام ہے۔

دیکھا تو اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ جج نے غصے کے لہجے میں بنیے سے کہا۔ گمنام دستاویز لے کر یہاں آئے ہو؟ اس نے کہا حضور! دستخط تھے، میں حلف کرتا ہوں۔ اس نے کہا تھے تو کہاں گئے؟ کوئی جن کھا گیا۔ کوئی اسے لے گیا۔ کہاں گئے دستخط؟ بنیے نے سر پیٹ لیا۔ آخر مولانا کی ڈگری ہوئی۔ بیس ہزار روپے کا اور دعویٰ کر دیا کہ میری حیثیت کی ہتک ہوئی ہے بیس ہزار اور وصول کر لئے یہ کیفیت تھی۔

سُنار کو گھر بلایا کہ زیورات کی ضرورت ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ دس پندرہ ہزار کے زیورات لینے ہیں۔ فرمایا کہ اتنی مہلت ہے، اجازت ہے کہ میں گھر کی عورتوں کو دکھلا آؤں۔ اس نے کہا ضرور دکھلا دیجئے۔ کوئی بے اعتباری تھوڑا ہی ہے۔ بس وہاں سے جا کر آدھ گھنٹہ میں جو کام کیا کہ سارے نگ اکھاڑ کر چھوٹے چھوٹے پرچوں پر دستخط کر کے نیچے رکھ دیئے اور نگوں کو اس طرح جڑ دیا جس طرح تھے اور لا کر واپس کر دیئے۔ وہ لیکر چلا گیا۔

مولانا نے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ سنار میرے گھر سے پندرہ ہزار روپے کے زیورات چرا کر لے گیا ہے اور پتہ نہیں ہے کہ کہاں ہیں۔ تو فوراً سمن جاری ہوا۔ اس کی طلبی ہوئی، عدالت میں حاضر ہوا۔ مولانا کا

دعویٰ تھا کہ پندرہ ہزار کے زیور لے گیا ہے۔اس نے کہا صاحب! میں کسی کے زیور نہیں لایا۔دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔مولانا نے کہا یہ جھوٹا ہے۔ چرا کر لے گیا ہے۔بات بنا رہا ہے کہ میں دکھانے کو لے گیا تھا۔ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔میں خود دکان پر جا کر دیکھ آتا۔

جھڑپ شروع ہوئی تو جج نے کہا ''کوئی ثبوت''؟ مولانا نے کہا کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے سارے زیور عدالت میں طلب کر لئے جائیں میں اپنے زیور پہچان لوں گا۔چنانچہ سارے زیور عدالت میں حاضر کئے گئے۔ مولانا نے جتنے ان کی نگاہ میں آچکے تھے،سب الگ کر دیئے۔اور کہا کہ ''یہ ہیں وہ سب زیور''۔سنار نے شور مچایا کہ صاحب ان کے کہاں سے آئے؟ یہ میری دکان کے زیور ہیں،ان کے نہیں۔

جج نے کہا ''ثبوت''؟۔انہوں نے کہا کسی زیور کا نگ اکھاڑ کر دیکھ لیجئے ہر نگ کے نیچے میرے نام کے دستخط موجود ہیں۔اب جس نگ کو اٹھاتے نیچے مولانا کے دستخط تھے۔پندرہ ہزار کے زیوروں پر دستخط موجود تھے۔آخر وہ زیور مولانا کو مل گئے اور گھر لے کر چلے آئے۔یہ حالت تھی اور ساتھ ہی علمی استعداد کا یہ حال کہ سڑک پر بھی جا رہے ہیں تو طلباء پیچھے۔مگر خیر آخر میں اللہ تعالیٰ نے توبہ نصیب فرمائی۔اور اس درجہ پر پہنچے کہ پوری پوری راتیں نوافل و تلاوتِ قرآن مجید اور درود شریف میں گزری ہیں۔یہ ان کا عام معمول تھا کہ جمعہ کی پوری رات درود شریف پڑھ کر گزارتے۔سوتے نہیں تھے۔جیسے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہم نے علم دنیا کی طلب کے لئے حاصل کیا تھا۔مگر علم نے کہا میں غیر کی طرف نہیں جاؤں گا۔تو ہمیں بھی اللہ سے ملا دیا۔انہوں نے علم سیکھا تو بالآخر اس علم نے اپنی طرف کھینچا۔یہ چیزیں ختم ہوئیں۔اخیر عمر ان کی نہایت مقدسانہ اور نہایت پاکیزہ زندگی بن گئی۔مگر میں نے اس پر یہ عرض کیا کہ باوجود ان خرافات کے،ان کی برائیوں کے چونکہ علم تھا،تو طلباء ان کے جوے کے درپے نہیں تھے۔انکے علم کے درپے تھے کہ یہ ہمیں مل جائے۔ان کا جوا ان کے ساتھ ہے،اللہ جانے اور وہ جانیں۔

پوری امت میں خیر کیسے نمایاں ہوسکتی ہے......اگر پوری امت میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کی شر کو اس کے لئے چھوڑ دو۔تو ساری امت نیک نظر آئے گی اور اگر پوری امت کے ایک ایک فرد کی برائیاں اچھالیں گے۔اور نیکیاں دفن کر دیں گے تو معلوم ہوگا کہ ساری امت برائیوں سے بھری ہوئی ہے۔اس امت میں کوئی نیک آدمی نہیں۔

اس جذبے سے ہم پوری امت کو برا کر کے دکھلا رہے ہیں۔نہ اجتماعیت باقی ہے،نہ اتحاد وحدت اور نہ قلوب کی یگانگت۔اس لئے ہر شخص کی نظر برائی پر ہے۔اپنی جانب سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور دوسرا حقیر اور دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور وہ حقیر۔سات فقیر ایک کمبل میں سو سکتے ہیں مگر دو بادشاہ ایک ملک میں جمع نہیں ہو سکتے۔اس لئے کہ فقیر میں تواضع ہے اور بادشاہ میں کبر۔تو کبر دوسرے کے ساتھ جمع نہیں

ہونے دیتا۔ ہر شخص نے کبر ونخوت کو پیشہ بنالیا۔ اس لئے فسادات اور جھگڑے بھی ہیں۔

تواضع پیدا ہو جائے تو جھگڑے ختم ہو جائیں۔ جب آپ دوسرے سے یوں کہیں گے کہ آپ بڑے ہیں۔ میں آپ کا خورد ہوں۔ وہ کہے گا کہ آپ بڑے ہیں، میں آپ کا خورد ہوں۔ لڑائی کیسے ہوگی؟ لڑائی اس سے ہوگی کہ آپ کہیں میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ اس نے کہا میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ بس لاٹھی چل پڑے گی۔ جب ہر شخص یہ کہے کہ حیثیت تو آپ کی ہے، میں تو آپ کا خادم ہوں۔ تو پاؤں میں پڑے سانپ کو بھی کوئی نہیں مارتا۔ بہر حال امت میں آپ جہاں دیکھیں کہ جھگڑا چلتا ہے، تو سمجھ لیں کہ کوئی متکبر آ گیا، کوئی صاحب نخوت موجود ہے، جسے اقتدار کی ہوس ہے۔ جاہ پسندی اس کے اندر گھر کئے ہوئے ہیں، وہی جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

دو چیزیں ہیں جو امت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ ایک حبّ جاہ اور ایک حبّ مال۔ جاہ اللہ کی دین ہے اسے استعمال کیا جائے۔ اس پر فخر نہ کیا جائے۔ مال اللہ کا انعام ہے۔ اس کے بتائے ہوئے مصارف میں اس کو استعمال کیا جائے۔ نہ کہ مال کوئی خدا بنانے کی چیز ہے کہ آدمی سر بسجود ہو کر جھک جائے۔ یہ تو استعمال کی چیزیں ہیں۔ بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کو جاہ دی ہے محنت کرتا ہے تو اسے مال دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی ہیں۔ خدا ہی کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔ اس واسطے کہ اگر ان چیزوں کو ہم مخلوق کے لئے استعمال کریں۔ اپنی نخوتوں کا سامان نہ بنائیں تو پوری امت میں خیر نمایاں ہوگی۔

بحیثیت مجموعی امّت بھی معصوم ہے..... تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں کہ پوری امت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے۔ جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے۔ اس میں طبقات برے ہوں گے، افراد بھی برے ہوں گے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے امت معصوم ہے یعنی دین ضائع نہیں ہو سکتا، کہ دین ختم ہو جائے اور گمراہی عام ہو جائے۔ ہدایت بالکل باقی نہ رہے۔ اصل ہدایت باقی رہے گی۔ تو مجموعی حیثیت سے گویا عصمت کے مقام پر ہے کہ امت ضائع ہو کر کسی دوسری امت کا وجود ہو جائے، یہ نہیں ہوگا۔ جیسے پہلی امتیں ختم ہوتی تھیں۔ نئی امت کی بنیاد پڑتی تھی۔ تو وہ یہ ہوتا تھا کہ ایک نبوت ختم ہوتی دوسری نبوت کی بنیاد پڑتی۔ اب نبوت ایک ہے جو قیامت تک رہے گی۔ تو امت بھی ایک ہے کہ قیامت تک رہے گی۔ اس لئے اس میں حق بھی رہے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق منقطع ہو جائے اور گمراہی پھیل جائے۔

ہمہ وقت اللہ کا دھیان رہے..... تو ساری ہدایتوں کا اجتماع جمعہ کے طفیل ہوا۔ جمعہ ہی آدم علیہ السلام کو نیچے لانے کا ذریعہ بنا۔ وہ نیچے آئے تو اولاد پیدا ہوئی اور پیغمبریاں بھی ظاہر ہوئیں۔ نبوتیں بھی نمایاں ہوئیں علم وکمال نمایاں ہوئے۔ پاکیزہ اخلاق بھی نمایاں ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ تو جمعہ کا دن تمام کمالات کا جامع اور سبب ہے۔ اس سے ہم فائدہ اٹھائیں کہ جس طرح ہم یہاں جمع ہوئے، کاش باہر جا کر بھی ہم بھائی بھائی بنے ہوئے ہوں۔ اسی طرح ہمارے قلوب میں یکسانی ہو۔ مسجد اور باہر کا فرق کیا؟ یہ کہ جب آپ باہر جائیں گے تو دنیا

سامنے ہوگی۔ جب جمعہ کے لئے مسجد کے اندر آئے تو اللہ میاں سامنے ہیں۔ معلوم ہوا خدا سامنے ہو تو وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا سامنے ہو تو انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ کسب حلال تمہارے اوپر فرض ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ دنیا پر قابو پا کر اس کی محبت ترک کر دو۔ دنیا کو استعمال کے لئے رکھو۔ اور تمہاری شان ہو کہ۔

دل بیار و دست بکار

ہاتھ پیر کام میں لگے ہیں اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہے۔ گویا اپنے پروردگار سے باتیں کر رہا ہے۔ غرض ترکِ دنیا اسلام میں اس معنی پر نہیں ہے کہ شہروں کو چھوڑ دو۔ آبادیوں کو چھوڑ دو۔ لذات کو ترک کر دو۔ حکم دیا گیا۔ ﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ① پاک غذائیں کھاؤ اور عملِ صالح اختیار کرو۔ فرمایا گیا ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ② نکاح بھی کر سکتے ہو، ضرورت پڑے تو چار بھی کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ ضرورت پڑے اور دل اجازت دے۔ اور دل میں عادل بنو تب، ویسے نہیں۔ مکان بنانے کے بارے میں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ ③ اللہ نے تمہارے لئے سکون کی جگہ رکھی۔ سکونت کی جگہ۔ کپڑوں کے گھر دیئے چمڑوں کے گھر دیئے اگر گھروں میں بسانا منظور نہ ہوتا، جنگلوں میں بسانا منظور نہ ہوتا تو احسان کیوں جتلایا جاتا۔ تو کھانے کی اجازت، پینے کی اجازت۔ اور فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ ④ کہہ دے اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت و زینت کو اپنے لئے حرام کرے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ حلال طریقے پر لذات کو استعمال کرو اور شکرِ خداوندی بجالاؤ اور عملِ صالح اختیار کرو۔

اسلام میں ترکِ دنیا کا مفہوم...... اسلام میں ترکِ دنیا کا یہ مفہوم نہیں کہ آدمی شہروں کو چھوڑ کر ساری لذات سے منہ موڑ کر جنگلوں میں پہاڑوں میں جا بیٹھے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ مال کمائے، شہر بسائے آباد کرے۔ سب میں رہے پھر بھی اللہ سے متعلق رہے۔ معبود ایک ہے، یہ چیزیں پرستش کے لائق نہ بنائے۔ تو روپے پیسے کو معبود مت بناؤ۔ اللہ نے یہ دولت خادم بنا کر دی ہے، مخدوم بنا کر نہیں دی کہ آدمی اس کی پرستش میں لگ جائے۔ جاہ و عزت آدمی کو اللہ نے اس لئے دی ہے کہ اس کے ذریعے باطل کو دفع کیا جائے۔ اس اقتدار سے مدافعت میں کام لیا جائے۔ اس لئے نہیں دی گئی کہ آدمی غرور کی شکل میں بولے۔ بڑا بول بولے، متکبر بنے اور عقل کے لئے مال دیا گیا ہے مال کے لئے وہ چیزیں جمع کرو جو نافع ہوں اور جاہ کے ذریعے ان چیزوں کو دفع کرو جو نفس کے لئے

① پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۵۱. ② پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰. ④ پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۲.

مضر ہوں۔ مقاصد کو چھوڑ کر آلات و وسائل میں پڑ جاؤ، یہ دانش مندی کے خلاف ہے۔

جمعہ کی تعلیم ...... بہر حال جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رخ ہوگا، مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے تب ٹکر پیدا ہوگی۔ جب سب کا رخ ایک طرف ہوگا۔ ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔

آپ میں سے جو حضرات حج کے لئے گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ طواف کرنے کی جگہ میں کئی لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیت اللہ شریف میں ایک ہی مقام پر لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ مرد و عورت کا ایک ہجوم ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے، لڑائی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سب ایک ہی رخ میں گھومتے ہیں۔ اگر کچھ ادھر کو چلتے، کچھ ادھر کو تو مڈبھیڑ ہوتی، اچھا خاصا تصادم ہوتا، کیونکہ رخ ایک ہے۔ اس لئے لاکھوں جمع ہیں، ان میں کوئی ٹکر نہیں۔

جب آپ جامع مسجد میں آئیں گے تو سب کا رخ ایک ہی طرف ہوگا، تو یگانگت پیدا ہوگی۔ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں جب باہر جائیں گے تو کسی کا منہ دکان کی طرف، کسی کا منہ دفتر کی طرف، ہر کوئی دوسرے کے سامنے۔ اس میں تصادم ٹکراؤ اور جھگڑے شروع ہونگے۔ جیسے یہاں ظاہری طور پر ہے اگر باطنی طور پر خدا کی طرف منہ کر لیا جائے وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی۔ تو جمعہ کا دن بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو، باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے۔ اس لئے جب تم باہر جاؤ تو باطن کا رخ ایک طرف رکھو۔ اللہ سے لو لگائے رکھو۔ تم میں تفریق پیدا نہیں ہوگی۔ بہر حال جمعہ یومِ امتحان بھی ہے کہ یہ امت کامیاب ہوئی۔ جمعہ یومِ جامعیت بھی ہے جس نے تمام بکھری ہوئی چیزیں جمع کیں۔ جمعہ یومِ فضیلت بھی ہے جس میں انسانوں کو فضیلت ملی۔ جمعہ یومِ مزید بھی ہے، جس میں دربارِ خداوندی میں حاضری کی عادت پڑی۔ اس لئے جمعہ کو انتہائی ذوق و شوق سے ادا کرنے کی ضرورت ہے اور اذانِ جمعہ سے پہلے آکر مسجد میں صفِ اوّل ہی میں بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ فضائل و برکات حاصل ہوں۔ اس مختصر سے وقت میں یہی موضوع جمعہ کا سامنے تھا۔ اسی کے متعلق میں نے چند باتیں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ، اَللّٰھُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ ، وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ. اٰمِیْن.

سنّتِ حضرت خلیل علیہ السّلام

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ ! "قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ، وَاِنَّهٗ لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا، وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ، فَطَيِّبُوْا بِهَا نَفْسًا. اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ "①

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ بقرہ عید کے دن انسان کے تمام نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب عمل قربانی ہے یہ قیامت کے دن اپنے سینگ، بال اور کھر کے ساتھ (صحیح سالم) آئے گی اور یقیناً (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے حق تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ سو قربانی خوشدلی سے کیا کرو"۔

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ حدیث جو اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی (اور جس کا ترجمہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے) احکامِ قربانی پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت تقریر و جلسہ کا موضوع ہے، تقریر تو مختصر ہوگی۔ اس لئے کہ اول تو یہ مسئلہ جزئی ہے اور جزئیات میں تفصیل نہیں ہوتی۔ کیونکہ بسط و تفصیل تو اصول میں ہوا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور اس سے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو واقف نہ ہو۔ قربانی کا عمل کوئی سال کا عمل نہیں بلکہ صدیوں سے یہ عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے بھی اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں تو نہ نفسِ مسئلہ میں تفصیل کی گنجائش اور اس کے عام ہونے کی بناء پر نہ تفصیل کی ضرورت ہے۔

اُصولِ ثلاثہ تکوینیہ...... اُصولِ اوّل: مسئلہ کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے اور یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اس طرح تشریعی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے۔ ایک روح ایک جسم یعنی ہر چیز کی صورت ہے، ایک اس کی حقیقت ایک اس کی ہیئت اور ایک ماہیت یا یوں کہئے کہ ایک اس کا ظاہری حصہ

① السنن للترمذی، ابواب الاضحیۃ، باب ماجاء فی فضل الاضحیۃ، ج:۵ ص:۴۴۴.

ہے اور ایک باطنی۔غرض تمام انسان، کل حیوانات، نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن اور ایک اس کی روح ہے۔اور ہر بدن میں خدا تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔جب حق تعالیٰ کی توجہ کائنات کی طاقتوں اور بدن بنانے کی طرف متوجہ ہوئی، تو یہی اصول مدِ نظر تھا۔

سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اوّل انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتداء نطفہ یعنی ایک گندے قطرہ سے ہوئی۔جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ، ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ① ”یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خُلاصہ (یعنی گندے قطرے) سے بنایا۔پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنادیا۔پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔پھر ہم نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنادیا۔سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے“۔

تو روح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس کی تیاری میں زمین کی قوتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں۔ آسمان کی بھی۔آفتاب کی طاقتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں اور ہواؤں کی بھی۔غرض جب کائنات کی ساری قوتیں مل کر ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو پھر اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔یہی صورت سارے جمادات اور نباتات اور حیوانات کی ہے۔

دوسرا اُصول...... جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی جب تک بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں، گویا بدن کی بقا روح پر موقوف ہے اور روح کی بقا بدن پر۔اگر آپ نے بدن کو پھوڑ کر خستہ وخراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہوگیا اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھہرتی، بلکہ پرواز کر جاتی ہے۔اس لئے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

غرض انسان میں جب تک روح ہے تو انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بے کار ہے۔پھر جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اس طرح بدن کے ہر جزء کے لئے ایک ایک روح ہے جو اسی کے ساتھ رہ سکتی ہے اگر اس جزء کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی۔یہ نہ ہوگا کہ اگر ایک جزء کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزء میں پہنچ جائے۔مثلاً آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت ناک میں آ جائے بلکہ یہ قوت ہی باقی نہیں رہتی۔اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

حاصل یہ کہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں روح اور قوت بھی ساتھ ساتھ پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں۔اگر دونوں کو الگ کر دیا جائے۔تو اسی حقیقت کو ”موت“ کہتے ہیں اور اس علیحدگی سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔ایک دوسرا اصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ

① پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون،الآیۃ: ۱۲، ۱۳، ۱۴.

بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سماعت کی کان سے غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ صورتیں نہ ہوتو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ ''بدن روح کی پہچان کا ذریعہ ہے''۔

تیسرا اُصول...... اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح تک کوئی اثر پہچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں۔ اس عالم میں براہِ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً آپ روح پر گرمی کا عمل کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں گے جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا، اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی اور اگر ٹھنڈک پہچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے، یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔ غرض ہر تاثیر کے لئے بدن ذریعہ ہے۔ بغیر بدن کے روح پر اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

اُصولِ ثلاثہ تشریعیہ...... تو اب تین اصول معلوم ہوئے کہ بدن سے تین کام لئے جاتے ہیں۔ روح کے قرار اور قیام کا۔ دوسرے روح کے تعارف اور پہچان کا۔ اور تیسرے تاثیر کا۔ اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں، اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔ یعنی اعمالِ شرعیہّ میں بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے اس طرح اگر روح تک کوئی اثر پہچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے۔ مثال کے طور پر وضو ہی کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے یعنی ایک خاص طرح بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ۔ اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ آپ وضو کر رہے ہیں۔ کھانا نہیں کھا رہے کیونکہ کھانا کھانے والے کی ہیئت اور ہے۔ یہ تو اس کی صورت ہے اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت حاصل کرنا تاکہ انسان دربارِ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے۔ اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ طہارت اور انشراح بغیر وضو کی صورت اختیار کئے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غسل کی بھی ایک صورت ہے یعنی تمام جسم کو دھونا اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت اور صفائی۔ اور اس کی تاثیر فرح وانبساط ہے۔ اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح وانبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لئے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آپ نماز کو لیجئے کہ اس کی صورت نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع وسجود وغیرہ ادا کرنا ہے اور اس کی روح خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے اور اپنی عبدیت وبندگی کا اظہار کرنا ہے، اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی اس طرح زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی

ایک روح اور ایک صورت ہے۔

محبوباتِ نفس کی قُربانی......تو یہ جو "قربانی" ہے۔اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح،صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب الی اللہ ہے۔تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے نماز میں نماز کی روح۔زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے غرض اللہ تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ① "یعنی تم خیرِ کامل کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے"۔

اور مال محبوب چیز ہے۔مال میں سے بھی جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے۔کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کوئی بے جان چیز ضائع ہو جائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے اگر فنا ہو گیا تو دوسرا نہیں ملتا۔اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بے کار ہے،اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرے تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتے تو "رضاءِ حق" جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ محبوبات قربان کئے بغیر کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟اور محبوبات کیا ہیں؟جان،مال،اولاد،عزّت آبرو وغیرہ۔

چنانچہ ارشاد ہے﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ② "یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا"۔

غرض آپ کو ان میں سے ہر چیز لٹانی ہوگی۔تب کہیں بندگی کا اظہار ہوگا۔درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھسا کر دیکھا جاتا ہے اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں،ورنہ نہیں تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے،لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں۔بس اس طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور یہ ہمارے اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں۔اس لئے جنت حاصل کرنے کے لئے ہمیں "محبوباتِ نفس" کو قربان کرنا لازمی ہے۔اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو۔جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو۔عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟۔انہوں نے پھر یہی عرض کیا اور آپ

① پارہ:۴،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۹۲. ② پارہ:۱۱،سورۃ التوبۃ،الآیۃ:۱۱۱.

صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا، کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مصیبتیں جھیلنے کو فقر فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو اور آفتیں جھیلنے کو تیار ہو جاؤ اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے اسی لئے ارشاد ہے۔ ﴿الٓمّٓ ٥ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ٥ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ﴾ ① ”یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض ”اٰمَنَّا“ کہنے سے ان کا چھٹکارا ہو جائے گا اور انکی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو پس ضرور بِضرور معلوم کرلے گا اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو اور ضرور معلوم کرلے گا جھوٹوں کو“۔

روحِ قربانی اور شبہ کا جواب...... غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صورت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع اور آخرت میں معاملہ برعکس ہوگا، روح اصل ہوگی اور صورت تابع۔ تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی روح کی بقا کے لئے صورت کی ضرورت ہے اسی طرح اعمال شرعیہ کی روح کی بقا کے لئے ان کے جسم وصورت کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں تو اصل روح ہے اس لئے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو تو اس کو چاہئے کہ یہ عمل پہلے اپنے اوپر جاری کرے کہ اپنے بدن کو ختم کر دے اور خودکشی کرے کہ بس میں تو روح کو باقی رکھوں گا لیکن اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر اعمالِ شرعیہ میں یہ عملِ جراحی کیوں کیا جاتا ہے؟

جیسا کہ شروع میں معلوم ہو چکا کہ کائنات میں جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اسی طرح ہر ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں بینائی کی قوت ایک روح ہے وغیرہ۔ اسی طرح سارے اعمال کا نام ”تقویٰ“ ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے۔ ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ﴾ ② ”یعنی اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے“۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے سو اگر کوئی یہ کہے کہ جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ تقویٰ اختیار کرلو کافی ہو جائے گا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کرلو کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے۔ ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ③ ”تم پر روزوں کا حکم ہوا جیسے تم سے پہلے لوگوں پر حکم ہوا تھا۔ شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ“۔ تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہے۔ نماز کے متعلق ارشاد باری ہے کہ ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ ④ ”نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے“۔ جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ لہٰذا نماز اور روزہ

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۱-۳۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۷۔

③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۳۔ ④ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

بھی چھوڑ دیجئے۔ پھر ارشاد ہے کہ ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ ① ''مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا نیکی نہیں ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور اس کی محبت پر مال دے اور رشتہ داروں کو، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے، اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں۔ یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی متقی ہیں''۔

لیجئے سارے اسلام کا حاصل تقوی نکلا اس لئے سب کچھ چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لیجئے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ہر ہر چیز کی روح علیحدہ ہے اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسری عبادت، صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کر دیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ گدھا ہی رہے گا اسی طرح صدقہ، صدقہ ہی رہے گا قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کہا جا سکتا ہے تو دنیا میں چونکہ بغیر صورت چارہ نہیں اس لئے قربانی کرنی ہی پڑے گی ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورت ضروری نہیں لیکن اگر آپ نے دنیا میں اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھیئے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ ''اَلْاِيْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِيَةٌ'' ② ''ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر''۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا کوئی عبادت نہیں ہو سکتی۔ لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَّوْمَ النَّحْرِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ۔'' ''بقرہ عید کے روز سب سے زیادہ محبوب عمل قربانی ہی ہے۔'' تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ'' ''یا رسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ'' ''تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے استفسار کیا کہ ''فَمَا لَنَا فِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' ''یا رسول اللہ اس میں ہمارا کیا نفع ہے؟''

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۷۔ ② قال ابن تیمیۃ فی شرح عقیدۃ الواسطیۃ: نعنی بالاسلام الاعمال الظاھرۃ، وبالایمان الاعتقادات الباطنۃ، کما جاء فی المسند من حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ .... ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قال: "الایمان فی القلب والاسلام علانیۃ." شرح عقیدۃ الواسطیۃ، ج: ۱۳ ص: ۱۴۰۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ" "قربانی کے ہر بال پر ایک نیکی ملے گی"۔ ① تو یہ اجر وثواب صدقہ وغیرہ پر کیسے مرتب ہوسکتا ہے؟ کیونکہ صدقہ میں بال کہاں ہیں تو بات دراصل وہی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔

قربانی کی حقیقت......اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے ان کو یہ گوارہ نہ ہوا اس لئے حکم دیا تم جانور ذبح کردو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کردیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواب کے ذریعہ بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کی قربانی پیش کریں اب دیکھئے کہ یہ حکم اول تو اولاد کے بارہ میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی، فرزند اور فرزند بھی ناخلف نہیں بلکہ نبی معصوم۔ ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے، مگر حکم خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر منی کے منحر میں تشریف لائے اور فرمایا بیٹا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کروں۔ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً فرمایا ﴿اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ ② جو آپ کو حکم ہوا ہے ضرور کیجئے۔ اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا؟ اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں ادھر باپ خوش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہا ہوں چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن میں چھری چلائی تو چھری کند ہوگئی اور اس وقت حکم ہوا۔ ﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَآ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ③ "بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم نیکو کاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں"۔ اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہوگیا۔

قربانی اور صدقہ میں فرق......اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے چنانچہ انسان میں جان سپاری اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی روح ہے، تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اس طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن مقرر نہیں مگر اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے اور اس کا نام بھی "يَوْمُ النَّحْرِ" اور "عِيْدُ الْاَضْحٰى" یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الاضاحي، باب ثواب الاضحية، ج: ٩ ص: ٢٨١.

② پارہ: ٢٣، سورۃ الصافات، الآیۃ: ١٠٢.

③ پارہ: ٢٣، سورۃ الصافات، الآیۃ: ١٠٥.

جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی اور امت کا اس پر اجماع ہے ابنیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ ائمہ کرام کا اس پر اجماع ہے یہ اور بات ہے کہ امام شافعی امام احمد بن حنبل، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم کے یہاں قربانی سنت ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس کے حکم میں اختلاف ہے اور ائمہ کے دقائق ہیں مگر قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں۔ اور اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں؟

چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی "أَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْأُذُنَ وَأَنْ لَا نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَلَا مُدَابَرَةٍ وَلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ" ① "ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال کرلیا کریں ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان چرا ہوا ہو، اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو"۔

اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جدا ہیں اس لئے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے پھر ساری امت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آرہی ہے، اور تعامل امت سب سے بڑی دلیل ہے۔

مُنکرینِ قُربانی پر طریقِ ردّ...... قربانی کے متعلق تو اب بیان ہو چکا، لیکن اگر کہا جاوے کہ آپ تو حدیث سے استدلال کر رہے ہیں حالانکہ ہم حدیث کو حجت ہی نہیں مانتے تو ایسے لوگوں سے پھر قربانی کے مسئلہ میں جھگڑا نہیں بلکہ پھر تو حدیث کے حجت ہونے پر گفتگو ہے یہ ایک اصولی اختلاف ہے ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جاوے گا کہ آپ قرآن مجید کو جو کلام اللہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کا کلام اللہ ہونا کیسے معلوم ہوا؟

اگر یہ جواب ہے کہ خود قرآن سے معلوم ہوا تو یہ "مکابرہ" ہے یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل اور یہ صریح غلطی ہے ورنہ پھر یہ تسلیم کر لیجئے کہ حدیث کا کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ درحقیقت جو شخص احادیث کا انکار کر رہا ہے وہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا بھی منکر ہے کیونکہ قرآن بغیر حدیث کے حجت نہیں بن سکتا جس طرح کوئی شخص بغیر رسول کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کلام اللہ تک بغیر کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رسائی ممکن نہیں کیونکہ لغت کے زور سے اگر کلام اللہ کو حل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی بلکہ اس شخص کی اپنی مراد ہوگی۔ جب تک پیغمبر یا پیغمبر کے نائبین کسی آیت کی مراد کو بیان نہ کریں وہ شریعت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں بلکہ لب ولہجہ بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں چنانچہ کبھی اس کو اِستفسارِ حال کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے لئے کبھی تعظیم شان کے لئے اور کبھی تحقیر کے لئے اب اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیں تو کیا وہ شخص اس کو پڑھ کر متکلم کی مراد کو سمجھ سکے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ

① السنن للترمذی، کتاب الاضاحی، باب مایکرہ من الاضاحی، ج:۵ ص:۴۵۴.

جو کچھ وہ سمجھے گا وہ اس کی اپنی مراد ہوگی چنانچہ اگر یہ شخص اس وقت تعجب کی حالت میں ہوگا تو اس کو تعجب کے لئے سمجھے گا اور اگر استفسارِ حال کا اس پر غلبہ ہوگا تو اسی کے لئے سمجھے گا۔ تو یہ کیفیات کاغذ پر نہیں آ سکتیں۔

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید ۔۔۔ لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

یعنی مصور تو صرف محبوب کی صورت بنا سکتا ہے۔ اس کے ناز و انداز کو کیسے اس میں ڈھال سکتا ہے؟

طریق رد نمبر۲...... اس کے علاوہ ایک چیز ''عُرف'' ہے یعنی کلام میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اہلِ عُرف کے پاس رہ کر ہی سمجھ میں آ سکتی ہیں چنانچہ دیوبند میں ایک صاحب تھے جو کلکٹو کے یہاں منشی تھے کلکٹو اگر چہ انگریز تھا مگر اس کو خیال تھا کہ میں اُردو بہت اچھی جانتا ہوں، چنانچہ اکثر وہ میر منشی صاحب سے بھی کہا کرتا تھا کہ ویل میر منشی! ''ہم تم سے زیادہ اُردو جانتے ہیں''۔ اور یہ بے چارے منشی اس کا جملہ سن کر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے کیونکہ کے ملازمت کا سوال تھا۔ آخر یک روز اس نے کسی بات پر میز پر ہاتھ مار کر کہا ''وَل منشی، ہم تم سے زیادہ اردو جانتے ہیں''۔ اس مرتبہ ان کو بھی جوش آ گیا انہوں نے سوچ لیا کہ ملازمت رہے یا نہ رہے مگر کم از کم ایک مرتبہ اسکو جواب تو دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میز پر مکہ مار کر کہا کہ ''صاحب بہادر: اُردو کی ابجد بھی نہیں جانتے'' یہ سن کر وہ انگریز بڑا حیران ہوا، اور کہا کہ ہمارا امتحان لو انہوں نے کہا اگر میں امتحان لوں تو صاحب بہادر بغلیں جھانکنے لگیں۔ اب تو صاحب بہادر واقعی بغلیں جھانکنے لگے کہ اس کا مطلب کیا ہوا بہت غور کیا مگر خاک سمجھ میں نہ آیا آخر کہا کہ تین دن کی مہلت دو۔ انہوں نے کہا کہ سات دن کی مہلت ہے غرض اس نے جملے کو لُغت میں تلاش کیا مگر لغت میں تو بغل مِل گیا اور جھانکنا مِل گیا مگر یہ جملہ کہاں ملتا۔ آخر کار اس نے سات دن کے بعد کہا کہ مطلب یہی ہے کہ بغل اُٹھا کر دیکھ لیا اور ادھر کی بغل کو اسی طرح دیکھ لیا۔ میر منشی یہ سن کر ہنس پڑے تب اس نے پوچھا کہ پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ میر منشی نے کہا کہ اس شرط پر بتاؤں گا کہ پھر کبھی اردو دانی کا دعویٰ نہ کرو۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا اور انہوں نے اس کا مطلب بتایا کہ دراصل یہ جملہ تحیر سے کنایہ ہے یعنی اگر صاحب بہادر کا امتحان لیا جائے تو وہ حیرت میں پڑ جائیں اور اس قسم کی غلطیاں ہونے کے متعدد واقعات ہیں غرض کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو ''عرف'' سے متعلق ہیں۔ غیر اہلِ عرف ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں۔

جب ہماری زبان اور کلام میں محاورات ہیں تو قرآن مجید میں بھی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی تو اب جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں ان کو چاہئے کہ اہلِ عرف کی طرف رجوع کریں یعنی جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف اور جو معنی وہ بتائیں ان کو صحیح سمجھیں اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱) ''اللہ

(۱) پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے قلوب کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں تعلیم کرتا ہے حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہ تھے''۔

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے تین فرائض بیان فرمائے یعنی تلاوت، تزکیہ و تعلیم اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام صرف آیتیں پڑھ کر سنا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب کو پاک کریں تاکہ وہ قرآن کے معانی سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے قابل ہوسکیں یہی وجہ ہے کہ آیت میں ''تزکیہ'' کو تعلیم پر مقدم کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسے حاصل کئے بغیر انسان کو قرآن مجید کے معانی سمجھنے کی استعداد حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب کا ایسا تزکیہ کیا کہ وہ حضرات پھر قرآن کے معانی کو اسی طریقے سے سمجھنے لگے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تابعین کے قلوب کی تزکیہ کیا اور انہوں نے تبع تابعین کا۔ غرض اسی طرح سلسلہ وار آج تک یہ معانی و مطالب محفوظ ہیں۔ اس لئے ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نکتہ بھی بغیر استاذ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ قرآن مجید ہمارے پاس امانت ہے جس طرح ہم لفظوں کے امین ہیں اسی طرح ہم معانی کے بھی امین ہیں۔ اور ہم کیا؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی الفاظ و معانی دونوں کے امین تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ شروع شروع میں آیات کو رٹنے کی کوشش فرماتے تاکہ بھول نہ جائیں اس لئے وحی نازل ہوئی ﴿لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھنے کی خاطر وحی کے دوران زبان بھی نہ ہلائیے''۔ اور زبان کیوں نہ ہلائیے اس لئے کہ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ''ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا''۔

پھر آپ کو کیا کرنا چاہئے؟ ﴿فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ③ ترجمہ: جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت سنتے رہئے پھر ہم ہی اس کا مطلب بیان کریں گے۔'' اس آیت میں حق تعالیٰ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اگر اس کے مطلب و معانی خود سمجھ میں آسکتے تو یہ کیوں فرمایا جاتا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے تو کسی اور کا کیا منہ ہے؟

یہی وجہ کہ بعض اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم کسی آیت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غور فرماتے رہتے۔ پھر کبھی تو من جانب اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس کا مطلب ڈال دیا جاتا ورنہ آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار فرماتے اگر ان کو معلوم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیتے ورنہ وہ فرماتے کہ میں حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تو قرآن مجید کے معانی اس طرح

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

آپ کو من جانب اللہ بتائے گئے اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معنی کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑتی تھی حالانکہ آپ اہل زبان تھے نور نبوت سے منور بھی تھے پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ بغیر حدیث کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے؟ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے موجد یا مخترع نہ تھے بلکہ الفاظ و معانی میں امین تھے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرما دیتے اس طرح آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب کو مانجھا اور تزکیہ فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی مسائل پر اسی طرح غور فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے تابعین کے دلوں کو اسی طرح مانجھا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو اسی طرح تزکیہ باطن سے آراستہ کیا اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے۔ ہم کو قرآن مجید کے جو مطالب پہنچے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں سے پہنچے ہیں یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں ہر شخص قرآن مجید کا مفسر نہ بن سکتا تھا۔ جب تک کسی ایسے ہی استاذ کا شاگرد نہ ہوا اور جو شخص قرآن مجید یا حدیث کی تفسیر وغیرہ بیان کرتا اس سے سند پوچھی جاتی تھی اگر وہ شخص مستند ہوا، اس کی بات قابل قبول سمجھی جاتی تھی ورنہ رد کر دی جاتی تھی۔ مگر آج کل چونکہ ناواقفیت کا زمانہ ہے اور خدا کا خوف لوگوں کے دلوں میں کم ہے اس لئے ہر وہ شخص جو ذرا عربی جانتا ہو وہ مفسر قرآن بننے کا مدعی ہے اور لوگ بغیر کسی تحقیق کے اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کے مطالب صرف انہی لوگوں سے حاصل کرنے چاہئیں جو خود صحیح سمجھتے ہوں۔ یعنی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور عالم کے شاگرد ہوں تاکہ ان کے اندر بھی تزکیہ نفس کا وہ وصف موجود ہو جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

حقیقت میں صحابہ رضی اللہ عنہم جو ساری امت سے افضل ہیں وہ اسی صحبت کی برکت سے ہیں کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی، جس سے ان کے دل صاف ہو گئے کہ اس میں صرف حق بات ہی سما سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس نہج پر ڈالا، اور ان کے قلوب کی صفائی و تزکیہ کیا۔

"أُولَئِکَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابُ أَبِی بَکْرٍ وَأَصْحَابُ عُمَرَ"

غرض یہ حضرات تھے کہ ان پر حق کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ حاصل یہ کہ کتاب اللہ تک ہم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نہیں پہنچ سکتے اور ہم کو کتاب اللہ کے اندر غور و فکر کرنے کی بھی جبھی اجازت ہے کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مطلب بیان فرما دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْکَ الذِّکْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ① "اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف قرآن مجید کو تاکہ آپ بیان فرما دیں لوگوں کے لئے جو ان کی طرف نازل ہوا، تاکہ وہ فکر کریں"۔

دیکھئے: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ ② فرمایا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

کا مطلب بیان کریں اس کے بعد "یَتَفَکَّرُوْنَ" ہے۔یعنی اس کے بعد لوگوں کوغور وفکر کی اجازت ہے۔تا کہ لوگ غور وفکر کرنے میں شریعت کی حدود سے نہ نکل جائیں۔

درحقیقت اگر ہر شخص اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق غور کرنا شروع کر دے تو قرآن مجید تو ایک کھیل تماشہ بن جائے۔اس لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے بھی حدود وقیود مقرر کی جائیں۔چنانچہ کر دی گئیں۔اب کسی کو بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "بیان" کے قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں۔اور چونکہ کلام اللہ کا مطلب سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب کے ساتھ ایک نبی ضرور بھیجا، چنانچہ اگر توریت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔صحف آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام بھی تشریف لائے اور انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور سب سے آخر میں قرآن مجید کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا۔ورنہ اگر صرف عربی دانی اور لغت کے زور سے کلام الٰہی کو حاصل کیا جاسکتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ یہ ہوا کرتا کہ ایک کتاب کسی فرشتہ کے ذریعہ سے بیت اللہ کی چھت پر رکھوادی جایا کرتی اور اعلان کر دیا جاتا کہ لوگو! یہ خدا کی کتاب ہے اس پر عمل کرو۔مگر ایسا نہیں کیا گیا۔کیونکہ کتاب کے ساتھ اس کو سمجھانے اور پڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ورنہ ہر شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے مطابق مطلب گھڑ کر استدلال کرلیا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج سے مناظرہ کرنے کو بھیجا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال مت کرنا بلکہ احادیث سے استدلال کرنا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا اور سوال فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ قرآن مجید کو میں خاص طور پر سمجھتا ہوں۔کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں دعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْقُرْاٰنَ." ① یا اللہ! ابن عباس کو قرآن کا فہم عطاء فرما۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک تم قرآن کو صحیح سمجھتے ہو مگر "اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْهٍ" (یعنی قرآن مجید کے الفاظ سے متعدد مطالب نکل سکتے ہیں) اس لئے تم صحیح مطلب بیان کرو گے اور لوگ اس کا غلط مطلب بیان کر دیں گے۔اور الفاظ سے کسی ایک کی بات متعین نہ ہوگی۔اس لئے تم حدیث سے استدلال پیش کرنا۔کیونکہ حدیث نے قرآن کے معانی متعین کر دیئے ہیں، جس میں کسی تاویل اور کید نفس کی گنجائش نہیں رہی۔②

یہی وجہ ہے کہ زمانہ سابق میں بھی جب کوئی فرقہ ایسا ہوا کہ اس نے دین میں تحریف کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا۔کیونکہ حدیث ہوتے ہوئے کسی قسم کی تحریف کا احتمال ہی نہیں رہتا۔اس لئے اس نے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹایا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ آج وہ لوگ ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کی تحریفات

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس، رقم: ۳۴۷۳. ② الدر المنثور، ج: ۱، ص: ۱۰.

بھی ختم ہوگئیں۔اور حدیث پر عمل کرنے والے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔الغرض حدیث کے بغیر قرآن نہیں سمجھ میں آ سکتا۔اور عجیب بات ہے کہ علماء صلحاء کا قول حجت ہومگر نبی کا کلام حجت نہ ہو۔

تقریر کا اصل موضوع تو قربانی کا مسئلہ تھا جس میں تفصیل نہ تھی مگر درمیان میں چونکہ کچھ اصول کی بحث آ گئی اس لئے بات ذرا طویل ہوگئی اگر چہ اس اصول بحث کو بہت مختصر بیان کیا گیا۔تاہم بحمد اللہ ضروری باتیں آ گئیں اور یہ معلوم ہوگیا کہ حدیث پر بھی ایمان ضروری ہے۔اب اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

متعلقات قربانی کی وضاحت......اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہو جائیں گے،سواول تو یہ خیال ہی غلط ہے کیونکہ روزانہ جو لاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں،عید کے دن وہ ذبح نہیں ہوتے اس طرح کچھ معمولی سافرق پڑتا ہے جو کسی طرح بھی قابل اعتناء نہیں۔پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔پھر ان کی ساری کھالیں غرباء و مساکین میں تقسیم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں خرچ ہوتا ہے،اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے۔تو بے شک مہاجرین کی امداد ضروری ہے مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر چھری کیوں چلتی ہے۔کچھ اپنی خواہشات نفس پر بھی تو چھری چلایئے اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجئے۔مثلاً سینما ہے شراب ہے،اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔

حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اسی طرح اعمال شرعیہ میں بھی ایک روح ہے۔اور جیسے وہاں صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آ سکتی۔اسی طرح یہاں بھی ایک روح ہے جو دوسرے میں نہیں آ سکتی۔

سو اب سمجھئے کہ سارے اعمال شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔روزے میں تزکیہ نفس کی صورت میں جہاد میں شجاعت کی صورت میں،صدقہ میں اِنفاق مال کی صورت میں،اور قربانی سے جان نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔اب اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی،تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) نہ ملا پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہوگا۔اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا،جس کے سپرد کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت سونپی۔اب اس نوکر نے یہ کیا کہ کھانا تو پکایا نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنا دیا۔ہر چیز قرینے سے رکھ دی جھاڑو بھی دی،فرش بھی دھویا،جالے بھی صاف کئے اب آپ جب گھر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً آپ خوش ہوں گے مگر جب کھانے کے وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اس

نے کھانا نہیں پکایا؟ تو کیا وہ ملازم جواب دے سکتا ہے کہ صاحب میں نے گھر تو صاف کر دیا۔ اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہاں جو کام تیرے سپرد کیا تھا وہ تو تو نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام جو فی الجملہ اچھا ہے مگر تیرے سپرد نہ تھا۔ اس لئے تجھ کو یہ کام کھانا کھلانے کے بعد کرنا چاہیئے تھا۔ اسی طرح صدقہ و خیرات تو عبادات نافلہ ہیں، مگر قربانی واجب ہے تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

حاصل یہ کہ آپ جو صورت اختیار کریں گے، اسی کی روح اس میں ڈالی جائے گی۔ جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح اور حیوان کی صورت میں حیوان کی پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آ سکتی ہے؟ اسلئے قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملتا ہے۔ روزہ دار کے لئے قیامت کے دن دستر خواں بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ: ’’اِنَّـهٗ لَيَـاْتِـىْ يَوْمَ الْـقِيٰـمَةِ بِـقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا‘‘ ① قیامت کے دن قربانی کے جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھالوں کے ساتھ موجود ہوگا۔

اس جگہ ان اجزاء کا ذکر ہے جن کو ہم بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یعنی اس کے ردی اجزا پر بھی ثواب دیا جائے گا۔ تو جو اصلی چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں نہ ملے؟ پھر آگے ارشاد ہے: ’’وَاِنَّ الـدَّمَ لَيَقَـعُ مِنَ اللّٰـهِ بِـمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا‘‘ ② ’’قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تم اس عمل کو کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرو‘‘۔ تو مقبولیت کا درجہ بھی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ کا بیان تو ہو چکا مگر ایسے جزئی مسائل میں جو اجماعی چیزیں ہیں شبہ پیش آنا، انتہائی تنزل، اور انحطاط کی علامت ہے۔ اب تک تو علماء کو صرف اصول ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مگر افسوس اب جزئیات و مسلمات کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ علماء کے ذمہ اس کا ثابت کرنا نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں مگر میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو کہاں تک جزئیات کو ثابت کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں مسلمات سے بھی رہنے دیجئے یہ تو نہ ہو کہ ہر چیز کی دلیل کی ضرورت پڑنے لگے۔ یہ انتہائی پستی اور تنزل کی دلیل ہے جس کی وجہ علم دین کی طرف سے لاپرواہی اور بے توجہی ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ آپ لوگ علمِ دین حاصل کرنے کی طرف توجہ کریں، کچھ نہیں اور میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسرے علوم وفنون حاصل نہ کریں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کریں۔ تا کہ روزمرہ کے موٹے موٹے مسائل میں آپ کو شبہات پیش نہ آئیں اور آپ کو ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام نہ بنا سکے۔ بلکہ آپ کو خود بھی حق و باطل میں

① السنن الکبریٰ للبیهقی، ج: ۹ ص: ۲۶۱۔

② السنن للترمذی، ابواب الاضحیة، باب ماجاء فی فضل الاضحیة، ج: ۵، ص: ۳۴۴۔

امتیاز کی تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔قرآن مجید کا ترجمہ بھی کسی سے تعلیم کے طور پر حاصل کریں، خود دیکھنے میں ہزاروں غلطیوں کا احتمال ہے۔

اگر آپ کو کسی مسئلہ میں شبہ ہو اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہو تو خود اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے علماء کی طرف رجوع کیجئے کہ دین بالکل بے غبار ہے بشرطیکہ آپ سمجھنے کا قصد رکھتے ہوں اور آپ کی بحث کا پیرایہ تحقیقی و تعمیری ہو۔ہٹ دھرمی اور ضد کو اس میں ادنی بھی دخل نہ ہو۔اب میں بات ختم کرتا ہوں۔دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو شرُ ور و فتن سے بچائے اور راہِ مستقیم پر قائم رکھے، اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔

آمِیۡنَ یَارَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَاَتۡبَاعِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ، بِرَحۡمَتِکَ یَآاَرۡحَمَ الرَّاحِمِیۡنَ

حقیقت نکاح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ. ①

اَحوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے نکاح کی تقریب انجام پائی ہے۔ اور اس میں اپنے عزیزوں میں سے ایک عزیز کا نکاح ہوا اس تقریب کا تقاضا یہ ہے کہ میں نکاح ہی کے سلسلہ میں کچھ کلمات گزارش کروں، جو نکاح کے ثمرات پر مشتمل ہوں۔ چونکہ موقع کے مناسب کوئی بیان ہوتا ہے، تو وہ نفع دیتا ہے۔ جو وقت کا تقاضا ہو۔ اسی کے مطابق بیان کیا جائے۔ گویا اس تقریب نے تقریر کا موضوع متعین کر دیا اسی موضوع کے سلسلہ میں کچھ بیان کیا جائے گا۔ اس وقت دو تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ دوسرے نکاح کی غرض وغایت، اور یہ کہ نکاح کے احکام کیا ہیں؟ یہ تین باتیں اس تقریر کا موضوع ہوں گی۔

دنیا جنت اور جہنم سے مرکّب ہے، تمہید...... ان تین باتوں کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی بات بطور تمہید کے سمجھ لیجئے پھر تینوں باتیں آسان ہو جائیں گی۔ وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ نے دو سلسلے پیدا کئے ہیں۔ ایک خیر کا سلسلہ ہے اور ایک شر کا ایک سلسلہ بھلائی، خوبی اور نیکی کا ہے اور ایک سلسلہ بدی، برائی اور شر کا ہے۔ ہر اصل کے مقابلے میں، جو اچھی اصل ہے، کوئی نہ کوئی اس کی ضد ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ دنیا اکہری نہیں ہے بلکہ بھلائی اور برائی دونوں سے مرکب ہے۔ جو خیر آپکے سامنے آئے گی، اس کے مقابلے میں کوئی شر ضرور ہوگی، جو اس کی ضد کہلائے گی۔ اگر اللہ نے دنیا میں اسلام پیدا کیا، تو مقابلے میں کفر بھی پیدا کیا۔ اگر دنیا میں سچ آیا تو مقابلے میں جھوٹ بھی آیا اگر نور دنیا میں لایا گیا، تو مقابلے میں ظلمت بھی لائی گئی۔ اگر تقویٰ وطہارت لایا گیا تو

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

مقابلے میں فسق و فجور بھی لایا گیا۔غرض ہر چیز کی اصل کے مقابلے میں کوئی ضد ضرور ہے۔اگر دن لایا گیا،تو مقابلے میں رات لائی گئی۔ یہ ایک سلسلہ ہے خیر وشر کا۔اگر آپ کو محض خیر کی تلاش ہو، جہاں برائی کا نشان نہ ہو، وہ جنت کا عالَم ہے اور جہاں خیر اور بھلائی کا نشان نہ ہو تو وہ جہنم کا عالَم ہے کہ وہاں سوائے برائی، اور کدورت اور تکلیف کے کچھ نہیں۔ دنیا کو اللہ نے جنت اور جہنم سے مرکب بنا دیا ہے، کہ کچھ خیر جنت سے لائی گئی اور کچھ شر جہنم سے لائی گئی دونوں سے ملا کر ایک عالَم بنا دیا گیا، جس کا نام دنیا ہے۔اس لئے یہاں خیر بھی ہے شر بھی اور نیکی بھی ہے، بدی بھی برائی بھی ہے بھلائی بھی۔اسلام بھی ہے ظلمت بھی ہر اصل کے مقابلے میں ایک ضد لگی ہوئی ہے۔

عالَم غیب میں خیر وشر کا سلسلہ......اس کائنات میں اوپر سے لے کر نیچے تک یہی سلسلہ ہے۔غیب کو دیکھا جائے۔یعنی وہ مخلوق جو آنکھوں سے اوجھل ہے، وہاں بھی یہ دونوں سلسلے ہیں ایک طرف ملائکہ علیہم السلام ہیں جو خیر محض ہیں۔ان کے مقابلے میں شیاطین ہیں، جو شر محض ہیں۔ملائکہ ہر بات میں خیر کی طرف چلتے ہیں، شیاطین ہر معاملے میں شر کی طرف چلتے ہیں۔ملائکہ کے لئے فرمایا گیا: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ ①

یہ اللہ کے پاکباز اور مکرم بندے ہیں. ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ ② ان کا شیوہ یہ ہے کہ اللہ کی ذرہ برابر نافرمانی یا عصیان کا کوئی شائبہ تک ان میں نہیں، سوائے اِطاعت، پاکیزگی اور برگزیدگی کے تو ان کو کہا گیا ''لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ ''عِصیان کا نشان نہیں۔اور شیاطن کو کہا گیا ﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ ③ ''شیطان کا کام ہی کفر کرنا اور کفران نعمت ہے۔

ملائکہ علیہم السلام جہاں ہوں گے، خوشبو کی طرف دوڑیں گے۔شیاطین جہاں ہوں گے بدبو کی طرف دوڑیں گے۔حدیث میں ہے کہ مساجد اور ذکر اللہ کی مجالس میں، ملائکہ علیہم السلام کا ہجوم ہوتا ہے۔جتنی کوڑیاں اور گندگی کی جگہیں ہیں، وہاں شیاطین کا ہجوم ہوتا ہے۔انہیں وہ پسند ہے۔یہ خیر کی طرف جاتے ہیں۔وہ شر کی طرف جاتے ہیں۔ ④ ملائکہ کا کام کیا ہے؟ ہر مخلوق کی خیر خواہی کرنا' ہر ایک کے لئے دعا کرنا، ہر ایک کے لئے بھلائی چاہنا شیاطین کا کام ہے، ہر ایک کی برائی چاہنا، ہر ایک کو ایذا پہنچانا۔ہر ایک کے لئے تکلیف کا سامان کرنا۔ملائکہ علیہم السلام کی شان قرآن کریم میں فرمائی گئی کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ⑤ جو ملائکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، ان سے زیادہ مقرب کون ہوگا؟ وہ اتنے نزدیک ہیں حق تعالیٰ کے کہ ملائکہ میں سے کسی کو اتنا قرب حق تعالیٰ کا میسر نہیں ہے۔اور جو ان کے اردگرد اربوں کھربوں ملائکہ ہیں۔ان کا کام کیا ہے؟ ﴿يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ

① پارہ:۱۷،سورۃ الانبیاء،الآیۃ:۲۶،۲۷ ② پارہ:۲۸،سورۃ التحریم،الآیۃ:۶ ③ پارہ:۱۵،سورۃ الاسراء،الآیۃ:۲۷.

④ تفسیر ابن ابی حاتم،ج:۱۱،ص:۴۴۷ ⑤ پارہ:۲۴،سورۃ المؤمن،الآیۃ:۷.

بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ① حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہماری اولادوں کے لئے، ہماری بیویوں کے لئے، اہل وعیال کے لئے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! ان کے لئے دنیا میں آخرت میں بھلائی دے۔ یہ ان کا کام ہے۔

اور شیاطین نے کیا کیا؟ سب سے پہلے بڑے شیطان نے اللہ ہی کے سامنے کہا کہ: ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ ② تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ایک انسان کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ ایک ایک انسان کو بھٹکا کے رہوں گا۔ کبھی خیر پر نہیں آنے دوں گا۔

حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں، تیرے ایک ایک متبع کو جہنم میں ڈال کے رہوں گا' اور جہنم کو بھر دوں گا۔ تو ملائکہ کہتے ہیں یا اللہ! سب کو بھیج جنت میں، خیر ان کے لئے پیدا کر۔ شیطان کہتا ہے کہ میں گمراہ کروں گا، تا کہ ایک ایک کو جہنمی بنا کے چھوڑوں۔ تو وہ انتہائی خیر خواہ یہ انتہائی بدخواہ۔ وہ نیکی کی طرف لاتے ہیں، یہ بدی کی طرف۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور بائیں جانب شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ فرشتہ کا کام کیا ہے؟ خیر کا راستہ دکھلاتا ہے، قلب میں خیال ڈالتا ہے کہ یہ بھی نیکی کر لے یہ بھی نیکی کر لے۔ شیطان کہتا ہے، یہ بھی بدی کر، یہ بھی بدی کر۔ اس میں بڑی لذت ہے۔ زنا کاری کر، اس میں بڑا لطف آئے گا۔ چوری کر، اس میں مال بڑھ جائے گا۔ یہ بدی کو مزین اور آراستہ کر کے پیش کرتا ہے، تا کہ انسان دل لبھادے اور مبتلا ہو جائے۔ فرشتہ نیکی کا راستہ دکھلاتا ہے کہ گناہ میں لذت تو آجائے گی، مگر انجام کو سوچ لے کہ جہنم بھی بھگتنا پڑے گا۔ معصیت کے اندر نفس کو نہایت لذت آتی ہے، مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ اس کے بعد قلق، کدورت اور تشویش پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں نفرت بڑھتی ہے۔ نیکی کرنے میں ابتداء تکلیف ہوتی ہے۔ مگر انجام کار قلب میں راحت، سکون، بشاشت اور ایک نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ تو فرشتہ خیر کی راہ دکھلاتا ہے۔ اور شیطان شر کی راہ دکھلاتا ہے۔ فرشتہ نیکی کے خطرات ڈالتا ہے۔ اور یہ بدی کے وساوس ڈالتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا، یہ جو بعض اوقات انسان کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ کبھی تو جی چاہتا ہے، کہ لاؤ نیکی کر لوں اور کبھی سستی آتی ہے کہ دیکھی جائے گی۔ کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ تہجد پڑھ لوں۔ پھر خیال آیا کہ رات کا اخیر ہے، بڑی میٹھی نیند ہے، کون پڑھے، کل کو دیکھی جائے گی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر یہ فرشتے اور شیطان کی جنگ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان ڈانواں ڈول ہوتا ہے۔ جو غالب آجائے، وہی انسان کر گزرتا ہے۔ ادھر ہی کو طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔

شیطان کے کہنے سے نیکی بھی درست نہیں...... اسی واسطے فرمایا گیا: کہ شیطان انسان کا انتہائی دشمن

① پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۸۲۔

ہے۔اس کے کہنے سے نیکی بھی مت کرو۔ نیکی اپنے ضمیر کے تقاضے سے کرو۔ وہ اگر یوں بھی کہے کہ نماز پڑھ لو۔ سمجھو کہ اس میں بھی کوئی مکاری اور شر پوشیدہ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سو رہے تھے۔ اتفاق سے شیطان نے وسوسے ڈالے۔ بہر حال نبی اور معصوم تو نہیں تھے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ابتلاء ہوسکتا ہے۔ تو اس کی کچھ حرکت اور تصرف سے ان کا تہجد قضا ہوگیا۔ شیطان بہت خوش ہوا کہ ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کا تہجد قضا کرا دیا۔ فرض تو چھڑا نہیں سکتا تھا۔ صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ نفل چھوٹ سکتی تھی، وہ چھوٹ گئی۔ مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اتنا صدمہ گزرا کہ برسوں کا میرا معمول چھوٹ گیا۔ سارے دن روئے، استغفار کیا، بیسیوں نفلیں پڑھیں توبہ کی۔ اگلا دن جب ہوا، تو ارادہ کر کے سوئے کہ آج اِن شاء اللہ ضرور اٹھوں گا۔ اور آج میرے اوپر نیند کا غلبہ نہیں ہونا چاہئے۔

ابھی اٹھنے نہیں پائے تھے۔ ایک شخص نے آ کر پیر ہلایا کہ امیر معاویہ! اٹھیئے اٹھیئے تہجد کا وقت آ گیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، کہ میرے اٹھانے کے لئے میرے محل سرائے میں رات کے وقت کون اجنبی آیا؟ ہاتھ پکڑا تو معلوم ہوا یہ شیطان ہے۔ وہ بھی صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ قوی الایمان ہیں۔ فرمایا۔ مردود تو یہاں کیوں آیا؟ اس نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی پیش نظر تھی۔ کل آپ کا تہجد قضا ہوگیا تھا۔ میں نے کہا آج میں ہی جا کے اٹھادوں۔ آپ کو تکلیف دی تھی۔ کہا۔ منحوس! تو؟ اور خیر خواہی؟ اللہ نے کہا ہے کہ: ﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا ارادشمن ہے، اسے دشمن ہی سمجھو یہ مت سمجھنا کہ دوست ہے۔ تو اور دوستی کرے، اور خیر خواہی کرے۔ سچ سچ بتلا، تو نے مجھے نماز کے لئے کیوں اٹھایا، کوئی مکاری اس میں ضرور پوشیدہ ہے، کوئی اس میں شر ہے۔ کہا کہ نہیں خیر خواہی پیش نظر تھی۔ فرمایا کہ تو اور خیر خواہی؟ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اللہ نے کہدیا کہ تو دشمن ہے، یہ ممکن نہیں کہ تو دوستی کرے۔

میں بھی صحابی ہوں۔ روحانیت میری بھی قوی ہے۔ آج میں تجھے انتہائی طور پر پکڑ کے پیٹوں گا، ورنہ بتا اصلیت کیا ہے؟ ہاتھ پکڑا ہوا ہے چھوٹتا نہیں۔ وہ اگر مزاج کا لطیف تھا۔ تو یہ روحانیت کے لحاظ سے قوی تھے، ان میں بھی لطافت تھی۔ کوئی ہم جیسا ہوتا، شیطان کبھی کا دھکا دے کے بھاگ بھی جاتا۔ تب وہ بات کھلی۔

اس نے کہا اصل قصہ یہ ہے کہ کل میں نے کچھ تصرف کیا تو آپ کا تہجد قضا ہوگیا۔ آپ نے توبہ کی، استغفار کیا۔ پچاسوں نفلیں پڑھیں تو اتنا ثواب ملا کہ تہجد کا بھی اتنا نہیں تھا۔ میں نے کہا لاؤ اٹھادوں کہ ثواب تو تھوڑا ہو جائے۔ دن بھر محنت کریں گے، پچاس رکعتوں کی بجائے یہ چار رکعات ہی سہی فرمایا۔ اب بات تو نے ٹھیک کہی، پھر اس کو چھوڑ دیا، کہ دور ہو ملعون تجھ پر لعنت تو شیطان خیر خواہی کبھی نہیں کرسکتا وہ ہمیشہ بدخواہی کرتا ہے۔ وہ اگر خیر کا راستہ بھی دکھائے۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی شر ہوگی۔ اس کے کہنے سے خیر بھی نہیں کرنی چاہئے۔ جب دل میں اور

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ٦.

ضمیر میں آ جائے۔ تبھی آدمی کرے۔ تو ملائکہ علیہم السلام انتہائی خیر خواہ ہیں، اور شیاطین انتہائی بدخواہ ہیں۔ تو غیب کا عالَم ہے۔ دونوں سلسلے وہاں بھی قائم ہیں۔ ایک خیر کا، وہ ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ اور ایک شر کا، وہ شیاطین ہیں۔

دنیا میں خیر و شر کا سلسلہ...... دنیا میں آنے کے بعد یہ سلسلہ یہاں بھی قائم ہے۔ انسانوں میں مقدس ترین طبقہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جو خیر محض ہیں۔ ان میں شر کا نشان نہیں ہے۔ ہر چیز میں بھلائی، ہر چیز میں خیر اور ہر انسان کے خیر خواہ۔ اور اس درجہ خیر خواہ کہ بعض اوقات حق تعالیٰ کو روکنا پڑتا ہے کہ اس درجہ خیر خواہی بھی مت کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔ آپ ہدایت فرماتے، کوئی ہدایت کو نہ مانتا، تو بیٹھ کر گھٹتے، محبت اور مخلوق کی خیر خواہی کی وجہ سے قلب مبارک کو تکلیف پہنچتی۔ کہ کیوں نہیں یہ سیدھے راستے پر آتے، کیوں برائی کے راستے پر چل رہے ہیں؟ کیوں تھوڑی سی لذت کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں انہیں سمجھ اور عقل آتی۔ تو جب نہیں مانتے تھے تو آپ گھٹتے تھے۔ حق تعالیٰ نے روکا ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ ① کیا ان کی ہدایت کی طمع میں آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کر دی، نہیں کوئی مانتا تو جائے جہنم میں۔ آپ اس میں کیوں مبتلا ہیں کہ قلب میں ضیق اور گھٹن ہے۔ تو روکنے کی نوبت آئی، اس لئے کہ خیر خواہی انتہائی درجہ کی تھی۔ ہر ایک کے لئے چاہتے تھے کہ ایماندار بن جائے۔ اس لئے جو خلاف کرتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو انبیاء علیہم السلام خیر محض ہیں۔ انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور محبت ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

دنیا میں جو انبیاء علیہم السلام کے مقابل ہیں۔ وہ دجال کہلاتے ہیں۔ ہر نبی علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی دجال آیا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں دجال آئے۔ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا دجل کے معنی ہی یہ ہیں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ آدمی تلبیس پیدا کرے۔ دعویٰ نبوت کا اور اندر سے کفر بھرا ہو۔ یوں تلبیس کر کے دنیا کو کفر پر لاتے تھے۔ تو نبی کا ٹھیک مقابلہ دجال سے ہوتا ہے۔ نبی خیر محض اور دجال شر محض ہے۔ ہر نبی کے مقابلے میں ایک نہ ایک دجال لایا گیا ہے کہ نبی مخلوق کو خیر کی طرف لائے، اور دجال، شر کی طرف لائے۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور نبوت، علم اور ایمان کا کمال، غرض سارے مراتب نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو چکے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الایمان نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الہدایت نہیں ہے۔ سارے مراتب خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ختم ہیں۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں کہ نبوت کا ہر درجہ اور مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ کر ختم ہو گیا۔ اسی لئے آپ کی امت میں جو دجال آئے گا، وہ اتنا بڑا دجال ہو گا کہ کوئی دجال ایسا نہیں گزرا ہو گا۔ اس لئے کہ اتنے بڑے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو اتنا ہی بڑا دجل و فریب ہونا

① پارہ: ۱۹، سورة الشعراء، الآية: ۳.

چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اور دجالوں نے نبوت کے دعوے کئے۔ اسلام میں جو اخیر میں دجال آئے گا، وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ اس پر شر کے مراتب ختم ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی پشت مبارک پر مہر نبوت تھی، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبین ہونے کی علامت تھی، اوراس پر لکھا ہوا تھا: سِرْ حَیْثُ شِئْتَ فَاِنَّکَ مَنْصُوْرٌ جہاں بھی جاؤ، خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ خیر تمہارے ساتھ ہے۔ خیر کے مراتب تم پر ختم ہیں۔ تو آپ کے لئے مہر نبوت تھی۔ جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیر مجسم ہیں۔ دجال کی پیشانی پر کفر لکھا ہوا ہوگا ''ک،ف،ر'' تو یہ کفر مجسم ہے۔ وہاں کفر کے مراتب ختم۔ تو انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ دجالوں سے ہے۔ انبیاء خیر ومحبت لیکر آتے ہیں۔ دجال عداوت اور شر لے کر آتے ہیں۔ تو وہاں ملائکہ اور شیاطین کا مقابلہ تھا، یہاں انبیاء اور دجالوں کا مقابلہ ہے۔

انبیاء کے ماننے والوں میں جو اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ انہیں امام کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا﴾ ① ہم نے لوگوں کو امام بنایا وہ خیر کے راستے کی ہدایت کرتے ہیں''۔ دجالوں کے جو اعلیٰ ترین متبع ہیں، ان کو آئمۃ الکفر کہا گیا ہے ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ﴾ ② ''ہم نے ایسے امام بنائے، جو جہنم کی دعوت دیتے ہیں۔ لوگوں کو آگ کی طرف لے جاتے ہیں''۔

یہ امام شر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام خیر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام ایمان کے ہیں یہ امام کفر کے ہیں۔ پھر ان آئمہ کے متبع ہیں۔ ائمہ ہدایت کے جو متبع ہیں، ان کا لقب ''اولیاءُ الرّحمٰن'' ہے۔ اور ائمۂ کفر کے جو متبع ہیں، ان کا لقب ''اولیاءُ الشیطٰن'' ہے۔ ایک ''حزب اللّٰہ'' ہے، اور ایک ''حزب الشیطان'' ہے۔ ایک کے لئے کہا گیا ہے۔ ﴿أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ③ اللہ ہی کے لشکر کو انجام کار فلاح نصیب ہوگی۔ ادھر کہا گیا: ﴿أَلَآ إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ④ شیاطین کے جو لشکر ہیں، وہ انجام کار گھاٹے، خسارے اور ٹوٹے میں رہیں گے۔ غرض اوپر سے لے کر نیچے تک دو سلسلے ہیں۔ ایک خیر کا، ایک شر کا۔ ادھر ملائکہ، ادھر شیاطین ادھر انبیاء، ادھر دجال، ادھر ائمۃ الایمان، ادھر ائمۃ الکفر۔ ادھر اولیاء الرحمٰن، ادھر اولیاء الشیطان یہ دو متضاد سلسلے دنیا میں چلے آرہے ہیں۔

خیر وشر کے سلسلوں کے کام...... اس خیر کے سلسلہ کا کام کیا ہے؟ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جو بچھڑ جاتے ہیں، ان کو ملاتا ہے۔ جن میں عداوت ہو، ان میں محبتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن میں لڑائی ہو، ان میں صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ملائکہ انبیاء اور اولیاء الرحمٰن کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا بس ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوجائے۔ سب کے قلوب ایک بن جائیں، سب ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے سے

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۲۴۔ ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۴۱۔
③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ④ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۹۔

ملیں، ایک دوسرے کی خیر خواہی میں غرق ہو جائیں۔ شیاطین، دجالوں اور آئمۃ الکفر کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ جو جڑے ہوئے ہیں، ان میں عداوتیں پھیل جائیں۔ جو ایک دوسرے کی خیر خواہی کر رہے ہیں وہ ایک دوسرے کی بد خواہی میں لگ جائیں۔ ہر ایک دوسرے کے راستے میں کانٹے بچھائے، ہر ایک دوسرے کو ذلیل وخوار کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا میں فتنہ وفساد پھیلے۔ یہ دجالوں کا شیاطین کا اور آئمۃ الکفر کا تقاضا ومقتضیٰ ہے تو انبیاء محبتیں پیدا کرانے، اور دجال عداوتیں پیدا کرانے کے لئے آئے ہیں۔

انبیاء کا کام یہ ہے کہ جو بندے خدا سے بچھڑ جائیں، انہیں خدا سے ملا دیں۔ جو آپس میں بچھڑ جائیں۔ انہیں آپس میں ملا دیں۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ بندے خدا سے بھی ٹوٹ جائیں۔ بندے بندوں سے بھی آپس میں ٹوٹ جائیں۔ بھائی بھائی میں لڑائی ہو۔ گھر گھر میں فساد ہو۔ اس واسطے جتنے سلسلے محبتیں اور اتحاد کے ہیں، انبیاء علیہم السلام ان کے حامل ہیں۔ اور جتنے سلسلے لڑائی، فتنے اور دنگے فساد کے ہیں، شیاطین ان کے حامل ہیں۔

انسانوں کو ملانے والا سب سے بڑا سلسلہ...... سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو ملانے والا نکاح کا سلسلہ ہے، جس سے دو اجنبی جڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اِتحاد باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت ہو جاتی ہے۔ ایسی مودت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ." ① "فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ." ② "نکاح میری سنت ہے، جو اس سے بھاگے گا، گریز کرے گا۔ وہ میری جماعت سے خارج ہے"۔ وہ میری جماعت میں شامل نہیں۔ اس واسطے کہ نکاح اتحاد کا ذریعہ ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وحدت ومحبت باہمی پیدا ہو۔

شیاطین اس کے حامل ہیں کہ یا نکاح ہونے نہ پائے، یا ہو کر ٹوٹ جائے، ایسی تفریق ان میں پڑے کہ نکاح ٹوٹ جائے، کہیں طلاق ہو جائے، آپس میں پھوٹ پڑ جائے، وہ یہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ طلاق اگرچہ جائز ہے، اور مجبوری کے وقت میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک جائز ہو کر بھی اس سے بغض ہے۔

ارشاد ہے: "أَبْغَضُ الْحلالِ عِنْدَاللهِ الطَّلَاقُ" ③ وہ چیز جو جائز ہے، پھر اللہ کو اس سے عداوت اور بغض ہے، وہ طلاق ہے۔ اس لئے کہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، جس سے لوگ بچھڑ جائیں گے، عداوتیں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، ج: ۵، ص: ۴۳۹. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ۴ ص: ۳۴۶، رقم: ۱۸۴۶. ② الصحيح للبخاري، كتاب النكاح، باب الترغيب في النكاح، ج: ۱۵، ص: ۴۹۳. ③ السنن لابي داؤد، كتاب الطلاق، باب في كراهية الطلاق، ج: ۶ ص: ۹۱.

پیدا ہوں گی اور یہ انبیاء کے موضوع کے خلاف ہے۔ اس لئے انبیاء نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ شیاطین طلاق سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ و رسول کے نزدیک طلاق مبغوض ہے۔ مجبوری کی بات الگ ہے مگر مبغوض ہے۔ نکاح کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ''اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ.'' اور یہ نہیں کہا گیا کہ ''اَلطَّلَاقُ مِنْ سُنَّتِیْ.'' طلاق میری سنت ہے۔ یہ تو مجبوری کی چیز ہے، کوئی عاجز آ جائے، ایسے وقت میں اجازت دی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چونکہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، اول تو اس سے بغض کیا گیا اور پھر اس کی تقسیم کی گئی۔ وہ یہ ایک طلاق سنت ہے، اور ایک طلاق بدعت۔ طلاق سنت یہ ہے کہ آدمی تین طلاق ایک دفعہ میں نہ دے۔ الگ الگ دے۔ اس لئے ہر طلاق کے بعد موقع رہتا ہے کہ پھر رجوع کرے۔ نکاح کی ضرورت نہ پڑے۔ تو سنت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ مجبوری یا ضرورت پیش آئے۔ تینوں طلاقیں ایک دم ہاتھ سے نہ نکالے، پھر وہ بائنہ ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈرانے دھمکانے کی خاطر دینا ہی ہے تو ایک دے۔ تاکہ چار مہینے اور دس دن جو عدت ہے، اس میں پھر آدمی کو رجوع کا حق رہے۔ اس کے بعد بھی اگر نوبت آئی، پھر ایک اور دے دے۔ پھر تین چار مہینے موقع رہے گا کہ پھر رجوع کرے اور تین طلاق ایک دم ختم کر دیں، سارے تیر ترکش سے نکال دیئے۔ آگے رجوع کا کوئی موقع نہیں۔ اکھٹی تینوں دے دنیا، اسے طلاق بدعت کہا گیا ہے اور طلاق سنت یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دے۔ تاکہ رجوع کرنے کا موقع رہے۔ بہرحال انبیاء علیہم السلام ہر ایسے طریق کو چاہتے ہیں، جس سے رشتہ جڑا رہے۔ یہ تعلق قائم رہے۔ اس لئے کہ یہ اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔

عورت کے ذریعے خاندانوں میں محبت قائم ہوتی ہے...... ایک اور دو کے اتحاد کا ذریعہ نہیں کہ خاوند اور بیوی مل جائیں۔ ایسی بات ہے کہ جب خاوند بیوی آپس میں ملیں گے، تو خاوند کے عزیز، بیوی کے عزیزوں سے، اور بیوی کے عزیز، خاوند کے عزیزوں سے ملیں گے۔ یہ دو کا ملنا نہیں ہے۔ یہ کئی کا ملنا ہے۔ یہ دو خاندانوں کا ملنا ہے، دو خاندانوں کا آپس میں جڑ جانا ہے۔ پھر حقوق قائم ہو جاتے ہیں۔ محبتیں ہو جاتی ہیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمائے۔ اور نو ازواج مطہرات ہوئی ہیں۔ ان کی مصلحت یہی تھی کہ ان خاندانوں سے جوڑ لگایا جائے۔ جن کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کے لئے کام لینا تھا۔ جب خاندانوں میں نکاح ہو گیا، وہ مربوط ہو گئے۔ ٹوٹ نہیں سکتے تھے۔ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین میں کام لیا، ان نکاحوں کی برکت سے قبیلے اسلام میں داخل ہوئے۔ اس لئے کہ عرب میں اس کی بڑی رعایت کی جاتی تھی کہ جہاں سلسلہ ورشتہ دامادی کا قائم ہو گیا، وہ کئی کئی پشتوں تک اس کی رعایت کرتے تھے اور ان حقوق کو مانتے تھے۔

جب مصر فتح ہوا تو مصر سے جو قیدی پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جو زوجہ مطہرہ ہیں۔ وہ مصر سے پکڑی ہوئی آئی تھیں۔ آ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرما لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دیکھو مصر سے سسرال کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کی

رعایت کرنا پوری امت پر حق عائد کر دیا کہ مصر والوں کی رعایت کرو۔ کیونکہ وہ میری سسرال بن گئی۔ یہ جو داماد اور سُسر کا رشتہ ہے یہ گویا اتنا لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ خاندان اس سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ عزیز نکاح کا تعلق ہے۔ حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ" ① تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں"۔

ان میں سے ایک چیز فرمائی کہ وہ عورت ہے۔ عورت کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ وہ معاذ اللہ شہوت رانی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلق و محبت کے قائم ہونے کا ذریعہ ہے۔ محبتیں عورت کے راستے سے قائم ہوتی ہیں۔ مرد تو اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی دکان پر، کوئی دفتر میں، کوئی کھیتی باڑی میں۔ یہ جو رشتہ داریاں جڑتی ہیں، اور حقوق ادا ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ عورتوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔ اگر عورت بد سلیقہ ہو، وہ توڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اندر سلیقہ ہو، خاندانوں کو ملا دیتی ہے۔ محل محبت فی الحقیقت عورت ہے۔ اس لئے کہ اسی سے محبتوں کے اگلے سلسلے چلتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ" ② تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ اس میں سے خوشبو کو پسند فرمایا۔ نماز کو پسند فرمایا، اور عورت کو پسند فرمایا۔ اسواسطے کہ خوشبو لگے گی، تو ملائکہ کا ہجوم ہو جائے گا۔ یہ بھی محبت باہمی کا ذریعہ بن جائے گی۔ عورت آئے گی، یہ بھی خاندانوں کے جڑ جانے کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس سے بھی محبت و اتحاد قائم ہوا۔ تو نکاح کی بڑی غرض و غایت وحدت باہمی اور سکون باہمی ہے۔

نکاح کی غرض و غایت...... یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جو نکاح کی غرض و غایت ذکر کی گئی، وہ سکون باہمی ذکر کی گئی ہے۔ لیکن نسل بڑھنا، یہ تو طبعی طور پر بڑھے گی۔ غرض و غایت اصلی جو ہے وہ یہ ہے۔ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ③ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑی جوڑا نکال دیا۔ مرد میں سے عورت نکال دی، عورت میں سے مرد نکال دیا۔ ورنہ دونوں سلسلے الگ الگ ہیں۔ مرد میں سے اگر کوئی نکلتا تو مرد ہی نکلتا۔ عورت میں سے عورت نکلتی۔ اس قدر عجیب قدرت صناعی ہے کہ مرد میں سے عورت نکال دی۔ اور عورت میں سے مرد کو پیدا کیا۔ فرمایا کہ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا۔ اگر عورت انسانوں کی جنس میں سے نہ ہوتی، فرشتوں میں سے یا جنات میں سے ہوتی، کبھی باہمی محبت قائم نہ

---

① جامع العلوم والحکم، ص: ۳۰۔ ② الحدیث اخرجه الامام البیهقی فی سنة الکبریٰ وقال: لفظ حدیث علی وفی روایة موسی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: حبب الی من الدنیا (تابعه یسار بن حاتم عن جعفر بن سلیمان عن ثابت عن انس) وری ذالک جماعة من الضعفاء عن ثابت والله اعلم، دیکھئے: السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۷ ص:۷۸

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیة: ۲۱.

ہوتی۔ دوسری جنس کے ساتھ میلان ہی نہیں ہوتا۔ جانوروں میں ہر طبقے میں ہزاروں مادائیں ہیں۔ شیر ہے تو شیرنی بھی ہے۔ بھیڑیا ہے تو اس کی مادہ بھی ہے۔ انسانوں کا کبھی رجوع نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غیر جنس ہے کبھی میلان نہیں۔ اپنی جنس کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ہماری قدرت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا، تمہاری جنس میں سے ایک تمہارے اندر میں سے، تا کہ تمہارا جب جٹ بنے تو تمہارے میں محبت قائم ہو۔ اگر غیر جنس کا جوڑا ملادیتے۔ جنی عورت بنادیتے، تمہارا رابطہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ مقصد اور موضوع ختم ہوجاتا ہے تو۔ ﴿أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ ① تم میں سے تمہارے نفسوں میں سے پیدا کیا۔ ﴿أَزْوَاجًا﴾ تمہارے جوڑوں کو۔ کیوں پیدا کیا؟ ﴿لِتَسْكُنُوْٓا إِلَيْهَا﴾ تا کہ تم اس سے سکون حاصل کرو۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ اور تم خاوند بیوی میں محبت اور مودت پیدا ہو۔ تم ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ ایک دوسرے میں تم میں محبت پیدا ہو۔ اس لئے ہم نے جوڑا بنایا اور فرمایا: ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ② جو لوگ فکر رکھتے ہیں، وہ اس چیز کی قدر کریں گے، جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو بے فکر ہیں، عقل ہی نہیں رکھتے، انہیں کیا خبر ہوگی کہ اس میں کیا مصلحت ہے؟ لیکن جب تم زندگی گزاروگے، اور اس مقام پر آ ؤ گے۔ تمہیں قدر آئے گی کہ ہم نے تم کو کتنی بڑی نعمت دی ہے۔ جو تمہارا جوڑا تم میں سے پیدا کیا۔ تا کہ تم میں سکون پیدا ہو۔

نکاح اللہ کی قدرت کی نشانی بھی ہے...... نکاح کو آیت کہا گیا ہے۔ آیت قدرت کی نشانی کو کہتے ہیں۔ کہ خدا ہی کر سکے، دوسرا نہ کر سکے۔ اسے آیت کہتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کی آیتیں ہیں۔ آیت کرسی ہے، آیتِ استخلاف ہے، آیت الرحمٰن ہے، آیت رحمت ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں اور قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کوئی دوسرا ایسا کلام نہیں لاسکتا۔ اسی طرح سے اس کے افعال میں بھی کچھ آیتیں ہیں فرمایا۔ ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا﴾ ③۔ یہ ہماری آیتوں میں سے ہے کہ زمین ہم ہی بنا سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں زمین مردہ ہوجاتی ہے، بارش برسا کے ہم اسے دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں۔ کہیں فرمایا: اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَنْخَسِفَانِ مِنْ مَّوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ ④ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی آیتوں میں سے دو آیتیں ہیں، جیسے قرآن کی آیت کا جواب نہیں۔ ان آیتوں کا بھی جواب نہیں کہ اس جیسا کوئی سورج بنادے۔ چاند جیسا چاند بنا دے۔ تو زمین سورج اور چاند کو بھی آیت کہا اور فرمایا: ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ﴾ ⑤ یہ جورات ہے یہ ہماری قدرت کی نشانی اور آیت ہے اسی کے اندر سے جب ہم کھینچتے ہیں، تو دن نکل آتا ہے۔ اندھیروں میں سے چاند نکل آتا ہے۔ ابھی دنیا پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں نور کا نشان نہیں تھا۔ انسانوں نے محنت کر کے مصنوعی انڈے، قمقمے لاکھوں چلائے چاندنا تو ہوگیا۔ مگر رات بدستور رہی۔ دن نہیں نکلا ہماری قدرت دیکھو۔ جب دن نکالنا چاہتے

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۳۳.
④ الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الکسوف، ج: ۴، ص: ۴۴۲. ⑤ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۳۷.

ہیں۔بس سورج کی آمد آمد ہوئی، اور رات غائب ہوئی یا تو دنیا پر ظلمت چھائی ہوئی تھی یا ایک دم چاند نے کی حکومت قائم ہوگئی۔ایک دم عالم میں نور پھیل گیا۔یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے۔

اسی طرح سے قدرت کی نشانی نکاح کو بھی کہا گیا ہے آپ کہیں گے نکاح میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ دومرد عورت کا نکاح کر دیا۔اس میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ کہ اللہ ہی بنا سکتا ہے اور کوئی نہیں تو نکاح میں آیت ہونے کی کیا شان ہے؟ خطیب نے خطبہ پڑھ دیا۔مولانا انصاری صاحب نے بڑا عمدہ خطبہ پڑھا، ایجاب و قبول ہوگیا۔اس میں قدرت کی نشانی کیا ہے؟

اس میں قدرت کی نشانی یہ ہے کہ دو بول پڑھے جانے سے پہلے مرد کو عورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔بالکل ایک اجنبیت تھی۔اگر رشتہ داری بھی ہوگی، تو رشتہ داریاں ہزاروں سے ہوتی ہیں، لیکن یہ کہ اس مرد کے قلب کا لگاؤ اس عورت سے تھا، قطعاً نہیں یا اس عورت کا لگاؤ مرد سے تھا، قطعاً نہیں۔وہ بالکل اجنبی، یہ بالکل اجنبی، اس کا دل اس سے بیگانہ، اس کا دل اس سے لیکن جہاں چار حروف پڑھے گئے، ایجاب وقبول ہوا۔ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔ اب اس مرد کے دل کا تعلق اس عورت سے قائم ہوا۔ایسے وقت اگر یہ خبر آئے کہ میری بیوی کو تکلیف ہے، اسے دکھ پہنچے گا۔اگر اسے پہلے خبر پہنچتی تو کہتا ہزاروں عورتیں تکلیف میں ہوں گی۔لیکن چار حرف پڑھے گئے، اور قلب کا رابطہ قائم ہوگیا۔عورت کو اگر اطلاع ہو جائے کہ جس سے میرا نکاح ہوا ہے خدانخواستہ وہ کسی تکلیف میں ہے۔وہ پریشان ہو جائے گی۔لیکن نکاح پڑھے جانے سے پہلے پچاس خبریں آتیں۔وہ کہتی ہزاروں مرد ہیں، عزیز بھی ہیں، رشتہ دار بھی ہیں، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دو حرف پڑھنے کے بعد جو انقلاب عظیم برپا ہوا، یہ اللہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ جو دلوں کو ایک دم موم اور مائل کر دیا۔ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہوگئی۔ابھی بے تعلقی تھی، منٹ بھر کے بعد تعلق پیدا ہوگیا۔یہ مرد عورت بے واسطہ تھے، اب ایک دم واسطہ پیدا ہوگیا۔ایسے میں اگر کوئی خوشی کی خبر بیوی کی نسبت آئی، خاوند کا دل بڑھ جائے گا، کہ جس سے میرا نکاح ہوا، اس کی کیسی عمدہ خبر سنی۔ خاوند کی طرف سے کوئی خوشی کی خبر پہنچے، اس کا دل بڑھ جائے گا کہ جس سے میرا رشتہ قائم ہوا۔اس کے لئے بڑی عزت کا سامان ہے۔وہ عورتوں میں سر اونچا کرے گی کہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔یہ مردوں میں سر اونچا کرے گا۔لیکن جب تک چار حرف نہیں پڑھے گئے تھے، نہ اس کا سر اونچا تھا، نہ اس کا سر اونچا تھا۔یہ جو ایک دم عظیم انقلاب برپا ہوگیا۔یہ خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ میرا آپ کا کام تو نہیں ہے۔یہی معنی ہیں نشانی ہونے کے کہ قلوب میں، روحوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہوگیا۔اس لئے فرمایا: ﴿مِنْ اٰیٰتِہٖ﴾ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا اور اسی کی نشانی یہ بھی کہ تم میں دو حرف کے پڑھے جانے سے اچانک سکون ومودت پیدا کر دیا۔حق تعالیٰ شانہٗ نے اسے موضع انعام میں ذکر فرمایا۔معلوم ہوتا ہے اللہ کو یہ محبوب ومطلوب ہے کہ یہ خاوند بیوی ملیں۔ان میں محبت پیدا ہو۔غرض وغایت نکاح کی یہ ذکر کی گئی۔تو

جب اللہ کا منشاء یہ ہے کہ مرد عورت جن کا نکاح ہے، وہ محبت سے ملیں۔ تو انبیاء کیسے نہیں پسند کریں گے؟ انبیاءؑ وہی چیز پسند کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہو۔ وہ اللہ کے ترجمان بن کر آتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کو بھی پسند ہے کہ محبت باہمی پیدا ہو جائے۔

خانگی زندگی میں سکون کا راز...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسی چیزیں عمل میں لاتے تھے جس سے محبت بڑھے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بیٹھ کر ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور ایسے دنوں میں جب وہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ زمانہ جاہلیت میں دستور یہ تھا، ایامِ حیض میں عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کے سائے کو بھی ناپاک سمجھتے تھے۔ ایک الگ کوٹھری میں بٹھا دیتے تھے، روٹی پانی بھی دیتے تھے تو بانس کے نلکے سے دیتے تھے کہ کہیں اس کا سایہ نہ پڑ جائے۔ یہ نجس ہوگئی۔ اسلام نے اس خیال کو مٹایا کہ یہ بیہودگی ہے۔ وہ نجاست حکمی ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ کوئی اس کا عین اور بدن تھوڑا ناپاک ہوا ہے۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی استنجا کر کے آئے، تو وضو کرنی واجب وہ حکمی نجاست ہے، یہ تھوڑا ہے کہ کوئی برائی اور گندگی لگی ہوئی ہے۔ حکمی طور پر نجاست ہے۔ حکم ہے کہ پاک بنالو۔ طاہر بن جاؤ۔

اسی طرح سے ایامِ حیض میں جو نجاست ہے، وہ حکمی ہے، یہ نہیں کہ بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے۔ اس کا دھونا ضروری ہے۔ حکم خداوندی ہے نجس سمجھو، پاک بناؤ۔ مگر زمانہ جاہلیت والے اس نجاست کو اتنی بڑی نجاست سمجھتے تھے کہ عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کا کھانا، پینا اور مکان تک الگ۔ اس کے سائے سے بچتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عین اس زمانے میں جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ایام گذر رہے تھے۔ ایک برتن میں کھانا کھایا اور نہ صرف یہی بلکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے لقمہ لیا منہ میں رکھ لیا، زبان لگادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس سے چھین کے خود تناول فرمالیا۔ تاکہ امت کو بتلا دیں کہ عورت کی ذات میں کوئی نجاست نہیں آتی۔ اس سے محبت قطع کر دینا، اسے اچھوت بنا دینا، یہ انسانیت کے خلاف بات ہے۔ یہ اسی لئے تھا تاکہ اس تعلق کی مضبوطی زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس واسطے اس قسم کی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم عملاً فرماتے۔

حدیث میں ہے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: آؤ ہم اور تم مل کر دوڑیں۔ آپس میں بھاگ ہوئی کہ کون آگے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے، صدیقہ رضی اللہ عنہا پیچھے رہ گئیں۔ اخیر عمر میں جب بدن مبارک بھاری پڑ گیا۔ پھر ایک دفعہ فرمایا کہ اچھا ہم اور تم مل کے بھاگیں۔ کون آگے نکلتا ہے۔ اب کے صدیقہ رضی اللہ عنہا آگے نکل گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بھاری پڑ گیا تھا۔ فرمایا: ''تِلْكَ بِتِلْكَ'' چلو برابر سرابر قصہ ہو گیا۔ ایک دفعہ ہم جیت گئے تھے۔ ایک دفعہ تم جیت گئیں۔ اب کوئی کہے، انبیاء علیہم السلام کو بھاگ دوڑ سے کیا تعلق؟ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے دل کو مٹھی میں

لینے کے لئے، اس کی دلداری کرنے کے لئے یہ چیزیں فرمائیں۔ اور فرمایا: ہر وہ لہو لعب جو حرام ہے بیوی کے ساتھ جائز ہے۔ تاکہ اس کا دل مٹھی میں آئے، اس کی دلداری دل جوئی ہو۔ مقصد یہ ہے، اس کے لئے تسلی کا سامان ہو۔ اس کے ساتھ محبت و یگانگت کا معاملہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَکْرَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَھْلًا'' ① ''تم میں سے زیادہ قابل تکریم مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ اور بیویوں کے ساتھ لطف و محبت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو''۔

سخت گیری نہ کرتا ہو، تیز و تند لب و لہجے سے نہ بولتا ہو۔ ہر وقت ڈرانے اور دھمکانے کے فکر میں نہ رہے، جیسے بے وقوف خاوندوں کی عادت ہوتی ہے اپنی شوخی اور قوت جتانے اور حکومت قائم رکھنے کے لئے سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ جب آئیں تو ناک منہ چڑھی ہوئی ہے، تاکہ بیوی بیچاری ڈر جائے، کہ کوئی شیر اور بھیڑیا آ گیا تاکہ میرا رعب رہے۔ یہ نہایت لغو حرکت ہے انسانیت و محبت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

ایک صحابی ہیں حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ انہوں نے کہیں اپنی بیوی کو مارا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوئے۔ چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ فرمایا اے انجشہ! کانچ کی شیشیوں کو توڑ ڈالنا کوئی جوان مردی کی بات ہے؟ عورت پر ہاتھ اٹھایا؟ لڑنا تھا تو کسی مد مقابل سے لڑتے اپنے سے زیادہ قوی سے لڑتے۔ اگر تمہیں کوئی شوخی اور طاقت دکھلانی تھی۔ عورت پر ہاتھ اٹھایا؟ نازک صنف کو مارنا شروع کیا، تاکہ آپ کی بہادری واضح ہو اتنے بڑے بہادر ہو، عورت کو مارا اور آ کے فخر کیا کہ میں نے مارا۔ بھئی کسی پہلوان پہ ہاتھ اٹھایا ہوتا۔ کسی جوان مرد کے مقابلے پہ آتے تم ایک مارتے، وہ چار رسید کرتا۔ جوانی معلوم ہو جاتی۔ عورت کے مقابلے پہ جوانی دکھلانا کہ میں بڑا طاقت ور ہوں۔ یہ تو کمینوں کی سی بات ہے۔ شرافت کی بات نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے، خفا ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ تو یہ تھا کہ ایک پیالے میں کھانا کھاتے ہیں۔ بعض اوقات بھاگنے دوڑنے کو فرمایا، تاکہ عورت کا دل مٹھی میں رہے، اس کی مدارت ہو۔ اس کے ساتھ لطف و اکرام کا برتاؤ ہو۔ اور دوسرا برتاؤ جو حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ نے کیا، تو آپ نے ڈانٹا، خفا ہوئے اور ناراض ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ دونوں خاوند بیوی میں مدارات کا برتاؤ رہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے اگر یہ دونوں مدارات اور لطف کا برتاؤ کریں گے، خانگی زندگی بہترین ہو جائے گی۔ جس گھر کے اندر خاوند بیوی ایک ذات ہوں، ایک دل اور ایک جان ہوں۔ اولاد میں بھی محبت پیدا ہوگی۔ عزیزوں میں بھی محبت پیدا ہوگی۔

اور جہاں خاوند بیوی کی لڑائی ہے۔ یہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بھوررہا ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بھور رہی ہے، اس کا نتیجہ ہوگا کہ اولاد میں بھی وہی چیزیں پیدا ہوں گی۔ اور گھر جہنم بن جائے گا۔ اس کا منہ ادھر کو، اس کا منہ ادھر کو۔ وہ گھر کیا ہوا۔ وہ تو دوزخ ہو جائے گی۔ جنت جب بنے گا گھر، جب ایک کو دیکھ کر دوسرا خوش ہو۔

① البحر المحیط، ج:۱۰، ص:۳۳۔

نیک بیوی آدمی کی سعادت کی علامت ہے...... حدیث میں فرمایا ہے: آدمی کی خوش نصیبی اور سعادت کی تین علامتیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ آدمی کا رزق اس کے وطن میں اترے اس کے لئے مارا مارا نہ پھرے کہ دنیا میں رزق کی تلاش کرتا ہوا جا رہا ہے۔ جہاں گھر ہے وہیں رزق کا سامان اللہ نے کر دیا۔ پہلی علامت خوش نصیبی کی یہ ہے۔

دوسری علامت یہ فرمائی گئی، اس کو گھر وسیع ملے، تنگ کوٹھری نہ ہو، کہ دیکھ کر اس کے دل میں تنگی اور گھٹن پیدا ہو جائے۔ صحن اسکا وسیع ہو، مکان ذرا اچھا ہو، اس لئے کہ مکان کی خوشنمائی سے دل میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے، اور مکان کی تنگی اور گھٹن سے دل میں بھی تنگی اور گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ تو دوسری علامت خوش نصیبی کی یہ فرمائی گئی کہ مکان اور اس کا صحن وسیع ہو، گھر اچھا ملے۔ تاکہ دل میں بھی وسعت پیدا ہو۔

اور تیسری علامت یہ ہے کہ بیوی نیک بخت ملے۔ جب اس کی صورت دیکھے، دل میں خوشی پیدا ہو جائے، اور جب اسے گھر میں چھوڑ کر جائے تو وہ مرد کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ ایسی صالحہ بیوی کہ وہ اللہ کا بھی حق ادا کرے، اپنے خاوند کا بھی حق ادا کرے۔ فرمایا: وہ آدمی خوش نصیب ہے جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں۔ گھر بھی درست ہو، بیوی بھی درست ہو۔ روزی بھی اسکی اس کے وطن میں اترے۔ باہر مارا مارا نہ پھرے۔ یہ تین علامتیں خوش نصیبی کی فرمائی گئیں۔ ان میں بڑی علامت یہ ہے کہ بیوی صالحہ ملے۔ جب اسے دیکھے، دل کے اندر خوشی بھر جائے اور جب اس کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ کرے، خوشی پیدا ہو کہ بڑی سمجھدار ہے اور جب اسے گھر پہ چھوڑ کے جائے تو اتنا مطمئن رہے کہ میرے گھر میں کوئی خرابی نہیں آسکتی، میری بیوی سلیقہ مند ہے، خوش نصیب ہے۔ تو واقعی بیوی کی صلاحیت وسوچ مندی، اور اعلیٰ درجہ کی ہوش مندی نہایت ہی بڑی نعمت اور ایک بڑی مسرت ہوتی ہے۔

فن نحو کے امام یحیٰی ابن اکثم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے واقعات میں ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ مگر انتہائی بدصورت، رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھوں میں زردی اور دانتوں میں بھی زردی۔ غرضیکہ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہوسکتی ہیں وہ سب جمع تھیں۔ اور بیوی اتنی حسین وجمیل تھی کہ ملکوں میں اس کا جواب موجود نہیں۔ جتنی علامتیں حسن و جمال کی ہوسکتی تھیں، وہ بیوی میں تھیں۔ جب دونوں خاوند بیوی بیٹھتے، جیسے دھوپ چھاں بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک طرف دھوپ چھن رہی ہے۔ دوسری طرف رات نظر آرہی ہے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے تو یحیٰی ابن اکثم بیوی کو خطاب کر کے کہتے تو بھی یقیناً جنتی ہے۔ میں بھی یقیناً جنتی ہوں دونوں جنتی ہیں۔ کیوں؟ اس واسطے کہ مجھے تو ملی تجھ جیسی بیوی۔ تو میرا کوئی منٹ شکر گزاری سے خالی نہیں ہوگا۔ شکر کے راستے سے تو جنت میں جاؤں گا اور تجھے ملا مجھ جیسا خاوند کہ کوئی منٹ بھی تیرا صبر سے خالی نہیں۔ تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی۔ میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ حقیقت یہی ہے اگر بیوی صالحہ ہو اور حسن و جمال بھی ہو۔ دونوں کی خوش نصیبی ہے۔ وہ اسے دیکھ کے خوش ہے، وہ اس سے راضی ہے۔ تو محبت باہمی مقصود ہے۔

بیوی کے انتخاب کا معیار...... مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھ لینا چاہئے کہ محبت عورت سے محض

صورت کی وجہ سے نہ کرنی چاہئے۔ صورت ڈھلتی ہوئی دھوپ ہے۔ آج اچھی صورت ہے، کل کو بگڑ گئی۔ بڑھاپے میں تو کم سے کم بگڑ ہی جاتی ہے اور اللہ بھلا کرے بخار کا کہ دو تین دن ہی میں حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ تین دن بخار آیا۔ نہ رنگ رہا، نہ عنفوانی رہی گلاب کا سا رنگ تھا وہ ختم ہو گیا قصہ۔ اور اگر بخار نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں۔ بڑھاپا آ کے صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت کہیں گئی ہی نہیں۔ وہ سب کی صورتیں ختم کر دیتی ہے۔ صورت ایک آنی جانی چیز ہے۔ اس لئے اگر کوئی بیوی سے محبت محض صورت کی وجہ سے کرے گا، وہ محبت غائب ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب صورت ڈھلی، محبت بھی ڈھل جائے گی۔ اس واسطے محبت کاہے سے کرنی چاہئے؟ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا معیار ارشاد فرمایا۔ فرمایا: ''تُنْكَحُ الْمَرْاَةُ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا'' ①

عورت سے چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے، کبھی تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔ صاحب جمال ہے۔ آدمی کا دل چاہا، نکاح کر لیا۔ کبھی اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ نکاح کریں گے تو جائیداد قبضے میں آئے گی۔ رئیس بن کے بیٹھ جائیں گے۔ کبھی اس کی حیثیت عرفی کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ بڑے اونچے خاندان کی ہے، اس کا نام بلند ہے۔ اس کے ماں باپ کی عزت دنیا میں قائم ہے۔ میں ایسی عورت سے نکاح کروں گا تو میری بھی عزت بڑھ جائے گی۔ اور کبھی اس کی دینداری کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، کہ اس کا دین بہت اعلیٰ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ'' ② نہ صورت کو دیکھو، نہ حسب کو دیکھو، دین کو دیکھو۔ اس لئے کہ اگر دین کی وجہ سے محبت قائم کریں گے، تو مرتے دم تک قائم رہے گی۔ اس میں ڈھلاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اگر صورت کی وجہ سے محبت کی، تو جہاں جوانی ڈھلی، محبت میں کمی آ گئی۔ اور آپس میں لڑائی شروع ہو گئی۔ دولت کی وجہ سے محبت کی۔ تو دولت کو رات دن آفت آتی رہتی ہے۔ جائیداد وغیرہ خدانخواستہ ختم ہو گئی، محبت کو بھی خیر باد کہیں گے، جب وہ بات ہی نہیں رہی، جس کی وجہ سے محبت تھی۔ اور اگر حیثیت عرفی یا ظاہری عزت کی وجہ سے کی۔ تو عزت و ذلت تو اضافی چیز ہے، کبھی عزت ہو جاتی ہے، کبھی ذلت ہو جاتی ہے۔ کبھی وقار، کبھی بے وقار۔ تو جہاں بے وقاری پیدا ہوئی۔ آپ کی محبت ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر دین کی وجہ سے محبت ہے، فرض کرلو عورت کالی کلوٹی ہے۔ آدمی یہ سمجھے گا، حق تعالیٰ نے اس کا حق میرے اوپر قائم کیا، میرا فرض ہے کہ میں اس کا حق ادا کروں۔ چاہے یہ گوری ہے، چاہے یہ کالی ہے۔ چاہے یہ دولت مند ہے۔ چاہے یہ مفلس ہے۔ چاہے یہ باحیثیت ہے، چاہے یہ بے حیثیت ہے۔ میری قسمت میں لکھ دی گئی، میرے اوپر اس کا حق آ گیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ مرتے دم تک اس کا حق ادا کروں۔ دین کی وجہ سے مرد و عورت کا معاملہ سدا بہار ہو جاتا

① الصحيح للبخاری، كتاب النكاح، باب الاكفاء في الدين، ج: ١٦، ص: ٣٣. ② الصحيح للبخاری، كتاب النكاح، باب الاكفاء في الدين، ج: ١٦، ص: ٣٣.

ہے۔اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح دین کی وجہ سے کرو۔تا کہ محبت میں دوام حاصل ہو جائے حقوق کی ادائیگی دائمی طور پر ہو جائے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح سنت ہے اس لئے کہ وہ محبت اور اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔شیاطین کے ہاں نکاح سے بغض ہے۔اس لئے کہ وہ اتحاد کا ذریعہ ہے۔شیاطین چاہتے ہیں کہ لڑائیاں ہوں، پھوٹ پڑے۔ نکاح ہونے نہیں دیتے،انہیں نکاح سے چڑ ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ آدمی زنا کاری اور بدکاری کی طرف چلے،اس لئے کہ بدکاری کا انجام لڑائی، پھوٹ قلوب کی کدورت اور قلق ہے۔

زوجین میں لڑائی ، بڑے فتنے کا پیش خیمہ بنتی ہے...... یہی وجہ ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے، شیطان روزانہ عصر کی نماز کے بعد سمندر کے کنارے یا پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اس پر بیٹھتا ہے۔پانی پر اس لئے بچھاتا ہے کہ اللہ میاں سے مقابلہ کرتا ہے ان کا پانی کے اوپر عرش ہے۔تو میں بھی اپنا عرش بچھاتا ہوں۔ فرق اتنا ہے،ان کا عرش جو پانی پر ہے وہ نہایت لطیف اور پاک ہوتا ہے۔اور یہ کڑوا، نمکین،اور بعض اوقات اس سے اذیت بھی پہنچتی ہے۔یہ مادی پانی ہے۔وہ روحانی پانی ہے۔مگر بہر حال شیطان ظاہری صورت بناتا ہے کہ اگر اللہ میاں عرش پر ہے،تو میں بھی عرش پر ہوں۔ان کا عرش پانی پر،تو میرا عرش بھی پانی پر۔کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں ہے۔تو وہاں بھی کمبخت مقابلہ ہی ٹھانتا ہے۔صورت ہی مقابلے کی بنالیتا ہے،روزانہ سمندر پر تخت بچھا کر اس کے اوپر بیٹھتا ہے۔کیوں بیٹھتا ہے؟اس کے شتونگڑے،اس کی اولاد و ذریت دن بھر میں لوگوں سے بدکاریاں کراتی ہیں۔ہر ایک آکر اس کے پاس رپورٹ دیتا ہے۔میں نے فلاں کی نماز قضا کرادی۔شیطان کہتا ہے کہ کام تو بہت عمدہ کیا،مگر کوئی بڑی بات نہیں کی، کہ تجھے انعام یا شاباش دوں۔دوسرا آتا ہے میں نے فلاں سے زنا کروادیا ہے۔کہتا ہے کہ ہاں ٹھیک کیا۔مناسب،کام کیا۔کوئی بڑا قابل قدر کام نہیں کیا۔ایک آتا ہے میں نے جھوٹ بلوادیا، جھوٹی گواہی دلوادی، کہتا ہے تو نے بھی اچھا کام کیا۔مگر کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ایک آتا ہے کہتا ہے کہ میں نے آج خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔حدیث میں ہے اس کو سینے سے لگاتا ہے کہ تو میرا سپوت۔تو نے بڑا کام کیا ہے۔تیرے سے میں خوش ہوں تیرے سے زیادہ بہترین میری دوسری اولاد نہیں ہے۔تو نے یہ کام کیا کہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔تو سینے سے لگاتا ہے، چمٹاتا ہے،اسے شاباش دیتا ہے۔ ①

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا فعل برا ہے۔اس پر شاباش دینی چاہئے تھی۔یہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ یہ تو گھروں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔لڑائی بھی ہو جاتی ہے، صلح بھی ہو جاتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کیوں خوش ہوتا ہے؟اس لئے کہ خاوند بیوی کی لڑائی دو کی لڑائی نہیں ہے، بلکہ سو کی لڑائی ہے۔اس لئے کہ جب خاوند بیوی لڑیں گے،تو خاوند کے جتنے عزیز ہیں، وہ خاوند کی حمایت کریں گے۔بیوی

---

① الصحيح لمسلم ،كتاب صفة القيامة والجنة والنار ،باب تحريش الشيطان...... ج:۱۳،ص:۴۲۶.

کے جتنے رشتے دار ہیں، وہ بیوی کی حمایت کریں گے۔ تو دو آدمیوں میں نہیں چلی، بلکہ دو گھرانوں میں چل گئی۔ اب گھرانے ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ ان کے مدمقابل، یہ ان کے مدمقابل۔ پھران دونوں گھرانوں کے لوگ آدھے اُدھر آجائیں گے، آدھے اِدھر آجائیں گے۔ بیوی والے بیوی کی طرف، خاوند والے خاوند کی طرف۔ تو دو گھروں میں نہیں چلی، دو خاندانوں میں چل جاتی ہے۔

اور اگر خاوند بیوی باحیثیت ہیں۔ جیسے ملک اور ملکہ، بادشاہ اور بادشاہ بیگم ہیں۔ ان میں لڑائی ہو جائے تو فوجیں کٹ مرتی ہیں۔ دو ملکوں میں لڑائی ہو جاتی ہیں اور جنگ عظیم برپا ہوتی ہے۔ تو دو کی لڑائی، یہ حقیقت سینکڑوں کی لڑائی ہے اور جب دو خاندانوں میں چلتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے؟ بدگوئی الگ، وہ اسے برا کہیں گے وہ اسے، غیبت کا گناہ سرزد ہوا۔ یہ اس کے ایذا رسانی کے درپے ہے۔ وہ اس کے درپے ہے۔ یہ ایذا رسانی کا گناہ الگ۔ اس کے بعد مقدمہ بازی چلے گی۔ وہ الگ بے عزت، یہ الگ بے عزت، پھر مقدمہ بازی میں جانبین کا روپیہ خرچ ہوا۔ لاکھوں انہوں نے برباد کئے، لاکھوں انہوں نے، جائیداد ختم ہوئی۔ تو ایک گناہ میں سینکڑوں گناہ چھپے ہوئے ہیں۔ جب دو میں لڑائی ہوگی، تو غیبتیں الگ ہوں گی۔ چغلخوریاں الگ ہوں گی، مقدمہ بازی الگ ہوگی، مال الگ ختم ہوگا، گھر الگ بے عزت ہوگا، شہر میں الگ فتنہ برپا ہوگا۔ لوگ کہیں گے، میاں دیکھا۔ فلاں دو بڑے بن رہے تھے۔ کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ دیکھا آپ نے لڑائی ہو رہی ہے؟ وہ الگ تحقیر کر رہا ہے، الگ برائی بیان کر رہا ہے۔ تو بدنامی الگ، مال کی بربادی الگ، عزت کی تباہی الگ، سکون دل الگ ہٹا۔ بیوی خاوند کی لڑائی ایک گناہ نہیں، بلکہ سینکڑوں گناہ اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس لئے شیطان خوش ہوتا ہے کہ اس میں فتنہ پھیلتا ہے، اور ہزاروں گناہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر کسی نے جھوٹ بول دیا۔ بس ایک گناہ، ختم ہوگیا، لیکن اس گناہ میں غیبت بھی ہے۔ عزت کی تباہی ہے، مال کی بربادی ہے، وغیرہ وغیرہ شیطان کے لئے کتنا خوشی کا موقع ہے؟

تو انبیاء علیہم السلام نکاح کے ختم ہونے پر خفا اور ناراض ہیں۔ اور شیاطین نکاح کے کمزور ہونے اور ٹوٹ جانے پر خوش ہیں۔ اس لئے کہ نکاح ٹوٹنے سے فتنہ پھیلے گا۔ اور اگر نکاح جڑا رہے گا، تو امانت داری پھیلے گی۔ انبیاء امانت کے حامل ہیں۔ شیاطین فتنہ کے حامل ہیں، وہ فتنہ پردازی پر خوش ہیں۔ یہ امانت داری پر خوش ہیں۔ انبیاء کو نکاح سے محبت ہے اور شیاطین کو اس کے ٹوٹ جانے سے محبت ہے۔

بیوی پر خاوند کی انتہائی اطاعت واجب ہے...... اس لئے خاوند سے کہا گیا ہے کہ تو عورت سے لطف و کرم کا معاملہ کر۔ عورت کو کہا گیا ہے کہ تو اپنے خاوند کے سامنے انتہائی اطاعت سے پیش آ۔ حدیث میں ہے اگر خاوند کسی کام کا حکم دے۔ اور عورت نہ مانے، تو جس دن اور رات میں اس نے حکم نہیں مانا، اس دن اور رات میں تمام ملائکہ اس عورت کے اوپر لعنت کرتے ہیں، کہ تو نے خاوند کی نافرمانی کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ

اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ بیوی کے مقابلے میں اتنا واجب الاحترام شریعت اسلام نے خاوند کو بتایا، کہ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام نہ ہوتا تو سجدے کرنے کی اجازت دے دیتا، اس تک کے لئے میں تیار ہو جاتا۔ معلوم ہوا، بیوی کے اوپر اطاعت لازم ہے۔ ①

گویا یوں سمجھو، کہ ایک تو رب حقیقی ہے، جو اللہ رب العزت ہے۔ عورت کے حق میں اس کا خاوند رب مجازی ہے، جو اس کی پال پرورش کرتا ہے محنت کر کے کماتا ہے۔ بیوی کے ہاتھ پہ لا کے دیتا ہے، تو اس کے حق میں گویا وہ ایک مجازی طور پر رب ہے۔ اس واسطے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس خاوند کی جو رب مجازی ہے اور اللہ کا سایہ ہے اس کی اطاعت کرے۔

اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جب نکاح ہو گیا تو ظاہر بات ہے عورت پر ماں باپ کا تو کوئی حق باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تعظیم وتوقیر کرے۔ لیکن یہ کہ خاوند کے مقابلے میں ماں باپ کوئی امر یا حکم دیں، اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ جب عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے آ گئی، وہ گھر اس سے منقطع ہو گیا۔ ماں باپ کے حقوق ختم ہو گئے۔ اب تو وہ خاوند کے رحم وکرم پر ہے۔ اگر یہ اطاعت کرے گی، وہ رحم کرے گا۔ تو اسی کا گھر بنے گا۔ اور اگر اس نے لڑائی جھگڑا اٹھا لیا، اور اس نے سختی کی۔ ماں باپ کا تو گھر رہا نہیں کہ وہاں جا کے پناہ پکڑے، خاوند کو الگ ناراض کر دیا۔ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی۔ تو دانش مندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خاوند کی اطاعت کرے۔ نافرمانی کرنے میں نہ اس گھر کی رہے گی نہ ماں باپ کے گھر کی رہے گی۔ تو ادھر سے عورت کو یہ حکم دیا کہ انتہائی اطاعت کر۔ انتہائی مدارات کر اور اگر تو نہیں کرے گی تو ملائکہ علیہم السلام تجھ پر لعنت کریں گے۔ ادھر خاوند کو کہا کہ انتہائی شفقت کر لطف وکرم کا برتاؤ کر تو نے اگر ذرا کمی کی تو تیری گردن قیامت میں نپے گی کہ تجھے ہم نے بادشاہ بنایا تھا، تو نے اپنی رعیت کے ساتھ ظلم کیوں کیا؟ عورت تیرے عیال میں تھی، تیری زیر تربیت تھی۔ تجھے اس کے اوپر سختی کا کیا حق تھا؟

پھر یہ کہ عورت تجھے باندی بنا کے تھوڑا ہی دی گئی ہے کہ تیری محکومہ ملازمہ ہے وہ تو برابر کی شریک زندگی ہے۔ جو تیرا حق ہے، وہی اس کا حق ہے۔ کوئی باندی ملازمہ اور نوکر نہیں ہے۔ تجھے کیا حق ہے کہ اسے حقیر سمجھے یا کم مرتبہ سمجھے؟ تو مرد کو کہا گیا کہ تو اس کی انتہائی توقیر کر۔ انتہائی محبت کر۔ عورت کو کہا تو انتہائی اطاعت کر۔ جب ادھر سے اطاعت، ادھر سے شفقت ہو گی۔ تو گھریلو زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلے گی۔ اگر ادھر سے اطاعت، ادھر سے شفقت نہ ہو، تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ گھر تباہ ہو جاتا ہے اولاد ہوئی تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ رشتہ دار اور ماں باپ الگ پریشان ہوتے ہیں۔ اس واسطے فرمایا گیا ہے کہ دونوں مل کر اس گھر کو چلاؤ۔ جیسے بیل گاڑی ہوتی ہے۔ دو بیل آگے جڑے ہوتے ہیں تو بیل گاڑی چلتی ہے۔ اگر ایک کندھا ڈال دے، گاڑی آگے نہیں چلے گی تو

---

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأۃ، ج: ۶ ص: ۴۲.

گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی جب تک خاوند بیوی محبت سے مدارات سے نہ چلیں۔اسی واسطے جگہ جگہ تاکید کی گئی۔

کم خرچ نکاح میں برکت دی جاتی ہے......مگراس میں ایک بات یادرکھنے کی ہے۔وہ یہ کہ یہ چیز جب ہوگی جب نکاح میں برکت ہو،اگر نکاح میں خدانخواستہ برکت نہ ہوئی، پھر برے آثار پڑتے ہیں۔اور نکاح میں برکت کب ہوتی ہے؟ فرمایا گیا جس نکاح میں خرچ کم ہوگا اس میں برکت زیادہ ہوگی۔جس نکاح میں خرچ زیادہ ہوگا، برکت اٹھالی جائے گی۔اس لئے کہ خرچ عموماً فخر ومباہات کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ برادری میں ناک نہ کٹ جائے۔ہم ذرا اونچے سمجھے جائیں۔اس لئے آدمی حیثیت سے بڑھ کر خرچ زیادہ کرتا ہے۔اور یہ غلطی ہے۔اس لئے کہ جسے برادری کہتے ہیں، وہ ہر صورت میں ناک کاٹنے ہی کے فکر میں رہتی ہے۔کتنا ہی خرچ کرلے، آدمی کی ناک نہیں رہتی۔اس لئے کہ بھائی برادر اس فکر میں رہتے ہیں کہ ذرا سی کمزوری ملے، اسے ہی اچھالتے ہیں۔تو جسے ناک کہیں، وہ پھر بھی نہیں رہتی۔تو مایہ بھی کھوئی، اور ناک بھی کٹوائی، فائدہ کیا ملا؟

وہ کسی ساہوکار نے اپنی بیٹی بیاہی، تو اس نے یہ سوچا کہ میں اتنا خرچ کروں کہ دنیا میں آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔تاکہ دنیا میں میرا نام ہوجائے۔تو اس نے ایک ہزار آدمی کی تو بارات بلائی۔اور خدا جانے پچیس چالیس قسم کے کھانے پکوائے۔تمام کمرہ کھانوں سے بھر گیا اور ہر ہر مہمان کے لئے کہیں بستر کہیں تکیئے غرض سامان کی انتہا کردی اور چلتے ہوئے فی مہمان دس دس گنی بھی دیں۔دس دس پونڈ بھی پیش کئے جواب تک کسی نے نہیں دیئے تھے۔مقصد یہ تھا کہ میرا نام ہوجائے کہ بھائی ساہوکار نے بڑی شادی کی۔یہ سب کچھ کرکرا کے جب بارات رخصت ہوئی۔لاکھوں روپے کا سامان بھی اپنی لڑکی کو دیا۔تو ساہوکار ذرا میل بھر آگے چلا گیا کہ کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھوں۔تاکہ میری تعریف کرتے ہوئے لوگ جاویں گے، کہ بھائی لالہ جی نے بڑا کام کیا۔اور ساہوکار نے بڑا جہیز دیا۔تو ذرا دل میرا بڑھے گا۔اس واسطے بارات کو رخصت کرکے، گھوڑے پر سوار ہوکر، دوسرے راستے سے میل بھر آگے جاکے آپ جھاڑی میں جاکر بیٹھ رہے، جہاں سے بارات گذرنی تھی۔کہ لوگ جب تعریفیں کرتے ہوئے گذریں گے، میرا دل خوش ہوگا، اور میری محنت وصول ہوجائے گی۔میں نے اپنا گھر کھویا ہے۔گھر تو کھویا گیا، دل تو نہ کھویا جائے۔جب وہاں بارات پہنچی۔اتفاق سے وہاں زمین ناہموار تھی۔اونچ نیچ تھی۔مٹی بہت جمع ہوگئی تھی۔اندیشہ تھا کہ اگر گاڑیاں گزریں، تو الٹ جائیں گی اور لوگ گریں گے۔تو یہ ارادہ کیا گیا کہ بھئی پہلے مٹی درست کرلو۔یہ جو مٹی جمع ہوگئی۔اسے کھود کر ایک طرف پھینک دو۔تو پھاوڑے کی تلاش ہوئی جس سے مٹی کھودا کرتے ہیں۔اتفاق سے پھاوڑا کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔اب کسی کو کیا خبر تھی کہ ہمیں راستہ میں سڑک بھی بنانی پڑے گی جو پھاوڑا رکھتے، کسی نے بھی نہیں رکھا۔لوگوں نے کہا، بھئی! تلاش کرو جہیز میں ہوگا، سارے جہیز میں تلاش کیا، پھاوڑا نہ ملا۔ساروں نے کہا۔سسرے نے دیا ہی کیا، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں۔بس ساہوکار را ٹھے کہ، لعنت اس بارات کے اوپر، لعنت اس خرچ کے اوپر، سارا گھر کھودیا، اور اب بھی میں سسرا ہی بنا رہا۔اور یہ کہ'' کیا

دیا سسرے نے، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں"۔

اور جو کچھ دیا تھا، وہ سب اکارت۔ تو جسے ناک کہتے ہیں۔ ناک رہ جانا، برادری والے کسی کی ناک نہیں رہنے دیتے۔ وہ ناک کاٹ کے ہی رہتے ہیں۔ پھر آدمی بے وجہ فضول اپنا گھر بھی تباہ کرے، ناک بھی کٹوائے؟ موقع سے اعتدال کا جو درجہ ہے، اس کے مطابق خرچ کردے۔ بیٹی کو دینا ہے، ساری عمر دے سکتا ہے۔ یہ کیا ضروری کہ آج ہی دے۔ آج جو دے رہا ہے وہ محض نام آوری کے لئے دے رہا ہے۔ بیٹی پیش نظر نہیں ہوتی۔ ناک پیش نظر ہوتی ہے۔ شریعت یہ کہتی اگر کچھ دو تو بیٹی کو دو۔ ناک کو کچھ مت دو۔ یہ رہنے والی نہیں، یہ تو کٹ جاتی ہے۔ بیٹی کو دے، تو ساری عمر دے سکتا ہے۔ مگر وہ بھی اعتدال کے ساتھ دے۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی بیٹی ہے، چلو بہت سا دے دیا۔ لیکن اگر اور بھی بیٹی ہے، تو اور اولاد کا بھی حق ہے۔ اب نام آوری کے لئے سارا گھر ایک کے اوپر خرچ کر دیا، کل کو جب دوسری شادی ہوگی، اور ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوگا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ بڑا بے وقوف آدمی تھا۔ پہلی پہ تو اتنا خرچ کر دیا۔ دوسری اولاد کیا سوتیلی تھی، حقیقی نہیں تھی؟ اس کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ جب ناک نہیں کٹی تھی۔ تو اب کٹ جائے گی۔ اس واسطے آدمی مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے۔ حدیث میں فرمایا گیا: اس نکاح میں برکت دی جاتی ہے، جس میں خرچ کم ہو۔ اور جس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے، اس سے برکت اٹھالی جاتی ہے، یا کم کر دی جاتی ہے۔

معاملات میں سب سے زیادہ آسان نکاح ہے...... اس کی بنا یہی ہے کہ وہ زیادہ خرچ مفاخرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نام آوری یا نمود کی وجہ سے۔ یہی خراب کرنے والی چیز ہے۔ ورنہ نکاح کو اللہ نے سب سے زیادہ آسان بنایا ہے جسے ہم نے سب سے زیادہ مشکل بنا رکھا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نکاح ایسی سادہ چیز تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور ایسے جلیل القدر صحابی ہیں کہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ اتنے بڑے لوگوں میں ہیں۔ اور جنت کی بشارت جن دس لوگوں کو دی گئی ہے، ان میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ تو دنیا ہی میں جنتی ہیں۔ اتنے جلیل القدر ہیں۔ ایک دن مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تو کپڑے اور چہرے پر زرد دھبے تھے۔ فرمایا، عبدالرحمٰن! یہ کیا بات ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے۔ اس زمانے میں جب نکاح ہوتا تھا تو ایک خاص قسم کا عطر ہوتا ہے، جو زعفران سے بنتا تھا۔ اس کو لگاتے تھے تو کپڑے پر کوئی دھبہ بھی آ جاتا تھا۔ جیسے بعض عطر مخصوص ہوتے ہیں۔ جو نکاح ہی کے دن لگائے جاتے ہیں، جیسے لڑکی کو نخ جلا کر بسایا جاتا ہے۔ نخ یہ چھوٹے چھوٹے چوپارے سے ہوتے ہیں، ان کو جب جلاتے ہیں، تو خوشبو مہکتی ہے کپڑوں میں وہ خوشبو لگاتے ہیں تو کپڑے مہک اٹھتے ہیں۔ اس کو نخ بسانا کہتے ہیں۔ وہ شادی ہی کے دن لگائی جاتی ہے۔ ویسے اس کو کوئی نہیں لگاتا۔ ایسا ہوتا ہے، رواج کی بات ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زرد رنگ کیسا؟ عرض کیا یارسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے اور نکاح کے دن خوشبو لگائی۔ فرمایا: کنواری سے نکاح کیا ہے یا بیوہ سے؟۔ عرض کیا۔ یارسول اللہ! بیوہ سے۔ فرمایا کیوں؟ عرض کیا، یارسول اللہ! پہلی بیوی مرگئی تھی، اس کی کچھ اولاد تھی۔ کنواری سے کرتا تو پال نہ سکتی۔ بیوہ بیچاری خدمت کردے گی۔ اولاد کو پال دے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی۔ ①

آپ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق کون ہوسکتا تھا۔ صحابی بھی جلیل القدر ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب کون ہوسکتا تھا؟ ان کی دنیا اور آخرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اندر پوشیدہ ہے۔ ایمان نام ہی محبت کا ہے۔ تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عاشق صادق، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ کامل۔ نکاح کرتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلاتے۔ یہاں نکاح ہوتا ہے کہ جب تک نویل نہ پھرے، جب تک برادری اور کنبے کے سر نہ جمع ہوں، یہ ناک کی مصیبت ہے کہ کہیں یہ نہ کٹ جائے۔ چاہے گھر میں کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن ناک کی وجہ سے جمع کریں گے۔ اور وہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت نہیں دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی برا نہیں مانا۔ یہ نہیں فرمایا بھئی! ہمیں تو تم نے بلایا ہی نہیں۔ نہ کوئی شکایت کی معلوم ہوا نکاح جیسی سادہ چیز اسلام میں کوئی نہیں تھی، کہ نکاح کریں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو خبر نہ ہو۔ معلوم ہوا گھر میں بیٹھ کر کرلیا۔ اتنی سادہ چیز تھی۔

نکاح میں معمولی دو خرچ ہیں...... نکاح کے بڑے اخراجات دو ہی ہیں۔ ایک مہر کا خرچ ہے۔ ایک ولیمہ کا خرچ ہے۔ خاوند کے ذمہ یہی ہے کہ ولیمہ کرے اور مہر ادا کرے۔ یہ اتنے آسان بنادیئے کہ ولیمے کے بارے میں فرمایا: "اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ" ② اگر کچھ بھی نہ ہو، تو ایک بکری ذبح کر کے کھانا کھلا دو۔ بکری بھی نہ ہو۔ جو ہاتھ پلے ہے، وہی کھلا دو۔

اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوگئی گھر میں کچھ تھا نہیں کہ ولیمہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کھلاؤں گھر میں تو فقر و فاقہ ہے۔ اسی وقت ایک شخص ہدیہ میں کچھ کھجوریں لے کر آیا، اور ایک مٹکا لے کر آیا آپ نے گھٹلیاں نکلوا کے مٹکے میں ملوا کے چمڑے کے دستر خوان پہ ڈال دیا۔ حاضرین سے فرمایا: کھاؤ، یہ ہمارا ولیمہ ہے۔ ③ تو بکری نہیں لانی پڑی، جو پاس تھا کھلا دیا۔ بس ولیمہ ہوگیا ایک خرچ نکاح میں یہ تھا۔ یہ اتنا سادہ، اور ایک مہر کا خرچ ہے۔ تو فرمایا گیا: دس درہم بھی اگر کسی کے پاس ہوں، نکاح ہوجائے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب الصفرة للمتزوج، ج: ۱۶ ص: ۱۲۷.

② الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب الصفرة للمتزوج، ج: ۱۶ ص: ۱۲۷.

③ المعجم الکبیر للطبرانی، ذکر ازواج رسول الله ﷺ، صفية بنت حيي... ج: ۲۴ ص: ۶۷. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفيه النهاس بن فهم وهو ضعيف مجمع عليه، دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۲۵۱.

گا۔ دس درہم کی ہندوستانی قیمت اڑھائی روپے بیٹھتی ہے۔ تو اڑھائی روپے میں نکاح شرعی ہو سکتا ہے۔

نکاح میں زیادہ خرچ کا نتیجہ...... یہ جو آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔ تو نکاح تو ہو جاتا ہے۔ تھوڑی بہت واہ واہ بھی ہو جاتی ہے۔ مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر برباد ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہی عزیزوں میں سے تھے شیخ ظفر حسین صاحب مرحوم بہت بڑے رئیس تھے، ان کی حویلی آج بھی دیوبند میں کھڑی ہے، یوں معلوم ہوتی ہے کہ شاہی قلعہ ہے۔ ہاتھی کے گھسنے کا دروازہ اور بڑی بڑی چیزیں۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کیا۔ تو ولیمہ جو کیا ہے، وہ فقط سارے دیوبند کا نہیں بلکہ دیوبند کے اردگرد جتنے دیہات تھے، سب کو مدعو کیا۔ ہزاروں دیہات والے۔ پھر ایک وقت کا نہیں، بلکہ ایک ہفتے تک دعوت کی۔ پورے سات دن یعنی چودہ وقت کا کھانا کھلا دیا۔

اور یہ بھی اعلان تھا کہ دیہاتیوں کو آنے میں زحمت ہوگی، کوئی دس میل سے آئے گا کوئی بیس میل سے۔ تو کھانے پک پک کے بہلیوں پر گاؤں گاؤں پہنچے۔ اور گھر گھر تقسیم ہوئے۔ ایک ہفتے تک کھانے پہنچتے رہے، بڑا نام ہو گیا، دنیا میں ایسا ولیمہ کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ دنیا ایک وقت کا ولیمہ کرتی ہے، انہوں نے چودہ وقت کھلا دیا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نکاح تو ہو گیا، لیکن آج اگر جا کے دیکھا جائے ان کی اولاد کا گزر بھیک کے ٹکڑوں پر ہے (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ) کسی نے خدا واسطے دے دیا، کھانا کھالیا۔ نہیں تو نہیں۔ ایسی شادی سے فائدہ کیا؟ یہ خانہ آبادی نہیں یہ تو خانہ بربادی ہے۔

نکاح میں پاک ثمرات کب ظاہر ہوتے ہیں...... میں اس پہ عرض کر رہا تھا کہ پاک ثمرے جب ظاہر ہوتے ہیں جب نکاح میں برکت ہو۔ اور برکت جب ہوتی ہے، جب نکاح میں خرچ کم ہو۔ اس لئے جو رائج الوقت مہر ہو اس کو باندھ دو۔ کوئی خاص مہر تلاش کرنا، یا جہیز کے سلسلے میں بہت زیادہ حدود سے گزر کر خرچ کرنا، یہ سب غلط چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کی جائدادیں اس میں تباہ ہوئی ہیں۔ یا شادی کی رسوم میں، یا غمی کی رسوم میں۔ مرنے والا مرتا ہے، وہ تو گیا۔ اس کے بعد اب برادری کے کھانے ہو رہے ہیں۔ چالیس دن کا الگ ہو رہا ہے۔ دس دن کا الگ ہو رہا ہے۔ برسی الگ ہو رہی ہے، اور چہلم الگ ہو رہا ہے۔ نہیں ہوتا تو قرض لے لے کر کرتے ہیں۔ تو مسلمانوں کی جائیدادیں برباد ہوئی ہیں۔ حکومتیں چھن گئیں۔ شادی کی رسموں میں، یا غمی کی رسموں میں رسوم کی وجہ سے مسلمان تباہ ہوئے۔ اور اب تک بھی ہوش نہیں آتا، اسی میں مبتلا ہیں۔

بہر حال میں نے اس لئے عرض کیا کہ نکاح کی غرض و غایت باہمی سکون و مودت ہے۔ مودت و محبت کا اثر جب پڑتا ہے۔ جب نکاح بابرکت ہو۔ بابرکت جب بنتا ہے۔ جب اخراجات میں کمی کی جائے۔ نام و نمود اور شہرت کے جذبات سے خالی ہو۔ فرض کی ادائیگی پیش نظر ہو کہ اولاد کا فرض ہے، اللہ کا حکم ہے، اس کو ادا کر رہے ہیں۔ اس میں دین پیش نظر ہو۔ خاوند کے پیش نظر بھی یہ ہو کہ لڑکی سے اس کے دین کی وجہ سے نکاح کر رہا ہوں۔ وہ خوب صورت ہو یا بدصورت اس کے ساتھ دین کی وجہ سے معاملہ کروں گا۔ میرے ذمہ تو حق ہے۔ مرتے دم تک

مجھے ادا کرنا ہے۔وہ مالدار ہو یا بے مال ہو۔میرے ذمے اس کا حق ادا کرنا ہے۔جب اللہ نے میرے حصے میں لگا دیا ہے، مجھے حقوق کی ادائیگی پیش نظر ہے۔جب اللہ نے حکم دیا کہ محبت سے برتاؤ کرو، میرا فرض ہوگا کہ میں اپنی بیوی کا دل مٹھی میں رکھوں اس کی مدارت کروں اسکے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤں۔اس میں پھر ایسی برکت ہوگی کہ اولاد میں برکت ہوگی، گھر بار میں برکت ہوگی، معاملات میں بھی برکت ہوگی۔

ادھر عورت کا یہ فرض ہے وہ یوں سمجھے کہ خاوند کا حق مجھ پر عائد کر دیا گیا۔یہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔میرا فرض ہے اس کا حق ادا کرنا۔میرے لئے وہ رب مجازی بنایا گیا ہے۔یہ انتہائی بدصورت سہی، مگر میرے لئے تو سرتاج ہے۔میرا فرض ہوگا میں اس کے حقوق ادا کروں گی۔یہ جذبات ہوں گے تو حقوق کی ادائیگی مرتے دم تک ہوگی۔گھر جنت بن جائے گا۔عارضی چیزوں پر مدار ہوگا۔دولت، عزت، حیثیت، یہ آنی جانی چیزیں ہیں۔آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں، ان پر اگر مدار رکھ دیا، محبت بھی عارضی ہوگی۔چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔تو مقصود اصلی اور غرض و غایت نکاح کی یہ ہے: ﴿ لِتَسْكُنُوٓا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ﴾ ① اس لئے تم میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا۔تم میں انس، سکون ہو۔تم ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مودت کا برتاؤ کرو۔اگر تم غور وفکر کرو تو یہ اللہ کی بڑی قدرت کی نشانی ہے۔

نکاح کے احکام......نکاح کی یہ غرض و غایت رکھی گئی۔اس غرض و غایت کے تحت احکام وہ رکھے گئے جن سے میل ملاپ پیدا ہو۔بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند بیوی میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔فرشتے تو ہیں نہیں، انسان ہی تو ہیں۔اس کا مضائقہ نہیں۔بعض دفعہ خاوند ناخوش ہو جاتا ہے۔ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے۔بعض دفعہ بیوی بھی ناخوش ہو جاتی ہے، اسے بھی ناز ہوتا ہے۔وہ بھی خاوند کو چار باتیں کہہ دیتی ہے۔ایسا بھی گھروں میں ہوتا ہے۔جب وہ بشر ہیں، تو ہوگا اس میں ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اگر ایسا ہو تو حکمت سے کام لے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: یہ عورت جو ہے، یہ بائیں پسلی کی پیدائش ہے۔بائیں بھی پسلی آدم علیہ السلام کی نیچے والی۔جو زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے، اس سے پیدا ہوئی۔اس کے مزاج میں ٹیڑھ ہے اور تھوڑی سے کجی ہے۔فرمایا نہ اسے بالکل ویسے ہی چھوڑ دو، ورنہ اور ٹیڑھی بنے گی اور نہ بالکل سیدھی کرنے کی فکر میں رہو، ورنہ ٹوٹ جائے گی۔تو نہ بالکل سیدھی کرو، نہ ویسے ہی چھوڑ دو۔کچھ نرمی، کچھ گرمی، کچھ مدارات، کچھ ڈانٹ ڈپٹ، کچھ سمجھانا بجھانا، دونوں چیزیں رہنی چاہئیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

فرمایا گیا نہ بالکل ویسے آزاد چھوڑ دو، زیادہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔نہ اتنی سختی کرو کہ وہ بالکل ٹوٹ جائے۔اعتدال کا معاملہ رکھو۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

اس واسطے قرآن حکیم میں اس کی ہدایت کی گئی۔ برداشت اور صبر کے برتاؤ کا حکم دیا گیا فرمایا گیا:
﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ ① نیک بیویاں کون ہیں؟ نیک ازواج کون ہیں؟ جو صالحات ہیں۔ وہ اللہ کی عبادت گزار بندیاں ہیں۔ جو اپنے نماز روزے، دین و دیانت کی پابند ہیں۔ وہی صالح بن سکتی ہیں۔ چکنی چپڑی باتیں کرنے والی صالح نہیں ہوتیں۔ حق ادا کرنے والی صالح ہوتی ہیں۔ ''حٰفِظٰتٌ'' جو غیب کی حفاظت کریں۔ غیب سے مراد خاوند کے راز اور اسرار ہیں وہ کسی پہ ظاہر نہیں کرتیں۔

خاوند کی ناقدری کا انجام..... بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ کسی محفل میں بیٹھیں۔ اس نے کہا تیرا خاوند ایسا برا، اس نے کہا تیرا ایسا برا۔ رات دن اسی لعن طعن میں مبتلا ہیں۔ اگر اس (تقریر) میں میری بہنیں بھی شریک ہوں، جو سن رہی ہوں۔ وہ بھی کان کھول کر سن لیں۔ جہاں میں نے ان کے لئے یہ کہا ہے کہ خاوند کا فرض ہے ان کی مدارات کرے۔ حقوق ادا کرے۔ یہ کرے وہ کرے۔ کچھ ان کے ذمے بھی حقوق ہیں۔ کچھ ان میں بھی کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہ اپنی اصلاح و حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن عورتوں میں وعظ فرمایا۔ عورتیں ایک طرف تھیں، مرد ایک طرف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور عورتوں کے گروہ میں وعظ فرمایا، ''تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ فَإِنِّيْ أُرِيْتُكُنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ النَّارِ'' ② اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کثرت سے دیا کرو۔ اس لئے کہ جہنم میں کثرت سے عورتوں کو دیکھتا ہوں صدقہ دو گی تو بلیات رد ہوں گی۔ حدیث میں ہے: ''اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ كَمَا يُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ'' ③

صدقہ اس طرح سے اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ تو فرمایا صدقہ کثرت سے کیا کرو۔ اس لئے کہ عورتوں کو جہنم میں میں کثرت سے دیکھتا ہوں۔ حدیث میں ہے: ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کا حلیہ بھی آتا ہے۔ کالے رنگ کی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی حبشی ہوگی۔ کہنے لگی: ''وَبِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟'' یارسول اللہ! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ہی جہنم میں زیادہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی ہم ہی چولہا جھونکیں۔ یہاں بھی آگ وہاں بھی آگ۔ دونوں جگہ آخر ہماری کیا مصیبت آئی۔ ایسا آخر کیوں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ ارشاد فرمائی۔ وہ میری بہنوں کے سننے کی ہے اور اس کو پلے باندھ لیں۔ اس لئے کہ انہوں نے یا مردوں نے مجھے اس کرسی پر بٹھلایا ہے یہ کرسی معالج کی ہے، جو دلوں کا علاج کرتا ہے۔ معالج چن چن کر امراض سامنے رکھ دے کہ یہ کھوٹ ہے، یہ بیماری ہے۔ تاکہ علاج کر سکیں۔ وہ طبیب بہت خائن

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴. ② الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم، ج: ۲ ص: ۳.
③ الصحیح لابن حبان، ج: ۱۴، ص: ۱۲۱. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۴ ص: ۴۰۷ رقم: ۱۹۰۸.

ہوگا کہ وہ تعریف کے کلمات کہہ جائے، اور کھوٹ کو ظاہر نہ کرے۔ وہ حکیم نہیں وہ علاج نہیں کر سکتا۔ اس واسطے اگر میری بہنیں یہاں ہوں تو برا نہ مانیں۔ بہرحال جو اصلی بات ہے وہ کہہ دوں تاکہ علاج کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور یہ میں تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں نقل کر رہا ہوں۔ اس واسطے میرے سے برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ناقل ہوں، حکم شرعی جو ہے وہ پہنچا دیا۔ اب تم برا مانو یا بھلا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عورت نے کہا "وَبِمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟" آخر ہم ہی کیوں آگ میں ہیں۔ یہاں بھی وہاں بھی۔ یہ ہماری قسمت میں ہی کیوں آگ رہ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دو وجہیں ارشاد فرمائیں۔

"تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ" تم میں دو بیماریاں اور دو روگ ہیں۔ ایک "تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ" لعن کی تم میں کثرت ہے۔ جس مجلس میں عورتیں بیٹھیں گی، لعن لعن نام رکھنا، تیرا زیور بہت برا، میرا زیور بہت اچھا۔ اس کی صورت اچھی نہیں، میری صورت اچھی، اس کا لباس خراب، میرا لباس اچھا۔ دنیا بھر کی بات اگر مجلس میں ہے تو وہ یہ فلانی بری اور میں اچھی صورت بھی میری اچھی، حیثیت سے بے خبر ہو۔ جاہل کا کام دوسرے کو طعن دینا ہے کیونکہ ان میں جہالت زیادہ ہوتی ہے، اس واسطے دوسرے کو طعنے دیتی رہتی ہیں۔ اگر اپنے عیب پیش نظر ہوں۔ دوسرے کو طعن دینے کی کبھی جرات نہیں ہو سکتی۔ اس کی بنا یہ ہے کہ اپنی چیز پیش نظر ہوتی ہے۔ دوسرے کی ہوتی نہیں اپنی برائی سامنے ہے نہیں بس دوسروں کی برائی نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے آئینہ ہے تو صورت تو اچھی نظر آ رہی ہے اور دل کا آئینہ ہے نہیں کہ یہ دیکھے دل میں کیا کارگزاری ہے۔ اس واسطے فرمایا کہ: ایک بات تم میں یہ ہے کہ تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو۔ ایک مرض تو تم میں یہ ہے۔ اور فرمایا "وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ" دوسرے یہ کہ خاوندوں کی ناقدری اور کفرانِ نعمت یہ بھی تمہارے اندر زیادہ ہے۔ یہ میں نہیں کہتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، میں تو اسے نقل کر رہا ہوں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، ایک خاوند عمر بھر سلوک کرے، جب وہ زیور مانگے، تو زیور بھی لا کے دے اور جب خاوند کے ساتھ اس کی لڑائی ہو گی تو کیا کہے گی؟ مَارَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ میں نے تو اس اجڑے گھر میں آ کے کبھی خیر دیکھی ہی نہیں۔ مصیبت ہی میں مبتلا رہی، سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ عمر بھر جو اس نے سلوک کیا تھا، وہ ایک جملے میں ختم کر دیا، کہ میں نے تو کبھی اس گھر میں خیر دیکھی ہی نہیں۔ بس ڈولے میں آئی تھی اور کھٹولی میں نکل جاؤں گی۔ بیچ میں یہی مصیبتیں میری تو قسمت میں تھیں۔ یہ ناقدری کا حال ہے۔ اب وہ خاوند غریب دیکھ رہا ہے کہ میں نے چوری کر کے، ڈکیتی ڈال کے اس کے لئے اشیاء فراہم کر دیں اور اس نے یہ قدردانی کی کہ "مَارَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ" میں نے کبھی اس اجڑے گھر میں آ کے خیر دیکھی ہی نہیں، اب وہ بیچارہ جواب دے تو کیا دے۔ اپنا سا منہ لے کر چپکے سے آ جاتا ہے۔ یا تو خفا ہو، پھر لڑائی بنتی ہے۔ سوائے اس کے کہ صبر کرے کہ اس عورت سے کون لڑے۔ غریب آ جاتا ہے۔ [1]

[1] الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب کفران العشیر و کفر دون کفر، ج: ۱ ص: ۵۰.

ہمارے مولانا عبدالرب صاحب مرحوم تھے۔انہوں نے عورتوں کی ذہنیت نمایاں کرنے کے لئے بڑی مقفی بات کہی۔ کہنے لگے اگر خاوندان سے پوچھے گھر میں تمہارے پاس کچھ ہیں کپڑے؟ تو کہیں گی، آئے تھے کپڑے وہ چار چیتھڑے پڑے ہوئے ہیں،کون سا میرے لئے لباس بنایا تھا؟ اور اگر کہے کہ تمہارے پاس جوتا بھی ہے؟ تو کہیں گی۔ آئے تھے جوتے، وہ دو لیتھڑے پڑے ہوئے ہیں۔لا کے دیئے تھے تم نے جوتے اور پوچھے کہ بھئی برتن بھی ہیں گھر میں؟ دھرے تھے برتن، وہی چار ٹھیکرے پڑے ہوئے ہیں۔خود باپ کے گھر سے لے آئی تھی، وہ کام آرہے ہیں، ورنہ تم نے کون سے لا کے دیئے تھے۔غریب کے سارے کئے کرائے پہ پانی پھیر دیا۔اس نے محنت کی،عمر بھر کما کما کے دیا۔یہ اس کی قدر نکلی کہ چار چیتھڑے ملے، دو لیتھڑے ملے، اور چار ٹھیکرے ملے، یہ اس کی قدر دانی ہوئی خاوندوں کی ناقدری کرنا تمہارا شیوہ ہے۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتنی ناقدری کرتی ہیں کہ عمر بھر کے احسان کا بدلہ دو لفظ میں چکا دیتی ہیں۔ فرمایا: یہ وجہ ہے کہ جہنم میں کثرت سے جاؤ گی۔اس کا علاج بتایا کہ صدقہ کثرت سے دو۔ تا کہ غضب خداوندی بجھے۔اس لئے کہ لعن طعن کرنے سے اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے۔کفران نعمت سے اللہ کا غضب بڑھکتا ہے۔ صدقہ دو گی، یہ غضب ٹھنڈا ہو جائے گا۔جتنی غریبوں کی خبر گیری صدقات خیرات سے کرو گی۔تو اس برائی کی تلافی ہو جائے گی، جو تمہارے اندر ہے۔تب جا کے اس عورت کو بات ذرا تسلیم ہوئی۔

عورت مرد کو اپنی ہدایت پر نہ چلائے...... اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا کہ: ہونا تو "نَـاقِـصَـاتُ الْعَقْلِ؟" اس پر کھڑی ہوگئی ہم میں کیا نقصان عقل ہے؟ گویا اپنے نزدیک وہ بڑی افلاطون تھی، ارسطو بنی ہوئی تھی کہ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں اور بعضوں کو تو یہ دعوی ہوتا ہے کہ مردوں میں کیا عقل رکھی۔عقل تو ہمارے اندر ہے اور یہ ایک حد تک انہوں نے صحیح بھی کہا۔حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔"مَارَأَيْتُ مِنْ نَّاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحدٰ كُنَّ"①

فرمایا کہ ہیں تو یہ ناقص العقل! مگر بڑے بڑے مردوں کی جو کامل العقل ہوتے ہیں، ان کی عقلیں اچک لے جاتی ہیں، اسے پاگل بنا کے چھوڑتی ہیں۔ایسے اتار چڑھاؤ سے بات کریں گی، اچھا خاصا عقلمند آدمی ان کے سامنے بیوقوف بن جائے گا، اور جو کہیں گی، وہ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ ان رسوم کے بارے میں جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی تم عقلمند ہو، تم یہ کیا کر رہے ہو، کہ جی عورتیں نہیں مانتیں گویا عورتیں حکام ہیں۔آرڈر وہاں سے آتا ہے۔یہ حضرات نیاز مند اور غلام ہیں۔تعمیل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ جواب دیتے ہیں۔تو ان کا ایک حد تک دعوی بھی صحیح ہے کہ ہم عقل مند ہیں۔ جب عقلمند کو بے وقوف بنانے کی قدرت ہے تو اور اس سے زیادہ کیا عقل مندی ہوگی؟ مگر فرمایا کہ: ناقص العقل اور ناقص الدین۔اس پر ایک عورت

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، باب فتنة النساء، ج: ١٢ ص: ٦.

نے عرض کیا۔ یارسول! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں کیا نقصان عقل ہے اور نقصان دین کیا ہے؟

فرمایا مہینہ میں بیس دن نماز پڑھو گی، دس دن سوؤ گی تو دین سے محروم ہی رہیں؟ اور نقصان دین کیا ہوتا ہے؟ اتنے دن دین سے بالکل محروم نہ نماز نہ روزہ، اور نقصان عقل یہ ہے۔ اگر عدالت میں شہادت ہو تو دو عورتیں ایک مرد کے برابر لی جاتی ہیں۔ گویا وہ آدھے مرد کے برابر ہیں۔ تو عقل بھی آدھی رہ گئی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کی جو خلقت ہے، وہ مرد کی نسبت کمزور ہے۔ جیسے قویٰ ظاہری کمزور ہیں، قویٰ باطنی بھی کمزور ہیں۔ (فہم اور عقل وغیرہ) مگر بھئی! یہ جنس کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض عورتیں ایسی بڑی عقل مند گزری ہوں کہ ہزاروں مرد بھی عقل وفہم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ وہ افراد کی بات ہے، یہ جنس کی بات ہے۔ جنس مرد کی قوی ہے۔ عورت کی جنس ضعیف ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی عورت پہلوان بن جائے تو جنس اپنی جگہ رہے گی، افراد ایسے ہی نکلیں گے۔

جیسے ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک حمیدہ بانو پہلوان ہے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو اس نے پچھاڑ دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مجھے کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ ہر لڑائی کے اندر وہی پالا جیتتی ہے۔ اب جنس تو اس کی کمزور رہے گی۔ اتفاق سے ایک عورت ایسی بھی قوی نکل آئی جنس تو ناقص العقل رہے گی۔ لیکن اتفاق سے بعض عورتیں ایسی کامل العقل بھی گزری ہیں کہ انہوں نے سلطنتیں چلائیں ہیں۔ مردوں میں وہ عقل کی قوت نہیں، جو ان کے اندر ہے، تو وہ افراد کا قصہ ہے، افراد، آحاد دانش مند بھی نکلیں، شاعر بھی نکلیں، ادیب بھی نکلیں، محدِّث ومفسّر بھی نکلیں۔ مگر جنس جو ہے اس کی عقل میں بہر حال نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: ''لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً'' ① وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنی سلطنت کے کاروبار عورت کے ہاتھ دے دیئے۔ یعنی اس کی عقل پہ چھوڑ دیئے وہ لے کے سارے کنبے کو ڈوبے گی۔ اس کی جیسی عقل ہے اس کے مطابق چلے گی۔ عورت کی عقل مرد کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ اتفاق سے کوئی اعلیٰ ترین عقل والی نکل آئے تو وہ ایک فرد کی بات ہوگی، جنس کی نہیں، بلکہ بعضوں کو، گدھوں سے بھی کم عقل ہوتی ہیں۔ بعضے ایسے بھی انسان نکلتے ہیں۔ مگر یوں نہیں کہا جائے گا کہ انسانوں کی جنس بے عقل ہے۔ مردوں کی جنس عقلمند، عورتوں کی جنس کم عقل، بعضی عورتیں بڑی عقل مند، بعضے مرد بڑے بے وقوف، یہ الگ قصہ ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ نقصان عقل بھی ہے، نقصان دین بھی ہے۔ اس واسطے تمہارا فرض ہے کہ مردوں کی ہدایت پر چلو۔ انہیں اپنی ہدایتوں پر مت چلاؤ۔ ورنہ وہ بھی ڈوبے گا اور پورا کنبہ بھی ڈوبے گا اگر تمہاری ہدایتوں پر چلا۔

عورت پر خاوند کیسے مہربان ہو سکتا ہے...... تو میں نے چند باتیں عرض کیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی غرض و

① الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم الی قیصر...... ج: ۱۳، ص: ۳۳.

غایت کیا ہے؟ وہ باہمی سکون ومودت ہے۔نسل کی تکثیر خود بخود ہوگی۔احکام کیا ہیں کہ مرد کے ذمے شفقت واجب ہے۔عورت کے ذمے اطاعت واجب ہے۔مرد کا کام یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کرے۔ بیوی کا کام یہ ہے کہ کامل اطاعت کا برتاؤ کرے۔اور اپنے خلاف بھی ہو،تو سننے کی عادت ڈالے۔یہ نہ ہو کہ جہاں خاوند نے مزاج کے خلاف بات کہی اور اس کی ناک چڑی ہوئی ہے۔ایک کیا چار جواب دینے کو تیار۔اس سے بے مہری پیدا ہو جاتی ہے۔یہ واقعہ ہے کہ گھر کی گاڑی جب چلتی ہے، جب عورت خاوند کی مطیع ہو اور خاوند عورت کا مطیع بن جائے،مگر مطیع کب بنے گا؟ جب عورت انتہائی محبت اور ایثار کا برتاؤ کرے گی۔اطاعت،اطاعت کو کھینچتی ہے۔سرکشی کرے گی تو اسے بھی نفرت پیدا ہو جائے گی۔اگر کوئی عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند بالکل میرے کہنے میں رہے، میرا غلام بن جائے۔تو پہلے خود غلام اور باندھی بن جائے۔وہ بھی مجبور ہو کے غلام بن جائے گا۔غلام بنانا،غلام بننے سے ہوتا ہے۔پہلے خود عملاً باندی بن کے دکھلائے وہ خود بخود غلام بن جائے گا۔اطاعت سے راحت ہوتی ہے؟ جتنی اس کی اطاعت کی جائے گی، وہ بھی اس کی اطاعت کرے گا۔تو عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے اس فکر میں رہے کہ کن چیزوں سے میرا خاوند ناخوش ہوتا ہے، میں وہ بات نہ کروں اور جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے، قصداً ہی وہ چیزیں کروں کہ اس کا دل راضی ہو، جتنا راضی ہوگا، میرے اوپر مہربان بن جائے گا، میرا گھر چلے گا۔اور مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کی ذہنیت کیا ہے۔کن چیزوں سے یہ خوش ہوتی ہے۔وہ چیزیں کرے۔یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اپنی عورت کو راضی کرنے کے لئے اس کی خواہشات کچھ پوری کرے۔آخر اس کا کچھ حق بھی تو ہے۔وہ گھر میں آتی ہے، اپنے جذبات لے کر آتی ہے۔اگر خاوند ان جذبات کی رعایت نہیں کرے گا۔تو کیا محلے والے رعایت کریں گے؟ یہ خاوند کا فرض ہے۔جانبین سے جب یہ بات ہوگی،تو گھر کی گاڑی عمدگی کے ساتھ چلے گی۔پھر سکون ومحبت اور باہمی مودت پیدا ہو جائے گی۔

عورت کی طرف سے نافرمانی پر تنبیہ کے درجات......اس میں اگر اتفاق سے کوئی ناچاقی پیش آ گئی،تو جانبین کو ذرا صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے۔یہ نہ ہو کہ ایک دم آپے سے باہر نکل کے وہیں جنگ چھڑ جائے۔چنانچہ قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہدایت کی فرمایا: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (1) نیک بیویاں کون ہیں؟ جو قانتات ہیں،عبادت گزار ہیں۔اس لئے کہ جو اللہ کا حق ادا کرے گی، وہی خاوند کا حق ادا کر سکتی ہے۔جو حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے، وہ کسی کی مطیع نہیں بن سکتی۔آگے فرمایا: ''حٰفِظٰتٌ للغیب'' غیب کی حفاظت کریں،مرد کے رازوں اور اسرار کی۔بعض مفسرین نے لکھا ہے۔کہ غیب سے مراد خاوند کا مال ودولت ہے۔اس کی حفاظت کرے۔یہ سمجھے کہ میں اس کی نگراں ہوں۔اگر وہ باہر جائے تو گھر میرے سپرد ہے۔پوری طرح سے اس کی حفاظت کرے۔

(1) پارہ:۵،سورۃ النساء،الآیۃ:۳۴.

آگے فرماتے ہیں: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ ① جن عورتوں سے تمہیں یہ خطرہ ہو کہ اب یہ نافرمانی کریں گی۔اس کا پارہ تیز ہو گیا ہے۔اب ممکن ہے یہ جنگ پہ آ جائے۔اور مقابل آ جائے۔اس کی ہدایت ذی۔یہ نہ ہو کہ تم یہ محسوس کرو کہ بیوی میں غصہ بڑھ گیا ہے۔یہ مدمقابل آئے گی۔تم چار برے بھلے کہہ کے اس کے دل کو بیزار کردو۔فرمایا جس سے نافرمانی کا خوف ہو، وہ خفا ہو چکی ہے۔کچھ زبان سے کہہ بھی رہی ہے، بکواس بھی کر رہی ہے۔لیکن اندیشہ ہے کہ بالکل بات ٹوٹ جائے۔تو پہلا درجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو برا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دو۔نہیں ﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ ② کچھ وعظ ونصیحت بتلا کے کرو۔اور یوں کہے کہ شریف زادیوں کے یہ دستور نہیں ہوا کرتے۔شریف گھرانے کی بیویوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرافت سے رہیں، اس طرح سے رہیں۔یہ غلط طریقہ ہے تو پیار و محبت سے سمجھایا جائے۔جو شریف الطبع عورت ہوگی۔وہ یہ لفظ سن کر فوراً پگھل جائے گی۔اور غصہ ڈھیلا پڑ جائے گا۔تو چار لفظوں سے نصیحت کرنا، یہ کارگر بن جائے گا اور جھگڑا وفساد ختم ہو جائے گا۔گھر جنت بن جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی بے وقوف ہے کہ نصیحت نے اس پر اثر نہ کیا، اب بھی یہ نہیں کہا اسے جدا کردو۔یا معاذ اللہ اسے طلاق دے کر نکاح توڑ دو۔نہیں۔فرمایا جب نصیحت سے نہیں مانی، تو ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ ③ دوسرا علاج یہ ہے کہ اس کو بستر سے تنہا چھوڑ دو، اپنا مردانے میں آ کے لیٹنا شروع کر دو۔جو شریف زادی ہے، طبیعت میں رعایت ہے، وہ سمجھے گی خاوند کی نگاہ پھر گئی ہے، راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے وہ تو گھر چھوڑ کے باہر بیٹھ گیا۔مردانہ میں سونے لگا۔اب گھر میں نہیں آ رہا ہے۔ایسا نہ ہو کہ کہیں مجھ سے بالکل ہی بیزار ہو جائے۔کہیں گھر ہی اجڑ جائے، تباہ ہو جائے۔تو اب پیام وسلام شروع ہو جائیں گے۔آدمی پہنچے گا، تشریف لائیے، ذرا بات چیت کیجئے۔وہ جو ایک بعد تھا، وہ ختم ہو جائے گا۔تو اول درجہ یہ ہے کہ نصیحت کردے، نصیحت سے نہ مانے تو اسے گھر میں تنہا چھوڑ کے باہر قیام کرلے۔ایک رات نہیں گزرنی پائے گی کہ دماغ سیدھا ہو جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی کوڑھ مغز ہے کہ اس کو نہ نصیحت کا اثر ہوا نہ باہر کا۔اس نے کہا میری جوتی سے اگر باہر لیٹ جائے، لیٹ جائے جا کے۔پھر آوے گا۔دو دن میں آوے گا، چار دن میں آوے گا، جھک مارے گا، پھر آوے گا۔یہ جو ایسی کوڑھ مغز ہے تو اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ④ تھوڑی سی تنبیہ تھوڑی سی مارپٹائی بھی ایسے حالات میں جائز ہے۔مگر شریعت نے مارپٹائی کی صورت بھی بتلائی ہے۔یہ نہیں ہے کہ لکڑی لے کے اس کے سر ہو جاؤ۔غریب کے ہاتھ پیر توڑ دو، یہ نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "واضْرِبُوْهُنَّ" (مار سکتے ہیں) کی تفسیر یہ کی ہے کہ اسی کا دوپٹہ لے کر ذرا اسے البیٹ دے کے دو چار مار دو۔اس سے تم کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے یہ بھی اختیار حاصل ہے۔

---

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴. ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴.

③ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴. ④ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴.

مارنا پیٹنا مقصود نہیں ہے۔ تھپڑوں سے مارے یا لکڑی سے مارے۔ یہ نہیں بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ اس کا دوپٹہ یا رومال لے کر ایک دوالبیٹ دے کے رسید کرے۔ چوٹ ووٹ تو اسے لگے گی نہیں۔ وہ یہ سمجھ لے گی کہ اُوہو یہ کام بھی اس کو آتا ہے۔ کل اگر اس کے ہاتھ میں لکڑی آ گئی، تو کیا ہوگا؟ گھبرائے گی، مگر یہ اس کا علاج ہے جو کوڑھ مغز ہو۔ جس پر نہ نصیحت اثر کرے، نہ بستر پر تنہا چھوڑ دینا اثر کرے۔ ایسی کوڑھ مغز کا تو یہی علاج ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی اجازت نہیں کہ اس کو چھوڑ دو۔ یا نکاح توڑ دو۔

﴿فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا﴾ ① اب اس کے بعد اگر اطاعت کرلے تو بس اب راستہ چھوڑ دو۔ زیادہ اسے تنگ مت کرو۔ مقصود پورا ہو گیا لیکن اگر کوئی ایسی احمق ہے کہ نہ نصیحت نے اثر کیا، نہ خاوند کے چھوڑ کر چلے جانے نے اس پر اثر کیا اور دو چار دوپٹے، البیٹ دے کے اس نے کھینچ مارے، اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ معلوم ہوا بڑی احمق ہے۔ اس کے دل میں کوئی کجی اور عناد بھرا ہوا ہے، الٹی کھوپڑی کی ہے۔ اس کے لئے اب چوتھا علاج ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اب اُسے نکاح سے جدا کر دو۔ یہ اب بھی اجازت نہیں دی۔

علاج یہ کہ اب تحکیم کا مسئلہ جاری کرو۔ حَکَم بناؤ۔ ایک حَکَم عورت کی طرف سے آئے، ایک حَکَم مرد کی طرف سے، دونوں طرف سے ایک ایک ثالث مقرر ہو۔ وہ دونوں ثالث مل کر فریقین کی شکایتیں پیش کریں۔ بیوی کا ثالث کہے کہ بیوی کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔ خاوند کا ثالث کہے کہ خاوند کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ ﴿إِنْ يُرِيدَآ إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا﴾ ② اگر نیک نیتی سے یہ دونوں ثالث بات چیت کریں گے، تو اللہ ضرور اصلاح فرمادے گا اور صلح صفائی ہو جائے گی۔ اور وہ جو کدورت بیٹھ گئی تھی، وہ نکل جائے گی۔

عندالضرورت آدابِ طلاق...... لیکن اگر اتنا کوڑھ پڑ گیا ہے کہ بجائے خود ثالث بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مزاجوں میں توافق نہیں ہے۔ عمر بھر ان میں کھٹ پٹ رہے گی، لڑتے رہیں گے۔ اب اجازت دی گئی کہ اتنے مرحلے گزارنے کے بعد اس حالت میں طلاق دے سکتے ہو۔ لیکن طلاق میں میں نے جیسے عرض کیا ایک طلاق سنت ہے ایک طلاق بدعت ہے۔ تو طلاق بدعت ممنوع ہے۔ طلاق سنت یہ کہ ایک طلاق دے، تاکہ مدت عدت میں پھر تمہیں رجوع کرنے کا حق رہے۔ اگر ایک دم تینوں دیدیں۔ اور پڑ گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائنہ ہو گئی، بات ہاتھ سے نکل گئی۔ بہت ممکن ہے۔ بعد میں پچھتاوا پیدا ہو، کہ بھئی ایسے جھگڑے تو روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو الگ کر دیا۔ پھر بیٹھ کر روئے گا۔ اور بیوی بھی روئے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں اگر مجبور ہو گئے ہو اور طلاق دینی ہی پڑے تو طلاق سنت ہی دو۔ ایک طلاق دینے کے بعد عدت کی مدت گزارے۔ عدت میں بلا نکاح رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق دینے کے بعد ممکن ہے دل میں آئے میں نے بڑی غلطی کی کہ طلاق دے دی۔ معاملہ سنبھل سکتا تھا۔ تو جدید نکاح کی ضرورت نہیں۔ بس رجوع کرلے اس سے معاملہ

---

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۵۔

شروع کردے۔ وہ اس کی بیوی ہے۔ پھر بھی اگر نباہ نہیں ہوسکا، پھر آگے دوسری طلاق کا حق ہے۔ پھر آگے اس کی عدت ہے۔ اس میں پھر رجوع کرنے کی گنجائش ہے۔ جب کوئی بھی گنجائش نہ ہو اور معلوم ہو کہ یہ عورت ہی الٹے مزاج کی ہے اور یہ گھر ہی کو تباہ کر کے رہے گی۔ جب تیسری طلاق دے کے قصہ پاک کیا جاسکتا ہے۔

آپ نے اندازہ کیا کہ شریعت نے کتنی برداشت کی ہے۔ اگر لڑائی کا خوف ہو تو نصیحت کرو، نصیحت سے نہ مانے تو ذرا گھر میں اس کو تنہا چھوڑ دو۔ اس سے نہ مانے تو اس کے دوپٹے سے ذرا اس کو تنبیہ کر دو۔ اس سے بھی نہ مانے تو ثالث مقرر کرلو اور اس سے بھی نہ مانے تو طلاق سنت دے دو۔ نکاح کو قطع مت کرو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح کتنی محبوب چیز ہے کہ اسے توڑنا نہیں چاہتے۔ اور شیاطین کے ہاں اتنی مبغوض چیز ہے وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح نکاح ٹوٹ جائے۔ اور ناچاقی پھیل جائے۔ خاوند بیوی کو لڑانے والا شیطان بھی آتا ہے، تو اسے بڑا شیطان گلے لگاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح انبیاء علیہم السلام کو محبوب اور عزیز ہے۔ اور شیاطین کو نکاح کا ٹوٹنا عزیز ہے۔

اللہ کے جوڑ کو باقی رکھنے والے ہی نیک نہاد ہیں...... تو نیک نہاد وہ ہوں گے جو انبیاء علیہم السلام کے راستے پر چلیں گے۔ اور نکاح کرنے کے بعد دل میں عہد باندھیں کہ ہمیں صبر وتحمل سے اپنی بیوی کی داشت کرنی ہے۔ اس کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی بہت زیادتی بھی کرے گی، ہمیں صبر وتحمل کرنا ہے، درگزر کرنا ہے، اسے لئے کہ ہمیں گھر بگاڑنا نہیں ہے۔ اور گھر بھی الگ رہا۔ دو خاندانوں کو لڑوانا نہیں ہے۔ یہ خاوند اور بیوی کے مزاج کے اوپر موقوف ہے۔ یہ نیک نیتی سے سچا معاملہ رکھیں گے تو دو گھر بھی جڑے رہیں گے، دو خاندان جڑے رہیں گے۔ دو برادریاں آپس میں جڑی رہیں گی۔ انہوں نے بے وقوفی کی تو دو خاندانوں اور برادریوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ دار ومدار ان دو کے اوپر ہے۔ اگر وہ دونوں حقوق پہچان لیں۔ نکاح کی غرض وغایت آداب اور وہ حقوق پہچان لیں جو شریعت نے بیان کئے ہیں تو گھر بار، برادری سب عزیز واقارب درست اور اپنی جگہ رہیں گے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ ایک آدمی پوری برادری کو سنبھالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اور وہ کتنا برا انسان ہوگا جو پوری برادری میں پھوٹ ڈالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اس واسطے نکاح کا مرحلہ بڑا نازک بھی ہے اور آسان بھی ہے۔ آسان تو یہ کہ چار بول پڑھے گئے اور وہ جڑ گئے، نازک اس لئے کہ ذمہ داریاں اس میں بہت آجاتی ہیں۔ عورت کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ مرد کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ ان کا نبھانا صبر وتحمل والے کا کام ہے، جو ذرا ذرا سی چیزوں میں آپے سے باہر نکل جانے کا عادی ہو، وہ تو لڑائی ہی کرا کے رہے گا۔ خاندانوں میں بگاڑ ہی پیدا کر کے رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس لئے نکاح کو اپنی آیت بتلایا، کہ یہ ہماری قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہم ہیں دلوں کے بدلنے والے جب اللہ دلوں میں جوڑ لگا دے۔ تو نیک طینت بندہ وہ ہے جو اللہ کے جوڑ کی عزت کرے۔ اسے مرتے دم تک باقی رکھے۔ اور اس کی غرض وغایت کہ تم سکون حاصل کرو، مرد عورت کی طرف رجوع

کر کے سکون حاصل کرے۔عورت مرد کی خدمت کر کے سکون حاصل کرے۔اور ان دونوں کے درمیان میں مودت،محبت اور رحمت کا علاقہ ہو،غضب وقہر اور توڑ پھوٹ کا علاقہ نہ ہو۔﴿إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ① اس نکاح میں قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔میں کہتا ہوں ان ساری چیزوں کو ادا کیا جائے، تو ہر ہر چیز مستقل ایک قدرت کی نشانی ہے۔اگر خاوند اور بیوی اس پر تیار ہوں اور عمل کریں تو ساری چیزیں نشانیاں بن جائیں گے۔مگر ان کے لئے جو غور وتفکر کرتے ہیں اور عقل لڑاتے ہیں۔

''تبریک''......اس آیت کی روشنی میں یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کیں کہ اس وقت نکاح کی تقریب تھی۔عزیز واقرباء نے تو مبارک باد پیش کی۔میری مبارک باد یہ ہے کہ میں نے نکاح کے بارے میں اس کے حقوق وآداب عرض کئے۔ان الفاظ کے ساتھ میں بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں،ان دونوں خاندانوں کے سامنے لڑکے والوں اور لڑکی والوں کے لئے بھی۔بس فرق اتنا ہی ہے کہ آپ حضرات نے عزیز داری کے ضمن میں مبارک باد دی۔میں ایک خادم قوم ہونے کی حیثیت سے مبارک باد دیتا ہوں۔اور خادم قوم کا کام یہی ہے۔کہ خدمت کے طریقے پیش کر دے۔یہ سب سے بڑی مبارک باد ہے اگر خاوند بیوی ان نصائح پر عمل کریں۔

تو سب سے بڑی مبارک باد کی بات فی الحقیقت یہی ہوگی۔اور وہی نکاح باعثِ خیر وبرکت ہوگا۔اب آپ سب حضرات دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں خاوند بیوی میں باہمی محبت نصیب فرمائے۔جو دو گھرانے آپس میں جڑے ہیں۔ان دونوں کے اندر محبت ومودت کا رشتہ قائم ہو۔ایک دوسرے کی خیر خواہی میں لگے رہیں اور ایک دوسرے سے محبت ومدارات کا نفع حاصل کریں۔ان کے دلوں میں سکون وتحمل رہے اور ایک دوسرے کے لئے خوشی کا باعث بنیں۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا وَّآخِرُ دَعْوَانَآ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

---

① پارہ: ۲۱،سورۃ الروم،الآیۃ: ۲۱.

فلسفہ موت

موت جیسے فزع اکبر ہے۔ جیسے عظیم ترین مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا۔ بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفہ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علقم پیدا ہونے کا، اور نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ . اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا. وَدَاعِیًااِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَا جًا مُّنِیْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ① اِلٰی قَوْلِہٖ تَعَالٰی ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ .

تمہید ...... بزرگانِ محترم! میری اس وقت حاضری کا مقصد ملتان میں نہ کوئی جلسہ تھا، نہ کوئی مجلس تھی نہ کوئی تقریب اور وعظ کا تخیل ذہن میں تھا۔ میری حاضری کا مقصد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانی مدرسہ خیر المدارس وملتان) کی وفات کے بعد یہ پہلی حاضری تھی تا کہ تعزیت ادا کروں۔ تعزیت کے لئے ہجوم اور مجمع نہیں ہوتا، اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، تو میں روک دیتا اور مجھے امید تھی کہ مولانا محمد شریف صاحب (مہتم مدرسہ خیر المدارس، فرزندار جمند حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ) مان بھی لیتے لیکن اچانک آ کر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ بھی ہے اور اجتماع بھی۔ جلسہ اور تقریر میں ان سب کے لئے ضرورت پڑتی ہے نشاط کی، طبیعت میں انشراح ہو نشاط ہو۔ یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر میں اس وقت حاضر ہوا ہوں ایک بجھے ہوئے دل کے ساتھ۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا غم سامنے ہے، یہاں آ کر تازہ ہو گیا۔ حالانکہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے مگر میرا تعلق اتنا قوی تھا ان سے اور قلبی رابطہ برسہا برس سے تھا۔

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۳۔

مولانا مرحوم جب جالندھر میں مقیم تھے۔ پنجاب کا جو بھی میرا سفر ہوا دو جگہ اترنا لازمی ہوتا تھا۔ جالندھر میں مولانا مرحوم کی وجہ سے، اور امرتسر میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم کی وجہ سے۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا موحوم کا قیام ملتان میں ہوا۔ یہاں بھی ایک آدھ مرتبہ ان کی حیات میں حاضری ہوئی۔ اس وقت ان کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع ہے حاضری کا۔ تو وہ سارے تعلقات سامنے آگئے، وہ ساری تاریخ سامنے آگئی۔ اس وجہ سے دل پر غم کا ایک بوجھ ہے تو اس بجھے ہوئے دل سے میں کیا تقریر کروں اور کیا جلسے کا حق ادا کروں؟ اور اوپر خود میرا بھی اب ضعیفی کا عالم ہے قوت بھی وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں۔ ایسی حالت میں تقریر ہو تو کیا ہو؟

بہر حال جب ہوگیا ایک اجتماع اور حضرات جمع ہوگئے ان کا احترام بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اس لئے غم کے سلسلے میں تعزیتی تقریر ہوگی۔ کوئی خاص وعظ ونصیحت اس میں نہ ہوگا۔

عالم کی بقاء روحانیت کی بقاء سے ممکن ہے...... حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات ایک مقناطیسی ذات تھی جو قلوب کا رجحان تھا، اور دل کھینچتے تھے اور ان کی وفات جیسا کہ مقولہ مشہور ہے۔ ''موت العالم موت العالم'' ''عالم کی موت فی الحقیقت عالَم کی موت ہے'' اس لئے کہ عالم کے ذریعے سے حیات پھیلتی ہے وہ حیات یہ نہیں ہے جو کھانے پینے کی ہے وہ حیات روحانی ہوتی ہے اور وہی حقیقی حیات بھی ہے اور وہی حقیقی روح بھی ہے، اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا ہے۔ اسی روح سے اقوام زندہ ہوں گی اور اسی روح کے نکل جانے سے پژمردگی طاری ہوگی۔

فرمایا ایک موقع پر کہ: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ①

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے یعنی اپنی روح آپ کے اندر ڈالی ہے وہ عالم کی روح ہے، اور وہ کتاب اللہ اور قرآن کریم ہے جس کو روح بتلایا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ زندگی ہے سارے عالم کی۔ یہ روح ایک فرد سے نکل جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا۔ پوری کائنات سے نکل جائے تو کائنات بھی مردہ ہو جائے گی۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

''لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ'' ②

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جس وقت اس عالم میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہوگا'' جب یک بھی باقی نہیں رہے گا تو قیامت آجائے گی۔ تو قیامت اس پورے عالم کی موت ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ اس عالم کی زندگی اور اس کی روح ''اللہ اللہ'' ہے۔ جب یہ روح نکل جائے عالم مردہ ہو جائے گا، اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ آسمان وزمین ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ساری کائنات کا شیرازہ منتشر

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

ہو جائے گا۔ غرض عالم کی روح وہ فی الحقیقت ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے، نہ صرف پورے عالم کی بلکہ ایک ایک جز کی روح بھی یہی ہے۔

''ہر چیز تسبیح خواں ہے''...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: درخت کی ہر ہر ٹہنی بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے اس پر زردی چھا جاتی ہے، وہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ روح نکل گئی، موت طاری ہو گئی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے جب کہ وہ ٹھہر جاتا ہے۔ تسبیح بند ہو جانے کے بعد ٹھہرا ہوا پانی سڑتا بھی ہے بدبودار بھی ہوتا ہے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ تو پانی کی زندگی بھی تسبیح و تہلیل سے ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: امام کے لئے مکروہ تحریمی ہے کہ ایسے کپڑے پہن کر امامت کرائے کہ پسینے میں زرد ہوئے ہوں۔ پسینے کی بو آ رہی ہو۔ اس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ جب بدبودار کپڑے ہوں گے اور تعفن ہوگا تو مقتدیوں کو اقتداء کرتے ہوئے کراہت پیدا ہوگی، نشاط باقی نہیں رہے گا۔ جو ایک رابطہ ہے بندہ اور خدا کے درمیان میں وہ پورا قائم نہیں رہ سکے گا، اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ امام کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہننا ضروری ہیں، اتنے میلے نہ ہوں کہ ان میں سے بدبو آنے لگے۔ رنگ بدل جائے، ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ بدبو سے مقتدیوں کو عار پیدا ہوگی۔

حقیقی وجہ یہ ہے کہ کپڑا گندا ہو کر اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ ذکر اللہ منقطع ہو جاتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، انقباض پیدا ہوتا ہے روح میں۔ تو درحقیقت عالم قائم نہیں رہے گا۔ عالم کی جزئیات ختم ہو جائیں گی تو ہر ہر چیز اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ (1)

''کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں ہے جو حق تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے یا آواز کو نہیں سنتے۔'' تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے اور درحقیقت وہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے اپنی زبان میں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔ فی الحقیقت وہ اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ پرندے سیٹیاں بجاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چہچہا رہے ہیں۔ حقیقت میں وہ ذکر الٰہی میں مصروف ہیں اپنی زبان میں۔ تو ؎

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کو اللہ نے ایک زبان دی ہے۔ وہ اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ ہم اس کی زبان کو نہیں سمجھتے، اور ہم ان کی زبان کو اگر نہیں سمجھتے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے ہی بھائی بندوں کی سب زبانیں کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی پشتونی آدمی پشتو میں اللہ کو پکارنے لگے، دعائیں مانگنے لگے، ہم کیا کریں گے،

---

(1) پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴.

بیٹھے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں آپ بولیں تو میں کیا سمجھ لوں گا۔ کوئی انگریزی میں اللہ کو پکارے تو ہم کیا سمجھیں گے، تو ہزاروں زبانیں دنیا میں رائج ہیں انسانوں میں۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبانیں نہیں جانتے۔ اگر پرندوں کی زبان بھی نہ جانیں تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ ہر ایک کی ان کی ایک تسبیح ہے...... اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے نہ سمجھیں۔ تو فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ.﴾ ① تم ان کی تسبیح کو نہیں پہچانتے باقی معجزے کے طور پر اگر اللہ کسی کو بتلا دے پرندوں کی بولیاں تو اس کی قدرت ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ.﴾ ② اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں بتلا دی گئی ہیں۔

جب پرندے بولتے تو سلیمان علیہ السلام فرماتے کہ یہ فلاں بات کہہ رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے ان کی بولیوں کو۔ یہ آواز کبھی آسکتی ہے ہم لوگوں کے کان میں بھی معجزانہ طریق پر، جیسے کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر کے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے زور زور سے آواز آ رہی تھی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سن رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں دے دیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ انہوں نے وہ کنکریاں دیں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ جب اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو منتقل کی گئیں تو تسبیح کی آواز سننا بند ہو گئی۔ تسبیح جاری رہی ہوگی مگر سنائی نہیں دی۔ اعجازی طور پر ہم سن بھی سکتے ہیں۔ جب اللہ کا کوئی معجزہ کسی پیغمبر کے ہاتھ ظاہر ہونا چاہے۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹیلیگراف آفس میں جائیں اور جا کر کہیں کہ بھائی یہ تار دے دو، کہ میں فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ اس نے پیتل کی ٹلی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ شروع کی۔ تو آپ کہیں گے کہ: احمق آدمی میں نے یہ کہا ہے، کہ میرے آنے کی اطلاع دے دو۔ تم نے کھٹ کھٹ شروع کر دی، وہ کہے گا احمق تو تو ہے۔ اسی کھٹ کھٹ میں یہ سارا علم پہنچ رہا ہے دوسرے ملک میں۔ باقی تو اس کھٹ کھٹ کی آواز سے واقف نہیں ہے۔ میں نے اس کی مشق کی ہے، اس کا فن حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ ایک دفعہ کھٹ ہوگی تو الف مراد ہوگا۔ دو دفعہ ہوگی تو ب مراد ہوگی۔ تین دفعہ ہوگی تو ج مراد ہوگا۔ تو کھٹ کھٹ سن رہا ہے۔ اور حقیقت میں یہ علم ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہو رہا ہے، تو اس فن کو حاصل کرے گا۔ تو تجھے بھی معلوم ہو جائے گا۔ نہیں حاصل کرے گا، تو نہیں پتہ چلے گا۔

تو جس طرح ہم اس کھٹا کھٹ سے علم نہیں سن سکتے۔ نہیں سمجھ سکتے اسی طرح جانوروں کی آوازوں کو ہم سنتے ہیں مگر تسبیح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ان کی زبان میں تسبیح ہے، ذکر ہے اپنی زبان میں، وہ کر رہے ہیں۔

ملائکہ علیہم السلام کو بھی مختلف تسبیحات دی گئی ہیں۔ وہ اپنی زبان میں تسبیح کرتے ہیں، ممکن ہے ان کی زبانیں بھی

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

متعدد ہوں۔ اپنی اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، بعض روایات میں ان کی تسبیحات بھی آئی ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے کہ بعض ملائکہ کی تسبیح ہے کہ: ''سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِالْلُّحٰى وَزَيَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَائِبِ'' ''پاک ہے وہ ذات جس نے مردوکو زینت دی ہے ڈاڑھیوں سے، اور عورتوں کو زینت دی ہے مینڈیوں اور چوٹیوں سے''۔

یہ ان کی زبان میں تسبیح ہے ان کی۔ وہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ تو مختلف تسبیحات ملائکہ بھی کرتے ہیں، جنّات بھی کرتے ہیں۔ آسمان بھی تسبیح میں مصروف ہیں، زمین بھی تسبیح میں مصروف ہے۔ ستارے بھی تسبیح میں مصروف ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ ①...... قرآن کریم نے خطاب فرمایا ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ آسمانوں میں جو ہیں وہ بھی مصروف، پہاڑ۔ اور یہ تو ہے تسبیح۔

ہر چیز نمازی بھی ہے...... قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز نمازی بھی ہے اپنے اپنے انداز سے نماز بھی ادا کرتی ہے۔ فقط ذکر ہی میں مصروف نہیں ہے۔ دعویٰ کیا ہے قرآن کریم نے:

﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ②

''ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی پہچان لیا ہے اور اپنی تسبیح کو بھی جان لیا ہے۔'' تو ہر ایک مخلوق نماز پڑھ رہی ہے۔ باقی اس کی نماز اسی انداز کی ہے جیسے اللہ نے اس کی ساخت بنائی ہے، جیسے اس کی ہیئت بنائی ہے اس ڈھنگ کی اس کی نماز بھی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ رکوع اور سجدہ نہیں ہے، وہ ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔ اطاعتِ خداوندی میں لگے ہوئے ہیں۔ چوپائیوں کی نماز میں رکوع ہے۔ ان کی ہیئت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت سر کو جھکائے ہوئے رکوع میں ہیں۔ حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے، مکوڑے، ان کی نماز سجدہ سے ہے۔ قیام اور رکوع نہیں ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے۔ جیسے انسان زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی نماز تشہد کے ساتھ ادا ہو رہی ہے، تسبیح میں مصروف ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز دعاء مانگنا ہے۔ جنت بھی دعاء کر رہا ہے کہ: اے اللہ! مجھے بھر دے اور وعدۂ خداوندی ہے کہ ہم بھر دیں گے۔ جہنم کی بھی یہی صدا ہے کہ مجھے بھر دیجئے، میری غذا مجھے پہنچایئے۔ قیامت کے دن دوزخ کو بھر دیا جائیگا۔ اہل جہنم جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ مگر دونوں کی آواز بند نہیں ہوگی۔ جہنم کہے گا ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'' اور لایئے ابھی تو میں خالی ہوں، جنت کہے گا میرے ہزاروں شہر خالی پڑے ہیں۔ آبادکاری فرمایئے، آپ کا وعدہ ہے کہ بھر دیں گے، تو جنت کے لئے حق تعالیٰ ایک مستقل مخلوق پیدا فرمائیں گے، جس سے آبادکاری ہوگی جنتوں کی۔ جہنم کے لئے مستقل مخلوق نہیں بنائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ اپنا قدم رکھ دیں گے اس پر، جیسا قدم ان کی جناب کے لائق ہے، تو وہ کہے گا قط قط۔ بس بس۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے میں بھر گیا۔ اس کی دعاء قبول

---

① پارہ: ۱۷، سورة الحج، الآية: ۱۸. ② پارہ: ۱۸، سورة النور، الآية: ۴۱.

ہو جائے گی۔ تو جنت اور جہنم کی نماز دعاء مانگنے سے ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کی نماز ہے صف بندی، کروڑوں ملائکہ صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ ہزار ہزار برس سے، کوئی جماعت رکوع میں ہے۔ کوئی جماعت سجدہ میں ہے۔ کوئی قیام میں ہے۔ صفیں بنی ہوئی ہیں۔ صف بندی ان کی نماز ہے۔ سیارے ہیں جو گھومتے ہیں، ان کی نماز حرکت دوراں ہے کہ جہاں سے چلے تھے پھر وہیں لوٹ آئیں۔ گھومنا ہی ان کی نماز ہے۔

اسلام کی نماز کی عظمت اور جامعیت ...... یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اسلام کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دی ہیں۔ درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت و دوزخ کا سا سوال و دعاء بھی ہے اور سیارات کا سا دوران بھی ہے۔ اس واسطے کہ ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ملاؤ تا کہ شفعہ بن جائے تو دو یا چار رکعت کی نماز میں آپ کیا کرتے ہیں، جو کام پہلی رکعت میں کیا الحمد پڑھی، سورت پڑھی، تسبیح پڑھی...... دوسری رکعت میں پھر وہیں سے شروع کر دیتے ہیں، وہی الحمد، وہی سورت، وہی تسبیح، وہی تحمید۔ تو جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آ گئے ایک دور ہے تمہاری نماز میں۔ تو سیارات جیسی گردش بھی آپ کی نماز میں۔ تو جامع ترین نماز ہے کہ جتنی ہیئتیں ممکن ہیں عقلاً وہ سب دی گئی ہیں، تا کہ بندہ عبادت اور تذلل کے ساتھ پیش ہو، کھڑا ہو تو تذلل، بیٹھے تو اپنی ذلت کا اظہار، جھکے تب ذلت کا اظہار۔

عبادت کا صحیح مفہوم ...... غرض عبادت نام ہے اظہار تذلل کا۔ انتہائی درجہ کی ذلت اپنی پیش کی جائے۔ اس لئے کہ جس ذات کے سامنے آدمی کھڑا ہوتا ہے وہ انتہائی عزت کے مقام پر ہے کہ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں عزت کا۔ اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کی جائے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو ذلیل محض بن کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس لئے کہ وہ عزت کے انتہائی مقام پر ہے اس کا فرض ہے کہ ذلت کے انتہائی مقام کو پیش کرے۔ کھڑے ہوتے ہیں آپ جامد و ساکت۔ یہ ایک درجہ ہے اظہار ذلت کا۔ رکوع کیا تو گردن جھکا دی، یہ دوسرا درجہ ہے اظہار ذلت کا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے، دعائیں مانگیں، تو بھیک مانگنا، یہ سب سے زیادہ انتہائی درجہ ہے ذلت کا۔ تو جتنی ہیئتیں ہیں وہ سب اظہار تذلل کی ہیں۔ جتنے اذکار ہیں نماز میں یا عظمتِ خداوندی کا اظہار ہے یا اپنی نیاز مندی کا اظہار ہے۔ انہی دو چیزوں پر مشتمل ہیں تمام اذکار، تو ذکر بھی، افعال بھی، ہیئت بھی سب اظہار ذلت کے ہیں نماز میں۔

صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے ...... اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ حقیقی معنوں میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔ دوسری عبادات اور وجوہ سے عبادت بنی ہیں، اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔

روزہ ...... اس کا معنی یہ ہے کہ کھانے پینے سے آدمی مستغنی ہو جائے، تو کھانے سے، پینے سے، بیوی سے مستغنی

ہونا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ مشابہت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری، تو یہ اظہار ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اظہار عزت ہے۔ یہ عبادت تعمیل حکم کی وجہ سے ہے۔ حکم دیا تعمیل کرو تو بن گئی عبادت۔

زکوٰۃ......اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ اس کے معنی عطا کرنے کے ہیں کہ فقیروں کو دو، عطا کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ یہ تشبیہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو عین عزت ہے۔ زکوٰۃ عبادت بنی اس لئے کہ حکم ہے کہ زکوٰۃ دو، تو تعمیل ارشاد نے اس میں پیدا کر دیئے معنی عبادت کے۔ اس طرح سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں اور وہ عبادت ہے لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں یہ تو اللہ کی صفت ہے۔

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا۔ ①

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ ②

تو سچ کہنا اور سچ بولنا حق تعالیٰ کی شان ہے بندہ اگر سچ بولے گا تو مشابہت پیدا کرلے گا کمالاتِ خداوندی کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہے یہ تو عین عزت ہے۔ پھر بھی وہ عبادت ہے کہ حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اللہ کا کہنا ہے سچ بولو۔ تعمیل کے لئے گردن جھکا دی کہ سچ بولوں گا۔ سچ کو عبادت بنا دیا تعمیل حکم نے۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں تھی۔ ورنہ اللہ کی صفت نہ ہوتی۔

صرف نماز پوری کائنات پر فرض ہے......لیکن نماز کی ہر ہیئت اظہار ذلت کے لئے ہے۔ ہر ذکر بھی اپنی ذلت کے اظہار پر مشتمل ہے اس واسطے نماز اپنی ذات سے عبادت ہے محض تعمیل حکم سے عبادت نہیں، اس کے اندر خاصیت ہی اظہار تذلل کی ہے یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات پر فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ، حج اور سچ بولنا فرض نہیں کیا گیا، فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ③ ہر چیز نے اپنی نماز کو پہچان لیا۔ یہ نہیں فرمایا: ''كُلٌّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهٗ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ زَكٰوتَهٗ۔'' تو نماز کائنات کی ہر چیز پر فرض کی گئی ہے۔ انسان، جن، فرشتہ درخت، پہاڑ اور پتھر سب کے لئے عبادت اور نماز لازمی قرار دی گئی ہے تو اصل معنٰی کے لحاظ سے نماز ہی عبادت ہے۔ بقیہ عبادتیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادتیں بنی ہیں۔

ربط مع الحق بدوں نماز ممکن نہیں......یہی وجہ ہے کہ بندے کا حقیقی رابطہ اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہوسکتا۔ آپ زکوٰۃ دیں گے تعلق مع الخلق درست ہو جائے گا۔ غریب کی خبر گیری ہوگی، وہ آپ کا ممنون ہوگا۔ تعلقات استوار ہو جائیں گے، اس تعمیل کی وجہ سے اللہ سے بھی تعلق پیدا ہوگا، مگر حقیقتاً وہ تعلق ہے مخلوق کے ساتھ۔ اس واسطے رابطہ بندے کا اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر نماز میں قصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رابطہ حق تعالیٰ سے قائم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (نماز میں) دوسرا خیال لاتا ہے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حق تعالیٰ

① پارہ: ۵، سورة النساء، الآية: ۱۲۲. ② پارہ: ۵، سورة النساء، الآية: ۸۷. ③ پارہ: ۱۸، سورة النور، الآية: ۴۱.

فرماتے ہیں: میرے ہوتے ہوئے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے تجھے حیا نہیں آتی۔ اگر متنبہ ہو گیا بندہ، پھر تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ نہ ہوا تو پھر خود بے رخ بن جاتے ہیں۔ توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اٹھک بیٹھک رہ جاتی ہے۔ تو نماز سے ہی فی الحقیقت رابطہ قائم ہوتا ہے۔

نماز سے دیدارِ خداوندی کی استعداد...... اس لئے حدیث میں فرمایا گیا: تمام نمازوں کے بارے میں اور خصوصیت سے صبح اور عصر کی نمازوں میں کہ ان دونوں سے استعداد پیدا ہوتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ نماز ہی سے اللہ کو دیکھنے کی صلاحیت بندہ میں آتی ہے۔ عمر بھر نماز پڑھتا رہے گا تو ابتداء عقیدے کی آنکھ سے دیکھے گا، پھر کشف کی آنکھ سے دیکھے گا۔ اور پھر ایک وقت آئے گا کہ آخرت میں اس آنکھ سے بھی دیکھ سکے گا۔ تو مقصودِ اصلی عبادت سے معبود کو دیکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے اور یہ صرف نماز سے ممکن ہے۔ تو حقیقی عبادت نماز ہی ہے۔

روحِ خداوندی ہر چیز میں موجود ہے...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ: حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا۔ اس روح کے اندر یہ عبادات بھی شامل ہیں۔ تعمیل ارشاد ہی اس کی روح ہے فی الحقیقت، بندے میں اللہ نے قرآن کی روح ڈال دی تا کہ اس میں بندگی پیدا ہو اور اللہ کی معبودیت ظاہر ہو۔ ''وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا''۔ پیغمبر! عالم امر کی روح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈال دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے سے وہ روح ہم تک پہنچ گئی، ہمارے اندر بھی وہ روح ہے ہم اس روح کو داخل رکھیں گے تو قوی رہیں گے۔ قوت کی علامت اس روح کی برقراری ہے اور ضعف کی علامت اس روح کا نکل جانا ہے۔

مسلم اقوام کی پریشانی کا علاج...... دنیا میں مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ فلاں قوم نے ہمیں تباہ کر دیا، فلاں قوم نے اپنی مکاریوں سے ہمیں پریشان کر دیا۔ ہماری جائدادیں ختم کر دیں۔ ہمارے جان و مال کو ختم کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ: یہ شکایت بالکل غلط ہے...... شکایت تو کفار کو ہونی چاہئے کہ تمہاری ناہنجاری سے ہم بدعنوان بن گئے۔ اگر تم صحیح معنوں میں اپنے دین پر قائم رہتے تو ہم تمہاری ٹھوکروں کے نیچے رہتے، ہم تمہاری اتباع کرتے لیکن جب تم اپنے نہج پر نہیں ہو تو ہم سے کیا توقع رکھتے ہو، کہ ہم تمہاری پیروی کریں یا پابندی کریں۔

تو حقیقت میں شکوہ ہے مسلمانوں کا۔ مسلمانوں کا حق نہیں ہے غیر اقوام سے شکوہ کرنے کا مسلمان آیا تھا دنیا کی اقوام کو درست کرنے کے لئے۔ اس کو اقوام امام بنایا گیا، امام ہی کا وضو نہ ہو تو کیا مقتدیوں کی نماز ہو جائے گی؟ اقوام کیوں اس کی اقتداء کریں گی۔ اور کیوں کر اس کی پیروی کریں گی؟

اس لئے کہ وہ قوت اس نے ختم کر دی جو غالب اور قاہر تھی اقوام پر۔ وہ روح ہوا کی طرح بھری ہوئی تھی۔ جب تک وہ ہے مسلمان قوی ہے، وہ نکل گئی مسلمان ضعیف ہے آپ نے دیکھا ہو گا کہ گیند ہے اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اگر آپ اسے زمین پر پٹخ دیں تو گر دا کھا کے دس گز اوپر جاتی ہے اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے اس میں۔ اور اگر اس میں سوئی چبھو دی جائے تو ہوا نکل جائے گی، تو جہاں ڈالیں گے، وہیں پڑی رہ جائے گی۔ اس کو آپ

پیروں سے پامال کردیں، وہ اٹھنے کا نام نہیں لے گی، اس لئے کہ روح نکل گئی۔

روح اسلامی نکلنے سے مسلمانوں کا انجام...... مسلمانوں کی روح قرآن پاک ہے۔ اقوام کی یہ مجال نہیں کہ اس کو دبائیں، دبائیں گے پٹخ دیں گے نیچے، تو یہ دس گز اوپر جائے گا، اور اوپر ہی جائے گا ''اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَایُعْلٰی'' (حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) لیکن یہ روح نہیں ہوگی، تو جہاں ڈالیں گے وہیں پڑا رہے گا۔ آج اگر مسلمان پامال ہو رہے ہیں، نہ اس لیے کہ کفار میں جان ہے۔ اس لئے کہ تم بے جان ہوگئے، جو روح تھی وہ نکال باہر کی، تو روح نکل جانے کے بعد آدمی لاشہ بن جاتا ہے۔ لاشہ کے لئے ہر انسان کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ دبائے، جلائے یا اسے دفن کردے (الغرض آنکھوں سے اوجھل کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے، اس دنیا میں اب اس کا کوئی مقام نہیں) اس کو گھر نہیں چھوڑتے، باہر نہیں چھوڑتے۔ اس کے تعفن سے دنیا کی صحت خراب ہوگی۔ پہلا کام یہ کرتے ہیں اسے دفن کرتے ہیں، کوئی جلاتا ہے، کوئی پانی میں بہا دیتا ہے، اور کوئی برا نہیں مناتا۔ لیکن اگر زندہ آدمی کو کوئی جلائے، تو گورنمنٹ ہی مدعی ہو جائے گی کہ اسے پھانسی دو، قوم بھی مدعی بنے گی کہ یہ بدکار ہے، مجرم ہے، روح کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں ہے کہ دبائے، دبائے گا تو مجرم ثابت ہوگا۔ لیکن جب روح نکل جائے گی، جس کا جی چاہے جلا دے، دفن کردے، تو مسلمانوں کا یہ شکوہ کرنا کہ فلاں قوم نے ہمیں جلا دیا، یا فلاں نے گرا دیا، میں کہتا ہوں غلط ہے۔ اس نے خود اپنے کو گرا دیا ہے، جب روح نکال دی، زندگی ختم ہوگئی زندہ آدمی کو کوئی نہیں جلا سکتا۔

عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے...... میں عرض یہ کر رہا تھا کہ: حقیقی معنیٰ میں حق تعالیٰ نے دینی روح (مسلمان میں) ڈال دی، اور وہ ہے قرآن مجید۔ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ① تو اس عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب یہ نکل جائے گی، تو عالم لاشہ کی مانند ہو جائے گا، اور لاشہ کا انجام پھولنا، پھٹنا، سڑنا، گلنا اور ریزہ ریزہ ہو جانا ہے۔ ایک ایک چیز کا ذرہ ذرہ پھٹ جائے گا قیامت کے دن، یہ عالم کی موت ہوگی اور یہ اس لئے واقع ہوگی کہ روح نکل جائیگی۔

روح کا حسی مرکز...... اس روح کا سب سے بڑا حسی مرکز بیت اللہ شریف ہے، جس کے ذریعے چلتی ہے اسی میں تجلی خداوندی ہے، جس کے سامنے ہم جھکتے ہیں۔ یہیں سے بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انوار و برکات چلتے ہیں۔ تو یہ مرکز روح ہے فی الحقیقت، قیامت کا جب قرب ہوگا اور روح اٹھنے والی ہوگی تو حدیث شریف میں ہے کہ بیت اللہ کو ایک حبشی غلام ریزہ ریزہ کردے گا۔ ایک ایک پتھر اس کا جدا کردے گا۔ تو سب سے پہلے بیت اللہ ختم ہوگا۔ پھر عالم پر قیامت طاری ہو جائے گی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کا لشکر چلتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جاتا ہے تاکہ بادشاہ آکر

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

ٹھہرے، ان کے اردگردان کے دربار کے اُمرا کے خیمے لگتے ہیں، پھر فوجیوں کے خیمے لگتے ہیں، جب بادشاہ آتے ہیں تو بڑا شہر بن جاتا ہے لیکن جب کیمپ اجڑتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جاتا ہے بعد میں اور امراء کے خیمے اکھڑتے ہیں اور پھر میدان خالی ہو جاتا ہے، یہی صورت یہاں بھی ہے وہ خیمۂ خداوندی کہ تجلیات الٰہیہ اس میں مقیم ہیں، سب سے پہلے اس کو عالم میں قائم کیا گیا۔ فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ.﴾ ① ''سب سے پہلا گھر جو اللہ نے عبادت کے لیے قائم کیا وہ وہ ہے جو مکہ شہر میں ہے اس کا نام کعبہ مقدس ہے۔'' یہ گویا خیمہ شاہی ہے جب عالم کو آباد کرنا ہوا تو سب سے پہلے خیمہ شاہی نصب کیا گیا اور جب عالم کا خیمہ اکھڑے گا اور یہ دنیا ختم ہوگی، تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جائے گا۔ جب بیت اللہ کی ایک حبشی غلام اینٹ سے اینٹ بجادے گا اور تجلی خداوندی اسے چھوڑ دے گی۔ اس کے بعد عام مساجد بھی ویران ہوں گی۔ تمام اہل اللہ کے ذکر خانے (خیمے) بھی ویران ہوں گے، اور ساری دنیا ویران ہو جائے گی۔ تو اولین چیز وہ شاہی خیمہ ہے جو سب سے پہلے نصب ہوتا ہے کیمپ میں اور اکھڑنے کے وقت سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھڑتا ہے۔ تو اولین چیز جو قائم کی گئی وہ بیت اللہ ہے اور ابتداء میں قیامت کے قرب میں وہ سب سے پہلے اکھاڑا جائے گا۔ بہر حال وہ روح ذکر اللہ ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اسی کی بقاء سے عالم باقی ہے۔

فلسفۂ موت اور علماء ربانی کی شان..... تو موت فی الحقیقت نام ہوا ذکر اللہ کے منقطع ہو جانے کا یہ منقطع نہ ہو تو آدمی مرتا نہیں۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ''مَثَلُ الذَّاکِرِ فِیْ الْغَافِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِیْ الْاَمْوَاتِ.'' ② ''غافلوں کے اندر ایک بھی ذکر اللہ کرنے والا موجود ہے تو وہ مثل زندہ ہے، وہ غافلوں میں سے نہیں اس لئے مردوں کے اندر وہ زندہ ہوتا ہے۔''

تو علماء ربانی کی شان یہی بتائی گئی ہے کہ ان کا دل، روح اور دماغ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اثر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان کا صدقہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ فرمایا گیا ہے: ''کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ.'' ③ ''کوئی لمحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔'' زبان سے ذکر کریں۔ قلب سے ذکر کریں، جس کو فکر کہتے ہیں۔ روح سے ذکر کریں جس کو توجہ کہتے ہیں اور معرفت کہتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طریق پر ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ ''موت العالم موت العالم'' تو ایسے عالم کا اُٹھ جانا، پورے عالم کا اٹھ جانا ہے، کیونکہ وہ روح نکل جاتی ہے تو پورے عالم پر ایک پژمردگی چھا

---

① پارہ:۴، سورۃ اٰل عمران، الآیۃ:۹۶. ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، ج:۳ ص:۱۹۵ حدیث صحیح ہے، امام بخاریؒ نے بھی اس کے مثل روایت کی ہے دیکھئے: الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ج:۲۰ ص:۲۳. ③ الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ تعالیٰ فی حال الجنابۃ وغیرھا ج:۲ ص۲۹۷.

جاتی ہے۔ تو میں نے (ابتداء میں) عرض کیا تھا کہ مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جیسے ان کے نام میں خیر ہے ان کے مسمّٰی میں اللہ نے خیریت ہی رکھی تھی۔ اور واقعتاً خیر ہی خیر تھے۔ حدیث کا پڑھنا پڑھانا، قرآن پاک کا پہنچانا، مواعظ سے تبلیغ و تلقین کرنا۔ اپنے پروردوں کی تربیت کرنا، غرض ذکر اللہ ہی ان کا مشغلہ تھا کسی بھی انداز سے ہو۔

ایسے عالم ربانی کا اٹھ جانا یقیناً پورے عالم کے لیے موت کا بھی اور علامات موت کا یقیناً اشارہ ہے۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے تو قلوب محسوس کرتے ہیں کہ ایک قسم کی ظلمت طاری ہوگئی ہے۔ پورے عالم میں روحانیت میں کمی آگئی۔ ہر شخص محسوس نہیں کرتا، صاحب دل جانتا ہے کہ نورانیت میں کتنی کمی آتی ہے، اسی واسطے فرمایا گیا کہ: ''اَلْمَوْتُ اَلْفَزْعُ الْاَکْبَرُ'' ''موت سب سے زیادہ گھبرا دینے والی چیز ہے۔'' مگر مجھے ساتھ یہ بھی عرض کرنا ہے کہ موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے، وہاں ایک تحفہ بھی ہے۔ ایک نعمت بھی ہے یہ نعمت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر موت نہ ہو عالم کی آبادکاری نہیں ہوسکتی۔

اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ...... ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ملائکہ علیہم السلام کے سامنے پیش کیا۔ اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے ہیں۔ ملائکہ نے انہیں دیکھ کر عرض کیا۔ یا اللہ یہ زمین میں سمائیں گے کیسے؟ یہ تو تین ارب ہوجائیں گے تو اسی وقت کہیں گے کہ نس بندی کراؤ فیملی پلاننگ کرو۔ ایک طوفان برپا ہے۔ اگر وہ پچاس ارب ہوجائیں تو زمین کا کیا حشر ہوگا؟ تو ملائکہ کو یہ خلجان گزرا کہ زمین میں یہ کیسے سمائیں گے؟

حق تعالیٰ نے کہا کہ: موت مسلط کردوں گا۔ آئیں گے بھی جائیں گے بھی، زمین خالی ہوتی رہے گی۔ اگلے آتے رہیں گے، پچھلے جاتے رہیں گے۔ تو میں نے موت کا سلسلہ قائم کیا تا کہ جانے والے جائیں، اور آنے والے خالی جگہ آ کر بستے جائیں۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا جب موت مسلط ہوگی تو ہر وقت موت کی فکر لاحق ہوگی، ان کی زندگی تلخ ہوجائے گی۔ نظام دنیا کیسے چلے گا؟ ہر وقت موت کی فکر میں غرق رہیں گے۔ فرمایا: حق تعالیٰ نے کہ اُمیدیں مسلط کردوں گا ان کے قلوب پر۔ اُمیدوں میں لگے رہیں گے، موت کا دھیان بھی نہیں ہوگا، نظام دنیا چلتا رہے گا۔

بہرحال موت جہاں ''فزع اکبر'' ہے گھبرا دینے والی چیز ہے۔ وہاں آبادکاری کا بھی ذریعہ ہے اگر موت نہ ہوتی تو اس زمین پر آبادکاری ممکن نہ ہوتی۔ تو مسافروں کی طرح آتے ہیں انسان اور چلے جاتے ہیں۔ جگہ خالی کردیتے ہیں۔

موت دنیوی تحفہ بھی ہے...... اور اگر دنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی موت ایک عجیب نعمت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''الموت تحفة المؤمن'' ① ''موت سب سے بڑا تحفہ ہے مومن کے لئے'' اس سے بڑھ کر

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: والدرھم والدینار مع المنافع وھما زادہ الی النار، ورواہ عن عائشۃ بلفظ: الموت غنیمۃ والمعصیۃ مصیبۃ والفقر راحۃ. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰.

اللہ کی طرف سے کوئی نعمت نہیں دی گئی اور کیوں ہے وہ تحفہ؟ اس کی وجہ بھی حدیث میں ہے: ''اَلْمَوْتُ جَسَرٌ یَصِلُ الْحَبِیْبِ اِلَی الْحَبِیْبِ'' ''موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے حبیب سے جاملتا ہے''۔ تو محبوب حقیقی سے مل جانا، یہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے؟ یہ کوئی مصیبت ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہوئی۔ بندہ اپنے خدا سے جاملے تو جس طرح کسی بندے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں، میں کہتا ہوں موت بھی خوشی کی چیز ہے۔ (اس پر بھی خوشیاں منانے کا اہتمام ہوا کرے) مگر لوگ تو یوں کہیں گے کہ یہ تو بالکل الٹی بات ہے، عقل کے بالکل خلاف، لوگ رونے لگتے ہیں خوشی کیسے منائیں گے؟

میں کہتا ہوں وہ رنج موت پر نہیں، وہ فراق پر رنج ہوتا ہے۔ موت کی خوشی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے خدا سے جا ملا۔ اسی لئے کہا کرتے ہیں کہ کسی کی اگر اچھی موت ہو کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت خوشی کی چیز نہ ہوتی تو کیوں کہتے لوگ؟

معلوم ہوا موت گھبرانے کی چیز نہیں ہے، جو روتے ہیں، وہ موت پر نہیں روتے۔ جدائی پر روتے ہیں کہ ایک نعمت ہم سے چھن گئی۔ ایک چیز ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ تو صدمہ فراق پر ہے موت پر نہیں موت خوشی کی چیز ہے۔ اس لئے کہ یہ مصیبت تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے اللہ سے جاملے۔ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ بندہ محبوب حقیقی تک پہنچ گیا۔

موت کی تمنا کرنا علامت ولایت ہے...... اسی واسطے موت کی تمنا یہ فی الحقیقت ولایت کی علامت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم اولیاء اللہ ہیں، تو قرآن نے دعویٰ کیا کہ:

﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ① تو خود موت کی تمنا بھی ایک نعمت ہے۔ اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے۔ ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُکَ'' ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے نبی ہونے کا قائل ہے''۔ اس لئے کہ موت ہی واسطہ ہے اللہ تک پہنچنے کا، موت نہ ہو تو بندہ اللہ تک کیسے پہنچے؟ تو موت ذریعہ ہے وصول الی اللہ کا۔ اس لئے موت تحفہ بھی ہے، نعمت بھی ہے اور واسطہ بھی ہے بندہ کا اللہ سے۔ اس لئے فرمایا کہ: موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے۔

اولیاء اللہ رات دن موت کی تمنا میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان پر تو یہ رہتا ہے:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم	راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بردیم
نذر کردم کہ اگر آید بسر زیں غم روزے	تا در میکدہ، شاداں وغزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو ہم چھوڑیں گے، اور شہر مطلوب میں پہنچیں گے، جہاں اللہ سے ہمارا رابطہ قائم ہوگا۔ خدا کرے کہ وہ ساعت جلد آئے تو اولیاء اللہ کے دل میں تو (موت کی) تڑپ رہتی ہے۔

① پارہ: ۲۸، سورة الجمعة، الآية: ٦.

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھوپالی نقشبندی خاندان میں سے ہیں اور ہمارے عزیزوں میں سے تھے، ان سے بہت فیضان اور (مخلوق کو) فائدہ ہوا۔ مرض وفات جب شروع ہوا، اور موت بالکل قریب آئی تو لوگوں نے جا کر تسلی دی کہ حضرت فکر نہ کریں، ان شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ غصہ آ گیا مولانا کو فرمایا:۔

''عمر بھر اس وقت کی تمنا میں تھے اور تم اس کو ہٹانے آئے ہو، خدا خدا کر کے وقت آیا کہ موت قریب آئی اور تم موت سے تسلی دیتے ہو کہ اور زندہ رہوں۔ خبردار اس کے بعد یہ جملہ نہ کہیو، دعاء کرو حسن خاتمہ ہو جائے۔ تسلیاں مت دو کہ میری عمر زیادہ ہو۔ عمر بھر میں اس وقت کی تمنا میں تھا۔ وقت آیا تو تم ہٹانے آ گئے۔''

طالب علمانہ شبہ...... یہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی طالب علم، طالب علمانہ طریق سے شبہ کرے کہ ایک حدیث میں تو موت کی تمنا کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ: ''لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُ کُمُ الْمَوْتَ ''① ''دیکھو تم میں کوئی موت کی تمنا نہ کرے'' یہاں تو فرمایا جا رہا ہے کہ موت کی تمنا نہ کرو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا دیتے ہیں کہ موت کی محبت ہر قلب مسلم میں ڈال دی جائے تو بظاہر تعارض ہے۔

جواب...... میں کہتا ہوں تعارض نہیں ہے جس حدیث میں فرمایا گیا کہ ''دیکھو موت کی تمنا نہ کرو'' اسی روایت میں یہ لفظ بھی ہیں۔ ''بِضُرٍّ نَزَلَ بِہٖ'' ''موت کی تمنا مت کرو دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر بیماری سخت ہو گئی کہ موت کیوں نہیں آ جاتی؟ افلاس بڑھ گیا، تمنا کرو، اس کی ممانعت ہے کہ دنیا کے مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا مت کرو، یہ بے اعتمادی ہے حق تعالیٰ پر اور یہ بندگی کے خلاف ہے۔ باقی اللہ سے ملاقات کے شوق میں تمنا کرنا یہ ولایت کی علامت ہے تو ہر ولی کامل دل میں شوق رکھے گا اللہ سے ملاقات کا، اور چاہے گا کہ جلد اللہ تک پہنچ جاؤں۔ بہر حال موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے وہاں ایک عظیم تحفہ اور نعمت بھی ہے۔

موت چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے...... میں کہتا ہوں کہ: اس لحاظ سے بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ اگر قیامت تک سارے بڑے بیٹھے رہا کرتے تو چھوٹوں کے جوہر کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ چھوٹوں کا نہ علم سامنے آتا نہ کمال مگر بڑوں کا کمال سامنے رہتا، سب اسی میں لگے رہتے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں تشریف رکھتے تو صحابہؓ کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اطاعت اور اطاعت گزاری میں رہتے، مستقل ہو کر آگے آ کر اپنی طبیعت اور قلب کے جوہر نہ دکھلاتے۔ نہ صدیق اکبرؓ کے جوہر کھلتے نہ فاروق اعظمؓ کے جوہر کھلتے۔ یہ جبھی ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، اور یہ قائم مقام بنے، قائم مقامی کا کام انجام دیا، اس میں تمام جوہر کھلے۔ تو میں کہتا ہوں کہ: اس لحاظ سے بھی موت نعمت ہے کہ چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔

اگر آج مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں ہیں۔ بے شک غم کی چیز ہے لیکن ان کے خلف صالح موجود ہیں۔ ان کی ذریت صالح موجود ہے، ان کے تلامذہ موجود ہیں جو اس کام کو جاری رکھیں گے اور ان کی طبیعت میں

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب کراھیۃ تمنی الموت... ج:۱۳ ص:۱۷۸.

جو جوہر موجود ہیں وہ کھلیں گے۔ اگر مولانا ہی رہتے تو یہ چیزیں کبھی نہ کھلتیں۔ تو یہ بھی ایک فائدہ کی چیز ہے۔ اگلوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے اگے دنیا کو آباد کریں گے، وہی کلمہ پہنچائیں گے۔

موت اصلاح وتربیت کے تعدد وتفنن کا ذریعہ ہے

موت نہ ہو تو نئی نسل کے دین سمجھنے میں دشواری پیش آتی، کیونکہ ہر زمانے کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہیں، ہر سو برس بعد نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں وعدہ کیا گیا: ''اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِأۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔'' ① ''ہر قرن پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جاہلانہ طریق پر جو لوگ تاویلیں کر کے دین میں خلط پیدا کر دیں گے۔ اللہ سو برس کے بعد پھر مجدد پیدا کر دیں گے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا، پھر دین کو نکھار دے گا۔ اس لیے کہ سو برس میں ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر آئندہ آنے والی نسل کے نظریات الگ ہوتے ہیں، افکار الگ ہوتے ہیں، نفسیات الگ ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ اسی دور کے اہل علم اپنی نفسیات میں ان کو دین سمجھانے والے ہوں۔ پرانے لوگ اگر ہوتے تو اپنی نفسیات میں سمجھاتے تو وہ لوگ دین کو نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے اللہ نے موت کو رکھا تا کہ نئے لوگ جب آئیں تو نئے مجدد بھی پیدا ہوں، اسی زمانے کی اصطلاح میں، اسی زبان میں، اسی ڈھنگ سے دین کو پیش کریں اور سمجھائیں، تو موت اس لحاظ سے بھی بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے کہ وہ ذریعہ ہے تربیت اور اصلاح کے تفنن اور تعدد کا، تا کہ مختلف الوان سے تربیت خداوندی میں داخل ہوں۔

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علماء وقت نے اسلام پیش کیا......ایک زمانہ تھا کہ روایت کا غلبہ تھا۔ عوام میں سے کوئی اس وقت تک دین کی بات نہیں مانتا تھا جب تک کہ سند پڑھ کر کوئی حدیث نہ سنا دی جائے۔ تو یہ روایت کا دور تھا، روایتی طور پر دین کو قائم کیا جاتا تھا جب تک کہ عقل کے پیرائے میں نہ سمجھائیں تو ایسے علماء اللہ نے کھڑے کئے۔ امام رازیؒ، امام غزالی کہ انہیں کی زبان میں دین سمجھایا، ان کو تائب کیا، پھر ایک زمانہ تصوف پسندی کا آیا، جب تک صوفیانہ رنگ میں کوئی نہ سمجھائے، لوگ نہیں سمجھتے تھے، تو اللہ نے ایسے صوفیائے کرام کھڑے کئے کہ ہر مسئلہ کو صوفیانہ رنگ میں ڈھالتے کہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔

آج حسیات کا دور ہے فلسفۂ قدیم کا دور ختم ہو گیا جو محض نظریاتی طور پر فلسفہ تھا۔ اب حسیات کا دور ہے، مشاہدات کا دور ہے، جب تک ایسے علماء نہ ہوں کہ مشاہدات کے انداز میں سائنس کے انداز میں حسّی مثالوں سے دین کو نہ سمجھائیں گے، لوگ نہیں سمجھیں گے، اگر بڑے ہی لوگ بیٹھے رہتے، آج کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے تو دین نہ سمجھا سکتے۔ اللہ نے انہیں اٹھالیا، ان کے خلف صالح پیدا کر دیئے کہ وہ اس دور کے مطابق اسی رنگ میں سمجھائیں، تو بہر حال موت جیسے فزع اکبر ہے، جیسے عظیم ترین مصیبت ہے، ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے،

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائۃ، ج: ۱۱ ص: ۳۶۲۔

عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا، بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے، راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا، اور نئے نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا، اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے، اس کی تمنا بھی دل میں رکھے، تو اس لئے میں نے عرض کیا کہ لوگ موت کو ہر وقت وحشت ناک سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ وحشت کی چیز نہیں ہے اگر تعلق مع اللہ مضبوط ہے تو اس سے بڑھ کر نعمت کوئی چیز نہیں اگر غفلت ہے تو بے شک موت عظیم ترین مصیبت بھی ہے، اسی واسطے وہ کفار کے حق میں مصیبت ہے، مومن کے حق میں مصیبت نہیں۔

کافر کی تمنا......اور فرمایا کہ: کافر تمنا کرتا ہے کہ زندگی بڑھتی ہی رہے۔ ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ. وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ.﴾ ① "تم ان کفار کو دیکھو گے کہ سب سے زیادہ حریص ہیں دنیا کی زندگی پر موت کے نام سے بھی موت آتی ہے انہیں اور مشرکین کو اگر ہم ہزار برس کی عمر بھی دے دیں تو اسی کی تمنا کریں گے کہ ایک ہزار برس اور ہو" یہ حال اور خاصہ کفار کا ہے، اور مومن کا یہ ہے کہ بس عمر ہو جائے تو اکتا جاتا ہے کہ اللہ جلد ہی بلا لیجئے کہ آپ سے مل لوں۔

تو بالکل برعکس ہے قصہ، تو موت سے فقط ڈرتے رہنا، گھبراتے رہنا غفلت کی علامت ہے، اور یہ غفلت (عن الحق) کفر کا سرا ہے اللہ بچائے ہر ایک کو، اور حق تعالیٰ سے موت کی تمنا کرنا یہ بیداری اور تعلق مع اللہ کی علامت ہے۔ اس لئے موت کا ایک ہی پہلو نہیں کہ آدمی رنج کرتا رہے بلکہ رنج کرنے سے روکا بھی ہے۔ طبعی رنج جتنا ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اس رنج کو پالنا، تازہ کرتے رہنا، اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا اور فرمایا: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ" ② "وہ ہم میں سے نہیں ہے جو موت کے غم میں بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، چھاتی پیٹ ڈالے" اس لئے کہ موت آتی ہے بیدار کرنے کے لیے نہ کہ غافل بنانے کے لئے، کہ آدمی اسی میں الجھ کر رہ جائے، موت آئی، "اناللہ" پڑھا، اس کے بعد مرنے والے کے عمل کو جاری کیا۔ اپنے عمل کو جاری کیا، اپنی تیاری شروع کر دی، تو موت بیداری پیدا کرنے والی چیز ہے نہ کہ غافل بنانے والی۔ بیداری جس سے پیدا ہو وہ تو نعمت ہے، مصیبت تھوڑا ہی ہے، مصیبت بنتی ہے اس کے لئے جس پر غفلت طاری ہو۔

غفلت عن الحق کے بُرے آثار......غافل عن الحق کو موت کے نام سے بھی موت آتی ہے، جو اللہ سے غافل ہو موت کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرے گا، ہر وقت اسی موڑ میں رہے گا۔ پھر اس میں سرکشی تمرد اور بغاوت پیدا ہوگی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ فرعون کی عمر چار سو برس کی ہوئی، اس عمر میں کبھی بھی بیمار نہیں ہوا، کبھی بھی کوئی مصیبت

---

① پارہ: ۱، سورة البقرہ، الآیة: ۹۶۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب لیس منامن ضرب الخدود ج: ۵ ص: ۱۷۵۔

نہیں دیکھی، تو کبر اور نخوت میں اپنے آپے سے باہر ہو گیا، اور کہا: انا ربکم الاعلی ۔یعنی میں سب سے بڑا رب ہوں، اور موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر و تذلیل کے در پے ہو، اور کہا:

﴿اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ.﴾ ① ......کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے پاؤں کے نیچے نہریں جاری ہیں، مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ کرسیاں میری مضبوط ہیں اور میرے مخالفین کو تم عزت دار سمجھتے ہو جس کے کپڑے بھی ٹھیک نہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام، تو توہین کے در پے ہوا۔

یہ کیوں ہوا تو ہین کے در پے۔ اس لئے کہ غفلت تھی اللہ سے، تو غفلت والے کو موت کے نام سے موت آتی ہے۔ اور (فرعون کی) جب واقعی موت آنے لگی اور لگا ڈوبنے تو بآواز بلند کہا۔ میں ایمان لایا موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کے پروردگار پر، جس کو فرمایا گیا:

﴿آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ ② ......"اب ایمان لایا جب کہ عالم غیب منکشف ہو گیا۔ اور اب تک دنیا میں فساد برپا کرتا رہا۔"

بعض روایات میں ہے کہ جبریل علیہ السلام اس کے منہ میں ریت ٹھوس رہے تھے کہ ایسا نہ ہو یہ ایسے کلمات کہے، کہیں نجات ہی نہ ہو جائے۔ بدبخت بخشا نہ جائے۔ ساری عمر تو مخلوقِ خدا کو پریشان کیا اور اب نجات پا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ علیہم السلام پر غلبہ حال کا ہوتا ہے غلبۂ محبت کا یا غلبہ عداوت کا۔ بہر حال جب غفلت طاری رہتی ہے، اللہ سے بری رہتا ہے۔ جب بری رہے گا، موت کو ناپسند کرے گا، اور اگر غفلت کی بجائے بیداری اور قلب میں ذکر اللہ ہے تو اللہ سے قریب ہوگا اور موت کی تمنا بھی کرے گا اور وہ ذریعہ بنے گا قربِ خداوندی کا۔ تو موت کا جہاں پہلو غم کا ہے وہاں خوشی کا بھی ہے، جہاں دل بیٹھنے کا ذریعہ ہے وہاں دل کے ابھرنے کا بھی ذریعہ ہے اس واسطے دونوں پہلوؤں کی موت کے اندر رعایت رکھنی چاہئے۔ کوئی میت ہو گئی تو یہ نہیں کہ آدمی غم میں ڈوب کر آپے سے باہر نکل جائے۔ عقل سے بھی کام لے، جو اس کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔

میت پر جزع فزع ......اگر غم میں بیٹھ کر آدمی نے بین کرنا شروع کیا تو میت کو کیا فائدہ پہنچا، بلکہ میت کو تکلیف پہنچتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَآءِ اَهْلِهٖ عَلَیْهِ." ③ "جب بین کر کے لوگ روتے ہیں تو میت کو تکلیف پہنچتی ہے" اور ایذا پہنچتی ہے یوں کر کے رویا جائے کہ واجبلاه ہائے تو تو پہاڑ تھا، تو ملائکہ چوکہ لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ تھے؟ وہ کہتے ہیں واشمساه کہ تو تو سورج تھا، ملائکہ چھبوتے ہیں کہ کیا واقعی آپ سورج تھے؟ اس سے اذیت پہنچتی ہے میت کو۔ تو رونا، بکا، نوحہ، جزع، فزع یہ میت کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

① پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآیة: ۵۱-۵۲. ② پارہ: ۱۱، سورة یونس، الآیة: ۹۱.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ یعذب المیت.... ج:۵ ص:۳۰.

اسی واسطے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ: میت ہونے پر پہلا کام تو یہ ہے کہ صبر کرو اور انا اللہ پڑھو۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو، تو وہ رونے سے نہیں پہنچتا، ثواب پہنچانے سے پہنچتا ہے۔ جس کے لئے ایصالِ ثواب ہوگا اس کے لئے باعث خیر و برکت ہوگا۔ تو میت کے لئے ہمیں نافع ہونا چاہئے اور میت کا نام آئے تو اس کے لئے فائدہ کا سامان پہنچانا چاہئے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اُذْکُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ''۔ اپنے مرنے والوں کی خوبیاں یاد کرو اور لوگوں کے سامنے بیان کرو، مرنے والوں کی برائیاں مت ذکر کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اگر اللہ نے بخش دیا ہے، تم اگر برائیاں کرتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تمہاری زبان گندی ہوگی، وہ تو مغفور ہوگیا۔ جتنا ممکن ہو خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر کرو۔ تاکہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ بہر حال میت ہونے کے بعد دوسرا کام یہی ہے کہ طبعی رنج ہوتا ہے۔ اس سے اللہ نے نہیں روکا۔ لیکن عقلاً روک دیا ہے کہ غم کو پالنے کے لئے مت بڑھاؤ۔

میت پر ضرورت سے زیادہ غم کرنا رسمی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ وہ رسمی غم ہوتا ہے جس کا زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا، کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تو وصیت کر کے جاتا تھا کہ مجھے چھ مہینے رویا جائے، مجھے برس تک رویا جائے تو باندیاں کرائے پر رکھتے کہ انہیں رونے کی مشق ہوتی ہے، جہاں گردن جھکائی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوگئے۔ تو کرایہ پر جہاں رونے والی رکھی جاتی ہوں، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا، یا کوئی نیا آدمی آیا وہاں انہوں نے گھیرا بنایا اور ہاہا شروع کی کہ واجبلاہ۔ واشمساہ واقمراہ۔ ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا وغیرہ، بیٹھی رو رہی ہیں۔ تو راہگیر کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی مرگیا ہے، جو چھ مہینے گزر گئے اور اب تک رویا جارہا ہے، تو یہ علامت تھی بڑے ہونے کی۔

ظاہر بات ہے کہ یہ رونا کوئی حقیقی رونا تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو رسمی اور بناوٹی رونا تھا۔ اسلام نے تصنع اور بناوٹ نہیں سکھلائی۔ حقیقت بتلائی ہے، کہ محض تصنع اور بناوٹ سے کوئی کام کرنا کوئی حقیقیت نہیں رکھتا۔ طبعی غم ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن عقلی طور پر غم کو پالنا اور بڑھاتے رہنا زمانۂ جاہلیت کی رسم تھی۔ اسلام نے یہ رسم نہیں رکھی۔ اس نے تو یہ سیدھی بات بتلادی کہ جب کوئی انتقال کرے تو صبر جس سے آئے وہ پڑھو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آیت استرجاع میں عقلاً وطبعاً صبر کی تعلیم ہے......اس آیت میں صبر اور تسلی کا پورا سامان موجود ہے۔ جب آدمی نے یوں کہا: انا اللہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔ اس سے عقلی طور پر صبر آگیا کہ جب ہم اللہ کی ملک ہیں تو اپنی مملوک میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔ چاہے اٹھائے، چاہے دنیا میں زندہ رکھے۔ ہم کون ہیں اس میں دخل دینے والے؟ اس سے صبر آجائے گا عقلی طور پر کہ ہم مملوک ہیں اور مالک کو اختیار ہے، اپنی مملوک میں جو چاہے کرے۔ مگر طبعاً ابھی تک گھٹن موجود تھی، طبعی رنج بھی ہوا تھا، تو دوسرے جملے میں اس کا علاج بتلایا فرمایا: وانا الیہ راجعون۔ کہ جب ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ملاقات ہوجائے گی۔ ہمیشہ کے لئے تھوڑا ہی جدائی ہوتی ہے، تو انا اللہ کے لفظ سے عقلاً اور انا الیہ راجعون سے طبعاً بھی صبر آجاتا ہے۔ دعاء اس لئے بتلائی گئی تاکہ صبر تحمل کے ساتھ اپنے عمل میں لگیں، فکر

آخرت میں لگیں، غم میں نہ گھلیں بیٹھ کر...... فارسی میں عرفی کا ایک شعر جس کا ترجمہ یہ ہے) اگر رونے سے مرنے والا واپس آجایا کرتا تو ہم ہزار برس رولیا کرتے، مگر وہ واپس آنے والا نہیں ہے۔ جو گیا سو گیا۔ اب اس جہان میں دوبارہ آنے والا نہیں ہے اب ملاقات ہوگی تو اس جہان میں ہوگی۔ یہ جہان بھی ختم ہو جائے گا۔

مومن اور کافر کی موت کا موازنہ...... مؤمن کو تو ہر وقت آس لگی ہوتی ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملوں گا، دوستوں سے ملوں گا اور فلاں فلاں سے ملاقات ہوگی۔ کافر جس نے ساری زندگی اسی دنیا کو سمجھا ہے، مایوس وہ ہے مسلمان نہیں۔ اس لئے کہ اسے کوئی تمنا نہیں ہے تو بہر حال اسی حکم (اناللہ وانا الیہ راجعون) سے صبر آجاتی ہے۔

تو میں نے عرض کیا تھا کہ: اس وقت نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی وعظ کہنا مقصود تھا، نہ کوئی تقریب مقصود تھی، تعزیت مقصود تھی، اور تعزیت ہنگاموں کو نہیں چاہتی، یہ ہمارے مولانا (محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان) نے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ آپ لوگوں کو تکلیف دی۔ میں تعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا تو تعزیت کر کے واپس ہو جاتا۔ لیکن خیر بہر حال جب آپ حضرات تشریف لے آئے اور آپ کا کرم ہوا اور ہماری سعادت ہوئی کہ اتنے بھائیوں کی زیارت نصیب ہوگئی، اتنے بھائیوں سے ملنا ہو گیا۔ تو مجمع کی ہیئت ایسی بن گئی کہ آپ سامنے بیٹھ گئے، مجھے اس کرسی پر بٹھلا دیا، اور سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا، تو خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہیئت مقتضی ہوئی، کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس لئے میں نے وہی چند کلمے کہے جو آپکے مقصد سے متعلق تھے اور وہ مقصد تھا تعزیت۔ تو تعزیت ہی کے سلسلے میں کچھ موت کا ذکر، کچھ موت کے پہلوؤں کا ذکر، کچھ مولانا (خیر محمد صاحب) مرحوم کی خیر و خوبی کا ذکر، کچھ ان کے پس ماندگان کا ذکر، اور ان کے خلفاء کا ذکر، یہی چیزیں تعزیت میں آسکتی تھیں اس لئے چند جملے عرض کئے گئے، حق تعالیٰ شانہ صبر کی توفیق دے اور مولانا مرحوم کا نعم البدل ہمیں زیادہ سے زیادہ عطا فرماوے، اور ان کا جو کام تھا حق تعالیٰ اس کو جاری و ساری رکھے۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ضروری نوٹ...... ہمارے ہاں یہ بات ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکی ہے کہ ہر نو وارد سے مصافحہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس میں دوسرے کی راحت کا خیال پیش نظر نہیں رکھا جاتا، حالانکہ نظم وضبط مسلمان کا امتیازی نشان تھا۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی تقریر فرما چکے تو ایک اژدہام اسٹیج کی طرف اُمڈ آیا، اور مصافحہ کی کوشش میں ادب واحترام اور ایذاء مسلم کا بھی بالکل پاس نہ رہا، بلکہ ایک دھینگا مشتی کا عالم تھا جو نہایت قابل افسوس تھا، اور خصوصاً ایسے مجمع میں جہاں علماء کرام اور مدارسِ عربیہ کے طلباء کرام کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن بایں ہمہ وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کم از کم دینی تعلیم یافتہ اصحاب سے نہ تھی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی نے مجمع کی اس پراگندہ حالت کو دیکھ کر نظم وضبط کی تعلیم فرمائی۔ اس کے باوجود حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کو اسٹیج سے اپنی رہائش تک رسائی میں انتہائی وقت اور دشواری پیش آئی۔ جلسہ کے منتظمین مجمع عام ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معذور تھے۔

یہ چند کلمات بھی جو کہ ہمارے قومی مزاج کی اصلاح کے لئے آپ نے ارشاد فرمائے تھے، ذیل میں رقم کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو عمل کی توفیق بخشے۔ (از مرتب غفرلہ)

بحیثیت مسلمان ہونے کے آداب شرعیہ اختیار کریں۔ آپ کے اندر نظم وضبط ہونا چاہئے۔ مصافحہ باعث برکت چیز ہے اور بہت خیر کی چیز ہے۔ اس پر اجر کے وعدے کئے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ دو مسلمان جب مصافحہ کرتے ہیں، اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجائے تو ہاتھ جدا نہیں کر پاتے کہ دونوں کے گناہوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ تو مصافحہ بڑی باعث برکت چیز ہے مگر ہر اطاعت کے اندر یہ شرط ہے کہ دوسرے کو اذیت نہ پہنچے، تکلیف کا سامان نہ ہو، ایذاء رسانی حرام ہے اور مصافحہ کرنا فرض نہیں۔ ایک مستحب کے لئے ایک مکروہ چیز کا ارتکاب کرے یہ غلط بات ہے۔ لوگ جو مصافحہ کے لئے دوڑتے ہیں، یہ طریقہ آدابِ اسلامیہ کا نہیں ہے۔ اسے بالکل ترک کر دیا جائے اور پھر اس طریق سے ہاتھا دھاپی، جس سے مصافحہ کرتے ہیں وہ بھی عاجز آجاتے ہیں۔ یہاں ہم پاکستان میں عاجز ہوتے، تو قاعدے سے تو ہم پولیس کی حراست میں تھے اور ان کی نگرانی میں تھے اور اب قوم کی حراست میں ہو گئے کہ جب تک حلقہ نہ بنے بھگدڑ نہیں کی جا سکتی۔ یہ کیا واہیات بات ہے؟ یہ مصافحہ ہے؟ یہ تو ایذاء پہنچانا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کی تکلیف نہ کریں۔ جب میں اٹھوں تو راستہ دے دیں۔ یہ مصافحہ خیر و برکت نہیں ہوگا جس میں اذیت پہنچے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے۔ ’’اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ‘‘ ۔ ① مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو یہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانا ہے۔

آپ حج کو جاتے ہیں۔ حجرِ اسود کا بوسہ یا تو مستحب ہے یا واجبات میں سے ہے، مگر جب دوسرے کو تکلیف پہنچے تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کو چوم لے، یہ مصافحہ ہو گیا۔ ہاتھ بھی نہ اٹھا سکو تو لکڑی سے اشارہ کرو یہ کافی ہو گیا۔ وہاں تو مصافحہ واجب تھا، اس کے لئے بدل رکھا اور یہاں تو واجب بھی نہیں ہے۔ اس واسطے خواہ مخواہ دوسروں کو اذیت پہنچانا، آپا دھاپی اختیار کرنا، اجر تو اجر، اس پر تو وبال ہوگا۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کا ارادہ نہ کریں۔ اور میں ویسے بھی کمزور ہوں، ضعیف اور بیمار ہوں، خود کو تحمل نہیں کہ ایک ہزار آدمیوں سے مصافحہ کروں۔ ہر ایک تو ایک دفعہ کرے گا، مجھے ایک ہزار مرتبہ ہاتھ اٹھانے پڑیں گے۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا بیٹھیں رہیں اور جب اٹھوں تو راستہ دے دیجئے۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون، ج: ١ ص: ٦.

معرفت باری تعالیٰ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْــدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ.بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ﴾ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (1)

بجواب سپاس...... بزرگان محترم! ابھی آپ حضرات کے سامنے میرے ایک محترم بھائی نے دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے بزرگوں کی نسبت، نیز خود میرے متعلق جو کلمات ارشاد فرمائے (اس کے بارے میں عرض ہے کہ)۔ جہاں تک دارالعلوم اور اس کے بزرگوں کا تعلق ہے، یہاں تک یہ کلمات بالکل صحیح اور حق ہیں۔ دارالعلوم بھی بڑی جگہ ہے، اور وہاں کے اکابر و اساتذہ بھی بڑے لوگ ہیں، بڑے ہی تھے، بڑے ہی اب بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک انہوں نے میرے متعلق فرمایا یہ ان کا ایک حسن ظن اور نیک گمان ہے۔ خود میرے اندر کوئی ایسی اہلیت و صلاحیت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ان بزرگوں کے جیسے یہ لوگ خوشہ چین اور وہاں کے فاضل ہیں، اسی طرح کا میں بھی وہاں کا ایک فاضل اور خوشہ چین ہوں۔

دارالعلوم کی ترقی غیبی قوت کی مرہون منت ہے...... جہاں تک دارالعلوم کی ترقیات کا تعلق ہے تو اس پینتیس سالہ خدمت کے دوران ہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ دارالعلوم کو چلانے والی کوئی غیبی طاقت ہے۔ یہ محض ایک تہمت ہے کہ فلاں مہتمم ہے۔ اس نے کوئی خدمت کی یا ترقی دی۔ یہ محض ایک راستہ اور وسیلہ کی بات ہے۔ ورنہ اس دارالعلوم کو بنانے اور چلانے والی ایک غیبی طاقت ہے، تہمت کے طور پر نام آ جاتا ہے کہ فلاں مہتمم یا منتظم ہے۔ اس نے یہ کیا اور وہ کیا۔ حالانکہ اس سے جو کچھ واقع ہوا، وہ سبھی کچھ من جانب اللہ ہے۔

(1) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷-۲۸.

کارِ زلف تست مشک افشانی اماعاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے توبستہ اند

فارسی کا شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے اور حقیقتاً محبوب حقیقی حق تعالیٰ ہیں۔ کہ ''تیری زلفوں کا اثر ہے کہ مشک میں سیاہی بھی اور خوشبو بھی پیدا ہوگئی۔ تہمت کے طور پر نام رکھ دیا گیا۔ کہ مشک ہرن کے اندر پیدا ہوتا ہے''۔ ہرن بے چاری کی کیا مجال تھی کہ مشک پیدا کرے۔ اس کے اندر خون بھرا ہوا تھا۔ خون جما کر سیاہ کر کے خوشبو پیدا کر دینا، اے اللہ! یہ تیرا کام ہے۔ ہرن کا کام نہیں ہے۔ نام ہرن کا لگ گیا کہ اس میں خون جم کر مشک بن گیا۔ بنانے والا تو ہے۔ ہرن بنانے والا نہیں ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ میرے اندر کوئی خون بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی اسے پتہ نہیں کہ خون میں خوشبو کس طرح پیدا کی جارہی ہے۔ جب ہرن سے خوشبو نکلی، لوگوں نے کہہ دیا، ہرن میں سے خوشبو نکلی، حالانکہ ہرن بے چارے کو خبر بھی نہیں ہے کہ کہاں سے خون آیا ہے؟ کس طرح سیاہ ہوا؟ کس طرح اس میں خوشبو پیدا ہوئی؟

تو کہنے والے نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی مہتمم ہے۔ اس کے زمانے میں ترقی ہوئی۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کس طرح ترقی ہوئی۔ کس طرح سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔ یہ محض ایک غیبی طاقت ہے جو چلا رہی ہے۔ یہ تہمت کی بات ہے کہ فلاں نے ایسا کیا۔

حقیقت میں ایسے مخلص بزرگوں نے اس کی بنیاد رکھی کہ ان کے اخلاص کی برکت سے آج تک دارالعلوم چل رہا ہے۔ تہمت ہم پر آرہی ہے۔ بلکہ ہماری برائی دارالعلوم کے سائے کے اندر دبی ہوئی ہے۔ اصل خیر اس کی ہے۔ چلانے والے نے اس زور سے پہیئے کو لڑھکایا تھا کہ وہ آج تک لڑھکتا ہوا چلا جارہا ہے۔ ہمارا کام اس کو چلانا نہیں ہے۔ ہم تو خود اس کے ساتھ لگے ہوئے اپنا کام بنارہے ہیں۔ ہمیں دین اور علم حاصل ہورہا ہے۔ یہ دارالعلوم کا طفیل ہے، نہ کہ دارالعلوم کو ہم بنارہے ہیں اور نہ اسے چلارہے ہیں۔ اس کو چلانے والے نے ترقی دی ہے وہ غیبی طاقت ہے، جو چلا رہی ہے اور ان اہل اللہ کی برکتیں، جنہوں نے اخلاص پر اس کی بنیاد قائم کی، وہ چلا رہی ہیں۔

دارالعلوم کی روح معرفت خداوندی ہے...... کس طرح سے انہوں نے بنیاد قائم کی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عارف باللہ تھے۔ اللہ کی معرفت، اس کے کمالات کا جاننا اور اس کی پہچان ان کے قلوب کے اندر تھی۔ اس معرفت اور پہچان کا ثمرہ تھا کہ انہوں نے دارالعلوم کو قائم کیا اور ان کی برکت سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔ تو دارالعلوم کی اصل روح معرفت خداوندی ہے جس کے وہ لوگ حامل تھے جو ان کے اندر موجود تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''رَاْسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللّٰهِ'' ''سب سے بڑا علم اللہ کی پہچان ہے''۔

آپ پہاڑوں اور زمین کو پہچان لیں، اپنے گھر کو پہچان لیں، دنیا کے مور، تیتر کو پہچان لیں تو عارف نہیں کہا جائے گا۔ اگر اللہ کی ذات وصفات کو پہچان لیں تو آپ کو عارف کامل اور عالم کہا جائے گا۔ یہ بزرگ عارف باللہ تھے۔ انہیں اللہ کی شان جلال و جمال کی پہچان تھی۔ اس کی برکت تھی جو اتنا بڑا کام کر گئے کہ آج مشرق ومغرب

میں اس کا فیض پہنچ رہا ہے۔ ساؤتھ افریقہ، ہندوستان سے آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں بھی ان کے نام لیوا موجود ہیں۔ ان کی برکت کا ظہور ہے اوران کی برکت معرفت الٰہی کے تابع تھی۔ اس لئے اصل بنیادی چیز جو دارالعلوم کو چلا رہی ہے وہ معرفت خداوندی ہے۔ غرض سب سے بڑا علم عالم میں اللہ کی پہچان ہے اس کے لئے قرآن اترا، اسی کے لئے حدیثیں آئیں اسی کے لئے علماء کی جدوجہد ہے کہ اللہ کی پہچان حاصل ہو جائے۔

انسان خدا کو دلائل سے نہیں فطرت کے دباؤ سے مانتا ہے..... حق تعالیٰ کو پہچاننے کے طریقے قرآن کریم میں بیسیوں ذکر کئے گئے ہیں۔ لیکن سارے طریقوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کی کچھ نشانیاں انسان کے اندر موجود ہیں، کچھ نشانیاں کائنات میں باہر موجود ہیں۔ جو ان کو پہچان لیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ تعمیر کو دیکھ کر معمار پہچانا جاتا ہے۔ لکھے ہوئے کو دیکھ کر لکھنے والا پہچانا جاتا ہے۔ شعر کو دیکھ کر شاعر کی پہچان ہو جاتی ہے۔ تو اتنی بڑی کائنات اور اتنی بڑی نشانیاں، انہیں دیکھ کر خود اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بنانے والا کوئی بہت بڑا ہے اور بڑی عظیم الشان ذات ہے۔ جس نے اتنی بڑی کائنات بنا کر رکھ دی۔ یہ کائنات ازخود نہیں بنی۔ بلکہ ایک حکیم نے بنائی ہے جو اسے چلا رہا ہے۔ بہت سے دہریوں نے انکار کیا کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ کائنات ازخود بن گئی۔ یہ بالکل جہالت ہے اور فطرت کے خلاف ہے۔ دلیل سے آدمی اللہ کو نہیں پہچانتا۔ بلکہ دل پر ایک دباؤ ہے کہ مجبور ہو کر ماننا پڑتا ہے کہ ہے کوئی ذات۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں مہدی جو اموی خلیفہ تھا۔ اس کے دربار میں ایک دہریہ آیا، جو خدا کی ذات کا انکار کرتا تھا۔ اس نے کہا میں نہیں مانتا کہ خدا موجود ہے۔ یہ کائنات طبعی رفتار سے خود بنی ہے اور خود ہی چل رہی ہے، لوگ مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں وغیرہ۔ یہ سب ایک طبعی کارخانہ ہے۔ کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ یہ اس کا دعویٰ تھا اور اس نے چیلنج کیا کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اس کو میرے مقابلے میں لایا جائے۔ تاکہ میں اس سے بحث کروں، لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ اپنی طاقتوں کو خواہ مخواہ ایک غیبی طاقت کے تابع کر دیا ہے۔ جو سارے جہان کو چلا رہی ہے۔ تو اس کے زمانے میں سب سے بڑے عالم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ مہدی نے امام صاحبؒ کے پاس آدمی بھیجا۔ رات کا وقت تھا۔ رات ہی کو خلیفہ کا دربار منعقد ہوتا تھا۔ آدمی بھیجا کہ وہ آکر اس دہریے سے بحث کریں اور اسے سمجھائیں اور راہ راست پر لائیں۔

چنانچہ آدمی پہنچا بغداد میں ایک بہت بڑا دریا ہے اسے دجلہ کہتے ہیں۔ اس کے ایک جانب شاہی محلات تھے۔ ایک جانب شہر، امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ شہر میں رہتے تھے۔ اس لئے دریا پار کر کے آنا پڑتا تھا۔ اس آدمی نے کہا اصل میں دربار میں ایک دہریہ آگیا ہے اور وہ دعویٰ کر رہا ہے کہ خدا کا وجود نہیں ہے، کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ آپ کو مناظرہ کے لئے بلایا گیا ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا آپ جا کے کہہ دیں کہ میں آ رہا ہوں۔ وہ آدمی واپس گیا اور کہا امام صاحب کو میں نے خبر کر دی ہے اور آپ آنے والے ہیں۔

اب دربار لگا ہوا ہے، خلیفہ، امراء، وزراء بیٹھے ہوئے ہیں اور دہریہ بھی بیٹھا ہوا ہے۔ امام صاحب کا انتظار ہے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں آ رہے۔ رات کے بارہ بج گئے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ندارد۔ دہریے کی بن آئی، اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب ڈر گئے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ کوئی بڑا فلسفی آیا ہے۔ میں اس سے نمٹ نہیں سکوں گا، اس واسطے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے اور آپ یقین رکھیں وہ نہیں آئیں گے۔ میرے مقابلے میں کوئی نہیں آ سکتا۔ اب خلیفہ بھی متامل ہے۔ درباری بھی حیران ہیں اور دہریہ بیٹھا ہوا شیخی دکھا رہا ہے۔ جب رات کا ایک بجا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہنچے، دربار میں حاضر ہوئے خلیفۂ وقت نے تعظیم کی، جیسے علماء ربانی کی کی جاتی ہے۔ تمام دربار کھڑا ہو گیا۔ خلیفہ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ اتنی دیر میں کیوں آئے؟ آدمی رات کے آٹھ بجے بھیجا گیا تھا۔ اب رات کا ایک بجا ہے۔ آخر اتنی تاخیر کی کیا وجہ پیش آئی؟ شاہی حکم تھا۔ اس کی تعمیل جلد ہونی چاہئے تھی نہ یہ کہ اس میں اتنی دیر لگائی جائے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک عجیب وغریب حادثہ پیش آ گیا۔ جس کی وجہ سے مجھے دیر لگی اور عمر بھر میں میں نے ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کیسا قصہ پیش آیا۔ اس شدومد سے بیان کیا کہ سارا دربار حیران ہو گیا کہ کیا حادثہ پیش آ گیا فرمایا: بس عجیب وغریب ہی واقعہ تھا اور خود مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا قصہ تھا؟ جب سارے دربار کو خوب شوق دلایا اور سب سرتاپا شوق بن گئے۔ حتیٰ کہ خود امیر المومنین نے کہا کہ فرمائیے کیا قصہ پیش آیا؟ فرمایا: قصہ یہ پیش آیا جب میں شاہی محل میں اترنے کے لئے چلا ہوں تو دریا بیچ میں تھا دریا کے کنارے پر جو پہنچا تو اندھیری رات تھی، نہ کوئی ملاح تھا نہ کشتی تھی، آنے کا کوئی راستہ نہ تھا، میں حیران تھا کہ دریا کو کس طرح پار کروں۔ اس شش وپنج میں کھڑا تھا کہ میں نے یہ حادثہ دیکھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود لکڑی کے نہایت عمدہ بنے بنائے تختے نکلنے شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ میں تحیر سے دیکھ رہا تھا کہ یا اللہ! دریا میں سے موتی نکل سکتا ہے، مچھلی نکل سکتی ہے۔ مگر یہ بنے بنائے تختے کہاں سے آئے؟ ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ اس سے زیادہ عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ تختے خود بخود جڑنے شروع ہوئے۔ جڑتے جڑتے کشتی کی صورت ہو گئی میں نے کہا یا اللہ! یہ کس طرح سے کشتی بن گئی آخر انہیں کون جوڑ رہا ہے کہ اوپر نیچے خود بخود تختے لگے چلے جا رہے ہیں۔

ابھی میں اس حیرت میں تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے پیتل کی کیلیں نکلنی شروع ہوئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھکنے لگیں اور جڑ جڑا کے بہترین قسم کی کشتی بن گئی۔ میں حیرت میں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ تختے جو جڑے ہوئے تھے انکی درزوں سے پانی اندر گھس رہا تھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود ایک روغن نکلنا شروع ہوا اور ان درزوں میں وہ بھرنا شروع ہوا جس سے پانی اندر گھسنا بند ہو گیا۔

ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ وہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھنی شروع ہوئی۔ اور کنارے پر آ کر ایسے جھک

گئی، گویا مجھے سوار کرنا چاہتی ہے، میں بھی بیٹھ گیا وہ خود بخود چلی مجھے لے کر روانہ ہوگئی۔ دریا کی دھار پر پہنچی پانی ادھر کو جارہا تھا کشتی خود بخود ادھر کو جارہی تھی۔ کیونکہ شاہی محلات ادھر کو تھے۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ! آخر پانی کے بہاؤ کے خلاف کون اس کو لے جارہا ہے؟ یہاں تک کہ شاہی محل کے قریب کنارے پر پہنچ گئی اور آ کر جھک کر پھر کنارے پر کھڑی ہوگئی کہ میں اتر جاؤں، تو میں اتر گیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشتی غائب بھی ہوگئی۔ گھنٹہ بھر اس کنارے اور گھنٹہ بھر اس کنارے پر سوچتا رہا کہ یہ کیا قصہ تھا؟

یہ سانحہ تھا جس کی وجہ سے تحیر میں کئی گھنٹے لگ گئے اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا ماجرا تھا؟ اور میں امیر المومنین سے معافی چاہتا ہوں کہ آٹھ بجے بلایا گیا اور میں ایک بجے پہنچا ہوں۔ دہریے نے کہا، امام صاحب! میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ بڑے عالم ہیں، بڑے دانش مند اور فاضل آدمی ہیں۔ مگر بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ پانی میں سے خود بخود تختے نکل آئیں، خود ہی جڑنے لگیں، خود کیلیں ٹھک جائیں، خود ہی روغن لگ جائے، خود آکے کشتی اپنے آپ کو جھکا دے، آپ اس پر بیٹھ جائیں اور خود ہی لے کے چل دے، خود ہی وہ کنارے پر پہنچا دے۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے دانش مند، فاضل اور عالم ہیں۔ امام آپ کا لقب ہے اور باتیں کر رہے ہیں آپ نادانوں اور بچوں جیسی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں، خود بخود بن گئی، کوئی کیلیں ٹھونکنے والا نہیں، خود بخود ٹھک گئیں کوئی روغن بھرنے والا نہیں، خود ہی بھر گیا کوئی چلانے والا ملاح نہیں، خود ہی چل پڑی۔ کوئی سمجھانے والا نہیں، خود ہی سمجھ گئی کہ مجھے شاہی محل کے اوپر جانا ہے۔ یہ عقل میں آنے والی بات ہے؟

امام صاحب نے فرمایا اچھا! بات نادانی اور بے وقوفی کی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! فرمایا: ایک کشتی بغیر بنانے والے کے بن نہ سکے، بغیر چلانے والے کے چل نہ سکے، بغیر کیلیں ٹھونکنے والے کے اس کی کیلیں ٹھک نہ سکیں، اور یہ اتنا بڑا جہان جس کی چھت آسمان ہے، جس کا فرش زمین ہے، جس کی فضا میں لاکھوں جانور ہیں۔ یہ خود بخود بن گیا، خود ہی چل رہا ہے سورج بھی، چاند بھی خود ہی چل رہے ہیں۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ ایک معمولی کشتی جسے انسان بنا سکتا ہے۔ یہ تو بغیر بنانے والے کے نہ بنے اور اتنا بڑا جہان جو انسان کے بس میں نہیں وہ خود بخود بن جائے تو تمہاری عقل بچوں جیسی ہے یا میری عقل بچوں جیسی ہے؟ میں نادان ہوں یا تم نادان ہو؟

مناظرہ ختم ہوگیا اور بحث تمام ہوگئی اور دہریہ اپنا سا منہ لے کر واپس ہوگیا اب کیا بحث کرے جو اس کی بنیاد تھی وہ ساری ختم ہوگئی۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا وجود اور اس کی پہچان دلائل کی محتاج نہیں ہے بلکہ قلب کے اندر خود بخود فطرت کہتی ہے کہ اس جہان کا ہے کوئی بنانے والا انسان کے قلب پر فطرت کا دباؤ ہے۔ ایک بچہ اور غیر مسلم وہ قلب میں اس چیز کا دباؤ محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس نے کسی کالج میں نہیں پڑھا، کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا۔ مگر دل میں دباؤ محسوس کرتا ہے۔

انسان اگر سوچے تو قدم قدم پر اللہ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں تمنائیں کرتے ہیں اور ہزاروں کام کرتے ہیں لیکن کامیابی سو میں سے ایک میں ہوتی ہے۔ ننانوے میں ناکامی ہوتی ہے۔ تو کون سا انسان چاہتا ہے کہ میں ناکام ہو جاؤں؟ کون چاہتا ہے کہ میں دوکان پر بیٹھوں اور مجھے خسارہ ہو؟ نفع ہی کی خاطر بیٹھتا ہے۔ لیکن بہت سی جگہ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ خسارہ دینے والا اور خلاف مرضی چلانے والا کون ہے؟

انسان چاہتا ہے کہ اولاد ہو، بیس بیس برس گزر جاتے ہیں، دوائیں کرتا ہے دعائیں کراتا ہے، نہیں ہوتی، بعضے چاہتے ہیں کہ ہمارے اولاد نہ ہو، بلکہ برتھ کنٹرول کا سسٹم جاری کرتے ہیں کہ اولاد بند ہو جائے اور جب سے برتھ کنٹرول کی دوائیں شروع کیں، جب سے اولاد زیادہ پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ غرض آدمی چاہتا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ہوتی چلی جا رہی ہے، چاہتا ہے کہ ہو مگر بیس بیس برس گزر جاتے ہیں نہیں ہوتی۔ ایک چاہتا ہے کہ نفع ہو، مگر خسارہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک کو لاکھوں روپے کا نفع ہو رہا ہے۔

آخر یہ سب کچھ کرنے والا کون ہے؟ سب سے برتر مخلوق انسان ہے۔ جب اس کا کیا ہوا پورا نہیں ہوتا تو گدھے اور گھوڑے تو اس سے نیچے کی چیز ہیں، درخت اور پتھر اس سے نیچے کی چیز ہیں۔ جب انسان اپنے ارادے میں عاجز ہے تو اور چیزوں کا کیا کہنا؟ جب برتر مخلوق بھی عاجز ہے۔ تو ضرور کوئی قوی اور طاقت ور ذات موجود ہے۔ کوئی اوپر کی طاقت ہے جو انہیں چلا رہی ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا میں انسان ہزاروں باتیں چاہتا ہے کہ یہ ہو، مگر نہیں ہوتیں، گھٹتا بھی ہے، پریشان بھی ہوتا ہے۔ لیکن لاکھ پریشان ہو جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں؟ سارے زندگی چاہتے ہیں موت کا اندیشہ ہوتا ہے تو دوائیں کرتے ہیں، غذائیں کھاتے ہیں، تفریح کرتے ہیں آب و ہوا بدلتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو بادشاہ، نواب لکھ پتی سب مجبور ہیں۔ اگر روپیہ خرچ کر کے جان بچا کرتی تو امیر آدمی ایک نہ مرتا سارے بے چارے غریب مرا کرتے، جن کے ہاتھ میں پیسہ نہ ہوتا اور بادشاہ تو مرنے کا نام ہی نہ لیتا خزانے کا منہ کھول دیا کرتا کچھ ملک الموت کو، کچھ انکے فرشتوں کو رشوت دے دی اور اپنی جان بچالی تو دولت مند کوئی نہ مرتا۔ لیکن سب مرتے ہیں، چاہتا کوئی نہیں، پھر مرتے ہیں۔ پھر آخر کون ہے جو موت دینے والا ہے؟ کون ہے جو مرضی کے خلاف زندگی چھیننے والا ہے؟ اپنی مرضی سے ہم دنیا میں آئے بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جائیں گے بھی نہیں۔ جب آنا ہوتا ہے تو آنے پر مجبور ہیں، جب جانے کا وقت آتا ہے تو جانے پر مجبور ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ مجبور کے لئے کوئی نہ کوئی جابر ہونا چاہئے جو جبر کر رہا ہے اور اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔

ہم مخلوق ہیں۔ خود ہم نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا جب مخلوق ہیں تو مخلوق ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی خالق ہو جس نے ہمیں مخلوق بنایا ورنہ ہم خود خالق بنیں، مقہور ہیں تو قاہر کی خبر ملتی ہے۔ مرزوق ہیں تو کسی رازق کا پتہ چلتا ہے۔ تو ہر ہر قدم پر انسان اللہ کو اور اسکی شانوں کو پہچاننے پر مجبور ہے اور اس کو دلائل سے نہیں پہچانتا بلکہ اس کی ہستی

میں واقعات وحوادث ہیں جو اس کو ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔

عقل سے خدا کو مانا جاتا تو فلاسفر عارفین کاملین ہوتے ...... باقی دلائل تو ہم خود واقعات سے بنا لیتے ہیں۔ دلائل پر خدا کا وجود موقوف نہیں ہے۔ اگر دلائل پر موقوف ہوتا، تو سب سے بڑے عارف اور خدا پرست فلسفی لوگ ہوتے۔ حالانکہ فلسفی جو عقل پرست ہیں، وہی خدا سے بعید ہیں اس لئے معرفت باری تعالیٰ کا دارومدار عقل اور دلائل پر نہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکے وجود پر سو دلیلیں قائم کی تھیں، بڑی پکی اور فلسفیانہ مضبوط دلیلیں تھیں اور انہیں ناز تھا کہ میرا ایمان سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ کیونکہ سو دلیلیں میں نے ایمان کے اوپر قائم کی ہیں۔ بلکہ بے پڑھا لکھا آتا تو اسے حقارت سے دیکھتے کہ اس کا ایمان کیا ہے؟ ایمان تو میرا ہے کہ میں نے دلیلوں کے زور سے اللہ کو ایک سمجھا ہے۔ ان جاہلوں کو پتہ ہی کچھ نہیں۔ یہ تو محض تقلیدی طور پر مانتے ہیں۔

ایک دفعہ امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کھیت پر چلے جا رہے تھے۔ کھیت کا ایک کاشت کار سامنے آ گیا کاشت کار بیچارہ بے پڑھا لکھا، نہ مولوی، نہ فلسفی، نہ عالم۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ کون ہو؟ اس نے کہا مسلمان ہوں۔ پوچھا، مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا جو یہ کہے کہ اللہ ایک اور رسول برحق، آخرت حق، وہ مسلمان ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مسلمان تو ہے۔ مگر تیرے مسلمان ہونے کی دلیل کیا ہے؟ دیہاتی نے کہا۔ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تو کوئی دہریہ آ گیا ہے۔ لاٹھی لے کے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے ہولیا کہ ٹھہر جا تجھے بتلاؤں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے آگے اور دیہاتی پیچھے پیچھے کہا کہ مسلمان ہونے کی دلیل مانگتا ہے؟ ارے مسلمان نے خدا کو دل کے یقین سے پہچانا ہے نہ کہ دلیل سے، دلائل کے پیر لکڑی کے ہوتے ہیں لکڑی آگ میں بھی جل جاتی ہے، پانی میں بھی بہہ جاتی ہے۔ ہوا میں بھی اڑ جاتی ہے۔ تو دلیلوں پر خدا کا وجود نہیں خدا کا وجود دل کے یقین پر ہے اور یقین اللہ ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے کہ میں ہوں اور میری شانیں برحق ہیں۔

قرآن کریم نے مشاہدات وواقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے ...... اسی واسطے قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود کے دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کے نہیں ہیں۔ بلکہ مشاہدات کو پیش کیا ہے کہ تم اس چیز کو دیکھو اور اس میں سے خدا کے وجود کو نکالو اس چیز کو دیکھو اور اس سے خدا کو سمجھو۔ اسی کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مجھے یاد آیا ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: میں نے شہتوت کے پتے سے پہچانا اس طرح کہ شہتوت کا پتہ بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ہرن کھاتا ہے تو مشک نکلنا شروع ہو جاتا ہے، ابریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو ایک پتہ ہے کہیں مینگنی نکلی، کہیں مشک نکلا، کہیں ریشم نکلا۔ یہ پتے کی طبیعت نہیں ہے۔ طبیعت ایک کام کر سکتی ہے، دس کام نہیں کر سکتی

اس کی طبیعت کے اوپر کوئی بنانے والا ہے کہ کبھی یہ بنا دیا، کبھی وہ بنا دیا میں نے اس حقیر سے پتے سے خدا کے وجود کو سمجھا۔ اگر آدمی سمجھنا چاہے تو ایک پتے سے خدا کے وجود کو نکال سکتا ہے اور نہ سمجھنا چاہے تو انبیاء علیہم السلام ہزاروں دلیلیں پیش کر دیں، رات دن معجزے دکھلائے ابوجہل کو نہیں سمجھنا تھا، مرتے دم تک نہیں سمجھا ابولہب کو نہیں ماننا تھا، آخر تک نہ مانا اور مان لیا تو صدیق اکبر نے عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے۔ جس نے مانا، تو کوئی صدیق بنا، کوئی فاروق بنا۔ جس نے نہیں مانا کوئی ابوجہل رہ گیا، کوئی ابولہب رہ گیا۔ معلوم ہوا جب آدمی نہیں ماننے پر آتا تو پیغمبر بھی نہیں منوا سکتے اور ماننے پہ آتا ہے تو شہتوت کے پتے سے خدا کو پہنچان لے۔

امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا: ہاں الحمد للہ اس نے کہا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ فرمایا، جو اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اس نے کہا، آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے؟ وہ موجود ہے اور کائنات بھی اسی نے بنائی ہے۔ اب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر یہ ارشاد فرماتے کہ اللہ نے اپنے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا وہ جاہل نہ سمجھ سکتا۔ اسی کے انداز پر اسے سمجھایا فرمایا میں جو خدا کے وجود کو سمجھا ہوں ایک عجیب انداز سے سمجھا ہوں۔ میں نے دنیا میں ایک محل دیکھا کہ وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اس میں نہ کہیں درز، نہ سوراخ، نہ کوئی روشن دان، کچھ بھی نہیں۔ اس محل کے اندر ایک سونے کا محل بنا ہوا ہے۔ اس میں بھی کوئی در و دیوار اور کھڑکی وغیرہ نہیں ہے۔ غرض یہ دو محل بنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں نہ کوئی اندر کی چیز باہر جا سکتی ہے اور نہ باہر سے اندر جا سکے حتیٰ کہ ہوا کا بھی گزر نہیں، ایک محل باہر ہے اور دوسرا اس کے اندر ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس محل کی دیوار ٹوٹی اور اس میں سے ایک جاندار نکلا پیدا ہوتے ہی بچہ نادان ہوتا ہے۔ مگر اس نے وہ کام شروع کیا جو تجربہ کار جانور کرتا ہے۔ اس سے میں سمجھا کہ اس محل میں باہر سے تو کوئی اندر گیا نہیں اور اندر سے یہ باہر نکلا ہے۔ تو کوئی اس محل کے اندر بنانے والا ہے جس نے اسے اندر تیار کر دیا ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ خدا کی ذات ہے۔

لوگوں نے عرض کیا حضرت! یہ چاندی کا محل جسے آپ دیکھ کے آئے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا اور چاندی کے محل میں سونے کا ایک اور محل ہو یہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ آخر آپ اس محل کو دیکھنے کس دنیا میں گئے تھے۔ فرمایا یہ تمہارے ہاں بھی موجود ہے۔ لوگوں نے کہا ہم نے تو نہیں دیکھا فرمایا، تم آنکھ بند کر لو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے۔ یہ تو تمہارے گھر میں بھی موجود ہے۔

فرمایا: کیا تم نے کبھی انڈا نہیں دیکھا؟ وہ چاندی کا ایک محل ہے اس میں جو زردی ہے۔ وہ سونے کا محل ہے، کوئی دروازہ نہیں نہ اندر کی چیز باہر آئے، نہ باہر کی چیز اندر آئے۔ مرغی لے کر اسے بیٹھ گئی اچانک اکیس دن کے بعد دونوں محلوں کی دیوار ٹوٹی اور بچہ نکل آیا، اور اس بچے نے وہی کام کرنے شروع کئے۔ حالانکہ نہ وہ کسی اسکول میں گیا، کوئی ڈگری اس نے نہیں پائی، ماں سے تربیت اس نے نہیں پائی۔ مگر جس طرح اماں دانہ چگتی ہے، وہ بھی چگنے لگا، جس طرح وہ بولتی ہے، اسی لغت میں اس نے بھی کلام کرنا شروع کر دیا۔

تو انسان کے بچے کو جب تک مکتب میں نہ بٹھائیں مادری زبان کی بھی جب تک کتاب نہیں پڑھے گا۔ وہ ادیب وشاعر نہیں بنے گا اور دوسری زبانوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ خود مادری اور ملکی زبان جب تک اس کو کتابی صورت میں نہ پڑھے، پڑھا لکھا نہیں سمجھا جا سکتا تو ایک انسان بغیر سیکھے زبان نہ بولے اور سیکھنے کے لئے اس کو بیسیوں ملکوں کا سفر کرنا پڑے کہیں جا کے دوسری زبان سے واقف ہو۔ اور یہ سونے چاندی کے محل میں سے ایک بچہ کڑ کڑ کرتا ہوا نکلا اور اس نے وہی کام کرنا شروع کیا، جو اس کی ماں کر رہی ہے۔

گویا وہ ترقی یافتہ پیدا ہوا۔ اس محل میں آخر اس کو کس نے پڑھایا لکھایا ہے، کس نے اس کو سمجھایا کہ تو نے اس طرح بولنا ہے اور کس نے وہ طریقہ بتلایا کہ انڈے سے باہر نکلتے ہی دانہ چگنا شروع کر دینا یہ تعلیم کس نے دی؟ یہ اس نے تعلیم دی جس نے فرمایا۔ ﴿رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (1) ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہر چیز کے مطابق اس میں ہدایت ڈال دی کہ تو یہ کام کر''۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو انسانی حرکتیں خود بخود اس سے سرزد ہونا شروع ہوتی ہیں۔ علم کی بات الگ ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانے کی خواہش، سونے کی خواہش۔ یہ بلا کسی تعلیم کے خود بخود کرتا ہے۔ تو اندر کوئی تعلیم دینے والا ہے۔ جس نے دل میں راہنمائی کی ہے اور وہ وہی اللہ کی ذات ہے۔ جو دل کے اندر ہدایت دیتی ہے۔

اللہ دل میں آتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے

اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے کہ۔

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

دل میں تو ہر انسان کے ہے کہ بے شک کوئی جابر ہستی ہے۔ جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔ سمجھنا چاہے تو اس کی ذات بڑی بلند و بالا ہے۔ ہماری سمجھ کے احاطے میں نہیں آ سکتی ہے تو اکبر کہتا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ نہیں آتا — بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

تو جو دل میں آ جائے، سمجھ میں نہ آئے۔ بس خدا کی ذات کی یہی پہچان ہے۔ ورنہ جو چیز دل میں آتی ہے۔ پہلے آدمی اسے سمجھ جاتا ہے۔ ایک خیال ہمارے دل میں آیا پہلے ہم اس کو سمجھ گئے تو ایک نظریہ ہمارے دل میں پیدا ہوا، ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کا وجود دل میں آتا ہے۔ مگر سمجھ نہیں سکتے کہ اس کی حقیقت و کیفیت کیا ہے۔ انسان عاجز ہے مگر ماننے پر مجبور ہے۔

اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے...... بالکل اسی طرح سے جیسے آپ موجود ہیں اور آپ کے اندر روح بھی موجود ہے۔ بدن کی تربیت اندر روح ہی کر رہی ہے۔ یہ بدن کے اوپر جو سرخی اور چہرے کے اوپر تر و تازگی ہے، یہ روح ہی کا اثر ہے۔ اگر روح نکال دی جائے تو بدن مرجھا کر، کملا کر، پژمردہ ہو کر

---

(1) پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۰.

تین دن کے اندر مٹی میں مل جاتا ہے۔ مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، ہوا ہوا میں اور آ گ آ گ میں مل جاتی ہے۔ تمام شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کو روح نے جوڑ رکھا ہے۔ لیکن آج تک آپ نے روح کو دیکھا نہیں مگر یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ روح ضرور ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی کس طرح سے ہے؟ آج تک آپ نے اپنی روح پر کوئی دلیل قائم نہیں کی، کہ کوئی فلسفی یوں کہے کہ یا تو دلیل سے بتاؤ میرے اندر روح ہے۔ ورنہ میں نہیں مانتا کہ میرے اندر روح ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا ایک بھی دلیل نہ ہو۔ آپ ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر نہیں مانتے پھر آپ کو زندہ کہنا مشکل ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ میں مردہ ہوں۔ لیکن کہتے ہیں کہ زندہ ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کبھی روح کو دیکھا ہے؟ کوئی دلیل آپ کے پاس ہے؟ ہر شخص موجود ہے، میں اس سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ آپ میں روح موجود ہے؟ دلیل تو نہیں۔ ہم کہیں گے آپ نے کبھی روح کو دیکھا؟ جواب یہ ہوگا کہ کبھی نہیں روح کی شکل وصورت کیسی ہے؟ معلوم نہیں۔ مگر ہے ضرور۔ تو دلیل ایک نہیں، دیکھا بھی نہیں پھر روح موجود ہے۔ تو یہ ایک ایسی مخلوق ہے کہ آدمی اسے بلا دلیل مانتا ہے اور خدا کی ذات کو نہ مانے، یہ حیرت کی بات ہے؟

جب ہمارا بدن بغیر روح کے نہیں ٹھہر سکتا تو اتنا بڑا بدن جس کا سر آسمان ہے، جس کے پیر زمین ہے۔ یہ اتنا بڑا بدن کس طرح قائم ہے۔ جب تک اس کے اندر کوئی روح موجود نہیں ہے۔ وہ چلا نہیں رہی اور تدبیر نہیں کر رہی؟ غرض جس طرح سے آپ روح کے ماننے کے لئے دلیل کے محتاج نہیں۔ محض قوت یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح سے پوری کائنات کے مدبر اعظم اور روح اعلیٰ کو دلیل سے نہیں مانا گیا۔ قلب کے یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی کے بدن کے اندر گھسایا جائے کہ بھئی ذرا دیکھ کر آؤ روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے۔ دل میں یا دماغ میں ہاتھ پیر میں، اس کا مقام کہاں ہے؟ پھر اس سے پوچھو کہ بھئی کیا دیکھا؟ وہ یوں کہے گا کہ میں جدھر دیکھتا ہوں، روح کا جلوہ نظر آتا ہے مگر اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ روح وہاں بیٹھی ہے یا یہاں بیٹھی ہے۔ جہاں جہاں بھی بدن موجود ہے وہیں وہیں روح موجود ہے۔ حتیٰ کہ بال، ناخن، آنکھ میں بھی موجود ہے۔

اور جس طرح ہمارے بدن میں ہماری روح ہے۔ جو سمت و جہت سے بھی پاک ہے اور اشارے سے بھی بری ہے اس طرح سے کائنات کی روح اعظم اللہ رب العزت کی طرف بھی اشارہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں یا وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سمت و جہت سے بری اور اشارہ سے بری مگر کائنات کے ذرے ذرے میں ان کا جلوہ موجود ہے۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ① ''تم جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تمہارے ساتھ ہے۔'' ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ ② تم ایک جگہ تین ہو تو چوتھا خدا موجود ہے اور اگر پانچ ہو تو چھٹا خدا

① پارہ: ۲۷، سورة الحديد، الآية: ۴۔ ② پارہ: ۲۸، سورة المجادلة، الآية: ۷۔

موجود ہے۔ زیادہ ہو یا کم، مگر خدا وہاں موجود ہے اور پھر بھی اشارے سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہے اللہ میاں۔ اس لئے کہ اتنے لطیف ہیں کہ بدن سے بھی پاک ہیں، صورت سے بھی پاک ہیں۔ تو جب ان کی بنائی ہوئی ایک مخلوق یہ شان رکھتی ہے کہ اس کو اشارے سے نہیں بتا سکتے کہ یہ ہے تو اللہ کی ذات تو کہیں بڑی و بالا ہے۔ روح کی آج تک آپ نے شکل دیکھی؟ نہیں دیکھی ہوگی اور آپ کہتے ہیں کہ روح کی کوئی شکل نہیں۔ اللہ ربّ العزّت بھی شکل سے بری و بالا ہیں۔ روح کا آپ نے کبھی رنگ دیکھا؟ کہ زرد یا کالی ہے؟ یہ گورے کالے کا فرق جو ہے، یہ تو بدن سے چلتا ہے روح سے نہیں چلتا۔

حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت پر نہیں ...... اسی لئے جو روحانی لوگ ہیں، ان کے ہاں کالے گورے کا فرق کوئی نہیں، وہاں تو روح کی چمک اور نورانیت دیکھی جاتی ہے۔ چمڑی کسی کی کالی ہو یا سفید ہو۔ یہ اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ وہ انسان خطا پرست ہوگا جو حقیقت کو چھوڑ کر محض چمڑی کو دیکھے حقیقت پسند انسان کی نظر کبھی چمڑی کے اوپر نہیں ہوتی کبھی صورت پر نہیں ہوتی وہ سیرت کو دیکھتا ہے

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سیاہ فام ہیں، موٹے موٹے ہونٹ ہیں کوئی ظاہری شکل وصورت نہیں ہے۔ جب انہیں نکاح کی ضرورت پیش آئی تو بڑے بڑے اجلاء صحابہ جو قریش کے سردار تھے، انہوں نے کہا، "بِلَالُ سَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا" ① بلال رضی اللہ عنہ ہمارے سردار اور آقا ہیں۔ ان کے لئے سب کی بیٹیاں حاضر ہیں۔ اگر وہاں کالے اور گورے کا فرق ہوتا تو گورے رنگ کا کوئی بیٹی دینا پسند نہ کرتا۔ مگر اسلام نے یہ سارے فرق مٹا دیئے اسلام کہتا ہے کہ صورت کو نہ دیکھو، سیرت اور حقیقت کو دیکھو شکل وصورت اور رنگوں کو مت دیکھو یہ تو آنی جانی اور اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ یہ ظاہری شکلیں چند روزہ ہیں۔ اصل سیرت ہے جو باقی رہنے والی چیز ہے۔ اور صورت کو آپ کتنا ہی بنالیں مگر صورت بگڑنے کیلئے ہی پیدا ہوئی ہے۔ یہ بنتی نہیں، یہ بگڑتی ہی ہے۔ اللہ بھلا کرے بخار کا۔ تین دن بخار آجائے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے۔ جو رنگ وروغن، غذائیں کھا کے مہینوں میں پیدا کیا تھا۔ بخار نے تین دن میں ختم کر دیا۔ اور بخار بھی نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں، بڑھاپا آکے ساری صورت کو چوق موق کر دیتا ہے نہ رنگ رہتا ہے نہ سفیدی۔ اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں موت آکے ساری صورت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اس لئے صورت بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اسے آپ کہاں تک بنائیں گے؟ کہاں تک اس کی خدمت کریں گے؟ جتنی خدمت کریں گے جب بگڑنے پہ آئے گی بیماری بگاڑ دے گی کوئی فکر لگ گیا اس سے بگڑ جائے گی بڑھاپا بگاڑ دے گا، موت بگاڑ دے گی اس لئے جو صورت بگڑنے کیلئے پیدا ہوئی اس کے بنانے سنوارنے میں وقت لگانا، وقت ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ تھی اور بہت سے مرید اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے اور شیخ ان

① تفسیر ظلال القرآن، پارہ: ۳۰، سورۃ عبس، ج: ۷، ص: ۴۶۱۔

کی تربیت کرتے تھے۔ایک شخص نیا مرید آیا اور بیعت ہوگیا۔اس نے اللہ اللہ کرنی شروع کی۔ابھی اللہ اللہ نے دل میں اثر نہیں کیا تھا۔بالکل نو آموز اور مبتدی تھا۔وہ بھی اپنے ذکر و شغل میں لگا۔شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ ان کے گھر سے کھانا پکا ہوا آتا تھا۔گھر میں ایک باندی تھی۔وہ کھانا ہر ہر حجرے میں بانٹ جاتی تھی۔یہ جو نئے مرید پہنچے تو معمول کے مطابق باندی انہیں کھانا دینے آئی۔باندی ذرا قبول صورت تھی۔ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق و محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔اب جب وہ آتی، تو کھانا رکھ لیتے مگر اسے گھورنا شروع کرتے۔شیخ کو پتہ چل گیا کہ سیکھنے تو اللہ اللہ آئے ہیں اور باندی سے عشق بازی اور آنکھ لڑانا شروع کر دی۔انہوں نے علاج کیا۔مگر اہل اللہ کے ہاں علاج زبان سے نہیں ہوتا، وہ تو ڈھنگ ایسا ڈالتے ہیں کہ خود بخود علاج ہو جائے۔شیخ نے جب دیکھا کہ اس آدمی کے اندر عشق پورا اثر کر گیا ہے اور بجائے اللہ اللہ کرنے کے یہ باندی باندی پکارتا ہے، بجائے اللہ کے مشاہدہ کرنے کے باندی کی صورت میں الجھ گیا ہے، اس کا علاج کرنا چاہئے۔علاج یہ کیا کہ کسی ڈاکٹر سے دست آور دوا منگوائی اور اس باندی کو کھلا دی اس کو دست آنے شروع ہوئے، تو اس کے لئے ایک جگہ مقرر کر دی کہ یہاں بیٹھ کے استنجاء سے فارغ ہو۔صبح سے شام تک اس کو خوب دست آئے اور شام کو یہ کیفیت ہوگئی کہ ناک پکڑیں تو اس کا دم نکلے نہ رنگ رہا، نہ روغن رہا۔ہڈی کو اس کا چمڑا لگ گیا۔اس کی صورت بالکل بھیانک ہوگئی۔اس کے بعد اس سے کہا کہ اس مرید کے پاس کھانا لے جا اور جو وہ معاملہ کرے مجھے اطلاع کر نا وہ کھانا لے کے پہنچی چلا جاتا نہیں تھا۔پاؤں لرز رہے ہیں زرد رنگ، ہڈیاں نکلی ہوئیں، صورت اس کی بری ہوگئی۔اب وہ کھانا لے کر آئی۔یا تو یہ صاحب انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے کہ باندی آئے تو اسے گھوروں اب جو آئی اور اس کی شکل دیکھی۔تو انہیں بڑی نفرت ہوئی۔منہ پھیر کے کہا رکھ دے کھانا۔چلی جا جلدی یہاں سے۔وہ بے چاری چلی گئی۔شیخ نے پوچھا، اس نے کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا حضرت! آج تو یہ معاملہ کیا کہ دیکھنا تو بجائے خود ہے۔اس نے تو نفرت سے منہ پھیر کے مجھے کہا کہ جا جلدی یہاں سے، رکھ دے کھانا۔میری طرف دیکھا بھی نہیں۔فرمایا، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' علاج ہوگیا۔

شیخ تشریف لائے، انہوں نے اس مرید سے کہا، ذرا میرے ساتھ تشریف لایئے ان کی انگلی پکڑی اور وہ جو قدمچہ تھا، جہاں باندی فارغ ہوئی تھی۔نجاست اس میں بھری ہوئی تھی فرمایا۔یہ آپ کا معشوق ہے۔اسے اٹھا کے لے جایئے اور بڑی حفاظت سے رکھئے اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔آپ کو پاخانہ سے محبت تھی۔جب تک یہ باندی میں تھا آپ کو عشق رہا۔جب یہ نکل گیا، آپ کا عشق ختم ہوگیا تو باندی سے عشق نہیں تھا، اس گندگی سے تھا۔اس اپنے معشوق کو لے جایئے اور صندوق میں بڑی حفاظت سے رکھئے اور اس کی زیارت کیا کیجئے اس دن مرید کی سمجھ میں آیا کہ:

عشق صورت عاقبت ننگے بُود

صورتیں عشق کے لئے نہیں ہیں، سیرت عشق کے لئے ہے۔صورت تو بگڑنے والی چیز ہے، صورت درحقیقت ایک گندگی ہے۔گندگی جب تک رہتی ہے صورت باقی ہے۔یہ نکل جائے تو صورت ختم ہو جاتی ہے لیکن

سیرت ہر حالت میں موجود ہے۔ اگر اچھی سیرت علم اور کمال ہو تو دنیا میں رہے گا جب با کمال، قبر میں جائے گا جب با کمال، حشر میں پہنچے گا جب با کمال اور صورت یہاں کہیں بھی ساتھ نہیں ہوگی۔ سیرت ہی سیرت انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لئے انسان کا یہ فرض ہے کہ اپنی سیرت بنانے کی فکر کرے نہ کہ صورت بنانے کی فکر میں رات دن لگا رہے۔ یہ تو بگڑنے والی ہے۔ ایک نہ ایک دن بگڑے گی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک تابعی ہیں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ یہ غلام تھے اور حبشی تھے، سیاہ رنگ تھے، صورت اچھی نہیں تھی۔ لیکن علم اتنا بڑا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''مَارَأَیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ '' ① ''میں نے اپنی عمر میں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی شخص عالم، افضل، برتر اور کامل نہیں پایا'' تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس کی تعریف کریں سمجھ لیجئے وہ شخص کس درجے کا ہوگا، کس درجے کا عالم ہوگا، تو علم اتنا بڑا کہ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے عاشق اور صورت کالی کلوٹی۔ اس لئے اسلام نے صورت پر مدار نہیں رکھا سیرت پر مدار رکھا ہے کہ اندرونی حقیقت درست ہونی چاہئے۔

انسان سیرت سے اشرف المخلوقات ہے صورت سے نہیں...... اور بھائی صورت کا تو یہ ہے کہ صورت ہمیشہ فتنوں میں ڈالتی ہے۔ سیرت ہمیشہ امن پیدا کرتی ہے اور عزت و بلندی پیدا کرتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ ہم اور آپ خوبصورت نہیں ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی۔ قرآن کریم میں موجود ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ نے حسن و جمال کو پیدا کیا، تو آدھا حسن پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا تو کتنے بڑے حسین و جمیل تھے۔

مصر کی بیگمات جب جمع ہوئیں اور ان کی صورت مبارک دیکھی تو کہا۔ ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ﴾ ② یہ کوئی انسان بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ اتنا حسن و جمال تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام جہاں جہاں مصیبتوں میں گرفتار ہوئے صورت کی خوبصورتی نے انہیں گرفتار کرایا، کنعان کے کنویں میں ڈالے گئے، حسن و جمال سبب بنا، بھائیوں نے حسد کیا اور کنویں میں ڈال دیا۔ قافلہ نکال کے لے گیا اس نے مصر کے بازار میں بیچ دیا۔ غلام بنے تو صورت کی وجہ سے بنے۔ زلیخا عاشق ہوگئی اور اس کی وجہ سے نو برس جیل میں رہنا پڑا۔ ان سب کا باعث صورت کی خوبصورتی تھی اور جب مصر کی سلطنت کا وقت آیا خود فرمایا ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ ③ اے بادشاہ مصر! ملک میرے سپرد کر، میں انتظام کر کے ملک چلا کے دکھاؤں گا زمین کے خزانے میرے حوالے کر۔ اس کی یہ وجہ بیان نہیں کی ''اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ''۔ مصر کی سلطنت میرے سپرد کر دے، اس واسطے کہ میں بہت خوبصورت ہوں، بلکہ یہ فرمایا، ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ④ ''اس

① علل الترمذی، ج: ۱۲، ص: ۴۹۲. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱.

③ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵. ④ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

واسطے کہ میں علم والا ہوں'' مجھ میں ملک چلانے کی قوت وصلاحیت موجود ہے۔غرض جب فتنے میں پڑنے کا وقت آیا تو صورت اس کا باعث بنی اور جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو سیرت آگے بڑھی تو سیرت انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے۔صورت ترقی ورفعت اور بلندی کا باعث نہیں ہے۔

جیسے آپ خوبصورت ہیں۔ بہت سے جانور بھی خوبصورت پھرتے ہیں۔مور کتنا خوبصورت ہے،اس کے اوپر کیسے عمدہ عمدہ نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، پہاڑوں کے اندر جو مرغ زرین ہوتا ہے۔کئی کئی رنگ اس کے پروں کے اندر ہوتے ہیں۔کتنا حسین وجمیل ہوتا ہے بہت سے درندے بھی ایسے ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔شیر کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کھال ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے بہت اعلیٰ قسم کا کمبل اوڑھ کر آیا ہے۔رنگ الگ ہوتے ہیں نقش الگ ہوتے ہیں۔آپ تو نقل اتار کے ایسا کمبل بناتے ہیں۔اس کے پاس قدرت کا بنا ہوا موجود ہے تو جانوروں کی کیسی عمدہ عمدہ کھالیں، پرندوں کے کیسے عمدہ عمدہ رنگ،ان سے زیادہ کون خوبصورت ہے۔ اگر خوبصورتی باعث ترقی ہوتی۔تو انہیں اشرف المخلوقات بنا دیا جاتا۔یہ آخر آپ ہی کو کیوں دعویٰ ہے؟ اور آپ ہی کے بہت سے بھائی بند ہیں۔صورت کے لحاظ سے کم رتبہ ہیں۔لیکن تقویٰ وطہارت کی وجہ سے بڑے بڑے ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔اگر صورت معیار ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی کوئی بھی تعریف نہ کرتا عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تعریف نہ کرتے اس لئے کہ صورت کالی کلوٹی تھی لیکن سیرت سامنے تھی۔اس لئے ان کی بڑی عظمت وبڑائی کی جاتی تھی۔معلوم ہوا صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔سیرت سے آدمی آدمی بنتا ہے۔خوب کہا ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ

گر بصورت آدمی انساں بدے ـــ احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

اگر صورت کی وجہ سے آدمی آدمی بنتا، تو ابوجہل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ایک درجے کے ہی ہوتے، کیونکہ اس کی صورت بھی آدمیوں جیسی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل بھی انسانوں جیسی ہے۔لیکن سیرت دیکھی جاتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت عرش سے اوپر پہنچی ہوئی ہے اور ابوجہل کی سیرت تحت الثریٰ کے اندر پہنچی ہوئی ہے۔سیرتوں کے لحاظ سے زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔صورت کے لحاظ سے کچھ بھی فرق نہیں اس لئے کہتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے ـــ احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

ز بروں چوں گور کافر پر حلل ـــ وز اندروں قہر خدائے عزوجل

باہر سے دیکھو تو ایک کافر کی قبر کو دیکھو۔اس کے نقش ونگار بنے ہیں۔اس پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، پھول پڑے ہوئے ہیں اور اندر جا کے دیکھو تو عذاب خداوندی بھرا ہوا ہے۔تو صورت اگر اچھی ہو،مگر اندر اخلاق اچھے نہ ہوں،علم کا کمال نہ ہو،معرفت الٰہی نہ ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کافر کی قبر اس کے اوپر اچھی اچھی چادریں پڑی ہوئیں

ہیں۔اندر خدا کا قہر پڑا ہوا ہے۔اس لئے آدمی سیرت سے آدمی بنتا ہے۔صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔

اہل سیرت کو ہی تاریخی عظمت نصیب ہوتی ہے...... دنیا میں ہر دور میں ہزاروں حسین گزر گئے اور خاک میں مل کر خاک ہو گئے کوئی جاننے والا بھی نہیں۔لیکن جو سیرت والے گزرے ہیں۔آج تک ان کے نام کے ساتھ آپ عظمت کے الفاظ بولتے ہیں۔عظمت سے انہیں یاد کرتے ہیں۔انبیاء علیہم السلام کا ذکر آتا ہے تو آپ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے ہیں۔صحابہ کرام کا ذکر آتا ہے تو آپ ''رضی اللہ عنہم اجمعین'' کہتے ہیں۔اولیاء کا ذکر آتا ہے آپ ''رحمتہ اللہ علیہم اجمعین'' کہتے ہیں۔حالانکہ ان کی صورتیں موجود نہیں ہیں اور ان میں سے کوئی کالا تھا،کوئی گورا تھا،کوئی زرد رنگ کا تھا،کوئی سرخ رنگ کا تھا تو رنگ کا کوئی پتہ نہیں۔لیکن نام لینے میں آپ آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔اس لئے کہ ان کی سیرت سامنے ہے۔ان کا علم وکمال سامنے ہے۔

امام ابوحنیفہ،امام شافعی،امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا نام آ جائے،عقیدت سے آپ گردن جھکا دیں گے،ان بزرگوں کی شان میں اگر کوئی ادنیٰ گستاخی کرے،آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ ہم یہ گستاخی نہیں سن سکتے،محبت وعظمت آج تک قلوب میں موجود ہے۔حالانکہ وہ ہستیاں سامنے نہیں ہیں۔ان کی سیرت اور علم وفضل ہی ہمارے سامنے ہے۔

صاحب! سیرت ہی خلافت خداوندی کا مستحق ہے......اس لئے اصل بنانے کی چیز علم ومعرفت اور اخلاق وکمالات الٰہیہ ہیں۔انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں تشریف لائے،وہ صورتیں بنانے کے لئے نہیں آئے انبیاء کا یہ موضوع نہیں ہے۔وہ سیرت بنانے کے لئے آئے ہیں کہ دلوں کے اندر اخلاق ربانی اجاگر کرو،دلوں کے اندر محبت الٰہیہ پیدا کرو انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب بننے کے لئے آیا ہے۔خلیفہ وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے اوصاف آ جائیں ایک شاعر اسی کو خلیفہ بنائے گا جس کے اندر شعر کہنے کا مادہ آ جائے ایک بڑھئی اس کو خلیفہ بنائے گا جو بڑھئی کے فن کے اندر ماہر ہو۔ایک میاں جی جو لڑکوں کو قرآن مجید حفظ کراتا ہے۔لڑکوں میں سے اس کو خلیفہ بنائے گا جو قرآن مجید کا حافظ ہوگا۔اللہ میاں اپنا خلیفہ اس کو بنائیں گے۔جس میں اللہ میاں کے اخلاق پیدا ہو جائیں گے،اللہ کے علوم وکمالات پیدا ہو جائیں گے۔اللہ میاں کی نیابت وخلافت شکلوں پر نہیں ہے وہ سیرت پر ہے،جو انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے گا وہ خلیفہ اور نائب الٰہی بن جائے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم،تابعین کی عظمت آپ کے دلوں میں ان کے کمالات کی وجہ سے ہے۔ان کی صورتوں کی وجہ سے نہیں ہے۔آج بھی اگر آپ کسی عالم سے محبت رکھتے ہیں یا اس کی عظمت کرتے ہیں یا اس کو سر پر بٹھاتے ہیں،اس کے چہرے مہرے کی وجہ سے نہیں بٹھاتے یہ جان کر کہ اس کے اندر علم کا مادہ موجود ہے،اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اور علم یہ درحقیقت اللہ کی چیز ہے کسی انسان کی چیز نہیں ہے۔انسان کی ذات میں نہ علم ہے،نہ اخلاقی کمالات ہیں۔یہ حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں،محنت کر کے آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

علم کے لئے مدرسے ہوتے ہیں۔نونو برس محنت کرتے ہیں۔ جب آدمی عالم بن کے آتا ہے۔ اخلاق درست کرنے کیلئے خانقاہیں بنتی ہیں، شیوخ کے ہاں رہتے ہیں۔ مشقتیں اٹھاتے ہیں۔تب جا کے اخلاقی کمالات حاصل کرتے ہیں۔لیکن کوئی مدرسہ ایسا بھی قائم ہوا ہے۔جس میں جہالت بھی سکھلائی جاتی ہو اور آپ بچے کو داخل کر دیں کہ صاحب اس کو جاہل بنا دو۔یا دنیا میں کوئی خانقاہ ایسی ہے کہ آپ بچے کو وہاں داخل کر کے کہیں کہ صاحب! ذرا اسے بداخلاق بنا دیجئے ہم آپ کو تنخواہ دیں گے۔ بداخلاقی کے لئے کوئی خانقاہ نہیں اس لئے کہ بداخلاق تو پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔حاصل کرنے کی چیز علم ہے نہ کہ جہالت وہ تو پہلے سے موجود ہے۔اس لئے سیرت بنانے کے لئے محنت اٹھانی چاہئے علم واخلاق پیدا کرنے کے لئے نہ کہ صورت بنانے کے لئے نہ کھال کو اجلا کرنے کے لئے یہ چیزیں تو من جانب اللہ جسے ملتی ہیں مل جاتی ہیں۔

انسانوں کا جوہر ایک ہے تفوق بلحاظ سیرت ہے جو امر اختیاری ہے......اسی واسطے قرآن کریم نے ایک اصول ارشاد فرمایا ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ ① اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام ان دو سے ساری اولاد چلی۔سب کے سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔کوئی کالا، کوئی گورا، کوئی سانولا، کوئی اجلا، کوئی سیاہ فام، کوئی سفید فام۔یہ آدم کی اولاد ہیں۔خاندان اور قبیلے ہم نے بنائے تاکہ دنیا میں پہچان سکو، کہ یہ فلاں کی اولاد ہے، یہ فلاں کا بیٹا ہے۔تاکہ احکام جاری ہوسکیں کہ یہ فلاں کی اولاد ہے۔لہٰذا میراث کا یہ مستحق ہے، دوسرا نہیں۔وراثت اسے ملے گی، دوسرے کو نہیں ملے گی۔تو خاندانوں سے پہچان اور وراثت ملتی ہے۔خاندان اس لئے نہیں ہیں کہ تم شیخیاں بناؤ کہ میں شیوخ میں سے ہوں اور میں سادات میں سے ہوں اور یہ نیچ ہے، میں اونچ ہوں (مراد اعلیٰ وادنیٰ)، اسلام نے ان سب چیزوں کو مٹا دیا۔

فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔ہاں اونچ نیچ تم میں ہے۔مگر یہ اختیاری ہے جس کا جی چاہے نیچ بن جائے۔﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ ② ”جو تم میں زیادہ متقی ہے وہ اللہ کے ہاں زیادہ باعظمت ہے“۔جس میں تقویٰ اور طہارت کم ہے وہ اللہ کے ہاں کم وقعت ہے اور تقویٰ حاصل کرنا یہ انسان کا اختیاری فعل ہے۔تو متقی بن کے جس کا جی چاہے باعزت بن جائے فاسق وفاجر بن کے جس کا جی چاہے ذلیل بن جائے۔خلقی طور پر جوہر میں فرق نہیں ہے کہ کسی کا جوہر اونچا ہے، کسی کا جوہر نیچا ہے۔فرمایا، ”اَنْتُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ“ ③ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا، لہٰذا تم سب کا جوہر مٹی ہے۔یہ نہیں کہ کوئی انسان سونے

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔

③ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب، ج: ۱۳، ص: ۳۲۰، رقم: ۴۴۵۲. حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۱ ص: ۱۱۶ رقم: ۵۱۱۶.

سے بنا ہے، کوئی مٹی سے بنا ہے اور کوئی لوہے سے بنا ہے اور کوئی پیتل سے، لہٰذا ان کے اندر فرق ہے۔ بلکہ سب مشت خاک ہیں۔ جب ہمارے باپ ہی خاک سے پیدا کیے گئے تو ہم میں چاندی کہاں سے آ جاتی ہے۔ اور مٹی کا کام کیا ہے؟ مٹی جتنا نیچے رہے گی باعظمت رہے گی۔ جتنا اونچا اڑے گی ذلیل ہوگی اگر مٹی اوپر چڑھ کے آنکھوں میں پڑی، تو آپ لعنت بھیجیں گے۔ کپڑوں پر پڑی تو دامن جھٹکیں گے کہ کمبخت کہاں سے آ گئی جب تک جوتیوں میں پامال رہے گی باعظمت رہے گی اور جہاں اس نے اوپر اڑنا شروع کیا، لوگوں نے لعنت بھیجنا شروع کی۔

متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہے...... اس لئے آدمی بھی وہ بہتر ہے جس میں خاکساری عجز و نیاز اور تواضع ہو۔ جو بڑا بنے گا اور ابھر کر شیخی لگائے گا، تو یہ ایسا ہے جیسے مٹی آنکھ میں پڑ گئی۔ تو لوگ لعنت بھیجیں گے جو ابھرے گا اسے پست کر دیں گے، جو شیخی بگھارے گا اسے نیچا دکھایا جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ۔ ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ''① ''جو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اللہ اس کو بلند کرتا ہے'' اور جو خود بلند ہوتا ہے اسے پٹخ دیتا ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست

جو خود ابھرتا ہے اسے پٹخ دیتے ہیں اور جو خود گر جاتا ہے اسے ابھار دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے، نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے شیخی بگھارے اور یوں کہے کہ یا اللہ! میں نے نماز پڑھی میں نے روزہ رکھا، گویا میں نے بہت بڑا کام کیا۔ معاذ اللہ: میں نے گویا آپ کے اوپر کوئی احسان کیا ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کام کیا؟ طاقت تیرے اندر ہم نے دی، ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا، اسباب ہم نے مہیا کیے تو نے کیا کیا؟ اور اگر بندہ نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے سب کچھ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ جتنا میں نے کیا، تیرا فضل و کرم تھا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں تھی۔ تو نے سب کچھ کیا۔ غرض جو یوں کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا اسے بلند کرتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا اور جو یوں کہتا کہ میں نے کیا۔ تو میں کے گلے چھری پھیر دی جاتی ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا یہ تو سب کچھ ہمارا کیا ہوا ہے۔ اصل چیز انسان میں یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میں عاجز ہوں اور ہے بھی بات یہی۔

اس لئے کہ اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ان کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اگر آپ ان کا شکر ادا کریں گے تو وہ بے شمار اور بے حد نہیں ہو سکتا۔ آپ خود محدود ہیں دماغ محدود ہے، عقل اور طاقت محدود ہے۔ محدود ہو اور لامحدود افعال کیسے انجام دے دے؟ تو نعمتیں لامحدود ہیں اور شکر محدود ہے۔ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ آدمی شکر ادا کر کے یوں کہے اے اللہ! میں عاجز ہوں، میں شکر ادا نہیں کر سکتا تیری نعمتیں بے شمار ہیں

① المصنف لابن ابی شیبہ ج: ۸، ص: ۱۷۹، رقم: ۹. حدیث حسن ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب لا فضل لاحد علی احد ج: ۳ ص: ۴۰۴.

اور میرے اندر طاقت کی کمی ہے۔ تو عاجز ہونے کا اظہار کرنا، اپنے عجز کو مان لینا اللہ کے ہاں یہی پسند ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ۔﴿اِعۡمَلُوۡٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا﴾ ① ''اے داؤد! ہمارا شکرادا کرو۔'' داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! بے شک میرا فرض ہے میں شکرادا کروں گا۔ کیونکہ جب آپ کا حکم ہے میں تعمیل کروں گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا شکرادا کروں تو کس طرح کروں؟

اس واسطے کہ جب نعمتوں پر شکرادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکرادا کرنے کی توفیق آپ ہی دیں گے، تو توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس کا شکرادا کرنا چاہئے اور جب اس کا شکرادا کروں گا۔ تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، پھر وہ ایک نعمت ہوگئی۔ تو پہلے اس کا شکرادا کروں تو ہر شکر سے پہلے شکر نکلتا ہے اس لئے میں تو شکر کی ابتداء نہیں کرسکتا۔ شکر کروں تو کس طرح کروں میں تو بالکل عاجز ہوں میرے بس میں نہیں ہے حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔

اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو شکرادا کرنے سے عاجز ہے۔ تو یہی شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنا عجز مان لو، اپنی ناتوانی تسلیم کرو کون ہے جو ہمارا شکرادا کرے اور ہماری طاعت کا حق ادا کردے، فرض ادا کر کے یہ کہنا کہ کچھ نہیں ہوسکا۔ بس یہی ادائیگی شکر ہے کہ اپنی ہار مان لو۔ اس لئے بندے کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں کچھ نہیں کرسکا اور یہ تواضع نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ کچھ بھی نہیں کرسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا فضل اگر دستگیری نہ کرے تو ہماری نجات بھی نہیں ہوسکتی عمل بھی قبول نہیں ہوسکتا۔ یہ ہماری نمازیں ان کے اندر کیا رکھا ہے؟ وسوسے بھرے ہوئے، خیالات بھرے ہوئے۔ نمازیں انبیاء علیہم السلام کی ہیں یا اولیاء اللہ کی۔ مگر یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ وہ قبول کرلے اور اپنے فضل وکرم سے قبول کرتے ہیں ہمارے عمل کے اندر کوئی جان نہیں ہے۔

مدار نجات فضل خداوندی ہے...... اور نجات بھی فضل سے ہے حدیث میں ہے کہ۔ ''لَنۡ یُّنۡجِیَ اَحَدَکُمۡ عَمَلُهٗ'' ''تم میں سے کسی کو بھی تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ کا فضل نہ ہو''۔ ②

شیخ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کتاب آخرت کے احوال پر لکھی ہے اس میں پچھلی امتوں میں سے بنی اسرائیل کا ایک بڑا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک عابد تھا جو رات دن اللہ کی عبادت میں لگا رہتا تھا مگر بہر حال جب آدمی دنیا میں رہتا ہے تو کھانے پکانے کی بھی ضرورت ہے، بیوی بچے ہیں، گھر بھی ہے، رشتہ دار بھی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ان میں بھی مشغولی ہوتی ہے۔ اس عابد کو یہ بھی ناگوار تھا کہ اتنی دیر بھی بیوی بچوں میں کیوں لگے؟ یہ وقت بھی اللہ ہی کی عبادت میں لگنا چاہئے تو اس نے یہ کیا کہ بیوی، بچے، رشتہ دار، مال، جائیداد کو ترک کر کے سمندر کے بیچ میں

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۱۳۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ، ج: ۲۰ ص: ۹۹ رقم: ۵۹۸۲۔

ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا کہ بس اب میں فارغ ہو گیا ہوں اور چوبیس گھنٹے اللہ کے ذکر میں مشغول رہوں گا۔ اس زمانے میں یہ چیز جائز تھی۔ اسلام نے اس چیز کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن پچھلی امتوں میں رہبانیت یعنی گوشہ گیری کرنا اور پہاڑوں پر چلا جانا، یہ جائز تھا۔ یہ بھی پہنچ گیا اور ایسی جگہ پہنچا کوئی آدمی وہاں نہ پہنچ سکے۔ سمندر اور اس کے بیچ میں ایک ٹیلہ تھا۔ اس پر جا کے بیٹھ گیا اور ایک چھپر ڈال لیا اللہ نے فضل کیا۔ اسی پہاڑ کے ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگ آیا اور اس پر میٹھے انار لگنے لگے اور اسی کڑوے پانی کے اندر اس پہاڑ میں سے اللہ نے ایک چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ ایک انار روز کھا لیا، ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے نماز میں مشغول نہ رات کو سونا نہ دن کو کہیں جانا۔ دن بھر نماز، رات بھر نماز پانچ سو برس اس نے اسی طرح گزارے۔ اور یہ عبادت بھی خالص اس لئے کہ وہاں دکھلاوا کس کو ہوتا۔ وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شہرت اور نام آوری مقصود نہیں تھی۔ وہاں کون نام سننے والا تھا۔ تن تنہا یہ بندہ اور اس کا خدا۔ تو خالص عبادت اور پانچ سو برس۔

پانچ سو برس گزر کر جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے نماز پڑھتے ہوئے سجدے کی حالت میں موت دیجئے اور میرے اس بدن کو سجدے کی حالت میں قیامت تک محفوظ رکھئے تاکہ قیامت تک میں تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں کم سے کم سجدہ کرنے والے کی صورت ہی بنی رہے۔ تو میری لاش سجدے کے حالت میں قیامت تک محفوظ رہے۔ یہ دعا قبول ہوگئی۔ اور حدیث میں ہے کہ اس کو عین سجدے کی حالت میں موت آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آج تک اس کی لاش سجدے میں محفوظ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اس کی روح نکل گئی اور بارگاہ حق میں اس کی پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے! میں نے اپنے فضل وکرم سے تجھے بخشا اور تجھے جنت کا مقام رفیع عطاء کیا۔ تو ابدالاباد تک کے لئے اب چین میں رہ۔ اور ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ۔ یہ میرا مقبول بندہ ہے۔ میں نے اس کو اپنے فضل وکرم سے نجات دی۔

اس عابد کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا کہ پانچ سو برس میں نے عبادت کی۔ بیوی، بچے، رشتہ داروں اور مال و دولت میں نے چھوڑا اور اب بھی اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا کم سے کم میری تسلی کے لئے کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دے دی۔ تو نے گھر بار چھوڑا تھا۔ تیرے اس عمل کے طفیل نجات دے دی۔ تو ذرا میرا دل خوش ہو جاتا کہ میرے عمل کی کچھ قدر کی اتنی میں نے محنت کی، ساری دنیا کو میں نے ترک کیا اور اب بھی بخشا تو اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا گویا میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ ایک وسوسہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کی کھٹک کو جانتے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ① ''سینوں میں جو خیالات ہیں ان کو بھی جانتے ہیں''۔

اس لئے ملائکہ سے فرمایا، جنت کی بجائے اس عابد کو جہنم کے راستے پر لے جاؤ۔ جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۴۔

لیکن اتنی دور جہنم سے کھڑا کرو جہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، اس کو وہاں پہنچایا گیا، وہاں جو جہنم کی ایک لو اور لپٹ آئی ہے تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہوگیا اس کو کانٹے چبھنے لگے اور پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ جہنم کا ایک جھونکا لگتے ہی اس کی ساری روح خشک ہوگئی۔ حدیث میں ہے ہے کہ ایک ہاتھ غیب سے نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑتا ہوا گیا کہ اسے اللہ کے بندے یہ پانی مجھے دے۔ یہ آگے گیا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، یہ اور آگے ہوگیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا یہ اور آگے ہوگیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا خدا کے لئے مجھے پانی دے۔

جواب یہ ملا، آواز آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے، مگر اس کی قیمت ہے۔ اس عابد نے پوچھا کیا قیمت ہے؟ کہ پانچ سو برس کی عبادت جو خالص کی ہو۔ وہ اگر قیمت میں ادا کردی جائے تو یہ پانی کا کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ اس نے کہا، میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ اور وہ جلدی سے پیش کردی کٹورا لے کر پیا تو کچھ دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ اس عابد کو لوٹا کے لاؤ اور پھر ہمارے سامنے پیش کرو پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے، تیری پانچ سو برس کی عبادت سے تو ہم چھوٹ گئے۔ تو نے پانچ سو برس عبادت کی تھی۔ اس کی قیمت ایک کٹورا پانی تجھے مل گئی اور وہ قیمت تو نے خود تجویز کی۔ ہم نے نہیں کی تو نے ہی کہا کہ میں پانچ سو برس کی عبادت دیتا ہوں اور کٹورا خریدتا ہوں۔ اس لئے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے ہم ادا ہوئے۔ معاملہ برابر سرابر ہوگیا۔

اب ان لاکھوں کٹوروں پانی کا حساب دے جو دنیا میں تو نے پیئے ان کے بدلے میں کیا کیا عمل لے کر آیا اور وہ جو دنیا میں تو نے لاتعداد اناروں کے دانے کھائے ہیں۔ ایک ایک دانے کا حساب دے ان کے بدلے میں کتنے سجدے، کتنے رکوع کئے کتنی عبادتیں کیں؟ اور دانہ پانی تو الگ ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں روشنی تھی جس سے تو صورتیں دیکھتا تھا، ایک ایک تار نگاہ کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا ہے؟ اور نگاہ تو الگ ہے۔ یہ جو تو سانس لیتا تھا۔ جس کے ذریعے زندگی قائم تھی۔ ایک ایک سانس کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو بدن میں ہم نے جان دی تھی۔ جس نے پانچ سو برس زندگی رکھی اور تو نے عبادت کی۔ اس طاقت کا حساب دے۔ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

اور وہ جو چشمہ اور انار کا درخت تیرے لئے رکھا تھا اور ہواؤں کو تیری طرف متوجہ کیا جس سے تو سانس لیتا تھا۔ اور جو ہم نے اپنے سورج کو گرمی بخشی جس نے تجھ تک گرمی پہنچائی، جس سے تیرا بدن قائم رہا۔ ان سب چیزوں کا حساب دے۔ ہماری دنیا کے ذرے ذرے سے جو فائدہ اٹھایا، اب سب کا حساب دے۔ کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

عابد بے چارہ تھرا گیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ! بے شک نجات تیرے فضل ہی سے ہوتی ہے۔

بندے کے عمل سے نہیں ہوتی۔ عمل کی تو کل قیمت یہ ہے کہ پانچ سو برس کے عمل کے بدلے ایک کٹورا پانی مل گیا۔ اور وہ بھی آپ نے فضل ہی سے دے دیا اگر آپ یوں فرماتے کہ کٹورا اسے ملے گا۔ جس نے ایک لاکھ برس عبادت کی ہے۔ میں تو اس سے بھی محروم رہ جاتا۔ تو نے قیمت اتنی رکھی جو میں ادا کر سکا یہ بھی تیرا ہی فضل ہے۔ اس لئے نجات فضل سے ہوتی ہے، عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل علامت فضل ہے...... مگر بھئی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے ہی نماز تو صفر اور گھر بیٹھ گئے کہ جب نجات فضل سے ہوگی، پھر عمل کی محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر فضل ہونا ہوگا، ہو جائے گا اور جس پر نہیں ہوگا نہیں ہوگا ہم کیوں محنت اٹھائیں؟ یہ خیال مت کرنا۔ بے شک فضل سے ہی نجات ہوگی لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ ہم پر فضل متوجہ ہے بھی یا نہیں؟ اس کی علامت عمل ہے۔ عمل جو کر رہے ہیں وہ اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہے عمل کو چھوڑ دینا اس کی علامت ہوگی کہ فضل متوجہ نہیں ہے۔ دنیا میں جب فضل متوجہ ہوتا ہے، تو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جب فضل متوجہ ہوگا تو جنتیوں کی صورت میں صلہ ملے گا یہاں بھی فضل، وہاں بھی فضل ہی کام کرے گا۔

جنت عمل کا نہیں ایمان کا صِلہ ہے...... البتہ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو کہ جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے جس سے ایمان پہچان لیا جائے ورنہ اصل میں ایمان کا بدلہ جنت ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ اگر سونا خریدنے کے لئے کسی صراف کی دوکان پر جائیں اور ایک ہزار روپے کا سونا آپ کو خریدنا ہے تو آپ یہ نہیں کرتے کہ آپ نے ہزار روپیہ دیا، اس نے سونا دے دیا اور آپ لے کے چلے آئے۔ پہلے اسے پرکھتے ہیں کہ اصل بھی ہے یا نہیں؟ اس میں کھوٹ ملا ہوا تو نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسوٹی ایک پتھر ہوتا ہے، اس پر گھسا کر دیکھتے ہیں۔ اگر اس پر سفید چمک دار لکیریں پڑیں، یہ اس کی علامت ہوئی کہ سونا کھرا ہے تو آپ ہزار روپے دیدیں گے، سونا لے لیں گے اور اگر میلی اور گھٹیا لے رنگ کی لکریں پڑیں تو آپ سمجھیں گے کہ سونا کھوٹا ہے۔ آپ نہیں لیں گے۔

یہ جو آپ نے سونا خریدا اور صراف کو ہزار روپیہ دیا۔ یہ ہزار روپیہ کیا ان لکیروں کی قیمت تھی۔ جو پتھر پر کھینچی گئیں یا سونے کی قیمت ہے؟۔ یہ سونے کی قیمت تھی، لکیروں کی نہیں تھی۔ وہ تو علامت تھیں، جن سے پہچانا گیا کہ سونا کھرا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت جو ملے گی یہ ایمان کا بدلہ ہوگا، عمل کا نہیں۔ عمل کی لکیریں ہوں گی جن سے ایمان کے کھرے کھوٹے ہونے کو پرکھا جائے گا عمل اچھے ہیں، تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان بھی اچھا تھا۔ لہٰذا اس ایمان کی قیمت جنت ادا کر دی جائے گی۔ اگر عمل برے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان میں کمی تھی، کھوٹ تھا۔ لہٰذا بدلہ پورا نہیں مل سکتا اس لئے بدلہ جو ملے گا وہ عمل کا نہیں، ایمان کا ملے گا ایمان کو پہچاننے کے لئے عمل کو دیکھا جائے گا۔

اگر عمل کا بدلہ ہوتا، تو میں نے اور آپ نے پچاس برس مثلاً عمل کیا۔ تو بس پچاس برس جنت میں رہتے، اس کے بعد کان سے پکڑ کے باہر نکال دیئے جاتے کہ جاؤ باہر، بدلہ ہوگیا۔ جنت میں جو آپ ابدالآباد رہیں گے یہ عمل کا بدلہ نہیں اس لئے کہ عمل محدود وقت تک انجام دیا تھا۔ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو عمر بھر قائم رہے گا۔ اور جب آدمی مرتا ہے تو یہ عزم لے کے جاتا ہے کہ اگر ایک کروڑ برس بھی زندہ رہوں گا، تب بھی اس ایمان کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو ایماندار ہی ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایمان چونکہ ابدی چیز ہے۔ اس لئے بدلہ بھی ابدی ملا عمل ابدی چیز نہیں ہے۔ اس لئے عمل کا بدلہ نہیں ہوتا اس کو بطور علامت دیکھتے ہیں۔ ظاہر میں بے شک عمل سے جنت ملی، مگر ایمان نہ ہو، کیا پھر بھی جنت مل جائے گی؟ نہیں ملتی معلوم ہوا عمل سے نہیں ملتی، ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ہو، تبھی عمل بھی معتبر ہوتا ہے اور ایمان کی پرکھ عمل سے ہی ہوتی ہے۔

اس واسطے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ فضل سے نجات ہوگی۔ لیکن عمل کرنا اس کی علامت ہے۔ اس لئے عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال شکل وصورت سے نہیں ہے، بلکہ سیرت سے ہے اور سیرت کا تعلق علم سے، اخلاق سے، اعمال صالحہ سے، ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے۔ اس سے سیرت بنتی ہے۔ یہی اصل مقصود ہے۔ اسے بنانے کی ضرورت ہے۔

دلائل قدرت..... اس کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دلائل قائم کئے ہیں۔ اپنے وجود کو منوانے اور اپنے کمالات کو بتلانے کے لئے دلائل قائم کئے ہیں اور وہ دلائل فلسفیانہ نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا کی چیزیں پیش کی ہیں کہ ان میں غور کرو، تاکہ اللہ کا وجود تمہاری سمجھ میں آجائے۔ یہ جو آیت میں نے پڑھی یہ بھی اللہ کے وجود کی مستقل دلیل ہے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ (1) ”اے مخاطب! تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا“۔

پانی کی طبیعت یہ ہے کے نیچے کی طرف جائے۔ اسے اوپر چڑھا کے کون لے گیا پانی نیچے سے ابلنا چاہئے۔ زبردستی آپ نکالتے ہیں۔ ورنہ اسے نیچے جانا چاہئے۔ یہ ہزاروں میل کی مسافت پر اوپر چڑھا کر کون لے گیا کہ وہاں سے پانی کو گرانا شروع کیا۔ تو پہلی دلیل تو یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ پانی کو نہ ہم بادلوں پر لے کر گئے نہ ہمارے آباؤ اجداد۔ کوئی بڑی ذات ہے جس کے حکم سے وہاں پہنچ گیا اور طبیعت کے خلاف اسے وہاں جانے پر مجبور کیا۔ اس لئے اللہ کا وجود پہلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا۔

پانی آکر زمین میں جذب ہوا، پھر زمین سے پھل، غلے، ترکاریاں اور سبزیاں اگنا شروع ہوئیں۔ ﴿فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا﴾ (2) ہم نے اس کے ذریعے پھل نکالے، ان پھلوں کے نکالنے والا کون ہے؟

(1) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷. (2) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷.

کاشت کار نے اگر بیج ڈال بھی دیا، تو منوں مٹی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے کونپل کو نکال رہا ہے؟ ہم نے نکالی؟ یا ہمارے آباؤ اجداد نکالنے گئے تھے؟ کاشت کار زیادہ سے زیادہ بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ خبر نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ زمین کے اندر اس بیج کو توڑنا پھوڑنا، اس میں سے کونپل بنا کے نکال دینا، یہ اللہ ہی کا کام ہے۔ پھر یہ کونپل ایسی نرم و نازک چیز ہے کہ آدمی اسے انگلیوں سے مسل دے، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن طاقت ورا تنی ہے کہ زمین کو پھاڑ کر نکل رہی ہے۔ تو اس میں یہ طاقت کس نے پیدا کر دی کہ وہ منوں مٹی کو چیر پھاڑ کر اوپر آ گئی۔ جب کہ اس کی طبیعت نیچے جانے کی تھی۔ گھاس کو آپ اوپر کو اچھالئے اوپر نہیں جائے گی نیچے کو آئے گی۔ یہ اس کی طبیعت کے خلاف نیچے سے اوپر کی طرف چڑھانے والا کون ہے؟

تو پانی کو نیچے اتارنا، اوپر چڑھانا، پھر زمین کے اندر بیج میں طاقت پیدا کرنا کہ بیج پھٹا، اس میں سے کونپل نکلی۔ منوں مٹی کے اندر سے اس نے زمین کو چاک کیا اور اوپر آ کے اپنا چہرہ دکھلایا کہ میں آ گئی ہوں۔ یہ سارے کام کرنے والے، بجز حق تعالیٰ کے اور کون ہیں؟

اور آگے دلیل یہ بیان کی کہ۔ ﴿مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا﴾ ① ہر پھل کے رنگ الگ سیب دیکھو اور رنگ، آم دیکھو اور رنگ، انگور دیکھو اور رنگ بلکہ اب تو ہر نوع کے اندر خدا جانے کتنی اقسام اور کتنے رنگ ہیں۔ سیب کی بہت سی اقسام اور بہت الوان۔ اس طرح آم کی بے شمار اقسام۔ انگور کی بھی اقسام ہیں رنگ بھی مختلف ہیں۔ حالانکہ جنس ایک ہے اور مزے مختلف ہیں۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ② حالانکہ سب کی اصل زمین ہے۔ زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں اور رنگ سب کے مختلف۔ اگر زمین کی طبیعت رنگ بناتی تو طبیعت تو ایک رفتار پر چلا کرتی ہے۔ یہ مختلف رفتار سے کام کوئی پھل، کوئی پھول، کوئی، پیلا، کوئی نیلا، کوئی سرخ، کوئی کالا۔ یہ بجز حق تعالیٰ کے کون کر سکتا ہے؟ اور فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ یہ سلسلہ صرف پھلوں ہی کا نہیں بلکہ ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُوْدٌ﴾ ③ پہاڑوں کو دیکھو تو کوئی سفید، کوئی نیلے رنگ کا، کوئی کالے رنگ کا، کوئی سبز و سرخ رنگ کا۔

یہ جو بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے آیت پڑھی۔ وہ آج کے سفر سے یاد تازہ ہوئی پہاڑوں کے بیچ میں سے نکل کر آ رہے تھے کہ کوئی پہاڑ نیلے رنگ کا سامنے آ گیا، کسی میں سرخی جھلک رہی ہے، کسی میں گلابی رنگ، کسی میں کالی مٹی، کسی میں سے کوئلہ نکل رہا ہے۔ تو پہاڑوں کے اتنے مختلف رنگ۔ اگر یہ پہاڑ کی خاصیت ہوتی تو ایک ہی رنگ کے پہاڑ بنتے۔ یہ رنگ کیسے پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فاعلِ مختار ہے۔ جو ان کے اندر اپنی مرضی سے رنگ بھرتا ہے۔ خود پہاڑ اپنی طبیعت سے پیدا نہیں کرتے۔ پھر کالے بھی معمولی رنگ کے نہیں، بلکہ فرمایا،

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۴۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔

﴿وَغَرَابِيبُ سُودٌ﴾ ① گاڑھے رنگ کے کالے اَسْوَدُ غَارِبٌ اسے کہتے ہیں، جس کے اندر بڑی گہری سیاہی ہو، دولفظ ہیں، غَرَابِيبُ اور سُوْدٌ یعنی انتہا کی سیاہی۔ تو پہاڑوں سے کوئلہ نکلتا ہے۔ جو انتہائی سیاہی ہے۔

پھر فرماتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو دیکھو تو ان میں مختلف رنگ ہیں۔ عربوں کو دیکھو تو سرخ رنگ، حبشیوں کو دیکھو تو کالے رنگ کے، تتروں میں سیاہ رنگ کے، چین اور جاپان میں زرد اور پیلے رنگ کے۔ ہندوستان میں دیکھو تو بوقلموں۔ کہیں کالے، گورے، سب گڈمڈ مختلف رنگوں کے انسان ملیں گے۔ اگر انسان کی طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ سفید ہو تو پھر کچھ کالے اور سفید کیوں ہو گئے؟ طبیعت سب کی انسان ہی ہے۔ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھرنے والا موجود ہے، کوئی خالق موجود ہے۔ جیسا اس نے چاہا ویسا کر دیا۔ اور فرماتے ہیں انسانوں ہی کی کیا بات ہے۔ چوپایوں کو دیکھو، ان میں بھی رنگ مختلف ہیں۔ ہزاروں چوپائے مختلف رنگ کے ہیں۔ شیر زرد رنگ کا، ہرن سیاہ رنگ کا، ہرنی پیلے رنگ کی، بگلا سفید، کوا سیاہ، تیتر سبز، مور ست رنگا، ہر جانور درندے، چرندے، پرندے سب کے رنگ الگ اور رنگوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اسی طرح ایک ہی نوع میں مختلف رنگ ہیں۔ گائے میں سفید رنگ کی بھی کالی بھی، سرخ رنگ کی بھی اور سفید بھی اور چت کبری بھی ہوتی ہے۔ بکریوں اور اونٹوں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر یہ حیوانی طبیعت کا تقاضا تھا، ایک رنگ ہوتا۔ یہ دس رنگ کیوں ہیں؟ پہاڑ کی طبیعت کا تقاضا ایک رنگ کا تھا، یہ پچاس رنگ کیوں ہیں؟ بجز اس کے کہ اس کو مانا جائے کہ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنے والی ذات وہ ہے، جس کو ہمہ قسم کے اختیارات حاصل ہیں کہ جس کو جیسا چاہے رنگ دے دے۔ جس کو جیسا چاہے بنا دے۔ تو اللہ کی شان ان تمام چیزوں کے اختلاف کو دیکھ کر ثابت ہوئی۔ پھر انسانوں میں اختلاف ہے، چہرے کا اختلاف، صورتوں کا اختلاف۔ یعنی کروڑوں انسان آج بھی موجود ہیں۔ اربوں گزر گئے ہیں، اربوں آنے والے ہیں۔ ایک کا نقشہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ اللہ کا اتنا لا محدود عمل ہے کہ ہر انسان کی شکل جدا کر دی۔

پھر فرق پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی کی ناک وہاں لگا دیتے، کسی کے یہاں لگا دیتے، کسی کے کان آگے ہوتے، کسی کے کان پیچھے ہوتے۔ کان، ناک وہیں ہیں جہاں ہونے چاہئیں، آنکھیں وہیں ہیں۔ اس کے باوجود فرق موجود ہے۔ غرض رنگوں کا اختلاف الگ، صورتوں اور نقشوں کا اختلاف الگ ہے۔ پھر زبانوں کا اختلاف الگ ہے۔ ایک جانور مثلاً طوطا ہے۔ اس کو دیکھیں عرب کا ہو، ہندوستان کا ہو، ترکستان کا ہو، کسی ملک کا ہو اس کی زبان ایک ہی ہوگی یا بیل ہے ہندو کا ہو، سندھی کا ہو، ایک ہی بول بولے گا۔ مرغ ہے وہ بھی ایک طرح بولے گا۔ لیکن انسان ہے کہ بھانت بھانت کی بولی بولتا ہے۔ مشرق، امریکہ، افریقہ، ہندوستان، انگلستان، جرمنی، فرانسیسی وغیرہ سب کی الگ الگ زبان ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں اس وقت اصولی طور پر ایک سو بیس

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔

زبانیں بولی جارہی ہیں۔ ہر صوبے کی زبان الگ الگ ہے۔ پنجابی، سندھی، مدراسی، مرادآبادی، بلوچستانی وغیرہ۔ ہر ایک کی زبان الگ۔

پھر ہر زبان میں فرق ہے۔ دہلی والوں کی اردو اور ہے، لکھنو والوں کی اور ہے، بہار کی اور طرح کی، یوپی کی اور طرح کی۔ انسان عجب چیز ہے کہ زبانوں کا اختلاف بے حد و بے حساب ہے۔ دنیا کی زبانیں گنیں تو ہزاروں کی تعداد نکلے گی۔ اگر انسان کی جبلّت کا تقاضا عربی وغیرہ تھا۔ سارے انسانوں کی ایک ہی زبان ہوتی۔ یہ کسی کی عربی، کسی کی ترکی۔ بتلانے والے نے بتلایا۔ یہ میری قدرت ہے کہ میں قلوب کو ہدایت دیتا ہوں کہ اس طرح بولو تم تھوڑا ہی زبانیں سکھلاتے ہو۔ ماں کے پیٹ سے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ماں باپ ایک ایک لفظ تھوڑا ہی سکھلاتے ہیں۔ وہ خود ہی بولتا ہوا اٹھتا ہے تو یہ کون ہے جو اندر تعلیم دیتا ہے غرض اختلاف اَلْسِنَہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی مستقل دلیل ہے۔

اس لئے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ﴾ ① اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے زمین وآسمان کی بناوٹ ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ مگر ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ② اس میں قدرت کی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں، تفکر کرتے ہیں، جو یہ سوچ بچار کرتے ہیں کہ آخر یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو کائنات کا اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو کائنات کا اختلاف یہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی ایک مستقل دلیل ہے۔ زبان، صورت، رنگ، پہاڑ، جانور، ہر ہر چیز میں اختلاف ہے۔ ایک ہی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ انسان اگر کچھ بنانے بیٹھے گا۔ تو وہ بھی یہ نہیں کہے گا کہ ایک رنگ کی چیز ہو۔ وہ بھی یہ چاہے گا کہ دس قسم کی چیزیں ہوں۔ یہ دس جذبات کس نے پیدا کر دیئے طبیعت کا تقاضا تھا کہ ایک ہی وضع کی چیز بنانا۔ ایک کا لباس ایسا ہو، ایک کا ایسا۔ تو میں روز ایک سے ایک فیشن نکالتی رہتی ہیں۔ آج جو فیشن ہے وہ کل پرانا ہو جائے گا۔ کل اور فیشن آ جائے گا۔ اگلے دن اور خدا جانے سو برس میں کتنے فیشن بن چکے ہیں، کتنے بدل چکے ہیں۔ آخر انسان میں اگر یہ جبلّت اور طبیعت کا تقاضا ہے تو وہ ایک شکل پر آتی۔ ہر چیز میں اختلاف ہے، عقلوں میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف پیدا کرنے والے اللہ ہیں۔ معلوم ہوا طبیعت کا تقاضا نہیں۔ کسی فاعل مختار کے ارادے کا یہ فعل ہے۔ اس نے جیسا ارادہ کیا ویسا بنا دیا۔ اس لئے اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو اپنے کو دیکھ لے، جب پہچان جائے گا۔ پہاڑ پہ نگاہ ڈالے تو پہچان جائے گا۔ غرض جس چیز پہ نگاہ ڈالے گا، اللہ کا وجود اس سے نمایاں ہوگا۔ اور اگر فکر نہ کرے تو انبیاء بھی تعلیم دیں جب بھی نہیں مانے گا اور ماننا چاہے تو اللہ نے ایک ایک چیز کو واعظ و مبلغ اور مذکر بنا دیا۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱۔

بہرحال یہ آیت میں نے اس لئے تلاوت کی تھی کہ اس آیت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے وجود کو منوایا ہے اور دلیلیں ایسی بیان کی ہیں، جو فلسفیانہ انداز کی نہیں ہیں۔ ایسی ہیں کہ گاؤں کا رہنے والا اور شہر کا رہنے والا بھی سمجھ جائے۔ قرآن کریم سارے انسانوں کے لئے کتاب ہے۔ اس میں ایسے دلائل ہونے چاہییں، جس کو عوام وخواص یکساں سمجھ سکیں اور اگر فلسفیوں کی طرح شکل اول بنائی جاتی، مقدمات لگائے جاتے اور صغریٰ وکبریٰ ملتا، پھر نتیجہ نکلتا۔ تو بے چارہ گنوار دیہاتی ان کو کیا سمجھتا؟ اس لئے ایسے دلائل سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا گیا کہ کم فہم سے کم فہم اور بے پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ سکے۔

بہرحال یہ آیت میں نے پڑھی تھی اس کے متعلق چند باتیں میں نے عرض کیں اللہ تعالیٰ ہمیں فہم سلیم عطا فرما دے۔ ہمارے لئے دنیا وآخرت میں بھلائی مقدر فرمائے۔ اپنی معرفت اور پہچان کی، علم وعمل کی توفیق عطا فرمائے۔ حق تعالیٰ اپنے رسول پاکؐ کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرما دے۔ دین کو ہمارا شعار بنائے۔ دنیا وآخرت دونوں ہماری درست فرما دے۔ آخرت میں بلاحساب ہمیں جنت میں داخل فرما دے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور معیت نصیب فرما دے۔ آمین

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

ذکراللہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ:......... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ، وَلَذِكْرُاللّٰهِ اَكْبَرُ ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگانِ محترم !...... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت آپ حضرات کے سامنے میں نے تلاوت کی۔ اس وقت پوری آیت کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آیت کے صرف ایک جز کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور وہ درحقیقت ساری شریعت کی روح ہے۔ اور وہ جز ﴿وَلَذِكْرُاللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② ہے۔ ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ نماز آدمی کو بے حیائی کی باتوں سے بچاتی ہے برائیوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔ نماز فحش اور منکرات سے کس طرح بچاتی ہے؟ اس وقت اس کے بارے میں کلام نہیں کرنا بلکہ ﴿وَلَذِكْرُاللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ③ کے بارے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں۔

اعمالِ شرعیہ کی روح...... اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکرُ اللہ ہی سب سے زیادہ اعمال میں افضل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔ بلکہ عمل مقبول ہوتا ہے تو ذکرُ اللہ ہی کی وجہ سے مقبول ہوتا ہے۔ اگر نماز میں ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی نہ ہو۔ (۲۸۔ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) نماز بے روح رہ جائے گی، روزے میں ذکرُ اللہ نہ ہو روزہ بے روح رہ جائے گا، زکوٰۃ میں ذکر اللہ نہ ہو زکوٰۃ بے روح ہو جاتی ہے۔ سارے اعمالِ شرعیّہ کی روح فی الحقیقت ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔ اس لئے اس پر کلام کرنا گویا ساری شریعت پر اور شریعت کے سارے احکام پر کلام کرنا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس آیت کا انتخاب کیا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت ، الآیۃ: ۴۵.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

زندگی روح سے ہے محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک کہ بدن کے اندر روح نہ ہو۔ روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مُردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اسے باقی رکھا جائے۔ بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں۔ یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے اسے جلد سے جلد اپنے سے دور کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا تعلق اور محبت در حقیقت بدن سے نہیں بلکہ بدن کے اندر جو روح سمائی ہوئی ہے اس سے تعلق ہوتا ہے وہ نکل گئی تو تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے کسی شے کے لئے بقا نہیں ہے۔

جس طرح سے ان مادی چیزوں میں روح سے ہی بقا ہے۔ اسی طرح سے اعمالِ شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکرُ اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کے مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے۔ اگر نماز میں یادِ خداوندی کی بجائے غفلت آ جائے، نماز ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ ① ”نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے“۔ جب ذکر نہ رہا، روح نماز ختم ہو گئی۔ اب محض ایک اُٹھک بیٹھک یا ایک بدنی ورزش ہے جس کی کوئی قدر و قیمت عند اللہ نہیں ہو گی۔ اس طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر، تلاوت اور تراویح نہ ہو تو روزہ بھی ایک فاقہ ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ نیت کے سچے اور اس میں یادِ خداوندی ہونے سے روزہ زندہ ہو جاتا ہے اس کو عبادت کہتے ہیں یہ روح نکل جائے عبادت کی بجائے عادت ہو جاتی ہے۔ تو عادت اور عبادت میں فرق یہی ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتی ہے۔ جس میں اللہ کی یاد نہیں ہوتی اگر یاد ہوتی بھی ہے تو اپنے نفس کی ہوتی ہے۔ اگر بلا نیت کے سارا دن کھانا نہ کھائیں، پانی نہ پئیں، بیوی کی طرف رخ کر کے بھی نہ دیکھیں۔ اسے فاقہ کہیں گے اور نیت کے ساتھ اور یادِ خداوندی کے ساتھ کریں تو اسی کو روزہ کہیں گے۔ اگر حج میں ذکرُ اللہ نہ ہو اور نیت صحیح نہ ہو تو حج نہیں بلکہ سیر و سیاحت ہے۔ اگر اسی میں سچی نیت آ جائے۔ وہ حج بن جاتا ہے تو عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے۔ کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے اور عبادت میں جذبہ یادِ حق ہے۔ جس سے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حاصل یہ نکلا جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے۔ اس طرح سے پوری شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے اگر دنیا میں سے روح نکل جائے تو دنیا ڈھانچہ بن جائے گی۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی عبادت نہیں رہے گی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ“ ② قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی۔ جب تک اس دنیا میں ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان آخر الزمان، ج: ۱، ص: ۳۵۴، رقم: ۲۱۱۔

قیامت قائم کردی جائے گی۔

قیامت کے معنی درحقیقت عالم کی موت کے ہیں۔ جیسا کہ مرنے کے بعد بدن پھول پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد آسمانوں کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جائیں گے۔ زمینیں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، پہاڑ گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے پانی مٹی میں اور مٹی پانی میں، سارا کارخانہ گڑبڑ اور درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ قیامت ہے۔ تو حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے جب ایک بھی نہیں رہے گا۔ جبھی عالم کو موت آ جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی روح ذکرُ اللہ ہے۔ تو پوری دنیا کی زندگی اور روح درحقیقت یادِ خداوندی ہے۔

دنیا کے ایک ایک جز میں ذکرُ اللہ سے زندگی ہے...... یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے ایک ایک جز میں زندگی کے آثار ذکرُ اللہ سے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ جب تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ تو وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر جاتا ہے جہاں پانی ٹھہرا تو چند دن کے بعد خراب ہو جاتا ہے، میل کچیل بڑھ جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی میں میل کچیل قائم نہیں ہوتی۔ اس لئے بہتا ہوا پانی تھوڑا ہو یا زیادہ، اس سے وضو جائز ہے۔ اگر اس میں کوئی گندگی بھی گر جائے اس کی پاکی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس میں تسبیح اور ذکرُ اللہ جاری ہے۔ وہ اسے ناپاک نہیں ہونے دیتا اور ٹھہرا ہوا پانی اگر مقدار میں کم ہے اور اس میں کوئی گندگی گر جائے وہ پورا پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس سے وضو وغیرہ نہیں کر سکتے۔ گندگی کیوں پھیلی؟ اس لئے کہ اس کے اندر وہ روح ختم ہو گئی۔ تو چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور ٹھہرا ہوا پانی تسبیح سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہی اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ درخت کی ٹہنیاں جب تک سرسبز ہیں، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح بند ہوئی جب ہی اس پر زردی آتی ہے خشک ہو جاتی ہیں۔ وہی جلانے کے قابل بن جاتی ہیں۔ گویا جہاں ان سے ذکر کی روح نکلی تو پھر اسے جلا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے حدیث میں فرمایا گیا کہ نیا کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے جہاں اس کی تسبیح بند ہوئی جبھی اس پر میل کچیل آنا شروع ہو جاتا ہے اور تسبیح ختم ہوتے ہی جہاں وہ میلا بنا، پھر پہننے کے قابل نہیں رہا، آپ اسے اُتار کر دھوبی کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ جب تک دُھل کر نہ آئے آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ اسے بدن کے قریب بھی کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے کی صفائی اور ستھرائی ذکرُ اللہ سے قائم ہے۔ ذکر کے بند ہوتے ہی اس میں میل کچیل آنا شروع ہو جاتی ہے۔

انسان کی صفائی بھی فی الحقیقت یادِ خداوندی سے ہے۔ جب اس میں ذکر اور یادِ حق باقی نہیں رہے۔ تب انسان کے قلب میں میل کچیل گندگی اور نجاست آنی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں یادِ الٰہی ختم ہوئی انسان میلا ہو جاتا ہے اور میلا انسان میلے کپڑے کی طرح ہے۔ وہ دھکے دینے کے قابل ہو جاتا ہے اسے کوئی اہل اللہ میں سے پسند نہیں کرتا۔ روح کے اندر جتنا ذکر زیادہ رہے گا، اتنی صفائی زیادہ رہے گی جتنا ذکر کم ہو جائے گا۔ اتنی ہی کدورت

پیدا ہوگی۔ جتنی کدورت اور ظلمت پیدا ہوگی۔ گناہ معصیت اور نافرمانی کرنے کے جذبات پیدا ہوں گے۔ شرک وبدعت کے جذبات اُبھریں گے جب تک ذکر قائم ہے اور روح کے اندر تازگی ہے، بدن تازہ ہے۔ نفس کے اندر صفائی ہے تو نورانیت پیدا ہوتی ہے اس سے نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان ہو یا دنیا کا کوئی بھی جز ہو وہ جبھی تک زندہ ہے جب تک اس میں یادِ خداوندی ہے۔ ذکر نہ ہو تو عالم کے لئے فنا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔

زراعت وتجارت سے نہیں دنیا دیانت سے قائم ہے...... دنیا کے بہت سے طبقات کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مثلاً ایک کاشتکار کا دعویٰ ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے اس واسطے کہ دنیا کھانے پینے سے قائم ہے۔ میں غلہ اُگاتا ہوں، گیہوں، چاول اور چنا سب میری بدولت اگتا ہے میں اگر اگانا چھوڑ دوں۔ کھانے کو کچھ نہ ملے تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ دنیا کی زندگی میرے دم سے ہے۔

اگر کاشت کار اور زمیندار دنیا میں نہ ہوں تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ تاجر نے آ کر کہا کہ دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے، اس لئے کہ تو تو کچی اجناس اُگاتا ہے۔ ان جنسوں کو اگر میں بنا سنوار کر دکانوں پر نہ سجاؤں۔ کپڑا، غلہ اور پھل، پھول سپلائی نہ کروں۔ دنیا بھوکی مر جائے گی۔ تو میری بدولت دنیا قائم ہے، نہ کہ تیری بدولت۔ تو نے غلے کا انبار لگا دیا۔ مگر ڈھیر سے کیا ہوتا ہے۔ بکے گا تو میری دکان پر آ کر۔ تو نے روئی اُگا دی۔ لیکن روئی کے گالے اگر پڑے رہیں تو کیا ہوتا ہے؟ کپڑا بنا کر میں نے اپنی دکان پر رکھا تو دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ تیرا دعوٰی غلط ہے۔ ان دونوں کے بالمقابل ایک سیاسی اور حکومت کا آدمی ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم دونوں غلط کہتے ہو دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ اس لئے کہ میں نے دنیا کا نظام قائم کر کے اس میں امن قائم کر رکھا ہے۔ اگر میں امن قائم نہ کروں، وہ آپا دھاپی پڑے کہ کاشت کار تاجر کو ختم کر دے اور تاجر کاشتکار کو، سرمایہ دار مزدور کو مار ڈالے اور مزدور سرمایہ دار کو۔ تاجر کاشتکار کے اور کاشت کار تاجر کی دکان پر ڈاکے مارے۔ دنیا ساری گڑ بڑ ہو جائے۔

میں نے اپنے عدل وانصاف سے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ میں کرسی سیاست پر بیٹھ کر دنیا کو تھام رہا ہوں تو کاشت کار، تاجر اور زمیندار نہیں سنبھال رہا میں سنبھال رہا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم سارے غلط کہتے ہو، دنیا کو سنبھالنے والا تو ہمارا نام لینے والا ہے۔ جو ہماری یاد میں مصروف ہے۔ اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ نہ کہ تاجر، کاشت کار، زمیندار اور سیاسی آدمی نے۔ ہم نے اور ہمارے نام لینے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔ غور کریں تو اللہ ہی کا دعویٰ سچا ہے۔ باقی سب کے دعوے غلط ہیں۔ اگر ایک دیندار کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے تو اس نے کب تک سنبھال رکھا ہے؟ اگر کاشت کار دیانت داری سے کام کرتا ہے نہ وہ دوسرے کی زمین پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ ایک انچ زمین دوسرے کی نہیں لینا چاہتا۔ جتنا غلہ اس کے ہاں اگتا ہے۔ اسی کو وہ بازار میں لے جا کر بیچتا ہے۔ دوسروں کے غلے چرا کر اپنے غلے میں ملا کر نہیں لے جاتا۔

تو جب تک وہ دین و دیانت سے کام کر رہا ہے۔اس وقت تک اس کی زمینداری چل رہی ہے اور اگر بد دیانتی اور ظلم وستم پر آ جائے۔لوگوں کی زمینوں پر چھاپے مارے۔لوگوں کے غلوں میں اپنا غلہ ڈال کر ان کے غلے کھینچ لائے۔اگلے دن اس پر مقدمہ قائم ہو جائے گا۔تو نہ اس کی کاشت کاری باقی رہے گی، نہ زمینداری نہ یہ دنیا کو سنبھال سکے گا۔تو معلوم ہوا کہ زمیندار نے اگر سنبھال رکھا ہے تو دیانت کی وجہ سے، دیانتداری ہی اللہ کا ذکر ہے۔تو بات یہ نکل آئی کہ ذکر کرنے والے نے دنیا کو سنبھالا، دیانت دار نے سنبھالا، بد دیانت نے نہیں سنبھالا۔

ایک تاجر اگر کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھالا۔وہ اس وقت صحیح ہے کہ وہ عدل وانصاف کے ساتھ تجارت کرتا ہو۔اصول تجارت کا پابند ہو۔اس کا جذبہ یہ ہو کہ نہ میرے گاہک کو نقصان پہنچے نہ مجھے۔وہ ایک منٹ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ یہ گاہک آ رہا ہے تو لاؤ اس کی کھال بھی اُتار لوں اور اس کو بالکل گھول کر کھا جاؤں۔یہ اس کا جذبہ نہیں ہے۔وہ کہتا ہے کہ میرے ہاں سے یہ مال لے جائے تو میری بھی اس کے دل میں یاد رہے میں اس کو اچھی چیز دوں اتنی قیمت میں دوں جتنی مناسب ہے۔نہ غبن فاحش کروں، نہ بلیک مارکیٹنگ کروں۔بلکہ دیانت داری سے اُصولی طور پر واجبی قیمت وصول کروں۔جس کے اندر کوئی دَغا وغیرہ نہ ہو۔حدیث میں فرمایا گیا ہے۔"غَفَرَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ كَانَ سَهْلًا اِذَا اشْتَرٰى سَهْلًا وَبَاعَ سَهْلًا" ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیانت دار تاجر کو دعا دی ہے اور فرمایا، اللہ اس شخص کی مغفرت وبخشش کرے جو سہولت کے ساتھ بیچتا اور خریدتا ہے۔انصاف کے ساتھ قیمت لگاتا ہے۔گاہکوں کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کرتا ہے۔تنگی اور سختی نہیں کرتا۔یہ نہیں ہے کہ جب مال خریدے تو قیمت کم سے کم لگائے کہ میں اسے لوٹ لوں اور جب بیچنے پہ آئے تو ساٹھ گنی لگائے کہ مجھے زیادہ ملے۔ہر صورت میں اپنا نفع چاہتا ہے۔ایسا نہیں ہے بلکہ بیچتے وقت اچھا مال دیتا ہے اور قیمت کفایت سے لیتا ہے اور خریدتے وقت کوئی کمی نہیں کرتا تا کہ بائع کو نقصان نہ پہنچے اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے یہ تاجر کون ہے؟ یہ وہی ہے جو دین کو پیش نظر رکھ کر تجارت کر رہا ہے۔

تو تجارت نے دنیا کو نہیں سنبھالا درحقیقت تاجر کی دیانت داری نے سنبھالا۔اگر بد دیانتی اور بے اصولی سے تجارت کرے ممکن ہے ابتدا میں کچھ بازار چل جائے اور کچھ فروغ ہو جائے۔لیکن پھر جو خسارہ پڑے گا تو راس المال کی بھی مصیبت آ جائے گی کہ وہ بھی باقی رہتا ہے یا نہیں۔تو اگر بد دیانتی شامل حال ہے تو وہ دکان بھی نہیں سنبھلے گی، دنیا کیا سنبھلے گی؟ اس سے واضح ہو گیا کہ تاجر نے دنیا کو نہیں سنبھالا، اسکی دیانت داری نے سنبھالا ہے۔دیانت داری میں پھر ذکر اللہ آ جاتا ہے۔تو اللہ کا نام لینے والے دنیا کو سنبھال رہے ہیں نہ کہ کوئی اور۔نظام حکومت سیاست سے نہیں دیانت سے چلتا ہے......کرسی عدالت پر بیٹھنے والا جج یا کرسی پر بیٹھنے والا

① السنن للترمذی، ابواب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی استقراض البعیر، ج:۵، ۱۴۹، رقم: ۱۲۴۱.

حاکم، بے شک اس نے امن کا نظام قائم کر رکھا ہے مگر کب؟ جب کہ عدل وانصاف قائم کرے اور اگر وہ ظلم وزیادتی کرتا ہے۔ پوری پبلک کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھتا اپنے اور پرائے کا فرق کرتا ہے وہ حکومت کو بھی تباہ کرے گا اور خود بھی تباہ ہوگا۔ لیکن اگر عدل سے کام لے رہا ہے جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْعَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ ① ''اے ایمان والو! ''قَوّام بِالْقِسْطِ'' بنو یعنی عدل وانصاف سے فیصلے کرو، دیانت داری سے فیصلے کرو۔ اگر چہ دیانت داری سے تمہارے نفس کے خلاف فیصلہ ہو۔ تو اپنے اوپر برداشت کرو۔ مگر فیصلہ حق کا کرو۔ اگر چہ تمہاری اولاد پر بن جائے، مت پرواہ کرو۔ عدل سے کام لو''۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک دعویٰ کیا اور قاضی شریح چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) ہیں کہ میری ایک ذرہ جو میں جنگ کے موقع پر سر پر رکھتا تھا وہ فلاں یہودی کے ہاں ہے۔ اس نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور وہ دینا نہیں چاہتا دعوی بالکل سچا تھا۔

قاضی شریح نے امیرلمومنین کو عدالت میں طلب کیا حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین ہیں۔ قاضی شریح ان کے ماتحت ہیں لیکن عدل اور عدالت کا مقام اتنا بڑا ہے کہ امیر ہو یا خلیفہ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ ایک مدعی اور مدعا علیہ کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ امیر المومنین ہیں۔ ان کے لئے تو کرسی بچھائی جائے اور غریب آدمی دعوی کر کے آئے تو وہ کٹہرے میں کھڑا ہو جب امیر المومنین مدعی بن کے آئے گا تو اسے وہیں کھڑا ہونا پڑے گا جہاں عام مدعی اور مدعیٰ علیہ کھڑے ہوں گے۔

تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سمن پہنچا کہ آپ عدالت میں حاضر ہوں آپ مدعی ہیں اور یہودی سے کہا کہ تو مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے حاضر ہو۔ دونوں کو حاضر ہونا پڑا اور دونوں کو ایک درجے میں کھڑا کیا، یہودی بھی کھڑا اور امیر المؤمنین بھی کھڑے ہیں۔ امیر المومنین کے مقابلے میں یہودی کی کیا حیثیت تھی۔ مگر قاضی اور عادل حاکم کی نگاہ میں دونوں ایک درجے کے تھے اس لئے دونوں برابر کھڑے کئے گئے۔ قاضی شریح نے فرمایا کیا دعویٰ ہے؟

امیر المومنین نے فرمایا: دعویٰ یہ ہے کہ اس نے میری ذرہ پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے دیتا نہیں حالانکہ ذرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا کہ ان کی ذرہ نہیں ہے۔ یہ تو میری ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے تھے۔ یہودی کی واقعی ذرہ نہیں تھی۔ مگر قاضی شریح نے کہا کہ کوئی گواہ ہے؟

فرمایا جی ہاں تو ایک غلام کو پیش کیا اور ایک اپنے بیٹے حضرت حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو پیش کیا۔ قاضی نے فرمایا بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے اور دو گواہ کے بغیر دعوی ثابت نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور گواہ لاؤ۔ انہوں نے کہا اور تو میرے پاس کوئی گواہ نہیں، یہی دو گواہ تھے یا میرا بیٹا یا یہ میرا غلام۔ فرمایا، اگر گواہ ایک ہو تو آپ

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۳۵.

کے حق میں ڈگری نہیں دی جاسکتی، یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ ذرہ اسی کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعویٰ سچا تھا۔ مگر ضابطہ کا ثبوت مہیا نہیں ہوا، اس واسطے فیصلہ ان کے خلاف ہوا اس عدل کا اثر کیا ہوا؟ یہودی نے اسی وقت وہیں کھڑے ہو کر کہا: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ.'' سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور کہا جس دین کے اندر اتنا عدل و انصاف ہے کہ ایک امیر المؤمنین اور ایک غریب سے غریب غیر مسلم ایک نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں وہ دین سچا ہے اور میں اس دین کی حقانیت کا قائل ہوتا ہوں اور علی الاعلان کہا کہ میرا دعویٰ غلط تھا، سچے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور ذرہ ان کو دے دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اب مجھے ذرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرہ کا تو ہی مالک ہے ذرہ بھی تو رکھ تیرا دین جب اسلام بن گیا تو میرے لئے سب کچھ ہو گیا۔ تو ایک سچائی نے کتنوں کو فائدہ پہنچایا امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی حقانیت کھلی یہودی کو دین نصیب ہو گیا ذرہ اس کو مل گئی اسلام کی عظمت واضح ہو گئی ایک سچائی سے کتنی برکات اور فائدے ظاہر ہوئے افراد کے حق میں الگ، دین کے حق میں الگ، اسلام کی عدالت کے حق میں الگ۔

تو اسلام یہ چاہتا ہے کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر دیانت داری سے فیصلہ کرو چاہے تمہارے خلاف فیصلہ ہو، چاہے تمہاری اولاد کے خلاف ہو، چاہے تمہارے رشتہ داروں کے خلاف ہو مگر عدل وانصاف ہونا چاہئے (اگر ایک حاکم اس عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ تو درحقیقت اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مگر حاکم نے) نہیں اس کی دیانتداری اور عدل نے سنبھال رکھا ہے۔ تو وہی بات آ گئی کہ ذکر اللہ کرنے والے نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے. عالم کو تھامنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے۔ اگر تاجر اور کاشت کار دیانت چھوڑ دے اگر حاکم عدالت دیانت چھوڑ دے اگر بادشاہ وقت دیانت چھوڑ دے، یہ سب دنیا کی تباہی کا ذریعہ بنیں گے۔ اور اگر دین و دیانت سے کام لیں گے تو دنیا کو سنبھالنے والے بنیں گے تو دنیا کو دیانت ذکر اللہ اور یاد خداوندی سنبھالتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کی خلافت کا دور ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب اور دبدبہ وہ ہے کہ ان کا نام سن کے دنیا کے بادشاہوں کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جبلہ ابن ایہم جو روم کا بادشاہ یا گورنر تھا، وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا، اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوا اور حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا، جب وہ طواف کر رہا تھا تو قبیلہ فزار کا ایک بدوی دیہاتی بھی طواف میں مشغول تھا۔ جو لوگ حج کرنے گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مطاف کے اندر کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی ایک وقت کے اندر طواف کرتے ہیں تو دھکے کے بھی لگتے ہیں، ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا سب جانتے ہیں کہ سب اللہ کی یاد میں مشغول ہیں۔ تو کوئی کسی سے ٹکرا جائے یا گر جائے تو نہ برا مانتے ہیں نہ مقابلہ کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ تھا۔ وہ فزاری طواف کر رہا تھا۔ اس وقت جبلہ ابن ایہم بھی طواف میں

مشغول تھا۔ تو جبلہ ابن ایہم کی لنگی پر اس دیہاتی کا پیر پڑ گیا اور لنگی کھل گئی وہ اپنے ہاں کا بادشاہ تھا۔ یہاں وہ مسلمان ہو کر غریب الوطن تھا۔ جذبات اس کے وہی شاہانہ تھے۔ اس نے دیکھا کہ میری لنگی پر ایک دیہاتی کا پیر پڑ گیا، اور وہ کھل گئی ہے تو اس نے زور سے ایک طمانچہ مارا وہ دیہاتی بے چارہ چوٹ کھا کے گرا۔ اس کے بعد اس نے لنگی درست کی اور پھر طواف میں مشغول ہو گیا۔ دیہاتی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے ہاں جا کے دعوی کیا کہ اس نے ناحق میرے طمانچہ مارا ہے۔ اس کی لنگی پر میں نے جان بوجھ کر پیر نہیں ڈالا تھا اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی کہ لنگی پر آدمی جان بوجھ کر پیر ڈالے۔ مجمع کے اندر کوئی کسی کی لنگی کھول کر تھوڑا ہی لے جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ میں اس کے اوپر پیر بدنیتی سے بھی نہیں ڈال سکتا تھا ہزاروں آدمی وہاں موجود تھے۔ دھکے مکے میں میرا پیر لگ گیا، تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی، مگر ارادی غلطی نہیں ہوئی، یہ مجھے تنبیہ کر دیتا، دھول جمانے کا کون سا موقع تھا۔ اس کا حق کیا تھا؟ یہ دعوی دائر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی عدالت سے جبلہ ابن ایہم کے نام سمن جاری ہوا کہ عدالت میں حاضر ہو، وہ حاضر ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تو نے کیوں چپت مارا؟ اس نے کہا اس نے میری لنگی پر پیر ڈالا، فرمایا لنگی پر پیر ضرور پڑا۔ لیکن وہ موقع ایسا ہے کہ وہاں ارادے سے پاؤں کوئی نہیں ڈال سکتا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے تم سے قصاص لیا جائے گا یا تو یہ دیہاتی تمہیں بھی اتنی زور سے دھول مارے گا یا پھر تم مالی طور پر فدیہ ادا کرو، اس نے جو چوٹ کھائی ہے اس کے بدلے میں کچھ مال دے دو، جبلہ نے کہا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر ہو گیا!!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اسلام میں سب برابر ہیں۔ یہاں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے خدا کے گھر میں ایک دیہاتی اور ایک امیر برابر ہیں۔ ایک صف میں بادشاہ اور اس کے برابر میں غلام بھی کھڑا ہو گا وہاں کوئی فرق روا نہیں رکھا جا سکتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

یہاں سب بندے ہیں۔ بندہ نواز کوئی نہیں بندہ نواز تو اللہ ہیں، جو اپنے بندوں کو نوازتے ہیں۔ اس عدالت میں آ کر تو امیر المومنین اور دیہاتی سب برابر ہیں۔ بادشاہ اور فقیر ایک جیسے ہیں۔ اسے سخت ناگوار گزرا کہ اس دین کے اندر ایک لاٹھی سے سب کو ہانکا جاتا ہے۔ وہ راتوں رات بھاگ گیا اور اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور بدستور پھر عیسائی بن گیا۔ عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں کہ بادشاہ بھی ہمارا آ گیا اور اس کا قدیم دین بھی واپس آ گیا بہر حال اسلام نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ایک صحابی قسطنطنیہ بلا ارادہ ہجرت، تجارت کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔ جبلہ ابن ایہم کو خبر ہوئی کہ ایک صحابی آئے ہیں۔ آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی ان صحابی کو اس نے دعوت دی اور بلایا اور یہ بھی پہنچے اس نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے میں اسلام لے آیا تھا۔ لیکن وہ فزاری کے

ساتھ میرا مقدمہ ہوا تو میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر نہیں ہو سکتا ،لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک نہ میرے دل کو سکھ ملا نہ چین، سچی بات وہی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ دین حق بھی وہی ہے اور سچا بھی وہی ہے اور میں اس پر نادم ہوں کہ میں مرتد ہوا گو مجھے ظاہری بادشاہت پھر مل گئی ،لیکن میرے دل میں سکھ اور چین نہیں ہے۔ میرا اب جی چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام میں داخل ہو جاؤں، مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس واسطے میں اپنے وقار کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہوں کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں کہہ سکوں کہ بھئی اگر میں نے اسلام قبول کیا تو کوئی بری بات نہیں کہ فلاں نعمت بھی مجھے ملی اور وہ یہ ہے کہ اگر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی سے میری شادی کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں، تو میں اس کو حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں، یا میں ہی انکار کر دوں، مگر میرے لئے ایک حیلہ اور عذر بن جائے گا، میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں۔ جب وہ اپنی بیٹی دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے ان کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ میں پھر اسلام قبول کر لیتا ہوں۔ ①

ان صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا، میں امیر المومنین کے پاس جا کے ذکر کر دوں گا اور اس کے بعد میں پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ چنانچہ یہ واپس ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ سارا واقعہ ذکر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم نے کیوں نہ وہیں وعدہ دے دیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اسلام کے مقابلہ میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے میری بیٹی کی اسلام کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہیں وعدہ کر لینا چاہئے تھا کہ ٹھیک ہے میرا وعدہ ہے'' ②

انہوں نے کہا، امیر المومنین! میں تو ڈر رہا تھا کہ میں کیسے وعدہ کروں؟ فرمایا نہیں فوراً جاؤ قسطنطنیہ کا سفر کرو اور کہو کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر۔

چنانچہ وہ واپس ہوئے۔ جب قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جبلہ ابن ایہم کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام نہیں تھا۔ خاتمہ ایمان پر نہیں ہونا تھا۔ صحابی رضی اللہ عنہم بے چارے واپس چلے آئے۔ تو میں نے یہ عرض کیا کہ حاکم عدالت جب بادشاہ اور غلام کو، فقیر اور حقیر کو، خادم اور اس کے آقا کو، کرسیٔ عدالت پر بیٹھ کر ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ اصول اپنائے ہوئے ہے۔ تو یہی اصل دین و دیانت ہے۔ تو ایک حاکم عدالت یا امیر کرسی عدالت پر بیٹھ کر دنیا کو سنبھال رہا ہے اور امن قائم کر رہا ہے۔ وہ امن جبھی تک قائم ہے جب تک دین و دیانت کے اصول کو برتے اور دین و دیانت کو برتنا فی الحقیقت یہی ذکر اللہ ہے۔ معلوم ہوا دنیا ذکر اللہ سے قائم ہے، سیاست سے قائم نہیں۔ زراعت سے قائم نہیں۔ دعویٰ اللہ ہی کا سچا رہا کہ دنیا کو تھامنے والے وہ ہیں جو اللہ اللہ کرتے ہیں اور کوئی نہیں۔ جنہوں نے دعویٰ کیا خواہ وہ تاجر، کاشت کار، حکام یا سیاسی لوگ ہوں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ دنیا کو

① تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، ج: ۲، ص: ۱۶۴۔ ② مختصر تاریخ دمشق ''ابن عساکر'' ج: ۲، ص: ۲۵۳۔

تھا منے والے اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔

سلاطین دنیا بدنوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں...... ظاہر میں بے چارے اللہ اللہ کرنے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے کوئی لاؤ لشکر اور فوج ان کے ساتھ نہیں، مگر ان کا سب سے بڑا لشکر اللہ کے ہاں مقبولیت ہے۔ قبولیت عنداللہ، یہ ان کی سب سے بڑی طاقت ہے، جس کو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر کہا ہے کہ۔

مبین حقیر گدایاں عشق راکیں قوم شہان بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

یہ جو اللہ اللہ کرنے والے ہیں یہ اللہ کے عشاق ہیں۔ یہ عاشقان خداوندی ہیں۔ انہیں حقارت سے مت دیکھو اگر چہ ان کے کپڑے معمولی اور پھٹے پرانے ہوں انکے پاس کوئی کوٹھی بنگلہ نہیں ہے۔ چھونپڑوں میں رہتے ہیں، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں، اگر چہ سر پر تاج نہیں ہے اور لاکھوں روپے کا پٹکا ان کی کمر پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ بے تاج بادشاہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تاج والا بادشاہ بدنوں پر حکومت کرتا ہے۔ اور یہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک آدمی بادشاہ کی حکومت کے نیچے جبری طور پر ہوتا ہے۔ دل میں عظمت نہیں ہوتی دل میں لعنت بھیجتا ہے ویسے مجبور ہے۔ لیکن اللہ والوں کی حکومت دل پر ہوا کرتی ہے۔ تنہائی میں بھی ہوگا تو بے ادبی سے ان کا نام نہیں لے سکتا، تو حقیقی عظمت وہ ہے کہ خلوت میں جائے جب بھی دل میں بھری ہوئی ہو اور مجمع میں آئے جب بھی، بادشاہان دنیا کی عظمت بھرے مجمعوں میں تو ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک کو خطرہ ہے کہ اگر میں نے کوئی گستاخی کی، تو پولیس آکے گردن ناپ لے گی، جیل جانا پڑے گا اس ڈر کے مارے آدمی بادشاہ کی عزت کرتا ہے. تنہائی میں آکر اس پر لعنت کرتا ہے۔ لیکن اللہ والوں کی، سامنے بھی اور تنہا بیٹھ کے بھی گستاخی نہیں کرتا سمجھتا ہے کہ میری آخرت بگڑ جائے گی۔ اہل اللہ کی بادشاہت دنیا میں ان کی عدم موجودگی میں بھی قائم ہوتی ہے

ان کی عظمت کے لئے ان کی موجودگی ضروری نہیں ہے وہ نگاہوں کے سامنے چھوڑ، دنیا میں بھی نہ ہوں پھر بھی تعظیم کی جاتی ہے۔ آج حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام آتا ہے، قلب جھک جاتا ہے آپ کہتے ہیں، رضی اللہ عنہ اللہ، ان سے راضی ہو آج امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتا ہے۔ تو آپ عقیدت سے گردن جھکا دیتے ہیں اور کہتے ہیں، رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے تو اتنی گرویدگی ہے کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر کوئی گستاخی کرے، تو آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور اس کو برداشت نہیں کریں گے حالانکہ آج دنیا میں دونوں نہیں ہیں۔ مگر عقیدت مندوں کا یہ حال ہے کہ ان کی بادشاہت و عظمت تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ یہ عظمت کاہے کی ہے؟ ان میں سے کسی کے پاس دولت، تاج اور قباء شاہی نہیں تھی مقبولیت عنداللہ تھی خدا کے مقبول بندے تھے۔ اس کی برکات ان کے قلوب کے اندر موجود تھیں۔ اس عظمت کی

وجہ سے آج تک آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ تو ان کی حکومت دلوں پر ہے اور ایسی کہ وہ دنیا میں بھی نہیں، جب بھی حکومت قائم ہے۔

مسٹر آرنلڈ، یہ سرسید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' (Preaching of Islam) لکھی ہے۔ اسلامی تہذیب کے متعلق اس نے دور دکھلائے ہیں کہ اسلام دنیا میں کس کس طرح سے پھیلا عرب، ہندوستان اور چین میں کیسے پھیلا اسلامی طور وطریقے اور آداب، مبلغین اسلام کی محنتیں اور جانفشانیاں اور ان کی جدوجہد، ان سب پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں اس نے ایک لطیفہ لکھا وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی جو دنیا میں اور جگہ دکھلائی نہیں دی۔ (وہ اسے نہیں دکھلائی دی ہوگی لیکن اور جگہ بھی ہے۔ مگر اسے کم از کم ہندوستان ہی میں نظر آئی)۔ وہ یہ ہے کہ جب میں اجمیر گیا، تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کا نام سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ یعنی حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کو ہم امیر الہند، امام الہند اور سلطان الہند کہتے ہیں اس لیے کہ خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں آ کر اسلام کو پھیلایا اجمیر شریف میں چھپر کی ایک کٹی ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہندو، مسلم اور غیر مسلم انکے دربار میں حاضر ہوتے عقیدت سے بیٹھتے، ان کی زبان فیض ترجمان سے کلمات حقہ سنتے ان کی دیانت، ان کے معاملات کی صفائی اور خدا پرستی دیکھ کر قلوب پر اثر ہوتا ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوتے خود اسی آرنلڈ نے لکھا ہے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بلا واسطہ ننانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے۔ ان کی تعداد الگ سے یعنی ایک کروڑ ہے۔ یعنی ایک کروڑ کے قریب افراد اسلام میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پھر آگے جتنوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا ان کی تعداد الگ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اجمیر میں یہ انوکھا واقعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا پورے ہندوستان کا سلطان بنا ہوا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ لوگ قبر پر آتے ہیں تو ان کی حکومت قائم ہے۔

اور بعضے تو جاہل شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں عظمت سہی ان کے دلوں میں مگر جب خلاف شرع عظمت ہوگی، اللہ کے ہاں مقبول نہیں، بعضے سجدے اور طواف کرتے ہیں۔ مقصد تعظیم تھا۔ مگر انہوں نے اس کو غلط طریق پر جاری کیا۔ ایک وہ ہیں کہ فاتحہ پڑھتے ہیں، استفاضہ کرتے ہیں اور پابند شرع بھی ہیں اصول شریعت کے متبع بھی ہیں۔ تو اتباع شریعت اور عدم اتباع شریعت تو الگ رہا مگر عظمت لے کے سب جاتے ہیں۔ حالانکہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی عظمت ایسی قائم ہے کہ اگر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں تشریف رکھتے اور ہم جاکے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اتنی ہی عظمت وہاں بھی کرتے، جتنی اب قبر پہ جا کر کرتے ہیں۔ تو اس کی حقیقت کیا چیز ہے؟ یہی کہ ان کی حکومت دلوں کے اوپر قائم ہے تو اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ بدنوں، پہاڑوں، پتھروں اور زمین کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دلوں پر ان کی

عظمت وحکومت قائم نہیں ہوتی دل سے لوگ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے اور ہم آزاد ہو جائیں اور اللہ والوں کی نسبت دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت اور زیادہ مضبوط ہو جائے ان کی محبت میں اگر ہم فنا ہو جائیں تو ہم کامیاب ہو گئے، ہماری دنیا بھی بن گئی، آخرت بھی بن گئی تو جامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا کہ

مبین حقیر گدایاں عشق راکیں قوم   شہان بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

اللہ والوں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو یہ بے تاج بادشاہ ہیں، موجود ہوں تب بھی اور موجود نہ ہوں تب بھی ساری دنیا ان کی رعیت میں داخل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو عقیدت سے کہتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم ان پر درود وسلام پڑھتے ہیں۔ ان کے صحابہ کا نام آجائے تو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ان کے ائمہ کا نام آجائے رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں۔ کسی ولی مومن کا نام آجائے مرحوم ومغفور کہتے ہیں۔ غرض دعاؤں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی محبت میں فنا ہوتے ہیں۔ تو بات یہ نکلی کہ ان لوگوں کی عظمت ہمارے دلوں پر قائم کیوں ہے؟ ان کے دلوں میں ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ یاد حق نے ان کو اللہ سے ملا کر ایسا کر دیا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اللہ والوں کی یہ شان ہے کہ ''اِذَارَاَوْا ذُکِرَ اللّٰہُ'' جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان لوگوں کا بھی ساتھ میں ذکر آتا ہے جب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی اللہ کا بھی ذکر آتا ہے گویا۔

خاصان خدا خدا نہ باشند   لیکن از خدا جدا نہ باشند

خاصان خدا خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے جب اللہ کا ذکر آئے گا تو اہل اللہ کا بھی ذکر ساتھ آئے گا اور جب اہل اللہ کا ذکر آئے تو خدا اور رسول کا بھی ذکر آئے گا ان کی عظمت در اصل اللہ سے ہے اسی ذکر سے آدم کی عظمت بھی قائم ہے۔ تو اصل یہ ہے کہ ذکر اللہ ہی درحقیقت سب سے بڑی سلطنت ہے۔ جب یہ سلطنت آجاتی ہے تو ان کی حکومت قلوب پر قائم ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام یا اولیاء اللہ کی محبت ذکر اللہ کی وجہ سے ہے۔

اہل اللہ دنیا کو کیوں لات مار دیتے ہیں؟...... آخر کوئی دولت تو ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا کی دولت کو لات مار دیتے ہیں۔ نہ ان کے سامنے دنیا کی وقعت، نہ اس کی شوکت کی وقعت، نہ تاج وتخت اور محلات کی وقعت کسی چیز کی بھی وقعت نہیں یہ جو ساری دنیا کو ٹھکرا دیتے ہیں، کوئی بڑی چیز ان کے پاس ہوتی ہے۔ جبھی تو ٹھکراتے ہیں معاذ اللہ: کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں کہ ساری دنیا کو لات ماردی بلکہ دنیا سے بڑھ کر سلطنت دی جاتی ہے۔ جب وہ آجاتی ہے تو پوری کی پوری دنیا ان کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہے دنیا کو ضرورت سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی عظمت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بڑی چیز ان کے قلب میں موجود ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ ان کی خانقاہ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ذکر اللہ کرنے والے دس دس ہزار مہمان ایک ہی وقت میں خانقاہ میں ہوتے تھے اور لنگر کا کھانا تقسیم ہوتا تھا، حضرت شیخ سے بادشاہ

سنجر بھی بیعت تھا۔ سنجر خراسان کے اندر جو کہ ایک بہت بڑا ملک تھا۔ اس ملک کا ایک صوبہ تھا۔ جس کو نیمروز کہتے تھے۔ بادشاہ سنجر کی حکومت نیمروز میں بھی تھی۔ چونکہ حضرت شیخ کے ہاں مہمانداری ہزاروں کی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ شیخ کے گھر نہ جائیداد نہ دولت کس طرح مہمانوں کی مدارات کرتے ہوں گے اس نے نیمروز کا پورا صوبہ حضرت شیخ کے نام ہبہ کیا اور لکھ کر بھیجا کہ یہ پورا صوبہ میں آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کرتا ہوں اس کی آمدنی لاکھوں روپے سال کی ہے مہمانداری میں سہولت ہوگی آپ کے ہاں دشواری ہوتی ہوگی اس واسطے یہ پورا صوبہ اور جائداد قبول فرمالیجئے۔

سبحان اللہ! حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب لکھا، تو وہ جو اس نے پرچہ لکھ کر بھیجا تھا اسی کاغذ پر حضرت نے بادشاہ سنجر کے نام جواب لکھ کر بھیجا اور دو شعر کا قطعہ لکھ دیا فرمایا۔

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد   دردل بود اگر ہوسِ ملکِ سنجرم

حاصل اس کا یہ تھا کہ بادشاہ سنجر کا جو چتر ہے۔ ایک تو بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا تھا اور اس کے پیچھے ایک سیاہ قسم کا چتر لگاتے تھے تاکہ اس کی سیاہی میں بادشاہ کا سفید و سرخ چہرہ نظر آئے وہ گویا عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ سر پر تاج ہو اس کے پیچھے ایک چتر ہو اس میں سونے کا کام ہو وہ چتر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ تو حضرت شیخ نے لکھا کہ بادشاہ سنجر کا جو سیاہ چتر ہے میرے نصیب پر بھی اسی طرح سیاہی آجائے جیسے بادشاہ سنجر کے چتر کی سیاہی ہے اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ذرا بھی ہوس پیدا ہو تو میں بدنصیب اور سیاہ بخت بن جاؤں میرے دل میں کوئی ہوس نہیں۔ ہوس کیوں نہ آئے؟ اگلے شعر میں اس کا جواب دیا اور وجہ بیان کی ہے فرمایا:

زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب   من ملکِ نیم روز رابیک جو نمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ لگا ہے۔ اس دن سے نیمروز کے صوبے کی میرے دل میں کوئی وقعت باقی نہیں ہے۔ نیم شب کا ملک کیا ہے؟ یعنی وہ جو میں رات کو اٹھ کر دو چھوٹی چھوٹی رکعات پڑھتا ہوں وہ سلطنت جو مجھے ملی ہے اس کے مقابلے میں نیمروز کا ملک میرے نزدیک جو کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا تو مجھے نیم شب کا ملک حاصل ہے۔ نیمروز کے ملک کی کیا ضرورت ہے؟ آدھی رات کی سلطنت مجھے حاصل ہے تو آدھے دن کی سلطنت مجھے درکار نہیں ہے:

خلیل آسا در ملکِ یقین زن   نوائے لا احب الآفلین زن

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے چاند اور سورج کو دیکھ کر فرمایا تھا، جب وہ غروب ہوگئے ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ ① یہ ابھی طلوع ہو کر غروب ہونے والے ہیں، ابھر کر گرنے والے ہیں مجھے ان سے کوئی محبت نہیں، مجھے اس ذات سے محبت ہے جو ہر وقت عروج، رفعت اور بلندی کے اوپر ہے۔ گم ہونے والی چیزوں سے مجھے محبت

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۶۔

نہیں ہے اس لئے اہل اللہ کے ہاں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں یہ جو ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے پورے صوبے پر لات ماردی اور ٹھکرادیا۔ فرمایا اگر میں دل میں ذرا بھی ہوس لاؤں تو بدنصیب بن جاؤں مجھے تیرے ملک سنجر کی ضرورت نہیں اس کی وجہ یہی تھی کہ دوسرا ملک ان کے ہاتھ میں ہے۔ جو اس سے بڑا ہے تو جب وہ ہاتھ آ جائے تو چھوٹے ملک کی کیا ضرورت رہی؟

اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت...... حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ایک دن ان کی زبان سے ایک بڑا بھاری کلمہ نکلا جب وجد طاری ہوا اور معرفت الٰہی کا ایک نشہ ان پر طاری ہوا اور سکر میں گئے تو زبان سے نکلا "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" میری سلطنت اللہ کی سلطنت سے بڑی ہے۔ مریدین بے چارے پریشان اور دم بخود۔ جب شیخ کو ہوش آیا اور افاقہ ہوا انہوں نے عرض کیا، حضرت! آج آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا فرمایا کفر کا کلمہ؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تم نے پھر سزا کیوں نہیں دی تم نے کفر کا کلمہ کیسے برداشت کیا اسی وقت سزا دینی چاہئے تھی پھر کبھی کفر کا کلمہ نکلے، فوراً سزا دو ایسا آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اسے چھوڑا جائے۔ فورا اسے تنبیہ کی جائے اور اس کی خبر لی جائے مریدین بے چارے چپ ہو گئے شیخ پر دو چار دن بعد پھر وجد طاری ہوا پھر وہی کلمہ نکلا کہ "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" مریدین تیار کھڑے ہی تھے شیخ کا حکم تھا۔ کوڑے لے کر شیخ کے اوپر برسانے شروع کر دیئے مگر شیخ جس مقام پر تھے۔ وہ کوڑا ان پر تو نہ لگا جتنا مارا، وہ ان کی کمروں پر لگنا شروع ہوئے اب مارنے پر تو یوں مجبور کہ شیخ کا حکم ہے اور جتنا مار رہے ہیں خود پٹ رہے ہیں۔ سارے مریدین لہولہان ہو گئے اور شیخ کا کچھ نہ بگڑا۔ مارتے مارتے جب خود بھی تھک گئے اور ساروں کی کمروں سے خون جاری ہو گیا اتنے میں شیخ کو ہوش آیا تو دیکھا کہ سب آدھ مرے پڑے ہوئے ہیں تو پوچھا بھئی! تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ حضور! آپ کا حکم تھا کہ (ایسا کلمہ نکلنے پر مجھے مارنا) ہم مارنے کھڑے ہوئے تو پٹے تو ہم، حضور پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ① فرمایا: آخر وہ کیا کلمہ ہے۔ جس کو تم کفر کا کلمہ کہتے ہو؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا کہ "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" فرمایا: نامعقولو! یہ کفر کا کلمہ کب ہے۔ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے۔ اب تم نہ سمجھو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ تم نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی لفظوں کو دیکھ لیا یہ تو عین کمال اور عین توحید کا کلمہ ہے۔ حضرت! آخر یہ کیسے ایمان کا کلمہ ہے کہ میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ③ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

فرمایا: اس کا مطلب سمجھ لو یہ بتلاؤ کہ اللہ کا ملک کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ اللہ کا ملک زمین، آسمان، پہاڑ،

① تفسیر حقی، تحت تفسیر سورۃ الملک، ج:۵، ص:۴۳۶. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ:۴۵.
③ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۷۲.

ستارے ہیں، میں ہوں تم ہو، یہ سب اللہ کا ملک ہیں اور میرا ملک کیا ہے؟ اللہ کی ذات وصفات، اسی میں میں سیر کرتا ہوں، اسی میں عروج کرتا ہوں رات دن اللہ کی ذات وصفات میں گھرا ہوا ہوں تو میرا ملک تو اللہ کی ذات ہے اور اللہ کا ملک میری ذات ہے۔ بتلاؤ پھر میرا ملک بڑا ہے یا اللہ کا ملک؟ (1) واقعی یہ بزرگ تو ایسے ہیں کہ ماریں اور مار کے رونے بھی نہ دیں یعنی خود جو کلمہ کہہ دیں وہ تو عین حق ہو جائے اور ہم حق بھی کہیں تو وہ بھی کفر بن جاتا ہے اب اس کا علاج کیا ہے؟ تو بظاہر یہ کلمہ کفر تھا۔ مگر شیخ نے بتایا کہ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے کہ ہمارا ملک اللہ کی ذات وصفات ہے۔ تو ہمارے ملک کے مقابلے میں سارے عالموں کی کیا حقیقت ہے؟ تو ملک میرا بڑا رہا۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جن کو یہ ملک ہاتھ آ جائے وہ اس ملک کا لالچ کیوں کریں گے؟ جنہیں یہ دولت وسلطنت ہاتھ آ جائے کہ اللہ کی ذات وصفات میں سیر کریں اور رات دن عروج کریں ذات وصفات کے عجائبات ان پر کھلیں، علوم وکمالات اور معارف نئے سے نئے کھلیں، وہ تو اس پورے جہاں کی طرف رخ نہیں کریں گے یہ دنیا تو دنیا ہے۔ وہ چاند اور سورج کو بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کی بھی کوئی عظمت نہیں ہے۔

اللہ کے نام کے بغیر بڑی سے بڑی مخلوق کوئی حقیقت نہیں رکھتی ...... اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دین کی دعوت دینی شروع کی پورے عرب کے اندر آپ کی دشمنی پھیل گئی خود آپ کے عزیز واقرباء دشمن بن کے کھڑے ہوئے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کا دین پھیلانے والے تھے۔ کسی کی دوستی، دشمنی کی آپ کو کیا پرواہ تھی آپ دین پھیلاتے رہے اور ابوطالب تھے تو اپنے آبائی دین پر، مگر حمایت ومدد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے تھے۔ قوم کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، وہ جمع ہو کر ابوطالب کے پاس آئے اور کہا اے ابوطالب! تمہارے بھتیجے نے ہمارے ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں ہمارے آبائی دین کو یہ ترک کرانا چاہتے ہیں اور نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا مگر ہم اس سے مجبور ہیں کہ تم ان کے حمایتی ہو تم ہمارے بڑے اور سردار ہو اس لئے ہم تمہیں واسطہ بناتے ہیں کہ تم اپنے بھتیجے سے ایک دفعہ ہماری طرف سے کھل کر بات کر لو کہ وہ چاہتے کیا ہیں؟ جو وہ چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ مگر خدا کے لئے اس کلمہ سے باز آ جائیں آپ ایک دفعہ ان پر حجت تمام کر دیں تاکہ ہم لوگ بھی آزاد ہو جائیں پھر جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے جو ان کا جی چاہے گا وہ کریں گے اب تم آڑے آ جاتے ہو تمہاری وجہ سے ہم مجبور ہیں۔

ابوطالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! تیری قوم کے سردار سب کے سب جمع ہو کر میرے پاس آئے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ تمہاری قوم یہ کہتی ہے کہ اگر تمہارا مقصد دولت ہے، تو ہم پورے حجاز کی دولت سمیٹ کر ان کے قدموں میں لا کے ڈالے دیتے ہیں۔ آج سے وہ اس

(1) تفسیر حقی ،تحت تفسیر سورة الحشر، ج: ۱۵، ص: ۲۴۳.

دولت کے مالک اور ہم ان کے تابع اور اگر ان کا مقصد حسن و جمال ہے تو حجاز کی جتنی بیٹیاں ہیں، تو وہ سامنے کئے دیتے ہیں جتنی چاہیں وہ پسند کرلیں ہم ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے اور اگر وہ اقتدار و حکومت چاہتے ہیں تو ہم سارے مل کے آج سے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کئے لیتے ہیں۔ جو وہ چاہیں اس کے لئے ہم تیار ہیں دولت، اقتدار اور بیٹیاں حاضر ہیں۔ یہ لے لیں، مگر خدا کے لئے یہ کلمہ بلند نہ کریں، ہمارے بتوں کی توہین نہ کریں، اس سے باز آ جائیں اور ہم سب چیزیں دینے کو تیار ہیں۔ ابو طالب نے کہا کہ میرے بھتیجے! تیری قوم یہ کہہ رہی ہے اور مجھے پیامبر بنا کے بھیجا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے چچا! آپ نے جو کہنا تھا کہہ چکے؟ کہا کہ ہاں کہہ چکا۔ فرمایا، اب میری سن لیجئے ''خدا کی قسم اگر میری قوم میرے دائیں ہاتھ پر سورج لا کے رکھ دے اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کے رکھ دے تب بھی میں یہ کلمہ نہیں چھوڑوں گا یا عالم میں اس کلمہ کو میں پھیلا کے رہوں گا یا اپنی جان قربان کر دوں گا۔'' ①

اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا تو دنیا ہے چاند، سورج اور آسمان کی چمک دمک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکرا دیا یہ کلمہ جب تک میرے پاس ہے، نہ مجھے چاند عزیز ہے نہ سورج۔ معلوم ہوا یہ کلمہ چاند، سورج سے بھی زیادہ اونچی چیز ہے۔ یہ اللہ کا نام ہے۔ اللہ کے نام سے ہی تو عالم زندہ ہے چاند، سورج بے چارے کی حقیقت کیا ہے۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے۔ جس کے لفظ اس قسم کے ہیں کہ میں اس نام سے التجا کر رہا ہوں جو تو نے قرن شمس پر لکھا ہے۔ آفتاب کے اوپر جو آپ نے نام لکھا ہے جس کی وجہ سے آفتاب کو زندگی ملی ہے میں اس نام سے تیرے سے دعا کرتا ہوں تو چاند اور سورج کی زندگی اللہ کے نام سے ہے۔ عرش عظیم اگر زندہ ہے۔ تو اس کے پایوں پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ اسی نام سے وہ قائم ہے تو ذکر اللہ اور نام خداوندی سب سے اونچی چیز ہے۔ اس کے مقابلے میں سورج، چاند حتیٰ کہ عرش و کرسی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ عرش و کرسی کی عظمت بھی تو اللہ ہی کے نام سے ہے۔ اگر اللہ میاں عرش و کرسی سے اپنے نام کو جدا کر دیں تو ہزار عرش و کرسی ہوں، کوئی وقعت نہیں لیکن چونکہ اللہ کے نام سے لگ گئے ہیں، اس واسطے وہ باعظمت بن گئے۔

قلب محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ذکر اللہ کا خزانہ ہے...... اس سے اندازہ کیجئے کہ سارے جہان ایک طرف، عرش و کرسی اور لوح و قلم ایک طرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ایک طرف جو عظمت اس قلب کی ہوگی، وہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور تمام جہانوں کی نہ ہوگی اس لئے کہ آپ کا قلب مبارک اللہ کے ذکر کا خزانہ ہے اور ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ جب یہ آتا ہے تو ساری چیزیں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ کسی چیز میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

---

① فی ظلال القرآن للسیدقطب المصری، ج:۷، ص: ۲۹۳، سورۃ القلم.

② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

اللہ کے اسم مبارک کا وزن......حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ میدان محشر میں ایک شخص حاضر ہوگا اور گناہوں کے ننانوے دفتر اسکے ساتھ ہوں گے یعنی اتنے گناہ کئے ہوں گے کہ ننانوے دفتر گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ایک ہی دفتر اتنا بڑا ہوگا کہ اسے پھیلایا جائے تو زمین و آسمان اس میں چھپ جائیں تو بقایا اٹھانوے دفتر کتنے بڑے ہوں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہ اتنے زیادہ ہوں گے کہ جہانوں میں اس کی سمائی نہیں ہوگی۔ وہ میدان محشر میں حاضر ہوگا حق تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی وہ دفتر سامنے رکھے جائیں گے اور وہ دل میں یقین کئے ہوگا کہ میری نجات کی کوئی صورت نہیں ننانوے دفتر جو ہیں۔

تو یہ تیار ہے کہ حق تعالیٰ ابھی حکم دیں گے کہ اسے جہنم میں پہنچاؤ یہ اسی قابل ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے بندے! یہ گناہ تو نے کئے؟ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے کئے فرمائیں گے تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ کہے گا کہ اے اللہ! کوئی عذر نہیں، محض اپنی سیاہ بختی، شقاوت اور بدنصیبی سے میں نے یہ برے اعمال کئے۔ کوئی حجت میرے پاس نہیں میں نے اپنے نفس کی خواہشات پوری کی ہیں۔ لذات نفس میں گرفتار تھا۔ کسی حجت اور دلیل سے میں نے یہ گناہ نہیں کئے۔ اب اسے یقین ہے کہ ابھی حکم ہوگا کہ اچھا پھر جا جہنم میں۔ تیرا ٹھکانا ہمارے پاس نہیں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے، تیرے ان ننانوے دفتروں میں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ایک چھوٹی سی پرچی نکلے گی کہ ساری عمر میں اس نے نیکی کیا کی؟ ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ '' یہ کلمہ پڑھا گویا بس مسلمان تھا۔ ایک دفعہ کلمہ پڑھا، یہی ایک نیکی باقی کوئی اور نیکی اس کے پاس نہیں تو ننانوے دفتروں میں نیکی کی ایک چھوٹی سے پرچی پڑی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیری ایک نیکی یہی ہے اور جا کر میزان عمل میں اپنا نامہ اعمال تلوا اور اپنی نگرانی میں تلوا وہ بندہ عرض کرے گا کہ اے اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔

''رَبِّ مَاهٰذِهِ الْبِطَاقَةُ؟'' اے اللہ! ان ننانوے دفتروں کے مقابلے میں یہ ذراسی پرچی کیا حقیقت رکھتی ہے؟ میں تو جہنم کے قابل ہوں، مجھے جہنم میں بھیج دیجئے میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، نہیں ﴿لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ﴾ ① ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے۔ رتی رتی کا حساب ہوگا ان اعمال کو جا کے تلوا اور اپنی آنکھوں کے سامنے تلوا کبھی تجھے یہ خطرہ پیدا نہ ہو کہ میرے فرشتوں نے تیرے اوپر کوئی ظلم کر دیا یا ناپ تول میں کوئی کمی کر دی۔

یہ پھر عرض کرے گا، یا اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔ فرمائیں گے نہیں تلوا جا کے، یہ تلوائے گا تو ایک پلڑے میں ننانوے دفتر رکھے جائیں گے دوسرے پلڑے میں یہ پرچی رکھی جائے گی۔ جب تولیں گے تو ننانوے دفتر ہلکے پڑ جائیں گے اور پرچی کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور تول میں غالب آجائے گا فرمائیں گے تیرے لئے

① پارہ: ۲۴، سورۃ المومن، الآیۃ: ۱۷.

جنت اور نجات ہے اور وجہ بیان فرمائیں گے۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ① اللہ کا ذکر سب سے وزنی چیز ہے تو لاکھوں برس کے گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ سچی توبہ کرلے اس توبہ کا وہ وزن ہے کہ لاکھوں برس گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ سچی توبہ کرلے اس توبہ کا جو وزن ہے وہ عالم کی کسی چیز کے اندر نہیں ہے۔ اس کو نجات دے دی جائے گی تو یہ ہے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ② کہ ایک ذراسی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آ گئی خدا جانے اس نے کس اخلاص سے یہ اللہ کا نام لیا ہوگا کہ اس اخلاص کے وزن نے ہر چیز کو ہلکا کر دیا۔ ③

حضورِ قلب سے ذکر میں وزن پیدا ہوتا ہے...... اصل میں وزن جو ہے وہ اخلاص کا ہوتا ہے۔ ہم رات دن اللہ اللہ کہتے جائیں لیکن غفلت کے ساتھ کریں۔ روح کے اندر بے داری اور دل میں خلوص نہ ہو، دنیا کے دکھلاوے کے لئے ہو، تو اللہ اللہ تو کیا مگر یہ اللہ اللہ ڈھانچہ ہے۔ اس میں روح نہیں ہے جس سے قدر و قیمت بڑھتی ہے اور وزن قائم ہوتا ہے۔ یہ وزن درحقیقت وہ یادِ حق ہے صرف اللہ اللہ کہہ دینا کافی نہیں۔ جب تک کہ لفظ اللہ کے ساتھ دل کی یاد بھی شامل نہ ہو زبان سے اللہ اللہ ہو اور دل میں غفلت بھری ہوئی ہو جس کو مولانا رومی رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ

برزبان تسبیح ، درد دل گاؤخر — ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر تو تسبیح جاری ہے، مگر دل میں گھربار کے خیال بھرے ہوئے ہیں۔ بات دوکان کی سوچ رہا ہے اور زبان پر اللہ اللہ جاری ہے یہ ذکر تو ہے مگر قلبی ذکر نہیں، زبانی ذکر ہے۔ تو جو زبان سے اللہ اللہ کہا جائے، دل ساتھ نہ ہو، وہ کافی نہیں وہ بلا روح ڈھانچہ ہے۔ وہ ڈھانچہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی کوئی وقعت نہیں کسی پہلوان کا لاشہ پڑا ہوا ہو اور بڑا ڈیل ڈول کا ہو مگر انتقال ہو چکا ہو اس کی کیا قدرت و قیمت ہے؟ اور ایک دق زدہ مریض ہے۔ اٹھنے کے قابل نہیں مگر زندہ ہے اس کی وقعت ہے اگر اسے کوئی قتل کر دے گا تو پھانسی چڑھے گا۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب! یہ تو ایک منٹ میں خود ہی مرنے والا تھا۔

آپ مجھے کیوں پھانسی دیتے ہیں یہ مرتا ہی تھا میں نے لاٹھی ماردی مرگیا۔ کہا جائے گا کہ جاندار کو مارا ہے۔ جان پر حملہ کیا اس لئے تجھ سے قصاص لیا جائے گا۔ اور پہلوان کی لاش پر پچاس لاٹھی ماردے کوئی قصاص نہیں اس لئے کہ اس میں جان ہی نہیں تھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں پتھر کی زیادہ قیمت ہے لاش کی کوئی قیمت نہیں۔ ایک پتھر آپ کا چند روپے میں بک جائے گا۔ اور لاش دس پیسے میں بھی نہیں بکے گی۔ اس واسطے کہ پتھر کو ستون بنائیں کھڑا کر کے عمارت بنائیں گے۔ اور لاش کو آپ کہاں کا ستون بنادیں گے؟ وہ کسی کام کی نہیں وہ یا تو دفنائی جائے، یا جلائی جائے، یا بہائی جائے، اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔ تو اصل میں قدر و قیمت جان سے ہوئی۔ اللہ اللہ کرنا،

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ السنن للترمذی، ابواب الایمان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی من یموت وھو یشھد...... ج: ۹، ص: ۲۳۲، رقم: ۲۵۶۳۔

نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا ایک ڈھانچہ ہے۔ اس کی روح ذکر اللہ یعنی یاد حق ہے۔ دل میں بے داری، تنبہ اور اللہ سے لگاؤ یہ روح ہے جب یاد حق نہیں تو زبان سے کتنے ہی لفظ ادا کر لیں ان کی کوئی قیمت نہیں جب تک لفظ کے اندر معنی نہ ہوں معنی کی اصل میں قدر و قیمت ہے۔ تو قیامت کے دن ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① کا ظہور ہوگا کہ ایک اتنی سی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آئے گی اس لئے کہ اس نے صرف لفظ اللہ نہیں کہا تھا بلکہ اللہ کہنے میں اس کا اخلاص اور قلب کا لگاؤ شامل تھا۔ تو ذکر کے معنی اللہ اللہ کہنے کے نہیں، ذکر کے معنی دل کے بیدار ہونے کے ہیں کہ یاد رکھی ہوئی ہو اس یاد سے کلمات جو نکل رہے ہوں وہ کلمات یاد خداوندی کے اندر ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں وہ ذکر اللہ کہلاتے ہیں۔ وہ جب دل میں ہوگا تو چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی کہے گا اس کی بھی قدر و قیمت ہوگی۔

الفاظ میں جذبات قلب سے تاثیر پیدا ہوتی ہے...... اللہ والوں کے چھوٹے جملوں میں بھی جو تاثیر ہوتی ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں ہوتی وہ لفظوں کے اندر معنی اور دل کی یاد سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر ہوتی ہے۔ جو دلوں پر پڑتی ہے۔ ورنہ محض شاعری کی کیا تاثیر ہے کوئی بڑا اچھا فصیح و بلیغ کلام بول دے شاعروں سے بڑھ کر فصیح و بلیغ کون ہوگا۔ لیکن شاعر پچاس غزلیں پڑھ لیں اثر کچھ بھی نہیں ہوتا لوگ واہ واہ تو کر دیں گے لیکن آگے اس کا کوئی اثر نہیں لوگ دل میں کچھ نہیں لے کے جاتے اسلئے کہ اس کے اندر معنی نہیں ہیں محض لفاظی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شاعر کسی امیر کے ہاں گئے تھے۔ تو انہوں نے جا کے وہاں قصیدہ پڑھا اور شعر ہے ہی وہ جس میں جھوٹ زیادہ ہو اور سچ کم ہو اگر شعر کے اندر ساری سچی پکی باتیں ہوں، وہ شعر ہی کیا ہوا؟ تو جب تک اس میں مبالغے اور بہت سی باتیں جھوٹ نہ ہوں، شعر بنتا نہیں کسی نے کہا ہے کہ شعر کی تعریف کیا ہے کہ "اَحْسَنُهٗ اَكْذَبُهٗ" جو سب سے زیادہ جھوٹا شعر ہوگا وہ سب سے زیادہ عمدہ شعر ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہوگا تو لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں۔ معنی اس کے اندر نہیں ہوتے۔ خیر وہ شاعر صاحب ایک لمبا چوڑا قصیدہ نواب کی شان میں لکھ کے لے گئے اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپ کا جو تخت سلطنت ہے اس کا پایہ آسمان کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ اور آپ کی کلاہ تاج ہے اس کا کنگرا ساتویں آسمان تک پہنچا ہوا ہے، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ثریا بھی ماند ہے اور چاند کی کوئی روشنی ہی نہیں جو آپ کی آنکھوں میں چمک ہے اور آپکے ہاتھ میں جو قوت ہے تو بجلی بھی وہ کام نہیں کر سکتی، جو آپ کا ہاتھ کرے گا غرض ایران توران کی ہانکی۔

امیر صاحب بہت خوش ہوئے کہ اس نے بڑی تعریف کی تو قصیدہ سنتے ہی کہا کہ پرسوں آنا تمہیں ہم دو ہزار روپیہ انعام دیں گے یہ بہت خوش ہو گئے اور جاتے ہی پانچ سو روپے قرض بھی لے لئے اور گھر میں مرغا بھی پک رہا ہے اور لباس وغیرہ بھی خوب بنائے کہ پرسوں کو تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے۔ پانچ سو قرضے کے ادا کر دیں گے تو ان میں سے پھر بھی باقی بچ جائیں گے مجھ سے زیادہ اب امیر کون ہوگا۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

چنانچہ وہ حسب وعدہ بڑی عمدہ شیروانی پہن کر وہاں پہنچ گئے، اب وہ امیر صاحب بیٹھے ہیں، نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے، انہوں نے سلام کہا، انہوں نے گردن بھی نہیں اٹھائی، تھوڑی دیر تو یہ بیٹھے اس کے بعد کھنکارنا شروع کیا، مگر امیر صاحب نے جب بھی کچھ نہیں سمجھا آخر یہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حضور میں حاضر ہوں۔ آپ کون ہیں؟ وہی جو پرسوں شاعر آیا، قصیدہ کہا تھا تو حضور نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دو ہزار دیں گے، میں اس وعدے کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا تم بڑے بے وقوف آدمی ہو، ارے بھائی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا تھا۔ ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا تھا۔ نہ ان لفظوں کے کوئی معنی تھے نہ ان لفظوں کے کوئی معنی۔ جو قصیدہ تم نے کہا تھا اس کے لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں تھے اور ہم نے جو دو ہزار کے لفظ کہے تھے تو ان لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں۔ بڑے بے وقوف آدمی ہو تمہیں صلہ مل چکا۔ اس نے کہا حضور! میں تو پانچ سو روپے قرض بھی لے چکا ہوں اگر تم نے لئے تو جھک مارا۔ کس نے تم سے کہا تھا؟ معلوم ہوا تم بے وقوف بھی ہو شاعر نہ ہوتے، عقلمند تو ہوتے عقل کی کچھ تو قیمت ہوتی۔

تو حقیقت یہی ہے کہ لفظوں کی کوئی قدر قیمت نہیں ہوتی جب تک لفظوں کے اندر معنٰی نہ ہوں اور معنیٰ کے اندر دلی جذبات نہ ہوں اس وقت تک لفظوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہم جیسا کوئی اللہ اللہ کرے گا تو وہ محض زبان سے ہوگا، دل کی بیداری شامل نہیں ہوگی اور اللہ والے جو اللہ اللہ کرتے ہیں۔ تو دل کا ذکر، محبت و معرفت، لگاؤ نسبت اور تعلق اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس لئے جو لفظ نکلتے ہیں وہ قلوب کے اوپر تاثیر کرتے ہیں۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے صاجزادے مولانا رکن الدین پڑھنے کے لئے دہلی گئے۔ اور آٹھ دس برس کے بعد بڑے اچھے عالم بن کے آئے۔ مریدین نے عرض کیا، حضرت! صاجزادے عالم بن کے آئے ہیں اگر وعظ کرا دیا جائے۔ فرمایا، ہاں بھئی! ضرور وعظ کہلاؤ جب علم پڑھا ہے تو علم کا اثر ظاہر ہو، دوسروں کو مسائل معلوم ہوں۔ صاجزادے کھڑے ہوئے اور بڑا عمدہ وعظ کہا تمام لوگ خوش ہوئے بہت سے مسائل بیان کئے لوگوں نے مسائل سیکھے، تعریف کی لیکن کوئی خاص اثر پیدا نہ ہوا کہ لوگ رونے لگے ہوں یا آپے سے باہر ہوئے ہوں۔ یہ کچھ بھی نہیں بس یہ ہوا کہ بہت اچھے صحیح مسئلے بیان کئے دل میں قدر و قیمت تھی۔

جب مولانا رکن الدین وعظ کر چکے، تو حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ منبر کے قریب کھڑے ہوئے ایک جملہ کہا، فرمایا، ''بھائی! رات عجیب بات پیش آئی، رکن الدین کی ماں نے فقیر کے لئے کھیر پکائی تھی، وہ کھیر پکا کے کھونٹے پہ رکھ دی، بلی آئی اور کھا کے چلی گئی فقیر محروم رہ گیا۔'' بس یہ کہنا تھا کہ ایک دم جو لوگوں پر گریہ طاری ہوا اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالا اور مسجد میں ایک طوفان بپا ہو گیا اب اس میں آخر کیا چیز تھی؟ کھیر پکی رکھی تھی، بلی آئی وہ کھا گئی تو یہ کون سے حقائق و معارف تھے؟ مگر حقیقت میں وہ جو قلب کی تاثیرات تھیں ان تاثیرات نے ان الفاظ کو آلہ بنایا اور الفاظ نے کانوں کو کھٹکھٹایا اور دل کی تاثیر الفاظ کے راستے سے دل پر پڑی اور دلوں میں محبت الٰہی بھری اور

انہوں نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ تو یہ لفظوں کا اثر نہیں تھا۔ شیخ کے قلب کا اثر تھا۔ اصل میں اہل اللہ دل میں اثر ڈالتے ہیں۔ الفاظ محض ان کا آلہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی قیمت نہیں ہوتی۔ کسی اللہ والے کے پاس سے آپ قلب میں کوئی اثر لے کے جائیں کوئی آخرت کا دین کی عظمت ومحبت کا، وہ الفاظ کا اثر نہیں ہوتا، وہ قلب کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر اس کے قلب میں کوئی اثر نہ ہوتا وہ بہتر سے بہتر لفظ کہتا آپ اس سے کوئی بھی اثر نہ لیتے۔ لفظ تو اثر نہیں کرتے، وہ معانی کرتے ہیں تو معانی لفظوں کے اندر وہی ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ وہی تاثیر وتصرف ہے جس سے قلوب جگمگا اٹھتے ہیں۔ قلوب کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① سب سے زیادہ وزنی چیز، سب سے زیادہ پر عظمت چیز وہ اللہ کی یاد ہے کہ دنیا و مافیہا اللہ کی یاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یادِ حق دل میں آ جائے تو بندہ عرشی ہو جاتا ہے...... جب بندے کے دل میں یہ یاد آ جاتی ہے تو لاکھوں سلطنتیں ایک طرف اور یہ چیز ایک طرف، اس کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے ہاں بھی مہمانداری بہت تھی اور مریدین کا ہجوم رہتا تھا۔ دو اڑھائی سو تک آدمی، ان کے مریدین میں سے نواب میر خاں جو ہندوستان میں ریاست ٹونک ہے، اس کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے ہاں مہمانداری بہت ہے اور کوئی دولت، جاگیر، جائیداد ہے نہیں ہے تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک ضلع ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا کہ یہ میں آپ کو دیتا ہوں اس کی ہزاروں روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ مہمانوں کا خرچ چلے گا اور وہ پیتل کے پترے پہ لکھ کے بھیجا کہ یہ میں بنام حضرت شاہ غلام علی عطیہ دیتا ہوں۔ یہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ آپکے مرید نواب میر علی خاں ہیں۔ انہوں نے یہ پورا ضلع ہدیہ پیش کیا ہے۔ اس کی پشت پر شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ایک شعر لکھ کے بھیج دیا جیسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ انہوں نے بھی ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور وہ شعر یہ تھا کہ:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم   با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے اور وہ آسمان سے آ رہی ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ یہ اتنی استغناء اور اتنی بیداری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دل کے اندر کوئی دولت جمع نہ ہو وہ دولت یہی ذکر اللہ کی تھی۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے تو ضلع، صوبہ، پوری دنیا کیا چیز ہے، ذکر اللہ کے سامنے چاند اور سورج کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جب وہ قلب میں آ جاتا ہے تو بندہ پھر عرشی بن جاتا ہے عرش کے اوپر کی باتیں کرتا ہے نیچے کی نہیں کرتا تو یہ ہے وہ

① ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

ذکر اللہ جو ساری شریعت اور کائنات کی روح ہے۔ اگر اس دنیا میں سے ذکر خداوندی نکل جائے، اسی دن قیامت آ جائے اور یہ خیمہ ختم کر دیا جائے اور اگر کسی کے قلب میں سے نکل جائے اسی دن ایمان واسلام ختم ہے۔ کسی قوم میں سے نکل جائے، وہ قوم بھی بے عزت، اس کی آبرو اور عزت بھی ختم۔ تو ہر چیز میں دولت، عزت حکومت کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین ودیانت، یادالٰہی اور یاد خداوندی شامل نہیں ہوتی اس وقت تک عالم میں کوئی چیز زندہ نہیں ہوتی کیونکہ سب چیزوں کی روح یہ ہے۔

ذکر اللہ کا مظہر اتم...... اس کا سب سے بڑا مظہر اتم جس سے ذکر الٰہی ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ نماز تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سے پہلے فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ① نماز فحش سے، بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے بچاتی ہے، جو شریعت میں گناہ ہیں۔ ان سب چیزوں سے نماز بچاتی ہے اور آگے بطور دلیل کے فرمایا، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② نماز کی روح ذکر ہے اور ذکر سب چیزوں سے بڑا ہے۔ ذکر کی روشنی جب آئے گی تو کوئی ظلمت اور تاریکی اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتی گناہ ہو، کچھ ہو، سب ختم ہو جائے گا۔

اس سے ایک شبہ کا جواب نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو شاید یہ سوال پیدا ہو کہ ہم تو خوب پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، مسجدیں بھی بنواتے ہیں، لاکھوں روپے بھی اس میں لگواتے ہیں اور بچے بچے کو لاتے ہیں مگر اس کے باوجود منکرات میں مبتلا ہیں۔ بعض بے غیرتی اور بے حیائی کی باتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ نمازی بھی ہیں۔ مگر یہ حرکتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ نماز فحش اور منکرات سے بچا دیتی ہے۔ حالانکہ ہم نمازی بھی ہیں پھر بھی منکرات میں مبتلا ہیں۔

اس شبہ کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ آپ اس سے مقابلہ کیجئے جو بالکل نماز نہیں پڑھتا۔ اس میں کتنے منکرات ہیں اور نمازی میں کتنے ہیں۔ زمین وآسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ نماز پڑھنے والا اگر مبتلا بھی ہوگا تو اتنی برائی نہیں ہوگی جتنی بے نمازی کے اندر ہوتی ہے۔ نمازی کے دل میں پھر بھی خوف خدا تھوڑا بہت موجود ہوگا تو ایک جواب تو یہ ہے، جو سرسری ہے کہ اللہ کا ذکر اور نماز بلاشبہ منکرات سے بچاتی ہے۔ آپ نہیں بچ رہے ہیں۔ تو یہ اصل میں زیادہ میں مبتلا نہیں، کم میں مبتلا ہیں۔ جو بالکل نماز نہیں پڑھتے وہ اس سے زیادہ میں مبتلا ہیں تو کسی نہ کسی حد تک تو آپ کو نماز نے بچا دیا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، ہمارے مرشد بھی ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم بھی ہیں۔ ملا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے استاذ اور مولانا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ یہ دارالعلوم کا ابتدائیہ ہے کہ دو محمودوں سے ابتدا ہوئی۔

الٰہی عاقبت محمود گرداں

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

جب ابتدا محمود ہے تو ان شاء اللہ عاقبت بھی محمود ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ سادات میں سے تھے۔ مگر ہیں سرحدی تو وہاں کے سادات کو بھی خان ہی کہتے ہیں۔ سب پٹھان کے لقب سے معروف ہیں۔ پٹھان اور خان گویا ان کے ہاں ایک عظمت کا لفظ ہوتا ہے۔

میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں کے اخبارات نے شائع کیا کہ مولانا محمد طیب خاں حالانکہ میں پٹھان نہیں۔ مگر وہ خان عزت وعظمت کا لفظ ہے۔ تو مولانا عزیر گل صاحب گویا انہیں عرف کے لحاظ سے سرحدی پٹھان کہنا چاہئے یوں تو سادات میں سے ہیں۔ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں بڑے دخیل تھے اور بعض دفعہ اتنے جوش سے بات چیت کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے سے چھوٹے سے بات کر رہا ہو یعنی اتنے دخیل تھے کہ بعض دفعہ بے ادبی کی بات ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ صحیح بخاری کے درس میں انہوں نے سوال کیا اور کہا حضرت! یہ مسئلہ کیسے ہے؟ حضرت نے سرسری جواب دے دیا بس کہنے لگے کہ خود کو نہیں آتا اور سرسری جواب دے کے آگے چل دیئے پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے اور جواب دینا آتا نہیں تو اس طرح سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ ان کی عام بات تھی کہ جب ہم لوگوں سے گفتگو شروع کرتے تو ''آپ'' سے شروع کرتے آپ نے یہ کہا، آپ نے یہ کہا۔ اس کے بعد جب جوش آتا تو ''تم'' کہتے، تم نے یہ کہا، تم نے یہ کہا۔ اس کے بعد ''تو'' نے یوں کہا، تو نے یوں کہا۔ اور اس کے بعد یہ کہ ارے خبیث تو نے یہ کیوں کہا۔ تو ''آپ'' سے شروع ہو کر ''خبیث'' پہ انتہا ہوتی تھی۔ ان کا ایک عام طرز تھا۔ تو بے تکلف بہت اور حضرت کی شان میں بعض جگہ بے ادبی کے کلمات کہہ دیتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عرض کیا کہ حضرت اتنے دنوں وہ آپ کی صحبت میں رہے اور انہیں تہذیب نہ آئی اتنے بے ہودہ اور بھدے کلمات کہہ دیتے ہیں۔ بیس پچیس برس آپ کی صحبت اٹھائی اور پھر بھی آدمی نہ بنے۔

حضرت نے فرمایا: یوں خیال کرو، اگر یہ بیس پچیس برس صحبت میں نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ جب رہ کر اتنے ہوئے، اگر بالکل نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ تو وہی میں کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھ کر اتنی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ بالکل نہ پڑھتے تو کیا ہوتے؟ اور کتنی برائیاں کرتے؟ تو سیدھا جواب تو یہ ہے کہ نمازی اگر مبتلا بھی ہوگا تو کم مبتلا ہوگا بے نمازی زیادہ مبتلا ہوگا۔

لیکن اصل جواب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے باوجود اگر آدمی فحش سے نہیں بچتا، بے حیائی اور برائی سے نہیں بچتا اس نے نماز کا ڈھانچہ قائم کیا اور جو ذکر اللہ کی روح ہے، وہ قلب کے اندر نہیں ہے، روح ہوتی، یقیناً بچ جاتا۔ تو نماز بے حیائی سے بچاتی ہے۔ جب کہ نماز جاندار ہو اور اگر بے جان پڑھے جس کے اندر روح ہی نہ ہو تو لاشہ اور ڈھانچہ کوئی چیز نہیں وہ تو کام نہیں کر سکتا تو نماز بھی کام نہیں آسکے گی نماز اٹھک بیٹھک کا نام نہیں ہے۔ نماز عظمت خداوندی اور یاد حق کا نام ہے کہ دل اللہ کی یاد میں غرق ہے دوسری چیزیں دل سے فنا محض ہو جائیں تو جتنی

یا د زیادہ ہوگی، اتنا ہی بے حیائی سے بچے گا جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم بچے گا۔ بالکل نہیں ہوگی تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے، جب بھی نہیں بچے گا اس لئے کہ جان تو ہے ہی نہیں تو اصل جواب یہ ہے کہ نماز بلاشبہ فحش سے بچاتی ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کا کلام حق ہے۔ ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ ① یقیناً نماز بے حیائی سے اور منکرات سے بچاتی ہے۔ بچاتی کیوں ہے؟ ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ② اس لئے کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ ③ نماز ذکر اللہ ہی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ ذکر روح ہے اگر روح نہیں ہوگی تو نہیں بچائے گی۔

روح نہ ہونے کے شبہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے...... لیکن میں اتنی بات عرض کئے دیتا ہوں کہ کبھی یہ سمجھئے کہ پورا ذکر تو ہے نہیں، ہماری نماز تو صورت ہی صورت ہے۔ یہ برائی سے بچاتی نہیں، تو آج سے اسے بھی چھوڑ دو اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہوا نہیں اس صورت کو قائم رکھو اس لئے کہ جو صورت بنا رہا ہے تو وقت آئے گا کہ اس صورت میں ہی روح آ جائے گی اگر صورت ہی نہیں بنے گی تو پھر روح کس میں آ کر پڑے گی؟ اس واسطے اس صورت کو بھی قائم رکھو۔ اگر روح نہ ہو، شکل اس کی بنائے رکھو اچھی شکل میں اچھی حقیقت آ جاتی ہے۔ آج نہیں آئے گی، کل آئے گی پڑھتے پڑھتے کسی دن تو خیال ہوگا کہ بھئی! یہ جو محض رسمی اور تصویری کی نماز پڑھ رہا ہوں، یہ بے کار نہ جائے۔ اس میں جان پیدا کرو تو پڑھتے پڑھتے چند دن کے بعد دھیان آ سکتا ہے۔ اور روح بن جائے گی اس واسطے چھوڑنا اسے بھی نہیں چاہئے جیسے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ۔

بہر دین و بہر دنیا و بہر نام ـــــ اللہ اللہ کردہ باید والسلام

تم اللہ اللہ کرو، دنیا کے لئے کرو، دکھلاوے کے لئے کرو، نام و نمود کے لئے کرو، کرتے رہو اس لئے کہ کرتے رہو گے تو اسی میں اخلاص بھی آ جائے گا اور بالکل ہی گھر نہ بناؤ تو مسافر آ کے ٹھہرے گا کہاں؟ تو گھر بنا لے، ممکن ہے ذکر اللہ کا مسافر آ جائے اور آ کر اس کے اندر مقیم ہو جائے۔ تو چاہے ریا کاری کی نماز ہو، چاہے بے دھیانی کی ہو، قلب میں کچھ نہ ہو مگر فرض ادا کرتے رہو صورت ہی ان شاء اللہ چند دن کے بعد اپنی طرف کھینچ لے گی تو یہ وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ جب اس میں روح نہیں تو پڑھنے سے فائدہ کیا؟ فائدہ ہے کم سے کم مفتی فتویٰ دے رہا ہے کہ نماز ہو گئی اسے دل کی خبر نہیں اور جب اللہ کی ہزاروں مخلوق نمازی کہے گی تو عند اللہ بھی معتبر ہوگی۔ تو جب سرکاری گواہوں نے گواہی دے دی کہ فلاں آدمی نمازی ہے تو عند اللہ بھی نمازی ہے۔ تو کیا خبر ہے کہ یہ نمازی کی صورت ہی آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جائے اس لئے چھوڑنا نہیں چاہئے۔

بہر حال مجھے اس ساری آیت سے کلام کرنا نہیں تھا کہ میں نماز کی حقیقت بیان کروں اور پھر یہ بیان کروں کہ نماز کس طرح منکرات اور بے حیائی سے بچاتی ہے بلکہ صرف ذکر اللہ کے بارے میں چند باتیں کہنی تھیں جو

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

آیت کا دوسرا جز ہے، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① وہ بھی اس لئے کہ وہی سارے عالم اور ساری شریعت کی روح ہے۔ شریعت سے ذکراللہ نکل جائے تو شریعت کے اعمال ڈھانچہ بن جائیں گے۔ دنیا کے اندر ذکراللہ نہ رہے، تو یہ دنیا بے جان لاشہ بن جائے گی اور ختم ہو جائے گی اس واسطے ذکراللہ کی رعایت کرنی چاہئے۔

ذکرِ کثیر کے حصول کی سہل صورت...... اور اس کے لئے سیدھی صورت یہ ہے کہ شریعت نے جو اعمال بتلائے ہیں۔ اگر بچپن سے ہی بچے کو وہ یاد کرا دئے جائیں۔ موقع بموقع کی دعائیں ہیں۔ ان کو ذکر کثیر کہا گیا ہے تو جب وہ دعائیں پڑھائیں گے تو قرآن حکیم میں جو حکم ہے کہ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ ② اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثیر کرو تو کثرت ذکر کیا ہے؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کثرت ذکر یہ کہ مختلف اوقات میں جو اذکار اور دعائیں آتی ہیں وہ ان اوقات میں پڑھی جاتی رہیں، تو ذکر کثیر ہو گیا مثلاً جب چارپائی پر سونے کے لئے لیٹیں تو اس کی دعا الگ ہے کہ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى." ③ یا سو کے اٹھیں اس کی دعا الگ ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ." ④ یا کھانا کھانے کے بعد کی دعا ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ." ⑤ یا استنجا کے لئے جائے پاخانے میں بایاں قدم رکھے اور کہے کہ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ." ⑥ اور جب واپس آئے تو دایاں پاؤں پہلے رکھے اور کہے: "غُفْرَانَكَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ." ⑦ یا جب لباس پہنے تو پڑھے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ." ⑧ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِهٖ وَخَيْرِ مَاصُنِعَ لَهٗ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ." ⑨

یا مثلاً بیوی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھے۔ کہ "اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّيْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا" ⑩ اولاد مقدر ہوگی تو صالح اولاد پیدا ہوگی۔ یا مثلاً بازار جائے تو بازار میں جانے کی دعا یہ ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ صَفْقَةً رَابِحَةً وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ صَفْقَةٍ خَاسِرَةٍ" ⑪ "وَلَفْظُهٗ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ السُّوْقِ

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۱. ③ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب مایقول اذانام، ج: ۱۹ ص: ۳۷۴ رقم: ۵۸۳۷. ④ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب مایقول اذانام، ج: ۱۹ ص: ۳۷۴ رقم: ۵۸۳۷. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب مایقول اذاطعم، ج: ۱۰، ص: ۳۳۳، رقم: ۳۳۵۲. ⑥ الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب مایقول عندالخلاء، ج: ۱ ص: ۲۴۶ رقم: ۱۳۹.

⑦ السنن لابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب مایقول اذا خرج من الخلاء، ج: ۱ ص: ۳۵۶ رقم: ۲۹۷. ⑧ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب بلاترجمۃ، ج: ۱۱ ص: ۳۷ رقم: ۳۵۰۵. حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۳. ⑨ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب اذا لبس جدیدا، ج: ۱۱ ص: ۳۶ رقم: ۳۵۰۴.

⑩ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب التسمیۃ علیٰ کل حال، ج: ۱ ص: ۲۴۴ رقم: ۱۳۸.

⑪ المعجم الاوسط للطبرانی، باب من اسمہ: محمد ج: ۱۲ ص: ۲۷۰. علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن ابان الجعفی وھوضعیف، دیکھئے: مجمع الزوائد، باب مایقول اذا دخل السوق ج: ۴ ص: ۳۹۸.

وَخَیْرَ مَا فِیْهَا، وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِیْهَا، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اُصِیْبَ فِیْهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً." "اے اللہ! میں نفع کا سودا چاہتا ہوں اور گھاٹے کے سودے سے پناہ مانگتا ہوں"۔ یا سورج نکلے تو دعا بتلائی گئی ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً وَجَآءَ بِالشَّمْسِ مَطْلَعِهَا." ①

تو ہر موقع کا ایک ایک ذکر ہے۔ یہ اذکار علماء نے چھاپ بھی دیئے ہیں۔ اگر بچے کو ابتداء سے یہ یاد کرا دیئے جائیں، تو یہ موتی ان کے قلوب میں بھر جائیں گے اور زندگی اسلام بن جائے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی کہ پاخانے جاتے ہوئے یہ، کھانے کے وقت یہ، لباس پہننے کے وقت یہ، دوستوں سے مصافحہ کرو، تو یہ، کسی سے ملے تو یہ، عادت پڑ جائے گی تو اسی سے اسلامی زندگی بنتی ہے۔ یہ ذکر کثیر مفت میں ہاتھ آ جاتا ہے۔ تو بڑی آسان بات یہ ہے کہ بچوں کو یاد کرا دی جائیں اور بڑے بھی اگر یاد کریں، تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں ساری یاد ہو سکتی ہیں۔ پچاس ساٹھ سے زیادہ یہ دعائیں نہیں ہوں گی، زیادہ ہوا تو سو ہو جائیں گی۔ تو ایک دن میں اگر ایک دعا یاد کر لے اور چار مہینے لگ جائیں، تو تین چار مہینے میں پورا دین حاصل ہو جائے یہ بڑے نفع کا سودا ہے، کوئی گھاٹے کی بات نہیں۔ تین مہینے میں نہیں، چار مہینے سہی اور بچے تو بہت جلدی یاد کرتے ہیں۔ چند دن میں یاد ہو جائیں گی اس طرح ذکر کثیر کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

یا پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کر لیا جائے کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ ایک آدھ گھنٹہ آدمی اللہ میاں کے لئے دے دے چوبیس گھنٹے دنیا کی ضروریات کے واسطے اگر اس میں کچھ وقت اللہ کے نام پر نکال دے تو کون سے بڑی بات ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ساری زندگی اللہ کی ہوتی، چھوٹا موٹا وقت دنیا کے کاموں کے لئے ہوتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں چلو تم سارا ہی وقت دنیا کے کاموں میں لگا دو تھوڑا سا وقت اللہ کے لئے دو۔ تو روزانہ صبح کے وقت بیٹھ کر ایک سو مرتبہ کلمہ تمجید، "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ." ② سو مرتبہ استغفار، "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ." ③ اور سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا جائے اور وہ مختصر یہ ہے: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ."

یہ کون سی بڑی بات ہے؟ ایک بیس منٹ کی بات ہے۔ لیکن ذکر کثیر کی دولت مفت میں حاصل ہو جاتی ہے تو سوتے وقت بھی پڑھ لے اور صبح کو بھی پڑھ لے۔ دونوں وقت نہ سہی، چلو صبح کی نماز کے بعد پڑھ لو صبح نہیں تو سوتے وقت آدھ گھنٹہ دے دو تو آدمی ذکر اللہ کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا اور ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ﴾ ④ کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ آدمی اگر دیندار بننا چاہے تو دین بڑا آسان ہے۔ دنیا کمانی بڑی مشکل ہے۔ دنیا اس

① حدیث محل کلام ہے۔ عمل الیوم واللیلة، ج: ۱ ص: ۲۷۷ رقم: ۱۴۶۔ ② الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التهلیل والتسبیح، ج: ۱۳ ص: ۲۰۵ رقم: ۴۸۶۱۔ ③ السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب فی الاستغفار، ج: ۴ ص: ۳۱۳ رقم: ۱۲۹۶۔ ④ پارہ: ۲۱، سورة العنکبوت، الآیة: ۴۵۔

وقت تک نہیں آسکتی جب تک آپ چوبیس گھنٹے دماغ دو کان میں نہ لگائے رکھیں، ذکر اللہ اور دین آسکتا ہے۔ اگر بیس منٹ بھی دے دیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تو دنیا کمانا مشکل اور دین کمانا آسان ہے۔ لوگوں نے آسان کو چھوڑ دیا اور مشکل کو اختیار کر لیا تو۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ کی فضیلت یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ مختلف اوقات کی دعائیں یاد کی جائیں اور یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ صبح، شام یہ تین تسبیح پڑھ لیں اور نماز کی پابندی کی۔ تو انشاء اللہ بہت سی برکات اسی سے پیدا ہو جائیں گی۔

اس واسطے میں نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں گذارش کیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ذکر اللہ کرنے اور یادِ خداوندی میں لگنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے دین کی ہمیں محبت عطا فرمائے اپنی اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے قلوب میں ڈال دے۔ اس محبت سے عظمت پیدا فرما دے اور عظمت سے متابعت اور اطاعت واتباع کی دولت نصیب فرما دے۔ (آمین)

''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.''

طریق اصلاح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا."

أَمَّا بَعْدُ:

دنیا کی ایک عام حالت، تمہید...... بزرگان محترم! اس دنیا کی بناوٹ اور ساخت پر ہم غور کریں، تو اس سے یہ اندازہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دو سلسلے جاری ہیں۔ ایک خیر اور بھلائی کا، ایک شر اور برائی کا، ہر چیز میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی ذوات کو چھوڑ کر کہ وہ خیر محض ہیں دنیا میں جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں کچھ بھلائی پائی جاتی ہے اور کچھ برائی۔ نہ کوئی خیر محض ہے نہ شر محض۔ ہر چیز میں سے ایک راستہ شر کا ایک اور ایک بھلائی کا نکلتا ہے۔ روٹی جیسی نعمت جو ہم روز کھاتے ہیں، وہ جس طرح زندگی بناتی اور طاقت دیتی ہے۔ ذرا بے اعتدالی ہو جائے، وہی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہی پانی، جس کے بارے میں فرمایا گیا، ﴿وَجَعَلْنَامِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ① ہر چیز کو ہم نے پانی سے زندگی دی، یہی پانی اگر زیادہ پیا جائے تو تخمہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی ہوا حیات کا سبب ہے۔ اگر یہی زیادہ پہنچ جائے، سانس اکھڑ جاتی ہے۔ فنا کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے زمین فرش بھی ہے اور قبر بھی بن جاتی ہے۔ موت کا بھی ذریعہ ہے، حیات کا بھی۔ تو ہر چیز میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔

انسان کو دیکھا جائے تو جہاں اس سے بھلائیاں پہنچتی ہیں کہ جتنی بھلائیاں یہ کرتا ہے اتنی کوئی نہیں کر سکتا۔ یہی جب شر پر آتا ہے تو اس سے اتنی شر پہنچتی ہے کہ شیطان بھی اتنی نہیں پہنچا سکتا، جتنی راحتیں اس سے پہنچتی ہیں، اتنی ایذائیں بھی پہنچتی ہیں۔ تو انسانوں میں کھانے میں، پہننے میں اور استعمال کی ہر چیز میں کچھ بھلائی ہے اور کچھ برائی۔

لیکن جہاں تک ہم غور کرتے ہیں تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ برائی تو ہر شی کی ذات میں رکھی ہوئی ہے اور بھلائی باہر سے لا کر اس کے اندر داخل کی جاتی ہے۔ ذات میں کوئی بھلائی موجود نہیں۔ جدوجہد اور محنت کرتے ہیں تو کچھ خوبی

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۰.

آ جاتی ہے۔ اگر محنت نہ کریں تو خرابی لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود اندر موجود ہے۔

فرض کیجئے کھانا ہے تو اس کی عمدگی یہ ہے کہ خوش ذائقہ خوش رنگ اور خوشبو ہو ان صفات کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑتی ہے کہیں آپ نعمت خانہ بنائیں گے، کہیں بہترین الماری بنوائیں گے جس کی جگہ بھی ٹھنڈی ہو، ہوا بھی پہنچتی رہے۔ تا کہ کھانا خراب نہ ہو تو کھانے کی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر آپ کھانے کو سڑانا چاہیں کہ اس میں بدبو آنے لگے، خراب ہو جائے تو کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ اپنی محنت چھوڑ دیجئے، دو دن کے بعد سڑ جائے گا۔ بدبو آنے لگے گی، رنگ بھی بگڑ جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ برائی اس کھانے کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم ہوئی وہ اندر کی برائی خود بخود سامنے آ گئی۔

یا مثلاً ایک بہت عمدہ باغ ہے تو اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، ہرا بھرا ہو، شاداب ہو، درخت لہلہا رہے ہوں، سبزہ چھایا ہوا ہو، ان خوبیوں کو دیکھ کر آپ مال بھی خرچ کریں گے، ملازم بھی رکھیں گے جو پانی بھی دے اور درختوں کی نگرانی بھی کرے تب جا کے باغ کی یہ خوبی برقرار رہے گی۔ لیکن اگر آپ باغ کو اجاڑنا چاہیں کہ وہ خشک ہو جائے اور جلانے کے قابل ہو جائے۔ تو نہ مالی اور تنخواہ دار ملازم رکھنے کی ضرورت، محنت بند کر دیجئے دس دن کے بعد وہ خراب، خشک ہو کر پتے جھڑیں گے، شاخیں ٹوٹیں گی۔ جلانے کے قابل ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ خرابی اس باغ کی ذات میں چھپی ہوئی تھی۔ تم نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم کر دی۔ خرابی خود بخود اندر سے ابھر آئی۔ خرابی پیدا کرنے کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح مکان ہے۔ کئی لاکھ روپے لگا کر آپ نے بلڈنگ بنوائی۔ اس کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ملازم رکھنے پڑتے ہیں۔ تب مکان خوشنما اور بہتر طریق پر باقی رہے گا۔ لیکن اگر آپ مکان کو اجاڑ یا ویرانہ بنانا چاہیں، اس کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن کے لئے جھاڑو دینا چھوڑ دیجئے پہلے گرد جمے گا، پھر پلاستر گرے گا، پھر اینٹیں گریں گی۔ چند دن کے بعد مکان کھنڈر بن جائے گا، تو کھنڈر بنانے کے لئے محنت کی ضرورت نہیں۔ عمدہ بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمدگی کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ خرابی خود بخود بلا محنت اندر سے ابھر آتی ہے۔ یہ دنیا کی عام حالت ہے۔

برائی انسان کی ذات میں موجود ہے...... اسی پر اپنے آپ کو قیاس کیجئے۔ انسان بھی بہر حال دنیا ہی کی ایک چیز ہے۔ انسان کو قابل بنانے کیلئے محنت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کسی کو عالم بنائیں گے تو کسی مدرسہ میں بھیجنا پڑے گا، گھر پڑھائیں گے تو ایک عالم کو رکھنا پڑے گا۔ تنخواہ اسے الگ دیں گے خوشامد الگ کریں گے۔ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ الگ ہوگی کہ محنت کرے، تعلیم پائے تب جا کر وہ عالم بنے گا۔ لیکن جاہل بنانے کے لئے نہ آج تک کوئی مدرسہ کھلا نہ کسی معلم کو رکھا گیا کہ آپ ہمارے بچے کو جاہل بنا دیجئے۔ جاہل خود ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا

ہے۔علم کو لانے کے لئے معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہالت ذات میں موجود ہے۔علم لا کر اسے چھپا دیا جاتا ہے جس کے لئے محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ۔

قرنہا باید تا یک سنگِ خاراز آفتاب ۔۔۔ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

سالہاسال کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک پتھر آفتاب کی گرمی سہتے سہتے تپش اور جلن لیتے لیتے صدیوں میں جا کر لعل بدخشاں اور یاقوت بنے گا۔جس کی قیمت اٹھے گی تو یاقوت بننے کے لئے پتھر کو ضرورت پڑی کہ آفتاب کی گرمی کو سہے اس کی تپش کو جذب کرے تب جا کر لعل بنے گا۔لیکن پتھر بنانے کے لئے وہ تو پہلے سے بنا بنایا پتھر ہے۔لعل بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ بے قیمت پتھر بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں تو شاعر نے خوب کہا کہ سینکڑوں برس ایک پتھر آفتاب کی کرنوں کو جذب کرے تب جا کے لعل بدخشانی بنتا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ۔

ماہ ہا باید کہ یک پنبہ دانہ بعد کشت ۔۔۔ جامہ گردد شاہدے رایا شہیدے راکفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ بنولہ کا ایک دانہ، اسے زمین میں ڈالو، مہینوں وہ مٹی میں دبے، اپنی ہستی کو ختم کرے، اس میں سے کونپل نکلے، درخت بنے، اس میں روئی لگے، پھر روئی کو صاف کیا جائے پھر دھنا جائے، پھر کپڑا بننے والے کے ہاں بھیجا جائے کہ اس کے تار بنائے اور مشینوں پر لگائے کپڑا بنے، تب جا کے کپڑا کسی محبوب کا لباس بنے گا یا کسی شہید کا کفن بنے گا۔لیکن اگر یہ روئی کا دانہ محنت نہ اٹھائے۔نہ اسے کپڑا بننا نصیب ہوگا، نہ جامہ محبوب بننا نصیب ہوگا۔وہ محض ایک بنولہ کا دانہ ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔تو بنولہ کے دانے میں یہ کمال آ جانا کہ اس میں سے نکلی ہوئی چیز محبوبوں کے سر پر جائے، جب ہوتا ہے جب بنولہ کا دانہ محنت اٹھائے مٹی میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کرے، اور کاشت کار کی محنتوں کو سہے تب جا کے اس رتبے پر پہنچتا ہے۔کمال پیدا کرنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑی اور بے کمالی پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔دانہ پڑا پڑا خود ہی خراب ہو جائے گا اور خوب کہا ہے۔اسی شاعر نے کہا۔

سالہا باید تا یک کودکے از درس علم ۔۔۔ عالمے گردد نکو، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہاسال کی مدت چاہئے کہ آدمی کا ایک نادان بچہ میاں جی کی مصیبتیں سہے۔مکتب میں جائے، نو برس تک مصیبتیں اٹھا کر کورس کو حاصل کرے تب جا کے عالم یا شاعر شیریں سخن بنے گا۔لیکن اگر یہ محنت نہ اٹھائی جائے۔تو جاہل رکھنے کے لئے کسی قسم کی محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔بے محنت چھوڑ دو، جاہل بنا بنایا ہے تو جاہل بنانے کے لئے آج تک کوئی مدرسہ قائم نہیں ہوا۔کوئی کہے کہ بھئی ہمارے بچے کو جاہل بنا دو۔وہ کہے گا کہ جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔بنوانا چاہتے ہو تو عالم بنا دوں گا بشرطیکہ یہ بھی محنت کرے اور میں بھی محنت کروں۔تو خوبی محنت سے لائی جاتی ہے۔خرابی کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ خرابی ہر چیز کی ذات میں موجود ہے۔

بااخلاق بنانے کے لئے مربیوں کو محنت کرنی پڑے گی۔ مربیان دین کے سپرد کرنا پڑے گا، شیوخ طریقت محنت کریں گے، اپنے مرید سے محنتیں کروائیں گے۔ جب جا کے برسہابرس میں اس کے اخلاق درست ہوں گے۔ تو خانقاہ اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اخلاق کو درست کریں کیریکٹر کی اصلاح کریں۔ انسان کو اعلیٰ انسان بنائیں۔ آج تک کوئی خانقاہ اس لئے قائم نہیں ہوئی کہ کسی بچے کو بداخلاق بنا دیا جائے بداخلاق بنتا نہیں۔ آپ ذرا محنت کر کے اخلاق کو خراب کر دیجئے یہ کہے گا ارے احمق! یہ تو ماں کے پیٹ سے ہی بداخلاق پیدا ہوا ہے۔ محنت خوبی کے لئے کی جاتی ہے، خرابی کے لئے نہیں کی جاتی۔

تو انسان کے اندر دو ہی بڑے بڑے کمال ہیں: ایک علم اور ایک اخلاق۔ جس سے عمل درست ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کمال محنت سے لائے جاتے ہیں اور محنت نہ کی جائے تو علم کی جگہ جہالت ہے، وہ بھی پہلے سے موجود اور حسن اخلاق کی جگہ بداخلاقی، وہ بھی پہلے سے موجود۔ قرآن کریم میں علم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① "اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حالت میں کہ تم جاہل مطلق تھے۔ ذرہ برابر تمہارے اندر علم نہیں تھا"۔ انسان کا بچہ ایک مضغہ گوشت پیدا ہوتا ہے۔ نہ اسے اچھے برے کی تمیز، نہ سیاہ کو جانتا ہے نہ سفید کو۔ حق تعالیٰ اس کے اندر سمجھنے، دیکھنے اور سننے کا مادہ رکھتے ہیں۔ تب سن سن کر، دیکھ دیکھ کر، سوچ سوچ کر برسہابرس میں جا کے وہ عالم بنتا ہے، محنت کرتا ہے تو عالم بن جاتا ہے۔ مگر خلقی طور پر جہالت لے کر پیدا ہوتا ہے تو علم انسان کی ذات میں نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں جہالت ہے۔

اخلاق کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ ② میں اپنے نفس کی بریت نہیں کرتا۔ نفس جب حکم دے گا، برائی کا حکم دے گا۔ اس میں شر ہی شر چھپا ہوا ہے۔ تو خیر لائی جاتی ہے، شر پہلے سے موجود ہے۔ اخلاق میں بھی بدی پہلے سے موجود، نیکی محنت سے لائی جائے گی۔ علم میں بھی جہالت پہلے سے موجود، علم محنت کر کے لایا جائے گا۔ دو ہی کمالوں سے آدمی بنتا ہے، علم سے اور اخلاق سے اور وہ دونوں اس کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔ اس کی ذات کے اندر بداخلاقی اور جہالت ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے جتنے مادے ہیں۔ وہ سب گندے اور نجس ہیں۔ ان سے علم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان سے نیک اخلاقی بن ہی نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ جہالت اور بداخلاقی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے ذکر کیا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ ③ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا اس گندے قطرے میں کوئی خوبی، شعور، بھلائی اور دانش مندی نہیں، بلکہ ناپاک قطرہ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸. ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳. ③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴.

ہے۔ بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو اس کا دھونا واجب، مسجد میں آنا جائز نہیں، قرآن پڑھنا جائز نہیں۔ اس درجہ گویا ناپاک اور نجس چیز ہے کہ عبادت سے آدمی جاتا رہتا ہے۔ مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس سے تو انسان کی پیدائش واقع ہوئی۔

بعض ائمہ کا اس بارے میں مذہب یہ ہے کہ وہ قطرہ پاک ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ عام ائمہؒ کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ ناپاک ہے۔ مگر بعض اس کے قائل ہیں کہ وہ پاک ہے وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا مادہ ہے۔ تو اس کو نجس کیسے کہہ دیں۔؟ تو کچھ نہ کچھ اختلاف ہو گیا۔

لیکن ماں کے پیٹ میں جا کر آگے کیا ہوتا ہے۔ چالیس دن کے بعد خون بنتا ہے۔ خون کے پاک ہونے کا کوئی قائل نہیں گویا ناپاکی کی طرف بڑھا۔ اب تک اختلاف تو تھا کہ کوئی پاک کہتا تھا، کوئی ناپاک، لیکن حدیث میں ہے کہ وہی نطفہ چالیس دن کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خون بالاتفاق ناپاک ہے۔ اس کی پاکی کا کوئی قائل نہیں تو گویا دوسرا مادہ انسان کی پیدائش کا ایسا گندہ ہے کہ سب ہی اس کی گندگی کے قائل ہیں۔ چالیس دن کے بعد خون کی یہ بوند ایک لوتھڑا بن جاتی ہے۔ اس میں بھی کوئی خوبی نہیں، کوئی نورانیت اور چاندنا نہیں۔ اس کے چالیس دن بعد ماں کے پیٹ میں اس میں ہڈیاں پیدا کی جاتی ہیں، اور ان پر گوشت ڈالا جاتا ہے، کھال بن جاتی ہے، ایک شکل بنا دی جاتی ہے اس میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔ غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک گندے یا خراب قسم کے مادے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے ایک موقع پر ذکر فرمایا کہ: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ (۱) ''ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا''۔

ظاہری بات ہے کہ مٹی میں نہ شعور و عقل نہ تمیز و امتیاز نہ علو شرف، ہر وقت پامال ہے، جوتیوں میں روندی جاتی ہے۔ یہ انسان کی پیدائش کا مادہ ہے۔ مٹی کے خلاصے سے پھر گندہ قطرہ بنا، وہ نجس، اس گندے قطرے سے خون بنا، وہ نجس۔ اور فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ (۲) یہاں حق تعالیٰ نے دور بتلائے ہیں کہ پہلے انسان مٹی تھا۔ مٹی سے گندہ قطرہ، پھر مضغہ گوشت بنا، پھر ہڈیاں آئیں، پھر کھال پہنائی گئی تب جا کے کہیں اس میں جان پڑی۔ اتنے ادوار میں جتنے مادے آئے۔ وہ سب گندے اور ناپاک۔ ان میں کوئی خوبی نہیں۔ اس سے انسان کی پیدائش عمل میں آئی جس مکان میں پیدائش ہوئی وہ بھی گندا ماں کے پیٹ میں کوئی چاندنا تھوڑا ہی ہے۔ نہ ظاہری روشنی نہ باطنی روشنی۔ قرآن کریم نے ایک موقع پر فرمایا ﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ (۳) ہم نے تمہیں

(۱) پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۲۔ (۲) پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۳، ۱۴۔

(۳) پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۶۔

ماں کے پیٹ میں تین اندھیری کوٹھڑیوں کے اندر پیدا کیا۔ ان میں ظلمت کے سوا نورانیت کا نشان نہیں۔ تو پہلے ماں کا پیٹ ہے۔ اس میں کون سا چاندنا ہے، پھر اس میں رحم مادر ہے۔ اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی اس میں اور زیادہ ظلمت پھر اس میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے۔ وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اسے کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ گویا تین ظلمتوں میں انسان کو پیدا کیا گیا تو پیدائش کے مادے وہ بھی گندے، مکان پیدائش کے وہ بھی گندے۔ اتنے گندے مادوں میں سے علم کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ اخلاق کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ نجاستوں میں سے خوبی نہیں نکلتی جب انسان کی پیدائش ہی ایسے مادوں سے ہے، اس میں خوبی کہاں سے آتی؟۔

انسان میں کمال منجانب اللہ ہے...... لیکن آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دنیا میں جتنی خوبیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ انسان ہی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ انسان میں اولیاء علماء پیدا ہوئے انبیاء وحکما پیدا ہوئے دنیا کو بھی انسان نے سجایا اور آخرت کو بھی انسان نے بنایا تو خوبیاں بھی انسان میں ہیں۔ پھر اگر یہ ایسا گندہ تھا تو یہ خوبیاں کیوں اس کے اندر ظاہر ہوگئیں؟

اس کا جواب بھی سن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں انسان کی پیدائش کے مادے ذکر کئے وہاں ان گندی چیزوں کا ذکر کیا۔ لیکن ان گندی چیزوں میں سے نہ کوئی علم نکلتا ہے نہ کمال علم کا تعلق اس کی روح، حقیقت اور روحانیت سے ہے۔ روح کا جب ذکر کیا، اسے اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا فرمایا ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي﴾ ① ''میں نے انسان کے اندر اپنی روح ڈال دی''۔

﴿فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا﴾ ② تو جہاں کمال کا ذکر آیا۔ اسے اپنی طرف منسوب کیا کہ ان کے اندر کمال میرا ہے۔ جہاں گندگی اور گندے مادوں کا ذکر آیا وہاں انسان کی طرف نسبت کی ﴿خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ﴾ ③ انسان کو ہم نے مٹی سے بنایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ ④ انسان کو سڑے ہوئے گارے سے بنایا تو جہاں انسان اور اس کے مادوں کا ذکر ہے۔ وہاں انسان کی طرف نسبت کی گئی۔ جہاں روح کا ذکر آیا۔ وہاں کہا کہ میں نے اپنی روح انسان میں ڈال دی۔

معلوم ہوا کہ کمالات جتنے آتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے آتے ہیں۔ عیب جتنے ہیں وہ انسان کی ذات میں پہلے سے موجود ہیں۔ اسی واسطے اسے کمال پیدا کرنے کے لئے اللہ کی طرف جھکنا پڑے گا۔ وہیں سے کمال ملے گا۔ اس کی ذات میں کچھ نہیں ہے۔ علم اور اخلاق کے لئے محنت کرنی پڑے گی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، کیونکہ علم وکمالات اور اخلاق کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن کتنا ہی علم آ جائے، ذات تو انسان کی ذات ہی رہے گی۔ ذات میں وہی کورا پن وہی گندگی۔ یہی وجہ ہے کہ علم آ جانے کے بعد جتنا علم بڑھتا رہتا ہے،

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۲. ② پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۱۲.
③ پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۲. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۲۶.

اتنے ہی اہل علم تواضع سے جھکتے رہتے ہیں، سرنیچا رکھتے ہیں، غرور نہیں کرتے۔اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ علم ہمارا کمال نہیں ہے۔غرور آدمی کرے تو اپنی چیز پر کرے۔ دوسرے کی چیز پر آدمی کیا غرور کرے جو آ بھی سکتی ہے، چھینی بھی جاسکتی ہے۔ یہ ہماری چیز نہیں ہے۔

آپ اپنے خزانے پر کسی خزانچی کو بٹھلا دیں اور خزانچی آپ کے امر سے دوسروں کو دیتا رہے تو خزانچی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس خزانہ کا مالک ہوں اور میں دے رہا ہوں؟ وہ جانتا ہے کہ خزانے کا مالک دوسرا ہے۔اس کی اجازت سے میں خرچ کررہا ہوں۔ میں تو امین ہوں اور میں تو محض منتقل کردینے کا ذمہ دار ہوں، مالک نہیں ہوں تو خزانچی کے دل میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوگا۔اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے۔

اسی طرح سے انسان کتنا ہی عالم وفاضل بن جائے۔مگر جب وہ یہ دیکھے گا کہ میری ذات سے یہ علم نہیں آیا۔ یہ تو باہر سے آیا ہے۔ یہ عمدہ اخلاق میرے نہیں ہیں۔ میرے مادے تو گندے اور برے تھے۔ یہ کہیں اور سے آئے ہیں۔اس لئے دانش مند آدمی کبھی شیخی نہیں کرے گا۔کبھی اترائے گا نہیں اصلیت کو سمجھے گا اور یوں کہے گا کہ میں ان کمالات پر شکر تو کرسکتا ہوں۔لیکن فخر نہیں کرسکتا فخر اپنی چیز پر ہوتا ہے۔ یہ چیز میری ہے ہی نہیں۔ جتنے بڑے لوگ، علماء، اولیاء اور حکماء گزرے ہیں جتنا اونچے بنتے گئے، اتنا ہی سر جھکاتے گئے ہیں کہ ہم کوئی چیز نہیں، ہم ہیچ در ہیچ ہیں، ہم میں کوئی خوبی نہیں۔اس لئے کہ ان پر اصلیت منکشف ہوتی ہے۔

اہل کمال میں تواضع بھی بدرجہ کمال ہوتی ہے...... اس عالم میں سب سے بڑے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔مخلوقات میں آپ کے برابر کا کیا ہوتا؟ کوئی آپ کے لگ بھگ بھی نہیں ہے۔سب سے بالا اور برتر آپ کی ذات عالی ہے۔اللہ کے بعد اگر رتبہ ہے تو بس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔اتنی بڑائی عالم میں کسی کو نہیں دی گئی جتنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔اگر غرور فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، اگر اتراہٹ ظاہر فرماتے تو آپ فرماتے۔لیکن آپ سے زیادہ تواضع کرنے والا بھی عالم میں کوئی نہیں۔ آپ سے زیادہ سر کو جھکانے والا بھی کوئی نہیں۔قدم قدم پر اپنی تواضع ظاہر فرماتے۔کبھی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ننگے پیر کھانا کھاتے اور فرماتے "آکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ" (1) میں ایسے کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتے ہیں۔میں کوئی بادشاہ اور سلطان نہیں ہوں۔ میں ایک غلام ہوں۔ جیسے غلام کھانا کھاتے ہیں، میں کھاتا ہوں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ میں کوئی چیز ہوں۔

اسی طرح سے جب آپ چلتے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ فرمائیں کہ میں آگے آگے رہوں، بقیہ سب پیچھے رہیں۔ وہاں بھی کمال تواضع کہ صحابہ آگے پیچھے، دائیں بائیں چل رہے ہیں۔آپ کوئی اپنا امتیاز ظاہر نہیں فرماتے۔ یہ کمال تواضع ہے لیکن یہ آگے اللہ کی دی ہوئی بزرگی ہے کہ آپ اپنے کو لوگوں میں کتنا ہی رلاتے ملاتے اور مل ملا کر

(1) المصنف لعبدالرزاق، ج:۱۰، ۴۱۵، رقم:۹۵۴۳. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج:۲ ص:۸۲.

لوگوں میں چلتے۔لیکن سب سے اونچے آپ ہی نظر پڑتے تھے، حالانکہ بہت سے صحابہ ہیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک میانہ تھا نہ پستہ قد تھے نہ بہت لمبا قد۔نہایت موزوں اور خوبصورت قد تھا۔ جب آپ چلتے تو سب سے اونچے آپ دکھائی دیتے تھے۔یہ اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی۔آپ خود آگے بڑھنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔

مجلس میں جب آپ بیٹھتے تو اور لوگ بھی بیٹھتے۔صحابہ آگے پیچھے اور دائیں بائیں بھی ہیں۔کبھی اپنے لئے کوئی امتیازی مقام تجویز نہیں فرماتے تھے۔لیکن اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ لمبے لمبے قد کے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں مگر سب سے اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر پڑتے تھے۔تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے بلند اور بالا آپ ہی نظر پڑتے تھے تو آپ کی ذات ہے۔لیکن سب سے زیادہ تواضع آپ ہی فرماتے تھے۔کہیں فرماتے ہیں، ''لَا تَطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ'' ① اے لوگو! میری تعریف میں مبالغے مت کرنا، مجھے میری حد سے مت گزارنا، جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف میں مبالغے کئے کہ انہیں خدا کا بیٹا بلکہ خدا تک کہہ دیا۔میری بزرگی یہ ہے کہ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو ''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ، '' نہ میں خدا ہوں، نہ خدا کی اولاد، وہ اولاد ہونے اور باپ ہونے سے بری ہے۔''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ '' میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ہاں یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اپنا رسول بنایا، مجھے اپنا ایلچی اور پیغمبر بنایا اور اتنی عظمت مجھے عطا کی۔یہ اس کی دین ہے، میں بندہ ہی ہوں، تو جگہ جگہ فرماتے ہیں۔''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ '' (صلی اللہ علیہ وسلم)

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو کہا کہ ''یَا سَیِّدَنَا'' اے ہمارے سردار! حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سردار ہی تھے۔آپ تو جہانوں کے سردار ہیں۔لیکن فرمایا، ''اَلسَّیِّدُ اللّٰہُ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ'' ② سردار اللہ ہے۔میں تو اللہ کا بندہ اور غلام ہوں۔فوراً اصلاح فرمائی کہ ایسے خطاب بھی مت دو جس سے مبالغے ٹپکتے ہوں۔کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''لَا تَقُوْلُوْا اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُّوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی '' ③ اے لوگو! یہ کبھی میری نسبت مت کہو کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر اور برتر ہوں۔حالانکہ آپ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔لیکن روکا یعنی اس طرح تعریف مت کرو کہ دوسرے کی تنقیص و توہین ہونے لگے۔مقابلے ڈال ڈال کر میری بڑائی مت بیان کرو، کہ میرے مقابلے میں دوسرے کم رتبہ ہیں اور میں زیادہ رتبے والا ہوں۔یہ ادب کے خلاف ہے۔گستاخی کی بات ہے۔یہ کمال تواضع ہے تو کہیں ہدایت فرمائی کہ میری تعریفوں میں مبالغے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم، ج: ۱۱ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۹.

② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ التمادح ج: ۱۲ ص: ۴۲۹.

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ وان یونس لمن المرسلین ج: ۱۱ ص: ۲۲۳ رقم: ۳۱۶۳.

مت کرو اور کہیں فرمایا کہ دیکھو میری حیات طیبہ میں ادب کرو۔ مگر مبالغے مت کرو اور وفات کے بعد فرمایا، ''لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ '' ① میری قبر کو بت مت بنالینا کہ پوجا شروع کردو، سجدے شروع کردو یا جھکنا شروع کردو، بت مت بنالینا۔ اور کہیں فرمایا: ''لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا '' ② میری قبر کو عید گاہ مت بنانا کہ وہاں میلے ٹھیلے کرنے لگو، وہاں جماعتیں بن کر آئیں۔ یہ مت کرنا۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری زیارت کرنے کے لئے آؤ۔ روضہ اقدس پر حاضر ہو۔ حدیث میں فرمایا: ''مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ'' ③ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ میرا حق ہے کہ وہ میرے پاس آئے۔ اگر زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آدمی سفر کر کے جائے۔ تو اس کا حق ہے کہ سفر کرے اور زیارت کرے اور روضہ اقدس پر حاضر ہو اور صلوۃ وسلام پڑھے۔

بہر حال وفات کے بعد اور وفات، سے پہلے جتنے آداب بتلائے ان میں اپنی عبدیت و بندگی ظاہر فرمائی کہ میرے ساتھ نہ زندگی میں مبالغے کرو، نہ وفات کے بعد کہیں فرمایا، ''لَا تَقُوْمُوْا لِیْ کَمَا یَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ'' ④ میرے دربار میں میرے پاس آ کر یہ مت کرو کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور لوگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہوں. جیسے عجمی بادشاہوں کے سامنے لوگ کھڑے رہا کرتے تھے اور درباری بادشاہوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ چاہے دو گھنٹے ہوں یا تین گھنٹے بادشاہ بیٹھتا تھا۔ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا: یہ مت کرو جیسے سلاطین دنیا کے سامنے کیا جاتا ہے۔ یہ رسمی تعظیم ہوتی ہے۔ حقیقی ادب نہیں ہوتا حقیقی ادب یہ ہے کہ دل میں عظمت اور عقیدت گھر کی ہوئی ہو اور بیٹھے رہو۔ جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اس سے منع فرمایا تو یہ بھی کمال عبدیت کا اظہار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میری بندگی پیش نظر رکھو۔

رسالت و بشریت...... حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے رسول بھی ہیں اور رسالت کی بزرگی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر معجزات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر کرامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ تو ایک طرف تو یہ کرامت کہ اشارہ فرما دیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں اشارہ فرمائیں تو درخت اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے سامنے آ جائیں۔ طشت میں انگلیاں ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے جاری ہو جائیں اور چودہ سو آدمی سیراب ہو جائیں ایک طرف تو یہ۔ اور ایک طرف یہ کہ غزوہ احد میں پتھر پیشانی مبارک پر لگا تو خون مبارک بہہ نکلا، گھوڑے سے آپ گڑھے میں گر پڑے۔ ایک طرف تو عظمت کے تصرفات آسمان تک پہنچے ہوئے

① سبل السلام، کتاب الجنائز، باب النهی عن البناء والتجصیص علی القبور، ج: ۳، ص: ۱۴۸، رقم: ۵۴۳
② السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور ج: ۵، ص: ۴۱۸، رقم: ۱۷۴۶ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۵ ص: ۴۲ رقم: ۲۰۴۲. ③ کنز العمال، ج: ۱ ص: ۲۶ رقم: ۱۲۳۶۹. علامہ عجلونی فرماتے ہیں کہ ابن الجوزی وغیرہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن اس حدیث کو موضوع قرار دینا مناسب نہیں دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۴۴. ④ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب قیام الرجل للرجل، ج: ۱۳، ص: ۴۶۶، رقم: ۴۵۵۳.

کہ چاند تک اثر پہنچا اور ایک طرف یہ بے بسی کہ آپ گھوڑے سے گر پڑتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب بخار آتا ہے تو اوروں کو ایک درجے کا آتا ہے، مجھے دوگنا آتا ہے، جتنا اوروں کو چڑھتا ہے، اس سے دوگنا مجھے چڑھتا ہے اور زیادہ قوت کے ساتھ بخار آتا ہے۔ تو ایک طرف یہ بے بسی اور ایک طرف یہ اقتدار کہ اشارہ کریں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں، اشارہ کریں تو سورج ہٹ جائے، زمانے کی حرکت بند ہو جائے، حق تعالیٰ نے یہ چیزیں کیوں رکھیں کہ ایک طرف بے بسی رکھی اور ایک طرف یہ دعویٰ رکھ دیا کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول بھی ہوں۔ یہ اس لئے کہ جب انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزے ظاہر ہوتے ہیں۔ تو لوگ کہیں ان کی خدائی کے قائل نہ ہو جائیں۔ اس لئے بشریت کے لوازم رکھ دیئے تا کہ خدائی کا کوئی اقرار نہ کرے۔ یوں کہیں کہ بندے ہیں۔ تو جہاں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے وہاں یہ بھی کہ گڑھے میں گر پڑے ایک دفعہ شکست بھی ہوگئی۔ بیماری بھی آ جاتی تھی۔ علاج کرنا پڑتا تھا۔ یہود نے سحر کرا دیا تو آپ سحر سے متاثر ہو گئے۔ غم بھی آ جاتا تھا۔ خوشی بھی آ جاتی تھی جتنے بشریت کے عوارض اور لوازم ہیں۔ وہ خود آپ پر طاری ہوتے تھے اور یہ اس لئے کئے جاتے تھے کہ آپ کے معجزات دیکھ کر کہیں آپ کو خدا ہی نہ مان لیں۔ یوں سمجھیں کہ آپ بندے ہی ہیں اور یہ خدا کی دی ہوئی بزرگی ہے۔ اس لئے آپ زبانِ مبارک سے بھی تواضع کے کلمات فرماتے، عمل بھی تواضع کا فرماتے۔ حق تعالیٰ آپ سے معاملہ بھی وہی کرتے جو بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام باوجود رسول ہونے کے، باوجود اللہ کے مقرب بندے ہونے کے ہیں بندے ہی، خدا نہیں ہیں۔ انسان اور بشر ہی، بشر بھی ایسے کہ جو بشریت کے آثار و خواص ہیں، وہ ان پر طاری ہوتے ہیں۔

بہر حال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مقدس اور زیادہ بزرگ طبقہ اس عالم میں کوئی دوسرا نہیں اور اس میں بھی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ نے فرمایا۔ ”اَنَا نَبِیُّ الْاَنْبِیَآءِ“ (الحدیث اخرجہ علی المتقی الھندی، فی کنز العمال، ”وَلَفْظُہٗ: اَنَا سَیِّدُ الْمُرْسَلِیْنَ،“ ”اور نبی امتوں کے نبی ہیں، میں نبیوں کا نبی ہوں“۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا کہ نبی آخر الزماں پر ایمان لاؤ۔ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ﴾ (1) حق تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں نبوت دوں اور کتاب دوں۔ اس کے بعد وہ رسول آئیں۔ جن کی تمہیں بشارت دی گئی ہے تو اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا، اس کی اتباع کرنا اور اس کے ساتھ رہنا۔ گویا انبیاء علیہم السلام سے بھی عہد لیا گیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ایمان نبی پر لایا جاتا ہے۔ گویا نبیوں کا بھی آپ کو نبی بنایا گیا اور انبیاء علیہم السلام کو ایمان لانے کا مکلف قرار دیا گیا۔ جیسے ہمیں اور آپ کو حکم ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

(1) پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

لائیں۔ انبیاء کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی ایمان لائیں اس لئے فرماتے ہیں کہ۔ ''اَنَا نَبِیُّ الْاَنْبِیَآءِ'' اور نبی امتوں کے لئے نبی ہیں، میں نبیوں کے لئے نبی بنایا گیا ہوں۔ تو اتنی بڑی ذات اقدس کہ انبیاء میں بھی آپ کا اتنا اونچا درجہ کہ خاتم انبیاء بنائے گئے۔ اگر عیاذاً باللہ غرور یا تکبر کرتے، تو آپ کرتے مگر سب سے پہلے زیادہ تواضع فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنے کمالات ہیں وہ اللہ کے ہیں، ادھر سے آتے ہیں۔ انسان کی ذات میں کمال نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے، عمل سے یہ بتلا دیا کہ انسان اپنے کو کورا سمجھے اور اللہ کا شکر مانے کہ اس نے تمہیں کمال دے دیا۔ اس لئے دنیا میں جتنے بھی بڑے گزرے ہیں۔ جتنے بڑے ہوتے گئے، اتنے ہی تواضع میں بڑھتے گئے۔ اتنی خاکساری اور عجز و نیاز برتنے لگے۔ اس لئے کہ ان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ کمال ہمارا نہیں، اللہ کا ہے۔ اور جب آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ کمال دینے والا دیتا ہے۔ لیکن جب لینے پر آتا ہے لے بھی لیتا ہے۔ انسان کے بس میں نہیں کہ روک لے۔ جیسے ایک طرف یوں فرمایا کہ انسان ماں کے پیٹ سے علم و ہنر اور اخلاق لے کر نہیں آتا۔ ہم دیتے ہیں۔

اسی طرح آخری عمر کے بارے میں فرمایا ﴿مَنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا﴾ ① انسان اَخیر میں جب اَرذلِ عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے جو عمر بہت ہی گری ہوئی ہے۔ سو یا سو سے زیادہ برس کا ہو گیا تو ایک ایک کر کے اس کا علم کھونا شروع ہو جاتا ہے۔ آج آنکھوں میں فرق آ گیا تو دیکھنے کا علم ختم ہو گیا، دماغ کمزور ہو گیا تو سوچنے سمجھنے کا علم ختم ہو گیا، کانوں کے سننے میں فرق آ گیا تو سننے کا علم ختم ہو گیا۔ نیا علم نہیں آ رہا۔ پرانا علم حافظہ میں محفوظ تھا۔ آج حافظہ کمزور ہو گیا، تو پچھلی معلومات ختم ہو گئیں، اگلی معلومات کا دروازہ بند ہو گیا۔ پچھلی ختم ہو گئیں انسان جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ بتلا دیتے ہیں کہ علم تیری چیز نہیں جب چاہا ہم نے دے دیا، جب چاہا ہم نے چھین لیا۔ پھر ایسا انسان کس طرح سے غرور کر سکتا ہے؟ اگر اس کے پاس علم و کمال آ جائے۔ وہ جانے گا کہ علم و کمال میرا نہیں، میرے مالک کا ہے، میں خزانچی اور امین ہوں۔ خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ یہ مال میرا ہے۔ یہ مال تو مالک کا ہے۔

علم و اخلاق کے حصول کا طریق اول، فیضِ صحبت...... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات میں ہنر نہیں ہے اور کچھ محنت کرے گا تو آئے گا۔ اب علم و اخلاق کے آنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اتنی بات تو واضح ہو گئی حاصل کرنا پڑے گا۔ بلا حاصل کئے نہ علم آئے گا نہ اخلاق پیدا ہوں گے تو پھر اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ سب سے بہتر طریقہ علم اور اخلاقی کمال حاصل کرنے کا فیض صحبت ہے۔ اہل اللہ اور اکابر دین کی خدمت میں رہ کر ان کی زبان سے جب آدمی سنتا ہے تو علم آدمی کے دل میں اترتا ہے۔ ان کے فیض صحبت سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ حضرات صحابہ کو صحابہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں۔ صحابہ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۰.

اس طرح علم حاصل نہیں کرتے تھے کہ کوئی کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے رات دن مطالعہ کررہے ہیں۔ جس طرح ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے، فیضِ صحبت حاصل کیا۔ فیض صحبت کی برکت سے علماء، عرفاء، کامل، زاہد اور درویش بن گئے۔ علم و اخلاق کے سارے کمالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ ترین طریق فیض صحبت ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔ ان کے قلب کا اثر انسان کے قلب پر پہنچتا ہے۔ ان کے قلب میں اگر علم ہے تو قلب سے قلب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کے اندر اگر پاکیزہ اخلاق ہیں تو اخلاق منتقل ہوتے ہیں، قلب پر اثر پڑتا ہے۔ اس واسطے تاکید کی گئی ہے کہ اچھی صحبت حاصل کرو، بری صحبت سے بچو، اچھے ماحول میں رہو، بُرے ماحول سے پرہیز کرو۔ مولانا رومیؒ نے کہا کہ ۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند   صحبتِ طالح ترا طالح کند

''نیک صحبت تجھے نیک بنادے گی، بری صحبت تجھے برا بنادے گی''۔ تو صحبت و معیت کا اثر پڑتا ہے۔ اور انسان تو انسان میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کی صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ آپ کپڑوں کے صندوق میں گلاب کے پھول بھر دیں۔ ہفتہ بھر بعد جب نکالیں گے، سارے کپڑوں میں سے گلاب کی خوشبو آئے گی۔ تو کپڑا گلاب نہیں تھا۔ گلاب کے پھول کی صحبت حاصل کی، خوشبو ادھر بھی منتقل ہوگئی اور کپڑوں میں سے وہی خوشبو آنے لگی۔ جو گلاب کے پھول میں سے آتی تھی۔

آپ جب گرم کپڑے کیڑے کے ڈر کی وجہ سے صندوقوں میں بند کرتے ہیں تو کافور کی گولیاں اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یا تمباکو ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ کیڑا نہ لگے۔ اب جب سردیوں میں کپڑے نکالیں گے تو کپڑوں میں سے تمباکو کی بو آتی ہوگی۔ حالانکہ خود کپڑا تمباکو نہیں تھا۔ مگر تمباکو کی صحبت میں رہ کر کپڑے نے بھی وہی خوبی پیدا کرلی۔

لوہے کو آپ بھٹی میں ڈال دیں۔ پندرہ منٹ آگ کی صحبت میں رہنے کے بعد جو آپ نکالیں گے تو شکل بھی اس کی آگ جیسی، وہی سرخ رنگت، کام بھی وہی کرے گا۔ جو آگ کرتی ہے۔ اس میں روشنی گرمی بھی ہے۔ اس کا سرخ رنگ ہوگیا۔ جیسے آگ کا ہوتا ہے اگر آپ اس جلتے ہوئے لوہے کو کسی چھپر میں ڈال دیں تو دو منٹ میں سارا گھر پھونک دے گا۔ جو کام آگ کرتی ہے، وہی لوہا کرے گا۔ اسلئے کہ آگ کی صحبت میں رہ کر وہی خوبی اس نے اختیار کرلی۔ بلکہ شکل بھی وہی بنالی جو آگ کی شکل تھی۔

صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ، اکابر اولیاء اللہ اور بڑے کاملین میں سے ہیں۔ دہلی میں ان کا مزار ہے۔ حضرت مجددؒ صاحب کے شیوخ میں سے ہیں۔ ان کے یہاں اتفاق سے مہمان آئے اور شیخ کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہورہا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ پریشان کہ کس طرح مدارات کروں گھر میں ایک دانہ نہیں، مہمانوں کو کیا کھلاؤں؟ اسی گھبراہٹ میں کبھی گھر میں جاتے ہیں، کبھی باہر آتے ہیں۔ پریشان ہیں کہ کس طرح سے مہمان کو کھلاؤں پلاؤں۔ گھر میں تو ایک دانہ بھی نہیں۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک بھٹیارہ، جو کھانے کی دکان کرتا تھا۔ آج اسے ہوٹل اور ہوٹل مالک کہتے ہیں۔ کل وہ بھٹیاری سرائے اور بھٹیارہ کہلاتا تھا، کھانا پکاتا تھا اور بیچتا تھا۔ وہ بھٹیارہ سمجھ گیا کہ شیخ کے گھر فاقہ ہے اور کھانے پینے کو کچھ ہے نہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو فوراً مجلس سے اٹھا۔ اپنی دکان پر گیا اور عمدہ عمدہ کھانے، جو اس کے ہاں پکے ہوئے تھے ان میں سے کھانے لے کر دستر خوان تیار کیا۔ کئی آدمیوں کا اور کئی قسم کا بڑا عمدہ کھانا، سر پر رکھ کر لایا اور ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بے حد خوش ہوئے۔ مہمانوں کو بڑی عزت اور مدارات سے کھانا کھلایا اور خوشی سے چہرہ کھل گیا کہ ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ '' میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور میں مدارات کر سکا۔ جب مہمان رخصت ہو گئے۔ تو خواجہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جوش میں آ کر بھٹیارے سے فرمایا، تو نے آج مجھے اتنا خوش کیا ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ جو تو آج مانگے گا، تجھے ملے گا۔

بھٹیارے کی زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! مجھے اپنے جیسا بنا دو۔ اب یہ چیز بڑی بھاری تھی کہ بھٹیارہ بعینہ خواجہ باقی باللہ بن جائے، خواجہ باقی باللہ کی استعداد اور صلاحیتیں، اور بھٹیارہ بے چارہ معمولی آدمی۔ نہ اس میں علم کی وہ صلاحیت نہ اخلاق کی استعداد۔ گویا اس نے درخواست اپنے حوصلہ سے بڑھ کر کی۔ یہ کہتا کہ دعا کیجئے مجھے اللہ نیک اور صالح بنا دے، اللہ مجھے جنت دے دے، یہ نہیں۔ بلکہ فرمایا بس اپنے جیسا مجھے بنا دیجئے۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ یہ تو نے اپنے حوصلہ سے بڑھ کر درخواست کی ہے۔ کوئی اور چیز مانگ۔ اس نے کہا نہیں۔ میں تو یہی مانگتا ہوں۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متامل کہ اس کو آخر میں اپنے جیسا کیسے بنا دوں۔ اور اگر میں کوشش بھی کروں تو اس میں اتنی استعداد کب ہے کہ اتنا علم اٹھا سکے تحمل بھی کر سکے اور ان اخلاقی کمالات کو برداشت کر سکے، جو میرے اندر اللہ نے دیئے ہیں۔ ہر انسان کی صلاحیت الگ ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استعدادیں اور ہیں۔ جو نبوت کے کمالات برداشت کرتے ہیں۔ امت میں کسی بڑے سے بڑے قطب، غوث اور ولی کی مجال نہیں کہ ان کمالات کی برداشت کر سکے، وہ ولایت کے کمال کا تحمل کریں گے۔ جو ولی نہیں ہے، معمولی عالم ہے، وہ ولایت کے کمالات کا تحمل نہیں کر سکتا۔ عوام الناس میں سے ہے وہ اہل علم کے کمالات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو ہر ایک کی استعداد و صلاحیت الگ ہے۔ اگر پیالہ پاؤ بھر کا ہو، جس میں پاؤ بھر غلہ آ سکے۔ وہ یوں کہے کہ میرے اندر دو مَن بھر دو، کیسے بھر دیں؟ اس کے اندر کب صلاحیت ہے اتنا بھر دینے کی؟ تو بھٹیارے کا یہی قصہ تھا کہ استعداد تو پاؤ بھر کی بھی نہیں تھی اور مانگ لیا اس نے کہ دس من میرے اندر بھر دو۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے اندر کیسے بھر دیں؟

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پھر فرمایا، تو نے اپنی ہمت سے بڑھ کر درخواست کی ہے تیرے اندر تحمل اور قوت نہیں ہے۔ اتنی بات مانگ جتنی تو برداشت کر سکے۔ اس نے کہا نہیں، اب تو میری زبان سے نکل گیا۔

اب تو مجھے اپنے ہی جیسا بنالو۔ اب پھر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متامل ہوئے۔ فرمایا، اچھا اللہ کے نام پر۔ فرمایا، اُٹھ میرے ساتھ، اسے اپنی کوٹھڑی میں لے گئے۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور بیٹھ کر اس کے اوپر توجہ ڈالنی شروع کی، اس کی روح میں تصرف کرنا شروع کیا۔ اس درجہ تصرف کیا اور اس درجہ اس کی روح کے اندر نسبت وکمالات کو بھرنا شروع کیا کہ وہ ساری چیزیں بھر دیں جو اپنے اندر تھیں۔ اور کیفیت یہ ہوئی کہ بھٹیارے کی شکل بھی ویسی بن گئی۔ جیسی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ اب جب کوٹھڑی سے باہر نکلے تو دو خواجہ باقی باللہ آ رہے ہیں۔ ایک اس طرف، ایک اس طرف شکل بھی وہی، صورت و رنگ بھی وہی۔ اپنی استعداد و صلاحیت سے اس طرح اس کے باطن کو بھرا کہ اس کی ظاہری شکل بھی ویسی بن گئی۔ لوگوں نے پہچانا کس طرح سے؟ ایک خواجہ باقی باللہ تو بڑی قوت اور متانت سے آ رہے تھے اور ایک خواجہ باقی باللہ اس طرح کہ پیر لڑھک رہے ہیں، بدن لرز رہا ہے، جیسے بوجھ ہے برداشت نہیں ہوتا۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ یہ بھٹیارہ ہے۔ جس کی صورت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بن گئی۔ تین یا چار دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بے چارہ برداشت نہیں کر سکا تو

آرزومی خواہ ولے دباند ازہ خواہ

آرزو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اتنی آرزو کرو، جتنی آدمی برداشت کر سکے، جتنی اندر صلاحیت ہو۔ میں نے کس وجہ سے یہ واقعہ ذکر کیا؟ اس لئے کہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دس منٹ صحبت اٹھائی، دوسرا باقی باللہ بن گیا۔ تو صحبت کا اثر پڑتا ہے اچھے آدمی کی صحبت سے قلوب کے اندر اچھائیاں پیوست ہوتی ہیں۔ اس سے انسان میں صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ تو حضرات صحابہ کو جو کمالات حاصل ہوئے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل ہوئے۔

فیضِ صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ہیں...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر نظر کی جائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار ہا معجزات ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزوں سے الگ معجزے ظاہر ہوئے۔ چاند سورج پر الگ معجزات ظاہر ہوئے اور دنیا کی ہر چیز پر آپ کے معجزات نمایاں ہوئے۔ پتھروں نے آپ کی نبوت کی شہادت دی اور بول پڑے۔

حدیث میں ہے کہ آپ کو استنجا کی ضرورت پیش آئی ریگستان تھا۔ میلوں تک کوئی آڑ نہیں تھی۔ کوئی صورت نہیں تھی کہ بیٹھ سکیں۔ میل بھر پر ایک اور دوسرے میل پر ایک درخت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر اشارہ فرمایا۔ دونوں درخت دوڑتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ دو میل کی مسافت طے کر کے آئے اور آ کر اس طرح کھڑے ہوئے کہ اپنی شاخیں پھیلا دیں۔ جیسے خیمہ اور پردہ بن گیا استنجا فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ چلے جاؤ وہ درخت اپنی جگہ چلے گئے تو درختوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔ جانوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا روتا ہوا آیا۔ آنکھوں میں اس کے آنسو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آ کر سر ڈال دیا اور بلبلا رہا ہے۔ آنکھوں سے پانی جاری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے مالک کو بلاؤ۔ مالک حاضر ہوا۔ فرمایا، یہ شکایت لے کر آیا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ اس کے اوپر بوجھ لادتا ہے۔ تجھے غیرت نہیں آتی؟ تیرا ذریعہ معاش یہ ہے، تیری کمائی اس کے ذریعے ہے۔ پھر اس پر رحم نہیں کھاتا؟ واقعہ سچا نکلا۔ اس نے توبہ کی کہ یا رسول اللہ! آئندہ میں ظلم نہیں کروں گا، اس کا حق پہچانوں گا، اسے غذا دوں گا، اتنا ہی بوجھ لادوں گا جتنی اس میں طاقت ہے۔ تو جانور آ کے شکایتیں کرتے ہیں۔ حضور فیصلے فرماتے ہیں تو یہ معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی طرح پتھروں نے بھی آپ کی نبوت کی شہادت دی۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ساری مجلس والوں نے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں۔ تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو دے دیں پھر تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں تو تسبیح بند ہوگئی۔ بہرحال یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ کنکریوں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

تو چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، پتھروں کا شہادت دینا، درختوں کا دوڑ کے چلے آنا، انگشتان مبارک (انگلیوں) سے پانی کے چشمے بہہ پڑنا، یہ عظیم معجزات ہیں جو نمایاں ہوئے۔ لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سارے معجزات ایک طرف اور یہ ایک معجزہ ایک طرف کہ ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے کیوں؟ اس واسطے کہ پتھر کو موم بنا دینا آسان ہے۔ لوہے کو نرم کر دینا آسان، لیکن انسان کی روح میں انقلاب پیدا کر دینا، یہ بڑا مشکل ہے۔ انسان کو انسان بنا کر اس کے دل کو پھیر دینا یہ بڑا مشکل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ ہے کہ ایک شخص مجلس مبارک میں آتا ہے، وہ کافر بھی ہے مشرک بھی ہے۔ بدعقیدہ بھی ہے اور بدعمل بھی ہے۔ ساری خرابیاں اسی میں ہیں۔ لیکن جونہی دستِ مبارک پر بیعت کر کے واپس ہوتا ہے تو اس حالت میں واپس ہوتا ہے کہ عالم بھی ہے۔ عارف بھی ہے، کامل بھی ہے، زاہد بھی ہے، عابد بھی ہے اور متقی بھی ہے۔ ایک دم دل کے اندر انقلاب پیدا ہوگیا تو پتھروں میں انقلاب آسان ہے۔ مگر انسان میں انقلاب پیدا کرنا بڑا مشکل ہے تو ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل معجزہ ہے یہ اعجاز کیسے ظاہر ہوا؟ یہ فیض صحبت کی ہی برکت تھی۔ آپ کی صحبت مبارک میں منٹوں میں وہ تاثیر ہوتی تھی کہ دوسری جگہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیعت کرتے ہی ہر شخص کامل ہو جاتا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس حالت میں آئے کہ شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ لیکن آ کر جونہی دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اسلام قبول کیا۔ تو یہ وہ زمانہ تھا کہ چھپ کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ کل تیرہ آدمی مسلمان تھے۔ دارِ ارقم میں

اندر سے زنجیر بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پہنچے، بیعت کی، اسلام قبول کیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ فرمایا کیوں نہیں ہیں؟ عرض کیا پھر چھپ کر نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا چلو، آگے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پیچھے پیچھے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ مسجد حرام میں پہنچے۔ مشرکین کی مجلسیں جمی ہوئی تھیں۔ اعلان سے کہا کہ جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ اب جان لے میں عمر ہوں اور میں کلمہ پڑھ کر آیا ہوں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُـحَـمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ① یہ کہنا تھا کہ تمام مشرکین مارنے پیٹنے پر پل پڑے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی آستینیں کھینچی، مار پٹائی سب کچھ ہوئی، لڑائی بھی ہوئی۔ مگر اللہ پر بھروسہ ایک منٹ میں اتنا پیدا ہو گیا کہ یا کفر میں پڑے ہوئے تھے یا ایک دم ایمان میں بڑھ گئے۔ یہ فیضِ صحبت ہی کا اثر تھا۔ بہر حال نبوت کی صحبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بنے اور صحابہ کے بارے میں اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اس امت میں صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی مقدس نہیں۔ کوئی ولی قطب بن جائے، غوث بن جائے۔ مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ کی جو شان ہے، وہ کسی کی نہیں بن سکتی۔ وہ اس وجہ سے کہ انہوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ دوسروں کو یہ شرف میسر نہیں ہے۔ تو سب سے بڑی بنیادی چیز جس سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ وہ فیضِ صحبت ہے۔ اگر ہمیں اپنے اخلاق اور اپنا علم صحیح کرنا ہو تو جو نیک اور صالح لوگ ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنا چاہئے چاہے کچھ بولیں یا نہ بولیں۔ لیکن پاس بیٹھنے سے ہی ایک اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔

بے شعور اشیاء کی صحبت ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی اور بری صحبت کی مثال دی ہے فرمایا، نیک صحبت کی مثال تو عطار کی دُکان جیسی ہے۔ عطر بیچنے والے کی دکان پر جب آپ بیٹھیں گے، چاہے عطر نہ بھی خریدیں۔ کم از کم دماغ میں ہی خوشبو آجائے گی۔ دماغ تو معطر ہو ہی جائے گا، کپڑوں میں خوشبو کی ہوا بھرے گی۔ گھر پہنچیں گے تو گھر والے کہیں گے۔ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو بدن کو ہی خوشبو لگ جائے گی، ناک میں ہی پہنچ جائے گی اور اگر کہیں عطر خرید ہی لیا اور مل لیا، پھر تو سبحان اللہ۔ مگر عطار کی دوکان پر محض جانے سے کم از کم دماغ تو معطر ہو ہی جاتا ہے۔ ②

اور بری صحبت کی مثال ایسی فرمائی کہ جیسے لوہار کی دوکان کہ بعض دفعہ لوہا گرم ہوتا ہے۔ کٹتا ہے تو اور کچھ نہیں تو تھوڑی سی کالک ہی کپڑے کو لگ جائے گی، لوہا جلنے کی تھوڑی سی بدبو ناک کے اندر آجائے گی۔ ③ غرض آدمی کوئی نہ کوئی کدورت دماغ میں لے کر آئے گا۔ کوئی نہ کوئی کالک اور سیاہی کپڑے کو لگا آئے گا۔ بری صحبت کی

---

① المطالب العالیة، کتاب السیر والمغازی، باب اسلام عمر، ج: ۱۲، ص: ۱۵۸، رقم: ۴۳۴۴.

② ③ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایومران یجالس...... ج: ۱۲ ص: ۴۵۷ رقم: ۴۱۹۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۳۲۹ رقم: ۴۸۲۹.

مثال یہی ہے کہ برے کے پاس بیٹھ کر یا تو برا بنے گا، برا نہیں بنے گا تو کم سے کم برائی کی برائی دل سے نکل جائے گی۔ کل کو برائی پر آمادہ ہو جائے گا۔ نیکوں کے پاس اگر بیٹھے گا، اگر دیندار نہیں بنے گا، تو کم سے کم دین کی محبت تو پیدا ہو ہی جائے گی محبت نہ بھی پیدا ہو، کوئی کلمہ سن کے دل کی برائی ہی جاتی رہے گی تو راستہ درست ہو جائے گا۔ جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ؎

یک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

''اللہ کے کسی ولی، مقبول اور دوست کے پاس ایک گھڑی بیٹھنا، یہ سو برس کی عبادت سے بہتر ہے''۔ اس لئے کہ ایک گھڑی بیٹھنے سے بعض دفعہ دل کی گرہیں ایسی کھل جاتی ہیں کہ سو برس کی عبادت کا راستہ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ جو دل میں گنجلک پڑی ہوئی ہوتی ہے، وہ نکل جاتی ہے تو فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اس واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔ مثل مشہور ہے کہ ''خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''۔ ہر چیز اپنا اثر کرتی ہے۔ آپ روز دریا کے کنارے دو چار گھنٹے جا کر بیٹھیں مزاج میں رطوبت پیدا ہو جائے گی، نرمی آ جائے گی، تری آ جائے گی۔ اس لئے کہ پانی کی صحبت اختیار کی۔ آپ آگ کے پاس بیٹھیں مہینہ بھر سینکتے رہیں۔ مزاج میں جھنجلاہٹ اور گرمی پیدا ہو جائے گی۔ آپ مٹی پر بیٹھیں، یبوست اور خشکی پیدا ہو جائے گی۔ مٹی کا اثر ہی یہ ہے۔

جب یہ ساری چیزیں جو بے شعور اور بے جان کہلاتی ہیں۔ یہ بھی اثر کرتی ہیں۔ کسی جاندار کے پاس بیٹھیں گے تو اس کا اثر کیوں نہیں ہوگا؟ اور ایماندار کے پاس بیٹھیں یا کسی فاسق و فاجر کے پاس بیٹھیں۔ آپ کے اندر وہی جذبات پیدا کر دے گا۔ جو اس کے اندر تھے. تو اصل چیز اخلاق درست کرنے کی یہ ہے کہ صحبت صالح اختیار کی جائے کہ ان کے پاکیزہ اخلاق کا اثر آپ کے قلب پر پڑے گا چند دن کے بعد آپ کو فرق محسوس ہوگا کہ اخلاق کچھ صحیح ہونے لگے۔ دل کا راستہ بدل جائے گا۔ دل ادھر ہی کو چل پڑے گا، جدھر کو اس صالح اور نیک آدمی کا چل رہا ہے۔ اس لئے سب سے اعلیٰ طریقہ علم و معرفت اور اخلاق حاصل کرنے کا اہل اللہ، اہل دل اور سچوں کی صحبت ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں امر فرمایا گیا ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (1) اے ایمان والو! اللہ کے سے ڈرو اور سچوں کی معیّت اختیار کرو۔ یعنی ڈر تمہارے دل میں قائم نہیں رہے گا۔ جب تک ڈرنے والوں کی معیّت نہ اختیار کرو۔ ان کے پاس بیٹھو تو ڈر دل میں اثر کر جائے۔ تقویٰ دل کے اندر اثر کر جائے گا۔

دین اہل اللہ کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے...... اصل یہی ہے کہ دین محض کتابوں کے ورقوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ اہل اللہ کے دلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابیں کوئی لاکھ پڑھ لے۔ صحبت نہ ملے، دین اثر نہیں کرے گا۔ قلب کے اندر رنگ نہیں پیدا ہوگا۔ محض کتاب یا کاغذ سے مراد نہیں، اہل دل کے پاس بیٹھ کر دل میں اثر پیدا ہوگا۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی یوپی کا بڑا شاعر گزرا ہے۔ اس نے کہا ہے۔ وہ اکثر علی گڑھ کالج کے لڑکوں سے خطاب کیا کرتا

(1) پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹.

تھا۔ جو چوٹیں ہوتی تھیں۔ ان پر طعن بھی کرتا تھا۔ ساتھ میں انہیں سمجھاتا بھی تھا۔ تو کالج کے لڑکوں سے اس نے خطاب کر کے کہا کہ۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل اللہ کی نظر پڑتی ہے، دین آنا شروع ہو جاتا ہے۔ نہ کتاب سے آتا ہے نہ مدرسے کے دروازوں سے اہل دل کے دل سے آتا ہے۔

از دل خیزد بردل ریزد

دل سے بات اٹھتی ہے تو دل ہی سے جا کے ٹکراتی ہے۔ اس واسطے اعلیٰ ترین طریقہ دین اور دینی اخلاق حاصل کرنے کا وہ فیضِ صحبت ہے خواہ علماء ربانی کی صحبت میسر ہو یا کوئی حقانی درویش اور اہل اللہ میں سے ہو۔ اس کی صحبت میسّر ہو وہ بھی نہ ہو، تو کسی نیک آدمی ہی کی صحبت میسّر ہو۔ عوام میں بھی نیک ہوتے ہیں، تاجروں میں ہوتے ہیں۔ ہر طبقے میں اللہ کے نیک بندے ضرور ہوتے ہیں۔ آدمی چھانٹ لے کہ یہ مقبول ہے اور مقبولیت اعمال سے معلوم ہو جاتی ہے، بلکہ صورت سے نظر پڑتی ہے کہ یہ آدمی مقبول ہے۔ اس کے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا، مگر دل سے پڑھ لیتا ہے کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایمان کی نرمائی، ایک بھول پن، ایک سادگی، اللہ پر بھروسہ اور توکل ہوتا ہے، نہ چالاکی اور عیاری برستی ہے، بلکہ سچائی برستی ہے۔

جیسے فرمایا گیا: ”اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ کَرِیْمٌ وَالْمُنَافِقُ خَبٌّ لَئِیْمٌ“ ① مومن کی شان یہ ہے کہ وہ بھولا بھالا، سیدھا، سچا ہوتا ہے۔ بھولے پن کے معنی یہ کہ عیاری، مکاری، چالاکی نہیں سیدھی سیدھی بات ہے اور ایک بے وقوفی ہے یہ اور چیز ہے۔ مومن بے وقوف نہیں ہوا کرتا جس درجے کا ایمان ہوگا۔ اس درجے کی عقل مندی بھی اس کے اندر ہوگی۔ ہاں ایمان ہی کمزور رہو، عقل بھی کمزور ہوگی۔ ایمان قوی ہے تو عقل بھی قوی ہوگی۔ ان کے چہروں پر بھول پن ہوتا ہے۔ یعنی فریب کاری نہیں ہوتی۔ سیدھی سیدھی جو دل میں ہے، وہی زبان پر، جو زبان پر ہے وہ دل میں۔ تو چہرہ مہرہ بتلا دیتا ہے کہ یہ آدمی سچا ہے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں۔ تو اول سندھ میں داخل ہوئے ہیں۔ سندھ کے راستے سے پنجاب پھر پنجاب کے راستے سے ہندوستان پہنچے ہیں۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم سندھ کے بازاروں سے گزرے۔ تو ہزاروں آدمیوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے اور کہا کہ یہ جھوٹوں کے چہرے نہیں۔ ان چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کے چہرے دلیل ہیں کہ ضرور اسلام حق ہے۔ اسلام ان کے چہروں پر برستا ہے۔ ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے زبردست محدث، عالم، عارف باللہ تھے۔ ان کے چہرے پر نورانیت برستی تھی۔ مظفر نگر میں مسلمانوں کا آریوں سے مناظرہ ہوا۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب العشرة، ج: ۱۲، ص: ۲۱۱، رقم: ۴۱۵۸.

ادھر ہندو آریہ تھے، ادھر مسلمان تھے، تو اسٹیج پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، مناظرہ نہیں فرمایا۔ مناظرہ دوسرے علماء کر رہے تھے۔ مگر صدر کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف رکھتے تھے۔ تو آریہ مناظر نے کہا کہ۔ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جا سکتا تھا۔ تو میں اس شخص کا چہرہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا ہے، اس کے چہرے پر ایمان کھل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس شخص کا دل، ایمان وعلم اور کمال سے بھرا ہوا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

مرد حقانی کی حقانیت چہرے پر آ جاتی ہیں۔ یہ چہرہ اصل میں چغل خور ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، چہرہ چغلی کھا دیتا ہے کہ یہ چیز دل میں بھری ہوئی ہے۔ اگر بدنیتی بھری ہوئی ہے، چہرے پر برستا ہے کہ یہ آدمی اچھا نہیں اور سچائی بھری ہوئی ہے تو چہرہ بول دیتا ہے کہ یہ سچا مادی کیفیات ہوں یا روحانی چہرے پر برسنے لگتی ہیں۔ اگر کسی کے دل میں خوف بھرا ہوا ہے تو چہرے پر ایک زردی اور پریشانی ظاہر ہوگی۔ دیکھتے ہی آپ کہیں گے کہ بھئی! تم ڈر رہے ہو؟ حالانکہ ڈر چہرے میں نہیں۔ ڈر دل کے اندر ہے مگر دل کے اثرات چہرے پر آتے ہیں۔ چہرہ آئینہ ہے۔ دل کی چیز چہرے پر کھل جاتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں خوشی بھری ہوئی ہے، کسی تقریب سے مسرّت ہے۔ چہرہ خوشی سے دمکتا ہوا ہوگا لوگ دیکھ کے کہیں گے کہ بھئی! بڑے خوش نظر آ رہے ہو، کیا بات پیش آئی حالانکہ خوشی تو دل میں بھر رہی ہے۔ مگر چہرہ چغلی کھا دیتا ہے کہ دل میں خوشی ہے۔ اگر دل میں غمی ہے چہرہ اداس پریشان ہوگا۔ لوگ کہیں گے کہ بھئی کیا بات ہے، کیوں پریشان ہو؟ حالانکہ پریشانی دل میں ہے، چہرے میں تھوڑا ہی ہے۔ مگر چہرہ آئینہ ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی اوپر آ جاتا ہے۔ جب قلب میں نور ایمان چمکتا ہے۔ تو اس کی چمک دمک چہرے کے اوپر نمایاں ہوتی ہے۔ کفر اندر بھرتا ہے تو چہرے پر فساد اور سخت دلی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ایمان کا نور چہرے پر آتا ہے۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

آدمی فوراً پہچان لیتا ہے۔ بہر حال "اَلظَّاهِرُ عُنْوَانُ الْبَاطِنِ" "ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے"۔ جو باطن میں چھپا ہوا ہوتا ہے وہ ظاہر کھول دیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے چہروں پر نور ایمان برس رہا تھا تو ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کر مسلمان ہو گئے کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، یہ خبر سن کے عرب میں آئے کہ کوئی نبی پیدا ہوئے ہیں۔ چونکہ پچھلی کتابیں پڑھی تھیں۔ دنیا کو انتظار لگا ہوا تھا کہ اس زمانے میں کوئی نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ وہ علامتیں جو اس نبی کی ہیں، پائی جا رہی ہیں۔ تو جب دعویٰ نبوت سنا۔ یہ فوراً گئے کہ میں جا کر دیکھوں۔ آپ صحابہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی یہ پاس نہیں پہنچے، تو اچانک دور سے چہرہ مبارک پر نظر پڑی، تو چلا کر کہا کہ:

''وَاللّٰهِ لَیْسَ هٰذَا الْوَجْهُ وَجْهُ الْکَذَّابِ'' ''خدا کی قسم یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے''۔ چہرہ خود بتلا رہا ہے کہ اس کے اوپر سچائی برس رہی ہے۔ اس کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ اس کے قلب کے اندر نورِ نبوت بھرا ہوا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صحبت سے وہ قلبی نور منتقل ہوتا ہے جو دوسروں کے قلب کے اندر ہے۔ اس لئے دین میں کمال پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ اہل اللہ، اکابرِ دین کی صحبت ہے کہ کتاب سے وہ چیز حاصل نہیں ہوگی، جو قلوب سے حاصل ہوگی۔ بلکہ کتاب کا مضمون بھی آپ سمجھیں گے تو شخصیتوں کی بدولت سمجھیں گے۔ اگر معلّم اور مربّی کتاب کا مطلب نہ سمجھائیں، وہ مطلب آپ کا اپنا مطلب ہوگا، کتاب والے کا مطلب نہیں ہوگا، خدا کا مطلب نہیں ہوگا، کتاب والے کا مطلب تب سمجھیں گے، جب کتاب والا خود بتلائے یا کسی کو بتلا کر بھیجے تو اللہ نے اپنی کتاب کا مطلب اپنے رسول کو سمجھایا، رسول نے اپنی صحبت سے صحابہ کو سمجھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی صحبت سے اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ محض کتاب سے کام نہیں چلا، جب تک مربّیوں کی شخصیت سامنے نہ ہوئی۔ ان کی صحبت حاصل نہ ہوئی۔ تو بڑا ذریعہ فیضِ صحبت ہے۔ جس سے دین اور دینی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

علم و اخلاق کے حصول کا دوسرا طریق، مواخاۃ فی اللہ...... اس لئے بڑی چیز فیض صحبت ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب ہم ایک ایسی بستی میں ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی اچھا آدمی نظر نہیں پڑتا۔ جس کی صحبت میں بیٹھا کریں نہ ہماری بستی میں کوئی عالم ہے، نہ کوئی درویش ہے اور ویسے ہی اچھے تو خود ہم بھی اچھے ہی ہیں۔ ہم کس کے پاس جائیں؟ اتنے اچھے ہم بھی ہیں۔ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی صحبت اٹھائیں کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ کیا ہمارے اخلاق درست نہیں ہوں گے؟ اس لئے کہ آپ نے بتلایا کہ دین، علم اور اخلاق کے کمال کے لئے صحبت اصل چیز ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے کہ ہم اس کے فیض صحبت سے دین و اخلاق حاصل کر لیں تو ہماری اصلاح کی کوئی صورت نہیں رہی۔ کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ میں اس کے لئے عرض کرتا ہوں کہ نہیں آپ کے لئے ایک دوسرا راستہ ہے۔ اگر نیک صحبت میسّر نہ ہو، پھر ایک اور تدبیر ہے۔ جس سے آپ اپنے دین میں کمال پیدا کر لیں۔ اخلاق درست کر لیں اور سیدھے راستے پر پڑ جائیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ کسی ایک آدمی سے دوستی پیدا کر لیں۔ اور دوستی اللہ کے لئے پیدا کریں معاہدہ یہ ہو کہ ہم اس لئے دوستی کر رہے ہیں کہ میں تمہارے دین کی حفاظت کروں گا، تم میرے دین کی حفاظت کرنا۔ اگر میں نماز میں سستی کروں کان سے پکڑ کر گھسیٹ کر مسجد کے اندر لے جانا اور تم نے اگر سستی کی، میں لے جاؤں گا۔ تم اگر برے راستہ پر گئے میں زبردستی ہٹاؤں گا۔ اگر میں چلوں تو تم ہٹانا۔ ہم اس لئے آپس میں دوستی کرتے ہیں کہ اس دوستی کی وجہ سے ایک دوسرے کے دین کی حفاظت ہو جائے۔

آپ اندازہ کیجئے کہ اگر آپ نے کسی ایک شخص سے دوستی کر لی اور اس میں روک ٹوک شروع ہوئی اور روک ٹوک دوسرا ہی کر سکتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اپنا عیب انسان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا فوراً پرکھ لیتا ہے کہ یہ عیب

کی بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ’’دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر ہو کے نظر پڑتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر بھی آدمی تنکا نہیں سمجھتا‘‘۔ اپنی برائی کو آدمی خود محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا فوراً سمجھ لیتا ہے یہ برائی ہے۔ اپنے ساتھ آدمی کو بڑا حسنِ ظن ہوتا ہے کہ میں تو اچھا ہوں۔ میرے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس حسنِ ظن سے جب دیکھتا ہے اپنی ہر حرکت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کوئی برائی کی۔ دوسرے کو اتنا حسن ظن ہوتا نہیں اس واسطے وہ نگاہ رکھتا ہے۔ پھر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ برائی ہے اور ہے وہ دوست، تو فوراً ٹوکے گا کہ بھئی! اس برائی کو چھوڑ دو۔ اس دوستی کو شریعت کی اصطلاح میں مواخات کہتے ہیں۔ یعنی دین کی خاطر بھائی چارہ قائم کرنا۔ کہ بھئی! جب میں کسی اچھی جگہ جاؤں گا، تمہیں ساتھ لے جاؤں گا، تم کہیں جاؤ تو مجھے ساتھ لے جانا تم برائی کرو، تو میں روک دوں گا۔ میں برائی کروں تو تم مجھے روک دینا۔ غرض ایک دوسرے کے دین کے حفاظت کریں گے۔ اس لئے بھائی بندی اور دوستی اختیار کرتے ہیں۔ اس کو مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔

یہ اصول خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آپ تشریف لائے۔ تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کو ملا کر دونوں میں آپ نے بھائی چارہ قائم کیا۔ جتنے تھے سب کو جوڑا جوڑا بنا دیا۔ یہ تمہارا دینی بھائی، یہ تمہارا دینی بھائی۔ اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، رہ گئے انصار کی تعداد ختم ہوگئی۔ سب مہاجرین کا بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمبر آیا تو اب کوئی انصاری باقی نہیں تھا کہ ان کی بھائی بندی کسی سے کرائی جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کچھ آزردگی پیدا ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اَنَا اَخُوْکَ فِی اللّٰہِ‘‘ ① تیرا دینی بھائی میں بنتا ہوں اور میرے ساتھ معاہدہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ خوش ہوگئے۔ اس سے بہتر کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھائی بنیں۔ بہر حال اس کو مواخات فی اللہ یعنی اللہ کے لئے بھائی بندی قائم کرنا کہتے ہیں۔ اس طرح سے اگر آپ بھائی بندی اختیار کریں تو چالیس دن میں پتہ چلے گا کہ کتنی برائیاں دور ہوگئی ہیں۔ اس واسطے کہ وہ دوست آپ کی برائیاں دیکھ دیکھ کر آپ کو مطلع کرے گا۔ آپ متنبہ ہوں گے۔ بہت سی برائیوں کی اصلاح ہو جائے گی بہت سے برے اخلاق چھوٹ جائیں گے، اس کے بھی چھوٹ جائیں گے، آپ کے بھی چھوٹ جائیں گے۔ تو بھائی بندی کے اصول سے آپ نے وہ چیز کمالی۔ جو کسی شیخ وقت سے کماتے، کسی عالم ربانی کی صحبت سے کماتے یا کسی درویش ربانی کی صحبت میں بیٹھ کر کماتے۔ اب یہ عذر باقی نہیں ہے کہ صاحب! میری بستی میں نہ کوئی عالم ہے نہ درویش نہ سچے لوگوں لوگوں میں سے کوئی ہے، میرے اخلاق درست نہیں ہو سکتے تو دوسرا طریقہ مواخات کا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے اخلاق درست کریں۔ اس اصول پر چل کر چالیس دن کے بعد فرق محسوس کریں گے۔ اگر اسی طرح برس دن گزر جائیں۔ اس وقت تک آپ ولی بن جائیں گے۔ اس لئے اصل چیز فیض صحبت ہے۔ دوسرے درجے کی چیز مواخات ہے۔

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضی اللہ تعالی عنہ، ج: ۱۲ ص: ۱۸۳ رقم: ۳۶۵۴.

علم واخلاق کے حصول کا تیسرا طریق، اِتّعاظ بالغیر...... لیکن اگر آپ پھر کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی بستی میں ہوں جہاں کوئی اچھا آدمی نہیں کہ میں اسے دوست بناؤں۔ سب برے ہی برے پھر رہے ہیں۔ یہ عقل سے تو بعید ہے کہ کوئی ایسی بستی ہو جس میں کوئی بھی اچھا آدمی نہ ہو۔ یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہوگا سو پچاس ہوں گے۔ تو علماء یہ لکھتے ہیں کہ چالیس آدمی جمع ہو جائیں ان میں کوئی نہ کوئی مقبول الٰہی ضرور ہوتا ہے۔ تو ایک بستی کی بستی ہو اور کوئی اللہ کا مقبول نہ ہو یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتا ہوں کہ بستی کے اندر کوئی بھلا آدمی نہیں اور دوست ہونے کے بجائے سارے آپ کے دشمن ہی دشمن پھر رہے ہیں، بدخواہ ہی بدخواہ ہیں کوئی بھی نیک انسان نہیں۔ میں کس سے بھائی چارہ قائم کروں؟

میں اس کے لئے ایک تیسری تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ ان دشمنوں سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ کیسے؟ اس کو اِتّعاظ بالغیر کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں سے عبرت پکڑ کر اپنی حالت کو درست کرنا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کی ٹوہ لگائیں۔ کہ آپ کے دشمن آپ کے حق میں کیا کہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ دشمن آپ کی بھلائیاں تو پھیلانے سے رہے۔ وہ تو چھانٹ چھانٹ کے آپ کی برائیوں کو شہرت دیں گے۔ فلانے میں یہ کھوٹ ہے، یہ برائی ہے۔ اگر آپ کی بھلائیاں شائع کرنے لگیں، وہ دشمن ہی کیا ہوئے۔ وہ تو آپ کے دوست ہوئے۔ مگر دشمن کا کام یہی ہے کہ برائیاں چُن چُن کر پھیلائے، بدنام کرنے کی کوشش کرے، رسوا کرے، آپ اس دشمن سے شیخ وقت کا کام لیں۔ وہ یہ کہ آپ یہ سنیں کہ میرے دشمن کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے جائیں آپ اسے چھوڑتے جائیں۔ جتنی برائیاں وہ بیان کریں، آپ اسے ایک ایک کر کے چھوڑ دیں۔ چالیس دن تک آپ عمل کر کے دیکھیں۔ بیسیوں برائیاں آپ میں سے ختم ہو جائیں گی۔ تو دشمن سے آپ نے وہ کام لے لیا، جو شیخ وقت سے لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کام لینا چاہیں، دشمن سے بھی لے سکتے ہیں۔ تو پہلی چیز فیض صحبت، دوسری مواخات فی اللہ اور تیسری اِتّعاظ بالغیر ہے کہ غیر سے نصیحت حاصل کرنا۔ تو دشمن سے آپ نے شیخ وقت کا کام لے لیا۔ اس لئے اگر کوئی اپنے دین کو درست بنانا چاہے تو راستہ کہیں رُکا ہوا نہیں ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا چوتھا طریق، محاسبۂ نفس...... اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی جگہ ہوں کہ جہاں نہ کوئی عالم وعارف نہ کوئی دوست، نہ دشمن گویا یہ بعید بات ہے کہ دوست نہ ہو۔ لیکن دشمن بیسیوں مِل جاتے ہیں۔ دشمن تو ٹکے سیر ملتے ہیں اور دوست سینکڑوں روپے سیر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ ٹکے سیر بھی زیادہ قیمت ہے۔ دشمن تو مفت بھی مل جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ آدمی پڑھا نہ لکھا تو جہالت کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ دشمنیاں ہی کرے گا۔ دوست علم واخلاق سکھاتے ہیں۔ جب علم واخلاق حاصل نہ کئے تو آدمی دنیا میں دشمنی اور حسد ہی کرتا پھرے گا۔ برائی چاہے گا، بھلائی نہیں چاہے گا۔ اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ میں بالکل تن تنہا ہوں۔ میرے اخلاق کی درستگی کا کوئی طریقہ نہیں۔ اس لئے کہ سفر کر کے یوں نہیں جاسکتا کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ گھر میں

میرے پاس کوئی عالم اور درویش نہیں۔ اپنے ماحول میں میرا کوئی دوست اور دشمن نہیں۔ میرے لئے اب تحصیل علم واخلاق اور کمال پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو میں چوتھی تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ اس کے باوجود بھی اپنے اخلاق درست کرلیں۔ اور وہ بھی صحیح طریقہ ہے، فرضی نہیں ہے۔ اس طریقہ کا نام محاسبہ نفس ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ آپ عشاء کی نماز کے بعد دس منٹ مقرر کرلیں اور اس میں یہ سوچیں کہ آج دن میں، میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں کی ہیں، تو عمر بھر کی بھلائی برائی یاد نہیں رہے گی۔ لیکن دن بھر کی بھلائی برائی یاد رہے گی کہ آج کس کو فائدہ پہنچایا، سخاوت کی، کس کی غیبت کی، کس کی چغلی کھائی، میں نے کوئی جھوٹی گواہی دی، کتنوں کا میں نے مال دبالیا، بدنیتی کر کے کس کا قرضہ دبالیا۔ جیب کتری، غرض جو بھی بری حرکت دن میں کی ہے، رات کو ضرور یاد رہے گی۔ اتنا بدحافظہ کوئی نہیں ہوتا کہ دن بھر کی باتیں عشاء کے بعد بھول جائے۔ تو محاسبہ کر کے شمار کرلیجئے کہ دس میں نے نیکیاں کی ہیں اور دس ہی بدیاں۔ دس نیکیوں پر اللہ کا سچے دل سے شکرادا کیجئے۔

کہ اے اللہ! میں قابل نہیں تھا کہ نیکی ادا کروں۔ یہ تیرا فضل اور احسان ہے تو نے مجھ سے نیکی کرادی میرے میں کہاں اہلیت تھی۔ اگر میں نے اپنے ارادے سے نیکی کی تو ارادہ بھی تو ہی پیدا کرنے والا ہے۔ میں ارادے سے نیکی کرتا۔ لیکن اگر عمل کرنے کے سامان نہ ہوتے، عمل کیسے کرتا؟ وہ سامان تو نے ہی پیدا کئے، توفیق تو نے دی، بدن میں طاقت تو نے دی۔ تیرے فضل وکرم سے یہ نیکی ہوئی۔ میں شکر کرتا ہوں اور تیرا احسان مانتا ہوں۔ وعدہ خداوندی ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① جس نعمت پر شکرادا کرو گے۔ اس نعمت کو بڑھاؤں گا، ترقی دوں گا۔ لہٰذا جب آپ نیکیوں پر شکرادا کریں گے۔ اللہ کے وعدے کے مطابق نیکیاں بڑھنی شروع ہوں گی۔ مال پر شکرادا کرو گے، مال بڑھے گا، دین پر شکر کرنے سے دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کرو گے، صحت ترقی کرے گی۔ قوت پر شکرادا کرو گے، قوت بڑھے گی۔ دین پر شکرادا کرو گے، دین بڑھے گا۔ عملِ صالح پر شکر کرو گے عمل صالح ترقی کرے گا۔ اس لئے کہ آیت عام ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① یہ نہیں فرمایا: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ فِي الْمَالِ لَأَزِيدَنَّكُمْ" مال پر شکر کرو گے میں بڑھادوں گا اور کسی چیز پر وعدہ نہیں۔ تو کوئی قید نہیں لگائی اور جب بلا قید کے فعل آتا ہے تو ہر چیز اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ جب آپ نے نیکیوں پر شکر ادا کیا۔ تو وعدہ خداوندی کے مطابق اس میں ترقی ہوگئی۔

اور دس ہی برائیاں یاد آئیں کہ کچھ چغلی کھائی تھی، غیبت کی تھی، کچھ یہ کیا، کچھ وہ کیا، کسی کا مال مارلیا، کچھ ناپ تول میں کمی کردی، ڈنڈی مارلی اور مال کم دیا، پیسے گاہک سے پورے لے لئے یا مال خراب دے دیا دام پورے کرلئے۔ تو ایک تو حقوق اللہ ہیں دیانت کے بارے میں۔ اس میں توبہ سے معاف ہو جانے کی توقع ہے۔ تو

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

جب بدیاں یاد آئیں ان سے توبہ کرلیں دس بدیاں تھیں چاہے دس دفعہ توبہ نہ کریں۔ ایک دفعہ ہی توبہ کرلیں دس بدیاں معاف ہوجائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر وعدہ خداوندی ہے۔ اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَـهٗ ① ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں''۔ بالکل پاک صاف ہوگیا تو نیکیوں پر شکر کیا، وہ بڑھنی شروع ہوگئیں۔ بدیوں پر توبہ کی وہ گھٹنی شروع ہوگئیں۔ چالیس دن اگر آپ اس عمل کو روزانہ کریں گے۔ اور دس دس بدیاں روزانہ کا حساب لگائیں تو چالیس دن میں چارسو بدیاں کم ہوگئیں۔ حالانکہ چارسو آپ کرتے بھی نہ، مگر بالکل مٹ گئیں شیخ وقت اتنی بدیاں نہ مٹا سکتا۔ جتنی آپ نے محاسبہ نفس سے مٹادیں۔ آپ نے اپنے اخلاق درست کرلئے۔ اب آپ کے لئے کوئی حجت باقی نہیں رہی کہ صاحب! میرے ہاں نہ کوئی شیخ ہے نہ عالم نہ دوست نہ دشمن. مجھ سے اللہ میاں پوچھیں گے کہ تو نے اخلاق کیوں نہیں درست کیے؟ میں کہہ دوں گا، حضور! اخلاق کو درست کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کیسے درست کرتا اور پیسہ میرے پاس نہیں تھا کہ سفر کرکے کسی بزرگ کے پاس جاؤں اس واسطے میں بداخلاق رہ گیا۔ فرمائیں گے نہیں تو تنہا پہاڑ پر تھا۔ جب بھی اخلاق درست کرنے کا طریقہ تھا اور وہ محاسبہ تھا۔ اپنے نفس کا حساب لینا تھا۔ اگر آپ عشاء کے بعد دس منٹ روز اس مراقبہ کو کرلیا کریں اور پھر اندازہ کریں چالیس دن کے بعد کتنے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ کتنی بداخلاقیاں مٹتی ہیں، کتنی نیکیاں بڑھتی ہیں۔ آپ جتنا کام ایک شیخ وقت سے لیتے۔ آپ نے شیخ وقت اپنے نفس کو بنالیا۔ نفس نے وہی کام کیا جو ایک شیخ وقت اور مربی دین کرتا ہے۔

اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں...... حاصل یہ نکلا کہ اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے بتلا دیئے ہیں، کرسکتے ہیں۔ نہ چاہیں، خود پیغمبر بھی نصیحت کریں۔ آدمی درست نہیں ہوسکتا۔ جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی۔ اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔ کوئی صدیق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی فاروق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی ذی النورین رضی اللہ عنہ بنا، کوئی علی مرتضی رضی اللہ عنہ بنا اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی تو کوئی ابوجہل بن گیا، کوئی ابولہب بن گیا، کوئی مسیلمہ کذّاب بن گیا۔ غرض بگڑے ہی رہے اور نبی وقت سے بھی ان کی اصلاح نہ ہوسکی۔ اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھی۔

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جب تمہیں ہی مقصود نہیں کہ اپنی اصلاح کرو تو دس تاویلیں کرلو گے، دس باتیں بنالو گے۔ مگر اللہ کے ہاں تاویلیں نہیں چلیں گی۔ دنیا کو آدمی دھوکہ دے سکتا ہے۔ تو خدا کی حجت بندے پر پوری ہوچکی۔ کسی بھی حالت میں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۱۲ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۲۴. علامہ سخاوی فرماتے ہیں: ہمارے شیخ (ابن حجرؒ) نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے لیکن اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۸۴ حرف التاء.

ہوں اصلاح اخلاق کا راستہ موجود ہے۔ دوست و دشمن میں ہوں جب بھی تنہا یا جماعت میں ہوں تب بھی۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ دنیا میں ہر چیز میں شر اور برائی اس کی ذات میں گھسی ہوئی ہے اور خوبی محنت کر کے لائی جاتی ہے۔ تو انسان کا بچہ بھی پیدائشی طور پر برائیوں سے بھرپور ہے۔ جب تک اصلاح کی جدوجہد نہیں کرے گا۔ اس میں خوبی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کی طبعی جہالت رفع نہیں ہوگی۔ جب تک علم حاصل نہ کر لے اس کے اخلاق پاکیزہ نہیں بنیں گے جب تک کسی بااخلاق کی صحبت نہ اٹھائے یا قلب کا محاسبہ نہ کرے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

جب آدمی اپنی اصلاح خود نہ چاہے، کوئی اصلاح نہیں کر سکتا۔ خود اپنی خواہش سے آدمی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ ① ”اے پیغمبر! قیامت سے آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں، جو دل میں ڈرنے کا ارادہ رکھتا ہے“، جو اپنے دل میں ڈرنے کا مادہ رکھتا ہے اور جس نے یہ تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو مجھے نہیں ڈرنا، اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ وہ جب قبر میں جائے گا جبھی اسے ڈر لگے گا۔ دنیا میں اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ جب تک کوئی خود نہ چاہے۔ بڑے سے بڑا عالم آجائے لیکن وہ نہ چاہے کہ مجھے علم پہنچے، کبھی بھی علم نہیں پہنچے گا۔ بڑے سے بڑا درویش اور ربانی آجائے اور اس کا جذبہ نہ ہو کہ میں اخلاق درست کروں، کبھی بھی اخلاق درست نہیں ہوں گے اور اگر اپنا جذبہ ہو کہ اخلاق درست کروں تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ آپ اپنے نفس سے درست کر لیں گے۔ اصل میں آپ کا جذبہ اور آپ کا عزم ہے۔ یہ اصل چیز ہے۔ عارف رومی نے کہا ہے کہ

آب کم جو، تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو، اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس ہوگی تو پانی خود آجائے گا۔ پیاس تو ہے نہیں اور آدمی یوں چاہے کہ پانی آجائے، تو اوپرے دل سے پانی کی تلاش کرے گا۔ اوپرے دل سے طلب کرنے پر کچھ بھی نہیں ملا کرتا۔ دل کے جذبے سے جب طلب ہوتی ہے، جبھی ملتا ہے۔

اگر بیوی یوں کہے کہ فلاں زیور بنوا کے دے اور خاوند کے دل میں جذبہ پیدا ہو تو خاوند چوری کرے گا، ڈکیتی کرے گا۔ مگر اسے بنا کے دے گا۔ اس لئے کہ جذبہ پیدا ہو گیا اور جذبہ نہیں ہے تو وہ لاکھ چلائے، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کام تو اپنے جذبے سے چلتا ہے جب تک دل میں طلب نہیں ہوگی، محض کہنے سننے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ حال ایمان اور دین کا ہے۔ لاکھ وعظ کہنے والے وعظ کہیں۔ لیکن جب تک آپ کا عزم نہیں ہوگا کہ ہم درست ہوں۔ کبھی بھی درست نہیں ہوں گے۔ اگر آپ وعظ میں اس نیت سے آئیں کہ بھئی! دیکھیں کون کیسا بولتا ہے۔ گویا آپ تماشا دیکھنے آئے کہ بھئی! مداری کا تماشہ تھا۔ فلاں نے اچھا کہا اور فلاں نے غلط۔ کبھی بھی فائدہ نہیں

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۴۵.

ہوگا اور اگر اس لئے آئے کہ مجھے بھی کچھ دین کی بات لے کے جانی ہے، مجھے زندگی میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اگر کوئی جاہل آدمی بھی سچی بات کہے گا۔ تو اس سے بھی آپ عبرت پکڑیں گے۔ اپنے دل کی خود ہی اصلاح کر لیں گے۔ تو پھر اپنے اوپر بات رہی۔ اپنے اندر طلب صادق پیدا کیجئے اپنے اندر پیاس پیدا کیجئے پانی آ جائے گا۔ اپنے اندر زر کی طلب پیدا کیجئے۔ دولت آنے لگ جائے گی۔ اس کے لئے دس حیلے کریں گے۔ دوکان پر بیٹھیں گے، زمین پر جائیں گے، صنعت وحرفت کریں گے دولت آ جائے گی اور اگر آپ کے دل میں طلب نہیں ہے، سست پڑا رہنا آپ کو گوارا ہے کہ بس چارپائی پر پڑے رہو، اس سے کیا ملے گا؟

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک کاشت کار ہو۔ برسات کی ہوائیں چلیں اور پانی پڑنا شروع ہوا۔ تو اس وقت بیج ڈالا جاتا ہے، بیج ڈالتے ہیں تو کھیتی اگتی ہے۔ مگر کاشت کار نے کہا، کیسی عمدہ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ چار مہینے ٹھنڈی ہواؤں کے ہیں۔ میں پڑ کے آرام سے سوؤں گا۔ کون جائے کھیت پر؟ کون بیج ڈالے؟ برسات کے چار مہینے اس نے چارپائی پر پڑ کے گزارے۔ یہاں تک کہ برسات ختم ہوگئی، گرمی آئی اور لو چلنی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھر میں غلے لے کے آئے اور یہ اب منہ تک رہا ہے۔ بیج ڈالتا تو غلہ لے آتا؟ مگر اس نے سونے میں اور آرام طلبی میں سارا وقت گزار دیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا اب تو جو بیج پڑا ہوا ہے، اس کے بھی مارے جانے کا اندیشہ ہے، لو چل رہی ہے، آگ کی سی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اب کھیتی باڑی کا کیا کام؟ تو جیسے اس وقت سُست کاشت کار کو پشیمانی اور ندامت ہوگی۔ مگر وہ ندامت کام نہیں دے گی اس لئے کہ وقت گزر چکا۔ اس طرح سے اگر ایک دین کے طالب میں سچی طلب نہیں ہے اور یہ دنیا کی عمر اس نے لہو ولعب اور کھیل کود میں گزار دی اور یہ سمجھ کے کہ آج تو چارپائیاں بھی ہیں، بستر بھی ہیں اور کھانے کی نعمتیں بھی ہیں۔ اب کون جائے نماز کو؟ اور کون روزے رکھے؟ کون دین کی تلاش کرے؟ یہ مزے پھر کہاں ملیں گے۔ تو جب موت کا وقت آئے گا۔ اس وقت کہا جائے گا۔ ﴿اَخْرِجُوْآ اَنْفُسَكُمُ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ ① "اس نفس کو حوالے کرو، یہ تمہاری ملک نہیں ہے۔ آج کے دن عذاب چکھنا پڑے گا"۔ اب ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو اس وقت ندامت نہ فائدہ دے گی نہ عمل کا وقت ہوگا۔

دنیا کا ہر ذرّہ واعظ ہے...... حدیث میں ہے کہ بعض لوگ موت کے وقت ملک الموت سے کہیں گے کہ اے ملک الموت! مجھے تھوڑا سا وقفہ دو کہ میں توبہ کرلوں اور میں اللہ کی طرف رجوع کرلوں۔ ملک الموت حیرت سے کہیں گے کہ کیا تیرے پاس میرے قاصد نہیں پہنچے؟ انہوں نے تجھے موت کا پیغام نہیں پہنچایا؟ جو آج توبہ کے لئے مجھ سے وقت مانگ رہا ہے؟ میرے بیسیوں قاصد اسی لئے پہنچے کہ تو توبہ کرے، وقت موجود تھا۔ اتنے قاصدوں پر جب تو نے توبہ نہ کی۔ میں تو آج آخری قاصد ہوں۔ اس کے بعد توبہ کا زمانہ ہی نہیں۔ وقت گزر

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۳.

گیا۔ وہ کہے گا کہ میرے پاس تو کوئی قاصد نہیں پہنچا۔ ملک الموت کہیں گے: قاصد نہیں پہنچا؟ میں نے بہت سے اپنے پیامبر بھیجے۔ جنہوں نے اطلاع دی ہوگی کہ میں تیرے پاس آنے والا ہوں۔ وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں پہنچا۔ فرمائیں گے کیا تیری داڑھی میں سفید بال نہیں آئے؟ کیا تیرے سر کے اندر بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہوئے؟ یہ بڑھاپا میرا ہی تو قاصد تھا، جو خبر دے رہا تھا کہ میرے آنے کا وقت آ رہا ہے۔ موت کا پیغام آ چکا ہے۔ موت قریب آنے والی ہے وہ میرا قاصد ہی تھا۔ فرمائیں گے کیا تیرے پوتے نہیں پیدا ہوئے؟ نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی قاصد تھے کہ ان کا زمانہ آ گیا ہے۔ تمہارے لئے دنیا کا وقت ختم ہو چکا۔ ان کے لئے جگہ خالی کرو۔ یہ میرے ہی تو قاصد تھے، جو خبر دے رہے تھے۔ ﴿وَجَآءَ كُمُ النَّذِيْرُ﴾ کیا ڈرانے والے تیرے پاس نہیں آئے؟ یہ سارے میری طرف سے آئے تھے۔ اور فرمائیں گے، کیا یہ دن رات کا لوٹ پھیر، اس نے تجھے وعظ نہیں کیا؟ سورج طلوع ہوا، طلوع کے بعد عروج کرتے کرتے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب گرنا شروع ہوا، یہ اس کی موت کا پیغام تھا۔ سورج کا چہرہ فق ہوا، روشنی زرد پڑ گئی اور آخر میں غروب ہو کر چھپ گیا۔ گویا ختم ہو گیا۔ روز طلوع اس کی حیات ہے اور غروب اس کی موت ہے۔ جب اتنی بڑی ہستی روزانہ آتی بھی ہے اور فنا بھی ہے، مٹنا بھی ہے، چھپ جانا بھی ہے۔ تو سورج بھی ایک واعظ ہے۔ جو وعظ و نصیحت کہتا ہے۔ لیکن کوئی عبرت کی نگاہ سے دیکھے۔ تو اس کے وعظ کو سنے گا۔ اور اگر بیلوں کی نگاہ سے دیکھے، تو بیل کے سامنے بھی سورج چھپتا ہے مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اس لئے کہ نہ عقل ہے نہ علم۔ اگر انسان بھی کائنات کے واقعات کو بیلوں کی طرح دیکھنے لگے کہ واقعات کی صورت تو دیکھ لے۔ عبرت، نصیحت حاصل نہ کرے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ گیا۔ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ جانور واقعات کی صورتوں کو دیکھتا ہے۔ انسان ان کی حقیقتوں میں گھس کر ان سے کچھ علم اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی۔ فرمایا: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ ① کتنی ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں کہ انسان پر گزرتی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے اور آنکھ بند کر کے چلا جاتا ہے۔ اس سے عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتا اور فرمایا، بہت سے وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ مومن بن گئے ہیں، مگر شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اس واسطے کہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ہر چیز سے کٹ کر اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ہر حادثے کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور مالک کو پہچانتے۔ لیکن یہ پھر بھی اپنے ہی نفس کی رضا میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ہی نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی آرام کی فکر میں ہیں۔ نہ آخرت، نہ عبرت، نہ نصیحت، پیش نظر، تو مومن بھی ہیں مگر ساتھ مشرک بھی ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے، کہ سورج کے طلوع و غروب کے واقعات حیوان کے اوپر بھی گزرتے ہیں اور انسان بھی دیکھ رہا ہے۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۵، ۱۰۶۔

حیوان فقط شکل کو دیکھتا ہے، انسان اس کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب اس میں تغیر ہے تو کون سا ذرہ خالی ہوگا، جس میں تغیرات نہ ہوں۔ ہواؤں کا چلنا، زمین کی تعمیر وتخریب موسموں کا آنا جانا، پھلوں کا آنا اور مٹ جانا۔ ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ عالم موت اور حیات کی کشمکش میں ہے۔ پیدائش بھی ہے اور موت بھی ہے، عروج بھی ہے زوال بھی ہے۔ ترقی بھی ہے، تنزلی بھی ہے، تعمیر بھی ہے، تخریب بھی ہے۔ جو چیز پیدا ہوئی وہ موت کے منہ میں ضرور جائے گی۔

عیسیٰ بن مریم نے فرمایا: "لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ" ① جو موت کے لئے بچوں کو مرنے کے لئے پیدا کرو، تعمیریں بناؤ ڈھانے کے لئے جو تعمیر بنے گی، ایک دن اس کی تخریب بھی ہوگی۔ دنیا میں ہر تعمیر کے لئے تخریب اور ہر بقاء کے لئے فنا لازم، ہر حیات کے لئے موت لازم، ہر آغاز کے لئے انجام لازم ہر ابتداء کے لئے انتہا لازم۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔

ہمارے مرشد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے ذرات کو اور حالات کو دیکھو کہ وہ اعلان کر رہے ہیں کہ "فَافْهَمْ فَافْهَمْ......" اب بھی سمجھو، اب بھی سمجھو، غفلت کی نیند کو چھوڑ دو، ان تغیرات کو دیکھ کر اب بھی متوجہ ہو لو، کہ تم میں بھی تغیر آنے والا ہے۔ تم بھی اس دنیا کے جز ہو۔ جب دنیا کے ہر جز میں تغیر ہے اور تغیر کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز فنا کی طرف جا رہی ہے۔ تو تم بھی فنا کی طرف جا رہے ہو۔ انسان پر جو بیماریاں آتی ہیں۔ یہ علامت ہے کہ جب یہ تغیر صحت سے پیدا ہوا تو صحت والے پر بھی ایک دن تغیر آنے والا ہے، طاقت بدن میں آتی ہے ایک دن اس کے گھٹنے کا زمانہ بھی آتا ہے۔ غذائیں ہضم کرنے کی قوت ہوتی ہے، ایک دن ضعف تغیر کا زمانہ ہے، جوانی آتی ہے، ایک دن بڑھاپے کا دور آنے والا ہے۔ جب انسان کے عوارض میں تغیرات ہیں تو ذات میں بھی تغیر ہوگا۔ یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گا۔ ان تمام چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ سارے واعظ و مقرر ہیں۔ سارے نصیحتیں کر رہے ہیں۔ آپ اس تلاش میں ہیں کہ کسی واعظ، مقرر یا عالم کو بلائیں اور تقریر سنیں میں نے ہزاروں واعظوں کا پتہ دے دیا کہ گھر بیٹھیئے اور وعظ سنتے جایئے۔ سورج زمین، ہواؤں کا چلنا، دنیا کے تغیرات۔ الغرض ذرہ ذرہ واعظ ہے، سننے والا اور عبرت پکڑنے والا ہونا چاہیئے وہ ہر جز سے عبرت پکڑے گا۔ تو گھر میں واعظ موجود ہے اور گھر چھوڑ آپ کے بدن کے اندر واعظ موجود ہیں۔ اپنے اندر کے تغیرات کو دیکھئے کہ ہر ہر چیز فنا کی طرف جا رہی ہے۔ استاد داغ بڑا شاعر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ۔

ہوش و حواس، تاب و تواں داغ جا چکے ۔۔۔ اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

سامان تو چلا گیا۔ اب مسافر بھی روانہ ہو رہا ہے۔ روزانہ سامان جاتا رہتا ہے اور ہمیں عبرت نہیں کہ ایک

① المطالب العالیۃ، کتاب الرقاق، باب الوصایا النافعۃ ج: ۹ ص: ۱۳۶ رقم: ۳۱۹۹.

وقت آ رہا ہے کہ ہمیں بھی جانا ہے۔

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں نوشیرواں کا واقعہ لکھتے ہوئے خوب کہا ہے کہ ؎

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر ——— زاں پیشتر کہ بانگ در آید فلاں نماند

اے عزیز! کچھ نہ کچھ خیر اور بھلائی کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ یہ موتیوں جیسے دن ہیں۔ جو جا رہے ہیں انمول موتی ہیں۔ جو قیمت سے نہیں، اللہ نے بلا قیمت دے دیئے ہیں۔ تو کوئی خیر کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ اس سے پہلے کہ یہ آواز دی جائے کہ آج فلاں نہیں رہا۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ ① اس سے پہلے کچھ کرنا ہے تو کر لے۔ آج ہم قبرستانوں سے گزرتے ہیں۔ ہزاروں وہ آدمی جو ہمارے دوست، احباب، والد، عزیز، اقرباء تھے آج وہ قبر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیں اور خاک کا جز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ افسوس! یہ آدمی تھے اور آج نہیں۔ کل کو ہم پر بھی یہی وقت آنے والا کہ گزرنے والے ہمارے اوپر سے گزریں گے اور کہیں گے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں تھے۔ مگر آج ان کا نشان اور پتہ نہیں تو ہر شخص اس راستے پر جانے والا ہے کچھ اس راستے کی بھی فکر کر لینی چاہیئے۔

شیطانی دھوکہ...... بعض آدمی کو دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میرے اندر قوت ہے۔ جب بڑھاپا آئے گا، توبہ کر لیں گے ابھی تو کھانے پینے لہو ولعب اور قوت کا دور ہے۔ موت کے کچھ آثار ونشانات نہیں ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا اور یہ بات سامنے آجائے گی کہ اب چند دن باقی رہ گئے۔ اس وقت توبہ کر لیں گے اب مزے اڑا لیں۔ عیش میں رہیں۔ مگر یہ محض دھوکہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اس لئے کہ موت کے لئے بڑھاپا، جوانی، بیماری شرط نہیں ہے۔ بلا بیماری کے آدمی بیٹھے بٹھائے چلا جاتا ہے۔ جوان بھی مرتے ہیں، بچے، بوڑھے بھی مرتے ہیں۔ موت کا بازار گرم ہے سب کو آ رہی ہے۔ اس وسوسے کو تب آپ دل میں جگہ دیں کہ بڑھاپے کے بغیر آدمی مرا ہی نہ کرتا۔ کہہ سکتے تھے کہ ابھی موت کا وقت ہی نہیں آیا۔ لیکن جب بڑھاپے سے پہلے موت آجاتی ہے پھر دل میں یہ خیال کیسے گزرا کہ بڑھاپا آئیگا جب توبہ کر لیں گے۔ کیا خبر ہے کہ بڑھاپا آئے گا بھی کہ نہیں؟ یہ اللہ کے علم میں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں، میں تو یوں کہوں گا کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں۔ جوانی میں موت زیادہ آتی ہے۔ بوڑھاپے میں کم آتی ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ مجمعوں کو دیکھیں، بازاروں میں گھومیں۔ آپ کو بوڑھے کم نظر آئیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے، تو دنیا میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سارے سفید داڑھی کے نظر پڑا کرتے حالانکہ جوان زیادہ نظر پڑتے ہیں، بوڑھے کم نظر پڑتے ہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ پہلے ہی ختم ہو جاتے

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۶۔

ہیں۔تو جوانی میں زیادہ اور بڑھاپے میں کم موت آتی ہے۔ یہ محض ایک دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا،تو بہ کر لیں گے۔ بڑھاپا شرط نہیں اور تو اور ماں کے پیٹ میں بھی مرجاتے ہیں۔ دنیا میں آنے ہی نہیں پاتے۔اس کی بھی نظیریں ہیں تو موت کے لئے کوئی خاص سبب متعین نہیں ہے۔ پھر اس میں اس دھوکے میں پڑنا کہ جب فلاں بات ہوگی،تب تو بہ کریں گے۔ آج نہیں کل کریں گے یہ جوکل پر بات ٹالنے کا عادی ہوگیا ہے۔ جب وہ کل آئے گی تو اگلی کل پر ڈال دے گا۔ وہ آئے گی تو اس سے اگلی کل پر۔ اسی کل کل میں رہے گا اور موت کا وقت آجائے گا۔تو بہ نصیب نہیں ہوگی۔ جسے تو بہ کرنی ہے۔ وہ آج کرے اور اس عمر کو غنیمت سمجھے۔

عمل کا زمانہ جوانی ہے...... بلکہ یہ خیال کرے کہ عمل کرنے کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپے کا زمانہ عمل کا نہیں ہوتا بڑھاپے کا زمانہ پنشن کا زمانہ ہے اور حق تعالیٰ کے ہاں پنشن دی جاتی ہے۔ جیسے گورنمنٹ کے ہاں پچپن سال کی عمر ہو جائے تو پنشن دے دیتے ہیں۔مگر گورنمنٹوں بے چاریوں کے خزانے چھوٹے ہیں۔اس واسطے وہ آدھی پنشن دیتے ہیں۔ دوگنی اور تگنی تو کیا؟ پوری تنخواہ بھی نہیں۔ آدھی تنخواہ دیتے ہیں۔ اللہ میاں کے ہاں سے پوری پنشن ملتی ہے۔حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جوانی میں کوئی عمل کرتا تھا۔ بڑھاپا آ گیا، طاقت رہی نہیں اور عمل نہیں کر سکتا حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں۔ کہ نامہ اعمال میں ثواب برابر لکھتے رہو۔اس واسطے کہ اس نے خود نہیں چھوڑا بڑھاپا ہم نے بھیجا ہے۔اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔لہذا عمل برابر لکھتے رہو۔گویا آج بھی عمل کر رہا ہے۔ جو دس مسئلے پڑھتا اور آج وہ نہیں پڑھ سکتا مگر ثواب دس ہی کا لکھتے جاؤ اس لئے کہ اس کے ارادے کا قصور نہیں ہے۔لہذا جوانی عمل اور بڑھاپا پنشن کا زمانہ ہے۔جس نے جو کچھ کیا، جوانی میں کیا ہے۔اس واسطے جوانی کے اندر یہ لیت ولعل کہ جب بڑھاپا آجائے گا، جب تو بہ کرلیں گے۔ ''الٹے بانس بریلی کو'' یہ تو اوندھا قصہ ہے کہ جب پنشن ملنے کا زمانہ آئے جب آدمی کہے کہ میں کام کروں گا۔ جیسے کوئی آدمی گورنمنٹ سے کہے کہ صاحب! ابھی تو میری پندرہ برس کی عمر ہے۔ابھی آپ مجھے ملازم نہ رکھیں۔ جب میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں، جب ملازم رکھیں۔ گورنمنٹ کہے گی کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ارے ملازمت کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپا پنشن کا اور عمل کے چھوڑنے کا زمانے ہے۔تو عمل کا زمانہ سمجھ رہا ہے۔یہی دین میں بھی بات ہے۔جس نے جو کچھ بھی کیا ہے، جوانی میں کیا ہے بڑھاپے میں تو ثواب لوٹنے کا زمانہ ہے۔ وہ کسی شاعر نے کیا خواب کہا ہے کہ ؎

من نمی گویم کہ زیاں کن، یا بند سود باش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اے زفرصت بے خبر، در ہر چہ باشی زود باش

میں یوں نہیں کہتا کہ کوئی نفع یا نقصان کا کام کرو۔ یہ کہتا ہوں کہ جو کرنا ہے جلدی کرلو۔ اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا۔تو عمل کا زمانہ یہی ہے جسے تو بہ کرنی ہے آج کرے،کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔اس واسطے وعظ سن کر یا دنیا کے ان ذروں سے وعظ سن کر یا دیکھ کر کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کرے۔ ممکن ہے کل کو یہ جذبہ بھی باقی نہ رہے۔

نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں......: حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر

میں لکھا ہے اگر کسی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ میں ایک پیسہ اللہ کے راستے میں صدقہ کروں، فوراً کر دے۔ اس لئے کہ ممکن ہے گھنٹہ بعد قلب کی وہ کیفیت نہ رہے کہ ایک پیسہ دے کے کیا کروں گا اور ہزار دینے پر قادر نہیں۔ پھر یہ نہ ایک کرے گا نہ ہزار کرے گا۔ محرومی اس کے سر پر پڑے گی۔ اس لئے جب کسی نیکی کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، نیکی کے اندر مشورے طلب کرنے یا استخارے کرنے کی ضرورت نہیں۔ استخارہ مشورہ ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جن میں حق واضح نہ ہو کہ بھئی مشورہ کرلو، حق واضح ہو جائے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دے دیا۔ اس میں استخارہ کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے کہا کہ نماز پڑھو۔ آپ نے کہا، میں ذرا گھر والوں سے مشورہ کرلوں کہ پڑھنی چاہئے یا نہیں، تو لوگ کہیں گے، احمق آدمی! خدا کے حکم کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے کہا زکوٰۃ دو کہ جی میں ذرا استخارہ کرلوں۔ اگر استخارہ اللہ سے پوچھنے کو کہتے ہیں تو وہ خود کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں حکم دے رہے ہیں۔

در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

کار خیر میں استخارہ کی ضرورت نہیں۔ جس میں آدمی کو تذبذب ہو اور اس کا خیر ہونا پوری طرح ثابت نہ ہو۔ اس میں استخارہ و مشورہ کرے۔ آج اگر کسی وعظ و نصیحت سے نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔ اللہ پر بھروسہ کرے۔ پھر وہ جاری بھی ہو جائے گی۔ ''لَیْتَ وَ لَعَلَّ '' میں نہ پڑے کہ کل کرلوں گا، پرسوں کرلوں گا۔ یہ شیطان کی طرف سے ڈھیل کرائی جاتی ہے کہ اس کے دل سے یہ جذبہ نکل جائے پھر میں اس سے نمٹ لوں گا۔ تو جب جذبہ خیر، جذبہ حق آ جائے۔ اسے خدا کی طرف سے امر سمجھو، اسے کر ڈالو۔ تو اپنی اصلاح کا تھوڑا بھی جذبہ پیدا ہو، آدمی کر گزرے۔ اپنے اخلاق کو درست کرنے کا جذبہ خواہ نفس کے محاسبے سے ہو یا مواخات فی اللہ سے ہو یا غیروں سے عبرت پکڑنے سے ہو یا سچوں کی صحبت اختیار کرنے سے ہو، آدمی کر گزرے۔ اس لئے یہ حیلہ کام نہیں دے گا کہ صاحب! کوئی درویش، عالم نہیں ہے، کوئی دوست نہیں ہے، کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں بھئی! کوئی بھی نہیں تو خود تو موجود ہے۔ اپنے نفس سے ہی کام لے سکتا ہے۔

تو یہ ایک نسخہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ جو چار دواؤں پر مشتمل ہے۔ صحبتِ صالحین، مواخات فی اللہ، اِتعاظ بالغیر اور محاسبۂ نفس۔ اب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مل جائے۔ وہ بھی ان شاء اللہ کار آمد ہے۔ بعض نسخے ایسے ہوتے ہیں کہ اس کی ایک دوا بھی مل جائے۔ تو وہ بھی صحت کے لئے مفید ہوتی ہے اور اگر چاروں دوائیں مل کے معجون مرکب بن جائے، تو سبحان اللہ کہ صحبت نیک بھی میسّر ہو مواخاۃ فی اللہ کہ دینی بھائی بندی بھی ہو جائے، دشمنوں سے عبرت بھی پکڑے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے۔ چاروں دواؤں کا نسخہ اگر پیئے تو بڑا مقوی ہوگا۔ جس نسخہ کا ایک ایک جز شفا کا ذریعہ ہو۔ اس نسخے کے اگر سارے اجزا مل جائیں، وہ تو اکسیر بن جائے گا۔ اس واسطے یہ چند چیزیں میں نے ذکر کیں تا کہ ان سے عبرت بھی ہو۔ ان سے اپنی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہو

اوران سے اپنے اخلاق بھی درست ہوں اور آدمی یہ سمجھ لے کہ میری ذات میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ خوبی کی میں جتنی محنت کروں گا آ جائے گی برائی محنت سے نہیں آتی۔ وہ میرے اندر پیدائشی طور پر ہے۔ اسے زائل کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہے اور اس کے زائل کرنے کے یہ چار طریقے ہیں۔ جو میں نے عرض کئے۔ بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ اب وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کی اصلاح کرنے، اپنے اعمال واخلاق کو درست کرنے اور اپنے عقائد کو سچا بنانے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا نصیب فرماوے، اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے، حق تعالیٰ ہمارے دین اور ہماری دنیا کو درست فرماوے، ہماری آخرت کو بھی درست فرماوے، ہم میں جتنے کھوٹ ہیں۔ اللہ ان کو نکال دے، نفس میں جتنی بیماریاں گھسی ہوئی ہیں، ان کو زائل فرماوے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دشمنوں کے نرغے سے محفوظ رکھے، حق تعالیٰ ہر مشکل سے ہمیں بچائے، ہماری راہ درست فرماوے۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ."

رضائے اِلٰہی

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:...... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿يٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ٥ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے۔ جواس وقت میں نے تلاوت کی۔ یہ سورۂ فجر کی آخری آیت ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے نفس مُطْمَئِنّہ! لوٹ چل اور واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا"۔

یہ آیت بہت سے علوم ومعارف اور حقائق پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ موقع نہ سب کے بیان کرنے کا ہے اور نہ ہی وقت ہے کہ پوری تفسیر کی جائے اور پورے حقائق کی تشریح بیان کی جائے۔ ورنہ آیت کا جب حق ادا ہو کہ پہلے نفس مطمئنہ کی تشریح کی جائے کہ نفس مطمئنہ کیا ہے؟ کسے کہتے ہیں؟ ﴿اِرْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ﴾ ② اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ یہ لوٹنا کیسا ہے؟ لوٹنا جب ہوتا ہے کہ پہلے آنا واضح کیا جائے۔ راضی اور مرضی ہونے کے کیا معنی ہیں؟ خاص بندوں میں شامل ہونے کی کیا حقیقت ہے؟ جنت میں داخل ہونے کی کیا کیفیت ہے؟ غرض یہ بہت سے مقاصد ہیں جن پر یہ آیت مشتمل ہے۔ ہر مقصد ایک مستقل موضوع ہے اور مستقل وقت چاہتا ہے اور اتنا وقت نہیں ہے۔ اس لئے اس آیت کے سلسلے میں تین باتوں کے متعلق میں کچھ تشریح تھوڑی سی عرض کروں گا۔

یہ آیت ایک تو واقعہ پر مشتمل ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ایک بشارت پر جس کی آیت میں وضاحت کی گئی ہے اور ایک انعام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں انہیں تینوں چیزوں کی مختصر تشریح کرنی ہے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷، ۳۰. ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸.

وقتِ نزع کا خطاب......اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس کی موت و نزع کے وقت خطاب کیا جائے گا۔ جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جیسے شرعی خطابات زندگی میں کہے گئے ہیں کہ "صَلُّوْا" نماز پڑھو۔ یا "عَلَيْكُمْ بِالصِّيَامِ" روزے رکھو یا "عَلَيْكُمْ بِالْحَجِّ" حج ادا کرو وغیرہ۔ یہ زندگی کے خطابات ہیں اور یہ زندگی کے خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔ اور اسی وقت کی یہ بشارت ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اور اسی وقت ایک انعام کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ① یہ خطاب کس وقت ہوگا؟ حدیث میں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ جب مومن پر اس کا آخری وقت آتا ہے اور اس کا نزع شروع ہوتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار اس شخص کے پاس پہنچتے ہیں جو حالت نزع میں ہے اور اس کی موت کی ابتداء ہو رہی ہے۔

ملکُ الموت کے دو قسم کے اَعوان مددگار ہیں۔ ایک اصحابِ یمین اور ایک اصحابِ شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بیض الوجوہ ہیں۔ یعنی سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے۔ تاریک اور سیاہ اور ڈراؤنے ان کے چہرے ہوں گے۔

مومن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے۔ اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحابِ یمین کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ بندہ جس کی موت قریب آچکی ہے۔ یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر سینکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسے ایک قسم کا تحیر پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحاب یمین اور ملک الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔ دور سے اس لئے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے، نئے عالم کی مخلوق سامنے آ رہی ہے۔ ایک دم سامنے آنے سے کہیں مومن گھبرا نہ جائے اور جزع فزع میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے پہلے دور بیٹھ کر اپنا جمال دکھلاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ انس پیدا ہو۔

یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر ایک عالم تحیر طاری ہے کہ سورج اور چاند ہیں، کیا چیز؟ آہستہ آہستہ قریب آ رہے ہیں، یہاں تک کہ بالکل قریب آ جاتے ہیں، اب مشخص ہوتا ہے کہ یہ محض روشنیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شکل وصورت سب مشخص ہو کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اس مومن کے ساتھ نہایت ہی خاطر و مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کر دیں۔ بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: "اُخْرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷.

رَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَانِ " ① اے پاک روح اور نفس! نکل اس بدن میں سے کہ تو نے اپنے عمل سے اسے پاک بنا دیا تھا۔ تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک۔ کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں، نعمتوں، آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب ناک نہیں ہوگا۔ بلکہ رحمت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس طرف چل یہ گویا ایک قسم کا وعظ ہوتا ہے. جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس میں دنیا کی گندگی اور برائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم والم اور نہ پریشانی ہے۔ بلکہ بشاشتیں، راحتیں اور اِنبساط ہے۔ ادھر چل اور اَخیر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی، محنتیں اٹھائیں۔ اب وہ نتیجہ قریب آ رہا ہے۔ یہ ایک وعظ وترغیب ہے تا کہ مومن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرنا آسان ہو جائے گا۔ دوسرے عالم کی طرف نکلنا سہل ہو جائے گا۔

ملائکہ موت مومن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں...... غرض پہلے دنیا کی برائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر طبعی طور پر انسان کو موت شاق ہے کہ اس عالم سے نکل کر جس میں پچاس، ساٹھ ستر برس گزارے ہوں، دوسرے عالم میں جائے۔ اس لئے جیسے بدن کا چھوڑنا بھاری ہے۔ اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے۔ اس لئے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت گوارا نہیں کرتی، لاکھ بشارتیں دی جائیں، نعمتوں کا پیغام سنایا جائے۔ مگر وہ طبعی کراہت اور جھجک غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔ بعض طبائع تو وہ ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فارغ بنا لیا تھا وہ فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ، میں ایک دن ان کی مجلس میں حاضر تھا۔ دو یا تین آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ عام مجلس نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے حضرت کی طبیعت میں کچھ جوش سا پیدا ہوا۔ تو ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اجنبی آدمی تو نہیں جیسے گویا کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاہتے ہوں، تو ادھر ادھر دیکھا تا کہ کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو۔ جب مطمئن ہو گئے تو ہم سے خطاب کر کے فرمایا کہ: "الحمدللہ! میں موت وآخرت کے لئے اتنا تیار بیٹھا ہوں کہ اگر ابھی پیغام آ جائے تو خوشی خوشی چلا جاؤں"۔ یہ بات فرمائی یہ بات ہمیں کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ کون سی ایسی نئی بات ہے جس شخص کے پاس بھی موت کا پیغام آئے گا، خواہی نخواہی اسے تو جانا ہی پڑے گا۔ یوں کہنا میں تیار بیٹھا ہوں۔ اس سے کیا حاصل؟ یہ تیار ہو یا نہ ہو جب موت آئے گی تو جانا ہی پڑے گا اس میں تیاری کی کیا بات ہے؟

گویا ہمیں ایک استعجاب سا ہوا کہ یہ کون سی ایسی راز کی بات تھی کہ حضرت نے دیکھا کہ ادھر ادھر کوئی اجنبی اور بیگانہ نہ ہو۔ مگر بعد میں واقعی معلوم ہوا کہ ایک تو موت کا آنا تکوینی طور پر ہے۔ جب آ جائے گی تو آدمی جائے گا۔ جیسے پیدا ہونے میں مجبور ہے۔ جب اللہ کسی کو دنیا میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہے نہ چاہے اسے آنا پڑتا ہے۔

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، ج: ١٢ ص: ٣١٤.

اسی طرح جب آخرت میں لے جانا چاہیں گے۔ وہ چاہے نہ چاہے جانا ہی پڑے گا۔ تو ایک فعل خداوندی ہے کہ تکوین الٰہی کے سامنے انسان مجبور ہے۔ ایک رضا ہے کہ اپنی خوشی سے جائے۔ یہ جب ہوگا جب اللہ سے انس و محبت غالب آ جائے۔ آخرت کی نعمتوں کی رغبت غالب آ جائے وہاں کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ معلوم ہو۔ قرآن کریم کی ایک آیت دنیا و مافیہا سے زیادہ اونچی اور برتر نظر آئے اور یہ سمجھے کہ اگر ایک آیت کا مفہوم میرے ذہن میں آ گیا اور کیفیت یہ طاری ہوگئی کہ پوری دنیا مجھ سے چھین لی جائے، یہ نعمت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ جب ہوتا ہے جب حق تعالیٰ اور دین اسلام کی محبت کا غلبہ ہو جائے۔ اس وقت پھر انسان کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ کس طرح سے دنیا سے نکلوں جیسے بعض عارفین کا قول ہے کہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم ‏ ‏ ‏ تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس آباد دیار میں پہنچیں گے اور اس شہر مطلوب میں پہنچیں گے۔ جہاں کے ہم سے وعدہ کئے گئے ہیں۔ اس لئے موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔

مومن کو عندالموت حق تعالیٰ براہِ راست بھی خطاب فرماتے ہیں...... حدیث میں موت کی تمنا کی ممانعت فرمائی گئی۔ فرمایا "لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ① کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اس لئے کہ موت آ کر زندگی اور عمل کو بھی قطع کر دے گی۔ جتنی زیادہ زندگی نیکی کے ساتھ ہو اتنی بہتر ہے۔ اس لئے موت کی تمنا مت کرو اور ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ② "اے یہود! اگر تمہیں اولیاء اللہ اور ولی کامل ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ"۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن ہونے اور ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔ بظاہر ایک تعارض سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو، ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو۔ یہ دو باتیں آپس میں ٹکرا گئیں لیکن ایک دوسری حدیث نے اس مضمون کو صاف کر دیا۔ فرمایا گیا: "لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ بِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ" ③ کوئی شخص کسی مصیبت سے اکتا کر موت کی تمنا نہ کرے۔ یہ بے صبری اور اللہ پر بے اعتمادی کی علامت ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کہے کہ موت ہی کیوں نہیں آ جاتی۔ اگر موت آ گئی اور وہاں بھی مصیبت ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا، یہ انعام خداوندی کو ٹھکرانا ہے، بے صبری ہے۔ اس کی ممانعت ہے۔ لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا

---

① الصحيح للبخاري، كتاب المرضىٰ، باب تمني المريض للموت، ج: ١٧ ص: ٤٢١ رقم: ٥٢٣٩.

② پارہ: ٢٨، سورة الجمعة، الآية: ٦.

③ الصحيح للبخاري، كتاب المرضىٰ، باب تمني المريض للموت، ج: ١٧ ص: ٤٢١ رقم: ٥٢٣٩.

ہو۔ یہ عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش، داڑھی کا ایک ایک بال کھلا ہوا یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوشی ان کے دل سے ابلی پڑتی تھی۔ فرمایا: ''غَدًا نَلْقٰی مُحَمَّدًا وَّ اَصْحَابَهٗ'' کل ان شاء اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس کی خوشی ہے۔ یہ خوشی عین مطلوب ہے۔ اس لئے اگر موت کی تمنا ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔ البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا یہ خلاف مطلوب ہے۔ بہر حال ولایت جب کامل ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے: ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُکَ'' ① ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت پیدا کر دے جو میرے نبی اور رسول ہونے کا قائل ہے''۔

اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے: ''اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ'' ② موت مومن کے لئے تحفہ ہے۔ ''یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ'' ③ جو ایک عاشق کو اس کے محبوب حقیقی تک پہنچاتا ہے۔ اگر عاشق ہو تو محبوب کے پاس جانا مطلوب ہوتا ہے یا مکروہ؟ جو عاشقِ خداوندی ہے اس کو اللہ سے ملنے کی تمنا ہوگی اور اللہ سے نہیں مل سکتا جب تک بیچ میں موت نہ آئے۔ تو موت درمیانی واسطہ ہے۔ اس واسطے کے بغیر محبوب سے نہیں مل سکتا۔ بہر حال جب ولایت ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو واقعی موت کے شائق ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے جن کو طبعاً موت مکروہ ہے۔

ملائکہ علیہم السلام اور ملک الموت کے اَعوان و انصار آکر انہیں موت کی ترغیب دیتے ہیں کہتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔ اس عالم کی طرف چلو جہاں روح و ریحان ہے اور اس رب کی طرف جو کبھی نامہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دوامی ہوگی۔ جب اس کے دل میں انعام کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہو جاتا ہے۔ پھر نزع شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آمادہ کر کے نکالنی ہے۔ گویا ظاہری طور پر جبراً اس کو کھینچنا نہیں ہے۔ یہ مومن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔ تو حدیث میں ہے اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لا کر دکھلاتے ہیں۔ یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر پھر مومن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم الٹا کر دو۔ تو

---

① المعجم الکبیر للطبرانی ج:۳ ص:۴۷۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۳۰۹. ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزوجل ج:۸ ص:۱۷. روایت ضعیف ہے، دیکھئے: کشف الخفاء رقم: ۲۶۶۷.

③ یہ حبان الاسود کا قول ہے دیکھئے۔ فیض القدیر ج:۳ ص:۳۰۷.

غرغرا کر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا۔ اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جاتا ہے۔ ﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ○فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ ①

تو بالواسطہ ملائکہ پیغام دیتے ہیں کہ اُخْرُجِیْٓ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّیِّبَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْٓ اِلٰی رَوْحٍ وَ رَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَان ② اے پاک روح چلی آ۔ تیرا بدن بھی پاک تھا اور خود بھی تو پاک ہے۔ یہ تو ملائکہ علیہم السلام کے واسطے سے بشارت ہوتی ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست پیغام دیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ خود پکارتے ہیں یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○...... اے نفس مطمئنہ آ۔ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ﴾ ③ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف کہ تو خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی۔ یہ اس وقت کا خطاب اور بشارت ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کو ہوگا۔ یہ تو وہ واقعہ ہے جو ہر بندے کو پیش آئے گا۔ مگر یہ خطاب صرف مومن کے لئے ہوگا۔

مؤمن کے لئے اعلان رضا کی بشارت...... بشارت اس میں کیا ہے؟ ﴿رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ ④ یہ بشارت ہے۔ یعنی اے نفس مطمئنہ آ اور ہماری طرف لوٹ۔ اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی۔ اعلان رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ مومن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔ مومن کے راضی ہونے کے کیا معنی؟

بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے۔ سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں۔ باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب کی ہو۔ مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس سے راضی ہونے پر ہے۔ کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہو؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا کہ میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے۔ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ غرض مومن کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ سارے اللہ سے راضی ہی ہیں۔ مومن کی کیا خصوصیات ہے؟

احادیث کے اندر اس رضا کی تفسیر فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ ایمان کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔ یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں۔ جب تک ان افعال الٰہیہ کے ساتھ رضامندی نہ ہو، جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، جیسے خالق و مالک ہیں، رب بھی ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷ تا ۳۰. ② السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له ج: ۱۲ ص: ۳۱۴. ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸. ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸.

رب کے معنی پالنے والے کے ہیں۔ پال پرورش کے اندر وہ افعال بھی کیے جاتے ہیں، جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کیے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے۔

ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چمکارتی ہے تھپڑ بھی تو مارتی ہے۔ جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے۔ باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب میں نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا دل میں محبت موجود ہے مگر کہہ رہا ہے کہ گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اب اگر تو نے کوتاہی کی تو دیوار سے دے کر تجھے ماروں گا۔ کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار میں دے مارے۔ صرف ڈرانے دھمکانے کے لئے ایسا کہتا ہے۔ غرض جیسے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی مامتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے اسے بھی تربیت کہتے ہیں یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔

اگر بچہ ماں کے دودھ پلانے پر خوش ہو جائے روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ بڑا نامعقول اور ناخلف بیٹا ہے۔ جیسے اسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہئے تھا ویسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصلحت کے لئے ہے۔ کیوں کہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں، محبت کا ہے۔ اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی۔ خلف صالح وہ کہلائے گا جو باپ کے چمکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے۔ کھانا کھلانے پر بھی راضی اور جب سزا دے کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا۔ ایک وقت کی روٹی بند کر دے۔ تو بھی راضی ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے لئے ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی وہ ماں کی گود میں جاتا ہے۔ جب طمانچہ مارتی ہے تو روتا جاتا ہے۔ مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس گود کے سوا میرے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ میرا ٹھکانہ یہی ہے۔ بہر حال جب کھلانا پلانا اور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے۔ تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تو تربیت ہے۔ بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو۔ اگر وہ تونگر بنا دے، تو جتنا اس وقت راضی ہو، اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جب وہ ساری نعمتیں چھین کر مفلس بنا دے۔ تب کہا جائے گا کہ یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے جتنی رضا مندی نعمت میں ہو، اگر وہ مصیبت بھیج دے تو اتنی ہی رضا مندی مصیبت میں بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ بندہ کو مصیبت بھیجتا ہے تو کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔

بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے۔ مثلاً بے شمار دولت دے دی، اقتدار دے دیا، لیکن بندے نے اس کو غلط طریق سے استعمال کرنا شروع کیا۔ بجائے اس کے شکر گزاری سے رات دن اپنے پروردگار کے آگے جھکتا اس

نے تعیش میں آ کر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بنالیا۔ تو انصاف اور عقل سے سوچئے کہ تھپڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔؟ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے۔ اس لئے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں۔ حقیقۃً وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی تھی۔ لاؤ اس سے چھین کے بھرلو بلکہ ایک تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ شاید یہ اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آ جائے اور جس برائی کی طرف جارہا ہے۔ پھر توبہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے جس کو قرآن کریم میں ایک موقع پر فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِکَ فَاَخَذْنٰھُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ﴾ ① ''ہم دنیا کی قوموں کو کبھی کبھی مصیبت سے آزماتے ہیں، کبھی کبھی خوف میں مبتلا کرتے ہیں، کبھی دشمنوں کو مسلط کر کے آزماتے ہیں۔ تا کہ یہ دوبارہ تضرع اور زاری کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں ہماری پناہ ڈھونڈیں۔''

بہت سی قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کے جھک جاتی ہیں۔ پھر ان پر مزید انعاموں کی بارش ہوتی ہے لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔ آگے اس کا ذکر کیا ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ ② ''ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب ہماری طرف سے مصیبت بھیجی جائے۔ تو یہ جھک کر تضرع اور زاری اختیار کریں''۔ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں۔ یہ عبرت قبول نہیں کرتے۔ نصیحت کا اثر ان پر نہیں ہوتا۔ اور شیطان نے یہ زندگی ان کے سامنے اتنی آراستہ کر دی ہے کہ اگلی اور دوسری زندگی کا وہم ہی نہیں گزرتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو قبضے کی زندگی ہے۔ اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے۔ اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزین ہو جاتی ہے، اس کی رنگینیوں میں الجھ کے رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ تو جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ وہ چھین بھی سکتا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا بِهٖ﴾ ③

جب نصیحتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور بھلا دیتے ہیں اور جتنی یاددہانی کی گئی سب اکارت جاتی ہے تو ﴿فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ﴾ ④ ہم بھی آزمائش کے لئے ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہر طرف سے دروازے کھل گئے۔ عزت، آبرو، رزق کے، اشیاء اور سامانوں کے، اولاد کے بھی۔ ﴿حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا﴾ ⑤ جب وہ مطمئن ہو گئے کہ اب تو وسائل زندگی قابو میں ہیں۔ اب چھننے والے نہیں ہیں۔ کون ہے جو ہم سے لے لے؟ ﴿فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا﴾ ⑥ مگن اور مطمئن ہو گئے، انجام کو بھلا چکے۔ پھر ﴿اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَةً﴾ ⑦

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۲. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۳. ③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

④ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ⑤ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ⑥ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

⑦ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

اچانک ہم پھر پکڑ کرتے ہیں اور عقاب کا پنجہ آ کر پڑتا ہے۔ ﴿فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ ① اب حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ مصیبت کہاں سے آ گئی؟ اس کا تو وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ یہ آفت کہاں سے آ گئی؟ ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② اس وقت ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیّت الٰہیّہ میں جیسے انعام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لئے ہے۔ جیسے دینا ربوبیّت ہے، چھیننا بھی ربوبیّت ہے۔ تو عبرت ونصیحت دلانے کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے اَفعال پر بھی راضی رہنا چاہئے...... حاصل یہ نکلا کہ بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہے۔ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو۔ اس کے انعام پر بھی راضی ہو اور کبھی سزا یا انتقام لے تو اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لئے کہ نعمت اور مصیبت بھیجنے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے، بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمت پر ہم راضی ہو جائیں اور بھیجی ہوئی مصیبت پر نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضا مندی ہونی چاہئے۔

اس لئے راضی اس بندے کو کہیں گے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں، بلکہ اس کے اَفعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات سے بھی راضی ہو۔ اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی۔ نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ مصیبت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے رضا شروع ہوتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے، لہٰذا ہم بھی اس کے۔ یہ اگر ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان، نہ مصیبت کا دھیان اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں الجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں۔ اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔

ہمارا دہلی کا جو آخری بادشاہ ظفر تھا۔ کچھ بے چارہ صوفی مزاج تھا ہی کچھ مصائب اور آفات نے اسے بنا دیا تھا اور بہترین شاعر بھی تھا۔ اس نے ایک قطعہ اپنے ان مصائب کے وقت کہا تھا۔ بڑی عبرت کی اور بڑی عجیب بات کہی، پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی جو اپنی خرابیوں پر جو نظر ۔۔۔ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

دوسروں کو آدمی اس لئے برا کہتا ہے کہ اپنی برائی اس کی نگاہ میں نہیں ہوتی اور اگر اپنی برائی سامنے آئے تو دوسرے کو معذور سمجھے گا، بلکہ اچھا سمجھے گا۔ کسی عرب کے شاعر نے کہا کہ ؎

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۵.

لعمری إن فی ذنبی لشغلا　　　بنفسی عن ذنوب بنی امیة

خدا کی قسم مجھے اپنے گناہوں کا اتنا شغل ہے کہ مجھے بنی امیہ کے گناہ یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ تو ظفر کہتا ہے کہ

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر　　　رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر　　　تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

اور آگے کہتا کہ

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا　　　گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

اسے آدمی نہ سمجھنا، خواہ کتنا ہی دانا اور دانش مند ہو۔

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی　　　جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی، نعمت میں بھی نہ بھولے مصیبت میں بھی نہ بھولے۔ دنیا میں نعمت بھی آزمائش کیلئے ہے۔ مصیبت بھی آزمائش کے لئے ہے۔ بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے اس لئے رضا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب اللہ کے قائل ہو گئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں۔ اس طرح تو مومن اور غیر مومن دونوں راضی ہیں۔ مومن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افعال سے، اس کی تقدیرات سے اور اللہ اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی۔ اگر وہ نعمت بھیج کر بادشاہ بنادے۔ تو کہے اے اللہ! میں راضی ہوں۔ تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جا کر اس وقت جنگ کرو۔ وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، میں جا کر جنگ کروں گا اور اگر کہے کہ جان دے دو تو بندہ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہم سب مال چھیننا چاہتے ہیں۔ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں۔ اس لئے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے۔ آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہوسکتی آپ غنی عن العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لئے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت ان کو نفع نقصان سے کیا تعلق؟

حدیث میں ہے کہ اگر سارے بندے مل کر اتقی قلب ہو جائیں۔ سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کا قلب ہوتا ہے تو میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر سب کے قلوب شیطان کے قلوب بن جائیں تو میرے ملک میں ذرہ برابر نقصان نہیں کر سکتے۔ اللہ کو نہ نفع کی پرواہ نہ نقصان کی نہ وہ نفع کا محتاج نہ نقصان کا۔ اس لئے جو کچھ بھی ہے بندے کی مصلحت کے لئے ہے اور بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے، اس کو راضیۃ کہا گیا ہے۔ اس حالت میں تو ہمارے پاس آ رہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا۔ ہر حالت اور ہر تقدیر پر راضی رہا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

آدمی صاحبِ نسبت کب ہوتا ہے؟...... حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام نسبت ہے۔ یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں صاحب نسبت بزرگ گزرے ہیں، ارباب نسبت میں سے ہیں۔ اس نسبت کے معنی یہ ہیں کہ بندے کو اللہ سے اتنا قوی تعلق پیدا ہو جائے کہ وہ اللہ سے راضی، اللہ اس سے راضی۔ جانبین سے جب رضا ہوگی تو کہیں گے کہ آدمی صاحبِ نسبت بن گیا۔ جہاں ایک طرف سے رضامندی ہو وہ صاحب نسبت نہیں۔ اللہ بھی راضی ہو جب صاحب نسبت بنے گا۔ جیسے نکاح اس وقت ہوتا ہے کہ عورت بھی راضی ہو۔ مرد کہہ دے کہ صاحب میں تو راضی بس ہو گیا میرا نکاح اور عورت راضی نہیں۔ نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟ جانبین کی رضا شرط ہے۔ جب یہ تعلق مضبوط ہوگا۔ اس سے نیک ثمرات پیدا ہوں گے۔ آگے اولاد ہوگی تو جانبین کی رضا سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔

اس طرح سے حق تعالیٰ شانہ، کے ساتھ جو تعلق ہے وہ جانبین سے ہوگا تب کہا جائے گا یہ بندہ صاحب نسبت ہے کہ یہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی ہے۔ تو بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی اور اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو گیا۔ حتی کہ اگر یہ بندہ کوئی غلطی بھی کر گزرے گا۔ تب بھی ناراض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ منشاء صحیح ہے۔ رضامندی سے کر رہا ہے۔ بھول چوک ہوگئی، کام غلط ہو گیا، اس لئے وہ بھی ناراض نہیں ہوتے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ۔ ”یا رسول اللہ! آپ کی ذات بابرکات عجیب وغریب ہے کہ اللہ میاں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آپ میں خواہش پیدا ہوئی اور پوری ہوئی۔ حق تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور نفس کے تقاضے کے ساتھ ہیں۔“ ①

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس اللہ کی رضا میں اتنا فانی ہے کہ اس نفس سے خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ہوتا ہی نہیں۔ جو ہوگا رضا کے مطابق ہوگا لہٰذا وہ پسندیدہ ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا پاک ہوتا ہے کہ نفسانی خواہش بھی ابھرتی ہے۔ وہ بھی عین حق وصواب ہوتی ہے۔ اگر نبی بیوی کے پاس جانا چاہیں تو وہ خواہش نفسانی کہلاتی ہے۔ مگر نفس اتنا پاک ہے کہ اس میں بھی رضائے خداوندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے ان کو اس میں بھی وہی اجر ملتا ہے جو آپ کو نماز اور روزے میں ملتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا ہر فعل پسندیدہ ہے۔ کیونکہ نفس رضائے حق میں فانی بن چکا ہے۔ تو جو اتنے اللہ سے راضی ہیں کہ اس کی ہر تقدیر پر راضی، تو اللہ ان سے اتنا راضی ہے کہ ان کے ہر فعل پر راضی اور ان کا ہر فعل پسندیدہ۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے: ”**اذا حکم الحاکم ثم اصاب فله اجران واذا حکم فاجتهد ثم أخطا فله اجر واحد**“ ② حاکم خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ صواب کرے گا تو دو اجر ملیں گے۔ خطا کرے گا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ ترجی من تشاء منهن ج: ۴ص: ۴۷۲ رقم: ۴۴۱۴.

② الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب اجر الحاکم ج: ۲۲ ص: ۳۳۵ رقم: ۶۸۰۵.

تو ایک اجر ملے گا تو خطا کرنے پر بھی اجر ملنا حالانکہ غلطی تھی۔ اس لئے کہ یہ اس غلطی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ مسئلہ حق واضح ہو، اتفاق سے پہنچ نہیں سکا۔ تو اس نے جان بوجھ کر غلطی نہیں کی۔ بلکہ عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکی اس واسطے یہ غلطی بھی کرتا ہے تو اسے ایک اجر دیا جاتا ہے۔ تو یہ کس لئے؟ کر تو رہا ہے خطا اور اوپر سے مل رہا ہے ثواب۔ غلطی کر رہا ہے اور ثواب دیا جارہا ہے۔ اس لئے کہ نفس رضاءِ حق میں فانی ہو چکا ہے۔ اس حالت میں غلطی بھی کر جائے گا۔ وہ بھی اس کا ثواب سمجھا جائے گا۔

این خطا از صد صواب اولیٰ تراست

یہ خطا بھی ہمارے صواب سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ فانی فی اللہ اور فانی فی الحق ہے۔

مقام صاحب نسبت...... اس مقام کے بارے میں فرمایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ”دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ“ ① حق ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے جدھر کو حضرت عمر گھومتے ہیں۔ یعنی بظاہر تو یوں فرماتے ہیں کہ جدھر کو حق گھومتا ہے عمر ادھر گھوم جاتے ہیں۔ حق کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہا جارہا ہے کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہ کب کہا گیا؟ جب عمر رضی اللہ عنہ رضائے حق کے اندر اتنے فانی ہو چکے تھے۔ کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضی خداوندی ہوتا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کی رضا خود ڈھونڈتی تھی۔ جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ امور میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے وحی سے مل گئی۔ جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہوگئی۔

حدیث میں ہے کہ ابتداء میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا۔ مجلس میں ازواج مطہرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، بعض منافق بھی شامل ہوتے ہیں، مجھے پسند نہیں آتا کہ ازواج مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں۔

یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہوگئی کہ: ﴿فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ② اور ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ﴾ ③ ”گھروں میں ٹھہری رہو، باہر مت نکلو“۔ جو رائے دی۔ عین اس کے مطابق وحی آئی۔ ④

اس طرح کے متعدد واقعات گزرے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے عرض کی اور وحی آ گئی۔ حدیث میں ہے کہ مقام ابراہیم، حج کرنے والے جانتے ہیں کہ طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے لیا جائے۔ تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور بیچ میں مقام ابراہیم آ جائے طواف کا دوگانہ

---

① رحم اللہ عمر یقول الحق وان کان مر حضرت عمرؓ کی شان میں یہ حدیث آئی ہے بجائے حدیث بالا کے، دیکھئے: جامع الاصول لابن الجزری ج: ۱، ص: ۴۶۶۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۵۳۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۳۔ ④ کنز العمال ج: ۱۳ ص: ۴ رقم: ۳۶۰۸۸۔

واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ پتھر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیر کا نشان بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فضائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''لَوْ كُنَّا نُصَلِّيْ خَلْفَهُ...... '' یا رسول اللہ! کیسا اچھا ہو کہ ہم مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں جس دن یہ کہا، اسی دن شام کو یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى﴾ ① ''مقام ابراہیم کو مصلّٰی بناؤ اور اسے درمیان میں لے کر دوگانہ ادا کرو''۔ ②

اس طرح کی متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو رائے دی وحی بعینہٖ اس طرح سے نازل ہوئی۔ گویا ان کا ضمیر وحیِ خداوندی کا اِتّباع کرتا تھا۔ ادھر ہی چلتا تھا جدھر وحیِ خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ'' ③ اگر میرے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا اور کوئی نبی آتا، تو عمر ضرور نبی بنائے جاتے۔ مناسبت نبوّت سے اتنی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں۔ وحی اس کے مطابق آتی ہے۔ مگر یہ صورت کب ہوئی؟ یہ صورت جب ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفس رضائے خداوندی میں بالکل فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ اس حالت میں نفس میں بھی جو خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ، حق اور مرضی خداوندی ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے۔ حتی کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو۔ اس لئے کہ اس کا منشاء حق کا طلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی نعمت دے جب راضی، مصیبت دے جب راضی۔

اللہ کے ہر فعل پر راضی ہونے کا دنیا میں اِنعام...... حضرت عمران ابن الحصین رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک پھوڑا نکلا وہ ناسور بن گیا۔ کوئی بتیس برس تک اس کا زخم رہا۔ ہر وقت اس میں سے پیپ وغیرہ بہتی اور بتیس برس تک چت لیٹے رہے، کسی ایک جانب کو کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے لیٹے کھانا کھاتے اسی طرح وضو کرنا، اسی طرح نماز پڑھنا۔ اندازہ کیجئے جو شخص بتیس برس تک ایک کروٹ پر چارپائی پر پڑا رہے۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن حضرت عمران ابن الحصین کے چہرے پر وہ بشاشت تھی کہ کسی تندرست وتوانا کے چہرے پر بھی وہ رونق نہ ہو۔ جوان کے چہرے پر تھی۔

لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! تکلیف کا تو یہ عالم برسہا برس گزر گئے آپ اٹھ نہیں سکتے، کروٹ نہیں لے

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵۔ ② کنز العمال ج: ۱۳ ص: ۴ رقم: ۳۶۰۸۸۔

③ السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب فی مناقب عمر، ج: ۱۲ ص: ۱۴۶ رقم: ۳۶۱۹۔

سکتے چت لیٹے ہوئے ہیں۔ پھر اتنے ہشاش بشاش؟ ان دونوں باتوں کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا۔ فرمایا ''تکلیف آئی۔ میں نے رضا کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں راضی ہوں جس حالت میں تو رکھے میں راضی ہوں اس لئے کہ تو میری مصلحت کو جانتا ہے۔ میں اپنی مصلحت کو خود نہیں جانتا میں نے رضا کا اظہار کیا۔ وہ رضا میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ میرے صبر و رضا سے اب یہ کیفیت ہے کہ میں چت لیٹے لیٹے ملائکہ علیہم السلام کی زیارت کرتا ہوں۔ عالم غیب مجھ پر منکشف ہے، عالم مَلکوت مجھ پر روشن ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ یہ تکلیف جائے۔ اتنا میں راضی ہوں۔ تو جو اللہ کے افعال پر اور اس کی تقدیر پر ہر طرح راضی ہو جائے تو اللہ بھی اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ بھی کرے اللہ اس سے راضی اور یہ برا کرے گا ہی نہیں۔ جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔

جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں کہ مسلمان تنگی کی حالت میں تھے اور شام کی طرف رومیوں سے مقابلہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ فرمایا۔ لیکن اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جہاد ہونے والا ہے۔ اس کی یہ فضیلت ہے۔ اس کے لئے چندہ جمع کرو۔ مسلمان غربت کی حالت میں تھے۔ چندہ لا نہیں سکتے تھے۔ امراء میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے سو اونٹ مہیا کر کے ان کی زینیں، چادریں، ہر اونٹ کے مناسب ہتھیار، اس پر توشہ چڑھا ہوا کہ مجاہد بیٹھ کر کیا کھائے گا۔ اس طرح سو اونٹ مکمل لا کر پیش کئے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک کھل گیا اور چمک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج آپ کے چہرے کے اندر دوڑ رہا ہے اور یہ لفظ فرمائے: ''مَاعَلٰی عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْیَوْمِ'' (1) ''آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے۔ اس کے اوپر کوئی وبال نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی برائی اور نا مرضی نہیں ہے۔ جو چاہے کرے''۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ کبیرہ گناہ کر لیں۔ جب بھی اللہ ان سے راضی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نفس اتنا مطمئن بن گیا ہے کہ ان کی نفسانی خواہش بھی پاک ہو گئی۔ جو کریں گے وہ پسندیدۂ الٰہی ہو گا۔ یہ گویا رضا کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی۔

بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں ...... تو انسان کے نفس میں اللہ سے اتنی محبت، تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشاشت کے ساتھ راضی ہو۔ مجبوری کے ساتھ نہیں صبر بشاشت کے ساتھ ہو۔ مجبوری کا صبر سب کو آ جاتا ہے۔ کیسی کے ہاں خدانخواستہ کوئی میت ہو جائے۔ تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آ جاتا ہے مگر صبر وہ ہے جو بروقت ارادے سے کیا جائے۔ جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو۔ اسے صبر کہتے ہیں۔ جیسے ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور بین کر کے رو رہی تھی اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بڑی بی! صبر کر! بڑی بی کو غم میں غصہ آ گیا۔ کہا تمہارے کوئی مر جاتا تب میں جانتی تم صبر کرتے میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ گزر گیا میں کیسے صبر کروں؟ فرمایا اچھا تیری مرضی مت صبر کر۔

(1) السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان ج: ۱۲ ص: ۱۶۱ رقم: ۳۶۳۳.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو گئے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو پریشان ہو گئی اور دوڑی ہوئی پہنچی کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ تھے اور آپ نے صبر کے لئے فرمایا۔ میں اب صبر کرتی ہوں آپ نے ارشاد فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی'' (۱) صبر کا وہ وقت تھا جب صدمہ پڑا ہوا تھا۔ تین دن کے بعد تو سبھی کو صبر آ جاتا ہے۔ یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے اور اختیار سے ہو اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے من جانب اللہ ہے اور اس کے اندر خیر ہی خیر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں در حقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاء الٰہی پر اُخروی و اَبدی انعام...... غرض مومن کو یہ ایک بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ ﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o﴾ (۲) اے نفسِ ''مطمئنہ''! تجھے اللہ کے ہر فعل اور ہر تقدیر پر اطمینان حاصل تھا۔ ''ضرّآء ہو یا سرّآء'' ہو، نعمت ہو یا مصیبت ہو، خوشی ہو یا غمی ہو۔ تو ہر حالت پر اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے۔ تو اے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر طمانیت و بشاشت حاصل ہو گئی۔ اب تو اس حالت میں ﴿اِرْجِعِیْ﴾ ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی راضی، ہم بھی تجھ سے راضی تو نے اپنی عمر رضا میں گزار دی۔

ہم اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے کہ ہم تجھ سے راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گے۔ جب تو اس مقام پر رہے تو ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ (۳) اب تیرا نام میرے بندگان خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔ تو ان میں داخل ہے مطلقاً بندے تو سبھی ہیں۔ کفار و فجار بھی اسی کے بندے ہیں۔ ابلیس بھی اس کا بندہ ہے۔ مگر عبادِ خاص نہیں ہیں۔ جن کو مقرب کہا جائے، جن پر عبد کا اطلاق آئے۔ عبد وہ ہے جس میں عبدیت ہو اور عبدیت مطلقہ۔ عبدیت کے معنی غلامی کے ہیں۔ یعنی اللہ کے سامنے ایسے غلامی ہو کہ جو بھی وہ کہیں بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو۔ ناخوشی کا کوئی سوال نہ پیدا ہوا سے عبدِ مطلق کہتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے تفویض کہا ہے: ﴿اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ (۴) ''ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں''۔

تفویض میں راحت، تجویز میں مصیبت ہے...... جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں۔ واقع یہ ہے کہ بندے کے لئے راحت بشاشت جتنی ہے تفویض کے اندر ہے۔ جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔ خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ یوں ہونا چاہئے۔ ویسا ہوتا نہیں، تو بیٹھ کے گھٹتے ہیں یہ مصیبت ہے۔ اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں کے جو اللہ میاں کر دے کہ بس میں اس پر راضی ہوں. پھر خلاف طبع کوئی چیز پیش ہی نہیں آئے گی جب خلاف طبع نہیں

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، ج: ۵ ص: ۹ رقم: ۱۲۰۳۔

(۲) پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷۔ (۳) پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۹۔

(۴) پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۴۴۔

پھر مصیبت کیا ہوئی۔مصیبت ہے ہی اپنی تجویز اور جب تفویض کردی۔ سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ جو ہوگا خیر ہوگا۔قلب کے اندر گھٹن ہی پیدا نہیں ہوگی۔نعمت آجائے جب بھی راضی، مصیبتیں آجائے جب بھی راضی۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔لوگوں نے کہا، آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہانوں کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں، فرمایا ہاں الحمدللہ۔ میں اسی درجے کا ہوں۔

لوگوں نے کہا، آخر یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے. جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔تو کوئی چیز میرے خلاف طبع دنیا میں ہوتی ہی نہیں۔کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں، الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا، کوئی دنیا سے گزرتا ہے۔میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے نہ ہونا چاہئے۔

جیسے بعض لوگ اخبارات میں کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر لکھ دیا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت سے ہمیں بڑا صدمہ پہنچا۔اس بندہ خدا سے کوئی پوچھے کہ خدا کی طرف سے کوئی چیز بے وقت بھی ہوتی ہے۔بے محل اور بے موقع بھی ہوسکتی ہے؟ یہ بڑی گستاخی کا لفظ ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ آپ سے مشورہ لینا چاہیے تھا کہ کون سا وقت مناسب ہے۔جس میں اس بندے کو موت دی جائے اور پھر موت دی جاتی۔ بڑی جرات کی بات ہے۔موت جب آئے گی اپنے وقت پر آئے گی، مرضی الٰہی سے آئے گی ہم اس معاملہ میں گھسنے والے کون ہیں؟ کسی کی ولادت ہوگی اپنے وقت پر ہوگی۔اس پر کسی کو صدمہ کرنے کا حق کیا ہے؟ ہر حالت میں بندہ کو رضا اپنانی چاہئے۔

تو اس بزرگ نے کہا کہ دونوں جہانوں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں. اس لئے کہ وہ اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔لہٰذا کوئی چیز دنیا میں خلاف طبع ہوتی ہی نہیں۔ یہ درحقیقت ان کی عبدیت کا مقام ہے کہ جو پیش آئے گا وہ من اللہ ہوگا اور جو من اللہ ہوگا وہ خیر ہوگا، وہی مصلحت ہوگا۔اس پر ہم راضی ہیں ہمیں ناراض ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس مقام کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اے نفسِ ''مطمئنہ!'' جب تو نے اپنی زندگی میں نیکی سے، فلاح ورشد سے اپنے نفس میں طمانیت پیدا کر لی اور اللہ کے کسی فعل پر تجھے کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔ جو ادھر سے فعل ہوا، تو نے کہا ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں تو جب تو نے اطمینان کا برتاؤ کیا۔ہم بھی تجھ پر مطمئن ہوگئے جب تو ہم سے راضی، ہم بھی تجھ سے راضی۔

دنیا میں قانونِ مکافات کا عمل جاری ہے......اس لئے کہ دنیا میں اللہ نے قانون مکافات جاری کیا ہوا

ہے۔یعنی اَدل بَدل کا قانون کہ جیسا تم کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہوگا۔ ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ '' ① ''جیسی راہ تم اختیار کرو گے، ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی''۔ بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ﴾ ② ''اگر تم گناہ کرنے سے لوٹ جاؤ گے ہم عذاب دینے سے لوٹ جائیں گے''۔ ﴿اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ ③ ''تم بدی کی طرف لوٹو گے ہم عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے''۔ جیسا تم کرو گے ویسا ہم کریں گے۔ ''مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَآئَہٗ'' ''جو ہم سے ملنا پسند کرتا ہے ہم بھی اس سے ملنا پسند کریں گے''۔ ''مَنْ کَرِہَ لِقَآءَ اللّٰہِ کَرِہَ اللّٰہُ لِقَائَہٗ '' ④ ''جو ہم سے ملنا مکروہ جانتا ہے۔ہم بھی اس سے ملنا مکروہ جانتے ہیں۔ہم بھی اسے نہیں ملیں گے''۔ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ﴾ ⑤ ''تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا'' ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ ⑥ ''تم ہماری یاد کرو گے، ہم تمہاری یاد کریں گے''۔غرض قانون مکافات ہے۔جو برتاؤ بندے کا ہوگا، وہ اللہ کا بندے کے ساتھ ہوگا۔

اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹیں...... اس لئے اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ حق تعالیٰ کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ اللہ کے ساتھ میرا تعلق کیسا ہے۔اس پر قیاس کرلے ویسا ہی ان کا تعلق ہے۔اگر آپ کی طبیعت میں اللہ کی طرف سے بعد ہے تو ادھر سے بھی بعد ہے۔اگر آپ کی طبیعت میں رجحان ہے اور جھک رہے ہیں۔ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہوگی یہ کسوٹی ہے۔ہر شخص پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہے۔وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنے سے قطع نظر کر کے اللہ کے معاملات کو دیکھنا چاہے۔مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔شکایت پیدا ہو جائے گی کوئی برائی آئی اور شکایت پیدا ہوئی کہ یہ کفار سارے رہ گئے تھے مصیبت کے لئے میرا ہی گھر رہ گیا تھا مجھ پر ہی مصیبت بھیجنی تھی۔حالانکہ میں مومن ہوں یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کر رہا ہوں کتنی اطاعت کر رہا ہوں اور اللہ سے کتنا راضی ہوں، تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہوگی، سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔

اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بعد ہو۔غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو اللہ سے دیکھ لے، حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔

فرمایا اس پر دیکھ لو کہ تم اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو۔اگر پڑوسی کو ستاتے ہو، سمجھ لو کہ اللہ میاں کو بھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب وسمیت ام الکتاب، ج:۱۳ ص:۳۸۵.

② پارہ:۹، سورۃ الانفال، الآیۃ:۱۹ . ③ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...... ج:۲۰ ص:۱۶۴ رقم:۶۰۲۶.

⑤ پارہ:۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ:۷. ⑥ پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۵۲.

تم سے بعد ہے۔اس کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہوگا۔اگر تم پڑوسی کے ساتھ انتہائی لطف وکرم کا معاملہ کرتے ہو۔یقیناً امید رکھو کہ ادھر سے لطف وکرم کا برتاؤ ہوگا۔تو کسوٹی بیان کردی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے۔اس لئے اگر آپ خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شام تک آپ کے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آجائے،آپ مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں۔سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی آپ کے ہر فعل سے راضی ہیں اور آپ کو اچھی راہ دے رہے ہیں۔تم اسی راہ پر چلو گے جو ان کی پسندیدہ ہوگی اور اگر آپ ان کی راہ سے ناراض ہیں کہ وہ جو معاملہ کرتے ہیں آپ اس سے اکتاتے ہیں۔وہ آپ کے معاملے سے ناراض ہیں آپ کی عبادت بھی ناپسندیدہ ہوگی۔آپ لاکھ سجدے کریں جب دل میں ناراضگی ہے تو سجدے سے کچھ نہیں ہوتا۔

ایک ملازم اپنے آقا کی خدمت بہت کرتا ہے مگر آقا کے ساتھ اچھا خیال نہیں رکھتا اس کی خدمت آقا کے لئے تکلیف دہ بن جائے گی اور ایک ملازم ہے کہ دل سے محبت کرتا ہے مگر بے وقوف ہے۔رات دن غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔آقا کہتا ہے اسے کچھ نہ کہو یہ میرا اپنا ہے۔غلطی ہوئی تو کیا ہوا بندہ بشر ہے۔غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔اس کی غلطی سے بھی راضی ہیں۔تو اصل چیز قلب کا رخ اور قلب کا معاملہ ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندے! قیامت کے دن اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے زمین وآسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی ہی بڑی رحمت ومغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔بشرطیکہ میری عظمت تیرے قلب کے اندر رہو۔① ہر بندہ دیکھ لے کہ اللہ کی کتنی عظمت اور بڑائی میرے دل میں ہے۔آیا دولت کے مقابلے میں، میں دولت کی عظمت کو جانتا ہوں یا اللہ کی عظمت کو؟ اسے حاجت روا سمجھتا ہوں یا اللہ کو حاجت روا سمجھتا ہوں؟ جب کوئی معاملہ آتا ہے تو پہلے میری نگاہ اسباب کی طرف جاتی ہے یا مسبب لاسباب کی طرف۔اسباب کو محض حکم برداری کے اِتباع کے لئے اختیار کرتا ہوں۔

اس لئے کہ نظر ہماری اسباب پر ہے۔مگر چونکہ ہمارا عقیدہ بھی یہ ہے کہ کرنے والا وہی ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ کرنے دھرنے والے تو اللہ میاں ہیں۔اسباب اختیار کئے جائیں گے۔مگر اطمینان اسباب پر ہے مسبّبُ الاسباب پر نہیں ہے۔اور ایک یہ کہ مسبّبُ الاسباب پر اطمینان ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ اسباب نہ بھی اختیار کریں تب بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔مگر حکمِ الٰہی ہے اس لئے ہم اسباب اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔تابعداری کے لئے اسباب اختیار کرتے ہیں۔اسی ایک کسوٹی سے پتہ چل جائے گا کہ ہم اسباب سے کتنے اور مسبّبُ الاسباب سے کتنے راضی ہیں۔اسی نے اللہ سے معاملہ سمجھ لیجئے کہ ویسا ہی برتاؤ ادھر سے ہوگا۔غرض ''كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ'' ''جیسی آپ راہ اختیار کریں گے ویسی راہ ادھر سے اختیار کی جائے گی''۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم، ج: ۱۲ ص: ۴۵۵ رقم: ۴۶۷۴.

مومن کواللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں......اس کو فرمایا گیا: ﴿اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ﴾ ① اے نفس لوٹ کرآ یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا تھا۔تو دنیا کی چیز نہیں تو آخرت کی چیز ہے۔اب تو نے اپنی رضا واطمینان کا امتحان دے دیا اس لئے مقصد پورا ہو گیا۔اس لئے اب واپس لوٹ کر ہماری طرف آ جا اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔

اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے اسے ''اِرْجِعِيْ'' کہ ''لوٹ کے آ'' کا خطاب نہیں کیا جائے گا تو دنیا کا تھا، دنیا ہی میں رہ۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے ملائکہ اسے لے جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔اس پر نفرین ولعنت کی جاتی ہے۔وہیں سے اس کو پٹخ دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ اس آسمان سے نیچے نیچے جتنا علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے۔گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔حق تعالیٰ نے ایک رسی ٹانگ دی ہے کہ اس کو جو پکڑ لے گا وہ اس قید خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا۔اور وہ رسی کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ ② ''اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو''۔

حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ'' ③ ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے۔جو اس کو تھام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اپنے تک پہنچا دیں گے''۔گویا مومن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا۔وہ جہنم میں موجود ہیں۔جہنم میں ہی رہیں گے۔یہ نہیں ہے کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔وہ اب بھی جہنم میں ہیں۔نکلنے والے نکل جائیں گے جو رہ گئے وہ رہ جائیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مومن کو اس لئے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر لوٹ کر آئے۔کافر کو اس لئے بھیجا ہے کہ تو جا رہا ہے تو اَبدالآباد تک وہیں رہے گا۔اسی کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔اس لئے کافر کو دنیا سے نکلنا نہیں ہے۔مومن کو نکل بھاگنا ہے اس لئے ''اِرْجِعِيْ'' رجوع کرو۔تو پہلے بھیجا گیا ہے۔بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے برائے چند دن بھیجا تھا اب لوٹ آؤ۔

علت رجوع......اور کس حالت میں لوٹ آؤ؟ یہ گویا رجوع کی علت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔جو ہم سے ناراض ہے۔اسے ہم اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸۔

② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

③ کنز العمال ج: ۱ ص: ۱۸۳۔ رقم: ۹۲۴۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۵ ص: ۲۳ رقم: ۲۰۲۴۔

تو ﴿ اِرۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴾ ① اس لئے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی، تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے اس بعد کے عالم میں نہیں ہے۔ جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔ بعینہ یہی جہنم ہے۔ مومن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایمان قبول کر چکا کافر نکلنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

جو بندہ نہیں بننا چاہتا، حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتے ...... اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ﴿ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴾ ② میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگان خاص ہیں۔ انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا جنہوں نے میرا دین نہیں مانا تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

جیسے حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا مقولہ ہے کہ جب انہیں دفن کر دیا گیا تو جیسے حدیث میں ہے کہ دو فرشتے آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں "مَنۡ رَّبُّکِ" تیرا رب کون ہے؟ ان کے پاس بھی منکر نکیر آئے۔ انہوں نے کہا "مَـــنۡ رَّبُّکِ" تیرا پروردگار کون ہے؟ تو رابعہ بصریہ تو ولیہ اور عارف باللہ تھیں۔ انہوں نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ رب سے پوچھو کہ وہ مجھے بندی سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں اسے رب جانتی ہوں یا نہیں اس لئے کہ اگر میں پچاس دفعہ کہوں کہ وہ میرے رب ہیں اور وہ یوں کہہ دیں کہ ہم تجھے بندی بنانا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ تو ان سے پوچھو کہ وہ مجھ کو اپنی بندی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بعد میں مجھ سے پوچھنا۔ وہ فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے کہ جو ہم سے ہی سوال کرنے لگا۔ تو بات وہی ہے کہ بندہ وہی ہے جسے وہ بندہ بنالیں اور جسے وہ کہہ دیں کہ تو ہمارا بندہ ہی نہیں ہے۔ وہ نہ بندہ ہے نہ اس کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تو کافر نے صفائی سے کہہ دیا کہ میں آپ کا بندہ نہیں بننا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا غلام اور مطیع بننا نہیں چاہتا ہوں نہ آپ کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ بھی فرما دیتے ہیں کہ یہ خود ہی اپنا ذمہ دار ہے۔ بے شک اسی عالم میں رہ جس پر تو راضی ہے ہم سے راضی ہوتا، ہماری طرف آتا تو ہم سے بعد پر راضی ہے تو اسی بعد کے عالم میں رہ۔ اور مومن کہتا ہے کہ اٰمنّا باللہ ہم ایمان لے آئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔ اس کو فرماتے ہیں کہ جب تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں۔ پھر وہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اس لئے چلے آؤ۔ اس لئے "اِرۡجِعِیۡ" کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن کر لوٹ کر آ گیا تو ﴿ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴾ ③ میرے عباد میں داخل ہو جا صحیح معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور مستحق ہے اور تو ہی اس قابل

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰.

ہے کہ تو اس مقام کریم وقرب میں پہنچ جائے۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ویسے تو یہ آیت بہت سے علوم پر حاوی ہے۔ اس میں صبح سے شام ہو جائے، پورے نہ ہوں۔ لیکن میں نے موٹے موٹے تین مقصد اختیار کئے ایک واقعہ کے متعلق جو نزع کا پیش آتا ہے۔ ایک بشارت سے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے اس بندہ محتضر کو دی جائے گی کہ ﴿اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً﴾ ① اور تیسرا انعام ہے ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تو میرے بندگان خاص میں داخل ہو جا اور اس مقام قرب میں تجھے داخل کرنے کی نوبت آ گئی جو شہر مطلوب ہے۔ جو ہمارے باپ کو دیا گیا تھا۔ پھر ایک لغزش کی وجہ سے وہ وہاں سے الگ کئے گئے ہم اور تم یہاں پیدا ہوئے وہاں پیدا ہوتے وہیں کے وارث ہو جاتے اور یہاں آ گئے۔ مگر آدم علیہ السلام سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے اندر اس شہر مطلوب کی طلب موجود ہے۔ جہاں سے آپ کو نکالا گیا ہے اب وہاں تک پہنچنے کے لئے اس دنیا کی گھاٹیوں میں سے گزرنا ضروری ہے اور اس کے لئے میں اپنا قانون بھیجوں گا۔ جو اس قانون پر چل پڑے گا اسے واپس بلالیں گے اور جو نہیں چلے گا وہ وہیں رہ جائے گا۔

اس واسطے میں نے یہ آیت پڑھی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا عرض کروں رات میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ کیا عرض کروں۔ جنہوں نے کہا تھا کہ کچھ بیان کرنا چاہیئے میں نے کہا کہ بھئی! میں نے تو مکہ مکرمہ سے لکھا تھا کہ آکر اس مسجد میں نماز پڑھوں گا۔ تقریر کا نہیں کہا تھا۔ میرا مقصد تو صرف ملنا اور ملاقات کرنا ہے۔ وعظ وتقریر کرنا مقصد نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اعلان کر دیا۔ جب اعلان کر دیا میں نے کہا اب کوئی بات تو بتائی جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس پر ہمارے ایک دوست نے کہا اللہ کی رضا کے بارے میں کچھ کہہ دیا جائے کہ اللہ کی رضا اختیار کرنی چاہیئے اس سے کچھ ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا۔ یہ گویا انہی کی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عمل عطا فرمائے اور ہم کو راضی ومرضی بنائے اور اپنے عباد خاص میں داخل فرمائے اور اپنے مقام قرب میں ہمیں پہنچائے اور ہم سب کو اس مقام کریم میں جمع فرمائے۔ آمین

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ."

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸۔

تعارف اہل حق

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ: ...... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَالْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ، اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌ ، بَصِيْرٌ ○ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ، فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ، وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ، وَمِنْهُمْ سَابِقٌ ، بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ، ذٰلِكَ هُوَالْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

کچھ اپنے بارے میں...... بزرگانِ محترم! اس مجمع خیر و برکت میں جس میں بہت سے حضرات کی نورانی شکلیں اسٹیج سے نیچے بھی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں کہ انکے چہرے مہرے سے دین ٹپک رہا ہے۔ دین کی علامتیں نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے باہر تک وہ دین کے دِلدادہ ہیں۔ انہیں حضرات میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں، جو ہم سے کچھ حسنِ ظن نہ رکھتے ہوں، کچھ خیالات کا تفاوت رکھتے ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔ تا کہ اشتباہ باقی نہ رہے اور جسے ہماری بات سننی اور ماننی ہو، بصیرت کے ساتھ مانے اور نہ مانے تو نہ مانے۔ مگر ہم اِشتباہ میں نہ ڈالیں۔

اس سپاسنامے میں یا نظم میں، یا حضرت العلّامہ دام ظلہ کی زبان پر جو چیزیں بطور تعارف کہی گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں میرا تعارف نہیں تھا۔ انہوں نے یہ اپنا تعارف کرایا ہے اس ناکارہ کے لئے اپنی عالی ظرفی، اپنی عالی حوصلگی، اپنی اُولوالعزمی اور اپنی ذرہ نوازی و خودنوازی کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ان کا تعارف تھا۔ میرا تعارف نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔

معیارِ تعارف اہل حق...... لیکن تعارف سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تعارف کا کوئی معیار تو ذکر کیا جائے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جائے کہ یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ ہمارے لئے کوئی کسوٹی ہونی چاہئے۔ جس پر پرکھ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱-۳۲.

کر ہم یہ کہیں کہ فلاں کی بات سچی ہے یا غلط؟ تو پہلی چیز تعارف اور تعارف سے بھی پہلی چیز تعارف اور کسوٹی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی ہے جس میں حق و باطل کا معیار ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ کس کا قولِ حق ہے کس کا قول غلط ہے۔ کون سچی بات کہہ رہا ہے اور کون بات ہی بنا رہا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کے سامنے اس آیت کا ترجمہ کر دوں۔ اس کے بعد پھر اس کی تشریح عرض کر دوں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ ①
''اے پیغمبر! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ کی طرف وحی کی، علم قطعی بھیجا اور اپنی کتاب آپ کے اوپر اتاری''۔ تو اللہ نے جو کتاب کی صورت میں آپ کی طرف جو وحی کی ہے۔ سچی وہی ہے۔ وہ کسی کے حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ لوگ سامنے ہوں یا گرد و پیش میں ہوں ان کو اگر کچھ پرکھنا ہے تو رائے سے نہ پرکھا جائے، محض عقل سے نہ پرکھا جائے۔ بلکہ اس کسوٹی پر پرکھا جائے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ﴿هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ ② یہ ہماری کتاب ہے، جو حق اور سچی ہے اور تمہارے سامنے اور تمہارے گرد و پیش کے حالات کی تصدیق اور تکذیب کا معیار ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ کتاب بھی آ گئی اور پیغمبر بھی آ گئے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں وہ تعلیم دے کر پردہ فرما گئے۔ تو کیا آگے دین ختم ہو گیا؟ اس لئے فرمایا ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے لوگوں کو وارث بنایا کہ جن کو وراثت میں یہ کتاب اللہ ملی اور وراثت میں یہ حق ملا اور جنہوں نے اس حق کو قبول کیا اور وہ بھی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک کا وعدہ دیا کہ وہ آتے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ، یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَ تَاوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ. ④ ہمیشہ سلف کے بعد خلف کھڑے ہوں گے، جو اس علم کو لیتے رہیں گے، جو سلف صالحین لے کر آئے تھے اور اس علم کی روشنی سے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ دروغ بافوں کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کریں گے۔ جاہلانہ اور رکیک تاویلات کا پردہ چاک کریں گے۔ تو قیامت تک یہ دین اصل حالت میں باقی رہے گا اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی کہ: ''اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا '' ⑤ ہر قرن کے بعد جب دوسرا قرن شروع ہوگا۔ تو اللہ ایسے لوگ بھیجے گا، جو دین کی

① پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآیة: ۳۱. ② پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآیة: ۳۱. ③ پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآیة: ۳۲. ④ مشکل الآثار للطحاوی، باب بیان مشکل ماروی یحمل هذا العلم...... ج: ۸، ص: ۳۷۳، رقم: ۳۲۶۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مشکاة المصابیح بالتعلیق للالبانی کتاب العلم ج: ۱ ص: ۵۳. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی القرن المائة، ج: ۱۱ ص: ۳۶۲ رقم: ۳۷۴۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۹۱ رقم: ۴۲۹۱.

تجدید کریں گے، اس کو نکھار دیں گے اور جتنی رکیک تاویلیں تھیں، ان کو کھول کر الگ کر دیں گے اور دین پھر اصل حالت میں آ جائے گا۔ ہر قرن پر ایسے لوگ آئیں گے جن کا نام مجدد ہے۔

قرن کی قید اس لئے لگائی کہ قرن عموماً سو سال کی مدت کو کہتے ہیں اور سو سال میں ایک نسل ختم ہو جاتی ہے۔ اگلی نسل شروع ہوتی ہے نئی نسل آتی ہے تو کچھ نئے نظریات بھی آتے ہیں، نئے افکار پیدا ہوتے ہیں، نئے حوادث اور واقعات سے دنیا دوچار ہوتی ہے۔ اس وقت ممکن تھا کہ نئے نظریات اور نئے افکار کی وجہ سے دین دب جائے یا ختم ہو جائے یا مشتبہ ہو جائے اس لئے اللہ نے ہر قرن پر ایک مجدّد رکھا۔ تاکہ ان نئے نظریات کے اندر دین کو پھر نکھار دے اور انہی نظریات کے مطابق ایسے دلائل کو پیش کرے، کہ دین پھر تازہ تازہ ہو جائے اور نئے افکار کا کوئی اثر دین کے اوپر نہ پڑے تو ہر قرن پر وعدہ دیا۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: ''لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مَّنْ خَذَلَھُمْ وَلَامَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰہِ'' ① ''میری امّت میں ہمیشہ ایک جماعت باقی رہے گی، جو وہی چیز کہے گی جو میں نے کہی، وہی عمل کر کے دکھلائے گی جس نوع کا عمل میں نے کیا ہے۔ انہیں رسوا کرنے والے رسوا نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا اَمر آ جائے اور دنیا ختم ہو جائے''۔ دین اسی رنگ میں باقی رہے گا۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا تو پوری امّت کے لئے وعدہ دیا کہ ایک جماعت حقّہ قائم رہے گی۔ ہر قرن پر وعدہ دیا کہ مجدّد آئیں گے پھر قرن کے اندر وعدہ دیا کہ سلَف کے بعد خلَف آئیں گے، جو علم لیتے رہیں۔ گے اور سلسلہ علم کا منقطع نہیں ہوگا تو فرمایا کہ: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ② نبی کے بعد اور کتاب کامل اتر آنے کے بعد ہم ایسی قوم اور ایسے افراد کو وارث بنائیں گے، جن کو ہم منتخب کریں گے اور پسند کریں گے۔ لوگوں کی رائے پر نہیں ہوگا کہ وہ کہیں یہ مجدد ہیں، یہ معلم ہیں۔ ہم قلوب میں براہ راست ڈالیں گے کہ حق کہنے والے یہ ہیں۔

دین نقلی ہے عقلی اور اِختراعی نہیں ہے...... بہر حال اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ دین نقلی اور روایتی ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ یعنی دین اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ کسی پارٹی یا مجلس کا ریزیویشن نہیں ہے۔ جنہوں نے بیٹھ کر دین بنا لیا ہو، بلکہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آیا ہوا ہے۔ عقلی اختراعات دین کی بنیاد نہیں ہیں۔ نقل و روایت دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے دین کی جب بھی کوئی بات سامنے آئے گی تو پہلا مطالبہ یہ نہیں ہوگا کہ تم عقل سے اس کو کیا سمجھے؟ تم نے اپنے فکر سے کیا جانا؟ اللہ کی وحی کے مقابلے میں ہمارا فکر کیا چیز ہے؟ اور ہماری عقل نارسا کیا ہے کہ اس معیار پر دین کو پرکھا جائے، دین معیار ہے جس پر ہماری عقلوں کو پرکھا جائے گا کہ یہ عقل ناقص

---

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ ج: ۱، ص: ۱۲، رقم: ۱۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۸۷. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیة: ۳۲.

ہے یا کامل، اس میں کھوٹ ہے یا اصلیت تو دین معیار بنے گا، عقل معیار نہیں بنے گی۔ عقل کو دین اور وحی خداوندی کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دین روایتی اور نقلی ہے۔ عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔

نقلی کے معنی یہاں وہ نہیں جو ہماری اردو میں بولے جاتے ہیں۔ اردو میں نقلی اصلی کے مقابلے میں آتا ہے کہ یہ چیز اصل ہے۔ اور یہ چیز نقل ہے۔ اس میں اصلیت ہے اور اس میں ملمع سازی ہے نقلی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ نقلی کے معنی روایت سے منتقل ہونے والی چیز کے ہیں۔ تو دین روایت کے ذریعے سے منتقل ہونے والی چیز ہے۔ عقل کی تجویز سے دین نہیں بنا۔

دین ایک غیبی حقیقت ہے عقل اس کی موجِد نہیں ہوسکتی ...... وجہ اس کی یہ ہے کہ دین "اَلطَّرِیْقُ الْمُوْصِلُ اِلَی اللّٰهِ...... " کا نام ہے، وہ راستہ جو بندے کو اللہ تک پہنچائے، ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کی طرف جائے گا تو راستہ اتنا لمبا اتنا کٹھن ہے کہ جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ یہ اس راستے کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ نے اپنا راستہ خود بتلایا کہ یہ میرا طریق ہے: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ ① یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو اور بعد میں جو عقلی اختراعات سے نئے نئے راستے نکلیں ان کی پیروی مت کرو۔ ورنہ تشتت، پراگندگی اور پارٹی بازی میں پڑ جاؤ گے۔ اصل دین کی تلاش کرو۔ تو "اَلطَّرِیْقُ الْمُوْصِلُ اِلَی اللّٰهِ" جو اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہو۔ اللہ ہی بتائے گا جب اس کی مرضیات معلوم ہوں گی تو خدا کی مرضی عقل سے نہیں سمجھ سکتے اور محض گریبان میں منہ ڈال کر ہم پتہ نہیں چلا سکتے کہ اللہ کس چیز سے راضی ہے اور کس چیز سے نہیں۔

دو حقیقی بھائی ہوں جنہوں نے ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہوں۔ وہ سینہ سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے قلب کی بات دوسرے کے قلب میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہی خود نہ بتائے کہ میرے ضمیر میں یہ بات چھپی ہوئی ہے تو دو انسان ایک نوع، ایک جنس اور ایک اصل کی دو شاخیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے۔ لیکن جب تک ایک ظاہر نہ کرے، دوسرا اس کے باطن کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ تو اللہ ربّ العزّت کے باطن سے جو بات چلی ہے۔ اسے محض دور بیٹھ کر ہم کیسے سمجھ لیں گے؟ جب تک وہ خود نہ ظاہر کرے تو اس کی مرضی و نامرضی کا پتہ اسی کے کلام سے چل سکتا ہے ہماری عقل سے پتہ نہیں چل سکتا۔ عقل زیادہ سے زیادہ اس آگ پانی کے گھروندے میں کام کرے گی محسوسات تک پہنچے گی اور محسوسات تک پہنچتی ہوئی بھی ٹھوکریں کھائے گی جو عقل محسوسات کے دائرے میں بھی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ غیب کی چیزیں کس طرح سے جان لے گی۔ وہ اس کا دائرہ ہی نہیں۔ وہ اپنے دائرہ کی بات کرے گی۔

آپ کی آنکھ ہے، وہ شکلیں اور صورتیں دیکھ سکتی ہے۔ کان ہیں، وہ آواز سن سکتے ہیں۔ زبان ہے جو ذائقے

---

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۳.

چکھ سکتی ہے اور یہ سب چیزیں دو تین انچ کے اندر جمع ہیں۔لیکن آنکھ کے دائرے میں کان قدم نہیں رکھ سکتا کہ کان یوں چاہے، میں صورتیں دیکھ لوں، نہیں ہوسکتا آنکھ چاہے کہ میں آوازیں سن لوں، تو کان کی طرف آنکھ کو رجوع کرنا پڑے گا۔آنکھ صورتیں دیکھنے کے لئے ہے، آوازیں سننے کے لئے نہیں اگر آپ ذائقہ چکھیں گے تو آنکھ لاکھ کوشش کرے کہ میں کھٹا میٹھا سمجھ لوں، نہیں سمجھ سکے گی۔تو اس چہرے میں دو انچ کے فاصلے پر ساری قوتیں جمع ہیں۔مگر ایک قوت دوسری قوت کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتی۔اسی دائرے میں جانا پڑے گا۔اس سے اوپر عقل کا درجہ ہے تو اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں۔تو عقل کی دوڑ صرف محسوسات تک ہے، وہ مغیبات تک نہیں پہنچ سکتی۔وہ علم کی موجد وایجاد کنندہ نہیں ہے.وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے۔کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے۔لیکن خود اصول وجزئیات بنالے یا واقعہ بنادے تو عقل موجد نہیں ہے جو واقعات کی ایجاد کرے۔پیدا شدہ واقعات میں عقل غور کرسکتی ہے، مگر واقعات کو پیدا نہیں کرسکتی۔دین اللہ کی خبر اور حقیقت غیبی ہے۔اسے نہ عقل بناسکتی ہے نہ اس میں اختراع کرسکتی ہے۔اس کا تو اسے ساتھ دینا پڑے گا غلامی کرنی پڑے گی۔

عقل کو مغیبات میں وحی کا اتباع ضروری ہے...... عقل کو اسلام نے بیکار نہیں ٹھہرایا، یہ بہت کارآمد ہے۔اللہ نے عقل کے فضائل بیان کئے اور فرمایا، "اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ" (1) سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا، ''اَقْبِلْ'' سامنے آ، وہ سامنے آ ئی فرمایا، ''اَدْبِرْ'' پشت پھیر اس نے پشت پھیری۔فرمایا: تو ہی ہے جس کے ذریعے سے میں بہت لوگوں کو عزت دوں گا اور بہت کو ذلیل کروں گا۔تو عقل کوئی بے کار چیز نہیں لیکن اپنے ہی دائرے میں کام دے گی۔آنکھ بے کار چیز نہیں۔مگر صورت ہی میں کام دے گی، آوازیں نہیں سنے گی، کان بے کار نہیں ہیں۔مگر خوشبو نہیں سونگھیں گے۔اپنے دائرے میں کام کریں گے۔عقل سے بالاتر جب مغیبات کی چیزیں آئیں گی۔وہاں وحی اور خدا کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ اللہ جو غیب کی چیزیں بتلائے وہ ہم مانیں گے۔آپ کی عقل دنیا کی چیزوں میں اختراعات کرسکتی ہے لیکن یہ پتہ نہیں دے سکتی کہ عرش عظیم کیسا ہے یہ نہیں بتاسکتی کہ کرسی کی شان کیسی ہے۔جس کی قرآن کریم نے خبر دی۔جنت کی نعمتیں کیا ہیں؟ جہنم کے عذاب کی کیا کیفیت ہے۔یہ عقل کا دائرہ ہی نہیں ہے جو لوگ عقل سے اس دائرے کو سمجھنا چاہتے ہیں، وہ ایسے ہیں جیسے آنکھ سے خوشبو سونگھنا چاہیں۔کان سے صورتیں دیکھنا چاہیں۔انکی عقل کے اوپر ماتم کیا جائے گا اس طرح ان کی عقلوں پر بھی ماتم کیا جائے گا جو غیبی چیزوں کے دائرے میں عقل کو لڑائیں جہاں اس کی رسائی نہیں ہے۔اس لئے لامحالہ

---

(1) ذکرهذاالحديث الصغانى فى الموضوعات له،والسخاوى فى الموضوعات و المقاصد الحسنة. وابن الجوزى فى تذكرة الموضوعات واصحاب اُخرفى كتب الموضوعات ولايصح الحديث ولاالرواية به الامع صراحة البيان لوضعه،نعم ذكره الرازى فى تفسيره ولم يذكرقوله. حدیث موضوع (من گھڑت) ہے۔دیکھئے:المقاصد الحسنہ ج: ١ ص: ٧٥، وغیرہ۔

عقل کو غیبی امور میں اِتباع کرنا پڑے گا۔ وہاں اس دائرہ میں رہ کر پھر عقل موشگافیاں کرے گی۔ طرح طرح کے نکتے پیدا کرے گی۔ لیکن مقصد کو پیدا کردے یہ کام عقل کا نہیں۔ یہ تو مقصد معلوم کر کے اس کی تشریح کرے گی۔ اس میں سے نئے نئے علوم پیدا کرے گی۔

قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے علیٰ وجہِ البصیرت ماننے کی دعوت دی ہے...... بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین روایتی اور نقلی چیز ہے۔ جو منقل ہو کر آیا ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی دین کا دعویٰ کرے گا۔ تو سب سے پہلے سند کا مطالبہ کیا جائے گا کہ یہ چیز تم تک کیسے پہنچی؟ کس راستے سے پہنچی؟ روایت کرنے والے کون ہیں؟ ان کا کردار اور کیریکٹر کیا ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اس کے باوجود حق تعالیٰ نے اس کی سند کا اہتمام فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا کلام ہے۔ ہم دباؤ ڈالتے ہیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ بلکہ فنی طور پر اس کی سند بیان کی کہ سند کے ساتھ جب یہ ثابت ہوگا کہ یہ کلام خداوندی ہے، پھر ماننا فرض ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دباؤ سے منوالیں یہ اللہ کا کلام ہے۔ لہٰذا مانو، ہم یہ زور نہیں ڈالتے، ہم فنی طور پر سمجھائیں گے۔ اس قرآن کریم کے اللہ سے آنے تک سند کے دو مرتبے ہیں۔ ایک اللہ سے رسول تک اور ایک پھر رسول سے ہم تک سند کے دو دائرے ہیں، دونوں دائروں میں حق تعالیٰ نے ہماری تسلی فرمائی ہے کہ سندِ متصل کے ساتھ پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ ہمارا کلام ہے پھر ماننے کا فیصلہ کرو۔ محض عقل اور خود رائی سے فیصلہ مت کرو۔

پہلی سند کہ اللہ سے کس نے کلام سنا ہے؟ اور کون ہے جو نبی تک لے کر آیا؟ اس سند کو حق تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا اور تفصیل بھی فنی طور پر کی۔ یعنی راویوں کے جو اوصاف ہیں۔ جن سے ان کی روایت معتبر ہوتی ہے۔ ان کا کردار جس سے بات سچی سمجھی جائے وہ بیان کی یہ نہیں کہا کہ ہمارا کلام ہے۔ تم ماننے کے لئے مجبور ہو۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام بیچ میں واسطہ ہیں۔ جو اُولوالعزم فرشتوں میں سے ہیں۔ سیّد الملائکہ ان کا لقب ہے۔ وہ واسطہ ہیں تو اللہ کا نام امین ہے، جبرئیل علیہ السلام کا لقب امین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی امین ہے۔ تو امین سے کلام چلا، امین کے واسطے سے آیا، امین پر اُترا۔ یہ جو بیچ میں امین ہے۔ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ حق تعالیٰ نے اسے ظاہر فرمایا اور سورۃ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ میں اس کی تفصیل فرمائی۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ (1) جبرئیل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک رسولِ کریم کا قول اور اس کا پڑھایا ہوا ہے۔ تو اوّل تو رسول کا لفظ استعمال کیا کہ جو کلام لے کر آیا، وہ ہمارا قاصد ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سفیر یا قاصد، حکومت اسے بناتی ہے جس پر پورا اعتماد اور اطمینان ہو اس میں بغاوت کی بُو تک نہ ہو۔ حکومت کی ساری پالیسیوں کا دِلدادہ اور ان کا امین ہو۔ اگر گورنمنٹ کو ذرا بھی یہ شبہ ہو جائے کہ جس کو سفیر بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا جا رہا ہے، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے یا اس کے اندر کچھ سرکشی کی خو بو ہے۔ وہ کبھی بھی

(1) پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹.

سفیر نہیں بنایا جائے گا۔ تو اللہ کی گورنمنٹ نے بھی اپنے کلام کے لئے ایسا سفیر و قاصد بنایا، جس کے اوصاف خود حق تعالیٰ بیان فرمارہے ہیں۔ اس سے زیادہ اَمین اور کون ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلا لفظ تو یہ فرمایا کہ یہ کلام رسول کا ہے۔ رسول کے معنی ہی پاکباز کے ہیں۔ قاصد خداوندی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ اس کے اندر سرکشی کی بو نہ ہو، بغاوت کا رنگ ذرہ برابر نہ ہو۔ اس لئے اوّل رسول کہنا، یہ خود ان کی تصدیق اور توثیق ہے۔ جو شخصیت ہمارا قرآن لے کر آئی ہے یہ باوُثوق ہے۔

پھر رسول کے آگے "کَرِیۡمٍ" کا لفظ بھی بولا کہ رسول کرامت اور بزرگی والا ہے۔ دیکھا جائے تو رسول کے لفظ میں ہی ساری بزرگیاں آجاتی ہیں اور جب آگے یہ بھی فرمایا کہ کریم النفس ہے تو دو وصف جمع ہو گئے کہ اللہ کا قاصد اور اپنی ذات سے کریم النفس، اس کے اندر کوئی خدشہ نہیں، بغاوت کی بو نہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص کہے کہ رسول بھی ہو، قاصد بھی ہو، کریم النفس بھی ہو، لیکن دبّو قسم کا ضعیف آدمی ہو، پیام لے کے آیا۔ قوم نے جھر جھرا کے کہا: کیا کہا تو نے؟ اپنی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ڈر کے کہہ دے کہ جی میں یہ نہیں کہہ رہا تھا، تو ہوسکتا ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو رسول تھے اور کریم النفس بھی تھے۔ مگر ضعیف اور دبّو قسم کے آدمی تھے۔ کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کلام کو بدل دیا ہو۔ اس لئے ایک جملہ آگے بڑھایا فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ذِىۡ قُوَّةٍ﴾ ① طاقت ور فرشتہ ہے۔ ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اسے دبالے کوئی اسے دھمکی دے اور جو چاہے کہلوالے تو کریم النفس رسول کا قول ہے جو طاقت ور ہے۔

جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قوم لوط پر جب عذاب خداوندی نازل ہوا تو مجھے امر فرمایا گیا: میں نے ان کی ساری بستیاں ہتھیلی پر اوپر لے جا کر پلٹ دیں اور پوری قوم تباہ ہوگئی۔ یہ اس فرشتے کی طاقت ہے۔ ایسا آدمی دب کر کلام بدل سکتا ہے۔ جس کی یہ طاقت ہو؟ یہ عقلی طور پر بھی ناممکن ہے کہ وہ کسی سے دب کر کلام کہہ دے۔ جیسے بعض لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ نیک تو تھے۔ مگر ضعیف قسم کے تھے۔ انہوں نے آکر کہا کہ بھئی! سچی بات یہ ہے تو دوسرے نے لاٹھی اٹھائی۔ اس نے کہا نہیں نہیں میرا مطلب تو یہ تھا، یہ نہیں تھا جان بچانے کے لئے بات بدل دی۔ تو جبرئیل علیہ السلام ان میں سے نہیں ہیں۔

اس کے بعد ممکن ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، کریم النفس بھی ہیں، طاقت ور بھی ہیں۔ مگر اللہ کا کلام بہت دور سے سنا، معلوم نہیں صحیح سنا ہے یا غلط سنا، کچھ کا کچھ سمجھ گئے ہوں۔ کچھ کی کچھ بات کان میں پڑ گئی ہو۔ تو ایسے راوی کی روایت کا کیا اعتبار، چاہے وہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو۔ مگر دس میل سے بات سن رہا ہے۔ کیا خبر پوری بات کان میں پڑی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹-۲۰.

مَكِيْنٍ﴾ ① ان کا مقام عرش والے کے پاس ہے کہیں دور نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہمارا کلام قریب سے سنتے ہیں، کہیں دور سے نہیں سنتے کہ آواز کے سننے میں فرق پڑ جائے۔ اگر کوئی راوی روایت کرے اور اسے اپنے شیخ سے ملاقات نصیب نہ ہو۔ اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی یا ملاقات ہو مگر دور سے ایک آواز سنی، دس احتمال ہیں کہ صحیح آواز پہنچی یا نہیں پہنچی۔ اس لئے راوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ کے قریب ہوتا کہ پوری طرح سے سن کر آئندہ روایت کر سکے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے مان لیا کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، بہت پارسا ہیں، کریم النفس بھی ہیں، ان پر کریمی برستی ہے، طاقت ور بھی ہیں اور عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں، کہیں دور سے نہیں سنا۔ لیکن ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کا وقار اور حیثیت عرفی کچھ نہیں ہے۔ لوگ اعتماد کیسے کریں؟

اس لئے کہ کلام میں حیثیت عرفی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی بات میں کہوں اور وہی بات آپ کو انگلستان کی ملکہ کہے اس کا اور اثر ہوگا۔ بادشاہ یا وزیر اعظم اگر بات کرے تو عالم کی سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے۔ اس کے معنی نکلتے ہیں، حکومتیں اس سے نتائج مرتب کرتی ہیں وہی کلام میں بولوں، کوئی اثر نہیں کہ ہاں بھئی! اچھی بات ہے ایک نیک آدمی نے کہا ہے۔ ٹھیک کہا ہوگا۔ تو وہی کلام صاحب حیثیت کہے اور وہی کلام بے حیثیت کہے۔ اثرات میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس بنا پر جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی یوں کہے کہ ان کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے۔ اس لئے آگے فرمایا، ﴿مُطَاعٍ﴾ ② وہ "سَيِّدُ الْمَلٰئِكَه" ہیں۔ سارے ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ آسمانوں میں ان کی سرداری مسلّمہ ہے۔ تو سارے ملائکہ جن کی شان یہ ہے کہ ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ ③ اللہ کے پاکیزہ بندے ہیں۔ ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ ④ وہ عمل کرنے کے لئے اللہ کے قول کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ منشاء دیکھتے ہیں کہ منشاءِ خداوندی کیا ہے اور اطاعت میں جھک پڑتے ہیں اور ﴿وَلَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ ⑤ کبھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ جو امر کیا جاتا ہے اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے اضافہ و کمی نہیں کرتے۔ تو سارے ملائکہ کمال امانت و کمال دیانت کے پیکر ہیں۔ ان ملائکہ کے سردار جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ تو اتنے پاکباز بندے کسی کی سرداری کو کیسے مان سکتے تھے جب تک کہ اس کی حیثیت اعلیٰ نہ ہو۔ آپ ذرا سا ایک امیر بنائیں تو اس کی خصوصیت دیکھتے ہیں۔ امیر حکومت اور بادشاہ الگ چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے سلسلے میں دیکھیں کہ کسی کو آپ امام بنائیں گے تو خیال کریں گے کہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت ہونی چاہئے کہ مقتدی اس کی اقتدا

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔

③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۶۔ ④ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۷۔

⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶۔

کرتے ہوئے کراہت نہ کریں۔

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ’’یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ‘‘ ’’امام اسے بناؤ جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو‘‘۔ ’’فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً‘‘ اگر قرآن دانی اور قرآت میں سب برابر ہیں۔ تو ’’فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ‘‘ ① جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے امام بناؤ اور اگر قرآن اور سنت میں سب برابر ہیں، پھر اسے بناؤ جو مسائل صلوٰۃ سے پورا واقف اور کامل العلم ہو۔ حتیٰ کہ لکھتے ہیں اگر اس میں بھی سب برابر ہوں، علم اور اخلاق میں بھی سب یکساں پھر اسے بناؤ جو زیادہ خوبصورت اور حسین وجمیل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اقتدا کرنے والوں میں کوئی گریز اور اعراض پیدا نہ ہو۔ تو جس کو آپ نماز کا امام بنائیں گے، اس میں بھی خصوصیات کا خیال کریں گے۔ اگر آپ کسی کو ملک اور قوم کا امام بنانے لگیں۔ تو اس میں کیا کسی خصوصیت کی رعایت نہیں کی جائے گی؟ سب سے زیادہ رعایت کی جائے گی۔ حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سردار بنایا اور ملائکہ وہ ہیں کہ عفت، عصمت اور پاکدامنی میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اگر جبرئیل علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی۔ ملائکہ ان کی اقتدا نہ کرسکتے یہ اس کی دلیل ہے کہ جبرئیل صاحبِ حیثیت ہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا، مطاعِ وہ واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔ یہ نہیں کہ ایرا غیرا اہم نے اپنا نائب یا سفیر بنا دیا۔ ایسا نہیں، بلکہ تمام آسمانوں میں واجبُ الاطاعت ہیں سیّد الملائکہ ہیں۔ تو اب گویا جبرئیل امین، رسول، کریم النفس، طاقت ور، عرش کے پاس مقیم اور واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔ لیکن اب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں مان لیں۔ مگر بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وصف امانت میں کوئی خرابی ہوتی ہے ان تمام اوصاف کے باوجود یہ کمی ہے کہ رازداری کے اندر کچھ زیادہ کامل نہیں۔ بعض لوگ نیک اور صالح ہوتے ہیں۔ مگر پیٹ ان کا ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ ان سے کوئی رازداری کی بات کہو، وہ چند دن میں دنیا جان لیتی ہے اور راز فاش ہو جاتا ہے، نیکی اور بزرگی میں کلام نہیں۔ مگر پیٹ کا ہلکا ہونا اور چیز ہے۔

جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا حبیبُ الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مجھ سے پہلے مہتمم تھے۔ وفات کے دن چند باتیں بطور وصیت مجھ سے فرمائیں۔ ایک بزرگ کا نام لے کر فرمایا، جو ہمارے استاذوں میں ہیں۔ نہایت، پارسا، متقی اور صالح فرمایا ان کو راز کی بات کبھی مت کہنا۔ اگر راز فاش کرنا ہو، تب تو کہنا اور اگر چھپانا ہو، تو ہرگز مت کہنا تو ساری خوبیاں تھیں۔ مگر پیٹ کے ہلکے تھے۔ جس چیز کا افشاء کرانا ہو۔ بس ان سے کہہ دو۔ اگلے دن وہ سارے بازار میں مشہور۔ وہ ایک ایک کے کان میں ڈال دیتے تھے۔ غرض سارے اوصاف کے باوجود پیٹ کا ہلکا ہونا ہوسکتا ہے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا: ﴿ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ وہ امانت میں بھی کامل ہیں، گھٹیا درجے کے نہیں۔ تو رسول، کریم، واجبُ الاطاعت، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں اور ساتھ ساتھ امانت دار بھی ہیں حتیٰ کہ ان کا لقب ہی جبرئیل امین ہے۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب من احق بالامامة، ج: ۳ص: ۴۲۸ رقم: ۱۰۸۷۔

اب ظاہر بات ہے کہ جب راوی میں یہ اوصاف ہوں کہ رسالت و بزرگی الگ صلاح وتقویٰ الگ اور قربِ خداوندی الگ تو کیا وجہ ہے کہ ان کی روایت کو نہ مانا جائے اور ٹھکرایا جائے۔ اگر پھر بھی کوئی ٹھکرائے۔ اس کے اوپر عقل خود ملامت کرے گی کہ یہ عقلی اصول کے خلاف ہے۔ روایت کے بارے میں روای کے کیریکٹر اور کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ جب کردار صحیح ثابت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت پر اعتبار نہ کیا جائے۔

تو اللہ ربّ العزّت کلام کے نازل کرنے والے اور اللہ کی ذات بے عیب ذات ہے وہاں ادنیٰ نقص و کمی کی گنجائش نہیں۔ مصدرِ خیر و برکت ہے۔ ''اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ'' ① حدیث میں فرمایا گیا کہ اے اللہ! خیر ساری تیری ہے اور تیری ہی طرف لوٹ جانے والی ہے اور شر و برائی تیرے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ حق تعالیٰ شانہٗ جو کلام فرمادیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں کسی قسم کے تامل کی گنجائش ہوتی تو راوی کی وجہ سے ہوتی کہ راوی میں خدانخواستہ کھوٹ ہے تو راوی کے فنی طور پر اوصاف بیان کئے کہ محض ہماری خدائی کی وجہ دبَ کرمت مانو جس کے ذریعے سے روایت کو بھیج رہے ہیں۔ اس کے اوصاف کو فنی طور پر پرکھو۔ کیا وجہ ہے کہ تم اس کی روایت نہ مانو جس کے یہ کامل اوصاف ہیں۔ تو اللہ بھی امین اور واسطہ بھی امین۔

اب آگے پیغمبر ہیں پیغمبر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو معصوم ہو۔ جو ہر برائی سے بری اور بالاتر ہو۔ جو ہر وقت حق تعالیٰ شانہٗ کے اندر فانی ہو۔ ہر وقت رضائے خداوندی کے اندر مستغرق ہو کہ ذرہ برابر شائبہ بھی نہ ہو کہ وہ اللہ کی ناراضگی کو لے سکتے ہیں۔ جن کی شان فرمائی گئی ہے۔ ''کَانَ یَذْکُرُ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِهٖ'' ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت آپ کے قلب مبارک میں یاد، زبان سے ذکر الگ، قلب مبارک سے الگ، روح پر فتوح سے الگ، جسمانی حرکات سے الگ کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت حضوری اور جلال و جمال کا مشاہدہ ہے تو جو دربار خداوندی میں ہر وقت حاضر ہو۔ کیا اس کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ غلط گوئی کرے گا؟ اور غلط گوئی بھی اللہ کے اوپر؟ عقل اس سے گریز کرتی ہے اور نہیں مانتی تو نازل کرنے والا اللہ، کلام کو لے کر آنے والے جبرئیل امین اور جن پر نازل ہوا، وہ پیغمبر اور نہ صرف پیغمبر بلکہ خاتم پیغمبراں، خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نبوّت کے جتنے کمالات ہیں۔ وہ سب اس ذات پر لاکر مکمل کر دیئے گئے۔ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں کہ کسی اور نبی کو لاکر اس درجہ کو پورا کر دیا جائے۔ سارے کمالات، علمی، اخلاقی اور عملی ان سب کا منتہی ایک ذات کو بنا دیا گیا۔

خاتم الدیانت والامانت کی روایت کی تکذیب ممکن نہیں...... اس لئے آپ کا نام خاتم ہے کہ خاتم الرسل اور خاتم الانبیاء ہیں۔ تو خاتم کے معنی یہ نہیں کہ نبوت کو ختم کر دیا اور نبوت قطع ہوگئی۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب الدعاء فی صلاۃ اللیل ج:۴ص:۱۲۹ رقم:۱۲۹۰۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ فی کل حال، ج:۲ ص:۲۹۷ رقم:۵۵۸۔

نبوت کی ایسی تکمیل ہوگئی کہ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے جو آپ کی ذات پرلا کر پورا نہ کردیا گیا ہوتو خاتم کے معنی منتھائے کمالات کے ہیں جس پرآ کر کمالات منتہی ہو جائیں ۔اس لئے خاتم نبوت کے معنی قاطع نبوت کے نہیں ہیں کہ نبوت قطع کر دی بلکہ خاتم کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ ایک ذات کے اوپر تمام مراتب نبوّت کے ختم کر دیئے گئے ۔اب اس کا نور قیامت تک کافی ہے کوئی درجہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نبی کو لاکر اس درجے کو پورا کر دیا جائے ۔ایک ہی آفتاب کا نور ہے۔جو آخر تک جائے گا۔

جب رات میں آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ایک ستارہ نکلا، دوسرا، تیسرا، اربوں کھربوں ستارے نکلے۔سارے ستارے مل کر کتنا ہی نور پھیلائیں۔وہ دن نہیں بنتا رات ہی رہتی ہے لیکن جب آفتاب کی آمد شروع ہوئی۔ابھی نکلا نہیں صبح صادق ہوتی ہے کہ ستارے ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہو گئے اور جب آفتاب نکل آیا تو ایک ستارہ بھی نظر نہیں پڑتا۔اب آفتاب اگر یوں کہے کہ انا خاتم الانوار میں سارے انوار کا ختم کرنے والا ہوں۔تو کیا یہ مطلب ہوگا کہ آفتاب نے نور ختم کر کے اندھیرا پھیلا دیا؟ خاتم کا مطلب یہ ہوگا کہ سارے ستاروں کے جتنے انوار تھے وہ تنہا میری ذات کے اندر جمع ہیں ۔میرے ہوتے ہوئے اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں ہے جب تک میرا دور باقی ہے میں ہی تنہا کافی ہوں۔ چاند مشتری اور زہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی سارے انوار کے پھیلانے کے لئے کافی ہوں۔تو خاتم کے معنی مکمل کے ہیں نہ کہ قاطع کے۔خاتم الانوار کے معنی قاطع الانوار کے نہیں کہ انوار قطع کر کے اندھیرا پھیلا دیا بلکہ تکمیل انوار کے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جو وصف کسی پر ختم ہوتا ہے۔اس سے شروع بھی ہوتا ہے۔وہی فاتح بھی ہوتا ہے، وہی خاتم بھی ہوتا ہے۔مثلاً آپ یوں کہیں کہ آفتاب خاتم ہے۔یعنی سارے انوار اس پر ختم ہو گئے۔تو فاتح انوار بھی وہی ہے کہ اسی کے نور سے ستارے جگمگا رہے ہیں۔سارے فلاسفر لکھتے ہیں کہ چاند اور دوسرے ستاروں میں کوئی ذاتی روشنی نہیں ہے آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، وہ چمک اٹھتے ہیں۔ذات میں اگر روشنی ہے تو آفتاب کے ہے آفتاب اگر خاتم الانوار ہے تو فاتح الانوار بھی ہے۔اس نے نور کی ابتدا کی ہے اسی پرآ کر انتہا ہوگئی۔

آپ یوں کہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خاتم الآباء ہیں۔یعنی آپ بھی باپ ہیں۔آپ کے باپ بھی باپ تھے۔ان کے باپ بھی باپ تھے ایک لمبا سلسلہ ہے تو سب کا باپ ہونا آدم علیہ السلام کے اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔آگے کوئی باپ نہیں نکلتا جو خاتم الاباء ہیں وہی فاتح الاباء بھی ہیں۔وہیں سے باپ ہونے کی رسم چلی ہے؟ اگر وہ نہ ہوتے۔اگلے بھی باپ پیدا نہ ہوتے۔اس لئے جو کسی وصف کا خاتم ہے وہی اس وصف کا فاتح بھی ہوگا۔

آپ یوں کہیں کہ حق تعالیٰ شانہ خاتم الوجود ہیں۔آپ کا وجود میرا وجود، زمین وآسمان کا وجود سارے وجود اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔آگے کوئی نہیں ہے کہ وجود کا سلسلہ چلے، وجود کے سارے مراتب اللہ پر منتہی ہو گئے تو فاتح الوجود بھی وہی ہیں۔وہیں سے وجود چلا جس سے ہم اور آپ موجود ہوئے اگر وہ وجود نہ دیتے۔ہم

آپ کہاں سے موجود کہلاتے؟

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبوّت کہا گیا یعنی وصف نبوّت کے سارے کمالات آپ پر ختم کردیئے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جیسے آپ خاتم ہیں فاتح بھی آپ ہیں۔ نبوّت کی ابتداء بھی آپ سے ہی ہوئی ہے جس کو آپ فرماتے ہیں کہ "اَنَا اَوَّلُھُمْ خَلْقًا وَّاٰخِرُھُمْ بَعْثًا" ① میں سب سے پہلا ہوں بلحاظ تخلیق کے اور سب سے آخری ہوں بلحاظِ بعثت کے کہ میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آپ خاتم النبوّت اور آپ ہی فاتح النبوّت بھی ہیں۔

بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نبوّت کے مراتب ختم کردیئے گئے۔ اس لئے نہ جدید نبی آسکتا ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ کوئی درجہ ہی باقی نہیں کہ نبی کے ذریعے اس کی تکمیل کرائی جائے۔ تنہا آپ کی ذات بابرکات کافی ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ نبوّت کے اوصاف میں امانت، دیانت، راست بازی، سچائی، عفت وعصمت اور پاکدامنی علیٰ وجہ الکمال ہونی چاہئیں۔ تو جب آپ خاتم النبوّت ہیں، تو پھر خاتم الحیاء بھی ہیں کہ حیاء کے مراتب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم الشجاعت بھی ہیں کہ بہادری کے مراتب بھی آپ کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم السخاوت بھی ہیں کہ سخاوت کے سارے مراتب آپ کے اوپر ختم ہیں۔ گویا آپ تمام کمالات پاکیزہ کا منتہی ہیں۔ اس واسطے جب آپ کو خاتم النبوّت کہا گیا تو خاتم الامانات بھی کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر امین بھی کوئی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمن کفار مکہ بھی آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ تو امین کی طرف سے وحی آئے، امین لے کر آئے، امین کے اوپر اتری۔ جب ایک خبر تین امینوں کے بیچ میں ہے تو اس کے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ دنیا ایسی ایسی چیزوں کو مان رہی ہے کہ سند کا بھی پتہ نہیں کہ اللہ سے کب چلی؟ کون لے کر آیا؟ کس نے لکھا؟ کہاں پہنچایا؟ تو جس کی سند اللہ سے لے کر نبی تک متصل ہے۔ اس کو بدرجہ اولیٰ ماننا چاہئے۔ پھر اس کے بعد آگے جو سند چلی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے ایک دو نے قرآن کریم پڑھ لیا۔ لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سینے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک حرف اس کا محفوظ ایک ایک اعراب اس کا گنا ہوا، ایک ایک تشدید، جزم، زبر، زیر اور پیش اس کا گنا ہوا۔ اسی طرح رکوع، سورتیں سب گنی ہوئی ہیں۔

اِمتیازی حفاظت...... اور حفاظت اللہ نے کہاں کرائی؟ محض کاغذ سے نہیں کرائی۔ کاغذ کو سمندر میں ڈال دو، نوشتہ بھی گل جائے گا۔ کاغذ بھی گل جائے گا۔ کاغذ کو زمین میں دفن کردو، زمین کھا جائے گی، کاغذ اور حروف بھی گم ہوجائیں گے۔ محض کاغذ ہو، اس کو دیمک بھی کھا سکتی ہے حروف ختم ہوجائیں گے۔ یہ سب آفات کاغذ اور تختی پر

① علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ البزار ورجالہ موثقون الا ان الربیع بن انس قال عن ابی العالیۃ اوغیرہ فتابعیہ مجھول، دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱ ص: ۷۱-۷۲۔

ممکن تھیں۔اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے ذریعے حفاظت نہیں کرائی بلکہ فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① یہ آیات بیّنات وہ ہیں جو ہم نے اہلِ علم کے سینے میں محفوظ کی ہیں۔تو کاغذ کو دیمک کھا سکتی ہے مگر مومن کے دل کو دیمک نہیں کھا سکتی۔وہاں آگ پہنچ سکتی ہے، یہاں آگ نہیں پہنچ سکتی۔اس کو پانی گلا سکتا ہے۔قلب پر پانی اثر نہیں کر سکتا۔اس لئے قلب کے اندر محفوظ کیا گیا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ۔﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ”ہم نے ہی یہ ذکرِ مبارک اتارا۔ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں“۔پچھلی کتابوں کے بارے میں اللہ نے ذمہ داری نہیں لی تھی بلکہ اقوام کے اوپر ذمہ داری ڈالی تھی۔جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِیْهَا هُدًی وَّنُوْرٌ یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰهِ وَکَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ﴾ ③ تورات ہم نے اتاری۔اَحبار اور رُہبان پیدا کیے۔جن کو تورات سکھلائی گئی: ﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا﴾ اَحبار اور رُہبان کو حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ تمہیں اس کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تم اس کی حفاظت کرو۔تو وہ نہیں کر سکے، اصلیت باقی نہ رہی۔قرآن پاک کے بارے میں یہ نہیں کہا اس لئے کہ یہ آخری کتاب تھی۔اس کے بعد کوئی کتاب نہیں آنے والی تھی۔آخری دین تھا اس کے بعد کوئی دین آنے والا نہیں تھا۔آخری پیغمبر تھے۔کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔اگر اس کی حفاظت ہمارے اور آپ کے سپرد ہوتی تو وہی حشر ہوتا، جو پچھلی امتوں نے اپنی کُتبِ سماویہ کا کیا، قرآن میں ردو بدل بھی ہوتا، محفوظ بھی نہ رہتا۔آخری کتاب کی حفاظت اللہ نے اپنی ذمہ لی ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ④ ہم نے اسے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔اس حفاظت کو اللہ نے واقعی کس عجیب طریق سے پورا کیا۔یعنی عموماً حفظ کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔بڑے آدمی اکثر حفظ نہیں کرتے اور کرتے بھی ہیں تو کچا رہتا ہے۔بچے ایسا محفوظ کرتے ہیں، جو پورا پکا یاد ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اگر بڑے حفظ کیا کرتے، تو کہا جا سکتا تھا کہ بھائی یہ قرآن کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں اس ذمہ داری کو جانتے ہیں۔سمجھ دار، دانا اور عالم ہیں۔قرآن کریم کی حفاظت کر رہے ہیں۔تو حفاظت اللہ کی طرف منسوب نہ ہوتی، لوگوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بڑے علماء اور بوڑھے مشائخ مکتبوں میں بیٹھ کر یاد کر رہے ہیں۔لیکن مکتبوں میں ایک بوڑھا نہیں ملے گا۔پانچ پانچ چھ چھ برس کے بچے ہیں اور دس سال کی عمر میں قرآن کریم محفوظ۔انہیں یہ خبر نہیں کہ یہ قرآن ہے کیا؟ انہیں یہ خبر نہیں کہ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ان کے ذریعے جو حفاظت کرائی جا رہی ہے۔یہ حفاظت خداوندی کہلائے گی۔بچے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت نہیں کر رہے۔اگر بوڑھے

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹. ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.
③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۴. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

کرتے تو حفاظت ان کی طرف منسوب ہوتی۔ بچوں کے ذریعے سے حفاظت کرائی گئی۔ اس واسطے اللہ کی حفاظت کہی جائے گی۔ اور ہر قرن میں لاکھوں کی تعداد میں حافظ موجود رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص عیاذاً باللہ سارے قرآن کریم خرید کر دریا برد کر دے، قرآن مٹ نہیں سکتا ایک دن میں پھر لکھا جائے گا۔ وہ سینوں میں لکھا ہوا ہے۔ لکھے ہوئے سے ہم اپنی یاداشت کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی متشابہ لگ گیا، کوئی غلطی ہوئی حافظ نے لکھا ہوا دیکھ لیا۔ مگر مدارِ حفاظت لکھا ہوا نہیں ہے۔ مدارِ حفاظت اہلِ علم کے سینے ہیں۔

پھر روایت تواتر کی ہے اور تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین تین آدمی بھی روایت کرتے چلے آئیں۔ وہ خبر متواتر کہلاتی ہے۔ یہاں تین تین سو اور تین ہزار نہیں بلکہ ہر دور میں لاکھوں روایت کرتے آرہے ہیں۔ تو لاکھوں کی تعداد میں جب حافظ موجود ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ وہ کلام ختم ہو سکے۔ یا اس کے اندر کوئی ردوبدل ہو سکے۔ بہر حال قرآن کریم کی اس شان سے حفاظت کرائی گئی کہ نازل کرنے والے نے خود حفاظت کی۔

مرادِ خداوندی اپنی رائے اور عقل سے متعیّن نہیں کی جاسکتی...... اب ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم دستورِ اساسی ہے۔ اس میں اصول بیان کر دیئے گئے۔ ساری جزئیات اس میں نہیں بیان کی گئی۔ اصول کلیہ ہیں ان سے جزئیات نکالتے رہو۔ ان کی شرح کرتے رہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث پاک سے آیتوں کی شرح کی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ، مرادِ ربانی یہ ہے تو حدیث درحقیقت مبین ہے۔ اللہ کی مراد کو بیان کرتی ہے۔ محض اپنی رائے سے ہم سمجھ لیں کہ یہ مراد ہوگی۔ یہ ممکن نہیں ہے جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ میری مراد یہ ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے لغت عرب سے الفاظ لئے ہیں۔ ایک لفظ کے لغت میں اور معنی ہیں۔ قرآن نے اس میں دوسرے معنی ڈالے۔ وہ مراد ہوں گے لغوی معنی مراد نہیں ہوں گے مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے دعا کرنے کے معنی ہیں تو آپ گھر بیٹھ کر دعا مانگ لیا کریں بس نماز ہوگئی۔ شریعت نے صلوٰۃ کا لفظ لغت سے لیا اور معنی اس میں اپنے ڈالے اس طرح نیت کرو، اس طرح ہاتھ باندھو، اس طرح رکوع وسجود کرو۔ یہ صلوٰۃ ہے تو صلوٰۃِ لغوی محض دعا مانگنا ہے اور صلوٰۃ شرعی وہ خاص افعال ہیں جو اللہ کے رسول نے بتلائے اگر رسول خود نہ بتلائیں کہ صلوٰۃ سے اللہ کی یہ مراد ہے، وہ مراد نہیں ہے جو تم نے لغت میں پڑھی تو صلوٰۃ کے معنی ہم کیسے سمجھیں گے؟ بس لغت میں جو لکھا ہے، وہ سمجھ لیں گے۔

یا مثلاً حج کے معنی لغت میں قصد کرنے کے ہیں۔ بس گھر بیٹھ کے آپ نے قصد کر لیا اور حاجی ہوگئے۔ یہ ہزاروں روپے خرچ کرنا اور ہوائی جہازوں سے مکہ پہنچنا اور عرفات میں جانا، یہ سب ضائع اور دوراز کار ہو جائے گا۔ شریعت نے جب اس لفظ کو لیا تو اس کے معنی مرادی بیان کئے کہ حج سے مراد ہماری یہ ہے کہ یوں احرام باندھو، طواف کرو، عرفات جاؤ، منیٰ اور مزدلفہ جاؤ، ذبیحہ کرو، اس سارے مجموعہ کو کہا کہ اللہ کی حج کے لفظ سے مراد یہ ہے اگر کوئی شخص محض لغت کے بل بوتے پر قرآن کا حج کرنے لگے اور حدیث کو ترک کر دے۔ جو اس کی شرح اور بیان

ہے تو مرادِ ربانی تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس کی نفسانی مراد ہوگی اور دنیا کو دھوکہ دے گا کہ اللہ نے یہ کہا حالانکہ لفظ اللہ کے لے رہا ہے اور معنی اپنے نفسانی بیان کر رہا ہے۔ یہ تلبیس اور دھوکہ دہی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ کبھی یہ نہیں فرماتے کہ اس آیت کے ایک معنی یہ بن سکتے ہیں، ایک معنی یہ بن سکتے ہیں اور زمانے کے مناسب حال یہ معنی ہیں۔ لہٰذا اللہ کی یہ مراد ہے۔ جس طرح اللہ نے لفظ نازل کئے اللہ ہی نے اس کی مراد اور اس کا علم آپ کے قلبِ مبارک پر اُتارا جس کو آپ نے کھولا۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جب وحی آتی تھی تو آپ رٹنا شروع کر دیتے تھے تاکہ الفاظِ خداوندی میرے سینے میں محفوظ ہو جائیں، کہیں بھول نہ جاؤں۔ حق تعالیٰ نے روکا، فرمایا ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ”اے نبی! اپنی زبان کو حرکت مت دو۔ تم اسی لئے تو جلدی کرتے ہو کہ بھول نہ جاؤں“۔ فرمایا ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ”یہ ہمارا ذمہ ہے کہ تمہارے سینے میں محفوظ کر دیں گے تمہاری زبان سے پڑھوا دیں گے تم اس کی فکر مت کرو“۔

﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ جب ہم قرأت کرنے لگیں، تمہارا کام یہ ہے کہ تم سنتے رہو۔ جمع و محفوظ کر دینا اور زبان سے پڑھوا دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا اللہ جیسے لفظوں کا نازل کرنے والا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح معانی کا بھی ذمہ دار ہے۔ نبی کے قلب کے اوپر معانی بھی خود ہی نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ اگلا جملہ یہ ہے۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ④ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا اور اس کو بیان کر دینا۔ قرأت پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق زبان سے ہے اور بیان کہتے ہیں کھول دینے کو۔ اس کا تعلق سینے اور قلب سے ہے۔ تو لفظ زبان سے پڑھے جائیں گے اور معنی سینے سے سمجھے جائیں گے۔ حق تعالیٰ نے الفاظ کی حفاظت میں جو لفظ استعمال کیا وہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ﴾ کہ ہم پر لازم ہے ہم حفاظت کریں گے۔ وہی لفظ معانی کے لئے بھی استعمال فرمایا کہ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ⑤ ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کرنا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ⑥ ”اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا تاکہ تم کھول کھول کر مخلوق کو سمجھا دو کہ اس لفظ سے اللہ کی یہ مراد ہے، اس لفظ سے یہ مراد ہے“۔ جب مراد وحی سے متعیّن ہوگئی۔ اب اس میں غور و تدبر کرو۔ تو وہ علوم و معارف کھلیں گے جو اللہ کی مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراد کو عقل اور فکر سے متعین نہیں کریں گے مراد علمِ الٰہی اور کلامِ پیغمبر سے متعین کریں گے پھر اس میں عقل سے غور و فکر کریں گے۔ اس میں نئے نئے علوم پیدا ہوں گے۔ وہ

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔
③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔
⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ⑥ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

قرآنی علوم ہوں گے اور اگر مراد ہی عقل سے متعین کرو، وہ نفسانی مراد ہوگی، خدائی مراد نہ ہوگی، لغت کی مراد ہوگی شریعت کی مراد نہیں ہوگی۔ حاصل یہ کہ سنتِ نبوی مرادِ ربانی کو متعین کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے میں بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ کرو، تو یہ نصیحت فرمائی کہ خوارج کے مقابلے میں قرآن سے کوئی دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے پیش کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے امیر المومنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے کہ: ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ'' ① ''اے اللہ! ابن عباس کو کتاب کا علم اور حکمت دے''۔

تو میرا خاص مضمون کتاب اللہ کے علوم ہیں اور انہی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں ان سے دلیل نہ پکڑوں۔ سنت سے دلیل پیش کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ ''اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْہٍ'' ② قرآن کے جملے بلیغ ہیں اور کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر خوارج کے مقابلے میں ایک آیت سے ایک معنی بیان کرو گے۔ وہ اسی آیت سے دوسرے معنی بیان کریں گے اور تم پر حجت قائم کریں گے۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں، وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق و باطل واضح نہیں ہوگا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے مراد متعین کرو گے۔ اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔ مراد متعین ہو جائے گی تو سنت درحقیقت مرادِ ربانی کو متعین کرتی ہے کہ اللہ کے یہ معنی مراد ہیں۔

اور سنت میں بھی اگر عموم ہو تو پھر اس کی مراد مجتہد فقہ سے متعین کرتا ہے جو ائمہ مجتہدین ہیں وہ آیتوں میں غور وفکر اور تدبر کرتے ہیں۔ رات دن ان کا اوڑھنا بچھونا قرآن کی آیتوں میں تفکر و تدبر کرنا ہے اور قرآن میں سے وہ ایسے مسائل نکال لیتے ہیں کہ ہمارا فہم وہاں تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ علم کے درجات ہیں۔ ﴿وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ③ سارے عالم ایک ہی درجے کے نہیں ہوتے بعضے ادنیٰ، بعضے اوسط، بعضے اعلیٰ اور بعضے افضل ہیں۔ جب انبیاء میں بھی درجات قائم ہیں۔ ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ ④ بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ تو علماء تو بعد کی چیز ہیں ان میں بھی تفاضل موجود ہے، بعض ادنیٰ و اوسط درجے کے اور بعض اعلیٰ مرتبے کے۔ تو اعلیٰ مرتبے کے علماء قرآن کریم سے جو اس کے حقائق سمجھیں گے ادنیٰ و اوسط مرتبے کے نہیں سمجھیں گے اور ان سب سے اوپر جن کو اللہ نے ملکہ اجتہاد دیا ہے وہ جو سمجھیں گے، وہ عوام علماء بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب ایک فقہ کا مسئلہ سامنے آ جائے گا کہ واقعی یہ آیت سے نکل رہا ہے تو ہماری بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ اس لئے وہ شریعت سے الگ نہیں ہوتا۔ تو قرآن کریم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کنواں ہو، اس سے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس رضی اللہ عنہما، ج: ۱۲ ص: ۱۰۰ رقم: ۳۴۷۳. ② الدر المنثور ج: ۱ ص: ۱۰. ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۱. ④ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۳.

پانی جاری ہے اور اجتہاد ایسے جیسے ڈول رسی تو آپ ڈول ڈال کر پانی نکالیں گے تو وہ پانی جو ڈول دے رہا ہے۔ وہ کوئی الگ پانی نہیں ہے۔ اس کنویں میں سے نکل کر آیا ہے ڈول اس کے نکالنے کا ذریعے بن گیا۔ اسی طرح امام مجتہد کا اجتہاد قرآن کے مخفی علوم نمایاں کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ قرآن پر کسی خاص قسم کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ زیادتی کمی کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ: ''اَلْقِیَاسُ مُظْھِرٌ لَا مُثْبِتٌ'' ''قیاس کسی مسئلے کو ثابت نہیں، ظاہر کرسکتا ہے، قرآن میں چھپا ہوا تھا قیاس کرنے والے مجتہد نے اسے نکال کر سامنے رکھ دیا''۔ بہرحال اوّل کتابُ اللہ، پھر سنتِ رسول اللہ۔ سنت رسول اللہ کے بعد مجتہد کا اجتہاد ہے۔ اس کے بعد اجماعِ اِمّت ہے۔ تو ہم جس مسئلہ کو بھی دیکھیں گے پہلے قرآن میں تلاش کریں گے، پھر قرآن کی شرح جو حدیث ہے، اس میں تلاش کریں گے۔ پھر اس کی شرح میں جو فقہ ہے، تلاش کریں گے۔ اس کے بعد پھر امّت کا تعامُل دیکھیں گے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم اور ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم کا کیا عمل رہا، اس سے کٹ نہیں سکتے، جہاں ایک طرف علمی دائرہ ہے۔ وہ محض لفظوں تک محدود ہے لیکن اس کے ساتھ ایک عملی دائرہ ہے کہ تمام سلفِ صالح اجماع کر چکے ہیں اور وہ ایک ہی چیز سمجھتے آرہے ہیں۔ تو تعامل اور عمل امت کو معتبر سمجھا جائے گا اور امت کے عمل کا مطلب زید، عمرو، بکر اور میرا تمہارا عمل نہیں۔ ان علماء ربانی اور صلحاء و مشائخ حقانی کا عمل ہے۔ جنہوں نے قرآن وحدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ علیہ، تبع تابعین رحمہم اللہ علیہ، مجتہدین رحمہم اللہ علیہ، محدّثین رحمہم اللہ علیہ وفقہاء رحمہم اللہ علیہ ہیں۔ یہ اجماع کریں اور عمل کا راستہ ڈال دیں تو یقیناً اس عمل کا ماخذ کتاب وسنت میں ہے اور غور کرتے ہیں تو وہ ماخذ نکل آتا ہے یہ نہیں کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔

مسائل دینیہ میں مطالبہ سند اس امّت کا ذوق ہے...... بہرحال اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ادھر تو قرآن کی سندِ متواتر، ادھر حدیث کی سندِ متواتر۔ یعنی کلام رسول کی اس امت نے وہ حفاظت کی ہے کہ دوسری قومیں اپنے کلام خداوندی کی وہ حفاظت نہیں کرسکیں۔ حدیث کا ایک ایک لفظ اور راویوں کی پوری سند علماء بیان کرتے ہیں۔ ''حَدَّثَنَا فُلَانٌ'' مجھ سے فلاں، اور فلاں نے اس سے، اس نے اس سے اور اس سے فلاں نے بیان کیا۔ یہاں تک کہ سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے جملے کے لئے بھی یہی طریق کار ہے۔ تو ایک ایک حدیث کی سند محفوظ حتی کہ مسلمانوں نے پچاس ہزار راویانِ حدیث کا کیریکٹر اور تاریخ مرتب کر دی اور ایک فن بنا دیا۔ جس کو فن اسماء الرّجال کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے نام اور کردار و کیریکٹر جو حدیث کے راوی ہیں ان کا حافظہ ایسا تھا۔ تقویٰ ایسا تھا، خاندانی نسبت ایسی تھی تو ایک ایک چیز لکھی اور اسے تاریخ کا جز بنا دیا۔

تو جب قرآن کی سند متواتر، کوئی حدیث سند سے خالی نہیں، پھر فقہ میں بھی یہی صورت ہے۔ یعنی اس امت کی عادت یہ پڑ گئی کہ بے سند کے کوئی چیز نہ مانے مثلاً ''الھدایۃ'' (جو فقہ کی مستند اور مشہور زمانہ کتاب ہے۔

ایک عرصہ سے داخل درسِ نظامی ہے) اس کی سند دی جاتی ہے کہ ہدایہ کی روایت مصنف ہدایہ سے کس نے کی اور اس سے کس نے اور اس سے کس نے روایت کی ہے؟ ہماری سند صاحبِ ہدایہ تک متصل ہے۔ حتیٰ کہ تصوّف میں جو محققین صوفیاء ہیں۔ انہوں نے کتابیں لکھیں تو تصوف کے مسائل میں بھی اسی طرح سند بیان کرتے ہیں جس طرح سے حدیث کی سند بیان ہوتی ہے۔ کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا، ان سے جنید نے اور ان سے شبلی نے بیان کیا، وہ بھی سند سے پیش کرتے ہیں۔ تو اس امت کا گویا ذوق ہی قرآن نے یہ بنا دیا کہ بے سند کسی چیز کو جو دین کے بارے میں ہو مت قبول کرو۔ آج بھی اگر کوئی دین کا مسئلہ پیش کرے گا۔ پہلا مطالبہ یہ ہوگا کہ بھئی! قرآن و حدیث فقہ اور تعامل اِمّت میں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ علیہ کا عمل اس پر تھا؟ ان میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو بات رد کر دی جائے گی ان سب میں موجود ہوگا تو کہیں گے کہ سر آنکھوں پر، ضرور قبول ہے۔

سندِ صحیح سے کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اِتّباع فرض ہے...... اس سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ جو لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور امت کے اکابر کی سند تک کے محتاج ہیں اور ایک ایک جز میں کہتے ہیں کہ ان کی سند لاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ ان کی سب سے پہلی محبت تو اللہ سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت ائمہ مجتہدین سے قائم ہے۔ ان کے بعد علماء ربانی اور مشائخ حقانی سے قائم ہے۔ محبت سے ہی یہ سارا سلسلہ چلتا ہے۔ اگر ائمہ محبوب نہ ہوتے تو ایک ایک جزئی میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اگر مشائخ طریقت محبوب نہ ہوتے۔

تو ان کی کسی بات کی یہ روایت نہ کرتے۔ حالانکہ اسے سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ اگر ائمہ مجتہدین محبوب نہ ہوتے، ان کا اجتہاد کبھی نہ قبول کرتے۔ تو اللہ سے الگ محبت، رسول سے الگ محبت، ائمہ، مجتہدین سے الگ محبت، فقہاء امت اور مشائخ طریقت سے الگ محبت۔ یہ تو سب کی محبت میں گرفتار ہو کے عاشقِ کل ہیں۔ انہیں کوئی یوں کہے کہ ان کے دلوں میں بزرگوں سے محبت ہے ہی نہیں۔ اس سے سے زیادہ دھوکہ دینے والا کون ہے؟ یہ تو اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ تو علماء، مجتہدین اور فقہاء تک محبت رکھتے ہیں، مشائخ طریقت سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کی بات کی بھی سند لاتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا، حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا: یہ ہمارے مقتدا ہیں۔ سند سے ایک بات ثابت ہوتی، ہم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں تو تصوّف، حدیث، تفسیر سب ان کے سر آنکھوں پر، سب کی محبت کے اسیر ہیں اور یہ سب کے عشاق اور سب کی محبت میں غرق ہیں۔ بہر حال سب سے پہلا مطالبہ سند کا ہوگا اور سند کے بعد جو درجہ رہ جاتا ہے وہ اِتباع کا ہے۔ تو جب سند صحیح سے ایک مسئلہ ثابت ہو جائے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی اِتباع کریں۔ اب خود رائی یہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔ دین میں رائے زنی یا کسی مسئلہ کو رائے سے بنانا، یہ کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ

یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ ① ''کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ و رسول کا حکم آ جانے کے بعد وہ اس کے اندر اپنی رائے زنی کرے''۔ اس کا اختیار حکمِ خداوندی آ جانے کے بعد سلب ہو جاتا ہے۔ نہ اس کا ارادہ باقی نہ اختیار باقی، اگر ہے تو اِتباع باقی ہے کہ پیروی کرو کہ جس اللہ سے ایک چیز ثابت ہو گئی۔ تو اب اس میں رائے کی گنجائش نہیں اور فقہ و تعاملِ اِمّت سے ثابت ہو گئی اب اس میں بھی رائے زنی اور ٹال مٹول کرنے کی گنجائش نہیں۔ اب صرف عمل کرنا ہے تو قانون شریعت عمل کے لئے ہے، تجویز کے لئے نہیں ہے۔ تجویز تو اللہ پاک کر چکا۔ ہمارا کام تجویز نہیں بلکہ تفویض ہے کہ اپنے کو سونپ دیں اور حوالے کر دیں کہ جو اللہ نے کہا وہ میرے سر آنکھوں پر ہے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی نجات ہے اور اسی میں گروہ بندی اور پارٹی سازی قطع ہوتی ہے۔ پارٹی بندی کبھی نقل، سے نہیں عقل کے گھوڑے دوڑانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیشہ تخیلات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر نص صریح نص فقہ، یا نص حدیث موجود ہے یا امّت کا تعامل موجود ہے تو اختلاف کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہتی۔

رائے زنی کبھی غلو محبت سے ہوتی ہے کہ کسی بزرگ سے بے حد محبت ہے۔ اس کا کوئی فعل دیکھا۔ اسے قانون کی صورت میں پیش کر دیا کسی سے عداوت ہے، اس کا کوئی قول دیکھا اسے رد کر دیا تو رد و قبول بعض دفعہ غلو محبت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ غلو عداوت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بدفہمی اور بعض دفعہ بدنیتی سے ہوتا ہے کہ نیت ہی خراب ہے کہ دین میں رخنہ ہی ڈالنا مقصود ہے۔ لیکن جب نصِ صریح آ گئی یہ ساری چیزیں قطع ہو جاتی ہیں۔ خیال آرائی کا دین میں کوئی تعلق نہیں، وہ منتقل دولت ہے جو آئی ہے، ہمارا کام اس کے سامنے گردن جھکانا ہے۔

بہر حال یہ معیار ٹھہرا، میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں تو کوئی چیز نہیں، لاشی محض ہوں۔ نہ کوئی عالم نہ فاضل، علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے والا ہوں۔ مگر علماء سے ایک نسبت ہے ان کا ایک ڈھنگ دیکھا ہے۔ یہ جو اکابر دیو بند کہلاتے ہیں۔ ان کا یہی ڈھنگ ہے کہ ہر مسئلہ میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ، فقہ حنفی، یا جس فقہ کا تابع ہے۔ فقہ حنبلی یا شافعی، اس کے بعد تعامل امّت اور امّت کا ذوق کہ کس ذوق پر امّت چل رہی ہے کس ذوق پر سلَفِ صالحین چلے ہیں۔ ان سب کو لے کر ایک مسلک بنتا ہے۔ جس میں قرآن بھی داخل، حدیث، فقہ، تصوّف، طریقت و شریعت بھی داخل ہے۔ ساری چیزوں کا مجموعہ ہے، اس کا اِتباع ہو۔ تو میں تو نہ کوئی عالم، نہ فاضل، دارالعلوم دیو بند کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ مگر ان بزرگوں سے نسبت حاصل ہے۔ ذرے کو بھی آفتاب سے نسبت حاصل ہوتی ہے۔ ذرہ چھوٹی اور حقیر چیز ہے۔ مگر جب آفتاب روشنی ڈالتا ہے۔ ایسے چمکنے لگتا ہے جیسے ہیرا۔ حالانکہ وہ چمک اس میں نہیں۔ وہ چمک آفتاب کی ہے۔ ایک نسبت آفتاب سے قائم ہو گئی جس سے وہ چمک رہا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ ان حضرات نے سپاسنامے میں جو تعارف کرایا۔ وہ میرا تعارف ہی نہیں تھا۔ وہ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم ایسے عالی حوصلہ ہیں کہ خوردوں کو بڑھا سکتے ہیں، اپنے چھوٹوں کو

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶.

عزّت دے سکتے ہیں۔اپنے علوحوصلہ اور عالی ظرفی کا تعارف کرایا۔میرا تعارف صرف یہ ہے کہ میں لاشی محض ہوں مگرایک نسبت رکھتا ہوں ؎

گرچہ خوردیم نسبتی است بزرگ ذرّۂ آفتا بے تابا نیم

ہم اگرچہ حقیر وذلیل ہیں۔مگرنسبت بڑی ہے۔جن بزرگوں سے وابستہ ہیں۔وہ بے شک بڑے تھے۔ان کی وجہ سے کوئی ہمارا نام بھی لے لیتا ہے،ہمیں پوچھ لیتا ہے۔ورنہ ہم میں کیا رکھا ہے۔اصل چیز ہمارے سامنے کتابُ اللہ،سنت رسول اللہ،تعامل امّت ،فقہ اسلامی اور اکابرِ طریقت وشریعت کی محبت اوران کی عظمت ، یہ چیزیں ہیں جن پر فی الحقیقت دین کامدار ہے۔

ادب وعظمت دین کی بنیاد ہے......دین کی بنیاد ادب پر قائم ہے۔بے ادبی اور گستاخی پر قائم نہیں ہے ؎

بے ادب محروم ماند از فضل ربّ

جو جسارت اور بے با کی برتے گا،وہ آخرت سے کبھی حصہ نہیں پائے گا۔کبھی اللہ والوں کا اعتماد نہیں پائے گا۔جیسے قرآن کریم نے فرمایا:﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ﴾ ① ’’اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں بیٹھ کر نبی کی آواز سے اپنی آواز بلندمت کرو۔کہیں ایسا نہ ہواس جرأت وگستاخی کی وجہ سے تمہارے سارے عمل ضائع کردیئے جائیں‘‘۔

یہ رسول کا ادب بتلایا۔قرآن کریم کا ادب بتلایا﴿لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ﴾ قرآن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ جب کہ تم باوضو اور پاک نہ ہو۔مساجد اللہ کا ادب بتلایا کہ جب مساجد میں آؤ،ادب کے ساتھ آؤ:’’لَا تَاْتُوْھَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاْتُوْھَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ‘‘﴾ ② مسجد میں دوڑے ہوئے مت آؤ۔جیسے بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔یہ سبک حرکتی ہے۔متانت،وقار اور سکون کے ساتھ آؤ۔نیز فرمایا گیا،مساجد کے اندر دنیا کے جھگڑے اور باتیں مت کرو۔ذکر اللہ کرو،نماز میں مشغول ہوجاؤ،درود شریف پڑھو یا تلاوت کرو۔جو جھگڑے گھروں میں چھوڑ کے آئے تھے،انہیں مسجد میں بھی لے آئے۔یہ مسجد کا احترام ہوا یا بے احترامی؟جس کو فرمایا گیا﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ط اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ بدنصیب،بدقسمت اور ظالم کون ہے؟ جو اللہ کی مسجدوں کو ڈھادے۔مسجد کی ایک صورت ہے۔ایک حقیقت ہے۔صورت اینٹیں ہیں۔انہیں کوئی ڈھادے،یہ بھی مسجد کا ڈھانا ہے۔ایک یہ کہ اینٹیں تو نہیں ڈھاتا۔مگر دنیا کی باتیں اور لغو شغل اتنے زور سے کرتا ہے کہ ذکر اللہ

① پارہ:۲۶،سورۃالحجرات،الآیۃ:۲.

② روح المعانی،سورۃ الجمعۃ،ج:۲۱ص:۹.

③ پارۃ:۱،سورۃالبقرۃ،الآیۃ:۱۱۴.

کرنے والوں کے ذکر کرنے میں خلل پڑ رہا ہے۔نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والوں کی نماز وتلاوت میں خلل پڑ رہا ہے۔اس کو بھی فقہاء نے منع لکھا ہے۔ بلکہ تلاوت بھی اتنے زور سے مت کرو کہ دوسرے کے ذکر میں خلل پڑے۔ یہ مسجد کی حقیقت کو ڈھانا ہے۔اس لئے کہ مسجد کی حقیقت ذکراللہ ہے۔ جب تم ذکراللہ میں آڑے آ گئے اور دوسرے کو روک دیا تو مسجد کی صورت نہیں ڈھائی مگر حقیقت تم نے ڈھادی۔

یعنی روایات میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی غیر ضروری باتیں کرنا ایسا ہے جیسے مسجد میں خنزیر ذبح کر دیا۔یعنی مسجد کو آلودہ اور گندہ کر دیا۔اس لئے مسجد، بیت اللہ، حرم محترم، اولیاء اللہ، انبیاء اللہ اور کتب اللہ، ان سب کا ادب بتلایا۔سارے دین کی بنیاد ادب وعظمت کے اوپر قائم ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ جن کا ذکر ابھی آپ نے سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ہمارا یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور حضرت خواجہ صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہما سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ان حضرات کے اوپر چشتیت غالب ہے۔گو تربیت قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ طریق پر بھی کرتے ہیں ان کے اذکار بھی بتلاتے ہیں اور جس کی جیسی مناسبت دیکھتے ہیں۔ویسی ہی اس کی تربیت کرتے ہیں۔تو چاروں سلسلے ان کے پاس ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر سال دو سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتے۔تو رُڑکی سے نہر کی پٹڑی پر کنارے کنارے کلیر شریف کو راستہ جاتا ہے۔وہاں سے کوئی پانچ چھ میل ہے۔حضرت جب نہر کی پٹڑی پر پہنچتے، جوتے اٹھا کر بغل میں داب لیتے۔پانچ میل ننگے پیر طے کرتے تھے۔یہ کیا چیز تھی؟ مشائخ طریقت کا ادب کہ جن کی جوتیوں کے صدقے ہم نے اخلاق سیکھے، جن کی بدولت ہمارے نفوس پاک ہوئے۔ان کے احسان کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟ کس طرح انہیں سر پر نہ بٹھلائیں۔ اس لئے پانچ میل کی مسافت ننگے پاؤں طے کرتے۔

حضرت مولانا جب حج کو گئے ہیں تو یہ وہ قافلہ ہے جس میں بڑے بڑے بزرگ تھے۔حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہ صاحب وغیرہ۔یہ سارے حضرات ایک ساتھ گئے تھے۔مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) جب قریب آتا ہے تو بیر علی ایک منزل ہے۔اس پر جب اونٹ چڑھتے ہیں تو چڑھتے ہی حرم شریف کے مینارے نظر پڑتے ہیں۔اب موٹروں کی سواریاں ہیں۔اس زمانے میں اونٹوں کی سواریاں ہوتی تھیں۔یہ سب حضرات اونٹوں پر روانہ ہوئے۔مکہ سے گیارہویں دن مدینے پہنچتے تھے۔ گیارہ راتیں راستے میں لگ جاتی تھیں۔ یہ قافلہ جب ''بیر علی'' پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سواری سے ایک دم اچھل کر نیچے کود دے اور ننگے پیر چلنا شروع کیا حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی نوکیلی ہیں کہ ایسی چبھتی ہیں جیسے سوئیاں چبھتی ہیں۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہاں

چل سکے۔ حضرت کی دیکھا دیکھی سینکڑوں آدمی نیچے کود گئے کہ ہم بھی پیدل چلیں گے۔ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بے وقوفی نہیں ہے؟ ان پر تو محبت نبوی کا حال غالب ہے۔ انہیں نہ کانٹوں کی پرواہ نہ چبھن کی پرواہ۔ یہ نقل اُتار رہے ہیں، یہ کہاں تک چلیں گے؟۔ چنانچہ کوئی سو قدم، کوئی ڈیڑھ سو قدم چلا، پھر اونٹ پر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا جیسے بالکل محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ربودہ اور غرق ہوتے ہیں۔ اسی حالت میں پیر لہولہان ہوگئے اور انہیں کچھ پتہ نہیں وہ جارہے ہیں۔ تو ادب کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف کے منارے دیکھ کر یہ جرات نہیں ہوئی کہ اونٹ پر بیٹھیں۔ ننگے پیر کنکریوں میں چلے جس سے معلوم ہوتا ہے ان حضرات کے دلوں میں شریعت کا ادب کتنا غالب تھا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ جو اس پوری جماعت کے شیخ طریقت ہیں۔ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار کے بعد مکہ مکرّمہ میں ہجرت فرمائی لوگوں نے دیکھا کہ سیاہ جوتا نہیں پہنتے پہلے تو اتفاقی بات سمجھے مگر جب کوئی لے کے آیا، اسے رد کردیا۔ سرخ یا زرد رنگ کا پہنتے۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ ارادی فعل ہے، اتفاقی نہیں ہے۔ حضرت سے عرض کیا، حضرت کیا سیاہ جوتا ممنوع ہے۔ فرمایا نہیں۔ آپ کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا ادب کے خلاف ہے۔ جو رنگ بیت اللہ کے غلاف کا ہے میں اسے پیروں میں ڈالوں؟ شرعاً سیاہ جوتا پہننا ممنوع نہیں۔ مگر جب ادب غالب ہوتا ہے، آدمی قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرتا ہے۔

ادب میں قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا یہ خود قانون نہیں...... مگر یہ سمجھ لیجئے کہ قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا۔ یہ خود قانون نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں۔ تم بھی سیاہ جوتا پہننا چھوڑ دو، تم بھی ننگے پیر چلا کرو۔ یہ ایک شخص کا حال ہے اگر وہ حال آپ میں پیدا ہو جائے۔ آپ یہ کام ضرور کریں گے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر نقالی کریں گے پھر پیغمبر کی نقل اصل ہے۔ لوگوں کی نقل اصل نہیں ہے۔ صاحب حال کا مقام اور نقال کا اور نقل کرنے والے سے کہا جائے گا کہ تو فلاں کی نقل مت کر، قانون شریعت کی نقل کر، سب کے لئے جو عام حجت ہے، وہ قانون شریعت ہے طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ وہ قانون نہیں ہوتے کہ دنیا کو پابند کیا جائے، طریقت کے اوراد بتائے جائیں گے اور ادا کرتے کرتے کوئی حال تک پہنچ گیا۔ اس کے لئے مبارک ہو پھر وہ اس حال کے مطابق عمل کرے گا۔ کسی کو ملامت کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن قانون بہرحال نہیں بنے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دے۔ منصور رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب ہوا اور غلبہ حال میں کہا کہ ''انا الحق''۔ میں حق ہوں یہ مطلب نہیں تھا کہ خدائی کا دعویٰ کررہے تھے۔ انا الحق کا یہ مطلب ہے کہ حق ہی حق موجود ہے۔ میں اپنے اندر دیکھتا ہوں، حق ہی کا جلوہ پاتا ہوں۔ خود میری ذات کوئی چیز نہیں جگہ جگہ حق ہی نظر آتا ہے۔ تو ''انا الحق'' کے معنی یہ لئے کہ حق کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ اپنی ہستی گم ہوگئی۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے آپ آفتاب کو دو منٹ ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اب جو نگاہ ہٹائیں گے

جدھر نظر پڑے گی، آفتاب کی ٹکیا سبز، سرخ اور سیاہ رنگ کی نظر پڑے گی۔ ساری چیزیں اوجھل ہو جائیں گی۔ آفتاب ہی آفتاب نظر آئے گا حتی کہ آپ اپنے آپ کو دیکھیں، وہاں بھی آفتاب ہی نظر آئے گا۔ ایسے میں اگر کوئی یوں کہہ دے کہ میں آفتاب ہوں تو یہ مطلب نہیں کہ میں آفتاب بن گیا۔ بلکہ یہ کہ آفتاب میرے اوپر اتنا غالب آ گیا کہ آفتاب کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تو منصور پر فنائیت کا غلبہ ہوا۔ حق تعالیٰ شانہ کی تجلیات اور انوار اتنے غالب ہوئے کہ اپنے اندر دیکھتے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا تھا ادھر ادھر دیکھتے تھے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا۔ بہر حال منصور کا ایک حال تھا جو انہوں نے ''انا الحق'' کہا۔ کیا یہ قانون ہے کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں کہ تم بھی ''انا الحق'' کہا کرو۔ اگر لوگ کہیں گے تو انہیں پھانسی دی جائے گی قابل گردن زنی ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ منصور نے کہا، ہم کہیں گے۔ منصور کا حال بھی تو پیدا کرو۔ جب حال پیدا ہوگا۔ تم خود بخود اس کو انجام دو گے۔ بلا حال نقل کرو گے تو قانون شریعت کی نقل لازمی رہے گی۔ شخصی حالات قانون نہیں ہوتے۔

مثلاً اگر کوئی بزرگ بیمار ہوا اور اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ بیٹھ کر نماز پڑھ لی۔ مریدین معتقد تھے۔ انہوں نے سب کو جا کر کہا کہ شیخ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے لہذا سب بیٹھ کر پڑھا کرو۔ سب نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چھوڑ دی کہ شیخ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔ انہیں کہا جائے گا کہ شیخ کی بیماری کا وہ حال بھی اپنے اندر پیدا کرو جب بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔ حال کا نشان نہیں اور شیخ کی نقالی کر رہے ہیں یہ حرکات وجدی ہیں۔ وجد جب پیدا ہوتا ہے جب وہ حرکت سرزد ہوتی ہے۔ وجد آپ کے اندر رہے ہی نہیں اور ان کی نقلیں اتاریں۔ وہ نقل بھونڈی ہوگی۔ پھر شریعت اور احکام شرعیہ کی نقل اتاری جائے گی ان احوال کی عظمت کی جائے گی۔ صاحب حال کو سر پر بٹھایا جائے گا۔ ان کی تعظیم کی جائے گی مگر قانون کے طور پر نہیں پیش کریں گے۔

مشائخ طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے سے نزاع پیدا ہوتا ہے...... مگر یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس کے اندر معرفت معرفتِ کامل ہو۔ حق کی پہچان کامل ہو، قرب خداوندی حاصل ہو، وہ یہ کر سکتا ہے کہ اتنی چیز میرے کرنے کی ہے اتنی چیز میرے قبضے سے باہر ہے۔ میں نہیں کر سکتا کسی کے ذاتی حال کو قانون بنا کر پیش کرنے سے جنگ شروع ہوتی ہے کہ علماء کھڑے ہوں گے، کہیں گے یہ ناجائز ہے، دوسرے کہیں گے یہ بزرگوں کے خلاف کر رہے ہیں، ہم تو بزرگوں کا حال پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہیں گے بزرگوں کا حال قانون نہیں۔ قانون شریعت پر عمل کرو۔ عمل کرتے کرتے اس حال پر آ جاؤ، جوان بزرگ کا ہے پھر ہم تمہیں کوئی ملامت نہیں کریں گے بلکہ گردن جھکا دیں گے۔ مگر تم بلا حال کے کرو تو قانون شریعت کی نقالی کی جائے گی لوگوں کے احوال کی نقالی نہیں کی جائے گی۔

بعض احوال شخصی ہوتے ہیں قانون نہیں ہوتے۔ حضرت شیخ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے اولیائے کاملین میں سے ہیں۔ ایک تو خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء ہیں۔ دوسرے مولانا نظام الدین ہیں۔ ایک شخص جوان کے مریدین میں سے تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ''حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو

خواب میں دیکھ لوں۔کوئی تدبیر بتلا دیجئے''۔

فرمایا''فرض نماز چھوڑ دو''۔یہ حیران ہوئے کہ فرض نماز چھوڑنے سے اللہ کا قرب پیدا ہوگا یا بعد؟ نماز پڑھنے سے قرب پیدا ہوتا ہے،نہ کہ نماز چھوڑنے سے؟ حضرت فرمارہے ہیں کہ نماز چھوڑ دو،اللہ میاں کی زیارت ہو جائے گی۔ادب سے بول کچھ نہیں سکا۔مگر عمل کرنے کی جرات نہیں کی،اس لئے کہ یہ بالکل خلاف شرع ہے کہ ترک نماز کا حکم دیا جائے۔مگر وہ جذبہ اندر تھا کہ کسی طرح حق تعالیٰ کی زیارت ہو۔تین چار دن کے بعد پھر حاضر ہوا کہ حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے اللہ کو خواب میں دیکھ لوں،کوئی تدبیر؟ فرمایا۔بیوقوف بتلا تو دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔اب یہ بے چارہ پھر چپ کہ شیخ کیسے فرمارہے ہیں۔پھر جرات نہیں ہوئی۔

تیسری دفعہ چند دن کے بعد پھر کہا۔فرمایا تو احمق میرا وقت ضائع کر رہا ہے۔تدبیر بتلا دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ایک دن جا کے یہ جرات تو نہ ہوئی کہ فرض چھوڑ دے۔فرض پڑھ لئے سنتیں چھوڑ دیں۔رات کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ فرمارہے ہیں کہ بھائی! ہم نے کیا قصور کیا تھا جو ہماری سنتیں چھوڑ دیں۔یہ جلدی سے گھبرا کے اٹھا،وضو کیا،عشاء کا وقت باقی تھا۔جلدی جلدی سنتیں ادا کیں۔صبح کو حضرت شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔عرض کیا حضرت یہ واقعہ گزرا فرمایا''اگر فرض چھوڑتا تو اللہ میاں آکے پڑھواتے تو نے سنتیں چھوڑنے پر قناعت کی''۔

شریعت وطریقت کو محقق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے......اب یہ ایک مسئلہ آیا۔اس میں دو پہلو نکلتے ہیں۔بے ادبی کا یہ پہلو ہے کہ مولانا شیخ نظام الدین نے سخت غلطی کی فرض نماز چھڑانے میں۔اللہ تو نماز فرض کرے،وہ کہیں چھوڑ دو۔ہم نہیں ان کی بات مانتے۔ان کی بات کو دیوار پر مارو۔یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے کہ ایک شیخ وقت کی شان میں گستاخی کی جائے۔اور ایک راستہ یہ نکلتا ہے کہ بھئی! ہم نہیں جانتے قرآن وحدیث میں کیا ہے۔نماز فرض ہے یا نہیں؟

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

شیخ وقت جو کہہ دے وہ قرآن ناطق ہے ہم اس پر عمل کریں گے۔ہمیں خبر نہیں قرآن وحدیث میں کیا ہے۔یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے۔کہ شیوخ طریقت کی وجہ سے قرآن وحدیث کو ترک کیا جائے یا قرآن وحدیث کا نام لے کر شیوخ کے طرق کو رد کر دیا جائے۔دونوں راستے تباہی اور ہلاکت کے ہیں۔نہ قرآن وحدیث کی بے ادبی جائز نہ اکابر اولیاء اللہ کی بے ادبی جائز۔معتدل حق راستہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن کا دامن رہے اور ایک ہاتھ میں بزرگوں کا دامن رہے اور جامع راستے پر چلے۔مگر یہ راستہ محقق سمجھ سکتا ہے،غیر محقق کے بس کی چیز نہیں ہے۔

مجھے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہی واقعہ پیش کیا گیا بعض نے تو کہا ہم نہیں مانتے۔یہ قرآن وحدیث کے

خلاف ہے اس بات کو رد کرو۔ بعض نے کہا ہم مانتے ہیں، ہم نہیں جانتے ان کاغذوں میں لکھے ہوئے قرآن و حدیث کو۔ فرمایا یہ دونوں راستے تباہی کے ہیں۔ معتدل اور حق راستہ یہ ہے کہ دونوں کی عظمت قائم رہے اور آدمی بیچ میں سے نکلے۔ فرمایا وہ (معتدل اور حق راستہ) کیا ہے؟

واقعی یہ تحقیق کی بات ہے۔ فرمایا پہلے ایک بات سمجھ لو، اس کے بعد مسئلہ سمجھ میں آ جائے گا۔ فرمایا اولیاء اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو اپنی ریاضت، محنت اور مجاہدے کرتے کرتے کسی بڑے مقام پر پہنچ جائے۔ کوئی قطب، کوئی غوث بنا، محنتیں اور ریاضتیں کیں اور بڑے مقام تک پہنچ گئے۔

اور ایک وہ ہے کہ حق تعالیٰ اسے منتخب فرمالیں کہ اسے اس مقام کے اوپر لانا ہے۔ وہ نہیں بھی چاہے گا تو زبردستی ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقام پر پہنچے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اپنی محنت، دیانت سے بڑے عہدوں تک پہنچ جائے۔ سپاہیوں میں ملازم ہوا۔ دیانت داری سے کام کیا تو وہ ہیڈ کانسٹیبل بن گیا اور محنت سے کام کیا تو اور اوپر کا عہدہ مل گیا اور محنت سے کام کیا تو وزیر پولیس بن گیا اور اونچے مقام تک پہنچ گیا۔ اور ایک وہ ہے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد ہے اور حکومت نے چاہا کہ یہ ولی عہد ہو اس کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر وہ بھاگے گا بھی، زبردستی تعلیم دی جائے گی تاکہ اس کو نیابت کے عہدے پر لائیں اور ولایت عہد سپرد کریں۔ اولیاء میں یہ دونوں طریقے ہیں۔ بعض اپنی محنت سے مقامات طے کرتے ہیں۔ بعض منتخب ہوتے ہیں کہ وہ نہ بھی آنا چاہیں تو زبردستی انہیں لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، آپ مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دم آپ مسکرائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یَارَسُوْلَ اللهِ! ”مَایُضْحِكُكَ“؟ کس چیز نے ہنسایا؟ فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں، بعض لوگ جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر جنت میں لے جانے کے لئے کھینچا جا رہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔

تو صوفیاء کی اصطلاح میں جو اپنی محنت سے مقامات طے کرے اسے مرید کہتے ہیں اور جو اللہ کی طرف سے منتخب ہو اسے مراد کہتے ہیں۔ تو ایک مرید ہے جو اپنی ارادت اور عقیدت سے ترقی کر رہا ہے اور ایک مراد ہے کہ جس کو منتخب کر لیا گیا ہے وہ نہیں چاہے گا تو زبردستی اسے اونچے مقام پر پہنچائیں گے۔

قرآن کریم میں بھی یہ دونوں مقامات بیان کئے گئے مگر قرآن کی اصطلاح دوسری ہے جو لوگ اپنی محنت سے آگے بڑھتے ہیں۔ انہیں قرآن میں مُنِیب کہتے ہیں۔ یعنی ”اِنَابَتْ اِلَى اللّٰهِ“ اور ”رُجُوْع اِلَى اللّٰهِ“ کے راستے سے ترقی کر کے پہنچتے ہیں اور جو منتخب کئے جاتے ہیں انہیں مجتبیٰ کہتے ہیں۔ جس کو ارشاد فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ ① اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، اسے مقامات پر پہنچاتا ہے اور جو ہدایت، اِنابت اور محنت کا راستہ اختیار کرے، اسے ہدایت دیتا ہے۔ اسے مدد دے کر مقامات تک پہنچا دیتے ہیں،

① پارہ: ۲۵، سورة الشورىٰ، الآية: ۱۳.

تو ایک مجتبین کی جماعت ہے اور ایک منیبین کی جماعت ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں ایک مریدین اور ایک مرادین کی جماعت ہے۔

یہ فرما کر اب حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بیچ کا راستہ کیا ہے کہ نہ مولانا نظام الدین کی بے ادبی لازم آئے نہ کتاب وسنت کی۔ فرمایا کہ یہ شخص جس نے یہ درخواست کی تھی کہ اللہ کہ کو خواب میں دیکھوں اس بارے میں مولانا نظام الدین نے پہچان لیا تھا کہ یہ مریدین میں سے نہیں ہے، مرادین میں سے ہے اگر یہ نماز ترک کرے گا۔ اس سے زبردستی پڑھوائیں گے۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں منتخب کیا جا چکا ہے، اس لئے تدبیر بتلائی کہ فرض نماز چھوڑ دے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ اس سے پڑھوائیں گے اور زیارت بھی ہو جائے گی۔ اب اس میں کتاب وسنت کی عظمت بھی اپنی جگہ قائم رہی اور اکابر دین کی عظمت بھی قائم رہی۔

بلا تربیت وصحبت محقق نہیں ہوسکتا...... مگر اسے محقق سمجھے گا غیر محقق نہیں۔ غیر محقق یا مولانا نظام الدین کی توہین کرے گا یا کتاب وسنت کو ترک کر دے گا اور یہ دونوں راستے تباہی و بربادی کے ہیں۔ نجات کا راستہ یہ ہے کہ قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ان کی عظمت بھی اور کتاب اللہ کی عظمت بھی دل میں جاگزیں ہو۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ تربیت ہو، محققین کی صحبت میسر ہو۔ اولیائے کاملین کی زیارت کے ساتھ ساتھ ان کا معالجہ نصیب ہو۔ تب آدمی کہیں محقق بنتا ہے۔ محض کتاب دیکھ لینے اور بزرگوں کا کلام سن لینے سے محقق نہیں بنتا جب تک کہ محنت کر کے تربیت نہ پائے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ۔

ماہ ہا بدید تا یک پنبہ دانہ بعد کشت ۔۔۔ جامہ گرد و شاہدے رایا شہیدے راکفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ ایک بنولے کا دانہ منوں مٹی کے اندر جائے۔ اپنی ہستی کو فنا کرے اس میں سے پودا پیدا ہو۔ اس میں سے روئی نکلے، اس سے لباس بنے پھر کہیں جا کے کسی محبوب کا لباس بنے اور دنیا اس کی قدر کرے۔ تو بنولہ کا دانہ اگر اپنی ہستی کو مٹا کر روئی کی صورت میں اپنے کو نہ پیش کرتا۔ نہ شہید کے لئے کفن میسّر آتا اور نہ محبوب کے لئے لباس اور کہتے ہیں کہ۔

قرنہا باید تا یک سنگ خاراز آفتاب ۔۔۔ لعل گرد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

قرنہا قرن کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک ٹکڑا آفتاب کی گرمی سہتے سہتے صدیوں میں جا کے لعل بدخشان بنے اور بازار میں لاکھوں روپے اس کی قیمت اٹھے۔ مگر جب تک وہ سنگِ خارا آفتاب کی گرمی اور آفتاب کی تپش کو نہیں سہے گا اور اپنے کو جلا کر پھونک نہیں دے گا لعل بدخشانی نہیں بنے گا۔ اور اسی طرح سے کہا ہے کہ۔

سالہا باید تا یک کود کے از درس علم ۔۔۔ عالمے گردونکو ، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدت ومحنت چاہئے کہ ایک نادان بچہ سات آٹھ برس میں جا کے عالم بنے یا شاعر شیریں سخن بنے۔ گھر بیٹھے علم کی دولت نہیں ملتی۔ بلا محنت کے باتیں بنانے سے یہ مقام میسر نہیں آتا اپنی جان کو سوہان لگانی

پڑتی ہے، جان کو جلانا پڑتا ہے، تب جا کے وصل کا مقام میسّر آتا ہے۔

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

باطن کے بادشاہ...... اور ؎

مبین حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم　　　　شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند

یہ ملاّ نے اور درویش بے چارے، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں گو سر پہ تاج نہیں ہے۔ یہ بادشاہ ہیں گو کمر میں سونے کا پٹکا بندھا ہوا نہیں ہے۔ مگر سلاطین ان کے آگے جھکے ہیں۔ یہ سلاطین کے آگے نہیں جھکے ان کو اللہ نے بڑی دولت دی ہے۔ جو باطن کی دولت ہے ظاہری دولت والے نہیں جانتے کہ انہیں کیا دولت میسر ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ محدث ہیں۔ جلیل القدر عالم اور امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ جب کوئی فقہ کا مسئلہ حاصل ہوتا تو بعض دفعہ وجد میں آ کے کہتے کہ "اَیْنَ اَبْنَآءُ الْمُلُوْکِ مِنْ ھٰذِہِ النِّعْمَۃِ" کہاں ہیں بادشاہ زادے کہ ہماری اس دولت کو دیکھیں اچھا ہوا کہ یہ اندھے ہیں اگر یہ اس دولت کو سمجھ لیتے تو شاید اس دولت کو چھیننے کے لئے تلواریں لے کر ہم سے جہاد کرتے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہیں اس لئے ہماری دولت محفوظ ہے۔ تو ایک باطنی دولت کے اور ایک ظاہری دولت کے بادشاہ ہیں۔ ظاہری دولت والے باطن والوں کے آگے جھکے ہیں۔ بشرطیکہ، ارباب باطن ہوں، ارباب بطن نہ ہوں۔ محض پیٹ کے بندے نہ ہوں کہ کھا پی لیں۔ ارباب باطن ہوں تو اربابِ ظاہر ان کے آگے جھکتے ہیں۔

اہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی آتی ہے..... حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ ان کے ہاں تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مہمانوں کا روزانہ دونوں وقت ہجوم رہتا تھا۔ نواب میر خاں جو ریاست ٹونک کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی، میرے شیخ کے ہاں ہزار دو ہزار مہمان رہتے ہیں بڑی پریشانی رہتی ہوگی۔ شیخ کی کوئی جائداد نہیں اور تجارت و ملازمت نہیں ہے۔ بڑے پریشان رہتے ہوں گے کہ مہمانوں کو کہاں سے کھلاؤں تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک پورا ضلع جس کی سالانہ آمدنی کئی لاکھ روپے تھی۔ پیتل کے پترے پر لکھ کر بھیجا کہ حضرت کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تا کہ آپ کو مہمانوں کی مہمانی میں دشواری نہ ہو۔ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے اس پیتل کے پترے پر جواب لکھا۔ عجیب جواب تھا۔ لکھا کہ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم　　　　با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو نہیں کھونا چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے آسمان سے آ رہی ہے۔ تیرے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے حکومتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور حکومت والے پیش پیش ہیں۔

اسی مقام کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اللہ و رسول کا ہو جاتا ہے تو "اَتَتِ الدُّنْیَا

وَهِيَ رَاغِمَةٌ '' دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں میں آ کر پڑتی ہے، وہ ٹھکراتے ہیں اور وہ زبردستی قدموں میں گرتی ہے۔ دنیا کے بندے خود دنیا کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ ٹھوکریں مارتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک غنی بن کے کماتا ہے ایک محتاج بن کے کماتا ہے۔ اہل اللہ بھی کماتے ہیں مگر غنی بن کر۔ اہل دنیا بھی کماتے ہیں مگر محتاج وفقیر بن کر ایک فقیر الی اللہ ہے، ایک فقیر الی الدّنیا ہے۔ جو اللہ کا فقیر ہے دنیا سے وہ بھی محروم نہیں رہتا۔

اس دنیا کا حاصل یہی ہے کہ آدمی پیٹ بھر لے، لباس سے تن ڈھانپے کون سا اللہ والا ہے جسے کھانے کو میسر نہیں؟ اب رہا یہ کہ انکے پاس بڑی کوٹھی بنگلہ نہیں۔ وہ چاہتے ہی کب ہیں کوٹھی بنگلے کو؟ وہ تو ایک جھاڑ کے نیچے گزر بسر کرنے کو بہت سمجھتے ہیں۔ یہ تو جب ہو جب وہ آپ کے بنگلوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ آپ انہیں لالچی کہیں مگر انہیں کوئی لالچ نہیں۔

اہل اللہ تارک الدنیا ہیں...... حقیقت میں یہ لوگ تارک الدنیا ہیں کہ دنیا پر قابو پاتے ہیں اور پھر ترک کرتے ہیں اور جس کے ہاتھ میں ہی دنیا نہ ہو اور وہ کہے کہ میں ترک کر رہا ہوں وہ متروک الدنیا ہے، تارک الدنیا نہیں ہے دنیا نے اسے ترک کر دیا۔ دل میں اس کے ہے کہ دنیا آئے مگر دنیا اس کو چھوڑ چکی۔ اسلام نے لوگوں کو تارک الدنیا بنایا ہے، متروک الدنیا نہیں بنایا۔ دنیا پر قابو پا کر، پھر اس کو ترک کرو۔ خواہ ہاتھ سے خواہ قلب سے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم دولت مندمت بنو اور بھک منگے بنو۔ مسلمان بھک منگا اور سائل بننے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا کو دینے کے لئے آیا ہے، دنیا سے مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کماؤ: ''كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ'' ① نیک اور پاک کمائی ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے اور اللہ اس میں برکت دے دے تو یہ نہیں کہ جا کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنے مصرف میں خرچ کرو، دولت مند بھی بنو۔ خدا اگر کروڑ پتی بنائے بن جاؤ اسے ضائع مت کرو۔ مگر قلب کا تعلق اس سے نہ رکھو۔ قلب کا تعلق اللہ سے رکھو، ہاتھ پیر کا دنیا سے رکھو۔ دنیا ترک نہیں کرائی کہ تم بھک منگے بن کے بیٹھ جاؤ۔ دنیا کو قلب سے ترک کرایا۔ ان کی شان یہ ہے کہ۔

دل بیار دست بکار

ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہو یہ اسلام کی تعلیم ہے نہ یہ کہ تم دنیا ترک کر کے پہاڑوں میں جا کے بیٹھ جاؤ اس کو رہبانیت فرمایا۔ اسلام میں گوشہ گیری نہیں دنیا کے اندر کماؤ بھی۔ چاہے خدا کروڑ پتی بنائے، اس کی قدر کرو اور اسے اپنے مصارف میں خرچ کرو۔ مگر دل کا تعلق اللہ سے ہو۔ اولیاء اللہ کا یہی کردار اور کیریکٹر تھا۔ یہی ہیں وہ علمائے دیوبند جو ان اکابر اولیاء اللہ کے جانشین ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ، مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے۔

---

① مشكوٰة المصابيح، كتاب البيوع ،باب الكسب وطلب الحلال، ج: ۲ ص: ۱۲۸ رقم: ۲۷۸۱. حدیث ضعیف ہے لیکن معناً درست ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں۔ دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۲ ص: ۴۶ .

حضرت عبداللہ ابن مبارک تقریباً دو ہزار اشرفی ہر وقت پاس رکھتے اور بعض دفعہ مجلس میں بیٹھ کرانہیں خوب اُچھالا کرتے۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت آپ یہ اشرفیاں اس طرح اچھال رہے ہیں؟ فرمایا: "لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ" ① اگر یہ درہم اور دنانیر روپیہ پیسہ ہاتھ میں نہ ہو یہ بادشاہ زادے تو ہمیں ناک پونچھنے کا رومال بنالیں۔ ہم بتلا دیتے ہیں جو تمہیں میسر ہے، وہ ہمیں بھی میسر ہے ہم تمہارے محتاج نہیں۔ لیکن جو ہمیں میسر ہے وہ بقدر ضرورت بھی تمہیں میسر نہیں۔ تم ہر حالت میں محتاج ہو کہ ہم سے آ کر سیکھو۔

تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سائل و مفلس بنانا مقصود نہیں، غنی بنانا مقصود ہے۔ "وَخَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ" غنی اور امیری قلب کی امیری ہے۔ ہاتھ پیر میں چاہے لاکھوں روپے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بیٹھ کر ایک ایک دن کے اندر کئی کئی لاکھ روپے اپنے دست مبارک سے تقسیم کئے ہیں۔ تو یہ شان بتلائی گئی کہ دنیا قبضے میں بھی کرو۔ پھر قلب سے ترک کرو اور اگر دنیا ملتی نہیں اور کہا ہم تارکُ الدنیا ہیں، تو تارک الدنیا نہیں متروکُ الدنیا ہو دنیا نے تمہیں ترک کر رکھا ہے۔ جیسے نامرد اور عنین یوں کہے کہ میں بڑا پارسا ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ لوگ کہیں گے تجھ میں جانے کی طاقت کہاں ہے؟ تو کہاں سے متقی بن گیا۔ متقی وہ ہے کہ جانے کی طاقت ہے پھر بھی نہیں جاتا۔ اللہ کے خوف سے ڈرتا ہے نہ کہ نامرد ہونے کا نام متقی ہے۔ بہر حال تارکُ الدنیا وہ ہے کہ دنیا قبضے میں ہے پھر ترک کر رہا ہے۔ وہ تارکُ الدنیا نہیں کہ دنیا ہاتھ میں نہیں، للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے کہ میں تارکُ الدنیا ہوں۔

اَدب و عظمت کے حامل کتابُ اللہ کے سچے وارث ہیں...... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد ادب وتادب پر ہے، عظمت شریعت کا ادب، اولیاء اللہ اور علماء ربانی کا ادب، کتابُ اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، مدارسِ دینی اور خانقاہوں کا ادب۔ ان سارے ادبوں پر دین کا مدار ہے۔ بے ادبی اور گستاخی میں آدمی کا دین نہیں بنتا۔

پھر ادب کے بعد اتباع ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اجماعِ امت کا اتباع اور اس ذوق کا اتباع جس کے اوپر پوری امت کے صلحاء چل رہے ہیں اس سے الگ ہو کر خیال آرائی اور تخیل سے کوئی پگڈنڈی بنانا، اسلام نے ان سب کو رد کیا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین وہی ہے کہ نقل صحیح، ذوقِ سلیم کے ساتھ اتباع اور ادب کے ساتھ اسے قبول کیا جائے اسی کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا کہ حق و باطل کا معیار یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ ② "اے پیغمبر! جو ہم نے آپ کی طرف کتاب کی وحی کی ہے۔ وہی ہے حق، وہی مصدق ہے۔ اس کی تصدیق اور تکذیب سے آدمی سچا اور جھوٹا سمجھا جائے گا"۔ اور فرمایا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے ایک جماعت کو اس کتاب اللہ کا وارث بنایا۔ کن لوگوں کو بنایا؟ جن کو ہم

① مشكوة المصابيح، كتاب الرقاق، باب استحباب المال والعمر للطاعة، الفصل الاول، ج: ٣ ص: ١٤٧ رقم: ٥٢٩١.
② پارہ: ٢٢، سورة الفاطر، الآية: ٣١. ③ پارہ: ٢٢، سورة الفاطر، الآية: ٣٢.

نے منتخب اور پسند کیا تھا کہ ان میں سے ہمیں دین کا کام لینا ہے، اس میدان میں ان سے کام لینا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وارثت تو باپ سے ہی ملتی ہے کوئی پیدا تو نہیں کرتا۔ پیدا شدہ کمائی کو وراثت نہیں کہتے۔ وراثت تو وہ ہے جو باپ کا ترکہ ہو اور مل جائے۔ اور ترکہ کب ملے گا؟ جب نسب نامہ ثابت ہو۔ یعنی باپ کا بیٹا ہونا ثابت ہو، تبھی ترکہ ملے گا اور اگر یہی ثابت نہ ہو کہ یہ مرنے والے کا بیٹا ہے تو اجنبی آدمی کو کبھی بھی ترکہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا، جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ ہے، اس کا شیخ یہ۔ اس کا آگے شیخ وہ، سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو، تو ترکہ ملے گا اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا تو وہ ایسا ہے جیسے بے باپ کی اولاد ہو کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ اس لئے کہ یہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال و دولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے، وہ نسب روحانی ہے۔ اس کو فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ① ''پھر ہم نے کتاب اللہ اور علم کا ان لوگوں کو وارث بنایا، جن کو ہم نے اس کام کے لئے چن لیا تھا''۔

اب فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ ② بعض ان میں گندے انڈے نکل گئے کہ انہوں نے یا کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یا کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع کیا یا تھوڑے تھوڑے حیلے کر کے معنوی تحریف شروع کی فرمایا یہ اپنے نفس پر ظالم ہیں۔ ان کو اس کی جزا اور صلہ ملے گا۔

اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ ③ بعض ان میں وہ ہیں کہ درمیانی راہ سے اللہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ ادھر ادھر نہیں ہٹتے، بٹیہ اختیار کر لی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ بھی نجات پائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ④ بعض وہ ہیں جو اس راستے پر دوڑ رہے ہیں اور دین کی کوئی جزئی چھوڑنا نہیں چاہتے، ہر حیثیت سے دین کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں اور دین کی طاقت ہاتھ میں لے کر فراٹے بھر رہے ہیں وہ سابق خیرات ہیں۔ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس روحانی میدان میں کوشش کرتے ہیں کہ ہم آگے نکل جائیں۔ اس طرح سے دوڑنے میں مصروف ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس لائن پر لگا دیا ہے تو کوئی دوڑ رہا ہے، کوئی لپک رہا ہے، کوئی معمولی چال چل رہا ہے، کوئی اِدھر اُدھر ہٹ کر اس بٹیہ سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود سے رہ گیا۔ لوگوں کی انواع و اقسام ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحیح معنی میں کتاب اللہ کے وارث بنیں انہی معنی پر چلتے رہیں جو روایت ہو کر چلے آ رہے ہیں۔ جس میں سلف کا ذوق اور سلف کا تعامل شامل ہے اور جس میں وہ مذاق دینی شامل ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.
③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.

علیہ وسلم نے تربیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کے محض الفاظ ہی منقول نہیں ہیں معنی بھی منقول ہیں اور معانی ہی منقول نہیں بلکہ تربیت کا وہ ذوق بھی سلسلہ وار چلا آ رہا ہے۔ جس ذوق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا کہ اسی نمونہ کے عمل پر رہو۔ اس لئے آپ کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپ کی چار شانیں ہیں۔ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ① اللہ کی آیتیں بامانت الفاظ آپ نے پہنچادیں۔ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② پھر تعلیم کے ذریعے ان کی مرادات ربانی بیان کیں۔ ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ پھر عملی اُسوہ بھی پیش کیا کہ یوں عمل کرو یہ نمونہ ہے جس کو میں کر کے دکھلا رہا ہوں اور فرمایا: ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ④ دلوں کو مانجھ کر اس میں استقامت بھی پیدا کی۔ کجی نکال دی اور زیغ نکال دیا۔ ان مجاہدات اور محنتوں کے بعد استقامت نصیب ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی نے چند حرف دیکھ لئے۔ کسی کی بات سن لی اور رائے دینی شروع کر دی۔ یہ چھچھور پن ہے یہ کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔ جس کا آدمی علم نہیں رکھتا اس میں کبھی رائے نہ دے۔ مثلاً سنار کا کوئی مسئلہ آئے گا، اگر آپ سے کوئی کہے کہ زیور کیسے بنتا ہے؟ آپ کہیں گے میں جانتا نہیں سنار کے پاس جاؤ یا لوہاری کی بات ہو۔ آپ یہ کہتے ہوئے عار نہیں کریں گے کہ بھئی! میں لوہار نہیں۔ اگر آپ کو لوہا کٹوانا ہے تو لوہار کے پاس جاؤ۔ مگر جب دین کی بات آتی ہے تو لوگوں کو اپنے کو جاہل کہتے ہوئے عار آتا ہے۔ اس میں رائے زنی کے لئے تیار ہیں۔ گویا دین ایک کھلونا ہے۔ جس کا جی چاہے اس میں رائے زنی کرے۔

اس واسطے میں نے یہ عرض کیا جزئیات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ میرے پاس بھی وقت کم ہے، آپ کے پاس بھی۔ اس لئے اصول میں نے عرض کر دیا۔ ایک کسوٹی پیش کر دی۔ اس سے آپ جزئیات کو عمر بھر پرکھتے رہیں اس سے آپ جزئیات کا فیصلہ کر سکیں گے۔ یہ چند ضروری باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ وقت میں نے زیادہ لے لیا۔ خود میں اتنی ہمت اور طاقت بھی نہیں تھی۔ مگر شاید ان بزرگوں نے کوئی قلبی زور لگایا ہو۔ جس سے کچھ بات چل گئی ورنہ اپنے اندر تو طاقت تھی نہیں۔ بہرحال اب میں اس بات کو ختم کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم وعمل کی توفیق عطا فرمادے، صحیح وسیدھے راستے پر چلائے۔ زیغ اور کج راہوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور اِدھر اُدھر کے تخیلات سے بچا کر صرف انہی روایات پر رکھے، جو سند صحیح کے ساتھ منقول ہوتی آ رہی ہیں۔ (آمین)

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ."

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعة، الآیة: ۲. ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعة، الآیة: ۲.

③ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعة، الآیة: ۲. ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعة، الآیة: ۲.

تسکین فطرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:......

تین فطری سوال...... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے میرے ایک عزیز نے چند سوالات نقل کئے جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ اور اس آنے اور جانے کے درمیان ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ جب تک ان تینوں سوالوں کا جواب شفا بخش طریقے سے نہیں مل جاتا۔ انسان میں بے چینی رہتی ہے سکون قلب پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین سوال جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں اس وقت جو ہمارے محترم قاری صاحب نے رکوع تلاوت کیا۔ ان تینوں سوالات کا جواب اس رکوع کے اندر موجود ہے۔ تو فرق اتنا ہوگیا کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے بعد میں اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہاں ایسا ہوگیا (۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) کہ پہلے جواب پڑھا گیا بعد میں سوال کیا گیا۔

یہ جو پورا رکوع ہمارے محترم قاری صاحب نے پڑھا ہے، یہ دس احکام پر مشتمل ہے۔ دس ہدایتیں اس میں حق تعالیٰ نے دی ہیں اور پھر ایک ایک ہدایت بہت سی چیزوں پر مشتمل ہے۔ تو مجموعے کے لحاظ سے یہ چیزیں بہت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصولاً اس میں دس باتیں بیان کی گئی ہیں اور وہ دس باتیں انہی سوالات کے جوابات ہیں کہ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ کس کی رضامندی اور کس کو خوش کرنے کے لئے ہم زندگی گزاریں اور وہ مبدا کیا ہے جس سے ہماری ابتداء ہوتی ہے۔ پھر اس زندگی کا انجام کیا ہوگا۔ تو اسی رکوع میں انجام بھی بتا دیا گیا ہے۔

غرض مذہب کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ ایک مبدا، ایک معاد، ایک میعاد۔ مبدا کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء کہاں سے ہوئی۔ معاد کا مطلب یہ کہ لوٹ کر کہاں جانا ہے۔ میعاد کا مطلب یہ کہ درمیان میں کس طرح زندگی گزاری

جائے۔تو اس رکوع میں مبدا کا بھی ذکر ہے کہ وہ کون سی ذات ہے جو تمہاری اصل ہے۔معاد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارا انجام کیا ہونا ہے اور اس کا بھی ذکر ہے کہ درمیان کی زندگی کس طرح گزارنی ہے۔اس لئے اس وقت کسی تقریر کے کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تفسیر کی ضرورت ہے کہ اس رکوع کی تفسیر کر دی جائے۔ترجمہ وشرح میں تقریر بھی ہو جائے گی۔

اِنسان کا مبدا کیا ہے؟......تو ابتدا یہاں سے کی گئی ہے کہ ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ① برکت والی وہ ذات ہے جس نے آسمان میں برج قائم کئے،منزلیں قائم کیں اور ان منزلوں میں سے سورج اور چاند کو گزارا،جس سے رات اور دن پیدا ہونے لگے،موسم بننے لگے، سردی گرمی اور برسات آنے لگی۔یہ گویا مبدا کا ذکر ہے کہ اصل ابتداء جس ذات سے ہے۔اس کی قدرت آسمانوں،زمین میں کام کر رہی ہے۔آسمان بنادیئے،چاند،سورج پیدا کر دیئے اور ان میں حرکت پیدا کر دی۔

رحمان کے بندوں کی چال......اس کے بعد دس احکام شروع کئے کہ اس کی رضا کے لئے کس طرح زندگی گزاری جائے ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ② رحمٰن کے بندوں کا دنیا میں کیا ڈھنگ ہونا چاہئے؟

رحمٰن لغت میں اور شریعت میں بھی اس ذات کو کہتے ہیں جو ساری نعمتوں کا مالک ہو۔ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں دینے پر قادر ہو۔ہر نعمت اس کے قبضے میں ہو۔ساری نعمتوں کا والی،وارث اور مالک ہو۔تو اس رحمٰن کے بندے کس طرح سے دنیا میں زندگی بسر کریں۔فرمایا،رحمٰن کے بندوں کا ڈھنگ یہ ہونا چاہئے کہ جب وہ زمین میں چلیں تو نرم چال چلیں۔اس میں ہدایت دی گئی کہ زندگی کی بنیاد تواضع اور خاکساری پر رکھی جائے۔کبر ونخوت پر نہ رکھی جائے۔تکبّر اور اپنے کو بڑا بنانا یہ نہیں بلکہ چال سے واضح ہو کہ کوئی خدا کا بندہ جا رہا ہے۔یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی جبار قہار جا رہا ہے۔انسان کی شان نہیں ہے اور انسان کی شان یہ کیوں نہیں ہے؟

اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ:''کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ'' ③ ''تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے''۔مٹی کا یہ کام نہیں ہے کہ اچھل اچھل کر اوپر جائے یہ جب تک پست اور پامال رہے گی جبھی تک اس کی قدر ہو گی۔مٹی جوتوں میں روندی جاتی ہے مگر چوں نہیں کرتی۔جبھی تک اس کی قدر ہے کہ جس طرح ہم تصرف کریں بلا چون وچرا اس تصرف کو قبول کرے،اگر مٹی اوپر اڑی،کسی کی آنکھ میں پڑی،وہ لعنت کرے گا۔کسی کے کپڑے پر گرے گی وہ کپڑے کو جھٹک دے گا۔کہے گا کہ کمبخت گرد کہاں سے آ گئی تو مٹی نے ذرا ابھرنے کا نام لیا تو اس پر لعنتیں برسنا شروع ہو گئیں۔

---

① پارہ:۱۹، سورۃ الفرقان،الآیۃ:۶۱. ② پارہ:۱۹، سورۃ الفرقان،الآیۃ:۶۳. ③ مسند بزار، ج:۷ ص:۴۲۱ رقم:۲۵۵۱. حدیث حسن ہے،دیکھئے:صحیح وضعیف الجامع ج:۷ ص:۱۱۵ رقم:۲۶۶۸.

تو جس مٹی سے انسان پیدا کیا گیا، اگر وہ اینٹھنے لگے، غرور کرنے لگے، کبر و نخوت اختیار کرنے لگے۔ ہر شخص اس انسان کو برا کہے گا اور جو تواضع و خاکساری اختیار کرے اور مٹی بن کر رہے، سب اس کو سر پر بٹھائیں گے کہ یہ بڑی کیمیا معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی مجلس میں جو بڑا بول بولتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ وہیں اس کو سزا مل جاتی ہے اور جو تواضع کا کلمہ بولتا ہے، سب اس کی قدر کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی عادتِ کریمہ بھی یہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی بندہ عبادت کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! میرے سے کچھ نہیں بن پایا۔ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ تیرا فضل ہے کہ یہ کام تو نے مجھ سے کرا دیا۔ میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی۔ حق تعالیٰ شانہٗ فوراً فرماتے ہیں کہ نہیں عمل تو نے ہی کیا تھا۔ مسجد کی طرف چل کر تو ہی گیا تھا۔ حج کے لئے بیت اللہ کی طرف تو نے ہی سفر کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کیا اور اگر کوئی کبر و نخوت سے یوں کہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے عبادت کی، میں نے یہ کام کیا۔ فرماتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کیا؟ ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا بدن، روح اور طاقت ہم نے دی۔ تو نے کیا کیا؟ جو خود دعوے کرتا ہے اسے پست کر دیتے ہیں اور جو دعویٰ چھوڑ کر کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے فرماتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا۔ اس لئے سنت اللہ یہ ہے کہ جو آدمی خاکساری برتے، عجز و نیاز برتے، بندگی کی شان سے آئے۔ اسے اونچا اٹھاتے ہیں، اسے عزت دیتے ہیں اور جو خود ابھرنے لگے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست ‏ ‏ ‏ ‏ اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

تو انسان کی فطرت یہی بنائی گئی کہ تیرے سامنے مٹی ہے۔ اگر وہ ابھرتی ہے تو تو لعنت بھیجتا ہے۔ یہ جوتیوں کے نیچے رہتی ہے تو تو عزت کرتا ہے۔ تو جس چیز سے تو بنا ہے تیرا مزاج بھی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ جتنی تو خاکساری برتے گا تیری عزت ہوگی۔ جتنا تو غرور کرے گا، اتنا ہی تجھے پست کر دیا جائے گا۔ تو پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ رحمٰن کے بندوں کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔ جب گھر سے باہر نکلیں اور چلیں تو زمین پر ہلکی چال چلیں نخوت و کبر کی چال نہ چلیں اس کو دوسرے موقع پر قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ﴾ ① اپنی چال میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور زیادہ زور سے چلا کر مت بولو حسبِ ضرورت آواز بلند کرو۔ بہت زیادہ شور مچا کر بولنا، کبر و نخوت کی علامت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کی آواز ہی خلقۃً بلند ہو، وہ دوسری بات ہے۔ لیکن ارادہ کر کے آدمی چلائے، یہ سمجھ کر کہ دوسرے کے اوپر میری آواز کا دباؤ پڑے یہ ممنوع ہے۔ بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ آواز بلند کرے۔ تو بولنے اور چلنے دونوں میں اعتدال ہونا چاہئے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال مبارک کا جو نقشہ حدیث میں آتا ہے کہ "اذا مشی تکفا کانما ینحط من صبب" ① آپ اس طرح چلتے تھے کہ عجیب شان تھی۔ اس طرح کہ گردن تو جھکی ہوئی جس کو خاکساری کی چال کہتے ہیں۔ مگر ساتھ میں قوت اتنی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا زمین کو کھود کر اندر گھس جائیں گے۔ اتنی قوت سے قدم پڑتا تھا۔ تو قوت بھی ہو، شجاعت بھی ہو اور خاکساروں کی طرح نیازمندی بھی ہو، وقار بھی اور تواضع بھی ہو۔ نہ بیماروں کی چال چلے جیسے کوئی مریض جارہا ہے کہ ذرا کوئی تھپڑ ماردے تو گر پڑے، یہ بھی نہیں اور نہ ابھر کر چلے جیسے کوئی متکبر جارہا ہے۔ بیچ کی چال ہو کہ اس سے خودداری اور خاکساری بھی ٹپکے ﴿یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا﴾ ② کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ چلے، بلکہ یہ کہ تواضع سے چلے چاہے تیز چلے گویا یہ پہلا نقشہ بتلایا گیا کہ جب گھر سے نکلو تو ایسی چال چلو۔ اس لئے کہ مسلمان بے فکرا نہیں پیدا کیا گیا کہ جس طرح اس کا جی چاہے چل پڑے۔ قدموں پر نگاہ ہونی چاہئے کہ یہ کس طرح سے چلیں اس لئے کہ مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔

قران کریم میں فرمایا گیا: ﴿مَایَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا﴾ ③ تم تین آدمی تنہائی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ سرگوشی کرو گے تو چوتھا خدا وہاں موجود ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ تمہاری باتوں کا سننے والا کوئی نہیں۔ تم چار ہو گے پانچواں خدا ہوگا۔ تو زیادہ ہو گے تب خدا موجود، کم ہو گے تب خدا موجود۔ جب اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود ہے تو آدمی کو ہر جگہ ادب سے چلنا پڑے گا۔ بے ادبی وہ کرے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ مسجد میں خدا ہے اس لئے میں ادب کرتا ہوں اور سڑک پر گویا خدا نہیں تو میرا جی جس طرح چاہے چلوں۔ یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے۔ ہر جگہ کے مناسب ادب ہوگا اور عجز و نیازمندی اختیار کی جائے گی۔ تو زندگی گزارنے کی پہلی بات یہ ہے کہ ہم زندگی میں قدم قدم پر نگاہ رکھیں کہ ہماری چال ڈھال کیا ہے۔

رحمٰن کے بندوں کا قال...... اس کے بعد آگے فرمایا، چلتے چلتے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ تو اس میں اچھے بھی ملتے ہیں اور برے بھی بعضے تو ایسے ملتے ہیں جو بڑے مہذب اور شائستہ ہیں۔ آپ نے سلام کیا، انہوں نے جواب دیا انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا، آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا، محبت بڑھ گئی۔ اور بعض ایسے بھی ملتے ہیں جو جھگڑے اور فساد کی بات اٹھاتے ہیں کہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ لیا یا کسی پر پھبتی کس دی۔ ایسے موقع پر ہماری رفتار کیا ہونی چاہئے اس پر فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ ④ "اگر جاہل ملیں اور جاہلانہ حرکتیں کریں تو تم ان کے ساتھ جاہل مت بنو"۔ تم سلام کہو۔ یعنی جب وہ جاہلانہ بات کریں۔ بس ان سے کہہ دو کہ بھئی!

---

① الجامع للترمذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۲ ص: ۸۹۔

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۳۔ ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۷۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۳۔

ہمارا اسلام ہم یہ باتیں نہیں جانتے تمہارے لئے بھی زیبا نہیں، ہمارے لئے بھی اور اگر آپ بھی جھگڑے میں لگ گئے تو وہاں اچھی خاصی لاٹھی چل جائے گی۔ جھگڑا اٹھ جائے گا اور جھگڑا اٹھانا بہت آسان ہے۔ مگر اس کا مٹانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے صبر وتحمل کرنا پڑتا ہے۔ تو فرمایا گیا جب چلو تو چال میں نرمی پیدا کرو۔ نرم چال رکھو کہ ہر ایک آدمی محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آپ سے کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔ جھگڑا جب کرے گا جب آپ متکبرانہ انداز سے جائیں اور جب تواضع سے گئے تو اول تو سب عزت کریں گے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی بے وقوف آدمی مل جائے اور جاہلانہ باتیں کرے، تو آپ کہیں گے: قَالُوْا سَلَامًا بھئی! ہم یہ بات نہیں جانتے، ہمارا اسلام ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔

سلام کی برکات اور آداب...... اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام ایک ایسی عظیم چیز ہے جو جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ سلام آدمی نہ کرے تو برا سمجھا جاتا ہے اور اگر سلام کر لے تو جاہل بھی ہوں گے، وہ بھی جھک جائیں گے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے سلام کر رہا ہے۔ اس واسطے فرمایا گیا اگر باہم دشمنیاں بھی ہوں، عداوتیں بھی ہوں۔ اگر دشمن کو آپ سلام کریں گے دشمنیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ وہ ''وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ'' کہنے پر مجبور ہوگا۔ جس کا مطلب ہے کہ تمہارے لئے بھی سلامتی ہو۔ جب سلامتی کی دعا دے گا تو جھگڑا اٹھائے گا کیوں؟ خود کہہ رہا ہے کہ اللہ تمہیں صحیح سلامت رکھے۔ تو دعا بھی دے اور اوپر سے جھگڑا بھی اٹھائے؟ اس سلام نے ساری دشمنی ختم کر دی۔

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''تَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ'' ① ''سلام کرنے کی عادت ڈالو، خواہ تعارف ہو یا نہ ہو''۔ آج کے زمانہ کا تمدن یہ ہے کہ جب تک تیسرا آدمی تعارف نہ کرائے نہ بول نہ چال نہ سلام نہ کلام۔ یہ متکبرانہ تمدن ہے۔ یہ اسلام کا تمدن نہیں ہے۔ اسلام کا تمدن یہ ہے کہ جب ہم میں اور تم میں اسلام کا رشتہ مشترک ہے، اسلامی اخوت اور بھائی بندی پھیلی ہوئی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا تعارف کرائے۔ پہلے سے ہی تعارف حاصل ہے۔ یہ ہمارا بھائی مسلمان ہے۔ اس میں اسلام بھرا ہوا ہے۔

ہمارا تعارف بھی اسے حاصل ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں جب دونوں کے اندر ایک رشتہ مشترک ہے، پھر تیسرے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ تعارف کرائے۔ اگر گھر میں دو حقیقی بھائی موجود ہوں وہ دونوں یوں کہیں کہ کوئی تیسرا محلے والا آ کر تعارف کرائے کہ یہ آپ کے حقیقی بھائی ہیں اور یہ آپ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ تب ہم کلام کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ میری رشتہ داری ہے۔ مجھے کیا مصیبت ہے کہ میں تیسرے آدمی کو بلاؤں کہ بھئی! میرا تعارف کرا دو۔ یہ تکلف اور بناوٹ ہے تو نسبتی رشتے سے زیادہ قومی رشتہ اسلام کا ہے۔ دو حقیقی بھائی اتنے قریب نہیں ہوتے۔ جتنے دینی رشتہ کی وجہ سے دو مسلمان قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ کوئی چوتھا تیسرا آدمی تعارف کرائے۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام، ج: ۱ ص: ۱۹۔

ہاں البتہ اس زمانے ایک مصیبت پڑگئی کہ ہم صورت سے یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان ہے بھی یا نہیں؟ بعض اوقات سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔لیکن سوچتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا عیسائی ہے یا یہودی ہے۔ یہ مصیبت آ کے پڑگئی اس سے معلوم ہوا کہ ہیئت اور وضع بھی ایسی ہو جس سے دور سے سمجھ لیا جائے کہ مسلمان آ رہا ہے تا کہ سلام و کلام کی نوبت آ جائے۔

بہر حال اس حدیث میں ہدایت کی گئی کہ پہچان پہچان کر سلام نہ کرو۔اس واسطے کہ تعارف کرانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ہوا۔اس کا تو تعارف ہو گیا اور اگر کوئی چھوٹا موٹا آدمی آئے تو اس کا کوئی تعارف نہیں کراتا۔گویا آپ کا سلام بڑے آدمی کو تو ہو گا چھوٹے کو نہیں ہوگا، یہ خود ایک تکبر ہے کہ چھوٹوں کو منہ نہ لگایا جائے اور بڑوں کے سامنے جھکے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سواری پر سوار جا رہا ہو اور لوگ سڑک پر سامنے بیٹھے ہوں۔تو سوار ہونے والے کا فرض ہے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سلام کرے۔اپنے اندر خاکساری پیدا کرے۔ایسی صورت نہ پیدا ہونے دے جس میں یہ انتظار ہو کہ یہ مجھے سلام کریں۔کیونکہ یہ میرے سے چھوٹے ہیں یہ چھوٹائی بڑائی کہاں کی؟ آدمی خود ہی چھوٹا ہے۔بڑا اللہ ہے۔سب سے بڑی ذات وہ ہے۔اس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔اس لئے ہر شخص یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں اور وہ بڑا ہے جب یہ سمجھے گا تو سلام کی ابتداء کرنے کی کوشش کرے گا۔اس لئے سلام کے آداب میں سے یہ ہے کہ جب دو آدمی ملیں تو یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرا مجھے سلام کہے کوشش کرے کہ پہلے میں سلام کہوں۔یہ زیادہ افضل ہے نہ کہ انتظار کرے کہ دوسرا مجھے سلام کرے۔اسی کو فرمایا گیا: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ① رحمٰن کے بندے جب چلیں تو خاکساری کی چال چلیں اور جب لوگوں سے ملیں تو سلام کی عادت ڈالیں۔اگر نیک لوگ ہیں تو سلامتی کی دعا ہوگی۔اگر برے اور جھگڑالو لوگ ہیں۔تو یہ سلام رخصت کا ہوگا کہ بھئی! ہمارا سلام ہم جاتے ہیں۔ہم ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔تو سلام ہر صورت میں انسان کے لئے لازم رہا۔

پھر یہ اتنی پاکیزہ چیز ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: ''لاتسلموا تسليم اليهود والنصارى فان تسليمهم بالاكف والرؤس والاشارة'' ② یہودیوں کا سلام انگلیوں سے ہے، نصاریٰ کا سلام ہتھیلی سے ہے اور مسلمانوں کا سلام ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ'' ہے۔تو یہود و نصاریٰ کا سلام اشارہ محض ہیں اور مسلمانوں کا سلام ایک مستقل وعام ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں، برکتیں تم پر نازل ہوں۔ہر مسلمان جو دوسرے کو دعا دے۔اس سے اس کی خیر خواہی اور محبت ظاہر ہوگی۔تعلق بھی مضبوط ہو جائے گا۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآية: ۶۳۔ ② الجامع للترمذی، کتاب الاستئذان والآداب، باب ماجاء فی کراهية اشارة اليد بالسلام ج: ۹ ص: ۳۱۷.

وہ مثل مشہور ہے کہ کسی آدمی کے سامنے کوئی جن آ گیا۔ تو اسے خطرہ لاحق ہو گیا کہ یہ تو کھا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا ماموں جان! سلام۔ اس نے کہا بھانجے وعلیکم السلام اور کہا کہ میرا ارادہ تجھے کھانے کا تھا۔ لیکن تو نے ماموں کہا اور سلام کہا۔ میرے دل میں رحم آ گیا۔ میں نے چھوڑ دیا اب تو آزاد ہے جہاں چاہے جا چلا جا۔ تو سلام نے جان بچائی یہی صورت دشمن کی بھی ہے۔ اگر کسی سے پکی دشمنی ہے اور آپ کہیں السلام علیکم وہ پسیج جائے گا دشمنی ڈھیلی پڑ جائے گی تو یہ بہت بڑی نعمت اور عظیم دعا ہے۔

تو زندگی گزارنے کے طریقے میں پہلی چیز چال ہے دوسری چیز قال ہے کہ قال میں دعا ہو، چال میں تواضع ہو اور جھگڑالوؤں سے بھی جب کلام کرو، سلام کے ساتھ کرو کہ ﴿سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ﴾ ① ہمارا سلام ہو، ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔ گویا اسلامی شریعت نے رہن سہن کے لئے ابتدائی دو چیزیں بتلائیں۔ ایک زبان کو قابو میں رکھو، دوسرے قدم کو قابو میں رکھو۔ بے ڈھنگا چلو بھی مت اور کلام بھی مت کرو۔

رحمٰن کے بندوں کی تنہائی...... یہ تو لوگوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ اب آگے اور چلے تو آ گئی مسجد۔ یا تنہائی آ گئی یا رات کا وقت آ گیا جس میں لوگوں کے ساتھ اختلاط نہیں، پھر کیا کرے آگے اس کی ہدایت دی ﴿وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا﴾ ② رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ رات گزارتے ہیں تو سجود اور قیام کے ساتھ گزارتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہیں، کبھی قیام اور رکوع میں ہیں، اللہ کی یاد کرتے ہیں، اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ گویا مخلوق کے آگے مہذب بن کر آتے ہیں اور خدا کے سامنے عابد بن کر آتے ہیں، یہاں عبادت کی ضرورت ہے، وہاں شفقت کی ضرورت ہے۔ شفقت کا اثر یہ ہے کہ سلام کرے اور عبادت کا اثر یہ ہے کہ سجدہ و رکوع کرے۔ ناک اور پیشانی کو اللہ کے سامنے سجدے میں رگڑے۔

یہ گویا جانی عبادت بتلائی گئی کہ جب تم اپنے گھر میں آؤ۔ یعنی مسجد میں تو سبھی عبادت کرتے ہیں، اس کو تو ساری دنیا جانتی ہے ہے۔ لیکن اگر گھر میں مبیت (رات گزارنے) کے لئے آؤ۔ مبیت کہتے ہیں رات گزارنے کو۔ رات گزارنے میں ہر انسان تنہا ہوتا ہے جب سو گیا تو وہ تن تنہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جاگتا ہوا ہوگا، مجلس کرے گا۔ دوستوں میں بیٹھے گا، باتیں بھی کرے گا اور جب سو گیا تو ایک لاکھ آدمی اگر ایک جگہ سوئے ہوئے ہیں، ہر ایک ان میں سے تن تنہا ہے۔ اس وقت ہر ایک کا سابقہ اللہ کے ساتھ ہے۔ بندوں کے ساتھ نہیں۔ اس واسطے اس موقع کا ادب بتلایا کہ جب تم تن تنہا ہو اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس وقت سجود و قیام اور طاعت و عبادت کو اپنا شیوہ بنالو تا کہ تمہاری بندگی نمایاں ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں کہ "ثَلٰثُ دَرَجَاتٍ" تین چیزیں ہیں جن سے انسان کے

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۵.

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۴.

درجات بلند ہوتے ہیں۔ عند اللہ بھی اس کا رتبہ اونچا ہے اور خلقت کے نزدیک بھی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ ''اِفْشَآءُ السَّلَامِ وَ اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالصَّلٰوۃُ بِالَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ'' ① سب سے پہلی چیز افشاء السلام ہے۔ یعنی مخلوق کو سلام کرنا ہے۔ اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اتنی بلندی کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہوگا اسے اللہ جانے یا بندہ آخرت میں جانے گا۔ دنیا میں یہ ہے کہ کثرت سلام سے لوگوں کے دلوں میں عزت ووقار پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز فرمائی: ''اِطْعَامُ الطَّعَامِ...... '' حاجت مندوں کو کھانا کھلانا۔ اس میں مسکین، غریب، سائل، مسافر، مہمان سبھی آتے ہیں۔ کھانا کھلانا سب کے لئے عام ہے۔ یعنی حقوق قائم کر دیئے گویا یہ فرمایا گیا کہ اس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ خواہ کوئی سائل بن کر آئے مہمان بن کر آئے یا ان میں سے کوئی نہ ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ فلاں حاجت مند ہے۔ ازخود آپ اس کو کھانا کھلائیں۔ اس سے بھی درجات بلند ہوتے ہیں۔

تیسری چیز رات کو نماز پڑھنا، جب کہ دنیا پڑی سو رہی ہو۔ اس لئے کہ یہ نماز انتہائی خلوص کی ہوگی۔ نہ اس میں نام ونمود کا جذبہ ہوگا نہ ریاء وشہرت پسندی کا جذبہ ہوگا نہ لوگوں کو دکھلاوے کے لئے ہوگی۔ دکھلاوے بھی کس کو؟ سب تو سو رہے ہیں، لوگوں کو کچھ خبر نہیں۔ اس وقت جو نماز پڑھتا ہے تو بجز اس کے کہ اللہ ہی کی محبت اس کو اٹھا کر جگائے اور کچھ نہیں۔ علماء لکھتے ہیں کہ جس کو بھی جو کچھ ملا ہے وہ رات کی نماز سے ملا ہے۔ دنیا بھی ملی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ آخرت بنی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا﴾ ② سکون وآرام کا وقت وہ رات ہی کا وقت ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تہجد آداب صالحین میں سے ہے کیونکہ دن میں ریاکاری اور دکھلاوے کا وہم ہوسکتا ہے۔ رات کی نماز میں دکھلاوے اور ریاکاری کا کوئی دخل نہیں۔ غرض جس کو جو ملا وہ رات کی نماز سے ملا۔

حدیث میں ہے کہ چند باتیں ایسی ہیں کہ ان سے اللہ کو ہنسی آتی ہیں جیسی ہنسی اس کی شان کے مناسب ہے۔ یہ ایسی ہنسی نہیں جیسے ہم اور آپ ہنستے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جسم سے پاک ہے مگر ہماری جسمانی ہنسی کی حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں کوئی خوشی پیدا ہو جب ہنسی آتی ہے۔ غم دل میں بھرا ہوا ہو تو کون ہنسا کرتا ہے۔ تو رونا غم کی اور ہنسنا خوشی کی علامت ہے۔ غرض خوشی ایک کیفیت ہے۔ اسے ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے ہنسی رکھ دی چونکہ ہمارے پاس بدن ہے۔ تو جب اندر خوشی ہے تو باہر بدن پر ہنسی آتی ہے۔ حق تعالیٰ چونکہ بدن وصورت سے پاک ہیں۔ اس لئے جب اس کو بیان کریں گے تو کہیں گے، ہنسی درست ہے مگر ہنسی کا وہ مطلب نہیں ہوگا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

تو حدیث میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔ ایک میدان حج میں جب ننگے سر، ننگے پاؤں، گرد پڑا ہوا، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، نہ خوشبو اور نہ زینت اور لبیک لبیک کہتے ہوئے بندے پھر

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغیر المعرفة ج: ۱۹ ص: ۲۵۲ رقم: ۵۷٦۷.
② پارہ: ۲۹، سورۃ المزمل، الآیة: ٦.

رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کو اس موقع پر ہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان کو ان کے گھروں سے نکال کر لائی ہے۔ بیوی بچے چھوڑے، وطن چھوڑا۔ آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح سے بے وطن ہوئے ہیں؟ میری محبت میں ہی تو پھر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ ہنستے ہیں اور ملائکہ سے کہتے ہیں کہ تمہیں گواہ کرتا ہوں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ یہ میری محبت میں گھر وبار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں کریم ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ گھر بار چھوڑ دیں اور میں توجہ نہ کروں۔ میں نے ان سب کی مغفرت کی تو خوش ہوکر مغفرت فرماتے ہیں۔ اس خوشی کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری ہنسی کب آتی ہے؟ جب مکبّر تکبیر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کے آرہے ہیں کہ صف اول میں جگہ ملے۔ ہر ایک کہتا ہے مجھے ملے گویا ایک قسم کا جھگڑا ہے اور آگے پیچھے ہونے کی دوڑ ہے۔ حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یہاں کوئی مٹھائی روٹی نہیں مل رہی؟ یہ آخر کیوں دوڑ رہے ہیں؟ یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں، یہ میرا دربار جان کر آئے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا بھی قریب ہو جائیں گے اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے خوش ہو کر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

اور تیسرا موقع کون سا ہے؟ فرمایا گیا کہ خاوند اور بیوی پڑے ہوئے سو رہے ہیں۔ اچانک خاوند کی آنکھ کھلی اور اس کا جی چاہا کہ تہجد پڑھوں۔ اس نے بیوی کے منہ کے اوپر پانی کا چھینٹا مارا وہ ہڑبڑا کے اٹھی اس نے کہا کیا مصیبت آئی ہے۔ خاوند نے کہا دو رکعت نفل پڑھ لے تہجد کا وقت ہے حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے۔ آرام سے میٹھی نیند سو رہی تھی ایک دم گھبرا کے اٹھی کہ بارش تو نہیں آ گئی۔ خاوند نے کہا۔ بارش تو نہیں مگر دو رکعت پڑھ لے تو یہ آگے سے کہتی ہے کہ میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی۔ اس نے بھی کھڑے ہوکے دو رکعتیں پڑھیں یا بیوی نے خاوند کے منہ پر چھینٹا مار دیا اور وہ ہڑبڑا کے اٹھا تو یہ موقع بھی حق تعالیٰ کی ہنسی کا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ کی انتہائی رضا کا وقت ہے۔ اس واسطے اس کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔

تو یہ جو فرمایا گیا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ① کہ جب رات تنہائی میں گزارتے ہیں تو کبھی سجدہ رکوع میں اور کبھی تلاوت میں ہیں۔ اس پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کسی کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو میں بڑا عابد زاہد ہوں۔ کسی کو دکھلانے کے لئے یہ نہیں اٹھا۔ یہ صرف مجھے دکھلانے اور میری رضا کیلئے اٹھا ہے۔ میں کریم ہوں۔ میں بخشتا ہوں اور مغفرت کرتا ہوں۔ اب گویا تین باتیں ہوئیں گھر سے نکلو تو تواضع کی چال چلو، قال ہو تو سلامتی کا کلمہ ہو، بُرے کلمات نہ ہوں، جاہلانہ باتیں نہ ہوں اور رات گزارو تنہائی میں جب کہ کسی انسان سے سابقہ نہیں، تو سجود و قیام اور اللہ کے ذکر و اطاعت کرو۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۴۔

رحمٰن کے بندوں کی زبان سے عبادت...... یہ تو عمل ہے کہ قیام کرلیا، سجدہ کرلیا اور قلب کے جذبات کیا ہونے چاہئیں؟ ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ﴾ ① دل میں خوف بھرا ہوا ہو، زبان پر اس کو ادا کرے اور یہ دعا کرے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب ہٹا دے اس کو ہمارے سے دور رکھ۔ ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ② اس لئے کہ یہ عذاب گلے کا ہار ہے۔ جب لٹک جائے گا تو اس کا جدا ہونا مشکل ہوگا۔ کسی کے بس میں نہیں ہوگا کہ اس عذاب کو دور کرے۔ اللہ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے تو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔ آخرت تو آخرت دنیا میں بھی حق تعالیٰ اگر کسی کو عیاذاً باللہ مبتلا کردیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں ملتی۔ جب تک اللہ ہی پناہ نہ دے کسی قوم کو گھیرے تو چاروں طرف سے راستے بند ہوجاتے ہیں۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے اللہ ہی پناہ دے اور مخرج پیدا کردے اور آخرت میں تو اسباب کا ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو سارا کارخانہ مسبّبُ الأسَباب کا ہے۔ اس لئے بڑا ڈر وہاں کا ہے۔ اس لئے کہ یہاں اگر آدمی مبتلا ہوجائے تو کم سے کم خیال تو باندھ لے گا کہ شاید کل کو چھٹکارا ہوجائے، شاید پرسوں کو وہاں تو خیال پر بھی پابندی ہوگی کہ راحت کا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو انتہائی قید و بند ہے کہ دل بھی گرفتار، زبان بھی گرفتار، ہاتھ پیر بھی گرفتار کوئی پناہ کی جگہ نہیں یہ ہے عذاب جہنم۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم ایک تو بدن سے عمل کرو۔ یعنی سجود اور قیام کرو اور ایک زبان سے یہ دعا پڑھو۔ ﴿رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ③

غرض پہلے قدموں کو لیا کہ انہیں ٹھیک ڈالو کہ چال درست ہو۔ پھر بدن کو لیا کہ سجدے اور قیام میں لگو۔ پھر زبان کو لیا کہ سلامتی کی بات کرو۔ اللہ سے دعائیں کرو ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ ④ اس لئے کہ جہنم جسے کہتے ہیں وہ بدترین ٹھکانا ہے اللہ اس سے پناہ دے اور نجات عطا فرمادے۔ اب گویا قول، بدن اور قدم کی سب عبادتیں آگئیں۔

مالیات کے سلسلہ میں رحمٰن کے بندوں کی شان...... اب اس سے آگے انسان کے وسائل اور اسباب ہیں جن کو مالیات کہتے ہیں۔ نقد، سامان، گھر بار یہ سب اموال کہلاتے ہیں۔ جب ہم اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہمارا سامان بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جان اور بدن سے عبادت کریں مال سے نہ کریں، مال اسی کی چیز ہے اس نے ہمیں دیا۔ یہ اس کا فضل ہے مگر اصل مالک وہ ہے۔ تو فرمایا جب بدن سے فارغ ہوگئے۔ بدن کا، قدموں کا، زبان، ہاتھ، پیر اور سونے جاگنے کا ڈھنگ معلوم ہوگیا۔ اب ایک چیز رہ جاتی ہے جو مالیات ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ ⑤ رحمٰن کے

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵۔

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۶۔

⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۷۔

بندوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ ان کو مال و دولت دے تو وہ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ تو بخیل بنیں کہ ایک پائی بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلے نہ فضول خرچ کریں کہ بے جا اپنی دولت خرچ کر کے محض اپنے نفس کی راحتوں میں گنوا دیں۔ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ اسراف کریں نہ تقتیر کریں۔ اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں۔ ''تَقْتِیْر' اِمساک'' اور ''بُخل'' کو کہتے ہیں۔ جس طرح اور جگہ فرمایا گیا ﴿ وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴾ ① نہ تو اپنے ہاتھ کو اتنا سکیڑو کہ تمہارا ہاتھ مونڈھے کو لگ جائے کہ دینے کے لئے کچھ نہیں اور نہ اتنا پھیلاؤ کہ جو کچھ ہے سب دے ڈالو کل کو بھیک مانگنے لگو۔ دونوں چیزیں ممنوع ہیں۔ درمیانی چال یہ ہے کہ دو بھی اور نہ بھی دو۔ یعنی یہ پہچان کر کہاں دینا جائز ہے کہاں ناجائز ہے۔ کہاں موزوں ہے کہاں ناموزوں ہے کہاں دینا حق ہے۔ کہاں دینا ناحق ہے۔ لہو ولعب' کھیل تماشے میں مت دو۔ وہاں بخیل بن جاؤ۔ یہی بہتر ہے اور اگر عمل خیر ہو یہاں دینا بہتر ہے جب آدمی اعتدال کے ساتھ خرچ کرے گا تو حدود معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی کہ کہاں خرچ کروں کہاں نہ کروں؟

اسلام کا اصول ہی اعتدال ہے، عمل میں بھی اعتدال ہو۔ چنانچہ یہ اسراف ہے کہ آدمی نفل پڑھنے پر آئے تو ساری رات پڑھتا رہے اور جب چھوڑ کے بھاگے تو فرضوں کی بھی خیر نہیں۔ یہ اچھی چیز نہیں، عبادت کرے، نفل پڑھے۔ مگر اس طرح کہ پھر عمر بھر اس کو نبھائے۔ اسی کو فرمایا گیا: '' خَیْرُ الْاُمُوْرِ مَادِیْمَ عَلَیْہِ ② آدمی کا بہترین عمل وہ ہے، جس پر وہ ہمیشگی کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ ''نہ دوڑ کے چلے نہ اکھڑ کے گرے'' چلے تو آدمیوں کی طرح چلے۔ نہ دوڑے نہ بالکل ضعیف بن جائے بیچ کی چال چلے۔ اسی کو فرمایا گیا کہ نفل، تلاوت، ذکر کرنے میں اعتدال ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ ایک قرآن روز ختم کیا کروں؟ فرمایا: ہرگز نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا کم کرو، عرض کیا: یا رسول اللہ! دو دن میں ایک ختم کر لیا کروں گا؟ فرمایا: نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ دس پارے روز پڑھوں اور ہر تیسرے دن ختم کروں؟ فرمایا: نہیں! نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک منزل روزانہ پڑھ لیا کروں؟ آپ نے زیادہ خوشی سے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ مگر جب اصرار دیکھا تو فرمایا اچھا۔ عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب میرا بڑھاپے کا زمانہ آیا۔ اب مجھے قدر ہوگئی کہ پانچ پارے روز بھی نہیں پڑھ سکتا تھا تو میں کہتا تھا کہ اگر میں روز کا ایک قرآن شریف شروع کر دیتا۔ تو چھوڑتے بن پڑتی اور محرومی اختیار کرتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی سچی بات فرمائی تھی۔ کیسی پاک نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی منشاء نہیں تھا کہ پانچ پارے روزانہ پڑھوں مقصد نبھانا تھا۔ اب ان پانچ کا نبھانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے آدمی کام اتنا کرے جو نبھ سکے۔ ③

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۹۔ ② الحدیث اخرجہ الامام الترمذی ولفظہ: کان احب العمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مادیم علیہ، کتاب الادب، باب ماجاء فی الفصاحۃ، ج: ۱۰، ص: ۷۸، رقم: ۲۷۸۳۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان تفاضل الاسلام... ج: ۱ ص: ۱۴۷۔

حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں، یہ مسجد نبوی میں عبادت کیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے دیکھا کہ چھت میں ایک رسی لٹک رہی ہے۔ فرمایا: یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا گیا کہ امّ سلمہ رضی اللہ عنہا عبادت کرتی ہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہیں، اونگھ آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا لے کر بیٹھتی ہیں، پھر عبادت کرنے لگتی ہیں۔ فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آئے پڑ کے سو جاؤ۔ جب سو کر اٹھو بشاشت ہو۔ پھر اللہ کو یاد کرو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ نیند آرہی ہے، اونگھ آرہی ہے۔ کہیں رسی کی آڑ، کہیں دیوار کی آڑ۔ اس تصنع اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ اتنا کام کرو جتنا نبھ جائے۔ تو اقتصاد یعنی عمل میں میانہ روی یہ معتبر ہے۔ خواہ جان کے خرچ کرنے کا عمل ہو یا مال کے خرچ کرنے کا، اعتدال ہونا چاہئے۔

رحمٰن کے بندوں کی قلبی عبادت...... یہاں تک گویا اعمال آگئے۔ چال ایسی ہو، سلام کرنا ایسا ہو وغیرہ۔ یہ گویا ہاتھ، پیر اور زبان کی عبادت آگئی۔ آگے قلب کی عبادت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس مبداء اور معاد کے درمیان میں جو زندگی گزارو تو دل کیسا ہونا چاہئے۔ دل کی عبادت کیا ہو؟ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ کو پکاریں تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، کسی کو ساجھی نہ ٹھہرائیں، نہ اس کی ذات میں نہ صفات میں اور نہ ہی افعال میں۔ ذات بھی اس کی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ صفات وکمالات بھی اس کے یکتا ہیں کہ کوئی اس جیسا نہیں۔ افعال میں بھی وہ یکتا ہے کہ کوئی اس جیسا نہیں۔

ذات لامحدود ہے پس اس کی حد نہیں اس کے سوا جو بھی ہے اس کی ایک حد ہے۔ سب سے بڑی مخلوق انسان ہے۔ مگر اس کی ایک حد ہے۔ ڈیڑھ گز کے اندر ہے اس سے باہر نہیں ہے۔ ہم ایک حد میں ہیں اس سے آگے نہیں ہیں۔ آپ اپنی حد میں ہیں اس سے باہر نہیں۔ میں اپنی حد میں ہوں اس سے باہر نہیں ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جہاں جاؤ وہ موجود، کہیں پہنچ جاؤ وہ موجود ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور ان کی تہوں میں گھس جاؤ تب اللہ موجود ہے، اس کے وجود کی کوئی حد نہیں ہے۔ تو اللہ کے سوا کون ہے کہ اس کے وجود کی حد نہ ہو۔ جیسے دیکھو اس کی ایک حد ہے۔ پہاڑ ہیں گو کتنے بڑے ہیں، مگر ایک حد میں ہیں۔ سمندر ہیں ان کی ایک حد ہے۔ جہاں کنارہ آ گیا سمندر ختم ہو گیا آگے زمین شروع ہو گئی۔ یہ نہیں کہ سمندر ہر جگہ موجود، آسمانوں، زمینوں، فضا میں بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے اپنے دائرے کے اندر ہے۔ زمین اپنے دائرے میں ایک حد میں ہے۔ حد سے آگے کچھ نہیں ہے اور اللہ کی ذات اس کی کہیں حد نہیں ہے کسی عالم میں پہنچو اللہ کی ذات موجود ہے۔ اس جیسی دوسری ذات نہیں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

اسی طرح اس کی صفات بھی یکتا ہیں۔ مثلاً: اس کی صفت علم ہے۔ آپ کا علم ہوگا کہ سو مسئلے معلوم ہوں گے، ہزار ہوں گے، دس ہزار معلوم ہوں گے۔ اس کے بعد پھر جہالت آگے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اللہ کی ذات کا علم لامحدود ہے کوئی ذرہ نہیں ہلتا کہ اسے علم نہ ہو۔ کوئی پتہ نہیں حرکت کرے گا کہ اس کے علم میں نہ ہو۔ آپ کی اور ہماری قدرت

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸.

ایک حد میں ہے۔ہم یہ لاؤڈ اسپیکر اٹھالیں گے، جائے نماز تہہ کر کے اٹھالیں گے۔لیکن اگر کوئی کہے کہ مسجد کو اٹھالو۔ آپ ہم کہہ دیں گے کہ یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے ہمارے بس میں نہیں ہے۔ایک جن مسجد کو اٹھالے گا لیکن اس کو اگر کہا جائے کہ ساری زمین کو اٹھالے وہ کہے گا میرے قبضے میں نہیں۔ملائکہ علیہم السلام زمین کا ایک ٹکڑا اٹھا کے پھینک دیں۔جبرئیل علیہ السلام نے لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں الٹ دیں۔لیکن ان سے کہا جائے کہ آسمانوں کو پلٹ دو۔وہ کہیں گے میری قدرت ہی نہیں۔غرض بڑے سے بڑے طاقت والے کی طاقت کی ایک حد ہے۔مگر اللہ کی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے،قدرت،علم،سماعت،بصارت ساری صفات اس کی ایسی ہیں۔

ایسے ہی وہ اپنے افعال میں بھی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی بھی نہیں کرسکتا۔وہ ماں کے پیٹ میں بچے کو بنا دیتا ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔اس نے چاند،سورج بنائے ہمارے آپ کے بس میں نہیں ہے۔ساری زمین کے حکماء ملیں تو چاند تو بڑا اونچا ہے زمین کا ایک ذرہ بنا دیں۔جس میں وہ خاصیتیں ہوں جو اللہ کی زمین میں ہیں۔زمین کے ٹکڑوں کو جوڑ توڑ کر کچھ بنالیں گے لیکن خود زمین کی ایجاد کریں ایک ذرہ بھی نہیں کرسکتے۔ساری دنیا کے فلاسفر جمع ہو جائیں سورج کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے اور اللہ نے بنایا ہے۔معلوم ہوا اس جیسا فعل کوئی نہیں کرسکتا۔

تو ذات،صفات اور افعال سب کچھ یکتا اور بے مثل ہے۔اس لئے جب جھکیں گے تو اس کے آگے جھکیں گے۔اگر اس کا کوئی شریک اور ساجھی ٹھہرالیں تو یہ کیسے درست ہوگا؟ کیوں کہ جب اس کی ذات وصفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں تو عبادت میں کون شریک ہوسکتا ہے؟ سب عبادتیں اسی کے لئے ہوں گی۔سجدہ،رکوع اور فریاد اسی کے سامنے کریں گے۔رزق،اولاد اسی سے مانگیں گے اس کی ذات کے سوا دینے والا کوئی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام اتنے مقدّس بندے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ افضل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ساری کائنات سے آپ برتر ہیں۔لیکن عبدیت کا یہ حال ہے کہ آپ سے یہ فرمایا گیا کہ تم خود اپنی زبان سے کہو ﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ ''اے پیغمبر! اعلان کرو کہ میں نہ تمہارے نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا''۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کر کے فرمایا: ''یَا فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ لَآ اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا'' ① ''اے فاطمہ! بیٹی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے قبضے میں کچھ نہیں ہے تیرے اندر ایمان اور عمل ہوگا تو نجات پا جائے گی میں نجات نہیں دلاسکوں گا۔نہ دنیا میرے قبضے میں ہے نہ آخرت''۔جب سیدّ الاوّلین والآخرین یہ فرمائیں کہ میرے بس میں کچھ نہیں تو میں آپ کیا چیز ہیں؟ پوری مخلوق کیا چیز ہے؟ جو اس سے نمٹ لے۔بالکل کسی کے بس میں کچھ نہیں۔تو اسی کو مانو،جس کے بس میں سب کچھ ہے وہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الوصایا، باب هل یدخل النساء والولد فی الاقارب ج: ۹ ص: ۲۹۱۔ حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۸ ص: ۲۱۸ رقم: ۳۷۱۸۔

اللہ کی ذات ہے۔

ہارون الرشید کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ اس وقت قحط پڑا۔ ایک دیہاتی آیا کہ میں بھی جا کر بادشاہ سے کچھ مانگوں۔ تا کہ میری اصلاح حال ہو بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ میں جا کر بادشاہ سے کہوں کہ اپنے خزانے سے مجھے کچھ دے۔ جب آیا تو دیکھا کہ ہارون الرشید نماز میں مصروف ہے۔ تو چوب دار نے کہا ذرا ٹھہر جا۔ یہ دیہاتی بے چارہ ٹھہر گیا۔ ہارون الرشید جب سلام پھیر چکے اور دعا مانگ چکے تو ہارون الرشید نے پوچھا کہ چودھری صاحب کیوں آئے؟

چودھری صاحب نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیوں آیا پہلے یہ بتا کہ تو کر کیا رہا تھا یہ کیا بات تھی۔ اس نے کہا میں اپنے اللہ کے آگے جھک رہا تھا۔ اس نے کہا اچھا تیرے سے بھی کوئی بڑا ہے؟ اس نے کہا میرے سے بڑے اللہ میاں ہیں۔ میں ان سے مانگتا ہوں۔ بس دیہاتی وہیں سے لوٹا کہ مجھے تجھ سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے کیوں نہ مانگوں، جس سے تو مانگ رہا ہے۔ جب تو بھی اس کا محتاج ہے تو میں محتاج کا محتاج کیوں بنوں؟ حقیقت یہی ہے کہ سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ وہی سب کے کام کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کو دے سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔ وہی دیتا ہے، اسی کو چھیننے کی قدرت ہے۔ آدمی کو اگر کچھ لینا ہے تو اپنے معاملے کو اللہ میاں سے درست کرے سب کچھ مل جائے گا۔ ان سے بگاڑ لی تو ملا ملایا بھی چھن جائے گا۔

ہارون الرشید ایک دفعہ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہی کا جوش جو آیا تو ہارون الرشید نے کہا آج جس کا جو جی چاہے مانگے اسے وہی دوں گا۔ بس لوگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دو۔ اس نے کہا دے دیا کسی نے کہا مجھے فلاں صوبے کی گورنری دے دیجئے اس نے کہا دے دی۔ کسی نے کہا، مجھے وائسرائے بنا دیجئے۔ اس نے کہا بنا دیا۔ کسی نے کہا مجھے قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا دے دیا۔ جو جس نے مانگا۔ ہارون نے حکم دیا کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ ہارون الرشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے گردن پھیر کر باندی سے کہا کہ تو نے کچھ نہیں مانگا۔ سب درباری مانگ رہے ہیں۔ باندی نے کہا ان بے وقوفوں سے نمٹ لیجئے۔ بعد میں میں بھی مانگوں گی۔ اس نے کہا۔ اچھا! یہ میرے وزراء، امراء سب بے وقوف، پاگل اور احمق ہیں۔

ہارون الرشید کو برا معلوم ہوا کہ اس نے میرے سارے وزراء، امراء کو پاگل بنا دیا۔ ان امراء کو بھی برا لگا۔ مگر امیر المومنین کی باندی تھی اس لئے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال اس نے کہا کہ پہلے یہ احمق لے لیں۔ اس کے بعد میں بھی آپ سے مانگوں گی۔ جب سب درباروالوں کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ ہارون نے کہا، اب مانگ کیا مانگتی ہے؟ اس نے کہا، جو کچھ میں مانگوں گی آپ دے سکیں گے۔ ہاں میں دوں گا۔ میرا اعلان ہے ضرور دوں گا۔ اس نے ہارون الرشید کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ جب آپ میرے ہو گئے تو ملک، قلعے، دولت اور خزانے سبھی کچھ میرے ہیں۔ یہ سارے بے وقوف تھے۔ اس لئے کہ جس نے خزانہ لیا۔ اسے خزانہ

مل گیا آ گے کچھ بھی نہیں قلعہ مانگا، قلعہ مل گیا۔ باقی کچھ نہیں کسی نے گورنری مانگی، گورنر بن گیا باقی کچھ نہیں۔ تو انہوں نے ایک ایک چیز مانگی اور میں نے وہ چیز مانگی کہ ساری چیزیں میرے قبضے میں آ جائیں۔

یہی شان اہل اللہ اور اہل دنیا کی ہے۔ مثلاً اہل دنیا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! مجھ کو لکھ پتی بنا دیجئے یا کروڑ پتی بنا دیجئے۔ تو وہ بنا دیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ مجھے جاگیر دے دیجئے۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ دے دی۔ اللہ والے کہتے ہیں کہ آپ میرے ہو جائیے تو سب کچھ میرے قبضے میں ہے۔ وہ کروڑ پتی بھی ہے، لکھ پتی بھی ہے۔ تو دانش مندی کی بات یہ ہے کہ جڑ اور بنیاد کو آدمی پکڑے۔

اس لئے آدمی کو اگر مانگنا چاہئے تو اللہ سے مانگے۔ اس سے کیا مانگے جو خود مانگنے والا اور محتاج ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو تنہا اللہ کی ذات کو پکارتے ہیں کسی کو بھی ساجھی نہیں سمجھتے، اس لئے کہ اللہ کا کوئی اور مددگار تو نہیں ہے۔ جب انھوں نے آسمان بنایا تھا تو کسی سے کہا تھا کہ اتنا کام تم کردو، اتنا کام میں کرلوں گا۔ جب پیٹ میں بچے کو بنایا تھا تو کیا کسی سے مدد مانگی تھی کہ آ تو بھی شریک ہو جا۔ مجھ اکیلے سے نہیں بنتا، تو شریک ہو جائے گا تو بن جائے گا۔ جب کسی کام کی تخلیق میں کوئی شریک نہیں ہے تو عبادت میں کیسے شریک ہو گئے؟ وہ تنہا بناتا ہے تو تنہا وہ معبود بھی ہوگا۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ② ''تنہا آپ ہی کی عبادت کریں گے۔ تنہا آپ ہی سے مدد مانگیں گے''۔ مسلم کو اللہ نے یہ شان دی ہے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ یہ ذلت پیش کرے گا تو اللہ کے سامنے کرے گا۔ بندہ بندہ کے آگے ذلیل ہونے کے لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ اسی واسطے شریعت نے بھیک مانگنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ کوئی کسی کے آگے بھیک نہ مانگے۔ اس لئے کہ مانگنے سے زیادہ ذلت کسی چیز میں نہیں ہے۔ بھیک مانگنا اپنے کو بے آبرو کرنا ہے۔ بندہ کو حق نہیں ہے کہ اپنے جیسے بندے کے آگے بے آبرو بنے۔

ایک دوستی میں مانگنا ہے۔ جیسے آپ کسی سے بے تکلفی میں یوں کہیں کہ بھئی! یہ چیز مجھے دے دو۔ یہ تعلق کو بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ ③ فرماتے ہیں اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھروں میں جس طرح تمہارا جی چاہے کھا سکتے ہو۔ ماں کے گھر سے مانگ کے کھا سکتے ہو۔ نہ مانگنا تکبر اور مانگنا تعلق کی علامت ہوگا۔ باپ، حقیقی بھائی، بہن، چچے، پھوپھی، ماموں، خالہ یا ایسے گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھر سے بھی مانگ کر کھا سکتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ ان سے مانگ کرلو گے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ جب انہوں نے اپنا سمجھا، جب مانگا۔ کوئی دنیا کے آگے تو

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸. ② سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ: ۵. ③ پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱.

یہ مانگنا نہیں پھرتا۔ اس طرح بے تکلفی سے اگر کوئی مانگ لے تو یہ بجائے بے آبروئی کے آبرو کا ذریعہ بنتا ہے اور تعلق کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک ہے بھیک مانگنا یعنی محتاج و مفلس بن کے کسی کے آگے آنا کہ تم ہمارا کام پورا کردو۔ ہم تو کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اس ذلت کے اظہار سے ممانعت کی گئی ہے۔ وقار کے ساتھ مانگنا جو ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ بہر حال سوال میں چونکہ ذلت تھی کہ ایسی ذلت صرف اللہ کے آگے اختیار کی جاسکتی ہے، غیر کے آگے نہیں۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے اور مانگو تو صرف خدا سے مانگو۔ فریاد اس سے کرو۔ اولاد، رزق، صحت سب کچھ اس سے مانگو۔

اس لئے کہ ہر چیز کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں۔ اس لئے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو اللہ کے سوا کسی کو شریک نہیں مانتے۔ تنہا اسی کو پکارتے ہیں۔

حقوق العباد کے بارے میں رحمٰن کے بندوں کے طرزِ عمل...... تو یہاں تک چال ڈھال، زبان، ہاتھ، پیر، مال و دولت اور روح کی سب عبادت آ گئی۔ اب آگے دوسرے کے ساتھ معاملہ، دوسرے کے حقوق کو بتلایا گیا اس بارے میں رحمٰن کے بندوں کی کیا شان ہے؟ ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ② ''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو ناحق قتل نہیں کرتے''۔ کہ کسی کی جان لے لی، کسی کی گردن اڑا دی۔ یہ رحمٰن کے بندوں کی شان نہیں ہے۔ یہ فُسّاق و فُجّار کی شان ہے کہ دوسروں کو اِیذا پہنچائیں۔ اپنی بڑائی جتلانے کے لئے دوسروں کی حقارت چاہیں معاملات میں دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ یہ متکبروں کی شان ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ دنیا میں اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ہیں۔ لیکن دنیا ہی میں ایسے لوگوں کا انجام برا ہو جاتا ہے۔ جو دوسروں کی تحقیر کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

ہاں اللہ ہی حکم دیں کہ قتل کرو، پھر قتل کرنا فرض ہے جیسے قصاص میں قتل کریں۔ کسی نے ناحق قتل کیا تھا تو سزا میں اس کا قتل کرنا یہ جائز ہے۔ یا کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے۔ اس کا قتل کردینا جائز ہے یا اسی طرح سے کوئی زنا کار ہو پتھروں سے سنگسار کردینا۔ یہ اس کا قتل کردینا ہے یہ بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے پتھروں سے قتل کیا جائے۔ غرض زنا کاری یا قاتلوں کو دنیا سے پاک کرنے کے لئے یا مرتدین جو دین کی کوئی اہمیت نہ سمجھیں اور اپنے دین کو بدل ڈالیں۔ ایسے لوگوں سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے قتل کرنا جائز ہے یہ قتل حق ہے۔ ناحق وہ قتل ہے کہ قتل کا کوئی استحقاق نہیں تھا اور چار پیسے کی خاطر گردن ماردی یا ڈاکہ ڈالنا تھا جاکے قتل کردیا۔ یا جذبہ آیا لڑائی شروع ہوئی۔ اِدھر سے بھی چھری نکل آئی، اُدھر سے بھی نکل ائی۔ قتل و غارت شروع ہو گیا اس کا کوئی حق نہیں۔ تو یہی فرمایا گیا جن کی نسبت رحمٰن کی طرف ہوگی اور وہ رحمانی ہوں گے وہ یہ کام نہیں کریں گے۔ یہ فساق و فجار کا کام ہے کہ وہ

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔

بیلوں کی طرح پھرتے ہیں۔ بیل کا کام یہی ہے کہ جو سامنے آ گیا اس کے سینگ مار دیا یا شیر کے کے آگے کوئی گیا تو وہ دانت کھول کر پھاڑ کر کھانے کے لئے جا پڑا۔ غرض یہ بہائم کا کام ہے۔ انسانوں کا کام نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ مومن کون ہے؟ مومن کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: ''اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَآئِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ'' ① مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جان، اپنے مال اور اپنی آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے کہ یہ ہماری جان نہیں لے سکتا۔ یہ ہمارے مال کو ضائع نہیں کر سکتا اور ہماری آبرو کو خراب نہیں کر سکتا۔ لوگوں کو اتنا اطمینان پیدا ہو جائے۔ پھر سمجھا جائے گا کہ یہ مومن ہے۔

پھر ''اَمِنَهُ النَّاسُ'' میں لفظ بھی عام ہے کہ لوگ مطمئن ہوں۔ خواہ مسلم یا غیر مسلم ہوں۔ ہر ایک کو اطمینان ہو جائے کہ بھئی! یہ مومن ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ مار دھاڑ کرتا پھرے یا آبروریزیاں کرتا پھرے۔ دنیا اس سے مطمئن رہے کہ یہ صالح آدمی ہے۔ اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ کسی سے کھٹکتے رہیں کہ بھئی کہیں یہ چھری نہ مار دے۔ یہ مومن کیا یہ اچھا خاصا بیل ہے، بیل جب سڑک پر چلتا ہے تو آپ دامن بچا کے چلتے ہیں کہ کہیں پیشاب نہ کر دے کہ کوئی چھینٹ نہ آ جائے، کہیں سینگ نہ مار دے تو اگر مومن سے بھی کوئی یوں بچنے لگے کہ بھئی جیب بچاؤ کہیں جیب نہ کتر لے، کہیں جیب سے فونٹین پین نہ نکال لے جائے تو یہ مومن کیا ہوا۔ مومن کا یہ کام نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا کہ: رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو نفس انسانی کے درپے نہیں ہوتے۔ قتل و غارت کرتے نہیں پھرتے۔ ہاں خدا کا حکم آ جائے حکم کی تعمیل کے لئے قصاص لے لیں تو قتل کر دیں۔ ویسے ان کا کام نہیں۔ ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾ ② آبروریزی نہیں کرتے۔ سب سے بڑی آبروریزی زنا کاری ہے کہ ایک عورت کی آبرو ختم کر دی اور اس درجے ختم کر دی کہ عمر بھر کے لئے بے آبرو ہو گئی۔ اس سے اگر بچہ پیدا ہوا وہ ولد الزنا ہو گا۔ تو پوری برادری کہے گی کہ یہ حرام کا بچہ ہے اس کو بیٹی مت دو۔ اس سے معاملہ مت کرو۔ تو کتنا عظیم اس نے گناہ کیا کہ ایک عورت کی پوری زندگی برباد و تباہ کر دی۔ سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت اور آبرو باقی نہ رہی ایسا شخص قابل گردن زدنی ہے۔

پھر آبروریزی ایک کی کی اور امن ساری سوسائٹی سے اٹھا دیا۔ دوسروں کو جرأت ہو گی کہ وہ بھی یہ حرکت کریں، تو دنیا کے اندر بدامنی پھیل گئی۔ آبرو باقی نہ رہی تو ایک کی آبرو جائے گی اور دوسرے کو اس نے آبروریزی کرنے کی جرأت دلائی۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ تو فقط یہ نہیں ہے کہ قتل کیا جائے۔ بلکہ اس کا نصف حصہ زمین میں گاڑ کر پبلک اکٹھی ہو اور پتھر مار مار کر اسے سنگسار کیا جائے۔ ظاہر میں تو یہ سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وحشت والی سزا ہے۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ جرم کی نوعیت کو دیکھو کہ ایک

① السنن للترمذی، ابواب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون...... ج: ۹ ص: ۲۱۵ رقم: ۲۵۵۱.

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸.

شخص کی آبرو ضائع کی۔ سوسائٹی برباد کی، دنیا سے اس نے امن اٹھادیا۔ ایسے شخص کو تو اس سے زیادہ سزا دینی چاہئے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ نہ وہ کسی کی جان گنواتے ہیں نہ کسی کی آبرو گنواتے ہیں۔ دونوں کی حفاظت کرتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا﴾ ① ''پھر بھی اگر کوئی یہ حرکت کرے گا اسے اثام میں ڈالا جائے گا''

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''اَثَام'' ایک وادی اور جہنم میں جنگل ہے۔ اس میں شدید عذاب ہے کہ جہنم بھی اس سے پناہ مانگتی ہے اس میں اس کا ٹھکانا بنایا جائے گا۔ ﴿يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ﴾ ② دوگنا تگنا عذاب اس کے اوپر بڑھتا ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جیسے اس نے دنیا میں آبروریزی کر کے آبرو کو تہ و بالا کیا کہ پھر آبرو ابھر ہی نہ سکے۔ اس طرح عذاب بھی تہہ بہ تہہ ڈالا جائے گا تا کہ وہ ابھر ہی نہ سکے۔ اسے بھی وہاں امن نہیں ہوگا۔ ﴿وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا﴾ ③ اور ایک لمبی مدت تک ذلت و رسوئی کے ساتھ یہ عذاب بھگتے گا۔

توبہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ...... ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ ④ سوائے اس کے کہ کوئی توبہ کرے، اس سے آخرت کا عذاب ٹل جائے گا۔ دنیا میں تو عذاب آ گیا کہ اسے سنگسار کر دیں گے، لیکن ابھی آخرت کی توبہ باقی ہے، اگر توبہ کر لی، وہاں کا عذاب ختم ہو جائے گا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ ⑤ جو توبہ کرے اور توبہ کے بعد نیک راستے پر چلنے لگے۔ فضول حرکتوں کو ترک بھی کر دے۔ پھر فقط گناہ معاف ہی نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کی نیکیاں بدیوں کو بھی مٹا دیں گی اس کی نیکیاں غالب آ جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں نیکیوں سے بدل دے گا اور اس تبدیلی کا ظہور آخرت میں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص میدانِ محشر میں حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ اسے بلائیں گے وہ بے چارہ یا تو توبہ کر کے گیا ہوگا یا توبہ نہ کی ہوگی تو حق تعالیٰ کا فضل متوجہ ہوگا۔ اسے فرمائیں گے قریب ہو جا، وہ قریب ہوگا۔ فرمائیں گے اور قریب ہو جا۔ یہ بے چارہ لرز رہا ہے، کپکپا رہا ہے، ہیبت زدہ اور ڈر رہا ہے، فرمائیں گے اور قریب ہو جا، اتنا قریب آئے گا کہ حدیث میں ہے اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ بات چیت ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ یاد دلائیں گے۔ فرمائیں گے یہ حرکت کیوں کی؟ اس کا دل اچھل اچھل کر منہ کو آرہا ہوگا کہ اب میری نجات کی کوئی صورت نہیں اور حکم ہوگا جاؤ جہنم میں۔ اس لئے کہ ابھی تو چھوٹی چھوٹی برائیاں پوچھ رہے ہیں۔ جو میں نے بڑی بڑی حرکتیں کی ہیں۔ ان کی نوبت آ گئی تو کیا ہوگا؟ یہ معمولی باتیں تھیں ان کو پوچھ لیا ہے۔

عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی عرض کرے گا اللہ میاں! میں نے اپنی بدبختی سے ایسی حرکتیں کیں۔ بہت سی بدیاں گنوانے کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے ان سب کے بدلے ہم تجھے نیکیاں دیتے ہیں اور تیرے نامہ اعمال میں وہ لکھی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۹۔ ③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۹۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۰۔ ⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۰۔

جاتی ہیں۔اب وہ حیران ہوگا کہ یہ تو دوسرا قصہ ہے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے لئے ہلاکت ہے۔ یہاں تو بدیوں کو نیکیوں سے بدلا جارہا ہے۔اب خود ہی کہے گا اللہ میاں وہ جو بہت بڑی بدی میں نے کی تھی وہ تو آپ نے پوچھی ہی نہیں۔فرمائیں گے حق تعالیٰ وہ کیا تھی؟ بندہ عرض کرے گا وہ یہ تھی۔فرمائیں گے اس کے بدلہ میں اتنی نیکیاں دیں۔تو رحمت متوجہ ہو جائے تو ہلاکت کی کوئی صورت نہیں اور غضب خدانخواستہ متوجہ ہو جائے تو نجات کی کوئی صورت نہیں۔آگے فرمایا﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا﴾ ① اس سے پہلے تو وہ گناہگاروں سے معاملہ تھا۔اب آگے اصول بیان کیا جس سے جو بھی قصور ہو وہ توبہ ورجوع کرے،توبہ کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں۔مومن کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ سے مایوس نہ ہو۔توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوگا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اور قیامت کی بڑی علامت نمایاں ہوں گی اور دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا۔اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہوگا۔اسی لئے اگر ستر برس سے بھی معصیت میں مبتلا ہو اور آج دل سے سچی توبہ کرلے۔آج بھی معافی مل جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے زنا کیا اور اس کے دل میں ندامت اور شرمندگی آئی۔اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اے میرے پروردگار!فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بخش دیجئے۔حق تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔''أَيَعْلَمُ أَنَّ لَهُ رَبًّا ''یعنی یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کو پکڑ کرے گا۔فرماتے ہیں جب یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے۔اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔اور حدیث میں ہے کہ مغفرت مانگ کر گیا اور اب پھر زنا کیا پھر ندامت ہوئی پھر آیا یَا رَبِّ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے اچھا اب بھی سمجھ گیا کہ ہے رب؟ پھر مغفرت مانگنے سے پہلے مغفرت کردیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے لوگو!تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔لیکن اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے مگر اس کی رحمت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔تو اس لئے یہ اصولا فرمادیا کہ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا﴾ ② اس کے بعد ایک دوسرا معاملہ ارشاد فرمایا:﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ ③ رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب ان سے کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ جھوٹ میں نہیں پڑتے۔زور کے معنی جھوٹی گواہی دینے کے ہیں۔تو رحمٰن کے بندے جھوٹی گواہیوں اور جھوٹی مقدمہ بازیوں میں نہیں پڑتے اور جب وہ لغو اور فضول مجلسوں سے گزرتے ہیں تو سادگی اور صفائی سے گزر جاتے ہیں،ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔کرام بن کے گزر جاتے ہیں۔

اور ان کی دعا ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتِنَا﴾ ④ ''اے ہمارے پروردگار!ہمیں جو ہماری بیویوں سے اولاد دے وہ صالح اور پاک اولاد دے اور ہمیں صالح اور

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۱. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۱.
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۲. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۴.

پاک لوگوں سے آگے چلنے والے بنا کہ ہم خود اپنی اولاد اور بیویوں کو راہ دکھلائیں‘‘۔ اور یہ بھی فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴾ ① اور ان کے دلوں پر دینی سمجھ اور علم اتنا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہوں تو فوراً قلب کی سلامتی کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے ان میں سمجھ پیدا کر دی جاتی ہے۔ وہ ان آیات کو اندھے بہروں کی طرح قبول نہیں کرتے بلکہ سمجھ داری کے ساتھ شنوا و بینا ہو کر قبول کرتے ہیں۔ وہ مطلب سمجھتے ہیں جو اللہ کا مطلب ہے۔

رحمٰن کے بندوں کی معاد...... آگے فرماتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ﴾ ② یہی وہ لوگ ہیں جن کو بالائی منزلوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ بلڈنگیں عالم آخرت میں عطا کی جائیں گی مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ محلات اور باغات ان کو عطا کئے جائیں گے اور ان کو اَبدی زندگی دی جائے گی گویا یہ ہمارے مقامات معاد ہیں جہاں ہم کو جانا ہے اور ایک وہ جگہ ہے جہاں سے ہم آئے تھے۔ یعنی اللہ کی ذات بابرکات اور اس کا حکم وہ ہمارے لئے مبدا تھا جس سے ہماری ابتداء ہوئی اور یہ (جزاء غرفات) ہماری معاد ہوگی۔ اور بیچ میں زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ہے کہ زبان، ہاتھ، پیر، روح اور مالیات کی بھی حفاظت ہو اور ہر چیز اللہ کے حکم کے مطابق صرف کرنے کا جذبہ ہمارے اندر ہو اور یہ جبھی ہوگا جب شریعت سامنے آئے اس کا علم اور تعلیم ہمارے سامنے آئے، جس کے ذریعے ہم ہاتھ، پیر، قلب، دماغ، روح وغیرہ کو اس راستے پر ڈال سکیں۔

تو یہ جو ابتداء میں کہا گیا تھا کہ تین سوال ہیں اور فطرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ کہاں سے آئے؟ کہاں جائیں گے؟ کس طرح زندگی گزاریں؟ تو جہاں سے ہم آئے وہ اللہ ربّ العزّت کی ذات بابرکات ہے جس کے امر سے آئے۔ اس کے وجود سے ہمیں پرتو (عکس) ملا تو ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جا، ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ وہیں جا کر راحت مل سکتی ہے۔ اور بیچ میں ہم اس کے کہے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسول اس کا فرمایا ہوا لے کر آئے ہیں۔ جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آ جائیں۔ جبھی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔ اتنا آدمی اندھا رہے کہ اسے راستہ ہی نہ ملے جس کے اوپر وہ چلے اور نہ یہ پتہ ہو کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ بس یہ کہ دنیا یوں ہی چلتی آئی ہے۔ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں سکون کبھی نہیں ہوگا۔

اسی طرح سے اگر کوئی یوں کہے کہ بس ایسے چلتے رہیں گے نہ آخرت آئے گی نہ قیامت آئے گی نہ یہ عالم ختم ہوگا تو پھر یہ الجھن پیدا ہوگی، کہ جس چیز کی ابتداء ہوتی ہے اس کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ جب اس عالم کی ایک ابتداء

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۵۔

ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ عالم کے ہر ہر جز کی ابتداء ہے تو کل کی بھی ابتداء ہے۔ جب ابتداء ہے تو انتہا بھی ہوگی۔ گویا عقل اسے مجبور کرتی ہے کہ مان اور اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ نہ مان، تو سکون پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر مان لیتا ہے تو سکون قلب پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی ایک راستے پر لگ گیا اسے پھر طمانیت اور بشاشت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس رکوع کی میں نے تفسیر کی۔ بس یہی تقریر تفسیر بھی تھی اس میں میں نے وہ جوابات عرض کئے جس سے فطرت کو تسلی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنی بھیجی ہوئی راہ پر لگا دے اور انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی ہمیں نصیب فرما دے۔ آپ کی زندگی پر ہماری زندگیوں کو منطبق بنا دے۔ ظاہر و باطن ہمارا ایسا بنا دے جس سے اللہ راضی اور خوش ہو۔ ہمارے قلوب کے اندر اطمینان اور سکون پیدا فرما دے اور انجام ہمارا بخیر فرمائے۔ آخرت ہماری درست فرمائے۔ دنیا ہماری صالح فرمائے۔ ہر مصیبت کو دفع فرمائے۔ جن مشکلات میں ہم مبتلا ہیں، ان سے رہائی نصیب فرما دے۔ (آمین)

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ."

ادب اوراختلاف رائے

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّـا بَعْـدُ:

شعائر اللہ کا ادب...... بزرگانِ محترم! دین کے لئے ادب ایک بنیادی چیز ہے۔جس حد تک ادب اور تادّب بڑھتا جائے گا۔اسی حد تک انسان کا دین قوی ہوتا جائے گا اور جس قدر بےادبی گستاخی، جرات وجسارت اور بے باکی بڑھتی جائے گی۔انسان دین سے ہٹتا جائے گا۔خواہ علم ہو یا غیر علم ان میں شریعت نے آداب کی رعایت رکھی ہے۔مثلاً قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ:﴿يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْآ اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَاتَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ ① "اے ایمان والو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کر بیٹھ کر بلند آواز سے گفتگو مت کرو، اپنی آوازوں کو پست کرو اور ایسی آواز نہ ہو کہ نبی کی آواز سے بڑھ جائے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔نہ اس پر اجر مرتب ہوگا نہ ثواب"۔

حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلقی طور پر بلند آواز اور جہری الصّوت تھے۔آواز ہی اس طرح بلند تھی کہ آہستہ بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ زور سے بول رہے ہیں۔لیکن اس آیت کے اترنے کے بعد اتنا آہستہ بولنے لگے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سننا پڑتا اور فرماتے "مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں میری آواز بلند ہو جائے اور میرے اعمال حبط نہ ہو جائیں"۔ ②

اس سے مسئلہ نکل آیا کہ ادب سب سے بڑی چیز ہے۔حقیقتاً تو ادب حق تعالیٰ شانہٗ کا ہے۔عظمت والی ذات اللہ ہی کی ہے۔اس واسطے کہ اس کی بارگاہ میں ادب اور تواضع چاہئے۔پھر جس جس کو اللہ سے نسبت ہوتی جائے گی ،اس کا ادب قائم ہوتا جائے گا۔مثلاً قرآن کریم کا ادب قائم کیا گیا کہ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ③

① پارہ: ۲۶ ،سورۃ الحجرات ،الآیۃ: ۲. ② السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجرات، ج: ۱۲ ص: ۹۱. ③ پارہ: ۲۷ ،سورۃ الواقعۃ،الآیۃ: ۷۹.

اگر حالت جنابت تک نجاست پہنچ گئی تو تلاوت بھی ناجائز ہوگئی گویا زبان بھی پاک نہ رہی۔ یہ قرآن کا ادب سکھلایا گیا کہ اس کلام کی نسبت اللہ کی طرف ہے جس کا نام کلام اللہ ہے۔ اللہ کا ادب ضروری ہے تو یہ تو کاغذوں کا مجموعہ ہے جو حروف ونقوش لکھے ہیں یہ کلام کی علامات ہیں۔ کلام وہ ہے جس کا تکلم کیا جائے۔ پھر وہ حروف ونقوش جن کاغذات میں درج ہیں انہیں بے وضو ہاتھ لگانے سے منع کیا گیا، وہ کاغذات جس جلد میں سی لئے جائیں وہ بھی واجب التعظیم بن جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ کلام کا ادب بتلایا گیا لیکن جو چیزیں اس کی طرف منسوب ہوتی گئیں، ان کا ادب بھی واجب ہوتا چلا گیا۔ کلام کی وجہ سے نقوش اور نقوش کی وجہ سے کاغذ اور جلد درجہ بدرجہ سب کی تعظیم ضروری ٹھہرتی گئی۔ اگر ادنیٰ درجہ بھی گستاخی ان میں سے کسی چیز کی کی جائے۔ تو اعمال کے ضبط وحبط ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ بے ادبی کے ساتھ دین قائم رہ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب اللہ کا ادب واجب ہے تو بیت اللہ کا ادب بھی واجب ہوگیا۔ ''اللہ کا گھر'' یہ نسبت جب آ گئی تو ادب لازم ٹھہرا۔ حالانکہ حق تعالیٰ حیز اور جسم ومکان سے بری ہیں۔ لیکن نسبت جب آتی ہے کہ وہ تجلیات ربانی کا مرکز ہے تو اس گھر کا ادب ضروری ہوگیا۔ جب بیت اللہ کا ادب واجب ہوا، تو جس مسجد حرام میں بیت اللہ واقع ہے وہ مسجد بھی واجب التعظیم ہوگئی اور اس درجہ بابرکت بن گئی کہ اگر ایک نماز یہاں پڑھی جائے، تو ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اس کی نسبت کی برکت ہے۔

مسجد حرام جس محل میں واقع ہے، وہ مکہ مکرمہ ہے۔ تو مکہ مکرمہ بھی واجب التعظیم ہوگیا اور اس کا ادب ضروری ہوگیا اور مکہ مکرمہ واقع حجاز میں ہے تو حجاز اور سارے عرب کا ادب واجب ہوگیا۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَبُغْضُ الْعَرَبِ مِنَ النِّفَاقِ'' ① ''عرب سے محبت کرنا ایمان اور بغض رکھنا، نفاق کی علامت ہے''۔ غرض درجہ بدرجہ سارے آداب واجب ہوتے چلے گئے۔ اگر بے ادبی اور گستاخی کسی ایک میں بھی آ گئی، تو دین کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔

غیر اختیاری کمالات کا ادب...... اس لئے تادب اور توقیر وتعظیم لازم قرار دی گئی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا'' ② ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا، اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہوگا''۔ اکابر کی تعظیم وتوقیر واجب قرار دی گئی اور دھمکی دی گئی کہ اگر اسے نہ انجام دو گے، ہماری جماعت میں شمار نہیں ہوگا اور یہ توقیر ادب عمر کی بڑائی کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی علم رکھتا ہے تو علم کی وجہ سے ادب ہوگا۔ علم کے ساتھ زہد وقناعت کے جذبات اور اخلاق رکھتا ہے، تو ان کا ادب واجب ہوگا

---

① المستدرک، کتاب معرفة الصحابة رضی الله عنهم، باب ذکر فضائل القبائل ج:۱۶ ص:۳۱۹. امام حاکم فرماتے ہیں: هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه.

② السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، ج:۷ ص:۱۵۵ رقم:۱۸۴۲.

لیکن اگر کوئی بھی کمال نہ ہو، صرف عمر کی بڑائی ہو، اس وجہ سے بھی اس کا ادب ضروری ہوگا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: جو شخص کسی بوڑھے کی تعظیم اس کے بوڑھا ہونے کی وجہ سے کرے تو وہ اس سے پہلے نہیں مرے گا کہ حق تعالیٰ اس کے لئے چھوٹے پیدا کر دیں گے جو اس کی تعظیم کریں گے۔ حدیث میں فرمایا کہ جو شخص سفید داڑھی والا ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے حیاء آتی ہے کہ اسے خالی واپس کر دوں تو یہ اس کی داڑھی کا عند اللہ وقار ہے۔ جو محض عمر کی بڑائی کی وجہ سے اسے حاصل ہو گیا ہے۔ اگر اس بڑائی کے تحت اور بڑائیاں بھی جمع ہو جائیں۔ علم، اخلاق تو ادب بھی بڑھتا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ہنر نہ ہو تو خلقی کمال پر بھی ادب کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد ہے: ’’یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُهُمْ لِکِتَابِ اللہِ. ‘‘ امامت کرنے کا حق اس کا ہے، جو سب سے صحیح قرآن پڑھنے، سب سے زیادہ قرآن کا علم ہو۔ ’’فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَآءَ ةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ ‘‘ ① (پھر) جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے بڑھایا جائے، اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو مسائل صلوٰۃ سے جو زیادہ واقف ہو اسے آگے بڑھاؤ۔ اگر سارے کے سارے حسین وجمیل جمع ہوں۔ فرمایا جس کا نسب اونچا ہو اسے آگے کرو۔ تو کوئی خصوصیت مقدم کرنی چاہئے کہ مقتدیوں کو عار لاحق نہ ہو۔ اگر بڑے بڑے اہل کمال جمع ہیں اور کسی جاہل کو امامت کے لئے بڑھایا، انہیں عار لاحق ہوگا کہ کسے بڑھا دیا؟ اگر سب حسین وجمیل ہوں اور کسی اندھے بہرے کو بڑھا دیا انہیں حقارت پیدا ہوگی کہ یہ کہاں سے آگے بڑھ گیا؟

جب اور کمالات میں سب برابر ہوں پھر خوبصورتی کو آگے رکھا گیا حالانکہ یہ کوئی اختیاری کمال نہیں، خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ لیکن غیر اختیاری چیز بھی بعض اوقات خصوصیت کا سبب بن جاتی ہے۔ تقدم وتقدیم کے لئے آداب کی ضرورت ہے اور ان آداب میں بعض دفعہ تکوینی چیزیں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ باوجودیکہ عمر یا حسن اللہ کی دی ہوئی چیز ہے مگر اس کے باوجود فرمایا، اس کا ادب کرو۔ حاصل یہ نکلا ہر بڑھائی تعظیم کی مستحق ہے۔ خواہ وہ تکوینی ہو یا تشریعی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔ اگر توقیر نہ کی گئی تو فرمایا کہ ممکن ہے تمہارے اعمال اور دین پر اثر پڑ جائے۔

نسبت کا اَدب...... یہاں تک کہ نسبتوں کا ادب سکھلایا گیا، یہ جو اللہ والوں کے ہاں نسبتوں کی توقیر کی جاتی ہے کہ شیخ کی عظمت کرتے ہیں۔ شیخ کی اولاد اور وطن کا بھی نسبت کی وجہ سے ادب کرتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: ’’فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَنِیْ ‘‘ ② ’’فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ جس نے اسے ستایا اس نے مجھے ستایا‘‘۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی توقیر کی، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی توقیر کی۔ یہ توقیر شرفِ صحابیت کی وجہ سے نہیں سکھلائی گئی، یہ تو اور صحابہ میں بھی ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

① الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب من احق بالامامة، ج:۳ص:۴۲۸رقم:۱۰۷۸.

② الحدیث اخرجه الامام مسلم فی صحیحه ولفظه: یوذینی ماآذاها، کتاب فضائل الصحابه باب فضائل فاطمة بنت النبی علیه الصلوٰة والسلام۔

اولاد ہونے کی جو نسبت ہے اسی کا ادب سکھلایا گیا۔ اس لئے فرمایا کہ فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے صحابہ میں داخل ہے۔ صحابیت کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی جمع ہو گئیں۔ جو اولا در سول ہوتا ہے کہ یہ جزو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو جب قلب میں رسول کا ادب ہوگا، تو اولا در سول کا بھی ہوگا۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق سنا کہ ان کی عادات میں ادب کا لحاظ بے حد ہوتا۔ اگر سادات کا کوئی نابالغ بچہ بھی آ جاتا تو سرہانہ چھوڑ کر پائنتی کی طرف بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ دنیا مخدوم زادوں کی عزت کرتی ہے۔ یہ سارے عالم کے مخدوم زادے ہیں۔ سارے عالم پر ان کی تعظیم واجب ہے۔ حالانکہ بچہ نابالغ ہے مگر فرماتے یہ مخدوم زادہ ہے۔ یہ اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سبق آموز واقعہ...... ایک دفعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مراد آباد تشریف لے گئے اور جانا آگے تھا۔ مراد آباد بھی ٹھہرے، پروگرام میں حضرت نے صرف ایک دن رکھا تھا لوگوں نے اصرار کیا، مگر آپ نے انکار فرما دیا تو علماء کا طبقہ جمع ہو کر آ گیا کہ ٹھہر جائیں انکار کر دیا کہ نہیں ٹھہروں گا۔ پھر بعض امراء جمع ہو کر آ گئے۔ امراء سے کہا کہ جب علماء کی نہ سنی، تو آپ کی کیسے مانوں؟ مراد آباد کے لوگوں کے دل میں ٹھن گئی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھہراؤ، تو ایک نے مشورہ دیا کہ ان کو ٹھہرانے کی ایک ہی صورت ہے۔ فلاں دفتر میں ایک کلرک لڑکا چودہ پندرہ سال کا ہے، اسے بلا لاؤ، وہ ٹھہرا سکے گا۔ جب وہ آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ادب سے اپنی مسند چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جھک کر مصافحہ کیا اور اپنی جگہ پر اس کو بٹھا دیا خود مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا کے حضرت جی چاہتا ہے کہ کچھ ٹھہر جائیں، فرمایا بہت اچھا۔ ٹھہر گئے اور اتنے ٹھہرے کہ ایک ہفتہ تک ٹھہر گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ حضرت اس وقت تک نہیں جائیں گے، جب تک وہ لڑکا نہیں کہے گا۔ تب آ کر اس نے اجازت دی۔

وہ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شیخ میاں جی نور محمد جھنجھانوی اعلیٰ اللہ مراتبہ تھے اور یہ لڑکا میاں جی مرحوم کا نواسہ لگتا تھا، تو شیخ کی نسبت کا اتنا ادب تھا کہ ان کے حکم کی وجہ سے وہیں رک گئے، کسی کا حکم نہ مانا۔ یہ نسبت کا ادب تھا۔ شیخ کے بھی نہیں شیخ الشیخ کے نواسے تھے اور یہ ادب تب ہوتا ہے۔ جب اصل شیخ کا ادب دل میں ہو۔ حتیٰ کی وطن کی نسبت کی وجہ سے شیخ کے وطن کے ساتھ شریف لگاتے ہیں۔ دیوبند شریف، نانوتہ شریف، مکہ شریف۔ تو وہ شریف کا لفظ تعظیم کی وجہ سے لگاتے تھے۔ نسبت کا ادب اور عظمت یہ کوئی غیر شرعی چیز نہیں۔

اہل اللہ نے نسبتوں کا اس درجہ ادب کیا ہے کہ شیخ کی اولاد اگر جاہل اور کندہ ناتراش بھی ہوتی، پھر بھی حد درجہ ادب کیا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرّہٗ جو مشائخ چشتیہ میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے پوتے ہیں شاہ ابوسعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو سلسلہ چشتیہ کے مشائخ میں سے ہیں۔ شاہ ابوسعید کا ابتدائی زمانہ بہت آزادی کا تھا۔ نہ نماز، نہ روزہ، نہ پابندی، لباس کے شوقین، ہر وقت پر تکلف کپڑے، بس اسی میں لگے رہتے۔ نہ علم

سیکھنے کی طرف توجہ، نہ اعمال کی اصلاح کی طرف، جوانی کا زمانہ تھا، رنگ رلیوں میں پڑے رہتے۔ وہ ایک دن گنگوہ میں کسی گلی میں جا رہے تھے۔ بھنگن نے ٹوکرہ کباڑہ کا کہیں پھینکا اور سارا گردان کے کپڑوں کو لگ گیا، تو غضبناک ہو گئے اور کہا حرام زادی، بے حیاء، تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ بھنگن تھی بوڑھی اور اس نے حضرت شیخ عبدالقدوس کا زمانہ پایا تھا تو اس نے تان کر کہا کہ کس برتے پر اکڑتا ہے؟ دادا کی میراث کمائی تھی، جو آج اتنے فخر سے بولتا ہے؟ بس وہ دن تھا، اسی وقت واپس ہوئے اور گھر میں آ کر والدہ سے کہا کہ اب میں گنگوہ اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک کہ دادا کی میراث نہ سنبھال لوں، اور پوچھا کہ اس وقت حضرت شیخ کے خلفاء میں سے کون کون سے لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ اجلاء خلفاء میں سے شیخ نظام الدین بلخی ہیں۔ انہوں نے خلافت لے کر بلخ کا سفر کیا تو بتلایا گیا کہ بلخ میں بڑی خانقاہ ہے۔ لاکھوں کی اصلاح اور افادہ ہو رہا ہے تو شیخ نظام الدین کو اطلاع دی کہ میں آ رہا ہوں۔ شیخ کو صاجزادہ کے پہنچنے کی اطلاع ہوی تو جو پہنچنے کا دن تھا۔ اس زمانے میں موٹر کاریں تو نہ تھیں مہینہ دو مہینہ قطع مسافت کے بعد کہیں جا کر پہنچے اگرچہ صاجزادہ جاہل ہیں نہ علم نہ ہنر اور شیخ وقت کے ہزاروں متوسل، ہزاروں مرید اور ہزاروں کو علم اور دین کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مگر اسی نسبت کے ادب کی وجہ سے کئی میل آگے جا کر استقبال کیا اور جب شیخ نکلے تو تمام بلخ، امراء بلخ حتی کہ شاہ بلخ بھی ساتھ نکلے۔ دور سے دیکھا کہ صاجزادے گھوڑے پر آ رہے ہیں تو حضرت نظام الدین آگے بڑھے اور قدموں پر ہاتھ رکھا۔ صاحبزادے گھوڑے سے اترنے لگے۔ فرمایا نہیں آپ نہ اتریں، اوپر رہیں۔

اب اس شان سے صاحبزادے چلے آ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں اور قدموں پر شیخ نے ہاتھ رکھا ہے اور جب شیخ نے ہاتھ رکھا تو دوسری رکاب پر خود شاہ بلخ نے ہاتھ رکھا۔ اس شان سے بلخ آئے مہمانداری بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تمام علماء و مشائخ اور امراء کو صاحبزادہ کے احترام میں دعوتیں دیں۔ جب تین دن گزر گئے اور شیخ کا یہ عالم کہ دوزانو بیٹھے ہیں۔ صاجزادہ کو مسند پر بٹھا رکھا ہے۔ پھر پوچھا صاحبزادے! اتنا لمبا چوڑا سفر کیسے کیا؟ کہاں ہندوستان اور کہاں بلخ، کیا ضرورت پیش آئی؟ صاحبزادے نے کہا کہ دادا کی میراث لینے آیا ہوں، جو آپ لے کر آئے ہیں۔ اور یہ وہ نسبت اور تعلق مع اللہ کی میراث ہے۔ فرمایا، اچھا یہ غرض ہے۔ کہا جی ہاں۔ فرمایا کہ وہاں جوتیوں میں جا کر بیٹھ جاؤ اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ اب نہ وہ ادب ہے نہ وہ تعظیم اور بیعت کر کے تزکیہ نفس کے لئے کچھ اعمال بتلائے۔ خدمت یہ سپرد کی کہ مسجد میں بیٹھ کر استنجاء کے لئے ڈھیلے توڑیں تاکہ نمازی آئیں تو تکلیف نہ ہو۔ سال بھر اسی حالت میں گزر گیا کہ کوئی پرسانِ حال نہیں یا تو شاہ بلخ رکاب تھامے آئے تھے یا آج صاحبزادے کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

جب ایک برس گزر گیا تو شیخ نے امتحان لینا چاہا کہ کس حد تک نفس کی اصلاح ہوئی۔ کبر، غرور رفع ہوا یا نہیں۔ تواضع لِلّٰہیت پیدا ہوئی یا نہیں نفسانیت ختم ہوگئی یا نہیں۔ تو بھنگن کو حکم دیا کہ کوڑا کباڑ کا ٹوکرہ لا کر

صاحبزادے کے قریب ڈال دے۔ تاکہ تھوڑا سا گرد صاحبزادے کے اوپر پڑ جائے اور جو کچھ کہے۔ وہ ہم سے آ کر کہ دے۔ بھنگن نے جا کر ٹوکرا زور سے ڈال دیا تو سارا گرد صاحبزادے پر پڑا تو اس نے آنکھیں لال پیلی کر کے کہا کہ ''بے حیاء! نہ ہوا گنگوہ کہ تجھے بتلاتا'' اس نے آ کر شیخ سے عرض کیا کہ وراثت نہیں ملی۔ ابھی نفسانیت کافی موجود ہے۔ اگلے دن پھر حکم ہوا، استنجے کے ڈھیلے توڑنا تو خیر ہے ہی مگر نمازی نماز پڑھ کر نکلیں تو جوتے سامنے رکھو، ان کی حفاظت بھی کرتے ہو۔

اب اس خدمت پر لگ گئے۔ جب ایک برس گزر گیا تو بھنگن کو پھر حکم دیا کہ قریب ہی نہیں بلکہ جا کر صاحبزادے کے اوپر سارا کوڑا کرکٹ ڈال دو۔ اس نے سارا ٹوکرہ جا کر ڈال دیا۔ تو صاحبزادے نے کہا ''ارے بی، کیوں اس کباڑ کو تو نے مجھ پر ڈال دیا۔ یہ مجھ سے زیادہ افضل ہے تو نے اس کباڑ کو بھی عیب لگایا۔ میں ایسی ناپاک ہستی ہوں کہ یہ کباڑ بھی میرے اوپر گرنے سے ناپاک ہو گیا۔ میرے اندر تو کوئی خوبی نہیں'' بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ سب کچھ عرض کیا۔ فرمایا اب دادا کی وراثت مل چکی ہے۔ اس کے بعد اگلے دن شیخ نے حکم دیا کہ ہم شکار کے لئے جائیں گے۔ صاحبزادے سے فرمایا تم ہمارے ساتھ چلو۔ شیخ گھوڑے پر سوار ہوئے اور حکم دیا کہ تم رکاب تھام کے چلو جب وہ آئے تھے تو شیخ نے رکاب تھامی تھی اور اب حالت یہ ہے کہ گرتے پڑتے شیخ کے ساتھ دوڑتے جا رہے ہیں، لہولہان ہو گئے، پیروں میں زخم آئے، خون نکل آیا مگر کیا مجال کہ یہ رکاب سے الگ ہو جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ شیخ حکم دیں اور اطاعت نہ کی جائے؟ اسی شان سے سارا دن بسر ہوا، شام کو واپس پہنچے تو صاحبزادہ کو حکم دیا کہ غسل کرو، صاحبزادے نے غسل کیا، کپڑے وغیرہ بدلوائے۔ اس کے بعد مجمع کیا اور بھرے مجمع میں صاحبزادے کو کھڑے کر کے جوتا ہاتھ میں دیا اور فرمایا۔ یہ غلام حاضر ہے، سر حاضر ہے، یہ جوتا ہے۔ میں اسی طرح خانہ زاد غلام ہوں۔ دادا کی میراث مل نہیں سکتی تھی اگر یہ محنت اور ریاضت نہ ہوتی۔ نفس کا کبر رفع نہ ہوتا۔ اب تمہیں دادا کی میراث مبارک ہو، خلافت دی اور پگڑی سر کے اوپر باندھی۔ وہ گویا بے ادبی نہیں تھی بلکہ مجاہدہ تھا کہ اس کے بغیر نفس کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی تو ریاضت اور مجاہدے اس لئے ہوتے ہیں کہ ادب کا مضمون قلب میں پیدا ہو جائے۔ تو اللہ اور اس کے نیک بندوں کا بھی ادب کرو، ہر بڑی چیز کا ادب کرو، جس میں کوئی بڑائی اور خوبی ہو۔ فرمایا: ''مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا'' ① ''جو ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے۔ اس کا ہمارے سے کوئی تعلق نہیں''۔

ادب میں محتملات کا لحاظ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا میں نے واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ کلیر شریف جب کبھی حاضر ہوتے۔ عرس وغیرہ سے یہ حضرات بچتے تھے کہ بدعات ہیں۔ لیکن بہر حال اللہ والوں کی قبروں پر جاتے تھے، استفادہ بھی کرتے تھے۔ کلیر شریف حاضر ہوتے تو کلیر شریف رڑکی سے پانچ چھ

① السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، ج:۷ص:۱۵۵ رقم:۱۸۴۲۔

میل کے فاصلہ پر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے تو چلتے وقت جوتے نکال دیتے تھے۔ ننگے پیر چھ میل کا فاصلہ طے کرتے۔ یہ محض ادب کا غلبہ حال تھا۔ آپ اگر پوچھیں کہ کیا شرعاً ایسا کرنا ضروری تھا؟ تو شرعاً تو ضروری نہیں ہے کسی جگہ حکم نہیں ہے کہ جاؤ تو ننگے پیر جایا کرو۔ لیکن ادب جب غلبہ حال کے درجہ میں آتا ہے تو ادب وتادب کے وہ وہ محتملات سامنے آتے ہیں کہ ظواہر شریعت میں نشان بھی نہیں ہوتا۔ مگر قلب شہادت دیتا ہے کہ یہ بھی ادب ہے اور اس پر عمل ضروری ہے۔ وہ قانونی عمل نہیں ہوتا، وہ اخلاقی عمل ہوتا ہے۔ قانون کی رو سے اسے واجب یا مستحب نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن قلب اور محبت کے قانون کے لحاظ سے وہ واجب ہوتا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عمر بھر سیاہ جوتا نہیں پہنا سرخ یا زرد رنگ کا پہنا کرتا تھے۔ فرمایا سیاہ رنگ کا جوتا ممنوع نہیں۔ مگر بیت اللہ کا غلاف سیاہ ہے۔ تو پاؤں میں اس رنگ کا جوتا کیسے پہنوں؟ اس ادب کی وجہ سے سیاہ رنگ کا جوتا پہننا چھوڑ دیا۔ پگڑی تو باندھتے سیاہ رنگ کی کہ یہ تو ادب کا مقام ہے مگر قدموں میں نہیں۔

اب اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! کسی روایت، کسی حدیث میں تو نہیں آیا تو حدیث میں تو ادب کا حکم آیا ہے۔ لیکن ادب جب رچ کر غلبہ حال کے درجہ میں آجاتا ہے تو بعید سے بعید چیز بھی ادب کے درجہ میں آتی ہو، انسان اس کا لحاظ رکھتا ہے اور عمل کرتا ہے جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعض چیزیں بڑی محتملات ہوتی ہیں۔ لیکن آداب شرعیہ کے لحاظ سے وہ ضروری قرار پاجاتی ہیں۔

الغرض اس طرح سے یہ آداب سکھائے گئے کہ اس کے بغیر دین کا تحفظ نہیں ہوسکتا اگر دل میں ذرا سا بھی ان چیزوں کے لئے تمسخر واستہزاء کا مادہ موجود ہے تو دین اس کا صحیح سالم نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے ضروری ہے کہ قلب کے اندر سنجیدگی وقار اور احترام ہو۔ آیات اور روایات کا اور ان شخصیتوں کا جن سے آیات وروایات اور دین کا تعلق ہے۔ جن کا ادب واحترام ضروری ہے جس کے بغیر دین محفوظ نہیں رہ سکتا۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا غایت درجہ اَدب...... حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حرم مکہ میں سیلاب آیا اور حرم شریف میں پانی بھر گیا تو مقام ابراہیم، یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی تھی بیت اللہ کی، وہ اب بھی محفوظ ہے اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان بھی ہے۔ اس کے لئے ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہے۔ اس کے اندر وہ نشان محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (1) جب طواف کر کے دوگانہ ادا کرتے ہیں تو مقام ابراہیم کو بیچ میں لینا مسنون ہے۔ الغرض سیلاب جو آیا تو مقام ابراہیم پر بنی ہوئی عمارت کا برج گر پڑا اور وہ مقام ابراہیم کے اوپر آ گیا تو اس کا ایک کنارہ ٹوٹ گیا اور وہ کنارہ اسی وقت شریف مکہ کے خزانے میں پہنچا دیا گیا وہ چیز

(1) پارہ: ١، سورة البقرة، الآية: ١٢٥.

مقدس تھی۔ شریف مکہ، علماء و مشائخ کو وقتاً فوقتاً اس پتھر کی زیارت کراتے تھے۔ خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ اس کے دو تین ٹکڑے ہو گئے۔ اس میں سے ایک چھوٹا ٹکڑا، شریف مکہ نے ہدیہ کے طور پر بعض مشائخ کو دیا اور وہ کسی نہ کسی طرح منتقل ہو کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ گیا۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ اس مقام ابراہیم کے ٹکڑے کو نکال کر پانی میں ڈالتے اور وہ پانی اہل مجلس میں تقسیم کیا جاتا۔ اس ٹکڑے میں سے کچھ ریزے گر گئے۔ حضرت نے فوراً ریزوں کو جمع کر کے آنکھوں کے سرمہ میں شامل کر لیا۔ جب آنکھوں میں سرمہ لگاتے تو وہ حل کیا ہوا پتھر بھی آنکھوں میں جاتا تو یہ ادب کی بات تھی۔ طبی اصول پر دیکھا جائے، تو آنکھوں کے اندر مٹی یا پتھر کا ریزہ ڈالنا بینائی کے لئے نقصان دہ ہے مگر اس چیز کی پرواہ نہ تھی۔

بینائی کیا چیز ہے؟ اس شرف کے مقابلہ میں جو مقام ابراہیم کی مجاورت اور قرب سے نصیب ہوتا ہے۔ بہر حال دین کی بنیاد ادب و توقیر اور تعظیم کے اوپر ہے۔ اللہ اور شعائر اللہ کی تعظیم، بیت اللہ، کتاب اللہ، اہل اللہ کی تعظیم، غرض جو بھی اللہ کی طرف سے منسوب ہو جائے۔ اس کی عظمت و توقیر کرنا یہ دین کی بنیاد ہے۔

اختلافِ رائے...... مشائخ لکھتے ہیں اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہو اور فرض کیجئے کہ اس کی سنت کے خلاف کوئی بات دیکھے اور ارادہ کیا کہ کسی متبع سنت سے بیعت ہو جائے۔ تو مشائخ بالا جماع لکھتے ہیں کہ اس شیخ سے بیعت ترک کر دینی چاہئے۔ جس سے سنت کے خلاف اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن بے ادبی کا کلمہ کبھی نہیں کہنا چاہئے۔ گستاخی کا کلمہ کبھی نہ کہے۔ اس کے حق میں کبھی جائز نہیں کہ اس کی بے ادبی کرتا پھرے۔ ورنہ معنویت اور روحانیت کو نقصان پہنچے گا۔ یہ وہی احترام کی بنیاد ہے کسی عالم سے فرض کیجئے کہ آپ کسی مسئلہ میں مختلف ہو جائیں یا دوسرا عالم آپ سے مختلف ہو جائے۔ تو مسئلہ میں اختلاف کرنا تو جائز ہے، جب اپنے کو "دِیَانَۃً عَلَی التَّحْقِیْقِ" سمجھے، لیکن بے ادبی اور تمسخر کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ بے ادبی اور تمسخر کرنا دین کا نقصان ہے اور اختلاف کرنا محبت سے، یہ عین دین ہے۔ دین جائز ہے اور خلاف دین جائز نہیں۔ اختلافِ رائے کا حق حاصل ہے حتیٰ کہ اگر ذاتی رائے اور مشورہ ہو تو انبیاء علیہم السلام سے بھی آدمی رائے میں مختلف ہو سکتا ہے احکام اور اوامر کا جہاں تک تعلق ہے، اختلاف اور رائے زنی جائز نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ ① "کسی مومن اور مومنہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ جب حکم آ جائے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو پھر اس کے سامنے چوں و چرا کی جائے"۔

تو جہاں تک احکام دین کا تعلق ہے رسول تبلیغ فرما دیں تو تامل بھی جائز نہیں۔ چہ جائیکہ قبول نہ کرے۔ لیکن اگر رسول یہ فرمائیں کہ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ اگر آدمی نہ مانے تو اس پر کوئی الزام و ملامت نہیں۔ حدیث میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان ہوا، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی تھیں۔ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ، بریرہ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶.

رضی اللہ عنہا کے سوجان سے عاشق تھے اور بریرہ رضی اللہ عنہا کو نفرت تھی۔اس دوران میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو آزاد کر دیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی اور منکوحہ اگر آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا نہ رکھنا، اس کے اختیار میں ہو جاتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ فلاں شخص غلام ہے تو جائز ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ اب حضرت مغیث رضی اللہ عنہ پریشان ہیں، وہ سوجان سے عاشق اور بریرہ رضی اللہ عنہا کی طبیعت کو مناسبت نہیں اور بات آ گئی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ۔ تو لکھا ہے حضرت مغیث رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کی گلیوں میں پھر رہے ہیں، رو رہے ہیں، آنسو داڑھی پر گر رہے ہیں، اور ہر ایک کے پاس جاتے ہیں کہ تم سفارش کر دو کہ بریرہ رضی اللہ عنہا نکاح کو فسخ نہ کرے، آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور کہا یا رسول اللہ! آپ بریرہ کو فرمائیں کہ وہ نکاح نہ توڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے بریرہ! نکاح کو فسخ مت کرو۔ مغیث کا برا حال ہے۔ اسے محبت اور تعلق ہے۔ مگر بریرہ رضی اللہ عنہا بہت دانش مند تھی۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا حضور کی ذاتی رائے ہے؟ فرمایا نہیں مشورہ ہے، حکم شرعی نہیں، عرض کیا میں تو نہیں مانتی، فرمایا تجھے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کا حق ہے۔ یعنی کوئی ملامت اس میں نہیں۔ نہ انبیاء کی نہ شریعت کی، یہ الگ چیز ہے کہ ادب کی وجہ سے ہم حضورؐ کے منشاء کو بھی سوائے حکموں سے زیادہ سمجھیں گے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا نے پہلے پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ! یہ حکمِ خداوندی ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے؟ جب معلوم ہوا، فرمایا کہ میں نہیں مانتی۔ ذرہ بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر گرانی نہیں ہوئی، لیکن رائے کے نہ ماننے کی وجہ سے کیا یہ جائز تھا کہ بریرہ رضی اللہ عنہا معاذ اللہ، ادنیٰ درجہ کی شان رسالت میں بے ادبی کرے۔ اگر ذرہ بھی بے ادبی ہوتی دین ختم ہو جاتا۔ ادب اور عظمت کو اسی طرح برقرار رکھا۔ لیکن شریعت نے جو حق دیا، اس کو استعمال کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں تو نہیں مانتی یہ میرا خانگی معاملہ ہے اور اگر حکم شرعی ہے تو سر جھکا ہوا ہے۔ اسے سے اندازہ ہوا کہ اختلاف رائے اگر اہل اللہ اور علماء میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن بے ادبی یا تذلیل کسی حالت میں جائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بہر حال عالم دین ہے۔ جس سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا مقام و منصب بطور نائب رسول کے ہے اس کی عظمت واجب ہوگی۔

ہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پچاسیوں مسئلوں میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر ادنیٰ درجہ کی بے ادبی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں نہیں آتی۔ اور جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واجبُ التعظیم ہیں، ویسے ہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی۔ دونوں ماہتاب و آفتاب ہیں دونوں سے نور اور برکت حاصل ہو رہی ہے۔ کسی طرح جائز نہیں کہ ادنیٰ درجہ کی گستاخی دل میں آ جائے۔

گستاخی جہالت کی علامت ہے...... گستاخی و استہزاء کرنا جہالت کی بھی علامت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو نصیحت کی اور فرمایا کہ فلاح مقتول زندہ ہو جائے گا اگر بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کا گوشت میت

سے ملا دیا جائے۔ تو بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ ① آپ کیا مذاق کرتے ہیں؟ اس بات میں کیا تعلق ہے کہ گوشت کو مردہ سے ملا دیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ② میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں، یعنی دل لگی، تمسخر جاہلوں کا کام ہے، عالموں کو مناسب نہیں کہ تمسخر کریں۔ اس لئے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ تو ایک ہے رائے کا اختلاف اور کسی عالم سے مسلک کا اختلاف اور ایک ہے بے ادبی، بے ادبی کسی حالت میں جائز نہیں۔ اختلاف جائز ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد رضا خاں (مرحومان)...... میں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم سے بہت سی چیزوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ قیام، عرس، میلاد وغیرہ مسائل میں اختلاف رہا۔ مگر جب مجلس میں ذکر آیا تو فرماتے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب۔ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھنے والے ایک شخص نے کہیں بغیر مولانا کے احمد رضا کہہ دیا۔ حضرت نے ڈانٹا اور خفا ہو کر فرمایا کہ عالم تو ہیں، اگر چہ اختلاف رائے ہے۔ تم منصب کی بے احترامی کرتے ہو، کس طرح جائز ہے؟۔ رائے کا اختلاف اور چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کو خطا پر سمجھتے ہیں اور صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر ان کی توہین اور بے ادبی کرنے کا کیا مطلب؟ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "مولانا" نہ کہنے پر برا مانا، حالانکہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابل جو مولانا تھے وہ انتہائی گستاخی کیا کرتے تھے۔ مگر مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اہل علم میں سے تھے۔ وہ تو نام بھی کسی کا آیا، تو ادب ضروری سمجھتے تھے۔ چاہے بالکل معاند ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ادب کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔

کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلوک...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ سنا کہ دہلی کا قیام تھا، حضرت کے خدام میں سے چند مخصوص تلامذہ ساتھ تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن رحمۃ اللہ علیہ امروہی، حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم یہ بھی وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر فرمایا کہ بھی! لال کنویں کہ مسجد کے جو امام ہیں، ان کی قرات بہت اچھی ہے۔ کل صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھ لیں۔ تو شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے غصے میں آ کر فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی، بے غیرت، وہ ہمارے حضرت کی تکفیر کرتا ہے۔ ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ جملے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پہنچے۔ اگلے دن حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ ان سب شاگردوں کو لے کر اسی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کی خاطر پہنچے اس امام کے پیچھے جا کر نماز پڑھی۔ سلام پھیرا، چونکہ یہ اجنبی تھے۔ نمازیوں نے دیکھا کہ ہیں تو علماء صورت، تو پوچھا کون ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد قاسم ہیں اور وہ ان کے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود احسن اور یہ مولانا احمد حسن محدث امروہی، ان کے تلمیذ ہیں۔ امام کو سخت حیرت ہوئی کہ میں رات دن انہیں کافر کہتا ہوں اور یہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔

نماز کے لئے میرے پیچھے آ گئے۔ امام نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا کہ حضرت میں آپ کی تکفیر کرتا تھا، میں آج شرمندہ ہوں۔ آپ نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔ حالانکہ میں آپ کو کافر کہتا رہا۔ حضرت نے فرمایا کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی قدر ہے اور زیادہ عزت دل میں بڑھ گئی ہے کیوں؟ اس واسطے کہ آپ کو جو روایت پہنچی کہ میں توہین رسول کرتا ہوں۔ تو آپ کی غیرت ایمانی کا یہی تقاضا تھا۔ ہاں البتہ شکایت اس کی ہے کہ روایت کی تحقیق کرنی چاہئے تھی۔ مگر بہر حال تکفیر کی بنیاد توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمان کرے گا، تکفیر واجب ہوگی، دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ تو فرمایا کہ میرے دل میں آپ کی غیرت ایمانی کی قدر ہے۔ ہاں شکایت اس لئے ہے کہ ایک بار تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط، تو میں یہ عرض کرنے آیا ہو کہ یہ خبر غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجہ میں بھی نبی کی توہین کرے۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں۔ "اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ......" اب امام بے چارہ قدموں پر گر پڑا، بچھا جاتا ہے۔

تو بات صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے دلوں میں تواضع للہ اور ادب مع اللہ اس درجہ رچا ہوا تھا کہ نفسانیت کا شائبہ نہ رہا تھا۔ استہزاء اور تمسخر تو بجائے خود ہے اپنے معاندوں کی بھی بے قدری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صحیح محمل پر اتار کر یہ کہتے ہیں کہ جو ہمیں کافر کہتے ہیں۔ یہ ان کی قوت ایمانی کی دلیل ہے۔ البتہ یہ تحقیق کر لینی چاہئے کہ واقعہ ہم توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں؟ ہم معاذ اللہ دشمنان رسول ہیں یا دوستان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ اس کی تحقیق ان کو واجب تھی بلا تحقیق حکم نہیں لگانا چاہئے۔ تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور تادب دین کی بنیاد ہے۔ جس کو عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

از خدا خواہیم توفیق ادب   بے ادب محروم گشت از فضل رب

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں جو گستاخ اور بے ادب ہے۔

بے ادبی کی وجہ سے علمی فیض سے محرومی..... بہت سے ایسے فضلاء ہماری نگاہوں میں ہیں۔ جنہوں نے دار العلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ اچھے اور ذی استعداد تھے۔ مگر اساتذہ سے بے ادبی کا معاملہ تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد علم کی خدمت سے محروم رہے، کوئی دکانداری کر رہا ہے، کوئی گاڑی چلا رہا ہے۔ یہ نصیب نہیں ہوا کہ محدث یا مفسر بن کر بیٹھیں اور ایسے بھی ہماری نگاہوں میں ہیں کہ استعداد اور علمی قوت بہت محدود تھی۔ لیکن تادب اور خدمت اتنی تھی کہ رات دن اساتذہ کی خدمت میں ادب کے ساتھ لگے رہتے، اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اتنی خدمت کر رہے ہیں کہ بڑے بڑے ذی استعداد فضلاء اتنی نہیں کر رہے ہے، تو مقبولیت ان کے اندر ادب کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تادّب کا دوسرا واقعہ..... حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک رسالہ خود لکھا اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ کو جو انکے مرید ہیں، دیا کہ اس کی نقل کر کے لاؤ، اس کے

اندر ایک جگہ اِملاء کی غلطی تھی، عین کے بجائے ہمزہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے از خود صحیح نہیں لکھا بلکہ وہ جگہ چھوڑ دی اور حضرت سے آ کر کہا کہ یہ لفظ سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا ہے؟ تو اِشتباہ کا راستہ اختیار کیا تلقین کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ شیخ کو جا کر یوں کہیں کہ آپ نے غلط لکھا یہ جرأت نہ تھی کہ یوں کہیں کہ یہ غلطی ہوگئی۔ گویا صورتاً بھی بے ادبی نہ کر سکے۔ حقیقتاً بے ادبی کیا کرتے؟

اَدب سے غفلت برتنے کا نتیجہ...... بہر حال دین کا دار و مدار تادبات اور آداب پر ہے۔ یہ شریعت کا مستقل باب ہے، جہاں احکام ہیں وہاں اس کے ساتھ کچھ آداب ہیں۔ ادبیات پر اگر آدمی قادر نہ ہو تو وہ اصل احکام سے بھی کورا اور محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے آداب کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے غالباً ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ پوری طرح یاد نہیں نقل کئے دیتا ہوں۔ تفسیر فتح العزیز میں ہے۔ ''مَنْ تَهَاوَنَ فِي الْاٰدَابِ حَرُمَ مِنَ السُّنَّةِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالسُّنَّةِ حَرُمَ مِنَ الْوَاجِبَاتِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالْوَاجِبَاتِ حَرُمَ مِنَ الْفَرَائِضِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالْفَرَائِضِ حَرُمَ مِنَ الْمَعْرِفَةِ.'' ''جس نے آداب پر عمل کرنے میں سستی دکھلائی، وہ سنت سے محروم ہو گیا جس نے سنت پر عمل سے سستی کی وہ واجبات سے محروم ہو جائے گا اور جس نے واجبات پر عمل سے سستی دکھلائی وہ فرائض پر عمل سے محروم ہو جائے گا اور جس نے فرائض کی ادائیگی میں سستی کی وہ اس کی پہچان سے محروم ہو گیا'' فرائض پر عمل کرے گا تو معرفت بڑھے گی۔ اس واسطے سنتوں کو مکمل فرائض کہا گیا تو جس نے آج سنتیں چھوڑ دیں، صرف فرائض کو پڑھ لیا کل وہ بھی نہ پڑھے گا۔ رفتہ رفتہ محروم ہو جائے گا۔

سدِ ذرائع اور اس کی امثلہ...... شریعت میں احکام کی دو قسمیں ہیں۔ مامورات یعنی کرنے کی چیزیں اس کے لئے آداب رکھے گئے کہ انہیں کرو گے، تب جا کر ماٴمورات پر عمل کرنا نصیب ہوگا اور ایک منہیات ہیں، روکنے کی چیزوں میں مکروہات رکھے گئے کہ مکروہات سے بچو گے، تب حرام سے بچنا نصیب ہوگا اور اگر مکروہات میں ڈوبے رہو گے تو ایک نہ ایک دن حرام میں پڑ جاؤ گے اور اس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی ذرائع اور وسائل سے بچانا تاکہ اصل ممنوع سے بچ جائے اور واجبات میں وسائل کو اختیار کرنا تاکہ فرائض پر عمل نصیب ہو۔ اسے کہتے ہیں سدِّ ذرائع۔

مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''مَآ اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ'' ① ''جس چیز کے زیادہ حصہ میں نشہ ہو اس کا کم حصہ بھی ناجائز ہے''۔ شراب کے ایک گھونٹ میں نشہ ہے۔ ایک قطرہ میں تو نہیں، لیکن قطرہ پینا بھی اس طرح حرام ہے، جس طرح گھونٹ پینا حرام ہے۔ حالانکہ حرمت تو سکر کی وجہ سے ہے اور ایک قطرہ میں ظاہر ہے کہ سکر نہیں۔ مگر سدِ ذرائع کے لئے ایسا کیا گیا کہ جو ایک قطرہ شراب پی لے گا، کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، پرسوں پورا

① السنن لابی داؤد، کتاب الاشربة، باب النهی عن المسكر، ج: ١٠، ص: ١٠٦، رقم: ٣١٩٦. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ٨ ص: ١٨ رقم: ٣٦٨١.

جام پیئے گا اور شرابی بن جائے گا۔ تو شرابی بننے سے بچانے کے لئے قطرہ کو حرام کیا گیا تاکہ وہاں تک پہنچنے نہ پائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) ① ''جو کسی جادوگر یا کاہن کے پاس گیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ساتھ کفر کیا''۔

حالانکہ جادوگر کے پاس سے جانے سے توحید و رسالت اور قیامت کا انکار نہیں ہوتا، کوئی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی فرماتے ہیں کہ اس نے شریعت اسلام کے ساتھ کفر کیا۔ اس لئے کہ آج جادوگر کے پاس گیا تو سحر کی برائی اس کے دل سے نکل گئی۔ تو کل کو سحر سیکھے گا اور پرسوں پورا جادوگر بن جائے گا۔ تو اسی جادو کے کفر سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کو کہتے ہیں سدِ ذرائع اصل مقصود کو کبیرہ گناہ کہتے ہیں اور وسائل کو صغیرہ گناہ تو وسائل سے روکتے ہیں تاکہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔

مثلاً چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے کہ کسی کے مال معصوم کو آدمی بلا اسی کی مرضی کے اٹھا لائے۔ لیکن یہ تو ہے اصل خرابی۔ مگر اس کی وجہ سے کسی کے مال کو تاک جھانک کرنا، نقب لگانا، دیوار سے جھانکنا، یہ سب صغائر ہیں اور اسی لئے ناجائز ہیں کہ جب یہ کرے گا، تو ایک دن اصل بھی کر بیٹھے گا۔ گو اپنی ذات سے کسی کے سامان کو دیکھنا، کسی کی دیوار کو تاک لگانا ممنوع چیز نہیں۔ مگر اس لئے ممنوع ہوئے کہ یہ چوری کا وسیلہ بنتے ہیں۔ یا مثلاً زنا کے سلسلہ میں اصل ممنوع وہ فعل (حرام) ہے مگر اس سے بچانے کے لئے نامحرم عورت سے تخلیہ کرنا، اس پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، ہاتھ سے چھونا، سب ممنوع قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ چیزیں اصل حرام فعل کے ذرائع بنتی ہیں۔ تو شریعت نے چاہا کہ گناہ سے بچنے کے لئے دواعی سے بھی بچو یہ سب شریعت کے آداب ہیں۔

عبادات کے وسائل بھی عبادت ہیں...... ماموررات میں نماز فرض ہے۔ اس فرض کو بجالانے کے لئے کچھ چیزوں کا اہتمام کیا گیا کہ اذان جب سنو تو اس کا جواب دو تاکہ اذان سنتے ہی فکر پیدا ہو جائے کہ اب مجھے نماز کو جانا ہے۔ اس کے بعد وضو کا اہتمام کرو۔ پھر ترغیب دی گئی کہ مسجد میں جاؤ گے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک بدی مٹا دی جائے گی۔ حالانکہ قدم رکھنا اپنی ذات سے کوئی عبادت نہیں۔ لیکن نماز کے لئے قدم رکھنا عبادت قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ قدم نماز پڑھنے کا ذریعہ بنے گا۔ تو اس اذان کا جواب دینا، قدم اٹھانا، وضو، استنجا اور طہارت وغیرہ کی فضیلت آئی۔

اہل اللہ کو نیکی کی حرص...... حتی کہ بعض اہل اللہ کی یہ شان سنی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ اگر مسجد کے دو راستے ہوں۔ ایک ذرا لمبا راستہ اور ایک مختصر راستہ، تو لمبا راستہ اختیار کرتے اور فرماتے، جتنے قدم زیادہ پڑیں گے، اتنی بدیاں مٹیں گی۔ تو کیا ہم محروم رہیں اور ساتھ میں قدم بھی چھوٹے چھوٹے رکھتے۔ یعنی بالطبع چال سے کم چال سے چلتے کیونکہ قدم اٹھانے پر اجر کا وعدہ ہے تو یہ ہمارے

① مسند احمد، ج: ۱۹، ص: ۲۱۴، رقم: ۹۱۷۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب ج: ۳ ص: ۹۸.

اختیار میں ہے کہ جتنے چاہیں قدم رکھیں تا کہ نیکیاں اتنی لکھی جاویں۔ سو قدم سے اگر مسجد تک پہنچتے تو آہستہ آہستہ چل کر انہیں دو سو قدم بنا دیتے۔ اور یہ حضرات نیکیوں پر حریص ہوتے ہیں جیسے دنیا والے دنیا کے بارے میں کہ انہیں سو مل جائے تو ہزار اور ہزار مل جائے تو لاکھ اور لاکھ مل جائے تو کروڑ کی تمنا اور حرص ہوتی ہے۔ اللہ والے دین کے بارے میں ایسے ہوتے ہیں۔ اگر ایک ثواب ملتا ہے تو اس پر قناعت نہیں، دو مل جائیں تو تیسرے کی خواہش۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... امام ابوداؤد بہت بڑے محدث ہیں۔ وہ دریا کے کنارے کھڑے تھے اور کنارے پر پانی کم تھا۔ ایک جہاز دو تین سو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا کنارے تک آ نہیں سکتا تھا۔ جہاز میں ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا اور اتنے زور سے کہا کہ ان کے کان میں آواز آئی تو مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جواب ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہہ دینا چاہئے۔ مگر یہ مسئلہ مجلس سے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی بازار میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو تم گھر سے جواب دینے جاؤ۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کی آواز پڑی۔ یہ لوگ چونکہ نیکیوں کے حریص تھے۔ چھوٹی سی نیکی ملنے کا امکان ہو تو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ نیکی اور خیر کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاز دور تھا، آواز پہنچ نہیں سکتی تھی۔ تین درہم میں کشتی کرایہ پر لی۔ اس میں بیٹھ کر جہاز کے اوپر چڑھے۔ وہاں جا کر کہا ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ''۔ ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ غیب سے آواز کان میں آئی کہ اے ابی داؤد! آج تین درہم میں تو نے جنت کو خرید لیا۔ حالانکہ امام کتنے بڑے محدث، کتنی حدیثیں لکھیں، کتنے تہجد پڑھے، کتنے جہاد کئے ہوں گے مگر جنت کی خریداری میں بڑے بڑے اعمال کا ذکر نہیں بلکہ ذکر آیا تو ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہنے کا، جو بظاہر بہت چھوٹا اور معمولی سا عمل تھا مگر کیوں آیا؟ اس لئے کہ ایسے اخلاص سے عمل کیا کہ اس چھوٹے سے عمل میں اتنا وزن پیدا ہوا کہ بڑے سے بڑے عمل میں اتنا نہ ہوگا اور اللہ کے ہاں عمل کی صورت نہیں، وزن دیکھا جاتا ہے۔ کشتی لے کر جہاز پر جا کر ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہنا نہ فرض تھا نہ واجب مگر یہ لوگ آداب پر عمل کے حریص ہوتے ہیں تا کہ فرائض پر عمل کی کوتاہی نہ آئے۔ تو تادب مع اللہ اتنا ضروری ہے۔

اس زمانے میں چونکہ بے ادبی اور گستاخی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی زیادہ ہوگئی۔ ایک دوسرے کے حق میں زبان طعن و ملامت اور زبان تضحیک کھولنا بہت معمولی بات بن گئی۔ اس واسطے میں نے یہ سمع خراشی آپ لوگوں کی کی، کہ اگر بالفرض کسی عالم سے اختلاف آ بھی جائے۔ تو اگر آپ خود عالم ہیں، تب آپ پر فرض ہے کہ دوسرے کا احترام کریں اور اگر آپ متبع ہیں اور وہ اقتدی کر رہا ہے دوسرے عالم کی، تو عمل اپنے مقتدی و متبوع کی تحقیق پر کریں۔ مگر دوسرے کے ساتھ تمسخر کرنا آپ کے حق میں بالکل جائز نہیں۔ بلکہ آپ یہ تاویل کریں کہ اس کے ہاتھ میں بھی حجت ہے، جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو وہ کہتا ہے عند اللہ وہ بھی مقبول ہے۔ ہر مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ اگر خطا ہو جائے تو بھی اسے اجر ملتا ہے اور آپ اس پر عقاب اور عذاب بھیجنے لگیں، یہ تو خدا کا مقابلہ ہو گیا۔ حق تعالیٰ کے ہاں اجتہاد کی خطا پر بھی ملامت نہیں۔ آج کل فروعی اختلاف کی

وجہ سے مسخرہ پن بڑھ گیا ہے یہ دین کے منافی ہے۔ بے شک آدمی عمل اپنی تحقیق پر کرے اور دوسرے کو معذور رکھے۔ ادب اور احترام میں کمی نہ آنے دے، یہ دانائی کی بات ہے۔

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرز عمل...... آئمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے، تو امام کا مسلک ہے، نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ سے کہنا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں زور سے کہنا افضل واولیٰ ہے۔ مگر جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی، تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا مجھے حیا آتی ہے اس صاحب مزار سے کہ اس کے قریب آکر اس کے اجتہاد سے خلاف کروں۔ یہ ادب اور تادب ہے۔ یعنی جس حد تک گنجائش ہو ایک تو حرام وحلال اور جائز و ناجائز کا فرق ہے کہ ایک کے ہاں جائز، دوسرے کے ہاں حرام، اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتے۔ مگر جہاں اولیٰ اور غیر اولیٰ کا فرق ہے وہاں ادب ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے افضل پر عمل ترک کر دیا اور غیر افضل پر عمل کیا امام کی رعایت سے، حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں۔ مگر یہ ادب کا عالم تھا اور یہ ادب اور تادب کی بات تھی۔

مسائل اور جذباتِ نفسانی...... حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان بھی اختلافات تھے، آئمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں جو اختلافات ہیں وہ صحابہ میں بھی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ادب واحترام اور عظمت وتعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ کے لئے مسائل کی خاصیت نہیں ہے، بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات کو نکالنے کے لئے مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔ اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ لڑتے کیوں کہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا۔ اس کے بعد آئمہ مجتہدین کے ہاں لاٹھی چلتی۔ پھر علماء ربانیین آپس میں لڑتے، مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔ یہ دراصل اختلاف رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات نکالتے ہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے۔ جب مسلمانوں کے پاس یہ چیزیں نہ رہیں۔ نہ جائیداد، نہ مکان، نہ سلطنت، سوچا کہ بھئی! دین کو لڑنے کا ذریعہ بناؤ اور مسائل کو آڑ بناؤ تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں۔ اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے فروعی اختلاف پر عیسائی جج کا طنز...... ایک عرصہ پہلے ایک یورپین عیسائی کلکٹر تھا۔ اس کے زمانہ میں احناف اور اہل حدیث میں لڑائی ہوئی اور لڑائی ''آمین'' کہنے پر ہوئی۔ حنفیوں نے آہستہ پڑھی۔ اہل حدیث نے زور سے کہی تو لاٹھی چل گئی۔ بہت لوگوں کا سر ٹوٹ گیا۔ مقدمہ کلکٹر کے ہاں گیا۔ فریقین کے وکلاء نے کلکٹر کو مقدمہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ بھئی! آمین کوئی جائیداد ہے یا بلڈنگ ہے کہ اس پر لڑتے ہیں؟ وکلاء نے کہا،

نہیں آمین ایک قول ہے جو زبان سے نکالتے ہیں۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر سے حدیث آئی ہے کہ آمین زور سے پڑھو، دوسرے کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے، آہستہ پڑھو اس نے کہا، جس کو جو حدیث معلوم ہے اس پر عمل کرے۔ تم لڑتے کیوں ہو؟ اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی اور سمجھ میں آنے کی بات بھی نہ تھی۔

بہر حال اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا کہ میں مقدمہ کی مثل دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک "آمِیْن بِالْجَھْر" زور سے پڑھنا، ایک "آمِیْن بِالسِّر" آہستہ پڑھنا اور ایک "آمِیْن بِالشَّر" یعنی جھگڑنے، لڑنے کے لئے پڑھنا اس لئے کہ پہلے دونوں کے بارے میں حدیث موجود ہے ایک کو ایک امام نے، دوسرے کو دوسرے امام نے اختیار کر لیا۔ اس میں لڑائی کی بنیاد ہی نہیں۔ یہ آمین بالشر کی لڑائی ہے۔ لہٰذا میں دونوں کو سزا دیتا ہوں۔ گویا اس نے بتایا کہ اختلافی مسائل نہ لڑائی کے لئے ہوتے ہیں نہ باہمی نزاع کے لئے، وہ دیانتاً حجت سے رائے قائم کرنے کے لئے ہوتے ہیں تو یہ ہمارے قلوب کا فساد ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات نکالنے کے لئے آڑ بنا لیا ہے اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا ڈالنے اور گروہ بندیوں کے لئے رہ گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں راہ صواب ...... اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو مگر لڑنا کیوں ہے؟ وہ اپنی قبر میں جائے گا اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے کیونکر اس سے مسخرہ کرو اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزاء کرے۔ آپ نے بیان کیا امر بالمعروف کا حق ادا ہو گیا۔ اب اگر کوئی نہیں مانتا، نہ مانے۔ اگر اس کے پاس کوئی حجت ہے تو وہ عنداللہ جواب دے گا تم ذمہ دار نہیں، نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے گا اور پھر دین منوانا (یعنی اصول دین پر کسی کو مجبور کرنا) بھی ضروری نہیں۔ چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا منوانا بھی ضروری ہو۔ بہر حال آج کل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت ...... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں مقام پر جا کر دین کی تبلیغ و اشاعت کرو، چلتے چلتے مرید نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمایئے مجھے شیخ نے فرمایا کہ دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدائی کا دعویٰ مت کرو اور نبوت کا دعویٰ مت کرو۔ وہ حیران ہوا کہ حضرت! میں بر سہا برس آپ کی صحبت میں رہا۔ کیا اب بھی یہ احتمال اور خطرہ تھا کہ میں خدائی اور نبوت کا دعویٰ کروں گا؟ فرمایا کہ خدائی اور نبوت کے دعویٰ کا مطلب سمجھ لو، پھر بات کرو۔ خدا کی ذات وہ ہے کہ وہ جو کہہ دے وہی اٹل ہو اس سے اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو انسان اپنی رائے کو اس درجہ میں پیش کرے کہ وہ اٹل ہو۔ اس کے خلاف نہ ہو سکے۔ کوئی بندہ اپنی رائے پر اتنا اصرار کرے، تو اس سے بڑھ کر خدائی کا دعویٰ کیا ہو گا؟ اور نبی وہ ہے کہ جو زبان سے فرمائے وہ سچی بات ہے، کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے قول کے بارے میں کہے کہ یہ

اتنی سچی بات ہے کہ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ وہ در پردہ گویا نبوت کا مدعی ہے کہ میری بات غلط نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کی رائے ہے۔

فساد یا اصلاح ؟...... تو ایک شخص اجتہادی رائے کے بارے میں اتنا جمود کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے۔ یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں فساد ہے۔ تو ایک چیز کو چلانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان، ماننے والے مانیں گے۔ تم ذمہ دار اور خدائی ٹھیکہ دار نہیں ہو۔ ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چباتے رہنا، اس سے خوامخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آ گئی۔

تبلیغی اور ترجیحی مسائل میں فرق...... ہاں ایک ہیں دین کے اصول، نماز فرض ہے، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ آپ زور سے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فروعی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں۔؟ تو یہ تبلیغی چیزیں ہی نہیں، آپ زور کہاں سے دیتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذاہب ہی نہیں آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو! تم حنفی بن جاؤ اور شافعی مت بنو۔ یا شافعی کہے کہ لوگو! شافعی بن جاؤ، حنفی مت بنو یہ ترجیحی مذاہب ہیں، تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا افضل ہے اور فلاں عمل نہیں۔ تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذاہب مت بناؤ کہ اگر کسی عالم کو کوئی جزئی تحقیق ہو۔ خوامخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔ بہرحال آج کل یہ چیز پیدا ہو گئی ہے۔ بہت گستاخی، جسارت اور جرات ہو رہی ہے اس واسطے یہ چند باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے عمل کی۔

"اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ"

حقوق مالیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّـــا بَعْــدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بدن اوراس کی ضروریات کا خالق...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنا نہیں ہے۔ مختصر طریق پر چند کام کی باتیں آپ حضرات کے سامنے گذارش کروں گا اور اس میں بھی کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ بلا تمہید جو اصل مقصود کی باتیں ہیں، وہی کہنی ہیں۔ اتنی بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ ہمارا خالق اور مالک اللہ رب العزت ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا، ہمارے بدن کو بھی اور ہماری روح کو بھی اور روح و بدن کے لئے جن سامانوں کی ضرورت ہے، ان سامانوں کو بھی اس نے پیدا کیا۔ بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت تھی۔ تو زمین سے لے کر آسمان تک ان ضروریات کو پھیلا دیا۔ زمین میں طاقت رکھ دی کہ ہماری غذائیں اگائے۔

اس میں طاقت رکھ دی کہ ہمارا لباس بھی اگائے۔ گویا زمین کو اللہ نے غذاؤں کا گودام بنا دیا۔ یہ گیہوں چنے، چاول، پھل پھول اور فروٹ سب اسی سے نکلتے ہیں۔ پھر اپنی حکمت سے زمین ہی کو سڑک بنا دیا۔ ہم اس پر چلتے پھرتے ہیں۔ پھر زمین ہی میں ہمارے لئے پانی کا سامان رکھا اور دریا جاری کر دیئے، زمین ہی کے اوپر ہوائیں پھیلا دیں کہ ہم سانس لے سکیں۔ تو زمین گودام، واٹرورکس، اور ہمارے کپڑوں کا صندوق بھی ہے۔ جس سے روئی اور جانوروں کی اون نکلتی ہے۔ ساری بدنی ضروریات اس میں مہیا کی ہوئی ہیں۔

بدن کو روشنی کی ضرورت تھی تو پہلے آسمان کی چھت قائم کی۔ اس میں چاند سورج اور ستاروں کے انڈے

① پارہ:۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۴.

لٹکا دیئے پھر ایک ہی چیز سے بہت سے کام لئے سورج ہمیں روشنی بھی بخشتا ہے۔ گرمی کی ضرورت ہے تو حرارت بھی بخشتا ہے۔ ٹائم اور وقت کی ضرورت ہو تو اچھی خاصی گھڑی بھی ہے۔ جس سے ہم اوقات بھی معلوم کرتے ہیں۔ ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ① ستاروں سے لوگ راستے بھی پاتے ہیں سمندروں میں جہاز رانی ہوتی ہے وہاں سڑکیں بنائی ہوئی نہیں ہوتی سمتوں سے چلتے ہیں اور سمتیں ستاروں سے متعین کرتے ہیں۔ تو ستاروں سے راہ، سورج سے روشنی اور گرمی ملتی ہے۔ نیز ستاروں سے جڑی بوٹیوں میں خاصیتیں اور تاثیر پیدا ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کی نلیوں میں گودا اور روغن پیدا ہوتا ہے۔ غرض انسان کے لئے جتنی بدن کی ضروریات درکار ہیں۔ وہ سب زمین اور آسمان کے وسط میں رکھ دی ہیں تو وہ ہمارے بدن کا بھی خالق ہے اور بدن کی ضروریات کا بھی۔

روح اور اس کی ضروریات کا خالق...... اسی طرح وہ ہماری روح اور اس کی ضروریات کا بھی خالق ہے۔ جیسے بدن کی ضروریات ہیں، بدن کے لئے غذا کی بھی ضرورت ہے تو روح کے لئے بھی ضرورت ہے۔ بدن کو اگر راحت کی ضرورت ہے تو روح کو بھی سکون وتسکین کی ضرورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بدن مادی چیز ہے اس کے سامان بھی مادی ہیں روح ایک پاکیزہ اور لطیف چیز ہے اس کے سامان بھی لطیف ہیں روح کی غذا علم ومعرفت، اخلاق ربانی اور ملکیت ہے۔ یعنی ملائکہ کی صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں۔ اس سے روح کو سکون ملتا ہے۔ روح کو آپ کے اس روٹی اور کپڑے کی ضرورت نہیں ہے اس کا روٹی کپڑا اس کے مناسب حال ہے جو علم کمال دین ودیانت اور اخلاق ہے۔

جس طرح پانی کے لئے بادل مقرر کئے جو اپنے وقت پر آ کر برس جاتے ہیں، جس سے آپ کی زمین سیراب ہوتی ہے اس طرح علم کے بادل پیدا کئے وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کے ذریعے وحی کی بارش ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا الخ“ ② میری اور میرے دائرہ علم وکمال ایسی مثال ہے جیسے بہت زور کا بادل اٹھا اور گھٹا اٹھی اس میں سے بارش برسنی شروع ہوئی موسلا دھار پانی پڑا تو زمین کی تین قسمیں ہوگئیں۔ ایک زمین وہ ہے جو پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور پھل پھول اگا کر باغ وبہار بنا دتی ہے، ایک وہ کہ باغ وبہار اور پھل پھول نہیں نکالتی لیکن پانی کو جمع کر لیتی ہے گہرے تالاب ہیں ان میں پانی بھر جاتا ہے پھر لوگ وہاں سے پانی لے کر پیتے ہیں۔ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ وہ جو بالکل چٹیل میدان ہے جس میں نہ اگانے کی صلاحیت ہے نہ پانی کے جمع کرنے کی، پانی آیا اور بہ کر نکل گیا۔ نہ جمع کیا کہ دوسرے فائدہ اٹھائیں نہ کوئی پھل پھول ہی اگایا کہ خود اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک قلوب وہ ہیں کہ جب وحی کا پانی آتا

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۶۔

② الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۷.

ہے تو وہ اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے علم وحکمت کے پھل پھول نکال کے پیش کرتے ہیں۔ جس سے روحانیت میں باغ و بہار آ جاتی ہے۔ یہ ہیں فقہاء کہ دین اور علم پہنچا، انہوں نے اجتہاد کیا مسائل نکال نکال کر دنیا کے آگے رکھ دیئے تا کہ لوگ عمل کریں۔

ایک قلوب کا وہ طبقہ ہے، جو پھل پھول تو نہیں اگا سکتا مگر امانت داری کے ساتھ وحی کے پانی کو جمع کر لیتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، کوئی اس سے پیتا ہے، کوئی کھیتی کو دیتا ہے۔ یہ ایسے ہیں جیسے مُحد ثین اور حُفاظ قرآن حکیم کہ وحی آئی اور انہوں نے اسے اپنے سینے میں جمع کر لیا۔ ان میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس میں سے مسئلہ نکال لیں۔ مگر جو آئے گا، اسے پانی پہنچا دیں گے وہ اس میں سے مسائل نکال لے گا۔

تیسرا طبقہ گمراہ کہا گیا وہ ہے کہ وحی کا پانی برسا لیکن اس کے دل ایسے ہیں جیسے اونچی زمین ہوتی ہے کہ آیا اور بہہ گیا۔ نہ اس میں جمع ہوا نہ پھل پھول نکلے۔ جیسے مادی پانی کے لحاظ سے زمین کی تین قسمیں ہیں اسی طرح وحی کے پانی کے اعتبار سے بھی قلوب کی تین قسمیں ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے جیسے بدن کے لئے غذائیں پیدا کی گئیں روح کے لئے بھی پیدا کی گئیں، بدن کی غذا بھی ہر ایک نہیں نکال سکتا۔ کسی کے اندر ایجاد کا مادہ ہے کہ زمین میں سے معدنیات نکالے، سونا چاندی اور سیسہ نکال کر طرح طرح کے سامان بنائے۔ ایک وہ مزدور ہیں جن میں یہ صلاحت نہیں ہے کہ وہ ایجاد کریں وہ سونا چاندنی نکال نکال کے پیش کریں۔ تا کہ دوسرے اس سے کام لیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن میں نہ عقل ہے نہ ہمت نہ ایجاد کر سکتے ہیں نہ وہ کوئی چیز جمع کر سکتے ہیں بلکہ دونوں باتوں سے خالی ہیں۔ غرض جیسے وہاں تین قسمیں ہیں۔ یہاں بھی تین ہی قسمیں ہیں۔

روح و بدن کو صحیح کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے...... تو بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ روح کے لئے روحانی غذاؤں علم و کمال وغیرہ کی ضرورت ہے اور یہ سارے سامان اللہ میاں نے پیدا کیے۔ تو ہم بھی، ہماری جان بھی، ہمارا مال بھی سب خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اور ہم اللہ کی ملک و مملوک ہیں۔ نہ ہمارا بدن ہماری ملک ہے نہ روح۔ ہم امانت دار ہیں مالک نے پیدا کیا ہمارا فرض ہے کہ ہم امانت داری کے ساتھ اسے سونپ دیں اور صحیح کر کے اسے سونپیں تو ہم اس بدن کے خود مالک نہیں ہیں۔ یہ سرکاری مشین ہے۔ اس لئے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔

اس لئے اگر بدن پر بیماری آ جائے تو سنت ہے کہ علاج کیا جائے۔ اس کی حفاظت کی جائے۔ اس لئے کہ ہماری ملک ہو تو چاہے اپنے کو ختم کر دیں، چاہے قتل کر دیں، خودکشی کر لیں۔ مگر یہ ہماری ملک نہیں، مالک کی چیز ہے۔ ہمیں امانت داری کے ساتھ اسے سونپنا ہے اس واسطے اس کے کہنے کے مطابق ہم بدن میں تصرف کرتے ہیں، بدن بیمار ہو تو علاج کرتے ہیں۔ پھوڑا پھنسی ہو تو مرہم لگاتے ہیں اندر کا زخم ہو تو آپریشن کراتے ہیں، دوائیں پیتے ہیں تا کہ صحت ہو جائے اسی طرح روح کے اندر بھی پھوڑے اور پھنسیاں نکلتی ہیں۔ بیماریاں بھی آتی

ہیں۔ اخلاق کی بیماریاں ہیں اگر بداخلاقی پیدا ہوگئی۔ حرص، حسد، بغض، تکبر اور غرور پیدا ہوگیا دوسرے کو ایذاء پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوگیا یہ روح کی بیماریاں ہیں۔

جیسے بدن کی بیماریوں میں علاج کے لئے آپ ڈاکٹروں اور اطباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روح کی بیماریوں کے لئے روحانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ اس کی تدبیر جانتے ہیں، مادی ڈاکٹر نہیں جانتے۔ وہی بتاسکیں گے کہ تکبر کو کیسے دور کریں، لالچ کو کیسے چھوڑیں، حسد کو کیسے دور کریں۔ اس کے علاج اور تدبیر کے لئے کتابیں ہیں علوم وفنون ہیں۔ جو قرآن وحدیث میں سب بیان کردیئے گئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہم نہ اپنے بدن کے مالک نہ روح کے مالک اور جب ہم اپنے بدن اور روح کے مالک نہیں ہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ ہم آسمان اور زمین کے مالک کیسے ہوئے؟

رُوح اور بدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ہے...... اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اگر آپ بدن وروح کے مالک ہوتے تو جان آپ کے قبضے میں ہوتی۔ کوئی بھی نہ مرا کرتا، کسی کا انتقال نہ ہوا کرتا، کوئی مارتا تو فوراً کہتے کہ میں مالک ہوں۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ میری جان نکال سکے تو ملک الموت سے بڑی لڑائیاں ہوا کرتیں کہ صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے۔ کہ آپ جان نکالنے آگئے جان تو میری ہے۔ مگر جب جان نکلنے کا وقت آتا ہے تو ایک منٹ کے لئے نہیں روک سکتے۔ پیدا بھی ہونا ہی پڑتا ہے، مرنا بھی پڑتا ہے، نہ جینا اپنے قبضے میں نہ مرنا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ نہ ہم جان کے مالک ہیں نہ بدن کے مالک اگر بدن پر ہمارا تسلط ہوتا، ہم کبھی بیمار نہ ہوتے۔ کون کہتا ہے کہ میرا بدن خراب ہو، یا میرا بدن کمزور پڑ جائے۔ لیکن جب بیماری آتی ہے، بیمار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جب کوئی آفت آتی ہے تو سہنی ہی پڑتی ہے۔

اس لئے جیسے بدن دوسرے کا ہے، اسی طرح اس پر عوارض آتے ہیں، وہ دوسرے کی طرف سے آتے ہیں۔ تو جب اسی طرح سے ہم بے بس ہیں کہ نہ آنا ہمارے قبضے میں، نہ جانا ہمارے قبضے میں۔ قضا لاتی ہے، آنا پڑتا ہے قضا لے جاتی ہے، جانا پڑتا ہے۔ جب ہم اپنے مالک نہیں تو اس زمین وآسمان کے مالک کیسے ہوئے؟ اسی طرح رات دن، اس کے بھی مالک نہیں۔ یہ ہمارے قبضے میں نہیں کہ رات کو لمبا اور دن کو چھوٹا کردیں۔ یہ اس کے قبضے میں ہے جو رات دن کو پیدا کررہا ہے۔ جب ہر صورت میں خالق ومالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہوگا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بدن کو پیدا تو وہ کرے۔ عبادت ہم دوسرے کی کریں، حکم دوسرے کا مانیں، گردن دوسرے کے سامنے جھکائیں۔ اسی کے آگے گردن جھکے گی، جس نے گردن کو بنایا ہے، اسی کے آگے ہماری روح اور بدن جھکے گا، جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جب مالک وخالق وہ ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں، تو غلام کا کام یہ ہے کہ بے چون وچرا مالک کے حکم پر گردن طاعت سے جھکادے۔ سرکشی کرے گا تو غلامی سے نکل جائے گا۔ اسی لئے قرآن

کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اورانسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری بندگی کریں''۔اس لئے کہ جب ہم پیدا کرنے والے ہیں، ہم مالک ہیں، تو کون ہے جو ہماری بندگی نہ کرے ہمارے سامنے نہ جھکے۔

بندے کا کام ارادہ سے ہمہ قسم عبادت ہے...... آپ ارادہ کریں نہ کریں، جھکنا تو پڑتا ہے موت آئے گی تو آپ جھکیں گے؟ یا یہ کہیں گے کہ ہم نہیں موت کو قبول کرتے، مجبور ہونا پڑے گا۔صحت و بیماری آئے گی۔ مجبور ہو کے اسے قبول کرنا پڑے گا مالک کے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔محتاج کا کام یہ ہے کہ غنی کے آگے جھکے۔ اگر آپ غنی ہیں، جھکنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر غنی نہیں محتاج ہیں، تو پھر محتاج ہوئے تو جھکنا ہی پڑے گا۔ تو بجائے اس کے کہ آدمی مجبوراً جھکے، رضامندی سے کیوں نہ جھکے۔ مجبوراً تو آسمان، زمین اور پہاڑ بھی جھک رہے ہیں۔ یہ ان پر قہر ہے۔لیکن انسان کو عقل وارادہ اور اختیار دیا گیا۔ تو اور چیزیں بلا ارادہ جھکتی ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ارادہ سے جھکے، عقل سے سوچ کر جھکے، اپنے اختیار سے جھکے۔ اسی کا نام عبادت ہے تو بندے کا کام بندگی کرنا ہے اور بندگی کا معنی غایت تذلل کے ہیں۔ پوری طرح اپنے مالک کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت ہے۔ یہ کیوں اختیار کرے۔؟ اس لئے اللہ کی اتنی عزت ہے کہ عزت کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے، جو اس کے ہاں نہ ہو۔ تو بندہ اس کے سامنے انتہائی ذلت ایسے پیش کرے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ انسان کے اندر سب سے بڑی چیز عزت کی اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ نماز میں زمین پر اس کو ٹیکا جاتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی سب سے زیادہ عزت کی چیز کو تیرے آگے پامال کرتا ہوں۔ کیونکہ تیری عزت سب سے بلند ہے۔ غرض بندے کا کام بندگی کرنا ہے۔ جان سے بھی، مال سے بھی اور آبرو سے بھی۔ اس لئے کہ عزت کی ضرورت پڑے تو وہ وہاں سے آئے گی۔ مال و جان کی ضرورت پڑے، وہ وہاں سے آئے گا۔ اس لئے کہ بندہ نہ اپنی جان کا مالک نہ اپنی آبرو اور مال کا مالک۔ تو بندگی کا حاصل یہ نکلا کہ مال، جان، آبرو، سامان سب سے عبادت کرے۔

اس لئے اللہ نے عبادتوں کی قسمیں رکھ دی ہیں۔ ایک جانی عبادت ہے، وہ جان سے ادا کی جاتی ہے۔ جیسے آپ نماز پڑھتے ہیں بدن کو، روح کو جھکاتے ہیں اور حج کرتے ہیں اس کے لئے سفر کرتے ہیں۔ ایک مالی عبادت ہے۔ جیسے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور غرباء کی خدمت کرتے ہیں۔ تو تینوں قسموں کی عبادتیں فرض کر دی گئیں۔ بندے کا کام یہ کہ جان، مال آبرو سے بھی جھکے۔ جان سے نماز میں اور آبرو سے حج میں جھکتا ہے۔

آبرو سے عبادت...... اس لئے کہ جتنے وقار اور ظاہری عزت کے سامان ہیں، سب کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ اپنے وطن میں آدمی آبرو اور وقار جتلاتا ہے۔ تو ملک چھڑوا دیا، تو جو وقار گھر کا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب مسافر بن کے چلا جا رہا ہے۔ پھر لباس آبرو اور وقار پیدا کرتا ہے. نیا لباس پہنا ہے، اکڑ کے چلتا ہے۔ تو حکم دیا گیا کہ لباس اتارو، کفنی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

پہنو، اور ننگے سر رہو۔ پھر آدمی بدن کی زینت سے اور چہرے کے بنانے سنوارنے سے وقار حاصل کرتا ہے۔ یہاں حکم یہ ہے کہ جب احرام باندھ لیا، بال، ناخن کتروانے کی اجازت نہیں، بدن میں جوئیں پڑ جائیں تو مارنے کی بھی اجازت نہیں، شکار کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ بندہ عاشق بن کر جاتا ہے، عاشق کا زینت سے کیا کام؟ عاشق اگر اپنی زینت اور آرائش کرے گا تو محبوب کی طرف کیسے متوجہ ہوگا؟ وہ پکا عاشق نہیں اس لئے یہ سب کچھ چھڑوایا گیا محبوب کے گھر آیا تو پروانوں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے، طواف کر رہا ہے۔ محبوب نے کہا کہ منیٰ جا، وہاں چلا گیا کہ سر منڈا، سر منڈا دیا۔ پھر کبھی آدمی چال سے وقار حاصل کرتا ہے کہ بن بن کر چلتا ہے۔ تو سارا وقار نکال دیا گیا۔ جب بیت اللہ کا طواف ہوتا ہے۔ تو جس طواف کے بعد سعی کرنی ہوتی ہے، اس میں رَمل بھی ضروری ہوتی ہے۔ کہ چار پھیروں میں اکڑ کے چلے۔ اب کوئی عالم ہو، لمبی داڑھی ہو، وہ جھک کر چلتا، مگر اب اکڑ کے چل رہا ہے جیسے پہلوان جا رہے ہوں۔ پھر رمل کا حکم دیا گیا جب تم رمل کرو اور پہلوانوں کی طرح چلو تو اِحرام کی چادر کو دائیں مونڈھے کے نیچے رکھ کے بائیں مونڈھے پر ڈال لو، تو سارا بدن کھل گیا۔ جو لوگ اپنا بدن کھولنا وقار کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ وقار بھی ختم ہو گیا اسی طرح صفا و مروہ میں دوڑنے سے وقار ختم ہوتا ہے۔

غرض وقار کی جتنی چیزیں تھیں۔ وہ سب ممنوع قرار دے دیں۔ تو حج میں آبرو ختم کر کے اسے مٹا کر عبادت کرائی جاتی ہے۔ نماز کا قصہ برعکس ہے کہ گھر سے نکلو تو دوڑ کے مت چلو فرمایا گیا: ''لَاتَـاْتُـوْهَـا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ.'' ① ''مسجد میں آؤ تو وقار کے ساتھ چلو۔ ایسے دوڑ کے مت چلو جیسے بچے دوڑا کرتے ہیں''۔ وہاں یہ حکم تھا کہ لباس اتار کر کفنی پہنو۔ یہاں یہ فرمایا کہ پورا لباس پہن کر ننگے سر بھی نہیں، پورے وقار کے ساتھ نکلو۔ حج میں فرمایا کہ: خبردار! اگر تم نے خوشبو لگائی۔ نماز کے بارے میں فرمایا، خود بھی خوشبو لگاؤ اور مسجد کو بھی معطر کرو۔ تو بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ نماز میں جان سے اور حج میں آبرو سے عبادت کرائی جاتی ہے۔

عبادتِ مالی...... اب مال رہ گیا تھا تو زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھ دی کہ اس میں سے غرباء کا حق نکالو۔ پہلی امتوں کو حکم یہ تھا کہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو بچے وہ صدقہ کر دو ایک پائی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر تم نے رکھا تو تمہاری روحانیت نہیں بنے گی۔ اخلاق درست نہیں ہوں گے۔ بس کھا لیا، پی لیا اور پہن لیا۔ باقی جو زائد ہے، صدقہ کر دیا اور اگر کوئی صدقہ لینے والا نہ ملے، تو حکم یہ تھا کہ اس مال کو آگ لگا دو ''تَـاْكُـلُـهُ النَّـارُ.'' آگ اس کو کھا لیتی تھی۔ یہ علامت تھی کہ صدقہ قبول ہو گیا، لیکن یہ امت ضعیف ہے۔ اس واسطے رعایت کی گئی کہ کھاؤ بھی، پیو بھی۔ اگر بچ رہے تو یہ نہیں ہے کہ سب دے ڈالو۔ اس میں کچھ حقوق مقرر کر دیئے کہ اس طرح سے اپنے مال کو خرچ کرو اور اس میں فرائض مقرر کئے۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب السعی الی الصلوة، ج: ۲، ص: ۱۸۴، رقم: ۴۸۵. حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۲ ص: ۷۲ رقم: ۵۷۲.

جس مال کے حاصل کرنے میں آدمی کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔اس میں اللہ نے اپنا حق کم کر دیا، تا کہ دینے میں آسانی ہو۔ جو مال کم محنت سے حاصل ہوتا ہے، اس میں اپنا حق بڑھا دیا کیونکہ دینے میں سہولت رہے۔ جس مال میں بالکل محنت نہ پڑے تو حصہ اور بھی بڑھا دیا۔ جسے حاصل کرنے میں آسانی تھی، تو دینے میں بھی آسانی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی کو دفینہ یا خزانہ مل جائے۔ مثلاً لاکھ دولاکھ کا زمین سے مل جائے۔ تو یہ بلا محنت کے ملا کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑی اتفاق سے جنگل میں گئے زمین کو کھودنے لگے تو ایک بڑی بھاری دیگ نکل آئی یہ بلا محنت ملا۔ اس میں حق تعالیٰ نے پانچواں حصہ رکھا ہے۔ اگر سو روپے ہیں تو پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرے گا۔ یعنی بیس روپے غرباء کا حق ہے اور اسی روپے تمہارا حق ہے۔ اس لئے کہ سو میں سے بیس دینا مشکل نہیں ہوگا۔ جبکہ اسی بھی بغیر محنت ومشقت کے مل رہے ہیں۔ چونکہ اس میں محنت کم تھی تو اللہ نے اپنا حق بڑھا دیا۔

اگر کھیتی باڑی کی، تو کھیتی میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں اپنا حق گھٹا دیا۔ دفینے میں پانچواں حصہ تھا۔ یہاں فرمایا گیا کہ دسواں حصہ دینا پڑے گا۔ یعنی سو روپے میں سے دس روپے دینے پڑیں گے۔ یہ بیت المال کا حق ہوگا جو غریبوں پر خرچ ہوگا۔ نوے روپے تمہارے اپنے ہیں تو کھیتی میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حق گھٹا دیا۔

اور اگر آدمی تجارت کرنے لگے تو تجارت میں زیادہ محنت ہوتی ہے تاجر کا دماغ صبح سے شام تک لگا رہتا کہ مال بھی باقی رکھوں، سامان میں بھی کمی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ گاہک آئے اور میری دوکان میں چیز نہ ہو تو صبح سے شام تک دماغ لڑاتا ہے گویا محنت زیادہ کرتا ہے۔ یہاں سے مال منگواؤ، وہاں سے مال منگواؤ، کہیں بکنگ کا قصہ ہے، کہیں لاٹری کا سسٹم ہے۔ غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس میں پھر ہر ایک کو خوش رکھنا، گاہک سے بھی معاملہ نرمی سے کرنا، اگر گاہک نے کوئی بے تمیزی کی، پھر بھی تاجر کا فرض ہے کہ اخلاق سے پیش آئے۔ بداخلاقی برتے گا تو گاہک دوکان چھوڑ کے چلا جائے گا۔

غرض یہاں بھر پور محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ نے اپنا حق اور کم کر دیا کہ تم بجائے خمس وعشر کے چالیسواں حصہ دے دو۔ سو میں سے اڑھائی روپے دے دو۔ تو سو روپے میں سے اڑھائی روپے دینے کوئی مشکل نہیں ہوتے۔ اور اس میں یہ آسانی کر دی کہ جس دن سو ہوئے، زکوٰۃ تو واجب ہوگئی، لیکن ادا کرنا واجب نہیں جب تک کہ ایک برس نہ گذرے ایک برس میں اگر اور کمائے گا، تو سو سے زیادہ ہو جائیں گے۔ پھر اڑھائی روپے دینا کچھ مشکل نہیں ہوں گے۔ تو اللہ نے یہ عجیب اصول رکھا کہ جس میں بندے کی محنت بڑھتی ہے۔ اتنا اپنا حق گھٹا دیتے ہیں، جتنا بندہ بے محنت کمائے، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں تا کہ دینے کے اندر اسے عار نہ پیدا ہو، مشکل نہ پیش آئے۔

تو زکوٰۃ میں غریبوں کا حق رکھ دیا گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کمانے میں آپ اپنے کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو بھی۔ غریب بھی اسی طرح آپ کی اولاد ہے۔ اگر یہ آپ کی نسبی اولاد ہے تو حیثیت کے لحاظ سے وہ آپ کی معنوی اولاد ہے۔ ان کو اگر نہ دیا، آپ کے لئے پھر دوسری مشکلات پیدا ہوں گی۔ جب غریبوں کو حقوق

نہیں پہنچیں گے۔ پھر سرمایہ اور مزدور کا سوال پیدا ہوگا۔ وہ سارے کھڑے ہو جائیں گے کہ ان سرمایہ داروں کو نکالو یہاں سے اس میں زیادہ مصیبت پڑے گی۔

میں تو کہاں کرتا ہوں کہ اللہ میاں نے سو روپے میں اڑھائی روپے رکھے تھے۔ جب اس کے دینے میں پس وپیش کیا اور نہ دیا۔ تو اتنے بڑے بڑے ٹیکس لگوائے کہ اسی فیصد گورنمنٹ کا اور بیس فیصدی تمہارا۔ اگر اڑھائی روپے دیتے رہتے، تو ساڑھے ستانوے روپے تمہارے ہوتے لیکن اب سو کماؤ گے تو اسی حکومت لے گی، بیس تمہارے ہاتھ میں رہ جائیں گے۔ یہ کفرانِ نعمت کا نتیجہ ہے۔ اگر خدا کا حق پورا دیتے رہتے اور اس کے اصول پر قائم رہتے۔ دوسرا غلبہ نہیں پا سکتا تھا۔

بہرحال شریعت نے یہ ایک اصول رکھا کہ جتنی محنت اور مشقت زیادہ ہے اللہ میاں اپنا حق گھٹا دیتے ہیں اور جب بندے کی محنت کم ہو، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً بکریاں ہیں، اگر تجارت کی ہوں تو چالیس بکریوں پر ایک بکری دینی پڑتی ہے اور گائے بیل ہوں، تو بیس گائے پر ایک گائے کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ بدن بڑھ گیا۔ تو اس کی تعداد گھٹا دی اور اگر اونٹ ہیں، پانچ اونٹ ہوں گے تو ایک اونٹ کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اونٹ گائے سے دوگنا تین گنا ہے۔ بدن بڑھ گیا، تو عدد کم کر دیا۔ تو عجیب حکمت سے ایک نظام قائم کیا ہے۔

عبادتِ مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازن قائم کرنا ہے......اور مقصد یہ کہ امیر اور غریب کے اندر قرب پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ امیر آسمان کے اوپر ہو اور غریب زمین کے اوپر ہو۔ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ غریب کو اوپر چڑھا دیا تا کہ توازن پیدا ہو جائے۔ یہ تو شریعت نے پسند نہیں کیا ایسی کہ مساوات کرو کہ بالکل ایک ہی جیسی روٹی لباس اور ایک ہی سب کی آمدنی ہو اور جبر کر کے امیر سے ساری آمدنی لے لی جائے تا کہ غریب میں بانٹ دی جائے۔ اس لئے کہ اس میں امیر اور غریب کو مضرت پہنچے گی۔

اوّل تو یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی میں اتنی عقل اور ہوشیاری ہے کہ وہ سو روپیہ لے جاتا ہے۔ تو ہزار روپے کما کے لاتا ہے۔ اور ایک اتنا احمق ہے کہ ہزار روپے لے جاتا ہے وہ بھی کھو کے آتا ہے۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو جائیں گے؟ تو جو محنت کرے گا، اس کا حق زیادہ ہوگا۔ جو نہیں کرے گا، اس کا حق کم ہوگا۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ دونوں برابر ہو گئے۔ بلکہ صراحۃً فرمایا: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’ہم نے اپنے بندوں پر معاش تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑھایا ہے۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا، کوئی امیر، کوئی غریب تا کہ ایک دوسرے کے کام آنے والا ہو اور تمدّن پیدا ہو‘‘۔ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو آپ صدقہ کسے دیتے۔ جسے دیتے وہ کہتا، میرے گھر میں بہت سا پڑا ہوا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ تو تعاون اور ایک دوسرے

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۳۲۔

کی خدمت گذاری ختم ہو جاتی۔ اور اگر سارے کے سارے ہی بھک منگے ہوتے تو نہ آپ اسے دیتے، نہ وہ آپ کو دیتا۔ وہ آپ سے بے تعلق، آپ اس سے بے تعلق۔ بالکل سارے مفلس ہوں جب بھی تعاون اور تمدن نہیں پیدا ہوتا اور سارے امیر بن جائیں، جب بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تمدن جبھی پیدا ہوگا جب کچھ امیر ہوں، کچھ غریب، امیر کی حاجت غریب اور غریب کی حاجت امیر سے اَٹکی ہوئی ہو۔ اس واسطے حکمتِ باہمی اور تعاون باہمی کے لئے اللہ نے فرق پیدا کیا۔ تو فرق کو مٹا دینا یہ فطرت کے خلاف ہے۔

اس لئے اگر مال کا فرق مٹانا ہے تو پھر عقلوں کا فرق بھی مٹانا چاہئے۔ ایک بڑا ہوشیار ہے، اسے تو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں اور جو بیوقوف ہے اسے عقلمند بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے قبضے میں نہیں۔ فہموں میں اختلاف ہے، رنگوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کالا، کوئی گورا۔ زبانوں میں اختلاف ہے۔ کسی کی عربی، کسی کی انگریزی، تو زبانوں، صورتوں، سیرتوں کا اخلاق کا اور عقل کا اختلاف ہے، تو جب مختلف عقل سے کمائیں گے، اس میں بھی اختلاف ہوگا۔ کوئی زیادہ کمائے گا، کوئی کم کمائے، اب اگر آپ جبر کر کے ایک امیر سے کہیں کہ ساری کمائی دے۔ اگر تیرے پاس پانچ ہیں تو یہ سب کو بانٹ دے تا کہ سب برابر ہو جائیں۔ اس کا نقصان یہ پہنچے گا کہ امیر کے دل میں مزدور سے بعد پیدا ہوگا کہ محنت تو میری اور جبراً سب کچھ اس نے لے لیا۔ میں اور یہ برابر ہو گئے فرق کیا رہا۔ میں رات دن محنت کروں اور اسے بے محنت دے دوں اس کا جی نہ چاہے گا فطرت کے خلاف ہے اور غریب یہ سمجھے گا، جب بے محنت مجھے بھی حصہ مل رہا ہے تو مجھے محنت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معطل ہو جائے گا غرض اگر آپ نے جبری طور پر معاش کے اندر مساوات اور برابری قائم کی تو نہ امیر باقی رہے گا نہ غریب نہ دونوں ایک دوسرے کے کام آ سکیں گے۔ اس واسطے مساوات فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں توازن ہے، یعنی ایک دوسرے سے بالکل بعید نہ ہوں کہ ایک آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ حق رکھ دیئے کہ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ یہ اوپر ہو جائے تا کہ محبتیں پیدا ہوں۔

مثلاً رمضان شریف آیا اور فرض کیجئے آپ ایک لاکھ کے مالک ہیں۔ اور چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا واجب ہوا۔ ایک لاکھ کا چالیسواں حصہ اڑھائی ہزار ہوگا۔ تو اڑھائی ہزار غریبوں کے لئے ہوگا۔ غریب نے کیا سمجھا کہ میں غریب ہوں ہی میرے سر پر ایسے امیر موجود ہیں۔ جو میری خدمت کرتے ہیں۔ میں غریب نہیں ہوں، میں بھی دولت مند ہوں۔ تو وہ شکر گزار ہوگا کہ یہ اولاد کی طرح مجھے پال رہے ہیں۔ اس کے دل میں محبت بڑھے گی۔ رمضان شریف میں آپ نے دس ہزار روپیہ بانٹا اور فرض کیجئے کہ دس بیس آدمی ہیں، انہوں نے بھی اتنی ہی مقدار میں تقسیم کیا۔ اب یہ لاکھ دو لاکھ غریب کے پاس جو پہنچے گا۔ تو اس کے دل میں ممنونیت پیدا ہوگی کہ انہوں نے میری خبر گیری کی۔ یہ درحقیقت جتنے امراء ہیں، میرے ماں باپ کی جگہ ہیں، میں ان کی اولاد کی جگہ ہوں، مجھے ان کا حق پہچاننا ہے۔

امیر نے یہ سوچا کہ میرے سے خدا نے کام لیا، میرے سے ان کی خدمت کرائی۔ میری دنیا بھی بنی آخرت

بھی بنی۔ وہ غریب کا ممنون ہوگا کہ اگر یہ غریب نہ ہوتا تو میں صدقہ وزکوٰۃ کسے دیتا۔ خدا نے میرے سے ادا کرا دیا، میری دنیا وآخرت بن گئی۔ غریب اپنی جگہ خوش، امیر اپنی جگہ خوش اور دونوں میں محبت پیدا ہوگئی۔

لیکن اگر غریب آدمی کہے، جو کچھ امیر کے پاس ہے سب پر قبضہ کرلوں۔ تو امیر کے دل میں یہ ہوگا کہ اگر میں نے نہ بھی دیا یہ کم بخت اسے اٹھالے جائے گا اور غریب کے دل میں کیا آئے گا۔ وہ کہے گا، امیر کے ذمہ ہے ہمیں دینا۔ ہمیں کوئی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امیر کہے گا اگر میرا بس چل جائے تو میں سارے غریبوں کی گردن ماردوں۔ کمائی میری ہے، مزے یہ اُٹھا رہے ہیں اور غریب اس فکر میں رہے گا کہ جتنے امیر ہیں سب تباہ ہوں۔ میرے پاس حکومت آئے، میں آج ہی سب کو ختم کردوں۔ جو برسرِ اقتدار آئے گا، وہ دوسرے کو ختم کرنے کی فکر میں رہے گا۔ یہ تو اسلام نے ایک توازن قائم کیا کہ غریب امیر کا محبّ اور عاشق بن جائے گا۔ امیر غریب پر شفیق اور مہربان بن جائے گا۔ تو تعاون، تمدن بھی بنا، محبتیں بھی بڑھیں لیکن جبری تقسیم اور مساوات وبرابری سے غیض وغضب پیدا ہوتا ہے۔ اس واسطے اسلام نے پہلی چیز تو یہ رکھی کہ محبتِ باہمی اور خلوص سے امیر غریب کو دے۔ ایک حصہ پر جبر کیا گیا کہ چالیسواں حصہ بھائی کو ضرور دو۔ ورنہ وہ بھائی ہی نہیں۔ اگر آخرت پیشِ نظر ہو تو خوش ہوگا کہ میری آخرت بن گئی۔ تو رمضان میں تو آپ نے یہ دیا۔

اب رمضان گزرا تو عیدُ الفطر آئی، تو اسلام نے صدقہ فطر واجب کردیا۔ ہر بچے کی طرف سے خواہ وہ عید سے پہلے ہی پیدا ہو، اس کی طرف سے بھی دینا پڑے گا۔ ابْ اگر ایک گھر میں بارہ آدمی ہیں تو بارہ روپے مثلاً نکلے اور سو آدمی ہیں تو سو روپے گھر سے نکلے۔ تو غریب کہے گا کہ رمضان میں انہوں نے مجھے نوازا تھا۔ عید آئی اب بھی انہوں نے مجھے نواز دیا۔ ان سے بہتر میرا اور کوئی خیر خواہ نہیں، اب محبت اور بڑھ گئی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غریب پروری...... جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ یہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے اور یہ نہیں کہ ایک آدھ دکان تھی کہ کپڑا بکوا دیا۔ جگہ جگہ کپڑے بننے اور سپلائی کرنے کے کارخانے تھے اور اتنی بڑی دولت تھی کہ جب امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی ہے تو کچھ امانتیں بھی تھیں۔ مگر چھپن کروڑ روپیہ خزانے کے اندر موجود تھا۔ جو انہوں نے چھوڑا۔ مگر ان چھپّن کروڑ سے کیا ہوتا تھا؟ یہ سب غریبوں خرچ ہوتا تھا۔

ان کی تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ کوفے میں جتنے غریب، بیوائیں اور یتیم تھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سب کی فہرستیں بنی ہوئی تھی اور ان کے قد وقامت بنے ہوئے تھے۔ کہ فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں جوان ہے، فلاں بچہ ہے۔ غریبوں کے ہر گھر کیلئے رمضان شریف میں کپڑے تیار ہوتے تھے۔ بڑے آدمی کے بڑے کپڑے، چھوٹے کے چھوٹے کپڑے عورتوں کے لئے ان کے مناسب اور جہاں عید کا دن آیا صبح صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے پہنچ جاتے تھے۔ تو غریب کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ جیسی عید امیروں کی، ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے۔ بہتر سے بہتر کپڑا ملا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس قائم کی۔ بڑے بڑے علماء و آئمہ اس میں جمع تھے۔ وہ فقہ کے ہر مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ جس کو آپ آج فقہ حنفی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے اماموں کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، بڑے بڑے آئمہ علم وفضل ان کی ایک کمیٹی بیٹھتی۔ ایک ایک مسئلے پر ایک ایک ہفتہ بحث ہوتی تھی۔ جب چھن چھنا کر بحث کرنے کے بعد ایک چیز صحیح طور پر واضح ہوتی تھی تب وہ لکھی جاتی۔ تو بیس جلدوں میں فقہ حنفی مرتب ہوا۔

یہ جو پچاس کی کمیٹی تھی، ان سب کو تنخواہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے خزانے سے دیتے تھے۔ کسی کو پانچ سو ماہوار، کسی کو ہزار۔ یہ لاکھ روپے کا خرچ تھا جس سے ان حضرات کی خدمت ہوتی تھی۔ غریبوں کے لئے الگ ہر عید میں سلے سلائے کپڑے موجود ہوتے تھے۔

پھر اس کے ساتھ یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ ہزاروں آدمی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے۔ ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا اور اس میں بھی یہ سخاوت کا جذبہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیس ہزار روپے قرض لیا اور مدت متعین کر دی کہ برس دن میں ادا کر دوں گا۔ مدت گزر گئی، اس کے پاس دینے کو نہ ہوا یا بخل کیا نہیں دیا۔ جب وقت گذر گیا اور نہیں ادا کیا۔ وہ اب امام صاحبؒ سے کترانے لگا کہ سامنے آؤں گا، تو شرمندگی پیدا ہوگی۔ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آرہے ہیں، اس گلی میں گھس گیا، اس کوچے میں چلا گیا تا کہ سامنا نہ ہو۔ ورنہ مجھے جھوٹا کریں گے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خیال پیدا ہوا تو ایک دن آپ جا رہے تھے، ادھر سے وہ آرہا تھا۔ وہ دیکھ کر ایک گلی میں گھسا، دوڑ کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس گلی میں گھسے اور جا کر پیچھے سے اس کا دامن پکڑا اور کہا کہ بھائی تو نے تعلقات کیوں خراب کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے وہ دینے کو نہیں تھے، اس لئے شرمندہ نہ ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا، تعلق بڑی چیز ہے روپیہ بڑی چیز نہیں ہے۔ تم ایک پائی دینے کی تکلیف مت گوارا کرو۔ تعلق کو کیوں ختم کیا''۔ ہزاروں کے اس طرح قرضے معاف کر دیئے۔ دیکھا کہ یہ نہیں دے سکتا بس اسے معاف کر دیا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں تقویٰ..... پھر اس میں تقویٰ کا یہ حال تھا کہ۔ آخر مسلمانوں کے امام ہیں انہوں نے کپڑا بنوا کر سپلائی کیا، کئی لاکھ روپے کا کپڑا اور ایک تاجر کو فروخت کرنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس وقت کپڑے کے دام ذرا سستے ہیں اور دو مہینے کے بعد دام چڑھ جائیں گے، کپڑا روک لیا تا کہ ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول ہوں چنانچہ یہی ہوا۔ جب یہ میعاد گزر گئی۔ اب لوگوں کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے دام بڑھا دیئے تو ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول کئے اور جا کر بڑی خوشی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رکھے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حساب سے تو ایک لاکھ ہونا چاہئے۔ یہ دو لاکھ کیسے ہو گئے؟ اس نے کہا

کہ میں نے دو مہینے کے لئے کپڑا روک لیا تھا کہ جب ضرورت بڑھ جائے گی، تب فروخت کروں گا۔ فرمایا، معاذ اللہ اسی کا نام اِحتکار ہے کہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ کہہ کر خفا ہوئے اور فرمایا یہ دو لاکھ غریبوں کے اوپر صدقہ کرو۔ یہ مال میرے کام کا نہیں ہے۔ اس میں تم نے غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ جب ضرورت کا وقت تھا، تمہیں مقررہ قیمت پر بیچنا چاہئے تھا۔ تو کمانے میں یہ تقویٰ تھا اور خرچ کرنے میں یہ سخاوت تھی۔

تو ایسے سخی کے سامنے غرباء کا دل کیسے ٹوٹ سکتا تھا۔ ہر غریب کہتا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ میں غریب نہیں رہا۔ نہ میری بیوی، بچے اور گھر غریب ہے، کھانے پینے کو آ رہا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یوں شکر گزار کہ اللہ نے مجھے توفیق دی، میں نے غریبوں کی خدمت کی مجھے اَجر ملا، آخرت بنی اور غریب یوں خوش کہ ہماری سرپرستی ہوئی۔ اس لئے وہ غریب اتنے عاشق تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار تھے۔ بہرحال اسلام نے خرچ رکھا اور تقسیم رکھی، مگر خوش دلی کے ساتھ، جبری طور پر نہیں رکھی گئی۔ جہاں جبر کیا، وہاں ایسی صورتیں رکھی ہیں کہ خرچ کرنا ناگوار نہ ہو۔ سو پر اڑھائی روپے اور اڑھائی روپے بھی فوری نہیں، سال بھر کی مدت رکھی تاکہ دینے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس طرح سے اسلام نے خرچ کرایا۔

اسلام نے مالیات کی بنیاد تقسیم کے اصول پر رکھی ہے جمع کے اصول پر نہیں ...... اسلام نے مالیات کی جو بنیاد رکھی ہے وہ تقسیم کے اصول پر رکھی ہے، جمع کے اصول پر نہیں رکھی۔ یعنی روپے کو رکھا ہے کہ چلتا رہے، گھومتا رہے۔ جمع ہو کر ایک جگہ نہ پڑا رہے۔ زکوٰۃ آئی تو ادا کی۔ پھر صدقہ فطر کا وقت آیا، پھر خرچ کروایا، تو رمضان میں دیا۔ عید الفطر پہ دیا اب بقرعید آئی۔ اس میں قربانی واجب ہوئی۔ قربانی میں مستحب یہ ہے کہ چوتھا حصہ غریبوں پر صدقہ کرو، اپنے رشتہ داروں کو دو، خود بھی کھاؤ اس موقع پر غریبوں کے گھر گوشت پہنچ گیا، سامان پہنچ گیا۔ اس سب کچھ کے بعد پھر فرمایا: ''اِنَّ فِیْ مَالِ الْمَرْءِ حَقٌّ سِوَی الزَّکٰوۃِ'' ''آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ حقوق ہیں۔ جو ضرورت کے وقت ادا کرے''۔

اس کو اسلام نے یوں سہل بنایا کہ اخلاقی حالت درست کی اور کہا کہ سخاوت افضل ہے اور بخل اللہ کے ہاں مبغوض ہے اس سے بغض وعداوت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلسَّخِیُّ حَبِیْبُ اللہِ قَرِیْبٌ مِّنَ اللہِ وَالْبَخِیْلُ عَدُوُّ اللہِ بَعِیْدٌ مِّنَ اللہِ'' ① ''سخی اللہ کا دوست ہے اور اس کے قریب ہے بخیل اللہ کا دشمن اور اس سے بعید ہے''۔

اس لئے کہ سخاوت اللہ کی صفت ہے، بخل اللہ کی صفت نہیں ہے دوست ہو دشمن، سب کو مل رہا ہے۔ سورج چمکاتے ہیں، دشمن بھی فائدہ اٹھاتے ہیں دوست بھی، مسلم بھی، کافر بھی، زمین پر غذا اگتی ہے، مومن بھی لیتا ہے کافر

---

① الحدیث اخرجہ الامام الترمذی فی سننہ بطریق ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولفظہ: السخی قریب من اللہ قریب من الجنۃ، قریب من الناس ،بعیدمن النار، والبخیل بعیدمن اللہ، بعیدمن الجنۃ، بعیدمن الناس، قریب من النار...... ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی السخاء، ج: ۵ ص: ۲۲۲ رقم: ۱۸۸۴.

بھی، دوست بھی حصہ پا رہا ہے دشمن بھی۔ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہے بخل نہیں ہے۔
البتہ مومن کے لئے خصوصی رحمت ہے کہ اسے دولت کے ساتھ اسلام ایمان، علم اور آخرت کا عقیدہ بھی دیا۔ یہ خصوصی توجہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے دوست، دشمن، مسلم و کافر سب برابر ہیں۔ تو جود وسخا اللہ کا خاص وصف ہے۔ اس کے خزانوں میں سے رات دن خرچ ہو رہا ہے۔ جو سخی ہوگا، اس نے گویا اللہ کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لی۔ بخل اللہ کی صفت نہیں ہے اگر کوئی بخیل ہوگا تو اللہ سے دور ہوگیا۔ اسے اللہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے جہاں خرچ کا حکم دیا۔ وہاں سخاوت کی فضیلت بیان کی تا کہ دینے پر آمادہ ہو۔ طبیعت میں گھٹن پیدا نہ ہو۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں جذبہ سخاوت...... اور یہ اتنا بڑھایا کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں دینا اتنا محبوب تھا کہ روکنا اتنا محبوب نہیں تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ گھر بار لٹا دیں۔ صحابہؓ میں حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہ یہ بہت زبردست تاجر تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجارت میں برکت کی دعا کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ روم، شام اور مصر جگہ جگہ ان کا مال جاتا تھا اور نفع جو آتا تھا تو وہ یہ نہیں تھا کہ دو چار آدمی لے کر چلے جائیں۔ نوٹوں کو گڈی ڈالی اور لے کے چلے آئے۔ بلکہ ایسا تھا کہ اونٹوں پر لد کر روپیہ، سونا، چاندی آتا تھا اور کثرت یہ تھی کہ جب گھر میں رکھنے کو جگہ نہیں رہتی تھی، تو عاجز آ کے کہتے تھے کہ گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ اور اشرفیوں کا چھت تک ڈھیر لگ جاتا تھا۔ یہ دولت کی کیفیت تھی۔ گویا کروڑ پتی لوگوں میں سے تھے مگر اس کے ساتھ معاملہ کیا تھا؟ فرماتے کہ اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور معاہدہ کیا تھا۔ ان کی تعداد کتنی ہوگی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ چودہ سو۔ تو ایک خاص برتن منگوایا جاتا۔ اس میں روپیہ اور اشرفیاں بھر بھر کر چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر گھر بھجوائی جاتیں کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔ آپ اسے قبول کرلیں۔ پھر پوچھتے کہ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کتنے ہیں۔ جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی معلوم ہوا تین سو تیرہ۔ پھر ان تین سو تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اشرفیاں بھجوائی جاتیں کہ یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ جن کے ہاں پہنچتیں، وہ کہتے کہ اتنا مال ہم کیا کریں گے؟ وہ بھی آگے غریبوں میں بانٹتے۔ تو روپیہ پیسہ ادھر سے چل رہا ہے، ادھر سے نکل رہا ہے۔ سب سے زیادہ دولت کی محبت عورتوں کو ہوتی ہے۔ ان میں بھی سخاوت کا جذبہ اتنا بھر گیا تھا کہ دینا انہیں عزیز بن گیا تھا، رکھنا عزیز نہیں تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہوں نے ایک بوری اشرفیوں کی بھر کر اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی خالہ کے گھر پہنچائی۔ جب یہ بوری پہنچی، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اتنا کیا کروں گی؟ خادمہ کو حکم دیا کہ اسے غریبوں میں تقسیم کردو۔ اس نے تقسیم کرنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک تقسیم کی ساری بوری ختم ہوگئی۔ باندی نے کہا، ام المومنین! تین دن سے آپ کے اوپر فاقہ ہے۔ غذا میں کچھ میسر نہیں تھا۔ آپ نے بھی کچھ رکھ لیا ہوتا، فرمایا: ’’جا بے وقوف!

پہلے سے کیوں نہ یاد دلایا دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی''۔ گویا یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر فاقہ ہے اور گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اس درجہ غنا اور سیر چشمی پیدا ہوگئی تھی کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ کچھ ہے بھی یاد نہیں۔ عورتوں کے دلوں میں سخاوت کا اتنا جذبہ اور اتنی بے تعلقی، یہ اسی تعلیم اور فیض اور صحبت کا اثر تھا کہ جس میں آپؐ نے اخلاق سکھلائے سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت بیان کی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب شام کے اوپر قابض ہوئے اور پوری خلافت ان کے ہاتھ میں آ گئی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ گو خلافت کا استحقاق میرا ہے۔ مگر میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتا ہوں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں سخاوت غیر معمولی ہے۔ تو ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر دستخط کر کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا کہ جتنا چاہو لکھ دو۔ اتنا ہی آپ کو سالانہ اور ماہانہ دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے لکھ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ وہ آتا اور تین دن میں ختم ہو جاتا۔ غربا، یتیموں اور فقیروں کو دینے میں ہی خوشی تھی جس پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ''لَاخَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ...... '' ''اسراف اور فضول خرچی میں خیر نہیں ہے۔ ڈھنگ سے دینا چاہئے۔ یہ نہیں کے ایک لاکھ آیا تو دو دن میں لٹا کے برابر کیا''۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ''لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ...... '' ''اسراف خیر کے اندر ہوتا ہی نہیں''۔ ① جب اللہ کے لئے دیتے ہیں تو اس میں ایک لاکھ دو لاکھ سب برابر ہیں۔ اس میں کوئی اسراف نہیں۔ غرض یہ کیفیت تھی اور یہ فیض صحبت کا اور اس تعلیم کا اثر تھا تو دینے کے کا قانون بھی بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی قلوب میں دینے کے جذبات بھی پیدا کئے گئے۔

سخاوت مسلمانوں کا قومی مزاج ہے...... یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں قومی حیثیت سے سخاوت موجود ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی فرد یا شخص بخیل پیدا ہو جائے۔ لیکن قوم کا مزاج جمع کا نہیں ہے۔ خرچ کرنے کا ہے۔ غریب امیر سب کے اندر جذبہ موجود ہے کہ دینے کی عظمت دل کے اندر موجود ہے، جمع کرنے کی عظمت نہیں ہے۔ کوئی واقعہ پیش آ جائے، رکاوٹ پیدا ہو جائے، تو الگ بات ہے۔ لیکن قوم کا مزاج قومی حیثیت سے سخاوت کا ہے، بخل کا نہیں ہے۔ مہمان نوازی ہوگی، تو اپنے آپ کو بچھا دیں گے۔ دینا ہوگا تو دینے میں کمی نہیں کریں گے۔ یتیموں کی خبر گیری کریں گے۔ اور اقوام میں دیکھنے میں آتا ہے کہ قومی طور پر یہ مزاج نہیں ہے۔ افراد بڑے بڑے سخی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں غریب ہو وہ بھی سخی ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج دیا ہے۔ امیر سخی ہے، غریب سخی ہے حتی کہ جو پیشہ ور لوگ تھے، ان میں سخاوت کا جذبہ ہے۔

معبد جُہَنی ایک بہت بڑا گویا تھا اور فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ منصور کے زمانے میں یہ گزرا ہے۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ جا کے غزل سنائی۔ تو چالیس ہزار روپیہ اس کی ایک دفعہ کی فیس تھی اور امراء اس کو دیتے تھے۔ شاہی

① تفسیر روح المعانی، ج: ۱ ص: ۱۰۹۔

خزانے سے دس ہزار روپیہ روزانہ مقرر تھا، خواہ وہ سنانے کے لئے آئے یا نہ آئے۔ گویا اس کی روزانہ دس ہزار روپے تنخواہ تھی۔ اندازہ کیجئے مہینے میں کتنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے باروچی خانے کے لئے تین بکرے مقرر تھے۔ دو ذبح کئے ہوئے، ایک صحیح سالم زندہ۔ یہ تین بکرے روز پہنچتے تھے۔

اور کیوں پہنچتے تھے؟ تھا تو گویا مگر مہمان داری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو مہمان اس کے دستر خوان پر ہوتے تھے۔ امراء آئے تھے، کوئی گانا سیکھنے کے لئے کوئی اس کی مجلس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور وہ مہمانداری کرتا تھا۔ اس کا بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ نے اتنا کمایا کہ اگر ہم چاہتے تو سونے چاندی کی اینٹوں کے محل بنا لیتے۔ لیکن جب انتقال ہوا تو نوے لاکھ روپے قرضہ چھوڑا جو بیٹے کو ادا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ مہمانداری پر اور غریبوں، یتیموں، ناداروں پر خرچ کرتا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں رکھتا تھا۔

تو اسلام میں گویوں اور پیشہ وروں کی یہ حالت تھی۔ یہ اس تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج بنا دیا تھا۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں ایک دفعہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے چلے تو سفر مینا کی پلٹن بارہ میل آگے رہتی تھی جو جا کے بادشاہ کے خیمے نصب کرتی تھی اور وہاں دو تین دن قیام ہوتا تھا جب وہاں سے روانہ ہوتا او وہ سفر مینا کے لوگ آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور آگے جا کر خیمے وغیرہ لگاتے تو یہ جو پلٹن تھی جو خیمے وغیرہ لگاتی تھی اس کے انچارج آفیسر کا نام منعم تھا۔ ایک موقع پر جا کر اس نے خیمے نصب کئے، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو چوتھے پانچویں دن وہاں پہنچنا تھا۔ سامان سب مرتب ہو گیا۔ ایک فقیر کو پتہ چلا کہ یہ بادشاہ کا کیمپ پڑا ہوا ہے، تو اس نے کسی سے معلوم کیا کہ انچارج آفیسر کا نام کیا ہے اسے پتہ چلا کہ اس کا نام منعم ہے تو اس نے آ کر بڑی خوش آوازی سے طرز سے ایک شعر پڑھا:

منعم بدست کوہ و بیاباں غریب نیست   ہرگاہ کہ رفت خیمہ زد بارگاہ ساخت

منعم کسی جنگل میں بھی غریب نہیں، جہاں جاتا ہے، شہر بنا ہوا تیار ہے، خیمے، شامیانے تیار۔ منعم کو خدا نے ایسی دولت اور انعام دیا ہے کہ وہ پہاڑوں میں جائے جب بھی غریب نہیں، جنگل میں جائے جب بھی غریب نہیں۔ جہاں بھی جائے گا، خیمے لگ جائیں گے، بارگاہیں بن جائیں گی۔ اس نے اس خوشی آوازی سے جو پڑھا۔ اس کی آواز سارے کیمپ میں پھیل گئی۔ تو منعم کو بڑا پسند آیا۔ حکم دیا، اس فقیر کو حاضر کرو۔ تو تین لاکھ درہم اس کو دیئے۔ ایک غریب اور بھک منگے کو ایک دم تین لاکھ روپے مل گئے۔

اگلے دن صبح کے بعد اس نے آ کر پھر اسی خوشی آوازی سے شعر پڑھا۔ اسے نے پھر بلایا اور تین لاکھ روپے اور دے دیئے۔ تیسرے دن اس نے پھر شعر پڑھا۔ تو تین لاکھ اور دیے دیئے۔ تین دن میں نو لاکھ روپیہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ چوتھے دن نہ آیا۔ اب منعم انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ وہ آئے تو میں دوں۔ مگر وہ نہ آیا۔ حکم دیا کہ اسے پکڑ کر لاؤ، آج کیوں نہیں آیا۔ سپاہی اور پیادے دوڑے اور اسے پکڑ کے لائے۔

منعم نے کہا کہ تو کیوں نہیں آیا؟ اور تو بڑا بے وقوف ہے مجھے تو یہاں دس دن ٹھہرنا ہے اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دس کے دس دن تجھے روزانہ تین لاکھ روپے دوں گا، بڑا احمق ہے۔ اس نے کہا، حضور بات یہ ہے کہ تین دن میں مجھے نو لاکھ روپے ملے ہیں یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ میری سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ میں نے یہ سمجھا یہ میرے لئے کافی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ حضور بادشاہ ہیں۔ جذبے میں آ کر دے دیا اور اگر کہیں یہ جذبہ آ گیا کہ چھین لو اس سے، تو پھر ایک پائی بھی میرے پاس نہیں بچے گی۔ اس لئے قناعت بھی نہ آنے کی باعث ہوئی، کہ میرے لئے کافی تھے اور خوف بھی باعث ہوا کہ کہیں چھین نہ لیں۔ اس واسطے نہیں آیا۔

اس نے کہا کہ یہ تیرا عمل تھا۔ مگر میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دس دن میں روزانہ تجھے تین لاکھ دوں گا۔ تو ایک ایک افسر گوئیے' پیشہ ور، اور ایک ایک عورت کا اسلام نے یہ مزاج بنا دیا تھا۔ سخاوت کے فضائل سنا کر، قانون کی فضیلت بتلا کر کہ کس طرح خرچ کریں۔ مگر اس میں جبر نہیں تھا۔ دل کے داعیئے اور جذبے سے آدمی دیتا تھا۔ اس لئے کہ اگر یہ چیزیں جبراً دلوائی جاتیں، آدمی دینے سے بیزار ہو جاتا کہ کون اس قانون کے تحت اپنی دولت کو کھوئے کہ میں محنت کروں اور جبراً دوسرے کو دلوا دیا۔ اس لئے جبر کرنے کی بجائے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کیا۔ خود اپنی خوشی سے دیں اور جو حصہ جبری تھا، جیسے زکوٰۃ، صدقہ فطر اور قربانی ہے۔ اس میں آخرت کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ بھی دل کے جذبے سے آدمی دیتا ہے۔ اسلام نے کہا کہ تو ایک حصہ قربانی کر۔ اس نے کہا، نہیں میں تو پورا اونٹ دوں گا۔ ساتوں حصے میری طرف سے ہوں گے۔ بلکہ لوگ کئی کئی قربانیاں کرتے ہیں تاکہ غریبوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ تو ایک مسلم دولت مند بن کر خوش دلی سے دیتا ہے۔

تقسیمِ دولت میں اسلام اور کمیونزم میں فرق...... کمیونزم اور اسلام میں یہی فرق ہے کہ کمیونزم دلواتا ہے مگر جبری طور پر اس سے غصہ اور غیض و غضب ہوتا ہے۔ امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کر دو۔ یہ کمائی میری ہے، لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کر دو، جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا، اسے ختم کر دے گا۔ وہ غالب آئے گا اسے ختم کر دے گا۔

آپ کے سامنے روس اور امریکہ کا مسئلہ ہے۔ ایک جگہ سرمایہ ہے ایک جگہ مزدوری کا دعویٰ ہے۔ یہ اس فکر میں ہے اور وہ اس کی فکر میں ہے دونوں کے ایٹم بم تیار ہیں وہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں، یہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں۔ یہ درحقیقت ایک دوسرے کا ردِ عمل ہے۔ یہ وہی جبر و تعدی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں اسلام ہے۔ اسلامی قانون آ جائے تو دونوں کی صلح ہو سکتی ہے اور یہ نہیں ہو گا تو دونوں ایک دوسرے کے مدِ مقابل ٹھریں گے۔

اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنایا...... اسلام اعتدال کامل پر ہے کہ دلواتا بھی ہے اور اتنا دلواتا ہے کہ غریب کا گھر بھروا دیا۔ مگر مساوات اور برابری قائم نہیں کی۔ بلکہ توازن پیدا کیا کہ امیر کو نیچے اتار دیا کہ

اگر تیرے پاس ایک لاکھ ہے تو اپنے دل کے جذبے کے ساتھ غریبوں کو تیس چالیس ہزار دے تو اسے نیچے اتارا اور غریب کو اونچا کر دیا کہ وہ اس درجے پر نہ رہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میری پیدائش ہی اس لئے ہے کہ میں جوتیاں اٹھایا کروں، تکلیف اٹھایا کروں۔ حدیث میں ہے کہ جو غلام جنگ میں پکڑے ہوئے آتے تھے۔ لوگوں کو ان کو بیچ دینے کا حق تھا، یہ قانون تھا۔ لیکن تعلیم یہ دی کہ ''خَوَلُکُمْ اِخْوَانُکُمْ'' یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو تم کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ۔ جو تم پہنتے ہو، انہیں پہناؤ۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی شخص کے ہاں باندی آ گئی تو باندی کا نام برا ہوتا ہے، ایک حقیر لفظ ہے۔ باندی کی اگر اولاد ہو جائے۔ اسے بھی لوگ حقیر سمجھتے ہیں کہ یہ باندی کا بچہ ہے، سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ اسلام نے تعلیم دی کہ جس شخص نے اپنی باندی کو تعلیم دی، تربیت کی، اسے شائستہ اور مہذب بنایا پھر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو دوگنا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا۔

مثلاً فرمایا کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا، تو اسے اجر ملے گا جیسے کہ بنی اسماعیل میں سے اس نے سو غلام آزاد کر کے خاندان نبوت کو آزاد کر دیا۔ یہ اجر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاد میں جتنے غلام آتے تھے اس سے زیادہ وہ آزاد ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کے لئے لوگ آزاد کرتے تھے، تعلیم دیتے تھے، جو خود کھاتے تھے انہیں کھلاتے، جو خود پہنتے، انہیں پہناتے۔ تو وہ ان کے عاشق، یہ ان کے عاشق۔ تمدن بنا ہوا تھا۔ اس درجہ اسلام نے گویا غلاموں کے حق میں تعلیم دی۔

تو باندی کے بارے میں فرمایا کہ جس نے اپنی باندی کو تعلیم دی۔ ''فَـاَحْسَـنَ تَـعْلِيْمَهَـا.'' اچھی تعلیم دی ''وَاَدَّبَهَـا فَـاَحْسَنَ تَاْدِيْبَهَا......'' اس کو ادب سکھلایا، تہذیب سکھلائی، تربیت دی اور بہت عمدہ تربیت کی اور پھر اس سے خود نکاح کر لیا، گویا اس کو برابر بٹھلا لیا۔ وہ بے چاری باندی تھی۔ اس کو حرہ بنا کر اپنے برابر بٹھلا لیا۔ فرماتے ہیں اس کو دوگنا اجر ملے گا اور قیامت کے دن اس کو اجر و ثواب ہے۔ تو ہزاروں لوگوں نے باندیوں کو تعلیمیں دیں، تہذیبیں سکھلائیں۔ ①

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری چوتھی صدی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور اکابر تھے، وہ سب غلام ہی تھے۔ سب جہاد ہی سے آئے ہوئے تھے ان کو آزاد کیا گیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ غلام ہی تھے۔ آزاد کر کے تعلیم دی گئی، تو مسلمانوں کے امام بن گئے اور صوفیاء کے اندر عظیم الشان شیوخ میں سے ہیں۔ سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ جہاد سے پکڑے ہوئے غلام بن کے آئے تھے۔ لیکن آزاد کر کے تعلیم دی تو اب بہت بڑے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ غلاموں میں سے تھے۔ لیکن بہت بڑے امام بنے۔ غرض اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غلاموں میں اتنے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے کہ ہر ہر فن میں انہوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ تو یہ اس تعلیم ہی

① الصحيح للبخاري، كتاب العلم، باب تعليم الرجل أمته واهله: ج: ١ ص: ١٧٠ ـ

کا نتیجہ ہے بہر حال اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنا دیا ہے اور اس درجہ پر شفیق بنا دیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ غریبوں کو مقدم سمجھتے ہیں۔ جو وہ فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ انہیں بھی وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جان بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ ہماری روح بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ مال خدا کی ملک ہے تو مالی عبادت بھی رکھی گئی۔ آبرو خدا کی بخشی ہوئی ہے تو آبرو کی عبادت رکھی گئی۔ تو اللہ کے سامنے مال، جان اور آبرو کی کوئی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ اس لئے اس کے نام پر لٹاؤ۔

اسلام نے خرچ کرنے میں حدود بتلائی ہیں...... ہاں اس کی حدود بتلا دیں کہ حد کے اندر خرچ کرو، نہ اسراف کرو اور نہ فضول خرچی کرو کہ آج جذبے میں آ کے سب کچھ لٹا دیا۔ کل کو بھیک مانگنے کے قابل ہو گئے۔ لوگوں کے آگے ہاں پھیلائیں اور اور نہ اتنا بخل کرو کہ ہاتھ ہی سکیڑ لو۔ ﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ ① ''نہ اتنا پھیلاؤ کہ سارا دے ڈالو اور کل کو بھیک مانگو۔ نہ ہاتھ اتنا سکیڑو کہ ہاتھ سے کچھ نہ نکلے''۔

درمیان میں جو اعتدال کا راستہ ہے وہ اسلامی تعلیم ہے کہ دو بھی اور روکو بھی۔ مگر مصرَف کو دیکھ کر کہ یہاں دینا صحیح ہے، یہاں اجر ہے لہٰذا دینے میں دریغ نہ کرو۔ برا مصرف ہے تو دینے میں بخیل بن جاؤ۔ یہاں نہ دینا زیادہ بہتر ہے، یہاں نہ دینا ثواب ہے۔ مثلاً آپ نے تھیٹر اور سینما پر خرچ کر دیا ناجائز چیزوں پر تو مال بھی گیا اور اوپر سے گناہ بھی سر پر۔ دنیا بھی ختم ہوئی، آخرت بھی برباد ہوئی۔ اور اگر آپ نے غریبوں یتیموں، کو دیا تو گو وہ ہیں نہیں گیا۔ اس لئے کہ غریب کو دیا۔ تو وہ آپ کا خادم ہو گیا وہ آپ کے کام آئے گا۔ اس لئے گویا وہ اپنے ہی گھر میں رہا اور اپنے بھائی کو دیا، تو اپنے گھر میں رہا اور آخرت الگ بن گئی۔ اللہ کے کہنے کے مطابق دینے سے دنیا بھی بنتی ہے، آخرت بھی بنتی ہے، اور اللہ سے کٹ کر دینے میں دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی جاتی ہے۔ غلط راستے پر خرچ کرنا ظاہر بات ہے، یہ غلط ہی ہوگا۔ اس کے نتائج بھی غلط نکلیں گے۔

مالِ حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے...... بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو مال غلط طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ غلط ہی مصرَف میں خرچ بھی ہوتا ہے۔ جو جائز طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے، مگر جائز راستہ پر خرچ ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ محض مال کے مصَرف کو دیکھ کر کہ کہاں خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس سے ماخذ کا پتہ چلا لو کہ یہ آیا کہاں سے ہے۔ جب برے راستہ پر جا رہا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کر برے ہی راستے سے آیا ہے۔ حرام مصرَف میں جا رہا ہے۔ تو سمجھ لیتا ہوں کہ کمانے میں ضرور کوئی ناجائز صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے یہ برے مصرف میں گیا۔ اگر خالص حلال کی کمائی ہوتی تو برے مصرف میں نہ جاتا۔ تو حلال کی کمائی مقدار میں تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر بدن کو بھی لگتی ہے۔ روح میں بھی بشاشت پیدا کرتی ہے اور اس سے آخرت

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۹.

بھی بن جاتی ہے۔اور ناجائز کمائی اگر بہت بھی ہو جائے ،تو نہ روح میں تسکین آتی ہے۔نہ بدن کو لگتی ہے نہ دوسرے کے کام آتی ہے۔ناجائز طریق پر ہی جاتی ہے۔اس لئے جائز ہی طریق پر کمایا جائے گا۔وہی کار آمد ثابت ہوگا۔

لقمۂ حلال قرب خداوندی کی شرطِ اوّل ہے......اسلام میں لقمۂ حلال اللہ کے قرب ہونے کی سب سے پہلی شرط ہے۔حرام لقمے سے کبھی قرب پیدا نہیں ہوتا۔توفیق چھن جاتی ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ جائز کمائی استعمال کرتے ہیں۔ان کے قلب میں نور ہوتا ہے نیک کام کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے۔ناجائز کمائی کھا کر توفیق چھن جاتی ہے اور سرکشی کرنے اور برے کام کرنے کو جی چاہتا ہے بڑا فرق پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے۔شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو کہتے تھے۔بالکل بے پڑھے لکھے تھے،مگر صاحبِ نسبت تھے۔ذکر و شغل ان کا مشغلہ تھا۔اللہ والے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے معاش کا یہ سلسلہ کر رکھا تھا کہ گھاس کھود کر بیچتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی کے چھ پیسے متعین تھے۔نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے اور نہ زیادہ اور لوگوں کا دیوبند میں یہ حال تھا کہ جنہیں جانوروں کے لئے گھاس خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ان کی ایک قطار کھڑی رہتی تھی۔اور بھی بہت سے مرد و عورت گھاس بیچنے والے تھے۔ان کی گٹھڑیاں رکھی ہیں۔مگر کوئی نہیں ان سے لیتا تھا۔ہر ایک کا جذبہ یہ تھا کہ شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے گھر میں برکت ہو جائے گی۔اس لئے سب انتظار میں کھڑے رہتے تھے اور جہاں دیکھا کہ شاہ جی گٹھڑی لے کر آئے۔لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے۔بس جس نے پہلے ہاتھ لگا دیا شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے کہ بس لے جاؤ۔اسی کی گٹھڑی ہو جاتی تھی اور چھ پیسے متعین تھے۔سردی ہو،گرمی ہو یا برسات ہو نہ ایک پائی کم نہ زیادہ۔

اس کا مصرف ان کے ہاں یہ تھا کہ دو پیسے اسی وقت صدقہ کر دیتے۔اس زمانے میں پیسوں کے کچھ تانبے کے ٹکڑے آتے تھے۔جنہیں منصوری پیسہ کہا جاتا تھا۔ایک پیسے کے بہت سے ٹکڑے آ جاتے تھے۔تو دو پیسوں کے بہت سے ٹکڑے لئے اور وہ ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کر دیئے۔اور دو پیسے روزان کے گھر کا خرچ تھا۔ایک پیسے مین ادھیلہ کا آٹا اور کچھ تیل وغیرہ لے لیا۔بہر حال گھر کی ضرورت دو پیسے میں پوری کرتے۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔سال بھر میں جب اس کے کچھ چھ سات روپے بن جاتے۔تو اس رقم سے ہمارے ان بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ،مولانا رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ،مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی،مولانا محمد یعقوب صاحب اعلیٰ اللہ مراتبہم جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی دارالعلوم آتے۔ان کی بھی دعوت کرتے سال میں ایک دعوت ہوتی تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہٗ یہ فرماتے تھے کہ سال بھر ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دعوت کا وقت آئے اور شاہ جی کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا،جس دن ان کے گھر کا کھانا

کھاتے۔ چالیس دن قلب میں نورانیت رہتی اور جذبہ اٹھتا کہ نماز پڑھو، تلاوت بھی کرو، ذکر اللہ میں مشغول رہو، یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں سال بھر دعوت کا ہمیں انتظار رہتا۔

ایک دفعہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ بے چارے بیمار ہوگئے۔ تو مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہلا کے بھیجا کہ میں تو مریض ہوں آ نہیں سکتا یہ سات آٹھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ میری طرف سے ان بزرگوں کو کھلا دیں۔ یہ پیسے جب مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس پہنچے تو غسل کیا، کپڑے بدلے، زمین کو پاک کیا، اس پر بیٹھ کر خود کھانا پکایا اور ان سب بزرگوں کی دعوت کی، تو حلال کے لقمہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ عبادت وطاعت کا جذبہ اٹھتا ہے۔

حلال کمائی ہی میں برکت ونورانیت ہے...... آج جو ہماری کیفیت چھن گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری کمائیاں مشتبہ ہوگئیں۔ اِلَّا ماشاء اللہ۔ اللہ کے نیک بندے ہزاروں، لاکھوں ہیں۔ وہ اپنے نزدیک اپنی ہمت صرف کرتے ہیں کہ جائز طریق سے کمائیں، لیکن ہمارے بھائی بہت سے ایسے ہیں کہ انہیں پرواہ نہیں ہے۔ جائز ہو، ناجائز ہو۔ بس پیسہ آنا چاہئے۔ اس میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو مال کی وجہ سے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے، پیسہ آنا چاہئے۔ لیکن انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پیسے میں برکت نہیں ہوتی اس قسم کی ناجائز کمائی اپنے کو بھی ضرر پہنچاتی ہے اور بعض اوقات پورے خاندان کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ ناجائز کمائی بچتی نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''مَاخَالَطَتِ الصدقة مَالًا قَطُّ اِلَّا اَھْلَکَتْهُ.'' (1) ''جس مال میں زکوٰۃ ملی رہ جاتی ہے، وہ راس المال کو بھی لے ڈوبتی ہے''۔

زکوٰۃ ملے ہوئے رہ جانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکوٰۃ فرض ہوئی اور نہ دی، وہ راس المال کسی نہ کسی دن تباہ ہوگا۔ ایک یہ ہے کہ دوسرے نے زکوٰۃ دی کہ غریبوں کو دے دینا۔ اس نے خود رکھ لی، حالانکہ خود امیر تھا اسے اپنے مال میں ملا لیا تو یہ اس کے راس المال کو تباہ کر کے رہے گی۔ غرض جس مال میں زکوٰۃ ملی ہوئی رہ جاتی ہے۔ وہ غنی کے مال کو لے ڈوبتی ہے۔ تو وہی بچتا ہے، جو بالکل جائز اور حلال طریقے سے کمایا جائے اس میں برکت بھی ہوتی ہے، دل میں نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اور ویسے مال بڑھ جائے فائدہ نہیں پہنچاتا۔ زکوٰۃ دینے اور نہ دینے کی مثال بالکل ایسی ہے زکوٰۃ اگر نہیں دے گا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے۔ ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار روپے دیئے جاتے، جب نہیں دے گا تو ایک لاکھ پورے ہیں اور جو زکوٰۃ دے رہا ہے، بظاہر اس کا مال گھٹ رہا ہے۔ مگر حقیقتاً بڑھ رہا ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص وہ ہے جس نے صحت حاصل کرنے کے لئے مسہل لیا، تو بالکل

---

(1) شعب الایمان للبیهقی، فصل فی الاستعفاف عن المسائلة ۴/ ۱۵۹. علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواه البیهقی وابن عدی عن عائشة بسند ضعیف ج: ۲ ص: ۱۸۸۔

لاغراور کمزور ہو گیا۔مگر وہ کمزوری صحت کی علامت ہے کہ مادہ فاسد نکل گیا۔چار دن کے بعد قوت آئے گی اور صحت مند و توانا ہو جائے گا۔ یہاں بظاہر بدن گھٹ گیا مگر حقیقتاً بڑھ گیا۔ کیونکہ چار دن کے بعد صحت بحال ہونے والی ہے اور اگر خرچ نہ کیا اور مال رہ گیا۔ یہ ایسا ہے جیسے بدن میں رول پڑ گئی۔تو دیکھنے میں تو پہلوان معلوم ہو رہا ہے۔ مگر صحت ساری برباد ہو رہی ہے۔ چند دن کے بعد یہ صحت ساری ختم ہو جائے گی۔ جو دے کر مال گھٹتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مسہل سے بدن گھٹتا ہے، وہ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔اور نہ دینے سے جو مال بڑھا ہوا نظر آتا ہے وہ ایسا ہے جیسے رول چڑھ گیا کہ دیکھنے میں آدمی بہت موٹا نظر آتا ہے اور حقیقت میں اندر سے جان نکل رہی ہے۔تو یہ ظاہری توانائی اور ظاہری زیادتی قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔اصلیت جس سے بدن میں توانائی اور نور پیدا ہوتا ہے وہ حلال اور جائز کمائی سے ہوتی ہے۔

بہر حال اسلام نے جہاں مال کے خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا۔اس کی درآمد طریقہ بھی بتلایا کہ اس طرح سے کماؤ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ اور ایسے پیشوں سے روک دیا ہے۔ جو مخلوق کے لئے ضرر پہنچانے والے ہوں۔ چوری، ڈکیتی سے روک دیا، سود، سٹے سے روکا، جوئے سے روکا، قمار بازی سے روکا، کہ ان میں ظاہر میں بڑھنا ہے، حقیقت میں گھٹنا ہے۔ عموماً دیکھا ہے کہ سودی لین دین کرنے والوں کا ابتداء میں مال بڑھ جاتا ہے لیکن جب دیوالیہ ہوتے ہیں۔تو ایسے ہوتے ہیں کہ بھک منگے بن جاتے ہیں۔ ہزاروں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ کسی کا ہارٹ فیل ہو گیا، کوئی گر پڑا تو اس قسم کا مال بچانے کی بجائے اور زیادہ وبال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اوّل تو یہ ہے کہ اس قسم کی ناجائز کمائی ظاہر میں تو آدمی خود کھاتا ہے اور جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو فقیر کو تھوڑا دینا پڑتا ہے، بادشاہ اور افسران کو زیادہ دینا پڑتا ہے۔بس رات دن ہزاروں روپے اسی میں لگا رہے ہیں۔ کچھ کسی نے چوری کر لیا تھا، کسی نے ڈکیتی کر لی اور گورنمنٹ نے ٹیکس بھی لگا دیئے اور اب پریشان ہو رہا ہے کہ اتنی مشکل سے کمایا۔لیکن اگر اعتدال کے ساتھ کمائے اور اعتدال کے ساتھ خرچ بھی کرے۔ اس کا یہ برا اثر نہیں پڑے گا۔ اسلام نے کمانے اور خرچ کرنے کا بھی ڈھنگ بتلایا۔ دونوں میں اعتدال پیدا کیا۔ اور قانونی طور پر جبر نہیں کیا۔ جبر کیا بھی تو بہت معمولی کہ دینا آسان ہو۔ اخلاقی طور پر زیادہ زور دیا ہے۔لاکھوں نظیریں موجود ہیں کہ قانونی طور پر زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ دیتے ہیں اور اس کے بعد بھی دینا اور دے کر خوش ہونا، مہمانداری وغیرہ، یہ مسلم کا گویا ایک پیشہ اور شعار ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن کا طرزِ اُسلوب......اس طرح سے اسلام نے مالی عبادت بھی سکھلائی اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا تو کیسے پیارے انداز میں حکم دیا کہ واقعی دینے کو جی چاہے۔ فرمایا ﴿وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ① ''خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے''۔ یعنی تم کہاں سے لے کر

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰.

آ ئے ہو، مال تو ہمارا دیا ہوا ہے۔ پھر اس میں سے خرچ کرتے ہوئے تمہیں کیوں دکھ ہوتا ہے، کیوں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ اگر یوں فرماتے کہ اپنی کمائی دے ڈالو۔ تو آدمی کو ذرا دکھ ہوتا کہ بھئی! کماؤں میں اور دوسرے کو دے ڈالوں۔ اس لئے عنوان یہ اختیار کیا کہ: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ① جو ہم نے دیا تھا اس میں سے دو۔ آدمی سمجھے گا کہ میرا تو ہے ہی نہیں، انکا ہے۔ وہ مانگ رہے ہیں، میں دے دوں۔

یہ ایسا ہے جیسے آپ کا ایک بچہ ہو اور اسے آپ دو روپے دیں۔ اس کے بعد کہیں کہ بیٹا دو پیسے ہمیں بھی دے دے ظاہر بات ہے کہ بچہ جو دے گا۔ وہ خود کما کے تھوڑا ہی لایا ہے، وہ تو باپ نے اس کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اسے دینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ باپ ہے اور پھر مجھ سے مانگ رہا ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ تو دینے والے حق تعالیٰ خود ہیں۔ پھر کہتے ہیں بھئی! جو ہم نے تجھے دیا تھا۔ اس میں سے ہمیں بھی کچھ دے دے۔ تو دینے والے کو بھاری نہیں گزرے گا کہ دینے والے اور مالک بھی خود ہیں، وہ مانگ رہے ہیں۔ پھر یہ مانگنے کے بعد جو تم نے دے دیا۔ پھر یہ نہیں کہ تمہارا تعلق اس سے ختم ہوا نہیں، فرماتے ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ② ''کوئی ہے جو اللہ میاں کو قرض دے''۔

دنیا میں تو قرض کے اوپر سود حرام قرار دے دیا کہ جتنا قرض لو، اتنا ہی دو۔ قرض دینے والا اوپر سے زیادتی لے، وہ سود ہے، ناجائز ہے اور خود سود دیتے ہیں۔ بلکہ سود در سود کہ اگر کسی نے دس روپے ہماری راہ میں دیئے تو تمہیں دس کے ستر دیں گے۔ یہاں قرض کے اوپر سود دے رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں میں سود اس لئے حرام قرار دیا کہ کمائی محدود ہے، تھوڑی سی کمائی ہے۔ اس کے اوپر ہم نے دس روپے قرض پر پانچ اور بڑھا دیئے تو دینے والے پر بڑا گراں گزرتا ہے کہ اس کی دولت محدود تھی۔ جب ظلم کے طور پر اس سے پانچ اور لیں گے تو کیسے دے گا؟

اور اللہ میاں کی دولت لامحدود ہے۔ اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آ سکتی۔ تو اپنے حق میں سود کا سلسلہ جائز رکھا، انسانوں کے حق میں ناجائز رکھا اور فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے گیہوں کا ایک دانہ زمین میں ڈال دیا جائے، گیہوں کا درخت اگا۔ تو سات بالیاں اس میں سے نکلیں اور ہر بالی کے سو دانے تو ایک دانہ ڈالا تھا اور سات سو دانے نکل آئے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ آپ نے اللہ کو ایک دانہ قرض دیا اور سات سو دانے وصول کئے۔ تو سات سو گنا کون سود دیتا ہے۔ یہ تو اللہ میاں ہی دیں گے۔

اور آگے یہ بھی فرمایا کہ: سات سو پر بس نہیں۔ اللہ اگر بڑھانا چاہیں تو کون روکنے والا ہے۔ وہ لاکھوں گنا سود دے دے، جب بھی اس کے ہاں کمی نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص چھوہارے کی ایک گٹھلی صدقہ

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۱۱. ③ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱.

کرتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اسے پالتے ہیں اور ایسے پالتے ہیں، جیسے تمہارے ہاں گھوڑے کا کوئی بچہ ہو تو تم اسے دودھ پلا کر پال لو۔ چند دن کے بعد ہی وہ گھوڑی بن جائے اور سواری کے قابل بن جائے۔ فرمایا، جو ایک گٹھلی بھی صدقہ دیتا ہے ہم اسے پال کر جبل اُحد کے برابر کر دیتے ہیں۔ آخرت میں جب یہ اجر کے ڈھیر سامنے آئیں گے۔ تو بندہ حیران ہوگا کہ میں نے کون سا ایسا صدقہ کیا تھا۔ جس کے بدلے میں یہ پہاڑ جیسا اجر سامنے ہے۔ فرمائیں گے، تو نے گٹھلی صدقہ کی تھی۔ لیکن ہم نے تیرے خلوص کے وجہ سے اس کو پال کر پہاڑ کے برابر کر دیا۔ اندازہ کیجئے ایک پہاڑ میں سے چھوہارے کی کتنی گٹھلیاں نکل سکتی ہیں۔ ایک گٹھلی اس نے صدقہ کی اور اربوں کھربوں گٹھلیوں کے برابر اس نے اَجر لے لیا۔ تو اللہ کے ہاں نہ سود سے کمی، نہ سود در سو سے کمی۔ دہ در دنیا ستر در آخرت، کا مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دس دے دو، آخرت میں ستر مل جائیں گے۔

ایمان اور سکونِ قلب دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں...... اور آخرت تو آخرت دنیا میں بھی مل جاتا ہے، اللہ کی راہ میں دینے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ اس نے دیا۔ مگر اس کے بدل میں کچھ نہ ملا۔ مگر جو قلب میں ایمان اور سکون کی دولت ہوتی ہے۔ وہ کروڑوں سلطنتوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے جو اس پر عطا کی جاتی ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے بزرگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ لباس کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔ بس جیسا مل گیا، پہن لیا۔ کبھی شاہانہ لباس، کبھی پھٹے پرانے کپڑے وہ بزرگ پھٹے پرانے کپڑوں سے چلے جا رہے تھے ایک شہر سامنے آیا تو سارے شہر کے دروازے بند۔ اب ہزاروں گاڑیاں اندر جانے والی، وہ باہر رکی ہوئیں، اور اندر کی اندر۔ تجارت و کاروبار بھی سب بند۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی! یہ دروازے کیوں بند ہو گئے۔ لوگوں نے کہا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز کھو گیا باز ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے چڑیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ کھو گیا ہے۔ تو بادشاہ نے کہا، چونکہ باز کھو گیا۔ شہر کے دروازے بند کر دو اور اسے کہیں سے پکڑ کے لاؤ۔

انہوں نے کہا، کیسا احمق بادشاہ ہے بھئی! پرندے کو اس سے کیا کہ دروازے بند کئے ہیں۔ وہ اڑ کے باہر چلا جائے گا۔ اسے دروازے کی کیا ضرورت ہے ایسا احمق آدمی ہے۔ پرندے کو اگر پکڑنا تھا تو شہر پر جال لگوا دیتا کہ اوپر سے اڑ کے نہ نکلے۔ دروازے بند کرانے کی کون سی تک ہے اور اس بزرگ نے کہا۔

یا اللہ! یہ آپ کی عجیب قدرت ہے کہ اس کندہ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ باز کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے یا شہر کے دروازے بند کرانے چاہئیں اور مجھ جیسے فاضل، عالم کو بھک مَنگا بنا رکھا ہے کہ جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں۔ عجیب آپ کی قدرت ہے اور آپ کا نظام کہ اس احمق کو سلطنت دے دی اور مجھے جوتیاں چٹخانے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس بزرگ کے دل میں یہ وسوسہ گذرا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہ تمہارے دل کی، ایمان کی دولت اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی سلطنت تمہیں دے

دیں۔ تھرّا گئے عرض کیا۔ نہیں، یا اللہ! میں ایمان نہیں دینا چاہتا۔ فرمایا اتنی بڑی دولت دے دی۔ پھر بھی بے وقوف اپنے کو بھک منگا سمجھ رہا ہے، یہ دولت ظاہری جس کے پاس ہے وہ کل کو ختم ہوگی، جس کے پاس ایمان ہے وہ دولت ہے جو ابدالآباد تک چلنے والی ہے۔ تو تجھے اَبدی دولت دی اور اسے عارضی دولت دی، تو نے اس کی قدر نہ کی۔

پھر توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر۔ واقعی تو نے مجھے دولت مند بنا دیا۔ جس کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ اس سے بڑھ کر کون دولت مند ہے۔ یہ دولت آگے تک جانے والی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مادی دولت ملے تو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایمان کی دولت الگ دی اور دنیا کی دولت بھی دی۔

مسلم کو دنیا بطورِ حق نہیں بلکہ خدمات کے صلہ میں ملتی ہے...... میں تو کہا کرتا ہوں، دنیا میں جتنی دولت ہے۔ مسلمان اس کا قطعاً حقدار نہیں ہے یہ کفار کا حق ہے۔ اس لئے کہ ان کی آخرت نہیں ہے۔ انہیں دنیا میں ہی سب کچھ دیا جاتا ہے اور یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ ایک مسلم یوں کہے کہ آخرت بھی مجھے ملے، دنیا بھی مجھے ملے اور کافر غریب کو کچھ بھی نہ ملے۔ دوسرے کے حق کو ساقط کر دینا، اسے محروم کر دینا، یہ کونسی دانش مندی کی بات ہے؟ مسلمانوں کو جو دولت ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے۔ جہاد کرے گا، حکومت مل جائے گی۔ جدوجہد کرے گا، دولت مل جائے گی۔ غرض مسلمانوں کو دولت اور دنیا جو ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے اس کا حق نہیں ہے۔ کافر کو خدمت کے صلے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا حق ہے اس لئے کہ آگے اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تو یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ یوں چاہیں کہ اس دنیا کی دولت بھی میرے ہی پاس آ جائے۔

پھر بھی یہ اللہ کا فضل ہے کہ اگر خدمت کرتا ہے تو مسلم کو دولت دنیا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ مقصودِ اصلی نہیں ہوتی، مقصودِ اصلی آخرت ہی ہوتی ہے۔ یہ دولت بھی اس کے لئے وسیلہ بنتی ہے۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا کے موقع پر جب آپ کی ازواجِ مطہرات نے نان ونفقہ طلب کیا اور گھیراڈال کر بیٹھیں کہ ہمیں بھی تو کچھ دینا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنارہ کشی کر کے اوپر ایک حجرہ تھا اس میں بیٹھ گئے اور بول چال بند کر دی۔ چہرہ مبارک پر بشاشت نہیں رہی کہ میرے گھر والے مجھ سے دولت طلب کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر بیٹھ گئے۔

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پریشان تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اوپر آنے کی اجازت چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اور ایک چمڑے کا چھوٹا سا برتن۔ جس میں تھوڑا سا شہد تھا۔ یہ کل سامان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر اُٹھ بیٹھے تو کمر مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ! قیصر و کسریٰ جو بادشاہ ہیں۔ یہ بڑے بڑے تخت، نرم بستروں اور محلات میں آرام کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور اس حالت میں کہ بدن مبارک

کے اوپر چٹائی کے نشان اتر آئے ہیں۔کوئی چیز بچھانے کی میسر نہیں تھی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔آپ نے فرمایا:''اَوَفِیْ ھٰذَا اَنْتَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟'' ''اے ابن خطاب! کیا تو ابھی تک حیرت میں پڑا ہوا ہے؟'' ''اُولٰئِکَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَھُمْ طَیِّبَاتُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔'' تو نے قیصر و کسریٰ کا نام لیا ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور تیرے اندر علم و ایمان اور دین کی دولت ہے۔پھر بھی تجھے حرص پیش آئی اور اس قوم کی جس کے لئے انجام میں کچھ نہیں ہے۔گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔یہ مت کرو۔یہ حرص ٹھیک نہیں۔شکر کی چیز یہ ہے کہ دولت ایمان عطا کر دی۔ جس کے پاس ایمان ہے، وہ کبھی مفلس نہیں ہو سکتا۔اللہ دولت دنیا دے تو شکر کا مقام ہے اور نہ دے تو تب بھی دولت مند ہے۔اس لئے کہ بڑی دولت میسر ہے۔ ①

بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے......اس لئے چونکہ جان بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، روح بھی اللہ کی دی ہوئی ہے مال بھی اللہ کا دیا ہوا ہے اور یہ چیزیں نہ صرف دی ہوئیں بلکہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔تو وہی مالک بھی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔اس لئے یہ چیزیں اسی کے کہے کے مطابق لٹائی جائیں گی اور خرچ کی جائیں گی۔کیونکہ مالک وہ ہے اگر وہ یوں کہے کہ سب مال لٹا دو، لٹا دینا چاہئے۔اگر وہ یوں کہے کہ بخیل بن جاؤ، بخیل بن جانا چاہئے۔اگر یوں کہے کہ جان دے دو، دے دینی چاہئے۔وہ کہے ہرگز مت دو، روک لینی چاہئے۔

اصل میں عبادت اسی کا نام ہے کہ اطاعتِ محض کی جائے۔جو حکم ہو اس کی تعمیل کر دی جائے۔یہی عبادت ہے۔ظاہر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا نام عبادت ہے۔یہ عبادت نہیں ہے یہ جزئیات ہیں، عبادت کی مثالیں ہیں۔کہنا ماننے اور زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت کرنے کا نام عبادت ہے۔پانچ وقت مؤذن اعلان کرتا ہے کہ نماز پڑھو۔نماز پڑھنا عبادت ہے۔پانچ وقتوں میں نماز فرض ہے۔نماز ادا کی جائے گی اور تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔جب آفتاب طلوع و غروب ہو رہا ہو یا سر کے اوپر آ گیا ہو، ان تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔اگر پڑھے گا تو قبول نہیں ہوگی۔معلوم ہوا نماز کا پڑھنا عبادت ہے، نہ چھوڑنا عبادت ہے۔کہنا ماننا عبادت ہے۔جب ہم کہیں پڑھو، جب ہم کہیں رک جاؤ، یہی بندہ کا کام ہے۔رمضان شریف میں روزہ رکھنا فرض ہے۔اگر نہیں رکھو گے تو گنہگار ہو گے اور عید کے دن روز رکھنا حرام ہے۔اگر رکھو گے تو گنہگار ہو گے۔معلوم ہوا روزہ رکھنا نہ رکھنا عبادت نہیں کہنا ماننا عبادت ہے۔جب ہم کہیں کہ مت رکھو، پھر چھوڑ دینا عبادت ہے۔

خودکشی حرام ہے۔کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنی جان کو خود ختم کر لے۔لیکن اگر وہ حکم دیں کہ میدان جہاد میں جا کے خود بھی شہید ہو جاؤ۔اب یہی عبادت ہے معلوم ہوا نہ جان رکھنا عبادت، نہ گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے۔جب کہیں کہ دے دو، تو عبادت اور جب کہیں کہ ہرگز مت دو تو روک لینا عبادت ہے۔یہی صورت مال کی بھی ہے۔اگر

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المظالم و الغصب، باب الغرفۃ العلیۃ المشرفۃ، ج:۸، ص:۳۵۷ رقم:۲۲۸۸.

یوں کہیں کہ ہرگز مت خرچ کرو۔ یہ مصرف بہت برا ہے۔تو روک لینا اور بخیل بننا ہی عبادت ہے اور اگر یوں کہیں کہ خرچ کرو، تو خرچ کرنا عبادت ہے۔مطلب یہ کہ بندہ جان، مال، آبرو، طاقت وقوت سب کے لحاظ سے بندہ ہے اور بندے کو یہ معلوم ہے کہ جو مالک کو حق ہوگا، غلام وہی انجام دے گا غلام اپنی تجویز سے کچھ نہیں کرے گا۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلادے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنادے کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام لے لے۔اس نے کہا تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا، اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو غلام ہی کیوں بنتا؟ آقا کیوں نہ بن جاتا۔میرے غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری مرضی، میرا ارادہ، میری خواہش بھی غلام۔یہی غلام ہونے کے معنی ہیں۔اگر یہ چیزیں میری اپنی ہوتیں، تو میں آقا ہوتا، غلام کیوں ہوتا؟ تو ایک انسان، انسان کا غلام بن جائے، جس نے نہ اسے پیدا کیا، نہ روزی دی۔محض ایک نسبت پیدا ہوگئی کہ خرید لیا اور غلام بن گیا۔اس کی یہ کیفیت کہ آقا کے مقابلے میں نہ مرضی نہ ارادہ نہ خواہش کچھ بھی تو نہیں۔

اور اللہ ربّ العزت جس نے پیدا کیا، جان دی، روح دی، ہر چیز کا مالک اس کے سامنے بندگی کا دعویٰ کرے اور بندگی کے خلاف بھی کرے؟ وہاں تو یہ ہونا چاہئے کہ ہماری مرضی بھی اللہ کی غلام ہے۔ہماری خواہش بھی اللہ کی غلام ہے۔وہاں آ کر آدمی بنتا ہے، یہاں آقائی میں آتا ہے۔شریعت کا حکم آئے تو اس میں رائے زنی کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔گویا اللہ میاں معاذ اللہ تابع ہیں اور یہ ان کے متبوع ہیں۔خدا اور رسول کو اپنی مرضی پر چلانا، اس سے زیادہ گستاخی کی کیا بات ہوگی۔بندہ اس لئے آیا تھا کہ اللہ ورسول کی مرضی پر چلے نہ یہ کہ اپنی مرضی پر انہیں چلانے کی کوشش کرے۔تو دین میں لوگ ترمیمیں پیش کیا کرتے ہیں کہ صاحب! یوں نہیں، یوں ہونا چاہئے۔گویا آپ پارلیمنٹ ہیں اور شریعت آپ کے مشورہ سے بن رہی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو جب دین اتارنا تھا، تو ہمیں بلا لیتے۔ہم سے مشورہ لے لیتے کہ یہ حکم کیسے اتاروں؟ یہ کتنی بڑی گستاخی کی بات ہے بندے اور خدا میں نسبت صرف غلامی کی ہے کہ بندہ غلام ہے اور وہ آقا ہیں اس کی مرضی بھی غلام اور خواہش بھی غلام۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ① ''اے ابراہیم مسلم بنو''۔یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ مسلمان نہیں تھے۔اب مسلمان ہو جاؤ۔اسلام کے معنی گردن نہاد ہونے کے ہیں۔اپنے آپ کو سونپ دینے کے ہیں۔یعنی اے ابراہیم! اپنے کو ہمارے حوالے کردو۔جو چاہیں ہم تمہارے اندر تصرف کریں اور تمہیں بولنے کی مجال نہ ہو۔جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں بے اختیار ہوتا ہے، جدھر کو چاہے کروٹ دے دے۔مردہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ادھر کیوں کروٹ دی۔اسی طرح شریعت کے ہاتھ میں آدمی مثل مردہ کے ہو جائے کہ شریعت جدھر بھی تصرف کرے، بلا چوں و چرا آدمی عمل کرے۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔

ایک آدمی گورنمنٹ کا ملازم ہو جاتا ہے۔ تو جب سرکاری آرڈر ہوتا ہے پھر چون وچرا کی گنجائش نہیں دیتا۔ کوئی چون وچرا کرے تو لڑنے کو تیار کہ سرکاری آرڈر ایسے ہی ہوتا ہے۔ اللہ میاں کا آرڈر آئے تو وہاں رائے زنی کرنے کو تیار کہ یہ آرڈر اور حکم کیوں آیا؟ ایسا کیوں نہ ہو گیا اور ویسا کیوں نہ ہو گیا یہ غلط کارروائی ہے۔ بہر حال جان ہو، مال ہو، آبرو ہو۔ یہ سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا کام یہ ہے کہ خالق کے آگے جھکے اس جھکنے ہی کا نام طاعت و عبادت ہے۔ اس لئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''۔ یعنی بندہ دنیا میں خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے۔ خدائی کے لئے خدا کی ذات کافی ہے۔ تمہیں تو بندہ بننے کے لئے بھیجا گیا ہے اور بندگی کے یہی معنی ہیں کہ بے چون وچرا اطاعت کرو۔

ہمارے ضلع سہارن پور کے قریب پنجاب کا ایک ضلع انبالہ ہے۔ اس میں عبداللہ پور ایک گاؤں ہے۔ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے عارف باللہ اور شیخ کامل تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے۔ وہاں وہ رہتے تھے۔ جمنا کے کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔ ایک دفعہ برسات میں جمنا میں پانی چڑھا اور اور اتنا چڑھا کہ گاؤں کی جو چہار دیواری تھی اس تک آدھا پانی آ گیا۔ اگر گز بھر اور بڑھ جاتا۔ تو پورا گاؤں غرق ہو جاتا۔ وہاں ایک بزرگ شاہ دولہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے تھے۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ پانی بہت چڑھ گیا اور دیوار اگر ٹوٹ گئی۔ تو پھر گاؤں کی خیر نہیں ہے۔ تو سارے گاؤں والے جمع ہو کے شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضور دعا کیجئے جمنا کا پانی چڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گاؤں ڈوب جائے۔ یہ ذرا دیوار کھڑی ہے۔ اس سے پانی رک رہا ہے۔ فرمایا، اچھا پانی بڑھ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا، ''جی ہاں'' فرمایا، پھر پھاوڑا اٹھا کے چلو۔ پھاوڑا لایا گیا۔ تو شاہ دولہؒ نے پھاوڑا لیا۔ اب شاہ دولہ آگے آگے، پیچھے پیچھے سارا گاؤں۔ وہ جو دیوار کھڑی تھی۔ جس سے پانی رک رہا تھا۔ شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دیوار کو توڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور پانی اندر آنا شروع ہوا۔ لوگوں نے کہا، حضرت یہ کیا کر رہے ہو؟ اس دیوار کی بدولت تو گاؤں بچ رہا ہے۔ دیوار توڑ دیں گے تو پانی نہیں آ جائے گا؟

فرمایا۔ ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' نامعقولو! تم مجھے اس لئے لائے تھے کہ میں اللہ سے مقابلہ کروں۔ وہ چاہیں کہ بستی غرق ہو۔ تو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ میں اللہ سے مقابلے کے لئے نہیں آیا۔ میں اطاعت کے لئے آیا ہوں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ یہ بستی غرق ہو، تو میرا منشاء بھی یہی ہے کہ اس بستی کو غرق ہونا چاہئے۔

کسی بزرگ سے کسی نے کہا تھا۔ کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا، اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو۔ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آپ اس درجہ کے ہیں۔ فرمایا،

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶۔

الحمدللہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے! فرمایا یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں۔

اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو جو بھی عالم میں ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پیدا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمدللہ پیدا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اگر کوئی مرتا ہے، میں کہتا ہوں الحمدللہ اسے مرنا ہی چاہئے تھا۔ میں کون ہوں۔ جو اللہ کا مقابلہ کروں کہ وہ موت دے، میں کہوں نہیں۔ موت نہیں آنی چاہئے۔ انسان بندگی کے لئے آیا ہے اور بندگی کے معنی اطاعت کے ہیں کہ جو ان کی مرضی وہ میری مرضی ؎

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ

تو بندہ وہ ہے کہ اپنی مرضی کو مال جان اور روح کو فنا کر دے۔ اس کو فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① اس میں میں نے جان کی تفصیلات کو چھوڑ کر مالیات کو بیان کیا۔ اس لئے کہ جب اللہ نے دولتیں دی ہیں۔ تو دولت کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ جہاں دولت کے حقوق پہچانے جائیں۔ وہاں غربا کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ غریب بھی آپ کے اور ہمارے ہی بھائی ہیں۔ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔ بہت سے مسلمان غریب ہیں سب کی یکساں حالت نہیں ہے۔ ان کی طرف توجہ دیں۔

اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے...... ایک تو یہ ہے کہ شخصی طور پر آپ نے دے دیا۔ بے شک عبادت انجام دی۔ جس غریب کو بھی دیں گے آپ نے عبادت ادا کی۔ زکوٰۃ دیں، صدقات دیں، وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر دیں۔ مثلاً آپ فنڈز بنائیں جس میں لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع ہو۔ بہت سے پس ماندہ غریب ہوتے ہیں کہ ان کے قرض لینے کا سامان ہوجاتا ہے، بہت سے بھک منگے ہوتے ہیں، کھانے پینے کو نہیں۔ انہیں قرض دے کر تجارت کرائی جائے۔ کوئی کاروبار لگا دیا جائے کہ بھئی! تم پانچ برس میں ہمارا قرض ادا کر دینا۔ مگر اب اپنا کام چلاؤ۔

ہندوستان میں بہت سی ایسی بستیاں ہیں کہ انہوں نے فنڈز جمع کئے اور ان سے غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ پہلے یہ صورت تھی کہ لوگ ساہوکاروں سے قرضہ لیتے تھے۔ تو مسلمانوں کی لاکھوں کی جائیدادیں تباہ ہو گئیں۔ وہ ساری سود ہی میں نکل جاتی تھیں۔ اس لئے مسلمانوں میں جو دولت مند تھے انہوں نے فنڈز قائم کئے اور اس میں بلا سود کا قرضہ دیا۔ اس میں کچھ ضمانتیں، یا لکھت پڑھت بھی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سینکڑوں آدمی کام سے لگ گئے۔ جو پریشان حال تھے ان کی پریشانی رفع ہوگئی۔ تو شخصی طور پر زکوٰۃ دی جائے بے شک ضروری ہے۔ فرض و عبادت ہے ثواب و اجر بھی ملے گا۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر فنڈز مقرر کئے جائیں کہ ہم اپنے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

غریب بھائی کو غریب نہیں رہنے دیں گے۔ جتنا ہم سے بن پڑے گا۔ اس میں تعلیم کا بھی بندوبست ہوسکتا، پیسہ کا بھی بندوبست ہوسکتا ہے، غریبوں کی خبر گیری بھی ہوسکتی ہے۔ ایک کا کام ایک ہی کا ہوتا ہے۔ جماعت کا کام جماعت ہی کا ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر خدمت کی جائے تو قوم کی زیادہ خدمت ہوسکتی ہے۔ تعلیم وتربیت اور معاشرت ومعاش کے سلسلہ میں خدمت کے بہت بہتر نتائج ظاہر ہوسکتے ہیں۔ غریبوں کے حقوق بھی امیروں کے اوپر عائد ہوتے ہیں۔ یہ غریب بھی اپنے بھائی ہیں کوئی الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ دولت مند بھائی ہیں یہ بھی ہیں۔ تو دولت مندوں کا یہ بھی فرض ہے کہ زکوٰۃ، صدقات اور لِلّٰہ فی اللہ سے اپنے بھائیوں کی خبر گیری کریں۔ شخصی طور پر بھی اجتماعی طور پر بھی۔ یہ بھی ایک مستقل عبادت اور طاعت ہوگی اور اس کا اجر جماعتی طور پر ہوگا۔ اس سے قوم کی ترقی ہوگی، بہبود وفلاح بھی ہوگی۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''۔ کہ وہ بندگی کریں۔ ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ﴾ ② ''ہم نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ ہم تم سے روزی چاہیں''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ③ ''روزی کا ذمہ ہم لیتے ہیں تم مت گھبراؤ''۔

تو ایک کام ہمارے سپرد کیا اور ایک اپنے ذمہ لیا۔ اپنے ذمہ روزی دینا لیا۔ آپ کے ذمہ طاعت وعبادت کرنا ہے۔ جتنا آپ طاعت وعبادت کریں گے، ادھر سے روزی آئے گی اور روزی کے معنی فقط روٹی کے نہیں ہیں۔ رزق، عزّت، آبرو، اِقتدار سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔ تو ہم روزی دیں گے، تم طاعت وعبادت کرو۔

اب مسلمانوں نے جو اپنے ذمے لیا تھا اسے ترک کر دیا اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کا مطالبہ قائم ہے۔ اگر روزی میں کمی ہوئی تو بس اللہ میاں کی شکایت شروع ہوگئی کہ صاحب! بس روزی بند کرنے کو میں ہی رہ گیا تھا کفار کہاں چلے گئے تھے۔ میرے ہی اوپر بلا آتی ہے۔ گویا انہوں نے جو روزی کا ذمہ لیا تھا۔ معاذ اللہ اسے پورا نہیں کیا اور آپ جو ذمہ لے کے آئے تھے کہ میں طاعت کروں گا۔ وہ آپ نے کب پورا کیا؟ اپنے کو دیکھتے نہیں، شکایت اللہ میاں کی شروع کر دی۔ اس واسطے اپنا بھی حق ادا کرو اور اللہ نے جو اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ ادا کریں گے تم کمی کرو گے، ادھر سے بھی کمی ہو جائیگی۔ تم پورا حق ادا کرو گے، ادھر سے بھی روزی دی جائے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ④ ''روزی کی فکر نہ کرو ہم دیں گے''۔ اپنے کام کی فکر کرو۔ جو تمہارے ذمے ڈالا گیا ہے اور وہ طاعت وعبادت ہے۔ یہ چند باتیں میں نے بلا تمہید عرض کیں کسی علمی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو طاعت وعبادت کی، جھکنے کی توفیق عطا فرماوے۔ (آمین)

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۷.
③ پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸. ④ پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸.

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَا سِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ."

خطبہ طیبہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّـــا بَعْــــدُ:

تمہید...... حضرات محترمین! اس عظیم اجتماع کی صدارت مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم کا کام نہ تھا۔ اس لئے اس مقام پر آتے ہوئے ایک قسم کی بے ادبی اور خجالت وندامت محسوس ہو رہی ہے اور حیران ہوں کہ اپنے بزرگوں کے اس اقدام (تفویض صدارت) پر ان کا شکریہ ادا کروں یا شکوہ کروں؟

تاہم "اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبِ......" کے تحت جب کہ بزرگوں کے امر کی تعمیل کر رہا ہوں اور جہاں بٹھلا دیا گیا ہوں، وہاں بیٹھ چکا ہوں۔ اس لئے شکریہ کے سوا چارہ کار بھی نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس اظہار کے ساتھ کہ حقیقی معنی میں صدر وہی حضرات ہیں جو بے بضاعتوں تک کو بھی صدارتیں بانٹ سکتے ہیں۔ میں صرف ان کے حکم کے ایک تعمیل کنندہ کی حیثیت سے اس مقام پر حاضر رہوں گا اور یہ تعمیل ارشاد ہی اس خجالت وندامت کا تدارک بن سکتی ہے۔ جو مجھے اس مقام پر بیٹھ کر ہو رہی ہے۔ حق تعالیٰ ان بزرگان علم وتعلیم کے منشاء کی تعمیل کی توفیق دے اور ان کے فیوض وبرکات کو تادیر قائم رکھے، یہ دعا میرا شکریہ ہے۔

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی ۔۔۔ منت شناس ازو کہ بہ خدمت گذاشتت

تعین موضوع...... حضرات کرام! یہ عظیم اجتماع چونکہ علمی اور تعلیمی ہے اور ایک موقر تعلیم گاہ کے انتساب سے منعقد ہو رہا ہے۔ اس لئے اس خطبہ افتتاحیہ کا موضوع قدرتی طور پر خود وہی متعین ہو جاتا ہے۔ جو جلسہ اور تعلیم گاہ کا موضوع ہے اور وہ علم وتعلیم اور تربیت ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کے دائرہ میں محدود رہ کر ذیل کی چند سطور عرض کرنے کی جرات کروں گا۔

دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت...... میرے اس سارے خطبہ افتتاحیہ کا حاصل دو لفظوں میں یہ ہے کہ انسانی زندگی میں دینی تعلیم انتہائی اہم اور ضروری ہے اور اس سے پیدا شدہ علم وعمل اور اس علم وعمل سے مربوط زندگی ہی حقیقی زندگی اور اعلیٰ ترین حیات ہے۔ جس کی اشاعت وترویج اس نازک ترین یا تاریک ترین دور میں پورے

جان ومال کی قربانیوں کے ساتھ اہم ترین ضرورت ہے۔

دینی تعلیم پر مبنی چند سوالات...... دینی تعلیم کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے مبادی وآ ثار اور لوازم کیا ہیں؟ پھر دینی تعلیم کے تقابل سے جو دنیوی تعلیم مفہوم ہوتی ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے اور پھر اس علم دنیا اور علم آخرت کے ثمرات ونتائج میں کیا فرق ہے؟ چند قدرتی سوالات ہیں۔ جو دینی تعلیم کے لفظ سے آپ کے ذہنوں میں ابھر رہے ہوں گے انہی کے جوابات پر یہ تحریر مشتمل ہے مگر جوابات کی تقریر اور تفہیم قدرے طویل ہوگئی ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ موضوع ہی قدرتاً طویل الذیل ہے۔ دوسرے اس بناء پر کہ یہ سطور ایک طالب علم کے قلم سے نکل رہی ہیں اور وہ بھی ایک تعلیم گاہ میں اور اوپر سے ایک تعلیمی اجتماع کے موقعہ پر اور طالب علم کے لئے ایسے مواقع میں یہ موضوع نقدِ زندگی اور لذیذ ترین موضوع ہے اس لئے محبوب مشغلہ میں کچھ ارادی طول بھی ہو جاتا ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ان ارادی اور غیر ارادی طوالتوں کے لئے میں اپنے بزرگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر ساتھ ہی کوشش کروں گا کہ طوالت کو کم کرنے کے لئے ان حقائق کو خالص اصولی رنگ سے پیش کردوں۔ واقعات وحوادث سامعین کے ذہنوں میں خود موجود ہیں بلکہ مجھ سے کہیں زیادہ۔ اس لئے عرض کردہ اصول پر واقعات کو وہ خود منطبق فرما کر ان حوادث کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا فیصلہ فرمالیں۔ یہ اصول قرآن حکیم کی روشنی سے اَخذ کئے گئے ہیں۔ جو کائنات کے سارے حوادث کی صحت وسقم کو تولنے کا واحد میزان ہے ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ① ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر''۔ اس لئے ان پر منطبق شدہ واقعات کا حکم بھی قطعی ہوگا۔ جس کی تعمیل میں کسی خدا پرست کو کوئی کلام نہ ہونا چاہیئے۔

[1] **انسان ایک حقیقت جامعہ کی تخلیق**...... حضراتِ کرام! حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی صنعت متقنہ سے انسان کو حقیقت جامعہ بنایا، اس کے باطن میں قوائے کمال ودیعت کئے اور اس کے ظاہر کو مختلف اعضاء جمال سے سنوارا۔

اعضاء کے خلقی وظائف اور ان سے ایک قرآنی استدلال...... پھر ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال وظیفہ عمل سپرد فرمایا۔ آنکھ بنائی کہ وہ دیکھے، کان دیئے کہ وہ سنیں، ناک دی کہ وہ سونگھے، زبان دی کہ وہ چکھے، ہاتھ دیئے کہ وہ پکڑیں، پیر دیئے کہ وہ چلیں، جلد بدن دی کہ وہ چھوئے، زبان دی کہ وہ کھائے پیئے اور بولے، دماغ دیا کہ وہ عقل سے سوچے اور فکر کرے۔ غرض ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال وظائف عمل سپرد فرمائے۔ تا کہ وہ انہیں ادا کرتا رہے جس سے مقاصد تخلیق پورے ہوتے رہیں۔

اعضاء انسانی کے یہ فرائض جیسے بدیہی اور مشاہد ہیں۔ جنہیں تجربۃً اور بداہتاً ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ایسے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵.

ہی وہ شرعی بھی ہیں کہ ایمانا بھی انہیں تسلیم کرتا ہے۔ جب کہ انکے خالق نے ہی یہ وظائف ان کے لئے تجویز فرمائے اور اس کی اطلاع بھی دی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کفار کو مخاطب فرماتے ہوئے ان کے فرضی معبودوں (بتوں اور مورتیوں) کے بے حس و بے شعور اور بے بس ہونے کو اس سے ہی واضح فرمایا کہ وہ اپنے ان مصنوعی اعضاء سے وہ کام ہی نہیں لے سکتے۔ جو قدرت نے ان اعضاء کے لئے رکھے تھے۔ تو یہ بے حس و معطل اور ناکارہ کیا خدا ہوتے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ ① ''جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر (ان بتوں کو) پکارتے ہیں وہ انہی کی طرح خدا کی مخلوق ہیں۔ (خدا نہیں) پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو، کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں؟ (اور جب یہ بھی نہیں کہ وہ مخلوقاتی فرائض ہی انجام دے لیں تو وہ خالق کا کام کیا انجام دے سکیں گے کہ انہیں پکارا جائے''۔

اس آیتِ کریمہ سے جہاں اور بہت سے علوم برآمد ہوتے ہیں۔ وہاں یہ بھی بداہتاً واضح ہے کہ اعضاء انسانی میں ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال کچھ فرائض اور وظائف خلقتاً سپرد کئے گئے ہیں جیسے پاؤں کے لئے چلنا ہاتھوں کے لئے پکڑنا، آنکھوں کے لئے دیکھنا اور کانوں کے لئے سننا اور ان اعضاء کی زندگی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے خلقی فرائض کو انجام دیتے رہیں۔

2 اعضاء کا عمل اور کائناتی عدل ...... اگر ہر ہر عضو سے وہی کام لیا گیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ تو مقاصد خلقت پورے ہوتے رہیں گے اور یہ کائنات انسانی عدل پر قائم رہے گی۔ جس کا نام احسان ہے۔ لیکن اگر کسی عضو کو معطل چھوڑ کر بے کار کر دیا گیا۔ تو یہ سفاہت و بدعقلی ہوگی۔ جس کا نام حرمان ہے اور اگر کسی عضو کو غیر کام پر لگا دیا گیا۔ تو یہ ظلم ہوگا جس کا نام خسران ہے اور ان دونوں کا مجموعہ تعدی یعنی حدود سے تجاوز ہوگا۔ جس کا نام کفران ہے۔

اس اضاعت نعمت کو خواہ وہ ترکِ نعمت سے ہو۔ جس میں انتفاع کو عدم انتفاع سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو حرمان ہے یا بے محل استعمال سے ہو کہ اس میں صحیح مصرف کو غلط مصرف سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو خسران ہے۔ قرآن حکیم نے تبدیلی نعمت کہہ کر کفرانِ نعمت سے تعبیر فرمایا ہے اور فیصلہ یہ دیا ہے کہ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ جَهَنَّمَ ج یَصْلَوْنَهَا ط وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ② ''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ اللہ کے احسان کا ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں۔ جو دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے''۔

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۹۴، ۱۹۵۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۸، ۲۹۔

عمل اعضاء کی غرض وغایت...... پھر قدرتی بات ہے کہ ان اعضاء کے طبعی وظائف واعمال کی کوئی غرض و غایت بھی ہونی چاہئے۔ ورنہ بے مقصد عمل لغواور عبث ہوتا ہے۔ اس لئے ان تمام اعضاء کے مفوضہ کاموں کی بھی بلاشبہ ایک غرض وغایت ہے اور وہ حق طلبی اور پیروی حق ہے جس کا پروگرام شریعت ہے۔ اگر یہ تمام اعضاء اپنے اپنے وظائف عمل میں اسی غرض وغایت کے لئے حرکت کریں گے۔ تو اسی میں ان کی سلامتی اور دارین کی نجات ہے۔ ورنہ اگر انہوں نے اپنے یہ خلقی وظائف بجائے محبت حق کے عداوت حق کے مظاہرہ کے لئے بصورت بغاوت انجام دیئے۔ تو باوجود اپنے پورے وظائف خلقت انجام دے لینے کے۔ چونکہ وہ صحیح غرض وغایت کے لئے انجام نہیں دیئے گئے۔ اس لئے وہ ان کے حق میں وبالِ جان اور موجب ہلاکت وعذاب بن جائیں گے اور یہ اعضاء بجائے اس کے کہ اپنے نفس کے حق میں قیامت کے دن کوئی اچھی شہادت پیش کر سکتے اُلٹے اس کے خلاف گواہ بن کر مدمقابل آجائیں گے اور عذاب کے لئے مضبوط حجت بن جائیں گے۔

قرآن کریم نے اعضاء بدن کی اس تبدیلی غرض یا مخالف غرض کام کرنے پر ان اعضاء کا مخالف نفس گواہ بن جانا اور اس کے عذاب کے لئے مُمد ومعاون ہو جانا ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے: ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوْآ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ ① ''اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلایئے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر (نے) کے (لئے موقف حساب میں) لائے جائیں گے۔ پھر وہ روکے جائیں گے (تاکہ بقیہ بھی آجائیں) یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آجائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے اور (اس وقت) وہ لوگ (متعجب ہو کر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ اعضاء جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی؟ اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو''۔

بہر حال آیت کریمہ سے کائنات انسانی کے عدل واحسان پر قائم رہنے کی دو بنیادیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اعضاء بدن اپنے اپنے خلقی وظائف انجام دیں۔ معطل نہ رہیں کہ یہ حرمان ہے اور دوسرے یہ کہ صحیح غرض و غایت یعنی طاعت حق میں انجام دیں۔ مخالف غرض کاموں میں نہ لگیں کہ یہ خسران ہے اور ان کی جنس جس میں دونوں شریک ہیں، کفران ہے۔

سلطانِ بدن قلب کا عمل...... بہر حال جب کہ اس تمام اقلیم بدن میں ہر ہر عضو ایک صحیح وثابت غرض کے لئے اپنے وظائف عمل ادا کرنے کے لئے بنا ہے۔ تو ناممکن ہے کہ قلب جو اس ساری اقلیم بدن کا سلطان اور حکمران ہے

① پارہ: ۲۴، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۱۹ تا ۲۱.

اس کی کارفرمائی کی کوئی غرض وغایت نہ ہو۔ بالخصوص جب کہ اس کے جنود وعساکر اور خدمہ یعنی اعضاء بدن میں سے کوئی عضو بھی بے کار یا بلا وظیفہ کے ناکارہ، معطل اور بے مقصد نہیں بنایا گیا۔ تو یہ مَلِکُ الاعضاء کب بے کار بنایا گیا ہوگا اور کس طرح اسے بلا کسی وظیفہ کے معطل اور بغیر کسی صحیح غرض وغایت کے مہمل مان لیا جائے؟ مگر اس کا وظیفہ وہی ہوسکتا ہے جو سلاطین وملوک کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بادشاہ کا کام محنت مزدوری نہیں۔ بلکہ رعایا اور اپنے خدمہ یا عمالِ حکومت کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا، ہمہ وقت ان سے باخبر رہنا اور اس علم وخبر کی روشنی میں اقلیم کی تدبیر اور نگرانی کرتے رہنا ہے، کہ وہ اپنے اپنے مفوضہ فرائض پر لگے رہیں اور راست بازی کے ساتھ اپنے وظائف عمل کی غرض وغایت پوری کرتے رہیں۔

پس قلب کا سب بڑا کام اپنی اقلیم سے باخبر رہنا اور عملی طور پر اندرونی اور بیرونی امور میں جو باتیں اس کائنات بدن کے لئے مفید ہیں۔ انہیں فراہم کرنا اور جو اس کی غرض وغایت کے لئے مضر ہیں۔ انہیں دفع کرتے رہنا ہے تاکہ یہ اقلیم تن نہ اندرونی طور پر مفاسد اور تشویشات کا شکار ہو اور نہ بیرونی طور پر کسی غنیم کے حملہ کا ہدف اور نشانہ بنے۔ اس لئے قلب کے فوائد کا مختصر لفظوں میں خلاصہ یہ نکلا کہ وہ اندر اور باہر اور انفس وآفاق میں توجہ کر کے ان سے معلومات حاصل کرتا رہے اور اس علم کی طاقت پر اپنی اقلیم تن کو چلاتا رہے۔ اگر اس نے یہ فریضہ صحیح طور پر انجام دیا تو یہ تنہا اسی کی نہیں بلکہ ساری اقلیم تن کی صلاح وفلاح ہوگی۔ ورنہ وہ بھی فاسد ہو جائے گا اور اس کی ساری اقلیم بھی تباہی وبربادی کی آماجگاہ بن جائے گی۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ''وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ'' ''بدن (انسانی) میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور وہ جب فاسد ہوتا ہے۔ تو سارا دبدن فاسد ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے''۔ (1)

[3] **قلب کا وسیلہ علم تفکر وتدبر**...... پھر جس طرح کانوں کے سننے کا لئے اِستماع یعنی سننے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بغیر اس توجہ کے وہ سننے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے اور آنکھ کے دیکھنے کے لئے جس طرح استبصار یعنی دیکھنے کی طرف متوجہ ہو کر اپنی پتلیاں گھمانا ضروری ہے تاکہ وہ گرد وپیش کو دیکھ سکے کہ اس توجہ کے بغیر وہ بینائی کا وظیفہ ادا نہیں کرسکتی۔ اسی طرح قلب کو علم حاصل کرنے کے لئے استعلام یعنی علم کے لئے توجہ کرنی ضروری ہوگی کہ بغیر اس توجہ کے جس کا نام حرکت فکری یا تفکر وتدبر ہے۔ وہ علم آشنا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ناگزیر طریقہ پر قلب کو عالم خلق اور عالم امر کی طرف اپنی قوتِ فکریہ کو دوڑانا پڑے گا اور تفکّر وتدّبر کے وظائف انجام دینے ہوں گے۔ جب ہی وہ ظاہر وباطن کا علم حاصل کر کے کائنات بدن کی صحیح تدبیر کرسکے گا۔ اسلئے قرآن حکیم نے ان دونوں عالموں خلق اور امر کی طرف قلوب کو توجہ دلائی۔ عالم خلق میں اَنفُس کے بارے میں فرمایا ﴿وَفِـي

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه، ج: ۱ ص: ۹۰.

﴿اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ ① ''اور تمہاری ذات میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟'' اور عالم خلق میں آفاق کے بارے میں فرمایا: ﴿اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''کیا وہ آسمان اور زمینوں کی پیدائش میں غور نہیں کرتے؟'' اور عالم امر کے بارے میں فرمایا: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا﴾ ② ''تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے''۔

گو یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حرکت فکری اور توجہ کے بعد قلب کو علم حاصل ہو ہی جائے اور وہ صحیح علم تک پہنچ ہی جائے۔ جیسا کہ بعض اوقات کان توجہ کریں اور سنائی نہ دے، ہلال دیکھنے کے لئے آنکھ نظریں لڑائے اور نظر نہ آئے۔ جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات اچانک نظر ڈالتے ہی آنکھوں کو ہلال نظر آجائے اور کانوں میں اچانک کوئی بات پڑ جائے اور وہ سن لیں۔ اسی طرح قلب کے لئے توجہ اور فکر شرط ہے خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ گو بعض اوقات کبھی ادنی توجہ ہی سے قلب میں علوم القاء ہو جاتے ہیں اور بے محنت پکی پکائی مل جاتی ہے۔ مگر قانونی عادت یہی ہے کہ توجہ ہی سے علم کا ثمر شیریں سامنے آتا ہے۔ جو حصول علم کی شرط اوّلین ہے۔

④ بدن کا ہر ہر عضو صاحبِ ادراک و شعور ہے...... اس موقعہ پر یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس سلطان الاعضاء (قلب) کے حاکم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کائنات بدن میں اور کوئی عضو عالم نہیں۔ بلکہ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' کے طبعی اصول پر اس کائنات بدن کا ہر ہر حصہ اور ہر ہر عضو علم واحساس سے بہرہ ور ہے اور اقلیم بدن کا ریشہ ریشہ احساس وادراک کا ذخیرہ درجہ بدرجہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

آنکھ کے دیکھنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسے صورتوں کا علم ہو جائے۔ کان کے سننے کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ اسے آوازوں کا علم وادراک ہو جائے، زبان کے چکھنے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ اسے ذائقوں کا علم ہو جائے، ناک کے سونگھنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے خوشبو یا بدبو کا ادراک ہو جائے، ہاتھ، پیر اور عام جلد بدن کے چھونے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ انہیں کسی جسم کی سختی، نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا ادراک ہو جائے وغیرہ۔ جس سے واضح ہے کہ کائنات بدن کا ذرہ ذرہ ادراک وشعور اور علم کی مختلف قوتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور اپنی اپنی معلومات کی فراہمی میں مشغول ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ سارے کا سارا انسان علمی قوتوں سے لبریز اور اندر باہر سے باشعور ہے۔ جب کہ ان کا حکمران (قلب) علوم ومعارف کا سرچشمہ ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان میں کس کا علم اصلی ہے اور کس کا فرعی اور جزوی۔ لیکن بہر حال جب کہ ان سب میں ادراک کسی نہ کسی شان سے موجود ہے۔ تو کسی بھی عضو کے علم وادراک سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اعضاء کے ادراک کی تین قوتیں...... بنا بریں ان اعضاء ادراک کی ان مختلف نوعیتوں کو سامنے رکھ کر کہا

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۲۔

جاسکتا ہے کہ ظاہر نظر انسان کے علم وادراک کی تین قوتیں ہیں۔ جو ان اعضاء میں حسب مناسبت پھیلی ہوئی اور منقسم ہیں۔ ایک حس جو مختلف نوعیّتوں کے ساتھ مختلف بدن میں فرق مراتب کے ساتھ قائم ہے اور اپنے اپنے دائرہ محسوسات میں مختلف اشیاء کو اپنے اپنے رنگ احساس سے محسوس کرتی ہے۔

دوسری عقل جو دماغ میں رچی ہوئی ہے اور امُور معقولہ کو ایک خاص شعور کے ساتھ اَخذ کر کے اپنے اپنے مواقع پر صرف کرتی ہے۔

تیسری قوت وجدان ہے۔ جو قلب میں جا گزیں ہے اور ماوراء طبعیات تک اس کی رسائی ہے کہ وہاں سے بھی وہ علوم کھینچ لاتی ہے۔ جہاں حواس وعقل گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پہلی دو قوتوں (حس اور عقل) کے عمل کا میدان یہ محسوس جہاں ہے۔ جس سے انہیں معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے۔ حس کو جزئیات کا اور عقل کو کلیات کا اور آخرت کی قوت یعنی وجدان صحیح کے عمل کا میدان غیب کا جہان ہے۔ جس پر وہاں سے علوم کا ترشح ہوتا ہے اور آیاتِ خداوندی اترتی ہیں خواہ وہ جزئیاتی ہوں یا کلیاتی۔

اگر جزئی ہیں تو ان کے مظاہر عمل حس کے ادراک میں بھی آجاتی ہیں اور اگر کلیاتی ہیں تو ان کی علمی صورتیں عقل پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں اور خالص وجدانی اور غیبی ہیں تو قلب کے زاویوں میں بامانت جاگزیں رہتی ہیں۔ علم اور حظ سے قلب ہمہ وقت و معمور اور مسرور ہوتا ہے۔ لیکن سرچشمہ ان سب کا غیبی ہی جہاں ہے۔ جس سے یہ علوم کبھی سماع سے قلب میں آتے ہیں کہ کوئی ہاتف غیبی خبر دے، کبھی الہام خداوندی سے قلب پر وارد ہوتے ہیں کہ قلب اچانک انہیں محسوس کرنے لگے۔ کبھی علم اور عرفانی تجربات سے خود بخود دل میں ابھر آتے ہیں کہ دل ان کا مورد ہو جائے۔ کبھی تربیت یافتہ عقل باطن کی روشنی سے ان کی انواع متمیز ہو جاتی ہیں۔ جس کی صورت ملکہ اجتہاد، واستنباط ہے اور کبھی عقل ظاہر کی سوچ بچار اور فکر و تدبر سے منکشف ہو جاتے ہیں جیسے عام علمی لطائف ونکات وغیرہ۔ مگر بہر حال یہ سب وجدانی علوم کہے جائیں گے جن کا تعلق حواس یا عقل طبعی سے براہ راست نہیں ہوتا۔

قرآن کریم سے وسائل ادراک کی تعیین...... قرآن حکیم نے ان سب صورتوں کی بنیادیں خود ہی قائم فرمائی ہیں اور ان مختلف الانواع آیاتِ الٰہی سے کچھ سیکھنے اور لینے کے لئے انہی مذکورہ وسائل سماع، فکر، علم اور عقل و انکشاف کا ذکر فرمایا ہے کہ یہی وہ وسائل ہیں۔ جو آیات الٰہیہ سے کچھ سبق لیتے ہیں اور علم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً انسان ہی میں سے انسان کا جوڑا نکل آنے اور ان میں اچانک انس و مودت قائم ہونے کی قدرتی نشانیوں کو سمجھ لینے کا ذریعہ فکر کو بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ① ''اس میں بہت پتہ کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں یا مثلاً زمین، آسمان کی پیدائش اور انسانوں کی زبانوں کے اختلاف اور رنگوں کے تفاوت سے جو سبق لیں اور ان میں قدرت کی نشانیاں دیکھیں، اس کا ذریعہ علم کو فرمایا گیا: ﴿اِنَّ فِیْ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

﴿ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ﴾ ① ’’اس میں بہت نشانیاں ہیں جانکاروں کے لئے‘‘۔

یا مثلاً دن اور رات میں انسان کے سونے جاگنے کا انقلاب اور روزانہ قدرتی خزانوں سے اپنا رزق ڈھونڈھ نکالنے میں قدرت کی جونشانیاں مخفی ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ سماع قبول بتلادیا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ﴾ ② ’’اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو بات سنتے ہیں‘‘۔

یا مثلاً بجلی کی کڑک اور اس سے خوف وطمع کا دلوں میں من اللہ ورود، پھر آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کردکھانے کی نشانیوں سے عبرت پکڑنا عقل کا کام بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ ③ ’’اس میں بہت پتے ہیں عقل والوں کے لئے‘‘۔

یا مثلاً قرون ماضیہ اور پچھلی امتوں کی تباہی اور باوجود ان کی عظیم طاقت وقوت کے برے دن آنے پر انہیں پناہ نہ مل سکنے کی عبرت ناک صورتوں سے درس عبرت لینا قلب کا کام بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ ④ ’’اس میں سوچنے کی جگہ ہے۔ اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر‘‘۔ بہر حال فکر، علم، سمع، عقل، وجدان ہی وہ اسباب شمار کر دیئے گئے ہیں جن سے مخفی علوم کا انکشاف ہوتا ہے۔ جو اوپر کے دعویٰ کیلئے ایک واضح اور قطعی دلیل ہے۔ غرض انسان میں عموماً علم آنے کے یہی تین راستے ہیں یا تین قوتیں ہیں۔ (حس، عقل، وجدان) جو اعضاء ادراک کے ذریعہ ادراک واحساس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مگر جبکہ ظاہر نظر میں ادراک، کا عمل ان کے اعضاء ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے عالم ومدرک ان اعضاء ہی کو کہا جاتا ہے اور انہی پر اس علم واحساس کی صحت وسقم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ دیکھنے والا آنکھ ہی کو کہا جائے گا۔ مخفی طور پر دیکھنے کا کام قوت باصرہ کا ہے اور سننے والا کان ہی کو کہا جائے گا۔ حقیقتاً سننے والی طاقت قوت سامعہ ہے وغیرہ۔

اعضائے اِدراک کا باہمی فرقِ مراتب...... البتہ علمی کمال ونقصان کے اعتبار سے ان اعضاء کے علم و ادراک میں یکسانی نہیں۔ بلکہ تفاوت اور فرق مراتب کافی ہے، کوئی عضو وسیع العلم ہے اور کوئی ناقص العلم، کوئی عمیق العلم ہے اور کوئی سطحی العلم جس کا معیار یہ ہے کہ جو عضو اپنے علم وادراک سے شی معلوم کی ذات اور اصلیت وحقیقت کا پتہ چلا سکتا ہے۔ اس کے علم کو کامل اور عمیق کہا جائے گا اور یہی علم صحیح معنی میں علم حقیقی کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اور جس کا ادراک شی کے محض ظواہر رُسوم اور عوارض تک محدود رہ جانے سے شے کی تمام حقیقت سامنے نہ آسکے، تو اس کے علم کو ناقص، سطحی اور ظاہری کہا جائے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شے کے ان رسوم وعوارض اور خواص و آثار میں جو عوارض حقیقت سے قریب ہوں گے۔ اسی حد تک ان کا علم ادراک علم حقیقت سے اقرب اور اس سے

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۳. ③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴.
④ پارہ: ۲۶، سورۃ قٓ، الآیۃ: ۳۷.

اشبہ کہلائے گا اور اسی درجہ میں اس عضو کی شرافت دوسرے اعضاء پر تسلیم کی جائے گی اور جس حد تک یہ عوارض کا علم، علم حقیقت سے بعید ہوگا۔ اسی حد تک اسے نا تمام، ناقص اور غیر حقیقی علم کہا جائے گا۔

اسی صوری وحقیقی اور سطحی وعمیق علم کا عنوان سامنے رکھ کر یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ صورت جیسے ایک کھلی چیز ہے۔ جو سب کے سامنے ہوتی ہے ایسے ہی حقیقت ایک باطنی اور مخفی چیز ہے۔ جو ان ظاہری حواس سے محسوس نہیں ہوتی اور سب جانتے ہیں کہ حقیقت صورت سے افضل ہوتی ہے کہ صورت کے وجود کا سرچشمہ ہی حقیقت ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکال لینا آسان ہے کہ علم حقیقت یا علم ارواح یا علم باطن اور اس کے متعلقات کا علم، علم اعلیٰ ہوگا اور علم صورت یا علم اجسام یا علم رنگ و بو اور ان کے متعلقات کا علم، علم ادنیٰ ہوگا اور اسی تناسب سے ان علوم کے ادراک کرنے والے اعضاء میں بھی اعلیٰ ادنیٰ کا فرق ہوگا۔

پھر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہ رہنی چاہئے کہ ظواہر اور صور اشکال چونکہ محدود اور بہت سی حد بندیوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ صورت نام ہی حد بندی کا ہے۔ اس لئے ہر ایک شکل اپنی حد میں رہ کر ہی دوسری شکلوں سے ممتاز اور متعارف ہوتی ہے۔ اس لئے ان ظواہر کے علم حاصل کرنے میں بھی حد بندی اور قیود وشرط ناگزیز ہیں کہ انہی حدود میں یہ اعضاء ادراک، ان کا ادراک واحساس کر سکتے ہیں۔ اگر یہ قیود وحدود توڑ دی جائیں تو علم واحساس ہی کا وجود ناممکن ہو جائے گا۔ جیسا کہ آئندہ ان قیود کی تشریح آ رہی ہے۔

اس لئے یہ اصولی دعویٰ بآسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جس عضو کے علم وادراک میں ظواہر کی قیود وشروط بڑھتی جائیں گی۔ اتنا ہی اس کا علم رسمی، سطحی، جزوی اور محدود ہوتا چلا جائے گا۔ جس کا نفع بھی محدود اور ادنیٰ ہوگا اور اسی حد تک یہ عضو بھی ادنیٰ الاعضاء شمار ہوگا اور جتنا کوئی عضو اپنے علم وادراک میں رسمی قیود وحدود سے آزاد ہوتا چلا جائے گا۔ اتنا ہی اس کا علم بھی وسیع، گہرا اور حاوی وشامل ہوتا جائے گا اور اسی حد تک یہ عضو بھی اشرف الاعضاء شمار ہوگا۔

5 اعضائے اِدراک کے علم کا باہمی تفاوُت...... اس معیار کو سامنے رکھ کر جب ہم اس انسانی ہیکل یا کائنات بدن پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں علم وادراک کے لحاظ سے سب اعضاء یکساں نہیں ہیں۔ کوئی ذکی الحس ہے اور کوئی غبی اور بلیدُ الحس ہے۔ کسی کا علم اونچا ہے اور کسی کا علم پست، کسی کا وسیع ہے اور کسی کا تنگ اولاً محسوسات ہی کو لیا جائے۔ تو ان میں بھی یہ تفاوت کافی نمایاں ہے۔

مثلاً چھونے کی قوت جسے قوّت لامسہَ کہتے ہیں۔ سب سے زیادہ بلید اور غبی قوت ہے۔ جس کا علم بہت سی قیدوں کے ساتھ مقید اور بہت سی حدود میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں اولین شرط تو یہی ہے کہ وہ جس شے کی ادراک کرے وہ جسمانی ہو، روحانی یا معنوی نہ ہو کہ روحانیت کا علم وادراک اس کی دسترس سے باہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اس جسم کو بھی وہ دور سے معلوم نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اس سے آ کر لگ نہ جائے اور یہ اسے چھو نہ دے یعنی اس کے لئے اپنے معلوم سے محض قرب واتصال کافی نہیں۔ بلکہ الصاق اور مل جانا ضروری

ہے اور پھر اس نہائی اتصال یعنی ٹکراؤ کے باوجود بھی اسے کسی شے کا شخصی تمیز حاصل نہیں ہوتا صرف جنسی یا نوعی امتیاز کا ادراک ہوتا ہے، اور وہ بھی مبہم اور اجمالی یعنی کسی چیز کو چھو کر اس چیز کی سختی، نرمی، گرمی، ٹھنڈک کا احساس ہو سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ لکڑی ہے یا پتھر، لوہا ہے یا مٹی یعنی زیادہ سے زیادہ اس کی نوعیت کا علم ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا مشخص اور ممتاز علم نہیں ہو سکتا کہ وہ شخصی طور پر کیا ہے اور کون ہے؟

یعنی نوع کے ان عوارض سے بھی وہ کسی فرد کی تشخیص کر کے اس کی ذات کے بارے میں کوئی غیر مبہم علم حاصل نہیں کر سکتی۔ حالانکہ کسی شیئ کا جسم ظاہر ترین اشیا ہے۔ جس میں کوئی خفا نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اس موٹے اور نمایاں جسم کو بھی یہ قوت بغیر ٹٹولے اور بغیر اس سے لگے لپٹے اسے یا اس کے بعض عوارض کو محسوس نہیں کر سکتی۔ تو اس سے زیادہ غبی اور بلید اور کون سی قوت ہوگی۔

پس علم کی وہ حقیقت جس کا نام تمیز بین الاشیاء ہے۔ اسے بہت ہی معمولی درجہ کی نصیب ہوئی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ یہ قوت انسانی مدرکات میں نہایت کم رتبہ اور حقیر قوت ہے۔ جس کے علم کو نام ہی کے درجہ میں علم کہہ سکتے ہیں ورنہ وہ لاعلمی اور جہل سے ہی زیادہ قریب ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ قوت لامسہ کے ذریعہ کسی چیز کو چھو کر احساس کر لینا کوئی خاص کمال نہیں، ایک غبی سے غبی اس قوت کے ذریعہ موٹے موٹے مادوں کا ادراک واحساس کر سکتا ہے۔ جس میں صلاحیت بھی نہ ہو کہ چھو کر بھی کسی شیئ کو کسی حد تک معلوم کر لے۔ تو اس سے زیادہ احمق اور جاہل اور کون ہو سکتا ہے؟ اسے تو جاندار کے بجائے پتھر اور لکڑی کہا جائے گا۔ تو یہی اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔

چنانچہ قرآن کریم نے کفار کا قرآن کے ساتھ عناد اور انکار ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ منکر ایسے بلید الحس اور غبی الفہم ہیں کہ اگر وہ کتاب الٰہی کو دیکھ بھی لیں اور اسے ہاتھ سے چھو بھی دیں۔ تب بھی وہ اس کا انکار ہی کریں گے''۔ ظاہر ہے کہ کسی شے کے ظہور وشہود کا اس سے آگے اور درجہ ہی کون سا ہے کہ اسے دیکھ بھی لیا جائے اور چھو بھی دیا جائے اور پھر بھی وہ شے دماغ میں نہ اترے تو انہیں حیوان بھی نہیں کہا جا سکتا چہ جائیکہ انسان کہا جائے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ ① ''اور اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرماتے۔ پھر یہ لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے۔ تب بھی یہ کافر لوگ یہ ہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے۔ قرآن کے اس بیان تنزل سے واضح ہوا کہ اس کی نظر میں قوت لامسہ غبی ترین قوت ہے جس کا ادراک نہایت ہی گھٹیا درجے کا علم ہے۔ جو محض جسم کو نوع اور جسم کے اوپر نمایاں عوارض، طول وعرض اور عمق کے ادراک سے آگے نہیں بڑھتا اور وہ بھی ٹٹول کر جس میں پورا ابہام رہتا ہے۔ کوئی خاص تمیز حاصل نہیں ہوتی۔ تاکہ کسی نوع کے اشخاص وافراد متمیز ہو جائیں۔ اس لئے اس کے علم کو علم کہنا درحقیقت علم سے لاعلمی کا اظہار کرنا ہے۔ اور اس

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷.

لئے اس کے ذریعے ایسے مبہم علم کا حاصل کرنے والا اہلِ علم میں شمار نہیں ہوسکتا۔

6 **قوتِ ذائقہ**......دوسری قوت ذائقہ ہے جس کا محل زبان ہے۔ وہ کھٹے میٹھے کا پتہ چلا لیتی ہے جو ایک باطنی خاصہ ہے۔ لیکن یہ قوت بھی اس وقت تک کسی چیز کے مزے کا ادراک نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ ذائقہ دار چیز کو زبان سے ملا نہ دیا جائے۔ اس لئے یہاں بھی وہی اِتصال تام بلکہ الصاق اور شئے کے لگ جانے کی شرط ہے جو قوت لامسہ میں تھی کہ یہ بھی بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے ذائقہ کا ادراک نہیں کرسکتی اور جتنا بھی کرتی ہے وہ شے کے عوارض کھٹے میٹھے تک ہی محدود ہے۔ جس سے شے کی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے اسے بھی قوت لامسہ کا ایک فرد سمجھنا چاہیئے۔ فرق اتنا ہوگا کہ لمس ومس کی قوت جب ہاتھ پیر اور جلد بدن کے ذریعہ اپنا کام کرتی ہے تو جسم کی سختی اور نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا احساس کرتی ہے اور جب زبان کے ذریعہ کام کرتی ہے تو ذائقے اور مزے کا احساس کرلیتی ہے بلکہ اسی کا ایک فرد قوت شہوانی بھی ہے۔ جو حقیقتاً قوتِ لامسہ ہی ہے کہ بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے لذت کا احساس نہیں کرسکتی ہے۔ پس یہی لامسہ جب اعضاء شہوت پر ظاہر ہوتی ہے تو شہوانی لذتوں کا ادراک کرلیتی ہے۔ لیکن لامسہ کی ان سب قسموں میں قدرِ مشترک یہی ہے کہ وہ کسی جسم سے لگیں اور چمٹیں تب ہی ادراک کرسکیں گی بغیر اس کے یہ جسمانی خواص وعوارض ان کے احساس میں نہیں آسکتے۔ فرق اگر ہے تو قوت کا نہیں محل کا ہے۔ یعنی جس محل میں لگنا اور چھونا واقع ہوگا اسی محل کے عوارض احساس میں آجائیں گے کہیں سختی نرمی کہیں مزہ اور ذائقہ اور کہیں لذات شہوت وغیرہ البتہ ان میں سے بعض ظاہر بدن کے عوارض ہیں اور بعض باطن بدن کے اور بعض باطن بدن سے بھی گذر کر نفس کے اور اسی لحاظ سے ان میں فرق مراتب ہے کہ بعض اس سے اعلیٰ ہیں۔ جیسے مزہ اور ذائقہ کہ وہ فی الجملہ باطن جسم سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جیسے لذت شہوت کہ وہ بدن کی گہرائیوں میں نفس کے عوارض سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جو ایک باطنی کیفیت ہے مگر اس فرق کے باوجود ان سب میں قدر مشترک وہی لمس ومس (لگنا اور چھونا) ہے۔ اس لئے یہ سب قوت لامسہ ہی کے افراد شمار کئے جائیں گے۔ جنہیں کسی شے کی حقیقت وماہیئت کی دریافت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس قوت لامسہ کے لمس ومس یعنی لگنے چھونے کو بعض جگہ ذوق سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے بھی قوت لامسہ ذائقہ ہی کا ایک فرد ہے۔ چنانچہ روز قیامت عذاب نار اور عذاب سقر (جہنم) میں بدن سے مس کرے گا۔ جب ہی اس کی اذیت محسوس ہوگی۔ لیکن اس مس کو قرآن حکیم میں چکھنے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ ① ''سقر (عذاب جہنم) کے چھونے کا مزہ چکھو''۔

جس سے لامسہ اور ذائقہ کا ایک دوسرے سے قریب ہونا معلوم ہوا یا جیسے موت ایک چھونے کی چیز ہے جس

① پارہ: ۲۷، سورۃ القمر، الآیۃ: ۴۸۔

کے لگنے سے روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لگنے ہی کو قرآن نے چکھنے سے تعبیر فرمایا۔ جیسے ارشادِ حق ہے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ① ''ہر نفس کے لئے موت کا مزہ (چکھنا) ہے''۔

پس چیز چھونے کی تھی، جس کا تعلق لمس اور مس سے تھا اور اسے تعبیر کیا گیا ذائقہ سے۔ یا جیسے قرآن کریم نے جہاں ایک بستی کے کفرانِ نعمت پر جسے رزق ہر طرف سے دیا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ بدظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ ② ''اللہ نے انہیں لباس جوع وخوف کا مزہ چکھا دیا''۔

ظاہر ہے کہ عذاب مس کرنے کی چیز ہے اسی لئے تو اسے لباس فرمایا گیا کہ جیسے لباس بدن سے چپک جاتا ہے۔ ایسے ہی عذاب بھی اس بستی کے تن پر لباس کی طرح چست ہو گیا کہ نہ وہ اسے جلدی سے اتار سکتے تھے نہ اس کی اذیت سے بچ سکتے تھے۔ لیکن اس اذیت اٹھانے کو قرآن نے چکھنے سے تعبیر فرمایا کہ اللہ نے اس بستی کو عذاب جوع وخوف کے لباس کا ذائقہ چکھا دیا۔

جس سے واضح ہے کہ وہ لباس کا چھونا تو بدن سے لگنے اور چمٹنے کی چیز ہے، مگر چونکہ وہ تاثر کے لحاظ سے چکھنے سے اَقرب ہے۔ اس لئے اسے ذائقہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ جس سے قرآنی روشنی میں بھی کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ کہ ذائقہ کی قوت لامسہ کی قوت سے الگ نہیں بلکہ اسی کا ایک فرد ہے یہ الگ بات ہے کہ قوت ذائقہ، لامسہ کا ایک اونچا فرد ہے۔ مگر جب کہ وہ لامسہ ہی ہے اور لمس ومس ہی پر اس کے ادراک کا دارومدار ہے تو اسے لامسہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور جو حکم لامسہ کا ہوگا، وہی اس کا بھی ہوگا۔ سو لامسہ کسی شے کی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتی بلکہ صرف اس کے بعض بدنی عوارض ہی کے ادراک تک محدود ہے۔

ایسے ہی ذائقہ بھی خواہ زبان سے چکھنے کا ہو یا اعضاء شہوت سے چکھنے کا رہے گا عوارض بدن کی کے پہچان کی حد تک' اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے قوت ذائقہ کا علم بھی ادنی ہی درجہ کا علم ثابت ہوا۔ جسے علم کی فہرست میں کوئی اونچا مقام نہیں دیا جا سکتا اور اس کے مدرک وعالم کو اقلیم تن کے علماء کی فہرست میں شمار نہیں کیا جائے گا کہ یہ کوئی معتدبہ علم ہی نہیں۔

⑦ قوتِ شامّہ...... رہی قوت شامّہ (سونگھنے کی قوت) سو وہ بلاشبہ اپنی کارفرمائی میں بظاہر لامسہ اور ذائقہ کے طرح لمس ومس کی محتاج نہیں۔ بلکہ جسم سے ملے بغیر دور ہی سے خوشبو یا بدبو کا احساس کر لیتی ہے۔ اس لئے اس قوت کو قوت لامسہ کی طرح بلید الحس اور ضعیف الاحساس نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ذکی الحس باور کیا جائے گا، کیونکہ وہ کسی شے کی خوشبو، بدبو سونگھنے میں اس کی محتاج نہیں کہ خوشبو دار چیز کو ناک سے رگڑا جائے۔ جب ہی وہ اس کی خوشبو کا ادراک کرے۔ بلکہ وہ دور سے بھی خوشبو کو محسوس کر لیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی قوت لامسہ سے کچھ دور

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۵۷. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۱۲.

نہیں۔ کیونکہ اس میں خوشبودار شے کا ناک سے لگ جانا ضروری ہے۔ خواہ اسے ہوا ہی لا کر لگائے۔

چنانچہ پھول کہیں رکھ دیئے جائیں۔ تو سارا مکان مہک جاتا ہے اور ہر ناک اسے دور سے ہی سونگھ لیتی ہے یا کسی پھول دار درخت کے پھولوں کی خوشبو بعض اوقات بیسیوں گز دور سے محسوس کر لی جاتی ہے جو ہوا کا کرشمہ ہے گو درخت ناک کے قریب نہیں۔ لیکن اس سے سونگھنے کی قوت کی کوئی فوقیت یا لطافت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہوا کہ لطافت ثابت ہوتی ہے کیونکہ ناک کی قوت درخت تک نہیں جاتی بلکہ ہوا اس کی خوشبو کو ناک تک کے لے آتی ہے، اور ناک اسے جب ہی سونگھتی ہے کہ وہ خوشبو اڑ کر ناک تک آ جائے اور اسے لگ جائے۔ فرق اتنا ہے کہ لامسہ اور ذائقہ میں ذائقہ دار چیز کا مزہ اور ذائقہ زبان تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ خود اس چیز کو زبان سے نہ ملا دیا جائے۔ لیکن خوشبو ذائقہ اور مزہ سے اس حد تک ضرور لطیف ہے کہ اپنے محل یعنی پھول وغیرہ سے الگ ہو کر اور اڑ کر ناک تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر ناک اسے جب ہی محسوس کرے گی کہ وہ ناک سے آ لگے پس لامسہ میں خود جسم آ کر لگتا ہے۔ تب ہی وہ احساس کرتی ہے اور شامہ میں جسم کے یہ عوارض یعنی خوشبو یا بدبو آ کر ناک کو لگتے ہیں۔ تب وہ ان کا احساس کرتی ہے۔ خواہ وہ ہوا ہی کے ذریعہ آئیں مگر مس کرنا بہر حال ضروری رہا۔ ورنہ سونگھنے کی قوت ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ اس لئے سونگھنے کی قوت بھی چھونے کے قوت سے اپنی کارکردگی میں کچھ زیادہ فائق نہیں ثابت ہوئی۔ فوقیت اگر ہے تو ان کے محسوسات میں ہے کہ ایک کا محسوس کثیف ہے اور ایک کا لطیف لیکن حاسے دونوں کے یکساں ہیں۔ پر اس میں بھی یہ چھونے اور چکھنے کی قوتیں یکساں ہی ہیں کہ شے کی حقیقت کا ادراک ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتی صرف عوراض شے کا احساس کرتی ہے۔ اس لئے گو بعض جہات سے قوت لامسہ اور ذائقہ پر کچھ فائق سہی۔ مگر شرائط ادراک اور نوعیت ادراک میں سب قریب ہی قریب ہیں۔

پھر یہ سب قوتیں صرف اجسام ہی میں اپنا کام کر سکتی ہیں نہ کہ ارواح و حقائق میں۔ چنانچہ روح نہ چھوئی جا سکتی ہے نہ ٹٹولی جا سکتی ہے اور نہ ہی چکھی جا سکتی ہے۔ اور پھر سب میں وہ اتصال اور لگنے کی شرط بھی مشترک ہے کہ جب ان کا محسوس ان سے آ کر ملے جب ہی وہ ادراک کر سکتی ہیں ورنہ نہیں اور ادھر ان سب کی سب کا ادراک پھر بھی عوارض جسم ہی تک محدود ہے، ذات تک ان میں سے کسی کی بھی رسائی نہیں کہ اسے معلوم کر لیں۔ اس لئے اس سونگھنے کی قوت کا علم و ادراک بھی کچھ زیادہ معتد بہ اور قابل شمار ثابت نہ ہوا۔

8 قوتِ شامّہ کے جزوی علم پر قرآنی اِستشہاد...... قرآن حکیم سے بھی اس کی طرف راہنمائی ملتی ہے کہ محض سونگھ لینا کوئی خاص اور امتیازی شان کا علم نہیں۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خوشبوئے یوسف سونگھ لینے کی حکایت سے جو قرآن نے کی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ﴿اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ ① ''میں (یعقوب علیہ السلام) یوسف کی خوشبو پاتا ہوں کہیں تم مجھے جھٹلا نہ دو''۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۹۴.

آیت میں ریح یوسف فرمایا گیا ہے محض ریح اور خوشبو نہیں کہہ دیا گیا ہے یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ایک خوشبو پاتا ہوں۔ (معلوم نہیں کس کی ہے؟) بلکہ یہ فرمایا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں۔ جس میں خوشبو والے کا علم بھی شامل تھا۔ جو ایک مشخص اور واقعاتی علم ہے۔ تو انہیں اس کی بھی فکر ہوئی کہ کہیں اسے جھٹلا نہ دیا جائے۔ جو ایک حقیقت واقعہ کی تکذیب ہوگی۔ ورنہ اگر مطلقاً کسی خوشبو سونگھ لینے کی بات ہوتی تو جھٹلانے کی فکر نہ ہوتی۔ کیونکہ مطلقاً کوئی خوشبو ناک میں آجائے تو خود سونگھنے والے کو بھی تردد لاحق ہو سکتا ہے کہ یہ کس چیز کی خوشبو ہے۔ اس لئے اگر دوسروں کو بھی اس میں تردد لاحق ہو اور وہ اسے جھٹلا دیں تو جھٹلا دینے کی کوئی بھی فکر سونگھنے والے کو نہیں ہوتی، کہ وہ خود بھی کسی متمیز حیثیت تک پہنچا ہوا نہیں جھٹلانے کی یہ فکر جب ہی ہوتی ہے کہ ناک میں معین شئے کی خوشبو آئے اور اس علاقہ کے ساتھ آئے کہ یہ فلاں کی خوشبو ہے، کسی اور کی نہیں تو یہ ایک متمیز اور معتدبہ علم ہوتا ہے جسے جھٹلانے کا کوئی واقعہ نہیں۔

پس آیتِ کریمہ سے صاف واضح ہے کہ خوشبوئے معین جس میں خوشبو والا بھی مشخص ہو علم ہے جو قابل تکذیب نہیں۔ اس کا اقتضائی نتیجہ یہ نکل آتا ہے کہ مطلقاً خوشبو سونگھ لینا جس میں خوشبو والا ذہن میں مشخص نہ ہو۔ کوئی معتدبہ علم نہیں اور ظاہر ہے کہ ناک کا علم اتنا ہی ہے کہ وہ خوشبو سونگھ لے نہ کہ اس کے ساتھ خوشبو والے کو بھی مشخص کرے کہ یہ ناک کا کام نہیں، ذہن کا کام ہے۔ تو قرآن سے بطور اقتضائے نص واضح ہو گیا کہ ناک کا علم جس میں صرف خوشبو ذہن میں حاضر ہوتی ہے خوشبو والا مشخص نہیں ہوتا۔ کوئی اعلیٰ علم نہیں کیونکہ ناک بنائی ہی گئی ہے، صرف خوشبو کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ خوشبو والی اشیاء کی تشخیص کے لئے۔

قوت لامسہ، ذائقہ اور شامہ کا علم کوئی معتدبہ علم نہیں ہے...... اس لئے جیسے چھونے اور چکھنے کا علم نصوص قرآنی کی روشنی میں کوئی اعلیٰ علم ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس پر دوررس نتائج وثمرات مرتب ہوں بلکہ محض ایک جزوی علم تھا۔ ایسے ہی سونگھنے کا علم بھی اس آیتِ قرآنی کی روشنی میں کوئی اونچا علم نہیں نکلتا کہ اس پر دین ودنیا کے کچھ دوررس اور اہم ثمرات مرتب ہوں۔ بلکہ ایک جزوی علم ثابت ہوتا ہے جس سے نہ کسی شے کی تمام حقیقت واضح ہوتی ہے اور نہ خود شے ہی متمیز ہوتی ہے۔ اس لئے ناک بہرحال پھر اپنے ہی جزوی علم کے مقام پر آ کر ٹھہر گئی اور اسے کوئی اصولی فوقیت ہاتھ، پاؤں اور زبان پر حاصل نہ ہو سکی، اس پر ثمرات بھی جزوی مرتب ہوں گے جو قابل شمار نہ ہوں گے۔ اب جب کہ چھونے، چکھنے، سونگھنے یعنی قوتِ ذائقہ، قوتِ شامہ اور بالفاظ دیگر ہاتھ، پیر، زبان اور ناک کا علم معتدبہ نہ رہا۔ بلکہ ایسا جزوی ثابت ہوا کہ ان پر انسان کے حق میں کچھ دوررس نتائج مرتب نہیں ہوتے۔

معتدبہ علم آنکھ کان اور قلب ہی کا ہے...... اس لئے مدرک اعضاء میں اب تین ہی بنیادی اعضاء رہ جاتے ہیں کہ ان کے علم کو ان مذکورہ اعضاء کی نسبت سے معتدبہ علم کہا جائے۔ آنکھ، کان اور قلب یعنی دیکھنے کا علم، سننے کا علم اور سمجھنے کا علم جن کے علم کو علم شمار کیا جائے اور وہ اہمیت کے ساتھ قابل ذکر ہوں اور پھر ان معلومات پر دنیا وآخرت

کے دوررس نتائج مرتب ہوں سوغور کیا جائے تو یہ تینوں اعضاء اوران کی یہ علمی قوتیں حقیقتاً ایسے علم وادراکات کی حامل ہیں۔ جن کا علم بہت حد تک امتیاز وتمیز کی شان بھی ہے جو علم کی حقیقت ہے اور اسکے نتائج بھی دوررس انداز میں انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات بدن کی بقاء وترقی کا راز کچھ انہی تین اعضاء کے علم میں مضمر ہے، اور انسان سے مواخذہ اور دنیا وآخرت میں پرسش وجواب کی ذمہ داری زیادہ تر انہی تین قوتوں سمع، بصر اور فہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں جہاں انسان کے قابل ذکر اور موجب مسئولیت ومواخذہ علم و ادراک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہاں خصوصی طور پر انہی تین قوتوں سمع، بصر اور سمجھ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

سمع، بصر اور قلب کی عطا...... ایک موقع پر جہاں انسان پر علم دیئے جانے کے احسان کو جتلایا گیا ہے وہاں انہی تین قوتوں کے عطاء فرمانے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ انسان میں قابل اعتناء اور قابل ذکر یہی تین علمی قوتیں ہیں۔

سمع، بصر اور قلب کا اِحساناً ذکر فرمایا گیا...... چنانچہ بطن مادر میں انسان کی ان ہی قوتوں کے رکھے جانے کا احسان ذیل کے الفاظ میں جتلایا گیا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّاتَشْكُرُوْنَ﴾ ① ''پھر اس (نفس) کو درست کیا اور اس میں اپنی روح ڈالی اور تمہارے لئے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں رکھیں مگر تم کم ہی شکر کرتے ہو''۔ پھر بطنِ مادر سے نکالتے ہوئے بھی انسان پر انہی تین قوتوں کی ایجاد وعطا کا احسان جتلایا گیا ہے۔ ارشادِ حق ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ② ''اور اللہ نے نکالا تم کو تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان آنکھیں اور دل تا کہ تم احسان مانو''۔

انسانی گمراہی کے ذمہ دار بھی یہی اعضاءِ ثلاثہ ہیں...... پھر آدمی کی ذمہ داری بھی انہی قوتوں کی بدراہی اور مسخ ہو جانے پر عائد ہو گئی ہے ارشاد الٰہی ہے: ﴿اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرالیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بچلا دیا اسکو اللہ نے جانتا بوجھتا، اور مہر لگادی اس کے کان پر اور دل پر اور ڈال دی اس کی آنکھ پر اندھیری۔

انہی اعضاء ثلاثہ کو مسئول بھی قرار دیا گیا ہے...... پھر انسانی بدراہی کے موقعہ پر انہی تین قوتوں کی بے راہ روی پر دنیوی اور اُخروی مسئولیت بھی عائد کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَاتَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ ③ ''اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی''۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۹. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۶.

اعضاء ثلاثہ کا غلط مصرف ہی عذابِ جہنم کا سبب ہوگا......اور آخر جب آدمی اپنی جاہلانہ اور عاصیانہ حرکتوں کے مسلسل اِرتکاب سے دنیا میں حیوان صفت اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہوگا۔ تو اس کی کل ذمہ داری انہیں تین عملی قوتوں پر ڈالی گئی ہے کہ جب یہ معتد بہ قسم کے تین علم تمہیں دیئے جاچکے تھے اور تم نے عواقب اور نتائج کو ان قوتوں کی بدولت سمجھ لیا تھا۔ تو پھر ان سے حق جوئی کا کام کیوں نہیں لیا؟ اور کیوں ان ناشائستہ حرکتوں میں مبتلا رہے؟ اس سے واضح ہوا کہ علمی زندگی کے بننے بگڑنے کا تعلق زیادہ تر انہی تین علوم و ادراکات سے ہے۔ ارشادِ حق ہے: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ① ”اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور آدمی ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ، وہی لوگ ہیں غافل“۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ ② ”مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے“۔

اعضاء ثلاثہ کے علم پر ہی ثمراتِ دنیا و آخرت کا مدار ہے...... بہرحال ان نصوصِ کریمہ سے واضح ہے کہ ان تین اعضاء آنکھ، کان اور قلب کا علم ایک بنیادی اور اساسی علم ہے اور اسی پر دنیا اور آخرت کے ثمرات زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ اگر یہ تین علم غلط ہوجائیں۔ تو دنیا کا علم اور آخرت کا سکون کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر یہ صحیح ہیں اور اپنے صحیح آثار دکھلا رہے ہوں تو انہی سے آخرت و دنیا دونوں بن جاتی ہیں۔

اس موقعہ پر ہاتھ، پاؤں، ناک یعنی لامسہ، ذائقہ اور شامہ کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ ان کا علم ایسا بنیادی اور معتد بہ قسم کا نہیں۔ جو دنیا و آخرت کے بننے بگڑنے کا مدار کار ہو۔ بلکہ بہت حد تک یہ تینوں علم انہی بعد کے تینوں علموں کے تابع اور انکے زیرِ اثر ہیں پس اصل علم یہی تین علوم ٹھہر جاتے ہیں۔ عینی علم جو آنکھ سے حاصل ہو، سمعی علم جو کان سے حاصل ہو اور فہمی علم جو قلب سے ابھرے۔

9 کثرتِ قیود و شرائط وسعتِ علم کے لئے مانع ہیں...... لیکن باوجود ان تینوں عملی قوتوں کے معتد بہ اور قابل ذکر ہونے کے پھر بھی اسی معیار کی رو سے کہ جس علم کے لئے ادراک کی قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ علم وسیع نہیں رہتا اور جس پر قیدیں اور شرطیں کم ہوں۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

اعضائے ثلاثہ میں آنکھ کا دائرہ علم سب سے تنگ ہے...... ان تینوں علوم میں بھی تفاوت اور فرقِ مراتب ہے۔ جو قرآن ہی کا مقتضاء ہے مثلاً آنکھ کے علم میں چونکہ قیود و شروط بہت ہیں اور کان کے علم میں کم۔

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷۔

اس لئے آنکھ کے علم کا دائرہ کان کی بہ نسبت تنگ اور محدود ہے۔ چنانچہ آنکھ کا علم اول تو صرف جسمانیات تک محدود ہے وہ مادیات کو تو دیکھ سکتی ہے۔ روحانیت کو نہیں۔ اس نے آج تک خود اپنی روح کو بھی باوجود انتہائی قرب کے نہیں دیکھا جس سے واضح ہے کہ معنویات اور لطائف کے ادراک سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ آنکھ سے اگر انسان کی صورت پوچھو تو بتا دے گی۔ لیکن اگر اس کی حقیقت اور معنویت پوچھنے لگو تو وہ معذور رہ جائے گی۔ پھر بلحاظ زمانہ جسمانیات کے دائرہ میں بھی اسے ماضی و مستقبل کے دیکھ لینے سے کوئی واسطہ نہیں جو چیزیں جا چکی ہیں یا جو آنے والی ہیں۔ آنکھ ان کے دیدار سے محروم ہے اور ان کی صورت، شکل یا جسم کا کوئی بھی پتہ نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس کا دائرہ عمل صرف حال رہ جاتا ہے کہ وہ صرف موجوداتِ وقت پر نظر ڈال لے اور ماضی و مستقبل کے دیدار سے محروم رہے۔ پھر موجوداتِ وقت کے دائرہ میں بھی اس کے دیکھنے کے لئے تقابل شرط ہے کہ وہ چیز آنکھ کے سامنے ہو۔ دائیں بائیں یا پس پشت ہوئی تو وہ پھر ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ پھر تقابل میں بھی اتصال معتدل کی شرط ہے کہ قابل دید شے آنکھ سے نہ زیادہ دور ہو نہ زیادہ نزدیک۔ بہت دور ہو تب بھی آنکھ بے کار ثابت ہوتی ہے اور بہت نزدیک ہو حتیٰ کہ آنکھ سے ملا دی جائے تو پھر بھی وہ دیدار سے عاجز رہ جاتی ہے۔

پھر اس معتدل فاصلہ کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ بیچ میں کوئی حائل اور حجاب بھی نہ ہو۔ اگر ذرا سا پردہ بھی بیچ میں آ جائے تو آنکھ دیدار سے معذور رہ جاتی ہے۔ پھر بلا حائل ہو کر بھی دیکھنے کی چیز کا سکون شرط ہے۔ اگر وہ متحرک ہو تو پھر بھی اس پر نگاہ نہیں جم سکتی کہ دیدار ہو جائے اور بینائی اپنا صحیح کام کر جائے۔ پھر بھی خواہ مخواہ نگاہ جما دی جائے گی تو گو دیدار ہو جائے گا۔ مگر غلط ہوگا کہ شئے کچھ سے کچھ دکھائی دینے لگے گی۔ جیسے ایک گول پہیہ حرکت کرتا ہوا دیکھا جائے تو اس کے درمیان کا قطر اور اس کی کڑیاں سب نگاہوں سے غائب ہو جائیں گی اور پہیہ بجائے درمیانی خلاؤں کو دکھانے کے متصلِ واحد ایک ٹھوس جسم دکھائی دے گا۔ جو اس کی واقعی ہیئت نہیں ہے۔

بہر حال آنکھ کی کارفرمائی میں ایک دو نہیں بہت سی شرطیں ہیں۔ جن کے بغیر وہ اپنی کارفرمائی نہیں کر سکتی۔ یعنی شے کا جسمانی ہونا، مقابل ہونا، حال ہونا، متصل ہونا، بلا حائل ہونا، ساکن ہونا وغیرہ کہ ان شرطوں کے بغیر وہ علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے آنکھ کے علم کا دائرہ بہت ہی محدود اور تنگ ثابت ہوا اور اس سب کے باوجود جتنا بھی علم ہوگا وہ سطحی ہوگا وہ سوائے اوپر اوپر کی صورت اور رنگ و نقش کے کچھ اور نہیں دیکھ سکے گی۔ حتیٰ کہ اگر کسی جسم کا جگر تک چاک کر کے اسے دکھایا جائے تب بھی اسے سطح اور رنگ ہی نظر آئے گا۔ کوئی گہری حقیقت ہرگز منکشف نہ ہوگی۔

بندگانِ عقل کا علم بصر پر غلط اعتماد...... اس لئے یہ علم اصلی ہونے کے باوجود پھر بھی سطحی اور غیر معتد بہ ثابت ہوتا ہے۔ جس پر آج دنیا میں بے حد فخر و غرور کا اظہار کیا جا رہا ہے اور عینی مشاہدہ ہی کو اصل الاصول اور یقین کی بنیاد باور کرایا جا رہا ہے۔ حالانکہ کسی شے کا علم حواس کے بارے میں یقین و اطمینان کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا مشاہدہ ہے نہ کہ اوپری صورت اور نقش و نگار کا معائنہ ہے۔ پس آنکھ کے مشاہدہ کا جب کہ حقائق سے تعلق

ہی نہیں جو کسی شے کی حقیقت کے بارے میں یقین واطمینان کی بنیادیں مستحکم کر سکے۔ تو اس کے علم کو کسی درجہ میں علم حقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی ہر دور کے دہرئیے اپنے عینی مشاہدات ہی کو اصل سمجھ کر معنویات میں بھی عینی مشاہدہ کے طلب گار رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لطیف وخبیر خدائے برحق کے بارے میں بھی عینی مشاہدہ ہی کا مطالبہ کر کے ایمان کو اس پر معلق کر چکے ہیں یہود نے کہا تھا کہ ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ① ''(اے موسیٰ) ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں''۔ یا مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ ﴿اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا﴾ ② ''(اے پیغمبر) ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، یا لے آ، اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے''۔

لیکن ان بندگان عقل کو اس کا شعور نہ ہوا کہ آنکھ معنویات اور لطائف کے احساس کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ جیسا کہ کان صورتیں دیکھنے کے لئے اور ناک آوازیں سننے کے لئے نہیں بنائی گئی۔ اس لئے جیسے کان سے صورتیں دیکھنے اور ناک سے آوزیں سننے کا مطالبہ لغو اور بے عقلی ہے۔ ایسے ہی آنکھ سے علم واخلاق، یا روح یا حق تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ بھی خلاف فطرت اور کج عقلی ہے۔ پس دیکھنے کا تعلق صرف رسوم ونقوش اور سطوح وخطوط سے ہے نہ کہ شئے کی ذات اور حقیقت سے اور یقین کی بنیادیں رسوم ونقوش پر قائم نہیں ہوتیں۔ بلکہ شے کی ذات اور اس کے حقائق کے ادراک پر قائم ہوتی ہیں۔ اس لئے آنکھ کا علم ان تینوں آلات علم آنکھ، کان قلب میں سے اپنی ذات میں قلیل ترین اور محدود ترین علم ثابت ہوتا ہے جسے آج سب سے اونچا علم ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج اس کے دوررس ہوں۔

10 کان اور قلب کا دائرہ علم آنکھ سے وسیع ہے ...... بخلاف کان اور قلب کے کہ ان دونوں کا علم آنکھ سے کہیں زیادہ وسیع اور حقیقی ہے۔ وہ ٹھوس جسم کے بجائے اس کے لطیف ترین عوارض کا ادراک کر لیتے ہیں جو آنکھ کے بس کی بات نہیں پھر ان میں زمان ومکان کی بھی قید نہیں کہ کان صرف وقت پر ہی بات سنیں۔ بلکہ وہ ماضی اور مستقبل کے واقعات کا بھی ادراک کر لیتے ہیں اور زمانہ بیچ میں حائل نہیں ہوتا۔ پھر کان کے سننے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ آواز سنانے والا کان کے متقابل ہو کر ہی آواز لگائے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ دائیں بائیں، آگے پیچھے جہاں سے بھی آواز آئے گی کان سن لیں گے اور دل اسے کچھ نہ کچھ سمجھ لے گا۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آواز دینے والا کان سے مل کر یا بہت قریب آ کر ہی آواز دے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ میلوں دور کی آوازیں بھی کانوں میں سما جاتی ہیں اور سنائی دیتی ہیں اور دل ان کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔

پھر ان دونوں کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ درمیانی حائل ان کی سماعت میں رکاوٹ پیدا کر دے کہ بلا حائل تو آواز سنی جائے، ورنہ نہیں بلکہ پس دیوار اور مقفل مکانوں کی آوازیں بھی کانوں میں فوراً آ جاتی ہیں اور وہ ادراک کر

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۵۵. ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۹۲.

لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کان صرف امور حاضرہ ہی کا ادراک کریں۔ بلکہ امور غائبہ اور مخفی واقعات بھی آواز کے ذریعہ کانوں کے پردوں میں اتر آتے ہیں۔ اس لئے کان اور قلب یا سمع اور فہم کا علم بلاشبہ آنکھ کے علم سے کہیں زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور گہرا ثابت ہوتا ہے۔ جس میں آنکھ کی بہ نسبت قیدیں اور شرطیں آدھی بھی نہیں ہیں۔

کان اور قلب کے واقعاتِ گذشتہ کے ادراک کرنے پر قرآنی استشہاد...... چنانچہ قرآن کریم نے جہاں نگاہوں سے اوجھل اور ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے امور کا ذکر عبرت وموعظت کے لئے کیا ہے۔ وہاں آنکھ کا ذکر نہیں فرمایا وہ اس میدان میں کام کر سکتے ہیں۔ ارشاد حق ہے ﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا﴾ ① کیا سیر نہیں کی ملک کی، جو اس کے دل ہوتے جن سے سمجھتے، یا کان ہوتے جن سے سنتے۔ کیوں کہ ہزاروں برس قبل کی ماضی کی سرگذشتوں اور سرکشوں کا انجام بد آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ کان ہی اسے سچی خبروں سے سن سکتے تھے اور دل ہی اسے سمجھ کر عبرت پکڑ سکتے تھے۔

چنانچہ جو لوگ حق کے بارہ میں نہ سننے سے کام لیتے تھے نہ سمجھنے سے، نہ کانوں کو متوجہ کرتے تھے نہ دلوں کو قرآن حکیم نے انہیں ڈھوروں اور ڈنگروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کے انہی دو اعضاء کان اور قلب کے بگڑ جانے کا ذکر فرمایا کہ ان دو کے معطل ہو جانے سے سارا نفسِ انسانی انسانیت سے نکل کر اور معطل ہو کر حیوانوں کی لائن میں چلا گیا فرمایا: ﴿أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ ② ''کیا آپ کو گمان ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو چوپایوں کی مانند ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ بھٹکے ہوئے ہیں''۔

اس طرح تذکیر موعظت کے موقعہ پر کانوں اور دلوں ہی کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ماضی بعید کی داستانیں کانوں سے سن کر دلوں کا ان سے نصیحت وعبرت پذیر ہونا، کان اور قلب ہی کا کام ہو سکتا تھا نہ کہ آنکھ کا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَحِيصٍ ◌ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ ③ ''اور کتنی تباہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ ان کی قوت زبردست تھی ان سے پھر لگے کریدنے شہروں میں۔ کہیں ہے بھاگ جانے کو ٹھکانا۔ اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہو یا لگائے کان دل لگا کر۔''

اسی لئے کفار بھی قیامت کے دن اپنی انہی دو قوتوں سے دنیا میں کام نہ لینے پر حسرت کریں گے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ ④ ''اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے، دوزخ والوں میں سے''۔

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۴۴۔
③ پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۶، ۳۷۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۰۔

کان کا دائرہ اِدراک بھی قلب کے مقابلہ پر محدود ہے...... لیکن غور کیا جائے تو کان باوجود اس وسعت علم کے جو ابھی ذکر کی گئی۔ پھر بھی بہت سی قیود اور حدود کا پابند اور محتاج ہے اور کم سے کم یہ قید تو اس پر بہر حال عائد ہے ہی کہ وہ جسمانیات سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور جسمانی دائرہ میں بھی آواز ہی کی حد تک اس کا دائرہ علم کام کر سکتا ہے، اور وہ بھی اس شرط سے کہ وہ زیادہ دور کی آواز نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بیرونی آلات اس کی مدد کر کے اسے بہت دور کی آوازیں سنوا دیں۔ مگر یہ اس کی قوت کا کرشمہ نہ ہوگا بلکہ آلات کی قوت وطاقت کا مظاہرہ ہوگا۔ کان کی تو بہر حال درماندگی اور محتاجگی ہی ثابت ہوگی۔ مذکورہ شرطوں کے علاوہ آلات کی اس پوری امداد کے باوجود پھر بھی کان مادی ہی آوازیں سن سکتا ہے۔ روحانی یا غیبی آوازیں سن لینا پھر بھی اس کے بس کی بات نہیں اور پھر مادی آوازیں سن کر وہ سن لینے ہی کا کام کر سکتا ہے۔ آواز والے کو تمیز کے ساتھ پہچان لینا کان کی استعداد نہیں۔ یعنی شنوائی کے سوا اس میں کوئی شعور یا فہم اور تمیز نہیں۔ اس لئے کان کا ادراک بھی ان تینوں اہم اعضاء میں کوئی تام ادراک نہ نکلا کہ تنہا اسے کوئی اونچا علم کہہ دیا جائے۔

11 احساس بھی قلب ہی کی خصوصیت ہے...... بہر حال انسانی علوم میں ابتدائی علم یہی حواس خمسہ کا علم ہے جن کے ذریعہ سے قابل احساس جزئیات کا ادراک کیا جاتا ہے اور کم از کم ان کے ظواہر صورت وشکل، رنگ، بو، یا عوارض وغیرہ کی جزئیات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جو عالم میں مختلف انواع میں بٹی ہوئی چہار طرف پھیلی پڑی ہیں۔ اس لئے گویا یہ پانچوں علم بلحاظ باطن قابل ذکر نہ سہی کہ حواس خمسہ ادراک باطن اور حقیقت نمائی کے لئے بنائے ہی نہیں گئے۔ لیکن بلحاظ ظاہر درجہ بدرجہ ایک گونہ اہمیت رکھتے ہیں جن کا فرق مراتب کے ساتھ ذکر قرآن حکیم کی روشنی میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔

غور کیا جائے تو گو ظاہر نظر میں ان محسوسات کا ادراک اعضاء حواس کرتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ احساسات قلب کے ہیں آنکھ، ناک، کان کے نہیں بظاہر آنکھ دیکھتی ہے۔ لیکن حقیقت میں آنکھ نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہی حال سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کا بھی ہے کہ بظاہر یہ احساس کان، ناک، زبان اور ہاتھ پاؤں کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سارے ادراکات قلب کے ہیں، ان اعضاء کے نہیں پس انسانی کائنات میں حقیقی مدرک اور اصلی عالم قلب ہی ٹھہر جاتا ہے۔

اور یہ تمام مختلف اعضاء ادراک اپنے اپنے ادراکات میں اس کے خدام ہیں۔ اس نے اپنے ظاہری علم کی حد تک یہ ہرکارے، اور جاسوس عالم حسیات میں اس لئے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ مختلف قسم کے محسوسات اور معلومات لا لا کر اس کے سامنے رکھتے رہیں اور وہ اس علم کی روشنی میں کائنات بدن کی تدبیر کرتا رہے۔ اس لئے ان محسوسات کا کوئی شعور خود ان اعضاء حواس کو نہیں ہوتا، آنکھ کچھ سوچ سمجھ کر نہیں دیکھتی کان کچھ غور وفکر کر کے نہیں سنتے اس کی نہ ان میں صلاحیت ہے نہ وہ اس کام کے لئے بنائے گئے ہیں۔ وہ محض دیکھ اور سن لیتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ اس

احساس کے مبادی واغراض کو سمجھنا صرف اسی صنوبری مضغہ گوشت کا کام ہے۔ جس کا نام دل ہے۔ پس احساس کی پالیسی دل بناتا ہے اور اس باشعور پالیسی کے تحت مزدوروں کی طرح احساس کا ظاہری فعل یہ اعضاء حواس انجام دیتے ہیں۔ پس احساس ظاہر نظر میں ان کا ہے اور شعور احساس دل کا ہے۔

حقیقتاً اعضاء کا احساس بھی قلب ہی کا فیض ہے...... مزید غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ احساس بھی در حقیقت یہ اعضاء نہیں کرتے۔ بلکہ وہ بھی تنہا قلب ہی کرتا ہے جب کہ ان عضاء کا یہ ظاہری احساس صرف اسی کی توجہ پر موقوف ہے۔ بغیر اس کی توجہ کے یہ سب اعضاء احساس بھی معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بازار کے ہنگامے، شوروشغب، باجے گاجوں کی نوع بنوع آوازیں کان ہی میں نہیں آتیں۔ اگر دل کا دھیان ادھر نہ ہوں، خوش منظر چیزیں، بلڈنگوں کے دیدہ زیب رنگ و روغن اور ان کی فلک پیا بلندی ورفعت کچھ بھی نگاہوں میں نہیں سماتی۔ اگر دل کا دھیان دوسری طرف ہو۔ بدن پر چوٹیں آ جائیں اور زخم لگ جائیں اور لمس ومس کی ساری ضربیں بدن پر پڑتی رہیں۔ لیکن اگر قلب کی توجہ ادھر نہ ہو تو ذرہ برابر ان مصائب کا اثر آدمی کو محسوس نہیں ہوسکتا۔ ہزار خوشبوئیں ہوا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ لیکن قلب اگر اپنے کسی اور غم میں منہمک ہو تو وہ ناک میں پہنچ کر بھی محسوس نہ ہوں گی۔ چہ جائیکہ کسی فرحت کا اثر پیدا کریں۔

بے تحاشا لذیذ کھانے دسترخوان پر چنے ہوئے ہوں۔ لیکن قلب کسی اور فکر میں مستغرق ہو تو کسی ایک چیز کا ذائقہ بھی زبان پر نہ آئے گا۔ خواہ آدمی کا پیٹ ناک تک بھی بھر جائے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ سننا، دیکھنا، چھونا، سونگھنا اور چکھنا، کان، آنکھ، ہاتھ، ناک اور زبان کا کام نہیں بلکہ دل کا کام ہے۔

اگر یہ احساسات بذاتِ خود ان اعضاء کے ہوتے تو آنکھ، ناک، کان میں آئے ہوئے محسوسات کے یہ نقشے بھی انہیں کے گوشت پوست میں سمائے ہوئے ہوتے، لیکن بجائے اس کے کہ اعضاء ان محسوسات کو اپنے اندر محفوظ رکھیں۔ یہ کام بھی قلب ہی کا ہے کہ وہی ان کی حفاظت کا خزانہ بھی ہے۔ اس لئے اگر آنکھ، ناک، کان بند بھی ہو جائیں۔ تب بھی ان محسوسات کے سارے نقشے، آوازیں اور ذائقے وغیرہ قلب ہی میں ہمہ وقت حاضر ملیں گے۔ نہ کہ ان اعضاء میں دل جب چاہے اور تصور میں لائے جب ہی فوراً بلا آنکھ، ناک، کان کے واسطہ کے ان سب کو عیاناً دیکھ اور سن سکتا ہے آنکھ، ناک، کان ہرگز ان نقشوں کو دیکھ، سن نہ سکیں گے کہ ان محسوسات کے نقشے ان میں محفوظ ہی نہیں۔

آدمی کہا کرتا ہے کہ میں نے فلاں وقت ایسا کھانا کھایا تھا کہ آج تک اس کا ذائقہ میرے منہ میں ہے۔ حالانکہ یہ مزہ اس کے منہ یا زبان میں نہیں ہے ورنہ ہر نئی کھائی ہوئی چیز کا ذائقہ اس پہلے ذائقہ سے خلط ملط ہو کر کبھی بھی خالص نہ رہتا اور کھانوں کے خالص مزے اس اختلاط سے ختم ہو جاتے، بلکہ یہ سارے مزے دل کے ظرف میں محفوظ رہتے ہیں اور دل جب بھی چاہتا ہے ان گذشتہ ذائقوں کو اپنے تصور میں لے آتا ہے اور ان کے ادراک سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جو اس کی واضح دلیل ہے کہ ان اعضاء کے یہ احساسات خود اپنے نہیں بلکہ صرف

دل کے ہیں۔اس لئے محفوظ بھی دل ہی میں ہیں ان میں نہیں بنابریں تن انسانی میں حقیقی مدرک اور عالم صرف قلب ہی ثابت ہوتا ہے اور یہ اعضاء صرف آلات ہی آلات باقی رہ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص آنکھ پر چشمہ لگا کر دیکھے تو کیا یہ بینائی کی عملی قوت چشمہ میں مانی جائے گی یا آنکھ میں اور یہ دیکھنا آنکھ کا کام ہوگا یا چشمہ کا؟ سب جانتے ہیں کہ یہ بینش (دیکھنا) کا عمل آنکھ کا کام ہوگا نہ کہ چشمہ کا کہ اس میں یہ قوت بینائی سرے سے ہے ہی نہیں ورنہ آنکھ سے اتار کر بھی چشمہ اشیاء کو دیکھ سکتا۔ یا مثلاً کسی شخص نے کان پر آلہ لگا کر سنا تو کیا یہ شنوائی کا عمل اس آلہ کا ہوگا؟ ہرگز نہیں بلکہ کان کا ہوگا۔ ورنہ کان سے الگ رہ کر بھی اس آلہ سے سن سکتے اور ادھر یہ صورت ہے کہ اگر آنکھ سے چشمہ اتار دیا جائے تو وہ بلا اس کے بھی دیکھ سکے گی۔ بشرطیکہ بیمار نہ ہو اور کان سے آلہ جدا کر دیا جائے۔ تب بھی کان سے سنے گا اگر مبتلائے مرض نہ ہو۔ کیونکہ قوت بینائی و شنوائی آنکھ اور کان میں ہے، آلہ میں نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ آنکھ دل کا ایک چشمہ ہے اور کان دل کا ایک آلہ سامع ہے۔ اس لئے حقیقتاً قوت بینائی و شنوائی آنکھ کان میں نہیں بلکہ قلب میں ہے۔ اس لئے آنکھ تو قلب سے جدا ہو کر نہیں دیکھ سکتی۔ مگر دل آنکھ سے جدا ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ آلہ اصل کا محتاج ہوتا ہے اصل آلات کی محتاج نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ وہ اصل پر رہے اور بیمار اور ضعیف نہ ہو جائے۔ بہر حال جب کہ یہ چشم و گوش آلات دل ہیں اور دل اصل ہے تو قوت بینائی اور قوت شنوائی اسی کی ہوگی نہ کہ آنکھ کان کی۔

قلب جیسے بحالت نومِ مدرک ہے ایسے ہی بعد الموت بھی رہتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ آدمی نیند میں جو موت کی چھوٹی بہن ہے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے۔ جو بیداری میں آنکھ کان سے دیکھتا سنتا ہے حالانکہ اس وقت آنکھ کان سوئے ہوئے اور معطل ہوتے ہیں جس سے صاف نمایاں ہے کہ دیدار کی قوت دل میں ہے آنکھ میں نہیں ہے۔

اس لئے اگر ہم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیں۔ بلکہ عقیدہ رکھیں کہ حقیقی موت کے بعد جب کہ آنکھ، ناک، کان کے اعضاء سرے سے باقی نہ رہیں گے پھر بھی آدمی اپنے اس لطیفہ قلب سے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ جو آنکھ کان سے دیکھتا سنتا تھا اور عالم برزخ کے وہ تمام عجائبات اس کی قوت بینائی اور قوت شنوائی پر منکشف ہوتے رہیں گے جن کو صاحب شریعت نے کھول کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ تو اس میں بھی کسی انکار و استعجاب کا موقعہ نہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ نیند ایک عارضی اور ہنگامی موت ہے جس میں روح حیات بدن سے کلیتہً جدا نہیں ہوتی۔ صرف اعضاء حواس معطل ہو جاتے ہیں مگر قلب بیدار رہتا ہے، ورنہ خواب کے عجائبات کیسے منکشف ہوتے اور موت اصلی موت ہے جس میں روح بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور اعضائے بدن سرے سے ہی باقی نہیں رہتے۔ مگر قلب پھر بھی بیدار رہتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہتا ہے۔ جو عالم برزخ میں سامنے آئے گا۔

پس جیسے وہ خواب میں بلا آنکھ کان کے سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا۔ ایسے ہی برزخ میں بھی بلا اس ظاہری آنکھ، کان کے سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ اس سے صاف نمایاں ہے کہ یہ اعضاء حواس درحقیقت خود مخزن احساس نہیں اور

نہ ہی یہ خود احساس کا کام انجام دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ساری کارگزاریاں درحقیقت صرف قلب ہی کی ہیں۔ جو نینداور موت میں بلا اعضائے ظاہری کے یکساں حساس رہتا ہے۔ بہرحال واضح ہو گیا کہ احساس بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعضائے حواس کا نہیں وہ اپنا احساس نہیں رکھتے۔ بلکہ صرف دل کے احساس کو ظاہر بینوں کے سامنے نمایاں کر دیتے ہیں۔

محسوسات سے تاثر پذیر بھی قلب ہی ہوتا ہے اعضائے اِحساس نہیں...... اس سے بھی آگے کی ایک بات یہ بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان محسوسات سے کسی اچھی بری کیفیت کا اثر لینا اوران کیفیات سے بلحاظ حظ و کرب شعور کے ساتھ متاثر ہونا بھی ان اعضائے حواس کا کام نہیں کہ ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ تن تنہا دل ہی کا کام ہے۔ اگر کوئی دردناک بات کان میں پڑ جائے تو درد آشنا دل ہوگا نہ کہ کان اور اگر کوئی خوش منظر چیز آنکھوں میں آ جائے تو متفرح قلب ہوگا نہ کہ آنکھ جس سے واضح ہے کہ یہ اعضاء صرف ان محسوسات کے رطب و یابس کو بٹورنے کے ذمہ دار ہیں اور وہ بھی قلب ہی کی توجہ اور تصرف سے اس کی خاصیات وآثار کو سمجھنے اوران سے اثر لینے کے ذمہ دار نہیں۔ اس لئے قلب نہ صرف ان محسوسات کا تن تنہا مدرک ہی ہے۔ بلکہ ان کے طبعی آثار و خواص اور کیفیات سے باکیف بھی وہی تن تنہا ہوتا ہے یہ اعضاء اس بارے میں کسی درجہ میں بھی اس کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اس لئے ان کی حیثیت آلات ووسائل احساس سے زیادہ کچھ نہیں جس سے کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ قلب دیکھنے سننے میں بھی ان اعضاء حواس کا محتاج نہیں اور کیفیات احوال کا اثر لینے میں بھی حواس کا دست نگر نہیں۔ جو اس کے حقیقی عالم ومدرک اور حقیقی باکیف اور صاحب حال ہونے کی واضح دلیل ہے۔

قلب اپنی قوت تصوریہ کے ذریعہ ایک حد تک موجد محسوسات بھی ہے...... پھر یہی نہیں کہ وہ محسوسات میں صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جو پہلے سے موجود ہوں۔ جیسا کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ صرف انہی چیزوں کو محسوس کر سکتی ہیں جو خارج میں موجود ہوں۔ خواہ وہ صورتیں شکلیں ہوں یا آوازیں اور خوشبوئیں وغیرہ۔ لیکن قلب اپنے احساسات میں اس کا بھی محتاج نہیں کہ صرف انہی اشیاء کا ادراک کر لیا کرے جو پہلے سے موجود ہوں بلکہ وہ اپنے تصور کی طاقت سے غیر موجود اشیاء کو ذہن میں خود وجود دے کر بھی ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ پس وہ محسوسات کا مدرک ہی نہیں بلکہ ایک حد تک موجد بھی ہے کہ جب چاہے خود ہی عالم تصور میں شہر کے شہر اور باغ کے باغ بنا لے اور پھر اپنے ہی اندران کی سیر بھی کرتا رہے، لطف بھی اٹھاتا رہے اور آنکھ، ناک، کان کو خبر بھی نہ ہو۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ ۔۔۔ تو زغنچہ کم نہ میدۂ درِدل کشابہ چمن درآ

اعضائے احساس کے بالمقابل قلب کی جلالتِ قدر...... پس قلب نہ صرف یہ کہ احساس میں ان اعضائے حواس کا محتاج نہیں بلکہ محسوسات کے کسی سابق وجود خارجی کا بھی محتاج نہیں۔ جس سے قلب کی علمی عظمت وجلالت اوران اعضاء حواس کی بے مائیگی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ادراک و

احساس بھی قلب ہی کا کام ہے اور محسوسات کی ایجاد و اختراع بھی اس کا حوصلہ ہے۔

فرق اتنا ہے کہ کہیں وہ ان اعضاء ظاہری کی وساطت سے ادراک کرتا ہے اور کہیں ان کے توسط کے بغیر اور کبھی وہ خارجی موجودات کو محسوس کرتا ہے، اور کبھی اپنے اندر تصوری موجودات بنا کر انہیں محسوس کرنے لگتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کا علم تابع معلوم ہوتا ہے اور دوسری صورت میں معلوم تابع علم نیز پہلی صورت میں علم انطباعی ہوتا ہے کہ باہر کی صورتیں شکلیں اس میں آ کر چھپ جاتی ہیں اور وہ انہیں دیکھتا رہتا ہے، اور دوسری صورت میں علم ایجادی ہوتا ہے کہ صورتیں بھی اندر ہی بنتی ہیں اور محسوس بھی اندر ہی ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ آفاقی محسوسات ہوں یا انفسی، امام علم بہرحال قلب ہی رہتا ہے اور اسی کے احساس کے صحت وسقم پر اس کائنات بدن کا سارا صحت وسقم موقوف ہے۔ اندریں صورت اگر احساس میں غلطی ہوئی تو اس میں ان اعضاء حواس کا براہ راست قصور نہ ہوگا کہ یہ محض آلاتِ کار تھے۔ بلکہ جرم وقصور فی الاصل دل ہی کا ثابت ہوگا کہ اس احساس وادراک میں وہی اصل تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان احساسات اور حواس کے علم میں قلب ہی کو اصل قرار دیتے ہوئے ان لوگوں کو جو حق بینی سے آنکھ پھیرلیں یا حق نیوشی کی سمجھ کو غیر کام پر لگا کر کبھی بھی نصیحت وعبرت قبول نہ کریں۔ آنکھ اور عقل کا اندھا نہیں بتلایا بلکہ دل کا اندھا کہا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (1) ''کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں (کہ آنکھوں سے دیکھ کر ان کے دل (حق کو) سمجھتے یا کانوں سے (کوئی سچی بات) سن لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل ہی اندھے ہیں''۔

بہرحال قرآن حکیم کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اعضاء احساس اپنے احساس وادراک میں اصل نہیں۔ بلکہ دل اصل ہے اور نہ ہی ان کا یہ تنہا علم کوئی مستقل اور معتد بہ علم ہے اور اگر آنکھ، کان اور دماغ کا علم کچھ معتد بہ اور کسی حد تک بنیادی اور نتائج وآثار کا حامل بھی ہے۔ تو ان میں بھی باہم فرق قوت وضعف کے ساتھ انجام کار علم صرف قلب ہی کا رہ جاتا ہے۔ جس پر کائنات انسانی کے صلاح وفلاح اور عدل کا دارومدار ہے۔ بحوائے ارشاد سید الاولین والآخرین صلوات اللہ علیہ وعلی الانبیاء جمیع اخوانہ من المرسلین۔ ''وَفِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ'' (2) ''بدن انسانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور جب وہ فاسد ہوتا ہے تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے''۔

حسیاتی علوم کی طرح دماغی علوم بھی حقیقتاً قلب ہی کا فیضان ہیں...... انسانی علوم کا ان پانچ ہی حواس

---

(1) پارہ: ١٧، سورة الحج، الآية: ٤٦۔ (2) الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب فضل من استبرء لدينه، ج: ١، ص: ٩٠.

میں انحصار نہیں۔ بلکہ ایک اہم اور دوررس قسم کا علم اور بھی ہے۔ جو بلحاظ باطن بھی ایک حد تک علم کہلائے جانے کا مستحق ہے اور رتبہ بھی ان پانچوں حسیاتی علوم سے اونچا ہے۔ یہ علم قوائے دماغ سے سرزد ہوتا ہے جہاں آنکھ، ناک، کان بے کار رہ جاتے ہیں۔ صرف دماغ اور اس کی ابتدائی قوت ہی کام کرتی ہے۔

نیز یہ علم حواس کے جزئیاتی علم سے زیادہ وسیع اور گہرا بھی ہے۔ جو اشیاء کی صورتوں شکلوں سے گزر کر ان کی کلی اور اصولی بنیادوں تک کا بھی پتہ چلا لیتا ہے اور ایک ایسی امتیازی شان لئے ہوئے ہے۔ جو اعضاء احساس میں سے کسی کو میسر نہیں کیونکہ یہ اعضائے حواس محسوسات کی صورتوں، آوازوں وغیرہ کا ادراک تو ضرور کر لیتے ہیں۔ لیکن کسی شعور کے ساتھ نہیں کرتے۔ لیکن دماغ اپنے خاص قوائے ادراک کی وجہ سے اپنے احساس میں باشعور بھی ہے کہ یہ محسوسات کیا ہیں؟ اور انکے اندرون میں کیا کیا کلی نوعیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جس سے اس محسوس کو وجود مل رہا ہے۔ پس اس کا ادراک محسوسات کی صورتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے مفہوم و مراد اور معنوی خصوصیات تک کو بھی جوں کا توں قبول کر کے اپنے اندر اتار لیتا ہے۔ جس سے ذہن میں شئے محسوس کی صورت و سیرت اور ہیئت و معنویت دونوں ہی کا نقشہ پورے کا پورا اتر آتا ہے۔ جو شعور کا ابتدائی مقام ہے اور دماغ کو حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے اس شعوری جوہر کو فقہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس کے معنی یہاں فہم معنویت کے ہیں۔

تفقہ بھی درحقیقت قلب ہی کا وصف ہے..... غور کیا جائے تو حواس خمسہ کے علم کی طرح یہ فہم و بصیرت کا علم بھی درحقیقت قلب ہی سے نکلتا ہے۔ جو قلب کے سامنے بواسطہ دماغ ظاہر ہوتا ہے چنانچہ کفار کے سمع و بصر وغیرہ کو جو کان، آنکھ سے ہوتا ہے۔ قرآن نے بے ثمر بتلاتے ہوئے ان کے قلوب سے فقہ و فہم کی نفی فرمائی ہے نہ کہ دماغ سے کہ جب ان میں دل کی سمجھ ہی نہیں اور وہ صرف ظاہری ہیئت یا سطحی معنویت ہی کو دیکھ لیتے ہیں۔ اندر کی بات ان کے دلوں میں نہیں اترتی تو ان کا یہ دیکھنا سننا سب بیکار اور عبث ہے چنانچہ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾ ① ''ان کے دل ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے''۔ یہاں منکروں کے دیکھنے سننے کی نفی سے جو اس آیت کے شروع میں کی گئی ہے۔ درحقیقت دل کے فہم و فقہ کی نفی مقصود ہے۔ جس سے واضح ہے کہ قلب کی اصلی صفت محض دیکھنا سننا نہیں، بلکہ سمجھنا ہے جس کا شرعی لقب فقہ ہے۔ جو قلب کا ایک طبعی جوہر ہے اور عام اعضاء کے طبعی و ظائف کی طرح اس میں ودیعت کیا گیا ہے۔

قلب کا وصف امتیازی تعقل ہے..... لیکن اس طبعی احساس و شعور سے اوپر قلب کی ایک خاص شان اور بھی ہے۔ جس میں اور کوئی عضو اس کا کسی درجہ میں بھی سہیم و شریک نہیں اور وہ یہ کہ قلب نہ صرف محسوسات کی صورت معنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کے تجزیہ بھی کرتا ہے اور بات سے بات پیدا کر کے اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے بھی اپنے اوپر کھول لیتا ہے یعنی وہ اس

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹۔

ایک محسوس جزئی کی معنویت سے آگے بڑھ کر اس میں سے اس کی علت نکال کر ایک کلیہ بھی بنالیتا ہے، جس سے ہزاروں جزئیات کا فیصلہ اسی ایک محسوس جزئی سے کر دیتا ہے۔ جو شعور وفہم سے آگے کا مقام ہے۔ قرآن حکیم نے قلب کی اس خاص صفت کا نام تعقل یا عقل ارشاد فرمایا ہے۔ جس کے معنی طبعی عقل کے نہیں بلکہ حقیقی عقل کے ہیں۔ جو اشیاء کی حقیقت تک جا پہنچتی ہے اور شئے کی جزئی صورت سے اس کی معنویت سے کلی نوعیت کا پتہ چلا لیتی ہے۔ جو بلاشبہ قلب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن نے اسے بھی قلب ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے کہ: ﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَا﴾ ① ''کیا سیر نہیں کی ملک کی، جوان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ ان منکروں نے زمین کی سیاحت بھی کی ہوگی اور اس کے عجائبات بھی دیکھے ہوں گے جن کی صورتیں اور معنویتیں ان کے دلوں میں اتری ہوں گی جس سے وہ بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن سمجھ کر جب انہوں نے عقل سے کام نہ لیا، نہ ان عجائبات کے منشاء اور انجام کو سوچا نہ کوئی عبرت وموعظت اس سے حاصل کی اور نہ ہی اپنے مالک حقیقی کو پہچان کر اس کی طاعت وذکر کا کوئی جذبہ ان میں ابھرا۔ تو یہ سمجھنا، بوجھنا سب بے کار اور اکارت ہے۔

ادراک قلب کی دونوعیتیں...... اس سے واضح ہوا کہ قرآن حکیم نے قلب کے ادراک کی دونوعیتیں بیان فرمائیں۔ ایک قوت فقہ وفہم جو ایک انفعالی قوت ہے کہ بات کو اس کی صورت ومعنویت سمیت جوں کا توں ظرف قلب میں اتار لیتی ہے اور ایک قوت عقل وکیاست کہ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں فاعلانہ تصرف کر کے انہیں آگے بڑھا دیتی ہے۔ مجمل کو مفصل، مشکل کو مفسر اور خفی کو ظاہر کر کے من بھر علم کو ہزار من کر دکھاتی ہے اور پھر اس میں سے جامع علت نکال کر اس کی جزئیت کو اس جامع علت سے کلیہ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس سے علم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ پس قلب کی سب سے بڑی اور امتیازی قوت یہی قوت عاقلہ یا صفت عقل ہے۔ جو اپنی ابتدائی بنیاد اور وضع خلقت کے لحاظ سے تو دماغ سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے عمل میں آخری حکم اور منشاء کے لحاظ سے بالآخر قلب سے متعلق ہے۔ کیونکہ قلب ہی انجام کار تمام اعضائے بدن پر جن میں دماغ بھی شامل ہے یکہ وتنہا حکمران ہے اور اسی کے اشاروں پر دماغ سمیت اعضاء کی یہ کائنات چل رہی ہے۔

قدیم وجدید ارباب دماغ کا منتہائے فکر...... عام طور پر ارباب دماغ یا فلاسفہ زیادہ تر عقل ہی کے بندے بنے رہے ہیں اور ان کی آخری پرواز عقل ہی کی عقیدت پر آ کر رک گئی ہے۔ چنانچہ فلاسفہ قدیم نے تو اسے خدائی کا درجہ اور تخلیق عالم تک میں اسے حصہ دار بنا دیا۔ افلاک کی تخلیق ان کے زعم میں عقلوں میں آئی جن میں سب سے بڑی تخلیق کنندہ عقل فعال ہے جسے عقل اول بھی کہا جاتا ہے۔ فلاسفہ حال جن پر سائنس کا روغن بھی چڑھا ہوا ہے اسے کھلے لفظوں میں خدا تو نہیں مانتے اور اس لئے نہیں مانتے کہ ان میں سے اکثر سرے سے خدا ہی کو نہیں

① پارہ: ۱۷، سورة الحج، الآیة: ۴۶۔

مانتے۔لیکن وہ اسے مدبر کائنات پھر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عالم کے تغیرات کا تعلق زیادہ تر عقلوں ہی سے ہے۔حتیٰ کہ وہ تکوینیات سے گزر کر وحی الٰہی تک کے اوپر عقل کو حکمران بنادینے کے منصوبے باندھے ہوئے بیٹھے ہیں،اور شرعی امور میں بھی اپنی انہی جزوی اور ناتمام عقلوں کو حکم کا درجہ دیئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہماری عقلوں کے حلق میں اتر جائے وہی قابل تسلیم ہے ورنہ نہیں۔

عقل کے بارے میں اہل دل کا نقطۂ نظر...... لیکن جہاں تک ارباب قلوب کا تعلق ہے وہ ان خرافات سے الگ رہتے ہوئے اس سے بہر حال انکار نہیں کرتے کہ عقل ایک شریف ترین آلہ شعور وادراک ضرور ہے۔جس سے بڑی بڑی پیچیدہ علمی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔اور وہ ایسے نازک نظری مقام پر کام کرتی ہے جہاں تک حواس کی رسائی نہیں۔اس لئے دین و دنیا میں اس کا استعمال ضروری ہے۔بشرطیکہ اسے اسی کی حدود میں رکھا جائے۔ شریعت نے بھی عقل کی فضلیت اور برتری کو ترقی دنیا وآخرت کے لئے تسلیم کیا ہے۔جس سے کتاب وسنت کی نصوص اور حکمائے اسلام کے حکیمانہ مقالات بھرے ہوئے ہیں۔

عقل کے حقیقی مرتبہ ومقام کی تعیین...... لیکن جہاں تک اس کی کارگزاری کی نوعیت کا تعلق ہے۔اس کے لحاظ سے وہ کسی مستقل حجت کا درجہ نہیں رکھتی۔حتیٰ کہ وہ اپنے ادراک وشعور میں بھی مستقل نہیں ہے جب تک کہ علم اس کی مدد نہ کرے۔بغیر علم کے وہ اپنے ادراک وشعور کا بھی وظیفہ ادا نہیں کرسکتی۔اس لئے نہ وہ مستقل بالا دراک ہے نہ مستقل بالحجیت حتیٰ کہ ایک حد تک حواس خمسہ کے احساسات سے بھی اس کے ادراک وشعور کی نوعیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ حواس خمسہ تو اپنے ادراک میں اشیاء کے موجود ہونے ہی کی محتاج تھے۔جہاں کوئی شئے موجود ہوئی اور اس کے مناسب حال کسی حاسہ کی گرفت میں آ گئی۔تو وہ فوراً ہی محسوس ہو جاتی تھی۔نگاہ کی بن آئی تو اس کی صورت محسوس ہوگئی،کانوں کی بن آئی تو اس کی آوازیں محسوس ہوگئیں اور ناک کی چلی گئی تو اس کی خوشبو،بدبو کا احساس ہوگیا۔

بہر حال حواس کو ادراک کرنے میں صرف اشیاء کے وجود اور موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ معدوم اشیاء میں ان کا احساس کام نہیں کرسکتا۔لیکن عقل کے ادراک کے لئے کسی چیز کا محض موجود ہو جانا کافی نہیں۔جب تک کہ حواس وغیرہ کے ذریعہ اس موجود کا علم بھی ذہن میں نہ آ جائے۔کیونکہ عقل معلومات اور محسوسات ہی میں اپنے تصرفات دکھلاسکتی ہے۔مجہولات میں نہیں حتیٰ کہ اگر وہ کسی مجہول چیز کو بھی حاصل کرنا چاہے تو معلومات ہی سے حاصل کرسکتی ہے نہ کہ مجہولات سے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا کام فکر ونظر ہے۔جو ایک ذہنی کام ہے اور ذہن کے اندر ہی کیا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن کے چھوٹے سے ظرف میں کائنات کے بھاری بھاری اجسام اپنے مادی طول وعرض کے ساتھ نہیں سما سکتے۔بلکہ ان اجسام کی صرف علمی صورتیں ہی ذہن میں آ سکتی ہیں۔جو مادی طول وعرض سے خالی ہوں۔تب

ہی فکری حرکت ان میں کام کرسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن میں ان آئی ہوئی ذہنی صورتوں ہی کا نام علم ہے۔ جو حواس کے ذریعہ آ کر ذہن میں منقش ہو جاتی ہیں۔ اشیاء کی ان صورتوں کو ذہن میں لے آنے ہی کا نام احساس و ادراک ہے۔ عقل ان ہی محسوسات یا معلومات کے علمی نقشوں میں ترتیب نظر وفکر اور تصرفات کر کے ان سے بطور نتائج کچھ جدید معلومات پیدا کر لیتی ہے۔ خواہ اس طرح کہ ان جزوی صورتوں کے استقراء وتتبع سے کوئی کلیہ بنالے اور اس سے جدید جزئیات پیدا کر لے، یا کسی جامع علت کی بناء پر ایک جزئی پر دوسری جزئی کو قیاس کر کے ایک کا حکم دوسری جزئیات تک پہنچادے، اور اس طرح کئی اور جزئیات پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کردیں یا اس جزئی میں سے علمی نکات ولطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کا اضافہ کردے۔ مگر عقل کے یہ سب علمی اور نظری کام ذہن ہی میں ہوتے ہیں جس میں اجسام خود نہیں اتر سکتے۔ بلکہ ان کی علمی صورتیں اترتی ہیں اور انہی میں حرکت فکری اندرون ذہن کام کرتی ہے جس سے نئی معلومات پیدا ہوتی ہیں۔

عقل نہ مستقل بالا دراک ہے اور نہ مستقل بالحجیت ...... جس سے واضح ہے کہ عقل موجودات اجسام میں اس وقت تک کام نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ وہ علمی صورتیں اختیار کر کے ذہن کے خزانے میں نہ پہنچ جائے اور ان صورتوں کا علمی انداز سے ذہن میں پہنچانا حواسِ خمسہ کا کام ہے۔ اس لئے عقل اپنے ادراک وعمل میں حواسِ خمسہ کی محتاج نکلی، بخلاف حواسِ خمسہ کے کہ وہ اپنے ادراک میں عقل کے محتاج نہیں، جانور بھی صورتوں، شکلوں اور آوازوں وغیرہ کا ادراک کر لیتے ہیں حالانکہ ان میں عقل نہیں۔

نیز انسان بھی جب صورتوں، آوازوں وغیرہ کا آنکھ، کان سے ادراک واحساس کرتا ہے تو کسی عقلی استدلال یا ترتیب مقدمات سے نہیں کرتا۔ بلکہ بلاشعور بھی اگر آنکھ کسی صورت پر پڑ جاتی ہے تو وہ بلاسوچے سمجھے اسے فوراً ہی محسوس کر لیتی ہے اسے کسی عقلی دلیل کی اس احساس میں حاجت نہیں پڑتی۔

پس عقل کا علم کتنا بھی بڑا اور شریف ہو۔ مگر موقوف ہے حواس اور ان کے محسوسات پر اور حواس کی علم کتنا بھی عقلی علم سے کم مرتبہ ہو۔ مگر وہ عقل اور عقلی استدلال پر موقوف نہیں اور نہ اس کا محتاج اس لئے عقل ہی اپنے کام میں حواس کا محتاج نکلتی ہے۔ حواس اپنے کام مین عقل کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عقل اپنے کام میں علم کی محتاج ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ عقل مستقل بالا دراک نہیں کہ بلا علم کے خود سے اپنا کام کر جائے۔ بلکہ اس میں دو محتاجگیاں ثابت ہوئیں۔ ایک اشیاء کی خارج میں موجودگی کی کہ معدومات میں عقل بیکار ہے اور ایک ذہن میں ان کے معلوم ہونے کی کہ مجہولات میں بھی وہ بے کار ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ خود تنہا عقل جیسے بالا دراک نہیں۔ ایسے ہی مستقل بالحجیتہ بھی نہیں۔ اس لئے حواس کا علم بہ نسبت عقل کے علم کے زیادہ آزاد اور بے قید ثابت ہوا، اور عقل کا علم بہ نسبت حواس کے علم کے تنگ ثابت ہوا کہ حواس کے بغیر عقل کو اپنے کام کا میدان ہی نہیں ملتا۔

اس لئے اس سابقہ اصول کے تحت کہ جس کے علم وادراک میں قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوں گی۔ اس کے علم

کا دائرہ تنگ ہوگا۔ عقل کا علمی دائرہ کچھ زیادہ وسیع ثابت نہ ہوا۔ اس لئے عام تمدنی امور اور بالخصوص دینیات میں عقل کو امام مطلق ماننے والے کافی کمزور بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ جو قطعاً پائدار نہیں۔

پھر اس عقل کی بدولت فلاسفہ کی جہاں تک رسائی بھی ہوئی۔ تو وہ صرف محسوسات ہی محسوسات ہیں جو حواس خمسہ ہی کے ادراک کا دائرہ ہے اور انتہائی طور پر محدود ہے۔ باقی بڑے بڑے جہان سب آگے رہ جاتے ہیں جہاں عقل کے پر بھی نہیں جم سکتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

عقل خدائی صفت نہیں ہے...... دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ عقل کچھ ہو بہر حال وہ کوئی خدائی صفت نہیں بلکہ انسان کی اندرون ایک طبعی خلقت ہے۔ جو خدائے برتر کی تخلیق سے اس میں ولادت کے وقت پیدا ہوتی ہے اور موت کی وقت موت کے نذر ہو جاتی ہے چنانچہ اس کی مخلوقیت کا دعویٰ شریعت میں صریح موجود ہے۔ ارشادِ نبوی ہے "اَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ." "پہلی چیز جو (انسان کی خلقی قوتوں میں) اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے"۔

جس سے واضح ہے کہ عقل مخلوق اور جب مخلوق ہے تو محدود بھی ہے۔ کیونکہ مخلوق ہونا ہی حد بندی ہے کہ نیز یہ کہ وہ عارضی ہے۔ کیونکہ مخلوق کہتے ہیں اس کو ہی جس کا وجود اپنا نہ ہو، عارضی ہو اور ساتھ ہی یہ کہ وہ ضعیف بھی ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق اپنے خالق کے سامنے ضعیف اور ناتواں ہی ہے۔ اس لئے اس کا علم کس طرح ایسا قوی ہو سکتا ہے جیسا اسے فلاسفہ نے قوی کہا ہے۔ اس لئے اس کے کلیات سے ثابت شدہ بات ظنی ہوتی ہے نہ کہ قطعی جو موجب تعیین ہو اور جب حسیات میں اس کا یہ حال ہے تو اسے دینیات میں کیسے مدار کار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ جس کی بنیاد یقین پر ہے۔

علم انسان کی نہیں بلکہ اللہ کی ذاتی صفت ہے...... ادھر علم کو دیکھا جائے تو وہ انسان کی صفت نہیں اور نہ ہی اس کی ذات میں موجود ہے۔ انسان میں اگر پیدائشی طور پر کچھ ہے تو وہ علم کی استعداد ہے علم نہیں۔ اسی لئے جب وہ دنیا میں آتا ہے، تو علم سے کورا آتا ہے۔ جیسا قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ "اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کسی چیز کا بھی علم نہیں رکھتے تھے"۔

اور جب دنیا سے جاتا ہے تو علم سے پھر کورا ہو کر ہی چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ "پھر (بوقتِ موت انسان) لوٹا دیا جاتا ہے ارذلِ عمر کی طرف کہ جاننے کے بعد انجام یہ ہو جاتا ہے (کہ کسی شئے کا بھی اسے علم نہیں رہتا)"۔

پس علم کا انسان کے اول و آخر نہ ہونا اور درمیان میں آمد و شد کے درمیان ہونا کہ آیا چلا گیا۔ اس کی واضح دلیل ہے کہ علم انسان کی کوئی ذاتی صفت نہیں۔ جس طرح کہ عقل ذاتی خلقت تھی بلکہ علم خدا کی ذاتی صفت ہے۔ جس کا پر تو عارضی اور وقتی طور پر انسان پر پڑ جاتا ہے اور وہ عالم کہلانے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے حق تعالیٰ ہی کو ذاتی طور پر عالم کہا ہے۔ جس کا علم ازلی، ابدی اور لم یزل و لایزال ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے: ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ "اور

وہ علیم خبیر ہے''۔اور فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ ''اور وہی ہے سینوں (کی چھپی ہوئی کو) جاننے والا''۔اور فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ﴾ ''اور وہی جانتا ہے (ان کے) سامنے اور پیچھے کی باتیں اور لوگ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے''۔اور فرمایا: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ ''اور کیا وہ نہ جانے گا اسے جسے اس نے پیدا کیا۔ جب کہ لطیف وخبیر وہی ہے، وغیرہ وغیرہ''۔

مخلوق (عقلِ انسانی) غیر مخلوق (علم الٰہی) پر حاکم نہیں ہو سکتی......پس عقل کا مخلوق ہو کر انسان کی صفت ہونا اور علم کا غیر مخلوق ہو کر خدا کی صفت ہونا۔اس کے سوا اور کسی چیز کا مقتضی ہے کہ انسان میں علم خدا ہی کی طرف سے آ سکتا ہے خود سے نہیں ہو سکتا۔اس کا قدرتی ثمرہ یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ جب خالق کی طرف سے کوئی علم آ جائے تو پھر عقل کے لئے چوں وچرا کی گنجائش نہ ہو۔ چہ جائیکہ اسے علمِ الٰہی کے سامنے ایک متوازی حاکم کی حیثیت سے لا کر کھڑا کر دیا جائے یا علم پر عقل کو حکمران تسلیم کر لیا جائے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خالق پر مخلوق حاکم ہو جائے یا غنی پر محتاج حکم چلائے اور طاقتور پر ضعیف وناتواں کا اقتدار قائم ہو جائے جو بداہتہ خلاف عقل ہی نہیں حماقت وجہالت بھی ہے جسے کم سے کم یہ عارف امت تو نہیں برداشت کر سکتی۔ جو علم الٰہی پر ایمان لائی ہوئی ہے کوئی جاہل یا بے قید امت مانے تو مانے۔ بنابریں عقل کا کام اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ علم الٰہی اور کلام ربانی آ جانے کے بعد اسے سمجھ لے مان لے اور مان کر اسے اس کے دائرہ میں محدود رکھ کر اس میں غور وتدبر کر لے اور استنباط واجتہاد کے ذریعہ اس کے چھپے ہوئے علمی خزانوں کو واشگاف کر دے اور ساتھ مخلوق کو خالق حکمران بنانے والوں کا انجام بد دیکھ کر عبرت وموعظت حاصل کرے۔

عقل کا سرچشمہ قلب ہی ہے......اور جب یہ عقل بنصِ قرآنی قلب ہی کا ایک آلہ ادراک ہے۔ جیسے حواس خمسہ بھی اس کے آلات ادراک تھے۔تو ظاہر ہے کہ حقائق میں یہ عقلی تدبر اور اجتہاد واستنباط بھی قلب سلیم ہی کا کام نکلتا ہے۔ جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ عقل کا سرچشمہ بھی آخر کار قلب ہی ہے۔ جیسا کہ حس کا سرچشمہ بھی قلب ہی تھا پس جیسے حسیاتی علوم قلب کے تھے۔ ایسے ہی عقلیاتی علوم بھی قلب ہی کے علوم ثابت ہوئے۔ گو کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حس اور عقل کی قوتیں دماغ میں ہیں، قلب میں نہیں جیسا کہ ظاہری طور پر ایسا ہی محسوس بھی ہوتا ہے بلکہ انسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ یہی یقین رکھتا ہے کہ عقلی اور حواسی قوتوں کا مرکز دماغ ہے۔ لیکن یہ ان قرآنی دعووں کے منافی نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ حسی اور عقلی قوتیں دماغ میں ہوں اور دماغ کی باگ ڈور دل کے ہاتھوں میں ہو۔ جو قلب کے اشاروں پر چلتا ہو۔ اس لئے ان قویٰ کو دماغی مان کر بھی انہیں قلب کی حکومت کے نیچے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ عقلی قوتیں بھی جب ہی کچھ سوچ سکتی ہیں۔ جب دل ٹھکانے ہو اگر قلب میں تشویش اور اضطراب وبے چینی ہو یا وہ کسی دوسرے مشغلہ میں منہمک ہو تو عقل سوچنے پر بھی قادر نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ کچھ

نتائج برآمد کر سکے۔اس سے واضح ہے کہ دماغ اوراس کی عقل دل کے تابع ہے دل جمعی کے ساتھ دل کا اشارہ ہوتا ہے تو عقل اور دماغ بتعمیل قلب سوچ بچار میں لگ جاتے ہیں۔ ورنہ معطل رہ جاتے ہیں۔

حقائق اشیاء تک عقل کی بھی رسائی نہیں ہے...... اس بحث سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عقلی علوم بھی کلیتہً باطن شئے اور حقیقت اشیاء تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ عقل کا ادراک حواس اور محسوسات کے تابع ہے اور محسوسات اپنی ذات سے ظاہری چیزیں ہیں۔ جن کا یہ ظاہر ہی حواس سے علم میں آتا ہے۔ حقیقت نہیں کھلتی تو عقل بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے گی۔ گو اس کے علوم کلیاتی ہونے کی وجہ سے ایک حد تک باطنی ہوں۔ مگر اپنے منشاء کے لحاظ سے وہ بھی ظاہری ہی کہلائیں گے جنہیں حقیقتہ الامر سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسی لئے فلاسفہ روزگار عقل کو امام مطلق ماننے کے باوجود آج تک کسی ایک چیز کی بھی حقیقت نہیں بتلا سکے۔ بقول لسان العصر اکبر مرحوم کے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

پس قلب کے یہ تمام علوم جو حواسِ خمسہ یا عقل کے واسطے سے اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کے آئینہ دار نہیں ہیں۔ اس لئے ان عقلی علوم کو بھی تمام علم اور کامل علم نہیں کہا جائے گا جس کی حقیقت تمیزٌ بین الاشیاء ہیں۔

پس قلب ان آلات حس وعقل سے جو کچھ بھی دیکھتا سنتا ہے۔ وہ اسی ظاہری عالم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے اس جہان سے متعلق اس کی یہ معلومات بھی ظاہری ہی کہلائیں گی۔ خواہ وہ حسی ہوں یا عقلی جن کا حقائق اصلیہ سے تعلق نہ ہوگا۔ پس قلب کا یہ بالواسطہ علم خواہ حسی یا عقلی، علم ظاہر کے سوا کچھ نہیں۔ محسوسات کا ظاہری ہونا تو کھلا مشاہدہ ہے اور معقولات کا ظاہر ہونا اس سے نمایاں ہے کہ عقل کی دوڑ دھوپ کا دائرہ یہی حسیات ہیں۔ اس لئے اس کے معقولات کو بھی ظواہر ہی کا علم کہا جائے گا نہ کہ علم باطن، اس لئے وہ تمام علم یا مطلقاً علم نافع نہ ہوگا کہ اسے دارین کے بنیادی نتائج وآثار کی اساس وبنیاد قرار دیا جائے کہ اس سے ساری غیبی حقیقتیں کھل جائیں اس لئے جیسے اعضاء حواس کو حقیقی معنی میں عالم مدرک نہیں کہا جائے گا۔ ایسے ہی اعضاء دماغ اور اس میں بھری ہوئی عقل محض کو بھی حقیقی مدرک نہیں مانا جائے گا جبکہ وہ بغیر اس ظاہری علم کی مدد کے اپنا کام ہی نہیں کر سکتی۔

[12] **حقیقی علم وادراک صرف قلب کی خصوصیت ہے**...... اس لئے اب آخری علم وہ رہ جاتا ہے جو براہ راست اور بلاواسطہ قلب ہی سے متعلق ہو۔ جس میں کسی بھی کھلے یا چھپے عضو کا واسطہ نہ ہو۔ بلکہ قلب ہی اپنے اندرونی قوت سے اس کا ادراک کرتا ہو اور ایک ایسے چھپے ہوئے جہان کی چیزوں کا ادراک کرتا ہو کہ وہ حواس اور عقل کی گرفت سے باہر ہو تو قدرۃً وہاں حس وعقل کام ہی نہیں دے سکتیں۔

سو اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واضح ہوگا۔ قلب کا واسطہ اسباب علم، ان تمام ادراکات حواس وعقل سے بدرجہا بالاتر اور گہرا علم ہے جس کی کرشمہ سازیاں اور شعور وادراک کی رعنائیاں محیّر العقول ہیں۔ نہ اس کے علم وادراک میں وہ قیدیں اور شرطیں ہیں۔ جو ان اعضاء حواس اور اعضاء دماغ کے علوم میں تھیں اور نہ ہی وہ اپنے

افادہ و استفادہ میں وہ محتاجگی اور پابستگی لئے ہوئے ہے۔ سو اسی مذکورہ اصول کو سامنے رکھ کر کہ جس عضو کے علم و ادراک میں ظواہر کی قیود و شروط زیادہ نہ ہوں گی۔ اسی حد تک اس کا علم وسیع، ہمہ گیر اور کمال تمیز کا حامل ہوگا۔

اگر ہم غور کریں تو واضح ہوگا کہ قلب کا علم ان تمام رسمی قیود سے آزاد ہے۔ جو بدن کے دوسرے اعضاء پر عائد تھی۔ قلب کے علم میں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی، نہ جسم کی شرط ہے نہ روح کی، نہ حسیات کی پابندی ہے نہ معنویات کی، نہ قرب کی حد بندی ہے نہ بعد کی، نہ تقابل کی ہے نہ جہات اور سمتوں کی، نہ اتصال کی ہے نہ انفصال کی۔ بلکہ اس کے علم کے سوتے شش جہات میں بہتے ہیں اور وہ اگر کسی چیز کے ادراک کرنے پر آ جائے تو اس کی صورت سے لے کر مادہ تک اور مادہ سے لے کر حقیقت تک اور حقیقت سے لے کر اس کی وجودی نسبت تک ہر ہر چیز کی حقیقت کھول کر دیتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی کائنات میں حقیقی مدرک اور اصلی عالم قلب ہی ہے۔

وہ محسوسات کا ادراک تو بواسطہ حواس کرتا ہے اور معقولات کا ادراک بواسطہ عقل اور وجدانیات کا ادراک بتوسّطِ وحی خداوندی۔ البتہ محسوس و معقول میں حس اور عقل کے واسطہ بن جانے کے سبب یہ محسوسات اور معقولات حواس اور عقل کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ وہ قلب ہی کے ادراکات ہیں اور وہی صحیح معنی میں قوت حاسہ اور قوت عاقلہ ہے۔

بہر حال یہ سب دلائل اسی کے ہیں۔ جیسے محسوسات کا علم حقیقتاً حواس کا علم نہ تھا، بلکہ دل کا تھا۔ اسی طرح معقولات کا علم بھی دماغ یا عقل کا نہیں، بلکہ دل ہی کا ہے۔ وہ ان کے واسطوں سے اس سطحی اور ظاہری جہان کو دیکھتا ہے۔ اس میں جزئی اور اصولی طور پر غور کرتا ہے اور اقلیم بدن کی تدبیر کرتا ہے۔ جس سے یہ جسمانی زندگی استوار ہو جاتی ہے اور اس کے تمام وسائل بواسطہ حواس و عقل دور بین مہیا کر کے تمدن کی بنیادیں ہموار کر لیتے ہیں، تاکہ نفس انسانی دینوی زندگی براحت بسر کر سکے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کا منتہا خوبصورت سامان ہیں خوش سیرت انسان نہیں...... لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان ظاہری علوم سے خواہ وہ حواسِ خمسہ کے ہوں یا عقل کے ظاہر آرائی ہی قوت مل سکتی ہے۔ صورت صورت ہی کو جنم دے سکتی ہے نہ کہ حقیقت کو۔ مادہ مادیات ہی کو نمایاں کر سکتا ہے نہ کہ روحانیات کو اور معقول معقول ہی کو سامنے لا سکتا ہے نہ کہ وجدان اور ضمیر کو۔ اس لئے تجربات و مشاہدات اور اصول کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ حواس خمسہ کی صورت آرائیوں کا یہ علم جو سائنس کے مرکب پر سوار ہو کر آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دماغی عقلیات کا یہ علم جو فلسفہ کے کاندھوں پر چڑھ کر آتا ہے۔ بلا شبہ اچھے اچھے خوب صورت سامان تو پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اچھے اور خوش سیرت انسان نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ حسیاتی علم وضع ہی کیا گیا ہے، صورت آرائی کے لئے نہ کہ حقیقت نمائی کے لئے، اس سے حقیقت نمائی یا سیرت سازی کی توقع باندھنا خلاف موضوع ہے۔ نیز ایسے ہی یہ عقلیاتی علم بنایا گیا ہے تمدنی نظریات قائم کرنے کے لئے نہ کہ حقائق غیبیہ اور یقینیات کو ضمیر میں جمانے کے لئے پس اس سے عیبی اور بنیادی

حقیقتیں کھول دینے کی توقع باندھنا ایسا ہی ہے۔ جیسے چیونٹی سے پہاڑ اٹھا لینے کی امید رکھنا۔

ان ظاہری علوم سے جب ہروقت اجسام اوران کی نت نئی صورتیں اوران ہی کے عوارض رنگ و بواور جسمانی لذات سامنے آتی رہیں گی۔ تو دل میں رنگینیوں ہی کے جذبات بھی قائم ہوں گے۔ صورتوں کی رنگینی، گوش نواز نغموں کی افراط، رنگ روپ کے چمکدار نمائشی سامان اور اسباب تعیش و آسائش ہی کے جذبات دلوں میں سما سکیں گے، نہ کہ سادگی و بے تکلفی اور قناعت و کفایت کے اخلاق و دواعی ابھریں گے۔

ادھر بھی حواس خمسہ کی ظاہر نمائی کا یہ علم جب دماغ کی ناتربیت یافتہ عقل کی سان پر چڑھتا ہے اور عقل انہی حسیاتی چیزوں کو استدلالی رنگ دینے پر اتر آتی ہے، تو طرح طرح کے طبعیاتی فلسفے نظریاتی ازم اور نمائشی فارمولے کیون اَزم، کیپٹل اَزم، سوشل اَزم وغیرہ وغیرہ دنیا کے دماغوں پر چھاتے ہیں۔ جس سے نمائشی تمدن نظری طور پر ایک معقول انداز کا فلسفہ نظر آنے لگتا ہے۔ خواہ اس کی حقیقت میں معقولیت کا نشان تک نہ ہو۔ جس سے اس مادی قسم کی معاشرت کو علمی رنگ کی تقویت بھی مل جاتی ہے۔ کیونکہ ان مادیاتی سامانوں کو اگر ایک غیر فلسفی محض اپنی صنعتی مہارت سے بناتا رہے۔ تو وہ زیادہ سے زیادہ صناع اور سامان سازی کا ایک کاریگر کہلا سکے گا۔

لیکن انہی چیزوں کو جب فلسفیانہ نظریات کی آب دے کر کوئی بنانے والا بنائے گا۔ تو اسے ڈاکٹر کا لقب ملے گا اور اب وہ مزدوروں یا صنعت کاروں کی لائن سے اوپر ہو کر فلسفیوں کی موقر لائن میں آ جائے گا۔ جس کی بدولت بظاہر دلائل کی قوت سے ایک ایسی ظاہر داری کا روکھا تمدن اور نمائشی معاشرہ دنیا میں ابھرے گا۔ جس میں تصنع، بناوٹ، نمائش اور گندم نمائی، جوفروشی کے جذبات کام کریں گے۔ جس سے مرنا، جینا اور رہنا، سہنا حتی کہ سامان خورد و نوش اور ضروریات لباس و پوشاک تک سب بناوٹی بن جائے گا اور ان ظاہری علوم سے ساری زندگی ہی ظاہرداری کی ہو کر رہ جائے گی۔ جس میں حقیقی اخلاق، فاضلانہ ملکات، صدق و اخلاص، انسانی اخوت، باہمی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے جذبات و عزائم ابھر ہی نہ سکیں گے، جس سے تمدن میں خلوص اور محبانہ تعاون و تناصر پیدا ہو جو تمدن کی حقیقت ہے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کے طبعی نتائج بد...... اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ان حسیاتی اور عقلیاتی فنون کی بنائی ہوئی صورتیں حقیقتوں اور معنوی قدروں سے خالی ہوں گی۔ جن کے لئے یہ فنون وضع ہی نہیں کئے گئے۔ تو وہ بے جان لاشوں کی مانند ہوں گی اور سب جانتے ہیں کہ بے جان لاشہ کا انجام گلنے، سڑنے، پھولنے، پھٹنے اور عفونت پھیلانے کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جس سے دنیا کا دماغ پراگندہ ہو کر ہزاروں ظاہری اور باطنی مہلک بیماریوں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جس میں سب کچھ ہوگا۔ مگر سکون واطمینان ہی نہ ہوگا۔

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج کی دنیا کے خوش منظر اور نظر فریب سامانوں اور ان کی نئے نئے ڈیزائنوں سے اسباب راحت کی بہتات ہے۔ لیکن راحت مفقود ہے۔ اسباب عیش کی کمی نہیں۔ لیکن عیش عنقا ہے، امن و سکون

کے نام پر ہزاروں خوشنما سامان نئے نئے اسباب معیشت، نئے نئے ڈیزائنوں اور نئے نئے روپوں میں مہیا ہیں۔ لیکن امن وسکون ہی ندارد ہے۔ بلکہ عیش کی جگہ تنگ حالی، امن کی جگہ مار دھاڑ، اور چین واطمینان کی جگہ ہمہ وقتی تشویش اور بے چینیوں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ قلبی راحت وطمانیت اور ضمیر ووجدان کے سکون کا تعلق اخلاقی بلندیوں اور سچے کردار سے ہے۔ نہ کہ صورتوں کی چمک دمک اور سامانوں کی کثرت سے۔

اسی لئے آج کا انسان صورتاً تو یقیناً انسان ہے اور بہت چمکیلا انسان لیکن سیرت وکردار کے لحاظ سے سانپ، بچھو اور گیدڑ، بھیڑیئے سے کم نہیں بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ''سَیَخْرُجُ اَقْوَامٌ حَدَثَآءَ الْاَسْنَانِ سُفَهَآءَ الْاَحْلَامِ يَقُوْلُوْنَ بِقَوْلِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ يَقْرَؤُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَايُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ الذِّئَابُ...... '' ''عنقریب کچھ قومیں ابھریں گی نوخیز، بدعقل، باتیں بڑی اصول رنگ کی بگھاریں گے، قرآن کا نام بھی زبانوں پر ہوگا۔ لیکن وہ ہنسلیوں سے نیچے اترا ہوا نہ ہوگا۔ ان کی زبانیں تو عربوں جیسی فصیح وشائستہ ہوں گی۔ لیکن دل ان کے بھیڑیوں کے سے ہوں گے''۔

اور جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد میں اعلیٰ لباسوں میں سجے ہوئے انسانوں کی بابت بڑی حسرت سے فرمایا تھا کہ ''كَانَ النَّاسُ وَرَقًا لَاشَوْكَ فِيْهِ فَصَارُوْا شَوْكًا لَاوَرَقَ فِيْهِ.'' ''لوگ ہرے بھرے پتے تھے جن میں کانٹے کا نشان نہ تھا۔ لیکن ہوگئے ایسے کانٹے، جن میں پتے کا نشان نہیں''۔

چنانچہ آج نہ اس صورت پسند انسان سے انسان کو چین ملتا ہے، نہ غیر انسان کو، انسان ہی نہیں کائنات کی کسی بھی چیز کو امن میسر نہیں۔ عباد اور بلاد دونوں تباہ حال ہیں، ملک ملکوں کے لئے، شہر شہروں کے لئے، دریا دریاؤں کے لئے اور فضاء وخلاء ساری فضاؤں کے لئے آفات ومصائب کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی تصویر قرآن حکیم نے اس طرح کھینچ دی ہے کہ: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے تاکہ وہ باز آجاویں''۔ اس سارے مہل کہ کی بنیاد ان حسیاتی اور مادیاتی علم کی بنائی ہوئی تمدنی صورتوں کا اخلاقی قدروں سے خالی ہونا اور ان کے صناعوں اور اس نمائش کے علمبرداروں کا مصدر اخلاق ومصدر کمالات حضرت حق جل مجدہ کے تعلق اور اس کی یاد سے یکسر غافل ہوجانا ہے۔

جو اخلاقی قدروں کی جڑ بنیاد ہے قرآن حکیم نے انہی دعویداران علم اور ان کی فلسفیانہ مبلغ علم کی قلعی ان الفاظ میں کھول دی ہے ﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا٥ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى﴾ ''سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا۔ پس یہیں تک پہنچی ان کی سمجھ۔ تحقیق تیرا رب ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے اور وہ خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا''۔

نیز اس لئے قرآن حکیم نے اس صورت سازی اور صورت بازی کے علم کو ظاہری علم فرما کر اشارہ فرمادیا ہے۔ کہ اس ظاہری علم میں کوئی باطنی حقیقت نہیں۔ جو اس علم کو جاندار بناتی، اس لئے یہ رسمی اور نمائشی علم خواہ سائنس کا ہو یا ریاضی کا، مساحت کا ہو یا فلسفہ کا، جب بھی اخلاقی قدروں سے خالی ہوگا۔ تو وہ انجام میں غفلتوں ہی کا نتیجہ پیدا کرسکتا ہے۔ ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ''جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے''۔

قلبی ادراک کے دو علمی رخ...... پس اس اصول پر کہ صورت بغیر حقیقت کے لاشہ اور گندگی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس قلب انسانی کو جہاں یہ علمی رخ عطا فرمایا کہ وہ اس ظاہری علم سے جو حواس وعقل کے راستہ سے اس میں نمایاں ہوتا ہے اور اس سے مادی زندگی کی دل فریب نقشے اور رنگین تمدن کی رنگین صورتیں اور ڈیزائین بنتے ہیں۔ جس میں آنکھ کے لئے دیدہ زیب مناظر، کانوں کے لئے سمع نواز آوازیں، ناک کے لئے پاکیزہ خوشبوئیں، زبان کے لئے خوش ذائقہ غذائیں، ہاتھ پاؤں کے لئے نرم وگداز بدن، چھونے اور پکڑنے کے لئے خوش گوار چیزیں، تن خاکی کے لئے راحت دہ بلڈنگیں ہوں۔ تاکہ نفسِ انسانی کے لئے ان معلومات اور ان محسوسات سے تسکین نفس اور لذت بدن کا سامان میسر آجائے۔ وہیں اس انسانی قلب کو حق تعالیٰ نے ایک دوسرا علمی، رخ بھی بخشتا ہے۔ جس کی بدولت قلب کے لئے بلاواسطہ حواس وعقل دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور سمجھنے کے کچھ معنوی سامان مہیا ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس مجموعہ عجائبات (قلب انسانی) میں ایک دریچہ اگر اس کی سمت اسفل میں کھولا تھا۔ جس سے وہ بتوسّط حواس وعقل اسی حسّی اور نمائشی جہاں کو دیکھتا تھا تاکہ اس کائنات بدن کے لیے اپنے اسی ظاہری علم سے بدنی اور جسمانی سامان فراہم کرے۔ تو دوسرا دریچہ اس کی سمت بالا میں کھولا ہے۔ جس سے وہ اس غیبی جہان کو دیکھتا ہے۔ جہان معارف الٰہیہ، اخلاق ربانی، لذات روحانی اور مقامات باطن مثل محبت والفت، انس وموانست، ہمدردی وخداترسی، اطاعت الٰہی اور بندگی حق کے ذخیرے جمع ہیں۔ تاکہ قلب اپنے اس باطن علم سے بلاتوسط حواس وعقل بالہام ربانی اپنی اخلاقی قدریں درست کرے۔ جس سے دنیا میں امن سکون کی فضا ہموار ہو اور یہ کائنات اطمینان وچین کی زندگی بسر کرسکے۔

قلبؓ کی مادی اور روحانی ادراکات میں مشابہت...... پس یہاں اگر علم ظاہر کا واسطہ حواس، اور عقل ہیں۔ جن کے راستہ سے یہ حسی علم قلب میں آتا ہے اور اس سے وہ کائنات بدنی کی تدبیر کرتا ہے تو وہاں اس علم باطنی کا واسطہ وحی والہام ربانی ہے۔ جس کے ذریعہ یہ الہیاتی علوم قلب کے وجدان پر مترشح ہوتے ہیں۔ جن سے یہ قلب اپنی کائنات روحانی کی تدبیر کرتا ہے۔ یہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا چہرے کی آنکھ، کان، ناک سے ہوتا ہے اور وہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا دل کی اندورنی آنکھ، ناک وکان سے ہوتا ہے۔ یہاں سونگھنے سے چکھنے سے تن وجان کو قوت ملتی ہے اور وہاں کے مشاہدہ وسماع سے روح ورواں اور معرفت وایمان کو قوت میسر آتی ہے

یہاں صورتوں کی نمائش ہوتی ہے اور وہاں سیرتوں کی آرائش۔

اگر بدنی زبان کھانے کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی مادی غذا ہے تو یہاں دل وجان کی زبان معرفت وایمان کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی معنوی غذا ہے۔ ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: ''ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا'' ''ایمان کا مزہ چکھ لیا اور اس شخص نے جو اللہ سے راضی ہو گیا بلحاظ اس کے رب ہونے کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو گیا بحیثیت رسول ہونے کے اور اسلام سے راضی ہو گیا بلحاظ دین ہونے کے''۔

اگر یہ مادی زبان حلوہ سے مٹھاس کا مزہ چکھ لیتی ہے تو دل کا وجدان ایمان وعرفان کی مٹھاس محسوس کرتا ہے ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّجِدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوْفَ تَذَلُّلًا لِّرَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ.'' ''جس کو ایمانی مٹھاس سے لطف اندوزی کا شوق ہو اسے چاہئے کہ اپنے رب کے سامنے اپنی ذلت کے اظہار کے لئے موٹا معمولی لباس پہنے''۔ اگر جسمانی معدہ لذیذ غذاؤں سے سیر ہوتا ہے تو روحانی بطن غیبی لطیف غذاؤں سے سیر ہوتا ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا افطار پے درپے روزے رکھنے پر فرمایا: ''اَيُّكُمْ مِثْلِيْ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ.'' ''تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلا بھی دیتا ہے اور پلا بھی دیتا ہے''۔ اگر پیشانی کی آنکھ خوشنما چہرے، اور اقلیموں کے جمیل مناظر دیکھتی ہے تو دل کی آنکھ رجال غیب (ملائکہ علیہم السلام) کے روشن چہرے اور عجائبات سماوی دیکھتی ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف شمس کے موقعہ پر جنت ودوزخ کو عیاناً دیکھا اور جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں ملاحظہ فرمایا اور شب معراج ایک انتہائی رفیع منزلہ پر پہنچ کر اپنے پروردگار کے جمال کا بھی مشاہدہ فرمایا۔ اگر یہ سر کے کان اس جہان کے حسی نغموں اور آوازوں کو سنتے ہیں۔ تو دل کے باطنی کان اسی جہان غیب کی آوازیں اور روح نواز نغمے سنتے ہیں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائکہ آکر باتیں کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے یا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کا دور کر کے سنتے سناتے تھے اور بعض اوقات آسمان کے دروازہ کھلنے کا تراقہ بھی سنتے۔

اگر منہ کی ناک ہواؤں کے طفیل پاکیزہ خوشبوئیں سونگھتی ہے تو دل کی اندرونی ناک اس عالم کے روح و ریحان کی خوشبوؤں کا ادراک کرتی ہے۔ جیسے حدیث نبوی میں جھوٹ کی بدبو اور سچ کی خوشبو کا ذکر کر کے فرمایا گیا کہ جھوٹ کی بدبو سے ملائکہ کاتبین عمل دور تک بھاگے ہوئے چلے جاتے ہیں اور جیسے مرنے کے بعد مومن کی روح میں سے مشک کی خوشبو کا مہکنا اور ملائکہ کا اسے سونگھنا بتلایا گیا اور جیسا کہ جان نکالنے کے وقت ملائکہ موت کا مرنے والے کے ہاتھ پاؤں کو سونگھنا کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا وہاں بھی ہے اور یہاں بھی، وہاں حواس سے ہے اور یہاں وجدان

سے، وہاں مادیت سے ہے اور یہاں روحانیت سے، وہاں قلب کے نچلے دریچہ سے اس جہان رنگ وبو کی صورتیں محسوس ہوتی ہیں اور یہاں قلب کے اوپر کے جھروکہ سے اس جہان کی اخلاقی اور روحانی قدریں مشاہدہ ہوتی ہیں، وہاں احساس ہے اور یہاں الہام، وہاں قوائے حساسہ اور عاقلہ ہیں اور یہاں قوائے وجدانیہ، وہ حسیات وعقلیات ہیں اور یہ معنویات، وہاں سائنس اور فلسفہ کی کارگزاری ہے اور یہاں حکمت الٰہی اور وحی ربانی کی۔

حس اور علم کا فرق...... اس سے یہ بھی کھل جاتا ہے کہ فلسفہ وسائنس یا حواس سے جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے اسے حس کہا جائے گا، علم نہیں کہا جائے گا اور یہاں غیبیات کی خبروں سے جو کچھ کھلے گا، اسے علم کہا جائے گا، حس نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ علم کہتے ہی ہیں کسی مخفی اور نگاہوں سے اوجھل چیز کے جان لینے کو، خواہ وہ غیبی اشخاص ہوں یا معنوی امور، علمی جزئیات ہوں یا اصول کلیہ کہ وہ حس سے محسوس نہیں ہوتے۔ اس لئے علم جب بھی ہوگا، مغیبات ہی کا ہوگا نہ کہ حسیات کا اور حس جب بھی ہوگی مشاہدات کی ہوگی خواہ وہ مشاہدہ صورت کا ہو یا مشاہدہ آواز واصوات ہو یا مشاہدہ خوشبو وغیرہ۔ گو توسعاً کبھی حس کو علم یا علم کے احساس سے تعبیر کر دیا جائے۔ بہر حال علم وہی ہے جو حواس سے غائب اور مخفی امور کا ہو اور آلات حس سے اس کا ادراک نہ ہوتا ہو۔ یہ علم جو حقیقی علم ہے اپنی پوری اصلیت اور قطعیت کے ساتھ انبیاء معصومین علیہم السلام پر اترتا ہے اور بطور ظل وفرع کے ان کے اتباع وخدام، اولیاء کرام اور علماء آخرت پر وارد ہوتا ہے

حسیاتی علوم کا سرچشمہ مادہ ہے اور الہامی علوم کا منبع ذات وصفات خداوندی ہے...... بہر حال ظاہری علوم یعنی احساسات اگر مادے کی ذات وصفات سے تعلق رکھتے ہیں کہ مادہ بھی ظواہر میں سے ہے اور یہ علم بھی ظواہر کا ہے۔ تو یہ الہامی علم خدا کی ذات وصفات اور افعال سے متعلق۔ ہے کہ وہی غیب مطلق اور غیب حقیقی ہے اور یہ علم بھی غیب ہی کا ہے۔ پس اگر علم کا شرف معلوم کرے تو جیسے خدا کی ذات وصفات، شرف وعظمت میں سب سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ ایسے ہی اس کا علم بھی اور تمام علوم سے اعلیٰ فائق تر اور اشرف تر ہوگا اور جس طرح مادہ کے علم سے مادہ ہی کی ذات وصفات اور اس کے تقاضے کھلتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذات وصفات کے علم سے اسی کے اوصاف وکمالات اور انکے تقاضے منکشف ہوں گے۔ اس غیبی علم کے سلسلہ میں چونکہ ذات بابرکات حق کا تعارف حاصل ہوتا ہے جو سارے کمالات وبرکات کا سرچشمہ اور تمام خیرات وحسنات کا منبع ہے اور آدمی مرتے دم تک ذوق وشوق اور محبت الٰہی سے اسی کی طرف دوڑتا اور بڑھتا رہتا ہے اور اسی کی ذات وصفات میں سراپا شوق بن کر گھستا رہتا ہے۔ تو طبعی طور پر اسی کی صفات وکمالات کا اسے انکشاف اور علم یقین بھی حاصل ہوتا رہتا ہے کہ وہ واحد مطلق، علیم وخبیر، حکیم وکریم، رؤف ورحیم، محسن ومنعم، رزاق وفتاح، ہادی برحق اور معلم مطلق ہے۔ تو اس سے قدرتی طور پر انسان میں خدائی اخلاق کے پرتو نمایاں ہوتے ہیں۔ یعنی رحمدلی، سخاوکرم، حیاء وعفت، غیرت وحمیت، جود وعطا، عدل وانصاف، ناداروں کی خبر گیری، مفلسوں کی حاجت برآری، مظلوموں کی دادرسی یتیموں اور بیواؤں کی خدمت گزاری، غریب

الوطنوں کی پشت پناہی، کمزوروں کو قوت رسانی اور عام مخلوق خدا کی خیر خواہی کے ہی اخلاق وجذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے عالم میں چین، ملکوں میں اطمینان، شہروں میں سکون، گھروں میں عافیت، دلوں میں بشاشت اور معاملات میں فرحت ومسرت کے آثار پھیل جاتے ہیں۔ جس سے یہ ظلمت کدہ دنیا جنت نظیر بن جاتا ہے۔ زندگیاں بڑھ جاتی ہے اور آدمی فرشتہ بن کر پردہ دنیا پر نمودار ہوتا ہے۔ جس پر ہمہ وقت رحمت کی بارشیں برستی ہیں اور وہ لوگ بھی اس سے محروم نہیں رہتے، جو اپنی تنگ نظری سے ان بھلوں کو بھی برا بناتے رہتے ہیں۔

ادیم زمیں سفرہ عام اوست ۔۔۔ بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

مادی اور الہامی علوم کے جُدا جُدا آثار وثمرات..... پھر نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کو بھی سکھ میسر آتا ہے۔ جس سے وہ اس قسم کے ربانیوں اور حقانیوں کی محبت وعقیدت میں سرشار ہو کر ان کے دعا گو بن جاتے ہیں۔ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں، مچھلیاں اپنے دریاؤں میں اور پرند اپنی فضاؤں میں ایسے انسانوں کی عمر درازی اور اقبال مندی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ملائکہ جیسی مقدس مخلوق ان کے قدموں کے نیچے پر بچھانے لگتی ہے۔

جس کی بنیاد یہ ہے کہ اس علم حقیقی کا پہلا اثر آدمی کے اخلاق میں نمایاں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ مادہ پرستوں مین مادہ کی ذات وصفات کو رات دن کریدتے رہنے اور اس میں ہمہ وقت گھسے رہنے سے مادیت اور مادی جذبات واخلاق ہی چھاتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے اس امارۃ بالسوء نفس کو قوت ملتی ہے اور وہ اس مادی قوت کے غرور اور وقتی وسائل زندگی کی کثرت کے گھمنڈ میں انجام سے بے خبر ہو کر نفس پروری، خود غرضی، بے حمیتی، طمع نفس، توقیر نفس، تحقیر غیر، نفاق انگیزی، ظلم پروری، قساوتِ قلبی، بے حیائی، دنیا طلبی، تلبیس آمیز آئینی انداز کی چوری، قانونی رنگ کی ڈکیتی اور اپنی حقیر حقیر قسم کی اغراض وخواہشات کی تکمیل کے لئے ہزاروں انسانوں کے جان ومال سے کھیلنے ہی میں لطف محسوس کرتا ہے۔ جس سے دنیا میں بے چینی، بے اطمینانی، باہمی بے اعتمادی، مایوسی، توہم پرستی اور تعصب پسندی کی فضاء بن جاتی ہے۔ جس سے نہ عباد کو چین ملتی ہے، نہ بلاد کو۔ ایسے ہی خدا کی ذات وصفات اور کمالات کی معرفت اور اس میں رات دن گھسنے اور دوڑنے سے اسی کے کمالات کے آثار نفس میں پیوست ہوتے ہیں۔ جس سے وہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اور اس میں خدائی اخلاق رحمت ومحبت، ایثار وغنا، خدمت خلق اللہ، دستگیری ضعفاء اور محبت آخرت وغیرہ کے اخلاق واعمال رونما ہوتے ہیں۔

پھر اسی غیبی علم کے سلسلہ میں ذات وصفات کے علم کے بعد اس کا اہم ترین حصہ اللہ رب العزت کے قانون کے علم کا ہے۔ جس سے اس کی مرضی ونامرضی کا پتہ چلتا ہے اور ان مذکورا خلاق وملکات کو عمل میں لانے کے لئے عمل کے طریقے سامنے آتے ہیں۔ حلال وحرام، جائز ناجائز، روا وناروا کی تمیز پیدا ہوتی ہے اس کے اوامر ونواہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اور اس کے مخلوق کے حقوق ادا کرنے کے ڈھنگ نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے وہ پختہ اور تیر بہدف کے نمونے اور پیغمبری اسوے نمودار ہوتے ہیں، جن سے انسان کی سعادت دنیا اور نجات آخرت رونما ہوتی چلی جاتی ہے۔

علم ربانی کی ساتھ علم نفس بھی ضروری ہے......مگر اسی علم اعلیٰ کا تتمہ ایک اور علم بھی ہے کہ جس کے بغیر آدمی اعلیٰ علم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ خود اپنے نفس کے نشیب و فراز کا علم ہے۔ جس سے نفس کی اصلیت اور اس کی جبلت کے گوشے واشگاف ہوں۔ کیونکہ نفس کی اونچ نیچ کا علم ہو جانے سے واشگاف ہوتا ہے کہ وہ تمام شرور ونقائص اور عیوب وذنوب کا منبع ہے۔ برائیاں اسی سے ابھرتی ہیں اور دینائے اخلاق کو تہہ و بالا کر ڈالتی ہیں۔

چنانچہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کھول دیا ہے کہ انسانی نفس کی ذات میں نہ کوئی کمال ہے نہ ہنر۔ کمال و ہنر کی دو ہی بنیادیں ہیں علم اور اخلاق۔ قرآنی روشنی میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ نہ اس کے اول میں علم ہے نہ آخر میں اور درمیان میں جتنا ہے وہ عارضی ہے۔ جو اس کی دلیل ہے کہ اس میں پیدائشی طور پر کوئی علمی کمال موجود نہیں۔ پھر جہاں تک اخلاقی کمال کا تعلق ہے۔ جس سے پاکیزہ اعمال اور خیر و برکت کی حرکات وسکنات کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ بھی اس میں نہیں، بلکہ ہے تو فتنہ وفساد کے جذبات اور برائیوں کے دواعی جاگزیں ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام کو جب انسان کی خلافت ارضی کا علم ہوا تو انہوں نے جناب باری میں عرض کیا تھا کہ: ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾ ''کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اور خون بہائے''۔

اِدھر یوسف علیہ السلام کا مقولہ حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: ﴿ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ﴾ ''بے شک نفس (امارہ) جو تو سکھلاتا ہے برائی، مگر جو رحم کر دیا میرے رب نے''۔ جس سے صاف واضح ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے جیسے علم لے کر نہیں آیا۔ ایسے ہی کوئی اخلاقی کمال لے کر بھی نہیں آیا۔ ورنہ اسے تعلیم و تربیت کی ضرورت نہ پڑتی اور ظاہر ہے کہ جب اس کے جذبات اس جہل و ناتوانی اور بداخلاقی و بدتہذیبی کے ساتھ نمایاں ہوں گے۔ تو وہ سوائے فتنہ وفساد کے اور کیا ہوں گے اور ادھر کمالات علم اور کمالات اخلاق کا سرچشمہ درحقیقت حق تعالیٰ شانہ کی ذات بابرکات ہے۔ جس کے آثار دنیا میں امن وامان اور دیانت وایمان پھیلاتے ہیں۔ جس سے دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی ہے تو ضروری تھا کہ جہاں علم خداوندی انسان کے لئے ضروری ہے۔ وہیں خود اپنے نفس کا علم بھی بتعلیم حق ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے جبلی شر و فساد کو فطرت الٰہیہ کی خیر و برکت زائل کر سکے اور اس طرح دنیا بھی اس کے شر سے محفوظ رہ سکے اور وہ خود بھی حفاظت کے دائرہ میں آجائے۔

علم کی دو بنیادی اقسام علم النفس اور علم الرّب......اس لئے قدرتی طور پر دو علم بنیادی طور پر ضروری ٹھہر جاتے ہیں۔ جو انسان کی صلاح وفلاح کے لئے ناگزیز ہیں۔ ایک علم النفس اور ایک علم الرب پھر دونوں علم جہاں اپنی اپنی خاصیتوں اور تاثیروں کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ وہیں اس وجہ سے بھی فطری ہیں کہ طبعاً انسان سب سے پہلے اپنے قرب کی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے اور پھر بعید اور دور کی چیزوں کا۔

اور ظاہر ہے کہ انسان کا نفس جس قدر انسان سے قریب ہے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ سو اگر کسی کو اتنے قرب اپنا بھی علم نہ ہو تو اس سے زیادہ جاہل اور کون ہو سکتا ہے اور ادھر اس سے بھی زیادہ قریب تر اس کا رب ہے کہ خود

نفس بھی اپنے سے اتنا قریب نہیں۔ تو اس غیر معمولی قرب پر بھی اگر انسان کو اپنے رب کا علم نہ ہو تو اس سے زیادہ اجہل اور کون ہو سکتا ہے؟

اس لئے قرب و بعد کے لحاظ سے بھی یہ دونوں علم انسان کے حق میں ضروری اور واجب ٹھہر جاتے ہیں۔

قرآن حکیم نے ان دونوں علموں کی ضرورت کی بنیادیں بھی قائم فرمادی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ﴾ ''ہم دکھلا دیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں ہی، یہاں تک کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے۔ کیا تیرا رب تھوڑا ہے اس چیز پر گواہ ہونے کے لئے خبردار وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے، خبردار وہ گھیرے ہوئے ہے ہر چیز''۔ ظاہر ہے کہ یہ ارائت آیات (نشانیاں دکھلانا) ہی علم پہنچانا ہے اور وہ علم نفس کے اندر کا بھی ہوگا اور باہر کا بھی جس سے علم النفس اور علم آفاق کی تحصیل کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے۔

پھر اس علم پر تبین حق مرتب کیا گیا ہے اور تبین کے معنی کھول دینے کے ہیں ظاہر ہے کہ ذہن پر یا قلب حق کا کھل جانا ہی علم ہے۔ جس سے علم الرب کی طرف اشارہ ہے اور ساتھ ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علم النفس یا نفس کے اندر آیات الٰہیہ کا دکھلایا جانا، ہی حق کے دکھلا دئے جانے کے مبادی میں سے ہے تو اس کا صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معرفت نفس ہی سے معرفت رب کا دروازہ کھل سکتا ہے، جسے عرفاء اسلام نے بلیغ ترین انداز سے اس حکیمانہ مقولہ سے مزید کھول دیا ہے کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ......'' ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا بیشک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔

علم الرب کی عملی تفاصیل کا نام فقہ ہے اور علم النفس کی تفاصیل کا نام تصوف ہے...... علم حق اور اس کے احکام کے لئے فقہ ہے۔ جس میں احکام مکلفین کو کتاب وسنت سے اخذ کر کے جمع کر دیا گیا ہے اور علم النفس اور اس کے جبلی دواعی کے لئے فن تصوف ہے جس میں نفس کے تمام مکائد اور اس کی بداخلاقیوں کے اصول اور پھر ان رذائل کو فضائل سے بدلنے کی تدابیر کتاب وسنت سے جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جب تک اپنے نفس کی جبلتوں کا علم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک حق کی فطرتوں سے استفادہ مشکل ہے۔ اس لئے جہاں علم الرب ضروری ہے۔ وہیں علم النفس بھی ضروری ہے، تاکہ ایک طرف شرور و نقائص کی فہرست سامنے آ جائے اور ایک طرف کمالات و مبرات کی تفصیل نمایاں ہو جائے اور اس طرح دنیا فتنہ وفساد سے بچ سکے۔

یہی دو علم ہیں جن سے انسان فرض شناس بنتا ہے، خوشی اور غمی میں اپنے حقیقی فرائض کو نہیں بھولتا دنیا کو چند روزہ اور اس کی لذتوں کو فانی لذت سمجھ کر اپنے ہر کام اور عمل میں آخرت ہی کو سامنے رکھتا ہے۔ اور اسی کو مقصد زندگی اور اپنی حیات مستعار کا نصب العین قرار دے لیتا ہے اور اس طرح تعظیم حق اور خدمت خلق کو اپنا جوہر نفس بنا

کر خاک ناپاک سے جوہر پاک بن جاتا ہے اعمال صالحہ اس سے اولاً بتکلف اور آخر کار بے تکلف سرزد ہونے لگتے ہیں جس سے مخلوق بھی اس پر اعتماد کرتی ہے اور خالق کی رضاء وخوشنودی بھی میسر آتی ہے اور اس طرح دارین کی فلاح و بہبود اس کا نقد زندگی بن جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اسی علم الرب کے پہنچانے کے لئے آتے ہیں...... یہی وہ قلب کا بلاواسطہ علم ہے۔ جس کے پہنچانے کے لئے فلسفی اور سائنس دان نہیں، بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے۔ اسی علم کو بطون غیب سے اس عالم ظاہر میں اتارنے کے لئے ملائکہ معصومین علیہم السلام آسمانوں سے زمین پر اتارے گئے اور اسی کے عملی نمونے دکھلانے کے لئے پیغمبروں اور ان کے مخلص خدام، آئمہ ہدایت، علماء ربانی اور دور یشان حقانی کو مامور فرمایا گیا یہی وہ علم ہے جس کا تعلق مادہ اور صورت سے نہیں بلکہ حقیقتہ الحقائق ذات بابرکات حق سبحانہ وتعالیٰ سے ہے اور جب کہ حسیاتی اور عقلیاتی علم کا آخری منتہا قلب تھا۔ جو بذریعہ حواس خمسہ اور بذریعہ عقل معاش اسے نظریاتی ازموں کمیون ازم، کیپٹل ازم، سوشل ازم وغیرہ اور مشینی عملوں کی صورت سے اس دنیا میں نمایاں کرتا رہا ہے۔ تو اس معنوی اخلاقی اور شرعی علم کا منتہا تو قلب کے سوا دوسرا عضو ہی ہو نہیں سکتا۔

پس یہ علم بطریق اولیٰ قلب ہی کا ہے جو بلاواسطہ حس وعقل محض وحی الٰہی سے ملتا ہے۔ ان رسمیاتی علوم سے اگر نظریاتی فلسفے نمایاں ہوتے تھے۔ جن سے آدمی مادہ کی گہرائیوں تک پہنچ کر مادیات ہی میں گم ہو جاتا تھا۔ تو س خدائی علم سے دینی حکمتیں، فقہی مسالک اور وصول الی اللہ کے طرق نمایاں ہوتے ہیں جن سے آدمی حق کی گہرائیوں میں پہنچ کر فانی فی اللہ ہو جاتا ہے۔ جو دوامی بقاء ہے وہاں اگر مشینی عملوں کی صورتیں نمودار ہوتی تھیں تو یہاں قلبی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ جن سے عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کی بدولت آدمی بلاتوسط اسباب بڑے بڑے یبی جہانوں حتی کہ چاند تک ہی نہیں، فوق سماوات تک جا پہنچتا ہے۔

اور جیسے ان نظریاتی ازموں کے علم وعمل سے دنیا میں ہمیشہ فتنہ وفساد اور اخلاقی گراوٹیں سامنے آتی رہیں اور آ رہی ہیں اور انسان انسانیت چھوڑ کر حیوانیت کے گڑھے میں گرتا رہا ہے۔ ایسے ہی ان فقہی اور خدائی مسلکوں کے علم وعمل سے ہمیشہ دنیا میں امن وسلامتی، اخلاقی بلندی اور پاکیزہ عزائم واعمال کے نمونے سامنے آتے رہے ہیں۔ جن سے انسان انسانیت سے بھی بالا ہو کر ملکیت کے آسمانوں پر پہنچتا رہا ہے اور اب بھی سعادت مند قلوب برابر پہنچ رہے ہیں۔ مادی قسم کے نظریات اور فارمولوں سے ہمیشہ فرعون وہامان پیدا ہوئے اور ان روحانی قسم کے فکار واعمال سے صدیق رضی اللہ عنہ وفاروق رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

حسیاتی علوم کی طرح ربانی علوم کا ظرف بھی قلب ہی ہے...... قرآن حکیم نے جیسے حسیاتی اور نظریاتی علوم کو قلب ہی کا علم کہا ہے۔ مگر بواسطہ حواس وعقل جس کی تفصیل گزر چکی ہے ایسے ہی خدائی علم کا ظرف بھی قلب ہی کو تلایا ہے۔ جو اس اقلیم تن میں حقیقی مدرک اور عالم ہے اور وہی اس حسی خول میں ایک لطیفہ ربانی ہے جو اس علم کو اپنے

اندر جذب کرتا ہے کہ اس کی اصلی غذا یہی علم و معرفت ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ ''اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا، لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر، تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں''۔

پس جیسے علوم حواس کا سرچشمہ مادہ اور صورت ہے۔ اسلئے اس علم سے مادہ صورت ہی کو قوت ملتی ہے۔ کھانے پینے اور بارام رہنے سہنے سے بدن اور بدنی قوتیں ہی زور پکڑتی ہیں اور اس سے پھر مزید نمائشی صورتوں اور اسباب تعیش کے نئے نئے ڈیزائنوں کی بجائے حقیقی اور سیرت و کردار کے نئے نئے پاکیزہ نقشے سامنے آتے ہیں۔ جن سے درجہ بدرجہ روحانیت کے مقامات ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں۔

اب اگر یہ حقیقی علم اور اس کی یہ اخلاقی قدریں اس نمائشی علم اور اس کی حسی صورتوں کے ساتھ لگ کر اسی میں روح کی طرح سما جائیں۔ تو پھر تمدن کے یہ نمائشی نقشے بے جان باقی نہیں رہ سکتے۔ بلکہ زندہ و پائندہ بن جاتے ہیں۔ جس سے دنیا کو حیات ملتی ہے نہ کہ تباہی و ہلاکت، دنیا میں امن و سکون پھیلتا ہے۔ نہ تشویش و اضطراب اور بے چینی جیسا کہ خلفاء راشدین اور آئمہ عدل و حق نے دنیا کے نقشوں کو مٹائے بغیر انہیں اخلاقی قوتوں سے جاندار بنا دیا تھا اور دنیا کے پردوں میں دینی زندگی بھر کر اس دنیا کو بھی زندہ جاوید دکھایا تھا۔

ربانی اور حسی علوم کے لوازم اور خاصیات...... جس کا راز یہ ہے کہ اس علم الٰہی کے لوازم میں سے پہلی چیز خشیت اللہ اور خوف خداوندی ہے جس کا طبعی اثر نافرمانی اور بغاوت حق سے گریز اور معصیت سے پرہیز ہے۔

پس عالم دین وہی شمار ہوگا جس میں علم کی یہ خاصیتیں سمائی ہوئی ہوں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل حسی اور فلسفیانہ علم کا خاصہ خوف خداوندی کے بجائے، منافع بدنی کے فوت ہونے کا خوف اور فرمانبرداری حق کے بجائے فرمانبرداری نفس ہے۔ جس کا طبعی اثر معصیت، حق تلفی اور طغیان و سرکشی ہے۔ جس سے عالم میں فتنے، فسادات اور ہنگامے پھیلتے ہیں۔ پس ایک مادی اور طبعی علم کا عالم وہی سمجھا جائے گا۔ جو سب سے زیادہ آزاد فکری، بے باکی اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہو۔ حلال و حرام کے فرق سے بے نیاز ہو اور اپنے منافع کی خاطر ایک دنیا کی دنیا کو تباہی کے گھاٹ اتار دینے سے بھی دریغ نہ رکھتا ہو۔ کسی عربی کے شاعر نے خوب کہا ہے ۔

رَضِيْعَا لِبَانٍ حِكْمَةٌ وَّتُقًى ۔۔۔ وَسَاكِنَا وَطْنٍ مَالٌ وَطُغْيَانٌ

''ایک ہی چھاتی کا دودھ پیا ہے علم اور خشیت الٰہی نے کہ ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں علم ہوگا۔ وہاں خوف خداوندی ضرور ہوگا (بشرطیکہ تربیت صحیح ہو) اور ایک ہی وطن کے باشندے ہیں مال (وسائل عیش) اور سرکشی کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ وسائل دنیا ہاتھ میں آ جائیں گے تو تمرد و بغاوت لازمی طور پر آئے گی (جبکہ تربیت صحیح نہ ہو)''۔

چنانچہ اس علم الٰہی کے آثار خشیت و خوف کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ

عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ''اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے''۔اور پھر اسی ربانی علم کے علماء کا مقابلہ غیر علماء سے کرتے ہوئے قرآن نے ان کا فرق مراتب اور عدم مساوات ارشاد فرمایا ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ''کیا جو لوگ (اللہ اور اس کے احکام کو) جانتے ہیں وہ برابر ہو جائیں گے ان لوگوں کے جو جاہل ہیں بلاشبہ ذکر و نصیحت پکڑنا عقل والوں ہی کا کام ہے''۔اور پھر اسی علم کے حاملین کے روز بروز بڑھنے والے درجات کے بارے میں ارشاد فرمایا: کہ : ﴿وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور جنہیں علم عطا ہوا ہے ان کے درجات ہیں''۔

علم نافع کی حقیقت و وسعت......یہی وہ مراتب و درجات والا علم ہے۔جس کا لقب علم نافع ہے اور جس کا نفع کسی حد پر آ کر نہیں رکتا بلاشبہ دنیا کے تمام علوم وفنون خواہ حیاتی ہوں یا نظریاتی، نفع سے خالی نہیں، سائنس ہو یا فلسفہ، ریاضی ہو یا مساحت، معاشیات ہوں یا اقتصادیات اور تمام علوم وفنون کے نافع ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ ان کی بدولت ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔رہائشی مکانات کی تعمیر، ظروف اور اثاث البیت کی تیاری، لباس اور تن پوشی کے سامان خورد ونوش کے ذرائع، نقل وحمل کے وسائل۔ پھر تجارت وصنعت کے اسباب و موادانہی کے ذریعہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ جو یقیناً نافع ہیں۔لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا نفع علی الاطلاق نہیں۔ بلکہ ایک حد تک محدود ہے جو قبر کے کنارہ سے آگے نہیں گزرتا۔

آپ ہوائی جہاز سے لندن اور برلن منٹوں میں پہنچ سکتے ہیں۔لیکن عرش کرسی اور جنت تک یہ سواریاں آپ کو نہیں پہنچاسکتیں۔آپ ان فنون کی ساختہ پرداختہ غذاؤں سے دنیا میں پیٹ بھر سکتے ہیں لیکن قبر میں شکم سیری کے لئے یہ کارآمد نہیں ہیں۔آپ نرم گدیلوں اور تکیوں سے یہاں بدن کو آرام پہنچاسکتے ہیں لیکن قبر وحشر میں یہ گدے، تکیے بے کار ہیں۔اس لئے ان علوم وفنون کا نفع اسی زندگی کے آخری سانس تک محدود ہے۔

لیکن علم شرائع جو سامان بنانے کے لئے نہیں بلکہ انسان بنانے کے لئے آیا ہے اور صحیح الانسانیت انسان کی گزرگاہ محض دنیا ہی نہیں۔ بلکہ برزخ اور حشر بھی ہے۔اس لئے اس علم کا تیار کردہ انسان جو انسانی کمالات سے بھرپور ہو اور اس کی راحت وطمانیت خود اس کے اندر ہی مہیا کر دی گئی ہو۔ دنیا میں بھی اس علم سے آرام پاسکتا ہے اور وہاں بھی کیونکہ اس کا راحت وآرام مادی وسائل کے تابع نہیں رہتا۔ بلکہ اس کی راحت اس علم کی بدولت اس کے قلب میں ہوتی ہے۔جسے کسی بھی جہان کی کوئی چیز زائل نہیں کرسکتی۔اس لئے نافع مطلق یہی علم ہوسکتا ہے جو انسان میں غناء وطمانیت پیدا کر کے دنیا وآخرت کی تمام راحتیں خود اسی کے اندر مہیا کر دیتا ہے۔اس لئے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کا سکھ اور چین کبھی زائل نہیں ہوتا۔

پس علی الاطلاق جب بھی علم نافع کا لفظ بولا جائے گا۔تو اس سے یہی علم شرائع اور علم حقائق مراد ہوگا۔صرف یہ کہ وہ مکدر عیش اور کدورت آمیز زندگی کا سبب بنیں گے، بلکہ تمدن کے وہی بے جان ڈھانچے اور لاشے پیدا

کریں گے، جن میں تعفن اور بدبو ہوگی اور دل و دماغ پراگندہ ہوکر ہلاکتوں کا شکار بن جائیں گے۔ پھر یہی وہ علم ہے جو قلب کے حقیقی فرائض میں ہے۔ جیسے دیکھنا، سننا کان آنکھ کے فرائض میں سے ہے اور جب قلب علم کا وہی وظیفہ ادا کرے گا، جو قدرت نے اسکے سپرد کیا ہے اور اس علم سے وہ اپنی اقلیم تن کا نظام چلائے گا۔ تو بھی کائنات انسانی کا وہ عدل ہوگا۔ جو حرمان وخسران سے بری ہوگا اور کفران کے عذاب سے انسانوں کو محفوظ رکھ سکے گا۔

اگر قلب کو اس کے اس اصلی علم سے ہٹا کر ظاہر داریوں کے علم میں ہمہ تن پھانس دیا جائے گا تو یہی وہ خسران ہے جس کا ذکر ابتدائی اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں اور اگر اسے ان سب سے معطل رکھ کر جہالت کے قعر میں گرادیا جائے تو یہی وہ حرمان ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ پھر یہی قلب کا وہ علم ہے جسے علم قطعی کہیں گے جس میں شک وشبہ اور تردد وتذبذب کی گنجائش نہ ہوگی۔ کیونکہ حواس خمسہ یا عقلیات جو معلومات اس دنیا سے بٹور کر لاتے ہیں۔ ان میں شک، وہم، تردد اور تذبذب کی آمیزش ہوتی ہے جو جہل کی اقسام میں سے ہے۔ اس لئے یہ دنیوی علوم جہل آمیز ہوتے ہیں، خالص علم نہیں ہوتے کہ ان میں قطعیت ہو۔

لیکن خدائے برتر کا نازل کردہ علم جو انسانی ضمیر پر بلا واسطہ حواس وعقل اترتا ہے، وہ سرچشمہ فطرت سے نازل ہونے کے سبب کمال قطعیت لئے ہوئے ہوتا ہے، جس میں کسی شک وشبہ یا دوہم وتردد کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔ اس لئے وہ مورث یقین واطمینان ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی بشاشت وطمانیت روبہ ترقی رہتی ہے اور اس میں حقیقی چین اور سکھ پیدا کرتی ہے۔

بہرحال اخلاقی قدریں علم الٰہی کے خواص وآثار میں سے ہیں اور بداخلاقی کی قدریں ان صورتوں شکلوں اور نمائشی ڈیزائنوں کے حسی علم کے خواص وآثار میں سے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں علم اپنی نوعیت اور اپنی خاصیت کے لحاظ سے گو بالکل جدا جدا ہیں۔ لیکن اگر ان ظاہری علوم کا مقصد اس حقیقی علم کو ٹھہرا کر آگے بڑھایا جائے اور ان نمائشی نقشوں کو ان حقیقی قدروں سے بھر دیا جائے۔ تو دنیا کے یہ خوشنما نمونے آخرت میں کام دے سکتے ہیں۔

عصری تعلیم گاہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے...... آج دنیا میں اخلاقی قدریں اگر مفقود ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ علم جس کا نام علم الٰہی ہے، ختم کیا جارہا ہے۔ جو اخلاقی قدروں کا سرچشمہ ہے اور اگر بداخلاقیاں دنیا میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تو صرف اس لئے کہ ان رسمیات اور صورتوں کے علم کو بالاستقلال موضوع زندگی بنا کر فروغ دیا جارہا ہے۔ جس میں سوائے ظاہر داری کے کسی قلبی حقیقت کی سمائی نہیں ہوتی۔

چنانچہ آج بہتات ہے تو کالجوں کی اور افراط ہے تو یونیورسٹیوں کی جن میں انہی مادی لذات ومنافع کے لئے حلال وحرام سے قطع نظر کر لینے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ خدائی اخلاق اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال دینے کے طریقے تعلیم کئے جارہے ہیں۔ جن سے آدمی حیوانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور انسانیت کا چولہ اتار پھینکنے ہی کو سب سے بڑی معراج ترقی سمجھ چکا ہے۔ پھر بھی اگر ان میں کچھ اخلاقی دوست اور دین پسند افراد نظر آئیں۔ تو یہ

ان کی اپنی سلامتی، فطرت یا گھریلو ماحول یا دیندار ماں باپ کی تربیت کا اثر ہوسکتا ہے نہ کہ خالص اس مادی تعلیم کا۔

ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وجود کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے لادینی ماحول اور مادہ پرستانہ اخلاقی تربیت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ لادینی اور اخلاقی انار کی محض کالج اور یونیورسٹی یا محض کسی کتاب کے نوشتوں کا اثر نہیں۔ بلکہ معلموں کی ناتربیتی اور اور پست اخلاقیوں کے ماحول کا اثر ہے اور پھر اس تعلیمی ماحول کے بگڑنے ہی سے پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے۔ ورنہ آج مدارس دینیہ میں بھی فلسفہ اور مبادی سائنس پڑھائے جارہے ہیں۔ لیکن وہ قلب واخلاق اور اعتقاد پر کوئی مضر اثر نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ پڑھانے والوں کا قلب، دیانت وامانت کا ظرف بنا ہوا ہوتا ہے اور نیک ماحول کا وجود قائم شدہ رہتا ہے۔ اس لئے یونیورسٹیاں مضر نہیں، بلکہ ان کا ماحول مضر ہے۔ اگر انہی یونیورسٹیوں میں مادہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کے دواعی پیدا ہو جائیں اور مادی ڈھانچوں میں روحانی قدروں کا رنگ بھر دیا جائے۔ تو یہی مادہ ایک صالح تمدن کا جنم دہند بن سکتا ہے۔ پس ضرورت کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مٹانے کی نہیں بلکہ ان کا نظام اور ماحول بدلنے کی ہے۔

مدارسِ دینیہ کے قیام کی ضرورت اور غرض وغایت...... لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو تو پھر دوسری مستقل صورت اس کے سوا اور نہیں ہوسکتی کہ الگ سے ایک صحیح اور مستقل خدا پرستانہ ماحول قائم ہو۔ جس میں علوم خداوندی کی تعلیم اور اس کے تحت اخلاقی تربیت پر پورا زور صرف کیا جائے اور دینی مدارس ملک میں زیادہ سے زیادہ پھیلا دیئے جائیں۔ جو بالآخر اپنے کردار وعمل سے ان دوسرے ماحولوں پر بھی موثر ہوں اور ادھر ان دینی اداروں میں ایسے افراد کی بھرتی کی خاص گنجائش رکھی جائے۔ جو سائنس وفلسفہ زدہ ہونے کی وجہ سے مایوس العلاج مریضوں کی صف میں آچکے ہوں مگر اپنا معالجہ چاہتے ہوں۔ کیونکہ آج کی صورت پرستانہ تمدن کی رنگین صورتوں میں اگر اخلاقی قدریں بھری جاسکتی ہیں اور تمدنی جزئیات کی ان خوب صورت مگر مردہ لاشوں کو روح اخلاق سے زندہ کیا جاسکتا ہے، تو وہ صرف اسی علم سے جو پاک قلوب پر بلاتوسط اسباب غیب سے اتارا گیا ہے۔ جس کا مقصد ہی انسان کو انسان بنانا ہے۔ نہ کہ سامان تیار کرنا، اس لئے اگر ایک طرف قوم کو نئی تعلیم کے ذریعہ زندگی کے ڈھانچے بنانے کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔ تو دوسری صرف انہیں اس دین کی قدیم تعلیم کے ذریعہ ان ڈھانچوں میں روح ڈالنے کے لیئے بھی تیار کیا جائے۔ ورنہ یہ تمدنی صورتوں کی مردہ لاشیں ایک نہ ایک دن دنیا کے دماغ کو پراگندہ کر کے رہیں گی اور پھر ان گلے سڑے ڈھانچوں میں روح آنے کی صلاحیت بھی نہ رہ جائے گی۔ اس لئے اگر آج حواس خمسہ کے سائنسی علوم اور عقل معاش کے فلسفیانہ علوم کی ضرورت ہے تو اس سے کہیں زیادہ قلوب کے اس عرفانی علم کی بھی ضرورت ہے۔ جسے حق تعالیٰ نے اپنی روح فرما کر اسی کو جہانوں کا زندہ کنندہ بتلایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے ﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ

اللهِ الَّذِیْ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ط اَلَآ اِلَی اللهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ﴾ ’’اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی، اس سے سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بے شک تو سمجھاتا ہے سیدھی راہ اللہ کی۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام‘‘۔

دورِ حاضر کی بیمار دنیا کا واحد علاج...... بہر حال اگر آج کی دنیا کا گہرا مرض یہی ہے کہ اس کے نمائشی تمدن میں اخلاقی قوتیں باقی نہ رہیں اور اگر دنیا کی عمومی بیماری یہی ہے کہ اسے سب کچھ ملنے کے باوجود جو چیز نہیں مل سکی، وہ سکونِ قلب اور روحی چین واطمینان ہے۔ تو اس کا واحد علاج یہی اور صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اسے سرچشمہ طمانیت وبشاشت علمِ دین اور علمِ اخلاق یا بالفاظ مختصر ’’مذہبی تعلیم‘‘ سے روشناس کرایا جائے اور دین ومذہب کے بنائے ہوئے علمی اور اخلاقی نقشوں پر ان کی تربیت کی جائے۔ جس کا مکمل اور مستند سرچشمہ آج کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سوا اور دوسرا نہیں۔ اس لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ’’لَایَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَاصَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا‘‘ ’’اس امت کے آخر حصہ کی اصلاح اسی چیز سے ہوسکتی ہے جس سے امت کے اول حصہ کی اصلاح ہوئی تھی‘‘۔ اور وہ وسیلہ اصلاح یہی روحِ الٰہی قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات اور تشریحات ہیں۔ جو حدیث اور فقہ میں منضبط اور مدون ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... میرا مقصد علم عصریہ سے کلیۃً ہٹانا ان سے نفرت دلا کر کلیۃً بے زار بنانا نہیں۔ کیونکہ جب انسان میں روح کے ساتھ بدن بھی لگا ہوا ہے تو روحانی قدروں کے ساتھ بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔ جس میں خورد نوش، بود وباش، نقل وحمل وغیرہ کے اسباب، نیز تجارت، زراعت، صنعت وحرفت وغیرہ کے تمام وسائل داخل ہیں۔ جنہیں سائنس وفلسفہ ہی مہیا کرتا ہے۔ اس لئے جب تک روح کا بدن سے انقطاع کلی نہیں ہو جاتا ان وسائل واسباب اور ان کی تعلیم سے بھی کلی یکسوئی ممکن نہیں۔ لیکن جب کہ اسی طرح بدن کے ساتھ روح بھی لگی ہوئی ہے۔ تو اس کے تقاضوں سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی بالخصوص جب کہ ایک نہ ایک دن نفس انسانی کا اس بدن سے انقطاع ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس وقت جو چیز انسان میں باقی رہے گی، وہ روح ہی روح ہوگی۔ اس لئے اس کی ضروریات کی فراہمی بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی زیادہ ضروری اور ناگزیر ہے۔ بلکہ جب بدن اور بدنی زندگی عارضی ہے اور روح اور روحانی زندگی دوامی ہے۔ تو بدنی ضروریات اور ان کے مہیا کرنے والے علوم وفنون اور ان کے منافع بھی بہر حال عارضی ہی ہوسکتے ہیں اور عقلی قاعدہ ہے کہ عارضی ضرورتوں کی فراہمی بقدرِ ضرورت ہی ہوتی ہے۔ عوارض میں مقاصد کے انداز کا انہاک نہیں ہوتا۔ اس لئے ان عصری فنون سے نہ کلیۃً قطع نظر ہی کی جاسکتی ہے اور نہ انہیں مقاصد زندگی بنا کر انہیں ترقی کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اصولی بات یہی ہوگی کہ انہیں کسی حد تک باقی رکھ کر ان سے معاش پیدا کی جائے۔ لیکن ہمہ وقتی فکر

مقصد زندگی کا رکھا جائے اور وہ دین ہے جو دنیا میں انسان کو انسانیت سکھلانے کے لئے بھیجا گیا ہے اور جس کے حصول کا واحد ذریعہ یہی دینی اور شرعی تعلیم ہے۔

علم دین ترقی کے لئے اور علم دنیا حصول ضروریات کے لئے ہے......اس طرز فکر کا قدرتی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے علم دین ترقی کے لئے رہ جائے اور علم دنیا وقتی ضروریات کے حصول کے لئے اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْھَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَۃِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْھَا'' ''دنیا کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے''۔ اس لئے آج شدید ضرورت ہے کہ مسلمان علم دین کو مقصدی حیثیت دے کر آگے بڑھیں اور اپنی نسلوں کو دین اور تعلیم کے فروغ دینے کے لئے تیار کریں۔ اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں اولین درجہ تعلیم دین ہی کو دیا ہے ارشاد فرمایا کہ: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ ''جیسا کہ بھیجا ہم نے تم ہی میں سے رسول جو پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تمکو اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اولین......اور اس لئے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کا اولین مقصد تعلیم دین کو ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''

بعثت کا مقصد ثانی......اس تعلیم کا طبعی اثر اصلاح عمل ہے۔ جس کی اصلاح اور پاکیزگی ہے بغیر علم بھی کارآمد ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا وبال جان بن جاتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دوسری اہم غرض و غایت اسوہ حسنہ بتلائی گئی ہے۔ جسے قرآن نے تعلیم حکمت سے تعبیر فرمایا ہے اور تیسری غرض تکمیل اخلاق ہے کہ اس کے بغیر عمل صالح کے وجود پذیر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کو تزکیہ سے تعبیر فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کردوں'' فرما کر خلق عظیم کا وہ نمونہ پیش فرمایا کہ دنیا مسخر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر جھکنے کے لے مجبور ہوگئی۔ علم محض کی عظمت و وقعت ضرور کی جاتی ہے۔ لیکن سر نیاز اخلاق و عمل ہی کے آگے جھکایا جاتا ہے۔

پس اخلاق بمنزلہ تخم کے ہیں۔ ان سے پھوٹنے والی شاخیں اعمال صالحہ ہیں۔

بعثت کا مقصد ثالث......پھر اگر کسی تخم پر برگ و بار نہ آئیں تو یہ اس کے سوخت ہو جانے کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے دینی زندگی کا تیسرا بنیادی اور اہم شعبہ تربیت اخلاق نکلتا ہے۔ جس سے اعمال شاخوں کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں اور آدمی اس کے بغیر معیاری انسان نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ دنیا میں کون ہے جو اپنے قول اور بیان کو خوش نما بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جس کا عمل اس کے قول کے موافق

پڑ جائے، تو ٹھیک ہے ورنہ محض قول سے وہ کھینچ کھینچ کر اپنے نفس کو خواہ مخواہ ہلاک کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "هَتَفَ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ فَإِنْ أَجَابَ وَإِلَّا ارْتَحَلَ" "علم نے عمل کو پکارا (کہ میرے ساتھ چل) اگر اس نے قبول کر لیا (یعنی اگر وہ ساتھ ہو لیا تو یہ علم عمل کی سواری پر سوار ہو کر اپنے عامل کو عرش تک پہنچا دے گا) ورنہ (یعنی اگر عمل ساتھ نہ ہوا) تو علم کوچ کر جاتا ہے (یعنی کہتا ہے کہ پھر میں بھی نہیں ٹھہرتا)"۔

علم وعمل کی باہمی وابستگی ...... اس سے واضح ہے کہ جب تک انسانی زندگی علم واخلاق اور عمل کے ساتھ وابستہ نہ ہو کہ انسان اس میں بند جائے۔ اس وقت تک اس کی زندگی معیاری نہیں بن سکتی کہ لوگ اسے نمونہ سمجھ کر اپنی زندگیاں اس کے حوالہ کر سکیں اور اس کے قول وعمل سے اپنی زندگیاں بنائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تزکیہ اخلاق اور تعلیم حکمت کو جس کا دوسرا نام تربیت اور ذہن سازی ہے۔ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے قائم فرمایا اور اپنے رسول کے بنیادی فرائض میں انہیں شمار فرمایا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت ہی بحیثیت مجموعی نبی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اس لئے نبی کا یہ فریضہ تعلیم وتربیت اب امت ہی پر عائد ہے۔ امت جب تک اس بنیادی فریضہ کو صحیح طور پر نہیں سنبھالے گی، اس وقت تک وہ صحیح معنی میں امت کہلائے جانے کے قابل نہ بنے گی۔ جس کے لئے وہ کتاب وسنت کی رو سے مامور کی گئی ہے۔

ان صریح احکام قرآن وحدیث کے بعد جس کی تائید عقل وفطرت بھی کر رہی ہیں، آخر امت کو اب اور کسی دلیل کا انتظار ہے؟ اور وہ اس کے سوا آخر کون سی حجت چاہتی ہے۔ جو معاذ اللہ کلام خداوندی سے بھی آگے کی ہو۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ "کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے، طے ہو جاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام"۔

مسلمانہ زندگی کے تین بنیادی شعبے ...... بہر حال ایک مسلمان کی دینی زندگی کے تین بنیادی شعبے نکل آتے ہیں۔ علم، اخلاق اور عمل، علم نہ ہو تو راستہ ہی نہیں مل سکتا کہ راہ روی ممکن ہو۔ اخلاق نہ ہوں تو عمل کی قوت میسر نہیں آ سکتی کہ آدمی راہ مستقیم پر رواں دواں ہو اور عمل نہ ہو تو معطل قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا کہ وہ عزت سے دنیا میں باقی رہے۔

قومی بربادی کے تین اسباب ...... اس سے طبعی طور پر کسی قوم کی تباہی اور بربادی کے بھی تین ہی بنیادی اصول نکل آتے ہیں۔ جن سے ایک قوم قعر مذلت میں گر کر دم توڑ دیتی ہے۔ ایک جہالت کہ راستہ ہی دکھائی نہ دے، ایک بدخلقی کہ تہذیب وشائستگی کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جائے اور انسان کی بجائے حیوان بن جائے اور ایک بے عملی کہ سست اقوام کا نتیجہ ہمیشہ ذلت، خواری اور پستی وغلامی نکلا ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی ہلاک ہوئی ہے وہ ان ہی تین بنیادی بیماریوں سے ہلاک ہوئی ہے۔

قومی ترقی کے تین وسائل......اس لئے اس کے بالمقابل یہی مذکورہ تین بنیادی اصول ہمیشہ قوموں کے عروج وارتقاء کا راستہ ثابت ہوئے ہیں۔ایک علم نافع جس سے دارین کی ترقی اور سرخروئی کی راہیں نظر آئیں، دوسرے اخلاق حسنہ جن سے ان راہوں پر چلنے کی قوت ملے اور تیسرے عمل صالح جس سے زندگی کی برتری اور عزت ممکن ہو۔اس لئے مسلمان غور کریں کہ وہ ان تین بنیادی معیاروں کے لحاظ سے آج کس مقام پر ہیں؟ وہ قوم جس کے اسلاف میں بزمانہ خلافت فاروقی تجارت تک کا لائسنس بھی اس وقت تک نہیں ملتا تھا۔ جب تک کہ تاجر بیع وشراء کے پورے مسائل اور فقہ درونی سے واقف نہ ہو جائے، چہ جائیکہ عبادات ومعاملات۔

دور حاضر اور ملت اسلامیہ......اسی قوم کے افراد آج پہچانے ہی جاتے ہیں، جہل ونادانی سے انا اللہ آج علاقے کے علاقے اور بستیوں کی بستیاں ہیں، جن میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی آبادی ہے۔لیکن عالم دین کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔اسی لئے جگہ جگہ وہ بدعات وخرافات اور رسوم ورواج کے بندھنوں میں بندھے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی جہالت سے انہی رسوم ورواج کو دین باور کر کے اپنی دنیا وآخرت خراب کر رہے ہیں۔ نہ ان میں قابل ذکر طریقہ پر دینی شعور ہے، نہ دنیوی احساس، تمدنی لائنوں میں صنعتی، تجارتی، سیاسی اور اقتصادی شعور سے بھی عامہ بے بہرہ ہیں۔ کیونکہ یہ ساری بنیادیں علم سے قائم ہوتی ہیں۔ جب علم ہی صفر کے درجہ میں ہو تو یہ بنیادیں کہاں قائم ہو سکتی ہیں اور جب بنیادیں نہ ہوں تو تعمیر اٹھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقوام کی تباہی کی طبعی ترتیب......عملی زندگی میں عامہ منکرات اور فواحش دلوں پر مسلط ہیں۔عمل کی خودساختہ صورتیں مرغوب ہو گئی ہیں اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی غیر مرغوب۔ گویا مرض جہالت کا بحران اس حد پر آ چکا ہے کہ ذہن کا ذائقہ ہی بدل چکا ہے، کڑوی چیزیں شیریں محسوس ہونے لگی ہیں اور شیریں چیزیں تلخ، جو نتیجہ ہے پیہم بدعملی کی مشق کا اور جب برے افعال عادت ثانیہ بن جاتے ہیں تو قدرتاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جاتا ہے اور جب اس ترک نصیحت کی بھی عادت جزو نفس ہو جاتی ہے، تو نصیحت بھی پھر برائیوں کی ہونے لگتی ہے اور بھلائیوں سے روکا جانے لگتا ہے اور اس کا قدرتی انجام یہی ہوتا ہے کہ بھلائی برائی نظر آنے لگتے اور برائی بھلائی دکھلانے لگے۔العیاذ باللہ جس سے فہم اور ذوق ہی بدل جاتا ہے اور ایک خاص مزاج اور مخصوص ذوق کی قوم ذوق کے تبدیل ہو جانے پر گو نام کے لحاظ سے وہی پرانی قوم کہلائی جاتی رہے۔لیکن حقیقتاً وہ قوم نہیں رہتی بلکہ کوئی دوسری قوم بن جاتی ہے اور بدقسمتی سے آج یہی منظر سامنے ہے۔

اور میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام اعضاء بدن کے علمی وعملی فرائض کے ساتھ قلب کو جو فریضہ بخشا گیا ہے۔وہ علم نافع، اخلاق فاضلہ اور افکار صادقہ ہیں۔ اگر وہ ان فرائض کو سرے سے ترک کر دیتا ہے تو یہ حرمان ہے اور اگر کچھ دوسرے مصنوعی فرائض اپنے سر لگا لیتا ہے، جس سے اصل فرائض رہ جائیں تو یہ خسران ہے۔ آج اگر دیکھا تو دنیا حرمان وخسران دونوں ہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔قلب آج نہ صرف اپنے حقیقی علم کے فرائض سے

محروم ہی ہو چکے ہیں بلکہ علم کے نام سے ایسے مصنوعی فلسفوں اور ازموں کو انہوں نے اپنے اندر بھر لیا جو علم نما جہل ہیں اور جن سے انسان نہ جاہل ہی رہتا ہے اور نہ عالم ہی بنتا ہے۔ بلکہ جہل مرکب کا شکار ہو جاتا ہے۔

پس آج کا انسان جب کہ اپنے تن خاکی کی حکومت اور اس کے عملہ کو قانون الٰہی سے ہٹ کر لاقانونیت کے ساتھ چلا رہا ہے اور علم کی نعمت کو جہالت سے تبدیل کر کے زندگی بسر کر رہا ہے۔ تو بلاشبہ وہ اپنے کو دارالبوار (جہنم) کا مستحق بنا تا جا رہا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ''تو نے نہ دیکھا کہ جنہوں نے بدلا اللہ کے احسان کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں جو دوزخ ہے، داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے''۔ ان حالات میں دینی مدارس کا قیام جس طرح اہم واجبات میں سے ہے ایسے ہی ان حضرات کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی بھی اہم فرائض میں سے ہے جو اس دور فتن والحاد میں دینی مدارس لئے بیٹھے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ بھوجپور اس سلسلہ کی ایک سنہری کڑی ہے۔ جس کے بانیوں، مدرسوں اور منتظموں نے اپنی جان و مال کی قربانی دے کر اس علمی درسگاہ کو پھر سے زندہ کیا اور اسے بام عروج پر پہنچانے کی سچی تڑپ اور آرزو لئے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اسی آرزو اور تڑپ کا اثر ہے کہ آج جامعہ اشرفیہ ایک نئی روح کے ساتھ سامنے ہے اور اس میں ارباب کمال جمع ہیں اور اسی قلب کے علم کو اور اس علم سے قلب کو پھر سے زندہ و پائندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ حضرات درحقیقت انہی اسلاف کے اخلاف ہیں۔ جنہوں نے انگریزی تسلط و اقتدار کے وقت جب کہ برطانوی حکومت نے اسلامی علوم وفنون کے سوتے ہر طرف سے بند کر دیئے تھے۔ ان بزرگوں نے اپنی نگاہ دوربین سے مستقبل کا صحیح اندازہ لگا کر آزاد دینی مدارس کا ایک جال ہندوستان میں بچھا دیا تھا، اور اس طرح ناسازگار ماحول میں دین کی ہزاروں شمعیں روشن کر دی تھیں۔ جن کا چاندنا آج تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے آج کتنا بھی ناسازگار ماحول کیوں نہ ہو۔ ان کے اخلاف عزائم اور ہمتیں ہارنے والے نہیں ہیں اور توقع ہے کہ یہ حضرات اسی طرح اسلامی علوم وفنون، اور اسلامی معاشرہ کو جوں کا توں باقی رکھیں گے۔ جس طرح ان کے بزرگوں نے اسے باقی رکھا تھا۔

اگر اب بھی جامعہ اشرفیہ سے فیض و برکات کا فائدہ نہ اٹھایا جائے اور دوسرے مریضوں کو بھی اس کا راستہ نہ دکھایا جائے تو انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان حضرات کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اس درس گاہ کو علوم قلب کی آبیاری کا وسیلہ ثابت فرمائے۔ علوم نبوت اس سے زندہ ہوں اور سرشاران عمل افراد اس سے ابھر ابھر کر دین کے مناد بنیں اور قوم میں دینی انقلاب آئے اور انجام بخیر ہو۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم	روز گارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس	بر رسولاں بلاغ باشد و بس

''وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.''

مقصودِ بعثت

”اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَـا وَسَنَـدَنَـا وَمَوْلَانَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ:...... فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ ① وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :”بُعِثْتُ لِأُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْـلَاقِ“ ② أَوْ کَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.

احادیث کا مفہوم...... بزرگانِ محترم! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں ہیں، جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں۔ ان دونوں احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریف آوری، بعثت اور اپنی رسالت و نبوت کی غرض وغایت بیان کی ہے کہ مجھے دنیا میں کیوں بھیجا گیا؟ اور میں کیوں مبعوث کیا گیا؟

تو آپ نے اپنی بعثت کی دو غرضیں ارشاد فرمائیں۔ ایک فرمایا: ”إِنَّمَـا بُعِثْتُ مُعَلِّمًـا“ ③ اور دوسری حدیث میں فرمایا: ”بُعِثْتُ لِأُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْـلَاقِ“ ④

پہلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ تعلیم دوں اور دوسری حدیث میں فرمایا: میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ پاکیزہ اخلاق کو مکمل بنا کے پیش کروں۔ دنیا کے اخلاق کی تکمیل کروں اور دنیا کو خلیق بنادوں۔ پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ دنیا کو عالم بنادوں اور دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ دنیا کو بااخلاق بنادوں۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم اور تربیت کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔ تعلیم کے ذریعے علم پھیلتا ہے اور تربیت کے ذریعے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی دو غرضیں ہوئیں۔ ایک علم پہنچانا اور ایک اخلاق درست کرنا۔ اس کے بغیر دنیا کی کوئی قوم نہ باقی رہ سکتی ہے نہ ترقی کرسکتی ہے۔

---

① ③ السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵. یہ حدیث ضعیف ہے الضعیفۃ ۱/ ۸۸ رقم ۱۱۔ ② ④ حدیث صحیح ہے مجمع الزوائد باب حسن معاشرۃ ۴/ ۶۱۔

اگر ایک شخص عالم ہے اور اس کا بہت بڑا علم ہے۔ لیکن بد اخلاق ہے، تو اس کا علم کبھی مؤثر نہیں ہوگا، وہ دوسروں کو فائدہ کبھی نہیں پہنچا سکتا اور اگر بہت با اخلاق ہے، نیک خلق ہے، لیکن جاہل ہے، تو محض اخلاق سے وہ دنیا کو تربیت نہیں دے سکتا۔

انسان کی ذات میں علم نہیں ہے...... علم انسان کی ذات میں نہیں ہے، وہ باہر سے لایا جاتا ہے۔ اخلاق اندر موجود ہیں لیکن انہیں درست کیا جاتا ہے۔ تو ایک چیز انسان کے گھر کی ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور ایک چیز سرے سے نہیں ہے۔ اس کو انسان کے اندر ڈالا جاتا ہے۔ تو خلقی طور پر انسان جاہل پیدا ہوا ہے۔ اس میں کوئی علم نہیں تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا اور نکالا۔ کس حالت میں؟ ذرہ برابر تمہیں علم نہیں تھا۔ جاہل مطلق پیدا ہوئے تھے۔ نہ سیاہ وسفید کی تمیز تھی، نہ اچھے برے میں امتیاز تھا، نہ حلال وحرام کا پتہ تھا، بالکل جاہل مطلق تھے، ماں کے پیٹ سے کوئی ہنر لے کر نہیں آئے اللہ نے اپنا فضل کیا۔ ﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ﴾ ② تم میں سننے کی طاقت رکھی، دیکھنے کی طاقت رکھی، سمجھنے اور بوجھنے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات تم سن کر حاصل کرتے تھے۔ کچھ دیکھ کر اور کچھ سنی ہوئی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور وفکر کر کے علم نکالتے تھے۔ اللہ نے یہ طاقتیں تمہارے اندر رکھیں تاکہ علم پیدا کرو، علم کے اندر آؤ۔ علم بھی تمہارے اندر گھسے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ خالی ہے۔ مگر ہاں صلاحیت ہے کہ اگر علم سیکھنا چاہے تو علم آ سکتا ہے۔ اسی لئے انسان کو جاہل کہا گیا ہے۔ جاہل اسے کہتے ہیں جو علم نہ رکھتا ہو، مگر علم لینے کی اس میں صلاحیت ہو۔ اس دیوار کو ہم جاہل نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ اس میں عالم بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لاؤڈ اسپیکر کو ہم جاہل نہیں کہیں گے، اس لئے کہ یہ عالم بن ہی نہیں سکتا یہ شامیانہ اور زمین وآسمان جاہل نہیں ہیں، کیونکہ ان میں عالم بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انسان ہی کو جاہل کہا جائے گا، کیونکہ اس میں عالم ہونے کی صلاحیت ہے، اس میں استعداد موجود ہے۔

تعدیل اخلاق بلا علم ممکن نہیں...... اسی طرح انسان کے اندر اخلاق تو ہیں، مگر جب تک اس میں علم نہیں ہے وہ معتدل اخلاق نہیں ہیں بلکہ انسان یا ایک کنارے پر رہتا ہے یا دوسرے کنارے پر، جب تک علم نہیں آتا وہ درمیان میں اعتدال پر نہیں ہے۔ افراط اور تفریط کے لئے جہالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عدل اخلاق کے لئے ان کو معتدل بنانے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔

مثلاً صبر ایک خلق ہے، تو صبر کا ایک کنارہ جزع فزع ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آئے تو آپے سے باہر

① ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

ہوجائے، گریبان پھاڑ دے، بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، منہ نوچ لے۔ یہ خلق صبر کا ایک کنارہ ہے یعنی انتہائی بے صبری۔ اور دوسرا کنارہ یہ ہے کہ کتنی ہی مصیبتیں آئیں، کوئی اثر ہی نہ ہو۔ اس کے اندر سرد مہری ہو کہ کوئی فوت ہو جائے تو اس کی آنکھ سے آنسو ہی نہ نکلے، دل میں غم تک نہ آئے، جیسے اپنے کام میں لگ رہا تھا، لگا رہے۔ پتھر کی مانند ہو جائے، اس کی طبیعت میں کوئی اثر نہ ہو۔ تو ایک کنارہ جزع فزع ہے کہ اتنا بے صبر بن جائے کہ آپے سے باہر نکل جائے، ایک کنارہ سرد مہری کا ہے کہ اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو۔ وہ بھی صبر نہیں، یہ بھی نہیں۔ صبر درمیان میں ہے کہ اثر تو لے، مگر حدود کے اندر رہے، آپے سے باہر نہ ہو، اسے صبر کہیں گے۔ تو نہ جزع فزع صبر ہے نہ سرد مہری صبر ہے۔ بیچ کا درجہ صبر ہے کہ حدود کے اندر رہے اور حدود جب تک معلوم نہ ہوں، صبر نہیں کر سکتا۔ اخلاق کے لئے علم کی ضرورت پڑی۔ اگر حدود کا علم نہ ہو آدمی صابر نہیں بن سکتا، لیکن افراط وتفریط یعنی رخسارے پیٹنا، منہ نوچ ڈالنا، آپے سے باہر ہونا، اس کے لئے کسی علم کی ضرورت نہیں، جہالت کی ضرورت ہے۔ جتنا ہی جاہل ہوگا، اتنا ہی بے صبرا پن بھی ہوگا، اتنا ہی ماتم نوحہ کرے گا، بین کر کے روئے گا۔ اس لئے کہ اسے حدود کا علم ہی نہیں اور بالکل اثر نہ لے، کتنی ہی اموات ہو جائیں، کتنے ہی غم آ جائیں، اسے فکر ہی نہیں۔ یہ بے فکرا ہے، تو بے فکری کے لئے بھی علم کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے جہالت کافی ہے، لیکن صبر بھی کرے اور حد کے اندر رہے، اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام آئے ہیں تا کہ اخلاق کے اندر درمیان کا راستہ بتلائیں۔

خلقِ صبر کی حقیقت...... مثلاً حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: ”وَاِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاهِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ۔“ (1) اے ابراہیم! تمہاری جدائی اور فراق سے ہم غمزدہ ہیں، ہمارا دل متاثر ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ تو فرماتے تھے کہ صبر کرنا چاہئے، حالانکہ آپ رو رہے ہیں۔ فرمایا: رونا قلب کی رحمت کی علامت ہے۔ میں نے جو کہا تھا صبر کرو، اس کا مطلب یہ تھا کہ بین کر کے مت رو۔ نوحے مت کرو، ماتم مت کرو، رخسارے مت پیٹو، گریبان مت چاک کرو۔ اس لئے کہ یہ بے صبری ہے۔ یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے کہ معاذ اللہ آپ نے یہ فعل ٹھیک نہیں کیا کہ فلاں کو موت دے دی۔ میں آپے سے باہر ہوں، تو میں نے حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کے اظہار سے روکا تھا، اس سے نہیں روکا تھا کہ تم آنسو مت نکالو۔ تمہارے دل میں بھی شفقت نہ آئے۔ یہ تو رحمت کی علامت ہے۔ جس مومن کے قلب میں رحمت نہ ہو اس میں ایمان ہی کہاں ہوا؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک شخص حاضر ہوا۔ اور زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ لوگ بیٹیوں کو زندہ دفن کر

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انابک لمحزونون، ج: ۱، ص: ۴۳۹، رقم: ۱۲۴۱۔

دیتے تھے۔ سینکڑوں بچیاں زندہ دفن کردیں، اس عار میں کہ ہم کسی کے سسر نہ کہلوائیں، کوئی ہمارا داماد نہ کہلوائے۔ وہ شخص آیا، اسلام قبول کیا۔ کسی نے کسی کی موت کی خبر دی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس شخص نے کہا: یارسول اللہ! آپ روتے ہیں۔ میں نے تو اپنی گیارہ لڑکیوں کو زندہ دفن کردیا ہے اور وہ چلاتی رہیں۔ اے باپ، اے باپ پکارتی رہیں، مجھے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ فرمایا: تیرے اندر دل ہے یا پتھر ہے؟ یہ قساوت قلب کی بات تھی۔ مومن اور انسان وہ ہے جس کے اوپر غم کا اثر ہو، جو اثر ہی قبول نہ کرے، وہ دل نہیں، وہ پتھر ہے۔

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی کہ صابر بنو۔ اور صابر بننا کسے کہتے ہیں کہ غم کا اظہار بھی کرو مگر حدود سے مت گزرو۔ یہ جبھی ہوگا جب حدود کا علم ہوگا کہ کہاں تک ہمیں رونا جائز ہے، کہاں تک جائز نہیں ہے۔ کہاں تک غم کرنا جائز ہے، کہاں تک جائز نہیں ہے۔ تو جائز و ناجائز کی حدود بتلانا یہ تعلیم ہے۔ غرض اخلاق درست نہیں ہوسکتے جب تک علم نہ آئے۔

حقیقتِ تواضع...... اسی طرح تمام اخلاق ہیں۔ مثلاً تواضع ہے، اس کا ایک کنارہ تو تکبر ہے کہ آدمی فرعون بن جائے، بڑے بول بولے، اکڑ کر اینٹھ کر چلے۔ دوسرا کنارہ یہ ہے کہ ذلت نفس پیدا ہو جائے۔ بس ہر کس و ناکس کے آگے جھکتا پھرے۔ یہ بھی تواضع نہیں، وہ بھی تواضع نہیں۔ وہ دونوں کنارے ہیں، ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بیچ میں تواضع ہے کہ اپنے نفس کو ذلیل بھی نہ بنائے اور متکبر بھی نہ بنائے۔ ذلت بھی نہ ہو یعنی وقار ہو۔ تکبر بھی نہ ہو یعنی تواضع ہو۔ یعنی اللہ کی خاطر اور اللہ کے سامنے جھکے۔ کسی بڑے کی تعظیم کرے تو لوجہ اللہ کرے۔ خوشامد اور غرض مندی سے نہ کرے، خوشامد اور غرض مندی سے جو تعظیم کرے گا، وہ تواضع نہیں ہوگی، وہ تملق اور چاپلوسی ہوگی۔ اور اگر کسی باکمال کے آگے اللہ کے لئے جھکے وہ تواضع للہ ہو جائے گی، تو نہ تکبر جائز، نہ ذلت نفس جائز۔ دونوں کے بیچ میں تواضع ہے مگر تواضع کے لئے حد کی ضرورت تھی کہ اس حد تک جھکو، اس حد تک مت جھکو اور یہ حدوں کا معلوم ہونا بغیر تعلیم اور انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کے نہیں ہوتا۔

مثلاً سلام کرنا ہے یہ مسلمان کا حق رکھا گیا ہے کہ اسے سلام کرے، لیکن سلام کرنے میں اگر جھک جائے اور اتنا جھکے کہ رکوع کی کیفیت پیدا ہو جائے، یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اس لئے کہ رکوع یہ عبادت کا جز ہے اور غیر اللہ کی عبادت نہیں کی جاتی۔ غیر اللہ کے آگے اتنا جھکنا جائز نہیں ہے کہ عبادت کی صورت پیدا ہو جائے۔

سجدہ کرنا عبادت ہے، غیر اللہ کے آگے سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ عبادت خدا کے لئے مخصوص ہے۔ بندوں کے لئے عبادت نہیں ہوتی، حدیث میں ہے اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ مگر اللہ کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں اس لئے میں نے روک دیا۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آکر سجدہ کیا۔ آپ

نے فرمایا: یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے قیصر اور کسریٰ کا دربار دیکھا وہ بادشاہ اپنے آگے سجدہ کراتے ہیں، وزراء سجدہ کرتے ہیں، ان کی رعیت کے لوگ سجدہ کرتے ہیں۔ یارسول اللہ! قیصر اور کسریٰ سجدہ کرائیں تو اللہ کے رسول بہت باعظمت ہیں، خلق اللہ میں سب سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار آئندہ ایسا مت کرنا، سجدہ صرف اللہ کے لئے زیبا ہے۔ کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں۔ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ ①

تو رکوع و سجود کرنا اور جو بھی عبادت کی چیزیں ہیں، وہ غیر اللہ کے لئے حرام اور ناجائز ہیں۔ اس لئے جو ہیئت عبادت کے قریب بھی آ جائے وہ بھی ممنوع قرار دی گئی۔ تو مخلوق کے آگے ذلیل النفس بننا جائز نہیں ہے۔ اور ایک ہے تکبر کہ مخلوق کے اوپر آدمی اپنی بڑائی جتلانے لگے یہ بھی ممنوع ہے۔ یعنی تکبر بھی ممنوع اور تذلل بھی ممنوع۔ ذلیل بننا بھی جائز نہیں۔ متکبر بننا بھی جائز نہیں۔ ان دونوں کے درمیان میں تواضع ہے۔ تو آدمی جھکے مگر لوجہ اللہ جھکے اور اتنا نہ جھکے جس سے عبادت کی شان پیدا ہو جائے۔ انہی حدود کے بتلانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔

اتباعِ شریعت...... اس سے معلوم ہوا نہ ہم تکبر میں آزاد ہیں نہ تواضع اور وقار میں آزاد ہیں۔ ہم شریعت کی تعلیم کے پابند ہیں۔ وہ جتنا ہمیں جھکا دے گی، اتنا جھک جائیں گے۔ جتنا کہے گی گردن اونچی کرلو، ہم گردن اونچی کرلیں گے۔ جتنا کہے گی ذلت اختیار کرو ہم ذلت اختیار کرلیں گے جہاں کہے گی یہاں بڑائی کی صورت بنالو، ہم بڑائی کی صورت بنالیں گے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ ② اے بندو! خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ مونڈھے ہلا کے، چھاتی ابھار کر متکبروں کی چال مت چلو۔ تم دنیا میں بندگی کرنے کے لئے آئے ہو، خدائی کرنے کے لئے نہیں آئے۔ خدائی کے لئے ایک خدا کی ذات کافی ہے۔ جب ہم بندے ہیں تو بندگی کی چال چلیں۔

اور فرمایا گیا کہ ﴿اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ ③ تم جو اکڑ کر چل رہے ہو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالو گے اور پہاڑوں کی بلندیوں کو نہیں پہنچو گے۔ اتنی جگہ میں رہو جتنی جگہ میں ہو۔ کیوں خوامخواہ مصیبت بھر رہے ہو؟ کیوں اپنے نفس کو تعب میں ڈال رہے ہو؟ اس لئے روک دیا گیا کہ اکڑ کر مت چلو۔ تو دین یہی ہے کہ آدمی اس حکم کو مان کر چلے۔ لیکن اگر کہیں یوں کہیں کہ اکڑ کر چلو تو ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ اس لئے کہ ہم حکم بردار بندے ہیں۔ فرمایا گیا جس طواف کے بعد سعی ہو تو ابتداء کے چار پھیروں میں اکڑ کر چلے،

---

① حدیث صحیح ہے۔ مجمع الزوائد للامام الهیثمی، باب حق الزوج علی المراة، ج: ۲، ص: ۲۱۳.

② ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۷.

سینہ ابھار کر مونڈھے ہلاتا ہوا، پہلوانوں کی طرح چلے۔ تو یہاں اس طرح چلنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ اگر نہیں چلے گا تو گنہگار رہوگا اور عام اوقات میں اکڑ کر چلنے کی ممانعت ہے، اگر چلے گا تو گنہگار رہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو حکم بردار رہنا چاہئے۔ جو شریعت حکم دے، اس کی اتباع کرے۔ اگر کہے کہ اکڑ و تو اکڑ لے۔ اگر کہے کہ جھک جاؤ تو جھک جائے۔ اسلام کے یہی معنی ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدود بتلانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔ مادے انسان میں موجود ہیں، ان کی قدریں بتلانے کے لئے آئے کہ یہ قدر اختیار کرو۔

اسلام نے اخلاقی جواہر کو باقی رکھا ہے...... انسان میں تکبر کا مادہ بھی ہے اور تذلل کا مادہ بھی ہے۔ ذلیل بننے کا بھی ہے، ابھرنے اور اکڑنے کا بھی ہے۔ شریعت نے کسی مادے کو ضائع نہیں کیا، بلکہ کہا کہ باقی رکھو اور جہاں ہم بتلائیں وہاں استعمال کرو۔ تکبر کا مادہ بھی کام آئے گا کہ جب کفار کے مقابلہ پر جاؤ تو خوب اکڑ کر پہلوانوں کی سی ہیئت بناؤ تاکہ ان کے اوپر رعب پڑے۔ اور جب ایمان والوں کے سامنے آؤ تو جھک کر چلو تاکہ تمہاری رحیمی اور کریم النفسی واضح ہو۔ تو دونوں مادوں کو باقی رکھا، ضائع نہیں کیا۔ ٹھکانہ اور مصرف بتلا دیا کہ اس طرح سے استعمال کرو۔ تو اسلام اس لئے نہیں آیا ہے کہ کسی مادے کو ضائع کردے۔ جو اللہ نے پیدا کیا اور خلقی طور پر رکھا ہے، اسے کھودے، بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آیا ہے۔ مثلاً غصہ ہے، حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا: ''عِظْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَاَوْجِزْ'' ① یا رسول اللہ! کچھ وعظ فرمائیے مگر مختصر۔ فرمایا: اِیَّاکَ وَالْغَضَبَ۔ وعظ ختم ہوگیا۔ لوگو! غصے سے بچتے رہنا۔ اس لئے کہ غصے میں سے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جتنے جذبات بھڑکتے ہیں، اتنا ہی فتنہ پھیلتا ہے۔ جب جذبات میں کوئی آپے سے باہر ہوگا، لڑائی ہو جائے گی۔ اور قرآن کریم نے فرمایا ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ﴾ ②

''اے پیغمبر! کفار اور منافقین کے مقابلہ میں جہاد کرو اور شدت اور غیظ وغضب ان کے مقابلہ میں دکھلاؤ''۔ یہاں غیظ وغضب اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ غصے کے مادے کو نکال دے، اس لئے آئی ہے کہ غصے کو باقی رکھو مگر ٹھکانے پر استعمال کرو۔ جہاں ہم بتلائیں وہاں استعمال کرو، جہاں ہم روکیں وہاں رک جاؤ۔ یہ ہمارے بخشے ہوئے جوہر ہیں۔ تمہیں حق نہیں ہے کہ تم انہیں کھو دو یا نکال دو۔

اسی طرح شہوت کا مادہ رکھا۔ شریعت اس لئے نہیں آئی کہ اس کو کھو دو۔ اگر کھودی گئی تو نسل کیسے چلے گی؟ مگر یہ فرمایا کہ اس شہوت کو زنا میں مت استعمال کرو، نکاح میں استعمال کرو۔ تو مصرف اور ٹھکانہ بتلا دیا کہ اس طرح استعمال کرو۔

اخلاقی جواہر میں انسان امین ہے...... حاصل یہ نکلا کہ انسان میں اللہ نے جوہر اور مادے پیدا کئے۔ مگر یہ اس کی

---

① احمد حدیث ابی ایوب انصاریؓ ۵/۴۱۲ ۲۳۹۸۷۔ حدیث صحیح ہے۔ الصحیحۃ ۱/۴۰۰ رقم ۴۰۱۔

② پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۷۳۔

دی ہوئی امانتیں ہیں۔ انسان ان مادوں میں امین ہے۔ اسے یہ حق نہیں ہے کہ اپنے اختیار وارادے اور اپنی تجویز سے استعمال کرے۔ جس کی دی ہوئی امانت ہے اسی کی تجویز معتبر ہوگی۔ اسی کے کہنے کے مطابق استعمال کرنا پڑے گا۔

اگر آپ کے پاس کوئی شخص روپیہ امانت رکھوادے تو آپ کو استعمال جائز نہیں، جب تک کہ وہ اجازت نہ دے۔ اور اجازت دینے والا جو مالک ہے، اگر وہ یوں کہے کہ تم استعمال کر سکتے ہو مگر فلاں چیز میں، مکان خرید سکتے ہو، دوسری جگہ میں اجازت نہیں دیتا۔ جہاں اجازت دے وہیں استعمال کریں گے، اگر وہ استعمال سے روک دے تو آپ کو کوئی حق نہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ امانت جب رکھوائی جاتی ہے تو اس اصل امانت ہی کا واپس کرنا واجب ہے۔ یعنی مثلاً آپ کے پاس سو روپیہ رکھوایا، تو جو روپیہ رکھوایا ہے، وہی بعینہ واپس کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہے کہ آپ نے خرچ کر کے سو اس کی جگہ رکھ دیئے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ تو امانت میں عین کا واپس کرنا واجب ہے۔ اگر آپ خرچ کریں گے تو مالک سے اجازت لینی پڑے گی۔ وہ اجازت دے گا کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔ جب میں مانگوں واپس کردینا۔ اس وقت عین کو بدلا جائے، اس کی جگہ آپ کوئی دوسری چیز دے دیں یہ آپ کے لئے ناجائز ہے۔

غرض یہ بدن، روح، قوتیں اور مادے ان سب کے مالک حق تعالیٰ شانہ ہیں، آپ نہیں ہیں۔ اگر آپ ہوتے تو خود بنے بنائے موجود ہوتے۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ میاں آپ کو بنائیں جب آپ وجود میں ان کے محتاج ہیں تو مالک وہ ہیں۔ جب وہ مالک بدن ہیں اور بدن میں جتنے جوہر ہیں ان کے بھی، روح میں جتنے ملکات اور قوتیں رکھی ہیں ان کے بھی، سب کے مالک وہ ہیں۔ تو آپ کو ان کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ جب تک ان سے اجازت نہ لیں اور جہاں کی وہ اجازت دے دیں وہیں استعمال کرو۔ جب وہ مانگیں گے تو بعینہ اسی طرح سے واپس کرنا پڑے گا۔ یہ جائز نہیں ہوگا کہ آپ یوں کہیں کہ صاحب! وہ بدن تو میں نے استعمال کرلیا۔ میں نے خودکشی کرلی تھی، اب آپ دوسرا بدن بنالیں، یہ نہیں ہے، اسی بدن کو واپس کرنا پڑے گا۔

اس واسطے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا، یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سرکاری مشین ہے۔ آپ کو کیا حق ہے کہ آپ اس کو کھودیں؟ یا خراب کردیں؟ آپ امانت دار ہیں۔ بعینہ آپ کو واپس کرنا پڑے گا۔ جب ملک الموت آئیں تو سپرد کردینا پڑے گا کہ روح بھی حاضر ہے، نفس بھی حاضر ہے اور یہ بدن بھی حاضر ہے۔ اس لئے کہ کوئی چیز میری نہیں ہے۔ تو جب اصل روح، بدن اور نفس کے بھی آپ مالک نہیں ہیں، تو ان کے افعال کے آپ کیسے مالک ہو جائیں گے؟ اور جو ان کے اندر مادے اور جوہر رکھے ہوئے ہیں، ان کے مالک آپ کب ہوں گے؟ ان کے مالک بھی حق تعالیٰ ہیں۔ غرض آپ کے نفس میں شہوت کی قوت رکھ دی، غصہ اور غضب کی قوت رکھ دی، تواضع اور جھکنے کی قوت رکھ دی، اکڑنے اور اینٹھنے کی قوت رکھ دی، امانتداری کی قوت رکھ دی اور اس کی کہ دوسروں سے چھین جھپٹ کرو۔ یہ سارے مادے ہیں۔ آپ کو اجازت لینی پڑے گی کہ کہاں کہاں استعمال کروں۔ شہوت وغضب کو کہاں؟ امانت داری اور چھین جھپٹ کے مادے کو کہاں استعمال کروں؟

انسانی جواہر میں تجویز شریعت کا اعتبار ہے......وہ اجازت دیں گے کہ شہوت کے مادے کو استعمال کر سکتے ہو، مگر نکاح کے ذریعے سے جائز مصرف میں۔ پھر تجویز بھی شریعت ہی بتلائے گی کہ نکاح بھی اگر کرو، تو ماں سے جائز نہیں، بہن سے جائز نہیں، پھوپھی سے جائز نہیں۔

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ﴾ ① ''تم پر تمہاری مائیں حرام کر دی گئیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری حقیقی بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری حقیقی بھتیجیاں، تمہاری حقیقی بھانجیاں، یہ تم پر حرام کی گئیں الخ''۔ جس وقت شریعت نے اجازت دی کہ اس شہوت کو نکاح کے ذریعے استعمال کرو، تو ساتھ ہی مصرف بھی بتلایا کہ فلاں فلاں جگہ نکاح مت کرنا، ورنہ نکاح نہیں ہوگا۔ جہاں شریعت بتلائے گی وہیں آپ نکاح کر سکو گے۔

اسی طرح غصے اور غضب کی قوت ہے۔ آپ اس میں مختار نہیں ہیں کہ جس پہ آپ چاہیں اکڑ، پھونک دکھانے لگیں۔ جس پہ چاہیں غصہ کرنے لگیں۔ آپ کو شریعت سے مشورہ کرنا ہوگا کہ میں غصے کو کہاں استعمال کروں؟ چنانچہ باپ کے مقابلے میں یہ جائز نہیں کہ آپ غصہ دکھلائیں۔ وہاں فرما دیا گیا ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ ② ماں باپ جب آئیں تو نیاز مندی کے ساتھ گردن جھکا دو، عجز و نیاز کے ساتھ ان کے سامنے جھکو اور محض جھکنا ہی نہیں، بلکہ زبان سے کوئی کلمہ ایسا مت نکالو جس سے ان کا دل دکھے یا ان کا دل پکڑا جائے، ایسا کلمہ نکالنا جائز نہیں۔

اور پھر یہی نہیں یہ تو اسی وقت کیا جائے گا، جب ماں باپ سامنے ہوں گے کہ ادب سے جھکیں گے بھی اور کلمہ بھی ادب سے کہیں گے۔ غائبانہ بھی ہوں تو اس وقت بھی ان کا ادب و عظمت کرو۔ ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ ③ اے اللہ! میرے ان ماں باپ پر رحم فرما، جیسے انہوں نے میرے بچپن میں مجھ پر رحم کیا۔ مجھے اتنے سے اتنا بنایا۔ اس وقت جب میں عاجز اور بے بس تھا، ان کے رحم و کرم پر پل کر آج میں اس قابل ہوا کہ چل پھر کر میں اپنا کام کاج کر سکوں۔ تو جنہوں نے مجھے اس قابل بنایا، بے کسی کی حالت میں مجھ پر رحم کھایا۔ اے اللہ! تو ان کی بے کسی کی حالت میں ان پر رحم کھا۔ تو غائبانہ بھی دعاء کرو۔ سامنے آؤ تو برا کلمہ مت کہو، عمل ایسا مت کرو جس سے ان کا دل دکھے۔ تو فرمایا کہ یہ تکبر و بڑائی اور غصے کا اظہار، اس کا مصرف ماں باپ نہیں ہیں۔ اسی طرح استاذ ہو، اس کے سامنے جائز نہیں کہ آپ اکڑیں یا اینٹھیں یا کبر و نخوت دکھائیں۔

عظمت استاذ......حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اَنَا عَبْدُ مَنْ عَلَّمَنِيْ حَرْفًا، اِنْ شَاءَ بَاعَ وَاِنْ شَاءَ عَتَقَ۔'' ④

---

① پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ: ۲۴۔
③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ: ۲۴۔ ④ روایت ضعیف ہے۔ کشف الخفاو مزیل الالباس، للعجلونی، ج: ۲، ص: ۲۶۵۔

''میں اس کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی تعلیم دی۔ چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے مجھے آزاد کردے''۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں، انہیں فقہی مسائل میں خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک مسئلہ میں خنزیر کا ذکر کیا، تو اس کی تحقیق کرنی تھی۔ اس کی تحقیق بھنگی سے زیادہ کسی دوسرے سے نہیں ہوسکتی۔ وہی خنزیر پالتے ہیں، تو حضرتؒ کے گھر کا بھنگی آیا۔ اس سے پوچھا کہ فلاں بات خنزیر کے بارے کس طرح سے ہے؟ اس نے کہا صاحب! یہ ہے۔ اس وقت سے یہ کیفیت تھی کہ جب وہ سامنے آتا اگر بیٹھے ہوئے ہوتے تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔ اس کو ہدایا بھیجتے تھے۔ اس کی خدمت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''فلاں مسئلے کی تحقیق مجھے اس بھنگی سے ہوئی''۔ وہ بمنزلہ استاذ کے بن گیا عمر بھر اس کا ادب کیا۔ تو اسلام نے استاذ کی عظمت یہ بتلائی ہے کہ اگر ایک حرف سکھلا دے، تمہیں آنکھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔

علمی احسان...... اس واسطے کہ اگر کوئی کسی کو چار پیسے دیتا ہے تو آدمی اس کا احسان مانتا ہے۔ اولاد کو آدمی وصیت کرجاتا ہے کہ فلاں آدمی نے میری خدمت کی تھی۔ تم اس کے نیاز مند رہنا۔ چار پیسے کا احسان مانتا ہے، تو علم کا ایک مسئلہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، علم اللہ کی صفت ہے۔ اس سے زیادہ باعظمت چیز کونسی ہوسکتی ہے؟ تو کوئی کسی کو علم سکھلائے اور اس کی عظمت ضروری نہ ہو؟ ایسا محسن کوئی نہیں۔ جو آدمی کو ایک مسئلہ بھی بتلا دے۔ اس نے دنیا و مافیہا اور آخرت کا راستہ درست کردیا۔ پیسے سے اگر کوئی کام نکلے گا تو دنیا کا نکلے گا۔ لیکن علم سے آخرت میں، قبر و برزخ میں، حشر میں اور دنیا میں بھی کام نکلے گا۔ ہر جگہ علم کا سکہ چلتا ہے۔ وہاں آپ کے یہ سونے چاندی کے سکے نہیں چلیں گے مگر مسائل کا سکہ چلے گا۔ حتی کہ جنت میں بھی جاکر مسائل کی ضرورت رہے گی، وہاں بھی آپ علم کے محتاج ہوں گے۔ تو جو شخص آپ کے ہاتھ میں علم کا سکہ دے۔ اس سے بڑھ کر کون محسن ہے؟ جب چار پیسے کا احسان کرنے والے کا آپ احسان مانتے ہیں۔ تو ایک مسئلہ بتلانے والے کا احسان کیوں نہیں مانیں گے؟ اس نے آپ کو زیادہ سے زیادہ بڑی دولت دی ہے۔ علم کی دولت چاندی اور سونے کے دولت سے بدرجہا بہتر ہے۔

علم اور مال میں فرق...... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علم اور مال میں فرق ہے، وہ یہ کہ مال جتنا خرچ کرو، گھٹتا ہے، علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے۔ اگر علم کہیں گھٹ جایا کرتا، تو جو حافظ قرآن شریف پڑھانے بیٹھتا، تو جتنی آیتیں بچوں کو سکھلایا کرتا، خود بھول جایا کرتا۔ اس کا علم دوسرے کے پاس منتقل ہوجایا کرتا۔ حالانکہ جتنا پڑھاتا ہے تو استاذ پرانا ہوجاتا ہے، اس کا علم ترقی کرجاتا ہے۔ غرض علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے، دولت کو جتنا خرچ کرو، گھٹتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ مال کی حفاظت مالک کو کرنی پڑتی ہے۔ چار پیسے ہوں گے تو آپ کو فکر ہے کہیں چور نہ لے جائے۔ تالا لگاؤں، تجوری میں رکھوں، گھر کی کوٹھڑی میں رکھوں اور سو رہے ہیں تو فکر ہے کہ رات کو کوئی چور نہ

آئے۔ تو آپ کو خود مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور علم عالم کی حفاظت کرتا ہے، عالم کو ضرورت نہیں۔ علم خود بتلائے گا کہ یہ خطرے کا راستہ ہے، یہ نجات کا۔ تو علم اپنے عالم کی خود حفاظت کرتا ہے مگر مال اپنے مالک کی حفاظت نہیں کرتا، مالک کو حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ مال آئے گا تو سو مصیبتیں ساتھ لے کر آئے گا کہ حفاظت کرو چور سے اور اس سے وغیرہ وغیرہ۔ اور علم آئے گا تو وہ احسان جتلاتا ہوا آئے گا کہ میں تیرا محافظ ہوں، میں تیری خدمت کروں گا، میں تجھے نجات کا راستہ بتلاؤں گا۔ تو علم جیسی چیز اگر کوئی سکھلائے تو وہ سب سے بڑا محسن ہے کہ اس نے دنیا اور آخرت کا راستہ کھول دیا۔

مال بلا علم...... دولت سے راستے نہیں کھلتے۔ اس سے تو آدمی بہکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں بھی علم ہی کام آتا ہے۔ اگر یہ علم کے مطابق کمائے اور علم کے مطابق خرچ کرے تو دولت کام دے گی اور اگر جاہلانہ طریق سے کمائے، حلال وحرام کا امتیاز نہ کرے اور خرچ کرنے میں حلال وحرام کا امتیاز نہ ہو، تو دولت مصیبت بن جاتی ہے۔

اب تک تو ہم عقیدے سے سمجھتے تھے کہ بھئی دولت کو بے جا طریق سے کماؤ تو مصیبت بن جاتی ہے، مگر آج تو دنیا میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ یعنی جن کے پاس ناجائز طریق سے کمائی ہوئی دولت تھی، آج وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا کے لئے دولت نکلے، جان تو ہماری بچ جائے۔ کوئی پہاڑوں میں چھپا رہا ہے، کوئی سمندر میں ڈال رہا ہے۔ مگر گورنمنٹ ہے کہ کھوج نکال کر ان چیزوں کو نکال رہی ہے۔ تو مالداروں پر ایک عجیب مصیبت گزر رہی ہے۔

یہ اللہ میاں کا فضل ہے کہ اس وقت ہم جیسے لوگ جو یہ کہا کرتے تھے کہ بھئی تھوڑے پیسے کافی ہیں۔ جو غریب یا زاہد تھے، آج انہیں امراء سے کہنے کا موقع ہے کہ بھئی آرام میں تو ہم ہیں۔ تمہاری دولت نے تمہیں فائدہ نہیں دیا۔ ہماری غربت نے ہمیں فائدہ دیا۔

کس نیاید بخانۂ درویش — کہ خراج زمین و باغ بدہ

درویش کے گھر گورنمنٹ کا کوئی آدمی نہیں آئے گا کہ خراج اور ٹیکس ادا کرو۔ وہ کہے گا کہ میرے ہاتھ پلے ہی کچھ نہیں۔ میں کہاں سے ادا کروں۔ وہ آرام سے ہے اور جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ مصیبت میں مبتلا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ۔

ما ہیچ نداریم ، غم ہیچ نداریم — دستار نداریم ، غم پیچ نداریم

ہم کچھ نہیں رکھتے، اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے۔ ہم دستار بھی نہیں رکھتے، پیچ کا غم کہاں سے رکھتے؟ جس پہ دستار ہوگی وہ پیچ وخم کی فکر کرے۔ یہاں تو دستار ہی ندارد ہے۔

جامہ ندارم، دامن از کجا آرم

یہاں کپڑا ہی ندارد ہے تو کلی اور دامن کی فکر کیوں ہوگی؟ بہر حال جو لوگ آج کم یعنی بقدر ضرورت رکھتے

ہیں، وہ آرام میں ہیں اور جو زیادہ رکھتے ہیں، وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مگر کیوں مبتلا ہیں؟ محض زیادہ رکھنے کی وجہ سے نہیں۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم مفلس اور قلاش بنو۔ ناجائز طریق پر زیادہ رکھتے ہو، اس لئے پریشان ہو۔ جس کے پاس جائز طریق سے ہے، وہ آج بھی پریشان نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا جائز راستے پر چلنا ہمیشہ راحت کا باعث ہوتا ہے۔ ناجائز راستہ پر چلنا مصیبت کا موجب ہوتا ہے۔ خواہ وہ قانوناً ناجائز ہو یا شرعاً ناجائز ہو؟ جب کسی ناجائز چیز کا آدمی ارتکاب کرے گا، مصیبت میں مبتلا ہوگا اور جائز وناجائز کیسے معلوم ہوگا؟ علم وتعلیم سے۔ قانون ہی یہ بتلائے گا کہ یہ چیز جائز ہے یہ ناجائز ہے۔ اس طرح مت کماؤ، قانون اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح کماؤ قانون اجازت دیتا ہے۔ تو اس بات کو علماء بتلائیں گے کہ اس طرح کمانا حلال، اس طرح کمانا حرام، اس طرح دولت رکھنا جائز اور اس طرح دولت رکھنا ناجائز ہے۔ تو دونوں قوانین کے وکلاء اور علماء ہیں۔ وہ سمجھائیں گے، وہی بتلائیں گے اور جب آدمی سمجھ جائے گا اور اس قانون کے مطابق چلے گا، اسے کوئی فکر نہیں۔ اس پر نہ گورنمنٹ اعتراض کرے گی نہ اللہ میاں اعتراض کریں گے۔ معلوم ہوا جان بچانے کا ذریعہ علم ہی ہے، دولت نہیں ہے۔ دولت میں جب علم کا دخل آئے گا تو وہ بچانے کی ذمہ دار ہوگی اور اگر جاہلانہ طریق پر ناجائز کمائی ہو تو وہ مصیبت بن جائے گی تو اصل میں نجات دینے والی چیز علم ہے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ① میں تمہیں علم دینے کے لئے آیا ہوں۔ کیونکہ علم ہی نجات دینے والا ہے، دنیا میں اگر تمہیں علم آ گیا اور علم نے بتلایا کہ یہ راستہ ٹھیک ہے اور یہ غلط ہے اور تم اس کے اوپر چلے تو کبھی تمہارے اوپر آفت نہیں ہے، نہ دنیا میں آفت آئے گی نہ قبر وآخرت میں۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے علم پہنچایا اور علم ہی وہ ہے جس سے دولت کی اصلاح ہوتی ہے، نفس کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ آبرو بھی محفوظ رہتی ہے اور علم نہ ہو تو دولت اور نفس بھی کارآمد نہیں۔

جذباتِ نفسانی بلاعلم...... اگر آپ نفسانی جذبات کو بلاعلم کے استعمال کریں گے، مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ آپ بازار میں جا رہے ہیں اور حلوائی کی دکان پر نہایت عمدہ تازہ مٹھائیاں بنی رکھی ہیں۔ جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ میں ہاتھ مارلوں، منہ مارلوں۔ اگر علم ہے تو وہ بتلائے گا کہ غیر کے مال پر ہاتھ ڈالنا جائز نہیں، جب تک اس کی رضامندی نہ ہو۔ لیکن اگر علم نہیں جذبات ہی جذبات ہیں، تو یا آدمی چوری کرے گا یا جھپٹا مار کر وہاں سے بھاگے گا اور دکاندار اس کے پیچھے گالیاں دیتا ہوا اور وہ آگے آگے اس کے ہاتھ میں چار لڈو ہیں۔ دو منہ میں، دو جیب میں رکھ کر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دکاندار نے آکر گردن ناپی اور فوراً پولیس آ گئی معلوم ہوا کہ اس نے ڈکیتی کی اور یہ دکان کے اوپر سے سامان اٹھا کر بھاگا تھا۔ پولیس نے فوراً چالان کیا۔ مقدمہ قائم ہوا، جو مل رہا ہے وہ تھو

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵. حدیث ضعیف ہے الضعیفة ۱/ ۸۸ رقم ۱۱۔

تھوکر رہا ہے کہ بڑا نالائق بڑا نابکار آدمی تھا۔

تو یہ جتنی ذلتیں اٹھائیں کہ گورنمنٹ الگ ناراض، پولیس الگ ناخوش، پبلک الگ ناخوش، دکان والے الگ ناخوش اور گالیاں پڑ رہی ہیں۔ یہ ذلت ورسوائی کیوں ہوئی؟ اس لئے کہ نفسانی جذبات پر عمل کیا تھا اور علم آپ کو تھا نہیں، جاہلانہ طریق پر ایک چیز کو لے گئے۔ لیکن اگر علم کے ساتھ اس سے بھاؤ طے کرتے کہ بھائی کتنے میں دیتے ہو؟ وہ قیمت کہتا۔ قانونی طور پر آپ اسے کہتے کہ بھائی! اتنی نہیں، اتنی قیمت لے لو۔ پھر آپ لیتے تو نہ دکاندار برا کہتا نہ پولیس برا کہتی نہ گورنمنٹ ناخوش ہوتی۔ کوئی آپ کو مشکل نہ ہوتی، پریشانی نہ ہوتی۔ معلوم ہوا محض نفسانی جذبات آدمی کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں۔ لیکن اگر صحیح علم کے ساتھ صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے، یہ جذبات کارآمد ہو جاتے ہیں۔ تو اصل میں علم نجات دینے والا ٹھہرا۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ.'' ① سب سے بڑا عیار دشمن وہ ہے، جو تمہارے دو پہلوؤں کے بیچ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو تمہارا نفس ہے۔ اس کو اگر قابو کرنے میں تم کامیاب ہو گئے ہو تو پھر کوئی مصیبت نہیں۔ لیکن اگر وہ آزاد ہے، تو ہر جگہ وہ مصیبت میں مبتلا کرے گا۔

اس واسطے کہ انسان کا نفس بالطبع جاہل ہے۔ پیدائشی طور پر جاہل ہے اگر آدمی علم حاصل نہ کرے، جاہل ہی پیدا ہوا ہو تو جاہل ہی رہے گا اور جاہل ہے تو جاہلانہ حرکات ہی کرے گا، وہ عالمانہ حرکات کہاں سے کرے گا؟ جب جاہلانہ حرکات کرے گا اور اپنے جذبات پر چلے گا، جبھی ذلت ورسوائی آئے گی۔ تو جس کے ذریعے سے رسوائی پہنچے، وہ دوست ہوتا ہے یا دشمن ہوتا ہے؟ سب سے بڑا دشمن وہی ہے جس کے ذریعے سے آدمی ذلیل ہو، جس کے ذریعے سے مصائب میں مبتلا ہو۔ اس لئے اگر نفس انسانی کو عالم نہ بنایا جائے، اس کے جذبات کو خود رو چھوڑ دیا جائے، تو وہ ہمیشہ گڑھے اور کھائی میں ڈالے گا، آدمی مصیبت میں مبتلا ہوگا۔

نفسِ انسانی کی مثال...... اسی واسطے نفس انسانی کی مثال محققین سرکش گھوڑے سے دیتے ہیں کہ جب سرکش گھوڑے پر سوار ہو تو لگام سنبھال کر بیٹھنا چاہئے۔ اگر لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑا اچھل پڑا۔ معلوم نہیں کس کنوئیں میں لے جا کے گرائے؟ پھر جان بچانی مشکل ہو جائے۔ تو انسان کا نفس بھی جب تک جاہل ہے، اس وقت تک سرکش ہے۔ اس کی لگام سہارنی چاہئے۔ مگر لگام وہی سہارے گا جس کو یہ پتہ ہو کہ لگام کس طرح پکڑنا چاہئے؟ کس طرح سہارنا چاہئے۔ پھر آخر میں علم ہی آ جاتا ہے۔ تو بغیر علم کے نفس سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

اس واسطے تمام انسانوں کے نفس گویا سرکش گھوڑوں کی طرح سے ہیں۔ جب تک ان کے منہ میں لگام نہ ڈالی جائے آدمی آدمی نہیں بنتا۔ بس وہی لگام شریعت ہے، آدمی کو سہار کر چلاتی ہے۔ اگر وہ لگام نکال دی جائے

① حدیث ضعیف ہے۔ کشف الخفاء ۲/ ۱۷۰۔

اور آدمی اس نفس کے اوپر سوار ہو جائے، تو یہ کسی کنویں اور ذلت کے گڑھے میں لے جا کے گرائے گا۔ تو علم انسان کو عزت کی راہ چلاتا ہے اور جہالت ذلت کی راہ پر چلاتی ہے۔ علم وہ دولت ہے جو بڑھتی دولت ہے، اور جہل و نفسانی جذبات یہ وہ ہیں، جو انسان کو گھاؤ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام سے زیادہ محسن کوئی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو علم سکھلانے کے لئے آتے ہیں اور جہالت مٹانے کے لئے آتے ہیں۔

علوم دنیوی کا نفع...... علم دنیا میں بہت سے ہیں اور ہر علم کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ جوتا گانٹھنے کا علم، اس کی بھی ضرورت ہے، کپڑے سینے اور پہننے کا علم ہے، اس کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے، اسے کپڑوں کی بھی حاجت ہے، اسے جوتے کی بھی ضرورت ہے۔ جب آدمی دنیا میں رہے گا، کاروبار کرے گا، اسے سواری کی بھی ضرورت ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ تجارت کا مال و اسباب لے جانے کی بھی ضرورت ہے، اس کے لئے ریل بھی چاہئے۔ ہوائی جہاز بھی چاہئے تو ایسی چیزوں کا علم یعنی سائنس کا علم وہ بھی کارآمد ہے، اس کے بغیر گاڑی نہیں چلتی۔

اسی طرح سے ایک انسان کو صنعت وحرفت کی بھی ضرورت ہے۔ اگر برتن نہ ہوں تو کھائیں کیسے؟ اگر کرسی نہ ہو تو بیٹھیں کیسے؟ اگر چارپائی نہ ہو تو لیٹیں کیسے؟ غرض ان تمام علوم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سارے علوم کہاں کارآمد ہیں؟ موت سے پہلے پہلے کارآمد ہیں اور جب انتقال ہوا، اب نہ ہوائی جہاز کارآمد ہے نہ چارپائی نہ کرسی، کوئی چیز بھی کام کی نہیں رہی۔ بیکار ہیں، اس لئے کہ ان تمام چیزوں کا نفع انسان کے بدن کو پہنچتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز منتقل کرے گا۔ تو آپ کے بدن ہی کو منتقل کرے گا، وہ یہاں سے کراچی پہنچا دے گا۔ روح کو ہوائی جہاز کی حاجت نہیں ہے۔ اگر آپ روح کو آزاد چھوڑ دیں وہ پل بھر میں عرش پر پہنچ جائے گی۔ یہ بدن کی مصیبت ہے جس کی وجہ سے یہ ساری چیزیں ایجاد کرنی پڑتی ہیں۔ جوتا ہے تو آپ کے بدن کی حفاظت کرے گا، کپڑا ہے تو آپ کے بدن کی حفاظت کرے گا۔ غرض یہ چیزیں اس وقت تک کارآمد ہوں گی جب تک بدن موجود ہے اور جب روح نکل گئی، بدن لاشہ بن گیا۔ اب یہ ساری چیزیں آپ کے حق میں بے کار ہیں۔

آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر لندن، کراچی جا سکتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آپ جنت میں پہنچ جائیں یا عرش عظیم کی سیر کر لیں، آسمانوں کی سیر کر لیں، یہ نہیں ہو سکے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں کارآمد اور نافع ہیں، مگر صرف بدن کی حد تک نافع ہیں، روح کو نفع پہنچانے والی نہیں ہیں۔ روح کے اندر پاکیزہ اخلاق پیدا کر دیں۔ یہ ہوائی جہاز کا کام ہی نہیں۔ آپ عمدہ سے عمدہ کپڑا پہن لیں، وہ کپڑا آپ میں صبر، علم اور حیاء پیدا کر دے۔ یہ کپڑے کا کام نہیں ہے۔ آپ اعلیٰ طریق پر پگڑی باندھ لیں اور اس کو خوب نمایاں کریں کہ آپ بڑے باوقار ہیں۔ لیکن قلب میں وقار پیدا نہیں ہوگا۔ پگڑی کا یہ کام نہیں کہ آپ کے قلب میں وقار بھی پیدا کر دے۔ یا پگڑی، جوتا بنانے والا آ کر آپ کے اخلاق کی اصلاح کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا، اس کا کام جوتا بنانے کا ہے۔ جوتا

بنانے سے اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور آدمی اخلاق کا نام ہے تو آخر اخلاق کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے؟ ان تمام چیزوں سے بدن کی اصلاح ہو گئی، مگر روح کی اصلاح کیسے ہو؟

تو جو چیز روح کی اصلاح کرنے والی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کا علم ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، جو اخلاق کی حدود بتلاتا ہے، اخلاقی قدریں سکھلاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے بغیر آدمی، آدمی نہیں بن سکتا۔ آدمی حیوان بن جائے، بکری بن جائے، کوابن جائے، یہ ممکن ہے۔ لیکن انسان بن جائے، یہ بغیر تعلیم انبیاءؑ کے ممکن نہیں۔

مثلاً آپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اڑ گئے اور سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ گئے۔ تو کوے، چڑیا اور کرگس بھی تو اڑتے ہیں۔ آپ نے کونسا کام کیا؟ زیادہ سے زیادہ آپ نے کرگس کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی۔ یہ کوئی انسانی ترقی نہ ہوئی، حیوانیت کی ترقی ہوئی۔ آپ نے اعلیٰ ترین غذائیں کھا کر بدن کو پال لیا۔ تو کتے بلی بھی بدن کو پال لیتے ہیں۔ شیر بھیڑیئے بھی پال لیتے ہیں۔ یہ کونسے کمال کی بات ہوئی؟ زیادہ سے زیادہ آپ نے ذرا عمدہ غذا کھالی اور کتّا ایسی غذا نہیں کھا سکا، مگر عمدہ اور لذیذ تو آپ جب کہیں، جب کتّا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے کہ اوہو! انسان تو پلاؤ کھا رہا ہے اور میں ہڈیاں کھا رہا ہوں۔ اس کو آپ کی غذا سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی آپ کو اس کی غذا سے ہے۔ ہر ایک اپنے مناسب حال غذا کھاتا ہے، آپ بھی ایک حیوان ہیں، وہ بھی حیوان ہے، وہ اپنے مناسب غذا کھا رہا ہے۔ آپ اپنے مناسب کھا رہے ہیں۔ تو کھانے میں دونوں برابر اور شریک ہیں۔ اچھی اور بری غذا، یہ خصوصیات کی بات ہے، لیکن غذا کھانا یہ حیوانیت ہے۔ اس لئے آپ اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بھی کھالیں گے، جب بھی آپ حیوان رہیں گے۔ عمدہ سے عمدہ سرائے میں آپ منتقل ہو جائیں، بدن منتقل ہوگا۔ وہ ایک مادی چیز ہوئی، لیکن اخلاق درست ہو جائیں، ان میں سے کوئی چیز درست نہیں کرے گی؟

علم شرائع...... اخلاق کی درستگی کے لئے تو اللہ نے انبیاء علیہم السلام ہی بھیجے ہیں کہ وہ آدمیوں کو آدمی بنائیں۔ تو سائنس اور فلسفہ اچھے اچھے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اچھے انسان نہیں پیدا کر سکتا۔ اچھے انسان پیدا کرنے والی چیز انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے۔ تو علم سب نافع ہیں۔ مگر ایک نافع مطلق ہے، جو ہر جگہ نفع دے۔ ایک نافع خاص ہے، جو یہاں تو نفع دے، وہاں نفع نہ دے۔ مادی علوم نافع ہیں، مضر نہیں۔ لیکن ایک خاص حد تک نافع ہیں کہ اس دنیا میں نفع دیں گے یا بدن کی حد تک نفع دیں گے۔ آگے نفع نہیں دیں گے۔ لیکن دین کا علم یہاں بھی نفع دے گا، قبر اور آخرت میں بھی نفع دے گا۔ اس لئے کہ اس کا تعلق نفس انسانی سے ہے۔ نفس ہر جگہ قائم ہے۔ یہاں بھی نفس موجود، برزخ و آخرت میں بھی موجود، ہر جگہ نفس ہے، تو اسے ہر جگہ علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے جو علم سارے جہانوں میں کارآمد ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام کا علم ہے، وہ دین اور شرائع کا علم ہے جو حلال و حرام بتلائے۔ اس علم کے سکھلانے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے ہیں۔

باقی جو صنعت و حرفت کا علم ہے یا مادیات کا علم ہے۔ یہ انبیاء کے آنے پر موقوف نہیں ہے۔ اگر ایک بھی

پیغمبر نہ آتا تو آپ کھیتی کر سکتے تھے۔ مکان بنا سکتے تھے، جیسا بھی بناتے۔ آخر یہ جانور جو گھونسلہ بناتے ہیں کیا ان کو کسی نبی نے آ کر تعلیم دی ہے؟ یہ جو شیر، بھیڑیئے اپنے بھٹ بناتے ہیں، تو کیا کسی اسکول میں پڑھ کر آتے ہیں کہ بھٹ یوں بنانا چاہئے؟ سانپ جو اپنی بِل بناتا ہے تو کیا اس کو کسی مدرسہ میں تعلیم دی تھی کہ یوں بنانی چاہئے؟ اس کی طبیعت کا تقاضا ہے، اس کی فطرت نے راہنمائی کی ہے، اسی طرح انسان کی طبیعت میں بھی راہنمائی ہے کہ وہ اپنے مناسب حال مکان بنالے۔ اگر پیغمبر نہ آئیں وہ پھر بھی مکان بنا سکتا تھا۔ یہ طبعی علوم ہیں اور علوم طبعیہ کے اندر نبوت کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام شریعت کی تعلیم دینے کے لئے آئے ہیں۔ شریعت انسان کی طبیعت سے نہیں ابھر سکتی۔ اس لئے کہ شریعت کے معنی ہیں، ''اللہ کی رضا اور نارضا کا پتہ چلانا''۔ کہ اللہ اس سے خوش ہیں، اس سے ناخوش ہیں اور کسی کی خوشی و ناخوشی اس کے بتلائے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔

دو حقیقی بھائی ہوں، ایک ماں کے پیٹ میں دونوں نے پاؤں پھیلائے ہوں اور دونوں پاس بیٹھ جائیں، بلکہ ایک دوسرے کے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں۔ ایک کے دل میں چھپی ہوئی چیز دوسرے کے دل میں نہیں جائے گی جب تک دوسرا خود ظاہر نہ کرے یا بتلائے۔ تو جب دو حقیقی بھائی، ایک نوع کے دو فرد، ایک دوسرے کے باطن کا پتہ نہیں چلا سکتے، جب تک کہ دوسرا اظہار نہ کرے۔ تو اللہ اور بندے میں تو بون بعید ہے۔ وہ نورِ مطلق یہ ظلمت محض، یہ اللہ کے اندر چھپی ہوئی مرضی اور نامرضی کا کیسے پتہ چلا سکتا ہے؟ جب تک کہ حق تعالیٰ خود نہ ظاہر فرمادیں۔

قانونِ شریعت انسانوں تک کیسے پہنچے؟...... اور خود ظاہر فرمانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر اعلان کریں کہ دیکھو اس سے میں خوش ہوں یہ کرو۔ اس سے ناخوش ہوں یہ نہ کرو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ان کی شان سے بعید ہے۔ ایک معمولی بادشاہ ایک حاکم، ایک معمولی ضلع کا کلکٹر جو ہم ہی جیسا انسان ہے۔ اس میں کوئی خصوصیت ہم سے زائد نہیں ہے، اس کو تو عار آتی ہے کہ گورنمنٹ کا کلکٹر خود گھر گھر کہتا پھرے کہ یہ میرا حکم، یہ میرا قانون ہے۔ وہ اپنے نائبین کو تحصیلداروں اور نائب تحصیلداروں کو حکم دیتا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے ہیں کہ منادی کرو۔ اس طرح سے قانون عام ہو جاتا ہے اور جو احکم الحاکمین اور بادشاہوں کا بادشاہ ہو، اس کی شان کے ذرا مناسب نہیں کہ وہ گھر گھر کہتا پھرے کہ یہ میرا قانون ہے۔ وہ اپنے نائبین کو قانون بتلائے گا، جو اس کے اپنے مقربانِ بارگاہ ہوں، وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیں گے۔ پھر وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیں گے، قانون عام ہو جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام نائبینِ خداوندی ہیں، جو مقربانِ بارگاہ ہیں۔ اخلاق میں اللہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ قرب کی اپنے اندر استعداد اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالطبع مقدس اور برگزیدہ پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان کی فطرتوں میں پارسائی اور پاکیزگی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ تو پاک افراد ہیں۔ اس لئے اللہ جو پاک ذات ہے، اس سے قرب کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حق تعالیٰ ان پر اپنا الہام فرماتے ہیں۔ ان پر اپنا علم نازل فرماتے ہیں، وہ اپنے نائبین تک پہنچاتے ہیں پھر وہ اپنے نائبین کو، وہ اپنے ماتحتوں کو، اس طرح سے علم پھیل جاتا ہے۔ تو دین کا علم انبیاء علیہم السلام

کے ذریعے سے اس لئے آیا کہ انبیاء علیہم السلام ہی مقرب تھے۔ وہی بارگاہِ حق سے مناسبت رکھتے تھے، ان پر علم اتارا گیا، ان کے ذریعے سے بالواسطہ ہم تک علم پہنچا۔

ضرورتِ مذہب...... بہر حال اس علم کا حاصل کیا جانا، یہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر آدمی کی نہ روحانیت جاگ سکتی ہے نہ روحانی مراتب طے ہوسکتے ہیں اور نہ اخلاق درست ہوسکتے ہیں۔ اس لئے کہ اخلاق کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہے اور جب تک مذہب و دین نہ ہو، آدمی کے اخلاق کبھی تربیت نہیں پاسکتے۔ مادیات سے تربیت نہیں ہوتی۔ اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا**" ① میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا کو جہالت سے نجات دلاؤں اور لوگ علم میں آئیں، اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں سنور سکتی۔

آج دنیا میں جو دین اور مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلے ہوئے ہیں، یہ اصل میں سب جہالت کے کرشمے ہیں۔ جب آپ کے اندر علم نہ ہو، جہالت ہو، جس کا جی چاہے، آپ کو بہکا دے، جو چاہے کہہ مارے۔ آپ مجبور ہیں، اس لئے کہ خود اپنے اندر کچھ نہیں رکھتے۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ علم حاصل کر کے آپ آگے بڑھیں تاکہ جائز و ناجائز عقیدے کا اچھا برا ہونا آپ کے اندر آجائے۔ اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی کہ سب سے ضروری چیز تعلیم ہے یہ اگر ہے تو سب چیزیں درست ہیں۔ تعلیم نہیں جہالت ہے تو سب چیزیں خراب ہوں گی۔ وقت چونکہ ختم ہو چکا ہے۔ اس واسطے میں ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ شانہ ہم اور آپ سب کو توفیق علم و عمل عطاء فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٦٥.
یہ حدیث ضعیف ہے الضعیفة ١/ ٨٨ رقم ١١۔

یادِ حق

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـا بَعْـدُ:...... فَقَدْقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "مَثَلُ الذَّاکِرِ فِی الْغٰفِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ ① اَوْکَمَاقَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ.

احوال واقعی...... بزرگان محترم! پہلے سے کوئی علم بھی نہیں تھا اور ارادہ بھی نہیں تھا کہ بیان بھی کرنا ہوگا۔ لیکن حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ نماز سے پہلے کچھ نہ کچھ بیان ہوگا۔ ان کی تعمیل حکم کے طور پر میں آپ حضرات کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ کوئی لمبی تقریر یا وعظ اس وقت نہیں ہو سکے گا، بلکہ محض تعمیل ارشاد کے طور پر چند کلمات، اس حدیث کی روشنی میں گزارش کروں گا جو اس وقت میں نے پڑھی۔

تمہید...... یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "مَثَلُ الذَّاکِرِ فِی الْغَافِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ" اس کی تفصیل سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک پیکر، بدن اور جثہ ہے اور ایک اس کی روح، زندگی اور حیات ہے۔ یہ ظاہری بدن جو آپ کو دیا گیا ہے۔ یہ خود مستقلاً انسان نہیں ہے۔ یہ انسان کی محض صورت اور علامت ہے۔ انسانیت اس جثہ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جو روح اور حقیقت کی صورت میں ہے۔ یہ اس حقیقت کی جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہے، محض نمائش اور نمود ہے۔ فی الحقیقت ہماری انسانیت وہی ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔

اگر وہ انسان کے بدن میں سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں چند دن روح کے پچھلے اثرات کے تحت رہے گا۔ جہاں دو تین دن گزریں گے اور زندگی کے جو تھوڑے بہت اثرات سیرایت کئے ہوئے تھے، وہ زائل ہو

---

① مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد ومواضع الصلوۃ، ج:۳، ص:۱۹۵. حدیث صحیح ہے امام بخاریؒ نے بھی اس کے مثل روایت کی ہے۔ دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ج:۲۰ ص:۲۳ رقم: ۵۹۲۸.

جائیں گے یہی بدن گلنا سڑنا اور پھٹنا شروع ہوگا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ مٹی، مٹی میں مل جائے گی، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں مل جائے گی۔ شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس بدن کی شیرازہ بندی اگر کر رکھی ہے تو روح نے کر رکھی ہے۔ روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں۔ باطل محض ہے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ زندگی صورت کا نہیں حقیقت کا نام ہے۔ صورت اس زندگی کی محض نمائش و مظاہرہ اور دکھلاوا ہے۔

روحِ کائنات...... یہی صورت سمجھ لیجئے اس پوری کائنات کی ہے۔ یہ جو ہمارا مختصر بدن ''کائنات'' ہے وہ روح سے زندہ ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے یہ پوری کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے۔ جب تک یہ روح اس کائنات میں موجود ہے، یہ کائنات زندہ کہلائے گی۔ جب روح نکال لی جائے گی، ساری کائنات کا خیمہ آ پڑے گا، درہم برہم ہو جائے گا، ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ یہ روح کیا چیز ہے؟ جو روح انسان کے بدن میں ہے، وہی روح کائنات میں ہے۔ انسانی روح کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ ① اے پیغمبر! آپ سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ ② کہہ دیجئے روح اللہ کا ایک امر ہے۔ ایک حکم اور لطیفۂ خداوندی ہے اس سے یہ کثیفۂ جسمانی سنبھلا ہوا ہے۔ وہ نکل جائے تو کثیفہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح سے پوری کائنات کی روح بھی درحقیقت لطیفۂ ربانی ہے اور اس کا نام ذکر اللہ ہے۔ یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس سے ذکرِ خداوندی منقطع ہو جائے گا۔ جبھی یہ خیمہ آ پڑے گا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ۔'' ③

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا اور سارے شرار الناس رہ جائیں گے جن کے دل میں نہ یادِ حق ہوگی نہ ذکرِ خداوندی ہوگا نہ ان کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہوگی۔ قلوب یکسر بھلا بیٹھیں گے۔ نہ صرف بھلا بیٹھیں گے بلکہ خالی ہو جائیں گے، ذکر مٹ جائے گا یعنی شرار الناس اور بدترین خلائق رہ جائیں گے جن کے بارے میں فرمایا گیا ''لَا یَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَّلَا یُنْکِرُوْنَ مُنْکَرًا'' ④ ''نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے نہ برائی کو برائی''

سڑکوں پر اس طرح سے بدکاری ہوگی جیسے جانور اور بہائم پھرتے ہیں۔ نہ حیا ہوگی نہ غیرت ہوگی۔ جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے۔ اسی وقت قیامت قائم کر دی جائے گی۔ تو قیامت اس عالم

① پارہ:۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ:۸۵۔ ② پارہ:۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ:۸۵۔
③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان فی آخر الزمان، ج:۱ ص:۱۳۱ رقم:۱۴۸۔
④ المستدرک علی الصحیحین للامام الحاکم، کتاب الفتن والملاحم، ج:۴ ص:۴۸۱ رقم:۸۳۴۱۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب توقیر الکبیر ورحمۃ الصغیر، ج:۳ ص:۳۶۴۔

کو ذرّہ ذرّہ کر کے بکھیر دینے کا نام ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، پانی میں مٹی اور مٹی میں پانی، ہوا میں آگ اور آگ میں ہوا سب گڈمڈ ہو کر قصہ درہم برہم ہو جائے گا اور سارا خیمہ دنیا کا آپڑے گا۔ جس طرح روح کے نکلنے سے بدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، اسی طرح پوری کائنات کا شیرازہ اس روح کے نکل جانے سے بکھر جائے گا جس کا نام ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کی روح ذکر خداوندی ہے یادِ حق جب تک موجود رہے گی۔ کائنات کا خیمہ کھڑا ہوا ہے، جب یہ نکل جائے گی کائنات درہم برہم ہو جائے گی، تو ظاہر میں کائنات ہم سے اور آپ سے سنبھلی ہوئی ہے، حقیقت میں اللہ کے ذکر کرنیوالوں سے سنبھلی ہوئی ہے، جب تک یہ موجود ہیں کائنات موجود ہے۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے کائنات ختم ہو جائے گی۔ غرض اس ساری کائنات کا خیمہ یادِ حق اور ذکر کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے...... یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ذکر خداوندی میں مصروف ہے، ہر وقت یادِ حق کرتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اس ذرّے کے مٹنے اور ختم ہو جانے کا وقت ہوتا ہے حدیث میں ہے کہ ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے، جب ذکر ختم ہو جاتا ہے۔ ٹہنیاں خشک ہو کر پتے جھڑ جاتے ہیں تو روحِ نباتی فی الحقیقت یادِ خداوندی ہے جب تک موجود ہے درخت موجود ہے، یادِ حق نہیں ہوگی تو ختم ہو کر مٹ جائے گا۔ اس کے پتے جھڑ جائیں گے، یہ اس کی موت کا وقت ہوگا۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ ذرّہ ذرّہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① کائنات کا کوئی ذرّہ نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ تمہاری زبان اور ہے کائنات کے ذرے کی زبان اور ہے۔ پرندے کی زبان اور ہے۔ وہ اپنی اپنی زبان میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ تم ان کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ اور تم ان کی زبان کو کیا سمجھو گے تم اپنے ہی بہت سے بھائی بندوں کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ ایک پنجاب کا رہنے والا بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ بنگال کا رہنے والا پشتو زبان نہیں جانتا۔ ایک پختونستان کا رہنے والا ترکی زبان نہیں جانتا۔ ترکی کا رہنے والا عربی زبان نہیں جانتا۔ تو جو اپنے بھائیوں کی زبان نہ سمجھے۔ وہ کنکریوں اور پرندوں کی زبان کیا سمجھے گا؟ لیکن زبان سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر آپ نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بنگلہ میں اللہ کو کوئی یاد نہیں کر رہا اور اگر آپ پشتو نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ پشتو میں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہے وہ نام لے گا، ذکر کرے گا آپ بیٹھے ہوئے منہ دیکھیں گے اس لئے کہ آپ اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے آپ ٹیلیگراف کے دفتر میں گئے ہوں گے۔ وہاں جا کے آپ نے تار دیا۔ دو تین روپے فیس کے ادا کئے، تار بابو نے پیتل کی کھونٹی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹ کرنا شروع کر دیا۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴.

آپ نے کہا کہ میں نے تو یہ مضمون دیا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں۔ یہ بیٹھا ہوا کھٹ کھٹ کر رہا ہے، اس کھٹ کھٹ کو اس مضمون سے کیا تعلق ہے۔؟ لیکن آپ کے سامنے تو وہ کھٹ کھٹ آ رہی ہے۔ حقیقت میں اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر میں علوم پہنچ رہے ہیں۔ مگر آپ اس فن سے واقف نہیں اس لئے آپ نہیں سمجھتے یہ اصطلاحات ہیں جن سے ایک شہر سے دوسرے شہر کو مضمون چل رہا ہے۔ اگر آپ اس فن کو سیکھے ہوئے ہوتے اس کھٹ کھٹ کی اصطلاحات سے واقف ہوتے تو آپ کو فوراً پتہ چل جاتا کہ کراچی سے لاہور کی طرف اور لاہور سے ڈھاکہ کی طرف کیا مضمون جا رہا ہے۔ مگر آپ کو اصطلاحات کا علم نہیں اس لئے آپ حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے میرا ابتلایا ہوا مضمون کس طرح پہنچے گا، مگر مضمون آپ کا ہے، اصطلاح اس کی ہے اور وہ دوسری جگہ جا رہا ہے۔

اسی طرح سے ایک پرندہ جب سیٹی بجاتا ہے آپ سمجھتے ہیں وہ سیٹیاں بجا رہا ہے حقیقت میں وہ ذکر اللہ کر رہا ہے، آپ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ طوطا بولتا ہے وہ اللہ کی یاد کرتا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں جیسا کہ آپ اپنے یورپ والے بھائی کی زبان سے واقف نہیں ہیں جو اپنی زبان میں خدا کو یاد کرے گا۔ آپ بیٹھے ہوئے منہ کو دیکھیں گے۔ تو کوئی پرندہ، درندہ، چرندہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو، مگر زبان اس کی ہے، فہم آپ کا نہیں ہے۔ ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو ورنہ وہ تسبیح میں مشغول ہیں۔

حدیث میں ہے کہ سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، جب میل آنا شروع ہوتا ہے ذکر اللہ بند ہو جاتا ہے۔ وہی وقت اس کی فنا کا ہوتا ہے آپ نفرت سے بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں جب تک دھوبی اس کو پاک صاف کر کے نہ لا دے، جب سفید ہو جائے گا پھر ذکر میں مشغول ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جس شخص کو مسجد کا امام بنایا جائے، وہ میلے کپڑوں سے نماز نہ پڑھائے، یعنی ایسے میلے کپڑے جن سے بدبو اٹھنے لگے۔ یوں تو کپڑا اگلے ہی دن میلا ہو جاتا ہے۔ علماء عربیت لکھتے ہیں کہ: "لَذَّةُ الثَّوْبِ لِيَوْمٍ" کپڑے کی لذت ایک دن کی ہوتی ہے۔ اگلے دن سے میل آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا بہت میل تو فوراً شروع ہو جاتا ہے، لیکن ایسا میلا پن کہ پسینہ جذب ہوتے ہوتے زرد رنگ بن جائے، اس میں سے بدبو آنے لگے، اس کا رنگ بھی متغیر ہو جائے، شکل بھی بدل جائے۔ اس وقت امام کو ان کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھانا مکروہ ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ امام فی الحقیقت اللہ کی بارگاہ میں تمام مقتدیوں کا وکیل ہے وہ قابل تعظیم ہے اس میں نفرت کی وجوہ نہ ہونی چاہئیں کہ مقتدی متنفر ہونے لگیں۔ اگر کپڑے غیر معمولی طور پر میلے ہوئے تو مقتدیوں کو خلجان پیدا ہوگا کہ کس بے ڈھنگے آدمی کو آگے لا کے کھڑا کر دیا گیا۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴.

تو جو مقتدی اس کے بے ڈھنگے پن کے خیال میں مشغول ہوں گے اللہ سے انکا کیا رابطہ قائم ہوگا؟ وہ تو امام کی مذمت میں لگے ہوئے ہیں کہ امام عجیب بے ڈھنگا ہے۔ امامت کے لئے کھڑا ہوگیا، بدبو اس میں سے آرہی ہے، رنگ اس کا صحیح نہیں، یہ ہمیں خدا تک کیا پہنچائے گا۔؟ تو امام کے لئے ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو۔ کپڑے بھی صاف ہوں۔ تو ظاہری وجہ تو یہی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو باطنی وجہ یہ ہے کہ سفید کپڑا ذکر اللہ میں مشغول ہوتا ہے امام کے کپڑوں کا ذکر خود امام کی طبیعت کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جب اس کے اردگرد ذکر اللہ کی آوازیں آرہی ہیں اگرچہ وہ کانوں سے نہ سنی جائیں، ان آوازوں سے خود امام کے قلب میں ذکر اللہ کی رغبت پیدا ہوگی اور یادحق تازہ ہوکر وہ اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا تو مقتدی بھی اتنے ہی متوجہ ہو جائیں گے۔

آپ نے تجربہ کر کے دیکھا ہوگا کہ جب آدمی غسل کر کے صاف کپڑے پہنتا ہے تو بے اختیار دل سے الحمدللہ نکلتا ہے طبیعت میں شگفتگی ہوتی ہے اور جب کپڑے میلے ہوتے ہیں تو انقباض اور تشتت دل میں پیدا ہوتا ہے، اللہ کا نام لینا بھی چاہتا ہے تو زبان سے نہیں نکلتا، طبیعت میں انقباض ہے۔ یہ حقیقت میں کپڑے کے ذکر کا اثر ہوتا ہے جو انسانی قلب پر پڑتا ہے۔

اگر سبزے میں بیٹھیں گے ذکر اللہ کی زیادہ توفیق ہوگی جھاڑ پھنکار میں بیٹھیں گے، کم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ سبزہ خود تسبیح میں مشغول ہے۔ اکثر اہل اللہ کو دیکھا گیا ہے کہ دریا کے کنارے سبزے پر جا کر ذکر اللہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول کا ذکر ان کے قلوب کے اوپر موثر ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رک جاتا ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ چلتا ہوا پانی ذکر کی حیات کی وجہ سے درحقیقت زندہ ہے اور جب ٹھہر گیا جسے ماء راکد کہتے ہیں اس میں تغیر آجاتا ہے وہ سڑ جاتا ہے خراب ہو جاتا ہے، تسبیح بند ہو جاتی ہے، تسبیح کا بند ہونا ہے کہ لطافت کی روح اس میں سے کھنچ جاتی ہے، اس کے اندر کثافت پیدا ہو جاتی ہے بہر حال چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے، سبز ٹہنیاں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، کنکریاں تسبیح کرتی ہیں۔ بہر حال تمام چیزیں ذکر میں مشغول ہیں ہم آپ سمجھتے نہیں ہیں۔

مخلوقات کی تسبیح کے بارے میں اہل باطن کا ادراک...... اہل باطن کو کبھی کبھی علم دیدیا جاتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے یہ علم دیا جاتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ یہی تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام کا مقولہ قرآن حکیم میں نقل کیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ① ''اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی ہیں''۔

① پارہ: ۱۹ سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

سلیمان علیہ السلام بتلا دیتے تھے کہ یہ دو کوّے آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں اور یہ دو چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں۔
احادیث میں تقریباً مختلف جانوروں کی اٹھارہ انیس مثالیں دی گئی ہیں اور ان کی تسبیح ذکر کی گئی ہے۔ تیتر یہ کہتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ فلاں کی یہ تسبیح ہے، فلاں کا یہ ذکر ہے۔ تیتر کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اس کی تسبیح یہ ہے کہ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ. ① ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے''۔ یہ ایک نصیحت ہے جو اس کی زبان سے ہر وقت نکلتی رہتی ہے۔
بعض کی یہ تسبیح ہے کہ ''سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَزَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَآئِبِ'' ② پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے زینت دی۔ مختلف عبرتیں اور نصیحتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں مگر ﴿وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ③

کس زبان مرانمی دند با عزیزاں چہ التماس کنم

لوگ میری زبان نہیں پہچانتے تو میں دوستوں سے کیا کہوں۔ پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں تو نصیحت پیش کر رہا ہوں۔ مگر انسان میری زبان نہیں پہچانتے، جن کو حق تعالیٰ علم دیتے ہیں وہ زبان پہچانتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کی بولیوں کا علم جان لیا تھا۔ مگر کسی کالج یا مدرسہ میں پڑھ کر نہیں، اللہ کے الہام سے یعنی بطور معجزے کے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جانوروں کی گفتگو...... جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ جانوروں کی زبان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا حاضر ہوا اور اس شان سے آیا کہ بول رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا۔ فرمایا اس کے مالک کو بلاؤ۔ اونٹ والا بلایا گیا۔ وہ آیا۔ فرمایا۔ یہ شکایت کر رہا ہے تو اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ لادتا ہے اس نے اقرار کیا۔ یا رسول اللہ! بے شک میں اس جرم کا مجرم ہوں۔ فرمایا۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اونٹ خوش ہوتا ہوا واپس ہو گیا۔ تو اونٹ کی زبان کو سمجھ کر اس کی فریاد سنی اور اس کے حق میں فیصلہ دیا۔
اسی طرح حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے کہ کسی دیہاتی کے مکان کے قریب سے گزر ہوا، وہ کہیں پہاڑ میں سے کوئی ہرنی پکڑ لایا تھا۔ اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی، وہ کھونٹی سے بندھ رہی تھی۔ اس نے دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد شروع کی۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیہاتی تجھے پکڑ لایا ہے تو اس کی ملک ہو گئی ہے اس لئے کہ پہاڑ میں جو چیز

① تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۵. ② علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواہ الحاکم عن عائشة وذکرہ فی تخریج احادیث مسند الفردوس للحافظ ابن حجر فی اثناء حدیث بلفظ. ملائکة السماء یستغفرون لذوائب النساء ولحی الرجال ویقولون سبحان الذی زین الرجال باللحی والنساء بالذوائب. اسندہ عن عائشة دیکھئے: کشف الخفاء ج:۱ ص:۴۴۴. ③ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیة:۴۴.

ہوتی ہے، جو اس پر قبضہ کرے وہ اس کی ملک ہو جاتی ہے۔ تو اس کی ملک ہو گئی، میں تجھے کیسے چھوڑ دوں؟

اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! پہاڑی میں میرے دو بچے بلبلا رہے ہیں اور بھوکے ہیں۔ میں ہی انہیں دودھ پلاتی تھی، میرے بچے مر جائیں گے آپ مجھے چھوڑ دیں۔

فرمایا: وعدہ کر کہ تو دودھ پلا کر پھر یہاں آ جائے گی۔ اس نے وعدہ کیا اور حلف دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گلے میں سے رسی کھول دی اس نے جونہی جا کر دودھ پلایا، واپس آ کر پھر وہیں کھڑی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رسی اس کے گلے میں ڈال دی۔

جب دیہاتی آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا تو نے زیادتی کی ہے؟ اس کے بچے بلبلا رہے ہیں تو نے جا کے قبضہ کیا۔ اس کو چھوڑ دے۔ اس نے نصیحت قبول کی اور ہرنی کو آزاد کر دیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کی بولیوں پر مطلع ہوتے تھے۔ تو انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے زبانوں کا علم دیا گیا حتی کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوعِ انسان کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے...... جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام انسانوں کی زبانوں کا علم دیا گیا تھا۔ یہ جو قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے گئے۔ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا يَعْنِيْ عِلْمَ اللُّغَاتِ كُلِّهَا."

آدم علیہ السلام کو ساری لغتیں سکھلا دی گئی تھیں جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جائیں گی وہ ہر زبان سکھلا دی تھی۔ ان کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب نسل مختلف ہوئی اور دنیا میں منتشر ہوئی، کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں آباد ہوا۔ تو وہاں کی زمینوں کی خصوصیات تھیں۔ ایک ایک قبیلے کے اوپر ایک ایک لغت کا غلبہ ہو گیا۔ اس طرح زبانیں الگ ہو گئیں۔ تو ایک نے دوسرے کی زبان کو سمجھنا چھوڑ دیا اور سمجھنے سے محروم ہو گیا۔ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی ظاہر فرمایا ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ ② اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش۔ اور تمہاری زبانوں کا اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ یعنی بنی آدم اس میں مختلف ہیں حالانکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ایک جنس، ایک نوع، لیکن ایک سے دوسرے کی صورت نہیں ملتی، رنگ نہیں ملتا، زبان نہیں ملتی۔ ایک پنجابی بولتا ہے، ایک بنگلہ بولتا ہے، ایک ہندی اور ایک انگریزی بولتا ہے۔ دنیا کے جتنے جاندار ہیں ہر نوع کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ مثلاً طوطا ٹیں ٹیں کرے گا۔ وہ ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا، عربستان کا ہو یا ترکستان کا۔ مور ایک بولی بولے گا چاہے یورپ کا ہو یا ایشیاء یا افریقہ کا ہو۔ کبوتر ایک ہی طرح بولے گا کہیں کا ہو۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲.

لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ ترکی اور طرح سے یورپین اور ایشین اور انداز سے۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک جنس کے سارے افراد ہیں اور زبان الگ الگ ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ یہ قدرت خداوندی کی نشانی ہے۔

انسان کی غفلت...... بہرحال ہر ہر چیز اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے مگر ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے، غرض کنکریاں تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے، چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے، ہری ٹہنیاں تسبیح و ذکر کرتی ہیں۔ لیکن نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں کرتا، غافل ہے، تو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہے، حالانکہ سب سے زیادہ اس کو ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اللہ نے جو نعمتیں اس پر مبذول کی ہیں، کائنات میں اللہ نے وہ کسی کو نہیں عطاء کیں۔ جتنا چہیتا اور پیاری مخلوق انسان ہے۔ کوئی مخلوق کائنات میں اللہ کو اتنی پیاری نہیں ہے۔ تو ساری مخلوقات ذاکر حق ہیں، مگر یہ حق تعالیٰ سے غافل ہے حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اس کو ہونا چاہئے تھا۔ اس کے اوپر انعامات کی بارش ہے۔

ساری کائنات انسان کی غذا ہے...... ہر چیز کا لباس اس کی کھال ہے۔ اس کو الگ لباس دیا گیا۔ رنگ برنگ کا لباس، رنگ برنگ کے کپڑے۔ ہر نوع کی غذا ایک ہے۔ کوئی نوع گھاس کھاتی ہے، کوئی نوع دانہ کھاتی ہے، کوئی پتے چباتی ہے، کوئی مٹی کھاتی ہے، کوئی ہوا چوستی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا ہر چیز اس کی غذا ہے۔ گھاس یہ کھائے، پھونس یہ کھائے، پتے یہ کھا جائے، چونا یہ کھائے، مٹی یہ کھائے، چاندی یہ کھائے، سونا یہ نگل لے، جواہرات اس کے پیٹ میں جاتے ہیں۔ غرض جمادات، نباتات اور حیوانات ساری چیزیں اس کی غذا ہیں۔ تانبے اور سونے کے ورق نگل جائے گا، چاندی سونا کا کشتہ کھا جائے گا۔ یاقوتیاں اس کی طاقت کے واسطے بنتی ہیں۔ مٹی یہ کھاتا ہے۔ یہ چونا آخر مٹی پتھر نہیں تو اور کیا ہے؟ کتھ یہ کھائے، پتے یہ کھائے، سبزیاں یہ کھائے۔ دنیا بھر کی چیزیں اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا اور پوری کائنات اس کی غذا۔

ساری کائنات انسان کی سواری ہے...... ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ اس کو سواریوں پر اٹھا کے چلایا گیا۔ حیوانات اس کی سواری میں ہیں، ریلیں جو چلتی ہیں وہ حیوانات کی قسم میں سے نہیں ہیں وہ جمادات میں سے ہیں اس کی سواری بنتی ہیں، گھوڑا، اونٹ، بیل یہ سب اس کی سواری بنتی ہیں تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار جمادات کے سروں پر یہ سوار اور نباتات اس کی سواری میں ہیں۔

سمندروں میں یہ سواری کر جائے، ہوا میں یہ سواری کر جائے، زمین کی پشت پر یہ سواری کر جائے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو سواری دی گئی ہو۔ ہر ایک اپنے پیر سے چلنے پر مجبور ہے اس کو مقرب اور معظم بنایا گیا ساری کائنات اس کی سواری بن گئی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے......اور ساری کائنات اس کا لباس کہ درختوں کی چھال سے یہ لباس

بنائے، روئی سے یہ لباس بنائے، جانوروں کی کھال کھسوٹ کر یہ لباس بنالے۔ اب سنا ہے کہ شیشے کے کپڑے چلنے والے ہیں۔ لکڑی اور کھال کے کپڑے بننے لگے ہیں۔ غرض ساری کائنات اس کا لباس، ساری کائنات اس کی غذا، ساری کائنات اس کی سواری۔ اللہ کے یہاں اتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات کو اس کی خدمت پر لگا رکھا ہے کہ کھانے کو آئے تو سر تسلیم خم کردے کہ کھالینے دو۔ لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس کو لباس بنانے دو۔ سواریاں بنائے تو سر جھکادو کہ سوار ہو کر جائے، تو ساری چیزوں سے زیادہ اس کو ذاکر بننا چاہئے تھا مگر سب چیزوں سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے پتھر بھی ذکر میں لگ جاتا ہے۔

انعامات کا تقاضا کیا ہے؟...... پتھروں کی شان یہ ہے کہ ﴿یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ ① اور کچھ نہیں تو پتھر رو پڑتے ہیں۔ ان سے پانی بہہ پڑتا ہے اور کچھ نہیں تو پتھر اوپر سے نیچے آپڑتا ہے یہ اس کی تواضع اور انکساری کی بات ہے۔ لیکن اگر فرعونیت اور کبر بھرا ہوا ہے تو انسان میں بھرا ہوا ہے کہ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا اور گرتا ہے۔ حالانکہ پتھر گر بھی پڑتا ہے اور پانی بھی بہادیتا ہے تو سب سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے حالانکہ اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس پر انعامات کی بارش ہے۔

حقیقتِ زندگی...... اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے، تو ذکر کرنیوالا غافلوں میں ایسا ہے جیسے مردوں میں زندہ بیٹھا ہو۔ اگر ایک بھرا مجمع غافلوں کا ہو، ایک اللہ کی یاد کرنے والا موجود ہے وہ ایسا ہے جیسے مردوں کے مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہوا ہو۔ اس لئے کہ زندگی نام بدن کا نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی زندگی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مرجائے ۔۔۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام دل کی زندگی کا ہے اور دل کی زندگی اللہ کی یاد سے ہوتی ہے۔ روٹی اور ٹکڑے سے نہیں ہوتی۔ یہ بدن کی زندگی ہے جو روٹی سے ہوتی ہے۔ یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں دیر ہو جائے بدن مرجھانے لگتا ہے اور منقطع ہو جائے تو بدن چھن جاتا ہے۔ لیکن قلب کی زندگی دوامی ہے۔ اس لئے کہ ذکر اللہ جو زندگی پیدا کرتا ہے وہ دوامی زندگی ہوتی ہے وہ نفس کے اندر قائم ہو جاتی ہے۔

ذاکر انسان کا مقام...... تو فرمایا گیا ذکر کرنے والے کی مثال غافلوں کے اندر ایسی ہے جیسے مردوں کے اندر کوئی زندہ بیٹھا ہوا ہو تو انسان اگر ذاکر بنے گا تو سارے ذاکروں پر بڑھ جائے گا اور اگر غافل بنے گا تو سب سے زیادہ بدتر ہو جائے گا۔ حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذکر کرتا۔ اور یہ غافل بن گیا پھر پتھر بھی اس سے اچھا، جانور بھی اس سے اچھے، درخت کی ٹہنیاں بھی اس سے اچھیں کیونکہ سب ذکر میں مشغول ہیں۔ یہ سب سے زیادہ ذلیل اور بدتر ہے اور اگر ذکر پر آجائے تو ہر ذاکر اس سے نیچے ہے اس لئے کہ اس کا ذکر جامع ہوگا جو اور انواع کو میسر نہیں ہے۔ تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے غذائے روحانی ذکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷۴.

زندگی کی حقیقی غذا...... انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی غذائیں قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ قوت ان میں یادِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے امت کو ممانعت فرمائی کہ صوم وصال مت رکھو یعنی بلا افطار کئے روزہ پر روزہ مت رکھو۔ سحر بھی کھاؤ، افطار بھی کرو، کھا پی کر اگلا روزہ رکھو۔ بلا کھائے پیئے روزے پر روزے رکھتے چلے جانا اس کو صوم وصال کہتے ہیں اس سے آپ نے ممانعت فرمائی۔ اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صوم وصال رکھتے تھے پندرہ پندرہ دن آپ کا مسلسل روزہ ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمیں تو آپ نے ممانعت فرمائی اور خود حضور صوم وصال رکھتے ہیں۔ فرمایا: ''اَيُّكُمْ مِثْلِي يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ'' ① تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے، یہ کھانا اور پلانا کیا تھا؟ یہ پلاؤ اور زردے کے دسترخوان آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ یہ ذکر اللہ اور یادِ حق غذا تھی جو روح میں پیوست تھی۔ اس سے روح زندہ تھی اور روح سے بدن زندہ تھا تو اللہ کا ذکر جب رگ و پے میں سما جاتا ہے تو غذاؤں کی حاجت کم ہو جاتی ہے تو زندگی کا دار و مدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو دار العلوم دیوبند کے بانی ہیں کہ اخیر عمر میں انتقال سے چند ماہ پیشتر یہ فرمایا کہ: ''اب بحمد اللہ بقائے حیات کے لئے مجھے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی ہے۔ محض اتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں۔ زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی''۔ غرض جب ذکر اللہ رگ و پے میں رچ بس جاتا ہے تو پھر زندگی کا دار و مدار روٹی پر نہیں ہوتا ذکر پر رہ جاتا ہے۔ ذکر اللہ سے آدمی زندہ ہوتا ہے۔ قوتِ روحانی سے اس کی حیات اور بقاء ہوتی ہے تو اصل زندگی فی الحقیقت یادِ حق کا نام ہے۔

محبوب کے فراق و وصال کے آثار...... بلکہ یوں کہنا چاہئے زندگی نام ہے نامِ محبوب اور وصالِ محبوب کا۔ محبوب کا نام آتا ہے تو محب اور عاشق میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی کی محبت میں گرفتار ہے اور رات دن اس کے دھیان میں غرق ہے اور محبوب اس سے جدا ہو جائے۔ یہ فراق میں پڑا ہوا گھل رہا ہے گھلتے گھلتے چارپائی کو لگ گیا ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی کھانا بھی چھوٹ گیا، پینا بھی چھوٹ گیا، چارپائی پر پڑا ہوا ہے فکرِ محبوب میں ہر وقت گرفتار ہے ایسے وقت کوئی آ کر کہہ دے کہ وہ آ گیا تیرا محبوب۔ ایک دم اٹھ بیٹھے گا کہاں ہے؟ کس نے کہا؟ یہ جان اس کے اندر کہاں سے آئی؟ کیا اس نے کوئی روٹی کھائی یا کوئی یاقوتی کھائی؟ محبوب کا نام ہی تو آیا مردہ اٹھ کر زندہ ہو گیا۔ معلوم ہوا زندگی نام ہے کسی محبوب چیز کے وصال کا۔

اب اگر کسی کو روپے پیسے سے محبت ہوگئی۔ جب تک اس کے سامنے روپے پیسے کا نام آتا رہے گا اس میں زندگی ہے اگر منقطع ہو جائے تو اس کی جان پہ بن جائے گی، بعض آدمی جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو ہارٹ فیل ہو جاتا

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال، ج: ۲ ص: ۲۹۴ رقم: ۱۸۶۴.

ہے۔اس لئے کہ محبوب چھن گیا۔زندگی ختم ہوگئی۔

یا اگر کسی کو کسی عورت سے محبت ہوجائے جب تک وہ پاس موجود ہے وہ زندہ ہے، جب چلی جائے تو فراق میں گھل کر جان دیدے گا۔غرض وصال محبوب کا نام زندگی ہے۔کسی کا محبوب دولت، عورت یا عزت ہے۔جن کا محبوب اللہ رب العزت ہے وہ اس کے نام سے زندہ ہیں جب تک ذکرِ حق ہے، ان میں زندگی ہے۔جب ذکر ان سے منقطع ہوجائے، ان کی موت ہوجاتی ہے۔جن کا دل پروردگارِ حقیقی سے اٹک چکا ہے ان کی زندگی جبھی ہے کہ وہ ہر وقت ذکر اللہ کئے جائیں، نام حق لئے جائیں۔جب اس میں کمی آجائے گی، یوں محسوس ہوگا کہ ہم ختم ہوگئے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　گرز باغ دل خلال کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں، غم کا پہاڑ اس کے دل پر ٹوٹ پڑتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ باغ دل میں سے ذکر اللہ کا کوئی خلال کم ہوگیا ہے تو ایک ذاکر کے لئے موت کے برابر ہوجاتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ اب میں زندہ نہیں ہوں۔

ذاکرین کے اوپر بعض اوقات قبض طاری ہوتا ہے اس قبض کا اثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہمارے اندر ذکر اللہ باقی نہیں ہے اور حق تعالیٰ سے جو تعلق تھا اس میں کمی آگئی۔تو بعض اوقات قبض زدہ لوگوں نے خودکشی کر لی۔اگر سنبھالنے والے موجود نہ ہوں مربی نہ سنبھالے تو قبض کی حالت میں خودکشی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز فرما دیئے گئے اور پہلی وحی آئی کہ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ① اس کے بعد میں وحی منقطع ہوگئی۔ایک عرصہ وحی کا انقطاع رہا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ایک غم اور گھٹن طاری ہوئی۔آپ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں، کہ اب زندگی کس کام کی جب وہ شے باقی نہیں جس سے محبت ہے۔حتیٰ کہ یہ ارادہ کر کے پہاڑ کے اوپر آئے کہ اپنے کو نیچے گرادوں، تو پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ گر پڑوں تو پیچھے سے کسی نے آواز دی یا محمد! آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی موجود نہیں تھا۔یہ قبض کی کیفیت جب طاری ہوتی ہے تو موت کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔سالک یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی ختم ہوگئی۔غرض زندگی ذکر اللہ، یادِ حق اور یادِ خداوندی کا نام ہے۔ہم چونکہ رات دن اس کھانے پینے اور پہننے میں مشغول ہیں۔اس لئے ہم نے زندگی اسی کو سمجھ لیا ہے، ہم اس کوچے سے نابلد ہیں جو حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے جو اس کے اندر آگئے ان کی سمجھ میں آگیا کہ حقیقی زندگی یہی ہے۔

تو اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مَثَلُ الذَّاكِرِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَمَثَلِ الْحَيِّ فِي الْأَمْوَاتِ" ② ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ ایک زندہ مردوں کے اندر بیٹھا ہوا ہو تو غفلت مردنی ہے اور ذکر زندگی ہے۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۔ ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد و مواضع الصلوۃ، ج: ۳، ص: ۱۹۵۔

ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ...... پھر اس کا عجیب اور عظیم ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانون مکافات ہے، جیسے انسان خود کرتا ہے، ویسا ہی ادھر سے معاملہ ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ① اگر تم اللہ کی مدد کرو گے، اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور فرمایا: مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآءَهٗ ② جسے یہ پسند ہے کہ میں جلد اللہ سے جا ملوں۔ اللہ کو یہ پسند ہے اور انتظار ہے کہ کب میرا بندہ مجھ سے آ کر ملے گا، جو ادھر سے معاملہ وہ ادھر سے معاملہ۔ اور فرماتے ہیں ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ③ مجھے یاد کرو میں تمہاری یاد کروں گا۔ اگر تم ذکر اللہ کرو گے تو میں تمہارے نفس کا ذکر کروں گا۔

حدیث (قدسی) میں فرمایا گیا کہ: اگر بندہ تنہائی میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اپنے نفس میں اسے یاد کرتا ہوں جو بھرے مجمع میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اسے ملائکہ کے مجمع میں یاد کرتا ہوں جس نوع کا یہ ذکر کرے گا اسی نوع کا وہاں ذکر ہوگا۔ تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے، انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔ ادھر سے اس نے ذکر کیا ادھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا تو مذکور بن گیا۔ اس لئے اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے ہاں میرا تذکرہ رہے تو یہ اللہ کا تذکرہ شروع کر دے۔ جتنا یہ یاد کرے گا اتنا ہی وہ یاد کریں گے۔

دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم، وزیر اعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں آپ کا تذکرہ آجائے اور آپ سن پائیں کہ آج پریذیڈنٹ نے میرا ذکر کیا تھا تو عزت وافتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔ اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج پریذیڈنٹ نے ہمارا تذکرہ کیا ہے۔ اس لئے کہ ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے مجھے یاد کر لے تو یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔

حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے یہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ تھوڑے فخر کی بات ہے؟ یہ تھوڑی عزت کی چیز ہے کہ اللہ کسی کو یاد کرے؟ اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب تم یاد کرو گے؟ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ④ غرض اگر کوئی یوں چاہتا ہے کہ میری یاد وہاں قائم ہو جائے، وہ اس کی یاد کو اپنے اندر قائم کر لے۔ اگر یہ ہر وقت ذکر کرے گا۔ وہاں بھی ہر وقت ذکر ہوگا یہ غافل بن جائے گا تو وہاں بھی غفلت برتی جائے گی۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ⑤ تم ایسے مت بنو کہ اللہ کو بھلا دو۔ تو تم اپنے نفس کو بھلا دو گے تو اللہ بھی تمہیں بھلا دے گا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جو لوگ قرآن کریم یاد کر کے اسے بھول جائیں تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس بندے کو نابینا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا ﴿رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا﴾ ⑥ اے رب! مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں بینا تھا؟ میں تو دیکھنے والا تھا؟ ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ ⑦ ہم نے اپنی آیتیں تیرے سینے میں ڈالی

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۷. ② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...... ج: ۲۰، ص: ۱۲۵، رقم: ۲۰۲۶. ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲. ④ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲.
⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹. ⑥ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۵. ⑦ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۶.

تھیں تو نے انہیں بھلا دیا، ہم نے تجھے بھلا دیا تو اگر یہ نسیان کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی نسیان کا برتاؤ ہو جائے گا۔ یہ ذکر کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی ذکر کا برتاؤ ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ شانہ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ:

اے بندے! تو اپنی تندرستی کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری بیماری کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو اپنی تونگری کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مفلسی کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ بیماری کے وقت میں تجھے یاد رکھوں جب کوئی تیرا یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ تو اپنی دنیا میں مجھے یاد رکھ تا کہ قبر میں میں تجھے یاد رکھوں۔ جو یہاں یاد کرے گا، یہ یاد وہاں کام دے گی۔ جو یہاں بھول جائے گا، وہ وہاں بھی کسمپرسی کے عالم میں ہوگا۔

یادِ حق کا احساس...... اس لئے ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ انسان کی بھی روح ہے بلکہ انسان کی روح کی روح ہے۔ اگر ذکر منقطع ہو جائے تو روح پر مردنی چھا جاتی ہے اگر احساس ہو فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزاروں دھبے ڈال دو احساس نہیں ہوگا کہ اس پر بھی کوئی دھبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تو ہے ہی سیاہ اور سفید کپڑے پر ذرا سا دھبہ لگا دو، وہ نمایاں ہوگا اور محسوس ہوگا۔ تو جن کے قلوب میں غفلت رچ چکی ہے۔ ان میں اگر دس غفلتیں بڑھ جائیں احساس نہیں ہوگا۔ کیونکہ دل غفلتوں میں رنگا ہوا ہے، لیکن یاد کرنے والا منٹ بھر غافل ہوا سے احساس ہوگا کہ پتہ نہیں کیا چیز میرے اندر سے چھن گئی۔

اس لئے ذکر اللہ کا احساس پیدا کرنا چاہئے زندگی یہی ہے۔ زندگی فی الحقیقت شیرازہ بندی کا نام ہے، اور موت شیرازہ بکھر جانے کا نام ہے اس بدن میں آج پانی مٹی ہوا آگ جمع شدہ موجود ہیں کہا جائے گا کہ زندہ ہے۔ قبر میں جا کے ریزہ ریزہ ہو کر اجزاء بکھر جائیں گے کہا جائے گا کہ مردہ ہے تو ذکر اللہ روح کو بدن سے ملائے رکھتا ہے اور بدن کے اجزاء کو جمع رکھتا ہے۔ تو ذکر اللہ انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہے۔

یادِ حق کا اصل طریق...... اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی اور مقصد یہ نہیں تھا کہ کوئی لمبی تقریر کی جائے مقصد صرف اس حدیث کی تشریح اور ترجمہ تھا کہ ذکر اللہ کی عادت ڈالی جائے اور اس کے تین طریقے ہیں۔ سب سے پہلا طریقہ جو اصل اور بنیادی ہے وہ فرائض کی ادائیگی ہے۔ سب سے بڑا ذکر، اللہ کے فرائض میں نماز ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ ① نماز قائم کرو میری یاد کے لئے۔ معلوم ہوا کہ نماز ذکر اللہ اور یادِ حق ہے۔

حج کے بارے میں جگہ جگہ فرمایا گیا ﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ ② حج کے ایک ایک رکن پر کہیں ذکر اللہ، کہیں استغفار، کہیں توبہ، کہیں یادِ حق ان سب کا

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۸، ۱۹۹۔

مقصد ذکر ہے نماز کا مقصد بھی ذکر ہے۔

زکوٰۃ اور صدقات کا مقصد بھی فی الحقیقت ذکر ہے فرمایا ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ ① جو تم قربانیاں کرتے ہو اس کا گوشت پوست اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ ذکر اللہ یادِ حق پہنچتی ہے جو قربانی کے وقت نام لیتے ہو اور قلب میں نیت کرتے ہو۔ وہ چیز اللہ تک جاتی ہے۔ یہ اس کی علامت ہے۔ بہر حال قربانی ہو، زکوٰۃ ہو، حج ہو، نماز ہو ان سب کی روح ذکر بتلائی گئی ہے تو ذکر کرنے کا بنیادی طریق فرائض شرعیہ کی ادائیگی ہے۔ یہ اصل ذکر ہے۔

ذکرِ مؤقت...... لیکن اصل ذکر کے ساتھ ساتھ امر کیا گیا ہے کہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا﴾ ② اے لوگو! اللہ کی یاد کرو ذکر کثیر کے ساتھ۔ تو ایک ذکر اصل ہے وہ فرائض ہیں اور ایک ذکر زائد اور ذکر کثیر ہے، وہ اس سے اوپر ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں ایک موقت، ایک غیر مؤقت۔ مؤقت تو یہ ہے کہ صبح اور شام کا وقت مقرر کر کے کچھ تسبیح اور تہلیل کر لیا کرے۔ صبح کی نماز کے بعد بیٹھ گئے۔ فرض کیجئے آپ نے سو مرتبہ کلمہ تمجید پڑھ لیا۔ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ'' سو مرتبہ استغفار پڑھ لیا، سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا۔ اسی طرح شام کو پڑھ لیا: ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ ③ فرمایا! اللہ کی تسبیح کرو کچھ صبح کو، کچھ شام کو کچھ دوپہر کو ﴿وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا﴾ ④ صبح اور شام اللہ کی تسبیح کرو۔ تو یہ مؤقت طریق ہے کہ ایک وقت باندھ کر آدمی کچھ تسبیح پڑھے، سو مرتبہ نہ ہو تینتیس مرتبہ پڑھ لے اتنا نہ ہو کچھ کم کر لو۔ مگر ایک عدد اور وقت معین کر کے اس کو نبھادے۔

حدیث میں ہے ''خَیْرُ الْاُمُوْرِ مَادِیْمَ عَلَیْهِ'' ⑤ بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی اور دوام برتا جائے۔ جو قلب میں جڑ پکڑ لیتا ہے رسوخ پیدا کر لیتا ہے۔ پہاڑ کی ایک چٹان ہے اس پر گرد پڑ گئی ہے۔ آپ نے لاکھوں من پانی بہا دیا۔ گرد دھل گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چڑھ جائے گی۔ تو منوں پانی بہا دینے سے ظاہری صفائی آ جاتی ہے۔ مگر چٹان کے اندر نمی نہیں پہنچتی، لیکن اگر آپ ایک قطرہ برس دن تک گراتے رہیں تو پتھر میں بھی سوارخ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا تھوڑا عمل ہو۔ اس سے قلب میں جڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ایک دن پچاس نمازیں پڑھ لیں لیکن پھر ایسے غائب ہوئے کہ برس دن تک غائب رہے تو گرد دھل جائے گی، اجڑ جائے گا لیکن قلب میں کوئی ملکہ، کوئی بنیاد، کوئی جڑ قائم نہیں ہوگی۔ تو تھوڑا عمل ہو مگر دوام کے ساتھ ہو وہ کارآمد ہوتا ہے دل میں

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۷۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۱۔

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۷، ۱۸۔ ④ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ ۴۲۔

⑤ الحدیث اخرجه الامام الترمذی ولفظه: کان احب العمل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم مادیم علیه، کتاب الادب، باب ماجاء فی الفصاحة، ج: ۱۰ ص: ۷۸ رقم: ۲۷۸۳۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے حوالہ ہذا۔

ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جڑ قائم ہو جاتی ہے۔ بہر حال سو مرتبہ نہ ہو بالکل تھوڑا ہی عدد ہو مگر ایک وقت مقررہ پر نام حق لیا جائے، کچھ تلاوت کرلی، کچھ تسبیح، کچھ تہلیل خواہ دس منٹ ہو مگر آدمی اس کا پابند ہو جائے، چالیس دن کے بعد خود محسوس ہوگا کہ میرے قلب کے اندر کیا اثر قائم ہوا۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کسی عمل کو چالیس دن خلوص کے ساتھ مسلسل کرے تو قلب میں سے حکمت کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ یادِ حق کی ایک بنیاد قائم ہو جاتی ہے جس کی جیسی مناسبت ہے ویسی معرفت اس کو شروع ہو جاتی ہے تو ذکر کثیر کی ایک صورت یہ ہے کہ مقررہ وقت پر آدمی کچھ اللہ کا نام لے۔

ذکر غیر مؤقت...... دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقررہ طریق پر آدمی یہ عادت ڈالے کہ اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام نکلتا رہے۔ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ سُبْحَانَ اللّٰـهِ، اَللّٰـهُ اَكْبَرُ وغیرہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے چلتے ہوئے کھڑے، وضو سے بے وضو کوئی قید نہیں۔ مہینہ دو مہینہ تو تکلف کر کے عادت ڈالنی پڑے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی تو بے اختیار اللہ کا نام زبان سے جاری ہوگا۔ کوئی حادثہ پیش آئے گا۔ (خدانخواستہ) مثلاً آپ گر پڑے فوراً اِلَّا اللّٰہُ، بِسْمِ اللّٰہِ کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان سے نکلے گا۔ یہ نہیں نکلے گا کہ لوگو دوڑو، مجھے بچاؤ، اللہ کا نام نکلے گا۔ ابتداً تکلف کرنا پڑے گا۔ جب عادت پڑ جائے گی تو پھر بغیر ارادہ ذکرِ حق زبان سے شروع ہو جائے گا۔

ذکر غیر مؤقت کا ثمرہ...... اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرتے وقت بھی بلا ارادہ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہوگا۔ خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ." "تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہوگی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے"۔

اگر اللہ کے نام کی مشق پر زندگی گزاری ہے تو موت کے وقت یقیناً اللہ کا نام زبان پر جاری ہوگا اور جب آدمی اللہ کا نام لیتا ہوا مرے گا تو قبر سے جب اٹھے گا وہی نام اس کی زبان پر جاری ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں درحقیقت موت میں ہوں اور اللہ کا نام لے رہا ہوں بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ تو میدانِ حشر ہے۔

آدمی کو جب عادت پڑتی ہے تو غیر ارادی طور پر وہ چیز جاری ہو جاتی ہے جس کی عادت ہوتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر عبادت ابتداء میں ریاکاری ہوتی ہے دکھلاوا ہوتا ہے۔ بعد میں عادت بنتی ہے، اخیر میں عبادت بنتی ہے۔ اور حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا "مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْهُمْ اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا." ① بچہ جب سات برس کا ہو، اس کو نماز کی تاکید کروا سے مسجد میں ساتھ لاؤ۔ اگر دس برس کا ہو جائے اور نہ مانے تو اس کو مار کر نماز پڑھاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ سات برس کے بچے کو جب آپ نماز پڑھائیں گے وہ نماز اللہ کی تھوڑا ہی ہوگی وہ باپ کی ہوگی۔ وہ مار پٹائی کے ڈر سے نماز ہوگی کہ مسجد میں جائے گا تو کن آنکھوں سے دیکھے گا کہ باپ دیکھ رہا ہے کہ نہیں۔

① المصنف لابن ابی شیبۃ، ج: ۱ ص: ۳۸۲.

اگر دیکھا کہ کھڑا ہوا ہے تو بڑے خشوع سے سجدہ کرے گا اور دیکھا کہ باپ چلا گیا تو وہ بھی تھوڑی دیر میں کھسک جائے گا۔ یہ باپ کی نماز ہے۔ حقیقی نماز نہیں ہے آٹھ نو برس کی عمر تک یہ ریا کاری رہی۔ دس برس کی عمر میں آ کر عادت پڑ گئی کچھ سمجھ بوجھ نہیں۔ نماز کی حقیقت منکشف نہیں۔ بس ایک عادت پڑی ہوئی ہے کہ گھر سے نکلے مسجد تک آ گئے۔ جماعت میں کھڑے ہو گئے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں اس کے اندر حقیقت کیا ہے؟ یا یہ کوئی عبادت یا طاعت ہے۔ بس ایک عادت ہے تو ابتداءً ریا کاری تھی کرتے کرتے عادت پڑ گئی پندرہ بیس برس کے بعد جب آثار و کیفیات طاری ہوں گے تب سمجھے گا یہ کوئی عبادت ہے۔ اب آ کر عبادت بنے گی۔ تو ہر عبادت ابتداء میں ریا کاری ہوتی ہے، بعد میں عادت بنتی ہے، پھر عبادت بنتی ہے۔

مگر اس کے باوجود شریعت نے حکم دیا کہ ریا کاری ہی سہی مگر نماز پڑھو اور عادت کے طور پر ہی سہی مگر نماز پڑھو تا کہ عبادت بن جائے۔ تو اگر کوئی ذکر اللہ کرنے آئے اور دل میں خیال ہو کہ یہ تو ریا کاری ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بڑے صوفی بن گئے، بڑے نمازی آئے، بڑے ذکر کرنے والے آئے، تو سمجھے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ دکھلاوے کے لئے ہی تم ذکر اللہ کرو، کرتے رہو۔ یہ ذکر خود کھینچ لے گا اور آپ کے قلب کے اندر رچ جائے گا۔

تو ابتداءً ؎

بہر دین و بہر دنیا و بہر نام ۔۔۔ اللہ اللہ کردہ باید والسلام

دین کے لئے ہو، دنیا کے لئے ہو یا دکھلاوے کے لئے ہو، اللہ کا نام لیتے رہو۔ یہ نام آپ کو اپنی طرف خود کھینچ لے گا۔

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں جن کا محدثین میں عظیم رتبہ ہے: ”طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبٰى اَنْ يَّكُوْنَ اِلَّا لِلّٰهِ۔“ ① ہم نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا تھا کہ علم پڑھ کر شہرت کمائیں گے۔ کچھ نام و نمود ہوگا۔ ممکن ہے کچھ پیسے بھی مل جائیں، سیکھا تو دنیا کے لئے تھا، مگر جب علم آ گیا تو علم نے انکار کیا کہ میں دنیا کے لئے نہیں میں تو اللہ ہی کے لئے ہونا چاہتا ہوں۔ آخر اس نے ہمیں بھی اللہ سے جا ملایا۔ تو علم آدمی چاہے دنیوی غرض سے سیکھے مگر سیکھ لے، علم آخر وہیں پہنچا تا ہے جو اس کا مقام ہے۔ تو علم پست رہنا نہیں چاہتا، علم بلندی کی چیز ہے۔ آپ کتنا ہی پست رہیں گے۔ مگر وہ آپ کو پکڑ کر اوپر لے جائے گا۔

یہی حقیقت ذکر اللہ کی بھی ہے کہ اللہ بلند ہے، اس کا نام بھی بلند ہے، اس کا ذکر بھی بلند ہے۔ بلند چیز کو جب آپ زبان پر رکھیں گے۔ چاہے اس کی غرض دنیّ اور پست ہو مگر انجام کار وہ رفعت کی طرف جائے گا اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جائے گا اس واسطے صبح اور شام کچھ نہ کچھ اللہ کا نام لینا چاہئے۔

تسبیح مذکرہ ہے...... اگر ویسے یاد نہ آئے تو آدمی تسبیح ہاتھ میں رکھ لے۔ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دلاتی

---

① مرقاة المفاتیح، المقدمة، ج: ا ص: ۲۰.

ہے۔ تسبیح دیکھ کر خواہ مخواہ ہی سُبْحَانَ اللّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہِ جاری ہو جاتا ہے۔ یہ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دہانی کرادیتی ہے۔

جواب شبہ: اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ لوگ کہیں گے بڑے صوفی بنے ہیں تو حضرت جنید بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیال کی وجہ سے ذکر کا چھوڑ دینا یہ شرک میں داخل ہے۔ اس واسطے اس کی پرواہ مت کرو لوگ کیا کہیں گے۔ اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ کرلو۔ ضمیر سے معاملہ ہے حق تعالیٰ کا لوگوں سے نہیں ہے۔ آپ جب اپنے قلب میں خالص اللہ۔ کے لئے ذکر اللہ کر رہے ہیں، تو یہ وسوسہ اگر آئے کہ میں دکھلاوے کے لئے کر رہا ہوں تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس پر لَاحَوْلَ پڑھ لے۔

عشق کامل ہو تو ملامت کارگر نہیں ہوتی ...... اگر کوئی ملامت کرے تو کرنے دیجئے، اس لئے کہ ملامت جبھی کارگر ہوتی ہے جب عشق ناتمام ہوتا ہے۔ جب محبت کامل ہوتی ہے۔ پھر ملامت گروں کی ملامت کوئی اثر نہیں کرتی۔ حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، جب ایران فتح ہوا تو حضرت حذیفہ ایران پہنچے، اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو ایران کا ملک بڑا متمدن ملک تھا۔ اس زمانے میں دو ہی بڑی حکومتیں تھیں، ایک قیصر کی حکومت یعنی رومیوں کی حکومت جو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، ایک کسریٰ کی حکومت جو فارسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ باقی ساری حکومتیں یا ان کے ماتحت تھیں یا ان کے زیر اثر تھیں جو صورت آج روس اور امریکہ کی ہے وہی اس زمانے میں ان کی تھی۔ تو حذیفہ ابن یمانؓ کھانا کھانے بیٹھے اور ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی اس کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں سے زمین پر لقمہ گر پڑا۔ انہوں نے جلدی ادب کے ساتھ لقمہ کو اٹھا کر مٹی جھاڑی اور تناول فرمالیا۔

فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ ملک تو بڑا مہذب ملک ہے۔ یہ بات یہاں کی تہذیب کے خلاف ہے، لوگ کہیں گے یہ بڑے حریص ہیں ایک ایک لقمہ پر جان دیتے ہیں۔ مٹی تک جھاڑ کر کھا گئے۔ یہ حرص کی دلیل ہے۔ ایسا نہ کیجئے یہ تمدن والوں کا ملک ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا۔؟ فرمایا: "أَتْرُکُ سُنَّةَ حَبِیْبِیْ لِهٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ." کیا میں اپنے حبیب پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟ گویا اس درجہ ایک سنت محبوب تھی، عزیز تھی کہ فارسیوں کا پورا ملک اور ان کی تہذیب وتمدن اتنا عزیز نہیں تھا۔ جب محبت کامل ہوتی ہے تو ملامت گر کی ملامت اثر نہیں کرتی۔ ملامت سے منفعل ہونا جبھی ہوتا ہے جب اپنے اندر خامی ہوتی ہے۔ اس واسطے خامی کو رفع کیجئے اور خامی رفع ہونے کی یہی صورت ہے کہ ذکر اللہ اور یاد حق کی عادت پڑ جائے۔ جب چوبیس گھنٹے اللہ کا نام دل و زبان پہ ہوگا، محبت اور معرفت بڑھ جائے گی۔ پھر ملامت کرنے والے ہزار ملامت کریں گے، کوئی اثر نہیں ہوگا، ان پر ہنسی آئے گی کہ یہ احمق ہیں اس چیز سے روک رہے ہیں۔ آپ خود منفعل اور شرمندہ نہیں ہوں گے۔

بہر حال یہ حدیث بتلاتی ہے کہ زندگی فی الحقیقت ذکر اللہ اور اللہ کا نام ہے جب کائنات، نباتات، جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہوگی۔ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر رہنا چاہئے تبھی وہ زندہ ہوگا بلکہ زندہ جاوید بن جائے گا۔

بس مولانا کی تعمیل حکم کے لئے یہ چند کلمے میں نے عرض کر دیئے اور اس حدیث کی شرح کی، دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ ہم کو یادِ الٰہی اور ذکرِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَاَصْحٰبِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

نبوت وملوکیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ٥ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

مادی وروحانی اقتدار کی انتہاء...... بزرگان محترم! اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نعمتوں کے دوسلسلے قائم فرمائے ہیں، ایک سلسلہ مادی نعمتوں کا اور ایک روحانی نعمتوں کا ہے۔ مادی نعمتوں کے سلسلے میں جیسے بہترین غذائیں، بہترین لباس اور بہترین مکان اور بہترین شکلیں، صورتیں اور ان سے نفع اٹھانا وغیرہ ایک یہ سلسلہ ہے جس کی کوئی حدونہایت معلوم نہیں ہوتی۔ دنیا میں یہ نعمتیں روز بروز ترقی پر ہیں۔ ہر چیز کے نئے سے نئے ڈیزائن اور نمونے، کچھ آنکھوں کو فرحت دینے والے، کچھ کانوں کو، کچھ دماغ کو اور کچھ ناک کو۔ غرض حواس خمسہ کے لئے اللہ نے نئی سے نئی نعمت پیدا کی اور وہ بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مادی نعمتوں میں سب سے بڑھ کر اقتدار ہے کہ کسی قوم کو عزت دی جائے، اس کے ہاتھ میں قدرت وتمکنت ہو اور وہ اپنی قسمت کی مالک آپ بن جائے۔ اسی کا نام اقتدار ہے پھر ان مادی نعمتوں میں ایک حصہ لذات کا ہے اور ایک اقتدار کا ہے۔

اس کے بالمقابل دوسری نعمتیں روحانی ہیں، جیسے علم، اخلاق، ہدایت پانا، قلب کی تسکین اور عقلی کام ہیں۔ یہ سب روحانی نعمتیں کہلاتی ہیں جن کے ذریعے انسان کی روح کو فرحت اور تسکین ملتی ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ مادی نعمتیں اس کے سامنے گرد ہیں جس کو روحانی لذت میسر آجائے، پھر مادی نعمتیں ہیچ اور گرد بن جاتی ہیں۔

اہل اللہ نے مادی لذتوں پر لات ماری ہے تو کوئی نعمت ان کو ہاتھ لگی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ان

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵، ۶.

نعمتوں کو حقیر اور کم رتبہ سمجھا ہے۔ غرض یہ بات الگ ہے کہ ایک نعمت اعلیٰ ہے۔ اور ایک ادنیٰ ہے۔ مگر ہیں دونوں نعمتیں ایک مادی اور جسمانی، دوسری روحانی اور معنوی لذتیں۔ مادی لذتوں کی انتہاء ملوکیت پر ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کو اللہ بادشاہت اور تمکنت دیدے اور ساری نعمتیں اس کے قبضہ میں آجائیں۔

اور روحانی نعمتوں کی انتہاء نبوّت پر ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام نبوت کے راستے سے جو نعمتیں لاتے ہیں وہ روح کی تسلی کی ہیں۔ ان میں علم واخلاق ہے، اللہ کے جمال وجلال کا مشاہدہ ہے، ہدایت پانا، اللہ کی کتابوں کی تلاوت کرنا، اس کے ذریعے سے روح کو اقتدار ملتا ہے یہ سلسلہ نبوّت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

مادی وروحانی اقتدار کی تاثیر.....تو بادشاہوں کا اقتدار مادی ہے جو بدنوں کے اوپر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اقتدار روحانی ہوتا ہے جو دلوں کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ بدنوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وہ دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کی حکومت جبری اور ان کی حکومت محبت کی ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ سامنے ہے تو آدمی ڈرتا ہے۔ اس کی سی، آئی، ڈی ہے تو خائف ہوتا ہے کہ کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکال دوں جس کی وجہ سے قانون کی زد میں آجاؤں اور مقدمہ چل جائے۔ چاہے دل میں لعنت ہی بھیجے۔ تو دل پر کوئی حکومت نہیں بلکہ دل میں بعض اوقات نفرت ہوتی ہے۔ لیکن زبان سے نہیں کہہ سکتا تو شاہی اور ملوکیت کا اقتدار بدنوں پر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی حکومت اور اقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے۔ وہ سامنے بھی نہ ہوں تب بھی آدمی انکی عظمت میں دبا ہوا ہوتا ہے بلکہ دنیا میں بھی نہ ہوں، جب بھی وہی عظمت واقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے جو ان کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ آج انبیاء علیہم السلام کا نام آجائے سب درود شریف پڑھیں گے صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیں گے انبیاء علیہم السلام کی ذات تو بہت بلند و بالا ہے ان کے خدام صحابہ کا ذکر آجائے تو رضی اللہ عنہم اجمعین کہیں گے۔ صحابہ کرام کا مقام بھی بہت بلند ہے ان کے خدام اور غلام اولیاء کرام ہیں، انکا ذکر آجائے تو سب رحمہ اللہ علیہم اجمعین کہیں گے۔ صالحین کا ذکر آجائے محبت سے یاد کریں گے۔ تو آج انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہیں لیکن قلوب ان کی محبت وعظمت سے لبریز ہیں۔ اگر آج خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آجائے تو عقیدت سے دل جھک جاتا ہے۔ اگر شیخ علاء الدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آجائے تو فرط عقیدت سے دل جھک جائے گا، آج اگر کوئی امام ابی حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ کا نام لے تو دل عقیدت سے جھک جائیں گے۔ اگر کوئی شخص ان کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہے آدمی جان دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ انکے خلاف کوئی کلمہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ محبت وعقیدت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ حضرات آج دنیا کے اندر موجود نہیں ہیں۔ لیکن قلوب پر حکومت آج بھی کر رہے ہیں۔

مسٹر آرنلڈ جو سرسید مرحوم کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی ہے۔ اس نے اسلامی تبلیغ کے دور اور طریقے تاریخی طور پر ذکر کیے ہیں کہ کس کس طرح سے

اسلام پھیلا اور دنیا میں رائج ہوا۔اس نے اس میں بڑی تفصیلات ذکر کی ہیں۔ ہندوستان کا بھی ذکر کیا ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک بڑی عجیب بات دیکھی جو مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔اس کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے اسے کہیں اور نظر نہیں آئی۔لیکن دوسروں کو وہ ہر جگہ نظر آئی مگر اس کے لئے وہ انوکھی بات ہے۔

''وہ یہ کہ میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ ایک شخص اجمیر میں قبر میں لیٹا ہوا، پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور سلطان بنا ہوا ہے۔نام بھی اس کا ''سلطان الہند'' ہے۔یعنی حضرت خواجہ اجمیر رحمۃ اللہ علیہ''۔

تو اس نے کہا میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے اس دنیا میں نہیں ہے مگر پورے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر اس کی حکومت قائم ہے اس کا نام بھی آتا ہے تو لوگ عظمت سے اس کا نام لیتے ہیں۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے مادی اقتدار بدنوں کے اوپر ہوتا ہے، روحانی اقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے۔اس لئے انبیاء علیہم السلام، ان کے خدام اور تربیت یافتہ، دلوں کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔سلاطین اور ان کے تربیت یافتہ بدنوں کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔سلاطین دنیا سامنے موجود ہوں تو آدمی عظمت کا کلمہ کہتا ہے ورنہ بعض اوقات لعنت کرتا ہے، انبیاء اور اولیاء دنیا میں موجود ہوں یا نہ ہوں، قلوب پر یکساں ان کی عقیدت و عظمت قائم ہے، محبت سے دل لبریز ہے تو اقتدار کے دو سلسلے نکلے، مادی اقتدار کی انتہاء حکومت کے اوپر ہے اور روحانی اقتدار کی انتہا نبوّت کے اوپر ہے۔

مزاجِ نبوّت و ملوکیت میں فرق......لیکن ان دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔نبوّت کا بھی ایک مزاج ہے اور بادشاہت وملوکیت کا بھی۔دنیا میں جب بادشاہت غالب آتی ہے تو اس کا مزاج کچھ اور ہے۔ان دونوں مزاجوں کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا۔فرمایا کہ بادشاہ جب کسی ملک پر غالب آتے اور اقتدار پاتے ہیں اور فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہ کیا کرتے ہیں؟ ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ ① جب کوئی بادشاہ کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اس شہر کو اس طرح سے فاسد کرتا ہے کہ عزت والوں کو پست کرتا ہے، ذلت والوں کو اونچا کرتا ہے۔انقلاب عظیم برپا کرتا ہے۔

اس لئے کہ جواب تک عزت والے تھے ان سے عزت چھیننی ہے کیونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ پھر برسر اقتدار نہ آجائیں۔اس لئے انہیں کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے اقتدار کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔وہ نشانات مٹائے جاتے ہیں جو کسی قوم کے اقتدار کے ہوتے ہیں۔کاغذوں سے وہ نام محو کئے جاتے ہیں تا کہ خیال بھی ادھر نہ جائے اس لئے کہ اگر ان کا اقتدار کسی درجہ میں بھی رہ گیا تو ہمارا اقتدار قائم نہیں ہوگا۔﴿وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ ② یہ سلاطین کا طریقہ ہے بادشاہت اور ملوکیت کی تاریخ دیکھی جائے تو ایسی ہی نظر آئے گی۔

① ② پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۳۴.

اقتدار پانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل......اور ایک انبیاء علیہم السلام کا مزاج ہے۔ جب نبوّت کا اقتدار غالب ہوتا ہے تو وہ امن کا اعلان کرتے ہیں۔ عزت والوں کی عزت کو برداشت کرتے ہیں اور جو پست ہیں ان کو ابھارتے ہیں تاکہ سب عزت میں شریک ہو جائیں اور کسی کی تذلیل اور رسوائی نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس برس کی زندگی کے بعد جب مدینہ طیبہ سے تشریف لائے اور فاتحانہ انداز میں مکہ کے اندر داخل ہوئے تو دس ہزار صحابہ کا لشکر ساتھ تھا۔ آپؐ اونٹنی پر سوار ہیں۔ بادشاہ ایسے موقع پر اقتدار جتلاتا ہوا اور اینٹھتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے۔ حدیث میں ہے کہ تواضع اور خاکساری کی وجہ سے گردن مبارک اونٹنی کی گردن پر جھکی ہوئی تھی۔ چونکہ عزت کے ساتھ داخلہ ہوا ہے تو اللہ کی عزت پیش نظر تھی۔ اس لئے غایت تواضع اور انکساری کی وجہ سے سر مبارک اتنا جھک گیا تھا کہ اونٹنی کے سر کو آ ملا تھا۔ تو انبیاء کا داخلہ تو اس شان سے ہوا۔ سلاطین داخل ہوتے ہیں تو اکڑتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ پھر سلاطین عزت والوں کو ذلیل بناتے ہیں، پستوں کو اور پست کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا مزاج یہ ہے کہ آپ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ داخل ہوئے تو جگہ جگہ امن کا اعلان فرمایا۔ فرمایا: ''مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ'' ابوسفیان کے گھر میں جو چلا جائے گا اسے بھی امن ہے۔ ''وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَھُوَ اٰمِنٌ'' جو مسجد حرام میں چلا جائے گا اسے بھی امن ہے۔ ''مَنْ اَغْلَقَ بَابَہٗ فَھُوَ اٰمِنٌ'' جو اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کرے گا اس کے لئے بھی امن ہے۔ غرض امن کا اعلان عام ہوتا جارہا ہے۔ (1)

اور کس قوم کے مقابلے میں؟ جس نے تیرہ برس اللہ کے رسول کو چین نہیں لینے دیا۔ انتہائی ایذاء رسانی کی بلکہ حد کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گالیاں دی گئیں، کذاب، مجنون، ساحر اور کاہن کہا گیا جادو آپ کے اوپر کرایا گیا، طائف میں تشریف لے گئے تو پتھر اتنے مارے گئے کہ پیر مبارک اتنے زخمی ہو گئے کہ نعلین مبارک خون سے بھر گئے، کتے پیچھے لگائے گئے، اس قوم کے مقابلے پر امن کا اعلان کیا جارہا ہے۔ جو مسجد حرام میں یا ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کرے، اسے بھی امن۔ گویا کوئی راستہ ایسا نہیں چھوڑا کہ بدامنی یا قتل و غارت ہو اور اس قوم کے ساتھ یہ شفقت برتی گئی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، وطن سے بے وطن کیا۔ یہ نبوّت کا مزاج ہے کہ جتنا اقتدار ملتا جاتا ہے اتنا ہی جھکتے جاتے ہیں۔

نہد شاخ پرز میوہ سر بر زمین

درخت کا پھل جب بڑھ جاتا ہے تو شاخیں زمین کی طرف جھک جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ درخت جب پھل دار ہو تو اوپر کو اٹھنے لگے۔ انبیاء علیہم السلام، اللہ کی طرف سے ساری دولتیں لے کر آتے ہیں ان میں تواضع بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن مادی دولت جوں جوں بڑھتی ہے اس سے نخوت بڑھتی رہتی ہے۔

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فتح مکہ ج: ۹ ص: ۲۴۹.

حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جب آپ ہجرت فرما رہے تھے تو جاتے ہوئے مسجد حرام میں تشریف لائے تو بیت اللہ کا کلید بردار عثمان شیبی کا خاندان تھا۔ شیبی اسے کہتے تھے، وہ بیت اللہ کے دروازے پر بیٹھتا تھا۔ بیت اللہ کی کنجی اس کے پاس رہتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مکہ چھوڑ کر ہجرت فرما رہے ہیں۔ آپ کو صدمہ ہے تو شیبی سے کہا:

''اے شیبی! ایک دومنٹ کے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھول دے، تا کہ میں اندر دو نفل پڑھ لوں''۔ اس نے جھڑک کر اور ڈانٹ کر کہا کہ تم ہرگز داخل نہیں کئے جاسکتے۔ تم نے ہمارے آبائی دین کو چھوڑا، ہمارے بتوں کو برا کہا۔ یہ نہیں ہوسکتا جاؤ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر لجاجت (نرمی) سے کہا ''میں عبادت کرنا چاہتا ہوں، دو رکعت پڑھنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا نہیں، آپ کو اجازت نہیں دی جائے گی، آپ جائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے شیبی! ایک وقت آنے والا ہے کہ جس جگہ تو بیٹھا ہوا ہے وہاں تو میں ہوں گا اور جہاں میں کھڑا ہوا التجاء کر رہا ہوں یہاں تو کھڑا ہوگا۔ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا؟''

اس نے کہا ''جاؤ ایسی باتیں بہت دیکھی ہیں۔'' اقتدار کے غرور میں مست تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بے کس و بے بس ہو کر گھر سے باہر نکل رہے تھے، مکے والوں کی اکثریت تھی، اقتدار تھا، دولت اور فوج بھی ان کی تھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا تو اسے غرور کا نشہ تھا، وہ جانتا تھا کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے، نبوت کی عظمت اس کے دل میں نہیں تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ نبوّت کو اللہ نے کیا کیا طاقتیں بخشی ہیں۔ وہ تو صرف مادی طاقت کو جانتا تھا اس بناء پر اس نے کہا ایسی تخیلات کی باتیں بہت سنی ہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہے اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں کہ میں کعبہ کے دروازے پر بطور متولی کے بیٹھوں گا اور جو آج متولی ہے وہ نیچے کھڑا ہوگا۔ یہ شیخ چلی کی باتیں ہیں، محض تخیلات ہیں۔ یہ اس نے کہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوگئے، ہجرت فرمائی۔ جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور امن کا اعلان کیا، ایک نفس کی خونریزی نہیں ہوئی، ایک جان نہیں گئی۔ آپ مسجد حرام میں تشریف لائے اور فرمایا کہ شیبی کو بلاؤ۔ وہ آیا، کعبے کی کنجی اس کے ہاتھ میں، کعبے کے دروازے کا تالا کھولا۔ آپ وہیں تشریف لے گئے جہاں شیبی کھڑا ہوا تھا اور شیبی وہیں کھڑا ہوا تھا جہاں آپ کھڑے ہوئے التجا کر رہے تھے۔

فرمایا: شیبی! وہ وقت تجھے یاد ہے کہ میں نے لجاجت سے التجاء کی تھی کہ مجھے ایک دو رکعت پڑھنے کی اجازت دیدے، تو نے ڈانٹ دیا تھا۔ کہا جی ہاں یاد ہے۔ فرمایا: یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کہا تھا کہ جس جگہ تو بیٹھا ہوا ہے اس جگہ میں ہوں گا اور جس جگہ میں کھڑا ہوں اس جگہ تو کھڑا ہوا ہوگا یہ تو نے دیکھ لیا؟

اس نے کہا: جی ہاں دیکھ لیا، بے شک میں اسی جگہ کھڑا ہوا ہوں جہاں آپ کھڑے ہوئے تھے۔ اور آپ اس

جگہ ہیں جس جگہ میں تھا۔ فرمایا، اب تیرا کیا حشر ہونا چاہئے؟

اس نے ایک ہی جملہ کہا کہ اَخٌ کَرِیْمٌ وَابن اخ کَرِیْمٌ ① میں ایک کریم پیغمبر اور کریم بھائی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ بہرحال یہ خاندان قریش میں سے تھا، تو اس نے یہ جملہ کہا اَخٌ کَرِیْمٌ وَنَبِیٌّ کَرِیْمٌ۔

اب یہ خیال فرمایئے شیبی نے کس طرح سے ڈانٹا تھا۔ اللہ کے رسول کی انتہائی عظمت کے باوجود اس نے کیا کہا کہ لیکن آپ نے کیا معاملہ فرمایا۔ فرمایا ''اے شیبی! یہ کعبے کی کنجی تیرے حوالے کرتا ہوں، قیامت تک تیرے ہی خاندان میں رہے گی، کوئی دوسرا اسے نہیں حاصل کر سکے گا۔ آج سے تو اور تیرا خاندان قیامت تک کے لئے متولی ہے''۔

عرب میں بیسیوں نئے انقلابات ہوئے، حکومتیں بدلیں، لیکن شیبی کا خاندان بدستور قائم ہے اور کعبے کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، مکہ کے آدھے بازاروں پر آج شیبی کا قبضہ ہے اور اس کی دولت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا ہر شخص چاہتا ہے اور وہ فیس لگا دیتا ہے کہ اتنی فیس ادا کردو گے تو داخل ہونے دوں گا ورنہ نہیں۔ حالانکہ ایسا داخلہ لگانا ممنوع ہے کیونکہ اس پر فیس لگانا جائز نہیں، مگر ایک تو بیت اللہ کی محبت اور اوپر سے کچھ عظمت بھی اور کچھ محبت بھی، اس لئے لوگ فیس ادا کرتے ہیں اور داخل ہوتے ہیں۔ لیکن محض محبت ہی تو مطلوب نہیں، شریعت کا ادب بھی تو ملحوظ ہے۔ وہ صحیح محبت سے کام نہیں کرتا جب تک اتباع شریعت نہ ہو، وہ محبت کارآمد نہیں ہے، جب تک محبت کے ساتھ متابعت سنت اور شریعت کی عظمت نہ ہو۔ اس لئے رشوت دے کر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

کئی بار حاضری ہوئی ہمارا بہت جی چاہتا تھا تو ہمارے لئے یہ مشکل تھی، تو ہم نے افسوس کے ساتھ مکے میں اپنے دوست سے ذکر کیا کہ ہم تو محروم ہی رہ گئے اور بیت اللہ میں داخل ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ ان کے شیبی کیساتھ تعلقات تھے۔ اس نے کہا، تنہا آپ کے لئے بیت اللہ کھولا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ اندر جاکے زیارت کریں گے۔

چنانچہ انہوں نے ایسا انتظام کیا جب ہجوم ختم ہو گیا، و، شیبی کعبے کا دروازہ بند کر کے جانے لگا، انہوں نے اپنے تعلقات کے وجہ سے اس سے بات کی اور بیت اللہ کا دروازہ کھولا اور میرے پاس آدمی بھیج کے مجھے بلایا کہ آپ کے لئے بیت اللہ کھلا ہوا ہے۔ تو میں تو کیا چیز تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں میں نے شریعت کا اتباع کیا تھا اور دل میں داخل ہونے کا جذبہ تھا لیکن رشوت دینا جائز نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرما دیا۔

بہرحال لوگ یہ نہیں سمجھتے وہ چاہتے ہیں بس داخل ہو جائیں خواہ کسی ممنوع کا ارتکاب کرنا پڑے۔ غرض شیبی آج بھی برسراقتدار ہے۔ چودہ صدیاں گذر گئیں مگر اسی کے خاندان کے ہاتھ میں بیت اللہ کی کنجیاں ہیں حالانکہ

① السنن الکبریٰ للبیھقی، باب فتح مکہ حرسھا اللہ تعالیٰ، ج: ۹ ص: ۱۱۸۔

شیبی نے اللہ کے رسول کے ساتھ انتہائی بے عظمتی کا برتاؤ کیا تھااور آپ نے نبی ہونے کی حیثیت سے اسے کیا دیا کہ بیت اللہ کا متولی قیامت تک کے لئے قرار دیدیا، بجائے اس کے کہ شیبی سے انتقام لیا جاتا۔ یہ چیز ملوکیت اور بادشاہت میں نہیں ہے۔ بادشاہت میں اگر کوئی ذرا بھی اقتدار کا خلاف کرے تو بغاوت کا الزام قائم ہوتا ہے اوراسے پھانسی دیدی جاتی ہے۔تو یہ نبوت کا خاصہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جوایک دوست دوست کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ تو نبوت کا مزاج اور ہے، ملوکیت کا اور ہے۔آج بھی شیبی برسراقتدار ہے اور کعبے کی کنجیاں اس کے پاس ہیں اور قیامت تک رہے گا۔ کیونکہ اللہ کے رسول نے فرمادیا ہے کہ کنجیاں قیامت تک کے لئے تیرے خاندان کو دیتا ہوں۔

اہل اللہ کے مزاج میں نیکی کی حرص...... اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ اللہ والے بھی عجیب چیز ہیں۔ یہ ہر بات سے اپنی آخرت کا فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ جب ایک شخص دنیا کا طالب ہو وہ ہیر پھیر کر کے اپنے پیسے کمالیتا ہے۔ یہ اللہ والے ہیر پھیر کر کے دین اور آخرت کمالیتے ہیں۔ جب ہم دنیا دار دنیا کے بارے میں حریص ہیں کہ اگر سو روپیہ مل جائے تو تمنا ہوتی ہے کہ ہزار روپیہ مل جائے، ہزار مل جائے تو تمنا ہوتی ہے کہ کروڑوں ہو جائیں۔غرض طلب کسی حد پر رکتی نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر اس بنی آدم کوایک جنگل بھی سونے کا مل جائے تو کہے گا یا اللہ! پیٹ نہیں بھرا، ایک جنگل اور سونے کا مل جائے۔ دوسرا مل جائے تو تیسرا مانگے گا کسی حد پر نہیں رکتا۔ بعینہ یہی کیفیت اللہ والوں کی ہے کہ ساری جنت پر ان کا قبضہ ہو جائے، تب بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ غرض اہل دنیا دنیا کے بارے میں حریص ہوتے ہیں، اہل اللہ آخرت کے بارے میں حریص ہوتے ہیں۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ، جونقشبندیہ خاندان کے اکابر میں سے تھے، ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ آئے، وہیں ان کی وفات بھی ہوئی اور قبر بھی ہے۔ انہیں یہ حدیث معلوم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبی کو بیت اللہ کی کنجیاں سپرد کی ہیں۔ مکہ میں چاہے سارے خاندان اجڑ جائیں مگر شیبی کا خاندان قیامت تک کے لئے باقی رہے گا۔ یہ ان کا ایمان تھا اور اللہ کے رسول کا قول تھا تو مولانا رفیع الدین صاحب کو عجیب ترکیب سوجھی۔ واقعی ان بزرگوں کو داد دینی چاہئے کہاں ذہن پہنچا۔

انہوں نے کہا جب یہ خاندان قیامت تک کے لئے باقی رہے گا تو اس زمانے میں بھی موجود ہوگا، جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا۔ اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ مہدی کا جب قرب قیامت میں ظہور ہوگا تو مکہ ہی میں ہوگا اور وہ بیت اللہ شریف کی دیوار سے کمر لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، لوگ ان کے ہاتھ پر آکر بیعت کریں گے۔

اور اس وقت کی جو علامات بتلائی گئی ہیں وہ یہ کہ پوری دنیا پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگا۔ بلاواسطہ پوری دنیا پر

نصاریٰ کا اقتدار چھایا ہوا ہوگا۔ دوسری علامت یہ فرمائی گئی "مُلِئَتِ الدُّنْيَا ظُلْمًا وَجَوْرًا" ① پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہوگی۔ دین و دیانت کا نشان باقی نہیں رہے گا، شرارت نفس، تعیش و عیاشی، ظلم اور بددینی عام ہو جائے گی، محدود لوگ ہوں گے جو پہاڑوں کی چوٹیوں میں جا کر اپنے دین کو سنبھالیں گے، دنیا ان کو حقیر و ذلیل سمجھے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک عالم اتنا ذلیل ہو جائے گا جیسے مردے گدھے کی لاش ہوتی ہے کہ اسے کوئی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ایک عالم کی ذلت کی یہ کیفیت ہوگی۔ تو اس درجہ ظلم وستم بددینی اور بددیانتی دنیا میں پھیل جائے گی۔ یہ وقت ہوگا کہ دنیا پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگا، مسلمان انتہائی ظلم وستم میں گرفتار ہوں گے۔ دیندار پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جا کر چھپ چھپ کر اپنے دین کی حفاظت کر رہے ہوں گے، شہروں اور قصبوں میں ان کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ نماز، روزہ کا تو ذکر کیا رہے گا، بس ظلم وستم غالب ہوگا۔ اس وقت مکہ مکرمہ میں مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا۔

اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ انکے بارے میں اللہ کی طرف سے اعلان کیا جائے گا، ایک غیبی آواز پیدا ہوگی کہ "هٰذَا خَلِيْفَةُ اللهِ الْمَهْدِيُّ فَاسْمَعُوْا لَهُ وَاَطِيْعُوْا" ② یہ اللہ کے خلیفہ مہدی ہیں ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ فرمایا گیا اس وقت ابدال شام، نجباء عراق اور اقطاب ہند اور تمام اہل اللہ جہاں جہاں ہوں گے سمٹ کر شام میں پہنچیں گے اور شام کو حضرت مہدی علیہ الرضوان مرکز بنائیں گے اور یہ وہیں جا کر ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور مسلمانوں کی قوت وہاں جمع ہوگی ان کے ہاتھ پر مغرب اور نصاریٰ کی طاقتیں ٹوٹیں گی اس کے بعد وہ آئے گا کہ پورے عالم میں دین اسلام پھیل جائے گا اور دوسرا کوئی دین اور قومیت باقی نہیں رہے گی۔ اس کی تفصیلات ہیں۔

ان میں مجھے نہیں جانا۔ جو مجھے واقعہ سنانا ہے اس کے متعلق جتنی چیز بیان کرنی تھی وہ میں نے عرض کی۔ گویا مہدی علیہ الرضوان کا ظہور مکے میں ہوگا۔ شام کو وہ اپنا مرکز بنائیں گے۔ مسلمانوں کی ساری قوت شام میں سمٹ آئے گی۔ دجال اور مغربی طاقتوں کا مقابلہ ہوگا ملحمہ کبریٰ واقع ہوگا یعنی سب سے بڑا جہاد اس زمانے میں ہوگا اور تین معرکے ہوں گے لاکھوں آدمی اس میں قتل ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ محاذ جنگ ہی اتنا لانبا ہوگا کہ کوا اڑے گا، کوے کی اڑان مشہور ہے کہ صبح سے شام تک اڑتا رہتا ہے، تھکتا نہیں ہے۔ تو صبح سے شام تک کوا اڑے گا، جہاں جہاں وہ جائے گا لاشیں ہی لاشیں نیچے پڑی ہوئی ہوں گی۔ اس کو یہ نظر آئے گا۔ اتنا لانبا محاذ ہوگا اور مقتولین کی کوئی حد نہیں ہوگی۔ یہ عظیم جہاد ہوگا اس جہاد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے مجاہدین کو وہ اجر ملے گا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو

---

① السنن لابی داؤد، کتاب المهدی، باب ۱۱ ص: ۳۵۶ رقم: ۳۷۳۶. اس حدیث کو ترمذیؒ نے حسن صحیح بتایا ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۸۲ رقم: ۴۲۸۲. ② الحدیث اخرجه الامام احمد ولفظه: اذا رأيتم الرايات السود قدجاءت من قبل خراسان فأتوها فان فيها خليفة المهدی. مسند احمد ج: ۷ ص: ۱۹۳ ومن حديث ثوبانؓ.

اجر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث میں فرمایا گیا ہے اب میں واقعہ عرض کرتا ہوں جو مولانا رفیع الدین صاحب یہ حدیث سن کر ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچے۔

یہ ان کا ایمان تھا کہ شیبی کا خاندان قیامت تک ضرور رہے گا اور جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا جب بھی یہ مکہ ہی میں ہوگا۔ جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور مکے میں ہوگا تو وہ بیت اللہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے اور مسلمانوں سے بیعت کریں گے۔ تو بیت اللہ کے دروازے کے کنجیاں شیبی کے ہاتھ میں ہوں گی۔ اس لئے یہ بھی وہاں موجود ہوگا۔ یہ چند کڑیاں ملا کر مولانا رفیع الدین صاحب نے ایک حمائل شریف اور ایک تلوار، یہ دونوں لیں۔ اور مہدی علیہ الرضوان کے نام ایک خط لکھا کہ

''فقیر رفیع الدین دیوبندی مکہ معظمہ میں حاضر ہے اور آپ جہاد کی ترتیب کر رہے ہیں۔ مجاہدین آپ کے ساتھ ہیں۔ جن کو وہ اجر ملے گا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین کو ملا، تو رفیع الدین کی طرف سے یہ حمائل تو آپ کی ذات کے لئے ہدیہ ہے اور یہ تلوار کسی مجاہد کو دیدیجئے کہ وہ میری طرف سے جنگ میں شریک ہو جائے، اور مجھے وہ اجر مل جائے جو غزوۂ بدر کے مجاہدین کو ملا''۔

یہ خط لکھ کر کے تلوار اور حمائل شیبی کے سپرد کی جوان کے زمانہ میں شیبی تھا اور کہا کہ تمہارا خاندان قیامت تک رہے گا اور مہدی علیہ الرضوان کے ظہور تک یہ امانت ہے۔ تو جب انتقال کرو تو جو تمہارا قائم مقام ہوا سے وصیت کر دینا اور اس سے یہ کہہ دینا کہ جب اس کا انتقال ہو وہ اپنی اولاد کو وصیت کرے کہ رفیع الدین کی یہ تلوار اور حمائل شریف خاندان میں چلتی رہے یہاں تک کہ مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہو جائے۔ تو جو اس کے زمانے میں شیبی ہو وہ میری طرف سے حضرت مہدی علیہ الرضوان کو یہ دونوں ہدیئے پیش کر دے۔ حمائل ان کی ذات کے لئے تحفہ ہے اور تلوار امانت ہے کہ وہ کسی مجاہد کو میری طرف سے دیدیں تاکہ جب وہ جہاد میں شریک ہو تو میری شرکت بھی ہو جائے اور اس اجر میں میں بھی حصہ پالوں۔ کہاں کی بات انہوں نے سوچی۔ اس حدیث سے انہوں نے کس طرح کام لیا کہ اعلیٰ ترین جہاد کے اندر اپنی شرکت کر لی۔

تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ والے نیکیوں پہ اتنے حریص ہوتے ہیں کہ چاہے ان کا گھر بھر جائے نیکی سے، لیکن انہیں خیال ہو کہ نیکی یہاں سے بھی مل جائے گی، جھٹ وہاں پہنچ جائیں گے کہ اسے بھی کیوں نہ سمیٹ لیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنتیں ہمارے قبضہ میں آ جائیں۔ یہ اللہ والوں کا مزاج ہے۔

امام ابوداؤد رحمتہ اللہ علیہ بہت بڑے محدث گزرے ہیں جن کی کتاب ابوداؤد مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، داخل درس ہے۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے اور سمندر میں جہاز اترا ہوا کھڑا تھا۔ ایسی گودیاں اس زمانے میں نہیں تھیں، جیسی آج بنتی ہیں۔ تو جہاز ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا ہوتا تھا۔ چونکہ کنارے پر پانی کم ہوتا تھا وہ جہاز کے لئے کافی نہیں ہوتا تھا اور لوگ کشتیوں میں بیٹھ کے جہاز میں

جاتے اور سوار ہوتے۔

ایک جہاز فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤدؒ بندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی۔ اس نے چھینک کر زور سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے اسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا چاہئے اور جس کے کان میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑے، وہ جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہے۔ اس شخص نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس زور سے کہا کہ امام ابوداؤدؒ کے کان میں آواز آئی۔ اب ان کا جی چاہا کہ میں شریعت کی اس چیز پر عمل کروں اور یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہوں تا کہ مجھے ثواب ملے حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ چھینک لینے والے کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا واجب ہے جبکہ اس مجلس میں وہ موجود ہو اور اس کے کان میں پڑ جائے کہ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا ہے۔ وہ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ کر جواب دے۔ یہ نہیں ہے کہ مسجد میں ایک شخص کو چھینک آئے اور دوسرا شخص بازار میں جا رہا ہے اور وہ جواب دینے کے لئے مسجد میں آئے۔ ایک مجلس کا مسئلہ ہے مجلس سے خارج کا نہیں ہے۔

تو امام ابوداؤد پر واجب نہیں تھا کہ وہ جواب دیں۔ اس لئے کہ چھینک لینے والا ایک فرلانگ پہ ہے اور یہ یہاں، وہ جہاز پر ہے۔ یہ کنارے پر ہیں۔ مجلس بھی ایک نہیں جگہ بھی ایک نہیں بیچ میں سمندر حائل، مگر وہی بات ہے کہ نیکی کی حرص ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کما لیں اس نیکی کو بھی کیوں چھوڑیں۔

امام ابوداؤدؒ کی آواز اتنی اونچی تو تھی نہیں کہ یہاں کنارے سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہیں تو اس کے کان میں پہنچے۔ چھینک لینے والے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا اس کی آواز یہاں پہنچ گئی تو تین درہم میں کرائے کی کشتی لی اور اس کشتی میں بیٹھ کر ڈیڑھ فرلانگ کا سفر کر کے جہاز میں پہنچے اور جہاز میں اوپر چڑھ کے کہا، یَرْحَمُکَ اللّٰہُ۔ یہ گویا نیکی کمائی۔ مورخین لکھتے ہیں جس وقت انہوں نے جا کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا، غیب سے ایک آواز آئی کہنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ آواز یہ آئی کہ ''اے ابوداؤد آج آپ نے تین درہم میں جنت خرید لی''۔

یہ آواز کان میں پڑی۔ معلوم نہیں کس خلوص سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا۔ حالانکہ امام ابوداؤدؒ محدث ہیں۔ جانے کتنی انہوں نے حدیثیں لکھیں اور کتنا اجر کمایا، کتنی نوافل اور تہجد پڑھے ہوں گے، کتنے صدقات دیئے ہوں گے۔ لیکن جنت کی خریداری کے وقت اس حقیر سے عمل کا ذکر کیا کہ تین درہم میں کشتی کرائے پر لے کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ دیا۔

اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کی مقبولیت اس کی صورت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی حقیقت سے ہوتی ہے۔ اخلاص جتنا غالب ہو، چاہے عمل چھوٹا ہو مگر اخلاص سے وزن پیدا ہو جاتا ہے، وہ مقبول ہوتا ہے۔ لمبا چوڑا عمل ہو، اخلاص ندارد ہو۔ قبولیت کی شان نہیں پیدا ہوتی۔ امام ابوداؤدؒ نے معلوم نہیں کس خلوص سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا ہوگا۔ اتباع سنت کے کس جذبے سے گئے ہوں گے کہ یہ ایک عمل اتنا غالب آ گیا کہ نہ تہجدوں کا ذکر آیا نہ صدقات کا ذکر آیا، ذکر آیا تو اس عمل کا ذکر آیا کہ تین درہم میں آپ نے جنت خرید لی۔ غرض یہ لوگ دین کے اندر بے حد حرص رکھتے ہیں کمانا اتنا جانتے ہیں کہ گویا ہر وقت کماتے ہی رہتے ہیں۔ ہم دکان پہ بیٹھ کے کماتے ہیں۔ یہ چلتے ہوئے الگ،

بیٹھے ہوئے الگ، سوتے ہوئے الگ اور گھر میں الگ کمائیں۔غرض ہر جگہ ثواب کمانے کی فکر رہتی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداداللہ قدس اللہ سرہ جو شیخ الطائفہ ہیں گویا تمام اہل دیوبند کے مرشد ہیں۔حضرت مولانا نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے مرشد ہیں۔ان کا عمل کیا تھا؟ حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آدمی جب گھر سے مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے چلتا ہے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ایک بدی مٹائی جاتی ہے اور یہ بھی دوسری حدیث میں فرمایا گیا کہ آپ نے سوال فرمایا کہ لوگو! جانتے ہو کہ درجات کن کن چیزوں سے بلند ہوتے ہیں اور کفارات کن کن چیزوں سے ہوتے ہیں کہ گناہ مٹادیئے جائیں؟ عرض کیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

منجملہ اور چیزوں کے فرمایا: کَثْــرَةُ الْخُطَاءِ اِلَی الْمَسْجِدِ ① مسجد کی طرف جتنے زیادہ قدم پڑیں گے اتنا ہی گناہوں کا کفارہ ہوگا، اتنے ہی درجات بلند ہوں گے۔

تو ایک طرف یہ حدیث ہے کہ جتنے قدم زیادہ ہوں گے نیکیاں بڑھیں گی، بدیاں گھٹیں گی اور دوسری طرف وہ حدیث ہے کہ ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹائی جاتی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ کا یہ عمل تھا کہ اگر مسجد کو دو راستے جاتے ہوں۔ایک ذرا لمبا اور ایک چھوٹا ہو تو لمبا راستہ اختیار کرتے تھے تاکہ قدم زیادہ پڑیں، نیکیاں زیادہ لکھی جائیں اور بدیاں زیادہ مٹائی جائیں اور اس میں بھی یہ کرتے تھے کہ لانبا راستہ اختیار کر کے چھوٹے چھوٹے قدم ڈالتے تھے۔لمبی لمبی گرہیں نہیں ڈالتے تھے، اس لئے کہ حدیث میں کَثْرَةُ الْخُطَاء فرمایا گیا ہے کہ قدموں کی کثرت مطلوب ہے۔یہ نہیں کہا گیا کہ چھوٹے قدم ہوں یا بڑے قدم ہوں اس کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔تو انہوں نے کہا کہ اگر میں چھوٹے قدم ڈالوں، شریعت نے مجھے نہیں روکا، یعنی اگر بیس قدم سے راستہ طے ہوتا، چالیس قدم سے طے کرتے تھے تاکہ چالیس نیکیاں ملیں۔یہ جب ہوتا ہے کہ دل میں ایک لگن لگی ہوئی ہو کہ مجھے نیکی کمانی ہے بالکل ہمیں اپنے اوپر قیاس کر لینا چاہئے کہ ہمارے دل میں لگن ہوتی ہے کہ کسی طرح ہم پیسہ کمائیں، تجارت، زراعت، ملازمت کے ذریعے کسی طرح کمائیں۔چوبیس گھنٹے آدمی دماغ لڑاتا رہتا ہے کہ مال کس طرح سے فراہم کروں، اگر مال میں کمی ہوجائے تو کس طرح سے بڑھاؤں' ڈیزائن ختم ہوجائے تو کس طرح سے پورا کروں کہ کمی نہ ہونے پائے۔ گاہک آئے میں یوں نہ کہوں کہ اس وقت مال نہیں ہے۔تو تاجر ہر مال رکھتا ہے تاکہ گاہک کو جواب نہ دینا پڑے۔

گاہکوں کی اگر کثرت ہے مثلاً پچاس ہوں تو سوگاہک کا مال رکھے گا کہ اگر ایک دم سو گاہک آجائیں تو مجھے انکار نہ کرنا پڑے۔حالانکہ اگر وہ انکار کرتا اور سو کی بجائے پچاس کو دے، روٹی تب بھی چلے گی، مگر وہ تو جذبہ ہوتا ہے کہ مال بڑھے، پیسہ بڑھے ایک لگن لگی ہوتی ہے۔۔بس ٹھیک اسی طرح سے ان لوگوں کے دل میں لگن ہوتی ہے

① السنن لابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ماجاء في اسباغ الوضوء ج: ۲ ص: ۱۹ .

کہ نیکی بڑھے، حالانکہ نجات کے لئے اتنی نیکیاں بھی کافی ہیں جتنی اب تک تھیں، مگر یہ چاہتے ہیں کہ اور اضافہ ہو، درجات ملتے رہیں۔ کسی مرتبے اور درجے پر آ کر رکتے ہی نہیں۔ ان کے دل میں ہوس ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ حرص وہوس کوئی بری چیز نہیں، مصرف اس کا صحیح، غلط ہوتا ہے۔ حرص بہت بڑی چیز ہے، اس کو ہم برا نہیں کہتے۔ حرص سے انسان کا حوصلہ کھلتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''اگر ہم ایک جنگل بھر کر بنی آدم کو سونے کا دیدیں تو یہ ہم سے دوسرا مانگے گا''۔

معلوم ہوا اتنا بڑا حوصلہ ہے کہ پوری دنیا کو سونے سے بھر دیں جب بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ گویا اس کا پیٹ یعنی حوصلہ بہت بڑا ہے تو حرص بہت بڑی چیز ہے۔ اس واسطے یہ بری چیز نہیں ہے کہ اس کو برا کہا جائے گا۔

البتہ برا کس چیز کو سمجھا گیا؟ اس کو کہ حوصلہ تو اتنا بڑا اور اسے چند ٹھیکروں میں گنوا دے، اس چیز سے وہ چیز کماؤ کہ جیسے تمہاری حرص کی حد نہیں، اس نعمت کی بھی کوئی حد نہ ہو۔ دنیاداری میں اگر ہم نے حرص لگائی تو حرص تو اتنی بری کہ دنیا کے ساتھ آخرت بھی سما جائے اور اسے دنیا کی چیزوں کے اوپر لگا دیا۔ دنیا کی چند دن کی عمر ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ حرص تو آگے جا رہی ہے اور دنیا یہیں ختم ہو گئی۔ تو اس جذبے کی ہم نے ناقدری کی کہ اللہ نے جذبہ بڑا دیا تھا اس کو حقیر چیز کے اندر ہم نے کھو دیا۔ لیکن اگر اس حرص سے ہم جنت چاہیں تو جیسے ہماری حرص کی حد نہیں، جنت کی نعمتوں کی بھی حد نہیں۔ مانگو کہاں تک مانگتے ہو۔

﴿وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ① یہی موقع ہے جس میں آدمی حریص بنے۔ تو حرص کا جذبہ برا نہیں ہے۔ اس کا مصرف ہم نے غلط تجویز کر رکھا ہے۔ حرص ہمیں وہاں کرنی چاہئے جہاں نعمت کی کہیں انتہاء نہ ہو۔ وہ اللہ کے علوم وکمالات ہیں کہ ان کی کہیں انتہاء نہیں۔ یعنی ایک عالم دوسرے عالم کو دیکھ کر حرص کرے کہ کہ اسے سو مسئلے معلوم ہیں میں ڈیڑھ سو کیوں نہ معلوم کروں؟ اور یہ دو سو جانتا ہے میں اڑھائی سو کیوں نہ معلوم کروں، اس میں حرص کرے۔

اس لئے دونوں اگر حرص کریں گے کہ اسے ڈیڑھ سو معلوم ہوئے اسے عار آئی کہ یہ مجھ سے بڑھ گیا میں تین سو معلوم کروں گا پھر اسے عار پیدا ہوئی تو یہ کہے گا میں چار سو معلوم کرتا ہوں۔ ساری عمر یہ بڑھتے رہیں وہاں کمی نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ علم کی کوئی انتہاء نہیں اگر ساری دنیا مل کر حرص کرنے لگے کہ ہمیں علم حاصل ہو۔ جب بھی علم میں کمی نہیں آئے گی۔ تو حرص ایسے موقع پر کرے جہاں کمی نہ ہو۔ حرص جیسی نعمت کو چھوٹی چیزوں میں گنوا دیا جائے، اسے پسند نہیں کیا گیا۔ یہاں تو ضرورت پوری کرو اور حرص کے جذبے کو آخرت، عمل اور معرفت کے ساتھ لگا دو تاکہ کہیں بھی تم نہ رک سکو۔ ان اہل اللہ نے دانش مندی سے کام لیا کہ اپنے اس حرص کے جذبے کو نیکی اور اجر کمانے کے اندر لگایا کہ جیسے ہماری حرص کی حد نہیں نیکی کی بھی حد نہیں ہم نے حرص کو ان چیزوں کے اندر لگا دیا جو

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶.

چند دن کے بعد ختم ہو جانے والی ہیں اور حرص آگے تک چلے گی، تو اس کا پیٹ نہیں بھرے گا اور آخرت میں پیٹ بھر سکتا ہے اس لئے یہ لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تو ہمارے حاجی امداداللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ، مسجد کے دو راستے ہوتے تو طویل راستے کو اختیار کرتے۔ مختصر راستے کو اختیار نہ کرتے اور طویل راستے میں بھی قدم کثیر رکھتے تا کہ قدم بڑھ جائیں۔ یہ وہی حرص تھی کہ جتنی نیکیاں کما سکیں۔

نبوّت ضعفاء کو بلند کرتی ہے...... بہرحال ایک ملوکیت اور ایک نبوّت ہے۔ ملوکیت دولت اور اقتدار کی مالک ہوتی ہے مادی چیزیں قبضے میں ہوتی ہیں اور نبوّت روحانی نعمتوں، علم، معرفت، کمالات خداوندی اور قرب الٰہی وغیرہ کی مالک ہوتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے مزاج میں رافت نرمی، محبت اور ترس کھانا ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ غالب ہوں گے اتنا زیادہ رحم و کرم ان میں اور بڑھتا رہے گا اور مادی اقتدار کے اندر قصہ برعکس ہوتا ہے۔ چونکہ اقتدار محدود ہے خواہ بادشاہ کا ہو، اسے ڈر ہوتا ہے کہ دوسرا نہ چھین لے۔ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تو وہ شک کے اوپر بھی دوسروں کی راہیں بند کرنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ کہیں آنے نہ پائیں کہ میرے اقتدار میں کمی آ جائے۔

تو نبوّت اور ملوکیت میں یہی فرق ہے کہ ملوکیت تعدی اور زیادتی کی طرف چلتی ہے اور نبوّت رحمدلی اور مہربانی کی طرف چلتی ہے۔ بادشاہت میں اگر کوئی برسر اقتدار سامنے آئے اس کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کوئی کمزور ہو اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ابھرنے نہ پائے اور انبیاء علیہم السلام کمزور کو ابھارتے ہیں، جو زور آور ہو اسے اعتدال پر رکھتے ہیں، اسی واسطے جو زیادہ ضعیف ہوگا اس پر انبیاء علیہم السلام کا لطف و کرم زیادہ مبذول ہوگا۔

دنیا کی اقوام نے عورت کی تذلیل کی اور اسلام نے اسے مقام بخشا...... مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ عورت بہت زیادہ کمزور صنف ہے۔ مرد کو اللہ پاک نے قوت بخشی ہے، عورت میں وہ قوت نہیں ہے۔ نہ معنوی قوت اتنی ہے نہ ظاہری۔ بدن کے اعتبار سے بھی عورت بنسبت مرد کے کمزور ہے اور اندرونی قوتوں عقل و فراست دونوں کے لحاظ سے بھی مرد سے کمزور ہے۔ تو یہ ایک ناتواں اور ضعیف صنف ہے، اسلام نے اس کو اتنا ابھارا، اتنا سہارا دیا کہ اسے احساس نہ پیدا ہو کہ میں کمزور ہوں۔ شروع سے ابھارنا شروع کیا۔ عورت پر تین ہی حالتیں گزرتی ہیں۔ ایک اس کا بچپن ہے جب وہ اولاد کے درجے میں ہوتی ہے۔ ماں باپ سرپرست ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ جوانی کا ہے جب اس کا نکاح ہو جاتا ہے تو خاوند کے ماتحت آ جاتی ہے۔ اور تیسری حالت یہ ہے کہ اس کی اپنی اولاد سامنے ہو۔ تو ایک خود بیٹی ہے اور ایک بیٹوں کی ماں بن جائے اور ایک خاوند کی بیوی بنے۔ ان تینوں حالتوں کے اندر اسلام نے اسے ابھارا ہے۔

جب وہ خود بیٹی ہو، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لڑکے تمہارے حق میں نعمتیں ہیں، ان پر شکر کرو اور لڑکیوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تمہاری نیکیاں ہیں۔ گویا نعمت کے اوپر شکر واجب ہے، کفرانِ نعمت کرو گے سزا ملے گی اور لڑکی کو کہا گیا کہ یہ باپ کی حسنات میں داخل ہے۔ نیکیاں جنت میں پہنچاتی ہیں تو یہ تمہیں جنت میں پہنچانے کا

ذریعہ بنیں گی۔اس لئے لڑکی کے اوپر محبت وشفقت زیادہ مبذول کی گئی تا کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں پر ماں باپ زیادہ شفقت کریں۔اندازہ کیجئے لڑکوں کو نعمت اور لڑکیوں کو نیکی کہا گیا۔تو جیسے ہر نیکی پر توقع ہوتی ہے کہ اجر ملے گا تو لڑکی کے ہونے پر اجر ملے گا۔لڑکے اگر دس بھی ہو جائیں اس پر اجر کا کوئی سوال نہیں۔شکر کرو گے تو ٹھیک ہے۔ نہیں کرو گے تو گردن نپے گی اور لڑکی اگر ہوگئی، آدمی شکر کرے نہ کرے لیکن خود اس کا ہو جانا ایک مستقل نیکی ہے۔ نامہ اعمال میں اجر لکھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اولاد میں گویا ماں باپ کے اوپر اس درجے میں احسان ہے کہ انکے نامہ اعمال کو اس نے نیکیوں سے بھر دیا اور شریعت کا منشاء یہ ہے کہ شفقت ورحمت لڑکی کے اوپر زیادہ مبذول ہونی چاہئے غرض جب وہ بیٹی ہے تو شریعت نے اس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا اور جب وہ منکوحہ ہو کر خاوند کے تحت آئی، پھر شریعت نے یہ بتلایا کہ "اِنَّ اَکْرَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَهْلًا" تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم، مسلمان وہ ہے کہ اس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور بیویوں کے ساتھ لطف ومحبت کرے، سخت دلی کا برتاؤ نہ کرے، تنگی اور سختی سے پیش نہ آئے۔اگر ان سے کوئی زیادتی بھی ہو تو صبر وتحمل سے کام لے۔تو جب بیوی ہونے کی حالت ہے تو خاوند کو متوجہ کیا کہ یہ تیری سب سے زیادہ شفقت ومحبت کی مستحق ہے اور اس کی اپنی اولاد ہو جائے، یعنی ماں بنے تو حدیث میں فرمایا گیا کہ اولاد کے لئے ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔جتنی ماں کی اطاعت کرے گا، جنت اس کے قریب ہوگی۔جتنی ماں کی نافرمانی کرے گا، اتنی جنت بعید ہوگی، اللہ کی رحمت سے دور ہوتا جائے گا۔معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے سر پر حق تعالیٰ کی رحمت مبذول ہوتی ہے کہ اگر اولاد ماں کے قریب ہو جائے تو رحمت قریب ہو جاتی ہے۔

اور یہ کیسے لطف کے ساتھ فرمایا، یوں بھی فرما دیتے کہ عورت (ماں) کے ہاتھ کے نیچے یا نگاہوں کے نیچے جنت ہے، یہ نہیں فرمایا۔فرمایا قدموں کے نیچے جنت ہے۔گویا مطلب یہ ہے کہ قدم سب سے زیادہ کم درجے کی چیز ہوتی ہے۔انسان کے بدن میں سب سے زیادہ کم رتبہ قدم ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ بارتبہ سر ہوتا ہے۔ اولاد کو یہ تنبیہہ کی گئی کہ تیرے حق میں اس کے قدم بھی بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔اگر تو ان قدموں کے اوپر ہاتھ رکھے گا تو جنت کو اس کے قدموں میں پائے گا۔گویا انتہاء درجے کی تکریم کی۔

عورت اقوام دنیا کی نظر میں......اور یہ اس لئے کہ دنیا کی اقوام نے عورت کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسلام سے پہلے ایک زمانہ تھا جب کہ یہود کا غلبہ تھا۔اب یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے مذہب کی چیز تھی یا نہیں تھی۔غالب گمان یہ ہے کہ مذہب کی چیز نہیں تھی، قومی قانون بنایا گیا تھا اس قومیت کے قانون کے تحت یہ چیز تھی اور یونانیوں میں سب سے زیادہ تھی۔وہ یہ کہ عورت پر ماں باپ کو اتنا استحقاق حاصل ہے کہ اسے چاہے باپ قتل کردے، چاہے اسے زندہ دفن کر دے حتیٰ کہ مشرکین مکہ میں بھی یہ رسم رائج تھی کہ عورت کو زندہ دفن کرتے۔گویا اس زمانے کے قانون نے انہیں یہ حق دیا تھا کہ اگر لڑکی کا گلا گھونٹ کر یا زندہ کو قبر میں ڈال دو، کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں،

کوئی عدالت انہیں سزا نہ دے سکتی تھی۔ یونانیوں کے ہاں یہ قانون تھا کہ خاوند جب کسی عورت سے نکاح کر لیتا تھا تو عورت باندی سے بھی کم رتبہ ہوتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور نافرمانی پر اسے حق تھا کہ عورت کی گردن مار دے اور قتل کر دے۔ انتہا سے زیادہ سزا تھی۔ یہاں تک کہ اگر عورت سے کوئی برائی ثابت ہو جائے تو گھوڑے کی ٹانگ میں رسی باندھ کر رسی کا ایک سرا عورت کی گردن میں باندھا جاتا تھا اور خاوند گھوڑے پر بیٹھ کر اسے دوڑاتا تھا اور وہ بیچاری گھسٹتی جا رہی ہے لہولہان ہو رہی ہے۔ عورت سے یہ سلوک کر رکھا تھا۔ اسلام نے آ کر عورت کا رتبہ بلند کیا۔

اور یہ تو وہ زمانہ تھا جس کو جہالت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ آج تمدن کا زمانہ ہے ابھی تقریباً دس پندرہ سال کا عرصہ ہوا ہے اخبارات میں خبر چھپی تھی کہ یورپ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی کہ اس پر غور کیا جائے کہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ عورت کی حیثیت و پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ مختلف ممالک کے نمائندے جمع ہوئے جنہوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ مختلف رائیں ہوئیں بعض ملکوں کے نمائندوں نے کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ عورت انسانیت میں ہی داخل نہیں ہے انسان نام فقط مرد کا ہے، عورت کا نام نہیں ہے۔ یہ کوئی اور جنس ہے جو مرد کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ ایک ملک والوں نے رائے دی پھر آراء میں اختلاف ہوتا رہا، بالآخر اس پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ عورت مرد کی تفریح کا ایک آلہ ہے، کھلونا ہے کہ مرد اس سے تفریح کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی خاص پوزیشن عورت کی نہیں ہے اس تفریح کی وجہ سے قدر کرتے ہیں، عورت کے مرتبے کی وجہ سے قدر نہیں کرتے۔ چونکہ اپنی غرض متعلق ہے اس واسطے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، آلۂ تفریح ہے اس لئے اس کو سجاتے ہیں۔ جیسے لڑکیاں جب گڑیوں سے کھیلتی ہیں تو دلہن کو بڑے اچھے اچھے کپڑے پہناتی ہیں، اس کو زیور بھی پہناتی ہیں اور بعض بے وقوف جب ان کی آپس میں شادیاں کراتی ہیں تو دس دس روپے کا جہیز بھی اسے دیتی ہیں۔

یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ انکے دل میں گڑیا کی کوئی وقعت ہے۔ وہ تو ایک کھلونا ہے اپنی تفریح طبع کے لئے اس گڑیا کو لباس پہنا کے سجا دیتے ہیں، چونکہ عورت بھی تفریح کا آلہ ہے، اس لئے اس کو سجا دیا۔ زیور پہنا دیا ورنہ اس کا کوئی خاص حق نہیں ہے۔

خاوند بیوی بلحاظ حقوق مساوی ہیں...... لیکن اسلام نے آ کر ان کے برخلاف عورتوں کو حقوق دیئے اور فرمایا ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ① جو عورت پر خاوند کے حقوق واجب ہیں وہی خاوند پر عورت کے حقوق واجب ہیں وہ حقوق میں کمی کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔ عورت کرے گی، اسے سزا دی جائے گی۔

تو زوجین میں نکاح کے بعد ازدواجی زندگی میں دونوں کا رتبہ حقوق کے لحاظ سے برابر قرار دیا۔ یہ الگ چیز ہے کہ عورت کی عقل میں چونکہ نقصان یا کمزوری ہے اس واسطے اس کو زیر تربیت رکھا، تو یہ منصب کی بات ہے لیکن

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸۔

حقوق کے درجے میں دونوں کو برابر قرار دیا کہ عورت کے اوپر مرد کے حقوق ہیں تو عورت کے بھی ہیں۔

اگر عورت نافرمانی کرے تو مرد کو طلاق کا مالک بنایا گیا ہے۔ اگر مرد زیادتی کرے تو عورت کو خلع کا مالک بنایا گیا ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہو تو وہ عدالت میں قاضی کے ہاں درخواست دے سکتی ہے کہ میں خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتی۔ نان ونفقہ خاوند پر واجب ہے، وہ ادا نہیں کرتا۔ حکومت اس کے اوپر جبر کرے گی اور اگر بالکل علیحدہ ہونا چاہے تو علیحدہ بھی ہوسکتی ہے جس کو خلع کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ قاضی کے ہاں درخواست کرے گی قاضی خاوند کو بلا کر اس سے مؤاخذہ کرے گا، کیوں نہیں تم نے حقوق ادا کئے۔ اگر اس نے جواب کچھ معقول دیا فبھا۔ ورنہ قاضی کہے گا نکاح فسخ کردے۔ یہ تیرے پاس نہیں رہنا چاہتی۔ اگر فسخ نہیں کرے گا تو قاضی عورت کو طلاق دیدے گا اور طلاق واقع ہوجائے گی تو اس خلع کا مالک عورت کو بنایا گیا ہے۔ غرض اگر ایک طرف طلاق کی ملکیت مرد کے لئے رکھی تو خلع کی ملکیت عورت کے لئے رکھی۔ وہ مجبور ہو کر جدا ہونا چاہے، ہوسکتا ہے یہ چاہے یہ بھی ہوسکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ حقوق کے درجے میں مساوی قرار دیا۔

بعض چیزیں عورت اخلاقاً انجام دیتی ہے اور بعض چیزیں مرد بھی اخلاقاً انجام دیتا ہے لیکن عورت کے لئے واجب نہیں ہے جیسے مثلاً دودھ پلانا ہے عورت کے ذمے واجب نہیں ہے۔ مرد سے کہہ سکتی ہے کہ تو خرچ کر کے دودھ پلوا، میں دودھ نہیں پلاسکتی۔ عورت اولاد کے کپڑے سیتی ہے لیکن اگر وہ خاوند سے کہے کہ درزی سے سلواؤ میرے ذمے واجب نہیں ہے تو خاوند ہرگز مجبور نہیں کرسکتا۔ بہر حال شریعت اسلام میں اس قسم کی چیزیں رکھی گئی ہیں کہ اگر اس کے حقوق ہیں تو اس کے بھی حقوق ہیں۔ یہ اسلام ہی نے اس کو ابھارا۔ تنگ دست اور نازک صنف کو ابھارا، جس کو دنیا کی اقوام نے پامال کردیا تھا۔

غرض جاہل اقوام نے اس پر یہ حقوق جتلائے کہ اس کی گردن مار سکتے تھے، اس کو ایذائیں پہنچا سکتے تھے اور متمدن اقوام یہاں تک پہنچیں کہ وہ تفریح کا ایک کھلونا ہے اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ اسلام نے کہا کہ کھلونا نہیں، بلکہ خانگی زندگی میں برابر کی حقدار ہے، جس طرح کہ خاوند کے انتقال کے بعد اس کی اولاد وارث ہوگی، دوسرے اس کے وارث ہوں گے، عورت کو وراثت پہنچے گی۔ جس طرح سے عورت کے انتقال کے بعد خاوند کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ عورت کو بھی خاوند کا وارث قرار دیا گیا۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ① جتنے عورتوں پر خاوندوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اتنا ہی خاوندوں کے اوپر بھی عورتوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ برابری اس حد تک رکھی گئی ہے کہ عورت کوئی باندی اور مملوک نہیں بلکہ شریک زندگی اور شریک حیات ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ کمزوروں کو ابھارتا ہے، دبتے کو دباتا نہیں

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸.

بلکہ دبے ہوئے کو اونچا کرنا چاہتا ہے، کمزوروں کو دباتا نہیں بلکہ اونچا بنانا چاہتا ہے، سب سے زیادہ کمزور صنف عورت تھی۔ اسلام نے اس کے اوپر انتہائی رحم وکرم کیا کہ جب وہ بیٹی ہونے کی حالت میں ہے تو ماں باپ کی نیکیوں میں شمار کیا جارہا ہے۔ جب وہ منکوحہ بنی، تو خاوند سے کہا گیا تو قابل تکریم تب بنے گا جب عورت کے ساتھ نرمی اور مدارات کا برتاؤ کرے، جب وہ ماں بن گئی تو اولاد سے کہا جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر قدم پر ہاتھ رکھے گا جنت کو قریب پائے گا، اگر تو نے ماں کو ستایا تو جنت قریب نہیں ہوگی، آخرت میں نجات نہیں ہوگی یعنی باپ سے زیادہ ماں کا حق قائم کردیا۔ باپ کے بھی اولاد کے اوپر حقوق ہیں لیکن ماں کے حقوق اس سے زیادہ ہیں۔

ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں......اور اس کی وجہ قرآنِ کریم نے ارشاد فرمائی کہ عورت جتنی مصیبت اولاد کی پرورش میں اٹھاتی ہے باپ نہیں اٹھاتا۔ باپ زیادہ سے زیادہ کماتا ہے میں کہتا ہوں اگر وہ شادی نہ کرتا جب بھی کماتا، اپنے لئے کماتا، دوسروں کے لئے کماتا۔ تو کمانا اس کی طبعی بات ہے وہ ہر صورت سے کماتا گویا وہ محنت محض بیوی کے لئے نہیں ہوتی، وہ اپنے نفس کے لئے بھی ہوتی ہے، اپنے عزیزوں کے لئے بھی ہوتی ہے لیکن عورت اولاد کے لئے جو محنت گوارا کرتی ہے وہ خاوند نہیں کرسکتا۔ نو مہینے تو پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے جس کو فرمایا گیا ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ ①

اور فرمایا گیا ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْكَ﴾ ② تھک تھک کر، عاجز آ کر نو مہینے اس کو پیٹ میں اٹھاتی ہے۔ اس کے اوپر ایک بوجھ ہے مگر برداشت کررہی ہے۔ پھر اس کے بعد وضع حمل، تو اس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ "جننا اور مرنا برابر ہوتا ہے" گویا اس کی زندگی کے لالے ہوتے ہیں۔ باقی اللہ بچاوے تو بچاوے، ورنہ موتیں واقع ہوجاتی ہیں۔ تو نو مہینے وہ مصیبت اٹھائی اور جننے کی ایک مستقل مصیبت اٹھائی، پھر اس کے بعد دو برس اس کو اپنا خون چسانا، دودھ پلانا، یہ اپنے بدن کے اجزا اس کو پہنچانا یہ خاوند نہیں کرسکتا، بیوی کرتی ہے، یہ ماں کرتی ہے، باپ نہیں کرسکتا۔

پھر اگر بچے کو ضد چڑھ گئی کہ میں تو گود میں چڑھ کر سوؤں گا۔ عورت کو ساری ساری رات گزر جاتی ہے کہ گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ بچہ اگر بیمار ہے تو ماں اس سے پہلے بیمار ہوجاتی ہے۔ اس کو الگ دکھ ہوتا ہے۔ غرض باپ کی مجال نہیں ہے کہ یہ محنت برداشت کرے، وہ تو مجنوں ہو کے نکل جائے۔

عورت میں جذبۂ خدمت......اور کہیں ایسا ہو کہ عورت یوں کہے کہ سال یا مہینہ بھر کے لئے خدمت کا تبادلہ کر لیں۔ میں تیری خدمت انجام دوں اور تو بیٹھ کے بال بچے پال، تو ممکن نہیں دو دن میں اسے جنون ہوجائے گا اور پریشان ہو کے نکل جائے گا یہ عورت ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اس محنت کو برداشت کرتی ہے مرد برداشت نہیں کرسکتا۔

وہ ہمارے ہاں ایک کاشتکار کا قصہ مشہور ہے اور قصہ واقعی ہے، فرضی نہیں ہے کہ وہ کاشتکار اپنے کھیت پر گیا۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۱۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۴۔

وہاں جا کے کھیت کیاری کے کام میں لگ گیا۔ تو طریقہ یہ تھا کہ اس کی عورت ٹھیک بارہ بجے کھانا پکا کے لایا کرتی تھی ایک دن اتفاق سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر ہوگئی۔ کاشتکار آئے جائے تو کہاں؟ اسے غصہ چڑھا اس نے سینکڑوں صلواتیں بیوی کو سنائیں کہ تجھ سے کام نہیں ہوتا اور تو سست ہوگئی ہے اور کم بخت تجھ سے کچھ نہیں نبھتا اور میں ہوتا تو یوں کرتا اور تو ایسی ہے تو ویسی ہے بیچاری سنتی رہی یعنی صبح سے شام تک لڑکھپ کے بچوں کو الگ پالا، کھانا الگ پکایا، کھیت پر لے کر بھی گئی، اتفاق سے اگر ذرا دیر ہوگئی تو خاوند نے سینکڑوں صلواتیں سنائیں خیر وہ غریب سنتی رہی۔ خاوند کی زبان سے نکلا کہ اگر میں اس کام میں ہوتا تو کبھی یہ بات نہ ہوتی۔ اس نے کہا اچھا پھر دو چار دن کے لئے خدمتوں کا تبادلہ کرلو۔ میں کھیت پر کام کروں گی تو گھر پر رہ بچوں کو پال اور بارہ بجے کھانا لیکر آجایا کرنا۔ اس نے کہا یہ کونسی بڑی بات ہے میں کرلوں گا۔ اس نے کہا اچھا کل سے پھر یہی ہوگا۔

چنانچہ صبح کو اٹھتے ہی بیوی تو کھیت پر چلی آئی اور کھیتی کا کام شروع کر دیا۔ اب یہ خاوند صاحب گھر لیٹے رہے آنکھ کھلی تو ایک بچہ رو دیا، یہ اسے سنبھالنے کے لئے گئے تو ادھر سے دوسرا چلایا، اسے پکڑنے کے لئے گئے تو تیسرا رویا، ابھی اس سے نہیں نمٹے کہ معلوم ہوا، وہ گھر میں گائے بندھ رہی تھی اس کا بچھڑا رسہ چھڑا کر گائے کے دودھ پر جا کے لگ گیا، اسی پر گذرا اوقات تھی۔ یہ جلدی سے بچھڑے کو سنبھالنے گیا، تو بچہ چارپائی سے نیچے گر پڑا، اب وہ چلا رہا ہے، شور مچا رہا ہے، یہ وہاں پہنچے بچھڑا جو وہاں پہنچا اور اس نے دودھ لیا تو گائے گھبرا کے بھاگی اور اس کی رسی چارپائی میں اٹک گئی تو وہ چارپائی سمیت چولھے پر چڑھ گئی۔ تو اب چارپائی چولھے کے اوپر رکھی ہوئی ہے، بچہ وہاں پڑا ہوا ہے اور ایک بچہ ادھر چلا رہا ہے، اب اسے پریشانی ہے کہ بچوں کو سنبھالوں یا بچھڑے کو سنبھالوں یا کھانا پکاؤں یا دودھ نکالوں، کھڑا ہوا مجنوں کی طرح ہر طرف دیکھ رہا ہے، یہاں تک کہ دس گیارہ بج گئے، وہ بیچاری کھیت کے اوپر محنت کر رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ آج بارہ چھوڑ ساڑھے گیارہ بجے کھانا آجائے گا۔ اس لئے کہ مرد بہت قوی ہے، خوب کام انجام دے گا۔ جب بارہ چھوڑ ایک بج گیا اور کوئی نہ آیا۔ اس نے کہا کیا قصہ پیش آ گیا؟ وہ آئی۔ تو آ کے دیکھا کہ ایک بچہ ادھر پڑا رو رہا ہے، ایک ادھر رو رہا ہے اور چارپائی چولھے کے اوپر ٹنگ رہی ہے اور گائے چولھے پر چڑھ رہی، اور بچھڑا پڑا ہوا ہے، نہ کھانا، نہ دودھ، نہ چارپائی، نہ اپنے بچے، گھر میں کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں اور خاوند صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟ خاوند نے کہا بس کچھ نہیں۔ یہ تیرا ہی کام ہے میرے بس کا کچھ نہیں۔ پھر اس نے کھیتی کا کام شروع کیا اور عورت نے گھر کو سنبھالا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عورت کا بڑا حوصلہ ہے کہ گھر میں بچوں کو سنبھالنا، کھانا پکانا، گھر کا انتظام کرنا اور خاوند کے سارے معمولات اور خدمات کو انجام دینا۔ اگر خاوند کو چار خدمتیں سپرد کر دی جائیں، دیوانہ ہو جائے۔ یہ عورت ہی کر سکتی ہے۔ چونکہ یہ چیز تھی اس واسطے شریعت اسلام نے اس کا رتبہ بلند کیا۔ باپ سے زیادہ اس کے حقوق بڑھائے۔ مرد منصب کے لحاظ سے کتنا ہی بلند سہی، لیکن حقوق کے لحاظ سے اتنا بلند نہیں ہے جتنے شریعت نے عورت کے حقوق قائم کئے ہیں۔

تو شریعت کا یہ خاص اصول ہے کہ ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ① جو زمین میں ضعیف اور کمزور ہیں ہم ان کو ابھاریں گے۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ ان کو بلند و بالا کیا جائے، تو عورت ضعیف، نازک تھی اس لئے اس کو ابھارا۔

یتیم پر شفقت کے لئے ساری امت کو متوجہ کیا گیا...... اسی طرح یتیم بیچارہ ضعیف ہوتا ہے۔ ماں باپ اس کے گزر گئے لاوارث رہ گیا، کوئی پالنے والا نہیں ہے اس پر شفقت کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے، اگر کوئی شخص یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: ''اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ كَهَاتَيْنِ.'' ② میں اور یتیم کی خدمت کرنے والا جنت میں بالکل اس طرح برابر ہوں گے میں ذرا آگے نکل جاؤں گا۔ وہ کچھ پیچھے رہے گا۔ مگر اس کے رتبے کی معیت وہی ہوگی جو جنت میں مجھے دی جائے گی۔ اور پہلے یتیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ سے زیادہ یتیموں کا والی اور وارث کون ہوسکتا ہے؟ اور آپ سے زیادہ یتیموں کو سہارا دینے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس واسطے احادیث یتیموں کی خدمت کے فضائل سے بھری پڑی ہیں۔

روح اس کے اندر یہی ہے کہ یتیم کمزور تھا، ماں باپ گزر گئے تھے دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ عزیز اقرباء بھی ہوتے ہیں، لیکن جب تک خود اپنی غرض متعلق نہ ہو خلوص سے خدمت کرنے والے دنیا میں گنے چنے ہوتے ہیں، عام طور سے نہیں ہوتے اس واسطے پوری امت کو متوجہ کیا ہے کہ یتیم کا باپ گزر گیا تو ساری امت بمنزلہ باپ کے ہے۔ ہر انسان اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی خدمت کی طرف توجہ کرے۔ تو عورت کمزور تھی اس کی طرف توجہ فرمائی، یتیم کمزور تھا اس کی طرف توجہ فرمائی۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم...... اگر آپ کا کوئی زرخرید غلام ہے وہ بیچارہ کمزور ہے۔ آپ کو آقا سمجھتا ہے تو اس کے لئے شریعت نے فرمایا، اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ ③ وہ غلام جن کو تم نے خریدا ہے وہ بمنزلہ تمہارے بھائی کے ہیں۔ جو خود کھاتے ہو وہ انہیں کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ، جو اپنی اولاد کو تعلیم دیتے ہو، وہ انہیں تعلیم دو۔ یعنی برابری کا رتبہ رکھو۔ پھر اس کی اتنی عزت بڑھائی کہ اگر آقا اور غلام مسجد میں آئیں تو یہ فرق نہیں ہوسکتا کہ غلام پچھلی صف میں آئے اور آقا اگلی صف میں آئے، وہ دوش بدوش برابر کھڑا ہوگا۔ آقا کو کوئی حق نہیں ہے کہ اسے پیچھے ہٹادے۔ شریعت نے مساوات قائم کی۔ تو ادھر فرمایا ''اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ'' ④

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب البر، باب الاحسان الی الارملة والمسکین والیتیم، ج: ۴ ص: ۲۲۸۷ رقم: ۲۹۸۳.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من الجاھلیة ولا یکفر صاحبھا، ج: ۱ ص: ۲۰ رقم: ۳۰.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من الجاھلیة ولا یکفر صاحبھا، ج: ۱ ص: ۲۰ رقم: ۳۰.

تمہارے برابر کے بھائی ہیں۔ جو خود کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو انہیں پہناؤ، ان کو تعلیم اور تادیب کرو، حسن سلوک سے ان سے پیش آؤ۔

پھر غلام کو آزاد کرنے کے فضائل سے احادیث بھری پڑی ہیں کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کر دیا فرمایا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک حج مع عمرے کے انجام دیا۔ جو اس کا اجر ہوتا ہے، وہ ایک غلام کو آزاد کرنے میں اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شروع زمانے میں جہاد جتنا زیادہ تھا، غلام زیادہ آتے تھے، ان کو آزاد کرنے کا اتنا دستور تھا کہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں غلام آزاد ہوتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے، پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شروع زمانہ اسلام میں بڑے بڑے اکابر علماء جن سے دین اور علم پھیلا، زیادہ تر غلام ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کے پاس کوئی زیادہ اسباب معیشت اور دولت نہیں ہوتی تھی، گھر بار نہیں ہوتا تھا کہ اس میں لگیں، وہ خالص دین اور علم کی طرف متوجہ ہو جاتے، اس لئے جتنا وہ علم سیکھتے تھے گھر بار والے اتنا نہیں سیکھتے تھے۔ انہیں کچھ دولت کا، کچھ گھر کا شغل بھی ہوتا۔ انہیں فقط علم سیکھنے کا شوق اور شغل ہوتا تھا۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دیہات کے رہنے والے اور غلام تھے۔ لیکن آج وہ سارے مسلمانوں کے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباحؒ کے بارے میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''مَارَاَیْتُ اَحْسَنَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ'' ① میں نے اپنے زمانے میں عطاء ابن ابی رباح سے زیادہ فضیلت والا کوئی شخص نہیں دیکھا، تو جس کے علم کی امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعریف کریں۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے علم کیا رتبہ ہوگا؟ یہ بھی غلام ہیں۔ تو اتنے بڑے ہیں کہ آج مسلمانوں کے مقتداء ہیں اور اپنی ذات سے دیکھیں تو وہ غلام ہیں۔

صوفیاء اور علماء میں غلام بڑے بڑے اکابر ہوئے اور بڑی تعداد میں ہوئے۔ یہ شریعت اسلام کی اس ہدایت کا اثر ہے کہ اس نے کمزور دیکھ کر پوری امت کو متوجہ کر دیا، ہر آقا کو متوجہ کیا کہ اپنے غلام کو حقیر مت سمجھنا۔

اسلام سے قبل غلاموں سے بدسلوکی...... یہ اس لئے ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کے لئے غلامی ایک بدترین عذاب تھا آقا کو غلام پر حق حاصل تھا کہ اسے قتل کر دے، اس کو ذبح کر دے، اس کو دردناک سزائیں دے، کوئی قانون اس پر گرفت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک لوگ کرتے تھے کہ تاریخوں میں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ کس طرح ان کے دل برداشت کرتے تھے، غلام سے ذرا سی کوتاہی ہوئی شکنجے بنوائے ہوئے ہوتے جس میں اِدھر اُدھر برچھے

---

① لم اجدهذه الروايةبهذا السياق ولكن اخرج الامام الترمذى والبيهقى وابن حبان والعلامة ابن بطةوالفاكهى وابن الجعد والزيلعى والعينى وابن عبدالبر واللفظ للترمذى:حيث قال: حدثنامحمودبن غيلان ،حدثناابويحيىٰ الحمانى سمعت اباحنيفة رحمه اللهتعالىٰ يقول مارايت احدا اكذب من جابرالجعفى ولاافضل من عطاء ابن ابى رباح ،السنن للترمذى ج:٢ ١ ص:٢٩٢ .اللهم الان الراقم قد تساهل فى نقل الرواية الصحيحة بهذه الالفاظ حيث ذكر"احسن "بدل قوله افضل.والله اعلم.

لگے ہوتے تھے بیچ میں غلام کو رکھ کے اس کو ملا دیتے تھے۔ اُدھر اُدھر سے برچھا آر پار ہو جاتا تھا اور ہنس رہے ہیں۔

تالابوں کے اندر سانپ چھوڑے ہوئے ہیں، غلام سے ذراسی کوتاہی ہوئی لات مار کے دھکیل دیا۔ سانپ لپٹ گئے اور آقا کی تفریح ہو رہی ہے۔ بھڑیئے جمع کئے گئے اور اس غلام پہ چھوڑ دیئے گئے، جو سزا کا مستحق تھا، بھیڑیئے اس کو جھپٹ رہے ہیں پھاڑ کھا رہے ہیں اور آقا تفریح کر رہے ہیں۔ غلام کی یہ کیفیت تھی۔

اسلام نے غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟...... اسلام نے آ کر غلامی کو تو نہیں مٹایا کہ یہ فطری سی چیز ہے۔ سیاسی طور پر جب کسی قوم پر غلبہ ہوا اور وہ قوم حربی بنے اور مقابلہ پر آئے تو سیاسی آزادی چھینی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم مفتوح قوم سے سیاسی آزادی چھین لیتی ہے۔ ان سے بھی چھینی جاتی تھی۔ یہی معنی غلامی کے ہیں۔ دینی آزادی نہیں چھینی جاتی تھی۔ غلام مسجد میں آ سکتا ہے، تلاوت بھی کر سکتا ہے، آقا کے برابر عبادات کر سکتا ہے۔ سیاسی حقوق نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی تھی تو سیاسی آزادی چھن گئی اور سارے حقوق باقی رکھے گئے، تو پچھلی اقوام غلام پر اتنا حق رکھتی تھیں کہ انتہائی دردناک سزائیں دیتیں۔ اسلام نے وہ سب سزائیں مٹا دیں۔ آزاد کرنے کے فضائل بیان کئے جس سے ہزاروں غلام روز آزاد ہوتے تھے تعلیم دینے کی فضلیت بیان کی جس سے ہزاروں غلام بڑے بڑے علما اور فضلاء بن گئے۔ تو ضعفاء کے اوپر اسلام نے رحم کھایا۔ اس لئے عورت، یتیم اور غلام پر رحم کیا۔ جو مظلوم اور بے کس ہو اس کے لئے پوری امت کو فرمایا گیا کہ پوری امت کا حق ہے کہ اس کے ظلم کو دفع کرے اور اس کی مدد کرے۔

جانوروں پر رحم کرنے کا حکم...... حتی کہ جانور جو زیادہ کمزور ہوتا ہے، اس پر اور زیادہ رحم و کرم بتلایا گیا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کو آپ نے جنت میں دیکھا۔ ساری عمر بدکاری کی اور دیکھا گیا جنت میں۔ وجہ کیا پیش آئی؟

فرمایا: ایک کتا پیاس کی وجہ سے مر رہا تھا، زبان پر کانٹے پڑے ہوئے تھے، عرب کی گرمی کی خشکی کی وجہ سے زبان باہر نکلی ہوئی وہ فاحشہ عورت آئی اس کو رحم آیا کہ ایک بے زبان جانور مر رہا ہے کنویں پر نہ ڈول تھا نہ رسی تھی۔ اس نے اپنے پیروں سے چمڑے کا موزہ نکالا اور اپنے دوپٹے میں اس کو باندھ کر اس میں جتنا پانی آیا وہ کتے کے منہ میں ٹپکایا جس سے اس کے دم میں دم آ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ فرمایا اس عمل کی بدولت فاحشہ عورت جنت میں داخل کی گئی۔

اور حدیث میں ہے کہ ایک نیک اور متقی آدمی کو آپ نے جہنم میں دیکھا۔ فرمایا کہ یہ منکشف ہوا کہ وہ اس لئے جہنم میں گیا اس نے ایک بلی کو جو ستاتی تھی جیسے بعض جانور ستاتے ہیں، اس نے غصے میں آ کر ایک کوٹھڑی میں بند کیا اور کہا کہ اسے کوئی نہ کھولے دو تین دن میں وہ سسک کر اندر مر گئی۔ فرمایا: وہ متقی جہنم میں گیا۔ اس لئے کہ اس نے جانور کے اوپر رحم نہیں کھایا۔

فرعونی طاقت پر بنی اسرائیل کے ضعفاء کو غالب کیا گیا......غرض اسلام ہر کمزور پر رحم کھاتا ہے، انسانوں میں کوئی کمزور ہو یا جانوروں میں تو جس دین نے جانوروں تک پر رحم کھایا وہ کیسے گوارا کرے گا کہ انسان انسانوں پر ظلم کرے یا کوئی کسی دوسرے کے اوپر زیادتی کرے۔ یہ اس نے برداشت نہیں کیا۔

اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ﴾ ①

یہ قصہ فرعون کے زمانے کا ہے، موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ حق تعالیٰ اس کو قرآن میں حکایت فرما رہے ہیں کہ ﴿اَنْ نَّمُنَّ﴾ ہم احسان کریں گے، کن پر؟ ان لوگوں پر جو زمین کے اندر کمزور ہو گئے۔ گویا یہ موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا جا رہا ہے۔

فرعون چونکہ غالب تھا، اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا' بنی اسرائیل مغلوب تھے اور بنی اسرائیل کو فرعون نے انتہا درجے کی ذلت پر پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ انبیاء زادے تھے، نبیوں کے خاندان سے تھے۔ اہل علم وسمجھ تھے۔ لیکن چونکہ فرعون کی غلامی میں مبتلا ہو گئے، اس واسطے اس نے جتنی ذلیل خدمات تھیں، وہ بنی اسرائیل کے سپرد کر رکھی تھیں۔ مزدوریاں کرنا، کوڑا اٹھانا اور ان کے بچوں کو پالنا غرض اس قسم کی ساری ذلیل خدمات ان سے لی جاتی تھیں اور انتہائی ذلت کے ساتھ ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور انہیں نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تربیت شروع کی، تعلیم وتربیت کے ذریعے ان کے اخلاق اور کردار کو درست فرمایا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ یہ جو کمزور ہیں، جن کی تم تربیت کر رہے ہو، ان کے اخلاق درست کر رہے ہیں، ﴿اَنْ نَّمُنَّ﴾ ان پر ہم احسان کرنے والے ہیں۔ یہ ضعفاء ہیں، زمین پر کمزور ہیں، ہم ان کو قوت دینے والے ہیں۔ ﴿وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً﴾ ② انہیں زمین میں امام بنانے والے ہیں۔

﴿وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ﴾ ③ اور زمین کی وارثت ان کو سپرد کرنے والے ہیں۔ زمین کی وراثت میں یہ حصہ دار بنیں گے گویا موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو تسلی دی گئی کہ اپنی کمزوری پر غم نہ کھاؤ۔ مگر ہاں شرط یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جس طرح تعلیم وتربیت دے رہے ہیں ان کا اتباع کیے جاؤ جس علم کی طرف لا رہے ہیں اس علم کی طرف آؤ۔ جن اخلاق کی طرف بلا رہے ہیں ان اخلاق کی طرف آؤ ان کی پیروی کرتے رہو۔ انکی تعلیم وتربیت کے سامنے جھکتے رہے۔ جب تمہارا اخلاق بلند ہوگا تو عنقریب ہم تم کو بلند کرنے والے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا۔

آگے ارشاد فرمایا ﴿وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَ هُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا

①②③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۔

﴿يَحْذَرُوْنَ﴾ ① اور ہم انہیں اقتدار وتمکنت دینے والے ہیں اور فرعون وہامان اور انکے لشکر جن جن چیزوں کو سامنے رکھ کر ڈرتے تھے، اب ان کے سامنے آنے والا ہے۔ انہی چیزوں میں مبتلا کئے جانے والے ہیں جن چیزوں کا خطرہ تھا کہ کہیں یہ بنی اسرائیل غلبہ نہ پالیں اور ہمیں کہیں نیچا نہ دکھادیں۔ یہ ان کے آگے آئیں گی اور تم کمزوری میں مبتلا تھے، تم ان پر غلبہ پاؤ گے۔ حق تعالیٰ نے اس زمانے کے اس واقعہ کی حکایت فرمائی اور اسلام نے اسے بطور اصول بیان کیا تو اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضعفاء کو سہارا دیا جائے، جو کمزور ہوں انکے اوپر احسان کیا جائے، جو مفلوک الحال ہوں ان کی مدد کی جائے جو غرباء، یتامی اور مساکین ہوں ان کا ہاتھ بٹایا جائے۔ جو کسی ظلم میں گرفتار ہوا اور اسے ظلم سے نجات دلانا آپ کے اختیار میں ہو تو آپ پر فرض ہے کہ آپ اسے نجات دلائیں۔

بہر حال عورت، غلام، یتیم اور مظلوم ومصیبت زدہ ان سب پر رحم کیا ہے۔ تو یہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ اس امت مسلمہ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم کمزوروں پر احسان کرنا سیکھو۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین فرمائی گئی کہ آپؐ جہانوں کے لئے رحمت ہیں اور سب سے زیادہ آپ کی رحمت کمزوروں پر ظاہر ہوئی ہے، سب سے زیادہ کمزور عرب تھے، ان کو اتنا قوی کیا کہ پورے عالم میں ان کا نظام قائم ہوگیا، ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ تو آپ کی رحمۃ للعالمینی نے کمزوروں اور ضعفاء کو سہارے دیئے مساکین کو اونچا کیا، یتیموں کو والی اور وارث بلکہ آقا بنادیا۔ غلاموں کو ان کے آقاؤں کے اوپر غالب کردیا۔ یہ اسلام کی تعلیم کا اثر تھا اس امت کے سامنے یہ تعلیم پیش کی گئی ہے تاکہ امت بھی اسی راستے پر چلے کمزوروں پر رحم کھائے۔ ہر قوم میں کمزور بھی ہوتے ہیں، قوی بھی ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ ناداروں کی وہ خبر گیری کریں، ضعفاء کی رعایت ومدد کریں۔

دورِ فاروقی میں غرباء کو عدل وانصاف کے ذریعہ غالب کیا گیا...... امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفۃ المسلمین بنادیئے گئے تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کے اعلان کیا کہ آج سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے اور جو قوی ہے وہ آج سے میرے نزدیک کمزور ہے۔ یعنی میں کمزوروں کی مدد کروں گا اور اقویاء اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ ان کے ہاتھ میں قوت ہے میں ایک ایک حق ان سے منتقل کر کے کمزوروں کو دلاؤں گا۔

چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت اس سے بھری پڑی ہے کہ عدل وانصاف سے غریبوں کو کتنا سہارا دیا۔ گویا اسلامی حکومت کا اصل مقصد تربیت خلق اللہ ہے۔ امیر المومنین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی تربیت کرے۔ اخلاقی طور پر ان کی نگہداشت کرے اور یہ دیکھے کہ علم اور اخلاق کے اندر کون کمزور ہے اس کو سہارا دیں۔ بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مثالیں قائم کیں۔

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رات کو نگہداشت کرنے کے لئے نکلتے کہ

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۶.

رات میں کون کس طرح زندگی بسر کر رہا ہے حتی کہ گھروں کی حالت معلوم کرتے تھے کہ اخلاقی حالت کچھ کمزور تو نہیں ہوگئی تو راتوں کو گشت کرتے تھے۔ایک دفعہ گشت کرر ہے تھے کہ ایک گھر سے کچھ گنگنانے کی آواز آئی جیسے کوئی کچھ گا رہا ہو اور عورت کی آواز تھی۔نو جوان لڑکی کچھ اشعار پڑھ رہی تھی،اشعار بھی کچھ عاشقانہ تھے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کھٹک پیدا ہوئی کہ ایک لڑکی اور گھر میں عاشقانہ اشعار پڑھے۔

خیر وہ گھر پہ آئے دستک دی کہ کون ہے گھر کے اندر؟ وہ لڑکی امیر المومنین کی آواز پہچان گئی اور رعب کی وجہ سے سہم گئی اور دب گئی اور اتنا رعب پڑا کہ وہ جواب نہ دے سکی،اس کے جواب نہ دینے اور چپ ہو جانے کی وجہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اور زیادہ شبہ پیدا ہوا کہ گانے کی آواز تو بند ہوگئی،مگر جواب کوئی نہیں دیتا پھر ڈانٹ کر آواز دی کہ اس گھر کے اندر کون ہے؟ لڑکی بیچاری اور زیادہ دب گئی اور ڈر گئی۔تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہو گئے کہ دیکھوں اندر کیا بات ہے۔معلوم ہوا کہ گھر میں ایک نو جوان لڑکی ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہے۔

فرمایا تو کون ہے؟ اور کیوں گا رہی تھی؟ اور تجھے معلوم نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کی آواز کو بھی عورت بنایا ہے۔ تو اتنی زور سے بول رہی تھی کہ باہر آواز آئے،تو نہیں سمجھتی کہ تو گنہگار ہوئی اب لڑکی نے جرات کی۔اسے بھی بھروسہ تھا کہ فاروق اعظمؓ عادل کامل ہیں۔جو چیز کہوں گی تو یہ نہیں ہے کہ وہ جذبات میں آ کر فیصلہ کریں وہ اس پر غور کریں گے۔اس لڑکی نے ذرا کرخت آواز کر کے کہا:امیر المومنین! مجھے آپ طعنہ دے رہے ہیں کہ میں نے گناہ کیا۔

آپ نے اس وقت کھڑے کھڑے تین گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کے احکام کی تین خلاف ورزیاں کی ہیں۔

بس! فاروق اعظم ٹھنڈے ہو گئے،بجائے اس کے کہ کوئی غصہ آتا۔رعایا کی ایک لڑکی اور امیر المومنین کو ڈانٹ دے تو جذبات ابھرنے چاہئے تھے۔کوئی اشتعال پیدا ہونا چاہئے تھا،لیکن جب اس نے کہا کہ آپ نے تین گناہ کئے ہیں تو فوراً سہم گئے اور مرعوب ہو گئے۔فرمایا بہن! میں نے کیا گناہ کئے؟

اس نے کہا کہ پہلا گناہ تو آپ کا یہ ہے کہ میں ایک اجنبی لڑکی ہوں اور اجنبی لڑکی کے ساتھ کسی مرد کو خلوت جائز نہیں ہے۔آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے گھر میں آئے اور آ کر میرے تخلئے میں خلل ڈالے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا صاف حکم ہے کہ ﴿وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا﴾ ① گھروں میں دروازوں کے ذریعے سے داخل ہو۔آپ نے خلاف ورزی کی کہ آپ دیوار پھلانگ کر گھر میں آئے آپ کو دیوار پھلانگ کر آنے کا کیا حق تھا؟

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا حکم ہے۔﴿لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا﴾ ② کسی کے گھر کے اندر اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور سلام نہ کر لو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی دوسرے کے گھر پر جاتے تو تین دفعہ سلام فرماتے

① پارہ:۲،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۱۸۹. ② پارہ:۱۸،سورۃ النور،الآیۃ:۲۷.

اور تین سلاموں کی کیا صورت ہوتی؟

ایک سلام استیذان یعنی اجازت لینے کا سلام، بجائے اس کے کہ دستک دیں، نام لے کر پکاریں۔ آپ دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے فرماتے، السلام علیکم، گھر والوں کو آواز سنائی دیتی، وہ وعلیکم السلام کہہ کر باہر آتے، اجازت دیتے اور گھر میں بلاتے۔ پھر جب گھر میں داخل ہوتے، تو مجلس کو سلام کرتے۔ یہ سلام تحیہ کہلاتا ہے۔ اور پھر جب واپس ہوتے، پھر سلام وداع کہتے، یہ سلام وداع کہلاتا ہے۔ تو تین سلام ہوتے ہیں۔ جو ابتدائی سلام ہے وہ سلام استیذان یعنی اجازت لینے کا سلام ہے۔ تو لڑکی نے کہا، قرآن نے حکم دیا تھا کہ جب تک اجازت کا سلام نہ کیا جائے، گھر میں داخل نہ ہوں۔ آپ بلا سلام استیذان و اجازت کیسے داخل ہو گئے؟

یہ تین گناہ آپ سے سرزد ہوئے ہیں۔ لڑکی نے یہ ڈانٹ کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بہن! لوجہ اللہ مجھے معاف کر، واقعی میرے سے غلطی ہوئی اس نے کہا میری خطاء آپ نے کب کی ہے جو میں آپ کو معاف کروں جس کی خطاء کی ہے، اس سے معافی چاہو، قرآن کی خلاف ورزی کی ہے۔ خدا کے سامنے توبہ استغفار کرو میرے سے معافی کا کیا مطلب؟

اب فاروق اعظمؓ بہت ہی شرمندہ اور بہت ہی منفعل وہاں سے واپس آئے۔ حالانکہ فاروق اعظمؓ امیر المومنین ہیں۔ امیر کو یا امیر کی پولیس کو شبہ پر یہ حق حاصل ہے کہ چھاپہ مار کر گھر میں داخل ہو۔ فاروق اعظم نے یہ کوئی گناہ نہیں کیا تھا پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اجازت تو لی۔ ڈانٹ کر کہا کہ کون ہے جو اندر گا رہا ہے؟ جب کوئی بولا نہیں اور انہیں شبہ ہوا، پھر داخل ہونے کا حق تھا تو خلاف ورزی انہوں نے کی یا لڑکی نے؟

امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو گنہگار کے مقام پر سمجھا کہ حقیقتاً مجھ سے غلطی ہوئی اور تمام رات جاگ کر استغفار کیا، عبادت کی اور اللہ کے سامنے روئے۔ صبح کو انشراح ہوا کہ اللہ نے میری غلطی معاف کر دی حالانکہ توبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ گنہگار تھے ہی نہیں مگر پھر بھی اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر توبہ کی۔

اب ضابطے کے مطابق آدمی بھیجا کہ اس لڑکی کو دربار خلافت میں حاضر کرو۔ لڑکی لائی گئی۔ فرمایا، بہن! اللہ تجھے جزائے خیر دے، تو نے مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کیا۔ میں نے تمام رات اللہ کے سامنے استغفار کیا اور توبہ کی اور اب مجھے انشراح ہے کہ اللہ نے میرے گناہ کو معاف کر دیا۔

تواضعاً گناہ کہہ رہے ہیں، ورنہ گناہ نہیں تھا۔ مجھے اللہ نے معاف کر دیا اور میں تیرا احسان مند ہوں۔ لیکن اب بحیثیت امیر المومنین ہونے کے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ گانا بجانا کیسا تھا اور تو یوں گا رہی تھی تجھے ایسے عاشقانہ اشعار پڑھنے کا کیا حق ہے؟

لڑکی نے کہا، امیر المومنین! اصل واقعہ یہ ہے کہ میں ایک نوجوان لڑکی ہوں اور بھرپور جوانی ہے اور ابھی

پندرہ دن میری شادی کو ہوئے تھے، میرا خاوند بھی نوجوان ہے آپ نے اسے فلاں محاذ پر فوج کیساتھ بھیج دیا۔ میں اس کے فراق میں یہ عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی اور کوئی بات نہیں تھی۔ نہ میں زانیہ ہوں نہ بدکار۔ فرمایا، بہتر تو نے سچ کہا، تیرا لہجہ بتلا رہا ہے کہ حقیقتاً بات یہی ہے۔ پھر اسے بہت اکرام کے ساتھ واپس کیا۔

ایک لڑکی کی وجہ سے پوری فوج کے لئے ضابطہ جاری کیا گیا......ادھر لڑکی کو واپس کیا اور گھر میں آ کر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلیہ محترمہ (رضی اللہ عنہا) سے یہ پوچھا کہ اگر نوجوان لڑکی کی شادی ہو اور نوجوان ہی خاوند ہو اور دونوں میں جدائی کر دی جائے تو کتنے دن تک وہ صبر کر سکتے ہیں کہ اس کے بعد بدکاری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ فرمایا، تین مہینے سے زیادہ نوجوان عورت صبر نہیں کر سکتی۔ یہ الگ چیز ہے کہ اس کا دین مضبوط ہو، اس میں حیاء ہو اور اپنے اخلاق کی وجہ سے صبر سے برسہا برس بلکہ عمر بھر گزار دے یہ عوارض کی بات ہے۔ گفتگو طبعی جذبات کے اوپر ہو رہی تھی، طبعی جذبات کے اعتبار سے فرمایا کہ اندیشہ ہوتا ہے تین ماہ کے بعد بدکاری میں مبتلا ہو جائے، اگر کوئی دین و دیانت مانع نہ ہو۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اب سرکاری آرڈر جاری کیا ''جن شادی شدہ جوانوں کو جنگ پر بھیجا گیا ہے۔ انہیں تین مہینے کے اندر واپس کیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے سپاہی بھیجے جائیں، تین مہینے یا تین مہینے سے زیادہ کسی نوجوان کو نہ رکھا جائے، جس کی شادی ہو چکی ہو، اور امکانی حد تک ان جوانوں کو فوج میں بھیجنے کی کوشش کی جائے، جو شادی شدہ نہ ہوں تا کہ یکسوئی کے ساتھ جہاد کر سکیں اور شادی شدہ ہوں تو انہیں تین مہینے کے اندر اندر فوراً واپس کیا جائے''

قوم کے اخلاق کی نگہداشت امیر المومنین کا فرض ہے......گویا اخلاق کی یہ نگہداشت سرکاری طور پر تھی۔ ایک سیاسی نگہداشت ہوتی ہے وہ تو ہر بادشاہ کرتا ہے۔ ایک اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ اسلام میں امیر المومنین کا یہ فرض ہوتا ہے کہ پبلک کے اخلاق و عادات کی اصلاح کرے۔ ان کے اخلاق اور گھریلو معاملات کو دیکھے کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہو رہی۔ ان کے تقویٰ و طہارت میں کوئی فرق تو نہیں آ گیا یہ ساری ذمہ داری امیر المومنین پر عائد ہوتی تھی۔

مذہبی معاملات میں پیشوائی بھی امیر المومنین کا فرض ہے......یہی وجہ تھی کہ امیر کا حق سمجھا گیا ہے کہ وہ امامت کرائے، نماز پڑھانا یہ امیر المومنین کا اصل کام ہے۔ جس عہدے کو ہم بہت ہی گھٹیا اور ردی سمجھتے ہیں۔

یہاں تو خدا کا فضل ہے، یہاں کے مسلمان الحمدللہ مسجدوں کا صرف احترام ہی نہیں کرتے بلکہ مسجدوں کو اپنے گھروں سے زیادہ آراستہ کرتے ہیں۔ ائمہ مساجد کی عزت بھی ہے، تنخواہیں بھی معقول ہیں۔ لیکن ہماری طرف اس بارے میں اس قدر حال ابتر ہے کہ جو بالکل کودن، نکما اور کندۂ ناتراش ہو، اسے امام بنائیں گے، جو حد درجہ جاہل ہو، جو دنیا کا کوئی کام نہ کر سکتا، اسے امام بنائیں گے، جو اندھا، لنگڑا، لولا ہو اسے موذن بنائیں گے، جو دنیا کے کسی کام کا نہ ہو اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارے گھر کا کمین ہے جیسے نائی، حجام، ڈوم کمین ہوتے ہیں۔ یہ امام بھی

ایک کمین ہے جیسے شادیوں کے موقع پر حجاموں اور ڈوموں کو دیا جاتا ہے۔ مسجد کے امام کو بھی کچھ دیدیتے ہیں۔

حالانکہ فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا وقیع عہدہ ہے اس کو امام بنانا چاہئے جس کی محلے دار عزت وعظمت کرسکیں، اس کی عزت کرنا شریعت نے فرائض میں شامل کیا۔

اس لئے کہ وہ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے۔ یہ قائم مقام کی حیثیت سے امامت کرارہا ہے۔ تو اصل میں یہ حق امیرالمؤمنین کے لئے رکھا گیا ہے اور اس میں مصلحت یہ ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" مثل مشہور ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ کے طریق پر چلتے ہیں۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ہوگا ویسی رعیت بنے گی، تو جب امیرالمومنین پانچ وقت آ کر نماز پڑھائیں گے تو رعیت کا کونسا آدمی رہ جائے گا جو مسجد میں حاضر ہوکر نماز نہ پڑھے۔

اس لئے کہ لوگ بادشاہ کی شوکت کو دیکھ کر وہی کام کرتے ہیں، جو بادشاہ کرتا ہے۔ یعنی دین تو بڑی چیز ہے اگر بادشاہ فسق وفجور میں مبتلا ہے تو رعیت میں بھی ازخود وہی بات ہوجاتی ہے کہ رعیت بھی مبتلا ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک، یہ اموی خاندان کا خلیفہ تھا۔ اس کو شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ ناجائز تو نہیں کرتا تھا۔ چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھتا تھا مگر جسے جائز عیاشی کہتے ہیں کہ قانون کی آڑ رکھ کر عیاشی کرنا، وہ کرتا تھا چار بیویاں رہتی تھیں جہاں چھ ماہ گزرے ایک کو طلاق دی اس کا مہر ادا کیا، اس کی جگہ پانچویں لے آئے پھر دوسری کو طلاق دے کر اس کی جگہ لے آئے۔ غرض اسی طرح کرتے کرتے اس نے دو اڑھائی سو کے قریب شادیاں کیں بس اس کا یہ شوق تھا، بادشاہت تھی، خزانہ ہاتھ میں تھا۔ دین ودیانت پیش نظر نہیں تھا کہ وہ قومی خزانہ اس طرح سے ذاتی مصارف میں خرچ کرتا اتنا غنیمت تھا کہ حرام کاری سے بچتا تھا۔ بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ مگر چار میں ردوبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ اس کا طریقہ تھا۔

تو اس زمانے کے امراء کی مجلس میں بیٹھ کر فخر یہ باتیں ہوتی تھیں، ایک رئیس کہتا کہ میں پچاس شادیاں کرچکا ہوں، تو دوسرا کہتا آپ نے کون سا بڑا کام کیا، میں سو بیویاں کرچکا ہوں، تیسرا کہتا جناب! میں دوسو کرچکا ہوں چونکہ بادشاہوں میں یہ طریقہ تھا تو ساری پبلک میں یہی چیز فخر کا باعث بن گئی۔

جس راستے پر امراء اور سلاطین چلتے ہیں اسی پر عام پبلک کے لوگ چلتے ہیں۔ اس لئے شریعت اسلام نے امیرالمومنین کا کام قرار دیا کہ وہ امامت کرائے تاکہ یہ ذلیل نہ رہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب امیرالمومنین خود مسجد میں آئیں گے تو امراء میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا جو مسجد میں نہ آجائے، غرباء ممکن ہے نہ آئیں لیکن امیر، نواب اور جاگیردار کوئی باقی نہیں رہے گا، جو مسجد میں نہ آئے اس لئے کہ انہیں بادشاہ کی رضامندی اور اس راہ پر چلنا مقصود ہوتا ہے۔ اب جب بادشاہ نماز کے راستے پر آگیا تو وہ کہیں گے چلو ہم بھی نماز کے راستے پر سہی۔

عالمگیرؒ کے زمانے کا واقعہ لکھا ہے کہ عالمگیرؒ کے زمانے میں علماء کچھ کسمپرسی میں مبتلا ہو گئے، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ اس واسطے کہ امراء اپنے نشۂ دولت میں پڑ گئے اب علماء سے مسئلہ کون پوچھے۔ تو علماء بے چارے جوتیاں چٹخاتے پھرنے لگے عالمگیرؒ چونکہ خود عالم تھے۔ اہل علم کی عظمت کو جانتے تھے۔ تو انہوں نے کوئی بیان وغیرہ اخبارات میں شائع نہیں کرایا کہ علماء کی قدر کرنی چاہیے۔

یہ تدبیر اختیار کی کہ جب نماز کا وقت آ گیا تو عالمگیرؒ نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آج فلاں والیٔ ملک جو دکن کے نواب ہیں وہ ہمیں وضو کرائیں تو جو دکن کے والی تھے انہوں نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی کہ بادشاہ سلامت نے مجھے حکم دیا کہ میں وضو کراؤں۔ وہ سمجھے کہ اب کوئی جاگیر ملے گی۔ بادشاہ بہت راضی ہے تو آپ فوراً پانی کا لوٹا بھر کر لائے اور آ کر وضو کرانا شروع کر دیا۔

عالمگیرؒ نے پوچھا کہ وضو میں فرض کتنے ہیں؟ انہوں نے ساری عمر کبھی وضو کیا ہو تو انہیں خبر ہوتی۔ اب وہ حیران کیا جواب دیں پوچھا واجبات کتنے ہیں؟ کچھ پتہ نہیں۔ پوچھا سنتیں کتنی ہیں۔ جواب ندارد۔ عالمگیرؒ نے کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ لاکھوں کی رعیت کے اوپر تم حاکم ہو، لاکھوں کی گردنوں پر حکومت کرتے ہو اور مسلم تمہارا نام ہے تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وضو میں فرض واجب اور سنتیں کتنی ہیں، مجھے امید ہے کہ میں آئندہ ایسی صورت نہیں دیکھوں گا ایک کے ساتھ یہ برتاؤ کیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ایک دوسرے امیر سے کہا آپ ہمارے ساتھ افطار کریں اس نے کہا۔

جہاں پناہ! یہ تو عزت افزائی ہے۔ ورنہ فقیر کی ایسی کہاں قسمت کہ بادشاہ سلامت یاد کریں اور جب افطار ہوا تو عالمگیرؒ نے ان سے کہا کہ مفسدات صوم جن سے روزہ فاسد ہوتا ہے کتنے ہیں؟

انہوں نے اتفاق سے روزہ ہی نہیں رکھا تھا انہیں پتہ نہیں تھا کہ روزے کے مفسدات کیا ہیں۔ اب چپ ہیں کیا جواب دیں۔

عالمگیرؒ نے کہا، بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ تم مسلمانوں کے امیر، والی ملک اور نواب کہلاتے ہو، ہزاروں آدمی تمہارے حکم پر چلتے ہیں اور تم مسلمان، ریاست اسلامی، تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ روزہ فاسد کن کن چیزوں سے ہوتا ہے۔

اسی طرح کسی سے زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھا تو زکوٰۃ کا نہ آیا۔ کسی سے حج وغیرہ کا۔ غرض سارے فیل ہوئے اور یہ کہا کہ آئندہ میں ایسا نہ دیکھوں۔

بس جب یہاں سے امراء واپس ہوئے۔ اب انہیں مسائل معلوم کرنے کی فکر پڑی تو مولویوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اب مولویوں نے نخرے شروع کئے ہم پانچ سو روپے تنخواہ لیں گے۔ انہوں نے کہا حضور! ہم ایک ہزار روپیہ تنخواہ دیں گے، اس لئے کہ جاگیریں جانے کا اندیشہ تھا۔ ریاست چھن جاتی۔ تو مولوی نہ ملیں۔ تمام ملک کے اندر مولویوں کی تلاش شروع ہوئی جتنے علماء، طلباء تھے سب ٹھکانے لگ گئے بڑی بڑی تنخواہیں جاری ہو گئیں اور ساتھ یہ

کہ جتنے امراء تھے انہیں مسائل معلوم ہوئے اور دین پر انہوں نے عمل شروع کر دیا تو یہ وہی بات تھی کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ویسی رعایا، بادشاہ اگر خود دین کی طرف متوجہ ہو جائے تو ناممکن ہے کہ رعایا اور پبلک متوجہ نہ ہو، اس لئے کہ حکومت جو راستہ ڈالتی ہے پبلک اسی پر خوش دلی سے چلتی ہے۔

اس میں نیکی ہی کی بات نہیں بری سے بری بات ہو، بادشاہ اس کو رائج کر دے لوگ اس پر چلیں گے۔ آج کا تہذیب وتمدن چونکہ حکومتوں کی طرف سے آیا ہے، تو آج کے تہذیب وتمدن کے کیا معنی؟ اسلام میں تہذیب وتمدن کے یہ معنی تھے کہ اخلاق ہونا، صبر وشکر، حیاء وغیرت، شجاعت وسخاوت ہو، لیکن آج تہذیب کے معنی ہیں کلب گھروں میں جا کر ناچنا، عریانی اور ننگے پن کا مظاہرہ کرنا، فحش اور بے حیائی کی باتیں کرنا، آج کی تہذیب کے یہ معنی ہیں چونکہ حکمرانوں کی طرف سے یہ تہذیب آ رہی ہے، پبلک بھی اسی پر چل رہی ہے اب انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اچھی یا بری چیز ہے۔ ہر اچھی یا بری چونکہ اوپر والے کر رہے ہیں لہٰذا ہم بھی کر رہے ہیں۔ تو جس کے پیچھے شوکت اور قوت آ جاتی ہے۔ وہ چیز دل پذیر بن جاتی ہے، دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔

اسی واسطے اسلام نے جتنی نیکیاں ہیں ان کا ذمہ دار خود امیر المومنین کو بنایا ہے، یعنی حد کی بات یہ ہے کہ اگر جنازہ آ جائے۔ تو حق یہ ہے کہ امیر المومنین جنازے کی نماز پڑھائیں ظاہر ہے کہ جب امیر المومنین اور بادشاہ جنازے کی نماز پڑھائے گا تو امراء جاگیردار، نواب جتنے بھی ہوں گے یہ لوگ میت سے کنارہ کشی چھوڑ دیں گے کہ بھئی! میت کے پاس بھی جانا چاہئے، اس کی نماز جنازہ بھی پڑھنا چاہئے۔ تو دیندار ہو جائیں گے، امامت کریں گے تو مساجد بھر جائیں گی نماز جنازہ پڑھائیں گے تو لوگ میت کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی شروع کر دیں گے۔ امیر زکوٰۃ دے گا تو دنیا میں زکوٰۃ رائج ہو جائے گی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ ①

اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی قوت وسلطنت دے دیں تو وہ تعیش نہیں اختیار کریں گے ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ یہ دین قائم کریں گے۔ ﴿وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، امر بالمعروف کا نظام قائم کریں گے۔ اچھی باتیں دنیا میں رائج کریں گے، منکرات کو مٹائیں گے۔ تو جب صاحب اقتدار منکرات کو مٹانے لگے تو پبلک میں کون رہے گا جو منکرات پر عمل کرے گا۔ وہ بھی مٹائیں گے۔ امیر المومنین معروف اور پاکیزہ خصلت کو رائج کرے تو ہر امیر وغریب رائج کرنے کی فکر میں لگے گا، دین پھیل جائے گا۔ اس واسطے امراء کے فرائض میں قرار دیا گیا ہے کہ نماز جنازہ بھی وہی پڑھائیں، مسجد میں امامت بھی وہی کرائیں۔ یہ منصب دراصل ایسا ہے جیسے آج دنیا میں گورنری کا عہدہ ہے جو کسی سلطنت یا صوبے میں بادشاہ کا نائب ہوتا ہے، امام اللہ کا نائب ہوتا ہے اللہ کے رسول کا قائم مقام ہو کے کھڑا ہوا ہے۔ تو دینی حکومت ہو تو یہ بڑے عہدے ہوتے ہیں۔

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱.

اسی واسطے فرمایا گیا''یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُهُمْ لِکِتَابِ اللّٰہِ'' ① امامت کا حق اس شخص کو ہے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہے اور ''فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَآءَۃِ سَوَآءً فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ'' ② اور اگر قرآن پڑھنے میں مقتدی اور امام سب برابر ہیں تو اسے امام بناؤ جو سنت کے علم سے زیادہ واقف ہو اور اگر قرآن وسنت میں سب کے سب ماہر ہوں پھر اسے امام بناؤ جو فقہ اور نماز کے مسائل زیادہ جانتا ہو اور اگر فقہ میں بھی سارے ماہر ہیں تو پھر اسے بناؤ جس کا نسب اونچا ہو اور اگر اس میں بھی سب برابر ہیں پھر اسے بناؤ جو خوبصورت ہو۔

مطلب یہ کہ امام کے اندر خصوصیت ایسی ہو کہ مقتدیوں کو اسکے پیچھے کھڑے ہونے میں کوئی عار نہ پیدا ہو۔ وہ اس کے ساتھ جھک جائیں اس کی بھی عزت کریں۔ اب اگر آپ جان بوجھ کر ایسے امام رکھیں جن کی صورت نہ شکل نہ علم نہ ہنر، کوئی چیز بھی ان کے اندر نہ ہو۔ جو ساری دنیا سے نکمے ہوں انہیں امام بنادو۔ تو پھر جیسا امام ہوگا، ویسی نماز ہوگی، ویسا ہی آخرت میں اجر ملے گا۔

بہر حال یہ عہدے ہیں اور ان عہدوں کی ذمہ داری امراء اسلام کے اوپر ڈالی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ وعظ، تقریر یا خطابت یہ امیر کے ہاتھوں میں دی گئی ہے، اور فرمایا گیا''لَایَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْمَامُوْرٌ اَوْمُخْتَالٌ'' ③ تقریر اور خطابت کا حق سب سے پہلے امیر المومنین کو ہے وہ خطیب بن کر وعظ کہے اور مسائل کہے۔ یا پھر وہ بیان کرے جس کو امیر حکم دے اور مامور کرے کہ تم جا کے وعظ وخطابت کرو اور مسائل پہنچاؤ، اور تیسرا جو کرے گا وہ دھوکہ باز ہوگا۔ وہ اپنی اغراض کے لئے وعظ وتقریر کرے گا۔ اس لئے جب نہ امیر نے اجازت دی اور نہ وہ خود امیر اور مامور، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ذاتی اغراض والا ہے۔

آج کے دور میں مجموعۂ علماء کو خلافت کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے...... آج کے دور میں جہاں امارت ہے خلافت نہیں ہے تو علماء کے مجموعے کو امیر کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔ اگر وہ شہادت دیں کہ یہ اس قابل ہے کہ خطابت کرے، مسائل بیان کرے، اس کو حق ہے، لیکن جس کی کوئی سند نہ ہو، پڑھا ہوا نہ ہو، کوئی عالم شہادت نہ دے کہ اس میں علم ہے وہ اگر تقریر کرے گا ظاہر ہے دین کو فاسد کرے گا اس کو بھی آزاد نہیں رکھا گیا۔

تقریر وتحریر کی آزادی نہیں ہے بلکہ شہادت کے ساتھ تقریر وتحریر کی اجازت ہے اگر یہ عام ہو جائے جیسے آج ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک کچھ کہہ گیا، دوسرا کچھ کہہ گیا۔ عوام تشویشات میں مبتلا ہوتے ہیں کہ کس کے مسائل پر عمل کریں۔ ایک جائز کہہ رہا ہے، ایک ناجائز کہہ رہا ہے، اب ان بے چاروں کو یہ خبر تو نہیں ہے کہ عالم کا لبادہ پہن کر آیا خود عالم نہیں ہے۔ عالم فلاں ہے۔ ان کے سامنے جو اللہ کا نام لے گا وہ کہیں گے یہ عالم ہے۔ امتیاز نہیں ہو سکے گا۔

---

① ② السنن للترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء من احق بالامامۃ، ج: ۱ ص: ۳۹۷ رقم: ۲۱۸. ③ السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب فی القصص، ج: ۱۰ ص: ۸۴ رقم: ۳۱۸۰. حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۸ ص: ۱۶۵ رقم: ۳۶۶۵.

یہی وجہ ہے کہ دین کے ساتھ امارت اور خلافت قائم کی گئی تھی کہ وہ دینی چیزوں کو اپنے قبضہ اور اقتدار میں رکھ کے آگے چلائے اسی لئے فرمایا گیا "لَایَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْمَامُوْرٌ اَوْمُخْتَالٌ" تقریر کرنے والا یا امیر ہوگا یا مامور ہوگا یا پھر دھوکے باز ہوگا اور امیر کے قائم مقام اہل علم ہیں۔

ہمارے ہاں ہندوستان میں حیدر آباد اور بھوپال کی ریاستوں میں کچھ وقت پہلے یہ چیز تھی کہ جب کوئی باہر سے خطیب آتا تو علماء کی ایک مجلس جب تک پاس کر کے شہادت نہ دے کہ یہ اس قابل ہے کہ تقریر کر سکے تقریر کی اجازت نہیں ہوتی تھی اس کا ثمرہ یہ ہوتا کہ ریاست میں صرف ایک خیال کے لوگ تھے۔ خیالات میں پراگندگی نہیں تھی۔ ایک مسلک پر سب عمل کرتے تھے عوام میں تشویش نہیں تھی، دین پر چل رہے ہیں۔

حیدر آباد میں بھی یہ چیز تھی اور بھوپال میں بھی۔ اس لئے وہاں علماء کی کثرت تھی، علم کی عظمت بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی جب ریاست قدر دانی کرتی ہے تو دین پھیلتا ہے۔

بھوپال میں ایک عام دستور تھا کہ اگر کسی غریب آدمی نے اپنے بچے کو مکتب میں بٹھلایا تو آج مثلاً اس نے الٓـمّٓ کا پارہ شروع کیا تو ریاست کی طرف سے ایک روپیہ ماہوار اس کا وظیفہ مقرر ہوگیا۔ جب دوسرا پارہ لگا تو دو روپے ماہوار ہوگیا۔ تیسرا پارہ لگا تو تین روپے ماہوار ہوگئے یہاں تک کہ جب تیس پارے ہوں تو تیس روپے بچے کا ماہوار وظیفہ ہوتا۔

اور اس زمانے میں ساٹھ ستر برس پہلے تیس روپے ماہوار ایسے تھے جیسے تین سو روپے ماہوار بہت بڑی آمدنی تھی۔ سستا زمانہ تھا، ارزانی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے غریب لوگ تھے جنہیں کھانے کو نہیں ملتا تھا وہ بچوں کو مدرسہ میں داخل کر دیتے تھے کہ قرآن کریم حفظ کرے گا تو اسی دن سے وظیفہ جاری۔ ہزاروں ایسے گھرانے تھے، اور ہزاروں ایسے حافظ پیدا ہوگئے۔ ساری مسجدیں حافظوں سے آباد ہوگئیں اس لئے کہ ریاست پشت پناہی کرتی تھی۔

تو یہ قاعدہ ہے کہ حکومت یا ریاست جس چیز کی پشت پناہی کرتی ہے وہ چلتی ہے اور عوام وخواص سب شوق کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں۔ خلافت میں چونکہ اصل مقصود دین ہے، اس لئے امیر کے ذمہ فرائض عائد کئے گئے کہ جب بادشاہ دین پر چلے گا تو رعیت اور پبلک بھی دین پر چلے گی اور دین عام ہوتا جائے گا۔ جب تک خلافت قائم رہی، دین عام ہوتا رہا اور خلافت کے دوران تیس سال کے اندر اندر نصف دنیا سے زیادہ او پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ پورا ایشیاء، آدھا یورپ اور ایشیاء کو چک، ان سب میں اسلام کا پرچم اونچا کر دیا، اس لئے کہ سب کا مقصد یہ تھا کہ دین پھیلے۔

خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد علماء ربانی اور صوفیاء کرام نے اسلام پھیلایا......خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد جب ملوکیت، بادشاہ پسندی اور اقتدار پسندی کا دور آیا تو سلاطین اسلام نے محض اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے آپس میں لڑنا شروع کیا، وہ جو دینی تبلیغ واشاعت تھی وہ قصہ ختم ہو چکا اور جو ملک صحابہ وتابعین وتبع

تابعین کے زمانے دین میں آئے وہ تو آئے اس کے بعد کسرویت وقیصرویت اور اقتدار پسندی غالب آئی تو سلاطین اسلام آپس میں تحفظ اقتدار کے لئے لڑنے لگے۔ دین کی اشاعت اور حفاظت بیچارے علماء نے سنبھال لی، جتنا اسلام پھیلا وہ صوفیاء کی بدولت پھیلا، علماء کی بدولت پھیلا، جو چٹائیوں پر بیٹھنے والے تھے انکے ہاتھ میں نہ کوئی اقتدار تھا نہ کوئی سلطنت کی باگ ڈور تھی۔ اسی لئے ان لوگوں کو تاکیدیں کی گئیں کہ امراء کے پاس مت جاؤ۔ بادشاہوں کی ہم نشینی اور صحبت مت اختیار کرو، ورنہ تم بھی دین سے جاؤ گے۔ ان سے ہٹ کر دین کو پھیلایا تو دین رحم وکرم اور نرمی ومروت کے اخلاق کے راستے آیا۔ سلطنت کے راستے ختم ہوگئے وہاں اقتدار پسندی رہ گئی۔

ہمیں مزاجِ نبوّت پر چلنا ہے......تو میں نے اس پر عرض کیا تھا کہ دنیا میں دو مزاج ہیں، ایک نبوّت کا مزاج ہے اور ایک ملوکیت کا مزاج بادشاہ کا مزاج اقتدار پسندی ہے اور نبوّت کا مزاج خاکساری اور عجز ونیاز مندی ہے۔ نبی تمام سلاطین اور سارے لوگوں سے بالاتر ہوتا ہے لیکن ایسا جھک سکتا ہے جیسے عام آدمی جھک سکتے ہیں۔ بادشاہ ایک محدود خطہ میں رہتا ہے، وہ اپنے کو ''مابدولت'' کے ساتھ تعبیر کرتا ہے کہ ہم نے یوں کیا، ہم نے یوں کہا۔ تو لفظ لفظ کے اندر اقتدار اور رعونت ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے الفاظ میں انتہائی تواضع، خاکساری ہوتی ہے اور عجز ونیاز کا برتاؤ ہوتا ہے۔

اپنے سے چھوٹے کے سامنے بھی عجز ونیاز کا برتاؤ کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفر پر جارہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رخصت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''وَلَا تَنْسَانَا یَا اَخِیْ فِیْ دُعَاءِ کَ'' ① اے میرے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں فراموش مت کرنا۔ اللہ اللہ! کہاں سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم! اور کہاں فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک خادم اور غلام ہیں ان کو فرماتے ہیں کہ میرے بھائی! مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا۔ تو یہ انتہائی عجز ونیاز کی بات ہے کہ سردار اولین وآخرین اور سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ایک خادم اور چھوٹے کو فرمارہے ہیں کہ مجھے دعاء میں یاد رکھنا یہ مزاج نبوّت کا ہے اور وہ مزاج بادشاہت کا ہے۔ ہمیں نبوّت کے مزاج پر چلنا ہے۔

جب بادشاہت اور ملوکیت دنیا کو فاسد کردے تو پناہ کی جگہ صرف نبوّت ہوتی ہے۔ اس واسطے ہم جتنا نبوّت کے دامن میں آئیں گے، اتنے ہی اخلاق بلند ہوں گے اتنا ہی علم ومعرفت آئے گی، اتنا ہی کریکٹر اور کردار عمدہ ہوگا۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پر، ان کی تربیت پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے راستے پر چلنا چاہئے۔ اس علم کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضعفاء قوی بن جاتے ہیں۔ جو پست ہوتے ہیں وہ شوکت والے بن جاتے ہیں جو مظلوم ہوتے ہیں انہیں عدل

---

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی ولفظه: اشرکنا فی دعائک ولا تنسنا، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی الله علیه وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۷۴.

مل جاتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کے راستہ پر ہی چلنے کا ثمرہ نکلتا ہے اس کے سوا پناہ کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے تا کہ دین کے اعتبار سے بھی نافع ہوں اور دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں اور حل کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ① ہمارے راستے پر چلو گے، ضعیف بھی ہو گے تو قوی بنا دیئے جاؤ گے، بے شوکت ہو گے تو باشوکت کر دیئے جاؤ گے۔

اس واسطے یہ چند جملے میں نے اس آیت کے تحت عرض کئے۔ چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ عورتیں بھی مدعو کی گئی ہیں۔ اس لئے کچھ عورتوں کے متعلق بھی بیان کیا کہ انکے حقوق پہچاننے کی ضرورت ہے کہ ان کے حقوق پامال نہ کئے جائیں۔ ان عورتوں کا حق ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے حقوق پامال نہ کریں تا کہ معاشرت صحیح طور پر چل سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، ہمارے احوال بھی درست فرما دے، ہمارا دین و دنیا دونوں درست فرما وے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً. اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۔

ثمرات العلم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اِقْرَأْبِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○ كَلَّآ إِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ○ أَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ○ إِنَّ إِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ.

کچھ اپنے تعارف کے بارے میں...... بزرگانِ محترم! ابھی میرے محترم بزرگ نے میرا تعارف کراتے ہوئے بہت سی چیزیں دارالعلوم دیوبند اور اس کے بانیوں کے بارے میں ذکر فرمائیں۔ حقیقت میں اگر تعارف کے قابل کوئی چیز ہے، وہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء ہی ہیں۔ ہم جیسے ناچیز اور بے مقدار ذرے، وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے اور تعارف کا نام لے کر انہیں پیش کیا جائے، ہمارا تعارف یہی کافی ہے کہ ہمیں دارالعلوم دیوبند سے خادمی اور غلامی کی نسبت حاصل ہے۔ اصل میں تعارف کی چیز ادارہ وہ جماعت ہے۔ جس جماعت سے وابستگی اور تعلق کی وجہ سے ہمارا بھی نام لے لیا جاتا ہے۔ اگر اس جماعت سے تعلق نہ ہو تو ہم کوئی قابل ذکر چیز بھی نہیں ہیں۔ آپ نے استاذ غالب کا نام سنا ہوگا شاعروں میں بڑا مشہور شاعر گذرا ہے کلام بھی اس کا بڑا اونچا اور بے نظیر ہوتا ہے خاص شاہی شاعر تھا اور مغلیہ دربار جس کے آخری بادشاہ ظفر تھے، کا شاعر تھا۔ اس نے اپنے متعلق ایک بات کہی ہے وہ پوری طرح سے ہم پر منطبق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

بنا ہے شاہ کا ملازم پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

بادشاہ کا ملازم ہوگیا ہے اس لئے لوگ پوچھنے لگے۔ اگر اپنے آپ کو ملازمت سے قطع کرلے، شہر میں اس کی آبرو نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہی صورت ہماری بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے اکابر سے ایک خادمی اور غلامی کی نسبت ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے لوگ ہمیں پوچھ لیتے ہیں۔ اگر وہ نسبت نہ رہے تو ہم میں کوئی چیز ایسی

---

① پارہ: ۳۰،سورۃ العلق، الآیۃ: ۱ تا ۸۔

نہیں ہے کہ اس کا کوئی تعارف کرایا جائے یا کوئی قابل ذکر چیز ہوں، ہم بھی اگر اتراتے پھرتے ہیں تو انہی بزرگوں پہ اتراتے پھرتے ہیں، ورنہ ہمارے اندر کوئی چیز نہیں ہے۔

حضرت مولانا مرتضیٰ حسن رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر اساتذہ میں سے تھے، انہوں نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ لاہور میں ایک فقیر، بہت ہی بیچارہ حقیر، فقیر بھی اور اوپر سے حقیر بھی، وہ لاہور کے بازاروں میں یہ کہتے ہوئے پھرتا تھا کہ ''لاہور میری ہتھیلی پر ہے جب چاہوں اسے پلٹ دوں اور ختم کردوں''۔

رات دن اس کی یہ صدا تھی۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! اس فقیر میں کیا طاقت ہے کہ لاہور جیسا شہر اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے جب چاہے پلٹ دے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اندر قوت ہے بھی یا یوں ہی خواہ مخواہ دعوے ہی کر رہا ہے؟ تو ایک بزرگ وہاں سے گزرے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ صاحب! یہ فقیر رات دن یہی دعوے کرتا ہے کہ لاہور کوئی چیز نہیں۔ میرے اندر یہ طاقت ہے کہ جب چاہوں اسے پلٹ دوں۔ آپ ذرا دیکھئے کہ اس میں ہے بھی کوئی جان اور طاقت؟ یہ بزرگ مراقب ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ فقیر میں کچھ بھی نہیں خالی قلاش ہے نہ اس میں کوئی بزرگی اور نہ کمال۔ انہیں حیرت ہوئی کہ اس بے مائیگی کے عالم میں یہ دعویٰ کیسے کر رہا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کے پیر کو دیکھنا چاہئے۔ شاید اس کے پیر میں طاقت ہو اسی کے بل پر کہتا ہو۔ لیکن معلوم ہوا وہ بھی خالی ہے۔ اس میں بھی کچھ نہیں۔ انہیں اور حیرانی ہوئی کہ آخر اس میں کیا جان ہے جس کی بنا پر اتنا بڑا دعویٰ؟ انہوں نے پھر مراقبہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا دادا پیر بے شک اتنی طاقت رکھتا ہے کہ جب چاہے لاہور کو پلٹ دے۔ انہوں نے کہا اسی کے بل بوتے پر یہ دعویٰ کر رہا ہے خود اس کے اندر کوئی کمال نہیں ہے۔

ہم بھی جو اتراتے پھرتے ہیں، یا کچھ کہتے ہیں، وہ انہی مشائخ کے بل بوتے پر کہتے پھرتے ہیں، ورنہ ہمارے اندر کوئی جان نہیں۔ اسی برتے پر آپ بھی کہتے ہیں کہ یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، اگر وہ نسبت قطع ہو جائے، نہ اچھے نہ برے یعنی قابل ذکر بھی نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ تعارف کرانے کے قابل وہی اکابر ہیں، وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں دین پھیلایا اور ہندوستان سے گزر کر کوئی ملک نہیں چھوڑا کہ ان کے پروردہ، ان کے فاضل اور ان کے فیض یافتہ وہاں موجود نہ ہوں۔ آج آپ کے افریقہ میں جو دیوبند سے آٹھ ہزار میل دور ہے، آپ دیکھیں تو ان کے نام لیوا اور ان کا ذکر خیر کرنے والے موجود ہیں۔ یہ مولانا محمد اسماعیل جو افریقی ہیں، ہمارے محترم بزرگ ہیں۔ یہی اس جماعت کا تعارف ہے کہ آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر دین کی روشنی پھیلانے والے موجود ہیں۔ تو کوئی کام تو انہوں نے کیا ہوگا کہ ہزاروں میل پر انکے نام لینے والے موجود ہیں۔ اس طرح سے آپ پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا، جاوا، سماٹرا، ملایا اور حجاز میں پہنچیں، جگہ جگہ ان کے شاگرد اور نام لیوا موجود ہیں۔

میرا برما جانا ہوا، میں نے دیکھا کہ قصبے قصبے میں فضلائے دیوبند موجود ہیں مدارس قائم ہیں، تعلیم دے رہے ہیں۔ افغانستان میں جانا ہوا، وہاں کوئی قصبہ خالی نہیں جہاں فضلاء موجود نہ ہوں، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال رکھا ہے،

کوئی شو، نمود دعوے اور پروپگنڈے نہیں لیکن عمل یہ ہے کہ ہزاروں کے ایمان سنبھلے ہوئے ہیں محض ان کے چہرے اور قول و عمل دیکھ کر لوگوں کے ایمان محفوظ ہیں تو ان اکابر نے ایک عظیم الشان کام کیا اور علم کا ایک سرچشمہ قائم کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا خواب مبارک...... حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند سات برس کی عمر تھی، حضرت نے خواب دیکھا، جس کو ان کی سوانح میں نقل بھی کیا گیا ہے۔ حضرتؒ نے یہ دیکھا کہ میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں کی دسوں انگلیوں سے اطراف عالم میں نہریں جاری ہیں اور پانی بہہ رہا ہے۔ حضرت کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم جو فارسی کے بڑے اچھے عالم اور متقی تھے، حضرت نے ان کو اپنا یہ خواب بیان کیا۔ انہوں نے کہا اس کی تعبیر یہ کہ تم سے علوم نبوت اطراف عالم میں پھیلیں گے۔ اب اس وقت کوئی کیا سمجھ سکتا تھا کہ نانوتہ ایک معمولی سی بستی، جہاں نہ کوئی عالم نہ فاضل، اس میں ایک سات برس کا بچہ خواب دیکھ رہا ہے اور اتنا بڑا خواب کہ دنیا جہاں میں میرے سے علم پھیل رہا ہے۔ حضرت نے جب دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، تب لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو آپ نے سات برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ تو دارالعلوم دیوبند فی الحقیقت علم کا ایک سمندر ہے جس کی نہریں اطراف عالم میں جاری ہیں اور پھیل رہی ہیں اور لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند الہامی ادارہ ہے...... میرے محترم بھائی نے جس چیز کا ابھی تذکرہ کیا کہ دارالعلوم میں احاطہ مولسری میں ایک کنواں ہے اس سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب متعلق ہے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم ہیں، لکھے پڑھے بالکل نہیں تھے، دستخط بھی کرنا نہیں جانتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کا اہتمام ان کے سپرد کیا تھا، انہوں نے عرض بھی کیا، حضرت! میں لکھنا پڑھنا اور دستخط کرنا بھی نہیں جانتا فرمایا نہیں آپ آ کے اہتمام سنبھالیں۔ اہتمام کرتے تھے، میر منشی بیٹھ کر احکام لکھتا تھا، مہر لگا دی جاتی تھی۔ دستخط کرنا جانتے نہیں تھے، وہ احکام جاری ہو جاتے، اس طرح سے اہتمام شروع کیا۔

مولانا رفیع الدین صاحب نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں ان کی طریقت کا یہ سلسلہ آپ کے یہاں افریقہ میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ یہ مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، ان کے خلیفہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی بنائے گئے ہیں۔ ان کے خلیفہ قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی ہیں، جن کی وفات ہو چکی، ان کے خلیفہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب جو مدینہ منورہ (زَادَھَا اللّٰہُ شَرَفًا وَّ کَرَامَۃً) میں مقیم ہیں، مہاجر ہیں، بحمد اللہ ان سے افریقہ کے سینکڑوں لوگ بیعت ہیں اور مستفیض ہیں، تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقت کا سلسلہ آپ کے افریقہ میں پھیلا ہوا ہے گویا آپ بھی ان کی روحانی اولاد ہیں۔ آپ ان سے الگ نہیں ہیں۔ ان کا میں واقعہ ذکر کر رہا ہوں۔ تو

مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں کہ جب اہتمام مجھے سپرد کیا گیا تو اتنا بڑا ادارہ اور میں بے پڑھا لکھا، مجھے پریشانی تھی میں اس نظم کو کس طرح سے چلاؤں گا؟ میرے اندر کیا طاقت ہے؟ کوئی علمی طاقت ہوتو میں پڑھا لکھا نہیں۔ اور اگر آدمی جہلا کا انتظام کرے، تو چلو ایک جاہل آدمی جاہلوں کا انتظام کرلے، انتظام علماء کا اور کرنے وہ بیٹھا جو قطعاً علم نہیں جانتا، تو مولانا کو حیرانی تھی کہ میں کس طرح یہ کام انجام دوں گا، علم باطن اور علم لدنی حق تعالیٰ نے انہیں دیا تھا لیکن علم ظاہری نہیں تھا۔ فرماتے تھے جب میں زیادہ پریشان ہوا تو میں نے ایک خواب دیکھا، وہ خواب مجھے سنانا ہے، خواب یہ دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو سب سے بڑا قدیم احاطہ ہے، اس کو احاطہ مولسری کہتے ہیں۔ مولسری میں دو درخت مولانا رفیع الدین صاحب نے ہی بوئے تھے، جب عمارت کی بنیاد رکھی تو اسی تاریخ میں دو درخت بھی لگائے۔ دارالعلوم دیوبند اور وہ دونوں درخت ہم عمر ہیں۔ ایک ہی سال، ایک ہی دن کی پیدائش دونوں ہیں، بہرحال حضرت نے خواب میں دیکھا کہ احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے وہ دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی مَن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرمارہے ہیں اور ہزاروں آدمی دودھ لے کر جا رہے ہیں، کوئی بڑی بالٹی، کوئی گھڑا، کوئی پیالے ہی میں بھر کر لے گیا، کسی کے پاس کوئی برتن نہیں تو اس نے چلو ہی میں لیا اور پی لیا، غرض درجہ بدرجہ ہر ایک دودھ لے جارہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم فرمارہے ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خواب دیکھنے کے بعد مراقب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ کیا اس کا مطلب ہے؟ تو مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ کنواں دارالعلوم دیوبند کی اور دودھ علم کی صورت مثالی ہے اور علم کو تقسیم کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور جو یہ دودھ لے لے کر جارہے ہیں، یہ دارالعلوم کے طلباء ہیں۔ تو فرمایا جب دارالعلوم میں شوال میں داخلہ ہوتا ہے اور طلباء ہجوم کر کے آتے ہیں، میں فوراً پہچان جاتا ہوں کہ اس میں یہ بھی موجود تھا۔ ان دودھ لینے والوں میں یہ بھی موجود تھا، یہ بھی، ایک ایک کی شکل پہچانتا ہوں۔ گویا ان کو ان تمام طلباء کی شکلیں دکھلائی گئیں، جو اس دارالعلوم سے آئندہ تک بھی فائدہ اٹھائیں گے اور علم حاصل کریں گے۔ تو جب دارالعلوم کی بنیاد الہام پر رکھی گئی، وہاں کے طلباء کا انتخاب بھی منجانب اللہ الہام ہی سے ہوتا ہے۔ ان کے قلوب میں الہام کیا جاتا ہے کہ جاؤ، اور جا کر علم پڑھو، جو جو وہاں کا فاضل ہے خواہ براہ راست فاضل ہے یا بالواسطہ فاضل ہے، وہ منجانب اللہ منتخب ہے جس کو چھانٹ لیا گیا ہے۔ کہ وہ علم پڑھے اور پڑھائے۔ اس طرح سے یہ ادارہ الہامی بنیاد پر قائم ہے۔

اور جیسے آپ نے ابھی واقعہ سنا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو نقشہ بنایا تھا۔ جتنا اب صحن ہے وہ اس سے چھوٹا رکھا گیا تھا، بنیادیں تیار کرلی گئی تھیں تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رات کو خواب دیکھا بزرگوں کا خواب بھی آدھا کشف اور آدھا خواب ہوتا ہے۔ ہمارے جیسا خواب نہیں ہوتا۔ وہ تو ان کو ایک انکشاف ہوتا ہے، ان کی روحانیت اور نورانیت قلب ہوتی ہے وہ عالم مثال اور عالم غیب کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ تو درحقیقت وہ خواب نہیں ہوتا وہ کشف ہوتا ہے۔ تو مولانا فرماتے ہیں کہ میں خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لائے اور آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ جو تم نے بنیادوں کے نشان لگائے ہیں اس سے صحن بہت کم رہے گا۔ مدرسہ چھوٹا ہو جائے گا، اس کو بڑا ہونا چاہیئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اب بنیاد ہے وہاں جا کر اپنی لاٹھی مبارک سے نشان لگایا اور لمبی لکیر کھینچی فرمایا: ''یہاں تک صحن آنا چاہیئے جب مدرسہ وسیع ہوگا''۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب صبح کو اٹھ کر میں گیا تو اسی طرح سے وہ نشان لگا ہوا تھا جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا تھا اور میں نے خواب میں دیکھا تھا اسی پر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کھودی گئی۔ گویا مدرسہ کی بناء قائم کرنے کا تصور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور الہام کے ہوا۔ اس کی بنیاد کا نشان بھی الہام کے ساتھ لگایا گیا۔ اس کے طلباء کا انتخاب بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ غرض ہر چیز الہامی ہے رسمی مشوروں کے تابع نہیں ہے۔ جیسے دنیا میں لوگ کیا کرتے ہیں کہ باہم جمع ہو کے مشورہ کیا کہ بھئی! ایک ادارہ قائم کرلو یہ صورت نہیں بلکہ غیبی طور پر قلوب میں ڈالا گیا کہ تعلیم گاہ قائم کرو۔

قیام دارالعلوم کا محرک...... وجہ اس کی یہ تھی کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا انہوں نے علم اور دین کے راستے بند کر دیئے اور پادری مسیحیت کی اشاعت کے لئے کھڑے ہو گئے اور علماء کو عاجز کرنا شروع کر دیا۔ پیچھے حکومت کی قوت تھی۔ مسلمان بے بس ہو چکے تھے۔ اس وقت ان بزرگوں نے دیکھا کہ اگر تعلیم دین جاری نہ کی گئی تو اسلام کا وجود ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ کوئی مذہب بھی باقی نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی تعلیم باقی نہ ہو، تعلیم سے مذہب قائم ہوتا ہے۔ کسی مذہب کی تعلیم مٹ جائے، مذہب مٹ جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے احساس کیا کہ کوئی تعلیم گاہ قائم ہونی چاہیئے۔ تو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

اس وقت صورت حال کیا تھی؟ جب ابتداء میں ہندوستان میں انقلاب ہوا مسلمانوں کو انگریزوں سے ایک عام نفرت تھی اس لئے کہ انہی کے ہاتھ سے حکومت چھینی تھی تو طبعی طور پر نفرت ہونی چاہیئے تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارا ملک برباد کیا، اقتدار چھینا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ نفرت نکل جائے، لیکن نفرت نہیں نکلی، قائم رہی بلکہ بڑھتی رہی۔ آخر وہاں کے مدبروں نے سوچ کر تدبیر نکالی اور وہ یہ کہ جب تک ان کے دل و دماغ کو بدلا نہیں جائے گا اس وقت تک یہ نفرت نہیں نکلے گی، تو نفرت نکالنے کی کوشش نہ کرو، ان کے دل و دماغ کو بدل دو اور دل و دماغ تعلیم کے ذریعہ بدلے جاتے ہیں تو اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم شروع کی گئی تاکہ ان کے دماغوں کے اندر سے وہ خوبی نکال دی جائے جو اسلام نے بھری ہوئی ہے۔ تو لارڈ میکاڈلے تعلیمی اسکیم لے کر ہندوستان آیا اور اس نے اعلان کیا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور فکر اور دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

اس نے گویا چیلنج کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان بزرگوں نے دیکھا اگر یہ تعلیم پھیل گئی تو الحاد و بے دینی اور انگلستانیت اتنی پھیل جائے گی کہ چاروں طرف سے بہالے جائے گی، اسلام کا وجود باقی

نہیں رہے گا۔ تو حضرت نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں لیکن فکر اور دماغ کے لحاظ سے عربستانی اور اسلامستانی ہوں اور ان کا دل و دماغ اسلامی بنے''۔

کوئی ہندی ہو، چینی ہو، کوئی ایرانی ہو، تورانی ہو، کوئی مصری ہو، کوئی حجازی ہو لیکن دل سب کے یکساں ہوں کہ وہ اسلامی ہوں، ان کے اندر ایمان بھرا ہوا ہو، اس لئے کہ دین اسلام ایک ایسا رشتہ ہے جو مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو ایک نکتے پر جمع کر دیتا ہے۔ رنگ اور نسل ہمیں ایک نکتے پر جمع نہیں کر سکتے، کالے اور گورے کا اگر فرق ہوگا تو تنفر پیدا ہوگا۔ یہ فطری چیز ہے، جس کو آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں، اگر نسل کا لحاظ کیا جائے تو نسلیں نہیں جمع ہوا کرتیں وطن کا لحاظ کیا جائے تو وطن میں حد بندی ہوتی ہے، دلوں میں بھی حد بندی ہو جائے گی، دلوں کو وہ چیز جمع کر سکتی ہے جس میں کوئی حد بندی نہ ہو، عالمگیر چیز ہو اور پورے عالم پر پھیلنے والی ہو وہ سوائے اسلام کے کوئی دوسری چیز نہیں۔ فرمایا گیا: ''لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَّلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ'' (١) کسی عرب والے کو کسی عجم والے پر کوئی بزرگی اور فضیلت حاصل نہیں ہے اگر ہے تو دین اور تقویٰ کے لحاظ سے ہے۔

آپ نے فرمایا بُعِثْتُ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ میں کالے اور گورے دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، میری نگاہ میں دونوں یکساں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا میں عرب اور عجم، ہند اور سندھ اور ایران اور توران سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا﴾ (٢) حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے پیغمبر کہہ دے کہ میں تمام انسانوں کی طرف، سارے کنبے اور برادریوں کی طرف رسول ہوں تو اسلام نے سب کو ایک نکتے پر لا کر جمع کیا۔

یہی وجہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اگر مشرق میں ایک مسلمان ہو اور اس کو کانٹا چبھے تو وہ ٹھیس محسوس کرتا ہے جو مغرب کے اندر بیٹھا ہوا ہے، کیونکہ دونوں میں رشتہ اسلام کا جڑا ہوا ہے۔ اگر وطن کا رشتہ ہو تو ایران والوں کو توران والوں سے کیا تعلق؟ ہندیوں کو افریقیوں سے اور افریقیوں کو حجازیوں سے کیا تعلق، لیکن اگر اسلام کا رشتہ ہے تو ہند اور سندھ سب ایک ہیں، افریقہ، امریکہ، ہندوستان و انگلستان سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ رشتہ ایک ہے۔ یہ رشتہ جب تک قائم ہے مسلمان یقیناً متحد ہیں، جب یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا، تفریق کا پیدا ہو جانا اور سر پھٹول لازمی ہے۔ تو دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے سب کو ایک نکتے پر جمع کیا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو نہ ماننے پر بنی اسرائیل کا انجامِ بد ...... اس پر مجھے بنی اسرائیل کا ایک (واقعہ

---

(١) مسند احمد، باقی مسند الانصار، ج:٤٧ ص:٤٧٨.

(٢) پارہ: ٩ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ١٥٨.

جو حدیث میں ہے) یاد آیا۔ اللہ نے ان کو بڑی برگزیدگی دی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ: ﴿يَـٰبَنِيٓ إِسْرَـٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَـٰلَمِينَ﴾ ① اے نبی اسرائیل! میری نعمتو ں کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعامات کئے دنیا جہاں کی قوموں پر تم کو فضیلت اور برگزیدگی دی۔ اپنے وقت میں بنی اسرائیل سے باعظمت کوئی خاندان نہیں تھا۔ ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے۔ اللہ نے سب کچھ دیا لیکن جب یہ دولت وثروت زیادہ آ جاتی ہے تو عیش پسندی کی طرف طبیعتیں مائل ہو جاتی ہیں اور جتنا عیش بڑھتا جاتا ہے اتنی غفلت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی پھر ذلت سامنے آتی ہے۔ بنی اسرائیل اس میں مبتلا ہوئے۔ دولت کی کثرت کی وجہ سے عیاشی کی طرف مائل ہوئے، سیاہ کاری، شراب خوری، زنا کاری تمام چیزیں شروع کیں، اس زمانے میں حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر تھے، حضرت دانیال علیہ السلام نے وعظ کہنے شروع کئے۔ فرمایا:

''اے لوگوں اس غفلت کو چھوڑ دو، اس غفلت کا نتیجہ بہت برا ہے، قوم تباہ و برباد ہو جائے گی، نسلیں برباد ہو جائیں گی، تمہارے چار دن کے عیش کی وجہ سے نسلیں بدترین جائیں گی، تو اپنے اوپر بھی رحم کھاؤ اور اپنی آنے والی نسلوں پر بھی۔ اس تعیش کو چھوڑ دو، اس دولت کو حکم خداوندی کے ماتحت استعمال کرو، اپنی ذاتی ملک مت سمجھو اور اس کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کرو، نفس کے کہنے سے تصرفات مت کرو''۔

لیکن جب کوئی قوم عیش میں مبتلا ہو جاتی ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا ہے، پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اور ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی تھی۔ اندھے ہو کر عیاشی میں پڑے رہے۔ آخر کو اس کا نتیجہ نکلا تو بخت نصر مسلط ہوا۔ یہ عراق کا بادشاہ تھا، سورج پرست تھا، کوئی توحید اس میں نہیں تھی لیکن جب موحدین میں سے توحید نکل جاتی ہے اور جرائم بڑھ جاتے ہیں تو دلوں میں جان باقی نہیں رہتی، پھر مشرک موحدوں کے اوپر تسلط کر سکتے ہیں، ورنہ جب تک موحدوں میں توحید ہے ان کی قلبی قوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہیں آ سکتی، جب خود میں جان نہ رہے تو دوسرے غالب آ جاتے ہیں۔ تو بخت نصر نے زبردست حملہ کیا اور ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، عورتوں کو تہ تیغ کیا، گھروں میں گھس کر عورتوں کے پیٹ چاک کئے اور جو بچے تھے ان کو نیزوں کے اوپر ٹانگا تورات اور اس کے اوراق کو جوتوں سے روندا، بیت المقدس میں گندگی اور پلیدی ڈالی اور ستر ہزار بنی اسرائیل کو قیدی اور غلام بنا کر بغداد لے گیا۔ فلسطین، جو یہود کا وطن بنایا گیا تھا اس پر قبضہ کیا۔ تو ستر ہزار کو قتل کیا، لاکھوں عورتوں کی آبروریزی کی، لاکھوں بچوں کو قتل کیا۔ جن ستر ہزار کو گرفتار کیا ان میں حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے، ان کی بھی مشکیں کسی گئیں۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا میں اسی دن سے تمہیں ڈراتا تھا خود بھی تباہ ہوئے اور مجھے بھی خراب کیا۔ اب بنی اسرائیل کو ہوش آیا۔ اب معذرت کی اور کہا کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ فرمایا، اب توبہ کرنے سے کیا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۷.

ہوتا ہے۔ توبہ کا وقت نکل گیا۔

اب کیا ہوتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

دانہ ہی سارا چگ گئیں، تو اب بھوسے پر قناعت کرلو۔ مگر بہر حال انبیاء علیہم السلام کی شفقت ماں باپ سے زیادہ ہوتی ہے، کوئی قوم جب رجوع کر کے آتی ہے پھر ان کا دل پگھلتا ہے۔ پھر شفقت بڑھتی ہے۔

فرمایا کہ اچھا میں اللہ سے دعا کروں گا۔ میری جدوجہد ہوگی کہ اللہ تمہیں قید سے نکال کر پھر وہی عروج اور ترقی دے۔ یہ ستر ہزار قیدی بغداد کے بڑے جیل خانے میں ڈالدئے اور غلام بنائے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ اس لئے کہ اس زمانے کی قید و بند آج کے ترقی یافتہ دور کی طرح تو نہ تھی کہ قیدیوں کے لئے اے کلاس، اور بی کلاس ہو کہ قیدیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہاں تو اندھے کنویں میں ڈالدیتے تھے کیڑے مکوڑے کاٹتے تھے، آدھا ریتا اور آدھے آٹے کی روٹی دی جاتی تھی جس سے آدمی مرنے سے پہلے مر جاتا تھا۔ کوئی بارکیں وہاں بنی ہوئی نہ تھیں بہر حال قید میں ڈالدیئے گئے، مگر حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر ہیں، چہرے پر نبوت کا جلال و جمال، عبادت اور زہد، تو ان کی عبادت اور اطاعت کو دیکھ کر جو جیل کا سب سے بڑا حاکم تھا، وہ ان کا معتقد ہو گیا اور بڑی عظمت کرنا شروع کی۔

کافر ہو یا مسلم، مگر ہر انسان کے دل میں ایک نور دیا گیا ہے جس سے وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے، تعصب کی وجہ سے اس کا نفس مانے یا نہ مانے یہ الگ بات ہے مگر دل قبول کرتا ہے کہ سچائی یہی ہے۔ تو حضرت دانیال علیہ السلام کی عظمت، عبادت، زہد، قناعت اور برکت دیکھی، ادھر بنی اسرائیل کو بھی ہوش آیا جب دولت نہ رہی عیش کے سامان بھی نہ رہے اور پیغمبر ساتھ ہیں تو انہیں بھی عبادت ہی کرنی تھی عیش کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بھی رات دن عبادت میں مصروف۔ تو وہ جیل خانہ کیا ہوا وہ تو خانقاہ بن گیا ہر جگہ سے ذکر اللہ کی آوازیں آرہی ہیں تو جیل کے جتنے حکام تھے سب معتقد ہو گئے اور اس وجہ سے پورے بنی اسرائیل کی بڑی رعائتیں کرتے تھے ادھر حضرت دانیال علیہ السلام کی دعا جاری کہ اے اللہ! ان کو رہائی بخش۔ آخر رہائی کے اسباب پیدا ہوئے۔

بنی اسرائیل کے لئے دوبارہ اقتدار کی راہ ہموار ہونا شروع ہوئی...... وہ ایسے کہ بخت نصر نے ایک خواب دیکھا اور دیکھ کر بھول گیا کہ میں نے کیا خواب دیکھا تھا، مگر خواب کچھ ہیبت ناک اور ڈراؤنا تھا تو اس کے دل میں الجھن اور پریشانی پیدا ہوئی، اس نے اپنے دربار کے کاہنوں، منجموں اور جو اس زمانے کا علم تھا، اس کے فاضلوں کو جمع کیا اور کہا میرے خواب کی تعبیر بتاؤ۔ انہوں نے کہا، خواب کیا ہے؟ کہا کہ خواب میں بھول گیا۔ انہوں نے کہا پھر تعبیر کا ہے کی بتائیں؟ اس نے کہا میں نے لاکھوں روپیہ تمہارے اوپر خرچ کیا، تم غیب دانی کے دعوے کرتے تھے تم میرا ایک خواب بھی نہیں بتا سکتے، تو تم کیسے غیب دان ہو؟ یا تو تین دن کے اندر خواب بتلاؤ، ورنہ تمہارے خاندانوں کو بھی تہس نہس کر دوں گا۔ ان کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ تو کل تین دن کی میعاد رہ گئی، ہمارا

سب گھر بار ختم ہوا۔اس لئے کہ وہ محض بناوٹی باتیں ہوتی تھیں کوئی غیب دانی نہ تھی، نہ کچھ معلوم تھا،بس پیسے وصول کرنے کے لئے سارے دعوے کرتے تھے، جب وقت پڑا تو ساری قلعی کھل گئی۔خیر یہ خبر عام ہوئی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے سامنے پہنچی۔

حضرت دانیال علیہ السلام جیلر کے پاس تشریف لائے ،فرمایا، بادشاہ نے خواب دیکھا ہے اس کا خواب اور تعبیر مجھے معلوم ہے۔تو جا کے اطلاع کرتا کہ بادشاہ مجھے بلائے اور میں خواب کی تعبیر دوں۔اور فرمایا یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس میں میرا بھی نفع ہے اور تیرا بھی نفع ہے۔تو جب جا کے کہے گا کہ میرے قیدیوں میں ایک شخص ہے جو تیرے خواب کو جانتا ہے اور خواب کی تعبیر بھی جانتا ہے۔تو بادشاہ پریشانی میں گرفتار ہے، خواب بھول گیا ہے، اس لئے بہت خوش ہوگا کہ جلدی بلاؤ، تو میرا یہ فائدہ ہے کہ میری رہائی ہو جائے گی اور رہا ہو کے میں اپنی قوم کی رہائی کی سعی کروں۔ تیرا فائدہ یہ ہے کہ جب تو بادشاہ کو الجھن سے نکال دے گا تیرا عہدہ بڑھے گا، ترقی ہوگی، عزت بڑھے گی۔تو دونوں کا فائدہ ہے۔

جیلر بہت خوش ہوا کہ عجیب وغریب قیدی ہے معتقد پہلے ہی سے تھا۔ جب یہ غیب دانی دیکھی، عقیدت اور بڑھ گئی۔جیلر نے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں اگر کوئی بادشاہ کا خواب بتا سکتا ہے تو وہ تو ہے لیکن سچ بتایئے، ہے بھی معلوم، یا ایسے ہی بات کہہ دی ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات واقعی نہ ہو تو میں پٹوں اور تمہاری بھی پٹائی ہو۔فرمایا، تو بے کھٹکے جا کے کہہ، مجھے خواب معلوم ہے اور تعبیر بھی معلوم ہے۔

اس نے بڑی خوشی میں جلدی سے جا کر بادشاہ کو اطلاع دی کہ حضور! آپ جس الجھن میں گرفتار ہیں کہ خواب دیکھ کر بھول گئے ہیں۔میرے قیدیوں میں ایک بڑا بزرگ قیدی ہے اور میں اس کی بزرگی سال بھر سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تو ایسا انسان نہیں دیکھا، وہ آپ کا خواب جانتا ہے۔اچھا میرا خواب جانتا ہے؟ اس نے کہا جلدی رہائی کر۔اس کی قید و بند کاٹ کر اعزاز و اکرام سے اس کو میرے دربار میں لے کے آ، اور اگر اس نے میرا خواب بتلا دیا تو تیرا عہدہ بہت بلند کروں گا، تیری تنخواہ بہت بڑھا دی جائے گی، تیرا اعزاز بڑھ جائے گا۔

جو پیغمبر علیہ السلام نے پیشین گوئی کی تھی وہ بات صحیح نکلی، جیلر کا تو دماغ آسمان پر پہنچ گیا۔ بہت خوش ہوا وہ دوڑا آیا۔آ کر حضرت دانیال علیہ السلام کی قیدیں کاٹیں، ہتھکڑیاں بیڑیاں جدا کیں اور فاخرہ لباس رکھا کہ اسے پہن کر آپ تشریف لے چلیں میری تو دنیا بن گئی، مجھے آپ نے بہت کچھ دلوا دیا۔فرمایا: ''تیرا ہی نہیں میرا بھی سب کچھ بنے گا''۔

حضرت دانیال علیہ السلام تشریف لے گئے۔ دربار شاہی میں امراء، وزراء، کاہن اور منجم بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی جان میں جان یوں آ گئی کہ ہماری جان بچ گئی، ورنہ تیسرے دن ہم تہہ تیغ کئے جاتے۔چلو بادشاہ کے خواب معلوم ہونے کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ دربار میں پہنچے تو حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے دین کے مطابق

بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے تعظیم وتوقیر سے اپنے پاس برابر بٹھلایا، دل میں اس کے بے چینی اور اضطراب تھا۔ فوراً دربار برخاست کیا اور تخلیہ کیا۔ تو تخلیئے میں ایک حضرت دانیال علیہ السلام، بادشاہ اور وہ جیلر، تاکہ اگر بات سچی ہو تو جیلر کی عزت افزائی کی جائے اور اگر غلط ہو تو پہلے اس کی گردن ناپی جائے اس نے آکر جھوٹ بولا۔

بخت نصر نے کہا کہ سب سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میرے دربار کا قاعدہ یہ ہے کہ جو درباری آتا ہے وہ مجھے سجدہ کرتا ہے، آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے اپنے مذہب اور طریق کے مطابق مجھے سلام کہا۔ لیکن میرے دربار کا قانون سجدہ کرنا ہے، آپ نے کیوں نہ کیا؟

انبیاء علیہم السلام کامل العقل بھی ہوتے ہیں...... حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر جیسے عارف کامل ہوتے ہیں، عالم کامل، عاقل کامل بھی ہوتے ہیں، پیغمبر کی عقل اتنی بلند ہوتی ہے کہ ساری امت کی عقلیں ملا کے جمع کی جائیں تو بھی پیغمبر کی عقل زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک کے سلسلے میں کتابیں لکھی گئی ہیں، آپ کی عقلمندی کے واقعات جمع کئے گئے، اس لئے کہ آپ سید الانبیاء، نبیوں کے بھی سردار ہیں جن کی نبوت سب سے بڑی، ان کی عقل بھی سب سے بڑی۔ تو تمام انبیاء علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک زیادہ ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری امتوں کے عقلاء اور حکماء جمع ہوں ان سب سے تنہا ذات نبوی کی عقل فائق ہے۔ اس لئے آپؐ نے بہت سے فیصلے وحی اترنے سے پہلے اپنی عقل مبارک سے فرمائے ہیں۔

حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے اتنا ستاتا ہے کہ اس نے میری زندگی تلخ کردی۔ میں نے خوشامدیں کرلیں، سب کچھ کرلیا، مگر ایسا موذی ہے کہ رات دن مجھے ایذا پہنچاتا ہے۔ یا رسول اللہ میں کیا کروں، میں تو عاجز آ گیا۔ فرمایا میں تدبیر بتلاتا ہوں، وہ یہ کہ سارا سامان گھر سے نکال کے سڑک پہ رکھ دے اور سامان کے اوپر بیٹھ جا، اور جو آکے پوچھے کہ بھائی گھر کے ہوتے ہوئے سڑک پر کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے کہا ہے کہ بھائی گھر چھوڑ دو، اس واسطے میں نے گھر چھوڑ دیا۔ چنانچہ لوگ آئے۔ پوچھا کہ بھئی! گھر کیوں چھوڑ دیا؟ گھر موجود ہے، سامان یہاں کیوں ہے؟ اس نے کہا کہ جی کیا کروں، پڑوسی نے ستانے میں انتہا کردی، اللہ کے رسولؐ نے کہا کہ بھئی گھر چھوڑ دے۔ تو جو سنے وہ کہے لعنت اس پڑوسی کے اوپر، جو آرہا ہے، واقعہ سن رہا ہے، لعنت لعنت کرتا ہے۔ مدینہ میں صبح سے شام تک ہزاروں لعنتیں اس پر ہوئیں۔ لعنتوں کی تسبیح پڑھی جانے لگی۔

وہ پڑوسی موذی عاجز آیا۔ اس نے آکے ہاتھ جوڑے اور کہا خدا کے واسطے گھر چل، میری تو زندگی تباہ و برباد ہوگئی، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر اب کبھی نہیں ستاؤں گا، بلکہ تیری خدمت کروں گا۔ اب انہوں نے نخرے کرنے شروع کردیئے کہ بتا پھر تو نہیں ستائے گا، اس نے کہا حلف اٹھاتا ہوں کبھی نہیں ستاؤں گا۔ تو اسے گھر میں لایا سارا سامان خود رکھا اور روزانہ ایذا پہنچانے کی بجائے خدمت شروع کردی۔ تو تدبیر کارگر ہوئی حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہ تدبیر عقل سے بتلائی تھی۔ وحی کے ذریعہ سے نہیں۔

تو پیغمبر عقلمند بھی اتنے ہوتے ہیں کہ ان کی عقل کے سامنے دنیا کی عقل گرد ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اللہ سے تعلق قوی ہونے کا نام ہے، اللہ سے تعلق ہوگا تو دل کا راستہ سیدھا سیدھا ہوگا۔ عقلمندی یہی ہے کہ اخیر تک کی بات آدمی کو سیدھی نظر آ جائے۔ وہ بغیر تعلق مع اللہ کے نہیں ہوتی، تعلق اللہ سے ہوتا ہے، پھر آدمی عقل مند بنے، وہ عقل نہیں چالاکی و عیاری ہوتی ہے۔ عیاری اور چیز ہے، عقلمندی اور چیز ہے، چالاکی میں دھوکہ دہی ہوتی ہے۔ دھوکہ دہی سے اپنی غرض پوری کی جاتی ہے۔ عقل میں کسی کو دھوکہ نہیں دیا جاتا، سیدھی بات تدبیر سے انجام دی جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کی نسبت اللہ سے کس کا تعلق زیادہ مضبوط ہوسکتا ہے؟ تو ان سے زیادہ عقل بھی کس کی کامل ہوسکتی ہے؟

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو غزوۂ بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمان تین سو تیرہ تھے، مگر مسلمانوں کو معلوم نہیں تھا کہ دشمن کی تعداد کتنی ہے۔ جب جنگ کے لئے گئے اس وقت پتہ نہیں تھا بعد میں پتہ چلا۔ تو مشرکین مکہ یعنی دشمن کے کیمپ سے کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کے لشکر میں آ نکلا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے پکڑ لیا اور کہا، بتا تمہارے لشکر کی تعداد کتنی ہے؟ ٹوہ ہوتی ہے کہ بھئی دشمن کی تعداد، سامان اور طاقت کتنی ہے؟ اس کا اندازہ ہو جائے۔ صحابہؓ نے اس سے پوچھا۔ وہ ہوشیار اور اپنے لشکر کا خیر خواہ تھا۔ اس نے تعداد نہیں بتلائی یوں کہا کہ وَاللّٰهِ لَكَثِيْرٌ خدا کی قسم بڑی بھاری جمعیت اور بڑا جتھہ ہے۔

صحابہ کرام نے اسے ستانا شروع کیا، مارا، ڈانٹا، ڈپٹا۔ غرض صحابہؓ نے ساری تدبیریں کر لیں، مگر وہ بول کے نہیں دیا۔ یوں کہتا رہا کہ وَاللّٰهِ لَكَثِيْرٌ.

یہ جو آوازیں اٹھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے نکلے۔ فرمایا، یہ شور کیسا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی آ پھنسا ہے۔ صحابہ اس سے لشکر کی تعداد معلوم کرنا چاہتے ہیں تاکہ دشمن کی قوت کا پتہ چل جائے۔ وہ بتاتا نہیں۔

فرمایا چھوڑ دو، کیوں پریشان کرتے ہو اسے یہاں لاؤ۔ وہ آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ یہ نہیں کہ کہ تعداد کتنی ہے۔ فرمایا، تمہارے لشکر میں گوشت تو ہوتا ہوگا؟ اس نے کہا جی ہاں روز ہوتا ہے۔ فرمایا کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ اس نے کہا دس فرمایا بس معلوم ہوگیا ایک ہزار آدمی ہے۔ اس لئے کہ ایک اونٹ میں سو آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ منٹ بھر میں پتا چلا لیا کہ ایک ہزار کی تعداد ہے۔ تو سارے صحابہؓ عاجز آ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پل بھر میں اس سے بات نکال لی یہ وحیؑ سے نہیں بلکہ عقل سے پتہ چلایا۔

تو انبیاء علیہم السلام کا جیسے علم اور دین کامل ہوتا ہے۔ ایسے ہی ان کی عقل کامل ہوتی ہے۔ کوئی عقلمند ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور انہی کی عقل کے اوپر علم کی وحی اترتی ہے۔ اگر عقل کامل نہ ہو تو وہ اتنا علم کیسے برداشت کر سکتے ہیں، کسی

استاد کے سامنے دو طالب علم ہوں ایک عقلمند ہو اور ایک بیوقوف ہو۔ استاذ دونوں کے سامنے ایک تقریر کرے گا۔ عقلمند تو اس سے دوگنا علم لے کے جائے گا اور بےوقوف کو جتنا پہلے سے تھا، اسے بھی کھو کر جائے گا تو عقل کے بقدر آدمی علم قبول کرتا ہے تو انبیاء کی عقلیں اگر غالب نہ ہوں تو اللہ کا اتنا بڑا علم ان کے قلوب کے اندر کیسے کھپ سکتا تھا۔ شریعت کا عمل ان کی طبیعت کے اوپر اترتا ہے اور علم ان کی عقل کے اوپر اترتا ہے۔ اس لئے علم بھی چوگنا ہوتا ہے جیسے عقل چوگنی، عمل بھی مضبوط ہوتا ہے کیونکہ سچا عمل ان کی طبیعت کا تقاضا ہے، پیغمبر کی طبیعت برائی کی طرف نہیں جاسکتی تو طبیعت پر شریعت اور عقل پر وحی اترتی ہے۔ اس لئے علم بھی کامل اور دین و عمل بھی کامل ہوتا ہے۔

میں حضرت دانیال علیہ السلام کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ بخت نصر نے سوال کیا کہ آپ نے میرے قانون کے مطابق مجھے سجدہ کیوں نہ کیا؟ تو دانیال پیغمبر ہیں، جیسے عامل کامل ہیں، عاقل بھی کامل ہیں۔ سبحان اللہ! کیا جواب دیا۔ فرمایا میں نے قصداً سجدہ نہیں کیا، اس لئے کہ سجدہ نہ کرنے میں میرا بھی نفع تھا، تیرا بھی نفع، اگر میں سجدہ کر لیتا تو تو بھی مارا جاتا اور میں بھی مارا جاتا؟ اس نے کہا یہ کیا بات ہے، سجدہ کرنے میں میری عزت تھی میں کیسے مارا جاتا؟ فرمایا اس کی وجہ ہے، وہ یہ کہ ایک میرا رب ہے اس نے مجھے علم دے رکھا ہے۔ یعنی بات تدبیر سے کی اور کتنی سچی اور سیدھی۔ تو اس نے مجھے علم دیا اور تیرا خواب بھی مجھے بتایا میرے ذہن میں جو تیرا خواب ہے۔ وہ میرا ذاتی علم نہیں وہ میرے رب کا بتلایا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ کہیں وہ کہے کہ یہ تو پیغمبر ہیں اور مجھے تبلیغ کرنے آ ... تو اگر میں تجھے سجدہ کر لیتا وہ مجھ سے خفا ہو جاتا۔ میرا علم مجھ سے چھین لیتا تو میں تو یوں گیا جب علم ہی ختم ہو گیا، میری حیثیت عرفی ختم ہو گئی اور میرے سوا تجھے خواب بتانے والا کوئی نہیں تو تو الجھن میں گرفتار رہتا تو بھی مارا جاتا۔ اس لئے میں نے سجدہ نہیں کیا تاکہ میرا علم باقی رہے اور میں تجھے خواب بتا سکوں میں بھی محفوظ رہوں تو بھی محفوظ رہے۔

اس نے ہاتھ چومے اور کہا میں نے دنیا میں اتنا دانشمند آدمی نہیں دیکھا جتنا کہ آپ ہیں اور اپنے رب کا ایسا خادم میں نے نہیں دیکھا کہ غائبانہ بھی اپنے رب کی خدمت کرے۔ تیرا رب یہاں میرے سامنے ہے نہ تیرے سامنے اس کے باوجود تو اپنے رب کی اتنی عظمت کرتا ہے میرا تو یہ حال ہے کہ جب تک میرا رب سامنے نہیں آتا پیٹھ پیچھے تو میں بھی اس کو گالیاں دیتا رہتا ہوں۔ برا بھلا کہتا ہوں سامنے آتا ہے تو ڈرتا ہوں، مگر حقیقی معنیٰ میں عابد تو ہے کہ تیری آنکھوں کے سامنے رب نہیں ہے، اس کے باوجود تیرے دل میں عظمت موجود تو تیرے سے زیادہ عقلمند اور تیرے سے زیادہ امانت دار بھی میں نے نہیں دیکھا' تو کیا واقعی تجھے میرا خواب معلوم ہے؟ فرمایا، ہاں واقعی مجھے تیرا خواب معلوم ہے۔ اس نے کہا، میرے دل میں بےچینی ہے بس جلدی بتلا۔ میں تو گھٹن میں مبتلا ہوں۔

بخت نصر کا خواب...... فرمایا کہ: سن تو نے خواب یہ دیکھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان میں ایک عظیم الشان بت ہے جس کا سر آسمان پر اور پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک مونڈھا مشرق میں ہے ایک مغرب میں۔

پوری فضا اس سے گھری ہوئی ہے تو اس کو حیرانی سے دیکھ رہا ہے کہ کتنا خوبصورت بنایا گیا ہے اور بنانے والا کیسا کاریگر ہے، اتنا بڑا بت کہ زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا گھیرے ہوئے ہے۔

پھر اس بت کی شان یہ ہے کہ چہرہ تو اس کا سونے کا ہے اور سینہ چاندی کا اور پیٹ پیتل کا ہے، رانیں تانبے کی ہیں اور پنڈلیاں لوہے اور سیسے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ ہر دھات الگ الگ چمک رہی ہے سونا سب سے زیادہ باقیمت ہے وہ اوپر ہے، چاندی اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، پیتل اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، تانبا اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، لوہا اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے اور مٹی کی کوئی قیمت نہیں تو وہ قدم بنی ہوئی ہے ہر دھات اپنی اپنی جگہ چمک رہی ہے۔

تو ابھی اسی حیرت میں ہی تھا، تو نے دوسری بات یہ دیکھی کہ آسمان سے پتھر گرا اور اس زور سے اس بت کے سر پر آ کر پڑا کہ بت چکنا چور ہو گیا۔ صرف یہی نہیں کہ ٹوٹ گیا بلکہ اوپر سے لے کر نیچے تک ریت کی طرح گر گیا اور وہ جتنی دھاتیں تھیں سب مل کر یک جان ہو گئیں۔ نہ سونا سونا رہا، نہ چاندی چاندی سب گڈمڈ ہو کر ایک ذات بن گئے۔ اب اس ذات میں سب کی تھوڑی تھوڑی چمک تھی مگر الگ الگ نمایاں نہیں تو اس سے اور زیادہ حیرت میں ہے کہ یہ پتھر کیا ہے؟ کہ ایک ضرب میں اس نے سارے بت کو توڑ دیا اور محض ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ پیس کر ایک ذات کر دیا ابھی تو دوسری حیرت میں تھا تو تو نے یہ دیکھا کہ وہ فضا جو بت سے خالی ہو گئی۔ اب وہ پتھر پھیلنا شروع ہوا پھیلتے پھیلتے وہ ساری فضا میں پھیل گیا جہاں تک وہ بت پھیلا ہوا تھا وہ پتھر پھیل گیا۔ اس پر تیری آنکھ کھل گئی۔ اس نے کہا میں اپنے رب کی قسم کھاتا ہوں، میرا خواب یہی تھا۔ تو نے بیان کرنے میں ذرہ برابر کمی کی، نہ زیادتی کی۔ ہو بہو یہی واقعہ ہے اور یہی میرے قلب کی حیرت کی کیفیت تھی جو تو نے کھول دی۔

حضرت دانیال علیہ السلام سے تعبیر...... پھر کہنے لگا کہ خدا کے لئے تعبیر جلدی بتا، میں تو مضطرب اور بے چین ہوں۔ فرمایا سن یہ جو تو نے بت دیکھا یہ دنیا کی قومیتیں ہیں۔ سب سے اوپر جو سونا دیکھا وہ تیری عراقی قوم ہے جس میں سب سے پہلے دنیا کا تمدن آیا۔ تمدن کے متعلق مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ سب سے پہلی متمدن قوم عراق کی ہے۔ بغداد سے تمدن شروع ہوا ہے تو یہ تیری قوم سے جو اعلیٰ ترین تمدن لئے ہوئے ہے اور سونے کی طرح چمک رہی ہے تیرے گزرنے کے بعد دوسری قوم آئے گی۔ وہ تیرے بیٹے کی ہوگی وہ چاندی کی طرح سے ہوگی گویا اس کا رتبہ گھٹ جائے گا اور یہ جو تو نے پیتل دیکھا ہے یہ زرد رنگ کی قومیں ہیں جیسے چینی جاپانی ہوتے ہیں کہ انکے چہروں کی رنگتیں زرد ہوتی ہیں اور یہ جو تو نے تانبا دیکھا، یہ سرخ رنگ کی اقوام ہیں۔ جیسے عربی حجازی اور شامی، ان کے چہرے سرخی مائل ہوتے ہیں اور جو یہ تو نے لوہا دیکھا یہ کالی قومیں ہیں جیسے تترونی اور حبشی، یہ جو تو نے قدموں میں مٹی دیکھی یہ دو ملکائیں پیدا ہوں گی، دو عورتیں بادشاہ بنیں گی۔ جو بہت کمزور حالت میں ہوں گی۔ ان کی قوم کو کمزور دکھایا گیا۔ دنیا انہیں نیچ سمجھے گی۔ تو تیری قوم سب سے زیادہ اونچی اور مٹی کی، یہ قوم سب سے زیادہ نیچی

جنہیں سب نے پامال کیا ہوگا، اور باقی دوسری قومیں درجہ بدرجہ فرق مراتب میں ہیں۔ تو تو نے یہ دیکھا کہ دنیا کہ قومیتوں کی اونچ نیچ ہے۔ کوئی قوم کہتی تھی کہ میں سونا ہوں، کوئی کہتی تھی میں چاندی ہوں وغیرہ، تو دنیا میں اونچ نیچ، قومیت اور برتری پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر والی قوم نیچے والی قوم کو حقیر جانتی تھی۔ دنیا میں حقارت اور کبر ونخوت کا دور دورہ تھا۔ کوئی کہتی تھی کہ ہم برما جی کے منہ سے نکلی ہوئی قوم ہیں، ہم برہمن ہیں، ہمارا مقام اونچا ہے، یہ جو اچھوت اقوام ہیں یہ نیچی ہیں یہ برماجی کے قدموں سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ہمیشہ ذلیل ہونے ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں تو اونچ نیچ میں دنیا گرفتار تھی اور قومیتیں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح چمک رہی تھیں کہ اچانک پتھر گرا۔ یہ پتھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تھا۔ یہ دین اسلام تھا جس نے آ کر دنیا کی قومیتوں کے اوپر ضرب لگائی اور اس درجہ پامال کر دیا کہ اونچ نیچ یکساں ہو کر سب گڈ مڈ ہو گیا۔ نہ سونا سونا نظر آیا نہ چاندی چاندی، خلط ملط ہو کر دنیا میں یکسانیت اور مساوات پیدا ہوگئی اور قانونی طور پر مساوات دنیا میں پھیل گئی۔

اس کے بعد تو نے دیکھا کہ وہ پتھر پھیلنا شروع ہوا۔ یہ اس دین کا انجام ہے کہ انجام کار دنیا کے آخری حصے میں یہی دین پورے عالم میں پھیل کر رہے گا اور پوری دنیا اسی کے اوپر آئے گی۔ جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ تو جذبات عالمگیری کی طرف جا رہے ہیں کہ سب قومیں ایک پلیٹ فارم کے اوپر آئیں۔ سب کا مسلک اور نصب العین ایک ہو تو یکسانی، مساوات اور وحدت اقوام ہو۔ تو یہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے جو انجام کار پورے عالم میں پھیل کر رہے گا۔ یہ تیرے خواب کی تعبیر ہے۔

علم نبوّت کی وجہ سے بنی اسرائیل کو دوبارہ عروج ملا...... اس نے ہاتھ چومے اور کہا کہ میں نے دنیا میں نہ اتنا دانشمند دیکھا نہ اتنا عارف کامل دیکھا اور آج سے میں نے حکم جاری کر دیا کہ میری سلطنت کا کوئی کام تیرے مشورے کے بغیر نہ ہو، وزارت کا قلمدان تیرے ہاتھ میں ہو، میرا بھی کوئی حکم اس وقت تک نہیں چلے گا جب تک تو اس پر صادر نہ کرے گا، اس لئے کہ میں نے آج تک ایسی کامل عقل نہیں دیکھی۔ چنانچہ حضرت دانیال علیہ السلام عملی طور پر خود بادشاہ ہو گئے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں برتری دلانے والی طاقت علم کی طاقت ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے پاس نہ دولت نہ حشمت نہ کروفر تھا، وحی کا علم تھا۔ اس علم سے وہ برتری پھیلی کہ دنیا کے بڑی سے بڑی قوم ان کے سامنے پست ہوگئی اور قلمدان وزارت ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم ‏ ‏ قلم کش را بدولت می رسانم

قلم کہتا ہے کہ میں دنیا کا اصل بادشاہ ہوں جو قلم چلاتا ہے میں اس کو بڑی بڑی حکومتوں پر اور بڑی بڑی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہوں۔ تو جس قوم نے دنیا میں برتری حاصل کی وہ محض صورت اور خوبصورتی سے نہیں ہوتی بلکہ خوبصورتی فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ علم فتنوں کے مٹانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

محض حسن صورت فتنہ کا پیشہ خیمہ ہے...... حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ حسین دنیا میں کوئی نہیں گزرا

حدیث میں فرمایا گیا ہے ”فَاِذَا قَدْ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ“ ① دنیا میں جب اللہ نے حسن پیدا کیا، تو آدھا حسن و جمال پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا۔ زنان مصر نے جب یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھا، تو یک زبان ہو کر کہا تھا کہ ﴿وَاللّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا. اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ② یہ کوئی بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ گویا ان کا حسن و جمال یہ ہے کہ قرآن بھی شہادت دے رہا ہے۔ اور حدیث بھی شہادت دے رہی ہے لیکن جتنی مصیبتیں اور فتنے یوسف علیہ السلام پر آئے، حسن صورت کی بدولت آئے۔ کنعان کے کنویں میں بھائیوں نے حسد کر کے ڈالا۔ انہیں ان کی خوبصورتی پر حسد تھا، قافلہ نے نکالا اور مصر کے بازار میں غلام بنا کے بیچے گئے۔ حسن صورت نے غلام بنوایا بیگمات مصر میں سے زلیخا عاشق ہوگی جو بادشاہ مصر کی بیوی تھی اس نے برا ارادہ کیا، پیغمبری کی وجہ سے بچے مگر اس نے جیل خانے میں ڈالا تو خوبصورتی کی بدولت نو برس جیل بھگتی، تو غلامی، جیل خانہ اور کنویں میں ڈالا جانا، یہ ساری مصیبتیں خوبصورتی کی بدولت آئیں اور مصر کی بادشاہت لینے کا وقت آیا۔ تو کیا فرمایا؟ ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ③ اگر ملک سنبھالنا ہے اور ملک کا نظم درست کرنا ہے تو ملک کی کنجیاں میرے سپرد کرو۔ میں انتظام کر کے دکھلاؤں گا کیوں؟ یہ نہیں فرمایا کہ اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ میں بڑا خوبصورت ہوں، بڑی عمدہ سلطنت چلاؤں گا۔ یہ فرمایا ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ④ میرے اندر علم ہے اور حفظ کا مادہ موجود ہے۔ تو فتنہ کا وقت آیا تو صورت کی خوبی آگے بڑھی اور سلطنت لینے کا وقت آیا تو علم اور کمال آگے بڑھا۔ دنیا میں فرد ہو یا قوم، اسے ترقی علم کی بدولت ہوتی ہے۔ حسن صورت، ظاہری آرائش اور جمال کی وجہ سے آدمی نہیں بڑھتا۔

جہالت تمام برائیوں کی جامع ہے...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوتی ہے تو آپ سے پہلے کا زمانہ سب سے برا زمانہ ہے۔ تاریخ میں موجود ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی برائی ایسی نہ تھی جو موجود نہ تھی۔ بدکاری، بداعتقادی، بدعملی اور قساوت قلبی وغیرہ ان میں تھی۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں ذبح کر دیتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے ان کے دل میں کوئی رحم نہیں آتا تھا۔ ڈکیتی ان کا رات دن کا شیوہ تھا۔ لڑائی جھگڑے اور فتنے رات دن کا قصہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر دو خاندانوں میں جنگ شروع ہوتی جن دو میں لڑائی ہوتی تھی۔ جب وہ مرتے تھے وصیت کر کے جاتے تھے کہ لڑائی مت بند کرنا، کہیں خاندان کی ناک کٹ جائے۔ تو خاندان کی ناک کٹنے کی وجہ سے پچاس پچاس برس تک جنگ جاری رہتی تھی لڑنے، بدعملی اور بداعتقادی سے انہیں عار نہیں تھا۔ شرک انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ کے اردگرد مطاف میں رکھے ہوئے تھے۔ تو تین سو ساٹھ بتوں کی تو وہاں عبادت

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ ......، ج: ۱ ص: ۱۴۶ رقم: ۱۶۲۔
② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱۔ ③ ④ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵۔

ہوتی تھی کثاف اور نائلہ کے دو بت بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے تھے، وہاں ان کی عبادت ہوتی تھی۔ گھر آتے تھے تو ہر خاندان اور قبیلہ کا بت الگ تھا۔ ایک خاندان کو عار آتا تھا کہ میں اس کے بت کو کیسے پوج لوں۔ یہ چھوٹا خاندان ہے میرا خاندان بڑا ہے، تو اس کا بت چھوٹا، میرا بت بڑا تو تعصبات چلتے تھے اور خاندانوں کے بت الگ تھے۔ پھر گھر گھر میں الگ الگ بت تھے۔ ایک گھر والا دوسرے گھر والے کی طرف رجوع نہیں کرتا تھا کہ میرا خدا میرے گھر میں موجود ہے میں اس کے گھر کی طرف کیوں رجوع کروں؟ پھر ہر شخص کا خدا الگ تھا۔ پھر ہر شخص کے سفر کا الگ اور حضر کا الگ خدا تھا۔ پھر ایک شخص سفر کرتا تھا تو خدا کو جیب میں ڈال کے لے جاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہاں نہ ملے، تو عبادت و پوجا کس کی کروں گا؟ وہاں پہاڑ پہ بیٹھ کے عبادت شروع کی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اتفاق سے نظر پڑی کہ میرے سامنے جو پتھر ہے اس سے زیادہ خوبصورت وہ پڑا ہوا ہے اسے پھینک دیا، اسے اٹھا کے آگے رکھ لیا، اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے جیسے ایک بیوی تھی اسے طلاق دیدی۔ دوسری کر لی۔ یہ حالت خداؤں کی کر رکھی تھی کہ عابدوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی خداؤں اور معبودوں کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ شرک انتہائی، بدعملی، بداعتقادی اور بے رحمی انتہائی سارے برے اخلاق جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اس زمانے کا جو نام رکھا گیا تو یہ نہیں رکھا گیا کہ زمانہ بدکاری، زمانہ قتل و غارت، زمانہ ڈکیتی اس کا نام زمانہ جاہلیت رکھا گیا جس سے بتلانا ہے کہ ساری برائیوں کا سرچشمہ جہالت ہے اگر وہ زمانہ جاہلیت نہ ہوتا۔ یہ بدکاریاں بھی نمایاں نہ ہوتیں ہر بدکاری الگ الگ ہے اور سب کی جامع جہالت ہے جس سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

علم تمام کمالات کا سرچشمہ ہے...... اس زمانے کے خلاف جب اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کو بھیجا اور آپ نور لے کر آئے تو سب سے پہلی آیت قرآن کریم کی کیا اتری؟ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ① پڑھو، یعنی جہالت دور کرو۔ اگر یہ چیز تمہیں رفع کرنی ہے، دنیا کی قومیں عربوں کو ذلیل و حقیر جانتی تھی۔ اگر یہ ذلت اور حقارت اپنی قوم سے مٹانی ہے۔ تو وہ جہالت سے آئی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اِقْرَاْ پڑھو اور پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہو جاؤ، جہالت کے جب یہ کرشمے تھے تو علم کا یہ کرشمہ ہوگا کہ ذلت کی بجائے عزت آئے گی۔ برائی کی جگہ بھلائی آئے گی۔ غلط اعتقاد کی بجائے صحیح اعتقاد آئیں گے، بدعملی کی بجائے صحیح عمل آئیں گے۔ شرک کی بجائے توحید پیدا ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جن جن سعادت مند قلوب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو سنا اور مانا اور قرآن کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ تو وہی زمانہ جس کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ اس کا نام خیر القرون ہوا کہ سب زمانوں میں بہترین زمانہ جن لوگوں کا نام جہلائے مکہ تھا، ان کا نام صحابہ کرامؓ ہوا، جن کا نام لے کر قوموں میں لعنت بھیجی جاتی تھی ان کا نام لے کر اب رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کہا جاتا ہے، اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی جن کی ذلت کا یہ عالم تھا کہ قومیں ان کو کہتی تھی کہ چرواہے، مینگنیوں میں کھیلنے والے، گندگیوں میں بسر کرنے والے،

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱.

اب ان کا لقب عارفین کاملین ہوا، صفائی ستھرائی ان میں، طہارت وعبادت ان میں، ذہانت وکمالات ان میں۔ بالکل زمانہ لوٹ گیا کہ یا بد تھا یا بہتر ہو گیا۔ یا جہالت کا تھا یا علم کا ہو گیا۔ یہ قرآنی تعلیم کی بدولت تھا، تو پہلی آیت قرآن کریم کی یہی نازل ہوئی کہ اِقْرَأْ جس سے واضح ہے کہ جب کوئی قوم ذلت میں گرفتار ہو جائے پریشانیوں میں مبتلا ہو اس کا علاج یہ ہے کہ علم کے ذریعے پہلے اپنے اخلاق اور اعمال درست کرے۔ چاہے اس میں کچھ مدت لگے لیکن انجام جبھی صحیح نکلے گا جب یہ ہو گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ برس تک تعلیم دی مکہ میں تیرہ برس کی زندگی کیسی تھی؟ مسلمان انتہائی کمزور، کھانے کی نہیں، پینے کو نہیں، شوکت ان کے ہاتھ میں نہیں، تعداد ندارد، ہر چیز کے محتاج، حتیٰ کہ مارے پیٹے جاتے تھے۔ صحابہؓ پر زیادتیاں، بدگوئیاں اور گالم گلوچ ہوتی تھی حکم یہ تھا کہ صبر کرو، تحمل کرو۔

مگر صبر وتحمل کے معنی یہ نہیں کہ پٹتے رہو۔ یہ بزدلی ہے۔ اسلام نے بزدلی نہیں سکھلائی۔ اسلام اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے محض پٹتے رہنا۔ یہ بزدلی تھی۔ تو جہاں یہ حکم آیا کہ پٹتے رہو، مار کھاتے رہو۔ مگر ساتھ میں حملہ بھی کرو اور حملہ کیا۔ ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ① کلمۂ حق کا اعلان کرتے رہو۔ اللہ کی طرف دعوت دیتے رہو، اللہ کی طرف بلاتے رہو، ماریں تو پٹتے رہو۔ برا بھلا کہیں، سنتے رہو، قتل کریں، مقتول ہو جاؤ۔ مگر کلمہ حق کی تبلیغ ودعوت مت چھوڑو۔ تو فقط پٹنا نہیں بتلایا بلکہ حملہ بھی بتلایا۔ مگر یہ حملہ تلوار، لاٹھی اور ہاتھ پیر سے نہیں حملہ زبان اور کلمہ حق کے ذریعے سے تھا۔

اس کے جواب میں تو تلوار چلتی تھی۔ اگر صحابہ کلمۂ حق بلند نہ کرتے، تو وہ خاندانی لوگ تھے سب آپس میں رشتہ دار تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف کون کھڑا ہوتا؟ یہ جو حملہ ہوتا تھا یہ ان کے حملہ کے جواب میں ہوتا تھا۔ مگر یہ حملہ کلمہ حق سے کرتے وہ ہاتھ سے کرتے تھے، اس لئے کہ اِدھر علم تھا اور علم والا سچی بات سے حملہ کرتا ہے جاہل ہاتھ سے جواب دیتا ہے اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تو لڑائی جاری تھی مگر اُدھر سے حملہ علم کے راستے سے اور اِدھر سے جہالت کے راستے سے ہوتا تھا۔ اس راستے میں فرمایا گیا کہ مار کھاؤ پٹو، کوئی پرواہ مت کرو۔ جواب بھی مت دو آیتیں جو نازل ہوتی تھیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا تھا: ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ ② ﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ③ ''اے نبی صبر جمیل اختیار کر، ان مشرکوں سے اعراض کرو، ان کے برا بھلا کہنے پر مت جاؤ۔ یہ کہتے رہیں، آپؐ اپنا کام کریں''۔ ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ ④ اے نبی! ہم جانتے جب یہ آپ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ تو آپ کا دل گھٹتا ہے، بشری طبیعت کے مطابق کوفت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کو رنج

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۵۲. ② پارہ: ۲۹، سورۃ المعارج، الآیۃ: ۵.
③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۶. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۷، ۹۹.

ہوتا ہے لیکن ان بے تمیزوں کو بکنے دو۔ آپ اللہ کی تسبیح وتہلیل اور اس کے ذکر میں لگیں۔ ان کو یہی توفیق ہے کہ یہ برا کہیں۔ آپ کی توفیق یہ کہ آپ کلمات حقہ زبان سے ادا کریں۔ تیرہ برس آپ نے اور صحابہؓ نے اس مصیبت میں گزارے۔ تیرہ برس کے بعد جو زمانہ لوٹا تو جو اقلیت تھی وہ اکثریت بن گئی، جو بے عزت تھے وہ عزت والے بن گئے، جن کے ہاتھ میں شوکت نہیں تھی وہ شوکت والے بن گئے، جو بے زر اور بے کس تھے ان کے ہاتھ میں قیصر و کسریٰ کے خزانے آنے شروع ہو گئے۔ ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔

تعمیر باطن سے دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے...... یہ کب ہوا؟ جب پہلے انہوں نے اپنے اندر انقلاب پیدا کیا۔ دنیا میں انقلاب باہر سے نہیں اندر سے چلتا ہے اپنے اندر کی تعمیر کرے، اپنے اخلاق درست کرے، اپنا کیرکٹر سنوارے، دنیا کی قومیں خود اس کے آگے جھک جاتی ہیں۔ ہم اگر برا کردار پیش کریں گے اس کے جواب میں دنیا توہین وتذلیل کرے گی۔ لیکن اگر ہم وقار ومتانت وسنجیدگی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کریں گے تو کیا دنیا کے دماغ میں پھوڑا اٹھا ہے کہ پھر بھی خواہ مخواہ بدگوئی کرے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ کرے گی تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ اس کا مستحق نہیں ہے، یہ سچا آدمی ہے تو اندورنی اخلاق جب اعلیٰ طریق پر ظاہر ہوتے ہیں تو میں خود جھک جاتی ہیں۔

حدیث قدسی میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ’’جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے، میرے قانون کو چھوڑ دیتی ہے۔ رات دن گناہوں میں اور معصیتوں میں مبتلا ہوتی ہے تو میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں اس کی عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ قومیں کھڑی ہوتی ہیں، انہیں سزا دیتی ہیں۔ تلوار اور ہاتھ سے بھی، دولت وشوکت چھیننے سے بھی، وہ میری طرف سے جلاد کے طور پر کام کرتی ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں ہیں میرا حکم چل رہا ہے۔ فرمایا اگر یہ تمہیں ناگوار ہے کہ دنیا کی قومیں تم پر مسلط ہو کر تمہیں تباہ وذلیل کریں۔ انہیں برا بھلا مت کہو میرے سے معاملہ درست کر لو۔ میں ان کے قلوب میں عداوت کی بجائے محبت ڈال دوں گا۔ وہی قومیں جو تمہارے مدمقابل تھیں وہ سرنگوں ہو جائیں گی۔ قلوب میرے ہاتھ میں ہیں ’’اَلْقُلُوْبُ بَيْنَ اِصْبَعَيِ الرَّحْمٰنِ يُصَرِّفُهَا حَيْثُ يَشَآءُ.‘‘ ① فرماتے ہیں دنیا کے قلوب رحمٰن کی دو انگلیوں کی بیچ میں ہیں۔ جدھر کو چاہیں پلٹ دیں۔

شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے، بڑی کامل اور جامع نصیحت کی ہے۔

گرگزندت رسد ز خلق مرنج ۔۔۔ کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

اگر تمہیں دنیا سے تکلیف پہنچے رنجیدہ مت ہو، اس لئے کہ دنیا کے ہاتھ میں نہ رنج پہنچانا ہے نہ خوشی پہنچانا۔ اگر کوئی تمہاری جائیداد چھیننے کے لئے کھڑا ہو تو اس کے قبضۂ قدرت میں ہے کب؟ وہ تو اللہ کی طرف سے مامور ہے جو کر رہا ہے۔ تو ۔

---

① السنن للترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بين اصبعي الرحمن، ج: ٨ ص: ٢٩ رقم: ٢٠٦٦.

گرگز ندت رسد زخلق مرنج   کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست   کہ دل ہر دو در تصرف اوست

دشمن کا خلاف اور دوستوں کی موافقت خدا کی طرف سے سمجھو، اس لئے کہ دل اس کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے کسی کو کسی کا دشمن بنادے، چاہے دوست بنادے، تو بجائے اس کے کہ دوستوں اور دشمنوں کے پیچھے پڑے رہو کہ یہ ہمارا دشمن ہے اس کو کس طرح سے ماریں اور یہ ہمارا دوست ہے اس کو کس طرح سے سر پر اٹھائیں، تم اس سے معاملہ کیوں نہیں درست کرتے کہ دوست دشمن دونوں کے قلوب اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ دوستوں کو پکا دوست بنادے گا۔ دشمنوں کو دوستی کی طرف مائل کر دے گا۔

دنیا میں حقیقی دانشمند اہل اللہ ہیں...... دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ایک ایک سے معاملہ کرو، ایک ایک کی خوشامد کرو، ہزار کی کرو، ایک ذات کی کیوں نہ کرلو کہ سب کی ضرورت ہی نہ پڑے سیدھا سیدھا معاملہ ہے۔

ہارون رشید دربار میں بیٹھا ہوا تھا، اسے جوش آیا تو درباریوں سے خطاب کر کے کہا، آج جس کا جو جی چاہے مانگے میں اس کو وہی دوں گا۔ کسی نے کہا حضور! مجھے دس لاکھ دیدیجئے۔ خزانچی کو حکم دیا، دیدو۔ کسی نے کہا، مجھے فلاں صوبے کی گورنری کا عہدہ دے دیجئے اس نے کہا دے دیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں فلاں قلعہ بخش دیجئے۔ اس نے کہا دیدیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں باغ دیدیجئے اس نے کہا دیدیا۔ غرض جتنے درباری تھے، منہ مانگی مرادیں مانگ رہے ہیں۔

ہارون رشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ ہارون رشید نے اس کی طرف رخ کر کے کہا۔ تو نے کچھ نہیں مانگا، اس نے کہا ان گدھوں کو نمٹ لینے دیجئے۔ اس کے بعد میں مانگوں گی۔ یہ احمق جب نمٹ جائیں گے، جب میں مانگوں گی۔

ہارون رشید نے کہا اچھا! یہ دربار کے سب امراء، وزرا، حکام، یہ سب گدھے اور احمق ہیں؟ اس نے کہا سب گدھے اور احمق ہیں۔ انہیں تمیز تو ہے ہی نہیں۔ ہارون رشید حیران ہوا کہ یہ عورت ذات تو بن گئی عقلمند اور یہ جتنے وزراء ہیں بے وقوف بن گئے، یہ خود احمق معلوم ہوتی ہے کیا تیرے دماغ میں مالیخولیا ہے۔ یہ سب میرے وزراء ہیں اور میرے ملک کا انتظام چلارہے ہیں خزانوں کے مالک ہیں یہ سارے گدھے ہیں؟

اس نے کہا: حضور! سارے گدھے ہیں، ان میں تمیز نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ ہارون رشید نے بھی یہ سمجھا کہ عورت ذات ہے بکواس کر رہی ہے۔ میں کہاں اس کے منہ آؤں؟ تو اب ہارون نے باندی کی طرف دیکھا اور کہا کیا تو کچھ مانگنا چاہتی ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ بے وقوف نمٹ چکے ہیں اب میرا موقع آیا ہے۔ اب میں مانگوں گی۔ ہارون نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے؟ کہا جو میں مانگوں گی دو گے؟ اس نے کہا میرا وعدہ واعلان ہے۔ اس نے ہارون کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں کہ آپ میرے ہو جائیں۔ تو اس نے واقعی عقلمندی کا ثبوت دیا، اس لئے کہ جس نے دس لاکھ مانگے مل گئے اور کچھ نہیں ملا۔ جس نے قلعہ مانگا اس کا کو قلعہ مل گیا باقی کچھ نہیں

ملا۔عہدہ مانگا،ایک عہدہ مل گیا۔باقی کچھ نہیں۔

اس نے ہارون رشید کو مانگ لیا کہ جب بادشاہ میرا تو عہدے بھی میرے، قلعے بھی میرے، خزانے بھی میرے،قوم بھی میری۔تو دانشمندی کی بات یہ تھی کہ اس نے جڑ بنیاد کو پکڑ لیا اور انہوں نے شاخوں کو پکڑا۔کسی نے پتہ لے لیا۔کسی نے پھل توڑ لیا۔اس نے کہا میں درخت ہی پر قبضہ نہ کروں کہ سارے پتے بھی اور سارے پھل بھی میرے ہو جائیں تو حقیقتاً اس باندی نے عورت ہو کر دانشمندی اور عقل کا ثبوت دیا۔

میں کہتا ہوں دنیا میں اہل اللہ حقیقت میں عقلمند ہیں جنہوں نے بجائے اس کہ یہ دولت لیں،وہ دولت لیں، اللہ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے ہو جایئے۔جب آپ ہمارے ہیں تو ساری دنیا ہماری،ساری آخرت ہماری، ساری جنتیں ہماری۔عرش وکرسی اور لوح قلم ہمارے اور آپ ہمارے نہیں ہیں تو اگر کسی نے دولت لے لی تو چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔آگے اس کے لئے کچھ بھی نہیں۔بڑی سے بڑی دولت حتیٰ کہ ہفت اقلیم کی دولت بھی مل جائے مگر اللہ سے تعلق نہ ہو تو دنیا میں بھی ممکن ہے کہ وہ ختم ہو جائے ورنہ موت تو ختم کر ہی دے گی۔آخرت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔کوئی چیز اس کی قسمت کی نہیں ہے۔تو واقعہ یہ ہے کہ باندی نے عقلمندی دکھلائی۔اسی طرح اللہ والے عقلمند ہیں جنہوں نے جڑ بنیاد پکڑ رکھی ہے۔یہی میں عرض کر رہا ہوں کہ بجائے اس کے کہ پچاس ہزار کو راضی کرنے کی کوشش کی جائے،ایک کو کیوں نہ راضی کر لیا جائے کہ وہ سارے پچاس ہزار غلام بنیں۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق بندگی کا ہونا چاہئے......مگر ساتھ میں یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کو جو راضی کیا جائے اور اس سے جو تعلق رکھا جائے وہ خود غرضی سے نہ رکھا جائے اس وجہ سے اللہ کو راضی کریں کہ میرا گھر بن جائے،میری دولت بڑھ جائے،تو اللہ مقصود نہ ہوا وہ تو گھر دولت مقصود ہو گئی۔اللہ کو راضی اس لئے کرو کہ حق یہی ہے کہ وہ راضی ہو۔جب وہ راضی ہو گیا تو سب کچھ مل گیا اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو آخرت تو مل گئی۔فرض کرو کہ آخرت بھی نہ ملے۔اللہ یوں کہہ دے کہ میں راضی ہوں،سب کچھ مل گیا۔اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ؎

تو بندگی چوں گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اللہ کی بندگی اور عبادت مزدوروں کی طرح مت کرو کہ صاحب!اجرت ملے گی تو سجدہ کریں گے۔ذرا کمی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔یہ اپنی مجبوری کی بندگی ہے خدا کی بندگی نہیں ہے۔اس لئے اللہ کی بندگی کرو کہ وہ راضی ہو جائے ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے تو خود سارے خزانے مل جائیں گے۔مگر خود طمع مت رکھو۔

جب محبوب حقیقی اپنا ہو گیا،جو ساری برکتوں کا سرچشمہ ہے وہ اگر ہمارا ہے تو ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔تو ایک تو یہ کہ آپ اللہ کی عبادت کریں کہ مجھے دنیا میں فلاں قلعہ،کوٹھی مل جائے۔یہ بہت ہی کم جذبے کی خواہش ہے اور ایک یہ کہ آپ یوں کہیں کہ چاہے سارے جہاں مجھ سے چھوٹ جائیں مگر میرا اللہ مجھ سے راضی ہو یہ ہے مانگنے

کی چیز اللہ میاں کا امتحان مت لو امتحان تو وہ لے کہ تم نے دعویٰ سچا کیا کہ تم اللہ والے بننا بھی چاہتے ہو یا نہیں؟ تم کون ہوتے ہو قدرت کا امتحان لینے والے؟ وہ امتحان لیں گے تم مفلس اور بندے بن کر ان کے سامنے اپنے کو ڈال دو کہ جو آپ چاہیں گے وہ ہی ہم بھی چاہیں گے۔

کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی پر دونوں جہاں چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کیا آپ اس درجہ کے ہیں کہ ساری دنیا و آخرت آپ کی مرضی پہ چل رہی ہے؟ فرمایا الحمد اللہ میں اسی درجے کا ہوں۔ میری مرضی پر دنیا و آخرت کے سارے واقعات چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا، یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہاں کے واقعات اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، جو اس کی مرضی ہے وہ میری مرضی ہے تو سارے جہاں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں۔ میری مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ کوئی مرے میں گھٹ کے بیٹھ جاؤں تو میں کوئی خدا سے لڑنے کے لئے جا رہا ہوں کہ وہ تو کہیں اس کی موت ہونی چاہئے۔ میں کہوں نہیں صاحب!۔ موت نہیں ہونی چاہئے یہ تو غلط بات ہے یہ تو لڑائی ہوگی اللہ میاں سے۔ آدمی بندہ بن کے بندگی دکھلائے بندگی کے معنی یہ ہیں کہ اپنی رضا اور خواہش کو فنا کر دے۔ جو آپ کی مرضی وہی میرے مرضی میں کون ہوں جو آپ کی مرضی کے خلاف کروں؟

ہمارے ہاں پنجاب میں شاہ دولہ ایک بزرگ گزرے ہیں، جمنا کے کنارے پر ایک بستی تھی، اس میں وہ رہتے تھے۔ برسات کا زمانہ آیا جمنا کا پانی چڑھا اور پانی چڑھ کر گاؤں کی طرف بڑھا۔ تو اس زمانے میں گاؤں میں چہار دیواری بنائی جاتی تھی۔ بستیاں گویا قلعہ بند ہوتی تھیں۔ تو وہاں ایک مضبوط دیوار تھی جس سے پانی ٹکرا رہا تھا اگر وہ نہ ہوتی تو گاؤں غرق ہو گیا ہوتا۔ مگر پانی جو آنا شروع ہوا تو آدھی دیوار تک پہنچ گیا اور اندیشہ ہوا کہ اب ذرا اوپر گیا تو اندر آیا اور بستی غرق ہوئی، لوگ گھبرا کے دوڑتے ہوئے شاہ دولہ کے پاس آئے اور کہا حضرت! دعا کیجئے، دستگیری کیجئے، گاؤں تو تباہ ہوا جمنا چڑھ رہی ہے اور دیوار تقریباً ڈوب چکی گز بھر باقی رہ گئی۔ اگر تھوڑا اور پانی آ گیا تو پھر گاؤں کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ فرمایا اچھا پانی زیادہ چڑھ گیا؟ عرض کیا بہت چڑھ گیا۔ فرمایا ایک پھاؤڑا اٹھا کے لاؤ (جس سے مزدور مٹی کھودتے ہیں) پھاؤڑا لایا گیا۔ شاہ دولہؒ نے اپنے کندھے پہ پھاؤڑا رکھا اور کہا چلو میرے ساتھ لوگ ساتھ آئے بیچارے خوش خوش کہ اب یہ کوئی تدبیر کریں گے۔ شاہ دولہؒ نے آتے ہی اس دیوار کو توڑنا شروع کیا جس سے پانی رک رہا تھا۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو گاؤں جلدی غرق ہو جائے گا۔ اسی نے تو گاؤں بچا رکھا ہے۔ فرمایا ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ''

نامعقولو! تم مجھے کیا اللہ میاں سے لڑوانے لائے ہو؟ کہ اللہ میاں تو چاہیں یہ بستی غرق ہو اور میں چاہوں غرق

نہ ہو۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ بستی غرق ہو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ۔ تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جب منشاء خداوندی سامنے آئے اپنا ارادہ اور رضا فنا کر دے کہ میں تابع حق ہوں۔ حق کے مقابلے پر اپنی مرضی جتلانا، اپنی تجویزیں رکھنا کہ یوں ہونا چاہئے۔ یہ اللہ میاں کو مشورہ دینا ہے۔ جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں۔ یہ نہایت ہی غلط مقولہ ہے۔ کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو لوگ تعزیت کے خط لکھتے ہیں۔ اس میں لکھا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت پہ مجھے بے حد قلق ہوا۔ اس جاہل سے آدمی پوچھے کہ موت بھی کبھی بے وقت آتی ہے۔ موت کا وقت تو مقرر ہے۔ گویا اس وقت مرنا مناسب نہیں تھا۔ یعنی عیاذ باللہ۔ اللہ میاں ان سے مشورہ کرتے کہ ان صاحب کو اس وقت موت دوں یا نہ دوں؟ اور آپ مشورہ دیتے کہ ابھی موقع نہیں ہے دو چار دن کے بعد دے دیجئے گا۔ بندے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کوئی لفظ بھی ایسا بولے جس سے معلوم ہو کہ حق تعالیٰ کی رضا اور تقدیر کے مقابلہ میں اس کی کوئی تجویز ہے۔ یہ جو ساری آفتیں آتی ہیں اس لئے آتی ہیں کہ ہم اپنی تجویز کو آگے رکھتے ہیں۔ تقدیر کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور راضی نہیں ہوتے کہ جو اللہ کی تقدیر ہے وہی حق ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک غلام کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی کا کوئی غلام تھا اس سے پوچھا کہ بھئی تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ جو آقا کھلا دے۔ پہنے گا کیا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دیدے۔ اس نے کہا آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا میری اپنی مرضی ہوتی، میں غلام ہی کیوں بنتا۔ آقا ہی نہ ہو جاتا۔ غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری رائے بھی غلام، میری مرضی بھی غلام اور میری خواہش بھی غلام۔ جب ایک بندہ، بندہ کا غلام بن کر اتنا فنا ہو جائے کہ اپنی مرضی اور رائے کو بھی چھوڑ دے۔ تو ایک بندہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کا غلام ہوں اور پھر اپنی مرضی بھی چلائے۔ یہ اجتماع ضدین ہے۔ بندگی کے معنی ہیں کہ میں فنا ہوں اور تجویز پیش کرنے کے معنی ہیں کہ اللہ میاں مجھ سے مشورہ لے۔ یہ کام کیوں ہوا؟ میری تجویز کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔ یہ سخت گستاخی کے الفاظ ہیں۔

مطیع کو سب کچھ اور مدعی کو کچھ نہیں ملتا...... بندہ کا کام یہ ہے کہ مرضی اور تجویز کو تو چھوڑ دے۔ جو انہوں نے قانون بتلا دیا اس پر عمل کرنا شروع کر دے۔ اطاعت کا ثمرہ یہ ہے کہ اس سے محبت پیدا ہو جائے گی۔ دنیا میں مطیع کو سب کچھ ملا ہے۔ جو طالب ہو اور دعویٰ کرے اسے کبھی نہیں ملتا۔ اطاعت کا راستہ اختیار کرے خود بخود ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی سے کہیں کہ صاحب! آپ ہمیں اپنے گھر کے راز بتلا دیجئے وہ کہے گا کہ نامعقول! تم کون ہوتے ہو میرے گھر کے راز پوچھنے والے؟ اور اگر آپ اس کے خادم بن جائیں چند دن کے بعد خود ہی سارے گھر کے راز کہہ دے گا۔

بادشاہ کے دربار میں ایک شخص جائے اور کہے کہ حضور اپنی بیگمات کو میرے سامنے کر دیجئے اور بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں چاندی کتنی اور سونا کتنا ہے؟ وہ کہے گا اس نامعقول کو کان سے پکڑ کے نکال دو یہ ہماری

بیگمات اور خزانے کا نام لے؟ اور یہ ہمارے توشے خانے کا نام لے کہ اس میں لباس کتنے اور ہتھیار کتنے؟ یہ کون بے ادب اور گستاخ ہے۔ کان پکڑ کر دربار سے نکال دیا جائے گا۔ یہ تو طالب کا انجام ہے جو مانگ رہا تھا۔

اور ایک وہ شخص ہے جو دربار میں آیا۔ بادشاہ نے کہا کھڑے ہو جاؤ، اس نے کہا بہت اچھا حضور، کہا بیٹھ جاؤ، اس نے کہا بہت اچھا حضور، غرض جب اطاعت مطلق ہوگی، بادشاہ کہے گا۔ بڑا نیاز مند ہے، بڑا مطیع ہے۔ تو اعتماد قائم ہوگا۔ بادشاہ کہے گا معلوم ہوتا ہے تو مخلص ہے اور نہایت مطیع اور وفادار ہے۔ اس واسطے شاہی محلات میں جس وقت تمہارا جی چاہے آ ؤ جاؤ، تم سے کوئی خطرہ نہیں۔ اندر جانا شروع ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بیگمات بھی اس سے پردہ چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ یہ ہمارا خاص آدمی ہے تو بیگمات نے باتیں شروع کیں۔ دو برس میں جب نیاز مندی اور اطاعت ظاہر ہوئی۔ بادشاہ نے کہا آ ؤ، آج تمہیں خزانے کی سیر کرائیں۔ تو شاہی خزانے پر لے گئے۔ سونا چاندی اور جواہرات دکھائے۔ اس نے اور زیادہ اطاعت شروع کی۔ جب ایک برس اور گزرا۔ بادشاہ نے کہا اس سے بہتر معتمد علیہ آدمی نہیں۔ لو اب تم پر سلطنت کی پالیسی اور راز بھی کھول دیتے ہیں۔

یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ اطاعت کا راستہ اختیار کیا اور پہلے کو دھکے دے کر کیوں نکال دیا گیا؟ اس لئے کہ اطاعت تو تھی نہیں اور خود مطالبہ کیا کہ اپنے اسرار مجھ پر کھول دیجئے۔ تو مطالبہ کرنے والے کا جواب کان پکڑ کے نکال دینا ہے اور اطاعت کرنے والے کا جواب یہ ہے کہ خود بادشاہ بلا بلا کر کہے کہ میرے راز معلوم کرو۔ ایک مومن کی یہ شان ہونی چاہئے کہ رات دن اطاعت میں سرگرم ہو۔ رات دن یہ معلوم کرے کہ جو شریعت اور قانون ہمارے لئے بھیجا گیا ہے۔ جب دین و دنیا کی بھلائی کے اس میں وعدے دیئے گئے ہیں۔ تو کیوں نہ ہم اللہ کے وعدے پر اطمینان کریں۔ معاذ اللہ یہ وعدے غلط بھی ہو سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (1) اللہ ان لوگوں سے وعدہ کرتا ہے۔ جو ایمان کو قبول کریں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔ ہم انہیں زمین کی طاقت عطا کریں گے۔ یہ اللہ کا سچا اور اٹل وعدہ ہے۔ کوئی کر کے دکھلائے یقیناً اس کے سامنے وعدہ آئے گا۔ کر کے نہ دکھلائے، تجربہ ہی نہ کرے اس کا کوئی علاج نہیں۔ اگر ایک طبیب آپ سے یوں کہے کہ بھئی تمہیں زکام ہو رہا ہے۔ دہی بھی چھوڑ دو اور دودھ پینا بھی چھوڑ دو۔ ملٹھی اور بنفشہ استعمال کرو، اگر وہ طبیب کی اطاعت کرے، استعمال کرے، جبھی زکام جائے گا۔ اگر اس نے کہا، بات تو آپ نے سچی کی۔ باقی مجھے دودھ دہی سے فرصت نہیں۔ میرے گھر پہ تو گائے بھینس بندھی ہوئی ہے۔ جب بٹنے کے بٹنے دودھ کے بھرے ہوئے آئیں گے تو کس سے جی رہے گا۔ وہ تو پینے ہی کو جی چاہے گا۔ کون گل بنفشہ اور ملٹھی کی مصیبت میں پڑے۔ میں تو صاحب دودھ پیوں گا۔ قانون اپنی جگہ بالکل حق ہے۔

---

(1) پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵.

یہی شان اس وقت مسلمانوں کی ہے کہ شریعت کا حکم پیش کیا جائے تو کہتے ہیں کہ بات بالکل سچی ہے۔ حکم سر آنکھوں پر ہے۔ باقی دوکان، جائیداد، مکان اور اپنی عیش سے فرصت نہیں ہے۔ قانون حق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسجد بھی اچھی چیز ہے، نماز بھی اچھی چیز ہے، روزہ، زکوٰۃ اور اطاعت خداوندی بڑی عمدہ چیزیں ہیں مگر کیا کریں کچھ فرصت نہیں ملتی ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ بات سچی ہے کہ جنت ملے گی۔ اب طبیعت نہ چاہے تو اس کا کیا علاج ہے؟ یہ ہماری مثال ہوگئی کہ سب کچھ جانتے ہیں سب کچھ کہتے ہیں مگر طبیعت کی غلامی اختیار کریں گے، شریعت کی غلامی کی طرف نہیں آئیں گے۔

تو جب طبیب کا کہنا ہی نہ مانے پھر زکام کیسے جائے گا؟ یہ کہنے سے کہ طبیب نے نسخہ سچ اور حق لکھا۔ اس سے زکام نہیں جائے گا۔ اس سچ کو استعمال کرنے سے جائے گا۔ تو شریعت ایک نسخہ ہے آپ اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیں، استعمال نہ کریں۔ بیماری نہیں جائے گی اور ایک تعریف کا کلمہ نہ کہیں۔ اطاعت شعاری سے نسخہ استعمال کرنا شروع کر دیں، صحت کے آثار خود بخود آنے شروع ہوں گے۔ آخر ہمارے اور آپ کے بزرگ ہی تھے، ہمیں آج اتنا سکھ نصیب نہیں جتنا ہمارے بزرگوں نے اٹھایا۔ چاہے ان کے پاس اس درجے کے کوٹھی بنگلے نہ ہوں جو ہمارے پاس ہیں۔ مکان سادہ ہوں۔ لیکن مکان کی آرائش سے دل کے سکھ کا کوئی تعلق نہیں، دل کا عیش الگ چیز ہے۔ اصل عیش اور راحت دل کا سکون ہے۔ اگر لاکھوں کروڑوں روپیہ، ہمارے اردگرد جمع ہوا اور دل میں گھٹن، بے چینی اور پریشانی ہے۔ معلوم ہوا کہ عیش نہیں ہے اور دن میں چکنی روٹی بھی نہ ملے مگر دل مطمئن ہو کہ کسی کا ہمارے اوپر حق استحقاق نہیں، وہ شخص بادشاہ ہے۔ تو عیش دل کی راحت اور سکون کا نام ہے۔ ہمارے اور آپ کے بزرگوں کو اللہ نے دولت بھی دی تھی اور دل کا سکون بھی دیا تھا۔ جو اطاعت خداوندی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے دولت میں پڑ کے اطاعات کو کھو دیا تو عیش کا سامان تو بہت ہے مگر جسے عیش کہتے ہیں وہ نہیں ہے، قلب میں راحت نہیں ہے بے چینی ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اللہ کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں۔ دولت بھی جبھی چین بخشتی ہے جب دل کے اندر اللہ کا نام ہو اور یہ نہ ہو تو دولت کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ یہ خود پریشانیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں افلاطون گزرا ہے۔ آپ نے نام سنا ہوگا۔ ایران کا بڑا طبیب ہے۔ ہم تو یہی سمجھا کرتے تھے کہ یہ ایک حکیم اور فلسفی ہے۔ مگر ایک بڑے محقق عالم شیخ عبدالکریم ہیں، انہوں نے ایک کتاب ''الانسان الکامل'' لکھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا۔ تو اس کی قبر کے اوپر انوار و برکات کی بارش ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص مقبولان الٰہی میں سے تھا محض فلسفی نہیں تھا۔ بہرحال

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

افلاطون کا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ایک ہے۔ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تعارف نہیں تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ افلاطون بھی ہے اور افلاطون جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ ایک دن اتفاق سے ایک جگہ جمع ہوئے۔ سرراہ ملاقات ہوئی۔ افلاطون چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چہرے پر نبوّت کا جلال و جمال اور انوار، دل میں ایمان کی چمک، اس سے وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہے۔

یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں۔ مگر بہر حال یہ سمجھا کہ یہ کوئی بڑا حکیم ہے۔ بڑی نیاز مندی سے ملاقات کی۔ گفتگو سے واضح ہوا کہ یہ کوئی عالی مقام ذات ہے۔ کہنے لگا برسوں سے میرے ذہن میں ایک سوال ہے جو میرے اندر کھٹک پیدا کرتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے آگے میں نے پیش کیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ آپ ضرور جواب دیں گے علم وفضل آپ کے اندر بھرا ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا سوال ہے؟ بڑا انوکھا اس نے سوال کیا۔ اس نے کہا سوال یہ ہے کہ اگر آسمان کو ہم کمان فرض کرلیں جس سے تیر چلائے جاتے ہیں اور یہ جو مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کرلیں اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کریں تو شکل ایسی بنی کہ آسمان کی کمان سے اللہ میاں مخلوق کے اوپر مصیبتوں کے تیر برسا رہے ہیں تو بچاؤ کی صورت کیا ہے؟ یہ سوال ہے۔

واقعی عقل عاجز ہے، جواب نہیں دے سکتی اس واسطے کہ جب آسمان کمان ہے، تو آسمان کے نیچے سے آپ کہاں چلے جائیں گے؟ زمین کے اوپر آسمان سرپوش کی طرح سے ڈھکا ہوا ہے۔ تو یہ ممکن ہے کہ آپ زمین چھوڑ دیں۔ مگر آسمان کی زد سے تو نہیں جاسکتے۔ عقل جب غور کرے گی تو کہے گی کہ مصیبت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

اور اگر مان بھی لیں کہ آپ کو کوئی راستہ مل گیا کہ آپ آسمان سے نکل کے بھاگ گئے۔ مگر اللہ میاں کی حکومت کے نیچے سے کہیں نہیں جاسکتے؟ کہیں بھی پہنچیں گے اللہ میاں کی حکومت موجود ہے۔ تو جب وہ تیر چلانا چاہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ جواب سے عقل عاجز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فلسفی اور حکیم اس کا جواب نہیں دے سکا۔ افلاطون یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی جواب نہیں دے سکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بچنے کی بڑی آسان صورت ہے۔ بڑے اطمینان سے پل بھر میں آدمی بچ جائے گا۔ افلاطون حیران ہوا کہ سارے حکماء تو عاجز ہوگئے اور ان کے نزدیک بڑا آسان جواب ہے۔ اس نے کہا کیا جواب ہے؟

آپ نے فرمایا جب تیر چلانے والا تیر چلائے، تو اس کے سامنے کی بجائے اس کے پہلو میں آکر کھڑے ہو جاؤ تیر لگے گا ہی نہیں۔ فرمایا جب اللہ میاں تیر چلائیں تو اللہ میاں کے پہلو میں آجاؤ اور اللہ میاں کا پہلو ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ جب دل میں یاد بھر جائے گی، اللہ میاں کو اعتماد پیدا ہو جائے گا ہزاروں مصیبتیں برسیں گی قلب میں کوئی تکلیف نہیں پیدا ہوگی اگر مصیبت آئی بھی تو آدمی کہے گا۔

ہرچہ از دوست می رسد نکو ہست

پروردگار نے بھیجی ہے۔ یقیناً اس میں مصلحت ہے۔ میں اس کے اوپر راضی ہوں۔ مصیبت تو مصیبت تب ہی بنتی ہے جب دل اس سے اثر لے اور جب دل خوش ہو کہ مجھے اللہ نے یاد کیا ہے۔ یہ مصیبت تھوڑا ہی ہے یہ تو نعمت ہوگئی۔ ہم بیماری کو، مفلسی کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ یہ مصیبتیں نہیں، مصیبت کے اسباب ہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ قلب متاثر ہو کے پریشانی کا اثر قبول کرے وہ مصیبت ہے اور اگر مصیبتیں آئیں اور آپ اثر نہ لیں تو آپ مصیبت زدہ نہیں ہیں۔

ایک بزرگ جیل میں چلا جائے اور کہے کہ سبحان اللہ میرے لئے بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کہ باہر تو لوگوں کو سر مارنا پڑتا تھا۔ یہاں صبح سے شام تک اللہ اللہ کروں گا اس سے بہتر میرے لئے نعمت کیا ہے؟ اس کے حق میں وہ جیل خانہ مصیبت کب رہا؟

ایک شخص مفلس ہوگیا، وہ کہے الحمد للہ جب دولت تھی تو کہیں حفاظت کی فکر کہیں ڈاکے کا خوف، کہیں گورنمنٹ کے ٹیکسوں کا خوف، یہ ساری مصیبتیں تھیں جو ٹل گئیں۔ اب میں تنہا اللہ کو یاد کروں گا۔ بڑا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ہلکا کر دیا۔ تو مفلسی اس کے حق میں مصیبت کہاں رہی وہ تو نعمت بن گئی۔ تو مصیبت درحقیقت نہ بیماری، نہ مفلسی اور نہ ناداری ہے بلکہ دل کا تاثر مصیبت ہے۔ جب اللہ سے دل متاثر ہو جائے اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو۔ پھر کبھی مصیبت زدہ نہیں بنے گا۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ مصیبتوں کے جب تیر برسنے لگیں تو اللہ کے پہلو میں آ کھڑے ہو اور اللہ کا پہلو اس کی یاد اور اس کا ذکر ہے۔ جب اس میں آ گئے پھر مصیبت اثر نہیں کرے گی۔ جس سے رب کا تعارف نہ ہو، وہ علم جہالت ہے...... تو بات سیدھی یہی ہے کہ سب سے ہٹ کر ایک کے ساتھ تعلق بڑھا لو، ہزاروں کی خوشامد نہ کرنی پڑے ایک کا آدمی ہو رہے۔ ''یک در گیر، محکم گیر'' اور یہ جبھی ہوتا ہے جب اس ذات کا علم صحیح ہو جائے کہ مجھے کس کا ہونا ہے؟ جب علم ہی نہیں ہوگا تو کبھی ادھر اور کبھی ادھر علم کے ذریعے یہ روشن ہو جائے گا کہ مجھے ادھر ہونا ہے۔ متعین ہو جائے گا کہ مجھے فلاں سے ملنا ہے اور وہ ذات بابرکات حق ہے جو کہ پروردگار، مالک اور خالق بھی ہے اس واسطے فرمایا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ (1) پڑھو کونسی پڑھائی پڑھو؟ جس میں پہلے اللہ کا نام آئے۔ اللہ کا تعارف ہو، وہ پڑھائی پڑھو۔ آپ نے پڑھنا شروع کیا۔ کیٹ، بلی، فین، پنکھا اس سے مخلوقات کا تعارف ہوا خدا کا تعارف نہ ہوا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ اللہ وہ ذات ہے جو خالق اور مالک ہے۔ یہاں سے علم کی ابتداء ہوئی تو پروردگار کی ذات کا اور اس کی عظمت کا تعارف ہوا، جب عظمت دل میں بیٹھ گئی تو بندگی کا جذبہ دل میں اٹھے گا اور

(1) پارہ: ۳۰، سورة العلق، الآية: ۱.

جب بندگی ہوگی تو طمانیت قلب، سکون اور بشاشت قلبی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے اللہ نے فرمایا کہ: تم اور علم حاصل کرو نہ، کرو تمہاری مرضی ہے۔ مگر پہلے وہ علم حاصل کرو جس سے پروردگار کا تعارف حاصل ہو جائے، وہ کونسا علم ہے؟ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو جو تمہارا پالنے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ماں باپ یوں کہیں کہ ہم پالنے والے ہیں؟ لہٰذا ہمارے نام سے پڑھا کرو۔ ہمارا تعارف حاصل کرو، اس لئے آگے فرمایا کونسا پروردگار؟ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ﴾ جس نے پیدا کیا وہ رب مراد ہے۔ ماں باپ رب نہیں وہ خالق نہیں ہیں۔ خلق کرنے والا اصل رب ہے۔ ماں باپ جو پالتے ہیں وہ بھی اللہ کی شفقت ہے جو اس نے دلوں میں ڈالدی ہے۔ اگر ماں کے دل میں بچے پر رحم و کرم اور شفقت نہ ہو وہ کبھی نہیں پال سکتی ایک ہی خاوند کی دو بیویاں ہوں، ماں تو پال دے گی، سوکن نہیں پالے گی، سوکن کے آگے بچہ آئے گا تو ایسی چٹکی بھرے گی کہ بچہ بلبلاتا ہوا رہ جائے گا۔

فرق یہی ہے کہ ماں کے دل میں شفقت اور سوکن کے دل میں عداوت ہے، پال پرورش سے نہیں ہوتی، رحم وشفقت سے ہوتی ہے حالانکہ اولاد اسی کی ہے جو دونوں کا خاوند کہلاتا ہے۔ تو ماں باپ کے دل میں رحمت وشفقت کس نے ڈالی؟ اس نے ڈالی، بعض دفعہ ماں باپ کے دل میں بھی عداوت ہو جاتی ہے اگر اولاد انتہائی نافرمانی کرے، ستاوے ماں باپ بدعا کرتے ہیں گھر سے نکال دیتے ہیں پھر اس کی خبر گیری نہیں کرتے۔

اس لئے فرمایا کہ پڑھو اس رب کے نام سے پڑھو جو خالق ہے۔ اگر ماں باپ کہنے لگیں کہ ہم ہی اولاد کے خالق ہیں۔ اگر ہم نہ ہوتے، اولاد کہاں سے آتی؟ آگے اس کا جواب دیا ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ ① جس نے خون کے لوتھڑے سے بنایا ہے۔ ماں باپ میں یہ قوت نہیں کہ وہ خون کے قطرے پر تصویر کشی کریں۔ وہ جو ماں کے پیٹ میں گندہ قطرہ جاتا ہے کیا باپ وہاں نقاشی کرنے کے لئے پہنچتا ہے؟ صورت وہ بناتا ہے؟ کون ذات ہے جس نے اندر پہنچ کر پالنا شروع کیا، اندر تصویر کشی کی اور ایسا پاکیزہ نقشہ بنایا کہ ایک گندے قطرے سے جوہر پاک بنا دیا۔ ایک گندی چیز ہے مگر اپنی حکمت سے کیا پاکباز انسان بنا دیا۔ اگر سونے، چاندی اور جواہرات سے انسان کو بناتے، تو اللہ کو بنانے والا کوئی نہ سمجھتا۔ سب یہ سمجھتے کہ جوہر کی خاصیت یہ ہے کہ اچھا انسان پیدا ہو، لیکن گندے قطرے سے پیدا کیا تاکہ اس کی صناعی واضح ہو کہ ہم وہ ہیں جو گندگی میں سے پاکی نکالتے ہیں، پاکی میں سے گندگی پیدا کرتے ہیں۔ تو ماں باپ خلق کے سبب ہیں خالق نہیں ہیں۔ خلق اور پیدائش حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں سبب تخلیق ہونا اور بات ہے خالق ہونا اور بات ہے۔

جب متعین ہو گیا کہ اصل میں پالنے والا اللہ ہے جو خالق ہے۔ تو اسی کا تعارف ہونا چاہئے۔ اسی کو علم کہا جائے گا جس سے آدمی اپنے خالق کو پہچانے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۲.

علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است

جو علم، راہ حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہالت ہے علم نہیں ہے، علم وہی ہے جو سیدھا اور حق کا راستہ بتائے۔ تو فرمایا کہ: اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو تا کہ اس کی پہچان پیدا ہو۔ باقی رب کا تعارف کس طرح سے ہو؟

تعارف کا طریق...... آگے اس کا طریقہ بتلایا کہ: ﴿اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ قلم لکڑی یا لوہے کا ہوتا ہے یا پلاسٹک کا ہوتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی میں شعور و عقل نہیں ہے۔ قلم سے بڑے بڑے علوم نکلتے ہیں۔ مگر قلم کو خود کچھ پتہ نہیں وہ جاہل مطلق ہے۔ تو حق تعالیٰ نے بتلایا کہ قلم خود کچھ نہیں قلم کے ذریعے سے ہم علم دے رہے ہیں۔ تو گویا ہم سے پوچھو، مگر قلم سے مت پوچھو۔ مگر علم کے پہنچانے کا سبب قلم کو بنا دیا۔ اسی طرح فرمایا ماں باپ کو ہم نے تخلیق کا سبب بنا دیا۔ وہ خالق نہیں ہیں، ان میں کیا قوت ہے کہ یہ کسی میں خلق کریں۔ تخلیق کے معنی وجود دینے کے ہیں۔ ان کا اپنا وجود تو ان کے اپنے ہاتھ میں ہے نہیں، تو بچے کو کیا وجود دیں گے۔ اگر ان کا وجود ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا تو ماں باپ مرنا کبھی گوارا نہ کرتے۔ لیکن سب کو جانا پڑتا ہے۔ جب ان کا اپنا وجود ہاتھ میں نہیں تو دوسروں کو کیا وجود دیں گے؟ اب آپ کہیں گے انکے ماں باپ نے انہیں وجود دیا۔ تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی۔ جب وہ جانے پہ آئے تو چلے گئے اپنے وجود کو نہیں سنبھال سکے۔ آدم علیہ السلام تک چلے جاؤ، کسی کا وجود اس کے ہاتھ میں نہیں آخر میں اللہ ہی کی ذات نکلے گی جس کے ہاتھ میں سب کے وجود ہیں۔

اسی لئے فرمایا کہ: جب قلم کو علوم کا راستہ بنا دیتے ہیں اور خود قلم کو بھی پتا نہیں۔ اس طرح ماں باپ کو پال پرورش کا واسطہ بنا دیتے ہیں، خود ماں باپ کے اندر کوئی جوہر نہیں شفقت، رحم و کرم، تدبیر ہم ڈالتے ہیں تا کہ بچے کی پرورش کریں۔ تو اس رب کے نام سے پڑھو جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ اور تعلیم دی تو وہ قلم کا بھی محتاج نہیں۔ زبان کے ذریعہ علم پہنچا تا ہے۔ بولنے سے، آنکھ سے دیکھ کر صورت کی نقل و حرکت سے اور دنیا کے تغیرات کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے، تو اس سے علم ملتا ہے۔ تو ہم نہ قلم کے نہ زبان کے محتاج، جس طرح چاہیں علم دیدیں۔ وہی ذات بابرکات تعارف کے قابل ہے جو اتنی باکمال ذات ہے تو اسی کے نام سے پڑھو۔

خلاصہ ساری بات کا یہ نکلا کہ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ علم حاصل کرنا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ جاہلیت کو ختم کیا تو اقـــراء کے ذریعے سے ختم کیا۔ پڑھنے سے ہی آدمی آگے بڑھتا ہے۔ اس سے اونچ نیچ اور مرضی خداوندی کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے بندگی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ تو ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ جو انسان نہیں جانتا تھا اللہ نے اس کے اندر علم ڈال دیا۔

افراط دولت علم سے محرومی کا ذریعہ ہے...... اور آگے یہ بھی فرما دیا، ﴿کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی o اَنْ

رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾ علم سے محروم کیا چیز رکھتی ہے؟ جب وسائل زندگی قبضہ میں آ جائیں اور آدمی سمجھے کہ میں مستغنی ہوں، مجھے خدا کی بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ خزانہ میرے پاس بھرا پڑا ہے۔ سونا، چاندی، غلہ، باغات سب کچھ میرے پاس، اب میں قابو یافتہ ہوں، اب مجھے خدا کی کیا ضرورت پڑی؟ جب خدا ہی کی ضرورت نہیں تو خدا کے علم کی کیا ضرورت ہوگی؟ تو علم سے محروم رکھنے والی زیادہ تر دولت کی افراط ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی اپنے دل کو اس میں اٹکا دے۔ اس کو فقط ایک خادم کا درجہ دے۔ خدا نہ بنائے اور یہ سمجھے کہ یہ میری نہیں ہے میرے خدا کی ہے، اسی کے حکم کے تحت مجھے اسے خرچ کرنا ہے جب اس پر آ جائے گا تو خدا کی مرضی کی ضرورت پڑے گی کہ وہ کیسے خرچ کرانا چاہتا ہے، اس کی منشاء کیا ہے، کس کو دوں؟ کس کو نہ دوں؟ پھر اس کو ٹوہ لگے گی کہ مرضیات خداوندی معلوم کروں۔ مرضیات معلوم کرے گا تو پھر تعلیم ہی آ جاتی ہے علم شریعت ہی آ جاتا ہے جس کے ذریعہ سے معلوم ہو کہ اللہ فلاں کام سے خوش اور فلاں سے ناراض ہوتا ہے۔

اہل حق قابل تعارف ہیں...... یہی تعلیم تھی جس کے دینے کے لئے بزرگوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ جس پر میں نے کہا تھا کہ اصل تعارف انکا ہونا چاہئے۔ ہم جیسوں کا کیا تعارف، ہم جیسے ہزاروں نالائق انکے خدام ہیں؟ اصل میں وہ قابل تعارف ہیں۔ انہوں نے اپنا تعارف اس طرح کرا دیا کہ علم کا ایک سرچشمہ قائم کر دیا۔ اس کے ذریعے سے ہزاروں کو عالم بنا دیا۔ اس سو برس کے اندر دارالعلوم سے بیس ہزار علماء تیار ہوئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے ہزاروں افراد اور علماء تیار کئے یہ تعارف کے قابل ہیں اور وہ سر چشمۂ علم ہے۔ ہم تو اپنا تعارف ان کا نام لے کر کراتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے لوگ ہمیں بھی پہچان لیتے ہیں۔ انہیں نہ پہچانیں تو ہمیں کوئی پہچاننے والا نہیں۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حدیث کے استاذ' طلباء کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے۔ طلباء کو اکثر پیار سے جاہلین کہا کرتے تھے۔ فرماتے: ''جاہلین! ہمیں تو روٹی بھی ملتی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ملتی ہے۔ ان کا نام لے لیتے ہیں لوگ قدر کر کے ہمیں روٹی کھلاتے ہیں ہماری تو روٹی بھی ان کے نام سے ہے۔ ان کا نام نہ ہو تو ہمارے پاس روٹی بھی نہ ہو''۔

تو تعارف کے قابل پیغمبر' خلفائے راشدین اور علمائے ربانی کی ذات ہے ہم جیسے کیا قابلیت رکھتے ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے۔ چونکہ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑ گیا تھا اس واسطے میں نے بھی اسی پر بولنا شروع کر دیا بہرحال کوئی موضوع ہاتھ لگنا چاہئے اس سے پہلے میں خود بھی سوچتا تھا کہ کیا بیان کروں کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر اللہ تعالیٰ ہمارے محترم بھائی کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے موضوع متعین کر دیا۔ تو چار کلمات میں بھی آپ کے سامنے عرض کر سکا۔ بہرحال یہ ان کا تعارف ہے اور یہ ان کی تعلیم ہے کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ

خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو زمانہ جاہلیت اور جاہلیت کو ختم کرو علم آئے گا۔ تو جیسے زمانہ جاہلیت کی ذلتیں مٹ کر عزتیں آئیں، اب بھی عزتیں آسکتی ہیں۔ زمانہ یکساں رہا ہے جو آثار اس وقت آئے تھے وہ آج بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے خوب کہا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا ؎ آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

ہم آج بھی اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز برتیں، تو آج بھی آگ بردوسلام بن سکتی ہے۔ وہی آگ جو جلانے کے لئے کھڑی ہوئی ہے وہ ٹھنڈی ہو کر باغ و بہار بن جائیگی، ہم اپنے اندر کوئی تغیر پیدا کریں۔ اس طرح تو کام نہیں چلتا کہ ہم تو اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوں اور چاہیں فلاں میں بھی تغیر آجائے، پبلک اور حکومت میں بھی تغیر آجائے مگر ہم اپنی جگہ قائم رہیں۔ ہم اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔ تو آپ ایسے قطب کہاں ہیں کہ دنیا ہل جائے مگر آپ نہ ہلیں۔ پہلے تو آپ کو ہلنا پڑے گا جب آپ حرکت میں آئیں گے، جب دنیا میں ہلچل آئے گی اس سے پہلے نہیں آئے گی۔ بس یہی چند باتیں عرض کرنی تھیں اسے وعظ و نصیحت سمجھ لیجئے، شکوہ یا علاج و تدبیر سمجھ لیجئے اس میں ساری چیزیں آگئیں۔ جو آپ کا جی چاہے سمجھ لیں۔

عورت کے ذریعے پورے گھر میں تعلیم آسکتی ہے......اور آپ ہی کے ساتھ اپنی بہنوں کو یہ خصوصیت سے خطاب ہے کہ سب سے پہلا مدرسہ بچے کے لئے ماں کی گود ہے۔ اگر ماں کی گود میں علم ہے تو سمجھو کہ بچہ عالم بنے گا۔ ماں کی گود میں اگر کوئی سمجھداری ہے سمجھو کہ بچہ سمجھدار پیدا ہوگا۔ تو سب سے زیادہ ہماری ماؤں، بہنوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی گود کو علم سے بھریں۔ خود مسائل سیکھیں بچہ ابتداءً جو کچھ سیکھے گا، انہی سے سیکھے گا۔ اگر ماں کی زبان پر علم کا چرچہ ہے۔ بچہ بھی وہی چرچہ لے کر کھڑا ہوگا اور ماں کی زبان پر جہالت ہے بچہ بھی جہالت لے کر چلے گا۔ اس لئے ہماری بہنوں کو اپنی وجہ سے اور اپنی نسلوں کی وجہ سے خود بھی بدلنے کی اور اپنی اصلاح کی ضرورت ہے کہ وہ علم کی طرف متوجہ ہوں اور اگر وہ متوجہ ہوگئیں تو ان مردوں کی کیا مجال ہے کہ یہ متوجہ نہ ہوں۔ اس واسطے کہ یہ تو ان کے زرخرید غلام ہیں۔ جتنی شادی اور غمی کی رسمیں ہوتی ہیں جن میں مسلمان تباہ ہوئے۔ جب پوچھا جائے کہ بھئی! تم عقلمند سمجھدار ہو پھر یہ کیا کر رہے ہو؟ تو کہتے ہیں کہ جی! عورتیں نہیں مانتیں گویا عورتیں لیڈر اور حکام ہیں وہاں سے آرڈر جاری ہوتا ہے اور ان کا فرض ہے کہ تعمیل کریں۔ یہ غلامی میں گرفتار ہیں۔ بہرحال یہ ایسے ہی غلام ہیں تو میں کہتا ہوں کہ اگر عورتیں انہیں خیر پہ لگانا چاہیں تو یہ ضرور لگ کے رہیں گے۔ آخر عورتوں کو جب کچھ بنوانا ہوتا ہے، زیور یا کپڑا وہ ضد کرتی ہیں اور اتنا اصرار کرتی ہیں کہ وہ چوری کرے ڈکیتی کرے، مگر انکی فرمائش پوری کرے۔ اگر عورتیں یوں کہہ دیں کہ جناب جب تک آپ صبح کو ایک سپارہ تلاوت نہیں کریں گے، نماز نہیں پڑھیں گے تو ہم نہ روٹی پکا کے دیں گی نہ کپڑا سی کے دیں گی سب کو چند دن کے بعد نانی یاد آجائیگی۔ جھک ماریں گے، تلاوت کریں گے۔ نماز پڑھیں گے۔ تو جب تم ضد کر کے دنیوی اغراض پوری کرالیتی ہو تو ضد

کر کے دینی اغراض کیوں نہیں پوری کرائی جاتیں؟ ہم نے بہت سے خاندان دیکھے ہیں کہ دیندار عورت آئی تو خاوند کو مجبور کر دیا اور اس کو دیندار بننا پڑا۔ بددین آئی تو اس نے بددین کر کے چھوڑا۔ تو عورت کا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ اثرات کو صحیح طور پر استعمال کریں تو اپنی اور خاوند دونوں بلکہ اولاد کی بھی دین و دنیا بن جائے۔ بس ذرا سی ضد کر لیا کرو کہ یہ کام نہیں ہوگا جب تک کہ یہ دینی کام نہ ہو۔ خاوند مجبور ہوگا اس لئے کہ جس کے ہاتھ میں ہانڈی، ڈوئی ہوتی ہے اس کے سامنے ہر کوئی مجبور ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''جس کے ہاتھ میں ہانڈی ڈوئی اس کا سب کچھ''۔

اب مرد تو بیٹھ کے نہیں کھانا پکا سکتا۔ وہ دکان پر کمائے گا یا گھر داری کرے گا؟ یہ عورت کا کام ہے اگر عورت یہ کام چھوڑ دے اور کہے کہ یوں کرنا پڑے گا۔ مرد اس کے کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ تو جب آرڈر ہی جاری کرنا ہے تو کچھ دین کے لئے بھی آرڈر جاری کر دیا کرو۔ فقط زیور، کپڑے کے لئے نہیں، کبھی کبھی دین کے لئے بھی ان زرخرید غلاموں کو آرڈر دیدیا یہ تو ماننے کے لئے مجبور ہیں، اس واسطے مجھے یہ چند باتیں اپنی بہنوں سے بھی عرض کرنی ہیں کہ وہ بھی ادھر توجہ کریں۔ وہ اگر مردوں کو آمادہ کر دیں گی تو یہ جلد آمادہ ہو جائیں گے اور ان کے اوپر زیادہ اثر پڑے گا۔ اس لئے کہ جب عورتیں اس پر آجائیں کہ تعلیم حاصل کرو۔ جن کا کام گھر میں رہنا ہے۔ تو مرد سوچے گا جب میرے گھر کے ذرے ذرے میں یہ چیز آ گئی تو میں کیسے جدا رہوں؟ بیوی، لڑکیاں اور بچے بھی کہنے لگے۔ اب میں اگر یہ کام نہیں کروں گا تو آخر جاؤں گا کہاں؟ کس سے ملنا ہوگا؟ مجبور ہو کے چلے گا۔ اس لئے اپنی بہنوں سے بہت ادب سے گذارش ہے کہ کبھی کبھی تھوڑی تھوڑی ضد، دیندار بنانے کے لئے بھی کر لیا کرو اور جو ناز نخرے دنیا کے لئے ہیں وہ دین کے بارے میں بھی جتا دیا کرو۔ گھروں میں دینداری آجائے گی۔

ورنہ حدیث میں فرمایا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کیا، فرمایا: ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآئُکُمْ'' اے لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں گے اور تمہاری عورتیں آزاد اور سرکش بن جائیں گی؟ صحابہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ وہ تو خیر محض کا زمانہ تھا۔

''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! یارسول اللہ! کیا ایسا بھی وقت آنا ہے؟ کہ ہماری عورتیں آزاد ہو جائیں اور ہمارے نوجوان لڑکے فاسق و فاجر بن جائیں دین پر نہ چلیں؟ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ فرمایا، یہ ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت باتیں ہوں گی۔ ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ'' اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم اچھی باتوں کی نصیحت چھور دو گے اور بری باتوں سے روکنا چھوڑ دو گے۔ تمہارے سامنے برائیاں ہوں گی اور کسی کو توفیق نہیں ہوگی کہ ٹوک دے کہ یہ حرکت بری ہے، اسے چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خود اس میں مبتلا ہے تو کسی دوسرے کو کیا کہے گا؟ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جائے گا۔ اب صحابہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔

''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! عرض کیا یارسول اللہ! ایسا بھی دن آنا ہے کہ اچھی بات کی نصیحت چھوٹ جائے، بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے، دنیا سے روک ٹوک اٹھ جائے؟ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔

''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ'' جب تم برائی کا حکم دوگے اور بھلائی سے روکو گے صحابہ کو اور حیرت ہوئی (عرض کیا): ''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! یارسول اللہ! ایسا بھی ہوگا؟ فرمایا: ''قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ'' یہ بھی ہوگا اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔ ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا.'' (1) جو کسی زمانے میں اچھی باتیں تھیں۔ آج لوگ ان کو برا سمجھ رہے ہیں۔ اور جو بری باتیں سمجھی جاتی تھیں آج لوگ ان کو اچھا سمجھ رہے ہیں۔ کام جب الٹتا ہے جب آدمی بدعملی کی مشق کرے۔ تو کرتے کرتے فہم خراب ہو جاتا ہے۔ علاج وہی ہے کہ آدمی پھر لوٹ کے آئے اور اسی نیکی سے ابتداء کرے۔ اتباع شریعت، اتباع سنت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے ابتداء کرے، وہیں آ کے بات بنے گی۔

صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اچھے انسان پیدا کرتی ہیں...... آج سائنس نے آنکھوں کو چکا چوند کر رکھا ہے بجلیوں سے شہر روشن، فضائیں ہوائی جہازوں سے بھری ہوئی ہیں، دریا بڑے بڑے بحری جہازوں سے آباد ہیں۔ گویا بر اور بحر کے اندر چاندنا ہو رہا ہے۔ مگر یاد رکھیے۔ سائنس اچھے اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے اچھے انسان نہیں پیدا کر سکتی۔ اچھے انسان انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پیدا کرے گی جس سے کریکٹر اور اخلاق ربانی درست ہوں۔ میں مخالف نہیں ہوں، ضرور جہاز بنائیے۔ مگر اپنے کو درست بھی کیجئے اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے، لسان العصر بڑا حکیم ہے، خوب اس نے بات کہی ہے کہ۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو ... جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

ہزاروں فٹ کی بلندی پر پہنچ جاؤ، چاند پر پہنچ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں، جائز ہے۔

پر ایک سخن بندہ عاجز کی رہے یاد ... اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

یہ دو چیزیں پیش فرمائیں۔ اللہ کی عظمت اور نفس کی حقارت کہ ہم ایک گندہ قطرہ ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی حقیقت کو فراموش مت کرو اور اللہ کی عظمت و بزرگی کو دل سے مت کھوؤ۔ جب یہ دو چیزیں یاد ہو جائیں گی تو سائنس' فلسفہ' سامان سب چیزیں اچھی بن جائیں گی۔ تمہارا دل اگر مسلم بن جائے تو ہوائی جہاز، بحری جہاز بھی مسلمان ہوگا، یہ سب چیزیں مسلمان ہوں گی اور اگر تمہارا دل کافر ہے تو یہ ساری چیزیں کفار ہیں اور مضرت رساں ہیں۔ تو درست کرنا اپنے آپ کو ہے۔ سامان تو پہلے ہی درست ہیں۔ ان کا کیا درست کرنا؟

ہم چاہتے ہیں کہ سائنس کے ذریعے ساری دنیا پر کنٹرول حاصل کرلیں۔ لیکن وہ انسان کیا کنٹرول حاصل

(1) المعجم الاوسط للطبرانی، باب الهاء، من اسمه همام، ج: ۲۰ ص: ۱۷۲.

کرے گا جس نے اپنے نفس کے اوپر کنٹرول حاصل نہیں کیا۔ اس کا نفس تو اس کے قبضے میں ہے ہی نہیں۔ نفس کی نکیل ہاتھ میں ہے نہیں۔ نفس نے کہا میں حرام کی غذا کھاؤں گا۔ اس نے کہا اچھی بات ہے، میں فلاں ناجائز کام کروں گا۔ اس نے کہا اچھی بات ہے۔ تو جو اپنے نفس پر قابو نہیں پاسکا، وہ دنیا پہ کیا قابو پائے گا؟ آج ہر آدمی اس فکر میں ہے کہ پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرے لیکن پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے اوپر تو کنٹرول حاصل کرو۔

تو کارے زمین رانکو ساختی — چہ باسماں نیز پر داختی

پہلے زمین کا انتظام صحیح کرلو پھر آسمان پر جانا۔ زمین پر تو کوے اڑ رہے ہیں اور آسمانوں پر جانے کی سوجھ رہی ہے۔ جو خاک کو نہ درست کرسکا، وہ جوہر پاک کی درستی کیا کرے گا؟ بہرحال یہ چند باتیں مجھے بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کرنی تھیں وہ یہ کہ اپنی درستگی اور اپنی اصلاح کی فکر کیجئے۔ وہ علم ربانی اور اخلاق ربانی سے ہوتی ہے۔ سامانوں سے نہیں ہوتی۔ سامان شوق سے استعمال کرو، مگر اپنے کو درست بنا کر، جبھی یہ کارآمد ہوں گے۔ بس' یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو نیکی کی راہ پر چلنے، حق کے راستے کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرماوے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

عمل صالح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَاكُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے، جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ اس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو عمل کے اوپر آمادہ کیا اور ابھارا ہے کہ عملی زندگی اختیار کرو۔ محض قولی اور باتیں کرنے کی زندگی، یہ آخرت کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک عملی جدوجہد اور سعی عمل انسان میں نہ ہو۔ اسی مقصد پر آمادہ کرنے کے لئے یہ آیت حق تعالیٰ شانہ نے اتاری۔ میں اسی کے متعلق چند جملے مختصر طریق پر گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

اس سے پہلے کہ آیت کا مضمون شروع کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں حدیث شریف کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس مثال کے ذریعے اس آیت کا مضمون بہت زیادہ واضح اور کھل جائے گا۔ کیونکہ مثال میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ باریک سے باریک مضمون بھی جب مثال کے ذریعے سمجھایا جائے تو وہ بالکل کھل جاتا اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ علم کی خاص قوت حق تعالیٰ شانہٗ نے انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہے۔ وہ بڑے بڑے دقیق مسئلوں کو موٹی موٹی مثالوں سے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ایک جاہل سے جاہل اور بے پڑھے سے بھی بے پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکے۔ یہ خاص قوت سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت سے اولیائے کاملین اور علمائے ربانی میں بھی یہ قوت ہوتی ہے۔

مثال ایک کھلی دلیل ہوتی ہے...... مجھے اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا، جن کا نام نامی آپ نے ابھی سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اپنے اعوان وانصار کے ساتھ اس

ادارے کو قائم کیا اور چلایا۔ انہی کا ایک واقعہ مثال کے سلسلے میں مجھے یاد آیا۔ ان کے مریدین میں ایک شخص اللہ دین تھا، میں نے بھی دیکھا ہے، بوڑھا آدمی بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا اس کی گوشت کی دکان تھی۔ بے پڑھا لکھا بھی تھا اور تجارت بھی اس کی ایسی تھی جس میں پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ گائے، بھینس ذبح کی، اس کا گوشت بیچ دیا۔ وہ حضرت سے بیعت تھا۔ مگر میں نے اس کو دیکھا کہ اس میں دین کی سمجھ اتنی اعلیٰ تھی کہ آج علماء میں بھی وہ نہیں ملتی۔ جو اس جاہل میں صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اس نے خود ہی یہ واقعہ مجھے سنایا تھا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا کوئی سوڈیڑھ سو آدمی حضرت کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے حضرت سے ایک سوال کیا کہ:

حضرت! یہ جو سننے میں آیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مرنے کے بعد بزرگوں کے قرب جوار میں دفن ہونے کی کوشش کی جائے، اولیاء کے مزارات کے پاس اپنی قبر بنوائیں اس کی لوگ کوشش کریں تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ مرنے والا اگر نیک ہے اور اعمال صالحہ اس کے ساتھ ہیں، اسے کہیں بھی دفن کر دو، اس کی نیکی اس کے ساتھ ہے، قبر اس کی روشن ہو جائے گی اور اگر وہ بدعمل ہے، اسے نبی کے قریب بھی دفن کر دیں، تب بھی اس کی بدی سامنے آئے گی۔ تو انبیاء و اولیاء کے قرب و جوار میں دفن کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟

یہ اس نے سوال کیا۔ اب سوال کرنے والا بالکل ان پڑھ جاہل آدمی اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے۔ اس کو اگر حقائق سمجھائے جائیں اور علم کی باریک باتیں بتائی جائیں، وہ کچھ بھی نہ سمجھتا۔ موٹی سمجھ کا آدمی تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سمجھایا اور ایک مثال کے ذریعے مسئلے کو واضح کر دیا کہ وہ جاہل بھی سمجھ گیا اور دوسرے بھی سمجھ گئے۔ جب وہ سوال کر چکا، حضرت نے فرمایا، اچھا ہم اس کا جواب دیں گے۔ ابھی جواب نہیں دیا۔ موقع پر جواب دیں گے وہ بھی خاموش ہو گیا۔ گرمی شدید پڑ رہی تھی، وہ پنکھا لے کر حضرت کو جھلنے کھڑا ہو گیا اسے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گذر چکے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا میاں اللہ دین! تم یہ پنکھا کسے جھل رہے ہو؟ کہا حضرتؒ! آپ کو جھل رہا ہوں۔ فرمایا یہ جو لوگ مجلس میں ساتھ بیٹھے ہیں انہیں تو نہیں جھل رہا؟ کہا نہیں، انہیں تو نہیں جھل رہا۔ اس واسطے کہ نہ میں ان کا شاگرد نہ ان کا مرید۔ یہ تو سارے میرے برابر ہیں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ ان کو پنکھا جھلوں اور ان کا خادم بنوں۔ میں تو آپ کو پنکھا جھلنے کھڑا ہو گیا۔ فرمایا ہوا ان سب لوگوں کو لگ رہی ہے؟ کہا کہ جی ہاں، ہوا تو لگ رہی ہے۔ فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔

تم نے یہ سوال کیا کہ انبیاء و اولیاء کے قریب دفن کرنے سے کیا فائدہ؟ فرمایا: اولیاء اللہ کی قبروں پر رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں، رحمت کی ہوائیں اترتی ہیں مقصود اصلی وہ ہوتے ہیں لیکن آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے۔ رحمت کے اثرات سب کو پہنچتے ہیں۔ اس واسطے دفن کرنے کے بارے میں فرمایا گیا کہ کوشش کرو اہل اللہ اور

صالحین کے پاس دفن ہوں، ان پر رحمت کی ہوائیں چلیں گی۔ آس پاس والوں کو بھی لگیں گی، چاہے وہ مقصودِ اصلی نہ ہوں۔ مقصود فقط وہ نبی یا ولی کامل ہوں۔ فرمایا یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ تو قبر اور برزخ کے عالم کا باریک مسئلہ پوچھنے والا ایک ان پڑھ تھا، مثال کے ذریعے جواب دیکر ایک باریک مسئلہ اسکے دل میں اتار دیا۔ سب لوگ سمجھ گئے۔ تو مثال ایک ایسی دلیل ہوتی ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل جو سمجھ میں نہ آسکیں، وہ مثال کے ذریعے سمجھائے جاسکتے ہیں۔

اسی اللہ دین نے حضرت سے ایک اور بھی سوال کیا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مظفر نگر تشریف لے گئے یہ دیوبند سے کوئی سولہ میل دور ایک ضلع ہے۔ حضرت کے ایک مرید ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب تھے، جو جیل کے ڈاکٹر تھے، وہیں ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے جیل کی طرف روانہ ہوئے ، یہی اللہ دین ساتھ تھا، پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ اس نے پھر حضرت سے اس سے بھی زیادہ باریک سوال کیا۔ واقعی باریک سوال کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ حدیث میں ہے کہ "اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ "① سوال کرنے کے لئے بھی آدھے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جاہل آدمی سوال بھی نہیں کرتا، کچھ نہ کچھ معلومات ہوں گی، جبھی سوال کرے گا۔ محض جاہل ہوتو آدمی کو سوال بھی سمجھ نہیں آتا۔ یہ بظاہر جاہل تھا، مگر صحبت یافتہ تھا، اس لئے بڑے باریک باریک سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے اور ان کے جواب میں جب علم کھلتا، لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ تو حضرتؒ مظفر نگر میں جیل کی طرف جارہے تھے یہ بھی ساتھ تھا اس نے پھر ایک سوال کیا۔ اس نے کہا، حضرت جی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پیشین گوئیاں انبیاء بھی کرتے ہی، اولیاء بھی کرتے ہیں انبیاء بھی خبریں دیتے ہیں کہ ایسا واقعہ ہونے والا ہے بلکہ مدت بتلا دیتے ہیں کہ سو یا دو سو برس کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ جیسے حدیث میں آپ نے خبر دی کہ مجھے میری امت کی عمر پانچ سو برس دکھلائی گئی۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ ہزار برس دکھلائی گئی۔ اس کا علماء نے جواب دیا کہ پانچ سو اور ہزار کو کیسے جمع کیا جائے، اس وقت مجھے وہ بیان کرنا مقصود نہیں، مطلب یہ تھا کہ آپ نے پیشین گوئی کی اور مدت متعین کر دی، ٹھیک پانچ سو برس کے بعد وہ واقعہ پیش آ گیا، جس کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا تھا۔ اور دوسرا واقعہ بھی ٹھیک ہزار برس کے بعد پیش آ گیا۔

تو اللہ دین نے کہا کہ انبیاء بھی پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور وقت بھی متعین کر دیتے ہیں اور ٹھیک مقرر وقت پر وہ بات پیش آتی ہے۔ مگر اولیاء اللہ پیشین گوئی کرتے ہیں اور وقت متعین کرتے ہیں۔ بعض دفعہ وقت سے پہلے ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وقت کے بعد ٹھیک وقت پہ نہیں ہوتی کیا یہ لوگ غلط دیکھتے ہیں؟ کیا اولیاء اللہ معاذ اللہ غلط

---

① شعب الایمان للبیھقی، ولفظه: وحسن السوال نصف العلم، الثانی والاربعون من شعب الایمان، ج:۱۴ ص:۸۶ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیه مخیس بن تمیم عن حفص بن عمر، قال الذهبی: مجهولون، دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:۱ ص:۱۶۰۔

گوئی کرتے ہیں اور جھوٹ بیان کر دیتے ہیں؟ جب ان کے بیان کئے ہوئے وقت پہ کام نہیں ہوتا، کبھی پہلے ہو گیا، کبھی بعد میں، معلوم ہوا وہ غلط اطلاع دیتے ہیں اور جو غلط اطلاع دے اور معاذ اللہ جھوٹ کہہ دے، وہ ولی کیسا ہوا؟ ہاں انبیاء جو بات کہتے ہیں۔ ٹھیک وقت متعین پر وہ بات پیش آ جاتی ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نبی جو وقت مقرر کرے، وہ بات تو ٹھیک وقت پہ پیش آئے اور ولی جو مقرر کرے۔ اس میں بات آگے پیچھے ہو جاتی ہے، تو ولی کی سمجھ میں نہیں آتا وہ غلط گوئی کرتے ہیں یا انہیں خبر نہیں ہوتی؟ تو کیا ضرورت ہے پیشین گوئی کرنے کی، جب انہیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔

اب یہ سوال بہت باریک، نبی اور ولی کے کشف کا سوال ایک جاہل آدمی پوچھ رہا ہے، جسے نہ کشف کی خبر نہ کشف کے اوقات کی خبر نہ اس کے تعینات کی خبر اور وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کر رہا ہے۔

اب اگر حضرت کشف کی حقیقت بیان کرتے اور کشف کی میعاد اور مدت سے بحث کرتے وہ کوندن کیا سمجھتا؟ وہ ایسے دیکھتا رہتا جیسے دیوار کھڑی رہتی ہے۔ مگر حضرت نے اس کے مناسب حال جواب دیا اتنا باریک مسئلہ ایک مثال سے سمجھا دیا۔

فرمایا: میاں اللہ دین! یہ سامنے جو عمارت نظر آ رہی ہے۔ یہ کیا عمارت ہے؟ اس نے کہا کہ جیل خانہ ہے جیل خانہ وہاں سے کوئی دو فرلانگ پر تھا۔ فرمایا یقینی بات ہے کہ جیل خانہ ہے؟ کہا کہ جی ہاں بالکل یقینی ہے۔ میں حلف اٹھالوں کہ یہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یہاں سے کتنی دور ہو گا؟ اس نے کہا اندازاً چار سو قدم ہو گا۔ فرمایا چار سو کے، تین سو پچانوے اور چار سو پانچ بھی ہو سکتے ہیں؟ کہا کہ جی ہاں ہو سکتے ہیں۔ یہ تو میرا ایک تخمینہ ہے۔ پانچ کم ہو جائیں یا پانچ زیادہ ہو جائیں۔ یہ یقینی ہے کہ یہ جیل خانہ ہے۔ حضرت خاموش ہو گئے اور برابر چل رہے ہیں۔

جب جیل خانہ کے دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اس کی دیوار بالکل ایک گز رہ گئی۔ فرمایا: اللہ دین یہ کیا عمارت ہے؟ کہا کہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یقینی ہے؟ کہا کہ جی اب تو اور بھی یقینی ہے۔ فرمایا کتنا دور ہو گا؟ اس نے کہا، جی ایک گز فرمایا، گز کی ڈیڑھ بھی ہو سکے یا پونے دو؟ اس نے کہا نہیں ٹھیک گز ہے۔ کہو تو میں ناپ کے بتلا دوں؟

فرمایا: یہی نبی اور ولی کے کشف میں فرق ہے۔ یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ جو چیز نبی دیکھتا ہے، وہی ولی بھی دیکھتا ہے۔ مگر ولی دور سے دیکھتا ہے، اپنے اندازہ اور تخمینے سے مدت متعین کرتا ہے اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور نبی کو شے کے سر پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، وہ جو مدت مقرر کرتا ہے، ٹھیک نپی تلی ہوتی ہے۔ اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ جیسے تم نے دو فرلانگ کے فاصلہ پر کہا کہ چار سو قدم ہیں، مگر چار سو کے تین سو پچانوے بھی ہو سکتے ہیں اور چار سو پانچ بھی اور جب جیل خانے کے سر پر پہنچ گئے، تم نے کہا صاحب! گز کا پون گز اور سوا گز نہیں ہو سکتا، گز بھر ہی رہے گا۔ فرمایا نبی اور ولی کے کشف میں یہی فرق ہے۔ اب کتنا دقیق مسئلہ تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کیسی سہولت سے اسے حل کر دیا کہ اس جاہل کو بھی سمجھ آ گیا اور ہم جیسے جاہلوں کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔

اگر یہ سوال نہ کرتا، ہماری بھی سمجھ میں بات نہ آتی۔

تو مثالوں کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام بڑے بڑے باریک مسائل موٹی عقل والوں کو سمجھا دیتے ہیں۔

اسی پر مجھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا، حضرتؒ ایک دفعہ مظفر نگر تشریف لے گئے۔ تو مظفر نگر کے اسٹیشن پر حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ اس زمانے کا سب سے بڑا مہندس، ریاضی دان، اقلیدس کا جاننے والا ایک ہندو تھا، اسے ناز تھا کہ میں فن ریاضی میں بڑا ماہر ہوں، اسے جو معلوم ہوا کہ حضرت نانوتوی اسٹیشن پر موجود ہیں۔ حضرت بھی فن ریاضی میں بڑے مشہور تھے حتیٰ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اقلیدس پر اعتراضات کئے ہیں، جس کے بارے میں یہ عام مسلّم تھا کہ اقلیدس پر اعتراض ممکن نہیں ہے، یہ تو بدیہی چیزیں ہیں۔ حضرت نے اس پر اعتراض کیا اور اس زمانے کے ریاضی دان حیران ہوئے کہ اس کا جواب کس طرح سے دیں۔ تو اس ہندو کو معلوم ہوا کہ حضرت بھی اسٹیشن پر ہیں، وہ جلدی سے آیا اور بڑی نیاز مندی سے ملا، کچھ بات چیت کی، اس کے بعد اس نے کہا حضرت جی! مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ لوح محفوظ میں ساری چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہر ہر انسان کی ہر ہر حرکت اور ہر ذرہ ذرہ اس میں قیامت تک کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ تو ایک انسان کی اتنی بڑی زندگی ہے کہ اس میں ہزاروں واقعات ہیں تو ایک ایک واقعہ اور ایک ایک ہوں، ایک ایک چوں اس میں لکھی ہوئی ہے تو لوح محفوظ کہاں تک پھیلی ہوئی ہوگی، اس کی تو کوئی حد نہیں ہوگی اس لئے کہ سارے انسانوں، جانوروں، درختوں اور پتھروں کے واقعات، ایک ایک پتھر کا ہلنا جب یہ سب کچھ ہوگا' تو کتنی بڑی لوح محفوظ ہوگی؟ وہ کہاں رکھی ہوئی ہوگی؟ آسمان کتنا بھی بڑا سہی، مگر لوح محفوظ میں تو آسمان بھی لکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہیں آ ہی نہیں سکتی؟ یہ اس نے سوال کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ: صاحب! آپ کی عمر کتنی ہے اس نے کہا ساٹھ برس۔ فرمایا ساٹھ برس میں آپ کی زندگی میں ہزاروں واقعات پیش آئے ہوں گے؟ کہا کہ بالکل۔ فرمایا آپ کو کچھ یاد بھی ہیں؟ کہا کہ جی بہت یاد ہیں، بس وہ جو بچپن کی چار، پانچ برس کی زندگی تھی، اس کو چھوڑ کے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا، تو حافظہ میرا قوی ہے، مجھے سارے واقعات یاد ہیں۔ فرمایا، اگر تم ان کو لکھنا شروع کرو تو کتنے کاغذوں پر لکھے جائیں گے؟ اس نے کہا کہ جی ایک کاغذ؟ اگر میں لکھنا شروع کروں، دس بیس پچاس میل تک وہ سلسلہ چلا جائے گا، وہ تو ساری زندگی ہے فرمایا اتنے لمبے چوڑے واقعات تمہیں یاد ہیں؟ تو وہ کہاں محفوظ ہیں؟ وہ جو اتنے واقعات ہیں وہ کہاں لکھے ہوئے ہیں؟ کہ تم فوراً سنا دیتے ہو۔ اس نے کہا جی میرے دماغ میں محفوظ ہیں؟ فرمایا زندگی اتنی سی اور اس کے واقعات لکھنا شروع کرو تو میلوں تک سلسلہ چلا جائے اور دماغ کی اتنی چھوٹی سی ڈبیہ میں وہ سارے واقعات (قوت حافظہ میں) محفوظ ہیں۔ فرمایا: یہ تمہاری قوت حافظہ ہے، لوح محفوظ اللہ کی قوت حافظہ ہے۔ جیسے تمہاری زندگی کے واقعات اس

میں محفوظ ہیں، کائنات کی زندگی کے واقعات اس میں محفوظ ہیں وہ بہت بڑی سہی لیکن جیسے تم کہہ رہے ہو کہ کہیں حدو نہایت نہیں۔ یہ بات نہیں جیسے تمہارے دماغ کی بھی ایک حد ہے کہ اتنی سی ڈبیہ ہے، جو پورے سر میں نہیں، سر کے پیچھے گدی میں ہے، اس لئے کہ اگلا حصہ حس مشترک کا ہے اس میں دیکھنے، سننے، اور سونگھنے کی طاقت جمع ہے ادھر اُدھر کچھ نالیاں ہیں، جن میں علم وغیرہ گھومتا رہتا ہے یعنی فکر کی طاقت، پچھلے جو واقعات ہیں وہ گدی کے قریب ایک چھوٹے سے حصہ میں ہیں۔ تو جس اللہ کو یہ قدرت ہے کہ انچ بھر کی ڈبیہ میں ہزاروں لاکھوں واقعات لکھ دے، جنہیں کاغذ پر لکھو تو پچاسوں میل تک کاغذ چلا جائے۔ اسے یہ قدرت بھی ہے کہ ساری دنیا کے ذرے ذرے کے واقعات لوحِ محفوظ میں لکھ دے۔ اور وہ لوحِ محفوظ اتنی بڑی نہ ہو، جتنی تم سمجھ رہے ہو۔

تو کتنا باریک مسئلہ تھا اور حضرت نے کس سہولت سے مثال دے کر سمجھا دیا۔ تو مثال بڑی عجیب وغریب دلیل ہوتی ہے کہ دقیق مسائل جو عقل وفہم میں نہ آسکیں مثال کے ذریعے واضح ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے دنیا و آخرت کے لئے بڑی بڑی مثالیں دی ہیں اور ان مثالوں سے سمجھا دیا ہے۔ احادیث میں بھی باریک مسائل کی ہزاروں مثالیں دی گئی ہیں۔ تو مثال یہ خاص قوت ہوتی ہے علم کی، جو انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور ان کے طفیل میں اولیاء اور علماء ربانی کو دی جاتی ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بھائیوں کی مثال...... مجھے ایک مثال حدیث کی یاد آئی، جو اس آیت سے متعلق ہے، جو میں نے تلاوت کی تھی۔ میں آیت کا مضمون اس مثال ہی سے شروع کرتا ہوں، جو حدیث میں فرمائی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! ایک مثال سنو۔ ! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متوجہ ہوئے۔

فرمایا: ایک شخص کے تین بھائی تھے۔ ایک بڑا، ایک منجھلا، ایک چھوٹا۔ تینوں حقیقی بھائی تھے اور ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ اس شخص کے مرنے کا وقت آیا، تو مرنے کی حالت میں انسان بے کس و بے بس ہوتا ہے، نہ خود کچھ کرسکتا ہے نہ کوئی دوسرا بنا سکتا ہے۔ محض اللہ کے رحم وکرم پر ایک بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ کوئی سہارا معاون اور مددگار اس کو نظر نہیں آتا۔

﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ○ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ﴾ ①. جب پنڈلی پر پنڈلی مارتا ہوا ہوتا ہے تشنج ہوتا ہے اور جان کھنچتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب پروردگار کی طرف روانگی ہے۔ اب کون ہے بچانے والا اور مدد کرنے والا؟ وہ انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس شخص کے اوپر بے کسی کا عالم طاری ہوا اور مرنے کا وقت آیا۔ تو سب سے پہلے اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا اے بھائی! میں نے ہمیشہ تیرے ساتھ احسان وسلوک کیا۔ اپنے کو نعمتوں میں پیچھے اور تجھے آگے رکھا۔ کوئی بھی آڑا وقت آن پڑا، میں نے تیری حفاظت، تیرے بچانے اور تجھے آرام پہنچانے میں جان لگا دی اب یہ میرے اوپر آخری اور انتہائی

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۲۹، ۳۰.

بے کسی کا وقت ہے۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی وہ جس کے ساتھ عمر بھر میں نے سلوک اور احسان کیا، میں چاہتا ہوں تو اس وقت میری مدد، کہ میرا کوئی مددگار نہیں ہے میں اس وقت کسی کو بھی نہیں پکار سکتا۔ وقت پڑنے پر بھائی ہی یاد آتا ہے تجھ سے میری توقع ہے کہ تو میری کچھ مدد کریگا۔ بڑے بھائی نے جواب دیا کہ تیرا بالکل غلط خیال ہے میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آسکتا ہوں تو نے اگر میرے ساتھ احسان کیا تو تو نے جھک مارا، برا کیا، میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا۔ صاف ٹکا سا جواب دے دیا۔ زیادہ سے زیادہ اگر میں تیری مدد کرسکتا ہوں تو اتنی کہ جب تک تیرے دم میں دم ہے میں تیرے پاس بیٹھا رہوں گا لیکن یہ کہ میں تیرا کوئی کام بنادوں، تیری مصیبت کو ٹلادوں، یا اپنے اوپر لے لوں، اس کی کوئی توقع مت رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں اسے بڑا صدمہ ہوا کہ جس بھائی کے ساتھ میں نے عمر بھر سلوک کیا۔ جب مجھ پر وقت پڑا، تو ٹکا سا جواب دے دیا۔

تو مایوس ہو کر منجھلے بھائی کو بلایا۔ اس کے سامنے بھی یہی تقریر کی اور کہا کہ یہ میرا آخری وقت ہے، کڑا وقت ہے، کوئی مددگار نہیں ہے۔ میری توقع ہے کہ تو میری مدد کریگا اس لئے کہ تیرے ساتھ بھی میں نے ساری عمر سلوک و احسان کیا، خود تکلیف اٹھائی مگر تجھ پر آنچ نہیں آنے دی۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے؟

اس نے کہا کہ بالکل تیرا خیال فاسد ہے میں بالکل تیری مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آؤں گا۔ تو نے میری مدد کی یا احسان کیا، کیا ہوگا، اچھا کیا یا برا کیا۔ بہر حال مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں۔ بہت اگر کام آیا تو اتنا کام میں کردوں گا کہ جب تیرا دم نکل جائے گا، تو تجھے لے جا کر گھڑے میں دفن کردوں گا، اس سے زیادہ کوئی توقع مت رکھنا۔ اس نے کہا افسوس اِنَّا لِلّٰہ جن بھائیوں سے توقع تھی انہوں نے وقت پر جواب دے دیا جن کے ساتھ سلوک کیا، انہوں نے وقت پر ٹکا سا جواب دیدیا۔ تب اس نے سب سے چھوٹے بھائی کو بلایا اور کہا بھائی! مجھ پر آڑا وقت ہے، میں پریشانی میں مبتلا ہوں۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے اور میرا منہ نہیں ہے کہ میں تجھ سے مدد مانگوں۔ اس لئے کہ میں نے عمر بھر تجھے تکلیف پہنچائی، ہمیشہ تجھے ایذائیں پہنچائیں۔ عمر بھر تیرے ساتھ کوئی بھلا سلوک نہیں کیا مگر بہر حال تو پھر بھائی ہے۔ شاید تو میرے کام آجائے۔

چھوٹے بھائی نے جواب دیا، تو ذرا پریشان مت ہو۔ میں تیرے کام آؤں گا کوئی مصیبت تجھ پر پڑے گی پہلے میں اپنے پر جھیلوں گا، بعد میں تجھ تک آنے دوں گا۔ اگرچہ تو نے عمر بھر مجھے ستایا اور پریشان کیا بلکہ میری تذلیل وتوہین کی اور مجھے ذلیل رکھا۔ مگر میں شریف الطبع ہوں۔ میں تیرے کام آؤں گا، تو بالکل مت گھبرا کوئی مصیبت آئے گی، پہلے میں ہوں، بعد میں تو ہے۔ اس نے کہا اللہ تجھے جزائے خیر دے، مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر واقعی تیرا حوصلہ بہت بلند ہے۔ میں نے ساری عمر تجھے ستایا اور وقت پر تو کام آیا تو نے مجھے تسلی دی۔ ①

یہ تین بھائیوں کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! سمجھے بھی یہ تین بھائی کون

① فضائل اعمال مولفہ از برکۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

ہیں؟ عرض کیا: اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ.

فرمایا: بڑا بھائی کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا، بڑا کمینہ اور بدخصلت تھا کہ وقت کے اوپر کام نہ آیا۔ بھائی تو وہ ہے جو وقت کے اوپر کام آئے۔

فرمایا: منجھلا کیسا تھا؟ عرض کیا وہ بھی بہت خراب وخستہ اور بڑا بدنیت اور بے مروت۔ جس نے عین وقت کے اوپر جواب دے دیا۔

اور فرمایا: چھوٹا بھائی کیسا تھا؟ عرض کیا بڑا شریف، بڑا عالی حوصلہ اور بڑا عالی ظرف۔ باوجودیکہ اس کے ساتھ برائی کی گئی، لیکن کام آیا تو وہی آیا۔

بڑے بھائی کا سلوک..... فرمایا: سمجھے کہ یہ تین بھائی کون ہیں؟ عرض کیا، اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ تین بھائی کون ہیں۔

فرمایا: وہ بڑا بھائی جس کے ساتھ آدمی عمر بھر سلوک واحسان کرتا ہے، وہ اس کا مال ودولت ہے۔ عمر بھر اس کے حاصل کرنے میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ایمان رہے نہ رہے، مگر پیسہ ہاتھ میں آنا چاہئے۔ اس کی عزت افزائی میں جان پہ مصیبت اٹھاتا ہے۔ اپنے کو ذلیل بنالیتا ہے۔ مگر مال پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ دنیا میں اتنی خدمت کسی چیز کی نہیں کی جاتی، جتنی مال کی کی جاتی ہے، جتنی رغبت اس کی طرف ہے، کسی چیز کی طرف نہیں کی جاتی۔ فرمایا بڑے بھائی سے آدمی جتنا اچھا سلوک کرسکتا ہے، اس سے زیادہ مال سے کرتا ہے۔ لیکن جب مرنے کا وقت آتا ہے، سب سے پہلے بیگانہ یہی مال ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی مال ودولت کی طرف رجوع کرے، تو وہ کہتا ہے، مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کرسکتا ہوں، جب تک تیرا سانس چل رہا ہے، میں تیرے پاس بیٹھا رہوں اور جب سانس نکل گیا، میرا تیرا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں، تو اور عالم میں جائے گا، میں اور عالم کی چیز ہوں، تو کسی اور کی چیز بنے گا، میں کسی اور کا بنوں گا۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: جب انسان کا جنازہ نکلتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام پکارتے ہیں، ’’مَاقَدَّمَ فُلَانٌ مَاقَدَّمَ فُلَانٌ‘‘ فلاں نے کیا چیز آگے بھیجی جو آخرت میں کام آئے، اور توشہ وزادِ راہ بنے۔

اور وارث کیا پکارتے ہیں؟ ’’مَآ اَخَّرَ فُلَانٌ، مَآ اَخَّرَ فُلَانٌ‘‘ فلاں نے پیچھے کیا چیز چھوڑی جو ہم اس پر قبضہ کریں اور اس کو بانٹیں۔ مرنے والا ابھی قبر میں پہنچنے نہیں پاتا اور وارثوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں کہ یہ چیز میں قبضاؤں گا۔ یہ چیز میرے قبضے میں آئے گی۔ بہت سے لوگ فرضی وارث بن کے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ اس کے مال کے وارث ہم ہیں، حتیٰ کہ بیویوں تک یہ نگاہ پہنچتی ہے کہ اس بیوہ سے میں نکاح کروں گا۔ کوئی کہتا ہے میں نکاح کروں گا۔ مالدار عورت ہے۔ تو مرنے والا ابھی قبر میں بھی نہیں پہنچتا اور وارثوں کی رال ٹپکنی شروع ہوجاتی ہے۔ تو مال ودولت سب سے پہلے بیگانہ بنتا ہے اور دوسروں کی گود میں چلا جاتا ہے۔ اصل

مالک پوچھتا ہوا رہ جاتا ہے کہ کوئی ہے میرے کام آنے والا؟ وہ کہتا ہے مجھ سے بالکل توقع مت رکھنا۔

بہرحال دولت کے مالک ورثاء اور پس ماندگان بن جاتے ہیں اور وہ اس بیچارے سے بیگانہ بن جاتی ہے، جس نے ساری عمر اس کو کمایا تھا، محنت کی تھی۔ حتیٰ کہ ایمان اور جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کتنی ہو، مگر دھوپ اور چھاؤں کی طرح سے ہے۔ آج ایک کے ہاتھ میں ہے، کل دوسرے کے ہاتھ میں ہے، ہزاروں امیر اس دنیا میں غریب بنتے دیکھے گئے ہیں اور ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے گئے۔ دولت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی اس کو آدمی خادم بنا کے رکھے، مخدوم نہ بنائے، قبلہ وکعبہ نہ بنائے کہ اس کی پرستش و پوجا شروع کردے۔ اس کی محبت کو دل سے وابستہ نہ کرے، ایک خادم کی حیثیت سمجھے، جیسے اللہ نے اور خدمت گذاری کے سامان پیدا کئے ہیں' یہ بھی استعمالی سامان ہے' اسے استعمال کرتا رہے اور خدا کا شکر ادا کرتا رہے، لیکن یہ کہ اپنی امیدوں کا مرکز بنالے، جب یہ چھوڑنے پہ آتی ہے، ساری امیدیں دھری رہ جاتی ہیں۔ اس واسطے دولت اور مال کو حق تعالیٰ نے یہ حیثیت دی ہے کہ اسے دین کا ایک وسیلہ اور خادم بنایا ہے، خود مقصود نہیں رکھا دنیا کا سامان انسان کا مقصود نہیں۔ مقصود دوسری چیز ہے، یہ اس کے لئے وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی سمجھا دولتیں کمائیں، تجارتیں کیں، زراعتیں کیں اللہ نے دولت دی مگر اس کو مقصود اصلی نہ سمجھا، مقصود کا وسیلہ سمجھا۔ مقصود اصلی حق تعالیٰ شانہ' اور ان کی محبت کو سمجھا۔ اس کو ایک ذریعہ اور راستہ بنایا کہ اس کے ذریعے اللہ تک پہنچیں۔ دولت مند دولت کے راستے سے اگر دین کمانا چاہے، تو کما سکتا ہے۔ ایک غریب آدمی اپنی جان اور جسم کے ذریعے دین کماتا ہے۔ اور دولت مند دولت کے ذریعے۔ اس کو جان دی۔ اس کو مال دیا۔ بنایا دونوں کو وسیلہ۔

انبیاء علیہم السلام نے دولت کمانے کا حکم بھی دیا فرمایا: ''كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ'' ① حلال کمائی کرنا، یہ بھی ایسا ہی فریضہ ہے، جیسے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا۔ مگر ساتھ یہ بتلایا کہ قلبی محبت کا تعلق اس سے نہ پیدا کرو۔ محبت کا تعلق صرف اللہ کی ذات سے رکھو، کام کاج کا تعلق اپنی دولت سے رکھو ؎

دل بیار دست بکار

دل مالک کے اندر لگا ہوا ہو۔ ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہوں۔ دل کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو۔ دل میں اللہ کی محبت ہو۔ اس لئے کہ دل ایک پاکیزہ ظرف ہے۔ پاک ظرف میں پاک ہی چیز بھرنے کی ضرورت ہے۔ اور اللہ کی محبت سے بڑھ کر پاک چیز کوئی نہیں ہے۔ تو دل اس کا مستحق ہے کہ وہی پاک چیز اس میں بھری جائے۔ دولت

---

① شعب الایمان للبیهقی، الستون من شعب الایمان وهو باب فی حقوق الاولاد والاهلین علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواه الطبرانی والبیهقی فی الشعب والقضاعی عن ابن مسعود مرفوعاً وقال البیهقی: تفرد به عباذ وهو ضعیف لکن له شواهد کثیرة: منها ما رواه الطبرانی فی الاوسط عن انس.. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۱۱۰۔

حلال ہونے کی وجہ سے پاک بن جائے، مگر اپنی ذات سے کوئی اعلیٰ چیز نہیں ہے کہ قلب کے اندر بھری جائے۔

قلب فقط آخرت کا عضو ہے......وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کے سارے بدن میں اگر آخرت کا کوئی عضو ہے، تو وہ قلب ہے۔ باقی سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ ہاتھ، پیر، دماغ سر یہ سب دنیوی اعضاء ہیں۔ صرف ایک ہی عضو ہے جو آخرت کا ہے۔

اور یہ فرق کیسے معلوم ہو؟ اس طرح کہ قلب صرف حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو کبھی قبول نہیں کرتا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ جائیں۔ مگر دل حق ہی سمجھ کر قبول کرے گا۔ باطل کو باطل سمجھے اور قبول کرے۔ جھوٹ کو جھوٹ سمجھے اور پھر قبول کرے، مطمئن ہو جائے ایسے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ جب سچی بات دل میں آئے گی، تبھی اطمینان ہوگا۔ ملمع سازی سے آپ جھوٹ کہتے رہیں، دل کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ برائی کی بات کریں تو قلب مطمئن نہیں ہوگا۔ چور، چوری کرتا ہے، لیکن اندر سے اس کا دل ملامت کرتا ہے، یہ بہت بری حرکت کر رہا ہے۔ اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے، مگر دل اعلان کر دیتا ہے کہ یہ بات بری ہے۔

آپ کسی کو بری نگاہ سے دیکھیں، دل ملامت کرے گا کہ غلط ہے، ناجائز کام ہے، بدنگاہی مت کرو۔ تو دل ملامت کرے گا، اگر آپ دیکھ لیں گے، دل میں گھٹن ہوگی کہ بہت بری حرکت ہوئی۔ تو قلب جب بھی قبول کرتا ہے، حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو، جھوٹ کو، فریب کو کبھی نہیں قبول کرتا۔ تو اس سے زیادہ مخلص کوئی دوسرا نہیں ہے کہ سچائی کا ماننے والا ہے، جھوٹ اور باطل کا ماننے والا نہیں ہے۔

بخلاف اور اعضاء کے، وہ سچ بھی قبول کرتے ہیں، جھوٹ بھی، حلال بھی قبول کرتے ہیں، حرام بھی اسی ہاتھ سے آپ پاک کمائی اٹھالیں گے اور ناجائز کمائی چوری، ڈکیتی کی وہ بھی جب اٹھائیں گے تو ہاتھ میں چبھے گی نہیں، ہاتھ اسے بھی پکڑ لے گا، دل قبول نہیں کرے گا، مگر ہاتھ قبول کر لے گا۔ حلال کی کمائی رکھ دو تب، حرام کی رکھ دو تب، دونوں کو لے کر گھر چلا آئے گا۔ منہ میں آپ کچھ ڈالیں تو جیسی لذت حلال چیز کے کھانے سے آئے گی، ویسی لذت حرام کمائی سے بھی آئے گی۔ مٹھائی اگر حرام کی ہے، تو یہ نہیں کہ وہ کڑوی ہو جائے۔ ویسی میٹھی لگے گی جیسی حلال کی مٹھائی۔ زبان دونوں کو قبول کر لیتی ہے، حلال کی مٹھائی کو بھی، حرام کی مٹھائی کو بھی حرام کی چیز سے کانٹے نہیں چبھتے، وہ کھا جاتی ہے اور اسے ذائقہ آتا ہے۔ لیکن قلب حرام کی چیز سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے بڑی بری حرکت کی، جانے آخرت میں کیا بنے گا، کیا میری درگت ہوگی۔ اسی طرح سے پیر ہیں، جس طرح سے آپ کو مسجد کی طرف لے جاتے ہیں اگر کوئی شراب کی بھٹی کی طرف جائے گا، پیر اسے بھی لے جائیں گے، پیروں میں کانٹے نہیں چبھیں گے۔ قطعاً نہیں رکیں گے، حرام موقع پر لے جاؤ، حلال موقع پر لے جاؤ، اپنی کارگذاری دکھلا دیں گے، تو ہاتھ، منہ، پیر جائز ناجائز دونوں کو قبول کرتے ہیں۔

اس آنکھ سے اگر اپنی ماں اور بیوی کو دیکھے تو پاک نگاہ ہوگی۔ لیکن اجنبی عورت کو دیکھے، ناپاک نگاہ ہوگی۔ مگر

آنکھ دونوں کو دیکھ لے گی۔ اجنبی عورت کے دیکھنے میں تو وہ نہیں آئے گا۔ آنکھ کے اندر کانٹے نہیں چبھیں گے، وہ ویسی ہی لذت لے گی، جیسے حلال عورت کو دیکھنے میں لذت آتی ہے۔ لیکن دل مطمئن نہیں ہوگا۔ دل کہے گا، بڑی غلط حرکت کی، خدا جانے آخرت میں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ تو دل ہمیشہ حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو قبول نہیں کرتا اور دل کے سوا جتنے اعضاء ہیں، حق و باطل دونوں کو قبول کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کا عضو صرف دل ہے، باقی اعضاء حقانی بھی ہیں باطل پرست بھی ہیں۔ نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں، انہیں حق بات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے یہ فقط قلب کا کام ہے۔ تو قلب جیسے حقانی عضو میں اگر آدمی ایسی چیزیں بھر لے، جو حلال بھی بن سکتی ہوں اور حرام بھی، تو اس نے قلب کو گندہ کر دیا۔ قلب میں ایسی چیز بھرنی چاہئے کہ جیسے یہ پاک ہے ویسے ہی وہ چیز بھی پاک ہو۔ وہ چیز اللہ کی محبت، علم و معرفت خداوندی اور پاکیزہ اخلاق ہیں کہ یہ حق ہی حق ہیں، ان کی جگہ قلب میں ہونی چاہئے۔ دولت کی جگہ قلب میں نہیں ہونی چاہئے، ہاتھ پیر میں ہونی چاہئے، اس لئے کہ وہ حلال و حرام اور پاک و ناپاک بھی بن سکتی ہے۔

قلب میں خالص پاک چیز آنی چاہئے۔ اہل اللہ کا مذاج ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے کمایا، دولت ہاتھ میں آئی، لیکن دولت کو قبلہ و کعبہ نہ بنایا کہ اس کی پوجا میں لگ جائیں، اسے ایک ضرورت کا زیر استعمال سامان سمجھا، جائز مواقع پر خرچ کیا، حکم خداوندی کے تابع رہے۔ حاصل یہ نکلا کہ دولت کو اپنا خدا بنا لینا کہ اگر وہ پاس ہے تو دل کو چین ہے اور ذرا اس میں کمی آئی، دل بے چین اور ڈانواں ڈول۔

یہ شان اللہ کی محبت کی ہونی چاہئے کہ حق تعالیٰ سے ذرا بعد ہو جائے، تو دل بے چین ہو جائے، اور قرب میسر آئے تو فرحت و انبساط پیدا ہو جائے۔

بازار اگر ذرا مندا (سُست) پڑ جائے، لوگ پریشان ہو جاتے ہیں، اب کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟ جیسے معلوم ہو سارا چین و آرام چھن گیا، یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کمانے کی چیز ہے، اسے جائز طریق پر آدمی کمائے۔ لیکن اس کو خادم سمجھے، مخدوم نہ بنائے۔ خدمت اللہ رب العزت کی اور اس کی محبت کی کرے۔

حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی اور بہت بڑے تاجر ہیں۔ انکی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی، تو کیفیت یہ تھی کہ روم، شام اور مصر میں جگہ جگہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں تھیں اور مال سپلائی ہوتا تھا اور نفع کی رقم جب آتی تھی تو یہ نہیں تھا کہ ایک دو آدمی لے کر چلے آئیں۔ لاکھوں روپے کا خزانہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی، تو تنگ آ کے کہتے کہ بھئی! کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ، سونے اور چاندی کے ٹکے اس طرح چھت تک بھرے ہوتے جیسے غلہ بھر دیا جاتا ہے، تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کروڑ پتی صحابہ میں سے تھے۔ مگر قلب کی کیا کیفیت تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمانداری کثرت سے تھی، تین تین سو، چار چار سو مہمان دستر خوان پر بیٹھتے تھے اور کئی کئی قسم کے کھانے دستر خوان پر

چنے جاتے، مدارات ہوتی تھی۔ جب دستر خوان پر کھانے چن دیئے جاتے اور اب قریب ہوتا کہ کھانا شروع ہو، تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا دل ایک دم روتا، آنکھوں سے آنسو جاری۔ اور فرماتے، اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰن کے دستر خوان پر اتنے کھانے؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جارہی ہیں؟

کہیں مجھے آخرت سے محروم تو نہیں کیا جا رہا۔ یہ کہہ کر روتے سارے حاضرین اور مہمان روتے۔ اس لئے کہ صحابی ہیں، صاحب دل ہیں۔ ان کے دل کا اثر دوسروں پر پڑتا اب چارسو آدمی کی ساری مجلس بیٹھی رو رہی ہے، گڑگڑا رہے ہیں اور اپنی آخرت کو یاد کر رہے ہیں۔ روتے روتے بدحال ہو جاتے اور سارا دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا۔ مہمان اور میزبان بھی فاقے سے اٹھ جاتے۔ رات کو پھر دستر خوان چنا جاتا، پھر کھانے کا وقت آتا تو بے اختیار حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کا دل دھڑکنا شروع ہوتا اور رونا شروع کرتے، اور کہتے:

''اے اللہ! مہاجرین اولین اس دنیا میں اس غربت سے گئے کہ کھانے کو ان کو پائی میسر نہیں تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا، اس غربت میں انہوں نے وفات پائی کہ کفن پورا میسر نہیں آیا، سر ڈھانپتے تھے، تو پیر کھل جاتے تھے پیر ڈھانپتے تھے، سر کھل جاتا تھا۔ آخر سر کو ڈھانپا گیا اور پیروں پر گھاس ڈال دی گئی، اس طرح سے دفن کیا، جن کا لقب ''سَیِّدُ الشُّھَدَآءِ حَمْزَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ'' ہے''۔

تو روتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے غربت کا یہ عالم اور عبدالرحمٰن کا یہ عالم کہ دس دس قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کہیں میری آخرت تو نہیں ختم کی جارہی ہے۔ حاضرین بھی روتے اور پھر دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا۔ تین تین وقت کا فاقہ اس طرح سے ہوتا تھا۔

اندازہ کیا آپ نے دولت تو اتنی بے شمار کہ گھر میں غلے کی طرح سے بھری ہوئی ہے اور قلب اتنا متوجہ الی اللہ کہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہوش، مسلم کو ایسا بنایا گیا ہے۔ مسلمان کو نہ تو یہ کہا گیا کہ تو شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر بیٹھ، پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ فرمایا یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے رہبانیت ختم کر دی۔ کمانا فرض بتلایا ہے۔ لیکن کمانے کے بعد لکھ پتی بن جائے۔ تو کیفیت یہ پیدا کر دی جائے کہ ہاتھ پیر میں تو سونا چاندی رکھا ہوا ہو، دل اللہ میں اٹکا ہوا ہو۔ مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے۔

اور مذاہب میں ترک دنیا اس طرح سکھلائی گئی کہ دولت کو ختم کر دو۔ اسلام میں اس طرح سے سکھلائی گئی کہ کماؤ مگر دل سے ترک کر دو۔ محبت کا تعلق نہ رہے۔ یہ زیادہ حوصلہ کا کام ہے۔ دنیا کو بالکل چھوڑ کر پہاڑ میں جا بیٹھے، یہ آسان ہے۔ لیکن سامنے موجود ہو، پھر دل میں گنجائش نہ ہو، یہ ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔ یہ مجاہدہ مسلمان کو بتلایا گیا کہ سب کچھ لے کر پھر قلب سے بے تعلق رہے اور ہاتھ پیر سے اس طرح لگا رہے جیسے چوبیس گھنٹے اسی کام کے ہوں۔

حاصل یہ نکلا کہ دولت کتنی بڑھ جائے، اس کو وفادار نہیں بتلایا گیا۔ وہ دنیوی زندگی میں بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور مرنے کے وقت تو چھوڑتی ہی ہے۔ جو ایسی بے وفا چیز ہو، اس سے محبت کر کے آدمی کیا کرے؟ اسے غلام اور خادم بنائے رکھے، یہی اس کا حق ہے۔ پھر بھی اگر اس کو قبلہ بنالے، تو حشر یہ ہوگا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال میں بیان فرمایا کہ عین مرتے وقت مال سے مدد طلب کی کہ میں نے ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح تیری عزت کی، کیا تو میرے کام آئے گا؟ اس نے کہا میں تیرے کام آنے والا نہیں۔ اس وقت آدمی پچھتائے گا کہ میں نے سارا دل ودماغ کا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا اور اس نے وفا نہ کی، افسوس رہا۔ تو فرمایا کہ یہ تو بڑا بھائی ہے۔

1 **منجھلے بھائی کا سلوک**...... اور فرمایا سمجھے منجھلا بھائی کون ہے؟ فرمایا وہ انسان کے بیوی اور بچے ہیں کہ انسان مرتے وقت امید کی نگاہیں ڈالتا ہے کہ شاید میری بیوی یا اولاد کام آجائے۔ میرا آخری وقت ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں کام آسکتے۔ تو جانے تیری قبر جانے زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ تو مر جائے گا تو تجھے زیرِ زمین دفن کر دیں گے۔ لیکن آگے تو جانے، تیرا کام جانے۔ ہم تیرے مددگار نہیں حالانکہ بیوی بچے آدمی کے وہ ہیں کہ آدمی بعض اوقات ان کی محبت میں جان بھی کھودیتا ہے، بعض دفعہ ایمان بھی کھودیتا ہے۔ اولاد کی صحت اور بیماری سے بچانے کے لئے بعض مرتبہ ماں باپ شرکیہ چیزیں بھی کر گزرتے ہیں۔ ٹونے اور ٹوٹکے نیز سحر اور جادو بھی کرالیتے ہیں۔ سحر حرام سے بھی باز نہیں رہتے کہ کسی طرح سے اولاد بچ جائے، کسی طرح سے جان بچ جائے۔ اولاد کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ مگر مرنے کے وقت وہ بھی ٹکا سا جواب دے دے گی کہ میں تمہارے کام کی نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔ یہ کہے گا، میں نے عمر بھر تیرے ساتھ سلوک کیا، وہ کہے گی، کیا ہوگا، تو نے جھک مارا، کس نے کہا تھا تجھے سلوک کرنے کو۔ اب بھگت اکیلے ہی۔ ہم تیرے کام آنے والے نہیں ہیں۔ تو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھائی کیسا ہے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ بھائی شریف نہیں ہے۔ یہ بھی کمینہ خصلت نکلا۔

اس واسطے بیوی بچوں سے محبت ہو تو ان کی اصلاح کے لئے ہو، ان کی تعلیم وتربیت کے لئے تعلق ہو۔ بیوی کی محبت اس لئے ہو کہ اس کو بھی خدا پرستی میں لگایا جائے۔ محض نفس پرستی کی محبت ہوگی تو سب سے پہلے وہ الگ ہو کر یہ کہے گی، میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں وہ کہے گا میں تیرا خاوند ہوں، وہ کہے گی میں نہیں جانتی۔ اب تو میں دوسرے کے گھر جانے والی ہوں یا بیٹھنے والی ہوں۔ میرا تیرا واسطہ کیا؟۔ لیکن اگر تربیت کی اور اسے سیدھے سچے راستے پر لگایا، وہ کہے گی کہ میں ایصالِ ثواب بھی کروں گی، میں قبر میں بھی تجھے نہیں بھلاؤں گی۔

آخرت میں بھی نہیں بھلاؤں گی، تو مطمئن رہ میں برابر ثواب پہنچاؤں گی۔ اولاد کہے گی، میں تیرے لئے صدقہ جاریہ ہوں۔ تو نے میری تربیت کی، مجھے علم پڑھایا، عمل کے راستہ پر لگایا، آج تو جا رہا ہے، تو میرا عمل تیرے ساتھ جارہا ہے۔ میرا صدقہ جاریہ ہونا تیرے ساتھ ہے، تو فکر مت کرنا۔ لیکن اگر محض اولاد ہی اولاد ہے، یا بیوی ہی بیوی ہے، کوئی تربیت نہیں، محض نفس پرستی اور تعیش ہی ہے اور کچھ نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا تیرا کیا

واسطہ؟ تو جانے تیرا کام جانے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ منجھلا بھائی کیسا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا بالکل بیکار اور کمینہ خصلت ثابت ہوا۔

چھوٹے بھائی کا حسن سلوک...... فرمایا: اور سمجھے وہ تیسرا بھائی کون ہے؟ جس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی کی اور اس نے کہا میں ہی آج کام آؤں گا۔ فرمایا وہ انسان کا نیک عمل ہے جس سے انسان عمر بھر بدسلوکی کرتا ہے۔ نماز کا گلا گھونٹتا ہے، یہ روز کا معمول ہے۔ نہ وقت کی پابندی نہ مسجد کی حاضری۔ کتنے انسان ہیں کہ رمضان آ رہا ہے، لیکن انہیں ذرا احترام نہیں۔ بر سر بازار وہ سگریٹ پیتے اور کھاتے پھر رہے ہیں۔ بہت سے اللہ کے بندے ہیں کہ انہیں بے شمار دولت دی گئی۔ انہیں زکوٰۃ وصدقات کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ وہ تعیش اور سینما تھیٹر پر خرچ کریں گے، یا شراب و کباب پر خرچ کریں گے۔ تو اس میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کا گلا گھونٹتے ہیں۔ نہ نماز کی فکر نہ روزے کی فکر، نہ حج کی فکر۔ اور اگر یہ چیزیں سرانجام دیں، تو دل میں غرور کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ اس لئے کہ باوجود دولت کے میں نے نماز پڑھ لی۔ معاذ اللہ اللہ پر کوئی احسان کیا۔ نماز پڑھنا چاہئے تو نہیں تھا، اس لئے کہ دولت مجھے فرصت کب دیتی ہے۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی اور حج کر لیا۔ حج کرنے کے بعد تو گویا ساتوں جنتیں میرے قبضے کی ہوگئیں۔ اب میرے نیچے سے نکل ہی نہیں سکتیں تو یا تو عمل ندارد اور اگر کرے تو غرور موجود ہے، اس سے تو نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

بہرحال نیکی کے ساتھ انسان بدسلوکی کرتا ہے۔ سوائے اس کے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو نیکی تقویٰ اور طہارت کو اصل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی نیکی کو قائم رکھنے کے لئے جان و مال کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر وہ سو میں دو چار ہوتے ہیں۔ زیادہ وہی ہوتے ہیں جنہیں نیکی وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ آخرت پیش نظر ہے ہی نہیں بس یہیں کا سارا جھگڑا سامنے ہے۔

تو مرنے کے وقت جب آدمی نیک عمل کی طرف رجوع کرے گا، تو یہ نیک عمل کہے گا۔ میں ہی ہوں تیرے کام آنے والا۔ اگرچہ تو نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ میں قبر میں، حشر میں، پل صراط پر تیرے ساتھ ہوں اور جنت میں بھی جو تجھے منافع ملیں گے، وہ میری وجہ سے ملیں گے۔ اس لئے وہاں بھی تیرے ساتھ ہوں۔ تو ابدالاباد تک جو چیز انسان کا ساتھ دینے والی ہے، وہ انسان کی نیکی اور عمل صالح ہے۔

حدیث میں ہے کہ: جب آدمی قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور سوال و جواب میں پورا اترتا ہے، اس کی قبر جہاں تک نگاہ جاتی ہے، وسیع کر دی جاتی ہے۔ اسے ایک عظیم عالم نظر پڑتا ہے، جس میں روشنی بھی ہے، چاندنا بھی ہے، تو دور سے اسے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے سے خیر و برکت ٹپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس کا چہرہ دیکھ کر دل میں فرحت اور خوشی بھر جاتی ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہا ہے۔ جب قریب آتا ہے تو یہ میت پوچھتی ہے، اے شخص تو کون ہے؟ اس تنہائی کے گھرانے میں تو میرے پاس آیا۔ تیرے چہرے کو دیکھ کر مجھے

یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل خوشیوں سے لبریز ہے۔تو کون ہے جو اس بے کسی کے عالم میں میرے پاس آ رہا ہے۔وہ کہے گا تو مجھے بھول گیا،اتنی جلدی فراموش کر دیا۔اَنَـا عَـمَـلُـکَ الصَّـالِحُ ① میں تیرا نیک عمل ہوں۔میں تجھے تسلی دینے کے لئے آیا ہوں کہ اسی تنہائی میں قطعاً مت گھبرانا،میں تیرے ساتھ ہوں۔کوئی آنچ تجھ پر نہیں آ سکتی آئے گی تو میں اسے جھیلوں گا۔

تو عمل صالح وہ ہے جو نزع میں بھی ساتھ،قبر میں بھی ساتھ۔حدیث میں ہے کہ نزع کے وقت خود ملک الموت علیہ السلام تلقین کرتے ہیں کہ دیکھ جان کنی کا وقت قریب ہے۔اب بھی اللہ اللہ کر لے،اب بھی کلمہ پڑھ تو نیکی کی ترغیب دیتے ہیں۔اس وقت آدمی عمل تو نہیں کر سکتا،بے بس ہے،بعض دفعہ تو زبان بھی بے بس ہوتی ہے۔آدمی وہ بھی نہیں کر سکتا،مگر دل میں تصور کر سکتا ہے۔اس وقت کا وہ عمل بھی کار آمد ہو جاتا ہے کہ وہ دل کے اندر توحید و رسالت اور ”لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ“ کا ورد کر رہا ہے۔تو ملک الموت بھی کہتے ہیں کہ ہاں جلدی کر۔اس کو تلقین کرتے ہیں۔اس لئے کہ یہی نیکی کار آمد ہوگی۔اس وقت کی یہ نیکی بھی کار آمد ہوگی۔تو اس وقت دولت،بیوی،بچوں کا کام نہیں کر سکتا۔کر سکتا ہے تو صرف نیکی کا کام کر سکتا ہے۔تو نزع میں بھی نیکی کار آمد ہوئی۔

قبر میں بھی نیکی کار آمد ہے۔حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے۔تو چاروں طرف سے عذاب اس کی طرف دوڑتا اور بڑھتا ہے۔لیکن اگر کسی کے دماغ میں قرآن کی آیتیں محفوظ ہیں،وہ کھڑی ہو جاتی ہیں،خبردار! ادھر سے مت آنا۔عذاب کا راستہ روک دیتی ہے۔دائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں ہے کہ نمازیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار اِدھر سے مت آنا۔بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں۔پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو زکوٰۃ و صدقات کھڑے ہو جاتے ہیں چہار طرف سے ناکہ بندی کر دیتے ہیں۔عذاب رک جاتا ہے۔اس طرح سے عذاب سے حفاظت کرنے والے وہاں اعمال صالحہ بنتے ہیں۔وہاں بیوی،بچے اور رشتہ دار مدد کو نہیں پہنچتے۔البتہ نیکی وہاں سنتری بن کے حفاظت کرتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی پر پھانسی کا مقدمہ چل جائے اور تمام ثبوت بیکار ہو جائیں اور یقین ہو کہ اب پھانسی چڑھے گا۔اس وقت دنیا کا دستور ہے کہ مجرم براہ راست بادشاہ کے سامنے مراحم خسروانہ کی درخواست کرتا ہے کہ قانون میں تو گنجائش نہیں ہے۔بادشاہ اگر خصوصی رحم و کرم سے مجھے چھوڑ دے،تو میری رہائی ہو سکتی ہے۔ایسے موقع پر آدمی بادشاہ اور حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کو پیش کرتا ہے۔

قدیم زمانے میں دستور تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شاہی فرمان ہوتا تھا،تو لوگ مراحم خسروانہ کی درخواست

---

① المصنف لابن ابی شیبة،باب فی نفس المومن کیف تخرج،ج:۳،ص:۲۵۶،رقم:۱۲۰۵۹۔امام ہیثمیؒ فرماتے ہیں امام احمد نے اس کو مطول ذکر کیا ہے اور اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔حدیث صحیح ہے۔دیکھئے:مجمع الزوائد،باب السوال فی القبر ج:۱ص:۴۷۱۔

پیش کرتے وقت وہ لے جا کر پیش کرتے تھے کہ ہم تو پشتینی حکومت کے وفادار ہیں، ہمارے گھر میں تو بادشاہ کا فرمان موجود ہے، ہمیں بادشاہ اور حکومت نے اپنا سمجھا تھا۔ ہم اس فرمان کو پیش کر کے نجات چاہتے ہیں۔ ہم وفادار، خدام، فدیہ اور حکومتی ٹیکس ادا کرنیوالا فدوی اور غلام ہیں۔ تو دستور یہ تھا کہ شاہی فرمان ادب کے ساتھ سر پر رکھ کر پیش کیا کرتے تھے کہ یہ فرمان ہے۔ ہم حکومت کے وفادار ہیں۔ اس لئے ہم کو چھوڑ دیا جائے تو ادب کی وجہ سے سر پر رکھ کر پیش کرتے تھے ہاتھ سے پیش نہیں کرتے تھے۔ تو علماء لکھتے ہیں کہ جب عذاب خداوندی سر کی طرف سے آئے گا تو یہ شخص جس کے دماغ میں قرآن کریم محفوظ ہے۔ یہ قرآن کریم کو پیش کرے گا کہ میں تو اللہ کی حکومت کا فرمانبردار ہوں، میں غلام رہ چکا ہوں میرے گھر میں تو یہ شاہی فرمان ''قرآن کریم'' آیا ہوا ہے۔ میں سر پر رکھ کر پیش کرتا ہوں کہ اس کی بدولت مجھے نجات دی جائے اور ابدالآباد کی پھانسی سے مجھے بچایا جائے۔ تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو قرآن روکتا ہے۔ اسی حدیث میں ہے ''اَلصَّلٰوۃُ بُرْھَانٌ'' ① نماز انسان کی دستاویز ہے اور عدالت میں جب اپنی رہائی کے ثبوت کے لئے دستاویز پیش کرتے ہیں، تو ادباً دائیں ہاتھ سے پیش کرتے ہیں۔ گویا نماز دائیں طرف سے عذاب کو روکے گی۔ گویا یہ انسان کی دستاویز ہے۔

اسی حدیث میں فرمایا گیا: اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ ② روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے تو جب وار روکا کرتے ہیں تو ڈھال بائیں ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزہ مثل ڈھال کے آگے آجاتا ہے۔ تو ادھر سے بھی عذاب نہیں آسکتا۔ اور زکوٰۃ وصدقات یہ انسان کے پامزد ہیں۔ ہاتھ پیر کی کمائی ہے۔ تو پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو یہ صدقات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض قبر میں چہار طرف سے ناکہ بندی عمل صالح ہی کرتا ہے۔

نیکی ہر عالم میں کارآمد ہوگی...... حدیث میں ہے کہ آدمی جب قبر سے اٹھ کر میدان محشر میں جائے گا، تو اس کے آگے آگے ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' سر کے اوپر ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ''، دائیں طرف ''سُبْحَانَ اللّٰہِ''، بائیں طرف ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' اور پشت پر ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ'' ہوگا اور یہ پانچوں کلمے اس طرح سے حفاظت کرتے ہوئے لے جائیں گے، جس طرح سپاہی حفاظت سے لے جاتے ہیں اور میدان محشر کے ہولناک مناظر سے بچادیں گے۔ بلکہ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ یَحْفَظُوْنَہٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ﴾ ③ اللہ کی طرف سے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں کچھ چیزیں ہوں گی۔ جو اللہ کے امر سے حفاظت کریں گی۔ وہ معقبات یہ تسبیحات ہوں گی۔ اللہ

---

① السنن للترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ، ج:۲ ص:۵۱۲ رقم: ۶۱۴. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج:۲ ص:۱۱۴ رقم: ۶۱۴. ② السنن للترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ، ج:۲ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج:۲ ص:۲۶۴ رقم: ۷۶۴. ③ پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱.

کے نام اور کلمات ہیں جن کے ذریعے سے آدمی بچے گا، تو محشر میں بھی عمل صالح ہی کام آیا قبر و نزع میں بھی عمل صالح کام آیا۔ زندگی میں بھی اگر کام آتا ہے تو یہی عمل آتا ہے۔ اگر کوئی شخص متقی ہے اور وہ اتفاق سے کسی مصیبت میں پھنس جائے تو لوگوں کی ہمدردیاں اس کیساتھ ہو جاتی ہیں کہا کرتے ہیں کہ بھائی غریب آدمی ہے، بے چارہ پھنس گیا مصیبت میں، یہ کوئی چور ڈاکو نہیں، کبھی برائی نہیں کرتا تھا، آج اس پر مقدمہ قائم ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے شرارت کی ہے۔ یہ اپنی ذات سے برا نہیں۔ تو نیک آدمی کو دنیا بھی اچھا کہتی ہے اور بد آدمی کو دنیا بھی برا کہتی ہے تو نیکی اور تقویٰ دنیا میں کام آتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا o وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ① جو اللہ سے ڈرتا ہے، نیکی کرتا ہے اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ میں تو ہر طرف سے پھنس چکا تھا۔ یہ کہاں سے راستہ پیدا ہو گیا۔ اللہ کی طرف سے اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے مدد ہوتی ہے۔

﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② جب رزق کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جاتے ہیں، اگر آدمی نیک اور متقی ہے، تو ایسے راستے سے رزق بھیجتے ہیں کہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس راستہ سے رزق آئے گا۔

تو دنیا میں، مرنے کے وقت اور قبر میں بھی حتیٰ کہ حشر میں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اس کے سوا کوئی چیز کہیں کام نہیں آتی۔ بلکہ بیوی اور بچے بھی جبھی کام آتے ہیں، جب ان کے اندر نیکی پیدا کر دی جائے۔ وہ بدمزاج ہوں تو بیوی وبال بن جاتی ہے۔ اولاد اگر بری پیدا ہوئی تو وہ ایک مستقل مصیبت بن جاتی ہے نبی کریم داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَّلَدٍ يَّكُوْنُ عَلَيَّ وَبَالًا. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ امْرَاَةٍ تُشَيِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِيْبِ" ③ اے اللہ! ایسی عورت سے پناہ مانگتا ہوں، جو بڑھاپے سے پہلے مجھے بوڑھا کر دے۔ یعنی رات دن اتنا ستائے کہ میں غم میں گھل گھل کر وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاؤں۔ اور ایسی اولاد سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے عذاب اور وبال بن جائے کہ نہ چھوڑ کے بن پڑتی ہے، نہ پکڑ کے بن پڑتی ہے۔ چھوڑ کے دھکا بھی نہیں دے سکتے کہ اولاد ہے۔ رکھے تو رات دن اس کی بدمزاجی کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار، اولاد و بیوی وبال جان بنتی ہیں۔ راحت کا ذریعہ کب بنتی ہیں؟ جب ان کو نیکی کا راستہ دکھایا جائے۔ تو یہاں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اولاد اور بیوی کام نہیں آئی۔ حدیث میں ہے کہ: چند چیزیں ہیں جن کے صدقہ جاریہ کا ثواب آدمی کو پہنچتا رہتا ہے۔ جیسے کنواں، سرائے یا مسافر خانہ بنوا دیا تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، آرام حاصل کریں گے۔ اسے ثواب ملتا رہے گا۔ ④ یہ ابدی صدقہ ہے۔ کسی نے مسجد و مدرسہ بنوا دیا۔ جب تک لوگ اس میں

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳. ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳. ③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه: محمد ج: ۱۳ ص: ۴۳۷ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیه من لم اعرفهم۔
④ الصحیح لمسلم، کتاب الوصیة، باب مایلحق الانسان من الثواب بعدوفاته، ج: ۳ ص: ۲۵۵، رقم: ۱۴۳۱.

پڑھیں گے، عبادت کریں گے اجر وثواب بنانے والے کو ملتا رہے گا یہ صدقات جاریہ ہیں۔فرمایا گیا سب سے بڑا صدقہ جاریہ انسان کی نیک اولاد ہے۔ جس کو آدمی سچے راستے پر ڈال دے۔ جب تک وہ نیکی کرے گی، اس کی نیکی کو دیکھ کر کوئی اور نیکی پہ چلے گا، تو جو سب کو اجر ملے گا، وہ تنہا اس شخص کو ملتا رہے گا۔ جس نے اولاد کو صالح بنایا، دین سکھلایا، علم دین پڑھایا، ان کی نیکیاں دیکھ کر محلہ والے، شہر والے نیک بن گئے۔ تو سب کو مل کر جتنا ثواب ملے گا، اس تنہا کو ملے گا، جس نے یہ راستہ پیدا کیا۔ تو اولاد صدقہ جاریہ کب بنتی ہے جب نیکی کے راستے پر ڈال دو۔ تو فی الحقیقت نیکی ہی کام آئی۔ اولاد کام نہیں آئی۔ بیوی کب راحت بنتی ہے، جب اس کے ماں باپ نے اس کے اخلاق درست کر دیئے ہوں۔ اس کو صحیح تربیت دی ہو کہ وہ اپنے خاوند اور سسرال کے لئے راحت کا ذریعہ بنے۔ تو راحت عورت نے نہیں پہنچائی، اس کی نیکی نے پہنچائی۔

حاصل یہ نکلا کہ عمل صالح دنیا میں، قبر میں اور آخرت میں بھی کام دے گا۔ نہ بیوی نہ اولاد نہ رشتہ دار اور نہ دولت کام آئیں گے۔ وہ تو بڑے اور منجھلے بھائی ہیں جو وقت کے اوپر جواب دیں گے۔ یہ بے چارہ عمل صالح ہی چھوٹا بھائی ہے جو ہر جگہ کام دیتا ہے۔

تو اس مثال سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا باریک مسئلہ حل فرما دیا۔ اولاد اور دولت کی پوزیشن بھی بتلادی اور عمل صالح کی بھی۔ اگر ویسے حجت و برہان سے سمجھایا جاتا تو شاید میری اور آپ کی سمجھ میں نہ آتا مثال دے کر سمجھایا تو بات بالکل عیاں ہوگئی اور کھل گئی۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص علمی قوت ہے کہ باریک مسائل کو مثالوں کے ذریعے واضح فرما دیتے ہیں۔ تو عمل صالح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمدہ طریق پر واضح فرما دیا۔ اس کی حیثیت کھل گئی اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا:

عمل صالح کی ضرورت...... ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا﴾ اے لوگو! عمل کرو۔ محض باتیں نہ بناؤ، محض معلومات میں اضافہ مت کرو۔ یہ ایک قسم کا تعیش ہے، یہ ذہن کی عیاشی ہے، یہ کارآمد نہیں ہوگی۔ علم کو اپنے اندر سمو کر عمل صالح کا راستہ بناؤ۔ یہ کارآمد ہوگا۔ تو اے پیغمبر! فرما دیجئے اے لوگو! عمل کرو۔ ﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ① یہ جو تم عمل کر رہے ہو۔ یہ رائیگاں جانے والا نہیں ہے اسے عنقریب اللہ اور اس کے رسول اور مومنین بھی دیکھنے والے ہیں۔ قیامت کے دن مسلمانوں کے سامنے بھی تمہاری زندگی آئے گی۔ اللہ کے سامنے اعمال پیش ہوں گے۔

انبیاء علیہم السلام اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اعمال پیش ہوں گے کہ یہ ہی آپ کی امت کے اعمال اور اولین وآخرین جتنے ایمان والے ہیں، سب کے سامنے ہر ہر شخص کی زندگی آئے گی۔ تو فرمایا گیا، ایسے موقع سے غافل مت رہو، جس میں ساری چیزیں کھلنے والی ہیں۔ اگر ہماری کوئی برائی ہو اور ہمارے گھر والوں کے

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۵.

سامنے آ جائے۔ تو ہم منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ گھر والوں کی نگاہ میں بھی ہماری ذلت ہوگی اور گھر والوں سے گزر کر محلے والے بھی جان لیں، تو اور زیادہ شرمندگی ہوتی ہے اور اگر محلے سے گزر کر پورے شہر میں پھیل جائے کہ فلاں صاحب نے یہ کرتوت کی، تو گھر سے نکلنے کا منہ نہیں ہوتا۔ تو دوسروں میں ذرا ہماری بدی پھیل جائے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور جب خدانخواستہ اولین و آخرین کے سامنے ہماری برائی آ گئی، آدمؑ کی ساری اولاد دیکھے گی۔ اس میں مسلم و کافر اپنے اور پرائے سب ہی ہیں۔ ہر ہر شخص علی رؤس الاشہاد دیکھے گا کہ فلاں نے یہ حرکت کی تھی۔ اس وقت شرمندگی کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت انسان کی خفت و ندامت کا کیا عالم ہوگا؟

تو اسوقت سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① اس دن سے ڈرو جب سب رب العالمین کے سامنے کھڑے حساب دیتے ہوئے ہوں گے ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ ② جب قیامت کے دن اللہ، رسولوں کو جمع کریں گے اور فرمائیں گے جب تم نے ہدایت کی، تو امتوں نے تمہارے سامنے کیا کیا جواب دیئے۔ اور وہ کہتے ہوئے ہوں گے کہ فلاں نے میری بات مانی اور فلاں نے نہیں مانی۔ فلاں طبقے نے سنا اور فلاں طبقے نے میرے کہنے کو بالکل اکارت کر دیا۔ اس وقت کی رسوائی، شرمندگی اور فضیحت کتنی بڑی ہوگی، اس کا کوئی اندازہ یہاں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔

روز کے روز نیک اعمال کرتے رہنا چاہیئے...... اس واسطے حدیث میں حضرت عمر بن خطاب کا ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''حَاسِبُوْا انفسکم قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا'' ③ اس سے پہلے اپنی زندگی کا حساب لے لو، کہ وہاں حساب لیا جائے۔ اس سے پہلے اپنے کچے چٹھے کو درست کر لو۔ جو وہاں پر خدا کے اکاؤنٹنٹ ہیں، وہ تمہارے حساب کو جانچیں۔

اگر یہ معمول بنا لیا جائے تو کوئی بڑی بات نہیں عمر بھر کی باتیں آدمی کو یاد نہیں رہتیں۔ لیکن روز کی بات تو روز یاد رہتی ہے۔ اگر چارپائی پر لیٹ کر آدمی عشاء کے بعد ایک وقت مقرر کر لے کہ لیٹ کر دس منٹ کیلئے سوچے، دن میں میں نے کتنی بدیاں کیں اور کتنی نیکیاں کیں اگر نیکیاں سمجھ میں آئیں تو اللہ کا شکر کرے، کہ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو مجھے نیکی کی توفیق دے دی۔ تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جس نعمت پر شکر کرو گے، اس نعمت کو بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکی پر شکر کرو گے، نیکی بڑھتی جائے گی اور دن بھر میں جتنی بدیاں کی ہیں، وہ بھی آدمی سوچ لے جو بدی سامنے آئے، گڑگڑا کے اللہ کے سامنے توبہ کرے کہ اے اللہ! میرے سے غلطی ہوئی۔ اگر اللہ کا حق تھا، توبہ کر لے، امید ہے کہ معاف ہو جائے گا۔ اگر مخلوق کا حق تھا، اگلے دن حق کو ادا کر دے کسی کا روپیہ مار لیا تھا، اسے دے دے۔ کسی کو گالی دی تھی یا غیبت کی تھی، اس سے معافی مانگ لے حقوق اللہ ضائع کئے ہیں تو توبہ سے معاف ہو جائیں گے۔

① پارہ: ۳۰، سورة المطففين، الآية: ٦. ② پارہ: ٦، سورة المائدة، الآية: ١٠٩. ③ السنن للترمذی، کتاب صفة القيامة والرقاق والورع، باب ماجاء في صفة اواني الحوض، ج: ۴ ص: ٦٣٨ رقم: ٢٤٥٩.

حقوق العباد ضائع کیے ہیں، توبہ کرے اور صاحب حق سے معافی مانگ لے۔ اگر روز کے روز کچا چٹھا صاف ہوتا رہا، آدمی کو مرنے کا غم نہیں ہوگا۔ مرنے کے وقت حساب صاف ہوگا، کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اور اگر روز کے روز نہ کیا، آج پچاس بدیاں کیں، وہ جمع ہوگئیں، کل اور کیں، ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ تیسرے دن اور بیس پچاس کیں، تو ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ مرنے کے وقت ظلمتوں کے سیاہ پردے سامنے پڑے ہوئے ہوں گے۔

کس طرح سے آدمی انہیں دھوئے گا، اگر ایک کپڑے پر دھبہ پڑ جائے، جبھی کپڑا صابن سے دھو دے کپڑا صاف اور اگر دھبے پڑتے پڑتے مہینے بھر میں سارا کپڑا سیاہ ہوگیا، تو سارے بازار کا صابن خرچ کر کے بھی دھبے نہیں جائیں گے۔ وہ تو کپڑا ہی کالا ہوگیا۔ اس واسطے آدمی روز کے دھبے دھولے۔ تو صاف ہوجائیں گے ان کو جمع نہ کرے۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اگر کوئی بدی کرے تو بدی کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے تاکہ وہ مٹ جائے نامہ اعمال درست ہوجائے۔ جمع و اصرار اس کے اوپر نہ کرے، تو یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا کرے۔ سونے کے وقت دس منٹ مقرر کرے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں۔ کتنی بدیاں کیں۔ نیکیاں یاد آئیں تو شکر کرے اور بدیاں یاد آئیں تو توبہ کرے۔ جب روز توبہ ہوتی رہے گی، بدیاں مٹتی رہیں گی۔ تو آدمی ہلکا پھلکا رہے گا۔ بڑی آسانی سے موت کے لئے منتظر ہوجائے گا اور موت کے تصور سے کوئی گرانی نہیں ہوگی۔

نیکی سے امید اور بدی سے مایوسی پیدا ہوتی ہے...... اس لئے کہ نیکی کرنے سے امید پیدا ہوتی ہے، بدی کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے جو ملازم ہمیشہ نالائقیاں کرتا ہے اسے مایوسی ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملنا ملانا، بس آقا کی طرف سے جوتیاں پڑیں گی اور جو کام عمدہ کرتا ہے، اسے تمنا رہتی ہے کاش میرے سے کوئی پوچھے، تو نے کیا کام کیا تاکہ میں بتا سکوں کہ میں نے یہ کیا یہ کیا مجھے انعام ملے گا، تنخواہ بڑھے گی، مالک کے دل میں میری قدر بڑھے گی۔ تو نیکی کرنے سے امیدیں بندھتی ہیں۔ حق تعالیٰ سے ملنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور بدیاں کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے، گھٹن پیدا ہوتی ہے اللہ کے سامنے جانے کو جی نہیں چاہتا نیک آدمی تمنا میں رہتا ہے کہ کب موت آئے اور مجھے بدلے ملیں اور بدآدمی مایوس ہوتا ہے کہ کسی طرح موت نہ آئے، اسے مرنا بھی موت ہوجاتا ہے۔

اسی واسطے کفار کے بارے میں فرمایا گیا، چونکہ انہیں مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ آخرت کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لئے انہیں مرنا بھی بھاری ہے ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ ① تم ان کو اس زندگی کے اوپر انتہائی حریص پاؤ گے۔ اگر ان کی عمر پچاس برس کی ہو تو وہ چاہیں گے، ساٹھ برس کی ہوجائے، دنیا سے ٹلنے کا نام نہیں لیں گے۔ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْيُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ ② اور جو شرک میں مبتلا ہیں، وہ اس تمنا میں ہیں کہ کاش ایک ہزار برس کی عمر مل جائے۔ وہ مل جائے تو چاہیں گے کہ ایک ہزار کی اور مل جائے۔ وہ دنیا سے ٹلنا چاہتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ آئندہ انہیں کوئی توقع نہیں۔ مایوسیاں اور

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۹۶. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۹۶.

ظلمتیں ان کے سامنے ہیں۔ مستقبل ان کا تاریک ہے۔

اور نیک آدمی مومن تو اس کے بارے میں ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا، یہود نے کہا تھا ہم اولیاء اللہ ہیں، تو فرمایا گیا ﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① اے یہود! اگر تم اولیاء اللہ ہو، اور تم اللہ کے دوست ہو، تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ ولی کو تو تمنا ہوتی ہے کہ کب میں اس دنیا کو چھوڑوں اور اپنے پروردگار کے پاس جاؤں تم اگر واقعی ولی ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ حالانکہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ موت کے نام سے تمہیں بخار چڑھتا ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ بس دنیا سے کسی طرح ٹلیں ہی نہ اور ایک ولی کامل کہتا ہے کہ یا اللہ! کب وہ دن آئے کہ اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑ کر پاک وطن میں پہنچیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں برویم ۔۔۔ راحت جاں طلبیم در پے جاناں بروئیم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ۔۔۔ تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروئیم

وہ کہتے کہ وہ کیسا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑی ہوئی بستی کو چھوڑ کر ہم اس پاک وطن میں پہنچیں گے غزل خواں وفرحاں وشاداں اور اللہ کے گن گاتے ہوئے اللہ کے ہاں آخرت میں پہنچیں گے۔ تو ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ مرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور بدی کا خاصہ یہ ہے کہ مایوسی بڑھتی ہے۔ خدا سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس واسطے فرمایا مشرکین کو حیات دنیوی پر زیادہ حریص پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی نیکی بڑھتی جائے گی، انسان کے لئے مرنا خوشگوار ہوتا جائے گا۔

یہ جو بعض اوقات ہماری کیفیت ہوتی ہے کہ ذرا سا بیمار ہوئے اور گمان ہوا کہ موت آئی تو بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں کہ کچھ کرو، کوئی تعویذ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ٹل جائیں مرنا جینا یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ مگر انسان اتنا گھبرا جائے، خدا جانے کیا ہو جائے گا۔ ایک صالح اور نیک بندے کے لئے تو خوشی کا مقام ہے کہ زندہ رہوں تو روزہ، نماز، طاعت وعبادت وغیرہ کا عمل نصیب ہوگا اور اگر مر گیا، تو اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، اس سے بہتر کیا چیز ہوگی۔ تو زندگی بھی خوشگوار، مرنا بھی خوشگوار! حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات کا جب وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے، خوشی اور مسرت میں ڈوبے ہوئے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! نزع کی تکلیف ہو رہی ہے اور خوشی ایسی جیسے معلوم ہو کہ شادی ہونے والی ہے فرمایا ”غَدًا نَلْقٰی مُحَمَّدًا وَّاَصْحَابَهٗ“ ② پس عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے ملاقات ہونے والی ہے۔ اسی خوشی میں جان دے رہے ہیں کہ اب وقت قریب ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت خوش ہیں، روزے سے ہیں، فرمایا بس عنقریب افطار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا کر کرنا ہے۔ چند منٹ رہ گئے ہیں یہ کیفیت نیکی اور تقویٰ وطہارت سے پیدا ہوتی ہے کہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶۔ ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الزکوۃ، باب الانفاق و کراھیۃ الامساک، ج: ۶ ص: ۱۷۷۔

موت خوشگوار بن جاتی ہے بلکہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال روز کے روز اگر محاسبہ کر لیا جائے اور اپنی نیکیوں کو شکر کے راستے سے بڑھایا جائے اور بدیوں کو توبہ کے راستے سے ختم کر دیا جائے۔ تو موت خوشگوار ہو جائے گی۔ اگر تصور بندھے گا کہ موت آنے والی ہے تو گھبراہٹ نہیں پیدا ہوگی۔ یہ کہے گا یا اللہ! اگر میں زندہ رہوں، تب بھی تیرا ہوں، مروں تب بھی تیرا ہوں۔ یہاں تو نے زمین کی سطح پہ رکھا ہے، وہاں زمین کی تہہ میں۔ عالم دونوں تیرے ہی ہیں۔ اس لئے تیرے ہی پاس رہوں گا، مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں قبر کے ہولناک حالات ارشاد فرمائے کہ منکر نکیر اس ڈراؤنی شکل میں آئیں گے۔ قبر میں یوں تاریکی اور اندھیرا ہوگا۔ مصیبت ناک صورتیں سامنے آئیں گی۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول! اس وقت ہماری عقل بھی درست ہوگی؟ فرمایا عقل تو رہے گی۔ کہا: اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہوتا رہے گا جو کچھ ہوگا۔ منکر نکیر سے نمٹ لیں گے تو عقل سے مراد مادی عقل نہیں تھی جس سے ہوائی جہاز اور موٹر تیار کئے جاتے ہیں۔ عقل سے مراد عقل ایمانی تھی۔ یعنی ہمارا علم، معرفت، بصیرت، توکل علی اللہ اور ایمانی قوت قائم رہے گی؟ فرمایا، رہے گی۔ عرض کیا اب کوئی فکر نہیں منکر نکیر کسی صورت میں آ جائیں۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق، ہم بھی اللہ کی مخلوق ڈرنے کی کیا ضرورت؟ اللہ میاں سامنے ہے جس سے ہم ڈر رہے ہیں۔ جو اللہ سے ڈر گیا۔ وہ پھر کسی سے بھی نہیں ڈرے گا۔ یہ توکل تام اور عمل صالح کی برکت ہے کہ نہ موت کی فکر نہ اس کے ہولناک مناظر کی فکر بس اللہ پر بھروسہ ہے۔ جب وہ چاہیں گے لے جائیں گے ہم تو ان کے زیر سایہ ہیں، ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت؟

جو بادشاہ کا ملازم ہے، صاحب خاص ہو اور ہر وقت پاس رہتا ہو اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ جب بادشاہ سفر کریں گے۔ تو میں ان کے ساتھ اور جب اپنے محل سرائے میں ہوں گے تو میں ان کے ساتھ ہوں گا۔ میرا حلوہ مانڈہ ہر وقت صحیح ہے اور ہر وقت کی عیش ہے۔ میں سفر میں بھی ساتھ، حضر میں بھی ساتھ، مجھے فکر کی کیا ضرورت؟۔ یہی شان مومن کی بھی ہے کہ سفر میں دنیا کے مسافر خانے میں ہو۔ تب بھی تکلیف نہیں کہ مالک کی نگاہ کے نیچے ہے اور منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ تب تو راحت ہی راحت ہے وہاں پہنچ گئے جس کے لئے سب محنتیں کیں۔ یہ سب چیزیں عمل سے بنتی ہے۔ اس لئے فرمایا گیا:

﴿قُلِ اعْمَلُوْا﴾ اے نبی کریم صلی علیہ وسلم! اپنی امت سے فرما دیجئے کہ اے لوگو! عمل کرو۔ اس لئے کہ عمل اکارت نہیں جائے گا، سامنے آئے گا۔ ﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ① عنقریب اس عمل کو اللہ، اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین بھی دیکھیں گے۔ ﴿وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۵.

وَالشَّهَادَةِ﴾ ① اور قریب وقت آ رہا ہے کہ تم سب کے سب اللہ کے پاس پہنچائے جاؤ گے جو غیب وشہادت کا جاننے والا ہے۔کوئی ادنیٰ چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔اور یہی نہیں کہ محض جانتا ہی ہے، بلکہ ﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ② وہ جتلائے گا کہ تم نے یہ یہ کرتوتیں کی تھیں۔اگر نیکی کی ہے،تو جتلائیں گے کہ تم بڑے اعلیٰ لوگ ہو۔بڑی اعلیٰ کارگردگی دکھلائی۔برائیاں کی ہیں تو یہ جتلایا جائے گا کہ یہ تمہارے کرتوت ہیں۔تو وہ خبر دے دیں گے ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ چیزیں کی تھیں۔

نیکی اور بدی دنیا میں بھی نمایاں ہو کر رہتی ہے...... آدمی کی نیکی اور بدی چھپی نہیں رہتی دنیا میں بھی سامنے آجاتی ہے۔آخرت میں تو آئے ہی گی۔حدیث میں فرمایا گیا ایک کوٹھڑی فرض کی جائے اس کے اندر ایک اور کوٹھڑی، اس کے اندر ایک اور کمرہ اور اس میں ایک اور کمرہ سات کمرے اندر باہر ہوں اور کسی کمرے میں نہ دروازہ ہو نہ روشن دان ہو نہ سوراخ ہو اور ساتویں کوٹھڑی کے اندر بیٹھ کر آدمی کوئی نیک یا بدعمل کرتا ہے، اللہ اس کے عمل کو کھول کے رہتا ہے کہ مخلوق کے دل میں پڑ جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ نیک آدمی کو ساری دنیا نیک کہتی ہے۔کسی نے جا کے تو اس کو نہیں دیکھا کہ اس نے کیا کیا نیکیاں کیں خواہ مخواہ دنیا کی زبان پر ہوتا ہے کہ فلاں بڑا نیک ہے۔یہ اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے اور بد ہمیشہ ساری بدیاں چھپا کے کرتا ہے کوئی کسی کے سامنے آ کر بدی نہیں کرتا چور چوری چھپ کر کرے گا، زنا کار چھپ کر زنا کرے گا۔مگر دنیا کی زبان پر ہے کہ فلاں بڑا بدکار، سیاہ کار اور بے ہودہ آدمی ہے۔اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم نے خود اس کو یہ عمل بد کرتے ہوئے دیکھا؟ کہیں گے نہیں، دیکھا تو نہیں۔یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو اطلاع دی جاتی ہے۔تو آدمی نیکی یا بدی کرے، چھپی نہیں رہتی۔

تو اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین اس کے عمل کو دیکھیں گے۔صرف دنیا ہی میں نہیں، بلکہ اللہ کے حضور میں دیکھیں گے۔پھر اللہ تعالیٰ جتلائیں گے کہ تم نے یہ یہ کیا تھا اور جتلانے کے بعد پھر ثمرہ مرتب ہوگا تو نیکی کا بدلہ نیکی سے اور بدی کا بدلہ بدی سے دیا جائے۔﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ﴾ ③ ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ سامنے آجائے گی۔اس کا بدلہ بھی دیا جائے گا۔﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ﴾ ④ اور ذرہ برابر بدی کی ہے، وہ بھی سامنے آجائے گی۔اس کا بھی صلہ ملے گا۔

عملی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت...... میں نے یہ آیت اسی واسطے اختیار کی تھی کہ عمل کی زندگی اختیار کی جائے۔جتنے مسائل اب تک عمل میں آچکے ہیں۔اپنی زندگی کا جائزہ لے کر ان کو عمل میں لایا جائے اور جو نہیں آئے، ان کو معلوم کیا جائے، تاکہ بقیہ زندگی درست کی جائے۔یہ جب ہی ہوگا جب دل میں عملی زندگی کی فکر ہو۔

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۶۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۶۔

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ: ۷۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ: ۸۔

قول ہی قول یا محض باتیں کر لینا یا بنا لینا یا امیدیں اور تمنائیں باندھ لینا کہ ہم تو مسلمان ہیں یوں ہوگا۔ اس سے کام نہیں چلتا۔ جدوجہد سے کام چلتا ہے۔ ﴿لَيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ ① انسان کے لئے اس کی سعی ہی کارآمد ہوگی۔ اس کی جدوجہد ہی کام دے گی۔ جیسے دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں اگر کوئی محنت نہ کرے، تجارت و زراعت نہ کرے، تو دوسروں کی محنت کام نہیں آتی اپنا ہی کیا کام آتا ہے۔ دوسرا اگر خدمت بھی کرے گا، ایک دن خدمت کر دی، دو دن کر دی۔ ناداروں کی طرح کفالت تو نہیں کر سکتے کہ انہیں بیٹھے بٹھائے کھلائے جاؤ۔ مثل مشہور ہے کہ ”آنسوؤں سے گھڑے تو نہیں بھرے جاسکتے“ گھڑے تو دریا سے ہی بھر سکتے ہیں تو لوگوں کی امداد سے زندگیاں نہیں گزرتیں کچھ آدمی خود کرے، کچھ کمی رہ جائے دوسرا کر دے۔ یہ تو ہوتا ہے۔ لیکن دنیا ان کی کفالت کر دے جو ہاتھ پیر ہلانا نہیں جانتے ایسا کوئی نہیں کیا کرتا۔ اپنی ہی سعی کام آتی ہے تو جب دنیا جیسی مردار چیز بھی بلاسعی کے نہیں حاصل کی جاسکتی۔

تو آخرت جیسی پاک چیز بلاسعی کیسے مل سکتی ہے؟ کہ وہ گھر بیٹھے خود ہی آجائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ ② کیا ہم رحمت تمہاری کمر سے چپکا دیں۔ تم بھاگے چلے جارہے ہو، اور ہم پیچھے آرہے ہیں کہ بھئی رحمت لیتے جاؤ۔ دس دفعہ محنت کرو، خوشامد کرو، تب رحمت ملے گی۔ مستغنی بنتے ہو؟ ہم تو غنی ہیں، تم محتاج ہو کے غنی بنتے ہو۔ ہم غنی ہی غنی ہیں۔ ہم میں محتاجگی کا نام نہیں، غنا تو ہمارا کام ہے نہ کہ بندے کا۔

اس واسطے یہ آیت میں نے تلاوت کی عمل کے بارے میں چند باتیں گذارش کیں اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مثال دی کہ عمل کی یہ پوزیشن ہے۔ اسی کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔ علم چاہے تھوڑا ہو مگر اس پر عمل پورا ہو۔ وہی انشاء اللہ دنیا و آخرت میں کام آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کرنے اور عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹. ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۲۸.

انسانی زندگی کا نصب العین

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ !

عظیم ترین نعمت...... بزرگان محترم! حق تعالیٰ کے انعامات انسانوں کے اوپر بے شمار ہیں۔ جن کی کوئی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ قدم قدم پر نعمتوں کی بارشیں ہیں اور لحہ بہ لحہ انسانوں کو عجیب عجیب انعامات دیئے جا رہے ہیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (1) اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے بیٹھ جاؤ تو تم شمار نہیں کر سکتے۔ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

غرض انسان کے اوپر بے شمار نعمتیں ہیں۔ لیکن ساری نعمتوں کی اصل اصول زندگی کی نعمت ہے جو ہمیں عطا کی گئی۔ اگر زندگی نہ ہو تو کوئی بھی نعمت نہ ہمارے لئے نافع بن سکتی ہے نہ مفید ہو سکتی ہے۔ تو اصل میں سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ ایک زندہ انسان ہی نعمت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ تو نعمتیں ساری ایک طرف اور زندگی ایک طرف۔ عظیم ترین یہ نعمت یا عمر جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اللہ نے بے قیمت عطا کر دی ہے۔

ما نبودیم و تقاضائے ما نبود! لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے کوئی پکار تھی۔ نہ ہماری طرف سے کوئی تقاضا تھا۔ مگر تیرا لطف و کرم ہماری خاموش آواز کو سن رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں زندگی ملے۔ اس خاموش پکار پر اتنی بڑی نعمت دیدی کہ سارے جہاں مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتے۔ ایک انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاں اولاد ہو، اگر نہیں ہوتی تو دنیا کے خزانے خرچ کر دے، نہیں ہوتی اور دینے پہ آتے ہیں تو غریب انسان کو اتنی دے دیتے ہیں کہ بظاہر وہ تنگ آ جاتا ہے۔ تو نہ مانگے سے ملتی ہے نہ قیمت سے ملتی ہے۔ محض فضل سے ملتی ہے۔

سب سے بڑی نعمت یہ عمر ہے پھر یہ عمر بھی کوئی چھوٹی موٹی عمر نہیں ہے۔ آپ اسے عمر سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کسی کی زندگی پچاس برس ہوگی؟ کسی کی ساٹھ ہوگی؟ بہت لمبی عمر ہوئی تو اسی نوے برس کی ہوگی؟ یہ زندگی ہے؟ یہ زندگی

---

(1) پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۸۔

کا ایک معمولی حصہ اور زندگی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے۔

ابدی زندگی...... انسان کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے" ہمیشہ سے نہیں تھا لیکن پیدا ہونے کے بعد اب ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اب انسان کے لئے مٹنا نہیں ہے۔ وطن کا انتقال ایک وطن سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف ہوتا رہتا ہے۔ نقل مکانی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی انسان سے چھنتی نہیں ہے۔

یہ پہلے "عالم الست" میں تھا جبکہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے سب بنی آدم کو نکالا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر داہنا ہاتھ مارا تو ساری نیک اولاد نکل پڑی اور بایاں ہاتھ مارا تو ساری بد اولاد نکل پڑی۔ یہ بنی آدم کا پہلا ظہور ہے تو "عہد الست" میں ابتدائی ظہور ہے۔ وہاں سے انسان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد منتقل ہو کر ماں کے پیٹ میں آ گیا پھر ماں کے پیٹ کی عمر نو مہینے کی ہے۔ پہلے بھی فنا نہیں ہوا تھا، ماں کے پیٹ میں بھی آ کر فنا نہیں ہوا۔ "عہد الست" سے انتقال ہوا تو رحم مادر میں آیا۔ رحم مادر سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گیا۔ ہر ایک عالم سے گزرتے ہوئے انتقال ہوتا ہے اور دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ دنیا میں انتقال ہوگا تو برزخ کے اندر پہنچ جائے گا۔ برزخ سے انتقال ہوگا تو عالم حشر کے اندر پہنچ جائے گا۔ وہاں پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ عالم حشر سے انتقال ہوگا تو عالم جنت میں پہنچ جائے گا۔ پھر جنت میں ابدالآباد تک روزانہ انتقالات ہیں۔ بڑے بڑے جہاں اور روز نئی نئی نعمتوں کی تجدید ہوگی۔ وہاں بھی درجہ بدرجہ عروج حاصل کرتا رہے گا۔ تو جب سے انسان کا ظہور ہوا اب تک برابر سفر میں ہے اور سفر کرتا رہے گا۔ اس لئے انسان ازلی نہیں ہے مگر ابدی ہے کہ مٹنے والا نہیں ہے تو آپ کی عمر تھوڑی نہیں ہے جس کو بیس پچاس اور سو برس سمجھ لیں۔ یہ انسان کی عمر کا ایک معمولی حصہ ہے، انسان ابدی طور پر زندہ ہے اس ابدی اور لامحدود عمر کا ایک معمولی حصہ ہے جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی زندگی بڑی طویل اور لمبی ہے۔

اختیاری نصب العین کی ضرورت...... اس دنیوی زندگی کو گزارنا، اس کے لئے اللہ نے ایک تو غیر اختیاری حصہ رکھا ہے۔ وہ آپ چاہیں نہ چاہیں گزر جائے گا اور جب انسان پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اختیار میں دی ہیں کہ اپنے ارادے اور اختیار سے زندگی کا نصب العین بناؤ۔ اس کے تحت زندگی گزارو۔ اس لئے کہ جو وقت یا جو زندگی بلا نصب العین کے گزرتی ہے۔ وہی مجنونانہ حرکت کہلاتی ہے۔ ایک دیوانے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ زندگی اس کی بھی گزر رہی ہے۔ تو دیوانگی کے ساتھ عمر کو گزارنا، یہ دانش مند کا کام نہیں ہے۔ یہ دیوانوں کا کام ہے۔ زندگی کا کوئی نصب العین بنانا پڑے گا جس کے تحت زندگی گزاری جائے کہ ہم کیوں زندہ ہیں؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ اور یہ جو روز میرے انتقال ہوتے رہتے ہیں اس جہاں سے اس جہاں کی طرف اور وہاں سے وہاں کی طرف۔ آخر یہ کیا کوئی افسانہ ہے؟ یا کوئی قصہ ہے کہ خواہ مخواہ انسان چل رہا ہے۔

ہم کراچی سے حیدر آباد دکن کا سفر کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مقصد دینی یا دنیوی سوچ لیتے ہیں کہ اس لئے جارہے ہیں۔ بلا مقصد ریل میں بیٹھ جائیں اور کوئی پوچھے کہ کیوں جارہے ہیں؟ کہ یوں ہی۔ کہا جائے گا کہ تم دیوانے ہو؟۔ تو دیوانہ اسے کہتے ہیں جو بلا نصب العین اور بلا مقصد کے زندگی گزارے، دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر نقل وحرکت کا کوئی نصب العین ضرور ہو۔ تو اتنی بڑی حرکت جو ہزاروں برس سے چل رہی ہے، اور ابد الآباد تک چلتی رہے گی اور بلا مقصد ہو؟ یعنی دیوانگی بھی اور اتنی لمبی دیوانگی کہ اس کی کوئی حد ونہایت نہ ہو۔ کم سے کم انسان کے لئے زیبا نہیں جو مدعی ہے کہ میں سب سے بڑا دانشمند ہوں مجھے عقل کامل دی گئی ہے۔ یہ مدعی ہے کہ میں ساری کائنات پر فوقیت رکھتا ہوں اور افضل ہوں حتیٰ کہ ملائکہ کی جنس سے بھی افضل ہونے کا دعوے دار ہے۔ تو یہ انسان جو اتنا بڑا دعویٰ رکھتا ہے، اس کی اتنی بڑی زندگی بلا کسی مقصد کے؟ تو ایک طرف یہ عقل کا دعویٰ کہ سب سے بالاتر اور ایک طرف یہ مجنونانہ حرکت کہ کوئی نصب العین زندگی کا نہیں۔ یہ کوئی جوڑ نہیں لگتا۔ اس لئے انسان وہی کہلائے گا جو اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کرے۔

ابدی مقصد...... اور نصب العین بھی معمولی نہیں ہونا چاہئے۔ اس واسطے کہ جب عمر لمبی اور ابد الآباد تک کی ہے تو مقصد ایسا ہو جو ابد الآباد تک چلے، چند دن میں ختم ہو جائے وہ بھی دیوانگی ہوگی کہ عمر تو لاکھوں برس کی لے کر آیا اور مقصد وہ سوچ لیا جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ پھر بلا مقصد کے عمر گزرے، پھر اس کے اوپر دیوانگی آجائے تو مقصد اور نصب العین زندگی کا ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے جیسی خدا نے عمر دی ہے کہ عمر لمبی ہے تو مقصد بھی لمبا ہو۔ اگر وہ دس جہان طے کرے تو وہ مقصد بھی دس جہان طے کرے، اس لئے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ زندگی جیسی نعمت اور دولت جو انمول موتی کی طرح سے ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتی، اس کے لئے کوئی ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ مقصد ہونا چاہئے کہ ہماری دانش کے بھی سب قائل ہو جائیں اور خود انسان بھی ایک دوسرے کا قائل ہو کہ واقعی صحیح مقصد ہے۔

وقتی دولت اور روٹی مقصد نہیں...... مقاصد دنیا میں بہت ہیں، مثلاً عمر کا ایک مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی لمبی چوڑی عمر، کا مقصد روٹی فرض کرلیں کہ ہمیں کھانے کو ملے، یہ مقصد اور نصب العین تو ہے لیکن یہ کیا نصب العین ہے جس کے لئے نہ فضیلت کی ضرورت نہ کمال کی ضرورت نہ علم کی ضرورت یہ مقصد بے پڑھے لکھے کو بھی حاصل ہے۔ روٹی ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کی انتہائی توہین ہے اگر اس کا مقصد روٹی بنایا جائے، اس لئے کہ روٹی جانور کا بھی مقصد ہے۔ ہر جاندار اپنے اپنے مناسب روٹی کھاتا ہے، شیر اور بھیڑیا جو کھاتے ہیں، کیا انہیں کوئی ڈگریاں حاصل ہوتی ہیں، جن سے یہ کماتے ہیں؟ تو روٹی اور کھانا ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں، عالم کو بھی ملتا ہے، جاہل کو بھی۔ غرض ایسی چیز کو مقصد زندگی قرار دینا جس کے لئے قطعاً علم وشعور کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی کی توہین ہوگی۔

پھر یہ کہ زندگی ابدالآباد کی مل رہی ہے اور مقصد وہ ٹھہرایا ہے جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ جب آدمی کا سانس ختم ہوا تو روٹی بھی ختم، روٹی اسے چھوڑ گئی یہ روٹی کو چھوڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ پھر بلا نصب العین کے زندگی رہ گئی، اس لئے لمبی زندگی کا نصب العین لمبا ہونا چاہئے اس لئے روٹی مقصد نہیں بن سکتی۔

دولت بھی اسی میں شامل ہے۔ آپ دولت کمانے کو نصب العین رکھیں گے تو یہ کوئی اونچا مقصد نہیں، یہ ایک وسیلہ ہے اور ضرورت کی چیز ہے، انسان جب تک دنیا میں زندہ رہے گا۔ کمائے گا بھی اور اسے حکم بھی ہے کہ کمائے، یہ بھی نہیں کہ معطل ہو کے بیٹھ جائے، لیکن مقصد زندگی نہیں، کمانا خود کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے، کمانا خود مقصد نہیں اگر وہ مقصد جو کمانے سے پورا ہوتا ہے کسی اور طریق سے پورا ہو جائے تو اس کمانے کو یقیناً چھوڑ دیا جائے گا مثلاً پیٹ بھرنا ہے، کپڑے پہننا یا رہنا سہنا یعنی مکان بنانا، یہ بڑا مقصد ہے۔ اگر اللہ میاں کسی ایسے جہان میں بھیج دیں جہاں ہمیں اس طرح کے مکان کی ضرورت پڑے نہ پیٹ بھرنے کی ضرورت پڑے، تو کمانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، غرض یہ زندگی کا نصب العین نہیں بن سکتا ایک وقتی چیز ہے۔

پھر یہ کہ اس جہاں کی کوئی کتنی بھی بڑی چیز ہے، یہ بھی اس میں داخل ہے کہ جب آدمی اس جہان کو چھوڑے گا وہ چیز اسے چھوڑ دے گی، یہ اس کو چھوڑ دے گا، پھر وہ نصب العین ہی کیا ہوا۔؟ ہمیں ایسا نصب العین چاہئے جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ چلے، کروڑوں برس کی عمر ہو جب بھی وہ چلتا رہے، جبھی عمر کی توقیر ہوگی اور اللہ کے انعام کی قدر ہوگی۔ ورنہ انتہائی بے قدری ہوگی کہ اتنی بڑی نعمت اور اس کے لئے کوئی مقصد ہی نہ ہو اور اگر ہو تو پانچ برس کا ہو۔

عزت وجاہ بھی مقصد نہیں...... یا مثلاً ایک مقصد یہ ہے کہ روٹی بھی نہیں، دولت بھی نہیں، کرسی مقصد ہے یعنی عزت اور جاہ ہمارا مقصد ہے کہ آدمی عزت کے ساتھ زندگی گزارے۔

یہ مقصد برا نہیں ہے۔ مگر انتہائی بے بنیاد مقصد ہے اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، اس واسطے کہ جس کو ہم عزت سمجھتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ہمیں بڑا سمجھیں اس کا مطلب یہ نکلا کہ لوگوں کا خیال ہماری طرف سے صحیح ہو تو عزت ہماری ہے اور ہاتھ میں لوگوں کے ہے؟ اور وہ بھی خیالی۔ ذرا وہ خیال بدل دیں، بس ہماری عزت ختم ہوگئی۔ آج اگر لوگوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈال دیا، ہم عزت والے اور کل کو پبلک خفا ہو کر جوتیوں کا ہار ڈال دے، بس ذلیل ہو گئے۔ یہ کیا مقصد ہوا؟ اول تو خیالی اور خیال بھی دوسرے کا؟

اگر ہمارے ہی خیال سے عزت قائم ہوتی، تو ہم تخیل باندھے بیٹھے رہتے کہ ہم بڑے باعزت ہیں اور عمر بھر اس تخیل کو نہ چھوڑتے، تو عمر بھر عزت والے تو رہتے، عزت ہماری، قبضے میں دوسرے کے وہ بھی خیالی۔ اور وہ خیال اس کے بھی ہاتھ میں نہیں۔ آج خیال بدل گیا تو کل ہماری بے عزتی ہوگئی تو لمبی چوڑی عمر اتنی بڑی نعمت کا نصب العین ایک بے بنیاد اور خیالی چیز؟

حقیقی عزت...... حقیقی عزت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں کوئی مقبول ہو، اسے عزت کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی کو مقبولیت

دے اور اپنی مخلوق کے دلوں میں اس کی عزت ڈال دے، وہ عزت ہے وہ خیال کی نہیں واقعی عزت ہوتی ہے۔حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حق تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبریل کو فرماتے ہیں، میں نے فلاں بندے سے محبت کی، تو بھی اس سے محبت کر۔ حضرت جبریلؑ کے دل میں محبت آ جاتی ہے، جبریل علیہ السلام آسمان اول کے ملائکہ میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب نے محبت کی تم بھی محبت کرو، آسمان دوم میں اس کی محبت ہوتی ہے، وہ تیسرے کو، وہ چوتھے کو، یہاں تک کہ اس آسمان دنیا تک محبت آ جاتی ہے۔تمام ملائکہ میں وہ محبوب بن جاتا ہے۔اس کے بعد یہ ملائکہ علوی ملائکہ سفلیٰ کو الہام کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں سے محبت کی، تم بھی محبت کرو، ان کے دلوں میں محبت آ جاتی ہے وہ ملائکہ سُفلیٰ اولیائے کرام جو دنیا میں محبوبانِ الٰہی ہیں، کے قلوب میں الہام کرتے ہیں کہ ہم سب محبت کرتے ہیں تم بھی محبت کرو، تو خواص اہل اللہ کے قلب میں محبت آ جاتی ہے۔ پھر ان کے آس پاس کے حلقوں کے اندر محبت پہنچتی ہے، ’’فَيُوْضَعُ لَهٗ قُبُوْلُهٗ فِي الْاَرْضِ‘‘ ① اس کی مقبولیت پوری زمین میں پھیل جاتی ہے اسے کچھ کرنا دھرنا نہیں پڑا اور محبت آسمانوں دنیا کے اندر پھیل جاتی ہے۔تو حقیقی عزت وعظمت یہ ہے کہ من جانب اللہ اس کی مقبولیت دنیا میں پھیل جائے، یہ اصل عزت ہے، اسی لئے نہ اپنے تخیل سے اپنے کو عزت دار سمجھے نہ چند افراد کے دماغ پر روغن قاز مل کر کوشش کرے کہ تم تخیل میں مجھے بڑا سمجھو، یہ خیالی چیز ہوگی، جب خیال بدل جائے گا، عزت ختم ہو جائے گی لیکن جس کی عزت ملاءِ اعلیٰ میں قائم ہوگی، ملائکہ علوی وسُفلیٰ کے دلوں میں جس کی محبت قائم ہوگی، وہ محبت بنیادوں پر قائم ہے تخیلات پر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے باطن میں اگر کسی محبت کی قائم ہے وہ اٹل ہے اور اتنی قوی بنیاد پر ہے کہ اسے کوئی مٹانیوالا نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی محبت یہی ہوتی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کی محبت ہوتی ہے پھر عالم میں ان کی محبوبیت پھیلا دی جاتی ہے۔اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور ائمہ مجتہدین کی محبت اٹل بنیادوں پر ہوتی ہے۔وہ دنیا سے گزر جائیں مگر ان کی محبت نہیں گزرتی۔ انبیاء علیہم السلام میں سے آج اگر کسی پیغمبر کا نام نامی آئے گا گردنیں عظمت سے جھک جائیں گی ہم درود شریف پڑھنا شروع کر دیں گے۔

یہ کیا چیز ہے؟ آج یہ ہستیاں اس عالم میں نہیں ہیں مگر دلوں کے اندر محبت موجود ہے، نسلاً بعد نسلٍ چلی جا رہی ہے۔صدیاں گزر گئیں مگر محبت اٹل ہے۔اس لئے کہ اس محبت کی بنیادوں میں حق تعالیٰ کے باطن سے چلنے والی محبت ہے جو مٹنے والی نہیں ہے۔ آج دنیا میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ موجود نہیں ہیں۔آج حضرت صابر کلیریؒ موجود نہیں ہیں۔شیخ شہاب الدین سہروردیؒ موجود نہیں ہیں۔لیکن قلوب میں محبت قائم ہے، ان لوگوں کے نام آتے ہیں تو ہماری زبانوں سے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نکلتا ہے۔عظمت سے ہم گردنیں جھکا دیتے ہیں۔وہ ہستیاں موجود نہیں، مگر محبوبیت موجود ہے، اس لئے کہ یہ محبوبیت اللہ سے چلی اور بندوں تک پہنچی، خواص سے

① الصحیح لمسلم کتاب البر والصلة والآداب، باب اذا احب اللہ عبدا حببه الی عبادہ، ج:۱۳ ص:۸۶ رقم: ۴۷۷۲.

شروع ہوئی عوام تک پہنچی۔

عزت کے بارے میں سنہری اصول......اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ جو مقبولیت عوام سے اوپر کی طرف چلتی ہے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ عوام میں پھیل گئی آگے خواص میں اس کا کوئی وجود نہیں، وہ عزت فرضی ہوتی ہے، چند دن کے بعد زائل ہو جاتی ہے اور جو خواص سے چلے، عوام کی طرف آئے وہ حقیقی عزت ہوتی ہے، تو میں نے عرض کیا انبیاء علیہم السلام، اولیائے کرام، علمائے ربانی اور صالح بندوں کی محبت، کوئی کارنامہ کر جانے والوں کی محبت جو رہتی دنیا تک قلوب میں باقی رہتی ہے وہ حقیقی عزت ہے۔ اس کی بنیاد فرضی نہیں ہوتی۔ آدمی کا خیال نہیں ہوتا قلب کی گہرائی ہوتی ہے۔ اگر آدمی یہ بھی چاہے کہ میں اپنے خیال سے یہ محبت نکال دوں، اسے قدرت نہیں ہوتی۔ اس کا دل ملامت کرے گا کہ نہیں تجھے محبت رکھنی پڑے گی، اس لئے کہ وہ بنیادوں پر قائم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عزت وہ ہے جو اللہ کی طرف سے چلے۔ مقبولیت عند اللہ ہو۔ وہ عزت نہیں ہے کہ لوگوں کے تخیلات کے اوپر اس کی بنا ہو۔ کیونکہ خیال رات دن بدلنے والی چیز ہے۔ تو ایسی محبت وعزت جو کہ خیالی ہو، اس کو ہم اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ یہ زندگی کی توہین ہے، زندگی امر واقعی اور نصب العین فرضی اور خیالی بنا رہے ہیں زندگی کی بنیادیں اٹل کہ انسان ابدی ہے اور عزت جو نصب العین ٹھہرا، اس کی کوئی بنیاد نہیں کہ کل کو ہے، پرسوں کو نہیں، یہ زندگی کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے یہ بھی نصب العین نہیں بن سکتی۔ تو نہ دولت اور رسمی عزت مقصد زندگی بن سکتی ہے نہ روٹی بن سکتی ہے۔ اگر دنیا ہی تک زندگی محدود ہوتی تو چلو ہم یہی نصب العین قرار دے لیتے مگر مشکل یہ ہے کہ زندگی آگے جانیوالی ہے۔ یہ زندگی کا کروڑواں معمولی حصہ ہے دائمی اور ابدی زندگی تو آگے ہے اس واسطے کوئی اور نصب العین ہونا چاہئے۔

انسان کا علم......وہ نصب العین کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ انسان تجویز نہیں کر سکتا، انسان بے چارہ محدود ہے وہ اپنے حال کی بات دیکھے گا۔ اس کا ماحول ایک محدود ماحول ہے۔ اس کے اندر وہ گھرا ہوا ہے، وہیں کی سوچے گا۔ تو انسان بے چارے کا تخیل ہی کیا؟ اس کی عقل ہی کیا؟ کہ وہ ایک لامحدود نصب العین سوچ لے۔ اپنے تخیل کے دائرے میں سوچے گا وہ محدود چیز ہوگی، کارآمد نہیں ہوگی۔ اس لئے انسانی زندگی کا نصب العین وہ بتلا سکتا ہے جو خود بھی لامحدود ہو، اس کا علم بھی ازلی ابدی ہو ازل سے ہے اور ابد تک جانے والا ہے۔ وہ خود انسان کا خالق ہے، اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو جانتا ہے۔ اس کے داؤ بھات سے واقف ہے فرمایا گیا ﴿**اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ**﴾ ①

جس نے پیدا کیا۔ کیا وہ نہیں جانے گا مخلوق کو؟ وہی ہے اصل میں جاننے والا۔ ہم تم اپنے سے اتنے واقف نہیں ہیں جتنا ہمارا خالق ہم سے واقف ہے، ہمیں آج یہ پتہ ہے ہی نہیں کہ ہمارے پیٹ میں کیا ہو رہا ہے، یعنی

① پارہ: ۲۹، سورة الملک، الآیة: ۱۴۔

پیٹ ہمارا، نفس ہمارا، خود ہمیں ہی پتہ نہیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ عظیم الشان مشین ہے جو چل رہی ہے۔ غذا پہنچ رہی ہے۔ معدہ اپنا کام کر رہا ہے، جگر، دل اور دماغ اپنا کام کر رہا ہے۔ جب آپ لقمہ کھاتے ہیں وہ معدے میں پہنچتا ہے معدہ اسے لے کر سفید حریرہ بنا دیتا ہے اور کچھ فضلات ہیں جن کو انتڑیوں کی طرف پھینک دیتا ہے اور اس کا جوہر جگر کی طرف پھینک دیتا ہے جگر کو کہتے ہیں کہ یہ طباخ بدن ہے (بدن کا باورچی) جگر اس حریرے کو پکاتا ہے۔ جب ہنڈیا پکتی ہے تو ایک حصہ اوپر جھاگ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک حصہ تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے، ایک حصہ بیچ بیچ میں ہوتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو جوہر بنتا ہے، وہ جو اوپر کا جھاگ کا حصہ ہے وہ بلغم ہے جو نیچے تلچھٹ کا حصہ ہے وہ سودا ہے، جو بین بین ہے وہ صفرا ہے اور ان تینوں چیزوں سے مل کر جو جوہر بنتا ہے۔ اسے خون کہتے ہیں۔ یہ چار خلطیں تیار ہوئیں جگر باریک رگوں کے ذریعہ خون کو قلب کے اندر بھیجتا ہے، قلب کے بارے میں اطباء لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہے جیسے چوگڑی ہوتی ہے کہ بیچ میں سے دبا ہوا دونوں کنارے پھیلے ہوئے، جیسے اگالدان ہوتا ہے تو بیچ میں سے پتلا اور دونوں کنارے چوڑے، یہ قلب کی صورت ہے۔ اس کا ایک حصہ بطن عالی اور ایک بطن سافل کہلاتا ہے۔ یہ خون بطن سافل کے اندر پہنچتا ہے قلب اس کو پھر اپنی حرارت سے پکاتا ہے۔ اس کے پکانے سے ایک لطیف بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ وہ روح حیوانی کہلاتی ہے، اس روح کے اوپر پھر اوپر سے روح آتی ہے جس کو روح ربانی کہتے ہیں، اس سے انسانی کے علم اور ادراک کا تعلق ہے۔ تو بدن کا حصہ نیچے ایک سواری ہے اس پر روح حیوانی سوار ہے پھر روح حیوانی ایک سواری ہے اس پر روح ربانی سوار ہے اس طرح سے یہ تین چیزیں ہیں جو مل کر سفر طے کر رہی ہیں۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ کس طرح غذائیں پہنچ رہی ہیں اور ہضم ہو رہی ہیں اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بن رہی ہیں لیکن انسان کو خود کو اس وقت پتہ نہیں کہ معدہ کیا کر رہا ہے، جگر کیا کر رہا ہے اور قلب کیا کر رہا ہے؟ جب ہمارے اندر سب کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تو اس کا محدود علم ہے۔ تو لامحدود زندگی کا نصب العین کیسے تجویز کرے گا؟ یہ اگر تجویز کرے گا تو چند روزہ ہوگا جیسے خود اس بیچارے کا علم چند روزہ ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ زندگی کا نصب العین تجویز کرنے والا وہ ہو جو زندگی کا خالق ہے۔ وہی اس کے اول و آخر سے واقف ہے۔ وہی نصب العین متعین بھی فرما سکتا ہے۔

خالق انسان کا تجویز کردہ نصب العین...... اس خالق نے ایک نصب العین تجویز فرمایا اور اپنے فرمان کے ذریعے ہم تک بھیج دیا جس کو قرآن کریم کہتے ہیں، فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری اطاعت کریں، تو مقصد زندگی درحقیقت اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت نکلی، عبادت کا لفظ سن کر ممکن ہے کہ آپ کو یہ تخیل پیدا ہوا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ جا کے مسجد میں بیٹھو، کوٹھی بھی چھوڑ دو اور بنگلہ بھی اور مسجد کا رستہ لو، عبادت تو وہاں ہوگی۔ اور ممکن ہے یہ کہا جائے کہ

---

① پارہ: ۲۷، سورة الذاريات، الآية: ۵۶.

بھائی! یہ دولت جو ہے اسے خیر باد کہو، یہ سب کچھ صدقہ کر کے جاؤ اللہ کے راستہ میں، اور اپنا گھر بار چھوڑو۔

دولت سے بھی خدا ملتا ہے..... تو میں عرض کئے دیتا ہوں کہ یہ غلط تخیل ہے اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ انسان جس دائرے میں رہے اسے مایوس نہیں کرتا، خدا تک پہنچنے کا لازمی راستہ بتلاتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انسان آج جس دائرے میں ہے، اس دائرے کو چھوڑ کر فلاں دائرے میں جائے جب تو مجھ تک آئے گا اور اگر نہیں چھوڑے گا تو مجھ تک نہیں آئے گا، ایسا نہیں ہے۔

اگر ایک آدمی دولت مند ہے۔ اسے اسلام یہ کبھی نہیں کہے گا کہ تو اپنی ساری دولت کو ختم کر دے بلکہ اسی دولت کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اس کے صرف اور آمد کا طریقہ بتلائے گا، اس کے قوانین بتلائے گا کہ میری اطاعت کے تحت اس کو خرچ کر۔ اور میری اطاعت کے تحت اس کو حاصل کر یہ سب تیرے لئے عبادت ہے، تو اس طرح کرنے سے مجھ تک پہنچ جائیگا، تو دولت مند کو کہے گا کہ تو دولت کے راستے سے مجھ تک پہنچ۔

اس واسطے کہ ہزاروں عبادتیں ہیں جن کا تعلق ہی مال سے ہے۔ اگر دولت نہیں ہوگی تو آدمی زکوٰۃ کیسے دے گا؟ صدقۂ فطر کیسے دے گا؟ خیرات کیسے کرے گا؟ صلہ رحمی کیسے کرے گا؟ حج کیسے کرے گا؟ اجتماعی امور کیسے انجام دے گا؟ غرض خیرات وصدقات اور چندے، یہ سارے اعمال انجام نہیں دے سکتا جب تک دولت نہ ہو اور یہ سارے کام اسلام کے ہیں۔ اسلام کیسے کہہ دے گا۔ کہ دولت کو ضائع کر دو یا حاصل نہ کرو یا آ گئی ہے تو اسے کھو دو، بلکہ اسی کو رکھ کر اسی دائرے میں سے راستہ نکال دے گا کہ اس کے اوپر چلو۔

غربت سے بھی خدا ملتا ہے..... لیکن اگر دولت مندوں کو اسلام نے راستہ بتلایا کہ تم اپنی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بناؤ۔ تو ممکن تھا کہ ایک غریب آدمی کا دل ٹوٹتا کہ بس دولت مند دنیا اور آخرت دونوں کما لے گیا۔ میں یہاں بھی محروم وہاں بھی محروم، نہ صدقہ دے سکتا ہوں نہ خیرات نہ صلہ رحمی کے قابل ہوں تو میں دنیا میں بھی ایسے ہی بے چارہ و بے کس رہا اور آخرت میں پہنچا تو بھی عبادتیں کم ہوئیں اس کا دل ٹوٹا۔ اسلام نے فوراً ڈھارس دی کہ تو بھی مایوس مت ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ: ''اے غریب! تو اپنی غربت پر پریشان مت ہو، اس وقت کو یاد کر کہ قیامت کے دن امراء اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہوں گے اور غرباء پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل بھی ہو چکے ہوں گے''۔

تو غریب نے کہا کہ مجھے میری غربت مبارک، مجھے تموّل کی ضرورت نہیں ہے، یہ پانچ سو برس کی مدت خدا جانے کیسے گزرے گی؟۔ حساب دے سکیں نہ دے سکیں؟۔ کوئی عتاب نہ ہو، مصیبت نہ کہیں بھگتنی پڑے۔ دنیا کی ساٹھ ستر برس کی عمر تو گزر ہی جائے گی۔ میں سچے دل سے اپنی غربت پر خوش ہوں، تو اسے دولت کی نعمت دی اور اسے استغناء کی نعمت دی، دولت نہیں ہے مگر اس کا دل غنی ہے۔ ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بعض دفعہ ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرماتے تھے۔

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا ——— نے غم وزد نے غم کالا!

ایک لنگی اوپر سے اوڑھ لی، ایک باندھ لی، نہ چور کا ڈر نہ چکار کا ڈر، بس غنی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت مند کو دولت کی وجہ سے ہزار مصیبتیں ہیں، اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے، کہیں چور، ڈاکو نہ آ جائے، حاکم حسد کرے تو اس سے بھی کسی طرح بچوں اور دولت کو بچاؤں کہیں ٹیکسوں کا اور محصول کا قصہ' غرض صبح سے شام تک ایک مصیبت ہے مگر غریب کہتا ہے کہ میں مصیبت زدہ نہیں ہوں۔

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا ——— نے غم وزد نے غم کالا!

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

ماہیچ نداریم ، غم ہیچ نداریم ——— دستار نداریم غم پیچ نداریم

ہم کچھ نہیں رکھتے، اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے، ہم دستار ہی نہیں رکھتے' اس لئے پیچ وخم کا بھی ہمیں غم نہیں پیچ وخم کے غم میں تو وہ پڑے جو دستار رکھتا ہو۔

غرض ایک دولت مند کو اگر مادی دولت دی گئی، تو غریب آدمی کو جو صابر اور محتسب ہے اس کو استغناء کی دولت دی گئی یہ کمال غناء سے بادشاہوں سے زیادہ مزے میں اور مطمئن ہے۔ فرمایا گیا کہ دنیا میں تجھے یہ نعمت ملی کہ تجھے غنی بنا دیا گیا سینکڑوں مصیبتوں سے چھوٹ گیا اور آخرت کی یہ نعمت ہے کہ پانچ سو برس پہلے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور امراء ابھی حساب و کتاب میں ہوں گے، تو دولت مند یوں خوش ہے کہ میں اپنی دولت سے جنت کما رہا ہوں، غریب آدمی یوں خوش ہے کہ میں اپنے غناء سے جنت کما رہا ہوں، تو اسلام نے کسی حالت میں مایوس نہ کیا، نہ دولت مند کو یہ کہا کہ تو فقیر بن۔ نہ فقیر کو یہ کہا کہ تو دولت مند بن ہر ایک حالت و کیفیت میں اس کو تسلی دی اور اسے راستہ بتلا دیا، یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ کسی حالت کے بدلے بغیر اسی حالت میں اسلام راستہ نکالتا ہے، مایوس نہیں ہونے دیتا۔

صحت و مرض میں بھی خدا ملتا ہے...... حدیث میں فرمایا گیا سب سے بڑی نعمت جس پر رشک کیا جائے، وہ صحت و تندرستی ہے صحت نہ ہو تو عبادت کیسے کرے؟ حج کو کیسے جائے؟ نماز کیسے پڑھے؟ روزہ کیسے رکھے؟ گویا ساری عبادتیں صحت سے وابستہ ہیں، اس لئے اس کی فضیلتیں بیان کی گئیں۔ صحت مند اور تندرست آدمی خوش ہے کہ مجھے اللہ نے صحت دی ہے، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جانی عبادت بھی کر رہا ہوں، محنت بھی اٹھا رہا ہوں، حج کو بھی جا رہا ہوں لیکن بیمار کا دل ٹوٹا کہ افسوس میں کچھ عمل نہ کر سکا، نہ میں مسجد تک جا سکتا ہوں نہ میں حج کرنے جا سکتا ہوں نہ میں جہاد کے لئے جا سکتا ہوں، کوئی کام بھی میں نہیں کر سکتا، افسوس میں محروم رہا۔ اسلام نے آ کر فوراً تسلی دی کہ پریشان مت ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ بعضے بندوں سے پوچھیں گے کہ۔ اے بندے! میں بیمار ہوا تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔؟ میں مریض ہوا تو میری مزاج پرسی کو نہ حاضر ہوا؟

بندہ کہے گا، اے اللہ! آپ تو رب ہیں آپ کو بیماری سے کیا تعلق؟ بیماری تو عیب اور نقص کی چیز ہے۔ آپ ہر نقص اور برائی سے بری ہیں۔ ①

فرمائیں گے فلاں بندہ بیمار ہوا تھا۔ اگر تو بیمار پرسی کے لئے جاتا، مجھے اس کی چارپائی کی پٹی پر موجود پاتا۔ بیمار کا دل بڑھ گیا کہ میری وہ خصوصیت ہے کہ بیماری میں حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے، کسی تندرست کی چارپائی پر حق تعالیٰ نہیں ہیں اور بیمار کی چارپائی پر موجود ہیں۔ یعنی خاص تجلی، لطف وکرم اور عنایت موجود ہے۔ کسی تندرست کے بارے میں حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تندرستی اپنے اوپر لے کر کہا ہو کہ میں تندرست تھا۔ تو میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ بیمار کے بارے میں اپنے اوپر لیکر فرمایا کہ میں بیمار ہوا، تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔ گویا بیمار اتنا عزیز ہے کہ اس کی بیماری کو اپنی بیماری فرمایا کہ میں بیمار ہوا۔ تو بیمار کا دل بڑھ گیا کہ ایسی تندرستی کو سلام ہے جسے اتنا قرب نہ ہو، مجھے یہ بیماری عزیز اور مبارک ہے میں اس بیماری کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ توجہ الی اللہ کا ذریعہ بن رہی ہے اور درجات ومراتب طے ہو رہے ہیں۔

صبر کا پھل..... حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، ایک ناسور پھوڑے کے اندر بتیس برس مبتلا رہے ہیں، جو پہلو پر تھا اور چت لیٹے رہتے تھے، کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ یعنی بتیس برس تک چت ہی لیٹے لیٹے کھانا بھی، پینا بھی، عبادت کرنا بھی، قضائے حاجت کرنا بھی۔ آپ اندازہ کیجئے بتیس برس ایک شخص ایک پہلو پر پڑا رہے، اس پر کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی بڑی بیماری ہے؟

یہ تو بیماری کی کیفیت تھی۔ لیکن چہرہ اتنا ہشاش بشاش کہ کسی تندرست کو وہ چہرہ میسر نہیں، لوگوں کو حیرت تھی کہ بیماری اتنی شدید کہ برس گزر گئے کروٹ نہیں بدل سکتے اور چہرہ دیکھو تو ایسا کھلا ہوا کہ تندرستوں کو بھی نصیب نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت!۔ یہ کیا بات ہے کہ بیماری تو اتنی شدید اور اتنی ممتد اور لمبی چوڑی اور آپ کے چہرے پر اتنی بشاشت اور تازگی کہ کسی تندرست کو بھی نصیب نہیں؟ فرمایا:

جب بیماری میرے اوپر آئی، میں نے صبر کیا، میں نے یہ کہا کہ: اللہ کی طرف سے میرے لئے عطیہ ہے۔ اللہ نے میرے لئے یہی مصلحت سمجھی۔ میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس صبر کا اللہ نے مجھے یہ پھل دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ ملائکہ علیہم السلام سے مصافحے کرتا ہوں۔ مجھے عالم غیب کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ عالم غیب میرے اوپر کھلا ہوا ہے۔

تو جس بیمار کے اوپر عالم غیب کا انکشاف ہو جائے۔ ملائکہ کی آمد ورفت محسوس ہونے لگے اسے کیا مصیبت ہے کہ وہ تندرستی چاہے؟ اس کے لئے تو بیماری ہزار درجے کی نعمت ہے۔ حاصل یہ کہ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی، بیمار کو کہا کہ تیری بیماری اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے تو اگر اس میں صبر اور

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل عیادة المریض، ج: ۴ ص: ۹۹۰ رقم: ۲۵۶۹.

احتساب کرے گا حسبۃً للہ اس حالت پر صابر اور راضی رہے گا تیرے لئے درجات ہی درجات ہیں۔

پھر یہ بھی نہیں فرمایا کہ تو علاج مت کر علاج بھی کر، دوا دارو بھی کر مگر نتیجہ جو بھی نکلے، اس پر راضی رہ، اپنی جدوجہد کئے جا باقی افعال خداوندی میں مداخلت مت کر تیرا کام دوا کرنا ہے۔ تیرا یہ کام نہیں ہے کہ دوا کے اوپر نتیجہ بھی مرتب کردے کہ صحت ہونی چاہئے۔ یہ اللہ کا کام ہے، تو اپنا کام کر، اللہ کے کام میں دخل مت دے، دوا دارو کر، مگر اللہ کی طرف سے جو کچھ ہوجائے اس پر راضی رہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے، اس پر صبر کروگے، وہی بیماری ترقی درجات اور اخلاق کی بلندی کا ذریعہ بنتی جائے گی۔ اس سے آدمی کے روحانی مقامات طے ہوں گے، تندرست کو روحانیت کے وہ مقامات نہیں ملتے جو بیمار کو ملتے ہیں۔ تو بیماریوں کہے گا مجھے میری بیماری مبارک، مجھے تندرستی کی ضرورت نہیں۔ تندرستی میں مجھے یہ مقامات مل نہیں سکتے تھے، جو بیماری میں ملے۔

تو اسلام نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی کہ تو اس کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، بیمار کو بیماری میں تسلی دی کہ تو بیماری کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، تو بیماری کی وجہ سے محروم نہیں رہ سکتا، یہ خیال مت کر کہ جو کچھ ملنا تھا، تندرست کو مل گیا، میرے واسطے کچھ نہیں رہا۔ تیری بیماری میں تیرے لئے سب کچھ ہے۔ بہرحال ہر ایک کو اپنے دائرے اور اپنے مقام پر تسلی دینا یہ اسلام کا کام ہے۔

زندگی اور موت میں بھی خدا ملتا ہے...... زندگی ہے، یہ بڑی نعمت ہے، زندگی نہ ہو تو آدمی طاعت وعبادت کیسے کرے؟ ترقی کے مدارج کیسے طے ہوں؟ سارے کام زندگی سے متعلق ہیں موت جب آئے، مرنے والے کا دل ٹوٹا کہ یہ تو اپنی زندگی میں سب کچھ کما رہا ہے، میں تو ختم ہو چکا، میرے لئے اب کچھ نہ رہا، فوراً اسلام نے تسلی دی کہ بے صبر مت بن پریشان مت ہو۔ "تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ" ① مومن کا سب سے بڑا تحفہ موت ہے جو اس کو اللہ کی طرف سے عطاء کیا جاتا ہے فرمایا "اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يُّوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ." ② موت ایک پل ہے جس سے گزر کر حبیب اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے، اگر موت بیچ میں نہ ہو تو اللہ سے ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اگر یہ زندگی ختم ہو کر اگلی زندگی نہ آئے تو جمال خداوندی کے دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو اس سے مرنے والے کو تسلی ہوگئی کہ میں تو بڑے درجات کی طرف جا رہا ہوں مجھے زندگی نہیں چاہئے۔ بلکہ ایسے میں موت کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ" ③ اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول ہونے کا

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ١ ص: ٦٦ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجلہ ثقات دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ٢ ص: ٣٢٠. ② یہ حضرت حبان الاسود کا قول ہے۔ دیکھئے: فیض القدیر، ج: ٣ ص: ٣٠٧.

③ المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ٣ ص: ٤٧٨ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ١٠ ص: ٣٠٩.

قائل ہو۔ جو مجھے رسول مانتا ہے، اس کے دل میں موت کی محبت ڈال دے اس لئے کہ اگر اسے اللہ سے محبت ہے۔ اللہ تک پہنچانے والی چیز موت ہے تو اس سے بھی محبت ہوگی، کیونکہ منزل اگر محبوب ہے تو راستہ بھی عزیز اور محبوب ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ اولیاء اللہ تو ہم ہیں۔ فوراً قرآن کریم نے مطالبہ کیا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① اے یہود! اگر تمہیں یہ دعویٰ ہے کہ تم اولیاء اللہ ہو تو ذرا موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ۔ ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اس زندگی سے زیادہ موت کی محبت ہوتی ہے ان کی زبانوں پر یہ شعر رہتا ہے کہ:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ تا در میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس شہر مطلوب تک پہنچیں گے اور غزلخواں، شاداں اور فرحاں جائیں گے، وہ کون سا دن ہوگا کہ اس گندے جہان کو چھوڑ کر پاک جہان میں جائیں گے۔

ابن الفارض رحمہ اللہ، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کھول دی گئیں اور منکشف ہوئیں، تو ابن الفارضؒ نے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں اور یہ شعر پڑھا ۔

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِىْ فِى الْحُبِّ عِنْدَكُمْ ۔۔۔ مَاقَدْ رَاَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِىْ

اگر میری عمر بھر کی محنت کا ثمرہ یہ آٹھ کھلونے ہیں جو آپ نے رکھ دیئے تو افسوس میری عمر ضائع ہوگئی، مجھے کچھ نہ ملا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں، تجلیات خداوندی سامنے آئیں اور ان کی روح غرغرا کر پرواز کر گئی، تو ایک مرنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ تجلیات خداوندی میرے استقبال کو آ رہی ہیں، اسے کیسے زندگی کی تمنا باقی رہ سکتی ہے؟

حدیث میں ہے کہ جب مومن کے مرنے کا وقت آتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دائیں ہاتھ پر ہیں۔ لاکھوں کروڑوں فرشتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بائیں ہاتھ پر ہیں۔ دائیں ہاتھ والے مومنوں کی ارواح قبض کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے کفار کی ارواح قبض کرتے ہیں۔ دائیں ہاتھ والے روشن چہرے کے ملائکہ ہیں، سورج اور چاند کی طرح ان کے چہرے چمکتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے ملائکہ سود الوجوہ ہیں، سیاہ اور بھیانک چہرے ہیبت ناک ان کی شکلیں ہیں۔

مومن پر جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ دور سے کچھ ستارے اور روشنی دیکھتا ہے وہ تحیر (حیران) میں مبتلا ہوتا ہے کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ یہ چاند سورج کیسے ہیں؟

یہ جو وقت ہوتا ہے ادھر سے غفلت کا اور ادھر متوجہ ہونے کا ہوتا ہے۔ ابھی نزع نہیں شروع ہوا ابھی غفلت

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶.

طاری ہوئی، نزع تب شروع ہوگا جب سانس چلنے لگے لیکن ابتداءً یہ خوشی طاری ہے ہے اور یہ غفلت ہے کہ ادھر کا جہان چھپ جاتا ہے اور ادھر کا جہان روشن ہو جاتا ہے اور یہ نظر پڑتا ہے کہ لاکھوں چاند اور سورج ہیں جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ تو یہ تحیر میں دیکھتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا کارخانہ ہے؟۔ اور ملائکہ علیہم السلام یہ آہستہ آہستہ اس لئے بڑھتے ہیں کہ مقصد شفقت ہے، اگر ایک دم آ پڑیں تو یہ گھبرا نہ جائے کہ یہ کیا بات ہوگئی، اس لئے آہستہ آہستہ اس کے دل میں گنجائش کرتے ہوئے آتے ہیں کہ وہ سہتا جائے اور یہ سمجھتا جائے پھر اخیر میں قریب آ جاتے ہیں پھر اسے کوئی اوپری بات معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہ نہیں کہ آتے ہی روح قبض کرنی شروع کر دی۔ حدیث میں ہے کہ اس میت کو عالم آخرت کی ترغیب دلاتے ہیں اور دنیا سے نفرت دلاتے ہیں کہتے ہیں کہ ''اُخْرُجِیْ اَیَّتُھَا النَّفْسُ الطَّیِّبَۃُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّرَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرِ غَضْبَانَ'' ① اے پاک روح! اے پاک نفس! تو نے اپنے بدن کو نیک اعمال سے پاک کیا۔ اپنی روح کو بھی ذکر سے نیک کیا یا نیک کلمات سے پاک رکھا، تو اے پاک روح! اپنے پاک بدن سے چلی آ۔ اور کہاں جا؟ ''اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّرَیْحَانٍ'' بہاروں کی طرف اور نعمتوں کی طرف چل اور اس پروردگار کی طرف چل جو تجھ پر نامہربان نہیں، بلکہ شفیق، مہربان اور رحمت والا ہے، تیرا منتظر ہے۔ یہ گویا ترغیب دیتے ہیں تاکہ بندہ راضی ہو اور اس کی رضا کے بعد روح قبض کرنا شروع کریں۔

انبیاء علیہم اسلام کی ارواح قبض کرنے کے لئے ملک الموت آتے ہیں تو باقاعدہ اجازت مانگتے ہیں جب انبیاء علیہم اسلام اجازت دے دیتے ہیں تب قبض روح شروع ہوتا ہے۔ مومن سے اجازت نہیں لی جاتی مگر ترغیب دی جاتی ہے تاکہ وہ موت کے اوپر مطمئن ہو جائے۔ اس کی رضا حاصل ہو جائے تب قبض روح شروع ہو، تو یوں ترغیب دیتے ہیں کہ اس گندے جہاں کو چھوڑ اور اس پاک جہاں کی طرف چل، ادھر نفس کی حکومت تھی، ادھر اس رب کی حکومت ہے جو تجھ پر کبھی نامہربان نہیں ہے، ہمیشہ تجھ پر مہربان رہے گا، روح و ریحان اور نعمتوں کی طرف چل۔

سب جانتے ہیں کہ موت سے انسان کو طبعاً کراہت ہے، کتنی نعمتیں ہوں مگر موت قبول کرنے کے لئے آدمی تیار نہیں ہوتا، تو جب وہ اس ترغیب سے راضی نہیں ہوتا، حدیث میں ہے کہ پھر ملائکہ اس کو جنت کے تحفے دکھلاتے ہیں، کچھ پھل، کچھ لباس، اس کو دیکھ کر ایک دم روح پرواز کرنی شروع کر دیتی ہے اور تشبیہ دی گئی کہ اس طرح سے نکل جاتی ہے جیسے مشک میں پانی بھر کر پانی الٹ دو، اس کا منہ کھول کر نیچے کر دو اور سارا پانی غرغرا کر نکل جائے گا، ایک قطرہ باقی نہیں رہے گا، اس طرح روح شوق و ذوق میں پرواز کر جاتی ہے، تو ملائکہ علیہم السلام آتے ہیں، ترغیب دیتے ہیں، بندے کی رضا حاصل کرتے ہیں جب وہ راضی ہوتا ہے تب اس کی روح قبض کرتے ہیں، یہ ملائکہ علیہم السلام کی شفقت ہے، ملک الموت اس سے بات بھی کرتے ہیں۔

① المصنف لعبدالرزاق، کتاب الجنائز، باب الصبر والبکاء والنیاحۃ، ج: ۳ ص: ۵۶۶ رقم: ۶۷۰۲.

جب نزع شروع ہوا۔ یہ ملک الموت کے اعوان وانصار کا کام ہے، نزع ہونے کے بعد روح کا قبض کرنا اور قبضے میں لینا، یہ ملک الموت کا کام ہے، گویا ابتدائی مبادی یہ ملائکہ طے کرتے ہیں اور آخری نتیجہ ملک الموت علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی جیسے نعمت ہے موت بھی ایک نعمت ہے۔ اسلام نے اگر زندگی کی تعریف کی اور ترغیب دی اور کہا کہ تم دعائیں مانگو کہ ہماری عمر صالحات وحسنات کے ساتھ دراز ہو، اب ایک شخص زندہ ہے تو ممکن ہے مرنے والے کے دل میں مایوسی پیدا ہو کہ اسے تو سب کچھ مل گیا، میری عمر ختم ہوگئی، تو اسے اس حالت میں تسلی دی کہ تیری موت تیرے لئے تحفہ اور روح وریحان کا پیغام ہے حق تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا پیغام ہے، غرض یہ اس پر راضی کہ مجھے موت آ رہی ہے، وہ اس پر راضی کہ مجھے زندگی مل رہی ہے، نہ یہ مایوس نہ وہ مایوس۔ اسلام نے ہر ایک کو تسلی دی ہے کسی حالت میں اپنے پیرووں کو مایوس نہیں کرتا، ہزار مصیبتیں آجائیں اسلام مایوس نہیں ہونے دے گا۔ ہزار نعمتیں آجائیں اس میں راستے دکھلائے گا، مصائب کے بارے فرمایا ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ① کتنی مصیبت آجائے، کبھی مایوس مت ہونا، مومن کا کام نہیں ہے اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا۔

تو مصائب میں اسلام تسلی دیتا ہے کہ مصیبت سے مت گھبراؤ، مصیبت بھیجنے والے پر نظر رکھو، نعمت میں آدمی راضی کہ نعمت مل گئی، مصیبت آگئی تو صابر اس کے اندر بھی راضی کہ مجھے بھی نعمت مل گئی، میرے اخلاق میں وہ بلندی پیدا ہوئی کہ نعمتوں میں وہ بلندی پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ تو اس مصیبت نے میرے اخلاق اونچے کر دیئے۔ غرض کوئی حالت ایسی نہیں ہے کہ انسان کو مایوس بنا دیا گیا ہو۔

یہ میں نے اس پر عرض کیا کہ جب میں نے عبادت کا نام لیا تو ممکن ہے اس طرف تصور گیا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ کوٹھی بنگلے چھوڑو اور جاؤ مسجد کی طرف۔ یہ نہیں کہا جارہا، بلکہ کوئی حالت ایسی نہیں جس میں خدا نہ ملتا ہو، اگر آپ کوٹھی بنگلوں میں رہ کر چاہیں، وہاں بھی اللہ کو یاد کرسکتے ہیں۔ آپ کی نیت صحیح ہونی چاہئے۔ آپ کا نصب العین درست ہونا چاہئے، مال کماؤ تو جائز طریق پر خرچ کرو جائز طریق پر، تو کمانا بھی عبادت، خرچ کرنا بھی عبادت ہے، دونوں پر سچی نیت سے اس طرح اجر ملے گا جس طرح نماز پڑھنے پر ملتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس بنے جب خدا کو پائے گا۔

دولت اپنی ذات سے بری نہیں...... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب مقبول ہیں، لیکن ان میں مالدار بھی ہیں اور نادار بھی، لکھ پتی بھی ہیں اور کروڑ پتی بھی اور ابوذر غفاریؓ جیسے بھی جن کا مذہب یہ تھا کہ اگر ایک وقت کا کھانا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے کہ دوسرے وقت کے لئے آدمی جمع کرے تو جہاں ابوذر غفاریؓ جیسے صحابہؓ ہیں وہاں عبدالرحمن ابن عوفؓ جیسے بھی ہیں جو لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں میں ہیں جن کی تجارت تھی۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷.

ان کی تجارت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تھی اور حال یہ تھا کہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں روم، مصر اور شام میں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں اور نفع کا مال جب آتا تھا، تو یہ نہیں تھا کہ دس پانچ آدمی لے کر آجائیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور فرماتے تھے کہ گھر میں ڈالدو، وہ اس قدر ہوتا تھا کہ غلے کی طرح ڈھیر لگ جاتا تھا۔ دولت کی یہ کیفیت تھی۔

مگر اس کے ساتھ قلب کی کیا کیفیت تھی؟ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مہمانداری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان، دستر خوان پر جمع ہوتے تھے، جب نعمتیں چنی جاتیں، دستر خوان سج جاتا اور کھانے کیلئے بیٹھتے تو عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونا شروع کرتے بے اختیار دل بھر آتا اور فرماتے ''اے اللہ! تیرے نبی کے دستر خوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا جمع نہ ہوا اور میرے دستر خوان پر اتنی نعمتیں۔؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جا رہیں''۔ یہ کہہ کر روتے اتنا روتے کہ بے خود ہو جاتے، سارے حاضرین اور مہمان بھی روتے اور بے کھائے پیئے دستر خوان اٹھ جاتا۔

رات کو پھر دستر خوان بچھایا جاتا۔ پھر اللہ کی نعمتیں چنی جاتیں، پھر عبدالرحمٰن ابن عوفؓ پر گریہ طاری ہوتا اور کہتے کہ ''اے اللہ مہاجرین اولین اتنی غربت اور بے کسی سے دنیا سے گئے کہ فاقے پر فاقے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس غربت میں وفات پائی کہ کفن بھی پورا میسر نہیں تھا۔ اگر سر ڈھانپا جاتا تو پیر کھل جاتے تھے۔ پیر ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ آخر میں سر ڈھانپ دیا گیا اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال کر دفن کر دیا گیا۔ تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو یہ حالت اور عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا گھر پیسوں اور اشرفیوں سے بھرا پڑا ہے کہیں دنیا ہی میں میری جنت کی نعمتیں تو ختم نہیں کی جا رہی ہیں؟''

پھر روتے، سارے حاضرین روتے اور بے کھائے پیئے دستر خوان اٹھ جاتا، تین تین وقت کے فاقے اس طرح سے آتے تھے۔ تو دولت کا یہ حال اور قلب کا یہ حال؟ غرض اسلام دولت کا مخالف نہیں ہے، تمول کو برا نہیں کہتا لیکن تمول سے اگر دل بگڑ جائے اس دل کو اسلام برا کہتا ہے، دولت اس لئے نہیں ہے کہ دل کو بگاڑا جائے، بلکہ اس لئے ہے کہ صحیح دل رکھ کر اس کو صحیح مصرف میں لگایا جائے تو آدمی کی دولت بری نہیں ہے آدمی برا ہوتا ہے، آدمی برا ہے تو دولت بری ہو جائے گی، آدمی اچھا ہے تو دولت اچھی ہو جائے گی سامان اپنی ذات سے اچھا یا برا نہیں، سامان والے کو دیکھو کہ وہ اچھا ہے یا برا۔؟ وہ اچھا ہے تو سارا سامان اچھا۔ وہ برا ہے تو سارا سامان برا۔ لوگ خواہ مخواہ دولت کو برا کہتے ہیں۔ دولت بیچاری نے کیا قصور کیا ہے؟ آدمی اپنے کو دیکھے۔

دولت کی مثال ...... عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی عجیب مثال دی ہے فرمایا: دولت کی مثال ایک سمندر کی ہے اور انسان کا دل کشتی جیسا ہے۔ پانی اگر کشتی سے باہر رہے تو منزلیں طے کرے گی اور اگر کشتی کے اندر آ گیا تو کشتی بھی گئی اور کشتی والا بھی گیا، تو فرمایا:

دولت ایک سمندر کی مانند ہے اور ہمارے دل کشتیوں کی مانند ہیں۔ اگر دولت دل سے باہر باہر ہے تو پار لگا کے آخرت کے کنارے پر پہنچا دے گی۔ لیکن اگر دل کے اندر آ گئی تو دل بھی ڈوبا اور دل والا بھی ڈوبا، غرض دولت کی برائی نہیں، دولت کا محل بتایا کہ دل سے باہر ہاتھ پاؤں میں رکھو کماؤ، کھاؤ پیو اور خرچ کرو، لیکن رہنی چاہئے ہاتھ پیر کے اندر۔ دل کے اندر فقط محبت خداوندی ہونی چاہئے۔ دولت کی محبت نہیں ہونی چاہئے۔

طبعی محبت کی رعایت...... اور اگر تھوڑی بہت طبعی طور پر محبت ہو بھی، آخر بالکل محبت کو کیسے دل سے نکال دے، کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے۔ تو اسلام نے بھی یہ نہیں کہا کہ بالکل محبت نکال دو تمہیں طبعی طور پر محبت و تعلق ہے، لہذا رکھو، مگر وہ محبت اتنی نہ ہو کہ جب محبت خداوندی کا مقابلہ پڑے تو یہ محبت غالب آ جائے۔ مقابلہ پڑے تو وہ محبت غالب رہنی چاہئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر تمہارے ماں باپ اور اولاد اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ' تمہارے اموال اور تمہاری تجارتیں جن میں کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار کھوٹا نہ ہونا چاہئے اور تمہاری بلڈنگیں' اعلیٰ اعلیٰ مکانات و محلات جن سے تم راضی ہو اور تمہارے قلوب میں کشش موجود ہے، ﴿اَحَبَّ اِلَيْكُمْ﴾ اگر یہ اللہ کی محبت کے مقابلہ میں زیادہ محبوب بن گئے تو مصائب اور فتنوں کا انتظار کرو۔

اس میں بتلا دیا گیا کہ "اَحَبِّيَّتُ" کی ممانعت ہے کہ بمقابلۂ خدا زیادہ محبوب نہیں ہونا چاہئے۔ معلوم ہوا تھوڑی بہت محبت ہو تو اجازت دی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنے مال اور اپنی چیزوں سے محبت ہوتی ہے، ہر انسان ولی کامل نہیں ہوتا۔ یہ پیغمبروں کے مقامات ہیں کہ ذرہ برابر قلب میں لگاؤ نہیں ہے، اولیاء کے مقامات ہیں کہ دولت یا مال سے ذرہ برابر لگاؤ نہیں' اب ہم اور آپ اس مقام تک کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محبت رکھو ہم نکالنا نہیں چاہتے، مگر مقابلہ پڑ جائے تو یہ دیکھو کہ محبت خداوندی کے مقابلے میں یہ مغلوب ہے یا غالب ہے؟ اگر غالب ہو تو پھر مصیبتوں کا انتظار کرو۔ اگر مغلوب ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، بہر حال اس کی گنجائش دی ہے۔ معلوم ہوا دولت کے اندر رہ کر بلکہ دولت کی کچھ نہ کچھ محبت رکھ کر پھر بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دولت اس سے چھینی جائے تب اللہ تک پہنچے یہ اسی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔ حاصل یہ نکلا کہ عبادت کا لفظ سن کر یہ دھیان نہ جانا چاہئے کہ گھر بار چھوڑ کر مسجد میں جاؤ، مسجد میں بھی خدا ملتا ہے گھر میں بھی ملتا ہے۔

انسان ہر حال میں خدا تک پہنچ سکتا ہے...... کھانا کھاتے ہوئے دستر خوان پر بھی ملتا ہے حتیٰ کہ استنجاء تک

---

① پارہ: ۱۰، سورة التوبة، الآية: ۲۴.

جاتے ہوئے بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ایک آدمی کھانا کھار ہا ہے اور اس نیت سے کھار ہا ہے کہ اگر میرے پیٹ میں کچھ قوت پڑ جائے تو اللہ کے راستہ میں عبادت وطاعت میں صرف کروں گا۔ وہ پورا کھانا عبادت میں داخل ہے اور اس شان سے داخل ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ جس نے بسم اللہ سے کھانا شروع کیا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا پر ختم کیا یعنی کھا کر یہ کہا فرماتے ہیں: غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِ پچھلے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں کھائی روٹی اور معاصی کی بخشش ہو رہی ہے، جو نماز پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے، وہ دسترخوان پر مرتب ہوا۔ معلوم ہوا آدمی دسترخوان پر بیٹھ کر بھی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔

روزہ سے بھی پہنچتا ہے، افطار سے بھی پہنچتا ہے۔ روزہ رکھے گا اس کے لئے فرماتے ہیں ''اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ.'' (1) ''روزہ میرا ہے میں اس کا بدلہ دوں گا'' اور افطار کرنے بیٹھا تو فرمایا افطار کرنے والے کے لئے دو فرحتیں ہیں، ایک فرحت یہ ہے کہ پانی پی کر پورے بدن میں سیرابی آ گئی اور دوسری فرحت یہ ہے کہ اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، رضائے خداوندی نصیب ہوگی۔ غرض روزے میں آدمی فاقہ کر کے اللہ تک پہنچا اور کھا کر بھی اللہ تک پہنچا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جب فاقہ کرے جبھی پہنچے اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس ہو جبھی اللہ تک پہنچے، سرمایہ دار ہو تب بھی پہنچ سکتا ہے، بشرطیکہ سرمایہ کا اول و آخر درست ہو، حرام اور ناجائز کمائی نہ ہو، خرچ میں بھی ناجائز طریقہ نہ ہو۔

آج کا جنید وشبلی ...... اور آج تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک انسان حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے تو وہ ولی کامل ہے۔ یہ اس زمانے میں جنید بغدادی جیسا ہے کہ اس زمانے میں جنید بننے کے لئے بے شک یہ ضروری تھا کہ کسی مکروہ کا بھی ارتکاب نہ کرے اور کوئی مستحب بھی نہ چھوٹنے پائے۔ لیکن آج کا جنید اگر فرائض سرانجام دے اور حرام سے بچ جائے تو انشاء اللہ اسے جنید وشبلی جیسا اجر ملے گا۔

اس لئے کہ آج کا زمانہ انتہائی فتنوں اور رکاوٹوں کا زمانہ ہے۔ ان رکاوٹوں میں رہ کر آدمی اپنے دین پر قائم رہ جائے تو وہ مجاہد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے ارشاد فرماتے ہیں کہ ''آج تم ایسے دور میں ہو کہ اگر دین کے دس حصوں سے نو حصے انجام دو۔ ایک حصہ چھوٹ جائے، تم سے قیامت کے دن مواخذہ ہوگا کہ تم نے ایک حصہ کیوں چھوڑا؟ اور فرمایا تمہارے بعد ضعفاء آنے والے ہیں کہ اگر دین کے دس حصوں میں ایک حصے پر عمل کریں اور نو حصے چھوٹ جائیں تو انہیں اجر وہ دیا جائے گا جو تمہیں دیا جا رہا ہے''۔

یہ اس لئے کہ تمہارے سامنے رکاوٹیں نہیں خدا کا رسول موجود ہے، معجزے موجود خیر القرون کے اندر تم موجود ہو، سارے دواعی اور اسباب دین موجود ہیں۔ اس لئے دین پر عمل کرنا تمہارے لئے دشوار نہیں۔ بعد والے وہ ہوں گے کہ نہ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ کا رسول موجود نہ معجزے ہوں گے نہ ان کے سامنے خیر القرون ہوگا نہ وہ

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الصوم، باب فضل الصیام، ج:۲، ص:۸۰۷ رقم: ۱۱۵۱.

حالات و کیفیات ہوں گی، بلکہ شک ڈالنے والے اور شبہات پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے۔ فتنوں کا ایک ہجوم ہوگا۔ جوان سب کے اندر رہ کر دین پر قائم ہوگا۔ وہ تھوڑا بھی کرے گا تو اجر وہ ملے گا جو آج تمہیں دیا جا رہا ہے۔

غرض رکاوٹوں اور موانع کی کثرت میں جو چیز آتی ہے وہ قابل قدر ہوتی ہے، اس واسطے دولت دنیا ہو، تمول ہو، بلڈنگیں ہوں، باغات ہوں اگر حلال طریق پر کمائی جائیں حق تعالیٰ نے عطا کیا، تو اس کا عطیہ ہے، ضائع نہ کیا جائے لیکن اسی سے پوچھ کر خرچ کیا جائے۔

ہماری ملکیت کی حیثیت...... اس واسطے کہ اپنی جان کے بھی ہم مالک نہیں ہیں تو اپنے مالوں کے مالک بھی ہم نہیں ہیں۔ جان کا مالک وہ ہے جس نے جان بنائی، ہمارے مالوں کا مالک وہ ہے جس نے مال بنا کر ہمارے سپرد کیا ہے۔ درحقیقت مالک حق تعالیٰ شانہ' ہیں ہم امین وخزانچی ہیں، خزانچی کا کام یہ نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جسے چاہے دیدے، مالک سے پوچھنا پڑے گا کہ کتنا کس کو دوں؟ وہاں سے آرڈر ہوگا جتنا حکم ہوگا، اتنا خرچ کرنا پڑے گا، فرمایا گیا ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ ① "زمین کا مالک اللہ ہے جسے چاہے بخش دے"۔ ہم مالک نہیں ہیں، اور جب بخش دیتے ہیں تو بخشنے کے بعد بھی مالک وہی رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ﴿وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ② سارے انسان دولتوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ "اصل وارث ہم ہیں"۔ پھر وراثت ہمارے ہی پاس آ جائے گی، ہم ہی اول میں مالک تھے، ہم ہی اخیر میں ہیں اور درمیان کے حصہ میں بھی مالک ہم ہی ہیں، ہمارا ہی آرڈر چلے گا، ہمارے ہی کہنے کے مطابق وہ خرچ کی جائے گی۔

اسی لئے فرماتے ہیں ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ③ اس دولت میں سے خرچ کرو جو ہماری بخشی ہوئی ہے۔ یہ لفظ اس لئے کہہ دیا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مالک ہو یا تم اس دولت کے بنانے والے ہو، پیدا کرنے والے بھی ہم ہیں مالک بھی ہم ہیں تو فرما دیا کہ ﴿مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ وہ جو ہم نے تمہیں دولت دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔

ترغیب انفاق...... اس عنوان سے خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو اپنی چیز دوسرے کو دینے میں طبعاً رکاوٹ ہوتی ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ بھائی یہ چیز تمہاری کب ہے تو دینا آسان ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ۔

مال مفت دل بے رحم

جب مال مفت کا ملے گا، آدمی بے تکلف خرچ کرے گا۔ ایک چیز دوسرے کی ہے، میں کیوں بخل کروں؟ اس لئے فرمایا کہ: تم اسے اپنی چیز سمجھتے کیوں ہو؟ یہ تو ہماری چیز ہے۔ جب ہم اجازت دے رہے ہیں تو ہماری چیز سمجھ کر خرچ کرو تا کہ سخاوت کر سکو۔ اطمینان سے دے سکو۔ یہ تمول اور دولت خود دین کے کمانے کے ذریعہ ہے جیسے میں نے عرض کیا صحابہؓ میں ابوذر غفاریؓ جیسے بھی ہیں اور صدیق اکبرؓ و (عبدالرحمٰن ابن عوفؓ) جیسے بھی ہیں۔

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸۔ ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۸۔ ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرے اوپر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ ابوبکرؓ کا احسان ہے کہ چالیس ہزار روپیہ میری ذات کے اوپر خرچ کیا ہے۔ اس زمانے کا چالیس ہزار روپیہ ایسا ہے جیسا آج کا چالیس لاکھ روپیہ۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ضرورت پیش آئی اور خدام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خرچ کیا۔ یہ خرچ کرنا عین طاعت وعبادت بنا وہی ترقی کا باعث بنا کہ صدیقیت کا مقام ملا۔

بادشاہت کے ساتھ عبادت...... حاصل یہ نکلا کہ انسان کسی بھی حالت میں ہو عبادت سے محروم نہیں رہ سکتا، ہر مقام کی عبادت ہے۔ دولت مند کی عبادت دولت کے ساتھ، غریب کی عبادت غربت کے ساتھ ہوتی ہے۔ بادشاہ کی عبادت بادشاہت کے ساتھ ہوتی ہے اور فقیر بے نوا کی عبادت فقر وفاقہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

امیر کے بارے میں فرمایا کہ: ''سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ'' ① ''سات قسم کے لوگ ہوں گے جن کو قیامت میں عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جس دن بجز اللہ کے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہوگا''۔ اس میں پہلی نوع فرمایا:

''اِمَامٌ عَادِلٌ.'' ''وہ بادشاہ جو عدل وانصاف والا ہو''۔ اسے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ ایک فقیر یہ سمجھتا تھا کہ اسے اتنے اونچے مراتب مل رہے ہیں۔ یہ تخت پہ بیٹھا ہوا بادشاہ ہے۔ اس کے سامنے وسائل زندگی کھلے ہوئے ہیں عیش کے سارے سامان اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ کیا دیندار ہوتا؟ لیکن اسلام نے آ کر اسے تسلی دی کہ تو تخت پر بیٹھ کر بھی اللہ کو پا سکے گا۔ اگر تو عدل وانصاف کرے تو تجھے وہ مقام ملے گا کہ تجھے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ غرض ایک فقیر بے نوا کو بھی یہ مقام دیا گیا اور ایک بادشاہ وقت کو جو تخت وتاج کا مالک تھا، اسے بھی یہ مقام دیا گیا۔ تو اسلام کسی کے ساتھ بخل نہیں کرتا۔ نہ یہ کہتا ہے کہ تو اپنا مقام بدل جب جا کے تجھے خدا ملے گا۔ بلکہ اپنے مقام پر رہ۔ مگر ضرورت کس چیز کی ہے؟ فکر کی ضرورت ہے۔ بے فکرا انسان کوئی انسان نہیں ہے۔ جس انسان کا نصب العین نہیں ہے، وہ انسان نہیں ہے، عقلمند انسان وہ ہے کہ اپنا نصب العین ٹھہرا دے۔ تو نصب العین طاعت وعبادت خداوندی نکلا۔ دولت مند ہوگا تب بھی اطاعت کر سکتا ہے۔ مفلسی میں ہوگا تب بھی یہ نصب العین اپنا سکتا ہے۔ بادشاہی تخت پر ہے تب بھی یہ نصب العین قائم ہے۔ غربت میں ہے تب بھی، تندرستی میں ہو تب بھی یہ نصب العین قائم اور انتہائی بیماری میں ہو تب بھی۔ زندگی ہو تو یہ نصب العین قائم، موت آ جائے تو بھی، یہ عجیب ترین نصب العین ہے جو اس لمبی عمر کے ساتھ اخیر تک چلتا ہے۔

قبر میں عبادت...... قبر میں بھی جا کر عبادت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے صاف حدیث موجود ہے کہ ''اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَآءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ'' (اَوْکَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ② ''انبیاء علیہم السلام اپنی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل الصدقة، ج: ۲ ص: ۱۵ ۷ رقم: ۱۰۳۱۔ ② المسند للامام ابی یعلیٰ الموصلی، احادیث انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ج: ۶ ص: ۴۷ رقم: ۳۴۲۵۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۲۱۱۔

قبروں میں زندہ ہیں اور عبادتوں میں مشغول ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں'' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی یُلَبِّیْ'' ① گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں موسیٰ علیہ السلام تلبیہ پڑھتے ہوئے لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے میدان عرفات میں جا رہے ہیں گویا حج بھی کرتے ہیں تلبیہ بھی پڑھتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مطاف میں ایک شخص چوڑے سینے والا، چہرہ اتنا حسین اور تروتازہ کہ ایسا معلوم ہوا ابھی حمام سے غسل کر کے نکلا ہے۔ بال اتنے خوبصورت اور اتنے شاداب جیسے معلوم ہو کہ ان سے پانی ابھی ٹپک پڑے گا۔ تو میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ: مطاف میں یہ کون شخص ہے؟ کہا مسیح ابن مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام طواف میں بھی ہیں، غرض انبیاء علیہم السلام کی عبادت ثابت ہوئی۔

اولیائے کرام، کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اولیائے کرام کو بھی ذکر کا الہام فرماتے ہوں وہ بھی تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہوں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ صلحائے مومنین بھی ذکر اللہ میں لگے رہتے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَتَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے''۔ اگر ذکر اللہ پر زندگی گزاری ہے، موت بھی ذکر اللہ پر آئے گی، قبر سے جب اٹھے گا وہی ذکر کرتا ہوا اٹھے گا اگر حج میں لبیک کہتا ہوا انتقال کر گیا تو حدیث میں ہے کہ جب قبر سے اٹھے گا تو لبیک لبیک زبان پر جاری ہوگا۔ اور یہ سمجھتا ہوا ہوگا گویا میں حج کر رہا ہوں۔ بعد میں یہ پتہ چلے گا کہ یہ میدان عرفات نہیں ہے بلکہ میدان محشر ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب انسان قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور ملائکہ علیہم السلام سوال و جواب کے لئے آتے ہیں جن میں سے ایک کا نام منکر اور ایک کا نام نکیر ہے، اور منکر نکیر اس لئے کہا کہ ان کی صورتیں اوپری ہوتی ہیں جو کبھی نہیں دیکھی ہوتیں۔ وحشت ناک، ہیبت ناک اور ڈراؤنی شکلیں ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہیں اور تین سوال کرتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون؟ وَمَادِیْنُکَ؟ اور تیرا طریق کار کیا تھا؟ وَمَنْ هٰذَا الرَّجُلُ؟ ② اور یہ ذات بابرکات جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے کون ہیں؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب یہ دونوں سوال کرنے کے لئے آتے ہیں تو ہر مومن کو جو وہاں قبر میں وقت دکھلایا جاتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ سورج ڈوبنے والا ہے اور عنقریب دن ختم ہونیوالا ہے۔ یَتَمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ سورج کی صورت مثالی سامنے آتی ہے کہ سورج ڈھلنے والا ہے۔ اس وقت فرشتہ پوچھتا ہے کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ کون

① الحديث اخرجه الامام مسلم في صحيحه ولفظه: كأني انظر الى موسىٰ عليه السلام ها بطاً من الثنية وله جؤار الى الله بالتلبية، كتاب الايمان، باب الاسراء برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السماوات ج: ا ص: ٣٩٢.

② المصنف لابن ابى شيبة، كتاب الجنائز، باب فى نفس المومن كيف تخرج ونفس الكافر، ج: ٣ ص: ٥٥ رقم: ١٢٠٨٩. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ٦ ص: ١٣٠.

ہے تیرا پروردگار؟ یہ میت جواب دیتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ میاں پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے کہیں وقت نہ نکل جائے، میری نماز مکروہ نہ ہو جائے۔

دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اس سے کیا جواب مانگتے ہو کہ تیرا رب کون ہے؟ یہ تو رب میں اتنا منہمک ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کو اور اس کی عبادت کرنے کو تیار ہے؟ اس سے رب کا کیا پوچھنا؟ اس نے عملاً جواب دیدیا کہ یہ اس کا بندہ ہے جس کی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ یہ جواب سچا دے گا، مگر ہمارا فرض ہے ہمیں ڈیوٹی انجام دینی ہے یہ ہمیں یقین ہے کہ تینوں سوالات کا جواب حق ملے گا۔ تو قبر میں اس مومن کا یہ کہنا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ (مجھے چھوڑ دو نماز کا وقت جا رہا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں نماز کا جذبہ رہے گا۔

اب یہ کہ پڑھوائی جائے نہ پڑھوائی جائے یہ اللہ جانتا ہے لیکن جذبہ ہے۔ ''نِیَّةُ الْمَرْءِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ'' ''اگر انسان نیت کرے تو نیت عمل سے بہتر ہے''۔ اس پر وہی اجر مرتب ہوتا ہے جو عمل پر ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ: بعض لوگ میدان محشر میں حاضر ہوں گے حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ ان کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ ساری عمر تہجد پڑھا۔ ملائکہ عرض کریں گے یا اللہ! انہوں نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔

حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے ان میں سے ایک جب رات کو سوتا تھا تو یہ جذبہ لے کر سوتا تھا کہ آج رات کو ضرور اٹھ کے تہجد پڑھوں گا۔ مگر غریب کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں، جب اس نے ساری عمر یہ نیت رکھی تو لکھ دو کہ اس نے ساری عمر تہجد پڑھا۔ غرض مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، وہاں جو یہ کہے گا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے چھوڑو، میں نماز پڑھتا ہوں، معلوم ہوتا ہے ہر مومن کے اندر یہ جذبہ ہے۔

مگر یہ جذبہ کس مومن کے لئے ہوگا؟ جو دنیا میں بھی وقت مکروہ سے بچنے کے لئے چاہتا تھا کہ وقت پہ نماز ادا کرلوں، وہی وہاں بھی کہے گا۔ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ اور جو یہاں پڑا ہوا دندناتا سوتا تھا، اس کی زبان سے نہیں نکلے گا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے چھوڑ دو۔ میں نماز پڑھتا ہوں۔

اور شاید عصر کی نماز اس لئے رکھی کہ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عصر کی نماز کے وقت کے دو حصے ہیں۔ ایک وقت کامل ہے، ایک وقت مکروہ۔ دھوپ میں جب تک زردی نہ آئے وہ وقت کامل ہے اور جب زردی آجائے وہ وقت مکروہ ہے اور عین جب سورج غروب ہونے لگے وہ وقت وقت مکروہ تحریمی ہے۔

امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ جب عصر کی نماز اس کے اوپر کامل فرض ہوئی تھی تو کامل ہی ادا کرنی چاہئے ناقص واجب ہوگی تو ناقص ادا کرے گا۔ اس واسطے اگر غروب کے وقت بھی ادا کردی تو ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جیسی واجب ہوئی تھی ویسی ادا کردی، اس لئے کہ عصر کے دو وقت ہیں، ایک وقت کامل ایک وقت مکروہ۔ قبر میں مومن کے واسطے ڈرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ کہیں وقت مکروہ نہ آجائے، میں پہلے ہی کیوں نہ ادا کرلوں؟ صبح کی نماز

میں دوقسم کے وقت نہیں ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے پڑھ لے، جتنا وقت ہے سارا کامل ہے، جب سورج نکل آیا، وقت ختم ہو گیا۔ بخلاف عصر کے اس کے دو وقت ہیں۔ تو شاید اس لئے عصر کی نماز کا وقت دکھایا جاتا ہے کہ اس میں ناقص اور کامل دو حصے ہیں۔ تو مومن سوچتا ہے کہ کامل نماز ادا کیا کرتا تھا۔ اب یہ وقت ناقص آ رہا ہے میری نماز کہیں ناقص نہ ہو جائے۔ اس لئے ملائکہ سے کہے گا دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔

بہرحال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن قبر میں ایک جذبہ لے کر جائے گا اور جذبہ یہ ہوگا کہ میں نماز پڑھوں۔ تو انبیاء علیہم السلام عملاً نماز میں مشغول ہیں۔ مومن اس جذبے میں مشغول ہے اگرچہ عمل کی اجازت نہ دی جائے یا اس میں سکت نہ ہو۔ تو دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ اس کا جذبہ ہی عمل کے قائم مقام ہوگا۔ گویا وہ بھی نماز پڑھ رہا ہے۔

میدانِ حشر میں جذبۂ عبادت...... تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کا نصب العین وہ ہونا چاہئے کہ انسان اسے اس دنیا میں بھی نصب العین بنا سکے اور جب قبر میں پہنچے تب اس کا نصب العین اس کے ساتھ ہو اور وہ عبادت ہے۔ عبادت کا جذبہ جیسے یہاں ہے ویسے وہاں ہوگا۔ میدانِ حشر میں جب آدمی اٹھے گا اسی حالت پر اٹھے گا جس حالت پر موت آئی ہے اگر نماز پڑھتے ہوئے، ذکر کرتے ہوئے، حج کرتے ہوئے موت آئے، اسی حالت میں قبر سے اللہ اللہ یا لبیک لبیک کہتے ہوئے اٹھے گا اور دل میں تمنا ہوگی کہ میدانِ محشر میں نماز پڑھوں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ جو دارالعلوم کے شیخ، مربی اور اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے ان کا مقولہ سنا، فرمایا: ''قیامت کے دن اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ اے امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے؟ عرض کروں گا، نہ مجھے جنت چاہئے نہ حوریں اور نہ محلات چاہئیں، مجھے تو اپنے عرش کے نیچے دو گز جگہ دے دیجئے۔ میں وہاں پر نماز پڑھتا رہوں''۔ گویا اس درجہ نماز کی تڑپ کہ اگر وہاں بھی طلب ہوگی تو نماز کی ہوگی۔ تو یہ ایک ایسا عمدہ نصب العین ہے کہ دنیا' قبر اور میدانِ محشر میں بھی ساتھ ہے۔

جنت میں عبادت...... اور جنت میں بھی ساتھ ہوگا۔ جنت کے بارے میں فرمایا گیا ''یُلْهَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ'' ① ''جتنے جنتی ہوں گے، ان کی زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہوگا''۔ یہ ارادۃً نہیں ہوگا، ارادے کی محنت دنیا میں انہوں نے اللہ اللہ کر کے اٹھالی تھی۔ اب اللہ کا ذکر نفس میں رچ گیا ہوگا اسلئے بلا ارادہ ذکر جاری ہوگا۔ سانس کے ساتھ اللہ کا نام نکلے گا، جیسے پاس انفاس ہوتا ہے کہ آنے والے سانس کے ساتھ اللہ اور جانے والے کے ساتھ هُوْ، اَللّٰهُ هُوْ، اَللّٰهُ هُوْ۔ غرض اہل جنت کی زبانوں پر بلا ارادہ تسبیح وتہلیل اور اللہ کا نام جاری ہوگا۔ یہ اس کا اثر ہوگا کہ دنیا میں انہوں نے محنت کر کے ذکر اللہ کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ ''رَتِّلْ وَارْتَقِ'' ② ''تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا'' جتنی تیری ہمت ہے درجات کماتا جا، معلوم ہوتا

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی صفات الجنة...... ج:۴ ص:۲۱۸ رقم:۳۵۲۸.

② السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی من قرأ حرفاً...... ج:۵ ص:۱۷۷ رقم:۲۹۱۴.

ہے جنت میں روزانہ ترقی ہوگی۔ تلاوت کے ذریعے سے روزانہ عروج ہوگا۔ نیا سے نیا مقام، نئی سے نئی حالت، نئی سے نئی کیفیت اور نئی سے نئی نعمت ملتی رہے گی۔ تو عبادت کا نصب العین وہ ہے کہ دنیا سے چلا قبر تک پہنچا حشر تک پھر جنت تک پہنچا اور جنت میں پھر نئے سے نئے جہان، نئے سے نئے مقامات ابدالآباد تک آتے رہیں گے اور عبادت کا یہ نصب العین ساتھ رہے گا۔

ایمان کی وجہ سے ہر چیز پاکیزہ بن جائے گی...... اس لئے میں نے عرض کیا کہ: اس لمبی زندگی کے لئے نصب العین بھی لمبا ہونا چاہئے معمولی نصب العین جو چند دن کے بعد ختم ہو جائے۔ وہ زندگی کے حسب حال اور لائق نہیں ہے۔ یہ زندگی کی توہین ہے، آپ زندگی کا نصب العین روٹی کو بنائیں۔ یہ اس کی توہین ہے اس لئے کہ روٹی انسانوں کو بھی ملتی ہے جانوروں کو بھی ملتی ہے، یا دولت کمانے کو نصب العین بنائیں تو دولت خود ایک ذریعہ اور واسطہ ہے خود مقصد نہیں ہے، آدمی کی جب جان پر آنے لگتی ہے تو دولت کو خرچ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا دولت خود مقصود نہیں، جان مقصود ہے اور جب ایمان پر آنے لگتی ہے تو جان گنوا دیتا ہے کہ ایمان محفوظ رہنا چاہئے، معلوم ہوتا ہے ایمان مقصود ہے، تو سب سے بڑا نصب العین ایمان ہوا کہ نہ جان کی پرواہ کی نہ مال کی، تو ان چیزوں کو نصب العین بنانا عارضی چیزوں کو نصب العین بنانا ہے۔ اس واسطے لمبی زندگی نصب العین وہ ہونا چاہئے جو زندگی کے آخری گوشے تک پہنچ جائے، وہ طاعت وعبادت خداوندی ہے، وہ دولت ایمان ہے، وہ دولت عرفان ہے، وہ اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔

اس کو سامنے رکھ کر آدمی مال کو بھی گھماتا رہے، جان اور آبرو کو بھی گھماتا رہے، اس وقت اس کی جان بھی قیمتی جان بن جائے گی کیونکہ ایمان کے لئے ذریعہ بنی، مال بھی اس کا پاک مال بن جائے گا کیونکہ ایمان کے لئے وسیلہ بنا۔ اس کی اولاد بھی پاک بنادی جائے گی کیونکہ ایمان اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ذریعہ بنے گی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ.'' ① ''نیک آدمی کا مال بھی نیک ہوتا ہے'' نیک مال نیکی کا ذریعہ بنتا ہے، تو انسان پاک رہے گا تو مال بھی پاک بنے گا۔ اگر انسان نے اپنے قلب اور روح کو معصیتوں سے ناپاک بنا دیا، اس کا مال بھی ناپاک بنے گا۔ اس لئے مال کی مذمت نہ کی جائے، مذمت اپنی کی جائے، غلطی ہماری ہوتی ہے، ڈال دیتے ہیں مال کے اوپر، آدمی پاک بن جائے ساری چیز پاک بن جائیں گی۔ بلڈنگ بھی پاک، مکان بھی پاک، ہر چیز اچھی ہو جائے گی، یہ جبھی ہوگا جب اپنی پوری زندگی کی نقل وحرکت کا اصل نصب العین اطاعت خداوندی بنایا جائے۔ اکبر الہ آبادی نے ایک قطعہ کہا تھا کہ اس قطعہ میں اس زمانے کی ایک حالت ظاہر کی ہے، مگر مقصد رہ گیا تھا تو ایک شعر میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ اس میں مقصد کی تکمیل ہوگئی۔ اکبر الہ آبادی کہتا ہے کہ ۔

① المسند للامام احمد، احادیث عمرو بن العاص، ج: ۴ ص: ۱۹۷۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے	یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی	یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

نہ راحت ابدی نہ مصیبت ابدی، اگر مصیبت میں آدمی وقت ٹلا دے مصیبت ختم ہو جاتی ہے۔ نعمت میں وقت ٹلا دے، نعمت ختم ہوگئی، پائیداری اور قرار کسی چیز کو نہیں ہے، نہ یہاں کی عیش کے لئے پائیداری ہے نہ مصیبت کے لئے عیش والا بھی سب کچھ چھوڑ کر چل دے گا، مصیبت والا بھی چل دے گا۔ تو اکبر نے کہا کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے	یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی	وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

مگر ابھی شعر تشنہ ادھورا رہ جاتا ہے، وقت تو گزر جائے گا مگر آخر انسان کرے کیا؟ مصیبت و راحت ایک حالت ہی آئی اور گئی کہنا آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس کا میں نے جوڑ لگا دیا۔ گو یہ جوڑ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دے اس لئے کہ اکبر تو لسان العصر ہے، بڑے اونچے درجے کا شاعر ہے ہماری کیا شاعری اس کے مقابلے میں بس تک بندی ہے، مگر بہر حال خواہ وہ تک بندی ہی ہو، مگر پیوند تو لگا ہی دیا۔ چاہے وہ مخمل میں ٹاٹ ہی کا ہو، اس لئے کہ اگر مخمل پھٹی رہ جائے تو بدن کھلا رہ جائے گا۔ تو ٹاٹ سے بدن تو چھپ جائے گا لباس کا مقصد پورا ہو جائے گا، اس واسطے ہم نے بھی پیوند لگا دیا۔ وہ پیوند کیا ہے؟ تو اکبر نے کہا کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے	یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی	وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں کہ ۔

مقصد زندگی ہے طاعت حق	نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے
رہ گیا عزوجاہ کا جھگڑا	نہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اور قابل ذکر بھی نہیں خورد و نوش	نہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے ①

اصل مقصد یہ ہے کہ طاعت حق ہو، یہ ہوگی تو ہر چیز پائیدار اور کار آمد بن گئی اور اگر اطاعت حق باقی نہ رہی تو مال بھی وبال، جان بھی وبال، صحت بھی وبال، ساری ہیئتیں حقیقتیں، حرکتیں سب وبال جان بن جائیں گی، اندر ایمان نہیں رہے گا اور اگر ایمان آ گیا پھر اس کے لئے ہر چیز نعمت و راحت کا ذریعہ بنے گا۔

زندگی کی قدر کی صورت...... اس ساری تقریر کا حاصل یہ نکلا کہ ہمیں اس زندگی کی قدر کرنی چاہئے، یہ اللہ کی ایک نعمت ہے اور قدر کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی نصب العین کے تحت خرچ کیا جائے، بلا موضوع اور بلا مقصد نہ خرچ کیا جائے، اور یہ مقاصد نہیں ہیں کہ مجھے عیش مل جائے یا میری زندگی آرام سے گزر جائے یا میرے پاس دولت

---

① از مجالس حکیم الاسلام ص ۳۹۔

زیادہ ہو جائے یا میرے پاس کوٹھی ہو یہ کوئی مقصد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دے آدمی بنالے مگر اس کو بھی کسی مقصد کے تابع کیا گیا ہے، کوٹھی میں نیت کرے کہ میں اس لئے بناتا ہوں کہ دوست احباب جمع ہوں گے خدا کا نام لیں گے، موقع ہوگا تو جماعت ہوگی۔ اب کوٹھی نہ ہوئی عبادت گاہ بن گئی۔ اس کوٹھی میں آپ کو وہ اجر مل گیا جو مسجد میں ملتا۔

حسن نیت...... کسی بزرگ کے ایک خادم نے مکان بنوایا، جب مکان مکمل ہو گیا تو اس نے اس میں اپنے شیخ کو دعوت دی کہ آپ تبرکاً مکان کا افتتاح کر دیں۔ شیخ آئے تو بڑے خوش ہوئے کہ بڑا عمدہ مکان ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ بھئی! یہ اتنے بڑے بڑے روشندان، دروازے اور کھڑکیاں کیوں رکھیں؟

اس نے کہا حضرت اس لئے رکھیں کہ ہوا آئے، فضا صاف رہے۔ دھوپ بھی آئے، فرمایا: جا بندۂ خدا! اس میں اس کی نیت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دھوپ تو ویسے بھی آ جاتی۔ نیت نہ کرتا، ہوا بھی آتی، ان روشندانوں میں تو نے کوئی ایسی نیت کیوں نہ کرلی کہ تجھے اجر مل جاتا۔ یہ چیزیں تو خود بخود آنی تھیں فرمایا، تو نے یہ نیت کیوں نہ کرلی کہ میں اس لئے لمبے لمبے روشندان رکھ رہا ہوں کہ ان سے موذن کی اذان کی آواز جلدی سے آ جایا کرے گی، میں در اس لئے رکھ رہا ہوں کہ ذکر اللہ کرنے والوں کی صدا جلدی میرے کانوں تک پہنچ جایا کرے اگر یہ نیت کرتا، تو اجر بھی ملتا، ثواب بھی ملتا۔ اور دھوپ ہوا بلا نیت کے بھی آ جاتی تو مکان کی خوشنمائی میں آدمی اگر یہ نیت کر لے کہ یہ میں گویا اپنا گھر نہیں بنوا رہا یہ اللہ کا گھر ہے اس میں ذکر بھی ہوگا، نمازیں بھی پڑھی جائیں گی، وعظ بھی ہوں گے، بس یہ مکان باعث اجر بن گیا اس نے وہ کام دیا جو مسجد اور خانقاہ کام دیتی۔ تو ذرا سی نیت کے پھیر سے انسان عادت کو عبادت بنا لیتا ہے اور ذرا سی نیت کی خرابی سے عبادت بھی عادت بن کے رہ جاتی، سارا اجر ختم ہو جاتا ہے۔ نماز کو اس نیت سے پڑھ لو کہ لوگ ہمیں اچھا سمجھیں، یہ ریا کاری ہو گئی۔ نماز ختم ہو گئی۔ یہ منہ پر مار دینے کے قابل ہے اور روٹی کھانے میں اس کی نیت کرلو کہ اس لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو عبادت کروں گا تو آپ کی روٹی عبادت بن گئی۔ نیت اللہ نے ایسی پاکیزہ چیز بنائی ہے کہ عادت کو چاہو تو عبادت بنالو اور بری نیت ہو تو عبادت عادت بن کر رہ جاتی ہے، وہ بالکل قابل اجر ہی نہیں باقی رہتی۔

اس واسطے نصب العین اور نیت صحیح ہو تو انسان کی پوری زندگی کارآمد بن جاتی ہے۔ یہ چند باتیں میں نے اس لئے گزارش کیں کہ مجمع میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے اور حق تعالیٰ نے دولتیں دی ہیں اور یہ شکر کی بات ہے کہ اللہ اپنے بندے کو نعمت عطاء کرے، فقط اسی کے خوش ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے ہر بھائی کو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے بھائی کو حق تعالیٰ نے نعمت دی اور سرفراز کیا۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہ دولت تو نہیں ملی مگر علم اور ایمان کامل کی دولت ملی ہوئی ہے تو اس درجے کی دولت ان کے پاس نہیں ہے اور بہت سے بیچارے ایسے بھی ہیں کہ نہ یہ دولت ہے نہ وہ دولت، مگر ساتھ میں حسرت اور صبر کی دولت ہے کہ ہائے ہمیں کچھ نہ ملا۔ اور ہم محروم رہ گئے۔ طاعت و عبادت مالی نہ کر سکے۔ ان کی حسرت اس دولت کے قائم مقام ہے، اس

حسرت سے ان کو اجر و ترقی دی جائے گی۔ ایسے مختلف لوگ موجود ہیں، اس واسطے نصب العین مشترک ہونا چاہئے جو سب کے لئے کار آمد ہو، وہ اطاعت حق اور عبادت خداوندی ہے کہ وہ دولت میں بھی قائم رہ سکتا ہے اور ناداری میں بھی، حسرت میں بھی قائم رہ سکتا ہے فرحت میں بھی اور ایسی چیز کے لئے زیبا ہے کہ اس کو ہم اس لمبی عمر کا نصب العین اور مقصد بنا سکیں تو اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے، اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ①

عبادت کے معنی......اور عبادت کے معنی حقیقت میں نہ نماز پڑھنے کے ہیں، نہ روزہ رکھنے کے ہیں، نہ زکوٰۃ دینے کے ہیں، عبادت کے معنی تعمیل حکم کے ہیں کہ جو ہم کہیں اس کی اطاعت کی جائے، اگر ہم کہیں نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت ہے۔ اگر ہم کہیں ہرگز نماز مت پڑھو، تو چھوڑنا عبادت بن جاتا ہے۔ اگر ہم کہیں روزہ رکھو تو روزہ رکھنا عبادت ہے، پانچ وقت میں نماز پڑھو تو نماز عبادت اور تین وقتوں میں حکم ہے کہ ہرگز مت پڑھو سورج ڈوبنے اور نکلنے کے وقت اور زوال کے وقت ان اوقات میں آدمی نماز پڑھے گا تو گنہگار ہوگا۔ معلوم ہوا نہ نماز پڑھنا عبادت نہ چھوڑنا عبادت کہنا ماننا عبادت ہے، رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے، عید کا چاند دکھائی دیا، تو عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر کوئی رکھے گا تو گنہگار ہوگا، معلوم ہوا نہ روزہ عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم کہیں رکھو تو رکھنا عبادت، جب ہم کہیں چھوڑ دو، تو چھوڑنا عبادت ہے۔

فرمایا گیا: خودکشی حرام ہے، اپنے آپ کو قتل مت کرو، لیکن اگر نفیر عام ہوا اور یوں فرما دیا جائے کہ میدان جہاد میں ذبح ہو جاؤ گھوڑوں کو بھی ختم کردو، یہ عبادت ہو جائے گی۔ معلوم ہوا نہ جان کی حفاظت عبادت، نہ جان گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں جان کی حفاظت کرو، حفاظت کرنا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں کہ اس جان کی پرواہ مت کرو، جان دیدو، پھر جان دیدینا عبادت ہے۔

غرض عبادت کا حاصل یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی کو قانون خداوندی کے تحت میں گزارنا، ہر حالت میں اسی کی رضا کو سامنے رکھنا اور اپنی منشاء کو ختم کرنا، یہ عبادت ہے۔

بہرحال اسلام کسی حالت میں کسی کو مایوس نہیں کرتا جس حالت میں بھی انسان ہو، اسی حال میں رہتے ہوئے خدا تک پہنچنے کے لئے اسے راہ بتلاتا ہے اور انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی راہ درست فرمائے اور اس نصب العین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنی رضا نصیب فرمائے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا آسان فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

پرسکون زندگی

مشاہیر عالم کے نام لکھے گئے خط کا جواب

از حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

(کراچی کے ایک صاحب اے جی یودوجکی نے مشاہیر عالم کے نام ایک مطبوعہ خط میں درخواست کی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ انسان اس ابتراور پراگندہ دنیا میں پرسکون زندگی کیسے بسر کرسکتا ہے۔

''حضرت مہتمم صاحب قدس اللہ سرہٗ کے نام بھی خط آیا اور اتفاق سے حضرت موصوف کے سامنے اس وقت آیا جب وہ پچھلے دنوں بمبئی سے کلکتے کا سفر ہوائی جہاز میں کررہے تھے۔اس فرصت میں موصوف نے اس سوال کا جواب ایک خط کی شکل میں کراچی کے ان صاحب کو تحریر فرمایا جسے ہم درج ذیل حوالہ قرطاس کرتے ہیں)۔

باسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى

محترم المقام! زید مجدکم السامی' ہدیہ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ آپ کا گرامی نامہ دفتر دارالعلوم دیوبند میں موصول ہوا۔ میں اس دوران سفر میں تھا،سفر طویل ہوگیا اور آپ کا والا نامہ دیوبند سے ہوتا ہوا مجھے بمبئی میں ملا۔ وہاں بھی مصروفیات کے سبب جواب لکھنے کا موقعہ نہ ملا اور کلکتہ روانگی ہوگئی۔اس لئے آج کلکتے سے جواب عرض کررہاہوں۔اوراس تاخیر جواب کی معافی چاہتاہوں۔

آپ نے والا نامہ میں سوال فرمایا کہ ''اس پریشان اور ابتر دنیا میں انسان کس طرح ایک خوش وخرم اور پرسکون زندگی بسر کرسکتا ہے؟''

جواباً عرض ہے کہ سوال اہم اور عموماً آج کے دکھی دلوں کی ایک عمومی پکار ہے اس لئے حقیقتاً توجہ طلب ہے، لیکن یہ سوال جس قدر اہم اور پیچیدہ دکھائی دیتا ہے اسی قدر اپنے جواب کے لحاظ سے واضح اور صاف بھی ہے۔ جواب سامنے لانے کے لئے پہلے پریشانی اور ابتری کے معنی متعین کر لینے چاہئیں تو اس سے بچنے کی صورت اور زندگی کے سکون کی راہ خود ہی متعین ہوجائے گی۔لوگوں نے عموماً مصیبت پریشانی، دکھ درد، بیماری افلاس، تنگ دستی، جیل قیدو بند، ماردھاڑ قتل وغارت، قحط، وباء، بلا وغیرہ کو سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک چیز بھی مصیبت نہیں، یہ صرف واقعات اور حوادث ہیں، پریشانی اور مصیبت درحقیقت ان سے دل کا اثر لینا تشویش میں پڑنا، دل

تنگ ہونا اور کرب و غم میں ڈوب جانا ہے۔

پس یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ اسباب مصیبت کہلائی جاسکتی ہیں، مصیبت نہیں کہی جاسکتیں، مصیبت قلب کی کیفیت احساس اور تاثر کا نام ہوگا، جیل کی قید و بند کا نام مصیبت نہیں بلکہ اس سے دل میں پراگندگی اور گھٹن کا اثر آنا مصیبت ہے۔ افلاس و تہی دستی خود کوئی پریشانی نہیں، بلکہ دل کا اس سے گھبرانا اور مضطرب ہونا پریشانی ہے، تپ ولرزہ یا ہیضہ و طاعون اور قحط و وباء مصیبت نہیں بلکہ دل کا ان سے کرب و بے چینی کا اثر لینا مصیبت ہے۔ پس مصیبت خود ہمارے دل کی کیفیت ہے۔ دنیا کے واقعات نہیں، اس لئے مصیبت کے خاتمہ کی یہ تدبیر کبھی معقول اور کارگر نہیں ہوسکتی کہ دنیا کے حوادث کو مٹانے کی کوشش کی جائے، جب کہ حوادث زمانہ نہ خود مصیبت ہیں اور نہ ہی ہمارے قبضے میں ہیں، بلکہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ان حوادث کے پیش آنے پر قلبی تشویش و پراگندگی کا راستہ روک دیا جائے اور ان سے بجائے خلاف طبع ضیق و تشویش کا اثر لینے کے، انہیں طبعیت کے موافق بنالیا جائے جس سے دل ان سے گھٹنے کے بجائے لذت لینے لگے تو ان میں سے نہ صرف مصیبت ہونے کی شان ہی نکل جائے گی بلکہ یہ امور قلبی راحتوں کا ذریعہ بن جائیں گے اور زندگی میں پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔

آج کی دنیا زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے ان حوادث زمانہ کو ختم کردینے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہ چونکہ ایک ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش ہے جو کبھی شرمندہ وقوع نہیں ہوسکتی اس لئے جتنا جتنا یہ اوندھی تدبیر بڑھتی جائے گی، اتنا ہی دنیا کی زندگی میں ابتری اور بے چینی کا اضافہ ہوتا رہے گا اور کبھی بھی پریشانیوں اور بے چینیوں کا خاتمہ نہ ہوگا، جیسا کہ مشاہدے میں آرہا ہے۔ پس عالم کو بدل ڈالنے کی کوشش کا نام چین نہیں بلکہ خود اپنے کو بدل دینے کا نام سکھ اور چین ہے۔

اس کی سہل صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظر کو ان حوادث سے ہٹا کر اس سرچشمہ کی طرف پھیر دیا جائے جہاں سے بن بن کر یہ اسباب، مصائب و آفات عالم پر اتر رہے ہیں اور وہ اللہ رب العزت کی ذات بابرکات ہے جس نے اس عالم کو اپنی لامحدود حکمتوں سے عالم اضداد بنایا ہے اور اس میں راحت و کلفت، نعمت و مصیبت، حظ و کرب اور چین اور بے چینی دونوں کو سمو کر اس عالم کی تعمیر کی ہے۔ اگر اس سے رشتہ محبت و عبودیت اور رابطہ رضا و تسلیم قائم کرلیا جائے جس کا نام ایمان ہے اور ریاضت و مشق سے اسے اپنا حال اور جو ہر نفس بنالیا جائے کہ اس کے ہر تصرف اور تقدیر پر اطمینان و اعتماد کلی میسر آجائے تو یہ محبت ہی ہر تلخ کو شیریں اور ہر ناگوار کو خوش گوار بنادے گی جس سے قلب ان حوادث سے تشویش کا اثر نہیں لے سکے گا جو مصیبت کی روح ہے کہ۔

از محبت تلخہا شیریں بود

کیوں کہ عاشق کے لئے محبوب کی طرف سے آئی ہوئی ہر چیز محبوب اور لذیذ ہوتی ہے، وہ محبوب کی بھیجی ہوئی تکلیف کو بھی اپنے حق میں یہ سمجھ کر راحت جانتا ہے کہ محبوب نے مجھے یاد تو کیا، وہ میری طرف متوجہ تو ہے اور

مجھے قابل معاملہ تو سمجھا، یہ تصور ہی اس مصیبت کو اس کے لئے لذت وراحت بنا دے گا اور مصیبت، مصیبت نہ رہے گی۔ خلاصہ یہ نکلا کہ مصیبت نام ہے خلاف طبع کا اور خلاف طبع کو موافق طبع بنانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ عالم کی طبیعت کو بدلنے کے بجائے، (جو بس کی بات نہیں) اپنی طبیعت کو بدل دیا جائے اور اس کا رخ مصیبت سے پھیر کر مصیبت بھیجنے والے کی طرف کر دیا جائے کہ نظر مصیبت پر نہ رہے بلکہ خالق مصیبت کی توجہ وعنایت اور بے پایاں حکمت وتربیت پر ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ یقین بجز خدا کی ذات کو مانے ہوئے اور اس کے ہر ہر تصرف پر کلی اعتماد واطمینان کئے بغیر میسر نہیں آ سکتا، اس لئے مصائب کا خاتمہ خدا کے نام سے بھاگنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی طرف لوٹنے میں ہے یعنی آگے بڑھنے میں نہیں بلکہ پیچھے ہٹنے میں ہے۔

اندریں صورت انسان جتنا بھی استیصال حوادث کی مہم میں لگا رہے گا، مصائب سے کبھی نجات نہ پا سکے گا جس کا راز یہ ہے کہ وہ دفعیہ حوادث وآفات کی تدبیر کسی نہ کسی سبب ہی کے ذریعے کرے گا اور یہ سبب بھی جب کہ خود ایک حادثہ ہوگا جس میں منفعت کے ساتھ مضرت کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوگا تو یہ دفع مصیبت بھی مصیبت سے خالی نہ ہوگا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ استیصال مصائب کی بجائے کچھ نہ کچھ اضافہ مصائب ہی ہو جائے گا اور ایک مصیبت اگر کسی حد تک ٹل بھی جائیگی تو دوسری مصیبت اسی آن اس کی جگہ لے لے گی ۔

گر گریزی برامید راحتے ہم ازاں جا پیشیت آید آفتے

لیکن اگر ان حوادث سے بالاتر ہو کر خالق حوادث سے قلب کا تعلق قائم کر لیا جائے تو ادھر سے علمی طور پر تو ان آفات ومصائب کی حکمتیں دل پر کھلیں گی جس سے یہ مصائب معقول اور برمحل محسوس ہونے لگیں گے اور ان سے اکتانے کی کوئی وجہ معقول نہ ہوگی کہ قلب عقلاً غمگین ہو اور پھر عشق الٰہی کی سرشاری میں جب کہ ان حوادث کا ورود منشاء محبوب محسوس ہوگا تو اسے توجہ محبوب سمجھ کر یہ عاشق قلب میں عملاً ان آفات سے لذت وسرشاری کا اثر بھی لینے لگے گا اور آخر کار اس روحانی لذت وسرشاری میں محو ہو کر اسے فرصت ہی نہیں ملے گی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان آفات ومصائب کی طرف دھیان بھی کر سکے۔ اس لئے اس کے حق میں نعمت تو نعمت ہوئی مصیبت اس سے بھی بڑھ کر نعمت ولذت بن جائے گی اور زندگی سے مصائب اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پس راحت حقیقۃً اسباب راحت میں نہیں بلکہ مسبب الاسباب سے سچے تعلق میں پنہاں ہے ۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلاصہ یہ ہے کہ راستے دو ہی ہیں، ایک مصائب سے دل تنگ ہو کر اسباب کے راستے سے ان کا مقابلہ اور استیصال کی فکر وسعی اور ایک مسبب الاسباب سے عشق کے ذریعہ مصائب کو توجہ محبوب سمجھ کر ان پر دل سے راضی ہو جانا اور شیوۂ تسلیم ورضا اختیار کرنا، پہلا راستہ بندگان عقل (فلاسفہ) نے اختیار کیا تو ایک لمحہ کے لئے بھی مصائب سے نجات نہ پا سکے، نہ خود مطمئن ہوئے نہ کسی کو اطمینان دلا سکے، بلکہ خود مبتلا ہو کر پوری دنیا کو مبتلائے مصائب

وآفات کردیا جس سے دنیا سے سکھ اور چین رخصت ہوگیا، اسباب راحت بڑھ گئے اور راحت رخصت ہوگئی۔

دوسرا راستہ بندگانِ خدا (انبیاء واولیاء) نے اختیار کیا کہ حوادثِ عالم سے تنگ دل ہونے کے بجائے انہیں توجہ حق اور منشاء الٰہی سمجھ کر ذریعہ راحت قلب بنایا تو تشویش و پریشانی ان کے قلب کے آس پاس بھی نہ پھٹک سکی، خود بھی مطمئن اور منشرح ہوئے اور عالم میں بھی سکون واطمینان کی لہریں دوڑا دیں اس لئے ان کی اور ان کے متبعین کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لئے مصیبتوں کا خاتمہ ہوا اور خوشی وخرمی ان کی زندگیوں کا عنوان بن گئی۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ؕ لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ ① "بلاشبہ اولیاء الٰہی پر نہ خوف ہے نہ غم جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے، ان کے لئے دنیا (زندگی) میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں خوشی وخرمی کا یہی اٹل قانون ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افلاطون حکیم نے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کو کمان فرض کیا جائے اور مصائب وآفات کو اس کمان سے چلنے والے تیر شمار کیا جائے اور خدا کو تیر انداز مانا جائے تو ان مصائب سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

عقل کا جواب تو مایوسی ہوتا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں کیوں کہ آدمی نہ آسمان کے دائرے کے باہر جا سکتا ہے نہ خدا کے احاطے سے باہر نکل سکتا ہے، اس لئے لامحالہ اسے مصائب کے تیر کھانے ہی پڑیں گے، بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، لیکن انبیاء فلاسفہ نہیں ہوتے کہ محسوسات میں گھری ہوئی محدود عقل کا سہارا پکڑ کر اپنے علم وعمل کے راستے محدود کرلیں، ان کا تعلق خالق عقل سے ہوتا ہے جو اپنے کمالات وتصرفات میں لامحدود ہے اور تعلق بھی محبت وعشق کا ہوتا ہے جو شش جہت سے بھی اوپر کی بات لاتا ہے۔

عقل گوید، شش جہت راہیست حدے بیش نیست ‏ ‏ ‏ عشق گوید، ہست راہے، بارہا من رفتہ ام

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مصائب کے تیروں سے بچاؤ کی بہت آسان صورت ہے اور وہ یہ کہ آدمی تیر انداز کے پہلو میں آ کھڑا ہو، نہ تیر لگے گا نہ اثر کرے گا اور پہلوئے خداوندی ذکر اللہ اور یاد حق ہے جس میں محو ہوکر آدمی اپنے کو کلیتہً خدا کے سپرد کردیتا ہے اور یہ محبت وتفویض ہی عاشق کا وہ کام ہے جس سے ہر تلخ اس کے لئے شیریں بن جاتا ہے اور اس کی صدا یہ ہوجاتی ہے کہ۔

ناخوش تو خوش بود برجان من ‏ ‏ ‏ دل فدائے یار دل رنجان من

اور پھر اس کی تفویض اور جان سپاری کا عالم یہ ہوجاتا ہے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو' وربکشی فدائے تو ‏ ‏ ‏ دل شدہ مبتلائے تو' ہر چہ کنی رضائے تو

ظاہر ہے کہ اس لذت جان سپاری کے ہوتے ہوئے مصائب وآفات کی مجال ہی کیا رہ جاتی ہے کہ وہ قلب

① پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۶۲، ۶۴۔

عاشق کو بے چین کرسکیں یا اس میں ذرہ برابر پراگندگی اور تشویش پیدا کرسکیں اس حالت میں قلب عاشق کی ہر تشویش و پراگندگی مبدل بہ سکون وطمانینت ہوجاتی ہے جو لذت وراحت کی جڑ اور بنیاد ہے اب اگر اس میں کوئی تشویش و خلش ہوسکتی ہے تو اندیشہ فراق محبوب کی تو ہوسکتی ہے ورنہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی تشویش و پریشانی سے آلودہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بندۂ عقل کو کبھی قلبی راحت نہیں مل سکتی اور بندۂ خدا کو کبھی قلبی پریشانی نہیں ہوسکتی۔

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① ''آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں''۔ مغروران عقل تجویز کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیشہ نامراد رہتے ہیں اور خاکساران حق تفویض کی راہ چلتے ہیں تو ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس دنیا والوں کی انتہائی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسباب راحت کو راحت اور اسباب مصیبت کو مصیبت سمجھ رکھا ہے اس لئے دنیا کو اسباب و وسائل سے بھرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ یہی راستہ زندگی کی تشویشات اور بے چینیوں کا ہے جس میں ایک لمحہ کے لئے راحت میسر نہیں آسکتی، وہ اس راہ سے جتنا بھی حصول راحت اور دفعیہ مصائب کی جدوجہد کرتے رہیں گے اتنا ہی راحت سے دور اور قلبی سکون سے بعید تر ہوتے چلے جائیں گے۔

حصول راحت کا راستہ صرف ایک ہی ہے کہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے لوٹ کر خدا سے معاملہ صاف اور رابطہ قوی کیا جائے اور اسی سچے خدا کا سہارا پکڑا جائے جسے چھوڑ کر ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، ورنہ زندگی کے پرسکون ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا، اس لئے آج کی پریشان حال اور ابتر دنیا اگر فی الحقیقت ایک خوش خرم اور پرسکون زندگی چاہتی ہے تو اپنا رخ بدلے اور بم چلانے، ایٹم بم بنانے، چاند پر جانے اور سیارات چھوڑنے میں راحت وسکون تلاش کرنے کی بجائے خداوند کریم کی بارگاہ کی طرف توجہ کرے اور اس کے بھیجے ہوئے مستند قانون کو اپنا کر راہ عبودیت اختیار کرے کہ اس بارگاہ سے نہ کبھی کوئی مایوس لوٹا ہے نہ لوٹے گا اور اس سے کٹ کر نہ کبھی کوئی کامیاب ہوا ہے نہ ہوگا۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر وبت پرستی باز آ
ایں درگہ مادرگہ نومیدی نیست	صد بار اگر تو بہ شکستی باز آ

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸۔

سیرت اور صورت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

احوال واقعی...... بزرگان محترم! اس جلسہ کا اصل مقصد جامعہ اشرفیہ کے فارغ التحصل طلباء کی دستار بندی اور ان کو مجمع عام میں سند وغیرہ دینا ہے تا کہ جامعہ کی سال بھر کی کارگزاری معاونوں کے سامنے آ جائے۔ تو اصل مقصد دستار بندی اور ان کی تکمیل کا اعلان ہے۔ یہ مقصد عنقریب آپ حضرات کے سامنے آ جائے گا۔ میں اسی ذیل میں چند کلمات بہت مختصر وقت میں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

اور مختصر وقت میں نے اس لئے عرض کیا کہ کچھ تو میں علیل اور ضعیف بھی ہوں اور زیادہ بیان ہوتا بھی نہیں ہے کچھ اس وجہ سے کہ علماء کے اتنے بڑے مجمع میں ایک طالب علم کو یوں بھی جرات نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہمارے استاذ اکبر حضرت علامہ مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون جاتے تو حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "شاہ صاحب کے آنے سے میرے قلب کے اوپر ان کی علمی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے۔ میں کچھ مرعوبیت سی محسوس کرتا ہوں"۔

حالانکہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عالم کامل، عارف باللہ وہ حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت محسوس کریں حالانکہ حضرت شاہ صاحب ان کے ہم درس ہیں۔ حق تعالیٰ علم جسے چاہیں عطاء فرمائیں۔ تو حضرت علمی عظمت اور بوجھ محسوس کرتے تھے اور جہاں اتنے علماء بیٹھے ہوئے ہوں' آپ اندازہ کیجئے میرے دل پر اس کا کتنا بوجھ پڑ رہا ہوگا۔ اور بوجھ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اول تو قلت استعداد کی وجہ سے کوئی مضمون ہی نہیں (ذہن میں) ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ اور حبط ہو جاتا ہے۔ مگر بہر حال جب آپ حضرات نے اس جگہ بٹھلا دیا، اس کا قدرتی تقاضا یہ

---

① پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآیة: ۷.

ہے کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس واسطے میں نے عرض کیا کہ اختصار ہوگا، کچھ علالت، کچھ ضعف اور کچھ علماء کی موجودگی یہ چند در چند چیزیں ہیں جن کی وجہ سے شاید میں زیادہ تفصیل نہ عرض کر سکوں اور مقصدِ اصلی دستار بندی ہے، اس کے لئے وقت بھی دینا ہے۔

اس دنیا میں ہر مخفی حقیقت کے لئے کسی پیکر کا ہونا ضروری ہے...... بات صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ اس دنیا کے حالات اور اس کی اشیاء پر جہاں تک ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز یہاں مرکب ہے۔ ایک حصہ اس میں نمایاں ہے، جس کو آپ جسم یا صورت کہہ دیں اور ایک حصہ مخفی ہے جس کو آپ روح یا جان کہہ دیں۔ غرض یہاں کی ہر چیز روح اور جسم سے مرکب ہے۔ اس جہان میں نہ جسم محض ہے نہ روح محض ہے جسم محض ہو تو اس کا انجام گلنا پھولنا، پھٹنا سڑنا ہے۔ وہ بغیر روح کے باقی نہیں رہ سکتا اور روح محض بلا جسم کے نمایاں نہیں ہو سکتی، وہ مخفی کی مخفی رہ جائے گی۔ اس لئے دنیا میں جب بھی کوئی چیز آئے گی تو وہ اپنا کوئی پیکر یا ہیئت لے کر آئے گی۔

یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جب بھی کوئی غیبی حقیقت ظاہر ہوگی۔ وہ کوئی نہ کوئی پیکر یا پیراہن ضرور اختیار کرے گی اور وہ پیراہن اسی کے مناسب حال ہوگا جو اللہ نے اس لئے کے تجویز کیا ہے۔ مثلاً گلاب کی خوشبو ایک غیبی حقیقت ہے وہ جب نمایاں ہوگی، یہ نہیں ہے کہ وہ کیکر کے پتوں میں نمایاں ہو جائے، اپنے ہی مناسب صورت اختیار کرے گی۔ خربوزہ ہے اس کا ایک ذائقہ ہے۔ جب بھی اسے آپ تلاش کریں گے تو خربوزے کی ہیئت میں تلاش کریں گے یہ نہیں کہ آپ آم کی ہیئت میں خربوزے کا مزہ ڈھونڈنے لگیں۔ اس لئے کہ اس ذائقہ کو اللہ نے اسی کے مناسب شکل دی ہے۔ وہ غیر شکل میں نمایاں نہیں ہو سکتا۔

حقیقت کے مناسب صورت...... انسان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حقیقت جامعہ بنایا ہے جس میں سارے ظاہری اور باطنی کمالات رکھے ہیں۔ اس کے مناسب حال یہی صورت ہے جو آپ کی صورت نوعیہ ہے۔ یہ حقیقت کسی جانور کی شکل میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اسی انسانی پیکر میں ظاہر ہوگی تو ہر حقیقت قدرۃً چاہتی ہے کہ میرے مناسب صورت ہو۔ ہر صورت چاہتی ہے کہ میرے مناسب اس میں حقیقت ڈالی جائے۔ اللہ کے ہاں کوئی بے جوڑ قصہ نہیں ہے کہ حقیقت کوئی سی ہو اور شکل کوئی سی ہو۔ ہر صورت کے مناسب حقیقت اور ہر حقیقت کے مناسب صورت ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''اِلْتَمِسُوا الْخَيْرَ فِيْ حِسَانِ الْوُجُوْهِ'' ① ''خوبصورت چہروں میں خیر تلاش کرو''۔ یعنی اگر چہرہ مہرہ اچھا ہے تو اندر بھی خیر ہی ہوگی۔ چہرہ مہرہ خراب ہے تو اس درجے کی نہیں ہوگی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ قادرِ مطلق ہیں۔ وہ پابند نہیں ہیں، وہ چاہیں تو بہتر سے بہتر صورت میں بری حقیقت ڈال دیں اور بری سی بری صورت میں بہترین حقیقت ڈال دیں۔ یہ درحقیقت ان کے قبضہ قدرت کی

---

① مسند ابی یعلی الموصلی، ولفظه: اطلبوا، سعید بن ستان عن انس بن مالکؓ ج: ١٠ ص: ٢١. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه ابو یعلی وفیه من لم اعرفهم دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ٨ ص: ١٩٥.

بات ہے۔لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ جیسا پیکر ہوگا ویسی حقیقت ظاہر ہوگی۔

دیدہ زیب صورت میں بری حقیقت...... غالباً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا دور ہے، اس میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ عام سڑک پر ایک عورت پڑی رہتی تھی اور جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ ساری اس میں جمع تھیں رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، دانت بھی زرد اور آنکھیں کرنڈی، رال بھی بہہ رہی ہے اور آنکھوں پہ چیپڑ بھی لگے ہوئے۔غرض اس کی صورت کو دیکھ کر نفرت آتی تھی۔سڑک پر پڑی رہتی تھی۔لوگ اسے بھیک دے دیتے تھے۔ رخ کوئی نہیں کرتا تھا۔سب نفرت کا اظہار کرتے تھے۔وہ حاملہ پائی گئی۔

لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس غلیظ کی طرف کس نے توجہ کی ہوگی؟ یہاں تک کہ حکومت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر اس گندی عورت کی طرف کون متوجہ ہوا ہوگا؟ تو سی۔آئی۔ڈی (C.I.D) سے کہا گیا کہ اس کا پتہ چلاؤ، کون ایسی بھدی عورت کی طرف متوجہ ہوا؟

پولیس نے ایک ایسے آدمی کو لا کر پیش کیا جو نہایت حسین وجمیل اور نہایت ہی دیدہ زیب اس کی صورت۔ لوگ حیران تھے کہ ایسے پاکیزہ صورت انسان سے ایسا گندہ فعل کیسے سرزد ہوا؟ اور یہ فرشتہ صورت آدمی اس غلیظ عورت کی طرف کیسے متوجہ ہوا؟ تو پولیس سے سوال کیا گیا کہ تم نے کیسے پہچانا؟ پولیس نے کہا کہ اصل میں یہ شخص عرائض نویس ہے۔جیسے لوگ عرضیاں لکھتے رہتے ہیں تو ان کو اجرت ملتی ہے۔یہ بھی عرائض نویس ہے۔فٹ پاتھ پر نالی بہہ رہی تھی اس کے قریب اس کی جگہ تھی۔اس کی دوات خشک ہوگئی، تو اس نے بے تکلف نالی میں ہاتھ ڈال کر وہ جو گندہ پانی بہہ رہا تھا۔اپنی دوات میں ڈالا۔ہم نے جا کے پکڑ لیا کہ ایسی عورت کے ساتھ ایسی گندی حرکت یہی شخص کر سکتا ہے۔اس کی طبیعت میں گندگی ہے اور پکڑنے کے بعد تحقیقات ہوئیں تو بات سچی ثابت ہوئی کہ یہی مبتلا تھے۔تو صورت اتنی حسین وجمیل کہ بقول شخصے "دیکھ کر دھوپ بھاگ جائے" اور حرکت ایسی گندی سرزد ہوگئی کہ اس گندی عورت کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔بہتر سے بہتر صورت میں گندی حقیقت ڈال دیں، اور گندی سے گندی صورت میں بہترین حقیقت ڈال دیں۔

بدنما صورت میں پاکیزہ حقیقت...... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "مَارَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ أَبِيْ رَبَاحٍ" ① "میں نے اپنے دور میں عطاء ابن ابی رباح سے بہتر عالم نہیں پایا، علم، زہد، تقوی، اور کمالات ظاہر وباطن کے لحاظ سے میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں پایا۔آپ اندازہ کیجئے کہ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس شخص کے علم وکمال کی تعریف کریں اس کا کس درجہ کا کمال اور علم وفضل ہوگا؟۔تو علم وفضل کا یہ حال کہ ابوحنیفہ، مداح اور صورت انتہائی بدنما، کالی کلوٹی، دیکھ کر لوگ بھاگیں۔مگر اس کالی صورت میں حقیقت اتنی

① السنن للترمذی، کتاب العلل، ج: ۱۲، ص: ۴۹۲.

پاکیزہ بھری ہوئی کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے سامنے گردن جھکا رہے ہیں۔

صورت ترجمانِ حقیقت ہے......تو یہ حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ اچھی صورت میں بری حقیقت اور بری صورت میں اچھی حقیقت ڈال دیں مگر سنت اللہ یہی ہے کہ اچھی صورتیں ہوں گی تو اچھی حقیقتیں ہوں گی اور بری صورت ہوگی تو حقیقت بھی اسی درجے کی ہوگی۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ''اِلْتَمِسُوا الْخَیْرَ فِیْ حِسَانِ الْوُجُوْہِ'' ① ''اچھی حقیقتوں کو پاکیزہ چہروں میں تلاش کرو'۔ اس قسم کی تکوینی چیزیں اکثری ہوتی ہیں کلیہ نہیں ہوتیں کوئی نہ کوئی جز ان سے نکلتا رہتا ہے۔ عام سنت اللہ یہی ہے کہ جیسی صورت ویسی حقیقت۔ غرض ہر حقیقت کے مناسب صورت اور ہر صورت کے مناسب حقیقت دی جاتی ہے۔

صورت کا کام درحقیقت تعارف کرانا ہے یعنی حقیقت چھپی ہوئی ہے اسے پہچان نہیں سکتے جب تک کوئی صورت سامنے نہ ہو۔ کیونکہ صورت حقیقت کی ترجمان ہوتی ہے صورت دیکھتے ہی آدمی کہتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے۔ گلاب کی پتی دیکھ کر آپ فوراً پہچان لیں گے کہ اس میں گلاب کی خوشبو ہے۔ آم کی شکل دیکھتے ہی پہچان لیں گے کہ یہ اس ذائقے کا پھل ہے۔ اس میں آپ خربوزے کا ذائقہ محسوس نہیں کریں گے۔ تو اس دنیا میں کوئی حقیقت بغیر شکل کے نہیں پہچانی جاتی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ہر حقیقت کو ایک صورت عطاء فرمائی ہے۔ اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ آپ بغیر صورت کے حقیقت کو پہچان لیں۔ تو شکل وصورت کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ محض اس لئے رکھی گئی ہے کہ تعارف حاصل ہو جائے۔

حقیقت بیت اللہ الکریم......آپ حج کرنے کے لئے جاتے ہیں یا یہاں بیٹھ کر بیت اللہ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ بیت اللہ کچھ نہیں ہے۔ بیت اللہ معبود نہیں ہے وہ جو ایک چہار دیواری کا کوٹھا سیاہ لباس پہنے ایک محبوب کی مانند کھڑا ہے وہ مسجود نہیں ہے کہ آپ اسے سجدہ کریں بلکہ کعبہ درحقیقت وہ محل مبارک ہے جس کے اوپر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے اور وہ محل بھی فی الحقیقت کعبہ نہیں اس محل پر تجلی خداوندی اتری ہوئی ہے۔ اس تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں، وہ مسجود ہے۔ تو اس تجلی کے لئے محل کی ضرورت تھی۔ تو اللہ نے ایک بقعہ مبارک معین فرما دیا۔ اس محل کی پہچان کروانے کی ضرورت تھی تو کعبے کی چہار دیواری پر محنت کی گئی اور اسے بنایا گیا۔ غرض کعبہ ایک علامتی نشان ہے۔ حقیقت کعبہ وہ تجلی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں وہی فی الحقیقت مسجود ہے۔

ذات بالاتر ہے۔ وہ کسی چیز میں نہیں سما سکتی کیونکہ لامحدود ہے۔ محدود چیزوں کے اندر ذات نہیں سما سکتی۔ البتہ تجلی ایسی چیز ہے کہ بڑی سے بڑی چیز یا چھوٹی سے چھوٹی چیز میں آ سکتی ہے۔ اس لئے کہ تجلی کے معنی عکس کے ہیں۔ جیسے مثلاً آفتاب بڑی چیز ہے اور سائنس دان کہتے ہیں کہ آفتاب زمین سے ساڑھے تین سو گنا بڑا ہے۔ لیکن

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۶ ص: ۲۵۰. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی من طریق یحی بن یزید بن عبدالملک النوفلی عن ابیہ و کلاھما ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۱۹۵.

زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جسے آئینہ کہتے ہیں۔اس میں آفتاب کی پوری تصویر اتر آتی ہے۔وہ آفتاب کا عکس ہے، عین آفتاب نہیں ہے۔ممکن نہیں کہ عین آفتاب آئینہ میں سما جائے۔لیکن اس عکس کو دیکھ کر آپ یہی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آئینے میں سورج کو دیکھا اس میں سورج کے سارے خدوخال موجود ہیں۔وہی رنگ، وہی نقشہ، بلکہ آئینے کا آفتاب کام بھی وہی کرتا ہے جو اصل کا کام ہے۔اصل کا کام گرمی اور روشنی پہنچانا ہے۔اس آئینے کے ذریعے سے بھی آپ گرمی پہنچالیں گے اور آئینے کے مقابلے میں آئینے رکھتے چلے جائیں۔ہر آئینے میں ایک سورج آتا چلا جائے گا اور ان کے واسطے سے اندھیرے کنوئیں میں بھی روشنی ہو جائے گی۔تو جو اصل کا کام ہے تنویر اور حرارت۔یعنی روشنی پہنچانا اور گرمی پہنچانا وہی کام عکس بھی کرتا ہے۔اس لئے عکس کو دیکھتے ہی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو دیکھا۔آپ کسی کی فوٹو لے لیں گو نا جائز ہی سہی لیکن فوٹو دیکھتے ہی آپ کہتے ہیں کہ یہ فلاں صاحب ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر اور اصل میں عینیت کا علاقہ ہوتا ہے، غیریت نہیں ہوتی اگر غیریت ہوتی تو عکس کو دیکھ کر اصل کو آپ کبھی نہ پہچان سکتے۔تو عکس کا دیکھنا بعینہ اصل کا دیکھنا ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات لامحدود ہے۔وہ کسی غیر میں (مخلوق میں) نہیں سما سکتی۔وہ بالاتر ہے لیکن مخلوق کو پہچان کروانے کیلئے بیچ میں اللہ نے تجلی کا راستہ رکھا تو اس فضا میں یا آئینۂ بیت اللہ کے اندر اپنا عکس ڈال دیا۔اور عکس بڑی سے بڑی چیز کا چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی آ سکتا ہے۔تو درحقیقت مسجود وہ تجلی اور عکس خداوندی ہے جو بیت اللہ کے اندر اترا ہوا ہے۔یہ بیت اللہ کی عمارت اس کا ایک علامتی نشان ہے۔اگر یہ نہ ہو تب بھی سجدہ ادھر ہی کو ہوگا۔کیونکہ مقیم موجود ہے جس کو سجدہ کیا جاتا ہے۔

عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جب انہوں نے کعبے کی عمارت نئی بنائی تو پرانی عمارت نہیں تھی۔وہ منہدم کر دی گئی تھی لیکن طواف بھی جاری رہا اور نمازیں بھی جاری رہیں۔حالانکہ عمارت موجود نہیں تھی تو کعبہ اس تجلی مبارک کا نام ہے۔جس کا علامتی نشان کعبہ ہے۔

صورتِ کعبہ کا احترام.....مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ علامتی نشان ہونے کی وجہ سے یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ وہ کوئی ناقابل التفات چیز ہے۔اس کی عظمت، اس کا احترام، اس کا ادب اتنا ہی واجب ہوگا جیسے عین تجلی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔اس لئے کہ اسے تجلی سے ایک نسبت ہے اور وہ اس سے ملحق ہے۔نسبت کا اثر آئے گا تو اس کی اینٹ اینٹ معظم اور محترم بن جائے گی۔اس کا بھی ادب واجب ہوگا۔

اور نہ صرف بیت اللہ کا بلکہ اگر آپ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیں تو وہ غلاف بنایا تو آپ ہی نے ہے، مگر جب اس پر چڑھ گیا۔اس کے ساتھ نسبت قائم ہوگئی۔اس نسبت کی وجہ سے بنانے والے کو بھی اس کے سامنے جھکنا پڑے گا تو تجلی کی وجہ سے عظمت بقعہ مبارک کی قائم ہوئی۔اس بقعہ کی وجہ سے بیت اللہ کی چہار دیواری کی عظمت قائم ہوئی اور پھر ان سبھی وجوہ سے مسجد حرام کی عظمت قائم ہوئی اور مسجد حرام کی وجہ سے پورے مکہ کی قائم ہوئی۔حتیٰ کہ حجاز

بھی مقدس بن گیا۔ درجہ بدرجہ وہ تعظیم و تقدیس اور تکریم سب میں آتی رہی۔ تو اصل تعظیم اس تجلی مبارک کی ہے پھر درجہ بدرجہ نسبتیں پا کر سب اشیاء مقدس اور باعظمت بنتی گئیں حتی کہ اگر کوئی حج کر کے آئے۔ آپ اس کے بھی ہاتھ چومتے ہیں۔ اس میں کیا نئی بات پیدا ہوئی؟ عبادت تھی تو وہ یہاں بھی کرتا تھا۔ نماز بھی پڑھتا تھا۔ ایک محض اسے بیت اللہ سے نسبت پیدا ہوگئی کہ اس کی آنکھوں نے بیت اللہ کا جلوہ دیکھا ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے وہ حاجی واجب الاحترام بن جاتا ہے تو دنیا میں ساری عظمتیں نسبت سے قائم ہوتی ہیں اور نسبت صورت اور حقیقت کی مطابقت کی وجہ سے قائم ہوتی ہے کہ یہ حقیقت اس صورت میں پائی جائے۔ لہٰذا یہ صورت بھی قابل احترام ہے۔

قرآن کریم اللہ کسی کے سینے میں اتار دے۔ اس حافظ کی بھی آپ قدر کرتے ہیں۔ حالانکہ حافظ گوشت پوست کا مجموعہ ہے۔ وہی گوشت پوست آپ کے اندر بھی موجود ہے۔ اس کی ذات میں کوئی عظمت نہیں مگر اللہ نے چونکہ اسکے قلب میں اپنا کلام اتار دیا ہے۔ کلام کی عظمت کی وجہ سے اس کی روح باعظمت ہوئی اور روح باعظمت ہونے کی وجہ سے اس کا بدن بھی باعظمت بن گیا۔ آپ لوگ اس کے ہاتھوں کو بھی چومتے ہیں۔

ظہورِ حقیقت کی علامت...... تو درحقیقت واجب التعظیم وہ حقیقت ہوتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کی پہچان کروانے کے لئے حق تعالیٰ ایک شکل بنا دیتے ہیں جو ذریعۂ تعارف بھی ہوتی ہے اور واجب الاحترام بھی ہوتی ہے تو سنت اللہ یہی ہے کہ جب کوئی حقیقت نمایاں ہونے کے قابل ہوتی ہے اسے کوئی شکل دے دی جاتی ہے۔

ایک بچہ ہے وہ بلوغ کے قریب پہنچ جائے تو وہ اعلان کرتا تھوڑا ہی پھرتا ہے کہ میں بالغ ہوگیا ہوں۔ مجھے بالغ سمجھو اور بلوغ کے احکام جاری کرو۔ البتہ اس کی شکل ایسی بنتی ہے کہ دیکھتے ہی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ بالغ ہوگیا۔ چہرہ بھی چوڑا چکلا ہو جاتا ہے۔ جان آنے لگتی ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ اب یہ نکاح کے قابل ہے اس کا اب کہیں رشتہ ڈھونڈو۔ اب یہ بچہ نہیں رہا۔ یہ درحقیقت جوانی ہے جو روپ اختیار کرتی ہے۔ اس روپ کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے کہ اس میں بلوغ کی حقیقت آ گئی ہے اور بلوغ کی حد کو پہنچ گیا۔ اب یہ اس درجے پر آ گیا ہے کہ اگر اس کا نکاح کر دیا جائے تو اس کی نسل آگے چل سکتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے ایک طالب علم جو آپ کے ہاں آٹھ برس سے تعلیم پا رہا تھا وہ اب تک نابالغ تھا۔ اس نے میزان پڑھی، بلوغ کو نہیں پہنچا۔ شرح وقایہ تک پہنچا جب بھی بالغ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جب اس نے بخاری پڑھی۔ اب کہیں گے کہ یہ حد بلوغ کو پہنچ گیا۔ اب ایسا ہے کہ اگر اس کا کتاب سے رشتہ کر دیا جائے، تو اس کی علمی نسل شروع ہو جائے گی۔ اس کے شاگرد پیدا ہونے لگیں گے۔ روحانی ذریت پیدا ہونے لگے گی۔ اس لئے کہ حد بلوغ کو پہنچ گیا۔ اس کے لئے اللہ نے علامتیں رکھی ہیں۔

اسی طرح سے معنوی طور پر جب ایک طالب علم حد بلوغ و کمال کو پہنچے اس کی بزرگوں نے کچھ علامتیں رکھ دی ہیں۔ جس سے پہچانا جائے۔ مثلاً ایک علامت پگڑی باندھنا ہے۔ دستار بندی۔ یہ درحقیقت ایک اعلان ہے اور اس کی

علامت ہے کہ یہ اب علمی طور پر بالغ ہوگیا ہے ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اب اس کی روحانی طور پر ذریت واولاد پیدا ہوسکتی ہے۔ بھئی! نکاح کرنے میں بھی آپ دو آدمی گواہ مقرر کرتے ہیں کہ نکاح ہوگیا۔ اولاد جائز ہوگی۔ اسی طرح اس بالغ طالب علم کے بارے میں سارے استاذ شہود بنتے ہیں کہ یہ بالغ ہے اب جسے یہ پڑھائے گا وہ اس سے علم حاصل کرے گا۔ غلط راستہ پر نہیں جائے گا تو پگڑی دے دینا یا سند اس کے ہاتھ میں دے دینا یہ علامت ہے۔

حصولِ حقیقت کے ذرائع کا احترام..... مگر وہ طلباء جن کی دستار بندی ہوگی حد کمال پر پہنچنے کا یہ مطلب نہ سمجھیں کہ ہم کامل ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صلاحیت واستعداد پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کامل بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں۔ اب استاذ اور کتاب کے محتاج نہیں رہے۔ اس درجے کی قوت آ گئی ہے کہ اگر وہ مطالعہ شروع کریں، تبحر پیدا کریں، تفقہ سے کام لیں، تو ان کا علم آگے چلے گا تو دستار بند ہو کے طلباء یہ تصور نہ باندھیں کہ ہم اب کامل ہوگئے بلکہ یہ تصور باندھیں کہ استاذوں کی برکت سے صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، کہ اگر ہم کمال کے راستے طے کریں تو اب طے کر سکتے ہیں، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوگا کہ ہم استاذوں سے بالکل مستغنی ہوگئے بلکہ مرتے دم تک استاذوں کے محتاج رہیں گے، اس لئے کہ جتنا علم ان کا بڑھ گیا، ان کے استاذوں کا علم بھی بڑھ رہا ہے تو وہ اور زیادہ آگے بڑھ جائیں گے۔

مجھے اس پر ہمارے بھائی ادریس کا واقعہ یاد آیا۔ آپ کے ہاں کے شیخ الحدیث مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، واقعی ایک مثالی عالم تھے۔ متقی صاحب تقویٰ وطہارت، متبحر اور متفقہ، غرض جو عالم میں خصوصیات ہونی چاہئیں۔ اللہ نے وہ سب عطاء کی تھیں اور وہ میرے بھائیوں میں بھی اور دوستوں میں سے بھی تھے اور ہم چونکہ ساتھ ہی پڑھے تھے۔ ایک ہی جماعت میں تھے۔ اس لئے ہماری آپس میں بے تکلفی بھی تھی۔ بہر حال ایک مثالی عالم تھے۔ انہوں نے مسئلہ تقدیر پر ایک مضمون لکھا، جو منظوم ہے غالباً وہ چھپ بھی گیا ہے اور اس کے شروع میں میں نے کچھ مقدمہ بھی لکھا تھا، مولانا نے مسئلہ تقدیر کی شرح لکھی ہے۔ اور اس کے شروع میں بطور مقدمے کے میں نے کچھ لکھا ہے۔ یہ رسالہ لکھ کر وہ تھانہ بھون پہنچے اور ان کے ذہن میں یہ تخیل تھا کہ ایسی بدیہی چیزیں میں نے لکھی ہیں کہ ان میں کسی قیاس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کھلی کھلی باتیں ہیں اور نصوص شرعیہ پیش کی ہیں۔ اس پر کون نکتہ چینی کر سکتا ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر عرض کیا' حضرت! میں نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ آپ اس پر ایک نگاہ ڈال دیں، کوئی تقریظ کا کلمہ لکھ دیں تا کہ یہ مستند بن جائے۔

حضرت نے فرمایا کہ بھئی! دوپہر کو قیلولہ کرنے کی عادت ہے تو لیٹ کر میں اسے دیکھ لوں گا کوئی بات ذہن میں آئی تو کچھ لکھ دوں گا۔ یہ حضرت کے پاس وہ رسالہ چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت نے دوپہر کو وہ سارا رسالہ دیکھا، ظہر کی نماز کے بعد جب جمع ہوئے تو حضرت مولانا ادریس صاحب بھی آئے۔ حضرت نے فرمایا: مولوی

ادریس یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ انہوں نے کہا ''جی حضرت'' فرمایا: اول سے لے کر آخیر تک سارا غلط ہے۔

اب ان کی آنکھیں کھلیں۔ فرمایا کہ مواد سارا صحیح ہے اس لئے کہ آیات وروایات پیش کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے جو لطائف نکالے گئے اور جو اس کا اسلوب بیان ہے اس میں غلطی کی ہے اور پھر اس پر اعتراضات کئے اور واقعی نا قابل حل اعتراضات تھے۔

ہمارے بھائی ادریس صاحب کو یہ بات نظر نہیں پڑی۔ اس پر حضرت نے ایک جملہ فرمایا۔ ''بھائی! نظر تمہاری وسیع ہے۔ علم تمہارا بہت وسیع ہے۔ ہمارا اتنا نہیں۔ مگر تم بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہوسکتے تمہیں رجوع کرنا پڑے گا''۔ اس لئے کہ دس برس کتابیں دیکھ کر جس نتیجے پر پہنچو گے۔ بوڑھوں کے پاس آکر منٹ بھر میں تمہیں چیز مل جائے گی۔ تو فر،یا ''تم بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہوسکتے''۔

غرض جن حضرات کی دستار بندی ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ اب انہیں کسی سے سروکار نہیں۔ وہ اب بھی اپنے اساتذہ کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ علم میں بڑھتے جائیں گے تو استاذ تو ان سے دس برس بڑا ہے۔ وہ ،ی تو آگے بڑھتا جائے گا۔ یہ یہاں تک پہنچیں گے وہ اور دس گز آگے پہنچ جائے گا۔ اور علم کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ کسی مقام پر پہنچ جائے، پھر بھی آدمی علم کا محتاج رہتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کا شعر ہے، فرماتے ہیں کہ۔

كُلَّمَآ اَدَّبَنِىْ دَهْرٌ اَرَانِىْ نَقْصَ عَقْلِىْ   كُلَّمَآ اَزْدَادُ عِلْمًا اِزْدَدْتُ عِلْمًا بِجَهْلِىْ

''جوں جوں زمانے نے مجھے علم سکھایا اور میرا شعور بڑھتا گیا اور مجھ پر میری جہالت واضح ہوتی گئی جس مقام پر میں پہنچتا اور اس مقام کا علم ہوتا تو ہزاروں مقام نظر پڑتے جس سے معلوم ہوتا کہ ان سے ابھی تک جہالت تھی''۔ جب اس سے اگلے مقام پر پہنچے، تو اس سے آگے لامحدود مقامات ہیں جن کا علم نہیں تو اور جہالت کھلی کہ ابھی تو جاہل ہی جاہل ہیں۔ اس لئے کہ علم حق تعالیٰ کی صفت اور اس کا کمال ہے۔ اس کی ہر صفت لامحدود ہے۔ آدمی کتنا ہی بڑھ جائے جہالت پھر بھی رہے گی۔ اخلاق ربانی بلحاظ کمال کے لامحدود ہیں۔ آدمی کتنا ہی بااخلاق بن جائے پھر بھی وہ نیچا ہی رہے گا۔ اس لئے کہ مراتب اخلاق لامحدود ہیں۔

قرآنی حقائق کی اخروی شکلیں...... اسی واسطے حضرات صوفیاء کے ہاں صوفی کا لقب نامراد ہے۔ یہ ایسا وحشت ناک لقب رکھتے ہیں کہ وہ مبنی بر حقیقت تو ہوتا ہے مگر لفظ ڈراؤنا ہوتا ہے یعنی جسے ہم بامراد سمجھتے ہیں کہ یہ کامل ومکمل ہے یہ اس کا نام نامراد رکھتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب طریقت کبھی مراد کو پہنچتا ہی نہیں حق تعالیٰ کے مراتب کمال لامحدود ہیں، جس حد تک پہنچے گا محدود پہنچے گا۔ معلوم ہوگا آگے ابھی باقی ہیں۔ وہ کبھی مراد کی انتہا کو پہنچے گا ہی نہیں۔ جب رہے گا بیچ میں ہی رہے گا اس لئے انہوں نے لقب ہی نامراد رکھ دیا۔

اے برادر بے نہایت در گہے ست   ہر چہ بروے مے رسی بروے مائیست

بے انتہا درگاہیں چلتے جاؤ، کوئی حدونہایت نہیں حتی کہ جنت میں بھی آپ پہنچ جائیں گے۔ اور انشاء اللہ ضرور پہنچیں گے۔ وہاں بھی آپ بڑھتے ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی حد پر رک جائیں گے۔ اس لئے کہ جنت ظاہری و باطنی کمالات ربانی کے مقامات کھلنے کا نام ہے جیسا کہ ظاہری نعمتیں وہاں بے شمار ملیں گی۔ باطنی نعمتوں کی بھی وہاں کوئی حدونہایت نہیں ہوگی۔ آدمی کا علم بڑھتا جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو فرمایا جائے گا۔

''رَتِّـلْ وَارْتَـقِ'' تلاوت کرتا جا، ترقی کرتا جا۔ یعنی جتنی آیتیں ہیں۔ اتنے ہی قرآن کے مقامات ہیں اور ان مقامات کی اتنی لامحدود کیفیات ہیں۔ جس مقام پر پہنچو گے لامحدود نعمتیں اور کیفیات محسوس ہوں گی اور معلوم ہوگا اب تک کچھ ملا ہی نہیں تھا تو آگے لے لو۔ کبھی بھی حد کو نہیں پہنچو گے۔ حافظ کو فرمادیا جائے گا۔ جہاں تک تیری قوت ہے تلاوت کر اور ترقی کرتا جا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی جتنی آیتیں ہیں اتنے ہی جنت کے درجات ہیں۔ جیسے دنیا میں ایک آیت لاکھوں علوم پر مشتمل ہے کہ جتنا اس کے سمندر میں غوطہ لگاؤ تہہ نہیں ملتی۔ علوم در علوم نکلتے چلے آتے ہیں ؎

حرف حرفش را اندر معنی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ معنی در معنی در معنی

جتنا کریدو گے علم کے نیچے علم ہے تہہ بہ تہہ علوم ہیں۔ آخر اللہ کا کلام ہے، معجزہ ہے۔ اسی طرح جب ایک آیت کے حقائق کھل کر وہاں کیفیات کی صورت میں نمایاں ہوں گے وہ بھی تہ بہ تہہ ہوں گے۔ ان کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی۔ گویا ایک ہی آیت کے علوم و کیفیات پاتے پاتے ہزاروں برس گزر جائیں گے۔ اسی کی لذت سے فارغ نہیں ہوگا۔ آگے کا مرتبہ جب آئے گا جب اس سے بھی فراغت نہ ہوگی۔ غرض بے انتہاء درجات و مراتب ہیں۔

اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ جنت میں جا کے مقامات انتہا کو نہیں پہنچیں گے۔ روز ترقی رہے گی اور یہی چیزیں جو آپ نے اللہ کی آیتیں پڑھی ہیں، انہی کے حقائق متمثل ہوں گے۔ شکل بدل بدل کر باغ و بہار کی صورت میں نعمت بن بن کر آپ کے سامنے آئے گی۔

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ ① ''دنیا میں جو عمل کرتے تھے، اس کو بعینہ یہی آپ کا عمل نعمت کے مختلف روپ اختیار کرے گا''۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَلسَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ'' ② ''یہ سخاوت جنت میں ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی''۔

ظاہر میں آپ نے فقیر کے ہاتھ پر کچھ رکھا، داد و دہش کی۔ اس کی شکل درخت کی ہوگی اس لئے کہ جزا مطابق عمل ہوتی ہے۔ عملاً آپ نے فقیر کے سر پر سایہ کیا۔ اس کی بھوک کو دفع کیا، اس کی پریشانی کو دور کیا، اس کی سرپرستی کی۔ گویا فقیر کو آپ نے اپنے زیر سایہ لے لیا۔ وہ بیچارہ مطمئن ہوگیا۔ اس عمل نے جنت میں جا کر ایک

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۴۹. ② الحدیث اخرجہ البیھقی فی شعب الایمان، الرابع والسبعون من شعب الایمان وضعفہ، ج: ۷ ص: ۴۳۴ رقم: ۱۰۸۷۵.

درخت کی شکل اختیار کی، تو درخت کے سایہ میں آپ آ گئے جیسے ایک فقیر کو آپ نے سایہ دیا تھا۔ اسے آپ نے پھل کھلایا تھا۔ جس سے وہ بیچارہ بچ گیا۔ وہ درخت آپ کو پھل دے گا۔ جس سے آپ کی زندگی بھی ترقی کرے گی۔ اس لئے آپ کا عمل درخت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ تو جیسے درخت سایہ بھی دیتا ہے، پھل بھی دیتا ہے، فرحت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہی منافع سخی کو حاصل ہوں گے۔

کمالِ علمی کی علامات...... حاصل ساری بات کا یہ نکلا کہ جس طرح جوانی کچھ علامتوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے روحانی مقامات اور اس کا حدِ کمال کو پہنچنا بھی کچھ علامات سے پہچانا جاتا ہے۔ جب علمی طور پر وہ بالغ ہوگا، اساتذہ شہادت دیں گے کہ یہ بالغ ہو گیا۔

اس کی علامت یہ ہے کہ سند اس کے ہاتھ میں دے دیں گے اور اس کے سر پر پگڑی باندھ دیں کوئی نشان اس کے سامنے پیش کر دیں وہ ایک علامت ہوگی، جیسے جوان آدمی کے لئے داڑھی کا نکلنا، چہرے کا چوڑا چکا ہو جانا جوانی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر جیسے میں نے عرض کیا جو بھی کسی حقیقت کی علامت ہوگی اگر وہ حقیقت اچھی ہے تو وہ علامت بھی قابلِ تعظیم ہوگی۔ جیسا کہ آپ کو گلاب کی خوشبو محبوب ہے تو اس کی پنکھڑیاں بھی اتنی ہی محبوب ہوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ انہیں جوتوں سے روندیں۔ اگر خوشبو عزیز ہے تو اس کے پتے بھی عزیز ہوں گے۔ وہی تو خوشبو کا ظرف ہے۔ وہ اگر پامال ہو گیا تو خوشبو باقی کہاں رہے گی؟۔ تو علم کی خوشبو کی جس قسم کی علامات ہیں، جس پیکر میں چھپی ہوئی ہوں گی۔ اگر علم واجب التعظیم ہے تو وہ شخصیت بھی واجب التعظیم ہوگی۔ جو اس کو سند ملے گی وہ بھی واجب الاحترام ہوگی۔ اس کو پگڑی ملے گی وہ بھی واجب القدر ہوگی۔ وہ اس اندرونی حقیقت کی علامت ہوگی جس سے آپ کو نظر آ جائے گا کہ اندر علم و کمال ہے۔

اس واسطے کہ متکلم کی حقیقت اس کے کلام سے کھلتی ہے جیسا کلام سامنے آئے گا آپ سمجھ جائیں گے ایسا ہی متکلم بھی ہوگا۔ تو جیسی علامتیں سامنے آئیں گی آپ سمجھ لیں گے کہ ایسی ہی حقیقت اس کے اندر ہے، مثلاً علامت یہ سامنے آئی کہ سر پر دستار باندھی گئی، سند ہاتھ میں دی گئی۔ اساتذہ نے شہادت دی۔ یہ علامت ہوگی کہ واقعی اس میں کوئی اچھی حقیقت ہے، وہ حقیقت واجب الاحترام تو یہ علامتیں بھی واجب الاحترام۔

انتقالِ حقیقت کا اثر...... مجھے اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمایا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ: جس سال ہم نے دارالعلوم سے تعلیم پائی تو دورے میں کل چودہ لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب یہ دورے سے فارغ ہوئے تو اہلِ مدرسہ نے فیصلہ کیا کہ کوئی جلسہ دستار بندی کیا جائے۔ ان کو پگڑی باندھی جائے اور اعلان کیا جائے کہ یہ فارغ التحصیل ہیں۔ فرماتے تھے کہ ہم طلباء کو بڑی فکر پیدا ہوئی کہ بھئی! ہمارے اندر نہ کوئی لیاقت ہے نہ قابلیت ہے اور برسرِ مجمع ہمیں دستار دی جائے تو کہیں ہم، اپنے استاذوں کے بدنام کنندہ ثابت نہ ہوں؟ اس لئے کسی طرح سے اس جلسے کو رکوانا چاہئے۔ ہم اس

قابل نہیں ہیں کہ ہمیں پگڑی دی جائے۔

خیر کا زمانہ تھا، تواضع اور کسرِ نفسی طلباء میں بھری ہوئی تھی۔ فرماتے تھے کہ سب نے مجھے وکیل بنایا کہ تو جا کے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عرض کر جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ: میں چھتے کی مسجد میں حاضر ہوا اور حضرتؒ کے حجرے میں گیا تو کتاب دیکھ رہے تھے اور ہیئت یہ بتائی کہ اونچا تکیہ تھا اور اس پر کہنیاں ٹیک رکھی تھی اور ہاتھ پیشانی کے قریب تھے۔ کتاب میں محو تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ دو تین منٹ کے بعد حضرت مولاناؒ نے دیکھا تو میں نے سلام عرض کیا۔ جواب دے کر فرمایا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟

میں نے عرض کیا حضرت! یہ سننے میں آ رہا ہے کہ دستار بندی کا جلسہ ہوگا اور ہمیں پگڑی باندھی جائے گی۔ اگر یہ امر ہے تب تو ہم تعمیل کریں۔ آپ جو چاہیں ہمارے سر کے اوپر باندھ دیں لیکن اگر اس میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے تو اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ (کہ ہم سب کی یہ رائے ہے کہ) ہم نالائق اس قابل نہیں ہیں کہ ہمیں پگڑی دی جائے۔ ہم کہیں اپنے استادوں کے بدنام کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔ اس لئے اس جلسے کو روک دیا جائے۔

فرماتے تھے کہ: مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں جوش رحمت پیدا ہوا۔ پہلا جملہ تو یہ فرمایا کہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم ایسا سمجھو اور جب تک آدمی اپنے بڑوں کے سامنے ہوتا ہے یہی سمجھتا ہے کہ میں نالائق ہوں کسی قابل نہیں ہوں اور اسے سمجھنا بھی چاہئے۔ فرمایا یہ تمہاری سعادت ہے۔

اس کے بعد فرمایا باقی ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ "فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اللهِ" مطمئن ہو کے کر رہے ہیں۔ ہمیں تمہاری استعدادوں کے اوپر اعتماد ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ہمیں شرح صدر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہم نہ صرف پگڑی باندھیں گے بلکہ یہ بھی اعلان کریں گے کہ: ''جس فن میں جس کا جی چاہے، ان سے مناظرہ کر لے''۔ تو حضرتؒ فرماتے تھے کہ: حضرتؒ نے یہ جملے فرمائے کہ ہم فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اللهِ مطمئن ہو کر تمہیں دستار باندھ رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں انشراح ہے تمہاری استعدادیں ہیں اور ہم بھرے مجمع میں اعلان کریں گے کہ جس کا جی چاہے جس فن میں ان سے بحث کر لے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تو کانپ گیا کہ بھئی! آئے تھے نماز بخشوانے، یہاں روزے بھی گلے پڑ گئے، ہم تو آئے تھے کہ سند بھی نہ ملے، یہاں اعلان ہوگا کہ بحث بھی کرو، تو میں بہت سہم گیا، اس کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور جملہ فرمایا جو شفقت کا تھا، فرمایا: ''تمہاری سعادت مندی ہے جو تم اپنے کو نا اہل اور نالائق سمجھتے ہو باقی عام طور پر دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں جاؤ گے تم ہی تم ہو گے۔'' فرماتے تھے کہ ہم نے یہی دیکھا کہ جہاں گئے ہم ہی ہم نظر آئے اور کسی کی دال گلتی ہم نے نہیں دیکھی یہ ان بزرگوں کے قول کا اثر تھا اور اس حقیقت کا جوان کے ذریعے سے ان کے قلوب میں پہنچی۔

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ: جس کو دستار دی جائے، اس کا جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ یہ بزرگوں کی طرف سے ایک عطیہ ہے، ہمارے لئے تبرک ہے مگر ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اس عطیہ کو ہم رکھ سکیں۔ شاید اس کی برکت سے

حق تعالیٰ ہمارے اندر کوئی پاکیزگی پیدا فرمادے۔

نقل پر حصول حقیقت...... اس لئے کہ بعض دفعہ جب صورت اچھی ہوتی ہے۔ تو اچھی صورت میں بھی اچھی حقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے آجاتی ہے۔ جب اچھی ہیئت بنے گی اور امید ہے کہ اللہ کی طرف سے اچھی حقیقت بھی آجائے گی۔

آپ نے واقعہ سنا ہی ہوگا' حدیث شریف میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا مشہور واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک یا کسی اور غزوے سے جب واپس ہوئے تو مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) چند میل باقی رہ گیا۔ عادت شریف یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نہیں داخل ہوا کرتے تھے۔ سعی فرماتے تھے کہ دن میں داخل ہوں۔ اس لئے وہاں پڑاؤ ڈال دیا گیا تا کہ کل صبح کو مدینہ منورہ میں پہنچ جائیں چونکہ لشکر تھا۔ خیمے وغیرہ لگ گئے۔ تو نماز کے لئے اذان ہوئی۔ جب کوئی فوج یا لشکر جاتا ہے تو لشکر اور فوجیں دیکھنے کیلئے عموماً بچے جمع ہوجاتے ہیں۔ اب یہ صحابہ کا لشکر تھا اور اس زمانے میں عام شہرہ تھا کہ ایک نئی قوم پیدا ہوئی ہے۔ یہ ان کا لشکر ہے تو دیکھنے کے لئے سینکڑوں بچے جمع ہوگئے جب اذان ہوئی تو بچوں نے اذان کی نقل اتارنی شروع کی اور ایک شور کی شکل بن گئی کیونکہ ہر بچہ جب اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے گا تو خود ہی شور ہوگیا اَللّٰهُ اَكْبَرُ کا بڑا شور مچا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر تشریف لائے۔ فرمایا یہ شور کیسا؟ لوگوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! موذن اذان دے رہا ہے، بچے نقلیں اتار رہے ہیں۔ فرمایا: ان بچوں کو پکڑ کے لاؤ۔

حضرات صحابہؓ پکڑنے کے لئے دوڑے تو بچے بھاگ گئے۔ یہ ابومحذورہؓ نہ جوان تھے نہ بالکل بچے تھے، انہیں غیرت آئی کہ میں بھاگ جاؤں۔ یہ کھڑے ہوگئے۔ صحابہؓ نے انہیں پکڑ لیا اور لا کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم کیا کررہے تھے؟ انہوں نے ذرا جرات سے کہا کہ اذان دے رہے تھے۔ فرمایا۔ اچھا دو اور نقل اتارو۔

انہوں نے ذرا دبے لفظوں میں کہا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، فرمایا' زور سے کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے زور سے کہا جیسے موذن اَللّٰهُ اَكْبَرُ پکارتا ہے۔ اس کے بعد حقیقت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ توحید کا مسئلہ آیا۔ فرمایا آگے چلو۔ اب یہ ذرا جھجکے۔ اس لئے کہ توحید میں بھی ان لوگوں کو بہت سا کلام تھا۔ وہ شرک کے اندر مبتلا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نقل کیوں نہیں اتارتے؟ انہوں نے ذرا دبے اور گھٹے لفظوں میں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا فرمایا: زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فرمایا آگے چلو۔ آگے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو ساری جھگڑے کی چیز تھی۔

اس لئے کہ توحید کے کسی نہ درجے کے مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ بالکل منکر نہیں تھے اور کہتے تھے کہ اللہ اور خالق تو ایک ہی ہے۔ اس نے اپنے نیچے بہت سے خدا بنا رکھے ہیں۔ انہیں اختیارات دے دیئے ہیں، کوئی روزی

دینے والا ہے، کوئی اولاد دینے والا ہے۔ اصل ایک ہی ہے اور اسی واسطے جب وہ حج میں جاتے تھے تو ان کا تلبیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جس میں ایسی ہی توحید کا اقرار تھا اور کہتے تھے ''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ. لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ اِلَّاشَرِیْکًاھُوَلَکَ'' ''اے اللہ میں تیرے پاس حاضر ہوا تیرا کوئی شریک نہیں، ہاں شریک وہ ہے جو تو نے خود ہی اپنا شریک بنا رکھا ہے''۔ یعنی تو نے ہی معاذ اللہ جو شرک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ وہ شریک تو موجود ہے باقی از خود کوئی تیرا شریک نہیں ہو سکتا۔

تو کسی نہ کسی درجے میں توحید کو مانتے تھے۔ سارا جھگڑا رسالت کے اندر تھا اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ تک تو بات بیت گئی۔ اب جب اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰہِ کی باری آئی تو یہ بہت سٹپٹائے کہ کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نقل اتارو۔ جب نقل اتار رہے تھے، انہوں نے بہت دبے گھٹے لفظوں میں کہا ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰہِ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا۔ یہاں تک کہ اذان پوری ہوگئی۔ فرمایا' جاؤ! عرض کیا، حضور! اب جاؤں کہاں؟ میں تو اب غلام بن چکا!

وہ توحید و رسالت جو زبان سے ادا کی۔ وہی صورت وہی آواز دل میں اثر کر گئی۔ توحید بھی دل میں اتر گئی۔ نبوت کی عظمت بھی دل میں اتر گئی۔ تو عرض کیا اب میں کہاں جاؤں۔ میں تو غلام ہو چکا ہوں۔ میرا تو دل مسلمان ہو چکا۔ زبان سے میں نے توحید و رسالت کا اعلان کر دیا۔ زبان نے جس چیز کا اعلان کیا تھا، وہی دل میں اثر کر گئی۔ اچھی صورت بنی تھی تو اس میں حقیقت بھی اچھی پیدا ہوگئی۔ تو آدمی اچھی صورت بنا لے تو حق تعالیٰ اس میں حقیقت حسنہ ڈال دیتے ہیں۔

ظاہری وضع کا باطن پر اثر...... یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے ظاہری روپ، ظاہری وضع قطع، اس کی تہذیب پر توجہ دلائی ہے کہ جیسی تم ظاہری وضع اختیار کرو گے، باطن بھی تمہارا ویسا بن جائے گا۔ فرض کر لیجئے کوئی شخص پہلوانوں کا سا لباس پہننے لگے، لنگوٹ باندھ کر میدان میں آجائے۔ طبعاً اس کا دل چاہے گا کہ پنجہ کشی کرے، ڈنڈ پیلے، مقابلے ہوں اور کشتی ہو۔ طبعاً ادھر جذبات مائل ہو جائیں گے۔ وہ اس وضع کا اثر ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص زنانہ لباس پہن لے۔ چوڑیاں بھی پہن لے، رنگین کپڑے پہن لے، چند دن کے بعد جذبات میں نسوانیت آجائے گی، اس کا جی چاہے گا کہ بولے بھی عورتوں کی طرح اور لب ولہجہ بھی وہی اختیار کرے۔ وہ اس وضع کا اثر ہوگا۔

اگر ایک شخص علماء کی وضع اختیار کرے طبعی طور پر ورع وتقویٰ کی طرف توجہ ہوگی چاہے ظاہر داری میں ہو کہ میاں مولویانہ لباس پہن رکھا ہے۔ اس میں اگر کوئی بری حرکت کی۔ لوگ کیا کہیں گے۔؟ اس لباس میں رہ کر یہ حرکت؟ تو خواہ مخواہ طبیعت مائل ہوتی ہے کہ کوئی متقیانہ افعال سرزد ہوں۔ یا اہل اللہ اور درویشوں جیسا لباس پہن لے۔ تو قدرۃً اس میں زہد وقناعت کے جذبات پیدا ہوں گے غرض ہر وضع قطع باطن پر موثر ہوتی ہے۔ جیسی ہیئت بنا لو گے ویسی

حقیقت بن جاتی ہے۔اس لئے شریعت نے زور دیا ہے کہ ہیئت بناؤ تو اہل اللہ جیسی بناؤ۔انبیاء علیہم السلام کی ہیئت بناؤ۔صحابہ کرامؓ اور علماء ربانی کی ہیئت بناؤ۔اس ہیئت میں اچھی حقیقت ڈال دیتے ہیں۔چاہے ظاہرداری کے لئے ہی بناؤ مگر بیکار نہیں ثابت ہوتی۔غرض ظاہری قول،ظاہری ہیئت ایسی مت اختیار کرو کہ تمہارا باطن بگڑ جائے۔

قول وفعل کا اثر......مثلاً زمانہ جاہلیت میں یہ رسم پڑی ہوئی تھی کہ اس طرح سے اگر کسی نے انگلی دکھلادی تو تلواریں نکل جاتی تھیں جیسے ہمارے آپ کے ملک میں کہتے ہیں کہ کسی کو ٹھینگا دکھا دینا،کسی کو انگوٹھا دکھادیا وہ لڑ پڑے گا۔یہ چڑانے کی علامت ہے۔زمانہ جاہلیت میں چڑانے کی یہ علامت تھی۔اس طرح انگلی دکھائی اور تلواریں نکلیں۔اس لئے اس انگلی کا نام سَبَّابَہ یعنی گالم گلوچ کی انگلی تھا۔جہاں اٹھی اور لڑائی شروع ہوتی۔

شریعت اسلام نے اس کی ہیئت کو بدلا۔اس کے محل کو بدلا کہ انگلی اٹھائی جائے مگر کہاں؟ شہادت اور توحید کے واسطے التحیات کے اندر اٹھائی جائے اور اس کا نام رکھا سَبَّاحَہ،یعنی اللہ کی پاکی بیان کرنے والی انگلی۔فرمایا سَبَّابَہ مت کہو،ورنہ وہی لغوی معنی یاد آئیں گے جو زمانہ جاہلیت کے تھے۔سَبَّاحَہ کہو۔جب لفظ اچھا بولو گے،حقیقت بھی اندر اچھی آجائے گی۔

تجارت کرنے والے کو قرآن کریم نے تاجر کہا ہے۔اور زمانہ جاہلیت میں خنسار کہتے تھے۔تو ارشاد فرمایا گیا کہ۔خنسار مت کہو۔تاجر کہو،یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ:''لَاتَقُولُوا خِنْسَارًا وَقُولُوا تَاجِرًا.''خنسار مت کہو،جاہلیت کی لغت ہے۔جب وہ بولو گے تو تمہاری طبیعت خواہ مخواہ جاہلیت کی طرف جائے گی،اس لئے وہی لفظ بولو،جو اللہ نے اختیار کیا ہے تاکہ ذہن جائے تو قرآن کی طرف اور حقائق الٰہیہ کی طرف جائے۔غرض ہر چیز میں ہیئت ہو۔لفظ یا قول ہو اچھی صورت اختیار کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تاثیر نہ ہو۔ہر چیز میں اللہ نے اثر دیا ہے۔کھانے پینے کی چیزوں میں اثر ہے،جیسا دانہ کھائیں گے ویسا اثر ظاہر ہوگا۔جیسا پھل کھائیں ویسا اثر ظاہر ہوگا۔ہر چیز میں تاثیر ہے۔اور فقط اشیاء ہی میں تاثیر نہیں۔آپ کے بدن میں بھی تاثیر ہے،آپ کی ہر ہیئت میں تاثیر ہے۔آپ اگر کسی کو منہ اچھا کر کے دکھلائیں،ممنون ہوگا اور اگر کسی بری ہیئت سے دکھلائیں۔جبھی لڑائی ہوجائے گی،معلوم ہوتا ہے ہیئت میں ممنون کرنے کا اثر بھی ہے اور غیض وغضب میں لانے کا بھی۔اسی طرح آپ کی آنکھ بھی موثر ہے۔اگر آپ نیچی نگاہ کر کے بات کریں،محبت پیدا ہوگی اور اگر آنکھ اٹھا کے گھور کے گفتگو کریں تو غیض وغضب پیدا ہوگا۔معلوم ہوتا ہے آنکھ خاموش ہے۔مگر خاموشی کے ساتھ بولتی ہے۔بعض دفعہ غیض اور بعض دفعہ محبت پیدا کردیتی ہے۔

لباس کی وضع قطع میں اثر ہے جیسی وضع ہوگی ویسی تاثیرات قلب کے اوپر پڑیں گی۔چہرے مہرے کی جیسی ہیئت بنائیں گے،ویسے قلب کے اوپر اثرات پڑیں گے۔جب ہر چیز میں اثر ہے۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اوضاع کے اندر اور ہیئت کے اندر اثر نہ ہو۔شریعت نے تہذیب سکھلائی کہ قول بھی ایسا مت کہو جو بھدا ہو جس سے دو معنی

کی طرف دھیان جائے۔ ہیئت بھی ایسی مت بناؤ جس سے کوئی برائی پیدا ہو۔ ہیئت، قول اور نظر بھی اچھی رکھو۔

اس لئے فرمایا ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ﴾ ① "چال میں میانہ روی اختیار کرو" ٹھپ ٹھپ کرتے ہوئے چلو گے، تکبرانہ چال ہو جائے گی، بہت جھک کے چلو گے بیماروں کی چال بن جائے گی۔ درمیانی چال رکھو اس میں تواضع اور انکساری بھی ہو اور ساتھ میں قوت بھی ہو، نہ تمہیں بیمار سمجھا جائے نہ متکبر سمجھا جائے اس لئے کہ چال کا بھی اثر پڑتا ہے۔ اور فرمایا ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ﴾ ② "آواز میں ذرا پستی اختیار کرو"۔ بہت زیادہ چلا کے بولنا جس سے دوسرا سمجھے کہ اس نے مجھے بہرہ سمجھا، جب ایک اچھے بھلے آدمی کو آپ خواہ مخواہ بہرہ بنا دیں گے، اسے غصہ ہی آئے گا، پھر زیادہ تلخ آواز کانوں کو بھی ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ بقدر ضرورت آواز بلند کرے، اعتدال کے ساتھ گفتگو کرے۔ تو پوری طرح مہذب بنو۔ ہاتھ پاؤں زبان اور ہیئت میں اعتدال رکھو۔ کہیں ارشاد فرمایا:

ایمان کا اثر......"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" ③ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔ وہ کیا مسلمان ہے کہ گالم گلوچ کرتا آ رہا ہے۔ دوسرے کا دل دکھاتا ہوا آ رہا ہے، چاہے آپ اسے اسلام سے خارج نہ کریں۔ مگر حقیقی معنی میں کوئی کمال تھوڑا ہی ہے؟ بڑا مسلم حقیقت میں وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں اور کہیں فرمایا: "اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ وَدِمَآئِهِمْ" ④ "مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جانوں، اموال اور آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں"۔ لاکھوں روپے چھوڑ کر چلے جائیں کہ یہ مومن ہے خیانت نہیں کر سکتا۔ بہو بیٹی کو چھوڑ کر اطمینان ہو کہ یہ مومن ہے خیانت نہیں کرے گا۔ اور یہاں لفظ جو فرمایا وہ یہ نہیں کہ: "مَنْ اَمِنَهُ الْمُؤْمِنُوْنَ" اس سے مسلمان مطمئن ہوں، بلکہ فرمایا مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ لوگ اس سے مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے خائن نہیں۔ غیر مسلم بھی اطمینان کا اظہار کریں کہ واقعی یہ ایماندار آدمی ہے۔ تو مومن تو وہ ہے۔

اگر مومن اور مسلم ایسا ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہوں کہ بھئی! ذرا بچ کے چلو۔ کہیں جیب نہ کترے، کہیں گالی نہ دیدے، کہیں دل نہ دکھا دے، مومن کیا، یہ تو اچھا خاصا بیل ہو گیا۔ اس لئے کہ بیل جب چلتا ہے تو لوگ بچ کے چلتے ہیں کہ بھئی! جانور ہے کہیں لات نہ مار دے، دم نہ مار دے، پیشاب نہ کر دے، چھینٹ نہ پڑ جائے۔ اگر مومن سے بھی اسی طرح بچ کے چلیں کہ کہیں گالی نہ دے دے، جیب نہ کتر لے، چھری نہ مار دے، یہ مومن کیا یہ تو اچھا خاصا بیل ہے مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے مطمئن ہوں کہ جان بھی محفوظ ہے، آبرو بھی اس سے محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ مومن ہے جب تک لوگوں کو اتنا اطمینان نہ ہو وہ آدمی سچا مومن ہے؟

---

① ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام، ج: ۱ ص: ۶۵ رقم: ۴۱۔ ④ الصحیح لابن حبان، کتاب الایمان، باب فرض الایمان، ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۵۱۰۔

کردار واخلاق کے اثرات ...... یہ ایمان لے کر اگر آپ غیر مسلموں کے سامنے جائیں گے۔ان کی گردنیں جھکیں گی۔اسلام اسی طرح پھیلا ہے، دباؤ سے نہیں پھیلا۔کردار واخلاق اور معاملات کی سچائی، اور خیر خواہی خلق اللہ سے اسلام پھیلا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جہاں ان اوصاف کو لے کے پہنچے لوگوں کی گردنیں جھک گئیں، سندھ میں جب حضرات صحابہؓ داخل ہوئے تو مورخین لکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کے مسلمان ہوئے ہیں کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔یہ سچوں کے چہرے ہیں۔تو مسلمان کا چہرہ مہرہ بھی مبلغ ہے۔اس کی وضع قطع بھی مبلغ ہے اوراس کی ہر حرکت مبلغ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم غور کریں تو ہم خود اسلام کی تبلیغ میں حائل ہیں۔غیر مسلم ہمیں اور آپ کو دیکھ کر، ہماری حرکات کو دیکھ کر اسلام سے رک گئے ہیں۔اگر سو میں سے دس پانچ آدمی پاکیزہ اخلاق کے نکل آئیں اسے قوم کی پاکیزگی نہیں کہتے کم سے کم اکثریت تو ہو۔حالات یہ ہیں کہ ہمارے افعال بھی منکر، ہیئتیں بھی منکر، بیسیوں خرافات بھری ہوئی ہیں۔تو غیر مسلموں تک اسلام کو پہنچانے میں اپنے افعال سے ہم خود حائل بنے ہوئے ہیں وہ ہمارے دین کو کتابوں سے نہیں، افعال سے دیکھتے ہیں۔ہماری حرکتیں بری دیکھیں گے، کہیں گے ان کا دین بھی ویسا ہی ہے، ہماری حرکتیں صحیح ہوں۔کہیں گے، واقعی ان کا دین اچھا ہے۔بہر حال ہمیں اور آپ کو سنبھلنے کی ضرورت ہے۔ہم ایسے ہوں کہ محض زبان سے تبلیغ نہ کریں بلکہ ہمارا چہرہ مہرہ دیکھ کر لوگ کہیں واقعی مسلمان آدمی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں دیو بند کے قریب مظفر نگر میں آریوں سے مسلمانوں کا مناظرہ ہوا۔اس میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے گئے۔یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی جوانی کا زمانہ تھا۔تھوڑی تھوڑی داڑھی آئی ہوئی تھی۔بالکل ابتدائی دور تھا۔حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وجیہ بھی تھے اور حسین وجمیل بھی تھے۔اکثر سبز پگڑی باندھا کرتے تھے۔غرض حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی دلکش صورت تھی۔حضرت شاہ صاحبؒ اس مناظرے میں گئے کیونکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان کے استاذ بھی پہنچے ہوئے تھے۔اس موقع پر آریہ مبلغ نے کہا کہ: ''اگر کسی کی صورت کو دیکھ کر اسلام قبول کیا جاسکتا۔تو میں مولوی انور شاہ کی صورت کو دیکھ کر ابھی اسلام قبول کر لیتا۔اس کا چہرہ بتلاتا ہے کہ اسلام یہ ہے''۔تو مسلمان کا چہرہ مہرہ خود مبلغ ہوتا ہے۔غرض شریعت اسلام نے ہیئتوں کی تہذیب اوران کو درست کرنے کی تاکید کی ہے۔کیونکہ ہیئت سے سارا کام چلتا ہے۔

لباس کا اثر ...... جب فوجیں آپس میں ملتی ہیں تو فوج کا سپاہی اپنی وردی سے پہچانا جاتا ہے جو اس کا یونیفارم ہوتا ہے اس سے شناخت ہوتی ہے۔اگر کوئی اپنا سپاہی دشمن کی وردی پہن کے آجائے یقیناً اسے گولی ماردیں گے بعد میں چاہے افسوس کریں کہ بھئی! یہ تو اپنی فوج کا تھا۔معلوم ہوا سارا دارومدار یونیفارم اور وردی ہوتا ہے۔آپ سب اللہ کی فوج کے سپاہی ہیں۔اگر دشمن کی ہیئت میں آئیں گے تو ڈر ہے کہیں گولی نہ ماردی جائے۔اپنی ہیئت میں آنا چاہئے

تا کہ اپنی فوج کا سپاہی سمجھا جائے تو ہیئتوں کی اصلاح، ظاہر کی تہذیب اس کی طرف شریعت نے بہت توجہ فرمائی۔

میں اس لئے یہ عرض کر رہا تھا کہ ان طالبعلموں کو جنہیں دستار دی جائے گی انکی ہیئت ایسی ہوگی کہ ہاتھ میں سند ہے۔ سر پر پگڑی ہے دل میں علم بھرا ہوا ہے۔ مجموعے سے سمجھا جائے گا یہ ماشاء اللہ فارغ التحصیل ہو گئے۔ مگر ان کا فرض ہے کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ ہم کامل مکمل ہو گئے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہم نے پہلے زینے پر قدم رکھ دیا ہے۔ اب تکمیل کا راستہ شروع ہوا ہے۔ اگر چاہیں تو مکمل ہو سکتے ہیں۔ فی الحال ہماری ابتداء تھی۔ اساتذہ کو انکی استعداد کی شہادت دینی ہے کہ ان کے دل میں طلب پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہ چاہیں تو مکمل ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک خوشی کا وقت ہوگا کہ ہم اپنے طلباء کو دستار باندھیں گے کہ قوم میں الحمد للہ ایسے نوجوان پیدا ہوئے جو کل کو علم سکھلائیں گے، ان کی علمی ذریت قائم ہوگی۔

علم کے اثرات...... اور ظاہر بات ہے کہ علم ایک ایسی چیز ہے کہ ساری دنیا اس کی قدر کرتی ہے۔ کوئی بڑا ہی کندہ ناتراش ہوگا جو علم کی قدر نہ کرے۔ اس لئے کہ علم نہ ہندی ہے نہ سندھی۔ نہ افریقی نہ امریکی۔ نہ ایشیائی نہ یورپین۔ بلکہ سارے انسانوں کی ایک متاع مشترک ہے۔ اس لئے ہر انسان علم کی طرف جھکتا ہے۔ علم میں زندگی و نسل اور وطن کا تعصب نہیں آتا وہ سب کے لئے یکساں ہے۔ اسی لئے طلباء کے تبادلے ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہوتے ہیں۔ علم سیکھنے کے لئے یورپ والے آپ کے یہاں آ رہے ہیں۔ آپ کے طلباء یورپ جا رہے ہیں۔

علم کوئی سا بھی ہو، انسان کا ایک طبعی مرغوب ہے۔ اس میں یہ قید نہیں کہ بھئی! یہ ہندوستان والوں کا علم ہے۔ ہمیں اس سے بچنا چاہئے۔ علم میں پاکستانی ہندوستانی کی تقسیم ہے ہی نہیں۔ وہ تقسیم سے بالاتر ہے۔ لہٰذا سب جھکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ہماری صفت نہیں ہے اگر ہماری صفت ہوتی اس میں تعصب ہوتا۔ یہ ہمارے خدا کی صفت ہے اور حق تعالیٰ ان ساری حد بندیوں سے بالا ہیں۔ ان کی صفت پر جب آپ آئیں گے تو اتحاد پیدا ہوگا۔

میرا افریقہ جانا ہوا تھا۔ افریقہ یونیورسٹی جو ہانسبرگ میں ہے۔ اس میں ایک تعلیمی اجتماع ہو رہا تھا۔ اور سارے یورپین جمع تھے۔ کوئی چھ سات ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ وہاں کالے گورے کی بڑی تفریق ہے۔ کالوں کی گاڑیاں الگ، گوروں کی الگ دکانیں، اسٹیشن پر کالوں کا حصہ الگ، گوروں کا الگ غرض رنگ کے لحاظ سے بڑا تعصب وہاں پھیلا ہوا ہے۔ تو ہم یونیورسٹی دیکھنے کے لئے گئے۔ معلوم ہوا کہ ایک بین الملکی تعلیمی اجتماع ہو رہا ہے۔ اس میں سارے ملک کے نمائندے جمع ہیں۔ ہم نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں پھر کسی وقت آ کے دیکھیں گے تو دو لڑکیاں کسی صوبے سے نمائندے کے طور پر آ رہی تھیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ یہ راستہ بھول گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اوپر جانا چاہتے ہیں تو آئیے ہمارے ساتھ چلئے، ہم بھی ساتھ ہو لئے۔ اوپر جا کے دیکھا تو بڑا عجیب اجتماع۔ اس میں چھ سات ہزار گورے مرد بھی عورتیں بھی جمع ہیں۔ اور اس طرح سے اسٹیج قائم جیسے پارلیمنٹوں میں ہوتا ہے کہ اوپر کی اسٹیج پہ تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ صدر نائب صدر اور سیکرٹری۔ اس کے بعد نیچے ایک اور اسٹیج تھا۔ اس پر پانچ افراد تھے۔ اس

سے نیچے ایک اور اسٹیج تھا۔ اس پر سات افراد تھے، جیسے پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس انداز کا تھا۔ ہم پیچھے کرسیوں پر دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ تو ایک نمائندے نے یہ سمجھ کر کہ یہ وضع قطع سے دوسرے ملک کے معلوم ہوتے ہیں. ہمارے میزبانوں سے پوچھا کہ یہ یہاں کے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں، ہندوستان سے آئے ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ انہوں نے کہا دارالعلوم دیوبند کے۔ انہوں نے کہا۔ دارالعلوم دیوبند کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا ایک مذہبی یونیورسٹی ہے اور یہ اس کے چانسلر ہیں۔ تو اس لڑکی کو بھی قدر ہوئی کہ اچھا یہ یونیورسٹی کے چانسلر ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ اس نے کہا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اگر میں (ان کی آمد کی) صدر کو اطلاع دوں؟ انہوں نے کہا دے دیجئے۔ اب میں تو کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ انگریزی میں بات چیت ہو رہی تھی۔ خیر اس نے صدر کو اطلاع دی۔ اس نے کھڑے ہو کے کہا کہ ہمارا تعلیمی جلسہ ہے۔ اور حسن اتفاق دیکھئے کہ ہندوستان کا ایک شخص جو وہاں کے تعلیمی ادارے کا ذمہ دار ہے۔ وہ موجود ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں اسے اسٹیج پہ بلاؤں؟

ساری پبلک نے کہا کہ ضرور بلایئے، اب وہاں سے ایک آدمی پہنچا، اب یہ قوم کی شائستگی کی بات ہے کہ جوں ہی میں اٹھا، تو پورا جلسہ کھڑا ہو گیا۔ اور تالیاں بجانی شروع کیں، اپنی دانست میں گویا تبریک وتہنیت پیش کی جب تک میں اسٹیج پر نہیں پہنچ گیا برابر تالیاں بجتی رہیں۔ اسٹیج پر جب پہنچے تو اوپر تین کرسیاں تھیں۔ صدر، نائب صدر، سیکرٹری۔ سیکرٹری عورت تھی اور وہ بیچ میں تھی صدر نائب صدر اِدھر اُدھر تھے۔ میرے پہنچتے ہی اس (سیکرٹری) عورت نے کرسی چھوڑ دی۔ مجھے بٹھلا دیا۔ خود پشت پہ کھڑی ہو گئی۔ تو خیر میں نے کہا گورا ہٹا، کالے نے قبضہ کیا۔ میں اب تک یہ سمجھ رہا ہوں کہ محض تکریماً اور اعزازاً ایسا کیا۔ لیکن صدر نے اعلان کیا کہ: یہ ہندوستان کی یورنیورسٹی کے ذمہ دار ہیں۔ آپ اجازت دیں، تو میں انہیں تقریر کے لئے کہوں؟ پبلک نے کہا' ضرور کہنا چاہئے۔

اب اس نے تقریر کی درخواست کی تب میں سمجھا کہ یہ مقصد تھا۔ میں محض اعزاز ہی سمجھ رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھے کہا کچھ بیان کیجئے۔ وہ جو وہاں میں نے جملے کہے کہ وہ مجھے سنانے تھے جس کے لئے یہ تمہید تھی جو میں نے یہ واقعہ سنایا، وہاں چونکہ کالے گورے کی تفریق ہے۔ تو پہلے میں نے کھڑے ہو کر حکومت کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں آنے کی اجازت دی اور پبلک کا کہ اس نے قبول کیا، پھر جلسے والوں کا کہ انہوں نے ہمیں یہاں آنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ "آپ نے اس پر غور کیا کہ کالے اور گورے مل کر اس وقت ایک جگہ جمع ہیں۔ تو کس چیز نے ہمیں جمع کیا؟ یہ سوال میں نے کھڑا کیا۔"

اگر آپ کہیں کہ رنگ نے جمع کیا تو میرا رنگ اور آپ کا رنگ اور ہے۔ رنگ کے معنی ہی حد بندی اور قطع و انقطاع کے ہیں۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہوسکتا۔ جو گورا ہے وہ کالا نہیں ہوسکتا۔ یہ ہمیشہ الگ ہی الگ رہیں گے۔ تو رنگوں کے ملنے کا بھی کوئی معنی نہیں۔ اسی طرح میں نے کہا: مجھے اور آپ کو وطن نے بھی جمع نہیں کیا۔ آپ کا وطن افریقہ ہے میرا وطن ہندوستان ہے اور وطن کے معنی ہی حد بندی کے ہیں کہ افریقہ ہندوستان، اور ہندوستان افریقہ

نہیں بن سکتا۔ تو ہم الگ ہی رہیں گے۔

اور میں نے کہا نسل نے بھی ہمیں جمع نہیں کیا میری نسل اور ہے اور آپ کی نسل اور ہے، نسل کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو ایک خاندان کا ہے وہ دوسرے خاندان کا نہیں بن سکتا، ہمیشہ انقطاع رہے گا۔ پھر آخر ہمیں کس چیز نے جمع کیا؟ اور میں نے کہا کہ جمع بھی اس طرح کہ آپ اور ہم صرف کندھا ہی ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ دل بھی ہمارے ملے ہوئے ہیں، ہر ایک کے دل میں دوسرے کی جگہ، یہ کس چیز نے جمع کیا؟ میں نے کہا درحقیقت ہمیں علم نے جمع کیا ہے نہ کہ رنگ، نسل اور وطن نے جمع کیا، اور علم نے کیوں جمع کیا؟ اس لئے کہ وہ ہماری صفت نہیں ہے۔ اگر وہ ہماری صفت ہوتی تو میرا علم اور ہوتا، اس کا علم اور ہوتا، آپ کا علم اور ہوتا۔ وہ بھی تفریق کا ذریعہ بنتا، علم اللہ کی صفت ہے میری اور آپ کی نہیں ہے میں نے کہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی صفات پر کبھی جمع نہیں ہو سکتے جب تک انہیں چھوڑ کر کوئی خدا کی صفت اختیار نہ کریں جامعیت کی شان اسی کے اندر ہے اور میں نے کہا کہ:

جب اللہ کی صفت میں جمع کرنے کی شان ہے۔ تو اگر کوئی ذات تک پہنچے۔ اس کو سامنے رکھے۔ پھر انسان ہی نہیں حیوان غیر حیوان سب جمع ہو جائیں گے۔ سب کا خالق وہی ہے۔ سب کی اصل ایک ہے۔ اس لئے جمع کرنے کی شان اللہ کی ذات وصفات ہی میں ہے۔ انسان کی ذات وصفات میں جمع کرنے اور جمع ہونے کی شان نہیں ہے۔ جب تک ہم اپنی صفات کو چھوڑ کر خدائی صفات اختیار نہیں کریں گے۔ ہم میں اتحاد نہیں قائم ہوگا۔ تو ذریعۂ اتحاد اللہ کی ذات وصفات ہیں۔ اور ذات وصفات اسلام بتاتا ہے۔ تو اسلام جمع ہونے کا ذریعہ ہے اور کوئی چیز جمع کرنیوالی نہیں ہے۔ یہ ایک بات بیچ میں یاد آ گئی تھی۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان طلباء کو جنہیں دستار دی جائے گی کہ یہ ایک ظاہری ہیئت ہے اور اس ظاہری ہیئت کے ذریعے سے وہ پہچانے جائیں گے کہ اللہ نے اتنی قابلیت عطاء کی تو انہیں غرہ نہیں کرنا چاہئے اور ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اب یہ ہم سے مستغنی ہو گئے۔ کتنا بھی زمانہ گزر جائے۔ وہ آپ کے شاگرد ہی رہیں گے اور بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

بہر حال یہ مبارک ساعت ہے کہ جس میں جامعہ کے سات آٹھ سال کا نچوڑ آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائے گا کہ اتنے افراد ہم نے تیار کئے اور انہوں کو اس قابل بنایا کہ یہ آگے دوسروں کو ہدایت ونصیحت کر سکیں۔

نسبت کا اثر...... اب یہ آپ حضرات کا فرض ہوگا کہ اپنی اعانت سے اپنے چندوں سے آپ نے جن کو تیار کیا، آپ خود ان کی قدر کریں۔ آپ کو بھی قدر کرنی پڑے گی۔ جیسے بیت اللہ کا غلاف آپ ہی اپنے ہاتھوں بناتے ہیں۔ لیکن بن کر جب وہ بیت اللہ پر لٹک جاتا ہے تو آپ ہی اسے چومتے ہیں اور پیشانی پر لگاتے ہیں کہ اسے نسبت پیدا ہو گئی۔ ان بچوں کو آپ ہی نے پڑھایا ہے اور پگڑی بھی آپ ہی نے دی۔ لیکن آپ کے لئے ان کی قدر کرنی واجب ہو گئی۔ چونکہ نسبت پیدا ہو گئی۔ اس لئے آپ کو بھی علم کے آگے جھکنا پڑے گا۔

آپ اگر کسی عالم کے آگے جھکتے ہیں تو اس کے گوشت پوست کی وجہ سے نہیں۔ جیسا گوشت پوست اس میں ہے آپ میں بھی ہے، اس علم کی وجہ سے جھکتے ہیں جو اس کے اندر ہے۔ تو یہی علم ان طلباء میں بھی ہے جس حد تک بھی اللہ نے ان کو علم دیا ہے اور قابلیت دی ہے، وہ ایسی ہے کہ آپ پر تعظیم کرنا واجب ہے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ ایک باپ بے پڑھا لکھا ہے۔ اس نے بچے کو پڑھا دیا۔ جب اسٹیج بنے گا، اسٹیج پر بچہ بیٹھے گا اور باپ نیچے۔ وہ علم ہی ہے جس نے اسے اونچا بنا دیا اور جس کے پاس علم نہیں وہ نیچا رہ گیا۔ کیونکہ علم خود ذاتی طور پر رفعت کی چیز ہے وہ اللہ کی صفت ہے۔ علم کبھی نیچا ہو کے نہیں رہتا۔ اس لئے عالم کبھی نیچا ہو کے نہیں رہے گا اگر واقع میں عالم ہے۔ علم میں طبعی طور پر ترفع اور بلندی کی شان ہے۔

طریق منزل مقصود..... مگر اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی میں کہیں تکبر نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس کا بدرقہ عبدیت ہے کہ علم کے ساتھ جب تک عبدیت جمع نہیں ہوگی تو تکبر اور نخوت اس سے الگ نہیں ہو سکتا اور عبدیت یہ ہے کہ کسی مرد کامل کے سامنے آدمی پامال بنے ؎

قال را بگذار، مرد حال شو ——— پیش مرد کاملے پامال شو

تو عالم اگر کسی کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کرائے تو علم اس کے لئے اور زیادہ تباہی اور وبال کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے وہ تکبر و نخوت پیدا کرے گا۔ لڑائی جھگڑے پیدا کرے گا۔ جو عالم تربیت یافتہ نہیں ہوگا، اخلاق صحیح نہیں ہوں گے۔ عموماً فسادات اور جھگڑے کا باعث بنے گا۔ جب تک اپنے اخلاق کو پامال کر کے ان کو بلند نہ کرلے، حرص کی بجائے قناعت نہ ہو، کبر کی بجائے تواضع نہ ہو، بخل کے بجائے سخاوت نہ ہو۔ غرض جب تک اخلاق فاضلہ نہ جمع ہوں علم کی قدر نہیں کھل سکتی نہ علم کام دے سکتا ہے جب تک اخلاق صحیح نہ ہوں۔ تو محض علم سے آدمی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا۔

اس لئے مدارس میں دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے ایک تعلیم کی جس سے علم پہنچے اور ایک تربیت کی جس سے اخلاق درست ہوں۔ اگر تعلیم محض رہ گئی۔ علم آ جائے گا، اخلاق نہیں آئیں گے وہ وبال جان بن جائے گا۔ اگر اخلاق درست ہو گئے علم نہ آیا تو جاہلانہ افعال سرزد ہوں گے۔ اس سے منکرات و بدعات سرزد ہوں گی، دونوں صورتیں تباہی کی ہیں۔ تو علم اور اخلاق جب تک جمع نہ ہوں کام چلنے والا نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ نے اپنے مقدمہ میں کچھ اشعار لکھے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ ؎

فَسَادٌ كَبِيْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ ——— وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ ——— لِمَنْ بِهِمَا فِي دِيْنِهِ يَتَمَسَّكُ

''وہ عالم دنیا میں فساد کبیر ہے جو دوسروں کی ہتک چاہے۔ کبر و نخوت میں بھرا ہوا ہو دوسروں کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو۔ وہ عالم میں عظیم فساد ہے اور اس سے بھی زیادہ فساد ہے اس عابد میں جو جہالت کے ساتھ عبادت

کررہا ہے۔ وہ رات دن بدعات ومنکرات میں مبتلا ہوگا۔‘‘

گویا امت کے فساد کے دو دھڑے ہیں۔ ایک جاہل مولوی ایک جاہل صوفی ایک وہ عالم ہے کہ علم ہے مگر اخلاق نہیں۔ ایک وہ عابد کہ عبادت ہے مگر علم نہیں۔ دونوں چیزیں جمع ہوں جب جاکے وہ مصلح ثابت ہوگا۔ تو کہتے ہیں۔

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ ۔۔۔ لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ

’’یہ دونوں قسم کے لوگ دنیا کے لئے فتنہ ہیں جو بھی دین کے بارے میں ان سے تمسک کرے گا۔ وہ فتنہ میں گرفتار ہوگا‘‘۔ وہ عالم ربانی جس کا علم بھی صحیح، اخلاق بھی صحیح، سیرت بھی پاکیزہ ہو۔ وہ اصلاح کا ذریعہ بنے گا۔ وہ صحیح راستہ دکھلائے گا۔ اسی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

یہ جو ہمارے بچے تیار ہوں گے اس میں اس کی ضرورت ہے کہ ان میں دونوں وصف آ جائیں علم بھی صحیح ہو اور اخلاق بھی ان کے درست ہوں۔ دوران تعلیم میں ہی اخلاق کی درستگی کی تمرین ہو۔ تواضع، انکسار، خدمت، ایثار اور جذبہ خدمت خلق اللہ، یہ جذبات ان کے اندر پیدا کئے جائیں، ابھارے جائیں۔ ان سے ان کی نشوونما صحیح ہوگی۔ اور فرض کیجئے اس وقت اس میں کوئی کمی رہ گئی، تو بعد میں اسے پورا کر لیجئے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ سلف کی شان یہ تھی ’’كَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ الْهُدٰى كَمَا كَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ الْعِلْمَ.‘‘ ’’سلف کی شان یہ تھی کہ جب آٹھ دس برس میں علم حاصل کر لیتے تھے اس کے بعد عمل سیکھنے کے لئے مستقلاً مشائخ کی خدمت میں رہتے تا کہ اعمال اور اخلاق درست ہوں‘‘۔

ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں بھی میری طالب علمی کے زمانے تک تو یہ پابندی رہی کہ طالب علم فارغ التحصیل ہو جاتا تھا، لیکن سند نہیں دی جاتی تھی جب تک جماعت کے کسی بزرگ کے پاس رہ کر ان کا مرید ہو کر اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کرالے، بعد میں ایسا نہ رہا۔ اس لئے خرابی پیدا ہوگئی۔ بہر حال جیسے علم ضروری ہے، اخلاق بھی ضروری ہیں۔

یہ ہمارے بھائی جو پگڑی باندھیں گے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ آج سے علم میں بھی کامل ہوگئے، اخلاق میں بھی کامل ہوگئے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہے، اب آگے چڑھنا ان کا کام ہے۔ تو ہمارے لئے خوشی کا مقام ہے کہ ہم نے پہلی سیڑھی پر انہیں چڑھا دیا۔

بس یہ چند باتیں جلسہ دستار بندی کے سلسلہ میں ذہن میں آگئیں اپنے ضعف کی وجہ سے میں کوئی خاص ترتیب سے کچھ زیادہ بول نہیں سکا۔ بہر حال جیسے کھانے کے بارے میں اصول ہے کہ ’’خَيْرُ الطَّعَامِ مَاحَضَرَ.‘‘ ’’بہترین کھانا وہ ہے جو حاضر ہو‘‘ آدمی مہمان کے سامنے رکھ دے۔ تو یہاں بھی خَيْرُ الْكَلَامِ مَاحَضَرَ جو دل میں آ گیا، وہ پیش کر دیا۔ اسے قبول کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ مدرسہ کو بھی قائم و دائم رکھے۔ مدرسہ کے سارے اساتذہ

کرام کو معاونین، منتظمین کو سب کو حق تعالیٰ برکتیں عطا فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

شعب الایمان

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:...... فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً اَعْلٰھَا قَوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَدْنٰھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ. وَالْحَیَآءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ. اَوْ کَمَاقَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ.

احوال واقعی...... بزرگان محترم! جیسا کہ آپ کے علم میں آیا ہے کہ قریب ہی میں میری آنکھ کا آپریشن ہوا اس کی وجہ سے کچھ ضعف بھی لاحق ہوا جس کا اثر اب تک موجود ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت تو یہ تھی کہ میں کم سے کم تین چار ماہ، مئی، جون تک زور سے بھی نہ بولوں اور تقریر بھی نہ کروں۔ لیکن یہاں ایک ایک کر کے اس ہدایت کی خلاف ورزی ہوئی۔ زور سے بھی بولنا پڑا اور تقریریں بھی کرنی پڑیں اور ایسی صورت بن جاتی ہے کہ بولنے کی مجبوری پیش آتی ہے تاہم جتنا اپنے بس میں ہوتا ہے میں احتیاط بھی کرتا ہوں۔ اس لئے یہ گذارش ہے کہ شاید میں زیادہ دیر تک نہ بول سکوں۔ جتنا بھی آسانی سے بن پڑے گا، اسی قدر چند لمحات آپ حضرات کے لوں گا اور اس حدیث کے بارے میں چند کلمات گذارش کروں گا۔

ترجمۂ حدیث...... یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ پہلے اس کا ترجمہ سن لیجئے۔ اس کے بعد اس کی تھوڑی تفسیر اور تشریح۔ ترجمہ یہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے اور شاخیں ہیں جن میں سے اعلیٰ ترین شعبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا اور پڑھنا۔ اور ادنیٰ شعبہ راستے سے ایذا دہ چیزوں کا ہٹا دینا، تکلیف دہ چیزوں کا دور کر دینا ہے تا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور فرمایا حیاء ایمان کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ یہ حدیث کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

اس میں ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے اس کی ضرورت ہے کہ خود ایمان کی حقیقت سامنے آئے تا کہ اس کے شعبوں کو اور اس کی شاخوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

ایمان کی دو بنیادیں...... ایمان کی دو بنیادیں ہیں، ایک "اَلتَّعْظِيمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اور ایک "اَلشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰـهِ" اللہ کے اوامر اور اس کے قانون کی عظمت وتعظیم کرنا اور دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت کرنا اور اس کی خدمت کرنا یہ ایمان کے اجزاء یا اس کے دو بنیادی شعبے ہیں۔ ایک کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف دوڑے، اسی کی طرف جانے کی کوشش کرے، اس کی عظمت وتعظیم کے حقوق بجالائے۔ دوسرے کا حاصل یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی خدمت کا حق بجالائے۔ اگر ایک شخص اللہ کی طرف دوڑتا ہے لیکن مخلوق کو ستاتا اور ایذا رسانی کرتا ہے۔ اس شخص کو ضعیف الایمان کہا جائے گا۔ اس کا ایمان کمزور، ناقص ہے۔ ایک طرف دوسرا شخص ہے جو دن رات قومی خدمات میں لگا ہوا ہے، ہر وقت کا اوڑھنا اور بچھونا قوم کی خدمت ہے۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع نہیں ہے۔ نہ عبادت ہے نہ اطاعت ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ ضعیف الایمان اور ناقص الایمان ہے۔ کامل الایمان وہی شخص سمجھا جائے گا کہ ایک طرف اللہ کی طرف جھکا ہوا ہو اور دوسری جانب مخلوق کی طرف رجوع کئے ہوئے ہو جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان ہے کہ ہمہ وقت رجوع الی اللہ بھی ہے اور ہمہ وقت خدمت مخلوق اللہ بھی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک فرمائی گئی کہ "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ" ① "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یاد خداوندی سے فارغ نہیں تھا"۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے حتی کہ گھر میں رہتے ہوئے، بیویوں کے پاس جاتے ہوئے بھی کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ ذکر اللہ آپؐ سے صادر نہ ہوا ہو۔ زبان مبارک، قلب مبارک اور عمل مبارک سے۔ غرض یاد خداوندی ہر وقت ہر لمحے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کی تربیت وتعلیم، ان کی راہنمائی وہدایت سے کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری عمر شریف رجوع الی اللہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع کرنا مخلوق کی خدمت سے غافل نہیں بناتا۔ اسی طرح ہر آں مخلوق کی خدمت میں منہمک ہیں اور یہ خدمت رجوع الی اللہ سے غافل نہیں کرسکتی تھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اللہ نے اپنے قانون کو حجت و برہان اور بصیرت سے منوایا ہے...... "اَلتَّعْظِيمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" "اللہ کے اوامر کی تعظیم کرنا"۔ یہ ایمان کا جزاول تھا مگر یہ قدرتی بات ہے کہ کسی قانون کی عظمت تب ہوتی ہے جب قانون ساز کی عظمت دل میں ہو۔ اگر قانون بنانے والا یا قانون چلانے والا، اس کی دل میں کوئی عظمت نہ ہو بلکہ اس کی حقارت دل میں بیٹھی ہوئی ہو، تو قانون کی عظمت بھی دل میں نہیں ہوسکتی۔ اگر قانون بنانے والے کی عظمت دل میں نہ ہو تو پھر قانون دباؤ اور مجبوری کا رہ جاتا ہے۔ دلی شغف کے ساتھ آدمی قانون پر نہیں چل سکتا۔

شریعت اسلام کے قانون کو اللہ نے اس طرح نہیں بھیجا کہ دباؤ ڈال کر منوایا ہو۔ پہلے مالک سے محبت پیدا کی گئی ہے۔ اس محبت کے ذیل میں قانون سے خود بخود محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی قانون شریعت پر اپنے دل کی

① الصحيح للبخاري، كتاب الاذان، باب هل يتتبع المؤذن فاه ههنا وههنا...... ج:٣ ص: ١٠ .

محبت، رضا اور شغف سے چلتا ہے دباؤ سے نہیں چلتا۔ یہ نہیں ہوا کہ تلوار کا دباؤ ڈالا اور مجبور و مقہور کر دیا ہو۔ بلکہ حجتیں پیش کیں کہ دلائل سے سمجھو، بصیرت سے سمجھو۔ جب شرح صدر ہو جائے قبول کرو، ورنہ چھوڑ دو۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی شان فرمائی گئی، ﴿اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا﴾ ① "جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں، تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں گرتے تھے بلکہ بینا و شنوا ہو کر سوچ سمجھ کر بصیرت کے ساتھ قبول کرتے تھے"۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی ﴿عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ، وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ ② "میں اور میرا اتباع کرنے والے اس دین پر بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ قائم ہیں"۔ کسی دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ دل کی لگن سے قائم ہیں تو شریعت اسلام نے بصیرت پیدا کرنی چاہی ہے۔ قران کریم نے جہاں جہاں اللہ کا وجود اس کی توحید اس کی صفات، منوائی ہیں۔ وہاں دلائل دیئے ہیں۔ انفسی دلائل بھی، آفاقی دلائل بھی۔ کہ اپنے نفسوں میں غور کرو تو تمہیں اللہ کے وجود کی حجتیں ملیں گی۔ کائنات میں غور کرو تو اس کے وجود اور اس کی یکتائی کے دلائل ملیں گے کہیں پہاڑوں کو، کہیں دریاؤں کو، کہیں ہواؤں کے لوٹ پھیر کو پیش کیا کہیں سورج کی حرکت کو پیش کیا کہ ان تمام تغیرات کو دیکھو۔ سورج کتنا بڑا عظیم کرہ ہے۔ آج کل کے فلاسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ زمین سے سورج گیارہ کروڑ گنا بڑا ہے۔ گویا سورج میں سے گیارہ کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں۔ اتنا بڑا سیارہ اور چوبیس گھنٹوں میں لاکھوں میل کی حرکت کرتا ہے تو اتنا بڑا کرہ اور غلاموں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بڑی طاقت ہے اس نے اسے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ اس لئے سورج کو دیکھ کر اس کی ذات عالی کو پہچانو۔

اگر زمین حرکت کر رہی ہے جیسا کہ آج کے فلاسفہ کا دعویٰ ہے۔ تو یہ عظیم کرہ جس میں اربوں کھربوں مخلوق آباد ہے اس کو کس نے چکر میں ڈال رکھا ہے؟ کس نے گھما رکھا ہے؟ ﴿لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ ③ "سورج کی یہ مجال نہیں کہ چاند کو جا پکڑے، رات کی یہ مجال نہیں ہے کہ دن کو نہ آنے دے، خود چھا جائے"۔ اپنے وقت پر دن، اپنے وقت پر رات بھی آرہی ہے۔ یہ محکم نظام کسی نابینا کا قائم کیا ہوا نہیں بلکہ دانا اور بینا کا قائم کیا ہوا ہے۔ ایسے دانا اور حکمت والے کا قائم کیا ہوا ہے جس کی حکمت لامحدود ہے، جس کے کمالات لامحدود ہیں۔ موسم اپنے اپنے وقت پر آرہے ہیں۔ گرمی اپنے وقت پر آتی ہے۔ ایک سیکنڈ نہیں رک سکتی، سردی، برسات اپنے اپنے وقت پر آتی ہے۔

سبزیوں کا جو نظام بنا دیا ہے اسی وقت پر بیج زمین سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تناور درخت بنتا ہے۔ درخت کی جو بنیاد اور عمر ہے وہ مقرر اور لکھی ہوئی ہے اتنا پاکیزہ اور اتنا اعلیٰ ترین محکم نظام بغیر کسی حکمت والے کے ممکن نہیں ہے۔ غرض قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود اور یکتائی کو منوایا، وہاں یہ نہیں کہا کہ تم مجبور ہو، ماننا پڑے گا ورنہ

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳. ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۴۰.

جہنم میں جاؤ گے بلکہ دلائل وحجتیں پیش کیں کہ ان کو سوچو اور سمجھو۔

عقل وبصیرت کے ساتھ کیئے ہوئے عمل سے ہی درجات بلند ہوتے ہیں...... عقل کی فضیلتیں الگ بیان کیں۔ حدیث میں ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یارسول اللہ! دو شخص یکساں قسم کا عمل کریں۔ اتنی ہی نمازیں وہ پڑھتا ہے، اتنی یہ اتنا ہی ذکر وہ کررہا ہے۔ اتنا ہی یہ لیکن روز قیامت ایک کے درجات زیادہ بلند ہوں گے، ایک نیچے رہ جائے گا حالانکہ عمل کی تعداد دونوں کی برابر ہے۔ فرق کی وجہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرق کی وجہ عقل ہے جو عقل اور بصیرت سے عمل کرتا ہے اس کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ جو بے بصیرتی سے عمل کرتا ہے وہ نجات پالے گا لیکن اس کے لئے درجات کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوگا۔ تو عقل کو (بلندی درجات کے لئے) معیار قرار دیا۔ اسی کو فرمایا: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ ① ”آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کے لوٹنے پھیرنے میں قدرت کی آیات اور نشانیاں ہیں مگر کن کے لئے؟ عقل والوں کیلئے جو تدبر کے ساتھ غور وفکر کرتے ہیں“۔ جو صرف پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں، ان کے لئے کوئی نشانی نہیں ہے۔ جو پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے بعد دل کی آنکھ سے بھی دیکھیں اور تدبر کریں، ان کے سامنے اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلیں گی۔

شریعت اسلامی کی نظر میں عقل مند کون ہیں؟......اور عقلمند کون ہیں؟ آگے ان کی تفصیل فرمائی: ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ ② ”عقل مند وہ ہیں جو اٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے اللہ کے ذکر میں منہمک ہیں اور ہر وقت تخلیق اور کمالات میں فکر کرتے رہتے ہیں“ تو دل میں ذکر اور فکر دونوں ہوں وہ عقلمند ہیں۔ فقط ذاکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا، فقط متفکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا۔ اگر محض فکر ہی فکر ہے ذکر اللہ نہیں تو وہ فلسفی ہے اور اگر محض ذکر ہی ہے فکر نہیں ہے تو وہ متکشف اور جامد ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہوں کہ ذاکر بھی اور متفکر بھی تو اس کو شریعت کی اصطلاح میں عقلمند کہا گیا ہے۔ اسی پر اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلتی ہیں۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے کوئی دباؤ ڈال کر نہیں منوایا چونکہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا مانو۔ حالانکہ یہ فرمانے کا حق تھا کہ اللہ کا حکم آگیا ہے تو ماننا پڑے گا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے وجود کو دلائل سے سمجھو، اس کے قانون کو بھی بصیرت سے سمجھو، سوچ سمجھ کر قبول کرو۔ اندھوں، بہروں کی طرح سے قبول نہ کرو۔ عقل کو آزاد چھوڑا ہے کہ وہ فکر کرے۔ شریعت اسلام نے جمود نہیں بتلایا حاصل اس کا یہ نکلا کہ کوئی دباؤ ڈالنا مقصود نہیں ہے بلکہ ذکر اور فکر کرانا مقصود ہے۔

مدار نجات اللہ کا فضل ہے......اور زیادہ ذکر کون کرتا ہے؟ ”مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ“ ”جس شخص کو جس سے محبت ہوتی ہے اس چیز کو کثرت سے یاد کرتا ہے“ اللہ سے جب محبت ہوگی اس کی یاد بھی بڑھے گی۔ اس کی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۰۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۱۔

فکر بھی بڑھے گی۔ رات دن غور بھی کرے گا۔ تو اصل چیز محبت نکل آتی ہے۔ یعنی دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت پیدا کرو پھر ان کے قانون کی محبت بھی ہوگی ان کے قوانین کی عظمت بھی ہوگی اور اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ جو ایمان کا ایک بڑا جز ہے وہ ثابت ہو جائے گا۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے اوامر کی تعظیم ہو اور اوامر کی عظمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک دل میں اللہ کی عظمت نہ بھری ہوئی ہو۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: میدان حشر میں بعض لوگ ایسے بھی آئیں گے جو بے شمار گناہوں کا بار اپنے سر پہ لئے ہوں گے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان لوگوں کے لئے فرماتے ہیں کہ ''اے بندے! اگر تو میرے سامنے اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں۔ تو اتنی بڑی مغفرت لے کر میں تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو میری بڑائی کو مانتا ہو''۔

بڑائی اور عظمت خداوندی وہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اگر اتفاقاً واحیاناً گناہ بھی سرزد ہو جائے۔ فرماتے ہیں، پرواہ مت کرو سچی توبہ کرلو اور اگر خدانخواستہ توبہ بھی نہ ہوئی، اس کے لئے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ''نیکیاں خود بدیوں کو مٹا دیں گی'' عمل صالح اور نیکی کے اندر لگے رہو۔ تو عمل صالح میں لگایا گیا تاکہ بدیاں بھی مٹ جائیں اور اگر اس کے باوجود بھی بدیاں سرزد ہوں تو دل کے اندر حق تعالیٰ کی عظمت ضرور رکھو۔

اس کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ آج سے آدمی بدیوں پر جری ہو جائے کہ جی! بس میں دل کے اندر عظمت ومحبت رکھتا ہوں۔ لہٰذا اب میں آزاد ہوں، میں جو چاہوں کروں۔ میں کہتا ہوں، جو بدی کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب کے اندر محبت کی کمی ہے۔ پوری محبت ہے ہی نہیں۔ جس کے قلب میں محبت رچی ہوئی ہوگی وہ بدی سے خود بخود بچے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ: جو بھی بندہ بخشا جائے گا وہ درحقیقت اپنے عمل سے نہیں، اللہ کے فضل سے بخشا جائے گا۔ جب تک فضل متوجہ نہ ہو، بخشش کی کوئی صورت نہیں ہے خواہ کتنی بڑی نیکیاں ہوں۔

اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''وَلَا اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ!'' یارسول اللہ کیا آپ کی نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوں؟ فرمایا کہ ''میری نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوگی'' اگر فضل متوجہ نہ ہو تو میری بھی نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ''اِلَّآ اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ'' ① جب تک اللہ ہی اپنی رحمت اور فضل نہ کرے۔ اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔

عمل بھی ضروری ہے۔ یہ بھی آپ نہ سمجھئے کہ بس فضل کے اوپر آدمی بیٹھا رہے اور یوں کہے کہ فضل ہوگا، نجات ہو جائے گی۔ پھر عمل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں عمل کرنا، اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہو چکا۔

① الصحیح لمسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لن یدخل الجنۃ احد بعملہ...... ج:۴ ص: ۱۲۷۱.

اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے اوپر فضل نہیں ہو رہا۔ عمل فضل کی علامت ہے کوئی بیکار چیز نہیں ہے۔ بہر حال عمل کرا دینا اور عمل قبول کر لینا یہ بھی فضل کی دلیل ہے، اس عمل پر نجات کا ثمرہ مرتب کرنا یہ بھی فضل کی دلیل ہے۔ اول سے آخر تک فضل خداوندی سے کام چلے گا۔ محض ہمارے اعمال کہ ہم اس پر غرہ (فخر) کریں، یہ اس درجے کے نہیں ہیں جو ہمیں نجات دلا سکیں۔ جب تک کہ اللہ کا فضل متوجہ نہ ہو۔

اسلام میں اعترافِ عجز روحِ عبادت ہے......اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عمل کتنا ہی کرے۔ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس واسطے کہ انعامات لامحدود ہیں۔ اور ہمارے عمل محدود ہوگا۔ ہم خود ہماری طاقت، ہمارا دماغ، عقل وقوت بھی محدود ہے، عمل جتنا کریں گے وہ ایک حد کے اندر ہوگا اور اللہ کی رحمتوں کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے۔ بارش کی طرح سے ہر ہر آن رحمتیں برس رہی ہیں۔ ان رحمتوں کا حق ادا کرنا حقیقت میں بس کی بات ہے بھی نہیں، ناممکن ہے۔ بس یہی صورت ہے کہ عمل کر کے آدمی یوں کہے، اے اللہ! مجھ سے کچھ نہیں بن پڑا۔ یہ اپنے عجز کا اعتراف کر لینا یہی حق کی ادائیگی ہے ورنہ حقیقی معنی میں اللہ کے حق کو کون ادا کر سکتا ہے؟ حضرات داؤد علیہ السلام کو فرمایا گیا ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا﴾ (۱)

اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے حضرات انبیاء علیہم السلام ہی ہوتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! جب شکر کرنے کا آپ کا حکم ہے۔ تو میرا فرض ہے اور میں شکر ادا کروں گا۔ مگر میں حیران ہوں کہ ادا کروں تو کس طرح سے کروں؟ اس لئے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس پر مجھے شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس پر شکر ادا کروں گا تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت اور آ گئی، تو پھر اس پر شکر ادا کرنا چاہئے۔ گویا ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں شکر کی ابتداء کیسے کروں؟ شکر کو انجام کیسے دوں؟ سوائے اس کے کہ اپنے عجز کا اعتراف کروں کہ میں آپ کے شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا ''اے داؤد! تم نے اگر یہ سمجھ لیا کہ تم ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنی ہار مان لو اور اپنے عجز کو تسلیم کر لو۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الشاکرین ہیں کہ آپ سے بڑھ کر اللہ کا کوئی بندہ شکر گزار نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ ''اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ'' اے اللہ! میرے بس میں نہیں ہے کہ تیری ثناء اور صفت بیان کر سکوں اور تیرا شکر ادا کر سکوں۔ ''اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ'' (۲) ''بس اس سے سوا کیا کہوں۔ تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے خود تعریف کی ہے''۔ میری تعریف سے تو بالا تر ہے۔ میرے قبضے میں نہیں ہے کہ تیری تعریف

---

(۱) پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۱۳۔ (۲) المصنف لابن ابی شیبۃ، کتاب الصلوۃ، باب مایقول الرجل فی آخر الوتر...... ج: ۲ ص: ۹۹ رقم: ۲۹۴۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۳۹۵۔

کرسکوں۔اس عجز کے اعتراف کو بھی حق تعالیٰ نے شکر قرار دیا ہے کہ یہی میرا شکر ہے۔اس لئے کہ حق ادا کرنا بندے کے قبضے میں نہیں ہے تو اعمال بھی ہمارے ناقص اور نکمے شکر کی ادائیگی سے بھی ہم عاجز پھر سوائے اعتراف عجز کے اور کیا صورت ہے؟اس کا نام اللہ نے شکر اور عبادت رکھ دیا کہ کرو اور کرنے کے بعد کہو کہ ہم سے کچھ نہ ہوسکا۔

ملائکہ علیہم السلام جو ہزار ہا ہزار برس سے عبادت میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں اربوں کھربوں ملائکہ ایسے ہیں کہ جب سے پیدا ہوئے وہ سجدے ہی میں ہیں۔ کچھ رکوع ہی میں ہیں اور بعض تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: ساتویں آسمان پر ملائکہ کا قبلہ ہے،جس کو بیت المعمور کہتے ہیں۔روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں اور فرمایا جو ستر ہزار آج طواف کریں گے،اب ابدالآباد تک انہیں پھر نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے دن پھر نئے ستر ہزار اور پھر نئے۔تو کروڑوں،کھربوں ملائکہ ہیں جو طواف میں مشغول ہیں۔اسی طرح اربوں کھربوں ہیں جو صف بندی کئے ہوئے تسبیح و تہلیل میں ہیں اتنی لاکھوں برس کی عبادت کے بعد ملائکہ قیامت کے دن عرض کریں گے: ''مَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ'' ① ''اے اللہ! ہم نہ تیری عبادت کا حق ادا کر سکے نہ ہم تیری معرفت پوری کر سکے۔تو ہماری عبادتوں سے بالاتر ہے۔''

یہ ان کا اعتراف عجز یہی حقیقت میں ان کی عبادت ہے تو عبادت گزار کا کام یہ ہے کہ اپنے عجز کا اعتراف کرے کہ مجھ سے کچھ نہیں بن سکا۔ یہ تواضع وانکسار اور یہ کسر نفس یہی اسلام میں عبادت کی روح ہے۔اسی سے انسان کی مقبولیت بڑھتی ہے۔

بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی کی عظمت نہیں ہوسکتی جب تک اللہ کی عظمت دل کے اندر نہ ہو اور اس عظمت کا تقاضا یہی ہوگا کہ ہمہ وقت زبان سے،قلب سے،دماغ سے اور اعضاء و جوارح سے بھی اطاعت وعبادت میں مشغول رہیں۔ ہر اعتبار سے ہم شکر گزار بنے رہیں۔

اور شکر گزاری یا عظمت کا اعتراف فقط زبان سے نہیں ہوتا،دل سے بھی ہوتا ہے۔روح سے بھی اور عمل سے بھی ہوتا ہے۔ جتنا اطاعت کا عمل بڑھے گا تو عملی شکر بڑھے گا،جتنا زبان سے اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہیں گے۔یہ اظہار عظمت کا شکر ہوگا،جتنا دماغ میں سوچیں گے کہ اللہ سب سے بڑی ذات ہے۔ یہ اس کی عظمت کا دماغ اعتراف کر رہا ہے۔عقل سے جتنے دلائل اس کی عظمت کے قائم کریں گے یہ عقل کا اعتراف عظمت ہے کہ وہ بھی مانتی ہے۔عظمت والی ذات وہ ہے۔جتنی آپ کے وجدان اور ضمیر میں عظمت بیٹھے گی۔یہ قلب کا اعتراف ہے کہ وہ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے تو رگ و پے سے عظمت کا اعتراف ہونا چاہئے۔وجدان،ارکان،زبان ولسان الغرض ہر اعتبار سے اس کی عظمتوں کا اعتراف چاہئے،جتنا شکر ادا کیا جائے گا،اتنی عظمت نمایاں ہوگی اور پھر بھی یہ کہہ دینا چاہئے کہ ہم حق ادا نہیں کر سکے۔

بہرحال اس عظمت کے بعد اب فرماتے ہیں کہ: جب تم اس مقام عظمت پر آ جاؤ گے،اگر تم سے گناہ بھی

① المستدرک علی الصحیحین للامام الحاکم ہو من مناقب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب، ج:۳ ص:۹۳ رقم: ۴۵۰۲.

سرزد ہوں گے تو پرواہ مت کرو۔ میں اتنی بڑی بخشش لے کر تم سے ملاقات کروں گا اس لئے اگر عظمت ہے تو بندہ تو خطا و نسیان سے مرکب ہے یہ غلطی کرے گا آخر بشریت ہے۔ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام بنائے گئے ہیں اور محفوظ اولیاء اللہ ہی بنائے گئے ہیں۔

ہم اور آپ تو رات دن گناہوں میں غرقاب ہیں۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہو اور وہ بغیر عظمت کے متوجہ نہیں ہوتا اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس لئے عظمت کا اعتراف دل میں ہوگا، تو قانون خداوندی کی عظمت بھی دل میں ہوگی اور جب اس کے قانون کی عظمت دل میں بیٹھے گی تو عمل درآمد دل کے لگاؤ سے ہوگا۔ خواہ وہ دیانات ہوں، خواہ وہ عبادات ہوں، خواہ وہ معاشرت ہو، انفرادی و جماعتی زندگی ہو، شہری زندگی ہو۔ جب قانون کی عظمت ہوگی تو آدمی بغیر قانون کس طرح نہیں چلے گا؟ ضرور چلے گا۔ ہر آن اس کی اس پر توجہ رہے گی کہ اس بارے میں میرے پروردگار کا کیا حکم ہے جو میں اس پر چلوں اور کس طریق پر عمل درآمد کروں۔

عظمت و محبت خداوندی ہی ایمان کی بنیاد ہے...... بہر حال پہلی بنیاد ''اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ'' ہے۔ یہ ایمان کا پہلا رکن ہے۔ اگر عظمت نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ پھر عظمت کے بھی درجات ہیں۔ ایک درجہ عظمت کا وہ ہے جو عوام مومنین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو اولیاء عظام اور علماء ربانیین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو ائمہ کرام کے دلوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے جو صحابہ کرامؓ کے قلوب میں تھا۔ ایک وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں تھا۔ اسی طرح ایمانوں میں بھی فرق ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا ایمان سب سے اعظم ترین ایمان ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایمان اس کے بعد تابعین کا' اس کے بعد ہم جیسے عوام کا ایمان سب سے آخر کا درجہ ہے۔ تو جیسے درجات عظمت کے ہیں۔ ویسے ہی درجات ایمان کے بھی ہیں۔ بہر حال جب نفس عظمت میں شرکت ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ قانون کی عظمت بھی ہوگی۔ جب عظمت ہوگی، پھر محبت بھی ہوگی، محبت ہوگی تو آدمی کے دل میں قانون پر عمل درآمد کرنے کی لگن پیدا ہو جائے گی۔

یہی محبت تھی جس نے حضرات صحابہ کرامؓ کو مجبور کیا کہ گھر بار انہوں نے چھوڑا، جائیدادیں انہوں نے ترک کیں، وطن چھوڑ کر بے وطن ہوئے۔ اپنی لذتیں ترک کیں، اپنا آرام و آسائش تج دیا۔ کس لئے؟ محض محبت نبوی اور عظمت خداوندی کی وجہ سے جب محبت دل میں بیٹھ گئی تو ہر چیز ان کے سامنے ہیچ بن گئی۔ تو ہجرت کر کے وطن چھوڑ کر کے اللہ کے رسول کے ساتھ آ گئے۔ جانیں الگ قربان کیں، مال الگ چھوڑا اولاد کو، عزیزوں کو، رشتہ داروں کو الگ چھوڑا، اگر محبت و عظمت نہ ہوتی، یہ اتنے بڑے بڑے کام ان سے سرزد نہیں ہو سکتے تھے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایات میں فرمایا گیا ہے کہ: جب غزوہ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ کے چھوٹے صاحبزادے اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' وہ کفار کے لشکر میں مسلمانوں کے مدمقابل تھے غزوہ بدر کے بعد ایمان کی توفیق ہوئی اور ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد ایک دفعہ اپنے

والد صدیق اکبرؓ سے کہنے لگے کہ: ''اے میرے والد! جنگ بدر کے اندر کئی دفعہ ایسا موقع آیا کہ آپ میری زد کے نیچے تھے اگر میں تیر چلاتا یا تلوار سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرتا، میں آپ کو ختم کر سکتا تھا، مگر میں نے یہ خیال کیا کہ یہ میرے باپ ہیں۔ میرے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے قتل ہوں۔ اس لئے میں باپ ہونے کی عظمت کی وجہ سے رک جاتا تھا''۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے میرے بیٹے! اگر تو میری زد پر آجاتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا پھر میں دوسروں کی طرف بڑھتا اس لئے کہ جب دل میں اللہ کی محبت آ گئی تو پھر کسی دوسرے کی محبت کی سمائی کا دل میں کیا سوال، پھر کہاں کی اولاد اور کہاں کی بنیاد؟ جب میں اللہ کے لئے کھڑا ہوا تو میں پہلے اس کو دیکھتا جو دشمن خدا ہے اور میرا عزیز بھی ہے تاکہ میں اپنی عزیز داری کو حق تعالیٰ کی دشمنی سے پاک کردوں۔ میں پہلے تجھے قتل کرتا''۔ اولاد کے حق میں یہ جذبہ پیدا ہو جانا، ظاہر بات ہے کہ عظمت و محبت خداوندی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس درجہ کی محبت رچ بس گئی تھی کہ اصول و فروع کی محبت ہی نہ رہی تھی۔

اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' ① ''کوئی بھی تم میں سے اس وقت تک کامل الایمان مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت اپنی اولاد ماں باپ سے نہ ہو جب تک اتنی محبت غالب نہیں آجائے گی اس وقت تک مت سمجھو کہ تم میں کمال ایمان پیدا ہو گیا''۔ ظاہر بات ہے کہ ایمان کی بنیاد محبت نکل آتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ایمان متحقق نہیں ہو سکتا۔

ایک محبت تو طبعی ہے جو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے اور اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہے اور ایک محبت عقلی ہے۔ ایمان عقلی محبت کا نام ہے طبعی محبت کا نام نہیں ہے۔ طبعی طور پر آدمی اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے لیکن عقلاً یہ سمجھتا ہے کہ زیادہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ اس واسطے جب اللہ کے حکم اور اولاد کا مقابلہ پڑتا ہے وہ اولاد کو دھکا دے دیتا ہے اور حکم خداوندی کو آگے رکھتا ہے۔ یہ عقلی محبت ہے، محض طبعی جذبہ نہیں ہے تو ایمان عقلی محبت و عظمت کا نام ہے۔ یہ پہلا رکن ہے۔

ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ...... دوسرا رکن یہ ہے کہ: اَلشَّفَقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللہِ جتنا آدمی اللہ کی طرف جھکے اتنا ہی اس کی مخلوق کی خدمت کی طرف متوجہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ یُّحْسِنُ اِلٰی عَیَالِہٖ. ② ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی قید نہیں ہے۔ جتنے بندگان خدا ہیں وہ سب خدا کا کنبہ ہیں۔ اس کی پیدا کی ہوئی چہیتی مخلوق ہے اللہ کو سب سے زیادہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ...... ج: ۱ ص: ۶۷ رقم: ۴۴.

② مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ ج: ۷ ص: ۳۴۰.

محبوب وہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ احسان وسلوک کے ساتھ پیش آئے''۔ وہی اللہ کا سب سے زیادہ چہیتا ہے۔ بہر حال جیسے اللہ کی محبت لازمی ہے، اسی طرح سے فرمایا گیا مخلوق پر شفقت کو لازمی سمجھو۔

اگر مخلوق ستم رسیدہ ہے، مظلوم و بے کس ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے۔ اگر کوئی غیر مسلم بھی مصائب میں پھنس جائے اور مسلم دیکھ رہا ہے کہ وہ مصیبت زدہ ہے تو مسلم کا کام یہ ہے کہ اس کو بھی مصیبت سے نجات دلائے۔ جتنا بھی اس کے بس میں ہے۔ اس کو بھی ظلم وستم اور پریشانی سے چھڑائے بہر حال مخلوق کی خدمت یہ شفقت کے لئے ضروری ہے۔ جب تک مخلوق کی خدمت نہ ہو شفقت نہیں پائی جاسکتی۔

خدمت کے پھر دو درجے ہیں۔ ایک درجہ نفع رسانی کا ہے، ایک درجہ ضرر رسانی سے بچ جانے کا۔ تکلیف نہ پہنچاؤ، نفع چاہے پہنچا سکو یا نہ پہنچا سکو۔ تو ایک درجہ کف الاذیٰ کا ہے یعنی اپنی ایذا رسانی کو روک دو۔ اذیت مت پہنچاؤ اور ایک یہ کہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی مخلوق کو نفع اور راحت پہنچاؤ۔ اولین درجہ یہ ہے کہ تم سے کسی مخلوق کو ضرر و اذیت نہ پہنچے، اگر یہ بھی نہ ہو تو سمجھو ایمان نہیں۔ اگر آدمی کسی دوسرے کو تکلیف میں مبتلا دیکھے یا اسے گمان ہوں کہ یہ مبتلا ہو جائے گا۔ آدمی کا فرض ہے کہ اسے متنبہ کر دے، اگر متنبہ بھی نہ کرے آنکھ بند کر کے گزر جائے تو سمجھ لو کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ ورنہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے کو متنبہ کر دے کہ یہ تکلیف کا راستہ ہے اس پر مت جاؤ، اسی واسطے فرمایا گیا: اَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ. (1)

''ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹائے'' جس سے کسی کو تکلیف پہنچے کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اٹھا کر راستے کو صاف کر دے۔ اینٹیں پڑی ہوئی ہیں جن سے لوگوں کو ٹھوکریں لگیں گی اٹھا دے تا کہ مخلوق کو اذیت نہ پہنچے۔ یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ: قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: تین قسم کے آدمی ہیں جن پر حق تعالیٰ لعنت کرتے ہیں۔ ایک وہ جو سڑک کے اوپر ایذا دہ چیزیں ڈال دے ایک وہ کہ موارد عامہ میں جہاں لوگ بیٹھتے ہوں، راحت اٹھاتے ہوں، وہاں بول و براز کر کے جگہ کو پراگندہ کرے۔ جیسے کوئی درخت کا سایہ ہے لوگوں کی بیٹھنے اٹھنے کی جگہ ہے وہاں پر آدمی نجاست ڈال دے یا بول براز کرے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس پر ہماری طرف سے لعنت ہے۔ اسی طرح سے کسی ایسی تکلیف کا سامان کر دے کہ مخلوق کو ٹھوکر لگ رہی ہے یا مخلوق کو کانٹے چبھ رہے ہیں جو اس نے پھیلا دیئے ہیں۔ اب لوگ تکلیف میں پڑتے ہیں تو یہ خوش ہوتا ہے۔ گویا اس کی تفریح ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سمجھو ایسے شخص میں ایمان نہیں ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہے۔ تو جہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کی عظمت کرو، وہاں یہ بھی بتلایا گیا کہ مخلوق کی خدمت کرو اور خدمت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کم سے کم اذیت دوسروں کو مت پہنچاؤ۔

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان و افضلها و ادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

مرا بخیر تو امید نیست بدمرساں

خیر کی امید نہیں تو کم از کم آدمی بدی نہ پہنچائے۔ دوسرے کے واسطے ایذا زدہ نہ بنے۔ یہ گویا لازمی سمجھا گیا ہے کہ نہ قول سے ایذا پہنچاؤ نہ عمل سے ایذا پہنچاؤ، نہ کسی ہیئت سے ایذا پہنچاؤ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ① لمز بھی مت کرو۔ کسی کو کن آنکھیوں سے آنکھ مار دینا، پھبتی اڑانے کے وقت آدمی آنکھوں سے اشارہ کیا کرتا ہے جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اس کی مخالفت فرمائی گئی کہ تمہاری آنکھ کو بھی حق نہیں ہے کہ دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا سبب بنے ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ برے لقب سے بھی یاد نہ کرو۔ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ: کوئی کسی کو کہے یا کافر، یا فاسق. فرمایا ایمان کے بعد ایسے برے القاب؟ ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ ② "ایمان کے بعد فسق و فجور مت اختیار کرو" کہ لوگوں کو برے القاب سے یاد کرو یا خطاب کرو۔ بعض لوگ دوسرے کو برے برے القاب سے مخاطب کرتے ہیں، وہ بیچارے شرمندہ ہوتے ہیں۔ اس کی مخالفت فرمائی گئی۔ فرمایا گیا ﴿لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾ ③ "ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر بھی مت کرو۔ پھبتی بھی مت کسو، ایسا مذاق بھی مت کرو کہ دوسرے کے دل کو صدمہ پہنچ جائے تم جو دوسرے کو تمسخر اور اس کی تحقیر کر رہے ہو، تمہیں کیا خبر ہے کہ اللہ کے ہاں وہ زیادہ مقبول ہو اور تمہاری قبولیت اتنی نہ ہو"۔ اس لئے فرمایا تمسخر بھی مت کرو، لمز بھی مت کرو۔ تکلیف دہ ہیئت بھی مت بناؤ۔ جیسے زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ یہ انگلی اگر کسی نے ذرا سی اٹھادی تو تلوار کھنچ جاتی تھی۔ چڑانے کی انگلی سمجھی جاتی تھی۔ گویا انگلی کا اٹھا دینا گالی دینا تھا۔ اسی واسطے اس انگلی کا نام "سَبَّابَه" تھا۔ یعنی گالم گلوچ کی انگلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام بدلا اور فرمایا اسے "سَبَّاحَه" کہو یعنی اللہ کی پاکی بلند کرنے کی انگلی اور نمازوں میں اس انگلی کو اٹھاؤ جب کلمہ شہادت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو۔ تو بجائے سبابہ کے سباحہ اس کا نام رکھا کہ یہ گالم گلوچ کی انگلی نہیں ہے بلکہ تسبیح وتہلیل ہے اور طاعت وعبادت کی انگلی ہے۔ اس نام کو بھی چھوڑ دو جو زمانہ جاہلیت کا نام ہے۔

کمال ایمان کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟...... بہر حال کسی ایسی ہیئت سے اشارہ کرنا یا جیسے کسی زمانے میں انگوٹھا دکھلا دینے کا دستور تھا جس سے دوسرا چڑ جائے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا زمانہ جاہلیت میں شہادت کی انگلی دکھا کر چڑا دینا سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام چیزوں سے روکا گیا تا کہ ایک مسلم دوسرے مسلم کے لئے ایذا رسانی کا باعث نہ بنے۔

فرمایا گیا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ ④ "مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ نہ زبان سے ایذا پہنچائے نہ ہاتھ سے"۔ کہیں فرمایا گیا "اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام، ج: ۱ ص: ۶۵ رقم: ۴۱.

اَلنَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ.'' ① مومن کون ہے؟ جس سے لوگ اپنی جان، مال، آبرو کے بارے میں امن میں ہوں اور مطمئن ہو جائیں، لوگ یوں سمجھیں کہ ہماری جان بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مومن ہے یہ جان کے اندر خیانت نہیں کرے گا۔ ہماری آبرو بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مومن ہے خائن نہیں ہے۔

اور یہاں پر لفظ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ ہے یعنی لوگ مطمئن ہوں۔ اس میں یہ بھی قید نہیں کہ مسلمان ہی مطمئن ہوں بلکہ غیر مسلم بھی مطمئن ہو جائیں کہ یہ موذی نہیں ہے۔ یہ ایماندار ہے تو ایمان کی علامت یہ بتلائی گئی کہ ہر کس و ناکس اس کے معاملات کو دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ یہ مومن ہے۔ اس سے مال، جان، آبرو میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ کسی میں بھی خیانت نہیں کرے گا۔ بہر حال مومن کی شان یہ ہوئی کہ اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھرا ہوا ہو اور بلا استثناء ہر مخلوق کی درجہ بدرجہ خدمت کرے جس کے دل میں محبت خداوندی ہوگی، اس کے دل میں اس کی مخلوق کی محبت ہوگی اور جب مخلوق کی بھی محبت ہوگی تو اسے چین نہیں آئے گا کہ کوئی شخص اذیت و تکلیف کے اندر رہے۔ وہ سعی کرے گا کہ اس کی تکلیف رفع کروں۔ کم سے کم اس کی اذیت و تکلیف کا ذریعہ نہ بنوں اور اس کی جان و مال محفوظ رہنا چاہئے۔

اگر خدانخواستہ مومن ایسا ہو جائے کہ لوگ اس سے دور ہٹنے لگیں کہ بھائی! کہیں یہ چھری نہ مار دے، کہیں جیب نہ کتر لے، کہیں گالی نہ دیدے تو وہ مومن کیا؟ وہ تو اچھا خاصا بیل ہے۔ بیل جب چلتا ہے تو لوگ پہلو بچا کر چلتے ہیں کہ بیل ہے کہیں لات نہ مار دے، کہیں دم نہ مار دے، کہیں پیشاب نہ کر دے، چھینٹا نہ پڑ جائے۔ اگر مومن سے بھی یہ کھٹک پیدا ہو گئی کہ کہیں چھری نہ مار دے، جیب نہ کتر لے وہ بھی پھر بیل ہوا۔

مومن وہ ہے جس سے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ یہ نہ ہماری جان کا لیوا ہے نہ آبرو گرانے والا ہے نہ مال میں خیانت کرنے والا۔ غائبانہ بھی خیانت نہ کرے بلکہ حفاظت کرے۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، اچھے بڑے صالح لوگوں میں سے تھے۔ وہ سہارنپور سے اپنے وطن کانپور جا رہے تھے۔ سہارنپور کے گنے مشہور ہیں۔ انہوں نے کافی مقدار میں گنے خرید کئے۔ اب وہ جا کے کانٹے پر ڈالے تا کہ تلواؤں، اس لئے کہ وہ اس مقدار سے زیادہ تھے جو ایک ٹکٹ میں لے جائی جا سکتی ہے۔ تولنے والے بابو نے دیکھا کہ ایک نیک صالح آدمی، صورت بھولی بھالی، اس کے چہرے پر ایمانداری برس رہی ہے اس نے کہا مولوی صاحب! تلوانے کی ضرورت نہیں، بس تم ویسے ہی لے جاؤ۔

انہوں نے کہا صاحب! آپ تو کہہ رہے ہیں کہ ویسے ہی لے جاؤ۔ اگر میں لے گیا اور ریل میں چیکر آ گیا اور اس نے مال چیک کیا۔ وہ کہے گا یہ مال زیادہ ہے۔ وہ میرے سے جرمانہ بھی وصول کرے گا۔ میں یہاں تھوڑا دے کر چھوٹتا ہوں، وہاں زیادہ دینا پڑے گا۔ آپ مجھے کیوں زیادہ میں پھنسا رہے ہیں؟

---

① الصحیح لابن حبان، کتاب الایمان، باب فرض الایمان، ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۵۱۰.

اس نے کہا۔نہیں، ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔انہوں نے کہا صاحب، غازی آباد سے گاڑی بدلے گی وہاں دوسرا چیکر آئے گا،اس نے چیک کیا تو جتنا لمبا راستہ ہوتا جائے گا محصول و جرمانہ بھی بڑھتا جائے گا۔اس نے کہا ہم اس سے کہہ دیں گے کہ وہ اس چیکر سے کہہ دے گا کہ بھئی! انہیں مت ستانا اور یہ مال لے جانے دو۔

انہوں نے کہا صاحب! اس نے چھوڑ دیا لیکن جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور میرے پاس جو وزن زیادہ ہوگا تو وہ بابو کہے گا کہ یہ اپنا ٹکٹ دے رہے ہو، اس مال کا ٹکٹ کہاں ہے؟ تب میں کیا کہوں گا؟ اس نے کہا ہم اس دوسرے چیکر سے کہلا دیں گے۔وہ اس بابو سے کہہ دے گا۔آپ کو پاس کر دیا جائے گا۔آپ بے فکر ہو کر لے جائیں۔انہوں نے کہا پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا پھر کیا ہوگا۔پھر آپ کا گھر آ جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ اللہ میاں جو میرے سے پوچھیں گے کہ ریلوے کے مال میں خیانت کیوں کر کے آیا تھا؟ قیامت کے دن جو باز پرس ہوگی، تو میں کیا جواب دوں گا؟ اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی مجنون اور دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔گویا اللہ کا نام لینا اس کے نزدیک دیوانگی تھی۔حقیقت یہی ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　　اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

دیوانہ وہ ہے جو اللہ کا دیوانہ نہیں بنتا،فرزانہ وہ ہے جو فرزانہ نہیں ہے۔ہر وقت غرور میں مبتلا ہے۔

''اَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ'' ① ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اتنا اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ اور مجنون کہنے لگیں''۔ایک سودا اس کے دل کے اندر سما جائے۔جب دیکھو اللہ اللہ، جب دیکھو اللہ اللہ۔معلوم ہوتا ہے دیوانہ ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا اور اس میں فرمایا کہ: ہمارے حضرت استاذ یہ فرماتے تھے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں امام اوزاعی کا مقولہ نقل کیا ہے امام اوزاعی تیسرے قرن کے اکابر علماء میں سے ہیں۔امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔امام اوزاعی نے اس وقت کے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کہا تھا کہ ''اگر صحابہ کرامؓ آج قبروں میں سے نکل آئیں تو تو ہم تو انہیں مجنون کہیں گے اور وہ ہمیں کافر کہیں گے کہ وہ اسلام جو دنیا کے اندر ہم چھوڑ گئے تھے وہ تو گیا۔اب اس کا وجود کہاں ہے؟'' یہ امام غزالی نے امام اوزاعی کا مقولہ نقل کیا ہے۔

اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''میں یہ کہتا ہوں اس زمانے میں اگر قبر سے نکل کر امام غزالی آ جائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے اور ہم انہیں مجنون کہیں گے''۔

اور شیخ الہند نے فرمایا: ''اگر میرے استاذ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے زمانے کے لوگ قبروں سے نکل کر آ جائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے، ہم انہیں مجنون کہیں گے''۔حقیقت یہی ہے کہ دیوانہ تو وہی ہے جسے لوگ دیوانہ کہیں اور خدا

① مسند احمد، مسند ابی سعید الخدریؓ ج:۲۳ ص:۱۷۱.

کا دیوانہ اللہ کا مجنون کہ ہر وقت اللہ ہی کا نام ہے۔ اسی ہی کی رٹ ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب تک یہ جنون نہیں سمائے گا، ایمان کا کمال نہیں ہو سکتا۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ علیہ عنہ جلیل القدر صحابیؓ ہیں۔ صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا لقب ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسرار اور فتن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں فرمائیں، ان کے اسرار ان کے قلب میں محفوظ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے بہت سے واقعات بیان کرتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے فتنے مجھے بتلا دیئے ہیں۔ فتنہ پردازوں کے نام اور ان کے نسب نامے بھی بتلا دیئے ہیں کہ فلاں فلاں وقت میں فلاں فلاں فتنہ پرداز کھڑا ہوگا۔ لیکن ان کو زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فتنوں کے بارے میں ان سے کچھ احادیث مروی ہیں، گویا اسرار نبوت کے امین ہیں۔ اسرار نبوت ان کے قلب میں ہیں۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب ایران فتح ہوا اور اس کا دارالسلطنت بغداد تھا۔ یہ وہاں پہنچے تو آپ کھانا کھا رہے تھے، ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی وغیرہ لئے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ تو حضرت حذیفہ ابن یمانؓ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے اتفاق سے ایک لقمہ گر پڑا۔ آپؓ نے فوراً لقمے کو اٹھایا۔ اس کی مٹی جھاڑ کر صاف کیا اور تناول فرما لیا۔ اس فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ متمدن لوگوں کا ملک ہے یہاں تہذیب اور شائستگی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ زمین پر سے لقمہ اٹھا کر کھا لینا، لوگ اس کو عیب شمار کریں گے اور کہیں گے کہ یہ حرص وہوس ہے، زمین پر پڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کے کھا لیا؟ یہ تمیز کے خلاف ہے۔ آپ ایسا نہ کریں ورنہ لوگ آپ کے اوپر ملامت کریں گے، مذاق اڑائیں گے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ.'' ''کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟'' اس سنت میں جو برکت ہے وہ دنیا ومافیہا میں نہیں ہے۔ سُبْحَانَ اللهِ.

جب تک اس درجے کا جنون دل میں نہ سما جائے کہ ایک ایک سنت پر آدمی جم جائے اور دانت سے مضبوط پکڑ لے کہ دنیا کی ملامت کا خوف ترک کر دے، اس وقت تک کمال ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں ایمان نام ہی جنون کا ہے۔ مگر جنون عشق کا نام ہے اور عشق بھی اللہ کا کسی غیر اللہ کے عشق کا نام ایمان نہیں ہے۔ جب عشق دل میں گھر کر جاتا ہے تو عاشق تو واقعی مجنون سا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ غیر محبوب اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ وہ تذکرہ کرے گا تو محبوب کا، نام لے گا تو محبوب کا، فکر ہوگی تو محبوب کی۔ غرض جنہیں عشق کی دولت میسر نہیں وہ انہیں مجنون نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قُلِ اللّٰهَ اللّٰهَ حَتّٰى تُقَالَ مَجْنُوْنٌ'' اتنا اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں۔

اسی بنا پر امام اوزاعی نے کہا تھا کہ اگر آج صحابہ کرامؓ اپنی قبروں میں سے نکل کر آجائیں تو ہم انہیں مجنون

کہیں گے وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ ہم کہیں گے یہ دیوانے ہیں۔ سوتے اور جاگتے انہیں ایک ہی لگن ہے۔ وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ وہ ذکر اللہ کی لگن اور وہ اسلام کہاں گیا جو ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ بہر حال دل کی لگن اور تڑپ کا نام ایمان ہے کہ دل میں ایک نسبت پیدا ہو جائے اور آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، کھانے، پینے، سونے، جاگنے میں ایک ہی کا نام اور ایک ہی کا ذکر ہو۔

مومن کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں ہونا چاہئے...... آخر احادیث میں جو مختلف اوقات کے اذکار بتلائے گئے ہیں کہ مومن کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے کہ اللہ کی طرف وہ توجہ نہ کرے۔ گھر سے باہر نکلے تو دعا پڑھے "بِسْمِ اللّٰهِ، آمَنَّا بِاللّٰهِ تَوَكَّلْنَا عَلَى اللّٰهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" ①

گھر میں داخل ہو تو کہو "اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا." ②

استنجا کے لئے داخل ہو تو کہو "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ." ③

استنجا کر کے باہر آؤ تو کہو "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ." ④

لباس پہنو تو کہو "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ." ⑤

دوستوں سے مصافحہ کرو تو کہو "نَحْمَدُ اللّٰهَ تَعَالٰی وَنَسْتَغْفِرُهٗ." ⑥ "ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اس سے استغفار کرتے ہیں"۔

دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھو تو کہو بسم اللہ اور فارغ ہو جاؤ تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا. پھر اس کے وعدے دیئے گئے کہ اگر کسی نے بسم اللہ سے کھانے کی ابتداء کی اور اَلْحَمْدُلِلّٰهِ كَثِيْرًا. پر ختم کیا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں تو گناہوں کی مغفرت کا وعدہ الگ دیا گیا، تو مومن کا کوئی لمحہ فارغ نہیں ہونا چاہئے۔ سونے کے لئے لیٹو تو کہو "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى." "اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر زندہ ہوں گا"۔

جب صبح کو اٹھو تو کہو "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَمَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ." "اس اللہ کے لئے حمد ہے

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول الرجل اذا اخرج من بیته، ج: ۴ ص: ۳۲۵ رقم: ۵۰۹۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب ج: ۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۱۶۰۵.

② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول الرجل اذا دخل بیته، ج: ۴ ص: ۳۲۵ رقم: ۵۰۹۶.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الطهارة، باب اذا اراد دخول الخلاء، ج: ۱ ص: ۲۸۳ رقم: ۳۷۵.

④ السنن لابن ماجه، کتاب الطهارة، باب مایقول اذا خرج من الخلاء، ج: ۱ ص: ۱۱۰ رقم: ۳۰۱.

⑤ المستدرک للامام الحاکم، کتاب اللباس، ج: ۴ ص: ۲۱۳.

⑥ السنن لابن ماجه، کتاب الادب، باب الرجل یقال له کیف اصبحت، ج: ۲ ص: ۱۲۲۲ رقم: ۳۷۱۱.

جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی اور اس کی طرف سب کو جانا ہے یا جمع ہونا ہے اور پھیلنا ہے“۔

آفتاب نکلے تو دعا بتلائی ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَلَّلَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً وَّجَآءَ بِالشَّمْسِ مِنْ مَّطْلَعِھَا. اَللّٰھُمَّ اُشْھِدُکَ وَاُشْھِدُ حَمَلَةَ عَرْشِکَ وَ مَلٰٓئِکَتَکَ وَجَمِیْعَ خَلْقِکَ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ.“ ① ”اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے دن چمکا دیا۔ جس نے سورج کو نکالا۔ اے اللہ میں تجھے بھی گواہ کرتا ہوں تیرے حملۂ عرش کو بھی گواہ کرتا ہوں تیرے ملائکہ کو بھی گواہ کرتا ہوں اور تیری تمام مخلوق کو گواہ کرتا ہوں کہ میں شاہد ہوں۔ تو اللہ ہے، تو یکتا ہے اور تیرا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے“۔

اسی طرح فرمایا: بیوی کے پاس جاؤ تو یہ دعا پڑھو: ”بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا.“ ② اولاد کی خبر سنو تو یہ دعا پڑھو۔ نیا پھل سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو۔ غرض تمام اوقات کی سینکڑوں دعائیں ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کی زندگی کو ہر آن ذاکر کی زندگی بنایا گیا ہے۔ وہ ہر آن اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ توحید کا سبق پڑھتا رہے۔ ایک ہی کی طرف جھکنا، ایک ہی کے لئے جینا، ایک ہی کے لئے مرنا اسی کا نام اسلام ہے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا ﴿اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ③ ”اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ“۔ اس مسلم بننے کے یہ معنی نہیں تھے کہ کلمہ پڑھ کر آج مسلم بن جاؤ۔ آپ تو پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی اولوالعزم، ہزارہا پیغمبروں کے والد بزرگوار ہیں۔ خلیل اللہ لقب ہے۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ اب تک مسلمان نہیں۔ اب کلمہ پڑھ کر مسلمان بن جاؤ۔ مسلم بننے کے معنی گردن جھکا دینے کے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے اور سپرد کر دو کہ نہ تمہاری مرضی رہے اور نہ ارادہ رہے۔ جو کچھ ہو ہماری مرضی اور ہمارا ارادہ ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ④ ”اے اللہ! میں مسلم بن گیا“۔ میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا۔ آپ کے حوالے کر دیا۔ جو چاہیں آپ کریں جب یہ کر دیا تو اب یہ اعلان کر دو:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ⑤ ابراہیم! کھلے بندوں کہہ دو، میری نماز، میرا حج، میرا مرنا اور میرا جینا، اور مرنے اور جینے کے درمیان جتنے افعال ہیں وہ خود سارے اس کے اندر آ گئے۔ تو سونا، جاگنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا۔ سب اللہ کیلئے ہے۔ میرے نفس کے لئے کچھ نہیں۔ جس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔ اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور آج میں ہی اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی گردن جھکا دینے کے نکل آئے۔ یعنی زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کو ہی یاد کرو۔ اس کی یہ تفسیر ہے

---

① الاذکار للنووی، ج: ۱ ص: ۸۶. عمل الیوم واللیلة لابن سنی ج: ۱ ص: ۲۷۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب النکاح، باب مایستحب ان یقول عندالجماع، ج: ۷ ص: ۱۲۵۸ رقم: ۱۴۳۴.

③ پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۱۳۱. ④ پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۱۳۱. ⑤ پارہ: ۸، سورة الانعام، الآیة: ۱۶۲، ۱۶۳.

جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں اذکار بتلاتے ہیں۔ فرائض وسنن اور واجبات اپنی جگہ وہ تو وقت خاص میں ادا کرو۔ لیکن تمام اوقات جو تمہاری زندگی کے ہیں۔ ہر موقع کی دعا ہر موقع پر ذکر اللہ کرو اور اسے یاد کرتے رہو تا کہ مسلم کی زندگی سو کر اٹھنے سے لے کر رات کے سونے تک ذکر اللہ سے معمور رہے۔ یہی حقیقت میں اسلام ہے ایسا اسلام جب آدمی کا ہوگا، تو لامحالہ لوگ اسے مجنون ہی کہیں گے کہ بھئی جب سو رہا ہے تو اللہ اللہ، جاگ رہا ہے تو اللہ اللہ، کپڑے پہنتا ہے جب بھی اللہ اللہ، روٹی کھاتا ہے جب بھی اللہ اللہ۔

مومن کا قلب بھی ذاکر ہونا چاہیئے...... اور یہ واقعہ ہے جو اس کی مشق کرے، اذکار کا پابند بن جائے گا۔ پھر قلب ذاکر بن جاتا ہے۔ پھر وہ ارادہ بھی نہ کرے جب بھی ذکر اللہ بے ارادہ اس کی زبان اور قلب سے جاری ہوتا ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں ایک صاحب اسی شان کے تھے کہ ذکر اللہ ان کے رگ وپے میں رچ چکا تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ کرتے تھے. ان کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پانی اتر آیا، تو آپریشن کی ضرورت پیش آئی۔ جب ہسپتال گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ: دیکھئے بالکل خاموش رہیئے گا۔ ہلنا جلنا بالکل نہیں ہوگا اور میں آپریشن کرتا ہوں پہلے میں آپ کو بے ہوش کروں گا۔ اس کے بعد پھر آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ بارہ گھنٹے کے لئے حس وحرکت نہ کریں انہوں نے فرمایا بہت اچھا۔

اس نے کلوروفام سنگھایا بے ہوش ہونا تھا کہ ایک دم قلب میں سے الا اللہ، الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے کہا کیا کرتے ہو؟ اب انہیں تھوڑی ہی خبر تھی کہ یہ کیا کررہے ہیں۔ وہ تو بے ہوش تھے۔ آخر وہ پھر ہوش میں لے آیا اور کہا یہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا کیا؟ کہا آپ تو اللہ اللہ کررہے تھے۔ انہوں نے کہا مجھے تو کوئی خبر نہیں۔ اس نے کہا دیکھئے اللہ اللہ کرنے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ کم سے کم اس وقت خاموش رہیئے۔ اس نے پھر بے ہوش کیا۔ بے ہوش ہونا تھا' پھر قلب سے الا اللہ الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ آخر ان کی آنکھ نہ بن سکی۔ ڈاکٹر نے کہا میں اس حالت میں آپریشن نہیں کر سکتا۔ تو آدمی جب بیداری میں اللہ کے نام کی مشق کرتا ہے، رات دن ذکر میں رہے پھر بلا ارادہ اس کی زبان پر ذکر جاری ہو جاتا ہے اور وہ ہر وقت ذاکر رہتا ہے۔ تو لامحالہ ایسے شخص کو مجنون ہی کہا جائے گا کہ عجیب جنونی آدمی ہے۔ ہر وقت الا اللہ سونے کے لئے لیٹے تب الا اللہ، اور جاگتا ہے تب الا اللہ گھر سے نکلتا ہے جب الا اللہ مسلم کی یہ زندگی ہے۔

معاشرے کے تمام گوشوں میں ذکر اللہ موجود ہے...... اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے معاشرہ سے بالکل بیگانہ بنا دیا ہے نہ تجارت کرو نہ زراعت بس اللہ اللہ کرتے رہو۔ اس تجارت وزراعت کو بھی اسلام نے اللہ اللہ بنا دیا ہے کہ جب حسن نیت سے شریعت کے مطابق تجارت ہو، زراعت، مزارعت، معاشرت، تمدن ہو، وہ خود اللہ اللہ کے اندر داخل ہے۔ وہ بھی ذکر حق ہے۔ جب اتباع سنت پایا جائے گا وہ خود ذکر اللہ ہوگا۔ بہرحال معاشرت کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس میں ذکر کی شان موجود نہ ہو، ذرا سی فکر کی ضرورت ہے دل میں یہ لگن ہو کہ میں اللہ کے لئے

کرر ہاہوں اور آدمی جو چیز کرے اس نمونے کو سامنے رکھ لے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا ہے۔ پھر اس کی ساری زندگی ذکر اللہ ہی میں شمار ہوگی، اسے ذاکر کہا جائے گا، غافل نہیں کہا جائیگا۔ عظمت ومحبت خداوندی جب قلب میں سماجاتی ہے تو ایسے ذاکر آدمی سے جب کوئی فعل سرزد ہوگا وہ خود ذکر کے حکم میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خدمت خلق اللہ کے اندر راسخ القدم ہوگا۔ وہ ایک طرف اللہ کا ذاکر ہوگا اور ایک طرف مخلوق کا خادم ہوگا۔ ایک طرف عبادت رب ادا کرے گا۔ ایک طرف خدمت خلق ادا کرے گا اور ایک چیز اس کو دوسری طرف سے غافل نہیں بنا سکے گی، جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے اور انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چل کر آدمی ولایت کے اونچے اونچے مراتب پر پہنچتا ہے۔ اس مرتبہ کا حاصل یہی ہے کہ ذکر اللہ اس کے رگ وپے میں راسخ ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھے جب بھی ذکر اللہ اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہو اور فرش زمین پر بیٹھے جب بھی ذاکر ہو۔ وہ بہترین فاخرہ لباس پہن لے جب بھی وہ ذاکر ہو، پھٹے پرانے کپڑے پہن رہا ہے جب بھی اس کا قلب ذاکر ہو کوئی چیز اس کو ذکر اللہ سے روکنے والی نہیں ہے بلکہ وہ لباس خود اس کے لئے یاددہانی کا ذریعہ اور مذکر بن جاتا ہے۔

اولیاء اللہ میں بزرگی کی دو شانیں...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے طبقے کے اور بہت سے بزرگ، رامپور ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں جمع ہوئے۔ کسی ایک جگہ دعوت میں یہ سب حضرات مدعو تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت اور شان یہ تھی کہ زہد اور ترک دنیا انتہا درجے کا تھا۔ میرے تو جدامجد ہی تھے۔ گھر میں جو واقعات میں نے سنے وہ یہ ہیں کہ حضرت کی ملک میں ایک جوڑا کپڑے سے زیادہ نہیں تھا جو بدن پر ہوتا۔ گھر بار جائیداد سب دوسرے کے حوالے کر دی تھی۔ ان کی ملک میں ایک جوڑا کپڑا جو بدن پر تھا، ایک قرآن شریف، ایک صحیح بخاری کا نسخہ اور فتوحات مکیہ کی جلد جو شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ چار چیزیں کل ان کی ملک تھیں۔

کپڑے کا جوڑا جب پھٹ پھٹا کر پرانا ہو جاتا تھا اور اس درجے پر آجاتا تھا کہ پہننے کے قابل نہ رہے تب دوسرا جوڑا بنتا تھا اور وہ جوڑا بھی گاڑھے کا کوئی اعلیٰ لباس نہیں ہوتا تھا۔ حضرت کا طریقہ یہ تھا کہ بند دارا چکن بلا کرتے کے پہنتے تھے اور ایک جوڑ پائچے کا چوڑا پاجامہ جو پرانے زمانے میں لوگ پہنتے تھے اور ایک پرانی لنگی کندھے پر رہتی تھی۔ کپڑوں کو دھولیا اور سکھا کر پہن لیا۔ وہی ایک جوڑا تھا جب تک وہ پھٹ کر بدن سے الگ نہ ہو جائے جب تک دوسرا جوڑا نہ بنتا تھا۔

تو رامپور کی جس دعوت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں حضرت تشریف رکھتے تھے۔ اتفاق سے کپڑا بہت پرانا ہو گیا تھا، پگڑی میں کچھ ڈورے بھی لٹک رہے تھے، یہ شان تو حضرت کی تھی۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس دن اتفاق سے بڑا فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً

پانچ سو روپے قیمت کا لباس ہوگا۔ بہترین جبہ اور بہترین عمامہ۔ تو لوگوں کی جیسی عادت ہوتی ہے دعوت میں بیٹھ کر انہوں نے کچھ تبصرے شروع کر دیئے۔ ایک نے کہا کہ بھئی! مولانا رشید احمد صاحب عالم بہت بڑے ہیں باقی بزرگی سے کیا تعلق؟ بزرگ تو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جو بالکل تارک الدنیا ہیں۔ کپڑا لباس دیکھو تو انتہائی زہد وقناعت بزرگی کی شان تو ان میں ہے اور یہ تو پانچ سو روپے کا جوڑا پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔

گویا عوام الناس ان بزرگوں کو لباس سے پہچانتے ہیں۔ لباس اچھا ہے تو بزرگی ندارد ہے۔ لباس پھٹا ہوا ہے تو بزرگی موجود ہے۔ یہ ایک سطحی سی چیز ہے۔ مگر بہرحال لوگوں نے یہ تبصرہ شروع کیا۔ یہ بھنک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پڑگئی حضرت نانوتوی کا چہرہ یہ چیز سن کر غصے میں سرخ ہوگیا اور اس شخص سے فرمایا کہ: ''جاہل! تو کیا جانے کہ بزرگ کسے کہتے ہیں تو نے کپڑوں کو دیکھ کر بزرگی سمجھی ہے؟ کپڑوں کے معیار سے تو بزرگی کو پرکھتا ہے؟'' فرمایا ''میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میں یہ پھٹا پرانا لباس نہ پہنوں، میرا نفس اپنے آپ سے باہر ہو جائے۔ اس لباس نے اسے روک رکھا ہے''۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ شخص وہ ہے کہ اگر ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تو بھی اس شخص کے نفس میں تغیر نہیں ہوگا نہ اس کے دل میں کوئی پھول پیدا ہوگی، نہ نفس پھولے گا، نہ غرور پیدا ہوگا۔ غنا کے اس درجے و مرتبے پر ان کا نفس پہنچ چکا ہے کہ بادشاہی تخت پر بٹھلا دو تب بھی یہ زاہد اور قانع ہیں۔ لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تب بھی ان کے قلب میں زہد وقناعت ہے''۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے اگر پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوں، تب بھی وہ ذاکر ہیں۔ ایک لاکھ کا لباس ہو تب بھی ذاکر ہیں۔ ذکر قلب کی شان ہے۔ قلب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی شان ہی دوسری ہو جاتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کبار محدثین میں گذرے ہیں۔ امام کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لباس بہت فاخرہ اور ٹھاٹھ دار پہنتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! بظاہر یہ زہد وقناعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا لباس پہنتے ہیں جیسے نوابوں کا فرمایا ''میں اس لئے پہنتا ہوں' اگر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن لوں تو۔ ''لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ'' ''یہ امیرزادے اور بادشاہ زادے مجھے ناک پوچھنے کا رومال بنالیں''۔ میں اس لئے فاخرہ لباس پہنتا ہوں تاکہ بتلا دوں کہ جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ہمارے پاس بھی ہے۔ ہم تم سے مستغنی ہیں کسی درجے میں تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ میں اس نیت سے پہنتا ہوں، تو اس نیت سے فاخرہ لباس پہننا یہ خود اطاعت وعبادت ہے۔ اس لئے اہل اللہ کا کوئی قدم بھی اطاعت وعبادت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ والوں میں بہت سے ایسے گزرے ہیں۔ جو فاخرہ لباس پہنتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن بزرگی ایک قدر مشترک تھی۔ یہاں بھی تھی، وہاں بھی تھی۔ یہاں اور نیت سے تھی وہاں اور نیت سے تھی۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں لیکن بادشاہوں کی وہ شان نہیں ہوتی تھی جوان کی شان تھی۔ مسند الگ تھی، صفائی ستھرائی الگ خدام الگ کھڑے ہوئے ہیں، دروازوں کے اوپر دربان الگ موجود ہیں اور صفائی کا یہ عالم کہ اگر ایک تنکا بھی سامنے پڑا ہوا ہوتا تھا تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ فرماتے تھے ''کوڑا کباڑ گھر کے اندر بھر رکھا ہے۔'' بہت نزاکت تھی۔

بادشاہ وقت نے ملنے کی آرزو کی۔ اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے بہت چاہا کے مجھے اجازت مل جائے۔ مگر اجازت نہیں تھی۔ آخر حضرت مرزا صاحب کے خادم خاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا: تو ان کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ تیرا معاملہ بہت رسوخ کا ہے تو میرے لئے ایک پانچ منٹ کی مہلت لے لے۔

اس نے کچھ اتار چڑھاؤ کر کے حضرت سے عرض کیا۔ تو پانچ منٹ کی اجازت ہوگئی کہ بادشاہ آ سکتے ہیں۔ بادشاہ سلامت آئے۔ بہت ادب کے ساتھ دوزانو ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت مرزا صاحبؒ نے کچھ نصائح فرمائیں اس دوران میں حضرت مرزا صاحب کو پیاس معلوم ہوئی تو خادم کو پانی لانے کے لئے اشارہ کیا بادشاہ نے سمجھ لیا کہ پانی چاہتے ہیں تو کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ اگر مجھے اجازت ہو؟ اجازت ہوگئی کہ اچھا تم پانی پلاؤ، تو بادشاہ پانی لینے گئے تو گھڑے کے اوپر جو بڑولی ڈھکی ہوئی تھی۔ پانی لے کر جوا سے رکھا وہ کچھ ٹیڑھی رکھی گئی بس مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا۔ فرمایا ''تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں تم بادشاہت کیسے کرتے ہو گے؟ ہٹو یہاں سے'' اپنے خادم خاص کو حکم دیا کہ وہی پانی پلائے گا۔

اس شان کے بھی بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی ولایت میں کوئی کمی نہیں۔ ولی کامل ہیں۔ ان کی نسبت و تصرف اور تربیت سے ہزاروں اولیاء بن گئے۔ ایک شان یہ ہے۔

اور ایک شان حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے یہ بھی انہی کے ہمعصر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور مرزا مظہر جاناں رحمہ اللہ علیہم یہ تینوں ایک قرن کے بزرگ ہیں۔ شاہ غلام علی صاحب کا یہ حال کہ نہ گھر، نہ در، نہ کپڑا نہ لتا، زہد و قناعت اور فقر و فاقے اور اس پر مہمانوں کی یہ کثرت کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان ہر وقت ان کے دستر خوان پر ہوتے تھے۔ لیکن ظاہر میں ذریعہ معاش کچھ نہیں ریاست ٹونک کے نواب۔ نواب امیر خاں، وہ حضرت کے مرید تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ کے ہاں تین تین سو، چار چار سو مہمان ہوتے ہیں۔ آخر یہ کہاں سے آتا ہوگا؟ بڑی تنگی اٹھاتے ہوں گے۔ بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ تو ریاست ٹونک کا ایک ضلع جس کی ایک سال کی کئی لاکھ روپے آمدنی تھی۔ وہ پورے کا پورا حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں پیتل کے پتر پر لکھ کر بھیجا کہ میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں تاکہ مہمانوں اور گھر والوں کا خرچ چلے۔ آپ اسے خدا کے لئے قبول فرمالیں۔ شاہ غلام علی صاحب نے اسی پتر پر جواب لکھا اور اس پر ایک شعر لکھ کر بھیج دیا۔ لکھا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ‌ ‌ ‌ ‌ با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر وفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے۔ میری طرف سے انہیں کہہ دو کہ روزی مقدر ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

تو ایک طرف یہ زہد وقناعت اور ایک طرف یہ ٹھاٹھ باٹھ جو مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے۔ ہیں وہ بھی ولی کامل، یہ بھی ولی کامل، ولایت کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ ولایت کا تعلق کپڑوں سے نہیں وہ قلب سے ہے۔ قلب جب اللہ رسیدہ بن جائے۔ وہ ولی کامل ہے۔ اپنے حسن نیت سے کوئی لباس فاخرہ پہنتا ہے اس میں بھی نیکی کی نیت مضمر ہوتی ہے، اس میں بھی مصلحت ہے۔ کسی پر زہد وقناعت کا غلبہ ہوتا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بزرگی کی دو شانیں...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں۔ آپؐ نے انہیں دعا دی ہے کہ: ''اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' (۱) ''اے اللہ! ابن عباس کو کتاب اللہ کا عالم بنادے اور اس کی حکمت سکھلا دے''۔ تو بڑے زبردست مفسر ہیں بلکہ تفسیر قرآن کے اندر صحابہؓ میں یکتا ہیں۔ لیکن لباس کس شان کا پہنتے تھے؟ ان کے لباس کا کپڑا اس زمانے کا بہترین کپڑا اور قیمتی ہوتا تھا۔ بڑا فاخرہ لباس ہوتا اور جس مجلس میں بیٹھتے تھے تو عجیب عطر ہوتا مجلس اس سے مہک جاتی تھی۔

اور ایک طرف ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو بدن پر کپڑا ہے ان کا مذہب یہ تھا کہ اس کے سوا دوسرا کپڑا رکھنا جائز نہیں۔ ان کی یہ شان تھی۔ جب ملک شام فتح ہوا تو شام میں تمدن تھا۔ حضرت امیر معاویہ کی حکومت تھی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ شام میں پہنچے وہاں تمدن، کھانے پینے کی افراط اور سب کے بہترین مکانات تھے۔ ان پر زہد وقناعت کا غلبہ، جس گھر میں جاتے اور دیکھا کہ دسترخوان پر بہترین کھانے جمع ہیں۔ بس لاٹھی لے کے سر ہو جاتے کہ اللہ کے رسولؐ کے دسترخوان پر کب دو کھانے جمع ہوئے ہیں جو تم نے جمع کر رکھے ہیں۔ تو یہ نہیں کہ امر بالمعروف کر دیں۔ لاٹھی لے کے مار پٹائی کے لئے تیار ہو جاتے۔ لوگ عظمت کرتے تھے کہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ دسترخوان اٹھ جاتا۔ لیکن لوگ تنگ آ گئے۔ اس طرح کسی کا بہترین لباس دیکھا۔ بس لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا لباس کب پہنا؟ کسی کے گھر میں صندوق میں دو چار جوڑے جمع ہیں۔ لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کب چار جوڑے رکھے تھے جو تم رکھ رہے ہو؟ اور مرنے مارنے کو تیار۔ آخر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے واقعات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھے کہ یہ تو لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔ اب لوگ اس کامل زہد وقناعت پر کیسے آ جائیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد وقناعت تھا۔ امت میں تو ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں حکم دیا جائے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ ان کی کسی سے نہ نبھے گی۔ چنانچہ وہاں سے حکم پہنچ گیا کہ ربذہ میں جاکے قیام کرو تو جنگل میں جاکے قیام کیا۔

---

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ اللهم علمه الكتاب، ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۵.

چونکہ امیر المومنین کا حکم تھا اور وہ واجب الاطاعت تھا، سر جھکا دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ کر جنگل میں قیام کیا۔ وفات کا جب وقت آیا تو گھر میں خود تھے اور ان کی بیوی تھی۔ تیسرا کوئی نہیں تھا، بیوی رونے لگی۔ اس لئے کہ ہاتھ پلے کچھ نہیں تھا، اس لئے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ صبح کا جو کھانا کھایا، تو رات کا کھانا رکھنا جائز ہی نہیں، توکل کے خلاف ہے۔ جو بدن پر کپڑا پہنے ہوئے تھے اس کے سوا اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔

آپ نے فرمایا: رومت۔ دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں تمہیں ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑے گا۔ ان سے کہنا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ کی وفات ہوگئی ہے۔ لوگو! (سواریوں سے) اتر جاؤ اور ان کے کفن دفن کا انتظام کردو۔ بیوی باہر جا کر بیٹھ گئی۔ تو واقعی تھوڑی دیر بعد گرد اڑی اور اونٹوں پر پانچ، چھ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا۔ جب وہ ان کے گھر کے قریب پہنچا بیوی نے کہا اے لوگو! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ابوذر غفاریؓ ہیں، ان کی وفات کا وقت ہے۔ آپ لوگ اتر جائیں ان کے کفن دفن کا انتظام کردیں اور نماز جنازہ پڑھا دیں۔ تو ان سواروں میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جلیل القدر صحابیؓ ہیں یہ سن کر کہ ابوذر غفاریؓ ہیں تو اس زور سے چلا پڑے کہ: ''صَدَقَ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ'' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ: ''وَیْحَکَ اَبِیْ ذَرٍّ یَعِیْشُ فَرِیْدًا وَیَمُوْتُ فَرِیْدًا.'' اے ابوذر! افسوس ہے کہ تنہائی میں زندگی گزارو گے اور تنہائی میں تمہاری موت بھی آئے گی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا۔ وہ واقعہ سامنے آ گیا۔

اس کے بعد اندر آئے ملاقات ہوئی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ خوش ہوئے۔ فرمایا یہ میرا آخری وقت ہے۔ میرے کفن دفن کا انتظام کردو اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کفن کا کوئی سامان نہیں۔ بس یہ کرتہ اور لنگی ہے جو باندھے ہوئے ہوں، اس کے سوا کوئی کپڑا نہیں۔ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے حضرات سے خطاب کر کے کہا کہ ''کوئی شخص مجھے ایک چادر دے دے تا کہ اس چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیا جاؤں''۔ گویا اگر کفن سنت میسر نہ ہو تو کفن کفایت ہی میسر آ جائے۔

کفن سنت تو تین کپڑے ہیں۔ ازار، لنگی اور ایک قمیض ہے اور کفن کفایت یہ ہے کہ ایک ہی کپڑے میں پوری لاش کو دفن کر دیا جائے۔ تو فرمایا کم سے کم کفن کفایت میسر آ جائے۔ ورنہ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں۔ اور زہد و قناعت کا یہ عالم کہ فرمایا: ''تم میں سے کوئی مجھے ایک چادر دے دو، مگر وہ شخص دے جو حکومت کا ملازم محصل اور زکوۃ وصول کرنے والا نہ ہو'' فرمایا ''جو لوگ مالیات کے وصول کرنے کے اوپر مقرر ہیں وہ بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں یا بہت اعلیٰ مال وصول کرلاتے ہیں تو رعایا تنگ ہوتی ہے یا رعایت و مروت کرتے ہیں تو ادنیٰ درجے کی چیزیں لے آتے ہیں۔ اس سے حکومت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اعتدال سے کام نہیں لیتے۔ اس واسطے اس شخص کی چادر میں قبول نہیں کروں گا جو مالیاتی تحقیق کے اوپر ملازم ہے''۔

حالانکہ وہ خلافت راشدہ کا دور ہے۔ یہ صحابہؓ ہیں جن کا تقوی اور تقدس دنیا کے لئے نمونہ اور معیار ہے۔ مگر ابوذر غفاریؓ کا تقوی یہ ہے کہ وہ اسے بھی خلاف تقوی سمجھتے ہیں کہ ایسے ملازم کا ہدیہ بھی قبول کریں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے پاس دو چادریں ہیں اور وہ میری ماں کے ہاتھ کا کاتا ہوا سوت ہے اور گھر ہی بنا ہوا ہے۔ فرمایا ''ہاں! بس وہ کافی ہے، ایک چادر مجھے دے دو۔'' چنانچہ وفات ہوئی اور اسی چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیئے گئے۔ ان پانچ، چھ حضرات نے جنازہ کی نماز ادا کر دی۔

تو میں عرض کر رہا ہوں ایک طرف ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جو پانچ سو روپے کا جبہ پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کوئی جوڑا بھی موجود نہیں۔ لیکن بزرگی میں کلام نہیں ہے۔ وہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ یہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ دونوں صحابیؓ ہیں اور صحابہؓ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ (رَضِیَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ)'' سارے صحابہؓ متقی، پارسا اور پاکباز ہیں اولیائے کاملین ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب اور ولی گزرے لیکن صحابیت کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ صحابیت کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ ان میں بھی دونوں شانیں موجود ہیں، تو بزرگی کا تعلق لباس کے فاخرہ ہونے اور لباس کے کمتر ہونے سے نہیں ہے۔ وہ قلوب سے متعلق ہے۔ فاخرہ لباس پہننے میں بھی ان کی نیتیں اچھی ہوتی ہیں اور پھٹا پرانا لباس پہننے میں بھی اچھی نیت ہوتی ہے۔ بزرگی دونوں کا ہی قدر مشترک ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں بزرگی کی دو شانیں...... اور میں تو کہتا ہوں کہ: انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون بزرگ ہے ان کی جوتیوں کے صدقے سے تو دنیا میں بزرگ بنتے ہیں۔ انبیاء آتے ہی بزرگی بانٹنے کے لئے ہیں۔ ان کے گھر سے بزرگی تقسیم ہوتی ہے۔ انبیاء میں بھی دونوں شانیں ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ ہیں اور تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہی محلات کھڑے ہوئے انکے نیچے نہریں اور دریا بہہ رہے ہیں اور ایک طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جو چیز بدن کے اوپر ہے اس کے سوا کوئی چیز ان کی ملک ہی نہیں ہے اور اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ کل سامان ان کے پاس کیا تھا؟ ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ کھانے کا وقت آتا تو وہ کھانے کا برتن تھا۔ وضو کا وقت آتا تو وہ پانی کا ظرف تھا۔ اسی میں پانی لے لیتے اسی میں پی لیتے اور اسی میں کھا لیتے۔ زندگی کا سامان ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ چمڑے کا تکیہ تھا کہ جہاں نیند آئی سر کے نیچے رکھا اور سو گئے۔ چاہے زمین ہی پر ہو۔ یہ کل مال و دولت تھا۔

ایک دن تشریف لے جا رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص دریا کے کنارے پر کھڑا چلو سے پانی پی رہا ہے۔ فرمایا اللہ اکبر اتنی دنیا ہم نے اپنے پاس رکھی ہے کہ جس کے بغیر بھی گذر ہو سکتا تھا۔ یہ بلا پیالے کے پانی پی رہا ہے۔ وہ پیالہ بھی پھینک کے چلے گئے کہ یہ بھی میرے پاس زائد تھا صرف تکیہ باقی رہ گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے

نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے۔ فرمایا اللہ اکبر۔ یہ تکیہ دنیا کا ایک مستقل سامان ہے جو میں نے رکھ رکھا ہے اس کے بغیر بھی گزر بسر ہو سکتا ہے، کہنی رکھ کے بھی سو سکتے ہیں۔ اس دن سے وہ تکیہ بھی چھوڑ دیا۔ اب اس کے بعد سوائے ستر ڈھانپنے کے کوئی چیز باقی نہ رہی، یہ بھی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ سلیمان علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں یہاں شاہی ٹھاٹھ ہے۔ وہاں انتہائی درویشی ہے اور ان دونوں میں بزرگی اور نبوت مشترک ہے۔

تو لباس سے کسی کو پرکھنا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک یہ کہ خلاف شرع لباس ہو، اگر وہ پہنے ہوئے ہو تو ہر مسلمان کو تنقید کا حق ہے کہ یہ جائز نہیں۔ پاجامہ پہنے اور وہ ٹخنوں سے نیچے ہے آپ کو نصیحت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے دن تین شخص ہوں گے جن کی طرف حق تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک شخص ''اَلْمُسْبِلُ الْمَنَّانُ'' ہے جس کے کپڑے اتنے لمبے ہوں جو ٹخنوں سے اتنے نیچے ہوں کہ گھسٹتے جا رہے ہوں۔ (۱)

یہ تکبر کی علامت ہے اور متکبر پر رحمت کی نظر نہیں ڈالی جائے گی، اس پر آپ اعتراض کر سکتے ہیں۔ کوئی ریشم کا لباس پہنے ہوئے ہو یہ ناجائز ہے آپ کو حق ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کے لئے خالص ریشم پہنا جائز نہیں سوائے اس کے کہ چار انگشت کے اندر اندر ریشم ہو کوئی پھول بوٹے یا دھاری بنی ہوئی ہو۔ یہ تو جائز ہے لیکن خالص ریشم کا لباس یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی خلاف شرع لباس پہنے ہوئے ہو آپ کو اعتراض کا حق ہے لیکن مطلقاً کوئی شخص قیمتی لباس پہنے ہوئے ہو اور آپ اس سے دلیل پکڑیں کہ اس کے قلب میں بزرگی نہیں ہے تو ھَلَّا شَقَقْتَ قَلْبَہٗ آپ اس کے قلب میں گھس کر دیکھ آئے ہیں کہ اس کے قلب میں بزرگی نہیں ہے۔ لباس سے بزرگی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ مکان کے اچھے ہونے سے بزرگی کی قلت یا بزرگی سے معدوم نہیں مانا جا سکتا۔ تو انبیاء میں دونوں شانیں موجود، اولیاءؒ میں بھی موجود، صحابہؓ میں بھی موجود۔ ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے، دیکھنا اصل یہ ہے کہ قلوب کس درجے کے ہیں۔

تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے...... بہر حال قلب وہ ہے جس کے اندر بزرگی ہو، لباس کیسا بھی ہو۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ انہوں نے ایک شخص سے فرمایا کہ جاہل تو کیا جانے کہ بزرگی کسے کہتے ہیں؟ ''میرے لئے اس پھٹے پرانے لباس میں بھی اپنے نفس کے لئے مشکل اور بھاری ہے اور یہ وہ شخص ہے کہ اسے ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو، اس کے نفس میں تغیر نہیں آ سکتا''۔

یہ تو یوں کہہ رہے ہیں اور مولانا گنگوہی سے جب پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کس مقام کے ہیں، یہ فرمایا کہ: ''بھائی! ہم نے ایک ہی ساتھ پڑھا، ایک ہی استاذ کے شاگرد ہوئے، ایک ہی شیخ کے مرید ہوئے، ایک ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن باوجود اس کے وہ اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ ہم ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ

(۱) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار...... ج: ۱ ص: ۱۰۲ رقم: ۱۰۶۔

پائے کہ وہ کہاں تک پہنچ چکے ہیں''۔

ان سے پوچھوتو وہ کہتے ہیں کہ وہ بہت اعلیٰ مقام پر ہیں۔ ان سے پوچھوتو یہ کہتے ہیں کہ وہ اتنے اونچے ہیں کہ میں ان کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔ بزرگی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اپنے نفس کی حقارت دل میں جمی ہوئی ہو اور دوسرے کی بزرگی جمی ہوئی ہو۔ اگر ایک شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اور وہ مدعی ہے کہ میں سب سے زیادہ بڑا ہوں۔ یہ دعویٰ ہی علامت ہے کہ بزرگی نشان کو بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ بزرگی میں نہ دعویٰ وادعاء ہوتا ہے نہ شیخی ہوتی ہے۔ ترک دعویٰ اور ترک شیخی کا نام بزرگی ہے۔ جب یہ پیدا ہو، کہا جائے گا بزرگی ہے۔

آج ہم اپنی حالت کو دیکھیں، ہر شخص یوں کہتا ہے کہ: میں اچھا ہوں اور یہ برا ہے اور قدیم مسلمانوں کا یہ دستور تھا کہ ہر شخص یوں جانتا تھا کہ یہ اچھا ہے اور ساری برائیاں میرے اندر ہیں۔ اس واسطے عالم میں امن تھا۔ آج ہم دوسرے کو حقیر اور اپنے کو بڑا جانتے ہیں اور اپنے کو بڑا جان کو دوسرے پر ہم ہر قسم کی زیادتی جائز رکھتے ہیں۔ تو دنیا فساد کا گھرانہ بن گئی۔ ہم نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور قدیم بزرگوں نے امن سے بھر رکھا تھا۔ ان میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ وہاں بزرگی کے معنی یہ تھے کہ اپنے نفس کی تحقیر ہو اور دوسرے کی عظمت جہاں فرمایا گیا ''ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا'' ''ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان اور حسن ظن رکھو''۔ اگر کوئی برائی بھی سننے میں آئے اس کی تاویل کرو کہ نہیں یہ نہیں یہ مطلب ہوگا۔

اچھے مطلب پر محمول کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی کی نیک عبادت بھی ہو تو توڑ مروڑ کر ایسے معنی بیان کریں کہ کسی طرح اس پر الزام آجائے۔ یہ قلب کے کھوٹ کی دلیل ہوتی ہے۔ ورنہ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر کسی کا قول، فعل یا کسی کی عبارت کچھ مبہم بھی ہو تو اس کو ایسے معنی پہناؤ کہ اس کی بریت ثابت ہو نہ یہ کہ وہ مجرم بن جائے۔

اس واسطے علماء لکھتے ہیں کہ: کسی مسلمان سے حسن ظن قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن بدظنی قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ جب تک ہاتھ میں حجت نہ ہو کسی سے بدگمانی پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب اپنے نفس کی حقارت اور دوسرے کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہو۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں، دوسرا بڑا ہے۔ فساد اس سے پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو حقیر ہے وہ کہے گا تو ذلیل ہے میں عزت دار ہوں، فساد شروع ہو جائے گا، جب آپ یوں کہیں کہ بڑے آپ ہی ہیں، وہ کہے نہیں بڑے آپ ہی ہیں۔ پھر نزاع کیسے ہوگا؟ لڑائی کہاں سے ہوگی تو تواضع کے اندر امن ہے اور تکبر کے اندر خلل امن اور بدامنی ہے۔ جہاں کہیں آپ فساد دیکھیں سر پھٹول دیکھیں سمجھ لیں کہ کسی متکبر کا وجود درمیان میں آگیا ہے۔ متواضع جب ہوگا تو وہاں بدامنی کے کوئی معنی نہیں۔ وہاں تو امن ہی امن قائم ہوگا، فلاح ہی فلاح ہوگی۔ مومن کو تواضع سکھلائی گئی ہے، تکبر نہیں سکھلایا گیا۔

عظمت و کبریائی صرف اللہ کی شان ہے

..... تکبر اللہ کی شان ہے۔ خدا کے سوا کسی کے لئے تکبر زیبا نہیں،

وہی فرما سکتے ہیں ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① "زمین اور آسمان کے اندر سب بڑائیاں ان کے لئے ہیں"۔ انہی کا نام ﴿اَلْمُتَكَبِّرُ﴾ ہے وہی تکبر کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے کہ کسی کو طالب علمانہ سوال پیدا ہو کہ حدیث میں تو یہ حکم دیا گیا کہ "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" ② "اللہ کے اخلاق اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرو"۔ وہ رحیم و کریم ہے تو تم بھی اپنے اندر رحم و کرم پیدا کرو۔ وہ علیم و خبیر ہے تو تم بھی اپنے اندر علم و خبر پیدا کرو۔ جہالت دور کرو۔ وہ لطیف ہے تو تم بھی اپنے اندر لطافت اور ستھرائی پیدا کرو۔ وہ حافظ و حسیب ہے۔ تو تم بھی اپنے بھائیوں کے محافظ بنو۔

جب یہ حکم ہے تو اللہ کی صفات میں سے متکبر ہونا بھی ایک صفت ہے۔ پھر چاہئے کہ ہر شخص متکبر بھی بنے۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ تکبر کرنا بہت بری بات ہے۔ تو ممکن ہے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا بری بات نہیں ہے۔ تکبر تو اللہ کی شان ہے۔ وہ بری تھوڑا ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں جھوٹ بولنا برا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو وہ سچے ہیں اور جب میں یوں کہوں گا کہ میں بڑا ہوں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ تو جھوٹ بولنا بری بات ہے تکبر کرنا بری بات نہیں ہے۔ خدا کے سوا جو تکبر اور بڑائی کا دعویٰ کرے گا۔ وہ جھوٹا ہوگا۔ تو جھوٹ سے بچایا گیا ہے اس لئے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" ③ اپنی جگہ صحیح ہے اور تکبر اور برائی کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ ہرگز بڑائی مت کرو، جھوٹے بن جاؤ گے۔ لیکن جب متواضع بنو گے تو اللہ خود بخود بڑائی دے دے گا۔ دنیا سمجھے گی کہ تم بڑے ہو۔ تمہارے اندر بڑائی آ گئی۔ تو ایک ہے بڑا بننے کا دعویٰ کرنا اور ایک عنداللہ بڑا بن جانا ہے تو عنداللہ بڑے بن جاؤ۔ اللہ تمہیں بڑائی دے دے، یہ بڑائی قابل قبول ہے لیکن تم خود ہی کہنے لگو کہ میں بڑا ہوں۔ یہ قابل قبول نہیں ہے۔ یہ حق تعالیٰ شانہ کا مقابلہ ہے جس کو ایک حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: "اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ وَمَنْ نَّازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ" ④ "تکبر میری چادر ہے، عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے جو اس میں کھینچا تانی کرے گا۔ میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچا دکھاؤں گا"۔ تو جو بھی بڑا بول بولتا ہے ہاتھ کے ہاتھ اسی مجلس میں اسے سزا مل جاتی ہے۔ چار آدمی کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی تذلیل کے درپے ہو جاتے ہیں اور جو چھوٹا بول بولتا ہے کہ میں ہیچ ہوں، میں حقیر ہوں۔ دوسرے تعریفیں کرتے ہیں کہ نہیں آپ بڑے ہیں، آپ بزرگ ہیں۔ آپ ایسے اور ایسے ہیں۔ تو بڑائی کا بول بولنا، دعویٰ کرنا، تذلیل کی علامت ہے۔ دوسرے یقیناً ذلیل سمجھیں گے۔ چھوٹا بنے گا تو دوسرے بڑا سمجھیں گے بڑائی حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دعوے کرے بلکہ دعویٰ ترک کر دے خود بخود بڑائی آ جائے گی۔ تو "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" میں اگر بزرگی لینی ہے تو اس کا راستہ تواضع ہے۔ تکبر اور کبریائی نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۲۵، سورة الجاثية، الآية: ۳۷. ② ③ احياء علوم الدين، باب بيان ان المستحق للمحبة هو الله وحده ج: ۳ ص: ۴۰۰. ④ السنن لابی داؤد، كتاب اللباس، باب ماجاء في الكبر، ج: ۶ ص: ۵۹ رقم: ۶۵۹۵.

جیسے آپ کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ جب چڑھیں گے تو جھک کے چڑھنا پڑے گا اور جب اتریں، تو جب تک اکڑیں گے نہیں اتر نا مشکل ہوگا۔ یہ اس کی علامت ہے کہ اونچائی پر جب پہنچ سکتے ہو جب جھک کے چلو، جب اکڑو گے تو نیچے کی طرف جاؤ گے۔ اوپر نہیں جاسکتے۔ آدمی جتنا اکڑے گا زمین میں دھنسے گا۔ جتنا جھکے گا اتنا بلندی کے اوپر پہنچے گا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ۔

پستی سے سربلند ہوا اور سرکشی سے پست   اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جتنا کوئی بڑا بننا چاہتا ہے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور جو بے چارہ خود گر جاتا ہے اسے اوپر اٹھا دیتے ہیں اور بلند بنا دیتے ہیں۔

''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' ① ''جو اللہ کے لئے نیچا بننا چاہے اللہ اسے اونچا کرتا ہے''۔ حدیث میں ہے کہ: اگر کوئی بندہ دعویٰ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی، میں نے حج کیا۔ میں نے اتنی نیکیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ نامعقول! تو نے کیا کیا؟ توفیق میں نے دی، عقل تیرے اندر میں نے پیدا کی، ارادہ میں نے پیدا کیا تو نے کیا کیا؟

اور اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اگر میں نے نماز پڑھی تو تو نے ہی توفیق دی تھی، تو نے ہی راستہ مہیا کیا تھا، تو نے ہی مجھے ہمت دی تھی۔ ساری بات خوبیوں کی تیری طرف ہے مجھ سے کچھ نہیں ہوسکا۔ اس کو فرماتے ہیں کہ نہیں چل کے تو ہی گیا تھا، مسجد تک تو ہی گیا تھا، حج کا ارادہ تو نے کیا تھا۔ اس کو سراہتے ہیں اور اونچا اٹھاتے ہیں۔ تو جو جھکتا ہے اسے اونچا کرتے ہیں۔ جو خود اونچا بننا چاہتا ہے اسے جھکا دیتے ہیں۔ اس لئے عزت پانے کا راستہ جھکاؤ ہے عزت یوں نہیں آیا کرتی کہ آپ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں کہ کرو میری عزت نہیں تو ماروں گا۔ یہ عزت کا طریقہ نہیں عزت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کی عزت کریں وہ تمہاری عزت کرے گا۔ تو معزز بن جاؤ گے تم ڈنڈے سے دوسرے کی تذلیل کرو اور کہو میری عزت کرو۔ یہ تو خود اپنی ذلت اور رسوائی مول لینا ہے۔

تواضع علامت آدمیت ہے...... بہر حال جب تک کہ تواضع، خدمت اور خدمت گزاری نہ ہو، اس وقت تک صحیح معنی میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی۔ مخلوق کی تذلیل و تحقیر سے آدمی خود اپنی ذلت کے راستے ہموار کرتا ہے، تو ایک طرف عظمت خداوندی دل میں ہو اور ایک طرف خدمت خلق اللہ ہو اور خادم خلق نہیں بن سکتا، جب تک کہ متواضع، منکسر المزاج نہ ہو جب تک یہ نہ سمجھے کہ میں ان سب سے کم رتبہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں۔ اب راستے میں کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک متکبر کانٹے کو اٹھانے کے لئے کبھی نہیں جھکے گا سمجھے گا میری شان کے خلاف ہے۔ میری حیثیت عرفی بہت بلند ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، ج: ٦ ص: ٢٠٠١ رقم: ٢٥٨٨.

متواضع ہے تو وہ جھک کر کانچ کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے اٹھا پھینکے گا تا کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ یہ خدمت وہ سر انجام دے گا جس کے قلب کے اندر تواضع اور انکساری موجود ہوگی، کبر اور ریا کاری جس کے اندر ہوگی، وہ کبھی یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکے گا۔ بہر خدمت خلق اللہ کا جذبہ تب موجود ہوگا، جب دل میں تواضع للہ کا جذبہ موجود ہو، منکسر المزاج ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے آدم علیہ السلام کا بیٹا ہو تو ضرور تواضع کرے گا اور اگر اپنا نسب نامہ شیطان سے ملا لے گا، کبھی تواضع نہیں کرے گا۔ اس واسطے کہ دونوں سے لغزشیں ہوئیں آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی ہوئی۔ آدم علیہ السلام نیت کے پاک تھے مگر بھول کر ایک لغزش ہوگئی۔ حکم دیا گیا تھا کہ درخت مت کھاؤ۔ بھول کر کھالیا حالانکہ وہ نافرمانی نہیں تھی۔ نافرمانی کہتے ہیں جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ یہ نہیں ہوا تھا۔ جانتے تھے کہ اللہ نے روکا ہے۔ مگر شکل کیا پیش آئی؟ ایک تو کمبخت شیطان نے آ کے قسم کھائی ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّی لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① "قسم کھا کے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں"۔ آدم علیہ السلام کا سچا قلب، آپ کسی فریب سے واقف نہیں۔ مقام جنت میں ہیں، جو کریم مقام ہے۔ یہ شبہ بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے، جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو حسن ظن دل میں ہوتا ہے۔ دوسرے کو بھی آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی اچھا ہے۔ یہ خدا کا نام لے کر قسم کھا رہا ہے۔ بھلا خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی جرات کیسے ہوسکتی ہے؟ ان کے ذہن میں یہ آیا۔

ہمارے بزرگوں میں سے ایک بزرگ تھے۔ حضرت میاں جی منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے ایک محدث تھے، انکے نانا تھے۔ بالکل مادرزاد ولی اور معصوم فطرت بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے ہی نہیں۔ ایک جگہ کھونٹی گاڑ رکھی تھی دھوپ وہاں تک پہنچ جاتی۔ کہتے کہ جاؤ بھئی! چھٹی کا وقت آ گیا لڑکے شرارت کر کے کھونٹی آگے گاڑ دیتے۔ دھوپ جلدی پہنچ جاتی اور کہتے میاں جی صاحب! چھٹی دے دو، وقت ہوگیا فرماتے اچھا جاؤ چھٹی۔

لوگوں نے عرض کیا، حضرت! یہ بچے جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے کھونٹی آگے گاڑ دی ہے فرماتے: مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا، مسلمان بچے کا یہ کام نہیں۔ فرماتے، بس بھئی تم جاؤ۔ تو واقعی جس کے دل میں اسلام اور سچائی ہوتی ہے۔ حسن ظن کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہی نہیں۔ سمجھتا ہے کہ سچ ہی بول رہا ہوگا۔ جب خدا کی قسم کھا کر کہے تب تو وہم بھی نہیں جاتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تو شیطان ملعون ہے سب کچھ ہے مگر جب اس نے اللہ کی قسم کھائی آدم علیہ السلام کا دل پگھل گیا۔ فرمایا: خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنا مشکل معلوم ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ مجھے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ممانعت کی گئی تھی اور یہ فرما دیا گیا تھا کہ یہ درخت مت کھانا کہیں حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ تو اس نے تاویل سمجھائی، یہ کہا کہ یہ حکم موبد نہیں تھا کہ ہمیشہ

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

ہمیشہ کے لئے ہو۔ یہ حکم محدود وقت کے لئے تھا۔ اس لئے حکم دیا گیا تھا کہ اس درخت کو کھانے کی آپ میں صلاحیت نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے اس درخت کے کھانے کی استعداد پیدا ہوگئی ہے اور جب آپ کھا لیں گے تو ابدالآ باد تک جنت میں رہیں گے۔

تو جنت مقام کریم وسکون ہے۔ اس میں رہنے کی تمنا آدم علیہ السلام کی فطرت کا جذبہ تھا اور قسم کھا کے اس نے خیر خواہی جتلائی اور تاویل سمجھائی کہ یہ ممانعت وقتی تھی، دوامی نہیں تھی۔ ان چیزوں سے گھبرا کر درخت کھالیا تھا۔ اسے نافرمانی نہیں کہتے۔ صورۃً تو نافرمانی ہے مگر حقیقتاً نافرمانی نہیں۔ اسے لغزش، خطاء فکری یا خطاء اجتہادی کہیں گے۔ عصیان اور نافرمانی نہیں کہیں گے۔

اور حق تعالیٰ نے بھی تعبیر فرمادیا کہ ﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ ① "آدم نے نافرمانی کی"۔ حقیقت میں آدم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر بھی ہیں۔ مگر ہیں تو اللہ کی بارگاہ کے بندے ہی، اور مقرب بندے۔ مقربین سے اگر ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو ان پر شدت تعلق کی بنا پر زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی دشمن آپ کو گالی دے آپ برا نہیں مانیں گے کہ دشمن کا کام ہی یہ ہے لیکن اگر آپ کا بیٹا ذرا ترچھی نگاہ سے بھی دیکھ لے، ڈھول مارنے کو تیار ہو جائیں گے کہ تو اپنا ہو کر یہ کام کرتا ہے تو شدت تعلق کی بنا پر تھوڑی سے بات بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام مقربان بارگاہ حق میں سے ہیں، پیغمبر ہیں۔ انہوں نے لغزش کر کے درخت کھالیا تو سختی سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم نافرمانی کر رہے ہو۔ یعنی اتنے مقرب ہو کر کیوں تم سے لغزش سرزد ہوئی؟ تمہارے حق میں یہ لغزش بھی عصیان کا نام پائے گی۔ مگر حقیقۃً وہ عصیان نہیں تھا۔ خطاء فکری اور خطاء اجتہادی تھی۔

تو ایک طرف ابلیس سے خطا سرزد ہوئی۔ فرمایا گیا تھا کہ تو آدم کو سجدہ کر، اس نے نہیں کیا اور آدم علیہ السلام سے بھی خطا سرزد ہوئی۔ مگر فرق کیا تھا؟ آدم علیہ السلام نے خطا کے بعد کہا کہ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ ② اے اللہ! میں نے کیا جب میں مجرم، نہیں کیا جب میں مجرم، جب تک آپ نہیں بخشیں گے میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔

﴿وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ③ "اگر آپ میری مغفرت نہیں کریں گے تو میں ٹوٹے اور گھاٹے والوں میں سے ہو جاؤں گا"۔ میرے پنپنے کی کوئی صورت نہیں بہرحال ہر حالت میں خطا کار ہوں تو اعتراف خطا کیا تو خلافت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا ابدالآ باد کے لئے مقبول بنائے گئے ان کی اولاد میں لاکھوں کروڑوں بندگان الٰہی مقبول بنے اور ان سے جنت آباد ہوگی۔

شیطان نے گناہ کر کے یہ نہیں کیا کہ یہ کہا ہو مجھ سے غلطی ہوئی بلکہ اللہ کے حکم میں اور نکتہ چینی کی کہ آپ کہتے ہیں کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ مجھے آگ سے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا۔ جھکنا خاک کا کام ہوتا ہے آگ کا کام نہیں۔ میں کیسے آدم کے سامنے جھک جاؤں؟ گویا پورا مقابلہ ٹھانا تو ابدالآ باد کے لئے ملعون بنا دیا گیا۔

① پارہ:۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۱. ② پارہ:۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳. ③ پارہ:۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳.

تو آدم علیہ السلام نے غلطی کا اعتراف کیا، تواضع وانکساری سے پیش آئے تو خلافت مل گئی۔ شیطان کبر وریاء سے پیش آیا ابدالآباد کے لئے ملعون بن گیا۔

اس نے کہا تھا ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ﴾ ① میں بہتر ہوں۔ آدم بہتر نہیں ہے انانیت وہاں سے چلی۔ جو انانیت برتتا ہے وہ گویا اپنا نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ رہا ہے اور جو کہتا ہے کہ میں ہیچ اور خاکسار ہوں، وہ آدم کا بیٹا ہے کیونکہ انکسار کرنا اور تواضع للہ کرنا آدم علیہ السلام ہی کا کام تھا۔

حدیث میں فرمایا گیا: "انتم بنوا آدم وآدم من تراب." ② "تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں" تو مٹی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اچھل اچھل کر اوپر جائے۔ وہ جتنی پامال ہوگی اتنی ہی کارآمد ہوگی۔ اگر وہ اڑ کر کپڑوں پر پڑی، آپ لعنت برسائیں گے، کپڑے جھٹک دیں گے اگر آنکھوں میں پڑی تو برا بھلا کہیں گے اور آنکھوں کو دھوئیں گے۔ جوتوں کے نیچے رہے گی تو باعزت رہے گی اوپر چڑھے گی تو بے عزت بن جائے گی۔

انسان بھی ایسا ہے کہ جتنا متواضع ہو کر مٹی بن جائے سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور اگر وہ سروں پر چڑھنے لگے تو اسے پٹخ کر پامال کر دیتے ہیں' پیروں کے نیچے آجاتا ہے تو متکبر بننا درحقیقت نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ دینا ہے۔ متواضع بننا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت کرنا ہے۔ جتنا آدم کے ہم بیٹے بنیں گے۔ اتنا ہی عزت پائیں گے۔ جتنا اپنے کو کبر وانانیت سے نسبت دیں گے اتنا ہی پامال کئے جائیں گے۔

مخلوق خدا کی خدمت وہ کر سکتا ہے جس میں انانیت نہ ہو۔ جو یوں کہے کہ ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ﴾ ③ اسے کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کو ایذا رسانی سے بچانے کے لئے مٹی، ڈھیلے، کانچ، کانٹے اٹھا کے پھینک دے۔ وہ کہے گا میں سب سے بہتر ہوں (سب کو چاہیے میری خدمت کریں، میں کسی کی خدمت کیوں کروں، اس لئے) میں کیوں کانٹوں کو اٹھاؤں۔ لیکن متواضع آدمی کہے گا کہ میں تو خدمت خلق کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں خدمت کروں۔

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دو رکن ہیں ایک "اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اللہ کے اوامر کی عظمت اور وہ پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کی بزرگی وعظمت سے دل لبریز نہ ہو جائے۔ دوسرا "اَلشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰهِ" مخلوق خدا پر شفقت کرنا، ترس کھانا اور اس کی خدمت کرنا یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تواضع للہ کا جذبہ نہ ہو۔ جب تک اپنی ہیچ دانی اپنے اندر نہ ہو، انانیت نہ ہو۔ جب یہ دو باتیں جمع ہو جائیں گی۔ کہا جائے گا کہ اس کے اندر ایمان ہے اور ایمان بھی کمال درجے کا ہے۔ کہ اِدھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق میں شامل اِدھر اللہ سے ملا ہوا

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۶. ② السنن للامام الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الحجرات، ج: ۵، ص: ۳۸۹ رقم: ۳۲۷۰. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۷ ص: ۱۱۵ رقم: ۲۶۶۸. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۶.

ہے اُدھر مخلوق میں ملا ہوا ہے۔ اللہ تک پہنچنے سے اس میں یہ کبر نہیں آتا کہ میں تو مقبولانِ الٰہی میں سے ہوں۔ یہ مخلوق میرے رتبے کی نہیں اسے پامال کر دے اور مخلوق میں آ کر یہ بات نہیں کہتا کہ میں رات دن چین اڑا رہا ہوں مجھے اللہ کی بندگی سے کیا واسطہ؟ بندگی میں بھی کامل، خدمت میں بھی کامل ہو تو ایمان بھی اسی کا کامل ہوگا۔

حیاء دار آدمی ہی عبادت و خدمت کر سکتا ہے...... مگر یہ کون کر سکتا ہے؟ جس کے اندر اللہ سے حیا موجود ہو جو حیادار ہو۔ کوئی بے حیا و بے غیرت ہو جائے، وہ نہ عبادت کی طرف متوجہ ہوگا نہ خدمت کی طرف متوجہ ہوگا۔ تو عظیم چیز حیا ہے اور حیا کی حقیقت وہی انکسارِ نفس کہ نفس میں انکسار ہو، نفس ٹوٹ رہا ہو اور اپنے کو دوسرے کی عظمت کے سامنے ہیچ سمجھ رہا ہو۔

تو ایمان اس زمین پر آتا ہے جس زمین میں حیاء موجود ہو، اس قلب میں گھر کرتا ہے جس قلب کے اندر حیاء موجود ہو۔ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً'' ① ''ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں اور شعبے ہیں'' اوپر کی شاخ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ دل میں اللہ کی اتنی عظمت بیٹھ چکی ہے کہ اس کے سوا کسی کو معبود بنانے کو تیار نہیں ہے اور ایمان کا ادنیٰ درجہ ''اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ.'' ہے یعنی راستے سے ایذا دہ چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا تاکہ مخلوق کو تکلیف نہ پہنچے تو ایک ایمان کا اوپر کا سرا بتلایا گیا جو اللہ سے ملا ہوا ہے اور ایک نیچے کا سرا بتلایا گیا جو مخلوق سے ملا ہوا ہے۔ اور دونوں کا منشاء بتلا دیا۔ ''وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ'' ② یہ دونوں شعبے وہ برتے گا' جس میں حیاء اور انکسارِ نفس موجود ہو اور جس میں حیاء نہیں تو ''اِذَا فَاتَکَ الْحَیَاءُ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ'' ③ ''جب آدمی سے حیاء جاتی رہتی ہے تو پھر جو چاہے کرے''۔ پھر قلب کے اندر زندگی باقی نہیں رہتی۔ بس جو کرتا ہے کرتا رہتا ہے۔

تو اس حدیث میں مومن کامل بننے کی ہدایت دی گئی اور اس کے لئے ایک طرف عباداتِ خداوندی ہے اس کا اعلیٰ قول ہے کہ زبان سے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے اور جب زبان سے پڑھنے کا عادی ہوگا تو یقیناً قلب میں بھی توحید جمے گی اور جب قلب میں جم جائے گی تو ہر فعل سے توحید سرزد ہوگی۔ مترشح ہوگی اور نکلے گی۔ ہر فعل میں توحید رچ جائے گی۔ پھر ہر موقعہ پر ذکر اس کے اندر ہوگا۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے وہ ذاکر بن جائے گا۔

دوسری چیز فرمائی خدمتِ خلق اللہ ہے۔ اس کا بھی تعلق حیاء سے ہوگا۔ جتنا حیاء دار ہوگا اتنا مخلوق سے شفقت سے پیش آئے گا اور اس کی خدمت کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ حدیث میں نے اس وقت تلاوت کی تھی اور اس کے

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵۔

③ الحدیث اخرجه البخاری فی صحیحه ولفظه: اذالم تستحی فاصنع ماشئت، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار ج: ۱۱ ص: ۳۰۳۔

متعلق یہ چند جملے عرض کئے جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ میں زیادہ نہیں بول سکوں گا اور اب بھی کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ مگر بہر حال اتنے پر قناعت ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں آپ سب کو کمال ایمان کی اور حیا کی توفیق دے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

تعلیم وتبلیغ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ: بزرگان محترم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دوحصوں میں تقسیم ہے۔مکی زندگی اور مدنی زندگی،مکی زندگی تیرہ برس کی ہےاورمدنی زندگی دس برس کی ہے۔

مکی زندگی......مکی زندگی تکالیف ومشکلات، پریشانیوں اور کلفتوں کی ایک طویل صبرآ زما زندگی ہے،خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔"کسی نبی کو اپنی قوم سے وہ ایذائیں اور تکلیفیں نہیں پہنچیں جو مجھ کو میری قوم سے پہنچی ہیں"۔لیکن ان تمام تکالیف کے بعد بھی آپ دین کی تبلیغ واشاعت کا کام انتہائی انہماک اور لگن سے کرتے رہے مشرکین کے ایمان نہ لانے سے آپکے دل میں جو ضیق وتنگی پیدا ہوئی تھی اس پر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: آپ اپنے دل کو ان پر نہ کڑائیے بلکہ اپنے کام میں لگے رہئے۔آپ خدا کے حکم پر عمل کرتے رہےاوراس کی حمدوتعریف اور اس کے بھیجے ہوئے مذہب کی تبلیغ میں لگے رہے،آپ ؐ کو مجنون، کاہن، جادوگر اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا،آپ ؐ پر پتھر پھینکے گئے،آپ کو زہر دیا گیا،کوئی نازیبا حرکت نہ تھی جو آپ کے ساتھ نہ کی گئی ہو،لیکن ان سب کے باوجود آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ انتہائی صبر وثبات کے ساتھ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سعی وکوشس کرتے رہے،خدا کی طرف سے بھی آپ کو یہی حکم ملا کہ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ﴾ ① ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ ② "آپ صبر کیجئے جیسا کہ آپ سے قبل دوسرے اولوالعزم وصاحب ہمت لوگوں نے صبر کیا" صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے اوراگر اس پر بھی یہ جاہل اعتراض کریں تو آپ ان پر اپنے دل کو نہ کڑائیے ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ③ "آپ ان پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجے گئے"۔

جہادِ کبیر......یہ بات اسلام کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ پٹتے رہنے اور مصائب وتکالیف برداشت کرنے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا، بات یہ نہیں بلکہ خدا کا یہ حکم تھا کہ ہر قسم کی تکالیف ومصائب کو برداشت کرو اور زبان سے

① پارہ: ۲۶،سورۃ الاحقاف،الآیۃ: ۳۵. ② پارہ: ۲۹،سورۃ المعارج،الآیۃ: ۵. ③ پارہ: ۳۰،سورۃ الغاشیۃ: ۲۲.

اُف بھی نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جواب نہ دیا جائے، جواب دیا جائے اور اس سے بھی سخت دیا جائے اگر تلوار سے جسم پر حملہ کیا جائے تو اس کا جواب زبان سے روح پر حملہ کر کے دیا جائے۔ اگر تکلیف پہنچائی جائے تو دین کی بات انہیں پہنچا کر تکلیف پہنچائی جائے، عربی شاعر نے کیا خوب کہا۔

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ　　وَلَا يَلْتَامُ مَاجَرَحَ اللِّسَانُ

''یعنی نیزوں کے لگے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے لگے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں''۔ انکا اندمال نہیں، یہ زبان کا جہاد بڑا جہاد ہے۔ اسے جہاد کبیر کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ جہاد جو تلوار لے کر کیا جاتا ہے اس میں منٹوں کا قصہ ہوتا ہے اور تکلیف بھی تھوڑی دیر کی، لیکن دین کی دعوت کا جو جہاد زبان سے کیا جاتا ہے وہ اذیت و تکلیف کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے اس میں تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانا اور ہر لحہ قتل ہونا ہے۔ ایک مرتبہ حصور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا بہادر کون ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ جو حملہ کر کے قتل کر دے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں جو اپنے نفس کو قتل کر دے، یہ دعوت کا کام جہاد کبیر ہے، اس میں انسان طعنے سنتا، گالیاں کھاتا، تکلیفیں اٹھاتا، مصیبتیں جھیلتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے اور میدان کارزار میں آدمی جا کر جنگ کرتا ہے پھر یا تو قتل کرتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے۔

انقلابِ عظیم...... اسلام نے اپنے متبعین کو صبر و تحمل کی تعلیم دے کر جبن و بزدلی کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ بہادری اور اولوالعزمی کی طرف بلایا ہے اور اپنے مشن کیلئے ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے اور بتلا دیا ہے کہ کامیابی و کامرانی شدائد و مصائب پر اسی طرح صبر و تحمل کرنے سے ملتی ہے، مکہ کی زندگی کو دیکھئے، تیرہ آدمی مسلمان ہوئے یہ سب حضرت ارقم کے گھر میں بند رہتے زنجیریں چڑھائے رکھتے، عدد کے اعتبار سے بھی کم، شوکت و سطوت بھی ندارد، لیکن دین کی تبلیغ میں لگے رہے، حق کی طرف بلاتے رہے، تکلیفیں اور مصائب جھیلتے رہے اور اپنی زبان سے کفار کے قلب و جگر پر نشتر زنی کرتے رہے، بالآخران کی پیہم سعی اور مسلسل کوشش سے ایک عظیم انقلاب آیا، اقلیت اکثریت میں بدل گئی۔ ذلت و خواری کی جگہ عظمت و رفعت نے لے لی، یہ تبدیلی تلوار کے جہاد سے رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ زبان کے اس جہاد سے ہوئی تھی جسے جہاد عظیم کہا گیا ہے اور کیسے ہوئی؟ اس طرح ہوئی کہ وہ لوگ مصائب کو جھیل گئے مگر حوصلہ نہیں چھوڑا۔

آج کی ہماری زندگی مشابہ ہے مکہ کی زندگی سے بالکل وہ حال تو نہیں جو وہاں تھا، یہاں ہماری جائدادیں ہیں، ہمیں قانونی حقوق حاصل ہیں۔ ہم جو پیشہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اسلام کی شوکت اور اسلام کا حکم نہیں ہے، تمدن تہذیب کی ہر بات تسلیم کر لی جاتی ہے لیکن وہی بات خدا کے نام پر نہیں مانی جاتی خدا کا نام لے کر کچھ نہیں منوایا جا سکتا۔ تمدن و تہذیب کے نام پر ہر بات منوائی جا سکتی ہے ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ

﴿الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ ① ''سارا غصہ، سارا شکوہ صرف اس وجہ سے ہے کہ خدا کا نام لیا جاتا ہے'' یہاں مادہ پرستی ہے، وطن پرستی ہے، لیکن خدا پرستی نہیں ہے اس زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ آج ہم اور آپ تلوار سے طاقت پیدا نہیں کر سکتے بلکہ صرف خدا کی طرف دعوت دے کر طاقت وقوت پیدا کر سکتے ہیں۔ آج ہماری کامیابی وکامرانی و فلاح اس دعوتی کام میں مضمر ہے، دعوت وتبلیغ کا یہ کام ہماری زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب لاسکتا ہے اور ہم میں وہ قوت پیدا کر سکتا ہے کہ جو ہم سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔

ہماری نجات کا ذریعہ..... حق بات کو دوسروں تک پہنچانا اور دین کی تبلیغ واشاعت کا کام انتہائی امانت اور دیانت سے کرنا خدا کا حکم ہے اور خدا کا کام کرنے والا خدا کی نگرانی میں ہے۔ اگر دل میں یہ تصور جاگ اٹھے کہ خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس بات کا ڈر اور کس کا خوف؟ گورنمنٹ کا ایک ادنیٰ ملازم جب سرکاری کام پر ہوتا ہے تو وہ کتنا جری ہوتا ہے اس کی تمام جرات صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ سرکاری ملازم ہے، اگر اس پر کوئی حملہ کرے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے سرکار پر حملہ کیا۔ یہی تصور دین کا کام کرتے وقت ہمارے دل میں ہونا چاہئے۔ ہم اس ملک میں اور ان حالات میں اگر اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں تو صرف مذہب کے نام سے، اس کے علاوہ ہماری نجات کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ② قسم ہے زمانے کی زمانہ چلا آ رہا ہے اور چلا جائے گا، زمانہ مکانیات پر چھا گیا ہے، مکان اپنی جگہ قائم ہے اور زمانہ پیہم گردش میں ہے سب سے زیادہ وسیع محرف زمانہ ہے، ازل سے قبل کا ہے اور انتہاء کا علم نہیں زمانہ کا پھیلاؤ بہت زیادہ، خدا تعالیٰ زمانہ کی قسم کھاتا ہے اور قسم گواہ کے قائم مقام ہے یعنی خدا تعالیٰ زمانہ کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ انسان ٹوٹے اور گھاٹے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے نیک اعمال کئے، ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے علاوہ تمام لوگ خسارہ ونقصان میں ہیں۔

قوتِ ایمان...... تاریخ دیکھی جائے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک فتح ان ہی قوتوں کو ہوئی جو ایمان والے تھے اور جن لوگوں نے ایمان والوں کی مخالفت کی، ان کو تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں وہ ذلیل وخوار ہوئے، فرعون، ہامان، شداد، ابوجہل، ابولہب اور ان جیسے تمام مال ودولت والے جنہوں نے اپنے اپنے وقتوں میں ایمان والوں کو ستایا، پریشان کیا اور ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی لیکن انجام کار خود ہی ذلت وخواری سے دوچار ہوئے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب...... اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو ایمان والا بننا پڑے گا قرآن پاک نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ ③ ''یعنی انسان کو اس کی سعی وکوشش ہی کام دے گی'' کسی دوسرے کی سعی کام نہ آئے گی۔ لیکن اس کے برخلاف حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ثواب دوسروں کو

① پارہ: ۳۰، سورۃ البروج، الآیۃ: ۸۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العصر۔ ③ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔

پہنچایا جائے تو ثواب دوسروں کو پہنچ جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کی سعی دوسرے کے کام آتی ہے۔اس طرح حدیث وقرآن میں تعارض واقع ہوتا ہے۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب جوایک خدا ترس عالم تھے۔انہوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ: میں نے جلالین میں قرآن کی یہ آیت پڑھی اور حدیث کی ایک کتاب میں ایصال ثواب کی یہ حدیث دیکھی،دونوں میں تعارض نظر آیا۔بہت سوچا،کتابیں دیکھی لیکن کسی طرح اس کا حل سمجھ نہ آسکا۔رات کو سونے کے لئے گھر گیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔لیکن معاً یہ خیال آیا کہ اگر رات کو موت آگئی تو دوصورتوں میں سے ایک یقینی ہے یا تو حدیث کا انکار لازم آتا ہے یا پھر قرآن کا اوران دوصورتوں میں ایمان کی سلامتی نہیں،یہ خیال آتے ہی بستر چھوڑ دیا اور پیدل گنگوہ کا سفر کیا،۲۲ کوس کا سفر رات بھر میں کر کے صبح تڑکے گنگوہ پہنچا،مولانا گنگوہیؒ جو کہ ضعیف ہو چکے تھے بینائی جا چکی تھی اس وقت وضوفر مارہے تھے،فرمایا کہ کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا کہ اس آیت اور حدیث میں تعارض واقع ہوگیا ہے اوراس کا حل سمجھ میں نہیں آرہاہے، اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا قرآن کی اس آیت ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی﴾ ① سے نفس ایمان مراد ہے یعنی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لائے تو کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہیں آئے گا اور حدیث سے مراد عمل ہے،ایمان کسی کو نہیں بخشا جاسکتا،عمل بخشا جاسکتا ہے۔

عام تبلیغ ہر شخص پر ضروری ہے......اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ: انسان خسارہ میں ہے مگر صرف اہل ایمان اور وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں،جوایک دوسرے کو حق وصبر کی وصیت کریں اور دوسروں کو صالح ونیکوکار بنانے کی کوشش کریں،دین کی تبلیغ واشاعت کا کام اس لئے شروع کیا گیا،کیونکہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ کام صرف علماء سے متعلق ہے، وہ مسائل جن میں اختلاف ہوانہیں نہ بیان کیا جائے بلکہ علماء اس کو بوقت ضرورت بیان کریں اور عام تبلیغ ہر شخص پر لازمی ہے امت محمدیہ کے ہر فرد سے اس ذمہ داری کو لازم ٹھہرایا گیا ہے ارشاد ہے﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② اس آیت میں اس امت کو مخاطب بنایا گیا ہے اور ’’لِلنَّاسِ‘‘ کہا گیا ہے ’’لِلْمُسْلِمِیْنَ‘‘ نہیں کہا گیا۔

تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ......ہندوستان میں اس وقت دعوت وتبلیغ کے کام کو چند سال قبل حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے شروع کیا۔خدا تعالیٰ نے ان کے قلب مبارک پر اس کا القاء کیا انہوں نے تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ اختیار کیا۔کیونکہ دستور ہے کہ جب کچھ لوگ مل کر ایک بات کہتے ہیں یا کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا اثر خاص طور پر پڑتا ہے،ایک ہی بات کو جب مختلف لوگ مختلف وقتوں میں کہتے ہیں تو اس کا اثر کبھی نہ کبھی تو ہوتا ہے حق تعالیٰ نے سورۂ یاسین میں ارشاد فرمایا ہے﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ

① پارہ:۲۷،سورۃ النجم،الآیۃ:۳۹. ② پارہ:۴،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۱۱۰.

فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَیْکُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿ ① ''جب ہم نے انکے پاس دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے تیسرا رسول بھیج کران کو سرفراز کیا، انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں''۔

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے دعوت کے کام میں جماعتی طریقہ اپنایا، کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ آج کا دور اجتماعی دور ہے، کھیل کود، صنعت وتجارت وزراعت غرض ہر چیز میں اجتماعیت پائی جاتی ہے، ہر مسئلہ میں وفود جاتے ہیں میٹنگیں ہوتی ہیں ہر جگہ جماعتی رنگ دکھلائی دیتا ہے، اس جماعتی ماحول میں انفرادی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا، یہی کچھ سوچ سمجھ کر مولانا مرحومؒ نے اس جماعتی کام کو جماعتی ڈھنگ سے شروع کیا، جب جماعت بنا کر کچھ لوگ کسی آدمی کے پاس جاتے ہیں اور اس حال میں کہ کاندھوں پر بستر لدے ہوئے پیدل چل کر آرہے ہیں، محنت ومشقت کے آثار چہرے سے ظاہر ہیں، لامحالہ وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ انہیں مجھ سے کوئی غرض ومطلب نہیں، پھر کیا چیز ہے جو انہیں اس تکلیف کو برداشت کرنے پر آمادہ کر رہی ہے، ضرور جو یہ لوگ کہتے ہیں وہ صحیح ہوگا یہ چیز اسے بہت متاثر کرتی ہے۔

تبلیغی جماعت اور انقلابِ عظیم...... میں نے شاید کہیں لکھا ہے کہ تبلیغ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر بطور فن کے القاء کیا، اس میں تعلیم وتربیت، سیر وسیاحت، روح کی دلچسپی، بدن کی ورزش ہر ایک چیز موجود ہے، آج کے دور میں یہ کام بڑا ہی مفید اور لازمی ہے، اسی وجہ سے یہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس تبلیغ سے ایک عظیم انقلاب آرہا ہے، ہندوستان کے ہر خطے میں اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی میں گیا وہاں میں نے تبلیغی جماعتیں اور تبلیغی مراکز دیکھے۔ رسمی انداز میں اس عالمگیر طریقہ پر کام نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نہ فتنہ وفساد ہے اور نہ واویلا اور شور، آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ ان جماعتی لوگوں نے کہیں غدر کیا، کہیں فساد برپا کیا۔ یہ ایک خاموش تبلیغ ہے، جو عالمگیر طریقہ سے ساری دنیا میں پھیلتی جارہی ہے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی آرہی ہے۔

تبلیغ میں باہر نکلنے کا فائدہ...... تبلیغ کے کام میں آدمی کو اسکے گھر سے نکالا جاتا ہے، وہ گھر کے ماحول سے نکل کر خدا کے گھر میں پہنچتا ہے، وہاں اسے دوسرا ماحول ملتا ہے، گھر کے ماحول میں اور اس ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے، یہاں اسے داعی اور عامل دونوں بننا پڑتا ہے، وہ داعی بن کر آتا ہے اور عامل بن کر جاتا ہے۔

مقصدِ تبلیغ...... حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: ہم نے علم حاصل کیا تھا غیر اللہ کے لئے مگر جب علم آگیا تو اس نے کہا کہ میں تو خدا کے لئے ہوں۔ اس تبلیغی کام کا ایک نظام ہے اور اوقات نکالنے کا ایک اصول ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ قلب کی صفائی ہو وہ تمام دنیوی آلودگیوں سے پاک ہو، تزکیۂ نفس ہو، انشراحِ قلبی اور روحانی قوتوں کو جلا ہو، شیطانی قوتیں دبیں اور مغلوب ہوجائیں۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یس، الآیۃ: ۱۴.

بے لوث خدمت......آج کے دور میں بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن یہ تحریک اپنی مثال آپ ہے۔اس میں نہ عہدے ہیں نہ منصب ہیں نہ کرسیاں اور نہ سیٹیں ہیں، بلکہ اپنے ہی مال کا خرچ ہے، اپنی جیب پر بار ہے، یہ تحریک موجودہ دور میں دین کے تحفظ کے لئے ایک بڑی پناہ گاہ ہے، کسی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے ''توہمات'' اور ''تنازع للبقاء'' پر لیکن یہاں اس کے برعکس ہے یہاں تنازع للبقاء کی جگہ فنا للبقاء ہے اور توہمات کی جگہ محبت و الفت ہے، ریاست کے لئے پارٹیاں بنائی جاتی ہیں اور یہاں خود بخود پارٹیاں بن جاتی ہیں۔

دو پناہ گاہیں......آج جس دور میں ہم گزر رہے ہیں اس دور میں مسلمانوں کے لئے صرف دو پناہ گاہیں ہیں ایک دینی مدرسے اور دوسرے یہ تبلیغی کام تعلیم والے باہر سے لوگوں کو لاکر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم دیتے ہیں اور یہ تبلیغی کام والے جمع شدہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

دعوۃِ شرکت......تبلیغی کام ایک ٹھوس اور بنیادی کام ہے، اس پر قوموں کے عروج وزوال کی بنیاد ہے جو لوگ اس تبلیغی کام میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے وقتوں کو لگاتے ہیں وہ مزید اس کام میں لگیں، اگر پہلے کم وقت لگاتے تھے تو اب اور زیادہ وقت لگائیں اور اس کام کو محنت اور جانفشانی سے کریں جو کہیں اس پر خود عامل ہوں اور عمل کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ سب سے بڑی دلیل عمل ہے اور عمل کے بڑے اثرات پڑتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ: دنیا میں ہر شخص اپنی بات کو خوشنما کر کے پیش کرتا ہے لیکن اگر اس کا یہ قول عمل کے مطابق ہے تو ٹھیک ورنہ اس کے لئے ہلاکت وتباہی ہے اسی طرح ہر کام کے کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ حدیں ہوتی ہیں، کام کو اس طرح کریں کہ دوسرے کے حقوق پامال نہ ہوں ''اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا'' ① انسان پر اس کے نفس کا، اس کی جان کا، اس کی بیوی کا، آنکھوں کا، ہر ایک کا حق ہے اگر ایک انسان ایک حق ادا کرے اور اس حق کے ادا کرنے میں دوسرے بہت سے حقوق پامال ہوں تو یہ خیر کی بات نہیں۔خیر کی بات تو یہ ہے کہ حق بھی ادا ہو جائے اور دوسرے حقوق کی پامالی بھی نہ ہو، کھاؤ بھی کہ یہ نفس کا حق ہے اور روزہ بھی رکھو کہ خدا کا حق بھی ادا ہو جائے۔

دعوتی کام کا نفع......آج دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے راہ نجات اور فلاح وکامرانی کی راہ یہی دعوتی کام ہے۔اس کام نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے یہی کام کرنے والے پنپے ہیں۔اور یہی کام کرنے والے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ②

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخیه لیفطر... ج:۷ ص:۷۶.

② نشان منزل، بھوپال۔مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۷ء

تبلیغی جماعت اور اصلاح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّـا بَعْــدُ!①

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس وقت تبلیغی سلسلے کے چند مقاصد آپ حضرات سے گزارش کرنے ہیں، وہ مقاصد اور باتیں کوئی نئی نہیں ہوں گی، ہاں عنوان کا فرق ہوگا' میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد سے پہلے بطور تمہید ایک اصول عرض کردوں۔ اصول سمجھ میں آجانے کے بعد مقاصد خود بخود سمجھ میں آجائیں گے۔

اصول یہ ہے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اضداد بنایا ہے، ہر اصل کے مقابلے میں اس کی ایک ضد رکھی ہے اور ہر اصل کا تصادم اپنی ضد سے برابر ہوتا رہتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں کفر ہے، توحید کے مقابلے میں شرک ہے، اخلاص کے مقابلے میں نفاق ہے، سچ کے مقابلہ میں جھوٹ ہے، ظلمت کے مقابلے میں نور ہے، دن کے مقابلے میں رات ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر خیر وشر، بھلائی اور برائی بھی ملی جلی چل رہی ہیں۔ اس دنیا کو نہ صرف خیر کا عالم کہہ سکتے ہیں اور نہ صرف شر کا، خیر محض اور راحت محض یہ عالم جنت ہے۔ تکلیف محض اور برائی محض یہ جہنم کا عالم ہے۔ اس دنیا کو جنت وجہنم دونوں سے مرکب کر کے بنایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر وشر دونوں ہی کے آثار موجود ہیں۔

ایک غور طلب حقیقت...... غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شر وبرائی اس عالم میں اصلی ہے اور یہ خود بخود چیزوں کے اندر پیدا ہوجاتی ہے، مگر بھلائی محنت کر کے لانی پڑتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ آدمی محنت کرتا ہے بھلائی پیدا ہوجاتی ہے اور اگر محنت نہیں کرتا تو برائی خود بخود ابھر کر سامنے آجاتی ہے مثال کے طور پر کھانا ہے اس کو خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ باقی رکھنے کے لئے نعمت خانہ بنوانا پڑتا ہے اسے ہوادار کمرے میں رکھنا پڑتا ہے، تب کہیں کھانا اپنی خوبیوں کے ساتھ باقی رہتا ہے، لیکن اگر یہ محنت نہ کی جائے تو کھانا خود بخود سڑ جائے گا، خراب ہوجائے گا۔ اس کے اندر بدبو پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

① عالمی تبلیغی اجتماع سہارنپور، منعقدہ ۱۹۷۱ء بروز شنبہ بعد مغرب اسلامیہ انٹر کالج میں بیان ہوا۔

اسی طرح ایک باغ ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، چمن بندی ہوئی ہو، پھول کھلے ہوئے ہوں۔ اس کا منظر نگاہوں کو اچھا معلوم ہوتا ہو، دیکھنے سے آنکھوں میں تراوٹ پیدا ہوتی ہو، سونگھنے سے ناک میں خوشبو آتی ہو، مگر یہ ساری خوبیاں اس وقت پیدا ہوگی جب کہ آپ مالی رکھیں گے، مالی رکھیں گے اور وہ برابر باغ کی دیکھ بھال کرتے رہیں، درختوں کی جڑوں کو صاف کریں، اس کو پانی دیں، جہاں مناسب سمجھیں کتر بیونت کریں۔

لیکن اگر آپ باغ کو جھال جھنکال بنا چاہیں سو اس کے لئے آپ کو نہ تو کسی مالی رکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی ہالی وموالی رکھنے کی ضرورت۔ بس بنانے کی محنت چھوڑ دیجئے تو خود بخود ہی چند دنوں میں باغ کی ساری سرسبزی وشادابی ختم ہو جائے گی۔

ایسے ہی مکان ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ صاف ہو، ستھرا ہو، خوش رنگ ہو، دیدہ زیب ہو، ڈیزائن اچھا ہو، ان سب کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑے گی، ماہر و تجربہ کار معمار لانے پڑیں گے، پھر مکان بن جانے کے بعد فراش رکھنا ہوگا جو برابر اس کو جھاڑتا پونچھتا رہے تب جا کر یہ خوبیاں برقرار رہیں گی، لیکن اگر آپ مکان کو ویران بنانا چاہیں، اسے اجاڑنا چاہیں تو کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کے صحیح رکھنے پر آپ جو محنت صرف کر رہے تھے اسے چھوڑ دیجئے چند دن کے بعد گرد آئے گی پھر پلاستر اکھڑے گا، پھر اینٹیں جھڑیں گی، پھر چھت گرے گی، پھر دیواریں آ پڑیں گی اور اس طرح مکان کھنڈر ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی اور شر کائنات کی ہر ہر چیز کی ذات کے اندر موجود ہے، انسان محنت کرتا ہے تو خیر آ جاتی ہے، نہیں کرتا تو شر خود بخود ابھر آتا ہے۔ یہ اس عالم کا ایک طرز ہے اور سنت اللہ اسی طرح جاری ہے چونکہ اس عالم کا ایک بڑا فرد انسان بھی ہے لہٰذا اس کے لئے بھی اس اصول اور اس قاعدہ سے جدا ہونا ممکن نہیں، چنانچہ بلاتکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ برائی ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتی ہے اور بھلائی لانی پڑتی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، آپ اس کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں تب جا کر وہ انسان بنتا ہے اور اگر آپ یہ محنت نہ کریں، تو اس کے اندر جو برائیاں ہیں ان کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، خوبیاں پیدا کرنے کے لئے عالم بنانے کے لئے سینکڑوں ادارے ہیں، مدرسے ہیں مگر کیا جاہل بنانے کے لئے بھی آپ نے کوئی مدرسہ دیکھا؟ جاہل تو انسان بنا بنایا پیدا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ”اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے اور پھر تمہارے اندر سننے کی طاقت رکھ دی تا کہ سن سن کر علم حاصل کرو، دیکھنے کی طاقت رکھ دی تا کہ دیکھ دیکھ کر علم حاصل کرو، تدبر و تفکر کی قوت رکھ دی تا کہ اس کے ذریعہ معلومات میں اضافہ کرو“۔

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان میں علم کی استعداد اور صلاحیت تو رکھتے ہیں، مگر کوئی ماں کے پیٹ سے علم وہنر لے کر نہیں آتا۔ یہ تو انسان کے علم کا حال ہے اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں موجود ہے ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢبِالسُّوْٓءِ﴾ ① ''میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا اس وجہ سے کہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے'' معلوم ہوا کہ نفس انسانی میں ذاتی طور پر شر موجود ہے اسلئے وہ انسان کے برے اعمال ہی کی طرف لے جائے گا۔ آپ اس کی تربیت کریں گے تو بن جائے گا اور بھلائی کی طرف آ جائے گا ورنہ برائی پیدا ہونے اور اس کی تربیت کے لئے کسی کالج اور مدرسہ کی ضرورت نہیں ہوگی، خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ ؎

قرنہا باید کہ تا یک سنگ خاراز آفتاب ——— لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

یعنی ایک پتھر کا بے قیمت ٹکڑا جب سالہا سال اور قرن ہا قرن دھوپ میں پڑا رہتا ہے، آفتاب کی تپش اور اس کی گرمی کو برداشت کرتا ہے تب جا کے ایک باقیمت لعل بنتا ہے ؎

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ بعد کشت ——— جامہ گردد شاہدے رایا شہیدے راکفن

ایک بنولے کا دانہ محبوب کے بدن کی زینت بنے اس کے لئے مہینوں کی مدت درکار ہوتی ہے' آدمی زمین پر محنت کرتا ہے اس میں ہل چلاتا ہے، اسے کھیتی کے قابل بناتا ہے پھر بیج کو زمین بوس کر دیتا ہے، اس کے بعد اس سے کونپل نکلتی ہے، درخت بنتا ہے، روئی بنتی ہے، اسے توڑ لیا جاتا ہے، پھر مل میں بھیجا جاتا ہے، اس کی دھنائی ہوتی ہے، صفائی ہوتی ہے، سوت بنتا ہے پھر کپڑا تیار ہوتا ہے اور پھر درزی اس کی قطع و برید کرتا ہے، ان تمام مراحل سے گزر کر پھر کسی محبوب کا جامہ بنتا ہے، ورنہ تو بنولے کی کوئی قیمت نہیں تھی، زیادہ سے زیادہ کسی بھینس کے منہ میں چلا جاتا۔ آگے کہا ہے کہ ؎

سالہا باید کہ تا یک کودکے از درس علم ——— عالمے گرد ونکو یا شاعر شیریں سخن

یعنی ایک نادان اور چھوٹا بچہ جب سالہا سال کسی مکتب اور مدرسے میں پڑھتا ہے، استاد کی مار اور سختیاں برداشت کرتا ہے اس کے بعد جا کر یا وہ عالم بنتا ہے یا شاعر۔

تو عالم بنانے اور خوش اخلاق بنانے کے لئے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی ہے، مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، معلمین و ملازمین رکھنے پڑتے ہیں، تب جا کے آدمی، آدمی بنتا ہے، لیکن جاہل و بداخلاق بنانے کے لئے نہ تو کہیں مدرسہ قائم کیا جاتا ہے اور نہ کوئی ادارہ۔ حاصل یہ کہ کسی چیز کو قیمتی بنانے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے، محنت کی ضرورت پڑتی ہے مگر بے قیمت بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انسان کی قدر و قیمت اوصاف سے ہے...... آپ جانتے ہیں کہ اللہ میں بالذات خوبیاں ہیں، کمالات

① پارہ: ۱۳، سورۂ یوسف، الآیۃ: ۵۳.

ہیں اور مخلوق میں ذاتی طور پر خوبی و کمال نام کی کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مسلمہ قاعدہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اوصاف سے ہوتی ہے، جس شئی کے اندر اوصاف زیادہ ہوں گے، اس کی اسی قدر توقیر ہوگی، عزت ہوگی اور اسی اعتبار سے اسے بلند مرتبہ اور مقام حاصل ہوگا، ایک شخص عالم ہے اس کی آپ عزت کرتے ہیں اس کے علم کی وجہ سے اور اگر وہی آپ کا استاد بھی ہو تو عزت کا ایک درجہ بڑھ جائے گا اور اگر اتفاق سے وہی آپ کا حاکم بھی ہو تو اس کی عزت کا ایک درجہ اور بڑھ جائے گا۔

حاصل یہ کہ انسان کے اندر جس قدر اوصاف بڑھتے جائیں گے، اس کی قدر و قیمت اور عزت و وقار میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ بالذات انسان میں کوئی کمال نہیں، کمال ایک عارضی شئی ہے، جو محنت کر کے لایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ بچے کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں اور اگر وہ تعلیم سے جی چراتا ہے تو لالچ دلاتے ہیں، اس لئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کسی ہنر اور کمال کا مالک بن جائے۔

بہرحال اتنا تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر قیمت اس کے اوصاف سے ہوتی ہے حضرات انبیاءؑ کی ذات بلاشبہ مقدس ہے اور ان میں بھی سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدس بابرکات تو حد درجہ متبرک و مقدس ہے، لیکن یہ سارے کا سارا تقدس نبوت و رسالت ہی کی وجہ سے ہے اور اسی منصب رسالت کی وجہ سے آپ واجب الاطاعت ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! اگر میں حکم شرعی بیان کروں تو اس کا ماننا لازمی اور ضروری ہے لیکن اگر ذاتی مشورہ دوں تو اس کا ماننا ضروری نہیں، یہ اور بات ہے کہ ہر مسلمان کے قلب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حد درجہ محبت ہے اس کی وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے کو بھی حکم سمجھے اور ماننے کے لئے تیار ہو جائے، مگر جہاں تک قانون کی بات تھی وہ آپ نے بیان فرمادی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے کر دیا، حضرت بریرہؓ نہایت ہی خوبصورت اور حضرت مغیثؓ بالکل معمولی شکل کے آدمی تھے، جس کی وجہ سے ان دونوں میں بنتی نہیں تھی، آئے دن لڑائی جھگڑے کا بازار گرم رہتا، حتی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کر دیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی جب آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا یا نہ رکھنا اس کے ہاتھ میں ہو جاتا ہے، حضرت بریرہؓ نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے فائدہ اٹھانا چاہئے چنانچہ انہوں نے نکاح کے فسخ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت مغیثؓ حضرت بریرہؓ پر سو جان سے عاشق تھے۔ جب انہیں بریرہ کے ارادے کی خبر ہوئی تو روایتوں میں آتا ہے کہ یہ مدینہ کی گلیوں میں بے چین و بیقرار پھر رہے تھے اسی بے چینی کی حالت میں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے بریرہؓ سے نکاح کرایا تھا اور اب آپ ہی اسے باقی رکھیئے، چنانچہ حضرت بریرہؓ کو بلایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ کی جانب سے سفارش فرمائی اور بریرہؓ کو طرح طرح سے سمجھایا اور کہا کہ نکاح باقی رکھو فسخ مت کرو، بریرہؓ بھی تھیں بڑی ہوشیار، انہوں نے فوراً پوچھا، یا

رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔ حضرت بریرہؓ کہتی ہیں۔ پھر تو میں نہیں قبول کرتی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا ① اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر اگر حضرات انبیاء بھی کوئی بات کہیں تو اس کا ماننا بھی ضروری نہیں ہے، یوں محبت وعقیدت کی لائن سے آپ جو کچھ بھی سمجھ لیں، تو جب حضرات انبیاءؑ کے یہ درجات ہیں تو پھر ہماری آپ کی کیا حیثیت ہے اور ہم اور آپ کس شمار میں آئیں گے؟

حقیقتِ آدمیت...... اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب انسان کے اندر اوصاف وکمال جمع ہو جائیں وہ علم وفضل کا مالک بن جائے تو اس کی توقیر ہوتی ہے، عزت ہوتی ہے بہر حال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ: اس دنیا میں برائی اصل ہے اس کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور بھلائی لائی جاتی ہے اس کے لئے محنت کرنی ہوتی ہے، مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے ورنہ نہ تعلیم گاہیں ہوتیں نہ خانقاہیں اور نہ اس طرح کے تبلیغی اجتماعات ہوتے، تعلیم کی حاجت ہونا یہ دلالت ہے کہ آدمی اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ نہیں بلکہ اس کو گھڑ گھڑ کر انسان بنایا جاتا ہے، آدمی پیدا ہوتا ہے مگر آدمیت بنائی جاتی ہے، آدمی کی صورت کا نام انسان نہیں بلکہ وہ تو سیرت اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ۔

گر بصورت آدمی انسان بودے ‏ ‏ احمد وبوجہل ہم یکساں بودے

اگر آدمی کی صورت ہی کا نام انسان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل میں کوئی فرق نہ ہوتا، صورت تو دونوں کی یکساں ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت دراصل آتی ہے سیرت سے، اخلاق سے، اگر صورت اچھی ہوئی لیکن باطن خراب ہے یا ظاہر درست ہے لیکن اندر ناقص اور نکما ہے تو اس سے کوئی بات پیدا نہ ہوگی، بلکہ یہ صورت حال عیب ہے ہنر نہیں اور اسی طرح باطن کے خراب رہتے ہوئے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد بالکل ایسی ہے جیسا کہ نجاست کے اوپر چاندی کا ورق لگا دیا جائے اس طرح نجاست کا پاک ہونا تو درکنار ورق بھی ناپاک اور ناقابل استعمال ہو جائیں گے، اسی طرح اگر کوئی بہترین لباس پہن لے مگر دل میں گندگی بھری ہو تو لباس کی وجہ سے وہ نہ تو واجب الاحترام ہوگا اور نہ اس کے کمال میں کسی طرح کا اضافہ ہوگا۔

ارسطو مشہور حکیم اور فلسفی گزرا ہے، رات دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں رہتا اور ان کا امتحان لیا کرتا تھا وہ اپنے کام میں اتنا مشغول رہتا کہ اسے نہ دن کی خبر ہوتی اور نہ رات کی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے دن کا تھکا ہارا راستہ پر سو گیا، اتفاق سے اسی دن بادشاہ کی سواری نکلی ہوئی تھی، آگے آگے نقیب وچوبدار ہٹو، بچو ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے آ رہے تھے مگر یہ نیند میں اس طرح مست کہ اسے کچھ بھی خبر نہیں پڑا سوتا رہا، ان بیچاروں کو کسی قسم کی فکر نہیں ہوا کرتی ہے، بادشاہ کی سواری کا گزر اس کے پاس سے ہوا اسے اس طرح سوتے دیکھ کر چلتے چلتے بادشاہ نے غصہ

① الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب شفاعة النبی ﷺ فی زوج بریرة، ج: ۵ ص: ۲۰۲۳ رقم: ۴۹۷۹۔

میں ایک ٹھوکر ماری اس پر اس نے کہا "بے ادب" بادشاہ نے کہا کہ گستاخ! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں ارسطو نے جواب دیتے ہوئے کہا: غالباً آپ جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ وہی ٹھوکر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ بادشاہ کو اس کے اس گستاخانہ کلام کو سن کر اور بھی غصہ آیا اس نے کہا بدتمیز! میرے پاس خزانہ ہے، فوجیں ہیں، قلعہ ہے، تخت و تاج ہے پھر بھی تو مجھ سے یہ گستاخانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے، ارسطو نے کہا کہ یہ ساری چیزیں تو باہر کی ہیں تیرے اندر میں کون سی چیز، کون سی خوبی اور کون سا کمال ہے، تو یقین رکھ کہ جس دن تیرے اوپر سے یہ قبا شاہی اتر جائے گی تو ذلیل ہو جائے گا، تیرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ آدمی کو فخر اپنے اندر کی چیز پر کرنا چاہئے جب تیرے اندر کوئی کمال نہیں ہے تو تو کپڑوں اور تخت و تاج سے با کمال نہیں بن جائے گا۔ یہ قبا شاہی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ۔ پھر ہم دونوں دریا میں کودیں جب معلوم ہوگا کہ تم کون ہو اور میں کون ہوں تیرے اندر کیا کمال ہے۔ اور میرے اندر کیا کمال ہے۔

حاصل یہ کہ آدمی صورت انسانی کا نام نہیں اور نہ اس کی وجہ سے آدمی با عزت اور با کمال بنتا ہے اسی طرح لباس، وہ انسان کے باہر کی چیز ہے اور دولت تو اس سے بھی باہر ہوتی ہے لہٰذا ان چیزوں کی وجہ سے با کمال ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، سرچشمۂ کمال تو خدا ہی کی ذات ہے اور ہمارے اندر جو کمال آئے گا وہ وہیں سے آئے گا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا قرب ہو بارگاہ خداوندی سے اور ظاہر ہے کہ قرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی، پھر جس قدر جدوجہد بڑھے گی قرب بڑھے گا اور جس قدر قرب بڑھتا جائے گا کمال آتا چلا جائے گا اور جتنا بعد ہوگا کمال کے اندر کمی پیدا ہوتی جائے گی۔

کمالاتِ انسانی...... انسان کے دو کمال ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کا علمی کمال اور دوسرا عملی کمال، علمی کمال پیدا کرنے کے لئے مکاتب ہیں، مدارس ہیں، یونیورسٹیاں ہیں اور عملی کمال پیدا کرنے کے بھی مختلف طریقے ہیں اور مختلف ذرائع ہیں، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں عملی کمال پیدا کرنے کے چار طریقے لکھے ہیں۔

صحبتِ اہل اللہ...... اول یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہا جائے، ان حضرات کی جتنی ہی زیادہ صحبت نصیب ہوگی، اتنا ہی ان کا رنگ قلب کے اندر اترتا چلا جائے گا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، صحبت نیک سے آدمی کے اندر خیر پیدا ہوتی ہے، خوبی پیدا ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَالسُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَ نَافِخِ الْكِيْرِ. فَحَامِلُ الْمِسْكِ: اِمَّا اَنْ يُّحْذِيَكَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبًا. وَنَافِخُ الْكِيْرِ: اِمَّا اَنْ يُّحْرِقَ ثِيَابَكَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا خَبِيْثَةً." ① "اچھے ساتھی اور برے رفیق کی مثال، مشک ساتھ رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے پس مشک والا اگر تمہارے پاس سے بھی گزر گیا تو جب بھی نفع تم اس سے خرید لو گے تو بھی نفع، ہر حالت میں دماغ معطر

① الصحيح للبخاري، كتاب البيوع، باب في العطار وبيع المسك، ج: ٢ ص: ٧/١٤ رقم: ١٩٩٥.

رہے گا۔اور بھٹی والے سے تعلق میں کپڑا جلے گا ورنہ اس کی بدبو بلاشبہ دماغ کو مکدر رکھے گی''۔

تو بھائی! ہر چیز کے اثرات ہوا کرتے ہیں، اگر آپ دریا کے کنارے آباد ہوں گے تو آپ کے مزاج میں بھی رطوبت پیدا ہوگی خشک علاقے میں رہیں گے تو یبوست پیدا ہوگی، گلاب کے پھول کو کپڑے میں رکھ دیجئے تھوڑ دیر کے بعد نکالیں گے تو کپڑے سے بھی گلاب کی خوشبو آئے گی، ریشمی کپڑوں میں عورتیں برسات کے موسم میں گولیاں رکھ دیتی ہیں، اگلے موسم میں جب نکالتی ہیں تو کپڑوں سے گولیوں کی بدبو آتی ہے، حالانکہ کپڑے کی ذات میں نہ تو خوشبو ہے، نہ بدبو، مگر مصاحبت کا اثر پڑتا ہے، اگر گلاب کو اس کا مصاحب بنادیا جائے تو کپڑے میں خوشبو آجاتی ہے اور اگر گولیوں کو مصاحب بنادیا جائے تو اس کے اثرات کپڑے کے اندر رچ بس جاتے ہیں اور کپڑے سے بدبو آنے لگتی ہے۔اسی طرح اہل اللہ کی صحبت کے اثرات ہوتے ہیں جن سے متاثر ہوئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا، ایک عالم ربانی اور درویش حقانی کی شان یہ ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آئے گویا کہ ان کا ذکر، ذکر خدا کی تمہید ہے کسی نے کہا ہے کہ ؎

خاصان خدا خدا نہ باشند ولیکن از خدا جدا نہ باشند

جب آپ اہل اللہ کے قریب ہوں گے تو کمالات ربانی آپ کے اندر آئیں گے، صحبت صالح کے آثار خیر و برکت کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔

فیض صحبت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)......یہی وجہ ہے کہ جو مرتبہ اور مقام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں، کوئی بڑے سے بڑا قطب ہو، غوث ہو، صحابیت کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ ان حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے، آپ کی مجلس میں شریک رہے ہیں جسے آپ کی صحبت نصیب ہوئی ہو اور آپ کی مجلس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو اس کے کمالات کا کیا کہنا، ایک آدمی آفتاب کے نیچے کھڑا ہو تو اس پر جو گرمی ہوگی وہ کمرے میں بیٹھنے والے کو نہیں ہوسکتی اور جو تہہ خانے میں بیٹھا ہوگا اس پر دھوپ اور گرمی کا اثر بھی کم ہوگا، جتنا آفتاب سے قریب ہوگا، حرارت اور نورانیت بڑھتی جائے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں آپ سے جو بلا واسطہ مستفید ہوئے ہیں انکے فضائل و کمالات درجہ اولی میں ہیں اور جو بالواسطہ ہیں ان کا ثانوی درجہ ہے اور ان حضرات سے جن لوگوں نے استفادہ کیا وہ تیسرے نمبر پر ہیں اسی طرح درجہ بدرجہ کمی ہوتی چلی جائے گی۔ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ'' ① ''سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر جو اس سے متصل ہو پھر جو اس سے متصل ہو''۔سلف میں شاگرد و استاد کی اصطلاح نہیں تھی بلکہ شاگردوں کو ''صاحب'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، کہا جاتا تھا کہ یہ اصحاب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ اصحاب مالک ہیں یہ اصحاب فلاں ہیں

① الصحیح لمسلم، کتاب المناقب، باب فضائل الصحابة ثم الذين يلونهم......ج: ۶ ص: ۱۹۶۴ رقم: ۲۵۳۵.

اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان حضرات نے اپنے استاذ اور شیخ سے محض کتاب کے الفاظ اور معنی ہی نہیں حاصل کئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے استاذ کے رنگ کو بھی قبول کیا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رنگ قبول کیا تھا جو آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔حاصل یہ کہ سب سے بڑی چیز ہے صحبت اس کے ذریعہ ایک کے قلب کا رنگ اور اس کے جذبات دوسرے کے اندر آتے ہیں، محمد حسین آزاد نے بالکل سادہ لفاظ میں ایک شعر کہا ہے ؎

ملنے والوں سے راہ پیدا کر اس کے ملنے کی اور صورت کیا

یعنی تم اگر محبوب سے ملنا چاہتے ہو تو پہلے ان کے پاس آنے جانیوالوں سے رسم وراہ پیدا کرو۔وہ کسی دن تذکرہ کردیں گے تمہاری بھی رسائی ہوجائے گی۔ایسے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچنے کے لئے پہلے اللہ والوں سے ملا جائے، ان کے رنگ کو قبول کیا جائے، قلوب کے بدلنے کی کوشش کی جائے، اخلاق کو درست کیا جائے، نفس کی اصلاح کی جائے، پھر بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قبول فرمالیں گے اور اپنا بنالیں گے۔

اگر کسی کے پاس علم ہے مگر اس نے شیخ کی صحبت نہیں اختیار کی ہے، اس کا رنگ نہیں قبول کیا ہے تو وہ علم صرف لفظی ہوگا حقیقی نہیں ہوگا۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ ① "اللہ سے ڈرو اور معیت اختیار کرو سچے لوگوں کی" سچوں کی معیت اختیار کرنے سے ان کے اثرات تمہارے اندر پیدا ہوں گے اور سچائی کی خوبی تمہارے ذہن میں بیٹھتی چلی جائے گی۔صحبت ہی کی بات ہے کہ محدثین کے یہاں ان راویوں کی روایت زیادہ قابل قبول ہوتی ہے، جنہوں نے محض سنا ہی نہیں بلکہ اپنے شیخ کی صحبت بھی زیادہ سے زیادہ اٹھائی ہو۔

علم حقیقی ...... دیکھو بھائی! ایک علم تو ہوتا ہے رسمی اور لفظی جو رٹنے اور کتابوں سے آجاتا ہے اور ایک علم ہوتا ہے حقیقی جو علماء ربانی اور اہل اللہ کی صحبت سے آتا ہے، بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آئے کہ وہ عالم تو نہیں مگر جاہلوں کو کون کہے عالموں کی بھی رہنمائی فرماتے تھے۔حاجی امیر خاں صاحب ہمارے اکابر دیوبند کے ایک متعارف خادم جن سے سنی ہوئی روایات کا مجموعہ خود میں نے مرتب کیا اور حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے اس پر فوائد اپنے قلم سے تحریر فرمائے جیسا کہ معلوم ہے کہ وہ رسمی عالم تو نہیں تھے یعنی انہوں نے باقاعدہ کسی درسگاہ میں نہ پڑھا تھا اور نہ کسی مدرسہ کی ان کے پاس سند تھی مگر حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہما کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اس کی برکت سے انکے علم وفکر میں کچھ ایسی گہرائی پیدا ہوگئی تھی کہ علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی بحر العلوم اور کتابوں کی حافظ شخصیت ان سے استفادہ کرتی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آتا ہے، وہ بداخلاق بھی ہے، مشرک بھی، مگر جب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔محبت سے فیض یاب ہوتا ہے تو عالم بھی بن جاتا ہے، خلیق بھی بن جاتا ہے اور کریم بھی۔

تو بھائی نیک صحبت سے اخلاق بدل جاتے ہیں، روحیں پلٹ جاتی ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ: الآیۃ: ۱۱۹۔

علیہ وسلم کے ہزاروں معجزات ہیں اور معجزات کو تو چھوڑ دیجئے آپ کا یہی کم کارنامہ اور کیا کم معجزہ ہے کہ آپؐ نے عرب جیسی تہذیب واخلاق سے ناآشنا قوم کے قلوب کو بدل کر رکھ دیا، لوہے کا نرم کر دینا آسان ہے مگر قلوب اور روحوں کا بدلنا نہایت ہی مشکل، ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا ہر ہر صحابیؓ ایک معجزہ ہے۔

مؤاخاۃ فی اللہ...... لیکن اگر کسی شخص کو اتفاق سے شیخ میسر نہ آئے اور وہ کہے کہ میری بستی میں نہ تو کوئی شیخ ہے نہ کوئی عالم پھر میرے نفس کی اصلاح کی کیا صورت ہوگی، ایسے شخص کے متعلق امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بستی میں اس کا کوئی دوست تو ہوگا ہی اور اگر نہ ہو تو ایک دو آدمیوں سے دوستی کر کے آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہئے کہ اگر میں کوئی برائی کروں تو تم میرا ہاتھ پکڑ کر روک دو، تم کرو گے تو میں روک دوں گا، تم سے کوئی کوتاہی ہوگی، تو میں تنبیہ کروں گا، مجھ سے ہوگی تم کرنا، اگر دوستی اس طرح ہوگئی تو زیادہ نہیں چالیس دن کے اندر سینکڑوں برائیاں ختم ہو جائیں گی۔

تو اگر کوئی شیخ نہیں ملتا، کوئی عالم نہیں ملتا۔ تو اس طرح اپنے نفس کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ: قیامت کے دن سات آدمی ایسے ہوں گے جنہیں اس دن جس دن کہ کہیں سایہ نہ ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ عرش کے سائے تلے جگہ دیں گے ان میں سے ایک نوع یہ بھی ہے۔ ''**قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: سَبْعَةٌ یُظِلُّھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّہٖ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّہٗ: اِمَامٌ عَادِلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَفِیْ عِبَادَةِ اللّٰہِ، وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْہُ حَتّٰی یَعُوْدَ اِلَیْہِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰہِ اِجْتَمَعَا عَلَیْہِ وَ تَفَرَّقَا، وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰہَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ، وَرَجُلٌ دَعَتْہُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاھَا حَتّٰی لَاتَعْلَمَ شِمَالُہٗ مَاتُنْفِقُ یَمِیْنُہٗ**'' ①

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمی وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لیں گے، جس دن کہ سوائے خدا کے سائے کے کسی کا سایہ نہ ہوگا، ایک انصاف پرور بادشاہ، دوسرے وہ نوجوان جس کی جوانی کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوا اور تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے، جب مسجد سے نکلتا ہے تو بے چین رہتا ہے، تاوقتیکہ پھر مسجد میں نہ پہنچ جائے اور دو اشخاص جنہوں نے اللہ ہی کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے ترک تعلق کیا اور ایک وہ شخص ہے کہ جس نے خدا کو یاد کیا ہو تنہائی میں اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک وہ کہ جسے ایک ایسی عورت نے زنا کی دعوت دی جو خوبصورت بھی تھی اور بلند خاندان سے تعلق بھی رکھتی تھی اس پر اس نوجوان نے یہ کہہ دیا کہ مجھے تو خدا کا خوف اس کام کی اجازت نہیں دیتا اور ایک وہ شخص جس نے صدقہ دیا اور اتنا چھپایا کہ بائیں ہاتھ کو بھی نہیں معلوم کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا''۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ، ج: ۲ ص: ۷۱۵ رقم: ۱۰۳۱.

حدیث میں ہے کہ: ایسے دو آدمی جن میں مواخات فی اللہ تھی اگر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور وہ مقبول عند اللہ ہو جائے تو وہ دعاء کرے گا کہ اے اللہ میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر لے آ، اسی کی وجہ سے مجھے یہ مقام ملا ہے۔

انتخاب دوست...... اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ: اصلاح کے اس دوسرے طریقہ میں کسی دوست سے مدد لینی ہوگی، تو بھائی! دوست بھی دنیا میں ایک ہی نوعیت، فطرت اور مزاج کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں بڑا فرق اور تفاوت رہتا ہے اس لئے دوست کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا کسی نے کہا ہے نا کہ۔

دلا اندر جہاں یاراں سہ قسم اند — زبانی اند و نانی اند و جانی
بنانی ناں بدہ از دربدر کن — تلطف کن بیاران زبانی
ولیکن یار جانی را بدست آر — مداراتش بگیری تا توانی

یعنی دوست کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو دستر خوانی دوست اگر خدا نے آپ کا دستر خوان سلامت رکھا ہے تو پھر آپ کے لئے دوستوں کی کمی نہیں جتنے چاہئے جمع کر لیجئے اور بعض زبانی دوست ہوتے ہیں ان کی بھی دنیا میں کوئی کمی نہیں اور بعض جگری اور حقیقی دوست ہوا کرتے ہیں جو صرف آرام اور راحت ہی میں نہیں بلکہ تکلیف اور مصیبت میں بھی پورا پورا ساتھ دیتے ہیں، ایسے دوستوں کی تعداد یقیناً کم ہے۔

جو دستر خوانی دوست ہوں ان کی بات تو بالکل نہ مانیو اس لئے کہ جس دن تمہارا دستر خوان لپٹ جائے گا ان کی دوستی بھی ختم ہو جائے گی البتہ انہیں انکی طلب وخواہش کے مطابق کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑا لیجئے اور جو زبانی جمع خرچ کرنے کے عادی ہوں تم بھی ان کے ساتھ دوستی زبان ہی تک محدود رکھو۔

ایک شاعر تھے انہوں نے ایک امیر صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھا اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپکی کرسی کا پایہ ہفت آسمان سے بلند ہے آپ کے تاج کے موتی، جیسے آسمان کے تارے وغیرہ وغیرہ۔ جب قصیدہ ختم ہوگیا تو امیر صاحب نے کہا کہ: پرسوں آنا تمہیں دو ہزار اشرفیاں دوں گا۔ اس سے جناب خوب خوش ہوئے اور گھر جا کر تیسرے دن کا انتظار کرنے لگے قبل اسکے کہ تیسرا دن آئے پہلے ہی انہوں نے اس امید پر کہ اب تو دو ہزار ملے گا ہی پانچ سو روپیہ قرض لے لیا، چنانچہ اب بہترین کھانے پک رہے ہیں، اعزاء واقارب کی دعوتیں ہورہی ہیں نئے نئے جوڑے تبدیل کئے جارہے ہیں۔ جب تیسرا دن آیا تو دربار پہنچ کر امیر صاحب کو سلامی دی۔ امیر صاحب نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، دوسری مرتبہ سلام کیا، اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے، تیسری بار کھانسے اس پر بھی امیر صاحب کی نگاہ نہ اٹھی، آخر زبان ہی سے کہا کہ بندہ حاضر ہے میں نے اس دن قصیدہ پڑھا تھا اور آج کے دن آپ نے دو ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ امیر صاحب نے سر اٹھایا اور کہا: بھائی تم نے قصیدہ پڑھا تھا جس کے اندر محض الفاظ ہی الفاظ تھے، حقیقت اور واقعیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا تم نے مجھے لفظوں سے خوش کر دیا۔

میں نے بھی تمہیں لفظوں سے خوش کر دیا، جیسا تم نے دیا تھا ویسا میں نے واپس کر دیا اب اور کیا چاہتے ہو؟

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دوستوں کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ محض زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں ان کی باتوں کا حقیقت اور واقعیت سے نہ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی واسطہ، ایسے دوستوں کی زبانوں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے، لیکن ایسے دوست جو مصیبت میں کام آتے ہوں، خود پریشانیاں اٹھالیتے ہوں مگر دوست پر آنچ نہ آنے دیتے ہوں، ہزاروں میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ اور اسی تیسرے دوست کے متعلق شاعر نے یہ بات کی ہے کہ اسے مضبوط پکڑلو اور اس کے تعلق ومحبت کی قدر کرو۔ بہر حال اصلاح نفس کے لئے اگر کوئی شیخ نہیں ملتا تو اپنے دوستوں ہی سے اپنی صلاح کرنی چاہئے۔

دشمن کے ذریعے اصلاح...... لیکن اگر کوئی کہے کہ میرا کوئی دوست ہی نہیں تو پھر اس کے لئے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے ایسا تو شاید ہی کوئی ہوگا کہ آج کے دور میں جس کا کوئی دشمن نہ ہو، آپ کے دشمن چھانٹ چھانٹ کر آپ کے عیوب اور برائیاں نکالتے اور پھیلاتے رہیں گے اب آپ کا کام یہ ہوگا کہ آپ کے اندر جو برائیاں ہیں انہیں چھوڑتے چلے جایئے۔ اگر آپ اس طرح ایک چلے دو چلے بھی گزار لیں گے تو بڑی حد تک آپ کی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور آپ صالح بن جائیں گے۔

محاسبۂ نفس...... اور اگر کوئی کہے کہ میں تو پہاڑ کی کھوہ میں رہتا ہوں، مجھے نہ کسی شیخ کی صحبت میسر ہے اور نہ میرا کوئی دوست ہے نہ دشمن ہے پھر میرے لئے اصلاح کا کیا طریقہ ہوگا، امام غزالی لکھتے ہیں کہ اس کو بھی مایوس نہ ہونا چاہئے اس کے لئے چوتھا طریقہ محاسبہ نفس کا ہے، روزانہ سوتے وقت کم از کم پندرہ منٹ مراقبہ کرے اور سوچے کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کیں اور کتنے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے، جو بھلائیاں کی ہوں ان پر شکر ادا کرے اسلئے کہ شکر یہ ادا کرنے سے اللہ تعالی زیادتی کی توفیق دیں گے، ارشاد خداوندی ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ①

"یعنی اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم نعمتوں کو بڑھا دیں گے، تو جتنا شکر ادا کریں گے خدا تعالیٰ نعمتوں کو بڑھا دیں گے" اور جو گناہ سرزد ہوئے ہوں ان پر سچے دل سے توبہ کرے، جب صدق دل سے توبہ کرلے گا تو سارے گناہ جھڑ جائیں گے، حدیث میں ہے: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ." ② "گناہ سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے کہ جیسا کہ اس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوا"۔ اگر برابر اس عمل کو جاری رکھا جائے گا تو برائیاں ختم ہوتی جائیں گی اور نفس میں اصلاح وتقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حاصل یہ کہ اولاً تو شیخ کے ذریعہ نفس کی اصلاح کیجئے شیخ نہ ملے تو پھر دوست کے ذریعے خوبیاں پیدا کیجئے اور اگر دوست نہ ہو تو پھر دشمن کو آلہ کار بنایئے اور اگر دشمن بھی نہیں ہے تو اپنا شیخ اپنے ہی کو بنا لیجئے، عرفی طور پر

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷۔

② السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۲ ص: ۱۴۱۹ رقم: ۴۲۵۰۔

اصلاح کے یہ چار طریقے ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی میسر آ جائے تو نجات کے لئے کافی ہے اور اگر اتفاق سے یہ چاروں چیزیں میسر آ جاویں تب وہ شخص کیمیا بن جائے گا کہ (۱) شیخ بھی ہو (۲) مواخاۃ فی اللہ بھی ہو (۳) دشمن بھی ہو اور (۴) محاسبہ بھی ہو گویا اگر کسی کو یہ چاروں چیزیں میسر آ جائیں تو پھر زہے قسمت وز ہے نصیب۔

تبلیغی جماعت اصلاحی طریقوں کی جامع ہے...... اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ اصلاح کے ان چاروں طریقوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے تو یہ تبلیغی جماعت ایک ''معجون مرکب'' ہے گویا یہ نسخہ امرت کا بن گیا جس میں اصلاح نفس کے یہ چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں۔ الغرض اس میں محنت کرنے سے بہت ہی بڑا فائدہ ہوگا آپ کہیں گے کہ تبلیغ میں نکالا کیوں جاتا ہے؟

تو تبلیغ میں اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اس میں بزرگوں کی صحبت میسر ہوتی ہے پھر ساتھی اچھے ملتے ہیں، جو ایک دوسرے کو برائی سے روکتے ہیں اور پھر جب وہ اپنا خرچ کر کے باہر نکلا ہے تو دینی جذبات بھی ابھریں گے اسے اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہوگا، اس لئے کہ جب وہ اپنا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور ہر قسم کی مشقت برداشت کر رہا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر لے کر ضرور ہی آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر یہ اثر لے کر نہ لوٹے تو وہ انسان نہیں پتھر ہے۔ اگر انسان ہے تو ضرور وہ اثر لے کر آئے گا۔ کیونکہ وہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔

جماعت کی برکات...... بہت ممکن ہے کہ اس مجموعہ مرکب میں بعض کمزور ارادہ، بعض نحیف عمل، بعض خام علم والے جمع ہو جائیں اور شبہ یہ ہو کہ تبلیغ سے حاصل ہونیوالا فائدہ یقینی ہونے کی بجائے موہوم ہو کر رہ جائے گا۔ تو بھائی اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ کمزوروں سے مرکب اجتماع، جمعیت اور اتحاد کی بنا پر یہ ایک قوت حاصل کر لے گا جیسا کہ اس کی نظیر خود ہی ہمارے فن حدیث میں بھی موجود ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ اگر کسی حدیث کے سلسلے میں چند ضعیف سندیں جمع ہو جائیں تو وہ حدیث بھی محدثین کے نزدیک قوی سمجھی جانے لگتی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اگر چند بھیک مانگنے والے دو، دو، چار، چار پیسے جمع کر لیتے ہیں تو سب کے کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے اور اگر علیحدہ علیحدہ چاہیں تو کسی کا بھی پیٹ نہیں بھر سکتا، ایسے ہی اگر چند ضعیف العمل اور ضعیف روحانیت والے نیک نیتی سے جمع ہو جائیں گے تو ایک کا دوسرے پر اثر پڑے گا اور سبھی کے اندر قوت پیدا ہو جائے گا۔ اور بھائی ان حضرات کی نیک نیتی میں کیا شبہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرات نہ تو تجارت کے لئے جمع ہوتے ہیں نہ کھیتی باڑی اور نہ کسی دوسرے کاروبار کے لئے۔

پھر یہ بھی تو سوچئے کہ دس پندرہ آدمیوں کی جماعت میں کوئی نہ کوئی تو مقبول خداوندی ضرور ہی ہوگا اور ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی مقبولیت کا اثر دوسروں پر یقیناً پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ مومن کو نماز با جماعت پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لئے کہ وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ ساری جماعت کے نمازی بھی کمزور کیوں نہ ہوں، پھر بھی مجموعہ میں خدا کا کوئی مقبول بندہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے پوری جماعت کی نماز قبول ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ جماعت میں خواہ کتنے ہی ضعیف کیوں نہ ہوں، لیکن خدا کا کوئی مقبول بندہ ضرور ہوگا جس کی وجہ سے

اس کی مقبولیت ضرور ہوگی۔

نیک نیتی کا اثر......اور پھر وہ اپنی ذاتی غرض سے نہیں نکلے ہیں، بلکہ اللہ کے رضا کے لئے نکلے ہیں۔اس نیک نیتی کا اثر بھی پڑتا ہے، کیونکہ یہ اللہ کا نام سیکھنے جارہے ہیں۔ خدا کو یاد کرنے کے لئے جارہے ہیں۔تو جب اس نیت سے اللہ کے راستہ میں نکلیں گے تو اس کا اثر بھی ضرور آئے گا۔گویا اس طرح فی الجملہ صحبت شیخ وصحبت صلحاء میسر آجائے گا۔بہرحال یہ سب سے پہلی چیز صحبت اہل اللہ ہے۔

تبلیغی بھائی......پھر جب ایک جذبہ سے جائیں گے تو مواخاۃ (بھائی چارگی) بھی قائم ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ان میں باہم دوستی بھی قائم ہو جاتی ہے۔اس لئے واپس آنے کے بعد ایک دوسرے کو تبلیغی بھائی کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی بھائی آرہے ہیں گویا ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی بن جاتا ہے اور آپس میں ایک قسم کی اخوت ہو جاتی ہے۔

جماعت کی نماز کی بھی یہی خصوصیت ہے، جب لوگ مسجد میں آتے ہیں تو ایک کی دوسرے سے آنکھیں چار ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں باہمی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور جب ان میں سے کوئی بھی غائب ہوتا ہے تو دوسرے سے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں تو روزانہ آیا کرتا تھا آج کیوں نہیں آیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے، پھر لوگ اس کی عیادت کے لئے جائیں گے اور اس طرح لوگوں کو عیادت مریض کا ثواب حاصل ہوگا۔نیز اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہوگا۔حدیث میں ہے کہ مرض کی حالت میں آدمی کو اللہ تعالیٰ سے بے حد قرب ہوتا ہے۔حدیث ہی میں ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے نعمتوں میں اتنا قرب نہیں ہوتا جتنا کہ مصیبتوں میں ہوتا ہے۔نیز حدیث ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تھا تو میری مزاج پرسی کے لئے نہیں گیا، بندہ کہے گا کہ اے باری تعالیٰ آپ کی ذات تو ان چیزوں سے پاک ہے، آپکے بیمار ہونے کا کیا سوال؟ باری تعالیٰ فرمائیں گے میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، اگر تو اس کی عیادت کے لئے جاتا تو مجھے اس کی پٹی پر موجود پاتا، تو پھر تجھے بھی وہ قرب نصیب ہوتا جو میرے اس بندے کو مجھ سے حاصل تھا۔

حاصل یہ ہے کہ ایک مریض کی عیادت کے لئے جانے سے عیادت کے ثواب کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب بھی نصیب ہوگا، اگر خدانخواستہ اس کا انتقال ہو گیا تو سب کے سب اس کے کفن دفن میں لگیں گے اس کا بھی ثواب ملے گا گویا کہ از اول تا آخر ثواب ہی ثواب ہے، یہ ہیں برکات مسجد میں حاضری اور بروقت مسلمانوں کے آپس میں ملنے جلنے کے نتائج، اب آپ دیکھئے کہ تبلیغ والے مرکز ہمیشہ مسجد کو ہی بناتے ہیں تو مسجدوں کی وہ برکات جو مسجد میں آنیوالوں کے لئے مخصوص ہیں۔خود تبلیغ والوں کو ضرور بلکہ کچھ زائد ہی نصیب ہونگی اور پھر ایک مشرب ایک مسکن ایک مطعم کی بناء پر جو مواخات بھائی بندی کے جذبات باہم رونما ہوتے ہیں یہ تبلیغ والے اس سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے تو تبلیغی جماعت میں نکل کر شیخ بھی ملے، دوست بھی ملے، نیت بھی اچھی ہوئی اور پھر اچھی بات

کہنے کا موقعہ بھی ملا۔

جماعت میں دشمنوں سے عبرت کا موقع......اب جب اچھی بات کہو گے تو ہر ایک ٹھنڈے دل سے نہیں سنے گا بلکہ اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت میں رہ کر دشمنوں سے بھی نصیحت حاصل کرنے کا بہترین موقع حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ آپ دس لوگوں کے پاس جائیں گے، دس منہ ہوں گے، دس قسم کی باتیں ہوں گی، کوئی بدعتی کہے گا، کوئی وہابی کہے گا اور بھی طرح طرح کی سخت وسست باتیں آپ کو لوگ کہیں گے، آپ کے عیوب اور خرابیاں نکالنے کی کوشش کریں گے، جب آپ بار بار اس قسم کے لوگوں کو سنیں گے تو غور کریں گے کہ آخر میرے اندر کیا کمزوریاں ہیں کیا کوتاہیاں ہیں پھر ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معلوم کر کے آپ ان کو دور کرنے کی فکر کریں گے۔ حاصل یہ کہ اس میں نیک لوگوں کی صحبت بھی میسر دوستی بھی میسر، دشمنوں سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا بھی موقعہ۔

تبلیغ میں محاسبہ......اور ان تمام باتوں کے ساتھ جب آپ رات کو پڑ کر سوئیں گے تو یقیناً سوچیں گے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں اور کتنی برائیاں کیں اور پھر آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ رات کا وقت ہے حق تعالیٰ سے قرب ہے لاؤ نیکیوں پر اس کا شکریہ ادا کروں اور برائیوں سے توبہ کرلوں، تو اس طرح نیکیوں کا سلسلہ بڑھ جائے گا اور برائیاں گھٹتی چلی جائیں گی۔ تو بھائی! اس جماعت میں یہ چاروں دوائیں موجود ہیں، جو ہدایت کے لئے ایک ایسا معجون مرکب ہے کہ اس کے بعد پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

تبلیغ اور اصلاح......اور مقصود اصلی یہ ہے کہ پہلے خود ہمارا ہی دین درست ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ابتداء خود اپنے ہی سے کرنی پڑتی ہے، ضروری ہے کہ آدمی پہلے خود صالح بنے، پھر دوسرا مقام یہ ہے کہ دوسروں کو صالح بنائے، ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل کرے گا تو صالح بنے گا۔ دوسروں کو عمل کی دعوت دے گا تو مصلح بنے گا۔

اعتراضات اور ان کا اصولی جواب......رہ گئے تبلیغی جماعت پر اعتراضات تو لوگ کرتے رہتے ہیں، کون سا ایسا کام اور کون سی ایسی جماعت ہے جس پر اعتراضات نہیں ہوتے، آپ اعتراضات کو چھوڑ دیجئے اور کام کرتے جائیے۔ مثال کے طور پر لوگ ایک اعتراض یہ کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے صرف فضائل بیان کرتے ہیں۔ مسائل نہیں بیان کرتے اور دین درست ہوتا ہے مسائل سے، فضائل سننے کے بعد دل میں امنگ تو پیدا ہو جاتی ہے مگر جب آگے مسئلہ نہیں معلوم ہوگا تو ممکن ہے کہ لوگ امنگ اور جذبات کی رو میں بہہ کر من گھڑت عمل شروع کر دیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ بدعت میں مبتلا ہوں گے۔

لوگوں کا یہ کہنا کہ اس طرز عمل سے لوگ بدعت کے اندر مبتلا ہوتے چلے جائیں گے۔ اولاً تو محض احتمال اور امکان کی بات ہے دیکھنا یہ ہے کہ واقعہ کیا ہے چالیس برس کے اندر کتنے لوگ بدعت میں مبتلا ہوئے؟

رہا مسائل کا نہ چھیڑنا، اس کا اگر یہ جواب دیا جائے کہ ہم پہلے فضائل بیان کر کے جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بعد میں مسائل چلائیں گے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال سے تبلیغ چل رہی ہے کیا آج تک جذبہ ہی پیدا نہیں ہوا؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ تبلیغ والے فضائل ہی تو بیان کرتے ہیں مسائل سے انکار تو نہیں کرتے، کیا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ کسی سے نہ پوچھو، ہرگز وہ ایسا نہیں کہتے۔

دوسرے یہ کہ کام کرنے کے مختلف میدان اور مختلف لائنیں ہوتی ہیں، کوئی درس و تدریس کی لائن اختیار کرتا ہے، کوئی وعظ و تبلیغ کی، تو کوئی سیاست و حکمت کی، ان حضرات نے بھی ایک لائن اختیار کرلی ہے، فضائل بیان کرتے ہیں، لوگوں کے اندر دینی جذبہ اور امنگ پیدا کرتے ہیں، اب ساری لائن وہی اختیار کرلیں، یہ نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن۔

جب آپ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو آپ کام کرنے سے پہلے کچھ مقاصد اور اصول مقرر کرتے ہیں اور اپنی لائن متعین کرتے ہیں، اس میں آپ سب چیزوں کو داخل نہیں کرتے، تو پھر آپ اس میں سب چیزوں کو کیوں شامل کرنا چاہتے ہیں؟ بہر حال جب کوئی اعتراض کرے تو اسے سن لینا چاہئے اور اپنا کام کرتے رہنا چاہئے عمل ہی سب اعتراضات کا جواب ہے۔

مقصد تبلیغ......بس تبلیغ والوں کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور دینی امنگ پیدا کردی جائے، اب اس امنگ سے آدمی دین کی جس لائن میں بھی کام لینا چاہے لے سکتا ہے، نیز دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب کسی چیز کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی خود ہی اس امنگ کو صحیح طریقے سے پورا کرنے کی جدوجہد اور سعی کرتا ہے۔ اگر آپ کے اندر صحیح امنگ پیدا ہوگئی ہے اور آپ کو مسائل کی طلب ہے تو علماء سے ملئے، مدرسے میں جایئے اور مسائل معلوم کیجئے باقی کام میں نہ لگنا اور اعتراضات کا کرنا یہ حیلہ کرنیوالوں کا کام ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ہر جماعت کا ایک نصب العین اور طریقہ کار ہوتا ہے، آپ کا اس پر دوسری چیزوں کو لادنا کہ فلاں چیز کو بھی اس میں شامل کرلیجئے کسی طرح مناسب نہ ہوگا، جب اس جماعت نے اپنا ایک موضوع متعین کرلیا تو آپ کو چاہئے کہ آپ اسے اس پر کار بند رہنے دیں۔

بہر حال تبلیغ سے نفع اظہر من الشمس ہے کہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں دین کی امنگ اور طلب پیدا ہوئی اور اسی امنگ اور طلب کی وجہ سے کتنی بدعات ختم ہوئیں ورنہ لاکھوں آدمیوں کا محض اللہ اور اللہ کے دین کی خاطر اپنا پیسہ خرچ کر کے سفر کرنا، اپنا کھانا، اپنا پینا، پہلے یہ جذبہ کہاں تھا تو اس سے جو نفع پہنچا اس کو تو آپ بیان نہ کریں اور جو ان کا منصوبہ نہیں اس کو آپ اعتراض کی بنیاد بنائیں، یہ تو کوئی مناسب بات نہ ہوگی۔

خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے......بہر حال! اصلاح نفس کے چار جزو اور چار طریقے ہیں اور تبلیغ کے اندر حسن اتفاق سے چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں، صحبت صالح بھی ہے۔ ذکر و فکر بھی ہے۔ مواخاۃ فی اللہ بھی ہے۔ دشمن سے عبرت و موعظت بھی ہے اور محاسبہ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔ عام لوگوں کے لئے اصلاح نفس کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا، اس طریقہ کار سے دین عام ہوتا جارہا

ہے اور ہر ملک کے اندر یہ صدا پہنچتی چلی جارہی ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے عقائد درست ہو رہے ہیں، لوگ تیزی سے اعمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں کم از کم ان تجربات کو سامنے رکھ کر اعتراض کرنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا اور غور کرنا چاہئے۔

اس لئے اس میں خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے، آپ خود داخل ہو کر اس بات کا فائدہ محسوس کریں گے کہ اس کام سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟ آپ اسے تجربات کی روشنی میں معلوم کر لیجئے جو شخص بھی حسن نیت سے اس کام میں آئے گا، اس کا اثر اسے ضرور ہوگا۔ اس کام میں دعوت بھی ہے اور دعوت ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی، نماز کی محنت بھی ہے، ساتھیوں کے ساتھ تعلق بھی ہے، ذکر بھی ہے اور محاسبہ بھی ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس محنت سے بہت سی خیر اور بھلائی انسان میں آرہی ہے۔ کتنے برے تھے جو جماعت کی وجہ سے اچھے بن گئے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ برے عقیدے والے صالح عقیدے والے بن گئے۔

بے جا اعتراض......اور پھر اعتراضات تو وہ قابل قبول ہیں، جو کام میں گھس کر کئے جاویں اور جو باہر بیٹھ کر اعتراضات کرے وہ قابل قبول نہیں ہوا کرتے، اگر اندر گھس کر کوئی اعتراض کرے تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اندر گھسنے والا کوئی اعتراض کرتا نہیں۔ کیونکہ داخل ہونے کے بعد اسے اس کام کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب باہر کے اعتراضات ہیں جو قابل قبول نہیں۔

یوں تو اعتراضات سے مدرسے والے بھی خالی نہیں۔ اللہ و رسول بھی اعتراضات سے خالی نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی نسبت کہا گیا کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہنا کسی طرح بھی گالی سے کم نہیں، بخاری شریف کی ایک حدیث میں: "قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: کَذَّبَنِی ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ یَکُنْ لَہٗ ذٰلِکَ، وَشَتَمَنِیْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ ذٰلِکَ. فَاَمَّا تَکْذِیْبُہٗ اِیَّایَ فَقَوْلُہٗ: لَنْ یُّعِیْدَنِیْ وَلَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَھْوَنَ عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِہٖ. وَاَمَّا شَتْمُہٗ اِیَّایَ فَقَوْلُہٗ: اِتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا، وَاَنَا الْاَحَدُ وَالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لِّیْ کُفُوًا اَحَدٌ." ترجمہ: "اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھ کو جھٹلایا۔ حالانکہ اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ میری تکذیب کرے اس نے مجھے برا بھلا کہا حالانکہ یہ اسے زیبا نہ تھا۔ تکذیب مثلاً یہ کہنا کہ اللہ مجھ کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہ کریں گے۔ حالانکہ پہلی مرتبہ کے مقابلے میں دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ یوں کہتا ہے کہ اللہ صاحب اولاد ہے، حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں اور نہ کوئی میرا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ ہی میرا کوئی شریک وساجھی ہے"۔

آپ خود سوچئے کہ اس سے زیادہ گالی کیا ہوگی کہ کسی آدمی کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں کے سانپ پیدا ہوا ہے اس شخص کے لئے کتنی شرم کی بات ہوگی، حالانکہ سانپ بھی جاندار ہے اور اس معنی کر کے دونوں میں ایک گونہ

مماثلت ومشابہت ہے۔

اور بھائی! اللہ تبارک تعالیٰ تو نور ہیں، پھر انکے لئے بیٹا اور بیٹی ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس طرح رسولوں کو بھی مورد طعن وتشنیع بنایا گیا۔ کسی نے کہا یہ تو کاہن ہیں، کسی نے کہا جادوگر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ ورسول بھی اعتراض سے نہیں بچ سکے تو ہماری اور آپ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ بہرحال اعتراض کرنیوالے تو سب پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہ چاہئے۔

اعتراض کی حقیقت...... اعتراضات کا دائرہ بہت وسیع اور نہایت آسان ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علمی لائینوں میں سب سے زیادہ مشکل کام فتویٰ دینا ہے۔ اس لئے کہ کسی مسئلے کے متعلق فتویٰ دینے کے لئے سینکڑوں جزئیات سامنے رکھنی پڑتی ہیں، جب تک تمام جزئیات سامنے نہ ہوں۔ فتویٰ دینا مشکل ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دو واقعے اور دو مسئلے بالکل ایک جیسے مگر حکم دونوں کا جدا جدا، حضرت نے فرمایا کہ: بڑے سے بڑے عالم کا مفتی ہونا ضروری نہیں۔ پھر فرمایا کہ: اس سے آسان کام درس دینا ہے، افتاء میں سینکڑوں جزئیات سامنے رکھنی پڑتی ہیں، غور کرنا پڑتا ہے، دماغ پر زور ڈالنا ہوتا ہے اور درس دینے والا ایک عبارت کو دیکھ کر اس کا ماحصل بیان کر دیتا ہے اور فرمایا کہ درس دینے سے بھی آسان کام تقریر کرنا ہے اور وہ بھی عامیانہ اور میں ان تینوں پر ایک جزیہ کا اضافہ کر کے یوں کہتا ہوں کہ ان سب سے آسان ہے اعتراض کا کر دینا، جس پر چاہے اعتراض کر دیجئے، صحابہؓ پر اعتراض، ائمہ مجتہدین پر اعتراض، لطف کی بات یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے تھکتے نہیں اور تھکیں بھی تو کیسے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ عقل کی، بس ہر بات کے متعلق یہ کہہ دیجئے کہ یہ غلط ہے۔

اور اعتراض کرنے کے لئے علم کی بھی ضرورت نہیں، اعتراض کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہوتی نہ علم کی نہ عمل کی اتنا آسان کام ہے اعتراض کا کرنا ایسے آسان کام کو ہر کوئی شخص کر سکتا ہے۔ تو بھائی! اگر کچھ لوگ ایسے گئے گزرے اور آسان کام کو اختیار کرتے ہیں تو کرتے رہیں، اس سے آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے، آپ اپنے کام میں پورے طریقے سے مشغول رہئے، کل میدان قیامت میں اعتراض کرنیوالے بھی کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والوں کی بھی صفیں لگی ہوں گی، ہر ایک کی محنت کا ثمرہ اس کے سامنے آ جائے گا۔

انعام خداوندی...... یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور آپ کی قسمت کی بات ہے کہ آپ کے حصے میں کام کرنا آیا اور دوسروں کے نصیب میں اعتراض کرنا۔ اس لئے آپ تو خوش رہئے کہ حق تعالیٰ نے آپ لوگوں کو کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اعتراضات سے بچا لیا۔ اور رہ گیا اوروں کا اعتراض کرنا، اس کے لئے آپ لوگوں کا عمل خود جواب ہے، مثل مشہور ہے کہ۔ ''ایک چپ سو کو ہرا دیتی ہے''۔ اور چپ سے بڑھ کر عمل ہے اس سے کچھ بھی اشکال قائم نہیں رہے گا۔

خلاصہ: بہرحال میں نے عرض کیا کہ: اصلاح نفس ضروری ہے اور اصلاح نفس کے طریق کو بھی میں نے بیان

کر دیا اور اس کام میں اصلاح نفس کے تقریباً چاروں طریقے موجود ہیں جو جتنی محنت کرے گا، اتنی ہی ترقی حاصل کریگا۔ اس لئے کہ جب آپ عمل کریں گے تو اس پر اس کام کے ثمرات بھی ضرور مرتب ہوں گے۔ اب تک معترضین کے متعلق جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ ان کے اعتراض کو مان کر کے، اور اگر غور کیا جائے تو سرے سے ان کے اعتراضات ہی قابل تسلیم نہیں۔ اس لئے کہ اس میں بڑے اور پرانے لوگ بھی تو موجود ہوتے ہیں، جن سے کام کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں اور اصول سے کام کرنے میں ترقی ہوگی، بعض ارباب درس و تدریس ہوتے ہیں اور بعض اہل فتویٰ ان سے آپ کو روکتے بھی نہیں ہیں۔ اگر کسی کو علم حاصل کرنا ہو تو ان سے حاصل کر سکتا ہے مسئلہ معلوم کرنا ہو تو ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔ کام کرنے والوں کیلئے یہ سب باتیں ہیں اور محنتیں ہیں۔ اور نہ کام کرنے والوں کے لئے یہ سارے اعتراضات ہیں، بہر حال نسخہ ہے مکمل ہاں دل ہی اگر نہ چاہے تو اور بات ہے کسی نے صحیح کہا ہے کہ ''اگر تو ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں'' تو بات بتلانے والوں نے بتلا دی، اعلان کرنے والوں نے آواز بھی لگا دی، منزل بھی بتلا دی' ثمرہ بھی بتلا دیا کہ یہ سامنے آئے گا۔ اب ان حضرات کی ذمہ داری نہیں کہ وہ آپ کی طرف سے چلیں بھی، آپ چلیں گے اور کام کریں گے تو اس کا پھل پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ نفع عام ہے اس لئے اس میں ضرورت ہے کہ سب چلیں۔ اگر آپ تعلیم میں شرکت کر سکتے ہیں تو تعلیم میں شریک ہوں، گشت میں شرکت کر سکتے ہوں، تو گشت میں شریک ہوں اور اگر کچھ اوقات لگا سکتے ہوں تو اوقات بھی لگائیں۔ اور بھائی! اس سے کنارے رہنا بڑی ہی محرومی کی بات ہے۔ فکری طور پر ہو، عملی طور پر ہو، جس درجہ میں بھی ہو، اس میں شریک رہنا چاہئے۔ یہاں آنے کا اصل مقصد حضرت شیخ مدظلہ سے ملاقات تھی پھر اس کے بعد آپ حضرات کی درخواست کو چلتے چلتے پورا کرنا بھی ضروری تھا۔ سو ملنے کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ بہر حال نفس کی اصلاح ہوگی تو انسان کامل ہوگا اور یہ بات حاصل ہوگی ان طریقوں سے۔ حق تعالیٰ ان چند کلمات کو قبول فرمائیں۔ اور ہمیں بھی اور آپ کو بھی عمل کی توفیق عطاء فرمائیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

جماعتی تبلیغ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْجَآءَ هَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ . ②

ہمیشہ دین ایک رہا اور شرائع حسب مزاج اقوام نازل ہوتی رہیں...... بزرگانِ محترم، و برادرانِ عزیز! اللہ کا دین ایک ہی ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی رہا۔ البتہ شریعتیں مختلف ہوئیں۔ مگر اصل دین ایک رہا۔ اصل دین میں بنیادی چیزیں داخل ہیں۔ جیسے وجودِ خداوندی، توحیدِ الٰہی، رسالت و نبوت، عالم برزخ، عالم حشر، جنت و دوزخ میزان، پل صراط۔ یہ تمام چیزیں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دی گئیں، جو بنیادی اصول ہیں۔ آگے شریعتیں عملی پروگرام ہیں، جو ان اصول کے تحت ہیں؛ وہ اقوام کے مختلف مزاج ونفسیات اور ان کی طبعی افتاد کے باعث مختلف رہی ہیں۔ جیسی ضرورت ہوئی، اسی انداز کا عمل ان کو بخشا گیا، اگر قوم سخت مزاج ہوئی، تو شرعی احکام سخت نازل ہوئے۔ اگر کسی قوم کے مزاج میں نرمی تھی، تو احکام میں بھی نرمی رکھی گئی، اگر اعتدال ہے تو احکام میں بھی اعتدال رکھا گیا۔ غرض عملی احکام نفسیاتِ اقوام اور افتادِ مزاج کے مطابق حق تعالیٰ نے نازل فرمائے۔

اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ: اَبُوْنَا وَاحِدٌ اُمَّهَاتُنَا شَتّٰى ③ "باپ ہمارا ایک ہے مائیں مختلف ہیں"۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳، ۱۴.

② بروز جمعرات ۱۶ ذی الحجہ ۹۸ھ بمطابق ۱۶ نومبر ۷۸ء بعد نماز مغرب، مسجد حنائر، مکہ مکرمہ۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قولہ تعالیٰ واذکر فی الکتب مریم، ج: ۱۳ ص: ۱۲۷ رقم: ۳۲۵۹.

باپ سے اصول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دین سب کا ایک ہے اور امہات سے عملی احکام کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی شریعتیں مختلف ہیں۔ اس لئے ہر نبی کے زمانے میں شریعتوں کے اندر اختلاف رہا ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا دور مبارک ہے، اسے یوں سمجھئے کہ وہ اس عالم بشریت کی طفولیت اور لڑکپن کا زمانہ ہے' گویا عالم بشریت ایک لڑکا ہے جو آگے جا کے جوان اور بوڑھا ہوا۔ اس زمانے کے احکام بہت ہلکے تھے۔

﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① ''چیزوں کے نام یاد کرادیئے گئے''۔ جیسے بچوں کو ابتداً آپ یاد کرادیتے ہیں۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، روٹی ہے، لوٹا ہے وغیرہ۔ عمل کے درجے میں صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام یاد کرادیئے گئے کہ یہ صبح وشام رٹ لیا کرو۔ لوگ یہی عمل کرتے تھے۔ تو عالم بشریت بالکل سادہ تھا۔ جیسے بچے کا مزاج ہوتا ہے۔ تو احکام بھی بالکل ابتدائی تھے۔ یہ مکمل احکام نہیں تھے جو بعد کی شریعتوں میں نازل کئے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ اس میں لوگ فلکیات کی طرف چل پڑے تھے۔ سورج چاند کو پوجنا اور ستاروں سے اثرات لینا، تو ابراہیم علیہ السلام نے اس زمانے کے طریق کو سامنے رکھ کر وجود خداوندی اور توحید خداوندی کو سمجھایا جس کا قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ ② ابراہیم علیہ السلام کو ستاروں اور فلکیات کی نفسیات سمجھادی گئی۔ انہوں نے اسی طریق پر قوم کی اصلاح فرمائی اور اس کے مناسب ہی احکام بھی دیئے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا۔ یہود کا مزاج بہت سخت تھا۔ ابتداء ہی سے یہ قوم تلخ اور سخت واقع ہوئی ہے۔ ان میں کبر ونخوت بھی تھا۔ بہرحال اولاد انبیاء علیہم السلام تھی۔ تو بزرگ زادوں میں نسبت کے لحاظ سے کچھ یوں بھی نخوت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کہتے تھے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ③ حق تعالیٰ سے ہماری رشتہ داریاں قائم ہیں، اسی لئے تو ہم اولاد انبیاء ہیں۔ تو وہ جلدی ماننے والے نہیں تھے۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا۔ بعض انبیاء کی تکفیر کی، بعض کو قتل کیا۔ گستاخیاں کیں اور جو احکام نازل ہوتے، ان کے مقابلے پر آجاتے تھے۔ مانتے نہیں تھے، تو یہ ساری شریعت بھی سخت قسم کی نازل ہوئی۔ اگر گوسالہ پرستی کی تو فرمایا گیا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ تو آپس میں باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو قتل کیا۔ ہزاروں آدمی قتل ہوئے۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ رات کو جو عمل کرتے تھے، صبح کو ان کے دروازوں پر لکھا ہوتا کہ یہ بدعملی کی ہے گویا دنیا ہی میں رسوا کردیا جاتا تھا۔ اتنے سخت احکام دیئے گئے تھے۔

اگر کپڑے پر نجاست لگ گئی، تو پانی سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ قینچی سے اسے کاٹنے کی نوبت آتی تھی۔ حتیٰ کہ اگر بدن پر نجاست لگ گئی تو صرف پانی سے پاک نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ کھال کو کھرچا نہ جائے۔ ایسے شدید ترین

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۴، ۷۵. ③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۸.

احکام تھے اس لئے کہ قوم کے مزاج میں شدت تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، وہ اس پہلے عمل کا ردعمل تھا۔ اس قوم میں نرمی بے حد تھی احکام بھی نرم دیئے گئے۔ فرمایا گیا، اگر تمہارے دائیں گال پر کوئی تھپڑ مار دے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو کہ ایک اور مار دے، خدا تیرا بھلا کرے۔ گویا انتقام لینا اس شریعت میں ممنوع تھا۔ یہود کی شریعت میں انتقام لینا واجب تھا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا دانت توڑو۔ آنکھ پھوڑے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑو۔ ﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ①

غرض جیسا عمل کرے، بدلہ لینا واجب ہے۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ معافی نرم خو لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ جو تند مزاج ہوں ان کو معافی کارگر نہیں ہوتی۔ وہاں تو بدلہ لینا ہی ضروری ہوتا ہے۔ جبھی وہ سیدھے ہو سکتے ہیں۔ تو شریعت موسوی کے اندر انتقام لینا واجب تھا۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ عیسوی شریعت میں اس کا بالکل ردعمل تھا کہ نہ صرف انتقام لینا ہی جائز نہیں، بلکہ معاف کرنا واجب تھا۔

وہاں یہ تھا کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو کپڑے کا قطع کر دینا ضروری تھا۔ یہاں یہ تھا کہ اگر سارا بدن نجاست میں لت پت ہو جائے، دل کو پاک رکھو، عبادت کرتے رہو، بدن چاہے کیسا ہو، اتنی نرمی کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ شرعی احکام حسب مزاج اقوام نازل کئے گئے ہیں۔ دین اور اصول سب کے ایک رہے ہیں۔

امت محمدیہ کو اجر و ثواب زیادہ دیا گیا اور عمل کا بار کم ڈالا گیا...... جب آخر میں امت مسلمہ آئی تو یہ بوڑھی امت تھی۔ بوڑھے آدمی کے اندر عقل و تجربہ بڑھ جاتا ہے مگر عملی قوت گھٹ جاتی ہے۔ بوڑھے آدمی سے عمل ہونا مشکل ہے۔ مگر دماغ اتنا روشن ہوتا ہے کہ نوجوانوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان سے مشورہ لیں، ان کی رائے پر عمل کریں۔ وہ زمانے کا سرد اور گرم دیکھے چکے ہوتے ہیں تو کوئی تجربے کی بات بتائیں گے۔ یہ امت بوڑھی امت تھی۔ دنیا کا اختتام اسی امت کے اوپر تھا۔ گویا یہ عالم بشریت کے بڑھاپے کا دور تھا۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں طفولیت کا دور تھا۔ وہاں بچوں کے مناسب احکام تھے۔ یہاں بوڑھوں کے مناسب احکام ہیں۔ بوڑھوں کے لئے یہ ہوتا تھا کہ عمل کا بار تو ان پر کم ڈالتے ہیں مگر تحسین و آفرین زیادہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شادی بیاہ ہو، تو بڑے میاں کو کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا کام یہ ہے کہ آپ کھانے کے اوپر بیٹھے نگرانی کرتے رہیں۔ نوجوان کھانا تقسیم کریں گے، بڑے میاں صبح سے شام تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ شام کو لوگ کہتے ہیں کہ صاحب بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔ بڑی ہمت کے آدمی ہیں۔ حالانکہ صبح سے شام تک بیٹھے ہی رہے اور بڑے میاں نے کیا کیا؟ مگر کہتے ہیں کہ بڑا کام کیا اور بڑے باہمت ہیں۔ حالانکہ ایک رکابی اٹھا کر انہوں نے نہیں دی۔ غرض بوڑھوں پر عمل کا بوجھ

---

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٤٥.

کم ڈالتے ہیں۔ تحسین اور آفرین زیادہ کرتے ہیں۔

البتہ نوجوانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی رائے پر چلیں۔ اس لئے کہ ان کی رائے میں وزن ہوتا ہے۔ یہی صورت اس امت کی ہوئی کہ تمام امتوں کے احوال اس کے سامنے تھے۔ تو اس امت کا علم کامل اور تجربہ وسیع ہوا۔ پچھلی امتوں کے سامنے بعض باریک مسئلوں کے احکام نہیں تھے، وہ اسی امت کے بارے میں رائج ہوسکتے تھے اور دنیا کے بارے میں رائج نہیں ہوسکتے تھے، کیونکہ یہ امت جو تھی اس کے سامنے امت آدم، امت نوح، امت موسیٰ، امت عیسیٰ علیہم السلام کے احوال کھلے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے ایک ایک چیز روشن کردی۔ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تاریخی چیزیں واضح کردیں۔ گویا یہ امت سب کے احوال سامنے رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے یہ روشن ضمیر ہے اور اس کا علم وسیع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن اس امت کی شہادت سے دنیا کے فیصلے ہوں گے، چونکہ یہ امتوں کے احوال کو جانتی تھی، اس لئے جس امت کے بارے میں گواہی دے گی کہ یہ باطل پر تھی، وہ عنداللہ بھی باطل پر سمجھی جائے گی، عذاب وثواب کے سارے معاملات اس امت کی شہادت پر ہوں گے۔ اس لئے کہ جاننے والی امت عالم میں اس کے سوا کوئی نہ ہوگی۔ قرآن حکیم میں فرمایا ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ① "یہ امت وسط، امت معتدل بنائی گئی۔ اس کو دنیا کی امتوں کے حق میں گواہ بنایا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حق میں گواہ بنیں گے کہ میری امت نے سچ کہا"۔ بہرحال اس امت کو علم دیا گیا لیکن عمل کا بار اس پر کم ڈالا گیا۔ جتنے شاق شاق عمل پچھلی امتوں پر اتارے گئے تھے۔ اس پر عشر عشیر اور نصف بھی نہیں ہے۔ بہت ہلکے ہلکے احکام دیئے گئے مگر اجر زیادہ دیا گیا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی اور دس ہی نہیں بلکہ سات سو ملیں گی اور سات سو ہی نہیں بلکہ ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ② اللہ "جس کے لئے چاہے جتنا چاہے اجر بڑھادے"۔ تو ایک نیکی دس نیکی کے برابر اور وہ سات سو نیکی کے برابر اور وہ ہزار ہا نیکی کے برابر۔ حدیث میں فرمایا: "تَصَدَّقُوْا وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ." ③ "صدقہ کرو اگرچہ چھوہارے کی گھٹلی صدقہ کی جائے"۔ اس گھٹلی کو حق تعالیٰ پالتے ہیں۔ قیامت میں اس کو جبل احد کے برابر کرکے اس کا اجر پیش کیا جائے گا۔ لوگ حیران ہوں گے کہ اتنا بڑا اجر۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے گھٹلی صدقہ کی۔ تو گھٹلی کا جبل احد سے مقابلہ کیا جائے۔ کتنی گھٹلیاں بن سکتی ہیں، اربوں کھربوں بنیں گی۔

امت محمدیہ سے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مراعات...... مطلب یہ ہے کہ ایک گھٹلی کا اجر کروڑوں گنا زیادہ دیا گیا۔ تو اس امت پر عمل ہلکا رکھا گیا اور اجر زیادہ دیا گیا۔ اگر کوئی ایک نیکی کا ارادہ کرے، ابھی عمل نہیں کیا۔ ایک نیکی

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۴۳. ② پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق تمرۃ او کلمۃ طیبۃ، ج: ۲ ص: ۷۰۳ رقم: ۱۰۱۶.

لکھی جاتی ہے۔ اگر وہ نیکی کر لی، پھر کئی گنا بڑھا دی جاتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بدی کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جاتا تا کہ آدمی بدی کا ارادہ کرتا، ایک بدی لکھ دی جاتی۔ مگر نہیں لکھی جاتی۔ ارادے کے بعد اگر بدی سے رک گیا، تو ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے کہ یہ رکنا بھی ایک مستقل نیکی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بدی کر لی تو حدیث میں ہے کہ ملائکہ انتظار کرتے ہیں کہ ابھی مت لکھو، ممکن ہے توبہ کر لے۔ ''اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ." ① ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا''۔ اس کا حساب ہی نہیں کیا جائے گا۔ اگر اس نے توبہ کر لی تو نامہ اعمال صاف ہے گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں اور اگر توبہ نہ بھی کی آگے وعدہ دیا گیا کہ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ② تمہاری اگر نیکیاں زیادہ ہیں تو وہ خود تمہاری بدیوں کو مٹا دیں گی۔ اس کا تدارک اس طرح سے کر دیا انتہائی تسہیل اور سہولت اس امت کو دی گئی ہے کہ عمل کا بار بہت کم ڈالا گیا اور اجر بہت زیادہ دیا گیا۔ پچھلی امتوں کو یہ کہا گیا کہ اگر تم نے نبی کی نافرمانی کی، تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا۔ قوم ثمود کو حضرت جبریل علیہ السلام کی ایک چنگھاڑ نے تباہ کر دیا۔ قوم شعیب پر آگ برسا دی گئی، وہ تہس نہس ہو گئے، قوم فرعون کو دریائے قلزم میں غرق کر دیا گیا۔ تو شدید ترین عذابات آتے تھے۔

اس امت کے بارے میں رحمت اللعالمینی کا صدقہ ہے کہ گناہ بھی کر رہی ہے، برائیاں بھی کر رہی ہے۔ مبتلا بھی ہے لیکن فرمایا گیا ﴿وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ ③ اللہ اس امت کو عذاب نہیں دیں گے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہوں اور جب کہ امت میں استغفار کرنے والے موجود ہوں، تو پوری امت کو عذاب میں نہیں مبتلا کیا جائے گا۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ میری امت کا استیصال ہو جائے۔ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حقہ قائم رہے گی۔ اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ ''لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلٰلَةِ'' ④ ''میری امت ساری کی ساری مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی'' فرقے اور پارٹیاں ہوں گی، مبطل اور شکوک و شبہات نکالنے والے بھی ہوں گے۔ مگر ایک جماعت حقہ قائم رہے گی۔ وہی کام کرے گی، جو میں نے کیا۔ وہی باتیں کہے گی، جو میں نے کہیں اعتقاد و عمل کا وہی نقشہ قائم کرے گی جو میں نے کیا۔

''لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ'' ⑤ میری امت میں ہمیشہ ایک طائفہ حقہ، موجود رہے گا۔ یہاں طائفہ کا لفظ بولا۔ طائفہ چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں۔ یعنی چاہے چھوٹی جماعت ہو مگر حق پر رہے گی اور من جانب اللہ ان کی مدد کی جائے گی۔ کوئی انہیں رسوا کرنا

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ٢ ص: ٤١٩ رقم: ٤٢٥٠.

② پاره: ١٢، سورة هود، الآية: ١١٤. ③ پاره: ٩، سورة الانفال، الآية: ٣٣. ④ المعجم الكبير للطبراني، ج: ١١ ص: ٧٨. ⑤ السنن للترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء في ائمة المضلين ج: ٨ ص: ١٧٢.

چاہے گا نہیں کر سکے گا۔ لوگ ان کی مخالفت کریں گے، مگر وہ حق سے نہیں ہٹے گی اور برابر آگے چلے گی"۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے اس امت کو بہت سی سہولتیں دی گئی ہیں۔ نیکیوں میں اجر و ثواب کی، بدیوں میں معافی کی، اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں ہیں۔

وحدت دین اور اختلاف شرائع کا قرآن سے ثبوت...... غرض میرا مطلب یہ تھا کہ دین از آدم تا ایں جا ایک ہے۔ آج تک وہی دین ہے، شریعتیں مختلف ہیں۔ تمام انبیاء کا دین ایک ہی رہا۔ یعنی توحید خداوندی، اسی توحید سے پھر سارے اعمال پیدا ہوئے۔ اسی کو فرمایا گیا "کَانَ دِیْنُ الْاَنْبِیَآءِ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" (1) یعنی دین ایک اور شریعتیں مختلف، اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم میں اس کا اشارہ نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دین کے بارے میں ارشاد ہے وہاں فرمایا ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَاوَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَاتَتَفَرَّقُوْافِیْہِ﴾ (2) "ہم نے جو وصیت حضرت نوح علیہ السلام کو کی تھی۔ وہی وصیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کی وہی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کی کہ دین قائم کرو۔ اس میں تفریق مت ڈالو"۔ وہ اول سے لے کر آخیر تک ایک تھا۔ ﴿شَرَعَ لَکُمْ﴾ کے لفظ میں مجموعہ استعمال کیا گیا کہ تم سب کے لئے اللہ نے ایک دین کو مذہب کر دیا دین میں تفریق نہیں ہے۔

اور شریعت کے بارے میں فرمایا ﴿لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا﴾ (3) "تم میں سے ہر ایک جماعت اور امت کے لئے ہم نے شریعتیں اور راستے مختلف بنا دیئے"۔ جہاں دین کا لفظ ہے، وہاں مجموعے کو کہا گیا کہ تمہارے لئے ایک دین ہے اور جہاں شریعتوں کا ذکر ہے وہاں ﴿لِکُلِّ اُمَّۃٍ﴾ فرمایا ہر طبقہ اور ہر امت کے لئے فرمایا۔ غرض قرآن کریم سے بالکل تائید ہوتی ہے کہ دین واحد اور شریعتیں مختلف ہیں اور مزاج اقوام کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔

فقہ میں اختلاف مشرب ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے...... اب ظاہر بات ہے کہ یہ شریعت تو ایک ہی ہے۔ کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، کوئی نئی کتاب آنے والی نہیں، نئی شریعت آنے والی نہیں۔ ذات نبوی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن کریم خاتم الکتب ہے، شریعت اسلام خاتم الشرائع ہے۔ ہر چیز اس دین کی مختتم، اختتامی اور انتہائی ہے کہ اس کے بعد کوئی نئی چیز آنے والی نہیں ہے۔ مگر اقوام کے مزاج تو مختلف ہیں، بیشک دین

---

(1) ذکر الحافظ ابن رجب الحنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ ان دین الانبیاء کلھم واحد وھو الاسلام. فتح الباری، کتاب الایمان ج: ۱ ص: ۷.

(2) پارہ: ۲۵، سورۃ الشوری، الآیۃ: ۱۳.

(3) پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۸.

اور شریعت تو ایک ہے لیکن جب یہ دنیا کی مختلف اقوام کیلئے پیغام ہے اور قوموں کے مزاج الگ الگ ہیں۔ یورپین اقوام کا مزاج اور ہے، ایشین کا اور، افریقیوں کا اور۔ اور ہم سب کے لئے ایک ہی شریعت ہے۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شریعت کے اندر ایسے آئمہ ہدایت پیدا ہوں، جو مزاج اقوام کے مناسب شریعت کو سمجھائیں۔ آئمۂ ہدایت مختلف ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام ابن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ یہ چار ائمہ تو چانداور سورج ہیں کہ پورے عالم میں ان کی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور بہت سے ائمہ تفقہ ہیں۔ امام بخاریؒ، حماد بن سلمہ، سفیان ثوری، سفیان ابن عینیہؒ یہ سب صاحب فقہ تھے۔ مگر ان سب کے فقہ دب گئے اور ان چار آئمہ کے فقہ اوپر آ گئے اور عام طور پر دنیا میں انہیں کو فقہاء مانتے ہیں۔ پوری ترکی، پورا افغانستان، ہندوستان کا ایک بڑا حصہ حنفی ہے۔ مغربی ممالک میں اکثریت مالکیوں کی ہے، نجد میں حنابلہ کی اکثریت ہے اور حجاز و مصر میں شوافع کی اکثریت ہے۔ غرض پوری دنیا انہی چار فقیہوں کے اندر گھری ہوئی ہے۔ انہیں چار کا مجموعہ اہلسنت والجماعت کہلاتا ہے۔ گویا اس وقت اہل السنّت والجماعت پوری دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ انہیں کا مذہب رائج ہے۔

تو انبیاء آ نہیں سکتے تھے۔ نئی کتاب نہیں آ سکتی تھی مگر قرآن کریم کو اللہ اتنا جامع بنایا کہ اس کے اندر فقہیں مختلف نکل آئیں۔ ہر فقہ ہر قوم کے مناسب ہے، ایک فقہ شافعی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس پر عمل کرے۔ فقہ حنفی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس کا پابند ہو جائے۔ فقہ مالکی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہے وہ اس کا تابع ہو جائے۔ اسی طرح فقہ حنبلی ہے۔ غرض ایک شریعت اصلی ہے۔ ایک شریعت فروعی ہے۔ اصلی شریعت تو ایک ہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مرحمت فرمائی اور شرائع مختلف ہیں یعنی اجتہادی امور میں اختلاف ہے۔ ائمہ سلف و آئمہ ہدایت نے دنیا میں پیش آنے والے واقعات وحوادث کے لئے قرآن وحدیث سے احکام نکالے۔ جو خود ایک مستقل فقہ بن گیا۔ ان فقہوں میں ظاہر ہے کہ مزاجوں کا دخل ہے۔ اس لئے جس مزاج کی قوم ہوگی۔ اس فقہ کی طرف چل پڑے گی، جبکہ وہ سب کے سب حق پر ہوں گے اور عنداللہ قبول ہوں گے۔

تصوف میں اختلاف مسلک ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے...... یہی صورت صوفیاء میں بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ صوفیاء کا جو اصل بنیادی طریقہ ہے، جس کو احسانی سلوک کہتے ہیں، وہ ایک ہی ہے اور وہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ قلب کو پاک بناؤ، ذکر اللہ کی کثرت کرو۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اب قلب کو پاک بنانے کے طریقے کیا ہیں؟ اس میں تجربات ہیں کہ چشتیہ نے اور طریقہ رکھا، نقشبندیہ نے اور طریقہ رکھا، سہروردیہ نے اور طریقہ رکھا۔ یہ درحقیقت قلوب کو مانجھنے کی تدابیر ہیں۔

جب قلوب منجھ گئے، تو آگے ذکر اللہ وہی ہے جو قرآن وحدیث میں ہے۔ ان حضرات نے کوئی ذکر نیا تجویز نہیں کیا وہی اذکار عشرہ ہیں۔ تسبیح، تحمید، تمجید، تھلیل، تکبیر ہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" تو حوقلہ، تعوّذ،

تسمیہ، استغفار اور درود شریف یہ سب کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ تمام طرق کے حضرات یہی اذکار بتلاتے ہیں۔ البتہ ان کے طریقے الگ الگ ہیں کہ اس کا دل کدھر چل رہا ہے۔ اس کو مانجھا جائے' مانجھنے کے طریقے الگ ہیں، ریاضات ومجاہدات الگ الگ تجویز کیئے۔ مگر وہ تدابیر کا درجہ ہیں۔ اگر کوئی ان کے خلاف کرے تو یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس کو عین دین نہیں کہتے۔ دین کی ایک تدبیر کہتے ہیں۔ بہرحال فقہ میں دیکھو تو مشرب مختلف ہیں۔ تصوف میں دیکھو تو مشاغل مختلف ہیں۔ فقہ وتصوف میں دیکھو۔ تو علماء کے مسالک مختلف ہیں مگر بنیاد سب کی ایک ہے۔

ابلاغ وتبلیغ کے طریقے مختلف ہوتے رہے مگر سب کا ماخذ ایک رہا...... یہی صورت بعینہ دین کے ابلاغ وتبلیغ میں اب واقع ہوئی۔ دین کو پہنچانا، وہ تو ایک ہی ہے، جیسے آپ پہنچائیں گے۔ وہی اذکار، وہی نماز، وہی روزہ، زکوٰۃ، حج اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے پہچانے کے لئے ڈھنگ کیا اختیار کیا جائے؟ کہ کڑوی دوائی کیپسول کے بیچ میں رکھ کے نگلوادی جائے۔ اس میں تدابیر کے طور پر طریقے مختلف ہیں۔ پھر تدابیر کے درجے مختلف ہوتے رہے ہیں لیکن تدبیروں سے جو چیز پہنچائی گئی، وہ ایک ہے۔ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

اب مثلاً مسلمانوں میں ابتدائی دور میں روایت پر زیادہ زور تھا کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت صحیح نہ ہو، لوگ نہیں مانتے تھے۔ اس واسطے اللہ نے محدثین پیدا کیئے۔ انہوں نے روایتوں کی چھان بین کر کے کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا۔ اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا، جس میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخیں مرتب کیں، جو راویان حدیث ہیں۔ ان کے خاندان، کیریکٹر وکردار، حافظہ، ضبط اور ان کی عدالت پر تمام چیزیں لکھیں گویا پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمری مرتب کی۔

پھر علم منکرات الحدیث مرتب کیا کہ حدیث کے بھی درجات ہیں۔ قوی، صحیح، ضعیف، متروک، مجہول وغیرہ یہ اصطلاحات مقرر کیں کہ سند متصل ہے تو حدیث مرفوع متصل کہلائے گی۔ اگر بیچ میں منقطع ہوگئی۔ تو اگر صحابی پر منقطع ہوگئی تو مرسل کہیں گے، وغیرہ۔ اصطلاحات مقرر کر کے ایک کانٹا اور میزان بنادی کہ حدیث میں غیر حدیث نہ شامل ہو سکے۔ اس میزان پر دیکھ لو۔ کھری چیز الگ ہو جائے گی اور کھوٹ الگ ہو جائے گا۔ تو ابتدائی دور میں زیادہ زور روایت پر تھا۔ تو روایت اور فن تاریخ کے اصول مدون کیئے گئے۔ روایتی طور پر دین کو نکھار کر کے پیش کر دیا گیا، لوگوں نے قبول کیا۔

پھر ایک زمانہ درایت کا آیا کہ روایتیں تو کتابوں میں جمع ہوگئیں، یکجا ہوگئیں۔ لیکن ان روایتوں سے مسائل اور احکام کا نکالنا، اس میں اجتہاد کی ضرورت تھی۔ یہ دور ائمہ مجتہدین کا دور تھا۔ تو ائمہ مجتہدین نے مسائل کا استنباط کیا، یہ معلوم کیا کہ حکم نبوی کی علت کیا ہے جس پر یہ حکم دائر ہے۔ اس علت کو نکالا۔ اس علت میں اختلاف پڑا۔ فرعیات میں اختلاف پڑتا چلا گیا۔ تو مذاہب میں اختلاف پیدا ہوا۔ مگر کل کے کل حق پر رہے۔ اس لئے کہ سب کا

ماخذ کتاب وسنت ہے۔ یہ دور اجتہاد کا تھا۔ اس میں روایت پر زور نہیں تھا یہ دیکھتے تھے کہ تفقہ وفقہ کیسا ہے۔ جب تفقہ اور درایت معلوم ہوتی تب لوگ قبول کرتے تھے۔

پھر ایک زمانہ صوفیت پسندیت کا آیا۔ کہ جب تک قرآن وحدیث کو صوفیانہ رنگ میں نہ سمجھاؤ، لوگ سمجھتے نہیں تھے۔ پورے عالم پر صوفیت چھا گئی تھی۔ امام غزالیؒ شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے قرآن وحدیث کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا۔ بہر حال ڈھنگ بدلتے رہے۔ قرآن وحدیث وہی رہا۔ لیکن سمجھانے کے طریقے الگ الگ ہوگئے۔ فروعات الگ الگ ہوگئیں، مگر ماخذ سب کا ایک تھا۔ بنیاد سب کی ایک تھی۔ اس لئے سب کے سب اہل حق تھے۔

اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا کہ عقلیات سے جب تک نہ سمجھاؤ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ تو شاہ ولی اللہ اور امام غزالیؒ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے دین کو عقلی رنگ میں سمجھایا اور جہاں نقلی دلائل تھے، وہاں عقلی دلائل بھی پیش کئے۔ مگر عقل کو نقل کے تابع رکھا۔ عقل، دین کے تابع ہے، دین پر حاکم نہیں ہو سکتی، حاکم دین رہے گا، اس کے خادم کے طور پر عقل بھی چلے گی۔ دین ایک دعویٰ کرے گا، عقل اس کی تائید کر کے اسے ثابت اور واضح کرے گی، خدمت کرنا یہ عقل کا کام ہے۔ اس لئے عقل کو خادم دین بنایا گیا۔ تو یہ دور ایسا تھا کہ جب تک عقلیات سے نہ سمجھاؤ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے بعد سائنس کا دور آیا۔ یہاں عقلیات سے زیادہ حسیات ہیں۔ محسوس چیز سے کسی چیز کو سمجھاؤ، تب لوگ سمجھتے ہیں۔ اللہ نے پھر ایسے علماء کرام پیدا کئے، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت مولانا نانوتوی، رحمہما اللہ تعالیٰ ان لوگوں نے محسوسات کے انداز سے دین کو سمجھایا اور حسی مثالوں سے واضح کیا کہ دین حق ہے۔ گویا دین ایک دعویٰ کرتا ہے، محسوسات اس کی خدمت کرتے ہوئے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ جو لوگ منکر تھے، وہ سن کر مجبور ہوئے۔ مثلاً معراج کا مسئلہ تھا۔ تو قدیم فلاسفہ کہتے تھے کہ یہ محال ہے، یہ ممکن نہیں، بالکل صاف انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بیچ میں کرہ نار ہے وغیرہ۔ اس سے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذہ معراج ہو نہیں سکتی۔ اب جب لوگ چاند تک پہنچ گئے اور چاند کی مٹی کھود لائے، اب لوگ معراج کو ماننے پر مجبور ہوئے کہ حسیات میں ایک نظیر آ گئی، تو خواہ مخواہ مجبور ہوئے کہ معراج بھی حق ہے۔ جب مادی وسائل سے آپ چاند تک پہنچ سکتے ہیں، تو روحانی وسائل ان سے کہیں زیادہ قوی ہیں۔ ان سے کیوں نہیں پہنچ سکتے؟۔ حاصل یہ نکلا کہ دین دعوے کرے اور مغربیت پسند اس کو ثابت کریں تا کہ ان پر حجتیں تمام ہوں اور وہ جھک مار کر ماننے پر مجبور ہوں۔

ہمارے ہاں انور صابری ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ جب یہ لوگ چاند سے لوٹ کر آئے تو اس نے ایک نظم لکھی، اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد رہ گیا، وہ کہتا ہے کہ ؎

سفر سے چاند کے لوٹے جو منکر معراج ۔۔۔ شکست عقل نے کھائی بڑے غرور کے بعد

عقل انکار کرتی تھی۔ اب اسے جھک مار کے ماننا پڑا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ بیت اللہ تیار کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اعلان عام کردو۔ لوگو! بیت اللہ بن گیا ہے، آ کر حج کرو۔

عرض کیا یا اللہ! میری آواز کیسے پہنچے گی؟ فرمایا تم آواز لگاؤ، ہم پہنچائیں گے۔ تو مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا کہ: اے لوگو! بیت اللہ تیار ہو گیا ہے، حج کرو۔ حدیث میں ہے کہ: جن جن کی قسمت میں حج تھا۔ انہوں نے لبیک کہا۔ حتیٰ کہ جو ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے انہوں نے بھی لبیک کہا اور فرمایا گیا، جس نے جتنی دفعہ لبیک کہا، اتنے ہی حج اس کے لئے مقرر ہو گئے، دس دفعہ کہا تو دس حج، بیس دفعہ کہا تو بیس حج۔

اس پر لوگ اعتراض کرتے تھے کہ بھلا یہ ہو کیسے ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آواز مقام ابراہیم سے پوری دنیا میں پہنچ جائے گی؟ لاؤڈ اسپیکر نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ آج لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ایک آدمی بولتا ہے تو مشرق سے مغرب تک سب جگہ آواز پھیل جاتی ہے۔ جب مادی وسائل میں اللہ نے قوت دی ہے کہ ایک آواز پورے عالم میں پھیل جائے تو روحانی وسائل میں یہ طاقت کیوں نہیں ہو سکتی؟ کہ آدمی روحانی قوت سے پورے عالم میں آواز پہنچا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی روحانی قوتوں سے وہ سب کام کرتے ہیں، جن کی حسی مثالیں آج مادی قوتوں سے دی جا رہی ہیں۔ اب امت کا مزاج اس پر ہو گیا کہ جب تک دین حسی مثالوں سے نہ سمجھایا جائے۔ لوگ نہیں سمجھتے۔ اللہ نے ایسے علماء کھڑے کر دیئے کہ حسی مثالوں سے انہوں نے دین کو سمجھایا۔

تو عقل کا دور آیا تو عقلاء حس کا دور آیا تو سائنس دان کھڑے ہوئے، صوفیت کا دور آیا تو متکلمین کھڑے ہو گئے۔ درایت کا دور ہوا تو فقہاء کھڑے ہو گئے۔ روایت کا دور آیا تو محدثین کھڑے ہو گئے۔ غرض دین ہر حالت میں چلتا رہا اور ہر شعبے میں نمایاں ہوتا رہا۔

جمہوریت پسندی کے زمانے میں دعوت و تبلیغ جماعتی طور پر مؤثر ہے...... اب یہی صورت تھی کہ دین کو دوسروں تک کس انداز میں پہنچایا جائے، تبلیغ کی جائے تو کس انداز سے کی جائے۔ دعوت دی جائے تو کس انداز سے دی جائے۔ یوں تو علماء دعوت دیتے آ رہے تھے اور سلسلہ دعوت برابر جاری تھا۔ مگر زمانے کے حالات ہوتے ہیں۔ آج کل جمہوریت پسندی کا زمانہ ہے۔ جب تک کسی چیز کو جماعتی طور پر پیش نہ کیا جائے، لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک آدمی کتنا ہی ثقہ اور بڑے درجہ کا ہو، وہ کہہ رہا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک آدمی کی بات ہے۔ دو ہوں تو کہتے ہیں کہ خیر اور جب جماعت ہو تو جھک مار کے مجبور ہوتے ہیں کہ جماعت مل کر غلط کیسے کرے گی؟ بہر حال انفرادی طور پر برابر علماء دین پہنچاتے رہے۔ اگر نہ پہنچاتے تو آج مسلمان آپ کے سامنے کہاں سے آتے؟ انہی کی محنتوں کا صدقہ ہے کہ آج ہم فخریہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ستر کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ لیکن دین کے راستے تو بند نہیں۔ آئندہ بھی دین کو پھیلنا ہے۔

جماعت میں مادی اور روحانی قوت ہوتی ہے...... اب راستہ یہ آ گیا کہ جب تک کوئی کام جماعتی طور پر نہ ہو، لوگ نہیں مانتے۔ مادی چیزوں میں حتیٰ کہ کھیل کود میں بھی ٹیمیں بنتی ہیں۔ ہندوستان کی ہاکی کی ٹیم پاکستان کھیلنے جارہی ہے اور پاکستان کی ٹیمیں ہندوستان آ رہی ہیں۔ وکلاء کو دیکھو تو ان کی ایک ٹیم ہے۔ ججوں کا ایک طبقہ ہے مزدوروں کی ایک جماعت ہے۔ اگر مزدوروں کو کوئی شکایت ہو ایک آدمی شکایت کرے، کوئی نہیں مانتا۔ لیکن اگر یونین بنالیں تو جھک مار کے مانتے ہیں، ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تو آج کا دور ہی جماعتی رنگ کا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آج کس قسم کی جمہوریت ہے۔ اسلام نے کس قسم کی جمہوریت پھیلائی ہے، وہ الگ بحث ہے، اس میں ہم پڑنا نہیں چاہتے، مگر بالا جمال یہ ہے کہ جب تک جمہوریت اور جماعتی رنگ پیش نہ ہو، وہ چیز قابل قبول نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے اوپر مطمئن نہیں ہوتے، زمانے کے حالات ہیں۔ اب اگر دین پہنچانے ایک آدمی جائے، تو لوگ کہتے ہیں کہ ہاں بھئی! نیک آدمی ہے۔ لیکن اگر جماعت چلی جائے، تو دباؤ پڑتا ہے کہ ہے کچھ بات قرآن نے اس کی اصل بتلائی ہے۔ فرمایا ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلاً اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ﴾ ① ''اے پیغمبر! آپ اصحاب قریہ کی مثال بیان کر دیجئے''۔ ایک خاص قریہ اور بستی کے لئے فرمایا گیا کہ آپ مثال بیان کر دیجئے۔ ﴿اِذْ جَآءَ هَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ ② جبکہ اللہ کے نبی اس کے اندر ہدایت کرنے کے لئے پہنچے آگے فرمایا ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ.﴾ ③ ''ہم نے اس قریہ میں دو رسول بھیجے کہ جا کے ہدایت کرو۔ تبلیغ کرو۔ اللہ کے احکام پہنچاؤ''۔

﴿فَكَذَّبُوْهُمَا﴾ ④ ''ان دونوں کو انہوں نے جھٹلا دیا''۔ فرماتے ہیں۔ ''فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ'' ''ہم نے انہیں قوت دی اور ایک تیسرے کا اضافہ اور کیا''۔

اب جماعتی حیثیت ہوگئی۔ ''اَلْاِثْنَانِ اَوْفَوْقَهُمَا جَمَاعَةٌ.'' ⑤ ''دو آدمی یا اس سے بڑھ جائیں، تو جماعت کے حکم میں آ جاتے ہیں''۔ جماعت کا رد کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ فرد واحد کی بات کو آپ رد کر سکتے ہیں کہ شاید یہ شک یا شبہ میں پڑ گیا ہوگا۔ لیکن جب تین چار مل کر کہیں گے اور ایک دوسرے کی تائید کریں گے۔ پھر یہ وسوسے قطع ہو جاتے ہیں کہ اس سے غلطی ہوگئی ہوگی۔ غلطی ہوتی تو چار مل کر غلطی پر کیسے قائم ہوتے؟ عقلاً و عادۃً محال ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں جو تعدد پیدا کیا گیا، وہ اس لئے نہیں کہ ایک نبی کی قوت کافی نہیں۔ انبیاءؑ سارے کے سارے جامع کمالات ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر روحانیت میں کون قوی ہو سکتا ہے؟ تو جہاں تک قوت حق کا جان لینا ہے۔ اس کے لئے ایک نبی بھی کافی ہے۔ پھر یہ ایک کے ساتھ دوسرا کیوں بھیجا گیا؟ عوام کی رعایت کی گئی کہ وہ مان لیں۔ ورنہ فی نفسہ ایک نبی کافی ہے۔ مگر جب دو کو بھی جھٹلایا گیا، تو فرمایا: ﴿فَعَزَّزْنَا

---

① پارہ: ۲۲، سورة یٰس، الآیة: ۱۳ . ② پارہ: ۲۲، سورة یٰس، الآیة: ۱۳ .

③ پارہ: ۲۲، سورة یٰس، الآیة: ۱۴ . ④ پارہ: ۲۲، سورة یٰس، الآیة: ۱۴ .

⑤ السنن لابن ماجه، کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها، باب الاثنان جماعة ج: ۳ ص: ۲۳۸ .

بِثَالِثٍ ﴾ (۲) ''ہم نے تیسرے کا اور اضافہ کیا''۔اب جماعت بن گئی۔ جماعت کا جھٹلانا انسان کی عقل سے باہر ہوتا ہے۔کتنا بھی معاند ہوگا مگر جب جماعت کہے گی تو کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا کہ بھئی کچھ بات سچی معلوم ہوتی ہے۔سارے آدمی مل کر جمع ہو کر آئے ہیں۔تو جماعتی حیثیت غالب ہوتی ہے۔اور ایک حدیث میں بھی ہے کہ ''یَدُاللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ'' اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔یعنی قوت خداوندی جماعت کی پشت پر ہوتی ہے۔فردِ واحد سے الگ رہ سکتی ہے مگر جماعت کے اوپر ہوتی ہے۔

حتی کہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں،حدیث تو نہیں ہے، تجرباتی بات ہے۔کہ اگر چالیس مسلمان جمع ہوں، ان میں کوئی نہ کوئی ایک آدھ ضرور مقبول خداوندی ہوتا ہے۔ چالیس آدمی جب آئیں گے تو ایک کی مقبولیت سب میں کام کرے گی اور اس چیز کو مقبول بنادے گی۔ بہر حال تعداد اور جماعتی رنگ میں ایک برکت کا اثر ہے۔مادی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی،مادی تو یوں کہ جب افراد بڑھ گئے،انکار کی گنجائش نہیں رہی اور روحانی طور پر اس طرح کہ جتنے اہل حق بڑھ جائیں گے،حق ہی کو قوت پہنچے گی۔حق میں اضافہ ہوگا۔غرض جماعت ہی ایک ایسی چیز ہے جو مادی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے اور روحانی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے۔

جماعت تبلیغ کی برکت سے عمل کا ماحول پیدا ہو گیا...... ہمارے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے قلب پر اللہ نے تبلیغ کو ایک فن کی صورت میں القاء فرمایا۔تبلیغ ہو رہی تھی،علماء دعوتیں بھی دے رہے تھے۔مولانا کے قلب پر اللہ نے الہام فرمایا اور انہوں نے ایک طریقہ مقرر کیا، جو اس زمانے میں موثر ہو اور اس میں جماعتی رنگ ہو کہ ایک ایک فرد نہ جائے،جماعتیں جائیں،لوگوں کو گھروں سے نکال کر لائیں اور جماعت بناؤ، جماعتی طور پر جب آپ گشت کریں گے اور جماعت ایک زبان ہو کر ایک ہی بات کہے گی،قدرتی طور پر اس کا اثر پڑے گا۔کوئی معاند ہو،کوئی دشمن ہو نہ مانے،دنیا میں ہر زمانے میں معاند اور دشمن رہے ہیں۔مگر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔عقل والوں کا اعتبار ہے۔عقلمندوں کے سامنے جماعتی حیثیت کبھی نظر انداز ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ تو مولانا کے قلب پر اللہ نے اس طریقے کو القاء فرمایا۔

جب انسان جماعت کے ساتھ چل پڑتا ہے۔تو گھر میں عمل سے روکنے والی چیز گھر کی آسائشیں اور راحتیں ہی تو ہوتی ہیں۔گھر میں آرام کرتا ہے تو کبھی نماز چھوٹ گئی،کبھی کوئی عمل چھوٹ گیا۔لیکن جب گھر سے نکل گیا تو سامان راحت ہی منقطع ہو گیا۔اب سوائے اللہ کے نام کے اور کوئی کام باقی نہیں رہ گیا کہ خواہ مخواہ آدمی اللہ ہی کا نام لے۔گھر سے نکل کر جب مسجد میں آ گیا۔اب اللہ کا نام نہیں لے گا تو اور کیا کرے گا؟ گویا عمل کرنے اور اللہ کا نام لینے پر مجبور کر دیا۔تو فقط یہی نہیں کہ دعوت الی اللہ کی جماعتی صورت قائم کی بلکہ ایک عملی صورت بھی قائم کر دی کہ ہر شخص عبادت پر مجبور ہو۔

---

(۱) پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴۔

اس واسطے کہ ماحول کا ایک اثر پڑتا ہے۔ ماحول جب اللہ والوں کا ہوتا ہے، تو آدمی خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ علیہ بارات کے سلسلہ میں تھانہ بھون گئے تھے۔ ایک شادی میں شرکت کرنی تھی۔ جیسے بارات والوں کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ ہو تو اس سے ملتے جاتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ تھانہ بھون میں موجود تھے۔ باراتیوں نے کہا کہ چلو بھئی! حاجی صاحب سے بھی مل لیں، بزرگ آدمی ہیں۔ مولانا گنگوہی حاضر ہوئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ نے مولانا گنگوہیؒ کو فراستِ باطنی سے پہنچالیا کہ اس شخص کے قلب کے اندر کوئی جوہر موجود ہے۔ خود فرمایا کہ کسی سے مرید بھی ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں، فرمایا مجھ سے ہی ہو جاؤ۔ یعنی کس تیقن سے فرما رہے ہیں کہ مجھ سے ہی مرید ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ: مرید ہونے کے لئے میں آیا نہیں۔ میں تو بارات میں آیا ہوں۔ فرمایا: ان دونوں میں کوئی تضاد تھوڑا ہی ہے؟ ٹھیک ہے بارات میں آئے تھے۔ اب مرید ہو جاؤ۔ انہوں نے کہ میں مرید ہو جاؤں گا تو آپ کہیں گے یہاں رکو اور اللہ اللہ کرو۔ یہ میرے لئے بڑا مشکل ہے۔ میں بچوں کو پالوں گا یا یہاں بیٹھ کر ذکر اللہ میں مشغول رہوں گا۔ فرمایا: یہ تو ہم نہیں کہتے کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اب حضرت حاجی صاحبؒ بار بار فرما رہے ہیں کہ تم بیعت ہو جاؤ اور مولانا گنگوہی بار بار انکار کر رہے ہیں۔ لیکن بالآخر بیعت ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ: بس ایک چالیس دن میرے پاس ٹھہر جاؤ۔ عرض کیا۔ اسی لئے میں بیعت نہیں ہوتا تھا کہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔ فرمایا: بیس دن ٹھہر جاؤ۔ انہوں نے کہ میرے پاس بیس دن بھی نہیں ہیں۔ فرمایا: دس دن ہی ٹھہر جاؤ۔ ہوتے ہوتے آخر تین دن پر بات آئی کہ میں تین دن ٹھہر جاؤں گا۔

مجھے سنانا یہ تھا کہ بارات تو رخصت ہو گئی، مولانا گنگوہیؒ آ کر تین دن کے لئے خانقاہ میں مقیم ہو گئے رات کو جب تین بجے کسی نے تہجد پڑھا۔ کسی نے ذکر اللہ کیا۔ اب پڑے پڑے شرم آئی کہ سارے تو اللہ اللہ کر رہے ہیں اور میں پڑا سوتا ہوں، تو خود بھی اٹھ کر وضو کیا اور چار رکعات پڑھیں۔ اگلے دن ارادہ کیا کہ اب میں نہیں پڑھوں گا، چاہے کوئی اٹھے نہ اٹھے۔ تو سو گئے۔ جب رات کے تین بجے لوگ اٹھے، تو ارادہ کیا کہ میں نہیں اٹھوں گا، مگر ماحول سے مجبور تھے، اٹھنا پڑا۔ تو کچھ تہجد پڑھی۔ اللہ اللہ بھی کیا۔ جب اسی طرح تین دن ہو گئے اور قلب پر اس کا اثر نمایاں ہوا، تو حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا۔ حضرت اگر آپ اجازت دیں تو کچھ اور ٹھہر جاؤں؟ فرمایا: ہم نے تو ٹھہرنے کو نہیں کہا تھا۔ تمہاری مرضی ہے۔ پھر دس دن ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ پھر بیس دن، پھر یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن یا کتنے دن وہاں ٹھہرے۔ لیکن بہر حال خلافت لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔ تو مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ایک جماعت کا رنگ بنایا' وہاں ایک ماحول بھی تیار کیا۔ اس ماحول کے اثر سے آدمی مجبور ہو گا کہ آدمی ذکر اللہ کرے۔

ماحول کا اثر ...... میں نے اپنی عمر میں تین ماحول دیکھے ہیں۔ ایک دار العلوم دیو بند کا ماحول، ایک گنگوہ کا ماحول

اور ایک تھانہ بھون کا ماحول۔ میری عمر آٹھ نو برس کی تھی۔ تو گنگوہ کا ماحول یہ تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ روئں روئں سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی ہے۔ ہر ایک سے ذکر اللہ، ہر ایک سے اللہ اللہ۔ اس کا اثر کیا تھا؟

گنگوہ میں خانقاہ کے سامنے ایک بہت بڑا تالاب ہے اور شہر کے سارے دھوبی اس میں کپڑے دھوتے ہیں۔ تو ساٹھ ستر دھوبیوں کے کپڑے وہاں رکھے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے مٹی کے کنڈے رکھے ہوئے ہیں۔ جس پر وہ کپڑوں پر پانی ڈال کر مارتے ہیں۔ اب دھوبی بے چارے بے پڑھے لکھے جاہل، جو کسی چیز سے واقف نہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ انہوں نے کپڑا اچھالا اور اس پر مارا، اور ہر ضرب کے ساتھ اِلَّا اللّٰہُ، اِلَّا اللّٰہُ سارا تالاب گونج اٹھتا، حالانکہ وہ جاہل اجہل تھے۔ لیکن یہ ماحول کا اثر تھا۔ خانقاہ سے جو ہر وقت اللہ اللہ کی اواز آتی تھی۔ تو دھوبیوں میں بھی وہ اللہ اللہ کی آواز چل پڑی۔ وہ بھی ہر ضرب کے ساتھ اِلَّا اللّٰہُ کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ تو وہاں کے ماحول کا اثر تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں یہ دیکھا کہ وہاں بے نماز رہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہر نماز کے لئے ایک ڈیڑھ ہزار آدمی حجروں سے نکل کر مسجد میں آئے گا، تو کوئی کہاں تک بے نماز رہے گا، خواہ مخواہ شرما شرمی نماز پڑھے گا۔ تو یہاں بے نمازی رہنا بڑا مشکل ہے۔ اتفاقاً کسی کی قضاء ہو جائے، وہ الگ چیز ہے۔ لیکن تارک نماز بن جائے، یہ ممکن نہیں یہ ماحول کا اثر ہے، نماز پڑھنے پر مجبور ہے۔

تھانہ بھون کا یہ ماحول تھا کہ معاملات کی سچائی، دیانت اور تقویٰ۔ وہاں ہر طرح کے لوگ مقیم تھے امیر، بھی غریب بھی۔ کسی حجرے کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی تالا لگا کر گیا ہو۔ ایک شخص کو بھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں تعلیم یہ ہوتی تھی، دیانت اور تدین پر قائم رہو۔ ایک دوسرے کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے حتی کہ اگر کسی کی کوئی چیز گر گئی، اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر حفاظت سے رکھو۔ یہیں پڑی رہنے دو۔ ممکن ہے وہ چیز والا آئے اور وہاں سے اٹھا کر لے جائے۔ ایک شخص تولیہ بھول گیا' تین دن تک مسجد کے فرش پر پڑا رہا۔ تیسرے دن وہ آیا اور اپنا تولیہ اٹھا کر لے گیا۔ یہاں دیانت، صفائی اور سچائی معاملات پر زور تھا۔ یہاں کے ماحول میں بد دیانت رہنا مشکل تھا۔

دارالعلوم کے ماحول میں بے نماز رہنا اور گنگوہ کے ماحول میں رہ کر غافل رہنا مشکل تھا۔ ذکر اللہ کی کچھ نہ کچھ توفیق ہوتی تھی۔ ماحول کا قدرتی اثر ہوتا ہے، جو قلب کے اوپر پڑتا ہے۔ یہ مولانا مرحوم کی فراست باطنی تھی کہ جماعتی حیثیت قائم کر کے ایک ماحول بنایا۔ گھروں سے نکل کر اللہ کے گھر میں لوگ جمع ہوں۔ کوئی چلہ دے گا، کوئی دو چلے دے گا، کوئی دس دن، کوئی بیس دن ایک جگہ جمع ہوں گے، اب جب سارے مل کر ذکر اللہ کریں گے تو ایک آدمی کیسے ان سے غافل رہے گا۔ وہ خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوگا۔ تو عمل کا راستہ بھی ڈال دیا، فقط تعلیم و تربیت ہی کا راستہ نہیں، بلکہ عملی راہ بھی ہموار کر دی۔ تو جماعتی حیثیت اس لئے ڈالی تاکہ لوگ اس کو قبول کریں۔ انفرادی بات کم قبول کرتے ہیں اور ماحول اس لئے بنایا کہ جماعت کے لوگوں میں خود دین راسخ ہو، یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت میں جانے والے کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ پہلے بے نماز تھے، اب

نمازی بن گئے۔ یہ تھوڑا اثر ہے؟ قدرتی من جانب اللہ اثر ہے۔ جب اس صحبت اور ماحول میں آئے گا، ممکن نہیں کہ آدمی اثر قبول نہ کرے۔

حدیث شریف میں نیک صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی گئی ہے۔ عطار کی دکان سے اگر آپ عطر نہ بھی خریدیں، کم سے کم خوشبو تو آ ہی جائے گی۔ دماغ میں فرحت تو ہو ہی جائے گی۔ اور بری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی گئی ہے۔ لوہار کی دکان پر جاؤ گے تو کالک ہی کپڑوں کے اوپر لگ جائے گی۔ کوئی پتنگا ہی آ لگے گا، کپڑا ہی جل جائے گا۔ کچھ نہ کچھ مضرت پہنچے گی۔ تو نیک صحبت سے ہمیشہ پاکیزہ اثرات پھیلتے ہیں اور بری صحبت سے برے اثرات پھیلتے ہیں۔

جماعت میں تربیت باطن بھی ہوتی ہے..... حضرت مولانا نے نیک صحبت کا ڈھنگ ڈال دیا کہ آدمی خواہ مخواہ ہی نیک بنے۔ ارادہ نہ بھی کرے، تب بھی نیک بننے پر مجبور ہوگا۔ کچھ ذکر اللہ، نماز اور روزے میں لگا، کچھ دیانت پیدا ہوئی، کایا پلٹ گئی۔ اتنے حالات بدل گئے تو اور آپ کیا چاہتے ہیں؟۔ پھر ایثار اور ایثار کے ساتھ قناعت۔ ان چیزوں کی بھی تعلیم موجود ہے جو تربیت باطن ہے۔

اس لئے کہ جب آپ باہر جائیں تو گھر کا سارا سامان تو لے جا نہیں سکتے۔ زہد کی شان پیدا ہوگئی، پھر جب تک جڑے رہیں گے، تو ایک دوسرے کی اعانت بھی کریں گے۔ تو ایثار کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں خدمت گذاری کا جذبہ، ایثار کا جذبہ، ہر ایک کی خدمت کے لئے کھڑے ہو جانا، یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ جو جماعت کی برکت سے من جانب اللہ پیدا ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ایمان دو چیزوں کا نام ہے۔ ''اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفْقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ'' اللہ کے اوامر کی تعظیم دل میں بیٹھ جائے اور مخلوق کی خدمت کا جذبہ دل میں پیدا ہو جائے۔ جماعتوں میں نکلنے سے بحمد اللہ، اللہ کی عظمت بھی دل میں بیٹھتی ہے اور خدمت خلق کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ ایک دوسرے کی اخلاص کے ساتھ خدمت گذاری کا جذبہ ابھرتا ہے۔

جو لوگ اپنا خرچ کر کے دنیا کے ملکوں میں جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ایثار ہی کر رہے ہیں۔ ایثار کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں اپنے خرچ پہ نکلیں۔ جو اپنا خرچ کرنے پر آمادہ ہے۔ وہ دوسرے کی خدمت سے کیسے گریز کرے گا۔ خود بخود خدمت خلق اللہ کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

جماعت تبلیغ کی مقبولیت کے آثار..... تو اس دور میں اصلاح کا اور طریقہ اس کے سوا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ طریقہ مولانا کے قلب مبارک پر وارد کیا اور اس تیس چالیس برس کے اندر اندر جماعتیں پھیلیں۔ دنیا کا کوئی ملک جہاں جہاں ہمارا جانا ہوا۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ جماعت تبلیغ وہاں موجود نہ ہو۔ لندن، فرانس، امریکہ اور افریقہ میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ من جانب اللہ مقبولیت کی بات ہے کہ اللہ کا نام لینے والے ہر جگہ پہنچ جائیں اور خدا

کے نام کی منادی دیں اوراعلان کریں۔ یہ آثار مقبولیت ہیں۔

اور میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بناء ڈالنے والے خود مقبولان الٰہی ہیں۔لوگ کچھ اعتراض کیا کرتے ہیں۔لیکن بشری کارخانہ کونسا ایسا ہے جس پہ اعتراض نہیں ہوتے۔مگر میں سب کا جواب ایک ہی دیتا ہوں کہ بھئی! ایک عارف باللہ کے قلب میں یہ چیز من جانب اللہ آئی۔اس واسطے وہ امر خیر ہے۔اگر یہ کسی لیڈر کے ذہن میں آتی، میں یہ سمجھتا کوئی سیاسی مصلحت ہوگی۔کسی وطنی آدمی کے ذہن میں آتی، میں سمجھتا کوئی وطنی مصالح ہوں گی۔لیکن ایک اللہ والے کے دل پر یہ چیز وارد ہوئی۔اس میں فی الحقیقت خیر ہی خیر ہے۔اس میں من جانب اللہ برکات کے آثار ہیں۔تو سب جوابوں کا ایک ہی جواب ہے کہ اس سلسلہ کو اہل اللہ نے اٹھایا ہے۔اس میں ان شاء اللہ خیر ہے۔جماعتوں کا نکلنا،اس میں لوگوں کی اصلاح ہو جانا۔یہ خود اس کی ایک دلیل ہے کہ اس کی برکات پھیل رہی ہیں۔ملکوں کے اندر پھیل رہی ہیں۔

ہم فرانس میں گئے،وہاں پر ظاہر ہے کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں تھا۔ہم پہنچے،ہوائی اڈے پر سینکڑوں آدمی استقبال کے لئے موجود ہیں۔مجھے حیرت ہوئی کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں۔پہلی دفعہ آنا ہوا ہے۔بہر حال وہ سمجھے کہ ہمارا ایک خادم آرہا ہے،ہم سب چلیں،وہ ہوائی اڈے پر آگئے۔اب یہ ایثار اور خدمت،یہ جذبۂ خدمت ہی کی بات ہے،ورنہ میں کیا چیز تھا۔ایک معمولی آدمی،میری کوئی حیثیت نہیں۔مگر محبت میں یہ سب آگئے جگہ جگہ یہی دیکھا۔

اب انہوں نے کہا کہ تقریر بھی کرو۔ایک جلسہ بھی منعقد کیا۔وہاں سارے عرب تھے۔میں نے کہا کہ: مجھے تو عربی بولنے کی قدرت نہیں ہے۔کتابوں میں پڑھی تھی،مگر بولنے کا تعلق تو مشق ہے۔میں نے کہا کہ: میں اردو میں تقریر کروں گا،کوئی صاحب بعد میں عربی میں ترجمہ کریں۔مگر وہاں کے عربوں نے کہا ہم عربی میں تقریر سنیں گے،چاہے پانچ ہی منٹ ہو،تو صاحب وہاں پھر عربی میں تقریر بھی کی۔پندرہ بیس منٹ ٹوٹی پھوٹی جو سمجھ میں آئی۔وہ کردی۔بہر حال ہر جگہ امریکہ وغیرہ میں یہی دیکھا۔ہر جگہ جماعت موجود۔بغیر مقبولیت من جانب اللہ کے یہ چیز پیدا نہیں ہوسکتی کہ قلوب پر الگ اثرات ہیں،عمومیت الگ ہے،ملکوں میں پھیل جانا الگ ہے۔یہ ساری چیزیں اس کی دلیل ہیں کہ اللہ کی طرف سے یہ سلسلہ اتارا گیا اور یہ مقبول خداوندی بھی ہے۔

برما جب جانا ہوا تو میں نے دو ہی چیزوں پر زور دیا۔ایک تو یہ کہ بقدر ضرورت تعلیم دو تاکہ مسائل معلوم ہوں۔سب کا عالم بننا ضروری نہیں۔جزوی طور پر عالم ہونا فرض کفایہ ہے۔اگر ہزاروں میں سے ایک بھی بن گیا۔پوری جماعت کا فرض ادا ہو گیا۔لیکن دیندار بننا ہر ایک پر فرض ہے اور دینداری کے لئے کچھ ابتدائی مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔اس واسطے ابتدائی تعلیم اور اس کے ساتھ پھر سلسلہ تبلیغ کے اندر لگو۔اس سے تمہارے قلوب کی بھی اصلاح ہوگی،اعمال کی بھی اصلاح ہوگی اور دین بھی پھیلے گا۔اس کی اشاعت ہوگی۔بحمد اللہ جماعت کے اثرات وہاں محدود نہیں،بلکہ پھیل رہے ہیں اور پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔

تبلیغ دین میں جماعتی حیثیت کارد کرنا مشکل ہوتا ہے......تو آیت میں نے یہ پڑھی تھی کہ ہم نے رسول بھیجے۔ دو کو انہوں نے جھٹلا دیا تو ہم نے تیسرے کا اضافہ کیا۔ یہ جماعتی صورت پیدا ہوگئی۔ جماعتی حیثیت کا ٹھکرانا بڑا مشکل ہوگا۔ ماننا نہ ماننا، عمل کرنا نہ کرنا تو لوگوں کے اختیار میں ہے۔ لیکن عقلی طور پر اس کو کوئی رد کرے، یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک جماعتی آواز ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ رد کی جاسکے۔ بحمد اللہ یہ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو توفیق دی اور جماعت کے ساتھ جو بھی وابستہ ہوا۔ ان کو توفیق دی اور اس توفیق سے بڑا کام ہوا۔

تعلیم وتبلیغ کا باہمی تقابل نہیں ہے...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ: یہ جماعت اس وقت ہمارے لئے آبرو ہے۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ بھائی! تم نے تبلیغ کیوں نہیں کی؟ ہم کہیں گے کہ ہماری جماعت تبلیغ کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کوئی جماعت تعلیم میں لگی ہوئی ہے، کوئی تبلیغ میں لگی ہوئی ہے۔ یہ تقسیم عمل ہے، تقسیم عمل سے عمل دو نہیں ہوتے، بنیاد سب کی ایک ہوتی ہے۔ اب دارالعلوم میں ایک جماعت منتظمین کی ہے، وہ درس نہیں دے سکتی۔ مدرسین کی جماعت انتظام نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں مدمقابل تھوڑا ہی ہیں۔ جو جماعت انتظام کر رہی ہے، وہ مدرسین کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ جو درس دے رہے ہیں وہ منتظمین کو تقویت پہنچا رہے ہیں، تو جو جماعت تبلیغ کر رہی ہے، وہ جماعت تعلیم کو تقویت پہنچا رہی ہے، میں نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود ان کا مقولہ سنا، ان کی شان عجیب تھی، فرمایا: ''بھائی! یہ سلسلہ میں نے اس لئے جاری کیا ہے کہ مدرسوں کو طالب علم ملیں اور مشائخ کو مرید ملیں''۔ اس واسطے یہ سلسلہ جاری کیا ہے تاکہ علم بھی پھیلے اور اخلاق بھی درست ہوں۔

اور مولانا مرحوم اس حد تک تھے کہ جب یہ کام ابتدائی شروع ہوا، تو ہر چھ مہینے کے بعد دہلی میں گزارتے تھے۔ کچھ دارالعلوم دیوبند میں، کچھ مظاہر العلوم میں۔ اور غایت تواضع سے فرماتے کہ: بھائی اتنا کام تو میں نے کرلیا۔ اب بتاؤ آگے کیا کروں؟

حالانکہ وہ خود ہی جاننے والے تھے۔ ان کے قلب پر یہ چیز وارد ہوئی تھی۔ لیکن تواضع کی انتہا تھی کہ دوسروں سے پوچھتے، حتیٰ کہ ہم جیسے چھوٹوں سے کہتے کہ بھئی! اب آگے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ پوچھ رہے ہیں۔ آپ تو خود دوسروں کے لئے راہنما ہیں۔ مگر یہ کمال تواضع تھا کہ سب کچھ کر کے بھی سمجھتے تھے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور چھوٹوں سے مشورہ لیتے تھے۔ یہ ان کی شان تھی۔

ایک اللہ والے کے اخلاص نے پوری دنیا کو متحرک کر دیا......اور ایک دھن تھی اور ایسی دھن تھی کہ کسی کو کھانے کی اور سونے کی نہیں ہوسکتی۔ وہی دھن اللہ کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔ وہی دھن اور جذبہ ہے کہ جماعت آج تک حرکت میں ہے۔ ایک اللہ والے کے قلب کے اخلاص نے سب کو متحرک بنا رکھا ہے۔ بہرحال جماعت بھی مبارک ہے، اس کا کام بھی مبارک ہے اور جتنا زیادہ کیا جائے، جتنی اس میں شرکت زیادہ ہو، وہ انشاء اللہ باعث خیر و برکت ہوگی۔ جتنا وقت ہے دو، چلہ لگاؤ، دو چلے لگاؤ وہ انشاء اللہ خیر ہی خیر پائیں گے۔ کوئی برائی اور شر

نہیں ہوگی۔ دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی انشاء اللہ درست ہوگی۔ بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ بَارِكْ وَسَلِّمْ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

فضیلت النساء

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ②

تمہید...... بزرگان محترم! قرآن شریف کی آل عمران سے تین آیتیں اس وقت میں نے تلاوت کیں۔ان میں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت مریم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا جس میں ملائکہ نے حضرت مریم کو خطاب فرمایا ہے۔اس جلسہ کے منعقد کرنے کی غرض وغایت چونکہ عورتوں کو خطاب ہے اس لئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو مردوں کے ہیں بلکہ بعض امور میں مردوں سے عورتوں کا حق زیادہ ہے۔اس لئے کہ بچوں کی تربیت میں سب سے پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔اسی سے بچہ تربیت پاتا ہے۔ سب سے پہلے جو سیکھتا ہے، ماں سے سیکھتا ہے، باپ کی تربیت کا زمانہ شعور کے بعد آتا ہے، لیکن ہوش سنبھالتے ہی بلکہ بے ہوشی کے زمانے میں بھی ماں ہی اس کی تربیت کرتی ہے۔گویا اسکی تربیت گاہ ماں کی گود ہے۔اگر ماں کی گود علم، نیکی، تقویٰ اور صلاحیتوں سے بھری ہوئی ہے، وہی اثر بچے میں آئے گا۔اور اگر خدانخواستہ ماں کی گود ہی ان نعمتوں سے خالی ہے تو بچہ بھی خالی رہ جائے گا۔ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج ۔۔۔ تا ثریا می رود دیوار کج

کسی فارسی کے شاعر نے کہا ہے کہ: جب عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی جائے‘ تو اخیر تک عمارت ٹیڑھی ہوتی چلی جاتی ہے۔شروع کی اینٹ اگر سیدھی رکھ دی جائے تو اخیر تک عمارت سیدھی چلتی ہے۔جس چیز کا آغاز اور ابتداء درست ہو جائے اس کی انتہا بھی درست ہو جاتی ہے۔اس واسطے عورتوں کا مردوں سے زیادہ حق

① پارہ:۳،سورۃ آل عمران،الآیۃ: ۴۲، ۴۳. ② ۱۷ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ۔

ہےاور ہم اسی حق کو زیادہ پامال کر رہے ہیں۔ مرد تو ہر جگہ موجود ہیں اور عورتوں کو سنانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر عورتیں مردوں کے حکم سے آئی ہیں تو مردوں کا شکریہ!

اور اگر ازخود آئی ہیں تو پھران کے دینی جذبے کی داد دینی چاہئے کہ ان کے اندر بھی ازخود ایک جوش وجذبہ ہے کہ دینی باتیں سیکھیں اور معلوم کریں۔ بہرحال سب سے زیادہ خوشی یہ ہے کہ ان کے اندر دین کی طلب ہے۔ اگر خود پیدا ہوئی تو وہ شکریئے کی مستحق ہیں اور اگر طلب پیدا کی گئی تو اس طلب کے پیدا کرنے والے بھی اور جنہوں نے اس کو قبول کیا وہ بھی شکریئے کے مستحق ہیں۔ اس واسطے میں نے کہا: مردوں سے عورتوں کا زیادہ حق ہے، اس لئے کہ زندگی کی ابتداء انہی سے ہوتی ہے۔

عورتوں کی قوت عقل...... اس وجہ سے بھی کہ بچوں کا قصہ بعد میں آتا ہے خود خاوند بھی عورت سے متاثر ہوتا ہے۔ عورتیں جب کسی چیز کو منوانا چاہتی ہیں تو منوا کے رہتی ہیں۔ وہ ضد کریں، ہٹ دھرمی کریں یا کچھ کریں خاوند کو مجبور کر دیتی ہیں۔ اس میں ایک پہلو جہاں عورتوں کے لئے عمدہ نکلتا ہے وہاں ایک بات کمزوری کی بھی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَارَاَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّ دِیْنٍ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ'' ① ''یہ عورتیں ہیں تو ناقص العقل' ان کی عقل کم ہے، مگر بڑے بڑے کامل العقل مردوں کی عقلیں اچک کر لے جاتی ہیں''۔ اچھے خاصے عقل مند بھی ان کے سامنے پاگل بن جاتے ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ یہ کام ہو تو مرد ان کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اور یہاں آپ کے ہاں بھی ایسا ہی ہوگا اس لئے کہ عورتوں کا مزاج سب جگہ ایک ہی ہے اور مردوں کی ذہنیت بھی ایک ہی ہے البتہ تمدن کا فرق ہے۔

شادی بیاہ وغیرہ میں جو اکثر رسمیں ہوتی ہیں وہ رسمیں تباہ کن ہوتی ہیں۔ وہ دولت اور دین کو بھی برباد کرتی ہیں، جب مردوں سے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی! کیوں ان خرافات میں پڑے ہوئے ہو، تم سمجھ دار اور عقل مند آدمی ہو، اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ دولت اور دین بھی برباد ہو رہا ہے۔ تو کیوں ایسا کرتے ہوں؟۔ کہ جی عورتیں نہیں مانتیں کیا کریں۔ گویا عورتیں حکام ہیں وہاں سے آرڈر جاری ہوتا ہے اور یہ غلام ورعایا ہیں ان کا فرض ہے کہ اطاعت کریں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہیں تو یہ ناقص العقل، مگر اچھے بڑے عقل والوں کی عقلیں اچک کر لے جاتی ہیں اور انھیں بے وقوف بنا دیتی ہیں۔ تو جب عورت میں یہ قوت موجود ہے کہ عقل مند کو بھی بے قوف بنا دیتی ہے اور اچھے بھلے مرد کو مجبور بنا دے، اگر وہ کسی اچھی چیز کے لئے مرد کو مجبور کرے گی تو مرد کیوں نہیں مجبور ہوگا؟

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے یوں کہہ دے کہ: جناب سیدھی بات ہے کہ آپ کا حکم واجب الاطاعت ہے۔ آپ خدا کی طرف سے میرے مربی سب کچھ ہیں لیکن آپ نماز نہیں پڑھتے، جب تک آپ نماز نہیں پڑھیں گے میں بھی آپ کے حکم کی پابند نہیں ہوں۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات، ج: ۱ ص: ۸۶ رقم: ۷۶.

وہ جھک مارے گا ضرور پڑھے گا، چاہے خدا کی نہ پڑھے، بیوی کی ضرور پڑھے گا۔ جب عورتیں ضد کر کے دنیا کی بات منوا لیتی ہیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین کی بات نہ منوالیں۔ عورتوں کی بدولت بہت سے خاندانوں کی اصلاح ہوگئی ہے۔ عورتوں نے ضد کی مرد مجبور ہو گئے۔ ہمارے ہاں بعض خاندان ایسے تھے جو کچھ خرافات میں مبتلا تھے۔ اس واسطے کہ گھر میں دولت تھی، کہیں سینما، کہیں تھیٹر وغیرہ۔ نماز کا تو کہیں سوال ہی نہیں اتفاق سے عورت نہایت صالح اور دیندار گھرانے کی آ گئی چند دن اس نے صبر کیا بعد میں اس نے کہا صاحب! یہ نبھاؤ بڑا مشکل ہے اس واسطے کہ رمضان آئے گا تو میں روزے سے رہوں گی اور تم بیٹھ کر کھانا کھاؤ گے اور پکانے پر مجھے مجبور کرو گے میں پکانے کے لئے مجبور نہیں ہوں جہاں چاہے پکواؤ اس گھر میں یہ نہیں ہوگا۔ اس واسطے کہ اس بد دینی میں تمہاری اعانت کرسکوں یہ خود گناہ کی بات ہے۔ یا تو اپنا بندوبست کرو یا پھر ان خرافات کو چھوڑو۔ آخر مرد مجبور ہوئے، نماز روزے کے پابند ہو گئے اور ان میں بہت سی اچھی خصلتیں پیدا ہو گئیں اس لئے سب سے بڑا مربی تو عورت ہے جو گھر کے اندر موجود ہے اس کی تربیت سے آدمی کام لے۔

اس لئے اپنی بہنوں سے یہ خطاب ہے کہ جب وہ ایسا دباؤ ڈال سکتی ہیں کہ مرد ان کے سامنے مجبور ہیں۔ تو جہاں دنیا کے لئے زیور، کپڑے لانے کے لئے، برتن لانے کے لئے گھر بنانے کے لئے دباؤ ڈالتی ہیں۔ اگر دیندار گھر بنانے کے لئے دباؤ ڈالیں تو یقیناً وہ دیندار بنیں اور وہ اپنے خاوند کے لئے اصلاح کا ذریعہ بن جائیں گی۔ اس لئے ان کی دل میں نیکی، تقویٰ اور بھلائی کا جذبہ ہونا چاہئے تاکہ خاوند پر بھی اس کا اثر پڑے۔ تو ایک عورت بچوں پر، خاوند پر اور کنبہ والوں پر بھی بہتر اثر ڈال سکتی ہے۔

عموماً سننے میں آیا ہے کہ خاندانوں میں جو جھگڑے اور تفریقیں پیدا ہوتی ہیں عورتوں کی بدولت پیدا ہوتی ہیں ایک دوسرے کو اتار چڑھاؤ کر کے بدظن بنا دیتی ہیں، دو حقیقی بھائیوں میں لڑائی پیدا کر دیتی ہیں حتی کہ خاندانوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں اس کے برعکس اگر عورت نیک نہاد اور نیک طینت ہے تو بڑے بڑے جھگڑے ختم کرا دیتی ہے خاندان مل جاتے ہیں تو اپنی اس طاقت کو نیکی میں کیوں نہ خرچ کیا جائے، برائی اور بدی میں کیوں خرچ کیا جائے؟ جب اللہ نے ایک طاقت دی ہے تو اس کو صحیح راستے پر خرچ کیا جائے۔

دینی ترقی کے لئے مرد و عورت کے لئے ایک ہی راستہ ہے...... اس واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی۔ اس میں خصوصیت سے عورتوں ہی کے واقعات کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ ترین بی بی کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی اس آیت کے پڑھنے کی نوبت آئی کہ عورتوں کو یہ شکایت پیدا نہ ہو جب خطاب کیا جاتا ہے۔ مردوں ہی کو کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ نے مردوں ہی کو خطاب کیا تاکہ یہ غلط فہمی ان کی رفع ہو جائے۔ جیسے مردوں کو خطاب کیا ہے۔ عورتوں کو بھی کیا ہے۔ کہیں مرد عورت دونوں کو ملا کر خطاب کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ جو دین کی ترقی کا راستہ مرد کے لئے ہے وہی عورت کے لئے ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ

وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ ① مسلم مرد، مسلم عورت، مومن مرد اور مومن عورت، عبادت گزار مرد اور عبادت گزار عورت، سچا مرد اور سچی عورت، صدقہ دینے والا مرد اور صدقہ دینے والی عورت، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورت، حیاء کی حفاظت کرنے والا مرد اور حیاء کی حفاظت کرنے والی عورت، اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والا مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورت۔ ان کے لئے وعدہ دیا ہے کہ اللہ نے ان کے لئے مغفرت، اجر عظیم اور آخرت کے درجات تیار کئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین کے راستہ پر چل کر جتنی ترقی مرد کر سکتا ہے۔ وہی بعینہ عورت بھی کر سکتی ہے۔ اگر ایک مرد ولی کامل بن سکتا ہے تو عورت بھی ولی کامل بن سکتی ہے۔ اسلام میں جیسے مردوں میں اولیاء اللہ کی کمی نہیں ہے۔ ویسے ہی عورتوں میں بھی اولیاء اللہ کی کمی نہیں ہے۔ اس بارے میں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ولایت کے مقام کو پہنچی ہیں اور ولی کامل گذری ہیں۔ ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہیں کہیں حضرت رابعہ بصریہ، کہیں رابعہ عدویہؒ ہیں پھر صحابیات جتنی ہیں وہ تو ساری کی ساری اولیائے کاملین میں سے ہیں تو تابعین، تبع تابعین اور بعد کے لوگوں میں بڑی بڑی کامل عورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ پھر ہر فن کے اندر پیدا ہوئیں، محدث، مفسر، ادیب، شاعر اور مؤرخ بھی گذری ہیں۔ ان کی تصنیفات ہیں اور ہزاروں مرد ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اگر عورت دینی ترقی نہ کر سکتی تو یہ عورتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں؟

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری وحی کا آدھا علم میرے سارے صحابہؓ سے حاصل کرو اور آدھا علم تنہا عائشہؓ سے حاصل کرو۔ گویا صدیقہ عائشہؓ اتنی زبردست عالمہ ہیں گویا نبوت کا آدھا علم صدیقہ کے پاس ہے۔ آدھا علم سارے صحابہؓ کے پاس ہے۔ صدیقہ عائشہؓ ایک عورت ہی تو ہیں۔ تو عورت کو اللہ نے وہ رتبہ دیا کہ ہزار ہا ہزار صحابہؓ ایک طرف اور ایک عورت ایک طرف اس سے معلوم ہوا۔ عورت جب ترقی کرنے پہ آتی ہے تو اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ بہت سے مرد بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تو اللہ کی طرف سے عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے۔ چاہے دنیا میں ترقی کریں یا دین میں علم و فضل میں بھی برابر چل سکتی ہیں۔

آپ نے امام ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہوگا۔ جن کی کتاب طحاوی شریف جو حدیث شریف کی کتاب ہے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ عورت کا طفیل ہے امام طحاویؒ کی بیٹی نے حدیث کی کتابیں املاء کی ہیں۔ باپ حدیث اور اس کے مطالب بیان کرتے تھے، بیٹی لکھتی جاتی تھی۔ اس طرح کتاب مرتب ہوگئی۔ گویا جتنے علماء اور محدث

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۵۔

گذرے ہیں۔ یہ سب امام ابی جعفر کی بیٹی کے شاگرد اور احسان مند ہیں۔ یہ بھی ایک عورت تو تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ امام طحاویؒ کی بیٹی تو محدث بن سکے، ہماری کوئی بہو بیٹی نہ بن سکے؟ وہی نسل ہے، وہی چیز ہے، وہی ایمان، وہی دین ہے۔ وہ علم آج بھی موجود ہے۔ توجہ اور بے توجہی کا فرق ہے۔ ان لوگوں نے توجہ دی تو عورتیں بھی ایسی بنیں کہ بڑے بڑے مرد بھی ان کے شاگرد بن گئے آج توجہ نہیں کرتیں، کمال نہیں پیدا ہوتا مگر صلاحیتیں موجود ہیں۔

عورت میں غیر معمولی ترقی کی صلاحیت موجود ہے...... بہر حال علماء اسلام نے ان بڑی بڑی عورتوں کا ذکر کیا ہے جو ولایت کے مقام تک پہنچی اور کامل ہوئی ہیں ہاں البتہ کچھ عہدے اسلام نے ایسے رکھے ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے گئے۔ وہ اس بنا پر کہ عورت کا جو مقام ہے وہ حرمت وعزت کا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اجنبی مردوں میں خلط ملط اور ملی جلی پھرے اس سے فتنے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ برائیوں کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لئے عورتوں کو ایسے عہدے نہیں دیئے گئے جس سے فتنوں کے دروازے کھلیں۔ لیکن صلاحیتیں موجود ہیں۔

صلاحیت اس حد تک تسلیم کی گئی ہے کہ علماء کی ایک جماعت اس بات کی بھی قائل ہے کہ عورت نبی بن سکتی ہے۔ رسول تو نہیں بن سکتی مگر نبی بن سکتی ہے۔ نبی اسے کہتے ہیں جس سے ملائکہ علیہم السلام خطاب کریں اور خدا کی وحی اس کے اوپر آئے۔ رسول اسے کہتے ہیں جو شریعت لے کر آئے اور خلق اللہ کی تربیت کرے اس لئے تربیت کا مقام تو نہیں دیا گیا مگر ان کے نزدیک نبوت کا مقام عورت کے لئے ممکن ہے۔

حتی کہ ظاہریہ کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں۔ فرشتے نے خطاب کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی تھیں اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ علیہا السلام جو ابتداء سے ہی مسلمان تھیں۔ وہ نبوت کے مقام پر پہنچیں تو نبوت سے بڑا عالم بشریت میں انسان کے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ خدائی کمالات کے بعد اگر بزرگی کا کوئی درجہ ہے، تو وہ نبوت کا ہے۔ اس سے بڑا کوئی درجہ نہیں جب عورت کو یہ درجہ بھی مل سکتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ عورت کی صلاحیتیں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ سب مقام طے کر سکتی ہے۔ البتہ رسول نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ رسول کے یہ معنی ہیں کہ وہ شریعت کے ساتھ تربیت کرے، اس لئے عورت کو اس مقام پر نہیں لایا گیا کہ وہ اجنبی مردوں کی تربیت کرے۔ اس میں چونکہ فتنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے یہ مقام چھوڑ دیا گیا۔

یا جیسے شریعت اسلام کا مسئلہ ہے کہ قاضی جج اور چیف جسٹس نہیں بنائی جائے گی کہ وہ فیصلے کرنے لگے اس لئے کہ جب وہ فیصلہ کرنے بیٹھے تو مدعی اور مدعی علیہ اس کے سامنے آئیں گے۔ اس کو حق ہے کہ جرح کرے گواہوں کی حالت کو دیکھے۔ سب اس کے آمنے سامنے ہوں گے۔ اس میں پھر فتنے کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے اس مقام پر عورت کو نہیں لایا گیا حاصل یہ ہے کہ اگر عورت محنت وتوجہ کرے تو کوئی مقام بزرگی اور علم فضل کا ایسا نہیں ہے جو عورت کو حاصل نہ ہو۔ امام طحاویؒ کی بیٹی، حضرت رابعہ بصریؒ حضرت رابعہ عدویہؒ ہزاروں لاکھوں کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عورتیں، تابعین کی بیویاں، بیٹیاں۔ یہ بڑی بڑی عالم اور فاضل گزری ہی ہیں۔

عورت اولیائے کاملین کے لئے مربی بھی بن سکتی ہے..... حضرت رابعہؒ کے واقعات میں ہے کہ ایک دن جوش سے چلیں۔ایک برتن میں آگ تھی اور ایک برتن میں پانی تھا۔بہت ہی جذبے اور جوش کے ساتھ جارہی ہیں۔

لوگوں نے کہا: اے رابعہ کہاں چلی؟ کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن اور ایک ہاتھ میں پانی کا برتن کہاں جارہی ہو؟۔جوش میں آکر کہا کہ میں اس لئے جارہی ہوں کہ اس آگ سے جنت کو جلادوں اور اس پانی سے جہنم کو بجھادوں اس لئے کہ جو عبادت کرتا ہے جنت کی طمع میں کرتا ہے یا دوزخ سے ڈر کر کرتا ہے۔اپنے مالک کی محبت میں کوئی عبادت نہیں کرتا۔میں اس لئے جارہی ہوں تاکہ ان دونوں کو ختم کروں تاکہ بندوں میں خلوص پیدا ہو۔ اخلاص اور محبت خداوندی کا مقام پیدا ہو۔اس مقام کی عورتیں بھی گذری ہیں جن کے جذبات کا یہ عالم ہے۔عورتوں نے بہت بڑے بڑے اولیائے کاملین کی تربیت کی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ تابعی ہیں اور صوفیاء کے امام ہیں اور سلسلہ چشتیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہؒ ان کے مکان پر آئیں کوئی مسئلہ پوچھنا تھا یا کوئی بات کرنی تھی معلوم ہوا حضرت حسن بصریؒ مکان پر نہیں ہیں۔پوچھا کہاں گئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے پر گئے ہیں اور ان کی عادت یہ ہے کہ اپنا ذکر اللہ یا عبادت وغیرہ دریا کے کنارے پر کرتے ہیں۔بعض اہل اللہ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے ذکر اللہ کرنے کے لئے جنگلوں کی راہ اختیار کی۔یا پہاڑوں میں بیٹھ کر اوراد کرتے ہیں اس میں ذرا یکسوئی زیادہ ہوتی ہے اور دریا کے کنارے پر بیٹھنے کے بارے میں صوفیاء لکھتے ہیں کہ قلب میں تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔مادی تاثیر اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ پانی کے کنارے پہنچ کر قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے۔جتنی فرحت اور نشاط پیدا ہوگا اتنا ہی قلب ذکر اللہ کی طرف مائل ہوگا بنیادی اور باطنی وجہ اس کی یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: چلتا ہوا پانی خود اللہ کی تسبیح کرتا ہے اللہ کا نام لیتا ہے اور ذکر کرتا ہے۔پانی کے ذکر کا اثر بھی انسان کے قلب پر پڑتا ہے تو اس کی طبیعت اور زیادہ ذکر اللہ کی طرف مائل ہوجاتی ہے ان وجوہ کی بناء پر حضرت حسن بصریؒ اکثر دریا کے کنارے پر جا کر عبادت کرتے تھے۔

بہرحال رابعہ بصریہ کو معلوم ہوا کہ حسن بصری اپنی عادت کے مطابق ذکر و عبادت کرنے کے لئے دریا کے کنارے پر گئے ہوئے ہیں۔یہ بھی وہیں پہنچ گئیں۔وہاں جاکے یہ عجیب ماجرا دیکھا کہ حسن بصریؒ نے پانی کے اوپر مصلی بچھا رکھا ہے اور اس کے اوپر نماز پڑھ رہے ہیں۔نہ مصلی ڈوبتا ہے نہ تر ہوتا ہے گویا کرامت ظاہر ہوئی۔ رابعہ بصریہ کو یہ چیز ناگوار گذری اور اسے اچھا نہ سمجھا کیونکہ یہ عبدیت اور بندگی کی شان کے خلاف ہے۔بندگی کے معنی یہ ہیں بڑے سے بڑا بزرگ لوگوں میں ملا جلا رہے۔کوئی امتیازی مقام پیدا کرنا یہ ایک قسم کا دعویٰ اور صورۃً تکبر ہے کہ میں سب سے بڑا ہوں اس لئے کہ تم وہ کام نہیں کرسکتے جو میں کرسکتا ہوں۔گویا میں بڑا صاحب کرامت اور صاحب تصرف ہوں، زبان سے اگرچہ نہ کہے مگر صورت حال سے ایک دعویٰ پیدا ہوتا ہے کہ اور اہل

اللہ کے نزدیک سب سے بڑی چیز جو ہے وہ دعویٰ کرنا ہے اس لئے کہ اس میں تکبر اور کبر کی علامت ہے اور ولایت کا مقام یہ ہے کہ تکبر مٹ کر خاکساری پیدا ہو۔ تو جس بزرگ میں تکبر یا کبر کی صورت بن جائے وہ بزرگ ہی کیا ہوا؟۔ حضرت رابعہؒ کو یہ چیز اس لئے ناگوار گزری کہ حسن بصریؒ بزرگوں کے امام اور وہ ایسی صورت پیدا کریں جس سے دعویٰ نکلتا ہو کہ میں بھی کوئی چیز ہوں، میں گویا بڑا کرامت والا ہوں۔ حسن بصریؒ کے لئے یہ زیبا نہیں تھا۔ یہ شان عبدیت کے خلاف ہے۔

بلکہ در پردہ گویا یہ دعویٰ ہے کہ میں خدائی اختیارات رکھتا ہوں کہ تم اسباب کے تحت مجبور ہو کے پانی پر کشتی سے جاؤ اور میں مجبور نہیں ہوں۔ میں پانی پر ویسے ہی چل سکتا ہوں، میرے پاس خدائی قوتیں موجود ہیں۔ جب یہ دعویٰ ہو گیا تو بزرگی کہاں رہی؟ اس واسطے یہ چیز اچھی نہ معلوم ہوئی۔ مگر چونکہ یہ بھی بزرگ ہیں تو انہوں نے اصلاح کی، اصلاح کس طرح کی؟ زبان سے کچھ نہیں کہا عمل سے اصلاح کی۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے پانی کے اوپر مصلیٰ بچھا رکھا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ اپنے مصلے کو ہوا کے اوپر اڑا کر اس کے اوپر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اب مصلیٰ ہوا کے اوپر لٹکا ہوا ہے اور نماز پڑھ رہی ہیں۔ حسن بصریؒ سمجھ گئے کہ مجھے ہدایت کرنی مقصود ہے۔ فوراً اپنا مصلیٰ لپیٹا اور دریا کے کنارے پر آ گئے۔

رابعہ بصریہؒ نے بھی ہوا سے مصلیٰ لپیٹا اور نیچے آئیں اور آ کر دو جملے ارشاد فرمائے۔ وہ کتنے قیمتی اور زریں جملے تھے کہ دین دنیا کے ساری نصیحتیں ان دو جملوں میں کھپی ہوئی تھیں، فرمایا: اے حسن بصری!

برآب روی خسے باشی، برہوا پری مگسے باشی ۔۔۔ دل بدست آرکہ کسے باشی

اے حسن بصریؒ! اگر تم پانی پر تیر گئے تو کوڑا کباڑ اور کچرا بھی پانی کے اوپر تیرتا ہے یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے اور اگر رابعہ ہوا میں اڑی تو مکھیاں بھی تو ہوا میں اڑتی ہیں۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ اپنے نفس کو قابو میں کرو، اس پر کنٹرول حاصل کرو، تا کہ صحیح معنی میں انسان بنو۔ انسان بننا کمال ہے مکھی بننا کمال نہیں ہے۔ آدمی بننا کمال ہے۔ کوڑا کچرا بننا کمال نہیں ہے۔

ہم اگر ہوائی جہاز سے پچاس ہزار فٹ بلندی پر اڑ جائیں بے شک یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ مگر یہ حیوانیت کا کمال ہے۔ انسانیت کا کمال نہیں ہے۔ اگر ہم ڈبکنی کشتی کے ذریعہ سمندر کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ تو یہ بھی حیوانیت کا کمال ہے۔ اس لئے کہ مچھلیاں بھی تو پہنچتی ہیں۔ آدمی سے ہم اگر مچھلی بن گئے تو کون سا کمال کیا، اسی طرح ہوا میں کرگسیں بھی اڑتی ہیں اگر آدمی سے کرگس بن گئے تو کون سا کمال ہوا۔ یہ حیوانیت کا کمال ہے انسانیت کا کمال نہیں ہے۔ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور عرش پہ باتیں کر رہا ہو۔ اپنے مصلیٰ کے اوپر ہو اور خدا سے اسے نیاز حاصل ہو۔ معاملات وہاں سے چل رہے ہوں۔ دیکھنے میں وہ فرشی ہو مگر حقیقت میں وہ عرشی ہو۔ فرش پر بیٹھے ہوئے عرش کے اوپر مقام ہو۔ یہ سب سے بڑا انسانیت کا کمال ہے جس کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام نے سکھلایا۔

تو رابعہ بصریہ نے کتنی قیمتی بات کہی کہ حضرت حسن بصریؒ نادم اور اور شرمندہ ہوئے اور توبہ کی کہ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں اسے بڑا کمال سمجھ رہا تھا مگر آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ دیکھئے رابعہ بصریہ عورت ہے اور حسن بصریؒ مردوں کے امام ہیں۔ یہ ایک عورت ایک مرد کامل کو ہدایت کر رہی ہے اور اسے راستہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس لئے عورت اگر کمال پیدا کرنا چاہے تو وہ بڑے بڑے مردوں کی مربی بن سکتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پوری امت کی استاذ ہیں...... ابن عباس رضی اللہ عنہما بڑے جلیل القدر صحابی ہیں امت میں سب سے بڑے مفسر قرآن ہیں۔ لیکن حضرت عائشہ کے شاگرد ہیں۔ علم زیادہ تر انہی سے سیکھا ہے۔ فتوے کی ضرورت ہوتی تھی تو صدیقہ عائشہؓ سے فتویٰ لیتے تھے۔ تو ابن عباسؓ ساری امت کے استاذ ہیں اور ان کی استاذ حضرت عائشہؓ ہیں گویا حضرت عائشہ علوم وکمالات کے اندر پوری امت کی استاذ ہیں۔

بعض صحابہ حضرت عائشہ سے کہا کرتے تھے کہ: ''مَا هٰذِهِ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَآ اٰلَ اَبِىْ بَكْرٍ'' ① ''اے آل ابی بکر! یہ پہلی برکت نہیں۔ تمہاری تو اتنی برکتیں ہیں کہ امت احسان سے تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی''۔ اس لئے کہ حضرت عائشہؓ کے سوالات کرنے سے ہزاروں مسئلے کھلے ہیں، بڑی ذہین وذکی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات ایسے کیا کرتی تھیں کہ دوسرے کی جرات نہیں ہوسکتی تھی۔ جواب میں آپؐ علوم ارشاد فرماتے: یہ ساری امت پر احسان تھا اگر وہ سوال نہ کرتیں تو علم نہ آتا۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: اگر کسی شخص کے تین بچے پیدا ہوں اور پیدا ہونے کے بعد دودھ پینے کی حالت میں گذر جائیں برس دن یا چھ مہینے کے بعد انتقال کر جائیں تو وہ تینوں کے تینوں ماں باپ کی نجات کا ذریعہ بنیں گے، شفاعت کریں گے اور اس طرح سے کریں گے گویا اللہ تعالیٰ کے اوپر اصرار کریں گے کہ ضرور بخشنا پڑے گا۔ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کے لئے جہنم کا حکم ہو جائے گا کہ یہ سزا کے مستحق ہیں، یہ جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہ تین بچے ملائکہ کے آگے آ کے سامنے سے روکیں گے کہ یہ ہمارے ماں باپ ہیں، آپ ان کو کہاں لے کے جا رہے ہیں؟ وہ کہیں گے انہیں جہنم کا حکم ہے۔ بچے کہیں گے ہم نہیں جانتے یہ ہمارے ماں باپ ہیں جیسے بچے کی ضد ہوتی ہے۔ اس طرح ضد کریں گے۔ وہ کہیں گے حکم خداوندی ہے، بچے کہیں گے، ہوگا۔ اللہ نے ہمیں تو معصوم بنایا ہم انہیں نہیں جانے دیتے ہمارے ہوتے ہوئے نہیں جائیں گے۔ ملائکہ علیہم السلام کو لوٹنا پڑے گا اور عرض کریں گے۔ الٰہی! یہ بچے راستہ روک رہے ہیں جانے نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کی ضد کے آگے فرشتوں کی نہیں چلے گی۔

جیسے باپ اگر بادشاہ بھی ہو اور بچہ ضد کرے تو بادشاہ کو بھی بچے کی ماننی پڑتی ہے اس کی حکومت کی ساری

① الصحيح للبخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ، ج: ١ ص: ٤ رقم: ٣.

قوت دھری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح فرشتوں کی طاقت بھی رکھی رہ جائے گی اور وہ مجبور ہو جائیں گے۔ بچے انہیں لوٹا دیں گے تو فرشتے عرض کریں گے کہ خداوندا! آپ کا ارشاد تھا کہ انہیں جہنم میں ڈال دو، یہ بچے روک رہے ہیں، ضد کر رہے ہیں، جانے نہیں دیتے حق تعالیٰ فرمائیں گے، ارے نادان بچو! تمہارے ان ماں باپ نے یہ برائی کی، یہ برائی کی، یہ گناہ کیا، یہ معصیت کی۔ یہ جہنم کے مستحق ہیں۔

یہ کہیں گے ہم نہیں جانتے انہوں نے کیا کیا، یہ تو ہمارے ماں باپ ہیں۔ اگر آپ کو انہیں جہنم میں ہی بھیجنا ہے تو ہمیں بھی بھیج دیجئے۔ اب ظاہر ہے کہ معصوم تو جہنم میں نہیں بھیجے جائیں گے اور اگر آپ نے ہمیں جنت میں بھیجنا ہے تو ہم انہیں بھی لے کے جائیں گے۔

حق تعالیٰ حجت کریں گے جواب دیں گے بچے وہاں بھی ضد کریں گے اخیر میں حق تعالیٰ فرمائیں گے" جاؤ ارے جھگڑالو بچو! ہمارا پیچھا چھوڑو۔ لے جاؤ ان ماں باپ کو جنت میں۔ چنانچہ ان کو جنت میں لے جائیں گے"۔ یہ حدیث آپ نے صدیقہ عائشہ کو سنائی، اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سوال کرتی ہے کہ یا رسول اللہ! اگر کسی کے دو بچے اس طرح گذر جائیں۔ فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے پھر سوال کیا اگر ایک بچہ گذر جائے۔ فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے حتیٰ کہ فرمایا کہ: اگر کوئی حمل ضائع ہو جائے بشرطیکہ بچے میں جان پڑ گئی ہو۔ اس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اس طرح سے ضد کر کے اپنے ماں باپ کو بخشوائے گا۔

اب دیکھئے چھوٹا بچہ جب گذرتا ہے تو ماں باپ پر اور بالخصوص ماں پر کیا گزرتی ہے اس کے تو وہ جگر کا ٹکڑا تھا اس نے نو مہینے اسے اپنے پیٹ میں رکھ کے پالا ہے۔ پرورش کیا تھا۔ پیدا ہونے کے بعد جب گذر جاتا ہے تو باپ کو تو کچھ جلدی صبر بھی آ جاتا ہے مگر ماں کو نہیں آتا، اس لئے کہ اس کے لئے تو ایسا ہے جیسے اس کے بدن کا ٹکڑا کٹ کے ضائع ہو جائے، تو ماں بہت زیادہ پریشان ہوتی ہے لیکن جب یہ حدیث سنے گی کہ یہ میری نجات کا سبب بنے گا تو شاید اسے خوشی پیدا ہو جائے کہ میرے لئے کوئی دکھ نہیں اگر ضائع ہو گیا تو بلا سے ضائع ہو گیا، میرے لئے تو جنت اور نجات کا سامان ہو گیا۔

اگر صدیقہ عائشہؓ یہ سوال نہ فرماتیں نہ اتنا علم کھلتا نہ اتنی آسانی پیدا ہوتی۔ ہم تو یہی کہتے اگر تین بچے گزریں تو پھر جنت کا وعدہ ہے اور اگر دو یا ایک ہوا پھر جنت کا وعدہ نہیں۔ مگر صدیقہ کے سوال کرنے سے معلوم ہوا دو اور ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ بلکہ حمل ساقط ہو جائے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بشرطیکہ روح پڑ گئی ہو۔ تو صدیقہ عائشہؓ کی ذہانت و ذکاوت اور سوال کرنے سے امت کے لئے کتنی بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ کتنے راستے نکلے، تو عورتیں ایسی بھی گذری ہیں جنہوں نے ہزاروں مردوں کے راستے درست کر دیئے اور ان کے لئے ہدایت کا سبب بن گئیں۔

عورت کے اندر بھی غیر معمولی تحمل کی صلاحیت موجود ہے...... شادی اور غمی ایسی چیز ہوتی ہے کہ اس میں آدمی کچھ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ زیادہ غم پڑے جب بھی پاگل سا ہو جاتا ہے۔ زیادہ خوشی آئے جب بھی آپے

سے باہر ہو جاتا ہے۔ایسے میں اگر کوئی سنبھال لے وہ بڑا محسن ہوتا ہے۔اسلام میں ایسی بھی عورتیں گذری ہیں انہوں نے ایسے وقتوں میں مردوں کو سنبھالا۔حالانکہ مرد بہ نسبت عورت کے قوی القلب ہوتا ہے۔عورت کا دل گواتنا قوی نہیں لیکن عورت میں سمجھ بوجھ اور دین و دیانت ہے تو بڑے بڑے قوی مردوں کے سنبھالنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان کا چھ سات برس کا بچہ بڑا ہونہار حسین و جمیل، بیمار ہوا۔اس زمانے کے مطابق دوا دارو کی گئی مگر بچہ اچھا نہ ہوا۔ادھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو اچانک سفر پیش آیا اور انہیں ضروری جانا پڑ گیا۔تو بیوی سے کہا کہ: دیکھو مجھے مجبوری کا سفر پیش آ گیا، میرا جانا ضروری ہے اور بچے کی حالت ایسی ہی ہے، ذرا دوا اور تیمارداری اچھی طرح سے کرنا اور میں جلدی آ جاؤں گا۔کوئی زیادہ دیر کے لئے مجھے نہیں جانا۔یہ فرما کر حضرت جابرؓ چلے گئے۔

جب آنے کا دن ہوا تو بچے کا انتقال ہو گیا۔آپؓ گھر میں تشریف لائے اور بیوی کی دانشمندی، ودیانت دار اور ہوشیاری یہ ہے۔ورنہ اگر کوئی آج کی طرح کی بیوی ہوتی جب وہ دیکھتی کہ خاوند آ رہے ہیں۔تو وہ بڑا رونا شروع کر دیتی تا کہ معلوم ہو بڑا غم پڑا ہوا ہے۔مگر دانشمند تھیں۔اس لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے آنے کا وقت ہوا تو اپنے کو سنبھالا اور صورت ایسی بنائی کہ اسے کوئی غم نہیں ہے اور بچے کو اندر لٹا دیا۔اس کی لاش پر چادر ڈال دی۔

حضرت جابرؓ آئے۔تو جیسے عرب کا دستور ہے۔بیوی نے بڑھ کر استقبال کیا، مصافحہ کیا اور اپنے خاوند کے ہاتھ چومے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ کہا: "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ بِعَافِيَةٍ وخَيرٍ" خدا کا شکر ہے عافیت میں ہے اور بڑی خیر سے ہے۔غلط بات بھی نہیں کی اس لئے کہ مرنے کے بعد بڑی عافیت و خیر ہوتی ہے۔تو ایسا جملہ کہا کہ غلط بھی نہ ہو اور خاوند کو تسلی بھی ہو جائے۔وہ مطمئن ہو گئے۔

ان کے ہاتھ دھلائے کھانا کھلایا۔اس لئے کہ آتے ہی صدمے کی خبر سنا دیتیں ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔پھر کہاں کا کھانا ہوتا، وہ اس کے سوگ میں لگ جاتے۔

کھانا کھلاتے کھلاتے کہا: میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتی ہوں۔اس میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ فرمایا پوچھو۔کہا اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے اور اس کی میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے لئے رکھواتا ہوں۔برس دن کے بعد واپس لے لوں گا۔تو شریعت کا اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

فرمایا حکم کھلا ہوا ہے۔اس کو ٹھیک وقت پہ ادا کرنا چاہئے۔کہا، اگر امانت کے ادا کرتے ہوئے دل گھٹنے لگے اور دل نہ چاہے۔فرمایا: دل گھٹنے کا حق کیا ہے۔چیز دوسرے کی ہے۔اپنی چیز پہ آدمی گھٹے جب دوسرے کی امانت ہے اور وقت مقرر تھا۔اب اس نے مانگ لی، تو گھٹنے اور غم کرنے کا کیا حق ہے؟ کہا شریعت کا یہی مسئلہ ہے؟ فرمایا ہاں مسئلہ یہی ہے۔

کہا: وہ بچہ جو تھا وہ امانت تھا اللہ نے وہ سات برس کیلئے رکھوایا تھا۔کل قاصد پہنچ گیا کہ امانت واپس کر دو۔

میں نے امانت واپس کردی۔ تو ہمیں گھٹنے کا تو کوئی حق نہیں؟ فرمایا نہیں ہے اور بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا: خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے ایسی تسلی دی کہ مجھے بجائے غم کے خوشی ہے کہ ہم امانت ادا کر چکے اور بوجھ ہلکا ہو گیا۔ یہ عورتیں ہی تھیں جو اس طرح سے تسلی بھی دیتی تھیں۔ مگر یہ ان عورتوں کا کام تھا جن میں حوصلہ اور دین و دیانت کا جذبہ تھا۔ اور اگر عورتیں رواج کے مطابق چلیں تو آنکھوں میں نہ بھی آنسو ہوں مگر جب تعزیت کے لئے کوئی آئے تو بنا بنا کر رونا شروع کر دیں گی۔ دوسرے آئیں وہ بھی رونا شروع کر دیں۔ تیسرے آئیں وہ بھی۔ لیکن تحمل کی بات یہ ہے کہ روتے ہوؤں کو تھام لیا جائے غم زدہ لوگوں کو تھام لیا جائے اور تسلی دی جائے، یہ کام کیا تو مرد کرتے ہیں مگر عورتیں بھی ایسے حوصلے کی گذری ہیں جنہوں نے مردوں کے غموں کو ہلکا کر دیا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا پوری امت پر احسان...... حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجہ پاک ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ: ساری امت پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا احسان ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی آئی اور عالم غیب سے پہلی بار سابقہ پڑا۔ تو حضرت جرائیل علیہ السلام کو آپ ؐ نے اصلی شکل میں دیکھا۔ ورنہ انسانی صورت میں آتے تھے۔ صحابہؓ میں حضرت دحیہ کلبیؓ بہت خوبصورت اور حسین وجمیل صحابیؓ تھے ان کی شکل میں حضرت جبرائیل آیا کرتے تھے۔ صحابہ دیکھتے تھے کہ دو دحیہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک ادھر ایک ادھر جانتے تھے کہ یہ دحیہ کلبی صحابی ہیں اور یہ حضرت جرائیل علیہ السلام ہیں۔ تو دو مرتبہ اصل شکل میں حضور علیہ السلام نے دیکھا۔ ایک تو جب غار حرا میں سب سے پہلی وحی آئی ہے۔ اس وقت اپنی اصلی شکل میں نمایاں ہوئے اور ایک معراج کی شب میں۔ اور یہ دیکھنا اس شان سے تھا کہ ان کے چھ، چھ سو بازو ہیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک جتنی فضا ہے، سب ان کے بدن سے گھری ہوئی ہے۔ اتنا عظیم قد و قامت ہے کہ سر آسمان پر ہے، پیر زمین پر ہیں۔ موڈھے جنوب وشمال میں، چھاتی اور سینہ مشرق و مغرب میں ہے۔ گویا پوری فضا جرائیل علیہ السلام کے بدن سے بھری ہوئی ہے۔ چہرہ سورج کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک تاج بھی ان کے سر پر رکھا ہوا ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے۔ اس سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں اور ایک سبز رنگ کا کپڑا ہے جو ان کے بدن پر پڑا ہوا ہے۔ تو اتنی حسین وجمیل شکل مگر اتنی عظیم دیکھ کر، ایک دفعہ تو آپ ؐ گھبرا گئے اور آپ ؐ کے اوپر ہیبت اور لرزہ طاری ہوا۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ رجال غیب کو اس طرح سے دیکھا اور دیکھا بھی اتنی عظیم شکل میں۔ آپ گھبرا کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ'' مجھے کمبل اڑاؤ، کمبل اڑاؤ مجھے ڈر ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گا، میری جان نکل جائیگی۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: کیا واقعہ ہوا؟

آپ ؐ نے واقعہ بیان فرمایا' تو حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی اور فرمایا: ''کَلَّا وَاللّٰہِ لَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا

اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تُقْرِءُ الضَّیْفَ وَ تَحْمِلُ الْکَلَّ وَ تُعِیْنُ عَلٰی نَوَآئِبِ الْحَقِّ" ① "خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ صلہ رحمی، غریبوں کی مدد اور مہمان نوازی آپ کرتے ہیں، مسکینوں کو آپ پناہ دیتے ہیں۔ ساری دنیا کی خیر خواہی میں لگے ہوئے ہیں ایسے بندوں کو اللہ ضائع نہیں کیا کرتا۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں آپ کی جان نہیں جاسکتی"۔

یہ تو زبان سے تسلی دی۔ اور عمل یہ کیا کہ ہاتھ پکڑ کر ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ عرب کے لوگوں میں بہت بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے تھے۔ مذہباً نصرانی تھے اس لئے انجیل اور تمام آسمانی کتابیں لکھا بھی کرتے تھے اور ان کو یہ کتابیں یاد تھیں اور ان کے علوم سے واقف بھی تھے۔ مشرکین عرب یا خاندان قریش میں ایک یہ تھے جو اہل کتاب میں شامل ہوئے اور آسمانی کتابوں کے بڑے زبردست عالم ہوئے۔ حضرت خدیجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس لے گئیں کہ انکے حالات کا صحیح پتا وہ دے سکتا ہے جو عالم ہو اور دینی و تاریخی علوم سے واقف ہو۔ حضرت خدیجہؓ جب انکے پاس پہنچیں اور کہا ذرا سنئے یہ آپ کا بھتیجا کیا کہتا ہے۔

"اِسْمَعْ لِابْنِ اَخِیْکَ؟" اپنے بھائی کے بچے سے پوچھئے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا حالت اس کو پیش آئی؟ ورقہ بن نوفل نے بڑی شفقت سے فرمایا: "یَا ابْنَ اَخِیْ مَاذَا تَرٰی؟" میرے بھتیجے کیا بات تم نے دیکھی؟ کیوں گھبرائے ہوئے ہو۔ آپ نے سارا واقعہ سنایا کہ میں اس طرح غار حرا میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی شخصیت نمایاں ہوئی۔ یہ اس کی شکل تھی اور یہ اس نے مجھ سے خطاب کیا۔ ②

ورقہ ابن نوفل نے کہا: اَبْشِرْ اَبْشِرْ۔ خوشخبری حاصل کر۔ یہ وہ ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لے کر آتا تھا اور دیگر پیغمبروں کے پاس آتا تھا۔ خدا نے تم کو اس امت کا پیغمبر بنایا ہے جس کی خبریں سننے میں آرہی تھیں وہ تم ہی معلوم ہوتے ہو، اس لئے تم نہ گھبراؤ۔ یہ تو تمہارے لئے بشارت ہے۔ اور کہا کہ "کاش جب تم تبلیغ کا نام لے کر کھڑے ہو اور اسلام کی دعوت دو، میں اس وقت زندہ ہوتا تو تمہاری مدد اور اعانت کرتا۔ لیکن میں تو قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہوں"۔

سو برس سے زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ بڑے معمر اور بوڑھے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ایسا کٹھن معاملہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ یہ معاملہ کوئی بدنی بیماری کا نہیں تھا کہ کوئی بخار آ گیا ہو، کھانسی آ گئی ہو، یہ روحانی معاملہ تھا اور روحانی معاملہ بھی وہ جو پیغمبروں سے پیش آتا ہے۔ کسی معمولی ولی کا بھی نہیں بلکہ نبی الانبیاء کا معاملہ تھا۔ اس میں تسلی دینے کے لئے ایک عورت کھڑی ہوئی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، ہمارے زمانے کی کوئی عورت ہوتی تو وہ گھبرا کے کہتی۔ خدا جانے اب کیا ہوگا۔ جلدی سے کمبل اڑھاؤ اور ایک واویلا شروع ہو جاتا۔ لیکن انکا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳۔

② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳۔

گھبرانا تو بجائے خود ہے۔اس ذات اقدس کو تسلی دی جو پورے عالم کی سردار بننے والی تھی۔ان کے دل کو تھامنے کی کوشش کی۔قول سے الگ تھاما،عمل سے الگ تھاما۔زبان سے یہ تسلی دی کہ آپ وہ نہیں ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع کرے۔آپ تو سرتاپا بزرگ ہی بزرگ،خیر ہی خیر ہیں۔عادت اللہ یہ ہے کہ ایسی ہستیوں کو اللہ کھویا نہیں کرتا اور عمل یہ کیا کہ ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں۔یہ ایک عورت ہی تھی جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا درحقیقت پوری اس امت کو تسلی دینا ہے جو قیامت تک آنے والی ہے۔گویا اکیلی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پوری امت پر احسان ہے۔①

میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتیں ایسی ایسی بھی گزری ہیں اس لئے عورتوں کا یہ خیال کرنا کہ ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ گھر میں بیٹھ جائیں۔کھانا پکا دیا۔زیادہ سے زیادہ بچوں کے کپڑے سی دیئے اور زیادہ ہوا،ان کی تربیت کر دی۔اس سے زیادہ ہم ترقی کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ میدان مردوں کا ہے۔ولی بھی مرد بنے گا،امام بھی مرد بنے گا،مجتہد اور خلیفہ بھی بنے گا۔ہم اس کام کے لئے نہیں ہیں۔تم چاہو تو مجتہد،ولی کامل بن سکتی ہو۔اللہ کی طرف سے تمہارے ساتھ الہام کا معاملہ ہو کہ تمہارے اوپر الہام آئے۔تم یہ بھی کر سکتی ہو۔جو ایک بڑے سے بڑے ولی کا حال ہو سکتا ہے۔وہ ایک عورت کا بھی ہو سکتا ہے۔بشرطیکہ عورت توجہ کرے مگر یہ توجہ نہیں کرتیں۔یہ ساری بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ یہ غلط فہمی رفع ہو جائے کہ عورت کے دل میں کھٹک پیدا ہو گئی کہ ہم نہ دینی ترقی کے لئے ہیں نہ عملی ترقی کے لئے اس کام کے لئے تو مرد ہیں۔

عورتوں کی علمی واخلاقی ترقی میں مرد سنگ راہ ہیں......اگر برا نہ مانا جائے تو میں کہوں گا اس میں زیادہ قصور مردوں کا ہے۔یہ خیال انہوں نے اپنے عمل سے پیدا کیا ہے۔زبان سے تو کسی نے نہیں کہا ہوگا۔مگر غریب عورتوں کے ساتھ جو طریق عمل برتا گیا ہے۔کہ نہ ان کو تعلیم وترقی دینے کا بندوبست،نہ دین سکھلانے کا بندوبست۔

گویا عملاً زبان حال سے آپ نے انہیں باور کرا دیا کہ تم اس لئے پیدا ہی نہیں کی گئی ہو کہ دینی واخلاقی ترقی کرو۔یہ کچھ کریں گے تو ہم کریں گے۔اور ہم بھی افریقہ میں رہ کے نہیں کریں گے۔کوئی ہندوستان میں رہ کر ترقی کرلے تو کرے۔ہم اس لئے پیدا ہی نہیں کیے گئے نہ ہماری عورتیں اس لئے پیدا کی گئیں۔

جب آپ نے اپنے طرز عمل سے عورتوں کے راستے بند کر دیئے ہیں۔تو ان غریب عورتوں کا کوئی قصور نہیں یہ قصور اصل میں مردوں کا ہے اور قیامت کے دن ان مردوں سے باز پرس ہوگی کہ تم نے کیوں تربیت کی طرف توجہ نہیں کی؟ کیوں ان کو تعلیم نہ دی۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ"② "تم میں سے ہر شخص بادشاہ ہے اور قیامت کے دن ہر بادشاہ سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا

① الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب فضيلة الامام العادل وعقوبة الجائر، ج: ١٣ ص: ١٤٥٩ رقم: ١٨٢٩.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن ج: ٣ ص: ٤١٤.

کہ اپنی رعیت کو کس طرح سے رکھا؟'' آرام سکھ سے رکھا یا تکلیف سے؟ صحیح تربیت کی یا نہیں کی؟ دین پر لگایا یا دین سے ہٹایا تو فرمایا، ہر گھر کا مرد بادشاہ ہے اور جتنے گھر میں رہنے والے ہیں وہ درحقیقت اس کی رعایا ہیں۔ اس کے زیر عیال ہیں۔ قیامت کے دن سوال ہوگا کہ گھر والوں کے ساتھ تم نے کس قسم کا برتاؤ کیا؟ ملک کا بادشاہ ہے تو پورا ملک اس کی رعیت ہے۔ قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعیت کو کس حال میں رکھا انکی آسائش کی خبر لی یا انہیں تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کو آبروبخشی یا انہیں بے آبرو اور بے عزت کیا؟ ان کو ایذا پہنچائی یا ان کی راحت رسانی کا سامان کیا یہ ہر بادشاہ سے سوال ہوگا۔ استاذ سے اس کے شاگردوں کی نسبت سوال ہوگا کہ تیرے شاگرد تیرے حق میں بمنزلہ رعیت کے تھے۔ تو ان کا بادشاہ تھا۔ وہ تیری حکم برداری کرتے تھے تو نے ان پر کیا کیا حکم چلایا۔ شیخ سے اس کے مریدین کی نسبت سوال ہوگا کہ مریدین بمنزلہ رعیت کے تھے تو حکم کرنے والا تھا تجھے منوانے کا مقام دیا گیا تھا اور وہ ماننے والے تھے۔ تو نے کیا کیا چیزیں منوائیں۔ تو نے اس سے دین منوایا یا بری چیزیں اس سے منوائیں۔ غرض ہر شخص سے سوال کیا جائے گا۔ تو آپ سے اور مجھ سے بھی سوال ہوگا۔ عورتوں کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔ کیونکہ وہ ہمارے زیر تربیت اور زیر عیال ہیں۔

عورتوں کے بارے میں مرض الموت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ توجہ عورتوں کی طرف دی ہے۔ حتیٰ کہ عین وفات کے وقت جو آخر کلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہے وہ یہ تھا کہ ''اِتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَآءِ'' ① ''اے لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو''۔ یہ امانتیں ہیں جو تمہارے سپرد کی گئی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم امانت میں خیانت کرو اور قیامت کے دن تم سے باز پرس ہو۔ یہ آخری کلمہ ہے جو عین وفات کے وقت فرمایا ہے۔ وہ یہ تھا کہ عورتوں کی فکر کرو کہیں یہ ضائع نہ ہو جائیں۔ ان کو خراب نہ کر دیا جائے، ان کی تربیت نہ تباہ ہو جائے۔ ان کا دین نہ برباد ہو جائے اور دنیا نہ خراب ہو جائے۔

تو جس ذات اقدس نے خود عورتوں کے بارے میں اتنی توجہ کی، اس کی امت کا بھی فرض ہے کہ وہ توجہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ: ''اِنَّ اَكْرَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُكُمْ اَهْلًا'' ② تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور عورتوں، بیویوں کے ساتھ لطف و مروت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو''۔ مطلب یہ کہ جو عورتوں کے ساتھ زیادتی اور سختی سے پیش آئے، جو ان کا دل دکھائے وہ قابل تکریم نہیں ہے۔ اس حدیث کا حاصل یہی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی اور پوری توجہ فرمائی اور عین وفات کے وقت آپ نے جو نصیحت ارشاد فرمائی وہ عورتوں کے بارے میں تھی۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ ج: ٢ ص: ٨٨٦ رقم: ١٢١٨.

② الحديث اخرجه البخاري ولفظه: ان من خيار كم احسنكم اخلاقاً، كتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم ج: ٣ ص: ٣٠٥.

امت کے لئے نبی اکرمؐ نے جہاں اتنا خیال کیا، امت کیا خیال کر رہی ہے؟ امت نے یہ کیا کہ طرزِ عمل سے یہ باور کرا دیا کہ تم نہ دینی ترقی کے قابل نہ دینی عمل کے قابل۔ یہ تمہارا کام ہی نہیں بس تمہارا کام یہ ہے کہ اگر تم غریب ہو تو گھر بیٹھ کے کھانا پکاؤ اور اگر تم دولت مند ہو تو کھانا ملازمہ پکا لے گی۔ تم اچھے کپڑے پہن لیا کرو، بہترین زیور پہن لیا کرو اور جو جی میں آئے آرائش زیبائش کر لیا کرو۔ بس قصہ ختم ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا۔

عشقِ صورت سے حقیقت کی محبت ختم ہو جاتی ہے...... اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بدنوں کو تو سنوار دیا لیکن دلوں کو بھی سنوارا ہے؟ بدن کی آرائش و زیبائش تو چند دن کی بہار ہے یہ چند دن میں ختم ہونے والی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا تین دن میں بتلا دیتا ہے۔ ساری جوانی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اگر آدمی جوانی کے اوپر ناز کرے اور چہرے کی تازگی و رونق پر اترائے تو تین دن کا بخار بتلا دیتا ہے کہ جوانی کی یہ حقیقت تھی۔ چہرے کی سرخی بھی ختم، منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور تین دن میں بخار سے ایسا حال ہو گیا اور بخار نے بتلا دیا کہ سب سے بڑا مربی اور ناصح میں ہوں۔ یہ بتلا دیتا ہے کہ جس کے لئے سارا سب کچھ کیا جا رہا ہے اس کی یہ قدر و قیمت ہے۔

اس واسطے اہل اللہ نے اس کی خاص طور پر تاکید کی ہے کہ صورتوں کے حسن و جمال میں زیادہ مت گھسو سیرت کے حسن و جمال کو دیکھو، اخلاق کی پاکیزگی کو دیکھو۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں اللہ اللہ سیکھنے کے لئے ہزاروں آدمی آتے تھے۔ ایک شخص آیا۔ ابھی بے چارہ نیا تھا بزرگی نے اس کے دل میں گھر نہیں کیا تھا، شیخ سے بیعت ہوا۔ شیخ نے اسے اللہ اللہ بتا دی۔ اس نے بھی ذکر اللہ شروع کر دیا اور طریقہ یہ تھا کہ خانقاہ میں جتنے مریدین ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا۔ ایک باندی تھی جو کھانا تقسیم کر جاتی تھی۔ یہ مرید جو نو وارد تھے۔ باندی انہیں کھانا دینے کے لئے آئی باندی ذرا اچھی صورت کی تھی۔ ان کی طبیعت اس کی طرف مائل ہو گئی۔ اب جب وہ کھانا لے کے آئے۔ یہ اسے گھورنا شروع کر دیں۔ شیخ کو پتہ چل گیا کہ یہ باندی کی صورت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ جتنا صورت و شکل میں الجھیں حقیقت اتنی کم ہو گی اور ذکر اللہ وغیرہ چھوٹ گیا بس یہ نگاہ بازی رہ گئی۔ جب وہ آئے اسے گھور رہے ہیں نہ اللہ کا نام اور نہ ذکر، عادت اللہ یہی ہے کہ بندہ صورتوں میں جتنا الجھتا ہے حقیقت سے اتنا ہی بے خبر بن جاتا ہے۔ جب صورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا حقیقت کا عشق ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ صورت کے دیکھنے میں لگ گئے اور جو حقیقت تھی اللہ اللہ کرنا اور یاد خداوندی، اس سے غفلت شروع ہو گئی۔

شیخ کو پتہ چل گیا کہ ہمارے مرید اس بلا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سبحان اللہ انہوں نے بڑی تدبیر سے علاج کیا۔ انہیں بلا کر یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی۔ ایسا مت کرو۔ بلکہ ایک تدبیر اختیار کی اور ہنسی کی تدبیر اختیار کی اور ان کی اصلاح بھی ہو گئی۔

وہ یہ کہ دستوں کی ایک دوا لا کر اس باندی کو کھلا دی۔ جمال گھوٹا یا کوئی دوسرا مسہل صبح سے شام تک اسے بڑی

تعداد میں دست آ گئے اور باندی کو یہ حکم دیا کہ ایک چوکی رکھ دی گئی ہے اس پر جا کر حاجت کرنا۔ وہ بیچاری ہر دس منٹ کے بعد جاتی۔ شام کو جب وہ چہرے کی سرخی باقی نہ رہی، ہڈی کو چمڑہ لگ گیا۔ صورت دیکھوتو دیکھ کے نفرت آئے اور وہ جو گلاب سا چہرہ کھل رہا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ ایک زردی سی چھا گئی۔

شیخ نے اب اس کو کہا کہ: اس مرید کے پاس کھانا لے کے جا اور تیرے ساتھ جو معاملہ کرے مجھے اس کی اطلاع دینا۔ اب وہ کھانا لے کے آئی تو انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب وہ آئے اور میں اس کو گھوروں۔ اور اب جو آئی تو دیکھا کہ ہڈیاں نکلی ہوئیں، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں، سرخی کی بجائے زردی چھائی ہوئی۔ انہیں بڑی نفرت پیدا ہوئی۔ کہا رکھ دے کھانا اور چلی جا جلدی یہاں سے وہ بیچاری کھانا رکھ کے چلی گئی۔ شیخ سے اس نے جا کے کہا، یہ اس نے کہا اور کہا بجائے اس کے کہ مجھے دیکھے، کہا چلی جا یہاں سے شیخ سمجھ گئے کہ علاج ہو گیا۔ شیخ تشریف لائے اور اس مرید سے فرمایا کہ میرے ساتھ تشریف لے چلئے، انگلی پکڑ کے لے گئے۔ وہ جو قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں کثیر تعداد دستوں کی نجاست بھری ہوئی تھی۔ فرمایا یہ ہے آپ کا معشوق اسے لے جایئے۔ اس لئے کہ جب تک یہ باندی میں موجود تھا باندی سے محبت تھی۔ اب یہ نکل گیا اور تو کوئی چیز نہیں نکلی۔ آپ کو نفرت ہو گئی معلوم ہوا اس باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے محبت تھی۔ اس گندگی کو احتیاط سے لے جایئے اور صندوق میں رکھیئے یہ آپ کا معشوق و محبوب ہے ؎

عشق صورت آخرت ننگے بود

حقیقت یہ ہے کہ صورتوں کا عشق گندگی کا عشق ہے۔ سیرت کا عشق پاکیزگی کا عشق ہے۔ اعلیٰ ترین سیرت اخلاق ہیں محبت کے قابل یہ چیز ہے۔

صورت کی خوبیاں فتنہ اور سیرت کی خوبیاں امن پیدا کرتی ہیں...... بلکہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ صورت کی خوبی فتنے پیدا کرتی ہے اور سیرت کی خوبی امن پیدا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا "فَإِذَا قَدْ أُعْطِيَ شَطْرُ الْحُسْنِ." "آدھا حسن اللہ نے ساری دنیا کو دیا اور آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو عطا کیا"۔ حضرت یوسف علیہ السلام اتنے بڑے حسین و جمیل تھے یوسف علیہ السلام پر جتنی مصیبتیں آئیں وہ صورت کے حسن کی وجہ سے آئی ہیں۔ بھائیوں نے کنعان کے کنویں میں ڈالا، مصر کے بازار میں غلام بنا کے بیچے گئے۔ نو برس تک جیل خانہ بھگتا۔ یہ ساری صورت کی مصیبت تھی اور جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا۔

اس وقت خود حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ ① مجھے مصر کی سلطنت دیدو، تو وجہ یہ نہیں بیان کی کہ "اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ" میں بڑا خوبصورت ہوں اس لئے مجھے بادشاہ بنا دو،

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

بلکہ یوں فرمایا ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ① "مجھے سلطنت بخش دو اس واسطے کہ میں عالم ہوں"۔ میں جانتا ہوں کہ سلطنت کس طرح سے چلتی ہے میں اپنے علم و کمال سے سلطنت چلا کے دکھلاؤں گا۔ تو مصیبتوں کا جب وقت آیا تو حسن و جمال سامنے آیا اور سلطنت ملنے کا وقت آیا تو اندرونی سیرت، علم و کمال سامنے آیا۔ اس لئے صورت کی خوبیاں فتنے میں مبتلا کرتی ہیں اور سیرت کی خوبیاں دنیا میں امن پیدا کرتی ہیں۔

میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ: اگر غریب گھرانے کی عورت ہے تب تو بڑے سے بڑا کام مردوں کی طرف سے کیا سپرد ہوتا ہے؟ یہ کہ کھانا پکا کے دے، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پال پرورش کر دے۔ اس کے فرائض ختم ہو گئے۔ اور اگر امیر گھرانے کی عورت ہے تو وہ بچوں کی دیکھ بھال نہیں کریگی وہ ملازمہ کرے گی کھانا بھی وہ پکائے گی ان کا کام یہ ہے کہ ذرا اچھے کپڑے پہن لئے۔ اچھا زیور پہن لیا، ذرا اور آزاد ہوئیں تو تفریح کے لئے بازار بھی ہو آئیں۔ یہ کام کر لیا اور زندگی کے فرائض ختم ہو گئے۔

آگے یہ کہ تمہاری سیرت کیسی ہے؟ تمہارا قلب کیسا؟ اخلاق کیسے؟ اس میں علم ہے یا نہیں؟ آخرت کا تعلق ہے یا نہیں؟ اللہ کے سامنے جانے کا کچھ خطرہ تمہارے سامنے ہے یا نہیں؟ قبر و حشر میں کیا گذرے گی انجام کیا ہو گا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بس کھا لیا، پی لیا، عمدہ لباس پہن لیا، بہتر سے بہتر زیور پہن لیا اور فرائض ختم ہو گئے۔

یہ تو اللہ کے ہاں سوال ہو گا کہ تمہیں بادشاہ بنایا گیا تھا کیا اس لئے کہ رعیت کو اچھا کھلا دو، پہنا دو اور ہم سے غافل کر دو؟ اس لئے تمہیں بادشاہ بنایا گیا تھا کہ مقصد کی طرف متوجہ کرو۔ وہ یہ کہ ہماری طرف متوجہ کرتے جس کے لئے تمہیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ یہ نہیں کیا تو تم سزا کے مستحق ہو، اس لئے میں سمجھتا ہوں اس میں عورتوں کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سارا مردوں کا قصور ہے کہ نہ ان کی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں نہ ان کی تربیت کا، ان کی دلداری کا بڑے سے بڑا طریقہ ان کے ہاں یہ ہے کہ جو ان کی خواہش ہو وہ پوری کرو کپڑے، زیور دیدو، بس فرض ختم ہو گیا۔ یہ نہیں کرتے کہ ان کے دل کو سنواریں، ان کی روح میں آراستگی پیدا کریں کیا قیامت کے دن اس بارے میں ہم سے سوال نہیں ہو گا؟ کیا ہم سے پوچھا نہیں جائے گا؟ ضرور پوچھا جائے گا؟ ضرور پرستش ہو گی۔ اس جوابدہی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

دولت میں رہ کر عورت متقی بن سکتی ہے...... اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب عورت کی گود علم و کمال سے خالی ہو گی تو بچے میں علم کہاں سے آئے گا؟ بچہ تو ماں کی گود سے علم حاصل کرتا ہے۔ وہاں جہالت ہے تو وہ بھی جاہل ہو گا۔ وہاں محض ظاہری ٹیپ ٹاپ کی خواہش ہے بچے میں بھی یہی ٹیپ ٹاپ پیدا ہو گی اسے بھی دل کے سنوارنے کی کوئی فکر نہیں ہو گی۔

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا اور وہ بڑی عبرت کا واقعہ ہے۔ وہ اس کا ہے کہ اگر عورت دیندار بننا چاہے اور اس کو بنانا چاہیں تو بڑے بڑے آرام اور عیش میں رہ کر بھی دیندار بن سکتی ہے۔ اور بد دین بننا چاہے فقر و فاقہ میں

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

بھی بددین بن سکتی ہے۔ دین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی بھک منگا بن جائے تو دین دار بنے گا اور اگر کوئی کروڑ پتی ہو گیا، تو وہ دین دار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ غلط ہے۔ دین دار بننا چاہے تو کروڑ پتی بن کے بھی دیندار بن سکتا ہے اور نہ بننا چاہے تو فاقہ مست ہو پھر بھی بددین بن سکتا ہے اس پر میں واقعہ عرض کررہا ہوں۔

وہ یہ کہ کابل کے بادشاہوں میں امیر دوست محمد خاں بہت دیندار بادشاہ گذرے ہیں، امیر امان اللہ خان مرحوم کے باپ امیر حبیب اللہ خاں تھے اور حبیب اللہ خاں کے باپ امیر عبدالرحمٰن تھے، ان کے باپ دوست محمد خاں تھے اور انکا زمانہ تھا۔ ان کے زمانے میں کسی دوسرے بادشاہ نے افغانستان کے اوپر حملہ کیا اور فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ امیر صاحب کو اس سے صدمہ بھی ہوا اور دکھ بھی کہ ایک بادشاہ نے میری سلطنت پر حملہ کردیا۔ ممکن ہے کہ بادشاہت بھی ختم ہو اور آنے والا ملک کو برباد کردے۔

اسی فکر میں شاہی محل میں اندر تشریف لائے، انکی بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ بیگم سے یہ کہا کہ: آج ایسی خبر آئی ہے کہ کسی بادشاہ نے حملہ کیا ہے۔ میں نے اپنے شہزادے کو فوج دے کر بھیج دیا ہے تاکہ وہ جا کے دشمن کا مقابلہ کرے۔ بیگم نے کہا ٹھیک کیا اور گھبرایئے مت اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ غرض اپنے شہزادے کو فوج دے کر بھیج دیا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرے اور اس کو ملک میں نہ آنے دے اور اسے دور دھکیل دے۔ شہزادہ فوج لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن امیر صاحب گھر میں آئے اور چہرے پر غم کا اثر بیگم سے کہا کہ: آج ایک بڑے صدمے کی خبر آئی ہے اور وہ یہ کہ میرا شہزادہ ہار گیا۔ اس نے شکست کھائی اور دشمن ملک کے اندر چڑھا ہوا آرہا ہے اور میرا بیٹا شکست کھا کر واپس بھاگتا ہوا آرہا ہے مجھے اسکا بڑا صدمہ ہے' ملک بھی جارہا ہے اور یہ بات بھی پیش آگئی۔

بیگم نے کہا: یہ بالکل جھوٹی خبر ہے اور آپ اس کا بالکل یقین نہ کریں۔ اس نے کہا جھوٹی نہیں ہے یہ تو سرکاری پرچہ نویس نے اطلاع دی ہے۔ محکمہ سی آئی ڈی کی اطلاع ہے۔ اس نے کہا آپ کا محکمہ بھی جھوٹا ہے اور سی آئی ڈی بھی آپ کی جھوٹی ہے۔ یہ غلط خبر ہے ایسا نہیں ہوسکتا۔

اب امیر صاحب کہہ رہے ہیں کہ سلطنت کی باضابطہ اطلاع ہے۔ یہ گھر میں بیٹھ کے کہہ رہی ہے کہ خبر جھوٹی ہے اس نے کہا کہ نہیں یہ باضابطہ بھی بالکل جھوٹ ہے۔ امیر نے کہا کہ: اب اس عورت سے بیٹھ کر کون جھک جھک کرے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ نہ کوئی دلیل نہ کوئی حجت میں دلائل بیان کررہا ہوں کہ محکمہ کی اطلاع اور ضابطہ کی خبر۔ اس نے کہا سب جھوٹ اب اس سے کون بحث کرے۔

جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ﴾ ① فرمایا کہ عورت میں کچھ عقل کی کمی ہوتی ہے۔ جب بحث ہوتی ہے تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بچپن سے زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے۔ جب ابتداہی سے رات دن سونا چاندی دل میں گھس

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

گیا تو علم اور کمال کہاں سے گھسے گا۔ ایک چیز گھس سکتی ہے یا سونا گھس جائے یا علم۔ ذرا دودھ پینا چھوٹا تو اس کے کان میں سوراخ کر دیا تاکہ اس میں سونے کی بال پڑ جائے اور ذرا بڑی ہوئی تو ناک میں سوارخ کر دیا تاکہ اس میں سونے کی بالی بھی ڈال دو اور زیادہ ہوا تو گلے میں سونے کا طوق ڈال دیا، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں ڈالدیں اور پیروں میں سونے کی بیڑیاں ڈال دیں۔ غرض سونے چاندی کی قیدی۔ اور واقعی اگر عورتوں سے یوں کہا جائے کہ تمہارے بدن میں کیلیں ٹھونکی جائیں گی مگر وہ سونے کی ہوں گی۔ فوراً راضی ہو جائیں گی۔ جلدی کرو ٹھونک دو۔ مگر کیل سونے چاندی کی ہونی چاہئے۔ اس درجہ سونے اور چاندی کی محبت میں گرفتار ہیں کہ بدن چھدوانے کو تیار ہیں مگر سونا اور چاندی ہو۔ جب اس درجہ پر بات ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جو قرآن نے فرمایا:

﴿اَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① وہ جو سونے اور چاندی میں نشو و نما پاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی قوت نہیں پیدا ہوتی۔ جب خاوند سے بحث ہوتی ہے وہ تو حجتیں پیش کرتا ہے اور یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتی ہے کہ نہیں یوں ہوگا۔

تو امیر صاحب نے دیکھا کہ بھئی میں حجت بیان کر رہا ہوں سرکاری خبریں دے رہا ہوں۔ یہ کہتی ہے سب غلط ہیں۔ اب اس عورت سے کون بحث کرے۔ محل سرائے سے واپس چلے آئے۔ دوسرے دن بڑے خوش خوش آئے اور کہا مبارک ہو۔ جو تم نے کہا تھا بات وہی سچی نکلی۔ خبر یہ آئی ہے کہ میرا شہزادہ فتح پا گیا اس نے دشمن کو بھگا دیا اور وہ کامیابی کے ساتھ واپس آرہا ہے۔

بیگم نے کہا الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری بات اونچی کی اور میری بات سچی کر دکھائی۔ امیر نے کہا آخر تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا جو تم نے کل یہ حکم لگا دیا کہ میرا محکمہ بھی جھوٹا سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس بھی جھوٹی۔ تو تمہیں کوئی الہام ہوا تھا؟

اس نے کہا کہ مجھے الہام سے کیا تعلق اول تو میں عورت ذات، پھر ایک بادشاہی تخت پر بیٹھنے والی۔ یہ بزرگوں کا کام ہے کہ انہیں الہام ہو۔ بھلا مجھے الہام سے کیا تعلق؟ میں ایک معمولی عورت۔ انہوں نے کہا کہ آخر تم نے اس قوت سے کس طرح کہہ دیا کہ سب بات غلط ہے اور واقعہ بھی وہی ہوا کہ وہ غلط ہی ثابت ہوئی۔

اس نے کہا اس کا ایک راز ہے جس کو میں نے اب تک کسی کے سامنے نہیں کھولا اور نہ اسے کھولنا چاہتی ہوں۔ امیر نے کہا وہ کیسا راز ہے؟ اب امیر صاحب سر ہو گئے کہ آخر ایسا کون سا راز ہے جو خاوند سے بھی چھپا ہوا رہ جائے۔ اس نے کہا صاحب! کہ ایسی بات ہے کہ میں اس کو کہنا نہیں چاہتی۔ ''اَلْاِنْسَانُ حَرِيْصٌ فِيْ مَامُنِعَ.'' مثل مشہور ہے کہ جس چیز سے روکا جائے اس کی اور زیادہ حرص بڑھتی ہے کہ آخر اس میں کیا ہوگا۔ تو امیر صاحب نے کہ اب تو بتانا پڑیگا۔ جب بہت زیادہ سر ہو گئے تو اس نے کہا آج تک میں نے یہ راز چھپایا اب کھولے دیتی ہوں۔

---

① پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآية: ۱۸.

وہ راز یہ ہے کہ مجھے اس کا کیوں یقین تھا کہ شہزادہ فتح پا کے آئے گا یا قتل ہوگا مگر شکست نہیں کھا سکتا۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کے نہیں آ سکتا۔ یہ میرا یقین کس بنا پر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ میرے پیٹ میں تھا۔ میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اس نو مہینے ایک مشتبہ لقمہ بھی اپنے پیٹ میں نہیں ڈالوں گی۔ رزق حلال کی کمائی میرے پیٹ میں جائیگی اس لئے کہ ناپاک کمائی سے خون بھی ناپاک پیدا ہوتا ہے اور ناپاک خون سے اخلاق بھی گندے اور ناپاک پیدا ہوتے ہیں تو میں نے عہد کیا اور نو مہینے اس کو پورا کیا کہ لقمہ حرام تو بجائے خود ہے۔ میں نے کوئی مشتبہ لقمہ بھی پیٹ میں نہیں جانے دیا۔ خالص حلال کی کمائی سے پیٹ کو بھرا۔ ایک تو میں نے یہ عہد کیا اس کو لازم رکھا اور اس پر عمل کیا۔

دوسری بات میں نے یہ کی کہ جب یہ پیدا ہو گیا تو ہزاروں دودھ پلانے والی ملازمات تھیں میں نے اس کو انہیں نہیں دیا، اپنا دودھ پلایا۔ دودھ پلانے کا طریقہ یہ تھا۔ جب یہ روتا میں پہلے وضو کرتی، دو رکعت نفل پڑھتی اس کے بعد اسے دودھ پلاتی۔ دعائیں بھی مانگتی۔ تو اندر پاک غذا پھر اللہ کی طرف توجہ۔ غرض دودھ بھی پاک، اس سے پیدا ہونے والا خون بھی پاک اور پاک خون سے پیدا ہونے والے اخلاق بھی پاک۔ اس لئے اس کے اندر بداخلاقی نہیں ہو سکتی۔ پشت دکھلا کر آنا اور بزدلی کرنا۔ یہ کمینے اخلاق میں سے ہے۔ شجاعت اور بہادری یہ پاکیزہ اخلاق میں سے ہے۔ جب اس کا خون پاک تھا تو یہ کیسے ممکن تھا یہ بزدل بنتا۔ یہ ممکن تھا یہ قتل ہو جاتا، شہید ہو جاتا، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ پشت کے اوپر زخم کھا کر واپس آتا اور بزدلی دکھلاتا، جب اس کے خون میں ناپاکی نہیں تو اس کے افعال میں ناپاکی کہاں سے آئے گی؟

یہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے دعویٰ کر دیا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ شکست کھا کر آئے ہاں آپ یہ کہتے کہ شہید ہو گیا۔ میں یقین کر لیتی کہ وہ قتل ہو گیا۔ اس بناء پر میں نے یہ دعویٰ کیا تھا آج میں نے یہ راز کھولا۔ آپ اندازہ کریں کہ امیر دوست محمد خاں کی بیوی ایک اقلیم کی ملکہ ہیں۔ ہزاروں فوجیں اور سپاہ، حشم وخدم اس کے سامنے ہیں اور وہ جب تخت سلطنت پر بیٹھ کر اتنی متقی بن سکتی ہے تو ہماری بہو بیٹیاں معمولی گھرانوں میں رہ کر کیوں نہیں متقی بن سکتیں۔ ہمارے پاس کونسی ایسی دولت ہے۔ ہم اگر لکھ پتی یا کروڑ پتی بنیں سارے افریقہ کے مالک تو نہیں ہو گئے ہفت اقلیم کے بادشاہ تو نہیں ہو گئے۔ ایک ملکہ اور بادشاہ کی بیوی جب یہ تقویٰ دکھلا سکتی ہے تو میری بہنیں کیوں نہیں تقویٰ دکھلا سکتیں؟ میری بیٹیاں کیوں نہیں یہ تقویٰ دکھلا سکتیں؟ ان کے پاس تو اتنی دولت بھی نہیں کہ دولت کے قصہ سے کوئی وقت فارغ نہ ہو۔ فارغ وقت بھی ہوتا ہے۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ اگر دیندار بننا چاہیں عورت ہو یا مرد کروڑ پتی بن کے بھی بن سکتا ہے۔ نہ بننا چاہے تو فاقہ زدہ ہو کے بھی دین دار نہیں بن سکتا۔ بددین رہے گا۔ یہ اپنے قلب پر موقوف ہے اور قلب میں یہ جذبہ جب پیدا ہوگا جب اس قلب کی تربیت کی جائے اس کو تعلیم دی جائے اس میں علم ڈالا جائے اس میں اللہ کی عظمت پیدا کی جائے۔ اس میں حلال کی کمائی کی رغبت پیدا کی جائے، ناجائز باتوں سے بچنے کے جذبے پیدا کئے جائیں تب قلب میں صلاحیت آئے گی۔ پھر جو اولاد تربیت سے پیدا

ہوگی وہ صالحین میں سے ہوگی۔ وہ خود بخود تقویٰ وطہارت اورنفس کی پاکیزگی لئے ہوئے پیدا ہوگی تو واقعہ یہ ہے کہ بنیاد عورت سے چلتی ہے۔ مگر عورت کے بنانے کی بنیاد مردوں سے چلتی ہے، انجام کار ہماری آپ کی کوتاہی نکلتی ہے ہماری بہنوں کا کوئی قصور نہیں۔

پیدا ہوتے ہی بچہ تربیت کا محتاج ہوتا ہے...... یہ میں کوئی ان بہنوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا کہ بھئی آج فقط عورتوں کا جلسہ ہے اس لئے ایسی بات کہہ دوں جس سے وہ ناراض نہ ہوں۔ ایسا نہیں بلکہ امر حقیقت ہے کہ اگر ہم صحیح تربیت کریں۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ چار پانچ برس کی بچی بے چاری کیا جانتی ہے۔ جس راہ پہ ڈالدیں گے پڑ جائے گی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: پیدا ہوا ہوا بچہ اسی وقت سے تربیت کے قابل بن جاتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جب چار پانچ برس کا ہوگا جب اس کو تعلیم و تربیت دیں گے، ایسا نہیں ہے بلکہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت کا وقت آجاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ بچہ مہینے بھر کا ہے۔ اسے ظاہر میں کوئی عقل وشعور اور تمیز کچھ نہیں۔ لیکن اس کے سامنے کوئی برا کلمہ مت کہو اور کوئی بری ہیئت بھی اس کے سامنے مت اختیار کرو، اس لئے کہ اس کو ہوش تو نہیں مگر اس کا قلب ایسے ہے جیسے سفید کاغذ، آنکھ کے راستے جو ہیئت جائے گی وہ اس کے قلب کے اوپر جاکے چھپ جائے گی۔ آپ برا کلمہ کہیں گے یا گالم گلوچ کریں گے۔ وہ کان کے راستہ سے جاکر اس کے دل پر چھپ جائے گا۔ جب وہ ہوش سنبھالے گا تو وہی باتیں بکتا ہوا ہوگا۔ غرض تربیت وہاں سے شروع ہوتی ہے ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے اسے کیا شعور ہے؟ جو چاہے اس کے سامنے کہہ دو اور چاہو کر گزرو، جو چاہو ہیئت بنالو، اسے کیا شعور؟ یہ درست ہے کہ اسے تمیز اور شعور نہیں ہے مگر یہ چیز کان، آنکھ کے راستہ سے جاکر دل پر چھپتی ہے۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے بات بھی کرو تو تہذیب اور شائستگی کی کرو، کوئی بے جابات مت کرو، وہ بے جابات اس کے دل میں گھر کر جائے گی اور جب کوئی ہیئت دکھلاؤ تو بری ہیئت مت دکھلاؤ، اچھی ہیئت دکھلاؤ۔ آنکھ کے راستے سے وہی ہیئت اس کے دل پہ چھپے گی۔ اس بنا پر کہتے ہیں کہ تربیت پانچ برس کی عمر میں نہیں ہوتی۔ پیدا ہوتے ہی تربیت کا موقع آجاتا ہے۔

بچہ ماں باپ کا نقال ہے...... یہ جب ہوگا جب خود ماں باپ میں تقویٰ و پاکیزگی اور احتیاط موجود ہو۔ جتنی یہ پاکیزگی برتیں گے، اتنی ہی پاکیزگی بچے کے قلب میں پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے بچے عموماً گالیاں دیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ شہروں کے تہذیب یافتہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دیہات میں خود ماں باپ گالیاں بکتے ہیں۔ بچے کے دل میں بھی وہی چھپتی رہتی ہیں۔ شہر میں ذرا تہذیب کے کلمے ہوتے ہیں۔ وہ چھپتے رہتے ہیں اس کا اثر پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے آداب میں سے یہ رکھا ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کے لئے سب سے پہلے

بندوبست نہ روٹی کا کیا کہ اسے دودھ پلاؤ، نہ کپڑے کا کیا۔ خیر وہ بھی پہنا دے۔ پہلا بندوبست یہ کیا کہ اس کے (اسے غسل دینے اور ظاہری الودگی سے پاکی کے بعد) دائیں کان میں اذان دو اور بائیں میں تکبیر، اذان کہنا ایسا ہے جیسے دیوار کے سامنے کہے تو دیوار کو کیا خبر؟

تو یہی بات آتی ہے کہ اسے خبر تو نہیں ہے مگر کان کے راستے جب 'اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ' پہنچے گا تو دل میں اَللّٰهُ اَكْبَرُ اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ کلمہ جب پہنچے گا تو دل میں اس کی چھاپ لگ جائے گی جب آپ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہیں گے دل پر رسالت پر ایمان لانا چھپ جائے گا۔ جب حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة کہیں گے کہ آپ کہیں گے کہ آپ نماز کی طرف دوڑو، یہی جملہ چھپ جائے گا۔ تو دائیں کان کو آپ نے توحید و رسالت، عمل صالح اور اللہ کی عظمت و بڑائی سے بھر دیا۔ اور بائیں کان کو تکبیر سے بھر دیا۔ اس میں اللہ و رسولؐ اور دین کی عظمت دل میں بٹھلائی۔ تو اذان و تکبیر ہوگئی۔ علماء لکھتے ہیں کہ اس اذان اور تکبیر کی نماز کونسی ہے؟ جو جنازہ کی نماز آپ پڑھیں گے اس کی یہ اذان و تکبیر ہے۔ دنیا میں آتے ہی اذان دی گئی تکبیر بھی کہی گئی۔ اور دنیا سے جاتے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھی گئی یہ اس کی اذان و تکبیر تھی تا کہ ایک مومن بچے کی ابتداء اور انتہاء دونوں اللہ کے نام پر ہوں تو اللہ اکبر سے زندگی شروع ہوئی اور اسی پر ختم ہوگی۔ زندگی کا اول و آخر خدا کے نام سے چلا۔

اس کی بنا یہی ہے کہ ابتداً ہی جو اس کے دل میں چھپے اللہ کا نام چھپے کوئی گالم گلوچ اور برا کلمہ نہ چھپے اب اگر آپ تربیت دیں گے تو دل میں پیدا ہوتے ہی بیج تو آپ نے ڈال دیا۔ اب نماز کے لئے کہیں گے تو بیج موجود ہے اس میں پھل پھول لگنے شروع ہو جائیں گے عمل صالح شروع ہو جائے گا۔ ہاں خدانخواستہ تربیت نہ کی تو وہ جو بیج ڈالا تھا، وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔

زمین میں آپ بیج ڈالدیں لیکن نہ پانی دیں نہ دھوپ سے بچائیں بیج جل کر ختم ہو جائے گا۔ امید بھی نہیں رہے گی کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہو۔ اس لئے بیج تو توحید و رسالت کا پیدا ہوتے ہی ڈال دیا جاتا ہے۔ آگے ماں باپ کو حکم ہے کہ "مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا" ① ''بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جاویں'' اور مار کر پڑھاؤ جب وہ دس برس کے ہو جائیں۔ یہ گویا تربیت اور آبیاری ہے کہ بیج وہاں ڈالا تھا اب پانی دینا شروع کرو۔ دھوپ سے بچاؤ تا کہ وہ بیج پھل لائے اور درخت بن جائے۔ یہ تربیت ہوگی تو اس کے بچے اور بچیاں بھی مستحق ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی۔ آگے ماں باپ قصوروار ہیں اولاد قصوروار نہیں ہے۔ اولاد جب قصوروار بنے گی جب وہ عاقل بالغ ہو، شریعت کا خطاب متوجہ ہو۔ پھر اس سے مواخذہ ہوگا۔ مگر ابتدائی تعلیم نہ دینے کا مواخذہ ماں باپ سے ہوگا کہ کیوں نہ تم نے صحیح راستے پر ڈالا؟ کیوں غلط راستے پر ڈالا؟

عورتوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت...... تو اس کی ضرورت ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا بھی صحیح طریق پر

① المسند للامام احمد، مسند عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ج: ۲ ص: ۱۸۰ رقم: ۶۶۸۹۔

بندوبست کیا جائے مثلاً ہمارے ہاں یہ قدیم زمانے میں دستور تھا بلکہ اب بھی کچھ قصبات میں ہے کہ اسکول یا کالج نہیں قائم ہوتے بلکہ محلے میں جو بڑی بوڑھیاں ہیں اور وہ پڑھی لکھی ہوئی ہیں تو محلے کی بچیاں ایک گھر میں جمع ہوجاتی ہیں۔ وہ گھر کے کام کاج بھی کر رہی ہیں، قرآن شریف بھی پڑھ رہی ہیں، ترجمہ بھی پڑھ رہی ہیں مسئلے مسائل کے لئے ان کو بہشتی زیور پڑھایا جارہا ہے۔ یہ ان کی گھریلو تعلیم ہوجاتی تھی۔ جب یہ چیز کم ہوگئی تو مدرسے کھلے بچیاں وہاں پڑھنے چلی جاتی ہیں بہرحال کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ ہے۔ یہ نہیں کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو جیسے خودرو درخت ہوتے ہیں کہ جدھر کوان کا جی چاہے چلی جائیں۔

بہرحال ان کو گھریلو تعلیم دی جائے۔ جو عورتیں قرآن شریف پڑھی ہوئی ہیں یا اردو جانتی ہوں یا انہیں اپنی زبان میں مسائل معلوم ہوں یا کوئی کتاب ہے وہ پڑھائیں تا کہ ابتداء سے مسئلے مسائل کا علم ہو۔

اس لئے کہ شریعت اسلام نے علم کے سلسلے میں دو درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ ہر انسان پر مرد ہو یا عورت واجب ہے اور ایک درجہ فرض کفایہ ہے کہ سو میں سے ایک ادا کردے تو سو کے لئے کافی ہے۔ وہ حصہ جو ہر ہر شخص پر واجب ہے وہ ضروریات دین کا ہے کہ جس سے عقیدہ معلوم ہوجائے، اخلاق کا پتہ چل جائے حقوق کی ادائیگی، ماں باپ، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے کیا حقوق ہیں۔ اللہ و رسول کا کیا حق ہے؟ کچھ عبادت، کچھ معاشرت، کچھ اخلاق، کچھ اعتقادات یہ سیکھنے تو واجب ہیں خوہ مرد ہو یا عورت اور ایک ہے پورا عالم بننا۔ یہ ہر ایک کے اوپر فرض نہیں ہے سو دو سو میں سے اگر ایک دو بھی عالم بن گئے تو سب کے لئے کافی ہے۔ ہاں ایک بھی نہیں بنے گا تو سب گنہگار ہوں گے۔

غرض فرض کفایہ کی یہ شان ہے کہ پوری قوم مل کر فرض کو چھوڑ دے تو پوری قوم گنہگار ہے۔ لیکن اگر ایک فیصد کو عالم بنادیا، عمل دکھلا دیا تو ساری قوم کے اوپر سے گناہ ہٹ گیا۔ تو ایک فرض عینی ہے، یعنی ہر ہر شخص گنہگار، جو نہیں کرے گا وہی گنہگار ہوگا۔ اس لئے اتنا حصہ عورت اور مرد دونوں کے لئے ضروری ہے جس سے وہ یہ سمجھیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ ہم مسلمان کیوں ہیں؟ ہم پر کیا چیزیں فرض ہیں؟ ہم پر کیا ضروریات عائد ہوتی ہیں۔ عورت بھی اور مرد بھی اس کا حقدار ہے۔ اس کا سکھانا فرض ہے۔ خود مرد اپنی بچیوں کو سکھلائیں یا مرد کسی ایک عورت کو پڑھادیں وہ عورت اور عورتوں کو تیار کردے کہ وہ گھروں میں جاکے یا کسی ایک جگہ مدرسہ قائم کرکے ان بچیوں کو پڑھادے۔ اس سے زیادہ کوئی قصہ نہیں۔ ذرا توجہ کی جائے تو یہ معاملہ باآسانی ہوسکتا ہے۔

رہا عالم بنانا، سب کیلئے عالم بننا ضروری نہیں ہے۔ نہ مردوں کے لئے نہ عورتوں کیلئے۔ قوم میں سے ایک دو بھی بن گئے یا باہر جاکے بن گئے، ہندوستان جاکے بن گئے۔ پوری قوم سے گناہ ہٹ گیا، اس عالم کا فرض ہے، وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے جو ان کی دینی ضروریات ہیں انہیں پورا کرے، انہیں مسائل بتلائے۔ فتویٰ دے، الجھنوں میں شرعی طور پر ان کی راہنمائی کرے۔ دل وساوس میں الجھ گئے ہوں تو فکر کا راستہ درست کرے۔ یہ اس کا فریضہ ہے۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ عورتیں بھی علم واخلاق کی اتنی حقدار ہیں۔ جتنے آپ حقدار ہیں۔ جتنا حصہ آپ پر ضروری ہے وہ ان پر بھی ضروری ہے۔ ان کی دیکھ بھال آپ کے ذمہ ہے۔ اگر آپ نہیں کرتے تو آپ سے مواخذہ ہوگا۔ اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے تھے اور آیت یہ تلاوت کی تھی۔ ﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ملائکہ علیہم السلام جب آئے اور انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے خطاب کیا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہیں، نہایت مقدس اور پاکباز بی بی ہیں حتیٰ کہ بعض علماء ان کے نبی ہونے کے قائل ہیں۔ ان سے ملائکہ نے خطاب کیا اور کہا:

اے مریم! بشارت حاصل کر اللہ نے تجھے منتخب کیا تجھے پاکباز اور مقدس بنایا اور تیرے زمانے میں جتنی عورتیں ہیں ان سب پر تجھے فضیلت، بڑائی اور بزرگی دی۔ جب اللہ نے یہ انعام تجھے دیا اور برتر و برگزیدہ کر دیا۔ تو تیرا کام کیا ہے؟

﴿يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ﴾ ② "اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے عبادت گذار بندی بن کے رہ" ﴿وَاسْجُدِيْ﴾ سجدے اختیار کر ﴿وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ③ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ رکوع سے مراد نماز ہوتی ہے، جہاں رکوع کا لفظ آتا ہے وہاں نماز کا ذکر ہے وہاں محض رکوع نہیں بلکہ پوری نماز مراد ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نماز قائم کرو، عبادت خداوندی کو اپنا شعار اور اپنی طبیعت بناؤ۔

اس لئے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ مریم علیہا السلام کتنی بڑی پارسا اور پاک بی بی ہیں۔ ان کو اللہ نے کتنا بڑا مقام دیا کہ فرشتوں نے ان سے خطاب کیا یہ شرف کس کو حاصل ہوا؟ یہ بڑی قسمت کی چیز ہے۔ یہ ایک عورت کو شرف حاصل ہوا اگر حضرت مریم علیہا السلام کو یہ شرف حاصل ہوا۔ ہماری بہو بیٹیوں کو کیوں نہیں ہوسکتا بشرطیکہ وہ بھی وہی کام کریں جو حضرت مریم نے کئے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کی کچھ اور خصوصیات تھیں وہ ان کے ساتھ خاص تھیں۔ لیکن جو بڑائی اور کمال اللہ نے دیا تھا اس کے دروازے اللہ نے کسی کے لئے بند نہیں کئے۔ مریم علیہا السلام اگر ولی کامل بن سکتی ہیں تو ہماری عورتیں بھی ولی کامل بن سکتی ہیں۔ نبوّت کا بے شک دروازہ بند ہوگیا۔ نبی اب کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی نبوّت قیامت تک کیلئے کافی ہے۔ اس نبوّت کے طفیل میں بڑے بڑے محدث، امام، مجتہد، اولیائے کاملین اور مجدد پیدا ہوں گے۔ فیضان قیامت تک اسی نبوّت کا کام کرتا رہے گا۔ گویا اتنی کامل نبوّت ہے کہ اسے ختم کر کے کسی اور نبوّت لانے کی ضرورت نہیں۔ جو مراتب تھے اس ذات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی مرتبہ نبوّت کا باقی نہیں رہا جس کے لانے کے لئے کسی کو بھیجا جائے کہ اس پر یہ مرتبہ پورا کیا جائے۔

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۲۔ ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۳۔
③ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۳۔

ایک ہی ذات پر سارے مراتب ختم ہو گئے یہ وہی ذات ہے جس کی روشنی قیامت تک چلتی رہے گی، روشنی کو پہنچانے والے اللہ تعالیٰ ہزاروں آئینے پیدا کر دے گا کہ آئینۂ آفتاب کے سامنے ہوگا اور عکس اندھیرے مکان میں ڈالدے گا۔ وہ بھی روشن ہو جائے گا۔ تو نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا مگر ولایت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس لئے اس نبوت کے نیچے رہ کر جو بڑے سے بڑا کمال مرد کو مل سکتا ہے وہ عورت کو بھی مل سکتا ہے۔ عورتیں مایوس نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ علم وغیرہ تو مردوں کے لئے ہے، ہم صرف گھر میں بیٹھنے کے لئے ہیں۔ گھر میں ہی بیٹھ کر سب کچھ مل سکتا ہے اگر محنت کی جائے اور یہ توجہ کریں۔ اس واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی اس کے تحت تھوڑی سی تشریح عرض کی۔ خدا کرے ہمارے قلوب قبول کریں اور ہمارے دل مائل ہوں اور ہم حقوق کو پہچانیں۔ ہمیں اگر راعی بنایا گیا ہے تو ہم اپنی رعیت کی خبر گیری کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطاء فرماوے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

وَلَوْ كَانَ النِّسَآءُ كَمَا ذُكِرْنَا لَفُضِّلَتِ النِّسَآءُ ۔۔۔ فَلَا التَّانِيْثُ لِاسْمِ الشَّمْسِ عَيْبٌ
عَلَى الرِّجَالِ ۔۔۔ وَلَا التَّذْكِيْرُ فَخْرٌ لِلْهِلَالِ

پیغام ہدایت...... ایک خط جو شادی کے موقع پر ارسال فرمایا① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ

شادی اور نکاح سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور اسے اسلام نے صرف معاملے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ عبادات کے زمرہ میں شمار کیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اذا تزوج العبد فقد كمل نِصْفُ الدِّيْنِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ.'' ② ''نکاح آدھا دین ہے آدمی کو چاہئے کہ بقیہ آدھا دین تقویٰ اور طہارت سے حاصل کرے''

نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ عفت، پاکدامنی اور خیال کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے آدمی حرام سے بچتا ہے اور حلال کے دائرہ میں محدود رہتا ہے۔ نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ اتحاد باہمی اور قبائل اور خاندانوں کے باہمی تعاون کی بنیاد پڑتی ہے۔ کتنے ہی اجنبی باہم مربوط ہو جاتے ہیں اور پہلے سے بیگانے ہوں تو یگانگت بڑھ جاتی ہے اور باہمی حقوق قائم ہو جاتے ہیں اسی لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے جہاں آبائی اور جدی نسب کو محل نعمت میں شمار فرمایا وہیں صہری اور سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا ارشاد خداوندی ہے ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا.﴾ ③ ''اور اللہ ہی وہ ہے جس نے ایک قطرہ پانی سے بشر کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے نسب آبائی اور سسرالی رشتہ پیدا فرمایا''۔

---

① از رسالہ دارالعلوم دیوبند، ماہ جون ۱۹۷۵ء۔ ② شعب الایمان، للبیھقی، ج: ۴، ص: ۳۸۳، رقم: ۵۴۸۶. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۱ ص: ۴۳۱. ③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۵۴.

پس جیسے نسب کو نعمت ظاہر فرما کر بشر پر اپنا احسان جتایا کہ یہ نعمت اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں دے سکتا ایسے ہی سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا کہ اجنبی دلوں کو اس طرح باہم ملا دینا بھی اسی کا کام ہے جو کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے نکاح کی غرض وغایت ظاہر فرماتے ہوئے اسے اپنی قدرت کی نشانی اور آیت قرار دیا۔

کیا یہ قدرت ہی کا کرشمہ نہیں کہ نکاح سے ایک منٹ پہلے مرد عورت باہم اجنبی ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو بعینہ اپنا دکھ درد نہیں سمجھتے اگر کبھی اجنبی عورت کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو سوائے عام انسانی ہمدردی کے آدمی اس کی کوئی خاص ٹیس اور چبھن اپنے دل میں اس طرح محسوس نہیں کرتا کہ بے چین ہو جائے اور اپنے دکھ درد کو بھول جائے۔ لیکن نکاح سے ایک منٹ بعد اگر عورت کے دکھ درد کی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو وہ متفکر، پریشان اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دکھ درد کو بھول کر منکوحہ کے دکھ درد کے مداوے میں مستغرق ہو جاتا ہے یہی صورت عورت کی بھی ہے۔ یہ دلوں کا ملاپ اور قلوب کی وحدت کیا محض قدرت کا ہی کرشمہ نہیں کہ دلوں کی دنیا یکدم بدل ڈالی اور جانبین کے دلوں میں انقلاب عظیم رونما فرما دیا اس لئے اگر اسے آیت اور نشانی فرمایا گیا ہے تو وہ ایک حقیقت واقعی ہے محض کوئی نظریہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ دو کا یہ ملاپ فریقین کے متعلقین کا بھی قدرتی ملاپ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی والے لڑکے والے کے اور لڑکے والے لڑکی والے کے دکھ درد میں شریک نہ ہوں اور باہم یگانگت محسوس نہ کریں اس لئے نکاح جیسے خود ایک آیت اور قدرت کے کرشموں کی ایک عظیم نشانی ہے ایسے ہی وہ باہمی اتحاد و یگانگت کا بھی ایک معجزانہ وسیلہ ہے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرما کر قبائل کو اپنے ساتھ ملایا، باہم شیر و شکر فرمایا اور اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کے تعلق کی پختگی اور مضبوطی کا اہتمام تھا طلاق جو قاطع نکاح ہے باوجود جائز ہونے کے عنداللہ اس کو مبغوض قرار دیا۔

چنانچہ فرمایا: ''اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَاللّٰهِ الطَّلَاقُ'' ''جائز چیزوں میں سب سے زیادہ عداوت خدا تعالیٰ کو طلاق سے ہے''۔ کیونکہ یہ قاطع نکاح ہے۔ نکاح جو ذریعہ اتحاد و وحدت ہے تو طلاق قاطع اتحاد و ملاپ بھی ہے اس حال میں کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد وحید توحید کے ساتھ اتحاد باہمی بھی ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا جائے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا جائے اور خدا سے ٹوٹے ہوئے دل کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے اس لئے وہ نکاح کے تعلق میں کسی ادنیٰ اختلال کو بھی کیسے گوارہ فرما سکتے تھے البتہ نکاحی تعلق مضبوط سے مضبوط اور ذریعہ اتحاد بنانے کا جو راستہ شریعت الٰہی نے طے فرما دیا وہ بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں ایک شفقت ایک اطاعت، جس سے معاشرہ کی گاڑی چلتی ہے۔

خاوند کو تو حکم دیا کہ وہ بیوی کے ساتھ انتہائی شفقت اور دلداری سے پیش آئیں اور نرم اخلاق سے اس کے دل کو موہ لینے کی سعی میں لگے رہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''اِنَّ اَكْرَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُكُمْ اَهْلاً.'' (یعنی) ''تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق

پاکیزہ ہوں اور بیوی کے ساتھ لطف و مدارات کا برتاؤ کرتا ہو'' حتیٰ کہ آپ نے فرمایا کھانا کھاتے وقت اپنے ہاتھ سے بیوی کے منہ میں لقمہ دے دینا بھی صدقہ کے حکم میں ہے جس پر اجر دیا جاتا ہے اور اسے عبادت شمار کیا جاتا ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ازواج مطہرات کے ساتھ انتہائی ملاطفت اور دل جوئی کا عمل فرماتے تھے اس لئے بیویوں کے ساتھ دل جوئی اور ان پر لطف و کرم اور شفقت و محبت کے برتاؤ سے جہاں نکاح کی حقیقی غرض و غایت نکلتی ہے وہیں اس سے قلوب میں سکون اور باہمی مودۃ و اتحاد پیدا ہوتا ہے، ارشاد باری ہے ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ ① ''اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم میں آپس میں مودۃ اور رحمت پیدا ہو، بلاشبہ اس میں فکر کرنیوالوں کے لئے قدرت کی نشانیاں ہیں (کہ بے تعلق قلوب میں وہ کس طرح اچانک تعلق خاص بلکہ محبت باہمی کا علاقہ قائم فرما دیتا ہے)''۔

اور یہ اس لئے کہ بیوی خاوند کی وجہ سے اپنے گھر بار، ماں باپ، اپنے عزیز و اقرباء کو چھوڑ چھاڑ کر خاوند کے گھر آتی ہے کہ اس کی بن کر رہے اگر وہ بھی ملاطفت اور شفقت سے دست کش ہو جائے اور اس کے ساتھ بے رحمی اور ایذا رسانی کا برتاؤ کرے تو یہ غریب عورت کہاں جائے نہ ادھر کی رہے گی نہ ادھر کی اپنے عزیز تو خاوند کی وجہ سے چھوٹے اور خاوند بھی اپنا نہ ہوا تو اس غریب کا ٹھکانہ ہی کیا باقی رہا سوائے اس کے کہ غم میں گھل گھل کر اپنی زندگی ختم کر دے۔

ادھر بیویوں کو حکم دیا گیا کہ وہ خاوند کی اطاعت اور اتباع میں سرگرمی دکھلائیں اور کوئی حرکت ایسی نہ کریں جس سے خاوند کا دل ٹوٹے اور بیوی سے بیزار ہو جائے۔ جس سے اس تعلق کی غرض و غایت ہی فوت ہو جائے جیسے بد مزاجی، درشت کلامی، سرکشی اور نافرمانی اور شوہر کے مال میں خیانت یا مال کو بجائے شوہر کے گھر بار پر خرچ کرنے کے اس کی اجازت کے بغیر اپنے میکے پر صرف کرنے لگے جو بلاشبہ خیانت ہوگی اور خاوند کے لئے بد دلی اور بیزاری کا باعث ہوگا، جس سے یقیناً اس تعلق کی خوشگواری اور نفس تعلق ہی کی بقاء میں خلل پڑ جائے گا۔ جس کے اثرات پورے گھرانے پر پڑنا قدرتی امر ہے اسی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتہائی بات فرما دی کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہروں کو سجدہ کیا کریں چونکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک اور قطعی حرام ہے اس لئے یہ امر نہیں کیا مگر اس سے اطاعت شوہر کی انتہائی تاکید برآمد ہوتی ہے کہ حرام اطاعت کے سوائے کوئی بھی اطاعت ایسی نہیں ہے جس کے لئے بیوی مامور نہ ہو اس لئے احادیث میں فرمایا کہ: اگر شب میں بیوی خاوند کیساتھ سرکشی برتتی ہے تو تمام ملائکہ اس پر لعنت کرتے ہیں یہی صورت دن کو بھی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ دو ہی باتیں اطاعت شوہر، ملاطفت زوجہ وہ ہیں جن کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان دونوں باتوں کا تعلق کسی ظاہری نمائش یا زینت پر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک ایسی حقیقت پر رکھا گیا جو لافانی اور جاودانی ہے مثلاً

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

اگر خاوند کی ملاطفت کا تعلق عورت کے ظاہری حسن و جمال، مال و دولت اور عرض و جاہت و عزت سے ہے تو یہ تمام چیزیں دنیا ہی میں پائیدار نہیں ہیں چہ جائیکہ آخرت میں کارآمد و نافع ثابت ہوں اس لئے کہ جب یہ کم یا گم ہوں تو شوہر کی ملاطفت ختم ہو جائے گی اور تعلقات میں کشیدگی بلکہ آخر کار انقطاع تعلق تک نوبت پہنچے گی اور اگر اس تعلق کی بنیاد عورت کی دین داری پر رکھی جائے تو دین سدا بہار اور دنیا کے بعد آخرت تک ساتھ جانے والا ہے اس لئے اس پر مبنی شدہ تعلق بھی دائمی اور مضبوط اور خوشگوار رہے گا جس میں کوئی عارضی چیز خلل انداز نہ ہوگی اس لئے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان امور کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ: ''تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ.'' ① ''عورت سے نکاح (بظاہر اسباب) چار وجوہ سے کیا جاتا ہے اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے، اس کے خوبصورت ہونے کی وجہ سے، اس کی عرفی عزت و وجاہت کی وجہ سے، اس کی دینداری کی وجہ سے سو تم ان تمام امور میں دینداری کو ترجیح دو''۔

ظاہر ہے کہ مال و جمال اور عرفی حیثیت آنی جانی چیزیں ہیں اگر بیوی پر لطف و شفقت ان کی بناء پر ہے تو اول تو یہ لطف و شفقت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور جس حد تک ہے بھی تو اس کے زوال سے تعلق زائل ہو جائے گا اور گھریلو زندگی میں ناچاقی اور بیزاری رونما ہو جائے گی جس سے گھر تباہ ہونے کی صورت پیدا ہوگی لیکن اگر نکاح کا مبنیٰ عورت کی دینداری ہے جو خاوند کے بھی دیندار ہونے کی کھلی علامت ہے۔ اور لطف و شفقت اس بناء پر ہوگا تو اس کی بنیاد خوف خدا پر ہوگی اور آدمی محسوس کرے گا کہ جب خدا نے اسے میرے ذمہ لگا دیا تو حسب اوامر خداوندی اس کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کروں خواہ وہ حسین و جمیل ہو یا نہ ہو، مالدار ہو یا نہ ہو، صاحب جاہ و منزلت ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس جذبہ سے یہ ملاطفت و شفقت عین دین ہوگی اور مرتے دم تک قائم رہے گی ہاں اگر حق تعالیٰ دینداری کے ساتھ ساتھ حسین و جمال، مال و منال بھی جمع فرما دیں تو یہ سونے پہ سہاگہ ہے لیکن یہ امور تعلق کی بنیاد بنانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ ہر آن قابل زوال و اختلال ہیں۔ بہر حال نکاح کے تعلق میں پختگی اور پائیداری ان دو ہی امور سے آتی ہے شوہر کی اطاعت اور زوجہ کی دلداری۔ دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ زوجہ کوئی باندی نہیں ہوتی، بلکہ شریک حیات اور رفیقہ زندگی ہوتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ اونچ نیچ کا برتاؤ کسی طرح بھی جائز نہیں، وہ قابل احترام بنائی گئی ہے نہ کہ مورد تذلیل و اہانت۔ چنانچہ عرب ممالک میں آج بھی اگر عورت سامنے آجائے تو ''حرمتہ'' کہہ کر لوگ توقیر کے ساتھ اسے راستہ دیتے ہیں نیز اگر اس کی حرمت و عزت باقی نہ رہے تو گھر والے بلکہ اولاد تک بھی اس کی عزت نہیں کر سکتی اس لئے شریعت نے جہاں مرد کو عورت پر حقوق دیئے ہیں اسی طرح عورت کو بھی مرد پر حقوق دیئے ہیں تاکہ وہ معاشرہ میں باعزت رہے چنانچہ قرآن حکیم نے ارشاد

① الصحيح لمسلم، كتاب النكاح، باب استحباب نكاح ذات الدين، ج: ٢ ص: ١٠٨٦ رقم: ١٤٦٦.

فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ﴾ ① "اور عورتوں کے بھی حقوق (مرد پر) اسی طرح ہیں جس طرح (مرد کے حقوق) عورت پر ہیں"۔

مثلاً اگر مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی خلع کا حق سونپا گیا ہے اگر نزاع باہمی ہے تو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے افراد کو حکم منتخب کرنے کا برابری کے ساتھ حق دیا گیا ہے جو اس کی واضح دلیل ہے کہ عورت کو لاوارث بنا کر مرد کے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ باعزت اور باحقوق بنا کر دیا ہے پس اگر بیوی کو اطاعت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے تو مرد کو دلداری کا۔ تو یہ دونوں کے منصب کا تقاضا ہے کوئی اونچ نیچ پیش نظر نہیں۔ خلاصہ یہ کہ معاشرتی مساوات کے ساتھ شوہر کی شفقت و اعانت اور زوجہ کی فرمانبرداری ہی سے گھریلو زندگی کی گاڑی رواں دواں ہو سکتی ہے جس کا اسلام نے راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ دین اور دینی جذبات کی پائیداری اور شرعی معاشرت کی پابندی کے سوا دوسرا نہیں ہے اس لئے شوہر اور زوجہ کے مطالعہ میں ایسی کتابیں رہنی چاہیں جن میں زوجیت کے حقوق اور اسلامی معاشرہ، رہن سہن اور باہمی تعلقات کی خوشگواری کے طریقے واضح ہوں اور وہ بکثرت شائع شدہ ہیں جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بہشتی زیور یا حقوق الزوجین یا حقوق المعاشرۃ وغیرہ وغیرہ۔

امید ہے کہ احقر کی شرکت و حاضری نکاح سے یہ پیغام زیادہ نافع ہوگا شرکت تو وقتی چیز رہتی ہے اور یہ دوامی دستور العمل ہوگا۔ (وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ.)

پیغام ہدایت...... ایک خط کا جواب ② محترم المقام زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مفصل گرامی نامہ ملا۔ میں سفروں میں رہا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ نے اپنے کچے مگر سچے حالات تحریر فرمائے اور اپنی اصلاح سے مایوسی ظاہر فرمائی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کفر ہے، مایوس ہرگز نہ ہو جایئے، کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج اللہ تعالیٰ نے نہ رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے مرض پیدا کئے تو علاج بھی پیدا کئے ہیں تاکہ بندوں کی عزیمت عمل اور اندرونی جوہر، ہمت قوی، عزیمت اور مدافعت کا ظہور ہو۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق امراض پیدا ہی نہ کئے جاتے باطنی امراض میں کفر و فسق کا نام و نشان ہی نہ ہوتا اور امراض باطن کے اسباب شیاطین اور کفار اور فساق کا ماحول پیدا ہی نہ کیا جاتا تو علاج اور اس کے اسباب یعنی اچھے اعمال، اچھے اشخاص کے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور جب نہ اچھے ہوتے اور نہ برے، اچھائی ہوتی اور نہ برائی تو دنیا آخر کس چیز کا نام ہوتا، جسے پیدا کیا جاتا، بالفاظ دیگر دنیا ہی نہ پیدا کی جاتی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ دنیا کا پیدا کیا جانا قرین حکمت تھا تو خوبی کے ساتھ خرابی، نیکی کے ساتھ بدی، تقویٰ کے ساتھ فجور، اسلام کے ساتھ کفر کا پیدا کیا جانا بھی ضروری اور عین حکمت تھا، تاکہ کفر کے مقابلہ سے اسلام کی قوت، فسق کے مقابلہ سے تقویٰ کی طاقت، بدی کے مقابلہ سے نیکی کی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸۔ ② از رسالہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۵۸ء۔

رفعت، کذب کے مقابلہ سے صدق کی عزت و فخامت نمایاں ہو آپ کے تخیل کے مطابق کہ اس شیطان کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا۔ شیطان پیدا نہ ہونا چاہئے تھا تا کہ آپ کو نہ ورغلاتا لیکن پھر آپ ہی کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت تھی نیز آپ میں مدافعت شر کی قوتیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی اور نیکی و بدی میں امتیاز کی قوت یعنی عقل پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور قوت ارادی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ حق کو باطل سے ممتاز دیکھ کر حق کی طرف اپنے ارادے سے دوڑیں اور یہ سب غیر ضروری تھا، تو وہ انسان کہاں رہتا، جس میں نہ قوت ارادی ہوتی نہ قوت تمیزی نہ عقل ہوتی نہ عزیمت ہوتی نہ طاقت مدافعت ہوتی، تو انسان کیا ہوتا، اینٹ پتھر کا ایک تودہ ہوتا اور جب ساری کائنات انسان کے لئے بنائی گئی اور انسان کا یہ عالم کہ وہ ایک تودۂ خاک، تو کائنات ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے علم وعقل سے استعمال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ لہذا آپ کی رائے کے مطابق اور وہ بھی آپ کی کم ہمتی کی وجہ سے اس دنیا کو ناپید رہنا چاہئے تھا اور اب بھی اگر وہ ہے تو اسے صرف ایک تودۂ خاک ہونا چاہئے یہ سوائے تخیلات فاسدہ کے اور کیا ہے۔

آپ نے جو کچھ نیکی یا بدی کی، ارادہ واختیار سے کی، اللہ تعالیٰ نے مجبور کر کے نہیں کرائی، کب ایسا موقع آیا کہ آپ اینٹ، پتھر کی طرح مسلوب الاختیار ہو گئے ہوں کہ آپ چاہتے ہوں نیکی کرنا مگر زبردستی آپ کا اختیار چھین کر آپ سے بدی کرا دی گئی۔ اس لئے اپنے کئے دھرے کو تقدیر کے سر ڈال کر بری الذمہ ہونے کی کوشش نہ کیجئے کہ یہ انتہائی جسارت اور گستاخی ہے۔ ایک تو آدمی بدی کرے اور اوپر سے بری الذمہ بن کر بدی کو اپنے مالک کے سر تھوپنے کی کوشش کرے۔

ان سارے فاسد تخیلات کا یک ہی علاج ہے، سب سے پہلے اپنی زندگی کا ایک نصب العین متعین کیجئے کہ آیا وہ دنیا ہے یا آخرت، اگر دنیا ہے تو اس کے کمانے کی فکر میں لگ جائیے اور حلال وحرام کا کوئی سوال نہیں جو جی میں آئے یا نام نہاد عقل میں آئے کرتے رہیے، بجز اس کے کہ جسے دنیا برا سمجھے دنیا کی خاطر اسے ترک کیجئے، جسے اچھا سمجھے اسے اختیار کرتے رہئے عاقبت کی فکر کو ترک کر دیجئے اور اگر آخرت ہے تو اسے کمانے کی فکر کیجئے تو پھر اخروی قانون سے مدد لیجئے کہ اس کی رو سے کون سی چیز حلال ہے، کون سی حرام اور دونوں دائروں میں خواہ دنیا ہو یا آخرت بہر حال اپنا ارادہ صرف کرنا ہوگا اور اختیار سے کام کرنا ہوگا، تقدیر کے حوالہ کر کے بری الذمہ ہونا ہے تو آج سے ملازمت، تجارت، زراعت سب ترک کر دیجئے کہ جو مقدر ہوگا، آپ ہی مل رہے گا، لیکن اس دائرہ میں اسباب رزق کا اختیار کرنا آپ کے نزدیک ضروری ہے، اس لئے زندگی کا ایک نصب العین متعین کر کے اپنی قوت مدافعت کا جائزہ لیجئے کہ وہ اس کی حد تک یہ زندگی کے نصب العین کے اجزاء کو حاصل کرنے اور اس کی منافی اشیاء کو دفع کرنے میں کام کرتی ہے۔

اخروی نصب العین کے لئے دستور العمل شریعت ہے، جس کے پانچ ارکان ہیں۔ عبادات، اخلاق،

اعتقادات، معاملات، عقوبات اور سب اختیاری ہیں، ان سب کو بنام خدا شروع کیجئے، فرائض کی پابندی، اخلاق کے تکمیل کے لئے کسی متخلق باخلاق اللہ کی طرف رجوع، عقیدہ کی اصلاح اور تخیلات فاسدہ سے گریز، معاملات میں فقہ کی پابندی، خود علم نہ ہو تو پوچھ پوچھ کر عمل۔

عقوبات کے سلسلہ میں مادی سزائیں مادی قوت نہ ہونے کی وجہ سے آج نہیں دی جاسکتی ہیں تو اسے بھی اللہ کی رحمت کہنا چاہئے اور اس کے قائم مقام استغفار کو رکھا جائے، جس کے معنی ماضی پر ندامت مستقبل کے لئے عزیمت کہ کچھ بھی ہو آئندہ یہ معصیت ہرگز نہیں کرنی، پھر بھی اتفاقاً شہوات سے مغلوب ہو کر ہو جائے تو پھر توبہ اور اپنے اوپر مالی جرمانہ جو صدقات کی صورت سے ہو، کیا جائے، ماحول کو حتی الامکان بدلا جائے، اگر وہ معصیت کا ماحول ہے اور دل کی کمزوری سے اس کے اثرات سے بچاؤ زیادہ دشوار ہو تو ماحول کی تبدیلی کی پوری سعی کی جائے جب اللہ کے لئے آدمی اپنے منافع تک ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اسے ادھر میں چھوڑ دیں، ادھر سے بلاشبہ دستگیری ہوگی ان سب عملی ونظری مفاسد سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ ذکر اللہ کی کثرت ہے زبان کو ذکر سے تر رکھا جائے، صبح وشام ذکر کا کوئی معمول کر لیا جائے، مثلاً صبح وشام سو سو مرتبہ "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' اور کلمہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا ذکر کیا جائے یعنی ایک تسبیح حسبنا کی اور ایک تسبیح کلمہ توحید کی صبح اور ایک شام کو، اس کے خلاف خیالات فاسدہ آویں تو لاحول پڑھی جائے جب نصب العین آخرت قرار دے لیا گیا تو منافی آخرت خیالات کو سوائے لاحول سے دفع کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے، یہ کثرت ذکر خود ہی قلب کو پاک کرے گا خیالات فاسدہ کو کم یا گم کرے گا قلب کی سختی کو مٹا کر رقت پیدا کر دے گا، اور برے ماحول سے نفرت دلا کر اچھے ماحول کے جذبات پیدا کرے گا، اس لئے ہر طرف سے ہٹ کر اس دستور العمل کو اختیار کر لیجئے اور برے خیالات پر لاحول بھیجئے، اس کے سوا دوسری راہ اصلاح کی نہیں، ساتھ ہی کسی کو اپنا رفیق عمل بنا لیجئے جو نیک مشورہ دے، اور کسی ایک کو مرجع افکار بنائیے کہ وہ وساوس اور ضعطوں کے وقت سنبھالتا رہے حاصل یہ کہ بیماری ہے تو طبیب متعین کیجئے اور اس کے سامنے حالات کی اطلاع، تدابیر کا اتباع اس پر اعتماد اور اس سے اعتقاد قائم کر کے ان چاروں باتوں کو مشعل راہ بنائیے۔ بھروسہ خدا کے فضل پر کیجئے مگر فضل کی علامت نیک عمل کو سمجھیے اگر وہ نہیں ہے تو سمجھئے کہ فضل متوجہ نہیں ہے، اس وقت اس سے زیادہ کسی اور بات کی حاجت نہیں، اسی لئے سردست اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت، استقامت، ہمت اور عزیمت عطا فرمائے اور حسن انجام نصیب فرما دے، آمین، والسلام۔

(حضرت حکیم الاسلام) محمد طیب غفرلہ مہتمم دار العلوم دیوبند ۷۔۹۔۱۱

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

حرف آغاز...... ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک غیر معمولی اور عظیم اجلاس میں شرکت ہوئی جس کا موضوع تھا۔ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ''۔ اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندوں اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلاء اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اجلاس کی اہمیت صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی احمد کی شرکت سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ احقر نا کارہ کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا۔ چونکہ صدر مملکت نے صرف ایک گھنٹہ دیا تھا۔ اس لئے اجلاس کی پہلی نشست کی ساری کاروائی ایک ہی گھنٹہ میں پوری کی جانی ضروری تھی۔ ابتداء میں شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد محترم ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج و ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نے اجلاس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پندرہ پندرہ منٹ صدر جلسہ اور صدر مملکت کی تقریروں کے لئے تھے۔ احقر نے اولاً اپنی تقریر سے جلسہ کا افتتاح کیا۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے چونکہ اس اہم موضوع پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہ تھا اس لئے تقریر میں چند بنیادی اور اساسی نقاط ہی بیان کئے جا سکے۔ البتہ نشست کے اختتام پر جب اس کا ذکر آیا تو ذمہ داران جامعہ نے اسے مناسب خیال فرمایا کہ یہ تفصیلات نقاط، مقالہ کے طور پر لکھ کر ارسال کر دی جائیں جس میں باقیماندہ نقاط بحث بھی شامل ہوں۔ اس لئے یہ مقالہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں وہ سب بنیادیں بھی ہیں جو اجلاس میں زبانی بیان کی گئی تھیں اور باقیماندہ نقاط بھی آ گئے ہیں جو وہاں بیان میں نہ آ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ ترتیب میں فرق ہو لیکن مقاصد سب آ گئے ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلہ میں چند بنیادی نقاط پیش کر دوں جنہیں فکر جدید کی تعمیر اٹھانے والے حضرات کو پیش نظر رکھنا میرے نزدیک ازبس ضروری ہے۔

عالم بشریت میں فکر و تفکر کی اہمیت...... پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالم بشریت میں فکر و تفکر ایسی ایک عظیم اصولی بلکہ اصل الاصول قوت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آئی ہوئی ہیں اور سب اسی کی دست نگر ہیں، جو بلا فکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ حواس خمسہ ہوں یا عقلی و دانش، ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقہ، حدس و تجربہ ہو یا جو ہر قیافہ ان سب کی قائد اور محرک فکر ہی ہے۔ پھر یہ فکر

نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سر چشمہ ہی ہے، بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے کیونکہ یہ قوت انسان کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرف کہہ دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

انسان کی مشہور و معروف تعریف حیوان ناطق یا حیوان عاقل سے کی جاتی ہے۔لیکن غور کیا جائے تو اس سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے انسان کی حدتام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت جو ہر غیر انسان حتیٰ کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ایک کتے کو بھی اگر ایک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آ موجود ہوگا۔گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اس جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور جب مل سکتا ہے تو پھر اسی جگہ پہنچ جانا چاہئے، یہ صغریٰ کبریٰ ملانا آخر عقلی قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے۔خواہ وہ تعبیری اور لفظی نہ ہو مگر ایک حقیقت تو ہے، نیز عرف عام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے۔ جیسے لومڑی اور گدھے، بھینس کو عام طور سے احمق اور بلید کہتے ہیں، سعدی شیرازی نے کہا تھا کہ ؎

مسکن خر اگر چہ بے تمیز است ۔۔۔ چون بارہمی برد عزیز است

اور کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا کہ ؎

جاموش بے وقوف و بے ہوش ۔۔۔ چوں شیر دہد تو چشم از وپوش

اگر ان حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو عرف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علی الاطلاق انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حدتام حیوان ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع قسم کا تعارف نہیں ہو سکتا، البتہ فکر و تدبیر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا، نئے نئے اکتشافات سے جزئیات پیدا کر لینا اور جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے جزئیات کا نکال لینا اور جزئیات کے عواقب و نتائج کو سمجھنا، نتائج کے معیار سے عواقب اور انجام دنیا و آخرت کو پیش نظر رکھنا، نوعی خیر سگالی اور اس کی منظم تدبیریں اور اصلاح معاشرہ کے لئے سوچ بچار وغیرہ بلاشبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں، اسی لئے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہو سکتی ہے تو وہ حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فکر مندی، فکر نمائی اور فکری پیمائش اور وہ بھی عمومی اور پوری نوع بشری کے لئے اور نہ صرف اس حیات کے لئے بلکہ حیات مابعد الممات تک کے لئے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے، جو اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں۔اس لئے حیوان متفکر ہی کو انسان کی حدتام تک کہنا کچھ زیادہ قرین عقل نظر آتا ہے۔

پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اولولامر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور ہر عنصری مخلوق سے اونچا سمجھا جاتا

ہے۔ پھر یہی نہیں کہ انسان اس قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل و دانش، ذوق و وجدان اور حدس و تجربہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی ان ہی جیسی ایک قوت ہے اور دوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنے محدود مخصوص دائرے میں کام دے جاتی ہے، بلکہ فکر کی طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران متصرف اور انکی روح ہے، جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادۂ عمل رہتی ہیں۔ اگر کہیں نمائشی کروفر کا بازار گرم ہو اور باجوں، گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں، لیکن اگر راہ گیر کسی دوسرے خیال میں مستغرق ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی نہ کان کوئی آواز سن پائے گا۔ اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں فلاں بات کی فکر میں ڈوبا ہوا تھا، مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ آنکھ کان نہ خود دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں بلکہ قوت خیال وفکر ہی دیکھتی سنتی ہے۔ یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہی صورت عقل و دوراندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو لیکن وہ کسی نظریئے کی سوچ میں محو ہو تو دوسرے کتنے ہی عقلی نظریات اس کے سامنے رکھ لئے جائیں، نہ وہ انہیں سمجھ سکے گا نہ ان کا شعور ہی پا سکے گا۔ کیونکہ اس کی قوت فکر یہ کسی دوسرے میں مصروف جولانی ہے اور فکر کو فرصت نہیں ہے کہ وہ اس نظریئے پر غور کر سکے۔ اسی طرح روحانی احوال و کیفیات کا ادراک بھی قوت فکر یہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اگر غیبی میدانوں میں فکر کی قوت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دوسرے روحانی مقام میں محو ہو تو دوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہو سکیں گے۔ آخر مراقبات میں قوت فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے۔ احسان یا تصوف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر و ناظر تصور کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ سو یہ قوت فکر کا استعمال نہیں تو اور کیا ہے؟

انسان کی فکری قوت کی کار پردازی...... بہرحال یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ انسان کی معنویت میں حقیقی کار پرداز صرف یہ فکر ہی قوت ہے۔ وہ متوجہ نہ ہو تو قوت باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور قوت عاملہ سب معطل رہ جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواس خمسہ ہرکاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑتے ہیں۔ جب عقلیات کی طرف منعطف ہوتی ہے تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ یہی قوت فکر جب غیبیات کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لئے قوت فکر یہ نہ صرف یہ کہ انسان ہی کی خصوصیت ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی ساری ہی اندرونی قوتوں کی روح اور ان کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ چنانچہ جو قومیں ان حسی طاقتوں' آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعہ معجزات انبیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلمات سنتی تھیں، مگر رضاء و تسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآن حکیم نے

اس کی وجہ آنکھوں کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دل کی نابینائی بتلائی ہے جو درحقیقت اس قوت فکریہ کی نابینائی ہے۔ارشادفرمایا: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ ① ''بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں (جو فکر اور غور سے عاری ہیں)''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی روح اور مدار کار فکر قلب ہی ہے نہ کہ نظر چشم ،فکر کی آنکھ نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں گو وہ طبعی آمادگی سے دید وشنید کا کام بھی انجام دیتے جائیں۔اس لئے قرآن حکیم نے منکرین کی ظاہری دید وشنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارکردگی کا انکار کیا ہے جبکہ اس کی غرض وغایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوت فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری روح ان محسوسات کے پیکروں میں سے ان کی روح نکال کر لاتی ہے۔ارشاد حق ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ ② ''اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھے ہیں۔کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے) ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (مع معجزات وکمالات) دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو''۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو ان سنی کر دینا اور دیکھ کر ان دیکھی بنا دینا قوت فکر ہی کے تعطل سے ہوتا ہے جس کو قرآن نے عقل وابصار سے تعبیر کیا ہے گویا جس مبصر ومسمع میں یہ بنیادی شعور شامل نہ ہو جس کا قوۂ مفکرہ کے غور وفکر سے تعلق ہو تو وہ مبصر ومسمع بلحاظ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے۔پھر اس طرح قرآن حکیم نے ایک دوسری جگہ ان منکروں کے حق میں فرمایا: جو پیغمبر علیہ السلام اور ان کے پیغمبرانہ اقوال وافعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور طبعی انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکر قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس ،حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں وہ فکر شعور نہ تھا جو حقیقی معنی میں دیکھتا اور سنتا ہے جسے قرآن نے فقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے۔ارشاد حق ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ؗ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ؗ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ③ ''ان کے دل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو ہیں یہی لوگ غافل ہیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے بلکہ فقہ قلب اصل ہے، جس کا دوسرا نام قوت فکر ہے، وہ نہ ہو تو حواس کام ہی نہ کریں گے یا کریں گے تو وہ ناقابل اعتبار ہوگا اور غیر قابل التفات

① پارہ:۱۷ سورۃ الحج،الآیۃ:۴۶۔ ② پارہ:۱۱ سورۃ یونس،الآیۃ:۴۲،۴۳۔ ③ پارہ:۹ سورۃ الاعراف،الآیۃ:۱۷۹۔

جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

عقل کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا حقیقی معیار ...... اسی طرح عقل کے بارے میں بھی قرآن کریم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا معیار بھی یہی قوت فکر ہے۔ عقل محض نہیں، یعنی عقل طبعی کی سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کی فقہی سوچ بچار اس کا منشا نہ ہو جس کا نام فکر ہے۔

تو عقلی شعور بھی بے شعور اور نا قابل اعتنا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسے قلوب کے جو بے فکرے ہوں۔ قرآن نے انہیں عاقل نہیں کہا غافل کہا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ ① ''اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اسی سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے' ان میں سے ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں''۔

اس آیت کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیاء غبار (زمین) وغیرہ باوجودیکہ آنکھوں سے نظر آنے کی چیزیں ہیں جنہیں سب دیکھتے ہیں حتیٰ کہ چرند و پرند بھی اور ان سے اس دنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف وطمع کا اثر بھی لیتے ہیں، لیکن فرمایا یہ گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی نشانیاں پنہاں ہیں اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے۔ وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لئے ہیں، آنکھ لڑانے والوں کے لئے نہیں اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے جو عقل کو کام پر لگاتا ہے، بے فکری اور بے توجہی سے عقلی تگ و تاز بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے، بہر حال حس ہو یا عقل، ذوق ہو یا وجدان بلا فکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز ...... یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ مختلف دائروں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے کہیں غور و فکر کے لئے انفسی آیات، کہیں شرعی اور علمی آیات سامنے رکھی ہیں اور کہیں وجدانی اور لدنی آیات اور ان میں تدبر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے۔ انفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لئے فرمایا ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ ② ''تمہارے اندر (خود دلائل معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کرو گے؟''

کہیں آفاقی آیات پیش کیں جیسے ﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ③ ''کیا وہ آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر (وفکر) نہیں کرتے؟''

کہیں ان دونوں نوعوں کو جمع کر کے فرمایا ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴۔ ② پارہ: ۲۶ سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۲۱۔ ③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۸۵۔

اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ ① ''ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گردو نواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے''۔

کہیں شرعی آیات پیش کہیں اور قرآن حکیم کو غور و تدبر کے لئے پیش کیا۔ ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ ② ''کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے''۔

کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیات طیبہ کی شانوں اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ تاکہ اس سیرت پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دلوں میں آ جائے اور لوگ اسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں' فرمایا ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ ③ ''آپ فرما دیں اے پیغمبر! کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور فرادی فرادی اٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے اس ساتھی (پیغمبر) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے؟ وہ تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے''۔ ﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ④ ''کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنے ساتھی (پیغمبر) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے؟ وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے آخرت کے عذاب سے کیا یہ کسی مجنون کا کام ہے؟''

یہی صورت وجدانیات کی بھی ہے کہ حقائق غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو ''لب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے۔ منکشف شدہ علوم و معارف کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا کہ ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُو الْاَلْبَابِ﴾ ⑤ ''جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر عطاء کر دی گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں''۔

حاصل کلام...... حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادہ ہے، جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ، مگر وہ صورت عقل ہے جو مادۂ شعور ہے اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کر لیتا ہے لیکن لب اور لباب حقیقت عقل ہے جس سے حقائق کونیہ اور حقائق شرعیہ منکشف ہوتی ہیں۔ اسی کا نام فکر ہے، یہ حکمت جسے خیر کثیر کہا گیا ہے۔ محض عقل طبعی سے برآمد نہیں ہوتی، بلکہ عقل عرفانی سے منکشف ہوتی ہے جسے لب کہا گیا ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے اس خاص قوت فکر کو جس کا تعلق قوانین الٰہی، معرفت خداوندی، حقائق نبوت اور اس کے ایوان کے انکشاف سے ہے جسے صبغت اللہ کہا گیا ہے۔ اسی کو کہیں فقہ قلبی سے، کہیں لب (عرفانی) کہیں نظر

---

① پارہ: ۲۵ سورۃ حم السجدۃ، الآیۃ: ۵۳۔ ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۲۔ ③ پارہ: ۲۲ سورۃ السبأ، الآیۃ: ۴۶۔

④ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۸۴۔ ⑤ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔

(باطن) سے، کہیں بصیرت سے اور انصباغ من اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوتوں، حواس عقل، وجدان عقل اور حدس و تجربے کو کام میں لگاتا ہے اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اس کا مصرف انفس و آفاق تشریع و تکوین اور کمالات ذات و صفات نبوی اور معرفت الٰہی کو بتلایا ہے اور جگہ جگہ اسی کی دعوت دی ہے اور ظاہر ہے کہ فکر و تدبر چشم بینا اور گوش شنوا کا کام نہیں، بلکہ قلب متفکر ہی کا کام ہے اور فکر ہی جب ان اعضاء حواس وغیرہ کی امام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتداء میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور پھر فکر ان میں سے اصولی، کلی اور علمی مقاصد تک پہنچ کر معرفت حق کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام...... خلاصہ یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیز ہے، فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کی امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتی تو اجتہاد کا دروازہ کلیۃً مسدود ہو جاتا اور شرائع فرعیہ امت کے سامنے نہ آسکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے۔ مگر اجتہاد کی جنس بہر حال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی، اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دلائی اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے اکتشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے، بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے، کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم و جدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا تاکہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں میں قدیم و جدید کی دوئی ختم کر کے انہیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے اس لئے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک و تحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی نہضت اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کے جذبات سامنے آنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا علمی آغاز کس مرکزی نقطہ سے کیا جائے جس میں یہ تمام مذکورہ انواع جن کے لئے قرآن حکیم نے دعوت دی ہے سمٹ کر اسی مرکزی نقطہ کے نیچے جمع ہو جائیں اور کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطہ سے شروع ہو۔

فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کا مرکزی نقطۂ منہاجِ نبوّت...... اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی فکر کے لئے سب سے پہلی فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہئے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائیاں صرف کریں اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا بلکہ تشتت افزا اوہام و خیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے

جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاج نبوّت ہے۔ جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے اس منہاج نبوّت کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آ جائے گا جو اس امت میں نبی امت نے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کی فکر جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں، نیز یہ بھی سامنے آ جائے گا کہ اس کے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا؟

منہاج نبوّت کا امت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر...... غور کیا جائے تو اس منہاج نبوّت نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمال اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دین داری کے نام پر دنیا کو کلیتہً ترک کر کے زاویہ نشین ہو جائیں۔ شہری آبادیوں تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات و میلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو، نہ در، نہ معاشرہ ہو، نہ معیشت ہو، نہ انسانی روابط ہوں، نہ قومی تعلقات، نہ موانست باہمی ہو، نہ اجتماعیت کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے، نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرت کا تقاضا۔ اس لئے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی برملا نفی کی ہے کہ "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" ① "اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں"۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادت الٰہی اور طاعت نبویؐ سے بیگانہ ہو کر کلیتہً نظام دنیا سنوارنے، اور جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو، نہ عقائد رہیں نہ عبادات نہ فرائض رہیں نہ سنن نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیر خواہی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ دن رات ہوائے نفس کی پیروی، شبانہ روز لہو و لعب، عیش و طرب، و آرائش و آسائش اور نمائش و زیبائش، مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے، سو اسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی، متاع اور غفلت یا بالفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے۔

فرمایا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ② ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ﴿ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ "اور دنیاوی زندگی

① قال الحافظ ابن حجر: لم اره بهذا اللفظ لكن في حديث سعد بن ابي وقاص عند الطبراني ان الله ابدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة دیکھئے: فتح الباری ج: ۱۴ ص: ۲۹۳۔ ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۸۵۔

تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں اور آپ ان کو (ان کے حال پر) رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے''۔

بلکہ اس افراط وتفریط سے الگ کر کے دنیا کو ترک کرانے کی بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلو اور مبالغے سے روکا ہے۔ یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دنیا کے شعبوں کو زیرِ استعمال رکھ کر ان ہی سے آخرت پیدا کی ہے، چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔ ''اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ.'' (1) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے، اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجرِ آخرت ہے وہیں حظِ دنیا بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر مسواک میں ثواب آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیشِ نظر ہے۔ اگر طیباتِ رزق میں بہ نیت حسنِ عبادت کی قوت رکھی گئی ہے۔ وہیں کام ودہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے۔

اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرتِ حیاء اور سترِ عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسنِ دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے۔ اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر ونخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت اختیار کی گئی ہے جو دنیاوی مفاد ہے۔ اگر تختِ شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظِ ملک، خدمتِ خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرت اصل ہے تو وہیں اسے دنیوی وقار وعزت اور سیاست وقیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے بہرحال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب واکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ صائب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

فکرِ دنیا کن اندیشہ عقبیٰ مگذار   تا بعقبیٰ نہ رسی۔ دامنِ دنیا مگذار

غرض منہاجِ نبوت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس امت کو ڈھالا ہے، جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں، اس لئے اس منہاج کے عناصرِ ترکیبی تہذیبِ نفس، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن، تسخیرِ اقالیم، تعظیمِ امر اللہ، شفقت علیٰ خلق اللہ، نظامِ اجتماعیت، جماعتی تنظیم ومرکزیت، اخلاق وایثار کی منظم تربیت، نظامِ عبادت اور نظامِ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکرِ آخرت اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے تاکہ یہ قوم جامعِ دین ودنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی جامد، مقلد اور مقتدی

(1) علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: لم اقف علیہ مع ایراد الغزالی لہ فی الاحیاء وفی الفردوس بلا سند عن ابن عمرؓ مرفوعاً: الدنیا قنطرۃ الآخرۃ فاعبروھا ولا تعمروھا. دیکھئے: المقاصد الحسنۃ ج: 1 ص: 118.

بنے، اسے خوددار بنا کر امام اقوام اور داعی حق وصداقت کی حیثیت دی گئی ۔

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام　　　ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

تشکیل جدید میں آج کی ضرورت...... پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوّت کو سمجھ کر فکر اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا، اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے جدید ہوں اور دلائل قدیم تا کہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں ۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں اصول اور قوعد کلیہ اور ضوابطہ کی پابندی کی اہمیت...... اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوّت کے تمام عقائد واحکام واخلاق وعبادات اور معاملات واجتماعیات وغیرہ آئے ہیں، تا کہ ہماری تشکیل جدید کا سرچشمہ وہی اصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم وجدید کی تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما نہ ہوگی ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی ۔

اگر ایک شخص سائنس کی فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فن طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسلمہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو یا منطق وفلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لئے صرف ونحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہوسکے گا، اس لئے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین وترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا تا کہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اساسی اصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد ومقاصد تک پہنچا ہوا ہے یہ اصول وقواعد ہی درحقیقت منہاج نبوّت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں؛ جس کا اثر پورے قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہے ۔ اگر تشکیل جدید میں یہ قواعد واضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی ۔

اصول وضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ...... البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں، اس لئے ان میں تغیر وتبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا ۔ البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کئے ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جن میں اصول وقواعد کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور

ہوتے رہیں گے، البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے۔اس لئے ان میں بہرحال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی، جسے مبصر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی۔جیسا کہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے۔بس ایک مجتہد کو اجتہادی تو اجازت ہے ایجادی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے، خواہ یہ اتباع جزئیات کا ہو جبکہ وہ منصوص ہوں یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ وہ اجتہادی ہوں۔جزئیات میں درحقیقت اتباع ان اصول اجتہاد ہی کا ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں۔اس لئے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگریز ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل و ترتیب عمل میں آ سکے گی' نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہو سکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہو سکتا۔جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے، یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیہ سے نہیں ہو سکتی، بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے۔یہی وجہ ہے کہ جن اصولوں کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان میں زیادہ غور و خوض کیا جائے۔مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوب حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ ان کے حقائق کے پیچھے مت پڑو۔﴿يَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ ① ''آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے''۔

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا دیا گیا کہ: تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابل تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو۔یہ حقائق یا خود ہی عملی ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ ② ''آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے''۔یا اسی طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرما دیا گیا کہ: تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں، صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔﴿يَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ○ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ○ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا﴾ ③ ''یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب

① پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۸۹۔ ② پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸۵۔

③ پارہ:۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ:۴۲، ۴۴۔

ہوگا، سواس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے‘‘۔

بہر حال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب۔ اور قابل تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہو اور سعادت دارین حاصل ہوتی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیات عملی سے بنتی ہے جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے، اسی لئے کسی مربی نفس ربانی کی ضرورت ہے، ربانی کی تفسیر ابن عباسؓ نے ’’اَلَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِھَا‘‘ سے کی ہے۔ ’’یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداء چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے‘‘۔ اس لئے قرآن کریم نے تذکیر مواعظ اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت وسلطنت) کی بنیادی غرض وغایت ٹھہرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صرف کریں وہ جہاں اصولی ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھرپور ہوتا کہ علم اور عمل دونوں جمع ہوسکیں کہ اس کے بغیر ہماری فکر اور اس کی تشکیل پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل مطلب...... حاصل یہی ہوا کہ فکر اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب آج کے دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح وانتخاب جدا بات ہے۔ وہ اہل علم کا کام ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور ان کی جامعیت، وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اصول کتنے بھی معقول اور دل پذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں، ان کا حقیقی مفہوم وانشگاف نہیں ہوسکتا ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت وشکل سامنے آسکتی ہے اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعہ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیر ہیں وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ اصول کی وسعت و جامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔

فقہاء متقدمین کے استخراج جزئیات کی افادیت...... اس سے ہی ان حوادث، وواقعات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جو ان جزئیات کے استخراج کا باعث بنے جب کہ فقہاء امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید سے بعید محتملات کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے، ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں، اس لئے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہوسکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس ضرور کیا جاسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کرسکیں، ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی۔ بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی، اس لئے

بجائے اس کے کہ ہم از سر نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں پھر بھی اگر مفتی کو نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو جزئیات سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کرسکیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑ ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے استخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہاء امت نے اصول تفقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید محتملات تک کے احکام مستنبط کر کے جمع کر دیئے ہیں جس کے مجموعہ سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہو گیا جس میں ہر شعبہ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔

اس لئے فکر جدید کی تشکیل میں قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا از بس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن و استہزاء کی وجہ سے کبھی ترک کرنا گوارہ نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اسے فوراً اٹھا کر اس کی گرد جھاڑی صاف کیا اور تناول فرمالیا۔ غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں دولتمندوں اور سیر چشموں کا ہے وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے فرمایا: ''اَاَتْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ.'' ''کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کردوں؟'' غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزیہ کی پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات، خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ متکبروں کا تمسخر و طعن، لیکن جو نشہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوّت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا۔ مگر ان سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات میں تیز قدم تھا، جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال و حوادث کے پیش نظر توسع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضا جوئی یا مجبوری یا آجکل کی اصطلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جاسکے۔

بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جاسکتے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔ دوسری یہ بات بھی اس واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دین ہے۔ جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق و محبت ہے، جو ذات حق، ذات نبوی اور ذات صحابہؓ سے وابستہ ہے، اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کے لئے بھی نظر انداز نہیں کرسکتا، جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہاں ''حبیبی'' کا لفظ استعمال فرما کر

اس محبت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزئیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانونِ عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے، جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزئیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور اس سے ایک انچ بھی نہیں ٹل سکتا، اس لئے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی میں آزادی ضمیر اور حریت رائے کی حدود...... لیکن اس انتہائی پابندی اور قید و بند کے ساتھ ہی آزادی ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عام سے عام آدمی بھی اس قانونِ حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کرسکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارہ کار نہیں ہوتا، اس کے لئے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے، جس کا نام امامت صغریٰ ہے، جو کلیتہً امامت کبریٰ یعنی امامت و خلافت پر منطبق ہے، وہاں اگر امام اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے۔ وہاں اگر جہاد میں ہر نقل و حرکت پر نعرہ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر امام کے حق میں سمع و طاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے۔ وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں تو یہاں بھی یہی ہے، وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے امامت صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں، اس صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کا مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ سجدہ میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہو جائیں وہ ولا الضالین کہے تو یہ آمین کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی ہو جائے اور وہ سجدہ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطاء میں ساتھ دیں اور سجدہ سہو کریں۔

لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر امام قرات یا افعال صلوۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کر لے یا قرات صحیح نہ کرے یا کسی رکن میں غلطی ہو جائے اور اسے درست نہ کر لے، چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر و تسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہو جائے۔

بعینہ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المومنین کی سمع و طاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر و سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطاء و لغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کر لے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے۔

فاروق اعظمؓ پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ بحیثیت امیر المومنین ممبر پر کھڑے۔ ہو کر

خطبے میں اعلان فرمار ہے تھے، ''لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' اعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ فرمایا کیوں؟ کہا مال غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی، حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا (عبداللہ بن عمر) دے گا، صاحب زادے نے فرمایا کہ امیر المومنین کا قد لانبا تھا، ایک چادر کافی نہ تھی اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کر دی، وہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے، تب اعرابی نے کہا کہ: اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ بہر حال منہاج نبوت کے مزاج کی رو سے عمل میں تو یہ تقیید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزئیہ میں ڈھیلا پن گوارا نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک عام آدمی کو بھی امیر المومنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگزاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا۔ لیکن حریت رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کر دینا کوئی قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جب کہ ان ہی اصولوں کی پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالمگیر بنی۔

اسلام اور اسلامی اصول کی عالمگیریت پر واقعاتی حقیقت کے شواہد...... آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دین کے مدعی ہیں تو اس ہمہ گیری کے معنی ان کے انہی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہوسکتا لیکن جب انہیں اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اصول سے تربیت پا کر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی ابھریں جنہوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دکھائی اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا۔ اس لئے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہوسکتا ہے۔ فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جاسکتا۔ بالخصوص جب کہ ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہل علم و فضل نے استخراج مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں۔ جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے۔

اس لئے تمدن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سنن زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا، بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے، ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں انہیں اہل علم ان کے اصول سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں، جیسا کہ مفکران باب فتویٰ کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے۔ بالخصوص مسائل کے طرز استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرن جدید میں نئے رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایک دور میں نظری فلسفہ نے رنگ جمایا اور دین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقلی چولے میں نہ آئے تو رازیؒ وغزالیؒ جیسے حکمائے ملت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے لوگوں پر حجت تمام کی، ایک دور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابن عربیؒ وغیرہ نے صوفیانہ اور

عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دور میں معاشی فلسفہ کا زور ہوا تو شاہ ولی اللہؒ جیسے حکیم امت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا اور وقت کے مسائل حل کئے۔ ایک دور سائنسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دارالعلوم (دیوبند) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو شواہداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کر کے اتمام حجت فرما دیا۔ جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس میں یہ سارے الوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو در حقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے۔ البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں۔

دور جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوت وشوکت...... آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے، مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو۔ ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے عوام کے لئے قابل التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا۔ بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا، حالات متحرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنہوں نے دین و دنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل تھے، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے سے کوئی سبق نہیں لیا اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھلا سکتی تھی جواب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

دور جدید میں دینی مزاج کے مطابق فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل...... بہر حال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول، اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے۔ وقت کے مسائل کو نئی تشکیل و ترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی جبکہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلف صالحین کا اسوہ،

مرادات خداوندی کے ساتھ تقید، رضاء حق کی پاسداری، اجتماعی اصلاح وفلاح، اخروی نجات کی فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آ جائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور تفقہ مزاجی کی ضرورت ہے۔ جس کی تفصیل عرض کی گئی، وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں۔ عصری حالات اور وقت کی ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علوم عصریہ میں انہیں مہارت وحذاقت میسر ہو، دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھتے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں کیونکہ حالات ہی اصل محرک فتاویٰ ہیں۔ اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر وبیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناں گوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر وبیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی اور دوسری طرف ماہرین عصریات جبکہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں، اگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض انہی کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی بہر دو صورت تشکیل جدید کا خاکہ ناتمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاستی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور فکر اور باہمی بحث وتمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکروں کو کتاب وسنت اور اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگی۔ جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا' نیز ایک طبقہ ہدف طعن و ملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سد راہ نہ ہوگا۔

تشکیل جدید کرنے والے مفکرین کے لئے ایک امر لازم...... البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے اور انہیں تنگی اور ضیق وحرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں۔ وہیں رضاء خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے۔ اس

لئے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلہ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے، حال کے معنی ہیں ''مَاحَالَ فَقَدْ زَالَ'' کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگیا) پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے لیکن اصول فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کر سکیں، اس لئے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات کے مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثہ کے بارے میں منہاج نبوت نے اصولاً یا جزءً وضع کئے ہیں اور ان پر منطبق کئے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر، مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے۔ نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں نئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی ضرورت واہمیت...... فی زمانہ اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات کی بوچھاڑ کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے زیادہ آج کے سیاسی نظریات دماغوں پر مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں۔ آج مسلک اور ازم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی اور معاشی قوانین تیار ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، حتی کہ عقائد بھی بن رہے ہیں تو وہ بھی سیاسی اور معاشی، چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی ٹھہر گئی ہے جو مذہب اور دین کے بارے میں رائج تھی کہ ہم فلاں نظریہ پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایمان لاتے ہیں جو کسی دور میں دینی عقائد کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس لئے آج ایک سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی بھی اشد ضرورت ہے۔ جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد وافکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے جس کے لئے چند مفکر عالم اور چند مفکر گریجویٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ قدیم زمانہ کے ''ملل ونحل'' اس دور کے پیدا شدہ مذہبی عقائد اور افکار کے پیش نظر مرتب ہوئے تھے۔ جب کہ دلوں پر سیاست کے ٹھپے لگے ہوئے نہیں تھے اب عصر حاضر کے سیاسی عقائد وافکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے سیاسی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل وشواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی ہے کہ جامعہ اسلامیہ نے آج جب فکر اسلامی کی تشکیل نو کا مسئلہ اٹھایا ہے تو ممکن ہے کہ سیمینار کے ثمرے کے طور پر اس سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی ''ملل ونحل'' کی مضبوط بنیاد بھی پڑ جائے۔ حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی تمدنی اور اجتماعی مسائل کی جو نوعیں ابواب وفصول کے ساتھ جن جن عنوانوں سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیتہً حاوی ہیں اور ان میں فقہاء

امت کے دل و دماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے اس لئے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر عملی اور فکری سعی کا محور بنایا لیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آ جائیں گے اور دوسرے مہم مسائل بھی شامل ہو جانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی ''ملل ونحل'' تیار ہو جائے گی جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع رکھنی چاہئے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینک کاری، اسٹاک ایکسچینج وسودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی۔ کیونکہ جب فکر اسلامی کے بارے میں قدم اٹھایا جا رہا ہے تو وہ بھرپور اٹھنا چاہئے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آ جانے پر یہ شبہ بھی حل ہو جائے کہ آیا اسلام میں جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہے، جسے اسلام کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ اسے توڑنے والا خود اسلام ہے، جیسا کہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے۔ اسلام نے اپنے اصول فطرت میں ماننے والوں کو محدود کر دیا ہے جس کے معنی جمود کے سمجھے جا رہے ہیں۔ لیکن اصول فطرت میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکن ہے۔

اسلامی مزاج اور منہاج نبوّت کے اساسی اصول ..... منفی پہلو

1 ..... لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ. ''اسلام بغیر جماعت نہیں یعنی اسلام کا مزاج اجتماعیت پسندانہ ہے انفرادیت پسندانہ نہیں''۔

2 ..... لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ. ''یعنی دین کے بارے میں اسلام کا مزاج اختراع پسندی اور جدت طرازی کا نہیں بلکہ اتباع پسندی ہے۔ نیز گوشہ گیری اور انقطاعیت پسندی کا نہیں بلکہ عام مخلوق میں ملے جلے رہ کر کام انجام دینے کا ہے''

3 ..... ﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ ① ''یعنی اسلام کا مزاج دین میں جبر واکراہ اور تشدد کا نہیں بلکہ نرمی ومحبت کے ساتھ حجت وبرہان سے حق واضح کر دینے کا ہے۔ ماننا نہ ماننا کلیتہً مخاطب کا اختیاری فعل ہے''۔

4 ..... لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْاِسْلَامِ. ② ''یعنی اسلام کا مزاج تخریبی یا ضرر رسانی نہیں بلکہ تعمیری اور نفع رسانی کا ہے''۔

5 ..... لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ فِي الْاِسْلَامِ. ③ ''یعنی اسلام کا مزاج توہم پسندانہ نہیں کہ شگون یا ٹونے ٹوٹکے یا کسی کی بیماری کسی کو لگ جانے کا تخیل باندھ لینا اس کے یہاں معتبر ہوں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے کہ امور واقعیہ ہی

---

① پارہ: ۳، البقرہ: ۲۵۶.

② السنن الامام الدارقطني، باب في المرأة تقتل اذا ارتدت، ج: ۴ ص: ۲۲۷ رقم: ۸۳.

③ الصحيح لمسلم، كتاب السلام، باب لاعدوى ولاطيرة، ج: ۴ ص: ۱۷۴۳ رقم: ۲۲۲۰.

اس کے نزدیک معتبر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ حسی اسباب سے ظہور پذیر ہوں یا معنوی اسباب سے تخیلاتی اور توہماتی خطرات ووساوس اس کے نزدیک اسباب نہیں ہیں کہ حوادث کا ان سے تعلق ہو"۔

6 ...... انا لا نولی هذا من سأله ولا من حرص علیه. ① "یعنی اسلام کا مزاج طالب عہدے کو عہدہ نہ دینے کا ہے۔ گویا عامۂ عہدوں کی طلب خود غرضی کی دلیل ہوتی ہے اور خود غرض انسان اپنی اغراض کی تکمیل میں مشغول رہ کر فرائض منصبی میں عادۃً قاصر رہتا ہے"۔

7 ...... ﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ② "یعنی اسلام کا مزاج کسی پر اس کی طاقت کے قدر بار ڈالنے کا ہے خواہ انسان ہو یا حیوان زائد از طاقت بوجھ رکھنا اس کے نزدیک ظلم ہے"۔

8 ...... لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّنَا ③ "یعنی اسلام کا مزاج گندم نمائی جو فروشی اور نمائشی خوبصورتیاں دکھلا کر وغل فصل کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت نمائی کا ہے"۔

9 ...... ﴿وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ ④ "یعنی اسلام کا مزاج تصنع، بناوٹ یا نمائش پسندی کا نہیں، بلکہ سادگی سچائی اور ظاہر و باطن کی یکسانی کا ہے"۔

10 ...... ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ ⑤ "یعنی اسلام کا مزاج شخصیات مقدسہ کے نام پر تعصب، تنگی، حد بندی اور گروہ سازی کا نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر توقیر و تعظیم کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور عالم انسانیت کو متحد کرنے کا ہے"۔

11 ...... ﴿لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ⑥ "یعنی اسلام کا مزاج دل چھوڑ کر بیٹھ رہنے اور بزدلی اور کم ہمتی دکھلانے کا نہیں بلکہ عزیمت اور قوت یقین کے ساتھ عالی حوصلگی اور ہمت مردانہ دکھلانے کا ہے"۔

12 ...... ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ ⑦ "یعنی اسلام کا مزاج کتنی بھی مشکلات کا ہجوم سر پر آ جائے مایوسی کا نہیں بلکہ امید بھروسہ اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ ثبات و استقلال اور آگے بڑھتے رہنے کا ہے مایوسی اس کے نزدیک

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب مایکره من الحرص علی الامارة ج: ۲۲ ص: ۲۰ رقم: ۶۶۱۶.

② پارہ: ۳ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۶.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ من غشنا ...... ج: ۱ ص: ۹۹ رقم: ۱۰۱.

④ پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۸۶.

⑤ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۵.

⑥ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۳۹.

⑦ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷.

کفر کا شعبہ ہے“۔

13 ......﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ① ”یعنی اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذور کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکال دی جاتی ہے“۔

14 ......لَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ ② ”یعنی اسلام کا مزاج دین میں غلو، مبالغہ اور تحمل بیجا کا نہیں ورنہ دین اسے ہٹا دے گا بلکہ اعتدال کے ساتھ بقدر طاقت بوجھ اٹھانے کا ہے۔ توسط و اقتصاد ہی اس کا بنیادی اصول ہے“۔

15 ......﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ③ ”یعنی اسلام کا مزاج دوست اور دشمن میں یکساں انصاف ہے جانبداری یا بے جا رعایت یا خویش نوازی اس کے یہاں خلاف عدل اور خلاف تقویٰ ہے“۔

16 ......﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ ④ ”یعنی اسلام کا مزاج عمل پر ابھارنا ہے کہ ہر ایک کو اسی کی سعی کام دے گی، دوسرے کی محنت کام نہ آئے گی تاکہ آدمی دوسروں پر تکیہ کر کے معطل نہ ہو بیٹھے، ہمت سے خود آگے بڑھے“۔

مثبت پہلو...... یہی صورت اسلام کے اساسی اصول میں مثبت ضابطوں کی بھی ہے، جس سے اسلام کا مزاج کھلتا ہے مثلاً

1 ......﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ ، بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ ، بَيِّنَةٍ.﴾ ⑤ ”یعنی اسلام کا مزاج حجت پسندی، حجت طلبی اور تحقیق حال کا ہے جذبات پسندی یا محض شبہات یا قرائن بے تحقیق کسی کو انعام یا انتقام دینے کا نہیں“

2 ......﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَّاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ ⑥ ”یعنی اسلام کا مزاج صلح جوئی اور امن پسندی کا ہے۔ لڑائی جھگڑا شر انگیزی اور فتنہ جوئی کا نہیں نیز اس کا مزاج احسان اور جود و کرم کا ہے۔ بخل، تنگی اور جزرسی کا نہیں“۔

3 ......﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ، اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ⑦ ”یعنی اسلام کا مزاج انتقام پسندانہ نہیں بلکہ کریمانہ اور مصائب یا ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا ہے۔ اس کو اس نے اولوالعزمی کہا ہے“۔

4 ......﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ⑧ ”یعنی اسلام کا مزاج باہمی بھائی بندی اور ملنساری کا ہے اجنبیت پسندی اور بیگانہ روش کا نہیں“۔

5 ......”اِنَّ النَّاسَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ.“ ”یعنی اسلام کا مزاج عام بھائی چارے کا ہے کہ تمام انسان بھائیوں کی

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۸۔
② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر ج: ۱ ص: ۶۹ رقم: ۳۸۔
③ پارہ: ۶، سورۃ المآئدۃ، الآیۃ: ۸۔
④ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔
⑤ پارہ: ۹ سورۃ الانفال، الآیۃ: ۴۲۔
⑥ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۲۸۔
⑦ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔
⑧ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۰۔

طرح رہیں خواہ کوئی بھی قوم ہو اور کسی بھی مذہب کی ماننے والی ہو۔ غلام سازی یا استحصالِ عوام یا گروہ سازیوں کے ذریعے بھائی کو بھائی سے جدا کر دینے کا نہیں ہے''۔

6 ......﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْفَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ ① ''یعنی اسلام کا مزاج پورے عالمِ انسانیت کے احترام و تحفظ کا ہے انسانیت کی تحقیر و تذلیل اور لاپرواہی سے اس کے ضائع ہو جانے پر قناعت کر لینے کا نہیں''۔

7 ......﴿وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ. وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ ② ''یعنی اسلام کا مزاج خلط و التباس یا حق و باطل کو مخلوط کر دینے یا اقوام کی رضا جوئی کی خاطر حق و باطل کو جمع کر کے بین بین راہیں نکالنے کا نہیں بلکہ حق و باطل کو نکھار کر متمیز کر دینے کا ہے''۔

8 ......﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ ③ ''یعنی اسلام کا مزاج دائرہ حق (اسلام) میں پورے داخل کرانے یکرخی کے ساتھ دلوں کو سکون و اطمینان بخشنے کا ہے۔ ناتمام اور ادھ کچرے کام سے دلوں کو ڈانواں ڈول کر دینے کا نہیں''۔

9 ......﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ④ ''یعنی اسلام کا مزاج امانت داری اور امانت سپاری کا ہے بددیانتی خیانت پسندی یا دغل فصل کا نہیں''۔

10 ......﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ⑤ ''یعنی اسلام کا مزاج اجتماعی امور میں استواری نظام اور قیامِ امارت پر امیر کے حق میں سمع و طاعت کا ہے اگرچہ ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے لامرکزیت یا فوضویت اور بے مرکز جمہوریت اسلام کا مزاج نہیں یہ انتشار پسندی ہے''۔

11 ......﴿كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ ⑥ ''یعنی اسلام کا مزاج ہر ایک کو اپنے ہی عمل پر ابھارتا ہے تا کہ دوسروں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے''۔

12 ......﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ ⑦ ''یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اپنی نسبت یا نسب یا انتساب پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے جس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضرور اس کے آگے آئے گا''۔

13 ...... ثَلٰثَةٌ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (وَمِنْهُمْ) مُتَّبِعٌ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً جَاهِلِيَّةً. ⑧ ''یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ

---

① پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳۲.
② پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۵۰.
③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۰۸.
④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۸.
⑤ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۶.
⑥ پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۲۱.
⑦ پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۲۳.
⑧ کنز العمال، ج: ۱۶ ص: ۵۸.

جاہلیت کی جن رسوم کو اس نے مٹا دیا ہے ان کا اعادہ یا نئی پگڈنڈیاں نکالنا اس کے لئے قابل برداشت نہیں کہ یہ خود اسلام کی تخریب ہے"۔

14 ...... ﴿مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ① "یعنی اسلام کا مزاج رسالت کی پیروی کرانا ہے۔ قانون حق میں ایجاد اختراع کرانا نہیں"۔

15 ...... "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" ② اور "اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ." ③ "یعنی اسلام کا مزاج ہر عمل کو خواہ عبادۃ ہو خواہ عادۃ، اخروی بنانا ہے، دنیا پر ختم کر دینا نہیں ہے نہ دنیاوی مفادات کو اصل رکھنا ہے، مگر دنیا ترک کرانا بھی نہیں بلکہ اسے اختیار کر کے اس میں سے آخرت نکلوانا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کو کھیتی کہا ہے، پس اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی کرنا بھی ضروری ہے ورنہ پھل نہیں مل سکتا، پس اسلام کے مزاج میں ترک دنیا نہیں بلکہ ترک محبت دنیا ہے اس لئے یہ ساری دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے تو وہ معطل نہیں چھوڑی جاسکتی اور انسان آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو اسے محض دنیا پر نہیں چھوڑا جاسکتا"۔

خلاصۂ اصول ...... بہر حال کتاب وسنت کے یہ چند اساسی اصول جیسے اجتماعی، انفرادی، شخصی، جماعتی مرکزیت، امارت، سمع وطاعت، تفویض، عہدہ جات کی نوعیت، عوام کا طرز تربیت، اخلاقی بلندی، عملی جوش، معاشرت کا ڈھنگ، دین کی وسعت، خلط والتباس سے اس کا بالاتر ہونا، بدعات ومحدثات سے گریز، اتباع رسالت، اخوت، ہمدردی، بے لوث عدل وانصاف، خدمت خلق، دنیا کا آخرت سے ربط اور آخرت کی مقصودیت وہ امور ہیں جن سے منہاج نبوت کا ذوق اور اسلام کا مزاج کھل کر سامنے آتا ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں جو سرسری طور پر ذہن میں آئیں ورنہ کتاب وسنت ان جیسے سینکڑوں اصول سے بھری ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنی تشکیل نو میں ان سب کو بہر حال سامنے رکھنا ہے۔

تشکیل جدید میں سب سے زیادہ اہم قدم رجال کار کا انتخاب ...... لیکن ان اقدامات میں سب سے زیادہ اہم قدم یا چوتھا قدم رجال کار کا انتخاب ہے جو دین کے مبصر اور فقیہانہ شان رکھتے ہوں۔ بحیثیت مجموعی دین کے اصول وفروع ان کے سامنے ہوں۔ اسلام کی حقیقی روح ان کی روحوں میں پیوست ہو اور اسلام کی وہ حکمت عملی اگر رجال کار ناواقف یا غیر فقیہہ یا غیر مبصر اور اسلام کی حکمت عملی سے نابلد، روح اسلام سے بیگانہ ہوں تو فکر اسلامی کی تشکیل ممکن نہ ہوگی۔ اس لئے سب سے بڑا مسئلہ شخصیات کے انتخاب کا ہے، حق تعالیٰ نے جب اس نا مکمل دین کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اولاً شخصیت ہی کا انتخاب فرمایا اور وہ ذات تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کی وجہ یہ ہے کہ دین محض تعلیم وتفکیر کیلئے نہیں بلکہ تربیت کے لئے آتا ہے اور تربیت محض تعلیم یا کتاب کے

---

① پارہ:۲۸ سورۃ الحشر، الآیۃ:۷. ② علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: لم اقف علیہا مع ایراد الغزالی لہ فی الاحیاء، وفی الفردوس بلا سند عن ابن عمر مرفوعاً: الدنیا قنطرۃ الآخرۃ فاعبروہا ولا تعمروہا. دیکھئے: المقاصد الحسنۃ ج:۱ ص:۱۱۸.

③ شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس. ج:۷ ص۰:۳۶.

نوشتوں سے نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ اس سے ہم آہنگ شخصیتیں اسے قلوب تک پہنچانے والی اور اپنے عمل سے نمایاں کرنے والی سامنے نہ ہوں۔ اس لئے دنیا کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ امتوں کی صلاح وفلاح کے لئے محض قانون اتارا گیا ہو اور پیغمبر کی شخصیت نہ بھیجی گئی ہو، کیونکہ شخصیت ہی دین اور مسائل دین کو اس انداز اور اس حکمت عملی سے پیش کرسکتی ہے، جو شارع حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ اس لئے وہی شخصیت مخاطب قوم کی نفسیات کی رعایت رکھتی ہے اور اس کے اجتماعی مزاج سے آگاہ ہوتی ہے جو ہدایت کے لئے منتخب کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر دور میں اس رنگ کی شریعت آئی جو رنگ مخاطب قوم کا تھا اور اس نوع کے معجزات سے نبوت کو ثابت کیا گیا۔ جو نوعیت اس دور کے ذہن ومزاج کی ہوئی۔

آج جبکہ نبوت ختم ہوچکی ہے تو انبیاء کا کام اس امت کے مجددوں اور مفکر علماء عرفاء کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریعت کو اسی رنگ سے ثابت کر کے دلوں میں جمائیں جو آج کے دور کی نفسیات کا رنگ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن سیرینؒ نے جو ایک جلیل القدر تابعی اور تعبیر خواب کے امام ہیں ان لفظوں میں ادا فرمایا کہ: ''اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَكُمْ.'' ① ''یہ علم (اور آج کی اصطلاح میں یہ فکر) ہی تمہارا دین ہے تو دیکھ لو کہ کس شخصیت سے تم دین (یا فکر) اخذ کر رہے ہو''۔

جس سے دین اور دین کے فکر کی بارے میں ہمیں پوری رہنمائی ملتی ہے کہ تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہے کاغذ اور نوشتے نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلح فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو تب قلوب کی صحیح رہنمائی کر سکے گا ورنہ وہ خود اگر اس منہاج کی فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب میں کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب وسنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لاکر دوسرے قلوب میں بھر دے گا۔

آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن ہی کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنی اپنی فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں اس حال میں کہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق وثواب پر ہوسکتا ہے۔ سب کے سب اس تضاد فکری کے ساتھ محق نہیں کہلائے جاسکتے۔ ظاہر ہے کہ کتاب وسنت کے سامنے ہونے اور اسے امام کہنے کے باوجود اگر کوئی فرقہ مبطل ہوسکتا ہے تو یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ اس راستے میں فکر صحیح اور مفکر کی ذات ہی اصل ہے اور کسی فرقے کے مبطل ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اس کے ہاتھ میں کتاب وسنت اور دینی لٹریچر نہیں۔ بلکہ یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی صحیح الفکر اور ذوق سلف پر تربیت یافتہ شخصیت نہیں، بلکہ کوئی مبطل اور زیغ زدہ شخصیت آئی ہوئی ہے پس اگر شخصیت صحیح ہو تو باطل نوشتوں سے بھی وہ حق ہی سامنے لے آئے گی اور اگر وہی فاسد الفکر ہو تو قرآن وحدیث سے بھی وہ باطل ہی نمایاں کر کے قلوب کو فاسد کردے گی۔ ورنہ قرآن کو امام کہنے والا کوئی مبطل فرقہ مبطل نہ ہوتا۔ اس لئے جب کہ ہم فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے قدم اٹھا رہے ہیں تو سب سے مقدم صحیح

① الصحیح لمسلم، المقدمة، باب بیان ان الاسناد من الدین...... ج: ۱ ص: ۱۴.

الفکر شخصیات ہی کا انتخاب ہے جس سے منہاج نبوّت کا صحیح اور متوارث ذوق ہمارے سامنے آجائے اور اس سیدھے سے منہاج پر ہماری فکر استقامت کے ساتھ رواں دواں ہو۔

حرف آخر...... بہرحال فکر اسلامی کی تشکیل تو قابل تبریک ہے جس کا سہرا جامعہ اسلامیہ کے سر ہوگا لیکن اس میں سب سے پہلا قدم نشان فکر متعین کرنا ہے اور وہ منہاج نبوّت ہے۔ دوسرا قدم اس منہاج میں فکر دوڑانے کے لئے اس کے اصول وقواعد درکار ہوں گے۔ جس میں قواعد کلیہ اور فروعات فقہیہ سب داخل ہیں۔ تیسرا قدم اس مزاج کا پہچاننا ہے اور اسے سامنے رکھنا ہے جو ملت اسلامیہ کو بخشا گیا ہے اور اس پر اس کی صدیوں سے تربیت ہوتی آرہی ہے۔ چوتھا رجال فکر کا انتخاب ہے کہ فکر کا ظہور، صاحب فکر ہی سے ہوسکتا ہے نہ کہ محض کاغذ کے نوشتوں سے اور پانچواں قدم ان ظاہری اور باطنی خصوصیات کی رعایت ہے جو اس منہاج کا جوہر اور اس کی خصوصیات ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اجلاس جامعہ میں تو قلت وقت کی وجہ سے قرآنی اصول کی صرف اجمالی فہرست ہی پیش کرسکا تھا۔ جو یقیناً تشنہ تفصیل تھی اور اب مقالہ کی صورت میں اس کی کچھ توضیحات بھی اگر پیش کررہا ہوں تو قلت فرصت کی وجہ سے وہ بھی کچھ تفصیلی اور مرتب شدہ نہیں ہیں۔ بلکہ کثرت مشاغل کے سبب بھاگ دوڑ کے ساتھ جو بھی منتشر چیزیں سامنے آرہی ہیں۔ انہی کو عجلت کے ساتھ جمع کردیا گیا۔ جس میں نہ کسی خاص ترتیب ہی کی رعایت ہوسکتی ہے۔ نہ نظام کلام کی۔ اس لئے اسے ''جُهْدُ الْعَقْلِ دُمُوْعَهٗ'' کے مصداق سمجھنا چاہئے، جو ادائے فرض تو ہے۔ مگر لوازم فرض سے آراستہ نہیں ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس مہم کو انجام حسن تک پہنچائے اور ملت کے لئے ایک نافع قدم ثابت فرمائے۔ (آمین)

ماخوذ از ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بھارت شمارہ جنوری' فروری' مارچ ۱۹۷۹ء

اسلامی تمدن

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!(1)

اسلام کے پیش کردہ دو راستے...... بزرگان محترم! اسلام نے دنیا کے سامنے دو راستے پیش کئے ہیں۔ گویا اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک اقترابات، دوسرے ارتفاقات۔

اقترابات کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستے جن سے آدمی اللہ کا قرب اور نزدیکی پیدا کر سکے اس کی نزدیکی کی یہ صورت نہیں ہے کہ جیسے ہم آپ کے نزدیک ہو جائیں کہ گز بھر کی بجائے آدھ گز یا آدھ گز کی بجائے بالشت بھر کا فاصلہ رہ جائے۔ اسے نزدیک کہیں گے مگر یہ نزدیک ہونا جسمانی ہے اور اللہ جسم نہیں ہے کہ اس کے نزدیک ہونے کا یہ مطلب ہو کہ ہم دو چار گز سرک جائیں یا دس پانچ میل آگے پہنچ جائیں۔ اس کی نزدیکی کا مطلب یہ ہے ہم اس سے مناسبت اور مضبوط تعلق پیدا کریں۔ اس کے اخلاق سے متخلق ہوں۔ اس کے کمالات سے باکمال بنیں۔ خدائی اوصاف ہمارے اندر نفوذ کریں تاکہ ہمیں خلافت اور نیابت خداوندی کا مقام حاصل ہو۔ اس چیز کا نام اسلام میں اقترابات یعنی قرب خداوندی پیدا کرنے کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے عبادات نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ رکھی گئی ہیں۔

دوسری چیز ارتفاقات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باہمی میل جول، لطف و مدارات، تمدن و تعاون اور مدنیت و شہریت کے اصول و طریقے ہمارے سامنے ہوں کہ کس طرح سے ہم دنیا میں زندگی گزاریں۔ دنیا میں جیسے مساجد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، گھر بنانے کی بھی ضرورت ہے، بازار بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سلسلہ ارتفاقات کے شعبے ہیں کہ آپس کا میل جول اور باہمی تمدن و تعاون، یہ ہم کس طرح سے انجام دیں۔ اس کے لئے مختلف شعبے ہیں، جن کی تفصیلات اسلام نے پیش کی ہیں۔ بہر حال یہ دو سلسلے ہیں، ایک اقترابات اور ایک ارتفاقات:

اس لئے کہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ ایک اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ اور ایک اَلشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ اللہ کے

(1) ۱۴ جولائی، ۱۹۶۳ء افریقہ۔

اوامراور بھیجے ہوئے قانون کی عظمت اور اس کی مخلوق پر شفقت ومدارات اور رحم وکرم کرنا یہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ اس لئے علم کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔

علم کی دو قسمیں...... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْیَانِ." علم دو ہیں۔ایک بدنی زندگی کا علم اور ایک روحانی زندگی کا علم۔بدنی زندگی کے نیچے یہ تمام شعبے آتے ہیں۔کھانا، پینا، گھر بنانا، بازار وغیرہ یہ تمام ضروریات۔

اور روحانی زندگی کے نیچے یہ شعبے آتے ہیں کہ کس طرح سے سجدہ کیا جائے، کس طرح اللہ کے سامنے جھکا جائے، کس طرح اس سے مناسبت پیدا کی جائے، تو جس طرح سے ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا دین و دیانت درست کریں، اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اپنی معاشرت وتمدن اور مدنیت کو بھی درست کریں۔

ہر ملت کا ایک مزاج ہے...... لیکن ہر قانون اور ہر ملت کا ایک مزاج ہوتا ہے۔یہودیت ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔نصرانیت ایک ملت ہے، اس کا خاص مذاج ہے۔اسلام ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ اسلام میں بھی پھر ایک فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے، جس کو حق کہا گیا ہے۔ جتنے فرقے الگ الگ ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مزاج ہے۔اہل تشیع کا ایک مزاج، سنیوں کا ایک مزاج۔غرض جس طرح سے ہر ہر طبقے کا مزاج الگ الگ ہے۔پوری ملت کا مزاج بھی الگ ہے۔ظاہر ہے کہ ہم اپنے مزاج کو باقی رکھ کر ہی اپنے اصولوں پر چل سکتے ہیں، اپنی بنیادیں قائم کر کے ہی اپنی تعمیر اٹھا سکتے ہیں۔اگر ہم نے دوسروں کی بنیادوں پر تعمیر کھڑی کی، تو دوسرے کو حق ہے کہ وہ کل کو کہہ دے کہ میاں! زمین اور بنیاد میری ہے۔تم اپنا ملبہ اٹھاؤ اور اپنی تعمیر ختم کرو۔آپ بے بس ہوں گے، اپنا لگا لگایا سرمایہ آپ کو ختم کرنا پڑے گا۔لیکن اگر ذاتی بنیاد پر تعمیر اٹھائی ہے تو کوئی کہنے والا نہیں ہے کہ تم ملبہ لے جاؤ، بنیادی میری ہے۔آپ کہیں گے کہ بنیاد، زمین اور تعمیر بھی ہماری ہے۔بہر حال ہر ملت کا یک الگ مزاج ہے جو اس کی تعمیر کی بنیاد ہے۔

دور جاہلیت کے تمدن کی بنیاد نفس پرستی پر اور اسلامی تمدن کی بنیاد حق پرستی پر ہے...... آج اس چیز کی ضرورت ہے، جس کے لئے مسلمان دنیا میں آیا کہ اس تمدن کو یہ غالب کرے جس کو اسلام لے کر آیا ہے۔اس واسطے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے تو دنیا میں دو بڑے بڑے تمدن قائم تھے۔ ایک طرف فارسیوں کا تمدن تھا، جس پر کسریٰ کی حکومت تھی۔ایک طرف رومیوں کا تمدن تھا، جس پر قیصر کی سلطنت تھی۔روم میں عیسائیوں کا اقتدار تھا اور فارس میں فارسیوں کا اقتدار تھا۔ان دونوں ملکوں اور حکومتوں نے تمدن کو انتہاء تک پہنچا دیا تھا۔تاریخوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم اور آپ اس تمدن کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچے، جتنا ان کا تمدن اونچا ہو چکا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ کوئی امیر اور رئیس اس وقت تک امیر نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کم سے کم ایک ایک لاکھ

روپے کا لباس اور زیور اس کے بدن پر نہ ہو۔ پٹکا ہو تو کم سے کم دس ہزار روپے کا۔ اسی طرح دیگر لباس بہر حال مجموعی تعداد لاکھ ڈیڑھ لاکھ تک پہنچتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، ہمارا بڑے سے بڑا رئیس اس مقام پر نہیں پہنچ سکا کہ صرف اس کے بدن پر ایک لاکھ روپے کا لباس ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اس کی ساری جائیداد کارکوٹھی لگا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہو۔ مگر یہ کہ بدن پر ایک لاکھ روپیہ لگا ہوا ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ اور وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ امیرزادے کے بدن پر ایک ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا ہوتا، تب وہ امیر سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جگہ پانے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ یہی حال رومیوں کا تھا اور یہی فارسیوں کا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اگر خالص تمدن مقصود ہوتا تو اس سے بڑا تمدن آج تک نہیں پیدا ہوسکا' جتنا ہو چکا تھا۔ آج کی خصوصیات اپنی جگہ ہیں کہ مشینی تمدن ہے۔ یہ بے شک انہیں میسر نہیں تھا۔ لیکن مشینی حالات کو چھوڑ کر جہاں تک عمارات، غنا اور امیری کا تعلق ہے تو وہ بہت اونچے پہنچے ہوئے تھے۔ یہی چیز مقصود ہوتی تو اسلام اسی کی تائید کر دیتا کہ فارسیوں کا اور رومیوں کا بھی تمدن حق ہے اور مقصود حاصل ہو جاتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی ضرورت نہ پیش آتی کہ جنگیں لڑلڑ کر اس تمدن کو ختم کر کے اسلامی تمدن کو جگہ دیں۔

اس کی بناء یہ تھی کہ ان تمدنوں کی بنیاد محض نفس کی آرائش پر تھی۔ اسلامی تمدن کی بناء رضاءِ خدا اور حق پرستی پر ہے، اس لئے دونوں کا مزاج بدل گیا ہے۔ اسے دنیا میں رائج کیا اور اس کے لئے بڑی بڑی محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں۔ اعلیٰ طریق تو یہ ہے کہ تمام مسلمان مل کر زمانے کی ضروریات سامنے رکھ کر، زمانے کے تقاضوں کو قطع نظر کر کے نہیں، بلکہ سامنے رکھ کر دینی طور پر اس تمدن کی بنیاد ڈالیں اور اسے غالب کریں تاکہ دنیا کی قومیں ہمارے سامنے آئیں، جھکیں اور اسے قبول کرنے پر مجبور ہوں۔

دورِ حاضر کا تمدن جہاں اسلامی تمدن سے ٹکرائے تو اسلامی تمدن کو ترجیح دینی چاہئے

...... رہا یہ کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ تو خوب کہا ہے لسان العصر اکبر الہ آبادی نے، وہ کہتا ہے کہ ؎

کیا ہوا آج جو بدلا ہے زمانے نے تجھے ۔۔۔ مرد وہ ہے جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

مردانگی کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ہم جھک کر اپنے عجز کا اعلان کریں بلکہ ہم اپنا کردار اور کیریکٹر پیش کر کے دنیا کے سامنے اس کی خوبی اور برکت پیش کریں تاکہ دنیا ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہو اور اس مشن کو لے کر آگے بڑھیں، جس مشن کو آگے بھیجنے اور پہنچانے کا ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ سے وعدہ کیا ہے۔

لیکن موجودہ حالات میں یہ ہمارے لئے دشوار ہے۔ ہم خواہ اپنی بد عملی سے یا تکوینی طور پر اس مقام پر آ گئے ہیں کہ دنیا کی قوموں کو جھکا نہیں سکتے۔ مگر کم سے کم یہ جذبہ تو سرد نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے تمدن ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی اچھی چیزیں لینے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا میں جب کوئی نیا تمدن آتا ہے، اس کی ایک ہوا ہوتی ہے اور ہوا جب چلتی ہے تو تنہائیوں میں بھی گھستی ہے۔ اس سے آدمی کو مفر نہیں ہوسکتا، اس سے آدمی الگ نہیں رہ سکتا۔

اس سے متاثر ہونا ضروری ہے مگر اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ کم سے کم ان مواقع کو دیکھیں جہاں اس تمدن کا اسلامی تمدن سے تصادم ہوتا ہے۔ اس میں ہم اپنے کردار اور اپنے مقاصد کو ترجیح دیں۔

دور جدید کے حوادث و واقعات سے اسلام صرف نظر نہیں کرتا...... جیسے مثلاً فرض کیجئے آپ تجارت کر رہے ہیں اور تجارت کے سلسلے میں مالی تمدنی مشکلات بھی پیش آ رہی ہیں۔ ان مشکلات کو آپ زیادہ سمجھتے ہیں۔ کچھ سنی سنائی ہمارے بھی سامنے ہیں۔ یقیناً مشکلات کا وقت ہے۔ لیکن جہاں ایسی چیزیں سامنے آ رہی ہیں جو مشکلات کا باعث ہیں۔ انہی مشکلات میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں، جو ان کا بدل بھی ہو سکتی ہیں۔ ان چیزوں کو اختیار کر کے آپ کو غور کرنا ہوگا کہ کس حد تک یہ چیزیں اسلام سے موافقت کرتی ہیں اور کتنی مخالفت کرتی ہیں۔ پھر مخالف چیزوں میں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ کس حد تک اسلام گنجائش دیتا ہے اور کس حد تک نہیں دیتا۔ میرا یقین ہے کہ کیسا ہی تمدن اور کیسا ہی زمانہ آ جائے، جو حوادث و واقعات پیش آتے ہیں، اسلام نے نہ پہلے کبھی ان سے قطع نظر کیا، نہ آج کرتا ہے اور نہ آئندہ کرے گا۔ ان کی رعایت کی جاتی ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر اسلام ایسی گنجائشیں دیتا ہے کہ قوم کا مفاد ختم نہ ہو۔ کچھ تھوڑا تغیر کر دیا۔ کچھ تھوڑی سی ترمیم کر دی۔ بعض چیزوں کو بعینہ قبول کر لیا۔ کچھ تغیر کچھ ترمیم کچھ خلاف کچھ قبولیت یہ مل کر کام چل سکتا ہے۔ ہمیں دنیا سے بہرحال الگ ہونا نہیں ہے۔

بعض چیزوں میں تھوڑا سا فرق پڑتا ہے ذرا سا طریقہ بدل دیں، فائدہ وہی کا وہی رہے گا۔ چیز بھی ضائع نہیں جائے گی اور حد جواز میں آ جائے گی ایسی صورتوں میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ ایک ممنوع اور گناہ میں مبتلا ہو کر رہیں۔ جب کہ ایسا طریقہ بھی ممکن تھا کہ فائدہ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ جاتا اور ہم کسی ناجائز چیز کے ارتکاب میں بھی مبتلا نہ ہوں۔

ہمارے ہاں میرٹھ میں حاجی عبدالغنی صاحب ایک تاجر تھے بڑے صالح اور نیک آدمی تھے۔ ان کے ہاں ٹوپیوں کی تجارت ہوتی تھی۔ ان سے دارالعلوم کے ایک فاضل نے فرمائش کی کہ مجھے دو ٹوپیاں بنا دی جائیں جو خالص زری کی ہوں اور کام اتنا گھٹا ہوا ہو کہ کپڑا نظر نہ پڑے۔ بس چاندی چاندی کا کام نظر پڑے کپڑا بالکل چھپ جائے۔

یہ اگلے دن پہنچے، انہوں نے کہا کہ ٹوپیوں کی تیس روپے قیمت ہے۔ پندرہ روپے کی ایک ٹوپی ہے۔ انہوں نے دیکھا تو ٹوپیاں بہت اعلیٰ اور ان کی مرضی کے مطابق بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا دام کل کو بھجوا دوں گا۔ حاجی صاحب نے کہا کہ: بے اعتمادی کی بات نہیں ہے۔ چاہے ایک مہینے کے بعد بھجوا دیں مگر آپ کے لئے یہ جائز بھی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس میں ناجائز ہونے کی کیا بات ہے؟ کیا ادھار نہیں لیا جا سکتا؟

انہوں نے کہا کہ اس ٹوپی میں کپڑا بالکل نظر نہیں آتا۔ اسے مورّق کہتے ہیں اور مورق کام کپڑے پر ہو تو وہ چاندی کے حکم میں بن جاتا ہے اور چاندی کی بیع و شرا میں ادھار جائز نہیں ہے۔

اب یہ بے چارے چپکے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں فاضل دیوبند ہو کر بھی نہیں جانتا اور تم دوکان پر بیٹھ کر بھی

اتنے باریک مسائل جانتے ہو۔مگر بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی تو کہا کہ اچھا یہ معاملہ ختم میں پرسوں دام لے کر آ ؤں گا۔

حاجی صاحب نے کہا کہ: میں ایسی ترکیب نہ بتلاؤں کہ ادھار بھی ہو جائے، جائز بھی ہو جائے۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہے؟ کہا کہ آپ تیس روپے میرے سے قرض لے لو اور یہ ٹوپیاں نقد خرید لو۔ بعد میں قرض ادا کر دینا۔ اب یہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے۔ خیر ان کو بات سمجھ آ گئی اور انہوں نے بہت بہت ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں اس بات کو نہیں سمجھا تھا۔

بات وہی ہوئی کہ خریداری بھی ہوئی، ادھار بھی ہو گیا، مگر ذرا سے ردوبدل سے بات حد جواز میں آ گئی۔ غرض بہت سے مسائل خواہ بینکنگ یا لاٹری سسٹم ہو یا انشورنس کا ہو۔ جہاں ان میں کچھ ناجائز چیزیں نکلیں گی، ایسی گنجائشیں بھی پیدا ہوں گی کہ اگر ذرا سا ردوبدل کر لیا جائے تو فائدہ تو ہاتھ سے نہ جائے اور چیز حد جواز میں آ جائے اور ممنوع نہ رہے کہ جس سے آدمی گنہگار کہلائے اور کسی برائی کا مرتکب نہ ٹھہرے۔

دور حاضر کے پیش آمدہ واقعات میں مفتی اور صاحب واقعہ مل کر اعتدال کی راہ نکال سکتے

ہیں......مگر اس کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام آدمی کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے اور جو فتویٰ دینے والا مفتی ہے اس کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے کوئی سرسری چیز نہیں ہے اگر آپ کوئی چیز اجمالاً پوچھیں گے تو فتویٰ اور ہوگا، تفصیل سے واقعات سامنے رکھ کر پوچھیں گے تو حکم اور ہوگا۔ اگر آپ مجھ سے یوں پوچھیں کہ ہم تجارت کر رہے ہیں۔ اس میں سودی کاروبار ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہوں گا حرام اور ناجائز ہے۔ سود کو اسلام نے حرام کیا ہے۔ قرآن میں صاف آیت موجود ہے۔ اجمالاً پوچھنے کا تو یہ جواب ہے۔

اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ بینکنگ کا سسٹم جاری ہے۔ بین الاقوامی تجارت ہے، اس لئے سود میں پڑنا ناگزیر ہے۔ تجارت کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ تو یا تو یہ فتویٰ دو کہ ہم سب چھوڑ چھاڑ کے جنگل میں جا کر بیٹھ جائیں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں گزر بسر کر لیں۔ دنیا کی قومیں بڑھیں گی ہم ان سے قطع نظر کر لیں گے کہ بھئی! بڑھتی ہیں تو بڑھ جائیں اور کل وہ ہمارے اوپر زیادتی کریں، تو ہم صبر کریں گے، مار کھائیں گے۔

اگر آپ یہ فتویٰ دیں تو ہم تیار ہیں۔ اور اگر آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ تمہیں دنیا کی قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے۔ عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنا ہے بقدر ضرورت دولت بھی کمانا ہے۔ تو پھر اس مصیبت کا کیا علاج ہے؟ کہ اس سسٹم میں بعض چیزیں ناجائز بھی ہیں۔ آپ غور کریں تو مجموعی حالت پر، جب آپ تفصیلی حالات سامنے رکھیں گے اور مفتی ان پر غور کرے گا، پھر حکم دوسرا ہوگا، پھر اس میں کچھ نہ کچھ گنجائشیں نکلیں گی۔ البتہ کچھ ایسی چیزیں بھی نکلیں گی جس میں آپ کو کچھ تغیر کرنا پڑے گا۔ آخر شریعت یا دین کا قانون پبلک کے تابع تو نہیں ہو سکتا کہ جو آپ چاہیں، قانون ادھر ہی کو جھک جائے۔ وہ قانون کیا ہوا، وہ تو موم کی ناک ہو گئی۔ جدھر کو چاہا اسے پھیر دو۔ لوگوں کو ہی قانون کے تابع بننا پڑتا ہے۔

اسلام ابدی بین الاقوامی قانون ہے وہ بین الاقوامی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا...... لیکن جب کوئی قانون بین الاقوامی ہوگا، سامنے آئے گا، وہ یہ بھی کہے گا میں ہر زمانے اور ہر ملت کے لئے یکساں قانون ہوں، میرا پیغام دنیا کی ہر قوم کے لئے ہے۔ تو اس قانون کو یہ رعایت بھی کرنی پڑے گی کہ کس قوم کی کیا ذہنیت ہے؟ اس کی کیا نفسیات ہیں؟ اس کا اصول کیا ہے؟ اس کا لین دین اور معاشرت کا کیا اصول ہے؟ اس کی رعایت کرنی پڑے گی۔

اسلام جب ایک جامع اور بین الاقوامی مذہب ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر رعایتیں نہ ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ بین الاقوامی تجارت کی بنیاد ہی اسلام نے ڈالی ہے۔ اس سے پہلے دنیا کو بین الاقوامی تجارت کی خبر نہیں تھی۔ تجارتیں بے شک بڑی بڑی تھیں۔ لیکن ایک ملک اور ایک شہر میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک ملک سے دوسرے ملک کو اور دوسرے سے تیسرے پھر پوری دنیا کو مال سپلائی۔ اور پوری دنیا سے رقم اور روپیہ آئے اور جائے۔ یہ صورت نہیں تھی نہ ہی اس کے وسائل تھے۔ لیکن اسلام نے بنیاد ڈالی۔

قرآن کریم نے ایک دو نہیں بلکہ چھ سات قسم کے سفر بتلائے۔ تعلیمی سفر، تبلیغی سفر، اخلاقی سفر، تجارتی سفر اور سیاسی سفر وغیرہ۔ ان سفروں کی فضیلتیں بیان کیں اور ان سفروں کی نوعیتیں بیان کیں۔ تو بین الاقوامی مذہب نے بین الاقوامی راستے ڈالے اور چونکہ بین الاقوامی مذہب کو دنیا میں آنا تھا اور بھیجنے والا اللہ، جس کو ماضی اور مستقبل کی بھی اطلاع ہے۔ وہی جانتا تھا کہ بین الاقوامی مذہب اسی دور میں آنا چاہئے، جس میں بین الاقوامی وسائل بھی سامنے ہوں نقل و حرکت کے بین الاقوامی وسائل ہوں، ایک ملک سے دوسرے ملک جانا آسان ہو۔ ایک ملک کی خبر دوسرے ملک میں پہنچانا آسان ہو۔ تو یہ ترتیب تھی کہ چونکہ تمدن بین الاقوامی ہونے والا ہے۔ تو دین بھی بین الاقوامی ہوتا کہ دین بھی دنیا کے سامنے آسکے۔ ایسا بین الاقوامی دین دنیا کی اقوام کی ذہنیتوں کو قطع نظر نہیں کر سکتا۔ ان کی نفسیات کی رعایت کرے گا۔ جب کہ اسلام کے خود اندورنی دائروں کے اندر بھی یہ چیز ہے۔ ہر قرن میں ہر موقع پر مختلف ذہنیتیں پیدا ہوئیں۔ بلکہ ہر سو برس کے بعد قوم کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ جب ایک نسل ختم ہوتی ہے۔ دوسری نسل آتی ہے۔ تو دنیا میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نظریات بدلتے ہیں، جب ایک جنگ ہو کر صلح کا وقت آتا ہے تو بھی نظریات تبدیل ہوتے ہیں، تمدن بدلتا ہے۔ اس لئے اسلام نے بھی یہ خبر دی کہ ہر سو برس کے بعد ہم مجدد بھیجیں گے جو دین کو نکھاریں گے اور اس کی تجدید کریں گے۔ چونکہ سو ہی برس کے لئے ان ضرورتوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لئے بعد میں آنے والوں کے لئے کل دین کی ان کے، مناسب حال، انہی کے رنگ میں، ان کی زبان میں تشریح کی جائے گی تاکہ وہ دین کو سمجھ سکیں۔

اگر قوم میں تصوف کا غلبہ ہوا تو اسلام نے اپنے کو صوفیانہ رنگ میں سامنے کیا تاکہ صوفی مشن لوگ سمجھ سکیں۔ صوفیانہ انداز میں تفسیریں لکھی گئیں۔ جیسے محی الدین ابن عربیؒ اور امام غزالیؒ ان لوگوں نے تفسیریں لکھیں۔ ایک زمانہ عقل پرستی کا آیا کہ لوگ بغیر عقل کی مدد کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ایسے مجدد پیدا ہوئے جنہوں نے

قرآن وحدیث کو عقلی رنگ میں پیش کیا۔امام رازی، شاہ ولی اللہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہ کام کیا کہ عقلی اصول پر تفسیریں لکھیں۔قرآنی مسائل کو خالص عقل کے جامے میں سمجھایا۔ایک زمانہ آیا،اس میں طبعیات کا غلبہ تھا۔تو طبعی رنگ میں قرآن وحدیث کو پیش کیا گیا۔قرآن کی یہ جامعیت ہے کہ وہ ایسا حسین چہرہ ہے کہ جیسا لباس پہنا دو۔اتنا ہی حسین معلوم ہوتا ہے۔جس رنگ کی کوئی قوم یا طبقہ سامنے آتا ہے۔وہ اسی رنگ میں اپنے کو سامنے کرتا ہے۔جیسے اسلام میں یہ جامعیت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کے طبقات اور دنیا کی قوموں کی ذہنیت الگ الگ ہو۔وہ سب کے لئے پیغام بنے اور سب کی نفسیات کی رعایت نہ کرے۔اس میں ایسے جامع اصول موجود ہیں،وہ ضرور رعایت کرے گا۔

ایسی اشیاء جو اپنی ذات سے ممنوع ہیں خاص اوقات میں مشروع ہو جاتی ہیں......مگر ضرورت اس کی ہے کہ سوال کرنے والے اجمالی سوال نہ کریں۔جن جن معاملات میں وہ مبتلا ہوں ان معاملات کو تفصیل سے واقعاتی رنگ میں پیش کریں۔یوں نہ پوچھیں کہ فلاں چیز جائز ہے یا نہیں۔بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟انشورنش جائز ہے یا نہیں؟اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ناجائز ہے۔اسلام کے اصول کے خلاف ہے۔سود بھی ناجائز انشورنش بھی ناجائز اور بیمہ کرانا بھی ناجائز۔فلاں اور فلاں چیز بھی حرام۔

لیکن جب ان واقعات کی تفصیل پیش کریں گے اور مجموعی پہلو جب سامنے آئیں گے،تو حکم میں گنجائش نکلے گی۔بلاشبہ اسلام میں شراب ناجائز ہے۔خاص حالات میں اسلام کی تفصیلات پیدا ہوتی ہیں۔لیکن یہ حکم تبدیل بھی ہوسکتا ہے۔چنانچہ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا مریض ہو کہ ڈاکٹر کہہ دے کہ یہ اس وقت تک زندہ نہیں بچ سکتا جب تک شراب نہ پیے۔اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ شراب پیے،وہ اپنی جان بچائے۔اسی طرح خنزیر ہے،اسلام میں بالکل نجس العین ہے۔اسلامی نقطہ نظر سے گوشت پوست ہی نہیں بلکہ اس کا جوہر بھی ناپاک ہے۔یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔لیکن اگر کوئی مر رہا ہو،فاقے کی حالت میں ہو اور کوئی غذا نہ ملتی ہو،تو اسلام اجازت دے گا کہ اسے خنزیر کھلا دو،اسے مردار کا گوشت بھی کھلا دیں گے۔کفر کا کلمہ کہنا اسلام کو ختم کر دیتا ہے۔اسی طرح کوئی شرک کا کلمہ کہے۔لیکن اگر ایک شخص تلوار لے کر مسلم کی گردن پر کھڑا ہو کہ یا کفر کا کلمہ کہہ،ورنہ ابھی تیری گردن قلم کردوں گا۔ اسلام اجازت دیتا ہے کہ دل سے ایمان پر مطمئن رہو،زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دو۔اب کوئی شخص ہم سے یہ سوال کرے کہ صاحب!کفر کا کلمہ جائز ہے یا ناجائز؟ہم کہیں گے بالکل حرام ہے۔آدمی کافر ہو جائے گا۔لیکن اگر یوں کہے میں اصول نہیں پوچھتا،میں تو یہ واقعہ پوچھتا ہوں کہ میرے اوپر ایک شخص تلوار لے کر آیا ہوا ہے،کہ کہہ کفر کا کلمہ ورنہ گردن قلم کردی جائے گی۔اب یہ حکم ہوگا کہ تیرے لئے جائز ہے،کفر کا کلمہ کہہ دے۔

اس سے اندازہ ہوا کہ ایک شئے اپنی ذات سے بالکل ممنوع ہوتی ہے،لیکن حالات کے سامنے آنے سے اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔یہ صورت خواہ انفرادی ہو یا قومی ہو۔اسلام میں گنجائشیں نکلتی ہیں۔اسلامی قانون

میں لچک ہے۔ یہ اعتدال کا مذہب ہے۔ افراط و تفریط کا مذہب نہیں ہے۔ ایک درمیانی نکتہ پر ہے جس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت نکلتی ہے۔

اس بناء پر میں عرض کر رہا ہوں کہ مسئلے دو ہی ہیں۔ ایک دیانات کا ہے جس میں عبادات آتی ہیں۔ ایک معاشرت کا ہے جس میں تجارت، معاملات، بیع و شرا، نکاح و طلاق، زمین کی خریداری، ٹھیکہ، کرایہ داری اور محکمہ قضا و مقدمات، فوجداری اور دیوانی عدالت، یہ اس کے نیچے آجاتی ہیں۔ ان سب کے اصول بتلائے گئے ہیں جو معتدل ہیں اور جامع بھی ہیں۔ ہر قوم کے جذبات کو اپیل کر سکتے ہیں، لیکن جب قوم اس کی طرف توجہ کرے یا خود سمجھے اور سیکھے یا پھر سیکھے ہوئے سے پوچھ کر اس پر عمل کرے، مگر شرط یہ ہے کہ تفصیل سے پوچھو۔ تو جس طرح استفتاء اور سوال کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فکر کے ساتھ واقعات سامنے رکھیں۔ اسی طرح مفتیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سارے واقعات کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر حکم لگائیں صرف اجمالی ذکر نہ کریں تفصیل کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کریں مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس میں ایسی گنجائشیں نکلیں گی کہ قوم اپنے مفاد سے بھی محروم نہیں ہوگی اور ناجائز و حرام کا ارتکاب بھی نہیں کرے گی۔

مفتی کے سامنے تفصیلی واقعات لانے سے ہی جدید مسائل میں گنجائشیں نکل سکتی ہیں...... اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سوالات کو آپ ہی مرتب کریں اور جوابات کے لئے ہم علماء کی کمیٹی بٹھا دیں گے کہ ان واقعات پر غور کر کے آپ فتویٰ دیں کہ کیا حکم ہے؟ یا تو یہ کہیں کہ قوم تجارت کو چھوڑ دے اور بالکل بین الاقوامی دنیا سے نکل کر جنگلوں میں جا کے بسر کرے۔ لیکن اگر اس کو ایک سچا شہری بننا ہے تو پھر جب اس کی شہریت بدل گئی ہے، اس کے مناسب آپ بھی گنجائشیں نکال کر فتویٰ دیں۔ جتنی اسلام نے گنجائش دی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

زیادہ سے زیادہ مفتی یہ کہے گا کہ: تم مجرم ہو۔ تم ناجائز چیزوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں مجرم کے لئے بھی گنجائشیں دی جاتی ہیں۔ شبہ کا فائدہ مجرم کو دیا جاتا ہے۔

اگر شبہ نکل آئے تو مجرم کی سزا اٹھالی جاتی ہے۔ تو ہم مجرم سہی، مگر ساتھ ہی کچھ شبہات بھی ہیں۔ ان شبہات کا فائدہ بھی ہمیں پہنچے گا۔ گنجائش ہمیں ملے گی۔ مگر واقعات کو پیش کرنے والے کو چاہئے کہ وہ تفصیلی واقعات ذکر کرے۔ اس زمانے میں اجمال اور سرسری بات سے کام نہیں چلتا۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے بالکل نابلد ہیں۔ ہم ان واقعات میں پڑے ہوئے نہیں۔ اب ہمیں کیا خبر کہ انشورنش میں کیا ہوتا ہے اور بیمے کس طرح سے کرائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ نہ تجارت کر رہے ہیں نہ انشورنش آپ حضرات مطلع ہیں، آپ تفصیل سے بتائیں۔

حکم بتلانا ہمارا کام ہے، واقعات بتلانا آپ کا کام ہوگا۔ اگر آپ نے واقعات میں اجمال برتا۔ تو ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، ہم تو یوں کہہ دیں گے کہ تم جو کر رہے ہو وہ حرام ہے۔ لیکن اگر واقعات اچھی طرح سے سامنے آئیں تو پھر جامع فتویٰ آئے گا۔

اس واسطے اس مختصر مجلس میں میں اتنا عرض کر سکتا ہوں۔ حضرات محترم مقررین نے جو کچھ کہا، وہ بیشک ہم تفصیل سے نہیں سمجھے۔ لیکن بالا جمال ایک اندازہ ہوا کہ دین و دنیا ان دونوں کے اندر ہمیں بڑھنا ہے۔ دین کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ اپنی تعلیم اور مدارس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور ساتھ ساتھ اپنی تجارت کو بھی حفاظت کرنی ہے۔ تجارتی لوگ نہ ہوں تو نہ مدارس چلیں، نہ علماء کی کتابیں چھپیں نہ کام ہو۔ تو دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ بہر حال واقعات کو شریعت کے سامنے پیش کر کے حل کیا جائے، اور فتویٰ حاصل کیا جائے۔ تا کہ لوگ بھی مطمئن رہیں کہ ہم کسی ناجائز پر نہیں چل رہے ہیں اور دنیا بھی ہماری چل رہی ہے۔ اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ ہم علماء کی ایک جماعت بٹھادیں گے، جو غور فکر کر کے اس کے بارے میں احکام دے آپ کا کام ہوگا کہ تفصیل سے واقعات ہمارے سامنے رکھیں تا کہ ان پر حکم دیا جا سکے۔

اظہار تشکر...... یہ چند باتیں مجھے گزارش کرنی تھیں اور اخیر میں اپنے بزرگوں اور بھائیوں کا اور مخلصین افریقہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک ناچیز بھائی کی پذیرائی فرمائی۔ اتنی عزت افزائی فرمائی' جس کا میں واقعی مستحق نہیں تھا۔ یہ محض آپ لوگوں کا کرم ہے۔ ہم اس کے شکرگزار بھی ہیں اور دل میں اس کا ایک نقش لے کر جائیں گے۔ یہ زبانی شکریہ نہیں، بلکہ دل معترف ہے اور جہاں جائیں گے دل میں اس کی قدر رہے گی اور اقرار رہے گا۔ اور سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ اس ماحول میں رہ کر ان حالات کے اندر بھی آپ لوگوں میں دینی جذبہ موجود ہے۔ گویا آپ چاہتے ہیں کہ ہماری نسلوں کے اندر دین وایمان باقی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر قوم کا کیریکٹر الگ ہوتا ہے۔ ہم اپنے قومی کیریکٹر کی خصوصیات چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اگر یہ جذبات موجود ہیں تو کام بالکل آسان ہو جائے گا۔ واقعات پیش کریں۔ فتویٰ ان کے اوپر ہوگا اور انشاء اللہ پھر زیادہ دشواری نہیں پیش آئے گی۔ تھوڑی بہت اس میں آپ کو تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ بعض چیزوں میں ہم اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان میں لوٹا کے پیچھے لانا پڑے گا۔ اسلام نے اتنا زیادہ آگے بڑھنا نہیں بتلایا ہے۔ جیسے رجعت نہیں بتلائی کہ رجعت پسند بن کے پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ بھی نہیں بتلایا کہ بالکل آگے بڑھ جاؤ۔ اعتدال کے نقطے پر قائم رہو۔

بہر حال یہ چیز قابل قدر ہے اور ہم دعاء کرتے ہیں اور آئندہ بھی دعاء کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی مشکلات کو آسان فرمائے اور سیدھا اور آسان روشن راستہ کھول دے اور آپ کی تجارتوں اور دین میں برکت عطاء فرمائے۔ اس وقت نماز کا بھی وقت ہے۔ یہی چند ضروری کلمات عرض کرنے تھے اور میں شکریہ پر ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

درس ختم بخاری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِ يْرًا ، وَّدَ اعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

ثمرات ختم بخاری...... بزرگان محترم و برادران عزیز طلباء! جہاں تک ختم بخاری کا تعلق تھا، وہ ہو گیا اور اس کا حق بھی ادا ہو گیا آخری حدیث پڑھی گئی اور دعا بھی ہو گئی۔

امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے اپنی (جامع) بخاری کی نسبت فرمایا: ''جَعَلْتُهٗ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اللّٰهِ حُجَّةً'' '' میں نے اس کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے''۔ اس کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ ختم بخاری کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں تو تجربہ بھی شاہد ہے، امت کا عمل بھی ہے کہ وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں، اس لئے عام علماء میں یہ دستور رہا ہے کہ جب بخاری ختم کرنی ہوتی ہے تو مجمع ہو جاتا ہے، اجتماعاً دعاء کر کے ختم کرتے ہیں۔ اب یہ سسٹم اور بڑھ گیا ہے کہ باہر سے بھی لوگ بلائے جانے لگے ہیں، لیکن ہم لوگ طالب علمی کے زمانے میں دیکھتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت اقدس مولانا انور شاہ صاحبؒ جب بخاری ختم کراتے تھے تو باہر سے کسی کو نہیں بلایا جاتا تھا۔ لیکن دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ، منتظمین سب جمع ہو کر ختم بخاری میں شریک ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے کہ جب بخاری ختم ہوتی ہے تو دارالعلوم کے لوگ اور شہر کے لوگ بھی اطلاع پانے پر آ جاتے ہیں۔ اور دعا میں شریک ہوتے ہیں۔

بہر حال ختم بخاری پر دعا کا معمول رہا ہے۔ ایک تو درساً درساً ختم ہوا اس وقت تو ختم بخاری ہوتی ہی ہے۔ دعا بھی کرتے ہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی مہم پیش آ جاتی ہے۔ خدانخواستہ مسلمانوں کو کوئی آفت پیش آئی یا کوئی مقصد کسی نے لکھ کر بھیجا اور چند مقاصد جمع ہو گئے، تو اس کے لئے بخاری کا ختم کرائے جانے کا مدارس میں اور دارالعلوم میں بھی معمول ہے۔ متعدد مقاصد و درخواستیں جمع ہو جائیں تو ایک دن اساتذہ اور طلباء جمع ہو کر ختم کرتے ہیں اور دعاء مانگتے ہیں اور اس کے اثرات بھی دیکھے گئے ہیں کہ حق تعالیٰ (دعا) قبول فرماتے ہیں۔

تقدیس بخاری...... امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب مقدس کو اپنے اور اللہ کے درمیان میں حجت ٹھہرایا،

اور حجت ہونی بھی چاہئے۔ اس لئے کہ جس اعتناء اور جس تقدس کے ساتھ امام بخاریؒ نے اس کتاب کو مدون کیا اس کی نظیر بھی دوسرے محدثین میں نہیں، حرم محترم میں جا کے اس کتاب کی کتابت اور تکمیل کی۔

اور فرماتے ہیں کہ ہر حدیث جب میں لکھتا تھا تو لکھنے سے پہلے غسل کرتا تھا، دو رکعت نفل پڑھتا تھا اور دعائیں مانگتا تھا کہ: اے اللہ! مجھ میں انشراح پیدا فرما۔ جب شرح صدر ہو جاتا تھا۔ تب ایک حدیث میں لکھتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں تقریباً سات ہزار یا کم وبیش حدیثیں ہیں۔ تو چودہ ہزار نفل پڑھ کر امام بخاریؒ نے قلم بند کیا ہے ہر حدیث پر رجوع الی اللہ کیا ہے۔

تو اول تو حدیث خود کلام مقدس، کلام نبوی ہے، پھر مدون کرنے والے امام بخاریؒ جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور اس کی تدوین میں حرم محترم میں ہر حدیث پر دو رکعت نفل پڑھنا۔ تقدس ہی تقدس جمع ہو گیا پھر بھی اگر حجت نہ بنتی تو اور کیا ہوتا؟ تو وہ حجت بنی اور امت میں یہ تعامل جاری ہے کہ ختم بخاری کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ ختم بخاری کا حق تو ادا ہو گیا۔ حدیث بھی پڑھی گئی۔ دعاء بھی مانگ لی گئی۔ اب آگے زوائد کی بات ہے۔

جہاں تک حدیث کی شرح کا تعلق ہے وہ اساتذہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں کیا عرض کروں؟۔ میں تو ان سے بہت زیادہ کم علم ہوں تو وہ بھی حق ادا ہو گیا یا ہو جائے گا کہ جو استاذ بخاری پڑھانے کے متعلق ہیں۔ وہ حدیث کی شرح کر دیں گے اور اگر کسی درجہ میں کوئی شرح کر سکتا تھا۔ تو تین سال ہوئے یہاں آ کے شرح بھی کر دی تھی۔ جب ختم بخاری ہوئی تھی، میں بھی اس میں شریک ہوا تھا۔ تو حدیث پر تقریر ہو گئی تھی وہ آئندہ کے لئے بھی کافی ہے۔ اس وقت اس مقدس جلسے میں تو صرف اظہار مسرت و مبارک باد مقصود ہے۔

شرف اولیت...... کیونکہ جہاں تک انسانوں کا تعامل ہے۔ دو چیزیں خوشی کی اور مبارک باد کے قابل سمجھی گئی ہیں۔ ایک کسی شئے کا آغاز اور ایک اختتام۔ آغاز پر بھی لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور اختتام پر بھی۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں' مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آج اس کی انسانیت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ابتداء ہو رہی ہے۔ اس واسطے خوشی کرتے ہیں۔ کوئی شخص باغ لگاتا ہے تو پہلا درخت نصب کر کے احباب کو بلاتا ہے مٹھائی تقسیم کرتا ہے' اس لئے کہ باغ کا آغاز ہو گیا۔

کوئی شخص دکان کھولتا ہے تو اکثر اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے کہ صاحب! آپ ہی افتتاح کر دیں۔ مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بہر حال آدمی کا آغاز ہو یا اس کے افعال کا آغاز ایک خوشی کی چیز ہے اور اسی لئے کسی چیز کی اولیت کو شرف سمجھا گیا اور اس کو فضیلت مانا گیا ہے۔ جو شخص بھی کسی کام کی ابتداء کرے وہ ایک تاریخی چیز بن جاتی ہے کہ فلاں کام کا یا فلاں بات کا فلاں نے آغاز کیا ہے تو اولیت ایک شرف ہے۔

نورِ علم...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں اولیات کو ایک خاص

مقام حاصل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ.'' ① ''سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا''۔

ظاہر بات ہے کہ نور سے مراد حسی نور نہیں ہے جیسے سورج یا چاند کا نور ہوتا ہے یہ نور اس کے سامنے معمولی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہے، وہ نور حقیقت محمد یہ کا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اللہ نے حقیقت محمد یہ پیدا کی اور وہ ہے نور یعنی میرا نور بنایا۔ حسی نور نہیں معنوی نور اور معنوی نوروں میں سب سے زیادہ علم کا نور اکمل ہے، جس طرح سے حسی نور کے چاندنے میں آپ راستہ پالیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے یا بری ہے۔ ادھر چلنا چاہئے ادھر نہیں۔ نور آفتاب میں راہ طے کرتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر نور علم ہے جس میں کسی شی کی خوبی اور خرابی کو پہچانا جاتا ہے۔ علم کی روشنی میں جائز اور ناجائز اور حلال وحرام کی تمیز ہوتی ہے۔ یہ چیز مرضی خداوندی اور یہ نامرضی خداوندی ہے۔ یہ اللہ کی پسند اور یہ ناپسند ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کی تمیز سورج کے نور سے نہیں ہو سکتی۔ سورج کا نور شکلیں دکھلا دے گا اور علم کا نور حقیقتیں دکھلاتا ہے حقائق کے اندر امتیاز پیدا ہوگا۔ صورت دکھلا دینا یہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ اس لئے آفتاب کا نور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لالٹین، انڈے اور بجلی کا نور ہے۔ اس میں شکلیں، صورتیں، رنگ اور الوان پہچانے جاتے ہیں لیکن علم کا نور وہ ہے جس میں حقائق پہچانے جاتے ہیں جس کے اندر شریعتیں پہچانی جاتی ہیں۔ شریعتوں کے احکام کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ احکام کی علتیں پہچانی جاتی ہیں۔ علتوں سے احکام نکالے جاتے ہیں اسرار و معارف اور حقائق پہچانے جاتے ہیں تو علم کا نور بہ نسبت آفتاب کے نور کے عظیم نور ہے۔

حقیقت محمد یہ (صلی اللہ علیہ وسلم)...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور علم ہے یعنی آپ کی حقیقت میں علم گوندھ دیا گیا ہے اس لئے آپ نے فرمایا: ''اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ.'' '' اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کر دیئے گئے''۔ تو آپ اعلم البشر ہیں۔ کائنات میں وہ علم نہ ملائکہ کو دیا گیا نہ انسانوں کو جو علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ تو آپ ساری خلائق میں سب سے زیادہ علم والے اور اعلم الخلائق ہیں۔ وہ کیوں ہیں؟

اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ہی علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے۔ اس لئے آپ کی شریعت علم سے لبریز ہے کوئی حکم نہیں جس کے نتیجے میں حکمت نہ ہو۔ کوئی نقل نہیں جس کے اندر عقل چھپی ہوئی نہ ہو۔ کوئی صورت حکم نہیں جس کے اندر حقائق کی تہ بہ تہ جمی ہوئی نہ ہو۔

حرف حرفش راست اندر معنی ـــــ معنی در معنی در معنی

ایک ایک حرف کے اندر حقائق کے دریا چھپے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم آپ پر معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ علمی معجزہ

① قال العلامة الکھنوی: وقد اشتھر بین القصاص حدیث ''اول ماخلق اللہ نوری'' وھو حدیث لم یثبت بھذا المعنی وان ورد غیرہ موافق لہ فی المعنی.

ہے۔تو قرآن کریم کی حقیقت علم سے لبریز ہے۔تو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خود علم سے گوندھی ہوئی ذات ہوئی۔ شریعت وہ دی گئی جو علم سے لبریز ہے۔شریعت کا کوئی حکم نہیں جس کی حقیقت ولمیّت موجود نہ ہو۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی ارشاد فرمایا: ﴿اُدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ① ''میں اور میرے ماننے والے دین کے بارے میں بصیرت پر ہیں''۔یعنی اسلام چند بندھی رسوم کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ حقائق سے لبریز دین ہے جو اس دین کی واقفیت حاصل کرے گا علوم وکمالات سے بھر جائے گا۔دنیا اور آخرت کے سارے راز اس پر کھلیں گے۔بہرحال نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جامع العلوم ہیں۔

کمالات نبوّت کے منتہیٰ......اور اس لئے آپ کو خاتم الانبیاء بنایا گیا۔ختم نبوّت کے معنی قطع نبوّت کے نہیں کہ نبوّت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ختم نبوّت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ نبوت کے جتنے مراتب اور کمالات ہیں وہ آپ کی ذات پر لاکر جمع کر دیئے گئے۔اب نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ بعد میں کسی کو نبی بنا کر لایا جائے اور اس کو ظاہر کیا جائے۔سارے کمالات نبوت علمی ہوں، اخلاقی ہوں عملی ہوں وہ سب آپ ؐ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ان کی انتہا ہوگئی۔تو آپ ؐ سارے کمالات نبوّت کے منتہی ہیں۔اخلاق کو دیکھو تو آپ صابر ہی نہیں بلکہ سید الصابرین ہیں، آپ شاکر ہی نہیں۔ بلکہ سید الشاکرین ہیں' آپ ؐ فقط حیاء والے ہی نہیں بلکہ حیاء والوں کے سردار ہیں اور حیاء کے سارے مراتب آپ ؐ میں جمع ہیں۔غیرت وحمیت اور شجاعت وسخاوت اور جتنے بھی اعلیٰ ترین اخلاق ہیں آپ ان سب کا منتہی ہیں کہ تمام اخلاقی درجات آپ پر لاکر ختم کر دیئے گئے۔اسی لئے فرمایا گیا﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ② ''آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں''۔

مراتب اخلاق......اس لئے کہ اخلاق میں اگر غور کیا جائے تو تین مرتبے نکلتے ہیں۔ایک خلق حسن، ایک خلق کریم اور ایک خلق عظیم۔خلق حسن کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امر کیا گیا، حق تعالیٰ نے فرمایا: ''خَلِيْلِيْ حَسِّنْ خُلُقَكَ وَلَوْ مَعَ الْكُفَّارِ۔'' ③ ''اے میرے خلیل! حسن اخلاق سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے کیوں نہ ہوں؟''

دوسرا درجہ خلق کریم کا ہے۔آدمی کا کریم الاخلاق ہونا یہ دوسرا مقام ہے اور تیسرا مقام خلق عظیم کا ہے۔ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔'' ④ ''میں مبعوث کیا گیا

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم من اسمہ: محمد ج: ۱۴ ص: ۲۷۲۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ مؤمل بن عبدالرحمٰن الثقفی وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۲۰۔

④ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیھا۔ ج: ۱۰ ص: ۱۹۲۔

ہوں اس لئے کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں''۔

تعریف اخلاق......تو آپ پر کریمانہ اخلاق، اخلاق حسنہ اور اخلاق عظیم بھی مکمل ہو گئے۔ ان تینوں اخلاق میں کیا فرق ہے؟ خلق حسن کے معنی عدل ومساوات کے ہیں کہ جو ادھر سے ہو اس کے برابر ادھر سے ہو۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ایک پیسے کا سلوک کرے تو آپ کا فرض ہے کہ ایک پیسے کے برابر آپ بھی سلوک کریں کہا جائے گا کہ انہوں نے خلق حسن برتا۔ اخلاق حسنہ کا آدمی ہے کہ بدلہ برابر کر دیا۔

اس کے برخلاف اگر کسی نے آپ کو تھپڑ مار دیا تو آپ کو حق ہے کہ آپ بھی تھپڑ ماریں۔ اگر تھپڑ سے زیادہ مکہ ماریں گے تو کہیں گے بد خلق آدمی ہے۔ اسے برابری کا حق تھا کہ دوسرے نے اس کو تھپڑ مارا، اسے بھی تھپڑ مارنے کا حق تھا۔ تھپڑ کی بجائے مکہ مار دینا بد اخلاقی وزیادتی شمار ہوگی۔ اس نے اتنی زیادتی نہیں کی تھی کی جتنی آپ نے کی تو آپ مستحق سزا ہوں گے تو خلق حسن کے معنی عدل ومساوات کے ہیں کہ نیکی اور برائی کے اندر برابر آپ بدلہ لیں یہ خلق حسن ہے۔

خلق کریم اس سے اگلا مرتبہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے ساتھ اگر کوئی برائی سے پیش آئے تو آپ بدلہ نہ لیں، بلکہ معاف کر دیں، درگزر کریں یہ خلق کریم ہے۔ اگر بدلہ لے لیا تو خلق حسن ہے بشرطیکہ برابر سرابر بدلہ ہوا اور اگر برائی کو معاف کر دیا یا ایک روپے کے بدلہ میں دو روپے دے دیئے ورنہ ایک روپیہ کا بدلہ ایک روپے سے دے سکتا تھا۔ تو کہیں گے خلق کریم کا برتاؤ کیا۔ یہ آدمی کریم النفس ہے بہر حال مساوات سے آگے بڑھ کر کچھ کام کرے وہ خلق کریم کہلائے گا۔

اور تیسرا درجہ خلق عظیم کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ برائی کی تو نہ صرف یہ کہ آپ نے بدلہ نہ لیا نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا بلکہ اوپر سے برائی کرنیوالے کے ساتھ احسان بھی کیا۔ یہ خلق عظیم ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم......جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی۔ فرمایا گیا ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ① اس سے زیادہ فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ ② وہ جو اللہ نے آپ میں کوٹ کوٹ کر رحمت بھر دی ہے۔ اس کی وجہ سے آپ رقیق القلب ہیں، قلب مبارک نہایت نرم ہے۔ ذرا سی مصیبت کسی کی دیکھی اور پگھل جاتا ہے۔ قلب رحمت سے بھرا ہوا ہے۔ ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ③ اگر آپ سخت دل ہوتے، یہ جو آپ کے اردگرد پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں۔ یہ اٹھ اٹھ کر بھاگ جاتے۔ سب آپ کے اخلاق نے انہیں جذب کر رکھا ہے۔ آپؐ کے اخلاق کیا ہیں؟

پہلا درجہ فرمایا گیا ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ④ یہ نہیں کہا گیا کہ برابر سرابر بدلہ لے لیں۔ اگر کوئی برائی کرے تو

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۹۹۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔ ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

معافی اور ایثار سے کام لیں۔ آپ معاف کر دیں، بدلہ لینے کا تصور نہ کریں۔ بدلہ لینے سے آپ کی ذات بہت بالاتر ہے۔ اگرچہ برابر کا بدلہ لینا وہ بھی خلقِ حسن ہے مگر آپ کے اخلاق اس سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ کا ابتدائی خلق یہ ہے کہ جب کوئی برائی کرے تو آپ تو معاف کر دیں۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ① اس برائی کرنیوالے کے لئے دعاء مغفرت بھی کریں یہ ایک درجہ اور بڑھادیا۔ دوسرا گالیاں دے رہا ہے اور آپ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ② آپ ان سے مشورہ لیں یہ اس سے بھی اونچا مقام ہے۔ اس مجموعہ کا نام خلق عظیم ہے۔ تو خلق عظیم میں خلق حسن اور خلق کریم بھی درج ہے۔

درجات تربیت...... انبیاء علیہم السلام جامع الاخلاق ہوتے ہیں لیکن تربیت کرنے میں انبیاء علیہم السلام کے درجات ہیں ان درجات میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاں خلق حسن کا درجہ ہے۔ جس پر انہوں نے اپنی امت کو تربیت دی کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے، تمہارا فرض ہے کہ تم برائی کا بدلہ لو۔ موسوی شریعت کے اندر معاف کرنا جائز نہیں تھا۔

فرمایا گیا ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ......﴾ ③ ہم نے اہل تورات پر لازم کر دیا تھا کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو معاف کرنا جائز نہیں۔ بدلہ لینا ضروری ہے۔ اگر کوئی دانت توڑے، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی دانت توڑ دو۔ کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑ دو۔ کوئی تھپڑ مارے، تم بھی تھپڑ مارو۔ بدلہ لینا واجب ہے عفو کرنا جائز نہیں۔ یہ موسوی شریعت ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو خلق حسن پر تربیت دی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، انہوں نے خلق کریم پر تربیت دی۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی برائی کرے تو بدلہ لینا جائز نہیں۔ معاف کرنا واجب ہے۔ تو وہاں تشدد غالب ہے۔ یہاں تساہل غالب ہے۔ یہاں یہ حکم ہے کہ اگر کوئی تمہارے بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھائی ایک اور مارتا جا خدا بھلا کرے۔

یہ نہیں کہ بدلہ لو۔ بدلہ لینا جائز نہیں، معاف کرنا واجب ہے جھک کر تواضع سے رہنا ضروری ہے۔ اسی میں تمہارے نفس کے لئے انکسار ہے۔ اسی میں اولیت و اولویت ہے تو یہاں خلق کریم پر تربیت دی گئی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خلق عظیم پر تربیت دی ہے کہ کوئی برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلا کرو۔ ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ ④ "دوسروں کی برائی کا بدلہ اپنی بھلائی سے دو۔ وہ گالیاں دے تم دعائیں دو"۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ جہاز میں سوار تھے اور حج کے لئے جا رہے تھے۔ لوگوں نے انکے مقام کو نہ پہچانا کسی نے برا کہا، کسی نے گالی دی، کسی نے کچھ اور کہا وہ گالیاں دے رہے ہیں اور جنیدؒ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ ان کو ہدایت دے اور انہیں وہی مقام دے جو تو نے مجھے دیا ہے تو وہ برائی کے درپے ہیں یہ ان کی بھلائی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۵۔ ④ پارہ: ۲۴، سورۃ الفصلت، الآیۃ: ۳۴۔

کے درپے ہیں۔اس شان سے امت محمد یہ کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ ان کے اندر خلق عظیم آئے۔
شرف خاتمیت ......عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ: اخلاق کے تین مراتب ہیں۔اعلیٰ ترین مرتبہ خلق عظیم ہے۔ اس کے بعد کوئی مرتبہ نہیں۔وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تو آپ جامع الاخلاق اور جامع الکمالات ہیں۔علم بھی آپ کو اگلوں اور پچھلوں کا دیا گیا۔تو آپ جامع العلوم بھی ہیں۔احوال سابقہ سارے آپ کے اوپر طاری ہوئے تو آپؐ جامع الاحوال بھی ہوئے۔اس لئے آپ کو خاتم بنایا گیا کہ آپ کمالات علم، کمالات عمل اور کمالات اخلاق کے منتہی ہیں۔گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کمالات سے بھر پور ہے۔اس کو آپ نے فرمایا: "اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ." سب سے پہلے میری حقیقت پیدا کی گئی۔وہ حقیقت علم اور کمالات سے گوندھی ہوئی ہے۔مگر عرض یہ کرنا تھا کہ مناقب میں اولیت کا ذکر کیا گیا۔اگر یہی چیزیں بعد میں پیدا کر دیتے کسی اور کو پہلے لا کر تو کمالات کے جامع جب بھی آپ ہی ہوتے مگر وہ جو اول ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ نہ ملتا۔تو اولیت بھی عطاء کی گئی۔تو ایک طرف تو خاتمیت عطاء کی گئی کہ آپؐ سب سے اخیر میں ہیں اور ایک طرف اولیت عطاء کی گئی۔

تو آپؐ ان کمالات میں جو اللہ نے عطاء کئے ہیں اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔رجوع آپ ہی کی طرف ہوگا۔ تو اولیت ایک عظیم فضیلت ہے۔یا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ مِنْهُ الْقَبْرُ." ① "سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا اور بعد میں سب کو اٹھاؤں گا"۔ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اٹھائیں گے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو جنت البقیع میں مدفون ہیں انہیں اٹھاؤں گا۔اس کے بعد مکہ کی طرف جنت المعلیٰ ہے۔وہاں کے قبرستان سے لوگ اٹھیں گے اور سب میرے ساتھ ہوں گے تو قبر سے اٹھنے میں آپ کی اولیت ثابت ہے۔

"اَنَا اَوَّلُ مَنْ يَّفْتَحُ بَابَ الْجَنَّةِ" ② "سب سے پہلے میں ہوں گا جو جنت کا دروازہ کھولوں گا"۔اس واسطے وہاں بھی آپ ہی کو اولیت حاصل ہے۔"وَاَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا" ③ "قیامت کے دن سب سے پہلے میں قائد ہوں گا"۔میری قیادت میں دنیا کی امتیں چلیں گی، میں ہی شفاعت کبریٰ کروں گا، سب امتیں میرے جھنڈے کے نیچے آئیں گی۔تو دنیا و آخرت کی جتنی بھی اولیتیں ہیں، وہ سب آپؐ کے لئے ثابت ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اولیت ایک عظیم شرف ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر چیز کی اولیت پر اور ابتداء و آغاز پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔

تکمیل پر مسرت......اسی طرح سے دوسرا مقام اختتام کا ہے کہ اس پر خوشی منائی جاتی ہے۔جب کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے تو خوشی مناتے ہیں کہ آج پوری ہوگئی۔بچہ اگر تعلیم سے فارغ ہو کر سند حاصل کرے، آپ دعوت کرتے

① الصحيح للبخاري، كتاب الخصومات، باب مايذكر في الاشخاص......ج: ٢ ص: ٨٥٠ رقم: ٢٢٨١.
② مسند ابي يعلى الموصلي، شهر بن حوشب عن ابي هريرةؓ ج: ١٣ ص: ٣٩٦.
③ السنن للامام الدارمي، باب ماعطي النبي ﷺ من الفضل، ج: ١ ص: ٤٠.

ہیں کہ بچہ فارغ ہوگیا۔ یعنی اس کا علم حد اختتام کو پہنچ گیا۔ جو تدریس کا سلسلہ تھا، اس میں آخری مرتبے پر آ گیا۔ تو انتہاء کی بھی خوشی کرتے ہیں۔

آپ کہیں گے، بچے کی پیدائش پر خوشی کرنا صحیح ہے لیکن اس کا تقاضا یہ ہے جس دن اس کا انتقال ہو، اس دن بھی خوشیاں منائی جاتیں حالانکہ اس دن روتے ہیں خوشیاں کوئی بھی نہیں مناتا۔ اس قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ جب ابتداء میں خوشی کی گئی تو انتہاء میں بھی خوشی کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ: انتہاء میں بھی آپ خوشی کرتے ہیں۔ موت پر کبھی کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اچھی موت ہو بعض اوقات کہا کرتے ہیں کہ: بھئی بڑا اچھا آدمی تھا، خدا ایسی موت ہر ایک کو نصیب کرے۔ مرنا تو تھا ہی، مگر ایسی موت نصیب ہوئی، بڑی خوشی کی بات ہے، بڑی فرحت کی بات ہے۔ کوئی جام شہادت پی لے تو آپ کہتے ہیں کہ بھئی! موت تو اپنے وقت پر آتی ہے لیکن شہید ہو کر مرا ہے۔ کتنی خوشی کا مقام ہے۔

موت کی خوشی ...... اور ویسے بھی مرنے کے معنی اللہ سے مل جانے کے ہیں۔ تو کیا اللہ سے مل جانا کوئی غم کی چیز ہے کہ اس میں آدمی رنج کرے کہ ہائے فلاں آدمی خدا سے کیوں مل گیا؟ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَللّٰھُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُکَ.'' ① ''یا اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے، جو میرے رسول ہونے کا قائل ہے''

کیوں محبت ڈال دے؟ کیوں موت محبوب بنائی گئی؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ: ''اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ.'' ② ''موت ایک پل ہے جس سے آدمی گزر کر محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے۔ اپنے پروردگار سے جا ملتا ہے''۔ تو موت درحقیقت بندے کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے۔ یہ نہیں کہ بندہ تو خدا سے مل رہا ہے اور آپ بیٹھ کر رنج کریں؟ اور آہ و فغاں کریں؟ بلکہ حقیقت میں موت بھی خوشی کی چیز ہے پھر بھی جو غم کرتے ہیں۔ وہ غم موت کا نہیں، جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں عزیز جدا ہو گیا۔ اس پر غم نہیں کہ مر کیوں گیا؟ اللہ سے کیوں مل گیا؟ بلکہ ایک نعمت ہم سے چھنی اصل میں اس کا غم ہوتا ہے۔ یہ غم اس کی موت پر نہیں ہوتا۔ یہ غم فراق کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں آدمی چھن گیا۔

تو غم حقیقت میں جدائی کا کرتے ہیں۔ موت کا غم نہیں ہوتا، نہ اس کا غم ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے کیوں مل گیا؟۔ لہٰذا موت بھی ایک خوشی کی چیز ہے۔ اور اہل اللہ کے ہاں تو اس سے زیادہ فرحت کی چیز ہی کوئی نہیں۔

ابن الفارض کہتے ہیں ؎

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج:۳ ص:۱۸۷۴. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:۱۰ ص:۳۰۹.

② یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے دیکھئے: فیض القدیر، ج:۳ ص:۲۳۳.

خرم آن روز کزیں منزل ویراں برویم   تادرمیکدہ شاداں و غزل خواں برویم

وہ کون سامبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے دیار کو چھوڑیں گے۔اور اپنے محبوب حقیقی سے جا کے ملیں گے۔

شوق ملاقات محبوب...... حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جب وفات کا وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے اور چہرے پر ایسی خوشی کہ عمر بھر اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔لوگوں نے عرض کیا: ''موت کی تو تکلیف گزر رہی ہے اور چہرہ آپ کا دمک رہا ہے۔خوشی سے نورانیت برس رہی ہے'' فرمایا: ''غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَّاَصْحَابَهٗ.'' بس ''اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی''۔ اس لگن میں مطمئن ہوں۔تو موت کی خوشی کوئی ان اہل حقیقت سے پوچھے کہ اس گندے عالم کو چھوڑ کر پاکیزہ عالم میں جارہے ہیں یہاں کے دوستوں کو چھوڑ کر جن کی دوستی مشکوک ہے،ان دوستوں میں جارہے ہیں جن کی دوستی میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

منصورؒ اکثر قبرستان میں رہتے۔لوگ کہتے کہ شہروں کو چھوڑ کر قبرستانوں میں کیوں جاتے ہو؟ تو کہتے کہ میں اس قوم کے پاس رہتا ہوں جو نہ غیبت کرتی ہے نہ جھوٹ بولتی ہے نہ چغلی کھاتی ہے نہ بدخواہی کرتی ہے۔مرنے کے بعد آدمی کی برائیاں ختم ہوجاتی ہیں اور اس کی جتنی نیکیاں ہیں وہ ابھر جاتی ہیں۔اس لئے آدمی ان سے مل کر خوش ہوتا ہے۔اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے ملے تو اس سے بڑھ کر خوشی کا کیا مقام ہے؟ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت بھی خوشی کی چیز ہے اور آپ بھی درحقیقت خوش ہی ہوتے ہیں مگر اس کے اوپر جدائی کا غم چونکہ غالب ہوجاتا ہے تو وہ خوشی دب جاتی ہے۔اگر جدائی کی غمی نہ ہوا کرتی تو شاید لوگ میت پر شادیانے بجایا کرتے کہ بڑا اچھا ہوا اللہ سے جاملا۔مگر اس خوشی کے اوپر جدائی کا غم غالب آجاتا ہے۔اس لئے آدمی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔تو مطلب یہ ہے کہ خوشی کی دو چیزیں ہیں۔ایک آغاز اور ایک اختتام۔

اصل خوشی...... آغاز میں توقع پر خوشی ہوتی ہے۔ابتداء آدمی توقع باندھتا ہے کہ آج میں نے بچے کو پڑھنے کے لئے بٹھایا ہے۔امید ہے کہ آٹھ برس میں عالم بن جائے گا۔اس توقع پر خوشی مناتے ہیں یہ نہیں کہ آج کوئی خوشی میسر آرہی ہے۔اگر باغ لگاتے ہیں اس کی ابتداء میں خوشی کریں تو توقع کی خوشی ہوتی ہے کہ اب چند دن کے بعد پھل دے گا اور ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔غرض ابتداء کی خوشی محض توقع پر مبنی ہوتی ہے واقع پر مبنی نہیں ہوتی۔لیکن انتہاء کی خوشی واقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ شی تکمیل کو پہنچ گئی۔ختم ہونے کا یہاں یہ مطلب ہے کہ دلوں کے اندر مکمل ہوگئی۔ساری احادیث کو عبور کر کے آج اس درجے پر آگئے کہ ہم سات ہزار احادیث کے عالم بن گئے۔بقدر استعداد ہم نے علم حاصل کرلیا۔وہ ہمارے اندر مجتمع ہے۔تو اختتام کے وقت جو خوشی ہوتی ہے۔وہ تکمیل شئے پر اور ابتداء میں محض توقعات پر خوشی ہوتی ہے۔کسی شے کا وجود نہیں ہوتا۔اس لئے اصل خوشی اختتام کی ہے۔تو آج خوشی کا دن ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔

قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ...... غور یہ کرنا ہے کہ آخر ختم پر ہم نے کیوں خوشی منائی؟ آپ کو بخاری

پڑھنے کے بعد دو چیزیں حاصل ہوئیں۔ایک متن حدیث اور اس کی مرادات جو آپ کے اساتذہ نے آپ کو سمجھائیں۔کتاب الایمان اور اس کی احادیث کے یہ مطالب و مرادات ہیں۔کتاب العلم اور اس کی احادیث کے یہ مطالب ہیں۔ یہ مفہوم شرعی ہے۔ کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الحج اور پھر آگے معاملات اور کتاب الاجتہاد اور غزوات، ان تمام چیزوں میں دو ہی باتیں ہیں۔ایک متن حدیث وہ آپ تک پہنچا اور آپ نے اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھ لیا اور دوسرا یہ کہ آپ کو سند ملی۔

آپ نے کہا مجھے یہ حدیث میرے استاذ سے پہنچی۔اسے اس کے استاد سے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ مل گیا۔گویا آپ کے قلب کا رشتہ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو گیا اور ایک نورانی سلسلے سے کلام کے لفظ اور معانی آپ کے قلب تک آ گئے۔تو متن حدیث کے ساتھ آپ کو سند بھی حاصل ہو گئی اور آپ مستند عالم ہو گئے۔

ضرورت سند......اور محض عالم ہونا کافی نہیں، مستند عالم ہونا ضروری ہے۔جس عالم کا بلا انقطاع سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو جائے، وہی عالم ہے۔اگر آپ دیکھیں اس سے سلسلہ ہی قطع ہو گیا۔نہ اس نے کسی استاد سے تعلیم پائی نہ سند حاصل کی، نہ تربیت حاصل کی اور پھر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے تو وہ قوت مطالعہ سے کہہ رہا ہے۔اپنے نفس کو امام بنا کے کہہ رہا ہے کہ جو میرے نفس نے سمجھ لیا وہ میں کہہ رہا ہوں۔ظاہر بات ہے وہ مراد ربانی نہیں ہو سکتی مراد نبوی نہیں ہو سکتی۔اس کے نفس کی مراد ہو سکتی ہے۔

اس لئے کہ لفظ اللہ و رسول کے لئے، اور معانی اپنے ڈال دیئے لفظ منقول لئے اور معنی غیر منقول لئے وہ معانی ہمیں مطلوب نہیں جو سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو کر ہم تک نہ پہنچیں۔

مسلسلات......محدثین نے تو سند کا یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ نہ صرف لفظ اور معانی ہی کو نقل کیا بلکہ ان ہیئتوں کو بھی نقل کیا ہے جو حدیث کے پڑھنے اور سننے میں ان کے سامنے آئیں، استاذ کی حالت و کیفیت کو بھی سند کے ساتھ نقل کیا۔چنانچہ مسلسلات کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے ''الدر الثمین'' مستقل رسالہ لکھا اس میں فقط الفاظ و معانی کی ہی نقل و روایت نہیں بلکہ ہیئتوں کی بھی ہے۔ان افعال کی بھی سند جو افعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلائے جیسے کہ مثلاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔وہ فرماتے ہیں ''صَافَحْتُ بِكَفِّي هٰذِهٖ كَفَّ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ①'' ''میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے مصافحہ کیا اور اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی''۔اور کہتے ہیں ''فَمَا مَسَسْتُ خَزًّا وَّلَا حَرِيْرًا اَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.'' ''میں نے جب اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی تو میں نے کوئی ریشم اور ملائم سے ملائم کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جیسی

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب مایذکر من صوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم والفطارہ ج:۷ ص:۸۳.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک نرم تھی، تو میں نے اس کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا‘‘۔

تابعی کہتے ہیں کہ مجھے اجازت دیجئے میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھوں تاکہ اس سلسلہ سے بالواسطہ میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی جائے، ان تابعی سے تبع تابعی بھی کہتے کہ مجھے آپ اجازت دیں کہ میں آپ سے مصافحہ کروں تاکہ دوواسطوں سے میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک پر رکھی جائے، اسطرح یہ حدیث چلی۔

عالی سند...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ کو فرمایا کہ: اس وقت میری سند اپنی جماعت میں سب سے عالی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مجھ میں کم واسطے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی سند دوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سہارن پور آ کر حدیث کی اجازت لو۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت! میں حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی بھول بھال گئے۔ ایک برس گزر گیا۔ اتفاق سے میں ایک سفر میں ساتھ ہوا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تو آیا نہیں؟ میں تجھے حدیث کی اجازت دیتا۔ میں نادم ہوا۔ میں نے کہا حضرت! اب حاضر ہوں گا۔ پھر ایک برس گزر گیا۔ وہ بھی لڑکپن کی بات تھی گزر گئی۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب فکر ہوئی کہ پھر یہ دولت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تو میں نے سہارن پور کا سفر کیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے کہا: حضرت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ بہت خوش ہوئے مولانا زکریا صاحب سے فرمایا: مظاہر العلوم کے کتب خانہ میں جتنی حدیث کی متداول کتابیں ہیں سب لے آؤ۔ تو وہ معاجم مسانید اور صحاح ستہ لے آئے۔ ساری کتابیں جمع ہو گئیں۔ ہر ہر کتاب کا اول پڑھ کر حضرت نے مجھے حدیث کی اجازت دی۔ کچھ مجھ سے پڑھوایا، بعض کتابوں کی نقل کرنے کی اجازت دی۔

اس کے بعد فرمایا بھائی! مسلسلات کی اجازت بھی دے دوں گا۔ تو یہ جو مسلسل بالمصافحہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کی اجازت مصافحہ کر کے اور میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ کر دی۔ مصافحہ کیا اور حدیث نقل کی کہ یہ مصافحہ بھی مسلسل سند کے ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ ان واسطوں سے گویا تیری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر رکھی گئی۔

اس کے بعد دوسری حدیث ’’حدیث مسلسل بالماء والتمر‘‘ کی بھی عملاً اجازت دی۔ یہ حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کھجور کی ضیافت کی اور اس کے بعد آپ نے کھجور کھائی اور کھا کر الش حضرت علیؓ کو کھلایا اور پانی پیا اور پانی حضرت علیؓ کو پلایا۔ گویا کھجور اور پانی کی دعوت کی اور دعوت کر کے پھر وہ حدیث سنائی کہ کھجور اور پانی کی دعوت کرنے میں کیا فضیلت ہے۔

حضرت علی نے اسی طرح اپنے شاگرد کو اجازت دی کہ خود کھجور کھائی۔ الش اسے کھلایا۔ پانی پیا اور بچا ہوا پانی

پلایا اور حدیث پڑھی۔ یہ مسلسل عمل چلا آ رہا ہے تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کھجور منگوائی اور پانی بھی منگوایا (زمزم کا پانی) کھجور کھا کر الش مجھے کھلایا اور پانی مجھے پلایا اور حدیث نقل فرمائی۔ اور اس کی اجازت دی۔ تو عملاً حدیث مسلسل بالماء والتمر اور مسلسل بالمصافحہ کی اجازت دی اور پھر روایۃً ساری مسلسل کی اجازت دی کہ میں حدیث کی اجازت دیتا ہوں تو ان کی روایت کرسکتا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ محدثین نے فقط قول نبی نقل نہیں کیا معانی بھی نقل کئے اور معانی ہی نہیں بلکہ وہ افعال اور ہیئتیں بھی سند کے ساتھ ہم تک پہنچائے جو افعال پہنچتے آئے ہیں۔

محدثین کی احتیاط...... معمولی سی بات ہے کہ میں نے مشکوٰۃ اپنے والد ماجد سے پڑھی تھی۔ تو نوحہ کی حدیث آئی۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تھا۔ تو وہ وصیت کر کے جاتا تھا کہ چھ مہینے تک یا سال یا دو برس تک مجھے رویا جائے اب ظاہر بات ہے کہ اتنے دنوں تک آنکھوں میں کوئی آنسو لے کر بیٹھ جائے تو یہ ہو نہیں سکتا اور نہ روئے تو لوگ کہیں گے بھئی! کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ معمولی تھا۔ مر گیا لہٰذا چھ مہینے روؤ تا کہ معلوم ہو کہ کوئی بڑا آدمی گزرا ہے۔ مگر اب چھ مہینے تک روئے کون؟ تو رونے والیاں کرائے پر رکھی جاتی تھیں کہ وہ چھ مہینے تک بیٹھ کر روئیں اور وہ عورتیں ہی رکھی جاتی تھیں۔ اس لئے کہ آنسو بہانا انہیں آسانی سے آتا ہے بس ارادہ کیا اور ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے۔ تو رونے اور رلانے کے لئے عورتوں سے بہتر دوسرا کرایہ دار نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے عورتوں کو کرایہ پر رکھتے تھے۔ اجرت بھی دی جاتی اور کھانا کپڑا بھی اور ان کا طریقہ کیا تھا؟ گھر میں بیٹھی ہوئی ہیں کھا پی رہی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا، بس وہ فوراً گھیرا بنا کر بیٹھ گئیں اور انہوں نے ''راں راں'' کر کے رونا شروع کیا۔ ''وَاکَبِدَاہ! وَاجَبَلَاہ! وَاشَمْسَاہ!'' تو تو پہاڑ تھا، تو تو آفتاب تھا، چاند تھا، وغیرہ۔ اور پوری لے کے ساتھ اور کچھ ''راں راں'' کر کے دکھلایا کہ یوں روتی تھیں۔

ہمیں حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ پھر خود ہی فرمایا کہ تمہارے ذہنوں میں سوال پیدا ہوا ہوگا کہ میں نے ''راں راں'' کر کے کیوں دکھلایا؟

فرمایا اس لئے کہ جب مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے حدیث پڑھی، تو انہوں نے یوں ہی ''راں راں'' کر کے دکھلایا تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو اس حدیث پر انہوں نے بھی یوں ہی ''راں راں'' کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: جب میں نے شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے یہی کر کے دکھلایا اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث

پڑھی۔ انہوں نے یونہی کر کے شاہ ولی اللہ کو دکھلایا اور اس ''راں راں'' کی صحابی تک سند پہنچادی۔

تو محدثین نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ نقل کئے بلکہ ہیئتیں بھی نقل کیں۔ بلکہ وہ عوارض اور احوال بھی سند کے ساتھ پہنچائے تا کہ معلوم ہو کہ پورے وثوق کے ساتھ انہیں حدیث آئی اور حدیث سنی ہے۔

غیر مستند عالم......اب جس شخص کے پاس سند نہ ہو، محض ترجے دیکھ کر وہ حدیث بیان کرے۔ وہ قابل اعتبار نہیں وہ مستند عالم نہیں ہے۔ اسے عالم نہیں کہیں گے زیادہ سے زیادہ ناقل کہیں گے۔ اگر نقل صحیح کر دی، کہیں گے نقل صحیح کی۔ غلط کی کہیں گے غلط کی، لیکن عالم کہہ دیں؟ یہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عالم کے لئے استناد لازمی ہے بغیر استناد کے علم، علم نہیں ہوتا۔

عقلی علوم میں استناد ضروری نہیں ہے کہ آپ فلسفہ میں صدرا پڑھ کر یوں کہیں کہ ''حَدَّثَنَا فُلَانٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَرَسْطُوْ وَ اَفْلَاطُوْنَ'' وہاں ضرورت نہیں۔ اس واسطے کہ عقلی چیزیں ہیں، ہمیں بھی عقل ہے۔ انہیں بھی عقل تھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی عقلی باتوں میں غلطی کر گئے ہوں۔ ہم کہیں گے غلط کام ہوا۔ ہماری عقل میں یہ چیز آتی ہے۔ تو ہر شخص کو عقل دی گئی ہے، دوسرے کی عقل اس کے لئے حجت نہیں وہ تخطیہ کر سکتا ہے۔

لیکن نقل و روایت کی چیز میں پابند ہونا پڑے گا استاذ کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم نقل کر کے کہے گا میرے استاذ نے یہ نقل کیا پھر وہ کہے گا میرے استاذ نے یہاں تک کہ صاحب شریعت تک سند پہنچ جائے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں، وہ وحی سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھ سے یوں فرمایا۔ تو ہماری سند حق تعالیٰ تک متصل ہو جائے گی۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی ختم ہوگئی علم مستند باقی نہیں رہے گا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں، نہ اسے عالم مستند کہیں گے۔

مثال غیر مستند عالم......اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے مادی وراثت میں جب تک باپ سے نسب ثابت نہ ہو آپ وارث کیسے بنیں گے؟ پہلے آپ یہ ثابت کریں گے۔ یہ فلاں کا بیٹا ہے تو اس کا جو ترکہ ہوگا وہ اس کو ملے گا اور اگر آپ یہ ثابت نہ کر سکے اور لوگوں نے کہا کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ اس کے بیٹے نہیں۔ معلوم نہیں اس کا باپ کون ہے۔ یہ فرضی طور پر کھڑے ہوگئے۔ وراثت نہیں مل سکتی۔ تو وراثت کے لئے نسب کا ہونا ضروری ہے باپ سے سلسلہ نسب ہو تو کہا جائے گا کہ وارث ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کی وراثت علم ہے۔ اس کا وارث بھی وہ بنے گا جس کا سلسلۂ نسب روحانی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہوا ہو۔ وہاں مادی نسب ضروری ہے، یہاں روحانی نسب ضروری ہے۔ وہاں بغیر مادی نسب کے وراثت نہیں مل سکتی، یہاں بغیر روحانی نسب کے علمی وراثت نہیں ملے گی۔

تو ہم اس علم کو علم کہتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے پہنچا ہو، جس علم کا ہماری عقل نے

اختراع کیا ہو، سنی سنائی باتیں کہہ رہے ہوں یا کسی ترجمہ میں دیکھ کر کہہ دیں۔ وہ مستند نہیں سمجھی جائیں گی۔ ایسے آدمی کو عالم نہیں کہا جائے گا۔ عالم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مستند ہو۔ کن اساتذہ سے اس نے علم حاصل کیا ہے؟ اس کا سلسلۂ نسب علم میں کہاں پہنچتا ہے؟ اگر نہیں پہنچتا ہم کہیں گے بھئی! تو بے باپ کا بیٹا ہے۔ اور جو بے باپ کا بیٹا ہے وہ وراثت کا مستحق نہیں ہوتا۔ بہر حال سب سے بڑی چیز سند اور استناد ہے۔

سببِ تبریک...... اسی واسطے محدثینؒ کہتے ہیں "لَوْلَا الْاِسْنَادُ لَبَطَلَ الدِّیْنُ." اگر دین میں اسناد نہ ہوتو دین ہی باطل ہو جائے۔ "لَقَالَ مَنْ شَآءَ مَاشَآءَ." ① "جس کا جو جی چاہے گا کہہ مارے گا"۔

اور کہے گا یہ دین کی بات ہے۔ ہر ایک کو حق ہوگا لیکن جب ہم پوچھیں گے سند کیا ہے؟ کس کے شاگرد ہو؟ وہ کس کے شاگرد ہیں؟ آگے وہ کس کے؟ جب تک اسناد پیش نہ کرے گا اس کے علم کو ہم علم نہیں کہیں گے۔ غرض علم میں سب سے بڑی چیز سند ہے۔

تو آپ کے لئے سب سے بڑی قابل مبارکباد چیز یہ ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔ یعنی آپ کو سند حاصل ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک روحانی نسب نامہ مل گیا۔ آپ وہی کہہ رہے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا اور وہی باتیں سمجھا رہے ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھائی تھیں اور صحابہ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو۔ تو ایک متن حاصل ہوا جس سے علم کا دروازہ کھلا۔ ایک سند حاصل ہوئی جس سے آپ کا علم مستند اور دوسروں کے لئے حجت بنا بغیر سند کے وہ حجت نہ ہوتا۔ اس لئے محدثین نے سند ضروری قرار دی۔

وقعتِ روایت...... اور اس میں بھی ایک درجہ رکھا ہے کہ اس شخص اور اس راوی کی روایت زیادہ وقیع ہے جو اپنے شیخ سے کثیر الصحبت ہو۔ ایک راوی تو وہ ہے کہ اس نے استاذ کی زیارت کی، ملاقات ہوئی۔ ایک حدیث نقل کی اور ایک وہ ہے کہ برس دو برس شیخ کی خدمت میں رہ کر اس نے فن حاصل کیا۔ ظاہر بات ہے جو برس دو برس اپنے شیخ کی خدمت میں رہے گا، اسے قول اور فعل ہی حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اُن کے قلب کو وہ رنگ بھی ملے گا جو استاد کے قلب کا رنگ ہے اس تک وہ کیفیات بھی منتقل ہوں گی جو استاد کے قلب میں اوپر سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں۔ اس لئے جو راوی کثیر الصحبت ہے اس کی روایت کا جو وقار ہوگا وہ اس راوی کی روایت کا نہیں ہوگا۔ جس کی چند گھنٹے ملاقات ہوئی۔ حدیث سن کر چلا آیا سند ٹھیک ہے۔ مگر سند کے ساتھ وہ کیفیات منتقل نہیں ہوں گی۔ جو استاذ کے قلب میں تھیں اور وہ اصل چیز ہیں۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ ② "اللہ کا رنگ سب رنگوں پر غالب ہے"۔ اللہ نے وہ رنگ اپنے نبیؑ کے قلب میں ڈالا۔ نبیؑ نے اپنے فیضِ صحبت سے وہ رنگ صحابہؓ کے قلوب میں ڈالا۔ صحابہؓ نے اپنے

① الصحیح لمسلم، المقدمۃ، ج: ۱ ص: ۳۸. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۸.

فیض صحبت سے وہ رنگ تابعین کے قلوب میں ڈالا۔انہوں نے تبع تابعین کے، وہ کیفیات، قلب کی صفائی اور ذوق ووجدان کا رنگ بھی درحقیقت منقول ہوتا چلا آ رہا ہے۔ہم اسی کو صحیح مانیں گے جو اوپر سے منقول ہو۔یعنی اپنے ذوق کا علاج بھی اپنے استاد سے کرائیں گے تاکہ ہمارا ذوق صحیح ہو جائے۔اپنے وجدان کو استاذ کے آگے پیش کریں گے کہ ہمارا وجدان صحیح ہے یا غلط؟ تو ذوق بھی وہی ہونا چاہئے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ وجدان کا رنگ بھی وہی ہونا چاہئے۔جو اللہ کے رسول کا ہے۔

ذوق صحیح......یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے چار فرائض قرآن حکیم میں ذکر کئے گئے ہیں ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾ ① پہلا کام یہ ہے کہ آپ آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔الفاظ خداوندی پوری امانت کے ساتھ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔اس کے بعد ہے ﴿یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم معانی کا سمجھانا اور مرادات ربانی کا ذکر کرنا ہے۔اسکے بعد فرمایا:

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ حکمت بھی سکھلاتے ہیں۔حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ایک حکمت نظری اور حکمت عملی۔حکمت نظری تعلیم کے اندر آ گئی۔باقی حکمت عملی رہ جاتی ہے تو بلاغت کے قاعدے سے اگر ایک لفظ کے دو معنی ہیں اور ایک پہلے لفظ میں آ جائیں۔تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے دوسرے معنی ہیں۔تو حکمت نظری تعلیم میں آ گئی۔اس لئے الحکمة میں حکمت عملی مراد ہوگی۔حکمت عملی سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ عمل بھی دکھلاتے ہیں کہ یہ عمل اس طرح کرو۔تو لفظوں میں تعبیرات پہنچائیں۔معنی میں مرادات سمجھائیں حکمت میں عمل کر کے دکھلایا کہ اس نمونہ کا عمل پیش کرو اور چوتھا فریضہ ذکر کیا:

﴿وَیُزَكِّیْهِمْ﴾ ④ آپ دلوں کو مانجھتے بھی ہیں۔یہ وہی ذوق اور وجدان کا صحیح کرنا ہے کہ قلوب میں سے زیغ نکل جائے۔ٹیڑھ نکل جائے۔کجی نکل جائے، استقامت پیدا ہو اور فہم میں اتنی سلامتی آ جائے کہ جو چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی جائے وہ قطعاً دل کے اندر اترتی ہوئی چلی جائے۔ٹیڑھ باقی نہ رہے۔غرض سلامتی قلب، ذوق صحیح اور وجدان صحیح یہ تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔تو صحابہؓ کے ساتھ آپؐ نے محنت کی، تاکہ ان کا ذوق درست کریں، کجی باقی نہ رہے۔

اس لئے کہ اگر دل میں کجی رہ جاتی تو دل کی کجی کے ہوتے ہوئے جو آیت بھی سامنے آئے گی، دل اس کے وہی معنی سمجھے گا جو الٹے معنی ہوں گے۔اگر معاذ اللہ کسی کے دل میں نصرانیت کا جذبہ گھسا ہوا ہو اور وہ نصرانیت کا ذوق لے کر قرآن پڑھے تو اسے ہر آیت سے نصرانیت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوگی۔اگر قادیانیت کا ذوق لے کر آئے تو پورے قرآن سے قادیانیت ٹپکتی ہوئی نظر آئے گی۔

① پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲. ② پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲.
③ پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲. ④ پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲.

اس واسطے کہ قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ یہ استاذ اور مربی سمجھائے گا کہ یہ مراد ہے اور یہ مراد نہیں۔ اگر تربیت نہ ہو تو کئی معنوں میں سے آدمی اپنے نفس کے مطابق جو معنی سمجھے گا وہ اختیار کرے گا۔ وہ مراد نبوی نہیں ہوگی۔ اس کے نفس کی مراد ہوگی۔ اس لئے ذوق کا درست کرنا ضروری ہے۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف قرآن پیش کیا، ایک طرف دلوں کو مانجھ کر کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تشریح کی۔ تو علماً وعملاً وذوقاً صحابہؓ وہی سمجھ گئے جو آپ کو سمجھانا تھا۔ اگر ذوق صحیح نہ ہو، عمل کا نمونہ سامنے نہ ہو تو مرادات ربانی سمجھنے کی کوئی صورت نہیں۔

مراد قرآن اور سنت...... یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو جب خوارج سے مناظرہ کرنے بھیجا تو ایک وصیت کی، فرمایا: دیکھو! خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے دلیل پیش کرنا۔ ابن عباسؓ نے عرض کیا، حضرت! قرآن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعا دی ہے "اَللّٰھُمَّ عَلِّمْـهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" ① "اے اللہ! ابن عباس کو قرآن کا علم وحکمت نصیب فرما"۔ اور اللہ نے مجھے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے اور قرآن ہی میرا موضوع ہے۔ اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کروں۔ سنت سے پیش کروں اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم آیت پڑھ کر ایک معنی سے استدلال کرو گے، مخالف اسی آیت کو دوسرے معنی میں ڈھال کر اپنی دلیل پیش کرے گا، عوام کہیں گے یہ بھی تو قرآن پڑھ رہا ہے۔ حق واضح نہیں ہوگا۔ لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پیش کر دیا۔ اس میں دو معنی نہیں ہو سکتے۔ اس سے مراد متعین ہو جائے گی۔ اس واسطے ضرورت ہے کہ سنت سے استدلال ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن سے من مانی مرادیں نکالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ بلا کہاں سے نازل ہو گئی۔ اس سے تو ہم وہی معنی لینے پر مجبور ہو گئے۔ جو اللہ کی طرف سے منقول ہوتے آ رہے ہیں اور ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ وہ انکار کر کے حدیث کو بیچ سے ہٹاتے ہیں تاکہ آزادی حاصل کریں اور جو ان کے نفس وعقل میں اختراعی چیزیں آئیں۔ انہیں قرآن کی طرف ٹھونک دیں ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کی مراد نہیں ہوگی۔ ان کے نفس کی مراد ہوگی۔

کلام میں لب ولہجہ کا دخل...... اس واسطے کہ قرآن کی مراد سمجھانے میں لب ولہجہ کا بھی دخل ہے، کلام کی خصوصیات کا بھی دخل ہے، ماحول کا بھی دخل ہے جب ساری چیزیں قطع ہو جائیں تو مراد کیسے متعین ہوگی؟ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو کا ایک جملہ ہے" کیا بات ہے، اسکے کئی معانی آتے ہیں اور لب لہجہ سے معنی بدل

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ اللھم علمه الکتاب...... ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۵.

جاتے ہیں اگر میں یوں کہوں کیا بات ہے؟ آپ سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں کہ بھئی! کیا معاملہ ہوا ہے؟ کیا واقعہ پیش آیا؟ اور اگر میں لہجہ بدل کر یوں کہوں کیا بات ہے۔ اب کیا سمجھے؟ قطعاً سوال نہیں سمجھے، بلکہ آپ سمجھے کہ میں کسی شئے کی بڑائی بیان کر رہا ہوں کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے۔ وہ تو بہت ہی بڑی ہے۔ اور اگر میں لب ولہجہ بدل دوں اور کہوں کیا بات ہے۔ اب آپ کیا سمجھے؟ اب نہ بڑائی سمجھے نہ سوال بلکہ تحقیر سمجھے کہ میں نے کسی شی کی حقارت بیان کی اور اگر پھر لب ولہجہ بدل کر اسی جملہ کو یوں ادا کردں کیا بات ہے۔ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ نہ بڑائی بیان کی نہ تحقیر نہ استفہام وسوال۔ تو ایک ہی جملہ ہے ''کیا بات ہے'' اور اس کے چند معنی ہیں اور سب معانی لب ولہجہ سے متعین ہوتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ اگر یہ جملہ خط میں لکھ کر بھیج دیں تو لب ولہجہ تو خط میں نہیں آئے گا۔ تو وہ اس جملہ سے وہی معنی سمجھے گا جو خیال اس کے نفس پر غالب ہوگا۔ لیکن اگر آپ بالمشافہ سامنے بٹھلا کر لب ولہجہ سے (یا کلام دے کر کسی شخصیت وپیامبر کے ذریعہ) سمجھائیں گے تو مخاطب وہی معنی سمجھے گا جو آپ کی مراد ہے۔ لیکن اگر خط میں لکھ کر بھیجیں گے تو وہ وہی معنی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہوگی۔ گویا وہ اس جملے کے جو معنی سمجھے گا وہ (لفظ آپ کے ہوں گے) مراد اس کی اپنی ہوگی لکھنے والے کی مراد نہیں ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم اور حدیث نبوی کو سمجھ لیں بہت سے معنی ہوتے ہیں جو لب ولہجہ اور ماحول سے متعین ہوتے ہیں اور بہت سے معنی ہیں جو اسباب نزول سے متعین ہوتے ہیں۔ اگر ان سب امور کو قطع کر کے محض الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو ہر شخص اس سے وہی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہوگی اور ایسا کرنے سے بہت سے نقصانات وجود میں آئیں گے۔ بہت سے بدبخت ایسے بھی ہیں جو تلبیس کر کے دنیا کو دھوکہ دیں گے کہ یہ اللہ اور رسول کی مراد ہے۔ حالانکہ اللہ اور رسول کی مراد نہیں، اس کی اپنی مراد ہے۔ لفظ اللہ کے لئے اور معنی اپنے بھر دیئے۔

لیکن اگر سند آ گئی، بیان رسول آ گیا، وراثتی معنی آ گئے جو صحابہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور مع کیفیات کے بیان کئے تو شی متعین ہو جائے گی اور ایسی صورت میں میں کسی کو دخل دینے کی مجال نہیں ہوگی۔ غرض جو بھی چاہے گا کہ میں قرآن میں من مانی مرادات کو داخل کروں وہ حدیث اور کلام سلف سے انکار کرے گا۔ وہ ان کے مفہوم کی حجیت کا انکار کرے گا تا کہ دنیا کے اندر اس کی حجیت قائم ہو۔ ہم کہتے ہیں دین وہ ہے جو سلسلے وار مرتب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مسلسل مل جائے۔ لفظ معنی اور کیفیت وحال بھی اور عوارض و واقعات اور احوال کے لحاظ سے بھی۔

ضرورت نبوّت...... آج وہ طلباء جنہوں نے بخاری شریف ختم کی ہے قابل مبارکباد ہیں۔ پہلی بات قابل مبارکباد یہ ہے کہ سات ہزار احادیث کے قریب متون ان کو حاصل ہوئے۔ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہیں اور کلام رسول کی عظمت وہی ہے جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جیسے اللہ

تک بندہ نہیں پہنچ سکتا جب تک بیچ میں رسول کا واسطہ نہ ہو۔ اس لئے کہ وہ نور مطلق ہیں اور بندہ ظلمت محض ہے۔ نور، ظلمت کے ساتھ نہیں جمع ہو سکتا۔ تو اللہ نے ایک برزخی مخلوق پیدا فرمائی کہ وہ بشر بھی ہیں۔ مگر اتنے کامل بشر کہ لطافتوں میں اللہ سے واصل ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ تو بندوں کے خدا تک پہنچنے کے لئے نبی واسطہ ہیں۔ نبی نہ ہو تو بندہ کا پہنچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اللہ کا کلام اتنی عظمت و جلالت میں ہے کہ بندہ کا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو کلام رسول بیچ میں برزخ ہے کہ اس واسطے سے ہم کلام خداوندی تک پہنچیں گے۔

اگر کوئی کلام رسول کا واسطہ بیچ میں سے نکال دے اور چاہے کہ چھلانگ مار کر اللہ کے کلام تک پہنچ جائے تو وہ نیچے آ پڑے گا اور وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے کہ وہ کلام بہت اونچائی پر ہے، جیسے ذات خداوندی تک پہنچنا بغیر ذوات رسل کے ممکن نہیں ایسے ہی کلام ربانی کے حقائق تک پہنچنا ممکن نہیں ورنہ پھر نبی کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟۔ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن شریف لکھ کر بیت اللہ شریف کی چھت پر رکھ دیتے اور ایک آواز لگا دیتے۔ اے لوگو! تم سب مریضان نفوس ہو اور یہ نسخہ شفا ہے اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج کر لیا کرو، پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہ تھی مگر پیغمبر بھیجا گیا۔ جیسے محض طب کی کتابوں کا مطالعہ کر کے نہ اپنا علاج کر سکتا ہے نہ غیر کا۔ کیونکہ کتاب میں اصول بیان ہوں گے۔ لیکن نبض پہچان کر کہ فلاں کو کیا روگ ہے؟ فلاں کا مزاج کیسا ہے؟ اس کے لئے تجربہ و تربیت کی ضرورت ہے اور کتاب کے اوراق تربیت کرتے نہیں۔ تربیت کرنے والی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ اگر شخصیتوں سے قطع نظر کر لیا جائے اور محض کتاب کے اوراق رہ جائیں تو کالے کالے نقوش تو سامنے آئیں گے۔ تربیت اور کیفیات سامنے نہ آئیں گی۔ اسی لئے اللہ کے کلام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کلام رسول کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم نہیں پہنچ سکتے۔ جو آج خوشی کا مقام ہے کہ کلام رسول آپ تک پہنچا، اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا، محض قوت مطالعہ یا کتب بینی سے یا اختراع نفس سے نہیں پہنچا کہ اس میں نفس کا بھی دخل ہوتا ہے، شیطان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سلسلہ جڑ گیا۔ تو وہ طلبہ خوش نصیب ہیں جنہیں آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہو گئی اور ان کا قلب گویا قلب نبوت سے بواسطہ کلام نبوت واصل ہو گیا۔

امت محمدیہ کی سب سے بڑی عظمت...... اس امت کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس امت میں اللہ کا کلام مستند طریق پر موجود ہے۔ آج قرآن کے بارے میں اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اس کی سند کیا ہے تو امت کے علماء اپنی جگہ ہیں میں یہ کہوں گا کہ میری سند حق تعالیٰ سے متصل ہے۔ مجھے یہ قرآن میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا، ان کو قاری عبدالرحمٰن نے حفظ کرایا اور قرات سکھلائی، انہیں قاری عبداللہ صاحب مکی نے حفظ کرایا اور قرات سکھلائی اور انہیں ابراہیم نے سکھلائی اور سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریل علیہ السلام نے پڑھا

اور جبریلؑ کے سامنے حق تعالیٰ شانہ' نے تکلم فرمایا، تو حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ' تک پہنچ جاتی ہے۔

دنیا میں آج کون سی کتاب ہے جو سند متصل کے ساتھ اللہ تک پہنچے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہو کہ یہ الہامی کتاب ہے تورات، انجیل یا زبور ہے کسی کی سند نہیں ہے۔ بس ایک ہی سند ہے کہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ ① "باپ دادا کو یوں ہی کہتے سنتے چلے آتے ہیں"۔ ممکن ہے باپ دادا نے غلطی کی ہو۔ جب تک سند سامنے نہ ہو غلطی کا امکان ہے لیکن اگر سند سامنے ہے تو غلطی کا امکان نہیں ہے۔

فن اسماء الرجال...... اور مسلمانوں نے یہی نہیں کیا کہ سند لے لی۔ نہیں، بلکہ روایان حدیث کے لئے ایک مستقل فن ایجاد کیا۔ اور پچاس ہزار ایسے آدمیوں کی سوانح عمریاں مرتب کیں جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں۔ ان کے نسب نامے کیا تھے؟ ان کا کیریکٹر کیا تھا؟ ان کا کردار کیا تھا؟ ان کا حافظہ کیسا تھا؟ ان کا عدل وانصاف کیسا تھا؟ انکے قلب کے اخلاق کیسے تھے؟ پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمریاں (فن اسماء الرجال) مرتب کر دیں۔ تو وہ کسوٹی ہے کہ دیکھ کر معلوم کر لیں کہ یہ راوی ہیں جن کے واسطے سے کتاب مبین ہم تک پہنچی ہے۔

غرض مسلمان اگر اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کا کلام لئے بیٹھے ہیں تو اس بھروسے پر نہیں کہ باپ دادا سے یوں ہی سنتے چلے آرہے ہیں۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ ② چاہے باپ دادا نے غلطی کی ہو، چاہے عقل نہ لڑائی ہو، پھر بھی تم یہی کہو گے کہ باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ کوئی سند کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو افواہ ہے۔ افواہاً کوئی چیز معتبر نہیں ہو سکتی۔ سند یہ ہے کہ میں نے فلاں سے پڑھا اور اس نے فلاں سے پڑھا اور اسی طور پر اس کی اللہ کے رسول تک انتہاء ہو جائے۔

دین کے ہر ہر جز کی سند...... تو مسلمانوں کے پاس ایک ایک حدیث کی سند موجود ہے۔ اگر چھوٹا جملہ بھی پڑھیں گے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچائیں گے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں استناد کی عادت پڑ گئی، وہ محض قرآن وحدیث نقل نہیں کرتے، بلکہ کوئی دینی فن نہیں کہ جس کی سند نہ ہو۔ آپ ہدایہ پڑھائیں گے، اس کی سند موجود ہے کہ صاحب ہدایہ سے ہمارے استاذوں نے اس اس طرح حاصل کیا۔ حتیٰ کہ تصوف کے اندر عرفاء حقیقت اور حضرات صوفیہ نے بھی سند کیساتھ۔

شیخ ابو اسحاق کا رسالہ قشیریہ ہے۔ اس میں حضرت جنید اور حضرت شبلی کے واقعات بھی نقل کئے ہیں اور سندیں بھی نقل کی ہیں تصوف کے اصول نقل کئے ہیں تو سندیں نقل کی ہیں۔ تصوف کا یہ واقعہ جنید یا شبلی سے یا سید الطائفہ سے فلاں سند کے ساتھ ہمیں پہنچا ہے۔

اور اس میں پھر آگے قرآن وحدیث سے ماخذ پیش کیا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے اخذ کیا ہے۔ تو تصوف کی سندیں الگ موجود ہیں، فقہ کی الگ، حدیث کی الگ۔ اور قرآن کی سند تو تواتر طبقات

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۰.

کے ساتھ ہے تو کوئی دینی فن یا دینی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان یہ کہہ کے نقل کریں کہ ہم باپ دادا سے یونہی سنتے چلے آرہے ہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ میں نے فلاں استاذ سے پڑھا وہ اپنے استاذ کا حوالہ دے گا، وہ اپنے استاذ کا تو یہ کسوٹی ہے جس کے ہاتھ میں سند نہ ہو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا علم مستند نہیں، ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی بات مانی جائے گی جو سند متصل سے بات کرے۔

تو آج ان طلباء کے لئے مبارکباد دینے کا وقت ہے جنہیں متن حدیث حاصل ہوا اور سند متصل کے ساتھ ہوا اس واسطے میں ان طلبہ کو بھی مبارکباد دیتا ہے۔ اور ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں، مدرسہ کے معاونین اور منتظمین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی محنتوں کا پھل ان کے سامنے آ گیا اور سند کے ساتھ چند علماء تیار ہو گئے۔

مراتب علماء...... یہ ظاہر ہے کہ علماء سب ایک درجہ کے نہیں ہوتے کوئی اعلیٰ فہم رکھتا ہے کوئی متوسط درجے کا۔ ﴿فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾. تو ایک درجے کے سارے نہیں ہوتے۔ بعض دقیق الفہم ہوتے ہیں۔ بعض بلید الفہم ہوتے ہیں، بعض غبی بھی ہوتے ہیں مگر خیر دیندار تو بن جاتے ہیں۔ ان کی عبادت اگر علم تک نہ پہنچا سکے تو کم سے کم ان کا عمل صحیح ہی قائم ہو جاتا ہے۔ بہر حال علماء ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ مگر سب کے ساتھ حسن ظن رکھنا ضروری ہے جب کہ وہ سند کے ساتھ روایت کریں اور انہیں سند کے ساتھ علم حاصل ہوا ہو تو ہم سب کا فرض ہے کہ انکے ساتھ حسن ظن رکھیں۔ ان کی عظمت کریں۔ وہ عظمت ان کی ذات کی نہیں ہوتی۔ ذات تو گوشت پوست سے بنی ہوئی ہے وہ ہمارے اندر بھی موجود ہے، اس کی کیا عظمت ہے؟

وہ عظمت علم کی ہوتی ہے اور ان کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کے پاس سے علم آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس واسطے علم کی اور اس نسبت اور سند کی تعظیم کی جاتی ہے۔ جو انہیں حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ تو یہ سب طلباء اور علماء جو تیار ہوئے ہیں، ہم سب کے لئے مستحق اور مستوجب تعظیم و عظمت اور وقار کے ہیں۔ "لِوَجْهِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" اور "لِوَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى" کہ انہیں حق تعالیٰ سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہو گئی ہے اس لئے ہم انکی عظمت کریں گے، کسی عالم کی تحقیر کسی طرح بھی جائز نہیں اس کی تحقیر سے علم کی تحقیر ہوتی ہے اور علم اللہ اور اللہ کے رسول کا ہے اس کی تحقیر ہمارے لئے کب جائز ہے؟ تو مستند عالم واجب التعظیم اور واجب التکریم ہے۔ اس واسطے ان دونوں کو عظمت دی جائے گی اور ان کو مبارکباد دی جائے گی۔ تو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اجازت حدیث...... اور چونکہ ختم کے لئے اپنی عنایت اور مہربانی سے انہوں نے مجھے بلایا اور اس سعادت میں شریک کیا کہ میں ختم کراؤں۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ میں اپنی سند پیش کر کے اس سند کی اجازت انہیں دوں جن طلبہ نے میرے سامنے حدیث پڑھی۔

میرا سلسلہ ایک یہ ہے حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ اور وہ شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں (اس سے آگے سلسلہ سند ترمذی شریف میں مرقوم ہے) اور دوسرا سلسلہ سند یہ ہے کہ بندہ کو مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارن پوری نے اور ان کو مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ان کو شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ الی آخر سند نے اجازت فرمائی۔ ہر دو سلسلہ سند سے میں ان طلباء کرام کو اجازت حدیث دیتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دورۂ افریقہ سے واپسی پرالوداعی خطاب

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

محبت وشکر گذاری کو الفاظ میں ادانہیں کیا جاسکتا...... بزرگان محترم، صاحب حق صدر باوقار، اراکین جمعیت علماء، اور ذمہ داران قوم! اس پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں متعدد جلسے، مجلسیں ہوتی رہیں اور میں ان میں حاضر رہا۔ آج بھی ایک بڑا اجتماع سامنے ہے۔ لیکن اور جلسوں کی نسبتاً اس جلسے کی نوعیت کچھ جداگانہ ہے۔

اس سے پہلے جو جلسے ہوتے تھے وہ درحقیقت سننے کیلئے تھے اور آج کا جلسہ کچھ کہنے کیلئے منعقد کیا گیا ہے اس سے پہلے آپ حضرات سنتے تھے اور بولنے والا ایک ہی ہوتا تھا۔ لیکن آج میں سننے والا ہوں۔

سب حضرات بولنے والے ہیں۔ جس کی ترجمانی وہ حضرات فرمارہے تھے، جنہوں نے ابھی کلام کیا۔ ہمارے مولانا عمردین صاحب، ہمارے محترم احمد اللہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب یہ حضرات کچھ کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا اور اس کو یوں کہنا چاہئے کہ اس ناچیز خادم کے پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں جو کچھ آپ کا تاثر ہوا، اسے قدردانی کے ساتھ اور شکریہ کے الفاظ کے ساتھ آپ نے ظاہر فرمایا۔

ان الفاظ سے اور پچیس روزہ محبت کے طرزِ عمل سے، خود میرے اندر بھی محبت وشکر گذاری کے جذبات پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ میں انہیں الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتا۔ وہ قلب کی کیفیات ہیں اور کیفیات الفاظ میں نہیں آسکتیں، کتنے بھی بڑے سے بڑے الفاظ میں کیفیات کی تصویر پر کھینچی جائے، محبت کو ظاہر کیا جائے لیکن وہ ظاہر ہو ہی نہیں سکتی۔ الفاظ کا دامن تنگ ہے اور جذبات محبت کا میدان بے حد وسیع ہے۔ تو الفاظ کی قبا کا لباس ان پر چست ہو ہی نہیں سکتا۔ کتنا ہی آدمی کھل کر بیان کرے۔ حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پر سید یکے کہ عاشقی چیست؟

کسی عاشق سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی عاشقی اور محبت کیا چیز ہے، اسے کچھ الفاظ میں بیان کرو ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

گفتم کہ تو چو ماشوی بدانی

یعنی میں محبت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ قلبی کیفیات اتنی لطیف اور باریک ہوتی ہیں کہ الفاظ میں نہ سما سکتی ہیں نہ الفاظ ان کو ادا کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ نفسانی کیفیات ہوں یا روحانی، الفاظ سے بالاتر ہیں۔

اگر کوئی بچہ آپ سے سوال کرے کہ جوانی کی کیفیات کیا ہیں؟ ذرا مجھے بتلا دیجئے۔ آپ کیا بتلائیں گے یوں کہیں گے کہ بیٹا! ایک دس برس کا انتظار کرو۔ جوان ہو جاؤ گے۔ خود بخود پتہ چل جائیگا کہ جوانی کیا چیز ہے۔ اس کی کی کیفیات ہیں۔ ایک نوجوان آدمی بوڑھے سے سوال کرے کہ بڑے میاں! مجھے بڑھاپے کی کیفیات بتلا دو؟ بوڑھا یہی کہے گا کہ: خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ بڑھاپے تک پہنچ جاؤ۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔ بڑھاپا کیا ہے۔ میں لفظوں میں کیسے ادا کروں؟

اسی طرح جب ایک بوڑھا آدمی اس کیفیت کو جو کسی محتضر کی جان پر گزر رہی ہو' کسی پر نزع کی کیفیت ہو' جان کنی ہو۔ اس کو شریعت اسلام میں محتضر کہتے ہیں کہ موت اس کے پاس آ گئی ہو۔ اب ایک بوڑھا اس محتضر سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ الفاظ میں مجھے بتلا دو۔ وہ کہے گا کہ اس کیفیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ چند دنوں میں تمہارے اوپر بھی آنے والی ہے۔ اس وقت سمجھ میں آ جائے گی۔ یا ایک محتضر کسی میت سے پوچھے کہ: قبر میں تم پر کیا کیفیات گزریں۔ وہ بھی کہے گا بھئی! قبر میں آ جانا۔ آنا تو ہے ہی۔ وہاں سمجھ میں آ جائے گی۔ میں کیا بیان کروں؟ تو کیفیات کو نہ الفاظ ادا کر سکتے ہیں نہ وہ الفاظ میں سما سکتی ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے لگے کہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟ میں کیا بیان کروں؟ کتنا ہی بیان کروں، حق ادا نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے یہ کہوں کہ چار پیسے خرچ کرو، سیب خریدو، کاٹ کے کھاؤ، پتہ چل جائے گا کہ سیب کی کیا کیفیات ہیں؟ مزے کو الفاظ میں میں کیسے ادا کروں؟ تو سیب کا مزہ ایک حسی مادی چیز ہے، وہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا، عاشقی اور محبت الفاظ میں کیسے سما سکتی ہے؟ کیسے ترجمانی ہو سکتی ہے؟ آپ حضرات کے محبت کے عمل سے جو شکر گزاری اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ الفاظ نہیں ہیں کہ انہیں ادا کیا جائے۔

آپ کی محبت کے جذبات دل کا جوہر بن گئے ہیں جو آخرت تک ساتھ جائیں گے...... پھر ایک طرف تو پچیس دن کا عمل ہے اور ایک طرف قول ہی قول ہے۔ کوئی عمل مجھ سے بن ہی نہیں پڑا۔ آپ حضرات کی طرف سے عمل کا ظہور ہوا۔ محبت کا عمل، مدارات کا عمل، اکرام ضیف کا عمل، آپ نے یہ عمل کر کے دکھلایا۔ ایک دن کی مہمانی ہو، دو دن کی ہو؟ یہ پچیس دن کی مہمانی؟ شرعی طور پر آدمی تین دن مہمان ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر مستحب ہے۔ گو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تین دن کی مہمانی واجب تھی۔ اور حدیث میں فرمایا گیا۔ اس زمانے کے لوگوں کو خطاب تھا کہ اگر کوئی تین دن مہمانی نہ کرے، ایک ہی دن میں جواب دے دے، تو مہمان کو حق ہوتا تھا کہ میزبان کے گھر سے اتنی قیمت کی روٹیاں اٹھا کے لے جائے جس میں تین دن کی مہمانی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ابتدائی حکم منسوخ کر

دیا گیا۔ ایک وقتی طور پر یہ حکم تھا، کیونکہ غربت کا دور تھا۔ اسلام لانے کے لئے لوگ آتے تھے، ان کی مدارات اور مہمانی نہ کی جاتی، وہ دین کی دولت سے محروم ہو جاتے۔ اس لئے تین دن کی مہمانی واجب قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ مستحب اور اعلیٰ واولیٰ کا درجہ ہو گیا۔ البتہ اس سے کم جتنے دن یا جتنی دیر ٹھہرے، اس کا اکرام واجب قرار دیا گیا، بلکہ اس کو ایمان کا جز بتلایا گیا اور فرمایا گیا: ''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ.'' ① ''جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مہمان کی مدارات کرے''۔

مہمان کی مدارات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے روزانہ مرغ ہی کھلایا جائے یا بریانی کھلائی جائے، یہ معنی نہیں۔ بلکہ یہ کہ جو کچھ بھی کھلایا جائے، محبت سے کھلایا جائے، چاہے چٹنی روٹی ہو اور اگر گوشت بریانی ہو اور ساتھ محبت و مدارات بھی ہو تو یہ نور علی نور ہے۔ غرض پچیس دن تک اسی طرح کی مہمانی کیا جانا، یہ مستحب ہونے کے درجات سے بالاتر ہے۔ واجبات میں نہیں تھی۔ محض محبت اور مخلصانہ جذبات تھے۔ تو پچیس دن کے عمل سے جو جذبات و تاثرات محبت اور شکر گزاری کے پیدا ہوئے وہ دس پندرہ منٹ میں الفاظ میں کیسے ادا ہو سکتے ہیں۔ وہ جذبات تو ساتھ جائیں گے، وہ دل کا جوہر بن گئے۔

اور یہ محبت کے جذبات انشاء اللہ آخرت تک بھی جائیں گے، دنیا تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ آپ حضرات نے جو مدارات و محبت فرمائی، وہ دنیا کی خاطر نہیں فرمائی، وہ آخرت کی خاطر فرمائی۔ کسی دنیوی رشتے سے نہیں کی کہ میرے سے آپ کی کوئی غرض متعلق تھی یا کوئی دنیا کا مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ محض اپنے دین کی محبت میں اس شبہ کی بناء پر کہ یہ شخص ہمیں کچھ نیک ہدایت کرے گا۔ تو یہ آخرت کے جذبات تھے۔ اس لئے اس کے تاثرات بھی یہیں تک نہیں ہیں، آخرت تک جائیں گے۔ جو چیز دنیا سے آخرت تک جانے والی ہو، اس کو الفاظ میں کس طرح سمایا جا سکے اور کون سا ایسا لفظ ہے کہ اس میں دنیا و آخرت دونوں سمٹ کر آ جائیں۔ اس لئے یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں ان جذبات تشکر کو یا اپنے ان تاثرات کو جو آپ حضرات کی محبت سے پیدا ہوئے۔ الفاظ میں ادا کر سکوں۔ بجز اس کے کہ دعا کی ہے اور یہ وعدہ ہے کہ آئندہ بھی دعا کروں گا۔ نیز دعا کے سوا اور کسی چیز کی ہم میں استطاعت بھی نہیں ہے۔

اور یہ اس لئے بھی کہ دعاء کے لئے اہلیت شرط نہیں ہے۔ نااہل بھی دعاء مانگتا ہے، اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ گنہگار بھی دعاء مانگتا ہے۔ اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ اس لئے دعاء مانگنے کے لئے اہل ہونا ضروری نہیں۔ اسی دعاء کی آپ سے بھی استدعا ہے۔ بجز دعا کے میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں پیش کر سکوں۔

مولانا عمر دین صاحب نے یہ فرمایا کہ: وہ خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات سے تقریر کر رہے ہیں۔ خوشی اس کی ظاہر ہے کہ ان کے خیال کے مطابق پچیس روزہ قیام میں کچھ کام بنا رنج اس کا ظاہر کر رہے ہیں کہ آج

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار والضیف، ج: ۱ ص: ۶۸ رقم: ۴۷.

جدائی کا دن ہے لیکن میرے اندر اس وقت سوائے رنج کے کوئی خوشی کا نشان نہیں ہے۔

اس لئے جدائی کا غم الگ ہے اور کام نہ بننے کا غم الگ ہے اس لئے کہ کوئی خدمت نہیں بن پڑی۔ یہ تو آپ کی قدردانی اور محبت کی بات ہے جو کہ آپ نے فرمایا کہ: اپنا سب وقت لگا دیا۔ کچھ بھی وقت نہیں لگایا۔ محض چند ساعتیں ایسی گزری ہیں جس میں کچھ عرض کر سکا۔ جو مجھے کرنا چاہئے تھا' نہیں کر سکا۔ اس لئے میرے واسطے تو غم ہی غم کا موقع ہے۔ جدائی کا غم بھی ہے اور کچھ نہ کر سکنے کا غم بھی ہے۔ اب سوائے اس کے میں شکریہ کی بجائے آپ حضرات سے معافی چاہوں اور کیا کر سکتا ہوں جو تقصیرات ہوئی ہیں، ان سے آپ درگزر فرمائیں اور جو خدمت میں قصور ہوا ہے، اس کو نظر انداز فرمائیں۔ کریموں کی کریم النفسی یہی ہوتی ہے کہ قصور و تقصیر پر درگزر اور معافی کا برتاؤ کیا جائے۔

اصل شکریہ عملی زندگی میں انقلاب ہے...... بہر حال ان دنوں میں جو بھی آپ نے خلوص اور محبت کا برتاؤ فرمایا، اس کے اثرات دل کے اندر موجود ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ان کا حقیقی شکریہ یہ ہے کہ جو گذارشات پیش کی گئی ہیں، ان پر عملی زندگی میں کوئی چیز سامنے آئے۔ عمل میں انقلاب پیدا ہو۔ یہ اصل شکر۔ یہ ہے شرعاً بھی شکریہ اسی کو کہتے ہیں کہ اگر قول کی بات بتائی گئی ہو، تو وہ قول کیا جائے، یہ شکریہ ہے اور اگر عمل کی بات بتائی گئی ہو، عمل کیا جائے، یہ شکریہ ہے اس لئے میں تو آپ کے شکریہ کا متمنی ہوں۔

یہ بھی ایک بے جا جرات اور جسارت ہے کہ میں آپ سے یوں کہوں کہ میرا شکریہ ادا کیجئے۔ مگر ہاں میں یہ جرات کرتا ہوں۔ آپ شکریہ ادا کریں۔ مگر عملی شکریہ ادا کریں۔ اگر ان پچیس دنوں میں کوئی کام کی بات آپ کے کانوں میں پڑ گئی ہے۔ تو اس پر عمل کر کے دکھلائیں۔

اور حقیقت میں یہ میرا شکریہ نہیں ہوگا۔ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی اور دین اسلام کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکر گزاری ہوگی کہ جن کی جوتیوں کے صدقے میں ہم کچھ کہہ سکے اور آپ کچھ سن سکے۔ تو اصل شکریہ جس کی مجھے خود طلب اور تمنا ہے وہ یہ ہے کہ عملی طور پر ہماری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ آپ حضرات تقریباً سو یا اسی سال سے یہاں ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد یہاں آئے، تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی آپ کو آج دولت یا عیش میسر ہے، یہ ان آباء و اجداد کا طفیل ہے۔ یہ ان کی دعاؤں کی اور خلوص کی برکت ہے۔ وہ آئے اور اپنا دین ساتھ لے کر آئے، دنیا بھی کمائی اور انہوں نے دین بھی کمایا اور دین کو مضبوطی سے پکڑا۔ ان کے دین کے آثار موجود ہیں۔ یہ جو آج اس ماحول میں آپ کے اندر دینی جذبات موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کا طفیل ہے۔ یہ ان کے اثرات ہیں جو آبائی طور پر آپ کے اندر منتقل ہیں۔ اسی سے آپ اندازہ کر لیں کہ اگر آپ ان تاثرات کو باقی رکھیں گے۔ آپ کی اولاد میں بھی وہ اثرات منتقل ہوں گے، جیسے ان آباء و اجداد سے آپ نے کچھ پایا، آپ کی اولاد بھی کچھ پائے گی اور اگر خدانخواستہ آپ نے ان اثرات کو چھوڑ دیا تو اولاد سے بھی کوئی توقع نہ رکھی جائے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آنے والے اپنے دین میں بھی مضبوط تھے' دنیا میں بھی ان کے معاملات میں

کھرا پن اور خالص دینی رنگ تھا اور ڈھیلا پن نہیں تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا ہے کہ: جب کوئی قوم میری اطاعت کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اس پر رحمت کرتا ہوں اور رحمت کا اثر اس کی سات پشت تک جاتا ہے اور جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے۔ میں بھی اس پر لعنت کرتا ہوں اور میری لعنت کا اثر بھی سات پشت تک جاتا ہے۔ یہ جو آپ کی پشتوں میں دین اور جذبات دین کا اثر ہے۔ یہ ان بزرگوں کے اثرات ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کا طفیل ہے، جنہوں نے اپنے قلوب کو دین سے بھر رکھا تھا۔ یہی عبرت کا مقام ہے۔ ہم بھی اگر اسی طرح سے ان کے دین کے جذبات سے بھر پور ہیں۔ تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ اس دین کا اثر ہماری اولادوں میں بھی قائم رہے گا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی شکریہ یہ ہے کہ دین کی باتوں کو عملی طور پر دنیا کے سامنے ظاہر کیا جائے۔

اسلام در حقیقت نام ہی عمل کا ہے۔ اسلام قول یا خیال کا نام نہیں ہے۔ حدیث میں ہے "اَلْاِیْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِیَةٌ" ① ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جو قلب میں رہتی ہے، وہ عقائد کا مجموعہ ہے۔ اسلام کھلی ہوئی چیز ہے جو عمل کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ تو نماز، روزہ، حج زکوٰۃ سچ بولنا اور حسن معاشرۃ وغیرہ یہ اسلام ہے اور اللہ کو ایک جاننا، رسول کو برحق ماننا، قیامت کو برحق ماننا، یہ ایمان ہے۔ ایمان مثل جڑ کے ہے جو دلوں میں مخفی رہتا ہے اور اسلام مثل شاخوں اور پھل پھول کے ہے جو اوپر نظر آتا ہے۔ اس لئے اسلام عمل ہی کو کہتے ہیں، کسی تخیل کا نام اسلام نہیں ہے، اس لئے اسلامی چیز عمل سے ظاہر ہوگی، قول سے نہیں ہوگی اور جو چیزیں پیش کی گئی ہیں، وہ اسلام کی چیزیں پیش کی گئی ہیں۔

اس لئے کہ ایمان تو بحمد اللہ ہر ایک دل میں موجود ہے۔ ہم جتنے بھی ہیں، آخرت کے، اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت کے بھی قائل ہیں اور سب چیزوں کو حق مانتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو موجود ہی ہے۔ کسر اور کوتاہی جو ہم میں ہے وہ عمل میں ہے عقائد میں نہیں ہے۔ اس واسطے عمل ہی کی چیزیں زیادہ بیان کی گئیں۔ اس لئے اس چیز کی تمنا اور توقع بھی ہے کہ وہی چیزیں آگے ظاہر بھی ہوں۔ تو اصل شکریہ وہی ہوگا۔ اس لئے قول کا شکریہ بلاشبہ ایک قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے یہ شکریہ جس طرح زبان اور قلب پر آتا ہے، اسی طرح عمل پر بھی آتا ہے۔ قلب کے شکر کے معنی اعتراف کے ہیں۔ زبانی شکر کے معنی بولنے کے ہیں۔ عملی شکر کے معنی عمل کرنے کے ہیں۔ تو قلب میں اور زبان پر بھی بحمد اللہ شکر گزاری کے جذبات اور اقوال موجود ہیں۔ اب آگے انتظار ہے تو عملی زندگی کا ہے۔ عملی چیزیں سامنے آئیں، جن کے اوپر چلا جائے۔ پھر شکریئے کی تکمیل ہو جائے گی۔

دنیوی مشکلات کے حل کے لئے دینی و روحانی تدبیر...... جو حالات آج کل پوری دنیا میں اور یہاں

① المسند للامام احمد، مسند انس بن مالکؓ، ج:۳ ص:۱۳۴ رقم: ۱۲۴۰۴۔

(افریقہ) بھی پیش آ رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر دین ہی کے اعتبار سے فی الحقیقت پریشان کن ہیں۔ دنیوی اعتبار سے مشکلات ہیں مگر دنیا کی مشکلات زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتیں کیونکہ عارضی ہوتی ہیں۔ ہوتی بھی ہیں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ اگر دینی تکلیف پیش آئے، وہ زیادہ سوہان روح ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے مصیبت کا تذکرہ کیا۔ تو کیسا اچھا حل دل کو ہلکا کرنے کے لئے بتلایا۔

فرمایا جب کوئی مصیبت آئے پہلے یہ سوچ کہ وہ تمہارے دین پر آئی ہے یا دنیا پر آئی ہے۔ اگر دنیا پر آئی ہے تو وہ شکر گزاری کا موقع ہے۔ کہ الحمدللہ دین محفوظ ہے، جو کچھ گزر رہی ہے دنیا پر گزر رہی ہے اور دنیا کی مصیبت چند دن کی ہوتی ہے۔ مگر دین کی مصیبت پائیدار ہوتی ہے، وہ لمبی چلتی ہے، اس کے آثار زیادہ ہوتے ہیں۔ اس واسطے اگر دین آفتوں سے محفوظ ہے، تو ہمارے لئے شکر کا موقع ہے۔

دنیا کی آفات بلاشبہ تکلیف دہ ہیں۔ لیکن ان کے حل بھی ہیں دنیوی اعتبار سے بھی، شرعی اعتبار سے بھی، وہ مصیبتیں ختم بھی ہو سکتی ہیں۔ خود دنیا ہی ختم ہونے والی ہے۔ تو اس کی مصیبتیں بھی عارضی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے، وہ اپنی ایک عمر لے کر آتی ہے۔ اس میں اجمالی درجہ میں اس کا کچھ دفعیہ اور تدبیر کرو۔ مگر زیادہ اللہ کو سونپ دو۔ جب اس کی عمر پوری ہوگی، وہ اپنے وقت پر خود ختم ہو جائے گی اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارے تو بعض دفعہ الٹ پڑ جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص بیمار ہو تو، ڈاکٹر یا طبیب کو بلائے اور اپنا معمولی علاج شروع کر دے، بیماری اپنے وقت پر گزر جائے گی لیکن اگر اتنا اہتمام کیا کہ ایک ڈاکٹر صبح کو اور ایک شام کو اور ایک دو پہر کو علاج کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ وہ علاج معالجہ ہی خود مرض بن جاتا ہے۔ مرض کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

اگر کوئی چڑیا کسی جال میں پھنس جائے، تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ آہستہ بیٹھی غور کرتی رہے کہ کونسا سوراخ ہے جس سے میں جال سے نکل کر بچوں اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارنے شروع کئے تو جال اتنا پھنس جائے گا کہ پھر نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ تو مصیبت جب آتی ہے تو زیادہ ہاتھ پیر مارنے سے آتی ہے۔ صبر و تحمل اور تدبیر کہ کس راستے سے نکلیں، اس کی تدبیر، کیا ہو سکتی ہے۔ سکون و صبر کے ساتھ وہ کی جائے۔ کچھ مصیبت کو گوارا کر لیا جائے۔ کچھ تدبیر کی جائے اگر آدمی یوں چاہے کہ مصیبت آنے نہ پائے اور بالکل ختم ہو جائے۔ یہ ناممکن ہوا کرتا ہے یہ دنیا کی فطرت کے خلاف ہے۔ تو کچھ تھوڑی سی وہ گوارہ کی جائے، تھوڑی سی تدبیر کی جائے۔ بیچ کا راستہ نکل آتا ہے۔ مصیبت کو ہاتھ پیر مار کر بالکل دفع کرے تو آدمی پھنس جائے گا اور بالکل چپ بیٹھا رہے تب بھی دوامی طور پر پھنسا رہے گا۔ بیچ ہی کی چال کارآمد ہوتی ہے۔ بہر حال دنیوی مصائب آتے بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔ زیادہ خیال کرنے کی چیز یہ ہے کہ دینی مشکل نہ ہو جو ہمارے دین پر کچھ بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے جتنا بھی عرض کیا وہ دینی امور کے بارے میں عرض کیا، دنیوی، سیاسی یا انتظامی

معاملات ظاہر ہے کہ میں ایک غیر ملکی آدمی کہہ ہی کیا سکتا ہوں اور کہنے کی ضرورت جب ہو، جب ملک کے اندر با فکر اور باتدبیر لوگ موجود نہ ہوں وہ خود ہی متفکر ہیں اور تدبیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنا کام تو یہ ہے کہ دعا کی جائے۔ ہم دعا کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہر مشکل سے آپ حضرات کو بچائے اور امید ہے کہ مشکلات رفع ہوں گی۔ حسن نیت اور تدبر کے ساتھ چلا جائے اور اللہ سے معاملہ صحیح کر لیا جائے، مشکلات رفع ہو جائیں گی اور مشکلات تو انسان پر آتی ہیں۔ اس لئے کہ دنیا نام ہی مشکلات کا ہے۔ اگر مشکلات نہ ہوں پھر اس کو جنت کیوں نہ کہا جائے؟ اور جنت کی پھر طلب کیوں ہو؟ یہ سب اس لئے ہے کہ دنیا مشکلات کا نام ہے۔

بہر حال اس کی دعاء ہے اور انشاء اللہ رہے گی کہ حق تعالیٰ آپ حضرات کی ہر قسم کی دینی اور دنیوی مشکلات حل فرماوے۔ (آمین)

مصائب سے بری و بالا کردے اور طمانیت وسکون کی زندگی دین و دنیا دونوں کے لحاظ سے نصیب فرماوے۔ (آمین)

اس لئے میں جو کچھ بھی عرض کر رہا ہوں، وہ درحقیقت اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار ہے کہ خود میں کتنا متاثر ہوا۔ آپ تو اپنے دینی جذبات کی وجہ سے کچھ کلام سن کے متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن میں عمل کو دیکھ کے متاثر ہوں کہ پچیس دن میں ہر قسم کی محبت ومدارات اور قدردانی سامنے آئی۔ ابتداء میں آتے ہوئے مجھے تشویش تھی کہ معلوم نہیں کیسا ماحول ہوگا۔ لوگ کچھ بات بھی سن سکیں گے یا نہیں؟ کس قسم کے جذبات ہوں گے۔ جب دور بیٹھے ہوئے اجنبیت ہوتی ہے، تو آدمی کو تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے کہ میرے عزیز نے بیان کیا۔ آنے کے بعد پہلے ہی دن معلوم ہوا کہ اپنے عزیزوں میں آ گئے۔ کوئی اجنبیت اور بعد محسوس نہیں ہوا۔ بالکل جیسے ہم گھر والے ہوتے ہیں اور پچیس دن کے بعد تو آدمی ویسے ہی گھر والا ہو جاتا ہے۔ مگر ہم تو پہلے ہی دن گھر والے ہو گئے۔

اس پر میں جتنا بھی شکر گزار اور اپنے جذبات اور قلب کے تاثرات کو ظاہر کروں، وہ کم ہی کم ہوں گے، سوائے اس کے کہ میں دعا کروں اور دعا کا وعدہ کروں اور آپ حضرات کے سامنے پیش کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ اتنی بات آپ حضرات سے عرض کرنی ہے کہ یہ مشکلات کا زمانہ ہے۔ جس طرح اور تدابیر کی جاتی ہیں اور اہل الرائے جو تدابیر بتلاتے ہیں۔ اس پر چلا جائے۔ وہ تدبیریں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن روحانی طور پر بعض ادعیہ اور چیزیں ایسی ہیں، وہ بھی مشکلات کے حل کے اندر معین ہیں اور ایک مسلم کیلئے ان سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اللہ کے بتلائے ہوئے راستہ پر آدمی چل پڑے اور اس سے قطع نظر کرے کہ کیا ہوگا؟ بس وہ حل ہو جائے گی۔ مگر ہم ایسے ماحول میں ہیں۔ اس درجے کا تو ہمارا ایمان نہیں ہے کہ بالکل ہر چیز سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو روحانی سلسلے میں ڈالدیں لیکن میں کہتا ہوں کہ دنیوی ومعاشرتی تدابیر ضرور ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ دینی تدابیر سے بھی غافل نہ ہوا جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض غزوات اور جنگوں میں جب غیر مسلموں سے مقابلہ پڑا

ہے تو حق تعالیٰ نے اس وقت آیت اتاری۔ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ① اور اس کا ثمرہ بھی بتلایا کہ ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ ② اور جوں ہی صحابہؓ نے اس کا ورد شروع کیا تو اللہ کی خبر ہے کہ انقلاب پیدا ہو گیا اور مصیبت سے نعمت آ گئی۔ اور اللہ کے فضل سے برائیاں دور ہو گئیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص کم سے کم روزانہ صبح کی نماز کے وقت سو مرتبہ ورد کر لیا کرے اور یہ نیت کر لیا کرے کہ میری بھی مشکل حل ہو اور میرے بھائیوں کی بھی۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے۔ ہر ایک وعدہ ٹل سکتا ہے اللہ کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ یہ تو لکھی پڑھی بات ہے۔ اس سے مشکلات حل ہوں گی۔ اس لئے ایک تو یہ اور ایک یہ آیت کریمہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ③ یہ حضرت یونس علیہ السلام کو تدبیر بتلائی گئی تھی جب کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے، اور مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو یہ دعاء تلقین فرمائی۔

اس کا اثر یہ نکلا کہ مصیبت ختم ہوئی اور ایسی بہترین فضا سامنے آئی کہ یونس علیہ السلام کے سامنے کامیابیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ کوئی ناکامی باقی نہیں رہی۔ یہ ہمارے اعتقادات میں کچھ ضعف اور سستی ہے، جس کی وجہ سے ہم پورا دھیان نہ دے سکے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تجربہ تو کر کے دیکھئے، انشاء اللہ حالات بدلیں گے، یہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے۔ کسی اور کا بتلایا ہوا نسخہ نہیں ہے، جس کے علم میں کوئی کوتاہی ہو تو ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ④ صبح کو سو مرتبہ ورد کر لیا جائے اور ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ⑤ سوتے وقت اس کا ورد کر لیا۔ تو صبح کی دعا تو مصیبت سے نعمت کا انقلاب پیدا کرے گی اور شام کی یہ دعا غم سے مسرت اور ناکامی سے کامیابی کا انقلاب پیدا کرے گی۔ انہی دو چیزوں کی ضرورت ہے کہ زندگی کامیاب ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تدبیر بھی کرو۔ مگر ظاہر بات ہے کہ محض تدبیر تو کارگر نہیں ہوتی اور اس پر اثرات پیدا کرنے والے تو اللہ ہی ہیں، اس لئے تدبیر تو بندے کا فعل ہے، لیکن بندہ فاعل تو نہیں ہے، فاعل مختار تو اللہ ہے، اس میں اثر ڈالنے والا تو وہ ہے۔ چھری کے اندر کاٹنے کا اثر ہے۔ لیکن اگر اللہ اثر چھین لے تو چھری کام نہیں کر سکتی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھی گئی تھی، چھری کی دھار بھی تھی، گلہ بھی نازک تھا۔ چاہئے تھا کہ کاٹتی اور اپنا اثر دکھاتی۔ مگر تاثیر نکال دی گئی تھی۔ کوئی اثر نہ دکھا سکی۔ گویا چھری میں اثر دینا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ آگ کی تاثیر جلانا ہے۔ لیکن حقیقت میں اللہ کی قدرت اور مشیت جلاتی ہے۔ آگ نہیں جلاتی۔ اس میں سے جلانے کی تاثیر نکال لی گئی۔ وہی آگ باغ و بہار بن گئی۔ اللہ رب العزت جو فاعل حقیقی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۳. ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۴. ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۷. ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۳. ⑤ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۷.

ہیں۔ ان سے معاملہ صحیح ہونا چاہئے۔ آگ کو پانی ٹھنڈا کرنے والا نہیں ہے، مشیت ٹھنڈا کرتی ہے۔ اگر پانی کو آگ بنا دیں تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح چھری نہیں کاٹتی مشیت حق کاٹتی ہے۔

اس واسطے مشکلات کے رفع کرنے کی جہاں اور تدابیر کی جائیں وہاں بڑی تدبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے نسخوں کو استعمال کیا جائے اور اس کا ورد کیا جائے۔ امید ہے کہ چند دن کے بعد ہر شخص محسوس کرے گا کہ کچھ انقلاب ہوا ہے۔ کچھ خیر کی طرف بات آ رہی ہے۔ اس واسطے ادھر توجہ فرمائی جائے۔

شریعت کا ہر حکم دینی و دنیوی فوائد پر مشتمل ہے...... اس کے علاوہ جو جو چیزیں وقتاً فوقتاً عرض کی گئیں۔ وہ حقیقت میں دینی اعتبار سے بھی نافع تھیں، دنیوی اعتبار سے بھی۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں آخرت کے ساتھ دنیا کا مفاد شامل نہ ہو۔ گو میں نے اس کی پوری تشریح نہیں کہ کہ دنیوی فوائد کیا کیا ہیں۔ زیادہ دینی فوائد بتلائے گئے ہیں۔ لیکن جب آپ کریں گے، دنیوی فائدہ بھی آخرت کے ساتھ اس پر مرتب ہوگا۔

مسواک کے بارے میں علماء لکھتے ہیں اور احادیث میں ہے کہ مادی فائدہ تو یہ ہے کہ منہ میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے امراض رفع ہو جاتے ہیں۔ آخرت کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی کو مرتے وقت کلمہ نصیب ہوتا ہے یہ گویا مسواک کی تاثیر بتلائی گئی۔ یہ اثر کیوں ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ اس کی تشریح اس وقت مقصود نہیں ہے کہ مسواک کرنے سے مرتے وقت کلمہ کس طرح منہ سے نکلے گا؟ یہ لمبا مضمون ہے۔ مگر بتلانا یہ ہے کہ اس میں دونوں فائدے ہیں۔ منہ کی خوشبو، یہ مادی فائدہ اور کلمہ نصیب ہو جانا یہ روحانی فائدہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شہادت کی حالت میں تھے، تو آپ مرض میں مبتلا تھے، زخم گہرا تھا، وفات قریب تھی۔ ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ جب وہ واپس چلا گیا۔ فرمایا اس نوجوان کو بلاؤ۔ اس کی لنگی پیروں سے اتنی نیچے پڑے ہوئی تھی کہ زمین کے اوپر گھسٹتی ہوئی آ رہی ہے۔ فرمایا "یَافَتٰی! اِرْفَعْ اِزَارَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَتْقٰی لِرَبِّکَ" ① "اے عزیز! اس لنگی کو زمین پر گھسیٹنے کی بجائے اوپر ٹخنوں تک اٹھا۔ یہ کپڑے کے لئے پاکی کا ذریعہ بنے گا اور تیرے لئے پروردگار کی رضامندی کا ذریعہ بنے گا۔ مادی فائدہ بھی بتلایا، آخرت کا فائدہ بھی بتلایا"۔

اسی طرح حدیث میں ہے "صُوْمُوْا تَصِحُّوْا" ② "روزہ رکھو، صحت حاصل کرو"۔ تو روزہ کا دنیوی فائدہ صحت ہے اور آخروی فائدہ رضاء خداوندی ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا جہاں مادی تدابیر اختیار کی جائیں۔ وہاں روحانی تدابیر سے غفلت نہ کی جائے۔ اس پر انشاء اللہ دنیوی فوائد بھی مرتب ہوں گے۔

نیز دنیوی اور دینی تدبیر میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح ہے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ اس لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ صبح کے وقت بیٹھ کر دس پندرہ منٹ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ③ کا ورد کر لے اور رات

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ج: ٦ ص: ٢٧. ② حدیث موضوع ہے دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات ج: ١ ص: ٧٠.

③ پارہ: ٤، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ١٧٣.

کو سوتے وقت پانچ منٹ صرف کر کے آیت کریمہ کا ورد کرلے۔ پھر انشاء اللہ اس کے اثرات نمایاں ہوں گے۔

میں نے ان چند کلمات سے اس وقت اپنے جذبات تشکر کا بھی اظہار کرنا ہے، اپنی محبت کا اظہار کرنا ہے اور دعا کے لئے دعویٰ تو نہیں کرتا۔ مگر بہرحال یہ ظاہر کرنا ہے کہ دعاء کے سوا اور کسی کا کا ہوں بھی نہیں۔ اس سے انشاء اللہ غفلت نہیں ہوگی۔ دعائیں برابر کرتا رہا ہوں برابر کرتا رہوں گا اور وہاں کے بزرگوں کو بھی توجہ دلاؤں گا کہ وہ بھی آپ سب حضرات کے لئے دعائیں کریں؟ ادھر دعاء ہو، ادھر مادی تدبیر اور روحانی تدبیر ہو۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مشکلات کا حل نہ نکلے۔ دنیوی و دینی دونوں مشکلات انشاء اللہ ختم ہوں گی۔

بار دگر شکریہ...... ان چند الفاظ کے ساتھ میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ حضرات سے بھی دعاؤں کا خواہشمند ہوں۔ آپ دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں۔ مادی چیزیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ لیکن دعاء منقطع نہیں ہوتی۔ اگر انسان آخرت میں بھی چلا جائے، جب بھی دعاء وہاں پہنچتی ہے۔ اس لئے اس سے آپ بھی فراموش نہ فرماویں۔

رہا یہ کہ یہاں دوبارہ آنا۔ تو میں کہتا ہوں کہ مولانا عمر دین صاحب کم ہمتی کیوں فرماویں کہ میں جوہانسبرگ سے یہاں آؤں۔ یہ ہمت فرمائیں کہ میں ہندوستان سے لوٹ کر پھر یہاں آ جاؤں۔ اس چیز کی کیا ضرورت ہے کہ میں تھوڑی دور جا کے پھر واپس آؤں۔

آپ کی محبت کی تو بے شک یہی بات ہے کہ تھوڑی دور سے واپس آؤں۔ مگر اصول یہ ہے کہ ڈاکٹر بھی موجود ہیں۔ وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ بھوک چھوڑ کے کھانا چاہئے۔ زیادہ پیٹ بھر کے آدمی کھالے گا تو کھانے کی طرف توجہ باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کچھ بھوک چھوڑی رکھنی چاہئے تا کہ بھوک باقی رہے اور دوبارہ خواہش ہو کہ پھر کھانا آئے اور جلدی جلدی کھانے میں معدہ خراب ہوتا ہے۔ بیچ میں کچھ فاصلہ ہونا چاہئے۔ اس واسطے آپ ہمت سے یوں کہیں کہ ہم وہاں سے بلوائیں گے۔ جوہانسبرگ سے بلوانا کوئی زیادہ ہمت کی بات نہیں ہے اور میں انشاء اللہ حاضری کے لئے تیار رہوں گا۔ نکما تو ہوں گا جیسے اب نکما ہوں، پھر رہوں گا۔ مگر آنے کے لئے بہرحال تیار رہوں گا۔ حق تعالیٰ حاضری بھی نافع فرماوے اور جو کچھ آپ حضرات کے لئے کہا جائے وہ بھی۔

ان چند جملوں کے ساتھ میں اپنے بھائیوں کا بہنوں کا اور اس ملک کے تمام مسلم باشندوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اپنی محبت اور مدارات سے ہمارے قلوب کو موہ لیا ہے اور اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ حق تعالیٰ اس محبت کو باقی رکھے اور اس کو دارین میں ثمرات صالحہ کا ذریعہ بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

شان بعثت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَقَدْقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً، وَلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا ①. وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا . ②وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ .اَوْکَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ③

حرف آغاز...... بزرگان محترم! اس وقت میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین حدیثیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان تینوں احادیث میں تین بنیادی مقاصد ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شان بیان فرمائی گئی ہے۔ کہ آپ کس رنگ کے ساتھ مبعوث کئے گئے۔ کون سی شان لے کر آپ دنیا میں تشریف لائے۔ تو ایک بعثت کی شان اور اس کی صفت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ دوسری دو روایتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض و غایت بیان فرمائی گئی ہے کہ آپ کو کیوں مبعوث کیا گیا اور وہ کیا مقاصد تھے، جن کو لے کر آپ دنیا میں تشریف لائے۔ اس تقریر کا موضوع دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا جز شان بعثت کہ آپ کا رنگ کیا ہے؟ دوسرا جزیہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے کیا مقاصد متعین تھے؟ وہ جبھی صحیح طور پر سامنے آسکیں گے جب ان کی اصل اور بنیاد پر روشنی ڈالی جائے، اس واسطے ابتدا میں بطور تمہید کے میں چند کلمات گزارش کروں گا اس کے بعد احادیث کی تفسیر ان کا موضوع اور ان کا معنی ان شاء اللہ واضح ہو جائیں گے۔

کلمات تمہید...... حق تعالیٰ شانہ، سارے کمالات کا سرچشمہ ہیں۔ ساری برکات اور ساری نعمتیں انہی کی ذات میں ہیں۔ انہوں نے دنیا میں تمام نعمتوں کو بھیجا۔ حق تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں: ایک جلالی صفات ہیں اور ایک جمالی۔ جلالی صفات جیسے شان قہر، شان غضب، شان انتقام یہ تمام جلالی صفات کہلاتی ہیں اور جمالی صفات جیسے

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب النھی عن لعن الدواب وغیرھا، ج:۴ ص:۲۰۰۶ رقم:۲۵۹۹. ② السنن لابن ماجہ، المقدمۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج:۱ ص:۲۶۵.
③ السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب الآداب، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیھا، ج:۱۰ ص:۱۹۱.

رزاقی، انعام واکرام اور تربیت، یہ تمام جمالی شانیں کہلاتی ہیں، غرض صفات خداوندی دو نوع میں منقسم ہیں۔ ایک جلالی شانیں اور ایک جمالی شانیں ہیں۔

جمالی شانوں کا سرچشمہ رحمت ہے اور جلالی شانوں کا سرچشمہ غضب ہے تو ساری صفات مل کر دو نوع میں آجاتی ہیں، ایک رحمت کے نیچے ایک غضب کے نیچے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔ حدیث میں ہے کہ عرش عظیم کے اوپر اللہ نے ایک لوح رکھی ہوئی ہے، جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے، اس پر ''اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' ① میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے، جب رحمت اور غضب کا مقابلہ ہوتا ہے تو رحمت آگے آگے چلتی ہے اور غضب پیچھے رہ جاتا ہے، تو عرش عظیم کے اوپر یہ بطور دستاویز کے لکھ کر رکھ دیا ہے۔

تختِ شاہی...... عرش عظیم وہ تخت شاہی ہے۔ احکام خداوندی عرش سے جاری ہوتے ہیں جس کو فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ ② ''کہ تمام امور کی تدبیر عرش سے ہوتی ہے، اس لئے عرش تخت شاہی ہے اور ساری کائنات اس کے نیچے''۔

اس کائنات کو دیکھا جائے یہ زمینیں، آسمان، جنتیں ان سب سے اوپر جا کر عرش کا سلسلہ ہے تو مخلوقات عرش تک جا کے ختم ہو جاتی ہیں۔ عرش کے اوپر کسی مخلوق کا وجود نہیں ہے، بجز اس تختی کے جو اوپر رکھی گئی ہے، جس پر لکھ دیا گیا ہے کہ:

دستاویزِ رحمت...... ''اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' صرف اس مخلوق کے سوا اوپر تجلیات ربانی ہیں اور صفات الٰہیہ کا وہ مرکز ہے تو عرش عظیم گویا پایہ تخت خداوندی ہے جس سے دنیا میں تدبیر امر ہوتی ہے اور احکام چلتے ہیں۔ اس عرش پر رحمت کو غالب کر دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام احکام میں رحمت کا غلبہ ہے اور اللہ نے اپنے بندوں سے جو تعلق قائم فرمایا ہے وہ شان رحمت سے قائم کیا ہے، اگر کہیں شان غضب سے تعلق قائم کرتے تو مخلوق کا وجود باقی نہ رہتا مخلوق پامال ہو جاتی، غضب اور قہر کے سامنے کیا چیز ٹھہر سکتی تھی تو بندوں سے جو رشتہ قائم فرمایا، وہ صفت رحمت سے قائم فرمایا صفت غضب سے نہیں۔

غضب تو تنبیہ کرنے اور سزا دینے کے لئے ایک وقتی چیز ہے، لیکن دوامی چیز جو تمام باتوں پر چھائی ہوئی ہے وہ رحمت کی شان ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی.﴾

''رحمٰن عرش کے اوپر چھا گیا''۔ اور عرش ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور عرش کے اوپر رحمٰن چھایا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ساری کائنات پر رحمٰن شان رحمت سے چھایا ہوا ہے۔ یعنی ساری کائنات کے اوپر رحمت غالب

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب وکان عرشه علی الماء وهو رب العرش العظیم: ج:٦ ص:٢٧٠٠ رقم:٦٩٨٦. ② پارہ: ١١، سورۃ یونس، الآیۃ: ٣.

ہے، یہ نہیں فرمایا کہ:

''اَلْجَبَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی یا'' '' اَلْقَهَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی.''

اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کائنات پر غضب چھایا ہوا ہے، اگر غضب چھایا ہوا ہوتا تو کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہتا بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی رحمٰن عرش کے اوپر چھایا ہوا ہے، یعنی صف رحمت عرش کے اوپر چھا گئی اور عرش ساری کائنات کے اوپر چھایا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرش پوری کائنات پر اس طرح سے ہے جس طرح ایک قبہ ہوتا ہے جس طرح خوان بنا کر اس کو آپ خوان پوش سے ڈھانپ دیں اور وہ سارے خوان پر چھا جائے۔ اس طرح سے پوری کائنات پر مثل قبہ کے چھایا ہوا ہے اور اس پر رحمت چھا گئی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت ساری کائنات پر چھا گئی ہے، تو رحمٰن عرش پر چھا گیا اور عرش کے اوپر دستاویز لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے۔

محلِ عرش...... پھر عرش کو کس چیز پر قائم کیا؟ حدیث میں بھی موجود ہے اور قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے:

﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ (1) ''عرش کو پانی کے اوپر قائم کیا ہے''۔

حدیث میں ہے کہ وہ ایک عظیم سمندر ہے، جس کی ایک ایک موج زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے اس سمندر پر عرش قائم ہے، اگر رحمت کو مجسم بنایا جائے تو پانی کی شکل اختیار کرے گی۔ جس طرح غضب کو اگر جسم دیا جائے تو وہ آگ کی صورت بن جائے گا۔

جب کوئی شخص مہربان ہوتا ہے اور رحم و کرم کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ: فلاں شخص پانی پانی ہو گیا، یعنی اس پر شان رحمت غالب آ گئی۔ اور محبت غالب آ گئی اور اگر کوئی غضب ناک ہوتا ہے اور غصہ میں ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی آگ بگولہ ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غضب کو آگ سے مناسبت ہے اور رحمت کو پانی سے نسبت ہے تو عرش کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے اوپر قائم فرمایا۔ اگر آگ پر قائم فرماتے تو معلوم ہوتا کہ غضب زمین ہے اس کے اوپر عرش کو قائم کیا۔ پانی کے اوپر قائم کیا اور پانی شان رحمت کی صورت مثالی ہے تو گویا عرش کے نیچے بھی رحمت ہے اور اوپر بھی رحمت ہے، عرش پانی پر قائم ہے اور پانی شان رحمت کی صورت ہے۔ تو عرش رحمت کے اوپر قائم ہوا۔ عرش پر رحمٰن چھا گیا یعنی صفت رحمت چھائی ہوئی ہے، عرش کے اوپر تختی لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے تو دستاویز بھی رحمت کی ہے گویا عرش کے اوپر بھی رحمت نیچے بھی رحمت۔

قیامت میں غلبہ رحمت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حق تعالیٰ نے اپنی شان رحمت سے سو رحمتیں عالموں کے لئے پیدا فرمائیں، جن میں ایک رحمت اس دنیا میں اتاری ہے۔ اس رحمت کا اثر ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں پر رحم کھاتے ہیں جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں، دوست دوست پر رحم کرتا ہے۔

(1) پارہ: ۱۲، سورۃ الھود، الآیۃ: ۷۔

عزیز عزیزوں پر رحم و کرم کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک رحمت کا اثر ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوق پر رحم و کرم فرماتا ہے۔ رزق دے رہا ہے، بارشیں آ رہی ہیں، نعمتیں مل رہی ہیں۔ یہ سب ایک رحمت کا اثر ہے، ننانویں رحمتیں جو ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ: وہ اپنے عرش کے نیچے چھپا کر رکھی ہوئی ہیں۔ قیامت کے دن ایمان والوں پر وہ رحمتیں کی جائیں گی تو اندازہ کیا جائے کہ قیامت کے دن کتنی رحمتیں ہوں گی جب ایک ہی رحمت کا اثر یہ ہے جو پوری دنیا میں نمایاں ہے تو ان ننانوے رحمتوں کے آثار کیا ہوں گے جو قیامت کے دن ایمان والوں پر کی جائیں گی، حیلوں پر مغفرت کی جائی گی، ذرا ذرا سے بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نجات دی جائے گی، گناہ گاروں پر شفقتیں کی جائیں گی، وہ ننانویں رحمتیں وہاں کام آئیں گی تو حاصل یہ نکلا کہ عرش کے اوپر بھی رحمت، نیچے بھی رحمت، پانی رحمت کی صورت مثالی اور ننانویں رحمتیں عرش کے نیچے چھپائی ہوئی ہیں۔ تو عرش گویا رحمت سے ڈھانپا ہوا ہے۔ اوپر سے نیچے تک رحمت ہی رحمت چھائی ہوئی ہے۔ اور ”اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى“ اور اللہ شان رحمت سے عرش کے اوپر چھا گیا ہے تو ساری کائنات پر رحمت غالب ہے۔

شان رحمت کا اثر...... اور اس شان رحمت کا اثر شان ہدایت ہے، اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی تو بندوں کی ہدایت کا سامان کیا۔ بندوں کے لئے راہنمائی فرمائی کہ خیر کی طرف چلیں اور شر سے بچیں، بھلائی کی طرف آئیں اور برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

یہ اسی شان رحمت کا اثر ہے، اگر بندوں کے اوپر رحمت و شفقت نہ ہو تو بھلائی کی طرف راہنمائی کیوں کریں؟ اگر کسی سے دشمنی کا تعلق ہو تو دشمن کو کون اچھا راستہ دکھلاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ اور جا کے جہنم میں جھک جائے جلدی سے ہلاک ہو۔ جب دشمن ہی ٹھہرا، دوست کو راہنمائی کی جاتی ہے کہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو۔ ماں باپ اپنے بچے کے دوست ہوتے ہیں اس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ بیٹا یہ کام کرو اور یہ مت کرو۔ یہ تمہارے لئے بھلائی کی بات ہے اور یہ برائی کی بات ہے۔ یہ رحمت و شفقت ہی کا اثر ہوتا ہے استاد اگر اپنے شاگردوں کو پڑھاتا ہے تو اسی شان شفقت کا اثر ہوتا ہے اگر استاد کو طالب علموں سے دشمنی ہو جائے وہ طالب علموں پر کیوں محنت کرے گا؟ نہ کتاب پڑھائے گا، نہ راہنمائی کرے گا، نہ مسائل بتائے گا تو شفقت اور رحمت کا اثر ہوتا ہے، جو راہنمائی کی جاتی ہے۔ سب سے بڑا رحمت کا ظہور ہدایت ہے کہ سیدھی اور بھلائی کی راہ بتلا دی جائے۔

سب سے بڑی دعاء...... اسی شان ہدایت کے تحت حق تعالیٰ شانہ، نے انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ وہ اللہ کی ہدایت ہیں جو اسباب کے ذیل میں نمایاں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا ہدایت کرنا، یہ اللہ کا ہدایت کرنا ہے۔ یہ اس کی رحمت کا ظہور ہے۔ تو ہدایت سب سے بڑی چیز ہے۔

سورہ فاتحہ جس کو قرآن عظیم فرمایا گیا ہے اور نماز کی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس سورہ کا نام ”سُوْرَةُ

اَلْمَسْئَلَةِ" بھی ہے، یعنی سوال کرنے کی سورت۔ اس میں سوال کیا گیا ہے؟ ﴿اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ① "ہدایت دے دیجئے، سیدھے راستہ کی"۔ یہ ہے سب سے بڑی دعاء جو سورۂ فاتحہ میں منگوائی گئی ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ابتدا میں حق تعالیٰ شانہ، کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ رب العلمین ہے۔ "رَحْمٰنُ وَ رَحِیْمُ ہے۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" ہے، معبود ہے، جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ آگے بندگی کی شان فرمائی گئی ہے کہ بندہ کا کام یہ ہے کہ معبود کے آگے جھکے، بھیک مانگے، سوال کی دعا یہ بتلائی گئی کہ: ﴿اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ گویا بندے مکلّف اور مامور کئے گئے ہیں کہ پانچوں نمازوں میں یہ دعا کریں۔ جب فاتحہ پڑھیں گے یہ دعا آئے گی۔ فرائض کے بعد سنتیں پڑھے تو پھر فاتحہ کے ذریعہ یہ دعا مانگے۔ نفلیں پڑھے یا تہجد پڑھے یہ دعا مانگے غرض جتنی نمازیں فرض، واجب، سنت اور نفل، یہ دعا سب میں لازم ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی اہم دعا ہے، ہدایت کا مانگنا کوئی بہت اہم چیز ہے۔

بظاہر ایک سوال ہوتا ہے کہ فاتحہ جس کو "سورة المسئلة" کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ذرا اونچی دعا منگوائی جاتی کہ یا اللہ! ہمیں جنت عطا کر دیجئے، یا اللہ ہم سے راضی ہو جایئے، اپنی رضا عطا کر دیجئے، ہمیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دید یجئے، یہ تو معمولی سی دعا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو ساری دعاؤں کی جڑ بنیاد یہی دعاء ہے اس واسطے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدھا راستہ دکھلا دیجئے تو جب سیدھا راستہ مل گیا تو آدمی اس پر چل پڑا، رضا خود بخود حاصل ہوگئی۔ بے راہ رو کو رضا حاصل نہیں ہوتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی، بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی، بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر چل پڑے تو عرش کے سائے میں بھی جگہ خود بخود مل گئی۔ اگر آدمی بدراہ ہوگا۔ عرش کا سایہ نہیں ملے گا، تو جتنی بڑی سے بڑی دعا ہوسکتی تھی، اور جتنا بڑے سے بڑا مقصد ہوسکتا تھا وہ سب اس دعا سے حل ہوتا ہے اصل میں ہدایت ہے، ہدایت ہوگئی تو رضا بھی ملی جنت بھی ملی عرش کا سایہ بھی ملا اور انبیاء علیہم السلام کی مرافقت بھی ملی۔ ساری نعمتیں دستیاب ہوگئیں۔ اور اگر خدانخواستہ ہدایت نہ ملے تو نہ جنت نہ عرش اگر آدمی ضلالت اور گمراہی پر ہو تو کہیں سے کوئی نعمت دستیاب نہیں ہوسکتی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ سب سے بڑی نعمت ہدایت ہے۔ اس لئے سورہ فاتحہ میں دعا منگوائی گئی کہ ہدایت کی دعا مانگو کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دیجئے دل کی کلیں درست ہوگئیں، دل کا راستہ درست ہوگیا، تو دنیا و آخرت کی ہر نعمت مل گئی۔

ثمرۂ دعاء...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ."

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جو صنوبری شکل کا ہے، اگر وہ درست ہے تو سارا انسان درست

① سورة الفاتحة.

ہے اگر وہ غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور وہ گوشت کا لوتھڑا ''دل'' ہے اگر دل درست ہے تو سارا انسان درست ہے اور اگر دل خراب تو سارا انسان خراب ہے۔ اور دل کب درست ہوتا ہے جب دل کی کلیں درست ہوں، دل کا راستہ درست ہو دل میں ہدایت موجود ہو، دل میں ضلالت اور گمراہی موجود نہ ہو، تب دل درست ہوتا ہے، تو سارے انسان کی درستگی قلب کی ہدایت پر موقوف نکلی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کوئی بہت بڑی عظیم نعمت ہے اس لئے یہاں دعا منگوائی گئی کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ''ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے دیجئے''۔

اور وہ صراط مستقیم کونسا ہے؟ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''جن پر آپ نے انعام کیا، ان کا راستہ''۔ اور وہ کون ہیں، جن پر انعام کیا گیا؟ وہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صلحاء ہیں تو ان کا راستہ مطلوب ہے۔ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ ''جن پر آپ کا غضب وقہر نازل ہوا ان کا اور گمراہوں کا راستہ ہمیں نہیں چاہئے''۔ ان کا راستہ چاہئے جن پر آپ کا انعام ہوا، وہ آپ کی رحمت کے نیچے ہیں۔

تو سب سے بڑی دعا جو فاتحہ میں منگوائی گئی وہ ہدایت کی دعا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اتنی بڑی نعمت ہے کہ ساری نعمتیں اس کے تابع ہیں اور ضلالت سب سے بڑی گمراہی ہے کہ ساری مصیبتیں اس کے تابع ہیں، اس لئے فاتحہ جو قرآن کریم کا خلاصہ ہے اس میں ہدایت کی دعاء رکھی گئی جو فاتحہ کا خلاصہ ہے، تو سارے قرآن کا خلاصہ ہدایت نکل آتی ہے۔

نعمتِ عظمٰی...... اسی واسطے سورہ بقرہ سے جب قرآن کریم کا آغاز کیا گیا اور کہا گیا کہ: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (1) ''وہ کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا نہیں''۔

اس کی شان یہ فرمائی گئی کہ: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت ہے''۔ یہ تو سب سے بڑی نعمت کتاب اللہ ہے، کتاب اللہ کی سب سے بڑی نعمت جو بنیاد ہے وہ ہدایت ہے۔ تو فاتحہ میں ہدایت مانگی گئی ہے۔ جو حق تعالیٰ شانہ، کی رحمت عرش پر چھائی ہوئی ہے۔

اور رحمت کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کا سامان کر دیا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ہدایت لے کر آئے۔ انبیاء علیہم السلام کا بھیجا جانا خود مستقل ایک انعام نکلا۔ اس سے بڑھ کر عالم میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہ آئیں، آدمی کو آدمی بننا میسر نہیں ہوسکتا، انسان کو انسان انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ ورنہ انسان تو گھوڑوں اور ڈنگروں کا ایک مجموعہ ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوتا ہے۔ جانور، جانور کے ساتھ وہ بدسلوکی نہیں کرتا، جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے، تو انسان اگر انسانیت پر نہ آئے تو سب سے بڑا درندہ یہ ہے، سب سے خونخوار غضبناک بھی یہ ہے اس کو جو جانور کی حد سے نکال کر انسانیت میں داخل کیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام ہی نے تو کیا ہے انہی کی

(1) پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱.

تعلیمات کا تو اثر ہے کہ آدمی آدمی بنتا ہے، جب ان کی تعلیمات کسی جگہ ختم ہو جاتی ہیں، وہیں انسان گھوڑوں اور ڈنگروں میں شامل ہو جاتے ہیں، جہاں تعلیمات آئیں وہیں آدمیت آجاتی ہے، تو آدمی کی آدمیت ہدایت پر موقوف ہے، اور ہدایت انبیاء علیہم السلام کے آنے پر موقوف ہے۔ تو نبیوں کا آنا ایک عظیم نعمت نکلی اور کل انبیاء علیہم السلام میں سے بھی سب سے بڑی نعمت جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، افضل الانبیاء ہیں اور افضل البشر ہیں۔

نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم...... حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا فیض بھی درحقیقت نبوّتِ محمدّی سے چلا، حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ: ''اَنَانَبِیُّ الْاَنْبِیَآءِ'' ''میں نبیوں کا نبی ہوں''۔

اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، انبیاء کرام سے عہد لیا گیا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ﴾ ①

''یاد کرو اس وقت جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب وہ رسول عظیم الشان آئے جن کو بھیجنا ہے اور تمہیں میں نبوت اور کتاب دے دوں اور پھر وہ رسول آئیں گے تو تم اس کے اوپر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو، اگر تم میں سے کوئی اس کا زمانہ پائے تو خود مدد کرے، ورنہ اپنی اقوام کو ہدایت کرو کہ وہ خاتم النبیین کی مدد کریں''۔

اس نبی کی کیا شان ہوگی؟ ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ﴾ وہ رسول عظیم، جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔

جامع الہدایات...... تصدیق، اس کی دلیل ہوتی ہے کہ جس چیز کی وہ تصدیق کرتا ہے وہ اس کے اندر موجود ہے، جس علم کی تصدیق کوئی کرے گا تو پہلے اس کا علم ہونا چاہئے۔ جاہل تصدیق نہیں کر سکتا، عالم تصدیق کرے گا، تو سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ جو علم سارے انبیاء کو دیا گیا تھا، وہ علم اس نبی عظیم میں موجود ہوگا تو آپ تمام علوم انبیاء کے جامع ہوں گے۔ اس لئے آپ سارے انبیاء کی تصدیق کریں گے، جو کچھ جسے ملا ہے میں کہتا ہوں کہ وہ حق ہے وہی سچ ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے پاس حق موجود ہو۔ وہ علم اس کے پاس موجود ہو تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور جامع العلوم بنائے گئے تو اگر انبیاء کا دنیا میں آنا رحمت ہے تو خاتم النبیین کا آنا سب سے زیادہ رحمت ہے۔ جو جامع ترین نعمت لے کر آئے۔ اگر اور انبیاء علیہم السلام مختلف رنگوں کی ہدایت لے کر آئیں تو آپ ساری ہدایتوں کا مجموعہ بن کر آئے۔ تو خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ آپ جامع الہدایات ہیں۔ جامع العلوم اور جامع الکمالات ہیں تو ایک ایک کمال کا آنا اگر نعمت اور رحمت ہے تو سارے کمالات کے مجموعے کا آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا نعمت ہوگی

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

اور سب سے بڑی نعمت آپ کی بعثت ہوگی۔

افضل الشئون......اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شان ہوگی، وہ ساری شانوں سے افضل ہوگی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم ہیں تو خاتم الشئون بھی ہونگے، ساری شانیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوں گی، تو جامع ترین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہونی چاہئے۔

تمام انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے کمالات کا مظہر بن کر آئے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جامع الکمالات ہیں اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ کے کمالات کا مظہر اتم ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ کی شانیں جس قوت اور کمال کے ساتھ آپ میں آئی ہیں، دوسروں میں نہیں آئیں۔

شانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غلبہ رحمت......ابھی آپ نے سنا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان یہ ہے کہ ان کی تمام صفات دو نوع میں ہیں۔صفات جمال اور صفات جلال، صفات جمال کا منشاء رحمت ہے اور صفات جلال کا منشا غضب ہے۔اور رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے۔تو جو اللہ کا سب سے بڑا مظہر اتم ہے اس میں بھی رحمت ہی غالب ہونی چاہئے اس لئے آپ کی شان فرمائی گئی کہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ① جیسے اللہ کے ہاں شان رحمت غالب ہے تو خاتم النبیین میں بھی ساری شانیں ہیں، مگر سب پر جو شان غالب ہے تو وہ رحمت کی شان ہے آپ کو رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''اَنَارَحْمَةٌ مُّھْدَاةٌ''. ②

میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے مخلوق کو دی گئی ہوں، یعنی میں اللہ کا ایک ہدیہ ہوں جو مخلوق کو عطا کیا گیا، ایک تحفہ ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لئے بھیجا ہے اور وہ میں ہوا اور میں کون ہوں؟ ''رَحْمَةٌ مُّھْدَاةٌ'' ایک رحمت مجسم ہوں جس کو بطور ہدیہ کے عطا کیا گیا، تو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے عظیم ہدیہ بھیجا۔وہ ہدیہ رحمت ہے۔

تو جیسے حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ: میری شانوں میں رحمت کی شان غالب ہے یہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے کہ آپ پر شان رحمت کا غلبہ ہے، شان غضب غالب نہیں ہے، جب آپ حق تعالیٰ شانہٗ کے نمائندے اور مظہر ہیں۔تو شان غضب بھی موجود ہے۔اس غضب کا اثر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں حدود بھی ہیں۔قصاص بھی ہیں۔کفارات بھی ہیں۔تعزیرات اور سزائیں بھی ہیں، جہاد بھی ہے۔جو شان غضب کا مظہر ہیں، مگر ان سب کے اندر بھی اگر غلبہ ہے تو شان رحمت کا غلبہ ہے۔غضب بھی چلتا ہے تو وہ بھی رحمت ہی سے چلتا ہے۔

اگر باپ بچے کو مارتا بھی ہے۔اس کا منشاء دشمنی نہیں ہوتی۔محبت منشا ہوتی ہے۔محبت ہی سے مارتا ہے تا کہ اس کو ہدایت ہو۔حق تعالیٰ شانہٗ بھی اگر کسی فرد یا قوم پر غضب فرماتے ہیں تو اس کا منشا رحمت ہوتا ہے۔تو نبی کریم

---

① پارہ: ۱۷، سورة الانبياء، الآية: ۱۰۷. ② سنن الدارمي، باب كيف كان اول شأن النبي صلى الله عليه وسلم ج: ۱ ص: ۱۷.
حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ۴۹۰۔

صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر کسی پر غضب یا غصہ فرمائیں اس کا منشا بھی رحمت ہی ہے، ہدایت اور تنبیہ اس کا منشا ہوتی ہے۔ تو غضب کا منشا بھی فی الحقیقت رحمت ہے تو رحمت غالب آ گئی۔ کہیں بلا واسطہ رحمت کا ظہور ہے۔ کہیں غضب کے واسطہ سے رحمت کا ظہور ہے غضب میں بھی سو رحمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ دشمن اگر غصہ کرے تو یہ غصہ ہے اور باپ اگر غصہ کرے تو اس کے اندر رحمت چھپی ہوئی ہے۔ دشمنی چھپی ہوئی نہیں۔ تو اللہ اپنی کائنات پر اور مخلوق پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے۔ تو اس کے غصہ میں بھی ہزاروں رحمتیں چھپی ہوئی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ بھی فرمائیں گے تو اس کا منشاء رحمت اور محبت ہی ہوگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شانِ رحمت اور رحمت مجسم بن کر آئے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں شانِ رحمت ...... اسی لئے آپ کی شریعت میں رحمت کا غلبہ ہے۔ ایک ایک حکم کے اندر رحمت کا غلبہ ہے، ہر ہر حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔ بندوں کو ہدایت دے رہے ہیں۔ اس میں بھی شانِ رحمت کا غلبہ ہے۔

اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جیسے رحمت مجسم ہیں تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت شانِ رحمت سے ہی فرمائی۔ اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان یہ فرمائی گئی کہ: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ ①

رحمت اور کرم ان کے اندر مخفی ہے، رحمت و کرم کے ان کے اندر رچا ہوا ہے اگر کفار پر شدت ہے تو ان کی ذوات پر نہیں ان کے کفر پر ہے۔ رحمت وہاں بھی چھپی ہوئی ہے کہ کسی طرح وہ بھی ایمان قبول کر لیں کسی طرح یہ ہدایت پر آ جائیں۔

رحیم اُمت ...... صحابہ میں سے بھی اَجل صحابہ، اکمل صحابہ رضی اللہ عنہم اور افضل صحابہ رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا کہ: انبیاء کے بعد اگر کوئی شخصیت ساری کائنات پر افضل ہے تو وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان فرمائی گئی: ''اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ'' ②

''صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رحمت کا غلبہ ہے''۔

حدیث میں واقعات آتے ہیں کہ: صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب اپنے مکان سے مسجد نبوی کی طرف چلتے تھے گویا دربارِ خلافت میں پہنچتے تھے تو رحمت کا غلبہ اس درجہ پر تھا اور اس درجہ مخلوق اس رحمت سے آپ کی طرف متوجہ ہوتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں بچے آپ کے پیچھے ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یَا اَبَتَا! اے باپ! اور کوئی کہتا

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل مزید بن ثابت... ج: ۱۲ ص: ۲۶۲. صحیح ابن حبان، کتاب اخبارہ ﷺ عن مناقب الصحابۃ، باب ذکر البیان بأن معاذ بن جبل کان من اعلم الصحابۃ بالحلال والحرام، ج: ۱۶ ص: ۷۴ رقم: ۷۱۳۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ۱۲۲۴۔

کہ اے چچا! اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں کہ کسی بچے کو کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں، کسی کو گود میں لئے ہوئے ہیں، کسی کے سر پر ہاتھ ہے، بیسیوں بچے پیچھے پیچھے ہیں اور امیر المومنین دربار خلافت میں جارہے ہیں۔ یہ رحمت کا غلبہ تھا۔ ''اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ''

سب سے رحیم القلب اور سب سے زیادہ شفیق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فرمایا گیا تو اللہ کے یہاں شانِ رحمت غالب ہے تو سب سے زیادہ بڑے نائب اور اللہ کے وزیر اعظم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کو رحمت مجسم فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں میں جو سب سے زیادہ باکمال ہیں اس کو ارحم کہا گیا کہ سب سے زیادہ رحیم ہیں۔ تو رحمت اوپر سے لے کر نیچے تک چھائی ہوئی ہے اور رحمت کا ایک سلسلہ چلا جو پہلے انبیاء میں آیا۔ اکمل ترین حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم میں آیا کہ ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' اکمل ترین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں آیا غرض رحمت غالب ہے اور رحمت کا سرچشمہ وہ فی الحقیقت ہدایت ہے۔ تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ہادی ہیں۔

طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ'' (۱) ''میرے تمام صحابی (رضی اللہ عنہم اجمعین) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں راستہ طے کرو گے ہدایت پا جاؤ گے''۔ ہر ایک ہادی اور مہدی ہے گویا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی وہ شان ہے کہ قرآن نے من حیث الطبقہ کسی کو مقدس کہا ہے تو وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے اوروں میں افراد کی تعریف کی گئی ہے، لیکن طبقے کے طبقے کو مقدس کہنا یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (۲)

سابقین اولین مہاجرین ہوں یا انصار ہوں اور جو بعد میں ان کے ساتھ ملتے گئے ان سب کے مجموعے کو کہا کہ اللہ ان سب سے راضی وہ اللہ سے راضی تو اللہ طبقہ سے راضی۔ افراد کا نام نہیں لیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی یا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے راضی۔ ﴿مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ﴾

مہاجرین اولین ہوں، انصار اولین ہوں یا بعد میں ان کے ساتھ لاحق ہونے والے ہوں، سب کو کہا گیا اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی جس طبقے میں طبقے کی حیثیت سے کھوٹ ہو۔ اللہ کبھی ان سے راضی نہیں ہوسکتا۔ رضا کا اعلان دلیل ہے کہ طبقے میں کھوٹ نہیں۔ طبقہ بہت مقدس ہے۔

---

(۱) علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیهقی و اسنده الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء بأیهم اقتدیتم اهتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف ''التلخیص الحبیر'' میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الجیر، باب ادب القضاء ج: ۵ ص: ۴۹۸.

(۲) پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰.

دوامی رضا کا اعلان...... پھر رضا کا بھی اعلان کوئی ہنگامی اور وقتی نہیں۔ یہ رضامندی کا اعلان قرآن میں کیا گیا اور قرآن قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ کوئی دقیقہ بیچ میں ایسا نہیں گزرے گا کہ اللہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ناراض ہو۔ جو رضا ابتدا میں ہے وہی وسط میں ہے، وہی انتہا میں ہے۔ قیامت تک وہ رضا باقی رہے گی اور قیامت کے بعد بھی رہے گی۔ قیامت کے بعد قرآن اسی طرح موجود ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں حافظ سے کہا جائے گا کہ: رَتِّلْ وَارْتَقِ ① قرآن پڑھتا جا۔ اور جہاں تک تیری طاقت میں ہے ترقی کرتا جا۔ تو وہاں بھی تلاوت ترقیات کا ذریعہ بنے گی۔ قرآن قیامت تک ختم نہیں ہوگا اس کے بعد بھی قرآن ہی کا دورِ حکومت ہے، جنت میں بھی قرآن ذریعہ ترقی بنتا جائے گا اور جب تک قرآن ہے: ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ کا نعرہ موجود ہے تو مطلب یہ نکلا کہ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم (نزولِ قرآن کریم کے وقت) موجود ہیں۔ اب بھی ہم ان سے راضی، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے راضی، قیامت میں بھی ہم ان سے راضی، اس کے بعد جنت میں بھی ان سے راضی یعنی ابدالآباد تک ان سے راضی ہیں۔ تو جس طبقے کے بارے میں رضا کا اعلان کیا جائے کہ علی الاطلاق ہم ان سے راضی ہیں اور وہ علی الاطلاق ہم سے راضی تو وہ طبقہ یقیناً بحیثیت طبقے کے مقدس ہے، یہ نہیں ہے کہ ایک دو فرد مقدس ہیں۔ باقی میں معاذ اللہ، معاذ اللہ کچھ کھوٹ ہے، بلکہ پورا طبقہ مقدس ہے۔

کتبِ سابقہ میں شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر...... پھر یہ کتب کہ سابقہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان بیان کی گئی، تورات میں بیان کی گئی۔ حدیث میں ہے کہ: صحابہ رضی اللہ عنہم کی شانیں اور صفات دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خواہش کی اور کہا کہ اے پروردگار! یہ امت مجھے عطا کر دیجئے فرمایا گیا کہ: یہ امت محمد ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ: پھر اس امت ہی میں مجھے داخل کر دیجئے۔

تو گویا ایسی شان بیان کی گئی کہ انبیاء نے تمنائیں کیں کہ اس امت کے ذیل میں ہمیں شمار کر لیا جائے۔ تو اس امت میں سب سے زیادہ مقدس طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ کتبِ سابقہ میں بھی اس طبقہ کے مقدس ہونے کی شہادت دی گئی اور قرآن میں شہادت دی گئی تو ازل سے ان کا تقدس چلا اور ابد تک چلتا رہا تو اول سے لے کر اخیر تک یہ طبقہ مقدس ہے اور طبقات کے تو افراد کو نام لے کر مقدس کہا گیا ہے یا بلا نام کے۔ اور اس پورے طبقے کی تقدیس کر دی گئی۔

اصنافِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... پھر اس طبقے کے نام لے لے کر قرآن کریم نے الگ تقدیس کی: ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾ ② ''اللہ ان مومنوں سے راضی

---

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر: ج: ۵ ص: ۱۷۷ رقم: ۲۹۱۴. ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۸.

ہو گیا جن سے آپ نے شجرۃ الرضوان کی بیعت لی ہے۔ حدیبیہ میں بیٹھ کر بیعت لی، ان سے اللہ راضی''۔

وہ ڈیڑھ ہزار کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ تو ایک صنف بتلائی گئی اس پر پھر رضا کا اعلان کیا گیا۔ تو مجموعہ سے رضا کا اعلان اور اسکی اصناف سے رضا کا اعلان۔ اصحاب بدر سے رضا کا اعلان، اصحاب احد سے رضا مندی کا اعلان پھر پورے رضا کے نیچے آجاتے ہیں۔ پورے صحابہ کی تقدیس وتقدس کا قرآن کریم اعلان کر رہا ہے اور شہادت دے رہا ہے، یہ اللہ کی شہادت ہے اصل اور مضبوط ترین شہادت ہے تو طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہ کو بحیثیت طبقہ مقدس قرار دے دیا گیا۔

مقاماتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... پھران کے اعمال کی تقدیس الگ کی گئی، ان کے اخلاق کی تقدیس الگ کی گئی، پھران کے مقات کو مقدس الگ بتلایا گیا۔

ایک موقع پر فرمایا گیا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ① ''جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں، ان کی شان یہ ہے کہ کفر کے بارے میں شدید ہیں اور ایمان اور مومن کے بارے میں رحیم اور رقیق القلب ہیں''۔ یہ ان کے مقامات کو سراہا گیا کہ ان کے قلبی مقامات میں سے دو مقام یہ ہیں کہ ایمان کے روبرو وائل اور مظبوط اور کفر کے بارے میں بہت شدید ہیں۔ کفر کا چھوٹے سے چھوٹا جزیہ بھی آجائے۔ اس کے سامنے جھک نہیں سکتے کفر کی ہر چیز کو رد کریں گے، کفر کی چیز سے رضا مندی کا اعلان نہیں کر سکتے، تو یہ ان کے قلبی مقامات کو سراہا گیا آگے فرمایا گیا:

اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... ﴿تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا﴾ پہلے قلبی مقامات تھے، اب بتلاتے ہیں کہ عمل کیا ہے؟ جب دیکھو رکوع اور سجود میں ہیں۔ اللہ کی رضا اور اس کے فضل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب دیکھو عبادت اور طاعت میں ہیں: ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ② جب کوئی ظرف بھر جاتا ہے تو بھر کر چھلکنے لگتا ہے۔ بھر کر وہ شی اس کے اوپر آجاتی ہے۔ تو اس درجہ صحابہ کے قلوب میں ایمان بھر چکا ہے کہ چھلک کر ان کی پیشانیوں پر نمایاں ہو گیا۔ سجدے کے آثار ان کی پیشانیوں پر ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی پیشانی ہر وقت اللہ کے سامنے جھکی رہتی ہے۔ ہر وقت یہ حق تعالیٰ کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔ یہ تو عمل بتلا دیا گیا۔ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ③ ان کی شانیں تو راۃ وانجیل میں بیان کر دی گئی ہیں تو پہلے سے انبیاء انہیں سراہتے ہوئے آرہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے ان کو الگ سراہا۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو الگ سراہا۔ حق تعالیٰ نے قرآن میں الگ سراہا اور دوامی رضا کا اعلان کر دیا کہ یہ طبقہ یقیناً کھوٹ سے بری ہے، نیتوں کی خرابی سے بری ہے۔

خطاءِ فکری..... کوئی اجتہادی خطا اور غلطی ہو جائے وہ ہو سکتی ہے خطاء اجتہادی تو انبیا سے بھی ممکن ہے وہ فکری خطا

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔

ہوتی ہے اس کو معصیت نہیں کہتے فرق اتنا ہے کہ نبی اگر خطاء اجتہادی کرتے ہیں تو حق تعالیٰ انہیں فوراً صواب تک پہنچادیتے ہیں۔ غیر نبی اگر خطا اجتہادی کرے وہ اس کے اوپر باقی رہ سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ صواب پر آئے۔ مگر اس کی خطا پر بھی اسے اجر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فکر کی خطا ہوتی ہے۔ نیت اور ارادے کی خطا نہیں ہوتی۔ صورت عمل کی خطا ہوتی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی نیتیں پاک اور مقدس ہیں۔ اسی طرح سے صحابہ کرام کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ عمل بھی پاک اور قلبی مقامات بھی پاک، کوئی ان میں کھوٹ نہیں ہے نیتیں بھی مقدس ہیں، ارادے بھی مقدس ہیں، فکری طور پر یا اجتہادی خطا واقع ہو یہ بڑے سے بڑے کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ کوئی معصیت نہیں، کوئی برائی نہیں۔

اس سے تو زیادہ سے زیادہ مخلوقیت ثابت ہوتی ہے۔ علم الٰہی ہے جو ہر قسم کی خطا سے بری ہے لیکن مخلوق کے علم میں خطا کا آجانا ممکن ہے۔ تو مخلوق ہونا تو کوئی برائی کی بات نہیں ہے، انبیاء بھی مخلوق ہیں، ملائکہ بھی مخلوق ہیں۔ اولیاء بھی مخلوق ہیں، تو مخلوق ہونا عیب نہیں ہے۔ تو اتنا تو ہے کہ وہ بے شک مخلوق ہیں، لیکن مخلوق ہونے کے بعد ان کا ظاہر و باطن ان کا قلب و قالب مقدس ہے۔

تقدیسِ قلب...... ممکن تھا کوئی یوں کہتا کہ دلوں کے اندر خرابی ہوگی یہ تو ظاہری اعمال ہیں۔ تو قرآن کریم نے اس کا بھی رد کردیا، فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ﴾ ① ''اللہ نے پہلے ہی ان کے قلوب کا امتحان کرلیا تھا۔ تقویٰ کے معیار پر انکے قلوب کو جانچ لیا تھا۔ یہ پختہ نکلے۔'' ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾. ''یہ سب کے سب بزرگ اور مقدس ہیں۔ رشد و ہدایت لئے ہوئے ہیں۔'' ﴿فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً﴾ ''یہ اللہ کی طرف سے اس کا فضل ہے اور اس کی بڑی نعمت ہے''۔

تو قلب کو الگ سراہا گیا۔ قالب کو الگ سراہا گیا۔ قلبی مقامات، قالب کے افعال کو الگ سراہا گیا اور طبقے کو الگ۔

شرفِ صحابیّت...... اس وجہ سے اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ''اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ'' سارے صحابہ متقن پاکباز اور مقدس ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب، شیخ، ولی اور کامل گزرے مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو رفعت مقام ہے۔ وہ بڑے سے بڑے قطب اور غوث کو نصیب نہیں۔ اس واسطے کہ صحابی وہ ہے جس نے اپنی آنکھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے۔ اپنے کانوں سے بلا واسطہ کلام مقدس کو سنا ہے یہ شرف غیر صحابی کو نصیب نہیں ہوسکتا۔ تو بلا واسطہ آفتاب نبوت کا نور جس طبقے نے لیا ہے۔ جو تیزی اس میں ہوگی بالواسطہ نور میں وہ تیزی نہیں ہوسکتی۔ وسائط کے سبب سے کچھ نہ کچھ پھیکا پن ضرور آئے گا، سب سے پہلے ایمان کا اثر اور نقش جو پڑا ہے۔ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلب پر پڑا ہے بلا واسطہ کسب فیض کیا، اور فیض صحبت حاصل کیا۔ تو نگاہیں بھی مقدس تھیں ان کے کان اور سماعتیں اور زبانیں بھی مقدس ہوگئیں اور ان کی ترقی قلوب ہوگئی۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ انہوں نے اپنی ہر قوت کا مصرف یہ سمجھا کہ ان کے ذریعہ اللہ کے رسول کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتے جائیں یہی ان کا دین یہی ان کا ایمان ہے۔

عشق صحابہ رضی اللہ عنہم...... حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو ایک صحابی ہیں، وہ عوام صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے ہیں، یعنی خواص میں سے نہیں ہیں کہ فقہاء وعلماء صحابہ میں سے ہوں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ تو اس دور میں عوام میں تھے مگر صحابی ہیں تو کھیت میں ہل چلا رہے تھے، تو کسی خبر دینے والے نے خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، ایک دم ہل روک کر ششدر اور حیران رہ گئے! کہا: وفات ہوگئی؟ کہا کہ: ہاں! وفات ہوگئی۔ بس ہل چھوڑ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ: ”اے اللہ! یہ آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کریں یہ کان اس لئے تھے کہ تیرے مقدس رسول کی آواز سنیں اور جب رسول دنیا میں نہیں تو میری بینائی بھی ختم کردے اور میری سماعت بھی ختم کردے اب میں نہ کسی کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں، نہ کسی کی آواز سننا چاہتا ہوں“۔

مستجاب الدعوات تھے۔ اسی وقت دعا قبول ہوگئی اور اسی وقت نابینا ہوگئے اور اسی وقت بہرے ہوگئے کہ کوئی لفظ سن نہیں سکتے تھے، یہ گویا انتہائی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کا مصرف دیدار نبوی سمجھا ہوا تھا۔ کانوں کا مصرف یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنیں، اور کوئی مصرف نہ تھا۔

یہ انتہائی کمال ولایت اور قرب مع اللہ اور نسبت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تمام اعضاء وقوی بدن کی آخری۔ غایت اللہ اور اس کا رسول رہ جائے، کان ہوں تو ان کا مصرف یہ ہے کہ اللہ ورسول کی باتیں سنیں، آنکھ ہو تو اس کا مصرف یہ ہو کہ اللہ کے رسول کا دیدار کرے، ہاتھ اس لئے ہوں کہ اس سے اللہ اور رسول کے آثار کو چھوئیں، قرآن پر ہاتھ رکھیں حدیث پر ہاتھ رکھیں دینی کتابیں اور دینی مکانات پر ہاتھ رکھیں۔ بیت اللہ کے پردوں پر ہاتھ رکھیں گویا ہاتھ کا مصرف یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو چھوئیں جو اللہ ورسول کے نام لگی ہوئی ہیں۔

وہ کسی عارف نے کہا ہے کہ:

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است ــــ افتم بپائے خود کہ بکوئے تو رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را ــــ او دامنت گرفتہ بسوئے ام کشیدہ است

عارف کہتا ہے کہ: مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے، مگر اس لئے ناز نہیں کہ میری آنکھ ہے، اس لئے ناز ہے کہ وہ تیرا جمال دیکھنے والی ہے، نہ اس لئے کہ وہ میری آنکھ ہے اس لئے کہ وہ تیری دیدار کنندہ ہے، اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے قدموں پر سر رکھدوں۔ اپنے قدموں کی تعظیم کروں نہ اس لئے کہ میرے قدم ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ قدم مجھے تیرے کوچے کی طرف کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تیری مسجد اور بیت اللہ کی طرف دینی احکامات کی طرف، دینی چیزوں کی طرف، یہ قدم مجھے کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے قدموں میں اپنا سر ڈالدوں۔ مجھے

قدموں سے محبت ہوگئی ہے، یہ تجھ تک پہنچنے کا واسطہ بن گئے ہیں۔

اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہر دم اپنے ہاتھوں کو چومے جاؤں، نہ اس لئے کہ میرے ہاتھ ہیں، بلکہ اس لئے کہ تیرا دامن پکڑ کر تجھے میری طرف لے آتے ہیں اور قرب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ تو کمال ولایت یہ ہے کہ آدمی اپنی ہر قوت کو ہر عضو کو ہر ملکے کو حق تعالیٰ تک پہنچنے کا اور اللہ کے رسول تک پہنچنے کا واسطہ بنائے۔ صحابہ میں عوام صحابہ کو یہ مرتبہ نصیب تھا۔ صحابہ کے بعد پچاسوں برس کی محنت اور ریاضت کے بعد کہیں یہ مسئلہ آدمی کے سامنے حل ہوتا ہے کہ میرے جسم اور میری روح کی غرض وغایت اللہ اور اس کا رسول ہے۔ بیسیوں برس کی محنت ترک لذات اور مجاہدوں کے بعد کہیں اس مقام تک پہنچتا ہے، مگر صحابہ کی یہ بات ہے کہ عوام صحابہ پہلے ہی قدم پر اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ دنیا تو دنیا اگر ہماری ذات کا بھی مصرف ہے تو اللہ و رسول ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز نہیں، غرض اس طبقے کی تقدیس فرمائی گئی۔ اور اس طبقہ کو مقدس ترین طبقہ کہا گیا۔

معیار ایمان و عمل...... اسی واسطے اہلسنت والجماعت کا یہ مذہب ہو گیا کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ."

"سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین متقن، عادل اور پاکباز ہیں۔"

اور ہماری ہر تنقید سے بالاتر ہیں۔ ہماری ہر حالت سے اونچے ہیں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے ایمانوں کو پرکھیں۔ اگر ان کے ایمان کے مطابق ہو جائے تو ہمارا ایمان درست ہے۔ ورنہ غلط ہے ہم ان کے اعمال کو کسوٹی کے طور پر سامنے رکھیں اگر ہمارا عمل ان کے عمل پر منطبق ہو گیا تو سیدھا۔ ورنہ ہمارے عمل میں کھوٹ ہے وہ ہمارے عمل کے حق و باطل کو پرکھنے اور پہچاننے کے معیار اور کسوٹی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ایمانوں کو پہچاننے کا معیار ہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے راوی ہیں اگر ان میں معاذ اللہ کوئی خرابی ہے تو پھر ہمارے دین کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر بنیاد میں خرابی پڑے تو ہم پھر صحیح ایمان نہیں لا سکتے۔ ہمارا ایمان تو انہی کے قدموں کے صدقے ہے اگر وہ صحیح ایمان لائے ہیں تو ہمارے پاس صحیح ہے اگر انہوں نے کوئی معاذ اللہ غلطی کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعد والوں کے ایمان درست ہوں۔ تو درحقیقت وہ ہمارے ایمان کے پہچاننے کے لئے ایک کسوٹی ہیں۔ ہمارے علم اور عمل کے صحیح اور درست ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ علم کی روایت بھی انہوں نے اللہ کے رسول سے کی ہے اور عمل کی روایت بھی انہوں نے ہی کی ہے۔

اسوۂ علم و عمل...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے یہ فرمایا گیا کہ: آپ اللہ کی طرف سے علم لے کر آئے ہیں۔ سچا اور قطعی علم لا کے امت کے سامنے پیش کیا۔ اسی طرح عمل کے نمونے بھی اللہ کی طرف سے آپ ہی لے کر آئے ہیں۔ ان نمونوں کو دیکھ کر امت نے عمل کا نمونہ سیکھا، اگر علم محض دے دیا جاتا اور عمل کا نمونہ سامنے نہ آتا تو جس شخص کا جیسا جی چاہتا عمل کا نمونہ اختیار کر لیتا۔ نماز کا حکم دے دیا جاتا، مگر نماز کا ڈھنگ عمل کر کے نہ بتلایا جاتا تو میں اپنی ڈھنگ کی نماز پڑھتا۔ آپ اپنی روش کی نماز پڑھتے۔ ایک نماز کی لاکھوں نمازیں بن جاتیں، لیکن اللہ کے

رسول نے جہاں علم دیا، جہاں نماز کا آرڈر دیا وہاں نماز کا نمونہ بھی دیا۔ اسی واسطے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''صَلُّوْا'' اے لوگو! نماز پڑھا کرو، یہ فرمایا کہ: ''صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' ① ''نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو''۔

یعنی نماز کے صحیح ہونے کا نمونہ میں ہوں اسی ڈھنگ کی پڑھو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''تَوَضَّؤُا'' اے لوگو وضو کرلیا کرو، جس طرح تمہارا جی چاہے۔ وضو کا آرڈر بھی دیا اور وضو کر کے بھی دکھلایا کہ یوں کرو۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو تمام اعضاء کو ایک ایک دفعہ دھویا، فرمایا:

هٰذَا وُضُوْءٌ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ الصَّلٰوةَ اِلَّا بِهٖ. ② ''یہ وہ وضو ہے جس کے بغیر نماز ہی نہیں قبول ہوگی''۔

یعنی اگر ایک دفعہ بھی اعضاء وضو نہ دھوئے جائیں تو وضو نہیں ہوتا تو پھر نماز کیسے ہوتی۔ یہ تو وہ وضو ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد دوبارہ وضو کیا اور ہر عضو کو دو مرتبہ دھویا۔ ہاتھ بھی دو مرتبہ دھوئے، کلی بھی دو مرتبہ کی، ناک میں پانی دو مرتبہ اور منہ بھی دو مرتبہ دھویا فرمایا کہ: یہ وہ وضو ہے جو نورٌ علی نور ہے۔ ایک نور ایک دفعہ دھونے میں دوسرا نور دوسری دفعہ کے دھونے میں۔

پھر تیسری دفعہ وضو کیا اور اس میں تمام اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ: هٰذَا وُضُوْءِیْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِیَآءِ مِنْ قَبْلِیْ. ''یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے سارے پیغمبروں کا یہی وضو ہے''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرڈر نہیں دیا کہ وضو کرو، یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں ہو کہ جب چاہو تم اپنی طرف سے گھڑ لو، عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں کہ جیسا چاہو نمونہ بنالو اس میں بھی اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

اسوۂ نبی کی احتیاج...... حدیث میں واقعہ آتا ہے، حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کا، جو صحابی ہیں، رمضان شریف کے بارے میں آیت نازل ہوئی: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ ③

فرمایا گیا کہ: ''کھاؤ اور پیو جب تک کھل کر نمایاں نہ ہو جائے، سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے یعنی متمیز نہ ہو جائے اور الگ پہچان نہ ہو جائے، اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ رات جب جانے لگے، سپیدی کا تاگہ جب نمودار ہو جائے اور صبح صادق ہوگئی اب کھانا پینا بند کردو، روزے کی نیت کرلو۔ رات میں کھانے کی اجازت ہے اور جہاں پو پھٹی اب کھانا پینا ممنوع ہوگیا۔ تو ''خیط ابیض'' یعنی سفید ڈورا صبح صادق کی

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة ج:۳ ص:۷ رقم: ۵۹۵.
② السنن الکبری للبیهقی، کتاب الطهاره، باب فضل التکرار فی الوضوء، ج:۱، ص:۸۰، رقم ۳۸۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحةباب ۲۶، ج:۱ ص:۲۶۰. ③ پارہ:۲، سورة البقرة، الآیة:۱۸۷.

لکیر کو کہا گیا ہے اور سیاہ ڈورا رات کی لکیر کو کہا گیا۔

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک دوڑا تو سفید رکھا اور ایک ڈورا سیاہ رنگوایا اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور کھانا پینا جاری ہے، تکیہ اٹھا کر دونوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ جب یہ ڈورے الگ پہچانے جائیں گے، تب کھانا پینا بند کروں گا، تو صبح صادق کب کی ہوگئی، چاندنا بھی ہوگیا مگر اتنا چاندنا نہیں ہوا تھا کہ ڈورے الگ نمایاں ہو جائیں، تو صبح صادق گزرے ہوئے بیس منٹ گزر گئے اور یہ اپنا کھاپی رہے ہیں کہ جب تک ڈورے الگ الگ نمایاں نہیں ہوں گے، کھانے پینے کی اجازت سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم کیا کرتے ہو؟ روزے کی نیت کب کرتے ہو؟

انہوں نے عرض کیا : یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ: کھاؤ پیو جب تک سفید ڈور کی سیاہ ڈورے سے الگ پہچان نہ ہوجائے۔ یارسول اللہ! میں نے دوڈورے تکئے کے نیچے رکھ رکھے ہیں، ایک کالا ڈورا ایک سفید ڈورا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ'' ''تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے'' کہ کالا ڈورا اور سفید ڈورا دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے، یعنی رات اور دن دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے، تیرے تکئے کی بڑائی کا کیا ٹھکانہ ہے؟

بندۂ خدا! کالے ڈورے سے مراد، رات کی سیاہی ہے اور سفید سے مراد صبح صادق کی لکیر ہے، تو تیرا تکیہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے نیچے صبح صادق بھی آگئی اور رات بھی آگئی۔ تب واضح ہوا کہ کالے ڈورے سے مراد خداوندی رات ہے اور سفید ڈورے سے مراد خداوندی صبح صادق ہے تو لغت کے لحاظ سے وہ یہ مطلب سمجھے اور لغت کے لحاظ سے وہ مطلب صحیح تھا، مگر مراد اللہ کی یہ نہیں تھی۔

اب اگر اللہ کا رسول اس مراد کو بیان نہ فرمائے۔ تو عمر بھر وہ اسی غلطی میں مبتلا رہتے، ایک روزہ بھی ان کا صحیح نہ ہوتا، اس لئے واضح ہوا کہ قرآن وحدیث میں ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک ارادی معنی جن کا اللہ ورسول نے ارادہ کیا ہے۔ ایک اس کا ترجمہ ہے اور ایک اس کا مطلب ہے یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں کہ جو چاہو اپنی طرف سے گھڑ لو۔ عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں ہو کہ جیسا چاہو نمونہ بنالو۔ اس میں اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

علم وعمل کی مطابقت...... اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں یہ فرمایا گیا کہ: یہ قرآن ﴿تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ﴾ ہے، ہر چیز کے لئے یہ تبیان ہے، تبیان دعوی مع الدلیل کو کہتے ہیں، یعنی اس میں احکام بھی ہیں اور احکام کے دلائل بھی ہیں، یعنی مدلل دعوؤں اور مدلل مسائل کا مجموعہ ہے۔

اس طرح سے فرمایا کہ: ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ (۱) تو قرآن نے جتنے علم کے نمونے

(۱) پارہ ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

پیش کئے۔ اللہ کے رسول نے اتنے ہی عمل کے نمونے پیش کئے۔ قرآن میں جو چیز قال کی صورت میں ہے اللہ کے رسول میں وہی چیز حال کی صورت میں ہے۔ وہاں قول ہے یہاں عمل ہے تو قول اور عمل دونوں مطابق ہیں آپ جو کچھ عمل کرتے ہیں، قرآن وہی کچھ کہتا ہے، جو کچھ قرآن کہتا ہے وہی آپ عمل کرتے ہیں۔ تو علم و عمل کی مطابقت ہے۔

اتباعِ محض ...... یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں اختلافات بہت کم ہیں، اس لئے کہ جہاں کسی آیت کے مضمون میں انہیں اشکال ہوا وہ اللہ کے رسول کے عمل کو دیکھ لیتے تھے اشکال حل ہو جاتا تھا۔ معلوم ہو جاتا تھا کہ اس علم کا مصداق یہ ہے کہ اس عمل کی ہیئت عمل یہ ہے جو اللہ کے رسول نے کر کے دکھلائی۔ تو جتنی چیزیں قرآن میں علم کی صورت میں ہیں وہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمل کی صورت میں ہیں۔ تو آپ نے جہاں یہ فرمایا کہ: ''یہ کرو اور یہ نہ کرو'' وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیا کہ جو کرنے کی چیز ہے اس کی ہیئت یہ ہے اور جو بچنے کی صورت ہے تو بچنے کی یہ ہیئت ہے، تو وضو کر کے دکھلایا۔ نماز کو کر کے دکھلایا جہاد کو کر کے دکھلایا۔ روزے کو کر کے دکھلایا۔ شادیاں کر کے دکھلائیں کہ یہ نمونہ ہے۔ اور غمی کو کر کے دکھلایا کہ یہ نمونہ ہے، دوستوں سے یہ معاملہ ہے، دشمنوں سے یہ ہے، صلح کا یہ طریقہ ہے، جنگ کا یہ طریقہ ہے۔ اصول بتلا دیئے اور ان اصولوں کے مطابق اپنے عمل کا نمونہ پیش کر دیا۔

تو خلوت ہو یا جلوت، انفراد ہو یا اجتماع، جماعتی زندگی ہو یا فردی، سب کے عمل کے نمونے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیئے۔ اس واسطے امت کے لئے اتباع ہی اتباع ہو گیا تجویز باقی نہیں رہی تجویز تو تب کریں جب کوئی نمونہ نہ دکھلایا گیا ہو۔ سارے نمونے موجود ہیں آگے اتباع رہ جاتا ہے۔ گھڑنا یا بنانا یا ساخت کرنا نہ علم کے درجے میں باقی۔ علم پورے کا پورا لا کر پیش کر دیا۔ شریعت جامع ہے۔ اس شریعت پر پورا پورا عمل کر کے دکھلایا تو اتباع باقی رہ جاتا ہے، تجویز امت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔

تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے سب سے پہلے اتباع کیا، سب سے زیادہ متبع سنت وہی ہیں۔ سب سے زیادہ متبع شریعت وہی ہیں۔ انہوں نے ہر نمونے کو اللہ کے رسول سے روایت کیا۔ تو قرآن کریم کی عملی روایت بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلی اور اس کی روایت بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلی۔ عمل بھی کر کے دکھلاتے رہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پھر تابعین اس کے بعد تبع تابعین۔

فرائضِ رسالت ...... قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار وظیفے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (1) اللہ نے رسول بھیجا۔ اس کی کیا شان ہے؟ اللہ کے رسول نے چار کام کئے، پہلے تلاوت آیات کی یعنی بلا کم و کاست، وحی کے الفاظ جو اللہ نے آپ کے قلب مبارک پر نازل کئے پڑھ کر سنا دیئے۔ اس کے بعد تعلیم دی۔ تعلیم تلاوت

(1) پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

سے الگ ہے، تلاوت کا تعلق لفظوں سے ہوتا ہے۔ تعلیم کا تعلق معانی سے ہوتا ہے، یعنی پہلے لفظ سنائے، پھر معانی سمجھائے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔ اس کے بعد پھر تعلیم حکمت کی اور حکمت سے مراد یہاں اسوۂ حسنہ ہے، یعنی کر کے دکھلایا۔ اس لئے کہ حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت نظری اور ایک حکمت عملی۔ حکمت نظری تو تعلیم میں آ گئی کہ نظر وفکر کی چیز تھی علمی صورت میں آپ نے بتلا دی، اب عملی صورت رہ جاتی تھی۔ اس کو حکمت سے تعبیر کیا کہ عمل کا نمونہ پیش کر دیا تو علم بھی سکھلایا اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا۔

تزکیۂ قلوب...... اس کے بعد چوتھی چیز بتلائی "وَيُزَكِّيهِمْ" دلوں کے مانجھنا اور ان کو صاف کرنا یہ بھی آپ کا ایک وظیفہ ہے، امت کا تزکیہ فرمانا اور ان نفوس میں استقامت پیدا کرنا، زیغ کجی اور ٹیڑھ نکال دیں، فہم کی ایسی سلامتی پیدا کریں کہ جب اللہ کی آیات پڑھی جائیں تو آدمی ٹھیک وہ مطلب سمجھے جو اللہ کی مراد ہے۔ دل صحیح راستہ پر پڑ جائے۔

اس واسطے کہ اگر دل میں ٹیڑھ رہ جاتی ہے تو صحیح سے صحیح کلام کا مطلب بھی ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ سمجھ کا دار و مدار دل پر ہے اور دل کا راستہ غلط ہو تو ہر مکتوب غلط ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کے دل میں خدانخواستہ یہودیت بھری ہوئی ہے وہ قرآن کو پڑھے گا تو ساری آیتوں میں سے یہودیت نکالنا شروع کر دے گا، اسے یوں معلوم ہوگا کہ سارا قرآن یہودیت سکھلانے کے لئے آیا ہے۔ نصرانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے نصرانیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے قادیانیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ کوئی اور نظریہ مکتب فکر لے لیجئے۔ جو مکتب فکر بنا ہوا ہوگا ویسا ہی آدمی ہر آیت ہر روایت سے مطلب سمجھے گا تو سمجھنے کا دار و مدار دل پر ہے۔ اگر دل میں صحیح سلامتی پیدا کی جائے تو آدمی ٹھیک مطلب سمجھے گا اور اگر دل ٹیڑھا ہے تو ہر چیز ٹیڑھی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط تعلیم ہی نہیں دی۔ فقط مطالب ہی نہیں بتلائے بلکہ دلوں کا رستہ بھی سیدھا کیا تا کہ سیدھا مطلب سیدھے دل میں اتر جائے گھر کر جائے۔ اگر دلوں میں ٹیڑھ رہ گئی تو یقیناً مطلب بھی ٹیڑھا بن جائے گا۔

عمل کی نگرانی..... تو آپ نے تزکیہ بھی کیا اور عمل کی نگرانی بھی کی۔ ایک طرف مسائل سکھلائے اور ایک طرف عمل دیکھتے تھے کہ آیا صحابہ کا عمل اس کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو نگرانی فرماتے تھے۔

(۱) حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نگرانی کرتے ہوئے گھومے تو آپ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تلاوت میں مشغول تھے اور اتنی آہستہ تلاوت کر رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے تو سننے میں آتی تھی ورنہ سننے میں نہیں آتی تھی۔ آپ آگے پہنچے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے وہ اتنے زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے کہ سارا محلّہ گونج رہا تھا۔

صبح کو جب یہ حضرات دربار نبوی میں جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ

(۱) السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی رفع الصوت بالقرأۃ فی صلوٰۃ اللیل، ج: ۲ ص: ۳۷ رقم ۱۳۲۹۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح ابی داؤد ج: ۳ ص: ۳۲۹ رقم: ۱۳۲۹۔

کیوں پڑھتے تھے کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے‘ کان لگائے تو مشکل سے سننے میں آئے عرض کیا، یا رسول اللہ میں اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے، یعنی اللہ رب العزت، تو مجھے زور زور سے پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو میرے دل کی کھٹک سے بھی واقف ہے:﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ”مجھے ضرورت نہیں تھی کہ میں زور زور سے آواز اٹھاؤں“۔ ”لَاتَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَآئِبًا.“ ”تم جو پکار رہے ہو نہ بہرے کو پکار رہے، ہو نہ غائب کو پکار رہے ہو وہ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور شنوا و بینا اور سمیع و بصیر ہے۔ اس واسطے میں آہستہ پڑھتا تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا: ”اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطَرِّدُالشَّيْطَانَ“

زور زور سے پڑھ کر سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، کہ اس کوچے میں نہ آنے پائے قرآن کی آواز سن کر دور سے بھاگ جائے۔ تو دونوں کے پاس ایک حجت تھی اور دونوں کے قلب کا ایک مقام تھا۔ اپنے مقام کے مطابق ہر ایک کا عمل سچا اور حق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو بکر! تم ذرا آواز کو پستی سے بلند کردو اور، اے عمر! تم ذرا رفعت سے پستی کی طرف آؤ، تا کہ اعتدال قائم ہو جائے۔ دونوں نقطہ اعتدال پر آ جاؤ، ظاہر بات ہے کہ یہ نگرانی تھی، یہ قلب کی راہیں درست کرنا تھا۔

غرض مجاہدہ...... یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا، آہستہ پڑھنا بھی جائز ہے اور پکار کر پڑھنا بھی جائز ہے، یہاں جائز و ناجائز کی بحث نہیں تھی۔ یہاں قلب کو راہ اعتدال پر لانے کی بحث تھی۔ یہ چیز قلبی مقامات سے متعلق ہے، مسائل سے نہیں بلکہ مقامات باطن سے متعلق تھی تو جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم سکھلایا۔ مسائل بتلائے وہاں دلوں کو مانجھا بھی اور رصاف بھی کیا۔ مجاہدے اور ریاضتیں کرا کرا اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بھری، تا کہ دنیا کی محبتیں قلب سے نکل جائیں تو کہیں جہاد، کہیں مجاہدہ اور کہیں راتوں کے تہجد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر راتوں کو تہجد میں راسخ القدم بن کے اتنا کھڑے رہتے تھے کہ پیروں پر ورم آ جاتا تھا، یہ محنتیں اور مجاہدے کس لئے تھے؟ تا کہ نفس کی مرغوبات ختم ہو کر روح کی مرغوبات سامنے آ جائیں، قلب کے اندر محبت الٰہی جاگزیں ہو جائے اور راسخ ہو جائے، اب دنیا کا کام بھی کریں تو اللہ کے لئے کریں، نفس کے لئے نہ کریں، تو نفس کی راہوں کو بند کر کے قلب اور روح کی راہیں ان کے سامنے کھول دیں کوئی عمل بند نہیں کیا۔

فرق عمل...... اعمال جو ایک عامی آدمی کرتا ہے، وہی ایک ولی بھی کرتا ہے، فرق ہوتا ہے قلب کے راستے میں اس کا کرنا لوجہ اللہ ہوتا ہے، اور اس کا لوجہ النفس ہوتا ہے، عمل دونوں کا برابر ہے۔ کھاتا یہ بھی ہے اور ایک ولی بھی کھاتا ہے، بازار میں یہ بھی جاتا ہے اور ایک ولی کامل بھی بازار جاتا ہے، صورت عمل میں تو فرق نہیں مگر نیت عمل اور غرض وغایت عمل میں فرق ہے تو باطن کا فرق ہوتا ہے آپ نے قلوب کو صاف کر کے باطن کو مانجھ دیا کہ جو کچھ کریں لوجہ النفس نہ رہے، لوجہ اللہ ہو جائے۔ دوستی ہو یا دشمنی، محبت ہو یا عداوت خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔

اخلاص عمل...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیر کی کتب میں مشہور ہے کہ آپ نے غزوۂ بدر میں ابو جہل کو پچھاڑ

دیا اور ارادہ کیا کہ خنجر لے کر اسے ذبح کر دیں۔ اس نے غصہ میں آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، بس خنجر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے قتل سے باز آ گئے کہ اب نہیں قتل کروں گا۔

ابو جہل نے کہا: اے علی! میں تو تم کو دانشمند سمجھتا تھا۔ میں تمہارا بھی دشمن، تمہارے رسول کا بھی دشمن اور تمہارے دین کا بھی دشمن۔ ایک منٹ کے لئے میں نہیں چاہتا کہ تمہارا دین اس دنیا میں باقی رہے تم یا تمہارے رسول باقی رہیں اتنے بڑے دشمن پر قابو پا کر اسے چھوڑ دینا یہ کونسی دانشمندی ہے؟ تم نے کیوں نہیں مجھے قتل کیا۔

فرمایا کہ: میں تجھے اللہ کے لئے قتل کرنے بیٹھا تھا۔ میری کوئی ذاتی لڑائی تجھ سے نہیں، کوئی ذاتی بغض نہیں۔ اللہ کی وجہ سے عداوت تھی اور یہ ساری لڑائی بھڑائی اللہ کی وجہ سے تھی۔ جب تو نے میرے منہ پر تھوکا تو میرے نفس میں غصہ پیدا ہو گیا، اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبات سے قتل کرتا تو میری عبادت شرک میں بدل جاتی۔ میری توحید، توحید باقی نہ رہتی۔ اس واسطے میں قتل سے باز آ گیا۔ اس لئے کہ یہ قتل و غارت نفسانی جذبے سے نہیں رحمانی جذبے سے ہے۔ جب نفس میں غضب پیدا ہو گیا۔ تو اب قتل کرنا نفس کی راہنمائی سے ہوتا خدا کی راہنمائی سے نہ ہوتا۔ لوجہ اللہ نہ ہوتا، لوجہ النفس ہوتا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا جو کچھ عمل تھا وہ اللہ کے لئے تھا، نفس کے لئے نہ تھا۔

حقیقتِ ولایت...... یہ دولت حضرات صحابہ کرام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ سے نصیب ہوئی۔ آپ نے ریاضتیں اور مجاہدے کرا کر دلوں کو مانجھا اور دلوں کی راہ درست کی نیتیں بھی صاف۔ منزلیں بھی صاف، غرض و غایت بھی درست، ہر عمل کھانا پینا، سونا جاگنا اللہ کے لئے ہو گیا۔ ان کی جوتیوں کی برکت ہے کہ اولیاء کرام میں بھی یہ چیزیں آئیں۔ ولایت کہتے ہی اس کو ہیں کہ قلب کا راستہ درست ہو جائے۔ ولایت کے یہ معنی نہیں کہ آدمی کھانا چھوڑ دے، لباس چھوڑ دے، گھر بار ڈھا دے، گھر میں رہنا سہنا ترک کر دے، ولی کے معنی یہ ہیں کہ گھر میں رہے مگر حظ نفس کے لئے نہیں۔ خدا کی رضا کے لئے، کھانا کھائے مگر نفس کی لذت کے لئے نہیں، رضائے خداوندی کے لئے۔ ایک ولی اور عامی میں یہی فرق ہوتا ہے تو عمل ولی اور عامی کا ایک ہوتا ہے، مگر قلب کا فرق ہے۔ نیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، قلب کے مقامات کا فرق ہوتا ہے، تو اولیاء میں یہی چیز ہوتی ہے کہ وہ ہر بات لوجہ اللہ کرتے ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ یہ اولیائے کاملین میں سے ہیں اور بڑے اونچے رتبے کے اولیاء میں ہیں، حتی کہ اس درجہ کے لوگوں میں ہیں کہ خود سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ: وہ جو حق تعالیٰ نے عالم ازل میں عہد لیا تھا ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟'' آدم علیہ السلام کی کمر سے ان کی ساری اولاد نیک و بد نکالی گئی اور سب کو سامنے کر کے حق تعالیٰ نے عہد لیا۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟﴾ ''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟'' سب نے وہاں عہد کیا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ ہمارے پروردگار ہیں۔ یہ سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اس درجے کے لوگوں میں ہیں فرماتے ہیں کہ: ''مجھے آج تک وہ عہد یاد ہے۔ اور وہ مقام بھی یاد ہے جہاں یہ عہد لیا گیا تھا''۔

اس درجہ ان کی روح صاف ہے اور جلا لئے ہوئے ہے کہ عالم ازل کا نقشہ پیدائش کے بعد بھی ان کے ذہن میں تھا۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ مجاہدین کی ایک جماعت جا رہی تھی۔ تو ان کا ارادہ ہوا کہ میں بھی جہاد میں شریک ہوں کہ مفت میں ایک اتنی بڑی عبادت ملتی ہے تو ان کے نفس میں تقاضا پیدا ہوا کہ میں جہاد میں شریک ہو جاؤں، لیکن جب نفس میں تقاضا پیدا ہوا تو بیٹھ گئے اور کہا کہ یہ نفس کیوں چاہتا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں۔ نفس کو تو جہاد سے بچنا چاہئے تھا نفس چاہے کہ میں عبادت کروں تو نفس تو اس درجے کی چیز نہیں وہ تو عبادت سے روکنے والی چیز ہے۔ ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ ①

نفس تو برائی کا امر کرتا ہے، نہ یہ کہ امر کرے کہ تم نماز پڑھو اور جہاد کرو اور اللہ کی راہ میں جان دے دو۔ نفس کو تو بچنا چاہئے۔ تو نفس میں کیوں یہ تقاضا ہے؟ کوئی مکر پوشیدہ ہے اور نفس کے اندر کوئی کھوٹ ہے غرض بیٹھ گئے اور بیٹھ کر سوچنا شروع کیا کہ آخر نفس کے لئے جہاد کے اندر کیا لذت کا سامان ہے کہ یہ نفس کہہ رہا ہے کہ جہاد میں چلو۔

تو ذہن میں یہ بات آئی کے مجھے چالیس برس روزے رکھتے ہوئے گزر گئے ہیں اور ایک دن بھی چالیس برس میں افطار نہیں کیا اور جہاد میں روزہ رکھ کر شریک ہونا مکروہ ہے، اگر رمضان بھی ہے تو بھی مستحب یہ ہے کہ افطار کرے تا کہ قوت سے جہاد کر سکے۔ بھوکا آدمی جہاد نہیں کر سکے گا۔ تو نفس کی مکاری یہ چھپی ہوئی تھی کہ چالیس برس سے مجھے بھوکا مار رکھا ہے۔ جہاد میں جاؤ گے تو دن میں کھانے کو روٹی تو مل جائے گی۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔ اب کھڑے ہوئے اور کہا اے نفس! میں جہاد میں جاؤں گا اور روزہ رکھ کر جاؤں گا۔ آج (افطار کرنے کے) مستحب کو انجام نہیں دوں گا چاہے مکروہ ہو مگر تجھے ستانا ہے اور تیرا مقابلہ کرنا ہے لہٰذا جہاد بھی کروں گا تو روزہ رکھ کر کروں گا۔ تجھے کھانے کو وہاں نہیں ملے گا۔ اس پر بھی نفس نے کہا تم چلو جاؤ جہاد میں، میں تیار ہوں۔

پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ! یہ نفس میں جہاد کا کیوں تقاضا ہے؟ یہ تقاضا قلب اور روح میں ہونا چاہئے یہ نفس کیوں تقاضا کر رہا ہے اسے تو جہاد سے بچنا چاہئے پھر بیٹھ گئے، غور اور مراقبہ کیا کہ آخر کونسا مکر نفس کے اندر پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ: جہاد کرو۔

تو سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ چالیس برس سے میں خلوت میں ہوں، آدمی کے نفس کا تقاضا لوگوں سے ملنا جلنا، انس و موانست حاصل کرنا ہوتا ہے۔ انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یہ جانوروں کی طرح بھٹوں میں وحشت زدہ ہو کر الگ الگ نہیں رہتا۔ بستیاں بنا کر رہتا ہے۔ میل جول سے رہتا ہے تا کہ انس و موانست پیدا ہو۔ یہ تو انس کا بندہ ہے۔ اور اسی واسطے انسان کو انسان کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ اُنس ہے جس میں انس نہ ہو وہ انسان ہی نہیں۔ تو انسان کا جبلی تقاضا انسیت و موانست ہے کسی عرب کے شاعر نے کہا ہے کہ:

وَمَاسُمِّیَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ وَمَاالْقَلْبُ اِلَّااَنَّهٗ یَتَقَلَّبُ

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳۔

انسان کو انسان کہا ہی اسی لئے گیا ہے کہ اس میں انسیت اور موانست کا مادہ موجود ہے۔ جیسے قلب کو قلب اس لئے کہتے ہیں کہ قلب کے معنی لوٹنے پوٹنے کے ہیں۔ قلب میں چوں کہ ہر وقت کا لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے کبھی یہ جذبہ، کبھی یہ خیال، کبھی یہ ارادہ، اس لئے قلب کو قلب کہتے ہیں۔ تو انسان انسان بنا ہی اس لئے کہ اس میں انس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ چار آدمیوں کے ساتھ مل کر رہے۔ تنہائی میں اسے وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تو چالیس برس سے سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ خلوت میں رہتے تھے۔ نفس چاہتا تھا کہ لوگوں سے مل جل کر رہیں، مگر بچتے تھے۔ تو نفس میں تقاضا جہاد کا ہوا کہ جب جہاد کریں گے تو چار آدمیوں سے ملاقات تو ہوگی۔ یہ جو تنہائی میں مجھے گھوٹ رکھا ہے۔ جہاد میں جا کے یہ تنہائی کی وحشت کچھ تو کم ہوگی۔ ایک خیمہ میں جب جمع ہونگے نو دس آدمی ہوں گے اور تو کچھ بات چیت کرنے کا موقع ملے گا، کسی میدان میں جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ موانست حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ تو یہ جو تنہائی کی وحشت کے ساتھ چالیس برس سے مجھے مار رکھا ہے۔ یہ مار تو ختم ہو جائے گی۔ اس لئے جہاد کا تقاضا پیدا ہوا۔

یہ گویا مکر تھا جو چھپا ہوا تھا۔ تو سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ پھر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ: ’’اے نفس! اگر میں جہاد کو بھی جاؤں گا تو کسی شخص کی طرف نہ دیکھوں گا، نہ انس حاصل کروں گا، نہ کسی سے گفتگو کروں گا۔ تجھے خلوت ہی میں رکھوں گا اور تجھے اسی طرح مارنا ہے‘‘۔

نفس نے کہا کہ: یہ بھی منظور ہے اگر تم جہاد کے لئے چلو، اب پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ کون سی ایسی مکاری چھپی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ نفس جہاد کا تقاضا کر رہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ: اے اللہ! اس نفس میں ایسا باریک مکر ہے، جو مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تو مجھ پر کھولے گا تو واضح ہوگا کہ کیا خباثت ہے اور کیا مکاری ہے جو چھپی ہوئی ہے کہ نفس چاہتا ہے کہ میں شریعت کے اعمال سرانجام دوں۔

ادھر سے الہام ہوا اور اب اصلیت کھلی اور وہ یہ کہ چالیس برس ریاضت اور مجاہدے میں گزر گئے تھے گویا نفس کو مار رکھا تھا ’’مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا۔‘‘ مرنے سے پہلے اسے مار دیا تھا۔ اس کی خواہشات کو کچل دیا تھا۔ اس کی مرضیات کو فنا کر دیا تھا تا کہ مرضی حق حاصل ہو۔ نفس پر یہ چیزیں شاق تھیں، تو نفس میں جہاد کا تقاضا اس لئے تھا کہ میدان میں جائے ایک دفعہ گولی لگے گی تو روز روز کی جھک جھک کا تو خاتمہ ہو جائے گا، بس ایک دفعہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ جو روز کی موت ہے، یہ تو ختم ہوگی۔ جو ہونا ہوگا ایک دفعہ ہو جائے گا، ایک دفعہ تلوار پڑے گی، ختم ہو جائیں گے۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔

سہل ابن اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ میری نیت درست کر دے، جب نیت درست ہوئی تو جا کر مجاہدین میں شریک ہوئے اور جہاد کے لئے گئے۔

عمل بلا تزکیہ...... یہ کیا چیز تھی؟ یہ وہی تھا کہ نفس مانجھ کر اس درجہ صیقل بنا لیا تھا اور حقیقی معنوں میں رضاء خداوندی

کا ادراک اور احسان جب تک نفس میں صفائی نہ ہو نہیں ہوسکتا، بعض دفعہ ایک عادت بصورت عبادت ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں عبادت کررہا ہوں اور وہ نفس کی پرستش ہوتی ہے ایک صاحب باطن بتاتا ہے کہ اس کے اندر کھوٹ ملا ہوا ہے۔ یہ عبادت صحیح نہیں بنی۔ اس سے رضائے حق تعالیٰ حاصل نہیں ہوگی۔ تو اس کا ادراک ہو جانا اور اس کی سمجھ پیدا ہو جانا کہ نفس کی کیا خواہش ہے اور حق تعالیٰ کی کیا مرضی ہے کس جانب کو مجھے جانا چاہئے اور کس جانب کو ترک کرنا چاہئے؟

تو نفس کی باریک باریک خواہشیں اور مکاریاں ہوتی ہیں یہ اس وقت تک منکشف نہیں ہوسکتیں۔ جب تک نفس کے اندر صفائی نہ پیدا ہو۔ جب تک جلاء نہ پیدا ہو اور نورانیت نہ پیدا ہو اور یہ نورانیت بغیر مجاہدے اور بغیر ریاضت کے نہیں آسکتی۔ اس واسطے مجاہدے اور ریاضتیں کراتے ہیں تاکہ نفس میں استقامت پیدا ہو سیدھا پن پیدا ہو سلامتی قلب پیدا ہو تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو مجاہدے کرائے گئے ریاضتیں کرائی گئیں۔ اس کے ذریعہ سے ان کے نفوس سے جو شرک کے نزغے تھے۔ وہ نکل گئے۔ وہ جو کج راہی تھی وہ نکل گئی۔ وہ جو غیر اللہ کی محبت میں سرشار تھے۔ وہ محبت ختم ہوئی۔

کمالِ استقامت......اب انکی محبت تھی تو اللہ کے لئے، عداوت تھی تو اللہ کے لئے، دینا تھا تو اللہ کے لئے، لینا تھا تو اللہ کے لئے۔ کمال ایمان کمال استقامت سے پیدا ہوتا ہے جس کی حدیث میں ایک موقع پر فرمایا گیا: ''مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ'' ''جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کیلئے کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا''۔

تو دنیا میں آدمی جو کچھ بھی عمل کرتا ہے یا بچتا ہے تو اس کا منشاء یا محبت ہوتی ہے یا عداوت۔ جس کام کو آپ کرتے ہیں اگر رغبت ہوگی جب ہی تو آپ کریں گے، اگر نفرت ہوگی تو کیسے کریں گے تو کسی چیز کی رغبت ہونا اس کے کرنے کی دلیل ہے، کرنا اس سے محبت اور مرغوب ہونے کی دلیل ہے جس چیز سے عداوت ہوگی، اس سے آپ بھاگتے ہیں۔

تو کسی چیز کو نہ کرنا اس سے نفرت کی دلیل ہے تو فرمایا گیا کہ: جس نے رغبت کی تو لوجہ اللہ کی۔ نفرت کی تو یوجہ اللہ کی۔ رغبت اور نفرت کا تعلق نفسانی جذبات سے باقی نہ رہے۔ دیا کسی کو تو اللہ کے لئے، نہ دیا تو اللہ کے لئے، جب ہر حرکت اور سکون لوجہ اللہ بن جائے۔ تب کہا جائے گا کہ: نفس کامل ہوگیا۔ اس کا ایمان کامل ہوگیا۔

تفویضِ مطلق......اس کے معنی اسلام کے ہیں یہی حقیقی اسلام ہے کہ جو کچھ ہو اللہ کے لئے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا تھا: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ﴾ ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ''۔

مسلم بننے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ غیر مسلم تھے، اب اسلام قبول کریں، آپ تو پیغمبر ہیں، مسلم ہونے کے کیا معنی؟ یعنی گردن جھکا دو۔ جو کچھ کرو، ہمارے لئے کرو۔ اپنے نفس کے لئے کچھ مت کرو۔

مسلم بننے کے یہ معنی تھے یعنی تفویض کرنا، اپنے نفس کو سونپ دینا، اللہ کے حوالے کر دینا کہ جس طرح اس کی شریعت الٹ پلٹ کرے، اس طرح الٹ پلٹ ہو جاؤ تمہاری اپنی کوئی مرضی یا تدبیر باقی نہ رہے، تم ایسے بن جاؤ ''کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِالْغَسَّالِ'' جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جدھر کو کروٹ دے دے، مردہ یہ نہیں کہتا کہ: مجھے ادھر کو کیوں پلٹ دیا، جدھر کو بٹھا دے، لٹا دے، کروٹ دے دے، میت نہلانے والے کے اختیار میں ہے۔ اس طرح سے آدمی اپنے ارادہ واختیار سے شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ غیر ارادی طور پر تو اب بھی انسان اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی مرضی سے اس کی حرکت اور سکون ہے، لیکن ارادے سے اپنے آپ کو سونپ دے کہ جدھر کو آپ چاہیں گے ادھر ہی کو میرا ارادہ متوجہ ہو جائے گا۔ یہ اسلام ہے۔ اس کو کہا گیا کہ۔ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ﴾ ① ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ''۔ یعنی اپنے کو ہمارے حوالے کر دو جس طرح ہم الٹیں پلٹیں تم تیار رہو۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ② ''اے اللہ! میں مسلم بن گیا''۔

یعنی میں نے اپنے کو حوالے کر دیا۔ جس طرح سے آپ کا جی چاہے مجھ میں تصرف کریں۔ میری محبت ہو گی تو آپ کے لئے ہو گی۔ عداوت ہو گی تو آپ کی خاطر ہو گی نفس کی خاطر کچھ نہیں ہو گا۔

فرمایا کہ: جب تم مسلم بن گئے اور مان لیا تو دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: اب اس اسلام کا اعلان کرو۔ وہ اسلام کیا ہے؟ ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ③ ''اے ابراہیم! اعلان کر دو کہ میری نماز اور میرا حج میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ کے لئے ہے، میرے اپنے لئے کچھ نہیں''۔

جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو میرے ان اعمال میں کوئی شریک نہیں، ایک ہی کی رضا کے لئے کر رہا ہے، چند کی رضا کے لئے نہیں، اور اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور میں آج کے دور میں اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی یہ نکل آئے کہ نماز بھی ہے تو اللہ کے لئے ہے، حج ہے تو اللہ کے لئے، مرنا ہے تو اللہ کے لئے، جینا ہے تو اللہ کے لئے، یعنی تفویض محض، اپنے آپ کو حوالے کر دینا ہے۔ اسلام کے یہی معنی ہیں کہ آدمی اپنے کو حوالے کر دے کہ نہ اس کی اپنی مرضی باقی رہے نہ اس کی اپنی رضا باقی رہے، رضا ہو تو اللہ کی ہو، ارادہ ہو تو اللہ کا ہو۔

فناءِ کلی..... کسی غلام سے کسی نے پوچھا: تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ: جو آقا کھلا دے۔ کہا: تو کیا پہنے گا؟ اس نے کہا: جو آقا پہنا دے۔ کہا: تو کام کیا کرے گا؟ کہا: آقا جو کام لے لے۔ اس نے کہا کہ: آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا: اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا!

پھر میں آقا ہی نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ میری مرضی بھی غلام میری رائے بھی غلام،

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔

③ پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۲-۱۶۳۔

میری خواہش بھی غلام،

اگر خواہش ہے تو آقا کی مرضی ہے تو آقا ہی کے لئے، ارادہ ہے تو آقا کا ہے۔ تو ایک انسان جب غلام بن کر اپنے کو دوسرے کے اس درجے حوالے کر دیتا ہے، حالانکہ دوسرا انسان اس کا خالق نہیں اس کا مالک نہیں، پھر بھی ذرا سے احسان کی بدولت حوالے ہو گیا۔ تو جو محسن حقیقی جو اللہ رب العزت ہیں، جس کا دعویٰ کیا ہے کہ میں اس کا غلام اور بندہ ہوں۔ اس کا بندہ بھی بنے اور تجویز بھی اپنی پیش کرے۔ اس کا بندہ بھی بنے اور اس کے سامنے پھر رائے بھی رکھے۔ یہ بندگی نہیں، دعویٰ بندگی ہے اور وہ غلط ہے۔ بندگی یہ ہے کہ کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِالْغَسَّالِ مرضی حق کے تابع ہونا ہے۔

مرضی حق...... آج دنیا میں لوگ اللہ کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ خود اس کے تابع ہونا نہیں چاہتے۔ مرضی سوچ لیتے ہیں کہ ایسا ہو، استفتاء بھی کریں گے تو اس نیت سے کہ ہماری مرضی کے مطابق فتویٰ ہو اگر رائے بھی پوچھیں گے تو اس نیت سے کہ جو ہم چاہیں گے وہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور دعاء بھی ہو تو اسی کے تابع ہو فتویٰ بھی ہو تو اسی کے تابع ہو۔ یہ تو اللہ کو تابع بنانا ہے۔ تو دعویٰ تو اپنے تابع ہونے کا ہے اور آدمی متبوع بن گیا اور چاہتا ہے کہ خدا اس کے تابع ہو تو یہ چلنے والی بات نہیں۔ تفویض کے بھی خلاف ہے اور اسلام کے بھی خلاف ہے مسلم ہونے کے تو یہ معنی ہیں کہ میں تابع ہوں مرضی حق کے میری مرضی کوئی چیز نہیں۔ فنائے مرضی ہی کا نام اسلام ہے فنائے خواہش ہی کا نام اسلام ہے اگر ہم میں ہماری مرضی زندہ ہے تو مسلم کب ہیں؟ اور اگر خواہش زندہ ہے تو حقیقی معنی میں مسلم کب ہیں؟ اس لئے فرمایا گیا کہ: اسلام یہ ہے کہ اپنے کو سونپ دو اور حوالے کر دوم، یہ زندگی اگر صحیح معنی میں دیکھی گئی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھی گئی، اگر ان کی آنکھ اس چیز کو دیکھ رہی ہے اور اللہ و رسول اس کو کوئی اور چیز کہلوانا چاہیں تو آنکھ کو بے تکلف جھٹلانے پر تیار تھے مگر مرضی حق کو جھٹلانے کو تیار نہ تھے۔

① حدیث میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: ''اَیُّ یَوْمٍ هٰذَا؟'' ''یہ کون سا دن ہے؟''۔

سب جانتے تھے کہ ۹ رذی الحج ہے۔ عرفہ کا دن ہے۔ حج میں جمع ہیں۔ تو سیدھا جواب یہ تھا کہ یوم عرفہ ہے، جواب کیا دیتے ہیں: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''اَیُّ بَلَدٍ هٰذَا؟'' مکہ مکرمہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟''۔

سب جانتے تھے کہ مکہ ہے، جواب یہ ہوتا کہ ''مکہ'' ہے مگر جواب کیا دیتے ہیں: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' ''اللہ ورسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون سا شہر ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَیُّ شَهْرٍ هٰذَا؟'' ''یہ کون سا مہینہ ہے؟''۔ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے جواب دے دیتے کہ ذی الحجہ ہے، مگر جواب میں یہ عرض کیا:

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منٰی، ج: ٦ ص: ٢٢٨.

''اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ'' ''اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا مہینہ ہے''۔

تابعین میں سے ایک شاگرد نے ان صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: یہ جواب آپ نے کیوں دیا۔ آپ کو قطعی علم تھا کہ یہ مکہ ہے۔ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، نویں تاریخ ہے، تو نام لے کر بتاتے کہ فلاں شہر ہے، فلاں مہینہ ہے، فلاں تاریخ ہے، یہ کہنا کہ ''اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ'' یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں، آپ نے یہ کیوں کہا؟

حقیقتِ اسلام...... اس صحابی رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفویض اسے کہتے ہیں۔ وہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے اس لئے کہا کہ:

اگر اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما دیتے کہ: یہ مکہ نہیں، مدینہ ہے۔ تو ہم کہتے کہ ہماری آنکھوں نے غلط دیکھا، بلاشبہ یہ مدینہ ہے، اللہ کا رسول غلط گو نہیں ہو سکتا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما دیتے کہ یہ ذی الحجہ نہیں، محرم کا مہینہ ہے، ہم سب کہہ دیتے کہ ہم سب ایمان لائے، بلاشبہ محرم کا مہینہ ہے، ہمارا علم غلط تھا کہ ہم اسے ذی الحجہ سمجھ رہے تھے۔

اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کہ یہ نویں تاریخ نہیں بلکہ ذی الحج کی بارہویں تاریخ ہے، ہم کہتے کہ بلاشبہ یہ بارھویں تاریخ ہے، ہم سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے کہ یہ نویں تاریخ ہے۔

تو تفویضِ مطلق اسے کہتے ہیں کہ پیغمبر کی خبر کے مقابلے میں آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے، کانوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے کہ میرا کان غلطی کر سکتا ہے، میری آنکھ غلطی کر سکتی ہے، مگر خدا کا رسول تبلیغ حق میں غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کو تفویضِ مطلق کہتے ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ اسلام ہے۔

آج ہم اللہ و رسول کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی پہلے متعین کر لی اور مسئلے کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہا۔ گویا خدا اور رسول کو اپنے تابع بنا رہے ہیں حالانکہ تابع بننے کا صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ درجہ حاصل کیا ہے کہ آنکھوں تک کو جھٹلانے کے لئے تیار ہیں۔ ہم تو خدا اور رسول کو اپنے خیال کا تابع بناتے ہیں، وہ مشاہدے کا بھی تابع نہیں بناتے۔ مشاہدے کو بھی اللہ و رسول کے تابع کرتے تھے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے اگر اللہ کے رسول اس کے خلاف فرما دیں گے، حق وہ ہو گا، آنکھ حق پر نہیں ہو گی۔ آنکھوں کی تکذیب کے لئے تیار ہیں۔

اللہ کے نام کے مقابلہ میں مشاہدہ کی تکذیب...... اور یہ تو یہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ اللہ کے نام کی وجہ سے اپنے مشاہدے کی تکذیب کر دیتے ہیں۔ سیر کی روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک چور کو دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے اور دن میں دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے، اور چیز اٹھا رہا ہے۔ آنکھوں سے دیکھ لیا، اس کو بلا کر پکڑ کر فرمایا: ''ظالم! یہ دن دھاڑے چوری کرتا ہے تجھے شرم نہیں آتی''۔ اس نے کہا: ''وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ مَا سَرَقْتُ'' ''قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میں نے چوری نہیں کی''۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ''صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَکَذَّبْتُ عَیْنِیْ۔'' ''میں اپنے پروردگار کے نام کی تصدیق

کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں۔'' بے شک تو نے چوری نہیں کی، جب تو نے اللہ کے نام پر حلف دیا تو اللہ کا نام سچا ہے۔ میں اس کی تکذیب نہیں کر سکتا۔ یہ اتباع کامل کا درجہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کا نام بھی آ جائے۔ حالانکہ چور اس نامِ پاک کو غلط استعمال کر رہا ہے، مگر جرات نہیں کرتے کہ تکذیب کریں کہ خدا کا نام آ گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خادم کو گوشت خریدنے کے لئے بھیجتے جب وہ لے کر آتا تو گوشت کی بوٹیاں گن لیتے تھے۔ مثلاً ایک پیسے میں چھ بوٹیاں آنی چاہئے تھیں تو یہ چھ لایا ہے یا پانچ لایا ہے۔ خادم کہتا کہ مجھ پر کیا اعتماد نہیں؟

فرمایا: اعتماد ہے، اپنے قلب کی تسکین اور تیرے ساتھ حسن ظن باقی رکھنے کے لئے میں یہ کام کرتا ہوں کہ گن لیتا ہوں۔ کسی نے کہا کہ: یہ خادم دھوکہ کرتا ہے اور یہ کم لے آتا ہے اور پیسے آپ سے زیادہ لے جاتا ہے، فرمایا کہ: وہ خادم اللہ کا نام لے کر کہتا ہے کہ میں پورا پورا لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا: وہ غلط نام لیتا ہے اور غلط حلف اٹھاتا ہے اور کم لے آتا ہے اور آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔

فرمایا: ''مَنْ خَدَعَنَا فِي اللهِ اَنْ خُدِعْنَالَهٗ.'' ''جو اللہ کا نام لے کر دھوکہ دے گا، ہم ضرور اس کے دھوکہ میں آئیں گے اللہ کے نام کو ہم نہیں جھٹلا سکتے''۔

عِلم، محبت اور اخلاق کا وظیفہ...... اس کا تعلق عظمت سے ہے۔ جب اللہ کے نام کی اس درجہ عظمت پیدا ہو جائے کہ اس کے سامنے آنکھ بھی بے کار، کان بھی بے کار، باتیں بھی بے کار، اللہ ہی اللہ سامنے ہے، وہ حقیق معنی میں قلب کی تفویض کا اور اسلام کا مقام ہے، یہ مقام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور تزکیہ سے دیا گیا تھا علم کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل بتلائے اور تزکیہ کے ذریعے سے قلوب کا راستہ سیدھا کیا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری بعثت کی غرض وغایت کیا ہے؟ ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، تاکہ علم کے ذریعے سے امت کو صحیح راستہ دکھلا دوں''۔ اور ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کو مکمل کر کے پیش کروں''

ان کو اخلاق کریمانہ کا مکمل نمونہ بنا دوں اخلاق عمل کی قوت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ علم سے تو میں راستہ دکھلاتا ہوں اور اخلاق درست کر کے اس راستہ پر چلنے کی قوت پیدا کرتا ہوں۔ علم آدمی کو اس وقت تک نہیں چلا سکتا جب تک اخلاق درست نہ ہوں۔ اخلاقی قوت سے ہی آدمی چلے گا۔ علم کا کام فقط راستہ دکھلانا ہے۔

اگر ایک عالم بہت اعلیٰ علم حاصل کرے، مگر عمل کی طرف متوجہ نہیں تو راستہ اس نے دیکھ لیا، مگر محض علم اسے راستے پر نہیں چلا سکتا۔ جب تک اس کے اندر چلنے کی اخلاقی قوت نہ ہو۔

اخلاق میں صبر ہے، شکر ہے، شجاعت ہے، رضا ہے تسلیم ہے یہ عملی چیزیں ہیں۔ علم راستہ بتلا دے گا کہ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ اور بچنے کا یہ طریقہ ہے، لیکن اس طریقہ پر آدمی چل پڑے، چلا دینا علم کا کام نہیں ہے۔ یہ کام اندرونی

قوت کا ہے جو اخلاقی قوت ہے۔ اگر قلب میں محبت ہے آدمی شجاعت اختیار کرے گا۔ محبوب کی کے خاطر لڑے گا اور محبوب کے دشمنوں کو فنا کر دینا چاہے گا۔ معلوم ہوا کہ محبت اخلاق کو چلاتی ہے، علم نہیں چلاتا۔ اگر انسان کے اندر صبر ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو مرغوب خدا کی خاطر اختیار کرے گا، اس پر جم جائے گا، گویا طاعت پر جمے گا اور صبر کرے گا۔ اس کے خلاف سے ہٹ جائے گا، یہ صبر محبت ہی کرائے گی، اگر حق تعالیٰ شانہ سے محبت نہ ہو تو عبادت پر آدمی صبر کیسے کرے؟ آپ نماز پر صبر کئے بیٹھے ہیں۔ سردی ہے، لحاف چھوڑ کر سردی کے زمانے میں نماز کے لئے آتے ہیں تو عبادت پر اتنا جمنا یہ محبت ہی سے تو ہے محض علم سے نہیں۔ علم نے تو راستہ دکھایا تھا کہ بھئی! اگر تم نے نماز پڑھ لی تو ثواب ملے گا، لیکن پڑھنا اور پڑھنے کے لئے اٹھنا۔ اور اپنے عیش و آرام کو چھوڑنا، یہ محبت کراتی ہے، علم نہیں کراتا ہے تو محبت اخلاق کو حرکت میں لاتی ہے، اخلاق عمل کو حرکت میں لاتے ہیں۔ تب جا کے آدمی عمل کرتا ہے۔

غرض ہر چیز کا ایک وظیفہ ہے۔ علم کا کام راہ دکھلانا ہے۔ محبت کا کام حرکت میں لانا ہے۔ اخلاق کا کام عمل کرا دینا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے دائرے میں عمل کرے گی۔ سارے کام آپ علم کے اوپر ڈال دیں کہ وہی راستہ دکھلائے، وہ چلائے، وہی گردن پکڑ کر آپ کو مسجد میں لے جائے تو ایک چیز سارے کام انجام نہیں دے سکتی۔ الگ الگ قوتیں ہیں۔ غرض تعلیم کے ذریعے سے علم پہنچتا ہے۔ تزکئے کے ذریعے سے اخلاق درست ہوتے ہیں اور محبت پیدا کرائی جاتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو وظیفے نکلے۔ ایک تعلیم اور ایک تربیت۔ تعلیم سے آپ مسائل پہنچاتے تھے۔ یہ جائز یہ ناجائز، یہ حلال یہ حرام۔ تزکیے کے ذریعے سے عمل کی قوتیں قلب میں فراہم کرتے تھے کہ اس حلال کے اوپر آدمی چل پڑے اور حرام سے بچنے لگے۔ جائز کے اوپر چل پڑے اور ناجائز سے بچنے لگے۔ یہ چیز تزکیہ اور احوال قلب سے متعلق تھی۔

قلب کی حالت اگر درست نہ ہو، فتنے میں پڑا ہوا ہو اور شکوک و شبہات میں پڑا ہوا ہو تو شکی آدمی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ تذبذب اور تردد ہو گا تو کبھی عمل ظہور پذیر نہیں ہو گا۔ قوت یقین پہلے آئے، پھر آدمی چلے گا، اور اخلاق ابھاریں گے تو آدمی عمل کرے گا۔ اس واسطے دو وظیفے فرمائے گئے، گویا بعثت کی دو غرض و غایت نکلیں۔ ایک فرمایا: ”اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ ”میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں“۔ اور ایک فرمایا: ”بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ“ ”میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کا مکمل نمونہ تمہارے سامنے رکھ دوں“۔

تاکہ تمہارے اخلاق صحیح ہو جائیں اخلاق کے بغیر عمل نہیں ہو گا، اور تعلیم کے بغیر علم نہیں آئے گا، جس سے جائز و ناجائز کا پتہ چلے۔

تعلیم بلا تربیت کا نقصان..... تو مجلس مبارک میں ایک طرف مسائل کی تعلیم ہوتی تھی جائز و ناجائز اور حلال و حرام بتلایا جاتا تھا اور رات کو نگرانی فرماتے تھے کہ: عمل کیسا ہے، مجاہدے کراتے تھے تاکہ نفوس کا تزکیہ ہو جائے، اس کا تعلق جائز و ناجائز سے نہیں قلب کے احوال باطن سے ہوتا ہے۔ احوال باطن وہی درست کر سکتا ہے، جو

باطن کے ان مقامات سے گذرا ہوا ہو، جو اس راہ میں چلا ہوا نہیں ہے، وہ کس طرح سے اعمال باطن کو درست کرے گا، اسے خود اپنے اندر کا پتہ نہیں دوسرے کے اندرون کا کیا پتہ چلے گا

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اس واسطے جیسے ظاہری مسائل پوچھنے کی ضرورت ہے، باطنی احوال کے درست کرنے کے لئے بھی لوگ اہل باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ وسوسوں کو دور کر کے قلب کی راہ کو درست کرلیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے مسائل کی تعلیم دی حلال وحرام، جائز و ناجائز کے دائرے کو بتلایا فرائض بتلائے، واجبات اور ان کی مقداریں بتلائیں، ان کے ادا کرنے میں جو خطرات اور وسوسوں کی رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں، ان کے رفع کرنے کی ذمہ داری بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے لی اور قلب کو درست کرنے کا طریقہ بھی آپ نے اختیار فرمایا۔ اس کا نام تعلیم ہے اور اس کا نام تربیت ہے، تربیت سے آدمی صحیح بنتا ہے، اگر تعلیم ہی تعلیم ہو اور علم ہی علم، تو کورے علم سے راستہ تو نظر آئے گا، مگر چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہوگی۔

جیسے غالب نے کہا تھا کہ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہدم پر طبیعت ادھر نہیں آتی

آج کے دور میں بدعملی جہالت کی وجہ سے نہیں ہے۔ علم کے باوجود بدعملی ہے، علم کے راستے اتنے پھیل چکے ہیں کہ قدم قدم پر آدمی کو علم ہوتا ہے اور ہے کاغذ ہے، پیپر ہے، رسائل اور اخبارات ہیں، رات دن علم سامنے آرہا ہے، مگر رات دن بدعملی بڑھتی جاتی ہے، یہ بدعملی جہالت کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ عدم تزکیہ کے سبب سے ہے کہ جب نفوس مانجھے ہی نہیں گئے اور قلب کے مقامات ہی درست نہیں ہوئے، دل کی کلیں ہی درست نہیں ہیں، تو جتنا بڑا علم ہوگا، اتنی ہی بڑی بدعملی بھی ہوگی، اس لئے جہاں ظاہری علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وہاں باطنی تربیت کی بھی ضرورت ہے اس کے بغیر آدمی چلتا نہیں ہے۔

اہمیّتِ تزکیہ...... اگر یہ چیز ضروری نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں تزکیہ نہ رکھا جاتا۔ اور تربیت نہ رکھی جاتی۔ تو سب سے زیادہ ضرورت تربیت کی پڑتی ہے۔ اور تربیت کے ساتھ تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے اور ان دونوں چیزوں کا تعلق کسی منجھی ہوئی شخصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

تزکیہ میں شخصیت کی احتیاج...... آدمی یہ چاہے کہ میری تربیت کاغذ سے ہو جائے تو کاغذ اور کتاب تربیت نہیں کرسکتے، کاغذ میں تو کالے کالے نقوش ہوتے ہیں، ان نقوش کی مرادات کیا ہیں؟ یہ تو معلم سمجھا سکتا ہے اور مزکی بتلا سکتا ہے کاغذ نہیں بتلائے گا۔ چناں چہ کلام میں جو کیفیات ہوتی ہیں تو کاغذ میں حروف کا نقش آتا ہے، کیفیت تو نہیں آتی، بہت سی کیفیتیں ہیں جو طرز ادا سے تعلق رکھتی ہیں، کلام کے بہت سے ایسے معانی ہوتے ہیں جو طرز ادا، ہیئت کذائی اور لب ولہجے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اگر وہ ہیئت اور انداز نہ ہو کلام کا مطلب متعین نہیں ہوگا اور میں اس کی

مثال دیا کرتا ہوں کہ اردو کا ایک جملہ اس کے کئی معنی آتے ہیں اور سب کا تعلق لب و لہجے سے ہے وہ جملہ "کیا بات ہے" اس کے معنی استفہام و استفسار، تفخیم شان، تحقیر شان، اور تعجب کے آتے ہیں، سب کا تعلق لب و لہجے سے ہے اگر لب ولہجہ سامنے نہ ہو تو معنی متعین نہیں ہو سکتے، اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی دوست کے پاس آپ بھجوا دیں تو کاغذ میں تو کالے کالے نقوش لکھے ہوتے ہیں، لب ولہجہ لکھا ہوا نہیں ہے، وہ اس سے جو سمجھے گا، وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی، بلکہ جو کیفیت اس پر غالب ہوگی وہ وہی معنی سمجھے گا، وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی وہ اس کی اپنی مراد ہوگی۔ وہ دنیا کہ یہ کہہ کر دھوکہ دے گا کہ لکھنے والے کی یہ مراد تھی حالانکہ یہ غلط ہے، کلام اس کا تھا مراد اس کی اپنی تھی۔

ٹھیک اسی طرح سے قرآن و حدیث میں بہت سے مضامین کا تعلق لب و لہجے سے ہے، اور بہت سے مضامین کا تعلق شان نزول سے ہے، ان سب سے کٹ کر اگر محض قرآن و حدیث کے لکھے ہوئے الفاظ سامنے آجائیں، اور اس کا آپ مطلب لیں تو وہ مطلب آپ کا ہوگا اگر چہ لفظ خدا کے ہوں گے، اب آپ دنیا کو یہ کہیں کہ خدا نے یہ فرمایا۔ یہ دھوکہ دہی ہوگی، وہ تو آپ فرما رہے ہیں۔ اور دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا مطلب تو جب کھلتا جب خدا کی طرف سے کوئی بیان کرنے والا آ کر اپنے لب لہجے، اپنے طرز ادا، اپنے ماحول اور اپنی کیفیت سے بیان کرتا۔ آپ کے سامنے ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ شانِ نزول بھی آپ کے سامنے نہیں، کالے نقش لکھے ہوئے آپ کے سامنے ہیں تو ماحول، کیفیت اور ہیئت کذائی آپ کی اپنی ہے، اور قرآن اور حدیث پر آپ نے تھوپ دی ہے۔ تو حقیقت میں وہ قرآن اور حدیث کا مطلب نہیں، وہ آپ کا مطلب ہے، لفظ آپ نے اللہ کے لئے اور مطلب اپنی طرف سے گھڑ لیا۔

اسی کو مٹانے کے لئے تعلیم و تزکیہ کو رکھا گیا ہے، کہ ایک شخصیت آ کر تعلیم دے اور سمجھائے کہ یہ مراد ربانی ہے، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا۔ تاکہ وہ کلام بھی سنائیں اور کلام سنا کر اس کا مطلب بھی بیان کریں کہ یہ اس کا مطلب اور مصداق ہے۔

مقاصدِ بعثت...... بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ علم سے دنیا کو آراستہ کریں اور اس علم سے راہ حق نظر آئے، اور تزکیہ سے آراستہ کریں جس سے لوگوں میں اس راستے پر چلنے کی قوت پیدا ہو، اور عمل کا نمونہ سکھلائیں، تاکہ عمل من گھڑت نہ ہو۔ اس میں بھی لوگ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت کے متبع ہوں۔ یہی چیزیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض و غایت ہیں اسی کے مجموعے کا نام تعلیم و تربیت ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ایک حدیث میں ایک غرض ظاہر کی گئی فرمایا: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" "میں دنیا معلم بن کر بھیجا گیا ہوں"۔

وہ علم سکھلاؤں جس کے ذریعے سے لوگوں کو حق کا راستہ ملے، لوگ خدا تک پہنچیں۔ ان کے اخلاق اور کردار و کریکٹر درست ہوں۔ دوسری غرض یہ فرمائی: "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ ترین نمونہ تمہارے سامنے رکھوں، اور عمل کر کے دکھلا

دوں، اور اخلاق کریمانہ کی ہیئت کذائی تم کو دکھلا دوں، اس کا نام تربیت ہے، اس کا نام تعلیم ہے، خلاصہ یہ نکلا کہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں آنے کی غرض وغایت تعلیم وتربیت ہے ہر قوم اور ہر ملک میں نبی بھیجے گئے تاکہ دنیا کی قومیں علم سے محروم نہ رہ جائیں اور اخلاق سے محروم نہ رہ جائیں۔

اندازِ تعلیم وتربیت......اور یہ تعلیم وتربیت کس شان بعثت سے کی؟ تو بعثت کی شان یہ ہے کہ اس میں رحمت کا غلبہ ہے، شریعت کے ایک ایک حکم سے رحمت ٹپکتی ہے، ایک ایک حکم میں شان رحمت رچی ہوئی نظر آتی ہے، غضب اور قہر رچا ہوا نہیں ہے، محبت کی آمیزش ہے عداوت کی آمیزش نہیں ہے، شفقت رچی ہوئی ہے، بیگانگی اور بے تعلقی رچی ہوئی نہیں ہے، انس موانست رچی ہوئی ہے وحشت رچی ہوئی نہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی، تربیت کی، اور ساتھ ساتھ وحشت سے بچایا، نفرتوں سے بچایا، انس وموانست کو پھیلایا، محبت ویگانگت پھیلائی۔

اندازِ حکومت......حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہما کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا۔ ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی القضاۃ، یعنی چیف جسٹس بنا کر بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صحابیوں کو اونٹ پر سوار کیا اور خود پیدل ساتھ ہو لیے۔

ان کو رکاوٹ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چلیں۔ اور ہم سواری پر بیٹھیں مگر امر ارشاد تھا کہ نہیں تم بیٹھو، تو یہ اونٹ پر سوار ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل ساتھ ہیں، میل بھر تک ساتھ تشریف لائے گئے اور مختلف نصیحتیں فرمائیں۔

فرمایا: جب تم یمن میں پہنچو گے تو تمہیں عیسائیوں کی رعایا ملے گی، وہاں کے سب باشندے عیسائی ہیں، تم وہاں جاکے کیا کام کرو گے۔ تو نصیحت فرمائی کہ: بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَتُطَاوِعَا وَلَا تَخْتَلِفَا.

عیسائیوں کی ریاست میں جاکر لوگوں کو بشارتیں سنانا، نفرتیں نہ دلانا آسانیاں بہم پہنچانا، لوگوں کو تنگیوں میں مبتلا نہ کرنا۔ مطاوعت، وحدت اور اتحاد پیدا کرنا، اختلاف کی راہیں مت ڈالنا کہ لوگ بکھر جائیں، تم ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرنا، متفرق بنانے کی کوششیں مت کرنا۔

تو برائے وصل کردن آمدی ‌ ‌ ‌ ‌ نے برائے فصل کردن آمدی

تم کو دنیا کے جوڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے، دنیا کو توڑنے کے لئے تم کو نہیں بھیجا گیا، متفرقوں کو جمع کرنے کا کام تمہارا ہے، جمع شدہ کو متفرق کر دینا یہ تمہارا کام نہیں ہے، اور جمع کرنے کا معیار تمہاری ذات نہیں ہوگی، اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہوگا۔ اسی پر لوگ جمع ہوسکیں گے، تمہاری عقل پر جمع نہیں ہوں گے، تمہارے مزاج پر جمع نہیں ہوں گے، ہر شخص عقل رکھتا ہے ضروری نہیں ہے کہ دوسرے کی عقل کا متبع ہو، تم کہو گے میرا مزاج یہ ہے، دوسرا کہے گا میرا مزاج یہ ہے۔ لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے سب گردن جھکا دیں گے وہ معیار ہے غرض تم لوگوں بشارتیں سنانا، نفرتیں مت دلانا۔ انہیں بانٹنا

متفرق کرنا اور گروہ سازی مت کرنا۔ سب کو ایک گروہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کوئی از خود گروہ بنے یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ تمہاری طرف سے اذن اور اعلان وحدۃ و اتحاد کا ہونا چاہئے۔ تو شان رحمت ہے کہ لوگوں کو ملاؤ اور بانٹو مت، متفرق مت کرو ان کے سامنے ایسی چیزیں کہو کہ اگر ان کے قلوب بکھرے ہوئے بھی ہوں تو جڑ جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ایسے کلمات ان کے سامنے مت کہو کہ ان میں گروہ بندی پیدا ہو جائے وہ بٹ جائیں، اور متفرق ہو کر ان میں نفرتیں پیدا ہونے لگیں، کسی ایک مرکز پر انہیں لانے کی کوشش کرو۔ تو یہ ہی شان رحمت ہے۔ غرض تعلیم دینا بھی شان رحمت ہے تربیت کرنا بھی شان رحمت ہے۔

رحمتِ مجسم ...... لیکن اگر اس ضابطے کو فرض قرار دیا جائے تو اس تعلیم و تربیت کو جس شان سے ادا کیا گیا وہ شان تو رحمت ہی کی ہے۔ اور وہ شان انس و موانست اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں لوگوں کو دور کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا ہے جب غزوۂ احد کے اندر ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر پتھر لگا۔ اور خون کی چادر منہ پر آ گری۔ دندان مبارک شہید ہو گئے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے لئے بددعا کیجئے کہ ان ناہنجاروں نے اللہ کے رسول کو زخم پہنچایا۔ سر مبارک پر زخم لگا۔ محبوب صحابہ رضی اللہ عنہم جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، شہید ہو گئے، بددعا فرمایئے۔! اس پر فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھٹکار دینے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔ اور فرماتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اغفر لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' ① ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت کر! یہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں''۔

اس موقع پر بھی رحمت ہی کا ظہور ہوا، یہ وہ اخلاق عظیم تھا کہ دوسرے گالیاں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں دعائیں کر رہے ہیں، دوسرے تلوار اٹھا کر زخم لگائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان فیض ترجمان سے ان کے اوپر پھول برسائیں یہی ہے وہ شان رحمت کہ دوستوں کے ساتھ رحم کرنا تو ہے ہی، لیکن دشمنوں کے ساتھ جو رحم و کرم کرے اور دشمنوں کو جو نوازنے کی کوشش کرے، کہا جائے گا کہ وہی ''رحمتِ مجسم'' ہے۔ غرض ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے ساتھ وہ کیا جو آج دوستوں کے ساتھ بھی کیا جانا مشکل ہے۔

بہر حال بعثت کی شان رحمت کی ہے، اور بعثت کی غرض و غایت تعلیم اور تربیت کی ہے۔ یہی تین حدیثیں ابتداء میں پڑھی تھیں کہ ایک میں شانِ بعثت بتلائی گئی۔ دو احادیث میں بعثت کی غرض و غایت بتلائی گئی۔

''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً'' میں شانِ بعثت ہے، کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور ''بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' اور

① المعجم الکبیر للطبرانی، سھل بن سعد الساعدی، ج: ۵، ص: ۳۸۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب مقتل حمزة ج: ۳ ص: ۱۵.

’’بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ‘‘ میں غرض وغایت، یعنی تعلیم وتربیت ہے۔ یہ تین روایتیں میں نے پڑھی تھیں بقدر ضرورت ان کی تشریح کی ہے، ان سب کا مقصد اور گویا لب لباب اور حاصل یہ نکلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد اصلی تعلیم وتربیت ہے۔

نیابتِ نبوی...... اور نبی کے بعد قوم نبی کے قائم مقام بنتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد یہ پوری امت نبی کے قائم مقام اور نبی کی نائب ہے، اس کا بھی اصلی فریضہ یہ ہے کہ یہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ ویسے دنیا میں بہت سے علوم ہیں، اور ہر علم مفید ہی ہے، لیکن حقیقی علم وہ ہے جو آدمی کو آدمی بنائے جو انسان میں اخلاق کے جوہر پیدا کرے، بہت سی تعلیمات ہیں جو سامان بناتی ہیں جیسے آپ سائنس پڑھیں گے تو بہترین قسم کے سامان بنائیں گے، فلسفہ پڑھیں گے تو دماغی ریاضت ہو جائے گی۔

ہندسہ اور انجینئرنگ پڑھیں گے تو بہترین قسم کے مکانات بنائیں گے، یہ سب چیزیں آپ کی ضروریات کی ہیں، اور اچھے اچھے سامان آپ کے لئے مہیا کریں گی، لیکن اچھے انسان بنانا ان علوم کا موضوع نہیں، اچھے سامان بنانا موضوع ہے، اگر آپ اچھا انسان بنانا چاہتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے نیچے آنا پڑے گا، نبیوں کی دنیا میں آنے سے غرض اچھا سامان بنانا نہیں، چھری، کانٹے بنانا نہیں ہے، یہ تو ضرورت کی چیزیں ہیں۔ جس طرح آپ چاہیں یہ خود بنالیں۔ ان کے آنے کی غرض یہ ہے کہ آپ کو انسان بنادیا جائے۔ انسان کے ہاتھ میں اگر چھری ہوگی تو دوست کے گلے پر نہیں چلے گی۔ دشمن کے گلے پر چلے گی، انسان کے ہاتھ میں اگر برتن ہوگا تو صحیح استعمال کرے گا، جانور کے آگے ہوگا تو اسے پھینک مارے گا، اس لئے آدمی اگر آدمی بن گیا تو سامان بھی کارآمد ہو گئے، اور اگر آدمیوں میں آدمیت نہ رہی تو یہ سامان وبال جان بن جائیں گے اگر دنیا میں کروڑوں روپے کا سامان بھرا ہوا ہے اور آدمی جانوروں کی مانند ہوں، جن میں نہ خدا کی پہچان، اور نہ رسول کی پہچان نہ حق وباطل کی پہچان، نہ انس و موانست، ایسے میں سامان اور زیادہ وبال جان ہیں۔

اور اگر ایک بھی سامان نہ ہو اور چٹنی روٹی پر گزر ہو، مگر آدمیوں میں انسانیت کا جوہر ہو، انس ہو، محبت ہو ہمدردی خلائق ہو وہ دنیا جنت ہے تو انبیاء علیہم السلام دنیا کو جنت بنانے آئے ہیں، جہنم بنانے نہیں آئے جہنم والوں کیا اخلاق فرمائے گئے ہیں۔ ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا﴾ ①

جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی، دوسری پارٹی اس پر لعنت کرے گی کہ تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم مبتلا ہوئے، وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہارے بہکانے کی وجہ سے ہم مبتلا ہوئے۔ تو جہنم کا عذاب ایک طرف، یہ لعن طعن خود ایک مستقل عذاب ہے۔

اور جنت والوں کے اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔ ﴿اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ ②

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۷۔

بڑی بڑی مسندوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے، جیسے حقیقی بھائیوں کے ہوتے ہیں، ہر ایک کے دل میں محبت کھچی ہوئی اور رچی ہوئی ہے، تو انبیاء علیہم السلام محبتیں پیدا کرنے آئے ہیں عداوتیں پیدا کرنے نہیں آئے۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

اور یہ چیز بغیر رحمت اور شفقت کے نہیں ہوتی۔ تو امت کو بھی اسی طرح شفیق بننا چاہئے اپنوں میں بھی باہم اور اغیار کے حق میں بھی کہ انہیں ہدایت کریں اور انہیں سیدھا راستہ دکھلائیں، ایسی راہیں پیدا کریں کہ لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ ایک طرح محبت واتحاد سے چلیں، اس میں قوم کی بھی قوت ہے، ملک کی بھی قوت ہے، جتنی پاکیزگی آپ کے نفوس میں بڑھے گی، جتنے پاکیزہ اعمال بڑھیں گے، آپ اپنی قوم کے لئے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ ملک کے لیے بھی مفید ثابت ہونگے، اگر بدعنوانیاں رہیں تو قوم کے لئے بھی اور حکومت کیلئے بھی وبال جان بن جائیں گے۔ تو آدمی وہ ہے جو صحیح طور پر معاشرہ کے لئے آدمی ثابت ہو اور بہترین انسان ثابت ہو۔

احساس ذمہ داری...... بلاشبہ بہت سی چیزوں میں حکومت روک تھام کرتی ہے۔ چوروں کو پکڑتی ہے، ڈکیتوں کو پکڑتی ہے، قانون بناتی ہے، لیکن ساری ذمہ داری حکومت پر نہیں کچھ آپ پر بھی عائد ہوتی ہے، آپ کو بھی تو اپنے اخلاق درست کرنے ہوں گے۔ جہاں کوئی سپاہ اور سی۔ آئی۔ ڈی نہ ہو، اگر آپ تنہائی میں ہوں اور اخلاق دوست نہ ہوں، وہاں پھر آپ خیانت کریں گے، ایسا آدمی ہو کہ جب تنہائی میں ہو جب بھی نیک نفس ہو، مجمع میں ہو جب بھی نیک نفس ہو۔ یہ جب ہو سکتا ہے کہ جب اس کا نفس درست ہو جائے، ورنہ اگر انسان بدنفس ہے تو ڈر کے مارے مجمع میں خیانت نہیں کرے گا، مگر جب تنہائی میں جائے گا، خیانت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوگی وہ آدمی آدمی نہیں بلکہ آدمی کی صورت ہوگی۔ تو آدمی صورت انسان کا نام نہیں حقیقتِ انسان کا نام ہے ۔

گر بصورتِ آدمی انسان بُدے احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے

اگر صورت سے آدمی آدمی بنا کرتا تو صورت انسان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں کی صورت انسان کی تھی، مگر زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے، وہ فرق حقیقت کے لحاظ سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت دیکھی جائے تو عرش کے اوپر پہنچی ہوئی ہے، اور ابوجہل کی حقیقت دیکھی جائے تو تحت الثری میں پہنچی ہوئی ہے، صورتیں دونوں کی انسانوں کی ہیں یکساں ہیں۔ غرض صورت سے آدمی نہیں بنتا، حقیقت سے بنتا ہے اور یہ حقیقت انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بنتی ہے۔ اس کے بغیر جوہر پیدا نہیں ہوتا، اس لئے جہاں آپ اور علوم کی طرف توجہ کریں بنیادی طور پر اس عمل کی طرف توجہ کرنا سب سے ضروری ہے، جس سے ہمارا جوہر درست ہو۔ اس واسطے یہ تین حدیثیں میں نے تلاوت کیں کہ تعلیم وتربیت تو اصل غرض ہے اور اس میں شفقت اور رحمت کی شان ملی ہوئی ہونی چاہئے۔ تب جاکے وہ تعلیم وتربیت صحیح معنی میں مفید ثابت ہوگی، حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم

تعلیم کے ذریعے سے علم حاصل کریں۔ تربیت کے ذریعے سے اخلاق درست کریں اور حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے اتباع کی توفیق عطاء فرمائیں۔ اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائیں۔ آمین۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَابَعْدَاِذْھَدَیْتَنَاوَھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ. اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَامِنَ الْفِتَنِ مَاظَھَرَمِنْھَا وَمَابَطَنَ. اَللّٰھُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَاوَاَبْصَارِنَاوَقُوَّتِنَآ اَحْیَیْتَنَاوَاجْعَلْ ثَارَنَاعَلٰی مَنْ ظَلَمَنَاوَلَاتَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَافِیْ دِیْنِنَاوَلَاتَجْعَلِ الدُّنْیَآاَکْبَرَھَمِّنَاوَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَاوَلَاغَایَۃَرَغْبَتِنَآاَللّٰھُمَّ لَاتُسَلِّطْ عَلَیْنَامَنْ لَّایَرْحَمُنَااَللّٰھُمَّ زِدْنَاوَلَا تَنْقُصْنَاوَاَکْرِمْنَاوَلَاتُھِنَّاوَ اَعْطِنَاوَلَاتَحْرِمْنَاوَاٰثِرْنَاوَلَاتُؤْثِرْعَلَیْنَاوَاَرْضِنَاعَنْکَ وَارْضَ عَنَّا،اَللّٰھُمَّ وَتَوَفَّنَامُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَابِالصّٰلِحِیْنَ غَیْرَخَزَایَا وَلَامَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِخَلْقِہٖ سَیِّدِنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَااَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ (حررہ ۸ جمادی الاولیٰ ۹۰ ھ)

عناصر سیرت

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ . ﴿قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ o یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ. صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ.

تمہید...... بزرگان محترم! یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی اس آیت کریمہ میں جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند بنیادی صفات اور چند بنیادی مقاصد وافعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی آیت کی مجھے مختصر طریق پر کچھ شرح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنی ہے، مگر آیت کی تشریح سے قبل بطور تمہید ومقدمہ کے چند باتیں سمجھ لیجئے تا کہ اس کے بعد آیت کے مقاصد سمجھنے آسان ہو جائیں اور وہ یہ کہ جب انسان کسی بھی متعین منزل کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان چار کے بغیر منزل مقصود تک آدمی نہیں پہنچ سکتا۔

1 ...... سب سے پہلی چیز روشنی راہ ہے۔ راستہ میں روشنی اور چاندنا ہو جس میں آدمی راستہ قطع کرے اور روشنی بھی ایسی کہ نہ اتنی تیز ہو کہ نگاہوں کو خیرہ اور چکا چوند کر دے کہ راستہ چلنا ہی مشکل ہو جائے، نہ اتنی دھیمی ہو کہ راستے کا نشیب و فراز ہی نظر نہ آئے، بلکہ معتدل روشنی ہو جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، غرض سب سے پہلی چیز راستہ کی روشنی ہے۔

2 ...... اس کے بعد خود راستہ ہے کہ جو سیدھا ہو اس میں ٹیڑھ اور کجی نہ ہو، جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، اگر راستہ میں اونچ نیچ ہے اور گڑھے ہوں تو روشنی بھی ہوگی تو گر جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اس لئے روشنی ہونے کے باوجود ضرورت ہوتی ہے کہ راستہ سیدھا ہو اونچ نیچ اور نشیب وفراز سے بری ہو۔

3 ...... اس کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز کی اور ضرورت پڑتی ہے کہ راستہ بھی سیدھا ہو اور ساتھ میں راہنما بھی

ہوا گر راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہو تو محض روشنی اور راستہ کام نہیں دے سکتا۔ تو راہنما کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر پہنچا دے۔ پھر چوتھی چیز ''راہ رو'' ہے کہ روشنی، راستہ اور راہنما بھی موجود ہے لیکن چلنے والا موجود نہیں تو منزل مقصود تک کون پہنچے؟ اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ خود راہ رو بھی ہو۔ غرض یہ چار باتیں ہیں کہ ان کے بغیر منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اگر روشنی نہیں ہوگی اندھیرے میں چلنا دشوار ہوگا، روشنی ہو، مگر راستہ نہ ہو تو آدمی چلے کس چیز پر؟ راستہ بھی ہو مگر راہنما اور راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہو تو پھر آدمی چلے کیسے؟ اور یہ تینوں چیزیں موجود ہوں، مگر چلنے والا کوئی نہ ہو تو منزل تک کون پہنچے؟

حصولِ منزل کی شرائط ...... دنیا میں بھی آپ جب کبھی کسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو چند باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے، حق تعالیٰ نے آپ کے لئے روشنی کا بندوبست کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ① ''برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج بنائے اور سراج منیر یعنی سورج اور قمر منیر رکھا''

دن میں آپ سورج کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہیں اور رات کو چاند کی روشنی میں راہیں قطع کرتے ہیں۔ اللہ نے آسمان پر دو بڑے روشن سیارے رکھ دیئے۔ اور فرمایا: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ﴾ اور لاکھوں کروڑوں ستارے متعین کئے جس سے سمتیں متعین ہوتی ہیں اور آپ آسانی سے راہ قطع کر سکتے ہیں لیکن محض سورج کام نہ دیتا اگر زمین پر سڑکیں بنی ہوئی نہ ہوتیں۔ راہ ہی نہ ہو سورج تو نکلتا ہے لیکن پہاڑ ہیں نہ اس میں راستہ ہے۔ بڑے بڑے غار ہیں، کھڈ ہیں تو آدمی چلے گا تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ منزل مقصود پر کیسے پہنچے گا؟ دوسری چیز یہ ہے کہ راہ ہو اور مستقیم ہو جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا﴾ ②

اللہ، وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ذلیل کر دیا پست بنا دیا کہ تم اس کے راستوں پر چلو۔ اس میں راہیں بنائیں کہ جس پر چل کر آدمی منزل مقصود پر پہنچے۔ راستہ ہو مگر راہنما نہ ہو، راستہ قطع کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ جس کی حق تعالیٰ حکایت فرماتے ہیں: ﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ﴾ ③

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مدین کا ارادہ فرمایا تو کہا کہ: قریب ہے۔ اللہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔ راہنمائی خدا کی ہوگی مجھے راستہ نظر آئے گا تو راستہ کے لئے راہنما کی ضرورت ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اُطْلُبُوا الرَّفِیْقَ قَبْلَ الطَّرِیْقِ'' راستہ چلنے سے پہلے رفیق سفر متعین کر لو، جو تمہاری رہنمائی کرے۔

ظاہر بات ہے کہ راہ رو کی تو ضرورت ہی ہے۔ راستہ چلنے والا ہوگا تو ان تینوں چیزوں کا متلاشی ہوگا اور اگر

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۱۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔ ③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۲۲۔

راہ رو ہی نہ ہو تو پھر کون چلے؟ غرض اصولاً کسی منزل تک پہنچنے کے لئے ان چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سفرِ روحانیت کی شرائط...... جب مادی راستوں میں ان چار چیزوں کی ضرورت ہے تو اللہ تک پہنچانے والا راستہ جو نہایت عظیم اور طویل ہے اس کے لئے ان چیزوں کی کیا ضرورت نہیں ہوگی؟ آپ معمولی سفر کریں تو یہ چار چیزیں ضروری ہوں اتنا طویل و عظیم سفر کہ بندہ اپنے خدا تک پہنچے، اتنا لمبا راستہ کہ اللہ کی ذات وراء الوریٰ اور بندہ ظلمت در ظلمت:

چہ نسبت خاک را عالم پاک

بندہ خدا تک جائے بلا راستہ، بلا روشنی اور بلا کسی راہنما کے پہنچ جائے اور بغیر اس جذبے کے پہنچ جائے جو اس کے دل میں راہ چلنے کے لئے ہونا چاہئے۔ لامحالہ ضرورت پڑے گی، بلکہ مادی راستوں سے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے یہ دنیوی سڑکیں تو نہیں ہوں گی۔ حق تعالیٰ شانہ جو نورِ مطلق ہیں، مادیات سے بھی بالا، روحانیت سے بھی بالا، اس کی لطافت کے سامنے روحانیت بھی کثیف ہیں تو اس کی ذات بابرکات اور لطیف و خبیر ذات تک پہنچنے کے لئے راستے بھی معنوی ہونے چاہئیں اور نور بھی معنوی ہونا چاہئے۔ (اس راہ کو قطع کرنے کے لئے) سورج کی روشنی کام نہیں دے سکتی سورج کی روشنی ہمیں ہندوستان سے پاکستان، ایران و عرب پہنچا دے گی مگر اس سے عرش عظیم تک نہیں پہنچ سکتے۔ جنتوں تک نہیں پہنچ سکتے عالم برزخ تک نہیں پہنچ سکتے، تو جیسا عالم ویسی روشنی۔ اس لئے اللہ تک پہنچے کے لئے مادی راستہ کافی نہیں بلکہ روحانی و معنوی راستہ کی ضرورت ہے۔ اور ویسی ہی معنوی روشنی کی ضرورت ہے کہ وہ لطافت لئے ہوئے ہو۔ اس میں کثافت کا نشان بھی نہ ہو اور مادیت سے بالاتر ہو تو ظاہر بات ہے کہ اللہ تک آ پہنچنے کے لئے ایسا راستہ درکار ہے اور ایسی ہی رہنما درکار ہے اور راہ رو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے، اس کے لئے فقط یہ پیر کافی نہیں کہ آدمی خدا تک چلا جائے وہ تو کوئی معنوی قوت ہونی چاہئے۔ تو مادی منزل کے لئے مادی راستے، مادی طریقے، مادی راہنما، اور عالم غیب تک پہنچنے اور اللہ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے روحانی راستے روحانی، راہنما اور روحانی رہ گزر کی ضرورت پیش آئے گی۔

نورِ معنوی کی ضرورت...... تو حق تعالیٰ تک پہنچانے والی روشنی کون سی ہے؟ جس میں ہمیں صحیح طور پر نظر آ جائے کہ راستہ کیسا ہے؟ نشیب و فراز کیسے ہیں؟ اس کے لئے حق تعالیٰ نے ایک روشنی کا مینار بلکہ روشنی کا آفتاب روشن کیا، لیکن وہ مادی آفتاب ہیں بلکہ آفتاب نبوت ہے، جس کی روشنی میں آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ''وہ ذات ہے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی''۔ جبکہ دنیا میں اتنی اندھیریاں چھا چکی تھیں کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

اس ظلمت میں حق و باطل میں امتیاز کرنا محال تھا۔ ساری علامتیں روشنیوں کی بجھ چکی تھیں۔ راستہ کے میل اور فرلانگ ختم ہو چکے تھے کہ جن سے راستہ کا پتہ چلے ظلمت ہی ظلمت پھیل چکی تھی کیفیت یہ تھی کہ بندے خدا اور مخلوق کا فرق مٹا چکے تھے۔ مخلوق کی ضعیف و ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کر لی تھیں اور خدا کی پاک صفات بندوں

میں مان لی تھیں۔ بندوں کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا اور خدا کو بندوں کے درجہ تک لے آئے تھے۔

یہود و نصاریٰ کے عقائد کی ظلمت......ایک جماعت کہتی تھی کہ: اللہ میں وہ ساری صفات موجود ہیں، جو بندوں کی بشری صفات ہیں۔ آپ توراۃ کو پڑھیں گے جو آج چھپی ہوئی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اللہ میاں سے کشتی ہوگئی اور بہت سے داؤ پیچ کے بعد اسرائیل بالآخر غالب آ گئے خدا کو پچھاڑ دیا۔ (نعوذ باللہ)

لکھا ہے کہ: طوفانِ نوح جب آیا ہے تو فرشتوں نے جا کر اطلاع کی کہ وہ آپ کا کنبہ ڈوب رہا ہے۔ مخلوق ختم ہو رہی ہے جب اور کچھ نہ بن پڑا تو خدا نے رونا شروع کر دیا اور اتنا روئے کہ آنکھیں دکھنے آ گئیں۔ فرشتے عیادت کے لئے پہنچے کہ اب مزاج کیسا ہے؟ اور آنکھوں کی سرخی کچھ کم ہوگئی یا نہیں؟ تو بندوں کی ساری ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کی ہوئی تھیں۔ جب کہ ایک قوم نے خدائی صفات بندوں میں مان لی تھیں۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے علمِ غیب تسلیم کرتے تھے۔ خدا کے لئے بیوی تجویز کی تو خصوصیات الوہیت وہ بندوں میں مان لی تھیں اور بندوں کی عیب دار صفات خدا کے اندر مان لی تھیں ایک قوم نے مخلوق کو خدا کا ظرف بنا دیا تھا کہ اس کے اندر حلول کرے اور طاریت کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ جسموں میں خدا سمایا ہوا ہے تو مخلوق ظرف بنی اور خالق اس کا مظروف بنا اور ایک قوم نے خالق کو ظرف بنا کر مخلوق کو اس کے اندر سمایا ہوا کہا کہ مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسا کہ گولر کے پیٹ میں بھندے ہوتے ہیں تو خدا کے پیٹ میں مخلوق مظروف ہے تو ایک نے مخلوق کو ظرف مانا اور خدا کو سمایا ہوا مانا یہ تو تجلی میں گت بنائی اور ایک نے خالق کو ظرف مانا اور مخلوق کو اس میں سمایا ہوا مانا یہ وحدۃ الوجود کی گت بگڑی۔ بہر حال دونوں قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے۔ اور خالق و مخلوق کا فرق مٹ چکا تھا۔

تردیدِ عیسائیت......عیسائیوں نے کہا تھا کہ: حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ٌابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللهِ﴾ ① یہود نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا کہ عزیز ہی صرف خدا کے بیٹے نہیں بلکہ ہم سب خدا کی اولاد ہیں۔ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ② ہم تو خدا کے بھائی بھتیجے ہیں، تو ایک نہیں لاکھوں بیٹے مانے۔

مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا بالکل ابتدائی دور تھا اور صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ایک عالم باعمل ہی نہیں بلکہ عارف باللہ صاحب کشف و کرامت بزرگ بھی تھے۔ ان کے زمانے کا ایک طالب علم اتفاق سے ڈیرہ زون پہنچا۔ یہ متوسط درجہ کا تھی، یعنی دستار بندی نہیں ہوئی تھی، فاضل نہیں تھا، فارغ التحصیل نہ تھا، وہ کہیں ڈیرہ زون پہنچ گیا۔ وہاں ایک چوراہے پر کھڑا ہوا پادری تقریر کر رہا

---

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۱۸۔

تھا اور یہ ثابت کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ طالب علم اس سے الجھ پڑا کہا کہ: آپ غلط کہتے ہیں اور بحث شروع کر دی مگر پادری بڑا ہوشیار تھا اور یہ بیچارہ مبتدی طالب علم۔ اس کے مقابلہ میں بحث میں چل نہ سکا کئی جگہ اس نے طالب علم کو عاجز کر دیا۔ جس کا لوگوں پر برا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ: یہ کون جانے گا کہ یہ طالب علم ہے فاضل نہیں ہے، لوگ تو یوں کہیں گے ایک عالم آیا تھا اور پادری سے ہار کر چلا گیا۔ وہیں قریب ایک بھٹیارے کی دکان تھی۔ وہ فوراً دکان سے کود کر نیچے اترا اور اس نے طالب علم کو دھکا دے کر کہا کہ: ''مولوی صاحب! آپ کا کام اس جاہل سے بحث کرنا نہیں، جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے، عالم کا کام نہیں ہے کہ جاہل سے نمٹے اس پادری سے بحث کرنا ہمارا کام ہے، آپ پیچھے ہٹیے۔'' اسے بھی غنیمت معلوم ہوا کہ وہ عاجز آ گیا تھا۔ بھٹیارا آگے بڑھا اور کہا کہ پادری صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ: ''عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں'' کہا اچھا آپ اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہا کہ: مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ کہا بے وقوف! بے ادبی کی بات کہتا ہے وہ تو ازلی ہیں۔ ابدی ہیں۔ انہیں عمر سے کیا تعلق؟ تو اس نے کہا: یہ مطلب ہے کہ بہت لمبی عمر ہے جس کی کہیں حد نہیں۔ کہا: ہاں! یوں سمجھ لیجئے۔

بھٹیارے نے کہا کہ اتنی عمر میں ان کی کتنی اولاد ہوئی؟۔ پادری نے کہا کہ صرف ایک بیٹا۔

بھٹیارے نے کہا کہ: ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ'' کہ میں بھٹیارہ باون برس کی عمر میں بارہ بچے جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی اربوں کھربوں برس کی عمر اور کل ایک بیٹا۔ اس پر تالیاں جو پٹیں اور شور پڑ گیا کہ پادری ہار گئے، ہار گئے۔ لوگوں نے دھکے دے کر اس کو وہاں سے نکال دیا اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔

یہ واقعہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچا، فرمایا کہ: بھٹیارے نے بڑا عالمانہ جواب دیا، مگر وہ بے چارہ اصطلاحات سے واقف نہیں تھا اس لئے اس نے اپنی بات ایک عامیانہ زبان میں کہی مگر مقصد اس کا یہ تھا کہ اگر باپ بننا اللہ میاں کے لئے صفت کمال ہے اور اولاد ہونا اس کے لئے کوئی کمال کی بات ہے تو اس کی ہر صفت لامحدود ہونی چاہئے۔ اولاد بھی لامحدود ہونی چاہئے تھی جس کے عدد کی کوئی انتہا نہ ہوتی اور اگر اولاد ہونا خدا کے لئے عیب کی صفت ہے تو ایک بیٹا ہونا بھی عیب ہے وہ ایک سے بھی بری ہونا چاہئے۔ بھٹیارہ کا یہ مطلب تھا مگر وہ بے چارہ اصطلاحی الفاظ سے واقف نہیں تھا، اس لئے اپنے عامیانہ الفاظ میں کہا کہ: عمر کتنی ہوگی۔ اور ان کروڑوں برسوں میں لے دے کے کل ایک بیٹا۔ حالانکہ میرے تو اب تک بارہ بچے ہو چکے ہیں۔ بہرحال عیسائیوں نے ایک ہی بیٹے کا دعویٰ کیا تھا۔

ردِ یہودیت...... یہود نے آگے بڑھ کر کہا: ﴿نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ''ہم سب اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔'' یہ گویا بھٹیارے کے مذہب پر چلے اس نے جو بحث میں کہا تھا کہ بہت سی اولاد ہونی چاہئے تھی تو یہود نے سمجھا کہ واقعی اللہ میاں کا کل ایک، بیٹا۔ ہزار دو ہزار، کروڑ دو کروڑ، تو ہونے چاہئیں۔ تو انہوں نے کہا

کہ: ہم سب خدا کے بیٹے ہیں۔ اور جو قومیں باقی رہ گئیں وہ بھی کچھ احباب میں ہیں کچھ بھتیجوں میں آ جائیں گے غرض اللہ میاں سے رشتہ داری قائم کر لی تو قرب خداوندی کی یہ گت بنائی کہ قرب بمعنی قرابت و راشتہ داری لے لیا اور کہا کہ: اللہ میاں کے قریب ہم بھی ہیں، یعنی اس کی اولاد ہیں، ہمارا نسب اس سے ملتا ہے۔

مشرکین کی تردید...... مشرکین مکہ نے بھی یہ دعوی کیا تھا کہ اللہ میاں کی اولاد ہوتی ہے مگر انہوں نے کہا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں جس کا قرآن کریم نے جواب دیا کہ: ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى o تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ ①

تم تو بیٹوں پر راضی، بیٹی ہو جائے تو ناک منہ چڑھاؤ اور اللہ میاں کے لئے بیٹیاں؟ کیا تم نے بھونڈی تقسیم کی ہے؟ جس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ وہ ظالموں نے خدا کے سر تھوپ دیا۔ اگر اولاد ماننی ہی تھی تو کم از کم یہود کی طرح بیٹے تو مانتے۔ بہرحال مخلوق اللہ کی قدر نہیں جانتی تھی۔ خالق اور مخلوق کا فرق بھلا چکی تھی۔ اپنی عیب دار صفات خالق میں مان لی تھیں کہ ہم باپ ہیں تو وہ بھی باپ ہے۔ ہماری اولاد ہے تو اس کی بھی اولاد ہے۔ ہم کسی ظرف میں رہتے ہیں تو خدا بھی کسی ظرف میں رہتا ہے۔ ہم محدود ہیں تو معاذ اللہ وہ بھی محدود ہے گویا اس درجہ کو جہالت کی ظلمت پہنچ چکی تھی کہ علم کا نشان باقی نہیں رہا تھا۔

مسخ عقل...... اسی طرح اللہ کی صفات کے بارے میں اور اس کی توحید کے بارے میں مخلوق علم کو گم کر چکی تھی۔ توحید جیسی عقلی چیز جسے انسان عقلاً سمجھ سکتا ہے اسے سمجھنے کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کامل کا دعوی کیا تو مشرکین مکہ نے حیرت سے کہا کہ: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ ②

کیا کروڑوں دیوتاؤں اور خداؤں کو ایک ہی خدا، پیغمبر نے بنا دیا؟ کیا ایک خدا سارے آسمانوں اور زمینوں کا انتظام کرلے گا؟ ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾

یہ تو عجیب بات ہے جو پیغمبر کہہ رہے ہیں، یعنی عجیب تو یہ تھا کہ شرک مانا جائے، مگر شرک رگ و پے میں اتنا سرایت کر چکا تھا کہ توحید عجیب معلوم ہونے لگی۔

توحید اجمالی...... توحید کا اجمال واقعی عقلی ہے۔ اگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بھی دنیا میں تشریف نہ لائیں۔ تو انسان کی فطرت اجمالاً مالک کے ایک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کلام لکھتے ہیں کہ: اگر کسی قوم یا فرد کو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی دعوت نہ پہنچے پہاڑوں کی چوٹیوں میں گزر کر رہا ہو۔ کوئی ڈرانے والا پیغام حق لے کر اس تک نہ پہنچا اور اسی پر اس کی موت آگئی تو قیامت کے دن توحید کا سوال اس سے بھی ہوگا۔ اگر اجمالی وہ اتنا کہہ دے کہ ”میں اتنا جانتا تھا کہ ہاں ہے کوئی پیدا کرنے والا اور وہ ایک ہے تفاصیل تو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بتاتے ہیں۔ تفاصیل مخبر صادق کی خبر اور وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتیں لیکن اتنا اجمال کہ کوئی پیدا کرنے والا ضروری

① پارہ ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۲۱. ② پارہ ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۵.

ہے اور وہ چند نہیں ہو سکتے دس بیس نہیں ہو سکتے یہ ایک فطری امر ہے، اور توحید عقلی ہے لیکن معقولات بھی اس دور میں ختم ہو چکی تھیں اس درجہ جہالت کی ظلمت چھا چکی تھی کہ توحید پیش کی تو کہا: ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ یہ پیغمبر نے کیا عجیب وغریب بات کہہ دی کہ ایک خدا سارے عالم کا انتظام کرلے گا۔

جہالت کی ظلمت...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاد کو پیش کیا کہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی۔ یوم آخرت آنے والا ہے۔ قیامت آنے والی ہے، تم سب کو وہاں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ تو حیرت سے کہا کہ: ﴿مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ ① ''جب ہماری ہڈیاں گل سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں گی۔ پھر کون ہے جو انہیں زندہ کرے اور اٹھائے؟'' ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کوئی قادرِ مطلق موجود ہے تو جہالت کی ظلمت اس قدر قلوب پر چھا چکی تھی کہ توحید جیسی معقول چیز کو وہ عجیب بات سمجھے۔

بشریت انبیاء علیہم السلام...... پیغمبر کی شان اور پیغمبر کی ذات کو بھی عجیب سمجھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انہوں نے کہا تھا: ﴿قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ ②

یہ کیسا رسول آیا ہے کہ کھانا یہ کھاتا ہے، پانی یہ پیتا ہے، بازاروں میں یہ جاتا ہے۔ گویا رسول کا تصور ان کے نزدیک یہ تھا کہ بشریت سے بالاتر ہو۔ تو رسول کی ذات کے لئے بشریت کا انکار لازم سمجھتے تھے کہ رسول بشری نہیں ہو سکتا۔ بشری عوارض اس پر طاری نہیں ہو سکتے۔

حالانکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر تمام بشری عوارض طاری کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان پر خدائی کا شبہ نہ کر سکیں اس لئے کہ ایک طرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ اشارہ فرمائیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ اشارہ فرمائیں تو بت آ کر وضو کے لئے پانی پیش کریں۔ درختوں کو اشارہ فرمائیں تو دوڑ کر آئیں اور سر مبارک کے اوپر سایہ کرلیں۔ پانی میں ہاتھ ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے بہہ پڑیں۔ جس سے پندرہ سو آدمی سیراب ہو جائیں۔ تو ایک طرف تو یہ افعال اور عجائبات قدرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نمایاں ہوں۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ بخار چڑھتا ہے تو شدید، اور فرمایا کہ جتنا تمہیں عام طور سے بخار آتا ہے۔ مجھے اس سے دوگنا آتا ہے۔ غزوہ احد میں سر مبارک پر پتھر لگ پڑا تو خون بہہ پڑا۔ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ لاشیں تڑپ رہی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ طائف پہنچے تو طائف کے شہدوں نے آپ کے پیچھے کتے لگا دیئے۔ پتھر مارے۔ پائے مبارک زخمی ہو گئے۔ سجدہ میں تھے کہ مشرکین مکہ نے عین حرم کے اندر اونٹ کا اوجھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ڈال دیا۔ جس سے اٹھنا دشوار ہو گیا۔ کانٹے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستوں میں بچھائے گئے۔ سحر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرایا گیا اور سحر کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گیا۔ تو ایک طرف قدرت کے یہ کارنامے کہ اشارہ کریں تو چاند دو

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۷۸. ② پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷.

ٹکڑے ہو جائے۔ایک طرف یہ کیفیت کہ اوجھ گر جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ نہیں سکتے۔ایک طرف یہ کیفیت کہ انگلیوں سے چشمے جاری ہو جائیں اور ایک طرف یہ کیفیت کہ بیت نبوت میں دو دو مہینے دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا کہ کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔یہ متضاد چیزیں کیوں رکھی گئیں اگر فقط معجزات دیئے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر خدائی کا شبہ ہو سکتا تھا۔اس لئے حق تعالیٰ نے تمام بشری عوارض طاری کئے ،تا کہ انبیاء علیہم السلام کی بشریت کی کوئی نفی نہ کرے۔

عظمت انبیاء علیہم السلام......اور پھر فرما دیا گیا کہ: اپنی زبان سے اعلان کر دو۔﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾①

کہہ دوا ے پیغمبر کہ میں بشر ہوں اور بشر بھی فقط نہیں کہا بلکہ "مِثْلُكُمْ" فرمایا کہ تم جیسا بشر ہوں،یعنی جو تمہارا طریق پیدائش ہے۔وہی میرا طریق پیدائش ہے۔جو تمہارا طریق وفات ہے وہی میرا طریق وفات ہو گا جیسے تم پر عوارض بشریت آتے ہیں میرے اوپر بھی آتے ہیں۔تو میں بشر ہوں اور تم جیسا بشر ہوں۔ہاں! اللہ نے یہ بزرگی دے دی کہ مجھ پر وحی فرمائی۔مجھ پر اپنا کلام نازل فرمایا یہ میری خصوصیت ہے جو تم میں سے کسی کو نہیں دی گئی۔

تو یہ بزرگی خدا کی دی ہوئی ہے۔لیکن دی کس کو؟ بشر ہی کو دی ہے،لیکن اس بزرگی کے آنے کے بعد بشریت کا چولہ نہیں اتر گیا۔میں بھی اپنی وحی کا اسی طرح متبع ہوں جیسا کہ تمہیں اتباع کی دعوت دے رہا ہوں۔چنانچہ فرمایا:﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ﴾② میں کوئی انوکھا رسول نہیں آیا۔میں وحی کی اتباع کرتا ہوں۔جس طرح وحی خداوندی کے تم پابند ہو میں بھی پابند ہوں۔جس طرح تم قانون حق کے پابند ہو۔میں بھی پابند ہوں۔یہ تمام چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے پیش کرائی گئیں تا کہ واضح ہو جائے کہ آپ بشر ہیں۔

نفیٔ بشریت کا نقصان......اور حقیقت یہ ہے کہ بشریت کی نفی کرنا یہ بد قسمتی کی بات ہے۔ہماری نوع میں اللہ نے وہ ذات بابرکات پیدا کی کہ تمام مخلوقات میں بڑھ چڑھ کر ہے یہ تو ہماری نوع کو خدا کا شرف ہے کہ ایسا شرف بخشا اور ہم اپنی نوع کی توہین کریں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے نکال دیں کہ آپ بالاتر ہیں۔یہ ہماری بد قسمتی اور محرومی کی بات ہوگی۔ہم تو دلائل کی رو سے کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے بشریت کی عظمت واضح ہو۔

بہر حال جہاں معجزات دیئے گئے وہاں عوارض بشریت بھی دیئے گئے تا کہ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدائی کا شبہ نہ ہو سکے۔

اظہارِ عبدیت کا امر......اسی لئے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور فرمایا مامور ہو کر:﴿قُلْ اِنِّيْ

---

① پارہ:۱۶،سورۃ الکھف،الآیۃ:۱۱۰.

② پارہ:۲۶،سورۃ الاحقاف،الآیۃ:۹.

لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا﴾ ① ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کر دیجئے کہ اگر اللہ میری پکڑ کرے تو کوئی مجھے چھڑانے والا نہیں اسی کا فضل وکرم مجھے چھڑا سکتا ہے“۔

اور اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی کہ: ”لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدَکُمْ عَمَلُہٗ“ تم میں سے کسی کا عمل کسی کو نجات نہیں دلا سکتا بجز اللہ کے فضل کے تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ”وَلَا اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللہِ؟“ کیا آپ کو بھی آپ کا عمل نجات نہیں دلا سکتا، فرمایا: ”لَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللہُ بِرَحْمَتِہٖ“ کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ ہی کا فضل میری دستگیری نہ فرمائے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ عبدیت کے کلمات اس لئے ادا کرائے جاتے ہیں تاکہ کسی کو ان کی الوہیت کا شبہ نہ ہو جائے۔ ان کی خدائی کا شبہ کسی کو نہ گزر جائے اس لئے یہ تمام چیزیں پیش آتی ہیں۔ ②

دورِ بعثت کا اجمالی حال...... غرض مشرکین میں نبوت کا تصور یہ تھا کہ وہ بشریت سے بالاتر کوئی چیز ہے کہ نبی نہ کھائے نہ پیئے تو کہتے تھے۔ ﴿مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ﴾ ③

بہرحال خدا کے بارے میں بھی رسول کے بارے میں بھی اس قدر ظلمت عالم پھیل چکی تھی۔ مکہ کے اندر بھی مکہ کے اردگرد بھی اور چہار طرف قلوب میں ظلمت اور اندھیری چھا گئی تھی۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ”اِنَّ اللّٰہَ نَظَرَ اِلٰی قُلُوْبِ بَنِیْ اٰدَمَ فَمَقَتَ عَرَبَھُمْ وَعَجَمَھُمْ“ ④ اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضبناک نگاہ سے دیکھا۔ کوئی شمہ خیر کا باقی نہیں رہ گیا تھا ”اِلَّا غُبَّرَ اَھْلُ الْکِتٰبِ“ اہل کتاب میں سے چند گنے چنے افراد جو حق کے اوپر قائم تھے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر اپنے دین کو بچا رہے تھے۔ مخلوق سے الگ تھے۔ حق کے لئے عام مجامع کے اندر، عام اجتماعات اور عام بستیوں میں گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی تو حق پر جمنے کے لئے لوگ پہاڑوں کی کھوہ میں جاتے تھے تاکہ دین کو سلامت رکھ سکیں۔ تو عقائد، اعمال، اخلاق اور رسوم کی ظلمت پھیل چکی تھی۔ ہر طرف اندھیریاں چھا گئی تھیں۔ ان اندھیریوں میں ایک تیز روشنی کی ضرورت تھی کہ ان تمام ظلمات کے پردے چاک ہوں۔ اور روشنی سامنے آئے جس سے عقائد، اعمال اور احوال درست ہوں۔ تو اس شدید ترین اندھیری کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

شانِ تشریف آوری...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شان سے دنیا میں تشریف لائے کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور آپ کے بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ اکٹھی دو روشنیاں لے کر آپ تشریف لائے۔ غالباً آپ کو یہ شبہ ہو گا کہ ہم نے یہ کسی تاریخ میں نہیں پڑھا۔ کسی حدیث میں نہیں پڑھا کہ آپ کے ہاتھ میں چاند اور سورج ہوں۔ یہ

---

① پارہ: ۲۹ سورۃ الجن، الآیۃ: ۲۲. ② الصحیح لمسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللہ تعالیٰ ج: ۴ ص: ۲۱۲۹. ③ پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب الصفات التی یعرف بھا فی الدنیا اھل الجنۃ واھل النار، ج: ۴ ص: ۲۱۹۷ رقم: ۲۸۶۵.

ایک نئی سی بات ہے۔تو میں عرض کرتا ہوں کہ آپ صبر وسکون سے کام لیں۔ بلا شبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔سورج سے کیا مطلب ہے؟ یعنی دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب تھی۔اور بائیں ہاتھ میں قلب نبوت تھا۔جس میں اخلاق کی روشنی بھری ہوئی تھی۔کتاب اللہ کے اندر الوہیت کا جلال بھرا ہوا تھا۔اگر فقط کتاب اللہ سامنے آئی اور پیغمبر نہ آتے تو الوہیت کا جلال مخلوق کو بھسم کر دیتا، مجال نہ تھی کہ کوئی اس کو سمجھ سکے اس کی روشنی کو قلب نبوت میں اتارا گیا تو نبوت کی عبدیت کے ساتھ جب الوہیت کا نور اس پر فائز ہوا تو ٹھنڈک پیدا ہوئی جس کو انسان سہ سکیں۔تو سورج اللہ کی کتاب تھی اور چاند جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک تھا جو کمالات اخلاق کا مرکز تھا۔اس طرح سے آپ دنیا میں تشریف لائے،یعنی جلال بھی تھا اور جمال بھی۔خدا کی کتاب کے اندر جلال تھا اور قلب مبارک کے اندر شان جمالی تھی۔

جامعیت شریعت......اس لئے شریعت مقدسہ میں دونوں شانیں موجود ہیں۔رحمۃ للعالمین کی شریعت ہے جس میں عفو و درگذر اور معافیاں بھی ہیں اور ساتھ ساتھ حدود وقصاص اور جہاد بھی ہے چور چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دو، زانی زنا کرے تو سنگسار کردو جہاں شریعت کے اندر رحمۃ للعالمینی ہے۔وہاں جلالی شانیں اور تعزیرات و عقوبات بھی موجود ہیں۔اسی لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''بُعِثْتُ مَرْحَمَةً وَّمَلْحَمَةً'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اور جنگ مجسم بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں۔مطیعوں کے لئے رحمت ہوں اور مجرموں کے لئے غضب مجسم ہوں''۔اسی طرح فرماتے ہیں:''اَنَا الضَّحُوْكُ الْقَتَّالُ'' میں بہت زیادہ ہنس مکھ بھی ہوں۔اور بہت زیادہ قتال کرنے والا بھی ہوں۔یعنی رحمت کی شان بھی ہے۔اللہ کی رحمت میرے اندر سرایت کئے ہوئے ہیں اور غضب کی شان بھی ہے کہ خدا کے غضب سے اس کے منکروں کے مقابلہ میں غضب مجسم بنتا ہوں۔غرض دونوں شانیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائیں۔بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں روشنیاں لے کر آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات فی الحقیقت ایک نور ہے،کیسا نور تھی؟

حق و باطل میں امتیاز کا نور......جیسی ظلمت آپ کے سامنے ابھی آئی ویسا ہی نور تھا۔جہالت،اخلاق وعقائد کی ظلمت بنی آدم میں تھی جبلت کی شہوتیں،جبلت کی ظلمتیں یہ ایسی ظلمات ہیں۔جن سے حق و باطل میں امتیاز نہیں ہوتا تو ان ظلمتوں کے لئے ویسے ہی نور کی ضرورت تھی کہ یہ ظلمتیں رفع ہوں۔چاندنے میں حق و باطل نظر آئے۔حق و باطل اس سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔وہ پیغمبر کی روشنی میں نظر آتا ہے۔جو علم اور کمالات اخلاق کی روشنی ہے۔حقیقت میں نبوت نورانی ہے۔

غرض جس طرح کی ظلمتیں میں نے عرض کیں یہ ظلمتیں وہ نہیں ہیں جو سورج کے ڈوبنے سے پیدا ہوتی ہیں۔یہ حسی اور مادی ظلمت ہے اور جہالت و بداخلاقی کی ظلمت یہ معنوی ظلمت ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے جیسے حدیث

میں فرمایا گیا کہ ''اَلظُّلْمُ ظُلُمٰتٌ'' ① (ظلم یہ ظلمت وتاریکی ہے۔عدل روشنی ہے تو عدل کی روشنی سورج کی طرح سے نہیں ہے۔علم کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح نہیں ہے،مگر سورج کی روشنی اس روشنی کے سامنے ماند ہے۔

سورج فقط مکان کو روشن کرتا ہے اور علم کی روشنی قلوب اور ارواح کو روشن کرتی ہے سورج سے فقط زمین اور مکان روشن ہوتا ہے، اور علم سے زمان، مکان اور اعیان سب روشن ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور خداوندی ہیں۔مگر مادی نور نہیں ہیں معنوی نور ہیں۔یعنی علم الٰہی کا پرتو جو آپ کے اوپر پڑا ہے وہ عالم میں کسی کے اوپر نہیں ڈالا گیا۔بعض روایتوں میں ہے کہ: ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ'' ② اس روایت کو بعض نے ضعیف اور بعض نے موضوع کہا ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، کیوں کہ قرآن کریم نے دعویٰ کیا کہ: ﴿قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ﴾ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور پہنچا۔اور نور سے مراد ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو ''اول ماخلق اللہ نوری'' کو دیکھا جائے تو اگر چہ حدیث موضوع بھی ہو مگر مضمون کے لحاظ سے صحیح ہے، کیوں کہ قرآن کے ساتھ موید ہے۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔مگر معنویت کا نور ہیں۔روحانیت کا نور ہیں۔اخلاق کا نور ہیں۔کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ظہور کرتے تھے۔جلوہ کرتے تھے اس کی روشنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تھی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم تھے۔اللہ کے کمالات کے جس طرح سے یہ بجلی کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔فیوز جو ہے اس کے اندر ایک بہت معمولی سا تار ہے، لیکن جب اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے ہو جاتا ہے تو وہ اتنا روشن ہو جاتا ہے کہ میدانوں کو چمکا دیتا ہے۔تو اصل میں روشنی پاور ہاؤس سے آتی ہے۔خود اس کے تار کے اندر روشنی نہیں ہے لیکن منور ہو کر تار کی ہستی نظر نہیں آتی۔روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ایسے میں اگر تار کہہ دے: ''اَنَا النُّوْرُ'' میں تو خود نور ہوں۔تو وہ کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت میں نور اور ہے اس کی ذات اور ہے اس کی ذات پر، نور نے جلوہ کیا ہے۔وہ نور کا مظہر بن گیا۔اسی واسطے نور بھی کہہ جاسکتا ہے اور جب ذات کی طرف نگاہ جائے گی تو کہا جائے گا کہ میں تو تار ہوں۔روشنی دوسرے کی ہے جو میرے اندر آرہی ہے۔انبیاء علیہم السلام وہ صلاحیتیں لے کر آتے ہیں کہ علوم خداوندی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔اخلاق ربانی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔تو یہ نور معنوی نور ہے جیسا کہ وہ ظلمت معنوی ظلمت تھی۔معنوی ظلمت کے رفع کرنے کے لئے معنوی نور کی ضرورت تھی۔آفتاب کا نور اسے زائل نہیں کر سکتا تھا۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نور بن کر آئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھ کر مخلوق نے یہ سمجھ لیا کہ حق یہ ہے، باطل یہ ہے، نیکی اسے کہتے ہیں، بدی اس کہتے ہیں۔آپ کے اعمال، اخلاق اور پاکیزہ کردار کو دیکھ کر دنیا کے سامنے معیار آگیا اور سمجھا کہ نیکی کس چیز کا نام

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المظالم والغصب، باب الظلم ظلمات یوم القیامة، ج: ۲ ص: ۸۶۴ رقم: ۲۳۱۵.

② قال العلامة اللکھنوی: وقد اشتھر بین القصاص حدیث ''اول ماخلق اللہ نوری'' وھو حدیث لم یثبت بھذا لمعنی وان ورد غیرہ موافق لہ فی المعنیٰ دیکھئے: الآثار المرفوعة ج: ۱ ص: ۴۳.

ہے۔ خلق حسن کس چیز کا نام ہے۔ کمال کس چیز کا نام ہے۔ عیب کس چیز کا نام ہے۔

گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ تک پہنچنے کے راستہ کے لئے روشنی تھے۔ اس کے بغیر راستہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعل نور بن کر تشریف لائے اور راہ خداوندی لوگوں کے سامنے کھل گئی۔

راہنمائے حق...... راہنما کیا چیز ہے؟ حقیقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو مشعل نور ہے جس سے راہ کھلی، لیکن راہ کے لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے تو راہنما آپ کی سنتیں۔ آپ کے افعال اور کردار ہیں۔ اسوہ حسنہ جس کو سیرت کہا جاتا ہے۔ وہ اسوہ حسنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اوراحوال کا مجموعہ ہے۔ فی الحقیقت وہ راہنما ہے تو یہ ایک نور راہ آیا جس سے راستہ روشن ہوا اور ایک راہنما آیا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے جو راہنمائی کرتی ہے کہ اس طرح سے چلو۔

اسوۂ عمل...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر جو اعمال کا نمونہ پیش کیا فقط آپ نے قانون نہیں پیش کر دیا۔ قانون کے ساتھ اپنا اسوہ بھی پیش کیا۔ آپ نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ "صَلُّوْا" نماز پڑھو بلکہ یہ فرمایا کہ: "صَلُّوْا كَمَارَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ" نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اسی نمونے کی نماز پڑھو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ عمل بن کر دنیا کے اندر آئے۔ آپ کی سیرت عمل کے لئے راہنما تھی جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہوگی وہ نماز صحیح پڑھے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سامنے نہیں ہوگی۔ نماز صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ تو یہ نہیں فرمایا کہ "صَلُّوْا" بلکہ فرمایا: "صَلُّوْا كَمَارَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ" اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا۔ فقط آرڈر نہیں دیا بلکہ وضو کر کے دکھلایا ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔ تو تمام اعضا کو ایک ایک دفعہ دھویا۔ اور فرمایا: "هٰذَا وُضُوْءٌ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةً اِلَّا بِهٖ" یہ وضو ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتے۔ اگر ایک دفعہ بھی اعضا کو نہ دھویا جائے تو وضو ہی نہ ہوگا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وضو فرمایا اور اعضاء کو دو دو مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ہے جو "نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ" ہے۔ اور اس کے بعد تیسری مرتبہ وضو کیا۔ تو تین تین دفعہ اعضاء وضو کو دھویا، اور فرمایا کہ: "هٰذَا وُضُوْئِيْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ قَبْلِيْ" یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے جتنے انبیاء تھے وہ یہی وضو کرتے تھے۔

ضرورتِ مربی...... تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ: "تَوَضَّؤُوْا" لوگو وضو کرو بلکہ کر کے دکھلایا کہ اس طرح سے کرو کیوں کہ عمل کی بہت سی خصوصیات ہوتی ہیں جو بلا عامل کی ہیئت کے سمجھ میں نہیں آ سکتیں، الفاظ سے آدمی عمل کی ہیئت نہیں بنا سکتا۔ جب تک کہ عمل کی ہیئت سامنے نہ ہو۔ دین ہی میں نہیں بلکہ ہر صنعت میں ہر حرفت میں یہی طریقہ ہے کہ محض اصول اور کتاب کافی نہیں ہوتے جب تک کر کے دکھلانے والا کوئی مربی اور استاد سامنے نہ ہو۔ خیاطی کا فن ہے۔ آپ پانچ سو صفحے کی کتاب پڑھ جائیں۔ جس میں یہ اصول ہوں کہ کپڑے سینے کے یہ یہ طریقے ہیں لیکن جب تک درزی کو سوئی چلاتے ہوئے نہیں دیکھیں گے آپ کو سوئی چلانی

آ ئے گی نہیں کیوں کہ عمل کی ایسی باریکیاں ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں کر کے دکھلانے والا جب تک اس ہیئت سے کر کے نہ دکھلائے۔

اسی واسطے حضرات محدثین نے جہاں جہاں احادیث کی روایت کی ہے وہاں خود بھی عمل کر کے دکھلایا ہے اور اپنے عمل کو روایت کے مطابق کیا ہے۔ میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی مشکوۃ شریف میں جب یہ باب آیا کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، تو رکوع کی بحث آئی تو رکوع کی روایت کو پڑھ کر اور اسے سمجھا کر خود والد مرحوم نے جماعت کے اندر رکوع کر کے دکھایا کہ یوں کرنا چاہیے، جب سجدے کی روایت آئی تو اسے پڑھا کر سجدہ کر کے دکھلایا کہ یوں کرنا چاہئے، تو ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہم تو رات دن رکوع وسجدہ کرتے ہیں۔اس میں درس کے دوران جماعت میں کر کے دکھلانے کی کیا ضرورت تھی؟

فرمایا کہ: یہ میں نے اس لئے دکھلایا کہ جب میں نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تھی تو انہوں نے بھی مجھے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی اس موقع پر یونہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی مجھے یوں ہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق صاحب نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے حدیث سمجھا کر یوں ہی رکوع اور سجدہ کر کے دکھلایا تھا اور کہا کہ: مجھے شاہ ولی اللہ نے یونہی کر کے دکھایا تھا اور شاہ ولی اللہ نے کہا کہ: مجھے شیخ ابو طاہر مدنی نے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور آخر تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچادی۔

تسلسل ہیئت عمل......تو محدثین جہاں الفاظ کی روایت کرتے ہیں وہاں ہیئت عمل کو بھی کر کے دکھاتے ہیں، یعنی الفاظ فقط اصول کا نام نہیں، بلکہ تاریخ بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے۔کوئی قانون قانون نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ اس کی تاریخ نہ ہو۔تو روایات حدیث کے ساتھ امت کا تعامل بھی موجود ہے۔اس میں اس عمل کے بارے میں راہنمائی ہوتی ہے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس عمل کی نقل کی تابعین نے اس عمل کی نقل کی روایت بھی پیش کی۔

اسی واسطے بعض روایات جو مسلسل بالاولیات کے نام سے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی روایت کو ظاہر فرمایا اور ایک حکم دیا اور اسی مجلس میں اس کو کر کے دکھلایا تو محدثین روایت کے ساتھ ساتھ سند اور اس کو کر کے دکھاتے چلے آتے ہیں۔

مثلاً حدیث "مُسَلْسَل بِالْمَآءِ وَالتَّمَر" یہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی فضیلت بیان کی اور بیان کر کے خود کھائی اور اپنا اولش (کھجور کا بقیہ) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیا اور کٹورے میں پانی پیا اور بچا ہوا پانی عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پلایا۔عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے

اپنے شاگرد کو کھجور کی فضیلت کی یہ حدیث سنائی تو فضیلت بیان کر کے اسی طرح کھجور کھائی اور بقیہ نصف اپنے شاگرد کو کھلائی اس طرح پانی پیا اور بچا ہوا اپنے شاگرد کو پلایا۔ اسی طرح تابعین نے تبع تابعین کو، تبع تابعین نے اتباع تبع تابعین کو کہا یہاں تک کہ سند ہم تک پہنچ گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث سہارنپوری اکابر علماء میں سے گزرے ہیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور جو مشہور ہے۔ اس کے حضرت صدر مدرس تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ کے خلفاء میں سے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ حضرت مولانا کے ساتھ سفر میں ساتھ ہوا۔ حضرت میرٹھ جا رہے تھے راستے میں مجھ سے فرمایا کہ: اس وقت میری حدیث کی سند پوری جماعت میں سب سے زیادہ عالی اور بلند ہے میں ایک واسطے سے حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد ہوں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے سند کی اجازت دوں اس کے لئے تو خود سہارنپور آ کر اجازت لے، میں نے عرض کیا کہ: حضرت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی اور ابالی پن کی وجہ سے بھول بھال گیا۔ ایک برس گزر گیا پھر اتفاق سے سفر میں ساتھ ہوا۔ پھر یہی ارشاد فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ اب میں حاضر ہوں گا پھر برس چھ مہینے کے قریب گزر گئے، چھ مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لئے جا رہے ہیں۔ اب میں نے سوچا کہ اگر یہ سند نہ لی تو میں محروم ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے سہارنپور کا سفر کیا حضرت بہت خوش ہوئے۔ مولانا محمد زکریا صاحب جو آج مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث ہیں سے فرمایا کہ حدیث کی جتنی کتابیں مظاہر العلوم کے کتب خانے میں ہیں وہ سب لے آؤ۔ تو ساری صحاح ستہ معاجم، مسانید اور سنن سب کتابیں آ گئیں اور اجازت دی تو حضرت نے بہت سی کتابوں کا اول مجھ سے پڑھوایا اور بعض کتابوں کو خود پڑھا اس کے بعد فرمایا کہ مسلسل بالاولیات بھی لے کر آؤ تو الیانع الجنی لائی گئی جس میں وہ روایتیں جمع ہیں۔ جو اولیات کے ساتھ مسلسل ہیں جن میں عمل کے ساتھ ہیئت عمل کی ضرورت ہے تو کھجور بھی منگوایا اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی فضیلت بیان کر کے خود کھائی اور انہیں کھلائی پانی پیا اور بچا ہوا پانی پلایا۔ تو خود کھجور کھا کر مجھے کھلائی، خود پانی پیا اور بچا ہوا مجھے پلایا۔ اس عمل کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ملا دی غرض محدثین جہاں حدیث کی روایت کرتے ہیں وہاں اس کے تعامل کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کی صفات اور کیفیات کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ حدیث کے درس میں جب "رَنَّةُ النِّيَاحَةِ" ① کی حدیث آئی یہ زمانہ اہلیت میں رسم تھی کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تھا تو وہ وصیت کر کے مرتا تھا کہ مجھ پر چھ مہینے تک رونا۔ تا کہ یہ سمجھا جائے کوئی بڑا آدمی مرا ہے۔ کوئی ایک برس کی کوئی دو برس تک رونے کی وصیت کرتا تھا۔

اب ظاہر بات ہے کہ برس دن رونے کے لئے کس کی آنکھ میں اتنے آنسو رکھے ہوئے ہیں۔ کہ ایک برس تک

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنائز، باب التشدید فی النیاحة، ج: ۲ ص: ۶۴۴ رقم: ۹۴۳.

رویا جائے۔ اس لئے رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں جو چھ مہینے برس دن تک روتی تھیں اور طریقہ ان کا یہ ہوتا تھا کہ جہاں کوئی تعزیت کرنے والا آیا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ کوئی آرہا ہے تو دوڑ کر آئیں اور حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ اور جب وہ قریب پہنچا تو انہوں نے راں راں کرنا شروع کر دیا۔ ''وَا کَذَا وَا جَبَلَا'' ہائے تو ایسا تھا۔ تو ویسا تھا۔ جب تعزیت کرنے والا چلا گیا تو انہوں نے بھی رونا موقوف کر دیا پھر کوئی آیا پھر شروع کر دیا تو شہرت ہوتی تھی کہ بڑا آدمی مرا ہے کہ رونا ہی نہیں تھمتا تو کرایہ پر رونے والیاں رکھی جاتی تھیں اور وہ بیان کر کے روتی تھیں۔ ماتم کرتی تھیں۔

تو جب یہ حدیث آئی تو میرے والد صاحب نے اس راں راں کی نقل اتاری ہم لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی تو والد محترم نے فرمایا کہ: مولانا گنگوہی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی اور انہوں نے فرمایا تھا کہ شاہ عبدالغنی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی۔ آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچا دی، بہر حال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو مشعل نور تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کر عرش تک پہنچنے کا راستہ نظر آجاتا تھا کہ یہ حق ہے اور فلاں راستہ باطل ہے نور اور ظلمت میں امتیاز ہو جاتا تھا اور راہنما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تھیں۔ آپ کا طریق عمل تھا جس سے آدمی حق کا راستہ پاتا تھا حج اس طرح کرتے ہیں، روزہ اس طرح، نماز اس طرح، جہاد اس طرح کرتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ، معاشرت، معیشت، صلح وامن کا یہ طریقہ ہے سب چیزیں آپ نے عملی طور پر کر کے دکھلائیں۔

عملی قرآن ...... تو کتاب اللہ میں جو چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں وہ چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں، اس لئے اللہ کا علمی قرآن وہ ہے جو اوراق اور کاغذوں میں موجود ہیں اور عملی قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ جو قرآن میں لکھا ہوا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا ہوا موجود تھا۔ اسی واسطے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور سیرت کیا تھی تو فرمایا۔ ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ'' اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دیکھنی ہے تو اول سے آخر تک قرآن پڑھتے جاؤ۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی یعنی جو اس میں لکھا ہوا ہے وہی آپ کے اندر عملی شان سے موجود ہے جو چیزیں اس میں اقوال کی شکل میں موجود ہیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں احوال کی شکل میں موجود ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ آتی تو راہنمائی ناممکن تھی۔

طریقۂ تعلیم خداوندی ...... اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کے لئے اور دین کی راہ قطع کرنے کے لئے محض کتاب اللہ کافی نہیں جب تک کہ شخصیت ساتھ نہ ہو۔ محض لٹریچر کافی نہیں ہے جب تک کہ کوئی شخصیت راہنمائی نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ خیر و برکت تک تعلیم کا یہی طریقہ اللہ نے رکھا کہ کتاب بھی بھیجی اور کتاب کے ساتھ معلم کتاب بھی بھیجے۔ آدم علیہ السلام کو صحیفے دیئے گئے تو خود ان کو بھی ساتھ بھیجا گیا، ادریس علیہ السلام کو پچاس صحیفے دیئے گئے تو حضرت ادریس علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔

اگر صحف ابراہیم بھیجے گئے تو ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔ تورات آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے اگر انجیل آئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے اور قرآن آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات آئی۔

اس لئے اگر پیغمبر نہ آئیں تو محض کتاب کے الفاظ سے آدمی مرادِ ربانی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگر سمجھ جاتا تو پیغمبروں کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب اللہ کو بیت اللہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! تم مریضان نفوس ہو اور یہ "شِفَآءٌ لِّمَافِي الصُّدُوْرِ" ہے۔ جاؤ! اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج خود کر لو اگر اٹھا کر لوگ لے جاتے تو مرادات ربانی ان کی سمجھ میں نہ آتیں جب تک پیغمبر تعلیم نہ دیتے۔

انبیاء علیہم السلام کی احتیاج...... اس واسطے کہ کلام کی مراد سمجھنے کے لئے کبھی لب و لہجے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، کاغذ پر جو کلام لکھا جاتا ہے۔ تو اس میں کلام کی کیفیات کاغذ پر نہیں آتیں وہ لب و لہجے اور ہیئت سے سمجھ میں آتی ہیں۔ ماحول سے سمجھ میں آتی ہیں محض کاغذ اور کاغذ کے کالے حروف سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان کا ایک جملہ ہے" کیا بات ہے" عام طور سے بولا جاتا ہے۔ اس کے کئی معنی آتے ہیں اور سارے معنوں کا تعلق لب ولہجہ سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی! کیا بات ہے؟ آپ یوں سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں، پوچھ رہا ہوں کہ کیا بات ہے، کیا واقعہ گذرا ہے؟ اور اگر میں یوں کہوں: کیا بات ہے، اب آپ کیا سمجھے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے بڑائی بیان کی کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے وہ تو بہت بڑی چیز ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ "کیا بات ہے" اب آپ کیا سمجھے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے ایک چیز کی تحقیر کی ہے کہ نہایت ذلیل چیز ہے کیا بات ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ کیا بات ہے۔ اب آپ سمجھیں گے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو ایک ہی جملہ ہے اس کے معنی وسوال، تعجب تفخیم شان اور تحقیر شان کے آتے ہیں۔ لیکن ہر معنی کا تعلق لب ولہجے سے ہے۔ کاغذ اور کالے نقوش سے نہیں اب اگر آپ کسی کے سامنے کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں کہ" کیا بات ہے" وہ مطلب سمجھے گا جو اس کے ذہن میں کیفیت ہے۔ وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی اس کی اپنی طبعی گھڑی ہوئی مراد ہوگی اور متکلم کے سر تھوپ دے گا۔

حالانکہ مراد اپنی ہوگی۔ تو ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم کا ایک لب ولہجہ ہے اگر قرآن کے ساتھ بیان کرنے والے مربی نہ آتے، لب ولہجہ، ماحول اور ہیئت کذائی سے نہ سمجھاتے تو قرآن کریم سے اللہ کی مرادیں سمجھنا آپ کے لئے ممکن نہ ہوتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لب ولہجے، طریق عمل اور ہیئت کذائی سے سمجھایا۔ حدیث میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ فرمایا گیا۔ جب قرآن کریم کی یہ آیت اتری ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ رمضان کی راتوں میں کھاؤ اور پیو جب تک فجر طلوع نہ کرے، اس کو اس طرح تعبیر کیا کہ اس وقت تک کھاؤ، پیو۔ جب تک فجر کا سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے تو سفید ڈورے سے مراد صبح صادق ہے جو پو پھٹتی ہے اور ایک لمبی لے کر آسمان پر کھنچ جاتی ہے اور سیاہ

ڈورے سے رات کی تاریکی مراد ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک ڈورا تو کالا لیا اور ایک سفید اور دونوں تکئے کے نیچے رکھ لئے کھاتے پیتے رہے تکیہ اٹھایا دیکھا کہ اتنا اندھیرا ہے کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہیں ہوتا۔ پھر کھاتے پیتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح صادق بھی ہوگئی پندرہ بیس منٹ اوپر گزر گئے کیوں کہ صبح صادق کے بعد کچھ دیر اندھیرا رہتا ہے، مگر چوں کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ اور نمایاں نظر نہیں آیا اس لئے کھاتے پیتے رہے۔ جب اتنا چاندنا ہو جاتا کہ دونوں ڈورے الگ الگ نظر آنے لگتے تب روزے کی نیت کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کی اطلاع دی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ فرمایا تم کیا عمل کرتے ہو؟ انہوں نے کہا حضرت! قرآن شریف میں یہ آیت نازل ہوگئی ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ①

تو میں نے کالا اور سفید ڈورا اپنے تکئے کے نیچے رکھ لیا ہے تاکہ دیکھتا رہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ" تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ کالا سفید دونوں ڈورے اس کے نیچے آگئے۔ بندہ خدا کالے ڈورے سے مراد رات کی تاریکی اور سفید ڈورے سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے، تو نے روئی کے دھاگے سمجھ لئے۔ تو لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے، مگر اللہ کی مراد نہیں تھی، مراد سمجھانے والے پیغمبر تھے۔ اگر مراد پیغمبر نہ سمجھائیں تو کالا ڈورا اور سفید ڈورے سے وہ روزہ رکھنا شروع کرتے روزہ رکھتے رہتے کوئی ملامت اس پر نہ ہوتی۔ مگر وہ مرادِ خداوندی نہ ہوسکتی، غرض بعض دفعہ لغت ہوتی ہے مرادِ خداوندی دوسری ہوتی ہے۔ عرفی معنی مراد ہوتے ہیں۔

تعینِ مراد میں عرف کا دخل ...... ہمارے محاروہ میں کہا جاتا ہے کہ "سونے پر سہاگہ" تو لغتہً تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سونا رکھ کر سہاگہ اس کے اوپر چھڑک دو، لیکن مراد یہ نہیں مراد عرف عام میں یہ ہے کہ جب کسی چیز میں خیر کا مبالغہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں کہ سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ یعنی سونا تو اپنی ذات سے عمدہ ہی تھا اور سہاگہ لگنے کے بعد کندن بن گیا، یعنی اس کی خوبی بڑھ گئی۔ عرف عام اور اہل زبان میں رہ کر یہ محاورے سمجھ میں آتے ہیں پھر ان کی لطافت محسوس ہوتی ہے۔ کوئی محض ڈکشنریاں دیکھے اور اہل عرف سے قطع نظر کردے تو وہ یہ سمجھے گا کہ سونا رکھ کر سہاگہ پیس کر اس پر چھڑک دے تو اہل عرف اس کی بات پر ہنسیں گے کہ یہ عرف کو جانتا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ہمارے اساتذہ میں آپ کے ضلع ہزارہ کے حضرت مولانا غلام رسول خان صاحب تھے، اردو پوری طرح نہیں بول سکتے تھے۔ جیسے سرحد کے لوگ بول سکتے ہیں۔ ویسی ہی بولتے تھے اور دعوی مولانا کو یہ تھا کہ میں سب سے زیادہ اردو جانتا ہوں۔ تو ایک موقع پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ جمع تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان کے بھائی مولانا محمد حسن صاحب وغیرہ تو مولانا محمد حسن صاحب نے کہا کہ: میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس سے تم دارالعلوم دیوبند میں مدرسی کر رہے ہو اور تمہیں اردو بولنی نہیں آئی۔ مولانا کو غصہ آ گیا کہنے لگے:

① پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۸۷.

''میں اردو نہیں جانتا؟''۔ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو لغو سمجھتا ہوں اس لئے بولتا نہیں ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ: آپ ہندوستانیوں سے زیادہ سمجھتے ہیں؟ کہا کہ ہاں! انہوں نے کہا کہ بتاؤ اس کے کیا معنی ہیں۔ ''کریلا اور نیم چڑھا'' اب مولانا چپ بیٹھے کہ اس کا کیا مطلب کہ ''کریلا اور نیم چڑھا''۔

کہنے لگے کہ: اس عطف (لفظ اور) نے کام خراب کر رکھا ہے ورنہ معنی ظاہر تھے حکیم صاحب نے کہا کہ چلو تم عطف نکال دو۔ ''کریلا نیم چڑھا'' اس کا مطلب بتلا دو کہنے لگے اب معنی ظاہر ہے کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔ سارا مجمع ہنس پڑا۔ اب ظاہر بات ہے کہ مولانا نے لغت کی مدد سے یہ معنی بیان کئے اہل عرف میں کبھی رہے نہیں تھے کہ اس محاروے کی حقیقت کو سمجھتے۔ ''کریلا'' لیا اردو کا ''نیم'' فارسی کا لیا چڑھا لیا ہندی کا اور تینوں چیزوں کو ملا کر ایک معنی بنا دیئے تو اس معنی پر اہل عرف کو ہنسنا ہی تھا یہ معنی مراد تھوڑا ہی ہیں۔

ایسے ہی ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک کلکٹر تھا یہ آج سے چالیس برس کی بات ہے، انہیں بھی یہی دعوی تھا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں ان کے ہاں پیش کار ہمارے دیوبند کے منشی حبیب حسن تھے بڑے عمدہ شاعر تھے، بڑی شستہ ان کی زبان تھی تو بعض اوقات وہ کلکٹر دعوی کیا کرتا کہ ویل! پیش کار۔ ہم تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہے۔

یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں کہ یہ کمبخت اردو کیا جانے، اس کی مادری زبان نہیں۔ اہل عرف میں یہ نہیں رہا۔ اسے خواہ مخواہ یہ دعوی ہو گیا۔ اب یہ ملازمت کے ڈر کے مارے بول نہیں سکتے تھے کہ کہیں برخاست نہ کر دے کہیں روٹی نہ جائے۔

ایک دن کوئی بات آ پڑی تو اس کلکٹر نے میز پر جوش کے ساتھ مکہ مار کر کہا کہ ویل پیش کار! تم جاہل ہو اردو سے۔ ہم اردو جانتے ہیں۔ پیش کار کو بھی غصہ آ گیا، انہوں نے کہا کہ: میری نوکری رہے یا نہ رہے مگر مجھے اس کے دماغ سے یہ خناس نکالنا ہے۔ اس نے میز پر ایک مکا مارا تھا انہوں نے دو مکے مارے اور کہا۔

ویل صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو تم نہیں جانتا اردو کسے کہتے ہیں ہم جانتے ہیں۔

صاحب کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا آسمان پر۔ کہنے لگا تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔ کہنے لگے تمہیں کیا خبر اردو کی؟ انہوں نے کہا ویل صاحب بہادر! اچھا میں تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں؟ کہ ''صاحب بہادر سے جب میں نے یہ پوچھا تو بغلیں جھانکتے رہ گئے'' صاحب نے کہا ادھر کو جھانک لیا، ادھر کو جھانک لیا۔ یہ بغلیں جھانکنا ہو گیا۔

وہ ہنس پڑے کہ یہ معنی ہیں؟ تو کہنے لگا اور کیا معنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ: آپ تو ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ آپ بتائیں میں کیوں بتاؤں؟ اب وہ صاحب بہادر بیٹھ کر سوچ رہے ہیں کہ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ بغل ادھر کو جھانک لی بغل ادھر کو جھانک لی۔ بغلیں جھانکنے کا لفظ صادق آ گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو

کہنے لگا کہ ویل پیش کار! آپ ہمیں تین دن کا مہلت دیں ہم آپ کو ڈکشنری دیکھ کر بتائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حضور تین دن کے بجائے آپ کو ایک ہفتہ کی مہلت ہے اور ساری ڈکشنری دیکھ کر بتایئے گا۔ تو صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں۔ لغت کی ہر چھوٹی بڑی کتاب دیکھ ماری۔ ان میں کہیں بھی یہ کیفیت اور ہیئت موجود نہ تھی۔ یہ محاروہ تھا۔ جب صاحب بہادر عاجز ہوگیا تین چار دن کے بعد کہا کہ: ویل پیش کار صاحب ہمیں کسی ڈکشنری میں یہ چیز نہیں ملی بغلیں جھانکنا تو لکھا ہے مگر اور کچھ نہیں نکلتا۔

انہوں نے کہا: حضور قیامت تک اور کچھ نکلے گا بھی نہیں۔ پھر اس نے کہا اچھا آپ بتلائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں بتلاتا آپ ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ کہا آپ بتلا دیں، انہوں نے کہا تو بہ کریں آئندہ میں یہ نہیں کہوں گا میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔ یہ صاحب بہادر پر بڑا شاق گذار، مگر جہالت کا اقرار کر چکے تھے تو مجبوراً انہیں کہنا پڑا کہ اچھا اب ہم نہیں کہیں گے۔ تب انہوں نے بتلایا کہ بغلیں جھانکنا لغۃ اس کے معنی یہ ہیں ہے کہ بغل میں ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا مگر عرف میں اسکے معنی یہ ہیں کہ بغلیں جھانکنا یہ تحیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ اس سے کوئی بات بن نہیں پڑی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو یہ حیرت سے کنایہ ہے۔

ہر زبان میں یہ چیز ہوتی ہے کہ ایک لغوی معنی ہوتے ہیں، ایک اصطلاحی اور ایک عرفی معنی ہوتے ہیں۔ فارسی کا محارہ ہے کہ ''فلاں شخص آب در کرد۔ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔

تو ٹوکری میں پانی ڈالنے کا لغوی مطلب تو یہ ہے کہ آدمی ٹوکری نیچے رکھ کر اوپر سے گھڑا انڈیل دے۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص بے نتیجہ اور فعل عبث کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے نتیجہ کچھ نہیں۔ ہزاروں گھڑے ڈال دے گا، پانی بہہ جائے گا۔ غرض جب کوئی آدمی عبث کام کر رہا ہو جو بے نتیجہ ہو تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔ تو جو لوگ فارسی دانوں کے عرف میں نہ رہے ہوں۔ اہل عرف کی صحبت نہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ وہ لغت کی مدد سے ایسے ہی معنی بیان کریں گے کہ اہل عرف ان کے معنی اور حماقت و جہالت پر ہنس پڑیں گے یہی شان قرآن وحدیث کی بھی ہے کہ ان کا بھی ایک عرف ہے قرآن فقط لغت پر نہیں اترا، اس کی کچھ اصطلاحیں ہیں۔ کچھ محاورات ہیں۔ ادا کا کچھ لب ولہجہ ہے وہ اس لب ولہجے اس ماحول اور طرز ادا ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تبھی اس کی مرادیں متعین ہوسکتی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص قرآن دانوں کے عرف کو ہی نہیں جانتا ہو قرآن والوں کے عرف میں نہ رہا ہو وہ کبھی بھی مراد ربانی کو نہیں سمجھ سکتا وہ لغت کی مدد سے مراد خداوندی کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو قرآن کریم کا لغت کی مدد سے حل کرنا کافی نہیں ہے۔ یہ کافی نہیں کہ آپ نے (عربی ادب کی کتاب) مقامات حریری یا اردو ادب کی کتابیں پڑھ لیں۔

مراد قرآنی کی تعیین میں سنت کا مقام...... نیز یہ تو قابلیت کی بات ہے، اور یہ تو تعجب بالائے تعجب ہے کہ

اردو کے ترجمے دیکھ کر آپ مفسر بن گئے، اس سے قرآن حل نہیں ہوتا جب تک مرادات ربانی پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں، اور وہ جب سمجھ میں آئیں گی جب پیغمبر کے اقوال وافعال اس کے ساتھ ملائے جائیں جن سے قرآن کریم کی تفسیر اور تطبیق ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج کے مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا کہ ان سے بحث ومناظرہ کرو اور ان کو حق سمجھاؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ تیار ہوئے۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا دیکھو خوارج کے سامنے مجمع میں قرآن سے کوئی دلیل نہ پیش کرنا بلکہ سنت سے دلیل پیش کرنا۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! قرآن حکیم کا علم تو میرا موضوع ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن فہمی کی دعا دی ہے تو میں عالم قرآن ہوں۔ تو جو میرا مضمون اور موضوع ہے۔ اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں اس سے استدلال نہ کروں اس کی کیا مصلحت ہے۔ فرمایا کہ: قرآن کریم کی آیتیں ذی وجوہ ہیں۔ اصولی جملے ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر عوام کے سامنے ایک آیت پڑھ کر اس کا مطلب بیان کرو گے۔ مخالف اس آیت کے عموم سے فائدہ اٹھا کر اسی کے دوسرے معنی بیان کر دے گا، عوام یوں کہیں گے کہ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ حق وباطل واضح نہیں ہوگا، لیکن جب سنت رسول کی دلیل پکڑو گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور عمل مشخص ہے اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں ہوگی، تو قرآن کریم کے معنی متعین ہو جائیں گے۔ دورنگی نہیں رہے گی دو معنی لینے کی گنجائش نہیں رہے گی اور حق واضح ہو جائے گا عوام سمجھیں گے کہ یہ حق ہے۔

اس لئے جب تک قرآن کے ساتھ سنت کو نہ ملایا جائے قرآن کی مراد مشخص نہیں ہوسکتی معنی متعین نہیں ہوسکتے۔ اس کے بغیر اگر مراد متعین کریں گے تو وہ آپ کی اپنی مراد ہوگی جو آپ قرآن کے سر تھوپ دیں گے تو یہ تلبیس ہوگی یا نفاق ہوگا کہ لفظ قرآن کے لئے معنی اپنا ڈال دیئے۔ حالانکہ دنیا میں کسی کے کلام کا بھی مطلب بیان کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ جب تک وہ صاحب کلام خود نہ کہے کہ یہ میرا مطلب ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ مراد ربانی کی تعیین اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک حق تعالیٰ شانہٗ اپنی طرف سے کسی کو نہ بھیجیں کہ جا کر میری مراد بتلادو۔

اسی واسطے قرآن کریم کی دو شانیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ پر قرآنی آیات کی وحی ہوتی تھی تو ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اس کو رٹنا شروع کر دیتے تھے کہ کہیں بھول نہ جاؤں اور۔ میرے ذہن میں آیت جم جائے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حکم فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ''اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دیں۔ جلدی مت کریں''۔ اس خیال سے کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ یہ لفظ میرے سینے میں جمع ہو جائیں۔ اس لئے فرمایا: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ''ہمارے ذمہ ہے اس کا تمہارے سینہ میں جمع کر دینا اور تمہاری زبان سے اس کا پڑھوا دینا تو حق تعالیٰ نے ذمہ لیا''۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ ''جب ہم (بواسطہ فرشتہ) کلام کرنے لگیں۔ تو اس کا اتباع کرو سنتے رہو''۔ یہ پہلا حکم تھا جو قرآن کے

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جمع کر دینے اور پڑھوا دینے کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے۔ معنی نہ جمع کئے جاتے ہیں نہ پڑھوائے جاتے ہیں۔ اب آگے معنی کی بات رہ جاتی ہے تو معنی کی صورت یہ نہیں تھی۔ یہ آپ نے کسی روایت میں کسی جگہ نہیں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم کی جب آیت اترتی ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر سوچتے ہوں کہ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ ایک یہ۔ یہ معنی ذرا زمانے کے زیادہ مناسب ہیں۔ لاؤ یہ اختیار کرلو۔ اس لئے کہ اگر خدانخواستہ یہ ہوتا تو یہ اپنی اختراع ہوتی متکلم کی مراد نہ ہوتی تو حق تعالیٰ شانہ نے جیسے لفظوں میں پابند کیا، آگے معانی میں بھی پابند کیا۔ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ﴾ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا کہ مطلب کیا ہے مراد کیا ہے''۔

تو بیان کا تعلق لفظوں سے نہیں ہوتا۔ معانی سے ہوتا ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کے بارے میں بھی امین تھے۔ اپنی طرف سے الفاظ اختراع نہیں فرماتے تھے۔ اور معانی کے بارے میں بھی امین تھے۔ جو آپ کے قلب مبارک میں اللہ نے ڈالا وہی معنی آپ نے سمجھا اپنی عقل سے یا سوچ بچار سے معنی متعین نہیں کئے تو نبی کو وحی میں آزاد نہیں کہا گیا کہ جو چاہو تم معنی متعین کر واس معنی کے پابند ہیں جو نازل کیے جائیں، جسے تم لفظوں میں پابند ہو جب اللہ کا رسول امین ہے اور آزاد نہیں کہا گیا ہے۔ کہ الفاظ و معانی میں ایک شوشہ گھٹا بڑھا سکے تو میں اور آپ کیسے آزاد ہو جائیں گے؟ کہ جو ہمارا جی چاہے ہم سمجھے لیں ہم انہی معنی کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے سمجھے اور آپ کو سمجھائے گئے۔ قرآن خود دعوی کرتا ہے کہ تم انہیں معنی کے اندر مقید ہو۔ اب وہ معنی اور بیان رسول کہاں ہے؟ اسی بیان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث کہتے ہیں، اور اسی کو سنت کہتے ہیں۔ کسی چیز کا بیان قول سے کیا کسی چیز کا عمل سے کیا، اور کسی چیز کا تقریر سے کیا کہ عمل دوسرے کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا یہ بیان تقریری کہلاتا ہے، ایک بیان قولی ہے اور ایک بیان فعلی ہے، ان تینوں بیانوں کے مجموعے کا نام سنت ہے۔

تفکر فی القرآن...... اسی واسطے ایک جگہ فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾ ① ''اے پیغمبر! ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا تا کہ تم کھول کھول کر اس کو بیان کر دو۔ اور شاید کہ لوگ اس میں تفکر کریں''۔

تو تفکر کا درجہ بیان کے بعد رکھا کہ بیان دے دو تا کہ مراد واضح ہو۔ اس مراد کے اندر رہ کر لوگ غور و فکر کریں تا کہ حقائق و معارف اور علوم لوگوں پر کھل جائیں۔ اس واسطے کہ علوم و معارف اللہ کی مراد میں چھپے ہوئے ہیں، ہماری اختراع میں علوم اور معارف نہیں ہیں تو پہلے بیان اور مراد سامنے آئے تو اس میں غور کریں گے تو حقائق علمی کھلیں گے۔ اور اگر اللہ کی مراد ہی سامنے نہ ہو تو پھر ہم کس چیز میں غور کریں گے؟ پھر جو غور ہوگا وہ محض ہمارا ذاتی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴.

تخیل ہوگا، اس تخیل کو ہم قرآن کریم کے سر تھوپ دیں گے۔ حالانکہ قرآن اس سے بری ہوگا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''مُبَیِّن'' بن کرتشریف لائے کیوں کہ قرآن کریم کی مرادات بغیر مبین کے سمجھ میں نہیں آتیں۔

جمع حدیث کی تکوینی تدبیر...... اسی واسطے حضرات محدثین نے حدیث کی جمع و تنقیح اور تشریح کی طرف پوری پوری توجہات منعطف کیں اور حق تعالیٰ شانہ نے انہیں محیر العقول حافظے دیئے۔ ان کے حافظوں میں کئی کئی لاکھ حدیثیں جمع ہوتی تھیں۔ عظیم الشان مجالس میں بیٹھ کر حدیث کا املا کیا جاتا تھا اور ایک ایک محدث اٹھتا تھا۔ اس کے سینے میں دو دو تین تین لاکھ احادیث مع متن اور سند کے جمع ہیں حق تعالیٰ کو یہ چیزیں حافظوں میں محفوظ کرانی تھیں تو محیر العقول حافظے دے دیئے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حجاز کا سفر کر رہے تھے۔ جہاز میں بیٹھے تھے اس زمانے میں بادبانی جہاز ہوتے تھے۔ ہوا موافق ہوئی چل پڑے۔ مخالف ہوئی لنگر ڈال دیا تو چھ چھ مہینے میں جا کر جدّہ کے ساحل پر اترتے تھے برس اور دو برس حج کرنے میں لگتے تھے تو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ جہاز پر سوار ہوئے۔ ترمذی اور بہت سے تلامذہ بھی ساتھ سوار ہو گئے۔ جہاز میں مدت کافی لگتی تھی۔ اس لئے یہ ارادہ کیا کہ شیخ سے عرض کریں کہ آپ احادیث کا املا کرائیں ہمارا یہ وقت احادیث کے سننے اور لکھنے میں کٹے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد نے اس کو مان لیا اور کہا کہ کل سے ایک وقت مقرر کر لو تا کہ میں حدیثیں املا کراؤں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ اب انہوں نے سوچا کہ اگر میں مجلس میں بلا کاغذ اور قلم دوات کے گیا تو مجھے اٹھا دیا جائے گا، یہ باب حدیث اور باب املا کے خلاف ہے۔ اس لئے سب سے پیچھے بیٹھ گئے اور اپنا ایک گھٹنا کھڑا کر کے اپنا ہاتھ سامنے رکھتے اور دوسرے ہاتھ کو حرکت دیتے رہتے تا کہ شیخ یوں سمجھیں کہ لکھ رہے ہیں اور مجلس سے نہ اٹھائے جائیں۔ تیس چالیس روز اسی طرح گزر گئے اور ہر دن میں دس دس، بیس بیس حدیثیں روایت ہوتی تھیں۔ ایک روز شیخ نے گردن اٹھائی دیکھا کہ نہ کاغذ نہ قلم۔ فرمایا یہ کیا حرکت ہے؟ کاغذ ہے؟ عرض کیا نہیں ہے۔ فرمایا قلم ہے؟ عرض کیا نہیں۔ پھر یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا میں اس لئے ایسا کرتا تھا کہ آپ یہ سمجھیں گے کہ اس کے پاس کاغذ قلم نہیں ہے۔ اس لئے مجلس سے اٹھا دیں گے تو میں اپنے کو بصورت کاتب نمایاں کرتا تھا کہ میں بھی لکھ رہا ہوں۔

شیخ کو غصہ آیا فرمایا تم نے میری محنت اکارت کر دی۔ تم درس میں مت بیٹھو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! محنت اکارت نہیں ہوئی۔ مجھے الحمد للہ وہ ساری روایتیں حفظ یاد ہیں۔ اب ان کو ترتیب وار پڑھنا شروع کیا کہ پہلی تاریخ میں آپ نے یہ حدیثیں مع اس سند کے بیان کیں۔ دوسری تاریخ میں یہ بیان کیں۔ اور یہ ان کی سند ہے۔ تیسرے دن آپ نے یہ حدیثیں بیان کیں اور ان کی سند یہ ہے اتنے روز یں جتنی روایتیں املا کرائی تھیں، وہ ساری امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سنا دیں۔ تو شیخ نے ان کہ حافظے پر اعتماد فرمایا اور اجازت دے دی کے تم

میرے درس میں بیٹھ سکتے ہو۔تو یہ محیر العقول حافظہ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے نے جو خود بھی محدث تھے بغداد کا سفر کیا تو بغداد کی جامع مسجد میں جب معلوم ہوا کہ امام ابو داؤد کے بیٹے آئے ہیں اور وہ خود بھی محدث ہیں، سارے عوام جھک پڑے۔لاکھوں آدمی جمع ہو گئے کہ کچھ حدیثیں تبرکاً سنی جائیں۔

بعض علماء نے عرض کیا کہ آپ الحمد اللہ یہاں تشریف لائے ہیں۔اللہ نے آپ کو محدث بنایا ہے۔کچھ حدیثیں آپ سنا دیں اور املا کرا دیں۔فرمایا کہ:''میں بیاض ساتھ نہیں لایا جس میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں''۔

اس کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ ایک محدث یوں کہے کہ میں اپنی یادداشت ساتھ نہیں لایا۔وہ محدث کیا ہوا جس کا حافظہ اتنا کمزور ہو۔

تو بعض نے کچھ لعن کا لفظ کہا جو ابن ابی داؤد کے کان میں پڑ گیا، اس میں غیرت جو آئی تو فوراً منبر پر بیٹھ گئے اور ابو داؤد کی حدیثیں سنانا شروع کیں تو ایک دو تین دن میں پوری ابو داؤد مع سند اور اور متن کے اپنی یادداشت سے سنا دی ایک دو مقام کے سوا کہیں فروگزاشت نہیں ہوئی۔پھر لوگوں نے مان لیا کہ واقعی یہ محدث ہیں۔بہر حال حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جمع کرنا تھا تو محیر العقول حافظے پیدا کر دیئے۔

دور جدید میں روایت حدیث کا طریق......جب ساری حدیثیں سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہو گئیں۔اسی نسبت سے حافظے کم ہونا شروع ہو گئے اس لئے کہ حاجت باقی نہیں رہی آج ہم اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نوٹ بک جیب میں نہ رکھیں تو صبح کی بات شام کو نہیں یاد رہ سکتی۔کاغذ دیکھ دیکھ کر اپنے افعال کو انجام دیتے ہیں۔

میرا جو یہاں آ کر حشر ہوا۔وہ یہ کہ جلسوں کی کچھ تاریخیں متعین ہوئیں۔یہاں دعوت چائے کی۔یہاں کھانے کی۔یہاں تقریر یہاں مذاکرہ۔وہ پندرہ دن کا پروگرام لکھا گیا۔اب وہ نامہ اعمال میری جیب میں پڑا ہوا ہے اور بحمد اللہ ہے دائیں جانب۔بائیں جانب نہیں ہے۔روز صبح کی نماز پڑھ کر میں دیکھتا ہوں کہ آج کہاں تقریر ہے۔آج کہاں جانا ہے۔تو حافظوں کی یہ حالت ہے کہ پندرہ دن تو پندرہ دن صبح کی بات شام کو یاد نہیں رہتی۔آج اگر کوئی یوں کہنے لگے میں امام بخاری ہوں، امام مسلم ہوں یا امام ابو داؤد ہوں۔تو یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔جن لوگوں کے حافظوں میں اللہ کو حدیث کو جمع کرانا تھا انہیں ایسے حافظے دے دیئے۔جب کتابوں میں روایت آ گئی اب محدث کے معنی فقط یہ ہیں کہ روایت کا حوالہ دے دے کہ یہ روایت بخاری میں ہے، یہ مسلم میں ہے، یہ ترمذی میں ہیں۔اول سے لے کر آخیر تک پوری سند پڑھنا اور رجال کی تنقیح کی حاجت باقی نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ کام سب محدثین کر چکے ہیں۔پکی پکائی ہمارے سامنے آ گئی ہے۔یہ نہایت ناقدری ہوگی کہ ہم دعویٰ کریں کہ ہم بھی بخاری ہو گئے۔صبح کی بات تو شام کو یاد نہیں رہتی اور بخاری بننے کا دعویٰ ہے۔

یہ قدرتی چیز ہے کہ جب کسی قوت سے کام لینے کی ضرورت باقی نہ رہے اسی نسبت سے وہ قوت گھٹنی شروع

ہو جاتی ہے تو حافظہ گھٹتے گھٹتے اس نوبت پہ آ گیا۔

اجتہادی قوت کا فقدان......اور میں کہتا ہوں کہ: یہ یہی صورت درایت اور تفقہ کے اندر بھی ہے، اجتہاد جس کو کہتے ہیں۔ جب قرآن اور حدیث کتابوں کے اندر جمع ہو گیا اور حافظوں سے نکل کر سفینوں میں آ گیا۔ تو مسائل نکالنے کی طاقت جس کو اجتہادی قوت کہتے ہیں، اللہ نے آئمہ کے اندر اعجازی طور پر پیدا کی کہ ایک رات میں ایک آیت سے ایک ایک سو مسئلے نکالے ہیں اور فقہ کو مرتب کر دیا۔ وہ استنباطی و اجتہادی مسائل جب سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہو گئے، اور کتابوں میں آ گئے۔ تو اسی نسبت سے اجتہاد گھٹنا شروع ہوا۔ گھٹتے گھٹتے اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک شخص عالم بنتا ہے مگر بعض دفعہ الٹا سمجھ جاتا ہے، کہتے کچھ ہیں، سمجھتا کچھ ہے تو فہم بھی ہمارے خراب اور ختم ہو گئے الٹی بات سمجھتے ہیں۔ ایک روایت یہاں سے نقل ہوئی ہے چلتے چلتے چند زبانوں کے بعد وہاں پہنچ کر کچھ کا کچھ بن جاتا ہے اور پروپیگنڈہ بن جاتا ہے۔ اصلیت کا پتہ نہیں ہوتا۔ تو اسی نسبت سے اجتہادی قوت بھی ختم ہو گئی۔ اس لئے آج اگر کوئی ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ مضحکہ خیز دعویٰ ہو گا۔ اس لئے کہ اس قوت کے باقی رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ کام اپنا پورا کر گئی۔ تو حافظے بھی ختم ہو گئے۔ اجتہادی قوتیں بھی اس نسبت سے ختم ہو گئیں۔ اس لئے جس طرح روایت میں ہمارا بڑا درجہ یہ ہے کہ ہم کتاب کا حوالہ دے دیں۔ استنباطی مسائل میں بڑا فقیہ وہ ہے جو کتاب کا حوالہ دے دے کہ یہ فلاں کتاب میں ہے۔

بہر حال جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے مبین بنا کر بھیجا۔ تا کہ آپ اللہ کی آیتوں کو بیان کریں کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اس کی مراد یہ ہے جیسا کہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو آپ نے سمجھا دیا۔ ورنہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ تو روئی کے ڈورے لے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کی مراد کا بیان کیا کہ روئی کا دھاگہ مراد نہیں ہے، بلکہ صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ تو اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر کے آیت کی مراد کو کھول دیا۔ اگر پیغمبر کی ذات نہ آتی۔ فقط قرآن کریم سامنے آتا تو یہ مرادات نہ کھل سکتیں ہم اپنے ذہن سے سمجھتے جو بھی ہمارے ذہن میں آتا۔

تزکیۂ قلب...... پھر اگر ذہن تربیت یافتہ نہ ہو۔ مزکی نہ ہو۔ صاف نہ ہو۔ اخلاقی قوتیں اس میں نہ ہوں۔ ایسے میں اگر وہ غور کرے تو اوندھا ہی سمجھے گا اور اپنے مذاق کے مطابق سمجھے گا۔ اس لئے جہاں اس کی ضرورت تھی کہ شخصیت آ کر مرادیں سمجھائے وہاں اسکی بھی ضرورت تھی کہ مخلوق کا ذہن بھی بنائے۔ ذہنیت بھی درست کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں مراد کو بیان کیا۔ وہاں لوگوں کے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ان کا ذہن بھی بنایا۔

اگر کوئی شخص مشرکانہ ذہنیت لے کر قرآن کو دیکھے تو یوں معلوم ہو گا کہ ہر آیت سے شرک ہی نکل رہا ہے، اگر نصرانی ذہنیت سے سوچے تو یوں معلوم ہو گا کہ ہر آیت میں عیسائیت بھری پڑی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم تو ایک مردِ سخی کی مانند ہے۔ دوست اس سے کما لے دشمن کما لے۔ وہ تو ذی وجوہ اصولی اور کلی جملے ہیں۔ ہیر پھیر کر آدمی اپنا

مطلب نکال سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہودیانہ ذہنیت سے دیکھے تو یوں معلوم ہوگا کہ قرآن میں یہودیت بھری پڑی ہے، لیکن اگر کوئی موحدانہ ذہنیت لے رجائے گا تو آیت آیت سے توحید نکلے گی اس لئے جہاں مراد سمجھانے کی ضرورت تھی وہاں ذہن کو بنانے کی بھی ضرورت تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ریاضت اور مجاہدات بھی اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کرائے، "تَوَجُّهٌ اِلَى اللهِ" کی مشق بھی کرائی "اِنَابَتْ اِلَى اللهِ رُجُوْعٌ اِلَى اللهِ" اور تعلق مع اللہ کے مجاہدے بھی کرائے، تاکہ اللہ سے رابطہ صحیح ہو۔ ذہن میں استقامت پیدا ہوجائے۔ ذہن سے زیغ اور کمی نکل جائے، جب ذہن میں استقامت آئے گی تو جو آیت پڑھی جائے یا معنی بیان کیے جائیں گے وہ آدمی صحیح سمجھے گا، غلط سمجھنے کی صورت باقی نہیں رہے گی تو ذہن میں استقامت پیدا کرنا یہ ایک مستقل موضوع اور مقصد نبی کے آنے کا ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فریضے بیان کئے گئے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ① اللہ کی ذات وہ ہے جس نے امیوں میں رسول بھیجا۔ کیسا رسول؟ خود بھی امی ہے لکھنے پڑھنے کی خبر نہیں مگر علوم وہ بیان کئے جن سے لوگوں کو عاجز کر دیا۔

یتیمے کہ نا کردہ قرآن درست   کتب خانہ چند ملت شست

بہر حال رسول بھیجا اس کا کیا کام ہے۔ اس کے کیا فرائض ہیں؟ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، یعنی اللہ نے جو الفاظ اتارے ہیں۔ وہ امانت اور دیانت کے ساتھ پورے الفاظ پہنچا دیتے ہیں۔ نیز تعلیم بھی دیتا ہے، تعلیم بیان مطالب کو کہتے ہیں یعنی ان کے معانی بھی سمجھاتے ہیں یہ نہیں کہ فقط الفاظ لوگوں کے سامنے رکھ دے اور یوں کہہ دیں کہ جو تمہارا جی چاہے اس کے معنی سمجھ لیں۔ اس لئے کہ تعلیم کہتے ہی اسے ہیں کہ الفاظ کے اندرونی حقائق اور معانی کو سامنے رکھا جائے۔ تو کتاب کی تعلیم معانی و مطلب کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور آگے فرمایا: حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، حکمت کی دو قسمیں ہیں، حکمت نظری اور حکمت عملی، حکمت نظری تو علمی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ تعلیم میں آگئی۔ اس لئے متعین ہوگیا کہ حکمت سے مراد حکمت عملی ہے، یعنی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ معانی بھی سمجھاتے ہیں۔ پھر کر کے دکھلاتے بھی ہیں تاکہ نمونہ عمل بھی سامنے آجائے۔ جس کے معنی اسوہ حسنہ کے ہیں تو عمل کی ہیئت بھی سامنے پیش کر دیتے ہیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے آیت کے معنی متعین ہوجائیں۔

آدمی میں یہ سب چیزیں ہوں مگر اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کی ضرورت تھی ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ہے ان کے دلوں کو مانجھتے تھے ان میں سے زیغ اور کجی بھی نکالتے تھے، کسی کی یہودیانہ ذہنیت تھی تو یہود سے مسلم بنا، کسی کی نصرانی ذہنیت تھی تو نصرانیت سے مسلم بنا، کسی کی مشرکانہ ذہنیت تھی تو شرک سے اسلام کی طرف آیا۔ غرض وہ پچھلے

---

① پارہ: ۲۸، سورة الجمعة، الآية: ۲.

اثرات زائل کر کے قلب کو پاک کر دیا۔ اس کے لئے ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے، تو آپ جہاں حلال وحرام کا بیان کرتے تھے وہاں پاک صاف قلوب کی دیکھ بھال بھی فرماتے تھے۔

عمل کی نگرانی......راتوں کو اٹھ کر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی فرماتے تھے کہ عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر رہے ہیں تو کیسا عمل کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے تو دیکھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں، مگر اتنی آہستہ کہ کان لگا کر سنو تو آواز آتی ہے، ورنہ آواز نہیں آتی۔ آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکان کی طرف بڑھے تو اس زور سے پر قرآن پڑھ رہے تھے کہ محلہ گونج رہا تھا۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں دونوں حضرات جمع ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے۔ تو عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس کو سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے، یعنی اللہ کو سنا رہا تھا۔

تو مجھے زیادہ چلانے کی ضرورت کیا تھی۔ پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنے زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ تو عرض کیا کہ: ''اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ الشَّیْطٰنَ'' سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، اس لئے زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ ان کی شان ہی ''اَشَدُّھُمْ فِیْٓ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ'' ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو اونچا کر دو۔ اور اے فاروق! تم ذرا آواز کو نیچا کر دو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔

یہ کوئی حلال وحرام یا جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا، یہ عمل کی نگرانی تھی، طرز عمل سکھلانا تھا۔ تا کہ استقامت اور اعتدال پیدا ہو جائے۔

قلوب کا علاج......حدیث میں ہے کہ: بعض لوگوں نے آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں، فرمایا: کیا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا: سوالات کا ایک سلسلہ ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کس نے بنائی؟ دل سے جواب نکلتا ہے اللہ نے بنائی۔ آسمان کس نے بنایا؟ دل سے جواب نکلتا ہے کہ اللہ نے۔ چاند سورج کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ نے ان سوالوں کے بعد ذہن میں ایک کلیہ جمع ہوتا ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے۔ ہر موجود کے لئے کسی موجد کی ضرورت ہے تو سوال ہمارے دل میں آتا ہے کہ اللہ میاں بھی تو موجود ہیں تو ان کے بنانے والا اور پیدا کرنے والا کون ہے؟

جب یہ سوال آ گیا تو ہمارا ایمان کہاں باقی رہا؟ جب اللہ کی نسبت یہ خیال آئے کہ اس کا بنانے والا کون ہے؟ تو ایمان کہاں باقی رہا؟ اور جب ایمان نہ رہا تو عمل میں تو ایمان سے طاقت آتی ہے تو ترقی عمل رک گئی، عمل معطل ہو گیا۔ وسوسہ کا اثر یہی پڑتا ہے کہ آدمی عمل سے معطل ہو جاتا ہے گویا عملی زندگی اور عملی ترقی رک گئی۔ سبحان اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وسوسہ کو دفع فرمایا اور کس حکیمانہ طریق سے اس وسوسہ اور شبہ کو زائل فرمایا۔

فرمایا: یہ جو تمہیں شبہات ہوتے ہیں سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں تم انہیں برا سمجھتے ہو یا اچھا؟ عرض کیا یا رسول اللہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے لیکن یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا: ''ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ'' فرمایا: یہی تو ایمان کی علامت ہے۔ یہ ایمان ہی تو ہے جو اس وسوسے کو برا بتلا رہا ہے۔ اگر اندر ایمان نہ ہوتو آدمی وسوسے کو برا نہ سمجھے اور ڈرے کیوں؟ یہ ایمان ہی ڈر پیدا کر رہا ہے۔

جیسے آنکھ کھل جاتی ہے، بیدار ہو گئے سمجھ یوں رہے تھے کہ ایمان باقی نہیں رہا واضح ہوا کہ ایمان تو موجود ہے وہ جو عمل کی ترقی رک گئی تھی۔ وہ پھر جاری ہو گئی۔

اب یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا نہ حلال وحرام کا مسئلہ تھا، یہ قلب کی تربیت کا مسئلہ تھا دل کی کلیں درست کرنی تھیں۔ دل کا رخ صحیح کرنا تھا کہ ادھر کو چلو ادھر کو نہ چلو۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جا رہے تھے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا اے حنظلہ کیا حال ہے؟ عرض کیا کہ ''نَافَقَ حَنْظَلَۃُ'' حنظلہ تو منافق ہو چکا ہے۔ اس میں ایمان باقی نہیں ہے، فرمایا: وَمَا ذَاکَ؟ یہ کیا بات کہی؟ فرمایا بات یہ ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں تو جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور جب گھر آتے ہیں اور بال بچوں میں لگتے ہیں تو وہ چیز باقی نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ ہم میں منہ دیکھے کا ایمان ہے، حقیقی ایمان نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاتے ہیں ایمان آجاتا ہے گھر آتے ہیں ایمان نکل جاتا ہے، یہی معنی نفاق کے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بات تو میرے اندر بھی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتا ہوں تو عرش و کرسی کا گویا مشاہدہ کرتا ہوں اور گھر میں یہ کیفیت نہیں ہوتی، یہ تو میرا بھی حال ہے اور جب یہ حال تیرا بھی اور میرا بھی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی دل کا روگ ہے۔ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس کا علاج کرائیں تو دونوں کے دونوں حاضر ہوئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا واقعہ سنایا کہ حنظلہ ملے۔ میں نے ان سے حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھ میں تو نفاق آ گیا۔ پھر میں نے کہا کہ یہ حال تو میرا بھی ہے۔ یا رسول اللہ ہم میں تو نفاق ہے ایمان کہاں ہے ہمارے اندر؟ یہ تو منہ دیکھے کا ایمان ہے۔ فرمایا: ''یَا حَنْظَلَۃُ! سَاعَۃً وَسَاعَۃً!'' فرمایا: اے حنظلہ! گھبرانے کی بات نہیں سَاعَۃً وَسَاعَۃً! یہی ہوتا ہے کہ کبھی حضور کی کیفیت، کبھی غیب کی کیفیت، کبھی غیبوبت کبھی حضور۔

اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے سمجھایا۔ فرمایا: دیکھو سمندر ہے، سمندر میں بعض دفعہ تو مد و جزر ہوتا ہے۔ طوفانوں کا زمانہ ہوتا ہے موجیں اٹھتی ہیں، جیسے مئی جون اور جولائی کے مہینے ہیں، پھر اکتوبر، نومبر، دسمبر میں آکر سمندر ساکن بن جاتا ہے۔ جب موجیں اٹھتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سمندر دوگنا تگنا ہو گیا، بلکہ چوگنا ہو گیا گویا اس کا پانی بہت بڑھ گیا۔ اور جب ساکن ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پانی گھٹ گیا، تو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ موجوں میں پانی بڑھتا ہے نہ سکون میں گھٹتا ہے، جب پانی میں جوش ہوتا ہے تو تموج کی وجہ سے نظریوں آتا ہے کہ پانی چوگنا بن گیا۔ سکون کے وقت وہ بات نہیں رہتی۔ فرمایا۔

''اسی طرح سے جب تم میری مجلس میں آتے ہو تو ایمان کے سمندر میں جوش پیدا ہوتا ہے وہ چوگنا نظر آتا ہے، جب گھروں میں جاتے ہو تو سکون پیدا ہوتا ہے ایمان کے اندر کمی نہیں آتی۔ رہتا اتنے کا اتنا ہی ہے، جیسے سمندر میں سکون کے وقت کمی نہیں، جوش کے وقت زیادتی نہیں''۔

جو وسوسہ گزر رہا تھا وہ قلب سے نکل گیا اور جو عمل کی ترقی رک گئی تھی وہ پھر جاری ہوگئی۔ یہ قلوب کا علاج کرنا ہے۔ یہ حلال وحرام کا بیان نہیں۔ یہ تربیت وتزکیہ نفوس ہے دلوں کا رخ درست کرنا ہے، تو تعلیم مدارس کا کام ہے، تربیت شیخ کا کام ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے سب سے بڑے استاد بھی ہیں اور سب سے بڑے شیخ بھی ہیں ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کی تصحیح فرماتے ہیں اور ایک طرف دلوں کو مانجھتے ہیں اور دلوں میں نورانیت پیدا فرماتے ہیں۔

قلبی نورانیت کے آثار...... اس نورانیت اور قلب کے رخ صحیح ہونے کا اثر یہ ہے کہ جب دل کی راہ صحیح پڑ گئی، جو آیت سامنے آئے گی اللہ کی صحیح مراد سمجھے گا کجی باقی نہیں رہے گی، صحیح مطلب سمجھے گا اور جس کے قلب کی تربیت صحیح نہ ہوا سے آیتوں میں شبہ ہوگا، روایتوں میں شبہ ہوگا، اس لئے کہ دل میں کجی ہے، وہ کجی حدیث یا قرآن کی نہیں وہ اس کے قلب کی ہے اسے وہ حدیث وقرآن میں نظر آتی ہے، حالانکہ حدیث وقرآن اس سے بری ہے اس نے اپنے قلب کو کسی سے صحیح کرایا نہیں۔

بلاتربیتِ قلب قرآن فہمی...... ایک ناتربیت یافتہ نفس جس میں حرص وہوا، کبر وحسد اور انانیت ہے ان اخلاق کے ساتھ جب قرآن میں غور کرے گا تو اوندھے سیدھے مطلب لے گا، اس لئے کہ قلب اوراستہ صحیح نہیں وہ نفس کی طرف متوجہ ہے خدا کی طرف متوجہ ہی نہیں۔

اسی واسطے اس حدیث میں فرمایا گیا ہے جس میں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی گئی ہے۔

''یُوْشِکُ رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَقُوْلُ'' عنقریب ایک وقت آئے گا کہ ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی تکیہ لگائے ہوئے مسند پر بیٹھا ہوا ہوگا اور کہے گا۔ ''حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ'' کتاب اللہ کافی ہے۔ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ جو اس میں حلال ہے اس کو حلال سمجھیں گے جو اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھیں گے۔ تو جہاں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی ہے وہاں یہ خبر بھی دی کہ اس فتنہ کا منشاء کیا ہوگا؟ تو فرمایا۔

''رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ''. پیٹ بھرا ہوا آدمی۔ پیٹ بھر کر کھانے والا وہی ہوتا ہے جس کے نفس کے اندر حرص آورزو زیادہ ہوتی ہے۔ صاحب تقوی اور متقی کی کام یہ ہے کہ بقدر ضرورت کائے۔ لیکن اناپ شناپ کھائے اور ناک تک پیٹ بھر جائے یہ حریص ہونے اور ہوسنا کی کی علامت ہوتی ہے، اور حریص وہ ہوتا ہے جو

بندہ نفس ہوتا ہے جب بندہ خدا بنتا ہے تو کجی باقی نہیں رہتی اور بندہ نفس ہے تو نفس کی طرف رخ رہے گا۔ تو منہ نفس کی طرف کئے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی آیتوں میں غور کر رہا ہے تو برعکس مطلب سمجھے گا۔ صحیح مطلب اس کو نہیں سمجھ میں آئے گا۔ اس لئے دو لفظ فرمائے "شَبْعَانٌ" اور "عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ" شبعان سے حریص ہونے کی طرف اشارہ ہے اور "عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ" اس سے کبر اور نخوت کی طرف اشارہ ہے۔ تو وہ لوگ جن کو اپنے علم پر گھمنڈ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور باقی سب جاہل ہیں تو پہلا نزغہ تو یہ ہے کہ ان میں کبر و نخوت ہے اور حریصانہ شان ہے۔ اس شان کو لے کر قرآن کو سمجھیں گے تو اپنی شان کے مطابق ہی وہ مطلب بھی سمجھیں گے اور خیال یہ کرلیں گے کہ یہ اللہ کا مطلب اور مراد ہے۔ اس لئے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا کہ لفظوں کی بھی تلاوت کرے، معنی بھی سمجھائیں عمل بھی کر کے دکھلائیں نفوس کو مانجھیں اور تزکیہ بھی کریں۔

اللہ کے رسول کے دنیا سے اٹھنے کے بعد یہ چاروں چیزیں موجود رہنی چاہئیں تب تو دین کامل موجود ہے اور اگر ان میں سے ایک بھی گھٹ جائے تو کہا جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناقص دین چھوڑ گئے ہیں کامل اسلام باقی نہیں ہے۔

خدمتِ کلامُ اللہ...... الحمد للہ! آج تلاوت آیات بھی موجود ہے، لاکھوں حفاظ امت کے اندر موجود ہیں، جن کو قرآن کے الفاظ ازبریاد ہیں۔ دنیا میں کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کی وہ خدمت نہیں کی جو مسلمانوں نے کی ہے ایک چھ برس کا بچہ کھڑا ہوتا ہے، اور الحمد سے لے کر والناس تک فرفر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ رمضان شریف میں آپ دیکھیں مساجد میں ایک رونق ہوتی ہے جگہ جگہ تراویح ہوتی ہیں۔ امام پڑھ رہا ہے اگر اس نے کہیں غلطی کی تو مقتدی پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اس کو لقمہ دے کر صحیح نہ کرادیں اس کو آگے نہیں چلنے دیتے تو سننے والے بھی حفاظ ہوتے ہیں، پڑھنے والے بھی تواتر طبقہ کے ساتھ قرآن کی روایت موجود ہیں، تو الفاظ کے محافظ درحقیقت حفاظ ہیں۔

قرآن کے معانی کی حفاظت کرنے والے علماء ربانی ہیں۔ عمل کر کے دکھلانے والے حضرات صوفیائے محققین ہیں جو کمال تقویٰ و دیانت سے عمل کی ہیئتیں بتلاتے ہیں، اور عمل کر کے دکھلاتے ہیں اور دلوں کو مانجھنے والے وہ حضرات ہیں جو خانقاہوں میں بیٹھ کر قلوب کی تربیت کرتے ہیں تو تلاوت، تعلیم، تزکیہ اور اسوہ کے تمام افعال جاری ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز باقی نہ رہے تو کہا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے چار ستونوں میں سے ایک گر گیا۔ تو اسلام کی عمارت کیسے باقی رہتی؟

آج بحمد اللہ چاروں طبقے موجود ہیں اور یہ چاروں حق تعالیٰ شانہٗ کے خلفاء ہیں۔ اللہ کے ایک علمی خلیفہ ہیں جو اس کے الفاظ کو محفوظ کئے ہوئے ہیں ایک علمی خلیفہ وہ ہیں جو اس کے معانی کو محفوظ کئے ہوئے ہیں، ایک عملی خلفاء ہیں کہ آیتوں میں جو کیفیات چھپی ہوئی ہیں اور قلب پر پڑتی ہیں۔ ان کیفیات کو ریاضات اور مجاہدات سے محفوظ کئے ہوئے ہیں، یہ مٹنے والی چیز نہیں۔ انکار کرنے والے انکار کریں، پہلے بھی منکر پیدا ہوئے ہیں۔

خدمتِ حدیث......فرق اتنا ہے کہ پہلے منکر اقرار کی صورت سے انکار کرتے تھے یعنی وضاعین حدیث کا زمانہ، یعنی حدیثیں گھڑ گھڑ کر صحیح احادیث سے ملاتے تھے تاکہ صحیح احادیث کا اعتماد اٹھ جائے۔ لوگ احادیث کو نا قابل اعتبار سمجھیں۔ تو انہیں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حدیث کا انکار کریں، اقرار کر کے پھر سازش کر کے حدیثیں گھڑ کر رلا ملا دیتے تھے، لیکن اللہ جزائے خیر دے حضرات محدثین کو کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا، مستقل کتابیں لکھ دیں کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں یہ حدیثیں موضوع ہیں، احادیث کی اقسام بیان کیں، حجیت کے مراتب بیان کئے۔

ہر حدیث ایک ہی درجے کی نہیں ہوتی۔ اگر حدیث متواتر ہے اس کی سند کا ثبوت ایسا ہے۔ جیسے قرآن کا اس حدیث سے جو چیز ثابت ہوگی وہ قطعی ہوگی، اور موجب یقین ہوگی۔ اگر حدیث اس سے کم درجہ کی ہو تو اسے خبر واحد کہتے ہیں۔ وہ موجب ظن ہوگی۔ موجب یقین نہیں ہوگی۔ اگر حدیث ظنی ہے اور اس میں کچھ اور کمزوری پیدا ہوگئی وہ معضل ہوگی۔ تائید کے درجے میں استعمال کی جا سکے گی، کسی حکم کی بنا نہیں بنائی جا سکے گی۔ غرض حدیث کی اقسام بیان کیں کہ متن کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں اور سند کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں، رجال سند کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں، اگر اول سے یعنی صحابی رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوئی راوی حذف ہو جائے تو اسے مرسل کہیں گے۔ شروع میں اگر راوی نہ رہے تو اسے معضل کہیں گے بیچ میں راوی نہ رہے تو اسے مشکل کہیں گے، معضل و مرسل اور مشکل کے احکام بیان کئے جو حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ سارے راوی اس کے ثقہ ہوں، وہ مرفوع متصل کہلائے گی۔ اور جس میں انقطاع پیدا ہو جائے اس کا یہ حکم ہے تو اس کو مستقل فن بنایا، دنیا میں روایت کا فن موجود نہیں تھا، مسلمانوں نے یہ فن بنایا اور حدیث کے فن کے لحاظ سے اس کو بنایا، حدیث کی تاریخ اور رجال حدیث کی تاریخ مرتب کر دی۔

روایت کرنے والے آدمی چار لاکھ کے قریب ہیں۔ تو چار لاکھ آدمیوں کی سوانح عمریاں جمع کر دیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ کس کیریکٹر کے آدمی تھے، کس کردار کے آدمی تھے۔

روایت حدیث میں احتیاط......پھر روایت میں یہ احتیاط کہ اگر عمر بھر میں ایک دفعہ جھوٹ ثابت ہو جائے تو اس کی عمر بھر کی روایتیں کالعدم کر دیتے تھے، کہ یہ روایتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور جھوٹ بولنا تو بجائے خود رہا۔ اگر صورت کذب اور واہمہ کذب بھی پیدا ہو جائے تب بھی اس کی روایت چھوڑ دیتے تھے۔

ایک محدث ہیں ان کا واقعہ تراجم میں موجود ہے کہ انہیں معلوم ہوا کہ اس حدیث کی سند عالی شام میں موجود ایک محدث کے پاس ہے، تو ایک حدیث کی سند لینے کے لئے مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) سے تین سو میل کا سفر شام کے لئے کیا۔ اس زمانے کے سفر پیدل چلنا، اونٹوں پر چلنا وغیرہ مہینوں میں جا کر پہنچتے تھے۔ صرف ایک حدیث سننے کے لئے تین سو میل سفر کی صعوبت اختیار کی، جا کر ان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ محدث فلاں محلے میں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر گئے آواز دی وہ باہر آئے۔ سلام و مصافحہ کیا۔ انہوں نے نہایت اخلاق

سے ٹھہرایا۔ ان کی مجلس ہوئی تو ان کا ایک بچہ اس مجلس میں آ گیا۔ بچے میں ضد ہوتی ہے وہ کسی چیز پر ضد کرنے لگا۔ اس کو ہزار بہلایا پھسلایا مگر وہ ضدی بچہ تھا مانتا نہیں تھا۔ تو ان محدث نے ہاتھ بند کر کے کہا کہ آؤ تمہیں چیز دیں۔ وہ بچہ آیا تو ہاتھ میں تو کچھ تھا نہیں، اسے بہلانا مقصود تھا، اسے لے کر باہر کر دیا۔

یہ جو حدیث سننے گئے تھے یہ لاحول پڑھ کر اٹھ کر چلے آئے اور کہا کہ جو معصوم بچے کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے کہ ہاتھ میں کچھ نہیں تھا اور کہا کہ: آؤ تمہیں چیز دیں۔ اسے اللہ پر جھوٹ بولتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے، وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول دے تو کیا اس کی زبان تھام لی جائے گی تو یہ بالکل مباح تھا۔ لیکن سارا اپنا سفر اکارت کر کے واپس آ گئے کہ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے حدیث سنی جائے، بچے کو بہلانے کے لئے جھوٹ بول دے۔ ہاتھ میں چیز نہ ہو اور کہہ دے کہ آؤ چیز دیں، حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے یہ جھوٹ نہیں تھا بہلانے کے لئے توریہ کی سی صورت ہوتی ہے، ایسے آدمی کو کاذب نہیں کہا جا سکتا مگر حدیث کی سند میں صورتِ کذب اور وہمِ کذب کو بھی کذب سمجھا ہے، اس احتیاط سے روایتیں لی ہیں تب آج دین منقح صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر خدا نخواستہ شیوون منکر پیدا ہو جاتے تو قرآن سمجھانے والا آج کوئی باقی نہ رہتا۔ بس پھر یہی ہوتا کہ اردو کے ترجمے دیکھ دیکھ کر لوگ الگ الگ ہانکتے اور کہتے کہ یہ خدا کی مراد ہے اور وہ علم نہ ہوتا اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چار فریضے دے کر بھیجا گیا تھا۔ وہ چاروں فریضے آج بھی موجود ہیں۔ اور چاروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء موجود ہیں۔ الفاظ کی روایت کرنے والے۔ معانی اور احکام کی روایت کرنے والے، تزکیہ قلوب کے سلسلے میں نیابت کا فرض انجام دینے والے بھی اور عمل کا نمونہ دکھلانے والے بھی۔

آدابِ تعلیم ...... مگر ہاں! ان کی تلاش کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے کہ ایسے لوگ لوگوں کے گھروں پر نہیں جایا کرتے کہ ہم سے سیکھ لو۔ لوگوں کو ان کے گھروں پر جانا پڑتا ہے۔ " اَلْعِلْمُ یُؤْتٰی وَلَا یَاْتِیْ " علم خود نہیں آتا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جایا جاتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ہارون الرشید نے کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ آپ انہیں "موطا" پڑھا دیں۔ (یہ حدیث کی کتاب ہے) آپ نے وعدہ فرمایا کہ پڑھا دوں گا۔ ہارون الرشید نے کہا کہ کس وقت تشریف لایا کریں گے؟ فرمایا تشریف لانے کا کیا مطلب؟

" اَلْعِلْمُ یُؤْتٰی وَلَا یَاْتِیْ " علم خود لوگوں کے دروازوں کے اوپر آیا کرتا ہے؟ ان کو خود آنا پڑے گا، تو ہارون الرشید پر ذرا بھاری گزرا، مگر اس نے کہا کہ بہتر ہے حاضر ہوں گے، مگر ایک شرط ہے کہ عام طالب علموں میں نہ بٹھائیں۔ ان کو ذرا امتیازی جگہ بٹھلائیں۔

فرمایا: طالب علمی کی لائن میں سب برابر ہیں، اگر آپ کو جاہل رکھنا ہے تو میں امتیازی برتاؤ کروں؟ عالم بنانا ہے تو یہ برتاؤ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے تم بنی عباس ہو۔ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے اقارب ہو۔ اگر تم ہی اس کو ذلیل کرو گے تو اسے عزت دینے کے لئے کون آئے گا؟

پھر شہزادے اسی طرح جاتے تھے، اسی طرح مؤدب بیٹھتے تھے اور استاد کی جھڑکیاں بھی سنتے تھے، اس طرح حدیث حاصل کی۔ پھر ہارون الرشید کا بھی یہ عالم ہوا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ مامون سے کہا کہ پانی ڈالو میں پیر دھوتا ہوں۔ تو مامون الرشید شاہزادہ پانی ڈال رہا تھا، امام مالک اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے صاف کر رہے تھے، اچانک ہارون الرشید پہنچ گئے تو دیکھ کر امام مالک سے شکایت کی۔ یہ شکایت نہیں کہ کیوں پیر دھلوائے؟ کیوں پانی ڈلوایا۔ فرمایا مجھے اس کی شکایت ہے کہ آپ اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے مل رہے ہیں، مامون کے ایک ہاتھ میں لوٹا ہوتا، ایک ہاتھ سے آپ کے پیر مل کر دھوتا۔ مامون کا یہ فرض تھا۔ نہ یہ کہ وہ فقط پانی ڈالے پھر اس درجے پر ہارون الرشید آ گیا۔

کمالِ طلب......تو حقیقت یہ ہے کہ: "اَلْعِلْمُ عِزٌّ لَا ذُلَّ فِيْهِ وَلٰكِنْ يُّحْصَلُ بِذُلٍّ لَا عِزَّ فِيْهِ" یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ علم ایک ایسی عزت ہے جس میں ذلت کا نشان نہیں، مگر ایسی ذلت سے حاصل ہوتا ہے جس میں عزت کا نشان نہیں، غلامی محض کرنی پڑتی ہے، اساتذہ کے آگے جھکنا پڑتا ہے اڑی کڑی جھیلنی پڑتی ہے۔ تب جا کر چار حرف آتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا علم آپ کو کیسے حاصل ہوا تو فرمایا: "بِلِسَانٍ سَئُوْلٍ وَّقَلْبٍ عَقُوْلٍ"①

سوال کرنے والی زبان اور عقل مند قلب کے ذریعہ حاصل ہوا، میں نے سوال کرنے میں کبھی عار نہیں کیا۔ اگر مسئلہ معلوم نہیں ہوا اپنے چھوٹے سے سوال کر لیا، چناں چہ ایک دفعہ ایک مسئلہ ذہن میں اٹکا، تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے استاد ہیں۔ ضرورت پڑی کہ ان سے تحقیق کی جائے، تو بارہ بجے دوپہر کو یہ سوال ذہن میں آیا تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دہلیز پر بیٹھ گئے، جہاں جلتا ہوا پتھر ہے، دھوپ پڑ رہی ہے یہ خیال کیا کہ جب ظہر کی نماز کے لئے نکلیں گے تو سوال کروں گا اگر مسجد میں پہنچ گئے تو درس شروع ہو جائے گا، سوال کا موقع نہیں رہے گا تو ساری دوپہر دھوپ میں دہلیز پر بیٹھ کر گزاری۔ جب اچانک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نکلے فرمایا۔

اے ابن عم رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ عرض کیا: حضرت ایک مسئلہ اٹک رہا تھا، اس کی تحقیق کرنی ہے۔ فرمایا پھر آ جاتے۔

عرض کیا: سوال تو دل میں اب ہی کھٹکا تھا، پھر آنے کا کون سا وقت ہے؟ جب سوال ذہن میں آیا تو جبھی حاضر ہو گیا۔

اس سے شدت طلب معلوم ہوئی۔ اور شدت طلب کے ساتھ ساتھ کسر نفس بھی واضح ہوا کہ علم کے حاصل

① فیض القدیر، ج: ۲ ص: ۵۶۹.

کرنے میں نہ کسی وقار کا سوال نہ کسی خودداری کا سوال غلاموں اور خادموں کی طرح جا کر دہلیز کے اوپر بیٹھ گئے اس طرح سے علم حاصل ہوتا ہے۔

عظمت استاذ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، (جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا) کو خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی فقہی مسئلہ میں کسی موقع پر خنزیر کا ذکر آیا تو لوگوں نے کہا کہ: یہ تو بھنگیوں سے معلوم ہوسکتا ہے، وہی خنزیر پالتے ہیں، انہیں کو زیادہ معلوم ہوگا۔

تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں جو بھنگی آتا تھا، ایک دن اس سے پوچھا کہ بھئی! خنزیر کے بارے میں اس بات میں تمہاری کیا تحقیق ہے؟ کیا علم ہے؟ اس نے اصلیت بتلائی کہ یہ صورت ہوتی ہے۔اس دن کے بعد سے جب وہ بھنگی آتا تو اس کی تعظیم۔ میں کھڑے ہو جاتے اور فرماتے۔''اس کے ذریعہ مجھے ایک علم حاصل ہوا ہے''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:'' اَنَا عَبْدُمَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًااِنْ شَآءَ بَاعَ وَاِنْ شَآءَ عَتَقَ''

میں اس کا زرخرید غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھا دیا۔ چاہے مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کر دے۔تو علم تو اس کے ساتھ آتا ہے کہ اتنا نفس پست کر لیا جائے اتنی ذلت و تواضع اختیار کی جائے۔ہم یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے سارا علم سمٹ کر خود بخود ہمارے سینے میں آ جائے یہ عادت اللہ کے خلاف ہے۔

اہل علم کا استغناء...... ایسے لوگ جو علم میں گہری نظر رکھتے ہیں، علمی تحقیقات پر ان کی عمریں بسر ہوئی ہیں، وہ لوگوں کے گھروں کے دروازوں کو جھانکتے نہیں پھرتے، لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے پاس آئیں۔ جو آتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں جو نہیں آتے بے علم رہ جاتے ہیں، مگر امت خالی نہیں ہے اگر امت خالی ہو جائے تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ''

فرمایا کہ: ہر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، اس علم کو اٹھاتے رہیں گے اور اس علم کے ذریعے سے غلو کرنے والوں کی تحریفوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے، مبطلوں کی دروغ بافیوں کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور علم نکھر کر سامنے آتا رہے گا، حق و باطل میں امتیاز ہوتا رہے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لاوارث چھوڑ کر نہیں گئے، آپ ہمارے ہاتھ میں علم و عمل ذوق اور استقامت ذہن کی پوری قوت دے کر گئے ہیں، سارے راستے ہمارے لئے کھول کر گئے ہیں۔

گمراہی سے حفاظت کی ضمانت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ: ''تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا'' دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے ان کو مضبوط پکڑ لیا اور ان کو لپٹ گئے تو کبھی قیامت تک گمراہ نہیں ہو گے۔''كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ'' اللہ کی کتاب اور میری سنت۔میرا طریقہ اور میرا عمل۔ان کو وزنی کہا ہے؟

اس لئے کہ جب طوفان اٹھتے ہیں۔ تنکے کا سہارا پکڑ لینے سے جان نہیں بچتی۔کوئی لکڑی تیر رہی ہے۔ بڑی سے بڑی ہے وہ خود بہہ رہی ہے۔آپ نے اسے پکڑ لیا، بہنے ہی کی طرف جائیں گے۔جان بچنی ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی چٹان پڑی ہو۔جو ہلائے نہ ہلے اگر اسے پکڑ لیں گے تو طوفان آپ کا کچھ نہیں کرسکتا۔تو کتاب وسنت ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں۔ دنیا میں کتنے ہی جہالتوں اور دروغ بافیوں کے طوفان آئیں لیکن اس چٹان سے جو تمسک کر رہا ہے وہ کبھی نہیں بہک سکتا،کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ کتاب اللہ اپنی جگہ اٹل ہے اس کے معانی بھی اٹل ہیں، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اوراس کے معانی اپنی جگہ اٹل ہیں جو اس سے تمسک کرے گا وہ ہر دروغ بافی کا پردہ چاک کرسکتا ہے ہر مبطل کے انتحال اور ہر جاہل کی رکیک تاویلوں کو رد کرسکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے گئے ہیں کہ قیامت تک امت میں خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے۔

تجدید دین...... جہاں یہ خبر دی کہ فرقے پیدا ہوں گے۔گمراہ پیدا ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ حقانی لوگ بھی برابر جاری رہیں گے۔اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا ."لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَلَهُمْ وَلَامَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ" ① فرمایا!میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی جو منصور من اللہ ہوگی۔اللہ کی طرف سے اس کی تائید ہوگی،خلاف کرنے والے اسے ضرر نہیں پہنچا سکتے رسوا کرنے والے اسے رسوا نہیں کرسکیں گے۔یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا." ② اس امت میں ہر سو برس کے بعد مجددین آتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔دودھ اور پانی الگ کر کے نکھار کر علم اور مسائل نکالتے رہیں گے۔صدی کے اخیر میں جو لوگ قلت علم اور کثرت جہل سے کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے، من گھڑت رسوم اور عمل پیدا کردیں گے تو اللہ نے وعدہ کردیا کہ ہر صدی کے آخر میں مجددین آکر دین کو نکھاردیں گے، پھر صدی کے اخیر میں علمی اور عملی فتنے پیدا ہوں گے پھر مجدد آجائیں گے، خواہ جماعتوں کی صورت میں آئیں یا افراد کی صورت میں آئیں،غرض امت گمراہ ہونے والی نہیں ہے۔چناں چہ فرمایا گیا:"لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ" ③ میری امت پوری کی پوری کبھی گمراہی پر قیامت تک جمع نہیں ہوگی۔اہل حق ہمیشہ باقی رہیں گے۔حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"کَیْفَ تُهْلَکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا" حدیث منکر ہے۔السلسلۃ الضعیفۃ ۵/۳۷۱ اول الکتاب ④ "وہ امت کیسے گمراہ ہوسکتی ہے

---

① سنن ابن ماجه،باب اتباع سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم، ج:۱،ص:۱۲ رقم:۱۰.

② السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم،باب مایذکر فی قرن المائة. حدیث صحیح ہے دیکھئے:صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج:۹ ص:۲۹۱. ③ المستدرک للحاکم ج:۱ ص:۲۰۱ رقم:۳۹۵. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے:صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج:۷ ص:۱۷۶. ④ الفتن لنعیم بن حماد،بقاء عیسی ابن مریم علیه السلام بعد نزوله، ج:۲ ص:۵۷۸ رقم:۱۶۱۴. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے:صحیح وضعیف ابن ماجه ج:۱ ص:۸۲ رقم:۸۲.

جس کے ابتدائی سرے پر میں ہوں۔ انتہائی سرے پر مسیح ابن مریم ہوں اور بیچ میں حضرت مہدی ہوں'' تو امت کا اول و آخر کے لحاظ سے بھی بتلایا کہ وہ حق پر قائم رہے گی امت کے درمیانی قرون کا بھی بتلایا کہ ہر قرن میں مجدد آئیں گے، امت کے ہر قرن کے ہر ہر سال کے بارے میں بتلایا کہ: ''یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ'' تدریس وتعلیم کا سلسلہ جاری ہوگا اور خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے، یہ امت کوئی لاوراثی امت نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس کا حلیہ بگاڑ دے، اگر بگاڑنے والے پیدا ہوں گے تو اس بگاڑ کو دکھلانے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ تاویل کرنے والے ہوں گے تو اس رکیک تاویل کو باطل کرنے والے بھی پیدا ہوں گے۔ بہر حال یہ دین ہر دہر اور قرن میں نکھرا ہوا رہے گا۔

فرقہ ناجیہ...... فرق اتنا ہے کہ کبھی اہل حق کی قلت ہوگی، کبھی کثرت ہوگی۔ لفظ ''طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ'' کا بولا ہے، یعنی ایک چھوٹی جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی، چاہے عددی قلت ہو مگر بہر حال موجود رہے گی۔ اسی طرح جہاں یہ خبر دی کہ امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے اور بہتر ناری ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''وَمَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! (صلی اللہ علیہ وسلم)'' وہ فرقہ ناجیہ کون ہے؟ فرمایا: ''مَآاَنَاعَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِيْ'' جس پر میں اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) آج کے دن ہیں اس پر چلنے والا فرقہ حق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین معیار حق ہیں...... اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ: ''مَآاَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِيْ'' جس پر میں اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنے ساتھ شریک کیا۔

اس سے واضح ہوا کہ جو میرا دین ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین ہے۔ جو میرا عقیدہ ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عقیدہ ہے جو میرا عمل ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ فرق اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان اعمال کے ساتھ وہ اعمال بھی ہیں کہ امت ان کی نقل نہیں اتار سکتی جو خصوصیات نبوت میں داخل ہیں۔ صحابہ کے اندر عملوں کے مختلف نمونے ہیں، تاجر ہے تو تجارتی عمل دیانت کے ساتھ اس کے اندر موجود ہے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم زارع اور کاشت کار ہیں تو زراعت کے مسائل دیانت کے ساتھ ان کے اندر موجود ہیں۔ فوجی ہیں تو فوج کے مسائل دیانت کے ساتھ موجود ہے۔ سول میں ملازم ہیں تو اس کے مسائل دیانت کے ساتھ ان میں موجود ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف رنگوں کے ہیں۔ مگر ہر رنگ میں دیانت بھری ہوئی ہے، سرخ اور سبز رنگ ہے، مگر اندر ان کے دین کی روح کام کر رہی ہے۔

امت میں چوں کہ طبقات مختلف ہیں، طبائع مختلف ہیں۔ مزاج مختلف ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اللہ نے اتنے ہی مزاج کے لوگ پیدا کر دیئے تا کہ جس مزاج کا آدمی ہو جیسا مزاج چاہئے ویسے ہی مزاج کا آدمی صحابہ رضی

اللہ عنہم میں مل جائے اس لئے فرمایا کہ ”میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم“ تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہ کا ایک دین ہے، اس لئے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا متبع بن گیا وہ میرا متبع ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا کہ ان کے عمل اور ایمان پر اپنے عمل اور ایمان کو پرکھ لو، یعنی تم صحابہ رضی اللہ عنہم کے افعال پر نقد و تبصرہ نہیں کر سکتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم تمہارے افعال پر نقد و تبصرہ کریں گے کیوں کہ وہ تمہارے کھرے اور کھوٹے پہچاننے کے لئے کسوٹی ہیں۔ تو کسوٹی بتلاتی ہے کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا، سونے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بتلائے کہ یہ کسوٹی کھری ہے یا کھوٹی، تو کسوٹی ناقد ہے منقود نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم ناقد ہیں ہم منقود ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ منقود ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے۔ ناقد غالب ہوتا ہے۔ اگر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم پر نقد و تبصرہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان پر غالب اور افضل ہیں۔ ان کے اعمال کا کھرا اور کھوٹا بتا سکتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہمارے حق میں کسوٹی ہیں۔ وہ بتلائیں گے کہ تمہارا اتنا عمل کھوٹا ہے کیوں کہ وہ ہمارے مطابق نہیں ہے اور اتنا کھرا ہے کہ جو ہمارے مطابق ہے۔ گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا گیا۔

اہل حق کی پہچان...... اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت و محبت اور اطاعت دل میں موجود ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ فرقہ حق پر ہے اور اگر عظمت و محبت اور اطاعت موجود نہیں ہے تو باطل پر ہے یہ ایک کھلا معیار ہے۔ اس لئے جو فرقے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں گالم گلوچ کرتے ہیں وہ کبھی حقانی نہیں کہے جا سکتے۔ انہوں نے پہلی بنیاد ہی ختم کر دی جو ان کے حق میں اس کے قائل ہیں کہ ان کی فلاں بات کھری ہے اور فلاں کھوٹی ہے وہ کبھی بھی دین کو پوری طرح نہیں پا سکتے۔ دین کو وہی پائیں گے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری عظمت کے قائل ہیں۔ چناں چہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ: ”اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ.“ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عدول، متقن اور پارسا ہیں۔

جیسے انبیاء علیہم السلام اپنے اقوال و افعال میں معصوم ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی نیات اور باطن میں محفوظ ہیں، عملی لغزش اگر ان سے ہو جائے تو ہو جائے، مگر ان کے قلوب کا رخ اتنا پاک اور صحیح ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کو پہلے ہی جانچ لیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ ①

صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کا پہلے ہی امتحان کر لیا ہے۔ انہیں اپنے رسول کی صحبت کے لئے منتخب کیا ہے، تو امتحان کر لیا اور یہ امتحان میں پاس ہو گئے، اس لئے ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی ہے تو جس پر حق تعالیٰ اطمینان نہ فرمائیں اسے کیسے اجر دیں؟

اسی طرح اور مقام پر ارشاد ہے: ”رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ“ اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی۔ جن کے دلوں میں کھوٹ ہو۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ رضا بھی ایسی کہ اس کا اعلان کر دیا گیا اور اعلان قرآن

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

حکیم میں کیا گیا تا کہ قیامت تک یہ اعلان جاری رہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں آ سکتا کہ ان کا کھوٹ ثابت ہو۔ قیامت تک ان کی رضا کا پتہ دے دیا۔ غرض قلوب اور باطن کا پتہ یہ کہہ کر دیا کہ ہم نے ان کے قلوب کو جانچ لیا ہے اور اعمال کا پتہ دوسری جگہ دیا۔ فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ①

تم انہیں دیکھو گے کہ رکوع اور سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رضا کو تلاش کر رہے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کی طرف انابت اور رجوع ہے ان کے سجدوں کا اثر ان کی پیشانیوں پر آ گیا ہے تو ایک طرف عمل کو سراہا اور ایک طرف دل کو سراہا۔ ایک طرف ان کا مقام بتلایا تو من حیث الطبقہ جس طبقے کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے، بعد میں افراد آتے رہیں گے، لیکن من حیث الطبقہ پورے طبقے کو سراہا گیا۔ اس کی تقدیس کر دی گئی ہو۔ سوائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دوسرا طبقہ نہیں ہے۔ اس لئے فرما دیا گیا: ''اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ'' میرے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چل پڑو گے۔ ہدایت پا جاؤ گے، راستہ تمہیں مل جائے گا، کسی کا استثناء نہیں کیا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم امین ہوئے۔

وارثت نبوی کا استحقاق...... اور گویا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی روحانی اولاد ہیں پھر ان کی روحانی اولاد تابعین ہیں جنہیں وہ وراثت ملی پھر ان کی روحانی اولاد تبع تابعین ہیں۔ جنہیں وہ وراثت ملی ثم وثم چلتے چلتے وہ فرقہ حقہ وہ اہل حق آج بھی ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے وارث بنے تو ہماری علمی وراثت جب ہی قائم رہ سکتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی کٹ گئی وراثت سے محروم ہو جائیں گے اس لئے کہ وراثت اسے ملتی ہے جس کا نسب محفوظ ہو اور نسب ہی محفوظ نہ ہو تو وراثت کا حق دار کہاں ہے؟ جس نے طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین یا تبع تابعین سے تعلق نہ رکھا تو سوال یہ ہے کہ وہ دین اس تک پہنچا کیسے؟ وہ جو سلسلہ زنجیر کا آ رہا ہے تھا اس کی کڑی ٹوٹ گئی تو دین کیسے پہنچا؟ وحی آنے سے رہی کیوں کہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ عقلی اختراعات کا نام دین نہیں ہے، نقل کا نام دین ہے، اور منقول ہونے کے لئے سلسلہ کی ضرورت ہے، اور سلسلہ میں سے ایک کڑی نکل گئی پھر دین کیسے پہنچا؟ تو لامحالہ الفاظ و معانی، ذوق اور استقامت قلب نیز تزکیہ نفس میں سلسلہ ماننا پڑے گا، ساری چیزیں ہم تک منقول ہو کر پہنچیں گی تب تک دین کا کمال ہم میں پیدا ہو گا، سلسلہ کٹ گیا یا سلسلہ کے ذریعہ جو چار چیزیں ہم تک پہنچ رہی تھیں، ان میں سے ایک کڑی کٹ گئی۔ دین ناقص رہ جائے گا۔ تو وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ دین کامل ہو کر باقی رہے گا اور سلسلہ ختم ہونے کے بعد سرے سے دین نہیں رہتا اور دین کے اجزاء میں سے کوئی چیز کٹ جائے تو کامل دین نہیں رہتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آئے گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے بری ہے کہ کوئی اس کی تکذیب کرے۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

آفتابِ راہ اور راہ نما...... بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ نبوت بن کر تشریف لائے، دنیا میں عقائد و اعمال اور رسوم کی جو ظلمات پھیل گئی تھیں، آفتاب نبوت نے آکر ان سب کے پردے چاک کر دیئے، دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ستاروں کی مانند ہیں۔ ستارے سارے کے سارے نمودار ہو جائیں، مگر رات زائل نہیں ہوتی اگر چہ روشنی پھیل جائے۔ آفتاب کی آمد کا جب قصہ شروع ہوا پو پھٹی تو ابھی آفتاب نکلا نہیں مگر رات غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے تو تمام انبیاء علیہم السلام آئے انہوں نے دلوں میں دماغوں میں روشنی پھیلائی۔ لیکن رات ہی رات رہی مگر آفتاب نبوت طلوع ہوتے رات ختم ہوگئی اور دن نکل آیا اور ہر چیز جتنی دن میں واضح نظر آتی ہے، رات میں نظر نہیں آتی تو توحید کے دقائق رسالت کے دقائق بلاشبہ سارے انبیاء علیہم السلام نے سمجھائے۔ لیکن رات کے وقت روشنی میں آدمی اجمالی طور پر سمجھتا ہے۔ دن کی روشنی میں ایک ایک مخفی چیز نمایاں ہو جاتی ہے تو توحید و رسالت کے جتنے دقائق اس دین میں کھلے۔ پچھلے ادیان میں وہ حقائق نہیں ملتے جتنے علوم و معارف توحید و رسالت کے اس دین نے واضح کئے دنیا کے کسی دین میں نہیں کھلے پچھلے انبیاء علیہم السلام نے نکتے کھولے مگر جتنی روشنی تھی اتنا اجمال سامنے آ گیا، جب تیز روشنی پڑی تو چھپی چیزیں بھی کھل گئیں اور نمایاں ہوگئیں۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات آفتاب نبوت اور مشعل نور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھنا یہ اس کی دلیل ہے کہ حق واضح ہو گیا جو آپ سے اوجھل ہے وہ ناحق ہے اور جو آپ میں روشن ہے وہ حق ہے، تو راستہ قطع کرنیکی لئے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے روشنی بھیج دی۔ راہنما کی ضرورت تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہماری راہنما ہیں کہ نماز و جہاد ایسے کرو۔ گھریلو زندگی ایسے بسر کرو تو ایک ایک سنت ہمارے عمل ے لئے راہنمائی کرتی ہے تو جہاں راستہ کے لئے نور کی ضرورت تھی وہاں رہنما کی بھی ضرورت تھی۔

صراطِ مستقیم...... اور صراط مستقیم اللہ کی رَوشن کتاب ہے۔ جس نے ایک لائن بچھا دی ہے۔ جس پر آدمی دوڑتا ہوا اللہ تک پہنچ جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" ① یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اس نے آسمان سے زمین تک لٹکا دی ہے۔ تمہارا کام کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا﴾ ② اللہ کی رسی کو تم مضبوط پکڑ لو۔ جب یہ رسی کھینچی جائے گی تو اس کے ساتھ لپٹنے والے کھنچ کر اوپر پہنچ جائیں گے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن پہلے آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک یہ سارا علاقہ جہنم کا ہوگا۔ جس میں آگ بھی تپے گی اور سارے سانپ بچھو وغیرہ ہوں گے۔

اور آسمان اول کے اوپر جنتیں ہوں گی۔ ویسے جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے لیکن قیامت کے دن اسے آسمان اوّل پر لا کر رکھیں گے اور آسمان بیچ میں ہوگا، پانچ سو برس کی مسافت اس کا پل ہوگا جو کہ اعراف ہوگا۔ جس

---

① تفسیر الطبری، واعتصمو ابحبل اللہ ج: ۴ ص: ۳۱ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۵ ص: ۲۳۔

② پارہ: ۴، سورة آل عمران، الآیة: ۱۰۳۔

میں کچھ آثار جنت کے ہوں گے اور کچھ آثار جہنم کے ہوں گے تو یہ سارا جہنم کا علاقہ ہے، جس میں ہم اور آپ پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ نے رسی لٹکائی کہ جسے جہنم سے نکل بھاگنا ہو۔ اس رسی کو پکڑ لے، میں اسے کھینچنے والا ہوں جو اسے پکڑ لے وہ بھی آ جائے گا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ کفار نے جو اللہ کی رسی کو نہیں پکڑا تو انہیں جہنم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں وہ ہیں ہی جہنم میں۔ تو اللہ کی رسی تو ٹوٹ نہیں سکتی البتہ چھوٹ سکتی ہے تو غور کرتے رہنا چاہئے بیدار رہنا چاہئے کہ کہیں یہ رسی چھوٹ نہ جائے۔ اللہ کے باطن سے نکل کر اس کا کلام (رسّی) آیا۔ جو اسے تھامے گا۔ باطنِ حق سے اس کا تعلق قائم ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰہِ وَخَرَجَ مِنْهُ" "قرآن پاک سے برکت حاصل کرو۔ کیوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ حق تعالیٰ کا تبرک براہ راست دنیا میں جو موجود ہے وہ صرف اس امت کے ہاتھوں میں موجود ہے کہ اس نے کلام کیا اور وہ کلام بعینہ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے۔

ویسے تو زمین، آسمان، سورج وغیرہ سب کچھ اس کا تبرک ہے جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ سب کچھ مخلوق ہیں اور قرآن کو پیدا نہیں کیا یہ تو کلام ہے اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ جو اس کی صفت ہے، تو صفت کو موصوف پیدا نہیں کیا کرتا۔ صفت موصوف سے صادر ہوتی ہے۔ میں یوں نہیں کہوں گا کہ میں اپنے کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ یوں کہوں گا کہ بول رہا ہوں، یعنی کلام مجھ سے صادر ہو رہا ہے۔ سرزد ہو رہا ہے کہ جو چیز میرے اندر بھری ہوئی ہے وہ باہر نکل رہی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ تو جو چیز اللہ سے صادر ہو رہی ہو۔ وہ اللہ سے منقطع نہیں ہو سکتی۔ اس کا سرا اوپر اللہ میاں سے لگا ہوا ہے نیچے کا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تھامو گے تو اللہ کی ذات تک رسائی ہوگی۔ اسی واسطے کثرت تلاوت سے جو ترقی ہوتی ہے اس سے ذات باری تعالیٰ سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری عبادات سے آدمی صفات خداوندی تک پہنچتا ہے، بہرحال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم اللہ کی ایک رسی ہے جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہے، وہ اس رسی کو مضبوطی سے تھام لے۔ غرض کتاب اللہ صراطِ مستقیم ہے۔ جس پر چل کر آدمی اللہ تک پہنچتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مشعل نور، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما اور سیدھا راستہ کتابِ مبین اور چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر چلنے کا جذبہ ہے، تو راستہ روشنی مینارے، میل اور فرلانگ کے نشانات موجود ہیں، اور منزل بھی سامنے ہے اور اگر چلنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے حق میں روشنی اور راستہ سب کچھ بیکار ہے۔

سنتیں اور واجبات بھی بے کار:

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآن وحدیث کی طرف سے کوئی کمی اور کوتاہی نہیں ہے کمی اور کوتاہی چلنے والوں کی طرف سے ہے۔ یہ چلنا نہیں چاہتے ورنہ ادھر سے فیضانِ خداوندی موجود ہے۔

حصولِ مقصد کی شرائط...... بہرحال میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے چار باتوں کی ضرورت ہے، ایک روشنی، راہ ایک راستہ، ایک راہنما ہو جو مبصر اور دانا ہو۔ راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہو تو روشنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ اور صراطِ مستقیم کتاب اللہ ہے جس میں کہیں ٹیڑھ کا نشان نہیں ہے۔ ﴿ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ﴾ ① یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا، زیغ اور ٹیڑھ پن نہیں ہے، سیدھا سیدھا راستہ ہے۔

یہ فرمایا: ﴿لَا رَیْبَ فِیْہِ﴾ یہ نہیں فرمایا ''لَا رَیْبَ فِیْھِمْ'' کہ لوگوں کے اندر ریب (اور شک) نہیں جتنی کھٹک ہے وہ ہمارے ہی سینوں میں ہے، کتاب میں کوئی کھٹک نہیں مگر یہ کھٹک بھی کتاب ہی کی طرف رجوع کرنے سے زائل ہوگی۔ خود بخود زائل نہیں ہوگی۔ آپ اس انتظار میں رہیں کہ پہلے کھٹک زائل ہو جائے پھر کتاب اللہ کو پکڑوں؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے بدن پر ناپاکی لگی ہوئی ہو اور دریا ہو سامنے اور یہ کہے کہ پہلے پاک ہو جاؤں۔ دریا کہے گا۔ بے وقوف! میرے اندر آ کے دیکھ، پاک بھی میں ہی کروں گا، اس لئے اگر کسی کے دل میں زیغ اور کجی موجود ہے اور وہ اس کا علاج چاہتا ہے تو اس میل کو دھونے کے لئے کتاب و سنت ہی ذریعہ ہے۔

لٹریچر کی کثرت کا نقصان...... زیغ تربیت اور تزکیہ نفس سے ہٹے گا، اس کے لئے شخصیت کی ضرورت پڑے گی، شخصیتوں کی طرف رجوع کئے بغیر محض کاغذی لٹریچر اور کالے نقوش سے کام نہیں چلے گا۔ آج ہم لٹریچر کتنا ہی اکٹھا کرلیں ہزاروں کتابیں شائع کردیں لیکن جب تک نفس کی تربیت نہ ہو تو جو کتاب جس کے آگے جائے گی جب ذہن بنا ہوا نہیں تو الٹے ذہن سے الٹی بات سمجھے گا۔ سیدھے ذہن سے دیکھے گا۔ سیدھی بات سمجھ میں آئے گی اور ذہن عموماً نا تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ لٹریچر کی کثرت عموماً مسلمانوں کو مضر پڑ رہی ہے۔ وہ فقط کاغذ کے بندے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اہل حق کی طرف رجوع نہیں کرتے، بس کتابچہ دیکھ لیں گے۔ تو کتابچوں سے دین تھوڑا ہی آتا ہے، دین تو صحبت اہل اللہ اور صحبتِ صلحاء سے آتا ہے۔

مرکزِ علم شخصیّت ہے اور کتاب علامت...... اسی واسطے جب کسی عالم کے علم کو جانچتے ہیں۔ اس سے یہ پوچھا کرتے ہیں؟ کہ تمہارا استاذ کون ہے؟ اور اس کا استاذ کون ہے؟ سلسلہ کیا ہے؟ یعنی سند پوچھی جاتی ہے۔ اگر دیکھتے ہیں کہ سند بڑے بڑے علماء کی ہے تو سمجھتے ہیں کہ مستند عالم ہے۔ یوں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ نے کون سی کتاب پڑھا تھا۔ اگر تو مطبع مجتبائی کی چھپی ہوئی تھی۔ تب تو آپ بڑے عالم ہیں، اگر کسی اور مطبع کی تھی تو آپ گھٹیا درجہ کے عالم ہیں، کیوں کہ وہ کتابیں غلط چھاپتا تھا اس کا کاغذ اچھا نہیں ہوتا تھا تو عالم کا علم کاغذ اور کتاب سے نہیں پہچانا جاتا۔ روشنائی کی عمدگی سے نہیں پہچانا جاتا۔ اس سے پہچانا جائے گا کہ اس کا معلم کیسا تھا۔ اس میں دین تھا یا نہیں۔

ابن سیرین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ'' یہ علم

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۱.

تمہارا دین ہے۔ تو جس سے دین سیکھو، پہلے اسے بھی دیکھ لو کہ اس میں بھی دین ہے یا نہیں، اس لئے کہ دین سینوں سے آتا ہے، سفینوں سے نہیں آتا۔

کتاب تو در حقیقت نقوش اور علامات ہیں۔ ان نقوش اور علامات کے حقائق سینوں کے اندر موجود ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ ايٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ ① یہ آیات بینات اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

انہوں نے اس ریاضت و مجاہدہ اور امانت و دیانت سے سینوں میں لیا ہے۔ کتابوں کی سند نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے کون سی کتاب چھپی تھی، اور اس سے پہلے کون سی۔ یہ دیکھیں گے کہ اسے کس نے پڑھایا اور اسے کس نے پڑھایا۔ تو محدثین سندوں میں شخصیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کو پیش نہیں کرتے، اس لئے مرکزِ علم شخصیت ہوتی ہے، کتاب نہیں، کتاب علامت ہوتی ہے جس سے وہ علم موجود رہے اور غلطی کے وقت کتاب کی طرف رجوع کریں۔

آدابِ طریق...... اس لئے محض کتابوں اور پمفلٹوں سے اگر ہم دین حاصل کریں۔ کبھی دین حاصل نہیں ہوگا۔ دس رائیں پیدا ہوں گی۔ یہی وجہ ہے جو کتاب دیکھتا ہے اس کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے۔ یہ جو ہو رہا ہے کہ ہر آدمی کہتا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اب اسے کون سمجھائے کہ آیت کا مطلب سمجھنے کے لئے کچھ اصول موضوعہ بھی ہیں اور کچھ مقدمات بھی ہیں۔ وہ تو نے حاصل نہیں کیئے۔ چاہتا یہ ہے کہ سارے مطالب میں سمجھ لوں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے اقلیدس کی شکل حل کرنے کے لئے ایک دیہات کا گنوار یہ کہے کہ مجھے اقلیدس کی اڑتالیسیوں شکل سمجھا دو۔ آپ اسے پوچھیں گے کہ اصول موضوعہ تجھے یاد ہیں؟ وہ کہے گا کہ وہ تو میں نے نہیں پڑھے۔ علوم متعلقہ تجھے یاد ہیں؟ کہ یہ بھی نہیں پڑے۔ تو استاد کہے گا میں سمجھاؤں کس طرح؟ جب مبادی تیرے ذہن میں نہیں تو مقاصد کس طرح ذہن میں ڈالوں، غرض علم کے لئے بہت سے مبادی اور مقدمات کی ضرورت ہے اور وہ کتاب وسنت میں ہیں۔ وہ مقدمات ذہن میں ندارد، اور نتیجہ سمجھنے کے لئے آجائے اور بحث کرنے کے لئے تیار، اب کس طرح سے ان کو سمجھایا جائے تو لٹریچر کی زیادتی سے یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ دس ہزار آدمی ہیں تو مسئلہ کے اندر دس ہزار رائیں ہیں، پھر ہر ایک اپنی رائے پر جمود کیئے ہوئے ہے کہ اسے ہی مانو یہی امر حق ہے، یا پھر مجھے سمجھا دیں۔ اور جو چیز سمجھ میں نہ آئے۔ چاہے اسی کے نقصان فہم کی وجہ سے سمجھ میں نہ آئے وہ سمجھتا ہے کہ مسئلہ ہی غلط ہے جو میں سمجھتا ہوں، وہ صحیح ہے۔ اس لئے علامات قیامت میں فرمایا گیا ہے کہ: "اِعْجَابُ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ" ② ہر شخص کو اپنی رائے پر اتنا اصرار اور جمود ہوگا کہ وہ اسے وحی خداوندی سمجھے گا کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اپنی رائے کے اوپر ایک گھمنڈ اور اتراہٹ ہوگی۔ لیکن جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں سامنے آئیں گی اور

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹.

② السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ المائدۃ ج: ۱۰ ص: ۳۲۱.

کتاب مبین کی اغراض و مقاصد اور مرادات واضح ہوں گی۔ پھر خود بخود اپنا کھوٹ اپنے اوپر کھل جائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں انسان سب سے پہلے اپنا کھوٹ دیکھتا ہے۔ اس کھوٹ کو زائل کر کے محبت اور اتباع کتاب سے اپنے اندر نورانیت پیدا کرتا ہے اور اطاعت کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں درکار ہیں، تو سنن نبوی ہمارے عمل کے لئے راہنمائی کرتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات روشنی پہنچاتی ہے، اور سیدھا راستہ کتابِ مبین ہے، اب ضرورت ہے چلنے کی تو چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر ہم ہی نہ چلیں تو کتاب وسنت کا کوئی قصور نہیں۔ گھر بیٹھے ہی ایک رائے قائم کر لیں تو کتاب وسنت پر وہ رائے عائد نہیں ہو سکتی اسی واسطے دین کے اندر مطیع و متاثر بن کر چلنے کی ضرورت ہے۔

وسائلِ علم کا ادب...... دین کی بنیاد ادب کے اوپر ہے۔

بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

جب ادب نہیں تو دین کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ دین کی بنیاد تا ادب پر ہے اللہ کا ادب۔ اللہ کے رسول کا ادب، کتاب اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، اہل علم کا ادب، اور وسائل علم کا ادب جب تک نہ ہو دین نہیں آ سکتا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو واقعی آیت من آیات اللہ تھے اور اس زمانے میں قدیم محدثین کا ایک نمونہ اللہ نے علم درایت وتفقہ اور عمل کے لحاظ سے پیدا کر دیا تھا نے خود ایک دفعہ فرمایا: بات تو بڑی چھوٹی سی ہے مگر جب آدمی کرے تو اس پر استقامت بڑی مشکل ہے۔ فرمایا: ''پانچ برس کی عمر سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور آج میری عمر ساٹھ برس کی ہے کسی دینی کتاب کو میں نے بے وضو ہاتھ نہیں لگایا''۔ یعنی قرآن کے بارے میں نہیں۔ حدیث کی کتاب ہو، فقہ کی ہو، اصول فقہ کی ہو، جس پر دینی فن کا اطلاق آ جائے فرمایا: اسے میں بے وضو ہاتھ نہیں لگاتا، اتنا ادب تھا تو حضرت شاہ صاحب بن گئے، بے ادب کا مقام تھوڑا ہی ہے کہ وہ شاہ صاحب بن جائے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (1) ''اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند مت کرو۔ کیوں کہ یہ بے ادبی ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز کو غالب بنانا چاہتے ہیں تو یہ گستاخی ہے ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ اعمال کی بقا ادب کے ساتھ ہے اگر بے ادبی ہوگی تو عمل حبط وضبط ہو جائیں گے اتنا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلقی طور پر جہری الصوت (بہت بلند آواز) تھے جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسجد نبوی میں آہستہ بولنے لگے تھے کہ لوگ ان کی باتوں کو کان لگا کر سنتے تھے، کہتے تھے کہ میری آواز بلند نہ ہو کہ میرے عمل اللہ کے ہاں حبط کر لئے جائیں۔ غرض یہ کہ ادب سکھلایا گیا۔ اسی طرح فرمایا

---

(1) پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲۔

گیا: ﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴾ ① رسول کو اس طرح مت پکارو۔ جس طرح آپس میں بے تکلف ایک دوسرے کو پکار دیتے ہو، بلکہ ادب وعظمت اور احترام کے ساتھ پکارو۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یا محمد کہہ کر پکارا۔ تو تنبیہ فرمائی گئی: یَارَسُوْلَ اللہِ اِیَانَبِیَ اللہِ ! کہہ کر پکارو۔ نام لے کر مت پکارو۔

رعایتِ مقام...... خود حق تعالیٰ شانہ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو نام لے لے کر پکارا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے القاب سے پکارا۔

﴿ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ﴾ ② ﴿ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ ﴾ ③ ﴿ يٰزَكَرِيَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ ﴾ ④ ﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ﴾ ⑤ ﴿ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ ﴾ ⑥ ﴿ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ﴾ ⑦

غرض ہر نبی کا نام لے پکارا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب فرمایا تو کہیں "یَامُحَمَّدُ" نہیں فرمایا بلکہ کہیں ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴾ ⑧ کہیں فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ ⑨ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ ⑩

منصب کے لقب لئے جاتے ہیں۔ تاکہ حرمت واحترام واضح کر دیا جائے۔ اور نمونہ بتلا دیا جائے کہ نبی کا نام لے کر کوئی نہ پکارو۔ خطاب خداوندی سے پکارو۔ رسول و نبی آپ کا خطاب ہے۔

حبیب اللہ آپ کا خطاب ہے۔ تو جب حق تعالیٰ شانہ جن کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کئے ہوئے ہیں وہ احترام فرمائیں گویا اپنی بنائی ہوئی چیز ان کے نزدیک اتنی اعلیٰ ہے کہ خود بھی احترام فرما رہے ہیں تو ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے کہ ہم بے حرمتی سے پیش آئیں۔ اگر بے حرمتی سے پیش آئیں گے تو عقائد و عمل اور دین بھی حبط۔

غرض اللہ کے رسول کا ادب بتلایا گیا۔ کتاب اللہ کا ادب بتلایا گیا ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ ⑪ "کتاب اللہ کو چھوئیں۔ صرف وہ لوگ جو طہارت حاصل کر چکے ہوں" وضو اور غسل جنابت کئے ہوئے ہوں۔ جو پاک ہوں وہ ہاتھ لگائیں، تو کتاب اللہ، رسول اللہ، بیت اللہ اور مساجد کا ادب بتلایا۔

لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ مساجد میں جمع ہو گئے ادھر ادھر کی بات چیت شروع کر دی تو اس کے بارے

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۳.
② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳.
③ پارہ: ۱۲، سورۃ الھود، الایۃ: ۴۸.
④ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۷.
⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۲.
⑥ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۵.
⑦ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۴.
⑧ پارہ: ۲۹، سورۃ المدثر، الآیۃ: ۱، ۲.
⑨ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۶۷.
⑩ پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۹.
⑪ پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹.

میں فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَاؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ ① اس سے زیادہ بدقسمت وبدبخت کون ہے جو مساجد میں ذکر اللہ کرنے والوں روکے اور مساجد کوڈھائے۔ایک مسجد کی صورت ہے جو اینٹ پتھر ہے۔ان کے ڈھانے کا یہ مطلب ہے کہ عمارت گرادے اور ایک مسجد کی حقیقت ہے جوذکر اللہ ہے اگر کوئی ذکر اللہ پر پابندی عائد کردے اور مخل بن جائے تو اس نے مسجد کی حقیقت کوڈھادیا۔دنیا کی باتوں سے ایسے مخل بن جائے کہ دوسرا نفلیں نہ پڑھ سکے زور زور سے دنیا بھر کی خرافات کررہے ہیں۔دوسرے کی تلاوت میں خلل پڑرہا ہے۔یہ حقیقت مسجد کوڈھادینا اور گرادینا ہے ان لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا بلکہ ان لوگوں پر واجب تھا کہ مسجد میں خوف ودہشت زدہ اور ڈرتے ہوئے داخل ہوئے کہ یہ دربار خداوندی ہے نہ یہ کہ بے ادبی گستاخی لاپرواہی اور لاابالی پن سے داخل ہوتے۔

اسی طرح اولیاء اللہ کا ادب بتلایا گیا کہ اللہ کے جتنے اولیاء ہیں۔انکی عظمت وحرمت کوملحوظ رکھا جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا: مَنْ صَلّٰى خَلْفَ عَالِمٍ تَقِيٍّ فَكَاَنَّمَا صَلّٰى خَلْفَ نَبِيٍّ ② جس نے کسی متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو ربانیوں کی توقیر اور ادب بتلایا گیا۔بہرحال علم کا ادب وسائل واشخاص علم کا ادب بتلایا گیا ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا جس قوم کے اندر جسارت اور بے ادبی ہوگی۔وہ دین سے محروم رہے گی۔

فسادِ کبیر...... صاحب ہدایہ نے ایک قطعہ لکھا ہے

فَسَادٌ كَبِيْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ ‏ وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ ‏ لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ

وہ عالم فسادکبیر ہے جو بےادب اور گستاخ ہو وہ دنیا کو بے ادبی کے راستہ پر ڈال دے گا تو عالم میں مفسدہ پھیلا رہا ہے اور اس سے بڑا مفسد جہالت کے ساتھ من گھڑت طریقوں پر عبادت کرے۔اور جس راستہ پر چاہا بےسند چل پڑا۔بےسند رسوم اختیار کیں۔بدعات میں مبتلا ہوگیا۔یہ جاہل بھی بے ادب عالم سے زیادہ فساد کبیر ہے جو جہالت سے عبادت کرے۔مسئلہ اور فتویٰ نہ پوچھے۔ایسا عالم اور جاہل یہ دونوں عالم کے اندر فتنے ہیں اور اس شخص کے لئے بھی فتنہ ہیں جوان سے اپنے دین کا تمسک کرے اور انہیں اپنا راہنما بنائے۔وہ بھی فتنہ میں گرفتار ہوجائے گا۔

عالم کا جوہر...... عالم کا جوہر یہ ہے کہ اس میں ادب ہو۔﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ③ خوفِ خدا اور خشیۃ اللہ عالم ہی کے اندر ہوتا ہے جتنا جس میں علم ہے۔اتنی ہی اس میں خشیت ہے۔جتنا علم

① پارہ:۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۱۱۴ . ② علامہ زیلعیؒ نے اس روایت کوغریب قرار دیا ہے البتہ وہ فرماتے ہیں: معجم طبرانی میں اس کے مثل روایت موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان سرکم ان تقبل صلاتکم فلیؤمکم علمائکم فانهم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم دیکھئے: نصب الرایة، باب الامامة، ج:۲ ص: ۴۸۰. ③ پارہ: ۲۲ ،سورۃ الفاطر،الآیۃ: ۲۸.

سے کورا ہے۔ اتنا ہی اس میں بے خوفی ہے اور نڈر ہے تو بنیادی چیز ادب ہے۔ دین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک ادب نہ کیا جائے۔ اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم بارگاہ رسالت کے اندر ادب اختیار کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیں تو درود شریف پڑھیں۔ نام مبارک آئے تو کہیں: ''صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ''۔ ایک تو رسمی درود ہے کہ ہم نے ایک طریقہ باندھ لیا کہ بیٹھ کر پڑھو، درود شریف۔ یہ تو ایک رواجی چیز ہے اور ایک یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو درود پڑھے بغیر نہ رہے صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس سے زیادہ بخیل کوئی نہیں جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے۔

اس لئے سب سے بڑی چیز ادب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں درود شریف ادب کا مظہر ہے۔ اور اس سے بڑھ کر چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع ہے۔ اطاعت نام کو نہ کرے اور ادب کا مدعی بنے تو وہ ''عشقِ سعدی تا بزانو'' ہے عشقِ حقیقی نہیں۔ اس لئے کہ جب ادب اور عظمت ہوئی ہے تو اطاعت اس کے لئے لازم ہوتی ہے۔

بہرحال ان وسائل کا ادب اور تادّبِ لازمی ہے ورنہ اس کے بغیر عمل نہیں ہو سکے گا۔ یعنی راستہ پر آپ نہیں چل سکیں گے۔ یعنی راہ روکی جو قید تھی تو اس کے لئے یہ تین چیزیں ہیں کہ روشنی راہ، راہ اور ساتھ میں راہنما۔ تو راہ رو بھی ہونا چاہئے۔ تو اس میں شرط یہ ہے کہ متادب بن کر چلے اللہ کے راستہ میں سینہ ابھار کر نہ چلے۔ گردن جھکا کر چلے گا تو سر بلند کیا جائے گا اور سینہ ابھار کر چلے گا تو پٹخ دیا جائے گا: ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ'' جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا۔ اللہ اسے سر بلند رکھیں گے۔

عبادت کا مفہوم...... اور اگر اکڑ کر چلے گا تو اس کے لئے دوسری چیز فرمائی گئی ہے: ''اَلْکِبْرِیَآءُ رِدَآئِیْ وَالْعَظَمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْھِمَا قَصَمْتُہٗ'' ① کبریائی اور تکبر میری چادر ہے۔ عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا، اس کی گردن توڑ دوں گا۔ میں اس کو نیچا دکھا دوں گا۔ تواضع کرے گا تو اونچا ہوگا۔ اینٹھے گا تو نیچا ہوگا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

پستی سے سر بلند ہو اور سرکشی سے پست ❊ اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

ابھر کے چلتا ہے تو گرا دیتے ہیں۔ گر کر چلتا ہے تو اٹھا دیتے ہیں تو اس راہ کے اندر گردن جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ وہ اور راہ ہوگی جس میں آپ اکڑ کر چلیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی ہمیں کہیں کہ اکڑ کر چلو پھر ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ انہوں نے حکم دیا: ﴿لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ② خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ اور فرماتے ہیں: ﴿اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ ③ اے اکڑ کر چلنے والے! تو جو اینٹھ

① سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر: ۴/۵۹، رقم: ۴۰۹۰۔

② پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۳۷۔ ③ پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۳۸۔

اینٹھ کر چل رہا ہے تو جو سینہ ابھار کر گردن اکڑا کر چل رہا ہے تو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ آسمان کو نہیں پہنچ سکے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا جتنی میں ہے پھر کیوں اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ اکڑ کر کہیں اوپر پہنچ جاتا تو ٹھیک تھا۔ اکبر (لسان العصر) نے خوب کہا ہے۔

تعجب نخوتِ اہلِ زمیں پر مجھ کو آتا ہے ۔۔۔ یہ کیوں اس پر اکڑتے ہیں کہ جس میں مرکر گڑنا ہے

جس چیز کے پیٹ میں سرنگوں ہوکر اور سر کے بل جانا ہے اس پر سر کو ابھارنا دانائی اور دانشمندی کے خلاف ہے اس لئے حکم دیا کہ اکڑ کر نہ چلو۔ لیکن اگر ہمیں حکم دیں کے اکڑ کر چلو جیسا کہ جس طواف کے بعد سعی ہوتی ہے تو اس کے ابتدائی تین پھیروں میں حکم ہوتا ہے کہ اکڑ کر چلو، ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دین ۔۔۔ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اگر بادشاہ یوں کہے کہ لالچی بنو تو ہم لالچی بن کر دکھائیں گے پھر ہمیں قناعت کی ضرورت نہیں اگر اللہ میاں یوں کہیں کہ تم لالچی بنو تو سو دفعہ لالچی بنیں گے پھر قناعت کے سر پر خاک ڈالیں گے۔ ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (۱)

جنت کے بارے میں حریص بننا چاہئے کہ ایک دوسرے پر حریص بن کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خوب لالچ کا مظاہرہ کریں۔ قناعت اگر کرنی ہے تو دنیا کے ٹال میں کرو۔ ہوسنا کی چھوڑ دو، لیکن آخرت کی نعمتوں کے بارے میں ہوسناک بنو۔ کسی حد پر نہ ٹھہرو۔

جنت کی نعمتوں میں علم اور معرفت بھی ہے اس لئے فرمایا کہ: مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ: طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا (۲) ''دو بھوکوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ طالب علم اور طالب دنیا کا''۔ ''اَمَّا طَالِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضَى الرَّحْمٰنِ وَاَمَّا طَالِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ'' ''طالب علم جتنا پڑھے گا رضاء خداوندی بڑھتی رہے گی اور دنیا کی طلب میں جتنا بڑھے گا۔ سرکشی اور تمرّد بڑھتا رہے گا تو جہاں قناعت کرنی ہے وہاں قناعت کرے۔ جہاں لالچی بننا ہے وہاں لالچی بنے۔ اور دونوں حکم خداوندی کے تابع ہیں''۔

حاصل یہ نکلا کہ بندہ وہ ہے جو فرمان خداوندی کے تابع ہو۔ بندگی اور عبدیت کے یہی معنی ہیں کہ جس وقت جو حکم دیں اسے انجام دے۔ اگر وہ یوں حکم دیں کہ نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت بن جائے گا اور اگر یوں کہیں کہ ہرگز مت پڑھو۔ تو نماز کا چھوڑ دینا عبادت بن جائے گا پانچوں وقتوں میں حکم دیا کہ نماز پڑھو۔ تو نماز پڑھنا عبادت

---

(۱) پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶.

(۲) سنن الدارمی، باب فی فضل العلم والعالم: ۱/۱۰۸ رقم ۳۳۲ . علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کا پہلا حصہ سنداً ضعیف ہے۔ البتہ دوسرا حصہ ''اما طالب العلم'' امام بیہقیؒ نے ''المدخل'' میں حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے دیکھئے: الدررۃ المنتشرۃ فی الاحادیث المشتھرہ، حرف الواؤ، ج۱۰ ص: ۲۰ کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۸۸.

اور تین وقتوں میں حکم دیا کہ ہرگز مت پڑھو۔ طلوع، غروب، اور استواءِ آفتاب کے وقت۔ اس وقت نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا۔ کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ نماز چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے جو کہہ دیں وہ کرو۔

حکم دیا کہ روزے رکھو۔ بہت اچھا۔ بس یہ عبادت ہے۔ عید کے دن حکم دیا کہ خبردار اگر روزہ رکھا تو گناہ گار ہوگا۔ افطار واجب ہے اس سے معلوم ہوا کہ نہ روزہ رکھنا عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنے کا ماننا عبادت ہے۔

خودکشی حرام کردی۔ خون مت بہاؤ اسی طرح دوسرے کا بھی خون نہ بہاؤ۔ فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ﴾ ① "جس نے مسلمان کو عمداً قتل کیا۔ اس کی جزاء جہنم ہے"۔

گویا قتل کرنا عظیم الشان معصیت ہے اور جہاں وہ فرمائیں کہ خوب قتل کرو۔ وہاں وہ عبادت ہے۔ چناں چہ جہاد میں جائے تو سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خون بہا دے تو معلوم ہوا کہ نہ خون کا بہانا معصیت نہ چھوڑنا معصیت کہنا نہ ماننا معصیت ہے اور ماننا اطاعت ہے۔ ہر چیز میں یہی اصول کارفرما ہے۔

فطرت اور شریعت...... اسلام معتدل مذہب ہے جسے اسپرنگ پالیسی کہتے ہیں وہ ہے اسلام میں، کہ دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے کہیں ادھر کا حکم دیتے کہیں ادھر کا حکم دیتے ہیں۔ علی الاطلاق کسی چیز کو معصیت نہیں قرار دیا۔ ایسے ہی "جھوٹ بولنا" بلاشبہ معصیت ہے۔ گناہ کبیرہ ہے بلاتوبہ کے معاف نہیں ہوتا لیکن انسان میں مبالغہ آمیزی کا ایک طبعی جذبہ ہے کہ جھوٹ بات بھی کہہ جاتا ہے۔ زورِ کلام میں بعض دفعہ غلط چیزیں بھی کہہ جاتا ہے۔ اس جذبے کو بھی شریعت نے پامال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ محفوظ رکھو اگر کہیں نوبت آئے اور ہم اجازت دیں تو ضرور جھوٹ بول لینا۔

چناں چہ فرمایا ② اگر دو بھائیوں میں لڑائی ہو رہی ہو۔ تلواریں کھنچ چکی ہوں۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو۔ تم جھوٹ بول کر صلح کرا سکتے ہو تو کرا دو۔ تمہیں جھوٹ بولنے میں وہ اجر ملے گا جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔ آپ نے ایک بھائی سے جا کر یہ کہا۔ "کہ بھائی تم کس سے لڑ رہے ہو وہ تو رات تمہاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے اور رو رہے تھے کہ میرا بھائی مجھ سے جدا ہوگیا"۔

اس نے نے کہا اچھا! میرے بھائی کے دل میں اتنی گنجائش ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ بڑا دشمن ہے۔ کہا آپ نے بالکل غلط سمجھا۔ دوسرے سے بھی جا کر یہ کہہ دیا کہ تم کس سے دشمنی کر رہے ہو وہ تو رات بھر تمہارا ذکر کرتے رہے اور جدائی کا افسوس کرتے رہے۔

اس کی دشمنی بھی ڈھیلی ہوگئی۔ اس کی بھی ہوگئی دونوں نے صبح مصافحہ کیا۔ حالانکہ آپ نے جھوٹ بولا تھا۔ اس جھوٹ پر آپ کو وہ اجر ملے گا جو آپ کو اطاعت و عبادت پر ملتا۔ اگر سچ بول دیں اور اس سے فتنہ پھیلے تو وہ سچ

---

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۹۳. ② مسند احمد، حدیث ام کلثوم بنت عقبۃ ج: ۶ ص: ۴۰۳، رقم: ۲۳۱۳.

حرام ہے۔اسی لئے غیبت حرام ہے۔غیبت سچ بولنے ہی کو کہتے ہیں۔اس لئے کہ غیبت کی تعریف یہی ہے کہ کسی کی واقعی برائی کو اس کی پشت پیچھے بیان کرے۔اگر جھوٹی بات کہی تو وہ افتراء ہے تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔کیوں کہ فتنے کا ذریعہ ہے اور وہ جھوٹ بولنا ضروری ہو جاتا ہے اس لئے کہ رفع فتنہ کا ذریعہ ہے۔اسی طرح دھوکہ دینا، مکرو فریب بہت بڑی چیز ہے۔"لَیْسَ مِنَّامَنْ غَشَّنَا" ① "وہ ہم میں سے ہے ہی نہیں جو دھوکہ بازی کرے"۔

لیکن فرماتے ہیں:"اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ" ② "جہاد میں دھوکہ دینا بھی جائز ہے"۔وہاں جا کے یہ عبادت بن گئی تو دھوکہ دہی کے جذبے کو شریعت نے پامال نہیں کیا۔مگر اپنے کنٹرول میں رکھا ہے۔جہاں ہم کہیں استعمال کرو۔جہاں روکیں رک جاؤ۔اس لئے کہ تم ہمارے بندے ہو۔اپنے نفس کے بندے نہیں ہو کہ جو تمہارا نفس چاہے وہ کرو۔نہیں جو ہم چاہیں وہ کرو نفس کو پیچھے پھینکو۔

تو جھوٹ مکروفریب یہ یقیناً معصیت ہیں اور انسان کے ضمیر کے اندر یہ معصیتیں رکھی گئی ہیں۔جھوٹ بولنے کا انسان کے قلب میں ایک کونہ ہے اور مکروفریب کا بھی ایک کونہ ہے۔غیض وغضب اور حسد کا بھی ایک کونہ انسان کے دل میں ہے تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ پیدائشی مادوں کو زائل کردے یا ختم کردے بلکہ اس لئے آئی ہے کہ مصرف بتادے اور ٹھکانے لگادے۔

غصہ کا جذبہ ہے۔اس کو شریعت نے پامال نہیں کیا اگر غصہ نہ ہو تو آپ جہاد کیسے کریں گے؟ اگر جوش اور جذبہ نہ ہو تو باطل کے مقابلہ میں آپ کیسے آئیں گے؟ اگر سارے ہی ٹھنڈے ہو جائیں تو ملک کی حفاظت کون کرے گا۔فوجی طاقت بھی تو ہونی چاہئے اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی تو چاہئے تا کہ فتنوں کا استیصال ہو۔اس لئے غصہ بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔اس کو پامال نہیں کیا۔یہ کہا کہ جہاں ہم کہیں وہاں استعمال کرو۔جہاں ہم نہ کہیں وہاں ٹھنڈے بن جاؤ۔جہاں بے مصرف استعمال کرو گے۔گناہ گار بنو گے۔جہاں مصرف صحیح میں استعمال کرو گے، نیکوکار بن جاؤ گے۔غرض کوئی جذبہ جسے ہم برے سے برا سمجھیں اسے شریعت نے ختم نہیں کیا۔ہاں ٹھکانے لگایا ہے۔یہی معنی ہیں دین فطرت کے کہ کسی قوت کو زائل نہیں کیا بلکہ ہر قوت کے مصارف بتلادیئے۔تو اپنی قوت کا استعمال کرنا یہ فطرت ہے، مصارف کا بیان کرنا شریعت کا کام ہے۔اس لئے فطرت کو پامال نہیں کیا۔

دینِ فطرت کی عجیب تعبیر...... اگر انسان ان قوتوں کو کھودے تو انسان ہی باقی نہیں رہے گا۔پھر شریعت پر عمل کون کرے گا۔ان چیزوں کے مجموعے ہی کا نام انسان ہے۔ہاتھ اور پیر کے مجموعے کا نام انسان ہے۔اگر ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دیں تو شرعی اعمال کون انجام دے گا؟ اگر پیر کو کاٹ کر پھینک دیں تو بیت اللہ اور مسجد میں کون جائے گا۔ان اعضاء کو صحیح رکھ کر ہی دین پر صحیح عمل ہوسکتا ہے۔

---

① الصحیح لمسلم ، کتاب الایمان،باب قول النبی صلی الله علیه وسلم،من غشنا فلیس منا، ج ا ص:۹۹، رقم:۱۰۱. ② الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الحرب خدعة، ج: ۱۰ ص:۲۲۹.

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ قوتوں اور اعضاء کو زائل کردو یہ دین ہے کسی جوگی نے ہاتھ اٹھایا اور برس دن اٹھائے رکھا۔ حتیٰ کہ وہ خشک ہوگیا۔ تو اس قوت کو زائل کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دین دار بن گئے۔ تو تعذیب جسمانی کا نام دین نہیں ہے۔ تہذیب روحانی کا نام دین ہے یہ جب ہوگی جب جسم کو استعمال میں لگاؤ۔ عمل کرو۔ تو ہاتھ کاٹ دینا یا مٹا دینا یہ دین نہیں ہے۔ ہاتھ کو شریعت کے مطابق صحیح مصرف میں استعمال کرنا یہ دین ہے۔ فرمایا گیا: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ" ① "مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔

تو یہ دین ہے کہ ہاتھ کو مار پٹائی کے لئے استعمال کرو۔ مگر مومن کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔ سچے کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔ جھوٹے کے مقابلے میں مجرم کے مقابلے میں استعمال کرو۔ تو اگر ہاتھ کی قوت زائل کردی تو مجرم کے اوپر ہاتھ اٹھانے والا کون ہوگا؟ دین دار بن کر سارے لنجے بن جائیں گے۔ غرض شریعت اسلام دین فطرت ہے اور دین فطرت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی قوت کو پامال نہ کیا جائے۔ ہر قوت کا صحیح مصرف بتلایا جائے۔ تو غصہ، جھوٹ، دھوکہ اور جذبہ اطاعت اور تواضع کا بھی مصرف بتلایا۔ سب چیزوں کے مصارف کو متعین کرنا یہ شریعت کا کام ہے اور ان ساری قوتوں کے حقوق ادا کرنے کا نام اسلام ہے کسی ایک قوت کو آپ کھودیں اس کا حق ادا نہ کریں۔ اسی حد تک آپ کا اسلام ناقص ہوگیا۔ دین ناقص ہوگیا۔

ان ساری چیزوں کے مجموعے کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً کر کے دکھلا دیا۔ ہاتھ یوں اٹھاتے ہیں، چلتے یوں ہیں۔ غصہ یوں کرتے ہیں۔ مہربانی یوں کرتے ہیں۔ محبت کا یہ طریقہ، عداوت کا یہ طریقہ ہے۔ ان ساری سنتوں کو راہنما بنا کے اپنی اندرونی قوتوں کو استعمال کیجئے۔ نمونہ نبی کا سامنے ہو۔ جذبہ آپ کے اندر ہو تو آپ کا دین کامل و مکمل ہو جائے گا بہر حال راہ رو کے اندر رہروی کی طاقت ہونی چاہئے۔ اگر اس میں طاقت موجود ہے تو راستہ بھی موجود ہے۔ راستے کی علامتیں بھی موجود ہیں۔ روشنی بھی موجود ہے۔ راہنما بھی موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خلل جتنا ہے وہ راہ رو کے اندر ہے۔

راہ دکھلائیں کسے راہ رومنزل ہی نہیں

جود و عطا...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: روزانہ آسمان دنیا پر حق تعالیٰ کی تجلیات اترتی ہیں، اور ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ جیسا ہاتھ ان کی شان کے مناسب ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ:

اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَدْعُوْنِیْ ۔ اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَسْتَغْفِرُنِیْ

اَنَا الرَّازِقُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَسْتَرْزِقُنِیْ

میں بادشاہ ہوں کوئی ہے مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں کوئی ہے بخشش طلب کرنے والا؟ میں

① الصحيح للبخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده: ۱/۱۳ رقم: ۱۰۔

رزق دینے والا ہوں کوئی ہے رزق طلب کرنے والا؟ ①

یعنی بندے کو تکلیف نہیں دی کہ تو اُڑ کر آسمان پر آ۔ اپنی تجلیات سے عرش سے آسمان دنیا پر نزول فرمایا۔ جو آپ کا آسمان ہے تو بجائے آپ کو تکلیف دیتے کہ اوپر چڑھو۔ خود بادشاہوں کا بادشاہ نیچے آتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔

اور ہاتھ پھیلانا سائل کا کام ہے۔ مگر یہاں دینے والا ہاتھ پھیلا رہا ہے کہ مانگو کون مانگتا ہے، صبح صادق تک یوں ہی آوازیں لگتی رہتی ہیں جن کو اللہ نے توفیق دی ہے اٹھتے ہیں تہجد پڑھتے ہیں گڑگڑاتے ہیں۔ مانگتے ہیں۔ ان کو منہ مانگی مرادیں ملتی ہیں جو محروم القسمت ہیں وہ پڑے رہتے ہیں۔

رعایت وسہولت...... پھر آسانی کتنی کر دی۔ تہجد کو ہی دیکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ رکعات بھی ثابت ہیں آٹھ بھی اور چار رکعات بھی ثابت ہیں حتیٰ کہ دو بھی ثابت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو بھی پڑھ لیں تو بھی آپ تہجد گزار ہیں، بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر اخیر شب میں اٹھنا ذرا بھاری ہو تو عشاء کی سنتوں کے وتروں سے پہلے دو یا چار رکعات تہجد کی نیت سے پڑھ لیں وہ بھی تہجد ہی شمار ہوگا۔ یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اخیر شب میں تہجد پڑھی۔ بلکہ حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن ایک شخص حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ عمر بھر تہجد پڑھا۔ ملائکہ عرض کریں گے۔ یا اللہ اس نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ کیسے لکھ دیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ سونے کے لئے لیٹتا تھا تو نیت کرتا تھا کہ آج ضرور اٹھوں گا۔ مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ تو آنکھ نہ کھلنا یہ اس کے قبضے کی چیز نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے تھا یہ تو نیت کر لیتا تھا اور ''نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ'' آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، جب عمر بھر روزانہ نیت کرتا تھا تو لکھ دو کہ روزانہ تہجد پڑھتا تھا۔ پوری عمر کا اجر وثواب (باوجود سوئے رہنے کے اس کو) مل جائے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی نہ پڑھے تو کم از کم سوتے ہوئے نیت ہی کر لیا کرے کہ اللہ میاں آج ضرور اٹھوں گا۔ یہ دوسری چیز ہے کہ اگر آنکھ کھل جائے تو تہجد پڑھ لو۔ اگر آنکھ نہ کھلے گی تو نیت کے لحاظ سے تہجد گزار بن جاؤ گے، تو اس سے زیادہ آسانی اور کیا چاہتے ہو۔ نیت کرنے میں ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ نہ پیسہ نہ دھیلہ مفت کا ایک ثواب۔ اتنی بھی کوئی کوشش نہ کرے۔ تو اس محروم القسمتی کا کسی کے پاس کیا علاج ہے۔ بلکہ آدمی ہر خیر کی نیت کرے۔

انوار السنن...... اچھا خیر کی نیت بھی نہ کرو یہ جو روزانہ فرائض کے علاوہ اعمال انجام دیتے ہو۔ مثلاً بازار جا رہے ہو۔ سودا خرید رہو۔ کپڑا لا رہے ہو۔ دنیا بھر کے کام کرتے ہو اگر ان کاموں میں یہ نیت کر لو کہ حق تعالی کے انعامات ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ انعام کا استعمال کرو تو میں تعمیل حکم الٰہی کے واسطہ یہ چیزیں خرید رہا ہوں۔ تو وہی اجر ملنا شروع ہو جائے گا جو عبادت کے اوپر ملتا تو ذرا سی نیت کے پھیر سے آدمی چاہے تو عادت کو عبادت بنا لے اور ذرا

① مسند احمد، حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، ج: ۲، ص: ۲۵۸، رقم: ۷۵۰۰۔

سی غفلت اور بے فکری سے عبادت کو چاہے تو عادت بنالے کہ بے اجر ہو کر رہ جائے۔

تو جب اللہ نے عادتوں پر بھی اجر رکھا ہے اور اس میں نیت کافی ہو جاتی ہے تو وہ آدمی بڑا محروم ہے کہ نیت ہی نہ کر پائے۔ جس پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی محنت نہیں بس ذرا سی فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب آدمی ایسا بھی کیا ہو کہ شتر بے مہار بن جائے کہ اسے نیت کرتے بھی تعجب ہو کہ میں خود بھی آزاد اور میری فکر بھی آزاد۔ تو پھر آزادی کے ساتھ جنگل میں چلے جانا چاہئے۔ شہر میں کیوں رہے۔ کسی بھی چیز کا پابند کیوں رہے؟

تو سنن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتنی آسان ہیں کہ ان میں اگر آدمی ذرا فکر کرے تو محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اور اجر و ثواب کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ لیکن ۔

اگر تو ہی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

خود اگر ارادہ نہ کرو تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ لقمان حکیم کے پاس بھی اس کی دوا نہیں یہ ایسا لاعلاج مرض ہے۔ تو میرے بزرگو!

سب سے پہلے ادب اور عظمت پیدا کرو۔ دین کی اہل دین کی اور وسائل دین کی۔ اس کے بعد اپنی نیت صحیح کرو۔ نیت کی صحت کے ساتھ جذبہ رکھو کہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع کریں گے جو نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں ہے وہ نور اور برکت تمہارے بنائے ہوئے نمونوں میں نہیں ہو سکتا۔ ہاں میں کہتا ہوں کہ مشائخ طریقت ہی بنائیں وہ ان کے حال کی بات ہو گی۔ لیکن نقالی جب کریں تو رسم پیغمبر کی کریں گے۔ اس لئے کہ رسم پیغمبر سے بہتر کوئی رسم نہیں ہو سکتی۔ جو طرز کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس میں جو نور ہے وہ کسی کے طرز کلام میں نہیں ہو سکتا۔ تو انوار و برکات اہل اللہ کے کلام میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے عمل میں بھی لیکن ع

از تو دہٗ کلاں بردار

جب اٹھانا ہی ہے تو بڑے ڈھیر میں سے اٹھاؤ۔ جس سے اونچے پہنچو تو اصل چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع ہے۔

آثارِ محبت..... تو محبت کا جذبہ رکھو اور محبت کے ساتھ اطاعت کا جذبہ رکھو۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''مَنْ أَحْيا سنتي فَقَدْ احبني وَمَنْ احبني كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ'' ① ''جس نے میرے ساتھ محبت کی وہ میری اطاعت ضرور کرے گا اور جو میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا''۔

معلوم ہوا کہ محبت کا ثمرہ لازمی اطاعت ہے اگر اطاعت اور اتباع سنت نہیں ہے تو دعویٰ محبت باطل ہے نیز عاشق دعویٰ نہیں کیا کرتا۔ عاشق تو عمل کرتا ہے جو کہتا پھرے کہ میں فلاں کا عاشق ہوں لوگ کہیں گے جھوٹا ہے مکار ہے عاشق کہیں دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔ عشق کی اولین منزل ترک دعویٰ ہے کہ دعویٰ نہ رہے فنائیت محضہ ہو جائے

① سنن الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع ج: ۵ ص: ۴۶، رقم: ۲۶۷۸۔

اور جو مدعی بنا ہوا ہے تو مدعی اپنی بقا کا قائل ہے اس میں فنائیت کہاں؟

غرض عاشق کے لئے دعوی کہاں؟ سب سے پہلی چیز عاشق کے لئے ترک دعوی ہے، اس لئے اگر کوئی عاشق رسول ہے تو اس کی علامت یہ ہے۔

کہ دعوی نہ ہو کہ میں عاشق رسول ہوں۔ بلکہ نادم ہو کہ جتنا عشق کرنا چاہئے تھا نہیں کرسکا۔ اور اس عشق کو اطاعت سے پہچانا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ: ''مَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ'' ''جو میرے ساتھ محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا''۔

تو محبت کی علامت اور اس کے ظہور کا طریقہ یہ فی الحقیقت اطاعت ہے، جیسا کہ ایمان کی علامت عمل صالح ہے تو ایمان نام محبت ہی کا تو ہے۔

''لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' (1) ''کوئی شخص تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت نہ اپنے نفس سے ہو اپنے اہل وعیال اور ماں باپ سے ہو''۔

اور اس کا پتہ چلتا ہے جب مقابلہ پڑتا ہے کہ ایک طرف اللہ ہے اور ایک طرف اولاد ہے کس کو اختیار کروں؟ جو محب اور مومن ہوگا وہ یقیناً اللہ کو ترجیح دے گا۔ اولاد کو ترک کردے گا۔

حدیث میں واقعہ آتا ہے کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے ایمان نہیں لائے تھے وہ کفار کی صف میں تھے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ادھر تھے۔ جب غزوہ بدر ختم ہوگیا اور وہ صاحبزادے ایمان لے آئے تو ایک دن انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اے باپ! اس جنگ (بدر) میں کئی مرتبہ اس کی نوبت آئی کہ آپ ٹھیک میری زد کے اوپر آگئے اور میں چاہتا تیر پھینکتا یا تلوار لگاتا تو یقیناً آپ کو ختم کردیتا۔ مگر دل میں خیال آیا کہ میرا باپ ہے میں بیٹا ہوکر باپ پر حملہ کروں۔؟ یہ اس نے کہا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس غزوہ میں تو میری زد میں نہیں آیا۔ اگر آجاتا تو خدا کی قسم سب سے پہلے تیرے گلے پر تلوار چلاتا۔ اس لئے کہ تو میرا بیٹا نہیں تھا۔ جب تو دشمن رسول اللہ بن گیا تو میں دشمنان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کررہا تھا۔ آل اور اولاد کا وہاں کیا کام؟

تو محبت خداوندی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ دوسری چیزوں سے پڑجائے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایمان اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بیٹے کو ختم کردینا چاہتے تھے تو محبت دو باتوں سے پہچانی جاتی ہے ایک یہ کہ دعوی ترک کردے۔ دوسرے محبوب کا اتباع کرے۔ اتباع بھی نہ ہو اور مدعی بھی ہو۔ وہ جھوٹا دعوی ہے۔ حقیقی دعوی نہیں ہے۔ اس لئے دعوی بھی ترک کیجئے نیت بھی اپنی صحیح کیجئے۔

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اکثر من الاهل، ج: ۱، ص: ۶۳.

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کیجئے۔

اسوۂ حسنہ...... اگر جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ جامع ہے جیسا کہ آپ خود دعوی کرتے ہیں کہ اللہ نے جامع رسول ہمارے پاس بھیجا۔ زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس کا نمونہ عمل نہ دکھلایا ہو تو آپ کو ہر گوشہ زندگی میں دیکھنا چاہیئے کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل کس طرح انجام دیا۔ اگر غمی ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غمی کس طرح انجام دی۔ آج تیجے دسویں اور چالیسیوں کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر شادی ہو تو میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح شادی کی۔ آیا اسی طرح سے برداریوں کے اندر نوید پھیری تھی۔ اسی طرح بڑھ چڑھ کر مفاخرت کی دعوتیں کی گئیں تھیں تو خوشی ہو یا غمی ہر چیز کے اندر مومن اور مسلم کی پہلی نگاہ اس پر جانی چاہیئے کہ میرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کر کے دکھلایا تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز میں تو آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور شادی بیاہ میں نہ کریں۔ موت اور غمی میں نہ کریں۔ یہ چیزیں آپ کے اختیار میں تھوڑا ہی دی گئیں۔ یہ چیزیں تو اہم چیزیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ معمولی معمولی چیزیں بھی آپ کے اختیار میں نہیں دی گئیں۔ لباس پہننا بھی آپ کے اختیار میں نہیں دیا گیا۔ آپ پابند ہیں کہ اسی نمونے کے مطابق پہنیں جو اللہ کے رسول کا نمونہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ کرتہ پہنو تو دایاں ہاتھ پہلے دائیں آستین میں ڈالو بایاں ہاتھ بعد میں ڈالو۔ تو سنت طریقہ یہ تھا کہ دایاں ہاتھ پہلے ڈالو اور بایاں بعد میں ڈالو۔ آج موجودہ تہذیب کے مطابق بایاں پہلے ڈالتے ہیں اور محبِ رسول اور عاشقِ رسول ہیں، عاشق تو وہ ہوتا ہے جو لباس پہنے تو دیکھے کہ میں سنت کی مطابقت کر رہا ہوں۔ یا سنت کے خلاف کر رہا ہوں۔ محبوب کے طرزِ عمل پر چل رہا ہوں۔ یا اپنے نفس کو محبوب بنا رکھا ہے اس کے نمونے پر چل رہا ہوں۔ تو لباس میں بھی آپ آزاد نہیں ہیں۔ فرمایا گیا جب رات کو سوتے وقت لباس اتارو تو اسے زمین پر یا فرش پر ویسے نہ ڈالو دو تین تہہ کر کے رکھو یا اور پر ٹانگو۔ فرماتے ہیں: "اِطْوُوْا ثِيَابَكُمْ تَرِدُ اِلَيْهَا اَرْوَاحُهَا" ①

"کپڑوں کو لپیٹ کر رکھوں۔ کپڑوں میں ارواح ہوتی ہیں"۔ کپڑے کی ایک روح ہے۔ اگر وہ نکل گئی تو کپڑے کی برکت جاتی رہے گی۔ پہننے کا حظ اور لذت ختم ہو جائے گی تو معلوم ہوا کہ لباس اتار کر رکھنے میں بھی آزاد نہیں۔ ایک طریقہ ہمیں بتلا دیا گیا ہے۔

نیند کا مسنون طریقہ...... اسی طرح ہم سونے میں بھی آزاد نہیں، سونے کے چار ہی طریقے ہیں یا آدمی الٹا لیٹ کر سوئے، یا چت لیٹ کر سوئے، یا دائیں کروٹ پر یا بائیں سوئے۔ الٹا لٹک کر یا کھڑے کھڑے نہیں سو سکتا۔ اس لئے یہی چار طریقے متعین ہیں۔

① المعجم الاوسط للطبراني، باب الميم، من اسمه: محمد ج: ۱۲ ص: ۴۴۱ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبراني في الاوسط وفيه عمر بن موسى بن وجيه وهو وضاع دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۵ ص: ۱۳۵۔

تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوندھا لیٹ کر سونا مکروہ ہے۔ شریعت نے اسے پسند نہیں کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں الٹے لیٹے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر سے ٹھوکر ماردی اور فرمایا: ''یَاجُنْدُبُ! یَاجُنْدُبُ! اِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةُ اَهْلِ النَّارِ'' ① ''یہ اوندھا لیٹنا جہنمیوں سے مشابہت ہے''۔

اہل جہنم اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے، مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ جہنمیوں سے مشابہت پیدا کرے۔ اس لئے اوندھا لیٹنا ناپسند کیا اور مکروہ قرار دیا۔

کوئی شخص چت لیٹے تو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ ضعیفوں کی سی ہیئت ہے۔ بیمار آدمی ہو تو چت پڑا رہتا ہے۔ ایسے ہی جو بے قابو گرتا ہے تو چت گرتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پہلوان نے پچھاڑ دیا اور وہ چاروں شانوں چت گرا یوں نہیں کہتے کہ چاروں شانوں پٹ گرا۔ تو چت گرنا بے قابو ہونے کی علامت ہے ضعیفوں کی سی ہیئت بنانے کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چناں چہ فرمایا گیا:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ ② ''قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے بہادر مسلمان بزدل مسلمان سے بہتر ہے''۔

بزدلی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی بہادری جمع ہوتی ہے تو ضعیفوں اور بے قابو لوگوں کی سی ہیئت بنانا پسندیدہ نہیں۔ اب رہا بائیں کروٹ پر لیٹنا یہ بھی جائز ہے مگر شریعت نے کچھ نامناسب سمجھا ہے اس واسطے کہ بائیں جانب قلب ہے، جب آپ بائیں رخ پر لیٹیں گے تو قلب کو سکون ملے گا اور جتنا زیادہ سکون ملے گا نیند گہری آئے گی اور جتنی گہری نیند آئے گی۔ آپ گھوڑے بیچ کر سوئیں گے۔ پھر نہ نماز کی فکر رہے گی، نہ تہجد کی۔ نہ قیام لیل کی تو اس سے عبادت کے نظام میں خلل پڑے گا۔ عبودیت کے اندر فرق پڑے گا تو نومِ غریق (گہری نیند) کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چوکنا سونا شریعت نے پسند کیا ہے۔ اس واسطے یہ بھی ناپسند ہے۔

اب ایک یہی طریقہ رہ جاتا ہے، یعنی دائیں کروٹ پر لیٹنا۔ یہی سنت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دائیں کروٹ پر جب آدمی لیٹے گا تو قلب بائیں جانب ہے وہ معلق رہے گا۔ جب معلق رہے گا تو گہری نیند کبھی نہیں آئے گی۔ چوکنا نیند آئے گی۔ اس وقت ارادہ کر کے سوئے گا جبھی آنکھ کھلے گی تو میں کہتا ہوں کہ ہم سونے میں بھی آزاد نہیں آپ سمجھتے تھے کہ یہ ایک عادت کی چیز ہے۔ طبعی چیز ہے طبعیات پر بھی شریعت نے آداب عائد کر دیئے ہیں ہم تو سونے میں بھی پابند ہیں چہ جائیکہ شادی اور غمی میں آزاد ہو جائیں۔ چہ جائیکہ رسوم میں آزاد ہو جائیں تو لباس اور سونے کے اندر بھی قانون شریعت لاگو ہے۔

---

① سنن ابن ماجه، كتاب الادب، باب النهي عن الاضطجاع على الوجه: ۲/ ۱۲۲۷ رقم: ۳۷۲۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجة ج: ۸ ص: ۲۲۴، رقم ۳۷۲۴.

② الصحيح لمسلم، كتاب القدر، باب في الامر بالقوة وترك العجز... ج: ۱۳ ص: ۱۴۲.

رسوم وخیالات اور قانون شریعت......حتی کہ ہمارے خیالات کے اوپر بھی یہ قانون لاگو ہے کہ خیالات میں بدبھی دل کے اندر نہ لاؤ۔ فکر بھی صحیح ہو عقیدہ بھی صحیح ہو قلب پاک چیز ہے پاک ظرف ہے اس کے اندر پاک چیزیں بھرو، ناپاک چیزیں مت بھرو، تو ہمارے قلب پر بھی قانون شریعت عائد ہے۔

سلاطین دنیا کا قانون بدنوں پر عائد ہوتا ہے اس لئے کہ بدن تک ہی ان کی رسائی ہے ہمارے قلب اور قلبی خیالات کو وہ نہیں جان سکتے لیکن جو ﴿عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ہو دلوں کی کھٹک سے واقف ہو اس کا قانون تو دل پر بھی عائد ہوگا۔ وہ دل کی حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے تو دیا نتاً ہم پر ضروری ہوا کہ تنہائی میں بیٹھ کر بدفکری بھی نہ کریں۔ خیالات فاسدہ بھی نہ لائیں۔ وساوس بھی سوچ سوچ کر نہ لائیں۔ غیر اختیاری طور سے آجائیں تو بلا سے آجائیں۔ تو جب قلوب کے خیالات، لباس، سونا اور جاگنا سب میں پابند ہیں۔ تو ہم دنیا اور معاشرہ کے اہم امور سے کیسے آزاد ہو جائیں گے۔ ان میں بھی ہم پابند رہیں گے۔ شادی ہوگی اس میں دیکھنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شادیاں کس طرح سے ہوئیں۔ غمی ہوگی تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے غمی کے وقت میں کیا کیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم بیان کر کے روؤ۔ بلکہ فرمایا: "اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ" ① "تم بیان کر کر کے روتے ہو اس سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے"۔

اور وہ عذاب یہ نہیں ہوتا کہ جہنم میں ڈال دیا جائے۔ بیان کرتے ہوئے جب یوں کہاں جاتا ہے کہ "وَاجَبَلَاهُ! وَاكَذَاهُ" ہائے تُو تو پہاڑ جیسا تھا۔ ہائے تو تو سونے جیسا تھا۔ تو ملائکہ چوکے لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ ہی تھے۔ آپ واقعی ایسے عظیم تھے۔ یہ جو طعن کا طرز ہوتا ہے۔ یہ برچھے ہے۔ زیادہ آدمی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو یہاں ہم بیان کر کے مناقب بیان کرتے ہیں۔ وہاں عذاب دیا جارہا ہے۔ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اگر بڑے سے بڑا غم پیش آجائے تو صبر کرو۔ تحمل سے کام لو۔ عمل کے نظام میں خلل نہ پڑے۔ رونا اور رونے کو لے کر بیٹھنا اور ماتم کرنا یہ بزدل عورتوں کا کام ہوتا ہے۔ مردوں کا کام نہیں ہے کہ رو رو کر گزاریں۔ بڑے سے بڑا صدمہ آئے تو مضبوط قلب ہو کر رہے۔ ماتم کے کیا معنی؟ تو رونے کا جب وقت آئے تو آپ اس وقت بھی شریعت کو دیکھیں گے کہ میرے نبی نے کیا کیا۔ آنکھوں سے رونا جائز ہے۔ بیان کر کر کے اور نوحہ کر کے رونا، یہ ناجائز ہے۔

ترکِ سنّت کا وبال......غرض شادی ہو، غمی ہو، چلنا ہو پھرنا ہو، اٹھنا ہو بیٹھنا ہو، سونا ہو جاگنا ہو، راہنما اس میں سنّت بنے گی اگر سنّت کو ترک کر دیا جائے اور حدیث کو قطع کر دیا جائے تو زندگی بنتی نہیں۔ قرآن تو دستور اساسی ہے۔ دستور اساسی سے معاشرہ تھوڑا ہی بنا کرتا ہے جب تک اس کا بیان کر کے اس کی جزئیات سامنے نہ آئیں اور بیان شدہ چیزوں میں سے استنباط کر کے سارے پہلو نہ کھول دیئے جائیں۔ تو عمل کی ہیئت نہیں بن سکتی اصول اور کلیات سے عمل تھوڑا ہی ہوسکتا ہے۔ عمل جزئیات سے ہوتا ہے جزئیات جب نکلتی ہے جب کلیات میں سے نکالی

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء اهله عليه ج: ۴ ص: ۵۰۰.

جائیں اور کلی کا بیان کیا جائے تو بیانِ رسول کو اگر قطع کر دیا۔ تو کلیات ہی کلیات رہ جائیں گی عمل ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقط قرآن پر اکتفا کرنے والے فی الحقیقت کام چوروں کی جماعت ہے۔ اس لئے کہ نہ انہیں عمل مقصود اور نہ عمل کی محنت اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں لوگ پکا مومن سمجھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ حدیث کا رشتہ (قرآن حکیم سے) قطع کر دو۔ نہ ہوگا نہ عمل کی ضرورت پیش آئے گی۔ قرآن سے جتنا ہمارا جی چاہا کر لیا۔ جتنا جی نہ چاہا نہ کیا اس لئے میں نے عرض کیا کہ سنت راہنما ہے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ایک روشن مینار ہے جس سے اللہ تک پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے، اور آپ کی سنتیں اس راستہ پر چلنے کی راہنمائی کرتی ہیں اور وہ راستہ کتاب اللہ ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اور چلنے والے آپ ہیں۔ اگر آپ میں طاقت ہے تو آپ چلیں گے اور طاقت نہیں ہے یا آپ پیدا بھی نہیں کرنا چاہتے تو چلنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اس کا الزام کتاب وسنت پر نہیں آئے گا۔ چلنے والوں کی کوتاہی پر آئے گا۔

نور اور کتاب...... یہی چند چیزیں ہیں جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ ٥ يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ① "حق تعالیٰ نے بشارت سنائی کہ تمہارے پاس نور آ گیا۔ اللہ کی جانب سے آیا ہے۔ معاذ اللہ کوئی بنا ہوا نہیں کسی نے افترا کر کے کہہ دیا ہو کہ میں نور ہوں۔ بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نور تمہارے پاس پہنچ گیا۔ مفسّرین لکھتے ہیں کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے جو روشنی راہ ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ فقط روشنی نہیں آئی کتاب مبین بھی آئی ہے جو سیدھا راستہ ہے"۔ ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ② "یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو۔ یہ ایک ہی راستہ ہے۔ سبل متفرقہ پر مت چلو"۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتدع اور متبع سنت کی کچھ علامتیں ہیں، بدعت پسند کی علامت ہمیشہ مجادلہ اور بدکلامی ہے۔ اور متبع سنت کی علامت ہمیشہ سلامتی اور سادگی کے ساتھ مسئلہ بیان کرنا ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس قوم میں بدعت کا نزغہ پیدا ہو گیا۔ جدال ومجادلہ بدگوئی وبدکلامی اور جھگڑا اس کے اندر ضرور آ جائے گا۔ اشتعال انگیزی اور فساد پھیلانا اس کا وطیرہ ہوگا اور جو سنت پر قائم ہوگا۔ وہ نبی کا طریقہ پیش کر دے گا۔ نہ اس میں جذبات کی ضرروت ہے نہ برا کہنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال روشنی اور سیدھا راستہ نور اور کتاب مبین سے مراد ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: ﴿يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ "اللہ اسے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ سلامتی کے راستے اس کے سامنے کھلتے ہیں۔ جو اس کی رضا کی پیروی کرے اور چاہتا ہو کہ اللہ راضی ہو جائے"۔

① پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۵، ۱۶۔ ② پارہ: ۸، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۱۵۳۔

اسلام قانون نہیں، دین ہے...... ایک تو یہ ہے کہ محض رسمی طور پر اسلام کو ایک لاء اور قانون کی طرح سمجھ کر اس پر چلیں تو یاد رکھئے اسلام لاء اور قانون نہیں ہے۔ دین ہے قانون اور دین میں فرق یہ ہے قانون روکھی دفعات کا نام ہے اور دین وہ ہے جس میں محبت اور عشق بھی شامل ہو تو اسلام قانون نہیں ہے بلکہ دین ہے تو دین کے اندر طریق ثواب بھی ہوگا، طریقِ عشق بھی ہوگا محبت بھی ہوگی اور قلب کے جذبات بھی ہوں گے، اس لئے فرمایا کہ: جو رضا کا طالب ہو۔ قانون پر اس لئے بھی چلتے ہیں کہ نہیں چلیں گے تو پٹائی ہوگی نہیں چلیں گے تو جیل پہنچ جائیں گے۔ کچھ جان کا خوف اور کچھ اپنے منافع پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ لیکن دین پر محض اس لئے چلتا ہے کہ میرا اللہ راضی ہو۔ محبوب کی رضا کے لئے اطاعت اور پیروی کرتا ہے اور جو رضا نہیں چاہتے تو فرمائیں گے کہ ہم اس سے راضی ہونا نہیں چاہتے۔ ہم تو "غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" ہیں محتاج تو تم ہو جب تم راضی نہیں ہونا چاہتے تو ہم کیوں راضی ہوں؟

نورِ علم و اخلاق...... مقصد اور نصب العین کیا ہے؟ ﴿یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ "تا کہ اللہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور میں لے آئے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ نور سے مراد حسّی نور نہیں ہے۔ یہ تو پہلے سے بھی موجود تھا۔ سورج بھی روشن تھا۔ چاند بھی روشن تھا۔ اس میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ معنوی نور ہے اور معنوی ہی ظلمت مراد ہوگی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ معنوی نور ہیں حسّی نور نہیں ہیں۔ اور معنوی نور جس سے اچھائی اور برائی میں تمیز ہو۔ وہ علم کامل اور عدل و اخلاق ہیں جس سے آدمی کو سیاہ اور سفید میں تمیز ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس نور کا مجموعہ ہیں وہ نور علم اور نور اخلاق ہیں، جس پر نبوت کی بنیاد ہے۔

نبی علم وحی سے لے کر آتے ہیں اور اخلاق کاملہ اپنی فطرت اور اللہ کے دین سے پیش کرتے ہیں تو اخلاق کا نور اور علم کا نور، یہ دونوں چیزیں پیش کرتے ہیں علم کے نور میں حدت اور شدت ہوتی ہے اور اخلاق کے نور میں رقت اور رافت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کا ہے علم میں ترفع کا خاصہ ہے۔ عالم کبھی گردن جھکا کر نہیں رکھتے علم ہمیشہ اسے اونچا لے جائے گا۔ رفعت کی طرف لے جائے گا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بعض دفعہ تکبر پیدا ہو جاتا ہے بعض دفعہ نخوت پیدا ہو جاتی ہے بعض دفعہ غرور اور گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے تو علم کے گھمنڈ کے لئے بدرقہ عبدیّت ہے اور عبدیّت نہیں آتی جب تک کسی شخصیّت کے آگے آدمی پامال نہ ہو۔

پیش مرد کاملے پامال شو

تو علم رفعت دکھلاتا تھا اور شخصیتوں کے آگے جھکنا تواضع سکھلاتا تھا ان دونوں کو جب ملایا تو وقار بھی جمع ہو گیا۔ تواضع بھی پیدا ہو گئی علم سے وقار آتا ہے۔ اور شخصیتوں کے آگے جھکنے سے قلب میں تواضع پیدا ہوتی ہے اگر علم نہ ہو اور شخصیتوں کے آگے جھکے تو ذلت نفس پیدا ہوگی جس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے اور اگر محض علم ہو اور شخصیتیں سامنے نہ ہوں تو کبر اور نخوت کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لئے جو اہل علم شخصیتوں سے وابستہ نہیں وہ عموماً

متکبر ہوتے ہیں اور جو علم سے وابستہ نہیں۔ مگر شخصیتوں سے وابستہ ہیں۔ ان میں ذلت نفس پیدا ہوگی۔

علم بلا شخصیت...... اور دونوں کی مثالیں دو قوموں میں موجود ہیں یہود کی امّت ایک علمی امت ہے تورات ان کو دی گئی۔ جس کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① ''ہر چیز کی تفاصیل بیان کی گئیں''۔ لیکن اہل تورات نے شخصیتوں سے اجتناب کیا، انبیاء علیہم السلام سے وابستگی کو کم کیا۔ ان کی توہین کی۔ ان کو قتل کیا:

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ ②

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے حرمتی کی اور کہا کہ وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی، کتاب اللہ (تورات) ہمارے لئے کافی ہے۔ جب تورات موجود ہے، ہم اس کو سمجھیں گے اور چلیں گے۔ نبی کی ضرورت کیا ہے۔ تو شخصیتوں کا دامن چھوڑ دیا تو محض کتاب کا علم ان کے لئے نخوت وترفع اور استکبار کا ذریعہ بن گیا۔ یہ متکبر قوم ہے جو نخوت شعار ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا﴾ ③ ''ہم اپنی آیتیں پھیر دیں گے۔ اس قوم سے جو زمین کے اندر متکبر بنی ہوئی ہے۔ جس کا کام نخوت شعاری، کبر اور ترفع ہے کہ اس ترفع اور تکبر نے ان کے قلب کا ستیاناس کر دیا۔ قلب کے رخ کو غلط کر دیا ہے اور اس درجہ کجی اور زیغ پیدا کر دیا ہے کہ جب ہماری کوئی آیت سامنے آتی ہے تو ایمان نہیں لاتے جب سیدھی راہ سامنے آتی ہے تو کبھی اس راستہ پر نہیں چلتے اور جب کبھی کوئی غــیّ طغیانی یا کجی کا راستہ آتا ہے تو فوراً چل پڑتے ہیں سنت پیش کرو نہیں چلتے۔ بدعت پیش کرو فوراً چل پڑتے ہیں''۔ بہرحال یہود کو متکبر کہا گیا اس لئے کہ فقط کتاب کو اختیار کیا اور شخصیتوں کو ترک کر دیا۔

شخصیت بلا علم...... نصاریٰ کی امّت یہ عملی امّت ہے اس کو علم زیادہ نہیں دیا گیا۔ انجیل میں احکام زیادہ نہیں ہیں۔ یہ فی الحقیقت تصوف کی کتاب ہے۔ اس میں تزکیۂ نفوس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے انہوں نے شخصیتوں کو اتنا پکڑا کہ کتاب کو چھوڑ کر شخصیتوں کو خدا کا قائم مقام بنا دیا۔

مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہا، بعضوں نے اللہ کہا: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ ④

انہوں نے اپنے علماء اور صوفیاء کو رب بنا دیا خدا بنا دیا تو اس درجہ شخصیتوں کا دامن پکڑا پھر جھکتے جھکتے ذلت نفس پیدا ہوگئی۔ اور شرک میں گرفتار ہو گئے تو ان سے علم چھوٹ گیا اور شرک آ گیا۔ یہود میں شرک نہیں تھا تو تکبر

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۵۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۸۷۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶۔ ④ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۱۔

پیدا ہو گیا تو فقط کتاب ہوگی تو تکبر پیدا ہوگا۔ فقط شخصیت کی پیروی ہوگی تو ذلت نفس پیدا ہوگی اور کتاب وشخصیت کو ملا دو تو وقار کے ساتھ تواضع للہ پیدا ہو جائے گی نہ کبر رہے گا نہ ذلت نفس باقی رہے گی۔ تو امت مسلمہ نے یہ دونوں چیزیں سنبھال لیں ایک طرف اہل اللہ کا دامن پکڑتی ہے اور ایک طرف کتاب وسنت کا دامن پکڑتی ہے۔ دونوں چیزوں کو ملا کر چلتی ہے تو وقار بھی ہے خودداری بھی ہے اور تواضع للہ بھی ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَقَدْ تَتَّبِعُوْنَ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ بَاعًا بِبَاعٍ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ دَخَلَ اَحَدًا" الخ ① "اے مسلمانو! تم لوگ پچھلی امتوں کی خوب پیروی کرو گے۔ بالشت بالشت بھر، ہاتھ ہاتھ بھر، دو دو ہاتھ بھر یعنی حقیر سے حقیر چیزوں میں اور بڑی سے بڑی چیزوں میں۔ حتی کہ اگر پچھلی امتوں میں سے کوئی گوہ کے سوارخ میں گھسا ہوگا جو فعل لغو اور عبث ہے تم میں بھی ایسے پیدا ہوں گے جو یہ فعل لغو اور عبث کریں گے"۔ عرض کیا یارسول اللہ! وہ پچھلی امت کون سی ہے؟ فرمایا: وہی یہود ونصاریٰ۔

غرض فرمایا گیا کہ: تم یہود ونصاریٰ کی پیروی کرو گے۔ عبادات میں، اعتقادات میں، معاشرت میں، معشیت میں، گھریلو زندگی میں، اجتماعی زندگی میں ہو بہو پیروی کروے گے۔ حتی کہ صورتوں شکلوں اور معنویّت میں بھی ان کے پیرو بنے ہوئے ہونگے۔ تو یہود ونصاریٰ کے دونمونے بیان کئے۔ ایک متکبر امّت ہے، جس نے کتاب کو لے کر شخصیتوں کو چھوڑ دیا۔

ایک عیسائیوں کی ضال اور گمراہ امت ہے۔ جنہوں نے شخصیتوں کو لے کر کتاب کو چھوڑ دیا تو امّت میں بھی دونوں نمونے موجود ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ کو ہاتھ میں لے کر چلتا ہے۔ سلف وآئمہ اور علماء سب کو ترک کرتے ہیں۔ "نَحْنُ رِجَالٌ وَهُمْ رِجَالٌ" "ہم بھی آدمی وہ بھی آدمی"۔ ضرورت کیا ہے کسی کے سامنے جھکنے کی کتاب موجود ہے تو بلاشبہ اتنا دعوی تو صحیح کیا مگر فقط کتاب کا اثر یہ ہے کہ استکبار اور جمود نیز رفعت وترفع کی شان ان میں پیدا ہوگئی۔

ایک طبقہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کتاب اللہ کیا ہے، ہم نہیں جانتے کہ بخاری اور مسلم کیا ہے۔ یہ جو اہل اللہ اور اہل کمال شخصیتیں ہیں یہی ہمارے لئے کتاب ہیں۔ یہی ہمارے لئے طریقہ ہیں۔ جو یہ کہیں گے ہم وہ کریں گے۔

شریعت وطریقت کا مابہ الامتیاز...... ظاہر بات ہے کہ نبی کے بعد اہل اللہ میں سے معصوم کوئی نہیں۔ اور معصوم نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ گناہ کرتے ہیں۔ یعنی دینی اعمال میں بہت سی چیزیں غلبہ حال میں ایسی سرزد ہوتی ہیں کہ حقیقتاً صحیح ہوتی ہیں۔ مگر ظواہر شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ مغلوب الحال جو ہوئے۔ اگر فقط شخصیتوں

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتتبعن سنن من قبلکم، ج: ٦، ص: ٢٦٦٩، رقم: ٦٨٨٩.

کی پیروی رہ جائے اور کتاب وسنّت کے اصول سامنے نہ ہوں تو ان کے احوال سے جو ان کی حرکتیں سرزد ہوئی ہیں ان میں بھی پیروی کریں گے تو گمراہ ہوں گے۔

منصور نے اگر وجد میں آکر "اَنَـا الْحَقُّ" کہہ دیا اور منصور کی ہر چیز شریعت بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا اَنَــا الْـحَقُّ کہے کہ میں بھی خدا ہوں۔ حالانکہ وہ غلبہ حال میں ایک کلمہ سرزد ہوا تھا۔ نہ یہ کہ وہ اصول ہے۔ تو شریعت قانون کلی کا نام ہے اور طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ قانون کلی تو ہر کس وناکس کے لئے پیغام ہوتا ہے اور شخصی احوال دوسرے کے لیے حجت نہیں ہوتے ہر ایک کی شخصی حالت الگ الگ ہے۔ اگر منصور نے "اَنَـا الْحَقُّ" کہا تو میرے لئے فرض نہیں ہے کہ میں بھی "اَنَا الْحَقُّ" کہوں۔ ہاں اگر وہ حال میرے اندر پیدا ہو جائے پھر غیر اختیاری طور پر میں کہہ دوں تو پھر کسی کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر حال نہ ہو اور ان کی وجدی حرکات کی نقالی کروں تو یہ محض رسوم کی پیروی ہے۔ بہر حال ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے کہ اس نے کہا کہ اصل کتاب ناطق تو یہ اہل اللہ ہیں ہم نہیں جانتے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے اصل یہ ہیں۔ ان کے سامنے جھکے تو شرک اور بدعت میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسرا طبقہ کتاب پر اس درجہ جھکا کہ شخصیتوں کو چھوڑ کر کبر اور نخوت میں مبتلا ہوا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: " مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَاءِ نَا فَفِيْهِ شِبْهٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا فَفِيْهِ شِبْهٌ مِّنَ النَّصَارٰى "" ہمارے علماء میں سے جو بگڑتا ہے وہ یہود کے نقش قدم پر ہوتا ہے اور عبّاد اور زہاد میں سے جو بگڑتا ہے وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر ہوتا ہے'۔ محقق کون ہے؟ جو نہ تکبر میں مبتلا ہو نہ ذلت نفس میں بلکہ وقار کے ساتھ تواضع للہ انجام دیتا رہے۔ اور یہ جب ہوگا کہ کتاب اور شخصیت دونوں کو ملا کر ان کا دامن پکڑ کر آدمی چلے تو حقانی علم وعمل اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے اور تا دب مع اللہ نصیب نہیں ہو سکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے۔

مدرسہ وخانقاہ...... واقعہ یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو علم مدارس میں سکھلایا جاتا ہے اور تربیتِ اخلاق خانقاہ میں ہوتی ہے۔ مدرسی ہونے کے ساتھ جب تک آدمی خانقاہی نہ بنے تکمیل نہیں ہوتی محض خانقاہ میں جائے گا تو آدمی وجدی بن جائے گا۔ اسے خانقاہ میں خوب وجد آئے گا اور کورا مدرس بنے گا تو نجدی بن جائے گا۔ تو اس راہ میں نہ وجدی ہونا کافی نہ نجدی ہونا کافی۔ نجد اور وجد دونوں کو آدمی جمع کرے۔ تبھی کامل بنے گا۔ ایک طرف آدمی علم لے جس کے لئے مدرسہ جانا پڑے گا اور ایک طرف تربیّت بھی لے اس کے لئے خانقاہ جانا پڑے گا۔ بہر حال دونوں چیزوں کو جمع کرنا یہ محقق ہونے کی علامت ہے۔

یہ جو مولویوں اور صوفیوں کی لڑائی ہے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک طرف کورے مولوی جن میں عشق کی کمی ہے اور ایک طرف کورے عاشق جن میں علم کی کمی ہے محقق اور کامل کبھی نہیں لڑا کرتا۔ اس کے ظرف کے اندر وسعت ہوگی تو کامل بننے کی کوشش کیجئے۔

برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

''ایک ہاتھ میں جامِ شریعت ہونا چاہئے اور ایک ہاتھ میں جامِ عشق ہونا چاہئے''۔ آگ بھی ہو اور پانی بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی۔ جب جا کے آدمی میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ کمال کی کوئی صورت نہیں۔ اور اعتدال بھی تبھی ہوگا جب جلال و جمال جمع ہو جائیں گے۔

روح کا علاج...... تو فرمایا گیا: ﴿یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ﴾ ''اللہ تعالیٰ اس آدمی کی رہنمائی فرمادیتے ہیں۔ جو ہماری رضا کی پیروی کرے''۔

اور رضا کا مقام ہے۔ رضا اسی کو حاصل ہوگی جو قلب کو متوجہ کرے گا۔ باطن سے گویا ابتداء ہوئی۔ اہل باطن سے آدمی اپنا علاج کرائے گا۔ جبھی تو رضا پیدا ہوگی۔

جیسے بدن پر بیماری آتی رہتی ہے۔ دل اور نفس پر بھی آتی ہے۔ بدن کی بیماریوں کے لئے طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ جو کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ روح کی بیماری ہوگی تو روحانی طبیب کے پاس جانا پڑے گا۔ جو وہ کہے گا کرنا پڑے گا۔ وہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ کہے گا معصیت سے پرہیز کرو۔ روزانہ کے اعمال شریعت غذا ہیں۔ ان میں کوتاہی نہ کرنا اور دوا ذکر اللہ ہے۔ اس کی اتنی تسبیح پڑھنا۔ اتنا اللہ کا نام لینا۔ تو دوا، غذا اور پرہیز سب ہی کچھ ہے۔

بہر حال جیسے بدن پر بیماریاں آتی ہیں۔ ایسے ہی نفس پر بھی بیماریاں آتی ہیں۔ جیسے بدن کے معالج ہیں، ایسے ہی نفس وقلب کے بھی معالج اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ تو جو ان سے معالجہ کرائے گا۔ اس کے قلب میں مقام رضا پیدا ہوگا۔ اسی طرح عشق ومحبت اور تفویض کا مقام پیدا ہوگا۔ اگر یہ نہیں ہے تو کچھ پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے باطن کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے متعلق اشارہ فرمایا کہ مشعل راہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما ہیں اور کتاب اللہ صراط مستقیم ہے۔ مگر چلے گا وہ جس کا دل درست ہوگا۔ اور رضاء خداوندی کا اثر ہو۔

سیرتِ نبوی کے عناصر اربعہ...... اور مقصد کیا ہے؟ ﴿یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ مقصد نور میں لانا ہے۔ جیسی ظلمت تھی اس کا مد مقابل ویسا ہی نور ہوگا۔ جہالت مظالم اور معصیّت کی ظلمت تھی۔ اس کے مقابل جو نور آئے گا، وہ علم، طاعت، کمال اور اخلاق ربّانی کا ہوگا۔ جس کا مرکز بنا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے یہ عناصر اربعہ ہیں، تعلیم کتاب، تلاوت الفاظ، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس اور اس کے ساتھ یہ بھی صحیح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعل نور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ قرآن اور اس پر چلنے والے مسلمان۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اس راستہ پر چلیں۔ ان عناصر سے اپنے عنصر کو بنائیں۔ اپنے بدن اور روح کا علاج کریں۔ اپنے نفس کی تکمیل کریں۔ حق تعالیٰ شانہ

ہمیں توفیق دے کہ ہم مرضیات حق پر چلیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کریں اور من گھڑت راستوں کو ترک کریں۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم علم صحیح استعمال کریں، تا کہ کتاب وسنت کا مقام ہمارے قلوب کے اندر آ جائے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَالَاتُزِغْ قُلُوْبَنَابَعْدَاِذْھَدَیْتَنَاوَھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ، اَللّٰھُمَّ اِنَّانَعُوْذُبِکَ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَھَرَمِنْھَاوَمَابَطَنَ رَبَّنَالَاتَجْعَلْنَافِتْنَۃً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ. اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَامُسْلِمِیْنَ غَیْرَخَزَایَا وَلَامَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِخَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

(۲۳ صفر ۱۴۰۵ھ)

اسلام عالمی مذہب ہے

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ ①

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

حکیمانہ تشکر...... بزرگانِ محترم! میرے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا۔ یہ اپنی عالی ظرفی اور بلند خیالی کا اظہار کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ان حضرات نے اپنے ظرف کی بلندی ظاہر فرمائی۔ میری بلندی اس میں ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے ذمہ شکریہ ادا کرنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ تعریف اپنی کریں کہ ہم اتنے عالی حوصلہ یا وسیع الظرف ہیں اور شکریہ میں ادا کروں؟ آپ اپنی تعریف کریں تو مجھ پر شکریہ کب فرض ہے؟ میری آپ تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا۔

اور تعریف کی بھی تو ایسی کہ اس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ چاند اور سورج ہیں تو میں کب چاند اور سورج ہوں میں انسانی مخلوق ہوں یہ کون سی میری تعریف، ہوئی جو واقعہ کے خلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ بہت بڑا آدمی ہوں تو میں کب بڑا ہوں؟ غرض میری تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا آپ نے میری تعریف نہیں کی۔ اس لئے میرے ذمہ نہیں ہے کہ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں؟

دارالعلوم کا ایک طالب علم...... جہاں تک تعارف کا تعلق ہے تو میں اپنا تعارف خود کرائے دیتا ہوں! میرا تعارف نہ چاند سورج سے ہوگا۔ نہ علم اور فضل سے ہوگا۔ اس لئے کہ علم اور فضل میں یہ حضرات مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کے سامنے مولانا محمد حسن صاحب کھڑے ہوئے تھے وہ ہمارے دارالعلوم (دیوبند) کے استاذ

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۴.

ہیں۔ میں بھی ان کی تعظیم کرتا ہوں میں ان کے سامنے ایک طالب علم ہوں۔

مولانا انظر شاہ صاحب ہیں۔ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ مگر علم میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں میں دل سے ان کی عظمت کرتا ہوں۔ تو میرا تعارف یہ ہے کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔ وہاں کے اساتذہ اور بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنا میرا کام ہے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ غرض اس سے زیادہ سمجھا بھی نہ جائے۔

اور یہ کوئی تواضع نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو دن رات تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا علم تازہ ہے مجھے پڑھے ہوئے ساٹھ برس ہو گئے۔ ان کا علم تازہ ہے اور میرا باسی۔ اور باسی ہو کر بھی چوراسی ہو گیا۔ گویا قریب الختم ہے۔ اس واسطے میرا تعارف اس سے زیادہ نہیں کہ دارالعلوم کا ایک طالب علم ہوں۔ اور ان حضرات کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا اپنی عالی ظرفی سے کہا۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ادائیگی فرض...... باقی شکر یہ ادا کر دینا میرا فرض تھا۔ کہ جب آپ نے صدر بنا دیا۔ تو اصل میں تو صدر بنانے والے آپ ہیں۔ جو گھٹیا آدمی کو بنا سکتے ہیں تو وہ خود صدر ہیں (بلکہ صدر ساز ہیں) جن کو بنانے پر قدرت ہے وہ خود صدر ہوں گے۔ بہر حال جب آپ نے صدر بنا دیا اور اس کرسی پر بٹھا دیا۔ تو لامحالہ اس کرسی کا وقار اور اس کی لاج رکھنا میرا فرض ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں مجھے گزارش کرنی ہیں۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے جس کے بارے میں چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔ اس سے پہلے ایک مختصر سی تمہید عرض کر دوں جس کے ذریعے آیت کا مفہوم سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا اور آیت کا جو منشاء اور مقصد ہے وہ بھی انشاء اللہ واضح ہو جائے گا۔ ابتداء میں تھوڑی سی تمہیدی باتیں ہیں۔

تمہید...... پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ یعنی ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے پہلے اگر دوسری ولایتوں کا مہینوں میں سفر ہوتا تھا اب وہ دنوں میں ہونے لگا ہے، جو سفر دنوں میں ہوتے تھے اب وہ گھنٹوں میں طے ہونے لگے ہیں جو گھنٹوں میں ہوتے تھے وہ منٹوں میں طے ہونے لگے تو ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے۔ پہلے بچپن میں ہم لوگ اگر دس بارہ میل کا سفر کرتے تھے تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں۔ کہ سفر درپیش ہے۔ آج وہ سفر سفر نہیں رہا شہروں میں دس بارہ میل کا سفر تو روزانہ ہوتا ہے۔ تو وسائل ایسے مہیا ہو گئے کہ جن کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں بدل گیا ہے۔ ہوائی جہاز پہ آپ یورپ جائیں گے تو بارہ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے پہلے دیوبند سے دہلی تک اڑتالیس گھنٹے لگتے تھے۔ اور اب لندن بارہ گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو ہزاروں میل کا سفر ایسا ہو گیا ہے جیسے چند فرلانگ کا سفر ہوتا ہے سواریاں ایسی ایجاد ہو گئیں کہ انہوں نے ساری دنیا کو لپیٹ کر رکھ دیا۔

نظریاتی یکسانیت...... اسی طرح سے علم وفضل کے وسائل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آج جو آپ یہاں علم رکھتے ہیں، وہی علم لندن والے بھی رکھتے ہیں۔ وہی معلومات امریکہ وجرمنی میں ہیں۔ کوئی خصوصیت کہیں کی باقی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ تمدن کی خصوصیات مٹتی چلی جا رہی ہیں یورپ وامریکہ اور ہندوستان کا تمدن یکساں سا ہو گیا ہے۔ جو چیزیں آپ

لندن میں دیکھیں گے، وہی بمبئی اور کلکتہ میں دیکھیں گے، جو امریکہ میں ہیں وہی امریکن اسٹائل یہاں بھی نظر پڑیں گی۔ تو تمدن بھی یکساں، نظریات بھی یکساں گویا پوری دنیا بین الاقوامی بن گئی۔ مسائل ایک ملک کے ہیں اور دنیا کے سارے ملک مل کر طے کر رہے ہیں، تو کسی ملک کی سیاست اپنی اندرونی نہیں رہی بلکہ بیرونی سیاست کے تابع ہو گئے ہیں ہر ملک کا یہی معاملہ ہے کشمیر کا معاملہ آپ کے ملک کا ہے اور اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے، آپ کے ملک کا مسئلہ ہے اور یورپ وامریکہ والے بیٹھ کر طے کر رہے ہیں۔ تو چھوٹے چھوٹے مسائل اقوام متحدہ میں پیش ہوتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ تو کسی ملک کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، اس لئے نظریات بھی یکساں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جو نظریہ تمدن کے بارے میں یورپ کا ہے وہی آج آپ کا، امریکہ اور روس کا بھی ہے۔ تو مدنیت اور معاشرے کا ایک ہی ذریعہ ہو گیا ہے۔ کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہاں سے نظریات برآمد ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک میں آتے ہیں۔ آپ قبول کرتے ہیں۔ تو ساری دنیا سمٹ کر ایک کنبہ بن گئی ہے جس سے ہر ملک کی خصوصیات ختم ہو گئیں۔ نظریات ایک ہو گئے۔ ذہنوں کا رخ ایک بن گیا۔ پلیٹ فارم ایک بن گیا۔ اور دنیا یہ چاہتی ہے کہ سب کے اندر یکسانیت پیدا ہو جائے۔ یہ ایک نظریہ ہے جو اب چل رہا ہے۔

مذہبی یکسانیت...... تو میں عرض کرتا ہوں کہ یہ نظریات جب یکسانیت کے ساتھ قائم ہو گئے حتی کہ تمدن و معاشرہ بھی ایک ہو، تو قدرتی طور پر یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ پھر مذہب بھی ایک ہی ہو۔ دین بھی سب کا ایک ہی ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ معاشرت تو یکساں ہو اور مذہب الگ الگ ہو۔ تمدن ایک ہو جائے اور دین ایک نہ ہو، یہ فطرت اور طبیعت کے خلاف ہے۔ نظریات میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔ مذہب کی یکسانیت کا مسئلہ باقی رہ گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ آتا جا رہا ہے۔ اور مذہبیت جاندار ہو رہی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِيْلٍ" (١)

"روئے زمین پر کوئی کچا اور پکا مکان باقی نہیں رہے گا۔ کپڑے کا گھرانہ ہو، جیسے خیمہ یا پتھروں کا گھرانہ ہو جیسے پہاڑوں پر مکانات ہوتے ہیں۔ یا اینٹ پتھر کا گھرانہ جسے آپ تعمیر کرتے ہیں۔ کوئی گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا" بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ کوئی رغبت سے قبول کرے یا مجبور ہو کر۔ مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان کسی کے گلے پر چھری رکھیں گے کہ یا قبول کرو، نہیں تو ذبح کر دیں گے۔ اس کی تو اسلام نے مخالف کی ہے۔ صاف فرمایا گیا: ﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (٢)

دین کے اندر کوئی جبر نہیں ہے نیکی اور بدی، خیر اور شر خود کھل کر سامنے آ گئی ہے جس کا جی چاہے اسلام قبول کرے جس کا جی چاہے نہ کرے، کوئی جبری چیز نہیں ہے۔ حتی کہ یہاں تک فرمایا: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى

---

(١) مسند احمد، حديث المقداد بن الاسود، ج: ٦، ص ٤، رقم: ٢٣٨٦٥. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب وصبره على ذلك ج: ٢ ص: ٤٤٩. (٢) پاره: ٣، سورة البقرة، الآية: ٢٥٦.

يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ ''اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ لوگ مسلمان بنیں''۔ یہ آپ کا حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حق ہے جس کے جی میں چاہے ایمان ڈال دیں آپ کا کام صرف تبلیغ اور دین کا پہنچا دینا ہے ماننا نہ ماننا ہر شخص کے اختیار میں ہے جس کو دوسری جگہ قرآن کریم نے فرمایا:﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ ① ''جس کا جی چاہے ایمان قبول کرے جس کا جی چاہے نہ قبول کرے ہم نے عذاب آخرت تیار کر رکھا ہے جس کا جی چاہے بچ جائے جس کا جی چاہے اپنے کو اس کے اندر جھونک دے''۔

تو دین میں کوئی جبر نہیں۔ اس لئے فرمایا: ''بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِيْلٍ'' اسلام کا کلمہ ہر شخص تک پہنچ جائے گا خواہ وہ رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر۔ تو مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان تلوار سے مجبور کریں گے۔ مجبور کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو دھکے کھا کر مجبور ہو کر انہی اصول کے اندر پناہ ملے گی۔ جو اسلام نے لا کر رکھے ہیں۔ لوگ مجبور ہو کر قبول کریں گے۔ اس کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہے گا تو یہ حاصل ہوا کہ گھر گھر اسلام کا کلمہ داخل ہو کر رہے گا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ آج اس کی تمہید بڑھتی چلی جا رہی ہے تمدن ایک بن گیا۔ نظریات ایک بن گئے معاشرت ایک ہوتی جاری ہے۔ خود یہ سوال آئے گا کہ پھر مذہب کیوں نہ ایک ہو؟ دین کیوں نہ ایک ہو؟ ساری قومیں مل کر ایک پلیٹ فارم پر کیوں نہ جمع ہوں؟ اتحاد تو جبھی پیدا ہوگا۔ تو یہ نظریہ سامنے آنے والا ہے۔ بلکہ زبانوں پر آنے بھی لگا ہے۔ اب کھل کر آنے والا ہے چند دن کے بعد۔

عالمی دین...... تو مقصد یہ ہے کہ جب دنیا بین الاقوامی ہے تو لامحالہ ایسے دین کی طرف توجہ منعطف ہوگی جو خود بین الاقوامی ہو۔ اگر دین ایک ملک کا ہو کہ دوسرے ملک کا اس کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ بین الاقوامی نہیں ہے، وہ تو ملک والوں کے لئے ہے۔ یا ایک خاندان کا ہو دوسرے خاندان کا نہ ہو تو دوسرا خاندان متوجہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو سارے ملکوں کا ہو سارے عالم کا ہو اس کی طرف خواہ مخواہ عالم کی توجہ ہوگی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً'' ② ''پہلے پیغمبر اپنی اپنی اقوام اور خاص خاص قوموں کی طرف۔ ان کو ہدایت کرتے تھے نصیحت کرتے تھے۔ تو اب یہ خاص کون ہیں؟''

تو بعض انبیاء علیہم السلام تو ایک خاندان کی طرف آئے ہیں جیسے بنی اسرائیل اس خاندان میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن ہر نبی کا کام یہ تھا کہ اسرائیلی خاندان کی اصلاح کرے، انہیں دوسرے خاندانوں سے تعلق نہیں تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں مگر بنی اسرائیل کے۔

خود حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں کہ یہ منتشر نہ رہیں دوسری اقوام میں جو بھیڑیں ہیں ان سے مجھے تعلق نہیں۔ تو بعض انبیاء مخصوص خاندانوں کی طرف آئے۔ اسی خاندان کی

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۲۹. ② الصحیح للبخاری، کتاب الصلاۃ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً، ج: ۱، ص: ۱۶۸، رقم: ۴۲۷.

اصلاح ان کے ذمے تھی۔

بعض مخصوص ملکوں کی طرف آئے یا مخصوص قوموں کی طرف کہ جیسے حضرت یونس علیہ السلام کہ چار قوموں کی طرف مبعوث ہوئے انہی کے اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور قوموں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا، اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اقوام، خاندان اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ ﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ''ہر قوم کے لئے ہم نے ہادی بھیجا اور ڈرانے والا بھیجا''۔ ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ ''کوئی امت ہم نے نہیں چھوڑی جس میں ڈرانے والے نہ بھیجے ہوں''۔ اور فرمایا گیا۔ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ ''ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک رسولوں کو بھیج کر تمام حجت نہ کر دیں''۔

دین پیش کر دیں اور وہ نہ مانیں، حجت تام ہو تب ہم عذاب دیں گے، ورنہ ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی قوم اور ملک باقی نہیں ہے جس کے اندر انبیاء علیہم السلام نہ آئے ہوں۔ اب یہ حجت تام اتنی عام ہے تو کروڑوں کا ملک ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے اندر اللہ کی طرف سے ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔

آغازِ اسلام...... اور میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے پیغمبر تو ہندوستان ہی میں مبعوث ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں ہی آئے تو ہندوستان میں ان کا نزول اور اترنا ثابت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے عربستان کا سفر کیا ہے۔ اور ایک سو بیس حج کئے ہیں چالیس حج پیدل کئے ہیں اور بقیہ حج بیل پر سوار ہو کر کئے ہیں۔ تو سب سے پہلا دار النبوت اور دار الخلافت اللہ کا ہندوستان ہے جس سے مذہب کا آغاز ہوا۔ مذہب کی تکمیل عربستان میں ہوئی مگر آغاز ہندوستان سے ہوا۔ تکمیل کے لئے تو فرمایا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ① ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں نے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمتوں کو تم پر پورا کر دیا ہے۔ اور میں آج اسلام کے سوا تم سے کسی اور دین پر راضی نہیں ہوں''۔

اسلام لے کر تو حضرت آدم علیہ السلام آئے ہیں۔ آغاز ان سے ہوا۔ تکمیل عربستان میں ہوئی۔ بیچ میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔ ہر ملک اور قوم کی طرف آتے رہے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے مگر اللہ کا دین ایک رہا شریعتوں میں چوں کہ تغیر و تبدیل ہوتا رہا پچھلی شریعتوں میں ایک چیز حلال تھی تو اگلی شریعتوں میں اسے حرام کر دیا۔ یا پہلی شریعت میں حرام تھی۔ اگلی شریعت میں اسے حلال کر دیا۔ شرائع کے اندر تو تغیر و تبدل رہا۔ مگر دین ایک رہا۔

تکمیل شریعت...... دین کے معنی اصول کے ہیں۔ اللہ کی توحید، نبی کی عظمت، آخرت کا یقین جنت و دوزخ کا ہونا۔ ملائکہ کا وجود، پل صراط کا ہونا۔ عرش کرسی اور لوح و قلم کا ہونا یہ غیبی چیزیں ہیں جو سب انبیاء کے زمانے میں ایک رہی ہیں۔ البتہ حلال و حرام کے احکام جس کو ہم عملی پروگرام کہیں گے اس عملی پروگرام میں کچھ تغیر و تبدیل ہوتا رہا، اخیر

① پارہ ۶: سورة المائدة، الآية: ۳.

میں آ کر وہ بھی مکمل ہو گیا۔ شریعت بھی اتنی مکمل ہو گئی کہ اب اس میں کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بچہ پیدا ہوا تو اس کے لئے کرتہ بنائیں تو بالشت بھر کا ہو گا۔ اور وہ بھی بلکہ بڑا ہو گا۔ بچہ اس میں چھپ جائے گا۔ لیکن اب جوں جوں بڑھتا جائے گا تو پیائش بڑھتی جائے گی۔ تو بچہ تو پیدائش سے لے کر ایک ہی ہے۔ مگر لباس اسکے بدلتے رہے۔ اسی طرح سے دین ایک ہے مگر عملی پروگرام کے لباس بدلتے رہے ہیں۔

وحدتِ دین...... انبیاء علیہم السلام آتے رہے تو تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں مگر دین سب کا ایک تھا۔ ''کَانَ دِیْنُ الْاَنْبِیَآءِ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ'' سارے پیغمبروں کا دین توحید تھا کہ ایک کو ہی مانو۔ ایک ہی کو سب کا کرتا دھرتا سمجھو، ایک ہی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھو، ایک ہی کو ہادی سمجھو، ایک ہی کو زندہ کرنے اور موت دینے والا سمجھو، نہ کسی کے بس میں موت ہے نہ حیات نہ کسی کے بس میں ہدایت و راہنمائی ہے، یہ صرف اللہ کا کام ہے، نجات دینا اس کا کام ہے، تو توحید سارے انبیاء کا دین رہا۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ① ''کوئی رسول دنیا میں ہم نے نہیں بھیجا جس نے یوں نہ کہا ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسی کی عبادت کرو''۔

نہ انبیاء علیہم السلام کی عبادت کرو نہ اولیاء اللہ کی عبادت کرو، نہ علماء و مشائخ کی، عبادت کے لئے سزاوار صرف ایک ہی ذات ہے، اور وہ ذات اللہ کی ہے، اس لئے کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ ہے اگر زندہ کرنے میں معاذ اللہ اس کا کوئی شریک ہوتا کہ کچھ ہماری اور آپ کی قوت اور کچھ اللہ تعالیٰ کی قوت، مل ملا کر زندہ کر دیا۔ اسی طرح موت دینے میں اللہ کے کچھ اور بھی شریک ہوتے تنہا اللہ کی قوت کافی نہ تھی، کچھ اور لوگوں کو ملا کر فلاں کو موت دی جائے۔ تو اگر موت و حیات میں شرکت ہوتی تو عبادت میں بھی شرکت ہوتی، تو اللہ کی بھی عبادت کرتے اور جو ان کے شریک ہوتے، ان کی بھی عبادت کرتے۔

مگر زندگی، موت، صحت و مرض، رزق دینے والے وہ تنہا ہیں اور کل معاملات ان کے ہاتھ میں ہیں پھر عبادت بھی تنہا انہی کی ہوگی، یہ کیسے ممکن ہے کہ کام تو وہ کریں اور جھکیں دوسرے کے آگے، دوسروں کے آگے پیشانی رگڑیں، جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کی باگ ڈور ہے، اسی کی عبادت کی جائے گی تو آیت شریفہ میں یہ بتلایا گیا کہ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا جس نے یہ تعلیم نہ دی ہو کہ دیکھو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی عبادت کرو، اسی سے ڈرو۔ اگر اس سے ڈرو گے تو سب سے ڈرنا چھوڑ دو گے۔ اگر اس سے نہیں ڈرو گے تو سب سے ڈرنا پڑے گا، اگر اس کی عبادت کرو گے تو ہر ایک کی عبادت ترک کر دو گے۔ اگر اس کی عبادت نہیں کرو گے تو در در پر جھکنا پڑے گا۔

ترکِ توحید کی پھٹکار...... آج کوئی آپ کے آگے جھک رہا ہے کوئی پتھر کے آگے جھک رہا ہے، کوئی آگ کے

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۵۔

آگے کوئی پانی کے آگے، تو میں کہتا ہوں کہ یہ شرک نہیں ہے یہ پھٹکار ہے کہ جب ایک کی عبادت نہیں کی تو ایک ایک چیز کے سامنے ناک رگڑ رگڑ کر یہاں بھی ذلیل بنو وہاں بھی ذلیل بنو، انسان کو اللہ نے معظم اور مکرم بنایا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے آگے اس کی پیشانی نہ جھکے، جب اس نے اپنے آپ کو خود عزت والے سے ہٹا لیا تو ایک ایک مخلوق کے آگے اسے جھکنا پڑا، ذلیل ہونا پڑا۔ حالانکہ آگ پانی، مٹی ہوا تو ہمارے خادم ہیں۔ یہ معبود تھوڑا ہی ہیں۔ ان سے تو ہم کام لیتے ہیں، پانی سے نجاستیں اور گندگیاں دھوتے ہیں، پھر پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ آپ اسے آٹھویں منزل پائپ کے ذریعے لے گئے، جانے پر یہ مجبور ہے آپ پانی سے مجبور نہیں ہیں، پانی آپ سے مجبور ہے، کہ وہ نیچے کو جانا چاہتا ہے اور آپ اس کی طبیعت کے خلاف اس کو اوپر لے جانا چاہتے ہیں۔ آگ کی طبیعت یہ ہے کہ وہ اوپر کو جاتی ہے اس کی لپٹ جب جاتی ہے تو اوپر کی طرف، نیچے کی طرف نہیں جائے گی، لیکن مشینوں کے ذریعے سے آپ اس کی لپٹ کو نیچے لے جاتے ہیں، وہ مجبور ہے کہ مشین چل رہی ہے لپٹ نیچے جا رہی ہے، تو آگ نے آپ کو مجبور نہیں کیا آپ نے آگ کو مجبور کر دیا۔ زمین پر آپ کو قابو ہے، زمین کو آپ پر قابو نہیں ہے، چناں چہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ﴾ ①

زمین کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل بنا دیا ذلیل نہیں کہا بلکہ مبالغہ کا صیغہ ذلولا فرمایا، اس کو کھودیں، پھاڑیں، چکنا چور کریں، بیچاری چوں نہیں کرتی، اسی طرح اس میں پانی بہا دیں نالی کھود دیں چوں نہیں کرے گی، تو زمین آپ کے سامنے مجبور ہے آپ اس کے سامنے مجبور نہیں ہیں۔

یہی صورت ہوا کی بھی ہے کہ ہوا کو آپ نے مجبور کر رکھا ہے، یہ ہوا جو فضا میں بھری ہوئی ہے، آپ کے قبضے میں جب آتی ہے تو جیسا چاہے تصرف کریں، سائیکل کے ٹیوب کے اندر آپ نے اُسے بند کر رکھا ہے، نکلنا چاہتی ہے مگر جا نہیں سکتی، پانچ آنے کی گیند آتی ہے اس میں الگ بند کر رکھا ہے، گیند کو نیچے ماریں گے وہ اچھل کر اُوپر جائے گی وہ ہوا ہی ہے نکلنا چاہتی ہے مگر نہیں نکل سکتی آپ نے اس کو قید کر رکھا ہے، غرض ہوا آپ کے سامنے مجبور ہے۔

یہی صورت آگ کی بھی ہے، اب یہ آپ کے سامنے بجلی ہے یہ پہاڑوں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ اب جب انسان کے ہاتھ میں آ گئی تو ایک پتلے سے تار میں باندھ رکھا ہے نہ چھوڑیں تو تار میں بند ہے۔ ذرا سو بچ نیچے دبا دیں فوراً خادم حاضر ہے۔ تو جو پہاڑوں کو چکنا چور کرتی ہے انسان کے ہاتھ میں آ کر قید ہوئی، تو چوں نہیں کر سکتی ہے۔ گرفتار ہے، بجلی کیا ہوئی ایک خادم ہوئی۔ تو خادم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے آگے جھکے، انسان نے الٹا کام کر دیا خود اس کے آگے جھکنا شروع کر دیا کبھی آگ کے آگے کبھی پانی کے آگے، کبھی درخت کے آگے، یہ سب چیزیں تو تمہاری خادم ہیں، تمہارے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ان کا کام ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں، نہ یہ کہ انسان جیسی

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔

معظم ومکرم چیز ان کے آگے جھکے اوران کی اطاعت کرے۔تو جھکنے کے لئے ایک ہی ذات سزاوار ہے جس کے ہاتھ میں سورج بھی ہے چاند بھی ہے درخت بھی ہیں پہاڑ بھی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ ① نہ تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو سجدہ کرو، اس ذات کو سجدہ کرو جس نے سورج اور چاند جیسی چیزیں تمہارے سامنے بنا کر رکھ دیں، اور تمہارے لئے بنائیں۔تو صبح کو سورج نکلتا ہے روشنی پھینکتا ہے تاکہ تم اپنے کام کاج کرو۔رات کو چاند نکلتا ہے۔اگر رات کو بھی سورج رہتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔تو رات کو وہ ستارے چمکائے جس میں ٹھنڈی روشنی ہے، دن میں وہ ستارے چمکائے جس میں گرم روشنی اور چاندنا کافی ہے، تو جس نے ان کے نوروں اور روشنیوں میں فرق ڈالا وہ اللہ رب العزت ہیں تو وہ عبادت کے لائق ہیں یا یہ چاند سورج عبادت کے لائق ہیں؟ یہ تو اس قدرت کے مظاہر ہیں کہ کسی میں گرم نور اور کسی میں ٹھنڈا نور چمکا دیا، پہاڑوں کو عظمت اور رفعت دے دی۔آسمان کو بلند کر دیا مگر سب کی بلندیوں سے جو زیادہ بلند ہے وہ ذات بابرکات ہے، سب عظمتوں پر جس کی عظمت فائق ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔تو سارے انبیاء کا دین یہی رہا توحید اور یہ کہ ایک کو کرتا دھرتا سمجھو اور اسی کے آگے جھکو۔

تاثیرِ توحید...... اسی میں قلب کی قوت بھی ہے

یک در گیر محکم گیر

ایک در کو مضبوط تھاموجو ایک کا ہو جاتا ہے اس کے قلب میں قوت آجاتی ہے کہ میرا آقا موجود ہے، اور چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا ایک طرف جھکے گا اسے خطرہ ہوگا کہ دوسرا اخفا نہ ہو جائے دوسرے کے آگے جھکے گا اسے خطرہ ہوگا تیسرا اخفا نہ ہو جائے۔تو چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا۔غلام جب خدمت کرے گا ایک آقا کی کرے گا جو متعین ہو کہ اسی کے ہاتھ میں میرا مفاد ہے۔تو حق تعالیٰ شانہ کے ہاتھ میں نفع ونقصان، وجود وعدم اور موت وحیات ہے، اس واسطے عبادت کے لائق وہ ہی ہے سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی ہے، تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دین سارے انبیاء علیہم السلام کا ایک رہا۔شریعتیں کچھ مختلف ہوتی رہی ہیں، جیسے آدمی کے لباس بدلتے رہتے ہیں مگر آدمی وہی رہتا ہے، وہی بچہ جس نے بالشت بھر کا لباس پہنا تھا وہی اب ڈیڑھ گز کا لباس پہنے گا کیوں کہ اس کی عمر اب بیس برس کی ہوگئی، لیکن جب اس کی نشو ونما مکمل ہوگئی۔اب اس میں بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔اب جو لباس پہنے گا اس کی پیائش متعین ہوگی وہ نہ کم ہو سکتا نہ زیادہ، اس لئے کہ کم زیادہ تو تب ہو جب انسان کے اندر بڑھنے کی گنجائش ہو کیوں کہ اس کی نشو نما اور بڑھوتری مکمل ہو چکی ہے۔اب لباس کی پیائش متعین ہوگی۔غرض دین تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی رہا، شریعتیں بدلتی رہیں۔اس لئے عبادت صرف ایک ہی ذات کی کی جائے گی۔

---

① پارہ: ۲۴، سورۃ حٰم سجدۃ، الآیۃ: ۳۷.

عبادت وتعظیم کا فرق...... البتہ کسی چیز کی تعظیم کا حکم ہو تو اس کی عظمت بجالائی جائے گی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ جو صاحب کشف وکرامات بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، مولانا پر اکثر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ گنگا کہاں سے نکلی ہے؟ جو ایک قوم کی قوم گنگا کی عظمت کر رہی ہے، اسی وقت اٹھ کر سفر شروع کر دیا تو دیوبند سے چالیس میل کے فاصلے پر گنگا بہتی ہے، مولانا نے چالیس میل کا سفر کیا۔ اور اس موضع مین پہنچے جہاں سے گنگا کا دہانہ پھوٹا ہے، جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ہے، گنگوتری اس جگہ کا نام ہے، سات دن وہاں ٹھہرے اس کے بعد آ کر فرمایا کہ میں نے گنگا کے دہانے پر روزے رکھے، عبادتیں کیں ذکر اور تلاوت خوب کرتا رہا تو مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ جہاں سے دہانہ پھوٹا ہے وہاں سے مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے، یا تو کسی نبی کی وہاں قبر ہے یا کسی نبی کی نشست گاہ ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے قوم کو ہدایت کی ہے، اسی برکات کے آثار اس پانی میں ہیں، اس لئے قوم کی قوم، اس کی عظمت کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک ہے کسی چیز کی عظمت کرنا اور ایک ہے عبادت کرنا۔ عبادت جائز نہیں عظمت سب کی ضروری ہے۔

زمزم شریف جو آپ کے ہاں پانی ہے اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اس لئے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کیساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور چھوٹے سے بچے ہیں، پیاس لگ رہی ہے، اور ﴿ وَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ ﴾ جہاں بیت اللہ ہے، ارد گرد ریگستان ہے، پانی کا نشان نہیں۔ تو بچے نے پیاس کے اندر تڑپنا شروع کیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر پَر مارا اور زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا آپ اسے عظمت سے پیتے ہیں ہر پانی کے لئے بیٹھ کر پینا سنت ہے، لیکن زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا سنت ہے، یہ تعظیم کی وجہ سے ہے اور فرمایا گیا حدیث میں: ''مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ'' ① ''زمزم پی کر جو دعا مانگو گے، اللہ اسے قبول کرے گا''۔

تو زمزم پینے سے پہلے کچھ اپنی مراد مانگنی چاہئے، وعدہ خداوندی ہے کہ وہ مراد عطا کی جائے گی، عام پانیوں میں یہ بات نہیں ہے، زمزم میں یہ خصوصیت ہے، اس لئے سارے مسلمان مل کر زمزم کی تعظیم کرتے ہیں زمزمیوں میں بھر کر لاتے ہیں اس کا قطرہ زمین پر گرنے نہیں دیتے کہ معظم ومشرف پانی ہے لیکن اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، سجدہ کے لئے صرف ایک ہی اللہ کی ذات ہے، عظمت وتعظیم اگرچہ کی جائیگی۔

تعظیمی سجدہ...... اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعظیم آپ کے اوپر فرض ہے، ذرا بے عظمتی کوئی کرے گا تو اسلام سے خارج ہو جائے گا، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہیں، تمام ہی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے تو تعظیم اتنی ضروری کہ جب تک نبی کی عظمت نہ کی جائے ایمان نہیں بنتا، مگر عبادت جائز نہیں کہ نبی کو سجدہ کرنے لگیں اس کو شریعت نے ممنوع قرار دیا۔

---

① السنن لابن ماجه، کتاب المناسک، باب الشرب من زمزم ج: ۹ ص: ۱۸۲.

حدیث میں ارشاد ہے کہ: ایک دفعہ ایک صحابی حاضر ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا: تم نے یہ کیا حرکت کی؟ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ قیصر و کسریٰ جو روم اور فارس کے بادشاہ ہیں۔ ان کے درباری جب آتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں تو اللہ کا رسول اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے، اس لئے میں نے سجدہ کیا۔

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اگر میں اجازت دیتا سجدہ کرنے کی، تو عورتوں کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں''۔ لیکن ان کے لئے بھی ممنوع اور ناجائز ہے، اس لئے یہ حرکت کبھی نہ کی جائے نبی ہو یا غیر نبی عبادت کسی کی جائز نہیں۔ تعظیماً بھی سجدہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ صحابہ نے تو تعظیما ہی سجدہ کیا تھا عبادت نہیں کی تھی اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع قرار دیا۔ تو غیر اللہ کے سامنے عبادت کی ہیئت بھی نہیں آنی چاہئے لیکن تعظیم ضروری ہے۔

معیارِ تعظیم...... ہم حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی بھی تعظیم کریں گے، اگر اولیاء اللہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بھی نکلے جو بظاہر شریعت کے خلاف ہو۔ تو اس کی تاویل و توجیہ کریں گے یہ نہیں ہے کہ گستاخی یا توہین کرنے لگیں۔ تو اولیاء کی توہین جائز نہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام؟ حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی بعض کتابوں میں تحریر فرمایا کہ: ہندوؤں کے جو بڑے اور مقتدا ہیں جیسے شری گلشن جی ہیں یا شری رام چندر جی ہیں ان کا نام لے کر کبھی ان کی شان میں گستاخی نہ کرو، ممکن ہے اپنے وقت میں یہی پیغمبر اور مردان حق ہوں، اگر ہمیں سند سے معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعی پیغمبر تھے تو ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام پر ایمان لاتے۔ مگر سند سے ثابت نہیں اور احتمال ہے کہ یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں۔ اس لئے حضرت نے تحریر فرمایا۔ کہ گستاخی کا کلمہ ان کی شان میں نہ کہا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ مردان حق ہوں۔ اور اللہ کی طرف سے شریعتیں لے کر آئے ہوں مگر جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی شریعتوں میں قوم نے تغیر کر دیا، شریعت اپنی ذات کی حد تک حق تھی جو آئی، بعد میں لوگوں نے تغیر و تبدل کیا اور تحریف کی، کتابوں کے اندر ردو بدل کیا اس کا وبال قوموں پر ہے، پیغمبر اس سے بری ہیں، وہ اپنے وقت میں حق تھیں۔ تو بدلنا قوموں کا کام ہے، لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے وہ آسمان سے نازل ہوئیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جن پیغمبروں کا نام بتلایا گیا ان پر اور جن کا نام نہیں بتلایا گیا ان پر بھی بالاجمال ایمان لانا ضروری ہے۔ ﴿مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ﴾ ① ''بعض وہ ہیں جن کے واقعات بیان کر دیئے نام بھی لیا اور بعض وہ ہیں جن کا نام ہم نے نہیں لیا''۔ جن کا نام لے لیا ہے، ان کا نام لے کر ان پر ایمان لاؤ، اور جن کے نام نہیں لئے ان کے بارے میں یوں کہو کہ جتنے اللہ کے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

تو تعظیم اور چیز ہے عبادت اور چیز ہے، تعظیم حضرات انبیاء اور اولیاء اللہ کی بھی ہوگی اور فرض ہے علماء ربانی اور مشائخ

① پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۷۸.

حقانی کی بھی تعظیم کی جائے گی مگر عبادت کسی کی نہیں کی جائیگی، عبادت صرف ایک اللہ رب العزت کی کی جائیگی کہ وہ مالک اور مختار ہے، اسی کے ہاتھ میں وجود وعدم کی باگ ڈور ہے تو انبیا علیہم السلام جتنے بھی آتے ہیں ان سب کا دین توحید رہا ہے کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، کسی دوسرے کی طرف عبادت کے راستہ سے مت جھکو، تعظیم کے راستہ سے جھکو۔

اوصافِ معبودیت...... اس لئے آگ ہو یا پانی، ہوا یا مٹی۔ ہم ان کی توقیر کریں گے کہ یہ اللہ کے تبرکات ہیں، مٹی بھی اسی کا ایک عطیہ ہے جس سے ہمارے پھل اور دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جس سے ہم خود پیدا ہوتے ہیں تو وہ ماں کی جگہ ہے، اسی لئے ایک عام مثل پھیل گئی کہ ''مادر وطن'' یعنی وہ زمین جس پر آدمی پیدا ہوا اس کو اپنی ماں کہتا ہے اور بعض روایات میں بھی یہ لفظ آتا ہے کہ زمین مثل ماں کے ہے، تو مادر وطن کا لفظ چلا، اس لئے کہ جس سے ہمارا خمیر بنا، جس سے ہمار غذا نکلی۔ اس کو ہم ماں کی جگہ سمجھیں گے، تو اس کی توقیر کریں گے کہ اللہ کا ایک عطیہ ہے مگر اس کی عبادت نہیں کریں گے۔ آگ کو ایک عطیہ سمجھیں گے، اس کی عبادت نہیں کریں گے سردیوں میں اس کے بغیر تاپ نہیں سکتے، اسکے بغیر کھانا نہیں پک سکتا۔

اور اگر کوئی عبادت کرے گا تو میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ کیا بے عقلی کی بات ہے، اس لئے آگ کے سامنے اگر آپ جھکیں گے تو آگ کی لپٹ آئی تو سب سے پہلے اسی کو ہی جھلسائے گی جو سجدہ میں پڑا ہوا ہے، جس آگ کو یہ بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا ماننے والا پجاری ہے اس کو تو بچادوں دوسروں کو پل بھر میں ختم کردوں، جس معبود کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا عابد ہے اور یہ میرا عابد نہیں وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ اسے دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔

اسی طرح پانی میں آپ گئے آپ نے اس کی عبادت کی۔ جب موج آئے گی تو پہلے وہی ڈوبے گا جو عبادت کررہا ہے۔ اس پانی کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ اسے نہ ڈبوؤں یہ تو میری عبادت کررہا ہے، دوسروں کو جا کے ڈبوؤں۔ تو جس معبود کو یہ بھی تمیز نہ ہو کہ کون میرا عابد ہے اور کون نہیں؟ کون میرا مطیع ہے اور کون نہیں؟ تو وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ عبادت کے لائق وہ ہے جو علیم وخبیر ہو: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ ''وہ پیدا کرنے والا ہے جو پیدا کرنے سے پہلے بھی جانتا ہے'' کہ میں کیا چیز پیدا کررہا ہوں پیدا کرنے کے بعد بھی جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز پیدا کی۔ اس کے انجام کو بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تو اول سے لے کر آخیر تک جس کے سامنے سارا علم حاضر ہے وہی عبادت کے لائق ہے، تو سارے انبیاء علیہم السلام نے ایک ہی چیز کی تعلیم دی اور وہ توحید ہے۔

تکمیلِ توحید...... اور توحید کے لئے البتہ نبوت کا ماننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ توحید کے معنی ہیں کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، ایک ہی کی رضا حاصل کرو ایک ہی کی مرضیات پر چلو، اور اس کی نامرضی چیزوں سے بچو، جس سے وہ خوش ہے اسے قبول کرو یہی دین کا حاصل نکلے گا کہ مرضیات خداوندی کے مطابق عمل کرو اور نامرضیات سے الگ رہو، جس کا حکم دیا ہے اس کو مانو جس سے روک دیا ہے اس سے بچو تو مرضی اور نامرضی کو پالینا یہی فی الحقیقت دین کی روح ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کسی کی مرضی اس کے بتلائے بغیر سمجھ

میں نہیں آسکتی۔ دوحقیقی بھائی ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں تو ایک کے دل کے بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی، جب تک کہ دوسرا زبان سے ظاہر نہ کرے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں اور فلاں چیز سے ناخوش ہوں۔ تو حقیقی دو بھائی جو ایک جنس اور ایک نوع ہیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ایک کے دل کی خبر دوسرے کے دل میں نہیں آتی۔ جب تک بتلانے والا خود نہ بتلائے۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے وہ وراء الورراء اور یہ سافل در سافل کوئی نسبت بندے کو خدا سے نہیں، اس کی مرضیات کا عمل بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں، فلاں چیز سے ناخوش ہوں فلاں چیز کو ترک کردو، اور فلاں کو اختیار کرو، یہ میرا قانون اور آرڈر ہے۔

اب ایک تو صورت یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر کہتے پھریں کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں فلاں چیز سے ناخوش ہوں ایک ایک گھر میں خود آئے اور اطلاع دی لیکن یہ اس کی شان اقدس کے لائق نہیں، دنیا کے معمولی بادشاہ جنہیں ہم بادشاہ بناتے ہیں خود ان کی بادشاہت ذات کی نہیں ہے، ہم نے ووٹ دیا تو بادشاہ بن گئے، ووٹ نہ دیں بادشاہ نہیں۔ لیکن بادشاہ بن جانے کے بعد بادشاہ کو بھی اس سے عار آتا ہے کہ وہ رعیت کے گھر گھر جا کر اپنے قانون کو پہنچائے کہ دیکھو میں اس سے خوش ہوں اور اس سے ناخوش ہوں وہ اپنے وزیر اعظم کو مقرر کرتا ہے، وزیر اعظم گورنروں کو مقرر کرتا ہے گورنر کمشنروں کو مقرر کرتے ہیں اور تحصیلدار ایک بھنگی کو بلا کر کہتا ہے کہ منادی کردو کہ بادشاہ کا حکم یہ ہے تو پھر رعیت کے دل میں آتا ہے، تو جب دنیا کے بادشاہ جنہیں ہم ہی بناتے ہیں انہیں غیرت آتی ہے کہ گھر گھر جائیں اور قانون کی منادی کریں تو اللہ رب العزت تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی جناب کے لائق کہاں ہے کہ وہ گھر گھر میں آ کے خود فرمائیں، وہ اپنے وزراء کو مقرر کرتا ہے وہ وزراء انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے قلوب پر اپنی وحی اتارتا ہے، وحی کے ذریعے اطلاع دیتا ہے۔

یہ میرا قانون ہے، میں یکتا اور بے مثل ہوں، وحی سے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جان لیا کہ ہمارا مالک ایک ہے اور یہ اس کی شان ہے۔ فرمایا گیا: ﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ﴾ ① ''موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر وحی فرمائی کہ میں اللہ ہوں۔ میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔

اپنی شان بیان فرمائی کہ: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ ② ''میری مانند کوئی نہیں، کوئی مجھ جیسا نہیں۔ نہ میرا کوئی جسم ہے نہ میرا کوئی ضد ہے نہ کوئی ند اور شریک ہے''۔ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ ③ ''کہہ دو اے پیغمبر! اللہ یکتا ہے''۔ ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ ''اللہ صمد ہے''۔

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱۔ ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص: ۱۔

صمد کے معنی یہ ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ زندگی نہیں مل سکتی جب تک ادھر رجوع نہ کرے موت نہیں آسکتی جب تک وہی موت نہ دے۔ ہم باقی نہیں رہ سکتے جب تک وہ باقی نہ رکھے۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو ہم اپنی موت وحیات اور حدوث وبقاء میں محتاج ہیں لیکن اللہ کسی کا محتاج نہیں اس کا وجود اپنا ہے وہ کہیں وجود مانگنے نہیں گیا۔ اس کی قدرت اپنی ہے، اس نے دوسروں سے قدرت نہیں مانگی۔ اس کا علم اپنا ہے اس نے دوسروں سے کب کہا تھا کہ مجھے علم دے دو۔

استحقاقِ عبودیت...... علم وقدرت اس کی اپنی صفات ہیں اس کے علم کا کچھ سایہ ہم پر پڑ جائے تو ہم بھی عالم کہلانے لگ جائیں، اس کی قدرت کی پر چھائیں پڑ جایں تو ہم اور آپ بھی قادر کہلانے لگ جاتے ہیں، کہ ہمیں بھی کچھ قدرت اور بس حاصل ہے، تو اصل میں قدرت والا ایک ہے، جس پر وہ اپنی قدرت کا نور فائز کر دے اس میں قدرت آ جاتی ہے، جس پر اپنا علم ڈالدے وہ عالم کہلانے لگتا ہے، جس پر اپنے اخلاق کا رنگ ڈال دے وہ درویش کہلانے لگتا ہے، عطا اور جود سب اس کی طرف سے ہے خود کسی کی ذات کے اندر کچھ نہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ انسان کی ذات کوری ہے نہ اس میں علم ہے نہ قدرت ہے نہ کوئی اور کمال ہے کمالات کو قبول کرنے کی صرف استعداد اور صلاحیت ہے، مگر پیدائشی طور پر ماں کے پیٹ سے کوئی کمال لے کر نہیں آتا چناں چہ ارشاد ہے: ﴿ واللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ① ”ہم نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا۔ اس حالت میں کہ ذرہ برابر تم علم نہیں رکھتے تھے، پیدا شدہ بچہ مضغہ گوشت ہوتا ہے، نہ اس کو اچھے کی خبر نہ برے کی خبر، نہ سیاہ کی تمیز نہ سفید کی، کوئی امتیاز اور علم نہیں تو ماں کے پیٹ سے لاعلم پیدا ہوتا ہے“۔ یہ انسان کی ابتداء ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ انتہا کیا ہے؟ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ﴾ ② ”انجام کار ہم تمہیں ایسی رذیل عمر کی طرف لوٹا دیتے ہیں کہ عالم ہونے کے بعد تم پھر جاہل بن جاتے ہو“۔

نوے سو برس کی عمر ہوگئی آج آنکھوں نے جواب دے دیا تو جو دیکھ کر علم حاصل ہوتا تھا اس کے راستے بند ہو گئے کانوں نے جواب دے دیا۔ ثقل سماعت پیدا ہوئی تو سن سن کے جو علم حاصل ہوتا تھا وہ راستہ ختم ہوا۔ اب کچھ حافظے میں محفوظ تھا، کچھ پہلی معلومات جمع تھیں۔ مگر پچھلی عمر میں حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے تو پچھلی معلومات بھی ختم ہوئیں۔ تو اگلی معلومات کا راستہ بند ہو گیا اور پچھلی معلومات نسیان کی نذر ہو گئیں نتیجہ آگے واضح ہو گیا تو جیسے کورے آئے تھے ویسے ہی کورے چلے گئے، تو حق تعالیٰ شانہٗ نے بتلا دیا کہ تمہاری ذات میں کوئی علم نہیں جب ہم نے چاہا ڈال دیا، اور جب چاہا نکال دیا، اگر یہ چیزیں تمہاری ذات میں ہوتیں تو پیدائشی طور پر تم عالم ہوتے اور مرتے دم تک عالم رہتے لیکن ذات میں نہیں ہے تو ہماری دین سے آتی ہیں۔ غرض ہمارا وجود، علم اور قدرت سب اسکی دی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل: الآیۃ: ۷۰۔

ہوئی ہیں۔ تو اسی کے سامنے جھکیں گے جس نے دی ہیں۔ دوسروں نے دی نہیں تو دوسروں کے آگے کیسے جھکیں گے؟ تعظیم وتو قیر الگ چیز ہے مگر عبادت نہیں کریں گے ذلت اختیار نہیں کریں گے، تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب ہماری دین ہے۔ یہ انسان کی حالت ہے کہ نہ پیدائشی طور پر اس میں علم ہے نہ اخلاقی کمالات ہیں، اور جتنے ہوں آخیر میں وہ بھی چھن جاتے ہیں، مثل مشہور ہے کہ بچہ اور بڑا ایک بن جاتا ہے۔ یعنی جیسے بچہ معصوم اور دسروں کے ہاتھوں میں ہے وہ بھی دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ چل نہیں سکتا جب تک کوئی چلانے والا ہو، بیٹھ نہیں سکتا جب تک اس کو حرکت نہ دیں، غرض بالکل بچہ کی طرح دوسروں کے ہاتھ پڑ جاتا ہے، پھر اس پر معصومیت طاری ہو جاتی ہے تو واضح ہوا کہ انسان کی ذات کوری ہے، اس میں کچھ نہیں، جب انسان کی ذات کوری ہے تو انسان عبادت کے لائق نہیں بن سکتا، جو اپنی ذات سے جاہل ہو وہ معبود کیسے بن جائے، معبود کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو۔

جب انسان معبود نہیں بن سکتا تو اور تو تمام انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں تو کیا جانور معبود بنیں گے جو انسان کے نیچے ہیں، کیا آگ پانی معبود بنیں گے جن کو انسان خود عدم سے نکالتا ہے، دیا سلائی کھینچی تو آگ آ گئی، پاؤں سے روند دی تو آگ ختم ہو گئی تو یہ آگ معبود بنے گی؟

جب انسان معبود نہیں تو ساری چیزیں انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں وہ انسان کی خادم ہیں وہ کیسے معبود بن سکتی ہیں؟ ایک ذات سب کی معبود ہے اور ایک یہی کرتا دھرتا ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام ساری دنیا اور سارے ملکوں میں آئے اور ایک ہی چیز لے کر آئے۔

اختلاف مذہب کے اسباب...... اور ابتداء میں سارے انسان ایک ہی دین پر تھے، لیکن جوں جوں لوگوں نے اپنی عقلیں چلائیں تو دین کے اندر فتنے پیدا ہوتے گئے اگر محض اتباع کرتے کہ جو اللہ کے رسول نے لا کر دے دیا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے، کوئی نزاع نہ ہوتا۔ نزاع جب ہوتا ہے جب اوپر سے آئی ہوئی چیزوں میں آدمی عقلیں لڑائیں اور عقلی ڈھکوسلوں سے عقیدے بنانا شروع کریں یہیں سے آدمی کے اندر خلل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس طرح کبھی انتہائی محبت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی ذات سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے اس کو اتنی بڑائی دی کہ اس کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ کبھی انتہائی عدوات سے عقیدہ بگڑتا ہے، کہ کسی سے عداوت ہوئی کہ فلاں پر نام لے کر لعنت بھیجنی شروع کر دو، نام لے کر برا کہو۔ اس کا بھی ایک غلو ہے، تو کبھی غلو عداوت میں اور کبھی غلو محبت میں عقیدے بگڑتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ”اے علی! تمہارے بارے میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے تباہ ہوں گے اور بعض عداوت کی وجہ سے“۔

بعض لوگوں نے انتہائی محبت کی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا تک کہا اور کہا کہ یہ خدا کا مظہر ہیں، اور اتنی انتہائی عقیدت کی کہ ان کے سامنے جھکے جیسے خدا کے آگے، یہ غلو محبت میں ہلاک ہوئے، اور رفض کا قصہ چلا۔ اور خوارج ان کی عداوت میں ہلاک ہوئے کہ ان کو مسلمان تک بھی نہ مانا، ان کا تبرا شروع کیا معاذ اللہ ان پر لعنت

بھیجنی شروع کی، تو بعض محبت میں اور بعض عداوت میں غلو سے تباہ ہوئے۔

یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کہ نصاریٰ ان کی محبت میں تباہ ہوئے کہ ان کو اللہ کہا، اللہ کا بیٹا کہا خدائے مجسد کہا کہ ایک نورانی خدا ہے ایک جسمانی خدا ہے، نورانی خدا اوپر ہے جسمانی خدا نیچے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کے لئے علم غیب اور قدرت ثابت کی اور سارے وہ اوصاف جو اللہ کے لئے ہیں ان کے لئے ثابت کئے تو غلو محبت میں عقائد تباہ کئے۔ اور یہود عداوت میں برباد ہوئے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا کہ یہ وَلَدِ غیًّا ہیں۔ بازار والے آدمی یوسف نجار سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام پر انہوں نے تہمت لگائی۔

بہر حال عقائد میں ان دو چیزوں سے خلل پڑتا ہے اور کبھی عقل لڑانے سے اس لئے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی چیز ہو اس میں عقل کی گنجائش نہیں۔ مثلاً قرآن کریم یا حدیث میں فرمایا گیا کہ عذاب قبر برحق ہے اور وہ اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اب لوگوں نے عقل لڑائی کہ ہم نے قبر کھود کر دیکھی ہمیں تو اس میں عذاب نظر آیا نہیں، وہاں تو ایک لاش پڑی ہوئی تھی وہاں نہ کوئی آگ تھی نہ سانپ نہ بچھو۔ تو ہم اس عقیدے کو کیوں مانیں، عقل لڑائی تو عقیدہ بگڑ گیا۔

حدودِ عقل...... حالانکہ یہ عمل سے بالاتر چیز ہے، وہ دوسرے عالم کی چیز ہے، لاش پڑی ہوئی ہو اور سب کچھ گزر رہا ہو ممکن ہے کہ آپ کو نظر نہ آئے۔ آپ ایک سوتے ہوئے آدمی کو دیکھیں کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں۔ تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا ہوں اور میرے سامنے ہزاروں غلام خدام کھڑے ہیں، اور فوجیں سلامیاں دے رہی ہیں۔ مگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ پڑا ہوا سو رہا ہے، نہ وہاں حشم و خدم ہیں نہ سپاہی اور اس پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے عالم، عالم مثال سے گزر رہا ہے، روح نیند کے وقت نکل کر اس عالم میں پہنچی تو وہاں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ آپ کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

جب وہ خود سویا ہوا اٹھ کر بیان کرے کہ میں نے یہ خواب دیکھا آپ اس کی تصدیق کریں گے، تو خواب میں اس نے لذت و راحت بھی اٹھائی اور عزت بھی پائی آپ کو کچھ نظر نہیں آیا، مگر آپ نے یقین کیا۔ تو جیسے ایک سونے والے پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو کچھ نظر نہیں آتا تو حدیث میں ہے کہ: "اَلنَّوْمُ اُخْتُ الْمَوْتِ" "نیند موت کی بہن ہے"۔

تو جو چیز نیند میں گزرتی ہے وہ موت کے بعد بھی گزر سکتی ہے، فرق اتنا ہے کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے، آپ کو ایک لاش نظر آ رہی ہے مگر اس پر سب کچھ گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں، جو دوسرے پر گزر رہی ہو۔

یا ایک چارپائی پر دو آدمی سو رہے ہوں، ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ سپاہی مجھے ڈنڈے مار کر جیل خانے میں لے جا رہے ہیں، ایک خواب میں ہنس رہا ہے اور ایک رو رہا ہے مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں جو اس پر گذر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں، جو دوسرے پر گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو خبر نہیں حالانکہ ملے ہوئے ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک قبر میں دو مردوں کو دفن

کردیں ایک اللہ کا مطیع ہے ایک مجرم ہے۔ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ قبر میں بہترین نعمتیں میرے سامنے ہیں، اور ایک دیکھ رہا ہے کہ بدترین عذاب میرے اوپر ہے اس کی اسے خبر نہیں، اس کی اسے خبر نہیں اور آپ دیکھیں گے کہ دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں نہ نعمت ہے نہ عذاب ہے۔

جب دنیا میں اللہ نے ایک نظیر رکھ دی ہے، اس میں جب نعمتیں اور مصیبتیں گزرتی ہیں تو مرنے کے بعد اگر قبر میں راحت، اور مصیبت گزرے، عذاب اور ثواب ہو تو اس میں کون سے تعجب کی بات ہے دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے۔لیکن اگر عقل لڑائیں گے تو عقیدہ بگڑ جائے گا، اس لئے کہ عقل کا وہاں کام نہیں۔عقل ہوا مٹی آگ پانی کے اس دار فانی میں کام کرنے کے لئے ہے یہاں کی چیزوں میں عقل چلے گی۔ یہاں کی عقل سے وہاں کی چیزوں میں کام لینے لگیں تو وہاں یہ نہیں چلے گی۔

امور غیبیہ اور عقل...... یہ بالکل ایسا ہے جیسے ترازو جو پیتل کی چھوٹی سی ہوتی ہے، اس پر سونا اور چاندی تلتا ہے۔ایک ذرا بڑی ہوتی ہے اس میں حلویٰ تلتا ہے، ایک اس سے بڑی ہے اس میں ایندھن اور سوختہ تلتا ہے اور ایک اتنی بڑی ہے کہ اس میں ہزاروں ٹن کا ریل کا ڈبہ تلتا ہے کہ اس میں اتنے ٹن وزن ہے، دس ہزار ٹن کا ایک جہاز ہے اس میں ایک مشین لگی ہوئی ہے، تو کانٹا بتلا دیتا ہے کہ اتنے ہزار ٹن کا جہاز ہے، اب اگر جہاز کو کانٹے پہ تولنے لگیں تو کیا تل جائے گا؟ ایندھن تولنے کے ترازو پر آپ ریل کے ڈبے کو رکھ دیں تو کیا وہ تل جائے گا؟ حالاں کہ یہ بھی ترازو ہے وہ بھی ترازو ہے، مگر یہ ترازو سونا تولنے کی، یہ گیہوں تولنے کی اور یہ ترازو لکڑیاں تولنے کی ہے۔اور یہ ترازو ریل کا ڈبہ تولنے کی ہے ہر ترازو میں وہی چیز تلے گی جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ چھوٹی ترازوؤں میں بڑی چیز تلنے لگے۔تو عقل بھی ایک ترازو ہے مگر اس میں محسوسات تولے جاتے ہیں، وجدان اور وحی بھی ایک ترازو ہے جس میں غیبی امور تولے جاتے ہیں، باطن بھی ایک ترازو ہے جس کے اندر قبر کا عذاب اور ثواب تولا جاتا ہے، اب اگر آپ آنکھ سے قبر کا عذاب اور ثواب تولنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے سونے تولنے کے کانٹے میں ریل کے ڈبے کو تولنے لگیں، وہ نہیں تلے گا بلکہ وہ ترازو ہی ختم ہو جائے گا، تو اگر عقل پر غیبی امور کا بوجھ ڈال دیا جائے تو وہ سسک کر مر جائے گی فیصلہ ان کا کیا کرے گی؟ تو آپ دنیا کی ترازو سے آخرت کی چیزیں تولنے لگیں تو وہاں عقل کیا کام کرے گی؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے سونے تولنے کی ترازو میں آپ لکڑی تولنے لگیں وہ نہیں تلیں گی۔بہرحال کبھی عقائد میں عقل لڑانے سے بگاڑ آتا ہے کہ عقائد غیب کی چیزیں ہیں عقل وہاں کام نہیں کرتی گویا آپ نے عقل کے کانٹے میں عقیدے کو تولنا شروع کر دیا۔

حدودِ ادراک...... دنیا کے اندر آنکھ کا کام نظر ہے کہ صورتیں دیکھے اور رنگ دیکھے، آپ یوں کہیں کہ میں آنکھ سے خوشبو سونگھوں، نہیں سونگھ سکتے، اس کے لئے ناک ہی کام دے گی۔ناک خوشبو سونگھتی ہے آپ ناک کے ذریعے کسی چیز کو دیکھنا چاہیں کبھی نہیں دیکھ سکتے، کان آوازیں سنتے ہیں، آپ یوں چاہیں کہ کان سے رنگ دیکھ لوں

کبھی نہیں دیکھ سکتے، حالانکہ ایک چہرے میں یہ ساری چیزیں جمع ہیں، آنکھ، ناک، کان، گلہ ان میں انچ انچ بھر کا فاصلہ ہے مگر ایسی سدِ سکندری حائل ہے کہ آنکھ کے دائرے میں کان اور کان کے دائرے میں ناک کام نہیں کر سکتی، اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے ہیں۔ تو عقل کا بھی ایک دائرہ ہے اور باطن کا بھی ایک دائرہ ہے اب اگر میں، گنگا کے کنارے پر بیٹھ کر معلوم کرنا چاہوں تو مجھے کیا معلوم ہوگا کہ گنگا کے اندر کیا برکت ہے، کون سے نبی آئے تھے کن کے آثار ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چل گیا۔ اس لئے کہ باطن کی آنکھ تھی ان پر منکشف ہو گیا کہ واقعی اس پانی میں کچھ برکات کے آثار ہیں، اور پیغمبروں کی طرف نسبت ہے اس لئے قوم کی قوم اس کی عظمت پر لگی ہوئی ہے۔

تو ہر چیز سے اس کے دائرے کی چیزیں تولی جاتی ہیں۔ عقل سے عقلی امور، آنکھ سے، رنگ وصورت، ناک سے خوشبو بدبو اور کان سے آوازیں۔ پھر ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے۔ تو اسی طرح سے ایک دائرہ وحی خداوندی کا ہے وحی بتلا سکتی ہے کہ قبر کیسی ہے، جنت و دوزخ کیسی ہے۔ پل صراط کیسا ہے۔ میزان عمل ”جس میں اعمال تولے جائیں گے“ وہ کیسی چیز ہے۔ آپ عقل سے جاننے لگیں گے نہ سمجھ سکیں گے یہ عقل سے بالاتر چیز ہے، جو وحی سے سمجھ میں آئے گی، بہر حال ہر چیز کا ایک دائرہ ہے۔

منبع عقائد..... تو عقیدہ کبھی عقل سے بگڑتا ہے کہ ہے غیر عقلی چیز اس میں عقل لڑانی شروع کی تو یا سچے عقیدہ کا انکار کریں گے یا غلط عقیدہ گھڑ لیں گے، دین برباد ہو جائیگا۔ اور کبھی عقیدہ غلو محبت سے بگڑتا ہے کہ اپنے اعتقاد والے بزرگوں سے اتنی محبت بڑھ جائے کہ آدمی فانی بن جائے جو وہ کہیں اسی کو آدمی شریعت سمجھ لے، جو وہ کہیں اسی کا عقیدہ بنا لے، کیوں کہ عقیدے شریعت کے ہیں ان میں اس سے بگاڑ پیدا ہوگا اور کہا جائیگا کہ عقیدے پیغمبر سے لئے جائیں گے اولیاء سے عقیدے نہیں لئے جائیں گے، علماء عقیدے بنانے والے نہیں ہیں، مشائخ عقیدہ قائم کرنے والے نہیں ہیں، مشائخ خود پابند ہیں ان عقیدوں کے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، علماء خود ان عقائد کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمائے عقیدہ خدا کی خبر سے بنتا ہے، علماء کے کہنے سے عقیدہ نہیں بنتا، لیکن محبت میں ان کے ہر قول و فعل کو آدمی عقیدہ بنا لے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت اور دین کے اندر خلل پیدا ہوگا۔

اور کبھی غلو عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی جماعت یا کسی شخص سے عداوت پیدا ہو جائے۔ ضد یا عناد پیدا ہو جائے، اچھی سے اچھی بات بھی کہیں گے، تو یہ غلط کہے گا، اس لئے کہ بدگمانی پہلے قائم کر لی۔ وہ صحیح عقیدہ بھی بیان کریں گے تو غلط کہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط عقیدے پر قائم ہو جائے گا، اور صحیح عقیدے سے محروم رہے گا تو عقائد کو بگاڑنے والی کبھی عقل ہوتی ہے کہ غیبی امور میں دخل دے۔

ضرورتِ اعتدال..... کبھی محبت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا محبت پیدا کر لے اور کبھی عداوت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا

عداوت پیدا کر لے، اس لئے شریعت نے اعتدال بتلایا۔ عربی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے: ’’اگر کسی سے محبت کرو تو اعتدال سے کرو، افراط کے ساتھ مت کرو، ممکن ہے کہ کل کو دشمنی پیدا ہو جائے کہ آج محبت میں آ کے سارے راز کھول دیئے اور کل کو ہوگئی دشمنی تو خود اس کے ہاتھ میں آگئے، جدھر چاہے تمہیں لے جا کے پٹخ دے، اب پچھتاؤ گے کہ محبت میں سارے راز میں نے کیوں کھول دیئے‘‘۔ اور فرمایا: کہ کسی سے عداوت کرو تو اعتدال سے کرو ممکن ہے کہ کل کلاں دوست بن جائے، تو عداوت میں آ کر جو برا بھلا کہا ہے کل کو تمہاری آنکھ نیچی ہوگی کہ ہم نے بہت برا بھلا کہا تو کیوں افراط وتفریط سے چلتے ہو، محبت کرو تو اعتدال سے، عداوت کرو تو اعتدال سے، نفس کے جذبے سے نہ محبت ہو نہ عداوت ہو، اس لئے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

کمالِ ایمان...... چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ’’مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِاسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ‘‘ ’’جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، نفس اور اپنی ذات کے جذبے سے نہیں کی، رضاء خداوندی کے لئے کی، عداوت باندھی تو اللہ کے لیے باندھی، کہ یہ اللہ کا دشمن ہے، مجھے بھی اس سے عداوت ہے۔ یہ اللہ کا دوست ہے میں بھی اس سے محبت کروں، کسی کو دیا تو اللہ کی رضا کے لئے دیا اور کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے روکا۔ تو عطاء ومنع اور محبت وعداوت سب لوجہ اللہ ہوں تو اس شخص نے ایمان کامل کر لیا‘‘۔ تو کمال ایمان یہ ہے کہ محبت اور عداوت لوجہ اللہ ہوں، ذاتی جذبہ اور غیض کا دخل نہ ہو، دینا اور لینا لوجہ اللہ ہو، محض ذاتی جذبہ نہ ہو کہ فلاں سے محبت ہوگئی تو سب دے ڈالو اور فلاں سے عداوت ہوئی تو روک لو نہیں! بلکہ یہ دیکھو کہ اللہ کے نزدیک اسے دینا پسندیدہ ہے یا نہیں۔ پسندیدہ ہو تو دو اگرچہ نفس نہ چاہئے اور اگر اللہ کے نزدیک دینا پسندیدہ نہیں تو ہرگز نہ دو، اگرچہ نفس دینا چاہے، تو اپنے نفس کو ایک طرف ڈالو، اللہ کی رضا کو مقدم رکھو، تو حاصل ایمان کا یہ ہے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر آپ زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے زندہ ہونے کو تیار ہیں اور اگر موت دیں تو میں آپ پر فدائی ہو جاؤں گا، دل آپ سے اٹک چکا ہے جو آپ کریں، جس سے آپ راضی اس سے میں راضی ہوں، تو بندے کا کام یہ ہے کہ رضاء خداوندی میں فنا ہو جائے کہ میری رضا کچھ نہیں جو رضاء ہے وہ اللہ کی ہے، میرا لینا دینا اور محبت وعداوت سب اللہ کی رضا کے تابع ہے۔

ممنونیت اِحسان...... اور خود میرے حق میں بھی نفس کے تابع نہیں ہے۔ کسی غلام سے کسی نے کہا تھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے کام کیا کریگا؟ جو آقا کام لے۔ اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا کہ اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا، میرے غلام بننے کے معنی یہ ہیں کہ اب میری مرضی بھی غلام، میرا ارادہ اور خواہش بھی غلام جو کچھ ہوگا آقا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ وہ کھلا دیں گے تو کھالیں گے، نہیں کھلائے گا تو نہیں کھائیں گے وہ کام لے تو کام کریں گے، معطل چھوڑ دے تو

معطل ہو جائیں گے، تو ہم اپنے آقا کے تابع ہیں۔

جب ایک انسان، ایک انسان کے ذرا سے احسان کی وجہ سے اتنا تابع ہوتا ہے تو رب العزت تو سارے محسنوں سے برتر محسن ہیں جب اس کا بندہ بنیں تو بندگی کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس کے تابع کردی نہ میری اپنی مرضی نہ اپنی رضا، نہ میرا اپنا ارادہ، جو کچھ ہو وہ آپ کا ہی ہے، یہ شان جب پیدا ہوگی تو کہا جائے گا کہ آج انسان میں بندگی آگئی۔ آج اس کے اندر عبدیت آئی۔

شانِ عبدیت...... اگر اپنا ارادہ اور اپنے عزائم ہیں تو پھر وہ بندہ کیا ہے؟ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ: فلاں جگہ جاؤ اور جا کر دین پھیلاؤ، رخصت ہوتے وقت اس مرید خلیفہ نے عرض کی کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔

فرمایا: دو نصیحتیں کرتا ہوں: ایک خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبی ہونے کا دعویٰ نہ کرنا۔

وہ حیران ہوا کہ حضرت کیا مجھ سے آپ کو یہ توقع تھی کہ میں خدائی کا دعویٰ کر دوں، آپ کا مرید اور آپ کا نائب اور خدائی کا دعویٰ کرے۔ اور کیا آپ کو یہ توقع تھی کہ میں نبی ہونے کا دعویٰ کروں گا۔ یہ تو ادنیٰ مسلمان بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ آپ کا مرید اور نائب خدائی اور نبوت کا دعویٰ کرے۔

فرمایا: پہلے اس کے معنی سمجھ لو، خدا کے معنی ہیں کہ جو کچھ وہ فرمائیں وہ ہو کر رہے وہ اٹل ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہوگا، وہ درپردہ خدائی کا مدعی ہے، چاہے زبان کے واسطے سے نہ کہے۔

اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو فرما دیں، وہی صدق اور حق ہے ممکن نہیں کہ نبی کا کہا ہوا غلط ہو جو آدمی یوں کہے کہ جو میں نے کہا یہی صحیح ہے، اس کے علاوہ سب غلط ہے تو وہ فی الحقیقت نبوت کا مدعی ہے، چاہے زبان سے نہ کہے، اس لئے میں نے کہا کہ نہ خدائی کا دعوی کرنا نہ نبوت کا دعویٰ کرنا۔

انسان جب یہ دعویٰ کرے کو جو میں کہہ رہا ہوں، اٹل ہے، وہی ہوگا، یہ درپردہ خدائی کا دعویٰ ہے، جو میں کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے، یہ درپردہ نبوت کا مدعی ہے، اسے یوں کہنا چاہئے کہ جو اللہ نے کہا ہے وہی حق ہے، میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ کے رسول نے کہا وہی حق ہے، میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں، جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا میرا چاہا ہوا پورا نہیں ہو سکتا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾

اگر یوں کہے تو ہے بندہ۔ اور اگر یوں کہے کہ میں جو چاہوں وہی ہوگا تو درپرہ خدائی کا مدعی ہے، جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے، باقی سب غلط ہے، یہ درپردہ نبوت کا دعویٰ ہے، یہ تفویض اور عبدیت کے خلاف ہے، بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کہا جائے یا کیا جائے وہ اس کی رضاء کے لئے ہو، حتیٰ کہ ہر نقل و حرکت اس کی رضا کے لئے ہو۔ جیسے مولانا رومی نے فرمایا: ''اے اللہ اگر آپ ہمیں علم دیں اور ہم علم کے میدان میں آئیں تو آپ کے محل اور ایوان و قصر میں

داخل ہو گئے، اور اگر آپ جہالت میں رکھیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہیں، آپ کے بندے علم میں لے آئیں تو آپ کے محل میں داخل ہو گئے اور اگر جیل میں لے آئیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہو گئے"۔

اگر آپ سلا دیں تو ہم بے بس ہیں اور اگر آپ بیدار رکھیں تو آپ کے ہاتھ میں ہیں نہ خواب ہمارے نہ بیداری ہماری، جو کچھ دیا ہوا ہے وہ آپ کا ہے، تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ ادھر کا منشاء ہو اس کی آدمی تابعداری کرے۔ جب آدمی اپنی بات چلائے، عقل چلائے، غلو محبت یا غلو عداوت چلائے تو در پردہ الوہیت و نبوت کا مدعی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اللہ کے آستانے کے آگے جھکے توحید کے معنی ہی یہ ہیں کہ دل سے بھی ایک ہی کو یکتا اور کرتا دھرتا سمجھے اور عمل سے بھی ایک ہی کی طرف جھکے۔

اقسامِ توحید...... اسی لئے شریعت اسلام نے توحید دو قسم کی بتلائی ہے، ایک توحید اعتقادی یعنی اعتقاد بھی یہ کہ ایک ہی اللہ ہے جو معبود ہے، وہی علیم و خبیر ہے اور رحمٰن و رحیم، وہی آقا وہی مالک ہے، یہ عقیدہ ہے، عملاً یوں جھکایا کہ زندگی کا کوئی موڑ نہیں ہے جس میں اللہ کی طرف نہ جھکایا ہو اگر آپ سونے کے لئے لیٹیں، حدیث میں حکم ہے کہ دعاء پڑھو: "بِاسْمِکَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی"۔ "اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر صبح کو زندہ ہوں گا"۔ یہ بھی ایک مجازی موت ہے، اللہ کے نام پر خاتمہ ہونا چاہئے، جب آپ جاگے تو پھر شریعت متوجہ ہوئی کہ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور کہیں: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَمَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ" ① "حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی، اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کے جانا ہے"۔

آفتاب طلوع ہو تو فرمایا: اللہ کی طرف توجہ کرو اور یہ دعا کرو: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَلَّلَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً" ② "حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے سورج کو چمکا دیا، جس نے سورج کے ذریعے ہمارے کام آسان کئے"۔ جب غروب آفتاب ہو پھر فرمایا کہ: اللہ کی طرف متوجہ ہو اور یہ پڑھو: "اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِکَ وَاِدْبَارُ نَهَارِکَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِکَ فَاغْفِرْلِیْ" ③ "اے اللہ! تیرے سورج کے جانے کا وقت ہے اور تیری رات کے آنے کا وقت ہے اور تیرے منادی نداء کر رہے ہیں کہ دوڑو نماز کی طرف، ایسے وقت میری مغفرت فرما"۔

غرض زندگی کا کوئی موڑ آئے شریعت نے فوراً متوجہ کیا ہے، کہ توجہ الی اللہ کرو تا کہ توحید میں خلل نہ پڑے، ایسا نہ ہو کہ تم سورج کو کرتا دھرتا سمجھ لو، ایسا نہ ہو کہ تم روشن دن کو یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارا کام چلانے والا ہے، ایسا نہ ہو کہ رات کو تم موت دینے والی سمجھ لو کہ رات آ گئی تو مر گئے سو گئے، نہ دن زندگی دیتا ہے نہ رات، جس نے رات اور دن بنائے وہی زندگی اور موت کا مالک ہے، لہٰذا بستر پر جا کر کہو: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا مکم ممن لا کافی له

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب وضع الید الیمنیٰ تحت الخد الایمن، ۵/۲۳۲۷ رقم: ۵۹۵۵.

② عمل الیوم واللیلة لابن سنی، ج: ۱ ص: ۲۷۷.

③ السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء ام سلمة، ج: ۱۲، ص: ۱۴.

ولا مؤوی" ① "حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے ہمیں کھلایا جس نے ہمیں پلایا جس نے ہمیں ٹھکانا دیا" تا کہ ادھر توجہ نہ ہو کہ یہ کھانا کھانا زندگی کا بڑا سبب ہے، کھانے نے ہمیں زندہ رکھا ہے، کھانا کیا چیز ہے؟ فاقہ مست بھی زندہ رہتے ہیں، زندگی ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے روٹی میں زندگی نہیں ہے تو روٹی کے وقت متوجہ کیا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹی کو خدا سمجھ بیٹھیں، اس کو خدا سمجھیں جس نے روٹی عطا کی، تو کھانا شروع کرو تو کہو بِسْمِ اللہِ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، ختم کرو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کثیرا بہت تعریف میرے پروردگار کے لئے ہے، جس نے کھلایا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: اگر "بِسْمِ اللّٰہِ" سے کھانا شروع کرے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا" پر ختم کرے "غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ" اس کے پچھلے چھوٹے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں، اس کی فضیلت بیان فرمائی۔ تو حاصل یہ ہے کہ زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہ ہوگا جس میں توجہ الی اللہ نہ ہو۔ استنجا کیلئے جاؤ تو دعاء بتلائی گئی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ ② "اے اللہ! میں ناپاک چیزوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں"۔ شیطان ہو یا کچھ اور ہو میں پناہ مانگتا ہوں۔

اور جب استنجاء کر کے نکلو پھر اللہ کو یاد کرو، اور کہو۔: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ" ③ "حمد ہے اس اللہ کیلئے جس نے اذیت کی چیزیں مجھ سے دور کر دیں اور اب میں اس کی عبادت کے لئے تیار ہو گیا اور میرے قلب میں نشاط پیدا ہو گیا"۔

تو آدمی یوں نہ سمجھ جائے کہ استنجاء کرنا درحقیقت صحت ہے، میری صحت استنجاء کے ہاتھ میں ہے، قبض ہوگی تو بیمار ہوں، قبض نہیں ہوگی تو بیمار نہیں رہا، گویا قبض وسط کے ہاتھ میں میری زندگی ہے، تو اس سے بچانے کیلئے کہا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو سونے جاگنے، استنجاء کرنے اور فارغ ہونے میں، سورج نکلنے اور غروب ہونے میں، دن کے آنے اور جانے میں اور اسی طرح گھر کے باہر نکلنے میں بھی کہ وہاں بھی متوجہ کیا کہ اب تم کام کاج کے لئے جا رہے ہو تو اللہ کی طرف توجہ کرو اور کہو: "بِسْمِ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ. تَوَکَّلْنَا عَلَی اللّٰہِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" ④ "میں اللہ کے نام سے نکل رہا ہوں، میں اللہ پر ایمان لا چکا ہوں میں نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے کہ جو کچھ پیش آئے گا، اس کی تقدیر سے پیش آئے گا، کوئی مجھے نقصان پہنچانے والا بجز ایک اللہ کے نہیں ہے"۔

اسی طرح گھر میں داخل ہو تو فوراً دعاء کرو: "بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰہِ خَرَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب مایقول عند النوم واخذالمضجع ج:۱۳ ص:۲۴۱. صحیح ابن حبان، کتاب الزینة والتطییب، باب آداب النوم، ج:۲۳، ص:۱۰۴.

② الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب الدعاء عند الخلاء، ج:۵، ص:۲۳۳۰.

③ سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما یقول اذا خرج من الخلاء، ج:۱ ص:۱۱۰، رقم:۳۰۱.

④ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا خرج من بیته، ج:۱۳، ص:۲۹۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح ابی داؤد، ج:۱۱ ص:۹۵ رقم ۵۰۹۵.

رَبَّنَا تَوَ کَّلْنَا"۔ " اللہ ہی کے نام سے ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں، اور اللہ ہی کے نام سے نکلیں گے، اور ہمیں تو اللہ پر بھروسہ ہے" کسی غیر اللہ پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے تا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے، کہ آرام دینے والا یہ گھرانہ ہے، گھرانے آدمی سے چھنتے رہتے ہیں، آج بڑی جائیداد اور کئی گاؤں کا مالک، لیکن کل کو غریب بن گیا، تو وہ خدا نہیں ہے وہ دینے والا نہیں ہے، وہ اسباب کے درجہ میں ہے۔

غرض ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرائی ہے۔ تو ایک تو حید اعتقادی ہے کہ دل میں یہ یقین رکھے کہ اللہ کی ذات اور ساری صفات یکتا ہوں، اور ایک ہی میں ہیں دوسرا اس کا مثل نہیں۔ اور دوسری عملی توحید ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک ہی کی طرف متوجہ کیا ہے، فقط نماز روزے ہی میں نہیں معاشرت میں چلنے پھرنے میں، گھر آنے جانے میں مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے میں سفر میں جانے اور آنے میں بھی ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرو، یہ توحید عملی ہے تا کہ عمل کے ایک ایک گوشہ میں تم اللہ ہی کی طرف پہنچو، کسی دوسرے تک نہ جاؤ۔

اسلام کا مزاج...... تو جس دین نے ہمیں سونے جاگنے، چلنے پھرنے میں ایک ذات کی طرف متوجہ کیا تو کیا وہ دین غیر اللہ کی طرف متوجہ کرے گا کہ ہم غیر اللہ کو سجدہ کریں اور غیر اللہ سے ہم پناہ مانگیں، غیر اللہ سے ہم مرادیں مانگیں، اس دین کا یہ مزاج ہی نہیں، یہ مزاج لوگوں کی عقلوں نے پیدا کیا ہے، لوگوں کی غلو محبت اور غلو عداوت نے پیدا کیا ہے اور عقائد انہیں اسباب سے بگڑتے ہیں۔ تو جب عقیدہ کا معاملہ آئے تو ان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ کی طرف اور رسول طرف رجوع کرو جو ارشاد خداوندی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے، ہماری عقل اور طبیعت اس قابل نہیں، تو عقائد کا مخزن قرآن کریم یا حدیث نبوی ہے جن سے عقیدہ بنتا ہے۔

عقائد صحیحہ کی پہچان...... اور قرآن کریم میں اگر خلجان پیدا ہو تو حدیث اس کی شرح ہے، حدیث کے سمجھنے میں خلجان پیدا ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل اس کی شرح ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو چیز قبول کی اور جو ان کا عمل جاری ہوا اس سے ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول کا یہی مطلب ہے ورنہ تو سب سے اول قرآن کریم ہے اس کے بعد حدیث نبوی ہے اس کے بعد تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم ہے حدیث اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے کٹ کر قرآن کریم میں محض عقل لڑائے تو وہ ہمارا عقلی عقیدہ ہوگا، خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ نہیں ہوگا، خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ وہی ہے جسے خدا خود فرمائے، اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی شرح کرے، ان کی شرح صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل و تعامل کر دے، تو اول کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ پھر تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے۔

اور اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر خلجان ہو پھر عام امّت کا عمل ہے، یعنی علماء امت اور ربانیوں کا عمل ہے کہ جو دین پہنچانے والے ہیں ان کا طریق عمل کیا رہا ہے؟ محدثین فقہاء، متکلمین وغیرہ یہ حضرات کس چیز پر جمے ہوئے ہیں تو اس سے عقیدہ واضح ہو جائے گا، قرآن نے اجمالاً کہا حدیث نے اس کی شرح کی، فقہ نے تفصیل کی، تعامل صحابہ نے اسے مضبوط بنایا، اور اب امت کے علماء ربانی نے اس کو موکد کر دیا، ان چیزوں سے مل کر عقیدہ بنتا

ہے، ان میں سے ایک چیز کو بھی آپ رکھ دیں، گے تو عقیدہ صحیح نہیں بنے گا، اس واسطے ضرورت پڑے گی کہ عقیدہ درست ہو اور عمل درست ہو۔ خیر بات دور نکل گئی، میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا، یہ بیچ میں آ گئی۔

بین الاقوامی دین کی علامت...... میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی دین لے کر آئے ہیں، اس واسطے قرآن کریم نے ہم پر واضح کیا کہ سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاؤ: ﴿قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ① ''حکم ہے کہ مسلمانوں کو کہہ دو، اعلان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اور اللہ نے جو ہم پر (قرآن وحدیث) نازل کیا، اس پر ایمان لائے، اور ابراہیم علیہ السلام پر جو صحف نازل ہوئے ان پر بھی ایمان لائے کہ وہ اپنے زمانے میں حق تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد تو اس میں نبی اسرائیل کے تمام پیغمبر آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو نازل ہوا، اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر جو نازل ہوا خواہ وہ کسی بھی ملک سے آئے ہوں، ہم سب پر ایمان لاتے ہیں، ہم تفریق نہیں کرتے کہ اس نبی پر ایمان لاؤ اور اس پر نہ لاؤ سب کو ہم اللہ کا فرستادہ سمجھتے ہیں''۔

ظاہر بات ہے کہ تعصب جو پیدا ہوتا ہے وہ شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ میرا متبع ہے میں اسے مانتا ہوں اور یہ تمہارا متبع ہے میں اسے نہیں مانتا یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے، اور جو سارے مقتداؤں کو مانے تو جھگڑا کہاں باقی رہا؟ اسلام نے سارے مقتداؤں کو ماننا بتلایا، تو بین الاقوامی دین اسلام ہی ہوسکتا ہے اگر اسلام یوں کہے کے عرب میں جو پیغمبر آئے ہیں انہیں تو مانو، شام حجاز اور ہندوستان وسندھ میں جو آئیں انہیں مت مانو، یہ تعصب ہوتا۔ یہ بین الاقوامی دین کی علامت نہیں ہوتی، بین الاقوامی دین کے معنی یہ ہیں کہ تعصبات کی جڑ کاٹ دی جائے، تعصب شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے، جب ہم ساری شخصیتوں پر ایمان لائے ہیں، تو ہندوسندھ میں کوئی بھی پیغمبر آئے ہوں، ہمیں نام معلوم ہوں یا نہ ہوں ہم بالاجمال ایمان لاتے ہیں، تو اقوام کے اندر سے غیض اور غصہ نکل جائے گا، غصہ تو جب ہو جب ہم کسی پیغمبر کو برا کہیں، وہ ہم سے لڑے گا، ہمارے پیغمبر کو برا کہے تو ہم لڑیں گے، اگر آنے والا یوں کہے کہ میں تمہارے پیغمبر کو بھی مانتا ہوں اپنا جان کر اور تم میرے پیغمبر کو بھی اپنا جان کر مانو، لڑائی ختم ہوگئی، تو پہلا تعصب شخصیتوں کا ہے، اسلام نے اس کو مٹا دیا یہ علامت ہے کہ وہ بین الاقوامی دین ہے وہ پوری دنیا کے لئے آیا ہے پوری دنیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی اگر وہ برا بھلا کہتا کہ فلاں جگہ کے نبیوں کو مت ماننا اور ہندوسندھ کے پیغمبروں کو مت ماننا تو سندھ وہند کی اقوام ہم سے الگ ہوتیں، ہم ان سے الگ ہوتے، اور جب سب کو مانا تو کسی کے دل میں غیض نہیں رہا۔ تو یہ بین الاقوامی دین کی علامت ہے۔ اور اگر کوئی یوں کہے کہ میرے

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۶۔

پیغمبر کو مانو اور فلاں جگہ کے پیغمبر کو مت ماننا تو یہ تعصب و تنگی اور مقامیت کی علامت ہے۔

ایک یہودی سے گفتگو...... میرا افریقہ جانا ہوا تو ہمیں پرس (یعنی بٹوے) خریدنے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں افریقہ سے حجاز مقدس جانا تھا تو احرام میں گھڑی، مسواک کاہے میں ڈالتے، کپڑا تو نہیں پہن سکتے۔ تو ہمارے میزبانوں نے کہا کہ پرس بنانے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ایک یہودی کی ہے، وہاں انواع واقسام کے پرس بنتے ہیں آپ وہاں چلیں، بہتر سے بہتر پرس ملے گا، چناں چہ ہم وہاں پہنچے، تو ہمارے میزبانوں نے پہلے جا کے کچھ میرا تعارف کرادیا کہ ہندوستان سے آیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا ذکر وغیرہ، وہ یہودی جوارب پتی تھا، وہ استقبال کے لئے باہر نکلا، بڑی آؤ بھگت کر کے اپنی فیکٹری میں لے گیا۔ خیر اس نے کہا کہ اپنے پرس پسند کرلیں، بعد میں بیٹھ کر بات چیت کریں گے، ہم نے پرس پسند کئے مگر ہم نے کہا کہ ان پرسوں میں جو ہینڈل ہے وہ چھوٹا ہے ہمیں گلے میں ڈالنے کے لئے چاہئے، اس نے کہا میں ابھی بنوائے دیتا ہوں اس نے آرڈر دیا کہ ان کا جو فیتا ہے وہ لمبا کردو تاکہ گلے میں ڈالنے کے قابل ہوجائے وہ دیدیئے اور کہا کہ وہ بن کر آجائیں گے اتنے میں ہم آپس میں بات چیت کریں، وہ بات چیت ہوتی رہی، اس میں اس نے کہا کہ کوئی مذہب کی بات بتائیے، میں کہا کہ میں مذہب کی کیا بات بتلاؤں آپ اپنے مذہب پر ہیں میں اپنے مذہب پر ہوں۔

﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ ① کہنے لگے: آپ کچھ کہئے۔ میں نے کہا آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ کہنے لگا، بالکل نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ہمارے دشمن ہیں، ہم آپ کے دوست ہیں۔ کہنے لگا: یہ کیسے؟ میں نے کہا کہ ہم تو آپ کے دوست ہیں۔ اس لئے کہ آپ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ہم ان کو اپنا پیغمبر جانتے ہیں کہ ذرہ برابر اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہوجائے گا، اس لئے جو آپ کے پیغمبر ہیں وہ ہمارے پیغمبر ہیں۔ اس لئے ہم مسلمان بن نہیں سکتے جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں اور آپ یہودی بن نہیں سکتے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جھٹلائیں اور یہ نہ کہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا وہ غلط تھا تو آپ انہیں جھٹلائے بغیر یہودی نہیں بن سکتے ہم تصدیق کئے بغیر مسلمان نہیں بن سکتے، تو ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہمارے دشمن ہیں۔ اب وہ بے چارہ چپ ہوگیا۔ چپ ہوکر کہنے لگا کچھ اور کہئے۔ میں نے کہا کہ ہم ایماندار ہیں آپ بالکل ایمان سے خارج ہیں۔ کہنے لگا کہ یہ کیسے؟ میں نے کہا ایمان ماننے کا نام ہے، نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، ہم سب کو مانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی، حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور سارے پیغمبروں کو بھی، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو نہ ماننے والے کا ایمان نہیں ہے ماننے کا نام ایمان ہے، اس لئے آپ ایمان سے خارج ہیں، ہم ایمان میں داخل ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الکافرون: ٦.

کہنے لگا: اور کچھ کہئے ۔ میں نے کہا: اب رہنے دیں ۔ کہنے لگا: کچھ تو کہئے ۔ میں نے کہا: آپ کے اندر عداوت بھری ہوئی ہے، ہمارے اندر محبت بھری ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ایمان محبت کا نام ہے۔ جب ہم ایمان لائے تو سارے انبیاء سے محبت رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں نہ ماننے کا نام ایمان ہے اور وہ عداوت کا سرچشمہ ہے، اس واسطے آپ عداوت سے بھرپور ہیں ہم محبت سے بھرپور ہیں۔

کہنے لگا! بس کافی ہوگیا، اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اب میں بات چیت کرنے کو برا مانوں گا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ ایمان ماننے کا اور محبت کا نام ہے، مومن وہی ہے جو سارے اللہ والوں کو مانے، وہ مومن نہیں ہے جو بعض انبیاء علیہم السلام کو مانے اور بعض کو نہ مانے، مومن وہی ہے جو سارے اولیائے کرام کا نام عظمت سے لے، ان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے، بعض اولیاء کو مانے اور بعض کو نہ مانے بعض کی تکفیر کردے اور بعض کو مومن مانے، حقیقت میں یہ شخص محبت سے خالی ہے۔

بہر حال ایمان ماننے اور محبت کا نام ہے۔ اور ایمان توکل اور بھروسہ کرنے کا نام ہے، تو اللہ پر بھروسہ اور انبیاء علیہم السلام کا ماننا اور ان کی اطاعت میں سرگرم رہنا، اور اطاعت بھی اس طرح کہ عقیدہ بھی درست ہو ایک ہی کو کرتا دھرتا مانے اور عمل بھی درست ہو کہ ہر موقع پر ایک ہی کی طرف توجہ ہو۔

بین الاقوامی دین کی دوسری علامت...... اور جو کچھ میں نے عرض کیا کہ صبح کو بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ گھر سے نکلتے وقت نماز کے وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ یہ سارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اعمال ہیں، آپ سے ہی یہ ساری دعائیں منقول ہیں کہ جب آپ گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے اور جب گھر سے خارج ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے مسجد میں جاتے تو یہ دعاء پڑھتے، تو مقصود اس سے یہی ہے کہ انسان کے قلب میں صرف ایک ذات سے محبت و تعلق ہونا چاہئے ایک ہی کی طرف دھیان اور لگاؤ ہو۔

اور ایک سے تعلق رکھنا جب انفرادی طور پر آسان ہے ایسے ہی اجتماعی طور پر آسان ہے ایک ہی کی ذات کی نسبت سے دنیا کے تمام انسان ایک لڑی میں آسکتے ہیں شخصیت وطن رنگ و نسل کی نسبت سے اجتماعی وحدت پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب تک اجتماعی وحدت نہ ہو ان امور کے لحاظ سے دین بھی مختلف ہوتا رہے تو کبھی بھی دین میں بین الاقوامیت نہیں آسکتی بین الاقوامی دین وہی ہوسکتا ہے جو رنگ و نسل اور شخصیت و وطن کے بتوں کو پاش پاش کردے اور ان سب چیزوں سے وراء الوراء کسی ایسی مقدس ذات سے انسان کو جوڑے جو سب کے لئے قابل قبول ہو اور وہ ذات اقدس اللہ رب العزت کی ذات ہی ہوسکتی ہے، اللہ رب العزت کی حقیقی پہچان اسلام دیتا ہے تو اسلام ہی بین الاقوامی دین ہوسکتا ہے کوئی اور دین نہیں ہوسکتا۔

بین الاقوامی دین کی تیسری علامت...... بہر حال اسلام نے شخصی تعصب کو بھی ختم کیا اور سب کو ماننے کا حکم دیا۔ اسی طرح وطنی تعصب کو بھی ختم کیا۔ تا کہ اس کی بین الاقوامیت ہر پہلو سے واضح ہوجائے اور اس پر کوئی حرف

نہ آسکے۔ چنانچہ اگر کوئی یوں کہے کہ میرا وطن بہت عمدہ ہے تمہارا وطن گھٹیا خواہ مخواہ جذبات کو مشتعل کرنا ہے کہ میرے وطن کو برا کہہ دیا اور اپنے وطن کو اچھا کہا میری زمین کو برا کہا، اپنی زمین کو اچھا کہا۔ تو اس سے آدمی میں وطنی تعصب پیدا ہوتا ہے کہ میری زمین ایسی اور تمہاری زمین گندی۔ اس سے بھی قوموں میں لڑائیاں پیدا ہوتی ہیں، زمین کے ٹکڑے بھی لڑائیاں کرا دیتے ہیں، اس تعصب سے بھی کبھی عقیدے اور مذہب میں خلل پڑتا ہے کہ میری زمین سے جو مذہب اگا ہے وہی مذہب ہے تمہاری زمین پر جو مذہب اگا ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے۔ بھلا مذہب کو بھی گیہوں چنے کی طرح پیداوار سمجھ لیا تو اس سے ایک تعصب پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام نے ہم وطنوں کی بھی تقدیس کی، احادیث کو آپ دیکھیں یمن، شام کی مدح فرمائی گئی، حجاز کی فضیلت بیان کی گئی ہندوستان کے مناقب الگ بیان کئے ہند اور سندھ کے بارے میں بھی تعریفی کلمات فرمائے گویا ملک کی تقدیس کی اور ہر ملک کی خوبی بیان کی تو اسلام نے وطنیت کی جڑ نکال دی یہ مذہب کی تفریق کا ذریعہ بنتی تھی، جب سارے ملک ایک ہو گئے۔

ہر ملک ملکِ ما است کہ ملکِ خدائے ما است

ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے اور خدا سب کا ایک ہے تو ہمارے سارے وطن! تو تعصب کہاں سے پیدا ہوگا؟ لڑائی کیسے پیدا ہوگی؟ تو اسلام نے جب وطنوں کی تعریف کی، معلوم ہوا اسلام بین الاقوامی مذہب ہے اور بین الاوطانی مذہب ہے ورنہ یوں کہتا کہ صاحب! عرب کی زمین میں جو فضیلت ہے نہ وہ ہندوستان میں ہے نہ یمن میں نہ شام میں، ان ملکوں کے آدمیوں سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔

افضلیت کا بین الاقوامی معیار...... ہم تو عرب کے لوگوں کو جانتے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا دیا گیا: ''لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ اِلَّا بِالدِّيْنِ وَتَقْوٰى'' ① ''کسی بھی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، فضیلت ہے تو تقویٰ، پارسائی اور پاکدامنی سے ہے۔'' کہیں کا رہنے والا ہو جو متقی ہوگا وہ اللہ کے ہاں معظم اور مکرم ہے جو تقویٰ نہیں اختیار کرے گا خدا سے نہیں ڈرے گا، پاکدامن پارسا نہیں بنے گا وہ اللہ کے ہاں محبوب نہیں چاہے وہ عرب ہی کا رہنے والا ہو، تو وطنیت کی جڑ نکال دی، سارے وطنوں کو اپنا وطن کہا۔ یہ دلیل ہے کہ اسلام بین الاقوامی دین ہے کوئی مقامی مذہب نہیں ہے کہ ایک زمین سے نکلا تو اس زمین والوں کے لئے ہے دوسری زمین والوں کے لئے نہیں ہے، تو شخصیت کا تعصب مٹایا، وطنیت کا تعصب بھی مٹایا۔

بین الاقوامی دین کی چوتھی علامت...... کبھی رنگ سے تعصب پیدا ہو جاتا ہے جیسے افریقہ میں ہو رہا ہے کہ وہاں کالے اور گورے کی بڑی سخت تفریق ہے کالوں کی گاڑیاں الگ اور گوروں کی الگ کالوں کی بسوں میں

---

① مسند الحارث زوائد الهيثمي، باب التبليغ، ج: ۱، ص: ۳۴۸، رقم: ۵۱. حديث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۳ ص: ۲۶۶.

گورے اور گوروں کی بسوں میں کالے نہیں بیٹھ سکتے، گوروں کے لئے عالی شان اسٹیشن ہے اور کالوں کے لئے ایک معمولی ساویٹنگ روم بنا ہوا ہے، گورے ادھر نہیں آسکتے کالے ادھر نہیں جاسکتے ہوائی اڈے پر جو اعلیٰ ترین حصہ ہے وہ گوروں کا ہے اور ایک معمولی ہال بنا ہوا ہے اس میں کالے بیٹھتے ہیں تو اس تفریق کی وجہ سے ایک خاص تعصب وہاں پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کالے گوروں کے اور گورے کالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں، کالوں کے بس میں آجائے تو گوروں کو گولی سے اڑا دیں اور گوروں کے بس میں آجائے تو کالوں کو ختم کر دیں تو رنگ کی وجہ سے تعصب پیدا ہو گیا۔ مگر اسلام نے اس تعصب کو مٹا دیا اور ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ'' ''میں کالے اور گورے سب کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں'' ①

کالے بھی میرے ہیں گورے بھی میرے ہیں، جو میرے خدا کا حکم مان لے وہ میرا ہے۔ چاہے وہ کالے رنگ کا ہو چاہے وہ گورے رنگ کا ہو۔ تو گورے اور کالے رنگ کا فرق مٹایا۔ اور شخصیتوں کا فرق الگ مٹایا، یہی تو اس دین کے بین الاقوامی ہونے کی علامت ہے۔ اگر زمین کے ساتھ مقید ہوتا تو مقامی دین ہوتا، شخصیتوں کے ساتھ مُقید ہوتا تو شخصی دین ہوتا، رنگ کے ساتھ مقید ہوتا تو رنگین دین بنتا، لیکن رنگ، وطن اور شخصیتوں سے بھی بالا تر ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ پورے عالم کے لئے یہ مذہب ہے اس لئے یہ فرمایا گیا کہ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ پہلے تو یہ کہو کہ جتنے بھی انبیاء ہیں ہم سب پر ایمان لائے، ان انبیاء پر جو کتابیں نازل ہوئیں ان سب پر ہم ایمان لائے اپنے وقت میں وہ سب حق تھیں، اگر برائی پیدا کی تو اقوام نے پیدا کی، انبیاء اور کتابیں اس سے بری ہیں، تغیر اور تبدل اقوام نے کیا ہے۔ پھر یہ انبیاء علیہم السلام سارے وطنوں میں آئے جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ② ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ ③

تو جن رسولوں پر ہم ایمان لائے، جب وہ ہر وطن میں ہیں تو سارے وطن ہمارے نزدیک مقدس ہیں، جس وطن میں پیغمبر آئے ہم کہیں گے وہ وطن ہمارے نزدیک مقدس ہے، وہاں بھی اللہ والے ہیں، جب ہم کسی وطن کو برا نہیں کہیں گے، سارے وطنوں کی خوبیاں ہمارے ذہن میں ہیں، تو معلوم ہوا کہ اسلام سارے وطنوں کے لئے ہے کسی ایک وطن کیلئے نہیں ہے وہ سارے افراد بنی آدم کے لئے ہے کسی ایک شخص کے لئے نہیں ہے کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے وہ سارے رنگوں کو اپنا کہتا ہے تو اس میں کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں تو جس میں یہ تفریقیں مٹ جائیں، سمجھو کہ وہ مذہب بین الاقوامی ہے جہاں یہ تفریقیں موجود ہیں سمجھو کہ وہ مقامی مذہب ہے، وطنی مذہب ہے، تو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے وطن میں جا کے داخل ہو۔ یہ حق تو بین الاقوامی مذہب کو ہے کہ وہ ساری دنیا میں پھیلے۔

بین الاقوامی دین ہونے کا معیار...... یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ دھڑے بندی مت کرو ایک اللہ کی

① مسند الرویاني، حدیث ابی موسیٰ رضی الله عنه: ۱/ ۳۲۱ رقم ۴۸۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: ارواء الغلیل، اول الکتاب ج: ۱ ص: ۳۱۶. ② پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۷. ③ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۴۷.

طرف متوجہ ہوکر یہ کوشش کرو کہ اللہ کا پیغام سند کے ساتھ ہمیں کہاں ملے گا۔اس لئے کہ دین نقلی ہے اور نقل کے لئے روایت کی ضرورت ہے اور روایت کے لئے سند کی ضرورت ہے تو سند تلاش کرو مقصد یہ کہ سندی اور تاریخی طور پر کون سا دین پیغمبر تک پہنچتا ہے اور بیچ میں پہنچانے والوں کو، سب کو ہم پہچانتے ہوں کہ یہ اس کا راوی ہے یہ اس کا راوی تو سند کے ساتھ جو دین پیغمبر تک پہنچ جائے وہ واجب الاعتقاد ہوگا، جس کی سند نہ ہو گویا قصے اور کہانی کے طور پر آ رہا ہے، ہوسکتا ہے اس میں غلطیاں داخل ہوگئی ہوں، ہوسکتا ہے اس میں کچھ برائیاں داخل ہوگئی ہوں۔لیکن سند کے ساتھ جو چیز آئے گی اس میں برائی نہیں آسکتی۔قرآن کو یا حدیث کو دیکھو ایک ایک آیت کی سند پیغمبر تک پہنچی ہوئی ہے مثلاً اگر میں یوں کہوں کہ میں نے قرآن کریم حضرت قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم سے حفظ کیا، انہوں نے قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے حفظ کیا انہوں نے قاری عبداللہ صاحب مرحوم سے، قاری عبداللہ صاحب نے قاری محمود صاحب مصری سے اور قاری محمود صاحب نے اپنے استاذ سے اور اس طرح سند میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادوں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جبریل علیہ السلام سے پہنچا اور جبریل امین کے قلب میں حق تعالیٰ شانہ نے القاء کیا گویا ایک حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ تک پہنچی ہوئی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں شاید کوئی مذہب اس طرح سند نہیں پیش کر سکے گا، اگر انجیل والوں سے پوچھو کہ یہ انجیل کہاں سے آئی تمہارے استاذ کون ہیں، ممکن ہے ایک دو اساتذہ تک بتلادیں۔آگے غائب، یہودیوں سے پوچھو کہ تورات لانے والے کون ہیں راوی کون کون ہیں؟ تاریخ ندارد ہے کیا خبر کسی نے کیا تصرف کیا۔زیادہ کیا یا کم کیا۔جب سندی دستاویز نہیں تو تصرفات ہوسکتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھنے کی چیز تاریخ اور سند متصل ہے کہ اللہ تک ملی ہوئی ہو تو قرآن وحدیث کے سوا ہم انصافاً کہتے ہیں کہ کوئی سند ملی ہوئی نہیں۔اس کی رو سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انجیل بھی حق ہے۔اگر قرآن نہ بتلائے تو ہمیں خبر نہیں تھی کہ انجیل حق ہے یا نہیں قرآن نے کہا کہ تورات حق ہے تو سند صحیح کے ساتھ معلوم ہوا کہ واقعی حق ہے۔تو اسلام نے سند متصل کے ساتھ پیغمبروں کا پتہ دیا۔ہم نے مانا، ایمان لائے۔

تو اصل چیز ایمان لانے کی سند ہوتی ہے۔اگر آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری ماننے کے قابل ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری زیادہ ماننے کے قابل ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے معجزے نازل کئے کہ ہاتھ گریبان سے نکالا تو سورج کی طرح روشن۔اور عصا پھینک دیا تو اژدھا بن گیا اور یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے تو اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں معجزے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے عطا کئے۔آپ کی انگشتان مبارک سے چشمے پھوٹ پڑے اور چودہ سو آدمیوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہوا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے لئے عرش تک پہنچایا گیا۔پتھروں نے آپ سے سلام کیا۔درندوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت دی کہ: ''اَشْهَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللهِ'' ایسی روایات سند متصل کے ساتھ اور نقل صحیح کے ساتھ موجود ہیں، جن کی سند ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا سکتے ہیں، مسلمانوں نے

پچاس ہزار آدمیوں کی جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں ان کی تاریخ مرتب کردی کہ یہ ان کا کیریکٹر تھا، یہ ان کا خاندان تھا، یہ ان کی نسل تھی، یہ ان کی سچ اور جھوٹ کی کیفیت تھی، ایک ایک چیز جمع کی۔ تو آج جس سند سے ہم روایت کریں گے اس سند کے ایک ایک فرد کی تاریخ بھی بیان کرسکیں گے کہ ہمارے استاد یہ تھے تو ان کی یہ شان تھی، ان کے استاد یہ تھے تو ان کا یہ کردار تھا، اسی طرح آگے سلسلہ ہے اس طور پر پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ مرتب ہے جن سے قرآن وحدیث ہم تک پہنچا تو سب سے پہلی چیز سند وروایت ہے، تو قرآن کی سند سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔ اور کتابوں کی ہم سند ہی نہیں پاتے۔ قرآن حکیم کی سند کے ہر ایک کے زمانے میں لاکھوں افراد موجود ہیں، جنہوں نے قرآن کریم حفظ کیا اگر معاذ اللہ کوئی قرآن کریم کو دریا برد بھی کردے تو منٹ بھر میں پھر لکھا جائے گا ہزاروں لاکھوں حفاظ موجود ہیں: ﴿بَلْ هُوَ ايٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① ''اللہ نے یہ آیتیں اہل علم کے سینے میں محفوظ کردی ہیں''۔

اگر صندوقوں میں قرآن محفوظ ہوتا تو صندوقوں کو دریا میں بہایا جاسکتا تھا۔ زمین میں دفن کرتے تو زمین اس کو گلا دیتی۔ ہوا میں رکھتے تو ہوا کاغذوں کو اڑا دیتی۔ اللہ نے ایسی جگہ حفاظت کی کہ نہ وہاں آگ جاسکے نہ پانی نہ مٹی اور وہ اہل علم کے قلوب ہیں، ان میں محفوظ ہے اسی طرح وہاں شیطان اور جن بھی نہیں جاسکتے، تو قرآن کی حفاظت یہ ہے کہ ایک وقت میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں، حدیث کی حفاظت یہ ہے کہ ایک ایک ٹکڑے کے لئے اللہ کے رسول تک سند موجود ہے۔ تو اتنا مستند کلام تو معتبر نہ ہو اور جس کی کوئی سند نہ ہو وہ معتبر ہو جائے؟ اگر وہ ماننے کے قابل ہے تو سب سے پہلے یہ ماننے کے قابل ہے۔ اگر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیھما السلام پر ایمان لانا ضروری ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ان سے زیادہ ضروری ہے۔ جو وہاں دلائل ہیں ان سے بڑھ کر یہاں دلائل موجود ہیں اس لئے اسی دین کو اختیار کرنا چاہئے۔

فکرِ فردا...... ایسے دین کے ہوتے ہوئے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنی موت اور آخرت دیکھ کر آخرت کو سیدھا کرے، دین کا بڑا کام یہ ہے کہ آخرت درست کرے، اس لئے کہ مرنا مجھے بھی ہے، تمہیں بھی۔ یہ سارے قصے یہیں ختم ہو جانے والے ہیں، نہ کوئی بوڑھا باقی رہے گا، نہ کوئی جوان، بالآخر اسی پروردگار کے آگے جانا ہے جس نے پیدا کیا ہے اور جہاں سے ہم آئے ہیں: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ ② جس نے ہماری ابتداء کی ہے اسی کی طرف ہماری انتہا بھی ہے، وہی مبدا بھی ہے وہی معاد بھی ہے وہیں سے چلے ہیں وہیں لوٹ کر جانے والے ہیں، تو جب ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، تو آدمی غور کرے اور سمجھے کہ میں وہاں کے لئے تو کچھ سامان کروں۔ اور وہاں کا سامان روٹی کا ٹکڑا تو ہے نہیں؟ وہ دین ہی ہوسکتا ہے تو دین وہ ہو جو مستند ہو سند متصل کیساتھ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہو، جس پر آدمی یقین کرسکے کہ یہ دین ہے۔ تو غور و

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۷.

فکر کرنا ہم سب کا فرض ہے خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ ہر ایک کو اس کے ہاں جانا ہے اور ہر ایک کو اس سے ملنا ہے۔

اور موت کا کوئی وقت ہمیں تو معلوم نہیں۔ خدا جانے کب آ جائے، یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ابھی تو جوانی ہے، بڑھاپا جب آئے گا دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ہم تندرست ہیں بیماری آئے گی تو دیکھی جائے گی، کیوں کہ موت تو بیماری سے آتی ہے۔ تو بھئی! موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے نہ بیماری شرط ہے نہ بچپن شرط ہے، بوڑھے بچے جوان سبھی مرتے ہیں تندرست بھی مرتے ہیں مریض بھی مرتے ہیں۔ بعضوں کے ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ اچھے بھلے تندرست ہوتے ہیں مگر منٹ بھر میں ختم ہو جاتے ہیں تو یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا تو بہ کرلیں گے اور غور کرلیں گے کیا خبر ہے بڑھاپا آئے گا بھی یا نہیں؟ کیا پتہ پہلے ہی چلتے بنیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں، زیادہ موت جوانوں کو آتی ہے بوڑھوں کو نہیں۔ اس لئے کہ آپ مجمعوں پر نگاہ ڈالیں تو بوڑھے کم نظریں پڑیں گے جوان زیادہ نظر آئیں گے، یہ اس کی علامت ہے جوان زیادہ مرتے ہیں اس لئے اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے تو بوڑھے مجموں میں زیادہ نظر پڑتے مگر وہاں جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے، پہلے ختم ہو جاتے ہیں تو نوجوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، بڑھاپے تک لوگ کم پہنچتے ہیں، غرض اس دھوکہ میں آپ نہ رہیں کہ جب بڑھاپا آئے گا جب سوچ لیں گے، جب بیماری آئے گی جب سوچ لیں گے، موت کی جب علامتیں شروع ہوں گی جب سوچ لیں گے۔ وہ تو یکدم آ جاتی ہے، کھڑے پیر آ جاتی ہے۔

درپیش منزل...... تین پیغمبر ہیں جن کو اچانک ہی موت واقع ہوئی ہے، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہم السلام تینوں کی موت اچانک ہوئی ہے تو جب انبیاء علیہم السلام اس دنیا سے اچانک گزر سکتے ہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ ہم کس چیز پر غرہ کریں؟ بہر حال موت کے لئے ظاہری علامت ضروری نہیں کئی آدمی بیٹھے بیٹھے گزر گئے۔ ہزاروں واقعات اس قسم کے ہیں۔ اس لئے جب سب کو یہ منزل درپیش ہے تو سب کو اس کی فکر کرنی چاہئے، اور اپنے ضمیر سے سوچنا چاہئے۔

دین حق کی آسان پہچان...... آدمی کا دل بڑا مخلص ہوتا ہے۔ دل منافق نہیں ہوتا۔ دل آدمی کو صحیح مشورہ دیتا ہے ادھر ادھر کے دوست غلط مشورہ بھی دے دیں مگر دل مطمئن نہیں ہوتا، جب تک آپ صحیح بات سوچ کر سامنے نہیں رکھ دیں گے اس لئے اپنے ضمیر سے سوچیں اور غور کریں کہ دینوں کے اندر واقعی کون سا دین حق ہے، سند اور روایت کے لحاظ سے کون سا دین حق ہے، تعلیمات کے لحاظ سے دیکھو تو کس کی تعلیم زیادہ ستھری، منقّی اور ممتاز تعلیم ہے کہ حق و باطل اس میں نکھرا ہوا ہے۔ اور جب ذہن میں آ جائے اور دل گواہی دے تو فوراً آدمی کو قبول کرنا چاہئے، پھر اس پر نہ رہے کہ قوم کیا کہے گی۔ اور میرے رشتہ دار کیا کہیں گے۔ وہاں نہ رشتہ دار کام آئے گا نہ قوم کام آئے گی۔ وہاں تو اپنا دین اور عمل کام آئے گی۔ اور اللہ کے آگے تو تنہا پہنچنا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں

فرمایا گیا:﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ ① ''حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آ گئے تم تن تنہا ہمارے پاس جیسے ہمارے پاس سے تنہا گئے تھے، کیوں کہ تمہارے پیدا ہونے میں کوئی شریک نہیں تھا۔ ہم نے تنہا بھیجا اور تم تنہا پہنچے۔ آج اسی طرح ہمارے پاس آئے ہو جیسے ہم نے پیدا کیا تھا اور جن چیزوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا، انہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ جن کو تم نے دوست سمجھ رکھا تھا، کہ یہ ہمیں بخشوالیں گے۔ (ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟) آج ہم تمہارا کوئی سفارشی نہیں دیکھتے۔ کوئی مددگار نہیں دیکھتے، جن کو تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے شریک ہیں جو اللہ کے ساتھ مل کر ہمیں نجات دلائیں گے۔ آج وہ تمہارے شفیع اور سفارشی کہاں ہیں؟ وہ سب امیدیں تمہاری قطع ہو گئیں۔ اور جو کچھ تم نے سوچ رکھا تھا وہ سب گنبد سرا ہو گیا''۔

اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ دین کے بارے میں آدمی اپنے ضمیر سے غور کر لے، اپنے دل سے مشورے اپنی موت اور اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر سوچے یہ سامنے رکھ کر نہ سوچے کہ میرے ساتھ سامان کتنا ہے، میرے ساتھ مشورہ دینے والے کتنے ہیں؟ میرے عزیز کتنے ہیں؟ یہ کوئی نجات دلانے والے نہیں، نہ کوئی ساتھ جانے والا ہے، ضمیر ساتھ جائے گا۔ اعتقاد اور ایمان ساتھ جائیگا۔ عمل ساتھ جائے گا اسی لئے انہیں کو اپنے ساتھ رکھو۔

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں اور خلیفہ بھی ہیں، بزرگوں سے میں ہیں۔ حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تینتیس (۳۳) برس رہے وہیں تربیت پائی اور تعلیم باطن حاصل کی۔ تینتیس برس کے بعد شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تینتیس برس میرے پاس رہے تم نے کیا حاصل کیا؟ عرض کیا کہ میں نے آٹھ مسئلے سیکھے ہیں: فرمایا کہ کل آٹھ مسئلے؟ عرض کیا جی ہاں کل آٹھ مسئلے! فرمایا کہ میرا بھی وقت ضائع کیا اپنا بھی وقت ضائع کیا۔ بندۂ خدا تینتیس برس میں کل آٹھ مسئلے؟ فرمایا: آخر وہ آٹھ مسئلے کیا ہیں؟ عرض کیا کہ:

انتخاب محبوب...... پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے دنیا میں دیکھا کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی سے محبت ہے اور وہ اپنے محبوب کی فکر میں ہے کہ وہ مجھ سے راضی ہو اور میں اس سے مل جاؤں مجھ میں اور اس میں جدائی اور فراق نہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سارے محبوب جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ جاتا ہے جس سے محبت کی تھی نہ وہ دستگیری کرتا ہے اس واسطے میں نے قرآن کریم میں یہ دیکھا کہ عمل آدمی کے ساتھ جاتا ہے تو میں نے اعمال صالحہ کے ساتھ محبت کی، اور سب سے محبت ترک کر دی تاکہ میرا محبوب قبر میں بھی میرے ساتھ رہے اور الگ نہ ہونے پائے۔

تو ایک مسئلہ تو میں نے یہ سیکھا ہے کہ سارے محبوب چھوڑ کر ایک عمل صالح کو محبوب بنا لیا ہے، اس لئے کہ کوئی

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۴.

محبوب قبر میں ساتھ نہیں جائے گا، نہ بیوی نہ دوست نہ بچہ، عمل آدمی کے ساتھ جائے گا، اس لئے اس کو محبوب بنالیا اور سارے محبوبوں کو ترک کر دیا۔

تعیینِ دشمن...... دوسرا میں نے یہ دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی سے عداوت بھی ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش اور فکر میں رہتا ہے۔ اور دوسرا اس کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا ہے تو آپس میں دشمنی ٹھن جاتی ہے، لیکن سارے دشمن ایک دن ختم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ تن تنہا رہ جائے گا، اب کس کی دشمنی سے آدمی بچے، فوج سے بچے، سپاہی سے بچے، بچھو سے بچے، سانپ سے بچے، سارے دشمن ہی دشمن ہیں تو بچنے میں مشکل ہوگی۔ ہزاروں دشمن ہیں اور آدمی کا دل ایک ہے تو بچنے کے لئے کہاں کہاں جائے؟۔ تو میں نے قرآن کریم دیکھا۔ اس میں ہے کہ: ﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① ''شیطان تمہارا دشمن ہے جو اخیر تک دشمنی کرے گا''۔

تو میں نے ایک سے دشمنی بنا کے سب سے دشمنی قطع کر لی، تو میں شیطان سے لڑتا ہوں اس سے لڑوں گا تو سب دشمن ختم ہو جائیں گے، ساری دشمنی کی بنیاد، شیطان ہی ہے۔ لہٰذا میری کسی سے دشمنی نہیں، کسی سے عداوت نہیں تو دوسرا مسئلہ میں نے یہ سیکھا۔

بااعتمادِ ذات...... تیسرا مسئلہ یہ ہے میں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک نے کسی نہ کسی پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے روپے پر سہارا کر رکھا ہے کہ میرے گھر میں دولت ہے جو چاہوں گا کروں گا۔ کسی نے غلّہ پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے حکومت پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے رشتہ دار پر سہارا کر رکھا ہے میں نے قرآن کریم میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سارے سہارے ختم ہو جائیں گے صرف ایک اللہ کا سہارا ہے جو باقی رہے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ② ''جو اللہ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لئے کافی ہے''۔

تو میں نے ایک کو سہارا بنایا، باقی سہاروں کو ترک کر دیا۔ تو یہ میں نے تیسرا مسئلہ سیکھا۔ اسی طرح سے انہوں نے اور مسائل بیان کئے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ ایک کو اپنا سہارا بنالو، ایک کو معبود بنالو، پھر اسی کی طرف جھکو، دنیا کی عداوت بھی چھوڑ دو، دنیا کی محبت بھی چھوڑ دو اگر محبت کرو تو اللہ کے لئے عداوت باندھو، تو اللہ کیلئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب تمہارا ایک ہی ہے اور مبغوض شیطان ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمن سمجھو، اس سے دشمنی ٹھان لو۔ اللہ سے دوستی کر لو اور اپنے ضمیر سے فیصلہ کر لو۔ تو مطلب یہ ہے کہ دین اور آخرت کی بات آدمی کو تنہا سوچنی ہے، اس میں کوئی سہارا نہیں خود اپنے ضمیر سے فیصلہ کر لو۔ اپنے دل سے سوچ لو اور خوب چھان بین کر لو، جب حق واضح ہو جائے۔ علی الاعلان اس کو مان لو یہ نہ دیکھو کہ کون کیا کہے گا؟ کون کیا کہے گا؟ کہنے والے کہا ہی کرتے ہیں ان کی باتوں کا قطعی دھیان نہ کیا جائے، اپنے ضمیر کی آواز کو دیکھا جائے۔

صاحب دور کا اتباع مدارِ نجات ہے...... تو قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ: تم اپنے ایمان کو مضبوط کرو۔ ایمان کو

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۶۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳۔

تعصبات میں دخل نہ دو۔ نہ شخصیتوں کے تعصبات کو، نہ رنگ و بو کے تعصبات کو، نہ زمین کے ٹکڑوں کے تعصبات کو نہ وطن اور قوم کے تعصبات کو، صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرو، ایک نبی کی بات کو مانو، کہ اس دور میں صرف انہی کے ماننے میں نجات منحصر ہے، جس کا دور اور زمانہ ہوگا اسی کے ماننے پر نجات منحصر ہے۔ یا کوئی یوں کہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں اور نجات ہو جائے گی، یہ غلط ہے، صاحب زمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کا دور ہے، ان کے ماننے میں نجات ہے، دوسروں کے ماننے میں نجات نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِىْ'' ''آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آ ئیں گے تو میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔''

ان کی نجات بھی میرے ہی دین کے ماننے میں ہے۔ اس لئے کہ میں صاحب وقت اور صاحب زمان ہوں، میری شریعت کا دور دورہ ہے آج پریزیڈنٹ وقت فخر الدین علی احمد ہیں، ہندوستان کا قانون ان کے دستخطوں سے جاری ہو رہا ہے۔ آج پچھلے لوگ صدر نہیں اگر ان سے کوئی زندہ بھی ہوا اور کوئی یوں کہے کہ میں اس قانون کو مانتا ہوں جو پچھلے صدر کے زمانے میں جاری ہوا۔ اور ان کے قانون کو نہیں مانتا تو وہ باغی سمجھا جائے گا اس کو پھانسی کی سزا ہوگی، کہا جائے گا کہ آج ان کا دور ہے انہی کے قانون میں نجات ہے۔ آج کسی اور صدر کا قانون نہیں چلے گا۔

یا کوئی سابقہ صدر یوں کہے کہ میں چوں کہ پریزیڈنٹ رہ چکا ہوں اب بھی میرا وہی مقام ہے، میں چاہے کسی کی مانوں چاہے نہ مانوں۔ میں اب بھی پریزیڈنٹ ہوں، گورنمنٹ مقدمہ کرے گی کہ آج کا پریزیڈنٹ فخر الدین علی احمد ہے آج تم نہیں ہو، تمہیں ان کا اتباع کرنا پڑے گا، جو وہ قانون دیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ اب تمہاری صدارت کا زمانہ نہیں ہے۔ تو جو صاحب دور اور صاحب زمان ہوتا ہے اس کے ماننے میں نجات منحصر ہوتی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک جب آ گیا اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے شریعت اور قانون لا کے رکھا تو آج نجات اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔ آج کوئی کہے کہ میں تورات کو مانتا ہوں یا کہے انجیل کو مانتا ہوں نجات نہیں ملے گی، ان کا دور ختم ہوا۔ آج کا دور قرآن کا ہے۔ اسی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔ بہر حال اس آیت سے یہ مسئلہ نکلا کہ سات سو بات میں دخل مت دو ایمان قبول کرو ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ''ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب کے مطیع اور فرمانبردار ہیں''۔ ہم سب کے بارے میں تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں۔

انکارِ قرآن تمام کتب کے انکار کو مستلزم ہے...... اور یہ ہمیں کس نے منوایا؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، آپ کا ماننا سب سے پہلے ہے۔ آپ کو ماننا سب کو ماننا ہے۔ قرآن کو مانا تو انجیل اور تورات کو بھی مانا۔ زبور کو بھی مانا۔ قرآن کریم کا انکار کیا تو کسی چیز کو بھی نہ مانا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تو سند صحیح موجود ہے اور تورات و انجیل کی سند موجود نہیں۔ یہ تو قرآن کریم نے بتلایا کہ یہ آسمانی کتابیں ہیں اس لئے قرآن کے ذریعے ان

کو بھی مانیں گے، اس لئے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾

قرآن کریم تمام کتب سماویہ کا محافظ......قرآن کریم تمام پچھلی کتابوں کا محافظ ہے کہ ان کے اندر جو تعلیم حق ہے وہ قرآن نے جاری کردی، اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔

اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بنا وہ صحیح معنی میں موسائی بنا۔ کہ اس نے سند متصل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بھی بنا۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو مانا۔ تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے، اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا، اس کا ماننا سب کا ماننا ہے اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے اس واسطے ہم سب کا فرض ہے کہ دین کے بارے میں تعصّبات کو چھوڑ دیں۔ دین کے بارے میں اس بات کو چھوڑ دیں کہ فلاں کیا کہتا ہے، فلاں کیا کہتا ہے، خود اپنے ضمیر پر غور کریں، اور اگر ماننے کی چیز ہے تو مانیں اور برملا اس کا اظہار کریں۔

یہ چند باتیں اس آیت کی روشنی میں مجھے عرض کرنی تھیں خدا جانے کہ میں اس میں کامیاب ہوا کہ نہیں اور آیت کے سلسلہ میں جو مقاصد ہیں وہ پیش ہو سکے یا نہیں؟ مگر بہرحال جو استطاعت تھی وہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے، خدا کرے کہ نافع ثابت ہوں۔

اور جب آیت میں آپ غور کریں گے تو یہ باتیں منکشف ہو کر آپ کے ذہن میں گھومیں گی، جتنا آپ سوچیں گے اتنا انشاء اللہ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اور اس سے اچھے نتائج اخذ کریں گے، بہرحال یہ چند باتیں میں نے عرض کر دیں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق دکھلائے اور باطل کو باطل دکھلائے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ. اَللّٰهُمَّ لَاتَنْزِعْ مِنَّا صَالِحَ مَآ اَعْطَيْتَنَا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْکٰفِرِيْنَ. (آمین)

۱۴. ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ

برسبیلِ تذکرہ

حَامِدًاوَّ مُصَلِّیًا

۷۔۸ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۱۔۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء دارالعلوم حقانیہ کا وہ عظیم الشان سالانہ دستار بندی اجلاس منعقد ہوا۔ جو ظاہری ومعنوی امتیازات وبرکات کے لحاظ سے دارالعلوم کی تاریخ میں امتیازی اور افادی حیثیت سے دور رس نتائج کا حامل رہے گا۔ اپنی روایتی آب وتاب، مسلمانوں کے بے پناہ خلوص ومحبت، اکابرین وعمائدین ملک وملت کی بزرگانہ ومخلصانہ ہمدردیوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلام فخر الاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم کی شمولیت بابرکت نے اجلاس کی رونق افادیت اور کامیابی کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔

اللہ تعالیٰ کے بے پناہ انعامات واکرامات ہی کا ثمرہ ہے کہ ابتداء تاسیس دارلعلوم حقانیہ سے اکابرین دیوبند وبزرگان ومشائخ عظام کی مبارک توجہات اور نیک دعائیں اس جانب مبذول ہیں اور دارالعلوم حقانیہ نے اپنے مادر علمی، گہوارہ علم وعمل مرکز عقیدت، حصن حصین اسلام دارلعلوم دیوبند کے رشتہ محبت اور وابستگی کو سعادت وفلاح کامیابی وترقی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھا ہے، چناں چہ اس سال جب سالانہ اجلاس دستاری بندی کے لئے حضرت المخدوم المعظم قاری صاحب مرحوم کو دعوت دی گئی تو انہوں نے شرف پذیرائی بخشتے ہوئے مذکورہ تاریخیں مقرر فرما کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دارالعلوم میں قدم رنجہ فرمایا۔

۲۱ اکتوبر کو فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی فرمائی اور جامع مسجد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا، ان تقریبات میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کے علاوہ پاکستان کے اکثر اکابر'' جیسے شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتی رحمۃ اللہ علیہ حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی، شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی، علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا محمد مفتی نعیم لدھیانوی مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی اور بے شمار ارباب علم وفضل موجود تھے۔

۲۱۔۲۲ اکتوبر کی درمیانی رات کو حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی وہ بہترین سحر انگیز حکیمانہ تقریر ہوئی جس نے اہل علم وفضل وارباب فکر وفہم اور عامۃ المسلمین کے ہزاروں کے مجمع کو گھنٹوں تک یکساں محور رکھا تھا۔ ہر ہر جملہ میں حضرت حجۃ الاسلام سیدنا الامام محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے انوار وتجلیات کی جھلک اور قاسمی علوم ومعارف کا شان استدلال وعقلیت نمایاں تھا، مظہر انوار قاسمیہ حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے اپنے اس مخصوص روایتی دلکش

خطاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں عقل ودرایت کی پختگی کے ساتھ فلسفیانہ مگر عام فہم انداز میں کائنات عالم کے اس اشرف واعلیٰ نوع مخلوقات انسان کی حقیقت اور پھر اس کے مقاصد ومنافع تخلیق اور وجوہات افضلیت اور امتیازات خصوصیت پر سیر حاصل بحث فرمائی اوراس ذیل میں بے شمار اسرار وحکم کی طرف رہنمائی کر کے فکر ونظر کے لئے ایک شاہرہ کھول دی۔

الحادو دہریت، سائنس اور مادیت کے اس ہیجانی وطوفانی دور میں ایسے ہی استدلال، زور بیان اور تجربہ و حقائق سے مادیت اور مغربیت زدہ پریشان اذہان وافکار کو چیلنج کیا جا سکتا ہےاور گم گشتہ راہ انسانیت کو اپنی حقیقت و مقام سے شناسا کرایا جاسکتا ہے آخر علوم الٰہیہ ربانیہ کے سواوہ کون سی خوبی ہوسکتی ہے جو اس ادنی وضعیف مخلوق خاکی انسان کو خلافت ربانی کے مقام جلیل پر کھڑا کر سکتی ہے؟ معارف نبوت ورسالت کے سواوہ کون سی روشنی ہے جس کو لے کر انسان ہدایت وسعادت کی بام رفیع ''نیابت نبوت'' پر فائز ہوسکتا ہے؟

انہی حقائق و معارف کی جانب حضرت قاری صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں ہماری رہنمائی کی ہے، بیان کی دلکشی ،تقریر کی جاذبیت، مضامین کی افادیت اور جامعیت اور خود حضرت موصوف کی جامع الکمالات پر کشش شخصیت نے مجمع میں کَاَنَّ عَلٰی رُءُ وْسِهِمُ الطَّیْرَ...... کا منظر پیش کر دیا تھا۔اور جلسہ کے اختتام کے فوراً بعد ملک کے اطراف واکناف سے اس تقریر کی مانگ شروع ہوگئی خود دارالعلوم حقانیہ نے بھی ضروری سمجھا کہ ان ارشادات کو افادۂ عام کے لئے شائع کیا جائے دوران تقریر میں بعض حضرات خصوصا برادر عزیز مکرم ومحترم مولانا شیر علی صاحب فاضل و مدرس دارالعلوم حقانیہ نے حتی الوسع بلفظہ قلم بند کرنے کی کوشش کی۔تاہم ضبط بیان میں قدرے اجمال وکوتاہی ہونی لازمی تھی۔جسکی وجہ سے ضروری سمجھا گیا کہ حضرت قاری صاحب مسودہ تقریر پر نظر ثانی فرمادیں، چناں چہ اسی غرض سے تیار شدہ مسودہ حضرت موصوف کی خدمت میں دیو بند بھیج دیا گیا،حضرت قاری صاحب مرحوم نے توالئی اسفار، کثرتِ مشاغل کے باوجود گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر مسودہ پر نظر ثانی فرمائی۔اور توضیح تعبیرات تفصیل مضامین کے لئے خود حضرت کے الفاظ میں ''باوجود غیر معمولی مصروفیت کے رات دن لگ کر اسے مرتب کیا اور گویا سارا مسودہ از سر نو خود ہی لکھنا پڑا''۔

اس بنا پر اب یہ بصیرت افروز تقریر ایک گرانمایہ تصنیف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اگر چہ کچھ دیر سے شائع ہو رہی ہے لیکن قیمتی اضافوں اور بے شمار فوائد کی بنا پر یہ تکوینی تاخیر، خیر وحسن کا موجب بن رہی ہے، رب جلیل اس علمی وتبلیغی احسان کے بدلے حضرت قاری صاحب کو تمام اہل علم اور مسلمانوں کی جانب سے اجر جزیل عطا فرماوے شَكَرَ اللهُ مَسَاعِیَهُمْ اور قارئین کو فرمان خداوندی ﴿ وَهُدُوْا اِلَى الطَّیِّبِ ﴾ الایة کے مصداق زمرہ میں شامل کر دے، برادر محترم مولانا سید شیر علی شاہ صاحب شکریہ کے مستحق ہیں، جن کی شبانہ روز سعی ومحنت سے یہ گنج گرانمایہ قارئین کے ہاتھ تک پہنچ رہا ہے۔تسہیل فہم اور ترتیب مضامین کے لئے عنوانات ضروری سمجھے گئے، جو ناچیز کے

لگائے ہوئے ہیں اس لئے تعبیر مفہوم میں نقص وکوتاہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کی اہمیت وعظمت کی بناء پر اسے ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا جائے، تاہم ناتجربہ کاری کی بناء پر پورے طور پر کامیابی نہیں ہوسکی۔دوسرے ایڈیشن میں انشاء اللہ العزیز اس کا تدارک کیا جائے گا۔یہ مجموعہ حضرت قاری صاحب کے تجویز کردہ نام ''انسانی فضیلت کا راز'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وَالْكِتَابُ يُقْرَءُ مِنْ عُنْوَانِهٖ

دادیم تراز گنج مقصود نشان گرما نرسیدیم شاید تو برسی

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَاِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ

محمد سمیع الحق كَانَ اللّٰهُ لَهٗ

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۳ شعبان ۱۳۷۸ھ۔۱۲ فروری ۱۹۵۹ء

تہنیت (تبریک ودعوت)

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

آج بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ احقر حسب دعوت حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک حاضر ہوا۔ اور دارالعلوم ہی میں قیام کیا۔

آٹھ سال کے بعد اس سرچشمہ علم میں حاضری کا یہ دوسرا موقعہ ہے ۱۹۵۰ء میں احقر اس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ اس مدرسہ کے لئے نہ کوئی مستقل جگہ تھی نہ مکان۔ ایک مسجد میں غریبانہ انداز سے اساتذہ وتلامذہ نے کارِ تعلیم شروع کر دیا تھا لیکن آٹھ سال کے بعد آج دارالعلوم کو اس شان سے دیکھا کہ اس کے پاس شاندار عمارت بھی ہے۔ وسیع میدان بھی ہاتھ میں ہے۔

اس کے وسیع نظم ونسق کے لئے مختلف انتظامی شعبہ جات بھی ہیں۔ شعبہ تعمیر مستقل حیثیت میں اپنا کام بھی کر رہا ہے۔ اور تعمیرات بھی روز افزوں ترقی پر ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہے۔ اساتذہ ماہر فنون کافی تعداد میں جمع ہیں۔ ۲۶۰ طلبہ فارغ التحصیل کی دستار بندی بھی ہوئی جن میں مختلف پاکستانی علاقوں کے علاوہ کابل وقندھار کے طلبہ بھی ہیں، ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد بھی رکھی جا رہی ہے۔ خلق اللہ کا رجوع ہے، اعتماد ہے اور وہ پورے بھروسہ کے ساتھ پروانہ وار اس شمع علم کے ارد گرد فدائیت وعقیدت کے ساتھ ہجوم کر کے آ رہے ہیں۔

حتیٰ کہ مدرسہ کے جلسہ نے ایک ''عظیم الشان علمی جشن'' کی صورت اختیار کر لی ہے اور بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اسے صوبہ سرحد کی سب سے بڑی اور مرکزی درسگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سات سال کی مختصر مدت میں یہ ظاہری وباطنی ترقیات بجز اس کے کہ کارکنوں کے، اخلاص وللّٰہیت کا ثمرہ کہا جائے، اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ ان مخلصین میں رئیس المخلصین حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی ہیں جن کے اخلاص وایثار کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہر فن استاد کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بہ مجبوری اٹک میں مقیم ہوئے اور دارالعلوم دیوبند آج تک ان کی جدائی پر نالاں ہے۔

ان کی سادہ بے لوث اور مخلصانہ طبیعت اور خدمت ہی نے اس سات سال کی قلیل مدت میں اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسہ سے دارالعلوم بنا دیا ہے۔ اس دارالعلوم کے احاطہ میں پہنچ کر احاطہ دارالعلوم دیوبند کا شبہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اس نے اپنی صورت وسیرت میں

دارالعلوم دیوبند کی صورت وسیرت کو محو کرلیا ہے اور وہ دارالعلوم دیوبند ہی بن گیا ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس سرچشمۂ فیض اور اس کے بانی کو اپنے فضل وکرم کے سایہ میں تا دیر قائم رکھے اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے یہ مدرسہ نورِ ہدایت اور مینارہ روشنی ثابت ہو!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

محمد طیب عفرلہ

مدیر "دارالعلوم دیوبند" واردحال اکوڑہ خٹک

انسانی فضیلت کا راز

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"اَلۡحَمۡدُلِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا ، مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ ، وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ، اَرۡسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيۡهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا.

اَمَّا بَعۡدُ! فَاَعُوۡذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ. ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ.﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ مَوۡلَانَا الۡعَظِيۡمُ.

دار العلوم کا موضوع اور مقصد...... بزرگانِ محترم! یہ اجتماع دار العلوم حقانیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے جس میں آپ اور ہم سب اس جگہ جمع ہوئے ہیں اور دار العلوم کا موضوع اور مقصد سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو ظلمت جہالت سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لے جانا ہے۔ اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے موزوں ومناسب یہی تھا کہ میں تقریر کے لئے علم ہی کا موضوع اختیار کروں اور غالباً اسی مناسبت سے اور حضرات مقررین نے بھی اپنی تقریروں میں اب تک علم ہی کا موضوع اختیار کیا ہے اور اسی موضوع پر تقریریں ہوتی رہی ہیں تا کہ علم کی ضرورت، فضیلت اور مطلوبہ تعلیم کی نوعیت پر روشنی پڑے، اسی مناسبت سے میں نے یہ آیتیں اس وقت تلاوت کی ہیں، جن میں ان مذکورہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے علم کی مطلوبہ نوعیت واہمیت بیان فرمائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ علوم کی لائن میں وہ کون سا علم ہے جو مطلوب اور نافع ہے؟ اور کیا اس کے آثار ہیں؟

اس وقت ان کی مختصر الفاظ میں آپ حضرات کے سامنے شرح کرنا مقصود ہے، خدا کرے آپ سمجھ سکیں، میری

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآية: ۳۱، ۳۴.

زبان اردو ہے اور اوپر کی کچھ طالب علمانہ بھی ہے۔ جس میں طبعی طور پر کچھ عربی الفاظ بھی آئیں گے۔ ممکن ہے کہ اس کے سمجھنے میں صوبہ سرحد کے بھائیوں کو کچھ دقت ہو۔ تاہم میں سعی کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ سہل الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کروں، اور بات کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کروں۔ امید ہے کہ اگر کوئی خاص لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آسکے تو مجموعی طور پر مطلب ضرور سمجھ میں آجائے گا۔ ورنہ اور بھی کچھ نہیں تو ثواب تو بہر حال مل جائے گا۔ جو سمجھنے پر موقوف نہیں صرف سنتے رہنے پر موقوف ہے۔

مقدمہ وتمہید...... قبل اس کے کہ میں ان آیات کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں ایک مختصر بات جو بطور مقدمہ و تمہید ہوگی، بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے آیات کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے پوری طرح سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی مہیا فرمائیں۔ زمین کا فرش بنایا اور اطلاع فرمائی کہ: ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا﴾ ① اور زمین کو فرش بنایا اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اسے ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ چناں چہ بتلایا کہ: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ ''اور ہم نے بنایا آسمان کو محفوظ چھت'' اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے تاکہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں اور فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا﴾ ② ''برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج رکھے اور ان میں روشن چراغ (سورج) اور روشنی بخش چاند رکھا''۔ پھر ان ستاروں کو چھت کیلئے سامان زینت بھی کر دکھایا اور اطلاع دی کہ: ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ﴾ ③ ہم نے آراستہ کیا آسمان دنیا کو زینت سے جو ستارے ہیں۔ پھر اس فرش خاک کو بستر بنا کر ایک وسیع ترین دسترخوان بھی بنایا جس سے ہر قسم کے غلے، ترکاریاں، پھل غذائیں اور دوائیں اگائیں۔ جس سے ہر قسم کے میٹھے کھٹے نمکین اور دوسرے ذائقوں کے پھل اور دانے نکلتے چلے آتے ہیں اور مطلع فرمایا کہ: ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ ④ ''ان سبزیوں کو نمایاں کرنے اور حیات بخشنے کے لئے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اور فرمایا کہ:'' ﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ﴾ پھر زمین کو فرش اور خوان نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا جس میں جگہ جگہ چلنے پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا کہ: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ ⑤

مقصود تخلیق کائنات...... غرض یہ کائنات ایک عظیم ترین بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۱۔ ③ پارہ: ۲۳، سورۃ الصافات، الآیۃ: ۶۔
④ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۹۔ ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ النوح، الآیۃ: ۱۹-۲۰۔

جس میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے، اس کائنات کی یہ ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبان حال سے بتا رہا ہے کہ ضروریات زندگی سے لبریز یہ مکان کسی ضرورت مند مکین کے لئے بنایا گیا ہے، خود مقصود نہیں ہے، یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے، محض مکان بنانا مقصود نہیں اور بلاشبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو ان سامانوں کا حاجت مند بھی ہو اور اس میں ان سامانوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو، تا کہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبادی اور زینت ہو، کیوں کہ مکان مکین کے بغیر ویرانہ، وحشت کدہ اور بے رونق ہوتا ہے، سو اس عالم میں ارادی کاروبار اور اختیاری، تصرفات دیکھنے سے انداز ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حساس مخلوق جو اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہے۔ چار ہی قسم کی ہے۔

ذی شعور اور حساس مخلوق کی چار اقسام...... ایک حیوانات ہیں جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا، گدھا، بیل، بکری، طوطا، مینا، شیر، بھیڑیا، سانپ، بچھو، چرند، پرند، درند وغیرہ ہیں۔ دوسرے جنات ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور بلحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں۔ مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں اور نر و مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں اور چوتھے بنی نوع انسان ہیں جو زمین کے ہر خطہ میں بسے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، یہی چار مخلوقات ہیں، جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس و شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ کے باشندے اور جائز وارث ہونے کی مستحق ہیں، اس زمین آسمان میں ان کے حقوق ہیں اور وہ مالک کائنات کی طرف سے ان کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے حقوق کو پامال کرے۔ یا انہیں منافع دنیا سے بے حق کر دے۔ غذا، مکان، تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حقوق قائم ہیں۔ انہیں حق ہے کہ رہنے کے لئے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لئے مناسب حال کھانا مہیا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان میں سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہوگا، وہ بلاشبہ مجرم اور مستحق سزا ہوگا۔

ہر نوع کے مستقل حقوق اور اسلام میں ان کی حفاظت...... چناں چہ شریعتِ اسلام نے جس طرح انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بلبلاتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بلبلاتا رہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاؤ اس کے مالک کو، مالک حاضر کیا گیا، فرمایا یہ اونٹ تیری شکایت کر رہا ہے کہ تو اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ شکایت بجا ہے واقعی میں اس جرم کا مرتکب ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی چند مثالیں...... بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چڑیا کے بچے پکڑ لائے اور وہ ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اڑ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بچے چھڑوا دیئے کہ کیوں ان کی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں ان کی ماں کو ستاتے ہو۔ کیڑے، مکوڑے، زمین میں سوراخ کر کے اپنے رہنے کا ٹھکانا کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سوارخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو، اس میں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمہیں تکلیف نہ پہنچا دے۔ وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کر کے اسے بے گھر مت بناؤ، اور اس کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمہیں حق نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چلائی کہ یا رسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیجئے کہ میں انہیں دودھ پلا آؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی! عرض کیا یا رسول اللہ! میں سچا وعدہ کرتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھول دیا اور وعدہ کے مطابق دودھ پلا کر فوراً واپس آ گئی آپ نے اس کے گلے میں وہی رسی پھر ڈال دی۔ اور اسے بدستور باندھ دیا اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کر دے۔ چنانچہ اس نے کھول دیا اور وہ اچھلتی کودتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جا ملی۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی جانور کی رعایت تو اس کو کھول دینے سے فرمائی، تاکہ ہرنی کی ماما کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دکھے، بچوں کی رعایت ان کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں۔ انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا تاکہ واضح ہو کہ انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے۔ جس میں رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا اور ساتھ اس میں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک وفائے عہد لازم ہے تو اس عقل مند انسان پر کیوں نہ ہوگا؟

حیوانات کے حقوق...... فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لئے فناءِ مصر (شہر کے قرب و جوار) میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں، جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہوتا کہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کر سکیں اور انہیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور ان کی آزادی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ ہمارے دارالعلوم دیوبند کے محدث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنے تو

چھتوں پر ڈلوا دیتے تھے کہ یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرات اور بھورے کو چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوا دیتے تھے یہ ان نہتے اور ضعیف جانوروں کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا، اور اسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لئے جہنم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا اور ایک فاحشہ عورت محض اس لئے جنت میں پہنچادی گئی کہ اس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچالی تھی۔ جیسا کہ احادیث میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔

شریعت اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے بنی نوع کے فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر دہشت سے خشک ہونے لگے، بہر حال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور امن و آزادی کے حقوق ہیں، جن کی حفاظت کا حکم اور ان کے ضائع کرنے کی ممانعت ہے۔

ہاں کوئی جانور شرّی اور موذی ہو تو اسے بے شک بند کرنے یا مار دینے کے حقوق بھی دیئے گئے ہیں، سو یہ جانوز ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، شریر انسان کیلئے بھی حدود و قصاص، حبس و جیل، قید و بند اور قتل و غارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چناں چہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور "قَتْلُ الْمُوْذِیْ قَبْلَ الْاِیْذَاءِ" کا معاملہ رکھا گیا ہے مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنات کے حقوق...... اسی طرح جنات بھی اس جہان کے باشندے ہیں، جن کے حقوق ہیں، انہیں مکان غذا اور رہنے کا حق دیا گیا ہے جسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جس طرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی انہیں حق دیا گیا کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش اختیار کریں، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنات بسے ہوئے ہیں چوں کہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں، اس لئے ہمیں پتا نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے، البتہ جو بدطینت اور شری فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔ بہر حال جب جنات بدی پر آجائیں تو پھر ان کا مقابلہ، بلکہ مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنات میں مختلف صفات و مذاہب...... ورنہ جہاں تک نیک اور مومن جنات کا تعلق ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے انہیں نکالنے کی فکر میں رہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی، سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی چہ جائیکہ جنات کی کی جاتی۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ جنات میں ہر قسم کے افراد ہیں، نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ مسلم بھی ہیں غیر مسلم بھی، مشرک بھی ہیں یہودی و نصرانی بھی چناں چہ قرآن کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنات آسمان کے دروازوں

تک آجا سکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگو سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اچک لاتے تھے، جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضور کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو انہیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے، جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے جس کی بدولت ہم پہ یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کچھ جنات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق و مغرب میں گھومے۔ کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی، کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو ان میں سے ایک جماعت کا گزر مکہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کا طرز و انداز نرالا اور ہادیانہ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس ہدایت کی زد ٹھیک ہمارے شر کے اوپر ہے۔ سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شری افعال پر یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ انہوں نے جا کر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ: ﴿اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا o یَّهۡدِیۡۤ اِلَى الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ ① ''ہم نے تو عجیب قسم کا کلام پڑھا ہوا سنا ہے جو نیکی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لائے''۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے تو ان میں کافر و مومن کی دونوں نوع نکلیں پھر آگے فرمایا: ﴿وَلَنۡ نُّشۡرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾ ② ''اور ہم اب ہرگز شرک نہیں کریں گے نہ آئندہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں گے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحد و مشرک کی تقسیم بھی تھی کچھ مشرک تھے اور کچھ موحد، آگے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ ③ ''اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے، اس سے کہ اس کی کوئی بیوی اور بیٹا ہو''۔ معلوم ہوا کہ ان میں بعض عیسائی بھی تھے، جو عقیدہ زوجیت اور ابنیت کے قائل تھے، آگے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوۡلُ سَفِيۡهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا﴾ ④

''اور ہم میں سے بیوقوف اللہ تعالیٰ پر حد سے زیادہ جھوٹ اور افتراء باندھتے تھے''۔ معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے۔ جو اپنی سفاہت اور بدعقلی سے خدا پر جھوٹ باندھ کر غیر دین کو دین باور کراتے تھے، اور وحی الٰہی کے نام سے اپنے تخیلات فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے، بہر حال اس سے واضح ہوا کہ جنات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات و عقائد کے افراد پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کے قدرتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدکاروں کو سزا و سرزنش کی جائے جیسے انسان کو کی جاتی ہے، لیکن ان کے حقوق کو نہیں روکا جا سکتا۔

جنات کے ساتھ رشتہ زوجیت؟...... حتیٰ کہ ان سے زوجیت کا رشتہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فقہاء میں یہ بحث ہے کہ مسلم جن عورت سے شادی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء نے اس نکاح کو جائز کہا ہے بعض نے ناجائز، جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح جنس سے ہوتا ہے نہ کہ غیر جنس سے، وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے، کیوں کہ

① پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۱، ۲. ② پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۲.
③ پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۳. ④ پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۴.

یہ نکاح ایسے ہی ہوگا، جیسے آدمی بکری یا گائے سے نکاح کرے تو جانور بوجہ غیر جنس ہونے کے محل نکاح ہی نہیں اس لئے نکاح نہ ہوگا، اور جن کی نظر اس پر ہے کہ جنات میں شعور ہے اور وہ شریعت کے مخاطب اور احکام کے مکلّف ہیں، نیز انسانی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔ بہرحال جنات کے مختلف حقوق ہیں، کچھ مکان کے ہیں، کچھ غذا کے حقوق ہیں۔ کچھ پڑوسی ہونے کے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ رشتہ زوجیت کے بھی ہیں۔ ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنات کو وعظ و تبلیغ...... حدیث شریف میں آتا ہے ① کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصیبین کے جنات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا! یا رسول اللہ! ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے، آپ تشریف لا کر انہیں وعظ و نصیحت فرمائیں اور ان سے متعلق مسائل بیان فرمائیں ان کے کچھ سوالات بھی ہیں، جن کا حل چاہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے، جس پر جنات کا یہ جلسہ جمع ہوا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب قماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں، لیکن دائرے کے اندر نہیں آسکتے۔ ان کی آوازیں بھی آتی تھیں، بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے، اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ: "فَاِنَّهَا زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ" "کیوں کہ یہ تمہارے جنات بھائیوں کی خوراک ہے"۔ جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کھا لیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنات کو "پُر گوشت" ہو کر ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجاء کرتے تھے، جس پر جنات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہڈی سے استنجاء کی ممانعت فرمائی، جس سے جنات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں، اسی طرح مکانات سے بے وجہ انہیں اجاڑنا جائز نہیں جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوق ملائکہ...... یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں، کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں، کچھ زمین میں، اور ان کے بھی حقوق ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ چار انگلی جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغول عبادت نہ ہوں، عالم بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالم سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے، وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں، مثلاً ملائکہ کو نفرت ہے بدبو سے اور رغبت ہے خوشبو سے، اس لئے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر الجن، ج:۱۲ ص:۲۳۶، مسند احمد، حدیث عبد اللہ بن مسعودؓ، ج:۱، ص:۴۵۸ رقم: ۴۳۸۱.

ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں، انہیں بدبو سے آلودہ کرنا جائز نہیں، مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہ ہے تو وہاں خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے، مساجد میں بخور اور ہر خوشبویات کا جلانا شرعاً مطلوب ہے تا کہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے تا کہ انہیں اذیت نہ ہو، حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لئے ملائکہ استغفار کرتے ہیں، جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہو اور وضو نہ ٹوٹے ایسا ہوتے ہی استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے، اور وہ ایسے بندوں سے رخ پھیر لیتے ہیں، گویا ہم بدبو سے انہیں ان کے مکان سے اجاڑ دیتے ہیں، جس کا ہمیں حق نہیں۔

ملائکہ کی بدبو اور جھوٹ سے نفرت...... حدیث میں ہے کہ: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دور چلا جاتا ہے گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر ان سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں۔ تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر بھی ہوں اور اپنی مقررہ جگہ پر متمکن ہوں تو آپ ان کو بھگا دیں اور ان کی جگہ چھین لیں، البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے، انہیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہوگی، جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اسے بھگا ہی دینا چاہئے، بہر حال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے، تو اس ذکر اللہ سے روکنے کی حرکت کرنا ان سے غذا چھین لینا ہے جیسے پہلے آ چکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے انہیں تشویش اور اذیت ہو، بہر حال ملائکہ کے حقوق بھی جنات اور حیوانات کی طرح ہیں، جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق...... چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ نے اسے بھی زمین آسمان میں حقوق دیئے ہیں، کھانے کا حق، اوڑھنے کا حق، غذا کا حق، مکان کا حق، آزادی کا حق، اسے بھی حق تعالیٰ نے اس زمین پر آباد کیا ہے، پس زمین ان چاروں مخلوقات حیوان، جن، فرشتہ اور انسان کا مکان ہے، جس پر وہ آباد ہیں، ان چاروں مخلوقات سے حق تعالیٰ کا معاملہ الگ الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنات سے نہیں ہے جنات سے جو معاملہ ہے وہ ملائکہ سے نہیں، جن و ملک سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں۔ مثلاً جانوروں سے معاملہ یہ ہے کہ انہیں قابل خطاب نہیں سمجھا گیا! اور کوئی امر و نہی انہیں نہیں دیا۔ کوئی قانون ان کے لئے خطابی رنگ میں نہیں اتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو کیوں کہ انہیں فہم خطاب کا مادہ ہی نہیں، نہ عقل ہے نہ فہم، اور ہے تو بہت ہی ادنی جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد سمجھنے کے لیے ہے کہ وہ اپنی غذا رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیا کریں۔

حیوانات کی پیدائش سے متعلقہ مقاصد..... مگر وہ امورِ کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفاد کلی کو سمجھنے کیلئے کوئی اہلیت نہیں رکھتے، صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس؟ سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو فہم و عقل مل جاتا تو کیا حرج تھا؟ جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے لئے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان میں عقل و فہم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ

عقل حارج ہوتی ہے اور وہ مقاصد کبھی پورے نہ ہو سکتے ان سے متعلقہ مقاصد یہ ہیں، جنہیں اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ① ''ہم نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے گرمی کا سامان ہے اور سردی دفع کرنے کی صورت مہیا ہے''۔

چناں چہ تم ان حیوانات کے اون سے گرم کپڑے ٹوپی اور کمبل وغیرہ بناتے ہو، ان کی کھالوں میں تمہارے لئے کئی قسم کے منافع ہیں، اوڑھنے کے بچھانے کے، زینت کے خیمے بنا کر رہتے سہتے اور ﴿مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو، یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ''اور تمہارے لئے ان جانوروں میں رونق و جمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کی شانیں قائم کرتے ہو''۔ سرکاری، قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زرین جھولے کس کر اپنا جاہ وحشم دکھلاتے ہو جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔ ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ ② ''اوران کے ذریعہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سامان منتقل کرتے ہو جس کو تم ان کے بغیر مشقت کثیر سے بھی مشکل ہی سے منتقل کر سکتے''۔

حیوانات کو عقل وفہم سے محروم رکھنے کی حکمت...... ان منافع اور حیوانات کے ان خلقی مقاصد پر غور کرو۔ تو ان کے لئے فہم وعقل کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیوں کہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا، زین رکھتا، یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا، تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی، اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آ جاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے، بلکہ ممکن ہو جاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا، ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی، ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جا سکتے نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جا سکتا، سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہو جاتے اور انسان کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل وفہم ملنے سے ہوئی پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی وہ علم حاصل کرنے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے کتے سب جمع رہتے، بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے ،تو آپ کو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا، غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہو جاتے اس لئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں عقل وفہم نہیں دیا۔ جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۵-۶۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۔

بے عقلی بھی نعمت ہے...... اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے، اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے، حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے، حتی کہ جو انسان بے عقل اور بے وقوف ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں۔ جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے بے وقوف نہ ہوتے تو لیڈروں کو غذا نہ ملتی، اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے، اس لئے جانوروں میں مادہ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلا بحث ومجادلہ نکال لئے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے، پامال ہو جاتے۔ حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی پیدائش سے جو مقاصد متعلق ہیں۔ ان میں عقل کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو ان کے فرائض کی وجہ سے بے سمجھ رکھا گیا تا کہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں اور جب عقل وفہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لئے کوئی شرعی قانون اتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلف بنائے جاتے، پس ان کے لئے نہ امر ہے نہ نہی نہ شریعت آئی نہ کوئی تشریعی قانون صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے جس سے وہ کام پر لگے رہیں اور لگے رہتے ہیں، اور روز وشب مشغول ومنہمک ہیں۔

ملائکہ کو خطابِ خدا کی نوعیّت...... ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطاب تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو بلکہ خطاب تشریفی کیا جو اعزازی اور تکریمی ہے، جیسے بادشاہ کسی مقرب سے باتیں کرے تو اس سے اس کی عزت بڑھانی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا، کلام بھی فرمایا گفتگو بھی کی مگر ان پر کوئی شریعت نہیں اتاری کیوں کہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں، جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے شر کے ہوتے ہیں، جس سے شر کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے، جیسے بدکاری، دغا بازی، رشوت ستانی، زنا کاری، شراب خوری، چوری، سرزوری، بغاوت تمرد سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر اور برائی کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا، تو انہیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ بدی نہیں کر سکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو امر کرنا تھا، جو سراسر خلافِ حکمت ہے اور حق تعالیٰ حکیم مطلق ہیں وہ خلاف حکمت بات سے بری اور منزہ ہیں، رہی خیر تو وہ ان کا طبعی تقاضا ہے جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں۔ عبادت بھی کرتے ہیں۔ سجدہ بھی کرتے ہیں اور اپنی طبع پاک ہی سے منشاء خداوندی کو پہچانتے ہیں۔ اس لئے ان کو شریعت کے ذریعے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں امر خیر کرنے کے لئے کسی قانون سے تنبیہ کی جاتی۔ پس جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا، سونا جاگنا وغیرہ طبعی بات ہے اسی طرح تمام امور خیر عبادت نیکی، پاکدامنی صفائے باطن وظاہر اور سلامتی ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے ایک شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی کریں گے، اس لئے امور خیر

کیلئے بھی کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی، بہرحال ملائکہ کو نہ امر شرعی کی ضرورت نہ نہی شرعی کی اس لئے ان سے خطاب تکلیفی نہیں کیا گیا، ملائکہ کو خطاب کیا گیا، مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔

جنّات کو تکلیفی خطاب کیا گیا مگر مستقل نہیں...... رہے جنات تو ان کو خطاب بھی کیا گیا اور تکلیفی خطاب کیا گیا، مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا یعنی خود ان پر براہ راست کوئی شریعت نہیں اتاری گئی اور نہ براہ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکالیف دی گئی، بلکہ انسان کے واسطے سے انہیں بھی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا چناں چہ ان میں جو یہودی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں تورات خود ان کی نوع پر نہیں اتری، جو عیسائی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں، انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اتری اور جو مسلمان ہیں وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں، خود قرآن براہ راست ان پر نہیں اتارا گیا پس جو شریعت انسانوں کے لئے آئی ہے وہ ان کے لئے بھی آئی مگر بواسطہ انسان کے انہیں پابند شریعت بنایا گیا۔

جنّات میں نبوّت نہ رکھنے کی وجہ...... بالفاظ دیگر ان میں نبوت نہیں رکھی گئی وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ اور شر کا لعدم ہے، جنّات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کا لعدم ہے اور نبوت کے لئے غلبۂ خیر ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی، ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بدفہمی یا بدعملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا، اس لئے انہیں تابع انسان بنایا گیا تاکہ اس کی شریعت سے وہ علم اور عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں اس لئے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا، ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنّات کو خطاب تکلیفی کیا مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً تشریعی خطاب کیا گیا......اور انسانوں کو خطاب بھی کیا۔ تکلیف شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب فرمایا، یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود ان سے کلام فرمایا، ان میں نبی اور رسول بنائے کبھی براہ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں اور کبھی بزبان ملکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی ملکیّت پر رہتا اور انبیاء بشریّت سے ملکیّت کی طرف منتقل ہو کر فرشتہ سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورت ملکی کو چھوڑ کر صورت انسانی میں آتا اور انبیاء بشری چولہ میں اسے دیکھتے۔ جس کو قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ ① پہلی صورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے، جس میں وہ اپنی اصلیت پر رہتا ہے، لیکن پیغمبر کو بشری اصلیت سے ملکیّت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے، اس لیے یہ صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی، دوسری صورت حق تعالیٰ کے براہ راست کلام فرمانے کی ہے جو پس پردہ رہ کر

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۱.

ہوتی تھی، یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلام حق سنتے تھے اور تیسری صورت فرشتہ کی انسانی صورت میں آکر پیغام خداوندی سنانے کی ہے جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے فرشتہ کو ملکی چولہ چھوڑ کر بشری چولہ میں آنا پڑتا تھا، یہ تینوں صورتیں وحی الٰہی کی تھیں۔

علم الٰہی کے لئے انسان کا انتخاب...... حاصل یہ ہے کہ وحی الٰہی اور نبوت و شریعت کی دولت کے لئے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں نہیں آیا اور ظاہر بات ہے کہ وحی علم کے اتارنے ہی کو کہتے ہیں، وحی کے ذریعہ علم ہی تو رسول کو دیا جاتا ہے، اس لئے دوسرے لفظوں میں علم الٰہی کی نعمت مستقلاً انسان ہی کو دی گئی ہے جس کو اس کی بنیادی خصوصیت اور امتیازی شان سمجھنا چاہئے کیوں کہ خصوصیت کے معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے اس لئے دوسرے لفظوں میں انسانیت کی خصوصیت علم وحی نکل آتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیت اس میں سے نکال دی جائے تو وہ چیز، وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

انسانیت کا جوہر علم وحی ہے...... اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علم وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان، انسان نہ رہے گا کہ انسانیت کی خصوصیات اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صورت انسانوں جیسی ہو، سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے اور انسانیت کا جوہر یہ علم وحی ہے، اس لئے جو انسان علم وحی کا حامل نہیں وہ دلائل بالا کی رو سے انسان نہیں صرف صورت انسان ہے اور محض صورت کی جس میں حقیقت نہ ہو، کوئی قدر و قیمت نہیں، اگر ہم گھوڑے کا مجسمہ بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل و نقل میں ذرا بھر فرق معلوم نہ ہو تو کیا اسے گھوڑا کہیں گے؟

اور کیا وہ گھوڑے کی طرح سواری کا کام دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار، پانچ سو روپیہ اٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ کیوں کہ وہ گھوڑا نہیں گھوڑے کی محض تصویر ہے، اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیت (علم) نہ ہو تو وہ صورت انسان ہے، انسان نہیں۔ اور قدر و قیمت انسان کی ہوتی ہے، صورت انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں دستیاب ہوسکتی ہیں، چاہئے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں، مگر ایسا نہیں ہوسکتا جس سے واضح ہوا کہ دنیا میں قدر و قیمت انسان کی ہے، تصویر انسان کی نہیں اور آدمی حقیقت آدمیت کو کہتے ہیں محض صورت آدمیت کو نہیں۔

گر بصورت آدمی انسان بدے ——— احمد صلی اللہ علیہ وسلم و بوجہل ہم یکساں بدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند! ——— نیستند آدم غلاف آدم اند!

از بروں چوگور کافر پر حلل ——— اندروں قہر خدائے عزّ وجل

علم مطلق انسان کی خصوصیت نہیں...... یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیت

مطلق علم نہیں۔ یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیت نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے، حتی کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں، اس لئے مطلق علم انسانی خصوصیت نہیں کہلائی جاسکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت وشرافت اور مخلوقات میں افضلیت نمایاں ہوسکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ آج کی دنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی قسمیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیت نہیں، جانوروں کو بھی ان سے حصہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔

فن انجینئری انسان کے ساتھ مخصوص نہیں...... آج اگر انسان دعوی کرے کہ میں اس لئے افضل المخلوقات ہوں کہ میں انجینئری کا علم جانتا ہوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کرسکتا ہوں تو یہ دعوی قابل سماع نہ ہوگا کیوں کہ انجینئری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں، وہ بھی دعوی کرسکیں گے کہ ہم بھی انجینئر ہیں اور اپنے مناسب حال راحت دہ مکانات بناتے ہیں۔

بیا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لئے عجیب وغریب قسم کا گھونسلا بناتی ہے، جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں، ماں باپ کا الگ، اور بچوں کا الگ حتی کہ اس میں بچے جھولتے ہیں، گویا مختلف رومز ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا گھاس سے بنایا جاتا ہے اور تین چار تاروں سے، کیکر وغیرہ کے درخت میں لگا ہوا اور لٹکا ہوا ہوتا ہے اور مضبوط اتنا کہ آندھی آئے، طوفان آئے مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی، آپ کا مکان گر جائے گا، مگر اس کا گھونسلہ محفوظ رہے گا کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے اور یہ چڑیا کیوں یہ دعوی نہیں کرسکتی کہ میں بھی انجینئر ہوں؟ ضرور کرسکتی ہے، تو پھر انجینئری انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اسکی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بناتی ہے اس کے ہشت پہلو سوارخ اس قدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پرکار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بنا سکتے پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں جو نہ بارش سے خراب ہو، نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے، کیا یہ انجینئری اور کاریگری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ انجینئری کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی افضلیت و برتری ثابت کرسکیں؟ سانپ اپنی ''بلمی'' مٹی سے بناتا ہے جو اوپر سے برجی دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں، کیا اسے انجینئری اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟ رہا یہ کہ آپ کہیں کہ صاحب ہم عمارتیں بڑی عالیشان بناتے ہیں، جن کی خوشنمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اونچی اور اعلیٰ ہوتی ہے، اس لئے ہم اور یہ جانور انجینئری میں برابر کیسے ہوسکتے ہیں ہتو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے آپ اپنی ضروریات کی، جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی ہوتی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعوی کرسکتے تھے،

لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت اظہار کرتا ہے، اگر آپ سانپ یا بیا یا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوں گے، بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہیں گے، اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر ہیں، اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں اس لئے انجینئری کے بارے میں آپ کو دعویٰ افضلیت کا کوئی حق نہیں۔

انسان اور علمِ طب...... اس طرح مثلاً علمِ طب ایک تجرباتی علم ہے، یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے، اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی بساط کی بقدر پایا جاتا ہے، آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس علم کا شرف حاصل ہے لہٰذا ہم ہی اس فن کی رو سے اشرف المخلوقات ہیں، غلط ہے، جانور بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم بھی علم طب میں مہارت رکھتے ہیں فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پر زیادہ بیماریاں آتی ہیں، تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں، جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اس لئے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں، لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علم طب صرف آپ کی خصوصیّت قرار نہیں پا سکتا۔

مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا، میرے بعض اعزہ وہاں اونچے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی، اس لئے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حد تک تھی، بندروں کی جبلت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذارسانی داخل ہے، اس لئے وہ کافی نقصان کرتے تھے، کبھی برتن اٹھا کے بھاگ جاتے کبھی کپڑا اٹھا لے جاتے۔ اور صرف لے جانا ہی نہ تھا، بلکہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسے لے جانا اور منڈیر پر بیٹھ کر اسے دکھا دکھا کر چیرنا پھاڑنا جس سے ایک تو کپڑا جانے کی تکلیف ہوتی۔ اسے ضائع ہوتا دیکھ کر اور بھی زیادہ دکھ ہوتا۔ اس لئے ہمیں ایک بار غصہ آیا اور ہم نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہئے، جس سے سو پچاس بندر ایک دفعہ مر جائیں تو کچھ تو نجات مل جائے گی، اس لئے ہم نے دو روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تا کہ وہ آتے جایں، روٹیاں کھاتے جائیں اور مرتے جائیں، اور ہم خوش ہوتے جائیں اس لئے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک پناہ میں بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ ابھی بندر آ کر ان روٹیوں کو کھائیں گے، اور مریں گے اور ہمارے لئے خوشی کا سامان ہوگا۔

یعنی اگر انہوں نے ہمارے دس کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تو دس بیس کو ہم بھی مرتا ہوا دیکھیں جس سے کچھ تو دل کو چین آئے۔ چنانچہ دو تین بندر آئے، مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے، ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جا سکتیں، اس لئے روٹی کو غور سے دیکھا اور پھر سونگھا اور سوچا یہ نیا حادثہ کیوں پیش آیا ہے۔ پہلے تو ہم ایک روٹی بھی چھت پر پڑی ہوتی نہیں پاتے تھے۔ اب یہ روٹیوں کا ڈھیر کیوں لگا ہوا ہے؟ اس میں ضرور کوئی راز ہے؟ بالآخر انہوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا اور چلے گئے ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جا کر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لے آیا

اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے ساتھ آئے اور وہ روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اور مشورہ شروع ہوا کہ روٹیاں اس مقدار میں یہاں کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا جانے انہوں نے باہم کیا کیا اشارے کئے ایک آگے بڑھا اور اس نے روٹیوں کو سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا، اس نے ایک روٹی توڑی اس کے ٹکڑوں کو سونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے اب ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر ناکام ہوگئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹہنی تھی، جن میں ہرے ہرے پتے تھے۔ انہوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا، ان کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنے یہ بندر تھے، تاکہ روٹیوں میں ہر ایک کو حصہ ملے، گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیش نظر تھا کہ۔

نیم نانے گر خورد مرد خدا بذل درویشان کندں نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخر کار انہوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لئے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے وہ پتے چبالئے جو ہر ایک اپنی ٹہنی کے ساتھ لایا تھا اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہے یعنی بے وقوف ہم رہے کہ دو روپیہ کا آٹا بھی گیا سنکھیے کے دام بھی بٹے کھاتے گئے، کپڑا تو پہلے ہی جاچکا تھا اور اوپر سے وقت بھی ضائع ہوا اور ہوشیار یہ بندر رہے کہ سب کچھ انہیں کا ہو کے رہا، اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے۔ جو ان بندروں کو معلوم تھا، اب بھی اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ طبیب صرف ہم ہی ہیں، جو جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں جانتے ہیں، تو یہ دعویٰ غلط ہوگا، کیوں کہ یہ بندر بھی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں، تو فن طب میں ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہے کہ صرف ہم ہی اطباء ہیں اور فن طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہوگئے گو کچھ خصوصیات کا فرق بھی سہی۔

فنِ سیاست بھی حیوانات میں ہے...... پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فن سیاست سہی، ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بارہ میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فن سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، شہد کی مکھی بھی ملت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز سے اس میں ہشت پہلو سوارخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ امیر منتخب کرتی ہیں، جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے، یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں، اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں تو شہد بھرا جاتا ہے، ایک حصہ میں ان

کے بچے ان خانوں میں پلتے ہیں، ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں، اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے۔

حتی کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہے، کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتہ پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ لیکر آئی ہو جس سے بنے ہوئے شہد میں سمیت کا سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اسے فورا مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتہ کے اندر گھسنے نہ پائے، تا کہ اس کے زہریلے مادہ سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک جان کی لے کر اگر پوری قوم کو بچالیا جائے تو کوئی جرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ①

شہد کی مکھیوں میں قانون قصاص اور مکافاتِ جرم...... یعنی ایک کی موت سے اگر پوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس کی موت میں کوئی مضائقہ نہیں، اس قتل نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوشدلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جھکا دی جاتی ہے، اور کسی کو خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہوا۔ بلکہ تمام قوم سر اطاعت جھکا کر مان لیتی ہے تو اولوالامر کا انتخاب، پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت، پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم، پھر بے راہی پر مجرم کا قتل، اگر سیاست نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بکثرت ہوتا ہے اور وہاں شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے، وہاں کا ہم نے ایک محاورہ سنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں، فلاں نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ جہیز میں پلنگ پٹیریاں، میز کرسی، زیور، کپڑا وغیرہ تو دنیا بھر میں دیا جاتا ہے، یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر کیا معنی ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں، اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہیں چھتہ بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اس گر کو سامنے رکھ کر وہاں کے شہد کے یہ کاروباری دو، چار امیر مکھیاں پکڑ کر ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں، وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں، اور مناسب مقام پر ان مکھیوں کو بٹھلا دیتی ہیں، تو وہیں شہد کے چھتے لگ جاتے ہیں۔

اور کئی کئی دھڑی شہد ہو جاتا ہے، تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۹.

دے دیا گیا۔ اس سے شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور نظم پسندی معلوم ہوئی، جس کی نظیر انسان میں بھی نہیں، سو اس نظم پسندی اور تنظیم ملت کی اعلیٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا ہے کہ صرف انسان ہی سیاست دان ہیں، یہ مکھیاں بھی دعوی کرسکتی ہیں، کہ ہم بھی سیاست دان ہیں تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کرلیں کہ کوئی غذا مہیا کرے کوئی تعلیم کا کام کرے، کوئی فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرے، تو کام بلاشبہ عمدہ ہے، ضروری بھی ہے، مگر محض انسان کی خصوصیت نہیں، مکھیاں بھی کرسکتی ہیں، اس لئے یہ تنظیم کوئی وجہ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم...... بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے، جب بطخیں سوتی ہیں تو ان کا امیر ان کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے، جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے، تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرہ سے آگاہ کرتا ہے، ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اٹھ کر پرواز میں آجاتی ہیں، اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اڑتی ہیں، جدھر امیر جاتا ہے، ادھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے، کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے وہیں عام بطخیں وہیں اتر پڑتی ہیں، یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہوسکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرہ سے آگاہ کرنا اور بچانا خود بیدار رہنا ان کو چوکنا رکھنا کیا اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لئے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، اصول سیاست میں حیوانات بھی اس کی برابری کا دعویٰ کرسکتے ہیں، مکھیاں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں، زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے تو اس کی وجہ سے یہ ہے کہ ملت میں جرائم زیادہ ہیں، اس لئے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں، مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہیں، تو تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں اور بطخوں کی افضلیت آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کمتری اور اصل سیاست میں برابری ثابت ہوگی تو یہ دعویٰ بھی آپ کا غلط ہے کہ ہم چوں کہ فنِ سیاست سے واقف ہیں، اس لئے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری...... اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بننے کا فن جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب جانداروں میں افضل ہیں تو مکڑی آکر کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں، دیکھئے مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تنتی ہے، جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں، وہ اتنا صاف باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صارف اور باریک نہیں ہوتی اور اتنا مضبوط جس کو آندھی اور ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارش بھی نہیں ہلا سکتی اس کی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں، آپ تو سوت سے کپڑا بنتے ہیں، وہ خدا جانے کس مادہ سے اپنا گھر بناتی ہے، آپ کا کپڑا

پھٹ جائے گا، مگر اس کا بنا ہوا خیمہ، یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔ آپ کا بنایا ہوا کپڑا میلا ہو جائیگا۔ جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔ صابن سے صاف کریں گے مگر مکڑی کے اس خیمہ کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لئے پرندے پھانسنے کے لئے جال بناتے ہیں، مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال بنتے ہیں۔ تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کیلئے سوت کے تاگوں سے کام لیتے ہیں تو بھی مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال بن سکتی ہوں، وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں، ہزار بھنبھناتی ہیں چلاتی ہیں، مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں۔ اور اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔ غرض آپ فنون طبعیہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیت کہہ سکیں گے، ضروریات زندگی کا کوئی فن ایسا نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ ہم جس قدر بھی ضروریات زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں، حیوانات بھی اپنی ضروریات زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

ضروریات زندگی کا ہر فن حیوانات میں موجود ہے..... حتی کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں۔ تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنے پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ آپ پیتل تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پَروں یعنی ہوائی جہازوں کے ذریعے اڑتے ہیں اور چیل کوے وغیرہ پرندے اپنے بنے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اڑتے ہیں، آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے ہیں، تب کہیں اڑتے ہیں، اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔ غرض آپ اگر اڑ گئے تو پرندے بھی اڑتے ہیں۔ یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا آپ نے کپڑا بن کر تن پوشی کی اور بدن کو کپڑے سے چھپایا تو ہر چرند پرند بھی اپنی کھال اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے اس کا قدرتی ہے، آپ رہنے کے لئے مکان بناتے ہیں۔ جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔ آپ اپنا رزق تلاش کرنے جنگل میں جاتے ہیں، وہ بھی اپنی غذا تلاش کرنے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں۔ وہ اس مصیبت سے بری ہیں، کچا ہی کھا لیتے ہیں، آپ اگر ان کے گھاس دانہ سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔

غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں۔ جس میں وہ آپ کی ہمسری کا دعوی نہ کرسکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے تو شہد کی مکھی اور بطخ سامنے آ کر اس دعوائے خصوصیت کو باطل کر دے گی آپ کپڑا بننے اور جال بنانے کا فن کا دعوی کریں گے تو مکڑی سامنے آ کر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کرسکتی ہوں، آپ فن طب کی مہارت کا دعوی کریں گے تو بندر اچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹی کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں۔ اور میں زہر کا تریاق جانتا ہوں۔ آپ فنِ پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آ کر کہیں گے ہم اس فن میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجینئری اور فن خانہ

سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درند آپ کے مقابلہ میں آ کر کہے گا کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے، لباس پہننے، علاج کرنے، مکان بنانے اور تنظیم وسیاست وصنعت کاری کرنے میں شریک ہیں۔

تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہوسکتا۔ افضلیت کسی خصوصیّت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو اس میں ہو، اور اوروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں۔ وہ علم شرائع اور علم احکامِ خداوندی ہے، جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے اور انسان اس علم کے ذریعے سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور نیابتِ خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے یہ علم کسی بھی غیر انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے نہ جنّات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں تو جمادات ونباتات کیا واقف ہوتے؟

یہ علم خصوصیت ہے انسان کی۔ علم شرائع صرف اس کی قسمت میں ہے جس نے اسے سب مخلوقات پر فوقیت وفضیلت دی، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آسکتا۔ کیوں کہ یہ علم اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتی۔ اور اللہ ہر کس وناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا سو اس کے لئے اس نے نوع انسانی کو مخصوص فرمایا اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا تو اس نے انہیں اپنی مرضیات ونامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں۔ اسے کرو اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اسے نہ کرو یعنی امر ونہی بتلایا پس امر ونہی کے قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لئے نبوت رکھی اور یہ نبوت نوع بشری ہی کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوّت کے علوم صرف انسان کو دیئے۔

انسانیت کا مدار ہی علوم الٰہیہ ہیں...... یعنی چار ذی شعور مخلوق، ملائکہ، جنات، حیوانات انسان۔ میں سے علم صرف انسان کو بخشا باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہو تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطہ سے ہوا، سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ، علوم وھمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیات نہیں یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں، کیوں کہ یہ تمام علوم اپنے اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم وبیش سب میں رکھے گئے ہیں، عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبعیت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا، اس سے خود اس کے نفس کی مرضی اور نامرضی اور خواہش وطلب کھلے گی۔

خدا کی مرضی نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آسکتی ہے، اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوت ورسالت کے ذریعے آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہوگیا کہ انسان کی خصوصیت علوم طبیعہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہی ہیں، علوم نبوت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں، اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور افضلیت کا دعوی کرسکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ کے ذریعے کرسکتا ہے۔ نہ کہ علوم طبیعہ وعقلیہ،

وہمیہ کے ذریعہ کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسر ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے، بلکہ اس کی انسانیت کا مدار بھی اس علم پر ہے، کیوں کہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیات ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو کیوں کہ جس چیز کی خصوصیت ختم ہو جائے۔ جس سے وہ چیز وہ چیز تھی تو پھر وہ شی وہ شی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں خصوصات باقی نہ رہے تو آپ آپ نہ رہے، اگر خصوصیت انسان انسان میں ہو تو انسان انسان کہلائے گا ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں وہ مکان بنانے، کھانے پینے علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں۔

پس جب انسان کی خصوصیت یہ علم الٰہی ہے، جس سے وہ مرضیاتِ الٰہی سمجھ لیتا ہے تو یہ علم الٰہی جب انسان میں ہوگا تو اس کا نام انسان ہوگا، ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا، کیوں کہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوش نما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے تب بھی رہے گا جانور ہی، کیوں کہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں جیسا کہ واضح کیا جاچکا ہے، بہرحال یہ بات صاف ہوگئی کہ نہ کھانا انسانیت ہے نہ سیاست و تنظیم اگر کوئی ماہر فن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیت ہے اور اگر مکان سازی پارچہ بافی نظم کاری میں عقل کو بھی لگا دیا جس سے یہ اشیاء مزیّن ہوگئیں تو گو بظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہوگیا۔ مگر حقیقت میں ان سے اور زیادہ گھٹ گیا کیوں کہ عقل جیسے پاک جوہر کو اس نے اپنی طبعیت کا خادم اور غلام بنا دیا اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے، اور عقل سرچشمہ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کردیا یہ کہاں کی عقل ہے۔ بلکہ بدعقلی ہے، جانور اس بے ہودگی سے بری ہیں اس لئے ایسا کر کے انسان اونچا تو کیا ہوتا جانوروں سے کہیں زیادہ نیچا اور کم رتبہ ہوگیا کہ جانور طبع حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام نہیں بناتے، اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انہوں نے طبعیت جیسے جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کا عالم وفاضل نہیں بنایا اور یہ انسان طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے انہیں مزین بنا کر حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ ملکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے، تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہوا۔

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے...... نیز یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، کیوں کہ میں کھانا کھایا کرتا ہوں تو لوگ کہیں گے کہ احمق یہ کون سی کمال کی بات ہے، جانور بھی کھانا کھاتے ہیں، یہ تو طبعی تقاضا ہے اس میں نہ محنت ہے نہ مشقت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جوانمردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے ورنہ سارے جانور بھی فضلاء اور باکمال ہوں گے یا اگر کوئی کہے گا کہ میں بڑا فاضل آدمی ہوں کیوں کہ میں رات کو پڑ کر سوتا ہوں تو بھی

کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے جانور بھی کر لیتے ہیں تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟ کمال نام ہے خلاف طبع کرنے کا کہ اس میں انسان کی محنت جفاکشی اور تحمل وصبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی کو سنایا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا تو لوگ اسے باکمال سمجھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں کہ واقعی خلاف طبع پر قابو پالینا کمال ہے نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کمال ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حجۃ الاسلام سیدنا الامام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بصیرت افروز واقعہ...... ابھی جس بزرگ کا نام نامی آپ کے سامنے لیا گیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیو بند، جن کا علم وفضل اور کمال ظاہری و باطنی معروف ہے، ان کا زمانہ اور پنڈت جی دیانند سرسوتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انہوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کئے، علماء نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آکر بحث کرو، اس نے کہا کہ تم لوگ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف ''مولبی کاسم'' سے بحث کروں گا۔ چنانچہ رڑکی کے علماء نے حضرت کو خط لکھا۔ کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لاویں باوجودیکہ حضرت مولانا قاسم بیمار تھے۔ مگر مذہب اسلامی کی حفاظت و اشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رُڑکی تشریف لے گئے۔

جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدث دارالعلوم دیو بند، مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی۔ مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور دیو بند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خدام خاص شریک سفر تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیو بند میں کل ڈیڑھ ذہین ہیں، پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں بیٹھ جائے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ رُڑکی پہنچے۔ تو انہوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا کہ تاکہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں، جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں، کھانے سے فارغ ہو کر بات چیت کریں گے۔ اتنے میں پنڈت جی کے لئے ایک بڑی لمبی چوڑی (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا۔ جس میں تقریباً چار پانچ سیر پوریاں، دو ڈھائی سیر حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری تھی گویا دو تین دھڑی کا ملبہ سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لیے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہو کر باہر آئی جس میں ایک حبہ بھی باقی نہ تھا، منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے کیوں کہ ایک آدمی بھلا اتنا کہاں کھا سکتا ہے، منشی صاحب کمرہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید لوگ کسی دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے، مگر دیکھا کہ کمرہ میں کوئی دروازہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے خادم سے پوچھا بھئی کہ اس کھانے میں کیا

اور بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ ایک آدمی اور اتنا کھانا، بہر حال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آ کر حضرت سے ساری گفتگو نقل کر دی، اس سلسلہ میں سنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس سے الگ ہو کر جب اپنے ہم جولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی مجھے ایک بات کی بڑی فکر ہوگی، وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے، ہمارے حضرت جیت جائیں گے، کیوں کہ بحمد للہ حق پر ہیں۔

لیکن یہ فکر ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی دم نہیں لیں گے، اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھے رہیں گے، تو یہ بات کیونکر بنے گی۔ بات ہنسی کی تھی۔ تمام احباب سن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی۔ لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ نے کیا کہا تھا۔

منشی جی گھبرائے فرمایا کہ: میں بات سن چکا ہوں مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اس کا جواب دینا ہے، منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا مقولہ دہرایا۔ فرمایا کہ: اس کے دو جواب ہیں، اول الزامی جواب ہے اور وہ یہ کہ کیا ساری باتوں کے مناظرہ کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں۔ آخر تم لوگ کس لئے ساتھ آئے ہو۔ کھانے میں بحث ہوئی تو تم مناظرہ کر لینا، دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ چیں ہو کر فرمایا) تم اتنے دن صحبت میں رہے، تمہارے ذہن میں یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں؟ کھانا بھیمیت کی علامت ہے اور بھیمیّت جہالت کا شعبہ ہے تو کیا تم مجھے بھمیت اور جہالت میں مناظرہ کرانے کے لیے یہاں لائے ہو؟ اگر بھیمیّت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم مقابلہ کے لئے پیش کر دیں گے، ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے کو پیش کریں گے، اونٹ کو پیش کریں گے، اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کریں گے، کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو؟

پھر فرمایا کہ: مناظرہ علم کا شعبہ ہے نہ کہ کھانا، تو تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ مناظرہ علم کے دائرہ کی چیز ہے اس کا مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائے گا، جو ذی علم ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک مقفل کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینہ کے بعد کھولا جائے اور جو تر و تازہ نکلے سمجھئے کہ وہ حق پر ہوگا۔

اہل اللہ کا ذریعۂ حیات...... اس سلسلہ میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقاءِ حیات کے لئے بحمد اللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباعِ سنت کے لئے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکر اللہ رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تو وہی ذریعہ حیات بن جاتا ہے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ وہ اظہارِ عبدیت اور امت کے لئے نمونہ عمل

چھوڑنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی انتہائی قلیل مقدار میں، اور وہ بھی بے حد سادہ کھانا، جیسے جو وغیرہ اور وہ بھی بے شمار فاقوں کے ساتھ، اس سے واضح ہوا کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اور ان کے ترک کا نام کمال ہے، جو جوانمردی ہے۔ طبعی تقاضے پورا کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال ہے تو ہر جانور میں ہے۔

ایسے ہی فنون طبیعہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم اور کمال علم نہیں ہے یہ طبعی علوم بقدر بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ اللہ سے باتیں کر کے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں سے بالاتر ہے اور وہ علم وحی ہے، جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے، نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر انہیں خوبصورت طریقوں سے نمایاں کر دینے سے ملتا ہے وہ صورت علم کہلائے گا حقیقی علم نہیں اور جب یہ علم الٰہی ہی انسانی خصوصیت ہے، تو انسان کے معنی ہی علم الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے، اس لئے انسان نام جیسے کپڑے پہننے، گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کا نام نہیں۔ ایسے ہی دو کان، دو آنکھ ایک ناک اور مخصوص صورت زیبا کے نہیں بلکہ سیرتِ زیبا کے ہیں، جو علم لدُنی اور علم الٰہی سے بنتی ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم وحکمت کا چشمہ پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو، یا اس کا حامی ہو اس لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا: ''اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَافِیْهَا اِلَّا عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ'' ① ''دنیا ملعون جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون سوائے عالم کے یا متعلم کے یا ان کے حامی اور دلدادہ کے'' اور وہ علم جو عالم یا متعلم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب وسنت کا علم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ ''اِنَّمَا الْعِلْمُ اٰیَةٌ مُحْکَمَةٌ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْ فَرِیْضَةٌ عَادِلَةٌ'' ② لاشبہ علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنت قائمہ ہے یا فریضہ عادلہ جو کتاب وسنت کے مشابہ ہو یعنی قیاس مجتہد یہ علم صرف انبیاء سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ عقل وطبع یا وہم وخیال سے۔

علم نبوی محنت اور مجاہدات سے ہی حاصل ہوتا ہے..... مگر یہ علم آتا ہے محنت اور خلاف طبع مجاہدے اور ریاضت کرنے سے کیوں کہ یہ علم علوم طبعیہ وعقلیہ کی طرح طبعی نہیں اس لئے سب علوم سے افضل ہے کیوں کہ امور طبعیہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آجائے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سوال فرمایا۔

بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت وہ تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت، دوزخ ان کے سامنے ہے، وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انبیاء ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو ان پر

---

① روایت حسن ہے۔ السنن للترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی هوان الدنیا علی الله عزوجل، ج: ۴، ص: ۵۶۱ رقم ۲۳۲۲.

② السنن للترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی هوان الدنیا علی الله عزوجل، باب منه ج: ۸ ص: ۳۰۲.

ملائکہ اترتے ہیں، اللہ کی وحی ان پر آتی ہے، جلال و جمال خداوندی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، معجزات ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کیا ہوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟ تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے؟ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ نہ پیغمبر ان کے سامنے ہوں گے نہ معجزات ان کے مشاہدہ میں آئیں گے اور اوپر سے شکوک وشبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور اس پر جمیں گے تو ان کا ایمان عجیب ہوگا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے وہی زیادہ عجیب ہوتی ہے ورنہ اگر کسی چیز کے معدات اور مویدات بکثرت ہوں اور اس کی طرف جھکانے والے اسباب بہت ہوں، رکاوٹ بالکل نہ ہو تو اس کا حاصل کر لیا جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا، اس بنا پر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، کیوں کہ تجلّیات الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ نہ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت وغضب کا قصہ تو عبادت ان کے حق میں امر طبعی ہے، اور طبیعت کے تقاضوں کا پورا کر لینا کوئی حیرت ناک بات نہیں، بلکہ اس سے رک جانا حیرت ناک اور عجیب ہے۔

پس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا سونا جاگنا عجیب نہیں کیوں کہ طبعیت کا تقاضا ہے ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے جس کو بجالانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کر کے اور بالفاظ دیگر اپنے نفس کو قتل کر کے رکوع وسجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے بدرجہا افضل ہے...... انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی عبادت سے عجیب بلکہ افضل ہے کیوں کہ وہ نفس کشی پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں پر وہ صبح کے وقت گرم لحاف میں سے اٹھ کر اور خواہشات نفس کے خلاف سردی میں پانی سے وضو کر کے اور اوپر سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اسے نیند کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ یہ نرم نرم بستر سے نہ اٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے۔ سرد ہواؤں میں سکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔

مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض اپنے مالک کی رضا کے لئے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوند کریم کے حکم کی تعمیل دل وجان سے کرتا ہے تو یہ مخالفت نفس ملائکہ میں کہاں؟ اور یہ نفس کشی اور جہاد نفس ملائکہ کو کہاں میسّر؟ کہ وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاد کر کے نفس کو پچھاڑا

جائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ملائکہ کی توہین کر رہا ہوں۔ العیاذ باللہ۔ وہ اللہ کے مقدس بندے ہیں۔

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں، جن سے کبھی بھی گناہ و معصیت کا صدور ممکن نہیں ﴿لَايَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ﴾ ① ان کی توہین کفر ہے اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ صرف بیان حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمت نفس ہے۔

انسان کی عبادت پوری مزاحمت نفس ہے...... اور انسان کی عبادت پوری مزاحمتِ نفس سے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلاف طبیعت کرنا کمال ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں کہ اس میں علم آئے بلکہ جہالت اس کی طبیعت کا تقاضا ہے، اس کی جبلت میں جہل ہے علم نہیں۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔ محنت و ریاضت سے ہنر پیدا کرتا ہے طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے۔ اور کمال بھی ہے۔ کمال اس لئے ہے کہ مجاہدے سے اسے حاصل کیا جس سے اس کے اندرونی قویٰ کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی ہے اور عجیب اس لئے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرہ سے بنایا گیا ہے۔ اور جماد لَایَعْقِل مادہ (نطفہ) سے تیار ہوا۔ نہ نور سے بنا نہ نار سے۔ بلکہ پامال خاک سے جس میں شعور کا نشان نہیں اور پھر ایسا باشعور نکلا کہ دنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔ نوری ملائکہ پر فائق ہوا اور ناری جنات پر غالب آ گیا محض علم کے کمال سے۔

انسان اور ملائکہ کے علم کا فرق!...... تو علم کا ان گندے مادوں اور کثیف جسموں میں اتار لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب وغریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تامل کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ پس ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اور ان کا علم ان کے اندرون سے ہے اور اندرون میں رہتا ہے۔ اس لئے پھیل نہیں سکتا جتنا ہے اتنا ہی رہے گا، لیکن انسان مجاہدہ سے علم حاصل کرتا ہے اور جو چیز اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ باہر سے لاتا ہے اور اسے علم حاصل کرنے کیلئے مشقت و مجاہدہ کے ساتھ کتنے ہی راستے تحصیل علم کے لئے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور کتنی ہی منزلوں سے گزر کر وہ علم کے مختلف درجات و مراتب اور علمی مقامات تک پہنچتا ہے، اس لئے اس کا علم پھیلتا ہوا ہوتا ہے، اس میں تدبر و تفکر شامل ہوتا ہے۔ جس سے من بھر علم دس من ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ پس ملائکہ کا علم عطائی قسم کا علم ہے، جس میں پھیلاؤ نہیں، اور انسان کا علم تدبر و تفقہ لئے ہوئے ہوتا ہے، جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے، یعنی فرشتے کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں وہ چار کے چار ہی ہیں اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبر و اجتہاد کے ذریعے ان چار میں دس بیس مسائل اور علوم پیدا کر لیتا ہے اور نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔ اس لئے ملائکہ نے بمقابلہ، آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا۔

انسانی علم کی فضیلت...... ﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَاعَلَّمْتَنَا﴾ اور انسان کے استنباط کو اور اجتہاد کو اس کے خدا نے سراہا کہ: ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ، وَلَوْرَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ

① پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶۔

وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ ① پس علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیت علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اسماء کی تعلیم ملی۔ جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیت علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقہ واجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور انسان کرتا ہے، پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اس میں زیادتِ علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

استنباط وارتقائے علم صرف انسانی علوم کا خاصہ ہے ...... پس علم اور ارتقائے علم درحقیقت انسان ہی کی خصوصیّت ثابت ہوتی ہے، جو دوسری مخلوقات میں نہیں اور ظاہر ہے کہ جامع علم شاہیت کی شان ہے کیوں کہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی مملکت کا علم رکھنا ہے تا کہ احکام دے سکے۔ اس لئے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پر نیابت وخلافت خداوندی بھی اسی کا کام ہوسکتا تھا جو اسے مل گیا۔ اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ نائب الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے، کائنات سے کام لے۔ اور اس میں حسب منشاء تصرفات کرے۔ اس لئے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے۔ جمادات سے الگ بیگار لیتا ہے، زمین سے آسمان تک اس کے تصرفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادی کائنات کے مادوں میں علم کی طاقت سے جوڑ توڑ کر نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیتا رہتا ہے، سب سے پہلے علم یہ ہے کہ شی کا نام معلوم ہو کیوں کہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل وصنعت میں نئی نئی اختراعات کرنا نہ فرشتوں سے بن پڑا نہ جن وحیوان سے۔

استعداد علم کی ترقی ...... بلکہ صرف انسان سے۔ تو حق تعالیٰ کی ازلی عنایت اس پر متوجہ ہوئی اور اسی کو اس نے اپنی توجہ وعنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔ چنانچہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شی کا نام معلوم ہونا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اسکی طرف توجہ ہی محال ہے اس لئے کہ مجہول مطلق کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھلائے۔ جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾

شی کا نام معلوم ہو جانے پر طبعًا آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو دیکھ بھی لوں۔ جس کا نام سنتا آرہا ہوں تو پھر حق تعالیٰ نے وہ ناموں والی کائنات پہچانوائی کہ وہ معلوم الاسماء اشیاء فلاں فلاں ہیں۔ تو زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے انہیں پیش کیا۔ پس ان کے خواص وآثار بتلائے۔ پھر ان کے نتائج وغایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بدرجہ عالم بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیاء علیہم السلام یکے بعد دیگرے معلم بن کر آتے رہے۔ اور علم کے مراتب کی درجہ بدرجہ تعلیم دیتے رہے۔

تکمیل علم وخلافت ...... یہاں تک کہ جب انسانی استعداد جامع علم کی متحمل ہوگئی اور قرنہا قرن گزرنے اور علمی

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۳۔

مشق کرنے کے بعد وہ ہمہ گیر علم کے لئے مستعد ہوگئی تو آخری معلم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے حقائق الٰہیہ کی تعلیم دی اور علم کو کامل کرتے ہوئے اس کے ہر ہر حکم کی علت اور لِم پر مطلع فرمایا۔ جس سے انسان نے حقیقت علم کا سراغ پایا اور وہ قرآن حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔

پس وہ خلافت جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں وہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گئی، کیوں کہ اس کا مبنیٰ علم تھا، علم ابتداء میں علم الاسماء کے ابتدائی دور میں تھا، تو اس پر مبنی شدہ خلافت بھی ابتدائی ادوار میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حد کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی ہی کے آنے کی گنجائش نہ رہی۔

جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے تو خلافت بھی حد کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ خلافت ظاہری تو حقائق کائنات کی تسخیر ہے، جس کے ذریعے عناصر اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں۔ اور خلافت باطنی حقائق الٰہیہ کی تحصیل ہے۔ جس کے ذریعہ روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوں۔ سو ظاہر ہے کہ دور محمدی میں یہ دونوں ہی خلافتیں حد کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک محیر العقول مادی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں۔ جو عقل و نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ اور ایک سے ایک حیرت ناک علمی و روحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو تفقہ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقل اور تفقہ یا عقل نفسانی اور فقہ روحانی دونوں حد کمال کو پہنچ گئے۔ کیوں کہ علم جامع دنیا کے سامنے آگیا۔ اس لئے خلافت صوری واسمی بھی مکمل ہوگئی اور خلافت حقیقی و معنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔

اختصاصِ خلافت...... لیکن صورت بلا حقیقت ناپائیدار اور بے معنی ہے۔ اس لئے مادی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنی اور جسم بلا روح کی مانند ہے۔ جس کے لئے نہ بقا ہے۔ نہ پائیداری اس لئے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان ہی کو دی گئیں، نہ ملائکہ کو ملیں نہ جنات و حیوانات کو کیوں کہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔ ہاں یہ علم انسان ہی میں کیوں ترقی کر سکتا تھا اور کیوں وہ بہائم یا جنّات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ بھی دونوں قسموں کی خلافتوں کے مستحق ہو جاتے۔

مادی ترقی عناصر کے تصادم و ٹکراؤ کا نتیجہ ہے...... سو اس کی بناء یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو یا صنعت و عمل کی۔ بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے کہ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہ ہو سکتے کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ بسیط مادہ میں ترقی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اسے اس کی ضد سے ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔ مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی، اسی انداز میں آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدت پیدا کر لی ہو۔

اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اس طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اچھل کود کرتا تھا۔ اسی طرح آج بھی کرر ہا ہے۔ نہ اس کے تموج نے کوئی جدت پیدا کی نہ جزر ومد نے وہی تموج آج بھی ہے، جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اب بھی ہے جو پہلے تھا۔ کوئی رخ تبدیل نہیں۔ نہ اس کا رخ بدلا، نہ دھارا بدلا اسی طرح ہوا جیسے پہلے چل رہی تھی۔ اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاک تھی۔ اب بھی ہے، نہ اس میں کوئی جدت ہے نہ ندرت نہ ترقی ہے۔ نہ ارتقاء، لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے ٹکرا دو، تو ترقی وہیں شروع ہو جائے گی۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری طرف آگ دھکا دیں کہ آگ پانی پر، حملہ آور ہو۔ اور پانی آگ پر وہ اسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اسے گرما دینا چاہے۔ تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جائے گی۔ جسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے ملیں اور مشینیں چلنے لگیں گی۔ اور تمدنی ترقی شروع ہو جائے گی اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو یہ تمدنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے، جو تنہا ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضا میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھونکوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہاب ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے جو کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں۔

اور ساکن فضاء میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہو سکتے اسی طرح اگر مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقت کو ختم کر دینا چاہتی ہے اور پانی مٹی کے جماؤ اور انجماد کو مٹا دینا چاہتا ہے تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہوگی پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے، جن سے تمدن کی ترقی ہوگی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ترقی نام تصادم کا ہے، تصادم نہ ہو تو ترقی بھی نہ ہو ان کو ان کو چھوڑ کر اعیان میں لو، تو دو پہلوان مثلاً فن کشتی و سپہ گری کے ماہر ہوں۔

لیکن کبھی بھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی بھی باہم کشتی نہ لڑیں تو ان کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کشتی لڑ پڑیں۔ تو ہر ایک کوشش کرے گا کہ دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تا کہ مغلوب نہ ہو، تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا۔ اور دنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔

علم وجہل، و باطل کے تصادم کی حکمت ......اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہو۔ اس کے علم میں خود بخود کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ کر دے تو

اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی بدولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہوگی جو بغیر اس علم و جہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اسلام حق ہے اس کا علم اور قانون سچا ہے لیکن اگر اس کے مقابلہ پر کفر نہ ہوا اور وہ اس سے ٹکر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کے حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہیں کھل سکتے۔ اور نہ ہی اس کی قوت نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلہ پر کفر، اخلاص کے مقابلہ پر نفاق، سچ کے مقابلہ پر جھوٹ، علم کے مقابلہ پر جہل، دیانت کے مقابلہ خیانت، ملائکہ کے مقابلہ پر شیاطین، انبیاء کے مقابلہ پر دجال رکھ دیئے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قوتیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں۔

قوموں کے باہمی تقابل میں درسِ عبرت ...... اس طرح وہ قومیں کتنی ہی جاہ و جبروت کی حامل ہوں۔ لیکن اگر ایک کی دوسری قوم سے ٹکر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلہ ہی کے وقت کھل سکتے ہیں، کبھی نہ کھلیں۔ اس لئے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب و مغلوب کے ملنے سے ہمیشہ نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دنیا کی وہ ترقیات جو عقل انسانی اور علمِ روحانی سے وابستہ ہیں اپنے اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوں۔ اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر اگلی نسلوں کے لئے مزید ترقیات کا درسِ عبرت بنیں۔ ورنہ ہر قوم ماء راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو کھودے اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی، کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے اور عالم میں فساد پیدا ہو جائے۔ اس لئے عوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لئے تازیانہ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ بے فکری سے اپنے خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے پائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل و کرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات کے سربستہ راز ہی واشگاف ہو سکتے ہیں، نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی پیدا ہو سکتی ہے، جو قدرت نے اس میں ودیعت رکھی تھی۔ فرمایا: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

ٹھیک اسی طرح سمجھیں کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیّت ہے، جنات میں صرف شیطنیت ہے اور ملائکہ میں صرف ربّانیت ہے۔ اسی لئے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں کوئی محض آگ کی مانند ہے جیسے جنّات۔ کوئی محض ہوا کی مانند ہے جیسے ملائکہ کوئی محض مٹی یا پانی کی مانند ہے جیسے بہائم۔ سو نہ جنات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے آج تک نہ کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا منہاج اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی نہ کسی بہیمیت نے آج تک کوئی نیا راستہ ڈالا جس سے دنیا کو کوئی رہنمائی ملتی۔

جنّات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ و فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے۔ اسی نوعیّت کا آج بھی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۱۔

کرتے ہیں۔ بہائم کھانا، پینا، چرنا اور نسل بڑھانا جیسا پہلے کرتے تھے وہی آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل کے گھاس کھانے کا اور نہ نر و مادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا، نہ فرشتہ کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکر و زور میں کوئی جدّت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہزار ہا ہزار برس پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں کیوں کہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی مادہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں جو ترقی کی بنیاد تھی۔

تقابل صفات سے ترقی...... بخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرما دیں اس میں ملکیّت بھی ہے۔ بھیمیّت بھی ہے اور شیطنیت بھی ہے تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو اکہری قوتوں سے نہیں ہو سکتا تھا مثلاً بھیمیّت کا کام کھانا، پینا اور نسل بڑھانا تھا لیکن جب اس کے ساتھ ملکیت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عفّت کہا جاتا ہے اور اس سے جائز و ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز، فلاں حرام، فلاں نسل کشی حلال اور فلاں حرام فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز غرض تدیّن کے ہزاروں گوشے عفت و پاک دامنی کی بدولت کھلتے ہیں جس سے دین و دیانت ترقی کرتے ہیں۔

اور عفت در حقیقت بھیمیّت اور ملکیّت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جیسے آگ پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنیّت کا کام دھوکہ، فریب، دغابازی اور مکاری ہے اس کے ساتھ اگر ملکیّت کی عقل لڑا دو تو تدبیر و تدبّر پیدا ہوگا، جس سے مکر و فریب کی بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہوگا اور مخفی تدبیروں کا حسن نمایاں ہوگا اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے، درندوں میں قوت غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے۔

کمال کا ظہور اور مادی و روحانی ترقی...... لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت و بردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس میں عقل و ہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال شہوت، غضب اور مکر و فریب کے ساتھ اگر قوت عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں، اور علمی و اخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن و ملک اور حیوان سے ممکن نہیں، کیوں کہ متضاد قوتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے۔ اس لئے ترقی کی راہیں بھی انسان پر کھل سکتی ہیں۔ نہ کہ ان تین مخلوقات پر اس لئے اگر ایجادات سے دنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل، تار، فون، بجلی اسٹیم، جہاز، کشتی سواری، مکان، ظروف، تجارت، حرفت، حکومت، انسان کے سوا کسی نے کر کے نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادت اور نقل و روایت کی استنادات دین، شریعت، مذہب، مشرب، ذوق وجدان حدس، تجربہ، علم، معرفت، قرب، طاعت، بصیرت بھی انسان کے سوا کسی نے حتیٰ کہ کسی پاکباز فرشتہ نے بھی کر کے نہیں

دکھلائی، یعنی انسان اس ترقی اور ان متضاد مادوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا پہنچا اور جبرئیل کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی جہاں ملائکہ بھی پر نہیں مار سکتے، یہ اس کی قوت عقلیہ کے قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوت سبعیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

قوائے شرّ کا عقل پر غالب ہونے کا نتیجہ...... ہاں اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور قوتیں بمقابلہ عقل کے غالب آ جائیں یعنی عقل ان مادوں کی خادم بن جائے اور ان کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے کی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار ہاتھ آگے کا بھیمہ اور شیاطین سے درجوں اوپر کا شیطان بن جاتا ہے جس سے بہائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی عقل بھیمیّت کا آلہ کار بن جائے تو بہائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے سوجھے گی۔

یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں ایجاد کر لے گا جو بہائم کے باپ کو بھی نہیں سوجھ سکتیں۔ اس کے ہاں عیاشی کے اڈے بن جائیں گے۔ زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن جائے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحاش دماغ اور عیاش دل اختراع کرے گا اور اگر اپنی عقل کو مکر و فریب کی قوتوں کا غلام بنا دیا تو پھر اسے وہ حیلے اور جعلسازیاں سوجھیں گی کہ شیطان کو صدیوں غور کر کے بھی نصیب نہ ہوں گی۔ غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو یہ احسن تقویم کا ثبوت پیش کرے گا اور اگر عقل پر شہوت و غضب اور درندگی غالب آ گئی تو پھر انسان اسفل سافلین میں کھڑا نظر آئے گا۔

لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں پر علم کے ہتھیاروں سے غالب آ سکتی ہے، بلا علم کے عقل طبعی ہے، جو بلا شبہ ان ہی طبعی قوتوں کا ساتھ دے گی اور انہیں اپنا کام کرنے کے نئے نئے راستے بتلائے گی لیکن عارف عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو۔ ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی، اور پھر ہر شعبہ زندگی میں انسانی کمالات کا ظہور ہوگا۔ اس لئے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر عقل محض سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور کورا عقلی بھی نہ ہو بلکہ ربّانی علم ہو جو بذریعہ وحی کے ذاتِ حق کی طرف آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جلا دیتا ہے۔ ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ دماغوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے ورنہ

آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا

اس لئے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری روشنی وابستہ ہے۔

شریعت کی حکمرانی......اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں یعنی خلوت اور جلوت، انفراد اور اجتماع، دوستی اور دشمنی حکومت اور غلامی، خوشی اور غمی، راحت اور مصیبت، موت و حیات ہر مرحلہ پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے، رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی

حیثیت سے ساتھ رکھیں۔ یہی قوتیں جو جہالت میں کام کرتی تھیں۔ اب علم میں کام کریں گی۔ وہی بھیمیت جو جہالت کے ساتھ عیاشی، فحاشی، بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی اب شریعت کے تابع ہو کر عفت وعصمت، پاکی، پاک دامنی اور نیکوکاری پر لے آئے گی، وہی قوت شیطنیت جو بحالت جہل مکاری، ڈپلومیسی، عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی۔ اب تابع فرمان الٰہی ہو کر تدبیر ودانائی، دانش وبینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی۔ اور بالفاظ دیگر جبلتِ نفسانی سے نکال کر فطرت روحانی کی طرف نکال لائے گی۔ اس لئے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کردی جائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم الٰہی کی کردی جائے۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا معنی...... تو انسان مزکّی مصفا اور مجلّی ہو جائے گا ورنہ ایک بہیمہ یا ایک شیطان یا ایک درندہ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خلقی مادہ کو ضائع کرنے یا پامال کرنے کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آئی ہے۔ تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دین فطرت ہونے کے، کہ اس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب۔ سبعیّت ہو یا شیطنیت کسی کو بھی بے کار نہیں ہونے دیا بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے، نیکی تو بجائے خود ہے، اس نے تو کسی بدی کو بھی علی الاطلاق نہیں مٹایا۔ بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے، مثلاً جھوٹ گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلّت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلاف واقعہ کلام کر جانا داخل ہے، شریعت نے اسے کلیۃً نہیں مٹایا۔ بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بول کر بھی صلح کرادو تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا۔ اور ایسا اجر جو نماز، روزہ پر ملتا ہے۔ دو بھائی باہم لڑ رہے تھے۔ آپ نے ایک بھائی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ میاں تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو وہ تو تمہاری جدائی سے بے حد غمگین اور سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور روتا تھا کہ ہائے میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا۔ ادھر دوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں، جس سے دونوں کے دل نرم ہو گئے اور مصالحت کو آمادہ ہو گئے۔ اور صبح کو دونوں نے معانقہ کر کے باہم صلح صفائی کر لی۔

شریعت نے جبلّی وطبعی قویٰ شر کو خیر کے طرف موڑا...... تو اس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گا جس سے فتنہ کا بیج بو دیا گیا اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑا دیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر شریعت کے اشاروں سے ہو اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتا ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی کے عیب واقعی کو اس کے پس پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی ہے اور اسے حرام رکھا۔ حالانکہ غیبت سچی بات کو کہتے ہیں اور جھوٹ ہو تو وہ افتراء ہوگا غیبت نہ ہوگی تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ﴾

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کے مردار گوشت کو نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے اور نہ جھوٹ معصیت بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیت ہے۔ یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت۔ غروب ہوتے وقت اور استواء یعنی سر پر ہوتے وقت ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا، معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔

عبادت کی حقیقت تسلیم ورضا ہے...... ماہ رمضان میں روزہ فرض ہے اگر بلا عذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں۔ لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا، جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے، کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں، روزہ رکھو جب ترک کرائیں ترک کر دو، اپنی تجویز کو دخل مت دیں کہ یہی اطاعت درحقیقت عبادت ہے یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقتِ عبادت اطاعت اور تسلیم ورضا ہے۔

خودکشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لئے پیش کر دینا اور سر کو ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے۔ نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بروقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل نفس اپنی نفس کے لئے کیا جائے تو معصیت ہے کہ خلاف اطاعت ہے اور یہی قتل نفس اگر حفاظت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور دین وعبادت ہے کیوں کہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیت نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے، اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کر سکتے ہاں مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں، وہ رکھوائیں تو اس کا رکھنا اور بچانا عبادت ہے وہ خود ہی اسے تلف کرائیں تو تلف کر دینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ معصیت ہے، نہ اس سے بچنا عبادت ہے کہنا ماننا عبادت ہے، اگر کہے کے مطابق لوٹ ماری بھی ہو تو عبادت اور کہے کے خلاف امن وامان دینا بھی معصیت ہے، زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا کبر نفس ہے۔ جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ ”خدا کی زمین پر تکبر کی چال مت چلو۔ کیوں کہ تم اکڑ کر اور ابھر ابھر کر زمین کو چیر نہیں دو گے۔ اور اونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے“۔

پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی مصیبت بھر رہے ہو جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیّت اور جرم ہے، لیکن حج کے موقع پر جس طواف کے بعد سعی صفا ومروہ ہو اس میں ابتدا کے چار پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزو عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیت ہے، نہ جھک کر چلنا عبادت ہے۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے، پس اصل چیز اطاعت حق نکلی، اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیّت بن جاتے ہیں، اور اگر کہے کے مطابق ہے تو جھوٹ، لوٹ مار، تکبر کی چال اور غارت گری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ بس اس طرح تمام خلقی قوتوں کو شریعت کے موافق استعمال کیا جائے تو وہ سب اطاعت بنتی چلی جائیں

گی، اور خلاف حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی۔ اس سے عبادت کی دو نوعیں نکلتی ہیں ایک افعال خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے، اور ایک افعال اثم جن سے بچنا ضروری ہے۔

بر و تقویٰ...... پہلی نوع کو شریعت کی اصطلاح میں بر کہتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ ①

اور دوسری نوع کو تقوی کہتے ہیں، جس کے ذریعہ گناہ سے بچا جاتا ہے۔ عبادت کی ان دونوعوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں نہیں بڑھا ہوا ہے بلکہ عبادت میں بھی فائق ہے، کیوں کہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ تقویٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شرّ کا مادہ ہی نہیں۔ وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے، تو ان سے بچنے کے لئے کہا بھی نہیں جا سکتا ہے اور انسان شر کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے۔ اس لیے شر سے اسے ہی روکا بھی جا سکتا ہے اور اس کا رکنا عبادت بھی قرار پا سکتا ہے کہ اور وہ ارادۂ رکتا ہے، فرشتہ میں نہ شرّ کا مادہ ہے نہ اس کے شرّ سے بالا رادہ رکنے کا سوال ہی پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے تقویٰ کی نوع کی عبادت ہی فرشتہ کے لئے نہیں۔ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے تو انسان اس نوع عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں۔ ان میں معاشرت، معاملات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لئے نہیں کیوں کہ ان میں نسل کا قصہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز و اقارب پیدا ہوں اور معاملات لین دین، آشتی و صلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے اس لیے بر کا دو تہائی حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص نکلا، اب رہے اعتقادات، سو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے، کیوں کہ اعتقاد کی اصل ایمان ہے اور ایمان کے معنیٰ ایمان بالغیب کے ہیں۔

فرشتہ کے حق میں کوئی چیز غیب ہی نہیں کہ اسے ایمان کا مکلف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لئے اعتقادات کا حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اب اگر رہ جاتا ہے تو دیانات کا رہ جاتا ہے۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، وغیرہ سو مال کی ضرورت معاشرت کے لئے ہے۔ فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں۔ کہ نسل نہیں اس لئے مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہو سکتا تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہی رہا روزہ کے معنی اپنے ارادہ و نیت سے کھانا پینا اور لذّت نساء کو ترک کرنا ہے، فرشتہ کے لئے نہ بیوی ہے نہ کھانا پینا تو وہاں اس عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لئے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فرشتہ کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔ انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبع کو برداشت کر کے ہوتا ہے۔ فرشتہ کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات و عبادات میں بھی انسان ہی فرشتہ سے افضل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں یہ بہیمیت اور شیطنیت والی قوتیں ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرشتہ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۷.

میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔ اس لئے وہ دو تہائی دین سے الگ تھلگ ہے۔ اب انسان میں قوت عقلی ہے۔ جو فرشتہ میں بھی ہے مگر اس عقل کے کتنے ہی مصرف جس سے عقلی قوت کی تفصیلات کھلتی ہیں۔ صرف انسان میں ہیں ملائکہ میں نہیں۔ اس لئے وہ اطاعت وعبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کر سکتا جو انسان پیش کر سکتا ہے، غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔ اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانون خداوندی کے ماتحت گزارنا ہے، سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملی۔ اس لئے اسلام اور تسلیم ورضا بھی اس کی جامع اور حاوی ہو سکتی ہے۔ جو کسی دوسری نوع کے لئے ممکن نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ہوا۔ ﴿ اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ﴾ "اے ابراہیم مسلم بن جاؤ" تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ کفر سے اسلام میں داخل ہو جاؤ بلکہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور گردن جھکا دو تو عرض کیا۔ ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ①

میں مسلم بن گیا۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اعلان کردو کہ میری زندگی اور موت۔ میری نماز اور عبادت سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ رضائے نفس کے لئے نہیں۔ مجھے اسی کا حکم کیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمین میں سے ہوں"۔

پس اسی تفویض وتسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لئے جئے اور رضائے حق ہی کے لئے مرے اسی کی خوشنودی کے لئے صلح کرے، اسی کے لئے لڑے، اسی کے لئے محبت کرے، اسی کیلئے عداوت باندھے، اسی کے لئے دے اور اسی کے لئے ہاتھ روکے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ" "جو اللہ ہی کے لئے محبت کرے، اسی کے لئے عداوت کرے، اسی کے لئے دے اور اسی کے لیے ہاتھ روک لے تو اس نے ایمان کامل کرلیا"۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں شہوت ہے نہ شیطنت ہے نہ غفلت ہے نہ نخوت۔ اس لئے جو اطاعت انسان کر سکتا ہے وہ فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادے ہی نہیں۔ جن کی روک تھام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔ اس لئے فرشتہ کو ان علوم کی ضرورت بھی نہ تھی جو انسان کو تھی۔ اس لئے کہ جتنی مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں۔ اتنے ہی دفاع ومدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لئے ضروری تھا۔

بنیادِ خلافت ...... اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اسکی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے فرشتہ کی نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل۔ تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی بنے، کیوں کہ کمالات خداوندی لامحدود ہونے کے باوجود دو ہی نوعوں میں اصلاً منحصر ہیں، کمالات علم اور کمالات عمل اور انہی دو میں انسان ساری مخلوقات حتیٰ کے فرشتوں سے بھی بڑھ کر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں وہی ہو سکتا

① پارہ: ۸۔ سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۲۔

تھا اور عمل چوں کہ علم کے تابع ہے اس لئے اصل بنیاد خلافت علم ہی ٹھہر جاتی ہے۔ جو انسان ہی میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے، اس لئے اسی کو خلفیہ الٰہی بنایا گیا۔

خلافتِ انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال...... اسی لئے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنا دیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنے والا کون ہے؟ تو حق تعالیٰ نے اولاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیاء کائنات کے نام تو بتا دو، وہ نہ بتا سکے تو حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: تم بتاؤ۔ انہوں نے فرفر گنوا دیئے، تو بتا دیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرتبہ علم اسماء ہے جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جا سکے تو اسماء کے بعد صفات اشیاء پھر خواص اشیاء پھر حقائق اشیاء وغیرہ کے علوم ہیں تم ان سے کب بازی لے جا سکو گے اس لئے مستحق خلافت انسان ہی ہے۔

بارہ گاہ الٰہی سے قولی و عملی جواب...... رہا عملی میدان تو اس میں ملائکہ نے نوع انسان کی مذمت کی تھی کہ وہ سفاک ہوگا۔ مفسد ہوگا تو قدم قدم پر حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اول تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں تا کہ قیامت تک ان کے اس شبہ کا جواب عملی ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں آیا ہے کہ جب کہیں مجلس خیر و وعظ نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل ہوتے ہیں جو اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ یہ مجلس ہے جس میں آج ہم اور آپ جمع ہو کر ذکر حق سن رہے ہیں۔ اس میں بلاشبہ کروڑوں فرشتے تشریف فرما ہیں۔ جب یہ مجلس خیر ختم ہوگی۔ تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور انہیں حق تعالیٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں تم کہاں گئے تھے۔ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں کی مجلس میں فرماتے ہیں تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں، مصروف تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنت، دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں انبیاء سے سن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنت و نار کو دیکھ پائیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے انہیں کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جنت بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور انہیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور انہیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں دنیا میں نہ معلوم کتنی ہو رہی ہوں گی جیسی مجلس یہاں ہو رہی ہے اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اترنا اور چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کو عملی جواب دینے کے لئے ہے کہ جس کے بارے میں تم کہتے تھے کہ: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ تم نے دیکھا کہ وہ کس درجہ عمل صالح اور بر و تقوی میں لگا ہوا ہے اور کس درجہ

صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر خود جمے رہنے کی سعی بھی کر رہا ہے۔

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت ...... کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ سفک دماء ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت و اطاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا، تا کہ اس کی سفا کی اور افساد کا تخیل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف ہو جائیں، چناں چہ ہر غیر معمولی عمل و عبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج و زیارت کرتے ہیں، طواف و سعی میں دوڑتے ہیں۔ منیٰ و عرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر سر سے کفن باندھ کر اپنی لذت و آرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سب میری خوشنودی و رضا کے لئے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ! تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کو وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ﴾ کہا تھا۔ دیکھو کیسا اطاعت و عبادت اور ترک لذات میں اپنے رب کی خاطر مصروف ہے۔

① حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اوپر چڑھتے ہیں اور اعمال نامے رات والے ملائکہ کے حوالے کر دیئے ہیں اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت دن والوں کو چارج دے کر اوپر چڑھتے ہیں غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج و نزول کا وقت فجر اور عصر کی نمازوں کے وقت کیا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ: "تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَاَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ" "جب ہم نے انہیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے۔ اور جب ہم نے جا کر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول تھے۔ سو یہ وہی عملی جواب ہے کہ جن کے بارہ میں تم مفسد اور سفاک ہونے کے مدعی تھے، دیکھو وہ رات دن کیسے مصروفِ عبادت ہیں۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح و شام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری ان پر جتائی جاتی ہے، تا کہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اس کی خلافت کے معترف ہوتے رہیں۔

احوال و کیفیات میں انسان کا تفوق ...... پھر نہ صرف علم و عمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا و برتر ہے بلکہ احوال و کیفیات بھی دیکھی جائیں۔ جو قرب الٰہی سے اسے حاصل ہوتی ہیں۔ سو وہ ان احوال میں بھی ملائکہ سے بالا و برتر ہے، آخر جو احوال و کیفیات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہیں وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں۔ کیوں کہ نہ ملائکہ علم و عمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں۔ جس سے انسان گزرتا ہے۔ نہ ان پر وہ کیفیات عشق و محبت

① الصحيح للبخاري، كتاب مواقيت الصلوٰة، باب فضل صلاة العصر، ج: ۲، ص: ۳۹۰.

طاری ہوتی ہیں۔ جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم، عمل، حال سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے۔ اور خلیفہ خداوندی بنایا جائے کہ بناء خلافت یہی دو چیزیں تھیں، علم خداوندی اور اخلاقِ خداوندی وہ دونوں جب اس میں علی وجہ الاتم ثابت ہوتے ہیں۔ تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اس میں آسکتی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیلِ خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جب کہ علمِ کامل اور عمل کامل ہے تو یہ علم وعمل جب تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا۔ جس انداز کا خود حق تعالیٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کی علمی وعملی خلافت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

تکمیل خلافت آخرت میں ہوگی...... اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے علم اور عمل وصناعی کی شان یہ ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے، یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کرلیا۔ (معاذ اللہ)

بلکہ علم کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے۔ یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے ابھرتا ہے، ایسے ہی اس کی صناعی بھی وسائل وآلات کی محتاج نہیں بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کُـــن (ہوجا) تو وہ ہوجاتی ہے، اس لئے وہ پل بھر میں جہان بنادیتے ہیں اور ان کے ارادہ ہی سے وہ چیز خود بخود معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ ①

اس صورتحال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنت میں داخل ہوکر پیدا ہوگی۔ چناں چہ علم تو یہ ہوگا کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب ومحنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جس جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی۔ اسی کو یوں قرآن میں فرمایا گیا: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ﴾ ②

یعنی ماضی ومستقبل سب کچھ انسان پر روشن ہوکر اس کے علم میں آجائے گا اگلے پچھلے تمام کئے ہوئے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بخود حاصل ہوں گے، نہ کوئی استاد ہوگا۔ نہ کتاب بلکہ نفس انسان خود مُدرک بن جائے گا اور ہر عمل کی یہ کیفیت ہوگی کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب ومحنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی جتنی جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی اسی کو قرآن میں فرمایا گیا: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ ③

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہوجائے گی کہ جو چاہا وہی ہوگیا۔ نہ اسباب کی ضرورت نہ وسائل کی اور جب علم انسانی اسباب سے مستغنی ہوجائیگا۔ اور عمل کسب وریاضت سے مستغنی ہوکر محض قوت ارادہ کے تابع ہوجائیگا۔

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۸۲. ② پارہ: ۳۰، سورۃ الانفطار، الآیۃ: ۱، ۲.

③ پارہ: ۲۴، سورۃ حٰم سجدۃ، الآیۃ: ۳۱.

بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے علم وصنعت کے مشابہ ہو جائے گا تو اس وقت انسان کی علمی وعملی خلافت مکمل ہوگی کہ وہ جس کا نائب ہے، وہ علم وعمل میں نائب ہے۔ اور اس کے علم وعمل سے مشابہ اس کا علم وعمل ہو جائے گا۔ اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم وعمل تھا۔ جو علم وعمل خداوندی کے مشابہ بن گیا تو خلافت بھی صحیح معنی میں اس وقت مستحکم اور مضبوط ہوگی، مگر جنت میں یہ استحکام خلافت جب ہی ہوگا جب دنیا میں علم وعمل کے اسباب و وسائل اختیار کر کے اسے جز ونفس بنانے کی انسان نے سعی کی ہوگی۔ ورنہ یہاں کی محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کامل بن جانے کے بعد حق تعالیٰ ان بندوں کو انہیں القاب وخطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب وخطابات خود ان کے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو نشاط میں لانے کے لئے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خط رسانی کا کام کریں گے۔ ان خطوط کے لفافوں پر یہ پتہ لکھا ہوگا۔'' مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ'' عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے یعنی القاب بھی وہی دے دیں گے۔ جو خود ان کے سرکاری خطابات ہیں۔ پس اس عالم میں انسان صورۃً خلیفۂ خداوندی ہے۔ اور محض خلافت کے راستہ پر ہے، آخرت میں پہنچ کر حقیقی معنی میں خلفیۂ خداوندی بن جائے گا مگر یہ منزل جب ہی آئے گی جب اس کا راستہ دنیا میں اختیار کر لیا جائے گا اگر یہاں نیابت کی یہ ظاہری صورت اختیار نہ کی جائے جو اطاعت وعبادت سے بنتی ہے۔ تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہوگی۔ اور کیسے ہو جائے گی؟ بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ جنات، ملائکہ اور حیوانات میں سے اس خلافت کے عہدہ کے لئے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا۔ آیا تو صرف انسان کا آیا۔

قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابل خطاب ہی نہ تھے۔ اس لئے قابل ذکر بھی نہ تھے۔ قابل ذکر ملائکہ۔ جنات اور انسان ہی تھے۔ سو ان ہی کا اللہ نے اس آیت میں جو میں نے ابتداء میں تلاوت کی تھی ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدان مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنات میں سے ہے اس کے فہم وعمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ امر خداوندی کے معارضہ پر اتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہو گیا جو اس کی بدفہمی اور بدنیتی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفہ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیت، انسان نے علم کا ثبوت دیا کہ جنت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علم اسماء سے اس کا علم ترقی کر گیا۔ جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعہ اس نے تمام اشیاء زندگی پر قابو پا لیا اور کائنات اس کے لئے مسخر ہوگئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اس کے مقابلہ پر چھوڑ دیا گیا کہ چوکنا رہے اور اس کا مقابلہ کر کے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے، اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہے۔ یہ علم انبیاء کو دیا اور انبیاء نے یہ علم جو مبنائے خلافت ہے بنی نوع انسان کو سکھایا پس انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے استاد اور مربی ہیں حق تعالیٰ نے ان پاکباز

استادوں کا گروہ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں بھیجا۔ اور دنیا کو حکم دیا کہ ان سے علم سیکھے اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے چھت آسمان ہے۔ اس میں ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان وجنّات اس مدرسہ کے طلبہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام استاذ ہیں اور ملائکہ خدام مدرسہ نگران اور منتظم ہیں، طلبہ کے لئے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دستر خوان بنا دیا تاکہ طلبہ وظیفہ پاسکیں اور ان کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاق خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کی فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہوگئی جس کی بنا علم ہے۔

خلافتِ نبوّت...... یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اوّلین خلفاء ربانی ہیں۔ ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو علمائے ربانی ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے "يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ" پھر ہر صدی پر مجدّد دین کا وعدہ دیا گیا ہے جو علماء راسخین فی العلم ہوں گے یہ حضراتِ علماء اس علم الٰہی سے غلو کنندوں کی تحریفوں، باطل پسندوں کی دروغ بافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک وشبہات اہل باطل اور اہل زیغ اس میں ڈالیں گے۔ یہ اہل علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ امّت لاوارث امّت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے دین وعلم کا حلیہ بگاڑ دے۔

اور کسی بھی مفسد وعیار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: "كَيْفَ تَهْلَكُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِيُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِيْحُ (ابْنُ مَرْيَمَ) اٰخِرُهَا" آپ نے ارشاد فرمایا: "لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ"

وراثتِ نبوّت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَايَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَلَهُمْ وَلَامَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُاللهِ

پس جس امّت میں اتنی انواع کے اخلاف رشید کے وعدے دیئے گئے ہوں۔ وہ امّت لاوارث امّت نہیں ہوسکتی۔ اس کی پشت پناہی اللہ ورسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی، جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَثَلُ اُمَّتِيْ كَمَثَلِ الْمَطَرِ لَايُدْرٰى اَوَّلُهَا خَيْرٌ اَمْ اٰخِرُهَا؟" ①

پس انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اس وارث امّت کو ملتا رہے گا جب تک اپنا روحانی نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑے رکھے گی اور وہ ترکہ بھی علم ہے کیوں کہ انبیاء روٹی اور کرسی وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم ومعرفت چھوڑتے ہیں۔ اسی علم ومعرفت سے آدمی آدمی بنتا ہے اور انسانیت اسی علم پر موقوف ہے اگر دنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف نہ لائے تو انسان ڈھوروں، ڈنگروں کا ایک گلّہ ہوتا جو بقول ملائکہ سفّاکی اور مفسدہ پردازی کے سوا دوسرا کام نہ جانتا۔

---

① المعجم الاوسط للبطرانی، من اسمه علی، ج: ۹ ص: ۲۵۹ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفيه عبيس بن ميمون وهو متروك دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۶۸۔

انسانی ترقی ...... پس مادی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کر سکتی ہے۔ مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کر سکتی، عمدہ انسان صرف انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندھیرا ہوتا ہے نہ تقوائے ظاہر ہوتا ہے، نہ تقوائے باطن۔ ظاہراً مادیات کی ترقی ہو رہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہو رہے ہیں۔ انسان نے نئی نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کر دیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی اگر وہ اڑنا چاہے تو لوہے لکڑی پیتل کا محتاج ہے اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو لاسلکی اور وائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل موٹر کا محتاج خود اپنے نفس کی اندرونی طاقتوں سے یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ ان آلات و وسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنہوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزار رہا میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آوازیں پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دی تو وہ ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انہوں نے بلند پرواز دکھلائی وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے۔ اور حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوتوں سے، نہ کہ مادی وسائل سے اس لئے اپنے اندر جوہر پیدا کرو، لوہے، پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مُسَبِّبُ الْاَسْبَابِ کے بندے بنو۔ آج کی یہ ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالانکہ انسانی ترقی استغناء کی ترقی ہے۔ لوہے، پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کر دینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اس جگہ باکمال ہے جہاں مشینیں ہوں، بجلی ہو۔ پاور ہاؤس ہو، پٹرول ہو، جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز، بے بس اور بے کس ہے۔ انسان کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو اور اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

نورِ قلب ...... شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولانا رومی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ رومیوں نے کہا کہ ہم اچھے صنّاع اور کاریگر ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے کہا۔ تم اپنی صنّاعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صنّاعیوں کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اس کے درمیان پردہ کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ چینیوں سے کہا نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دوسرے نصف میں تم اپنی اپنی صنّاعی کا نمونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاستر کر کے قسم قسم کے بیل بوٹے اور پھول پتے رنگ برنگ کے بنائے اور اپنے حصّہ کے کمرہ کو مختلف نقش و نگار اور رنگا رنگ بیل بوٹوں سے گل و گلزار بنا دیا۔ ادھر رومیوں نے دیواروں پر پلاستر کر کے ایک بھی پھول پتہ نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی ایک بھی رنگ لگایا بلکہ دیوار کے

پلاستر کو صیقل کرنا شروع کر دیا اور اتنا شفاف اور چمک دار کر دیا کہ اس میں آئینہ کی طرح صورت نظر آنے لگی۔ جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صناعی ختم کر لی تو بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آئے اور حکم کیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے جونہی دیوار بیچ میں سے ہٹی، چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گلکاری رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگی اور وہ تمام بیل بوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہو گئے۔ جسے رومیوں نے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا بادشاہ سخت حیران ہوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے کیوں کہ ایک ہی قسم کے نقش و نگار دونوں طرف نظر آ رہے تھے۔ آخر کار اس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان کی صناعی اعلٰی ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی صناعی بھی دکھلائی اور ساتھ چینیوں کی کاریگری بھی چھین لی۔

مولانا روم نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل میں رومیوں کی صناعی جاری کر، یعنی اپنے قلب کو ریاضت و مجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دنیا کے سارے نقش و نگار اپنے دل میں نظر آ لگیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر و سرو دچمن درآ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ دردل کشابہ چمن در آ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے کہ اس میں سے ہر قسم کا مادی میل کچیل نکال پھینک اور اسے علمِ الٰہی کی روشنی سے منور کر دے تو تجھے دنیا اور آخرت کے حقائق و معارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بے کتاب و بے معید اوستا

ایسے قلب صافی پر بے استاد و کتاب، براہ راست علومِ خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور وہ روشن سے روشن تر ہو جاتا ہے۔

برکتِ عمل...... مگر یہ شان مادی علوم کی نہیں۔ صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے جب کہ ان پر عمل کیا جائے حدیث میں ہے۔ عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اس میں نہ تھے اس لئے انسان اگر انسانیت چاہتا ہے تو اولاً عالم بنے، پھر عامل بنے تب آخر کار علم لدنّی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم، علمِ دراست ہے اور انتہائی علم، علمِ وراثت ہے، یہ کتابوں کے درس و مطالعہ کا علم، علمِ دراست ہے۔ "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ" (۱)

انسانیت کی فیکٹریاں...... اور اس کی عملی مشق سے پیدا شدہ بصیرت و گہرائی علم وراثت ہے مگر علم وراثت نصیب ہوتا ہے علم دراست ہی سے۔ پس یہ مدارس علم دراست سکھاتے ہیں۔ اور علم وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارس دینیہ نہ ہوں تو نہ علم دراست ملے نہ علم وراثت۔ پس یہ مدارس اس لئے قائم کئے جا رہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیاء سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لئے یہ

(۱) الحدیث اخرجه ابونعیم فی حلیة وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابی الحواری ج: ۴ ص: ۲۵۰.

مدارس گویا سچے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔

پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں۔ جس کے ظاہر و باطن علوم انبیاء سے روشن ہوں۔ مادی علوم محض ظاہر کی ٹیپ ٹاپ اور نمائش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علوم شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں مادی علم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے۔

صورت اور سیرت میں فرق...... اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے جو جاتا آتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا اسے دو دن بخار ہی آ کر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہو جاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں وہ تو ساری صورتیں اور خوبصورتیاں مٹا کر رہتی ہے البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے۔ اسے موت نہیں مٹا سکتی وہ قبر میں حشر میں اور اس کے بعد برابر قائم رہتی ہے۔ حدیث میں شریف میں فرمایا گیا ہے:

"تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَتَمُوْتُوْنَ كَمَاتَحْيَوْنَ" حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہے اور موت اس حالت میں آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لئے۔

میرا ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب کے ہاں لدھیانہ جانا ہوا، ان کی مسجد میں ایک کتبہ آویزاں دیکھا جس کے الفاظ یہ تھے کہ: "مرد وہ ہے جسے دیکھ کر رعب طاری ہو۔ مرد وہ نہیں ہے جسے دیکھ کر شہوت ابھرے"۔

یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے۔ اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ صورت کو کہاں تک بنائیں گے جو صورت بگڑنے کے لئے ہی بنی ہے اس کو کہاں تک بنائیں گے، سنواریں گے، بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاق فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں۔

معیارِ کمال و قبول سیرت ہے نہ صورت...... دنیا میں صورت فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عز و جاہ کا، حضرت یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے، مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے۔ زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیل خانہ میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسنِ صورت نے پیدا کئے لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ: اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَسِيْنٌ جَمِيْلٌ بلکہ: ﴿اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ کہا تھا یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عزّ و جاہ اور کمال پیدا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں، صورتوں کی آرائش کرانے کے لئے نہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ" (1) اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولت مند اور خوبصورت ہو اسے قبول فرمالے اور جو غریب و مفلس ہو اسے رد کر دے۔ یہی معیار حضرات انبیاء علیہم السلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا ردو قبول حسنِ صورت سے نہیں بلکہ حسن سیرت سے کرتے ہیں۔ دنیا والوں کے یہاں ردو قبول کا معیار حسن صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ صورت کے سیاہ تھے۔ غلام حبشی تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو ھُوَ سَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی گردنیں بلال کے آگے جھک جاتیں، حسنِ صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں۔ بلکہ حسنِ سیرت کی وجہ سے کہ وہ بحدِ کمال ان میں موجود تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: مَارَاَیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاح حالانکہ وہ صورت کے کالے تھے وہ صورت کی تعریف نہیں تھی۔ سیرت کی تھی جس نے کالوں کو گوروں کے اوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے قوتِ علم اور قوتِ اخلاق (یعنی قوّتِ عمل) ان ہی دونوں قوتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اسے خلافت ملتی ہے۔ قربِ حق نصیب ہوتا ہے اور صورت دو چیزوں سے بنتی ہے، دولت سے اور جہالت سے۔

مدارس دینیہ سیرت سنوارنے کے لئے ہیں...... پس یہ مدارس دینیہ انسانیت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیت دنیا سے ختم ہوجائے کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں مگر وہاں انسانیت نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورت انسانی بنائی جاتی ہے۔

زہد و قناعت...... لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں، میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ حقیقت انسانیت دکھلائی جاتی ہے اور زہد و قناعت انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے، حتیٰ کہ فقر و فاقہ تک سے بھی انسانیت حاصل کر لینی سکھلائی جاتی ہے۔ زہد و قناعت اسی علم کی بدولت قائم ہے۔ یہ علماء سو، پچاس روپیہ کی تنخواہ پر بخوشی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ آج کل سو روپیہ کیا وقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے۔ کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی اس شعر کو بار بار پڑھتے اور لذت لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

ما ہیچ نداریم غم ہیچ نداریم ... دستار نداریم غم ہیچ نداریم

اور کبھی فرماتے ؎

لُنگکے زیر و لُنگکے بالا ... نے غم دزد و نے غم کالا

اور کبھی فرماتے ؎

کس نیاید بہ خانہ درویش ... کہ خراجِ زمین و باغ بدہ

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ، ج: ۴، ص: ۱۹۸۶ رقم: ۲۵۶۴.

کل تک ہم زہد وقناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کر کے بتلاتے تھے لیکن آج زمانہ نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کا مشاہدہ کرا دیا ہے۔ ہزاروں من غلّے والے غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ والے پریشان حال اور نالاں ہیں انہیں ہر وقت مارشل لاء کے قوانین نے ڈرا رکھا ہے لیکن جن کے پاس غلّہ ہی نہیں یا بقدر ضرورت ہے وہ مطمئن ہیں پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی افراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے۔

بقدر ضرورت یسارے بُود کند کار ار مردِ کارے بُود

ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لے کر آتی ہے۔ اور جب جاتی ہے، جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔

اِذَا اَدْبَرَتْ کَانَتْ عَلَی الْمَرْءِ حَسْرَۃً وَاِنْ اَقْبَلَتْ کَانَتْ کَثِیْرًا ھُمُوْمُھَا

''جب دنیا جاتی ہے تو حسرت چھوڑ جاتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غم ساتھ لاتی ہے''۔

بہر حال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کی فکر کریں تو دنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درست ہو جائے گی، اور یہ ان ہی مدارس کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان مدارس کی اگر آپ نے امداد کی تو آپ نے ان مدارس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ چندہ حقیقت میں آپ نے قرضہ دیا ہے جو آپ کو مع سود کے واپس ملے گا۔ دنیا میں تو قرضہ دے کر نفع لینا سود ہے جو حرام ہے مگر وہاں آخرت میں سود جائز ہے، جو ملے گا اور ایک کے بدلے سات سو تک اور اس بھی زائد ملے گا پس آپ نے اگر ان مدارس کو چندہ دے دیا تو گویا آپ نے خدائی بینکوں میں رقم جمع کر دی۔ اگر آپ کے چندہ سے یہ مدارس قائم رہے اور ان کے ذریعہ آدمی آدمی بنتے رہے تو آپ ہی کی قوم بنے گی۔

احسانِ عظیم...... یہ مدارس صرف علم نہیں سکھلاتے، بلکہ ملک میں امن وامان کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ان مدارس کی بدولت اگر متدیّن، خداترس آدمی پیدا ہوں گے تو نہ ڈکیتی ہوگی۔ نہ چوری نہ زنا کاری ہوگی۔ نہ شراب نوشی۔ تو امن کے ساتھ گورنمنٹ کے کروڑوں روپیہ کی بچت ہوگی اور پولیس اور فوج کی غیر معمولی بھرتی کی حاجت نہ رہے گی۔ ہر شخص اپنے حق میں خود پولیس مین بن جائے گا۔ پس یہ مدارس امن وامان چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں ملک کی خدمت کر رہے ہیں، اور پورے ملک کے یہ محسن ہیں۔ ان مدارس کی تقویّت وبقاء میں آپ کی تقویّت وبقاء ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیتیں بیان کی ہیں۔

خاتمہ...... کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیّت اور نیابت ملی اور کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لئے اس افضلیّت کو اپنے حق میں باقی کر لیجئے اور جو منصب حق تعالیٰ نے بلا قیمت عطا فرما دیا ہے۔ اس کے تحفظ کی سعی کیجئے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ (آمین)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اٰمِيْن! محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم، دیوبند انڈیا وارد حال اکوڑہ خٹک

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مقصدِ نعمت ومصیبت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا .

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ.﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

دارالامتحان...... بزرگانِ محترم! یہ دنیا جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یہ پوری کی پوری امتحان گاہ ہے۔اس میں حق تعالیٰ نے ہماری جانچ اور آزمائش کے لئے ہمیں بھیجا ہے۔ یہاں کی آزمائش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا کہ یہ کیسے ہیں۔ اچھے ہیں یا برے ہیں؟ قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ ان کو سب معلوم ہے۔ان کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ جانچ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ نے جو جوہر پیدا کئے ہیں، ان کو کھول دے اور نمایاں کردے یعنی ہر چیز کی خاصیّت کو ظاہر ہونے کا موقع دے۔ اگر ایک شخص قوی القلب ہے تو اس کو مصائب میں ڈالتے ہیں تا کہ اس کی قوتِ قلب واضح ہو جائے اور اگر ضعیف القلب ہے تو اس کا ضعف واضح ہو جائے تو حق تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب استعلام (یعنی علم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ پہلے سے علم نہیں تھا۔) نہیں ہے۔ بلکہ جو ان کا علم جس کے متعلق ہے، اسکو نمایاں کرنا چاہتے ہیں تا کہ پوری دنیا میں واضح ہو جائے کہ فلاں چیز میں یہ اثرات تھے اور فلاں میں یہ خاصیّتیں تھیں۔ اس لئے دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ درحقیقت جانچ کے لئے آیا ہے۔ کہ جو بھی جوہر اس میں رکھے گئے ہیں ان کو کھولا جائے۔

مقصدِ امتحان...... اور جانچ کے لئے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے قائم کئے ہیں، ایک سلسلہ نعمتوں کا اور ایک سلسلہ مصیبتوں کا۔ دونوں سے مقصد انسان کی جانچ اور آزمائش ہے۔ نعمتیں دے کر اس لئے آزماتے ہیں کہ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۵، ۱۵۷.

آیا نعمتوں میں گھر کر یہ آدمی نعمت دینے والے کو بھی یاد رکھتا ہے یا نعمتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنی نعمتوں میں، اپنی عیش میں الجھ کر رہ جائے۔ اور اسے یہ یاد نہ رہے کہ یہ نعمت کس نے دی تھی تو کہا جائے گا کہ اس بندے کے قلب میں کفرانِ نعمت کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ وہ کھول دیا گیا اور ظاہر ہو گیا۔ کل کو اگر اس کے لئے کوئی جزا تجویز کی جائے گی تو اس کو یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ مجھے پہلے جانچ تو لیا ہوتا۔ آزمائش کا موقع تو دیا ہوتا۔ بلکہ خود اس پر نمایاں ہو جائے گا کہ اس جانچ میں پڑ کر میں نے اپنے بارے میں کیا ثبوت دیا۔ اس طرح سے نعمت دنیا میں خود ایک مستقل آزمائش کی چیز ہے۔ خواہ وہ دولت ہو، خواہ وہ عزت ہو۔

امتحان بطریقِ نعمت...... اس سب کا مقصد اپنا امتحان پیش کرنا ہے کہ تمہارا فرض کس درجہ پر ہے، تم منعم کو دیکھتے ہو یا نعمت کو دیکھتے ہو؟ نعمت دینے والے پر نظر ہے یا خود نعمت پر نظر ہے۔ اگر دینے والے پر نظر ہے تو بے اختیار انسان کی زبان سے شکر نکلے گا اور کہے گا۔ اے نعمتوں کے دینے والے تیرا فضل ہے کہ تو نے مجھے دیا، نہ میں اس کا مستحق تھا، نہ میں اس کا اہل تھا، یہ محض تیرا فضل اور انعام ہے، تو بندے نے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی نعمت دی گئی تھی۔ اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا۔ تو نعمت کا حق فقط یہ نہیں ہے کہ آدمی نعمت کو استعمال کرے۔ بلکہ نعمت کے استعمال کے ساتھ ساتھ نعمت دینے والے کی طرف توجہ اس کی دین اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنا یہ بھی اس کا حق ہے۔ گویا نعمت دیئے جانے کے بعد دو طرح سے آدمی آزمایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نعمت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اس نعمت پر نعمت دینے والے کا شکر ادا کرے، نگاہ اس کی طرف رہے۔ کیوں کہ جس کو دینا آتا ہے اس کو چھیننا بھی آتا ہے۔ جو دے سکتا وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔ غرض جانچتے ہیں کہ اگر دینے والے پر نگاہ ہے اور شکر کرو گے تو دینے والے کے خزانے لامحدود ہیں وہ نعمتوں کو بڑھاتا رہے گا۔ اگر کفرانِ نعمت اختیار کیا معلوم ہوا کہ نعمت کی قدر کرنی نہ آئی۔ وہ اپنی نعمت کو واپس لے لے گا۔ تو واضح ہو گیا کہ نعمتوں کا دینا درحقیقت آزمائش اور جانچ کے لئے ہے اور جوہروں کے کھول دینے کے لئے ہے۔

امتحان بطریقِ مصیبت...... اسی طرح سے کبھی کبھی مصیبتوں سے بھی آزمایا جاتا ہے۔ مصیبت سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں گھر کر آیا آدمی مصیبت ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے، واویلا، جزع فزع اور پریشانی ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی نگاہ مصیبت کے بھیجنے والے پر بھی ہوتی ہے کہ اس نے میری کسی مصلحت کے سبب اسے بھیجا ہے۔ اگر مصیبت پر نگاہ ہے مصیبت بھیجنے والے پر نہیں تو اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی کا بے صبراپن ظاہر ہوگا۔ اللہ کی شکایت ظاہر ہو گی کہ میں ہی آزمائش کے لئے رہ گیا تھا۔ اور میں ہی مبتلا کرنے کے لئے رہ گیا تھا۔ لیکن اگر مصیبت میں گھر کا ثابت قدم رہے اور یہ نہ دیکھے کہ مصیبت تو بے شک سخت ہے مگر بھیجنے والا ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے اس لئے یہ مصیبت میرے ستانے کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے، ایمان کی جانچ کے لئے بھیجی گئی ہے۔ پھر بندہ صبر کرے گا اور صبر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے گا۔ تو نعمت سے آدمی کی شکر گزاری کا امتحان ہوتا ہے اور

مصیبت سے آدمی کے صبر وتحمل کا امتحان ہوتا ہے کہ کون بندہ ثابت قدم ہے اور کون ضعیف القلب۔ جو نعمت اور مصیبت کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوا وہی بندہ فی الحقیقت بندہ ہے۔ اور جو کامیاب نہ ہو وہ بندہ نہیں۔ یا نعمت کا بندہ ہے یا مصیبت کا بندہ ہے جو انہی دو کی طرف جھکتا ہے۔

مقامِ آدمیّت...... ہمارے آپ کے ہندوستان کے آخری بادشاہ ظفر، اس نے اس حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے ایک قطعہ کہا ہے، کچھ تو ظفر بادشاہ مزاج ہی صوفیانہ رکھتا تھا اور کچھ حالات نے اس کو درویش بنا دیا تھا۔ جس کی سلطنت چھنتی ہے وہی جانتا ہے کہ اس کے قلب پر کیا گزری ہے۔ تو اس نے ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے کہتا ہے کہ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ۔۔۔ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار ہو مگر آدمی نہ سمجھنا۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ۔۔۔ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ۔۔۔ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تو دینے والے کو نہ بھولے نہ اسے عیش اللہ سے غافل کرے، نہ طیش اسے اللہ سے غافل کرے۔ ایک حالت میں خوف پیش نظر رہے اور ایک حالت میں رجاء وامید اور شکر گزاری پیش نظر رہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس دنیا میں انسان کو جانچنے اور آزمائش کے دو سلسلے رکھے ہیں۔ ایک نعمتوں کا سلسلہ اور ایک مصیبتوں کا سلسلہ۔

مقدارِ امتحان...... اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ جتنی زیادہ نعمت دی جاتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے، جس پر زیادہ مصیبت آتی ہے، اس کے قلب کی اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے۔ چھوٹی موٹی مصیبت کو آدمی جھیل جاتا ہے۔ صبر بھی کر جاتا ہے۔ جب بڑی مصیبت آئے، اس وقت ثابت قدم رہے تو کہا جائے گا کہ ایمان بھی مضبوط قلب بھی مضبوط۔ بڑی نعمت دیدی جائے پھر ثابت قدم رہے اور نعمت دینے والے کو نہ بھولے تو کہا جائے گا کہ یہ قوی القلب ہے اور امتحان میں کامیاب ہے۔

امتحان کی عمومی روش...... پھر اسی کے ساتھ مصائب میں آدمی کی زیادہ جانچ ہوتی ہے نعمتوں میں اتنی نہیں ہوتی۔ اللہ نے اس عالم میں مصیبتیں بے شمار رکھی ہیں۔ اور نعمتیں کم رکھی ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدم علیہ السلام کا پتلا جب اللہ نے بنایا اور مٹی کو پانی میں بھگویا ہے تو چالیس دن اس پر پانی پڑا ہے۔ اور چالیس دن اس پر مینہ برسایا گیا۔ تو روایات میں ہے کہ اس مٹی پر انتالیس دن غم کا مینہ برسا ہے اور ایک دن خوشی کا۔ اس لئے دنیا میں خوشی کم ہے اور مصیبت زیادہ۔ زیادہ تر انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ زیادہ تر عیش اور بے فکری میں کم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ﴾ ①

ہم نے آدمی کو مصائب ہی کے اندر پیدا کیا ہے۔ تو زیادہ تر مصیبتیں انسان پر آتی ہیں، اس لیے جانچ بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ البلد، الآیۃ: ۴.

زیادہ مصیبتوں میں ہوتی ہے اور اوّل سے لے کر آخیر تک مصائب کا ایک سلسلہ ہے۔ جس آن انسان پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کی گھڑی مصیبت ہی کی ہوتی ہے۔ آدمی روتا ہوا آتا ہے۔ چلاتا ہوا آتا ہے۔ کوئی بچہ بھی دنیا کے اندر ہنستا ہوا نہیں آتا۔ تو دنیا میں پریشانی کی حالت میں آیا۔ پھر جوں جوں عمر بڑھتی چلی جاتی ہے مصائب کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان تمنائیں بہت باندھتا ہے، سو تمناؤں میں سے ایک پوری ہوتی ہے ننانوے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ یہ ننانوے میں جو ناکامیابی ہے یہی اس کے حق میں مصیبت ہے تو اس کی تمنا اور طبیعت کے خلاف ہونا یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور یہ انسان کے لئے لازم ہے۔

مقصدِ نعمت و مُصیبت...... اس دنیا کو حق تعالیٰ نے نہ فقط عیش کی جگہ بنایا نہ فقط مصیبت کی جگہ بنایا عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے۔ گو عیش کم ہے مصیبت زیادہ ہے۔ جہاں فقط عیش ہے۔ مصیبت کا نام نہیں، اسی عالم کو ہم جنّت کہتے ہیں اور جس جہان میں مصیبت ہی مصیبت ہے عیش کا نشان نہیں اسی کو ہم جہنم کہتے ہیں جہاں عیش کا کوئی تخیل بھی نہیں باندھ سکتا تو دونوں کی عیش اور مصیبت سے ملا کر دنیا کو بنایا گیا جس میں عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے تو کچھ جنت کی نعمتوں کے نمونے ہیں اور کچھ جہنم کی مصیبتوں کے نمونے ہیں تا کہ انسان جب عالم آخرت میں پہنچے تو جب تک دنیا میں گزارے اسے اس عالم کا تصور ہو جہاں سے عیش آئی ہے اگر اسے عیش پسند ہے تو اس عالم کے لئے سامان کرلے اور اگر مصیبت ناپسند ہے تو اس جہان کی مصیبتوں سے ڈرنے اور بچنے کا آدمی اہتمام کرے۔ تو دنیا میں عیش اور مصیبت اس لئے رکھی ہے تا کہ انجام پر نظر رہے عیش کی جگہ کی طلب میں رہے اور مصیبت کی جگہ سے بچنے کا بندوبست کرتا رہے گا اس لئے اللہ نے یہ دونوں سلسلے جاری کئے۔

موت وحیات کی کشمکش...... مصیبتوں کی انتہا موت پر ہوتی ہے اور نعمتوں کی انتہاء زندگی پر جا کر ہوتی ہے، زندگی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور موت مصیبتوں کا سرچشمہ ہے، موت کے معنی درحقیقت سلب حیات ہے۔ یعنی زندگی چھین لی جائے بس یہ موت ہے تو عیش کو چھین لیا جائے یہ عیش کی مصیبت یہ بھی موت ہے صحت کو چھین لیا جائے بیماری آ جائے تو یہ صحت کی موت ہے مرض اور بیماری کی مصیبت مسلّط ہوگئی تو جس طرح انسان کی ذات پر موت آتی ہے اسی طرح سے اس کے احوال پر موت آتی ہے ایک حال آتا ہے ایک جاتا ہے جو حال جاتا ہے اس کی موت واقع ہوگئی۔ جو حال آیا اس کی زندگی ہوگئی صحت گئی تو صحت کی موت آ گئی عیش چلا گیا تو عیش کی موت آئی تو اس طرح ہر قدم پر انسان موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نعمتیں آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔

پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ خود ہی چلا جاتا ہے، اس کے احوال پر روزانہ موت طاری ہوتی رہتی تھی مگر خود اس کی ذات پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو آخری سانس ہے اس کی ذات کی موت ہے، وہ بھی بالآخر چلا جاتا ہے تو پوری دنیا موت وحیات کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے۔

ذرائعِ امتحان...... تو اس آیت کریمہ کے اندر اس سلسلے کو بتلایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کا مصائب سے امتحان

لیا۔اوراس کے صبر وتحمل کا ہم نے امتحان لیاتو فرمایا گیا:﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ﴾

یہاں عربیّت کے قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ میں واو لائے، جو تاکید کے لئے ہوتا ہے، لام لائے جو تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ پھر صیغہ جمع کا لائے جو خود تاکید کے لیے ہوتا ہے، پھر نون ثقیلہ تاکید لائے جو خود تاکید کے لئے ہوتا ہے، پھراس کو ضمیر خطاب یعنی کم کی طرف منسوب کیا۔ تو کئی تاکیدیں لائی گئیں۔اس کے معنی یہ نکلے کہ ہم ضرور بالضرور تمہاری جانچ کرر ہے ہیں۔ یہ خیال مت کرنا کہ نعمتیں دیکر تمہاری جانچ اور آزمائش چھوڑ دیں گے لازمی طور پر تمہیں آزمائیں گے، تاکید کے الفاظ لائے گئے ہیں، اس لئے آدمی احتمالی بات نہ سمجھے۔ جانچ ضرور واقع ہوگی۔

پہلا ذریعہ "خوف"...... کا ہے۔ سے واقع ہوگی۔ تو فرمایا﴿ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ﴾ کبھی تو ہم دشمنوں کا خوف مسلط کریں گے، چہار طرف سے خطرہ ہے کہ ادھر سے نہ جان چلی جائے۔ ادھر سے کوئی حملہ نہ کردے۔ ادھر سے کوئی غنیم نہ چڑھ آئے۔ کوئی دشمن نہ آجائے ہر وقت ایک فکر لگی رہتی ہے۔

خوف سے آزمانے کی غرض کیا ہوتی ہے؟ تا کہ انسان چوکنا رہے، وہ جو تدبیر کرنے کا مادہ ہے وہ معطل نہ ہونے پائے۔ اگر بے خوف ہوکر آدمی بیٹھا رہے گا تو وہ جو بچاؤ کی تدبیروں کے جوہر رکھے گئے ہیں وہ سب ملیامیٹ ہوجائیں گے اور سب آدمی میں چھپے رہ جائیں گے، اس لئے خوف مسلط کرتے ہیں تا کہ بیداری اور تیقظ سے آدمی کام لے اور وہ تدابیر اختیار کرے جن سے بچا جاتا ہے تا کہ دل کے جوہر کھلیں کہ یہ کتنا مدبّر اور دانا تھا۔ اور کتنا اس نے بچاؤ کا ثبوت دیا۔

دوسرا ذریعہ "فقر"......﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ﴾ اور کبھی ہم بھوک دے کر آزماتے ہیں، کبھی اس طرح سے آزمائش ہوتی ہے کہ فقر وفاقہ مسلط کردیا۔ ایمان کی جانچ کرنا منظور ہے اور قلب کی قوت کی جانچ کرنا منظور ہے۔ اس کے لئے کبھی خوف دیا کہ خوف اور گھبراہٹ میں آدمی ہمارا نام لیتا ہے یا محض پامال ہو کررہ جاتا ہے۔ اگر ہمارا نام لیا تو فرماتے ہیں کہ ہم مدد کے لئے تیار ہیں ہم اس کی مدد کے لئے آئیں گے۔

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ①

"اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ اور اللہ کی مدد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دین کی مدد کی جائے۔ اور دین کی سب سے پہلی مدد یہ ہے کہ خود آدمی دین پر ثابت قدم رہے۔ دین کوئی تصویر یا مجسمہ تو نہیں ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ دین کی مدد کے یہ معنی ہیں کہ دین کو اپنے میں سمولے ہر حالت میں دین کو پیش نظر رکھے، دین کی مدد ہے۔ اور اللہ کی مدد ہے۔﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ ② "مجھے یاد کروگے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" تم مجھے بھلادوگے تو میں بھی تمہیں بھلادوں گا۔

---

① پارہ: ۲۶، سورة محمد، الآية: ۷۔ ② پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۵۲۔

بندہ تسلیم و رضا...... غرض کبھی تو آدمی خوف سے آزمایا جاتا ہے۔ اور کبھی فقر و فاقے سے آزمایا جاتا ہے کہ تنگ دستی مسلط کر دی۔ لیکن تنگدستی کے باوجود بندہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، تو جس حالت میں رکھے، میں تو بندہ ہوں بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو حال بھی آجائے آدمی شاکر اور صابر رہے، تسلیم و رضا کے ساتھ گردن جھکا دے۔ اگر اپنی تجویز پیش کرنے لگا کہ آپ نے میرے اوپر غم بھیج دیا۔ آپ کو تو خوشی بھیجنی چاہئے تھی۔ آپ نے میرے اوپر بھلا خوف کیوں مسلط کیا۔ میرے اوپر تو اطمینان بھیجنا چاہئے تھا۔ تو یہ تجویز ہے، بندہ بندگی کے لئے آیا ہے۔ بندگی کے معنی تفویض یعنی سونپ دینے کے ہیں کہ جس حالت میں آپ رکھیں میں راضی ہوں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی تجویز چھوڑ دے خود اپنے لیے کچھ تجویز نہ کرے، جو ادھر سے آجائے اس کے لئے راضی رہے، تو آزماتے ہیں کہ اس میں تفویض یعنی سونپ دینے کا اس کے قلب میں مضمون ہے یا اپنی تجویز اور خود رائی کا مضمون ہے۔ خود رائی اگر ہوئی تو یہ بندگی کے خلاف ہے رائے کو ترک کر دیا تو یہ بندگی ہے۔ کہ جو حق تعالیٰ چاہیں میں اسی پر راضی ہوں۔ گویا اس طرح سے آدمی بن جائے جیسا کے نہلانے والے کے ہاتھ میں میت ہوتی ہے کہ جدھر کو چاہے کروٹ دیدے جدھر کو چاہے پلٹ دے، میت یہ نہیں کہتا کہ ادھر مجھے کیوں کروٹ دی ادھر کو کیوں نہ دی؟ بس بالکل غسال کے ہاتھ میں ہے۔ یہی شان بندے کی اپنے پروردگار کے ہاتھ میں ہونی چاہئے کہ ادھر سے جو حالت آئے اسی پر لگ جائے اور کہے اے اللہ تیرا شکر ہے، میں اسی کے اندر راضی ہوں اگر خوف آئے تو راضی ہو جائے۔ مانگتا تو رہے اطمینان، مگر پیش جو کچھ آئے اس پر رضامندی کا اظہار کرے، بندگی اسی کا نام ہے۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا تھا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دے دے۔ تو اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں ہوتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا ارادہ بھی غلام، میری خواہش بھی غلام، میری مرضی بھی غلام، جو کچھ مرضی ہے وہ آقا کی، جو کچھ ارادہ ہے وہ آقا کا۔ وہ آقا ہے اور میں غلام ہوں۔ تو ایک انسان جب ایک انسان کا خادم اور غلام بن جاتا ہے، حالانکہ اس آقا نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی زندگی اور نعمت و مصیبت آقا کے ہاتھ میں نہیں۔ مگر بہر حال نام کا تو غلام بن گیا۔ تو آدمی اس درجہ اپنے کو جھکا دیتا ہے ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نہ میری مرضی نہ میری خواہش نہ میرا ارادہ۔ تو اللہ رب العزت کا بندہ جس کے ہاتھ میں جان بھی ہے اور جس کے ہاتھ میں اس کا ایمان بھی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں اس کی عزت و آبرو ہے۔ اس کے سامنے کوئی تجویز رکھے اور دعویٰ کرے کہ میں بندہ ہوں تو یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو آپ چاہیں وہی ٹھیک ہے اسی میں میری رضا ہے۔ تو اس تسلیم و رضا کا پیدا ہو جانا اور بندۂ رضا بن جانا یہی فی الحقیقت بندگی ہے تو اس غلام نے کر کے دکھلایا کہ اس سے کہا گیا کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔

جو ہر قلب کا امتحان...... یہی حال بندے کا ہونا چاہئے کہ اگر پوچھا جائے ایک انسان سے کیا تو خدا کا بندہ

ہے؟ کیا معنی ہیں تیرے بندہ ہونے کے؟ وہ یوں کہے کہ اگر عیش میں رکھے تو میں اس کا بندہ اگر وہ مصیبت میں رکھے تو میں اس کا بندہ۔ اگر وہ اطمینان دے تب بھی میں اس کا بندہ اگر وہ فکر میں مبتلا کر دے تب بھی میں اس کا بندہ تب تو ہے بندگی۔ اگر یوں کہے کہ نعمت آتی تب تو میں خدا کا بندہ اور نعمت چھین لی تو پھر میں بندہ نہیں پھر تو شکایت کروں گا۔ تو وہ خدا کا بندہ نہیں ہے وہ نعمت کا بندہ ہے۔ نعمت اس کا معبود ہے۔ اگر وہ آ گیا ہے تو یہ راضی ہے نعمت چلی گئی وہ ناراض ہو گیا۔ اس دنیا میں آدمی خدا کی بندگی کرنے آیا ہے۔ نعمت کی بندگی کرنے نہیں آیا۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم آدمی کے اس جوہر کو جانچتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا بندہ ہے۔ مصیبت ہو یا نعمت ہو کس حد تک ہماری طرف جھکتا ہے اس لئے نعمت ومصیبت کا یہ سلسلہ قائم کر دیا۔

طہارت روح...... حدیث میں ہے کہ اگر ایک انسان کے گناہ زیادہ ہوں اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کو اعلیٰ مقام اور مقام کریم عطاء کریں۔ اس کے اعمال میں سکت نہیں۔ معاصی اور گناہوں کی کثرت ہے تو اس کو اس مقام کے لائق بنانے کے لئے ہم اس پر بیماری مسلط کر دیتے ہیں۔ جوں جوں بیماری بڑھتی ہے وہ صبر وتحمل کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ اس بیماری کی مصیبت سے اس کے گناہ کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اور مقامِ کریم کے قریب پہنچ رہا ہے۔

اگر اس کے گناہ نپٹ گئے اور اس مقام تک پہنچ گیا تو بہتر، اور پھر بھی اگر اس کے گناہ باقی رہ گئے تو بیماری کے ساتھ میں ناداری بھی مسلط کر دیتا ہوں۔ بیمار پہلے سے تھا، مفلس اب ہو گیا۔ ہاتھ میں پیسہ نہیں کہ غذا استعمال کرے، دوا استعمال کرے۔ تو بیماری بھی ہے مگر علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ اور فاقہ بھی ہے مگر غذا کے لئے پیسہ نہیں لیکن اس حالت میں بھی ثابت قدم ہے۔ کہتا یہی ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اس کے قلب میں جو گناہوں کا میل کچیل بھرا ہوا تھا وہ اب مٹ رہا ہے۔ اگر گناہ نمٹ گئے فبہا، نہ نمٹے تو فرماتے ہیں کہ اس پر موت مسلط کر دیتا ہوں کہ اس کا کوئی عزیز میں چھین لیتا ہوں۔ بیماری پہلے سے تھی، ناداری بعد میں آئی، موت اب مسلّط ہو گئی۔ عزیز قریب چلے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ بھی اس کے لیے کفارہ سیئات ہے جتنا اس پر غم پڑے گا۔ اتنا ہی اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ اتنا ہی اس کو قرب خداوندی نصیب ہو گا۔ اتنا ہی اجر ملے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ایک انسان کو ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے اور اس سے تکلیف پہنچی ہے تو اس چبھن پر ایک نیکی نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں اور ایک بدی مٹا دیتے ہیں۔ اگر دس دفعہ کانٹا چبھا تو دس نیکیاں مل گئیں اور دس بدیاں مٹ گئیں۔ اور یہ ادنیٰ مصیبت پر ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر بڑی مصیبت پڑے تو نیکی بھی بڑی دی جائے گی اور بڑی سے بڑی مصیبت کا کفارہ بھی کیا جائے گا۔ تو یہ مصائب کا سلسلہ کفارہ کے لئے ہے کہ مصیبتیں گھٹ جائیں اور نیکیاں بڑھ جائیں اس کے درجات بلند ہو جائیں اور اس مقام کریم کے قابل ہو جائے۔ اگر یہ بدیاں

نمٹ گئیں اور روح میل کچیل سے صاف ہوگئی تو فبہا۔اور اگر پھر بھی صاف نہ ہوئی تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میں نزع میں شدت کر دیتا ہوں۔جان کنی شدید ہوتی ہے۔یہ خود ایک مستقل مجاہدہ انسان کو ہوتا ہے۔لیکن وہ اس میں بھی بندۂ صبر ورضا بنا ہوا ہے۔جانتا ہے کہ میں قاہر و جابر کے ہاتھ میں ہوں، مجھے راضی رہنا چاہئے وہی میرا مالک ہے۔اس سے اگر برائیاں نمٹ گئیں اور کفارہ ہوگیا تو فبہا۔اور اگر نہ ہوا تو پھر قبر کی اندر کچھ ہولناک حالات پیش آتے ہیں۔قبر کا فتنہ ہے،قبر کا دبانا ہے منکر نکیر کا آنا ہے،سوال و جواب ہے۔آزمائش اور امتحان ہے۔یہ بھی در حقیقت کفارے کے لئے ہے۔اگر یہاں بھی گناہ نہ نمٹے تو پھر میدان محشر کے ہولناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔دھوپ کی تیزی ہوگی،سرگردانی ہوگی،اللہ رب العزت کے سامنے کھڑے ہونے کا ایک دہشت ناک مقام ہوگا۔اگر وہاں گناہ نمٹ گئے تو فبہا۔اگر نہ نمٹے تو آگے پل صراط ہوگا،وہ ایک مصیبت ہے۔

حدیث میں ہے کہ پل صراط جو جہنم کے اوپر باندھا جائے گا۔پندرہ ہزار سال کا اس کا راستہ ہوگا۔پانچ ہزار برس چڑھائی کے، پانچ ہزار برس اترائی کے اور پانچ ہزار برس برابر چلنے کے۔اس کے اوپر سے انسان کو گزارا جائے گا۔یہ خود ایک مستقل مصیبت ہوگی۔یہ دراصل کفارہ کے لئے ہوگا کہ جو کچھ روح کا میل کچیل ہے وہ نکل جائے۔پھر بھی اگر نہ نکلا اور مصیبتیں باقی رہ گئیں تو اس پل سے کٹ کر آدمی جہنم میں جا گرے گا۔مومن کو جہنم میں کفارہ سیئات کے لئے ڈالا جائے گا۔کافر کو تو ایندھن کے طور پر ڈالا جائے گا۔مومن کو صاف کرنے کے لئے ڈالا جائے گا۔جیسا کہ سونار بھٹی میں کوئلہ بھی ڈالتا ہے اور سونا بھی ڈالتا ہے۔کوئلہ ڈالتا ہے تا کہ آگ روشن ہو اور سونا اس لئے ڈالتا ہے۔کہ اس کا میل کچیل جل کر سونا کندن ہو کر نکل آئے،مومن کو اس لئے ڈالتے ہیں کہ اس کے ایمان پر جو معصیتوں کا خس و خاشاک رہ گیا تھا۔اور اس کی روح میں میل کچیل رہ گیا تھا۔وہ جل جلا کر روح صاف ہو جائے،اور کندن بن کر نکلے اور اس مقام کریم کے لئے لائق ہو جائے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔غرض اس مقام تک پہنچانے کے مصیبتوں کا ایک سلسلہ ہے۔پیدائش سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک اور حشر سے لے کر پل صراط تک ایک مصیبتوں کا سلسلہ ہے،سارا سلسلہ اس لئے ہے۔کہ انسان جل جلا کر کندن ثابت ہو۔اس کے اندر جو غل وغیظ کی کدورتیں بھری ہوئی ہیں۔اعمال بد اور معصیتوں کی کدورتیں ہیں وہ سب جل جلا کر صاف ہو جائیں۔اور وہ کسی اعلیٰ مقام کے لائق ہو۔

مصائب کفارۂ سیئات ہیں......اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ایک بہت عمدہ صاف ستھرا لباس پہن رکھا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر میل کچیل آنا شروع ہوا۔ہفتہ بھر میں اتنا میلا ہوگیا کہ وہ برا معلوم ہونے لگا تو آپ اسے بیزاری کے ساتھ اتار کر غسل خانے میں پھینک دیتے ہیں۔اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ہاتھ بھی لگائیں بلکہ نفرت سے دیکھتے ہیں۔اگر مکان میں سامنے میلے کپڑے ڈال دیئے جائیں۔اگرچہ وہ آپ ہی کے ہوں۔آپ

گھر والوں سے کہیں گے کیا حماقت ہے میلی کچیلی چیزیں سامنے ڈال دیں۔ ان کو کہیں ایک طرف کونے میں ڈالو۔ تو آپ کو خود نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ ان پر میل آ گیا۔ کپڑا تو وہی ہے، قیمت بھی اس کی وہی ہے۔ اتنا ہی تو فرق ہوا کہ میل اس پر آ گیا بد بو اٹھنے لگی۔ آپ کو نفرت ہو گئی۔

اب دھوبی اس کپڑے کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ سب سے پہلے اسے ایک نہر یا تالاب کے کنارے ایک لکڑی کا پٹڑا بچھا کر زور زور دے کر مارنا شروع کرے گا۔ اتنی اس کپڑے کو سزا مل رہی ہے کہ بھگو بھگو کر مارا جا رہا ہے، اگر کپڑے کے زبان ہو اور وہ دھوبی سے یوں کہے کہ ظالم میں نے تیرا کیا قصور کیا تھا؟ تو مجھے پنخ پنخ کر مار رہا ہے۔ تجھے ذرا ترس نہیں آتا۔ تو دھوبی کہے گا کہ احمق تیرے ہی نفع کے لئے دے دے کر مار رہا ہوں۔ تیرا میل کچیل نہیں نکل سکتا۔ جب تک تجھے اس طرح دے دے کر نہ مارا جائے، تو پٹڑے پر دے دے کر اسے مارا تو پوری سزا دی۔

اسی پر بس نہیں کی، بھٹی چڑھا کر اس کے نیچے آگ جلا کر اس میں کپڑے کو ڈال دیا۔ پانی آگ کی وجہ سے ساں ساں کر رہا ہے۔ گویا زبان حال سے کپڑا چلا رہا ہے۔ کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوا کہ اب تک تو مجھے پنخ کر مارا گیا تھا، اب مجھے بھٹی میں آگ کے اوپر رکھ دیا۔ وہ جل رہا ہے یہاں تک کہ اسے بھٹی میں نکالا گیا اور اسے نچوڑا گیا۔ اس میں سے بہت سا میل نکلا۔ پھر دھوبی اس پر قناعت نہیں کرتا۔ یہاں سے جانے کے بعد اس پر استری کرتا ہے، ایک لوہے یا پتیل میں آگ ڈال کر اسے تپا کر پھیرتا ہے۔ تاکہ اس کپڑے کے بل بھی نکل جائیں۔ جو سل پڑے ہوئے تھے وہ بھی باقی نہ رہیں۔ پھر اس پر ابرک کوٹ کر جمایا گیا۔ جس سے اس میں چمک پیدا ہوئی۔ پھول سا بنا کر مالک کے پاس وہ کپڑے کو لایا، تو اب یہ مالک کا سلوک نہیں ہوگا کہ وہ کہے اسے پرے پھینکو۔ اب عزت کے ساتھ اگر عمامہ ہو تو سر پر جگہ دی جائی گی، چوغہ ہے تو اسے بغل میں ڈال دیا جائے گا، کرتہ ہے تو اس کو گلے میں پہنیں گے۔

اور جس مجلس میں بیٹھیں گے اس کے مناقب بیان ہوں گے کہ بڑا نفیس کپڑا ہے اس کی کتنی قیمت ہے، لوگ پوچھیں گے کہ کہاں سے منگوایا ہے تو آپ منہ بھر کر کہیں گے کہ فلاں کارخانہ کا بنا ہوا ہے، اتنا بہتر ہے اس کے اوصاف یہ ہیں، دھلنے، کے بعد ایسا ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے، تو مجلس میں اس کے مناقب بیان کئے جا رہے ہیں، اس کی خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں۔ مالک کے سر پر جگہ ملی اور وہ عمامہ بن کر سر پر پہنچا! یہ کاہے کا نتیجہ تھا کہ اس میں سے میل کچیل نکل گیا میل کچیل نکالنے کے لئے مصیبتوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا، دے دے کر الگ مارا گیا۔ بھٹی میں الگ جلایا گیا۔ استری جلتی ہوئی گرم الگ اس پر پھیری گئی۔ دھوپ میں الگ تپایا گیا۔ ان مصیبتوں سے گزرنے کے بعد اب وہ مقام عزت پر پہنچا۔ اور اس کی تعریفیں کی جانے لگیں۔

اب اگر اس کپڑے کو عقل ہو تو وہ دھوبی کا شکریہ ادا کرے گا کہ میری بڑی خیر خواہی کی کہ مجھے ان مصیبتوں سے گزارا۔ اگر میں نہ گزرتا تو یہ عزت کا مقام نہ پاتا۔ بعینہ یہی صورت انسان کی بھی ہے کہ اللہ نے اس کو صاف

ستھرا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ "کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ" ①

ہر انسان صاف، صحیح فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ گناہ گار بن کر نہیں آتا لیکن جوں جوں جوانی چڑھتی ہے اور اسبابِ عیش مہیا ہوتے ہیں، معصیتوں میں اور نفسانی جذبات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اس کو بھول کر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ نعمتیں کس نے مجھے دی تھیں۔ یہ انعامات کس نے کئے؟ اگر ایک غریب آدمی ایک سجدہ کرتا ہے، تو مجھ کو اللہ نے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ مجھ کو ایک ہزار سجدے کرنے چاہئیں۔ جس کے پاس جتنی نعمت ہو اتنا ہی اس کو شکر ادا کرنا چاہیئے، مگر اس کو یہ خیال نہیں آتا۔ معصیتوں اور گناہوں کا میل کچیل اس کی روح میں بھرا رہتا ہے۔

مالک الملک کی طرف سے اسے تکلیف دی جاتی ہے لیکن متنبہ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ مصائب کے سلسلہ میں ڈالتے ہیں، جیسے دھوبی نے کپڑے کو مصیبتوں کے سلسلہ میں ڈالا تھا، لیکن دھوبی کا منشا کپڑے کو ستانا نہیں تھا، مقام بلند تک پہنچانا تھا۔ اسی طرح سے حق تعالیٰ کا منشاء ان مصیبتوں سے بندے کو بلند مقام تک پہنچانا ہے۔ اس کو مصیبتوں کی بھٹیوں میں ڈالتے ہیں، کبھی ناداری مسلط کر کے، کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے کبھی فقر و فاقہ مسلط کر کے کبھی غم والم مسلط کر کے، کبھی عزیزوں کو چھین کر کے اور کبھی موت کو مسلط کر کے، یہ سب چیزیں اسلیئے ہیں کہ اس کے قلب میں جو میل کچیل ہے وہ نکلے اور قلب میں توجہ الی اللہ اور نورانیت پیدا ہو۔ جب یہ پیدا ہو جائے گی تو مقام کریم پر پہنچا دیا جائے گا۔

تو حاصل یہ نکلا کہ نعمتیں ہوں یا مصیبتیں۔ دونوں سلسلے جانچ کے لئے ہیں اور جانچ اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا (معاذ اللہ) بلکہ علم تھا۔ اس علم کو ظاہر کرنے کے لئے کہ بندہ بھی محسوس کرے کہ میں نے کیا کیا تھا اور اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ مصیبتوں کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ شاید میرے ساتھ برائی کی جارہی ہے، لیکن اگر اس کے دل میں فکر ہے اور دماغ میں عقل کی خوبی ہے تو وہ کہے گا کہ میرے ساتھ برائی نہیں کی جارہی ہے۔ میرے ساتھ بھلائی کا سامان کیا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ کو مجھے مقامِ عزت تک پہنچانا مقصود ہے، اسی لئے مجھے مصیبتوں کی بھٹی میں ڈالا ہے۔

عملِ جراحی...... بالکل اس کی مثال یہی ہے جیسا کہ کسی بچے کو کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو آپ ڈاکٹر کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کیجئے۔ اگر ڈاکٹر نے مرہم لگایا تو معمولی پھوڑا پھنسی اس سے درست ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بڑا دنبل نکلا ہوا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپریشن کیجئے۔ ڈاکٹر نے نشتر لگایا، بچہ روتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے باپ کو شاید میرے ساتھ دشمنی پیدا ہوگئی۔ جیتی جاگتی کھال کٹوا دی اور باپ ہے کہ ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! دیکھئے ذرا گہرا نشتر لگایئے ایسا نہ ہو کہ مادۂ فاسد باقی رہ جائے، پھر کل کو ابھرے، ایسا آپریشن کیجئے کہ صاف ہو جائے۔ اس نے چھا چھا کر گہرا نشتر لگایا۔ اور بچہ چلا رہا ہے کہ باپ تو قصائی ہو گیا، اس کے اندر رحم و کرم باقی نہیں رہا مگر باپ بچے کی کوئی فریاد نہیں سنتا۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین، ج: ۱، ص: ۴۶۵ رقم: ۱۳۱۹۔

اور جب ڈاکٹر نشتر لگا کر فارغ ہو چکتا ہے تو ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ بچہ اور ناخوش ہوتا ہے کہ ایک تو اس نے میری کھال کاٹ دی اوپر سے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

لیکن جب زخم درست ہو جاتا ہے اور عقل درست ہوتی ہے تو اب وہ بچہ باپ کا شکر گزار ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نشتر نہ لگواتے تو زندگی خطرہ میں رہتی اگر نشتر نہ لگتا اور مادہ فاسد باقی رہ جاتا تو وہ پھیل کر تمام اعضاء کو خراب کر دیتا جڑیں بڑھ جاتیں اور موت واقع ہو جاتی اس سے بچاؤ کی یہی تدبیر تھی کہ آپریشن کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح۔ جب ہماری روح میں مصیبتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسیاں اور بری حرکات کے دنبل نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں درحقیقت آپریشن ہیں۔ کہ ان سے مادہ فاسدہ نکالنا ہوتا ہے۔

مصائب کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق...... یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش وطرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے، حق تعالیٰ اس کا علاج کرتے ہیں کہ کچھ نعمتیں چھین کر بتاتے ہیں۔ اگر دانشمند ہو تو فوراً متوجہ ہو کر توبہ کی طرف لگ جاتا ہے، تو نتیجہ نکل آتا ہے کہ اسے متوجہ کیا گیا تو یہ متوجہ ہو گیا تو نعمت دوبارہ واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر نہیں مانتا تو پھر دوسرا آپریشن کرتے ہیں۔ یہ ساری مصیبتیں درحقیقت بندے کے حق میں آپریشن ہیں۔ اس لئے مصلحت ہیں اور خوبی کا ذریعہ ہیں اس کے انجام کی بھلائی پیش نظر ہوتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ شانہ، ان مصائب کے نشتر کے ذریعہ سے جو مادۂ فاسدہ بھرا ہوا ہے اس کو خارج کرتے ہیں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر مصیبتیں آئیں اور مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت موت کی ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آئے تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ یہ میرے ستانے کا سامان کیا گیا ہے۔ یہ منجانب اللہ خیر و برکت کا سامان اور عبرت دلانے کا سامان ہے۔

آپ غور کر کے دیکھیں ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوگا کہ جس گھر میں میّت ہوتی ہے، قلوب میں اس درجہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بے ثباتی ہر شخص کے سامنے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ میرے لئے بھی درپیش ہے، مجھے بھی اس راستہ سے جانا ہے وہ جو ایک بے فکری طغیانی اور سرکشی تھی وہ خود بخود گھٹ جاتی ہے، برسوں کے مجاہدے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو ایک جنازہ سامنے آنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے موت وحیات کا سلسلہ اس لئے رکھا ہے تاکہ انابت کا مضمون پیدا ہو اور قلوب کی بے فکری ہٹ جائے۔

مقصدِ موت...... اور اگر یہ شخص رونے دھونے میں لگ جائے اور رات دن میّت کو یاد کر کے روئے تو اس سے نہ میّت کو فائدہ ہوگا اور نہ خود اس کو۔ موت اس لئے بھیجی گئی تھی کہ اس کو دیکھ کر آدمی اپنی موت کو یاد کرے، نہ یہ کہ دوسرے کی موت میں الجھ کر رہ جائے۔ تو اصل مقصد موت کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عبرت حاصل کی جائے اور

اپنے آخیر وقت کو یاد کیا جائے اور ایسے سامان پیدا کئے جائیں کہ ہمارے لئے بھی نافع ہو اور میت کے لئے بھی نافع ہو۔ اس لئے مثلاً تلاوت قرآن کریم بتلائی گئی کہ ایصال ثواب کریں، ایصال ثواب سے اس کو بھی راحت پہنچے گی اور آپ کے قلب کو بھی تسکین ہوگی۔

اور اس کے لئے بہترین تدبیر یہ دعاء ہے جو اس آیت کریمہ میں بتلائی گئی اور فرمایا گیا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ ''ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے، کبھی بھوک اور فقر و فاقہ مسلّط کر کے، کبھی مال گھٹا کر اور خسارہ دے کر اور کبھی جانوں کو کم کر کے، یعنی موت مسلّط کر کے، تو مختلف طریقوں سے آزمائیں گے''۔

دعاءِ تسکین...... لیکن فرماتے ہیں ان مصیبتوں کے بعد جو صبر کر گیا اور تحمل سے کام لیا کہ اپنے پروردگار پر نگاہ رکھی۔ تو فرماتے ہیں: ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''بشارت دے دو صبر کرنیوالوں کو'' کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے وہ تسکین کی یہ دعاء پڑھتے ہیں۔ وہ دعاء یہ ہے: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ''ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔

تسکینِ عقل...... اس میں تسلی کس طرح سے دی گئی دو جملے فرمائے گئے: ایک اِنَّا لِلّٰهِ. اور ایک اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ . اِنَّا لِلّٰهِ. کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔ جب ذہن میں یہ تصور آ گیا تو آدمی سمجھے گا کہ مالک کو اختیار ہے اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کرے، مالک اگر یہ چاہے کہ میں اپنی چیز کو اوپر رکھ دوں تو حق ہے اگر یہ چاہے کہ میں اسے نیچے کے کمرے میں رکھ دوں یہ بھی اس کا حق ہے اور اگر وہ یہ چاہے کہ زمین سے نیچے رکھ دوں یہ بھی اس کو حق ہے۔

جب ہم اللہ کی ملک ہیں، زمین کے اوپر رکھنا چاہے، یہ بھی اس کو اختیار ہے، زمین کی تہہ میں قبر میں پہنچانا چاہئے۔ یہ بھی اس کو اختیار ہے، قبر سے آگے کسی اور عالم میں بھیج دے یہ بھی اس کو اختیار ہے، تو اس۔ کا مطلب اللہ کی مالکیت کا تصور ہے کہ وہ مالک اور ہم مملوک ہیں، وہ ہمارا آقا اور ہم اس کے خادم۔ اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے تو عقلی طور پر انسان میں صبر آ گیا۔ عقل نے سمجھا دیا کہ جب تو ملک ہے تو تجھے واویلا کرنے سے کیا مطلب؟ حق تعالیٰ مالک ہیں۔ اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے، تو عقلی طور پر صبر آ گیا۔

تسکینِ طبع...... لیکن طبعی طور پر ابھی غم مسلّط ہے، عقل بے شک سمجھا رہی ہے کہ مالک نے اپنی ملک میں تصرف کیا ہے، یہ بندہ اس کی ملکیت تھا۔ اس نے اس کو اٹھا لیا۔ بہر حال طبعی طور پر رونے کا جذبہ موجود ہے تو دوسرے جملہ میں اس کا علاج کر دیا گیا۔

﴿وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ہم سب لوٹ کر اس کی طرف جانے والے ہیں، اس میں یہ بتلا دیا گیا کہ جہاں یہ گیا

وہاں تم بھی پہنچو گے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو چند دن کی جدائی ہے۔ اس کے بعد جہاں یہ ہوگا وہاں تم ہو گے۔

اگر ہمارا کوئی عزیز سفر پر چلا جائے یا ملازمت پر ایک ہزار میل کے فاصلے پر چلا جائے۔ بعض دفعہ دس دس برس ملاقات نہیں ہوتی، لیکن آدمی یوں نہیں گھبراتا کہ جب موقع ہوگا وہ چلا آئے گا۔ ملنے کا امکان ہے، تو اس امکان کی وجہ سے جدائی کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہاں امکان نہیں بلکہ قوت یقین سے یہ چیز حاصل ہے کہ جہاں یہ گیا وہاں ہم بھی پہنچنے والے ہیں۔ امکان پر اگر صبر آجاتا تھا تو یقین سے صبر کیوں نہیں آئے گا؟ تو "اِنَّـآ اِلَيْـهِ رٰجِعُوْنَ" سے انسان کو طبعی طور پر بھی صبر آجاتا ہے تو "اِنَّالِلّٰهِ" سے عقلی طور پر اور "وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" سے طبعی طور پر صدمہ گھٹ جاتا ہے۔ طبیعت اور عقل دونوں بتلا دیتی ہیں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جو واقعہ پیش آیا ہے وہ تمہارے لئے بھی پیش آنا ہے۔ تو اس آیت کریمہ اور دعاء میں سبق دیا گیا۔ اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: اگر کوئی ادنیٰ بھی مصیبت آئے تو فوراً کہو ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

صرف میت ہی پر یہ دعا نہیں پڑھی جاتی بلکہ اگر یہ ایک پیسہ بھی گم ہو جائے تو بھی پڑھی جائے۔ کوئی کپڑا بھی گم ہو جائے جب بھی پڑھو۔

تاثیرِ دعاء تسکین...... اس دعا کی برکت سے صبر بھی حاصل ہوتا ہے۔ مالک کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے اور بدل بھی مل جاتا ہے۔ نعم البدل ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ اس دعا کی خاصیت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مصائب کے سلسلہ میں جزع فزع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صبر ہی کرنے سے سب کچھ ملتا ہے صبر و تحمل سے اپنے کو بھی ملتا ہے دوسرے کو بھی ملتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کا بیٹا آٹھ نو سال کا تھا بہت خوبصورت اور ہونہار تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ ماں باپ کی توقعات اولاد ہی سے وابستہ ہوتی ہیں، اولاد ان کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ غرض ان کو بہت زیادہ محبت تھی اور توقعات بھی تھیں اور صورت شکل سے ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ یہ بچہ بیمار ہوا۔ اس زمانے میں جو علاج ہوتا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لیکن بیماری بڑھتی گئی اسی حالت میں انہیں ایک دو دن کا سفر پیش آیا اور سفر بھی کوئی ضروری تھا۔ اس لئے جانے پر مجبور ہوئے تو بیوی سے یہ فرمایا کہ بچے کی تیمارداری پوری کی جائے اور علاج معالجے میں کوئی کمی نہ کی جائے اور میں پرسوں تک آجاؤں گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے۔ ان کی غیبت میں ان کے آنے کا دن تھا کہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ تو بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ صاحب نسبت اولیاء میں سے تھیں انہوں نے بچے کی لاش کمرے میں رکھی اور چادر سے ڈھانک دی اور باہر آکر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ پہنچے تو عرب کے قاعدے کے مطابق بیوی نے آگے بڑھ کر خاوند کا استقبال کیا۔ مصافحہ کر کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ تو فرمایا کہ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِعَافِيَةٍ وَخَيْرٍ" خدا کا شکر ہے بڑی عافیت اور خیریت میں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات

نہیں، وہ مطمئن ہو گئے۔ان کو کھانا کھلایا۔

کھانا کھلاتے ہوئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے آپ سے شریعت کا ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے، اور اس کی ایک میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے بعد میں اپنی یہ چیز یا پیسہ واپس لے لوں گا۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک مقرر وقت پر ادا کر دینا چاہئے۔ تو کہا کہ ہم دیر لگائیں اور ٹال مٹول شروع کر دیں۔ فرمایا کہ: ہمیں کوئی حق نہیں۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ خیانت ہے اور امانت داری کے خلاف ہے۔ کہا اگر ہم نے وقت پر ادا کر دیا۔ مگر دل میں گھٹن پیدا ہوئی کہ ہم نے کیوں ادا کیا رکھ ہی لیتے۔ فرمایا گھٹنے کا تمہیں کیا حق ہے، وہ چیز تمہاری کب ہے۔ اپنی چیز پر آدمی گھٹے۔ دوسرے کی چیز پر گھٹن لانے کا کیا حق ہے؟ بلکہ فرمایا کہ: شکر یہ ادا کرنا چاہے کہ ٹھیک وقت پر امانت سے ادا ہو گئے۔ کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ جس کی چیز تھی اسے پہنچ گئی۔ کہا کہ شریعت کا مسئلہ یہ ہے۔ فرمایا: مسئلہ تو یہی ہے اس کے بعد فرمایا کہ:

''وہ جو آپ کا بیٹا تھا وہ اللہ کی امانت تھی۔ اس نے ٹھیک آٹھ برس دو مہینے کے لئے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ جب میعاد پوری ہو گئی تو قاصد آیا اور کہا کہ میری امانت میرے حوالے کرو۔ ہم نے حوالے کر دی۔ اب ہمیں بیٹھ کر گھٹنا چاہیئے؟ ہمیں غم میں مبتلا ہونا چاہیئے؟''۔

بیوی کے ہاتھ چومے، اور فرمایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میرے دل کو ایسا صبر دیا کہ بجائے غم کے مجھے خوشی ہے کہ امانت، امانت داری کے ساتھ ادا کر دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم سبکدوش ہو گئے۔ اور امانت مالک کو پہنچا دی۔

حقیقت حال یہی ہے کہ اللہ جب کسی نفس کو واپس لیتا ہے۔ تو طبعی طور پر صدمہ اور غم ضرور ہوتا ہے۔ مگر عقل اور طبیعت دونوں بتلاتی ہیں کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا حق تھا طبعیت کہتی ہے کہ جدائی کا غم ہے یہ تو چند روزہ جدائی ہے پھر ہم بھی وہیں جانے والے ہیں، اس سے آدمی کے اندر صبر اور سکون پیدا ہوتا ہے۔

اجرِ صبر......اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اجر شروع ہو جاتا ہے۔ تو دنیا بھی بنتی ہے آخرت بھی بنتی ہے اس لئے میّت ہو جانے کے بعد گھٹن میں رہنا یا غم والم میں رہنا یا میت کا اس لئے تذکرہ کرنا کہ غم تازہ ہو۔ یہ منشاء شریعت کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہونی چاہے کہ جب غم تازہ ہو تو وہ افعال انجام دینے چاہئیں جن سے ہمیں نفع ہو۔ اور میت کو بھی نفع ہو۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ یہ دعاء پڑھے: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ دوسری چیز پھر ایصال ثواب ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت میں آدمی لگے تو قلب کو تسکین الگ ہوگی۔ میت کو ثواب پہنچے گا اور اس کے درجات الگ بلند ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ: میّت عالم برزخ میں پہنچ کر ہر ہر رشتہ دار، عزیز اور پس ماندہ کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کون میرے لئے کیا کرتا ہے۔ اس کی مثال دی گئی کہ جیسے دریا میں کوئی ڈوبتا ہوا ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے

کہ شاید میں اس کی وجہ سے ڈوبنے سے بچ جاؤں، میت کی یہی کیفیت رہتی ہے۔تو عزیز واقارب کی طرف اس کی آس لگی رہتی ہے کہ کوئی مجھے یاد کرتا ہے یا نہیں؟ کوئی اجر پہنچتا ہے یا نہیں؟

برزخ میں آثارِ نعمت......حدیث میں فرمایا گیا کہ: مردوں کو اجتماع کا کچھ وقت دیا جاتا ہے تو جب وہ جمع ہوتے ہیں تو اگر کسی کے پاس زیادہ ثواب پہنچتا ہے تو وہ دوسرے مردوں کے اوپر فخر کرتا ہے کہ میرے عزیز تھے جو مجھے یاد کرتے تھے اور اگر کسی کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ میرا بھی کوئی عزیز ہوتا تو مجھے یاد کرتا تو اس کو خجالت اور ندامت ہوتی ہے۔اور اس کا سر اونچا نہیں ہوتا۔تو جو دنیا میں کیفیت تھی کہ نعمت زیادہ ہوتی ہے تو آدمی کا سر اونچا ہوتا تھا۔مصیبت آپڑتی تھی تو سرنگوں ہوجاتے تھے۔یہی کیفیت برزخ میں بھی رہتی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت اور مصیبت کمائی نہیں جاتی۔یہاں سے بھیجی جاتی ہے، یا یہاں کا کیا ہوا اس کے ساتھ رہتا ہے۔تو اگر کوئی ثواب پہنچا دیتا ہے تو اس کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور وہ دوسروں سے کہتا ہے کہ تمہارے عزیز قریب تو کچھ نہیں بھیج رہے تو یہ ہے وہ چیز جس سے اپنے قلب کو بھی تسکین ہوتی ہے اور میّت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔لیکن محض رونا یا غم میں مبتلا رہنا ہمارے لئے بھی تکلیف دہ ہے اور میّت کے لئے بھی تکلیف دہ ہے نہ اس کے لئے فائدہ نہ ہمارے لئے فائدہ۔

میّت اور پس ماندگان کا باہمی نفع......تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ: اس گھرانے پر جو ایک سال میں دو صدمات واقع ہوئے۔ایک باوانی صاحب مرحوم کی وفات اور ایک ان کے داماد ستار بھائی صاحب کی وفات حقیقت میں یہ دو بڑے صدمات ہیں۔ایک سال کے اندر اتنے بڑے صدمات کا پڑنا کہ دو گھروں کے دو وارث اٹھ جائیں یہ کوئی کم صدمہ نہیں ہوتا۔لیکن جتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے اس سے اگر آدمی چاہے تو اتنی ہی بڑی آخرت کمائی جاسکتی جتنا دل میں غم ہو اور صدمہ ہو، اتنا ہی بڑا صبر ہوگا اور اتنا ہی بڑا اجر ہوگا۔

وقتِ صبر......اور صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے، مدت کے گزر جانے پر تو ہر ایک کو صبر آجاتا ہے۔وہ باعثِ اجر نہیں ہوتا۔صبر وہی باعثِ اجر ہے جو ارادہ واختیار سے مصیبت کو دبانے کے لئے کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مرگیا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔بڑھیا واویلا فریاد اور بین کرکر کے رو رہی تھی۔آپے سے باہر تھی۔آپ نے فرمایا: بڑی بی! صبر کرو۔حق تعالیٰ کو یہی منظور تھا تحمل کرو۔ (۱)

اس نے جذبے میں کہا کہ: تمہارے اوپر گزرتی، جب میں جانتی۔میرا تو جوان بیٹا مرگیا تم مجھے کہہ رہے ہو صبر کرو۔اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔غرض جواب دے دیا اور کہا کہ: مجھ سے نہیں صبر ہوتا۔فرمایا: اچھا تو جان۔تیری مرضی۔اور آپ آگے گزر گئے۔

اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔تو بے چاری پریشان اور نادم ہو کر نبی کریم صلی

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، ج: ۱، ص: ۴۳۰ رقم: ۱۲۲۳.

اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑی اور مسجد نبوی میں جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔اب میں صبر کرتی ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی" جب صدمہ پڑ رہا ہو جب صبر کیا جائے وہ صبر ہے"۔

وقت گزر جانے کے بعد مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔اس پر اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔جب آدمی غم میں ڈوبا ہوا ہو۔اس وقت آدمی تحمل کرے اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرے تو یہ صبر ہے تو اتنے بڑے صدموں کا یقیناً غم بھی زیادہ ہوگا اس غم میں جتنا صبر کیا جائے گا اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملے گا۔

مشترکہ غم ...... اور پھر اس پر غور کیا جائے کہ کوئی بڑی شخصیت گزرتی ہے تو وہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ وہ ہزاروں کا صدمہ ہوتا ہے۔ باوانی صاحب مرحوم، ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بہت سے لوگوں کے وارث بنے ہوئے تھے۔ بہت سوں کے باپ بنے ہوئے تھے۔ ہزاروں کو ان سے فائدہ تھا۔

ہزاروں کو ان سے نفع ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ سننے میں آیا جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ باید و شاید ایسا بہت کم ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہی تھی کہ ہر شخص ان کا مرہون منّت تھا۔کوئی اخلاق کا کوئی دولت کا کوئی انعام کا کوئی اکرام کا اپنے اپنے غم میں ہر کوئی رو رہا تھا۔تو ایسی شخصیّت کا غم کسی ایک خاندان کا غم نہیں ہوتا۔کسی ایک گھرانے کا غم نہیں ہوتا، یہ پورے ملک کا غم ہوتا ہے۔پورے شہر کا غم ہوتا ہے۔

تو جب غم اٹھانے والے بہت سے ہوں تو دو چار گھر والوں کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ غم کے اندر ڈوبیں۔وہ تو کہیں گے ہمارا غم تو سب نے مٹا دیا۔سب کے اندر بٹ گیا۔تو واقعہ یہ ہے کہ سب غم زدہ ہیں۔

خیر الناس...... ایسی شخصیتوں کے گزرنے سے جو خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ ہوں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہو۔وہ بہترین خلائق سمجھے گئے ہیں۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ ترجمہ: بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے۔فرمایا گیا بہترین انسان وہ ہے جو مِفْتَاحٌ لِّلْخَيْرِ ہو اور مِغْلَاقٌ لِّلشَّرِّ ہو۔یعنی اس کے ذریعے خیر کے دروازے کھلتے ہوں اور شر کے دروازے بند ہوتے ہوں۔دنیا کے اوپر برائیوں کے دروازے بند کرتا ہو اور بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہو۔وہ درحقیقت پوری دنیا کا وارث اور والی بن جاتا ہے۔اس لئے اس کا غم بھی ساری دنیا کا غم ہوتا ہے۔

تو باوانی صاحب مرحوم یا ستار بھائی مرحوم درحقیقت ایسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔اپنے دین سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ستار بھائی کو میں نے دیکھا کہ تبلیغی سلسلے میں رات دن منہمک کبھی ڈھاکہ جا رہے ہیں۔اور کبھی ادھر ادھر گویا دین پھیلانے کا ان کے دل کے اندر ایک جذبہ موجود تھا۔تو جس جس تک ان کی آواز پہنچی، انہوں نے اس کو دین کا فائدہ پہنچایا۔تو کوئی دین کا نفع پہنچانے والا تھا۔کوئی دنیا کا یہ خَيْرُ النَّاسِ میں داخل تھے۔یقیناً ایسے لوگوں کا صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔مگر ایسے صدمے میں جتنا تحمل اور

صبر کیا جائے اتنا ہی بڑا اجر بھی ہوتا ہے، کسی شاعر نے کہا ہے۔

یاد داری وقت زادن تو ہمہ خنداں تو گریاں

شاعر انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تجھے یاد ہے جب تیری پیدائش کا وقت تھا کہ تو روتا ہوا آیا تھا اور ساری دنیا خوشی خوشی ہنس رہی تھی۔

آنچناں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں خنداں

ایسی زندگی گزار کہ تو ہنستا ہوا جائے اور دنیا تیرے لئے رو رہی ہے تو نیک لوگ جب جاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ تو ہنستے ہوئے جاتے ہیں اور رونے والے پیچھے سے روتے ہیں۔

رونے کی حقیقت...... لیکن یہ رونا درحقیقت ان کی موت کا رونا نہیں ہوتا۔ اپنے نفع کے گم ہو جانے پر رونا ہوتا ہے۔ ورنہ میت تو اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچتی ہے، تو اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی وجہ سے کسی کو غم تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس زمانے میں مثلاً رمضان میں ہو تو یہ کہہ کر تسلی دیا کرتے ہیں کہ میاں! غم کرنے کی کیا بات ہے خوش ہونا چاہئے کہ موت کا کتنا اچھا زمانہ ملا۔ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس مقام پر مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ "زَادَهُمَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً" میں ہو جائے لوگ وارثوں کو تسلی دیتے ہیں کہ غم کرنے کی بات نہیں خوش ہو جاؤ کہ پاک مقام مل گیا۔ مدینہ طیبہ کی زمین نے اسے قبول کر لیا معلوم ہوا کہ موت غم کی چیز نہیں نہ کوئی موت پر غم کرتا ہے نہ روتا ہے۔ رونا اپنی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے یہ شخص چھن گیا۔ خود تو وہ بہت اچھے مقام پر پہنچ گیا کہ آج باوانی صاحب مرحوم اگر نہیں ہیں کہ موت واقع ہو گئی۔

موت تو ہمیں بھی آئے گی، جتنے ہم ہیں ہم سب کو آئے گی، اس پر کیا رونا؟ بلکہ اس بارے میں تو خوش ہونا چاہئے کہ ایک اعلیٰ ترین زندگی گزار کر ایک اچھے مقام پر انشاء اللہ پہنچ گئے تو ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ یہ جو غم اور رونا ہے یہ ان کی جدائی پر ہے کہ ہم سے ایک ذات چھن گئی۔ حقیقت میں آدمی اپنی غرض اور اپنے منافع کو روتا ہے نہ کہ مرنے والے کو تو مرنے والے کے انجام کو جب دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بڑا اچھا خاتمہ ہوا۔

اچانک موت ...... اب جیسے باوانی صاحب مرحوم کا میں نے سنا کہ۔ اچانک موت واقع ہوئی اور ہارٹ فیل ہوا۔ حدیث میں فرمایا گیا مَوْتُ الْفُجَاءَةِ الخ ① اچانک کی موت کافر کے لئے عذاب ہے اور مومن کے لئے رحمت ہے۔ تو اللہ کی فرمائی چیز ہے تو یہ یقینی ہے کہ ان کے لئے رحمت واقع ہوئی۔ اس لئے کہ بحمد اللہ وہ مومن تھے اور مسلم تھے اور مسلم پر جب اچانک موت آتی ہے وہ رحمت بنتی ہے۔ تو موت تو خوشی کی چیز ثابت ہوئی کہ رحمت نے انہیں قبول کر لیا۔ آگے غم اپنا ہے کہ وہ ہم سے چھین لئے گئے۔ ہم سے وہ جدا ہو گئے تو اس جدائی۔ کی تسکین یہ ہے کہ ہم ایصال ثواب کریں۔ ان کو یاد رکھیں تو وہ ہم سے قریب رہیں ہم ان کے قریب رہیں۔ کبھی کبھی ان کے

---

① مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الجنائز، باب فی موت الفجاءة وماذکر فیه، ج:۳، ص:۴۸ رقم ۱۲۰۰۵.

مزار پر جا کر زیارت کرلیں۔

آدابِ زیارت..... حدیث میں ہے کہ جب قبر کی زیارت کی جاتی ہے تو آدابِ زیارت میں سے فرمایا گیا کہ آدمی قبلہ کی طرف پشت اور میّت کی طرف منہ کرے، اس لئے کہ میّت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے، جو پہچان دنیا میں تھی وہی برزخ میں جا کر رہتی ہے، پچھلا علم سلب نہیں ہوتا۔ چھن نہیں جاتا۔ جو جذبات اور جان پہچان دنیا میں تھی وہ وہاں بھی باقی رہتی ہے تو جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے وہاں بھی قائم رہتا ہے، جس سے جتنی جان پہچان تھی وہ قائم رہتی ہے، تو اس تعلق کو نبھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا جائے اور ایصال ثواب کے جائز طریقے اختیار کر کے ان کو نفع پہنچایا جائے۔ اس میں مرنے والوں کا بھی نفع ہے اور پس ماندگان کے لئے بھی تسکین ہے۔ انہی چند کلمات پر تقریر ختم کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور نافع فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَامِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

افاداتِ بخاری نمبرا

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.''

أَمَّـا بَعْـدُ!فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ربط بین الا بواب...... یہ بخاری کی آخری حدیث ہے۔جس پر امام ہمام نے اپنی کتاب کو ختم کیا۔ پہلے تو امام کی اس صنعت پر غور کیا جائے، کہ ابتداء بھی عجیب انداز سے فرمائی اور انتہاء بھی عجیب انداز سے کی، محدثین کرام کا طریق یہ ہے کہ اگر کسی نے جامع لکھی تو ''کتاب الایمان'' سے ابتداء کرتے ہیں اور اسکے بعد دوسرے ابواب لاتے ہیں، اور اگر سنن کی کتاب ہے، تو عموماً ابتداء ''کتاب الطہارت'' سے کی جاتی ہے اور پھر نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے ابواب لاتے ہیں۔تو سنن کا بھی ایک طریقہ ہے، اور جوامع کا بھی ایک طریقہ ہے

وحی سے ابتداء کی وجہ......لیکن مصنف نے ''کتاب الإيمان'' سے ابتداء کرنے کے بجائے، بَابُ بَدْءِ الْوَحْيِ سے کی ہے کہ وحی کی ابتداء جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح ہوئی۔اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے دین کے ابواب ہیں، ان کا مادہ درحقیقت وحی ہے۔وحی مادہ شریعت ہے، اور اس مادہ کی بھی شاخیں ہیں۔کوئی شاخ کتاب الایمان ہے کوئی شاخ کتاب الصلوٰۃ ہے۔کوئی شاخ کتاب الزکوٰۃ ہے۔تو ان سب میں وحی جلوہ گر ہے۔ قدر مشترک وحی ہے اور اس کی شکلیں مختلف ہیں۔اور وہی وحی کبھی نماز کی صورت میں نمایاں ہوئی اور وہی وحی کبھی حج کی صورت میں نمایاں ہوئی۔اور وہی وحی کبھی دوسرے ابواب کی صورت میں ''ظہور پذیر ہوئی'' تو مادہ شریعت کا وحیِ خداوندی ہے، اس لئے مصنف نے ابتداً مادۂ شریعت کو ذکر کیا۔اس کے بعد پھر اس کی شکلوں کو ذکر کیا'' اور ظاہر بات ہے کہ مادہ کا وجود شکل پر مقدم ہوتا ہے''۔

بنیادِ علم ایمان ہے......تو سب سے پہلے کتاب الایمان کو لاتے ہیں۔اس لئے کہ تمام اعمال کی مقبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے۔ایمان نہ ہو تو کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا، گویا ایمان تمام علوم کا مدار علیہ اور موقوف علیہ تھا۔ اس لئے پہلے کتاب الایمان لائے اب آدمی کو ایمان حاصل ہو گیا اعتقاد حاصل ہو گیا۔حق تعالیٰ کی یکتائی پر، نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر، تو سب چیزوں پر یقین ہو گیا۔

ضرورت علم...... لیکن یقین کے بعد علم کی ضرورت پڑتی ہے، کہ اس یقینی چیز کو ہم کس طرح انجام دیں، ظاہر ہے کہ اس کیلئے علم کی ضرورت ہے، جہالت سے کوئی چیز انجام نہیں دی جاسکتی تو کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم لائے ہیں تا کہ علم کی عظمت اور علم کی نوعیت واضح ہو جائے۔ گویا اب آدمی میں ایمان بھی ہے اور علم بھی حاصل ہو گیا۔

مقصدِ تخلیق...... اس کے بعد پھر عبادات شروع کئے ہیں جو انسان کی پیدائش کا اصل مقصد ہے ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴾ ① تو مقصد اصلی یہ ہے کہ انسان عبادت کرے۔ عبادت کے معنی ہیں کہ بندے کا ربط اللہ سے اور عبد کا معبود سے رابطہ کیا ہے؟ اس رابطے اور جوڑ کو عبادت کہتے ہیں۔ کہ جس سے بندہ قربت حق حاصل کر سکے۔ اور حق تعالیٰ سے تقرب پیدا کر سکے۔

عبادات کے بعد معاملات...... جب بندے اور خدا کا رشتہ جڑ گیا۔ اس کے بعد بندوں سے بندوں کا کیا واسطہ ہے۔ تو معاملات (کے ابواب) لائے جس میں نکاح بھی ہے، جس میں بیع وشراء بھی ہے، ہبہ اور میراث بھی ہے، اوقاف بھی ہیں یہ تمام معاملات لائے ان تمام کو جب بیان کر لیا۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کو فتنوں سے بچانے کی کیا صورت ہے؟ ساری معلومات حاصل ہیں۔ سارے ابواب سامنے ہیں مگر فتنہ اتنا ہے کہ ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ضرورتِ جہاد...... تو پھر کتاب المغازی لائے اس کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ ہے تا کہ دین کو فتنوں سے محفوظ رکھا جائے اور فتنہ مرتفع ہو، پھر اس کے بعد جب جہاد بھی آ گیا تو ان مجاہدین کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں ذکر کیں کہ اصل مجاہد تو یہ حضرات تھے، ان کی پیروی میں دوسرے جہاد کریں گے۔

طریقِ عمل...... لیکن طریق عمل کیا ہو گا؟ جس سے علم پر عمل کرے، ظاہر ہے کہ وہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، اس لئے اس کے بعد "بَابُ اِتِّبَاعِ السُّنَّةِ" لاتے ہیں کہ سنت کی پیروی ہو گی تب اس علم پر عمل نصیب ہو گا۔ اور علم پر عمل نصیب ہو جانا جب موثر ہو گا۔ جب پہلے ایمان ہو گا تو پہلے کتاب الایمان لائے، پھر کتاب العلم لائے اور پھر کتاب اتباع السنۃ لائے۔

فضیلتِ امّت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم...... ان تمام ابواب کو اس امت کی فضیلت پر لا کر ختم کیا اور آخر میں یہ حدیث لائے جس کی آپ نے تلاوت کی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ مصنف نے دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر کتاب کو ختم کیا۔

ندرتِ سند...... دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا، پھر اسلام کا، پھر اعمال کا، پھر معاملات کا، ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

مقبولیت پیدا ہوگی؟ تو اس حدیث پر لا کر ختم کیا کہ تسبیح وتہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے تو دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر ختم کیا یہ ایک عجیب وغریب صنعت ہوگئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہاء میں قیامت اور یوم حشر،اس کے ثمرات اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے۔

عظمتِ سند......تو جیسے کتاب جلیل القدر ہے،اور جیسے مصنف جلالت والے ہیں،اسی طرح سے ان کی صنعت بھی جلالت قدر رکھتی ہے،کہ مصنف علام نے عجیب وغریب صنعت اختیار کی ہے۔یہ تو میں نے ابتداء بخاری کے بارے میں عرض کر دیا۔

اوصافِ حدیثِ متعلقہ......اب اس کے بعد یہ حدیث آئی جو تلاوت کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:"كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ حَبِيبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ" (1) اس میں تسبیح "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ" کا ذکر ہے۔حدیث میں اس کے تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں،ایک تو حسی صورت ہے جو کانوں سے محفوظ ہوتی ہے اور آدمی دیکھ سکتا ہے،ایک معنوی چیز ہے اور ایک اخروی چیز ہے تو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

حسی وصف اول......پہلی صف یہ بیان کی گئی ہے کہ"خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ" یہ کلمے زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ان کے پڑھنے میں کوئی دشواری اور پیچیدگی نہیں کہ زبان کو اینچنا پڑے،"بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ"عربی زبان جیسی خفیف اور اخف زبان کے یہ کلمات ہیں،زبان بھی ہلکی پھلکی ہے اور یہ کلمات"خاص طور پر"اس میں اور ہلکے پھلکے ہیں،جن کے ادا کرنے میں نہ زبان کو کوئی دشواری پیش آئے اور نہ اینچنا پڑے،بہت ہی ہلکے پھلکے ہیں۔

سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ

فضیلتِ عربی......اور بناء اس کی یہ ہے کہ خود عربی زبان بہت ہی خفیف اور ہلکی بھی ہے،اس کے کلمات جن معانی کو ادا کرتے ہیں وہ کلمات ایسے لطیف ہیں کہ ان کے بغیر وہ حقیقت ادا نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہی کلمہ نہ پڑھا جائے،ان کلمات کو دوسری زبان میں ادا کرنا ہو تو دوسری زبانوں میں کلمات نہیں ملتے جو اس پوری حقیقت کو ادا کر دیں۔تو زبان پاکیزہ اور نہایت خفیف ہے،لسان اللہ بھی ہے،حق تعالیٰ اسی میں کلام فرماتے ہیں،اللہ نے اسی زبان کو اپنے معجزے کے اظہار کے لئے منتخب فرمایا۔قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا یہ کلام نہیں کرسکتا۔تو اس شانِ اعجاز کا کوئی دوسری زبان تحمل نہیں کرسکتی،نہ انگریزی نہ ترکی زبانیں نہ پنجابی،اعجاز اور معجزے کا تحمل اگر کسی زبان نے کیا ہے تو وہ عربی زبان ہے کہ کلمات بہت تھوڑے اور حقائق اس میں بہت زیادہ بھرے ہوئے ہیں،تو زبان کے لحاظ سے خفیف بھی اور لطیف بھی ہے اور معجزے کا تحمل کرنے والی ہے۔جس میں اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔اسی لئے فرمایا گیا کہ:لِسَانُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی"

(1) الصحيح للبخاري، كتاب التوحيد،باب قول الله تعالىٰ ونضع الموازين القسط، ج:٦، ص:٤٩٧،رقم:٧١٢٤.

اہل برزخ کی زبان...... برزخ کی زبان تو سریانی ہے۔ جس میں میّت کلام کرے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس سے خطاب کریں گے، وہ زبان تو سریانی ہے، لیکن میدان محشر سے جو زبان شروع ہوگی تو وہ عربی زبان ہوگی۔ پھر جنّت کی وہی زبان رہے گی۔ اور ابدالآباد تک وہی زبان رہے گی۔ تو قرآن کی زبان عربی حق تعالیٰ شانہ کا کلام عربی، اہل جنت کی زبان عربی تو یہ عربی زبان کی فضیلت وخفت اور اسکا ہلکا پھلکا ہونا دلیل سے واضح ہوگیا۔

سابقہ کتب کی زبان...... ابتداء میں حق تعالیٰ کی کتابیں عبرانی اور سریانی زبانوں میں نازل ہوئیں تو عبرانی ثقیل زبان ہے، جب اس کو ہلکا پھلکا کیا گیا تو اس کی شکل عربی ہوگئی، ورنہ ابتداً وہ ثقیل تھی، مثلاً توراۃ عبرانی زبان میں اتری ہے، ایک آیت ہے اس سے اندازا کیجئے کہ اس میں زبان کو کتنا اینچنا پڑتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاں پیشن گوئی کی تو فرمایا کہ: ''نابی بخر بحاما خوخا یا خیم نی یخو خاد جسمهم'' اس میں سوائے خا''خ'' کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا جب اس کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ معنیٰ نہیں بلکہ لفظاً تو یوں ہوگیا نابی سے نبی تو ہوگیا۔ یعنی ''خر بحنا یعنی من قربک بخر بخا کی جگہ آگیا: من تربک ماخوخا یعنی من اخیک یا خیم لخا یعنی یقیم لک یخوخا الهک فتسمون.''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیشن گوئی فرمائی گئی کہ نبی آئیں گے تمہارے قریب کے ہوں گے، تم بنی اسرائیل ہو وہ بنی اسماعیل ہوں گے، چچا تائے کے بھائی ہوں گے۔

''نابی بخر بخا یعنی نبی من قوبک ما خوخاً یعنی من اخیک'' تمہارے بھائی ہوں گے ''یا خیم لخا یعنی یقیم لک'' وہ اللہ کی الوہیت کو قائم کریں گے، اور اللہ کی عظمت وبزرگی اور اس کی عبادات کو قائم کریں گے، تو اب کہاں نابی بخو خایا خیم لخا یاخوخا ہے۔ اور کہاں نَبِیٌّ مِّنْ قُرْبِکَ مِنْ اَخِیْکَ یُقِیْمُ لَکَ اِلٰھَکَ.

تو لطافت کا فرق نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں تو زبان کو ذرا اینچنا پڑتا ہے اور ایک میں زبان ہلکی پھلکی چلتی ہے، چوں کہ زبان خود خفیف تھی اور اس میں یہ کلمات اور بھی زیادہ خفیف اور اخف ہیں تو فرمایا: خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ان دوکلموں کو ادا کرو تو زبان پر بھاری نہیں ہیں، بہت ہلکے پھلکے ہیں نہ کچھ وقت لگتا ہے نہ کوئی پیچیدگی بلکہ پل بھر میں کلمات ادا ہوجاتے ہیں۔ تو ایک صفت تو یہ بیان کی گئی کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں، یہ صفت حسی، یعنی جب آپ سنیں گے تو کان محسوس کریں گے کہ بڑی ہلکی پھلکی چیز ہے۔

وصفِ ثانی وزنِ اعمال اوران کی کیفیت...... دوسری صفت'' ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ'' زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں وزنی اور بھاری اجر اتنا بڑا ہوگا کہ آدمی بظاہر کتنا ہی پڑھے اتنا اجر نہیں ملے گا جتنا ان دوکلموں کے پڑھنے سے ملے گا تو میزان عمل میں وزنی اور ثقیل ہوں گے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت...... وزن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی وزن اور ایک معنوی ہے جسمانی وزن تو

اجسام کا یہ ہے کہ سیر بھر کا وزن کم ہے دوسیر کا زیادہ اور تین سیر کا اس سے زیادہ اور دھڑی بھر کا اس سے زیادہ اور من کا اس سے زیادہ۔ تو ایک تو مادی ہے جو مادیات سے متعلق ہے جتنی مادی چیز ضخیم ہوگی اور بڑی ہوتی جائے گی وزن بڑھتا جائے گا۔ اور ایک معنوی وزن ہے تو ان دو کلمات میں معنوی وزن ہے۔ ترازو میں تو لنے لگو تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے معنی پر غور کرو تو نہایت باعظمت معنی ہیں جس کا بوجھ پڑتا ہے۔ بوجھ فقط مادی نہیں ہوتا بلکہ روحانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں عالم آئے تو میرے دل پر بوجھ پڑا۔ ان کے آنے سے کیا بوجھ؟

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ سیر کا وزن رکھا گیا؟ نہیں بلکہ ان کی عظمت کا بوجھ پڑا۔ ان کے اندر جو روحانی قوت تھی اس کی ہیبت پڑی اور میرا دل بیٹھنے لگا اور انکی عظمت کو مان لیا۔ تو حق تعالیٰ کی عظمت جو دلوں میں ہے وہ معنوی عظمت ہے کہ بوجھ ہے اور وہ بوجھ معنوی ہے، حق تعالیٰ مادیات سے بری ہیں۔ اسی طرح ان کا کلام بھی مادیات سے بری ہے۔ روحانی اور لطیف ہے اس کا بوجھ قلوب کے اوپر پڑتا ہے۔ اگر کوئی جاہل کلام کہے تو آپ کے دل میں قطعی احسان نہیں ہوگا کہ بھائی یہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے اگر کوئی عالم کلام کرے تو آپ غور کریں گے اور کہیں گے کہ بڑا وزنی کلام ہے دل میں بیٹھتا نہیں ایک دفعہ اور سنا دو ایک دفعہ اور سنا دو تا کہ دل میں پوری طرح بیٹھ جائے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لائے، تو فرمایا کہ ان کے آنے سے میرے دل پر ان کی عظمت کا بوجھ پڑا، یہ بوجھ مادی وزن نہیں تھا روحانی وزن تھا، جو باعظمت ہوتا ہے اس کے اثر کو روح قبول کرتی ہے، دل قبول کرتے ہیں، کاغذ کے اوپر اگر آپ یہ کلمہ لکھ دیں تو کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ لیکن جب پڑھنے لگیں۔ اور عظمت خداوندی سامنے آئے تو جی لرزنے لگے گا جیسے کسی چیز کو اٹھایا نہیں جا سکتا تو یہ معنوی بوجھ ہوتا ہے، تو یہاں مراد معنوی بوجھ ہے، کہ میزان عمل میں جب اس کلمے کو تولا جائے گا تو میزان عمل اس کی عظمت کے بوجھ سے جھک جائے گی۔

وزنِ روحانی...... جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن ایک بندہ حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ اس کی بدکاریوں کے انبار ہوں گے۔ ایک دفتر کو پھیلاؤ تو زمین و آسمان جھک جائیں۔ وہ حاضر ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔ کہ اے بندے اپنے اعمال کو تلواؤ۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اللہ میں کا ہے کو تلواؤں میرے پاس تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ تولنے کی ضرورت تو تب ہو جب ایک طرف نیکی ہو اور دوسری طرف بدیاں ہوں۔ یہ تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ فرمایا کہ نہیں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ننانوے دفتروں میں ایک پرچی نکلے گی کہ پوری عمر میں ایک مرتبہ ل "آاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کلمہ طیبہ پڑھا ہوگا تو وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ ان ننانوے دفتروں کے مقابلہ میں اس پرچی کی کیا حیثیت ہوگی؟ میں تو جہنم کا مستحق ہوں۔ مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے، میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ مقام کریم تک پہنچ سکوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ﴿لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے، ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا، تم تلواؤ اور اپنی نگرانی میں تلواؤ کہیں تو

یوں نہ کہے کہ ملائکہ علیہم السلام نے کوئی زیادتی کردی ہے کم تول دیا یا زیادہ تول دیا۔ وہ ننانوے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔﴿ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾

اللہ کے نام سے زیادہ وزنی نام کون سا ہوسکتا ہے جس کی اندر عظمت کا بوجھ ہو تو اسی کے نام پاک کا یہ کلمہ بھی ہے ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ'' کہ اس کی عظمت سے میزان کا پلڑا جھک جائے گا اگر چہ لاکھوں بدیاں اور برائیاں ہوں مگر اس کی عظمت غالب آجائے گی اور وہ جھک جائے گا، تو مطلب یہ کہ ایک وزن مادی ہوتا ہے اور ایک وزن روحانی اور علمی ہوتا ہے۔ یہاں روحانی اور علمی وزن مراد ہے۔

درود شریف کی برکت...... نیز حدیث میں جیسے فرمایا گیا کہ اس امت کے ایک فرد کو جہنم کا حکم دے دیا جائے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس کو جہنم کی طرف لے جا رہے ہوں گے اور وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوگا کہ کوئی مددگار ہے یا نہیں؟ تو حضرت آدم علیہ السلام کی نگاہ اس پر پڑے گی تو حضرت آدم علیہ السلام پکاریں گے کہ یَـآ اَحْمَدُ! یَـآ اَحْمَدُ! آپ عرض کریں گے: لَبَّيْكَ يَـآ اَبَا الْبَشَرِ حاضر ہوں۔ تو وہ فرمائیں گے آپ کی امت کا ایک آدمی ہے۔ جسے جہنم کی طرف لے جایا جارہا ہے تو آپ ملائکہ کا پیچھا کریں گے اور ان سے فرمائیں گے رک جاؤ، وہ کہیں گے ہمارا نام زبانیہ ہے ہم جہنم کے ملائکہ ہیں اور ہم امر خداوندی کے مامور ہیں ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے، امر خداوندی آچکا ہے، تو آپ بہت ہی تاسف سے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیریں گے، اور جا کر عرش کے نیچے سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے کہ:

اے اللہ! میرا ایک امتی ہے، بے شک گنہگار ہے مگر آپ کی رحمت وسیع ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم آپ کو رسوا نہیں کریں اور ادھر سے آواز دی جائے گی: لَا تَعْجَلُوْا جلدی مت کرو، ملائکہ رک جائیں گے، آپ تشریف لائیں گے اور اپنی جیب میں سے ایک پرچہ نکالیں گے جیسے اس وقت کی جیب ہوگی، جیسا لباس ہوگا، خدا بہتر جانتا ہے پرچہ نکالیں گے، اور بِسْمِ اللّٰهِ کہہ کر آپ اس کو میزان عمل میں ڈالیں گے، ایک دم نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا اور اس کی نجات ہو جائے گی۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتا نہیں ہوگا تو آ کر عرض کرے گا اے نیک نہاد! آپ کون ہیں جو اس آڑے وقت میں میری امداد کی اور مجھے جہنم سے بچایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے: اَنَـا اَحْمَدُ میں تیرا نبی ہوں میرا نام احمد ہے تو وہ جھک جائے گا اور کہے گا، سبحان اللہ یہ آپ نے آ کے کیا کیا۔ میرا تو پلڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ تو نے ایک دفعہ نہایت ہی کمال اخلاص کے ساتھ درود بھیجا تھا وہ درود کی پرچی میرے پاس جیب میں محفوظ تھی۔ وہ اتنے اخلاص سے بھرا ہوا تھا کہ جب میں نے وہ پلڑے میں ڈالی تو اس اخلاص کی برکت سے وہ ساری بدیاں ہلکی پڑ گئیں۔

ظاہر بات ہے کہ درود شریف کو اگر پرچی پر لکھ کر جیب میں ڈال لیں تو کوئی وزن محسوس نہیں ہوگا لیکن روح اس کے وزن کو محسوس کرے گی۔ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ روح محسوس کرے گی تو حق تعالیٰ شانہ قیامت

کے دن اعمال کے ڈھانچوں کو نہیں دیکھیں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر اخلاص کتنا ہے سچائی کتنی ہے محبت خداوندی کتنی ہے درحقیقت اس کا وزن ہوگا حدیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے اور میزانِ عمل میں اپنی معنویت کی وجہ سے بھاری ہیں تو یہ دوسرا وصف ہوا یہ وصف حسّی نہیں ہے بلکہ وصف روحانی ہے اس کو ارواح وقلوب محسوس کریں گے۔

تیسرا وصف...... تیسرا وصف ذکر کیا کہ: ''حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ'' یہ دونوں کلمے وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں ظاہر بات ہے کہ جب کسی کے پاس اس کی پسندیدہ چیز ہدیے میں لے جائیں گے تو توجہ بہت ہوگی۔فطرت کا تقاضہ ہے کہ کوئی ایسا ہدیہ لے جائیں جس سے اگلا کراہت محسوس کرے تو پسند نہیں کرے گا قبول نہیں کرے گا کوئی ایسی چیز لے جائیں جو مرغوب ہے تو شکریہ بھی ادا کرے گا اور خوش بھی ہوگا، تو یہ کلمات حق تعالیٰ شانہ کو محبوب ہیں، محبوب چیز کا جب ہدیہ پیش ہوگا تو عنایات متوجہ ہو جائیں گی۔محبوب کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں الوہیت کے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقامِ الوہیّت...... مقاماتِ الوہیّت چار ہیں جو خصوصیات خداوندی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اس میں شرک کی گنجائش نہیں ہے۔

پہلا مقام...... سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، تنزیہہ کے معنی ہیں۔اللہ کی پاکی بیان کرنا ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے پاک ہر نقص سے بری وبالا۔کوئی ادنیٰ درجے کے نقص کا شائبہ یا عیب کا شائبہ ممکن نہیں۔تصور میں بھی نہیں آسکتا تو سب سے پہلی چیز حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہے، اللہ ہر عیب سے ہر ذم سے یعنی برائی اور کوتاہی سے پاک ہے تو تسبیح کے معنی درحقیقت تنزیہہ کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے اور سب چیزوں سے بالا ہے جس کو قرآن حکیم میں مختلف عنوانات میں بیان فرمایا گیا ہے۔کہیں فرمایا گیا: ﴿لَا تَـاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ ① نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اس لئے کہ یہ تھکن کی علامت ہے اور تھکن ضعف کی علامت ہے اور وہ قوی ہے اس کا ضعف سے کیا کام کہیں فرمایا: ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى﴾ ②

میرا پروردگار نہ بہکتا ہے اور نہ بھولتا ہے بھول اور بہک ضعف کے سبب سے ہوتی ہے اور حافظہ قوی نہ ہو۔ اور وہ تو قوی ہے وہاں بھول چوک کا کیا کام؟ تو یہ آیتیں تنزیہہ کے لئے ہیں ۔ ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى﴾ ﴿لَا تَـاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ نہ وہاں نیند ہے نہ وہاں اونگھ ہے اور نہ وہاں معاذ اللہ بہکنا ہے اور نہ وہاں نسیان ہے۔ ہر چیز سے وہ بری وبالا ہے اس کا علم قطعی اور محیط ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تو ساری چیزیں ''سبحان'' کے نیچے آتی ہیں کہ اللہ نوم سے، اونگھنے سے، بہکنے سے اور بے راہ چلنے سے بھی پاک ہے تو سبحان کا کلمہ تنزیہہ کے لئے رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم نے اس کی طرف دعوت دی ہے، کہیں فرمایا: ﴿فَسُبْحَانَ

---

① پارہ:۳،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۲۵۵. ② پارہ:۱۶،سورۃ طٰہٰ،الآیۃ:۵۲.

اللہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ﴾ ” اللہ پاک ہے تم صبح کرو یا شام کرو“ یعنی صبح و شام تغیر کی علامت اور تغیر ضعف کی علامت ہے اور وہ ان سب سے بری ہے سارے تغیرات تمہارے اندر ہیں۔ ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ ① ”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی اور مسجد اقصیٰ سے سمٰوٰت کی طرف رجوع فرمایا“۔ کہیں فرمایا: ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی﴾ ② ”اپنے رب کی پاکی بیان کرو“ اور کہیں فرمایا: ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الۡاَرۡضِ﴾ ③ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الۡاَرۡضِ﴾ ④

تو جگہ جگہ قرآن کریم نے تسبیح کا لفظ استعمال کیا ہے، جہاں تنزیہہ بیان کرنی مقصود ہے کہ وہ ہر کوتاہی، ہر عیب، ہر شئی سے منزہ ہے تو حق تعالیٰ شانہ، کی ذات کا پہلا مقام تنزیہہ ہے کہ وہ ہر عیب سے بری و بالا ہے۔

دوسرا مقام...... اس کے بعد دوسرا مقام اس کی عظمت شان کا ہے کہ اس کی شان سب سے بڑی اور نرالی ہے اور لامحدود عظمتوں کا وہ مالک ہے اس کے لئے شریعت نے حمد کا کلمہ رکھا ہے ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ⑤

حمد کے معنی یہ ہیں کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور تعریف کبھی برائی پر تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ کمال پر ہوتی ہے تو جب ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سارے کمالات اسی کے لئے ہیں وہ سارے کمالات کا مصدر ہے۔ ہر خیر اور ہر برکت اس کی طرف سے ہے، ہر کمال اس کا۔ ہر علم اس کا ہے، ہر خوبی اس کی ہے وہ تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔ تو کمالات کا سرچشمہ ہونے سے ظاہر کیا ہے کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور جب ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں تو سارے کمالات بھی اس کے لئے ہیں اس لئے کہ حمد کسی جمیل اختیاری پر ہوتی ہے کہ کوئی عمل اور کام ارادی اور اختیاری اتنا اعلیٰ ہو کہ جی چاہتا ہو کہ اس (کے صانع) کی تعریف اور حمد کریں۔ تو اس حمد کے ظاہر کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ نے حمد کا کلمہ رکھا ہے۔ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ⑥ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ﴾ ⑦ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الۡاَرۡضِ﴾ ⑧

تو جگہ جگہ حمد کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ بعض سورتیں کلمہ حمد سے شروع ہوتی ہیں تو عرض تنزیہہ ہے کہ پاکی بیان کی جائے اس کے لئے سبحان کا کلمہ ہے اور تحمید ہے، یہ الوہیت کا دوسرا مقام ہے۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۱۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الاعلی، الآیۃ: ۱۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۱۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الصف، الآیۃ: ۱۔
⑤ سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ: ۱۔ ⑥ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۱۔
⑦ پارہ: ۵، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۔ ⑧ پارہ: ۲۴، سورۃ السباء، الآیۃ: ۱۔

تیسرا مقام......اور ظاہر بات ہے کہ جو ذات ایسی ہو۔ ہر عیب سے پاک اور کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی اس کے سوا کس کی ہو سکتی ہے؟ ساری برکتیں اس کی ساری عظمتیں اس کی اسی لئے فرمایا گیا: ﴿وَلَـــهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لئے اسلام میں تکبیر کا حکم ہے وہ اکبر ہے یعنی ہر چیز سے بالا ﴿ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ﴾ وہی بڑا، وہی عالی اور بلند ہے اس کیلئے تکبیر کا حکم ہے اَللّٰهُ اَكْبَر یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہر بڑائی اس کے سامنے حقیر ہے ہر عظمت اس کی عظمت کے سامنے چھوٹی ہے۔ اب کوئی انڈے کے سامنے چراغ جلا دے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ اور سورج کے سامنے انڈا جلا دے تو انڈے کی کیا حقیقت ہوگی؟ اس کا سارا نور سورج کے نور میں گم ہو کر رہ جائے گا، سورج کے سامنے چراغ جلا دے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ تو انوار ربّانی کے سامنے کوئی نور نہیں چلتا سب مدہم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انوار ربّانی کے سامنے کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔ تو کبیر کے معنی یہ ہیں کہ بلندی، برتری اور بالائی سب اسی کے واسطے ہیں جس کو ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے تعبیر کیا کہ آسمانوں اور زمینوں میں اسی کے واسطے بڑائی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِىْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِىْ فَمَنْ نَّازَعَنِىْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ۔'' تکبر اور بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا تو میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچے دکھاؤں گا۔ اس لئے جو بھی کسی مجلس میں بڑا بول بولتا ہے تو یقیناً اسی مجلس میں اس کی حقارت کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ سہائی (معافی) ہے۔ لیکن کبر اور نخوت جب ہوگی تو ہاتھ کے ہاتھ اس کو جواب ملے گا۔ اس کی مغفرت نہیں یہ قابل برداشت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ گناہ بندے کا اپنا فعل ہے، اور اپنی صفت ہے اور کبریائی و بڑائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جو اس کی بڑائی میں حصہ دار بننا چاہے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کو نیچا دکھایا جائے گا۔ ذلیل ورسوا کیا جائے گا تو عظمت و کبریائی تیسرا وصف ہے۔

چوتھا مقام......حق تعالیٰ کی تمجید یعنی اس کی عظمت اس کی بزرگی اور اس کی بڑائی کے لئے تکبیر کا کلمہ رکھا گیا ہے کہ: ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ'' اللہ ہر چیز سے بڑا ہے، اب ظاہر بات کہ جو ہر عیب سے پاک ہے، اور خوبی کا سرچشمہ ہو، بڑائی بھی اسی کے لیے ہو تو اس کے علاوہ یکتائی کے لائق اور کون ہو سکتا ہے۔ اس سے توحید پیدا ہوتی ہے، اس کے لئے تہلیل کا حکم رکھا گیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے آگے جھکیں گے، اسی کے آگے فریاد کریں گے اسی سے مدد مانگیں گے اور اسی کی طرف رجوع کریں گے وہی دافع امراض ہے ہر عبادت اسی کے لئے ہوگی۔ تو یہ دعویٰ توحید چوتھا مقام ہے۔

دعویٰ توحید کی تکمیل......اس سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ توحید کا دعویٰ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ تین مقام سامنے نہ ہوں تنزیہہ مکمل ہو کہ ہر عیب سے پاک ہو تنویہہ ہو کہ ہر خوبی کا مالک ہو، تکبیر مکمل ہو کہ ہر عظمت اس

کی ہو، جب یہ تین چیزیں ثابت ہوں گی تب توحید کا وجود ہوگا۔ اگر کوئی اللہ کی تنزیہہ نہ کرے اس میں مخلوق کی صفات مان لے یا مخلوق میں خالق کی صفات مان لے تو وہ کبھی بھی توحید کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ ہوگا توحید کا پہلا قدم تنزیہہ کہ ہر عیب سے اس کی پاکی بیان کرو. ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ ①

نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ اس کی کوئی اصل ہے، وہ خود اصل ہے نہ وہ کسی کو جنے گا کہ اس کا کوئی بیٹا ہو یا کوئی اس کی بیوی ہو یا کوئی کفو اور برابر ہو۔ تو ان سب چیزوں سے آدمی پاکی بیان کرے گا، تب توحید کے مقام پر پہنچے گا۔ اللہ کے باپ ہونے کا قائل ہو جائے، اللہ کے لیے بیوی ہونے کا قائل ہو جائے، اس کے لئے کسی برابری کا قائل ہو جائے، اس کیلئے کسی شریک ہونے کا قائل ہو جائے۔ وہ کبھی توحید کا مدعی نہیں بن سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا ہوگا، اس لئے کہ توحید کا پہلا قدم تنزیہہ ہے۔ تو چاہے نصاریٰ توحید کا دعویٰ کریں، چاہے مشرکین کریں مگر وہ زبانی دعویٰ ہے حقیقت اس میں کچھ نہیں، کیوں کہ ان کے پاس تنزیہہ نہیں اس طرح سے تنویہ یعنی ساری عظمتیں اور بڑائیاں اس کی ذرہ برابر اس میں نقص نہیں، اگر حق تعالیٰ کی ذات میں ادنی درجے کا نقص مان لے گا تو وہ تنویہ کے خلاف ہوگا اور توحید کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

جیسے یہود نے بندوں کی ناقص صفات اللہ میں تسلیم کیں اور کہا کہ جب طوفان نوح آیا تو حق تعالیٰ بیٹھ کر رونے لگے۔ ہائے میری مخلوق ڈوب رہی ہے تو معاذ اللہ اس کی اتنی قدرت نہیں تھی کہ بچالے تو رونے بیٹھ گئے۔ اتنے روئے کے آنکھیں دکھنے آگئیں اور فرشتے مزاج پرسی کو پہنچ گئے کہ حضرت اب آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟ تو معاذ اللہ معاذ اللہ یہود نے خالق کے اندر مخلوق کی ناقص صفات مان لیں اور نصاریٰ نے خالق کی مخصوص صفات مخلوق میں مان لیں، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تین معبودوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم غیب کلی رکھتے ہیں۔ کہ سب سے پہلا دعویٰ نصاریٰ کا ہے کہ وہ محیط الکل ہیں، مقتدر اعلیٰ پیدا کرتے ہیں، چاہے موت دے دیں یا زندگی جو الوہیّت کی خصوصیات تھیں وہ بندے میں مان لیں جو بندے میں مانی نہیں جا سکتی تھیں اور یہود نے جو بندوں کی ناقص صفات تھیں وہ خدا میں مان لیں۔ تو انہوں نے جو حدود تھیں توڑ دیں۔ خالق اور مخلوق کا فرق اٹھا دیا تو جب اللہ کی تنزیہہ باقی نہ رہے تو بھی توحید کو آدمی نہیں پا سکتا۔

خصوصیّت الوہیّت...... اس کے بعد تیسری چیز تکبیر ہے کہ ساری عظمتیں اس کی ہیں، جس میں بھی عظمت ہے تو وہ اس کی عظمت کا جلوہ اور پرتو ہے، فی ذاتہ کسی میں عظمت نہیں ہے بذاتہ عظمت صرف ذات حق میں ہے وہ کسی کو عظمت عطا کر دیں تو وہ عظمت والا بن جائے گا، عظمت چھین لیں تو وہ بے عظمت بن جائے گا، کسی کو حکومت دے دیں تو وہ حاکم کہلائے گا، حکومت چھین لیں تو حاکم باقی نہیں رہے گا۔ کسی کو ملک دے دیں تو وہ ملک کہلائے گا۔ کسی سے چھین لیں تو وہ ملک باقی نہیں رہے گا۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص، الآیۃ: ۳.

لیکن اللہ کا ملک ہونا ازل سے لے کر ابد تک ہے۔ اس کی کسی کی دی ہوئی حکومت نہیں وہ بالذات ملک ہے، اس کی ملکیت بالذات ہے، یہ نہیں ہے کہ اس کی ملکیّت کو اس سے کوئی چھین لے، ہر ایک ملکیّت چھن سکتی ہے ہر ایک کا ملک جاسکتا ہے ہر ایک کا اقتدار جاسکتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے آتا بھی ہے جاتا بھی ہے۔ لیکن ازل سے لے کر ابد تک جس کی قدرت محیط، جس کا اقتدار محیط، جس کا ملک محیط جس کی مِلک محیط۔ وہ صرف حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں، اس لئے عظمتوں کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے، اسی لئے نمازوں میں سبحان ربی العظیم پڑھتے ہیں، تاکہ عظمت نمایاں ہو، یہ چار مقام ہوئے، یہ مقام توحید کا انتہائی درجہ ہے، ابتدائی درجہ تنزیہہ کا ہے، پھر تنویہ کا پھر تکبیر کا پھر جا کر توحید کا مقام آتا ہے، ان تینوں کو پھلانگ کر کوئی توحید تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ کرے گا۔

حدیثِ متعلقہ...... حدیث مذکورہ میں یہ چاروں مقام بیان فرمائے گئے ہیں، "سُبْحَانَ اللهِ" میں تنزیہہ آ گئی کہ ہر کمال کا وہ مالک ہے، ہر عظمت کا مالک وہ ہے، اس کے لیے حمد ہے، اور "سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْم" کے اندر عظمت آ گئی کہ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں، جب ساری بڑائیاں اس کے لیے ہیں تو سارے کمالات اس کے لئے ہیں، اس لئے وہ سارے عیبوں سے بری اور بالا ہے تو التزامی طور پر یکتا وہی ہوگا۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" بھی اس سے نکل آیا۔ اور ایک حدیث میں تو ان چاروں باتوں کو عبارۃً بیان کیا گیا ہے جیسے فرمایا گیا کہ: "اَحَبُّ الْكَلِمَاتِ اِلَى اللهِ اَرْبَعٌ" سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کو چار کلمے ہیں: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" ان چاروں کلموں کو محبوب کہا گیا ہے۔ تو یہاں عبارت کے اندر چاروں کلمے موجود ہیں۔

سُبْحَانَ اللهِ بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی، اَللّٰهُ اَكْبَرُ بھی اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی۔ تو اس کلمہ (یعنی حدیث مذکورہ فی الباب) میں تین عبارۃً موجود ہیں اور ایک اقتضاء ہے کہ عبارت از خود اس کا تقاضا کرتی ہے، اور وہ اس طرح کہ سبحان اللہ میں تو تسبیح آ گئی اور وبحمدہ میں حمد آ گئی۔ العظیم میں عظمت آ گئی اور ان تینوں کے مجموعے سے لازم آ گیا کہ ایک ایسی ذات جو یکتا ہے تو اس سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نکل آیا۔ تو وہاں عبارت میں چاروں مقامات موجود ہیں اور یہاں تین تو عبارت النص میں موجود ہیں اور ایک اقتضاء النص سے نکلتا ہے، یہ چاروں کلمے اللہ کو محبوب ہیں۔

محبوب کیوں ہیں؟ اس لئے کہ یہ کلمات اس کے مقام کے ترجمان ہیں، اور فطرت ہے کہ جس میں کسی کی واقعیت بیان کی جائے تو وہ اس کو پسند ہوگی، آپ کسی کی بیٹھ کی تعریف کریں تو بڑے غور سے سنے گا اور بہت خوش ہوگا اور اگر برائی کریں تو رنجیدہ ہوگا، بھلائیاں بیان کریں خوش ہوگا، کیوں خوش ہوگا؟ اس لئے کہ وہ بھلائیاں اس کے اندر موجود ہیں، تو وہ خوش ہوگا کہ اس کے سنانے والے موجود ہیں۔ اس کو بیان کرنے والے موجود ہیں۔ تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی کی خوبی بیان کی جائے تو وہ خوبی والا فطرۃً خوش ہوتا رہے گا، اس کے لئے دلیل کی حاجت نہیں حق تعالیٰ کی خصوصیات جب کوئی بندہ بیان کرے گا، تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں وہ پسند ہوں گی۔ وہ چیزیں ان کے سامنے محبوب بنیں گی یہ الوہیّت کی خصوصیات تھیں، اس لئے جب بندہ انہیں ادا کرے گا تو یہ کلمے

بھی محبوب بنیں گے اور ادا کرنے والا بھی محبوب بنے گا۔

حدیث میں مذکور اوصافِ ثلثہ اور صفتِ علم کی فوقیت ......تو اس سے میں نے عرض کیا کہ تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک حسّی وصف ہے ایک معنوی وصف ہے اور ایک غیبی وصف ہے حسّی وصف تو یہ ہے کہ زبان پر ہلکے پھلکے ہیں ہر ایک محسوس کرے گا۔ معنوی وصف یہ ہے کہ میزانِ عمل میں وزنی اور ان کی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے اور غیبی وصف یہ ہے کہ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنعت قابل داد ہے کہ سب سے پہلے وحی کا ذکر کیا کہ وہ پسندیدہ چیز ہے چوں کہ وحی کی حقیقتِ علم ہے اور علم سب سے بڑی صفت ہے تمام صفات سے، اس لئے کہ جتنی بھی صفات ہیں وہ اپنی کار گزاری میں علم کی محتاج ہیں لیکن علم اپنے کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ سب سے اول ارادہ ہے ارادہ آپ جب کریں گے جب مراد کا علم ہو جائے گا۔ اگر مراد ہی معلوم نہیں تو آپ کس کا ارادہ کریں گے اسی طرح قدرت ہے۔ قدرت جب آپ استعمال کریں گے جب اس مقدور کا علم تو ہو کہ مجھے قدرت کا ہے میں صرف کرنی ہے اگر اس مقدور کا علم ہی نہ ہو تو آپ قدرت کا بے جا صرف کریں گے۔ تو قدرت اپنے کام کرنے میں علم کی محتاج ہوتی ہے۔ ارادہ اپنے کام لانے میں علم کا محتاج ہے۔ اسی طرح اقتدار ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ وہ مقتدر چیزیں جن پر آپ کو اقتدار حاصل ہوگا۔ پہلے سے معلوم ہوں ایک ملک پر آپ اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس ملک کا علم تو ہو کہ وہ کہاں ہے تا کہ میں جا کر اس پر اقتدار کو قائم کر سکوں تو اقتدار نہیں آ سکتا جب تک مقتدر کا علم نہ ہو تو ارادہ بھی علم کا محتاج قدرت بھی علم کی محتاج اور اقتدار بھی علم کا محتاج۔ اسی طرح آپ کسی چیز کی حفاظت کریں تو پہلے اس شئی کا علم تو ہو جس کی آپ حفاظت کر رہے ہیں اور اگر شئی معلوم نہ ہو تو آپ حفاظت کس کی کریں گے تو حفیظ کی صفت کام نہیں کرے گی جب تک کہ پہلے علیم کی صفت نہ ہو تو ہر صفت اپنے کام میں علم کی محتاج ہے لیکن علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج۔

آپ ریل میں جا رہے ہیں تالاب آ گیا، آپ ارادہ کریں یا نہ کریں آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ تالاب ہے یہ نہیں کہ آپ ارادہ کریں تو یہ معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے اور اگر ارادہ نہ کریں تو کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ تو ارادہ کی احتیاج نہیں جب شی سامنے آ جائے گی تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ آپ نے شہر دیکھ لیا علم ہو گیا کہ یہ شہر ہے۔ علم اس کا محتاج نہیں ہے کہ پہلے آپ شہر پر اقتدار حاصل کر لیں اور پھر معلوم ہو (کہ شہر ہے) تو آپ کو اس پر اقتدار حاصل ہو نہ ہو۔ جب شہر سامنے آئے گا تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ فلاں شہر ہے۔ تو علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج ورنہ ساری صفات علم کی محتاج ہیں تو علم اُم الصفات ہے سب سے اونچی صفت ہے اور ظاہر بات ہے۔ کہ جب علم سب سے زیادہ اونچی صفت ہے اور تمام صفات اس کی محتاج ہیں تو وحی بھی حقیقتِ علم ہی تو ہے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر وحی فرمائیں اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہی ہے کہ اپنا علم القاء کر دیا۔ تو وحی کے دوسرے معنی

علم خداوندی کے ہیں تو وحی بھی محبوب چیز ہوئی کیوں کہ علم انسان کو محبوب ہے تو محبوب چیز سے اپنی کتاب کی ابتداء کی۔ یعنی بدءالوحی سے اور محبوب ہی چیز پر کتاب کو ختم کیا ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ''

''اب ظاہر بات ہے کہ جو کتاب محبوبات سے شروع ہو اور محبوبات پر ختم ہو تو بیچ کی ساری باتیں محبوبات میں داخل ہو جائیں گی''۔ ''اول بآخر نسبت دارد'' ہر اوّل کو اپنے آخر سے نسبت ہوتی ہے اور بیچ کی چیزیں اوّل یا آخر کے تابع ہوتی ہیں۔ کتاب کی ابتداء بھی محبوب چیز سے ہوئی وہ علم خداوندی ہے اور کتاب کی انتہا بھی ایک ایسے عمل سے ہوئی کہ وہ عمل محبوب خداوندی ہے یعنی ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' پڑھنا یہ عمل محبوب ہے، تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنعت بھی واقعی نرالی اور انوکھی ہے جہاں ان کا دل اور قلب پہنچا دوسرے نہیں پہنچ سکے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان اور ان کا کمال وہ اسی کا مقتضی تھا کہ کتاب بھی اتنے ہی کمالات سے بھری ہوئی ہو۔

صحتِ بخاری...... تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرنے میں یکتا ہیں کہ صحیح بخاری کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ ان کی شرائط پر منطبق ہیں وہ نہایت ہی اونچی حدیثیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحیح حدیث کسی اور کتاب میں نہیں ہے مسلم میں بھی صحیح حدیثیں ہیں ترمذی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔ نسائی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔ جو صحیح حدیثیں اور کتابوں میں بھی ہیں مگر جن شرائط اور محتاط طریقے سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ قبول کرتے ہیں ان سب سے نیچے ہیں۔ ان کی نہایت پکی شرطیں ہوتی ہیں۔ ان میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی کڑی شرطیں راویت میں لگائی ہیں کہ وہ اور صحیحوں سے بڑھ کر روایت میں صحیح ہیں جن کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کر دیا۔ اسی لئے امّت کا اس پر اجماع ہے: ''اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللهِ'' کہ اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری ہے۔ کتاب اللہ کے بعد اس کا درجہ رکھا گیا۔ اول تو طبعًا بھی بعد میں اس کا مرتبہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کتاب اللہ میں تو اللہ کا علم ہے۔ کتاب اللہ کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کا علم ہو، اور یہ صحیح بخاری درحقیقت کتاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول کا درجہ تو اللہ کے بعد ہی ہے اس لئے رسول کی کتاب کا درجہ بھی اللہ کی کتاب کے بعد ہوا۔ تو اعلیٰ ترین صحت کتاب اللہ کی ہے کہ اس عالم میں کسی آسمانی کتاب کو وہ صحت نصیب نہیں ہوئی وہ فصیحت اور سندیت نصیب نہیں ہوئی، جو کتاب مبین کو ہوئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کلام اللہ درحقیت صرف یہی ہے۔

سابقہ کتب سماوی کی حیثیت...... توراۃ حقیقی معنی میں کلام اللہ نہیں ہے انجیل بھی حقیقی معنی کے لحاظ سے کلام اللہ نہیں اس لئے کہ کلام کہتے ہیں مایتکلم بہ جس کو بولنے والا بولے وہ کلام کہلاتا ہے لکھ کر دے دے اس کو مجازاً کلام کہہ دیں گے اس کو خط تو کہیں گے لیکن کلام نہیں کہیں گے یوں مجازاً آپ کلام کہہ دیں گے۔

آپ نے کوئی مضمون اپنے دل کی حکمت سے دوسرے کے دل میں ڈال دیا تو اسے کلام نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ آپ نے زبان سے تو وہ کلام نہیں کہا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دی گئی مگر پڑھ کر حق تعالیٰ نے نہیں

سنائی توراۃ کو الواح کے اوپر لکھ کر حوالے کر دیا تو توراۃ کتاب خداوندی ہے کلامِ خداوندی نہیں ہے مجازی طور پر اس کو کلامِ خداوندی کہیں تو کہہ سکتے ہیں حقیقی معنی میں کلام نہیں ہے اسی طرح کتاب انجیل ہے۔

وہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القا فرمایا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اس کو ادا کیا جیسے حدیث ہے کہ یہ وحی ہے مضمون حق تعالیٰ کا ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، اس میں وحی متلو وہ ہے جو قرآن ہے اور وحی غیر متلو یہ حدیث رسول ہے، وہاں الفاظ بھی اللہ کے ہیں اور مضمون بھی، انجیل میں مضمون تو حق تعالیٰ کا ہے لیکن اس میں الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ اس لئے انجیل کو مضمون خداوندی کہا جائے گا کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے تکلم نہیں کیا۔ مجازاً آپ کہہ دیں کہ یہ بھی کلام خداوندی ہے۔ لیکن قرآن حکیم حقیقی معنی میں کلام خداوندی ہے، حق تعالیٰ نے پڑھ کر سنایا بھی ہے تو مَـا یَتَـکَلَّمُ بھی ہے یعنی کلام بھی اللہ نے کیا اور مضمون تو اس کا ہے ہی اور لوح محفوظ میں لکھا بھی ہے تو یہ کتاب خداوندی بھی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے پڑھا بھی ہے اس لئے یہ کلام خداوندی بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کی عظمت سے تمام ملائکہ بے ہوش ہو جاتے تھے اور جب ہوش میں آتے تو پوچھتے: ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ﴾ ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام فرماتے کہ حق فرمایا ہے۔ اور وہ علی کبیر ہے۔ تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا ہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورا قرآن لا کر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔

صرف قرآن ہی کلام خداوندی ہے...... تو قرآن کریم کتاب خداوندی بھی ہے کہ سب سے پہلے اس کو لوحِ محفوظ میں لکھا گیا اور اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا کہ وہ حروف ذرا خفی تھے اور لوحِ محفوظ کے حروف جلی تھے بعض احادیث میں ہے کہ ایک ایک حرف کوہِ قاف کے برابر تھا جیسا لکھنے والا، ویسا اس کا قلم، ویسے اس کے حروف ویسے ہی اس کی لوح۔ لکھنے والا لامحدود عظمت والا ہے اس کے کلام کی کتابت بھی ایسی ہوگی اور حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر چھوٹے حروف میں لکھا گیا۔

یہاں سے حمائل کا ماخذ نکل آیا مسلمان بڑی تختی میں بھی قرآن کریم لکھتے اور چھوٹی حمائل شریف بھی گلے میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے حمائل بھی لکھ دی اور لوحِ محفوظ پر جلی حروف میں بھی لکھا۔ اس کا ماخذ بھی موجود ہے، بہر حال یہ کتابِ خداوندی بھی ہے جس کو قرآن کہتے ہیں اور کلامِ خداوندی ہے جس کا باری تعالیٰ نے اولاً تکلم کیا پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور علیہ الصلوۃ السلام کے سامنے تکلم کیا، احادیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں حضور علیہ السلام کے ساتھ دور کرتے تھے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام پڑھتے، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام پڑھتے، وفات کا جو سال ہے جو آپ کا آخری رمضان تھا اس میں دو مرتبہ دور فرمایا تو تکلم واقع ہوا۔ نبی کی زبان سے بھی یہ کلام ادا ہوا اور فرشتے کی زبان سے بھی یہ تکلم ہوا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی یہ تکلم

ہوا۔ تو کلامِ حقیقی صرف کلامِ خداوندی یہی قرآن ہے، دوسری چیزوں کا کلام مجازاً کہہ دیں گے حقیقتاً وہ یا کتابِ خداوندی ہے یا مضمونِ خداوندی ہے لیکن کلام اسی کو کہیں گے جس کے ساتھ تکلم واقع ہوا۔

قرآن وحدیث میں مابہ الامتیاز...... تو یوں کہنا چاہئے کہ حدیث مضمونِ خداوندی لیکن الفاظ حضور علیہ السلام کے ہیں اور قرآن کلام خداوندی ہے کہ لفظ بھی اللہ کا اس لئے اس کو وحی متلو کہتے ہیں کہ وہ تلاوت میں آتی ہیں اور اس (حدیث) کو وحی غیر متلو کہتے ہیں کہ یہ ان معنوں میں تلاوت میں نہیں آتی۔ لیکن محبت اور استفادے کا تقاضا ہے کہ اس کی بھی تلاوت کی جائے۔

چناں چہ بعض علماء کا معمول رہا ہے کہ جہاں وہ دو چار پارے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو وہاں وہ بخاری کا پارہ۔ یا نصف یا ربع یا ثلث مقرر کر لیتے تھے اور اس کی بھی تلاوت کرتے تھے تو اب بھی بعض علماء ایسے ہیں کہ وہ بخاری کی تلاوت کرتے ہیں دو تین سال میں ختم کر دیتے ہیں تو تلاوت کرنے میں ایک برکت حاصل ہوگئی دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا ہوتی ہے جتنا کسی کے کلام کو پڑھا جائے اس سے نسبت پیدا ہو جائے گی یعنی دل اٹک جاتا ہے اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر آدمی بامعنی پڑھے تو حقائق تک پہنچتا ہے اور اگر مراقبے کے ساتھ پڑھے تو کیفیات بھی طاری ہونے لگتی ہیں۔

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: جب تلاوت کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ دراصل تلاوت کنندہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، میں تلاوت نہیں کر رہا۔ حق تعالیٰ تلاوت کر رہے ہیں زبان میری ہل رہی ہے زبان میری ہے کلام ان کا ہے تکلم ہو رہا ہے: ﴿وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىO اِنْ هُوَاِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾

ہمارا نبی جو کلام کرتا ہے کلام ہمارا ہے زبان ان کی ہے زبان مظہر بنی ہوئی ہے۔ تو شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ تلاوت کرنے بیٹھو تو اس لحاظ سے کرو کہ کلام حق تعالیٰ کا ہے۔ وہ پڑھ رہے ہیں زبان میری حرکت کر رہی ہے۔ اس پر عبور ہو رہا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ جب یہ مراقبہ مضبوط ہو جائے گا تو صراحۃً غیب وکشف کے اندر سے آواز آنا بھی شروع ہو جائے گی کہ حقیقتاً تم تلاوت نہیں کر رہے ہو۔ حق تعالیٰ ہی تلاوت کر رہے ہیں اور جب وہ تلاوت کریں گے تو پورے عالم کا ذرّہ ذرّہ ناطق ہوگا۔ اس کلام کے ساتھ ہر درخت کے پتہ سے آواز آئے گی کہ تلاوت ہو رہی ہے۔

بہر حال یہ کلام خداوندی کی خصوصیت ہے کہ اس کی تلاوت کرو تو بڑھتا چلا جائے گا۔ تلاوت کثرت سے کرو گے تو حق تعالیٰ سے نسبت پیدا ہوگی اور اس کو مراقبہ سے کرو تو وہ کیفیات جو ان آیات میں بھری ہوئی ہیں وہ قلب پر طاری ہونا شروع ہو جائیں گی اور قلب وروح محسوس کریں گے اور قیامت میں جا کر آنکھوں کو محسوس ہوگا۔

عظمتِ قرآن اور پیغمبر کی جلالتِ شان...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: حق تعالیٰ لوحِ محفوظ کو (قیامت میں) خطاب کریں گے کہ قرآن لاؤ۔ وہ عرض کرے گی کہ قرآن تو جبرائیل امین لے گئے تھے جبرائیل علیہ السلام کو بلایا جائے گا تو وہ اس طرح آئیں گے کہ ان کے ہاتھ پیر کانپتے ہوں گے۔ اتنا مشکل ہوگا لرزتے ہوئے ہوں

گے کہ معلوم نہیں کیا ہوگا؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ قرآن لوحِ محفوظ سے تم لے کر آئے ہو؟ عرض کریں گے، میں لے کر آیا، کہاں لے کر گئے، میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا۔

تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی ہوگی۔ حق تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ ہمارا قرآن آپ تک جبرائیل نے پہنچایا۔ آپ فرمائیں گے بلاشک پہنچایا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے آپ نے کیا کیا؟ میں نے اپنی امت کے سامنے تلاوت کیا اور اس کو پڑھا اور تعلیم بھی دی اس کی کیفیات بھی میں نے بتائیں ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا اب ہمارے سامنے اور ان امتوں کے سامنے بھی تلاوت کرو۔ حدیث میں ہے کہ آپ کا منبر اس مقام پر بچھا دیا جائے گا۔ جہاں آج آپ کا منبر بچھا ہوا ہے یعنی مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں۔ اس پر بیٹھ کر آپ تلاوت فرمائیں گے پوری ترتیل کے ساتھ اوّل سے لے کر آخر تک پورقرآن پڑھیں گے اور دنیا کی سار ی امتیں سنیں گی۔ تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے اب تک سنا ہی نہیں جو آج سن رہے ہیں اس لئے کہ وہ کیفیات جن کا ادراک روح کرتی تھی آج آنکھوں سے نظر آئیں گی اور قرآن ایک باغ و بہار کے رنگ میں ہوگا جس میں عجیب وغریب پھول کھلے ہوئے ہوں گے، عجیب عجیب خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں تو پورے قرآن کو مجسم کر دیا جائے گا۔ اور وہ کیفیات جو روحیں محسوس کرتی تھیں، قیامت کو آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔ ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ سامنے ہوں، تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کا مجمع ہو اور سیّد اولین والآخرین پڑھ رہے ہوں تو ان کیفیات کا کیا ٹھکانہ ہوگا جو قلوب پر طاری ہونگی اور وہاں سے بڑھ کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔ تو درحقیقت قرآن کریم میں پہلی چیز لفظ اور دوسری چیز معنی ہیں اور تیسری چیز اس کے حقائق ہیں، اور چوتھی حقائق کے نیچے، اس کی کیفیات ہیں جو اروح پر طاری ہوتی ہے کبھی خوف کا غلبہ، کبھی خشیت کا غلبہ، کبھی رجاء کا غلبہ، کبھی امید کا غلبہ، کبھی رحمت سامنے، کبھی قہر سامنے، یہاں روح محسوس کرتی ہے وہاں آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

اس لئے میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں تو کیفیات الوہیئت جمع ہیں اور کلام رسول میں کیفیات نبوّت جمع ہیں۔ اگر آیت قرآن کو تلاوت کیا تو کیفیات الہیہ آپ کے باطن پر طاری ہوں گی اور اگر کلام نبوّت کو تلاوت کیا تو کوائف نبوّت آپ کے قلب کے اوپر طاری ہوں گے، اور پھر آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسا عجیب وغریب کلام ہے کہ کتنے سمندر اس میں چھپے ہوئے ہیں۔ تو بہر حال یہ داستان تو بڑی طویل ہے، میرا یہ مقصد تھا عرض کرنے کا کہ پہلی بات کتاب کی صنعت تھی اور دوسری چیز حدیث کی خصوصیات تھیں۔

احوال واقعی...... حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعوم دیوبند نے دارالعلوم حقانیہ میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر طلباء واساتذہ، دارالعلوم کی خواہش پر بروز اتوار ۲۰ رجب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء دارالحدیث ہال میں بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پر نہایت حکیمانہ اور عالمانہ درس دیا۔

دارالحدیث اوراس کے باہر برآمدے۔ اہل علم وفضل سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، ہال پر ایک عجیب نورانی فضاء چھائی ہوئی تھی۔ علوم ومعارف قاسمیہ کا یہ فیضان نماز عصر تک جاری رہا۔ یہ تقریب ایک گونہ دارالعلوم کی طرف سے استقبالیہ تقریب بھی تھی، اس لیے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف سے دارالعلوم کے مدرس مولانا شیر علی شاہ نے عربی زبان میں ایک فصیح وبلیغ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام مظہر انوار قاسمیہ مدظلہ کی تقریر کے تمہیدی کلمات اپنے اندر اکابرین دیوبند کی تواضع عجز، انکساری اور بے نفسی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ حضرت مدظلہ کا درس اس وقت ٹیپ ریکارڈ سے محفوظ کرلیا گیا۔ اوراب اسے من عن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ ''الحق'' دارالعلوم اکوڑہ خٹک

افادات بخاری نمبر۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

”اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ أَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ أَعۡمَالِنَا ، مَنۡ یَّھۡدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشۡھَدُ أَنۡ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَـرِیۡکَ لَـہٗ ، وَنَشۡھَدُ أَنَّ سَیِّـدَنَـاوَسَنَـدَ نَـا وَمَوۡلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ،أَرۡسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیۡہِ بِإِذۡنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا.

أَمَّـــا بَعۡـــدُ!......حَدَّثَنَاالۡحُمَیۡدِيُّ (إِلٰی قَوۡلِہٖ)سَمِعۡتُ عُمَرَبۡنَ الۡخَطَّابِ عَلَی الۡمِنۡبَرِ قَالَ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ یَقُوۡلُ :”إِنَّمَاالۡاَعۡمَالُ بِالنِّیَّاتِ، وَإِنَّمَا لِکُلِّ امۡرِئٍ مَانَوٰی،فَمَنۡ کَـانَـتۡ ھِـجۡـرَتُـہٗ إِلَـی اللّٰہِ وَرَسُـوۡلِـہٖ فَھِـجۡـرَتُـہٗ إِلَـی اللّٰہِ وَرَسُـوۡلِـہٖ،وَمَنۡ کَـانَـتۡ ھِجۡرَتُـہٗ إِلٰی دُنۡیَایُصِیۡبُھَاأَوۡإِلٰی امۡرَأَۃٍ یَّنۡکِحُھَافَھِجۡرَتُہٗ إِلٰی مَاھَاجَرَ إِلَیۡہِ .“①

عَـنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ :کَلِمَتَانِ حَبِیۡبَتَانِ إِلَـی الـرَّحۡـمٰـنِ خَـفِیۡـفَـتَـانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیۡلَتَانِ فِي الۡمِیۡزَانِ:”سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمۡدِہٖ سُبۡحَانَ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ“②

بجواب سپاس نامہ...... بزرگان محترم! یہ مجلس کسی وعظ وتلقین کی یا کوئی اجتماع عام نہیں ہے۔ بلکہ مجلس درس ہے اس لئے میں نے صحیح بخاری کی دوحدیثیں تلاوت کی ہیں۔ایک بالکل ابتدائی اور ایک بالکل انتہائی۔ابتداء اور انتہاء کے بیچ میں ”وسط“ کا حصہ ہوتا ہے۔تو اس اعتبار سے تقریباً پوری بخاری معنیً وحکماً آپ کے سامنے میں نے تلاوت کر دی۔

سپاسنامہ میرے لئے دنیا وآخرت کی نجات کی دستاویز ہے۔اس لئے کہ پیش کرنے والے جن کا نام مبارک لیا گیا،حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ ہیں میں انہیں اپنے اساتذہ کے طبقے میں سمجھتا ہوں۔اس لئے ان کا سپاس نامہ درحقیقت شفقت نامہ ہے،سپاسنامہ تو کسی چھوٹے کی طرف سے ہوتا ہے،بڑوں کی طرف سے محض شفقت،

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۳.

② الصحیح للبخاری، کتاب التوحید،باب قول اللہ تعالیٰ ،ونضع الموازین القسط،ج: ۶، ص: ۴۹ ۷،رقم: ۷۱۲۴.

حوصلہ افزائی اور اظہار برکت کے لئے ہوتا ہے۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: اَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ اللهِ فِي الْاَرْضِ ① تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اگر سرکاری گواہ کسی کی نسبت شہادت دے دے کہ وہ اچھا ہے تو وہ عند اللہ اچھا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان حضرات کی شہادت اگر چہ کریم النفسی یا حوصلہ افزائی ہے لیکن میں اسے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اہل اللہ کی زبان ہے اور اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ من اللہ ہے۔ اور میں کتنا بھی نالائق سہی لیکن جب ایسے پاکیزہ لوگ گواہی دیں گے تو اللہ کے ہاں کیا بڑی بات ہے کہ اللہ کسی نالائق کو لائق بنادے، کسی برے کو اچھا بنادے۔ سپاسنامہ درس کے مناسب حال نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں یہاں دار العلوم حقانیہ حاضر ہوا، تو میں اسے اپنا گھر سمجھتا ہوں کہ دار العلوم دیوبند میں بیٹھا ہوا ہوں میں تو خود آپ کے گھر کا ایک جز ہوں۔ تو اپنے گھر میں کسی کو سپاس نامہ تھوڑا ہی دیا جاتا ہے۔ یہ تو غیر کو دیا جاتا ہے۔

برادری مختلف جگہوں پہ منتشر ہے لیکن افراد کے انتشار سے خاندان منتشر نہیں ہوتا۔ ہمارا علمی خاندان ایک ہی ہے اس کے اجزاء منتشر ہیں کچھ دیوبند میں، کچھ پاکستان میں، کچھ برما میں، اور کچھ افریقہ میں، یہ سارے افراد کنبہ ہیں جو مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اصل ہم سب کی ایک ہے جس کو دار العلوم دیوبند کہا جاتا ہے۔ اس واسطے جیسے آپ اس کی شاخیں ہیں، میں بھی ایک شاخ ہوں تو میں اپنی برداری میں آیا، بھائیوں میں آیا۔ تو بھائیوں میں سپاس نامہ عزّت افزائی تو ہے مگر ایک رسمی سی چیز ہے۔ لیکن چوں کہ اہل حق پیش کر رہے ہیں میں اس لئے اسے رسم بھی نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ جو کچھ ارشاد فرمایا گیا یہ اعماقِ قلب سے ارشاد فرمایا گیا یہ زبان اور قلم نے حرکت نہیں کی۔ بلکہ دل کی حرکت ہے اور دل سے جب ایک چھوٹے اور نالائق کو اچھا کہا گیا، تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ عند اللہ اچھا بن جائے گا۔

تو میں نے اس وقت بجائے کسی تقریر کے جو جلسے کا موضوع ہوتا ہے صحیح بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں اور اسی سلسلے میں چند کلمات طالب علموں کے سامنے گزارش کروں گا۔ میرے مخاطب حضرات اساتذہ نہیں ہیں۔ یہ تو خود میرے استادوں کے طبقے میں ہیں۔ یہ میری بات چیت طلبہ سے ہے جو برادری کے بھائی ہیں۔

علم میں بے شک آپ مجھ سے افضل ہیں، آپ کا علم تازہ ہے۔ اور مجھے تو پڑھے ہوئے چالیس برس گزر گئے ، بھول بھال بھی گیا کہ پڑھا تھا۔ انتظامی سلسلے کے جھگڑوں میں پھنس کر وہ نوعیّت بھی نہیں رہی اس واسطے ایک بھائی تو ہوں مگر ایک جاہل قسم کا بھائی ہوں آپ بحمد اللہ علماء ہیں علم تازہ ہے تاہم آپ نے چوں کہ اس جگہ بٹھلا دیا۔ اس واسطے اسی کے مناسب حال یہ روایتیں میں نے تلاوت کیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی کتاب کی عظمت...... امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور

① سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الثناء الحسن علی المیت، ج: ۴، ص: ۲۱۸. حدیث صحیح ہے۔
دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی بحوالہ صحیح ابن ماجۃ ج: ۳ ص: ۵۸ رقم ۱۰۵۸ .

جلالتِ قدر سے کون مسلمان ناواقف ہے اہل علم میں کون ہے جو ناواقف ہے۔ان کی تصنیف یا تالیف صحیح بخاری کی عظمت وجلالت پوری امّت پر واضح ہے۔امّت نے اجتماعی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور ''اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللهِ'' ہونے کی شہادت دی ہے اس لئے مولف بھی جلیل القدر، کتاب بھی جلیل القدر اور کتاب کا جو موضوع ہے وہ حدیث ہے، یعنی ''کَلَامُ النَّبِیِّ ﷺ وَ اَفْعَالُهٗ وَاَقْوَالُهٗ وَتَقْرِیْرَاتُهٗ.''

اس لئے موضوع بھی مبارک، مصنف بھی مبارک، تصنیف بھی مبارک، حق تعالیٰ ہم سب کو بھی مبارک بنا دے کہ ان کے سلسلے سے ہم سامنے آ رہے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ صفت تمام محدثین کرام میں امتیازی طور پر معروف ہے نسائی رحمۃ اللہ علیہ کو کہتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ نقش قدم اختیار کیا ہے مگر بہر حال اصل اصل اور فرع فرع ہے صنع بخاری یہ بہت اونچی چیز ہے اور تراجم بخاری یہ تو فی الحقیقت فقہ کا ایک مستقل باب ہیں: ''فِقْـهُ الْبُـخَـارِیُ فِیْ تَـرَاجِـمِهٖ'' تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ محدّث بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں۔ نیز اجتہاد کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں اس لئے میں نے تبرکاً پہلی حدیث بھی تلاوت کی اور آخر کی بھی تلاوت کی۔

عملی دنیا کی دو چیزیں...... دونوں روایتوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں نہ وقت ہے نہ اب اتنی طاقت ہے لیکن اتنی بات بالا جمال عرض کئے دیتا ہوں کہ آدمی کے لئے عملی دنیا میں دو چیزیں ہیں، ایک مصدرِ عمل اور ایک مظہرِ عمل، وہ چیز ہے جس سے عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔اور مظہرِ عمل، عمل کی وہ ہیئت کذائی ہے جس میں رہ کر ہم اور آپ عمل انجام دیتے ہیں تو مصدرِ عمل درحقیقت انسان کی نیت ہے جس سے عمل سرزد ہوتا ہے، اور عمل کی قبولیت نا قبولیت، نیّت پر موقوف ہے، اچھا سے اچھا عمل ہو، لیکن نیت خراب ہو وہ برا بن جاتا ہے، اور برے سے برا عمل ہو لیکن وہ نیت کی صحت سے انجام پائے تو آدمی کبھی مورد ملامت نہیں ہوتا۔وہ عمل بھی مقبول ہو جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑی چیز نیت ہے کہ جس سے عمل کا صدور ہو اور ایسے پاک عمل کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو میزان عمل ہے وہ بھاری پڑ جائے۔نیک اعمال ہی سے میزان میں وزن پیدا ہوگا۔ برے اعمال کا وزن نہیں ہے۔ بلکہ بروں کو تو تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اچھے اور برے جمع ہوں گے جبھی تو تولنے کی ضرورت پڑے گی۔ تاکہ توازن قائم ہو جائے۔

اس عملی دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک مصدرِ عمل اور ایک ثمرہ عمل۔ تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدا میں ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' (۱) حدیث نقل کی ہے کہ گویا نیّت بنیاد ہے عمل کا ظہور درحقیت اسی نیّت سے ہوتا ہے ، قبولیت بھی اسی نیت پر موقوف ہے یہ الگ چیز ہے کہ بعض اعمال بلانیّت کے صحیح ہو جائیں اور شریعت ان کو معتبر مان لے، لیکن آخرت کا اجر وثواب بغیر نیّت کے مرتّب نہیں ہوگا۔ وضو اگر آپ بلانیت بھی کریں تو مفتاح صلوٰۃ تو بن

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم ج:۱، ص:۳، رقم: ۱

جائے گا۔ لیکن جب تک نیّت نہ ہو، اجر مرتّب نہیں ہوگا۔ تو عند اللہ قبولیت کا معیار درحقیقت نیت پر ہے۔ صحت کا معیار فتویٰ ہے۔ اس لئے کہ بعض بغیر نیّت کے صحیح بھی نہیں ہوتے بعض صحیح تو ہو جاتے ہیں گو ان پر اجر مرتب نہ ہو۔

نیت عمل کی بنیاد ہے...... بہر حال قدرِ مشترک کے طور پر نیّت بنیادی چیز ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ'' آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ یوم محشر میں بعض لوگ حاضر ہوں گے، حق تعالیٰ شانہ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ لکھ دو انہوں نے عمر بھر تہجد پڑھی ہے۔ ملائکہ عرض کریں گے کہ انہوں نے ایک دن بھی تہجد نہیں پڑھی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، روزانہ سوتے وقت نیت کرتے تھے کہ آج ہم تہجد پڑھیں گے، مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی، لہٰذا لکھ دو کہ انہوں نے ساری عمر تہجد پڑھی تو انسان کی نیّت عمل کی بنیاد ہے۔

ربط بین الابواب...... دوسرے لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کرنا چاہئے کہ آدمی پہلے دل سے عمل کرتا ہے پھر ہاتھ پاؤں سے۔ وہی دل کا عمل بنیاد ہے جس سے ہاتھ پیر کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ تو قلب سے عمل کرنے کی صورت نیّت ہے اور قالب سے عمل کرنے کی ہیئت کذائیہ ہے جو شریعت نے ارشاد فرمائی۔ تو پہلے ہر عمل قلب سے ہوتا ہے پھر قالب سے انجام پاتا ہے اور وہ قالبی عمل اس باطنی عمل پر منطبق ہوتا ہے۔ تو رخ دو ہیں اور عمل درحقیقت ایک ہے باطنی رخ اس کا نیت ہے اور ظاہری رخ اس کی وہ ہیئت عمل ہے۔

تو امام ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے ایسی بنیادی حدیث نقل کی کہ کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس میں نیت کا دخل نہ ہو۔ اور اس کے اجر و ثواب کا تعلق نیّت سے نہ ہو۔ ترتیب یوں ہوگی کہ پہلے نیت درست کرادی۔ اس کے بعد ابواب ایمان، ابواب علم، پھر ابواب زکوۃ، اور دیگر ابواب بیان کئے، ان سب کا مصدر ''نیت'' ہی بتلا دیا۔ تو حکماً وہ سارے ابواب اس کے نیچے آ گئے۔

اعمال پر اجر کا ترتب...... اخیر میں جو چیز تھی وہ عند اللہ قبولیت اور اجر کا ترتب ہے۔ تو آخر میں یہ حدیث نقل کی: كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ: ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' دو کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے، ان کے ادا کرنے میں نہ وقت لگتا ہے نہ دشواری ہے۔ ایک کلمہ ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ''

اور دوسرا کلمہ ''سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' ہے۔ یہ ہلکے ہلکے دو کلمے جو ادائیگی میں نہایت ہلکے زبان پر نہایت لطیف، لیکن بلحاظ اجر کے ثقیل ہیں۔ میزان عمل کے اندر جو ان کا وزن ہوگا۔ وہ دوسرے اعمال کا نہیں ہوگا۔ کیوں ہیں یہ وزنی؟

وزنِ کلمات کی وجہ...... ان کے ثقیل ہونے کی بنا درحقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں مقامات الوہیت کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اتنے عظیم ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز اس کے لگ بھگ نہیں ہو سکتی۔ تو انتہائی بات یہ ہے کہ

مقامات الوہیّت کو ان دوکلموں کے ذریعے بیان فرمایا گیا گویا یوں کہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اجزاء سے پاک ہیں۔ وہ نہ بسیط ہے نہ مرکب، ہر چیز سے وراء الوراء ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی الوہیت کے مقامات، ظاہر بات ہے کہ وہ لامحدود ہیں حد کمال انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مقامِ تنزیہہ...... حق تعالیٰ کے مقامات میں سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، یعنی وہ ہر عیب سے بری۔ ہر نقص سے بالا اور تمام عیوب سے پاک تو حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی بیان کرنا ظاہر بات ہے کہ یہ مقامات الوہیت میں ایک مقام ہے۔ خدا کہتے ہیں اس ذات کو جو ہر برائی سے پاک ہو "اَلْخَيْرُ كُلُّهُ مِنْكَ وَإِلَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ" ہر خیر کا سرچشمہ وہ ہے، اسی سے خیر چلتی ہے، ہر شر سے بری وبالا ہے ذات بھی شر سے پاک ہے اور باہر کی شر بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ ہر حیثیت سے وراء الوراء ہے۔ تو الوہیّت کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ خدا ذات برتر ہر عیب سے پاک ہے، تو پہلی چیز مقامات الوہیت میں تنزیہہ ہے اور سبحان اللہ کہنا یہ گویا اشارہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی پاکی بیان کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک ذات بابرکات وہ ہو جو ہر عیب سے پاک اور بری ہے (تو الوہیّت اسی کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ تو ایک مقام تو الوہیت کا یہ ہوا)۔

اب آگے خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ تو جہاں بھی جو خوبی ہے وہ اسی ذات کی ہے اگر آپ علم دیکھیں گے تو اصل علم حق تعالیٰ کا ہے اس کا پرتو پڑتا ہے تو دوسرے عالم کہلانے لگتے ہیں۔ قدرت درحقیقت اس کی ہے اس کا پرتو پڑا۔ تو ملائکہ قادر کہلانے لگے۔ کہ پل بھر میں آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان پر۔ ان کا علم حقیقی اور ذاتی ہے اس کا پرتو پڑا تو ہم آپ بھی عالم کہلانے لگے اور اور انسان کو مظہر علم بنادیا۔ رفیع المرتبہ اور رفعت وعظمت ان کی شان ہے۔ اس کا پرتو آسمانوں پر پڑا تو وہ رفعت والے ہوگئے۔ وہ بھی اونچے بن گئے اور ان کی برتری ثابت ہوگئی۔ تو سرچشمۂ کمالات کا اللہ کی ذاتِ بابرکات ہے اور ظاہر بات ہے کہ حمد وثناء کمال پر ہی کی جاتی ہے۔ نقص اور عیب پر کوئی کسی کی حمد وثناء نہیں کرتا تو حمد وثناء کے معنی یہ ہیں کہ جمیل اختیاری پر حمد کی جائے۔

مقامِ تحمید...... ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ تمام کمالات کا سرچشمہ اور ساری برکتوں کا مصدر ہیں اس لئے تمام تعریفیں بھی انھی کے لئے ہونگی۔ حمد وثناء بھی انھی کے لئے ہوگی۔ جس کی بھی ثنا کی جائے گی وہ درحقیقت انجام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ثناء ہوگی۔ کیوں کہ اسی کا کمال تھا جو کسی دوسرے میں ظاہر ہوا۔ تو حمد وثناء کے اظہار کا طریقہ درحقیقت تحمید ہے اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا تو سبحان اللہ کا کلمہ تنزیہہ بیان کرنے کے لئے ہے۔

دوسرا مقام تنویہ اور عظمت بیان کرنے کا ہے اس لئے تحمید رکھی گئی اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف عنوانوں سے ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿فَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ وَغَيْرَ ذٰلِكَ. تو تسبیح وتحمید اور حمد وتسبیح کرنا جگہ جگہ ذکر کیا گیا۔ تو سبحان کا کلمہ مقام تنزیہہ کو

ظاہر کرتا ہے اور الحمدللہ کا کلمہ مقام تنویہ کو ظاہر کرتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے جو ذات اقدس ہر عیب سے بری اور ہر کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی بھی اسی کے لئے ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عظمتوں کا سرچشمہ تو وہ ہو اور بڑائی کسی اور کی ہو جائے۔ عظمت اور کبریائی کسی اور کے لئے ہو جائے۔ جو درحقیقت کمال کا مصدر ہے وہی حمد وعظمت کا مستحق ہے کہ اسی کی کبریائی اور عظمت بیان کی جائے، اسی لئے اسلام نے تکبیر کا عنوان رکھا اور اس کے لئے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا صیغہ رکھا۔ تاکہ اللہ کی عظمت بیان کی جائے کہ اَکْبَرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وہ ہر چیز سے وہ بڑا ہے۔

اور نہ صرف اضافۃً بڑا ہے بلکہ حقیقتاً بڑا ہے کہ بڑائی ہے ہی اس کے لئے جس میں کوئی بڑائی آتی ہے اسی کے نام کے ساتھ ملنے سے آتی ہے، اس کے نام سے جو کٹ گیا، اس میں بڑائی ختم ہوگئی۔ تو بڑائی، عظمت و کبریائی درحقیقت اسی کے لئے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اَلْکِبْرِیَآءُ رِدَآئِیْ وَالْعَظَمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْھِمَا قَصَمْتُہٗ'' تکبر میری چادر ہے، بزرگی میری لنگی ہے جو بھی اس میں کھینچا تانی کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کو نیچا دکھلاؤں گا۔ تو یہ برداشت نہیں کہ کبریاء وعظمت میں کوئی شریک ہو۔ وہ وحدہ لاشریک لہ کے لئے ہے۔ تو ﴿وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اس کے لئے بڑائی وعظمت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب ...... یہاں ذرا سا ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوگا۔ یا ہوا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں حکم ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ اللہ کے اخلاق سے متخلق بنو، وہ کریم ہے تو تم بھی کریم بنو۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی رحیم القلب بنو وہ حافظ حفیظ ہے تو تم بھی اپنوں کی نگہداشت کرو وہ معطی حقیقی ہے تو تم بھی فقیروں کے ہاتھ پر رکھو اور اعطاء کی صفت اختیار کرو۔ تو اللہ تعالی کے کمالات سے متکمل بھی بنو۔ اور اس کے اخلاق سے متخلق بھی بنو۔ تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر بھی تو اس کی شان ہے، اس میں بھی تخلق ہونا چاہئے ہر شخص متکبر بنے ورنہ کریم النفس بننے سے روکا جائے۔ اس میں بھی شرک ہوگا تو پھر اگر ہم تکبر کریں تو ملامت کیوں کی جاتی ہیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ (بموجب حدیث) اللہ کے اخلاق سے متخلق بننا تو عین کمال ہے۔؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا معاذ اللہ بری بات نہیں ہے۔ نہ کبر بری چیز ہے۔ وہ تو صفت خداوندی ہے، تکبر کرنا برا نہیں ہے۔

جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ جو اللہ کے سوا کہے گا میں بڑا ہوں جھوٹا ہوگا۔ جھوٹ بولے گا۔ تو جھوٹ بولنے سے روکا گیا ہے، اب ایک ہی ذات کے لئے تکبر سزا وار ہے تو اللہ ہی فرما سکتا ہے: ''اَنَا الْکَبِیْرُ، اَنَا الْمُتَعَالُ، لِیَ الْکِبْرِیَآءُ'' بڑائیاں میرے لئے ہیں اور عظمت میرے لئے ہے۔ اس کے سوا جو دعوی کرے گا کہ ''لِیَ الْکِبْرِیَآءُ، لِیَ الْعَظَمَۃُ'' ۔ وہ جھوٹا ہوگا تو جھوٹ بولنا بری عادت ہے تکبر کرنا بری عادت نہیں ہے۔ مگر حق تعالی شانہ کے سوا جو متکبر بنے گا، جھوٹ بولے گا۔ اس واسطے روک دیا گیا۔

(دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حقیقی جواب ہے، کیوں کہ آدمی تکبر تو نہیں کرتا کیوں کہ ہر متکبر حق تعالی شانہ کے

علاوہ جھوٹا ہوگا۔لیکن پھر حدیث "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" کے پیشِ نظر "صفت کبریائی" کوملحوظ رکھتے ہوئے اس کے مفہوم کا تعین ضروری ہے تو فرماتے ہیں) پھر یہ کہ کبریائی وعظمت درحقیقت صفات ذات میں سے ہے۔ صفات افعال میں اگر ہم تخلق کریں تو وہ الگ بات ہے (اس کا تو حکم ہے) لیکن صفات ذات مثلاً خالقیت کی صفت میں کوئی تخلق کرنے لگے یا تکبر میں تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی ذات کی برابری چاہتا ہو۔اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔اس واسطے روکا گیا کہ تکبر نہ کیا جائے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔تکبر کرنے والا ہمیشہ محروم ہوتا ہے کیوں کہ وہ جھوٹا ہوتا ہے، کسی کو تکبر کی اجازت نہیں ہے۔

حقیقتِ توحید......تو جو ذات تمام عیوب سے پاک ہو، تنزیہہ اسی کے لئے ہے۔ جو ذات ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہو، تنویہ اسی کے لئے ہے۔ جو ذات ساری خوبیوں کی مالک ہو، عظمت وکبریائی اس کے لئے ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جب ذات وہ مان لی جو ہر عیب سے پاک اور ہر کمال سے متصف وموصوف اور ذاتی طور پر ہر برائی اور عظمت اس میں ہے، تو پھر یکتا بھی وہی ہوگا۔ جب ایسی ذات کوئی دوسری نہیں ہے تو اس ذات کو یکتا کہا جائے گا۔ جس کا کوئی شریک نہیں برابر نہیں۔کوئی ند نہیں، کوئی ضد نہیں، کوئی اس کے لگ بھگ نہیں تن تنہا ایک ہی ذات بابرکات ہے جو ایک بھی ہے اور یکتا بھی نہ اس کی ذات جیسی ذات، نہ اس کے افعال جیسے افعال، نہ اس کی شیون جیسے شیون، تو ہر چیز کے اندر وہ یکتا ہے، اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں توحید ہے۔توحید کے معنی محض ایک ہونے کے نہیں ایک تو اپنی اپنی ذات میں ہم اور آپ سبھی ہیں، توحید کے معنی یکتا کے ہیں کہ اس کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ تو درحقیقت توحید کی بنائیں تین ہیں، ایک تنزیہہ مطلق، ایک تنویہ مطلق، ایک تعظیم مطلق، عظمت بھی اس کی، پاکی بھی اس کی مصدر کمالات ہونا بھی اسی کی ذات کے شایان شان ہے تو جو ذات پاک بھی ہے۔ جو ذات خوبیوں کا مصدر بھی ہے، جو عظمت والی بھی ہے تو معبودیّت بھی اسی کی ہوگی یکتا بھی اسی کو کہا جائے گا۔ پھر عبادت بھی اسی کی ہوگی، کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ یہی توحید کے معنی ہیں۔ کہ ذات کے لحاظ سے بھی یکتا ہو، صفات کے لحاظ سے بھی اور افعال کے لحاظ سے بھی کہ اس کا کوئی شریک نہ ہو اور شیون بھی اس کے بے مثل اور بے نظیر ہوں۔

تو مقامات الوہیّت چار نکل آئے، ایک تنزیہہ جو سُبْحَانَ اللّٰہِ سے ادا ہوتی ہے، ایک تنویہ جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے ادا ہوتی ہے ایک کبریائی وعظمت جو اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ سے ادا ہوتی ہے اور ان تینوں کے مجموعے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو یہ اس کے لئے توحید نکلی۔

تو اس حدیث پاک میں مقامات الوہیّت بیان فرمائے گئے ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ سے تسبیح وَبِحَمْدِہٖ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ میں عظمت وکبریائی بیان کی گئی ہے اور ان تینوں کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو توحید بطور ثمرہ ان پر مرتب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلی حدیث جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نیّت کے بارے میں روایت

فرمائی‘‘۔اس میں مقامات عبدیّت ہیں،عبد کا کام یہ ہے کہ نیت سے بھی اس کی طرف رجوع کرے اور عمل سے بھی اس کی طرف رجوع کرے،قلب سے متوجہ ہوگا وہ نیت ہو جائے گی۔قالب سے متوجہ ہوگا،وہ عمل ہو جائے گا۔

صحیح نیت اور حقیقت نیت......تو درحقیقت اس حدیث میں مقامات عبدیّت بیان کئے گئے ہیں۔بندے کا کام یہ ہے کہ نیت صحیح ہو۔نکاح کرے تو نیت صحیح ہو۔ہجرت کرے تو بھی اس کی نیّت صحیح ہو،دولت کمائے تو بھی نیّت صحیح ہو،اور نیّت صحیح کے معنیٰ ’’حُبُّہٗ‘‘ کے ہیں۔یعنی ہر عمل لِرِضَآءِ اللّٰہِ اور لِوَجْہِ اللّٰہِ ہو۔اور یہ کام بندے کا ہے۔حق تعالیٰ شانہ معاذ اللہ نیت کے پابند نہیں،وہاں نیّت کا کیا دخل۔؟ وہ تو ہر چیز سے بری ہے۔کیوں کہ نیت تو درحقیقت عبادت ہے اور وہ عبادت سے بری ہے۔وہ تو معبود ہے(یہ کیسے ممکن ہے کہ معبود خود ہی اپنی عبادت شروع کردے)۔اس واسطے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ میں تو ’’مقامات عبدیّت‘‘ بیان کئے اور اخیر حدیث میں مقامات الوہیّت بیان فرمائے اور درمیان میں علم کے ابواب عمل کے ابوابُ، اور اعتقاد کے ابواب، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال اور ان اعتقادات میں نیت صحیح کرو تاکہ قرب پیدا ہو۔اور جب قرب ہوگا تو ثمرات مرتب ہوں گے۔کہ تمہاری میزان عمل بھر جائے گی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنع بھی حد کمال تک ہیں لیکن یہ اول و آخر کی صنعت اس میں بھی حدّ کمال ہے کہ ابتدا میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیت کے مقامات کی طرف اشارہ کر دیا اور بیچ کے اندر تمام ابواب آ گئے۔اس میں عبادات بھی ہیں،معاملات بھی ہیں،معاشرت بھی ہے،سیاسیات بھی ہیں،تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آ جاتے ہیں،اور اول و آخر کو نیّت اور میزان عمل سے گھیر دیا،اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادت بھی قبول،معاشرت بھی قبول،سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے،اس واسطے میں نے اوّل کی حدیث بھی تلاوت کر دی اور آخر کی حدیث بھی اور ـ ع۔اول باخر نسبتے دارد۔ان دونوں میں باہم ایک نسبت ہے اور وہ نسبت یہی ہے کہ بندہ ابتداء سے چلے اور انتہا تک پہنچ جائے اور امت میں علم و عمل اور عبادت سب کو لیتا ہوا چلے اور انجام کار میزان عمل تک پہنچ جائے، یہی آپ کے اعمال ہی درحقیقت تولے جائیں گے۔

اعمال میں وزن کیسے ہوگا؟......اور اعمال میں وزن نیّت سے ہوگا۔اگر نیت صحیح ہے،اخلاص صحیح ہے تو وہ عمل وزنی ہوگا،اگر العیاذ باللہ نیّت صحیح نہیں تو کتنا ہی بڑا عمل ہوگا،نامقبول ہوگا،تو اللہ کے ہاں صورت نہیں دیکھی جائے گی کہ ڈیل ڈول کتنا ہے؟ پھیلاؤ کتنا ہے؟ بڑا کتنا ہے، بلکہ وہاں وزن دیکھا جائے گا کہ اندر اخلاص کتنا ہے؟ کتنا حسن نیّت ہے۔صدق دل کتنا ہے؟

’’اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ‘‘ اللہ تعالیٰ شانہ،نہ تمہاری صورتیں دیکھتا ہے نہ تمہارے اعمال کی صورتیں دیکھتا ہے لیکن وہ تمہارے اندر دیکھتا ہے دلوں میں کیا ہے؟ اور عمل بھی دیکھتا ہے(کہ کتنا حسنِ نیت ہے)؟

بعض دفعہ چھوٹا سا عمل ہوتا ہے اور آدمی کمال اخلاص سے انجام دیتا ہے۔ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور بعض دفعہ صورت کے لحاظ سے سے عمل بہت بڑا ہوتا ہے مگر نیّت درست نہیں تو وہی حبط اعمال کا ذریعہ بن جاتا ہے، اسی طرح ایک عمل چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ کس کمال خلوص سے ادا کیا گیا کہ وہی مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اخلاص کی قوّت...... امام ابوداؤدؒ محدث جلیل، ان کی کتاب ''ابوداؤد شریف'' نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے تراجم میں لکھا ہے کہ وہ کسی دریا کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے اور تقریباً سو پچاس قدم کے فاصلہ پر جہاز کھڑا ہوا تھا اس زمانے میں گودیاں تو تھی نہیں کہ جہاز پلیٹ فارم سے لگ جائے، تو جہاز پرے کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤدؒ کنارے پر تھے۔

جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی اس نے بہت زور سے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا۔ ان کے کان میں آواز پڑی۔ تو مسئلہ آپ بھی جانتے ہیں کہ چھینک لینے والا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو اس کے جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنا اخلاقی فرض ہے۔ مگر اس کے لئے مجلس شرط ہے یہ نہیں کہ کوئی بازار میں چھینک مارکر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو آپ سفر کر کے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنے کے لئے جائیں۔

امام ابوداؤدؒ پر واجب نہیں تھا کہ وہ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہتے۔ وہ کنارے پر تھے اور جہاز آدھے فرلانگ کے فاصلے پر دور تھا۔ مگر یہ حضرات عمل کے بارے میں حریص ہوتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے جیسے دنیادار پیسے پیسے کے لئے حریص ہوتے ہیں کہ ہزار ہوں تو کہیں گے کہ دس ہزار ہو جائیں۔ دس ہزار ہو جائیں تو پھر کہیں گے کہ ایک لاکھ کے مالک ہو جائیں۔

اگر جنگل بھر کے بھی ان کو سونے کا دیں تو ضرور حرص کی وجہ سے دوسرا جنگل مانگیں گے ان اہل اللہ کو عملِ صالح کی حرص ہوتی ہے کہ جتنا ہو سکے کمالیں، گویا ساری جنت کو اپنے لئے سمیٹنا چاہتے ہیں۔

مگر اس کے معنی بخل کے نہیں (کہ کسی اور کو کچھ نہ ملے) بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنت پر قبضہ کرلیں اور اپنے ساتھ جو وابستہ ہیں۔ ان کو بھی ساتھ لے جائیں۔ معاذ اللہ خود غرضی لاحق نہیں کہ تنہا چلے جائیں بلکہ (بفضل خدا) اپنے سب متعلقین کو ساتھ پہنچائیں گے۔ بہرحال چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے۔ تو کان میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' پڑا، تین روپیہ میں کرایہ پر کشتی لی، اس میں بیٹھ گئے کہ جہاز کو پہنچ جائیں، وہاں جا کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا۔ تو اہل تراجم لکھتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز کان پڑی، بولنے والا تو نظر نہیں آتا تھا کہ اے ابوداؤدؒ آج تین درہم میں تم نے جنت خرید لی۔

اب امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، کتنے تو انہوں نے تہجد پڑھے ہوں گے، کتنی حدیثیں روایت کی ہوں گی۔ کتنے جہاد کئے ہوں گے، کتنے اعمال صالحہ کئے ہوں گے اور جنت کی خریداری میں صرف تین درہم لگے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمل کامل اخلاص سے کیا تھا، وہ اتنا وزنی بن گیا کہ وہی نجات کا ذریعہ بن گیا، تو اصل میں عمل کو مقبول بنا دینے

والی چیز وہ اخلاص کی قوت ہے، عمل تو بمنزلہ ڈھانچے کے ہے اور روح اس کے اندر حسنِ نیت ہے، اگر یہ روح نہ ہو تو عمل کا ڈھانچہ لاش کی مانند ہے۔ اور لاش کا انجام پھٹنا، پھولنا، سڑنا، گلنا ہے۔ اسی طرح عمل ہے۔ اس کے لئے اخلاص روح ہے۔ وہ آخرت تک پہنچے گا، اس پر ثمرات مرتب ہوں گے، تو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے تین درہم میں جنت کمالی۔ اسی طرح جو بھی آپ حدیث پڑھ لیں اس کو کم درجے کا نہ سمجھیں ایک حدیث پڑھنے کی بھی توفیق ہوگئی تو دنیا و مافیہا ہمارے ہاتھ آ گئی۔ جنت میں تو ایک تنکے کے برابر ایک جوتے کے تسمے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو سعادت ہے، دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

حقیقت جنت وعمل...... اور جنت یہ قرآن و حدیث ہی تو ہے بلکہ بعض روایات میں تو فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی جتنی آیات ہیں اتنے ہی جنت میں درجات ہیں اور بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں، وہاں جا کر نعیم مقیم کی صورت میں متمثل ہونگی۔ یہاں ان کی عمل کی شکل ہے، وہاں جا کر ان کی شکل نعمت کی بن جائے گی تو چیز ایک ہی ہے، دارِ دنیا میں ان کا لباس عمل ہے اور دارِ آخرت میں ان کا لباس ثمرہ اور جزاء کا ہے۔ تو یہ اعمال بعینہٖ وہاں جا کر باغ و بہار کی صورت اختیار کریں گے۔

تمثل اعمال کی مثال...... ہمارے بچپن میں یورپ سے ایک کھلونا آیا کرتا تھا۔ ایک پیکٹ ہوتا۔ اس میں بارہ ٹکیاں ہوتیں۔ وہ دو آنے میں ملا کرتا تھا۔ ٹکیہ لے کر بچے بیٹھ جاتے اور کٹورے میں پانی ڈال لیتے تھے پھر ایک ٹکیہ اس میں ڈال لیتے تھے۔ منٹ بھر کے بعد ٹکیہ پھٹتی تو کسی سے پھول نکل آتا، کسی میں سے انجن۔ کسی میں ریل کا ڈبہ نکل آتا۔ بچے خوش ہوتے کہ گولی کا انجن بن گیا۔ گولی کا پھول بن گیا۔ گویا کاری گر نے اس گولی کو ایسی ساخت سے بنایا تھا کہ جب وہ کھلے تو کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہو جائے۔

آیات نعمت کی شکل میں ظاہر ہونے کی مثال...... آتش بازی آپ نے دیکھی ہوگی۔ آتش بازی میں ایک بانس کا چکر ہوتا ہے اس کے سر پر مصالحہ اور بارود وغیرہ لگا دیتے ہیں، لیکن جب اس کو آگ دے کر کھولتے ہیں تو کسی میں سے آگ کا بنا ہوا گھوڑا اور کسی میں سے سوار نکل آتا ہے۔

وہ فضا کے اندر دوڑ رہا ہے۔ یہ کاریگر کی صناعی ہوتی ہے کہ وہ ایسے انداز سے مصالحہ لپیٹتا ہے کہ جب وہ کھلے تو گھوڑے کی شکل بن جائے۔ تو ان گولیوں میں بھی صنعت ہے، اور یہ بندوں کی صنعت ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو کسی ایسی صورت سے ترتیب دیا ہے کہ جب وہ کھلیں گی تو باغ و بہار بن جائیں گی۔ یہاں ان کی شکل آیت کی ہے، وہاں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔ تو چیز ایک ہی ہے۔ دار بدلنے سے، وطن بدلنے سے، اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انجینئر جب کوئی کوٹھی بناتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کے قلب میں وہ کوٹھی بنتی ہے۔ اتنی کھڑکیاں، دروازے، اور رنگ و روغن وہ سب دل میں ذہنی آئینے میں تصور میں دیکھتا ہے کہ

وہی کوٹھی بعینہ بنی بنائی تیار ہے۔ پھر وہ اس کا نقشہ کاغذ پر کھینچتا ہے۔ پنسل سے یا قلم سے، وہی کوٹھی کا نقشہ کاغذ پر آجاتا ہے۔ پھر اس کے مطابق زمین پر وہ اینٹ سے کوٹھی تیار کرتا ہے۔ تو کوٹھی درحقیقت ایک ہی ہے جو کاغذ اور زمین پر آئی ذہن کا ظرف لطیف ہے تو اس کی شکل بھی مادی نہیں تھی۔ کاغذ پر آئی تو اس کی شکل روشنائی اور لکیروں کی بن گئی۔ دنیا کے میدان میں زمین پر آئی تو اس کی شکل اینٹ پتھر کی بن گئی۔ مگر جو اصل نقشہ ہے وہ بعینہ وہی ہے جو انجینئر کے دل میں تھا، لباس بدلتے رہے لیکن وطن کے بدلتے رہنے کے باوجود شی ایک ہی رہی۔ اس طرح یہ آیات الٰہیہ اور اعمال صالحہ ہیں یہاں ان کی عمل کی شکل ہے۔ جب وطن بدل جائے گا۔ تو آخرت میں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔

تمثّلِ اعمال کی حقیقت...... تو یہاں یہ جو آپ عمل کر رہے ہیں۔ یہ عمل بھاری بھی ہے شاق بھی، مگر صبر وتحمل سے اطاعت کے طور پر انجام دے رہے ہیں۔ یہاں یہ عمل آپ کے سر پر سوار ہے۔ آپ پر بوجھ ہے مگر آخرت میں جائے گا تو آپ کا بوجھ اٹھائے گا۔

آخرت میں حمل ونقل کے قابل بن جائے گا۔ آپ اس پر سوار ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے آپ سفر کرتے ہیں تو ایک چھوٹا سا بستر باندھا اور ایک بکس لیا بکس سر پر رکھا، اور بستر کو بغل میں دابا، بکس بھی آپ کے سر پر سوار ہے اور بستر بھی آپ کے سر پر، تھکتے ہوئے، ہانپتے کانپتے ہوئے آپ جا رہے ہیں جب آپ سرائے میں پہنچے تو بستر بچھایا، اب بستر نیچے ہے اور آپ اس کے اوپر اور وہ بکس آپ کے لئے تکیہ بن گیا۔ تو اثناء سفر میں سامان آپ کے اوپر بار تھا اور منزل پر پہنچ کر وہ آپ کے لیے تکیہ بن گیا، بعینہ یہ وہاں کی مثال ہے، یہاں اعمال بھاری ہیں۔ صبر وتحمل کرنا پڑتا ہے، مگر وہاں جا کر یہ عمل ہمارے لئے سواری بن جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''سَمِّنُوا ضَحَايَاكُمْ فَإِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ'' ''تم قربانیوں کو فربہ کیا کرو کہ یہی تمہارے لئے پل صراط پر سواریاں بنیں گی''۔ ①

تو یہاں قربانی گویا ہمارے پر سوار ہے، بوجھ ہے کہ سینکڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد دل کڑھ رہا ہے کہ ایسے محبوب جانور ذبح کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے کانٹ چھانٹ دیا۔ اور وہاں جا کر ہم اس کے اوپر بار ہو جائیں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَلسَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ'' ''یہ سخاوت جنت کے اندر ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی''۔

جیسے آپ نے سخاوت کی اور کسی غریب کی خبر گیری کی، کسی کو چار پیسے دیدیئے تو وہ آپ کی سخاوت کے زیر سایہ پل رہا ہے۔ سایہ اور راحت بھی ملی، یہی عمل وہاں جا کر درخت بنے گا۔ آپ اس کے پھلوں سے فائدہ اٹھائیں گے تو یہی سخاوت وہاں جا کر درخت کی صورت میں تمثل ہوگئی۔

---

① الحديث اخرجه الديلمي ولفظه: ''استفرهوا'' علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواه الديلمي بسند ضعيف جداً عن ابی هريرةؓ دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۲۱.

اعمال متشکل کب ہوں گے؟......تو حق تعالیٰ قیامت کے دن ہر ایک عمل کو کوئی نہ کوئی صورت دیں گے۔ یہ اعمال متجسد اور متشکل بن جائیں گے اور یہ یوم حشر سے ہی شروع ہو جائے گا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرصات حشر میں قیامت کے میدان میں ہر آدمی کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم جس سے ہیبت ناک آوازیں آتی ہوں گی اور ایک اس کے اعمال جو قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ عمل کے مناسب ان کو شکلیں دے دی جائیں گی۔ گویاں پوری دنیا مجسم کر کے سامنے کردی جائے گی، ہر ایک آدمی بیٹھا ہوا اپنے کو دیکھے گا کہ میں فلاں برائی کر رہا ہوں۔ سات کوٹھڑیوں کے اندر، فلاں وقت، بعینہ وہی زمانہ، وہی ہیئت ہے۔ وہ زمانہ وہ مکان سب وہاں منتقل کیا جائے گا۔ اسے نظر آئے گا کہ میں اس زمانہ اور مکان میں بیٹھا ہوا اس حرکت میں مشغول ہوں۔ تو یہاں کا زمانہ، مکان ہر عمل اور اس کی ہر ہیئت کذائی بھی وہاں لوٹا دی جائے گی۔

سائنسی دنیا سے تمثیل اجساد کی تصدیق......اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آج کی سائنس نے تو اسے بالکل آسان کر دیا ہے ہندوستان میں دلی میں ایک نمائش ہوئی، مختلف یورپین ممالک نے اپنے اپنے سٹال لگائے، اور اپنی اپنی ایجادات دکھلائیں۔ روس کی طرف سے ٹیلی ویژن آیا تھا تو اس نمائش میں ہم دیکھنے کے لئے گئے۔ تو ہم نے ان سے کہا کہ کوئی عجیب چیز اپنے روس کی دکھلاؤ۔ اس نے ایک ٹیلی ویژن دکھلایا۔ اس کے بعد اس نے کچھ مشینوں سے اور کام لیا۔ تو ہمیں یوں نظر آیا کہ چین کا ایک جنگل ہے، جس میں عورتیں دھان بو رہی ہیں۔ تو چینی عورتوں کا طریقہ یہ ہے کہ دھان بوتے بوتے کچھ گیت گاتی جاتی ہیں، تو ٹیلی ویژن کے اندر وہ کھیتوں میں دھان لگاتی جاتی ہیں، اور چینی زبان میں ان کی گانے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ ہم نے واقعی یہ عجیب چیز دیکھی تھی۔ پھر لطف یہ کہ ہم یہ رات کے وقت دیکھ رہے تھے، اور وہاں ظہر کا وقت تھا گویا بارہ ایک بجے ہوں گے، اس میں وہی وقت نظر آتا تھا، ویسی ہی دھوپ پھیلی ہوئی ہے، وہی وقت ہے۔

تو ٹیلی ویژن والوں کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ ایک وقت کو متمثل کر کے دوسرے وقت میں دکھلا دیں۔ عشاء کے وقت میں ظہر کا وقت دکھلا دیں چین کا جنگل ہندوستان میں دکھلا دیں چینی عورتوں کا حرکت کرنا ہمیں نظر آ جائے ان کے گانے کی آواز ہم سن سکیں، ایک وقت ایک مکان میں دوسرا وقت اور دوسرا مکان نمایاں کر دیں۔ تو اللہ نے انسان کو یہ عقل وقدرت دی ہے تو اللہ کی قدرت کیا ایسا نہیں کر سکتی کہ دنیا کے سارے اعمال اور سارے زمانے اور سارے مکان آخرت میں سب کے سامنے پیش کر دے۔ جو اس کو مان سکتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ اسے نہیں مانے گا؟

جو یہاں کی ایجاد کو مانتا ہے وہ وہاں کی ایجاد کو بھی مانے گا، جبکہ یہاں کی ایجاد بھی انسان کی ذاتی نہیں۔ اللہ نے ہی تو عمل اور عقل دیا، جس سے یہ ایسی ایجاد کرتے ہیں تو جس کے دیئے سے ہم اس نہج پر پہنچ گئے، تو جو ان کمالات کا سرچشمہ ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ بنا دے تو تعجب کی کونسی بات ہے؟

بہر حال یہ آیتیں، یہ اعمال۔ یہاں عمل کی صورت میں ہیں۔ وہاں جا کر نعیم مقیم اور باغ و بہار کی صورت بن جائے گی۔ ایک آدمی یہاں معاذ اللہ زنا کرتا ہے وہ گویا اپنے بدن سے سانپ اور بچھو لپیٹ رہا ہے مگر یہاں شکل نمایاں نہیں قیامت کے دن شکل نمایاں ہو جائے گی کہ وہ زنا نہیں تھا بلکہ سانپ اور بچھو تھا وہ چوری نہیں تھی بلکہ عذاب تھا۔ جو عذاب الیم وہاں لپیٹا تھا۔ یہاں آ کے وہ شکل بن گئی تھوڑے عرصہ میں شکل سامنے آجائے گی۔

سردیوں میں بعض بچوں کو گڑ کھانے کی عادت ہوتی ہے اور اگر زمینداروں کا گھر ہو تو وہاں گڑ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور بچے کھاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ روکتے ہیں کہ بھئی گرمی کرے گا، مگر چوں کہ مٹھاس ہوتی ہے، مزہ آتا ہے تو رکتے نہیں تو وہ انہوں نے پانچ مہینے کھایا اور خوب کھاتے رہے مگر جب گرمی کا موسم آیا اب وہ پھوٹ پھوٹ کر نکلنا شروع ہوا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں اور پیپ بہنے لگی۔ اب والد علاج کراتے کراتے تنگ آ گیا کہیں مرہم لگا رہا ہے۔ کہیں مصفیات پلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ بچے! اسی دن کے لئے تو میں روکتا تھا کہ گرمی میں پھوٹ کر نکلے گا۔ تو یہی گڑ وہاں اس کی شکل مٹھاس کی تھی اور یہاں اس کی شکل پھوڑے کی ہو گئی تھوڑا سا موسم بدل گیا تو آثار ظاہر ہو گئے۔

آج جو بدعملی یہاں کی جا رہی ہے۔ وہ یہاں عمل کی شکل ہے، لیکن تھوڑا سا وقفہ گزرنے کے بعد جب موت کو پار کر کے آدمی قیامت میں پہنچے گا۔ وہی عذاب الیم کی صورت میں پھوٹ پھوٹ کر بدن سے نکلے گی۔ جو یہاں نکلا تھا، وہ وہاں سامنے آجائے گا۔

جتنے بھی اعمال ہیں یہ محض سطحی نہیں ہیں بلکہ انسانی نفس ان کو نگلتا ہے اور جزو بدن بناتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی جب جزو نفس بن گئیں تو جب اس میدان میں پہنچے گا تو وہی چیزیں جو جزو بدن بنالی تھیں نفس سے وہ نکل گئیں اور اللہ تعالیٰ اندر سے نمایاں کر دیں گے عمل کو۔ اور باہر سے بھی عمل کو مجسم بنا کر حجت تمام کریں گے۔

صحیح بخاری کے اوّل و آخر کی نسبت...... بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں عمل کا پہلا سرا بتلا دیا کہ: **اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ** کہ نیت صحیح کرو تا کہ عمل صحیح ہو گویا: **اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ** تو ایک اصول و کلیہ ہے کہ ہر چیز نیت سے معتبر ہو گی۔ شرعی وجود اور شرعی ثواب نیت سے ہو گا۔ اب ہم اس کلیہ سے نفع کس طرح اٹھائیں تو انتفاع کے لئے دوسرا جملہ رکھا: **وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّانَوٰی** آدمی جو نیت کرے گا اس کو وہی پھل ملے گا۔ محض اصول کے درجے میں بات نہیں رہ جائے گی بلکہ عمل کے میدان میں یا ضرر اٹھائے گا۔ یا نفع، تو یہ دوسرا اصول ہے، انتفاع کے لحاظ سے وہ اصول ہے عقلی اور کلی، کوئی آدمی کرے یا نہ کرے وہ اصول اپنی جگہ ہے اور جب کرے گا تو **وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّانَوٰی** اب اس سے منتفع ہونے کا وقت آیا۔ تو یہ اصول در حقیقت عمل ہی ہے اور پہلا اصول نظری۔

اس کے بعد تیسری مثال جزوی دی کہ: "**فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُهَا اَوْاِلَی امْرَاَةٍ یَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَاهَاجَرَ اِلَیْهِ**۔" تو ایک

جزوی مثال۔ایک عملی اصول،ایک نظری اصول۔یہ تینوں اس حدیث میں جمع کر دیئے گئے اور مجموعہ سے یہ بات نکلی کہ عمل بغیر نیّت کے ہوتا ہی نہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔حتیٰ کہ اگر دنیا میں کوئی مجرم ہو تو بعض گورنمنٹ کا قانون بھی کہتا ہے اور وکیل بھی کہتا ہے کہ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی،باقی عمل سرزد ہو گیا تو وہاں تو مدار ہی نیت پر ہے۔اللہ کی حکومت میں تو اصل باطن ہی کو دیکھا جاتا ہے تو اس حدیث میں تین چیزیں بیان فرما دیں اور عمل کا مبداء بیان کر دیا۔اور دوسری حدیث میں کلمات ارشاد فرمائے۔اخیر میں کہ وہ ثمرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔
سوال یہ ہے کہ آخر نتیجہ کیا نکلے گا؟ تو اسے ظاہر فرمادیا کہ: ''كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ'' ''یہ دو کلمے ایسے ہیں کہ زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں بھاری ہیں''۔

میں ہنسی میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں،کبھی آپ نے یہ پاپڑ تو کھائے ہوں گے باریک بنتے ہیں، کبھی موم کے کبھی ویسے،تو میں کہا کرتا ہوں کہ: ''خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ''
زبان پر ہلکے مگر معدے میں گئے تو بھاری ہو جاتے ہیں۔گڑبڑ پیدا کرتے ہیں تو یہ مادی غذاؤں میں اس کا مصداق ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال شریعت میں یہ کلمات وہ ہیں کہ زبان پر ہلکے،ادائیگی میں کوئی دشواری نہیں اور نہ ان میں وقت لگے،اور میزان کو دیکھو تو وہ پُر ہو جاتی ہے اجر و ثواب سے۔

تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صنعت سے مبداء بھی بیان کر دیا اور منتہا بھی،مصدر بھی اور مظہر بھی۔اس واسطے میں نے یہ دو روایتیں پڑھیں کیوں کہ یہ مجلس وعظ اور تقریر کی نہ تھی درس کی تھی۔

تو ان دو احادیث کا کچھ ترجمہ پیش کر دیا اور اصل جو علوم ہیں اور کمالات ہیں،وہ تو ہمارے مولانا (حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مرحوم) ہی آپ کے سامنے بیان فرماویں گے۔اور علماء ہی کا بیان کا حق ہے۔میں نے تو چند باتیں طالب علمانہ عرض کر دیں کہ تعمیل حکم کے بغیر چارہ نہ تھا۔

دعاء......اب امید ہے کہ آپ حضرات میرے لئے بھی دعاء فرمائیں گے۔اپنے لئے بھی اور حضرت مولانا (عبدالحق مرحوم) کے لئے بھی دعا فرماویں گے کہ،جن کی وجہ سے یہ ساری بہار قائم ہے اور یہ باغ و بہار آپ کے سامنے ہے،اور دارالعلوم دیوبند کے لیے بھی دعا فرماویں گے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک مادرِ علمی بنادیا ہے وہاں سے یہ سب گل کھل رہے ہیں اور یہ پھل پھول نکل کر سامنے آ رہے ہیں حق تعالیٰ ہم سب کا انجام بخیر فرماوے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآأَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

علمی معجزہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!.....فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ، وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ①

معجزہ دلیل نبوت ہے...... بزرگانِ محترم! انبیاء علیہم السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف معجزات دیئے ہیں معجزہ چونکہ دلیل نبوت ہوتا ہے۔ تو وہ نبی ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اور گویا یہ فعل خداوندی ہے کہ اس کی مثل لانے سے مخلوق عاجز ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ معجزہ دیا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ تو احیائے موتی ان کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اندھے مادرزاد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ ان میں بینائی آ جاتی تھی۔ جذامیوں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے، ان کا بدن صاف ستھرا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس دور کے ڈاکٹر اور اطباء عاجز آ گئے تھے اور ان بیماریوں کو لاعلاج سمجھا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ معجزہ ظاہر کیا تو دنیا سمجھ گئی کہ یہ اسباب کے درجے کی چیز نہیں ہے ضرور مسبب الاسباب کی طرف سے یہ کوئی کرشمہ اور خرق عادت ہے۔ یہ ان کی نبوت کی دلیل تھی۔

موسیٰ علیہ السلام آئے ان کو عصاء موسیٰ دیا گیا۔ جس کی خاصیت یہ تھی کہ اسے زمین پر ڈالتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا، ہاتھ میں تھام لیتے تھے تو لکڑی بن جاتی تھی۔

اسی طرح ید بیضاء ان کو عطا کیا گیا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تھے تو سورج کی طرح ان کا ہاتھ چمکتا تھا۔ ہر سو روشنی پھیل جاتی تھی۔ دنیا نے سمجھ لیا کہ یہ چیزیں دوسرا کوئی دکھلانے والا نہیں۔ یقیناً یہ خدا کی طرف سے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵۔

اس شخص کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے۔ جو سفیر خداوندی ہے اور اس کی سفارت لے کر آیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر کی کہ ان کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا اور آگ بردوسلام بن گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ چیز دکھلانے والا رب ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ پر ایک ایسا عجیب معجزہ ظاہر ہوا جو ان کے مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ تو نارِ خلیل ان کو دی گئی۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی معجزات دیئے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ظلہ شعیب دیا گیا قوم نے جب نہ مانا تو ابر آیا اور ابر میں سے انگارے برسے۔ قوم عذاب میں مبتلا ہوئی۔ حضرت ہود علیہ السلام آئے تو ہوا کا معجزہ دیا گیا قوم نے نافرمانی کی تیز آندھی چلی اور سات دن تک چلتی رہی یہ چھوٹی موٹی آندھی نہیں تھی اتنی عظیم آندھی تھی کہ اس نے بستیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ قوم عاد کے جانوروں کی آوازیں فضا میں سنی جاتی تھیں مکانات اوپر جاتے تھے پھر پٹخے جاتے تھے۔ یہ معجزہ تھا جس سے سمجھ لیا گیا کہ یہ شخص بے شک مبعوث من اللہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو ناقہ صالحہ دی گئی۔ قوم نے مطالبہ کیا کہ کوئی دلیل لاؤ کوئی سند لاؤ کہ ہم تمہیں نبی سمجھیں۔ فرمایا۔ جو تم مانگو۔ انہوں نے کہا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکالو۔ ظاہر ہے کہ بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال دے۔ یہ تو اسی ذات کا کام ہے جس کی شان یہ ہے کہ: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ (1) زندہ میں سے مردہ نکال دے اور مردہ میں سے زندہ پیدا کر دے۔ تو پتھر جیسی ظاہری طور پر ایک بے جان چیز میں سے جاندار کو نکالنا یہ معجزہ تھا آپ یہ معجزہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں مگر چونکہ رات دن کا قصہ ہے اس لئے وہ عجیب معلوم نہیں ہوتا انسان کی پیدائش کیا معجزہ نہیں ہے؟ ایک جماد لایعقل، ایک بے حقیقت قطرہ اس پانی پر نقاشی کرنا، نقش کھینچنا اور گندے قطرے میں سے ایک پاکباز انسان نکال کر تیار کرنا، بے عقل چیز میں سے عاقل انسان پیدا کر دینا۔ بے جان چیز میں سے جان دار چیز کو نکالنا، بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کے اندر سے اونٹنی نکال دی گئی۔ مگر چونکہ رات دن یہ قصہ ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے مشکل اور عجیب نہیں معلوم ہوتا ورنہ معجزات رات دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ تو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ناقہ صالح تھی۔

یوسف علیہ السلام کو قمیص یوسف دیا گیا۔ وہ یعقوب علیہ السلام کے چہرہ مبارک پر ڈالا گیا قمیص کا ڈالنا تھا کہ بارہ برس کی بینائی جو ضائع ہوئی تھی پانچ منٹ بعد لوٹ آئی اور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ داؤد علیہ السلام کو الانۃ (نرمی) حدید کا معجزہ دیا گیا۔ لوہے کو ہاتھوں میں پکڑتے تھے وہ موم کی طرح سے نرما جاتا تھا۔ جس طرح چاہتے اس سے سامان بنا لیتے تھے۔

---

(1) پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۹۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح کا معجزہ دیا گیا۔ ہوائیں مسخر تھیں ان کے حکم سے ہوائیں تخت اڑاتی تھیں۔ سواریاں لے جاتی تھیں۔ ہوا پر وہ کام ہوتا تھا جو زمین پر سواری کو چلانے کا ہوتا ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ﴾ ① بہر حال تسخیر ریاح یہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

اسی طرح منطق الطیر کا معجزہ بھی دیا گیا۔ پرندوں کی بولیوں کا جاننا اور سمجھنا اور اس پر احکام مرتب کرنا یہ اعجاز سلیمانی تھا۔ تو داؤد علیہ السلام کو الانہ حدید یعنی لوہے کو نرم دینے کا معجزہ دیا گیا، سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح، موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا اور عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔ یہ تمام معجزے درحقیقت ان کی نبوت کے دلائل تھے تا کہ یہ سمجھا جائے کہ یہ مبعوث من اللہ ہیں۔ خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اس کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کا تفوق...... جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے ہزاروں معجزات عطاء کئے گئے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا کہ ان کے ارشاد سے مردے زندہ ہوتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر استوانہ حنانہ کو زندگی عطاء کی گئی۔

واقعہ آپ نے سنا ہوگا احادیث میں صراحۃً موجود ہے کہ منبر بننے سے قبل مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ تو کھجور کا ایک سوکھا ہوا تنا کھڑا ہوا تھا، جس کو کاٹ دیا گیا تھا اس پر ٹیک لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ایک مدت دراز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا، جب منبر تیار ہوگیا اس پر خطبہ پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے تو حدیث میں موجود ہے اس ستون میں سے آہ و بکاء کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں اس طرح سے اس نے بلک بلک کر رونا شروع کیا جیسے فراق زدہ انسان روتا ہے۔ اور جب چیخ و پکار بڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر سے اترے، اس پر ہاتھ رکھا اور اس طرح دلاسہ دیا جس طرح سسکتے ہوئے بچے کو چپ کرایا جاتا ہے اور وہ چپ ہوا۔ ②

تو عیسیٰ علیہ السلام نے اگر مردے کو زندہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے ایک سوکھا ہوا تنا زندہ بنا۔ یہ معجزہ اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ اس لئے کہ انسانی لاش میں بہر حال پہلے جان موجود تھی۔ اگر دوبارہ لوٹ آئے تو اس روح کو اس بدن سے مناسبت تھی۔ اگر نکل سکتی تھی۔ تو داخل بھی ہوسکتی تھی اپنے محل اور مکان میں پہنچ گئی۔ اپنے سانچے میں آ کر ڈھل گئی۔

لیکن کھجور کا ایک تنا زندہ ہو اور زندہ ہو کر وہ آثار ظاہر ہوں جو جاندار میں سے ظاہر ہوتے ہیں اگر فقط اتنی زندگی ہوتی کہ اس پر ہرے پتے لگ جاتے تو کہا جاتا کہ اس کے اندر روح نباتی آ گئی۔ روح نباتی اگر اس کے خشک ہونے کی وجہ سے چلی گئی تھی وہ دوبارہ لوٹ آئی، اس کا محل تھا۔ جیسے مردے میں جان آ جائے۔

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۳۶۔

② السنن لابن ماجه، کتاب الصلوٰة والسنة فیها، باب ماجاء فی بدء شان المنبر ج: ۴ ص: ۳۳۶۔

لیکن جان آئی تو ایسی آئی جو جانداروں کی سی جان ہے۔ یعنی روح حیوانی داخل ہوئی نہ صرف روح حیوانی بلکہ انسانی افعال ظاہر ہوئے۔ تو روح انسانی داخل ہوئی اور انسانی افعال میں سے وہ افعال سرزد ہوئے جو عشاق خداوندی سے سرزد ہوتے ہیں عاشقانِ الٰہی کی طرح فراق نبوی میں رونا اور چلانا شروع کیا جو ایک عاشق خداوندی کا کام ہے۔ تو ایک کھجور کے خشک تنے میں جان بھی آئی تو انسانوں جیسی بلکہ کامل انسانوں جیسی تو یہ اس سے بڑا معجزہ ہے کہ ایک لاش کے اندر انسانی جان آئے جو انسان ہی کی لاش تھی۔ لاش تو ہو درخت کی اور روح اس میں کامل انسان کی پڑے یہ کہیں زیادہ اونچی بات ہے یہ نسبت اس احیاء موتی کے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا عطاء کیا گیا کہ ہاتھ روشن ہوتا تھا تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی جن کا نام غالبًا حنیفہؓ ہے وہ جنگل میں جارہے تھے۔ سخت اندھیرا تھا، راستہ ملتا نہیں تھا۔ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ راستے کی کوئی صورت ہو؟ کسی طرح سے مجھے راہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ان کی لاٹھی اس طرح روشن کر دی گئی کہ پورے جنگل میں روشنی پھیلی اور راہ نظر آنے لگی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرامؓ میں یہ کرامتیں پائی گئیں۔ یہ معجزہ ہی کا اثر تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہلائے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے وہ سب کے سب بلکہ بدرجہا زائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطاء فرمائے گئے۔

سب سے بڑا معجزہ...... لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ جو انبیائے سابقین کو نہیں دیا گیا وہ معجزہ فی الحقیقت علمی معجزہ ہے۔ جس کو قرآن حکیم کہا جاتا ہے کہ ایسی کتاب اور شریعت لاکر پیش کی جو جامع ہدایات ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معجزہ ہے اس کی فصاحت و بلاغت وہ ہے کہ دنیا اس کے مقابلہ کرنے سے عاجز رہ گئی، معانی اور مضامین کے لحاظ سے انتہائی جامع ہے کہ اتنا جامع کلام پیش کرنے سے دنیا عاجز آ گئی۔

عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ ان کو دعوی تھا کہ ہم عرب ہیں باقی ساری کی ساری دنیا عجم ہے۔ عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔ وہ اپنے مقابلے میں پوری دنیا کو گونگا جانتے تھے کہ نہ انہیں بولنا آتا ہے نہ یہ شادی اور غم کی شرح کر سکتے ہیں، نہ وہ اسالیب بیان ان کے ہاتھ میں ہیں جو عربوں کے ہاتھ میں ہیں قصائد لکھتے تھے اور دنیا کو چیلنج کرتے تھے کہ کوئی ہے جو ان کا مقابلہ کرے؟ ان جیسا قصیدہ لائے؟ بیت اللہ میں قصیدے ٹانگے جاتے تھے چیلنج دیا جاتا تھا کہ کوئی ان کا مثل بنا کر لائے۔ یہ گویا اس زمانے میں عام دستور تھا۔ اور عربوں کی فصاحت و بلاغت اس حد پر پہنچ چکی تھی کہ ان کی پانچ چھ برس کی بچیاں ننانوے ننانوے اشعار کے نہایت بدیہ قصائد برجستہ پڑھ جاتی تھیں۔ یہ سبعہ معلقہ جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے یہ وہی سات قصیدے ہیں جو بیت اللہ میں لٹکائے گئے تھے اور چیلنج کیا گیا تھا کہ کوئی ان کا مثل لائے۔

غرض اس زمانے میں عربوں کے اندر فصاحت و بلاغت کا زور تھا، اس وقت کا معجزہ جو جناب نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے لا کر پیش کیا وہ فصاحت وبلاغت ہی کا معجزہ تھا جس کو قرآن کریم کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اگر قصائد لٹکا کر چیلنج کیا اللہ نے قرآن اتار کر چیلنج کیا ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ① ”اگر جن اور انسان سب مل کر مجتمع ہو جائیں اور اس قرآن کا مثل بنانا چاہیں تو ان کو قدرت نہیں ہے کہ وہ بنا سکیں“۔ اس لئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ خدا کا کلام ہے۔

حقیقتِ معجزہ...... جس سے سب عاجز آ جائیں یہ دلیل ہوتی ہے کہ یہ بشر کے قبضہ قدرت کی بات نہیں ہے۔ آج آپ پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورج اور چاند خدا کا فعل ہے اس لئے کہ سارے انسان مل کر چاہیں تو سورج کی ایک کرن نہیں بنا سکتے۔ آپ کہتے ہیں زمین خدا کی بنا ہوئی ہے۔ دلیل یہی دے دیتے ہیں کہ سارے انسان جمع ہو جائیں تو زمین کا ایک ذرہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اس کے ذروں کو جوڑ توڑ کر اس سے کام لے لینا تو اور چیز ہے۔ لیکن ایک ذرہ بنا دیں جس میں وہی انبات وغیرہ کی تمام صلاحیتیں ہوں جو زمین میں ہیں دنیا کے سارے فلاسفر جمع ہو کر نہیں بنا سکتے۔ چاند اور سورج تو علویات وفلکیات میں سے ہیں ارضیات میں سے زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جز انسان نہیں بنا سکتا۔ درخت کی ایک پتی ایسی نہیں بنا سکتا جس میں وہی خاصیتیں ہوں جو اللہ نے کسی پتے میں رکھی ہوں یہ الگ چیز ہے کہ آپ زمین کے اجزاء میں ترکیب اور تحلیل کر کے اس سے کوئی نئی چیز پیدا کر لیں۔ مگر پیدا کرنے میں آپ اسی زمین کے اور اس کے مادوں کے محتاج رہیں گے۔ خود مادے کو اپنے ہاتھ سے بنا لینا اور اس کو ایجاد کر لینا، عدم سے وجود میں لے آنا، یہ انسان اور بشر کی قدرت کی چیز نہیں ہے سارے انسان جمع ہو جائیں نہیں بنا سکتے۔ جس چیز سے سارے انسان عاجز آ جائیں اس کی نظیر نہ لا سکیں اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی...... اسی طرح کلام کے سلسلہ میں ساری دنیا کے فصحاء اور بلغاء عاجز آ گئے اور وہ عرب عاجز آ گئے جنہوں نے دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی فصاحت وبلاغت کا نمونہ لائے لیکن جب قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں تو ہار مان لی اور کہا کہ: ”اِنَّ فِيْهِ لَحَلَاوَةً وَّاِنَّ فِيْهِ لَتَرَاوَةً“ ② اس کلام میں عجیب قسم کی حلاوۃ اور شیرینی ہے کہ ہم پیدا کرنا چاہیں تو اس کا عشر عشیر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ غرض اس زمانے کے فصحاء اور بلغاء اس چیز کو مان گئے کہ ہم اس کی نظیر لانے سے عاجز ہیں۔

ورنہ آپ خود اندازہ کیجئے کہ جب چیلنج کیا گیا تو جن لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے بے گھر کیا، انتہائی ایذاء رسانی کی، لڑائیاں ٹھانیں، مقابلے کئے یہ ساری چیزیں تھیں۔ مگر ایک آیت کی نظیر لا کر پیش کر دی ہو، کسی نے یہ نہیں کیا۔ پورا قرآن تو بجائے خود ہے کسی ایک آیت کی نظیر نہیں دے سکے۔ اسی لئے قران نے پہلے تو یہ چیلنج کیا کہ: ﴿عَلٰٓی اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ ③ ”اس قرآن کا مثل لاؤ“۔

① پارہ: ۱۵ سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۸. ② دلائل النبوۃ، باب اعتراف مشرکی مکۃ...... ج: ۲، ص: ۷۵، رقم: ۵۰۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۲ ص: ۳۶۰ رقم ۸۶۰. ③ پارہ: ۱۵ سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۸.

پھر تنزل کر کے کہا ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ① ''تم کہتے ہو کہ یہ اختراع کردہ کلام ہے تو اس قسم کی اختراع کردہ دس سورتیں تم بھی لاؤ'' پھر اور تنزل کیا اور کہا ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ ② ''ایک ہی سورۃ اس جیسی بنا لاؤ''۔

سورت میں یہ بھی قید نہیں لگائی کہ سورت بقرہ جیسی سورت ہو جو اڑھائی پارے کی ہے۔ آل عمران جیسی سورۃ ہو یہ بھی قید نہیں ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ﴾ ③ کی طرح کی چھوٹی سی سورۃ بنا لاؤ۔ پھر اس سے تنزل کیا اور کہا کہ ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ ④ ''اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک بات ہی اس جیسی بنا لاؤ''۔ سورت تو بجائے خود ہے۔

تو اندازہ کیجئے اس قوم کے سامنے جو چیلنج دینے کی عادی تھی اتنے بڑے چیلنج دیئے جائیں وہ دوسرے سارے مقابلے کرے، جتن کرے۔ لیکن کلام کی نظیر نہ پیش کرے تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ بشر کی طاقت سے خارج ہے اس قدر فصاحت و بلاغت سے کلام کا بھرا ہوا ہونا یہ صرف اعجاز خداوندی ہے۔

انسانی صفات کی حد اعجاز...... آپ اندازہ کیجئے کہ جتنی بھی انسانی صفات ہیں اور انسانی افعال ہیں ان میں ایک حد ایسی نکلتی ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک حد تک قادر رہتا ہے پھر ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتا ہے اسی حد سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے خدائی حدود ہیں۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں گویا آپ میں بصر کی طاقت ہے۔ آپ فرلانگ دو فرلانگ یا میل بھر کی چیز دیکھ لیں گے۔ آسمان کے ستارے دیکھ لیں گے۔ لیکن اس کے بعد؟ اس کے بعد نگاہ عاجز ہو گی اور ایک حد نکلے گی جہاں آپ کی نگاہ عاجز ہو جائے گی، آپ تحت الثریٰ کو نہیں دیکھ سکتے، صرف سطح کو دیکھ سکتے ہیں آپ کسی چیز کے اندرونی جگر کو اپنی بصر سے نہیں دیکھ سکتے۔ بصر عاجز ہے۔ بہر حال آپ کی بصر دیکھے گی اسے دیکھنے کی قدرت ہے مگر ایک حد ایسی نکلے گی جہاں آ کر عجز کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اس سے آگے خدائی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی کی بصر ہے جو دیکھتی ہے۔

آپ میل دو میل یا پچاس میل کی بات سنیں گے۔ آلات کے ذریعے سے آپ مشرق و مغرب کی خبریں سن لیں گے لیکن آسمان کے اندر کی خبریں اور آوازیں بھی آپ سننے لگیں؟ آپ کی سماعت یہاں آ کر عاجز ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی سمع و بصر اور تکلم بھی محدود۔ ہر چیز محدود ہے ایک حد کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس حد کے اوپر پہنچ کر آپ اپنے عجز کا اقرار کرتے۔ ہیں اس حد سے باہر خدائی قوتیں ہوتی ہیں۔

یہی صورت کلام کی بھی ہے کہ آپ کلام کرنے کے سلسلہ میں فصیح و بلیغ اور بہترین کلام کریں گے۔ آپ بہترین شاعر بن جائیں گے۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اور پیدا ہوگا، وہ آپ سے اچھا کلام کرے گا۔ پھر اس سے اور

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ هود، الآية: ۱۳. ② پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآية: ۳۸. ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الکوثر، الآية: ۱.
④ پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآية: ۳۴.

بڑھ کر پیدا ہوگا جو اور اچھا کلام کرے گا۔ مگر ایک حد ایسی نکلے گی کہ بشر وہاں عجز کا اقرار کرے گا کہ اتنے دقیق معانی کو میں چار الفاظ میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" ہیں۔ احادیث میں دقیق سے دقیق مضامین سہل سے سہل تعبیر سے ادا فرمادئے گئے ہیں، دوزخ و نار کی کیفیات، جنت کی کیفیات، حشر کی کیفیات اور قبر کے احوال وغیرہ جو خالص کیفیاتی چیزیں ہیں ان کو اگر ادا کیا ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل الفاظ میں ادا کیا ہے، تعبیر اور عنوان نہایت سہل، اور مضامین نہایت دقیق، ایک عامی آدمی سمجھے گا تو اپنی بساط کے مطابق سمجھے گا۔ اسی کلام کو ایک حکیم پڑھے تو اس میں سے حکمت کی باتیں نکالے گا، اسی کلام کو ایک عارف باللہ پڑھے تو معرفت کی باتیں نکالے گا۔ تو کلام چھوٹا سا ہے مگر مضامین اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ احادیث کا ذخیرہ آپ کے سامنے ہے ان کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی حد و نہایت نہیں۔ حدیث ایک ہے۔ ہر عالم نئے سے نئی اس کی شرح کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، ایک عالم ایک پہلو لیتا ہے تو اس پہلو سے بے انتہاء علوم نکلتے چلے آتے ہیں دوسرا عالم دوسرے پہلو پر غور کرتا ہے تو اس سے بے انتہاء علم نکلتا چلا آتا ہے۔ حدیث ایک ہوتی ہے اس کے اندر سے ہزاروں دقائق اور معانی نکلتے آتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں میں بھی عاجز ہوں کہ میں ایسا کلام نہیں لاسکتا۔ یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ تو ایک حد ایسی پیدا ہوئی کہ خالق ہی اس تعبیر کے اوپر قادر ہے۔ مخلوق کو قدرت نہیں دی گئی۔ تو تمام صفات میں، سمع، بصر، قدرت اور حیات ہو ان میں جیسے ایک حد اعجاز نکلتی ہے تو کلام میں بھی ایک حد اعجاز ہے اور وہی حد اعجاز معجزہ کہلاتی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قران کریم کا معجزہ دیا گیا ہے۔

اعجاز کلام...... قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے ثبوت میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے دلائل پیش کئے ہیں۔ موٹی سی ایک بات یہ ہے جو سمجھنے کی ہے۔ ہر شخص اسے سمجھے گا کہ ہر انسان پر مختلف کیفیات آتی ہیں جس کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے اس حالت میں جو وہ کلام کرتا ہے وہی کیفیت اس کے کلام میں ہوتی ہے۔ اگر وہ یوں چاہے کہ اس وقت میرے کلام میں دوسری کیفیت آجائے اسے قدرت نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص غمگین بیٹھا ہوا ہے خدانخواستہ کوئی میت ہوگئی، اس کا قلب غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وقت وہ جو بھی کلام کرے گا اس میں غم کے اثرات نمایاں ہوں گے اگر وہ یہ چاہے کہ میں اس وقت خوشی کا کلام کروں اسے قدرت نہیں ہوگی۔ اگر وہ تصنع اور بناوٹ کر کے چاہے بھی کہ میں خوشی کا بھرا ہوا کلام کروں ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس وقت غم کی کیفیت غالب ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہوگا، وہی چیز اس کے کلام میں آئے گی۔

اگر ایک شخص پر خوشی ہے اس کے ہاں شادی ہو رہی ہے وہ جب بھی بولے گا۔ اس کے ہر ہر لفظ سے بے

ساختہ خوشی ٹپکے گی۔ اگر وہ یوں چاہے کہ میں ایسا کلام کروں جس سے بے انتہا غم ٹپکتا ہو۔ اس کی قدرت میں نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت خوشی سے مغلوب ہے۔ تو ہر کیفیت انسان پر جب آ کر غالب ہوتی ہے اس کیفیت کے تحت جب بھی کلام کرے گا تو کلام میں اسی کیفیت کا غلبہ ہوگا۔ ایک کیفیت سامنے آئے گی۔ دوسری مغلوب ہوگی۔

لیکن قرآن کریم کو دیکھا جاتا ہے ایک وقت میں ایک آیت نازل ہوئی اس کی ابتدا میں بے انتہاء جلال خداوندی کا اظہار معلوم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے جملہ میں بے انتہاء جمال معلوم ہوتا ہے کہ بے انتہاء بشارتیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر جنت کا ذکر ہے تو اسی کے ساتھ دوزخ کا ذکر ہے اور جس وقت ہم پڑھتے ہیں تو یہ کیفیات ہمارے قلوب کے اوپر طاری ہوتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متضاد کیفیات برابر چل رہی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان تو ابن الحال ہے، ہر حال اس پر غالب آتا ہے جیسا حال ہوگا ویسا کلام کرے گا۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ، پر کوئی چیز غالب نہیں آ سکتی۔ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ ①

نہ خوشی غالب آ سکتی ہے نہ غمی، خوشی اور غمی اس کی پیدا کردہ ہے۔ اس لئے جب وہ کلام کریں گے تو اگر چاہیں کہ اس میں خوشی کی کیفیات بھری ہوئی ہوں اس میں پیدا کر دیں گے۔ اگر چاہیں کہ غمی کی کیفیات ہوں تو وہ پیدا کر دیں گے کیونکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہیں۔ تو قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے اندر جو لمبی آیت ہو کئی متضاد کیفیات پوری قوت کے ساتھ برابری سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشر کی طاقت سے خارج ہے بشری کلام نہیں بلکہ اس ذات کا کلام ہے جو ہر چیز کے اوپر غالب ہے اس کی صفات اور اس کی شانیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں جب آدمی پڑھے اور سمجھ کر بصیرت کے ساتھ پڑھے تو کچھ کیفیات قلب پر مترشح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

معرفت اوصاف متکلم...... وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کلام میں متکلم کے اثرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام کو پڑھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ کسی عالم کا کلام ہے یا جاہل کا؟ شاعر کا ہے یا غیر شاعر کا؟ اس کے کلام کے طرز بیان اور مضامین کو دیکھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا کلام ہے یا ایسے شخص کا جس میں فلاں صفت غالب ہے۔ غرض کلام میں متکلم کے اثرات غالب ہوتے ہیں بلکہ کلام میں خود متکلم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اگر متکلم کو دیکھنا ہو اس کا کلام پڑھ لو تو اس کی کیفیت عیاں ہو جائے گی۔

اورنگ زیب کی بیٹی ''زیب النساء'' یہ بڑی شاعرہ تھی۔ اس کا کلام بہترین ہوتا تھا۔ مشاعرے جب ہوتے تھے تو اس کا کلام بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو عاقل خان جو اورنگ زیب کے زمانے کا بڑا عہدہ دار بھی تھا اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اس کی زبان سے کہیں یہ جملہ نکلا کہ کاش میں اس شاعرہ کو کہیں دیکھتا جس کا اتنا اونچا کلام ہے، اتنی اس میں بلاغت ہے۔ یہ جملہ زیب النساء کو پہنچا۔ زیب النساء نے اس کا جواب ایک شعر میں دیا۔ اگر تو مجھے دیکھنا چاہتا ہے

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۱.

تو دیکھ سکتا ہے۔ میں اس کی تدبیر بتلائے دیتی ہوں۔ اس نے یہ شعر لکھ کر بھیجا کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

میں اپنے کلام میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہوں جس طرح سے گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے، میں نمایاں ہو جاؤں گی۔ غرض ہر کلام میں متکلم کے اوصاف چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعراء کے کلام کی فصاحت و بلاغت کے درجات آپ اسی طرح سے قائم کرتے ہیں کہ اگر بہت اونچا شعر ہے آپ کہتے ہیں کہ کسی بڑے اونچے شاعر کا ہے۔ اگر معمولی کلام ہے آپ کہتے ہیں کہ ہاں تک بندی ہے۔

ایک بات مجھے یاد آئی کہ ہماری اردو زبان میں ایک محاورہ ہے "آنکھیں چار ہونا" اور یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب محبت کا اشارہ کنایہ کرنا ہوتا۔ اس محاورے کو استاذ ذوق نے نظم کیا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

ایک دوسرا شاعر ہندو اس نے بھی یہی مضمون بیان کیا۔ مگر اس مضمون کو اونچا کر دیا۔

وہ کہتا ہے ؎

دل کی نہیں تقصیر مکنڈ آنکھیں ہیں ظالم یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

یہ ایک ہی بات دو شعروں میں ادا کی گئی مگر جاننے والوں نے جان لیا کہ اس مضمون کو دوسرے شعر میں جس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے وہ بہ نسبت پہلے پیرائے کے بلند پیرایہ ہے۔ تو کلام کے اندر فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے مراتب اور تفاوت فصحاء و بلغاء سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ بہترین کلام ہے اس سے زیادہ بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جب انسانوں کے کلام میں ایسے درجات نکلتے ہیں کہ بعض موقعوں پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہل ممتنع ہے اس سے آگے اب بہتر نہیں ہو سکتا۔

متکلم حقیقی..... تو اللہ کے کلام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ پائی جانی چاہئے۔ جب وہ کلام کرے تو اس درجے کا بدیع ہو کہ اس سے بہتر ناممکن ہو۔ انسانی کلام کتنا ہی بدیع ہو مگر اس سے بہتر ممکن تو ہو گا اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح و بلیغ انسان پیدا ہو جائے۔ لیکن اللہ جو کام کرے گا یا کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کا نظیر ہے نہ اس کے کلام کا نظیر ہو سکتا ہے نہ اس کے لئے کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہو سکتا ہے۔ اس لئے فرما دیا گیا کہ ﴿لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ ①۔ اس کے کلام کے مثل کوئی نہیں لا سکتا۔

اس لئے کہ اس کی ذات و صفات کا مثل کوئی موجود نہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۸.

الْبَصِیْرُ﴾ ① ''اس کی ذات کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے، وہ سمیع اور بصیر ہے''۔

جب ذات بے چوں اور بے چگون ہے اور صفات کی کوئی نظیر نہیں ہے تو پھر افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ تو صفات میں سے کلام بھی ہے۔ کلام کرنے کا حق تو اللہ ہی کا ہے۔ ہم اور آپ متکلم تو اس کے پرتو سے بن گئے ہیں اگر کلام کا پرتو نہ پڑے تو ہمیں متکلم ہونا نصیب نہیں ہوسکتا۔ سمع اور بصر اس کی صفت ہے۔ اس کا پرتو پڑا تو ہم بھی سمیع اور بصیر کہلائے۔ موجود حقیقی وہ ہے۔ اس کے وجود کا پرتو پڑ گیا تو ہم بھی موجود کہلانے لگے۔ ورنہ ہم میں کوئی اپنا ذاتی اور اصلی وجود نہیں ہے۔ تو جب ہماری ہر چیز حق تعالیٰ کے پرتو سے ہے، اصل صفات اس کی ظلی صفات ہماری ہیں، اصل وجود اس کا ظلی وجود ہمارا، اصل کلام اس کا، ظلی کلام ہمارا تو اصل فصاحت و بلاغت اس کی ہوگی ہماری فصاحت و بلاغت ظلی ہوگی۔

غرض جب اصل فصاحت و بلاغت ہمارے اندر ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایک کا ظل دوسرے ظل کے مشابہ ہوسکتا ہے۔ اصل کے مشابہ تو جب ہو جب کوئی دوسرا اصل پیدا ہو اور اصل ایک ہے تو اصل کلام ایک ہی رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے حقیقت میں جیسے افعال کے معجزے ظاہر فرمائے زمین ایک معجزہ ہے، آسمان ایک معجزہ ہے، چاند اور سورج ایک معجزہ کہ جن کی نظیر لانے کی کسی کو قدرت نہیں، تو کلام کا معجزہ بھی ظاہر فرمایا اور وہ قرآن کریم ہے جس کا مثل ناممکن تھا۔ نہیں لایا گیا اور آج تک نہیں لایا گیا۔

دنیا کی اقوام نے دن رات مقابلے کئے مگر اس جیسا کلام لا کر پیش کر دیں جس میں ویسی ہی معنویت ہو اتنے ہی پہلو بھرے ہوئے ہوں، اتنی ہی جامعیت ہو اور اتنی ہی فصاحت و بلاغت ہو یہ کوئی نہ کر سکا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے یعنی خدا کا کلام ہے بشر کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجاز نمائی...... پھر یہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی قرآن کریم نے معجزات بنائے اس واسطے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے سے بڑے بڑے اکابر اولیاء پیدا ہوئے ان اولیاء کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہوئیں تو قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ہاتھ پر معجزے نمایاں بھی کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر جو خرق عادت ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ ولی کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہو اسے کرامت کہتے ہیں۔ ابوحنیفہ، سفیان ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ یہ اکابر مجتہدین گزرے ہیں یہ انبیاء نہیں تھے مگر نبیوں جیسے کام کئے ایک ایک نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو ایمان سے رنگا اور ایک ایک خطہ کو ایمان و اسلام سے رنگیں بنا دیا۔

صوفیاء کے طبقے پر نگاہ ڈالو۔ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کسی مسلمان کی نہیں بلکہ ایک عیسائی کی شہادت ہے۔ جس کا نام مسٹر آرنلڈ ہے، اس نے ''پریچنگ آف اسلام'' کتاب لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر ننانوے لاکھ آدمیوں نے

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱۔

ہندوستان میں اسلام قبول کیا ہے۔تو ایک فرد نے ننانوے لاکھ کو مسلم بنایا۔خود حضرت شیخ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ اسلام لائے ان کی تعداد الگ ہے۔تو ایک شیخ معین نے وہ کام کیا جو انبیاء بنی اسرائیل کرتے تھے کہ جس خطے میں بیٹھ گئے، لاکھوں اور کروڑوں کو باایمان بنایا۔ایمان کی روشنی پیدا کر دی،تو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے اور اس پر عمل کی بدولت لوگ ایسے مقامات پر پہنچے' ولایت کے ان مرتبوں پر پہنچے جن کے ہاتھوں پر خرق عادت اور کرامتیں ظاہر ہوئیں، الہامات ظاہر ہوئے۔

شرائع ظلیہ...... یہ جتنے ائمہ مجتہدین ہیں اگر انبیاء علیہم السلام پر اصلی شریعتیں ظاہر ہوئیں تو ان مجتہدین کے قلوب پر ظلی شریعتیں ظاہر ہوئیں۔یعنی انہوں نے انہی شریعتوں میں سے استنباط کر کے مستقل احکام دیئے۔انہی شریعتوں میں اجتہاد کر کے احکام نکالے اور کتابوں کی کتابیں بھر دیں۔

یہ کتاب وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔کتاب وسنت کی کلیات میں جو چیزیں چھپی پڑی تھیں۔مجتہد کے فہم نے ان کو اندر سے نکال کر کے نمایاں کر دیا یہ الہامی چیزیں تھیں۔حق تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ڈالیں، انہوں نے ان کو واضح کر دیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... مجھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں کا واقعہ یاد آیا۔استاذ بھی امام ہیں اور شاگرد بھی امام ہیں۔اور دونوں صاحب مذہب اور صاحب فقہ ہیں۔امام شافعیؒ کا فقہ حجاز میں پھیلا اس لئے کہ ان کی ابتداء حجاز میں ہوئی انتہا مصر میں جا کر ہوئی۔مصر کی اکثریت شوافع کی ہے۔امام احمد بن حنبلؒ مغربی ممالک کی طرف گئے۔تو نجد اور یمن کے اندر حنبلیت پھیلی ہوئی ہے۔لاکھوں انسان فقہ حنبلی پر چل رہے ہیں۔

چونکہ امام شافعیؒ کا اخیر زمانہ مصر میں گزرا ہے اور امام احمدؒ سے ملاقات کئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔تو امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے نام خط لکھا۔''بہت عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے اور ملنے کو جی چاہتا ہے۔اگر مصر آنے کی کوئی صورت بن پڑے تو کوشش کرو مصر آ جاؤ۔جی چاہتا ہے کہ اخیر عمر میں تمہیں ایک دفعہ اور دیکھ لوں''۔

امام احمد نے جواب لکھا کہ ''میں حاضر ہو رہا ہوں''۔دن اور تاریخ متعین کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو حاضر ہو رہا ہوں۔چنانچہ مقررہ وقت پر امام احمد بن حنبلؒ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور اسی تاریخ کو مصر پہنچے جس کا وعدہ لکھا تھا۔امام شافعیؒ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔جب امام نکلے تو جتنے علماء تھے سب کے سب امام شافعیؒ کے ساتھ چلے۔علماء جب چلے تو جتنے احکام اور زعماء تھے وہ بھی ساتھ ہوئے۔حتیٰ کہ بادشاہ وقت بھی استقبال کے لئے آ گیا ایک بڑا عظیم جتھہ گویا ملک کے اجلہ اور اکابر استقبال کے لئے آئے اور پورے مصر میں خوشی تھی کہ آج امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہے ہیں۔امام شافعیؒ کی بچیوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کودتی پھرتی ہیں کہ ہمارے ہاں امام وقت مہمان ہونے والا ہے۔خدا خدا کر کے امام احمدؒ پہنچے، اور امام شافعیؒ کے ہاں قیام کیا۔

امام شافعیؒ نے کھانا لا کے رکھا۔ امام شافعیؒ کی مہمان نوازی مشہور اور تاریخی چیز ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے عجائبات تاریخ کا حصہ ہیں۔ غرض امام شافعیؒ نے بہت شغف اور توجہ کے ساتھ مہمان نوازی کی اور کھانا لا کر رکھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کھانا، کھانا شروع کیا مگر اس طرح سے کھایا جس طرح کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے اور کافی مقدار میں خوب پیٹ بھر کے کھایا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ معلوم نہیں کتنے وقت کا کھانا نہیں ملا۔ وہ زمانہ تقویٰ اور طہارت کا ہے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے گھر میں امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے یہ کیسا امام وقت ہے جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے یہ عوام الناس کا کام ہے کہ پیٹ بھر کے کھائیں۔ اتقیاء کا یہ کام نہیں ہے۔ وہ تو سنت کے تابع ہوتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور تابعین کی سنت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھالیا۔ لیکن اس طرح سے گر پڑ کے کھانا کہ معلوم ہو بہت وقت کا بھوکا ہے یہ شان اتقیاء کی نہیں ہے۔ تو یہ کیسا امام وقت ہے؟

امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا۔ فرمایا کہ: حیرت مجھے بھی ہے۔ مگر میں بول یوں نہیں سکتا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میری زبان سے یہ نکلا کہ بھائی کم کھاؤ۔ تو یہ موضع تہمت ہوگا کہ میں شاید اپنی روٹی بچانا چاہتا ہوں۔ اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں مگر حیرت مجھے بھی ہے کہ احمد بن حنبلؒ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا؟ کھانے کی طرف اس طرح سے متوجہ کیسے ہوئے؟

رعایت مقام...... اتقیاء کے کھانے کی شان یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ: جب جہاد میں جاتے تھے تو یہ نہیں تھا کہ سامان رسد کے طور پر وہاں انڈے کیک اور پیڑیاں پہنچتی تھیں۔ کچھ سوکھے ٹکڑے زنبیلوں میں بھرے ہوئے ہیں بہت بھوک لگی چبا کر کھالئے۔ کسی کے پاس وہ بھی نہیں کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں وہ کھالیں۔ یہ بھی نہ ہوا تو بعض کے پاس گھٹلیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں گھٹلیاں منہ میں ڈال لیں گویا نفس کو بہلا دیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں اور نفس سمجھ گیا کہ مجھے میری غذا مل گئی تو غذائیں یہ تھیں اور چوبیس گھنٹے جہاد میں مصروف تھے۔ یہ روحانی و معنوی قوت ہوتی تھی۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے ایک بادام بھی کوئی غذا ہے۔ شراح لکھتے ہیں کہ وہ خود حضرت شیخ ہیں۔ اپنے کو چھپانے کے لئے ایسے لکھا کہ میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے اور حالت یہ تھی کہ ان کے تراجم میں موجود ہے رات کو جب ذکر اللہ کرتے تھے تو اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ سرائے میں ذکر کرتے تھے، دو فرلانگ پر شہر ہے ہر گھر میں اس طرح پر آواز پہنچتی تھی جیسے ہمارے دروازے پر بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں یہ ان کی قوت کی حالت تھی۔ یہ روحانی و معنوی قوت تھی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ: دو دو مہینے ایسے گزرتے تھے کہ بیت نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا اسود ین پر گزر ہوتا تھا ایک کھجور کھالی، ایک کٹورا پانی پی لیا، یہ غذا ہوتی تھی اور جب صوم وصال رکھنے پر آئے تو یہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔ ①

بہر حال انبیاء علیہم السلام کی شان بھی کھانے پینے کے بارے میں انتہائی تقلیل کی ہے، صحابہ، اولیاء اور اتقیاء کی شان بھی انتہائی قلت کی ہے۔ اتقیاء کی یہ نظیریں سامنے تھیں، ان کو سامنے رکھ کر لڑکیوں نے اعتراض کیا کہ احمد بن حنبلؒ کیسا متقی شخص ہے؟ اور کیسا امام ہے جس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا؟

امام شافعیؒ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا اور فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے مگر میں میزبان ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ خیر وہ بات ختم ہو گئی۔

عشاء کا وقت آیا اور امام احمد بن حنبلؒ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے امام احمد کے لئے بستر لگایا اور لوٹا بھر کر پانی کا رکھا تا کہ رات کو تہجد کے لئے اٹھیں تو تکلیف نہ ہو۔ لوٹا بھرا بھرایا مل جائے۔ رات کا یہ سب سامان کر کے بچیاں چلی گئیں۔

امام احمدؒ تشریف لائے چارپائی پر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کو جب اٹھ کر گئے۔ بچیاں بستر تہہ کرنے آئیں تو معلوم ہوا لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو ان کے غصہ کا پارہ انتہائی طور پر چڑھ گیا اور انہوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑ کے کہا کہ یہ تمہارے شاگرد جن کو تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے اور اتقیاء امت میں سے ہیں کیسا متقی ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے؟ اور رات کے اوقات میں نوافل پڑھنے کی اسے توفیق نہ ہو؟ تہجد یہ نہ پڑھے؟ یہ کیسا نئی قسم کا امام ہے۔ اب امام شافعیؒ سے بھی ضبط نہ ہو سکا آخر احمد بن حنبلؒ کے استاذ تھے۔ تو بٹھا کر کہا کہ:

اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔ میں کل سے دیکھ رہا ہوں اور صبر کر رہا ہوں تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ میں اس لئے نہیں بولا کہ میں میزبان تھا۔ میرے اوپر تہمت آتی۔ بہر حال میں نے صبر کیا۔

لیکن اب جب دیکھا کہ رات کو تہجد تک کی توفیق نہیں ہوئی، تو میرے سے نہ رہا گیا۔ تو تمہارے حالات میں یہ تغیر کب سے پیدا ہوا؟ یہ تو افسوسناک حالات ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ ہنسے اور عرض کیا، حضرت! واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔

شانِ عمل اور شانِ اجتہاد...... فرمایا کیا واقعہ ہے؟ کہا کہ: واقعہ یہ ہے آپ کو میرے زیادہ کھانے کے اوپر اعتراض ہوا۔ حقیقتاً میں نے زیادہ کھایا ہے اور کافی کھایا۔ عمر بھر میں کبھی اتنا نہیں کھایا تھا جتنا یہاں کھایا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا دستر خوان بچھا تو اتنی حلال کی کمائی تھی اس کے اوپر آسمان سے انوار و برکات کی بارش تھی، میں نے عالم میں اتنی پاک کمائی نہیں دیکھی۔ میں نے ارادہ کیا جتنا زیادہ سے زیادہ کھا سکوں کھالوں

① دلائل النبوة للامام البیهقي، باب ذكر اخبار رؤية في زهده...... ج: ۱، ص: ۳۳۱، رقم: ۲۹۸.

ممکن ہے پھر ایسی پاک غذا مجھے نصیب نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے زیادہ کھایا چاہے مجھے سات دن روزے رکھنے پڑیں۔ مگر اتنا منور اور بابرکت لقمہ حلال میں نے آج تک عالم میں نہیں دیکھا۔ اور فرمایا کہ: اس کھانے کی دو برکتیں میرے اندر نمایاں ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی۔ عملی برکت تو یہ نمایاں ہوئی کہ میں نے آج عشاء کے وضو سے تہجد پڑھی اور صبح کی نماز بھی پڑھی یہ وجہ ہوئی لوٹا استعمال نہ کرنے کی وہ بھرا ہوا رہ گیا۔ میں رات بھر عبادت میں رہا۔

اور علمی برکت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن حکیم کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے نکالے اور علوم کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ یہ لقمۂ حلال کی غذا کی برکت تھی۔

شرط معرفت...... حقیقت یہ ہے کہ نورِ معرفت حلال غذا سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لقمہ حلال کا ہو۔ ایمانی و روحانی قوتیں لقمہ حلال کے تابع ہیں۔ انسان کا پیٹ حوض بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے گا نلوں اور نالیوں میں بھی وہی آئے گا۔ اگر پیٹ میں پاک غذا ہے تو قلب میں پاک آثار آئیں گے اور دماغ میں بھی، اقوال بھی پاک نکلیں گے اور اگر لقمہ حلال نہیں ہے تو پھر وہی ظلمت اور کدورت ملے ہوئے اقوال وافعال ہوں گے اور ایسی ہی حرکات بھی ہوں گی۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ لقمہ حلال کا اہتمام کرتے تھے کہ ہماری کمائی پاک ہو۔ اس کمائی سے ہی قلب میں نور معرفت پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے شاہ جی عبداللہ صاحب ان کا نام تھا۔ بے پڑھے لکھے امی محض تھے۔ مگر صاحب نسبت بزرگوں میں تھے انہوں نے اپنے گزر اوقات کا ذریعہ گھاس کھودنا مقرر کر لیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھڑی بیچتے تھے۔ اور گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے۔ دیوبند میں جتنے لوگ اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدتے تھے، منڈی میں پہنچتے تو سینکڑوں گٹھڑیاں گھاس کی ہوتی تھیں، مگر سب منتظر رہتے تھے کہ ہم شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے۔ ہر ایک اس کی کوشش میں ہوتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہمارا جانور ان کا لایا ہوا گھاس کھائے گا تو گھر میں برکت ہوگی۔ جب شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نظر پڑتے تو لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے، بس جس نے جا کر پہلے ہاتھ لگایا، شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے اور چھ پیسے لے لیتے تھے۔

اس چھ پیسے کی تقسیم ان کے ہاں کیا تھی؟ دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ ان دو پیسوں میں اس زمانے میں کچھ پائیاں ملتی تھیں تو وہ ایک ایک دو دو بچوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو غریبوں کو وہیں کھڑے کھڑے تقسیم کر دیتے۔ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ کچھ تیل لے لیا، کچھ نمک، لکڑی وغیرہ سستا زمانہ تھا تو دو پیسے روز میں گھر والوں کا خرچ ہو جاتا تھا۔

اور دو پیسے جو بچتے تھے۔ انہیں جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب وہ چھ، سات روپے بن جاتے اس رقم سے ہمارے اکابر حاجی امداداللہ صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی دعوت کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں۔ یہ فقط عالم ہی نہیں عارف باللہ بلکہ صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ سال بھر ہمیں شاہ جی" کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ان کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا جس دن کھانا کھاتے تھے۔ تو چالیس چالیس دن قلب میں نور رہتا تھا اور قلب میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی عبادت کر لیں، نوافل پڑھ لیں، تلاوت کر لیں۔ ہر وقت طاعت وعبادت کو جی چاہتا تھا۔ اس اکل حلال کی یہ برکت قلوب میں نمایاں ہوتی تھی۔

سلب توفیق..... لقمہ حلال درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے۔ آج کی بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں ہے۔ علم تو عام ہو گیا۔ ہر شخص جانتا بوجھتا ہے۔ پھر بھی بدعملی ہے؟ توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے۔ اور توفیق لقمہ حرام یا مشتبہ لقمہ کی وجہ سے سلب ہوتی ہے اکل حلال پورا میسر نہیں ہے۔ بقول غالب کے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ــــ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لئے کہ مشتبہ غذاؤں نے طبعیت پر بندش عائد کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ غرض آج کے گناہوں کا سبب لاعلمی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت کی قساوت یا ظلمت یا عدم توفیق یا سلب توفیق یہ چیزیں باعث بنتی ہیں۔ اس لئے کہ لقمہ صحیح نہیں رہا۔

میں دیکھا کرتا ہوں یہاں تو نہیں مگر ادھر اپنے نواح میں دیکھا۔ یہ جو آج کل شوگر مل ہر جگہ ہیں۔ ہمارے ہاں دیوبند سے لے کر دہلی تک ہر اسٹیشن پر ایک شوگر مل ہے۔ اس کی وجہ سے گنے کی کاشت بڑھ گئی۔ تو گنے ریل گاڑی اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ بعض مل والوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریلیں چلا رکھی ہیں تو وہ کھیتوں میں گھومتی ہیں اور وہاں سے گنا مل میں پہنچاتے ہیں تو مال گاڑی کے ڈبے ہر وقت بھرے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ تو میں نے دیکھا کہ مسافر جب اترتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مال گاڑی گنوں سے بھری کھڑی ہے تو کوئی بیس گنے کھینچ لایا، کوئی چالیس کوئی پچاس اور کھا رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھا کرتا ہوں کہ یہ لوگ گویا یوں سمجھ کے کھا رہے ہیں کہ ان کے باپ کا مال ہے۔ انہیں کوئی احساس نہیں کہ یہ غیر کا مال ہے۔ ہمارے لئے اس کا کھانا حلال نہیں یا حرام ہے۔ کوئی حس باقی نہیں جیسے جانور، مثلاً بیل جس کھیت میں گھسا، منہ مارتا ہوا چلا گیا، اسے اس کی کیا تمیز کہ میرے مالک کا کھیت ہے یا غیر کا۔ یہی حالت انسانوں کی ہو گئی کہ بس کھانے کی چیز سامنے آنی چاہئے۔ پھر حلال ہو یا حرام۔ بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ! ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہو گی؟ اس قسم کے مال سے سوائے قساوت، ظلمت اور تاریکی کے اور کیا پیدا ہو سکتا ہے۔ لقمہ حرام سے نیکی کا جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ نیکی کا جذبہ ہمیشہ لقمہ حلال سے ابھرے گا۔

پچھلے زمانے میں اہل اللہ جب بیعت کرتے تھے' پہلی شرط یہ لگاتے تھے کہ لقمہ حلال بھی میسر ہے یا نہیں؟ اگر تمہاری غذا مشتبہ ہے تو سارا دن بھی ذکر اللہ کرو گے تو قلب کے اوپر آثار نمایاں نہیں ہوں گے۔ غرض لقمہ حلال کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاک کمائی سے نور معرفت پیدا ہوتا ہے اور پاک کمائی کی طرف جذبہ؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اتباع انبیاء علیہم السلام سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ لقمہ حلال کی قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے فرمایا ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ① ایک دوسرے کا مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ حق کے ساتھ کھاؤ، جائز طریق پر کھاؤ، ناجائز طریق پر مت استعمال کرو۔ یہ چوری، ڈکیتی، رشوت، جواسب اسی لئے تو ممنوع ہوئیں کہ یہ کمائیاں ناجائز ہیں۔ ان کے کھانے سے قلب پر برا اثر پڑے گا' مشتبہ کمائی سے برا اثر پڑے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ یعنی جن مواقع میں صرف ہوتا ہے۔ ان مواقع کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مال کیسے مواقع سے آیا ہوگا۔ اگر پاک جگہ پر خرچ ہو رہا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ پاک طریق پر کمایا گیا ہے۔ اگر ناپاک مواقع پر صرف ہو رہا ہے، میں سمجھ لیتا ہوں کہ یقیناً ناجائز طریق پر کمایا گیا ہے، پاک مال کبھی بھی ناپاک جگہ پر خرچ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ناپاک مال پاک جگہ پر نہیں لگ سکتا۔

مشتبہ چندے سے احتراز...... دارالعلوم دیوبند میں بمبئی کے ایک سیٹھ آئے تھے۔ لکھ پتی لوگوں میں سے تھے دارالعلوم کو دیکھا۔ بہت خوش ہوئے پسند کیا اور اعلان کیا کہ پچیس ہزار روپیہ بھیجوں گا۔ تو ہمارے بزرگوں نے اس کے اوپر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے مثلاً یہ ہوتا کہ انہوں نے اعلان کیا تھا تو اس پر کوئی شکریہ ادا کیا جاتا یا کوئی دعائیہ کلمات کہے جاتے، جس سے ان کا دل بڑھتا۔ بس چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بے چارے نے تو کتنی جی داری کا ثبوت دیا۔

پچیس ہزار، یہ آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے پینتالیس برس پہلے پچیس ہزار کی قیمت ایسی ہی ہے جیسے آج اسی ہزار۔ پھر دینی مدارس میں پچیس ہزار کی رقم آئے تو ان کے مصارف تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے بلحاظ مصارف وہ رقم بہت تھی۔ تو بجائے اس کے کہ ان کا کوئی شکریہ یا دعاء وغیرہ کے کلمات یا خوشی کا کچھ غیر معمولی اظہار ہوتا۔ سارے ہی چپ بیٹھ گئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ خیر وہ سیٹھ صاحب اعلان کر کے چلے گئے۔ ایک مہینہ گزرا، دو مہینے گزرے میں نے مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ آپ نے یاددہانی نہیں فرمائی۔ دارالعلوم کو اگر اتنی رقم مل جاتی تو دارالعلوم کے بہت سے کام چلتے۔ ایک شخص نے وعدہ کیا اعلان کیا کم سے کم وعدہ کی یاددہانی فرمادیں میری بات سن کر وہ خاموش ہوگئے۔ پھر مجھے حیرت ہوئی کہ اس شخص کو نہ شکریہ نہ دعا دی اور

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۸۔

اب بھی یاددہانی کے لئے کہہ رہا ہوں تو چپ۔ پھر میں نے کسی دوسرے وقت یاددہانی کرائی کہ کم سے کم ایک خط تو لکھ دیں کہ بھائی یہ رقم بھیج دیں۔ اس وقت کچھ منہ بنا کر فرمایا کہ ''یہ رقم دارالعلوم میں آ نہیں سکتی''۔

میں نے کہا: آخر کیوں؟ فرمایا: ان کا سارا کام سود بٹے پر چلتا ہے۔ آبکاری کے محکمے میں ان کی ملازمت ہے اور اسی قسم کی ان کی ساری کمائی ہے۔ وہ کمائی یہاں نہیں آئے گی نہ یہاں چلے گی اور نہ انہیں بھیجنے کی توفیق ہوگی۔ ہم کیوں یاددہانی کرائیں۔ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ ان حضرات کو ہمیشہ ایسی کمائی کا چندہ قبول کرنے سے انکار رہتا تھا۔ جس کو یہ مشتبہ سمجھتے تھے۔ اور وہ اس بناء پر کہ اگر چندہ صرف کیا گیا تو طلباء پر بھی وہی اثر پڑے گا، ان کے علم میں برکت نہیں رہے گی۔ ان کی معرفت ختم ہو جائے گی۔ اس واسطے گریز کرتے تھے۔

بہرحال اہل اللہ کے ہاں یہ مسئلہ ہمیشہ بہت ہی زیادہ قابل توجہ رہا ہے کہ کمائی مشتبہ نہ ہونی چاہئے۔ پاک ہونی چاہئے اس لئے کہ اسی پر توفیق اور اعمال کا دارومدار ہے۔ تو تقلیل تو بجائے خود ہے کہ حلال میں سے بھی کم سے کم ہو۔ یہ تو خیر بڑوں کی شان ہے۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو رکھیں کہ کمائی حرام اور مشتبہ نہ ہو۔

شانِ اتقیاء..... تو میں نے عرض کیا کہ آج بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب ہیں ہمارے اندر احتیاط باقی نہیں ہے۔ تقویٰ اور طہارت چھوڑ فتویٰ بھی باقی نہیں کہ فتویٰ کے مطابق ہماری کمائیاں صحیح ہوں۔ سب کو میں نہیں کہتا الا ماشاء اللہ ایسے آج بھی موجود ہیں جو برابر اپنی کمائی میں احتیاط کرتے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہ امت خالی نہیں ہوگی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُهٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُهٗ'' ①

میری امت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بارش۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زمین کے لئے بارش کا پہلا قطرہ زیادہ نافع ہوا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ یعنی میری امت میں خیریت مشترک ہے۔ کمی اور زیادتی کا فرق رہے گا۔ لیکن خیر سے امت کبھی خالی نہیں ہوگی۔ اس لئے متقیوں سے یہ امت کبھی خالی نہیں ہوسکتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا ہے فرمایا: ''لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَالَفَهُمْ وَلَا مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ.'' ② میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہے گا جو منصور من اللہ ہوگا، موید من اللہ ہوگا، حق کہتا اور سناتا رہے گا، حق ہی پر عمل کرتا رہے گا۔ اس کے خلاف کرنے والے اس کو گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں لفظ طائفہ فرمایا یعنی چھوٹی جماعت یہ تو ہوگا کہ وہ کم ہو جائیں گے۔ مگر موجود رہیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ امت میں باقی نہ رہیں گے۔

اسی طرح فرمایا: ''لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ.'' ③ فرمایا: میری امت ساری کی ساری مل کر گمراہی پر جمع نہیں ہوگی اہل حق اس میں ضرور باقی رہیں گے اور اس مت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ تو

---

① المسند للامام ابی یعلیٰ، ج:۷، ص:۴۹۵، رقم:۳۳۸۱. ② السنن للامام ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ، ج:۱، ص:۱۲، رقم:۱۰. ③ المعجم الكبير للطبراني، ج:۱۱ ص:۷۸.

نہیں کہا جا سکتا کہ خدانخواستہ سارے کے سارے (ایسے مشتبہ حرام کمائی والے) ہی ہیں مگر ہاں اکثریت ایسوں کی ہوگئی ہے۔قلیل طبقہ ہے جو احتیاط برتتا ہے اور تقوی وطہارت کو پیش نظر رکھتا ہے۔تو بات اس پر یاد آئی تھی کہ لقمہ حلال سے ہی انسان میں توفیق ہوتی ہے نہ صرف عمل کی بلکہ اس سے علم اور معرفت بھی پیدا ہوتی ہے۔

کمال دانشمندی......تو امام شافعیؒ اس وقت خوش ہوئے اور لڑکیوں سے کہا کہ دیکھا تم نے کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے؟ یہ امام کی شان ہے کہ وہ قلیل کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔کثیر کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔تو دیندار حقیقی معنی میں وہی ہے کہ اس کو دنیا جہاں بھی ملے وہ اس میں سے اپنے لئے دین پیدا کر لے۔یہ بدعقلی ہے کہ آدمی دین کو بھی دنیا بنا لے اور دانش مندی یہ ہے کہ دنیا میں سے اپنے حق میں دین اور خیر نکال لے۔

غرض امام شافعیؒ اس پر بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا کہ: دیکھو! امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے۔بات اس پر یاد آئی تھی کہ اکل حلال اور قلیل کھانے میں بہرحال ایک نور اور ایک معرفت ہے اور اس سے آدمی چلتا ہے۔

عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثلت......تو قرآن کریم ایک معجزہ ہے اس پر چل کر لوگ ولی بنے، کامل بنے اور امت اولیاء سے بھر گئی اور ایسے ایسے اولیاء کاملین پیدا ہوئے جو ''کَـأَنْبِيَـآءِ بَـنِـيْٓ اِسْـرَآئِيْلَ.'' تھے، وہ نبی نہیں تھے، مگر انہوں نے کام ایسے کئے جیسے نبیوں کے ہوتے ہیں۔نبیوں پر اگر وحی آتی تھی تو ان پر الہام ہوا۔نبیوں کے ہاتھوں پر اگر معجزے ظاہر ہوئے تو ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔نبیوں نے اگر اصل شرائع پیش کیں تو انہوں نے شرائع وضعیہ پیش کیں جنہیں اجتہادی شرائع کہتے ہیں۔تو انبیاء علیہم السلام سے مماثلت پیدا ہوگئی۔اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کَاَنْبِيَآءِ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ.'' ①

یہ حدیث گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔مگر اس کے ہم معنی اور بھی حدیثیں ہیں۔مضمون قدر مشترک کے طور پر ثابت ہے کہ اس امت کے اولیاء، اتقیاء اور علماء کارناموں اور کارگزاری کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کے مثل ہوئے ہیں۔یہ ان کی ساری چیزیں عمل بالقرآن سے پیدا ہوئی ہیں۔

تو بات اس پر چلی تھی کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزے بناتا بھی ہے۔یعنی معجزے کی شبیہ چیزیں اولیاء کے ہاتھ پر نمایاں ہوتی ہیں جب وہ عمل بالقرآن کرتے ہیں۔تو قرآن کریم معجزہ ہے جو نبوت کی دلیل ہے۔

علمی معجزے کا امتیاز......اس سے ایک اور بات واضح ہوئی۔وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دے دیئے گئے تھے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ علمی معجزہ بھی دیا گیا، عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔مگر اس

---

① علامہ پٹنی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال شیخنا الزرکشی لا اصل له ولا یعرف فی کتاب معتبر. دیکھئے: تذکرة الموضوعات، ج:۱ ص:۲۰.

کا علم باقی رہتا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن علمی معجزہ قرآن کریم ہے جو آج تک باقی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

دوام کتاب دوام نبوت کو مستلزم ہے...... موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ آج ان کی نبوت پر ایمان لے آؤ اور دلیل مانگی جائے تو نہ عصاء موسیٰ ہے نہ ید بیضاء ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں آج نہ احیاء موتی ہے نہ ابراء اکمہ وابرص ہے، جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ شعیب علیہ السلام کی نبوت کو پیش کیا جائے تو ان کی نبوت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو پیش کیا جائے اور دلیل کا مطالبہ ہو تو یہ دلیل موجود ہے، یہ معجزہ کلامی اور علمی ہے۔ جو عالم کے دنیا سے اٹھنے کے بعد ختم نہیں ہوا بلکہ آج بھی بدستور موجود ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی ابدی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کی دلیل قائم ہے۔ غرض اور انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں حق ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں سچی ہیں مگر آج ان کے دلائل عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل آج دنیا میں موجود ہے اس لئے نبوت قائم ہے اور اس کے بارے میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ قرآن کی وجہ سے یہ نبوت دائمی اور ابدی ہے اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ قیامت تک باقی رکھنی تھی اس لئے دلیل نبوت وہ دی گئی جو باقی رہ سکے ختم نہ ہونے پائے۔ اور وہ ''علمی معجزہ'' ہے۔

معارضۂ قرآن کا عذاب...... معجزے کی شان یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی معجزے کے مقابل آئی ہے، جبھی فنا ہو گئی۔ صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا گیا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال کر دو۔ انہوں نے باذن اللہ اونٹنی نکال کر دکھلائی۔ قوم نے اونٹنی کا مقابلہ کیا اور اس کو ختم کیا۔ تو قوم کے اوپر عذاب آیا اور اس کا صفایا کر دیا گیا۔ غرض جب بھی دنیا میں معجزے کے مقابل کوئی قوم آئی ہے جبھی گر گئی۔ قرآن کریم ایک معجزہ ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ ہم اپنی سستی یا غفلت سے عمل میں کوتاہی کریں۔ لیکن خدانخواستہ اگر کوئی قوم مدمقابل آئے گی اور قرآن کے معارض پڑے گی۔ تو یقیناً خسارے میں پڑے گی یقیناً کسی نہ کسی عذاب میں پڑے گی۔ وہ عذاب چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو اس امت پر وہ عذاب تو نہیں آئیں گے جو پچھلی امتوں پر آئے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''لَيْسَ عَذَابُ أُمَّتِي الْخَسْفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْفُ إِنَّ عَذَابَهَا الْقَتْلُ وَالْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ.'' (1) ''میری امت کا عذاب یہ نہیں ہے کہ صورتیں مسخ کر دی جائیں۔ جیسے پچھلی امتوں کی گئیں یا پوری امت زمین میں دھنسا دی جائے یہ نہیں ہو گا یا پتھر برسا کر ختم کر دی جائے یہ نہیں ہو گا یہ عذاب ختم کر دیئے گئے''۔

---

(1) مسند الشهاب القضاعي، ج:٣، ص:٤٨٥، رقم: ٩٠١.

میری امت کا عذاب کیا ہے؟ فتنے پھیلیں گے، ایک دوسرے کو مزہ چکھائیں گے، ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں گے۔ ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْيَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ ① فرماتے ہیں! اللہ اس پر قادر ہے کہ اس امت پر اوپر سے عذاب برسادے، نیچے سے عذاب ابھار دے۔ یا ان کے اندر عذاب ڈال دے۔ وہ کیا ہے؟ ﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ ② ان میں گروہ بندی پیدا کردے۔ ایک پارٹی دوسرے کو مزہ چکھاتی رہے، چین سے نہ بیٹھے، یہ عذاب آج بھی موجود ہے۔ یہ جبھی ہوگا جب لوگ قرآن ''جو معجزہ ہے'' کے معارضے پر آئیں گے۔ قرآن کریم کو ماننے پر آئیں، اختلافات ختم ہو جاتے ہیں، معارضہ کرنے پر آئیں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ نزاعات کا برا اثر پھر امت ہی کے اوپر پڑتا ہے۔

افتراق امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ...... اگر اس کو امام مان کر سارے طبقات اس پر جمع ہو جائیں اور اس کی شرح حدیث ہے، اس پر جمع ہو جائیں اور آئمہ وعلماء راسخین نے جو جو مسائل اس سے استنباط کئے ہیں اس پر جمع ہو ہو جائیں تو فی الحقیقت قوم کو کوئی گمراہ کرنے والا اور مٹانے والا نہیں ہے۔ اس کی قوت بنی بنائی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا'' فرماتے ہیں کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا، اگر تم ان دونوں چیزوں سے تمسک کرتے رہو گے۔ تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، کبھی مغلوب نہیں ہو گے۔ ''كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّتِيْ.'' ③ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یعنی اسوہ اور میرا طریق عمل، جب ان دو کو اختیار کرلو گے۔ تو ان دو کو ثقلین فرمایا گیا۔ یہ وزنی چیزیں ہیں یہ ہٹنے والی نہیں ہیں۔ مٹنے والی نہیں ہیں۔

جب طوفان آتا ہے۔ اگر آدمی تنکے کا سہارا پکڑے تو تنکا بھی بہہ جائے گا اور آدمی بھی بہہ جائے گا، کوئی درخت بہتا ہوا آرہا ہے گو بڑا نظر آئے، مگر وہ بھی بہتا ہے، اسے پکڑے گا تو یہ بھی بہہ جائے گا۔ لیکن اگر آدمی کسی عظیم الشان چٹان کی پناہ لے۔ تو چٹان کو طوفان نہیں ہلاسکتا۔ تو اس شخص کو بھی نہیں ہلاسکتا۔ اس لئے کہ وہ ثقیل اور وزنی چیز ہے تو کتاب وسنت کو ثقلین کہا گیا۔ یعنی یہ دو اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹلنے اور ہلنے والی نہیں ہیں۔ انکو کوئی دوسرا نہیں ہلاسکتا۔ اگر ان دو چیزوں کو ہم مضبوط تھام لیں۔ تو یہ ایسی ثقیل اور وزنی چیزیں ہیں کہ پھر طوفان ہمیں بہا نہیں سکتا۔ یقیناً ہم اپنی جگہ اٹل ہو جائیں گے۔ ایک قوی حجت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔

اگر ہم عقلی حجت پیش کریں تو جس سے بھی ہم کوئی معقول بات کہیں گے وہ کہے گا میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں میں بھی ایک معقول بات پیش کرتا ہوں۔ ہم طبعی بات پیش کریں گے، وہ کہے گا میرے اندر بھی طبیعت ہے،

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۶۵۔ ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۶۵۔

③ السنن للامام الترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب اھل بیت ... ج: ۱۲ ص: ۲۵۸ رقم: ۳۷۲۰۔

ہم اپنے مزاج کی بات منوانا چاہیں گے، وہ کہے گا میرے اندر بھی مزاج موجود ہے میری بات آپ کیوں نہ مانیں۔لیکن جب آپ ایسی چیز پیش کریں گے جو سب مزاجوں سے بالاتر اور سب طبیعتوں سے اونچی ہوگی اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہیں۔ یہ دو ایسی وزنی اور اٹل چیزیں ہوں گی کہ ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔تو ایک تو ی حجت اللہ نے ہمارے ہاتھ میں عطاء کی ہے۔

اور وہ قرآن وسنت ہے کہ یہ اٹل چیز ہے اپنی جگہ سے ملنے والی نہیں ہے۔ بہر حال قرآن کریم معجزہ بھی ہے اور معجزہ نما بھی ہے، اس پر چل کر آدمی خود معجزہ نما بھی بن سکتا ہے۔ ہزاروں اولیاء بنے، ہزاروں کاملین تیار ہوئے۔اسی کتاب وسنت کے عمل نے تیار کئے یہ خود مستقل ایک حجت ہے۔

تو قرآن کریم کو علم کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین علم اس میں ہے، عمل کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین عمل کی کتاب ہے اس کا وظیفہ پڑھو تو وظیفے کی بہترین کتاب ہے اس میں سے حکمت نکالو تو بہترین حکمت کی کتاب ہے آج اس کے علم وحکمت سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔

علوم القرآن......امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے دنیا کی کسی امت نے تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہیں کیا جتنا اس امت نے کیا ہے۔تصانیف کے راستے ڈال دیئے ہیں، تاتار کی جنگ کے موقع پر تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا ہے تو بغداد میں کتنے کتب خانے تھے یہ تو آپ تاریخ میں دیکھیں، تو تعداد آپ کو معلوم ہوگی۔صرف ایک کتب خانے کا مورخین حال لکھتے ہیں کہ بغداد کے کنارے پر جو دجلہ دریا بہتا ہے اس کا پل توڑ دیا گیا تھا تا کہ دشمن اندر نہ آسکے۔لیکن بہر حال دشمن اندر پہنچ گئے اور بغداد کو فتح کرلیا۔ پل ٹوٹا ہوا تھا۔تاتاریوں کو آنے جانے کی ضرورت تھی دریا گہرا تھا تو مسلمانوں کے ایک کتب خانے کو لے کر اس کی کتابوں سے دریا کو بھرنا شروع کیا پاٹتے پاٹتے اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر برابر آجاسکتی تھیں۔صرف ایک کتب خانے کی کتابوں کا یہ عالم تھا۔

نیز مورخین لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی روشنائی سے دھل دھل کر پانی جو بہا ہے تو ایک مہینے تک علماء کو روشنائی لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دریا کا پانی اتنا سیاہ ہو گیا تھا کہ اس سے بے تکلف لکھا جاسکتا تھا۔تو اندازہ کیجئے جس شہر کے ایک کتب خانہ کا یہ حال ہو اس شہر کے دوسرے کتب خانے کتنے ہوں گے۔اس ملک میں کتنے ہوں گے۔

اندلس ''اسپین'' کی حکومت جب تباہ ہوئی ہے تو ایک عیسائی عورت نے اس کی تاریخ لکھی ہے جس کا نام ''حَاضِرُ الْاُنْدَلُسِ وَ غَابِرُهَا'' ہے تو اس میں تعصب دکھلایا ہے کہ عیسائیوں نے تعصب میں آکر ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر تباہ کیا جائے۔اگر یہ کتابیں باقی رہ گئیں۔تو ان کا عروج پھر ممکن ہے۔اس لئے ایک مستقل مہم قائم کی گئی کہ ان کتب خانوں کو ختم کیا جائے۔اس مقصد کے لئے افراد چنے گئے۔ایک محکمہ قائم کیا گیا کہ کتب خانوں کو جلا دیا جائے یا دریا برد کیا جائے اور ضائع کیا جائے۔اس کے لئے ایک مستقل انچارج آفیسر مقرر ہوا۔

تو وہ لکھتی ہے کہ کتب خانوں کی کتابیں لائی جاتی تھیں اور جلائی جاتی تھیں۔ پچاس برس میں جا کر پورے ملک کے کتب خانے ختم ہوئے ہیں، تو اندازہ کیجئے کتنے کتب خانے ہوں گے، ہندوستان کے کتب خانے، آپ کے پاکستان کے کتب خانے، بہت سے قدیم کتب خانے ہیں، جن کو کیڑے چاٹ رہے ہیں، پڑھنے والا کوئی نہیں، ہزاروں کتب خانے اب بھی موجود ہیں جو کیڑوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح حجاز کے کتب خانے، نیز مصر کے کتب خانے، مصری حکومت چھاپتے چھاپتے تنگ آ گئی ہے۔ مگر سلف کی کتابیں عشر عشیر بھی نہیں چھپی ہیں، ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں اب بھی باقی ہیں جو چھپ سکتی ہیں۔ یہ اتنا ذخیرہ اس قرآن وسنت ہی کی بدولت تو قائم ہوا۔ یہ علماء نے جو تصانیف کی ہیں۔ یہ قرآن ہی کی تو شرح ہو رہی ہیں۔

کتاب مبین کا خاصہ..... تو قرآن وحدیث کا اندازہ کیجئے کہ یہ اسلوب بیان کتنا جامع اور بلیغ ہے کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے ہزاروں کتب خانے جمع ہو گئے۔ اب بھی عشر عشیر ہوا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں اب بھی باقی ہیں جو شرح طلب ہیں تو اس سے قرآن کے علم کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علم معجزے کا علم ہے کسی انسان کے علم کی تعبیر میں علم کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوتا کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے صدیاں گذر جائیں اور اس کی شرح ختم نہ ہو۔ یہ کتاب مبین ہی کا خاصہ ہے۔ خدائی کتاب ہے اور اسی کے علم ہی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ علماء، حکماء، عرفاء، اور صوفیاء ہزاروں طبقات کھڑے ہوئے اور اس کی شرح کی اور وہ شرح ہوتی جا رہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: "لَا تَنْقَضِيْ عَجَآئِبُهٗ." ①

قیامت آجائے گی مگر قرآن کریم کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے برابر چلتے ہی رہے گے اور نکلتے ہی رہیں گے اور آج بھی علماء ہزاروں تصانیف کرتے جا رہے ہیں اور استدلال آیات سے یا احادیث ہی سے ہوتا ہے۔ تو اندازہ کیجئے ایک ایک آیت مستقل ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے نہ صرف تصانیف کی ہیں بلکہ فنون کی بنیاد ڈالی۔ بیسیوں فنون اور علوم ایجاد کئے ہر ہر فن کے اندر پھر لاکھوں کتابیں ہوئیں۔ تو یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟۔ کہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کہ اس کتاب کے اندر سے اتنا علم نکلتا چلا آ رہا ہے کہ لاکھوں کتب خانے بھر گئے، لاکھوں کتابیں بن گئیں اور آج بھی بنتی جا رہی ہیں اور جو نیا مسئلہ یا حادثہ سامنے آتا ہے اس میں سے اس کا حکم نکلتا چلا آتا ہے یہ سوائے اعجاز کی قوت کے اور کون سی قوت ہے؟

اصلاحی نصاب...... بہر حال قرآن کریم معجزہ ہے اور مسلمان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ معجزہ انہیں عطاء فرمایا اور اللہ کا ایک تبرک جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے وہ ان کے اندر موجود ہے۔ وہ آج بھی اس کی طرف توجہ کریں تو ان کا علم عمل اور تقویٰ پھر اونچے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے آثار پھر ویسے ہی نمایاں ہو سکتے ہیں جیسا کہ کسی زمانے میں نمایاں ہوئے تھے۔

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء في فضل القرآن، ج: ١٠، ص: ١٤٧.

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''لَایَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَاصَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا.'' ① اس امت کے اخیر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے، جس چیز سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی ہے۔ تو امت کا اولین طبقہ صحابہ کرامؓ کا ہے۔ ان کی اصلاح کا ضامن یہی قرآن ہوا ہے۔ ان کے کتب خانے میں قرآن کے سوا اور کوئی کتاب نہیں تھی یا قرآن تھا یا اللہ کے رسول کا کلام تھا جو ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اسی نے ان کی اصلاح کی۔ زمانہ جاہلیت کو تبدیل کیا، اس میں انقلاب پیدا کیا۔ انقلاب پیدا کرنے والی یہی کتاب مبین تھی۔ جو قوم کہ دنیا کی تمام اقوام میں ذلیل سمجھی جاتی تھی، حقارت کی نگاہوں سے عربوں کو دیکھا جاتا تھا۔ وہ پچاس برس کے اندر اندر اتنی اونچی بن گئی کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے حکومتوں میں انقلاب پیدا کر دیئے، دنیا میں جہالت کی بجائے علم کو فروغ دیا اور پھیلا دیا۔ یہ انقلاب ان کے اندر اس کتاب مبین ہی نے پیدا کیا۔ اس کے سوا کوئی اور کتاب نہیں تھی اسی کا علم اور اسی کا عمل تھا۔ جس نے انہیں اتنا آگے بڑھایا تو جو چیز ان کی اصلاح کا ذریعہ بنی وہی آج ہماری بھی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔

مرکز علوم...... میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم اور فنون کی تعلیم چھوڑ دیں۔

تمام علوم وفنون آپ حاصل کریں۔ آپ سائنس، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی اور علوم طبعیہ وعقلیہ بھی حاصل کریں۔ لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی تو ہونا چاہئے جس کے اردگرد وہ علوم گھومیں۔ سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج وتبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کر رہے ہیں یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی، دنیا ہی کارآمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجر وثواب بھی مرتب ہونا شروع ہو جائے گا۔ اگر دین اور کتاب وسنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم وفنون اس کے اردگرد گھمائے جائیں، جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے اس کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم وفن کام دے گا اور ہر علم وفن باعث اجر اور باعث اصلاح وتقویٰ بنے گا۔

تبریک...... بہر حال اس وقت یہ چند کلمات میں نے قرآن کریم کے متعلق اس لئے عرض کئے کہ دار القرآن میں یہ جلسہ ہو رہا ہے تو وہ لوگ مبارک ہیں جنہوں نے دار القرآن قائم کر کے قرآن کے فروغ کا راستہ ڈالا۔

قرآن کے الفاظ کا اور اس کے لب ولہجے کے پہنچانے کا۔ اور یہی پھر آگے قرآنی علوم کو پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو وہ افراد یقیناً قابل مبارکباد ہیں جنہوں قرآن کی تبلیغ اور ترویج کے لئے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی اور قائم کئے۔ اسی میں ہمارے لئے صلاح اور فلاح ہے۔ اس وقت یہ چند جملے اس ذیل میں ذہن میں آ گئے تھے جو میں نے عرض کئے حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو قرآن کریم پر چلنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَامِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَمِنْهَا وَمَا

---

① شرح بلوغ المرام، ج: ۱ ص: ۲۹۸.

بَطَنَ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ اِمَامًا لَّنَا وَاجْعَلْهُ حُجَّةً لَّنَا وَارْزُقْنَا عَمَلَهٗ بِفَضْلِكَ الْعَظِيْمِ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ. ①

① ۲، ربیع الاول، ۱۴۰۹ھ

خلافت تجوید

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـا بَعْـدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ وَخَرَجَ مِنْہُ اَوْکَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (1)

جوہرِ دنیا...... بزرگانِ محترم! یہ دنیا دو چیزوں سے آباد ہے وہی دو چیزیں اس دنیا کا جوہر اور روح ہیں۔ ایک اللہ کا کام اور ایک اللہ کا کلام ایک طرف آپ کے سامنے یہ دنیا کھڑی ہوئی ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، آسمان کا خیمہ اوپر تنا ہوا ہے، آسمان میں سورج اور چاند کے انڈے روشن ہیں۔ جن سے اس دنیا میں روشنی اور جگمگاہٹ ہے۔ مختلف قسم کی جاندار اور بے جان مخلوق اس میں آباد ہے اور بس رہی ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کا کام ہیں، یہ اس کی صنعت و صناعی اور کاریگری ہے جو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ یہ سب چیزیں فی الحقیقت اللہ کے انعامات اور اس کے تبرکات ہیں۔ سورج اور چاند بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے' زمین اور آسمان بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئی۔ اللہ کے پیدا کئے ہوئے سے پیدا ہوئی ہے، لیکن خدا کے اندر سے نکل کر نہیں آئی اس نے ایک معدوم شے کو وجود دیا، تخلیق کی، پیدا کیا اور نمایاں فرما دیا تو اس کی ایجاد سے ہی یہ ساری چیزیں آپکے سامنے موجود ہیں۔

امتیازی عطیہ...... لیکن وہ تبرک اور عطیہ جو اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے اس کے باطن سے نکل کر ظاہر ہوا اور آپ کے سامنے آیا وہ اللہ کا کلام ہے۔ تو یہ ساری چیزیں مخلوق کہلائیں گی۔ لیکن کلام مخلوق نہیں ہو سکتا۔ جب آپ کوئی چیز بناتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ چیز بنائی، میں نے عمارت بنائی، چارپائی بنائی، برتن بنایا۔ لیکن جب کلام کرتے ہیں تو یوں نہیں کہا کرتے کہ میں نے اپنے کلام کو بنایا یا میں نے اپنے کلام کو پیدا کیا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کلام کیا۔ تو کلام متکلم کے اندر سے سرزد ہوتا ہے، صادر ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔ باہر کی چیز بنائی

(1) کنز العمال لعلی المتقی الھندی، ج:۱،ص:۳۲۶،رقم:۲۳۶۴.

جاتی ہے۔ جس کو وجود دیا جاتا ہے تو یہ زمین اور آسمان اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے، اس کے پیدا کئے سے پیدا ہو گئے اور نمایاں ہو گئے۔ لیکن کلام خداوندی خود اس کی ذات میں سے نکلا ہے اور نکل کر ہمارے سامنے آیا تو سب سے بڑا تبرک اور عطیہ جو بلا واسطہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا، وہ آج مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔

امتیازِ مسلم......تو یہ ایک مسلمانوں کا امتیاز اور خوش قسمتی ہے کہ براہ راست عطیہ خداوندی اور تبرک الٰہی ان کے ہاتھ کے اندر موجود ہے۔ اللہ کے اندر سے نکلا اور ان کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی واسطے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ كَلَامُ اللهِ وَخَرَجَ مِنْهُ اَوْكَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'' ''قرآن سے برکت حاصل کرو، اس لئے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔

کلام خداوندی یوں تورات بھی ہے، انجیل اور زبور بھی ہے۔ لیکن حقیقی معنی میں کلام وہ ہوتا ہے، جس سے تکلم کیا جائے اور بولا جائے۔ تورات سے حق تعالیٰ بولے نہیں بلکہ الواح لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں۔ اسی طرح انجیل بھی کلام خداوندی ہے مگر اس کا تکلم واقع نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر اس کا الہام کر دیا گیا۔ الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں۔ مضمون حق تعالیٰ کا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مبارک الفاظ میں اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی طرح سے زبور کے ساتھ بھی تکلم واقع نہیں ہوا۔

امتیازی کتاب......قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ نے اس کا تکلم کیا، اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی واسطے قرآن کریم میں قرات کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی، تلاوت کی نسبت بھی اپنی طرف کی اور تکلم کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ فرمایا گیا: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ① ''جب ہم قرآن کریم کی قرات کریں تو اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سنتے رہو اور اس کی پیروی کرو''

کہیں فرمایا: ﴿نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ﴾ اے پیغمبر! ہم آپ کے اوپر تلاوت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور فرعون کا قصہ۔ بہرحال حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو تالی اور تلاوت کنندہ بھی کہا اور قاری بھی اپنے آپ کو کہا اور حافظ بھی اپنے آپ کو کہا۔ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ''اور ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے اور ہم ہی اس کے حافظ اور نگہبان ہیں''۔

تو حافظ بھی وہ ہیں، قاری بھی وہ ہیں اور تلاوت کرنے والے بھی وہ ہیں تو یہ خصوصیت قرآن کریم کی ہے کہ اس کی تلاوت بھی اللہ کی طرف سے واقع ہوئی، اس کا تکلم بھی ان کی طرف سے واقع ہوا، اس کی قرات بھی ان کی طرف سے واقع ہوئی۔

صوتِ سرمدی......کلام کے لئے بہرحال کچھ آواز کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸.

② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

پوچھا گیا کہ: ''کَیْفَ یَاْتِیْکَ الْوَحْیُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟'' ① ''یارسول اللہ! آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ کیا کیفیت ہوتی ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یَاْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ.'' ② میرے اوپر وحی اس طرح سے آتی ہے جیسے گھنٹہ بجا کر جب چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس میں ایک قسم کی گونج ہوتی ہے جو کئی منٹ تک اس کی آواز آتی رہتی ہے میں ایسی ایک گونج دار آواز سنتا ہوں۔

کہیں یہ فرمایا چکنے پتھر کے اوپر اگر ایک لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے کھینچا جائے تو ایک مسلسل جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، میں اس قسم کی آواز سنتا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں کسی قسم کی صوت اور آواز کا بھی دخل ہے اگر چہ اس کی کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ مگر بہر حال تکلم کے لئے صوت ہوتی ہے تو صوت سرمدی کے ساتھ قرآن کریم سنایا گیا۔

عظمتِ کلام...... جبرئیل علیہ السلام نے اولاً کلام کو سنا۔ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ وحی فرماتے تو اس کی ہیبت اور عظمت سے تمام ملائکہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے خود جبرئیل علیہ السلام پر بھی اس کی ہیبت وعظمت اور جلال سے غشی طاری ہوتی تھی۔ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام افاقہ پاتے تھے، اس کے بعد دوسرے ہوش میں آتے تھے تو ملائکہ پوچھتے تھے ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ﴾ ③ ''کیا فرمایا تمہارے پروردگار نے؟'' ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ ④ کہتے ''حق فرمایا اور وہ ''علی وکبیر'' ہے''۔

خلافتِ تجوید وقرات...... اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام جبریل علیہ السلام سنتے تھے اس سماع کی ہیبت سے ہی غشی طاری ہوتی تھی تو تکلم کے ساتھ صورت اور آواز واقع ہوتی ہے، جب آواز عظیم اور ہیبت ناک ہوتی ہے تو اس کی ہیبت سے ضروری ہے کہ غشی طاری ہوتی ہے۔ اگر گرج زور سے ہو جائے تو یقیناً دل دہل جاتے ہیں اور بعض دفعہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے آدمی تو آدمی۔ آواز جب زوردار آتی ہے تو اس سے پہاڑ تک شق ہو جاتے ہیں، عمارتیں گر جاتی ہیں مکانات گر پڑتے ہیں۔ تو قرآن کریم کی آواز جب سنائی دیتی تھی تو ملائکہ جیسی طاقت ور مخلوق بھی ہیبت زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت واقع ہوئی اور تکلم واقع ہوا اور کوئی خاص قسم کی آواز بھی تھی جس سے تکلم ہوتا تھا۔ جس کو ملائکہ سنتے تھے اور بعض اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سنا۔ تو قرآن کریم میں ایک طرف الفاظ ہیں، ایک طرف اس کے معنی ہیں اور ایک طرف اس کا تکلم اور لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے۔ بجنسہٖ آج اس کا ایک ایک لفظ، اس کا ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے اور لکھا پڑھا موجود ہے۔ بعض قرآن کریم چھاپے گئے ہیں جن میں رکوعات کی تعداد اور سورتوں کی تعداد، حروف کی اور لفظوں کی تعداد اور زیر وزبر

① ② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۴، رقم: ۲. ③ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳.

کی تعداد تک لکھی گئی ہے۔اس کو حفاظ نے محفوظ کیا۔اس کے معانی کی علماء اور فقہاء نے حفاظت کی۔اس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قانونی حیثیت دی تھی،اس کو علماء نے سمجھا اس کے لب ولہجہ اور طرز ادا کی قراء اور مجودین نے حفاظت کی۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے سنا جبریل علیہ السلام سے سنا تو ایک خاص لب و لہجے سے سنا، پھر اسی لب و لہجے سے آپ نے تلاوت فرمایا اور اپنے صحابہ کو آپ نے سکھلایا۔اس میں سے بہت سے قراء اور مجودین ہیں ان مجودین نے سنا اور سن کر دوسروں کو سنایا اور سکھلایا۔تو قرآن کریم کی طرز ادا کی مجودین نے حفاظت کی۔اگر الفاظ میں حفاظ خلفاء خداوندی ہیں اور معانی میں اگر خلفاء الٰہی علماء ہیں تو اصوات اور طرز قرات میں خلفاء ربانی قراء اور مجودین ہیں جنہوں نے طرزِ ادا کی حفاظت کی۔اس کے رسم الخط کی حفاظت کی۔وہ اسی انداز میں آج بھی لکھا جاتا ہے جس انداز میں قرن اول میں لکھا گیا۔مثلاً آپ الرحمٰن لکھیں گے تو یہ لکھنا مکروہ اور ممنوع ہے کہ میم کے ساتھ الف ملا کر ''الرحمان'' لکھا جائے میم کے ساتھ نون ملا کر لکھیں گے اور میم پر کھڑا زبر دے دیں گے۔یہ اصل رسم الخط ہے۔تو اسی طرح پورے رسم الخط کی حفاظت کی گئی۔علماء رسم الخط نے اس کے قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک فن کی صورت دی۔تو پورے ایک طبقے نے اس کی حفاظت کی۔

اس کی حکمتوں کی حفاظت حکماء اسلام نے کی۔اسکے اندر تاریخ کے جتنے جملے موجود ہیں، ان کی تفصیلات مؤرخین نے بیان کیں۔اس میں جتنے حقائق موجود ہیں، ان کو صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے منضبط کیا۔تو قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے مستقل ایک ایک طبقہ کھڑا ہو گیا۔الفاظ کے لئے حفاظ، معانی کے لئے علماء، رسم الخط کے لئے علماء رسم الخط، آواز اور طرزِ ادا کے لئے قراء اور مجودین، حکم اور مصالح کے لئے حکماء، حقائق کے لئے صوفیاء، اور علل و اسرار کے لئے فقہاء۔تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی اسی طرح سے قرآن کریم محفوظ ہوا۔﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ''ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔

امتیازی حفاظت......تو حقیقی حفاظت تو حق تعالیٰ شانہٗ کی ہے۔لیکن اللہ کی جتنی صفات اور کمالات ہیں، وہ اس دنیا میں بذیل اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔خالق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن تخلیق مرد و عورت کے ملنے سے واقع ہوتی ہے تو سبب تخلیق مرد و عورت ہیں اور خالق حق تعالیٰ ہیں۔ماں باپ کو خالق نہیں کہا جائے گا، سبب تخلیق کہا جائے گا۔رزاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن رزق رسانی کا ذریعہ زمین کو بنایا، اس سے غلہ اگتا ہے۔کاشتکار اس میں محنت کرتا ہے تو کاشتکار ظاہر میں محنت کرتا ہے۔حقیقت میں کاشتکاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ② ''تم زراعت کرتے ہو کہ ہم زراعت کرتے ہیں؟''۔

تم نے بیج ڈال دیا، اس بیج کی منوں مٹی کے نیچے حفاظت کرنا، اس میں سے کونپل نکالنا، کونپل میں مادّے اور جوہر

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴۔

رکھنا، پھر اس کو نپل میں دانہ پیدا کرنا، یہ کاشتکار کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ تو محض دانہ ڈال دینا یہ کاشت نہیں ہے۔ اس میں سے بنانا، بنا کر درخت نکالنا، درخت میں سے پھل نکالنا، اصل کاشتکاری یہ ہے تو فرماتے ہیں: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ① ''تم زارع اور کاشتکار ہو کہ ہم کاشتکار ہیں؟ ہم کھیتی کرتے ہیں کہ تم کرتے ہو؟''۔

اور فرمایا: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ ② تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ نر و مادہ مل گئے۔ رحم مادر میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح سے مخلوق بنائی جا رہی ہے؟ کس ترتیب سے اسے ابھارا جا رہا ہے؟ یہ تو کرنے والا جانتا ہے۔ وہی کرتا ہے، خود اس ماں کو خبر نہیں جس کے پیٹ میں یہ ساری مشینری چل رہی ہے اور کارخانہ چل رہا ہے۔ تو اس اندھیری کوٹھڑی میں پانی کے اوپر نقاشی کرنا یہ اسی صانع حکیم کا کام ہے جس کی قدرت لامحدود ہے۔ اسی طرح سے کلام کو تکلم کرنا، فرمایا تم تکلم کرتے ہو، ظاہر میں تم ہو مگر حقیقت میں کلام ہمارا ہوتا ہے۔ حفاظت بظاہر تم کر رہے ہو مگر حقیقت میں ہماری حفاظت ہے۔ ظاہر میں تم قاری ہو مگر حقیقت میں ہم قاری ہیں جو قرآن کریم کی قرات کر رہے ہیں۔ تو حفاظت خداوندی بذیل اسباب نمایاں ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں جب کہ قرآن کریم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہے یعنی سو میں سے ایک دو کی ہے۔ مجموعی طور پر قوم متوجہ نہیں ہے جیسا کہ توجہ کا حق ہے قرآن کی تعلیم پر کوئی مادی وعدہ نہیں ہے کہ آپ نے اگر قرآن پڑھ لیا تو آپ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے گا یا قرآن پڑھ لیا تو چند لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے یا کوئی جاگیر آپ کو مل جائے گی؟ کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ دار العلوم کس طرح سے قائم ہیں؟ یہ حافظ خانے کس طرح سے قائم ہیں؟ ہزاروں آدمی کیوں چلے آ رہے ہیں؟ یہ محض قرآن کا معجزہ ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور دلوں پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ آؤ پڑھو اور پڑھاؤ بظاہر اس میں کوئی دنیوی مفاد نہیں ہے پھر بھی آنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ وہ آ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں اور قرآن کی حفاظت ہو رہی ہے۔

پھر حفاظت بھی چھوٹے بچوں سے کرائی جا رہی ہے۔ عموماً قرآن کریم پڑھنے والے چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اگر پڑھتے تو یہ تہمت آ سکتی تھی کہ وہ حفاظت قرآن کی غرض سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف حفاظت منسوب ہوتی کہ اگر یہ عقلاء اور بڑے بوڑھے متوجہ نہ ہوتے تو قرآن محفوظ نہ ہو سکتا۔ تو وہ اگر حفاظت کرتے تو ان کے ارادے کی طرف نسبت ہوتی کہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت کی ہے۔ لیکن بچوں سے حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے؟ اور حفاظت ہو رہی ہے تا کہ اس کی حفاظت کی نسبت خالص اللہ کی طرف ہو کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں، بچے حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ تو بڑوں کے ذریعے حفاظت ہوتی تو حفاظت کی نسبت ان کی طرف ہوتی جس سے تہمت آتی۔ اس لئے عادت اللہ یوں چلی کہ چھوٹے بچے پانچ پانچ، چھ چھ اور سات سات برس کے جن سینوں کے اندر قرآن کریم محفوظ

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹۔

ہے تا کہ یہ حفاظت براہ راست اللہ کی حفاظت سمجھی جائے، بہر حال فرمایا گیا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ''ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ تو حقیقی حفاظت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہو رہی ہے۔

حفاظت بطریق حفظ...... اور اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے ایک ایک مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے حفاظت کی۔ تو یہ قراء اور مجودین بھی فی الحقیقت قرات کے اندر خلفاء خداوندی ہیں۔ ان کی سند بھی جا کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پہنچتی ہے۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چیز استناد کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہے، حدیث ہے، فقہ ہے اصول فقہ ہے۔ سب چیزیں سند کے ساتھ ہیں۔ حدیث کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑے کی سند ہم سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ ایک ذرا سا جملہ آپ روایت کریں گے اس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گی۔ محدثین نے حدیث کے راویوں میں سے چار لاکھ راویوں کی تاریخ مدون کر دی۔ ان کا کیریکٹر ان کا کردار، ان کا حافظہ، ان کا ضبط ان کی عدالت اور ان کے نام ونسب محفوظ کر دیئے کہ یہ راویان حدیث ہیں۔

اسی طرح سے قرآن کریم کی حفاظت سند کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ جتنے قراء اور مجودین ہیں، ان کو سند دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود مولانا قاری عبد الوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم پڑھا اور تجوید کے ساتھ پڑھا تو اس کی سند میرے پاس محفوظ ہے۔ تو مجھے قاری عبد الوحید صاحب نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبد الرحمٰن صاحب الہ آبادی نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبد اللہ صاحب مکی نے پڑھایا، ان کو قاری ابراہیم رشید مصری نے پڑھایا اور پھر آگے ان کے استاد، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اسکو بواسطہ جبرئیل حق تعالیٰ سے حاصل کیا اور جبرئیل کہتے ہیں کہ میں نے براہ راست حق تعالیٰ سے سنا۔ تو ایک قاری کی سند اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو جس طرح سے قرآن کریم کے الفاظ کی سند محفوظ ہے اسی طرح سے اس کے لب ولہجے کی سند بھی محفوظ ہے اس کے معانی اور علوم کی سند بھی محفوظ ہے اس کے کلام کے جتنے پہلو ہیں وہ سب سند کے ساتھ محفوظ ہیں، ایک ایک نقطہ تک اس کا حفاظت کیا گیا ہے۔ تو فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ''ہم نے اس کو نازل کیا، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ تو حفاظت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ زبان سے پڑھا جائے یا لکھا جائے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تکلم بھی واقع ہوا اور لکھا بھی گیا۔

حفاظت بطریق کتابت...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سب سے پہلے لوح محفوظ کے اوپر لکھا گیا ہے۔ جیسا کاتب ہے ویسی ہی اس کی کتابت ہے۔ ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ بعض سیر کی روایتوں میں ہے کہ لوح محفوظ میں قرآن کریم لکھا گیا اور اس کا ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر ہے۔ تو جیسا اس کا لکھنے والا

①② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

ہے ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے لوح محفوظ کو دیکھ کر قرآن حفظ کیا۔ پھر اسی قرآن کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا یہ گویا ان پر انعام کیا گیا۔ تو اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اور لوح محفوظ میں بھی درج ہے اور جبریل علیہ السلام کے قلب میں درج کیا گیا۔ اس کے بعد میں پھر بیت العزت میں قرآن اتارا گیا۔ یہ آسمان اول کے اوپر یعنی آسمان دنیا میں ایک مقام ہے۔ پورا قرآن آسمان دنیا کے اوپر بیت العزت میں اتار دیا گیا۔ اور وہاں سے پھر تیئس برس میں رفتہ رفتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل ہوا۔ ایک ایک آیت، دو دو آیت حسب موقع حسب واقعہ اترتی گئی۔ تو گویا اللہ سے چلا لوح محفوظ تک آیا پھر جبرئیل تک آیا، پھر بیت العزت میں آیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔

حفاظت بطریق تواتر...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پڑھایا، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تابعین کو پڑھایا۔ تو قرآن کریم میں تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ ایک تو ضابطے کا تواتر ہوتا ہے حدیث متواتر اس کو کہتے ہیں جس میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے چلے آ رہے ہوں اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ بہر حال تین ہو یا تین سے زیادہ۔ یہ اعلیٰ ترین تواتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں تین تین کا نہیں بلکہ ہزاروں ہزار کا ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں حافظ رہے۔ ہر قرن کے اندر ایک طبقے نے دوسرے طبقے سے سنا، دوسرے نے تیسرے سے سنا۔ اس طرح سے سند چلی۔

محیط بالدیانت کتاب...... تو مروی عنہ جس سے روایت کی گی وہ حق تعالیٰ شانہ ہیں، راوی اول وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ پھر حفاظت کے ساتھ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس کو اتارا گیا۔ جس کو ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ ① "یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اس کو لے کر روح الامین نازل ہوئے اور قلب محمدی کے اوپر لے کر آئے"۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت اس کے اسماء میں سے امین ہے کہ وہ امانت والا ہے۔ حضرت جبریل کی صفت روح الامین، وہ خود امانت والے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت محمد الامین ہے کہ امانت والے۔ اور یہ امانت کا لفظ وہ تھا جس کو اپنوں نے ہی نہیں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ نبوت سے پہلے تمام کفار مکہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آتے تو کہتے: "جَآءَ مُحَمَّدُ نِ الْاَمِيْنُ" ② "امانت والا آ گیا"۔

تو کلام امین سے چلا، امین کے قلب پر اترا۔ تو امانت کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پہنچ گیا۔ سند میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ راوی اور مروی عنہ پوری عدالت لئے ہوئے ہوں، پورا ضبط لئے ہوئے ہوں پوری امانت داری کے ساتھ پہنچائیں۔ تو اللہ سے بڑھ کر امانت والا کون ہوسکتا ہے اور جبرئیل علیہ السلام سے بڑھ کر امین کون ہوسکتا ہے؟ اور خاتم الانبیاء سے بڑھ کر انسانوں میں امانت والا کون ہوسکتا ہے؟ تو تین امینوں کے اندر یہ کلام رہا پھر سند کا سلسلہ چلا۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۲ تا ۱۹۴۔ ② المستدرک للحاکم، کتاب المناسک، ج: ۴ ص: ۲۲۸۔

سندِ قرآن پر از روئے قرآن بحث......اسی واسطے ایک جگہ قرآن کریم میں اس کی سند بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ محدثین کوئی حدیث بیان کریں تو راویوں کے اوپر نقد تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کے راوی کیسے ہیں پہنچانے والے کیسے ہیں جس درجہ کا راوی ہوگا اسی درجے کی روایت ہوگی۔ تو ایک سورۃ میں مستقل طور پر قرآن کریم کی سند پر بحث کی گئی ہے۔ فرمایا گیا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ ①

گویا راوی اول جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لئے ان کا وصف بیان کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ ② ''یہ کہا ہوا ہے ایک رسول کا جو کریم ہے''۔ تو لفظ ''رسول'' سے تعبیر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول کس کے ہیں؟ اللہ ہی کے رسول ہیں اللہ تعبیر فرما رہے ہیں۔ ہر شخص اپنا رسول اور قاصد اسے بناتا ہے جس پر پورا اطمینان ہوا۔ اگر ذرا بھی بے اعتمادی ہو اسے قاصد نہیں بنایا جا سکتا۔ معمولی معمولی باتوں پر اسے قاصد بناتے ہیں جس پر پورا اطمینان ہو، وہ دوستوں میں شمار ہوتا ہو، دشمن اور بدخواہ نہ ہو۔ سچا ہو، امانت دار ہو۔ تو اول تو لفظ رسول سے حضرت جبریل کی تعریف کی گئی کہ وہ ہمارے رسول ہیں۔ رسالت خود ایک بزرگی اور برگزیدگی کی چیز ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ رسول بھی کیسے ہیں؟ کریم ہیں۔

جن کے اخلاق میں کرم داخل ہے۔ ان کی عادت میں کرم داخل ہے۔ تو رسول بھی ہیں اور کریم بھی ہیں۔ کریم النفسی ان کا جوہر ہے تو دو لفظ فرمائے گئے ایک رسول اور ایک کریم جس سے گویا جبریل علیہ السلام کی شان واضح کی گئی۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص رسول بھی ہے، کریم بھی ہے، نیک نفس ہے۔ بلکہ نیک نیت ہے۔ مگر اتنا کمزور ہے کہ اگر کلام لے کر آئے تو کسی نے دباؤ ڈالا، تو ممکن ہے کہ دباؤ میں بات بدل ڈالے، دباؤ میں آ کر مرعوب ہو جائے۔ تو نیک نیت بھی ہے، امانت دار بھی ہے مگر دل کا کمزور ہے۔ سچی بات کہنے لگا تھا مگر دوسرے نے تلوار دکھلائی کہ یہ کیا کہتا ہے؟ دباؤ میں آ کر اس نے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ تو بعض دفعہ ایک شخص نیک نیت ہے، کریم النفس بھی ہے۔ مگر بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید دب کر کلام میں تبدیلی کر دے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا:

﴿ذِىْ قُوَّةٍ﴾ ③ رسول بھی ہے، کریم بھی ہے، طاقت ور ہے، کمزور اور ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال کر کچھ کا کچھ کہلوائے بہرحال تین باتیں ہوئیں کہ جبریل میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے اور قوت بھی ہے جبریل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کے دباؤ میں آ کر کچھ کا کچھ کہہ دیں۔ سنجیدگی سے کہیں گے، امانت سے کہیں گے اور جو پیغام دیا گیا ہے وہی پہنچائیں گے۔ لیکن پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نیک نیت بھی ہے، کریم النفس بھی اور باقوت بھی ہے۔ لیکن اس نے دور سے کلام کو سنا اور کچھ کا کچھ سن لیا۔ جب روایت کی تو پوری طرح وہ روایت نہ کر سکا جو اصل متکلم کا کلام تھا۔ اس نے میل دو میل، فرلانگ دو فرلانگ سے سنا۔ آواز آ رہی تھی مگر دور کی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹، ۲۱. ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰.

آواز تو دور کی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے۔ کہ غلط فہمی ہو جائے آواز پوری طرح کان میں نہ پڑے۔ یہ ایک احتمال ہوسکتا تھا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھایا ﴿عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾ ① جبریل عرش والے کے پاس ہی رہتے ہیں کہیں دوری اور بعد نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دور بیٹھ کر کچھ کا کچھ سن لیں۔ تو قرب بھی انتہائی ہے کہ ان کا مکان اور جگہ اور رتبہ بھی عرش والے کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: جبریل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتہی ہے۔ اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے سدرۃ کے آگے پھر جنتوں کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر سمندر ہے جس کے اوپر عرش عظیم واقع ہے۔ بہر حال کائنات کا دائرہ جس کو مکلف کہا جاتا ہے وہ آسمانوں کے نیچے نیچے ہے تو آسمان کے اوپر جا کر حضرت جبریل کا مقام ہے۔ اب پرواز اگر ہوتی ہوگی تو کہیں اوپر ہی ہوگی۔ نیچے بھی آتے ہیں اوپر بھی جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: ﴿عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾ ② ''عرش والے ہی کے پاس مقیم ہیں''۔

لہٰذا دوری اور بعد کا کوئی سوال نہیں۔ تو ایک راوی کی یہ شان نکلی کہ اس میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے، قوت بھی ہے اور قربِ خداوندی بھی ہے۔ بُعد کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

مگر پھر بھی ایک احتمال ہوسکتا تھا کہ ایک شخص رسول ہے، کریم ہے، طاقت ور ہے، اللہ کا مقرب بھی ہے۔ لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یعنی اس کا منصب کوئی نہیں۔ منصب والا جب بولتا ہے، اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ ایک بڑے سے بڑا آدمی ہو طاقت ور بھی ہو مگر اس کے پاس کوئی عہدہ نہ ہو، کوئی ضابطے کی بڑائی اس کے پاس نہ ہو، تو اس کے کلام کو توجہ سے نہیں سنا جائے گا۔ اگر میں ایک جملہ بولوں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر کسی ملک کا سربراہ وہی جملہ بولے، تو سیاست کی بساط الٹتی چلی جاتی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ملکوں میں اس سے انقلابات واقع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک صاحب منصب نے کلام کیا۔ تو آدمی نیک بھی ہے، بزرگ بھی ہے، مقرب خداوندی بھی ہے، حقانی بھی ہے۔ مگر منصب دار اور عہدہ دار نہیں، کوئی منصبی رتبہ نہیں ہے، تو اس کا کلام زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتا۔ تو جبریل علیہ السلام کے متعلق ممکن تھا کہ کوئی یہ کہتا کہ بڑے درویش ہیں، بڑے اعلیٰ درجہ کے مقرب ہیں، عرش کے قریب رہتے ہیں، نیک بھی اور بزرگ بھی ہیں، کامل امانت دار ہیں مگر عہدہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس لئے ان کی ذمہ دارانہ شان نہیں ہے کہ ان کے کلام کو توجہ سے سنا جائے اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا۔

﴿مُطَاعٍ﴾ ③ سارے ملائکہ کے سردار بھی ہیں اور واجب الاطاعت ہیں، سارے فرشتے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں، آسمانوں میں ان کی حکومت ہے، سید الملائکہ ہیں تو ظاہر بات ہے جب متکلم، قاصد اور بولنے والا بنی ذات سے بزرگ ہو، صاحب امانت ہو، باہر سے اس کو رسالت ملی ہوئی ہو اور اوپر سے اتنا بڑا عہدہ دار کہ ساتوں آسمانوں میں اس کی حکمرانی بھی ہو۔ اس کی ذمہ داری اور اس کا منصب بھی ہو، تو اتنی بڑی شخصیت جب

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹. ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹. ③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱.

پیام پہنچائے گی تو اس میں کوئی دغل وفصل کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد پھر فرمایا:

﴿ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾ ② ان سارے اوصاف کے اوپر یہ ہے کہ وہ امانت دار ہیں اور اس کی شہادت کون دے رہا ہے؟ اللہ میاں شہادت دے رہے ہیں۔ یہ جبریل کو کون کہہ رہا ہے کہ وہ بزرگ بھی ہیں، مطاع بھی ہیں۔ صاحب قرآن کہہ رہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ ان کی صفت فرما رہے ہیں۔

عظیم شہادت ...... اگر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کوئی چھوٹا آدمی بیان کرنے لگے تو وہ بڑائی نہیں سمجھی جاتی یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعریف خود کرنا چاہتا ہے۔

مادح خورشید مداحِ خود است

اگر سورج کی کوئی تعریف کرنے لگے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اپنی تعریف منظور ہے، سورج محتاج تعارف نہیں ہے۔ تو کسی بڑے آدمی کا تعارف اگر چھوٹا کرائے، وہ درحقیقت اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ بڑا تو خود ہی متعارف ہے۔ لیکن اگر بڑا تعارف کرائے یہ فی الحقیقت ایک عظیم شہادت ہے۔ تو جبریل علیہ السلام کا مثلاً میں تعارف کرانے لگوں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ میں اپنے تعارف اور اپنی عزت کا خواہاں ہوں کہ ایک بڑے آدمی کا نام لے رہا ہوں ایک بڑی شخصیت کا نام لے رہا ہوں۔ جبریل علیہ السلام کا تعارف وہ کرائے جو خود جبریل کا خالق ہے جو جبریل کا معبود ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جبریل رسول بھی ہیں، کریم بھی ہیں۔ ذی قوت بھی ہیں، امانت دار بھی ہیں، مقرب بارگاہ بھی ہیں، عہدے دار بھی ہیں یعنی سید الملائکہ بھی ہیں۔ ان کو ہم نے قاصد اور پیغمبر بنا کر بھیجا۔ تو بھیجنے والے حق تعالیٰ جن کا علم لامحدود ہے۔ ان کے علم کی کوئی حد ونہایت نہیں۔ جن کو بھیجا گیا وہ صاحب امانت ہیں اور جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو نبوت کا عہدہ دیا گیا کہ عالم بشریت میں اس سے بڑا کوئی باکمال نہیں۔

عظمت سند ...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ جو نبوت کے درجات کا منتہی ہو۔ یعنی نبوت کے سارے مراتب ان کے اوپر آ کر ختم ہو جائیں۔ کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہے کہ کسی اور شخصیت کی ضرورت پڑے کہ وہ اس درجے کو لے کر سامنے آئے۔ تو خاتم النبیین کا یہ مطلب ہے کہ نبوت کے کمالات کے جتنے درجات اور جتنے مراتب ہیں وہ اس ذات میں ہیں وہ اس ذات اقدس پر ختم ہو گئے۔

نبوت کی بنیاد دو ہی چیزوں کے اوپر ہے۔ ایک کمالات علمی اور ایک کمالات اخلاق، جن سے عمل کا سلسلہ چلتا ہے۔ تو علم کے بارے میں تو فرمایا گیا: ''اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ'' ''اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم آپ کو عطاء کئے گئے''۔

اور اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ ② ''تو اخلاق بھی خلق عظیم''۔ اور

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۔

آپ کا علم اتنا جامع کہ اولین وآخرین کا تمام علم آپ کو دے دیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جو ذات بابرکات علم میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو، اخلاق میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو۔ تو اس کی نبوت بھی انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ مکمل ہوگی۔ اس لئے آپ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔ یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت کے مراتب ختم کردیئے گئے۔

تو ایسی ذات کے اوپر قرآن نازل ہو جو کمالات بشریہ میں سب سے زیادہ اکمل ہو۔ اور ایسی ذات قرآن کو لے کر آئے جس کی حق تعالیٰ تعریف فرمائیں کہ ایک راوی میں جتنے اوصاف ہوسکتے ہیں وہ سب ان میں موجود ہوں اور قرآن کریم کو بھیجنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہو جو سارے کمالات کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔ تو اوپر سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن کریم کی سند اتنی مکمل ہے کہ اس میں کسی نقد وتبصرہ کی گنجائش نہیں۔

تواتر طبقہ...... اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن پڑھایا تو صحابہؓ نے طبقے کے طور پر اس کو لیا۔ یعنی اِکے دُکے نے حفظ نہیں کیا۔ بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور طبقات کے طبقات حافظ قرآن ہوئے۔ انہوں نے پھر بعد والے طبقات کو حافظ بنایا اور طبقہ در طبقہ حافظ بنتے چلے گئے۔ اسی طرح آج تک تواتر طبقہ کے ساتھ یہ قرآن کریم چلا آرہا ہے کہ ایک ایک اور دو دو یا بیس بیس اور چالیس چالیس نہیں سو سو اور پچاس پچاس نہیں بلکہ ہزاروں ہزار حفاظ ہر قرن میں موجود رہے۔ اوپر کے قرن سے لیتے رہے اور نیچے کے قرن کو دیتے رہے۔ تو جو کلام خداوندی اس حفاظت کے ساتھ آئے اور قیامت تک چلتا رہے اس میں کسی دَغل وفصل یا تحریف کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی تحریف کرنے والا تحریف کرے گا۔ چونکہ حفاظت کے سامان کافی ہیں اس لئے اس کی تحریف کھل جائے گی چنانچہ بہت سے محرفین پیدا ہوئے جنہوں نے معنی کے لحاظ سے بھی تحریف کرنا چاہی لیکن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا گیا۔

ہمہ گیر ابدی حفاظت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر صدی پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا'' ① ہر صدی کے اوپر اللہ مجدد بھیجے گا۔ مجدد کے لئے کوئی شخص واحد ہونا ضروری نہیں۔ جماعتیں بھی مجدد بن کر آئی ہیں افراد بھی مجدد بن کر آئے ہیں۔ دین کے جس گوشے میں لوگوں نے خلط واقع کیا اور تنقیص واقع کیا۔ انہوں نے آکر اسی کو کھول دیا۔

تو ہر صدی پر مجددوں کا وعدہ دیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''كَيْفَ تَهْلَكُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَسِيْحُ آخِرُهَا وَالْمَهْدِيُّ وَسَطُهَا.'' ② وہ امت کیسے ہلاک ہوجائے گی جس کی ابتداء میں میں ہوں اور اخیر میں مسیح ہیں اور بیچ میں مہدی ہیں۔ تو اول وآخر کی بھی حفاظت بتلائی گئی، ہر صدی کی حفاظت بتلائی گئی۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائة ج: ۱۱ ص: ۳۶۲.

② مشکاة المصابیح، کتاب المناقب، باب ثواب هذه الامة، ج: ۳، ص: ۱۷۳، رقم: ۶۲۷۸.

پھر ہر صدی کے اندر اندر وعدہ دیا گیا: ''يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ.'' ① ہر قرن اور زمانے کے اندر اس علم کو اٹھاتے رہیں گے، اسلاف میں سے اخلاف رشید، نیک خلف، نیک سلف سے لیتے رہیں گے۔ اس علم کو امانت داری کے ساتھ سلف سے خلف قبول کرتے رہیں گے غلو کرنے والے کے غلو کو توڑ دیں گے۔ غلو کرنے والے جو تحریفیں کریں گے اور معانی کے اندر جو تحریف واقع کر دیں گے اس کو مٹائیں گے اور دروغ بافیوں اور جاہلانہ تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔ بہر حال اس امت میں وعدہ دیا گیا کہ قیامت تک ایک طبقہ حقانی ضرور باقی رہے گا جو بجنسہٖ قرآن کو مع اس کے لفظ و بیان اور مع اس کی شرح کے دیتا رہے گا تو سلف سے خلف تک پہنچتا رہے گا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ امت میں فرقے ہوں گے اور اختلافات رونما ہوں گے وہاں یہ بھی وعدہ دے دیا گیا کہ قیامت تک ایک فرقہ ضرور حق کے اوپر رہے گا اور اپنے ذوق، وجدان اور دلائل سے لوگ سمجھتے رہیں گے کہ یہ فرقہ حقانی ہے۔ اس کے افعال واعمال اور اس کی علامات بتلاتی رہیں گی کہ یہ حقانی ہے اور لوگ اس کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ غرض ایک طبقہ ہمیشہ باقی رہے گا جو صحیح مزاج کے ساتھ دین کو باقی رکھے گا اور صحیح ذوق کے ساتھ اس کو قائم رکھے گا۔ ''لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ.'' ② نہ ان کو رسوا کرنے والا رسوا کر سکے گا نہ ذلیل کرنے والا ذلیل کر سکے گا۔ وہ ایک ہی چیز کہتے رہیں گے کہ: ''مَا اَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَاَصْحَابِيْ'' ③ جن کے اوپر آج کے دن میں (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہؓ ہیں۔

اسی کے مطابق لفظ اور معنی اور حقائق و کیفیات دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ بہر حال یہ وعدہ دیا گیا اور جہاں اختلافات کی خبر دی گئی وہیں ساتھ اس فرقہ حقانی کی بھی خبر دی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دین خاتم النبیین کا دین ہے۔ قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ درجات نبوت آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی درجہ باقی نہیں رہا کہ کسی شخصیت کو لا کر اسے پورا کیا جائے۔

بہر حال قرآن کریم کی حفاظت خداوندی کے سلسلہ میں مجددین کے وعدے الگ ہیں۔ ائمہ ہدایت کے وعدے الگ ہیں، خلفاء کے وعدے الگ ہیں اور خلف عدول کے وعدے الگ ہیں، صلحاء کے وعدے الگ ہیں کہ یہ برابر بھیجے جاتے رہیں گے اور دین کی حقانیت قائم رہے گی۔ تو یہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ④ میں بتلایا گیا کہ جہاں قرآن کریم کے الفاظ محفوظ کیے گئے اور جہاں اس کا رسم الخط محفوظ کیا گیا، وہیں اس کے

① السنن الكبرىٰ للبيهقي ج: ١٠ ص: ٢٠٩، مجمع الزوائد ج: ١ ص: ١٤٠ ② الصحيح للبخاري، كتاب المناقب، باب سوال المشركين ان يريهم...... ج: ١١، ص: ٤٧٢، رقم: ٣٣٦٩. ③ السنن للامام الترمذي، ابواب الايمان، باب ماجاء في افتراق هذه الامة، ج: ٩، ص: ٢٣٥، رقم: ٢٥٦٥. ④ پارہ: ١٤، سورة الحجر، الآية: ٩.

علوم اور معانی بھی محفوظ کئے گئے، وہیں اس کے احکام بھی محفوظ کئے گئے۔ تو اول سے لے کر اخیر تک اور ظاہر سے لے کر باطن تک قرآن کریم کا ایک ایک پہلو محفوظ ہے اور محفوظ چلا جائے گا۔

بہر حال یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ یہ دار القرآن قائم کیا گیا، بہر حال یہ بھی ایک خلافت خداوندی ہے۔ یہ الفاظ اور لب و لہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قرّاء اور مجودین نے اسی لب و لہجے کے حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہوتا ہے۔

تغنی بالقرآن...... اس واسطے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ: مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا" ② "جو قرآن کریم کے ساتھ تغنی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

مگر تَغَنِّی کے معنی یہاں موسیقی کے نہیں ہیں۔ گانے بجانے کے طرز پر پڑھنے کے متعلق دھمکی دی گئی ہے۔ اگر کوئی قرآن کو مزامیر کی صورت سے پڑھے تو اسے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے تو قرآن کا غنا الگ ہے، گانے بجانے کا غنا الگ ہے۔ قرآن کریم کی تغنی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اتنے درد آمیز لہجے کے ساتھ پڑھے کہ قرآن کی کیفیات ایک قلب سے دوسرے قلب میں پہنچنے لگیں۔ تو وہ ایک خاص درد، ایک خاص لب ولہجہ ہے، قراء اور مجودین وہی اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی سینکڑوں قسم کی موسیقیاں ہیں۔ ہر ملک کی موسیقی الگ ہے لیکن قرآن کا غنا وہ ہے کہ کسی موسیقی پہ منطبق نہیں اور کسی موسیقی میں وہ تاثیر نہیں جو اس میں تاثیر ہے اگر صحیح معنی میں کوئی پڑھنے والا موجود ہو اس سے دل کھنچتے ہیں۔ تو فرمایا گیا "مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا."

کہیں فرمایا گیا "زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا." ① قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔ اس سے قرآن کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ تو خوش آوازی میں اوپر والوں کی تقلید کرنی پڑے گی کہ جس انداز کی خوش آوازی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے چلی آرہی ہے اور تابعین سے چلی آرہی ہے اور سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہے۔ اسی کے ساتھ تغنی کرو۔ اسی کے ساتھ حسن صورت اختیار کرو۔ تو قرآن کریم کی آواز اور لب ولہجہ اور طرز ادا تک محفوظ کیا گیا۔

تبریک...... اور وہ قراء و مجودین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے یہ خلافت خداوندی سنبھالی۔ تو ایک خلافت علمی ہے، ایک خلافت اخلاقی ہے، ایک خلافت عملی ہے اور یہ خلافت صوتی ہے کہ آواز کے لحاظ سے بھی دنیا میں اللہ کے خلیفہ موجود ہیں کہ اس کے کلام کو اسی کے انداز سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس واسطے مبارک باد کے مستحق ہیں

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ واسروا قولکم اوجهروا به، ج: ۲، ص: ۵۵، رقم: ۶۹۷۳.

② الحدیث اخرجه الدارمی ولفظه: حسنوا القرآن...... کتاب فضائل القرآن، باب التغنی بالقرآن، ج: ۱۰، ص: ۴۱۰، رقم: ۳۵۶۵.

اور دارالقرآن بھی مبارکباد کا مستحق ہے جس نے قراء اور مجودین بنانے کا ایک راستہ پیدا کیا۔ اس فن شریف کو پھیلانے کا ارادہ کیا۔ بہرحال یہ اس کی برکات میں سے ایک برکت ہے کہ آپ حضرات یہاں جمع ہیں اور قرآن سننے کے لئے جمع ہوئے۔ قراء اور مجودین کی محفل منعقد ہوئی۔ کلام خداوندی پڑھا گیا۔ تو حقیقت میں یہ کلام اللہ کا ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں جب کفار کے اوپر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ کے بارے میں فرمایا گیا تھا ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ② اے نبی! جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے وہ آپ نہیں پھینک رہے تھے۔ وہ تو ہم پھینک رہے تھے۔ یعنی اعضاء آپ کے تھے ہمارے کمالات کا ظہور ہو رہا تھا اور مظہر آپ بنے ہوئے تھے۔ تو زبانیں ہماری ہیں، کلام خدا کا ہے اور انسان مظہر بنا ہوا ہے۔ اس واسطے یہ ادارہ مستحق مبارکباد ہے جس نے قراء اور مجودین جمع بھی کئے اور آئندہ پیدا کرنے کا سلسلہ بھی ڈالا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کامیاب فرمائے اور اس ادارے سے بہت سے مجودین پیدا ہوں اور قرآن کریم کے پڑھنے کی اور اس فن تجوید کی اشاعت ہو اور لوگوں کے دلوں میں یہ گھر کرے اور پھر لوگ مائل ہوں اور اس کے علم و عمل کی طرف متوجہ ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ①

---

① پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۰. ③ حررہ: ۲۴، ربیع الاول، ۹ ۱۴۰ھ

نجوم ہدایت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ (اَوْكَمَاقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ①

مقام صحابیت...... آفتاب نبوت کی تاثیر وتربیت اور تعلیم وتمرین سے امت کے استفادہ اور منور ہونے کے متفاوت درجات ومراتب کھل جاتے ہیں جن کا معیار آفتاب سے قرب اور بعد ہے یعنی جو اس سے قریب تر ہے وہ اتنا ہی نورانی تر اور متاثر تر ہے اور جتنا آفتاب سے دور ہے اتنا ہی اس کے فیض سے کم مستفید ہے۔

مثلاً طلوعِ آفتاب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آفتاب کے آثار سے متاثر ہوتی ہے وہ فضا ہے۔ وہ چونکہ خلقۃً اپنی ذات سے شفاف ہے اور ادھر آفتاب کے سامنے بلاواسطہ حاضر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ وہ اس کے نور وحرارت کا اثر لیتی ہے۔ وہ اس درجہ منور ہوتی ہے کہ باوجود اس کے چمک اٹھنے کے خود اس کی چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی بلکہ آفتاب ہی کی دھوپ اور شعاعیں نظر پڑتی ہیں۔ اگر فضا میں نگاہ اٹھائی جائے تو فضا کا جو حصہ بھی سامنے آئے گا اس میں آفتاب ہی دکھائی دے گا۔ خود فضا کی ہستی نظر نہ پڑے گی۔ گویا وہ اس کے نور میں اس درجہ مستغرق اور فنا ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا تنور کسی کی آنکھ میں نہیں آتا بلکہ آفتاب اس میں سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا بلاواسطہ دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ فضا اپنی بے حد وسعت کے ساتھ بیچ میں حائل ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب سے استفادہ کی بھی ہے کہ اس کے عالمگیر آثار سے متاثر تو سب ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ متاثر وہ طبقہ ہوتا ہے جو بلاواسطہ اس سے قریب ہو کر نور لیتا ہے اور وہ طبقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے جو فضا کی مانند ہے کہ زمین سے بالاتر ہے اور فلک شمس یعنی آسمان نبوت سے فروتر ہے وہ فضا کی طرح خلقی طور

① الابانة الكبرىٰ للامام ابن بطة، باب التحذير من استماع كلام قوم يريدون نقص الاسلام، ج: ٢، ص: ٢٢٠ رقم: ٧٠٩.

پر خود شفاف ہے جو محض اس کے نور ہی کو دکھا دینے کی نہیں بلکہ عین آفتاب کو دکھلانے کی کامل استعداد رکھتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آپ نے فرمایا کہ: سارے نبیوں کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب کر لئے گئے۔ یا جیسے عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے دل شفاف تھے، ان کا علم گہرا تھا، ان میں تکلفات نہ تھے، انہیں اقامت دین کے لئے پوری امت میں سے چن لیا تھا۔ ان کا نقش قدم واجب الاتباع ہے وغیرہ۔ جس سے حضرات صحابہ کرامؓ کی کمال قابلیت کھلتی ہے جو انہیں انوار نبوت کو جذب کرنے کیلئے عطاء ہوئی تھی۔ پس وہ فطری شفافی اور کمال قرب کے لحاظ سے بمنزلہ فضا کے ہوئے جو شفاف ہے اور ساری دنیا کی نسبت سے آفتاب سے قریب تر بھی ہے کہ بلاواسطہ نور آفتاب جذب کرتی ہے۔ پس انہوں نے ان شفاف سینوں سے اس درجہ آفتاب نبوت کا نور واثر قبول کیا کہ فضا کی طرح سرتاپا نور بن گئے اور جیسا کہ فضا آفتاب سے متصل اور ملحق ہو کر اس درجہ منور ہو جاتی ہے کہ وہ خود نظر نہیں آتی۔ یعنی وہ خود اپنے کو نہیں دکھلاتی بلکہ صرف آفتاب اور اس کی شعاعوں اور چمک دمک ہی کو نمایاں کرتی ہے۔ ایسے ہی صحابہ ؓ کرام اپنی فطری قابلیتوں کی بناء پر اس درجہ پاک قلوب، عمیق العلم، قلیل التکلف اور بے غل وغش بنا دیئے گئے تھے گویا ان میں خود ان کی کوئی ذاتی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجسم نمونے بن گئے تھے۔

سنن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم...... اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عقیدہ وعمل کو اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ ختم کر کے انہیں معیار حق فرمایا اور اعلان فرمایا کہ سنن نبوتؐ اور سنن صحابہؓ ایک ہی ہیں جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی دینی خصوصیات، خصوصیاتِ نبوی تھیں۔ چنانچہ امت کے بہتر (۷۲) فرقوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا کہ ان بہتر (۷۲) میں وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا: ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' ① ''جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہؓ ہیں''

گویا اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ انکے عقیدہ وعمل کو اس طرح ملا کر بتلایا کہ ان کے عقیدہ وعمل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ وعمل کی نوعیت ایک ثابت ہوگئی اور فرقوں کے حق وباطل ہونے کا معیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بابرکات اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو ٹھہرایا۔

سب وشتم کا انجام...... پھر جیسے فضا تک کوئی گندگی نہیں پہنچتی اور پہنچائی بھی جائے تو وہ لوٹ کر پہنچانے والے ہی پر گرتی ہے۔ فضا اس سے گندی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حضرات صحابہ کرام کا طبقہ جو روحانی فضا کی مانند ہے۔ امت کی تنقیدوں سے بالاتر ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی طبقہ سب وشتم یا گستاخی یا سوء ادب یا جسارت وبے باکی یا ان پر اپنی تنقیدی تحقیر کی گندگی اچھالے گا تو اس کی یہ ناپا کی اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس فضاء شفاف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ بہر حال حضرات صحابہؓ فضاء قریب کی مانند ہیں کہ انہیں شفافی میں بھی آفتاب سے مناسبت ہے وہ

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی افتراق هذه الامة، ج: ۹، ص: ۲۳۵، رقم: ۲۵۶۵.

آفتاب نبوت سے نزدیک تر بھی ہیں۔ بلاواسطہ اس سے ملحق بھی ہیں۔ وہ زمین کی کدورتوں سے بالاتر بھی ہیں اور وہ آفتاب کے نور میں فانی بھی ہیں کہ اس نور کی نمائش گاہ بن کر رہ گئے ہیں جن میں اپنی خصوصیت بجز انفعال اور قبول حق کے دوسری نہیں رہ گئی تھی۔

جامع اضداد زندگی...... پس صحابہ کرامؓ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرب تر اور اشبہ تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شعاعوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی اور اولعزمانہ زندگی ہے کہ جائزات کی آڑ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ ہی کو اپنالیا جائے اور نفس کی راحت طلبیوں کو خیر باد کہہ کر عملی مجاہدہ و ریاضت ہی کو زندگی بنالیا جائے بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبوی بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی ودائی اور ملکیت بھی غالب اس کمال اعتدال و جامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ کرامؓ کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں۔ آحاد و افراد اس زندگی کے حامل نظر پڑیں گے۔ جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا، لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت کی حد کمال کو طے کئے ہوئے ہو۔ طبقہ صحابہؓ کے سوا دوسرا نہیں۔ جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر اور نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف رضائے حق کو اپنی زندگی بنایا۔ مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کر دیا۔ موطن طبیعت سے ہجرت کر کے موطن شریعت میں آ کر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی حیلہ جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزم صادق کے ساتھ ہمہ تن مرضیات الٰہی اور سنن نبوی ؐ کی پیروی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنالیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ کلیۃً تارک دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی، دنیا اور دنیا کے جاہ و جلال، دھن و دولت، حکومت و سیاست، گھر بار، زمین، جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادائے حقوق میں بے لاگ بھی یہ زن، زر، زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر قلباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی، درویش کامل بھی ہیں اور قبا شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور دلق گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری کی خو بھی بدستور قائم ہے۔

یوں بہم کس نے کئے ساغر و سندال دونوں

کامل انسانیت کا طبقہ...... انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے کہ بشر بھی ہیں اور ملک بھی۔ نہ طبائع کو ترک کرتے ہیں اور نہ عقل و فراست کے تقاضوں سے ایک انچ ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ خالص طبعی جذبات کی پیروی حیوان کا کام ہے اور طبعیات سے کلیہ باہر رہ کر محض عقل کلی کی پیروی فرشتوں کا کام ہے، لیکن طبعیات کو بحالہ قائم رکھ کر انہیں عقلی شعور کے ساتھ عقل کی ماتحتی میں انجام دینا اور حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ انسان کا کام ہے۔ مگر انسان

کامل فرما کراس کے تقدس و برگزیدگی کو نمایاں کیا گیا۔ اس لئے جس طبقہ کے افعال اقوی، عقائد، احوال، اقوال سب میں یہ کامل اعتدال رچا ہوا ہو۔ وہی طبقہ کامل انسانیت کا طبقہ کہلائے گا۔ سو طبقاتی حیثیت سے یہ کمال بالذات تو انبیاء علیہم السلام میں ہوتا ہے اور بالغرض بحیثیت طبقہ ان کے صحابہ ؓ میں ان کے بعد طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف انفرادی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی اس مقام کی نہیں جس پر یہ طبقہ فائز ہوتا ہے۔

ظلِ نبوّت...... پس صحابہ کرام ؓ درحقیقت نبوت کا ظلِ کامل تھے جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالات نبوت پہچانے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ و رسول ؐ کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کرام ؓ کا طبقہ ہے جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی اور ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ﴾ ① اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ دستاویز رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیام قیامت ثبت کر دی گئی۔ کہیں ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّاَجۡرٌ عَظِیۡمٌ﴾ ② ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقوے کے لئے خالص کر دیا ہے ان لوگوں کے لئے مغفرت و اجرِ عظیم ہے۔ کے ذریعے ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی۔

اور کہیں ﴿اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۙ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعۡمَۃً﴾ ③ اور کہیں ﴿وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا﴾ ④ فرما کر ان کے اخلاق کی برتری ثابت کی گئی اور کہیں۔ ''اَصۡحَابِیۡ کَالنُّجُوۡمِ بِاَیِّہِمُ اقۡتَدَیۡتُمۡ اِہۡتَدَیۡتُمۡ'' فرما کر ان کے ہر ہر فرد کو پوری امت کا مقتدا بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصول ہدایت میں کوئی ادنیٰ کھٹکا نہ ہو۔

مکمل میزان اور متوازن ترازو...... کچھ عرصہ ہوا بعض منتسبین دارالعلوم کا ایک خط در بارہ طلب سرٹیفکیٹ احقر کے نام دفتر دارالعلوم میں موصول ہوا۔ جس میں ضمناً مودودی مکتب فکر اور خود اپنے مودودی ہونے کی نوعیت کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا تھا۔ یہ اصلاح طلب نوعیت دیکھ کر حضرت شیخ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بنظر اصلاح انہیں ایک شفقت نامہ تحریر فرمایا جس میں مودودی مکتب خیال کی بعض بنیادی دفعات پر کلام فرماتے ہوئے ان کے اصلاح خیال کی توجہ فرمائی ہے۔ حضرت شیخ مدنی کا یہ ارشاد نامہ سلسلہ عقائد و افکار کے لئے ایک مکمل میزان اور متوازن ترازو کی حیثیت رکھتا ہے جس سے موجودہ زمانے کے حدود سے گزرے ہوئے افکار و خیالات کو عموماً اور مودودی نقطہ نظر کے مزعومات و معتقدات کو خصوصاً تول کر ان کے حق و باطل کا فیصلہ با آسانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت ممدوح ؒ کے اس والا نامہ کا موضوع مودودی لٹریچر کا کوئی فروعی یا جزوی مسئلہ نہیں ہے جسے مودودی صاحب کی شخصی رائے یا ان کے اجتہاد و قیاس کا ثمرہ کہہ کر جماعت کے سر سے بوجھ ہلکا کر لیا جائے۔ جیسا کہ اس قسم

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۷-۸۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔

کے موقع پر عموماً ایسا ہی کیا جاتا ہے بلکہ ایک اصولی مسئلہ ہے اور وہ بھی دستور جماعت کا بنیادی اصول موضوعہ جو جماعت اور امیر سب کے لئے یکساں حجت اور معیار عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس اگر پوری جماعت دستور کو جو بنام دستور اسلامی شائع شدہ ہے، تسلیم کرتی ہے۔(اور ضرور تسلیم کرتی ہے جب کہ جماعت کا وجود اور اس کی تشکیل ہی اس دستور سے ہوئی ہے) تو بلاشبہ دستور کی یہ دفعہ:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ''ذہنی غلامی'' میں مبتلا نہ ہو''۔

ساری جماعت کا ایک مسلمہ عقیدہ اور بنیادی اصول ثابت ہوئی۔ اس لئے حضرت شیخ کے مکتوب گرامی میں اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کر کے اس پر جو شرعی گرفتیں کی گئی ہیں وہ یقیناً پوری جماعت کے ایک ایک فرد پر حجت ہیں اور اس لئے بحیثیت مجموعی جماعت کو گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عقائد کا معاملہ دنیوی نہیں اخروی ہے جو زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔

دفعہ مذکورہ پر حضرت شیخؒ نے کتاب وسنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے سامنے آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس دفعہ کے آنے سے پہلے تنقیح کر دوں تا کہ ان حقائق کا جو اس مکتوب کا موضوع ہے سمجھنا آسان ہو جائے۔ اس دفعہ میں مودودی صاحب نے غیر رسول کو معیار حق بنانے اور تنقید سے بالاتر سمجھنے سے روکا ہے۔ مگر یہ ممانعت جب ہی درست ہو سکتی ہے کہ شرعاً کوئی غیر رسول معیار حق وباطل نہ بن سکے اور تنقید سے بالاتر نہ ہو۔ اگر شرعی طور پر کوئی معیار ہو اور بن سکتا ہو تو اسے معیار حق مان لینا اور تنقید سے بالاتر سمجھنا جرم نہیں ہو سکتا۔ کوئی تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اگر کسی نے از خود کسی کو معیار حق بنا لیا اور تنقید سے بالاتر سمجھا تو وہ شرعی مجرم اور ایک شرعی گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اس لئے ہمارا کلام مودودی صاحب (علیہ ما علیہ) کے اس نظریہ پر ہوگا کہ غیر رسول معیار حق نہیں بن سکتا اور تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس دفعہ نمبر ۶ کو اس کے ہمہ گیر عموم کے ساتھ اس کے عام الفاظ میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ۔

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں، کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں، اور کوئی بھی اس کا مستحق نہیں کہ اس کی ذہنی غلامی کی جائے''۔

تو سوال یہ ہے کہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کسی کو معیار حق بنا دیں یا اس کے معیار حق ہونے کی شہادت دیں یا معیار حق ہونے کا ضابطہ بتا دیں کہ اس کی رو سے معیار حق ہونے کی تعیین کر لی جائے تو کیا وہ پھر بھی معیار حق نہ بن سکے گا؟ اگر بن سکے گا تو یہ اصول غلط نکلا کہ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم'' کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں ہو سکتا۔ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے باوجود بھی ان کے سوا کوئی معیار حق نہ ہوا تو خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا معیار حق ہونا معاذ اللہ باطل ٹھہر جاتا ہے جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول خلاف ہو گیا۔

(العیاذ باللہ) دونوں صورتوں میں دستور جماعت کی دفعہ نمبر ۶ باطل ہو جاتی ہے۔ایک صورت میں اس کا منفی پہلو یا باطل ٹھہرتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیار حق نہیں اور دوسری صورت میں اس کا مثبت پہلو باطل ہو جاتا ہے کہ صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہی معیار حق ہیں۔اس ضابطہ سے نکلنے کی آسان صورت اس کے سوا دوسری نہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق معیار حق اور نا قابل تنقید تسلیم کر لیں۔کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بذاتہ معیار حق ہیں اور غیر رسول بارشاد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم معیار حق ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا منصوص ہے......سوال رہ جاتا ہے تو صرف یہ کہ آیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو معیار حق بنایا بھی ہے یا نہیں؟ اور آیا کسی کو تنقید سے بالاتر اور مستحق ذہنی غلامی فرمایا بھی ہے یا نہیں؟

سو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کا نام لے کر معیار حق و باطل قرار دیا' ان پر جرح و تنقید سے روکا اور ذہنوں کو ان کی غلامی کے لئے مستعد فرمایا وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس جماعت ہے۔ان کے معیار حق بتلانے ہی کے لئے آپ نے نہایت صاف و صریح اور غیر مبہم ہدایت جاری فرمائی۔یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا قیاسی یا استنباطی نہیں بلکہ منصوص ہے۔جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مستقل حدیث ارشاد فرمائی:

عَنْ عَبْدِاللہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّۃً کُلُّھُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَۃً قِیْلَ مَنْ ھُمْ یَارَسُوْلَ اللہِ؟ قَالَ: مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ. ① ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری امت تہتر (۷۳) ملتوں پر تقسیم ہو جائے گی سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔پوچھا گیا کہ وہ (مستثنیٰ) کون ہیں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جو لوگ میرے اور میرے اصحاب کے طریق پر ہیں''۔

فرق اسلامیہ کے حق و باطل ہونے کا معیار......اب اس حدیث میں فرق اسلامیہ کی نجات و ہلاکت اور بالفاظ دیگر ان کے حق و باطل ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ وہ میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ ہے۔لیکن اس طریقہ کو شخصیتوں سے الگ کر کے تنہا کو معیار نہیں بتلایا۔بلکہ اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ ؓ کی ذوات قدسیہ کی طرف منسوب کر کے معیار بتلایا کہ وہ ان شخصیتوں کے ضمن میں پایا جائے۔ورنہ بیان معیار میں اس نسبت اور نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ مَنْ ھُمْ کے جواب میں مَا اَنَا عَلَیْہِ کی سیدھی تعبیر یہ تھی کہ مَا جِئْتُ بِہٖ فرما دیا جاتا۔یعنی معیار حق وہی ہے جسے میں لے کر آیا ہوں۔یعنی شریعت' لیکن شریعت کو شخصیتوں سے الگ کر کے ذکر کرنے کی بجائے شخصیتوں کے انتساب سے ذکر فرمانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے

---

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ، ج: ۹ ص: ۲۳۵.

کہ محض کاغذ کے کالے نقوش معیار نہیں بلکہ وہ ذوات معیار حق ہیں جن میں یہ نقوش وحروف اعمال واحوال بن کر رچ گئے ہیں اور اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب کوئی بھی ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ محض لٹریچر معیار حق نہیں بلکہ وہ ذات معیار حق ہیں جو اس لٹریچر کی حقیقی ظرف بن چکی ہیں: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ ① ''بلکہ یہ تو قرآن کی آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں''۔

پھر اس طریقہ کو شخصیت کی طرف منسوب کرنے کے سلسلہ میں بظاہر (مَا) کے بعد (اَنَا) کافی تھا اور یہ فرما دینا بس کرتا تھا کہ نجات وہلاکت کے پہچاننے کا طریقہ میری ذات ہے تاکہ معیار حق صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہوتی، لیکن آپ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو بھی شامل فرمایا جس سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ فرقوں اور مختلف مکاتب خیال کے حق وباطل کے پرکھنے کا معیار جیسے رسول کی ذات ہے ویسے ہی صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذوات بھی ہیں اور اس لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی یا عدم موجودگی میں کسی فرقہ اور کسی مکتب خیال کے افراد کو پرکھنے کے لئے یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی راہ پر چل رہے ہیں یا مخالف سمت میں ہیں، ان کی اطاعت کر رہے ہیں یا ان سے گریز پر ہیں، ان کے ساتھ حسن ظن کا برتاؤ کر رہے ہیں یا سوء ظن اور بے اعتمادی کا! کہ یہی شان کسی کے معیار ہونے کی ہوتی ہے۔ جس سے صاف طور پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رسول کا معیار حق ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہ حدیث اس بارے میں نص صریح ثابت ہوتی ہے جس کا مقصد ہی یہ مدعا ثابت کرنا ہے۔

اطاعت صحابہ رضی اللہ عنہم اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے...... اس کی وجہ یہ ہے جو خود اس حدیث ہی سے نمایاں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنے طریق کو بعینہ اپنے صحابہ کا طریق بتایا ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ان کی راہ چلنا میری راہ چلنا ہے اور ان کی پیروی میری پیروی ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے حق تعالیٰ شانہ اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ② ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

اس سے ایک کی اطاعت کو بعینہ دوسرے کی اطاعت بتلانا مقصود ہے جس کے صاف معنی یہی ہوتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول کا طریق الگ الگ نہیں۔ جو اللہ کا راستہ ہے وہی رسول کا راستہ ہے۔ پس اللہ کی اطاعت معلوم کرنے کا معیار یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر وہ ہے تو بلاشبہ خدا

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔ ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۰۔

کی اطاعت بھی ہے ورنہ نہیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی واطاعت کو بعینہ اپنی پیروی وطاعت قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دیکھنی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر صحابہ کرامؓ کی متابعت کی جاری ہے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قائم ہے ورنہ نہیں۔ اس کا حاصل وہی نکلتا ہے کہ رسول اور صحابہ رسول کے طریقے الگ الگ نہیں بلکہ جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے وہی بعینہ صحابہؓ رسول کا طریقہ ہے۔ اس لئے جیسے رسولؐ فرقوں کے حق و باطل کا معیار ہیں۔ ایسے ہی صحابہؓ رسول بھی معیار حق و باطل ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر سب کے حق و باطل کو بآسانی پرکھا سکتا ہے۔ بہر حال اس حدیث سے حضرات صحابہؓ کی صرف منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی۔ نیز ان کی معیاریت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں بلکہ امت کے حق و باطل کے لئے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی حق پر نہیں ہیں بلکہ حق و باطل کے لئے امت کی کسوٹی بھی بن چکے ہیں۔ جن سے دوسروں کا حق و باطل بھی کھل جاتا ہے پھر یہ بھی کہ ان میں یہ معیار ہونے کی شان محض ان کی غیر معمولی فضیلت سے بطور رائے وقیاس نہیں مان لی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے دوش بدوش ان کے معیار حق و باطل ہونے کی شہادت دی ہے۔ اس لئے ان کا معیار حق و باطل ہونا قیاسی نہیں بلکہ منصوص ثابت ہوا۔

معیار قابلِ تنقید نہیں ہوتا...... اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہؓ رسول پوری امت کے حق و باطل کے پرکھنے کا معیار ثابت ہوں تو کیا امت کو یہ حق پہنچے گا کہ وہ ان پر تنقید کرے اور گرفتیں کر کر کے ان کی خطائیں پکڑنے لگے؟ یا یہ حق خود ان کا ہوگا کہ امت کے خطاء وثواب کا فیصلہ کریں؟ کون نہیں جانتا کہ تنقید کا حق معیار کو ہوتا ہے جو پرکھنے والا ہے نہ کہ محتاج معیار کو جو پرکھوانے والا ہے، آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو اپنے خطاء وثواب کو کسی معیار پر جو جانچنے اور اپنا فیصلہ کرانے چلے ہوں اور وہ چلتے چلتے راستہ میں خود ہی معیار بن جائیں اور اپنے اوپر حکم لگوانے کی بجائے معیار پر ہی حکم لگانے کھڑے ہو جائیں؟ اس سے واضح ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معیار حق و باطل کی وجہ سے تنقید سے بالاتر ہیں۔ ایسے ہی آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی، جب کہ آپؐ نے ان کو بھی حکم میں ساتھ ملا کر معیار حق و باطل قرار دیا ہے، تنقید سے بالاتر ہیں۔ ورنہ کسی کو معیار حق مان کر اس پر نکتہ چینی کرنا یعنی خلاف حق ہونے کا اس کی طرف ابہام کرنا یا اسے خلاف حق ہونے کا طعنہ دینا اسے معیار مان کر بھی معیار نہ ماننا ہے جو صریح اجتماع ضدین ہے اس لئے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اگر امت کے فرقوں کے حق و باطل کے فیصلے کا معیار ہیں اور حسب بالا ضرور ہیں تو وہ یقیناً ان فرقوں کی تنقید سے بالاتر بھی ضرور ہیں ورنہ ان میں معیار ہونے کی شان قائم نہیں رہے گی، جس کا قائم رہنا بنص حدیث ضروری ہے۔

حق دستیاب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ہوگا...... صحابہ کرام کا معیار حق اور بالاتر از تنقید

ثابت ہو جانے کے بعد یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے معیار حق و باطل کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جیسے کسوٹی کا پتھر سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو تو نمایاں کر دیتا ہے۔ مگر خود نہ کھرا ہوتا ہے نہ کھوٹا۔ ایسے ہی حضرات صحابہ بھی بایں معنی معیار حق ہوں کہ دوسروں کا حق و باطل تو ان سے کھل جائے مگر وہ خود معاذ اللہ نہ حق ہوں نہ باطل۔ کیونکہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ ملا کر امت کے لئے معیار حق بتلایا ہے اور ظاہر ہے کہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار حق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق و صداقت کا مجسم نمونہ اور سرتا پا صدق و امانت ہیں۔ جن میں باطل کی آمیزش کا شائبہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے معیار حق ہونے کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ وہ بھی خالص حق کے پیکر ہوں اور حق و صداقت کا مجسم نمونہ ہوں جس میں باطل کا گذر نہ ہو۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیار حق ہونے کی شان یہ نکلتی ہے کہ ان کو سامنے رکھ لینے پر حق و باطل میں امتیاز کامل بھی پیدا ہو جائے اور حق دستیاب بھی ہو جائے۔ کیونکہ جب وہ کامل نمونہ حق ٹھہرے اور وہی اس امت کے اولین نمونہ حق بھی ہوئے تو حق پہچانا بھی انہی سے جائے گا اور دستیاب بھی انہی سے ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی پیروی کی جائے۔ اندریں صورت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیار حق ہونے اور امت کے مختلف الخیال فرقوں کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی نکل آئے کہ جو فرقہ ان کی اطاعت کا التزام کرے گا وہی حق پر ہوگا اور اس کسوٹی پر پورا اترے گا اور جو ان سے منحرف ہو کر خلاف راہ چلے گا وہی باطل پر ہوگا۔

اور ظاہر ہے التزام اطاعت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان پر جرح و تنقید کرنے کی بجائے ان کی تصویب کی جائے۔ ان کی خطائیں پکڑنے اور ان پر گرفتیں کرنے کی بجائے ان کی توصیف کی جائے۔ ان سے بدظنی کی بجائے حسن ظن رکھا جائے اور ان پر امور قبیحہ مثل جھوٹ وغیرہ کی تہمتیں دھرنے کی بجائے انہیں صادق و امین سمجھا جائے۔ اگر ان کے بعد امت کے طبقات کو پیروی کا یہ درجہ بھی حاصل نہ ہو اور اس انداز سے وہ صحابہ کرامؓ کے نمونوں کو سامنے نہ رکھیں تو یقیناً نہ انہیں حق حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ان کے دلوں میں حق و باطل کا امتیاز ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین سلامت نہیں رہ سکتا...... کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے مؤمنین اولین اور امت کے حق میں دین کے مبلغین اولین ہیں۔ دین کا کوئی حصہ کسی سے پہنچا ہے اور کوئی کسی سے، قرآن کریم کا کوئی ٹکڑا کسی سے ملا ہے اور کوئی کسی سے۔ جن کو جامعین قرآن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جمع فرمایا ہے تو کسی ایک صحابیؓ کی پیروی سے انحراف یا کسی ایک صحابیؓ پر جرح اور نکتہ چینی درحقیقت دین کے اس ٹکڑے سے انحراف ہوگا جو اس سے روایت ہو کر امت تک پہنچا ہے اگر راوی مجروح اور ناقابل پیروی ہے تو اس کا روایت کردہ حصہ دین بھی مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔ اگر معاذ اللہ یہ نکتہ چینی اور جرح اور عدم پیروی ان حضرات کے حق میں یونہی جائز کر دی جائے اور وہ سب میں دائر و سائر اور جاری رہے۔ جس کا

ہم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو اور نہ کسی کی ذہنی غلامی میں بتلا ہو تو دین کا کوئی ایک حصہ بھی غیر مجروح اور معتبر باقی نہیں رہ سکتا اور امت کا کوئی ایک فر بھی دین دار یا مدعی دین نہیں بن سکتا۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کو جائز سمجھنے والے بلکہ اسے اپنے دین کا موضوع بنانے والے پہلے اپنے دین کی خبر لیں کہ وہ باقی رہا کہ وہ ختم ہو گیا۔ بہر حال التزام طاعت اور ''ذہنی غلامی'' کا ادنی ترین مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قلبی حسن ظن اور ان پر جرح وتنقید سے روک تھام ہے۔ انہیں خطا کار سمجھ کر اطاعت شعار بننا ممکن نہیں کیونکہ خطا کو خطا سمجھ کر اس کی اطاعت نہیں کی جاتی۔

فرقہ ناجیہ اہلسنت والجماعت...... اس لئے امت میں صرف وہی ایک فرقہ اس حدیث کی رو سے حق پر ہوسکتا ہے جو ہر نہج سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توثیق وتصدیق اور تصویب وتنزیہ کے جذبات اپنے اندر لئے ہوئے ہو اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ مطیع طبقہ یا ''ذہنی غلامی'' کا پیکر طبقہ صرف اہلسنت والجماعت کا جن کا مذہب ہی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب بلا استثناء مطلقاً عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے ہر فعل کا منشا پاک' نیتیں راست' ارادے سچے تھے۔ وہ جھگڑتے بھی تھے تو ان کے جھگڑے میں شر نہ ہوتا تھا' ان کا اختلاف بھی ہماری آشتی سے خوش آیند تر تھا' ان سب کے نفوس امارہ نہیں بلکہ مطمئنہ تھے' ان کے قلوب تقویٰ اور تقدس کا محور تھے۔ جن کا امتحان اللہ تعالیٰ نے کر لیا تھا' ان کا آدھ پاؤ صدقہ بھی ہمارے پہاڑ جیسے صدقہ سے افضل تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے بری تھے۔ ان کا علم گہرا اور نکھرا ہوا تھا۔ ان کے مقامات توحید واخلاص سے پوری امت کے توحید واخلاق کو کوئی نسبت نہیں اور بقول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ امیر معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کے اوپر کا غبار عمر بن عبدالعزیزؒ سے ہزار درجے افضل تھا۔ کیونکہ امیر معاویہؓ صحابی تھے اور عمر بن عبدالعزیزؒ تابعی (روح المعانی وغیرہ وغیرہ)۔

ذہنی غلامی کے بغیر چارۂ کار نہیں...... ظاہر ہے کہ ان جذبات کو بطور عقیدہ ذہن میں رکھ لینے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جرح وتنقید کا تو کوئی سوال ہی ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ البتہ ''ذہنی غلامی'' کا سوال ضرور پیدا ہوسکتا ہے۔ سو اس منقول دین میں اولین طبقہ کا ہر آدمی کا کلیتہً محتاج ہوگا۔ روایت میں بھی اور درایت میں بھی' تاویلات میں بھی اور تعلم وتزکیہ میں بھی اجمال میں بھی اور تفسیر میں بھی آخر اس کی ''ذہنی غلامی'' نہ کرے گا تو کیا کرے گا اور جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کو امت کے مختلف فرقوں کے حق و باطل کا معیار بھی قرار دے دیا اور معیار ہونے کی شان یہ ہے کہ انہی سے حق و باطل ممتاز ہوتا ہے اور انہی سے ملتا بھی ہے اور اس صورت میں بجز ''ذہنی غلامی'' کے چارہ کار بھی کیا ہے ورنہ بجق ہونے کے بجائے آدمی مبطل ہونا گوارہ کرے۔

روافض، خوارج، معتزلہ اور دوسرے انہی کے ہم رنگ فرقے مبطل ہی اس لئے قرار پائے کہ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا ان کی ''ذہنی غلامی'' پر راضی نہ ہوئے اور ان پر طعنہ زنی اور نکتہ چینی سے باز نہ آئے۔ جس سے صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا تھا اور فرمایا تھا کہ میرے

صحابہ پر سب وشتم نہ کرو، میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جس میں نکتہ چینی اور گرفت اور نقد وتبصرہ سب ہی کچھ زیر ممانعت آ جاتا ہے۔ وہ نجوم ہدایت ہیں تو ان سے راہ پائی جائے گی۔ انہیں راہ دکھائی نہیں جائے گی، ان کی اقتداء کی جائے گی، ان کی غلطیاں پکڑ پکڑ کر ان سے اقتداء کرائی نہیں جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ جو لوگ اپنے نقد وتبصرہ کا دائرہ ان آباء صالحین تک وسیع کر دینا چاہتے ہیں اور بقول شخصے ''بازی بازی بار لیش بابا ہم بازی'' کے ڈھنگ پر ان پر جرح وتنقید جائز سمجھتے ہیں۔ تو یہی ایک چیز ان کے مسلک کے باطل ہونے اور مخالف اہلسنت والجماعت ہونے پر ان سے اعتزال کر لینے کی کافی دلیل ہے۔ اب خواہ کوئی نیا فرقہ بن جائے یا پرانے مبطل فرقوں کی ''ذہنی غلامی'' میں مبتلا ہو کر انہی کا مقلد ہو۔ بہر حال وہ اہل حق میں سے نہ ہوگا۔

ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم افتراقِ امت کا سبب ہیں...... کیونکہ اس حدیث میں یہ بھی نمایاں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیار حق و باطل ہیں تو ان کی مخالفت ہی سے نیا فرقہ بنے گا۔ موافقت سے کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ بلکہ وہی قدیم ناجی فرقہ برقرار رہتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے اپنا روحانی سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائے ہوئے ہے، کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک ہی فرقہ تھا جو ناجی تھا اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی جو برحق بھی تھی اور معیار حق بھی۔ بعد میں جتنے فرقے بنے وہ ان کی مخالف راہ چل کر ہی بنے۔

اور اسی لئے وہ ناحق قرار پائے کہ معیار حق سے الگ ہو گئے۔ پس جو لوگ بلا استثناء سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت وعقیدت کے ساتھ پیروی کرتے ہیں اور ان پر زبان طعن وتنقید کھولنا جائز نہیں سمجھتے وہ یقیناً فرقہ نہیں بلکہ اصل جماعت ہیں۔ جن کے عقیدہ وعمل کا سرا سند کے ساتھ قرن اول کی پاکباز جماعت سے ملا ہوا ہے اور وہی اس جماعت کی سنتوں پر عقیدت وعظمت سے جمے ہوئے ہونے کے سبب صحیح معنوں میں اہلسنت والجماعت کہلانے کے مستحق ہیں۔ البتہ صحابہ کرامؓ کا خلاف کرنے والے اور ان پر جرح وتنقید سے نہ رکنے والے حتیٰ کہ اسے اصول قرار دینے والے درحقیقت بلا جڑ کی نئی نئی شاخیں دین میں نکال کر اور نئے نئے خوشنما روپ کے عنوانوں سے دین کی تعبیریں کر کے اسے صد رخ بنا دینے والے امت میں افتراق وانتشار پھیلا رہے ہیں اور امت کو دین کے نام پر ضعیف ناتواں بناتے جا رہے ہیں تو یہی لوگ فی الحقیقت فرقہ ہیں ''جماعت نہیں'' گو اپنے نام کے ساتھ جماعت کا لفظ پکار پکار کر شامل کر لیں ''فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ سَمَّاھُمُ اللّٰہُ'' بہر حال اس حدیث مذکورہ سے ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معیار حق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا اور وہ آپ کے منشاء کے مطابق معیار حق ثابت ہوئے۔ جن پر آج تک امت مرحومہ اپنے کھرے اور کھوٹے کو پہچانتی رہی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ان پر کلی اعتماد فرما کر ان کے طریقے کو اپنا طریقہ اور اپنے طریقہ کو ان کا طریقہ فرمایا اور پوری امت کے لئے انہیں حجت قرار دیا جس سے قیامت تک امت کے حق و باطل کا فیصلہ انہی کے علم وعمل کے معیار سے ہوتا رہے گا۔

خود اپنے معیارِ حق ہونے کا ادعاء...... اندریں صورت مودودی صاحب کا دستورِ جماعت کی بنیادی دفعہ میں عموم واطلاق کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر نہیں ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے شامل ہوتے ہیں اور پھر ان پر جرح وتنقید کا عملی پرداز بھی ڈال دینا حدیثِ رسول کا محض معارضہ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک خود اپنے معیارِ حق ہونا کا ادعاء ہے۔ جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک کو پرکھنے کی جرات کر لی گئی۔ گویا جس اصول کو شد ومد سے تحریک کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اپنے ہی بارے میں اسے ہی سب سے پہلے توڑ دیا گیا اور سلف وخلف کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خود معیارِ حق بن بیٹھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ①

صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتماعی اطاعت...... اِدھر الفاظِ حبیبؐ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایک دو صحابی ہی معیارِ حق نہیں بنا دیئے گئے۔ بلکہ "اصحابی" جمع کا صیغہ لا کر اشارہ کیا گیا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق بن کر واجب الاطاعت ہیں۔ جس کے لئے احادیث میں ایک ایک، دو دو اور چار چار اس سے زیادہ اور پھر پوری جماعت کی اقتداء کے اوامر وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ معیار ہو کر بھی واجب الاطاعت نہ بنے تو معیار معیار نہیں رہتا اور جب کہ معیارِ حق ساری جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا گیا تو سارے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم بلا استثناء واجب الاطاعت بھی قرار دیئے گئے۔ ممکن ہے کہ کسی کو شک وشبہ گذرے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فروعی مذاہب مختلف رہے اور مسائل میں اختلاف اور تناقض تک نظر آتا ہے تو لامحالہ ایک کی اطاعت کر کے بقیہ کی اطاعت سے دست برداری ہی کرنی پڑے گی ورنہ ضدین کا اجتماع ہو جائے گا جو ناممکن العمل ہے تو پھر سب کی اطاعت وپیروی کہاں رہی اور ممکن ہی کب ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ اگر ایک کی پیروی دوسروں کی طعن وتنقید سے بچ کر اور سب کی عظمت رکھ کر ہو تو وہ سب ہی کی پیروی کہلائے گی۔ جیسا سلسلہ ختمِ نبوت میں عملاً پیروی ایک رسول کی ہوتی ہے مگر معیارِ حق سب کو سمجھا جاتا ہے۔ عظمت وتنزیہ اور تقدیس سب کی یکساں کی جاتی ہے۔ تنقید وتخطیہ سب کا معصیت سمجھا جاتا ہے۔ تو یہی سارے انبیاء کی پیروی سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ کسی ایک پر بھی زبانِ طعن یا لسانی نقد وتبصرہ کھول کر ہزار کی پیروی بھی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ سب کی مخالفت اور بغاوت ہے کیونکہ خود حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم فروعات میں مختلف رہنے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کی عظمت وتوقیر کو واجب سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام شرائع میں مختلف رہ کر ایک دوسرے کی تصدیق کو اصلِ ایمان قرار دیتے تھے۔ پس ایک طعنہ زن اور نکتہ چین جب کہ ان کے اس قدرِ مشترک کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ سب کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سب کے حق میں باغی ہے۔ ذیل کے ارشادِ نبویؐ میں اس حقیقت پر روشنی بھی ڈال دی گئی ہے کہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹.

"اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ" "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔ "اَیُّهُـــمْ" کے لفظ سے اقتدا تو مطلق رکھی گئی ہے کہ کسی کی بھی کی جائے ہدایت مل جائے گی۔ لیکن نجوم کے لفظ سے اقتداء کو سمجھنا اور ہادی ماننا سب کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ جس کی پیروی کرو نجم ہدایت اور نور بخش صرف اسی کو سمجھو پس پیروی کا عمل تو ایک دو تک محدود ہو سکتا ہے لیکن نورافشانی کا عقیدہ ایک دو تک تو محدود نہیں رہ سکتا وہ سب کے لئے ماننا لازمی ہوگا۔

بہر حال صحابہ کرام کا طبقہ تو وہ ہے کہ اس کا نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امت کے مختلف مکاتب خیال کے فرقوں کے حق و باطل کا معیار قرار دیا ہے۔ تنقید سے بالاتر بتلایا اور ان کی "ذہنی غلامی" یا اطاعت و پیروی ضروری قرار دی۔

تا قیامت معیار شخصیت رہے گا...... باقی ان حضرات کے بعد کسی طبقہ کو طبقہ کی حیثیت سے نام لے کر معیار حق نہیں فرمایا، البتہ معیار حق ہونے کا ایک کلی ضابطہ اور معیاری اوصاف کا تعین فرما دیا گیا ہے۔ جنہیں سامنے رکھ کر معیاری افراد کو ہر زمانے میں فی الجملہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ قرون مشہودہ کے بعد بشری کمزوریوں کے امکانات بھی رہے اور ایسی کمزوریوں کا گاہے بگاہے عملاً ظہور بھی ہوا، لیکن ایسی گاہے بگاہے کمزوریوں سے معیاری شخصیتوں کے معیار ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اول تو اتقیاء امت میں سے کسی کی زندگی کو پاکباز زندگی کہنے کیلئے یہ کافی ہے کہ غالب زندگی تقویٰ وطہارت کی ہو۔ بھول، چوک، نسیان وذہول اور گاہے بگاہے ارادی کمزوری انسانی خمیر میں ہے۔

دوسرے بعد کے لوگ صرف بایں معنی معیار حق و باطل ہوتے ہیں کہ ان کی مجموعی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنے لئے دینی راہ عمل کا خاکہ بنا لیا جائے اور اسے ان کے پارسایانہ عمل کے خاکہ پر منطبق کر کے اپنے حق و باطل ہونے کا فیصلہ کیا جائے، بایں معنی معیار حق ہونے کو انکا ہر قول وفعل حجت شرعی ہو تو اس قسم کے مقدس افراد اور معیاری لوگ ہر دور میں ہوتے رہیں گے اور امت کے لئے مینارۂ روشنی ثابت ہوتے رہیں گے چنانچہ حضرت شیخ نے معیاریت کے ایسے اوصاف پر بھی کتاب وسنت سے روشنی ڈالی اور اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ راہ رشد وہدایت میں محض لٹریچر سے رہنمائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ شخصیتوں کے کردار کے جامہ میں سامنے نہ آئے۔ ورنہ کتب سماویہ کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمائے جانے کی ضرورت نہ ہوتی درحالیکہ خود کتب سماوی کے معانی و مرادات کی تعیین کے لئے بھی معیار حق یہی مقدس ہستیاں ہوئی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو کتب الٰہیہ کے معنی متعین کرنے میں ہر بوالہوس آزاد ہو جائے اور حق و باطل کا کوئی فیصلہ کبھی نہ ہو سکے۔ اس لئے قیامت تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسی معیاری شخصیتوں کا بنام، مجدد، محدث، امام، مجتہد، راسخ فی العلم، فقیہ وغیرہ کا آتے رہنا ضروری ہے جس کے معیار سے امت کے عوام وخواص اپنے دینی عقیدہ وکردار کو جانچتے رہیں اور فی الجملہ ان پر اپنے کو

منطبق کر کے روحانی سکون وطمانیت حاصل کرتے رہیں۔

پس مودودی صاحب تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انسان کو معیارِ حق ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن کتاب وسنت کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک معیاری شخصیتیں آتی رہیں گی جو درجہ بدرجہ حق وباطل کا معیار ثابت ہوتی رہیں گی اور جو بھی کتاب وسنت کے الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کرے تو ایسی شخصیتیں اپنے اپنے دور کے مناسب حال عنوانوں سے انکی تاویلاوت کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کا چہرہ دکھاتی رہیں گی۔

جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ.'' ''اس علم (دین) کو (ہر دور میں) اعتدال پسند خلف (اپنے سلف سے) لیتے رہیں گے جو غلو پسندوں (اور حدود واعتدال سے گذر جانے والوں) کی تحریفوں، باطل پرستوں کی دروغ بیانیوں اور جہلاء کی (رکیک) تاویلوں کو رد کرتے رہیں گے''۔

اگر توفیق خداوندی شامل حال ہوئی تو ان معیاری شخصیتوں اور ان کے معیار ہونے کی شانوں کی تفصیل آئندہ کسی دوسرے مقالہ میں کی جاسکے گی۔

بہر حال حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب گرامی میں اہم اور بنیادی نکتہ بحث بھی معیاریت غیر رسول کا مسئلہ ہے جس کو مودودی صاحب نے اصولی طور پر اپنے بنیادی دستور میں رد کر دیا ہے اور شیخ نے اسے اہل حق کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جس سے یہ اختلاف فروعی نہیں بلکہ اصول بن گیا۔ خدا کرے کہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کار اس خلیج کو پاٹ دینے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائیں۔ کسی تحریک کو چلانے کے لئے بنیادی اختلافات پیدا کر لینا خود تحریک کو اپنے ہاتھوں ختم کر دینا ہے۔ فروعی باتیں تو اتفاق واختلاف دونوں راستوں سے چلتی رہتی ہیں، لیکن اصولی اختلاف اور صرف نظر ایک طرف میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ①

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ

محمد طیب غفرلہ مہتمم دار العلوم دیوبند

۲۰ جمادی الاول ۱۳۷۵ھ

① محمد طیب غفرلہ مہتمم دار العلوم دیوبند، ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ (یوم الخمیس)

ضمیمہ

ذہنی غلامی اور تقلید...... ذہنی غلامی کے لفظ سے غالباً مودودی صاحب نے ''تقلید'' کی ترجمانی فرمائی ہے لیکن اس معنی میں یہ اصطلاح غلط اور مغالطہ انگیز ہے۔ غلامی کا حاصل کسی کے آگے جھکنا ہے اور تقلید کے معنی کسی کی بات ماننا ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کے کمالات کے آگے نہیں جھکتا بلکہ اس کی ذات کے سامنے جھکتا ہے خواہ وہ کندہ ناتراش اور احمق ہی کیوں نہ ہو، لیکن ایک مقلد اپنے امام مجتہد کے سامنے آتا ہے تو صرف اس کے منصب و مقام کی پیروی کرتا ہے جس کو وہ عقل و نقل کا پیکر کامل سمجھتا ہے۔ ذات کے آگے نہیں جھکتا۔ پس غلامی میں آقا کی ذات پیش نظر ہوتی ہے۔ اس کا کمال پیش نظر نہیں ہوتا اور تقلید میں مجتہد کا کمال سامنے ہوتا ہے، ذات سامنے نہیں ہوتی۔ غلامی میں جبر ہوتا ہے کہ نہ غلام اپنی صلاحیتوں کو آقا کے انتخاب میں صرف کر سکتا ہے ورنہ خود آقا ہی کی صلاحیتوں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ ادھر بھی ذات اور ذاتی خوف و طمع، ادھر بھی ذات اور ذاتی جبر و قہر۔ نہ وہاں شعور و استدلال نہ یہاں۔ پس ''ذہنی غلامی'' میں نہ اپنا شعور بیچ میں ہوتا ہے نہ آقا کا کمال اور تقلید میں طوع و رغبت، عقلی شعور اور قلبی اعتقاد ہوتا ہے جس میں نہ جبر و دباؤ کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ امام مجتہد کے کمالات سے بے شعوری، غرض غلامی بے عقلی سے پیدا ہوتی ہے اور تقلید اتباع عقل و شعور سے، کیونکہ تقلید کسی کے آگے سر جھکانے کا نام نہیں، اس کی بات ماننے کا نام ہے اور بات بھی وہ جسے جذبات سے نہیں، علمی کمالات کے چشموں سے نکلی ہوئی سمجھ لی گئی ہو اور پھر کمالاتی ہی نہ ہو بلکہ اوپر سے نسبت بھی ہو کہ وہ خود اس شخص کی بات نہیں بلکہ اوپر کی بات ہے جہاں جھک جانا ہی نفسانی شرف ہے۔ پس تقلید میں شعور ہوتا ہے۔ بے شعوری نہیں، استدلال ہوتا ہے۔ (گو جزوی مسئلہ نہ ہو، اصولی اور کلی ہو۔ جس سے مجتہد مطاع کی شخصیت اتباع کے لئے متعین کی جاتی ہے) بے حجتی اور ذاتی دباؤ نہیں ہوتا، عبودیت نہیں ہوتی اطاعت ہوتی ہے۔ پس کہاں غلامی اور عبدیت اور کہاں اتباع و عقیدت، کہاں غرض مندی اور خوف و طمع اور کہاں محبت و غنائیت، کہاں شعور و استدلال اور کہاں جمود و تعطل، کہاں حسن ظن اور قلبی شفقت اور کہاں بیزاری اور اندرونی انحراف، کہاں عقل و خرد بالائے طاق اور کہاں عقلی رہنمائی پیش پیش۔

چراغ مردہ کجا، نور آفتاب کجا۔ اس لئے ذہنی غلامی کا لفظ جس کا معنی ذہن کو شعور و استدلال سے معطل کر کے کسی کی ذات کے آگے جھکا دینے کے ہیں اس تقلید کا ترجمان نہیں بن سکتا جس میں ذہنی شعور کی بیداری کے ساتھ کسی کی علمی اور کمالاتی نسبتوں کو سامنے رکھ کر حسن ظن اور استدلال کلی سے اس کی تقلید کی ترجمانی کے لئے ''ذہنی

غلامی'' کا تحقیر آمیز لفظ شاید اشتعال انگیزی اور نئی نسل کے دل و دماغ پر چوٹ لگا کر انہیں تقلید سے بیزار بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ فی زمانہ غلامی کے لفظ سے زیادہ کریہہ کوئی لفظ نہیں، آج افراد ہوں یا طبقات' اقوام ہوں یا اوطان۔ آزادی کے نام پر برسرِ پیکار ہیں۔

با اقتدار قوموں نے چونکہ کمزوروں کی غلام سازی کو زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے جس سے بے دست و پا اقوام تنگ آ چکی ہیں۔ اس لئے وہ آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور آج کی دنیا میں غلامی کے لفظ ہی کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اس لفظ کے سامنے آتے ہی لوگ چونک پڑتے ہیں اور نفرت کے ساتھ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس لئے تقلید سے نفرت دلانے کے لئے اس سے بہتر تدبیر نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ اس کا ترجمہ ایک ایسے مکروہ لفظ سے کر دیا جائے تو جو خود ہی ذہنوں میں حقیر و ذلیل ہو کہ اس راستہ سے تقلید کے مفہوم سے ہی لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی جائے، لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ذہنی غلامی اور تقلید کی حقیقتوں میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اور ایک کے لئے دوسرا لفظ کسی طرح بھی ترجمان نہیں ہو سکتا بلکہ یہ لفظ ہی شرعی نہیں ہے جو کسی دینی اور شرعی اصطلاح کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ محض اشتعال انگیزی اور پنہائی مقصد برآری کے لئے ایک حیلہ کیا گیا ہے۔

پس ہم تقلید کے ضرور قائل ہیں لیکن تقلید کے معنی ذہنی غلامی کے نہیں سمجھتے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ تقلید میں اتباع بھی ہوتا ہے اور شعور بھی۔ گو شعور اجمالی ہو تفصیلی نہ ہو۔ ارشادِ ربانی ہے۔

﴿عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ﴾ ① یہاں صحابہ کرامؓ کے لئے (جو متبعین اولین ہیں) اتباع بھی ثابت کیا گیا ہے اور بصیرت و شعور بھی جس میں سب سے پہلے اس کا شعور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام کس کا ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہے اور وہ شخصیت کون ہے جس کا اتباع کیا جا رہا ہے۔ اور ذہنی غلامی کا حاصل کلیتہً ذہنی بے شعوری اور جمود کے ہیں جو کسی بھی مومن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون میں ہم نے جہاں بھی یہ لفظ لیا ہے وہ مودودی صاحب کے کلام سے بطور حکایت و نقل کے لیا ہے ورنہ ہمارے نزدیک اسلامی اصطلاح کے نقطۂ نظر سے یہ لفظ مہمل اور بے معنی ہے۔ نہ یہ کسی شرعی مفہوم کا ترجمان بن سکتا ہے نہ عقل کا۔ کفار کی آبائی تقلید پر بول دیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی حد تک چسپاں ہو جائے۔

(محمد طیب غفرلہ)

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔

آغازِ بخاری

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِىَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـا بَعْـدُ!...... كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ذِكْرُهٗ: ﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ﴾حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ ِ الْاَنْصَارِيُّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ اَنَّهٗ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ ِ اللَّيْثِيِّ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ:اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ،وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَااَوْاِلَى امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ①

کلماتِ تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ ہم لوگوں کی سعادت ہے کہ بخاری شریف کے افتتاح میں شرکت کا موقع ملا۔ عموماً اصحابِ درس کا طریق یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن کی اہم کتاب شروع کرنے کے وقت چار چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ سب سے پہلے مصنف کا اجمالی تعارف کراتے ہیں۔ دوسرے خود تصنیف کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ خود کتاب کی عظمت وجلالت کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے جس سے کتاب میں بحث کی گئی ہے اور چوتھے یہ کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیوں اس کتاب کو پڑھتے ہیں؟

اس کو اگر علمی اصطلاح میں لایا جائے تو وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ سب سے پہلے "علت فاعلی" کہ اس کا فاعل کون ہے جس کی طرف ہم توجہ کر رہے ہیں۔ دوسرے "علت مادی" کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن پر مصنف نے بحث کی ہے اور تیسرے "علت صوری" کہ اس کتاب کی اور موضوع کی تشکیل کس طرح سے ہوئی ہے؟ اور چوتھے

① الصحیح للبخاری ، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ ، ج: ۱ ، ص: ۱ ، رقم: ۱ .

''علت غائی'' کہ اس کے پڑھنے سے کیا غرض وغایت ہے۔ تو عام طور پر اصحاب درس علتِ فاعلی، علتِ مادی، علتِ صوری اور علتِ غائی انہیں چار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

جلالتِ امام رحمۃ اللہ علیہ...... جہاں تک مصنفؒ کی ذات کا تعلق ہے، وہ مسلمانوں کے قلوب میں آفتاب سے زیادہ مرکوز اور روشن ہے۔ کوئی زیادہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے، اوائل میں سے ہیں، متقدمین میں سے ہیں، امام ہیں، حافظ ہیں اور مصنف ہیں۔ تمام اوصاف کمال جو اہل علم میں ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان میں جمع فرمائی ہیں۔

تقریباً ۱۹۲ھ یا ۱۹۴ھ میں پیدائش ہوئی ہے۔ باسٹھ (۶۲) سال کی عمر ہوئی ہے اور قریب قریب ۲۵۳ھ یا ۲۵۶ھ میں وفات ہوئی ہے۔؟ نے یہ تین چیزیں جمع کی ہیں اور تاریخ بتلائی کہ کونسا سن ولادت کا ہے اور کون سا سن وفات کا ہے اور عمر کتنی ہے؟ تو ان تینوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا ہے ؎

كَانَ الْبُخَارِيُّ حَافِظًا وَّمُحَدِّثًا ــــ جَمَعَ الصَّحِيْحَ مُكَمَّلَ التَّحْرِيْرَ

مِيْلَادُهٗ صِدْقٌ وَمُـــدَّةُ عُمْرِهٖ ــــ فِيْهَا حَمِيْدٌ وَانْقَضٰى فِيْ نُوْرٍ

گویا سن ولادت تو صدق کے لفظ سے نکلتا ہے اور مدتِ عمر حمید کے لفظ سے ہے اور سن وفات نور کے لفظ میں ہے۔ ①

جہاں تک امام کی عظمت اور جلالت کا تعلق ہے۔ حافظہ، عدل و اتقان، زہد وتقویٰ اور دیانت وہ اس سے زیادہ مشہور ہے جتنا کہ آفتاب کو ہم دیکھتے ہیں۔ پوری امت نے امام کی تلقی بالقبول کی ہے۔

حافظہ حق تعالیٰ نے محیرّ العقول عطاء فرمایا۔ اس زمانے میں حفظ ہی پر مدار تھا اور بڑے بڑے محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوئے کہ جن کے حفظ کو بس کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ عام طبعی طور پر یہ حافظے نہیں ہوتے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو زیادہ پھیلانا تھا تو حیرت ناک حافظے عطاء فرمائے، جس کو ہم کرامت ہی کہہ سکتے ہیں۔

کرامتِ حفظ...... امام ترمذیؒ مکہ مکرمہ کا سفر کر رہے تھے اور شیخ بھی ساتھ ہیں، جن کے امام ترمذی شاگرد ہیں۔ متعدد تلامیذ ساتھ ہیں۔ تمام تلامیذ نے درخواست کی کہ جہاز میں ایک لمبا وقت گزرنے گا تو حدیث کا املاء کرا دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ: شرط یہ ہے کہ کاغذ دوات ہو اور قلم لے کر بیٹھو۔ جو حدیث میں لکھواؤں لکھتے جاؤ۔ یہ شرط مان لی گئی۔ امام ترمذی کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم اور شوق یہ تھا کہ میں بھی درس میں حاضر ہوں۔ مگر شیخؒ نے شرط لگا دی تھی۔

تو یہ کیا کہ پیچھے بیٹھے تھے اور ایک گھٹنا کھڑا کر کے بایاں ہاتھ اس پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتے تھے گویا لکھ رہے ہیں۔ تا کہ شیخ یہ سمجھیں کہ کاغذ بھی ہے اور لکھائی بھی ہو رہی ہے۔ متعدد ایام گزر گئے، ایک دن شیخ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نہ کاغذ ہے نہ قلم ہے فرمایا. میں نے شرط لگائی تھی تم بلا کاغذ اور قلم کے کیسے آ گئے؟

---

① صدق ۱۹۴ھ، حمید ۶۲، نور ۲۵۶ھ ۶۲ سال عمر مبارک ہوئی۔

انہوں نے کہا کہ: حضرت! مقصد تو یہ تھا کہ چیز محفوظ ہو جائے. تو اس ایک ہفتے میں حضرت نے جتنی حدیثیں ارشاد کیں وہ سب محفوظ ہیں اور پہلے دن اتنی حدیثیں ان اسانید کے ساتھ سنائیں۔ دوسرے دن یہ حدیثیں فلاں فلاں سند کے ساتھ سنائیں، ہفتے کی کل حدیثیں مع اسانید کے حافظے سے بتلائیں۔ شیخ بڑے خوش ہوئے۔ گلے لگایا۔ فرمایا: تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہے۔

اب یہ حافظ کہ دس دن بعد فرمائیں کہ فلاں دن یہ حدیثیں تھیں، اور یہ یہ سند تھی، فلاں دن یہ حدیثیں تھیں یہ یہ سند تھی۔ اس کو سوائے کرامت کے اور کیا کہا جائے۔ عام حافظے میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

امتحانِ حفظ...... یہ امام بخاریؒ جب بغداد تشریف لائے۔ تو محدثین میں چرچا تھا کہ ایک نوجوان ہے جو حافظ حدیث ہے اور حفظ کا جو شہرہ تھا یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا غیر معمولی حفظ ہو، تو ارادہ کیا گیا کہ امام بخاریؒ کے حافظے کا امتحان لیا جائے۔ دس محدّث جمع ہوئے اور دس دس حدیثیں چھانٹ لیں۔ سو احادیث میں امتحان کرنا تھا۔ بہت عظیم مجمع ہوا۔

پہلے محدّث نے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ کسی متن کی سند کسی کے ساتھ تھوپ دی، کسی کی سند کسی کے ساتھ، تو دس حدیثیں الٹ پلٹ کر کے بیان کیں۔

امام بخاریؒ فرماتے اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ. اس کے بعد دوسرے محدّث نے اسی طرح الٹ پلٹ کر کے کسی کی سند اور کسی کا متن خلط ملط کر کے بیان کیا۔

ہر حدیث پر فرماتے رہے "لَآ اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ"

میں نہیں پہچانتا، سو کی سو حدیثیں اس طرح سے روایت کی گئیں ہر حدیث پر امام نے کہا: "لَآ اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ" میں نہیں پہچانتا۔ لوگوں نے کہا کہ خواہ مخواہ شہرت ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان نہ حفظ رکھتا ہے، نہ اتقان رکھتا ہے وہ ہر چیز میں "لَآ اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ" میں نہیں پہچانتا ہی کہتا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو امام بخاریؒ بولے سب سے پہلے محدثؒ نے اس ترتیب سے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ پہلی حدیث کی یہ سند ہے، دوسری کی یہ سند ہے، تیسری کی یہ ہے۔ دس کی دس صحیح سندیں بیان کیں۔ اس کے بعد کہا کہ دوسرے محدثؒ نے یہ دس حدیثیں بیان کیں، ان مین یہ خرابی تھی۔ یہ خرابی تھی۔ اس کی اصل سند یہ ہے، یہ ہے۔ سو کی سو روایتوں کی صحیح سندیں بیان کر دیں۔ تمام محدّثین کی گردنیں جھک گئیں اور کہا جو سنا تھا وہ حقیقتاً سچ تھا اور یہ شخص امامت کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ وہاں سے پھر امام بخاریؒ کا شہرہ ہوا۔ بہر حال امام بخاریؒ کا حافظہ، ان کا اتقان اور ان کا زہد و تقویٰ یہ گویا اظہر من الشمس ہے۔ ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔

جلالتِ کتاب...... ظاہر بات ہے "قَدْرُ الشَّهَادَةِ قَدْرَ الشُّهُوْدِ" جیسا شہود ہوتا ہے ویسی ہی شہادت ہوتی ہے۔ جب امام اس درجہ کا ہے تو اس کی تصنیف بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ تو بخاری کی جلالت شان یہ ہے کہ پوری امت نے اجمالی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور "اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللهِ" مانا گیا ہے۔

بعض حضرات محدثین کی رائے ہے کہ "اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللهِ" امام مالکؒ کی مؤطا ہے اور وہ حدیث میں اوّلین تصنیف بھی ہے۔ لیکن مؤطا کے اندر احادیث بھی ہیں، آثارِ صحابہؓ بھی ہیں اور فتاویٰ بھی ہیں۔ تو مخلوط ہے۔

امام بخاریؒ نے تنقیح کی بلکہ ہر چیز کو الگ الگ کر دیا ہے۔ ابواب اور فصول مرتب کئے اور ایسی کڑی شرائط لگائیں کہ دوسری عبارات اور اسانید میں وہ شرطیں نہیں پائی جاتیں، بالآخر امت کا اجماع ہو گیا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری ہے۔ اولین درجہ سند میں قرآن کریم کا ہے تو وہاں تواترِ طبقہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تواترِ روایت ہو یا تواترِ سند ہو۔ بلکہ طبقاتی تواتر ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں حافظِ قرآن مجید موجود ہیں۔ اس واسطے وہ تواترِ طبقہ ہے کہ جس میں کذب کا شائبہ یا خلط ملط کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔

اسماءُ الرجال...... احادیث میں محدثینؒ نے "حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے" اور بڑے بڑے مقامات دے، امت کے لئے سامان کر دیا۔ روایاتِ حدیث کے سلسلے میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ جمع کر دی جو روایانِ حدیث ہیں۔ ان کے خاندان کیا ہیں، ان کا کیریکٹر کیا ہے، ان کا کردار کیا ہے، حافظے کیسے تھے، عدالت کیسی تھی یہ سب جمع کر دیا ہے۔ تو پچاس ہزار انسانوں کی تاریخ ان کے خاندانوں اور احوال سمیت مرتب کر دی کہ یہ روایانِ حدیث ہیں۔

میزانِ حدیث...... پھر مصطلحات الحدیث مستقل فن ایجاد کر دیا۔ حدیث کے درجات قائم کر دیئے کہ اگر حدیث مرفوع متصل ہے اور طبقہ میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے آ رہے ہیں اس کو متواتر کہا۔ جو مورثِ یقین ہوتی ہے، اس کے منکر کو جاحد کہا کہ وہ کفر میں مبتلا ہے اس سے دوسرا درجہ خبرِ مشہور کا ہے کہ کم سے کم دو دو آدمی صحابی سے لے کر اب تک روایت کرتے آ رہے ہوں۔ کہیں زیادہ ہو جائیں تو مضائقہ نہیں مگر دو سے کم نہ ہوں، وہ حدیث مشہور کہلاتی ہے۔ یہ مورثِ ظنِ غالب ہے جو قریب قریب یقین کے ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ خبرِ واحد کا رکھا کہ ایک ایک آدمی روایت کرتا آ رہا ہو۔ یہ درمیان میں بڑھ جائے تو مضائقہ نہیں مگر ایک سے کم نہ ہو، یہ خبرِ واحد یا خبرِ وحید کہلاتی ہے۔ یہ مورثِ مطلق ظن ہوتی ہے۔ اس کا منکر کافر تو نہیں ہوتا مگر فسق میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے، تو خبرِ مرفوع متصل، متواتر، مشہور، خبرِ واحد۔ پھر اس کے بعد اگر بیچ میں انقطاع آئے تو منقطع۔ اگر صحابیؓ کی جگہ پر انقطاع آئے تو مرسل، بیچ میں انقطاع مسلسل دو راویوں کا آئے تو معضل، غرض اقسامِ حدیث بیان کی گئی ہیں کہ حدیث مشہور ہے، متواتر ہے، معضل ہے، مشکل ہے، مجمل ہے، مجہول ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ درجہ بتلایا کہ کس درجے میں اس کی حجیت ہے۔ بہر حال محدثین نے ایسے کانٹے اور میزانیں بنا کر دیں کہ کوئی بوالہوس خلط ملط نہیں کر سکتا، اس کانٹے پر ناپ کر پانی الگ اور دودھ الگ کر دیا جاتا ہے، نکھار دیا جاتا ہے۔

انتخابِ احادیث...... امام بخاریؒ اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور کتاب میں سات لاکھ احادیث میں سے سات ہزار حدیثیں منتخب کیں ہیں۔ اگر مکرّرات کو ملا دیا جائے تو سات ہزار بیٹھتی ہیں، مکرّرات کو حذف کر دیا جائے تو چار ہزار سے اوپر بیٹھتی ہیں جو روایتیں اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں بہر حال مصنف بھی جلیل القدر اور کتاب بھی جلیل القدر۔

شانِ قبولیت......خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "جَعَلْتُهُ بَيْنِىْ وَبَيْنَ اللّٰهِ حُجَّةً" ① میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے۔

حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ انشاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں، وہ بھی انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے۔ یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

موضوعِ کتاب......اس کا موضوع اقوال و افعالِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے جو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یا عمل کر کے دکھلایا یا کسی کے عمل پر سکوت فرمایا۔ یہ سکوت رضا ہے یہ سب احادیث میں داخل ہیں۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام......اس لئے کہ نبی کا قول اور فعل ہی شریعت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دین کے بارے میں معصوم پیدا فرمائے گئے ہیں اور اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ قبل از نبوت بھی معصوم ہیں اور بعد از نبوت بھی معصوم ہیں معصومیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ گناہ نہ کریں۔ قوتیں ساری موجود ہیں۔ مگر مخالفتِ نفس کی اتنی قوت ہے کہ کوئی ایک درجہ بھی رضائے حق کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ قوت نفس اور مقاومتِ نفس اتنی ہے کہ شوائب نفس باقی نہیں رہے، مغلوب ہو گئے ہیں۔

بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا مطمئن ہوتا ہے کہ جو نفس میں خواہش آتی ہے وہ بھی پاک ہی آتی ہے۔ غیر پاک یا ناپاک آتی ہی نہیں۔ اتنے پاک اور صاف انبیاء علیہم السلام کے قلوب پیدا کئے گئے ہیں، جس کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی عجیب شان ہے" إِنَّ رَبَّكَ يُسَارِعُكَ فِىْ هَوَاكَ" ②

آپ کی ہر خواہش کے پورا کرنے میں حق تعالیٰ اتنی جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر دل میں خواہش آئی اور ادھر پوری ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کے قلب میں خواہش ہی پاک آتی ہے۔ جب نبی کو مخلی باالطبع چھوڑ دیں گے تو خیر ہی کی طرف طبیعت جائے گی' شر کی طرف نہیں جائے گی۔ تو خیر غالب ہوتی ہے اور ہوائے نفس اس کے تحت ہوتی ہے، ہر خواہش نفس میں انبیاء علیہم السلام کو رضائے حق کا دھیان ہر وقت رہتا ہے۔ کسی وقت بری خواہش ان کے قلب میں آتی ہی نہیں۔ "إِنَّ رَبَّكَ يُسَارِعُكَ فِىْ هَوَائِكَ"

حفاظتِ اولیاء......اور انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے اور ان کی جوتیوں کی برکت سے انبیاء علیہم السلام کے خدام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے نفوس بھی مطمئن ہیں اور ان کی ہر خواہش پاک ہوتی ہے۔ جیسے

---

① تهذيب الكمال للعلامة المزى، فصل فى ماروى عن الائمة فى فضيلة هذه الكتب الستة، ج: ١، ص: ١٦٧.

② الحديث اخرجه الامام البخارى فى صحيحه ولفظه: مارى ربك الأيسارع فى هوائك، كتاب التفسير، باب قوله تعالى ترجى من تشاء ج: ١٤، ص: ٤٧٢ رقم: ٤٤١٤.

حدیث میں ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ: ''اَلْحَقُّ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ'' ① ''عمر کی زبان پر حق بولتا ہے''۔ ''دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ'' ''جدھر عمر جاتے ہیں، حق بھی ادھر جاتا ہے''۔

تو بظاہر تو یہ ہوتا کہ جدھر حق جاتا ہے ادھر عمر جاتے ہیں اور فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمر جاتے ہیں، حق ادھر جاتا ہے۔ یہ انتہائی مقام ہے۔ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر ہی مبتدی بھی چلے۔ لیکن جب اس مشق کے بعد منتہی ہوتا ہے، پھر وہ جدھر جاتا ہے، حق ادھر ہی جاتا ہے، اس لئے قلب پاک اور مطمئن بن جاتا ہے اس میں وہ چیز ہی آتی ہے جو حق ہوتی ہے، ناحق چیز نہیں آتی۔ انبیاء علیہم السلام کے خدام میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جدھر جھک جائیں حق بھی ادھر جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت بلند و بالا ہے۔

بہر حال نبی، کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل اور سکوت سب شریعت ہے، اس لئے کہ وہ پاک ہی پاک ہے، خیر ہی خیر ہے۔ تو اس فن کا موضوع اقوالِ نبیؐ، افعالِ نبیؐ اور رضائے نبویؐ ہے۔

غرضِ کتاب...... اس کے پڑھنے کی غرض و غایت کیا ہے؟ رضائے خداوندی حاصل کرنا، آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح ہے۔ دارین کی فلاح اگر حاصل کرنی ہو تو فن حدیث کی طرف آدمی متوجہ ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے ہم اور آپ اور دنیا کا کوئی بھی انسان بغیر نبی کے توسل کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

وساطتِ حدیث...... اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ بیچ میں نہ ہو تو کوئی بھی خدا رسیدہ نہیں ہوسکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام ہی کا صدقہ ہے کہ بیچ میں آکر بندے کو خدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام ادھر بھی واسطہ، ادھر بھی واسطہ۔ ادھر مخلوق میں شامل، ادھر اللہ سے واصل۔ تو بیچ میں جو بھی آجائے گا، اسے اللہ سے واصل کر دیں گے۔ بغیر نبی کے واسطے کے کوئی بھی انسان خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح سے لوگوں کا علمی کلام قرآن سے نہیں جڑ سکتا۔ جب تک بیچ میں کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ نہ ہو۔ تو حدیثِ نبوی قرآن سے لیتی ہے، فقہاء کو دیتی ہے۔ اگر فقیہہ کے کلام اور قرآن کریم کے بیچ میں حدیث نہ ہو تو فقہاء کا کلام قرآنِ کریم سے نہیں جڑ سکتا، جیسے افراد اللہ سے بغیر نبی کے واسطے نہیں جڑ سکتے ایسے ہی کلام الناس بھی بغیر کلامِ رسول کے واسطے کے کلامِ خداوندی سے نہیں جڑ سکتا۔ تو حدیث بیچ میں واسطہ ہے۔ قرآن سے لیتی ہے اور فقہاء کو دیتی ہے۔

بیان القرآن...... اسی واسطے حدیث کو بیانِ قرآن کہا گیا ہے۔ ایک قرآن ہے اور ایک بیانِ قرآن ہے۔ قرآنِ کریم تو وہ کلمات اور الفاظ ہیں جو منزل من اللہ ہیں ان کے معنی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر خود

---

① الحديث أخرجه الامام ابن ماجه رحمه الله تعالىٰ في سننه: عن ابی ذر رضی الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: ان الله وضع الحق على لسان عمر. كتاب السنة، باب فضل عمر رضي الله عنه، ج: ١، ص: ١١٩، رقم: ١٠٥.

ہی اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ تو قرآن لفظوں اور معنی کا مجموعہ ہے۔ لفظ بھی منزل من اللہ ہیں اور معنی بھی منزل من اللہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فکر اور سوچ سے قرآن کے معانی متعین کئے ہوں کہ یہ مطلب ہو سکتا ہے۔ اس مطلب کو بھی اللہ ہی نے واضح کیا ہے۔ تو لفظ بھی اللہ کے ہیں، معنی بھی اللہ کے ہیں۔

چنانچہ ابتداء میں یہ تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو جلدی جلدی رٹنا شروع کر دیتے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① "آپ جلدی نہ کریں۔ آپ کو یہی تو ڈر ہے کہ آپ بھول نہ جائیں"۔ فرمایا: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ہمارے ذمہ ہے کہ ہم آپ کے سینے میں جمع بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ اس کی فکر نہ کریں۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ جب ہم قرات کریں۔ از خود یا بواسطہ ملک کے۔ آپ سنتے رہیں۔ ہمہ تن گوش ہو کر اسے جذب کر لیں۔ دھیان نہ کریں، نہ عقل لڑائیں نہ حواس کو دخل دیں۔ صرف جذب کریں۔ آگے اس کا جمع کرنا، پڑھوانا اور جمع کر دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ تو الفاظ سے جمع کرنے کی اور زبان سے پڑھوا دینے کی گارنٹی حق تعالیٰ نے دی۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾

اس کے بعد پھر فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ④ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا بھی کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی مراد کیا ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معنی میں بھی امین ہیں۔ پوری امانت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے کلمات بھی پہنچا دیئے اور حق تعالیٰ کے کلام سے جو مرادات ہیں، وہ بھی بندوں تک پہنچا دیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین ہی امین ہیں۔

اہمیت فنِ حدیث...... بہر حال قرآن کریم اور کلام فقہاء کے درمیان اگر اتصال کا واسطہ ہے تو وہ حدیث ہے۔ اگر حدیث بیچ میں نہ ہو تو کلام فقہاء کا حدیث سے کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا۔ جیسا کہ بندوں اور خدا کے درمیان اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ نہ ہو تو کوئی بندہ اپنے خدا سے مربوط نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے اسلام میں فن حدیث کی اہمیت ہے۔ اور یہ دنیا میں اعلیٰ ترین اور اشرف ترین فن شمار کیا گیا ہے۔ تو اس فن میں اعلیٰ ترین کتاب یہ ہے، جس کا نام بخاری ہے۔ جسے اللہ اور بندے کے درمیان امام بخاریؒ نے حجت قرار دیا ہے۔ وہ آج شروع ہو رہی ہے۔ شروع میں اس میں چند مباحث ہیں۔ جو اکثر حضرات اساتذہ بیان کرتے ہیں۔

حمد و نعت سے ابتداء نہ کرنے کی وجہ...... پہلی بات تو یہ کہ عام کتابوں کا طریقہ یہ ہے کہ کتابیں حمد و نعت سے شروع کی جاتی ہیں۔ خطبہ ماثورہ ہوتا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ" الخ اسی میں حمد ہوتی ہے نعت بھی ہوتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے یہ نہیں کیا بس بسم اللہ سے کتاب شروع کر دی۔ تو ایک عام شبہ اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے عام مروجہ طریق کے خلاف کیوں

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷.
③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸. ④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹.

کیا؟ لیکن حقیقت میں یہ کوئی اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس اعتراض کا منشاء کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے کس حدیث یا نص کی خلاف ورزی کی ہے؟ بظاہر ایک رواج کی خلاف ورزی کر دی، تو رواج کوئی حجت قاطعہ تو نہیں تھا کہ امام خواہ مخواہ اس کی پابندی کرتے؟ تو اصل منشاء کیا ہے؟

تو منشاء یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ''كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءُ بِبِسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَهُوَ اَقْطَعُ'' جو مہتم بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع البرکۃ ہوتا ہے۔ یہ حجت تھی۔ لیکن چھ طریقوں سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے اس کے کلمات مختلف ہیں: ایک صیغہ ''كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءُ بِبِسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَهُوَ اَقْطَعُ '' دوسرا صیغہ یہ ہے: ''كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءُ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ'' ① تیسرا صیغہ یہ ہے: ''كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءُ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَهُوَ اَقْطَعُ'' ② اسی طرح سے اور بھی ہیں جو تقریباً چھ صیغے ہیں۔ تو سب میں قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ ''ذِكْرُ اللّٰهِ'' سے آغاز کیا جائے۔ اس میں بِسْمِ اللّٰهِ بھی آ گئی، اِسْمُ اللّٰهِ بھی آ گیا، ذِكْرُ اللّٰه بھی آ گیا۔ ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے آغاز ہو۔ تو مصنف نے بِسْمِ اللّٰهِ سے آغاز کر دیا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بسم اللہ بھی تو ذکر ہے اور اعلیٰ ترین ذکر ہے۔ پھر انہوں نے شبہ کیا کہ اگر لکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟ تو سوال یہ ہے کہ نہ لکھتے تو کیا حرج تھا؟

حدیث میں یہ ہے کہ ''كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاْ'' الخ...... کوئی مہتم بالشان کام جس کو ذکر اللہ سے شروع نہ کیا جائے مَقْطُوْعُ الْبَرَكَةِ ہے۔ تو اس حدیث میں لَمْ یُبْدَءُ کا لفظ ہے لَمْ یُكْتَبُ کا لفظ تو نہیں ہے کہ کوئی اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ کے شروع میں اگر بِسْمِ اللّٰهِ نہ لکھی جائے وہ مَقْطُوْعُ الْبَرَكَتُ ہوتا ہے لَمْ یُبْدَءُ شروع نہ کیا جائے۔ اب خواہ زبان سے شروع کر دے، لکھ کر شروع کر دے، دل سے شروع کر دے۔ حدیث پر عمل ہو جائیگا۔ تو مصنفؒ نے اگر نہیں لکھا تو حمد ثناء زبان سے کہہ دی ہو گی۔

ہر حدیث کی ابتداء میں اذکار عشرہ...... اور میں تو یہ کہتا ہوں۔ کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا مگر بہر حال قواعدِ فن کے بھی خلاف نہیں۔ کہ امام بخاریؒ کا طریق یہ ہے جو راویوں نے نقل کیا ہے کہ امام نے مکہ مکرمہ (زَادَ هَااللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں سولہ برس گزارے ہیں اور وہیں بخاریؒ کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس دوران میں اور بھی سفر ہوئے مگر مستقر مکہ مکرمہ رہا، یہاں بیٹھ کر بخاری کی تکمیل کی ہے اور تکمیل بھی اس طرح سے کی ہے کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے۔ پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ جب انشراح تام ہو جاتا تب حدیث نقل کرتے، تو ہر حدیث کو نماز اور غسل سے شروع کیا ہے۔ اور نماز اذکارِ عشرہ کا مجموعہ ہے۔ نماز کے اندر بِسْمِ اللّٰهِ بھی ہے، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ بھی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صَلٰوۃ و سلام بھی ہے، تکبیر بھی ہے، تحمید بھی ہے، تسبیح بھی ہے، تهلیل

① كنز العمال، ج: ١، ص: ٥٥٥، رقم: ٢٤٩٠. (عبدالقادر الدهلوى فى الاربعين عن ابى هريرةؓ)

② مسند احمد، مسند ابى هريرة رضى الله عنه، ج: ١٧ ص: ٣٩٧.

بھی ہے جو اذکارِ عشرہ کہلاتے ہیں اور دین میں معروف ہیں وہ سارے اذکار جمع کیے، طاعت و عبادت کی ساری ہیئتیں جمع کیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے ابتداء نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری نے ایک ایک حدیث میں نماز اور اذکارِ عشرہ سے ابتداء کی ہے۔ اس سے زیادہ اور آپ امام بخاریؒ سے کیا چاہتے ہیں؟۔ اگر کتاب میں اذکارِ عشرہ نہیں لکھے۔ تو ہر حدیث کی ابتداء میں اذکارِ عشرہ کئے ہیں۔ اس کے بغیر حدیث نہیں لکھی۔ لَمْ يُكْتَبْ کا لفظ تو ہے نہیں لَمْ يُبْدَأْ کا لفظ ہے اور بدایت اس طرح سے کی کہ ایک ایک حدیث کے لکھنے سے پہلے نماز پڑھ لی۔ ہر نماز میں سارے اذکار ادا کئے، تو آپ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے شروع نہیں کیا، میں کہتا ہوں کہ ہر ہر حدیث کو اذکارِ عشرہ سے شروع کیا ہے۔ اس کی کوئی نظیر بتلائے۔ یہ کیا اعتراض کی بات ہوئی۔؟ غرض اس میں مصنفؒ پر کوئی شبہ نہیں پڑتا۔

ابتداءِ کتاب میں اتباعِ سنت کا اہتمام...... اب آگے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اذکار میں بِسْمِ اللهِ بھی داخل ہے 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی داخل ہے تو بِسْمِ اللهِ ہی کی کیوں تخصیص کی؟ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ کیوں نہ لکھ دیا۔؟ اس قسم کے سوالات طالبعلمانہ ہوتے ہیں کہ لکھا کیوں نہیں؟ فقط بِسْمِ اللهِ ہی کیوں لکھی؟

تو میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی امام بخاریؒ نے اتباعِ سنت کیا ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب آپ منبر پر وعظ اور خطاب فرماتے تو پورا خطبہ ماثورہ پڑھتے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ" الخ اور جب سلاطین کو دعوتِ اسلام کا فرمان بھیجتے تو اس میں فقط بِسْمِ اللهِ ہوتی تھی اس کے بعد "مِنْ مُّحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى فُلَانَ اِلٰى فُلَانَ"۔ تو عادتِ کریمہ یہ تھی کہ خطبات اور مواعظ کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورا خطبۂ ماثورہ پڑھتے اور فرامین لکھتے تو فقط بسم اللہ پر اکتفاء فرماتے۔ تو امامؒ نے دیکھا کہ حدیثیں فی الحقیقت فرامین ہیں جوامت کے نام بھیجے گئے ہیں۔ تو بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ابتداء کی۔

ترجمۃُ الباب اور حدیث میں مناسبت...... اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ باب رکھا "كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" وحی کا آغاز کیسے ہوا؟ اور حدیث لائے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ." دوسری حدیث میں جس میں وحی کی کیفیت ذکر کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وحی اس طرح سے میرے اوپر آتی ہے، "يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ" جیسے گھنٹہ بجانے کے بعد جو گونج پیدا ہوتی ہے بس اس قسم کی آواز سنتا ہوں، اس میں سے پھر حروف متمیز ہوتے ہیں۔ تو اگر بَدْءُ الْوَحْيِ کا باب رکھا تھا تو اگلی حدیث لانی چاہئے تھی، یہ بیچ میں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کا کیا ذکر؟ تو ترجمۃ الباب میں اور حدیث میں کوئی مناسبت قائم نہیں ہوتی، یہ ایک سوال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مصنف کا طریق یہ ہے کہ ترجمۃ الباب وہ رکھتے ہیں جو بعد میں حدیث لاتے ہیں۔ تو حدیث میں اور ترجمۃ الباب میں کامل مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ کہاں بَدْءُ الْوَحْيِ اور کہاں " اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کہ عمل نیت سے ہوتا ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو کامل مناسبت ہے۔اس واسطے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر جب وحی آتی ہے۔تو نبی کے قلب میں پہلا جذبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اسے امت تک پہنچاؤں۔یہی تو نیت تھی۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس وحی کا تحمل بھی کروں اور امت کے لیے اس وحی کی ادائیگی بھی کروں۔نزولِ وحی کے وقت انبیا علیہم السلام کی یہی دو نیتیں ہوتی ہیں،معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت سب سے پہلی چیز جو قلبِ نبوت میں آتی ہے وہ نیت ہے یا وحی کا انجذاب ہے۔تو "بَدْءُ الْوَحْيِ" کو "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ① سے کامل مناسبت ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں وحی کے اترنے کے وقت یہ نیت تھی کہ میں اسے جذب کرو۔یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رٹنے لگتے تھے جس سے حق تعالیٰ نے روک دیا کہ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی نہ کریں۔ہم آپ کے قلبِ مبارک میں جمع کر دیں گے"

تو قلبِ مبارک میں پہلی نیت تو یہ آئی کہ میں اس وحی کو اپنے اندر جذب کرلوں اور ایسا یاد رکھوں کہ بھول نہ سکوں۔تو سب سے پہلی نیت نبی کے قلب میں یہ آتی ہے کہ اس کا تحمل کرلوں اور اسے جذب کرلوں،اسے جزوِ نفس کرلوں۔اس کے بعد دوسری نیت یہ ہوتی ہے کہ اسے مخلوق کی طرف پہنچاؤں اور اس امانت کو ادا کر دوں۔تو معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کامل مناسبت ہے۔نبی پر جب وحی آتی ہے تو سب سے پہلے قلب کے اندر نیت کا انضباط ہوتا ہے اس واسطے اگر بدء الوحی کے نیچے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" لائے تو کامل مناسبت پیدا ہوگئی کہ یہی حدیث لانی چاہئے۔تو پوری مناسبت ہے۔یہ کوئی شبہ واعتراض کی بات نہیں۔

"كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ." "وحی کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟" کس طرح سے وحی آئی؟ یہ تو اللہ کا فعل ہے کہ کس طرح سے وحی بھیجی؟ نبی کا فعل یہ ہے کہ جب وحی آئی تو نبی نے کیا نیت کی؟ یہ کہ اس کا تحمل بھی کروں اور ادائیگی بھی کر دوں۔تو نیت اور وحی میں کامل مناسبت ہے۔

مثلاً آپ کے سامنے اگر وحی قرآنی پیش کی جائے یا وحی حدیث ہی پیش کی جائے تو سب سے پہلے آپ کے دل میں نیت ہی تو آتی ہے کہ اسے مان لوں۔ماننے کے بعد یہ نیت آتی ہے کہ اس پر عمل بھی کروں،اس کے برکات اور فوائد بھی حاصل کروں۔تو وحی کو نیت سے اتنی مناسبت ہے کہ درجہء اوّل میں وحی ہے اور درجۂ دوم میں نیت ہے۔بالکل مطابقت ہے۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کا تفقّہ......تو امام بخاری نے "كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" کا باب رکھ کر پھر حدیث "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کا ذکر کیا،اس سے کمالِ مناسبت ظاہر ہوتی ہے کہ وحی نمبر اوّل ہے اور نیت نمبر دوم ہے،تو ان

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی،باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج:۱،ص:۴، رقم:۱۔

② پارہ: ۲۹ ،سورۃ القیامۃ الآیۃ:۱۶۔

میں کامل تطبیق ہے۔اس واسطے بدءالوحی کے تحت میں حدیثِ مذکور کا آنا برمحل اور بہت موزوں ثابت ہوا۔

اس سے گویا امام بخاریؒ کے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔تو امام بخاریؒ فقط محدّث ہی نہیں تھے بلکہ فقیہ بھی تھے۔فقط روایت ہی سامنے نہیں تھی بلکہ درایت بھی سامنے تھی۔حدیث کے الفاظ ہی سامنے نہیں تھے بلکہ حدیث کے معانی اور حدیث کے حقائق اور معارف بھی ان کے قلب میں موجود تھے۔تو امام بخاریؒ روایت اور درایت دونوں کے جامع ہیں۔اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ "فِقْهُ الْبُخَارِیْ فِیْ تَرَاجِمِهٖ" . امام بخاریؒ کا فقہ اگر دیکھنا ہو تو ان تراجم کو دیکھو جو باب رکھتے ہیں،مثلاً یہی "بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ بَابُ الْإِيْمَانِ، بَابُ الصَّلٰوةِ" وغیرہ۔اوران کے نیچے روایتیں لاتے ہیں۔تو امام بخاریؒ کا اگر فقہ دیکھنا ہو تو ابواب وتراجم کو دیکھ لو۔اس سے تفقہ معلوم ہوگا۔

درجۂ اجتہاد...... یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ویسے معروف تو یہ ہے کہ وہ شافعی ہیں اور اکثر اعمال میں ہیں بھی شافعی۔لیکن احادیث میں جب غور کیا جاتا ہے اوران کی رائے معلوم ہوتی ہے تو بعض راوں میں فقہِ حنفی کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض میں امام شافعیؒ کی فقہ کو اور بعض میں امام مالکؒ کی فقہ کو مختلف مذاہب کی ترجیحات ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحبِ اجتہاد ہیں۔خود مستقل ان کی ایک رائے ہے۔تو محض مقلّد ہی نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں۔جس درجہ کا بھی اجتہاد ہو مگر اجتہاد ہے۔تو ان کا تفقہ تراجم وابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ "بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ"یہ ترجمہ ہے اوراس کے نیچے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی حدیث لائے ،اس سے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وحی اور نیت کی کیسی تطبیق ان کے قلبِ مبارک میں آئی کہ وہی حدیث ذکر کی جو بَدْءُ الْوَحْيِ کے ساتھ زیادہ مناسب تھی۔بہرحال امام بخاریؒ نے اگر بِسْمِ اللّٰهِ سے آغاز کیا تو اتباعِ سنت کیا۔ابتداء میں بَدْأُ الْوَحْيِ کا ذکر لائے تو مادۂ شریعت کا ذکر کیا جس کا مقام اوّلیت کا ہے پھر بَدْءُ الْوَحْيِ کے ساتھ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کو لائے ،اس سے تفقہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کتنی کامل مناسبت ہے۔

تشریحِ حدیث......اس کے بعد حدیث نقل کی'' اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ اِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّانَوٰی فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِامْرَاَةٍ يَّتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ."

اصلِ کلی......اس حدیث کے تین جز ہیں۔سب سے پہلا جز'' اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' ہے۔یہ ایک اصلِ کلی ہے جس میں کسی عمل کی طرف اشارہ نہیں۔حاصل اس کا یہ ہے کہ عمل نیت سے ہے۔نیت اچھی عمل اچھا۔نیت بری عمل برا۔عمل نیت کے تابع ہے۔بعض نے کہا ہے کہ: ''اِنَّمَا ثَوَابُ الْاَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ'' عمل پر جو ثواب ملتا ہے وہ نیت ہی سے ملتا ہے اور بعض نے کہا: ''اِنَّمَا صِحَّةُ الْاَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ'' جب تک نیت نہ ہو عمل صحیح نہیں ہوتا۔

ہر ایک چیز پر اعتراض پڑتا ہے اس واسطے کہ شریعت کے بعضے اعمال ایسے ہیں کہ نیت نہ ہو تب بھی شریعت معتبر

مان لیتی ہے، ایک شخص جنبی ہے، بلانیت کے دریا میں کود گیا۔شریعت نے اس عمل کو معقول سمجھا۔وہ پاک ہو گیا۔نماز ادا کر سکے گا، یا ایک شخص نے وضو کیا، نیت کچھ نہیں کی۔لیکن اس کا وضو مفتاحِ صلوٰۃ بن جائے گا۔شریعت اس کو معتبر مانے گی۔تو یہ کہنا کہ ''اِنَّمَا صِحَّۃُ الْاَعْمَالِ بِالنِّیَّاتِ'' عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا، یہ چلنے والا اصول نہیں ہے، بہت سے اعمال ایسے ہیں جو صحیح ہو جاتے ہیں اور شریعت میں معتبر ہو جاتے ہیں حالاں کہ نیت نہیں ہوتی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عمل کا ثواب اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نیت نہ ہو۔اگر بلانیت کے وضو ہوا تو مفتاح صلوۃ تو بن جائے گا مگر اجر نہیں ملے گا جب تک تقرب کی نیت نہ ہو۔نماز اس درجہ میں صحیح ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عام یہ ہے کہ جیسی نیت ویسا عمل، نیت اچھی تو عمل اچھا، نیت بری تو عمل برا۔تو ''وُجُوْدُ الْاَعْمَالِ یا صِحَّۃُ الْاَعْمَالِ'' تو صحیح نہیں ہوگا۔البتہ ثَوَابُ الْاَعْمَالِ اس درجہ میں صحیح ہوگا، یا پھر اعتبار کا لفظ (مقدر مانا جائے) کہ ''اِنَّمَا تُعْتَبَرُ الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ''۔عمل کا اعتبار نیت سے ہے، جیسی نیت ویسا عمل۔بہر حال سب معنی محدثین نے ذکر کیے ہیں۔تو پہلا جملہ ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' یہ ایک اصلِ کلی ہے۔اس میں کسی عمل کا ذکر نہیں۔جو بھی عمل ہو وہ ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' کے نیچے آجائے گا' تو ایک اصل کلی ذکر فرمایا۔

انتفاعِ نیّت......اس کے بعد دوسرا جملہ ''وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّانَوٰی'' ہے، جیسی نیت کرے گا، وہی صلہ ملے گا۔یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔کیوں کہ جب آپ نے نیت کی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نیت پر کوئی فائدہ بھی مرتب ہوگا یا خالی نیت ہی کرانی ہے۔کوئی ثمرہ مرتب ہوگا یا نہیں؟ یا قلب کا ایک تخیل ہے کہ ہم نے نیّت کر لی۔

تو دوسرے جملے میں اس کا جواب دیا کہ نہیں، اس کا انتفاع بھی ہوگا۔اگر نیت اچھی ہے تو عند اللہ عمل معتبر ہے۔اس پر اجر و ثواب مرّتب ہوگا اور جیسی نیّت کی وہی اس کو ملے گا۔اگر اللہ و رسول کی قربت کی نیّت کی ہے تو تقرّب مل جائے گا۔اگر دنیوی مصالح کی نیت کی ہے تو وہ مصلحت مرتب ہو جائے گی۔مگر نیّت رائیگاں نہیں جائے گی۔ضرور اس پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

ابتدا و ظہورِ عمل......اسی واسطے شرعی طور پر فرمایا گیا کہ ''نِیَّۃُ الْمَرْءِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ'' ① ''آدمی کی نیّت اس کے عمل سے بہتر ہے''۔یعنی عمل کا آغاز نیّت سے ہوتا ہے۔سب سے پہلے دل عمل کرتا ہے جو نیت ہے۔اس کے بعد ہاتھ، پیر عمل کرتے ہیں۔وہ ہیئتِ عمل ہے۔تو سب سے اوّل عمل کی ابتداء قلب سے ہوتی ہے اور وہ نیّت کی صورت میں ہے۔تو جس نے عمل کی نیت کر لی گویا اس نے اپنے دل سے عمل کر لیا۔عمل کا ظہور نہیں ہوا وہ ہاتھ پیر سے ہوگا۔مگر اس پر بھی نفع مرتب ہوتا ہے۔حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ایک شخص نے نیّت کی کہ فلاں نیک کام کروں۔ابھی کیا نہیں تو فرشتہ لکھ دیتا ہے کہ ایک نیکی کر لی۔اس پر آخرت میں ثواب مرتّب ہوگا۔تو مطلق نیّت پر بھی ثواب مرتب ہوتا ہے۔اگر بدی کی نیت کی تو قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک بدی لکھ دیتے، مگر نہیں لکھی جاتی۔اگر

① المعجم الكبير للطبراني، باب السين، سهل بن سعد الساعدي، ج: ٦ ص: ١٨٥.

نیت بدل گئی کہ اس بدی کو نہیں کروں گا تو اس رک جانے پر ایک نیکی لکھ دیتے ہیں کہ یہ بھی ایک حسنہ اور نیکی ہے۔ یہ قلب ہی قلب سے معاملہ چل رہا ہے۔ اور نیّت پر ثمرات مرتب ہور ہے ہیں۔ تو پہلا جملہ ثواب و عذاب سے قطع نظر محض ایک اصول تھا کہ جیسی نیت ویسا عمل، دوسرے جملے میں انتفاع کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رائیگاں نہیں بلکہ جیسی نیت ہوگی ویسے ثمرات مرتّب ہوں گے ''وَاِنـمـا لامـرءٍ مانوی'' جیسی نیت کرے گا وہ آگے آجائے گی۔ دنیا کی نیت کرے گا دنیا آجائے گی۔ آخرت کی نیت کرے گا آخرت آجائے گی۔

ثمراتِ نیّت...... جن کے واقعہ میں یہ حدیث ارشاد فرمائی گئی۔ یعنی حدیث کا شانِ نزول، وہ صحابی ہیں جنہوں نے اس نیت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ فلاں عورت مالدار ہے، امّ قیس اس کا نام ہے، اس سے نکاح بھی کریں گے، دولت مند ہے کوئی مال بھی حاصل ہوگا۔ یہ نیت کی اور ہجرت کی۔ اس پر ارشاد فرمایا گیا ''اِنَّـمَـا الْاَعْـمَـالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّانَوٰی'' ''جو نیت کی ہے وہ ملے گا۔ اگر عورت کی نیت کی ہے وہ مل جائے گی''۔ مگر خدا نہیں ملے گا۔ اگر خدا کی نیت کی ہے تو خدا ملے گا۔ جیسی نیت ویسا ثمرہ۔ تو دوسرے جملہ میں ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ یہ نیت رائیگاں نہیں جاتی بلکہ اس سے انتفاع ہوتا ہے، دنیا اور آخرت کا اس سے آدمی نفع اٹھاتا ہے۔

واقعۂ جزئی...... چناں چہ اس صحابی کا لقب ہی ''مُهَـاجِـرُ اُمِّ قَيْـس'' مشہور ہو گیا کہ یہ ام قیس کے مہاجر تھے جو مدینے گئے اور عورت کی نیت کی۔ بعد میں نیت درست کی ہوگی، توبہ کی ہوگی۔ غرض پہلا جملہ اصل کلی ہے، دوسرا جملہ اس اصل سے انتفاع کا بیان ہے کہ آدمی نیت سے منتفع ہوگا۔ جیسی نیت کی ہوگی ویسے ثمرات سامنے آئیں گے۔ اور تیسرا جملہ ایک جزوی مثال کا ہے۔ ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَـانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْاِلَى امْرَاَةٍ يَّتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ.'' تو پہلے جملے میں اصول بیان کیا گیا دوسرے جملہ میں انتفاع بیان کیا گیا اور تیسرے جملے میں جزوی مثال بیان کی گئی۔

جامعیتِ حدیث...... اور ظاہر بات ہے کہ یہی تین درجے ہیں کہ جن سے ایک دعویٰ منضبط اور مرتّب ہوتا ہے کہ پہلے دعویٰ کرو، پھر اس کی غرض وغایت بیان کرو۔ پھر اس کی ایک حسّی مثال بیان کرو۔ تو دعویٰ منقّح اور ثابت ہو جاتا ہے۔ تو یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: چھ چیزیں مجھے عطاء کی ہیں جو پچھلے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے ''اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ'' مجھے جامع جملے دیئے گئے ہیں کہ چھوٹا جملہ بولتا ہوں اور علوم کے دریا اس کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہزار ہا ہزار مسائل اس سے نکل آتے ہیں۔ تو یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کہ تین جملے ہیں اور تینوں میں تین علوم ہیں اور الگ الگ تین فوائد ہیں۔ ایک اصل کلی ایک انتفاعی کلیہ اور ایک مثال جزوی۔ غرض یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا۔

غور کیا جائے تو اس ایک حدیث پر عمل ہو تو آدمی کامیاب ہے۔ ہر چیز میں نیت کر لیا کریں۔ تو دنیا بھی دین

بنتی چلی جائے گی لباس پہنتے ہوئے اگر یہ نیت کرلیں کہ حکمِ خداوندی کی تعمیل کر رہا ہوں، بدن چھپانا واجب ہے، اب یہ عبادت بن گیا۔ اس پر اجر وثواب مرتب ہوگا۔ کھانا کھاتے ہوئے نیت کرلے کہ تقویٰ علی العبادت کے لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو اللہ کو یاد کروں پھر یہ سارا کھانا عبادت میں داخل ہو جائے گا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ نیت کرے کہ اتباعِ سنت یہ ہے کہ گھر میں سلام اور اللہ کے نام سے داخل ہو تو میں اتباعِ سنت کر رہا ہوں، یہ گھر میں داخل ہونا عبادت بن جائے گا۔ تو پوری دنیا کو دین بنالینا یہ نیت سے ممکن ہے۔ بری نیت ہو تو عبادت بھی بری کی اور اعلیٰ نیت ہو تو عادت بھی عبادت بن جاتی ہے۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے بھی ہے۔ اور دین کا نچوڑ اس میں گویا بیان کر دیا ہے کہ دین کا آغاز نیت ہی سے ہوتا ہے۔ آدمی جب اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی نیت یہی تو ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں داخل ہو جاؤں۔ تو نیت سے دین کا آغاز ہوا۔ آگے عمل کا درجہ اب باقی ہے۔ یہ جوامع الکلم میں سے بھی ہے اور یہ حدیث دین کا اصل الاصول بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کو امام بخاریؒ ابتداء لائے۔

ضروری تنبیہ...... دوسرے یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ امامؒ طلباء کے لئے گویا اشارہ کر رہے ہیں کہ جو بخاری پڑھنے کے لئے بیٹھے ہیں، وہ سب ابھی سے اپنی نیت درست کرلیں کہ بخاری کیوں پڑھ رہے ہو؟ اگر صحیح نیت ہے تو آخیر تک یہ دین بنتا جائے گا، اگر نیت غلط کی ہے مثلاً کوئی اس لیے بخاری پڑھ رہا ہوں کہ میں محدث کہلاؤں تو شہرت طلبی مقصود ہوئی، خدا طلبی مقصود نہ ہوئی۔ اگر کوئی اس لئے پڑھ رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے دنیا کماؤں تو دنیا حاصل ہوگی آخرت نہیں ملے گی اس واسطے امامؒ نے گویا ابتداً اس کو روایت کر کے طالبانِ علم کے لئے تنبیہ کی ہے کہ سب سے پہلے اپنی نیت درست کرلو کہ کیوں بخاری پڑھ رہے ہو؟ تمہاری غرض وغایت کیا ہے؟ جیسی اخیر تک نیت کروگے، وہی ثمرات مرتّب ہوتے چلے جائیں گے۔ تو جوامع الکلم میں سے بھی ہے، دین کی اساس بھی ہے اور ایک مختصر نصیحت جو پورے انسانوں کے دین کے لئے ہے اور جامع بھی ہے۔ اس واسطے امام بخاریؒ کا تقویٰ اور زہد اور اس کے ساتھ ذکاوت اور فطانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ کیسے عجیب طریق پر مصنفؒ نے اپنی کتاب کا آغاز کیا۔ تو یہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے۔ طالب علموں کے سامنے تو یہ جملے دس منٹ میں ادا ہو سکتے تھے۔ مگر چوں کہ دوسرا مجمع بھی تھا، اس واسطے قدرے تفصیل بھی کی۔ ورنہ درس کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ درس میں تو مختصر اور مجمل الفاظ ادا کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ دس منٹ کے بات تھی۔ مگر جیسے مخاطب ہوں گے تو تھوڑی تفصیل کرنی پڑے گی۔

بہرحال اس تفصیل میں بھی کچھ فنی چیزیں آگئیں، کچھ احادیث آگئیں۔ کچھ امامؒ کی عظمت وجلالتِ شان آگئی، کچھ کتاب کی عظمت وجلالتِ شان آگئی اور کچھ آغازِ کتاب کی برکت کا بھی ذکر آگیا۔ تو یہ سب چیزیں جمع ہوگئیں۔

دعاء...... اب آیئے سب حضرات مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو تادیر قائم رکھے۔ جس کے ذریعے سے دین پھیل رہا ہے۔ اور حجازِ مقدّس میں علم کا چرچا ہے اور جو بھی طلباء داخل ہوں وہ اپنے علوم سے منتفع ہوں۔ حق

تعالیٰ انہیں باکمال بنا کر وہاں تک پہنچائے۔جیسا کہ اب تک اس دارالعلوم ''(مدرسہ صولتیہ)'' سے بہت سے علماء اور فضلاء نکل چکے ہیں اور انہوں نے دین کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ،اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّ عَمَلًا صَالِحًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَّ شِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ ،اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ، رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

تعلیم وتدریس

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!......فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًالِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْارَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ①

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! جس مبارک جامعہ کا افتتاح آج کیا جارہا ہے اور یہ ایک برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے کیا جارہا ہے۔یعنی حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے اسم گرامی کی طرف منسوب کر کے یہ جامعہ قائم کی جارہی ہے یہ ہم سب کے لئے خوش قسمتی ہے کہ تعلیم گاہ قائم ہو اور کسی برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے قائم ہو، یہ خود ایک عظیم ترین نعمت ہے۔اسی سلسلہ میں یہ آیت میں نے تلاوت کی ہے اور اس سلسلے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں اور وہ مختصر وقت میں ہی انشاء اللہ پوری ہو جائیں گی۔گھنٹہ سوا گھنٹہ تو وقت دیا گیا ہے۔شاید یہ بھی پورا نہ ہو سکے۔بہرحال میں کوشش کروں گا کہ ان چند باتوں کو محدود وقت کے اندر اندر عرض کردوں۔

شرف انسانی کے بارے میں دعویٰ شریعت...... ایک بڑا مسئلہ علماء میں یہ زیر بحث رہا ہے کہ انسان جو ساری کائنات میں افضل ترین نوع ہے اور اس کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔شریعت نے بھی اس کا دعویٰ کیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔عقل بھی اس کی شاہد ہے اور محسوسات بھی اس کے شاہد ہیں۔شرع، عقل اور حس تینوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان افضل الکائنات ہے، اشرف المخلوقات ہے۔قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ:﴿وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ ② "ہم نے انسان کو مکرم اور معظم بنایا اور بر و بحر میں اس کو اٹھایا، بلند کیا اور اونچا کیا اور بہترین پاکیزہ رزق اس کے کھانے کے

① پارہ:۳،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۷۹. ② پارہ:۱۵،سورۃ الاسرآء،الآیۃ:۷۰.

لئے دیا اور اسے بہت بڑی فضیلت دی۔ جتنی بھی چیزیں ہم نے پیدا کیں، ان میں اسے فضیلت دی‘‘۔ تو انسان کی افضلیت اور اشرف المخلوقات ہونا اس آیت سے پوری طرح ثابت ہے اور یہ دعویٰ قرآن کریم کا ہے۔

شرفِ انسانی کے بارے میں دعویٰ عقل...... عقل بھی اس کی شاہد ہے کہ انسان ساری کائنات پر بلند اور برتر ہے۔ اس لئے کہ ساری کائنات میں یہی تصرّف کرتا ہے۔ کائنات اس کے اندر متصرّف نہیں ہے۔ زمین، آسمان، سورج، چاند ساری چیزیں اس کے استعمال میں ہیں۔ ہر چیز میں اس کے تصرّفات ہیں۔

زمین کو نہ صرف کھود سکتا اور اس کے مکانات بھی بنا سکتا ہے بلکہ اس کی خصوصیات پر بھی مطلع ہے۔ اس کے خواص وآثار سے طرح طرح کی چیزیں ایجاد کر رہا ہے۔ سورج کی روشنی اور گرمی سے صرف فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کی شعاعوں اور حرارت سے مشینوں کے طرز پر یہ چیزیں بنا بنا کے استعمال کر رہا ہے۔ نہ صرف سیارات کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ سیارات کے اجسام تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے اور آلات تیار کر رہا ہے۔ گویا سیّاروں کی ذوات میں بھی تصرف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو اور فضاء میں بھی اس کے تصرّفات ہیں، زمین پر بھی تصرّفات ہیں، سمندروں میں بھی تصرّفات ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ ①

فرماتے ہیں کہ: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو کام میں لگا دیا ہے۔ جو کچھ زمین میں اور آسمانوں میں خزانے ہیں سب انسان کے کام میں آتے ہیں اور اللہ نے اپنی نعمتیں انسان کے لئے کامل اور مکمل کردیں۔ کسی نوع کے لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا جو انسان کے لئے کیا گیا۔ تو افضل بھی کہا گیا، متصرّف بھی کہا گیا، موجد بھی کہا گیا۔ تو یہ ایک دعویٰ ہے۔

حکماء کی نظر میں وجہِ اشرفیّت...... سوال یہ ہوتا ہے کہ انسان کیوں افضل ہے؟ اس کی فضیلت کی خصوصیت اور بنا کیا ہے؟ بہرحال کوئی تخصیص ہوگی جو اوروں میں نہیں پائی جاتی ہوگی، جس کی وجہ سے یہ سب سے بلند وبالا بن گیا۔

حکماء اور فلاسفہ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ انسان میں ایک جوہر ہے جو دوسری چیزوں میں نہیں ہے اور وہ عقل ہے۔ اسی لئے منطقی اس کی ’’حیوان ناطق‘‘ سے تعریف کرتے ہیں۔ یعنی ایسا جاندار جو معقولات کا بندہ اور پانے والا ہے۔ یعنی عقل سے امور دریافت کرتا ہے جو اور چیزوں میں نہیں ہے۔ اس واسطے انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا، تو بناءِ اشرفیّتِ عقل ہے جو اس کے اندر ہے۔ یہ عام طور سے فلاسفہ اور حکماء کا دعویٰ ہے۔

حکماء کے نظریئے کی غلطی...... لیکن میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ کچھ نامکمل ہے۔ فی الجملہ صحیح بھی ہے لیکن محض عقل پر بنیاد رکھ دینا، یہ انسان کی فضیلت کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل تھوڑی بہت جانوروں میں بھی موجود ہے۔ عقل سے انسان قیاس ہی تو کرتا ہے کہ ایک معلوم چیز پر قیاس کر کے نامعلوم کا حکم معلوم کرے۔ تو عقل کا

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۲۰.

سب سے بڑا کام قیاس اور استنباط ہے کہ انہونی چیز کو ایک موجود شے میں سے نکالا ہے۔ عقل یہ کام کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جانور بھی یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک شے کا جو حکم ان کے ذہن میں ہے، قیاس کر کے دوسری شے پر لگا دیں گے۔ ایک کتا ایک جگہ موجود ہو، آپ اسے لاٹھی مار دیں۔ دوسرے دن اس جگہ نہیں آئے گا۔ اس نے قیاس کیا کہ کل گیا تھا تو یہ حرکت ہوئی تھی، آج جاؤں گا تو آج بھی وہی ہوگی۔ یہ عقل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اگلے دن کی مار پٹائی کو اس نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی دن پٹ چکا تھا دوسرے دن کی مار پٹائی سے جو بچ رہا ہے یہ محض فہم اور عقل کی وجہ سے ہے۔ سمجھتا ہے کہ جو واقعہ کل ہوا تھا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ آج بھی وہی ہوگا۔ تو انسان قیاس کرتا ہے تو کتا بھی قیاس کرتا ہے۔ اس میں بھی عقل ہے اور اس میں بھی، یہ الگ بات ہے کہ انسان میں زیادہ عقل ہے، اور اس میں کم ہے، تو زیادتی اور کمی کی بات تو یہ ہے کہ خود انسانوں کی عقلیں برابر تھوڑا ہی ہیں۔ بعضے حکیم گزرے ہیں، بعضے نہایت غبی؛ بعضے بلید انسان ہیں، بعضے تیز فہم ہیں۔ بعضوں کی عقل بہت اعلیٰ بعضوں کی بہت ادنیٰ، جب خود آپ کی نوع میں عقلوں کا تفاوت اور کمی وبیشی کا فرق مراتب ہے اور کم عقل والے کو بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی عقل مند ہے تو اس سے کم تھوڑی سی کتے میں ہوگی تو اسے کیوں نہیں کہتے کہ یہ بھی عقل مند ہے۔ تھوڑی سی عقل ہے گو آپ کے برابر نہ سہی۔ تو انسان محض یہ دعویٰ کر کے بیٹھ جائے کہ میں ہی عقل مند ہوں، دوسرے میں عقل نہیں ہے، یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، اور لومڑی کی چالاکی و ہوشیاری تو مشہور ہے اور بندر کی عیاری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایسی چالاکیاں کرتا ہے کہ بعض دفعہ انسان بھی زچ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال مطلقاً عقل وشعور ہر جاندار کو دیا گیا ہے۔ کمی وبیشی کا فرق ہے جیسے خود بنی نوع انسان میں ہے، جانوروں میں بھی کمی وبیشی کا فرق ہے، اس لئے افضلیت کی بناء محض عقل پر رکھنا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، جب کہ یہ جوہر دوسروں میں بھی موجود ہے، چاہے کم ہی درجہ کا ہو۔

علم محض بھی وجہِ شرافت نہیں...... اس لئے بعض حکماء نے دعویٰ کیا کہ عقل بناءِ افضلیّت نہیں۔ بناءِ افضلیّت علم ہے۔ جانوروں کو علم نہیں دیا گیا، انسانوں کو علم عطاء کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی بناء صحیح نہیں ہے، فی الجملہ صحیح ہے مگر اس پر ہم دارومدار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ جانوروں کو بھی علم دیا گیا ہے اور علم بھی معمولی نہیں، شریعت کے احکام کا علم ہے، بندگی اور اطاعت کا علم ہے جیسے انسان کو دیا گیا ہے، جانوروں کو بھی دیا گیا ہے۔

انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو بھی علم حاصل ہے...... قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ ① ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی اور تسبیح کو بھی جان لیا ہے“۔

تو نہ صرف آپ نماز پڑھتے ہیں بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ نماز پڑھتا ہے اور جانور بھی اپنی نماز کو جاہلانہ طریق

① پارہ: ۱۷ النور، الآیۃ: ۴۱.

پر نہیں پڑھتے۔ قَدْعَلِمَ میں قَدْ کلمہ تحقیق کا ہے اور ماضی پر داخل ہو رہا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ یقیناً ہر شے نے جان لیا ہے۔ اور لفظ کُلٌّ کے اندر جمادات بھی آتے ہیں، نباتات بھی آتے ہیں، حیوانات بھی آتے ہیں۔ تو شریعت سب کے لئے علم ثابت کر رہی ہے اور علم بھی شریعت کا۔ یعنی سب اپنی اپنی تسبیح اور نماز جانتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ نمازی ہے، نماز پڑھتا ہے مگر ہر ایک کی نماز اس کے مناسبِ حال ہے لکھتے ہیں کہ: درختوں کی نماز میں قیام ہے، رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ وہ ایک پیر پر کھڑے ہوئے اللہ کی یاد میں مصروف ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ جس طرح آپ نے ہمیں بنایا۔ ہماری اطاعت کا تقاضا ہے کہ ہم یوں ہی بنے رہیں۔ نہ اِدھر جھکیں نہ، اُدھر جھکیں، نہ گریں نہ سجدہ کریں، ایک پیر پر کھڑے ہوئے قیام کی حالت میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اطاعت وفرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ حقیقی معنی میں مسلم ہیں۔ ﴿وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ ① یعنی ہر چیز مسلم ہے اور عبادت گذار ہے۔ تو درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ یعنی ہیئت ایسی بنائی ہے گویا وہ قیام کیے ہوئے ہیں۔

اور لکھتے ہیں کہ چوپایوں کی نماز میں رکوع ہے۔ سجدہ اور قیام نہیں ہے، جو چار پیر سے چلنے والے جانور ہیں۔ ان کی ہیئت ایسی بنائی کہ وہ ہمہ وقت رکوع کے ساتھ عبادت میں مشغول ہیں۔ ان کی نماز میں رکوع ہے۔

جتنے حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے ان کی نماز میں سجدہ ہے۔ رکوع اور قیام نہیں ہے۔ وہ اوندھے پڑے ہوئے ہیں، گویا ہر وقت اللہ کے سجدہ گزار ہیں۔ اسی میں نماز ادا کر رہے ہیں۔

پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے یعنی گھٹنے ٹیکے ہوئے زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں جیسے نمازی آدمی اَلتَّحِیَّاتُ میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھتا ہے۔ ان کی نماز میں تشہد ہے۔ نہ قیام ہے، نہ رکوع ہے، نہ سجدہ، اگر پہاڑ سجدہ کرنے لگیں تو ساری دنیا پس کر رہ جائیں، غنیمت ہے کہ وہ ایک جگہ تشہد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز میں فقط دعا ہے۔ سوال کرنا اور مانگنا یہ جنت اور دوزخ کی نماز ہے۔۔ جنت بھی سوال کر رہا ہے کہ اے اللہ! مجھے بھر دیجئے۔ جہنم بھی سوال کر رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ قیامت کے دن تمہارا پیٹ بھر دیں گے۔

جہنمی جب سارے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے اور جہنم پھر بھی خالی رہ جائے گا تو کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ. هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ ② اور لائیے اور لائیے۔ بھرنے کا وعدہ ہے۔ میں نے عمر بھر پیٹ بھرنے کی دعائیں مانگی ہیں۔ آج میرا پیٹ بھریئے۔ پہاڑ جھونک دیئے جائیں گے۔ زمین جھونک دی جائے گی۔ پھر بھی کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ اور لائیے یہ تو بہت بڑا عالم ہے کروڑوں دنیائیں اس کے اندر بن جائیں جب ساری چیزیں جھونکنے کی ختم ہوں گی اور پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا اور بھوک سے یہی کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾

---

① پارہ: ۳ ال عمران، الآیۃ: ۸۳. ② پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۰.

تو حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ایڑی اس کے منہ پر رکھ دیں گے تو کہے گی قَطْ قَطْ. بس میں بھر گئی۔ اب مجھ میں تاب نہیں ہے، تو سوال پورا ہو جائے گا۔ جنت کا بھی یہی سوال ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ تمام اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ہزاروں محلات اور اس کے شہر خالی ہوں گے' وہ کہے گا کہ آپ کا وعدہ ہے مجھے بھر دیجئے، تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرمائیں گے جس سے جنّت کی آبادکاری ہوگی، اس کا سوال پورا کیا جائے گا۔ تو جنت و دوزخ کی نماز دعا مانگنا اور سوال کرنا ہے۔ ①

فرشتوں کی نماز صف بندی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں رکوع میں ہیں' کروڑوں سجدے میں ہیں۔ کروڑوں حالتِ قیام میں ہیں کروڑوں بیت المعمور کے طواف میں مشغول ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔

تو فرشتوں کی نماز صف بندی ہے کہ ترتیب وار کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت ادا کر رہے ہیں۔ رکوع سے ہو یا سجدے اور قیام سے ہو جتنے سیارے ہیں جو چکر کھا رہے ہیں، جیسے فلاسفہ قدیم کے کہنے کے مطابق سورج گردش میں ہے اور فلاسفہء حال کے دعویٰ کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ بہرحال زمین کو بھی وہ ایک سیارہ مانتے ہیں اور چاند و سورج کو بھی سیّارہ مانتے ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں گردش میں ہوں۔ ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ جہاں سے چلے پھر پھرا کر وہیں پھر لوٹ آئے۔ پھر وہاں سے چلے پھر وہاں لوٹ آئے۔ یہ گردش اور چکر یہی ان کی نماز ہے۔

تو کائنات کا ایک ایک ذرّہ اپنی ہیئت اور خلقت کے مطابق نماز اور "تَسْبِیْح وَتَھْلِیْل" میں مشغول ہے۔ احادیث میں وہ تسبیحات بتلائی گئی ہیں جو مختلف جانوروں کی ہیں کہ تیتر بولتا ہے تو اس کی یہ تسبیح ہے۔ فرمایا گیا کہ: تیتر جو اپنی زبان میں بولتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ." ② جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ بعض جانور کہتے ہیں۔ "سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ" ③ جانوروں کی مختلف تسبیحات آتی ہیں کہ مور یہ کہتا ہے، تیتر یہ کہتا ہے، طوطا یہ کہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سیٹیاں بج رہی ہیں۔ حقیقۃً یہ تسبیح وتہلیل ہے مگر ان کی زبان میں ہے۔

اسی کو فرماتے ہیں ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ﴾ ④ کوئی شے کائنات کی ایسی نہیں ہے جو تسبیح میں مشغول نہ ہو، تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں۔ اور آپ اپنے ہی بھائیوں کی زبان کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی انگریزی میں تسبیح پڑھے تو آپ کیا سمجھیں گے؟ پشتو زبان میں کوئی تسبیح پڑھے، آپ اسے کیا سمجھیں گے؟ جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ مشرق

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ تعالٰی هل من مزید، ج:۱۵ ص:۸۵.

② ③ تفسیر الطبری، ج:۱۳ ص:۱۶۵. ④ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۴۴.

ومغرب کے انسان آتے ہیں۔ پشتونی آدمی اپنی پشتو میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ بنگالی آدمی اپنی بنگلہ زبان میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ پنجابی، پنجابی زبان میں دعائیں مانگ رہا ہے۔ دوسرا اس سے نابلد ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ خدا جانے کیا گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ لیکن اس گڑ بڑ میں بہت سے علوم ہیں، بہت سے اذکار ہیں، بہت سی تسبیحات ہیں جو پوری ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم انہیں نہیں سمجھتے۔

جیسے تار برقی والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب تار دینے جاتے ہیں اسے مضمون بتا دیا، آپ کے سامنے سوائے اس کے کہ وہ پیتل کی ایک کلی کے اوپر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے کچھ نہیں اور آپ کہیں گے کہ عجیب احمق آدمی ہے۔ میں آیا تھا کہ اس مضمون کو یہ بذریعہ تار پہنچا دے اور یہ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں کہ اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں علم پہنچ رہا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف معلومات منتقل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ ان اصطلاحات سے واقف ہو جائیں جن اصطلاحات کو تار برقی والے جانتے ہیں، سارے علوم آپ کے سامنے آ جائیں کہ اس کھٹا کھٹ میں کیا پوشیدہ ہے۔ اسی طرح اگر پرندوں کی بولیوں سے آپ واقف ہو جائیں تو سمجھیں گے کہ کس طرح عظیم الشان تسبیح وتہلیل اور ذکر اللہ ہے جو ان کی زبان پر جاری ہے۔ جن کو حق تعالیٰ نے معجزانہ طریق پر سمجھا دیا وہ جانتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں. ﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ﴾ ① اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلا دی گئی ہیں۔ وہ بتلا دیتے تھے کہ یہ کوا یہ کہہ رہا ہے۔ یہ کبوتر یہ بول رہا ہے۔ اللہ نے ہمیں جانوروں کی بولیاں سکھلا دی ہیں۔ لیکن کسی کالج اور اسکول کے ذریعہ سے نہیں۔ اعجاز کے طور پر ان کی زبانوں کا دل میں الہام کر دیا تو ؎

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کی ایک لغت ہے۔ انسانوں کی بھی ایک لغت ہے۔ ہندی کی اور لغت، سندھی کی اور لغت پنجابی کی اور لغت۔ اسی طرح تیتر اور طوطے کی الگ الگ لغت ہے۔ یہ سارے اپنی اپنی لغات میں تسبیح وتہلیل کرتے ہیں۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محض علم کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہو تو علم تو پرندوں کو بھی ہے، جانوروں کو بھی ہے اور علم بھی تسبیح وتہلیل اور شریعت ونماز تک کا علم ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ کی نماز کو اللہ نے مکمل کر دیا، تو آپ کی نماز میں درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت ودوزخ کی سی دعا مانگنا بھی ہے۔ فرشتوں کی سی صف بندی بھی ہے اور سیاروں کی سی گردش بھی ہے، اس لئے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں ہے۔ دو رکعت کے معنی یہ ہیں کہ جو کام پہلی رکعت میں کریں گے لوٹ کر پھر دوسری رکعت میں وہی کریں

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶.

گے۔تو آپ کی نماز کے اندر گردش بھی ہے۔اگر آپ کے لئے گردش نماز ہے تو آفتاب کے لئے گردش نماز کیوں نہیں ہوسکتی؟ اگر آپ کا ایک رکعت سے دوسری رکعت کی طرف جانا اور چکر کھانا عبادت ہے تو زمین اگر چکر کھانے لگے تو وہ کیوں عبادت نہیں ہوگی؟ بہر حال عبادت کے طریقے مختلف اور اس کا علم بھی مختلف ہے۔تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناء نہیں ہوسکتی کہ آپ کو علم ہے۔

علم وعقل میں اگر انسان اور دیگر مخلوقات میں کچھ فرق ہے تو خود انسانوں میں بھی باہم فرق

ہے......اور علم محسوسات تو بہت معمولی چیز ہے،ایک گدھے میں بھی ہوتا ہے،آپ سورج کو دیکھتے ہیں،گدھا بھی سورج کو دیکھتا ہے۔آپ کو بھی حس ہے اسے بھی حس ہے۔آپ زمین دیکھ رہے ہیں وہ بھی دیکھ رہا ہے،تو احساسات میں جانور اور انسان برابر ہے۔اس میں سے چیزیں نکالنا نتیجے پیدا کرنا یہ عقل سے تعلق رکھتا ہے تو تھوڑی،بہت عقل جانوروں کو بھی ہے،اس سے بھی آگے بڑھ کر اس علم کا مرتبہ ہے کہ آپ احکام خداوندی کو جان گئے۔یہ مرتبہ جانوروں کو بھی نصیب ہے۔بہت سے بہت آپ اس مرتبے میں کامل سہی۔وہ ناقص سہی تو میں یہ عرض کروں گا کہ سارے انسان عالم ہی نہیں،کیا سارے احکام شریعت کو جانتے ہیں؟اگر سارے عالم الکل ہوتے تو اس جامعہ قاسمیہ ہی کے قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟اور اس مدرسہ کے قیام کی کیا ضرورت تھی،سارے ماں کے پیٹ سے عالم ہی پیدا ہوتے۔تو سارے ایک درجے کے نہیں۔تو علم اگر آپ میں ہے تو تھوڑا بہت جانوروں میں بھی ہے۔عقل اگر آپ میں ہے تو تھوڑی بہت جانوروں میں بھی ہے۔فہم اگر آپ میں ہے تو ان میں بھی ہے۔

پھر کیا چیز ہے کہ آپ اشرف المخلوقات ہیں؟آخر آپ کو کیوں دعویٰ ہے کہ ہم ہی سب سے افضل ہیں؟

آپ کہیں گے کہ ہم مکان بناتے ہیں تو کوا کہے گا کہ میں بھی گھونسلہ بناتا ہوں۔آپ کہیں گے کہ میں کئی منزلہ مکان بناتا ہوں تو بھیاّ ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے،وہ کہے گا میں مکان بناتا ہوں جس میں ایسی ایسی بلڈنگ ہوتی ہے۔اس میں باتھ روم الگ ہے،سونے کا کمرہ الگ ہے اور بچوں کا کمرہ الگ اور جھولا الگ اور کیسا پر تکلف اور مضبوط مکان؟یعنی دو تین گھاس کے تار ہوتے ہیں جس سے وہ اپنے گھر کو کیکر میں تانتا ہے۔آندھیاں چلیں، بارشیں آئیں،طوفان آئے کیکرا کھڑ کر گر جائے گا مگر کیا مجال ہے کہ گھونسلہ ٹوٹ جائے۔اتنی پکی بلڈنگ بنتی ہے اور اس میں کمرے اور خانے ہیں۔تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہوگیا کہ ہم بڑے انجینئر ہیں،وہ کہے گا کہ میں بھی انجینئر ہوں۔میں بھی کئی منزلہ مکان بناتا ہوں۔

شہد کی مکھی کہے گی کہ میں تم سے زیادہ کاریگر ہوں۔اس لئے کہ وہ شہد کے چھتے میں ہشت پہلو سوراخ بناتی ہے۔آپ پرکار سے بھی ایسے برابر برابر سوراخ مشکل سے بنائیں گے وہ بلا پرکار کے اپنے منہ سے اپنے صحیح اندازے سے بناتی ہے۔پھر اس میں تقسیم عمل ہے کہ ایک حصہ میں شہد بھرا ہوا ہے۔جو قوم کی خوراک ہے۔ایک حصہ میں بچے ہیں اور ایک میں ماں باپ ہیں۔یہ ساری کارروائیاں جو آپ کرتے ہیں وہ بھی کرتی ہے۔اگر آپ

کے ہاں وزیر خوراک ہے، تو ان کے ہاں بھی وزیر خوراک ہے۔

آپ کہیں گے کہ صاحب ہم تنظیم ملّت جانتے ہیں۔ ہمارا ایک صدر اور پریزیڈنٹ ہے۔ وزیر اعظم ہے۔ جانوروں کو کہاں نصیب؟ شہد کی مکھی کہے گی کہ میرے ہاں بھی یہ سب کچھ موجود ہے۔ امارت بھی ہے۔ عربی زبان میں جو سب سے بڑی مکھی ہوتی ہے اسے یعسوب کہتے ہیں۔ اس کے اشاروں پر پوری مکھیاں حرکت کرتی ہیں۔ وہ جہاں جاکے بیٹھے گی ہزاروں مکھیاں وہیں بیٹھیں گی۔ وہیں شہد کا چھتہ بنے گا۔ مجال نہیں کہ یعسوب چلی جائے اور قوم نہ جائے۔ پھر تنظیمِ ملت کا یہ عالم ہے کہ مجرموں کو سزا دینا اور مطیعوں کو سرفراز کرنا، یہ بھی مکھیوں میں موجود ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں شہد کا چھتہ ہوتا ہے اس کے نیچے کچھ مکھیاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہوتی ہیں۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے درخت پر بیٹھ کر آئی اور زہریلا عرق چوس کر آئی ہے، وہ امیر یعسوب فوراً پہچان لیتا ہے کہ یہ زہریلا مادّہ لے کر آئی ہے، اگر یہ یہاں بیٹھ گئی اور اس نے شہد میں ملا دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی، تو اس کی گردن توڑ کر اسے نیچے پھینک دیتا ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ امیر نے قتل کر دیا۔ لیکن قوم میں ایجی ٹیشن نہیں ہوتا کہ امیر کو برطرف کرنے کے لئے نعرے لگا کر کھڑی ہو جائے۔ ساری کہتی ہیں کہ ہماری خیر خواہی کے لئے کیا ہے۔ ہمارے اندر اتنا علم نہیں ہے جتنا اس کے اندر ہے۔ یہ قوم کے بھلے برے کو جانتا ہے۔ لہٰذا اس کے قتل پر راضی ہیں۔ یہی قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ ① ایک کو قتل کرتے ہیں تاکہ قوم زندہ ہو جائے۔ یعسوب بھی یہی کہے گا کہ ایک قتل کرتا ہوں تاکہ پوری قوم میں زندگی باقی رہے۔ اگر میں نے اسے باقی چھوڑ دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔ تو علم سیاست اور علمِ تنظیم ملت بھی ان میں ہے۔ انجینئری اور مکان سازی بھی ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا کہ انجینئر تو ہم ہیں۔ سیاسی ہیں تو ہم ہیں۔ تنظیم ملت کرتے ہیں تو ہم کرتے ہیں، یہ تو سارے جانور کرتے ہیں۔

بطخیں جب آتی ہیں تو ہمیشہ مثلث ہو کر آتی ہیں، دو قطاریں اور آگے آگے ان کا امیر ہوتا ہے۔ جیسے پریڈ کے میدان میں فوجیں قطار باندھ کر جاتی ہیں اور لیفٹیننٹ کی آواز پر چلتی ہیں۔ وہی شان بطخوں کے اندر ہے۔ جب جھیل پر بیٹھتی ہیں۔ اگر ذرا خطرہ ہوتا ہے تو ان کا امیر جو بطخا ہوتا ہے۔ وہ پوری رات ایک پیر پر کھڑا ہو کر گزارتا ہے تاکہ میری پوری قوم آرام سے سوئے، تکلیف میں اٹھاؤں۔ اس لئے کہ عیش کرنے کا نام امارت نہیں ہے۔ امارت قوم کے لئے تکلیف اٹھانے کا نام ہے۔ میری قوم کو راحت پہنچے۔ اس لئے پوری رات امیر تکلیف اٹھاتا ہے۔ ذرا خطرہ دیکھا تو وہ ایک آواز لگاتا ہے اس پر ساری بطخیں چوکنا ہو جاتی ہیں، دوبارہ آواز لگاتا ہے تو پر تولنے لگتی ہیں اور تیسری دفعہ جو اس نے آواز لگائی تو ایک دم راستہ چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ جیسے فوجی کمانڈر گویا بگل بجا دیتا ہے اور اس

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۱۷۹.

میں اصطلاحات ہیں کہ پہلے بگل پر تیار ہو جائیں دوسرے پر وردیاں پہن لیں، تیسرے پر ہتھیار آراستہ کریں اور چوتھے پر مارچ کرنا شروع کر دیں۔ وہی ان کے اندر قاعدہ ہے، تو آپ کو خواہ مخواہ یہ دعویٰ ہو گیا کہ ہم ہی جنگی لوگ ہیں، ہم ہی امیر الحرب ہیں، ہم ہی حربی علوم سے واقف ہیں۔ وہ عربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ حربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ ان میں بھی دونوں قسم کے علوم ہیں، تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناء نہیں ہو سکتی۔

آپ کہیں گے صاحب! ہم تو بڑے عمدہ کپڑے بناتے ہیں۔ کھانے بڑے عمدہ کھاتے ہیں۔ بھلا گدھا پلاؤ زردہ کہاں کھاتا ہے۔ ہم کھاتے ہیں، لہٰذا ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ تو آپ جب کہیں جب گدھے کو آپ کے زردہ پلاؤ پر لالچ آیا ہو۔ جس طرح آپ اس کی گھاس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کے پلاؤ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ اپنی نوع کے مطابق غذا کھاتے ہیں وہ اپنی نوع کے مطابق، تو نوعیت میں فرق ہوا۔ کھانے اور بھوک میں تو فرق نہیں آیا، آپ کا بھی جذبہ ہے۔ اس کا بھی جذبہ ہے۔ بہر حال نہ کھانا شرافت کی وجہ ہو سکتی ہے۔ نہ مکان بنانا اور نہ انجینئری وجہِ شرافت ہے۔ نہ علومِ سیاسیہ آپ کی افضلیت کی دلیل ہو سکتی ہے۔ ان میں بھی سیاسی موجود ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے طبیب ہیں، علاج کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی بڑے بڑے اطباء موجود ہیں۔ مجھے راجپوتانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے خسر مولوی محمود صاحب مرحوم ریاست اندر گڑھ میں وزیر تھے۔ وہاں چوں کہ ہندو راج تھا تو بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی اور یہ بندر بڑا نقصان کرتے۔ ذرا کمرہ کھلا رہ گیا تو کوئی برتن لے گیا، کوئی کپڑے لے گیا۔ روز یہ قصہ ہوتا۔ اور یہ ایسا موذی جانور ہے کہ یہ نہیں کہ کپڑا لے گیا بلکہ منڈیر پر بیٹھ کر دکھا دکھا کے اسے پھاڑتے۔ جیسے چڑا رہا ہو۔ خواہ مخواہ بھی غصہ آتا مگر اب بس کی بات بھی نہیں تھی، مار بھی نہیں سکتے تھے۔ چھپ چھپا کر دو چار بندر مارے اور راتوں کو باہر پھینکوا دیئے۔ مگر اس سے بندروں میں کمی تھوڑا ہی آتی تھی۔ اگلے دن پھر موجود اور پھر وہی قصہ۔

ہم نے یہ ارادہ کیا کہ سو پچاس ایک دم مر جائیں۔ کچھ تو کمی ہو گی اور ہمارا دل بھی ٹھنڈا ہو گا۔ تو ہم نے چار روپے کا سنکھیا خریدا اور کئی سیر آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور انہیں چھت پر پھیلا دیا اور ہم دیکھنے بیٹھ گئے اور تصور یہ تھا کہ بندر آتے جائیں گے، کھاتے جائیں گے، مرتے جائیں گے اور ہم خوش ہوتے جائیں گے۔

مگر دو تین بندر آئے۔ بندر تو بڑا سیانا جانور ہے۔ اس نے دیکھا کہ روٹیاں پھیلی پڑی ہیں۔ روٹیوں کی یہ حالت ہوتی نہیں کہ وہ پھیلی پڑی ہوں، کوئی بات اس کے اندر ہے۔ اب وہ کم بخت بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے۔ روٹی اٹھانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا۔ دو تین آئے تھے، وہ چلے گئے۔ ہم یہ سمجھے کہ تدبیر فیل ہو گئی۔ یہ کم بخت کچھ سمجھ گئے۔ انہوں نے اپنے شہر یا بستی میں جا کر اطلاع کی ہو گی تو وہاں سے چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر اور آئے اور انہوں نے آ کر یہ دیکھنا شروع کیا۔ گویا ان کے ذہن نے یہ سوال اٹھایا کہ عادۃً اس طرح روٹیاں پھیلی نہیں رہا کرتیں یہ جو پھیلی پڑی ہیں ان کے اندر کوئی بات ہے اور ان کی سمجھ میں آ نہیں رہی۔ وہ بھی آخر چلے گئے۔ اس کے

دس پندرہ منٹ کے بعد پچاس ساٹھ بندروں کی قطار بڑے بڑے موٹے چوہدری قسم کے لوگ آئے اور وہ روٹیوں کے اردگرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گویا گول میز کانفرنس منعقد کی کہ اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پھیلی پڑی ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے، ڈر کے مارے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔ خیر ایک بڑا بوڑھا بندر آگے بڑھا۔ اس نے روٹی کو توڑ کر سونگھا، دوسرے نے توڑا۔ اس نے بھی سونگھا، تیسرے نے توڑا، اس نے بھی سونگھا' اب گویا یہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور پچاس کے پچاس بھاگ گئے۔ ہم نے سمجھا کہ تدبیر فیل ہوگئی مگر وہ ہم سے زیادہ چالاک تھے۔ کوئی دس بیس منٹ گذرے ہوں گے تو کوئی سو دوسو بندروں کی ایک قطار اور ہر ایک یک ہاتھ میں ایک ایک ہری ٹہنی جس میں پتے بھی تھے۔ وہ لئے چلے آرہے ہیں۔ ایک لشکر چلا آرہا ہے اور ٹہنیاں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ کمبخت آئے۔ آکر انہوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کیئے۔ اس لئے کہ بندروں کی تعداد زیادہ تھی اور روٹیوں کی تعداد کم تھی۔

نیم نانے گرخورد مردِ خدا   بذلِ درویشاں کندنیمے دگر

درویش لوگ تھے۔ انہوں نے کہا خود غرضی ٹھیک نہیں۔ بانٹ کر کھاؤ، سب کو مل جائے تو مناسب ہے تو تعداد کے مطابق ٹکڑے کیئے اور اس کے بعد ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے پتے چبائے اور دندناتے ہوئے چلے گئے۔ ان میں سے بے ہوش بھی کوئی نہیں ہوا مرنا تو بعد میں ہے۔ تو وہ اچھے خاصے عقل مند ہوئے اور بے وقوف ہم ثابت ہوئے کہ چار روپے بھی گئے، سنکھیے کی خریداری ہوئی۔ آٹا بھی خراب ہوا اور وقت بھی گیا اور بات وہیں کی وہیں رہی، وہ اطمینان سے چلے گئے۔ انہیں گویا ایک ایسی جڑی بوٹی معلوم تھی جس میں تریاقیت موجود تھی۔ جو زہر کو مارنے والی تھی۔ انہوں نے وہ زہر کا لقمہ کھایا۔ اور اوپر سے وہ تریاقی پتے کھالئے۔ کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہے کہ طبیب ہم ہیں۔ ان میں بھی اطباء ہیں۔ وہ بھی جڑی بوٹیوں کی خاصیت جانتے ہیں۔ آپ سو کی جانتے ہیں وہ دو چار کی جانتے ہوں گے۔ اتنا فرق ہے مگر جاننے والے وہ بھی ہیں۔

بہر حال علومِ طبیبہ لیجئے، علوم شرعیہ یا علوم حسیّہ لیجئے۔ سب میں جانوروں کا حصہ ہے۔ تو آپ خواہ مخواہ مدعی بن بیٹھے کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں اس لئے کہ ہم عالم ہیں۔ ان میں بھی سارے نمونے موجود ہیں، تو یہ سوال بدستور باقی ہے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ عقل محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم کی نوعیتیں کافی نہیں کہ علم کی انواعِ مختلفہ ان میں بھی موجود ہیں۔ پھر آخر کیا بناء ہے؟

تمام مخلوقات میں علم وفہم کے درجات...... اگر غور کیا جائے اور انصاف سے دیکھا جائے تو ایک خصوصیت ہے جو انسان میں ہے۔ غیر انسان میں نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ملائکہ میں بھی نہیں۔ یعنی عالم تو ملائکہ بھی ہیں۔ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں ملائکہ کو رکھا اور حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ: ﴿اَنْبِئْهُمْ

﴿بِاَسْمَآءِ هِمْ﴾ ① ان چیزوں کے نام بتاؤ۔آدم علیہ السلام نے تمام چیزوں کے نام اور خاصیتیں بتادیں اور ملائکہ نے کہا تھا، ﴿سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ ② بے شک آپ پاک ہیں، ہمیں علم نہیں۔جتنی آپ نے تعلیم دے دی اتنا ہے۔معلوم ہوا کہ ملائکہ کو علم سکھلایا گیا ہے ان کے پاس بھی علم تھا۔اتنا نہ سہی جتنا حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا۔نیز جب جانوروں تک کو علم ہے تو ملائکہ کو تو اور زیادہ ہونا چاہئے۔خلاصہ یہ کہ عقل اور علم و فہم ملائکہ میں بھی ہے۔ان سے کم درجہ کا جنّات میں ہے۔ان سے کم درجے کا حیوانات میں ہے۔ان سے کم درجے کا نباتات اور جمادات کا ہے۔تو انسان کو دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ چوں کہ میں عقل رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں، میں علم رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں۔علم بھی سب میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے۔

انتقالِ علوم انسانی خصوصیّت ہے......البتہ ایک چیز ہے جو انسان کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔وہ علم نہیں بلکہ تعلیم ہے۔یعنی دوسروں کو سکھلانا، دوسروں کو بنانا، دوسروں کی تربیت کرنا۔یہ نہ ملائکہ میں ہے، نہ جنّات میں ہے، نہ حیوانات میں ہے۔حیوانوں میں جتنا علم ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا۔کسی مکتب میں جاکے وہ تعلیم نہیں پاتے۔

آج یہاں جامعہ قاسمیہ قائم ہو رہا ہے۔آپ نے کبھی سنا کہ آسمانِ اوّل پر کوئی جامعہ قائم ہوا اور فرشتے مدرس بن کے بیٹھے یا کسی اور آسمان میں کوئی مدرسہ ہو۔یا جنّات نے کسی ویرانے میں کوئی مدرسہ اور مکتب کھولا ہو؟ یہ صرف انسان کا کام ہے کہ ایک سے دوسرے تک تعلیم کے ذریعے علم منتقل ہوتا ہے۔ملائکہ کا علم جو ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے جتنا ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔بس۔یہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہے۔جانوروں میں جتنا علم ہے وہ ان کے اندر سیکھنے سے نہیں آتا، من جانب اللہ تکوینی طور پر ان کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے۔وہ عالم بن جاتے ہیں۔لیکن انسان تکوینی علم کے ساتھ ساتھ کسبی علم بھی رکھتا ہے کہ سیکھتا بھی ہے، سکھاتا بھی ہے۔جو اس کے ذہن میں ہے اسے دوسرے کی طرف منتقل کرتا ہے۔اس علم پر تربیت دیتا ہے۔ٹرینڈ کرتا ہے، مشاق بناتا ہے۔یہ معلّمی کی خصوصیات وہ ہے کہ عالَم میں انسان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، نہ فرشتوں میں تعلیم و تربیت ہے، نہ جنات میں تعلیم و تربیت ہے، نہ حیوانات میں ہے۔گویا انسان میں علم متعدی ہے۔طوطے کو اگر معلوم ہے تو اس کے اندر ہے۔دوسرے کو وہ نہیں سکھلاسکتا۔دوسرے طوطے کو جتنا آئے گا وہ پھر خدا کی طرف سے آئے گا وہ محدود ہے۔وہ تیسرے طوطے کو نہیں سکھلاسکتا۔

فرشتے میں جو علم آئے گا وہ اس کی ذات کے لئے ہے، وہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں کرسکتا۔انسان کو جو علم ہے وہ اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے، وہ اگلوں کو پڑھاتے ہیں، تو ازل کا علم ابد تک چلتا رہتا ہے، یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔تو معلّمی، تعلیم و تلقین اور تربیت یہ انسانی خاصہ ہے اور یہ وجہِ اشرفیت اور بناءِ افضلیّت ہے۔انسان

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳. ② پارہ، ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۲.

کہہ سکتا ہے کہ میں سب سے افضل ہوں کہ جو چیز میرے اندر ہے وہ کسی میں نہیں کہ میں اپنا علم ہزاروں تک منتقل کر سکتا ہوں۔ دوسرے اپنا علم منتقل نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان تک بھی علم منتقل ہو کر نہیں آیا۔ ان کی طبیعت میں مرکوز ہے۔ ان کو اس کا بھی شعور نہیں کہ ہم میں علم ہے مگر ان کے اندر علم ہے۔ اور انسان کو شعور ہے کہ مجھے سو مسئلے معلوم ہیں اور میں ان سو کو دوسرے تک پہنچا سکتا ہوں۔ تو سب سے بڑی انسان کی خصوصیت تعلیم اور تربیت ہے۔ یعنی اکتسابی علم، جدوجہد سے علم حاصل کرنا اور جدوجہد کے ذریعے دوسرے تک علم پہنچانا۔ تو ایک علم لازم ہے جو سب کے اندر ہے اور ایک علم متعدی ہے وہ صرف انسان میں ہے کہ دیئے سے دیا جلتا رہتا ہے۔ جو علوم آدم علیہ السلام کو عطاء کئے گئے۔ وہ آج تک محفوظ ہیں۔ ہزار ہا برس گزرنے کے بعد فطری طور پر منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں نوح علیہ السلام نے جو اضافہ کیا وہ اضافہ بھی آج موجود ہے۔ جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اضافہ کیا وہ بھی محفوظ ہے۔ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے جو علمی اضافے کئے وہ بھی موجود ہیں۔ پھر ان پر تکمیل کا لیبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا کہ ہر چیز اور علم کے ہر دائرے کو اتنا مکمل کر دیا کہ نوعی طور پر اس میں اب بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ ایسے اصول وکلیات بتلائے کہ قیامت تک لاکھوں جزئیات ان کے نیچے سے نکلتی رہیں گی اور انسان ان علوم کے اندر تشنہ نہیں رہے گا۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کے علوم وکمالات تعلیم ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں، تربیت ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں۔ تو تعلیم وتربیت برابر چلتی رہی ہے اور بڑھتی رہی ہے۔ یہ چیز انسان کے سوا کسی میں نہیں۔ اس لئے کہا جائے گا کہ یہی افضلیت کی بناء ہے کہ یہ معلّم ہے۔

عظمتِ تعلیمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا"[1] میں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یعنی عالم تو آپ اتنے بڑے ہیں کہ کائنات میں کوئی اتنا بڑا عالم نہیں، اللہ کے بعد اگر علم میں رتبہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تو ایک ہے آپ کا عالم ہونا اور ایک ہے کہ دوسروں کو یہ علم پہنچا کر عالم بنا دینا۔ یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ اپنی حیات طیبہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم وبیش) افراد کے مقدّس نمونے تیار کر دیئے جو آپ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے۔ آپ کے پسینے پر اپنے قطراتِ خون چھڑکنے والے تھے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے تیار کر دیئے۔ یہ تعلیم وتربیت ہی نے تیار کئے۔ تعلیم کے ذریعے مسائل سکھلائے۔ اور تربیت کے ذریعے قلوب کی راہ کو درست کیا، دلوں میں تصرّف کیا۔ وہ باطنی تعلیم ہے کہ دل سے دل تک علوم اور کمالات کو پہنچایا۔

بتصرّف تعلیمِ باطن ...... جیسے حدیث میں ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ حضرت خبّاب بن ارت رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ اور قرآنِ کریم کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ "اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی

[1] السنن للامام ابن ماجه، کتاب السنة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵، رقم: ۲۲۵.

سَبْعَةِ اَحْرُفٍ" ①

ابتداء میں سات لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تو وہ نماز میں اپنی لغت کے مطابق قرآن پڑھ رہے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو لغت قریش میں قرآن یاد تھا۔ معنی میں تو فرق نہیں پڑتا مگر لغت بدلی ہوئی ہے۔ عرب میں سات بڑے بڑے قبیلے تھے، جن کی لغت فصیح تھا۔ سب سے اعلیٰ ترین قبیلہ قریش کا تھا، پھر بنی تمیم، پھر بنی ہذیل وغیرہ، یہ سب قبائل تھے۔ اور یہ ایسا فرق تھا جیسا دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں ہے یا دہلی اور حیدرآباد کی زبان میں۔ اردو سب بولتے ہیں مگر کچھ لب ولہجے کا فرق، کچھ محاورات کا فرق اور کچھ اصطلاحات کا فرق ہے۔ تو معانی وہ بھی وہی سمجھاتے ہیں جو دہلی والے اور لکھنؤ والے۔ مگر انہی معنی کے سمجھانے کے لئے ان کے ہاں اور لغت ہے، ان کے ہاں اور لغت ہے۔ مقصود دونوں کا ایک ہے۔ لب ولہجہ الگ ہے۔ بہرحال ابتداءِ اسلام میں سات لغت میں قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ حضرت خبابؓ رضی اللہ عنہ نے اپنی لغت میں قرآن پڑھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے آ کے سننے لگے تو وہ دوسری لغت تھی۔ وہ تو "اَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ" تھے۔ وہ تو ایک دم شدت تھی، انہوں نے اسی وقت حضرت خبابؓ رضی اللہ عنہ کی پگڑی اتار کر مشکیں کس دیں اور کہا:

منافق! قرآن غلط پڑھتا ہے؟ میں ابھی تیری گردن اڑا دوں گا۔ اور گھسیٹتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ قرآن غلط پڑھتا ہے۔

آپ نے فرمایا: چھوڑ دو۔ اور حضرت خباب سے فرمایا پڑھو۔ انہوں نے اپنی لغت پر پڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" "یوں ہی نازل ہوا" حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم پڑھو! انہوں نے لغت قریش میں پڑھا۔ فرمایا: "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" "یوں ہی نازل ہوا"۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ یہ کیسا قرآن ہے۔ جو جس طرح پڑھ دے تو فرما دیا جاتا ہے "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" یوں ہی نازل ہوا ہے۔ ریب اور شک کی کیفیت وسوسہ کے درجے میں آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔ "يَا ابْنَ الْخَطَّابِ!" (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے تمام آسمان مجھ پر منکشف ہو گئے، شرح صدر ہو گیا، حقیقت حال سمجھ میں آ گئی۔ یہ بھی تعلیم تھی مگر یہ لسانی تعلیم نہیں تھی، باطن کے اندر تصرف تھا۔

دست مبارک کا سینے پر پھیر دینا، قلب پر ہاتھ کا مارنا یہ باطنی تعلیم تھی۔ قلبِ نبوت کا فیضان ہاتھ کی حرکت سے ان کے قلب تک پہنچا، جیسے بجلی کا کرنٹ آپ ایک لوہے کے تار لیں اور دوسرا تار اس میں ملائیں اور پھر آدمی تک پہنچائیں ان واسطوں سے پورا کرنٹ اس کے اندر سما جائے گا۔ تو قلب کا جو علمی کرنٹ تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کے ذریعے سے پہنچایا، یہ باطنی تصرّف تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القران، باب انزل القران علی سبعة احرف، ج: ۱۵، ص: ۳۹۰.

بھی تعلیم دی۔قلبِ مبارک کی توجہ سے بھی تعلیم دی۔ دستِ مبارک کے تصرّفات سے بھی تعلیم دی۔ یہ صرف انسان کا خاصّہ ہے۔انبیاء علیہم السلام معلّمین اوّلین ہیں جنہوں نے دنیا کو تعلیم وتربیت دینا سکھلایا۔یہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی بناء پر یہ افضل ہے۔

نبوّت تعلیم ہی ہے...... نبوّت بھی تو تعلیم ہی کا نام ہے۔نبی اس لئے آتے ہیں کہ انباء کریں۔انباء خبر دینے اور علم پہنچانے کو کہتے ہیں۔تو نبوت کا حاصل ہی تعلیم وتربیت ہے اور نبوت سے بڑا کوئی مقام نہیں۔تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔تو تعلیم وہ خصوصیت ہے جو انسان کے سوا کسی کو نہیں دی گئی۔جنات وملائکہ میں کوئی پیغمبر نہیں۔بلکہ ملائکہ اور جنّات انبیاءِ بشری کے تابع بنائے گئے ہیں۔جیسا کہ اس عالم میں یہودی بھی ہیں‘ نصرانی بھی ہیں،عیسائی بھی ہیں اور مسلم بھی ہیں۔اسی طرح سے جنّات کے اندر یہودی بھی ہیں،عیسائی بھی ہیں‘ نصرانی بھی ہیں دہریئے بھی ہیں،ملحد بھی ہیں،بددین بھی ہیں۔سب طرح کے موجود ہیں۔وہ بھی انہیں انبیاء علیہم السلام کے اوپر ایمان لائے تھے۔بعضے عیسائی ہیں۔بعضے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔بعضے ان سے پہلے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ان میں پیغمبری نہیں ہے۔پیغمبری بشر کے اندر ہے اور جنّات تابع بنائے گئے ہیں۔ پیغمبری کے معنی سوائے تعلیم وتربیت کے اور کیا ہیں؟ صرف یہ کہ علم پہنچا کر ان کو روشن بنایا جائے اور علم سے منوّر بنایا جائے۔تو یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جس سے انسان اشرف الکائنات اور افضل المخلوقات بنا۔

بِلا تعلیم انسانیّت ختم ہوجاتی ہے......اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب یہ انسان کی خصوصیت ہے۔تو خصوصیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب تک وہ خصوصیت رہتی ہے انسان انسان رہتا ہے۔جب وہ خصوصیت ختم ہوجائے تو انسانیّت ختم ہوجاتی ہے۔اگر تعلیم انسان کی خصوصیت ہے تو جب تک تعلیم انسانوں میں موجود ہے۔انسان انسان رہتا ہے۔جب تعلیم نکل جائے گی ان کی انسانیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ناقص وناتمام رہ جائے گی اور جب تعلیم نہیں رہے گی،علم نہیں رہے گا،تو علم جب نہ رہے تو آدمی جمادات ونباتات سے بھی بدتر ہوجائے گا۔اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی برتری تعلیم وتعلّم سے اور تربیّت سے ہی قائم ہے۔یہ نہ رہے تو انسان انسان نہیں ہے۔

مدارس بقاءِ انسانیت کا ذریعہ ہیں......آج جو مدارس ومکاتب قائم کئے جارہے ہیں، یہ دراصل انسانی خصوصّیت کو اجاگر کیا جارہا ہے۔انسان کی افضلیت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔اگر یہ مدارس قائم نہ کئے جائیں،یہ جوامع قائم نہ کی جائیں اور تعلیم نہ دی جائے اور فرض کیجئے کہ تعلیم مٹ گئی تو انسانیت مٹ گئی،یہ تعلیم وتعلّم کا سارا جھگڑا انسان کی بقاء کے لئے ہے۔کیونکہ یہ خصوصیت ہے۔

اس لحاظ سے جامعہ قاسمیہ کا قائم ہونا،یہ ایک سعادت ہے اور مبارک علامت ہے۔یہ انسانیت کے برقرار رکھنے کا ایک سلسلہ ہے۔جتنا مضبوط ہوگا اتنی انسانیت مضبوط ہوگی۔جتنی نیک نیّتی اور اخلاص سے تعلیم دی جائے گی،اتنا ہی فی الحقیقت آدمیت کو اونچا بنایا جائے گا۔

علم مستند......اور کوئی علم اس وقت تک اونچا نہیں ہوتا جب تک اس کا انتساب صحیح نہ ہو، علم تو ہزاروں ہیں لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ علم مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے تو وہ علم مستند ہو جائے گا، جیسے مہر لگ گئی، پکا ہو گیا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ میری رائے یوں ہے، دنیا کہے گی آپ اپنی رائے اپنے پاس رکھیں، ہماری رائے یہ ہے، ہر انسان کی الگ الگ رائے ہے۔ لیکن جب انسان یوں کہے گا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ کے رسول کا کہا ہوا کہہ رہا ہوں، جوں ہی گردن جھکا دی جائے تو وہ کہے گا بے شک گردن جھکی ہوئی ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟ برگزیدہ شخصیت کی طرف علم کی نسبت قائم ہو گئی۔ تو علم میں انتساب سے مقبولیت آتی ہے۔ اگر انتساب نہ ہو مقبولیت نہ ہوگی۔

اس کی وجہ فی الحقیقت یہ ہے کہ علم ایک وراثت ہے۔ جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ الْاَنْبِیَآءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْھَمًا وَلٰکِنْ وَّرَّثُوا الْعِلْمَ'' ① انبیاء (علیہم السلام) اپنے ورثے میں درہم ودینار نہیں چھوڑتے، روپیہ پیسہ نہیں چھوڑتے، محلات اور بلڈنگیں نہیں چھوڑتے، وہ اپنے ترکے میں علم ومعرفت اور اخلاقی کمالات اور باطنی وظاہری علوم چھوڑتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے۔

علمی وراثت کی شرط......اور فرماتے ہیں: ''اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ'' ② علماء اس ورثے کو پاتے ہیں۔ لیکن وراثت کب ملتی ہے؟

جب نسب صحیح ہو۔ باپ کا وارث بیٹا تب بنتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی اس باپ کا بیٹا ہے۔ اور اگر بیٹا ہی یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہی نہیں، پھر کہاں سے وراثت مل جائے گی، یا سلسلے کے بیچ میں کوئی انقطاع پڑ جائے۔ دادا سے ایک جائداد چلتی آ رہی ہے اس کے باپ تک پہنچی۔ اس نے بیچ میں ایک واسطہ قطع کر دیا۔ تو میراث سلسلے سے آ رہی تھی، جب سلسلہ نہیں رہا، میراث رک جائے گی۔ تو میراث جب ملتی ہے جب مورثِ اعلیٰ تک سلسلہ یکسانی کے ساتھ قائم ہو، مثلاً علوم دین، علوم اسلام میں اور ان علوم میں جو اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ ہمارے مورث اعلیٰ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی اوّلین روحانی اولاد صحابہ کرامؓ ہیں۔ صحابہؓ کے بعد دوسری پشت تابعین عظام ہیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعین ہیں۔ تبع تابعین کے بعد پھر ائمہ کرام، علمائے مجتہدین اور محدثین وفقہاء درجہ بدرجہ، طبقہ بطبقہ یہ سب وارث بنتے چلے آ رہے ہیں اور ایک سلسلہ قائم ہے۔

تو آج آپ قرآن پڑھیں گے تو یوں کہیں گے کہ قرآن میرا اور میرے باپ کا بنایا ہوا نہیں، یہ اللہ کے رسول کا لایا ہوا ہے اور یہ میرا سلسلہ ہے اور میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی، اس نے فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے سنی۔ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا۔ ایک ایک حدیث کی سند محدثین کے یہاں موجود ہے۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم ج: ۱ ص: ۴۷ رقم: ۳۱۷.

② السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۶.

پھراحادیث کی قسمیں ہیں کہ سنداگر شبہ سے بالاتر ہواور مورثِ یقین ہوتو وہ حدیث قرآن کے درجے میں آجائے گی، جیسے اس کا منکر کافر ویسے اس کا منکر بھی کافر۔اگر مورثِ یقین نہیں ہے مورث ظن ہے تو اس کا منکر کافر نہیں ہوگا مگر فاسق ہوجائے گا اور مبتدع کہلائے گا۔اگر اس سے بھی کم درجہ ہے یعنی شبہات ہیں تو اس کا منکر نہ کافر ہوگا نہ فاسق،تو حدیث کے علم کا درجہ استناد پر موقوف ہے۔اسی لئے محدثین نے چار لاکھ افراد کے قریب جو راویانِ حدیث ہیں۔ان کی سوانح عمری مرتب کردی کہ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کا کیریکٹر کیسا تھا؟ کس طرح سے یہ حدیث منتقل ہوکر آئی،تو ایک مسلمان کو بحمداللہ یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اپنے رسول کے ایک جملے کو سنے گا تو رسول تک سند پہنچادے گا۔گویا مطلب یہ ہے کہ اس سند کے ساتھ یہ علم کی وراثت مجھ تک پہنچ گئی ہے۔اس لئے میں صحیح معنی میں روحانی طور پر اولادِ رسول ہوں اور میں صحیح وارث ہوں۔تو وراثت تب ملتی ہے جب اوپر سے لے کر نیچے تک نسب ملا ہوا ہو۔اگر بیچ میں انقطاع ہوجائے وراثت ختم ہوجاتی ہے۔

تو یہی روحانی وراثت میں بھی ہے کہ علم کی وراثت تب ملے گی کہ یہاں سے لے کر تلمذ اور شاگردی کا سلسلہ قائم ہونا چاہئے کہ یہ میرا استاذ اور یہ میرے استاذ کا استاذ اور آگے تک سلسلہ پہنچ جائے۔اور وہ بھی بصیرت کے ساتھ یعنی راویوں کے احوال اور کردار کے ساتھ۔

اگر بیچ میں سے آپ خدانخواستہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو نکال دیں پھر ہم تک علم پہنچتا ہی نہیں۔تابعین کو نکال دیں،علم نہیں پہنچے گا۔اس لئے کہ زنجیر ٹوٹ گئی یا آپ کسی کو استاذ نہ بنائیں اور یوں کہیں کہ میرے اوپر یہ علم آیا ہے پھر تو سرے سے نسب ہی قائم نہ ہوا،تو وراثت وہ نہ رہی جو پیغمبر کی تھی۔کچھ آپ کے وساوس اور کچھ اوہام ہوں گے۔جن کو آپ نے علم سمجھ لیا۔علم تو وہ ہے جو سند کے ساتھ منتقل ہوکر آپ تک پہنچے۔

علومِ اسلامیہ کی خصوصیت......یہ اسلام کی خصوصیت ہے،آج دنیا میں کس قوم کے پاس خدائی کتابوں کی سند موجود ہے؟ اور مسلمانوں میں پیغمبر کے کلام تک کی سند موجود ہے۔وہ روایت یہاں سے لے کر اوپر تک ملا سکتے ہیں۔

اہتمامِ استناد......اور قرآن وحدیث تو بجائے خود ہے،فقہ کی جو کتابیں ہیں،ان کی سند موجود ہے۔اگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط لکھی ہے تو مبسوط کی روایت موجود ہے کہ یہ ہمیں فلاں سے پہنچی،انہوں نے فلاں سے سنا اور انہوں نے فلاں سے۔تصوف کی سند موجود ہے۔۔رسالہ قشیریہ جو تصوّف کی بنیادی کتاب ہے۔جتنے تصوّف کے مسائل اور اصطلاحات ہیں ان کی سند جنید وشبلی تک اس میں پہنچائی گئی ہے۔اور جنید وشبلی سے آگے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔تو یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس امت نے ہر دینی فن کو سند کے ساتھ قبول کیا ہے۔بلاسند اور بلا حجت کے کوئی بات نہیں ہے۔لفظوں کی بھی روایت کی ہے تو سند موجود ہے۔مثلاً میں نے قرآن شریف حفظ کیا،اگر میں سند پڑھوں تو اللہ میاں تک سلسلہ پہنچا سکتا ہوں،مجھے تجوید کے ساتھ میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا،انہیں تجوید کے ساتھ قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمانی نے حفظ کرایا،

انہیں قاری ابراہیم صاحب مکی نے تجوید کے ساتھ حفظ کرایا۔اس طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تک سند پہنچ جائے گی اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ کرایا۔تو جتنے مجوِّدین اور قراء ہیں ان سب کی سند موجود ہے۔

تصوف کے سلسلہ میں یہ جو شجرے پڑھے جاتے ہیں یہ سند ہی تو ہے کہ میں نے فلاں شیخ سے بیعت کی۔ اس نے فلاں سے کی،اس نے فلاں سے کی اور سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک۔تو یہ جو شجرہ ہے یہ در حقیقت نسب نامہ ہے، یہ رواۃ کا سلسلہ ہے۔تو فقہاء کے ہاں الگ سند، محدثین کے ہاں الگ سند،قراء اور مجودین کے ہاں الگ سند،صوفیاء کے ہاں الگ سند ہے۔ہر چیز سند سے ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

بقائے سلاسل تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے......تو مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے۔اس خصوصیت کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پڑھایا،سلسلہ ہم تک پہنچ گیا۔یہ تعلیم ہی سے پہنچا ہے۔محض علم سے نہیں پہنچا۔علم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہ آپ کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص پہنچا ہے۔اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم نہ دیتے تو ہم کیسے عالم بنتے؟ ہم تک علم کیسے پہنچتا؟ تو تعلیم کے ذریعے ہم تک علم پہنچا۔تو در حقیقت انسانی خصوصیت اور بشری کمال تعلیم وتعلّم میں منحصر ہے۔یہی افضلیت کی وجہ ہے جس نے انسان کو کائنات پر بڑھایا ہے۔ورنہ مطلقاً علم تو حیوانات میں بھی ہے۔تھوڑے بہت کا فرق ہے۔آپ میں زیادہ ہے ان میں کچھ کم ہے۔لیکن ہے۔مگر کوئی معلّم نہیں۔انسانوں میں سب سے پہلے معلّم حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں،پھر ان کے بعد ان کے اصحابِ کرام ہیں۔پھر ائمہ عظام،پھر علماء ربانیین۔

تردیدِ باطل تعلیم پر موقوف ہے......"یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَ انْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر قرن اور ہر دور میں اس علم کو اٹھاتے رہیں گے،سلف سے منتقل کر کے ہر زمانے میں خلف موجود ہوں گے جو علم کو لیتے رہیں گے اور صحیح مستند پیغمبر کا علم پہنچتا رہے گا۔جو اخلافِ رشید ہوں گے وہ اسلاف سے علم لیتے رہیں گے اور آگے چلتا کرتے رہیں گے۔

اس علم کی بدولت ہر قرن میں ایسے لوگ رہیں گے جو غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور مبطلین کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کو چاک کر کے رہیں گے۔ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے ہونے کی خبر دی گئی۔

وہ ہوں گے تو تعلیم ہی کے ذریعے سے ہوں گے،تو اصل بنیادی چیز تعلیم ہے۔جس پر امت کا دارومدار ہے،افراد کا دارومدار ہے۔اور اشخاص کا دارومدار ہے۔اور تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے جاتے ہیں۔اس لئے

① الحديث اخرجه الامام البيهقي في سننه الكبرىٰ ج: ۱۰ ص: ۲۰۹. والهيثمي وضعفه، مجمع الزوائد. ج: ۱ ص: ۱۴۰.

مدارس فی الحقیقت انسانیت کی بقاء کے لئے قائم ہورہے ہیں۔ انسانیت اجاگر نہیں ہوسکتی اور خصوصیت انسانی باقی نہیں رہتی اگر مدارس ومکاتب نہ ہوں، اس لئے میں اپنے عزیز کو اور ان حضرات کو جو ان کے معاون ہیں۔ اس جامعہ قاسمیہ کے قیام پر مبارکباد دیتا ہوں۔

تعلیم وتعلّم کے لحاظ سے برگزیدہ شخصیت...... اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ اس جامعہ قاسمیہ میں جو تعلیم دی جائے گی اس کا ایک ہستی کی طرف استناد کیا گیا ہے جو فی الحقیقت علم میں بھی اونچی ہے اور معلّمی میں بھی اونچی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کیا اور دس بارہ شاگرد ایسے پیدا اور مہیا کئے کہ اس وقت ہندوستان میں علومِ حدیث کا دارومدار انہی پر ہے۔ دارالعلوم میں تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس برس تک حدیث کا درس دیا۔ ہزاروں طلبہ وفضلاء ان سے فیضیاب ہوئے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فضلاء اور شاگرد کون ہیں؟

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے پاکستان کے شیخ الاسلام ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو وہاں شیخ الاسلام کہلاتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولوی عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ عبدالرب کے محدّث تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ جو مدرسہ شاہی مراد آباد کے محدّث تھے۔ تو جہاں جہاں یہ بڑے بڑے مدارس ہیں۔ حضرت کے تلامذہ نے وہاں حدیث پہنچائی اور فقہ پہنچایا۔

افادیتِ مدارس...... اور یہ خاص حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان تھی کہ دارالعلوم دیوبند قائم کرکے جہاں جہاں گئے مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ امروہہ میں مدرسہ قائم کیا، مراد آباد میں مدرسۃ الغرباء قائم کیا، انبیٹھ، شاہجہان پور اور بریلی میں مدارس قائم کئے۔ اسی طرح گلاوٹھی میں قائم کیا اور اپنے شاگردوں اور مریدین کو تاکید کی کہ جہاں رہو مدرسے قائم کرو! آج ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں مدارس ہیں وہیں کچھ علم کی روشنی پائی جاتی ہے۔ جہاں مدارس نہیں جس کا جو جی چاہے کہتا ہے۔ ظلمت پھیلی ہوئی ہے، مستند علم کا نشان نہیں ہے، یا موضوع روایتیں ہیں جو لوگ پڑھ دیتے ہیں یا غیر مستند باتیں ہیں، لیکن محدثانہ اور معلمانہ طرز پر بیٹھ کر سندِ صحیح کے ساتھ علم کو پہنچانا اور پرکھ کر دینا، یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ جہاں مدارس ہیں وہاں پائی جاتی ہے۔

درجاتِ تربیت...... اس آیت میں یہی فرمایا گیا کہ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ کس بشر کے لئے زیبا نہیں اور جائز نہیں ہے۔ کسی بشر کے لئے؟ جس کو اللہ تعالیٰ علم دے، نبوت دے، وہ لوگوں سے یوں کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ اور میری عبادت کرو۔ یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ وہ یوں کہے گا۔ ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ (1) ربانی بنو، رب والے بنو، اللہ والے بنو، میرے بندے مت بنو اور ربانی کسے کہتے ہیں؟

(1) پارہ: ۳، سورۃ ال عمران، الآیۃ: ۷۹۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صحیح بخاری میں اس کی تفسیر فرمائی کہ ربانی کون ہے؟ فرماتے ہیں "اَلَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِهَا" ① ربانی وہ ہے کہ مخلوقِ خدا کو چھوٹے چھوٹے مسائل سے تربیت دے کر بڑے مسائل تک پہنچائے۔ محض بڑے ہمہ گیر اور کلیاتی مسائل کا پیش کرنا ربانی کی شان نہیں ہوتی۔ ربانی تو جزئیات پیش کرتا ہے۔ کہیں نماز کے مسائل، کہیں وضو کے مسائل، کہیں نکاح وطلاق کے مسائل، کہیں معاشرت کے۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر تربیت کرتا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے علوم سامنے لاتا ہے۔ اسے اس سے اپنی ہیچ مدانی محسوس نہیں ہوتی کہ میں اتنا بڑا عالم ہوں۔ میں نماز کا کیا مسئلہ بیان کروں؟ وضو کا مسئلہ کیا بیان کروں۔ یہی سب سے بڑی کائنات ہے کہ ابتداء مخلوق کو چھوٹے مسائل سے تربیت دے تاکہ عملی زندگی درست ہو۔ پھر اونچے اونچے مسائل بیان کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: "عَلِّمْنِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ غَرَآئِبَ الْعِلْمِ" یارسول اللہ! علم کے کچھ عجائبات کچھ نکتے اور کچھ لطیفے ارشاد فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "هَلْ عَرَفْتَ رَأْسَ الْعِلْمِ؟" یہ جو علم کے کچھ لطیفے اور نکتے سیکھنے آیا ہے کیا اصل علم بھی تیرے پاس ہے؟ بنیادی علم بھی تیرے پاس ہے جس کے اوپر نکتوں کی تعمیر کھڑی کی جائے؟

اس نے عرض کیا کہ: "مَاشَآءَ اللّٰهُ". جتنا اللہ نے چاہا فرمایا: "هَلْ عَرَفْتَ اللّٰهَ؟ قَالَ مَاشَآءَ اللّٰهُ" جتنی میری استعداد تھی پہچان چکا ہوں۔ فرمایا: "هَلْ عَرَفْتَ الْمَوْتَ؟" تو نے اپنی موت کو پہچان لیا؟ "قَالَ مَاشَآءَ اللّٰهُ" فرمایا! پہلے ان دو علموں کا حق ادا کر کے آ۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ پھر ہم عجائبات بتلائیں گے۔ پہلے ان چیزوں پر تو عمل کر لے۔ تو ربانی وہ ہے کہ عمل کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلائے اور رفتہ رفتہ بڑے علوم تک پہنچائے، تو قرآنِ حکیم میں فرمایا کہ ہم جس کو علم وحکمت اور نبوّت دیتے ہیں اس کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ، میری عبادت کرو۔ وہ یوں کہے گا۔ ②

بلا تعلیم ربانیّت پیدا نہیں ہوتی...... ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ﴾ تم ربانی بنو، رب والے بنو اور کس طرح سے؟ آگے صورت بتلائی۔ ﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ ③ کتاب کی جو تعلیم دیتے ہو اور درس وتدریس کا جو مشغلہ اختیار کرتے ہو اس کے سبب سے تمہیں ربانی بننا پڑے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ درس وتدریس کا مشغلہ نہ ہو تو ربانیّت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ محض وعظ گوئی سے اور محض

---

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۷. ② احیاء علوم الدین، کتاب العلم، باب وبیان علامات علماء الآخرة ج: ۱ ص: ۷۰. علامہ عراقی فرماتے ہیں: رواه ابن السنی وابو نعیم فی کتاب الریاضة لهما، وابن عبدالبر من حدیث عبدالله بن المسور مرسلا وهو ضعیف جداً دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۱ ص: ۱۵۵.. ③ پاره: ۳، سورة آل عمران، الآیة: ۷۷.

تقریروں سے ربانی نہیں بنایا جاسکتا، تقریریں تو مذکرات ہیں جو بھولا ہوا سبق یاد دلادیتی ہیں۔ تقریر تربیت کی چیز تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو وقتی بات ہوتی ہے۔ تو تقریر یا خطابت یہ تربیت نہیں کرسکتیں یہ تو محض مذکّر ہیں۔ اور یاد دہانی تو اس کی کی جائے گی جس سبق کو آدمی پہلے پڑھ چکا ہو اور جو پڑھا ہی نہ ہو تو یاد کا ہے کو دلایا جائے گا؟ تو حقیقت میں مربی جو شے ہے وہ تعلیم اور تدریس ہے اور تعلیم وتدریس بھی کتاب کے ساتھ۔ ﴿تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَـدْرُسُـوْنَ﴾ یعنی کتاب اللہ سامنے ہو اور اس کا درس دو۔ اس کی تعلیم دو جو علوم کا سرچشمہ ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکل آیا کہ ربانیت بغیر تعلیم وتربیت کے پیدا نہیں ہوتی اور تعلیم وتعلّم ہی انسان کی خصوصیت ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقی معنی میں ربانی بنانا یہ انسان کا کام ہے دوسروں کا کام نہیں ہے، حتّی کہ ملائکہ بھی اگر جدوجہد کریں تو انسانوں کو ربانی نہیں بناسکتے وہ زیادہ سے زیادہ علم لاکر پہنچادیں گے۔ چاہے انہیں معنی معلوم نہ ہوں۔ جیسے کتاب علم پہنچادیتی ہے۔ لیکن حقیقی معنی میں اس کو سمجھنے والا اور سمجھانے والا انسان ہوگا۔ اس واسطے علم ہو اور علم کے بعد تعلیم ہو، تعلیم کے بعد استناد ہو، اس کی سند اور نسبت صحیح ہو، یہ مقبول ہوجاتی ہے۔

عظمتِ استناد...... الحمدللہ جامعہ قاسمیہ کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ علم بھی ہے، تعلیم بھی ہے اور تعلیم کے ساتھ ایک ذات کے ساتھ استناد بھی ہے اور وہ ذات مقبولانِ الٰہی میں سے ہے۔ میں تو کہتا ہوں ہمارا اصل وجود نسبت سے ہے۔ ہمارے وجود کے معنی یہ ہاتھ اور پیر، یہ جگہ گھیرنا، یہ نہیں ہے۔ ہمارا وجود نسبت سے قائم ہے۔ ایک مومن کیوں مومن ہے؟ اس کا ایمانی وجود کیا ہے؟ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے۔ وہ جب اپنا تعارف بحیثیت مومن کے کرائے گا تو وہ یہ کہے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں۔ بس یہ میرا تعارف ہے۔ یہ نسبت ہی تو ہوئی کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میں کسی کا نہیں ہوں میں تو ذاتِ بابرکاتِ نبوی کا غلام ہوں۔

جیسے دھوپ سے اگر پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ وہ اس کے سوا اور کیا تعارف کرائے گی کہ میں آفتاب کا ایک سایہ ہوں۔ تو آفتاب کی طرف نسبت دے دینا' یہی اس کا وجود ہے۔ اگر دھوپ آفتاب سے کٹ جائے، اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ تو حاصل یہ نکلا کہ وجود حقیقت میں نسبت وانتساب کا نام ہے۔ اگر ہمارا علم کسی مقدّس ذات کی طرف منسوب ہو۔ وہ علم کارآمد اور معتبر ہے، اگر کسی ذات کی طرف منسوب نہیں، محض اپنے ہی اندر سے اٹھا ہے، اسے دماغی بخار کہا جائے گا۔ اس کا نام علم نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اوہام ووساوس کا مجموعہ کہا جائے گا۔ خواہ عقل بھی اس میں شامل ہو۔

نسبتِ علمی...... کیوں کہ عقل محض بھی علوم پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لئے کہ عقل غلط بھی چلتی ہے' صحیح بھی چلتی ہے۔ اس کے غلط اور صحیح ہونے کا بھی تو معیار ہونا چاہئے جس پر پرکھ کر ہم کہیں یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ سورج گھومتا ہے، ایک کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے، ایک فلسفی عقلی دعوؤں سے کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ ایک

کہتا ہے کہ بالکل موجود نہیں ہے۔علّت تامّہ موجود ہے۔ایک فلسفی کہتا ہے کہ قیامت آئے گی، دوسرا کہتا ہے کہ ہر گز نہیں آئے گی، عالم قدیم ہے۔یوں ہی آ رہا ہے یوں ہی چلتا رہے گا۔یہ سارے عقل مند ہی تو ہیں لیکن متضاد دعوے ہیں۔ایک کا دعوی سچا ہوگا ایک کا دعوی جھوٹا ہوگا اور دونوں عقل سے کہہ رہے ہیں، تو جب عقل غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتی ہے۔تو غلط اور صحیح ہونے کی کوئی کسوٹی تو ہوگی جس پر پرکھ کر ہم کہیں کہ یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط، تو عقل کی کسوٹی نقل اور وحیِ خداوندی ہے۔اس علم پر پرکھ کر ہم کہیں گے کہ یہ عقل صحیح کہہ رہی ہے اور یہ عقل غلط کہہ رہی ہے۔اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل ہے۔اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل نہیں ہے۔کس میں یہ قطعیت ہے اور کس میں محض وہمیّت ہے، تو عقل کی صحت وسقم کا مدار خود وحی کے اوپر ہے۔

اصل بنیاد وحی ہے اور وحی کا علم نسبت ہی تو لئے ہوئے ہے کہ اللہ کا علم، اللہ کے رسول کا علم، رسول کے صحابہؓ کا علم اور صحابہؓ کے تابعین کا علم۔اس نسبت نے علم کو معتبر بنایا، اگر یہ نسبت نہ ہو اور ایک شخص یوں کہے کہ میرا علم۔تو اس کو دیوار پر مارا جائے گا۔کہا جائے گا کہ تیرا علم ہے تو ہمارا بھی علم ہے۔ہم تیری بات کیوں مانیں؟ ہم بھی تو انسان ہیں۔لیکن جب دونوں مل کر کہیں گے کہ نہ میرا علم نہ تیرا علم، خدا کا علم۔دونوں گردن جھکا دیں گے کہ بے شک اب جھکنا پڑے گا۔تو خدا کے علم کے معنی یہ ہیں کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے آیا۔جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔

قبولیّتِ نسبت......تو نسبت سے علم بڑا بنتا ہے اور قابلِ قبول بنتا ہے۔تو جامعہ قاسمیہ کے لفظ میں جیسے تعلیم کی طرف اشارہ ہے ویسے ہی نسبت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ ایک ایسی ذات کی یادگار میں ہے جو معلّمِ ہند ہو کر گزری ہے، جس نے بڑے بڑے محدّث پیدا کئے، جس نے سینکڑوں ہزاروں مدارس قائم کئے۔

آج اگر آپ دیکھیں، آپ کے پاکستان میں قصبے قصبے میں مدرسے موجود ہیں۔میں افغانستان گیا تو گاؤں گاؤں میں فضلاءِ دیوبند موجود ہیں، برما میں گیا تو شہر شہر میں فضلائے دیوبند اور مدارس موجود، اخیاب میں پہنچا تو چار سو کے قریب علماء جمع ہوئے جو فضلاء دیوبند تھے، ملنے کے لئے آئے۔افریقہ میں جاؤ تو ہزاروں کی تعداد میں فضلاء موجود۔تو یہ جگہ جگہ مدارس، جگہ جگہ فضلاء اور جگہ جگہ معلّم۔یہ درحقیقت عالمِ اسباب میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے۔جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھ کر گویا علم کی ایک فیکٹری قائم کردی کہ وہاں سے علم کی مشینیں تیار ہوتی رہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات برس کی عمر میں خواب دیکھا تھا کہ میں بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے ہاتھ اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے دودھ کی نہریں جاری ہیں جو اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں۔تو ان کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم نے تعبیر دی تھی کہ حق تعالیٰ شانہٗ تمہارے ذریعے سے علومِ نبوّت کا فیضان کریں گے۔

کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نانوتہ ایک کورسی بستی جو ضلع سہارن پور (انڈیا) میں ہے، کوئی اس کی خصوصیت

نہیں تھی کہ وہاں ایک ایسی شخصیت بھی پیدا ہوگی کہ مشرق و مغرب میں اس کے ذریعے علوم کے دریا بہیں۔ جب دارالعلوم قائم ہوا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تعبیر ہے۔ آج دارالعلوم کے نقش قدم پر مدینہ منورہ میں اگر مدرسہ شرعیہ قائم ہے تو فضلاءِ دیوبند کا قائم کیا ہوا ہے۔ مکہ میں مدرسۃ الفلاح کا قیام ہوا تو مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری کے ذریعہ جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ مکہ ہو، مدینہ ہو، بخارا ہو، بلخ ہو، افغانستان ہو، افریقہ ہو ہزاروں ہزار مدرسے قائم ہیں۔ تقریباً بیس ہزار کے قریب دارالعلوم دیوبند نے ایسے علماء تیار کر دیئے۔ جن پر فتوی کا مدار اور حدیث سنانے کا مدار اور قرآنِ کریم کی تعلیم کا مدار ہے۔ مشائخ طریقت ان میں ہیں اور صوفیت کی تعلیم بھی ان میں ہے۔

عزتِ نسبت...... تو ایک ایسی ذات جس کے فیضان سے ہزار ہا علماء تیار ہوں، ہزار ہا مدارس تیار ہو جائیں۔ اس کی طرف نسبت کر دینے سے یقیناً ہم لوگوں کی عزت ہے اور اس جامعہ کی بھی یقیناً عزت ہے کہ نسبت کی وجہ سے مقبولیت پیدا ہو جائے گی کہ قبولیت نسبت سے آتی ہے۔

آپ مکہ مکرّمہ میں جاتے ہیں اور بیت اللہ کے در و دیوار کو عزت و عظمت سے چومتے ہیں۔ کیوں؟۔ اس لئے کہ اس کی اللہ سے نسبت ہے۔ اس کا نام بیت اللہ ہے۔ یعنی اللہ کا گھر، حالانکہ اللہ میاں اس میں رہتے تھوڑا ہی ہیں، وہ تو جسم سے پاک اور بری و بالا ہیں۔ مگر ایک نسبت ہے اور اس نسبت کی وجہ سے بیت اللہ مکرّم و معظم ہے۔ اور تجلیات کا مورد بن گیا۔

تو بیتُ اللہ قابلِ تعظیم اور واجب التعظیم نسبت کی وجہ سے بنا۔ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیا۔ حالاں کہ آپ ہی نے تو اسے پاکستان سے سی کر بھیجا تھا۔ وہاں جب پڑ جائے گا تو آپ اسے چومیں گے۔ اگر چہ اس سے پہلے چومنا نہایت غلطی ہے۔ اس واسطے کہ ابھی اسے وہ نسبت حاصل نہیں ہوئی، ابھی تو اسے آپ کی طرف نسبت ہے۔ جب اسے بیت اللہ سے نسبت ہوگی جب اسے چومنا۔ تو جب اسے بیت اللہ پر ٹانگ دیا جائے گا اور بیت اللہ سے مس کر دے گا تو اس میں برکات کے آثار آئیں گے۔ پھر بے شک آپ اسے چومیں تو آپ کے لئے عزّت و عظمت اور مقبولیّت ہے۔ تو پردوں میں مقبولیت آ گئی اس لئے کہ دیوارِ کعبہ کو لگ گیا۔ دیوارِ کعبہ میں مقبولیت آئی کہ اللہ کا نام لگ گیا۔ بیت اللہ مسجدِ حرام میں ہے تو مسجدِ حرام ساری مسجدوں سے افضل بن گئی۔ مسجد حرام جس شہر میں ہے تو اس شہر کا نام بلد امین ہو گیا۔ کیوں کہ وہ مسجدِ حرام کا شہر بن گیا۔ وہ مکہ شہر جس صوبے میں ہے وہ حجاز کا صوبہ مقدس بن گیا، اس لئے کہ اس میں مکہ واقع ہے۔ تو نسبت در نسبت سے فضیلت اور بڑائی آئی۔ اس طرح سے علم خود بڑی چیز ہے اور کسی بڑی شخصیت کی طرف انتساب ہو جائے تو اس کی اور بڑائی ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس جامعہ کا قیام اور اس کے قائم کرنے والے دونوں مستحق مبارکباد ہیں۔ یہ چند جملے تھے جو مجھے اس آیت کے تحت اس جامعہ کے متعلق عرض کرنے تھے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو مضبوط بنائے اور اس کو فیضان کا ذریعہ بنائے اور ایسے معاون اس کے لئے پیدا ہو جائیں تا کہ جو اس کے مقاصد ہیں وہ آگے بڑھیں اور علم پھیلے اور یہ علم کا منارہ بن جائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَافِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اسْتَعْمِلْنَا بِالْقُرْاٰنِ اَجْسَادَنَا.

۱۲ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ

تاثیر الاعمال

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ!......فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ. (1)

تمہید...... بزرگانِ محترم! حدیثِ قدسی میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ" میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، جیسا گمان میرے ساتھ قائم کرے گا ویسا ہی میرا عمل اس کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ نے ایک ناکارہ کے بارے میں اچھا گمان کرلیا ہے تو کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو کارآمد بنادے۔ بہر حال اس وقت میں کچھ زیادہ کہنے کی ہمت تو نہیں ہے، نہ کچھ قوت ہی ہے اور سفر بھی بہت لمبا رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ بھی ہے۔ اس لئے زیادہ وقت تو میں نہیں لے سکوں گا۔ البتہ جلسہ کے احترام کی وجہ سے چند جملے ضرور عرض کروں گا۔

خواصِ اعیان...... اتنی اصولی بات سمجھ لیجئے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ نے ایک خاصیّت رکھی ہے۔ دوا ہو، غذا ہو ہر چیز کی ایک خاصیّت ہے اور اس کے استعمال سے وہ خاصیّت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً گل بنفشہ ہے۔ زکام زائل کرتا ہے۔ یہ اس کی خاصیّت ہے۔ جب آپ اسے استعمال کریں گے اور زکام ہوگا تو وہ زائل ہوگا۔ ملٹھی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کھانسی دفع کرتی ہے، جب بھی آپ استعمال کریں گے، کھانسی ہوگی، اللہ تعالیٰ اسے زائل فرمادیں گے۔ تو ہر دوا کی ایک خاصیت ہے۔ اسی طرح ہر غذا کی ایک خاصیت ہے۔ گیہوں کھائیں گے تو اور خاصیّت ہے، چنا کھائیں گے تو اور خاصیّت ہے، چاول کھائیں گے تو اس کی اور خاصیّت ہے۔ بہر حال ہر چیز کی ایک خاصیّت ہے۔

خواصِ افعال...... اور میں کہتا ہوں کہ یہ چیزیں تو اعیان میں سے ہیں، ان کی خاصیتیں تو ہیں ہی، انسان کی ہر حرکت میں ایک خاصیت ہے۔ ہر وضع میں ہر انداز میں ایک اثر ہے۔ اگر آپ کسی کے سامنے یوں اشارہ کریں،

(1) پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۳۸.

ممنونِ کرم ہو جائے گا اور اگر یوں کریں تو لڑائی بن جائے گی۔ اگر کسی کو انگوٹھا دکھلا دیں تو چڑ پیدا ہو جائے گی اور کسی کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو محبت پیدا ہو جائے گی۔ رخ دے کر بات کریں، اس کا اثر اور ہے اور منہ پھیر کر بات کریں، اس کا اثر دوسرا ہے۔ ہر ہیئت کا اثر اور ہر شے کا ایک اثر ہے۔

اسی طرح سمجھئے کہ شرعی اعمال کی بھی کچھ خاصیتیں ہیں۔ جتنے اعمال حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہوئے ہیں، ہر عمل کی ایک خاصیت اور اس کی ایک خاص تاثیر ہے، جب اسے استعمال کیا جائے گا، اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

روزے کی خصوصیت...... مثلاً روزہ ہے، اس کی ایک خصوصیّت اور خاصیّت ہے۔ اور وہ قہرِ نفس ہے۔ جب آپ نفس کا دانہ پانی بند کر دیں گے اور نفس کو مقہور و مجبور کر دیں گے تو نفس مقہور ہو کر کے گناہ کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ تو خمارِ گندم ہے۔ جتنی زیادہ غذا کھائی جاتی ہے، طاقت بڑھتی ہے، گناہ کی سوجھتی ہے اور سات دن فاقہ کر لیں تو گناہ کی طرف طبیعت ہی مائل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ نفس کے اندر ہی جان باقی نہیں ہوگی، تو روزہ قہرِ نفس کے لئے رکھا گیا ہے کہ اس کو مقہور کر دے، قہر کے نیچے دبا دے تاکہ وہ کھل کر کوئی عمل نہ کر سکے اور مجبور ہو جائے۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: روزہ رکھنے میں ۔ نفس تو مقہود ہوتا ہی ہے اور نفس کے آثار و خواص تو مغلوب ہوتے ہی ہیں۔ نفس کے ساتھ شیطان کا ساز باز ہے۔ رمضان میں شیاطین بھی قید کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جو کھل کر نفس پر اثر ڈالتے ہیں وہ گھٹ جاتا ہے۔ اس لئے کتنے بھی نیچے درجے کا مسلمان ہو، اس میں کچھ نہ کچھ رمضان کا احترام ضرور ہوگا۔ اگر روزہ بھی نہیں رکھے گا تو بھی دن میں کھاتے ہوئے شرمائے گا۔ بے روزہ رہنے کو اعلانیہ ظاہر کرنے سے شرمائے گا اور عار محسوس کرے گا۔ یہ خاصیّت ہے۔

زکوٰۃ کی خصوصیت...... زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیّت ہے۔ پہلی خاصیّت یہ ہے کہ بخل کا رذیلہ انسان کے اندر سے زائل ہوتا ہے۔ بخیلی کا جو مادّہ ہے وہ گھٹ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ غرباء کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے حسنِ معاشرت پیدا ہوتا ہے۔ جتنا آپ غرباء پر خرچ کریں گے۔ وہ آپ کے ممنونِ کرم ہوں گے اور جان نثار بن جائیں گے۔ آپ تو یوں خوش ہوئے کہ میں نے اللہ کا ایک فرض ادا کیا کہ زکوٰۃ دے دی۔ غریب یہ سمجھے گا کہ میرے اوپر کرم کیا اور احسان کیا۔ تو امیر اور غریب میں ایک ربط اور رشتہ قائم ہو جائے گا۔ اور وہی حسنِ معاشرت کی بنیاد ہے۔ تو زکوٰۃ کے اندر جہاں نفس کے اندر یہ اثر پڑتا ہے کہ بخل کا رذیلہ زائل ہو، وہاں معاشرت کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور تمدّن کی خوبی بھی سامنے آتی ہے اور امیر و غریب میں باہمی میل جول پیدا ہو جاتا ہے۔ تو یہ زکوٰۃ کی خاصیّت ہے۔

ظہورِ خواص کی شرط...... جب آپ اسے استعمال کریں گے یہ خاصیّت ظاہر ہوگی، اب کوئی استعمال ہی نہ کرے تو وہ بات جداگانہ ہے۔ جیسے کوئی دوائی استعمال نہ کرے تو بیماری کیسے زائل ہوگی۔ محض طبیب کے نسخہ لکھ دینے سے تو بیماری زائل نہیں ہوگی۔ استعمال ہی کرنے سے زائل ہوگی۔ یہی صورت شرعی اعمال کی ہے کہ ہر عمل کی

ایک خاصیت ہے۔ظاہر جب ہی ہوگی جب اسے استعمال کیا جائے۔

ماہرین خواص کی اطاعت......حق تعالیٰ نے جس طرح سے اطبّاءِ جسمانی پیدا فرمائے، ڈاکٹر ہیں، طبیب ہیں، وہ ان خواص و آثار کو جانتے ہیں۔ مریض کی حالت دیکھ کر وہ نسخہ لکھتے ہیں، مریض اگر طبیب کی اطاعت کرے گا، شفا پائے گا۔ اطاعت نہیں کرے گا بیمار پڑا رہے گا۔ بیماری بڑھ جائے گی، ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔ تو اطبّاء جانتے ہیں۔ ہر شخص دوا کی خاصیّت کو نہیں جانتا۔ اسے طبیب کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی طبیب نسخہ لکھے۔ اور بیمار یوں کہے کہ آپ نے اس نسخے میں گلِ بنفشہ کو چھ ماشے کیوں لکھا ہے۔ ایک تولہ کیوں نہ لکھ دیا۔ اور ملٹھی آپ نے تین ماشے کیوں لکھی ہے چھ ماشے کیوں نہیں لکھی۔ تو طبیب کان پکڑ کر مطب سے نکال دے گا کہ تو مجھے تعلیم دینے کے لئے آیا ہے یا شفا پانے کے لئے نسخہ لینے آیا ہے؟۔ تو لامحالہ مریض کو اطاعت کرنی پڑے گی۔ جتنی مقدار وہ لکھ دے اور جو وقت وہ تجویز کرے۔ اسی وقت میں وہ دوا استعمال کی جائے گی۔ اتنی ہی مقدار میں استعمال کی جائے گی جتنی مقدار طبیب لکھ دے گا۔

پھر جو پرہیز بتلائے گا وہ بھی کرنی پڑے گی اگر آپ پرہیز نہ کریں تو دوا فائدہ نہیں دے گی۔ زکام کو زائل کرنے کے لئے اس نے گلِ بنفشہ لکھا۔ وہ آپ نے پی لیا۔ مگر صبح سے شام تک سیر بھر دہی برف ملا کے پی لی۔ اس سے تو زکام اور ترقی پر آ جائے گا۔ تو دوا موثر نہیں ہوتی۔ جب تک پرہیز نہ ہو۔ ہر علاج کے اندر دو جز ہوتے ہیں ایک دوا، ایک پرہیز۔ بلکہ پرہیز زیادہ نافع ہوتی ہے۔ اگر جم کر پرہیز کرے تو بیماری آدھی ہو جاتی ہے۔ دوا سے پھر بقایا آدھی بیماری زائل ہو سکتی ہے۔ مگر ہر صورت میں طبیب کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ رائے زنی کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اس نسخے میں آپ نے پانچ دوائیں کیوں لکھی ہیں۔ چھ کیوں نہ لکھ دیں؟ مریض کو اس کا حق نہیں ہوگا، طبیب کہے گا کہ میں فن کی رُو سے جانتا ہوں کہ کتنی مقدار ہونی چاہئے۔ تجھے اگر علاج کرانا ہے تو یہ نسخہ اسی مقدار میں استعمال کر۔

یہی صورت بعینہٖ طبِ روحانی یعنی شریعت کی ہے۔ جو اللہ نے نازل فرمائی۔ اس کے لئے اطبّائے روحانی بھی نازل کئے، وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ انبیاء کی تعلیم سے ان کے ورثاء پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو علمائے ربانی کہا جاتا ہے۔ وہ انبیاء سے وراثت پاتے ہیں اور وہ طب روحانی ان کے پاس آتی ہے۔ مریض سامنے آتے ہیں وہ بھی نسخے لکھتے ہیں۔ ہر مرض کے مناسب حال دوا تجویز کرتے ہیں۔ اگر مریض یہ کہنے لگے کہ آپ نے فلاں وقت میں مجھے دو ہی رکعتیں کیوں بتلائی ہیں، میں چار کیوں نہ پڑھ لوں؟ وہ کان پکڑ کے نکال دیں گے کہ تو علاج کے لئے آیا ہے یا تعلیم دینے کے لئے آیا ہے؟ اتنی ہی مقدار لازمی ہے۔ شریعت نے ایک تسبیح کی مقدار بتلائی کہ سو مرتبہ پڑھا کرو۔ مریضوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں سو کے سوا سو کیوں نہ ہوئے؟ اور سو کے نوّے کیوں نہ کر دیئے گئے۔ جتنی مقدار اللہ تعالیٰ نے تجویز کی ہے۔ وہی نافع ہوگی۔ جتنی مقدار تجویز نہیں کی وہ نافع نہیں ہو سکتی۔ تو ہر عمل کی ایک خاصیّت ہے، روزے کی بھی ایک خاصیّت ہے، زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے، حج کی بھی ایک

خاصیّت ہے اور نماز کی بھی ایک خاصیت ہے۔

نماز کی خصوصیّت...... نماز کی خاصیّت کیا ہے؟ نماز پڑھنے والے میں دیدارِ خداوندی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر نماز کا تارک ہے تو وہ جو میدانِ محشر میں دیدار خداوندی ہوگا' اس کی استعداد نہیں پیدا ہوگی، وہ دیدارِ الٰہی سے محروم رہے گا۔ تو نماز کی خاصیّت یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر دیدارِ خداوندی کی صلاحیّت پیدا کر دیتی ہے۔

دیدارِ خداوندی کے مراتب...... یہاں نماز پڑھنے میں آپ اللہ تعالیٰ کو عقیدے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عبادت اس طرح سے کرو کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ اس عقیدہ سے نماز پڑھے گا تو گویا عقیدے کی آنکھ سے حق تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، گو اس آنکھ سے نہیں دیکھ رہا۔ کوئی بزرگ ہے۔ ولی کامل ہے۔ وہ کشف کی آنکھ سے تجلیاتِ خداوندی کو دیکھتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو تجلّیاتِ الٰہیہ اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ مگر قیامت کے بعد ایک وقت آئے گا کہ جس کے دیکھنے کی مشق آپ نے قلب سے' حواس سے اور باطنی آنکھ سے کی تھی، وہ آج ظاہری آنکھ سے سامنے آجائے گی اور دیدارِ خداوندی عیاناً ' ہونا شروع ہو جائے گا۔ مختلف تجلّیات نمایاں ہوں گی۔ جس میں بندے حق تعالیٰ شانہ، کو دیکھیں گے۔ یہ دیکھنے کی استعداد نماز ہی پیدا کرتی ہے۔ ①

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف میں تشریف رکھتے تھے اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین چاند کو بھی اور چاندنی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ارشاد فرمایا کہ تم جو چاند کو دیکھ رہے ہو تو ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں حارج تو نہیں ہے؟ وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے، وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ تو نہیں بنا ہوا، اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ نہیں بنا ہوا۔ دنیا کے کروڑوں اربوں انسان چاند کو ایک وقت میں دیکھتے ہیں مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوتا۔ فرمایا۔ اسی طرح قیامت میں بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ اربوں کھربوں ہوں گے مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوگا۔ جس طرح سے تم چاند کو دیکھ رہے ہو۔ ②

فجر و عصر کی خصوصیّت...... اور اس کے بعد فرمایا: اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو اور یہ کر سکو کہ صبح کی نماز اور شام کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو تو دیدار خداوندی کا یہی ذریعہ بنیں گی۔ گویا خاصیت تو ہر نماز میں ہے مگر خصوصیّت سے یہ دو نمازیں، عصر کی اور صبح کی، یہ دو نمازیں وہ ہیں کہ یہ حق تعالیٰ کے دیدار کی زیادہ استعداد پیدا کرتی ہیں۔

اور بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں عالمِ غیب آدمی کے قریب ہو جاتا ہے۔ یہ جو اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں، یہ رات کے اور ہیں اور دن کے اور ہیں۔ دن کے لکھنے والے صبح کی نماز کے وقت

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل ج: ۱ ص: ۸۷.

② الصحیح للبخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الفجر ج: ۲ ص: ۲۱۷ رقم: ۵۳۷.

آتے ہیں اور رات کے لکھنے والے انہیں چارج دے کر واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ دن بھر اعمال لکھتے ہیں، عصر کی نماز جب پڑھتے ہیں تو یہ رات والے ملائکہ کو چارج دے دیتے ہیں۔ رات کو وہ اعمال لکھتے ہیں۔ تو صبح کی نماز میں بھی کروڑوں، اربوں، کھربوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں اور اسی طرح عصر کی نماز کے وقت بھی جمع ہوتے ہیں۔ ہر بندے کے اوپر دو ۲ فرشتے ہیں جو اعمال لکھتے ہیں۔ تو اگر بندے ایک ارب ہیں تو وہ چار ارب ہوں گے۔ غرض اربوں کی تعداد میں یہ ملائکہ صبح اور شام کی نماز کے وقت آتے ہیں۔

فجر و عصر میں نزولِ ملائکہ کی حکمت ...... اور عجیب حکمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ان دو نمازوں کے لئے ملائکہ کا تبادلہ رکھا، کیوں رکھا؟ اس لئے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت دی جا رہی تھی اور حق تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ ① میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں جو میری طرف سے دنیا میں میرا قانون چلائے گا۔ میری طرف سے نیابت کرے گا اور جو احکام میں نے بندوں کے لئے جاری کئے ہیں، انہیں پھیلائے گا۔ میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں، تو ملائکہ کو خلجان گزرا۔ جس کی وجوہ تھیں کہ۔

﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ﴾ ②

آپ ایسی نوع کو خلیفہ بنا رہے ہیں۔ جو دنیا میں خون ریزی الگ کرے گی، فساد الگ مچائے گی اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو ہر وقت آپ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ گویا در پردہ اشارہ ادھر تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، یہ انسان تو نہایت ہی مفسد اور سفاک ہوگا۔

انسان کی تاریخ خون سے بھری پڑی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے آدمی کا جو خون آدمی کے ذریعہ سے بہنا شروع ہوا ہے۔ وہ آج تک بند نہیں ہوا۔ بلکہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ تو انسان انسان کو پھاڑ کھا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان کو درندہ کہنا یہ درندے کی توہین ہے۔ اس لئے کہ درندہ مثلاً شیر ہے، اگر پھاڑتا ہے تو بکری کو پھاڑے گا۔ شیر شیر کو تو نہیں پھاڑتا۔ انسان ایسا درندہ ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں کو پھاڑ کھاتا ہے۔ جتنے مہلک ہتھیار ایجاد ہو رہے ہیں اور انسان ایجاد کر رہے ہیں، وہ انسانوں ہی کی تباہی کے لئے ہو رہے ہیں۔ سانپ بچھوؤں کو ہلاک کرنے کے لئے تو یہ توپیں اور بندوقیں نہیں ہیں۔ آدمی آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے مہلک ہتھیار تیار کر رہا ہے۔ تو انسانی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے۔ انسان ہی انسان کا خون بہا رہا ہے۔ انسان ہی انسانوں کے حق میں فساد برپا کر رہا ہے۔ کچھ صلاح پہ آنا چاہتے ہیں۔ یہ فساد انگیزی کر کے صلاح کے راستے سے ہٹا دیتا ہے، تو فساد بھی ہے، خون ریزی بھی ہے تو ملائکہ نے یہی عرض کیا تھا کہ اس نوع کے اندر خون بھرا ہوا ہے اور فساد بھرا ہوا ہے یہ آپ کی نیابت کرے گا؟ یہ تو نیابت کو اور فاسد بنا دے گا اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو رات دن تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہیں۔ ہمیں خلیفہ بنایا جائے۔

---

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۳۰. ② پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۳۰.

خلافتِ آدم پر شبہ کا حاکمانہ جواب......تو حق تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو حاکمانہ دیا کہ: ﴿اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ① تم نہیں جانتے، ہم حقیقت حال کو جانتے ہیں۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ خاموش ہونے سے دل کا خلجان بھی نکل گیا ہو، حاکم کے حکم سے آدمی دب کر ادباً چپکا تو ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ دل کا خلجان بھی نکل جائے۔ اس لئے دوسرا جواب حکیمانہ دیا۔

خلافتِ آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب......اور وہ یہ تھا۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ② حضرت آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کی تعلیم دے دی۔ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کے نام بتلائے۔ ان سب کی خاصیتیں بتائیں۔ اللہ کے جتنے نام ہیں وہ بتلائے، ان کے خواص و آثار بتلائے۔ تو اسماء الٰہیہ اور اسماءِ کونیہ سب حضرت آدم علیہ السلام کو بتلائے۔ اس کے بعد ملائکہ سے کہا۔ ﴿اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ③ اگر تم اپنے دعوے میں، وہ جو تمہارے دل میں دعویٰ ہے کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں، سچے ہو، ذرا چیزوں کے نام تو بتلاؤ۔

اس واسطے کہ خلافت علم سے چلتی ہے اور علم کا ابتدائی مقام یہ ہے کہ کسی چیز کا نام معلوم ہو۔ اگر نام معلوم نہ ہو تو شئی مجہول مطلق ہے۔ نام معلوم ہوگا تو شئی کو تلاش کرے گا اور اگر نام ہی معلوم نہیں تو کسی سے کیا پوچھے گا؟ اور کیا کہہ کر پوچھے گا؟ تو علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسرا درجہ ان ناموں کی مسمّیات کا ہے کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کے یہ نام ہیں۔ پھر ان کے افعال کیا ہیں؟

پھر ان کے حقائق کیا ہیں؟ اور ان کے نفوس کے اندر جذبات کیا ہیں؟ یہ چوتھا درجہ ہے علم کے بعد، علم کے بعد، علم کے بعد علم۔ علم کے درجات نکلتے ہیں مگر ابتدائی درجہ علم کا ناموں کا معلوم کرنا ہے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کو جن پر حکمرانی کروانی تھی اور جن کا نظم بندھوانا تھا ان سب چیزوں کے نام بتلا دیئے۔

ملائکہ سے کہا کہ ان کے نام تو بتلاؤ؟ ملائکہ نہیں بتلا سکے۔ اس لئے کہ جن ملائکہ کو جس نوع پر متعین کیا ہے اس کے ناموں سے تو وہ واقف ہیں، دوسرے ناموں سے واقف نہیں ہیں جو ملائکہ بارشیں لانے پر مقرر ہیں۔ وہ بارش کے احوال کو تو جانتے ہیں لیکن بقیہ دوسرے احوال کا انہیں پتہ نہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں، اعمال کی حد تک علم رکھتے ہیں، لیکن اعمال سے جو خارج چیزیں ہیں، ان کا انہیں پتہ نہیں ہے، تو ملائکہ کو ہر نوع کی اتنی ہی چیزیں معلوم ہیں جن پر انہیں مقرر کیا گیا ہے، ساری دنیا کی ساری چیزوں کے نام انہیں نہیں بتلائے گئے۔ اس لئے کہ ساری دنیا سے ملائکہ کا کوئی تعلق نہیں۔

غرض ملائکہ جواب نہیں دے سکے۔ پھر حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: ﴿یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱، سورۃ، البقرۃ الآیۃ: ۳۱.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱.

بِاَسْمَآئِهِمْ ﴾ ① اے آدم! تم چیزوں کے نام بتلاؤ''۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرفر تقریر شروع کردی۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، یہ لوٹا ہے اور یہ روٹی ہے اور اس کے یہ آثار اور اس کی یہ خاصیات ہیں، تمام چیزوں کے نام اور آثار گنوانے شروع کئے۔ جو ملائکہ کے علم میں نہیں تھے۔

اب ملائکہ خاموش ہوئے۔ اور کہا۔ ﴿سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾ ② بے شک آپ پاک ہیں۔ آپ نے جتنی چیزوں کے نام ہمارے حلقۂ عمل کے بارے میں بتلا دیئے ہیں۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے، سب معلوم نہیں۔ آدم کو تو ساری چیزوں کے نام معلوم ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزیں، زمین کی پیداوار کی چیزیں اور آسمان کے رہنے والوں کے پتے اور ان کے آثار و خواص سیارات کا پتہ، چاند سورج کا پتہ، پھر ان چاند سورج کے جو آثار ہیں ان کا پتہ، انسانی بدن کے اندر تمام اعضاء کا پتہ، معدہ کیا کام کرتا ہے۔ جگر کیا کام کرتا ہے، قلب کا کیا کام ہے، دماغ کا کیا کام ہے۔ ہر ہر چیز حضرت آدم علیہ السلام پر روشن کردی گئی جو ملائکہ پر نہیں تھی۔ آخر ہار مانی اور خاموش ہوئے اور کہا کہ سُبْحٰنَکَ، آپ پاک ہیں۔ وہ جو ہمارا خلجان تھا، اس سے آپ بری و بالا ہیں۔ بلاشبہ آپ کا انسان کو نائب بنانا برحق ہے اور آدم ہی اس کا مستحق تھا۔

لیکن ابھی ایک درجہ جواب کا اور باقی ہے۔ وہ یہ کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ہو گیا کہ آدم سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جو تمہارے اندر نہیں۔ یہ بھی جواب ہو گیا کہ آدم کے حقائق کو ہم جانتے ہیں تم نہیں۔ لیکن وہ جو کہا تھا کہ فساد ہو گا خون پھیلے گا، وہ چیز ابھی تک باقی تھی؟

حق تعالیٰ نے اس کا جواب حکیمانہ طریق پر یہ دیا کہ جہاں کوئی عمل خیر ہو اور انسان اس کے اندر جمع ہوں، ملائکہ کو حکم دیتے ہیں کہ اس مجلس کے اندر جاؤ۔ ایک جلسہ ہوا، اس میں بہت سے اللہ والے جمع ہیں، اللہ کے ناموں کا ذکر ہو رہا ہے، مسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔

تو حدیث میں فرمایا گیا۔ ''اِنَّ لِلّٰہِ مَلٰٓئِکَۃً سَیَّاحِیْنَ'' اللہ کے ہاں کروڑوں، اربوں کی تعداد میں ملائکہ ہیں جن کا کام یہی ہے کہ دنیا میں گھومیں پھریں اور دیکھیں کہ انسان کیا کام کر رہا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ ایک مجلس خیر و برکت کی ہے۔ مسائل کا ذکر ہے وہ دوڑ پڑتے ہیں اور پچھلوں کو آواز دیتے ہیں۔ ''ھَلُمُّوْٓا اِلٰی مَقْصَدِکُمْ'' دوڑو، تمہارا مقصد اس مجلس میں پورا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے پچھلوں کو بلاتے ہیں، یہاں تک کہ اس مجلس اور جلسے میں چہار طرف آسمان تک اربوں کھربوں ملائکہ کا چھت لگ جاتا ہے۔ ''غَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ'' ملائکہ اس مجلس کو ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت اس کو گھیر لیتی ہے۔ اب یہ مجلس ختم ہونے کو ہے، ختم ہوئی۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتے ہیں، جب یہ ملائکہ مجلس میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو کچھ مجلس میں ہو رہا ہے، اب یہ آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں تو ان سے حق تعالیٰ سوال کرتے ہیں اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۲.

ہیں۔مگر حکمت کے تحت سوال ہوتا ہے کہ بندوں کو کس حالت میں پایا؟

عرض کرتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں مصروف تھے۔کیا ذکر کرتے تھے؟ آپ کی جنّت کے طالب تھے اور جہنّم سے ڈرتے تھے۔فرماتے ہیں کہ جنت کو انہوں نے دیکھا ہے جو طلب کر رہے تھے یا جہنم کو دیکھ لیا ہے جو خوف کھا رہے تھے؟

عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں، آپ کے انبیاء کی زبان سے سنا ہے اور ایمانا مانا ہے کہ جنّت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق ہے۔گویا پہلا الزام تو یہ ہوتا ہے کہ تم جنت و دوزخ کو آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔اگر رات دن تسبیح میں مصروف رہو تو تمہارا کیا کمال ہے۔کمال اس انسان کا ہے کہ دیکھی ایک چیز نہیں اور پھر تسبیح وتہلیل اور ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اے ملائکہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ جتنے اس مجلس میں موجود تھے، جو مانگتے تھے، وہ میں نے دیا۔یعنی جنّت۔اور جس سے ڈرتے تھے اس میں نے انہیں بچالیا۔یعنی جہنّم۔اور میں نے ان کی مغفرت کردی۔تو ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! بہت سے تو وہ لوگ تھے جو گھروں سے قصد کر کے آئے تھے کہ اس مجلس میں شریک ہوں گے، اس جلسے میں بیٹھیں گے۔مگر بعض تماشہ بین بھی کناروں پر آ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ان کا مقصد نہیں تھا کہ اس جلسے میں آئیں۔جب قریب سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ بھئی! کیا ہورہا ہے، ہم بھی دیکھتے چلیں۔وہ کھڑے ہوگئے تو کیا وہ بھی اس مغفرت میں شامل ہیں؟

جواب میں فرماتے ہیں ''هُمُ الْقَوْمُ لَايَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ.'' اس جلسے میں بیٹھنے والی ایسی قوم ہے کہ ان کے آس پاس والا بھی محروم نہیں رہ سکتا، وہ بھی مغفرت میں شامل ہے۔سب کی مغفرت ہوگئی۔ (1)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک بڑے جلسے کی مغفرت کرنی تھی۔ہزاروں آدمی اس میں جمع تھے۔تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ آسمانوں پر چڑھیں اور ان سے سوال کیا جائے کہ بندے کیا کر رہے ہیں، وہ جواب دیں۔پھر انہیں گواہ بنایا جائے اور مغفرت کی جائے۔اور پھر ان جلسوں کو دیکھا جائے تو ایک ہی جلسہ تو نہیں۔ایک ہی وقت میں ہزاروں جلسے ہورہے ہیں۔اسی پاکستان میں آج ایک جلسہ یہاں ہے۔ہر شہر میں معلوم نہیں کتنے جلسے ہورہے ہوں گے۔

اور ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں اور پھر چڑھیں اور حق تعالیٰ سوال کریں اور مغفرت کی جائے۔پھر ایک پاکستان ہی نہیں، ہندوستان کے شہروں میں جلسے ہورہے ہوں گے۔ترکی کے لوگ ہیں وہاں بھی جلسے ہوں گے۔عرب کے لوگ ہیں، وہاں بھی ہوں گے۔دنیا میں سارے جلسوں کو لو، تو لاکھوں جلسے ہوں گے۔تو ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں۔پھر وہ اوپر چڑھیں اوران سے سوال ہو۔تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو بخش دیتے۔اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ اس طرح سے آئیں اور ان سے سوال کیا جائے اور انہیں گواہ بنایا جائے کہ تم گواہ رہو کہ ہم نے بخشش کی۔

---

(1) السنن للترمذی ،ابواب الدعوات، باب ما جاء ان لله تعالى ملائكه...... ج: ۱۲ ،ص: ۲۷ رقم ۳۵۲۴.

یہ درحقیقت ان کے خلجان کا جواب ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ انسان کی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے، یہ انسان ہی تو ہے جو ہر وقت ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔ تم نے بھی جا کے فائدہ اٹھایا۔ تو انسانی نوع میں یہ بھی داخل ہے کہ ذکر اللہ میں مصروف، مسائل سننے میں مصروف، کتاب وسنت کے احکام جاننے میں مصروف۔ تو تم نے سارے انسانوں پر کیسے حکم لگایا تھا کہ سارے ہی فسادی ہوں گے، سارے ہی مفسد ہوں گے، سارے ہی سفاک ہوں گے۔ ان میں یہ بھی تو ہیں۔ ایک لاکھ فسادی ایک طرف اور ایک صالح ایک طرف۔ اس کی وجہ سے ہزاروں کی نجات ہو سکتی ہے۔ تو انسانوں کے اندر یہ بھی تو ہیں۔ یہ جواب ہے اس کا کہ جو تمہارے دلوں کے اندر خلجان گزرا تھا۔

ملائکہ پر اتمامِ حجت...... حج جب ہوتا ہے، وہی صورت وہاں بھی ہوتی ہے۔ ملائکہ اربوں کھربوں جمع ہیں۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ۔ ''یہ بندے ننگے سر، ننگے پیر، گرد آلود، ریگستان میں پڑے ہوئے ہیں، آخر یہ کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟۔ میری ہی محبت تو انہیں کھینچ کرلائی ہے۔ اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنے حج کرنے والے ہیں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ اور آج یہ ویسے ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوئے ہیں''۔

ملائکہ پر یہ حجت تام کی جاتی ہے کہ یہی وہ انسان ہے جسے تم نے کہا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا، بڑا سفاک ہوگا۔ یہ سفاکی کر رہے ہیں؟ یہ مفسدہ پردازی کر رہے ہیں؟ ہمارے ذکر میں مصروف، ہماری اطاعت میں مصروف۔

غرض ایسے تمام مواقع میں ملائکہ بھیجا جاتا ہے تاکہ عملی طور پر جواب ہو جائے کہ تم نے جو پوری نوع پر حکم لگایا تھا کہ یہ مفسد نوع ہے خلافت کے لائق نہیں۔ سارے ایسے نہیں ہیں۔ بے شک زیادہ ایسے ہوں گے جو سفاک ہوں گے مگر ان کے اندر کم وبیش وہ بھی ہوں گے جو اللہ کا نام لینے والے ہوں گے، خدا کی یاد کرنے والے ہوں گے اور انہیں پر دنیا قائم ہے۔ ایک بھی نہ رہے تو دنیا باقی نہیں رہ سکتی۔

ذکرِ اِنسانی پر نظامِ دنیا قائم ہے...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ'' قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا دنیا میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا جب قیامت قائم ہوگی اور یہ سارا عالم درہم برہم کر دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اللہ کے نام پر قائم ہے۔ جب نام نکل جائے گا۔ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اور ختم ہو جائے گی۔ تو دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا قائم ہے اللہ کے نام لینے والوں کے اوپر، جب تک اللہ کا نام لینے والے موجود ہیں، دنیا قائم ہے۔ جب وہ مٹ جائیں گے تو دنیا ختم کر دی جائے۔ جس ملک کے اندر اللہ کا نام لینے والے باقی نہ رہیں وہ تباہی کی طرف جائے گا. اور جس ملک میں سارے ہی اللہ کا نام لیں، وہ بقاء اور ترقی کی طرف جائے گا۔ بہرحال اللہ کے نام میں ترقی ہے۔ تو جہاں کہیں بھی اللہ کا نام لینے والے جمع ہوتے ہیں تو فرشتوں کو بھیج کر انہیں جواب دیا جاتا ہے اور انہی کو گواہ بناتے ہیں کہ تم گواہ رہو، میں نے ان کی مغفرت کی۔ انہی میں سے ایک شکل یہ بھی ہے صبح اور عصر کی نماز کے وقت لاکھوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جب یہ

دن والے چڑھتے ہیں اور رات والوں کو چارج دے دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ بندوں کو کس حالت میں چھوڑا؟ عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ''اَتَیْنَاهُمْ وَهُمْ یُصَلُّوْنَ وَتَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ یُصَلُّوْنَ.'' جب ہم اعمال نامے لینے کے لئے گئے اور چارج لینے کے لئے گئے جب بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور جب صبح کی نماز میں چھوڑ کر آئے، جب بھی یہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔ تو ترک بھی ہم نے انہیں نماز میں ہی کیا اور جب ہم پہنچے جب بھی نماز ہی پڑھ رہے تھے۔ ①

گویا جواب دیا جاتا ہے کہ یہی ہے وہ انسان جس کے بارے میں تم نے خلجان ظاہر کیا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا، یہ فسدے کا کام ہے؟ کہ جب تم گئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا، جب تم چھوڑ کر آئے جب بھی عبادت میں مصرف تھا۔ یہ ملائکہ پر اس خلجان کی وجہ سے حجت تمام کی جاتی ہے۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہر عمل کی ایک خاصیّت ہے۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی استعداد اور صلاحیّت پیدا ہو جاتی ہے۔ تارکِ نماز کے اندر دیدارِ خداوندی کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔

جلوۂ خداوندی رُوحِ عبادت ہے...... اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نماز اکمل ترین عبادت ہے اور عبادت میں لطف جب ہی آتا ہے جب عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اگر معبود بالکل غائب ہو تو نماز کے اندر لطف نہیں آئے گا' نمازی اور عبادت گزار یہ کہے گا کہ ایک خیالی چیز کی عبادت کر رہا ہوں، کوئی میرے سامنے تو ہے نہیں۔ یہ خطرہ گزر سکتا تھا۔ تو اصل میں نماز کا مقصد ہی یہ ہے کہ عابد اور معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اسی لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کیا۔ ''مَا الْاِحْسَانُ یَا رَسُوْلَ اللهِ؟'' احسان کیا چیز ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: ''اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ'' ② احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم آنکھوں سے حق تعالیٰ شانہٗ کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی یہ تصوّر اور یہ دھیان باندھو کہ اللہ کے سامنے میں حاضر ہوں اور اگر تمہارے اندر اتنی قوت نہیں ہے تو کم سے کم یہ تصور رکھو کہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اس کی نگاہوں سے تم اوجھل نہیں ہو۔ غرض دیکھنا اور آمنا سامنا ہونا یہ عبادت کی روح معلوم ہوتی ہے کہ محسن اور احسان والا عبادت میں جب ہی بنے گا جب معبود کا آمنا سامنا ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ، کے بارے میں تصور کی آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں کہ معبود ہمارا سامنے ہے اور ہم اس کی عبادت کر رہے ہیں۔

دنیا میں تجلیّاتِ ربّانی کا ظہور...... زیادہ عبادت کی، قلب میں روشنی پیدا ہوئی۔ تو تجلّیات اور انوارِ ربانی سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں، تو جو آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا، ذات تو وراء الوریٰ ہے اور نفسِ ذات تو قیامت کے بعد بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اتنی لطیف، اتنی چمک اور اتنی نورانیت میں ہے کہ آنکھ کتنی

① الصحيح للبخاری، كتاب مواقيت الصلوة، باب فضل صلاة العصر، ج: ٢، ص: ٣٩٠ رقم ٥٢٢.

② الصحيح للبخاری، كتاب الايمان، باب سؤال جبريل......، ج: ١، ص: ٨٧.

لطیف بن جائے۔ مگر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ ذات بابرکات کو دیکھ سکے۔ تجلّیاتِ ربانی کو دیکھے گی، عکوس کو دیکھے گی۔ یعنی عکس خداوندی مختلف صورتوں میں سامنے آئے گا، اسے دیکھ لے گی، ذات کا دیکھنا، وہ کبھی نہیں ہوگا۔ مگر بہرحال تجلّیات وانوار سامنے آتے ہیں جو اہل اللہ کے سامنے آنے لگتے ہیں۔

تجلّیٔ اخروی...... البتہ قیامت کے دن اس تجلّی کو دیکھیں گے جو اقرب الی الذات ہے، یعنی جو ذات کے بالکل اقرب ہے۔ گویا اس کا دیکھنا ذات کا دیکھ لینا ہے۔ مگر تجلّی کو دیکھیں گے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا مقام دیدارِ خداوندی کا جنتیں ہوں گی۔

دربارِ خداوندی کا انعقاد...... حدیث میں فرمایا گیا کہ ہر ہفتہ میں۔ وہاں ہفتے تو نہیں ہوں گے مگر ایک ہفتے کی جتنی مسافت اور مقدار ہوتی ہے۔ اس میں دربارِ خداوندی ہوگا۔ اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے، ان سو کے اوپر پھر کرسی ہے۔ اس کے اوپر سمندر ہے۔ اس کے اوپر پھر عرش خداوندی ہے۔ تو کرسی گویا جنتوں کی چھت کے اوپر ہے۔ اس میں دربار ہوگا۔

آخرت میں رؤیتِ خداوندی کا مقام...... وہ دربار کہاں ہوگا؟ تو حدیث میں اس کی شرح یہ فرمائی گئی کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک دفعہ حاضر ہوئے تو ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آئینے کے بیچ میں ایک نکتہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نکتہ کیسا ہے؟ عرض کیا کہ اس کا نام مزید ہے۔ فرمایا: مزید، کیا چیز ہے؟

عرض کیا یارسول اللہ! جنت میں ایک میدان ہے جس کا نام مزید ہے اور وہ اتنا بڑا ہے کہ لاکھوں برس سے میں اس میں گھوم رہا ہوں اور اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہیں۔ اس کی ہر چیز سفید ہے، زمین سفید ہے، کنکریاں سفید ہیں، گھاس بھی سفید۔ غرض ہر چیز سفید ہے۔ تو جب جمعہ کا دن آئے گا وقت اس دربار کے لئے تیاری کی جائے گی۔ اس تمام میدان میں بیچوں بیچ تو اللہ تعالیٰ کی کرسی بچھائی جائے گی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ ① آسمانوں اور زمینوں سے کہیں زیادہ کرسی بڑی ہے، لیکن اس میدان میں جب کرسی بچھے گی تو وہ ایسی معلوم ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھوٹا سا چھلّہ ڈال دیا جائے۔ وہ بیچوں بیچ بچھائی جائے گی۔ اس کے اردگرد انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے۔ وہ نور کے منبر ہوں گے۔ ہر منبر کے پیچھے امتوں کی کرسیاں ہوں گی۔ ہر نبی کی امت اس کے پیچھے ہوگی اور کرسیاں جو ہوں گی وہ علیٰ قدر مراتب ہوں گی۔ جو عمل میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ قریب ہیں، ان کی کرسیاں منبر کے قریب اور جو عمل میں بعید تھے، کوتاہ عمل تھے، ان سے ان کی بعید۔ درجہ بدرجہ۔ ②

دربارِ خداوندی میں اہلِ جنّت کی شرکت...... جب یہ دربار کا دن آئے گا تو تمام اہلِ جنّت دربار کی شرکت کے لئے چلیں گے۔ اب یہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہوگا مگر سواریوں پر جائیں گے، تخت ہوا ہوں گے۔ وہاں کوئی مشین

① پارہ: ۳، سورۃ البقرہ، آیۃ: ۲۵۵. ② تفسیر ابن کثیر تحت قولہ تعالی ولدینا مزید، ج: ۷، ص: ۴۰۲.

نہیں ہے۔ جیٹ طیّارے نہیں ہوں گے کہ ان کی مرمت کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ قوت متخیلہ کے تابع ہوں گے۔ تخت پر بیٹھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ چلے اب وہ تخت چلنا شروع ہوا، اور لاکھوں میل کا فاصلہ وہاں کی سواریاں پل بھر میں طے کریں گی۔ کوئی براق پر سوار ہے، کوئی تختِ ہوا پر سوار ہے۔ درجہ بدرجہ مختلف سواریاں ہوں گی۔ اس میدان میں آ کر بیٹھیں گے۔ جہاں کرسیاں ہوں گی۔

پھر کرسیوں میں یہ نہیں کہ وہاں نظم کرنے والے کھڑے ہوں کہ بھئی! یہ کرسی تمہاری ہے۔ یہ سیٹ تمہاری ہے۔ وہاں نہ بیٹھ جانا یہ نہیں ہوگا۔ ہر شخص اپنی قلبی شہادت سے اپنے مقام کو پہچانے گا۔ ٹھیک اسی کرسی پر جا کر بیٹھے گا جو اس کے نام زد ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ دوسری کرسی پر بیٹھ جائے، تو تمام لوگ جمع ہو جائیں گے اور میدان بھر جائے گا۔ اس میں جو بالکل عوام ہوں گے، جن میں عملی کوتاہیاں زیادہ تھیں، تو کرسیوں کے پیچھے چبوترے ہوں گے۔ ان پر مشک وعنبر کے غالیچے ہوں گے، وہ اس پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ اب یہ پورا دربار بھر گیا بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہے۔ اب کرسی کے اوپر تجلّیاتِ ربانی کا ورود شروع ہوگا۔ جیسے احادیث میں فرمایا گیا ہے، یہ محسوس ہوگا کہ جب اللہ کی تجلّیات اتریں گی تو کرسی اس طرح چڑ چڑائے گی جیسے اب ٹوٹ کے دی، اب ٹوٹ کے دی۔ وہاں بوجھ بدن کا نہیں ہوگا۔ حق تعالیٰ بدن سے پاک ہیں۔ وہ بدن کے خالق بھی ہیں اور روح کے خالق بھی ہیں۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا۔ ان کے کمالات کا بوجھ ہوگا جس کو ارواح محسوس کریں گے۔ وہ حسّی اور جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔ تو کرسی گویا ایسے چڑ چڑائے گی جیسے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب گویا تجلیّات اتر چکی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ موجود ہیں اور انبیاء علیہم السلام ارد گرد نورانی منبروں پر ہیں اور ان کے پیچھے امتیں اربوں کھربوں اوّلین وآخرین جمع ہیں۔

دربارِ خداوندی میں شرابِ طہور کا دور...... حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ علیہم السلام کو فرمائیں گے کہ وہ جو ہم نے قرآن کریم میں وعدہ کیا تھا ﴿وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ ① ایک پاک قسم کا شربت ہم پلائیں گے، وہ ان بندوں کو تقسیم کرو۔ ملائکہ تقسیم شروع کریں گے۔ گویا شاہی دربار کی طرف سے ایک ضیافت ہوگی۔ اس کو پئیں گے۔ اس سے ایسا سرور پیدا ہوگا، اس کو نشہ تو نہیں کہہ سکتے۔ روحانی نشہ ضرور ہوگا۔ یعنی دنیا کی شراب میں تو یہ نشہ ہے کہ عقل جاتی رہتی ہے۔ آدمی مجنون ہو جاتا ہے خبطی بن جاتا ہے۔ اس شراب کے پینے سے عقل میں اور تیزی پیدا ہوگی اور معارفِ الٰہیہ اور علومِ ربانیہ اور زیادہ کھلنے شروع ہو جائیں گے۔ انوار و برکات بڑھ جائیں گے۔ تو یہ شرابِ طہور تقسیم ہوگی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوتِ مُناجات...... اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جن کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا، اتنی پاکیزہ پاک اور خوشنما آواز تھی کہ جب وہ حمد وثنا کی مُناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند وپرند سب ان کے ارد

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر الآیۃ: ۲۱.

گرد جمع ہو کر سر دھنتے تھے اور مست ہو جاتے تھے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے داؤد! ان اہلِ دربار کو وہ مُناجاتیں سناؤ جو تم دنیا میں پڑھتے تھے اور اسی اعجازی آواز سے سناؤ۔

حضرت داؤد علیہ السلام حمد وثنا کی وہ مناجاتیں پڑھنا شروع کریں گے۔ تو آواز تو معجزہ تھی ہی۔ اور وہاں میدان میں سارے اللہ والے جمع ہیں، سارے انبیاء علیہم السلام جمع ہیں۔ اربوں کھربوں ملائکہ جمع اور خود حق تعالیٰ شانہ، موجود۔ تو اس کی تاثیر کی کیا انتہا ہوگی۔ جب وہ مناجاتیں پڑھی جائیں گی تو عجیب قسم کے اس کے آثار نمایاں ہوں گے، سب بندے اس کے اندر محو ہو جائیں گے۔

جمالِ خداوندی کے دیدار کا سوال...... اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے: ''سَلُوْنِیْ مَاشِئْتُمْ'' جس کا جو جی چاہے ہم سے مانگو اور ہم سے سوال کرے بندے عرض کریں گے کون سی نعمت ہے جو آپ نے ہمیں عطاء نہیں کر دی جنت ساری نعمتوں کا مجموعہ ہے۔ وہاں نقص کا نشان نہیں۔ ہر چیز میں کمال ہے، جب آپ نے ہمیں سب کچھ دے دیا تو اب ہم کیا مانگیں؟ ہمارے تو خیال سے بھی زیادہ بلند چیزیں ہمیں مل چکی ہیں۔ اب کیا مانگیں ہمارا تو تخیل بھی نہیں جا سکتا۔

ارشاد ہوگا۔ نہیں، مانگو! جب کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب مل کر علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ تم فتویٰ دو اور مشورہ دو کیا چیز مانگیں۔ ہمیں تو سب کچھ مل چکا ہے۔ ①

تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ لوگ دنیا میں علماء سے کنارہ کشی چاہتے ہیں کہ چھوڑ دیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں بھی فتوے کی ضرورت پڑے گی۔ وہاں بھی علماء کی حاجت پڑے گی۔ علمِ خداوندی کے بغیر نہ دنیا میں کام چل سکتا ہے نہ آخرت میں کام چل سکتا ہے۔

علماء فتویٰ دیں گے کہ ایک چیز نہیں ملی، وہ مانگو۔ بے شک ساری نعمتیں مل گئیں۔ مگر ایک چیز ابھی تک نہیں ملی اور وہ یہ کہ جمالِ خداوندی کا دیدار ابھی تک نہیں ہوا۔ وہ طلب کرو۔ اس وقت بندے عرض کریں گے کہ: ''اے اللہ! اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ آپ نے سب نعمتیں دے دیں۔ مگر یہ نعمت ابھی تک باقی ہے''۔ یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔

نعمتِ مزید:..... اور حق تعالیٰ فرمائیں گے: ''اَنْ کَمَا اَنْتُمْ۔'' ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اگر یہ نہ فرما دیں تو: ''لَاَحْرَقَ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَايَيْنَ يَدَيْهِ'' اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیں۔ خود فرما دیں گے کہ ہر چیز تھمی رہے۔ اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ اور سب حجابات اٹھ کر ایک حجاب کبریائی کا باقی رہ جائے گا۔ ②

اس وقت بندوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایک تو شرابِ طہور۔ روحانی نشہ چڑھا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام

① الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، تحت قوله تعالیٰ وجوه یومئذ ناضرة، ج: ۱، ص: ۱۵۴.

② تفسیر ابن کثیر ج: ۷، ص: ۴۷.

کے مضمونوں سے معرفت کا نشہ بڑھا۔ حق تعالیٰ کا جمال دیکھ کر اتنے محو ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہے گی۔ اور یہ سمجھیں گے کہ کوئی نعمت ہی ہمیں اب تک جنت میں نہیں ملی تھی۔ آج ہمیں نعمت ملی ہے۔ اس نعمت کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''مزید'' ہے۔ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ میدانِ مزید ہے۔ اس میں وہ نعمت ملے گی جو سب کے اوپر مزید ہے۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلَدَيْنَامَزِيْدٌ﴾ ① ہم ضابطے کا اجر تو سب کو دیں گے۔ اور کچھ مزید بھی ہے جو ہم بعد میں عطاء کریں گے۔ وہ مزید یہ نعمت ہوگی۔

یومُ المزید اور اس کے آداب...... اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام ''يَوْمُ الْمَزِيْدِ'' ہے تو دنیا میں اس میدانِ مزید کی نقل جمعہ کا دن رکھی گئی ہے۔ جمعہ کا دن گویا دربارِ خداوندی کا دن ہے۔ امام اور خطیب نائبِ خداوندی ہو کر بیٹھتا ہے۔ اسی واسطے فرمایا فرمایا گیا ہے کہ کوشش کرو کہ امام کے قریب بیٹھو۔ جو جمعہ کے اندر امام کے قریب بیٹھنے کی عادت ڈالے گا۔ اسے وہاں بھی اللہ کے قریب اور انبیاء علیہم السلام کے قریب جگہ ملے گی اور جو یہاں سستی کرے گا، پیچھے رہے گا۔ وہاں بھی پیچھے رہ جائے گا۔

اسی واسطے فرمایا گیا: ''اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَاصَلٰوۃَ وَلَا كَلَامَ.'' ② جب خطبہ پڑھنے کے لئے خطیب نکل آئے تو نہ سلام و کلام کرنے کی اجازت ہے، نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے، نہ تلاوت کرنے کی اجازت ہے۔ اس وقت سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خطیب کو دیکھے۔ اگر سامنے نہ ہو تو کم سے کم اس کی آواز سے کان لگائے۔ آواز سنائی نہ دے تو استماع کرے۔ کان لگائے۔ یعنی خطیب ہی کی طرف متوجہ رہے۔ اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے۔ یہ خطبہ عام وعظوں کی طرح وعظ نہیں ہے۔ اس میں تو بات بھی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی سکتے ہیں۔ لیکن خطبہ کے آداب یہ ہیں کہ نہ کنکر سے نہ تنکوں سے کھیلو، نہ نماز پڑھو، نہ ذکر کرو۔ بس امام کو دیکھو۔ اس وقت تمہاری سب سے بڑی یہی عبادت ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا: ''مَنْ مَسَّ الْحَصَا فَقَدْ لَغَا.'' جس نے کنکری چھوئی اس نے لغو حرکت کی۔ ③ جس نے چٹائی کا کوئی تنکا چھوا، اس نے لغو حرکت کی۔ اس کا کام یہ نہیں تھا، اس کا کام یہ تھا کہ امام کو دیکھے۔ سامنے نہ ہو تو کم سے کم یہ ہے کہ ادھر آنکھ لگائے۔ آواز نہ آئے تو ادھر کان لگائے۔ غرض ہمہ تن امام کی طرف متوجہ رہے۔ جو جتنا یہاں اس توجہ کی مشق کرے گا۔ وہی میدانِ مزید میں اللہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ جو جتنا یہاں قریب ہوگا وہاں قریب ہوگا۔ جو جتنا زیادہ جمعہ میں متوجہ ہوگا، وہاں متوجہ ہوگا تو جمعہ درحقیقت اس دربارِ خداوندی کی ایک نقل ہے جو دنیا میں ہمیں دی گئی ہے۔ اس کا نام میدان مزید تھا اور دن کا نام بھی مزید، وہی نام جمعہ کے دن کا ہے۔ اسے یوم

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۵. ② علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں: غریب مرفوعاً قال البیهقی: رفعه وهم فاحش انما هو من کلام الزهری دیکھئے: نصب الرایۃ، کتاب الصلوٰۃ، باب صلاۃ الجمعۃ ج:۳ ص: ۳۶۴.

③ السنن لابن ماجه، کتاب اقامة الصلوٰۃ والسنة فیها، باب مسح الحصافی الصلوٰۃ ج:۳ ص: ۳۰۹.

المزید کہا گیا ہے کیوں کہ اجر وثواب کے اندر زیادت پیدا کرتا ہے۔

تو حدیث مجھے اس پر یاد آ گئی تھی کہ عبادت میں اصل تو یہ ہے کہ معبود سامنے ہوا سے دیکھ کر عبادت کرے۔ لیکن دنیا میں یہ چیز ناممکن ہے بلکہ ذات کا دیکھنا آخرت میں بھی ناممکن ہے۔ تجلّیات ہی کو دیکھے گا، عکس ہی کو دیکھے گا، رُوپوں کو دیکھے گا۔ ذات نگاہ کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ ﴿لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ ① ذات کے اوپر آپ کی نگاہ غالب نہیں آسکتی، نہ فتح پاسکتی ہے۔

رؤیتِ باری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک...... اسی واسطے مسلمانوں میں ایک معتزلہ کا فرقہ ہے اس نے دیدارِ خداوندی کا انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیدار وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ناممکن اور محال ہے اور اس کو عقلاً محال کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا۔

مسلکِ اہلِ حق...... لیکن انبیاء علیہم السلام اور اہلِ حق کا مسلک یہ ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ﴾ ② بہت سے تروتازہ چہرے ہوں گے جو پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ: ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ ③ کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ قیامت کے دن تمہارے اور اللہ کے درمیان حجابات آجائیں گے، تم اللہ کو نہیں دیکھ سکو گے۔ نہ دیکھنے کی دھمکی دینا جبھی ممکن ہے جب دیکھنا ممکن ہو۔ بہرحال قرآن کریم اور تمام آسمانی کتابوں کا مسلک اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مسلک یہی ہے کہ آخرت میں دیدارِ خداوندی ہوگا۔ مگر معتزلہ ایک فرقہ ہے جو اسے نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً محال ہے۔

مناظرے میں معتزلہ کی شکست...... چنانچہ مامون کے زمانے میں یہ بڑا فتنہ پھیلا۔ معتزلہ غلبہ پا گئے اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ دیدارِ خداوندی محال ہے۔ عقلاً ممکن نہیں ہے، واقعتاً تو ہوگا ہی نہیں۔ عقل بھی قبول نہیں کرسکتی۔ اس کے انہوں نے دلائل بیان کئے۔ مسلمان فتنے میں گرفتار ہونا شروع ہوئے۔ علماء نے جوابات دینا شروع کئے مگر مشکل مسئلے کا اعتراض جلد سمجھ میں آجاتا ہے اور جواب دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ دقیق مسئلہ تھا تو اعتراض تو سب کی سمجھ میں آ گیا۔ جواب سمجھ میں نہ آئے۔ فتنہ بڑھتا رہا۔ علماء عاجز آ گئے۔

آخر اس زمانے کے شیخ ہیں۔ حضرت شیخ شبلیؒ۔ ان کی خدمت میں علماء کا ایک وفد حاضر ہوا کہ حضرت! جتنا ہمارے امکان میں تھا ہم جوابات دے چکے۔ مگر وہ جوابات علمی ہیں اور عوام علم کی باتیں سمجھتے نہیں۔ اس واسطے شبہات تو ان کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ جوابات نہیں بیٹھتے۔ مگر اب ہم کیا کریں۔ اب تو اہل اللہ کچھ قلبی تصرّف و توجہ سے کام کریں تو یہ فتنہ رفع ہو۔ محض علم سے رفع نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ شبلیؒ نے فرمایا کہ: اچھا! اعلان کر دو کہ ہم معتزلہ سے مناظرہ کریں گے۔ اعلان ہو گیا۔ اور جامعہ

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۳۔ ② پارہ: ۲۹، القیامۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ③ پارہ: ۳۰، المطففین، الآیۃ: ۱۵۔

بغداد میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ اوّل تو اس لئے کہ شیخ شبلی اور وعظ کہیں۔ کبھی نہیں وعظ فرماتے تھے۔ ایک نئی چیز معلوم ہوئی کہ شیخ کبھی مجمع میں وعظ کہنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ آج وعظ فرمائیں گے، تو لاکھوں لوگ جمع ہوئے۔

دوسرے یہ کہ نام مناظرہ کا تھا اور مناظرہ درحقیقت جھگڑا ہے۔ چاہے وہ علمی ہی سہی۔ عوام کو جھگڑوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کوئی سکون کی بات ہو کوئی نہیں جائے گا اور جھگڑا ہو تو ہزاروں وہاں پہنچ جائیں گے۔ تو لوگوں نے کہا کہ آج مناظرہ اور بحث ہوگی۔ بڑا تماشہ ہوگا۔ غرض لاکھوں آدمی جمع ہوگئے۔

منبر بچھایا گیا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھ گئے۔ معتزلہ کے جتنے علماء تھے وہ قطار باندھ کر سامنے بیٹھ گئے۔ تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تمہارا دعویٰ کیا ہے؟ معتزلہ نے کہا کہ دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ اللہ کا دیکھنا ناممکن ومحال ہے۔ کبھی نہیں ہوسکتا۔ عقل گوارا نہیں کرتی، عقلاً محال ہے''۔

تو اہل اللہ پر حقائق روشن ہوتے ہیں۔ وہ لفظوں کی گرفت سے تھوڑا ہی گرفت کرتے ہیں۔ وہ لمبی تقریریں تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ وہ چٹکی میں ضمیر کو تھام لیتے ہیں۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے دومنٹ میں فیصلہ کر دیا۔ سارے مناظرے ختم ہوگئے۔

''معتزلہ سے پوچھا کہ تمہارے دلائل اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم تمہارے دل سے بات پوچھنا چاہتے ہیں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے اللہ کو دیکھنے کو؟'' سب نے کہا دل تو چاہتا ہے۔

فرمایا: یہ دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ اس لئے محال کو دیکھنے کی تمنا کبھی قلب کے اندر نہیں آسکتی۔ اسی چیز کو دیکھنے کی تمنا آئے گی جس کو دیکھا جانا ممکن ہو۔ کبھی آدمی تمنا نہیں کرے گا کہ میں کان سے دیکھ لوں۔ اس لئے کہ کان کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں۔ آنکھ سے ہی دیکھنے کی تمنا کرے گا۔ کبھی یہ تمنا نہیں کرے گا کہ میں زبان سے آواز سن لوں زبان چکھنے کے لئے ہے۔ آواز سننے کے لئے نہیں۔ اس کے لئے کان ہیں۔ تو کان سے سننے کی اور آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھنے کی تمنا کرے گا۔ یہ نہیں کرسکتا کہ آنکھ کا کام زبان سے لینے لگے اور زبان کا کام آنکھ سے لینے گئے یہ دل میں آتا ہی نہیں۔

تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب تمہارے دل میں تمنا ہے کہ ہم اللہ کو دیکھیں تو تمنا اور دل کے اندر ہونا، اس کی دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ جس کا دیکھا جانا محال ہو کبھی اس کے دیکھنے کی تمنا دل میں نہیں آسکتی۔ تو امکان تمہارے ضمیر سے ثابت ہوگیا اور وقوع پیغمبر کی خبر سے ثابت ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا کیا اعتراض ہے؟

اب وہ چپ چاپ بیٹھے۔ وہ تو ان کا دل پکڑا گیا۔ سارا قصہ ختم ہوگیا۔ ساری بحث ختم ہوئی اور فتنہ ایک منٹ میں ختم ہوگیا۔ بہرحال مقصد یہ تھا کہ دیدارِ خداوندی کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہے کہ میں اپنے معبود کو دیکھوں۔ اسی تمنا میں وہ نمازیں پڑھتا ہے۔ اسی تمنا میں وہ عبادتیں کررہا ہے۔

دیدارِ خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی...... یہاں عقیدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے، اور آگے بڑھا تو خواب کی آنکھ

سے دیکھتا ہے، اور آگے بڑھا تو کشف کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ موت کے بعد جب آگے بڑھے گا تو پھر اس آنکھ سے دیکھنا شروع کر دے گا تو درجہ بدرجہ اس کا ابھی سے دیدار شروع ہو گیا ہے۔ نماز کے اندر تصوّر اور عقیدے سے دیکھنا، یہ دیکھنے کی ابتداء ہے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ چیز آنکھ کے سامنے آجائے گی۔ جو دل میں جم جاتی ہے۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ اگر آپ تصور سے کوئی چیز دل میں جمالیں تو چند دن کے بعد وہ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آئے گی۔ ایک بزرگ سے کوئی صاحب بیعت ہوئے۔ شیخ نے انہیں بیعت کر لیا اور ذکر، شغل بتلا دیا۔ محنت بھی کی، مجاہدے بھی کئے۔ مگر یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی کہ ہر چیز سے کٹ کے توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ بہت علاج کئے مگر یہ نہیں ہوتی تھی۔

تو شیخ نے کہا تمہیں کسی چیز سے محبت بھی ہے؟ اس نے کہا جی! مجھے بھینس سے محبت ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ فرمایا اچھا بیٹھ کر چلہ کرو۔ چالیس دن بھینس کا تصوّر کرو۔ چلّہ کرایا۔ وہ حجرے میں بیٹھ گئے۔ طبعیت کا میلان تو بھینس کی طرف تھا ہی۔ تصوّر کیا تو وہ دل میں جمنے لگی۔ چالیس دن کے بعد شیخ گئے اور فرمایا. باہر آؤ۔ دروازہ کھولا۔

اس نے کہا باہر کیسے آؤں۔ بھینس کھڑی ہوئی ہے۔ راستہ رکا ہوا ہے۔ حالانکہ نہ بھینس تھی نہ کچھ تھا۔ مگر دل میں بھینس اتنی جم گئی تھی کہ آنکھوں سے وہی نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ بھینس دروازہ روکے کھڑی ہے۔ تو یہ ایک فطری چیز ہے کہ جو چیز آدمی کے دل میں جم جاتی ہے وہ مصوّر ہو کر آنکھ کے سامنے آنے لگتی ہے۔

تو جب دل میں جمائیں گے کہ میں اپنے پروردگار کو دیکھ رہا ہوں اور عقیدے کی آنکھ سے دیکھیں گے اور پھر ترقی کر کے خواب میں دیکھنے لگیں گے۔ تو ایک وقت آئے گا کہ اس آنکھ سے بھی اللہ کا دیدار ہو جائے گا۔ جس درجہ میں بھی ہو۔ بہر حال دیدار ہو گا۔ تو اصل نماز تو وہاں ہو گی۔

روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ...... جیسے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب آدمی انتقال کرتا ہے تو اس کی روح کو آسمانوں کی طرف چڑھا دیا جاتا ہے۔ صالح آدمی ہے تو لاکھوں ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو اس کی روح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ آسمان اوّل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کے ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگلا آسمان آیا تو اس کے دروازے کھلتے ہیں تو وہاں کے ملائکہ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اس جلوس کے ساتھ وہ عرش کے نیچے پہنچتی ہے اور وہاں جا کر سجدہ کرتی ہے۔ تو وہ سجدہ جو عینِ عرش کے سامنے ہے، مرنے کے بعد نصیب ہو گا مرنے سے پہلے مشکل ہے۔

دنیوی جذبات کا برزخ میں ظہور...... جس کے دل میں نماز کی لو لگی ہوئی ہے وہ برزخ میں بھی نماز کی لو لے کر جائے گا، حشر میں بھی نماز کا جذبہ لے کر جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب میّت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو دو ملائکہ آ کر اس سے سوال کرتے ہیں، وہ پوری زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور تین سوال ہوتے ہیں۔ مَــــنْ

رَّبُّکَ؟ تیرا رب کون تھا؟ وَمَادِیْنُکَ ؟ تیرا دین کیا تھا؟ وَمَنْ هٰذَا الرَّجُلُ؟ اور یہ کون ہے؟ ①

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ: میت کو ایسا متمثّل ہوتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے۔ مغرب کا وقت قریب ہے۔ حالاں کہ سورج وہاں نہیں ہوتا۔ مگر وہ وقت کی صورتِ مثالی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ملائکہ یہ پوچھتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ وہ کہتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ میاں پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ غروب ہو جائے گا تو میری عصر کی نماز قضا ہو جائے گی۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے کیا رب کا سوال کرتے ہو۔ یہ تو رب پر اتنا مٹا ہوا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔ دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جواب سچا دے گا مگر ہماری تو ڈیوٹی ہے، ہمیں تو ادا کرنی ہے، سوال کرنا ہی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جواب حق دے گا۔

مگر دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ یہ کون کہے گا؟ جسے دنیا میں نماز کی عادت ہوگی۔ اور جو دنیا میں ٹلاتا رہتا ہے اسے دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس کے لئے تو دنیا میں روز وقت تنگ ہوتا تھا تو نہ نماز کا تھا نہ روزہ کا۔ تو دنیا میں جس چیز کی مشق کر لیں گے وہی سامنے آئے گی۔ جس چیز کی عادت ڈال لیں گے آخرت میں وہی متمثّل بنے گی۔ ②

دنیوی جذبات کا آخرت میں ظہور...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے۔ اگر لہو ولعب، کھیل کود اور مختلف عیش و آرام کی حالتوں میں زندگی گزاری ہے، موت کے وقت بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا اور قبر سے اٹھے گا تب بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا۔

اور اگر اللہ کے ذکر اور اس کے نام لینے میں اور اس کے فرائض کے ادا کرنے میں زندگی گزاری ہے۔ وہی جذبہ موت کے وقت رہے گا کہ کسی طرح میری نماز قضا نہ ہو۔ کسی طرح میرا اور داور وظیفہ قضا نہ ہو۔ اور جب قبر سے اٹھے گا وہی جذبہ ہوگا کہ کہیں میرا اور د قضا نہ ہو جائے، بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ میدانِ محشر ہے۔ مگر وہ یہی سمجھے گا کہ یہ دنیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہہ رہا تھا اور اتفاق سے اونٹ سے گر پڑا اور موت واقع ہوئی تو قیامت کے دن جب اٹھے گا تو لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ اس کی زبان پر جاری ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ میں میدان عرفات میں ہوں۔ بعد میں اس پر کھلے گا کہ یہ میدانِ محشر ہے۔ میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر جذبہ وہی رہے گا جو دنیا میں پیدا کیا تھا۔ تو موت حقیقت میں قاطع نہیں ہوتی کہ کسی چیز کو قطع کر دے۔ متمّم اور مکمل ہوتی ہے، جو دنیا کی زندگی کے جذبات ہیں ان کو حد کمال تک پہنچا کر نفس کا جوہر بنا دیتی ہے۔ تو جس حالت پر زندگی گزرے گی اسی

① السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی المسالة فی القبر، ج:۳، ص:۳۶۷، رقم:۴۱۲۷.

② السنن لابی داؤد کتاب الجنائز، باب فی المسالة فی القبر، ج:۳، ص:۳۶۷، رقم:۴۱۲۷.

حالت پر موت آئے گی اور جس حالت پر موت آئے گی اسی حالت پر حشر ہوگا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں جب نماز کی عادت تھی اور وقت ٹلا کر پڑھنے کی نہیں تھی، بروقت پڑھنے کی تھی وقت ٹلنے لگا اور تنگ ہونے لگا تو پریشانی اور اضطراب ہوتا تھا کہ کہیں میری نماز قضاء نہ ہو جائے۔ وہی قبر میں کہے گا دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پرے کو ہٹو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ جسے دنیا میں عادت نہیں تھی وہ وہاں بھی نہیں کہے گا اور آخرت میں بھی یوں ہی جذبہ رہے گا۔

سایۂ عرش میں اشتیاقِ نماز ...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ، جو پوری جماعتِ دیوبند کے شیخِ طریقت ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے دن پوچھا کہ امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ ''یا اللہ! نہ مجھے جنّت کی ضرورت ہے، نہ حوریں مطلوب ہیں، نہ محلات مطلوب ہیں، نہ باغات مطلوب ہیں۔ مجھے تو اپنے عرش کے نیچے ڈیڑھ گز کی جگہ دے دیجئے کہ کھڑا ہو کر نماز پڑھتا رہوں''۔ اللہ سے میں یہ مانگوں گا۔ تو اہل اللہ کو نماز میں وہ لطف میسر ہوتا ہے کہ سلطنتیں بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہیں مگر نماز چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

لطفِ نماز ...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جُعِلَ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ'' ① ''نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے''۔ نماز پڑھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ دل میں سرور اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال نماز ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے دل میں سرور اور فرحت اور دیدارِ خداوندی کی صلاحیت اور دیدار کی تڑپ کہ کسی طرح میں اپنے معبود کو دیکھ لوں، پیدا ہوتی ہے۔ یہ نماز کی خاصیت ہے۔

تو ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسنِ معاشرت پیدا ہو، ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں۔ ایک زکوٰۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کا رذیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے، تو عبادات میں اللہ تعالیٰ کو خاص تعلق نماز ہی سے ہے۔

حقیقی عبادت ...... حقیقت میں اگر حقیقی عبادت ہے تو نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اس لئے کہ عادت کے معنی عبادت تذلّل کے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے انتہائی ذلّت اختیار کرنا۔ کیوں کہ اللہ کی ذات وہ ہے کہ انتہائی عزت میں ہے کہ عزت کا کوئی مقام نہیں ہے کہ اس کے پاس نہ ہو۔ اس لئے اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے، جو بندہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش نہ کردے۔

اب ظاہر بات ہے کہ زکوٰۃ ہے اس میں غایت تذلّل کہاں ہے؟ زکوٰۃ میں تو آپ غریب کو عطاء کرتے

① السنن للنسائی، کتاب العشرۃ، باب حب النساء، ج: ۱۲، ص: ۲۷۷، رقم: ۳۶۷۷.

ہیں۔تو عطاء کرنا تو اللہ کی شان ہے۔آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مشابہت پیدا کررہے ہیں۔وہ بھی معطی ہے۔آپ بھی عطا کررہے ہیں، تو اس میں ذلت کیا ہوئی؟ یہ تو عین عزت کی چیز ہوئی۔جب اس میں ذلت کا نشان نہیں تو عبادت کیسے بنی؟

آپ روزہ رکھتے ہیں، کھانا چھوڑ دیا پینا چھوڑ دیا، بیوی چھوڑ دی۔یہ تو حق تعالیٰ کی شان ہے کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری۔یہ اللہ کے ساتھ مشابہت ہوئی۔اس میں ذلت کہاں ہے۔یہ تو عین عزت کا مقام ہے۔غرض روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں، اس میں غایت تذلل ہی نہیں۔لیکن نماز وہ ہے کہ اول سے لے کر اخیر تک سوائے اظہارِ ذلت کے اور کوئی چیز نہیں۔

ابتداء آپ نوکر چاکروں کی طرح سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور غلاموں کی طرح گردن جھکا دیتے ہیں۔یہ ذلت کا ابتدائی درجہ ہے جو آپ اپنے رب کے سامنے پیش کررہے ہیں۔اس کے بعد آگے بڑھے۔سر جھکایا، رکوع کیا۔اس میں پہلے سے بھی ذلت کا بڑا درجہ ہے۔اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ ناک اور پیشانی زمین پر رگڑتے ہیں جو انتہاء ذلت کا مقام ہے، اس کے بعد پھر اور ہے کہ آپ تشہد میں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں کہ یا اللہ مجھے یہ دے۔بھیک مانگنا سب سے زیادہ ذلت کی چیز ہے۔تو نماز میں جتنے افعال ہیں، قیام ہو، رکوع ہو، سجدہ ہو، تشہد ہو سب میں اپنی نیاز مندی اور ذلت کا اظہار ہے۔اس لئے حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔دوسری چیزیں دوسری وجوہ سے عبادت بنی ہیں۔زکوٰۃ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔پھر کیوں عبادت بنی؟ تعمیلِ حکم کی وجہ سے۔حکمِ خداوندی ہے کہ زکوٰۃ دو۔تعمیل کی۔تو تعمیل ارشاد کی وجہ سے یہ عبادت بن گئی۔

روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے، تعمیلِ حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا ہے۔حکم ہے کہ روزہ رکھو۔تعمیل کی وجہ سے عبادت بن گیا۔لیکن نماز اپنی ذات سے عبادت ہے، اس لئے کہ جتنی ہیئتیں ہیں، سب اظہارِ ذلت کی ہیں۔

پھر نماز کے اندر جو بھی آپ پڑھیں گے تسبیح وتہلیل میں، یا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہے یا اپنی فدویت کا اظہار۔یا اللہ کی عظمت کا اظہار کریں گے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ② یوم الدین کا مالک ہے، یا اپنی فدویت کا اظہار ہے کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ③ ہم آپ ہی کی عبادت کریں گے اور ہم تو آپ ہی سے مانگتے ہیں۔غرض یا تو اللہ کی عظمت کا اظہار یا اپنی ذلت کا اظہار۔اس کے سوا نماز میں اذکار ہوں یا اعمال ہوں، سب کی یہی حیثیت ہے۔تو حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو وہ نماز ہے۔دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادتیں بنی ہیں۔یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔تو ظاہر بات ہے کہ عبادت کرنے والے عابد کا جذبہ ہوگا کہ معبود میرے سامنے ہو تا کہ میں دیکھوں میں جس کی عبادت کررہا ہوں۔تو یہ جذبہ لے کر کھڑا ہوا ہے۔

①②③ سورة الفاتحة الآية: ۱، ۴.

جذبۂ عبادت کی تسکین......اللہ نے اس جذبے کی تسکین کا سامان کر دیا کہ دنیا گندی جگہ ہے۔ دیدارِ خداوندی یہاں نہیں ہوسکتا۔ تو عقیدے کی آنکھ سے اللہ کو دیکھو، دل میں یقین کے ساتھ تصوّر باندھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم مزید روشنی دیں گے کہ تمہارے اوپر کچھ انکشاف ہوگا، انوارِ ربّانی کچھ نظر پڑنے لگیں گے۔ اس کے بعد میں اور انکشاف ہوگا۔ آنکھوں سے بھی تجلّیاتِ الٰہیہ دنیا میں نظر آسکتی ہیں۔ اس کے بعد مزید انکشاف ہوگا۔ مگر وہ موت کے بعد قیامت کے دن ہوگا کہ ذات کے ہم پلہ تجلّی سامنے آئے گی اور بندے آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ تو نماز کی ایک خاصیت ہے تو بات اس پر چلی تھی کہ دواؤں کی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔ اسی طرح سے عبادات کی بھی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔

مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر......اور جیسے دواؤں میں ایک مقدار ہے جو فن دان طبیب مقرر کرتا ہے کہ یہ دوا تین ہی ماشے ہوگی اور یہ ایک تولہ ہوگی۔ ایسے ہی تسبیحات کے عدد بھی شارع علیہ السلام نے متعین کئے ہیں کہ رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہو تو کم سے کم تین مرتبہ ہو۔ تین سے کم نہ ہو۔ پانچ دفعہ کہہ لو۔ سات دفعہ کہہ لو۔ مگر تین سے کم سنّت کے مطابق نہیں ہوگا۔ تو مقدار تین بتلائی گئی۔ اسی طرح "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کم سے کم تین دفعہ۔ فاتحہ پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں تو سورت پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں، تشہد میں درود شریف پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں تو ہر چیز میں کہیں تکرار ہے، کہیں تکرار نہیں۔ جہاں تکرار ہے وہاں عدد معیّن ہے کہ اتنے عدد میں پڑھو۔ دو دفعہ یا تین دفعہ۔

اسی طرح نمازوں کی رکعات کے اعداد متعین کر دیئے، صبح کی نماز دو رکعت کی، مغرب کی نماز تین رکعت کی، بقیہ نمازیں چار چار رکعت کی۔ تو کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ کہے کہ یہ چار رکعت والی کی پانچ رکعات کیوں نہ کر دیں؟ اور تین والی کی دو دو رکعات کیوں نہ کر دیں؟

جو جواب طبیب دنیا میں فن کی رو سے دے گا کہ جو مقدار فن کی رو سے ضروری ہے وہی میں لکھوں گا، مریض کو کمی زیادتی کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہی انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جواب ہے کہ اللہ نے یہ اذکار کی دوائیں مقرّر کی ہیں۔ اس کی مقداریں بھی خود مقرر کی ہیں۔ ہمیں اس میں کمی یا زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جتنی مقدار آئے گی اتنی استعمال کریں گے۔ زیادہ کریں گے، ہلاکت واقع ہوگی۔ اگر کوئی ظہر کی نماز پڑھے اور یہ خیال کرے کہ نماز تو اچھی چیز ہے، لاؤ آج آٹھ یا بارہ رکعات پڑھ لوں۔ وہ منہ پر ماردی جائے گی اور ہلاکت کے قریب ہو جائے گا۔ حالاں کہ اس نے زیادتی ہی تو کی ہے۔ مگر زیادتی بھی ناجائز، کمی بھی ناجائز۔ یہ مقدار شارعِ حقیقی کی طرف سے معین ہے، وہی مقدار رکھنی پڑے گی۔ اس واسطے جب مجموعۂ شریعت پر عمل ہوگا پھر روحانی صحت کامل نصیب ہو جائے گی۔ جیسا کہ گل بنفشہ پیا تو زکام دفع ہو گیا۔ ملٹھی کھائی تو کھانسی رفع ہو گئی، یاقوتی کھائی تو دماغ میں طاقت پیدا ہو گئی، مفرح بارد کھایا تو قلب میں فرحت پیدا ہو گئی اور اگر ان ساری چیزوں کا مجموعہ معجون مرکب بنا

کر کھاؤ تو صحت کامل بن جاتی ہے۔ یہی صورت شریعت کی ہے کہ الگ الگ اعمال کی بھی خاصیتیں ہیں اور مجموعۂ شریعت کو استعمال کرو تو مکمل طریق پر روحانی صحت حاصل ہوگئی تو آدمی چاق و چوبند ہوگا۔

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ہماری اور آپ کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی شریعت کے اتباع پر موقوف ہے۔ ہم اور آپ سب مریضانِ نفوس ہیں۔ کوئی شہوتوں میں گرفتار ہے، کوئی شبہات میں گرفتار ہے، کسی میں عقائد کی خرابی ہے، کسی میں کبر کی خرابی، کسی میں عمل کی خرابی ہے، ان ساری چیزوں کو رفع کرنے والی چیز قرآن و حدیث اور شریعت ہی تو ہے، جب آپ سب کو استعمال کریں گے تو نہ عقائد کا فتنہ باقی رہے گا، نہ عمل کا فتنہ باقی رہے گا، کوئی روگ باقی نہیں رہے گا۔ سلامتی پر آ جائیں گے۔

علم و عمل کی بنیادیں...... جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ. لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِيْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا. كِتَابُ اللهِ وَسُنَّتِيْ“ ① میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہو گے۔ اور وہ دو وزنی چیزیں کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور میری سنّت۔ یعنی میرا اسوۂ حسنہ۔

علم حاصل کرو قرآن سے اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ برکات سے حاصل کرو۔ علم و عمل جب درست ہوگا تو علمی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے۔ جو عقائد کو برباد کرتے ہیں اور عملی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے جو اتباعِ سنت کو برباد کرتے ہیں اور منکرات و بدعات میں لوگوں کو مبتلا کرتے ہیں۔ تو منکرات و بدعات ختم نہیں ہوسکتیں جب تک سنت طریقہ سامنے نہ رکھا جائے، علمی فتنے اور شہادت ختم نہیں ہوسکتے۔ جب تک قرآن کو سامنے نہ رکھا جائے۔ انہی دو کے مجموعے کا نام شریعت ہے، شریعت کی یہی دو بنیادیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، تو ایک سے علم حاصل کرو، ایک سے عمل حاصل کرو، ایک سے فکر صحیح کرو، ایک سے اخلاق درست کرو، اخلاق و کمالات کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

اعمالِ صالحہ کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، علوم کاملہ کا مجموعہ قرآن کی ذات ہے۔ ان دونوں ذاتوں کو اگر آپ ہاتھوں میں تھام لو تو کبھی فتنے میں گرفتار نہیں ہو گے، جب مسلمان تباہ ہوئے ہیں، انہیں دو چیزوں کے ترک کرنے سے تباہ ہوئے ہیں، جب ان دو کو اختیار کرلیا۔ جب ہی نجات پا گئے اور عروج پا گئے۔

بہر حال یہ چند کلمات میں نے عرض کئے، میں تو بہت تھوڑی دیر چاہتا تھا، کچھ دماغ میں قوت نہیں تھی، اور صلاحیت بھی نہیں رہی تھی ضعف بھی بہت تھا۔ مگر خیر بات بڑھ گئی۔

صدقِ طلب...... تو مقصدِ اصلی یہ تھا کہ اتباعِ شریعت کو اصل سمجھا جائے۔ اتباعِ سنّت کو اصل سمجھا جائے۔ اس کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے۔ وہ معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر آپ خود عالم ہیں تو اپنے علم کی روشنی

---

① مؤطا امام مالک، كتاب الجامع، باب النهي عن القول بالقدر ج:۵ ص: ۳۷۱.

میں آپ سنت کی پیروی کریں۔ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو قرآن کریم نے طریقہ بتلایا کہ: ﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ① تم اگر نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔ اور ان سے سوالات کر کے، استفتاء کر کے فتویٰ لو۔

پھر اس کے اوپر چلو۔ تو یا اپنے علم پر چلو یا دوسرے کے علم پر اعتماد کر کے اس سے پوچھ پوچھ کر چلو۔ اگر دل کے اندر تڑپ رہے گی تو یا خود علم حاصل کر کے یا علم والوں سے پوچھ کر چلنے پر مجبور ہوں گے اور اگر دل میں طلب نہیں ہوگی تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ پانی کی تلاش زیادہ مت کرو۔ اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس پیدا ہوگئی تو پانی خود آپ کے پاس آجائے گا۔ پیاس ہی نہیں، طلب ہی نہیں۔ جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر اقبال مرحوم جو ''شکوہ جواب شکوہ'' ان کی مشہور نظم ہے، اس میں ایک موقع پر کہتے ہیں۔

راہ دکھلائیں کسے ، رہروِ منزل ہی نہیں

ہم تو راہ دکھلانے کے لئے موجود ہیں۔ مگر کوئی چلنے والا بھی تو ہو؟

راہ دکھلائیں کسے ، رہروِ منزل ہی نہیں ـــ جس سے تعمیر ہو آدم کی، وہ گل ہی نہیں

وہ مٹی ہی باقی نہیں رہی جس سے آدمی کی تعمیر ہوتی تھی، خدا جانے لوگوں میں مٹی کہاں کہاں سے آگئی ہے کہ اتباع شریعت، اتباع سنت اور اتباع دین کا کوئی رجحان نہیں آرہا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی ہی خراب ہوگئی ہے کہ

جس سے تعمیر ہو آدم کی، وہ گل ہی نہیں

تو خوب کہا ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ـــ راہ دکھلائیں کسے، رہر منزل ہی نہیں

حدیث میں ہے کہ روزانہ حق تعالیٰ کی تجلّیات آسمانِ دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں، جیسا ہاتھ ان کی جناب اقدس کے لائق ہے اور فرماتے ہیں: ''اَنَا الرَّازِقُ! مَنْ ذَالَّذِیْ یَسْتَرْزِقُنِیْ اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَالَّذِیْ یَسْتَغْفِرُنِیْ'' ② ''میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت کا طلب کرنے والا؟''

اخیر شب میں تہائی رات میں طلوع فجر تک آوازیں لگتی رہتی ہیں۔ جن کو اللہ توفیق دیتے ہیں وہ مانگتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں۔ ورنہ ہم جیسے پڑے ہوئے سوئے رہتے ہیں۔ تو یہی کہا جائے گا کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ـــ راہ دکھلائیں کسے رہرِ منزل ہی نہیں

اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اتباع شریعت اور اتباع سنت آسان ہو جائے گا اپنے اندر پیاس پیدا کرلو۔ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم متبع بن کر رہیں، مبتدع اور مخترع بن کر نہ رہیں کہ ایجاد کر کے رواج کو دین بنا دیں۔ جو رواج

① پارہ:۱۷،سورۃ الانبیاء،الآیۃ:۷. ② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃؓ ج:۱۵ ص:۲۳۷.

پڑ گیا وہی دین جو رسم پڑ گئی وہی دین بلکہ ہر معاملہ میں دیکھوں کہ اللہ کے رسول نے کیا فرمایا۔ اس کے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا کیا عمل تھا۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے تعامل سے ثابت ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو، اس پر چلو، جو بے غل وغش راستہ ہے، شادی ہو، بیاہ ہو، غمی ہو، خوشی ہو، ہر ایک میں دیکھو کہ میرے پیغمبر نے اس کے اندر کیا نمونہ دکھلایا ہے، اس کے مطابق کرو۔ اس میں کوئی گھاٹا نہیں، کوئی خسارہ نہیں۔ آسان راستہ ہے، حقیقت میں دنیا طلبی مشکل ہے۔ دنیا میں جھگڑوں میں پڑ کر ہزاروں طوق وسلاسل آپ نے اپنے گلے میں ڈال لئے ہیں اور اپنے کو گویا زنجیروں میں باندھ لیا۔ شریعت ان زنجیروں کو کھولنے کے لئے آئی ہے کہ آزادی اور سہولت کے ساتھ عمل کر کے دنیا بھی کما لو اور اللہ تک بھی پہنچ جاؤ۔ اس لئے میں نے یہ چند جملے عرض کئے کہ

آب کم جو تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو۔ پیاس پیدا کرو۔ پانی خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ اتباعِ حق، شریعت پر عمل کرنے اور آخرت کی نجات کی پیاس ہونی چاہئے، اپنی موت کو یاد کرو۔ اس عالم کے ختم ہونے کو یاد کرو، تو جب ایک دن ختم ہونا ہے تو ایک دن جواب وہی کا بھی آنا ہے۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو تیاری کی ضرورت ہے۔

حکیمانہ بات...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی حکیمانہ بات فرمائی اور انبیاء علیہم السلام سے زیادہ حکیمانہ بات کہہ کون سکتا ہے۔ فرمایا: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمِقْدَرِ بَقَآئِکَ فِيْهَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِيْهَا'' ''دنیا کے لئے اتنا کام کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے''۔ یہاں چند دن رہنا ہے تو تھوڑا کام بھی کافی ہے، وہاں ابد الآباد تک رہنا ہے تو بہت سے کام کی ضررت ہے۔

احترامِ جلسہ...... بہر حال یہ چند جملے میں عرض کئے۔ ہمت اور طاقت تو تھی نہیں، مگر جلسے کے احترام نے مجبور کیا۔ اب جب لوگ جمع ہوں، لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا جائے اور ایک شخص کو لا کر بٹھلا دو اور تواضعاً یہ بھی کہہ دیں کہ ہم بالکل تقریر کرنے کی درخواست نہیں کرتے، چاہے۔ آپ تقریر کریں چاہے نہ کریں۔

یہ بڑے عمدہ پیرائے میں تقریر کے لئے مجبور کرنا ہے، جب ہیئتِ جلسہ کی بن گئی، لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا گیا تو آدمی جھک مارے گا اور تقریر کرے گا۔

آپ تو بری ہو گئے کہ دیکھئے ہم نے تو فرمائش نہیں کی تھی، نہ مجبور کیا تھا۔ آپ دعا کر کے اٹھ جاتے، ہم اس پر بھی راضی تھے۔ مگر ہیئت ایسی بنا دیں کہ میں کچھ عرض کرنے پر مجبور تھا۔ ارادہ تھوڑا تھا، مگر بہر حال ہو گیا کچھ زیادہ۔ بہر حال نفع ہی کی چیزیں بیان ہوئی۔ مسائل ہی علم میں آئے۔ اب دعاء کر لیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ، توفیق عطا فرمائیں۔ اپنی مرضیات پر چلائیں۔ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ ہمارے دلوں میں دین کی محبت عطا فرمائے۔ ہمارے دلوں کے اندر موت کی یاد اور قیامت کی حاضری کا جذبہ رہے اور حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا جذبہ تازہ رہے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ. اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ. بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

۲۱ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ جمعۃ المبارک

آدابِ دعاء

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!......فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

سیّدالایّام...... بزرگانِ محترم! اتنا وقت نہیں ہے کہ کوئی مستقل مضمون شروع کیا جائے۔ جمعہ سے قبل جو تھوڑا سا وقت ہے۔اس میں چند مختصر باتیں منتشر طریق پر گزارش کرنی ہیں۔جس وجہ سے ہم جمع ہیں وہ جمعہ ہے۔تو جمعہ نے موضوع متعین کر دیا۔ جمعہ ہی کے متعلق چند باتیں عرض کر دی جائیں گی۔

جمعہ کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ یہ سیّدالایّام ہے۔یعنی تمام دنوں کا سردار اور تمام دنوں کا بادشاہ یہ دن گنا گیا ہے۔اور اس کو"عید المومنین" بھی فرمایا گیا ہے۔

شانِ جامعیت......"جمعہ" لغتِ عرب میں اس کا مادّہ جَمْعٌ ہے۔یعنی جمعہ کے اندر جمع کرنے اور جامعیّت کی شان موجود ہے۔کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کر دیتا ہے۔اس لئے اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔جب سے اللہ نے اس دن کو پیدا کیا۔اس دن سے اس کا کام برابر یہی ہے کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کرتا رہتا ہے۔جتنے بڑے بڑے کام اور عظام امور دنیا میں پیش آئے ہیں، جُمعہ، ہی کے دن پیش آئے اور سب میں جمعیت کی شان موجود ہے۔

اجزائے انسان کی جمعیّت......سب سے پہلے اسی دن میں انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کیا گیا، جن سے انسان تیار کیا گیا۔حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو جمعہ ہی کے دن حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

زمین کی مٹی میں سے ہر ہر موقع سے اجزاء جمع کر کے ایک مٹھی بھر کر لے آؤ تا کہ میں ایک نئی مخلوق تیار

---

① پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۹.

کروں۔اس کا واقعہ طویل ہے وہ سنانا مقصود نہیں ہے۔ جبریل علیہ السلام پہنچے اور زمین نے معذرت کی کہ میں اپنے اجزاء نہیں دینا چاہتی کہ میرے ذریعے ایسی مخلوق تیار ہو جو جہنم میں جلائی جائے۔ تو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مصیبت میں کیوں گرفتار ہوں۔ اس لئے آپ مجھے معاف کریں۔ انہیں رحم آیا اور چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام بھیجے گئے، ان کے سامنے بھی زمین نے معذرت کی اور فریاد کی۔ انہیں بھی رحم آیا، وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے، حضرت میکائیل علیہ السلام بھیجے گئے، انہیں بھی رحم آ گیا، وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے عزرائیل علیہ السلام ملک الموت بھیجے گئے۔ ان کے سامنے بھی زمین نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا تیری فریاد کے سننے کی بہ نسبت مالک کا حکم ماننا زیادہ اونچی چیز ہے۔ اللہ کا مجھے یہ حکم ہے کہ میں مٹی جمع کروں، مجھے ہر صورت میں جمع کرنی ہے۔ چاہے کوئی جنت میں جائے، چاہے کوئی جہنم میں جائے۔ مجھے اس سے بحث نہیں، مجھے تعمیلِ حکم کرنی ہے۔ انہوں نے تمام اجزاء جمع کئے اور لا کر پیش کئے۔ حضرت آدم علیہ السلام بنا دیئے گئے اور ان کا پتلا تیار کر دیا گیا اور ملک الموت کو فرمایا گیا کہ موت پر ہم نے تم ہی کو مقرر کیا۔ اس لئے کہ موت میں ایک منٹ کی تاخیر اس سے نہیں ہو سکتی جس کا جو وقت مقرر ہے، اگر آپ بھی اس طرح فریاد سنتے تو مرنے کے وقت ہر شخص فریاد کیا کرتا کہ خدا کے لئے چند منٹ کی مہلت اور دے دو۔ تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا، تو ایسا ہی فرد موت کے لئے مناسب ہے۔ لہٰذا تم ہی موت کے اوپر مقرر کئے گئے۔ بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کے اجزاء جمعہ کے دن جمع کئے گئے اور پتلا تیار کر دیا گیا تو جامعیت کی شان ابتداء سے چلی کہ منتشر اجزاء اس میں جمع ہوئے۔

جمعِ شرائع...... پھر جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اتارے گئے ہیں وہ بھی جمعہ ہی کے دن اتارے گئے ہیں اور یہ وقت انسانی اعمال کے جمع کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ جن عملوں سے سعادت میسّر آتی ہے، جن اعمالِ شرعیّہ سے انسان کو ترقی دی جاتی ہے وہ دنیا ہی میں پہنچ کر ممکن تھے۔ تو شریعتوں کی آمد جبھی ممکن تھی کہ انسان دنیا میں آتا، جنت میں نہ شریعت کی ضرورت تھی نہ احکام وقوانین کی ضرورت تھی، دنیا ہی میں احکامِ شرعیہ کی ضرورت تھی اور احکام ایک دو نہیں ہزاروں تھے۔ دین اور شریعتیں مختلف رنگوں میں آئیں، تمام انبیاء علیہم السلام مختلف شریعتیں لے کر تشریف لائے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب دنیا میں پیغمبر تشریف لائے۔ دین بے شک ایک ہی رہا، اصول ایک ہی رہے۔ مگر شریعتیں مختلف ہوئیں۔ ان تمام شریعتوں کا اجتماع دنیا میں ہوا اور اس کا سبب حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہے۔ تو منتشر شرائع کو جمع کرنے والا دن بھی درحقیقت جمعہ ہی کا دن ہے۔ تو پہلے اس نے اجزائے آدم کو جمع کیا، پھر اجزاء احکام کو اس نے جمع کیا اور اسی دن میں حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت حوا علیہا السلام سے ملاقات ہوئی ہے۔ تو دونوں جمع ہوئے، تو وہ بھی اسی دن میں جمع ہوئے۔

اجتماعِ قیامت...... قیامت قائم ہوگی وہ بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔ اس دن اوّلین وآخرین کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا۔ یہی زمین جس میں اونچ نیچ ہے، پہاڑ ہیں، دریا ہیں تو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس

دن زمین ایسی بنا دی جائے گی جس میں نہ اونچ ہوگی نہ نیچ ہوگی' پہاڑ ہوں گے نہ دریا ہوں گے، "کَـأَنَّهَـا طَبَقُ فِـضَّـةٍ" جیسے چاندی کی ایک پلیٹ ہوتی ہے۔ بالکل ہموار زمین۔ تمام بنی آدم قبروں سے نکال کر اس پر جمع کئے جائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اوّلین و آخرین جمع ہوگی۔

"یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ" جس دن سارے انسان جمع کردیئے جائیں گے۔ تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔ جس دن قیامت قائم کی جائے گی۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی جمعہ کے دن جمع ہوئی۔ احکامِ شرعیہ کے جمع ہونے کا سبب جمعہ کا دن بنا۔ پھر تمام انسانوں کو ایک جگہ ایک میدان میں اسی دن نے جمع کیا تو اس جمعہ کے اندر جامعیّت کی شان موجود ہے کہ بکھرے ہوئے کو جمع کردے۔

اسی واسطے اس کو 'عید المومنین' کہا گیا ہے جس میں ایک محلّہ یا ایک شہر کے منتشر افراد جمع ہو کر ایک جگہ آجاتے ہیں۔ ان کو جمعہ کا دن جمع کردیتا ہے۔ اس لئے اس میں جمع کرنے کی یا جامعیّت کی شان پائی جاتی ہے۔

تعیینِ جمعہ میں اقوام کا امتحان...... یہی وہ دن ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کی بڑی قوموں کا امتحان لیا گیا ہے اور اس میں صرف مسلمان کامیاب ہوئے۔ اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی نگاہ میں یہ دن متعین تھا کہ اس میں اس کی عبادت کی جائے۔ تمام کام چھوڑ کر دن کا زیادہ حصہ عبادتِ خداوندی میں لگایا جائے۔ لیکن ابھی حق تعالیٰ نے ظاہر نہیں فرمایا تھا۔

یہود کی امت جب دنیا میں آئی تو فرمایا کہ عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو! اگر تمہارا انتخاب اس دن تک پہنچ گیا جو ہمارے علم میں ہے تو تم کامیاب قوم سمجھے جاؤ گے۔ ورنہ نہیں۔ یہود نے اٹکل لڑائی تو یوم السبت یعنی شنبہ (ہفتہ) کا دن عبادت کے لئے منتخب کیا۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم الرّاحت ہے۔ یعنی اتوار کے دن سے عالم کی پیدائش شروع کی گئی اور جمعہ پر ختم کی گئی۔ تو شنبہ کا دن فارغ رہا۔ یہ یوم الفراغ ہے۔ لہٰذا یہ خوشی کا دن ہونا چاہئے۔ اس دن یہود نے عید منائی اور عبادت کے لئے اس دن کو منتخب کیا۔ لیکن وہ اس نکتے تک نہیں پہنچے جو حق تعالیٰ کے علم میں مرکوز اور مقدّر تھا۔

نصاریٰ کی امت آئی تو ان سے کہا گیا کہ ایک دن عبادت کے لئے منتخب کرو۔ اگر ہمارے علم کے مطابق تمہارا انتخاب ہوگیا تو تم امتحان میں کامیاب سمجھے جاؤ گے۔ انہوں نے اتوار کا دن منتخب کیا اور اسے یوم العید قرار دیا۔

اور بناء یہ قرار دی کہ "یَوْمُ الْاِفْتِتَاح" ہے۔ یعنی دنیا کی پیدائش کا آغاز اتوار کے دن سے کیا گیا ہے اور یومِ افتتاح خوشی کا دن ہوتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اتوار کا دن متعین کردیا اور اس کو عبادت کے لئے رکھا۔

مسلمان دنیا میں آئے تو حق تعالیٰ نے یہی سوال ان کے سامنے ڈالا کہ ہفتے میں ایک دن عبادت کے واسطے منتخب کرو! جس میں زیادہ حصّہ تم عبادت میں صرف کرو گے۔

مسلمانوں نے اپنی تخمین و انتخاب سے جمعہ کا دن متعین کیا کہ اس دن ہم عبادت کریں گے۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یومِ تکمیل ہے۔ یعنی اتوار کے دن عالم کی تخلیق شروع ہوئی ہے اور جمعہ کے دن ختم ہوئی اور جمعہ کی آخری ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔

جمعہ میں قبولیّت دعا کی گھڑی...... اسی واسطے جمعہ کی آخری ساعت اللہ کے ہاں مقبول ہے کہ اس میں جو شخص بھی جس مراد کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھے گا، وہ دعا قبول کی جائے گی اور وہ ساعت آخری ساعت ہے۔ یعنی غروب سے پہلے پہلے کا جو گھنٹہ ہوتا ہے جس میں غروب واقع ہوتا ہے۔ وہی آخری ساعت ہے۔ اس ساعت کو مقبول قرار دیا گیا کہ اس میں جو بھی دعا مانگی جائے گی، حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ بعض دفعہ ہم دعا مانگتے ہیں اور قبولیّت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ حالاں کہ نص حدیث ہے کہ ہم قبول کریں گے۔ ہم نے تو بارہا ایسا دیکھا کہ ایک دعا مانگی۔ لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔ مہینہ بھر انتظار کیا، دو مہینے انتظار کیا مگر قبولیت کے کچھ آثار ظاہر نہیں ہوئے۔

قلبی دعا قابلِ قبول ہے...... اوّل اس پر غور کرنا چاہئے کہ دعا کی کچھ شرائط ہیں اور کچھ آداب ہیں۔ ان شرائط اور آداب کو پورا کر کے آدمی دعا مانگے تو ممکن نہیں کہ قبول نہ ہو۔ ان شرائط و آداب کو اگر چھوڑ دیا جائے اور پھر قبول نہ ہو تو اس میں ساعت مقبولہ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قصور ہمارا ہوگا۔ مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اِنَّ اللّٰـــہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِن قَلْبٍ غافِلٍ لَاہٍ'' ① لہو ولعب میں پڑے دل کی دعا ہرگز قبول نہیں کی جاتی۔ اللہ سے دعا مانگ رہا ہے اور خیالات دوسری طرف ملتفت ہیں۔ کہیں بیوی میں، کہیں بچوں میں، کہیں تجارت میں اور کہیں مکان میں۔ تو خیالات بٹے ہوئے ہیں، قلب میں وساوس آرہے ہیں اور ہاتھ دعاء کے لئے اٹھائے ہوئے ہیں۔ تو یہ دعا قبول نہیں کی جاتی، دعا وہ قبول کی جاتی ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَـــاہُ﴾ ② مضطر اور بے قرار ہو کر جب آدمی مانگتا ہے۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ وہ دعا رائیگاں ہو اور قبول نہ کی جائے۔ لیکن جب دل کے اندر اضطرار نہیں، رسمی طور پر مانگ رہا ہے، دل کے اندر بے چینی نہیں ہے۔ خیالات منتشر اور بٹے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں وہ دعا ہم قبول نہیں کرتے، وہ الفاظ کی دعا ہے اور ہم دل کی گہرائی کی دعا قبول کرتے ہیں۔ دل کی گہرائی سے آدمی مانگے تو ممکن نہیں ہے کہ قبول نہ ہو۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے۔

مالِ حرام قبولیّتِ دُعا میں منع ہے...... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بعض لوگ دعائیں مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں۔ فرمایا: ''مَطْعَمُہٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ یَقُوْلُ یَا رَبِّ یَارَبِّ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَہٗ'' ③

کھانا دیکھو حرام، پینا حرام کا، لباس حرام کا اور کہہ رہا ہے یا رب یا رب دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی، یعنی

① السنن للترمذی، ابواب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات، ج: ۱۲، ص: ۳۷۳، رقم ۳۴۱.

② پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۶۲. ③ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب قبول الصدقۃ ج: ۵، ص: ۱۹۲.

دعا کی قبولیت کے لئے لازمی ہے کہ پاکیزہ بن کر جائے۔ کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں۔ تو قاعدہ ہے کہ کپڑے بدلتے ہیں، بدن کو صاف ستھرا کرتے ہیں، غسل کرتے ہیں، عطر لگاتے ہیں، معطر اور معنبر ہو کر جاتے ہیں۔ دربار کے آداب کا یہی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص میلے کچیلے کپڑے پہن کر چلا جائے اور اوپر سے عطر کے بجائے گندگی بھی لگا لے تو کیا اس کو دربار میں بیٹھنے بھی دیا جائے گا۔ اسے کان پکڑ کر نکال دیں گے کہ اس نے دربار کے آداب کے خلاف کیا۔ بات سننا تو بعد کی چیز ہے۔ اسے بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا کہ یہ بے ادب ہے۔ آدابِ دربار کی اسے کوئی رعایت نہیں۔ تو حرام کا کپڑا پہننا یا حرام کی غذا کھا کے جانا ایسا ہی ہے جیسا کپڑے اور بدن کے اوپر نجاست لگا کر جانا۔ بلکہ یہ تو ظاہری نجاست ہے جو پانی سے دھل جاتی ہے، گناہ کی نجاست معنوی نجاست ہے جسے پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ وہ زیادہ گندی چیز ہے۔ حق تعالیٰ کے دربار میں آدمی جائے اور گندہ بن کر جائے۔ تو بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا چہ جائیکہ اس کی دعاء قبول کی جائے۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ: ''مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَا رَبِّ يَارَبِّ فَانّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ'' لباس حرام کا، کھانا پینا حرام کا۔ اور یا رب یا رب کہتا ہے۔ کہاں سے دعا قبول کی جائے گی؟ وہ تو گندگی لگا کر گیا ہے۔

جیسا کہ یہ ادب تھا کہ دل میں لہو ولعب نہ ہو۔ خیالات بٹے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے ہی یہ بھی دعا کے آداب میں سے ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے۔ نیت کو صاف کر کے جائے۔ لباس حلال کمائی کا پہن کر جائے۔ انشاء اللہ قبولیت ہوگی۔

دعا بالقیود...... پھر دعا مانگنے میں بعض لوگ قیدیں لگاتے ہیں۔ یا اللہ مجھے مکان دیجیو، جو اس رنگ کا ہو، ایسے ڈیزائن اور ایسے نقشے کا ہو۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک دیہاتی نے دعا مانگی ''اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُکَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ فِي الْجَنَّةِ'' ① یا اللہ میاں! مجھ جنت میں محل دیجیو، مگر سفید رنگ کا ہو، اتنا بڑا ہو، ایسی منزلیں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ دعا مانگنے کا کیا طریقہ ہے، تم تو مطلق دعا مانگو۔ اگر جنت میں داخلہ بھی ہو گیا تو یہ عظیم ترین نعمت ہے۔ یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ تم نے جو قیدیں لگائیں کہ محل ایسا ہو۔ پیمائش اتنی ہو۔ رنگ ایسا ہو۔

یہ تو معاذ اللہ! اللہ کی ذات کے اوپر واجب کرنا ہے۔ کہ دیکھئے یہ یہ چیزیں دینی پڑیں گی۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ آدمی مطلق سوال کرے اور مانگے۔ اگر کوئی سائل آپ کے دروازے پر آ کر یوں کہے مجھے آپ پلاؤ پکا کر دیں۔ چینی کی رکابی ہو اور اس کا رنگ سبز ہو اور پھول سنہرے بنے ہوئے ہوں۔ تب تو میں قبول کروں گا۔ تو مالک کہے گا چلا جا نا معقول میرے گھر سے، میں کہاں سے لاؤں۔ میرے بچوں کے پاس بھی نہیں ہے کہ میں ایسی رکابی استعمال کروں، تیرے لئے کہاں سے لاؤں؟ اور یہ مانگنے کا کون سا ڈھنگ ہے؟۔ تو وہ اس کو نکال دے گا۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب الاسراف فی الماء، ج: ۱، ص: ۱۳۴، رقم: ۷۷.

تو اس سے زیادہ گستاخی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں مانگے اور قیدیں اور شرائط لگائے۔ جو واقعی مراد ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان ہے، معذور اور مجبور ہے، اسے مانگ لے۔ اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یہ ادب کے خلاف ہے، ممکن ہے کہ دعاء رد ہو جائے۔

وسعتِ رحمت کے منافی قید سے بھی دعا ردّ ہو جاتی ہے...... یا یہ کہ آدمی (دعا میں) کوئی ایسی قید لگائے جو اللہ کی وسیع رحمت کے خلاف اور منافی ہو۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے دعا مانگی "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَلَاتَرْحَمْ عَلٰی اَحَدٍ" "یا اللہ! مجھ پر رحم کر، اور کسی کے اوپر رحم نہ کیجیو"۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا" ① بندۂ خدا! تو نے ایک لامحدود، وسیع چیز کو کم کر کے رکھ دیا۔ اللہ کی رحمت تو وہ ہے کہ سارے جہانوں پر بٹے، جب بھی شمہ برابر کمی نہیں آسکتی اور تو کہتا ہے کہ مجھ پر تو رحم ہو اور کسی پر رحم نہ ہو۔ تو یہ اس سے بھی زیادہ گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے۔ تو لہو ولعب میں پڑے ہوئے دل سے دعا مانگنا وہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا، اور اس میں اپنی طرف سے قیدیں اور شرطیں لگانا، وہ بھی مقبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا اور رحمت کے دائرے کو تنگ کر کے مانگنا، یہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کے کچھ آداب اور ڈھنگ ہیں۔ آدمی اس طریق پر مانگے تو ملتا ہے۔ سائل قیدیں نہیں لگایا کرتا، وہ تو مراد پیش کرتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھے عطاء کر دیجئے، آپ کے دربار سے مجھے کچھ نہ کچھ مل جائے۔

مانگنے کا ڈھنگ...... تو ہم دعا کے آداب پورے نہیں کرتے اور جب قبولیت کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے تو حدیث پر سوال کرتے ہیں کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی۔ مگر ہمارے حق میں تو کچھ بھی قبول نہ ہوا۔ سوال یہ ہے کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی مگر تم نے مقبولیت کا ڈھنگ بھی اختیار کیا؟ تم نے قبولیت کے آداب بھی اختیار کئے یا نہیں؟۔ تو انسان کی نظر اپنی کوتاہی پر نہیں ہے۔ وہ اللہ کے احکام اور قوانین پر الزام ڈال دیتا ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اگر قبولیت کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اپنے اندر غور کرے کہ آیا میں نے کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ کوئی غلطی تو نہیں کی؟

فوری قبولیت...... اچھا! پھر یہ ہے کہ اگر آپ نے سارے آداب پورے کئے، ساری شرائط آپ نے جمع کیں اور دعا مانگی اِنشاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔ لیکن قبولیّت کے طریقے مختلف ہیں۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ منہ مانگی مراد فوراً ہاتھ کے ہاتھ مل گئی اور آدمی کہا کرتا ہے کہ بھئی! عجیب قبولیت کی گھڑی تھی کہ جو مانگا وہی مل گیا۔ کاش میں اس وقت فلاں چیز مانگ لیتا تو وہ بھی مل جاتی، تو بعض دفعہ تو منہ مانگی مراد ہاتھ کے ہاتھ مل جاتی ہے اور انسان دعا مانگ کر کامیاب اٹھتا ہے۔

از دیادِ قبولیّت...... اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ شے تو نہیں ملتی۔ مگر اس سے بڑی چیز مل جاتی ہے۔ تو بعد میں خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا وہ چیز نہ ملی جو مانگی تھی۔ مجھے تو اس سے بھی بڑی چیز مل گئی۔ ایسی چیز ملی کہ اس کے ملنے سے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الهبة، باب قبول الهدية ج:۷، ص:۲۶، رقم:۲۳۷.

جو چیز مانگی تھی، اس جیسی ہزاروں چیزیں خودبخود آجاتی ہیں۔ تو انسان خوش ہوتا ہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں مراد کی قبولیّت نہ ہوئی، اس سے بڑی چیز مجھے مل گئی۔

تاخیرِ قبولیت...... بعض دفعہ منہ مانگی ہی مراد ملتی ہے۔ مگر ذرا دیر سے ملتی ہے۔ مانگنے والے میں کچھ کھوٹ ہوتا ہے۔ انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ کھوٹ رفع ہو اور اس مراد کے لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تب اس کو دیتے ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی مصلحت کی وجہ سے قبولیت میں تاخیر کی جاتی ہے۔

مصلحتِ تاخیر...... اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بچہ ہو اور بچے سے زیادہ کون محبوب ہوتا ہے، اولاد سے زیادہ کس سے محبت ہوتی ہے؟ محبوب ترین اولاد ہے اور اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے، آپ لکھ پتی ہیں۔ اگر سو روپے روز بھی جیب خرچ دیں تو آپ پر بھاری نہیں۔ آپ کا بیٹا مانگتا ہے کہ مجھے سو روپے دے دیجئے تو کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فوراً بٹوہ جیب سے نکالا اور سو روپے کا نوٹ اس کے حوالے کیا۔ بیٹا بڑا خوش ہوا کہ باپ محبت والا بھی ہے، کریم النفس بھی، جو میں نے مانگا فوراً دے دیا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے کہ مجھے بیس یا دس روپے ہی روز دے دیجئے اور آپ نہیں دیتے۔ مہینے گزر گئے یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے اور وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ شاید باپ کے دل میں میری محبت باقی نہیں رہی ورنہ لکھ پتی ہے اگر دو سو بھی روز دیتا تو سوائے اس کے کہ کوئی بڑی بات نہیں تھی اور میں تو دس ہی روپے روز کے مانگتا ہوں۔ مگر نہیں دیئے۔ اب وہ کڑھ رہا ہے۔ چھ مہینے کے بعد دس روپے روز کے حساب سے آپ نے کئی سینکڑوں کی تھیلی حوالے کی اور کہا کہ لو بیٹا! میں نے اس لئے نہیں دیئے تھے کہ تم مریض تھے۔ معدے کے بھی مریض تھے۔ جگر بھی خراب تھا اور تمہارا علاج ہو رہا تھا۔ اگر میں تمہیں دس روپے روزانہ دیتا تو تم کھانے پینے اور چاٹنے میں اڑا دیتے تو اس سے روپیہ بھی ضائع ہوتا، صحت بھی برباد ہوتی۔ تو میں نے انتظار کیا کہ جب تمہیں پوری تندرستی حاصل ہو جائے، تمہارا معدہ ہر چیز کے ہضم کرنے کے لائق ہو جائے، جب میں تمہیں دوں تاکہ جو بھی کھاؤ، ہضم ہو جائے۔ صحت میں قوّت پیدا ہو۔ اب طبیب نے کہہ دیا ہے کہ تم اچھے ہو گئے۔ لہٰذا اب یہ روپیہ موجود ہے۔ اب بیٹا خوش ہوگا اور باپ کو دعائیں دے گا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وقت پر منہ مانگی مراد پوری نہ کی۔ اگر باپ پوری کر دیتا تو میں بدپرہیزی کرتا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا۔ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا بروقت منہ مانگی مراد مجھے نہ ملی۔

تاخیرِ قبولیت پر تشکّر...... اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برس گزر گئے اور بیٹا مانگ رہا ہے اور آپ نہیں دے رہے۔ اس کے دل میں بُرائی پیدا ہو گئی کہ باپ بے انتہا بخیل ہے اور باپ کے دل میں شفقت باقی نہیں رہی، دوسروں سے شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ مگر باپ کوئی خیال نہیں کرتا اور اس کی رعایت نہیں کرتا۔ بدستور جما ہوا ہے کہ بھئی! کچھ نہیں ملے گا۔

جب دس پندرہ برس گزر گئے۔ تو اس وقت اس نے بیٹے کو جو اس نے مانگا تھا، جمع کر کے ایک بیس ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ میں نے اس لئے نہیں دیا تھا کہ اگر سو روپے روز دوں تو محض فضولیات میں اڑا دیتا۔ میں نے

تیرے لئے جمع کیا۔ آج دیتا ہوں تا کہ اس سے جائیداد خریدے اور جائیداد خریدنے کے بعد اتنی آمدنی روزانہ تجھے ہو جائے کہ جتنی تو مانگا کرتا تھا بلکہ اس سے دوگنی ہو جائے۔ تیرے کام آئے گی۔ ورنہ فضول بیس ہزار روپیہ ضائع ہو جاتا۔ اب یہ بیس ہزار تیرے ہی نہیں بلکہ تیری نسل کے بھی کام آئیں گے۔

اس وقت بیٹا دعا دیتا ہے کہ واقعی باپ نے بڑی خیر خواہی کی کہ نہ دیا۔ اور اس صورت سے مجھے دیا کہ نہ صرف میرے ہی بلکہ میری نسل کے بھی کام آئیں گے۔ تو دیکھئے تاخیر یہاں بھی ہوئی۔ لیکن اس تاخیر پر مانگنے والا اخیر میں جا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ جب حقیقت حال کھلتی ہے اور جب حقیقت حال سامنے نہیں تھی، شکایتیں کرتا پھرتا تھا کہ باپ کو محبت نہیں رہی۔ ٹھیک یہی صورت یہاں بھی سمجھئے کہ بندہ حق تعالیٰ سے مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے ایک جائیداد دے دیجئے۔ مجھے اتنے ہزار یا اتنے لاکھ دے دیجئے۔

کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ منہ مانگی مراد مل گئی۔ بندہ بڑا خوش ہوا کہ اللہ نے مانگتے ہی وہ چیز دے دی۔ اگر میں اس سے چوگنا مانگتا وہ بھی مل جاتا۔ وہ تو مقبولیت کی گھڑی تھی۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ مانگ رہے ہیں۔ مگر نہیں مل رہا۔ دو یا تین مہینے یا برس دن گزر گئے۔ برسوں کے بعد اسباب ایسے ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے وہ مراد پوری کی اور دل میں آپ کے القاء کیا اور آپ کے اوپر واضح کر دیا کہ معصیت اور گناہوں کا مادّہ موجود تھا۔ اگر ایسے میں ہم جائیداد دے دیتے تو تم سینما دیکھتے، لہو ولعب میں خرچ کرتے اور زیادہ اللہ کی حجت تمام ہوتی۔ لیکن ایک دم ہم نے پیسے بند کر دیئے، اس کی وجہ سے تمہارے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہا۔ تم میں پریشانی بڑھی۔ اس پریشانی کا اثر یہ ہوا کہ اخلاقی حالت درست ہونی شروع ہوئی، وہ جو لہو ولعب میں بالکل آزاد تھے، وہ آزادی ختم ہوئی۔ اب جب حالت درست ہوگئی، حق تعالیٰ نے مراد پوری کر دی تا کہ بے جا مصرف میں رقم صرف نہ ہو۔ گناہ انسان کے نہ بڑھیں۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ بڑھے۔ اس وقت بندہ خوش ہوتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے برس دن پہلے یہ جائیداد نہ دے دی۔ میں تو واقعی اڑا دیتا۔ برس دن کے بعد دی جب کہ میرے قلب کی رفتار صحیح ہوگئی، دل کی کلیں درست ہوگئیں۔

دعا کا اُخروی ذخیرہ...... اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ مانگ رہا ہے، مانگ رہا ہے عمر گزر گئی، مرتے دم تک کچھ نہیں دیا گیا۔ اسی افلاس اور پریشانی میں مبتلا ہے اور کہتا ہے کہ معلوم نہیں کون سی مجھ سے ایسی غلطی ہوئی کہ کسی طرح میری دعا قبول نہیں ہوتی۔ عمر بھر مانگتا رہا اور نہ ملا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت بھی آ گئی، انتقال کر گیا۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ بندہ میدانِ محشر میں حاضر ہوگا، دیکھے گا کہ اجر وثواب کے بے انتہا ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کا اجر اتنا بڑا ہوتا، یہ نعمتیں کہاں سے میرے لئے جمع ہوئیں؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے، وہ جو تو دعائیں مانگا کرتا تھا، ہم تیری دعاؤں کا ذخیرہ کرتے رہے۔ تیرے پاس عمل کا ذخیرہ نہیں تھا۔ لیکن تو ہم سے مانگتا تھا، ہم نے اسی کو تیرے لئے ذخیرہ بنایا۔ عمر بھر کی دعائیں جمع کر کے آج

اتنی بڑی نعمت جمع کی کہ اب تو ابدالآباد تک جنت میں چین اڑا اور آرام کر۔ اس وقت بندہ خوش ہوگا کہ اے اللہ! تیرا شکر اور احسان ہے کہ اس وقت تو نے دعا قبول نہ کی اور اب وہ قبولیت کا ذخیرہ مجھے عطاء کیا۔

دعا میں تفویض...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ دعا تو مانگے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے کہ اگر میں مانگ رہا ہوں تو یوں ہونا چاہئے۔ یہ مالک کے اوپر چھوڑ دے۔ کبھی ہاتھ در ہاتھ ملے گا۔ کبھی دیر سے ملے گا۔ کبھی مرنے کے قریب ملے گا، کبھی مرنے کے بعد ملے گا مگر مضطرب ہو کر جو دعا مانگی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ رائیگاں چلی جائے۔ ضرور قبول ہوگی۔

دعا کا مقام عبادت...... اور میں کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ نہ دنیا میں ملا نہ آخرت میں ملا۔ کچھ نہیں ملا۔ مگر دعا مانگنا خود عبادت تو ہے تو عبادت کی توفیق ہوئی، یہ آپ کو تھوڑا نفع ہے؟ حدیث میں ہے کہ ''اَلدُّعَآءُ هو الْعِبَادَةِ'' ① دعا عبادت کا خلاصہ ہے۔

اس لئے کہ عبادت کے معنی غایتِ تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے۔ اتنی ذلّت آدمی اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلّت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقتِ عبادت ہے۔ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلّت نہیں ہے۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے۔ اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جاسکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو۔ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعا مانگنے میں انتہائی ذلّت ہے۔

مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا کر ہاتھ باندھتے ہیں۔ یہ اظہارِ ذلّت کا ابتدائی درجہ ہے کہ نوکروں چاکروں اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مگر یہ انتہائی ذلّت نہیں بلکہ ابتدائی ذلّت ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ رکوع میں سر جھکا دیتے ہیں تو رکوع میں بہ نسبت قیام اور ہاتھ باندھنے کے زیادہ ذلّت ہے۔ رکوع میں گردن جھک گئی اور سر جھک گیا۔ لیکن یہ بھی انتہائی ذلّت نہیں ایک درمیانی قسم کی ذلّت ہے۔ جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو ناک اور پیشانی خاک پر رگڑتے ہیں۔ یہ انتہائی ذلّت ہوگئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی انتہائی ذلّت نہیں ہے۔ انتہائی ذلّت اخیر میں رکھی گئی ہے کہ سلام پھیر کر ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے دعا مانگو۔ یا سلام پھیرنے سے پیشتر وہ دعائیں پڑھو جو شریعت نے تلقین کی ہیں۔ تو دعا کا مانگنا اور بھیک مانگنا یہ انتہائی ذلّت ہے۔

سوال ممانعت...... اسی واسطے سوال کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے کہ آدمی آدمی سے سوال کرے یعنی بھیک مانگے۔ سوائے اس کے کہ مضطر ہو جائے مخمصہ کی حالت ہو کہ اگر نہیں مانگوں گا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔ اس وقت

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب الدعاء فی الصلوٰة، ج:۳، ص:۴۷، رقم:۷۴۷۔

اجازت دی گئی ہے کہ مانگ لو۔ عام حالات میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں۔

سوالِ محبت...... ایک ہے سوالِ محبت اور سوالِ تعلّق۔ وہ اس سے خارج ہے۔ جیسے بیٹا باپ سے مانگنے لگے یا دوست احباب میں باہم گہرا تعلق ہے اور وہ مانگے کہ بھئی! ہمیں چند پیسے دے دو یا کھانا کھلا دو یہ سوال نہیں۔ یہ سوالِ تعلق ہے۔ یہ سوال ذلّت کا نہیں بلکہ یہ سوال محبت کا ہے۔ اس سوال کی اجازت ہے۔

بلکہ بعض اوقات شریعت نے تلقین کی ہے کہ بعض مواقع میں جا کر خود مانگ کر کھاؤ تا کہ تعلّق میں اضافہ ہو جیسے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ ①

تمہارے اوپر کوئی نہیں گناہ اگر تم اپنے گھر میں مانگ کر کھالو۔ اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ فلاں چیز مجھے دے۔ یہ سوال ذلت کا تھوڑا ہی ہے۔ یہ حق کا سوال ہے اور تعلق کا سوال ہے۔ تو آدمی اپنے گھر سے بلا کسی دعوت کے کھائے، اسے یہ حق ہے بلکہ کھانا ہی چاہئے۔ اگر اپنے گھر میں بھی یہ انتظار کرے کہ مجھے دعوت دی جائے تو میں کھاؤں۔ تو بھوکا مرے گا، گھر میں بیٹھ کر روز کون اسے دعوت دے گا۔

اسی طرح فرمایا کہ: یا تمہارے باپ کا گھر ہو، بیٹے کو الگ کر دیا ہے۔ باپ کا گھر الگ ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی مانگ کر کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جانا چاہئے اور مانگ کر کھانا چاہئے تا کہ تعلق میں اضافہ ہو، باپ یہ نہ سمجھے کہ بیٹا مجھ سے اجنبی ہو گیا یا مستقل اپنی بارگاہ بنالی کہ اس میں بیٹے ہونے کی شان باقی نہیں رہی۔ کبھی کبھی باپ کے سامنے اپنے بیٹے ہونے کی اور اپنی محتاجگی کی شان ظاہر کرنی چاہئے تا کہ اس کی بڑائی واضح ہو، ہماری خوردی واضح ہو۔ اس لئے فرمایا کہ باپ کے گھر میں جاکے مانگ کر کھالو۔

یا ماں کا گھر جدا ہے۔ تو وہاں جاؤ اور مانگ کر کھالو یا پھوپھی اور خالہ، ان کے گھروں میں جاؤ اور مانگ کر کھالو۔ اس لئے کہ خالہ بھی ماں کے برابر ہے، پھوپھی بھی ماں کے برابر ہے۔ وہ باپ کی بہن ہے۔ یا فرماتے ہیں کہ: ﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ﴾ ② یا تمہاری باندی کا گھر ہے یا تمہارے غلام کا گھر ہے جو تمہارا زرخرید ہے۔ وہ تمہارا مملوک ہے، تمہاری اولاد کی مثل ہے۔ اس سے اگر مانگو گے تو یہ مانگنا ذلت کا نہیں بلکہ ازدیادِ تعلق کا ہے۔

﴿اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ یا دوست احباب ہوں یا تم میں میل جول ہے۔ اپنے کسی دوست کے گھر جاکے کہے کہ بھئی! آج تو تمہارے گھر سے کھانا کھائیں گے۔ تو یہ ذلّت کی بات نہیں بلکہ اس سے تعلق بڑھتا ہے۔ اس کے

① پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱.

② پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱.

دل میں یہ گنجائش پیدا ہوگی کہ اس نے مجھے اپنا سمجھا تو آ کر مانگا۔ آدمی کسی اجنبی کے ہاں جا کر تھوڑا مانگ لیتا ہے۔

خود فرمائش...... حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ تو بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی اور مملوکہ ہیں۔ بے چاری غریب تھیں۔ آپ نے جا کے خود فرمائش کی کہ بریرہ کوئی چیز کھانے کی رکھی ہے؟

انہوں نے عرض کیا: ہے تو مگر آپ کے کھانے کی نہیں۔ فرمایا: کیا ہے؟ عرض کیا: کچھ گوشت رکھا ہوا ہے مگر وہ آپ کے لئے نہیں۔

فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: وہ صدقے کا میرے پاس آیا ہے۔ فرمایا: "لَکِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ" ①

فرمایا: صدقہ تیرے لئے ہے۔ جب تو ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ بن جائے گا۔ آپ نے تناول فرمایا تو معاذ اللہ یہ ذلّت کا سوال نہیں تھا، یہ محبت بڑھانے کا سوال تھا۔ تعلق بڑھانے کے لئے آپ نے مانگا تھا، تو تعلق میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت آدمی مانگتا ہے۔ دوسرا سمجھتا ہے کہ ہمیں اپنا سمجھا ہے۔

ترکِ تکلّف...... میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں ترکستانیوں میں ایک رواج دیکھا جو ترکستان سے مہاجرین آئے ہوئے تھے، خود کابلی افغانیوں میں بھی ہے۔ شہر کابل میں گویا یہ ایک عام تمدن ہے کہ بیٹھے بیٹھے چند دوست احباب جمع ہوئے کہ آج فلاں دوست یا بھائی کے ہاں کھانا کھائیں گے، تو دس بیس آدمی اکٹھے پہنچ گئے۔ وہ بہت خیر مقدم کرے گا۔ دعائیں دے گا اور استقبال کرے گا کہ آئیے بیٹھیے اور کھانا پکنا شروع ہو جائے گا۔ دس بیس اور احباب جمع ہوئے۔ وہ ہمارے گھر آ گئے کہ ہم تو کھانا کھانے آئے ہیں۔ تو ہر شخص وہاں دس بیس آدمی کے کھانے کا بندوبست رکھتا ہے۔ ایک عام رواج ہے کہ بے بلائے دس دس، بیس بیس آدمی پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب دوستوں میں بھی یہ تکلّف ہو کہ آدمی دعوت کا انتظار کرے تو وہ دوستی کیا ہوئی؟ وہ بے تکلّفی کیا ہوئی؟

وہاں یہ ایک عام رواج ہے جس سے وہاں تعلّقات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تعلّقات مضبوط ہیں۔

اسلامی بے تکلّفی...... کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ تواضع کریں گے۔ انہوں نے کوئی تواضع نہیں کی کہ ان کے دل میں بڑی گرانی ہوئی کہ بزرگ آدمی ہیں، کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ تو اخلاقی بات بھی ہے اور ایک مسلمان کا حق بھی ہے کہ یوں کہے کہ بھئی! کھانا کھالو۔ بلکہ اگر کسی کو نہیں بھی کھلانا ہوتا تو ظاہرداری کے طور پر ہی کہہ دیا کرتا ہے کہ بھائی! کھانا کھائیے اور جب دوسرا کہتا ہے کہ میں تو کھا کے آیا ہوں۔ تو دل میں شکر کرتا ہے کہ اچھا ہوا کھا آیا۔ تو ظاہرداری تو کی۔ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کم از کم ظاہرداری کے طور پر ہی تواضع تو کر لیتے۔ یہ تو ایک اسلامی تعلّق ہے۔ تو کچھ منقبض اور گھٹے گھٹے سے رہے۔

وہ بزرگ کھانا کھا کے فارغ ہو گئے۔ تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے شکایت کی کہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ

① السنن للنسائی، کتاب الطلاق، باب خیار الامة، ج: ١١، ص: ١٤٧.

بزرگ ہیں اور اسلامی تعلق کا مقتضٰی ہے اور اسلامی بے تکلفی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کہتے کہ کھانا کھاؤ۔ تو انہوں نے حیرت سے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں؟

کہا کہ الحمد للہ میں مسلمان ہوں جیسے کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا اسلامی بے تکلفی کے تو یہ معنی تھے کہ آپ نے اپنا گھر سمجھا تھا تو کھانا کھانے بیٹھ جاتے۔ یہ انتظار کرنا کہ کوئی تمہیں دعوت دے تو اضع کرے۔ معلوم ہوا تمہارے ذہن میں تکلف موجود ہے۔ بے تکلف تعلق نہیں رکھتے۔ تمہاری محبت کامل نہیں تھی۔

یہ انہوں نے جواب دیا۔ خیر یہ بات اب عام تو نہیں ہے مگر بعض جگہ واقعی یہ ہوتا ہے کہ اس کا انتظار کیا کہ ہماری تواضع کی جائے۔ تب بیٹھیں گے، یہ داخل تکلّف ہوتا ہے۔ بے تکلف آ کے بیٹھ جایئے۔ اب باپ بھائی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں، شیخ یا استاذ کھانا کھا رہے ہیں جن سے نہایت بے تکلفی کا اور نیاز مندانہ تعلّق ہے۔ اگر آدمی بے تکلّف آ کے بیٹھ جائے کہ صاحب! مجھے تو کھانا کھانا ہے۔ تو وہ اور شکر گزار ہوں گے کہ نہایت بے تکلّف آدمی ہے۔ تعلّق مضبوط ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ شریعت کے ہاں یہ مطلوب ہے کہ بعض جگہ تواضع اور دعوت کا انتظار مت کرو تا کہ تعلق واضح ہو۔ اس میں اپنا گھر ہے، ماں کا گھر ہے، باپ کا گھر ہے، پھوپھی اور خالہ کا گھر ہے۔ ان میں آدمی جا کے مانگے اور بے تکلّف کھائے تا کہ تعلّق بڑھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً کھانے اور پینے کی چیز کا سوال کرنا ممنوع نہیں ہے۔

ذلّت سوال...... بلکہ سوال ذلّت ممنوع ہے جس میں بھکاری بن کے جائے اور ذلیل النفس بن کے جائے۔ اور اگر عزیز النفس بن کے جائے، محبت کے بڑھانے کے لئے سوال کرے، یہ سوال اس سے مستثنٰی ہے۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذلّت انسان کو سوال کرنے کے وقت پیش آتی ہے اور سوال کرنے والا جب سوال کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے منہ کی آب جاتی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر جو ایک رونق ہوتی ہے۔ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خود اپنے ذہن میں اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا۔ تو سب سے زیادہ ذلّت سوال کے وقت پیش آتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن وہ لوگ جو دنیا میں بے وجہ، محض طمع اور لالچ سے سوال کرتے تھے اور ذلیل النفس بنتے تھے۔ ان کا حشر اس حالت میں کیا جائے گا کہ ان کے چہرے کا گوشت اڑا ہوا ہوگا۔ کچھ ادھر لٹک رہا ہے، کچھ ادھر لٹک رہا ہے۔ ہڈیاں نمایاں ہیں۔ نہایت ذلیل صورت ہوگی، یہ گویا عمل کے مطابق جزا ہے۔ اس لئے کہ جب بھیک مانگتا ہے تو چہرے کی آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے، اس بے رونقی کو اس شان سے ظاہر کیا جائے گا کہ گوشت کچھ ادھر لٹکا ہوا اور کچھ اُدھر لٹکا ہوا ہے اور ہڈیاں نمایاں ہیں۔ یعنی ایسا چہرہ لے کر آئے گا کہ دنیا اس چہرے کو دیکھ کر نفرت کرے گی۔ وہ جو ذلت نفس اس کے اندر تھی، اس ذلت کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ وہ ذلت اس صورت میں چمکے گی کہ چہرے پر عزت کے کوئی آثار

باقی نہیں رہیں گے اور چہرے کی رونق اڑ جائے گی۔

تو قیام میں انسان اللہ کے سامنے ذلّت اختیار کرتا ہے مگر یہ ابتدائی مرتبہ ہے، رکوع میں اس سے زیادہ ذلت ہے، سجدے میں اس سے زیادہ ذلت ہے اور مانگنے میں اس سے زیادہ ذلت ہے۔

بندہ کے سوال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی...... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ سوال کرنے سے جتنے خوش ہوتے ہیں اتنے کسی چیز سے خوش نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں اگر کوئی بندہ سوال کرتا ہے تو ہم اس سے خوش ہیں کہ اگر سوال نہیں کرے گا تو ہم اس سے ناراض اور ناخوش ہیں۔ دنیا میں اس کے برعکس قصہ ہے، اگر آپ کسی کے آگے سوال کرنے لگیں تو وہ خوش نہیں ہوگا بلکہ ناخوش ہوگا۔ محبت بھی ہوگی تو ختم ہو جائے گی اور حق تعالیٰ کے ہاں اگر نہ مانگے تب ناخوش ہوتے ہیں، مانگنے پر خوش ہوتے ہیں۔

اس کی بناء یہ ہے کہ دنیا میں آپ جس سے بھی مانگیں گے، چاہے وہ ارب پتی ہو۔ مگر اس کا خزانہ پھر بھی محدود ہے، جتنا دے گا اتنی خزانے میں کمی پڑ جائے گی۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں، اگر عالم بھی بخش دیں تب بھی کمی نہیں پڑے گی۔ اس لئے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ یہ امتحان ہے کہ کون بندگی اختیار کر کے آتا ہے۔ کون بندہ کی صورت سے آتا ہے۔ تو بندہ وہی ہے جو پوری بندگی نمایاں کرے اور بندگی کے معنی اظہارِ ذلت کے ہیں۔ اس واسطے مانگنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ خوب مانگا جائے۔

مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کی جائے۔ مراد مانگ لی جائے اس میں قیدیں اور شرطیں لگانا یا جس سے آپ مانگ رہے ہیں، اسے آپ کہیں کہ آپ کو یوں کرنا ہوگا تو یہ حق تعالیٰ کے ہاں بے ادبی اور خلاف تہذیب ہے۔ تو مانگنے میں کسر نہ چھوڑے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے۔ جتنا مانگے گا اتنی ہی ادھر خوشی بڑھے گی اور رضا کا تعلق بھی اتنا ہی ہوگا۔

تعلیمِ دُعا...... مجھے مکّہ معظمہ کا ایک واقعہ یاد آیا، جن لوگوں کو حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں، حجاز اور مکّہ میں غرباء بہت زیادہ ہیں۔ بے چارے مانگتے ہیں اور لیچڑ بن کر مانگتے ہیں۔ حرم شریف میں باوجود یہ کہ حکومت انتظام کرتی ہے کہ سائل نہ آئیں، مگر پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک کے آگے ایک قرش دو قرش مانگتے پھرتے ہیں۔ اور اس طرح سے مانگتے ہیں کہ دینے والا اگر دے دے تو تھوڑی دیر میں پھر لوٹ کے آجائیں گے۔ پھر لوٹ کے آجائیں گے۔ نہ دے تو وہ کھڑے رہیں گے، یا وہ انکار کرے یا وہ منہ پھیرے۔ غرض لوگ مانگنے والوں سے زچ آجاتے ہیں اور تنگ آجاتے ہیں۔ تو بعض لوگ جھنجلائے ہوئے میرے پاس آئے کہ صاحب! یہ عجیب بے وقوف قسم کے سائل ہیں۔ انہوں نے ہماری تلاوت بھی ختم کر دی، نوافل بھی ختم کر دیئے، جہاں تلاوت کرنے بیٹھے وہ آکے کھڑے ہوگئے۔ اب یا تو دے یا جب تک زبان سے یوں نہ کہے ''اللہ کریم'' آگے جاؤ، اس وقت تک ٹلتے نہیں۔ اب تلاوت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ چند آیتیں پڑھیں پھر کہا، اللہ کریم۔ چند آیتیں پڑھیں پھر دوسرا آگیا، پھر اس سے کہا، اللہ کریم آگے جاؤ۔ تو ہم عاجز آگئے اور پریشان ہیں اور

آپ یہ کہتے ہیں کہ سائل کو جھڑکو بھی نہ۔ آپ کیا کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ ① کہ سائل کو مت جھڑکو۔ اب نہ کہیں یا نہ جھڑکیں تو انہوں نے تو عاجز کر دیا، کیا کریں؟ غرض بہت ہی غصے اور خفگی میں تھے اور کئی آدمی تھے۔ میں نے کہا آپ نے غور نہیں کیا۔ یہ سوال کرنے والے آپ کے معلّم ہیں۔ آپ کو تعلیم دینے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہاں کی تعلیم؟

میں نے کہا یہ آپ کو مانگنا سکھانے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح لیچڑ ہو کے مانگو کہ ہم تو لے ہی کے اٹھیں گے۔ خیر وہ اس پر ٹھنڈے ہو گئے اور بہت خوش ہو کے واپس ہوئے۔ پھر انہوں نے نہ کسی سائل کو برا بھلا کہا نہ جھڑکنے کی نوبت پیش آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ واقعی یوں ہی مانگنا چاہئے۔ مانگنے کا ڈھنگ یہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ انہوں نے غلطی یہ کی کہ آدمی سے اس طرح مانگنا شروع کیا حالاں کہ اس طرح اللہ میاں سے مانگنا چاہئے کہ آدمی گھٹنے ٹیک دے کہ میں لئے بغیر نہیں اٹھوں گا۔ میں رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور محروم چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ تو اس عزم سے آدمی مانگے تو کبھی محروم نہیں ہوسکتا۔

علامتِ قبولیت...... اور بعض علامتیں بھی ایسی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب کوئی بوڑھا آدمی جس کی داڑھی سفید ہو اور وہ اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ اس سفید ریش کو خالی ہاتھ واپس کروں۔ یوں تو میں کریم ہوں ہی، لیکن میری کریمی اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی سفید ریش، سفید بال والا مانگتا ہے کہ اس بوڑھے کو میں محروم واپس کروں۔ اس کے چہرے پر ایک ہیبت کا اثر ہے اور ایک وقار ہے تو میں اس کو ذلیل کر کے واپس کروں، تو حق تعالیٰ اس کی بات تھامتے ہیں۔ فرماتے ہیں، میں اس کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا اور اس کی مراد پوری کرتا ہوں۔

اہلِ قبولیت سے مشابہت کا اثر...... اور اس میں بعض بزرگوں نے تو لطیفہ کیا۔ یحیٰ ابن اکثمؒ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ اور صاحبِ فنون ہیں۔ نحو یا صرف کے غالباً امام ہیں۔ بہرحال بڑے لوگوں میں ہیں، جس وقت ان کے انتقال کا وقت آیا۔ تو انہوں نے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھے قبر میں اتاریں تو میری داڑھی کے اوپر سفید میدہ یا چونا کوٹ کر رکھ دینا کہ میری داڑھی سفید ہو جائے۔ کس لئے رکھنا؟ تجھے اس سے بحث نہیں۔ اس نے تعمیل حکم کی، کفن دیتے ہوئے کوئی میدہ اور چونا ایسا مل دیا کہ داڑھی کے بال بالکل سفید ہو گئے اور ڈھانپ دیا اور نماز پڑھ کے دفن کر دیا۔ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور عرض کیا کہ میری مغفرت فرما دیجئے۔

فرمایا: او بوڑھے! تو نے فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں گناہ نہیں کیا؟ عرض کیا جی ہاں! سب کچھ کیا، کہ پھر تو اس قابل ہے کہ تیری مغفرت کی جائے۔ مانگنے کو تو آیا ہے؟ کیا تیری مراد پوری کی جائے؟ عرض کیا کہ یا اللہ! میری داڑھی سفید ہے۔ اسے تو دیکھ لیجئے، آپ ہی نے تو فرمایا ہے کہ ہم سفید داڑھی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الضحیٰ، الآیۃ: ۱۰۔

رکھنے والے کو واپس نہیں کرتے۔ تو میں سفید داڑھی نہیں رکھتا تھا تو میں نے سفید داڑھی رکھنے والوں سے کم از کم مشابہت پیدا کرنے کے لئے چونا لگایا اور داڑھی کو سفید کر لیا۔ تو رنگ تو سفید ہو گیا۔ چاہے عارضی طور پر ہو چاہے اصلی طور پر ہو، اور آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ سفید وہ ہو جو اصلیت سے سفید ہو۔ سفید داڑھی کے معنی سفید بالوں کے ہیں اور میں سفید بال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ وعدہ کے مطابق بخش دیجئے۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ' نے فرمایا او بڈھے جا ہم نے تجھے بخشا اور معاف کر دیا۔

تو بعض بزرگ وہاں بھی جا کر مذاق کرتے ہیں، مگر اس قسم کا مذاق جو اصولِ شرعیہ سے ماخوذ ہو۔ حق تعالیٰ اس کی رعایت فرماتے ہیں۔ چناں چہ یحیٰ ابن اکثمؒ کو بخش دیا۔ جس شخص نے انہیں خواب میں دیکھا تو اس کو انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں نے تو اپنی سفید داڑھی سامنے کر دی تھی اور عرض کیا کہ آپ ہی کا وعدہ ہے کہ ہم سفید ریش کو واپس نہیں کرتے۔ میں تو مغفرت مانگتا ہوں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ سفید داڑھی تو وقار ہے ہی اور نیکی اور تقویٰ کی علامت ہے، اس کے ساتھ اگر مشابہت ہی پیدا کر لی جائے، وہ آدمی بھی محروم نہیں رہتا، تو کم سے کم اس لئے ہی مشابہت پیدا کر لیجئے، اگر ہماری داڑھی نہیں ہے تو ہم اس لئے رکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ ہو جائے جو داڑھی والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسلامی صورت ...... نیز یہ کہا گیا کہ قیامت کے دن داڑھی کو نور بنایا جائے گا۔ داڑھیاں نور کی صورت اختیار کریں گی۔ یعنی اس روشنی میں آدمی راستہ طے کرے گا۔ تو اس لئے رکھ لے کہ بھائی! میرا راستہ ہی طے ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ میرا نور بجھ جائے۔ اس اندھیرے میں کس طرح قدم اٹھاؤں گا تو کم سے کم یہ رعایت کرے۔

اور مسلمان کی صورت تو داڑھی ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ داڑھی نہ ہو۔ آپ خود غور کر لیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن میں منفعل بھی ہیں کہ کچھ سوسائٹی اور ماحول کی مجبوری سے ایسا کر لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر مجبوری تو وہ پیشِ نظر رکھنی چاہئے جس کا کوئی جواب نہیں ہو گا اور وہ قیامت کے دن کی مجبوری ہے، یہاں کی مجبوریاں تو سہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہاں کوئی ایسی بات سامنے آئے تو کسی صورت میں وہاں تدارک ہی نہیں، وہاں تو پھر بھگتانے ہی کی صورت ہے۔ تو کم سے کم اسی نیّت سے کرے۔

تشبُّہ باسمِ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثمرہ ...... اور کچھ نہیں تو یہی نیت کرے کہ میری جو محبوب ترین ذات ہے وہ میرے رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کی صورت پاک ایسی تھی، کم از کم میں ان سے ہی مشابہت کروں۔ تشبُّہ میں بڑی برکتیں ہیں، اگر نام بھی رکھ لے اس میں برکت ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن جب میدانِ محشر میں لوگ جمع ہوں گے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر کو "یَا مُحَمَّدُ" کہہ کر پکاریں گے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جتنے لوگوں کے نام محمد ہوں گے، ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مجھے پکارا ہے تو لاکھوں آدمی کھڑے ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تو اپنے پیغمبر کو پکارا تھا۔ جنہیں ہم نے جنت میں بھیجنا

تھا۔لیکن جب تم کھڑے ہوگئے تو تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔اب ہم تمہیں بٹھانا نہیں چاہتے۔اس نام کی برکت سے نجات اور مغفرت ہوجائے گی،تو جن کے نام پاک کے نام کی نقل اتارنے کی یہ برکت ہے،اگر ان کی صورت کی نقل اتار لی تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔اگر ان کی سنتوں کی،ہم نقل اتارنے لگیں تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ بہرحال اتباعِ سنّت میں خیر ہی خیر ہے،کوئی برائی نہیں اور ترکِ سنّت میں برائی ہی برائی ہے۔چاہے وہ آج واضح نہ ہو،کل کو واضح ہوجائے گی یا قبر میں واضح ہوگی یا محشر میں واضح ہوگی۔

میں تو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر مولویوں کی سی داڑھی نہ رکھیں تو کم سے کم اتنی رکھ لیں کہ دور سے نظر آئے کہ بھئی! داڑھی ہے مسلمان ہے۔وہ بھی انشاء اللہ نور کا کام دے گی،انشاء اللہ ضائع نہیں جائے گی،یہ فعل بھی اکارت نہیں جائے گا۔اتباعِ سنّت کے لئے ایک قدم بڑھے گا،ایک ہی قدم کا اجر ملے گا۔دو بڑھیں گے،دو کا اجر ملے گا،لپک کر چلیں گے،اس کا اجر ملے گا۔جتنا بھی آپ بڑھیں گے۔خیر کی طرف بڑھیں گے،خیرِ دنیا و آخرت دونوں اس میں ظاہر ہوں گی،انشاء اللہ برکات نمایاں ہوں گی۔

مشابہت کا تمدّنی فائدہ.....مصر میں میں نے ایک واقعہ سنا،اس سے واقعی مجھے عبرت ہوئی،وہاں عام طور سے لوگ داڑھی نہیں رکھتے بلکہ جو رکھ لیتا ہے اسے پکارتے ہیں کہ یہ تو یہودی ہوگیا۔یہ اس کو طعن دیتے ہیں۔مگر جن لوگوں کے داڑھی ہے،ان سے پوچھا تم نے کیا فائدہ سوچا؟۔یعنی شرعی بات تو الگ ہے،اس سے قطع نظر کرکے تمدن کی حیثیت سے تم نے کیا بات سوچی جو تم داڑھی رکھتے ہو؟ یہ جواب تو صحیح ہے کہ اتباعِ سنّت کرتے ہیں پیغمبر علیہ السلام کی صورت سے مشابہت بے شک برکت ہی برکت ہے۔لیکن تم پر جو ملامتیں پڑتی ہیں۔اس کے مقابلہ کے لئے تمدّنی حیثیت سے داڑھی رکھنے میں تم نے کیا مصلحت سوچی؟

انہوں نے کہا کہ ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ یہاں پردہ بالکل نہیں۔نوجوان لڑکیاں پھرتی ہیں اور بہت زیادہ بالکل آزاد ہیں داڑھی والا جو اُن کے سامنے آتا ہے،منہ پھیر کے چلی جاتی ہیں۔کبھی اس کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے لئے تقویٰ کا راستہ صاف ہوگیا۔اگر ہم نہ بچنا چاہیں تو وہ ہم سے بچتی ہیں۔ہم برائی میں مبتلا نہیں ہوسکتے۔ میں نے کہا: الحمد للہ،دنیا میں کم سے کم یہ مصلحت تو نمایاں ہوئی کہ داڑھی والے کی طرف آزاد اور اوباش قسم کی عورتیں متوجہ نہیں ہوتیں اگر متوجہ ہوگی تو اپنی ہی بیوی متوجہ ہوگی۔یعنی حلال ہی کام اس سے سرزد ہوگا،حرام سرزد نہیں ہوگا۔یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

اور پھر یہ کہ اگر آپ نے مولویانہ صورت بنالی تو آپ کو کبھی جرات نہیں ہوگی کہ سینما میں جاکے بیٹھیں،لوگ یوں کہیں گے کہ نامعقول مولویانہ صورت سے تم یہاں آئے؟ دنیا طعن دے گی۔تو اس داڑھی کی وجہ سے آدمی بہت سے مصائب اور برائیوں سے بچ جاتا ہے۔تو ایسی چیز تو محبت کرنے کے قابل ہے جو بہت سی برائیوں سے بچانے کا ذریعہ بن جائے۔تو ایک تو اتباعِ سنّت ہے،وہ تو عظیم چیز ہے۔دنیا میں بہت سے منافع بھی ہیں اور فوائد و برکات بھی ہیں۔

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کمالِ عشق ومحبت......اور اصل یہ ہے کہ محبت کی کمی ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تام اور پوری ہو جائے۔ پھر اس قسم کے معاذیر اور عذرات کچھ پیش نہیں چلتے۔ محبت ناقص اور عشق ناتمام میں اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں کہ ملامت کرنے والے یوں ملامت کریں گے تو ہم کیا کہیں گے اور فلاں عیب لگا دے گا تو ہم کیا کہیں گے۔ جب عشق قلب میں تام ہو جاتا ہے تو پھر کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ باقی نہیں رہتی۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ، جب ایران فتح ہو گیا، بغداد میں تشریف رکھتے تھے اور کھانا تناول فرمار ہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے فوراً جھک کر زمین پر سے لقمہ اٹھایا اور خاک وغیرہ اڑا کر صاف کیا اور تناول کر لیا۔ وہ فارسی غلام جو کھڑا ہوا تھا، اس نے کہا کہ: یہ آپ نے کیا حرکت کی؟ یہاں بڑا تمدّن ہے بڑے متمدّنوں کا ملک ہے اور بڑے معزز لوگ ہیں زمین پر پڑی ہوئی چیز اٹھا کر کھا لینا، یہاں بڑی بدتہذیبی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ آپ پر طعن کریں گے کہ یہ بڑے حریص ہیں کہ انہوں نے ایک گری ہوئی چیز اٹھا کر کھالی۔ تو اس کو عیب اور ذلّت سمجھا جاتا ہے۔ آپ حضرات کو اپنا وقار تھامنے کے لئے ان باتوں کی رعایت رکھنی چاہئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں ''ءَاَ تْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ'' کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟ کہ یہ ملامت کریں گے۔ ان کی ملامت مجھ پر کیا اثر کر سکتی ہے؟ سنت کے فوائد میرے سامنے ہیں اور اس ملامت کا کوئی ضرر مجھ تک دنیا وآخرت میں نہیں پہنچ سکتا۔ تو جو چیز کہ کوئی ضرر نہ پہنچا سکے، اس کی وجہ سے میں وہ فعل اختیار کر لوں جو دنیا میں بھی میرے لئے مضر ہو اور آخرت میں بھی مضر ہو۔؟ تو فرمایا کہ: میں ان ملامت گروں کی ملامت کی وجہ سے سنت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہیں کر سکتا۔ اس میں گویا روٹی کا بھی ادب ہوا اور اتباعِ سنت بھی ہوا اور عظمتِ سنّت بھی ہوئی اور سنت کے مقابلہ میں کسی ملامت اور لومتہ لائم کی پرواہ بھی نہ ہوئی۔ تو اس سے حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کا کمالِ عشق اور کمالِ ایمان واضح ہو جاتا ہے۔

عطیۂ خداوندی کی قدر ومنزلت......اور روٹی کی عزت کرنا یہ خود شرعاً فی نفسہ واجب ہے۔ صریح حدیث میں فرمایا گیا: ''اَکْرِمُوا الْخُبْزَ'' ''روٹی کا اکرام کرو''۔

اس لئے کہ روٹی اللہ کا تبرک ہے، اس کو عزت کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اس کو استعمالی سامان مت سمجھو کہ کھائی اور جو باقی بچی اٹھا کر پھینک دی۔ جیسے ہم بعض دفعہ ریلوں میں دیکھتے ہیں۔ یہاں تو الحمد للہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر ادھر کہ روٹی کھائی اور جو بچی اس سے منہ صاف کیا اور اسے لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے۔ میں نے تو بعض کو ملامت کی حالاں کہ وہ غیر مسلم تھے۔ میں نے کہا یہ کیا طریقہ ہے۔؟ کہنے لگے کہ: اب یہ کام کی

نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ: یہ کرتہ پائجامہ میلا ہوگیا ہے۔اسے بھی اتار کر ذلت سے پھینک دو۔ کام کا نہیں رہا۔ اس لئے کہ میلا ہوگیا۔اس وقت کھانا تمہارے کام کا نہیں رہا۔شام کو تمہارے کام آجائے گا۔تمہارے کام کا نہ ہو کسی غریب کے کام آجائے گا۔ یہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے،اسے ذلیل کر کے پھینکنا،اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روٹی سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ روٹی کا ادب سکھلایا گیا ہے۔ اس کی بے ادبی جائز نہیں رکھی گئی،اس کا احترام واجب ہے۔اسی طرح اگر دانے زمین پر گر جائیں۔انہیں چگ لینا چاہئے، یہ نہیں کہ انہیں جوتیوں میں روند دیا جائے۔وہ اللہ کا عطیہ ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کا تبرّک ہے۔

احترامِ رزق...... ہمارے اساتذہ میں سے حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے محدّث تھے۔ان کی وفات ہوگئی بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے اور صاحبِ حال لوگوں میں سے تھے۔ ان کا عجیب طریقہ تھا۔ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا باہر آیا تو جب مہمان کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے۔ تو کچھ تو روٹیوں کے ٹکڑے بچ جاتے ہیں، کچھ چھوٹے موٹے کنے بچ جاتے ہیں اور کچھ ریزے ہوتے ہیں جو دسترخوان پر پڑے ہوتے ہیں۔تو میاں صاحب مرحوم کا عجیب طریقہ تھا، روٹیوں کے جو بڑے ٹکڑے بچ جاتے،انہیں جمع کر کے احتیاط سے گھر میں بھیجتے کہ یہ مہمان کا تبرّک ہے۔ یہ گھر والوں کو کھانا چاہئے، وہ جو کنارے اور چھوٹے چھوٹے کنے رہ جاتے،ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے فرماتے کہ انہیں چھت پر پھیلا دو، یہ چڑیوں اور کوؤں کا حق ہے۔ ہمارے رزق میں اللہ نے ان کا بھی حصّہ رکھا ہے۔اور وہ ریزے جو چھوٹے چھوٹے بھورے ہوتے، ان کو جمع کر کے جہاں چیونٹیوں کے سوراخ ہوتے وہاں ڈال دیتے کہ چیونٹیاں انہیں لے جائیں کہ ان کا بھی ہماری غذا کے اندر حق ہے۔تو ادب بھی ہوا اور ٹھکانے بھی لگا۔تو روزی اور رزق اسی قسم کی چیز ہے۔ پرانے بزرگوں میں اس کا بڑا احترام کیا جاتا اور کہا جاتا کہ: ''روزی کا مارا ہوا اور روٹی کا مارا کہیں نہیں پنپتا''۔

یعنی جو روٹی کے ساتھ بے ادبی کرے، رزق کے ساتھ گستاخی کرے۔ وہ محروم الرزق بن جاتا ہے،اس لئے شریعت اسلام نے روٹی کا ادب سکھلایا کہ اس کی توقیر کرو،اس کو کوڑے میں مت ڈالو،اس کو خاک پہ مت ڈالو،اسے منہ پونچھنے کا رومال مت بناؤ،بلکہ جتنا بچ جائے،ادب کے ساتھ احتیاط سے رکھو،خود تمہارے کام آئے گا۔تمہارے کام نہیں آئے گا کسی فقیر کے کام آئے گا، کسی غریب کے کام آئے گا۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔انہیں کھانے کو ٹکڑا نہیں ملتا اور تم سینکڑوں ٹکڑے ضائع کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ خود بے ادبی کا ثبوت دیا اور دنیا کو رزق سے محروم کیا۔ جو دنیا کو رزق سے محروم کرے کہیں اس پر یہ اثر نہ پڑے کہ اللہ اسے رزق سے محروم کر دے وہاں تو ادل بدل ہے۔ بہر حال روٹی کا اکرام بھی واجب قرار دیا گیا۔ رزق کا احترام بھی واجب قرار دیا گیا۔ ذرا ذرا سی چیزوں میں ادب سکھلایا گیا۔

احترامِ لباس...... یہی ادب کپڑے پہننے میں ہے۔ مثلاً رات کو آدمی سوتے وقت کپڑے اتارتا ہے۔اچکن

اتارا، کرتہ اتارا، لنگی باندھی۔ فرمایا گیا کہ ان کپڑوں کو زمین پر مت ڈالو۔ فرش پر بکھرا ہوا مت چھوڑو، یعنی بے ادبی اور بے توقیری سے پھیلا ہوا مت چھوڑو۔ اوّل تو یہ ادب کے خلاف ہے۔ جب یہ عطیۂ خداوندی ہے تو جس اللہ نے دیا ہے اس کی نعمت کا احترام کر کے تہہ کر کے سرہانے رکھ دو یا کسی کھونٹی پر ٹانگ دو۔ زمین پر پڑا ہوا مت چھوڑو، اور اس میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اس میں دنیوی مضرّت بھی ہے، فرماتے ہیں کہ "اِطْوُوْا ثِیَابَکُمْ تَرِدُ اِلَیْھَا اَرْوَاحُھَا" کپڑوں کو لپیٹ کر احتیاط سے رکھو۔ بکھرے ہوئے چھوڑو گے تو ممکن ہے اس کے اندر چیونٹیاں گھس جائیں اور جب پہننے لگو تو ایذا پہنچائیں۔ ممکن ہے کوئی بچھو گھس جائے اور تکلیف پہنچائے، کپڑے کو پڑا ہوا مت چھوڑو۔ بے ادبی بھی ہے اور دنیوی مضرت بھی ہے۔ بلکہ اس کو تہہ کر دیا کھونٹی پر ڈالو، ہر چیز کے اندر شریعت نے آداب سکھلائے ہیں، کھانے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ڈھنگ بتلایا کہ ڈھنگ بھی بے ادبی کا مت اختیار کرو کہ وہ اللہ کا عطیہ ہے۔

ہیئت احترام...... کوئی بادشاہ اگر کسی کو کوئی عطیہ دے، اور آدمی نے منہ ادھر کو پھیر کر بائیں ہاتھ سے لے لیا، وہ انعام سے محروم کر دیا جائے گا کہ شاہی عطیہ کی اس نے قدر نہیں کی۔ دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں یا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ادب کے ساتھ لیتے ہیں کہ شاہی عطیہ ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ: جب کھانا کھانے بیٹھو، دائیں ہاتھ سے روٹی کھاؤ، دائیں ہاتھ سے پانی پیو۔ گویا حق تعالیٰ ایک ایک لقمہ تمہیں پہنچا رہے ہیں۔ ہر ہر منٹ پر انعام ہو رہا ہے اور تم لیتے جا رہے ہو، تو بائیں ہاتھ سے مت لو کہ یہ بے ادبی ہے۔ جھک کر کھاؤ، متکبر بن کر مت کھاؤ، چوکڑا مار کر مت کھاؤ کہ یہ متکبروں کی طرز ہے۔ سوائے اس کے کوئی معذور ہو۔ بعض دفعہ آدمی لحیم شحیم اور موٹا تازہ ہے۔ اب اس غریب سے اکڑوں نہ بیٹھا جائے۔ نہ یہ کہ ایک پاؤں کھڑا کر کے ایک بچھا کے بیٹھا جائے۔ چوکڑا ہی مار کر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ معذور ہے۔ تو معذور کا باب الگ ہے۔ لیکن اصل حکم یہ ہے کہ تربع یعنی چوکڑا مار کر کھانا مکروہ ہے۔ لیٹ کر کھانا مکروہ ہے کہ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے اور طبّی اصول کے بھی خلاف ہے۔ تو یہ سارے آداب اس لئے سکھلائے گئے کہ دنیا کی بھی منفعت حاصل ہو اور اخروی نفع بھی حاصل ہو اور رضائے خداوندی بھی حاصل ہو۔

احکامِ شریعت میں فوائدِ اُخروی و دنیوی...... شریعت کے ہر حکم میں جہاں آخرت کے منافع ہیں وہاں دنیا کے بھی منافع ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: "اَلسِّوَاکُ مِطْھَرَۃٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاۃٌ لِّلرَّبِّ" (1) مسواک کرنے میں منہ کی پاکیزگی اور خوشبو ہے اور آخرت کا ثواب ہے اور حق تعالیٰ کی رضا ہے۔

تو مسواک کرنے میں دو فائدے حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منہ کی صفائی، اور منہ کی صفائی کا صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ دانت صاف رہیں گے تو پائیوریا نہیں ہوگا تو معدہ نہیں بگڑے گا۔ معدہ نہیں بگڑے گا تو صحت اچھی رہے گی، گویا جسمانی صحت بھی اچھی ہوئی اور صحتِ روحانی بھی حاصل ہوئی کہ رضائے حق میسر آ گئی۔ تو چیز

(1) السنن للنسائی، کتاب الطھارۃ، باب الترغیب فی السواک ج:1 ص:11.

ایک ہے، ایک حکم ہے۔اس سے دنیا کا فائدہ بھی اور آخرت کا فائدہ بھی۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو چکے اور مرض الوفات میں تھے تو ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ مزاج پوچھا اس سے بات چیت فرمائی۔ وہ واپس ہو گیا۔ جب تھوڑی دور گیا تو غلام سے کہا کہ اس نوجوان کو بلاؤ۔ وہ آیا۔ لنگی پہنے ہوئے تھا جو ٹخنوں سے نیچے زمین پر گھسٹتی ہوئی جارہی تھی۔ تو آپ نے نہایت ہی محبت سے فرمایا۔ یَا فَتٰی! (اے نوجوان) ''اِرْفَعْ اِزَارَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَتْقٰی لِرَبِّکَ.'' ① اس کپڑے کو اٹھا۔ اس میں تیرے لئے دو فائدے ہیں انقی لثوبک سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تیرا کپڑا صاف ستھرا رہے گا۔ یہ جو زمین پر گھسٹتا ہوا آرہا ہے، تو کہیں جگہ پاک ہے کہیں ناپاک ہے۔ پاکی لگی، ناپاکی لگی۔ کپڑا بے اعتبار بن گیا نہ عبادت کے قابل رہا، نہ نماز کے قابل رہا۔ تو انقی لثوبک دنیوی فائدہ تو یہ ہے کہ کپڑا پاک رہے گا۔ واتقی لربک اور پروردگار کے لحاظ سے دیکھیں تو تیرے اندر تقویٰ پیدا کرے گا۔ خوفِ خدا پیدا کرے گا۔ اس لئے کہ کپڑا زیادہ گھسٹتا ہوا ہوتا ہے تو دل میں رعونت پیدا ہوتی ہے اور کبر کا مضمون دل میں پیدا ہوتا ہے اور اگر کپڑا ٹخنے سے اونچا ہوتا ہے تو تواضع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

آثارِ لباس...... اسی واسطے سلاطین اور بادشاہوں کا لباس آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کے لباس تین تین گز ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ کندھے پر قباء ہے اور دو دو گز ادھر ادھر بکھری ہوئی پڑی ہے۔ یہ انتہائی کبر ونخوت اور رعونت کی دلیل ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا کہ بندے کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بندگی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام جو منافی بندگی ہو کرے، لباس کا زمین پر پھیلا ہوا رہنا کبر کی علامت ہے اور لباس کا اونچا رہنا یہ تواضع کی علامت ہے، اس میں تزیّن کم ہوتا ہے۔ اس میں زینت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی زینت بڑھ جائے گی تبختر اور اتراہٹ پیدا ہوگی، کبر ونخوت پیدا ہوگی، کبر ونخوت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اور اگر زینت میں کمی ہے، یعنی جمال تو ہے، تزیّن نہیں ہے۔ جمال کے معنی صفائی ستھرائی، موٹا کپڑا، لیکن آدمی اگر بناؤ اور سنگھار میں لگ جائے، اسی سے کبرِ نفس کی طرف طبیعت جاتی ہے۔ عورت چوں کہ محلِ زینت ہے، اس واسطے عورتوں میں تکبّر زیادہ ہوتا ہے۔ مرد چوں کہ زینت کم اختیار کرتے ہیں، اس لئے عورتوں کی نسبت متکبر کم ہوتے ہیں۔ متواضع زیادہ ہوتے ہیں۔ تو عورت میں ناز ونخرہ اور کبر ونخوت زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ محلِ زینت ہوتی ہے۔ اور مرد محلِ شجاعت اور محلِ ہمّت ہے۔ اگر مرد بھی محلِ زینت بننے لگے تو مرد اور عورت میں فرق نہیں رہے گا۔ اگر مرد اسی طرح بناؤ سنگھار کرنے لگے جس طرح عورتیں کرتی ہیں، تو ان میں کبرِ نفس پیدا ہوگا، جتنا زینت کو چھوڑ کر تجمل اختیار کریں گے، اتنی تواضع پیدا ہوگی۔ تزیّن بناؤ سنگھار کو کہتے ہیں اور تجمل صفائی و ستھرائی، ڈھنگ اور طریقے کو کہتے ہیں۔ تو شریعت نے تجمّل کا حکم دیا ہے یعنی موٹا کپڑا پہنو مگر صاف ستھرا ہو اور جمال کی شان ہو، اور

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قصة البيعة والاتفاق علیٰ عثمان، ج: ۱۲، ص: ۵۳، رقم: ۳۴۲۴.

ایک زینت ہے یعنی بناؤ سنگھار کرنا، یہ عورتوں کے لئے مخصوص کی گئی۔ تو عورتیں متکبر زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کا علاج دوسرے ڈھنگ سے بتلایا گیا۔ عورت سے زینت ترک نہیں کرائی بلکہ زینت کا حکم دیا گیا۔ اس واسطے کہ زینت سے محبت کا تعلق ہے۔ اور یہ مطلوب ہے کہ عورت خاوند کی محبوب بنے۔ اس کو محبت اور تعلق رہے۔ اگر خاوند میں بیزاری پیدا ہوئی تو گھر اور معاشرت منزلی تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے مرد کو عورت کا محب بنانا چاہا ہے اور عورت کو مرد کا محبوب بنانا چاہا ہے۔ اس لئے عورتوں کے لئے زینت کا حکم دیا ہے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت سارے سفید کپڑے پہن لے تو یہ مکروہ ہے، کوئی نہ کوئی کپڑا رنگین ہونا چاہئے تا کہ زینت کی شان اس کے اندر پیدا ہو۔

حرف آخر...... بہر حال شروع میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ کوئی منضبط بات تو ہے نہیں، منتشر چیز ہے۔ مگر مختلف مسائل آ گئے۔ اب وقت بھی پورا ہو گیا۔ جمعہ پر بات چلی تھی کہ جمعہ یوم جامع ہے۔ معلوم نہیں ادھر کس طرح نکل آیا۔ بس اللہ کا حکم تھا ادھر نکل آیا۔ جمعہ کے متعلق جو بیان کرنا تھا، وہ رہ گیا۔ پھر کبھی آنا ہوا تو اس کی تقریر ہو جائے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

الہامی ادارہ اوراس کے فضلاء کی تنظیم

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ!...... فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قیام دارالعلوم، اسباب ومحرکات...... بزرگانِ محترم! دارالعلوم دیو بند جس کا نام آپ کل سے بار بارسن رہے ہیں اور یہ تمام اکابر جواس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ اجلاس میں) آپ حضرات کے سامنے جمع ہیں۔ اسی دارالعلوم دیو بند کے اجزاء واعضاء ہیں۔ دارالعلوم کے ارکان ہیں۔ ان ہی حضرات کے اجتماع کا نام دارالعلوم دیو بند ہے، خواہ وہ دارالعلوم دیو بند کے اندر ہوں یا باہر ہوں۔

دارالعلوم دیو بند کا قیام رسمی طور سے عمل میں نہیں آیا کہ چند آدمی شہر کے ذمہ دار حضرات جمع ہوئے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت نہ تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ انگریزوں کا تسلط واقتدار ہندوستان میں آیا۔ دین کی کسمپرسی کا حال سب کے سامنے ہوا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اسلام شاید اب باقی رہے یا نہ رہے۔ تو اس وقت جتنے اولیاء اور اکابر تھے۔ یک دم ان کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا کوئی ادارہ ہونا چاہئے جس کے ذریعہ سے دین اور علم دین باقی رہے۔ دین کی حفاظت کی جاسکے۔ اگر یہ باقی رہے تو تمام چیزیں اسلام اور مسلمان کی باقی رہ سکتی ہیں اور اگر دین وعلم دین باقی نہ رہے تو خدانخواستہ مسلمان مسلمان نہ رہ سکیں گے۔

دین کی بقاء علم دین کی بقاء سے ہوسکتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت وشوکت باقی بھی ہو تو قابل اعتناء نہیں۔ تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا ادارہ ضروری ہے۔ ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی۔ بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی، الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چناں چہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا یاسین صاحب دیوان جی حضرت قاسم العلومؒ کے خادمِ خاص اور معتمد علیہ تھے۔ جب حج کو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت امداداللہ صاحب قدّس سرہ، کی خدمت میں جانا ہوا جو پورے مشائخ کے شیخ اور مرشد طریقت تھے۔ تو رخصت کے وقت عرض کیا کہ ہمارے مدرسہ کے لئے بھی دعا کریں۔ حضرت حاجی صاحب نے یہ سن کر تعجب سے جواب میں فرمایا، چہ خوب، پیشانیاں تو برسوں ہم نے رگڑیں راتوں بھر سجدے ہم نے کئے دعائیں ہم نے مانگیں، اب جب مدرسہ قائم ہوا تو مدرسہ آپ کا ہوگیا اور پھر فرمایا کہ ہمارا خیال مدرسے کا تھانہ بھون یانانوتہ میں قائم کرنے کا تھا، ہمیں کیا خبر تھی کہ دیوبند والے یہ غنیمت لے اڑیں گے۔ تو مدرسہ دیوبند کا قیام ہنگامی حالات اور مشورہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ اکابر کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سجدے کئے جارہے تھے۔ راتوں کو دعائیں مانگی جارہی تھیں۔ حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، معلوم ہوا کہ الہام غیبی سے مدرسہ قائم ہوا۔

خشتِ اوّل...... اس ادارہ کی عمارت کی سب سے پہلی اینٹ حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دارالعلوم کے جلیل القدر استاد کے نانا میاں جی منے شاہ نے رکھی، ان کا نام محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ میاں جی مرحوم کے بارے میں حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: میں آج پہلی اینٹ ایک ایسے شخص سے رکھواؤں گا کہ جسے کبھی بھی عمر بھر صغیرہ کے درجہ میں بھی گناہ کا تصور نہیں ہوا۔ استغراق اور ربودگی کی یہ کیفیت طاری تھی کہ اپنی اولاد تک کو نہ پہچانتے۔ ان کے داماد تھے، اللہ بندہ نام تھا۔ جب ان کی خدمت میں آتے تو پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے۔ اللہ بندہ، پھر پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے آپ کا داماد ہوں، دس منٹ بعد پھر وہی استغراق۔ یہ کیفیت استغراق کی جاری رہتی، نہایت ہی پاک طینت بزرگ تھے۔ جب انتقال ہوا اور غسل کے لئے تختے پر لٹائے گئے۔ تو چشم دید واقعہ مولانا محمد یسٰین صاحب نے سنایا، جو میرے فارسی کے استاد تھے اور آپ کے پاکستان کے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے والد ماجد تھے۔ انہوں نے خود سنایا کہ تختے پر لٹاتے ہی میاں صاحب ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ شور مچ گیا تو لوگ دوڑ پڑے۔ جب مجمع زیادہ ہوا تو ہنسا بند ہوا، تو اس قماش کے لوگ تھے۔ جنہوں نے دارالعلوم کی پہلی اینٹ رکھی پھر حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ اور دوسرے اکابر نے بعد میں اینٹ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اینٹ رکھنے والے ایسے اولیاء اللہ اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ایسے لوگ ہوں تو اس مدرسہ کی بنیادیں کتنی مضبوط ہوں گی۔ آج بحمدللہ اس پر سو برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے۔ ہزاروں مصائب آآ کر ختم ہوئے اور وہ مدرسہ ترقی کرتا گیا۔ برابر بڑھتا جارہا ہے اور آج تک اسی آب و تاب سے قائم ہے۔ یہ ایک رسمی بات ہے کہ فلاں شخص وہاں کا مہتمم ہے، عہدیدار ہے یا مدرس ہے اور اسے ترقی دیتا ہے، یہ غلط اور محض ایک تہمت ہے۔ ترقی دینے والی غیبی طاقت ہے، سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کرتا ہے۔

مرکزِ روحانیّت...... میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے سنا، فرماتے تھے کہ دارالعلوم آدمیوں کو بناتا ہے۔ آدمیوں نے دارالعلوم کو نہیں بنایا۔ یہ ایک کسوٹی ہے، پرکھ ہے، یہاں دارالعلوم کے ہزاروں

فضلاء ہیں اور مدارس قائم کیے ہوئے ہیں، میں برما گیا تو دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود۔ افغانستان گیا تو سینکڑوں علماء موجود اور قصبہ قصبہ آباد ہے۔ مدارس قائم کر چکے ہیں۔ یہاں کثرت سے فضلاء سرگرمی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان سب کا رجوع دارالعلوم کی طرف ہے۔ یہ اس ماحول کے آثار ہیں۔ وہاں کی غیبی طاقت ہے کہ سب کا تعلق اور رجوع اس مرکز کی طرف ہے۔ وہاں کے فضلاء کہتے ہیں کہ جب ہم دارالعلوم سے جدا ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی گود سے جدا ہونے کی حالت ہے، گویا ایک جاذبیت ہے، روحانیت ہے اور دارالعلوم مرکزِ روحانیت بن گیا ہے۔

دارالعلوم کی شانِ تجدید...... حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے ’’اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔‘‘ (1)

ہر ایک صدی میں کوئی نہ کوئی مجدّد آئے گا۔ جو دین کو نکھارے گا۔ عقائد و اعمال اور کلیاتِ دین میں لوگ جو فرق و خرابی ڈالیں گے مجدّد ہر صدی میں آ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گا، تو فرمایا کہ مجدّد کے لئے فردِ واحد ہونا شرط نہیں۔ جماعت بھی مجدّد بن سکتی ہے اور فرمایا کہ دارالعلوم کے بانی حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ ان سب کی حیثیت مجدّد کی سی ہے اور ان حضرات کا مظہرِ اتم دارالعلوم ہے۔ گویا دارالعلوم کی حیثیت مجدّد کی سی ہے۔ جس نے بدعت و سنت کو الگ الگ کیا۔ دین کو خلط ملط، غل و غش سے پاک صاف کر دیا۔ مسائل میں جو خلط لوگوں نے کیا تھا، اسے نکھار نکھار کر پاک صاف کر دیا۔ یہ ایک کیفیت ہے دارالعلوم کی۔

مرکزِ اتحاد...... مادّی چیزوں میں تغیر اور انتشار ہوتا ہے۔ روحانیت میں قدرتی طور پر اجتماع ہوتا ہے اور دارالعلوم کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ مادّہ کا خاصہ ہی تغیر ہوتا ہے اور روحانیت میں ایسا نہیں ہوتا، ایک شیخ کے مرید، ایک استاد کے شاگرد قدرتی طور پر مجتمع رہتے ہیں۔ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم کے فضلاء کے قلوب ایک مرکز سے وابستہ ہیں اور حقیقی طور سے وابستہ ہیں۔

جو اتحاد کا مرکز ہے تو قدرتی طور پر ان کا آپس میں اتحاد قائم ہے۔ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ جب تک حیات تھے، ان کی سرپرستی دارالعلوم کو حاصل تھی۔ تو کیفیت یہ تھی اور ہماری حالت یہ تھی کہ لوگ اختلاف کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے دلوں میں افتراق کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور جب ان کی وفات ہوئی اور حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی آئی تو اگر کچھ اختلافات اٹھتے بھی۔ مگر حضرت گنگوہیؒ کی روحانیت کی وجہ سے ختم ہو جاتے۔ ان کی روحانی طاقت انہیں دبا دیتی اور قوت مجتمع رہتی۔

تنظیم کی ضرورت...... پھر خلفاء کے زمانے میں مراکز الگ الگ ہوئے۔ مرکز خلفاء بن گئے۔ مگر قوت مجتمع تھی۔ مریدین آپس میں مجتمع تھے۔ اس وقت سوال پیدا ہوا کہ مراکز کے اختلافات کی وجہ سے رسمی طور سے تنظیم

---

(1) السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذ کر فی قرن المائة، ج: ۱۱، ص: ۳۶۲ رقم: ۳۷۴۰.

ہونی چاہئے تا کہ رسمی طور پر بھی ایک اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک نظام اور تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مرکز پر سب متحد رہیں۔ ورنہ مشائخ کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے صورتِ اختلاف تشتت وظاہری پراگندگی کی نمایاں ہو جاتی ہے۔ گو وہ درحقیقت مذموم نہ ہو۔

اس وقت بزرگوں کے دلوں میں وارد ہوا کہ تنظیم ابنائے دارالعلوم دیو بند ہونی چاہئے۔ یہ تنظیم ابنائے قدیم آج کی نہیں، ہاں زیادہ قوت اس تنظیم میں ابھی چند سال ہوئے کہ پیدا ہوئی، ورنہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے زمانے میں جب کہ دارالعلوم ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ضرورت محسوس کی۔ زیادہ قوت سے اس کی ضرورت اب محسوس کی گئی۔ یہ تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں، نہ سیاسی مقاصد اس کے ساتھ متعلق ہیں۔

مقصدِ تنظیم...... بلکہ اس تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ فضلاء دینی علمی قابلیتوں سے عظیم کام انجام دے رہے تھے۔ ان کو منظم کیا جائے تا کہ زیادہ موثر ثابت ہوسکیں۔ آج ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم کے فضلاء ہیں، فیض یافتہ ہیں جو دین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک میں اس کے فضلاء پھیلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے تو کوئی قصبہ ایسا نہیں جو ان سے خالی ہو۔ ان سو برس میں جتنی خدمت اس ادارے نے کی، کوئی نظیر اس کی نہیں۔ جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے۔ ہزار ہا ہزار تصانیف اس جماعت کی مختلف مسائل پر موجود ہیں۔ ایک حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا جائے تو ایک ہزار تصانیف اپنے ترکے میں چھوڑ گئے۔ ہر زبان میں تصانیف، ہر علم میں، ہر فن میں تصنیفات موجود ہیں۔ نظم میں موجود ہیں، نثر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہزار کے قریب مواعظ الگ چھوڑ گئے۔ کچھ چھپ گئے ہیں، کچھ باقی ہیں۔ گویا ایک ایک فرد نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرّہ کے مرید ومتوسل ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اسی طرح حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرّہ کے ہزار ہا شاگرد، مریدین اور متوسلین ملک کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے مریدین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں الگ پھیلے ہوئے ہیں۔ سب اپنے رنگ میں دین کا کام کر رہے ہیں۔ حدیث، فقہ، فتویٰ، تفسیر، عمل جہاد ہر میدان میں اس جماعت کے لوگ نمایاں نظر آئیں گے غرض یہ کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے ایمان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کام سب سے بڑھ کر، خدمت کے میدان میں تمام جماعتوں سے آگے اور زیادہ۔ ہر دیہات میں کوئی نہ کوئی فاضل موجود ہے۔ شہرت نہیں، اخباروں اور رسالوں میں نام نہیں۔ مگر ہزاروں کے ایمان کو سنبھالے اور خود بھی سنبھلے ہوئے ہیں۔ اب آپ کے اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب سلمہٗ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہی شخصیت نے دارالعلوم قائم کیا۔ یہ ہزاروں لوگ علماء ومشائخ جو اس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) نظر آرہے ہیں۔ یہ ان کی نہیں بلکہ دارالعلوم دیو بند کی خدمت ہے۔ ایک شخص کے ساتھ ہزاروں لوگوں کا دین وابستہ ہے۔ مگر رسمی طور پر اگر کسی

نے کہا کہ دارالعلوم دیو بند نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے فارغین کیا کیا کام کررہے ہیں۔ تو چوں کہ انتشار ہے۔ منظم نہیں ہیں۔ تو صحیح خدمات آپ نہیں بتلا سکتے۔ اگر چہ خدمتیں بے شمار ہیں۔ آپ اجمالاً بیس ہزار کی تعداد کہہ سکیں گے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان بیس ہزار علماء وفضلاء نے کیا کام کر دکھایا۔ مورخ بھی اجمالاً ذکر کردے گا۔ مگر تفصیلی طور سے اسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔ دنیا کو اجمالاً بھی پتہ نہ چل سکے گا۔

تنظیم خدمات...... لہٰذا اسی مقصد کے لئے شعبۂ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تا کہ دارالعلوم کی روحانی ذریت کے کارنامے منضبط ہوسکیں۔ مقصد خدمات کی تنظیم ہے۔ افراد کی تنظیم نہیں۔ اس کے لئے ایک فارم تیار کیا گیا جس کی سرخیاں میں نے خود لکھیں کہ ہر فاضل اس کی خانہ پری کر کے بھیج دے، اس کی مدت فراغت اور کہاں اقامت ہے۔ تصنیف وتالیف کے کیا اور کون سے کام کئے۔ جائے سکونت اور بیعت وارشاد کے بارے میں سوالات لکھے گئے۔ الحمد للہ کہ ڈھائی تین ہزار فارم پُر ہو کر آ گئے اور یہ خدمات اور کارنامے اگر کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ ان حضرات نے دنیا کو دین وایمان سے بھر دیا ہے اور پھر ان حضرات کے وعظ وارشاد، تعلیم وتبلیغ سے اور ہزاروں متکلم، خطیب، شیخ طریقت، واعظ مبلغ تیار ہوئے۔ اب اسی مقصد کے لئے یہ ادارہ قائم کیا جا رہا ہے۔ کہ ماہنامہ دارالعلوم کے چار صفحات اسی غرض کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں کہ ان میں دارالعلوم کے فضلاء کا ذکر ہو۔ سن وار ان کے حالات اور کارنامے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ دین اور علم دین اور علماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہوگی۔

وسعتِ دارالعلوم...... دارالعلوم اس چاردیواری کا نام نہیں۔ اس تمام نظام مسلک، تحریک اور خدمات کا نام ہے۔ جو ہندو بیرون ہند میں قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ذکر کیا کہ بریلی میں ایک مدرس ہیں۔ جو دارالعلوم کے نمایاں فاضل ہیں۔ انہیں دارالعلوم میں بلالیں، مولانا خاموش رہے، چپ ہو گئے۔ تین دفعہ عرض کیا گیا، پھر عرض کیا کہ آپ کیوں رکاوٹ کرتے ہیں، فرمایا ان کو بلانا غلط ہے۔ اس لئے کہ جو فاضل جہاں بیٹھا ہے وہاں دارالعلوم دیو بند قائم ہے، اسی طرح گویا ہر شہر وقصبہ میں دارالعلوم قائم ہے۔ یہ دارالعلوم دیو بند کی وسعت ہے، آپ فاضل کو بلا کر دارالعلوم کے دائرے کو سمیٹ کر محدود کر رہے ہیں اور میں سمیٹنا نہیں چاہتا، یہ ساری روحانی اولاد اسی دارالعلوم کی ذرّیت ہے۔ کسی کا ایک بچہ رہ جاتا ہے کسی کے دو کسی کے تین۔ دارالعلوم کے لاکھوں بیٹے ہیں۔ لاتعداد اولاد ہے اور جائز اولاد ہے۔ ترکے اور میراث کے وارث ہیں۔ اور یہ ترکہ اخلاق ہیں، اعمال ہیں، علوم ہیں، معارف ہیں جو انبیاء علیہم السلام کا ترکہ ہوتا ہے۔ اور اس ترکہ میں ہر ایک کو بقدرِ ظرف حصّہ ملا ہے۔

معیار اہتمام...... حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے مہتمم اور اُمّی محض تھے، منقطع عن الخلائق، صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بلا کر مجبور کیا۔ دارالعلوم کے

اہتمام کے لئے، فرمایا! میں تو محض امّی ہوں، نہ لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا، فرمایا اس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں بلکہ قلب سے اس چیز کا تعلق ہے۔ چنانچہ مولانا اہتمام کے لئے بیٹھ جاتے اور جو کچھ لکھواتے، لکھ دیا جاتا اور اس پر مولانا کی مہر لگائی جاتی تھی۔ بہرحال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ ادارہ بڑا ہے، میں اس ذمہ داری کو کس طرح سنبھال سکوں گا اور اتنا تحمل کس طرح کر سکوں گا۔

معیارِ طلباء...... اس واقعہ سے پہلے ان کا ایک اور واقعہ سنئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام کے زمانے میں دارالعلوم میں پچاس ساٹھ طالب علم تھے۔ چوبیس پچیس طلبہ مطبخ سے کھانا لیتے تھے۔ یہ کل کائنات تھی۔ حضرت مولانا دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں کھڑے تھے۔ ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ لایا، اور غصہ سے مولانا کے سامنے پٹخ دیا اور کہا یہ سالن ہے یا پانی ہے۔ یہ کھانا مطبخ سے کھلاتے ہو؟ بے ادبی کے الفاظ بھی استعمال کئے۔ کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام؟ مولانا نے تین مرتبہ سر سے پاؤں تک اس طالب علم کو دیکھا اور فرمایا یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ لوگوں نے کہا مدرسہ کا طالب علم ہے، یہاں مقیم ہے، مطبخ سے کھانا لیتا ہے، فرمایا کچھ بھی ہو مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ طلبہ چپ رہے، دو تین دن کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں تھا۔ اس نام سے دھوکہ دے کر مدرسہ سے کھانا لینے کے لئے داخل ہوا تھا، اہل مدرسہ نے آپ سے پوچھا۔ حضرت آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ فرمایا کہ جب مدرسہ کا اہتمام میرے سپرد ہوا پریشانی ہوئی کہ کس طرح یہ کام سنبھالوں گا۔ اس عالم میں رات کو خواب دیکھا۔ صاحبِ دل اور عارف ربانی تھے اور صاحبِ دل کا خواب آدھا خواب اور آدھا کشف ہوتا ہے۔

تو فرمایا کہ میں نے مولسری کے کنویں کو دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی من پر بیٹھ کر دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ کسی کو لوٹا بھر کر دے رہے ہیں، کسی کو دیگ میں، کسی کو بالٹی میں مل رہا ہے اور کوئی پیالہ بھر رہا ہے اور جس کے ساتھ برتن نہیں تو چلو میں ہی پی کے چلا گیا، اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ دودھ بھر کے لے جا رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد ہے، آنکھ کھل گئی تو میں نے مراقبہ کیا، تعبیر کے لئے منکشف ہوا کہ یہ کنواں صورت مثالی ہے علم کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صورت مثالی ہیں قاسم العلم کی جو تقسیم کر رہے ہیں علم کو اور یہ لے جانے والے طلبہ ہیں جو بقدرِ ظرف لیتے جا رہے ہیں۔ اب اس سے زیادہ عجیب بات یہ کہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ: جب شوال کا داخلہ ہوتا ہے تو میں فوراً طلبہ کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ طلبہ کے اس مجمع میں موجود تھا۔ اب جب یہ طالب علم آیا تو میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی، معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں نہیں تھا۔

الہامی طریقے سے اس کا علم ہوا۔ معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے طلبہ کا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے، جہاں بھی کام کرتے ہیں غالب آتے ہیں۔ غلبہ پر ایک واقعہ یاد آیا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں چودہ طالب علم دورہ حدیث میں تھے دستار بندی کی تجویز ہوئی، یہ دارالعلوم کا دوسرا جلسہ تھا۔ ہمیں

بھی پگڑی باندھنے کا ارادہ کیا گیا تو ان چودہ طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جلسہ کو رکوانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیوں کہ ہم اُمیّوں کو پگڑی بندھوائی جائے گی اور ہم اہل نہیں، جس سے مدرسہ کی بدنامی ہوگی۔ غرض ان چودہ طالب علموں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ جا کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی سے جلسہ رکوانے کی درخواست پیش کریں، حضرت مولانا یعقوب صاحب دارالعلوم کے اول صدر مدرس تھے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب ان کی خدمت میں پہنچے تو مولانا محمد یعقوب صاحب مطالعہ فرما رہے تھے کتابوں کا۔ حضرت تھانوی نے ہیئت بھی اس وقت کی بتلادی کہ میں جب حجرہ میں گیا تو ڈیسک پر کتاب رکھی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور بہت گہرے طریقے سے مطالعہ کر رہے تھے کتابوں سے نگاہ اٹھائی، ان کا رعب اتنا تھا کہ ہر ایک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پوچھا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں نے درخواست پیش کی کہ دیوبند میں جلسہ، دستار بندی ہو رہا ہے، اگر یہ حکم ہو تو تعمیل سے انکار نہیں اور اگر کہنے کا موقع ہو تو ہماری درخواست ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، نالائق ہیں، پورا مدرسہ اور ہمارے اکابر واساتذہ بدنام ہو جائیں گے۔ جلسہ روک دیا جائے اور ہماری نالائقیوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عیوب پر پردہ ڈالا جائے، یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو جوش رحمت آیا، فرمایا یہ تمہاری نالائقی کا احساس تمہاری سعادت مندی کی علامت ہے۔

جب آدمی میں اپنی نالائقی کا احساس آ جائے تو یہ اس کے کمال وفضیلت اور سعادت مندی کی دلیل ہے اور ہم جو یہ جلسہ کریں گے تو وہاں اعلان کریں گے کہ فیما بیننا وبین اللہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اہل ہیں قابل ہیں، اور جس کی مرضی ہو ان کا کسی فن میں بھی امتحان لے لے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ: ہم لوگ اور بھی ڈر گئے کہ آئے تھے جلسہ رکوانے کے لئے اور یہاں امتحان دینے کا الگ کہا گیا۔ بہرحال ہم وہاں سے چلے گئے۔ جاتے وقت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جملہ فرمایا کہ دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بھی تم جاؤ گے وہاں تم ہی تم ہو گے، تمہارا ہی غلبہ ہوگا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم نے تجربہ کیا کہ جہاں گئے، ہم ہی ہم نظر آئے جہاں گئے غالب ہی غالب رہے کیوں کہ حق ہی کو غلبہ ہے۔ "اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلٰی" غالبیت کے لئے حق ہے اور مغلوبیت کے لئے باطل ہے۔ بہرحال یہ ہے فضلاءِ دیوبند کی تنظیم جو دراصل خدمات کی تنظیم ہے۔

تنظیم کے فوائد...... دوسرا فائدہ اس میں یہ ہے کہ کچھ خدمات مرکز کی ہیں، کچھ فضلاء کی۔ دونوں کے سامنے خدمات ہیں۔ اس واسطے بھی تنظیم ہونی چاہئے کہ مرکز کو فضلاء کی خدمات کا پتہ لگے اور فضلاء کے سامنے مرکز کی خدمات آتی رہیں۔ اگر فضلاء کو کسی مدد کی ضرورت وحاجت ہو تو ادھر مرکز کو پتہ لگے اور اس کے لئے سوچے اور مرکز کی ضرورتوں کا علم فضلاء کو ہو۔ غرض جانبین سے ایک رابطہ قائم رہے گا۔ ہندوستان میں دیکھا گیا کہ فتنے اٹھتے ہیں، علمی فتنے، عملی فتنے، اور ہر قسم فتنے کے اٹھتے ہیں۔ فضلاءِ دیوبند نے مقامی طور پر ان فتنوں کا مقابلہ کیا اور ان

فتنوں کو مغلوب کیا۔ مرکز کو پتہ نہیں کہ فضلاء نے کیا خدمات انجام دیں اور فضلاء کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہم بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ لیکن مرکز ہماری خبر نہیں لیتا، ہماری تحسین نہیں کرتا۔ تو اس غرض سے تنظیم کا سلسلہ قائم کیا گیا کہ اگر ضرورت پڑے گی تو آپس میں اجتماعی آواز ہوگی، ان کی حمایت میں آواز اٹھے گی یا مرکز کوئی شخص ان کی امداد کے لئے بھیج سکے گا۔ جماعتی آواز کا اثر اور طاقت ہوگی، دین کا فائدہ ہوگا، قوم کو فائدہ ہوگا، تو یہ تنظیم خدمات کی ہے افراد کی نہیں۔ اس صورت میں خدمات زندہ جاوید رہیں گی۔ منظم ہونا قوم کو ہر حیثیت سے مفید رہے گا۔ باہمی تعاون جاری رہے گا۔ خدمات کا انضباط کیا جاسکے گا کہ کہاں کہاں اور کیا کیا خدمات انجام دی جارہی ہیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے دعوے بہت کئے اور کام بہت تھوڑا کیا یا بالکل نہیں کیا، معمولی خدمات مگر نمائش زیادہ۔ ہمارے ہاں کام ہوتا ہے۔ مگر نہ اخبارات نہ اشتہارات اور دعویٰ یہ لوگ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ہم نے سنبھالا ہے، ہمارے اکابر کے ہاں کام ہے نام نہیں، پروپیگنڈہ نہیں، لوگ چھوٹی چھوٹی خدمات اخبارات میں دیتے ہیں، میں سوچا کرتا ہوں کہ دارالعلوم میں روزانہ جلسے ہوتے ہیں لیکن کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ جتنے لوگ اشتہارات منصوبوں اور پروگرام کے بعد کسی جلسے میں جمع ہوتے ہیں۔ وہاں بلا کسی منصوبہ، آئے دن اتنے لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں مگر پروپیگنڈہ بہت ہے، کام کے درجہ میں صفر ہوتے ہیں۔ کئی لوگ دارالعلوم کو جاننے والے نہیں کہ کیا خدمات انجام دیں۔ اس تنظیم میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مرکز میں بھی انبساط ہوگا اور فضلاء کا دل الگ بڑھے گا۔ خدمتیں نمایاں ہوکر سامنے آئیں گی اور بھی کئی قسم کے فوائد ہیں۔ یہ صورت پیش آئی کہ تنظیم ہونی چاہئے اس کے لئے کئی قواعد وضوابط منضبط کئے گئے۔ تنظیم کو صوبہ وار پھر ضلع وار رکھا گیا کہ فضلاءِ دارالعلوم علاقہ وار جمع ہوکر ایک ذمہ دار مقرر کریں، صدر بنائیں۔ سیکرٹری منتخب کریں۔ یہ خیال زیادہ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اکابر نے ارادہ کیا۔

اجلاسِ صد سالہ...... ایک جلسہ دستار بندی کا بھی ہوجائے، تقریباً پچاس برس سے جلسۂ دستار بندی نہیں ہوا۔ ۱۳۲۸ھ سے لے کر اب تک درج رجسٹر فضلاء کی تعداد چھ ہزار تک ہے۔ ان چھ ہزار علماء کی دستار بندی کرائی جائے۔ اس واسطے اشتہارات جاری کئے گئے۔ ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا کہ اس تنظیم کے نظم ونسق کو سوچیں۔ ترتیب دیں۔ اس کے اعلانات جاری کئے گئے تو ملک میں اس کا شہرہ ہوا۔ ملک میں اس کا شدید انتظار ہے۔ بیرونِ ملک کے لوگ بھی منتظر ہیں۔ کیوں کہ ان میں حجازی بھی ہیں، ایشیا، ساٹرا، ملایا، چینی، ترکستانی، ایسٹ افریقہ، افغانستان کے فضلاء ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ تو ہزاروں کی تعداد میں جب جلسہ ہوگا۔ تو ایسی صورت میں گورنمنٹ کے سامنے ویزوں کے لئے درخواست دینی ہوگی۔ متعلقہ حکومتوں سے اجازت لینی ہوگی، اس کے ساتھ مصارف کا تخمینہ اور ساتھ ہی ساتھ آمدنی کا اندازہ وغیرہ اہم امور ہیں۔ کیوں کہ حاضرین کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ سے کم نہ ہوگا، پورے ملک میں انتظار ہوگا۔ ہم لوگ اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ دیوبند کی آبادی تیس ہزار ہے،

اور اگر دولاکھ آدمی آجائیں تو اس مختصر آبادی میں کس طرح سماسکیں گے۔ کہاں بسیں گے۔ ہر ایک فاضل کو پگڑی باندھنی ہوگی اور اگر دس روپے فی پگڑی ہو تب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے صرف پگڑیوں کے مصارف ہوں گے اور اگر یہ بھی آسان ہوجائے تو اس کے باندھنے کا مسئلہ ہے۔ کل یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) ۳۰، ۳۵ طلبہ کو پگڑی بندھوانی تھی۔ تو بڈھے بزرگ تھک گئے، ہاتھ تھک گئے۔ مگر ختم نہیں ہورہے تھے۔

تو یہ تقریباً پانچ ہزار پگڑیاں باندھنا آسان کام نہیں۔ کل دستار بندی کے وقت ہمارے مولانا عبدالحنّان صاحب (ہزاروی) نے خوب جملہ چسپاں کیا کہ یہ پگڑیاں ہیں۔ یا سوٹہ بازی ہے۔ میں نے کہا کہ: پگڑیاں بھی کلف دار ہیں اور باندھنے والے بھی مکلّف ہیں اور پگڑیاں بھی ذرا مکلف ہونی چاہئیں۔ کلف لگا ہوا ہو۔ یہ بھی صورت ہے کہ اس وقت پیچ وخم نہ ہو۔ بلکہ پہلے سے باندھ کر رکھ دی جائیں۔ (یہ جملے حضرت نے مزاحاً فرمائے) خیر ان حالات کی وجہ سے یہ جلسہ ذرا مؤخر کیا گیا۔ مجلس شوریٰ میں یہ بھی بحث میں آیا کہ دارالعلوم کے سوسال پورا کرنے میں ایک سال باقی ہے تو پورا ہونے پر سوسالہ جشن منایا جائے۔ بہر حال منصوبہ ہے، تجویز ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد پر منحصر ہے۔

وسائل جمع کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں کہ ہندو بیرونِ ہند کے دوڈھائی لاکھ افراد جمع ہوسکیں اور انعقاد کیا جاسکے۔ یہ تنظیم کی غرض وغایت ہے۔ یہ چند باتیں تنظیم کے بارے میں ذکر کی گئیں، یہاں آج اس مجلس میں اس صوبہ کے فضلاء اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ ان مقاصد پر غور کیا جائے۔ میں تو دیکھ کر خوش ہونے والوں میں ہوں گا۔ اب کام کرنا ان حضرات کو ہوگا۔ کام آپ حضرات ہی کا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

تقریظ

از: حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمتہ اللہ علیہ

(صدر، مہتمم، دار العلوم دیوبند)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

برادرِ محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے چند ماہ پیشتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک معرکتہ الآ راء تقریر کی تھی جسے بعد میں منضبط کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا اور اس کا نام ''سائنس اور اسلام، رکھا گیا۔

چھپنے سے پہلے برادر ممدوح نے مجھے بھی اس کے مطالعہ کا موقع دیا۔ میں اس مضمون کے مطالعہ سے بے حد محظوظ و مسرور ہوا اور دل سے مولف کے حق میں دعا نکلی۔

یوں تو اس موضوع پر مختلف مذاق کے لوگ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے ہیں گے لیکن یہ مضمون اپنی نوعیت میں نرالا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مضمون، حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کی صرف نسبی اولاد ہی نہیں؛ ان کے علمی وارث بھی ہیں۔ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز (علی گڑھ) میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا، وہ مسلمانوں کی اصلاح کی ایک خوش آئند اور درخشاں علامت ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے نو تعلیم یافتہ بھائیوں کو بار بار اس طرح کے افادات سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

شبیر احمد عثمانی

۳ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ

تقریظ

از: حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب
(سابق شیخ الادب والفقہ، دارالعلوم دیوبند)

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا. اَمَّا بَعْدُ! -

اس رسالہ کے اوراق اس مقبول عام تقریر کے حامل ہیں جو عالی جناب مولانا الحاج المولوی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے "اسلام اور سائنس" کے خشک مگر ضروری عنوان پر بمقام علی گڑھ کالج اسٹریچی ہال میں فرمائی تھی۔

خالص علمی اور خشک عنوان پر تقریر اور ایسے شخص کی تقریر جس کو کتب عربیہ کے مطالعہ، عربی طلبہ کے ہجوم میں عربی الفاظ و مصطلحات کی مزاولت سے فرصت ہی نہ ملتی تھی اور وہ بھی ایسے مجمع میں جہاں اس کے برعکس انگریزی زبان اور اس کے محاورات مادری زبان کے حکم میں آ گئے ہوں۔ یقیناً اضداد کے اجتماع کے حکم میں تھی اور اگر ضب (گوہ) اور نون (ماہی) کی ضدّیت اور بعد مکانی کا صحیح مشاہدہ ہوسکتا تھا تو یہاں ہونا چاہئے تھا، لیکن بیان کی سلاست، مضامین کے ارتباط اور دقائق علمیہ ظاہرانہ انداز سے روزمرہ کے محاورہ میں ادا کرنے نے ایسا سہل الحصول بنا دیا ہے کہ اس کے شروع ہو جانے کے بعد ختم کلام سے پہلے سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔

پھر یہی نہیں کہ صرف سائنس اور اسلام کے ہر ہر گوشہ پر مقرر ممدوح نے روشنی ڈال کر اس پتھریلی اور سنگلاخ زمین کو طریقۂ بیضاء بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے معارف و دقائق علمی و اسلامی بھی نہایت سہولت کے ساتھ اہل بصیرت اور ارباب نظر کے پیش نظر کر دیئے اور قابل تحسین یہ امر ہے کہ جس جگہ کوئی ایسا دقیقہ علمیہ سمجھانا ہو جس کو سمجھنے کے لئے علوم قدیمہ سے واقفیت، مصطلحات فنونیہ کا تداول شرط تھا یا فی الحقیقت اس میں مقرر کے لئے دلچسپی پیدا کر لینا ضروری تھا تا کہ اذہان میں نشاط پیدا ہو۔ اس کو اگر ایک جگہ معمولی معمولی مثالیں دے کر کالشمس فی نصف النہار کر دیا تو دوسری جگہ ادیبانہ تشبیہات و استعارات، لطائف و ظرائف سے مزیّن بنا کر ذہن نشین کر دیا۔

پس یقیناً یہ تقریر اگر ایک جانب حقائق اسلامیہ، معارف شرعیہ کا آئینہ ہے تو دوسری طرف ادبی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی ہے ۔

درکفے جام شریعت درکفِ سندانِ عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

پس اگر یہ امر قابلِ تعجب نہیں کہ مشک ان دماغوں کو معطر کر دیتا ہے جو ماؤف نہ ہوں تو یہ بھی شایان تعجب نہیں کہ نزدیکان بے بصر کے علاوہ تمام قلوب اس تقریر سے مستفید ہوئے اور اگر یہ لائق حیرت نہیں کہ آفتاب افق مشرق سے طلوع کرنے کے بعد اپنے مقابل زمین کے ہر ہر گوشہ کو منور کر دیتا ہے تو یہ بھی موجبِ حیرت نہیں کہ اس تقریر نے مسئلہ مبحوث عنہا کے کسی گوشہ کو روشن کئے بغیر نہ چھوڑا اور اگر یہ صحیح ہے کہ ٹھنڈا اور میٹھا غیرِ مکدّر پانی پیا سوں کی پیاس کا ازالہ اس طرح کر دیتا ہے کہ ان کے رونگٹے رونگٹے سے تشنگی کی اذیت، یبوست کی تکلیف زائل ہو جاتی ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اس تقریر نے عنوان بالا سے متعلق تشنگان کمال کی تشنگی اسی دلچسپی کے ساتھ زائل کر دی جو پیاسے کو پانی سے ہوتی ہے۔ قاسمی فیضان کی وجہ سے میرے نزدیک تو نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقررِ ممدوح کی دوسری تقریریں یا تالیفات، اگر کسی ناواقف کو تعجب ہو تو وہ جانے اس کا کام۔

عَجِبْتُ فِی الزَّمَانِ مَا عَجِبُ ۔۔۔ اَتٰی مِنْ اٰلِ سَیَّارٍ عَجِیْبًا

محمد اعزاز علی غفرلہ

تقریظ

از: جناب ڈاکٹر محمد زکی الدین صاحب
(شیخ الطبعیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام مسلمانانِ ہند کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ نے سائنس اور اسلام کے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمنِ اسلامی تاریخ وتمدن کے سامنے فرمایا، اب وہی خطبہ شائع کیا جا رہا ہے تا کہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کریں۔

سائنس اور مذہب کی بحث اور فلسفہ اور مذہب کی بحث مدت سے چلی آتی ہے، سائنس اور مادّیات کی وجہ سے مذہب کو (اسلام اور عیسائیت کو خاص طور پر) سخت نقصان پہنچا۔ ساتھ ساتھ علماء کی یہ کوشش رہی کہ ان نقصانات کی تلافی کی جائے۔

ڈریپر نے ایک کتاب سائنس اور مذہب کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور سائنس کے متعلق مختلف سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے، علامہ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے پیرس جا کر مشہور ومعروف فلسفی رینان سے بحث کی اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام سائنس کی مخالفت نہیں کرتا، اس کے بعد وہ اس موضوع پر کئی مضامین بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے بعد ان کے شاگرد علامہ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا نے مسلسل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

ہندوستان میں سرسید نے اسلام اور سائنس کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ اسلام ریویو میں خواجہ کمال الدین نے بہت سے مضامین شائع کئے۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی اور دیگر علماء نے متعدد خطبات اور مضامین اس سلسلہ میں دیئے۔ علماء کی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ

1 ...... سائنس اسلام کے مخالف نہیں۔

2 ...... جب مسلمان عروج پر تھے تو انہوں نے بہت سی سائنس کی ایجادات کیں، جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ سائنس اسلام کی مخالفت نہیں کرتا۔

مصر میں علامہ طنطاوی نے ''تفسیر جواہر'' ۲۲ جلدوں میں شائع کی ہے، اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کا تعلق سائنس سے دکھایا جائے اور ایک حد تک اس میں علامہ موصوف کو کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلی صدی میں یہ ایک شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی فاش غلطی علماء سے سرزد ہوئی، وہ یہ کہ انہوں نے سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو ابدی سمجھ لیا اور وہ بالکل بھول گئے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے، سائنس کے نظریوں اور اصولوں کی خامیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان میں وقتاً فوقتاً زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ساتھ ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن شریف خدا کا پیغام ہے جو ہمیشہ کے لئے آیا ہے، جو دو متضاد چیزیں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ فاضلانہ خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے پورے طور پر مستفید ہوں گے اور یہ خطبہ ہمارے ان نوجوان کے لئے جن کے دماغ میں سائنس اور الحاد مترادف ہے، مشعلِ ہدایت ہوگا۔

(زکی الدّین)

سائنس اور اسلام

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّــا بَعْــدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِیْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِھَا عَلَیْھَا فَعَجِبَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ شِدَّۃِ الْجِبَالِ، فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ ؟ قَالَ نَعَمْ :اَلْحَدِیْدُ فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِیْدِ؟ قَالَ نَعَمْ. اَلنَّارُ......ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِقَالَ نَعَمْ! اَلْمَآءُ ......ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَآءِ؟قَالَ نَعَمْ: اَلرِّیْحُ فَقَالُوْایَارَبِّ ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّیْحِ؟قَالَ نَعَمْ:اِبْنُ الْاٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَۃً یَمِیْنُہٗ یُخْفِیْھَا مِنْ شِمَالِہٖ (1)

ترجمہ:’’نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو کانپنے اور ڈولنے لگی، تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور ان سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا۔ ملائکہ نے پہاڑوں کی شدت وصلابت پر تعجب کیا اور کہنے لگے کہ اے پروردگار!۔ تیری مخلوق میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں لوہا ہے۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار تیری مخلوق میں لوہے سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آگ ہے، پھر عرض کرنے لگے کہ الٰہی آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ تو پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں، آدم کی اولاد ہے جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو‘‘

تمہید...... صدرِ محترم بزرگانِ قوم و برادرانِ عزیز طلبہ! مجھے اس وقت جس موضوع پر تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا عنوان ’’سائنس اور اسلام‘‘ ہے۔ مجھے جس طرح اس پر تعجب ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ایک

(1) السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ المعوذتین ج: ۱۱، ص:۲۱۵، رقم:۳۲۱.

مرکزی جگہ پر قوم کے منتخب فضلاء مختلف علوم وفنون کے ماہر اور مخصوص ارباب کمال جمع ہیں، تقریر کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم اور نا کارۂ علم وعمل کا انتخاب کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا زائد اس پر تعجب ہے کہ تقریروں کے اہم موضوعات میں سے اس اہم تر بلکہ مشکل ترین موضوع کو مجھ ناچیز کے سر پر عائد کیا گیا ہے۔ عنوان مذکور حقیقتاً ایک غیر معمولی عنوان ہے جس کے لیے معمولی قابلیت کافی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ یہ عنوان ''سائنس اور اسلام'' اپنی لفظی حیثیت میں جس قدر سہل اور مختصر ہے، اسی قدر اپنی معنوی وسعت اور وقت کے لحاظ سے طویل اور صعب ترین ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ عنوان تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک سائنس، دوسرے اسلام، تیسرے ایک درمیانی عطف، اس لئے قدرتی طور پر اس کے ماتحت تین امور کی تشریح مقرّر کے ذمہ عائد ہو جاتی ہے۔ ایک سائنس کا مفہوم اور اس کی حقیقت، دوسرے اسلام کا مفہوم اور اس کی حقیقت تیسرے ان دونوں کی باہمی نسبت اور اس کا حاشیتین سے ارتباط اور پھر ایک چوتھی چیز ان تین سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان تین امور کا مقتضی ہے، یعنی اگر سائنس اور اسلام اور ان کی درمیانی نسبت واضح ہو جائے تو یہ ایک واقعہ کا اثبات ہوگا۔ مگر ہر واقعہ محض ایک واقعہ کی حیثیت سے ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس سے کوئی عمل، کوئی حکم اور کوئی طلب نہ پیدا ہو۔ اس لئے چوتھا مقصد یہ ہوگا کہ ان تین ثابت شدہ حقائق کا ہم پر تقاضا کیا ہے اور یہ واقعات ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے موضوع سے تین مقصد پورے ہو جاتے ہیں جن پر اس مضمون کی بنیاد ہوگی اور سائنس اور اسلام کی حقیقت سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت اور اسلام اور سائنس سے پیدا شدہ موعظت۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور جس قدر اہم ہیں اسی قدر میری نسبت سے صعب اور مشکل ہیں، کیونکہ اول تو اسلامی حقائق ومقاصد ہی پر سیر حاصل روشنی ڈالنا ایک بے مایہ طالب علم کے لئے یقیناً دشوار گزار ہے۔ تاہم اگر اس حیثیت سے کہ مجھے علماء کی ایک مرکزی جماعت (علماء دارالعلوم دیوبند) کی جوتیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور ''**ھم القوم لایشقی جلیسھم**'' کے قاعدے کے مطابق میں کوئی ایک آدھ جملہ اسلام کے مقاصد کے متعلق کہہ بھی دوں تو بہر حال سائنس تو میرے لئے ہر صورت میں ایک نئی چیز اور اجنبی ہے، نہ میں اس کے اصول سے واقف ہوں نہ فروع سے باخبر اور نہ فنی حیثیت سے مجھے اس کے مبادی اور مقاصد سے کوئی تعارف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کے اطراف میں سے اگر ایک طرف بھی گوشۂ چشم سے ایک طرف رہ جائے تو طرفین کی درمیانی نسبت پر روشنی ڈالنا کس قدر مشکل ہے؟ تاہم جب کہ ایک محترم جماعت کی طرف سے مجھے مامور کیا گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ من اللہ ایک طلب ہے، اس لئے غیبی امداد کی توقع پر جرات ہوتی ہے کہ عنوان زیرِ نظر پر اپنی بساط کے موافق کچھ کلام کروں اور سامعین سے اپنی اغلاط کے سلسلہ میں عفوو مسامحت کی درخواست کر کے امیدوارِ تسامح رہوں۔

حضرات! اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے وہ عنوانِ مذکورہ کی تینوں جہات پر انتہائی جامعیت کے ساتھ حاوی ہے اور اس میں میرے علم وفہم کے مطابق پہلے سائنس کی جوہری حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی

ہے کہ گویا اس کا مغز اور لبِّ لباب کھول کر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔اس کے بعد اسلام کی اصلیت واشگاف فرمائی گئی اور پھران دونوں چیزوں کی باہمی نسبت اس انداز سے آشکارا کی گئی ہے۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مقصودیت کی شان کس کو حاصل ہے اور وسیلہ محض ہونے کی کس کو؟ اور پھر یہ کہ اس وسیلہ سے اس کے مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر حصول مقصد کے بعد اس پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں جن کی توقع پر تحصیل مطلوب کی سعی کی جائے۔

ہاں مگر حدیثی حقائق کھولنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میں سائنس کا موضوع متعین کردوں تاکہ اس پر انضباط کے ساتھ بحث کی جاسکے مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ فن سائنس کے موضوع کی تعیین فن کی حیثیت سے میری قدرت میں اس لئے نہیں کہ میں نے اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ البتہ اس کے مشہور اور زبان زد آثار کو سامنے رکھ کر اپنی ذہنی سعی سے سائنس کا جو کچھ موضوع متعین کرسکتا ہوں، اسی کو عرض کروں گا، مجھے امید ہے کہ اگر میں اس میں غلطی کروں گا تو اس مرکز کے اہلِ فن اور سائنس دان استاذ مجھے اس غلطی پر قائم نہ رہنے دیں گے۔

فن سائنس کا موضوع.....حضرات! اس دور ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادّیات کے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دور حاضر نے اپنی اعجازی کروٹ سے دنیا کو دیوانہ بنا دیا۔ مثلاً وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہری آثار ہیں، یا مثلاً وسائل نقل وحرکت کے سلسلہ میں جب ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور دوسری بادپا سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع وحرفت کے سلسلہ میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب وغریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئری کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں، اس طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات، پھل اور پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار وخواص کے متعلق انکشافات کا نام جب لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آجاتا ہے۔

اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہنچانے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب وغریب پھرتیلی صورتیں، کیمیاوی طریق پر فن دواسازی کی حیرتناک ترقی، تحلیل وترکیب کی محیر العقول تدبیریں بجلی کے ذریعے معالجات کی صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں تو ساتھ ہی انتہائی وقعت کے ساتھ سائنس کا نام بھی زبان زد ہوتا ہے کہ یہ سب اسی کے درخشندہ آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ موضوع عمل موالید ثلاثہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

پھر چونکہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا، مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلمہ چیز ہے اور اس کے لئے اس پر کسی استدلال کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظِ حقیقت عناصرِ اربعہ ٹھہر جاتے ہیں۔ جن کی خاصیت اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھیر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل و ترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور پر لاتے رہنا، سائنس کا مخصوص دائرۂ علم و عمل ہو جاتا ہے، پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیریں درحقیقت انہیں چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر اس تفصیلی حقیقت کا مختصر عنوان میں خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کا موضوع ''مادّہ اور اس کے عوارض ذاتیہ'' سے بحث کرنا ہے اور بس، جو بھی مادّیات میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہ کر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہوگا، وہی سب سے بڑا سائنس دان اور بہترین ماہرِ سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

موضوع متعین ہو جانے کے بعد اب سائنس کے اس چورنگ مادہ، آگ، پانی، ہوا، مٹی پر جس کا مرتب بیان حدیثِ زیبِ عنوان میں کیا گیا ہے ایک ذرا سا غور فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ:

عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار...... ان چاروں عنصروں کے خواص و آثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں بلکہ کافی حد تک متفاوت ہیں اور نہ صرف عوارض و آثار ہی میں تفاوت ہے بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی، کوئی قوی تر اور کوئی اقویٰ تر ہے۔ اور پھر یہ قوت وضعف کا تفاوت بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں، بلکہ معیاری ہے، وہ معیار یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے، اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی ہے اور پھر طاقت ہی کے اندازہ سے اس میں غلبہ و تسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے اور جس حد تک لطافت کم ہو کر کثافت کے لئے جگہ خالی کرتی گئی ہے، اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی گئی ہے، پھر کمزوری کی قدر اس میں بے بسی، مغلوبیت اور ذلت و پستی بھی نمایاں ہوتی گئی ہے۔

راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصف کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذاتِ بابرکات ہے۔ اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے اور اسی قاعدہ سے بوجہ لطافت طاقتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ چنانچہ اس کی بے انتہا لطافت کا عالم تو یہ ہے کہ آنکھوں سے اوجھل، حواس و خیال کی حدود سے بالاتر اور ادراک و انکشاف کی حد بندیوں سے وراء الوراء ہے، پھر ان کی بے انتہائی طاقت کا کرشمہ یہ ہے کہ تمام جہانوں پر اپنی اور صرف اپنی شہنشاہی کا نظام محکم کئے ہوئے ہے۔ اس لئے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ درحقیقت اسی کی ذات و صفات کا کوئی پَرتو ہے۔ جس کا اثر بقدر استعداد اس نے قبول کر لیا ہے اور جب کہ قبولِ اثر بغیر کسی مناسبت کے نہیں ہوتا، اس لئے یہ کہا جانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہر لطیف شئ کو بقدرِ لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو ذاتِ بابرکات کے ساتھ قرب و تناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی، غالب اور با اقتدار بنتی جائے گی، ادھر کثائف کو اس کی ذات سے بے انتہا بُعد اور بیگانگی

ہے کہ وہاں کثافت کا نشان نہیں۔اس لئے جو چیز بھی بقدر کثافت اس لطیف وخبیر سے دور پڑتی جائے گی، اسی وجہ سے پست ومغلوب اور ذلیل ہوتی جائے گی اور اس میں سے غلبہ واستیلاء کی شان نکلتی جائے گی۔ بلکہ اسی طرح جس طرح پانی سے کوئی چیز قریب۔ جائے تو اس میں پانی کے آثار برودت ورقت وغیرہ سرایت کرتے چلے جائیں گے۔آگ سے قریب ہو جائے تو حرارت ونخونت وغیرہ آثار راسخ ہو جائیں۔مٹی سے قریب ہو جائے تو یبوست اور خشکی کے آثار گھر کر جائیں۔

اسی طرح جو چیز کسی وصف کے ذریعہ بھی ذاتِ بابرکات حق سے قرب ومناسبت پیدا کرلے گی۔وہ اسی حد تک بقدرِ استعداد شئون ربانی اور صفاتِ کمالیہ کا مرکز ومحور بنتی چلی جائے گی اور ضرور ہے کہ اس میں استیلاء واستغناء کا ظہور ہوا اور وہ قوی تر، غالب تر اور رفیع المنزلت ہوتی جائے۔فرق اگر ہے تو یہ کہ حسیات میں قرب بھی حسی ہوتا ہے اور آثار قرب بھی محسوس طریق پر نمایاں نظر آتے ہیں۔مگر اس کی بارگاہِ رفیع میں حس کی رسائی نہیں، اس لئے اس کا قرب بھی حسی ہونے کی بجائے وصفی ہوتا ہے، یعنی جو چیز اخلاق واوصاف کے لحاظ سے قرب ومناسبت کا درجہ حاصل کرلے گی وہی اس کے کمالات سے بقدر استعداد حصہ پانے لگے گی اور اسی حد تک غلبہ وتسلط اور استغناء واستیلاء اس کے حصہ میں آجائے گا۔

عنصر خاک......اس معیار کے ماتحت جب ہم عناصرِ اربعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ کثیف عنصر ''مٹی'' نظر آتا ہے، جس کا مخزن یہ زمین ہے، یہ خاک کا ڈھیر کثیف ہی نہیں بلکہ کثافت آور بھی ہے۔ساری چیزوں میں اگر کثافت وغلاظت آتی ہے تو اس مٹی ہی کی بدولت آتی ہے، آگ نے آج تک کسی چیز کو گندہ اور غلیظ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگ پر پکانے کی وجہ سے کسی چیز میں غلظت آجائے۔سو یہ غلظت آگ میں سے نہیں آتی بلکہ آگ اس شے کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے جس سے اس کا اصل مادّہ غلیظہ باقی رہ کر نمایاں ہو جاتا ہے اور شے غلیظ معلوم ہونے لگتی ہے، سو آگ اس میں کوئی چیز ڈالتی نہیں بلکہ اس سے کچھ نکال لیتی ہے، پس یہ غلظت آگ میں سے نکل کر نہیں آتی بلکہ خود اس شے کی ذات سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، جب کہ آگ اس کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے، اسی طرح پانی کسی چیز کو مکدر اور غلیظ نہیں بناتا بلکہ اس کی بدولت تو غلاظتیں اور کدورتیں صاف کی جاتی ہیں کہ اس کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے۔

اسی طرح ہوا بھی کسی چیز کو مکدر اور گندہ نہیں کرتی۔یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طریقہ پر اجزاء ارضیہ ملے ہوئے چلے آئیں اور کسی شے کو مکدر بنادیں تو پھر یہ کدورت بھی زمین ہی کا فیض ہوگا نہ کہ ہوا کا۔اس لئے انجام کار ساری کثافتوں کی جڑ یہ خاک دھول بنتی ہے۔جس کو لطافت سے دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں۔اس لئے عام عناصر میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔آپ ساری ہی زمین کے اس طویل وعریض کرہ کو لے لیجئے، اس میں بجز پامالی اور ذلت ومسکنت کے اور کوئی جوہر دکھائی نہیں دے گا۔یہ زمین رات دن روندی جاتی ہے۔مگر ذلت و

پستی کا یہ عالم ہے کہ چوں تک نہیں کر سکتی، نہ اس میں ادراک ہے، نہ احساس، نہ غلبہ ہے، نہ اقتدار، اگر غلبہ ہے تو دوسرے تمام عناصر کا خود اسی پر ہے۔ گویا سارے ہی عناصر کا قدم اس کے سر پر ہے اور ہر ایک عنصر کا یہ کھلونا ہے، ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے، پانی اسے بہائے پھرتا ہے، آگ اسے جھلستی رہتی ہے مگر یہ ذرا بھی زور نہیں دکھا سکتی کہ زور ہو تو دکھائے۔ طاقتیں تو اس کی کثافتِ مطلقہ نے سلب کر رکھی ہیں، زور آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر فقدانِ لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مادہ بھی کثیف اور صورت بھی کثیف، اسے کتنا ہی صیقل کرو، مگر سطح پھر بھی کِرکِری ہی رہے گی۔ نہ چکناہٹ قبول کرے گی نہ چمکاہٹ۔ پھر نہ صرف کثیف المادہ اور کثیف الصورت ہی ہے، بلکہ کثیف الطبع بھی ہے، ایک ڈھیلے کو کتنا ہی زور سے اوپر پھینکو۔ جب تک پھینکنے والے کا عارضی زور اس کے ساتھ رہے گا، وہ اونچا ہوتا جائے گا۔ لیکن جب اس کی اصلی حالت اور عرضی طبیعت عود کرے گی تو پھر نیچے ہی آپڑے گا۔ بہر حال جب کہ زمین کے مادہ صورت اور طبیعت میں کسی جہت سے بھی لطافت نہیں، گویا اسے ذاتِ اقدس سے اس وصف میں بُعد مطلق حاصل ہے تو ضعفِ مطلق اور ذلتِ مطلقہ بھی اسی عنصر کے حصہ میں آنی چاہئے تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے زمین کو ذلیل ہی نہیں، بلکہ ذلول فرمایا ہے، جو ذلت کا مبالغہ ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا﴾ ① ہاں اس زمین کا ایک جزء پہاڑ بھی ہیں جن کی مٹی یعنی ریت نے بہ نسبت غبار کے کچھ لطافت وستھرائی قبول کر کے کدورت و کثافت سے قدرے بعُد پیدا کر لیا، تو اس کی شان اسی حد تک مٹی سے فائق ہو گئی۔ چنانچہ خشک ریت کو اگر جھاڑ دو تو بکھر جاتی ہے۔ پانی ڈالو تو کیچڑ نہیں بنتا۔ اس کے ذرّات کو دیکھو تو چمک بھی اٹھتے ہیں۔ اس پر نظر ڈالو، خاک کی بہ نسبت نظر فریب بھی ہے۔

حتی کہ بعض اوقات اس کی صاف ستھری صورت اور اس کی آب وتاب دیکھ کر پانی اور دریا کا بھی شبہ ہو جاتا ہے، غرض جس حد تک اس میں لطافت وستھرائی آئی تھی۔ اسی حد تک وہ بہ نسبت غبار کے عزیز الوجود بھی ہو گیا۔ اس کی قدر وقیمت بھی بڑھ گئی اور پھر اس کی ترکیب سے اگر پتھر اور پتھروں کی ترکیب سے پہاڑ بنے تو ان کی عظمت وشان اور قدر وقیمت زمین کی سطح سے کہیں دوبالا ہو گی۔ چناں چہ مٹی کی نسبت سے پتھروں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں بلکہ مٹی کی پختہ سے پختہ اینٹوں کو ایک پتھر سے چکنا چور کر دیا جا سکتا ہے لیکن مٹی کے تودے پتھروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر پہاڑ کی کوئی چٹان زمین پر آگرے تو زمین دہل جاتی ہے اور دب جاتی ہے اور اس میں گہرا غار قائم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے برخلاف مٹی کا منوں ڈھیر بھی اگر کسی سنگین چٹان پر آپڑے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے شکستہ بنائے، نہ وہ ہلتی ہے نہ اس میں غار پڑتا ہے، پھر انہیں پتھروں میں بھی جوں جوں صفائی ستھرائی اور جلا بڑھتی جاتی ہے ان کی قیمت اور معنوی طاقت بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ سنگِ خارا عام

① پارہ: ۲۹ سورة الملک الآية: ۱۵.

پتھروں سے قیمتی، سنگِ مرمر اس سے زیادہ قیمتی، جوہرات اور لعل ویاقوت اس سے زیادہ قیمتی ہیرا اس سے قیمتی، فرق ہے تو وہی لطافت وکثافت اور غلاظت وصفائی کا ہے، زمین کی سطح تو اس حد تک کثیف تھی کہ اسے کتنا ہی صیقل کرو لیکن ہاتھ پھیرنے سے کامل چکناہٹ کبھی محسوس نہیں ہوسکتی۔ لیکن پتھروں میں بوجہ لطافت مادہ یہ قابلیت ضرور ہے کہ اگر انہیں صیقل کردو تو مسکہ کی طرح املس اور چکنے ہوجاتے ہیں۔ پھر بعض میں چمک پیدا ہوجاتی ہے اور بعض جھمٹا سا عکس بھی دکھلانے لگتے ہیں۔ پس پتھروں نے جس حد تک صفائی قبول کی، اسی حد تک ان میں شدت وقوت پیدا ہوگئی ، بہرحال پہاڑ اور ان کا مادہ بہ نسبت زمین اور اس کے غبار کے لطیف ہے اس لئے طاقتور بھی ہے اور زمین سے کہیں زیادہ شدت وصلابت اور قوت کا مالک ہے، پس وجہ شدت وقوت وہی لطافت وستھرائی نکل آئی ہے۔

لیکن پہاڑ اور ان کے شدید القویٰ پتھر جن کی شدت کے سامنے زمین تھر تھرا بھی نہیں سکتی تھی اور پامال محض تھی، اسی وقت تک شدید ہیں جب کہ زمین کی خاک دھول سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے، لیکن اگر کہیں پہاڑوں کی ان شدید ومدید چٹانوں کا سامنا لوہے سے ہوجائے تو پھر ان کی یہ ساری سنگدلی ہوا ہوجاتی ہے۔ لوہے کی ایک بالشت بھر کدال بڑی بڑی چٹانوں کا منٹوں میں فیصلہ کردیتی ہے۔ وزنی وزنی پتھروں کو چکنا چور ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ریل کی پٹریوں پر یہ دوطرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہوتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی کدالوں کی برکت سے مٹی اور لائن دبانے کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور اپنی بے انتہا رفعت سے گر کر اس بے انتہا پستی پر آئے تھے۔ ان پتھروں پر لوہے کی کدالیں اس طرح پڑتی ہیں، جیسے ایک بے دست وپا قیدی کے سر پر کوڑے اور بید پڑتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ لوہا پتھروں سے زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ کیوں؟ راز اس کا بھی وہی لطافت ہے، لوہے کے اجزا نے خلقی طور پر پتھروں کے ریت سے زیادہ صفائی اور ستھرائی قبول کی ہے اور اس میں مٹی تو کیا ریت جیسی بھی کثافت نہیں ہے۔

لوہے کا برادہ اڑتا نہیں پھرتا کہ چیزوں کو آلودہ کردے، ریت اگر پانی میں بھی پڑ جاتا ہے تو بہرحال اسے کسی نہ کسی حد تک مکدّر کردیتا ہے کہ آخر کار خاک ہی ہے۔ مگر لوہے کے اجزاء اگر برادہ کرکے بھی پانی میں ڈال دیئے جائیں تب بھی اس کی جلا اور رقت وسیلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر لوہے پر پالش کردی جائی تو چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے بلکہ اسے صیقل کردو تو آئینہ بن جاتا ہے جو باریک سے باریک خدوخال تک کا عکس دکھلانے لگتا ہے، لیکن پتھر میں نہ ایسی پالش قبول کرنے کی استعداد ہے اور نہ وہ اس طرح کے صیقل ہونے کی صلاحیت ہی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس اگر پتھر منجمد ہوکر اشیاء کی ذات کا سراپا کسی حد تک نمایاں کرسکتا تھا تو لوہا اس سراپا کی تمام باریک سے باریک خوبیاں بھی عیاں کرسکتا ہے۔ اس لئے لوہے کی لطافت پتھروں سے کہیں زیادہ نکلی۔ بس اسی لطافت کی بنا پر لوہا تو پتھروں پر گراں اور طاقتور ہے اور پتھر اپنی کثافت کی بنا پر اس کے سامنے ذلیل وخوار ہے۔ بس بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی اس نمایاں عظمت وہیبت کے باوجود ذرا سے لوہے کے سامنے اپنے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

عنصرِ آتش...... لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے۔ جب ہی تک طاقتور ہے جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے، لیکن اگر اسی لوہے کو کہیں آگ چھو جائے یا لوہے کا بڑے سے بڑا ٹکڑا کسی لوہار کی بھٹی میں پہنچ جائے تو اس کا رنگ روپ متغیّر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی صورتِ نوعیہ اور ذاتی خاصیت تک کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ آگ اس کے جگر تک گھس کر اسے ہم رنگِ آتش بنا کر ڈالتی ہے، پھر اس غریب لوہے کو آگ کی بھٹی سے تھوڑی دیر اور نہ چھڑایا جائے تو آگ اسے گلا کر پانی کی طرح بہا دیتی ہے اور اس کی شدت وصلابت کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی۔ کوئی اب اس لوہے سے کہے کہ پہاڑ کی ایک چھوٹی سے چھوٹی ٹکڑی کا ہی سر کچل دے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ غور کرو تو اس کا راز بھی وہی عقلی اور طبعی اصول ہے کہ آگ میں لوہے سے بھی زیادہ لطافت موجود ہے اور لوہا اس کے مقابلے میں کثیف ہے، لوہے میں اگر اتنی لطافت تھی کہ وہ باوجود پتھروں کی طرح کثیف المادّہ ہونے کے عوارض کے سبب رقت وسیلان قبول کر لیتا تھا تو آگ اپنی ذات سے کوئی ٹھوس جسم نہیں رکھتی، جس میں کوئی چیز گھس نہ سکے۔ ادھر تو ہر چیز آگ کے جگر میں گھس سکتی ہے اور ادھر آگ بھی ہر چیز کے جگر تک میں سرایت کر جاتی ہے، جس کی صلاحیت لوہے میں نہیں پھر لوہا اگر کسی وقت چمک کر باہر سے نورانی شعاعیں قبول کر لیتا تھا تو آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں خود بخود شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ یعنی لوہا دوسروں کی روشنی قبول کرتا ہے اور آگ اپنی روشنی خود دوسروں پر ڈالتی ہے۔ خود بھی روشن ہے اور دوسری تاریک چیزوں کو بھی روشن کر سکتی ہے، پھر صیقل شدہ لطیف لوہا جسے آئینہ کہتے ہیں اس لطافت صورت کے باوجود پھر بھی اتنا ثقیل الجسم اور کثیف المادّہ ہے کہ اگر اس پر ہاتھ مارو تو اس کے متکاثف جسم سے ہاتھ ٹکرا کر واپس آ جاتا ہے، لیکن آگ کی جسمانی لطافت کا عالم یہ ہے کہ اس کے جسم میں سے ہاتھ آر پار نکل جاتا ہے اور پھر اس کا جسم بھی نہیں ٹوٹتا، پھر صیقل شدہ لوہا تو صرف عکس ہی قبول کرتا ہے لیکن آگ اصلی جسم ہی کو قبول کر لیتی ہے اور پھر بھی اس کے جسم میں پھٹن نہیں پائی جاتی اور وہ کسی دوسرے جسم کے تداخل سے مانع نہیں ہوتی، اس لئے وہ لوہے سے زیادہ شدید اور زیادہ طاقتور ہے بلکہ اسی لطافت کی حد تک اس کا حلقۂ اثر بھی کثیف اشیاء کی نسبت وسیع ہوتا گیا ہے۔ پتھر اور لوہا جہاں رکھا ہوا ہے اتنی ہی جگہ اس سے پر ہو جاتی ہے اور اس حد سے باہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آگ جس مکان میں ہے اس سے باہر تک اس کے اثراتِ نورانیت وحرارت پہنچتے ہیں۔ اور اگر آگ اور اس کا مکان نگاہوں سے اوجھل بھی ہو تب بھی اس کے پھیلنے والے آثار اس کے وجود کی خبریں دور دور تک پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے آگ لوہے پر غالب ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار ڈالتی ہے۔

عنصرِ آب...... لیکن یہی دہکتی ہوئی آگ اور اس کا یہ کر دفر جب ہی قائم ہے جب تک اس کے آس پاس کہیں پانی کا نشان نہ ہو۔ اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر آ گریں تو آگ کی چمک دمک اور یہ تعلّی وترفّع سر نیچا ہی نہیں

کرتی بلکہ سب ختم ہو جاتی ہے۔ پانی اس کے وجود ہی کو باقی نہیں چھوڑتا کہ وہ کچھ ابھر سکے۔ بلکہ جس لکڑی کو کچھ دیر آگ سے اپنی جان بچانا ہے وہ پانی کی چادر اوڑھ لے یا نمناک ہی ہو جائے۔ آگ چمک مار کر رہ جائے گی، لیکن اس کا گیلی لکڑی پر کوئی بس نہ چلے گا۔

بہر حال جہاں پانی موجود ہو، آگ کے پر نہیں جم سکتے۔ خواہ پانی آگ پر چھڑک دو یا آگ پانی میں گرا دو، آگ کی خیر نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑا انگارہ پانی پر گرا دو تو اس کے گرتے ہی پانی ادھر ادھر ہٹ جائے گا اور پھر اچانک چاروں طرف سے سمٹ کر اس انگارے کو دبوچے گا تو وہ غریب روسیاہ ہو کر رہ جائے گا۔

غرض یہ اس کے سامنے آئے یا وہ اس کا سامنا کرے، ہر صورت میں پانی کی طاقت کے سامنے آگ کی شعلہ زنی کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ جس سے پانی کی شدت و طاقت آگ پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس غلبہ و مغلوبیت کی روح یہاں بھی وہی اصول ہے جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، آگ اپنی لطافتِ جسم کے سبب کسی شے کی ذات کو اپنے اندر کھپا لیتی تھی، لیکن اس کا چہرہ اتنا صاف نہ تھا کہ اشیاء کا عکس قبول کر سکے۔ مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر کھپا لیتا ہے کہ وہ فقط لطیف المادہ ہی نہیں بلکہ لطیف الصّورت بھی ہے۔

یعنی کچھ بھی اس میں ڈال دو، ہر چیز اس کے قعر اور جگر میں سما جائے گی۔ پھر اس رقّت وسیلان کے باوجود اس کا چہرہ یا سطح اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آئینہ کی طرح صورت بھی دکھلا سکتا ہے۔ پانی کی یہ صفت کہ ہر چیز اس کے آر پار نکل جاتی ہے، گو آگ کو بھی میسر ہے۔ لیکن پانی کا کمالِ لطافت یہ ہے کہ نگاہ تک بھی اس سے پار ہو جاتی ہے۔ جو آگ میں ممکن نہیں۔ پس پانی لوہے کی تصویر کشی اور آگ کے عدم تکاثف دونوں لطافتوں کا جامع ہے، اس لئے اس کی قوت بھی آگ اور لوہے کی قوت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو آگ اور لوہے دونوں کو ختم کر سکتا ہے، لیکن یہ دونوں اس پر غالب نہیں آ سکتے اور اسی لئے پانی کا حلقۂ اثر بھی آگ سے زیادہ وسیع ہے۔ آگ کا اثر اگر اسے کسی بند اور محدود مکان میں روشن کیا جائے، اسی مکان کی چہار دیواری تک محدود ہوگا۔ لیکن پانی جس مکان میں مسدود ہے، اس سے باہر بھی دور دور تک نمی اور رطوبت کے آثار پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں، تو آب وہوا ہی نہیں، لوگوں کے مزاج تک مرطوب ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب اس کی لطافت اور سرعتِ نفوذ کے کرشمے ہیں، لوہا اور آگ مسامات میں نہیں گھستے، لیکن پانی بوجہِ لطافت خاص باریک سے باریک منفذ میں گھر کر لیتا ہے اور جب کہ غلبہ و طاقت بقدرِ لطافت ہے تو پانی کی طاقت بھی بلاشبہ آگ سے کہیں بڑھ کر رہی۔

عنصر ہوا...... اب آگے چلو، یہی پانی جو آگ کو تہس نہس کر دیتا ہے، ہوا کے سامنے یہ مسکین بھی عاجز اور ناتواں ہے اور اس کی کچھ پیش بھی نہیں جاتی وہ چلتی ہوا میں اگر سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ پانی کی موجیں بلکہ موجوں کی موجیں

ایک دوسرے پر گرتی پھرتی پڑتی ہیں۔سمندر کے عظیم الشان کرہ کو بایں عظمت و ہیبت قرار نہیں ہوتا ٹھہرا ہوا پانی ہو تو ہوا اسے خشک کر ڈالتی ہے اور اڑا دیتی ہے۔اگر پانی کا کوئی مخزن و منبع نہ ہو جو اس کی مدد کرے، تو پانی کا وجود ہی باقی نہ رہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہوا پانی پر بھی غالب اور حکمران ہے، وجہ وہی اصول ہے کہ ہوا سب عناصر سے بڑھ کر لطیف و شفاف ہے چنانچہ اس کی جسمانی لطافت کا تو یہ عالم ہے کہ نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اس کی لطافت کے سامنے لطیف ہے، جو اس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی۔بدن کو لگ کر گو ہوا محسوس ہو جائے جس سے اس کے جسم ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔لیکن اور کوئی لطیف سے لطیف حاسہ حتی کہ تارِ نگاہ بھی جو الطف ترین اجسام ہے، نہ اس میں نفوذ کر سکتا ہے، نہ اس کا ادراک ہی کر سکتا ہے۔اسی طرح ہوا اپنی شدتِ لطافت کے سبب رنگ و روپ کو بھی قبول نہیں کرتی۔کہ یہ چیزیں بہرحال نگاہ و بصر ہی سے متعلق ہیں اور وہ بصر ہی کو قبول نہیں کرتی، تو محسوساتِ بصر تک کیا نوبت پہنچ سکتی ہے۔ہاں آواز اور خوشبو جیسی لطیف اشیاء جن کی نہ کوئی حسی شکل ہے نہ ہیئت، ہوا سے ساز کر لیتی ہے اور اپنی لطافت کی بدولت ہوا میں سما جاتی ہے۔جنہیں ہوا قبول کر کے ادھر سے ادھر منتقل کر دیتی ہے۔

پھر اثر کا یہ عالم ہے کہ فوق و تحت کے گوشہ گوشہ اور ایک ایک منفذ میں موجود، جہاں آگ کی روشنی اور پانی کی نمی نہیں پہنچ سکتی، وہاں ہوا قائم اور دائم ہے، ذرا بھی کہیں خلا پیدا ہو جائے تو ہوا کو آتے دیر نہیں لگتی، پانی کو بھی لاؤ تو نالی بناؤ، نشیب پیدا کرو اور پھر بھی اس کی نقل و حرکت میں تدریج۔لیکن ہوا کو نہ نشیب کی ضرورت نہ فراز کی، جگہ ہوئی اور وہ دفعتاً آئی۔گویا پہلے سے موجود تھی۔غرض ہوا لطیف تر تھی تو قوی تر اور غالب بھی ہوئی جو تمام عناصر پر حکمران، سب سے بالا دفوق اور پھر سب میں ساری و جاری ہے۔

جامع العناصر انسان اور اس کی طاقت ......لیکن اگر ان سارے عناصر اور ان کے تینوں موالید، اور موالید کی بھی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر تنہا انسان کو ایک طرف رکھو تو نظر آتا ہے کہ انسان ان سب ہی سے زیادہ اشد، اقویٰ اور ان پر غالب و متصرف ہے۔یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج اور اس سے مغلوب ہیں۔لیکن وہ ان میں سے کسی کے زیرِ تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں کیوں کہ اولاً تو عناصر کی باہمی اور نسبتی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آنے سے کھلتی ہے، اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔لوہا خود بخود پتھروں کو کچلتا نہیں پھرتا۔آگ جگہ جگہ لوہے کو خود گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی۔پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا۔ہوا کی یہ جزوی متصادم حرکات خود بخود نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کے لئے ذریعے ہوتی ہے۔وہی کدالیں بناتا ہے اور پتھر توڑتا ہے، وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے، وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے، وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیارات کو اڑاتا ہے۔پس عناصر کی یہ متغلبانہ کارفرمائی بہت حد تک انسانی افعال کی دستِ نگر ہے۔اگر انسان ان میں دخل نہ دے تو عناصرِ اربعہ اپنے اپنے خزانوں میں پڑے ہوئے جیسے چاہیں اینٹھتے رہیں، لیکن میدانِ مقابلہ میں پہنچ کر ان جزوی افعال میں اپنا تغلب نہیں دکھلا سکتے۔پس جس پر

کسی غالب کا غلبہ موقوف ہو اور جس پر کسی قوی کی فتح و نصرت معلق ہو، ظاہر ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہوگا اور اس کی اشدیت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

عناصر میں انسانی تصرّفات...... پھر یہی نہیں کہ انسان ان کی باہمی نسبت کھول دینے ہی کا ایک ذریعہ ہے، نہیں بلکہ ان کی یہ تمام طاقتیں بھی اس کے پنجۂ تصرف و تسخیر میں قید ہیں، زمین کا قلب و جگر چاک کر دیا، کنوئیں بنائے، راستے بنائے، تہ خانے تیار کئے، ارضی معدنیات، سرمہ، ہڑتال، سونا چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے اس سے چھین لئے، پہاڑوں کو تراش کر تہ بتہ مکانات بنائے، پہاڑوں اور برفانی چوٹیوں کو جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی، اپنی بستی بنا کر ان میں راستے نکالے، انہیں برما کر ان میں سرنگیں بنائیں، ان میں سواریاں دوڑائیں ''وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا'' زمین کے خزائن و دفائن کا راز فاش کر کے اثقال زمین کو عالم میں آشکار کر دیا اور زمین اور اس کے اجزاء سے برابر نوکروں چاکروں اور غلاموں کی سی خدمت لے رہا ہے۔

پانی کو لو تو زمین کی تہہ میں سے اسے کھوج نکالا، کنوئیں کھود کر ڈول رسی کے جال سے اسے پکڑا، نل لگا کر سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا۔ دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے۔ مکانات ٹھنڈے کئے، پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے۔ جمنا اور گنگا جگہ جگہ ماری پھرتی ہے، اسے واٹرورکس کے ذریعہ گھر گھر رسوا کیا، وہ مائی تھی تو جگہ جگہ اس بچہ نے اس سے گومت دھلوا کر چھوڑا۔ پانی جیسا آزاد عنصر ٹنکیوں میں قید، نلوں میں بند اور نکلنے میں برابر اسکاک کی حرکت کا محتاج۔ یہ سب انسان کی تسخیر کا نتیجہ ہے، وہ غریب اپنے طبعی میلان سے نیچے کو جاتا ہے، یہ اسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پٹخ دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کے اسے جما دیا، کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا، کبھی آگ دکھا کر گرما دیا، غرض وہی پانی جس سے آگ جیسا قوی عنصر بھی پناہ مانگتا تھا، انسان کے سامنے ایسا بے بس اور بے یار و مددگار ہے کہ اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ پانیوں کا سب سے بڑا گھر اور ابوالمیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ پیکر موجوں کا لگاتار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرۂ زمین کو نگل جائے گا۔ بایں ہیبت و عظمت بھی انسانی دست برد سے نہ بچ سکا۔ انسان نے سمندروں کے جگر چیر ڈالے۔ اس میں جہاز چلائے، تار دوڑائے۔ آبدوز کشتیوں سے اس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا۔ اس کے مدفون موتیوں کے خزانے اگلوائے۔ اس کی تہہ کی چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں رسوا ہو رہی ہیں۔

خود سمندر کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ ان کا نمک الگ کر دیا، رطوبت الگ۔ گویا پانی کا خون تک پی گیا اور پھر اس کے سب نکے الگ کر لئے۔ غرض یہ قوی تر پانی زمین کی تہہ میں جا کر چھپتا ہے تو اسے پناہ نہیں پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو اس کو رستگاری نہیں۔ مجبور بھی ہے، قید بھی۔ پھر ذلیل سے ذلیل خدمتیں اسے سے لی جا رہی ہیں۔ نجاستوں کا دھونا، ظروف صاف کرنا، میلے کپڑے پاک کرنا وغیرہ اس کے سر ہیں، جس

سے اندازہ کر لیا جائے کہ انسانی طاقت نے کس درجہ اس لطیف عنصر کو اپنا غلام اور پابند قیدی بنالیا ہے۔ آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو تو وہ انسان کے سامنے ایک خاکسار غلام کی طرح مجبور ہے۔ وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی ہے، انسان نے آتشی شیشوں کے ذریعہ ان کو گرفتار کیا اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ایک ذرا دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا۔ جب چاہا دیا سلائی کا سرا رگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا۔ گویا وہ آگ جو سر نیچا ہی نہ کرتی تھی، انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی وہ رفعت و تعلّی خاک میں مل گئی، کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے، کہیں انگیٹھیوں میں محبوس ہے، کہیں اس کا تزکیۂ نفس کیا تو آگ کا گیس بنا دیا جس کا دھواں اور دخان سب رخصت ہو گیا۔ غرض آگ کا عنصر بھی انسان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے، جب چاہا اور جس طرح چاہا الٹ پلٹ کر دیا۔ جسے کسی حالت میں بھی چین نہیں۔

ہوا بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی، جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پا سکی تھی، مگر اس کی یہ پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے اسے نہ بچا سکی اور اس اڑتے ہوئے پرندے کو بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں انسانوں کے جہاز اڑ رہے ہیں اور اپنے کندھوں پر انہیں سوار کئے پھر رہی ہے، ہوا کیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا ہے جس پر بے لگام اس نے سواری کس رکھی ہے۔

انسان کی خبر رسانی کی خدمت پر جدا مجبور ہے۔ مشرق سے مغرب تک انسان کے افسانے دوڑ رہے ہیں اور ہوا پنی مخفی طاقتوں سے انہیں لئے پھر رہی ہے۔ گویا انسان کی ایک چٹھی رسان ہے جو بلا اجرت غلامی کر رہی ہے۔

ادھر برقی پنکھوں کو حرکت میں لانے کے لئے جدا ناچ رہی ہے تا کہ انسان کا پسینہ خشک کرنے کی خدمت انجام دے۔ غرض خدمت گزاری کے فرائض میں چاکروں کی مانند مصروف ہے اور چوں و چرا نہیں کر سکتی، پھر انسان اسے قید کرنے میں اترا تو موٹروں کے پہیوں میں وہ بند، سائیکلوں کے ٹائروں میں وہ قید، برتنوں میں وہ گرفتار اور ربڑ کی گیندوں میں وہ محبوس۔

غرض یہ نادیدہ طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا، پھنسی تو ایسی پھنسی کہ انسان کے ہاتھ میں ایک قیدی محض بن کر رہ گئی جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

عناصر میں انسانی ایجادات ...... پھر اس ظالم انسان کو اسی پر قناعت نہیں کہ عناصر کو باقی رکھی کر ہی ان سے کام لیتا رہے، نہیں اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں انہیں فنا کر کے اور انہیں باہم لڑا لڑا کر بھی ان سے نئی نئی چیزیں عالم آشکارا کرتا رہتا ہے تا کہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا۔ آگ تو جوش میں پانی کو اڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے۔ دونوں اپنی جگہ غیظ و غیظ میں ہیں اور انسان ان کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا

کر کے انجن اور مشینیں چلا رہا ہے، لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ کر رہا ہے۔ مل چل رہے ہیں، مشینیں گھوم رہی ہیں، انجنوں میں کوئلہ کی کانیں پھنک رہی ہیں، مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے۔ گویا ساری کائنات پچلی جا رہی ہے۔ مٹ رہی ہے مگر اف نہیں کر سکتی کہ ایک انسان کا بچہ مشین کی کل دبائے کھڑا ہے جس کی انگلی کی ہر حرکت سے عناصر اربعہ اور موالیدِ ثلاثہ پر یہ طوفان بپا ہو رہے ہیں۔

پھر پانی کو پانی سے ٹکرایا اور برق پیدا کر لی، گویا پانی میں آگ لگا دی۔ پھر وہ بجلی جو سیکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی اور آسمان و زمین ایک کر ڈالتی ہے، اسے تابنے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ بایں زور و طاقت اس گرفت سے باہر نہیں جا سکتی۔ ایک ذرا سی پیتل کی گھنڈی جسے سوئچ کہتے ہیں، اس کا قفل ہے۔ اسے نیچے کو ہلا دو تو بجلی آموجود اور اوپر کو اٹھا دو تو غائب، گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی کی قید میں گرفتار ہے، اور وہ پوری فوج اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر یہ مصنوعی ہی بجلی نہیں، آسمانی بجلی کی گرفتاری کے لئے بھی انسان ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لئے تیار ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگوں پر چھپٹے تار چڑھائے ہوئے ہیں کہ اگر یہ جہاں سوز بجلی عمارت پر آپڑتی ہے تو یہی معمولی سا رتار اسے الجھا دیتا ہے۔ اور وہ عمارت کو ذرہ برابر آنکھ محض دکھا نہیں سکتی بلکہ اس تار میں غلطاں پیچاں ہو کر رہ جاتی ہے۔

پیٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگا دی۔ آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہا ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے، ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔

غرض ساری کائنات کے ناک میں دم ہے۔ ایک مشتِ استخواں سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ عاجز ہے۔ عناصر نے باہم اپنی طاقتوں کے کیا جوہر کھائے تھے جو اس مجموعہء عناصر نے کر دکھایا۔ بحر و بر اور خشکی و تری کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں، اور انسان ہے کہ رات دن ان عناصر کے الٹ پھیر میں انتھک طریق پر لگا ہوا ہے۔ جس سے ساری کائنات کا دم بند ہے اور سارے جماد و حیوان قید و غلامی میں مقید ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے خورد سالہ بچہ کو نصیحت کی تھی کہ انسان سے بچتے رہنا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ وہ انسان کے شوقِ دید میں تھا۔ کچھ شعور پا کر انسان کی تلاش میں نکلا کہ دیکھوں آخر یہ کیا بلا ہے جس سے سلاطین صحرا بھی اپنے دار السلطنت میں بیٹھ کر کپکپاتے ہیں، چلا تو پہلے اتفاق سے گھوڑے پر نظر پڑی۔ جس کی جسامت اور پھرتی و چالاکی کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ ہی انسان ہے، پوچھا تو گھوڑے نے کہا کہ مجھ بیچارے کی کیا مجال ہے کہ میں انسان کے سامنے ٹھہر سکوں، چوبیس گھنٹے گلے میں رسی، پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا جیل ہے اور جب حضرت انسان کا جی چاہا تو میری پیٹھ پر سوار، منہ میں لگام اور اوپر سے تڑاتڑ کوڑوں کی مار۔ جیسی مجھ پر گزرتی ہے میں ہی جانتا ہوں۔

شیر کا بچہ سہم گیا کہ یا اللہ کیا بلا ہے انسان کہ عناصر ہی نہیں۔ موالید بھی گرفتارِ بلا ہیں۔ آگے بڑھا تو اونٹ نظر پڑا جو گھوڑے سے دوگنا اور عجیب الخلقت تھا۔ اسے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو یہی انسان ہے، یہ گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے، اس سے دریافت کیا تو اسے بھی انسان سے دہائی دیتے ہوئے سنا، وہ بولا کہ میرے اس قد وقامت پر نہ جاؤ۔ انسان نے بایں جسامت وقامت میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میں کیا سینکڑوں مجھ جیسے میرے بھائی بند، صرف ایک نکیل میں گرفتار اور ایک خورد سال بچہ ہمیں جنگل در جنگل لئے پھرتا ہے۔ منوں بوجھ کمر پر ہے۔ ہم بلبلاتے ہیں مگر شنوائی نہیں۔ انسانوں کے لئے ہماری گردنیں سیڑھیاں ہیں۔ جب چاہتا ہے کمر پر دھرا جاتا ہے۔ پھر ایک نہیں دو نہیں تین تین آدمی لد جاتے ہیں اور نہ صرف خود لدتے ہیں، بلکہ بڑے بڑے پلنگ ہماری کمروں پر کس کر براجمان ہوتے ہیں۔ ہم چپ چاپ کان دبائے منزلیں قطع کرتے رہتے ہیں، راتوں چلتے ہیں اور دنوں بلبلاتے ہیں۔ مگر کوئی مخلص نہیں نکلتا۔

غرض ہماری یہ ساری مصیبت وغلامی صرف اسی انسان کی بدولت ہے۔ بھلا ہم انسان تو کیا ہوتے، ہم تو اس کا نام بھی بے خوف ہو کر نہیں لے سکتے۔

شیر کا بچہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا کہ خدا جانے انسان کیسے ڈیل ڈول کی چیز ہوگی جس سے ایسے عظیم الخلقت جانور پناہ مانگ رہے ہیں۔ آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی پر نظر پڑ گئی۔ جو ایک عظیم الشان بلڈنگ کی طرح سے سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا۔ جس کی عمارت چار بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی، اسے یقین محکم ہو گیا کہ یہ بالضرور انسان ہے اور یہی ایسی ہستی ہے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر غالب آ سکتی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے کہا کہ غالباً آپ ہی کا نام نامی انسان ہے۔

ہاتھی نے نہایت حیرت سے بچۂ شیر کو دیکھا اور کہا کہ بیٹا تم ناسمجھ ہو۔ کس بری بلا کا نام لے رہے ہو، مجھ ایسے لمبے ڈول کی جو گت اس ظالم انسان نے بنائی ہے، خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ گھوڑے کے منہ میں لگام تو دے دیتا ہے، اونٹ کی ناک میں نکیل تو پہنا دیتا ہے، لیکن مجھ پر تو بے ڈھانٹی سوار ہوتا ہے، لگام میرے نہیں، نکیل میرے نہیں، مگر پھر بھی ایسا گرفتار اور مجبورِ محض ہوں کہ اس ظالم کے آگے چوں تک نہیں کر سکتا۔ ہر وقت میری گردن پر سوار، لوہے کا آنکس ہاتھ میں، ذرا چوں کروں تو سر پر اتنے پڑتے ہیں کہ کھایا پیا بھول جاتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ انسان کے سامنے اف بھی کر سکوں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل پیرا رہیں اور اپنی جنگل کی بادشاہت کی حرمت قائم رکھیں، اس انسان کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ورنہ یہ شاہزادگی ساری کرکری ہو جائے گی اور کوئی پھر فریاد کو بھی نہ پہنچے گا۔

شیر کا بچہ حیران تھا کہ انسان آخر کس تن وتوش کا ہوگا، جس کے غلبہ وتسلط کا چار دانگ عالم میں یہ شہرہ اور شور نشور برپا ہے۔ آخر کار اس نے بے نیل ومرام واپسی کا قصد کر لیا۔ لوٹ رہا تھا کہ ایک بن میں ایک بڑھئی کے بچہ کو

دیکھا کہ وہ ایک بڑے شہتیر کو آرے سے چیر رہا ہے اور جتنا چیر چکا ہے اس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی ہے، بچۂ شیر کا التفات بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہی انسان ہے لیکن پتہ لینے کے لئے اس سے سوال کیا کہ جناب انسان سے واقف ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے؟ کہا کہ میں اس کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا بندہ ہی انسان کہلاتا ہے۔ شیر نے حقارت و تعجب سے دیکھ کر کہا، ارے کیا تو ہی وہ انسان ہے جس سے شیر، گھوڑا، اونٹ سب لرزتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں واقعہ تو یہی ہے، بچۂ شیر نے کہا کہ او دشمن تو ہے کیا؟ تیرا کام تو میں ابھی اپنے طمانچہ سے ختم کیئے دیتا ہوں۔ بڑے ہی بیوقوف میرے آباؤ اجداد تھے جو تجھ سے کانپتے رہے اور بڑے احمق وہ تھے جنہوں نے راستے میں مجھے خوامخواہ سہا دیا۔ اس لاف زنی کے ساتھ بچۂ شیر آگے بڑھا تا کہ قوت آزمائی کرے۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ وقت آبرہوا۔ اب تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہا کہ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں، میں بے چارہ کیا چیز ہوں، آپ جو چاہیں فرمائیں، اس وقت میرا ایک کام درپیش ہے جسے میں اپنے ضعف کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا۔ خدا نے آپ جیسا قوی اور بہادر بھیج دیا۔ پہلے وہ کام کر دیجئے پھر میرے ساتھ جو چاہے سلوک فرمائیے اور وہ یہ ہے کہ میں اس شہتیر میں سے یہ کھونٹی سرکانا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنا ہاتھ اس شہتیر کے شگاف میں ڈال کر اسے تھام لیجئے تا کہ میں کھونٹی سرکا دوں۔

شیر صاحب اس مدح وثناء سے مسحور ہو کر بے تکلف آگے بڑھے اور ایک نہیں دونوں ہاتھ شگاف میں ڈال دیئے۔ بڑھئی کے بچہ نے کھونٹی نکال لی۔ کھونٹی کا نکلنا تھا کہ شہتیر کے دونوں پلٹ مل گئے اور شیر صاحب کے دونوں ہاتھ اس میں پھنس کر رہ گئے، اب شیر صاحب نے چیں چیں کرنا شروع کیا اور بڑھئی کے بچہ نے ہنسنا شروع کیا کہ فرمائیے، انسان کو دیکھ لیا؟ اس وقت شیر نادم ہوا کہ واقعی تجربہ کاروں اور بڑوں کی نصیحت سے روگردانی کا انجام برا ہوتا ہے۔ مگر پھر سوچنے لگا کہ ظاہر میں تو یہ انسان بڑا ہی کمزور اور حقیر ہے۔ اس کا جثہ تو قطعاً طاقتور نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں کوئی اندرونی طاقت ہے جس سے اس نے مجھے اس وقت بے بس کر دیا اور ساری کائنات کو پچھاڑے رکھا ہے۔ یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے بس کرتی ہے۔ ان مشاہدات کی رُو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں زیادہ طاقت موجود ہے، جب ہی وہ ایک چھوٹے سے جُثہ میں کم سے کم ہونے کے باوجود بھی عناصر کے مخزنوں اور موالید کے جثوں پر بھاری ہو رہا ہے اور ان کے غلبہ کے ساتھ ہر قسم کے تصرفات اور حاکمانہ کارروائیاں کرنے میں کسی سے مغلوب نہیں، اور جب یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں لطافت بھی عناصر سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ کیوں کہ پہلے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے کہ طاقت درحقیقت لطافت ہی میں ہے کہ کثافت میں بجز ضعف و درماندگی کے اور کچھ نہیں۔ پس انسان میں جب ہوا سے بھی زیادہ طاقت ہے جو الطف العناصر تھا، تو ناگزیر ہے کہ اس میں لطافت بھی ہوا اور اسے کہیں زیادہ ہو، تا کہ وہ اس پر اپنی یہ طاقتور حکمرانی برقرار رکھ سکے۔

انسانی طاقت و تسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے..... مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کے ظاہر میں تو کوئی

لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی، نہ وہ صیقل شدہ آئینہ یا صاف پانی کی سی چمک رکھتا ہے کہ اس میں منہ نظر آنے لگے، نہ وہ خود ہی ایسا روشن ہے کہ فضا میں اس سے شعاعیں پھوٹتی ہوں اور روشنی نکلتی ہو، نہ وہ ہوا کی طرح غیر مرئی ہے۔ پھر اس میں یہ لطافتوں کو زیر کر دینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طاقت اور لطافت اس کے بدن کی نہیں ہوسکتی کہ بدن تو وہی آگ، پانی، مٹی، ہوا کا مجموعہ ہے۔ اگر اس بدن میں کوئی طاقت بھی ہو تو پھر بھی وہ بے چارہ اس تھوڑے سے آگ پانی سے سارے جہان کے اس آگ پانی پر کیا غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔ یہ بدنی آگ پانی تو خود آفاقی آگ پانی سے لیا ہوا ایک قلیل سا جزء ہے اور جزءِ قلیل اپنے کل پر کیا غالب آسکتا ہے۔ ایک قطرہ دریا کو کیا مغلوب کر سکتا ہے؟ ایک چنگاری کرۂ نار پر کیا تسلط جما سکتی ہے؟ ایک ذرّہ کرۂ ارض پر کیا حکومت کر سکتا ہے؟ بلکہ اس صورت میں تو قصہ برعکس ہونا چاہئے تھا کہ یہ مادی جہان خود اس انسان پر ہر حیثیت سے غالب رہتا اور اسے دم بخود رکھتا، چہ جائیکہ اس مشتِ خاک سے ساری کائنات، آب وگل مسخر ہو جائے اور خود اسی کا دم اس ضعیف البنیان کے سامنے بند ہو؟ پس یہ تسخیر یقیناً اس کے بدن اور بدنی آب و آتش یا ہوائی لطافتوں کا کام نہیں ہوسکتی، بلکہ انسان کی یہ غلبہ پانے والی قوت بلاشبہ ایسی ہونی چاہئے جو آگ پانی تو کیا ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے، اس کی لطافت وہ ہو کہ باوجود انسان کے رگ وپے میں سمائے ہوئے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو۔ بلکہ کبھی اس کی لمس ومس تک کا بھی اسے احساس نہ ہوا ہو۔ وہ متصل تو اتنی ہو کہ انسان اس سے ملے بغیر اپنی ہستی کو باقی نہ رکھ سے اور منفصل ایسی ہو کہ انسان کے کسی حاسہ کی رسائی اس تک نہ ہو۔ خود اس پر کوئی سرد وگرم نہ پہنچ سکے۔ اس لئے وہ فقط اپنے بدن پر ہی نہیں بلکہ جہان کے عناصر اربعہ پر غالب آجائے، اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کون سی چیز ہوسکتی ہے، جس کی یہ صفات ہوں کہ ان دو ہی سے انسان مرکب ہے۔ یعنی انسان میں یہ طاقت نہیں۔

روحِ انسانی کی لطافت اور حسّی نورانیت...... یہ کرشمے ہیں تو دوسرے ہی جزو میں ہوسکتے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ روح عناصر اربعہ ہی نہیں۔ تمام مادی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ پھر روح کی یہ لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہی ہیں بلکہ حسی طور پر بھی اس کی لطافتیں عالم آشکارا ہیں۔ خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں تھیں، اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب روح میں جمع ہیں۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اتار لیتا تھا تو انسان کی آنکھوں کو روح نے ایک ایسی چمک دے رکھی ہے کہ جدھر اٹھ جاتی ہے، ادھر کے تمام نقشے، فوٹو اور سینریاں اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ آئینہ کا فوٹو تو بے اصلِ محض ہے کہ پشتِ آئینہ خالی ہے، لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں کہ اس کے پیچھے حس مشترک میں اس کا پورا مصوّر علم قائم ہے۔

اگر آگ سے تارِ شعاع پھیلتے ہیں تو آنکھوں سے تارِ نگاہ منتشر ہوتے ہیں جو ان شعاعوں سے کسی طرح کم

نہیں، کیونکہ یہ تارِ شعاع سے تو چیز کی صورت محض آنکھ ہی کے سامنے روشن ہو جاتی ہے اور تارِ نگاہ سے یہ سب چیزیں دل کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جو ان کی حقیقت پر بھی غور کر سکتا ہے۔

اگر پانی غایتِ لطافت سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے اور سخت سے سخت جسم بھی اس کے سریان سے نہیں بچ سکتا، جب کہ اس سے اتصال قائم ہو جائے، تو روح بھی جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہوتی ہے، حتی کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اس سے تازگی لئے ہوئے ہوتی ہیں، پھر پانی تو اپنے سریان سے اپنے محل کو محض ٹھنڈا ہی کئے ہوئے رہتا ہے اور روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اگر ہوا غایت لطافت سے دکھلائی نہیں دے سکتی تو روح بھی اپنی لطافتِ بے غایت سے آج تک نادیدہ ہے، اور جیسے ہوا کا رنگ و بو غیر محسوس چیز ہے یا ہے ہی نہیں۔ ایسے ہی روح بھی ان خواص سے بری ہے۔

غرض عناصر میں لطافت کے جو جو کمالات اور لطافت کے جس قدر مراتب و درجات تھے، وہ سب روح میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر عناصر کو حق تعالیٰ سے جزوی مناسبتیں تھیں اور اس بناء پر وہ قوی تھے، تو روح کو بحیثیتِ مجموعی اس سے یہ ساری مناسبتیں قائم ہیں۔ اس سے وہ عناصر سے زیادہ قوی ہونی چاہئے اور جو کام عناصر کر سکتے ہیں وہ سب اس سے بے تکلف سرزد ہو جانے چاہئیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ عناصر کو تو ان کی طاقتوں کی بناء پر درجہ بدرجہ اشد کہا جائے اور روح کو اشد ترین نہ کہا جائے۔ اس لئے عنصری اور مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لے جانے کی ایک یہی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان کی ساری لطافتوں کی جامع ہے اور انہیں ذاتِ بابرکات سے جزوی مناسبتیں ہیں، تو روح کو کلی مناسبت ہے۔

روحِ انسانی کی معنوی لطافت و طاقت...... لیکن اگر مزید غور کرو تو روح کو حق تعالیٰ سے محض عناصر کی سی مناسبت نہیں یا بالفاظ دیگر محض مناسبت ہی نہیں بلکہ ایک جہت سے ایسی مماثلت بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے مخصوص اوصاف و کمالات کے لئے بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہے اور عناصر اس کے لگ بھگ بھی نہیں رہ سکتے کہ وہ سرے ہی سے ان کمالات سے عاری اور کورے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ اگر غیر مرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم اور مدبر ہے تو اسی طرز پر روح کائناتِ بدن کی قیوم اور مربی ہے۔ وہ ذرا اپنی توجہ ہٹالے تو کائناتِ بدن درہم برہم ہو جائے جیسا کہ موت کے وقت ہو جاتا ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کے انوار ساری کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں جلوہ افروز ہیں اور ہر ہر خطہ اور اس کے ہر ہر جزو سے اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجود اس ظہورِ تام کے پھر بھی آج تک کسی آنکھ نے اسے نہیں دیکھا۔ اسی طرح روح کے انوار بدنی کائنات میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر ہر عضو سے اس مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجودیکہ بدن کی رگ رگ میں روح کا ظہور ہے، آنکھ کی چمک میں، رخسار کی سرخی میں، بالوں کی سیاہی، دانتوں کی سفیدی میں، بدن کی تازگی میں اسی کا جلوہ ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ سارے جلوے ایک آن میں ختم

ہو جائیں۔ مگر باوجود اس ظہورِ تام کے پھر بھی آج تک ایسی نادیدہ ہے کہ خود اپنا نفس بھی اس کے دیدار سے محروم ہے۔

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّہ سے جلوہ آشکار　　اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

پس جیسے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ ایسے ہی روح ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، پھر جس طرح اس ساری کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل وحرکت سے ذاتِ حق اول اور اقدم ہے کہ وہی تو معطی وجود ہے اور وجود سے پہلے کوئی بھی اقدام ممکن نہیں۔ آپ عالم کا کوئی اقدام ایسا نہیں پیش کر سکتے کہ وہ ہو جائے اور ذاتِ حق تعالیٰ اس کے بعد آئے۔ اس کے بغیر تو کائنات کی زندگی ہی نہیں اور بلا زندگی اس کی کوئی نقل وحرکت ہی ممکن نہیں، تو مخلوق خالق سے پہلے کیسے ہوسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ ہر مخلوق اور مخلوق کے ہر فعل سے خالق کی ذات مقدم ہو۔ پھر اسی طرح کائنات کی ہر نقل وحرکت کا منتہی بھی اس کی ذات ہے۔ آپ عالم کا کوئی اقدام بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ وہ ذات حق سے گزرتا ہوا آئے پہنچ جائے اور ذات حق کو ادھر ہی چھوڑ آئے۔ کیوں کہ جب ذاتِ حق ہی سے اس کائنات کی زندگی قائم ہے۔ تو یہ دعویٰ ایسا ہوگا کہ کائنات اپنے افعال کرتی ہوئی زندگی کی حد سے گزر جائے اور پھر بھی اس کے افعال جاری رہیں، جو عقلاً ناممکن ہے۔ پس عالم کے ہر حرکت وسکون کا منتہی بھی اس کی ذات نکلتی ہے۔ اس کے آگے اور بعد کچھ نہیں۔ وہی ہر چیز کا اوّل بھی ہے اور وہی آخر بھی۔ جیسے کہ وہی ظاہر تھا اور وہی باطن بھی۔ ٹھیک اسی طرح بدنی کائنات کی ہر نقل وحرکت بلکہ اس کی نفس ہستی ہی سے روح اوّل بھی ہے اور آخر بھی، کیوں کہ جب روح ہی بدن کے لئے باعثِ ہستی وحیات ہے تو کسی زندہ کا کوئی اقدام زندگی سے قبل کیسے ہوسکے گا۔ پس ہر کام بلکہ بدن کے ہر کام کے اوّل روح آتی ہے۔ اور اسی طرح جب کہ روح ہی بدن کے لئے باعث حیات ہے تو کائنات بدن کا کوئی اقدام بھی حیات سے مؤخر نہیں ہوسکتا بلکہ آخر اور منتہائے حیات بھی یہی رہے گی۔ پس روح ہی اس بدن عالم کے لئے اوّل بھی ہوئی اور آخر بھی۔ جیسا کہ وہی ظاہر تھی اور وہی باطن بھی۔ پھر جیسا کہ ذات حق عالم سے متصل تو اتنی ہی ہے کہ ﴿اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ اور ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ﴾ اور پھر منفصل بھی اتنی کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء، مخلوقِ ظلمتِ محض اور وہ نورِ مطلق۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

ٹھیک اسی طرح روح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کروڑواں حصہ بھی اس سے الگ نہیں، ورنہ زندہ نہ رہے۔ لیکن دور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں۔ لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ؟ کجا یہ مشتِ خاک اور کجا وہ جوہرِ پاک، چراغ مردہ کجا، نور آفتاب کجا؟

صفاتِ روح سے الٰہیّات پر استدلال...... ان مماثلوں کے سبب جس طرح ہم تشبیہ کے سلسلہ میں اُدھر سے اِدھر آئے اِدھر سے اُدھر بھی جا سکتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی روحانی کائنات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی یکتائی اور بے چونی پر استدلال بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح یہ ہماری بدنی کائنات بلا اس غیر مرئی

مدبر یعنی روح کے موجود اور باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ ساری کائناتِ عالم بھی بلا کسی مدبر حکیم کے موجود اور بقاء پذیر نہیں ہوسکتی۔ پس روح کی بدولت وجودِ صانع پر ہمارے ہی اندر سے دلیل نکل آئی۔

پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کرسکتی ہے۔ اگر دو ہوں تو کائناتِ بدن فاسد ہوجائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو انسان نہیں سماسکتے۔ اسی طرح کائناتِ عالم میں ایک ہی واحد وقیوم اور حکیم ومدبّر کی تدبیر کارگر ہوسکتی ہے۔

ورنہ ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَ تَا﴾ ① کا ظہور ہوجائے گا۔ پس روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحیدِ صانع کی دلیل بھی پیدا ہوگئی۔ پھر جس طرح بدن کے قعر تک میں گھس جانے سے روح کا کوئی کم و کیف، کوئی لون ورنگ اور کوئی سمت وجہت نہیں دکھائی دے سکتی، اسی طرح وہ ذاتِ بابرکات بھی بے چون وبے چگون اور سمت وسمات سے مبرّا اور رنگ ولون سے منزہ ہے کہ رنگ برنگ کے جلوے تو اس سے ہیں، مگر وہ ہر رنگ سے بری وبالا ہے۔ پس روح کی بدولت اس کی شانِ تنزیہ وتقدیس بھی ہمارے ہی اندر سے ہویدا ہوگئی۔

پھر جس طرح روح بدن کے ذرّہ ذرّہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے اس کا تعلق وابستہ ہے۔ مگر تعلقات کی شدت وضعف کا یہ تفاوت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے وہ کبد ومعدہ سے نہیں اور جوان سے ہے وہ عام جوارحِ بدن سے نہیں۔ اسی لئے قلب ودماغ کی ادنیٰ ایذاء یا توہین سے روح میں غصہ وجوش پیدا ہوجاتا ہے اور ان اعضاءِ رئیسہ پر ادنیٰ سی ضرب بھی پڑ جانے سے روح اپنی حیات کو سمیٹ لے جاتی ہے۔ بخلاف عام اعضاء کے کہ اگر ہاتھ پیر بھی کاٹ دیئے جائیں تو کمالِ زندگی خواہ چھن جائے مگر نفسِ زندگی مسلوب نہیں ہوتی۔

اس طرح ذاتِ بابرکات کا جلوہ جہانوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر مواضع کے تفاوت سے تعلق کی شدت وضعف میں بھی تفاوت ہے کہ جو تعلق اس کی ذات کو عرشِ عظیم سے ہے وہ اور مقامات سے نہیں کہ وہ مرکزِ استواء ہے، پھر جو تعلق بیت المعمور سے ہے اور وہ سماوی مواضع سے نہیں کہ وہ قبلۂ ملائکہ ہے، پھر جو تعلق بیت اللہ اور مسجدِ اقصیٰ یا حرمِ نبوی سے ہے وہ اور جگہوں سے نہیں ہے۔ اس لئے اگر ان کی کوئی توہینی کا یا جارحانہ اقدام ہوتو روحِ اعظم کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ عالم میں ہیجان شروع ہوجاتا ہے اور دنیا کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی اینٹیں اکھڑ جانے پر بھی اس عالم سے زندگی کھینچ لی جائے گی۔ پس روح کی بدولت ہم پر اللہ کے تعلقات کی نوعیت بھی منکشف ہوگئی۔

پھر جس طرح ہر شخص اپنی روح کی پکار اور حقّانی دعوت کو دل کے کانوں سے بے تکلّف سنتا ہے اور اس کی نصیحتوں کو قلب کے واسطہ سے ادراک کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے کلام میں نہ لفظ ہیں نہ آواز۔ یہی شانِ حق

① پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ:۲۲.

تعالیٰ کے کلام کی ہے کہ کلام بھی ہے، اس میں حقائق بھی ہیں، اس میں سماع بھی اور اسماع بھی ہے۔ اور مخصوص افراد بنی آدم (انبیاء علیہم السلام) جو بنی نوع انسانی میں مثل قلب کے ہیں، اسے سنتے بھی ہیں، پر نہ وہاں الفاظ کی حد بندیاں ہیں نہ الفاظ وتلفظ کی قیودِ گوظہور کے بعد مخلوق میں پہنچتے پہنچتے یہ ساری تحدیدات نمایاں ہو جائیں۔ پس روح کی بدولت ہمیں ذات کے کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا بھی فی الجملہ ادراک ہوا۔

پھر اگر تم آنکھ بند کرلو تو روح کا دیکھنا بند نہیں ہوتا اور کان بند کرلو تو اس کے سننے میں فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آنکھ کان بند کر کے تصوّر کے لامحدود عالم میں یہی روح دیکھنے کی چیزوں کو اور زیادہ بے تکلفی کے ساتھ دیکھتی ہے اور سننے کی چیزوں کو اور زیادہ بے غائلہ سنتی ہے۔ حالاں کہ نہ آواز روح سے ٹکراتی ہے اور نہ کسی صورت کا رنگ و روغن اور جسم اس کے آس پاس پھٹک سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ ذات بے چون و چگون ہر چیز کو سنتی اور دیکھتی ہے۔ مگر نہ وہاں رنگ وروپ اور مادیت کو قرب نصیب ہوتا ہے اور نہ آوازوں کے نغمے ہی اس کی سمع سے ٹکر کھاتے ہیں۔ پس اپنی ہی روح کی بدولت ہمیں اللہ کی سمع وبصر کی بے کیفی اور بیچونی کا بھی ایک گونہ اندازہ ہوا۔

اسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیات تو روح کی زندگی سے قائم ہے۔ مگر روح کے لئے کسی اور روح کی حاجت نہیں۔ وہ خود پنے ہی معدنِ حیات کی ایک موج ہے، تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیات سے قائم ہے اور خود اس کی حیات کے لئے کسی اور ذات کی حاجت نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی حیات سے حی ہے جس میں کوئی فرق نہیں آ سکتا اور اس طرح ہم پر اللہ کی صفتِ حیات کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہو گیا۔

بہر حال روح کو ذاتِ بابرکات سے مناسبتیں ہی نہیں بلکہ فی الجملہ مماثلتیں حاصل ہیں، جس سے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات کی مثالیں ہمارے نفوس میں پہنچ گئی ہیں اور ہم اپنے اندر ہی سب کچھ عیاناً دیکھنے پر قادر ہو گئے، اس لئے روح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کچھ نہیں ہو سکتی، جو قرآنِ کریم نے فرمائی کہ: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾. ①

غرض روح اس ساری تفصیل سے ایک لطیفۂ کہ ربانی ثابت ہو جاتی ہے اور جسم محض ایک کثیفۂ ظلماتی۔ لیکن جب یہ بدنی عناصر جو عالم خلق کی چیزیں ہیں، اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سالگاؤ پیدا کر کے ایسے قوی ہو سکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے، تو خود روح جو عالمِ امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ بلکہ مماثلت کی گہرائیوں کی کوئی حد نہیں۔ اللہ جل ذکرہ، سے اس قوی مناسبت ومماثلت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب ومتسلط نہ ہوگی۔ اگر ڈھنگ سے اس کی قوتوں کو استعمال کیا جائے تو کیا پھر کائنات اس کا تحمل کر سکے گی؟

پس بچۂ شیر کے قول کے مطابق انسان اگر پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کی بدولت نہیں کہ

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۵.

بدن تو وہی آگ پانی کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ یہ بے چارہ قلیل وحقیر بدن اپنے عظیم وکثیر مخزن پر کیا غالب آ سکتا ہے۔ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوّت اور قوّت کی یہ غیر معمولی کرشمہ آرائیاں درحقیقت اس کی روح کی بدولت نمایاں ہو رہی ہیں کہ روح کی لطافتوں کی کوئی حد نہیں اور وہ مجموعۂ لطافتِ سفلی وعلوی ہے، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ روح تمام مادیات اور تمام عناصر سے اقویٰ و اشدّ ہے، پس جہاں ذاتِ بابرکاتِ حق نے عالم آفاق میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تا کہ اس کے کمالاتِ ظاہر در آیاتِ بینہ کا کسی حد تک ادراک واحساس ہو سکے۔ اسی طرح بلکہ ان سے بدرجہا زائد جو مخصوص مثالیں ہمارے انفس میں رکھ دیں تا کہ ان شئونِ باطنیہ اور کمالِ بطون در بطون تک ہم بقدرِ استعداد کچھ رسائی پا سکیں۔

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ ① ”ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد ونواح میں دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے“۔

غرض مادی سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں جن کی طرف تمہید میں میں اشارہ کر چکا ہوں، دیکھنے میں بدن اور بدنی عناصر سے نمایاں ہو رہی ہیں۔ مگر بلحاظِ حقیقت یہ سب کچھ روح کا طفیل ہے جس کی مخفی طاقتیں اس چورنگ مادہ کو نچاتی رہتی ہیں اور مزدور کی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔

روح کی طاقتوں کا غلط استعمال...... لیکن سوال یہ ہے کہ روح نے اپنے یہ باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر جدوجہد کی اور ترکیب وتحلیل کے ذریعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کے جس قدر بھی عجائبات موالیدِ ثلاثہ میں نمایاں کیے۔ اس سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ اور روح کو بحیثیتِ روح اس جدوجہد سے کیا شرف حاصل ہوا؟

ظاہر ہے کہ اوّل تو ان تمام سائنسی ایجادات کا نفع روح کو کچھ نہیں، صرف بدن ہی کو پہنچا۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا۔ سردی میں آگ کی حرارت گرمی میں پانی کی تبرید، برسات میں ہوا تفریح بدن ہی کے لئے ہے، روح نہ سردی کی محتاج نہ گرمی کی کہ حرارت وبرودت روح کے اوصاف ہی نہیں، اسی طرح ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اڑایا تو بدن کو، ورنہ روح جیسی لطیف چیز اڑانے کے لئے اس وزنی اور کثیف طیارہ کی حاجت ہی نہ تھی۔ مرنے کے بعد وہ نامعلوم کہاں کہاں اڑتی ہے تو کون سے ہوائی جہاز اس کے لئے جاتے ہیں، پھر سوچو کہ خود ہوا کو اڑنے کے لئے کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہے؟ ہوا تو خود ہی جہاز کو اڑاتی ہے۔ تو جو روح ہوا سے بھی لطیف تر ہے اور جس نے خود ہوا ہی کو مسخر اور قید کر رکھا ہے بلکہ ہوا کے خلافِ طبع اسے جگہ جگہ اڑا رکھا ہے، وہ اپنے اڑنے میں اس کی کیا محتاج ہوتی؟ اور جب اس کی محتاج نہیں تو اس کے بھی محتاجوں یعنی طیاروں کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے؟

① پارہ: ۲۵، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۵۳.

اسی طرح ریلوں اور موٹروں سے روح کو کیا فائدہ؟ ریل اور موٹر اپنے وجودِ ظہور میں خود ہی روح کے محتاج ہیں تو روح کو ان کی احتیاج کیا ہوسکتی ہے۔اس لئے ان تمام مادّی کرشمہ آرائیوں اور سائنسی ایجادات کا نفع اگر ہوسکتا ہے تو صرف بدن ہی کے لئے، نہ کہ روح کے لئے۔ ریل اور موٹر میلوں کو منتقل کر سکتے ہیں تو بدن کو، برق اور گیس اگر ضیا پاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر، نہ کہ ارواح پر، جن کے نور سے خود ہی وہ ظہور میں آئے۔ گراموفون، ٹیلی فون، ٹیلی گراف اور لاسکی وغیرہ اگر منقطع کر سکتے ہیں تو اجسام کو، ورنہ روح اپنی حقیقی قوتوں کے لحاظ سے ان اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہوسکتی ہے۔

پس ان تمام اسبابِ راحت کی راحت رسانی بدن تک محدود، نکلی اور بدن کیا ہے؟ وہی عناصرِ اربعہ کا مجموعہ اور آگ، پانی، ہوا، مٹی کا گھروندہ، تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات کے ذریعہ آگ پانی ہی کو نفع پہنچا دیا۔ بالفاظِ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی لیا اور اندر کے آگ پانی تک پہنچا دیا اور اب روح کا کام یہ رہ گیا کہ وہ اپنے علم وادراک کا سرمایہ آفاقی آگ پانی پر خرچ کرتی رہے اور یہ بیرونی آگ پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہے۔ یعنی جسم کی خدمت گزاری میں ہمہ وقت مصروف رہے، اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جوان عناصر سے لطیف تر اور بالاتر تھی اور جوان پر حکمرانی کر رہی تھی، آپ نے دھوکہ دے کر اسے جسم جیسی کثیف چیز یا بعنوانِ دیگر عناصر کا غلام بنا دیا۔ ایک لطیف چیز کو کثیف کے تابع کر دیا اور بہ تعبیر دیگر آپ نے لطیف روح کو خود اسی کی لطافت مٹانے میں استعمال کیا جو قلبِ موضوع ہے، پس اب اس مسکین روح کی مثال ایسی ہوگئی، جیسے ایک عالم وفاضل بادشاہ جس سے ملک وقوم کو بڑے بڑے منافع کی توقع ہو اور جس کے حسنِ سیاست اور کمال تدبیر سے ملک کے دفاع و بہبود کی ہزارہا امیدیں وابستہ ہوں، باوجود اس علم وفضل کے اس کے مزاج میں کوئی چالاک اور کمینہ غلام دخیل ہوکر رسوخ پالے اور اپنی ذاتی اغراض ومنافع میں بادشاہ کو استعمال کرنے لگے اور ملک کا پیٹ کٹوا کر صرف اپنا تنورِ شکم بھرنے کی فکر میں لگا رہے، ادھر بادشاہ غلام کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اسی کا کہا کرنے لگے، وزراء لاکھ سمجھائیں، نصائح کریں اور منت وسماجت سے بادشاہ کو راہِ راست لانے کی کوشش کریں لیکن یہ کمینہ غلام کسی کی نہ چلنے دے بلکہ اور الٹا وزراء سے بدظن کر دے اور بادشاہ کے وسیلے اور ذرائع معلومات کو چہار طرف سے مسدود کر کے صرف اپنے ہی ڈھنگوں پر لگا لے یا گویا زمامِ سلطنت بظاہر تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حقیقتاً بادشاہ کے پردہ میں یہ کمینہ غلام حکومت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت کا قضیہ برعکس ہو جاتا ہے۔ جو حاکم تھا محکوم ہوگیا اور جو محکوم تھا وہ حاکم ہوگیا۔

اور سب جانتے ہیں کہ ایسی مملکت جس میں کمینے برسرِ اقتدار آجائیں اور اشراف دھکے کھاتے پھریں، دیرپا نہیں ہوسکتی بلکہ ایسے ملک کی تباہی کے آثار جلد سامنے آنے لگیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بادشاہ معزول کر دیا جائے گا اس کی عمارت وسلطنت چھن جائے گی۔ ادھر آپ خود سمجھ لیں کہ انقلابِ سلطنت کے بعد اس کمینہ ملازم کا

کیا حشر ہوگا؟ وہی اس کے وسائل عمل اور اعضاءِ کار جوان خودغرضیوں میں اس کے ہمنوا اور مددگار تھے، خود اسی کے خلاف گواہی دیں گے اور اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر پہلے خود اسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہر صورت میں سب سے زیادہ یہی کمینہ قابل گردن زدنی قرار پائے گا اور اس کے لیے ملک کے کسی گوشہ میں پناہ نہ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ روح ایک عالم فاضل ہے، جس میں محسوسات معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں جو کائناتِ بدن ہی میں نہیں بلکہ اس کے واسطہ سے کائنات عالم پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل اس کا وزیر اعظم ہے اور نقل اس کا قانون ہے، مگر ساتھ ہی اس کا ایک کمینہ اور بدذات خادم بھی ہے، جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ وزراء وعمائدان کا نفاذ کریں۔ وہ کمینہ خادم یہ بدن ہے جو عناصرِ اربعہ کا مجموعہ ہے۔ کمینہ اس لئے ہے کہ جس قدر بھی اس کے اجزاء ترکیبی ہیں، سب بے شعور، لایعقل، جاہل اور بے تمیز ہیں۔ جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کمینگی کی یہ حالت کہ جوان سے زیادہ محنت کر کے ان کا قرب حاصل کرے اسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن جاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتوں اور پتھر کے وزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانہ تک سجدے کرتا جائے، لیکن اگر وزنی مورت اوپر سے آگرے تو پہلے اپنے اس مقرّب پوجاری کا سر پھوڑے گی، اسے قطعاً خیال نہ ہوگا کہ یہ میرا محبّ اور عبادت گزار بندہ ہے، مجھے اس کا سر نہ کچلنا چاہئے بلکہ میرا یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے جو مجھ سے بعید تر ہیں، اور معبودانہ عظمت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی کسی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے، ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے کیونکہ جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اسی کو غرق کرے گی جو اس سے زیادہ قرب حاصل کیئے ہوئے ہوگا۔ اسے قطعاً یگانے اور بیگانے کی تمیز نہ ہوگی۔ ایک مجوسی برسہا برس بھی آتش کدہ میں سربسجود رہے۔ لیکن آگ اس کی اعانت نہیں کرسکتی بلکہ اس کی پہلی لپٹ اپنے اسی مقرّب کو پہلے پھونکے گی۔ ہوا پرست ہزار ہوائی باتوں میں رہیں لیکن ہوائے نفس کے جھکولے پہلے صاحبِ ہوا ہی کو غارت کریں گے، دوسروں تک نوبت کہیں بعد میں آوے گی۔ آپ تمدّن کے سلسلہ میں ہی دیکھ لیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں، وہی مادیات کے ہاتھوں میں زیادہ تباہ وبرباد بھی ہیں۔ مشینوں کی لپیٹ میں وہی زیادہ آتے ہیں۔ جو مشینری میں رات دن مبتلاءِ عمل ہیں، ہوائی جہازوں سے زیادہ وہی تباہ ہوتے ہیں، جوان سے زیادہ مزاولت اور مقاربت رکھتے ہیں۔

ڈریڈناٹ اور وزنی آلاتِ جنگ سے وہی لوگ زیادہ ختم ہورہے ہیں، جو ان آلات کے سامنے سربسجود ہیں، گیس اور زہریلے ٹینک رائفلیں اور ریوالور، کارتوس اور بارود سے انہیں کا خاتمہ زیادہ ہورہا ہے جو ان کے عشق میں جان باختہ ہیں اور کبھی بھی مادّیات کے ان روشن آثار کو ادھر التفات نہیں ہوتا کہ جو ہمارے موجد اور غلامِ بے درہم ہیں اور جنہوں نے اپنی جانوں ہی کو نہیں بلکہ ایمانوں کو بھی ہم پر نثار کردیا ہے، کم از کم انہیں تو اپنا نشانہ نہ

بنائیں۔ انہی کو جا کر تباہ کریں جو بے لگاؤ رہ کر ہم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

پس اس سے زیادہ مادیات کی کمینگی اور سفلہ پن اور کیا ہوسکتا ہے کہ انہیں نہ صرف دوست دشمن کا کوئی بھی امتیاز نہیں بلکہ جوان کا زیادہ دوست ہے، اس کے زیادہ دشمن ہیں، سفلہ پن کی اسی پر حد نہیں، بلکہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ جوان کا دشمن ہے، الٹے اس کے قدموں میں پڑ کر دعوی دوستی کرتے ہیں، پس ان کی اطاعت شعاری علم وشعور سے نہیں، فاضلانہ اخلاق سے نہیں، بلکہ جوتے کے زور سے ہے اور یہ واضح رہے کہ اخلاق کے جہاں میں دباؤ کو اطاعت نہیں کہا جاتا، پس جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت، ہو ان سے مرکب شدہ بدن سے کب کسی خیر کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور ایسے بدن کے لئے اگر کمینہ کا لقب اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان وخسران ہے ...... بہر حال اس نالائق اور کمینہ غلام (بدن) نے اپنے ذاتی تعیّش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگالیا، عقل دور اندیش سے بر سر پیکار کر دیا، قانونِ نقل کو طاق نسیان پر پھینکوا دیا حظوظِ نفس کی تحصیل اور عاجل منافع سے لا پرواہ بنا دیا اور اس غفلت زدہ روح نے اپنی تمام کمالاتی قوتوں سے وہ حظوظ حاصل کرنے شروع کر دیے، جن کا نفع فقط اس چورنگ مادّہ یا کمینہ غلام ہی کو پہنچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ مل گیا، مگر روح خالی ہاتھ رہ گئی بلکہ جو کچھ بھی اس نے حاصل کرنے کا عزم باندھا تھا، اس میں بھی خود اس غلام ہی کی محتاج ہوگئی۔ وہ روح جو کہ کمالاتِ ربّانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغناء کی اعلیٰ شان رکھتی تھی اور کسی کی محتاج نہ تھی، وہ اپنے اس لایعقل بدن کی محتاج ہوگئی جو ہر جہت سے خود اس کا محتاج تھا۔ وہ غنی روح جس سے ان تمام وسائلِ کار کا وجود تھا، وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی اور وہ روح جو کبھی مسجود ملائک بنی تھی، آج عبد الاسباب بن کر اپنے ہی باندی غلاموں کو سجدے کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام بن گئی کہ اگر مادی وسائل اس کے ہاتھ میں نہ ہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔ اندریں حالات اس روح نے اپنی علمی طاقتوں سے مادّی منافع کا ایک تمدن تو قائم کیا مگر اپنے ان جوہری کمالات کو کھو کر جو اس کے جزِ نفس ہوتے اور ہر موقع پر اس کے ساتھ رہتے، وہ شہر میں ہوتی یا جنگل میں، اسباب کے ہجوم میں ہوتی یا بے وسیلہ، ہر جگہ اپنا جوہر نمایاں کر سکتی۔ لیکن یہ غلام اور غلام پسند روح محتاجگی کے اس درجہ پر آ گئی کہ اگر شہر میں ہے اور شہر بھی وہ جہاں بجلی سسٹم اور اسٹیم کی طاقت مہیا ہو تو با کمال ہے۔

ریڈیو سے خبر بھی دے سکتی ہے، ٹیلیفون کر سکتی ہے، ٹیلیگراف سے آواز بھی پہنچا سکتی ہے، کیمرہ ہو تو فوٹو بھی اتار سکتی ہے، لیکن اگر وہ دیہات میں ہو، جہاں ان مادی وسائل کا وجود نہ ہو یا شہر ہی میں ہو مگر بجلی فیل ہو جائے یا دشمن بڑھ کر برقی تاروں کو کاٹ دے تو یہ پھر روح اپاہج اور نکّمی ہے۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ یہ روح اپنے اصلی اور جوہری کمالات لوہے پیتل کے حوالہ کر کے خود کوری ہو بیٹھی، جو محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔

حالانکہ روح تو وہ تھی جو شئونِ ربّانیہ کی جامع تھی، وہ علم اور معرفت کا ایک حظِ وافر لے کر آئی تھی، وہ

لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی، اس کا استغناء اور کمالِ غیرت تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے کسی فعل میں بھی اپنے باندی غلاموں اور ان بے شعور اور اپاہج مادوں کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ اگر دیہات میں بیٹھ کر جہاں نہ بجلی نہ فون ہوتا نہ گیس کا خزانہ، اگر وہ آواز نکالتی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی، وہ اگر ایسی جگہ نقل وحرکت پر آتی، جہاں نہ ریل ہوتی نہ موٹر اور طیارہ، تو سیکنڈوں میں ہزار ہا میل کا سفر طے کر لیتی۔ وہ اگر دیکھنے پر آتی تو ایک تنگ و تاریک کونہ میں بیٹھ کر ساری دنیا ہی کی نہیں عرش عظیم تک کی کائنات کا معائنہ کر لیتی۔ زمین اس کے لئے سمٹ جاتی ' ہوائیں اس کے لئے مسخر ہوتیں، زمانہ اس کے لئے سمٹ جاتا، وہ سیرابی وتری میں دریاؤں کے رحم وکرم کی محتاج نہ ہوتی بلکہ دریا رخود ہی اپنی روانی اور طغیانی میں اس کے اشاروں کو دیکھتے۔ وہ جنگ وقتال میں لوہے اور ہتھیاروں کی محتاج نہ ہوتی بلکہ جس پر ہاتھ ڈالتی وہی اس کے لئے ہتھیار ہو جاتی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ یہ مادی اور عنصری آلات جب کہ اس عنصری لطافت پر ایسی طاقتوں کے کام کر سکتے تھے۔

تو روح نہ صرف ان سب لطافتوں کی جامع ہی تھی بلکہ ان سے ہزار ہا گنا بڑھ چڑھ کر لطافتوں کا ایک عمیق خزانہ تھی اور انہی لطافتوں کے سبب اس مالک الملک کی ذات پاک سے مناسبت تامہ رکھتی تھی۔ جو اپنے کسی کام میں وسائل کی محتاج نہیں بلکہ وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں، تو ضروری تھا کہ روح ربانی کی شان بھی ایسی ہوتی ہو کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لحہ کے لئے بھی ان مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے، اور جو روح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے، وہ زمین سے ایک انچ بھی بجلی کی مدد کے بغیر اوپر نہ اٹھ سکے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک انجن تو اپنی آگ پانی کی اندرونی طاقت سے مشرق ومغرب کو ایک کر ڈالے اور جو انسان خود انجنوں میں یہ طاقت مہیا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ ایسی سریعانہ حرکتوں میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تار اور ٹیلیفون کی برقی رو تو ہزار ہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو مشینریوں میں خود بجلی کی روح کو پھونکتا ہے، ایک میل بھی از خود اپنی آواز نہ پہنچا سکے۔

بہر حال اگر مادیات سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی بہ طفیلِ روح، تو خود روح اور روحانیت سے تو ایسے ہی نہیں، بلکہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر عجائبات کا کارخانہ کھل جانا چاہئے تھا، تاکہ اس غیر محتاج روح کے استغناء وغیرت کا پورا پورا ظہور ہو سکتا ورنہ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ مستعیر تو طاقت ور اور مالک کلیتہً ضعیف ولاچار غلام تو حکمران اور بادشاہ مجبور و بے بس۔

روحانی طاقتوں کے محیّر العقول کارنامے...... آپ اسے کوئی خیالی بات یا محض کوئی علمی نظریہ نہ سمجھیں، بلکہ حقیقتاً روح جب بھی اپنی اصل فطرت پر چلی ہے تو اس سے بلاواسطۂ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کرا نہیں اپنی روحانیت کے بل بوتہ پر خوب خوب نچایا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک "یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلِ" ① کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہنچادی حالاں کہ اس وقت تک لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہو کر اعلان حج کی ندا دی تھی، وہ عالم کے گوشہ گوشہ میں ہی نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں گونج گئی حالاں کہ وہ کسی مکبّر الصوت آلہ کے ذریعہ نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازہ کے کھلنے کا تڑاکہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سن لیا جو کہ یقیناً کسی برقی آلہ کے ذریعہ نہیں سنایا گیا تھا۔ آپ نے جہنم کے قعر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ دنیا ہی میں سن لیا جو ستّر برس میں اس کی تہ تک پہنچا تھا حالانکہ یہاں بھی کوئی حسی اور مادی آلۂ صوت استعمال میں نہیں لایا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث ابن ابی خرار کے فدیہ کے اونٹ اور لونڈیاں مع تعداد، اس کے بتلانے سے پیشتر ہی بتلادیں حالاں کہ وائرلیس کے ذریعہ بعید کی خبریں دینے کی کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نہ ہوئی تھی۔

آپ نے وحیِ الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ نہ کرلیا جاتا ہو ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ ② حالاں کہ اس وقت ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ جو کی آوازیں جذب کرنے والوں اور ان کے نظریوں کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کو مسجد نبویؐ کے منبر ہی سے معائنہ فرما کر حاضرین کو پتہ دے دیا حالانکہ وہاں آج کے آلات خبر رسانی کی بو دو نمونہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ کے حرم میں بیٹھے ہوئے مسجد اقصیٰ کی محرابیں اور طاق تک دیکھ کر گن دیئے حالاں کہ اس وقت تک دور بین کی کوئی ایجاد کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر صلوٰۃ خوف میں انہی عرب کی وادیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت و نار کا مشاہدہ فرمالیا۔ عرفات کے میدان میں شیطان کو ویل و ثبور کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یوم بدر میں ملائکہ مسوّمین کی فوجوں کے پرّے مشاہدہ فرمالئے اور ایک شبِ تار میں غیبی حقائق یعنی فتن و آلام کے نزول تک کا معائنہ فرمالیا، حالانکہ وہاں مادّی شیشوں کی کوئی دور بین درمیان میں نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تختِ سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں حالاں کہ آج کے ہوائی جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت تک کوئی ادنیٰ التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف فضاء آسمانی بلکہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔

---

① احیاء علوم الدین، باب فی اکتساب المعرفة لامن التعلم... ج:۲ ص:۲۲۷. مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب مناقب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ج:۱۷، ص:۳۷۳.

② پارہ:۲۶، سورۃ ق، الآیۃ:۱۸.

حالانکہ وہاں کسی پٹرولی طیارہ کا واسطہ اس سیر میں نہ تھا کہ طیاروں کا تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور طیارے ہوتے بھی تو انہیں آسمانی سیر سے کیا علاقہ ہوتا۔ اس طرح کے ہزار ہا واقعات بطون تاریخ میں منضبط ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے غلام کبھی نہیں ہوتے۔ بلکہ مادیات ہی نے ان کے اشارۂ خم ابرو پر ہمیشہ کام کیا اور ان کی غلامی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصل شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہ کر اور اسی کے ساتھ اپنی مناسبتوں اور مماثلتوں کو بحال رکھ کر اپنے کسی فعل میں ان مادّیات کی جو اس سے بدرجہا کمتر ہیں محتاج نہ ہو، جیسا کہ اس کی فطری لطافتوں کا تقاضا ہے اور جس کی متعدد مثالیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کے کرامات و خوارق سے پیش کی گئیں، جن میں ایک لمحے کے لئے مادّیات سے کوئی مدد نہیں لی گئی بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادّیات کو روحانیت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

مادی تصرّف کوئی حقیقی کمال نہیں...... بہر حال روحانی اقتدار کے ان ثابت شدہ نمونوں اور خوارق کی ان سچی مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک باکمال روح کا اصل کمال درحقیقت مادیات سے مستغنی ہونے اور مادی وسائل کی گرفت سے آزاد ہو جانے میں پنہاں ہے، ورنہ کسی روح کا مادّیات میں مادی وسائل کے ذریعہ تصرّفات کر لینا خود روح کا کوئی مخصوص کمال اور ممتاز کارنامہ نہیں ہے۔ یوں تو ایک مادہ بھی مادہ میں بلاواسطۂ روح تصرّف کر لیتا ہے۔

کہیں مٹی اور غبار اڑ اڑ کر بھی چند صدیوں میں دریا کو خشکی بنا دیتا ہے۔ رواں پانی نشیب میں نئے نئے نکاس نکال کر برّ کو بحر اور بحر کو برّ کر دیتا ہے۔ کوہ آتش فشاں پھٹ کر خنک فضاء کو کرۂ نار بنا دیتا ہے۔ ہوائیں چل چل کر تالابوں اور جھیلوں کو خشک کر دیتی ہیں۔ پس مادہ میں تصرّفات کر لینا اگر کوئی کمال ہے تو یہ کمال تو خود مادی قوتیں بھی کر دکھاتی ہیں، جہاں روحانیت کا کوئی توسط نہیں ہوتا، پس اگر انسان کی انسانیت ان عناصر سے بدرجہا افضل ہے اور ضرور ہے اور اگر وہ عناصر کے تینوں موالید میں اعلیٰ و اشرف ترین نوع ہے، اور بلاشبہ ہے، تو اس کا مابہ الفخر یا مابہ الامتیاز کمال وہ نہیں ہو سکتا، جو اس سے ارذل ترین اشیاء سے بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ روح کے یہ تصرّفات بھی ان مادّیات ہی کے واسطہ سے ہوں، گویا روح ان کی وساطت کے بغیر اس تصرف پر بھی قادر نہ ہو، تو پھر روح کے لئے یہ بے کمال ہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا عیب ہوگا کہ اپنے سے ارذل ترین اشیاء کی محتاج بن جائے اور اپنا کمال ان سے ڈھونڈنے لگے۔ کیوں کہ کسی کامل کے لئے عیب کی جڑ استکمال بالغیر ہے۔ جب کہ وہ غیر اپنے سے ارذل اور کمتر ہو، ہاں اپنے سے برتر سے استکمال کرنا عیب کی بجائے ایک بہترین ہنر ہے۔ کیوں کہ بلا استکمال بالغیر اپنی ذات سے خود بخود باکمال ہونا صرف ایک ذات بابرکات حق ہی کی شان ہو سکتی ہے جو ہر عیب سے منزّہ اور ہر کمال کا منبع و مخزن ہے۔ مخلوق کسی حال میں بھی بے عیب محض نہیں ہو سکتی اور کچھ بھی نہیں تو مخلوقیت کا عیب تو اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ جس کی حقیقت عدم اصلی نکلتا ہے اور جب کہ مخلوق ذات کے درجہ میں معدوم نکلی تو ناگزیر

ہے کہ درجۂ ذات میں کمالات سے عاری بھی ہو کہ عدم ہی تمام نقائص وعیوب کا منبع ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس عیب دار کے باکمال بننے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اسی منبع وجود ذات (یعنی حق جل مجدہٗ) کی طرف رجوع کر کے استکمال کرے، جو کمالات کا مخزن اور عیوب سے مبرّا ہے۔ نہ یہ کہ حصول کمال کے لئے اپنے سے ارذل ترین چیز (مادہ) کی طرف جھکنے لگے کہ محصول کمال کے لئے اپنے بدن یا مادّیت کی طرف جو مجموعہء عناصر ہے، رجوع کرے گویا آگ پانی ہوا، مٹی سے کمال کا جویا ہو تو وہ استکمال نہیں بلکہ ازالۂ کمال اور استحصالِ نقص ہے کہ اپنے سے ارذل کی احتیاج وغلامی ہے اور گویا سلاطین کا غلاموں کی بندگی کرنا ہے جو خود ایک بدترین اور شرمناک عیب ہے، پس اگر سائنس کی حقیقت یہی ہے کہ انسان مادہ کے ذریعہ مادوں میں تصرّفات کرنے پر قادر ہو جائے تو اس صورت میں انسان آگ پانی کے گھروندہ سے باہر ہی نہیں نکلتا کہ اسے حقیقی انسانیت کا حامل بھی کہا جائے بلکہ ایک ناقص اور عیب دار انسان ثابت ہوتا ہے، جس کا عیب بھی حد سے گزر کر شرمناک ہو، ورنہ کم سے کم کوئی ایسا ہنر تو کسی سے بھی ثابت نہیں ہوتا جس سے انسانیت کی کوئی امتیازی شان ہویدا ہوتی ہو۔

انسان میں محتاجگی کا اصل مادہ ہے...... ہاں اگر مادہ میں کچھ بھی استغناء کی شان ہوتی، تب بھی ممکن تھا کہ اس کی غلامی سے تھوڑا بہت استغناء ہی ہاتھ لگ جاتا۔ لیکن جب کہ خود اس کی اصل اور ذاتی صفت ہی محتاجگی اور پابستگی ہے اور گویا مجبوریت ہی اس کی شانِ امتیاز ہے تو اس کی غلامی سے استغناء تو کیا حاصل ہوتا، حاصل شدہ استغناء بھی فنا ہو جائے گا اور مجبوری در مجبوری پیدا ہو جائے گی جو تمام ذلتوں کی جڑ ہے، پس روح جیسے مستغنی، جوہر کا مادہ جیسے مجبور ومحتاج عنصر کی دہلیز پر جھکنا حقیقتاً اپنی امتیازی شان کو فنا کر دینا ہے۔

عناصر اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں...... ہاں اب یہ معمّہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس چورنگ مادہ میں ذاتی محتاجگی کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر وشر اس کے طبعی اخلاق سے پھوٹتی ہے، اس چورنگ مادہ کے جبلّی اور طبعی اخلاق ہی سراپا احتیاج وغلامی ہیں، اس لئے انسانی نفس جس حد تک بھی مادّہ اور مادّیات کا شغل قائم رکھے گا۔ اسی حد تک محتاجگی اور غلامی کا اکتساب کرتا رہے گا چونکہ انسان کے نفسِ امارہ کی نشو ونما اور امتزاج انہی عناصر اربعہ سے ہے۔ اس لئے وہ انسان کو پستی ودنانیت اور محتاجگی کی طرف سے لے چلتا ہے، جو درحقیقت عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور فائز نہ کیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آئے تو یہ چورنگ مادہ اور اس کے جبلّی اخلاق ایک لحہ کے لئے بھی اسے محتاجگی اور بے بسی کی دلدل سے نہیں نکلنے دے سکتے کہ مادہ کی خلقت وجبلت ہی بے بسی اور محتاجی ہے۔

مٹی اور اس کے جبلّی اخلاق...... چنانچہ اولاً مٹی ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے کہ اس کی جبلّی اور بنیادی خاصیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حسی خاصیت تو پستی اور تسفل ہے اور معنوی یا اخلاقی خاصیّت قبض اور بخل ہے، چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے اسے دبا لے گی اور جب تک آپ اس کا جگر چاک کر کے خود ہی نہ نکالیں، نہ دے گی،

آدم کی اولاد کے نا معلوم کس قدر خزانے اور کتنے دفینے اس نے اپنے بطن حرص وآز میں چھپا رکھے ہیں اور اس کا پیٹ چاک کر کے نکال لو تو فبہا، ورنہ از خود اطلاع نہ دگی، نہ چیز دے گی۔ آپ زمینی کشت زار کو دیکھ کر خیال نہ کریں کہ زمین تو بڑی فیاض ہے، جو ایک کے سو کر دیتی ہے اور کھیتوں کے ذریعہ اس کے جود وسخا کی داستانیں سنانے لگیں، کیوں کہ دانہ خود آپ کا ہے جس میں زمین کا دخل نہیں اور اگر وہ زمین سے حاصل شدہ بھی ہے تو وہ بھی کسی ڈالے ہوئے دانے کا طفیل ہے نہ کہ خود زمین نے دانے اور بیج کی ایجاد کی ہے، اس سے واضح ہے کہ سب سے پہلی اور ابتدائی کھیتی کا بیج یقیناً باہر سے زمین میں ڈالا گیا ہے نہ کہ زمین نے ابتداء کی ہے، پس دانہ یقیناً آپ کا ہے نہ کہ زمین کا، اس لئے داد ودہش کی ابتداء زمین سے نہیں ہوئی بلکہ انسان سے ہوئی، پھر دانہ ڈال کر اس کو محفوظ رکھنے، بڑھانے اور پھر نکالنے کے سامان بھی آپ ہی کی طرف سے ہیں، اگر پانی نہ دیا جائے تو زمین اصل بیج کو بھی سوخت کر دیتی ہے، چہ جائیکہ اسے باقی رکھ کر بڑھائے، پس پانی دینا درحقیقت بیج کو باقی رکھنا، بڑھانا اور بڑھا کر اس میں سے دوسرا دانہ کھینچ لینے کا ایک آلہ ہے، اس لیے زمین نے نہ محض از خود بیج کو بڑھانہ دیا، بلکہ پانی کا لشکر بھیج کر آپ نے جبراً اس سے راس المال مع سود کے منگوالیا۔ اس لئے زمین کا ذاتی خاصہ قبض وبخل بحالہٖ ثابت شدہ رہا۔

اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادہ انسان کا جزوِ اعظم ہے اور وہ مشت خاکی کہلایا۔ تو جبلی طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے چناں چہ پیدا شدہ بچہ کو ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لئے چیختا ہے نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے، آپ جو چیز بھی بچہ کے سامنے ڈال دیں گے، اسے اٹھائے گا اور طبعی تقاضا سے منہ کی طرف لے جائے گا تاکہ اسے قبض کر کے ہضم کر جائے، اسے دیتے رہو تو خوش رہے گا، چھیننے لگو تو چلائے گا۔ پس جبلی طور پر اس کی طبعیت سخا اور ایثار کی طرف نہیں جاتی، بلکہ قبض اور بخل کی طرف کہ اس میں عنصرِ خاکی کا غالب خلق یہی قبض وبخل ہے اور ظاہر ہے کہ قبض وبخل جس کا منشاء حرص وطمع ہے، محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں، غنا واستغناء سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیوں کہ بخیل اول تو خود اس شے کا محتاج ہوا جس میں بخل ظاہر ہوا، پھر اس شخص کا محتاج ہوا جس کی شے ہے، پھر اس کی عطا کا محتاج جس کی بدولت یہ شے اس کے پاس آئے گی، پھر اگر معطی اور عطا اور عطیہ نہ ہو تو بخیل اس درجہ محتاج ہے کہ اپنے بخل کا بھی پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا، اس لیے ایک بخیل کسی چیز کے لینے سے بیشتر تو معطی کا محتاج اور لینے کے بعد اس عطیہ کا محتاج ہو جاتا ہے کہ اپنے قلب وقالب کو اس سے جدا کر لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے بخیل کے لئے اول وآخر محتاجی اور غلامی ہی نکلتی ہے اور زمین میں چوں کہ یہی وصف ایک امتیازی وصف ہے۔ اس لئے اس کی محتاجگی وذلت بھی سارے ہی عناصر سے زائد ہے، اس لئے یہ خاکی انسان خاکی رہتے ہوئے جبلی طور پر بخل کے رذیلہ میں گرفتار رہتا ہے۔ جو سراپا احتیاج (نمایاں ہو) ذلت ہے اور قبض وبخل کے بجائے سخاو ایثار پیشہ بن جائے تو اس کا ثمرہ استغناء ہے جو سراپا عزت ومحبوبیت ہے اور اس میں کسی غیر کی احتیاج وغلامی نہیں بلکہ غیر ہی سے اپنی غلامی کرانا ہے۔

آگ اور اس کے جبلّی اخلاق ...... اسی طرح آگ کو لو تو اس کی طبعی خاصیت اور جبلت ترفع ہے کہ سر نیچا ہی نہیں کرتی ۔ کسی واجبی مصلحت سے بھی دباؤ تو نہیں دبتی ۔ گویا آگ خاک کی ضد ہے کہ وہ ہمہ تن پستی ہے اور یہ سرتاپا تعلّی ، ناری شیطان نے یہی کہہ کر حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا کہ: ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ ① ظاہر ہے کہ انسان میں آگ کا ایک کافی حصہ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کی بدنی حرارت اور بعض اوقات بخار کا ہیجان اس کی کافی دلیل ہے ۔ اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں جبلی طور پر وہی ترفع و تعلّی شیخی اور انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے جو حقیقت میں ناری اثر ہے، چنانچہ تعلّی اور شیخی سے مغلوب ہو کر جب انسان میں جوش وغضب اور غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے، اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ پر آگ کی سرخی آجاتی ہے، تو عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص آگ بگولا ہو گیا، فلاں میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی ۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میں غصہ کا پانی بہہ گیا یا غصہ کی مٹی بکھیرنے لگا، بلکہ مٹی ہو جانا، اس کے ٹھنڈے ہو جانے کی علامت شمار ہوتی ہے کہ مٹی درحقیقت آگ کی ضد ہے، بہر حال انسان کا یہ ترفع و تعلّی اور انانیت درحقیقت وہی ناری خلق ہے، اب اس خلق پر غور کرو تو یہ بھی سراپا احتیاج و ذلت نظر آئے گا کیوں کہ تعلّی اور ترفع کا حاصل دوسرے پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو ان کی نظروں میں بڑا دکھانے یا ان کے خیال پر نکلا، جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں یا ان کا خیال اس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اس کی بڑائی کی عمارت منہدم ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہوگی کہ عزت ہماری ہو اور قابو میں دوسرے کے ہو، رفعت ہماری ہو اور دوسرے کے خیالات کی بہنے والی رو میں بہتی جا رہی ہو کہ دوسرے کے پاس بھی اسے تمکن اور استقرار نصیب نہیں ۔ اسی بنا پر تعلّی و تفاخر کے لئے مداراۃ ناس اور تملّق بھی لازمی ہے تاکہ ان کا خیال بدلنے نا پائے اور یہ ترفع کا بھوکہ ان کی نظروں میں سبک نہ ہونے پائے ۔

پس جو خلق ایک انسان کو ہزار ہا انسانوں کا محتاج بناتا ہو اس سے زیادہ ذلت آمیز اور احتیاج خیز خلق اور کون سا ہوگا؟ ہاں اس کے بالمقابل تواضع کا خلق ہے، جس کی حقیقت بلا مجبور و پابندی محض اپنے قصد وارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں وہ سمجھیں مگر ہم تو اپنی اصلیت پر ہیں، جو آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کسی حال بھی تبدیل نہیں ہو سکتی ۔ پس تواضع کا حاصل استغناء اور ترفع کا حاصل محتاجگی اور غلامی نکل آیا ۔ نیز تواضع کے سلسلہ میں بلند اور رفیع ہوتے ہوئے قصد وارادہ سے جھکنا اعتماد علی النفس کی دلیل ہے کہ اس پر خود کو قابو ہے اور وہ اپنی ناریت سے مرتفع ہونا چاہتا تھا اور ہم اسے حاکمیت سے جھکا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نفس پر قدرت اور قابو مالکیت کی دلیل ہے جو محتاجگی کے منافی ہے ۔ کیونکہ ہمیشہ مملوکیت میں ہوتی ہے نہ کہ مالکیت میں، ادھر شیخی میں انسان کو اپنے اوپر قدرت نہیں رہتی جو مجبوری اور

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲ .

محتاجگی ہے، پس تواضع سے استغناء اور ترفع ونخوت سے احتیاج وغلامی پیدا ہونا اس جہت سے بھی تواضع ہے۔

غرض جب تک انسان اس ناریت کے جال سے رہا نہ ہو، یہ ناری خلق اسے محتاج اور ذلیل ہی بنائے رکھتا ہے کہ احتیاج کی خاصیت ہی ذلت ومسکنت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ آگ بھی اپنی جبلت سے محتاجگی کا ثمرہ پیدا کرتی ہے نہ کہ غناء کا۔

ہوا اور اس کے جبلّی اخلاق...... اسی طرح ہوا کو لیجئے کہ اس میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود رہے، ہر جگہ گھسی رہے، ہر جگہ بھری رہے، ذرّہ ذرّہ اس سے وابستہ رہے۔ گویا اسے پھیلا نتا رہے۔ انسان میں ہوائی جز و بھی ہے۔ جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے نمایاں ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ میں ہر جگہ موجود رہوں، ہر جگہ گھسا رہوں، ہر زمان اور ہر مکان میں میرا وجود رہے۔ مگر چوں کہ اس کا مادی نفس اتنا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ رہے۔ اس لئے وہ انتشاریت، شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچا کریں۔ میرا ذکر پھلائیں اور اپنے ذکر وتذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہے۔ پس ہوائے شہرت انسان میں اسی ہوائی جزو کا اثر ہے۔ غور کرو تو اس شہرت پسندی کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے۔ کیوں کہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اسے پہچانیں اور اس کے بعد اس کی ہوا بندی بھی کریں، اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور چرچا بھی کریں اور اسے اڑاتے بھی رہیں۔ پس اس خلق کا حاصل بھی وہی غیروں کی احتیاج نکل آئی۔ اس لئے شہرت پسندی بھی کوئی عزت آفرین نہیں بلکہ ایک ذلت افزا ملکہ ہے جو اپنے مقاصد کو دوسروں پر معلّق کردیتا ہے، برخلاف شہرت پسندی کی ضد کے، جسے اخفاء وتستّر کہتے ہیں، کہ اس کی حقیقت میں خود بخود مگن رہنا اور دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہوجانا ہے حالانکہ اس غناء پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اس مصنوعی اور جعلی شہرت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ بہرحال ہوا کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی اور جگہ جگہ مارے مارے پھرنا آیا۔

پانی اور اس کے جبلّی اخلاق...... اس طرح پانی کو لو تو اس کا طبعی فعل ہے، عدم التکلف اور عدم الضبط، یعنی پانی میں اعتماد علی النفس کا نشان نہیں۔ وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا۔ ہر طرف سے آپ روک لگائیں، رک جائے گا اور جہاں بند ٹوٹا برتن پھوٹا، وہیں پانی بکھرا، سیدھا چل رہا ہے اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہ گیا، ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی، اور وہ اپنا مستقر چھوڑ کر وہیں آ رہا۔ انسان میں بھی چوں کہ پانی کا جزو موجود ہے، جیسا کہ تھوک، سنک، بلغم، پیشاب وغیرہ سے واضح ہے۔ اس لئے اس میں بھی ضبطِ نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا، ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے، کسی کی عورت پر نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے، کوئی قبول صورت چیز نظر پڑ گئی، اس کے پیچھے ہولئے، کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچاتی نظروں سے اسے دیکھنے لگ گئے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی۔

غرض ذرا سا نشیب سامنے آنے سے بکھر پڑنے کا مادّہ انسان میں آبی جزو سے آیا ہے۔ مگر اس کا حاصل

بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے۔ کیوں کہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا، عدم قدرت اور عجز کی دلیل ہے اور عجز جڑ ہے محتاجگی کی۔ ہاں ضبطِ نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اس سے بے نیاز رہنا، خود کو قابو میں رکھنا اور گرنے سے بچالینا قدرت کی دلیل ہے، جس کا حاصل بھی وہی استغناء نکلتا ہے۔ اس لئے پانی کی طبعی خاصیت بھی وہی احتیاج اور غلامی نکل آئی۔

رذائلِ نفس کے چار اصول...... پس اس طرح ان مادی یا رزائلِ نفس کے چار اصول نکل آتے ہیں۔ قبض، بخل، تعلّی و ترفع، شہرت پسندی اور انتشاریت، عدم ضبط نفس یعنی حرص و ہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج و غلام بنادیتے ہیں۔

فضائلِ نفس کے چار اصول...... ہاں پھر یہیں سے استغناء و خودداری کے اصول پر روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ ان اخلاقِ چارگانہ کی ضد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قبض و بخل کی ضد سخاوت و ایثار ہے، کبر و نخوت کی ضد تواضع و فروتنی ہے۔ شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء و تستر ہے۔ حرص و ہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبطِ نفس اور قناعت ہے اور جب یہ چارگانہ اضداد مادہ کے چارگانہ اخلاق کی ضدیں ہیں تو یقیناً انہیں مادی اخلاق بھی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس روح کے روحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے جو مادہ کی ضد ہیں اور اس طرح اگر مادہ کے جوہر میں سے رذائلِ نفس کے چار اصول نکلے تھے تو روح کے جوہر میں سے فضائلِ نفس کے بھی چار ہی اصول نکل آئے، ایثار، تواضع، اخفاء، قناعت۔

اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں...... لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق کے جبلی آثار افعال ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اگر ان اخلاق کے مناسب افعال سرزد نہ ہوں تو اخلاق کے طبعی آثار ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتے، جیسے مثلاً خلق شجاعت کی تاثیرات بغیر فعلِ مقاتلہ و مقابلہ کے کبھی نہیں کھل سکتیں۔ خلقِ تواضع کی کیفیات بغیر انکساری کے اور جھکاؤ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ یہی حال اور تمام اخلاق کا بھی ہے۔ اس لئے ناگزیز ہے کہ ان مادی اخلاق کے اثراتِ محتاجگی اور روحانی اخلاق کے آثار کو ظاہر کرنے والے افعال کون سے ہیں؟

مادی اخلاق کا مظہر فعلِ امساک ہے...... سو مادی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا، ان کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ بخل ہو یا حرص، شہرت پسندی ہو یا تعلّی، سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامن ہوس میں سمٹ آئے۔ گویا ہر چیز کو اوروں سے روک کر اپنے لئے مختص کر لینا ان نفسانی اخلاق کا مقتضی ہے۔ چناں چہ قبض اور بخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے روکی جاتی ہے۔ حرص و ہوس میں دوسروں کی مقبوضہ چیز ان سے روک کر اپنے لئے پسند کی جاتی ہے۔ تعلّی و ترفع میں ہر درجۂ کمال کو دوسروں سے منفی کر کے اپنے سے مختص ظاہر کیا جاتا ہے۔

شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر صرف اپنا نام چاہا جاتا ہے، پس ان سب اخلاق میں کسی نہ کسی جہت سے اوروں سے رکاوٹ اور اپنا اختصاص کارفرما رہتا ہے۔ اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کے طبعی آثار کو جو فعل بطور قدر مشترک کے کھولتا ہے، وہ امساک ہے، بخل و حرص میں یہ امساک مالی ہوتا ہے اور تعلّی

ونام آوری میں امساک جاہی۔ مگر حبّ جاہ ہو یا حبّ مال، دونوں کا مظاہرہ اس فعل امساک ہی سے ہوتا ہے۔ گویا ان اخلاق کے طبعی آثار خود غرضی ومحتاجگی، بغیر فعل امساک کے نمایاں نہیں ہو سکتے۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعلِ انفاق ہے...... ادھر روحانی اخلاق چونکہ ہر ہیئت سے مادی اخلاق کی ضد ہیں، اس لئے ان کے طبعی اثرات اور ان اثرات کو ظاہر کرنے والے افعال بھی مذکورہ افعال کی ضد ہی ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جیسے مادی اخلاق کا اثر خود غرضی تھا۔ روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار و تواضع ہو یا اخفاء وقناعت، ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی اس خود غرضانہ خواہش پر نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اسی کو مل جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے۔ قناعت میں دوسروں کی چیز انہی کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے اور اخفاء میں دوسروں کی عزت کے لئے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔

غرض ان تمام اخلاق کی بنیاد دوسروں سے روکنے یا چھیننے پر نہیں، بلکہ دوسروں کو دینے اور عطاء ونوال پر ہے، اس لئے واضح ہوتا ہے کہ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھولتا ہے، وہ فعل امساک نہیں بلکہ اس کی ضد، انفاق ہوسکتا ہے، سخاوت وقناعت میں یہ انفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع واخفاء میں انفاق جاہی، مگر استغناء مالی ہو یا استغناء جاہی بغیر فعل انفاق کے کھل نہیں سکتا اور یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جاہ ومال سے یہ بے نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنادیتی ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مستحکم کر دیتی ہے، جس سے وسعتِ صدر اور فراخ دلی کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے، اس لئے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعتِ حوصلہ، استغناء، وقار، خودداری و بے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے، جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان ومال، آبرو اور قول وعمل کو مالک الملک کے لئے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں۔ پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوباتِ نفس اور لذائذِ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بالطبع شاق ہے، اس لئے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔ اس لئے خلاصہ یہ نکلا کہ طبعی امساک کے ذریعہ انسان میں جو محتاجگی اور تنگی قائم ہوتی ہے، اس کے مٹانے اور اس کی جگہ استغناء وخودداری کی دولت جاگزین کرنے کا ذریعہ صرف صدقہ ومجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

گویا انفاق کا جو درجہ بھی امساک کے مقابلہ پر آتا رہے گا اسی درجہ نفسِ انسانی میں محتاجگی وغلامی مٹ کر استغناء کے مراتب قائم ہوتے رہیں گے کیوں کہ صدقہ سے وہ مادی اخلاق مضمحل اور کمزور پڑتے جائیں گے، جن کی بدولت امساک کے افعال نمایاں ہوتے تھے۔

صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہوسکتا ہے...... چنانچہ ایک صدقہ دینے والا جب اپنے محبوب مال متاع کو اپنے سے کھودیتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس نے قبض وبخل کی تو جڑ کاٹ دی، جو ارضی خُلق تھا، ورنہ غلبہ بخل کے ہوتے ہوئے یہ متاع جدا ہی کب کی جاسکتی تھی اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی قبض وبخل کا رذیلہ سست پڑے گا جو محتاجگی کی

جڑ تھا، اسی حد تک سخا و ایثار کا غلبہ راسخ ہوگا، جو ذریعہ استغناء ہے اور اس طرح استغناء کے ایک بڑے درجہ پر فتح ہو جائے گا۔ پھر جب کہ ایک صدقہ دہندہ کو عطاء ونوال میں لطف محسوس ہونے لگا تو ظاہر ہے کہ اب وہ دوسروں کی چیز پر نہ نگاہ حرص ڈال سکے گا نہ کسی چیز کو دیکھ کر بکھر سکے گا بلکہ اس کے عطاء وتصدق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو تھامے رکھنے کا خواہشمند ہے، جسے قناعت کہتے ہیں۔ پس اسی صدقہ وانفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہوگیا جو آبی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک دوسرا مقام طے ہوگیا۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر اپنی چیز کی محبت قطع ہوئی تھی، جس سے بخل قائم تھا اور دوسرے مقام پر پہنچ کر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی جس سے حرص قائم تھی، اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا، پھر جب کہ یہ صدقہ اخفاء کے ساتھ کیا گیا، جس میں نام ونمود کی کوئی خواہش نہیں ہوسکتی، ورنہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی تو اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی جڑ کٹ گئی جو ہوائی خلق تھا، اس عظیم محتاجگی کی جڑ کٹ جانے سے جس کی تفصیلات آچکی ہیں، استغناء کا ایک اور مقام میسر آ گیا۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ صدقہ دہندہ اپنے اس عمل کو چھپانے کی سعی جب ہی کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنا یہ عمل دوسروں کے عمل سے کم نظر آئے اور وہ اپنے عمل کی دوسروں کے عمل کے مقابلہ میں کوئی برتری اور بڑائی اپنی نگاہوں میں محسوس نہ کرے۔ ورنہ وہ اس عمل کو مخفی رکھنے کی بجائے دوسروں کے عمل سے برتر اور فائق تر ظاہر کرنا اور جابجا اس کا چرچا کرنا پسند کرتا، لیکن جب کہ وہ اپنے صدقہ کو دوسروں کے صدقات سے نسبت تک دینے سے رک رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے عمل کے تفوق و برتری کے خیال سے بھی جدا ہو چکا ہے، اور اس طرح دوسروں کی نسبت خود اپنی ذات کی برتری اور تعلّی سے بھی بیزار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اخفاءِ صدقہ سے تعلّی اور ترفع کی جڑ بھی کٹ گئی، جو آتشی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک چوتھا مقام میسر ہوگیا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی نیکی کے اخفاء میں مبالغہ اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا گیا، خود اپنے نفس کو بھی خبر نہ ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نیکی پر خود اپنے ضمیر میں بھی اسے کوئی فخر وناز محسوس نہ ہو، وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اس نیکی کی بمقابلہ غیر ہی نہیں بلکہ بحیثیت اپنے فعل ہونے کے بھی ذرہ برابر وقعت وعظمت نہ ہو، بلکہ وہ اسے محض ادائے فرض کہہ کر کرے، نہ کہ ادائے حق جان کر کرے، ظاہر ہے کہ صدقہ کے اس اخفاء تام سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جس سے استغناء کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسر آ جاتا ہے۔ استغناء کے یہ آخری تین مقامات جاہ کے سلسلے میں محتاجگی سے بچاتے تھے۔ ان تین مقامات میں باہمی فرق وتفاوت ہے، تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر صدقہ دہندہ دوسروں سے طالبِ جاہ نہیں رہتا۔ دوسرے مقام پر اپنے عمل سے کاسب جاہ نہیں رہتا اور تیسرے مقام پر خود اپنے نفس سے بھی تخیلِ جاہ قائم کرنے کا روادار نہیں رہتا اور اس طرح ان پانچوں مقامات کے ذریعہ مال وجاہ دونوں

کے سلسلہ میں اس محتاجگی اور پابستگی سے آزاد ہو کر جس نے اسے ذلت وپستی کے حضیض میں گرا رکھا تھا، غیر سے بھی غنی ہو جاتا ہے اور خود اپنے سے بھی مستغنی۔

مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے...... الحاصل اس مادہ پرست اور مادّی نفس کے دو رذیلے بخل اور حرص تو نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے اور تین رذیلے، تملق، نام آوری اور خود بینی اخفاءِ صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا، سخی ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنی دولت کی بھی پروانہ رہی، حریص نہ رہا بلکہ قانع ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے غیروں کی دولت کی بھی پروانہ رہی۔ شہرت پسند نہ رہا بلکہ عزلت پسند ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے لوگوں کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہ رہی، شیخی پسند اور خود بین نہ رہا بلکہ خود گزار ہو گیا، جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنے نفس کی بھی پرواہ نہ رہی۔ تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے ہیں، عالم میں کسی کا غلام نہ رہا اور اسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسر آگئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہو کر اب اگر اس کا رشتۂ نیاز کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی خاطر اس نے یہ اپنا مال، اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ تخلیق کیا، اندریں حالات اسے مناسبت پیدا ہوئی تو اس غنی عن العالمین سے اور لگاؤ پیدا ہوا تو صرف اسی ذات بے نیاز سے جو اپنے کاموں میں کسی کی محتاج نہیں، بلکہ ہر چیز اپنے وجودِ ظہور میں اسی کی دستِ نگر ہے۔

تعلق مع اللہ کی قوّت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے...... اور اس صورت میں ضروری ہے کہ اس مردِ متصدق او بندہ مجاہد یا تارک ماسوی اللہ سے بھی جس نے اس غنی مطلق سے نسبت قائم کر لی ہے۔ غناءِ کامل کا ظہور ہو اور وہ بھی اپنے کسی کام میں ان مخلوقاتی وسائل یعنی مادی ذرائع کا محتاج نہ رہے بلکہ خود یہ وسائل ہی اس کی چشم وآبرو کو دیکھنے لگیں، اس کے تصرف بلا وسائل زمین تک ہی نہیں آسمانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ وہ اوپر جائے تو طیاروں کا محتاج نہ ہو اور زمینی مسافت طے کرے تو ریلوں او موٹروں کا پابند نہ ہو۔ وہ عالم میں اپنی صدا پہنچائے تو ہوا و برق کا دست نگر نہ ہو اور عالم کی صدائیں سننا چاہے تو ریڈیو اور ٹیلیفون کا محتاج نہ ہو۔

غرض اس کے ہاتھوں پر وہ سب کچھ ظاہر ہو، جسے دنیا کے سارے فلسفی اور سائنس دان مل کر بھی ظاہر نہ کریں۔ ورنہ کم سے کم غنا کا یہ درجہ تو اسے ضرور حاصل ہو جائے کہ علم واعتقاد کے درجہ میں تو ان وسائل کو موثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اسے ان اسباب ووسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے بلکہ عادت کے طور پر محض حیلہ کے درجہ میں اور وہ بھی امرِ خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا رہے، پس پہلا درجہ توکل وغنا کا اعلیٰ مقام ہے، جس میں ترک اسباب پر پوری قدرت محسوس ہونے لگے اور دوسرا درجہ ثانوی ہے جس میں گویا قدرت نہ ہو، مگر معرفت صحیح ہو جائے اور اختیارِ اسباب میں غلو اور انہماک باقی نہ رہے۔

بہر حال اب پوری طرح کھل گیا کہ مادہ میں بجز محتاجگی اور ذلت نفس پیدا کر دینے کے کوئی جوہر نہیں کہ اس کے اخلاق کی خاصیت ہی احتیاج وغلامی ہے جس کا ظہور فعلِ امساک سے ہوتا ہے اور روح میں بجز عزت نفس پیدا کرنے کے دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں کہ اس کے فطری اخلاق کی طبیعت ہی استغناء وغناء ہے، منشاء عزت وعظمت ہے۔ جس کا ظہور فعلِ انفاق سے ہوتا ہے، جسے صدقہ کہتے ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مادی اور روحانی اخلاق، ان کی زینتوں اور ان کے خواص وآثار میں تضاد کی نسبت ہے کہ خود روح و مادہ ہی میں تضاد کی نسبت ہے۔

روح ایک لطیفۂ ربانی ہے اور جسم ایک کثیفۂ ظلمانی، وہ مائل بہ علو ہے، یہ مائل بہ سفل، وہ انسان کو عرشی بناتی ہے یہ فرشی، وہ اسے سر بلند کرتی ہے، یہ سرنگوں، گویا ان دونوں کی مثال ترازو کے دو پلوں کی سی ہے کہ جتنا ایک کو جھکا دیا جائے دوسرا اسی قدر اٹھ جائے گا۔ اس لئے آپ ان مادی تصرفات کے ذریعہ مادی اخلاق کو جس قدر بھی قوت اور رسوخ دیں گے، روحانی اخلاق اس قدر مضمحل ہوتے رہیں گے اور اسی حد تک استغناءِ نفس مٹ کر احتیاج وذلتِ نفس کی زنجیریں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس کو دوسری تعبیر سے یوں سمجھ لیجئے کہ روح جیسا فاضل بادشاہ جس حد تک جسم جیسے کمینہ اور بے شعور غلام کے زیر اثر بسر کرتا رہے گا، اسی حد تک اپنی ساری فرمانروائی کی عزت وشوکت برباد کرتا رہے گا اور نتیجۃً انجام کی تباہی وبربادی دونوں ہی کو گھیرتی رہے گی۔

لیکن اگر صدقہ ومجاہدہ یعنی مادیات اور مادی لذات سے بے نیازی کے ذریعہ ان روحانی اخلاق کو قوۃ و رسوخ کا موقع دیتے رہیں گے تو احتیاج وغلامی مٹ کر اسی حد تک استغناء وکمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس سے کائنات بدن میں روح کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور بدن کا غلام ہر آن اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہ کر محض بجا آوریٔ احکام کے لئے رہ جائے گا، جس سے دونوں اپنے اپنے منصبی کاموں میں بھی لگے رہیں گے۔ دونوں کی عزت بھی بقدرِ مرتبہ قائم ہوگی اور اقلیم جان کا عدل بھی استوار رہے گا۔

سائنسِ محض کبھی یہ غناء پیدا نہیں کر سکتی...... اور جب کہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلتِ نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوعِ عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ ومجاہدہ جن سے استغناء وعزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوعِ عمل ہے، تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلتِ نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت وفلاحِ دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔

پہلی صورت یعنی مادیات کا علو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل، اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلبِ موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے

اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سر بلندی اور مادہ کی محکومی کی ہے، جس سے عزیز مسندِ عزت پر اور ذلیل اپنی حدِ ذلت ومقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عینِ عدل اور دونوں کے لئے دارین

میں موجبِ فلاح و بہبود ہے، بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ جو اپنی بساطِ علم کی قدر، میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور یہی اس تقریر کے تین مقاصد میں سے پہلا مقصد تھا جو الحمد للہ کہ اتمام کو پہنچ گیا۔
سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے......اب اس پر غور کیجئے کہ یہ چورنگ مادہ ہے اور اس سے تیار شدہ بدن ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کی زندگی روح سے ہے اور روح اسے زندہ رکھ کر اپنے علوم و کمالات کو اسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے، پس بدن کمالات روح کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اس مقامِ معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کے لیے طے شدہ تھا، جب ہی اس ڈھانچہ اور وسیلہ کو روح سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً فاعل نہیں بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں محض وسیلہ ہے۔

اگر اس جسم کو بالاستقلال مقصودیت کا درجہ دے دیا جائے تو یہ فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنا لینا ہے، جس کا انجام سڑنے، گلنے اور دماغوں کو پراگندہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب کہ سائنس کا موضع محض یہ جسمانیات اور مادی چیزیں ہی ہیں اور مادیات ڈھانچہ اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، تو خود بخود حل ہو گیا کہ سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولاً وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے اور جب کہ اسلام کا موضوع بالاصالہ روحانیت اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے، تو یہ بھی خود ہی واضح ہو گیا کہ اسلام کے تمام امور بھی مقصودیت کے درجہ سے کسی طرح نہیں گر سکتے۔ ان دونوں صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلہ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ و ذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہوگی۔ جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی، جس کا انجام بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر صحیح دماغوں اور سچے قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف فضاء کو خراب کر دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایسی سائنس جس کا حاصل تعیش محض اور عناصر اربعہ کے خزانوں کو بلا دینی روح کے استعمال میں لانا ہے اور جسے اصطلاح میں دنیوی زندگی پکارا جاتا ہے، قرآن کی زبان میں لاشہ بے جان اور چند دن اپنی سطحی چمک دمک اور زینت دکھا کر خاک کا ڈھیر ہو جانے والا ایک لاشہ ہے۔ جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں۔

ارشادِ حق ہے: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا﴾ (1) ”تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے“۔

(1) پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۰۔

اس غیر ضروری تعیش یا تعیش محض اور جمعِ وسائل کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے، جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف کہا جاتا ہے ارشادِ نبویؐ ہے: ''اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَهٗ.'' ① ''دنیا نگھرے کا گھر ہے اور اس کی جمع پر وہی پڑے گا، جس میں عقل کا نشان نہ ہو''۔

بہر حال حسی، عقلی اور نقلی طور پر یہ واضح ہوگیا کہ جس طرح جسم اور مادہ روح کے لیے وسیلہ عمل ہیں، خود مقصود و اصل نہیں۔ اس طرح مادی تصرفات، جن کا نام سائنس ہے، روحانی تصرفات کے لئے جن کا نام اسلام ہے، اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں، خود مقصودیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود میں معین ہو، یعنی بقدرِ ضرورت، ورنہ بالا دصالہ اس میں انہماک رکھنا، اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا ہے، جو قلبِ موضوع اور خلافِ عقل ہے، اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصودِ اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل قرار نہیں پا سکتا بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدارِ ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی۔

اس لئے دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبانِ نبویؐ پر دی گئی ہے، جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو۔

ابو بکر طرطوشی کا قول ہے ''اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِقَدْرِ مَقَامِکَ فِیْهَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِقَدْرِ بَقَآئِکَ فِیْهَا.'' ② ''دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کرو، جتنا وہاں رہنا ہے''۔

خلاصہ...... یہ ہے کہ سائنس کا درجہ وسیلہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا کہ اس کا معمولِ اصلی مادہ ہے اور مادہ روح کے لئے محض وسیلہ ہے اور اسلام کا درجہ مقصودیت سے گر نہیں سکتا کہ اس کا معمولِ اصلی روح ہے اور روح مادہ کے لئے اصلِ مقصود ہے۔

اس تقریر سے الحمدللہ پوری طرح سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت بھی واضح ہوگئی اور کھل گیا کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جو موضوعِ تقریر کا دوسرا مقصد تھا، اور جس کا حاصل یہ ہے کہ سائنس کے کارنامے جب تک مذہب کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہوں گے، خواہ ترقی کی کسی حد پر ہی پہنچ جائیں، ان کا انجام خوش کن ہوگا اور جب اس سے جدا ہو کر خود مقصودیت کی شان لے لیں گے یعنی روحانیت ترک ہو کر مادیتِ محضہ مقصود کی جگہ لے لے گی، خواہ وہ کم سے کم بھی ہو، جب ہی انجام خطرناک اور ذلت آمیز نکلے گا۔

سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا ہم پر تقاضہ کیا ہے؟...... اسی سے آپ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ آپ کی ترقی کا میلان کیا ہونا چاہئے؟ جس کے شور سے آج فضاءِ دنیا گونج رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وہی عقل سلیم کر سکتی ہے جس

---

① مسند احمد، حدیث السیدة عائشةؓ ج: ۴۹ ص: ۴۳۹. ② تفسیر الثعالبی تحت قوله تعالی وسیری الله عملکم، ج: ۲، ص: ۱۶۲ . علامہ ثعالبی نے اسے استاد ابو بکر الطرطوشی کا قول قرار دیا ہے۔

نے ان میں سے ایک کو وسیلہ اور ایک کو مقصود باور کرایا ہے کہ آیا ترقی وسائل میں کی جاتی ہے یا مقصد میں؟ اور ترقی کی دوڑ راستہ کے لئے ہوتی ہے یا منزلِ مقصود کے لئے؟

پس اگر سائنس وسیلہ ہے اور بہ شہادتِ عقل ونقل ضرور ہے، جیسا کہ ثابت ہو گیا تو پھر عقل ہی کی شہادت سے وہ کبھی مطلقاً میدانِ ترقی بھی قرار نہیں پا سکتی کہ وہ تو راہِ محض ہے، منزلِ مقصود نہیں اور اگر اسلام مقصودِ اصلی ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقل ونقل سے ثابت ہو چکا ہے تو اسی کو دوڑنے اور ترقی کرنے کا میدان بھی بنایا جا سکتا ہے کہ وہ راہِ محض نہیں، شہرِ مطلوب ہے۔ جس میں پہنچنے کے لئے ساری جدوجہد تھی، چنانچہ قرآن کریم نے ترقی کو روکا نہیں بلکہ انسان کو دنیا میں بھیجا ہی ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہاں وسائل میں ترقی کرنے کو اضاعتِ وقت کہا ہے اور مقاصد میں جس کا عنوان خیرات ومبرّات رکھا ہے، ترقی کرنا نہ صرف روا ہی بتلایا ہے بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ① ''ہر قوم کے لئے ایک قبلۂ مقصود ہے، جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں سبقت کرو!''

دوسری جگہ نعیمِ آخرت کا ذکر فرمایا جو تمام خیرات ومبرّات کا مقصودِ اصلی ہے، ارشاد فرمایا ﴿وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ ② ''اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنی چاہئے''

پس ایک جگہ سبقتِ باہمی اور ایک جگہ حرصِ باہمی کے عنوان سے مسلمانوں کو ترقی کے لئے ابھارا گیا اور مامور کیا گیا ہے، لیکن یہ ترقی اسی میدان کی ہے جس کی فطرۃً ہونی چاہئے، یعنی مقاصد کی، کیوں کہ وسائل میں ترقی ترقی نہیں بلکہ بے عقلی ہے۔ اس اصولی حقیقت کے پیش نظر اب آپ اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ نے کس طرح اس موضوع کو الٹ دیا ہے۔ مقصود کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود، بادشاہ کو غلام اور غلام کو بادشاہ بنا دیا ہے، مقصودِ اصلی کو تابعِ محض اور رسمی واسمی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصودِ حقیقی اور مطلوبِ اصلی قرار دے لیا ہے۔ پھر ساتھ ہی اس کے انجامِ بد کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ ان حالات میں یہ مادہ کا کمینہ غلام آپ کو حرمان وخسران کے کس گڑھے میں لے جا کر گرائے گا، جیسا کہ اب تک اقوام کو گراتا آیا ہے۔ اللہ کے نذیرِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خالص نمائشی کروفر اور مادیات کی اسی چمک دمک پر جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں زینت اور زہرۃ ہے' خوف کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ ''وَاللّٰهِ مَآ اَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ مِّمَّآ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِىْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا تُفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَتُهْلِكُكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ۔'' ③ ''خدا کی قسم، مجھے اپنے بعد تم پر فقر وفاقہ پڑ جانے سے کوئی خوف نہیں، خوف ہے تو اس کا کہ میرے بعد تم پر دنیا کی چمک دمک کھلے گی۔ اور تمہیں اسی طرح ہلاک کر ڈالے گی جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک کیا ہے''۔

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۴۸۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶۔

③ السنن لابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتن المال، ج: ۱۱، ص: ۴۹۹، رقم: ۳۹۷۸۔

مادیاتِ محضہ کی مضرّتیں...... ہاں مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقادات بگڑتے ہیں اور پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں۔ جس سے ہمتِ عمل ختم ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں اس طرح کہ مادیات خود بے شعور ہیں، چنانچہ آگ، پانی، ہوا، مٹی میں سے کوئی ایک مادہ بھی عقل و ہوش نہیں رکھتا ورنہ انسانوں کے ہاتھ میں اس طرح بے بس ہو کر مسخر نہ ہوتا۔ اس لئے ان جہالت کے کھلونوں سے رات دن کھیلنا، ظاہر ہے کہ جہل سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نیز یہ مادیات چونکہ خود محسوسات کی انواع ہیں، اس لئے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور جس کا تعلق حواسِ خمسہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ سے ہے۔ اس لئے ایک چشم و گوش کا بندہ مشاہداتِ چشم و گوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علومِ قلب، علومِ ارواح اور علومِ حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقفِ محض ہو اور ناواقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی نہ کرے تو اس کا مبلغ پرواز بجز اوہام و خیالات اور شکوک و شبہات کے علوم و معارف کب ہو سکتے ہیں؟

اسی لئے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک و شبہات ہی گھیرے رہتے ہیں، جو درحقیقت مادیات میں انہماک و شغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے، اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کر کے جو منشاء علوم و ادراکات ہیں، قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے، جس سے اوہام و وساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوں۔

طلبائے یونیورسٹی کو خطابِ موعظہ...... مجھے معاف کیا جائے، اگر میں نیاز مندانہ طریق پر یہ عرض کروں کہ آج مسلمانوں میں اور آپ برا نہ مانیں تو آپ جیسے نئی ذہنیت کے افراد میں اس علمی اور عرفانی روشنی کا سرے سے ہی پتہ نہیں ملتا جو شکوک و شبہات کا تریاق اور وساوس و اوہام کا بدرقہ ہے، بلکہ قلوب میں ریب و ارتیاب اور تحیّر نے جگہ پکڑ کر اصل حقیقت ہی سے بیگانہ بنا دیا ہے اور جب کہ ایمان کی وہ شفاف روشنی جو ظلماتِ جہل اور جہل سے پیدا شدہ شبہات کو دفع کرتی ہے اور مشاہدۂ حق کی وہ تجلی ریزی جو ہر سوال کا جواب بنتی ہے، قلوب میں پیوست ہی نہیں تو محض علمی تعبیرات سے آپ قلوب کو کب تک پھسلاتے رہیں گے؟

یہ علمی عجائبات جو تقریروں کے ذریعہ آپ سننا چاہتے ہیں، اس وقت کا مشغلہ ہیں، جب کہ اصل علم کا راس المال ہاتھ میں ہو یہاں ایمان ہی کی خیر نظر نہیں آتی، تا بہ اسلام و عمل چہ رسد؟

مادّیات کی مضرّتیں رفع کرنے کا طریقہ...... اس لئے میری صلاح تو یہ ہے اور نہ میری صلاح بلکہ اسلام کی حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ میرے عزیز بھائی اوپر کی ٹیپ ٹاپ اور مرہم پٹی کو چھوڑ کر اس مادۂ فاسد کا تنقیہ کریں، جو مادی سائنس کے غیر ضروری انہماک اور غلو نے پیدا کر دیا ہے۔ اور فسلفیتہ کے علم نما جہل نے اس کی آبیاری کی ہے۔ ان حالات میں ان کا فرض ہے کہ وہ جسم کے بجائے روح کو ابھرنے کے قابل بنائیں کہ وہ ہی انسان میں علم کا منبع ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ہوائے نفسانی اور مادی خواہشات کے بے شمار مقاصد سے ذرا ایک

طرف ہو کر اس منبع جود و کمال ذاتِ حق کی طرف رجوع کریں۔ جس سے علم معرفت کی روشنی چلتی اور شبہات و وساوس کی دنیا کو تنگ بنا دیتی ہے۔

استحکامِ توحید...... گویا دوسرے لفظوں میں تعددِ مطالب یا شرک کو چھوڑ کر توحید پر استقامت اختیار کی جائے جو اسلام کی روح اور اصل اصول ہے، اس کی تدبیر بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہی کہ کلمہ توحید کو بار بار اور بکرات و مرّات دہرایا جائے تاکہ قول کا اثر قلب پر پڑے اور توحید راسخ ہو۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' ① پھر ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' میں ایک توحیدِ ذات ہی کا تصور نہ کریں بلکہ توحیدِ صفات کا دھیان بھی اسی کلمہ سے کریں۔ یعنی اللہ کے سو ناموں یا سو صفات کی توحید بھی اسی کلمہ سے حاصل کریں۔ گویا الوہیت کا اثبات و نفی اس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے ہی رحمانیت، نافعیت، ضاریت وغیرہ کا اثبات و نفی بھی اس طرح کیا جائے۔ ''لَارَحْمٰنَ اِلَّا اللّٰهُ. لَامَالِکَ اِلَّا اللّٰهُ. لَانَافِعَ اِلَّا اللّٰهُ. لَامَلِکَ اِلَّا اللّٰهُ.'' وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر جب قلب میں یہ ذہن نشین ہو جائے گا کہ مالک بھی ایک وہی ہے. نافع بھی وہی اور ضار بھی وہی ہے عظمت و جبروت والا بھی وہی ہے اور ذوالجلال والاکرام بھی ایک وہی ہے تو اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہوگا کہ قلب سے سب عظمتیں مٹ کر صرف ایک ذات واحد کی عظمت رہ جائے گی اور یہی کسوٹی اور یک رخی قلب کی قوت ہے۔ ایک غلام دو آقاؤں کو بیک دم خوش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ متفکر متردد اور مذبذب رہے گا۔ جس سے قلب میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو اس یقین پر ہے کہ میرا ایک ہی آقا ہے اور وہ بھی ایسا جو علی الاطلاق ہر چیز کا مالک اور اس پر قابض و متصرف ہے۔ تو وہ متردد رہنے کے بجائے متیقن اور مطمئن ہو جائے گا اور یقین و اطمینان ہی قوت قلب کی بنیاد ہے۔ جس سے اس کی قوت فکری سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور پھر اس سے عجائباتِ فکر اور غرائبِ علوم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی بصیرت و معرفت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی قوت یقین کے ماتحت حضرات صحابہؓ اور سلف کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں جنہوں نے متمدن دنیا کو آج تک حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی ترقیات اور طوفانی کارنامے روپیہ پیسہ اور دھن دولت کے رہین منت نہ تھے بلکہ دولتیں خود ان کے کارناموں سے بنتی اور بگڑتی تھیں۔

اس لئے سب سے پہلے اپنے توحیدی اعتقاد درست کیجئے کہ یہی ہر خیر و کمال کی بنیاد ہے۔

یادِ حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ...... ہاں پھر اس توحیدی فکر کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے طمانیت قلب کی حاجت ہے۔ ورنہ وساوس و خطرات اور تشویشاتِ فکر اس صاف حقیقت پر قائم نہیں رہنے دیں گے۔ اس لئے قرآن کریم نے طمانیتِ قلب پیدا کرنے کا موثر ذریعہ فرمایا کہ: ﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ②

① المسند للامام احمد، مسند ابی ھریرةؓ، ج:۷، ص: ۳۷۲ رقم: ۷۳۵۳.

② پارہ:۱۳، سورة الرعد، الآیة:۲۸.

''یاد رکھو! اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں'' اس سے مقصود ذکرِ قلبی ہے۔ مگر ذکر قلب میں راسخ نہیں ہوتا، جب تک کہ زبان سے اس کا بار بار تکرار نہ کیا جائے۔ چنانچہ طالب علم اپنے سبق کو قلب میں محفوظ کرنے کے لئے زبان ہی سے اس کو بار بار دہراتا ہے اور رٹتا ہے، اس لئے اولاً زبان کو ذاکر بنانا چاہئے تا کہ قلب ذاکر بن جائے اور یہ ایمان وتوحید دل میں اپنی جڑیں چھوڑ دے اور قلب اس پر قانع اور مطمئن ہو جائے۔

اس لئے شریعت نے ذکرِ حق کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج ان کا استعمال تو بجائے خود رہا ان کا علم تک بھی مسلمانوں اور اس طبقہ کو نہیں ہے، جو تعلیم یافتہ کہلاتا ہے۔

شریعت نے سب سے پہلے فرائض رکھے جو ذکر اللہ کا اعلیٰ مظہر ہیں اور ہر چھوٹے بڑے پر لازم کئے۔ اس لئے فرائض علوم وصلوٰۃ وغیرہ کی پابندی کیجئے، پھر اوقاتِ مخصوصہ کی دعائیں یاد رکھیں تا کہ چلتے پھرتے بھی خدا کی تسبیح وتہلیل آدمی کی زبان پر جاری رہے، اس لئے اس قسم کے اذکار کو یاد کرنے کی فکر کیجئے۔ پھر مختلف مواقع کلام کے محاورے اسلامی زبان نے ایسے رکھے ہیں کہ ان میں بلا ارادہ بھی ذکر اللہ زبان پر جاری رہے: ''بِسْمِ اللّٰہِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ. جَزَاکَ اللّٰہُ. اِنَّا لِلّٰہِ. مَاشَآءَ اللّٰہُ. اِنْشَآءَ اللّٰہُ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ. اِلَّا اللّٰہُ. سُبْحَانَ اللّٰہِ'' وغیرہ۔ آپ کی زبان کے رات دن کے محاورے ہیں۔ اگر آپ استعمال کریں اور اغیار کی زبانوں سے شغف پیدا نہ کریں۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا کام جس سے کلام کا تعلق ہو، ایسا نہیں ہے۔ جس کے متعلقہ کلام میں اللہ کا نام داخل محاورہ نہ ہو۔

گویا اسلامی معاشرت میں رہ کر کلام کرنے والا بے ارادہ بھی ہر وقت اللہ کا نام لینے پر مجبور ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی دینی زبان سے جس کی بدولت وہ ارادہ اور بے ارادہ ہر وقت خدا کا نام لینے کی توفیق پاتے تھے، نہ صرف بے پرواہ ہی ہیں بلکہ اس کے مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں حالاں کہ اسلام نے عربیت اور عربی محاورے قائم رکھنے پر اسی لئے کافی زور دیا تھا کہ زبان کا اثر تہذیب، کلچر، تمدن اور عام احوالِ زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار کے آغاز کے وقت علماءِ وقت اور خصوصاً اکابر دار العلوم دیو بند نے مسلمانوں کی فہمائش کی تھی کہ وہ اپنی عربیت کو تھامے ہوئے غیر زبان کی ترویج وتقویت پر اس ذوق وشوق سے زور نہ دیں کہ وہی زبان ان کی بنیاد اور قبلۂ مقصود بن جائے، مگر مسلمانوں نے ان مبصرّوں کا کہنا نہ مانا اور بالآخر آج وہ اس کے نتائج بد سے دوچار ہوئے کہ ان کی تمدنی صورت وسیرت ہی مسلمانوں جیسی نہ رہی، چہ جائیکہ ان کا علمی دین اصلی رنگ میں محفوظ رہتا۔

مگر بہر حال رجوع کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں۔ اگر آپ پوری تندہی سے آج ذکر اللہ کے پابند نہیں ہو سکتے تو کم از کم عربیت کو زبان ہی کی حیثیت سے باقی رکھنے کی سعی کیجئے اور اس کے دینی محاورات ہی کو زبان زد کرتے رہئے تا کہ اسی بہانہ سے خدا کا نام زبانوں پر جاری رہے۔ نام حق کی یہ زبانی مشق اگرچہ بے ارادہ بھی ہو پھر بھی انشاء اللہ قلوب میں ایک حد تک ذکر اللہ کو قائم کرتی رہے گی۔

صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ..... مگر ان امور کی توفیق اس کے بغیر مشکل ہے کہ اسبابِ توفیق بھی اس

کے ساتھ جمع کیے جائیں اوران میں موثر ترین سبب سچوں کی صحبت و معیت ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ ① ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیّت اختیار کرو'' چنانچہ صحبت یافتہ جاہل بعض اوقات غیر صحبت یافتہ عالم سے بدر جہا زائد مقاصدِ دین کو سمجھتا ہے اور دینی رنگ سے رنگین اور متصبغ ہو جاتا ہے، اس لئے اہلِ علم اور اہل اللہ کے پاس آمد و رفت کو ایک مستقل مقصد کی حیثیت سے قائم رکھیئے۔ بردِ یقین اور ثلجِ صدر استدلال سے پیدا نہیں ہوسکتا۔

اکبر نے خوب کہا ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

آگے حصولِ یقین و دین کی تدبیر کے بارہ میں کہتا ہے کہ۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس لئے میں نیاز مندانہ التماس کروں گا کہ میرے عزیز بھائی اہل اللہ اور اہل دین سے بیگانہ نہ رہیں، بلکہ ان سے وابستگی پیدا کرنے کی صورتیں نکالیں تا کہ ان سے دولتِ دین و یقین حاصل ہو اور شکوک و شبہات یا تردّدات کا مادۂ فاسدہ ختم ہو جائے۔ ورنہ محض تقریروں اور وہ بھی ایسے کلّی مسائل کی تقریروں سے جو خالص علمی حقائق پر مشتمل ہوں، اصلاح نفوس کی راہیں استوار نہیں ہوتیں، یہ اس وقت کا مشغلہ ہے جب ذوق یقین سے قلوب معمور ہو چکے ہیں۔ دین کا رنگ قوت عمل اور صحبت صلحاء ہی سے قلوب پر چڑھ سکتا ہے۔ پس آپ حضرات کا فریضہ ہونا چاہئے کہ مادیت کے اس ہجوم میں روحانیت کو فراموشِ محض نہ کر ڈالیں۔

خلاصۂ بحث...... بہر حال اس تقریر سے اسلام کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی واضح ہوگئی کہ وہ انسان کو روحانی میدان میں دوڑا کر اسے دائمی رفعت و عزت اور طمانیت و بشاشت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے کہ دائمی رفعت و عزت روحانیت ہی میں ہے اور پھر ساتھ ہی سائنس کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی سامنے آ گئی کہ وہ انسان کو مادی میدانوں میں چھوڑ کر انجام کار اسے ذلت و خسران کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ محض مادیات کا انجام فنا و ذلت کے سوا کچھ نہیں اور آخر کار ایک سائنس زدہ نہ اپنے مادی منافع ہی کو باقی رکھ سکتا ہے اور نہ اسے روحانی منافع ہی نصیب ہوتے ہیں، نیز ''سائنس اور اسلام'' کی باہمی نسبت بھی واضح ہوگئی کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہ بنیں گے، ان کا انجام خوش کن نہ ہوگا اور اسی کے ساتھ بطورِ ثمرہ یہ مقصد بھی حل ہو گیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ، تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں، یعنی سائنس کے معمولات اسی حد تک اختیار کیے جائیں، جس

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ الآیۃ: ۱۱۹.

حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔

مباحثِ تقریر کا ربط حدیثِ زیبِ عنوان سے...... یہی وہ مقاصدِ سہ گانہ تھے، جن کی تشریح کا حدیث زیب عنوان کے دائرہ میں رہتے ہوئے میں نے ابتداءِ تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ الحمدللہ ان مقاصد کی ایک حد تک توضیح و تشریح ہو چکی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد کی اس طولانی بحث کو سمیٹ کر اور حدیثِ عنوان پر منطبق کر کے یہ واضح کروں کہ تقریر کی یہ تمام تفصیلات جو عرض کی گئی ہیں، اسی حدیث کے چند جامع اور بلیغ جملوں کی شرح ہیں اور صرف اسی کی تعبیرات سے مستنبط ہیں

سو بغور سنیئے کہ اس حدیث کی ابتداء میں اولاً تو ملائکہ کے سوال پر عناصرِ اربعہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جو عالم کا مادہ اور اس کے موالیدِ ثلاثہ (جمادات، نباتات، حیوانات) کی اصل ہے۔ جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے۔ پھر یہ تذکرۂ عناصر ایک ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان کی شدت وضعف کے باہمی مراتب پر بھی ایک سیر حاصل روشنی پڑ گئی ہے کہ ان میں سے مثلاً مٹی سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ اس سے قوی لوہا ہے، جو اجزاءِ ارضیہ میں سے ہے۔ اس سے اشد آگ ہے، اس سے اشد پانی ہے اور اس سے اشد ہوا ہے۔ یہ بیان "قَالَ نَعَمْ اَلرِّيْحُ" تک چلا گیا ہے۔

پھر ان مادی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رخ فرماتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزو انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے زیادہ اقویٰ و اشد انسان ہے جس کا ذکر "قَالَ نَعَمْ اِبْــنُ اٰدَمَ" کے جملہ سے فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے انسان کے افعال دکھلا کر واضح کر دیا ہے کہ انسان ہی وہ نوع ہے جس کے اشاروں پر تمام مادیات اور سارے ہی موالید ناچ رہے ہیں۔

پھر ان مادیات سے منتقل ہو کر روحانیت کی طرف حدیث مبارک کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ ابن آدم علی الاطلاق اشد اور اقویٰ نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ روحانی بنے اور مادی نہ رہے، یعنی مادیات کو ترک کرتا ہو جس کا بیان تصدق صدقة میں فرمایا گیا ہے۔ کیوں کہ صدقہ ہی ترکِ ماسواء یا ترکِ مادیات کا نام ہے۔

پھر روحانیت سے منتقل ہو کر روح کے بھی اعلیٰ مقامات تجرد خالص اور غوائل نفسانیہ سے برأت اور کثافت اخلاق سے پاکی، پھر لطافتِ اخلاق سے آراستگی کی طرف حدیث کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ انسان کا محض صدقہ دے دینا، مادیات سے انقطاع کر لینا بھی کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس میں خلوص اور قطع ریاء نہ ہو اور اسی کا نام اخفاءِ صدقہ ہے۔ جس کا بیان يُخْفِيْهَا میں فرمایا گیا ہے۔ یعنی محض صدقہ دہندہ سے وہ مخلص صدقہ دہندہ قوی اور شدید ہوتا ہے جس کے صدقہ میں ریاء و نمود کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صدقہ یا ترک مادیات محض حِسْبَةً لِــلّٰــهِ ہو اور یہ متصدق بجائے مادی ہونے کے روحانی بن کر صدقہ دے رہا ہو۔

پھر فرمایا گیا کہ مخلوق سے چھپا کر صدقہ کرنا بھی قوت وشدت کے لئے کافی نہیں جب تک کہ خود اپنے نفس سے بھی اس کو مخفی نہ رکھا جائے۔ یعنی اس میں خود بینی اور اعجاب و ناز بھی شامل نہ ہو اور خود اپنے نفس میں اس کو کوئی

چیز بھی نہ سمجھ رہا ہو۔ گویا صدقہ دہندہ نفسانی ہونے کے بجائے خالص ربانی بن کر صدقہ کرے، تو وہ تمام عناصر اربعہ، تمام موالید، تمام انسانوں، تمام صدقہ دہندہ انسانوں پھر تمام مخلص اور بے ریا صدقہ دہندوں سے بھی اشدو اقویٰ ہوگا۔ اسی مقام کی طرف "یُخْفِیْھَا مِنْ شِمَالِهٖ" میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اس درجہ مخفی صدقہ ہو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کسے دیا؟ ①

پھر ظاہر ہے کہ استغناء اور ترک کی یہ کامل شان کہ آدمی نے دنیا ہی کو نہیں خود اپنے نفس کو بھی چھوڑ دیا ہو۔ جب کہ دنیا اور اپنے نفس کے دکھاوے کے لئے نہیں، تو ظاہر ہے کہ بجز خدا کے اور کس کے دکھلانے کے لئے ہوسکتی ہے اور جب کہ خدا کے لئے ہونے، یعنی اس کامل للہیّت نے یا بالفاظ دیگر صدقہ کی نسبت خدا کی طرف ہو جانے نے اس ضعیف البنیان صدقہ دہندہ میں وہ غیر معمولی طاقت پیدا کردی کہ اس نے ساری مادیات اور اس کے عناصر و موالید کو مسخر کرلیا۔ تو اس سے صاف واضح ہوگیا کہ حقیقتاً قوی مطلق اور شدید مطلق صرف خدا ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اسی کی طرف دوڑنے یا اسی کی نسبت پیدا کرنے میں ساری قوتیں اور شدتیں پنہاں ہیں۔

ادھر حدیث ہی کی ترتیب بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قوت و طاعت بقدرِ لطافت ہوتی ہے۔ تو یہ بھی حدیث ہی کی دلالت سے نکل آیا کہ جو خدا قوت و طاقت اور شدت کا مخزن ہے وہی لامحدود لطافت کا بھی مخزن ہے۔ چنانچہ اس کی لامحدود لطافت کا یہ عالم ہے کہ اسے نگاہیں بھی نہیں پاسکتیں۔

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ ② اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے"۔ اس لئے حدیث سے گویا یہ اصول بھی مستنبط ہوگیا کہ قوی و متین صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر اس سے مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ مادیات سے ہٹ کر روحانیت کی طرف آنا ہے، جس کا طریق صدقہ ہے۔ چوں کہ مخلص متصدق جو بلا اعجابِ نفس اور بلا ریاءِ خلق صدقہ دے رہا ہے۔ اس سے کامل مناسبت پیدا کرلیتا ہے۔ اسی لئے وہی کامل لطافت کا حامل اور سب سے بڑھ کر طاقت ور ہو جاتا ہے۔

مباحثِ حدیث کے لطیف نتائج...... بہر حال حدیث کے اس مرتب بیان سے کہ ہر کثیف کو پہلے بیان کیا اور ہر لطیف کو اس کے بعد اور پھر ہر پچھلے کو پہلے سے اشد اور اقویٰ فرمایا۔ یہ ثابت ہوگیا کہ معیارِ شدت و قوت یہ وصفِ لطافت ہی ہے اور اس کی ترتیب طبعی یہی ہوسکتی تھی کہ مٹی سے لطیف لوہا، لوہے سے لطیف آگ، آگ سے لطیف پانی، پانی سے لطیف ہوا، ہوا سے لطیف انسان، عام انسانوں سے لطیف تارک الدنیا اور عام تارکین دنیا سے لطیف وہ تارک مخلص اور زاہد بے ریا، انسان ہے، جس کا قلب شواغل دنیا سے پاک، مادیات کی محبت سے بالاتر، مادی کثافتوں سے نفور، اور روحانی لطافتوں کا محور ہو، گویا وہ روحانی اور ربانی انسان ہی کامل لطافت کے حامل بن

---

① السنن للترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورة المعوذتین، ج: ۱۱، ص: ۲۱۵ رقم: ۳۲۷۱.

② پارہ: ۷، سورة الانعام، الآیة: ۱۰۳.

سکتے ہیں۔ جو بدنوں کے پالنے میں منہمک نہ ہوں بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں اور مادی تصرفات کے بجائے روحانی اعمال ان کا شعار بن گئے ہوں۔

لطافتِ روح مذہبی بننے میں مضمر ہے...... اور یہ سب جانتے ہیں کہ ربانی بننے کے طریقے اور روحانی شعائر برپا کرنے کے ڈھنگ سکھلانا مذہب کا موضوع ہے نہ کہ سائنس کا۔ اس لئے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ لطیف تر اور قوی تر انسان وہی ہو سکتا ہے جو مذہبی ہو اور جس کا اوڑھنا اور بچھونا مذہب ہی مذہب ہو چکا ہو۔ اس لئے حدیث سے جہاں قوت وشدت کا معیار مستفاد ہوا کہ وہ لطافت ہے، وہیں حصولِ لطافت کا طریقہ بھی مستفاد ہوا کہ وہ مذہب ہے جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافت پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح روح بادشاہ ٹھہر جاتی ہے۔ جو اس کا حقیقی منصب ہے۔ نفس اس مملکت کا خاکروب ٹھہرتا ہے، جو تقویٰ کے وسیلے سے سیئات کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا نہ پھرے۔ عقل اس کا وزیر ٹھہر جاتی ہے جو مفید مشورے دے۔ وحیءِ الٰہی اس کا حتمی قانون ٹھہر جاتی ہے جس سے راہ ملے اور اس طرح روح کی منظم حکمرانی سے روحانیت کا عدل چاردانگِ اقلیم بدن میں پھیل جاتا ہے۔ چور اور ڈاکو مقید ہوتے ہیں، جن سے بدامنی پھیلتی تھی، پھر ایسے مامون اور مضبوط ملک میں جس کا فرمانروا بیدار، وزیر دانشمند، قانون روشن اور عدل وانصاف کے سبب پوری اقلیم منظم ہو، نہ تو بیرونی دشمنوں کو حملہ کی ہمت ہوتی ہے کہ اس اقلیم میں گھس کر فتنہ وفساد مچائیں اور نہ اندرونی خائنوں اور چوروں کی جرات ہوتی ہے کہ بدنظمی پھیلائیں، بیرونی دشمن، یعنی شیطان کے بارہ میں تو قرآن نے فرمایا کہ:

﴿اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ﴾ ① ''یقیناً اس (شیطان) کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں''۔ اور اندرونی دشمن یعنی نفس امارہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا ہے اور اسی پر مطمئن اور راضی بن جاتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ ② ''اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش''۔

اسلام کی بنیادی حقیقت...... اب اس تمام مضمون کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ یہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم شدہ ہے، ''مادیت اور روحانیت، یا سائنس اور اسلام'' اسلام اور روحانیت کی بنیاد بحوائے حدیث دو اصول پر ہے۔ ایک ترک ماسوی اللہ جسے صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اخلاق جسے اخفاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے اصول کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا ہو یا اپنا نفس اور ہوائے نفس، سب کی وہ الفت قلب سے نکال پھینکنا جو الفتِ حق میں خلل انداز ہو، اور دوسرے اصول کا حاصل یہ ہے کہ اس ترک ماسوی میں خالص اسی ایک محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہو جو اس ارض وسماء کی محفل کا خالق ہے۔ اس بارے میں، نہ خود بینی ہو، نہ خودنمائی، نہ خودی ہو، نہ خودستائی۔

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآیة: ۹۹. ② پارہ: ۳۰، سورة الفجر الآیة: ۲۷. ۲۸.

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے؟......اس کے بالمقابل سائنس کی بنیاد جو اسلام کے متقابل ہے۔خود بخود ان دو اصولوں کی ضدوں پر نکل آتی ہے۔ترک ماسوی کی ضد حب ماسویٰ ہے اور اخلاص کی ضد نفاق ہے۔

جب ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ ہر غیر اللہ اور ہر باطل کی محبت ہو اور نہ ہو تو خدا اور حق کی محبت نہ ہو۔چونکہ غیر اللہ کی محبت کے سلسلہ میں اپنا نفس سب سے مقدم ہے۔اس لئے گویا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اپنے نفس سے ہو اور نفس کو چونکہ تمام مادی لذائذ سے محبت ہے۔اس لئے بواسطۂ نفس سارے مادی لذائذ سے محبت ہو جس کا نام دنیا ہے۔گویا حبّ ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ نفس جاہل بوجہ حقیقت ناشناسی کے انہی مادی لذائذ کو جن کی صورت آراستہ ہے اور انجام گندہ ہے،اپنا منتہائے مقصود ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جب کہ فی نفسہ یہ مادی لذائذ کسی برتری اور انجام کی خوبی نہ رکھنے کے سبب اہل بصیرت کی نگاہوں میں باوقعت نہیں بنتے اور وہ ایسے دنی مانوس کو قابلِ ملامت ہی سمجھتے رہتے ہیں۔اس لئے یہ نفوس اپنے خسیس مطلوبات پر اصول اور شائستگی کا پردہ ڈال کر انہیں معقول باور کرانے کی سعی کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے تمام نفسانی جذبات کو جن سے مذاقِ سلیم کتراتا ہے،کمالات کا لباس پہنا کر سامنے لاتے ہیں تا کہ اپنے ان خسیس مطلوبات کو عام نگاہوں میں کچھ باوقعت بنا سکیں۔مثلاً عام لہو ولعب اور بازاری رقص و سرور کو فنونِ لطیفہ کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔منظم عیاشیوں اور بدکاریوں کو قانونی رنگ میں لے کر تہذیب و تمدن کا عنوان دیتے ہیں۔استعمار اور جوع الارض کو خوشنما الفاظ میں پیش کر کے ترقی کا عنوان دیتے ہیں۔جنگی آلات کی بے پناہ خون ریزیوں اور تباہی انسانیت کو جنگِ حق وصداقت اور قیامِ امن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔وسائل عیش وطرب کی فراہمی کو سوسائٹی کی بلندی اور برتری سے تعبیر کرتے ہیں،پرستش اپنے نفس اور ہوائے نفس کی کرتے ہیں اور الفاظ کے چکر سے اسی کو حق کی پرستش دکھلاتے ہیں۔عقیدت واطاعت اپنے جذبات کی ہوتی ہے اور نام سچائی کی عقیدت کا لیتے ہیں۔

غرض یہ مادی نفوس اچھے عنوان سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوسنا کیوں کو چھپانے اور انہیں خوبصورت لباس میں دکھلا کر باوقعت بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ نفاق کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اندر کچھ ہو اور دکھلایا کچھ جائے،باطن گندہ ہو اور ظاہر کو آراستہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو دھوکہ اور فریب دیا جائے۔مادی تمدن کی انہی خوشنمائیوں اور گندم نما جوفروشیوں کو قرآنِ کریم نے زینت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے،جس کی حقیقت یہی ہے کہ اندر کچھ نہ ہو،مگر ٹیپ ٹاپ اور سطحی آرائش سے اس میں دلفریبی کافی پیدا کر دی جائے۔

ارشادِ حق ہے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

حُسۡنُ الۡمَاٰبِ﴾ ① ''خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کی محبت، مرغوب چیزوں کی، عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، مویشی ہوئے، ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی، یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے''۔

اس میں شہوت پرستیوں، مالی ہوسنا کیوں، اسباب مفاخرت و ریاست، غرض مالی تکاثر اور جاہی تفاخر کو زینتِ دنیا فرما کر بتلایا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں زن، زر، زمین وغیرہ میں محض سطحی، عاجل اور ناپائیدار لذت ہے۔ ورنہ ان کی اندرونی حالت تیرہ و سیاہ ہے اور ان سب کی وابستگی کا انجام کدورت اور تلخی ہے۔ اگر چہ اس پر کتنے ہی پردے خوشنما اور دلفریب عنوانات کے لباس پڑے ہوئے ہوں۔ جس کا حاصل وہی بے حقیقت دکھلاوا ہے، جسے اصطلاحی لباس میں نفاق کہتے ہیں۔

اب اگر آپ غور کریں تو سائنس کے ان دونوں اصولوں حب ماسویٰ اور نفاق کی حقیقت باطل نکلتی ہے۔ نفاق کا باطل ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ دیکھنے میں بہت کچھ ہو اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو۔ اوپر سے چمک رہا ہو اور اندر سے تاریک ہو پس جب کہ نفاق کی بھی یہ ہی کیفیت ہے کہ اندر کچھ ہو اور اوپر کچھ ہو تو نفاق کا باطل ہونا واضح ہے۔

ادھر ماسوی اللہ بھی باطل ہی کا ترجمہ ہے۔ کیوں کہ ہر ماسویٰ اللہ کی ہستی ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے وجود دینے سے قائم ہوتی ہے۔ نہ وہ از خود قائم ہے اور نہ از خود موجود ہے۔ اس لئے حقیقتاً ماسویٰ اللہ کی ذات میں کوئی وجود یا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ محض وجودِ حق اور کمالاتِ حق کا مظاہرہ ہوتا ہے اور جب کہ ماسوی اللہ کا خواہ وہ نفس انسانی ہو یا دوسرے موالید عناصر اربعہ ہوں یا دوسرے اجزائے کائنات، خود ہی کوئی وجود نہ نکلا، تو وہ بظاہر تو موجود ہیں مگر کوئی ہستی ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کل کا کل ماسوی اللہ بھی اپنی ذات سے باطل ہی نکلا:

اَلَا کُلُّ شَیۡءٍ مَاخَلَا اللّٰہُ بَاطِلٌ

اور جب کہ سائنس کی بنیاد انہی دو باطلوں پر تھی، ایک خدا سے قطع ہو کر ماسویٰ اللہ پر جو آفاقی باطل ہے۔ ایک نفاق پر جو نفسی باطل ہے تو پوری سائنس کی حقیقت بجز باطل ہونے اور باطل پسندی کے اور کچھ نہ ہوئی، جس پر سائنس دانوں کا یہ ناز اور وہ شور وشغب ہے کہ اس سے ساری زمین اور آسمانی فضا گونج رہی ہے۔

ہاں اس کے بالمقابل اگر ماسویٰ اللہ کو ترک کر کے اللہ کو اختیار کیا جائے تو وہ حق ہے اور نفاق کو ترک کر کے اخلاص کو اختیار کیا جائے تو وہ بھی حق پر ہے اور اللہ کے ساتھ اسی مخلصانہ تعلق قائم کرنے کا ہی نام اسلام ہے، تو اسلام کی بنیاد ایسے حق پر نکلتی ہے جس میں باطل کا نشان نہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس تو ایک شورِ بے بنیاد اور باطل کا نام ہے، اور اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ اور حق کا نام ہے، جس کی جڑیں مستحکم اور دائمی ہیں۔ باطل کا کلمہ

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ ۱۴.

بے بنیاد، حق کا کلمہ اپنی بنیادوں پر راسخ ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ o تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ ، بِاِذْنِ رَبِّھَا ، وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ o . وَمَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ ، اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَھَا مِنْ قَرَارٍ﴾ ① ’’کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے، جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں، وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتی ہوں اور اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تا کہ وہ خوب سمجھیں، اور گندے کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، اس کو کچھ ثبات نہ ہو‘‘۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ..... مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ میں نفس سائنس اور اس کی ایجادات کو روک رہا ہوں یا سائنس کی تعلیم پر حرمت کا فتویٰ دے رہا ہوں یا اس میں اشتغال کلیتہً باطل ہے بلکہ مقصد وہی ہے جو مختلف عنوانوں سے تقریر کے ذیل میں آ چکا ہے کہ میں اسے قبلۂ مقصود اور کعبۂ مطلوب بنانے سے منع کر رہا ہوں۔ اگر یہ ساری جدوجہد جو آج سائنس کے سلسلہ میں کی جا رہی ہے، کسی حقیقی مقصود کے لئے ہو، وہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ آج کے دور میں مطلوب ہے اور وہ مقصود نہ ساری دنیا ہے کہ وہ تو خود وسیلہ ہے، نہ مادی راحت و آرام ہے کہ وہ بھی وسیلہ ہے بلکہ ایک مسلمان کے لئے آخرت اور اس کی مذہبی دیانت ہی مقصود ہو سکتی ہے کہ وہی مقصودِ اصلی ہے اور اسی کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

پس سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمہ خبیثہ ہے جس کے لئے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور بطورِ ذریعۂ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلاشبہ نافع اور کار آمد ہو گی اور کلمۂ طیبہ ہی کے ذیل میں آ جائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں

لیکن میں جہاں تک محسوس کرتا ہوں، آج سائنسی جدوجہد ایک حقیقی مقصود کی سی نظر آ رہی ہے، لوگ اس پر اسی کی خاطر جھک پڑے ہیں اور نہ صرف یہی کہ اس کے رد و قبول کا معیار مذہب کو نہیں بنایا گیا بلکہ بیشتر مواقع میں اسے مذہب کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اور گویا سائنس ایک ایسا مقصود ہے کہ مذہب اس کا وسیلہ تک بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ اس کا مقصود قرار پائے۔

بہت ممکن ہے کہ دنیا کے قدیم مذاہب کے لئے سائنس نے کوئی ایسا ہی تخریبی اقدام کیا ہو۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کے جس مذہب کے ایک ایک جزو کے ساتھ سائنس ساتھ رہ کر چل سکتی ہے، وہ نہ صرف مذہبِ فطرت یعنی مذہب اسلام ہے۔ اگر اس کی تفصیلات دیکھنی ہوں تو میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۴-۲۶.

''تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام'' لکھا ہے۔ جسے ''ندوۃ المصنفین'' دہلی نے شائع کیا ہے۔ جس میں دلائلِ واضحہ سے دکھلایا گیا ہے کہ سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلام کی معنویتوں کا مادی رخ ہیں اور اس دور میں اسلام کے تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لئے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بناء کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا، مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

طلبائے یونیورسٹی کے لئے مقام عبرت...... بہر حال جب کہ سائنس محض یعنی بلا توسطِ مذہب کلمۂ خبیثہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور اسلام کلمۂ طیبہ ہے جس کی جڑیں مستحکم اور ہستی پائیدار ہے تو نیک نہاد اسلام فرزندوں کے لئے اس میں سے عبرت وموعظت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقاتِ عزیز کو سائنس محض کی معلومات میں اس طرح نہ گنوائیں کہ وہ مقصودِ اصلی قرار پائے اور اس کی فانی لذّات اصل ہو جائیں کہ یہ انجام کی ندامت کا سبب ہوگا۔ نیز وہ ان اقوام کی ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ نہ ہوں جنہوں نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے گھروندوں میں سے کچھ چمکیلی چیزیں بنا کر دنیا کے لہو ولعب میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس کی چمک دمک کی عمر بہت قلیل اور ہمیشہ قلیل ہی رہتی ہے۔

یہ سائنسی تمدّن اور شہریّت کی مکر چاندنی ایک متاعِ قلیل اور اس تمدن میں منہمک رہنے والی اقوام کی زندگی بہت محدود اور چندروزہ ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے کہ چمکیلی تہذیب اپنے ہی تمدن سے ٹکرائے اور اپنے ہی متمدنوں کو اس اندرونی تصادم اور ٹکر سے ختم کر ڈالے۔ ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ○ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۔ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ①. ''تم کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے، چندروزہ بہار ہے۔ پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور بری ہی آرام گاہ ہے''۔

دیکھنے میں عناصرِ اربعہ بھی نہایت نظر فریب ہیں۔ آگ نہایت چمکیلی باکروفر اور حرارت کے دوررس اثرات کی مالک ہے۔ پانی دیکھنے میں چاندی کی طرح شفاف اور نمنا کی کے پھیلنے والے اثرات کا حامل ہے۔ ہوا بظاہر لطافت کے سبب نہایت رقیق الجسم اور ہر جگہ بذاتِ خود منتشر اور موجود ہے۔ کرۂ زمین بحیثیت مجموعی نگاہوں میں نہایت باعظمت اور باشکوہ اور تاحد نظر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے جبلی اخلاق وآثار کی بدولت یہ چاروں ہی عناصر محتاج پسماندہ اور بے حد ذلیل ثابت ہوئے اور ان کی یہ ظاہری چمک دمک ان کی جوہری پستی کو نہ مٹا سکی جیسا کہ مفصل ثابت ہو چکا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ جس قوم یا سوسائٹی یا فرد پر ان مادی اخلاق کا غلبہ ہو اور وہ رات دن مادیات ہی کے جوڑ توڑ میں لگی رہے تو وہ قوم یا سوسائٹی گو بظاہر آگ کی سی چمک، پانی کا سا گورا رنگ، ہوا کی سی دوررسی اور پھیلاؤ اور زمین کی سی ٹھوس عظمت کی مالک نظر آ رہی ہو۔ مگر اپنے ان مادی اخلاق کے سبب جو اس میں مادی اشغال کی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۶، ۱۹۷.

بدولت رہ چکے ہوں، اپنے کو انجام کی ذلت وخواری سے کسی طرح نہیں بچا سکتی جو آخرت سے پہلے دنیا میں اس کے سامنے آ کر رہے گی۔ کیوں کہ جس مادہ کی قسمت میں بدءِ فطرت ہی سے کوئی عزت نہیں لکھی گئی، اس کی بنائی ہوئی قومی عمارتیں جتنی بھی زیادہ سر بفلک ہوں گی، اتنی ہی جلدی منہدم ہو جائیں گی۔

خاتمۂ کلام اور خلاصۂ نصیحت...... پس اے عزیزانِ ملت! آج کی نام نہاد متمدن اقوام کی ظاہری شوکت پر نہ جاؤ۔ ان کا ہلاکت آفرین انجام عنقریب ہی سامنے آنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدا نہ کرے ان کی نقالی ورتقلید سے تم بھی اس انجام کی لپیٹ میں آجاؤ۔ ان اقوام کی طاقت آپ کے ضعف میں مضمر ہے نہ کہ خود ان کے کسی جوہر میں۔ روحانیوں نے میدان چھوڑ دیا تو مادیوں نے اسے آ دبایا۔ ورنہ جب دورِ اسلاف میں روحانیوں کی کثرت اور روحانی قومیت قائم تھی تو دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے مادی عظمتوں کو کسی طرح نیچا دکھایا اور مادی رفعتوں کی کیا گت بنائی ہے۔ اگر آج بھی آپ اپنی حقیقت پہچان کر حقیقت پسند بن کر جائیں تو وہ سابقہ عظمت لوٹ سکتی ہے ورنہ یہ صورتوں کی نمائشیں زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوسکیں گی۔ بہرحال حدیث کی ایک حد تک شرح ہو چکی ہے اور سائنس اور اسلام کے موضوع کے عوارض یعنی دونوں کی حقیقت، دونوں کی غرض وغایت، دونوں میں مقصود ووسیلہ کی تعیین، دونوں کے طبعی اخلاق وخواص، دونوں کا انجام اور پھر دونوں کا مقتضا میں نے اپنی بساط کے موافق اس حدیث سے استنباط کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور جس عنوان کا بیان آپ حضرات نے مجھ پر عائد فرمایا تھا۔ الحمد للہ کہ میں اس سے ایک حد تک عہدہ برآ ہو چکا ہوں۔ اس لئے دعائے توفیق واستقامت پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

احقر: محمد طیّب غُفِرَلَهٗ وَلِوَالِدَيْهِ
مہتمم دار العلوم دیوبند

خطبۂ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّابَعْدُ!

صدرِ محترم! حضراتِ گرامی، علمائے کرام، مہمانانِ عظام ومعزّز حاضرین! ہم اس ایمانی اور تاریخی اجتماع کے موقع پر جو برّصغیر کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی بین الاقوامی تعلیم گاہ "جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیو بند" میں بین الاوطانی انداز سے منعقد ہو رہا ہے، جس میں تقریبا تمام اسلامی منطقوں کے فضلاء اور اربابِ دانش جمع ہیں، سب سے پہلے حق جل مجدہ کا شکرادا کرتے ہیں کہ اس نے اس چھوٹی سی بستی میں ایسی بڑی بڑی ہستیوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کی زیارت وملاقات، ربطِ باہمی اور اسلامی اخوت ومودت کو تازہ بتازہ کرنے کا موقعہ عطاء فرمایا۔ ہم اس موقع پر اس غیر معمولی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج یہ کبرائے ملت، ہم غرباءِ امت کے کندھوں سے کندھا ملائے بیٹھے ہوئے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دلوں سے دل ملا کر اسلامی اخوت، مساوات اور مودت باہمی کا عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں، جو محض فضل خداوندی اور انعام ربانی ہے۔

﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ ① اس پر جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے۔ ہم بصمیمِ قلب دعاء گو ہیں کہ اہلِ علم کی ہمت افزائی اور ملتِ اسلامیہ کی عزت افزائی کے لئے آپ حضرات اس سرزمینِ علم پر بار بار قدم رنجہ فرمائیں! آمین

شکر وسپاس...... اس کے بعد میرا سب زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں بحیثیت خادم جامعہ اپنی مجلس شوریٰ، اپنے ادارہ کے اساتذہ، شیوخ، طلبائے عزیز، فضلاءِ گرامی، مسلمانانِ ہند، جمیع کارکنان، ادارہ اور بالخصوص اجلاس صد سالہ کے مخلص کارکنوں کی طرف سے آنے والے مہمانانِ کرام کا شکریہ ادا کروں، جنہوں نے مشرق ومغرب کے دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیل کر محض اللہ کے لئے اس بین الملّی اجتماع میں شرکت فرمائی۔

بلاشبہ یہ اسلام ہی کی جامعیّت اور اجتماعیّت کا کرشمہ ہے کہ ہم جیسے غرباء ان کبرائے قوم اور عظمائے ممالک

① پارہ: ۱۰، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۶۳.

کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں اور ان کے پر از مودّت و اخوت چہروں کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بڑھا رہے ہیں، جس میں علماء و عرفاء بھی ہیں اور اصحاب حدیث و تفسیر بھی، ارباب فقہ و اصول بھی ہیں اور دانایان فلسفہ و کلام بھی، علوم شریعت کے شیوخ بھی ہیں اور علوم جدیدہ کے دانشور بھی، عمائد ملک و ملت بھی ہیں اور زعماءِ ممالک و اقوام بھی، جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی موء قر خدمات سے انسانیت کے لئے رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ان جلیل القدر ہستیوں کا شکریہ ادا کریں۔ جب کہ الفاظ تو جذبہء امتنان و منت پزیری سے اوپر چڑھنا چاہتے ہیں، لیکن ان ہستیوں کی بلند مکانی تک صد ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ پاتے ۔

دامانِ نگاہ تنگ گل حسنِ تو بسیار

ہم زبان و بیان بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والے اور ایمانی تقاضوں اور روحِ اسلامی سے مملو پُرخلوص جذباتِ تشکر کو دعائیہ تعبیر میں آپ حضرات کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں کہ! ''جَزَاكُمُ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا وَّأَبْقَاكُمْ فِيْ عِزٍّ عَلَى الدَّوَامِ'' (آمین!)

دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی...... حضراتِ محترم! ''یہ بستی ''دیوبند'' جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، تاریخوں سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، قدیم زمانے سے یہ بستی برادرانِ وطن کی ایک زبردست تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے (جو ''دیوی کنڈ'' کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر آج بھی سالانہ میلہ لگتا ہے) مرکزیّت کی حامل ہے، اس دیوی کنڈ ہی کے نام پر اس بستی کا قدیم نام ''ڈیبی بن'' تھا جو کثرت استعمال سے ''دیوبند'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس چھوٹی سی بستی میں جس میں مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے، سو سے اوپر مسجدیں ہیں، جن میں متعدد مساجد شاہی زمانوں کی یادگار ہیں، آدینی مسجد ''یعنی قدیم جامع مسجد'' پانچ سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پرانی ہے جس کے سنگین کتبے پر بہلول شاہ ثبت ہے۔ مسجد خانقاہ عہدِ اکبری کی یادگار ہے'' مسجد سرائے پیرزادگان عہدِ جہانگیری کے آثار میں سے ہے۔

یہ بستی شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد دہلی سے ۹۲ میل شمالی جانب صوبہء یوپی میں واقع ہے۔ شیر شاہی شاہراہ اعظم جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے، اس بستی سے ہو کر گزرتی ہے، اس بستی میں قدامت کے ساتھ مرکزیّت کی شان بھی پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن قدرت کو اس رسمی مرکزیّت سے شرعی مرکزیّت کا کام لینا تھا اور اس جگہ سے علم کا ایک ایسا ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے۔

روشن ضمیر اہلِ دل اس کی پیشین گوئیاں پہلے سے کرتے آرہے تھے'' جس کی تفصیل تاریخ دارالعلوم'' میں دی گئی ہے، ان پیشین گوئیوں کے مطابق یہ بستی عالموں، فاضلوں، قادر الکلام ادیبوں، آزادی کے جانبازوں اور

دینی میدان کے سرفروشوں کی بستی بننے والی تھی، یا باسبابِ ظاہرہ یہاں کی قدیم مساجد کی اذانوں اور تکبیروں، ذکرو تلاوت کی محفلوں اور نمازیوں کے جمگھٹوں کی برکات کا ظہور دینی رنگ میں ہونے والا تھا۔

قیامِ دارالعلوم کا پس منظر اور اسبابِ تاسیس...... وقت آیا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز کے بعد اس بستی کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں علمی وعرفانی زندگی کا ستارہ طلوع ہوا جبکہ ہندوستان کی باگ انگریز کے ہاتھ میں جا چکی تھی، اسلامی شوکت کے چراغ میں صرف دھواں اٹھتا ہوا رہ گیا تھا، جو چراغ کے بجھ جانے کا اعلان تھا۔ دہلی کا تختِ مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، اسلامی شعائر رفتہ رفتہ روبزوال تھے، دینی تعلیم گاہیں اور علمی خانوادے اجڑ چکے تھے، دینی شعور رخصت ہو رہا تھا، جہالت وضلالت کی گھٹائیں افقِ ہند پر چھا چکی تھی، سنن انبیاء کی جگہ جاہلانہ رسوم ورواجات، مشرکانہ بدعات وخرافات اور ہواپرستی زور پکڑتی جارہی تھی جس سے دہریت والحاد، فطرت پرستی، آزاد فکری، بے قیدی نفس اور فوضویت کی وباء پھوٹ پڑی تھی، چمنِ اسلام میں خوش آواز پرندوں کے زمزموں کی جگہ زاغ وزغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، مسلمان مضطرب وبے چین اور مایوسی کا شکار تھے، علماء کے لئے پھانسیوں کے پھندے تھے یا جلاوطنی کے مصائب، اس وقت چند نفوسِ قدسیہ نے اپنے منور قلوب میں یہ خلش اور کسک محسوس کی کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے ملی وجود کے تحفظ اور علومِ نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان میں دینی شعور اور ایمان دارانہ سیاسی فکر کو حیاتِ نو کس طرح بخشی جائے؟ تو یہ صلحائے امت کمرِ ہمت باندھ کر میدان میں آئے، جو رسمی قسم کے لیڈر نہ تھے بلکہ خدارسیدہ بزرگ اور اولیاءِ وقت تھے، جو غیبی اشارے کے تحت کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے، جن کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) تھے، جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھ کر اسے اس تجویز کی صورت دی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی تعلیم وتربیت اور علم وعمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمان کو سہارا دے کر دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو تعلیمی رنگ میں عالمگیر احیاءِ دین کی تحریک کا یہ پودا چھتہ کی مسجد میں (جو آپ حضرات کی نگاہ میں آ چکی ہے) ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں کے ذریعہ نصب کیا گیا، دونوں کا نام محمود تھا۔ ایک محمود معلّم تھا اور ایک محمود متعلّم۔ جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے معروفِ زمانہ ہوا۔ اس وقت نہ اس گمنام مدرسہ کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ مکان بنانے کا سرمایہ، نہ پروپیگنڈہ تھا نہ اشتہار واعلان کا تخیل، صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ تھا جس کی تلقین اور تاکید خود بانیٔ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدّس اللہ سرّہٗ کے ہشتگانہ اساسی اصول میں بار بار بشد ومد کی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور احیائے دین کی عالمگیر تحریک...... غور کرنے کی بات ہے کہ جس طرح ہندوستان سے اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا حادثہ محض مقامی یا محض ملکی قسم کا نہ تھا بلکہ عالمی رنگ کا تھا جس کے دوررس اثرات دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی پڑے، چناں چہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان کی غلامی کتنے ہی ملکوں اور

ریاستوں کی غلامی پر منتج ہوئی، اس طرح ایمانی اور علمی رنگ میں احیاء دین کی یہ تحریک جو ''محمود دین'' سے شروع ہوئی، ابتداء محض ایک ضعیف کونپل کی صورت میں نمودار ہوئی، مگر اہل نظر کی نظر میں اس کونپل بلکہ اس کے تخم ہی میں ایک تناور شجرہ طیبہ لپٹا ہوا محسوس ہو چکا تھا، جس کے شیریں ثمرات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی بہرہ مند ہونے والے تھے اور وہ دین کی نشاۃِ ثانیہ کا مصدر و منشاء بننے والا تھا۔

اس لئے جہاں غلامی کے رنگ میں اس ملک کی تخریب عالمی تھی وہیں تعلیمی رنگ میں یہ تعمیری تحریک بھی بانی اعظم کی فکر پر عالمی رنگ سے اٹھی، جو نہ صرف علم دین کے لحاظ سے ہی عالمگیر ہوتی چلی گئی بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ثابت ہوئی تا آنکہ اسی تحریک کے پروردوں نے جہاں سو برس بعد ہندوستان کو آزاد کرایا، وہیں اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر جو ممالک اور ریاستیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ بھی رفتہ رفتہ آزادی کا سانس لینے لگے، تخریب اگر عالمی انداز کی تھی تو اس کے ردِعمل کے طور پر یہ تعمیر بھی عالمی ہی انداز سے ابھری جس کا علمی و عملی فیضان چند ہی سال میں ایشیاء سے آگے بڑھ کر افریقہ تک پھیل گیا اور آج یورپ و امریکہ تک اس کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں، ان ساری آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیوبند تھا، جس کے فضلاء نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی و سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اتر کر تحریکات کے ذریعہ اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور ۱۸۵۷ء ہی سے پھونکنی شروع کر دی تھی جب کہ ملک کے دوسرے حلقے سراسیمہ اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوئے تھے، ان بزرگوں نے غاصب انگریز کا مقابلہ ابتداءً آہنی تلوار سے کیا، پھر امن اور علم کی ناقابلِ شکست طاقت سے نبرد آزما ہوئے اور علمی رنگ سے یہ جذبات دوررس ثابت ہوئے اور آزادی کی لہریں دور دور تک پھیلیں جس سے اس جامعہ کے موسسین، فضلاء اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد...... اس مرکزی جامعہ کی تعلیم کا اصل مقصد کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج، اس کی عملی تمرین اور عمومی اشاعت و تبلیغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعصب آمیز منافرتوں کا استیصال کر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت مکتب فکر اس درسگاہ نے ہر اسلامی طبقہ کی طرف موانست و محبت کا ہاتھ بڑھایا اور بحیثیت جامعہ اس نے اپنا تعلیمی نصاب ایسا جامع رکھا کہ کوئی بھی اسلامی طبقہ اس سے باہر نہ رہنے پائے، نصاب میں حفظِ قرآن سے لے کر تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اصول فقہ کلام بلاغت و بیان، حقائق و اسرار اور ان منقولات کے ساتھ علوم معقولہ، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، عروض و قافیہ، مناظرہ اور اختیاری فنون، مبادی سائنس، معلومات عامہ، علمِ طب، صنعت و حرفت اور خوشخطی وغیرہ نصابِ درس میں شامل کیں تا کہ کوئی بھی علمی، عملی، اخلاقی اور صنعتی طبقہ اس اجنبیت کو محسوس نہ کرے اور نہ صرف یہی بلکہ علم دین کے ہر بنیادی شعبے کو اس جامعہ میں ایک مستقل مدرسہ و کلیہ کی حیثیت و صورت دی گئی ہے جیسے مدرسۃ القرآن، مدرسۃ التجوید، مدرسۃ فارسی و ریاضی، کلیۃ الطب، کلیۃ الصنائع، کلیۃ اللغۃ العربیہ

اور کلیۃ الفقہ والافتاء وغیرہ، اس طرح اس درسگاہ نے ایک مذہبی یونیورسٹی اور جامعہ کی صورت اختیار کر لی اور الحمدللہ ہر ہر فن کے متخصص تاحال اس سے ۱۶ ہزار تیار ہو چکے ہیں اور جامعہ سال بسال مائل بہ ترقی ہے۔ ان ۱۶ ہزار فضلاء کی تعداد میں مدرّسین بھی ہیں اور مبلغین بھی، خطباء بھی ہیں اور مقررّین بھی، علماء بھی ہیں اور مفکرّین بھی، مصنفین بھی ہیں اور مؤرخین بھی، اطباءِ جسمانی بھی ہیں اور مصلحانِ روحانی بھی۔ فضلا دارالعلوم کی مذکورہ ۱۶ ہزار تعداد بلاواسطہ ہے اور بالوسائط ان فضلاء کو بھی شمار کیا جائے جو فضلائے دیوبند کے تیار کردہ ہیں تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس علمی گہوارہ کے لاکھوں مستفیدین نہ صرف برصغیر میں بلکہ ایشیاء، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں بیش بہا دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت بانیءِ دارالعلوم اور جملہ بزرگان دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے، چناں چہ حضرت الامام بانیٔ دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند کے علاوہ جگہ جگہ بنفس نفیس پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور اپنے متوسلین کو خطوط بھیج بھیج کر بڑی تعداد میں مدارس قائم کرائے۔

دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اس طرزِ فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے اور آج بحمداللہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتبِ فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علمائے دیوبند علمی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظِ دین اور اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی اور کوئی صورت نہیں، نبیءِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیتِ اخلاق ہی ظاہر فرمایا ہے۔

"اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① یعنی احکام کا تعلق تعلیم سے ہے۔ جو حدیثِ اول کا مفاد ہے اور احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا تعلق تربیت اور تزکیۂ اخلاق سے ہے جو دوسری حدیث کا مفاد ہے۔ اس لئے علماء دارالعلوم نے انہی دونوں چیزوں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ٹھہرایا اور کامیابی کے ساتھ یہ منازل طے کیں! "تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ" ②

دارالعلوم کی تصنیفی خدمات...... اس مکتبِ فکر کا دوسرا سلسلہ تصنیف و تالیف کا ہے، تو اس سلسلے میں بھی علماء دیوبند کے قلم حقیقت رقم نے پانچ ہزار سے زائد تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جمع کیا جو برصغیر کے ہر اسلامی مکتبِ فکر سے بدرجہا زائد اور وقیع ہے۔

---

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۷۴.

② مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهی عن القول بالقدر ج: ۵ ص: ۳۷۱.

تصنیف وتالیف کا سلسلہ آغازِ دارالعلوم ہی سے شروع ہو گیا تھا، خود حجۃ الاسلام حضرت بانیٔ اعظم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصانیف ۲۵ سے زائد ہیں جن میں علمِ کلام، عقائد اور فقہیات وغیرہ کو عقلی اور حسی دلائل سے مبرہن کیا ہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو نہر سے بحر بنا دیا، دارالعلوم کے مشہور مصنفین جنہوں نے علومِ دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، احسان، اجتماعیات، سیاسیات، تاریخ اور سیرت وغیرہ میں تصنیفی خزانہ جمع کیا ہے، ان میں سرفہرست نام مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا آتا ہے جن کی تصانیف کا عدد ایک ہزار تک پہنچا ہوا ہے جو موصوف نے ہر علم وفن میں نثر ونظم میں، عربی، فارسی اور اردو میں مدوّن فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب محدث گوجرانوالہ پاکستان، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند ومحدّث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدّث دارالعلوم دیوبند پھر ان کے تلامذہ میں ''حضرت شیخ الاسلام پاکستان علاّمہ شبیّر احمد صاحب عثمانی'' ''صاحب فتح الملہم''۔ حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی وصدر جمعیت علماء ہند، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر رسالہ ''القاسم'' و''الرشید'' دیوبند' حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ شیخ الادب والفقہ دارُالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدنی محدّث دارالعلوم دیوبند، پھر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ثم المدنی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مفتیٔ اعظم پاکستان، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر برہان دہلی، مولانا منظور احمد نعمانی صاحب مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیر ترین تلامذہ میں یہ احقر راقم السطور بھی شامل ہے جس کی تصنیفات سو (۱۰۰) سے اوپر ہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم اکوڑہ خٹک پاکستان، مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سربراہ مدرسہ رحمانیہ مونگیر، مولانا حامد الانصاری غازی صاحب وغیرہ اور ہزاروں وہ فضلاء ہیں جن کے قلم سے ہزار ہا تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح تصنیف کے سلسلے میں بھی یہ مکتبِ فکر برصغیر کے تمام مکاتبِ فکر سے آگے اور ممتاز ہے۔ جس نے دین کے ہر ہر گوشے کو اجاگر کیا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو علمی رنگ میں دنیا کے سامنے رکھا۔

ساتھ ہی دارالعلوم محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک عملی تربیّت گاہ بھی ہے جہاں علم کے ساتھ عمل صالح، اخلاق فاضلہ اور کثرتِ ذکر کی روح بھی طلبہ میں پھونکی اور پیوست کی جاتی ہے۔ اس ادارہ میں حسن سلوک واحسان کے تحت شخصی تربیت کے علاوہ اصولی اور علمی طور پر بھی فن کے مسائل کو کتاب وسنّت سے واشگاف کر کے اس مصنوعی تصوف پر کاری ضرب لگائی ہے جو فی زمانہ بنام تصوف چند بندھی جڑی رسوم وبدعات ومحدثات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں علم کے ساتھ عزتِ نفس، وقار، استغناء اور خودداری کے ساتھ خاکساری تواضع، زہد وتقویٰ اور صلاح ورشد کی روشنی بھی راسخ ہوتی ہے جو اس کے فروعی مدارس میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند برِ صغیر کے مدارس وجامعات میں ام الجامعات ہے، اس لئے اسے ازہر الہند بھی کہا جاتا ہے جس کے فیضان سے ہزار ہا مدارس ومعاہد چل رہے ہیں اور لاکھوں کے قلوب میں ایمانوں کی حفاظت ہو رہی ہے اور بیشمار افراد طریق سنت پر لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح اس دور کی عقلیت پسندی اور خوگرئ محسوسات چونکہ نقلیاتِ دین کے ماننے میں حارج ہوتی تھی۔ اس لئے انہی فضلائے دارالعلوم دیوبند نے قاسمی رنگ سے متکلمانہ انداز کی بھی سینکڑوں تصنیفیں سطح پر لا رکھیں جس سے نام نہاد عقلی شکوک وشبہات، تمدنی تاویلات اور معاشی تحریکات کا پردہ چاک ہو گیا۔ ان فضلائے گرامی کو اگر چہ دستار وسند تو آج دی جا رہی ہے لیکن یہ بہت پہلے سے اپنی خدمات وتعلیمات سے خود سند ومستند ثابت ہو چکے ہیں۔

جامعہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی امتیاز...... اس دارالعلوم میں خصوصیت سے تدریس حدیث پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے جو قرآن حکیم کی اوّلین تفسیر اور فقہ اسلامی کا اولین سرچشمہ ہے، اس لئے کہ فن حدیث کی تکمیل سے قرآنِ مبین اور فقہ فی الدین دونوں کے سمجھنے کی صحیح استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس کے نصاب کا اساسی حصہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام وبلاغت ومعانی، ادبِ عربی اور صرف ونحو ہے تفسیر فنون بطور مبادی واسباب یا بطور آثار ونتائج پڑھائے جاتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند...... اس دارالعلوم کا سلسلۂ سند اساتذہ دارالعلوم سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ تک، اور ان سے سندِ متصل کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ دارالعلوم کی جماعت خالصتاً اہلِ سُنّت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنّت اور فقہ ائمہ پر قائم ہے۔ اس کے ذوق پر تمام مسائل میں اولین درجہ نقل وروایت اور آثار سلف کو حاصل ہے۔ اس لئے فضلائے ادارہ کتاب وسنت کی مرادات اقوالِ سلف سے، ان کے متوارث تعامل وذوق کی معرفت کے ساتھ اساتذہ شیوخ کی تربیت وصحبت اور معیت وملازمت سے حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ مکتبِ فکر عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین کو بھی فہمِ کتاب وسنّت کا ایک اہم ترین رکن قرار دیتا ہے۔

جامعہ دارالعلوم کا انتظامی طریقۂ کار...... انتظامی حیثیت سے اس دارالعلوم کی تعلیمات وانتظامات کی نگران

اعلیٰ ایک مؤقر مجلس شوریٰ ہے جس میں ملک کے مقتدر علماء اور اربابِ فکر ونظر فضلاء شامل ہیں جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ادارۂ اہتمام کے تحت چوبیس انتظامی شعبے ہیں۔ ساٹھ اساتذہ اور دو سو سے اوپر شعبہ جاتی عملہ ہے جو تقسیمِ کار کے اصول پر کام کرتا ہے۔ ان تمام شعبوں کا حقیقی مقصد اساتذہ اور طلبہ کی ضروریات کی تکمیل اور نظام کی استواری ہے جس پر سالانہ ۳۰ لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے جس کی تکمیل کا شعبۂ محاسبی ذمہ دار ہے۔ اس کے ذریعہ ہر سال میزانیہ تیار ہو کر مجلس شوریٰ سے منظور کرایا جاتا ہے اور اسے باضابطہ آڈٹ بھی کرایا جاتا ہے۔

ملی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دارالعلوم کی تاریخی خدمات...... اس کے ساتھ دارالعلوم کی سرگرمیاں محض درس وتدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے قومی، ملکی اور سیاسی معاملات میں بھی اندرون حدودِ شرعیہ بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا اور لے رہا ہے، اس کے اکابر کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہا نے جہاد اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جو نقش اپنے پاکیزہ لہو سے کھینچا تھا، وہ ہر وقت علماء دیوبند کے سامنے ہے۔

۱۸۵۷ء میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم اور حضرت قطبِ وقت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سرپرستِ اعظم دارالعلوم نے شاملی کے میدان میں تلوار اٹھائی اور انگریزوں سے جنگ کی، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مجاہدین کے قائد تھے، پھر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند اسی قیادت کو لے کر اٹھے اور آزادیٔ ہند کے لئے وہی 1915ء کی ریشمی خط کی انقلابی تحریک کے قائد تھے، جس کا مرکز افغانستان اور کثیر التعداد سینٹر مختلف ملکوں میں قائم تھے، مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور احمد انصاری، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سرفروش مجاہد ان کے دستِ راست تھے، اس راہ میں ہزاروں، شہید ہوئے، ہزاروں غازی بنے، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پانچ سال تک فرنگی قید میں مالٹا رہے اور رہا ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر اسی جوشِ جہاد سے جمعیت علماء ہند کی سرپرستی فرمائی اور آپ کے بعد یہ جماعت فضلاءِ دارالعلوم ہی کے تحت مصروفِ خدمت رہی۔

۱۹۲۰ء کی تحریکِ خلافت اور پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں کتنے ہی علماء نے قائدانہ حصہ لیا، یہ اسی موروثی جذبہ اور عمل کا اثر تھا کہ جب ملک معظم عبدالعزیز آل سعود نے جزیرہ عرب میں اسلامی حکومت کا پرداز ڈالا تو علماءِ دیوبند نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی اور دیوبند سے متعدد علماء اس کی تائید کے لئے سفر کر کے حجاز پہنچے، اسی طرح ماضی قریب میں جب بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی تحریک اٹھی تو صیہونی اور برطانوی سامراج کے خلاف علمائے دیوبند ہی کا فتویٰ سب سے پہلے صادر ہوا اور ان مسائل میں دارالعلوم ہی نے تمام مسلمانوں کو اختلاف سے بالاتر ہو کر ایک محاذ پر جمع کیا اور اجتماعی احتجاج عمل میں آیا۔

اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم اور انہیں پسماندہ ومتفرق کرنے کے لئے جب بھی نزاعی مسائل

کھڑے کئے گئے تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے بھی فضلائے دیوبند آگے بڑھے۔ چناں چہ مسلمانوں میں تنظیمی اور طبقاتی اتحاد پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت قائم کی گئی، جس کی سربراہی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فاضل دیوبند رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم کررہے ہیں، اس لئے اگر دارالعلوم کی یہ خواہش ہو کہ عالم اسلام کے رہنما، تعلیمی، علمی، تمدّنی اور اجتماعی میدان میں علمائے دیوبند اور مسلمانانِ ہند سے تعاون کریں، تو اس کی ہمہ جہت روشن تاریخ کی روشنی میں یہ خواہش یقیناً بجا اور برمحل ہوگی۔ حاصل یہ کہ جب بھی کوئی سیاسی فتنہ اٹھا جس سے مسلمانوں کے اجتماعی یا مذہبی معاملات مجروح ہونے کا اندیشہ ہوا، تو علماء دیوبند نے بیرونِ ملک بھی اس کے سدِ باب میں وہی پامردی دکھلائی جو اندرونِ ملک ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہی۔

جامعہ دارالعلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ...... انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں، جن کے ذریعہ یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہِ راست سے ڈگمگانے کی کوششیں کی گئیں، مگر دارالعلوم اور اس کے فضلاء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بحمد اللہ ان کی کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکمت کی دسیسہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے۔ بعض باطل پسندانہ تحریکات حضرت بانی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئیں اور ان کی جانب سے اسلامی احکام و مسائل پر جاہلانہ اور غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کی گئی لیکن حضرت بانی دارالعلوم اور پھر ان کے تلامذہ نے مناظروں اور تصانیف کے ذریعہ ان کے خلاف ایک مضبوط بند باندھ کر انہیں ختم کردیا۔

انکارِ حدیث کا فتنہ ابھرا تو انہیں فضلائے دیوبند نے جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور راقم الحروف (رحمۃ اللہ علیہ) نے نہایت مدلّل کتابیں تالیف کرکے اس کا سدِ باب کیا، اسی طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دارالعلوم دیوبند نے پچاس سے زیادہ فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتار کر ان کی مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا۔ فقہیاتِ اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اٹھا تو دارالعلوم ہی نے قضاءِ شرعی قائم کرنے کی تحریک اٹھائی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خامس دارالعلوم نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمۂ قضاءِ شرعی کا مطالبہ پیش کردیا جس سے یہ باطل تحریک مضمحل ہوگئی۔ ابھی ماضی قریب میں دوبارہ اس تحریک نے ترمیم فقہ کا روپ اختیار کیا اور عائلی قوانین اور فقہ میں ترمیم کرنے کی آوازیں بلند ہوئی تو دارالعلوم ہی کی تحریک پر بمبئی میں تمام مسلم فرقوں کا کنونشن بلایا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا جس کی صدارت بالاتفاق مہتمم حال دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی اور بورڈ کی متحدہ احتجاجی آواز پر حکومت نے اعلان کیا کہ وہ خود مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔

غرض برِ صغیر میں جامعہ دیوبند کے ان علماءِ ربانیین رحمۃ اللہ علیہ اور فضلاءِ صالحین رحمۃ اللہ علیہ نے درس و

تدریس کے مشاغل کے ساتھ مذہبی اور دینی فضاء کو کبھی مکدّ ر اور زہر آلود نہیں ہونے دیا، بلکہ قلوب اور دماغوں کو جلا بخشنے کے لئے مدلّل تحریر و کتاب اور تقریر و خطاب کے ذریعہ ایک زبردست پشتہ بنا کر ان سیلابوں پر بند باندھ دیا۔ اس طرح برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں اس نے دین توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم و برقرار رکھا ہے۔ اور آج یہ جامعہ اس بین الاوطانی اجتماع میں انہی خدمات پر ایک بڑی حسی دلیل کے طور پر اپنے ہزاروں فضلاء کو پیش کرنے میں شکر آمیز فخر محسوس کر رہا ہے کہ جن کی خدمات سے اطراف عالم میں دین پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

عصری بین الاقوامیّت کے تقاضے...... یہ علمی اور عملی ثمرات اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا پھیلی ہوئی تھی اور ہر ملک کا دائرہ عمل اپنی ہی حدود تک محدود رہتا تھا، لیکن آج وسائل نقل و حمل اور ذرائع علم و خبر کے وسیع تر ہو جانے کے سبب یہ پوری دنیا سمٹ کر ایک عائلہ اور قبیلہ بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک محض اپنی داخلی سیاست سے اپنا کام نہیں چلا سکتا جب تک کہ اس کے روابط دوسرے تمام ممالک سے مستحکم نہ ہوں، اسی لحاظ سے آج دنیا کے سارے ممالکِ ملک واحد بن چکے ہیں اور پوری دنیا ایک نقطہ پر آ گئی ہے، اس لئے سیاسی امور ہوں یا انتظامی، سب بین الاقوامی رنگ ہی سے نمایاں ہو رہے ہیں، اس لئے ہمیں بھی مقامیّت سے آگے بڑھ کر بین لاقوامیّت کے دائرہ میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، گو دارالعلوم کا مزاج ابتداء ہی سے بین الاقوامی ہے، اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات و اجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا، مؤتمر عالم اسلامی مصر، رابطہء عالم اسلامی مکہ مکرمہ، مؤتمر السیر ت والسنہ ''دوحہ وقطر'' مؤتمر ریاض میں اس کے نمائندگان نے شرکت کی اور اب عرب اور امارات متحدہ بھیجا، نیز رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش پر یہاں سے تربیت الاطفال کے سلسلے میں متعدد اہلِ قلم نے مقالات ارسال کئے۔ اور آج بھی دارالعلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم پر آشکارا کیا جائے، نیز اسلام پر وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔

بلاشبہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ بین الاوطانی اشتراک کے ساتھ اسلامی منطقوں کے رجالِ علم و فضل کو تکلیف دی جائے اور دارالعلوم کی خدمات پیش کر کے ان کی آراءِ گرامی سے استفادہ کیا جائے، ان خدمات کے پیش کرنے کا منشاء ہرگز ہرگز اس جامعہ کا کوئی تفوق جتانا یا جماعتی خودستائی کرنا نہیں حاشا وکلا، بلکہ یہ ہے کہ ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے آپ حضرات کے مشورہ و تعاون سے ان تبلیغی تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعلیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کارفرما ہو، جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آ سکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی عملی اثر ڈال سکیں، اور وہ ایمانی اخوت، باہمی تعاون، علمی اشتراک اور فکری یکسانئی ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم و خدمات کو بروئے کار لا سکیں اور ان میں دینی دعوت کا وہ جذبہ ابھر آئے جو قرنِ اوّل کا نصبُ العین تھا کہ اس کے بغیر ان کی وہ پست ہمتی دور نہیں

ہوسکتی، جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے۔

اگر اسلام کا مقصد واقعی اقوام دنیا کی اصلاح اور انہیں خدا پرستی پر لانا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ مقصد نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد، آج اجتماعی آواز، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ حقیقت آج کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ آج کوئی آواز بھی اس وقت تک وقیع نہیں بنتی جب تک کہ اس میں ہمہ گیری اور عالمیّت نہ ہو، اس لئے کہ آج کی سیاست ہے تو بین الاقوامی، تمدن و معاشرت ہے تو بین الاقوامی، تجارت وصنعت ہے تو بین الاقوامی، صلح و جنگ ہے تو بین الاقوامی، حتیٰ کہ کھیل کود بھی ہیں تو بین الاقوامی۔ اس لئے قدرتی طور پر طبائع میں یہ جذبہ آنا ہی چاہئے کہ دین کی دعوت اور اصلاحی آواز ہو تو وہ بھی بین الاقوامی ہی ہو، بالخصوص جبکہ اسلام خود ہی اپنی ذات سے بین الاقوامی بن کر دنیا میں آیا ہے جو ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے بلکہ اس نے دنیا میں بین الاقوامیت کا پردار زڈالا ہے۔ اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں۔ ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ﴾ [1] کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آچکا ہے اور وہ یہی وقت ہے کہ جس میں فطرتِ اسلام پکار رہی ہے کہ یہ بین الاقوامی دین اور اس کے انسانی فلاح کے ضامن بین الاقوامی مقاصد اور اس کی ہمہ گیر ثقافت بھی عالمی رنگ سے دنیا کے سامنے آئے۔

توحید وسنّت کی حامل جماعت تیار کرنے کے بعد حالاتِ وقت کے پیش نظر جامعہ دارالعلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امتِ مسلمہ کے عالمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے اسے اجتماعی بنائیں تاکہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔

عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت...... ہمارے نزدیک قابل غور ضروری مسائل میں سب زیادہ اہم مسئلہ عالمی دعوتِ اسلام اور بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کن کن راستوں سے بگاڑ آرہا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے، عموماً بے پڑھے لوگوں کا بگاڑ رسوم و رواجات اور کورانہ تقلید سے نشونما پارہا ہے، جس کا انسداد تبلیغی ذریعہ سے ممکن ہے۔ اور برسرِ اقتدار طبقوں کا بگاڑ جاہ پسندی اور ہواءِ نفسانی سے ابھرا ہوا ہے جس کا حل ان سے ہمدردانہ رابطہ قائم کرکے انہیں راہ پر لگانا ہے، اس لئے ان سب کے لئے نفسیات شناس ایسے مخلص فکری مصلحوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک کے برسراقتدار طبقہ کو اس کے اقتدار کی برقراری کا یقین دلاکر ان کی شخصی اصلاح کے ساتھ ان عمومی مقاصد دعوت کے لئے انہیں آمادہ بھی کرسکیں اور ان سے کام بھی لے سکیں۔

بہر حال تقسیمِ عمل کے اصول پر ہر طبقہ میں اسی کے مناسب حال اصلاحی افراد کی تشخیص عمل میں لانے کا مسئلہ آپ کے غور فکر کا محتاج ہے، ساتھ ہی ان مسائل سے متعلق مالیاتی مصارف اور ایک بین الملی مشترک فنڈ کا وجود

---

[1] پارہ: ۲۸، سورۃ الصف، الآیۃ: ۹.

بھی بھی اپنی طبعی اہمیت کے ساتھ محتاجِ اعتناء ہے، اس عظیم دینی وملی مقصد و خدمت کے لئے یہ مرکزی جامعہ اپنی تمام تر عملی اور علمی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہے، ہم اس کے آرزومند ہیں کہ اربابِ علم وفضل ہمیں اس باب میں بھی اپنے موقر مشوروں سے نوازیں کہ اس مرکزی جامعہ کا عالمِ اسلام کے تعلیمی جامعات ومعاہد سے ممکن حد تک تعلیمی یکسانی کے ساتھ اس طرح قریبی رابطہ قائم ہو کہ جس سے طلبہ کے بین الجامعاتی تبادلے اور سندات کے معادلے کے مسائل سہل ہو جائیں اور عالمگیر سطح پر دینی خدمات کی راہیں ہموار ہو جائیں، غور کیا جائے تو فی زمانہ اداری قوّت ایک بڑی قوّت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے تعلیمی، تہذیبی اور تبلیغی معیار سے جوڑ سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ادارے جہاں ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر رہنے کے ذرائع مہیّا کریں، وہیں معاندینِ اسلام کی لڑیری راہوں سے آنے والی دسیسہ کاریوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے اور بروقت اس کا سدِ باب کرنے کے لئے اپنے ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔

اس ناچیز نے دار العلوم کی ماضی کی خدمات کے اجمالی تذکرہ اور مستقبل کے منصوبوں کی پیش کش کے ساتھ چند مشورہ طلب نقاط بھی پیش کر دینے ضروری سمجھے، تا کہ اس بامقصد اجلاس کے اثرات آئندہ نسلوں کے لئے دیرپا اور خوش آئند ثابت ہوں۔ اس کے بعد میں اس سمع خراشی پر معذرت خواہی کے ساتھ صدرِ معظم اور مہمانانِ کرام اور معزز حاضرین کا تہہ دل سے مکرر شکریہ تشریف آوری پر ان افتتاحی اور خیر مقدمی کلمات کو ختم کرتا ہوں۔

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ كَثِيْرًا اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

دعا جو و دعا گو

محمد طیّب

رئیس جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیو بند

۲۵ ؍ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ ۱۳ فروری ۱۹۸۰ء

اساس توحید

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ . ①

مدارِ حیاتِ انسانی...... بزرگانِ محترم! کائنات میں زمین سے لے کر جس قدر بھی مخلوقات ہیں اور جس قدر اللہ نے اشیاء پیدا فرمائی ہیں وہ سب انسان کے لئے بنائی ہیں اور انسان کے کارآمد ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انسان کا نفع یا نقصان متعلق نہ ہو۔ انسانی زندگی کا دارو مدار انہی کائناتی اشیاء کے اوپر ہے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کس چیز کے اوپر رہے، گزر بسر کرے؟ اگر آسمان اور اس میں ستارے، چاند اور سورج نہ ہو تو روشنی کیسے ہو؟ سورج کی گرمی نہ ہو تو کھیتیاں کیسے پکیں، چاند کی ٹھنڈک نہ ہو تو پھلوں میں رس کیسے پیدا ہو؟ اور ہڈیوں میں گودا کیسے پیدا ہو؟ ستارے نہ ہوں تو راستوں کا تعین کیسے ہو؟ جہاز رانی کس طرح سے ہو؟ سمتیں کیسے معلوم ہوں؟ غرض زمین سے لے کر آسمان تک کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کے کارآمد نہ ہو۔

حیوانات ہیں تو وہ انسان کے کام آتے ہیں، کوئی انسان کو سواری دیتا ہے، کوئی انسان کے کھانے کے کام میں آتا ہے، کسی جانور کی ہڈیاں انسان کو کام دیتی ہیں، کسی جانور کا چمڑہ کام آتا ہے، چمڑوں کے اوپر کا اون اور پشمینہ انسان کے کام میں آتا ہے، غرض کوئی جانور ایسا نہیں جس سے انسان کا نفع متعلق نہ ہو۔

درختوں اور جڑی بوٹیوں میں کوئی درخت اور جڑی بوٹی ایسی نہیں ہے جو انسان کے نفع کے لئے نہ ہو۔ سب سے زیادہ وہ چیز جس کو انسان نفرت سے پھینک دیتا ہے وہ فضلات، گندگی اور نجاست ہے، وہ بھی انسان کے کارآمد ہے، اگر کھاد نہ ہو انسان کی کھیتی نہ اگے، تو وہ بھی کام دیتی ہے اور اس کی بھی دنیا میں قدر و قیمت ہے۔ چناں چہ

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶، ۶۷.

کھاد بھی ہزاروں روپے کے حساب سے بکتی ہے اور انسان کے کام آتی ہے۔ تو پاک چیز ہو یا ناپاک چیز ہو، انسان کے لئے کارآمد ہے اور انسان کی زندگی ان چیزوں کے اوپر اٹکی ہوئی ہے۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہوگی انسان کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ سورج نہ ہو تب زندگی ختم، چاند نہ ہو تب ختم، ہوا نہ تب ختم، زمین نہ ہو تب ختم، اس کی غذائیں نہ ہوں تب ختم، دوائیں نہ ہوں تب ختم، تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کی زندگی اس پر اٹکی ہوئی نہ ہو۔

کائنات کی انسان سے بے تعلقی ...... لیکن ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی ہو، اگر سارے انسان ختم ہو جائیں تو سورج کا کچھ نہیں بگڑتا، چاند کا کچھ نہیں بگڑے گا، ایک بھی انسان باقی نہ رہے تو زمین کا کچھ بھی نقصان نہیں، آسمان کا کوئی نقصان نہیں، پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ درخت اور جڑی بوٹیاں اپنی جگہ قائم رہیں گی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کے کام کی نہ ہو اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا انسان بیکار پیدا کیا گیا ہے۔ جب یہ نہ زمین کے کام کا، نہ چاند کے کام کا، نہ آسمان کے کام کا، آخر یہ انسان کس کام کے لئے بنایا گیا ہے، ان میں سے تو کسی کے کام کا نہیں ہے۔ کسی کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ انسان کو بیکار پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اللہ کی حکمت پر حرف آتا ہے حالاں کہ وہ اس سے بری ہے کہ اس کی حکمت پر کوئی عیب یا حرف آئے۔ جب کھاد جیسی گندی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی تو کیا انسان جیسی اشرف المخلوقات کو اللہ نے بیکار پیدا کیا ہے؟ یہ کس مرض کی دوا ہے، غرض جب کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں تو انسان بھی بیکار تو نہیں ہو سکتا جبکہ یہ سب سے اونچا اور افضل ہے۔

تخلیقِ کائنات و انسان میں باہمی ارتباط ...... اگر ان میں سے کسی چیز کے کام کا نہیں، پھر کس کے کام کا ہے۔ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مخلوق میں سے کسی کے کام نہیں تو پھر خالق کے کام کا ہوگا۔ اور کسی کے کام کا نہیں ہو سکتا۔ اب آگے یہ سوال رہ جاتا ہے کہ خالق کا کون سا کام انسان کے اوپر اٹکا ہوا ہے؟ اس کی مخلوق کا تو کوئی کام اٹکا ہوا نہیں، تو خالق جو غنی ہے اور ہر برائی اور محتاجگی سے بری ہے، اس کا کون سا کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے جس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے اور طلب کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خزانے میں ہر چیز ہے، اس کے خزانے بھرپور ہیں مگر ایک چیز اس کے خزانے میں نہیں ہے، اس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے۔ اللہ کے خزانے میں علم ہے، کمال ہے، عروج ہے، رفعت اور بلندی ہے، غناء اور استغناء ہے، مگر اللہ کے یہاں محتاجگی نہیں ہے۔ ذلت نہیں ہے، جھکنا نہیں ہے، پس ماندگی نہیں ہے، انسان کو اس لئے بنایا گیا کہ یہ اس کے سامنے جھکے، اپنی ذلت اس کے سامنے پیش کرے اور اپنی محتاجگی نمایاں کرے تاکہ اس کی عزت وعظمت دنیا کے اوپر واضح ہو اور اس کی رفعت و سربلندی دنیا کے اوپر نمایاں ہو جائے، تو انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جھکے یعنی عبادت کرے، عبادت کے معنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں۔ انسان کو اللہ نے اس لئے بنایا کہ یہ اللہ کے آگے اپنی انتہائی ذلت پیش کرے تاکہ اللہ کی انتہائی عزت سب کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ یہ

یوں عرض کرے کہ ''اے اللہ! جیسے تیری عزّت کی کوئی حدّ ونہایت نہیں ہے، تیرے سامنے میں وہ ذلّت پیش کرتا ہوں کہ اس ذلت کی بھی کوئی حدّ ونہایت نہیں ہے انتہائی طور پر تیرے آگے پست ہوتا ہوں''۔

انسان میں سب سے زیادہ عزت کی چیز اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ اگر کوئی ذلیل بن جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ ''فلاں کی ناک کٹ گئی'' یعنی وہ ذلیل ہوگیا، فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا، یعنی اسے ذلّت پہنچ گئی، تو ناک اور پیشانی سے زیادہ بلند اور باعزت چیز انسان میں اور کوئی نہیں، انہی کو اللہ کے سامنے زمین پر رگڑا جاتا ہے تاکہ انسان کی انتہائی ذلّت ظاہر ہو جائے۔

غرض اللہ عزّتِ مطلقہ رکھتا ہے اس کے سامنے جو مخلوق ذلتِ مطلقہ پیش کرے وہ انسان ہے، اس کے بنانے کی غرض وغایت یہ ہے کہ یہ اللہ کے آگے جھکے اور ساری کائنات اس کے آگے جھکے، ہر چیز اس کے آگے چاکر اور نوکر بن کر پیش ہو، اور یہ اللہ کا نوکر بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو۔

''اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اَنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ.'' ① ''ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی اور تم آخرت کے لئے بنائے گئے'' تم دنیا کے لئے نہیں بنائے گئے، دنیا تو تمہارے لئے بنائی گئی ہے، تم درخت اور پتھروں کے لئے نہیں ہو، درخت اور پتھر تمہاری چاکری کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تم چاند اور سورج کے لئے نہیں، چاند اور سورج تمہاری خدمت کے لئے بنائے گئے ﴿خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ ② ''جو کچھ زمین میں ہے وہ سب انسان کے لئے ہے اور انسان پروردگار کے لئے ہے''۔

کائنات میں انسان کا مرتبہ...... اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا کہ ایک شخص عظیم الشان بلڈنگ تیار کرے، کیوں؟ اس لئے کہ اس نے ایک عورت سے نکاح کرنا چاہا جس سے اس کو محبت پیدا ہوئی۔ نکاح کر کے اس نے عورت کی ضرورت سے ایک بلڈنگ بنائی۔ تاکہ وہ راحت سے اس میں رہے اور گزر بسر کرے۔

بلڈنگ کے اندر اس نے ملازم رکھے، فرّاش رکھے، جھاڑو اور صفائی کرنے والے رکھے تاکہ مکان صاف ستھرا رہے، اس کی بیوی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس نے باورچی رکھے تاکہ بیوی بھوکی نہ مرے، اس کے لئے کھانا پکائیں، اس نے مشعلچی رکھے تاکہ رات کو مکان میں روشنی کریں، تاکہ اندھیرے میں رات کو اسے تکلیف نہ پہنچے۔ غرض جتنی بھی خدمت کی اشیاء ہیں وہ سب مہیا کیں، اور ہر خدمت کے خادم مہیّا کئے۔ یہ سب بیوی کے لئے، اور بیوی کاہے کے لئے ہے؟

بیوی ان خادموں کے لئے نہیں ہے۔ فرّاش اور باورچی کے لئے نہیں ہے، مالک نے بیوی اپنے لئے

---

① شعب الایمان للامام البیهقی، النوع التاسع والثلاثون من الایمان، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵. علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں: اخرجه البیهقی فی الشعب من حدیث الحسن عن رجل من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم وفیه انقطاع دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۲. ② پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۲۹.

رکھی ہے تاکہ ساری ضرورتیں اور خدمتیں بیوی کی ہوں اور بیوی میرے کام آئے۔اگر بیوی خاوند کی خدمت سے انکار کردے یا سرکشی دکھلانے لگے یا خاوند کو آنکھ دکھانے لگے۔تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیوی کو طلاق دے گا بلکہ گولی مار دے گا،اس مکان کو بھی ترک کرے گا،اسے بڑھا دے گا،خادم بھی ختم کردے گا،اس کی ضرورت سے یہ رکھے تھے،جب یہ میری وفادار نہ ہوئی تو مجھے نہ بلڈنگ کی ضرورت ہے نہ خادموں کی ضرورت ہے،نہ فرّاش کی ضرورت ہے،اس پر تین طلاق،یہ اس قابل نہیں ہے کہ یہاں رہے بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے۔

خالقِ کائنات کا انسان سے خصوصی معاملہ...... یہی صورت بعینہٖ انسان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی محبوب ترین مخلوق بنایا،اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا کہ کائنات کی کسی چیز کے ساتھ اس محبت کا برتاؤ نہیں کیا، عزت اسے دی،کھانے پینے کی اشیاء اسے دیں،دریا اور پہاڑ اس کے لئے بنائے،آسمان وزمین کی بلڈنگ تیار کی،اس میں سورج اور چاند کے انڈے لٹکائے تاکہ روشنی ہو،اس میں بادل بنائے تاکہ پانی برسے،ہوائیں چلائیں تاکہ مکان صاف ستھرا رہے۔یہ سب کچھ انسان کے لئے اور انسان مالک کے لئے،اگر مالک کے کام نہیں آئے گا تو یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہوگا۔اور اگر سارے انسان مل کر سرکش بن جائیں تو اس خیمے ہی کو بڑھا دیا جائے گا کہ نہ آسمان کی ضرورت ہے نہ زمین کی،جب یہ ہی قابل گردن زدنی بن گیا تو اب اس کے خدّام کی ضرورت باقی نہیں رہی،تو یہ انسان کا نقشہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے بنایا گیا ہے،کائنات انسان کے لئے بنائی گئی۔''اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اَنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ. ''

اب اگر وہی جس کے لئے بلڈنگ بنائی تھی اور خادم رکھے تھے۔ایک تو یہ تھا کہ خاوند کی خدمت نہ کرے چھوڑے،تب بھی قابلِ گردن زدنی تھی۔اور اگر اس سے بڑھ کر بیوی یہ حرکت کرے کہ کہیں اس نے کسی خادم سے آنکھ ملانی شروع کردی،کہیں اس نے فرّاش سے آشنائی شروع کردی،کہیں باورچیوں سے اس نے دل لگی کی باتیں شروع کردیں تو اب زندہ رکھنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔خاوند اس کو گولی مار دے گا،کہ یہ تو بدکار اور فاحشہ ہے،یہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔جہاں تک میری خدمت ترک کردی تھی،بری تو بنتی تھی مگر خیر۔چھوڑ دینے کے قابل تھی،اسے چھوڑا جاسکتا تھا۔جب مجھے چھوڑ کر اس نے دوسروں سے آشنائی شروع کی۔اور وہ بھی اپنے باندی غلاموں سے،اب تو یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔یہی حال انسان کا ہے۔کہ اللہ نے یہ بلڈنگ بنائی،اس میں خادم رکھے۔کس طرح سے خادم رکھے؟

کائناتی خدّام...... فرّاش رکھے تاکہ مکان صاف ہو۔یہ ہوا جو ہے یہ اس کائنات کی فرّاش ہی تو ہے۔اگر ہوائیں نہ چلیں تو کوڑا کرکٹ نہیں جاسکتا،تو اس بلڈنگ کے صاف کرنے کے لئے اللہ نے ہوائیں پیدا کیں تاکہ فرّاش کا کام دیں۔اور مکان کو صاف ستھرا رکھیں۔یہ سورج کیا ہے۔؟ یہ آپ کا باورچی ہے جو آپ کی کھیتیاں پکاتا ہے،اس کی گرمی سے آپ کے دانے پکتے ہیں اور یوں سمجھنا چاہئے کہ سورج فی الحقیقت ایک باورچی ہے جو اللہ

نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔

یہ بادل کیا ہیں؟ یہ بہشتی ہیں جو پانی بھر بھر کے لاتے ہیں اور آپ کی کائنات کو سیراب کرتے ہیں، ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے کہ اس وقت آ کے آپ کے تالابوں کو بھریں۔ آپ کی نہروں کو چلائیں۔ اور آپ کے کنوؤں کو پانی دیں۔ تاکہ سال بھر تک یہ خزانہ پانی سے بھرپور رہے اور انسان کو تکلیف نہ ہو۔ تو کوئی بہشتی ہے، کوئی باورچی ہے، کوئی فراش ہے جو کام کر رہا ہے۔ اب اگر یہ انسان مالک کو چھوڑ کر کہیں باورچی سے آنکھ ملانا شروع کرے اور سورج کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے اور باروچی کے آگے جھکنے لگے، کہیں فرّاش جو ہوا ہے اس کے سامنے سجدہ کرنے لگے اور ہوا پرستی کرے، کہیں آپ کے لئے پانی برسانے کا بادل سامنے آئے، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو اور منتیں مانگنے لگے۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے بیوی بہشتی سے آشنائی کرلے۔ یا فرّاش سے آشنائی کرلے۔ تو گولی ماردینے کے قابل ہوگی، اس قابل نہیں ہے کہ اسے بلڈنگ میں رکھا جائے۔

مخدومِ کائنات کی بے عقلی...... بلکہ جب وہ اس درجہ پر ہے تو یہ بلڈنگ بھی منحوس ہے۔ اسے بھی بڑھادو۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ ساری چیزیں اس کے لئے ہوں اور یہ اللہ کے لئے ہو۔ یہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہ کرے۔ اس سے زیادہ انسان کی کم حوصلگی نہیں ہوگی کہ وہ آگ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے، وہ پانی کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے وہ سورج اور چاند کے آگے جھکنے لگے، جو باندی، غلام اور خادم بنائے گئے تھے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا، کھڑا ہونا قلبِ موضوع ہے کہ جو مخدوم تھا وہ خادم بن گیا، جو خادم تھا اسے مخدوم بنالیا گیا۔ گویا عقل کو انسان نے الٹ دیا کہ جس کو اپنے سامنے جھکانا چاہئے تھا۔ اس کے سامنے یہ خود جھک گیا، یہ تو وہ ہیں کہ جب اللہ والوں کو ضرورت پیش آتی ہے تو یہ خدمت کرتے ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے، اسے پھٹتے بن پڑی، حضرت یوشع ابن نون علیہ الصلوٰۃ السلام کے لئے جنگ کے موقع پر سورج روک دیا گیا تاکہ دن دن میں فتح ہو جائے، تو دن کو ٹھہرا دیا گیا تھا، سورج خادم تھا تو اسے لئے روکا گیا۔ لیکن حضرت یوشع علیہ السلام کے کام کو نہیں روکا گیا۔ کہ وہ مقصود تھا اور سورج اس کا وسیلہ تھا۔ وسیلے پر پابندی عائد کی گئی مقصود پر پابندی عائد نہیں کی گئی۔ غرض بادل ان کے لئے آتے ہیں، سورج ان کی خدمت کے لئے آتا ہے، چاند ان کے سامنے اطاعت کرتا ہے، ذرّاتِ کائنات اطاعت کرتے ہیں۔

کائنات کا افادی پہلو اور اس کا مقصد...... انسان کو دیکھو سمندروں میں اس کا تصرف ہے، پہاڑوں میں اس کا تصرف ہے، زمین اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے، چاہے زمین کو کھودے، چاہے سڑکیں بنائے، فرمایا گیا ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ﴾ ①

''وہ، وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے ذلیل بنادیا، تاکہ اس میں کھیتی کرو، دانہ ڈالو، سڑکیں بناؤ، کنویں کھودو، ذلیل

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵.

ہے زمین چوں نہیں کرسکتی، انسان کے سامنے اُف نہیں کرسکتی''۔ مگر انسان کس لئے ہے؟ ﴿وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ﴾ تا کہ یادر کھے کہ اسے اپنے مالک کے آگے جانا ہے اور اس کے آگے جوابد ہی کرنی ہے۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ حشر ونشر کو سوچے، قیامت کے دن کو سوچے، اور ان چیزوں کا کام یہ ہے کہ انسان کی چاکری میں لگی رہیں، جو خدمت یہ لے، اف نہ کریں، چپ چاپ اس کے کام میں لگی رہیں۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ ① یہ چوپائے اور مویشی ﴿خَلَقَهَا لَكُمْ﴾ تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، ﴿فِيْهَا دِفْءٌ﴾ بعضوں سے تم گرمی حاصل کرتے ہو، اونی کپڑے بنا کر ان سے گرمی حاصل کرتے ہو۔ ﴿وَمَنَافِعُ﴾ اور مختلف منافع ہیں ﴿وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور بعض جانوروں کے گوشت سے تمہارے کھانے پینے کا تعلق ہے۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ② بعضوں سے تم کرّ وفرّ اور حشم وخدم حاصل کرتے ہو جب ہاتھی اور گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر جلوس نکالتے ہو اور اپنا کرّ وفرّ دکھلاتے ہو اور اپنے حشم وخدم کی نمائش کرتے ہو۔

اور فرمایا ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ ③ بعضے جانور وہ ہیں کہ ان پر مال کو لاد کر ایک بستی سے دوسری بستی تک لے جاتے ہو۔ غرض مختلف منافع فرمائے گئے۔ ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ④ یہ وہ چیزیں ہیں کہ آج سواریاں بن گئی ہیں فرماتے ہیں، اور تمہیں کیا خبر ہے کہ آئندہ ہم نئی نئی قسم کی سواریاں پیدا کر دیں جن پر چڑھ کر انسان منزلیں طے کریں۔ چناں چہ موٹر سائیکلیں ہوائی جہاز اور دُخانی جہاز۔ غرض مختلف قسم کی سواریاں انسان کے لئے نکلیں تا کہ وہ احترام کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو۔ چوپائے اور جانور کو یہ عزت نہیں بخشی گئی، چوپایا جہاں بھی جائے گا اپنے پیروں سے چل کر جائے گا اور انسان سوار ہو کر جائے گا، کبھی چوپائے کے سر پر، کبھی جمادات کے سر پر اور کبھی نباتات کے سر پر، ہر چیز انسان کے لئے سواری بنا دی گئی۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ انسان اللہ کے لئے ہے اور کائنات انسان کے لئے ہے۔

معیارِ عبادت...... یہ اللہ کے لئے کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نفع اور نقصان کے معیار پر کی جاتی ہے، جس کے قبضے میں انسان کا نفع اور نقصان ہے، اس کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کے ہاتھ میں انسان کے نفع اور نقصان کی باگ ڈور ہے، نفع دے جب بھی اس کے قبضے میں ہے، نقصان پہنچائے جب بھی اس کے قبضے میں ہے۔ خواہ نعمتیں دے دے، خواہ مصیبت ڈال دے، نعمت دیکر چھین لے، یا چھینی ہوئی نعمت پھر واپس کر دے، ہر صورت میں اس کے دستِ قدرت میں ہے۔

معطیٔ حیات...... مادی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت انسان کے لئے زندگی ہے، اس پر انسان کا کوئی بس

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۵. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۶.

③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸.

نہیں ہے، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے زندگی دے دے اور جب چاہے زندگی چھین لے۔ جب تک زندگی نہیں آتی، ایک انسان چاہتا ہے کہ میری اولاد ہوجائے۔ لیکن زندگی ہاتھ میں نہیں ہے تو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے کہ جب چاہے پیدا کرے۔ وہ دینا چاہے تو دے دے، نہ دینا چاہے تو انسان کو تمنائیں کرتے کرتے کرکے اور اسباب مہیّا کرتے کرتے برس گزر جاتے ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی، اس لئے کہ زندگی ہاتھ میں نہیں ہے، غرض زندگی کی نعمت اسی کے یدِ قدرت میں ہے۔ جب چھننے پر آتی ہے اور موت کا وقت آتا ہے تو آدمی ساری دنیا کے خزانے علاج پر صرف کردے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی آدمی زندگی کو روک نہیں سکتا۔ جو اس کے جانے کا وقت ہے اس پر جا کر رہتی ہے، غرض نہ زندگی کو لانا قبضے میں ہے، نہ روکنا قبضے میں اور نہ واپس لے آنا قبضے میں ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ سب سے بڑا نافع ہے جس کے قبضے میں نفع کی باگ ڈور ہے۔

معطیٔ صحت...... آپ زندہ موجود ہیں۔ زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت تندرستی ہے۔ تندرستی آپ کے بس کی چیز نہیں ہے، جب تک مالک تندرست رکھنا چاہے آدمی تندرست رہتا ہے۔ چھیننا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ لوگ اسباب مہیّا کرتے ہیں اور صحت کا تحفظ کرتے ہیں لیکن قابو نہیں ہے کہ اس کو حاصل کرلیں، آج شہر کے اندر انفلوئنزا پھیلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ بھی سعی کررہی ہے۔ مونسپلٹیاں بھی سعی کررہی ہیں۔ شخصی طور پر ڈاکٹر بھی مطب کھولے ہوئے ہیں۔ پبلک بھی ایک دوسرے کی خدمت پر کھڑی ہوئی ہے۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ منٹ بھر میں یہ مادّہ رفع ہوجائے۔ لیکن قبضے میں نہیں ہے۔ جب مالک کا حکم ہوگا جب ہی یہ بیماری واپس جائے گی۔ خواہ کتنا ہی جتن کیا جائے، اپنے وقت تک رہے گی۔

مبالغہ فی الاسباب کی ممانعت...... جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب کوئی مصیبت آتی ہے، وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، جب اس کا وقت ختم ہوگا، جبھی ٹلے گی۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اسباب کے درجے میں کچھ نہ کچھ اجمالی طور پر تحفظ کی فکر کی جائے۔ اسباب میں زیادہ مبالغہ نہ کرے ورنہ الجھ کر مصیبت کی عمر بڑھ جاتی ہے، فی الجملہ یہ سمجھ کر تحفظ کا سامان کرتا رہے کہ میں بندہ ہوں اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسباب اختیار کروں تو ''وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَ تَوَکَّلُوْا عَلَیْهِ'' ①

اجمال کے ساتھ اسباب کو طلب کرتے رہو، اللہ کے اوپر بھروسہ رکھو، اسباب پر بھروسہ مت کرو۔ اجمالی طور پر آدمی کچھ تحفظ کا سامان کرتا رہے، دوا پی لی۔ طبیب کو دکھلا دیا، لیکن طبیب کے اوپر توکل کر بیٹھے، یا دواؤں پر توکل کر بیٹھے یا ہمہ تن دل کو ڈال دے کہ یہی چیز شفا دینے والی ہے۔ یہ غلط ہے، دواؤں میں شفاء نہیں ہے، اور طبیب کے قبضے میں شفا نہیں ہے یہ تو وسائل اور اسباب ہیں۔ وسائل کے اندر تاثیر رکھنا مسبّبُ الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔

---

① المستدرک للامام الحاکم، ج: ۴، ص: ۳۶۱، رقم: ۷۹۲۴۔ امام حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے ان کی موافقت فرمائی ہے۔ دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۶ ص: ۱۰۶ رقم: ۲۶۰۷۔

تاثیراتِ اسباب کی حقیقت...... یہ آگ پانی، ہوا، اور مٹی بھی اسباب ہیں۔آگ کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جلائے ،لیکن یہ اس کی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔اللہ نے اس میں یہ تاثیر رکھ دی ہے۔وہ یہ تاثیر دکھلاتی رہتی ہے لیکن قبضے میں مالک کے ہے۔اگر وہ آگ کی تاثیر کھینچ لے تو آگ جلانے کا ارادہ بھی کرے تو اس کے قبضے میں جلانا نہیں ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا، جلانے کی تاثیر سلب کر لی گئی، آگ جھک مار کر بیٹھ گئی آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی، غرض آگ نہیں جلاتی، مشیتِ خداوندی جلاتی ہے۔جب مشیت تقاضا کرتی ہے آگ جلانا شروع کر دیتی ہے۔

یہ پانی اصل میں ٹھنڈک بخشنے والا نہیں ہے، مشیتِ الٰہی ٹھنڈک بخشتی ہے۔اگر پانی میں سے تبرید کا مادہ نکال لیں اور وہ خود بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے تو قابو نہیں پا سکتا، جب تک مالک اس کی تاثیر کو نمایاں نہ کر دے، ہر چیز کے افعال اور خاصیتیں یہ مخلوقِ خداوندی ہیں جب وہ نہیں چاہتے ہیں، نمایاں نہیں ہوتیں، اس لیے اصل موثر کو چھوڑ کر آدمی ان چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ یہی مجھے شفا بخشنے والی ہیں۔یہ غلط چیز ہے۔

موہم شرک عنوان سے احتراز کی تاکید......اسی واسطے شریعت نے بہت سے عنوانات کی اصلاح کی ہے۔ مثلاً یہ عنوان کہ انسانوں کو چاہئے کہ اولاد پیدا کیا کریں۔شرعی اعتبار سے یہ عنوان غلط ہے، شرعی طور پر اس عنوان کو بے ادبی کہا گیا ہے۔پیدا کرنا خالق کا کام ہے، ماں باپ کا کام نہیں ہے کہ اولاد پیدا کریں۔ماں باپ کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب کے درجے میں باہم مل جائیں اور اللہ سے دعا کریں کہ اولاد پیدا کر دی جائے۔اگر حق تعالیٰ شانہٗ پیدا نہ کرنا چاہیں تو ہزار دفعہ خاوند بیوی ملا کریں، کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔مانگنا بھی اسی سے ہے۔بھروسہ بھی اسی پر ہے، ملتا بھی اسی سے ہے۔جب اسباب اور وسائل میں وہ اثر ڈالتے ہیں تو اثر آ جاتا ہے۔اور اگر آدمی مطلقاً اسباب کی طرف رجوع کرے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

معرفتِ توحید و تصرّف......حضرات انبیاء علیہم السلام ہی فی الحقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کی توحید اور تصرّف کو پوری طرح سمجھتے ہیں، وہ مانگتے بھی ہیں تو اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔فریاد بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں، کسی مصیبت کی شکایت بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں۔ہر چیز میں اللہ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

بارگاہِ حق میں سوال کا طریقِ کار......حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ انہیں بیٹا مانگنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کی نبوت کا مشن آگے چلے اور بڑھے۔تو بیٹا مانگا۔اس مانگنے کو حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: مانگنا بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔مانگنے کا ڈھنگ بھی حقیقتاً حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ان کے بتلانے ہی سے دوسروں کو آتا ہے۔غرض حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹا مانگا؟ اس دعا کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے اور واقعی اس طرح سے مانگنے کا انہیں کا حق تھا، دوسرے تو اس طرح سے سوجھ بھی نہیں سکتی۔

﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ ① فرماتے ہیں اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے چپکے چپکے اپنے دل میں اللہ سے مانگنا شروع کیا اور چھپی ہوئی آواز سے اولاد کی طلب کی۔ جس کو وہ سنتے تھے اور ان کا اللہ سنتا تھا، کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں تھی، اس طرح سے مانگنا شروع کیا۔

معلوم ہوا کہ مانگنے کا پہلا ادب تو یہ ہے کہ آدمی زیادہ چلا کر نہ مانگے۔ ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ ② ''اللہ کے سامنے دعائیں کرو چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ''۔ غرض آہستہ آہستہ مانگنا شروع کیا۔ کس طرح سے مانگا؟ عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ﴾ ③ ''اے اللہ! میری ہڈیاں خشک ہوگئیں''۔ بڑھاپے کی انتہا یہ ہے کہ ہڈیاں بھی خشک ہوگئیں، ان میں گودا تک باقی نہیں رہا۔ ظاہر بات ہے کہ جب گودا تک باقی نہیں رہے گا، تری اور روغن باقی نہیں رہے گا، ہڈیاں خشک ہوگئیں تو گوشت کہاں باقی رہے گا؟ حاصل یہ نکلا کہ ہڈی سے چمڑا لگ چکا ہے، کوئی طاقت میرے اندر باقی نہیں ہے۔ اور عرض کیا۔

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ ④ ''اور سر سفید ہوگیا ہے جیسے آگ جلا کرتی ہے''۔ تو اندر بھی بڑھاپا سرایت کر گیا کہ ہڈیوں میں روغن تک باقی نہیں۔ اور اوپر بھی بڑھاپا چھا گیا کہ بالوں میں سیاہی نہیں ہے۔ غرض اوپر سے سفید ہوگیا ہوں اور اندر سے خشک ہوگیا ہوں۔ یہ میری حالت ہے۔ یعنی بیٹا مانگنا چاہتے ہیں اور حالت وہ پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسباب کے درجے میں بیٹا ہونا ناممکن ہے۔ جب بڑھاپے کا اتنا غلبہ ہوجائے کہ اندر روغن تک باقی نہ رہے، ہڈیاں تک خشک ہوجائیں اور بڑھاپا چھا جائے تو اولاد کہاں سے ہوگی؟

مگر یہ مانگنے کا طریقہ ہے کہ وہ اسباب جن کے ذریعے سے اولاد ہوتی، وہ موجود نہیں، تو خود ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں، یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں، تاکہ جواب یوں نہ آجائے۔ کہ اگر یوں مانگتے کہ یا اللہ! مجھے بیٹا دیجئے۔ تو یہ ہوسکتا تھا کہ جواب یوں آجائے کہ نہیں تم بوڑھے ہوگئے ہو، عادتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ ایسے میں بیٹا نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا خاموش ہوجاؤ۔ تو پہلے ہی ان چیزوں کو پیش کر کے دفع دخل مقدر کر دیا، جو جواب آگے ممکن تھا میں وہ جواب خود ہی نہ دے دوں تاکہ آئندہ کا مقصد بھی پورا ہوجائے۔ تو کہا کہ: اے اللہ! میری ہڈیاں تو خشک ہوگئیں اور سر کے بال سفید ہوگئے، بڑھاپا چھا گیا۔ اور بیچ میں ایک لفظ یہ بھی کہہ دیا: ﴿وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا﴾ ⑤ اے اللہ! میں کبھی بھی آپ کے سامنے سے نامراد واپس نہیں گیا، جب گیا ہوں کچھ نہ کچھ لے کے گیا ہوں یہ کبھی نہیں ہوا کہ مایوس گیا ہوں۔ یہ بھی بیچ میں کہہ دیا۔ حاصل یہ کہ اسباب کے درجے میں کچھ موجود نہیں اور آپ کے در سے کبھی مایوس گیا نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین رکھنا چاہئے کہ منہ مانگی مراد ملے گی۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۳۔ ② پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۵۔

③ ④ ⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۴۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دعاء اس طرح سے مانگو "اَلِحُّـوْا." ① الحاح کرو، اتنی زاری کرو کہ لیچڑ بن کے مانگو، کہ بے لئے ہم نہیں ٹلیں گے، کلام بھی ایسا ہی عاجزانہ ہو، جھکنا بھی ایسا ہی ہو اور بیٹھنا بھی ایسا ہی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کریم کے دروازے پر آئیں اور خالی ہاتھ واپس جائیں۔ ہم لے کے ہٹیں گے۔ اور آگے عرض کیا ﴿وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ﴾ ② "مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈر بھی ہے۔ اور کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے، بلکہ میرے مقصد کو ضائع کر دیں گے"۔

اس کے بعد عرض کرتے ہیں ﴿وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا﴾ ③ یا اللہ میاں! میں ہی بوڑھا نہیں میری بیوی بانجھ بھی ہے اور اس کے اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی ساتھ میں عرض کر دوں۔ تو میں بوڑھا ہوں، مجھ میں اولاد کی صلاحیت نہیں، بیوی بانجھ ہے اس میں اولاد ہونے کی قابلیت نہیں، رشتہ داروں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ تو ہوا کیا؟

﴿فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا﴾ ④ پس اللہ میاں! ایک بیٹا مجھے عطاء کر دیجئے جو میرے ان کمالات کا وارث بنے اور ان کو آگے بڑھائے۔ تو حقیقت میں مانگنے کا ڈھنگ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ بارگاہِ حق میں کس طرح سوال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کے آداب ارشاد فرمائے ہیں کہ دعائیں مانگو مگر اس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

چناں چہ کسی شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! لوگ دعائیں مانگتے ہیں، قبول نہیں ہوتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔" فرمایا: مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَارَبِّ يَارَبِّ، اَنّٰی يُسْتَجَابُ لَهٗ ⑤ کھانا دیکھو تو حرام کا، لباس دیکھو تو حرام کا، کمائی دیکھو تو وہ مشتبہ اور آدمی کہہ رہا ہے۔ "يَارَبِّ يَارَبِّ اَنّٰی يُسْتَجَابُ لَهٗ" دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی؟ یہ تو دل لگی اور مذاق کرنا ہے۔ پاک بن کر اللہ کے آگے آئے تب دعا سنی جائے گی، ناپاک بن کر آئے تو دعا کیوں سنی جائے گی؟

بادشاہ کے دربار میں جب جاتے ہیں تو پاکیزہ کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔ عطر لگا کر جاتے ہیں، معطر ہو کر جاتے ہیں۔ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ دربار میں سیٹ دی جاتی ہے، اگر دربار میں عرض و معروض کریں تو اس کی شنوائی ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی میلے کپڑے پہن کر اور اوپر سے نجاست مل کر چلا گیا تو دربان دھکے دے کر نکال دیں گے کہ یہ پاس کھڑے ہونے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اسے دربار میں سیٹ دی جائے۔ اور چہ جائیکہ اسی کی بات مانی جائے۔ تو اسے نکال دیں گے کہ یہ آدابِ دربار کے خلاف ہے۔ تو حرام کی غذا کھا کے اور حرام کا لباس پہن کر

---

① عمدة القاری، کتاب الفتن، باب التعوذ من الفتن، ج: ۲۴، ص: ۱۱.

② ③ ④ پارہ: ۱۶، سورة مریم، الآية: ۵.

⑤ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوة، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب، ص: ۸۳۷، رقم: ۲۳۴۲.

جانا اور پھر یا اللہ، یا اللہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نجاست لیپ کر دربار میں جائے اور بادشاہ کے سامنے عرض و معروض کرے، تو شنوائی ہوگی یا دھکے دیئے جائیں گے؟ تو قبولیت ہوگی یا نامقبولیت ہوگی؟

کسبِ حلال کے آثار...... غرض بتلایا گیا کہ دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے، پہلے اپنے ضمیر کو پاک کرے کہ میں آج سے حرام کی غذا سے تائب ہوتا ہوں، اور اور مشتبہ کمائی سے تائب ہوتا ہوں کہ اگر کمائی مشتبہ ہوگی تو اس سے قلب کے اندر ظلمت پیدا ہوگی اور اس سے توفیق سلب ہو جاتی ہے، حلال کی کمائی کا اثر قلب میں نورانیت پیدا ہونا اور توفیق کا پیدا ہونا ہے۔ حرام کی کمائی کا اثر سلبِ توفیق ہے۔ قلوب کے اندر سے توفیق نکل جاتی ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا، ہمارے دیوبند میں ایک بزرگ ''شاہ جی عبداللہ'' تھے۔ اور عوام میں شمار ہوتے تھے لیکن صاحبِ نسبت بزرگ اور درویش تھے، انہوں نے کمائی کا طریقہ یہ رکھا تھا کہ گھاس کھود کے لاتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی بیچ کر اپنا گزر اوقات کرتے تھے، صاحبِ نسبت تھے، اوقات کے پابند تھے، ان کے ہاں گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر تھی، تو دیوبند میں جتنے گھاس خریدنے والے لوگ تھے وہ قطار باندھ کر کھڑے رہتے تھے کی شاہ جی کہ گٹھڑی ہم خریدیں گے، ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر میں نے خرید لی تو میرے مویشی میں بھی برکت ہوگی، میرے گھر میں بھی برکت ہوگی۔

اس لئے جہاں شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ سامنے آئے۔ لوگ دوڑتے تھے، جس نے ہاتھ پہلے لگا دیا، انہوں نے گٹھڑی وہیں ڈال دی اور چھ پیسے لے لئے۔ سردی ہو، گرمی ہو، برسات ہو۔ نہ سات پیسے نہ پانچ پیسے، چھ پیسے متعیّن تھے۔ جب چھ پیسے لے لیتے تو ان کے خرچ کا ان کے ہاں کیا طریقہ تھا۔؟ دو پیسے تو اسی وقت فقیروں میں صدقہ کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں کوڑیاں ہوتی تھیں۔ گنڈے ہوتے تھے۔ پانچ گنڈے کا ایک پیسہ ہوتا تھا۔ تو دو پیسے کے گنڈے لے کر کسی یتیم کو، کسی غریب کو، کسی بیوہ کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اس میں کچھ نمک لے لیا اور کچھ تیل لے لیا، کچھ ترکاری لے لی۔ سستے کا زمانہ تھا۔ جو آج دو روپے میں کام چلتا ہے۔ وہ دو پیسے میں چل جاتا تھا، تو دو پیسے ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب دو پیسے روز کے جمع کرتے کرتے سات آٹھ روپے ہو جاتے تو ان کا کھانا پکا کر ہمارے ان سب بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان تمام بزرگوں کو جمع کر کے دعوت کر دی۔ تو میں نے اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور بڑے صاحبِ نسبت ولیٔ کامل گزرے ہیں کہ ''سال بھر تک ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کا کھانا کھائیں''۔

اور فرمایا کہ: ''جس دن کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور رہتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ نماز پڑھیں، جی چاہتا تھا کہ تلاوت کریں۔ دل میں طاعت وعبادت اور زہد وریاضت کی امنگ پیدا ہوتی تھی''۔ یہ اس حلال کی کمائی کا اثر تھا۔ تو جتنی پاک کمائی ہوتی ہے قلب میں توفیق پیدا ہوتی ہے۔

حرام کی نحوست...... جتنی ناپاک یا مشتبہ کمائی ہوتی ہے، توفیق سلب ہوتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ کام نیکی کا ہے۔ مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے کرنے کی امنگ نہیں ہوتی جیسے غالب نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد ۔۔۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

معلوم تو ہے کہ یہ کام اچھا ہے، یہ برا ہے۔ اور اچھے کو کرنا چاہئے مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا، تو دل میں جب ناپاکی گھس جاتی ہے تو وہ اچھے کام کے لیے ابھرتا نہیں۔ آج جو ہم اور آپ معصیت میں مبتلا ہیں وہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں، علم تو بڑا وسیع ہو چکا ہے، حلال وحرام کا امتیاز اچھے اور برے کی تمیز اتنی ہو چکی، ہر شخص شریعت میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار ہے۔ جہاں کوئی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے، بس اس نے قرآن وحدیث میں رائے زنی شروع کر دی، گویا مجتہد بن گیا۔ تو علم کی کمی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا نہیں ہیں۔ علم موجود ہے۔ پھر بھی مبتلا ہیں توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اور توفیق اس لئے سلب ہوگئی کہ ہماری کمائی مشتبہ ہے، حلال کی غذا اندر نہیں پہنچتی۔ معدہ حوض بدن ہے جو اس میں بھر دیں گے، رگ وپے میں وہ چیز پھیلے گی۔ پاک کمائی بھریں گے، پاکی کے اثرات رگ وپے میں بھریں گے۔ ناپاک چیزیں بھریں گے، ناپاکی کے اثرات پھیل جائیں گے، تو حلال کی کمائی کا ایک اثر ہوتا ہے۔

لقمۂ حلال کی علمی وعملی برکات...... حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے۔ یہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی جلیل القدر امام ہیں۔ چار ہی بڑے امام ہیں جن کی فقہ آج کل رائج ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ علیہ، اور بھی صاحب فقہ آئمہ گزرے ہیں لیکن ان کی فقہ ختم ہوگئی۔ من جانب اللہ ان چار فقہوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور کروڑہا کروڑ اانسان ان کی فقہ پر چل رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ترکستان یہ سب حنفی المذہب ہیں اور سب میں فقہ حنفی رائج ہے۔ مصر قریب قریب کل کا کل شافعی فقہ پر چل رہا ہے۔ حجاز بھی قریب قریب شافعی فقہ کا پابند ہے۔ نجد وغیرہ ممالک یہ فقہ حنبلی کے پابند ہیں۔ مغربی ممالک جیسے الجزائر وغیرہ میں مالکی زیادہ ہیں تو دنیا کے اکثر حصوں میں یہی چار فقہ رائج ہیں۔ انہیں چار اماموں کے مسلک پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں جلیل القدر امام ہیں، مگر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام مصر میں تھا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں لکھا کہ بہت عرصہ ہو گیا ملاقات کئے ہوئے۔ اگر کوئی ملاقات کا موقع ہو تو کوشش کر کے آ جاؤ، مصر میں

ملاقات ہو، اور علماء آپ کے منتظر ہیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور تاریخ معیّن کر دی کہ فلاں تاریخ کو پہنچوں گا۔

مقررہ تاریخ پر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ پہنچے۔ تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے، بادشاہِ وقت چوں کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد تھا، وہ بھی ساتھ ہو گیا۔ جب بادشاہ آیا تو وزراء، امراءِ علماء، اور زعماء غرض پورا مصر استقبال کے لئے نکل آیا۔ اور بڑے عزت واحترام سے حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو لے کر آئے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں عید کی سی خوشی تھی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بچیاں کودتی پھرتی تھیں کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہا ہے۔ ایک عجیب خوشی تھی۔ غرض ان خوشیوں کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ علماء وزعماء اور سب اکابر ملت ملنے کے لیے آئے۔

کھانے کا وقت آیا تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے دستر خوان بچھایا۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بٹھلایا گیا۔ اور بھی لوگ بیٹھے۔ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جو کھانا شروع کیا تو اس طرح سے کھایا جیسے کوئی بہت حریص آدمی کھایا کرتا ہے۔ اور جیسے کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ تو بہت زیادہ کھایا اور جلدی جلدی کھایا، جیسے معلوم ہو کہ کھانے کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب کھانے کے بعد گھر پہنچے تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بچیوں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ حضرت امام وقت ہے۔ یہ کیسا امام وقت ہے جو عوام الناس کی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے۔ اتقیاء کی شان تو یہ ہے کہ وہ کم کھاتے ہیں، طاعت زیادہ کرتے ہیں۔ یہ پیٹ بھر کے کھانا اور وہ بھی ناک تک کھالینا، یہ عوام کا کام ہے خواص کا نہیں۔ خواص میں بھی جو شخص امامت کے رتبہ کو پہنچا ہوا ہو، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ اس طرح سے النسٹھ کھالے، جیسے اناڑی کی بندوق بھری جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک، یہ اونچے طبقے کے لوگوں کا کام نہیں جو دیانت میں اونچا مقام رکھتے ہوں۔ تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جواب نہیں بن پڑا اور یہ فرمایا کہ: محسوس تو میں نے بھی اس کو کیا مگر میں یوں بول نہیں سکتا تھا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میں یوں کہتا کہ تم زیادہ کیوں کھاتے ہو، تو تہمت آتی کہ شاید میں مہمان سے اپنا کھانا بچانا چاہتا ہوں، اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں تھا مگر محسوس میں بھی کر رہا تھا کہ یہ حضرت احمد بن حنبل کو ہو کیا گیا۔ اس طرح سے پیٹ بھر کے کھانا۔

اندرون از طعام خالی دار ـــــ تا نورِ معرفت درو بینی

پیٹ کو کھانے سے خالی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ نورِ معرفت پیدا ہو، نہ یہ کہ آدمی اتنا بھر لے۔ بہر حال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جواب نہیں بن پڑا، بچیوں نے اعتراض کیا تو چپ ہو گئے۔ وہ وقت گزر گیا۔ اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ عشاء کی نماز کے لئے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد چھوٹی بچیوں نے بستر بچھایا۔اور پانی کا لوٹا بھر کے رکھا کہ امام جب تہجد کے لئے اٹھیں تو پانی لانے کی دشواری نہ ہو۔اطمینان سے وضوء کر لیں۔حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے لئے جب اٹھ کر گئے تو بستر وغیرہ اٹھانے کے لئے بچیاں آئیں۔دیکھا کہ لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔اب تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ کیسا امام ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے،رات کا کوئی وقت عبادت کا اسے نصیب نہ ہو۔ وضو یہ نہ کرے،تہجد یہ نہ پڑھے۔یہ خواہ مخواہ ہی دنیا میں غلط شہرت ہوگئی کہ اپنے وقت کا بڑا امام ہے۔

جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پہنچے تو بچیوں نے دامن پکڑ لیا کہ آپ نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا کہ حضرت احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ راس الاتقیاء متقیوں کا سردار ہے۔یہ کیسا امام ہے۔؟ ناک تک یہ کھانا کھاتا ہے اور تہجد کی توفیق اسے نہیں۔رات بھر پڑ کر یہ سوئے۔اب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی رہا نہ گیا اور باہر آ کر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ ''اے احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ)! یہ تغیّر تم میں کب سے پیدا ہوا؟ مجھے تو اس کی توقع نہیں تھی۔یہ تمہاری حالت کب سے بدلی،پیٹ بھر کر تم کھانا کھاتے ہو۔تہجد کی توفیق تمہیں نہ ہوئی۔رات کو تم نہ اٹھے،وضو تم نے نہ کیا،آخر یہ تغیّر تمہارے اندر کیسے پیدا ہوا''؟ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے۔اور عرض کیا حضرت واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں،فرمایا،واقعہ کیا ہے؟

''عرض کیا کہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے آج عشاء کے وضو سے تہجد اور صبح کی نماز کی نوبت آئی ہے۔اور عرض کیا کہ قصہ یہ ہوا کہ جب دسترخوان پر کھانا چنا گیا تو میں نے دنیا میں اتنی حلال کی کمائی نہیں دیکھی۔اس کھانے کے اوپر آسمانوں سے انوار و برکات کی اتنی بارش تھی کہ مکان منوّر تھا اور کھانے پر نظر ڈال کر قلب میں ذکر اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی تھی،اتنی حلال اور پاک کمائی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی،تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جتنا کھا سکوں کھالوں، چاہے بعد میں مجھے سات دن فاقہ کرنا پڑے،پھر یہ نورانی کھانا مجھے کہاں نصیب ہوگا،اس واسطے میں زیادہ کھایا''۔

اور عرض کیا۔:اس کھانے کی دو برکتیں نمایاں ہوئیں،ایک علمی برکت اور ایک عملی برکت۔عملی برکت تو یہ ہوئی کہ عشاء کے وضو سے میں نے صبح کی نماز پڑھی،اور تہجد پڑھا۔مجھے وضو کی ضرورت پیش نہیں آئی۔اور علمی برکت یہ ہوئی کہ چارپائی پر لیٹ کر قرآن کریم کی ایک آیت سے آج میں نے فقہ کے سو مسئلے نکالے،جواب تک مجھے سمجھ نہیں آئے تھے،علم کے دروازے میرے قلب کے اوپر کھل گئے۔اور سو مسئلے ایک ہی آیت سے میں نے استنباط کئے،یہ علم کی برکت ہوئی۔

تب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاڑھی کا بال بال خوشی سے کھل گیا۔اور بچیوں سے کہا کہ دیکھا ہم نہیں کہتے تھے کہ یہ امام وقت ہے۔تب بچیوں کو تسلّی ہوئی۔تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حلال کی کمائی کا اثر یہ ہے کہ معرفت بڑھتی ہے،علم الٰہی کی برکت پیدا ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ہوتی ہے۔آج ہمارے میں عمل کی کوتاہی اس وجہ سے نہیں کہ آج ہمیں مسائل کا علم نہیں ہے۔ہر شخص جانتا ہے۔علم کے وسائل اتنے عام ہوگئے کہ

پہلے زمانے میں نہیں تھے، کتابیں چھپی ہوئی الگ، اخبار الگ، رسالے الگ، پیپر الگ اور ہر چیز میں شریعت پر ہی مشق کی جا رہی ہے، سب مسائل ہی کو موضوع بحث بنا رہے ہیں۔ تو اختلافی مسائل ان کے علم میں نہ ہوں مگر اس کے باوجود کہ زبان، علم کے بارے میں کافی چلتی ہے۔ ہاتھ پیر عمل کے لئے نہیں چلتے۔

نمائشِ علم ...... علم کو بھی اگر لوگ استعمال کر رہے ہیں تو اس انداز سے جیسے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اخیر زمانے میں علم تجمل کے لئے رہ جائے گا۔ جس طرح سے لوگ کپڑوں سے زینت حاصل کرتے ہیں، اچھی بلڈنگ سے تجمل حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم سے بھی اپنی زینت اور نمائش کریں گے کہ ہم بھی پڑھے لکھے ہیں، ہم بھی عالم ہیں اور ہم بھی مسائل پر عبور رکھتے ہیں۔ تو علم عمل کے لئے نہیں رہے گا، نمائش کے لئے رہے گا کہ اپنا جمال دکھلایا جائے، اپنا کمال دکھلایا جائے۔

کثرتِ علم کے باوجود قلتِ عمل ...... غرض علم کی کمی نہیں، اگر کمی ہے تو عمل کی کمی ہے۔ اگر علم کی کثرت سے عمل نصیب ہو جایا کرتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ عمل کرنے والی ہوتی، کیوں کہ علم کی کمی نہیں ہے۔ مگر جتنا علم بڑھتا جا رہا ہے عمل گھٹتا جا رہا ہے۔ اس واسطے کہ علم تجمل کے لئے ہے۔ اسبابِ علم بڑھتے جاتے ہیں، علم کی حقیقت دلوں میں ختم ہوئی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ: اخیر زمانے میں علم گھٹ جائے گا، اور ایک میں خبر دی گئی کہ قربِ قیامت میں علم بڑھ جائے گا۔ علماء نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے، وہ یہ کہ اسبابِ علم بڑھ جائیں گے اور علم کی حقیقت دلوں میں گھٹ جائے گی۔ اسباب اتنے کہ قدم قدم پر علم کے نقشے سامنے ہوں گے اور ظلمت اتنی کہ قلب کے اندر نورانیت کا نشان نہیں کہ آدمی حق و باطل کا پورا امتیاز کر سکے۔ اور اس کے اندر عمل کا جذبہ اور امنگ پیدا ہو۔

آثارِ علم ...... علم کے آثار میں سے ہے۔ ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① اہل علم میں جو علم ہوتا ہے کہ ان میں خشیتِ الٰہی اور خوفِ خداوندی ضرور پیدا ہوتا ہے، یہ علم کی تاثیر ہے اور جو خوفِ آخرت ہوگا اور اپنے مرنے کا ڈر ہوگا اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ ہوگا تو عمل کا جذبہ انسان میں پیدا ہوگا۔ لیکن جب علم سے خشیت اور خوف پیدا نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم حقیقی نہیں ہے، رسمی علم ہے، لفظی علم ہے، لفظی علم کے لئے خشیت کا وعدہ نہیں ہے۔

ابتلاءِ معصیت کے اسباب ...... غرض آج کی معصیت اور گناہ قلتِ علم کے سبب سے نہیں ہے بلکہ قلتِ اخلاق کے سبب سے ہے۔ قلتِ نورانیت کے سبب سے ہے، اور قلتِ توفیق کے سبب سے ہے اور توفیق سلب ہونے کے اسباب میں سے مشتبہ کمائی، حرام کمائی ہے کہ آدمی احتیاط سے نہ کمائے، حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہ کرے، مشتبہ اور غیر مشتبہ کو نہ دیکھے۔ پیسہ مقصود ہو جائے۔ کہ جس طرح ہو پیسہ بٹور لو۔ ڈکیتی سے ہو، چوری سے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

ہو، رشوت سے ہو، کسی بھی انداز سے ہو پیسہ آنا چاہئے، ایسے پیسے کا اثر تو یہی ہوتا ہے کہ توفیق جاتی رہتی ہے۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ عبادت اور زہادت کی جب توفیق ہوتی ہے جب قلب میں نور ہو، اور نورِ قلب میں جب ہوتا ہے جب کمائی ٹھیک ہو حلال کی ہو، حلال کا لقمہ میسّر ہو۔

رزقِ حلال میں قلت و برکت...... نیز حلال کی کمائی ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ حرام کمائی تو ہوسکتا کہ زیادہ ہو لیکن عادتاً حلال کی کمائی کم ہوتی ہے۔ الا ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کسی کو بڑھا دے، مگر عادتاً لازمی بات یہ ہے کہ ضرورت کے موافق ملتا ہے، مگر برکت اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی خیر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

بناءِ عبادت...... غرض انسان عبادت کے لئے بنایا گیا ہے اور عبادت جب ہوگی جب اس کے وسائل اور اسباب درست ہوں۔ اس لئے فرمایا گیا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ساری چیزیں اس کے لئے بنائیں۔ اسے اپنے لئے بنایا تاکہ میری یاد میں لگے، ساری دنیا اس کے لئے مددگار بنے۔ یہ دنیا سے نفع حاصل کرے مگر کہے کے مطابق جو حدود کے اندر میں جائز طریقے سے بتلاؤں، اس طریق پر نفع حاصل کرے۔ تو نفع اور نقصان سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، عبادت کی بنیاد نفع اور نقصان ہے جو میں عرض کر رہا تھا۔ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَايَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ﴾ ② اپنی قوم کو خطاب کیا، کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جو تمہیں ادنیٰ درجے کا نفع نہیں پہنچا سکتے، ادنی درجہ میں ضرر نہیں پہنچا سکتے؟ ان مورتیوں کو جو سامنے رکھی ہوئی ہیں؛ جن کو تم خود ہی اپنے ہاتھ سے بناتے ہو اور خود ہی تصوّر کر لیتے ہو کہ یہ ہمارے معبود ہیں۔ یہ بے جان چیزیں ہیں۔ تو مصنوع تمہاری اور تم اس کے صانع؛ اس کے باوجود تم نے اپنے لئے مالک تجویز کر لیا۔ یہ چیزیں تمہیں نفع بھی نہیں پہنچا سکتیں اور نقصان بھی نہیں پہنچا سکتیں۔ حاصل یہ نکلا کہ عبادت کی بنا نفع اور نقصان کا مالک بننا ہے۔

اہلِ شرک کا دھوکہ...... اہل شرک کو یہیں سے دھوکہ لگا ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع نقصان پر ہے تو دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جس میں انسان کا کچھ نہ کچھ نفع نہ ہو، یا کچھ نہ کچھ نقصان نہ ہو، دنیا کی کوئی چیز نہ محض نفع ہی پہنچاتی ہے نہ محض نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر چیز سے کچھ نفع پہنچتا ہے کچھ ضرر پہنچتا ہے۔ غرض ہر چیز میں نفع ضرر موجود ہے۔ یہ روٹی جو آپ روز کھاتے ہیں، نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی پہنچا دیتی ہے، اگر ذرا حدود سے زیادہ کھالی، بیماری پیدا ہوگی، حدود کے اندر کھائیں گے نفع دے گی۔ یہی پانی اگر اعتدال کے ساتھ پئیں گے نفع دے گا، اگر بے اعتدالی کے ساتھ پانی چڑھاتے چلے جائیں گے، بار دامراض پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔

یہی ہوا ہے، نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی دیتی ہے۔ بے اعتدالی کے ساتھ ایسی چیزیں کھائیں گے جس سے فاسد ہوا پیدا ہو، نفخ کی بیماری پیدا ہوگی، اعتدال کے ساتھ کھائیں گے تو ہوا نفع دے جائے گی۔ غرض ہر چیز

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶.

میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے، نباتات ہوں، جمادات ہوں، حیوانات ہوں، ہر ایک میں نفع ونقصان مشترک ہے، جب عبادت کی بنیاد نفع ونقصان پر رہی اور دنیا کی ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے، تو مشرکین نے ہر چیز کو پوجنا شروع کیا کہ جب عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے اور نفع وضرر دنیا کی ہر چیز میں ہے تو کہیں پانی کو پوجنا شروع کیا کہ اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے۔ اور کہیں آفتاب کو پوجنا شروع کیا کہ اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے تو ضرر سے بچنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں۔ اسی طرح ستاروں کو، پتھروں کو، مورتیوں کو، سونے اور چاندی کو پوجنا شروع کیا۔ تو پوجنے والا ایک ہے اور تینتیس کروڑ اس کے خدا ہیں، جتنی دنیا کے اندر انواع ہیں کہ ان میں سے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نفع ونقصان موجود ہے۔

آلاتِ صنعت کی پرستش...... حتیٰ کہ اگر بعض قومیں صنعت وحرفت بھی رکھتی ہیں تو جتنے ان کی صنعت وحرفت کے آلات ہیں وہ ان کو پوجتی ہیں کہ یہ ہمارے نفع کا ذریعہ ہیں اور یہی نقصان کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کاتب ہے تو وہ قلم کے آگے بیٹھ کر ڈنڈوز کرتا ہے۔ اگر کوئی تلوار کا دھنی ہے تو وہ تلوار کو پوجتا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے تو وہ بسولی کو پوجتا ہے کہ میرا نفع ونقصان اس سے متعلق ہے۔ غرض دنیا کی ہر چیز کو معبود بنالیا، کیوں کہ عبادت کی بنیاد نفع ونقصان ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ مشرکین نے یہ اصول تو صحیح اختیار کیا کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے لیکن یہ غلط سمجھا کہ ہر چیز میں نفع وضرر ہے۔

اسلام کا دعوئے توحید...... شریعتِ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو، تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے، یہ مالک کے ارادے سے نفع و نقصان پہنچتا ہے۔ خود تھوڑا نفع نہیں پہنچاتا، خود ہو انفع نہیں پہنچاتی مشیتِ خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو مسبب الاسباب ہے۔ اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں۔ اس لئے عبادت اسی کی، کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع ونقصان ہے، نہ اس کی جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے۔ نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے، نفع و نقصان کا خالق نہیں ہے، محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق ہونا لازم نہیں آتا۔

استحقاقِ عبادت...... انسان اولاد کے پیدا ہونے کا سبب ہے لیکن اولاد کے حق میں اس کو خالق تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟ کاشتکار کھیتی اگ جانے کا سبب ہے لیکن کھیتی کو اگانے والا کاشت کار کو تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟

اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ (1) تم کاشتکاری کرتے ہو یا ہم کاشت کاری کرتے ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ تم کھیتی کے اگ جانے کا سبب بن جاتے ہو، کھیتی کے اگانے والے نہیں ہوا، گانے والے ہم ہیں، منوں مٹی میں جو بیج چھپا دیا جاتا ہے۔ تو زمین کی تہہ میں سے کون کونپل نکالتا ہے، کیا تم نکالنے جاتے ہو یا ہماری قدرت نکالتی ہے؟

ماں کے پیٹ میں نطفہ پہنچتا ہے تو اس پانی کے اوپر صناعی کر کے نقشہ تم کھینچتے ہو یا ہم کھینچتے ہیں۔؟ ہم اسے

(1) پارہ: ۲۷، سورة الذاريات، الآية: ۵۶.

مُضغہ بناتے ہیں اور بڑھاتے ہیں یا تم بڑھاتے ہو؟ غرض تم سببِ خلقت ہو خالق نہیں ہو، کاشت کار زراعت کا سبب ہے خود کاشت کار زراعت پیدا نہیں کرتا، تو دنیا میں جتنی بھی اشیاء ہیں یہ نفع ونقصان کا سبب بنتی ہیں، نفع و نقصان کو پیدا کرنے والی اور ایجاد کرنے والی نہیں ہیں۔ نفع ونقصان مُسبّب الاسباب کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے زندگی دے دے جس سے چاہے زندگی چھین لے، جسے چاہے صحت دے دے اور جس کی چاہے چھین لے، جسے چاہے اولاد کی نعمت دے دے اور جب چاہے چھین لے، ہاتھ میں اسی کے ہے، اسباب میں نہیں ہے۔

اگر تم اولاد کے خالق ہوتے تو جیسے تم پیدا کرنے پر قادر تھے تو روکنے پر بھی قادر ہوتے، کوئی بھی ماں باپ اولاد کو مرنے نہ دیتے۔ لیکن بے بس ہیں۔ جب زندگی کے روکنے پر قادر نہیں ہو، تو زندگی ڈالنے پر انہیں قدرت کہاں سے آئی؟ تم زیادہ سے زیادہ سبب ہو۔ اس سے زیادہ نہیں ہو۔ موت کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

آدمی کسی کو چھری مار دے تو وہ موت دینے والا نہیں ہے، سببِ موت ہے، موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں۔ اگر کوئی چھری مار دے اور وہ چھری میں سے تاثیر نکال دیں اور موت نہ دیں، تو لاکھ ذبح کیا کرو، کبھی کوئی ذبح نہیں ہوگا۔ آگ سے جل کر اگر کوئی مر جائے تو مارنے والی آگ نہیں ہے، مرنے کا سبب ہے، مارنے والی اللہ کی مشیت ہے، آگ کو اس نے سبب بنا دیا۔

اس لئے اسباب میں سے جو نفع ونقصان پیدا ہوتا ہے وہ مالک کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ خود یہ اسباب نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں، اس واسطے ان اسباب کی عبادت بھی جائز نہیں ہوگی، عبادت اسی کی کی جائے گی جس کے قبضہ قدرت میں نفع ونقصان ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ تو نفع ونقصان کا سبب ساری دنیا بن جائے وہ پوجا کے لائق نہیں ہے۔ جو نفع ونقصان کو بھیج رہا ہے۔ وہ عبادت کے لائق ہے۔ تو اس میں گویا اصول بتلا دیا کہ: ﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ ① ''تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو کہ تمہیں نہ نفع پہنچا سکیں، نہ تمہیں نقصان پہنچا سکیں''۔ ﴿اُفٍّ لَّكُمْ﴾ تمہارے اوپر اُف ہے، تمہارے بنائے ہوئے ان فرضی معبودوں کے اوپر جن میں نہ نافع ہونے کی صلاحیت ہے، نہ مضر ہونے کی صلاحیت ہے۔ جیسے ایک دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ ② ''یہ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کو پکارتے ہیں، جن مورتیوں کے آگے بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ یہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگر ساری مورتیاں جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ایک مکھی کو پیدا کر دیں، ان کے بس میں نہیں ہے''۔ ﴿وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ ③ ۔ ④

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶، ۶۷۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۳۔ ③ ④ یہ تقریر اتنی ہی حاصل ہو سکی، جو کہ شاملِ اشاعت کی جا رہی ہے، بقیہ حصہ دستیاب ہوا تو کسی دوسری اشاعت میں شاملِ کتاب کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز (از مرتب غفرلہ)

حج بین الاقوامی عبادت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

اسوۂ مساوات...... بزرگانِ محترم! مساوات اور ایک رُخی کو برنگِ عبادت عملی صورت دینے کے لئے حق تعالیٰ نے حج کی عبادت مقرر فرمائی کہ اس قبلہ پر مشرق ومغرب کی قومیں یکساں انداز سے جمع ہوں تا کہ ان میں سے اونچ نیچ کے جراثیم ختم ہوں، بلکہ اس مساویانہ اجتماع سے پیدا شدہ عملی مساوات کے نمونہ کو سامنے رکھ کر اپنی پوری زندگی اسی مساوات اور باہمی برابری کے ساتھ گزار دیں۔

اس بناء پر شریعتِ اسلام نے اس قبلہ کو اوّل تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا چناں چہ آثار وروایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دنیا میں ایسے نہیں گزرے کہ انہوں نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب سارے حضرات انبیاء علیہم السلام اس بیتِ خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق ومحبت کرتے آئے ہیں اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں۔ تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ ثابت ہوتا ہے۔

عالمی ہدایت کا قبلہ...... پھر قرآن نے بھی یہی بتلایا کہ: قبلہ کی وضع دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے کہ: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② سب سے پہلا خدا کا گھر (کعبۂ معظم) جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ مکہ میں ہے۔ آیت کریمہ میں اول تو ﴿وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾ کا لفظ لایا گیا، یعنی سارے انسانوں کے لئے وُضِعَ لِلْعَرَبِ یا لِلْعَجَمِ نہیں فرمایا گیا، جس سے عرب اور بقیہ ساری اقوام کا قبلہ یہی بیت کریم ثابت ہوا۔ پھر اسے ہدایت اور راہنما بتلانے کے لئے "عَالَمِيْنَ" کا لفظ استعمال فرمایا کہ: وہ جہانوں اور عالموں کے لئے ہدایت ہے، جس سے اس قبلہ کا تمام جہانوں کے لئے عالمی

①② پارہ: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۹۶.

ہدایت کا قبلہ ہونا ثابت ہوا، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اطراف واکناف عالم سے تمام اصنافِ بشر اور تمام قومیں اس عالمی رہنمائی کے تحت حج کرنے کے لئے اسی کی طرف بڑھیں اور اپنی اجتماعیت کبریٰ یا عالمی اجتماعیت کا ثبوت دیں۔

امام ناس (علیہ السلام) اور مرکزِ ناس...... اسی لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جنہیں قرآن نے امام الناس فرمایا ہے کہ: ﴿اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ① اور فرمایا ﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ ② لوگوں کے لئے حج بیت اللہ کا اعلانِ عام کردیں۔

تو یہاں بھی دونوں جگہ بلا تخصیص عرب وعجم ''الناس'' کا لفظ لایا گیا۔ یعنی موذن تو امام الناس بنائے گئے جنہیں بلا تخصیص تقریباً دنیا کی تمام بڑی قومیں امام تسلیم کرتی ہیں اور اس اعلان کا مخاطب بھی ''الناس'' ہی کو بنایا گیا جس میں کسی قوم یا ملک کی تخصیص نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسانو! حج کے لئے چلو، اس لئے امام العرب یا امام الشام یا امام العراق نہیں بلکہ امام الناس'' کہا گیا۔ جنہیں یہود و نصاریٰ بھی امام مانتے ہیں۔ اور مسلمان بھی انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ مجوس اور فارس قومیں بھی زرتشت کے نام سے انہیں امام تسلیم کرتی ہیں اور براہمہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنا لقب براہمہ رکھا ہے۔ نیز بقیہ اقوام بھی تبعاً اسی ذیل میں آجاتی ہیں جو ممکن ہے کہ ناموں کے تفاوت سے وہ بھی ان کی امامت کو تسلیم کرتی ہوں، غرض اعلانِ حج کے لئے امام الناس کو منتخب فرمایا جانا اس کی کھلی علامت ہے کہ حج کا یہ اذن عام دنیا جہاں کے سارے انسانوں کے لئے تھا اور حج کے اس اعلان عام کا خطاب ''الناس'' کو بنایا جانا بھی جس میں کسی ملک یا قوم کی تخصیص نہیں، اس کی کھلی دلیل ہے کہ حج کا خطاب دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے، جس سے صاف واضح ہے ہے حق تعالیٰ نے اس قبلہ مقدسہ کو مرکزِ ناس اور مرکزِ عالم بنا کر حج کے لئے اس کے اردگرد سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے کا اذن عام دیا ہے جس سے حج ایک بین الاقوامی عبادت ثابت ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر اور قومیں اس سے منحرف بھی ہوجائیں اور صرف مسلمان ہی اس کی طرف رجوع کریں تب بھی وہ بین الاقوامی ہی ثابت ہوگا، کیوں کہ مسلمان دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں اور وہ یورپ، ایشیاء، افریقہ اور امریکہ سے چل کر نوبت بہ نوبت حج کے لئے آئیں گے تو بین الاقوامیت پھر بھی نمایاں رہے گی۔ اور اس میں پہنچ کر حج بین الاقوامی ہی عبادت ثابت ہوگا۔

عالمی مساوات...... خلاصہ یہ کہ حج بروئے قرآن اس دنیا میں ایک عالمی اجتماع ہے جس میں ساری قومیں یکسانی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ اس لئے ان میں قدرتی طور پر اخوتِ اسلامی، عالمی مساوات، اور عالمی بھائی چارہ اور عالمی خدمت کا جذبہ ابھرنا چاہئے، پھر ساتھ ہی حج میں صورتوں میں بھی مساوات رکھی گئی ہے۔ پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ اقوام ہی یکساں رہیں، بلکہ آنے والے افراد میں بھی باہم یکسانی رونما ہو، لباس بھی سب کا ایک ہو،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۴۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۷۔

وضع ایک اور افعال بھی سب کے ایک اور یکساں ہو، امیر وغریب، بادشاہ وگدا، خواص وعوام، عالم وجاہل، نیک وبد، صالح وطالح، متقی اور فاسق، ایک ہی لباس میں، ایک ہی کفن میں، ننگے سر، ننگے پاؤں یکساں فقیرانہ انداز سے اس بیتِ کریم کے اردگرد جمع ہوں، احرام بندھا ہوا ہو۔ اور ایک وضع اور ایک رُخ ہو کر اس بیتِ کریم کے اردگرد پروانوں کی طرح چکر کھائیں، طواف کریں، اور اس پر جاں نثاری کا ثبوت دیں۔

بندگی میں یکسانی...... عرفات کے میدان میں بھی اسی ایک وضع میں خاک بہ سر ہو کر اپنے رب کے سامنے گڑ گڑائیں، فریاد کریں، مزدلفہ میں بھی ایک ہی انداز سے گریہ وزاری میں محو اور مست ہوں، صفاومروہ کے پہاڑوں کے درمیان بھی اسی ایک اندازِ گرویدگی اور محویت سے عاشقانہ اور والہانہ دوڑ لگائیں، ایک قافلہ، دوسرے قافلہ کو دیکھے تو بجائے کسی دنیوی یا معاشرتی نعرہ کے ''لبیک لبیک'' کا نعرہ بلند کرے تاکہ باہمی یکسانی کے ساتھ ان کی بندگی میں بھی یکسانی رہے اور ایک ہی متواضعانہ اور سرفروشانہ انداز سے ایک دوسرے کے سامنے آئیں، خواہ وہ حکمران ملک اور سربراہان ریاست ہوں، یا عوام الناس اور پبلک میں ہوں، ظاہر ہے کہ جب اسی طرح لاکھوں لاکھ انسانوں کی ایک ہی فقیرانہ وردی، ایک ہی سب کی نقل وحرکت، ایک ہی عمل ایک ہی مرکز اور ایک ہی رُخ ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ اس مساویانہ انداز میں ہو کر ان میں اونچ نیچ کا کوئی تصوّر بھی باقی رہے، دنیا کی کوئی قوم اس عملی مساوات کا نمونہ دکھلائے تو سہی کہ ایسی بین الاقوامی مساوات کس میں ہے؟ اور ظاہر وباطن کی برابری اور ہمواری کا ایسا سچا مظاہرہ کس نے کر کے دکھلایا ہے یا دکھلا سکتی ہے۔

قلوب وقوالب کی یکسانی...... پھر اسی کے ساتھ سب کی پارسائی اور زہدوقناعت کا یہ عالم کہ گھر وبار چھوڑے زرومال بقدرِ ضرورت ہی لئے ہوئے، نہ رسمی عزت وجاہ کا تصور، نہ کسی پر کسی کو بڑائی کا زعم، نہ کسی میں اونچ نیچ کا وہم، نہ کسی کی زبان پر کوئی فحش وبے حیائی کا کلمہ، نہ آپس میں جھگڑا اور نزاع، نہ جدال وقتال۔ بلکہ قلبی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گرویدگی، خدمتِ باہمی کا جذبہ، ایثار وقربانی کا ہمہ وقت تصوّر اور ہر ایک میں بجائے نیچ ہونے کے غناء وتوکّل کا جذبہ۔ رسمی کرّ وفرّ اور ٹھاٹھ باٹھ سے کوسوں دور۔ سادگی اور بے تکلفی سے مخمور، اسی ایک کی محبت میں چور چور اسی ایک کو پکارنا، اسی ایک سے مانگنا، اور اسی ایک کے آگے جھکنا، جو سب کا ایک ہی مرکزِ حقیقی، اصل وجود اور خالق ومالک ہے۔ اور اسی کے اس بین الاقوامی گھر کے اردگرد گھومنا جو سب کا مرکزِ ظہور، سب کی مادی اصل اور سب کے لئے مرکزِ کشش ہے۔

دنیا کی کوئی قوم قلوب کی یہ یکسانی، قوالب کی یہ مساوات، افرادِ انسان کی یہ عالمی موانست اور اولادِ آدم کی یہ عالمی اخوت دکھلائے تو سہی کہ کہاں ہے جو اسلام اور مسلم نے اپنے رب سے جڑ کر دکھلائی اور نہ خود ہی دکھلائی بلکہ اسی نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اونچ نیچ کا مٹانا نعروں سے نہیں بلکہ عملاً یوں ہوتا ہے۔ اور کبروغرور کا سر اس طرح توڑ دیا جاتا ہے۔

مساوات وعبادت کی یکسانی...... اسی توجہ الی اللہ اور ایک رُخی کا قدرتی اثر ہے کہ لاکھوں لاکھ کے مجمعے میں جس میں مرد عورت مساوات کے ساتھ ایک جگہ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ نہ کہیں فحش کا نشان ہوتا ہے۔ نہ بے حیائی کا وہم وگمان، نہ معصیت کاری کا کوئی داعیہ، نہ کسی کی حق تلفی کا کوئی جذبہ۔ نہ طبقہ وارانہ فسادات، نہ نزاع وجدال ہے، نہ قتل وقتال، نگاہوں میں پاکی اور دلوں میں حق شناسی، اور ساتھ ہی ساتھ عبادت اور اللہ سے وابستگی۔

یوں باہم کس نے کئے ساغر وسنداں دونوں

عملاً دکھایا جاتا ہے کہ معاصی اور گناہوں سے کیوں کر بچا جاسکتا ہے اور انسانی ہمدردی اور مساوات کو عبادت کے ساتھ کس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے۔

عالمی اخوت...... پھر حج میں عالمی اخوت ومساوات محض لفظی یا اخلاقی حد تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اس کے ساتھ تعاون باہمی، ضرورت مندوں کے لئے مالی اعانت و ہمدردی کا سلسلہ بھی قائم فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ اخوت و مساوات ہر نہج سے مستحکم ہوتی رہے اور اس حسن سلوک اور احسان عام سے دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ منت پذیری اور احسان شناسی کے ساتھ مربوط ہوں، کیوں کہ خصوصیت سے اس طویل وعریض سفر میں صرف امراء ہی نہیں آتے بلکہ غرباء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثریت غرباء ہی کی ہوتی ہے جو اپنے ذوق وشوق سے کسی نہ کسی ضروری حد تک ہی سامان سفر مہیا کر کے پہنچ پاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس رقم کی قلت ہوجائے۔ اور وہ اپنی بعض واجبی ضروریات بھی پوری نہ کرسکیں۔ اور تکلیف میں مبتلا ہوجائیں یا ضرورت کی حد تک رقم ہو مگر اچانک کوئی غیر معمولی ضرورت پیش آجائے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جیسے بیماری اور دوا دارو وغیرہ کی پریشانی۔ یا یہ بھی نہ ہو۔ مال چوری ہوجائے اور وہ غنی ہوتے ہوئے بھی اس سفرِ غربت میں فقیر بن جائیں۔ اور مستحق امداد بن جائیں یا ان میں کوئی بھی صورت پیش نہ آئے، وقتی حالات کے لئے تالیفِ قلوب ہی ضروری ہوجائے، ان تمام احوال کے پیش نظر حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ان کی مالی اعانتوں کی ترغیب دی کہ حرمِ محترم میں جو بھی غریبوں پر خرچ کیا جائے گا، اس کا اجر ایک لاکھ گنا ہوگا۔ یعنی ایک روپیہ کا صدقہ ایک لاکھ روپے کے صدقے کے مساوی ہوگا۔

حج میں روحانی ترقی کے درجات...... جس کا حاصل یہ ہے کہ غیرِ حرم میں تزکیۂ نفس یا رذیلۂ بخل سے پاکی اور غنائے نفس کا ملکہ ایک لاکھ روپیہ دے کر پیدا ہوتا ہے وہ حرم محترم میں ایک روپیہ دے کر ہوجائے گا، اور روحانی ترقی کے درجات ایک سے ایک لاکھ تک پہنچ جائیں گے، سوکون ہوگا کہ اس ترغیب کے بعد اس بہتی ہوئی سبیل میں ہاتھ تر نہ کرے۔

عالمی حسن سلوک...... پھر قرآن کریم نے حج کی قربانیوں تک میں جو مناسکِ حج میں سے ہیں، غرباء اور ضرورت مندوں کی رعایت فرمائی اور اس حسن سلوک کا سلسلہ بھی عالمی بنادیا، ارشاد حق ہے: ﴿فَكُلُوا مِنْهَا

وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ ① سوان قربانیوں کے جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۔ غرض حج میں جیسے عالمی اخوت ومساوات رکھی گئی ہے ویسے ہی مالی تعاون کو بھی بین الاقوامی بنا دیا ہے۔ کیوں کہ مصیبت زدہ فقیر میں کسی ملک یا وطن کی تخصیص نہیں فرمائی گئی کہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، بلکہ دنیا کے کسی خطہ کے ہوں سب اسی میں داخل ہیں۔

حج میں عالمی تجارت...... سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص صدقہ وخیرات کا جذبہ بھی رکھتا ہے اور غریبوں کی امداد بھی کرنا چاہتا ہے لیکن نقد رقم اس کے پاس اتنی نہ ہو کہ وہ یہ جذبہ پورا کر سکے۔ تو قرآن حکیم نے اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی مالِ تجارت ساتھ لے جا کر فروخت کر سکے جس سے اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں، تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ اس عبادت میں اس سے کوئی فرق پڑے گا۔

ارشاد فرمایا گیا: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ② اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج) میں معاش کی تلاش کرو (جو تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھا) ہے۔

دوسری جگہ ایک دوسرے عنوان سے اسی اجازت کو اس طرح دہرایا گیا ہے کہ اس میں ترغیب دینے کی شان بھی پیدا ہوگئی۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلان کر دینے کا امر فرمایا گیا وہیں یہ بھی ارشادِ حق ہے فرمایا: ﴿لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ ③ (اس اعلان سے لوگ پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، چلے آئیں گے) تاکہ وہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں۔

یہاں منافع کا لفظ عام ہے جس میں اوّلیت کے ساتھ حج کے اخروی منافع جیسے رضاءِ خداوندی، اجر وثواب اور آخرت کی ترقی ءدرجات بھی داخل ہیں اور ثانویت کے ساتھ دنیوی منافع جیسے قربانی کا گوشت کھانا اور کھلانا اور تجارت یا صنعت وحرفت یا علاج معالجہ وغیرہ سے مال کمانا بھی شامل ہیں۔

عالمگیر امدادِ باہمی...... پس قرآن حکیم نے جیسے مناسکِ حج کے سلسلہ میں عالمی اخوت ومساوات کے رشتے قائم فرمائے، ویسے ہی عالمی تجارت اور بین الاقوامی انداز سے صنعت وحرفت کے منافع کا راستہ بھی ہموار فرما دیا۔ تاکہ اخوت ومساوات حسن سلوک کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اور عالمگیر طریق پر امداد باہمی بقائے باہم کے سلسلہ جاری رہیں تاکہ مسلمان کے روابط صرف اپنے ہی ملک کے مسلمانوں تک محدود نہ ہو جائیں بلکہ دنیا کے آخری کناروں تک پہنچیں اور بین الاقوامی بنیں۔

بہرحال حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت، اور بین الاقوامی تعاون کا ایک

---

① پارہ:۱۷، سورة الحج، الآیة:۲۸. ② پارہ:۲، سورة البقرة، الآیة: ۱۹۸.

③ پارہ:۱۷، سورة الحج، الآیة:۲۸.

بے مثال اور عظیم المرتبت نمونہ ہے جس میں مرکز بھی ایک، محبت بھی ایک، اور سب کی انسانیت بھی ایک ہوکر سامنے آتی ہے اور اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت وحقارتِ باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے۔ پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونہ، مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں، ورنہ وہ بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر نہ لائیں۔ وہ صرف مساوات، اخوت اور بھائی چارہ کے الفاظ رٹے ہوئے ہیں۔

جوہرِ تخلیق میں مساوات کا تقاضا......اور شاید وہ بھی اسلام ہی کی اس عام پکار اور دعوت کی بدولت کہ "أنتم بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ" ① "تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے"۔ تم میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے نہ چاند کی، نہ کوئی سونے سے بنا ہوا ہے نہ چاندی سے، نہ کوئی خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے نہ اس کے پیروں سے، بلکہ سب اس کی مشیت وتخلیق سے ایک ہی جوہر سے اور ایک ہی باپ کی اولاد سے پیدا شدہ ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت ومحبت کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ لوگ چاند اور سورج کی اولاد بن کر انسانوں کو اخوت ومساوات کا درس نہیں دے سکتے بلکہ آدم خاکی کی اولاد ہوکر اور آدمیوں میں مل کر ہی یہ سبق پڑھا سکتے ہیں۔ وہ بہت سے خداؤں کے بندے بن کر دنیا کو ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتے بلکہ ایک اور صرف ایک واحدِ قہار اور بے مثل ویکتا خدا کے بندے بن کر ہی وحدیت اور مرکزیت کے نقطہ پر لا سکتے ہیں۔

عالمی اخوت کے مرکزی نقاط......کیوں کہ اسی خدائے واحد وبے مثال نے عالمی اخوت اور محبت کے لئے دنیا میں تین مرکز 1 کلام اللہ 2 بیت اللہ 3 اور رسول اللہ بھیجے ہیں جنہیں عالمی مرکزیت دی ہے۔ قرآن کو ﴿ذِكْرى لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② بتلایا۔

بیت اللہ کو ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ فرمایا اور حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ کہا۔ قرآن سے عالمگیر ہدایت بصورتِ قانون پھیلی، بیت اللہ سے عالمگیر اخوت ومساوات بصورتِ حج ابھری اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے عالمگیر رحمت ومحبت اور انسانیت بصورتِ عمل سامنے آئی۔

طلب صادق......اس لئے جو قومیں صحیح ہدایت، صحیح اخوت ومساوات اور صحیح انسانیت انسانوں میں دیکھنا چاہتی ہیں انہیں ان تین مرکزوں سے چارہ کار نہیں ہے اور یہ پاک پونجی انہیں ان ہی تین دروازوں سے مل سکتی ہے، اگر تعصبات کو چھوڑ کر طلبِ صادق کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گی بلا شبہ کامیاب واپس ہوں گی، حاصل یہ کہ حج جیسے بین الاقوامی اور اجتماعی رنگ کی عبادت ہے، ویسے ہی عالمی اخوت ومساوات اور عالمی امدادِ باہمی کا سرچشمہ بھی ہے۔

قرآن حکیم نے اخوت ومساوات کا ایک مستقل قانون دیا ہے جس کا ایک اہم پہلو حج کی عبادت میں بھی

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب، ج: ۱۱ ص: ۱۶ ! رقم: ۵۱۱۶.

② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الایۃ: ۹۰. ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷.

مضمر تھااس لئے موضوع کی رعایت سے اسی پہلو کو مختصر خطاب اور اس قلیل وقت میں ظاہر کرنا مقصود تھا، ورنہ حج کے سلسلے میں دینی اور دنیوی فوائد اور منافع کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ اتنی نہیں کہ ان چند سطروں میں سما سکے، اس کے لئے دفتر درکار ہیں۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ ①

① ماخوذ از ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک (پشاور)

اہمیت تزکیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . أَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ٥ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (1) صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

حرفِ آغاز...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی چند آیات ہیں جو اس وقت میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے دین کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے۔ جو اصل مقصد ہے اور انسان کی پیدائش کی بنیادی غرض وغایت ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کی تشریح کی جائے، پہلے بطور تمہید کے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے، پھر ان آیات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

خیر وشر سے مرکب مخلوق...... اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان میں اللہ نے دو مادّے رکھے ہیں، ایک خیر کا مادّہ ہے اور ایک شر کا مادّہ ہے، خیر کے مادے سے وہ اچھے افعال انجام دیتا ہے اور شر کے مادے سے برائی، بدی اور معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ کوئی انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ دو مادّے اس کے اندر نہ ہوں۔ انسان، انسان بنا ہی اس لئے ہے کہ اس میں خیر اور شر دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ خیرِ محض ہوتا، تو وہ انسان نہ ہوتا، اس کو فرشتہ کہتے اور اگر شرِ محض ہوتا تب بھی انسان نہ ہوتا، اس کو شیطان کہتے، تو جس میں شر کا نشان نہیں ہے وہ فرشتہ ہے، اور جس میں خیر کا نشان نہیں ہے وہ شیطان ہے۔ انسان دونوں کا مجموعہ ہے۔ کہ وہ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی ہے۔ دونوں مادّے اس کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔

انسان کی ترقّی کا راز...... اور اسی لئے اسی میں ترقی ہے۔ نہ فرشتہ ترقی کر سکتا ہے نہ شیطان، مادی وروحانی جتنی ترقی کی ہے وہ انسان نے کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں دونوں مادّے موجود ہیں۔ اور دو ضدیں جب ٹکراتی

(1) پارہ: ۳۰، سورة الشمس، الآية: ۷، ۱۰.

ہیں تب ہی کوئی تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ترقیات عطاء فرمائی ہیں کہ اس میں یہ دونوں مادّے موجود ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہر انسان میں ایک لَمّۂ خیر کا موجود ہے اور ایک لَمّۂ شر کا موجود ہے۔ یعنی ایک جذبہ اور داعیہ بھلائی کا موجود ہے۔ ایک جذبہ اور داعیہ برائی کا موجود ہے۔ پھر ان دونوں مادّوں کو امداد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو ہی خزانے رکھے ہیں جن سے ان دونوں مادّوں کو امداد پہنچتی ہے۔

جذبات خیر و شر کا محرک...... حدیث میں ہے کہ: ہر قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو خیر کی طرف ابھارتا ہے، اور ہر قلب کی بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ جب یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے؟ فرمایا بَلٰی وَلٰکِنَّہٗ اَسْلَمَ میرے قلب کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے مگر وہ میرے تصرّف اور میری برکت سے مسلمان ہوگیا، اب اگر وہ بھی مجھے امر کرتا ہے تو خیر کی بات کرتا ہے، سُجھاتا ہے تو خیر کی بات سُجھاتا ہے۔''

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر و برکت نے اس کی ماہیت بدل دی کہ بجائے شر کے خود اس میں خیر پیدا ہوگئی۔ مگر بٹھلایا گیا ضرور۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو یہ فرمایا گیا تھا۔ قران کریم سے بھی واضح ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ: ''جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چیختا ہوا اور روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان اس کو چوکے لگاتا ہے۔ اپنے اثرات پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی کوکھ میں اپنی چونچ مارتا ہے تاکہ اس کا اثر پہنچ جائے۔ صرف دو ہستیوں کو مستثنیٰ کیا گیا جن کو شیطان کوئی اثر نہیں پہنچا سکا۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ایک حضرت مریم رضی اللہ عنہا۔ ان کی پیدائش کے وقت شیطان اپنا کوئی اثر نہیں پہنچا سکا''۔

اس سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ بظاہر اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: صرف دو ہی انسان ہیں جن تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم رضی اللہ عنہا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں بلکہ حضرت مریم علیہا السلام بھی۔

لیکن میں نے جو ابھی حدیث بیان کی اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیطان پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر غالب ہوگیا، تو وہ شیطان ہی باقی نہ رہا۔ تو قوی تاثیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نکلتی ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔ وہاں بہت سے بہت یہ ہوا کہ شیطان نہیں آسکا۔ یہاں آ بھی نہیں سکا۔ اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اثر ڈال کر اسے بدل ڈالا، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوئی۔ بہر حال یہ

واضح ہے کہ ہر انسان میں دو مادّے رکھے گئے ہیں ایک خیر کا اور ایک شر کا، اور قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے۔ فرشتہ خیر کی طرف توجہ دلاتا ہے اور شیطان شر کی طرف۔

محرکاتِ خیر وشر کی جنگ اور ان کی مدد...... یہ تو آپ نے بعض اوقات دیکھا ہوگا کہ ایک نیک کام کرنے میں آدمی کو تردّد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا بدی کرنے میں تردّد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں؟ یہ شیطان اور فرشتے کی جنگ کا اثر ہوتا ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ خیر کر، شیطان کہتا ہے کہ شر کر، آدمی تردّد میں پڑتا ہے کہ کیا کروں، جو چیز غالب آجاتی ہے وہی کرتا ہے۔ خیر غالب آگئی تو گویا فرشتے نے غلبہ پالیا، شر غالب آگئی تو گویا شیطان نے غلبہ پالیا، بہر حال ہر انسان میں دو مادّے بھی ہیں اور ان دونوں مادّوں کو امداد بھی پہنچتی ہے، اس لئے انسان دو ہی قسم کے افعال کرتا ہے یا برائی کے یا بھلائی کے، یا نیکی کرے گا یا بدی کرے گا۔

اوامر ونواہی کی حکمت...... یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام دو ۲ حصے لے کر دنیا میں اتری، ایک حصہ اوامر کا ہے۔ حکم دیا گیا کہ یہ کام کرو، یہ تو خیر کو ابھارنے کے لئے ہے، ایک حصہ نواہی اور ممانعت کا ہے کہ ان کاموں کو مت کرو۔ یہ شر کو دبانے کا ہے تو شریعت کے دو ۲ حصے ہیں، ایک ماموارت کا، ایک منہیات کا، ماموارت کا معنی ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور منہیات کا معنی ہے جن کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا اور ان سے روکا گیا۔ ایک طرف کہا گیا کہ تم تو نماز پڑھو، تم عبادت کرو، تم روزے رکھو، تم حج کرو، تم سچ بولو۔ یہ اوامر اور احکامِ خداوندی ہیں، اور ایک طرف نواہی ہیں ''لَا تَقْتُلُوْا. لَاتُسْرِفُوْا. لَا تَزْنُوْا'' نہ چوری کرو، نہ زنا کرو، نہ قتل کرو اور نہ شراب پیو، نہ بدکاری کرو۔ یہ منہیات کا حصہ ہے، اس لئے شریعت کے دو حصے ہوگئے، ایک امر بالمعروف یعنی اچھائیوں کا حکم دینا اور ایک نہی عن المنکر، یعنی برائیوں سے روکنا۔ یہ شریعت کی دو ۲ جانبیں ہیں، ان دو کے بغیر انسان کو ترقی نہیں ہوسکتی، اگر وہ ساری نیکیاں کرتا رہے مگر بدیوں سے نہ بچے، ادھر نماز پڑھتا ہے، ادھر شراب خوری بھی کرتا ہے۔ ادھر روزہ بھی رکھتا ہے، ادھر معاذ اللہ زنا کاری میں بھی مبتلا ہے، اسے کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی نیکیاں اکارت جائیں گی، دونوں چیزیں جب تک جمع نہ ہوں کہ بچنے کی چیزوں سے بچتا رہے، کرنے کی چیزوں کو کرتا رہے، اس کے بغیر انسان کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

تقدیم نواہی...... اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص بیمار ہو، طبیب یہ کہے کہ یہ دوائیں پینی پڑیں گی۔ یہ امر کا حصہ ہے۔ اور فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرنا پڑے گا۔ یہ نہی کا حصہ ہے۔ تو علاج میں دو چیزیں نکلتی ہیں۔ ایک دوا کا پینا، ایک پرہیز کرنا۔ اگر آدمی دوا پیتا رہے مگر پرہیز نہ کرے، بیماری رفع نہیں ہوگی، اطباء ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرہیز کرنا دوا پینے کی نسبت زیادہ مقدم ہے۔ بعض دفعہ دوا نہ بھی پئے۔ پرہیز کرنے سے آدھی سے زیادہ بیماری خود بخود ختم ہوجاتی ہے، اس لئے پرہیز مقدم ہے، اسی طرح سے شریعت میں بچنے کی چیزوں سے بچنا، کرنے کی چیزوں سے زیادہ مقدم ہے، اگر آدمی معاصی سے، بدعملیوں سے اور برائیوں سے بچتا رہا تو اس کے دین کا بہت سا

حصہ محفوظ ہو جائے گا۔ اگر چہ کرنے کی چیزیں اس نے نہیں کیں۔ بہر حال انسان میں بہت حد تک پاکی پیدا ہو جائے گی۔ تو پرہیز دوا سے مقدم ہوتی ہے، مضرت سے بچنا، نفع حاصل کرنے سے مقدم ہوتا ہے۔

ایک تاجر کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجھے نقصان نہ پہنچ جائے، جب نقصان سے بچ گیا تو دوسری سعی ہوتی ہے کہ نفع حاصل کرے۔ تو خسارے اور نقصان سے بچنا مقدم ہے۔ اسی طرح شریعت میں مقدم یہ ہے کہ آدمی بد عملی سے بچ جائے، اس سے کچھ نیکی کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور بد عملیوں میں مبتلا رہنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ آدمی نیکی نہیں کرتا۔ یہ عقلی اصول ہے کہ دفعِ مضرت جلبِ منفعت سے مقدم ہے۔ تو شریعت کے اعمال میں منکرات سے بچنا جتنا ضروری ہے، معروفات پر عمل کرنا اس درجہ کا نہیں، پہلے ضرورت ہے کہ آدمی منکرات سے بچے۔ قتلِ ناحق ہے۔ شراب خوری ہے۔ جوا ہے۔ جھوٹ بولنا ہے۔ رشوت ستانی ہے۔ سود بٹے کا کاروبار ہے۔ ان سے بچنا مقدم ہے، اس کے بعد نماز سے بھی نفع پہنچ سکتا ہے، روزے سے بھی، حج سے بھی، زکوۃ سے بھی، اگر ایک انسان کی کمائی ناپاک ہے، وہ سود خوری بھی کرتا ہے، نفلیں بھی پڑھتا رہے نفلوں کی تاثیر نہیں ہوگی، ممکن ہے فرض ادا ہو جائے، ممکن ہے کہ مفتی فتوی دے دے کہ فریضہ ادا ہو گیا لیکن قلب پر کوئی اثر پہنچ جائے۔ نہیں پہنچے گا جب تک اس چیز سے نہ بچے۔

آدمی چوریاں کرتا پھرے، اور ساتھ ہی روزے بھی رکھتا رہے، بے شک فریضہ ساقط ہو گیا۔ لیکن روزے کی وہ تاثیر کہ نفس پاک بن جائے، نہیں ہوگی، جب تک ایک طرف سے آلائش لگی ہوئی ہے کہ چوری، بدکاری کر رہا ہے، تو بد عملی سے بچنے پر ہی قلب میں نیکی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، اس لئے شریعت کی تاکید ہے۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ پہلے منکرات سے بچنے کی کوشش کرے، بد عملی سے بچے تاکہ نیکی تمہارے لئے کار آمد اور مفید ثابت ہو۔

وسائل منہیات سے احتراز...... ان منکرات میں پھر دو ۲ درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ تو آخری ہے جو اصل مقصد ہوتا ہے اور ایک درجہ اس کے وسائل کا ہے۔ شریعت وسائل سے بھی بچاتی ہے تاکہ مفسد سے آدمی خود بخود بچ جائے۔ مثلاً شریعت نے زنا سے روکا اور فرمایا ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا﴾ ① زنا کے پاس بھی مت پھٹکو، اس لئے کہ وہ فحش اور بے حیائی کی حرکت ہے اور بدترین راستہ ہے جو انسان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے، اور آخرت میں بھی رسوا کرتا ہے، مقصود اصلی زنا سے روکنا ہے۔ لیکن زنا تک پہنچانے والے جو افعال تھے شریعت نے ان سے بھی روکا۔

حکم دیا گیا کہ عورت پر بری نگاہ بھی مت ڈالو، اجنبیہ کی طرف چل کر بھی مت جاؤ، اس کی خوشبو سونگھنے کی طرف بھی ناک کو متوجہ مت کرو، اس کی آواز پر بھی کان مت دھرو۔ حالانکہ آواز کا سن لینا کوئی گناہ نہ تھا، خوشبو کا ناک میں آ جانا کوئی گناہ نہیں تھا، لیکن چوں کہ یہ ایک گناہ کا ذریعہ بنتا ہے، اس واسطے اس سے روک دیا گیا اور کہا

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۲۔

گیا کہ اس سے رکو﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ ① ''اے نبیء کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں سے فرمادیجئے اپنی نگاہوں کو نیچا اور پست کریں۔'' اسی طرح ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ ② اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہ نیچی رکھنے کا حکم کیوں بیان کیا گیا۔؟ اس لئے کہ نگاہ پڑے گی، تو قلب اس سے اثر لے گا، ممکن ہے کہ دل میں فتنہ پیدا ہو جائے یا برائی کا جذبہ پیدا ہو جائے، اس لئے وہیں سے روک دیا۔ اسی طرح سے عورت کی آواز کو بھی عورت کہا گیا ہے کہ اس کی آواز سننے کی بھی کوشش مت کرو۔ بعض دفعہ آواز کی تاثیر سے بھی آدمی کے قلب میں برے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے آواز سے بچایا گیا۔

حکمتِ حجاب...... یہی وجہ ہے کہ عورتوں لئے حجاب رکھا گیا کہ باہر نکلیں تو نقاب ڈال کر نکلیں، کھلے چہرے نہ نکلیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ الْمَرْأَةَ عَوْرَةٌ مَسْتُوْرَةٌ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطٰنُ.'' ③ عورت، مرد کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے، اس کا ناموس اور اس کی آبرو ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے کہ اب کتنوں کو مبتلا کروں گا۔ کسی کو بدنگاہی میں، کسی کو بدخیالی میں مبتلا کروں گا۔ اس واسطے ارشاد فرمایا گیا کہ: جب عورت باہر نکلے تو چہرے پر نقاب ڈال کر نکلے۔

پھر یہی نہیں فقط، یہ بھی کہا گیا کہ خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ خوشبو لگا کر نکلی تو خوشبو پھیلنے پر خیالات متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کو بھی روک دیا گیا، بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ''مَنْ اَصَابَتْ بُخُوْرًا فَهِيَ كَذَا وَكَذَا.'' ④ جو عورت خوشبو لگا کر باہر نکلی، وہ بمنزلۂ زنا کار کے ہے۔ گویا اس نے زنا کر لیا، اور زنا کا راستہ صاف کر دیا۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں یہاں تک بھی ہے کہ وہ گھر میں آ کر غسل کرے۔ اس نے ناپاکی کا راستہ اختیار کیا۔

ممانعتِ اختلاط...... پھر تاکید فرمائی گئی کہ جب عورت باہر نکلے اور نقاب ڈال کر نکلے تو راستے کے بیچ میں نہ چلے، کنارے پر چلے تاکہ مردوں سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہو۔ مسلم کا حق فرمایا گیا ہے سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا۔ عورت کو ممانعت کی گئی کہ اجنبی مردوں کو نہ سلام کرے اور نہ اس کے سلام کا جواب دے۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مرد کا اختلاط پیدا نہ ہو۔ یہی اختلاط برائیوں اور بدعملیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس سوسائٹی میں مرد عورت کا اختلاط بڑھ جائے گا یقیناً وہ سوسائٹی بدکار بن کر رہے گی۔ کتنا ہی وہ دعوے کرے کہ وہ تقویٰ شعار ہے مگر ناممکن اور محال ہے، اس لئے شریعت نے روکا کہ اجنبی مرد عورت کا خلط ملط نہ ہو۔

① پارہ:۱۸، سورة النور، الآية: ۳۰. ② پارہ:۱۸، سورة النور، الآية: ۳۱.

③ الجامع للترمذي، كتاب الرضاع، باب ماجاء في كراهية الدخول على المغيبات، ج:۴ ص:۴۰۶.

④ الحديث اخرجه الامام مسلم في صحيحه ولفظه: ايما امرأة اصابت بخوراً فلا تشهد معنا العشاء الآخرة، ج:۲ ص:۴۴۸.

اوّل تو بے ضرورت گھر سے باہر جانے کی ممانعت ہے، لیکن اگر کسی ضرورت سے جائے تو نقاب ڈال کر جائے، نقاب بھی ڈال کر جائے تو راستے کے کناروں پر چلے وسط میں نہ چلے، کناروں پر بھی چلے تو خوشبو لگا کر نہ چلے کہ وہ خود کو لوگوں کی توجہالت کا ذریعہ بنائے۔ یہ سب چیزیں اس لئے کہ اختلاط نہ ہونے پائے۔

مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابیہ رضی اللہ عنہن کی شرکتِ جماعت کے لئے درخواست......

حدیث میں ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے جو ایک انصاری عورت صحابیہ رضی اللہ عنہا ہیں اور خیر القرون ہے۔ نیکی ہی نیکی مردوں اور عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ غرض ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک درخواست پیش کی اور عرض کیا ''یارسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں مسجدِ نبوی میں آ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں میری نماز ہو''۔ کتنی پاکیزہ درخواست پیش کی!

اول تو نماز افضل العبادات ہے کہ اس سے اونچی کوئی عبادت نہیں، اس کی درخواست کی۔ پھر اس عبادت کی درخواست بھی کہاں کی؟ مسجدِ نبوی میں۔ جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے۔ کون سے امام کے پیچھے درخواست کی؟ جو عالم میں سب سے افضل ہستی اور ذات بابرکات ہے۔ اور کس جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھنے کی درخواست کی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں جن کے بارے میں مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ امت میں بڑے سے بڑا قطب، غوث کسی مقام پہ پہنچ جائے۔ صحابیت کے مقام کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تمام امت سے بالا جماع افضل ہیں۔ تو کتنی پاکیزہ درخواست کی کہ افضل العبادات نماز کی درخواست تھی۔ بہترین اور اعلیٰ ترین مسجد میں نماز پڑھنے کی درخواست تھی۔ اعلیٰ ترین جماعت میں شامل ہونے کی درخواست تھی اور اعلیٰ ترین امام کے پیچھے نماز کی درخواست تھی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''صَلٰوتُکِ فِیْ دَارِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا. '' تیرا نماز گھر میں پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ پھر فرمایا: ''وَصَلٰوتُکِ فِیْ بَیْتِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ دَارِکِ.'' اور گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے بہتر گھر کے دالان میں نماز پڑھنا ہے۔ پھر فرمایا: ''وَصَلٰوتُکِ فِیْ مِخْدَعِکِ خَیْرٌ مِنْ صَلٰوتِکِ فِیْ بَیْتِکِ.'' ''اور گھر میں بھی اندر کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ گھر کے دالان میں نماز پڑھنے سے۔''①

گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ جس حصے میں پردہ بڑھتا گیا، اس حصے میں افضلیت بڑھتی گئی ہے۔ مسجد میں جانے کی بہ نسبت گھر میں عورت زیادہ پردہ نشیں ہے تو اس میں نماز افضل قرار دی گئی، پھر گھر کے صحن سے دالان میں زیادہ پردہ ہے کہ آسمان سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں بہ نسبت صحن کے افضل ہے، پھر اندر کی کوٹھڑی

① مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الصلوٰة، باب من کرہ ذالک (خروج النساء الی المسجد) ج: ۲ ص: ۲۷۷.

دالان سے زیادہ افضل ٹھہرائی گئی کہ اس میں اور بھی زیادہ پردہ ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جتنا زیادہ پردہ ہوگا، جتنا زیادہ چھپنا ہوگا، اتنی ہی زیادہ افضلیّت عورت کے لئے بڑھتی جائے گی۔

حتیٰ کہ مسجدِ حرام ومسجد ابراہیمی مکّہ مکرّمہ میں جس کے حج کے لئے عالم جاتا ہے۔ جو ہم سب کی عبادت کا مرکز ہے کہ جب تک ہماری اپنی مسجد کا رخ مسجدِ حرام کی طرف نہیں ہوگا اس وقت تک قبول نہیں ہوگی۔ گویا ہر مسجد، مسجد حرام کی طرف رخ کئے ہوئے ہے۔ اس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ: ''وہاں ایک نماز پڑھنا، ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے''۔

گویا ایک لاکھ گنا اجر ملتا ہے۔ لیکن عورت کے لئے یہ افضلیت نہیں رکھی گئی۔ عورت وہاں بھی اگر گھر میں پڑھے گی تو اس نماز سے زیادہ افضل نماز ہوگی جو کہ وہ مسجدِ حرام میں نماز پڑھتی۔ تبرکاً آدمی عورت کو اجازت دے دے کہ وہ کسی نہ کسی وقت جا کے مسجد حرام میں نماز پڑھ لے۔ لیکن وہ اتنی پابندی نہ کرے کہ دھوپ ہو، گرمی ہو، کسی نہ کسی طرح پہنچے۔ فرمایا افضل یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھے، اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ وہاں اجنبی مردوں کا ہجوم ہے، اختلاط زیادہ پڑھے گا، ممکن ہے کہ قلب میں کوئی فساد پیدا ہو جائے۔ ممکن ہے کوئی برائی آ جائے، ممکن ہے کوئی برائی پیدا ہو۔ تو شریعت چاہتی ہے کہ نفسِ انسانی کو پاک بنایا جائے جس میں خیالات بھی برے پیدا نہ ہوں، اس لئے ان اسباب کو قطع کیا جائے گا جن سے کوئی بدخیالی پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ کیفیت کیوں ہے؟ دراصل اسے اُسی بری حرکت سے بچانا ہے، یہ چیزیں اس برائی کا جسے زنا کہتے ہیں، ذریعہ بن سکتی تھیں، تو یہیں سے روک دیا گیا۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہتے ہیں۔ یعنی وسائل سے روک دیتے ہیں تا کہ آدمی مقاصد سے بچ سکے۔ اگر وسائل اور ذرائع میں پھنس گیا تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور مقصد تک پہنچ جائے گا۔

طریقِ تربیّت ...... حدیث میں ہے کہ: '' مَآ اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ۔ '' [1] جس چیز کے بہت سے حصے میں نشہ ہے اس کا تھوڑا حصہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کا جیسے ایک گھونٹ ممنوع ہے، ایک قطرہ چکھنا بھی ممنوع ہے، حالاں کہ ایک قطرہ پینے سے نشہ نہیں پیدا ہوتا، اور شراب نشے کی وجہ سے حرام کی گئی ہے، تو ایک قطرہ پی لینا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس میں حکم کی علت نہیں پائی جاتی اور وہ نشہ ہے۔ جب ایک قطرہ چکھنے میں نشہ نہیں ہے تو جائز ہوتا، مگر اسے ناجائز قرار دیا گیا۔ کیوں۔؟ اس لئے کہ جس نے آج ایک قطرہ چکھا ہے، وہ کل ایک گھونٹ بھی پیئے گا۔ اور جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، وہ پرسوں کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔ اور جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا وہ چند دن کے بعد شرابی بن جائے گا۔ شرابی بننے سے روکنا اصل مقصود ہے۔ تو ایک قطرہ سے رکاوٹ شروع کی تا کہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حدیث میں ہے کہ: ''مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

[1] السنن لابن ماجه، کتاب الاشربة، باب مااسکر کثیره فقلیله حرام ج: ۱۰ ص: ۱۷۱ حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج:۷ ص: ۳۹۳ رقم : ۳۳۹۳.

وَسَلَّمَ." ① "حدیث میں ہے کہ: جو کسی جادوگر کے پاس گیا اس نے شریعتِ محمدی کے ساتھ کفر کیا"۔ حالاں کہ کفر جب ہوتا ہے جب آدمی توحید کا انکار کردے، نبوت کا انکار کردے قیامت کا انکار کردے، تب کفر لازم ہوتا ہے۔ جادوگر کے پاس جانے سے تو بظاہر کفر نہیں آنا چاہئے۔

مگر اسے کفر کیوں قرار دیا گیا؟ نتیجے کے اعتبار سے کہ جو آج جادوگر کے پاس گیا ہے تو اوّل تو اس کے دل سے جادو کی برائی نکلے گی۔ کل کو وہ فرمائش کرے گا کہ تو کچھ جادو کر۔ پرسوں کو وہ سیکھے گا کہ مجھے بھی یہ تعویذ اور منتر سکھلا دے اور ترسوں کو اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے ہی سے روک دیا گیا۔ کہ جادوگر کے پاس جاتے ہی کیوں ہو؟ اور یہ نوبت آئے ہی کیوں؟ تو یہ سدِ ذرائع ہے کہ وسائل سے روک دیتے ہیں تا کہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچ پائے۔

آج کی عورت کا تمدّن...... اب آج کی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو ہم سب سے زیادہ منکرات میں گرفتار ہیں۔ یعنی کہا تو یہ گیا ہے کہ اجنبی عورت باہر نہ نکلے بے پردہ نہ نکلے، آج عورتوں کا کیا' قوم کا شعار اور تمدن یہ بن گیا ہے کہ جتنی عورت زیادہ سے زیادہ باہر جائے اسے تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ حدیث میں صاف فرمایا گیا اور خبر دی گئی کہ "رُبَّ کَاسِیَاتٍ عَارِیَاتٍ مَائِلَاتٍ مُمِیْلَاتٍ لَایَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ." ② بہت سی عورتیں جو لباس پہنی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی ننگی ہیں۔ وہ نکلیں گی کہ لباس بھی پہنے ہوں گی، مگر پھر بھی عریاں ہوں گی، خود بھی اجنبیوں پر مائل ہوں گی، دوسروں کو بھی اپنی طرف مائل کریں گی ان کو جنت میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جنت کا مقامِ کریم ان کا ٹھکانا نہیں ہوگا جب تک انہیں سزا دے کر پاک نہ بنایا جائے یا جو بھی اللہ چاہے، ایکا ایکی وہ اس مقامِ کریم میں داخل ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔

فرمایا گیا کہ ایک وقت آئے گا کہ عورتوں کے سر ایسے ہوں گے جیسے اونٹ کی کوہان حرکت کرتی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی بال اس طرح سے بنائیں گی جیسے اوپر ایک ٹوکرا سا رکھا ہوا ہو اور معلوم ہو کہ اونٹ کی کوہان ہے۔ آج ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔ اسی طرح سے مائلات بھی ہیں اور ممیلات بھی ہیں اور کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں۔

لباس کی عریانی...... لباس پہنے ہوئے ہیں اور پھر عریاں ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لباس ہی ناقص ہو۔ جیسے آج کل ہے کہ پنڈلیاں بھی کھلی ہوئی ہیں بازو بھی کھلے ہوئے ہیں۔ سینہ بھی کھلا ہوا، پشت بھی کھلی ہوئی اور سر بھی کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ عورت کا بدن گردن سے لے کر ٹخنوں تک ستر قرار دیا گیا ہے کہ اس کو وہ نہ چھپائے تو نماز نہیں ہو سکتی۔ سوائے خاص حالتوں کے۔ تنہائی میں بھی اس کا چھپانا ضروری ہے۔ چہ جائے کہ بھرے مجمعوں

① الصحیح لمسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکهانة، ص: ۱۰۷۴، رقم: ۵۸۲۱.

② الصحیح لمسلم، کتاب اللباس و الزینة، باب النساء الکاسیات...... ص: ۱۰۵۸، رقم: ۵۵۸۲.

میں عورتیں ستر کھول کر نکلیں۔ تو ایک تو لباس کے ناقص ہونے کی وجہ سے عریانی ہو اور لباس ہی ناتمام ہو کہ گھٹنے ٹخنے سب ننگے۔ اور ایک یہ کہ لباس تو پورا ہو، گردن سے لے کر ٹخنے تک سب بدن چھپا ہوا، لیکن اتنا باریک ہو کہ چھپنے کے باوجود بدن اندر سے ڈھپک رہا ہے۔ یہ بھی کاسیات اور عاریات میں داخل ہے کہ لباس بھی ہے اور عورت پھر بھی ننگی ہے۔ اتنا باریک لباس نائیلون کا پہن لیا کہ وہ لباس نظر نہیں آتا، مگر بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس سر سے پیر تک ہو اور موٹے کپڑے کا ہو مگر بدن کے اوپر اتنا چست ہو کہ بدن کی ساری حیثیت نمایاں ہو رہی ہے۔ یہ بھی اس کا فرد ہے۔ جیسے آج کل ہم سنتے ہیں کہ ایک لباس چلا ہے جسے ٹیڈی کہتے ہیں کہ پاجامہ ہے تو وہ اتنا کسا ہوا اور چست ہے کہ اس میں ران اور پنڈلی کی پوری حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ نظر نہ آئے۔ غرض ایک عُریانی یہ ہے کہ لباس ناتمام ہو، اور ایک یہ کہ لباس پورا ہو مگر اتنا باریک ہو کہ بدن کو چھپا نہ سکتا ہو۔ اور ایک یہ کہ لباس پورا بھی ہو اور موٹا بھی ہو مگر چست اتنا ہو کہ بدن کی حیثیت نمایاں کرتا ہو۔ یہ سب کاسیات و عاریات کہ لباس پہنے ہوئے ہو کر بھی عریانی کے افراد میں داخل ہیں۔ اس کو فرمایا گیا: ''لَا یَدْخُلْنَ الْجَنَّۃَ.'' وہ جنت کی ہوا نہیں پائیں گی، مقامِ کریم تک نہیں پہنچیں گی۔ انہیں رضائے خداوندی کا مقام حاصل نہیں ہوگا۔ آج نماز، روزہ جتنا ضروری ہے ان سے زیادہ ان چیزوں سے بچنا اور بچانا ضروری ہے کہ ہم خود بھی بچیں اور اپنی نسلوں کو بھی بچائیں اور اپنی عورتوں کو بچائیں۔

اجتنابِ منکرات کی تاکید...... شریعت نے یہاں تک اس کی تاکید کی ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہوں، ابھی جوان بھی نہیں ہوئے، دس گیارہ برس کے ہیں تو فرمایا گیا کہ: دونوں کو تنہا مکان میں مت چھوڑو، ایک چارپائی پر شریعت نے دو بہن بھائی کو لیٹنے کی اجازت نہیں دی، حالاں کہ حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ابھی بالغ بھی نہیں ہیں۔ مراہقت کا درجہ ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر ہے۔

مثل مشہور ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ شیطان کو آتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے۔ شریعت رحیم و کریم ہے وہ ایسے اسباب ڈالتی ہے کہ ہر انسان مقدس اور منزہ بنے، پاک اور پارسا بنے، تو ان اسباب سے بچنا پڑے گا جو تقویٰ و طہارت اور پارسائی میں حارج ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ جتنا کہ فرائض کا انجام دینا ضروری ہے، ایک طرف آپ نماز پڑھیں اور ایک طرف گھر کی معاشرت جو بدکاری کی طرف جارہی ہو اسے نہ روکیں تو وہ نماز بھی اپنا اثر نہیں دکھائے گی جب تک ان چیزوں سے بچاؤ نہ ہو، دوا اثر نہیں دکھلائے گی، جب تک پرہیز نہ کیا جائے، ایک طرف تو زکام کی حالت میں آپ نے گلِ بنفشہ پیا اور دوسری طرف آپ نے سیر بھر دہی برف ملا کر پی لیا، تو گل بنفشہ کا ایسے میں کیا اثر ظاہر ہوگا؟ غرض منکرات سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے، جتنا کہ معروف چیزوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

سوسائٹی کی تباہی کے عوامل...... اور منکرات میں بھی چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، مجھے حضور نے فرمایا اے عائشہ! ''اِيَّاکِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ.'' حقیر گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کرو، بڑے بڑے گناہوں سے تو آدمی کبھی وضع داری اور ظاہرداری کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ایک اچھی سوسائٹی میں بیٹھنے والا کبھی کھلے بندوں شراب نہیں پئے گا۔اس کا جی تو چاہتا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ایسا بڑا آدمی اور شراب خانوں میں بیٹھا ہے۔تو اس سے بچنا کبھی سوسائٹی کی وجہ سے بھی ممکن ہوتا ہے۔لیکن چھوٹے چھوٹے گناہ جن کی طرف کسی کی بھی نگاہ نہیں جاتی، انہیں آدمی کرتا رہتا ہے۔اس کو یہ سمجھتا ہے کہ وضع داری کے خلاف مجھ پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ان سے بچنے کی زیادہ کوشش کرو، وہی آدمی کے قلب کا ناس مارتے ہیں، آپ اجنبیہ کی طرف نگاہ ڈال دیں کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی بھی نہیں سمجھے گا، لیکن اس سے بچنا، اس سے زیادہ ضروری ہے جتنا زنا سے بچنا کیوں کہ آگے بڑھنے کا یہی راستہ ہے۔

تو۔''اِيَّاكُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ.'' ① سب سے زیادہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو جن کو آدمی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی گناہ ہوگا۔اور کر بھی لیتا ہے۔اور انجام کار وہ بڑی برائی کی طرف پہنچا دیتے ہیں۔سوسائٹی جو تباہ ہوتی ہے۔وہ منکرات سے تباہ ہوتی ہے۔اس واسطے ان سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

اخلاقی جرأت کے بغیر استیصالِ جرائم ممکن نہیں......اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ قلب کے اندر پارسائی کا جذبہ پیدا نہ کرلیا جائے، یعنی دوسرے روکتے ہیں اور آپ رکتے ہیں۔اسے رکنا نہیں کہتے، یہ تو مجبوری کا رکنا ہے، آپ کے قلب کے اندر خود داعیہ پیدا ہو کہ مجھے رکنا چاہئے اگر قانون آپ کو روکے اور آپ رک جائیں، یہ مجبوری کا رکنا ہے۔ہزاروں جرائم اور ہزاروں برائیاں ہیں کہ قانون سے ان کا استیصال نہیں ہوسکتا، قانون سے وہ جرائم بند نہیں ہوسکتے جب تک خود انسان میں بچنے کی اخلاقی جرات نہ ہو اور اپنے اندر جذبہ نہ ہو۔

ایک تھیلی میں بھرا ہوا تین لاکھ روپیہ ایک تنہا مکان میں رکھا ہوا ہے، وہاں پولیس کا بھی کوئی آدمی نہیں، سی آئی ڈی کا بھی کوئی آدمی نہیں۔اگر آپ اٹھالیں کوئی روکنے والا نہیں۔پھر بھی اگر آپ رکتے ہیں۔تو کیوں رکتے ہیں؟ اللہ کا خوف آپ کو رکاوٹ ڈالتا ہے۔تو اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے، پولیس نہیں بچا سکتی۔

قوانین کی کثرت سے جرائم کم نہیں ہوسکتے......اگر پولیس سے، ہتھیاروں سے، اور فوجی قوتوں سے گناہوں سے روکا جاسکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی، نہ پولیس کی کمی، نہ ہتھیاروں کی کمی۔زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں، فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے۔پولیس اتنی کبھی نہیں، جتنی آج ہے۔حتیٰ کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔لیکن یہ چیزیں بڑھتی جارہی ہیں جرائم بھی بڑھتے جارہے ہیں۔بناوہی ہے کہ جرائم کا روک لینا، پولیس

---

① مسند احمد، حدیث ابی مالک سهل بن سعد الساعدیؓ ج:۴۶ ص:۲۹۲. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب للالبانی، الترغیب فی الامر ج:۲ ص:۳۲۴.

کا کام نہیں ہے، محض قانون کا کام نہیں، جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو، اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔

تقویٰ شعار ہی جرم سے بچتا ہے...... حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ جو خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہی سنایا تھا کہ وہ سہارنپور کا سفر فرما رہے تھے۔ اور سہارنپور کے گنّے مشہور ہیں، بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ تو دو تین دھڑی گنّے خرید لئے۔ اتفاق سے ساتھ میں دو ایک مسلمان چیکر بھی تھے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "بھائی! کانٹے پر جا کر انہیں تلوا دو۔ تا کہ محصول ادا کر دوں"۔ وہ جو چیکر ساتھ تھے، انہوں نے کہا، حضرت! اس کی ضرورت نہیں، ہم ہی تو چیک کرتے ہیں اور ہم ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ بے تکلف رکھیئے۔ فرمایا "بھائی! مجھے آگے جانا ہے"۔ انہوں نے کہا، آگے آپ کہاں جائیں گے؟ فرمایا "فی الحال تو میں کانپور جا رہا ہوں۔ اور آپ لوگ غازی آباد میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دلی چلیں جائیں گے۔ پھر آگے کیا ہوگا؟ وہ دوسرے چیکر آئیں گے۔ اور وہ ڈبل محصول لیں گے، ممکن ہے کہ وہ جرمانہ بھی ڈالیں، تو آپ مجھے مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے کہا کہ ہم غازی آباد میں اس گاڑی کے چیکر کو کہہ دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں روکیں گے۔ فرمایا۔ "جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور دروازے سے باہر جاؤں گا تو وہاں ٹکٹ لینے والا کھڑا ہوگا، وہ کہے گا۔ انہوں نے کہا۔ ہم ان چیکروں کے ذریعے اس بابو سے بھی کہلوا دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں چھیڑے گا۔

اس پر فرمایا "بھائی! مجھے اور آگے جانا ہے۔" انہوں نے کہا، حضرت! آگے اور کہاں جانا ہے۔ بس آپ گھر پہنچ گئے، فرمایا، "اس سے بھی آگے جانا ہے"۔ "مجھے اللہ کے پاس بھی تو جانا ہے، مجھے اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے اگر چیکر نے چھوڑ دیا اور گھر تک پہنچ گیا، مگر قبر اور حشر میں میرا کیا حال ہوگا۔ پھر مجھ سے گرفت ہوگی کہ تم نے کیوں یہ ناجائز حرکت کی؟ تم نے قانون کی یہ چوری کیوں کی۔؟ اس وقت میں کیا جواب دوں گا؟ اس لئے آپ مہربانی کر کے تلوا دیں، میں یہیں سے محصول دیئے دیتا ہوں تا کہ میں دنیا اور آخرت کی گرفت سے بچا رہوں"۔

یہ چیز تھی جس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بچایا، اور ہر مسلمان کو بچانے والی چیز یہ "خوفِ خداوندی" ہے جو قلب کے اندر ہوتا ہے، یہ جرائم سے بچاتا ہے، قانون منظر عام کی برائیوں کو روک سکتا ہے، اگر آپ کھلے بندوں ڈکیتی ڈال رہے ہوں یا کھلے بندوں بدامنی کی، پولیس آ کر آپ کو پکڑ لے گی، مگر جہاں تنہائی میں چھپ کر بدامنی ہوتی ہے، جہاں پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو وہاں بچانے والا کون ہے، وہ تو وہی اپنا ضمیر اور اپنا قلب بچائے گا۔ تو سب سے بڑی پولیس وہ قلب کا جذبہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، ایک بھی پولیس نہ ہو اور قلب کے اندر جذبہ موجود ہو آدمی خود بخود بچے گا۔

انسدادِ جرائم میں پارلیمنٹ کی ناکامی...... دو واقعے مجھے یاد آئے۔ اور دونوں میں فرق کا آپ اندازہ کریں۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کچھ عرصہ ہوا ہے کہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا کر شراب کی بندش ہونی

چاہئے۔ چناں چہ جتنے ذمہ داران حکومت تھے وہ اس پر متفق ہو گئے کہ شراب کو بند ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو شراب بندی کا قانون بنائے۔ اس کے لئے کتنے لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ برس ڈیڑھ برس میں وہ قانون تیار ہوگا تو قانون بنانے والوں کی تنخواہیں دی جائیں گی، دفتری اخراجات ہوں گے، تو لاکھوں روپے کا بجٹ منظور ہوا۔ برسوں میں وہ قانون تیار ہوا۔ جب قانون بن گیا، اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا، اس کی پہلی خواندگی ہوئی۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے منظور کر کے یہ حکم جاری کیا کہ پبلک میں اس کا اشتہار دیا جائے اور اس قانون کو عام کیا جائے، تاکہ اس کے بارے میں رائے عامہ معلوم ہو۔ اس کی لکھائی چھپائی اور رائج کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کا بجٹ منظور ہوا، تاکہ اس قانون کو چھاپ کر پورے ملک میں شائع کریں۔ تاکہ جتنے اہل فکر ہیں وہ اس پر رائے زنی کریں۔

ایک عرصے تک اس کو منتشر رکھا گیا اور پھیلایا گیا، تاکہ لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔ جب رائیں آ گئیں پھر وہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا، پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا، اب اس کو چلانے کے لئے کئی کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ زائد پولیس رکھی جائے جو اسے جاری کرے اور نافذ کرے، تاکہ اہلِ ملک اس پر عمل کریں، گویا کروڑوں روپے خرچ کر کے قانون بنا اور وہ جاری کر دیا گیا۔ پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایک برس کے بعد رپورٹ کرے کہ اس پر عملدر آمد کیسا رہا، اور اس کے کیا اثرات نمایاں ہوئے؟ برس دن کے بعد پولیس نے رپورٹ دی کہ پہلے اگر شراب پینے والے پچاس ہزار تھے تو اب ایک لاکھ بن گئے ہیں۔ یہ اس کا اثر نمایاں ہوا۔ اور وہ کیوں نمایاں ہوا؟

اس لئے کہ پہلے شراب خانے کھلے ہوئے تھے، ہزاروں آدمی پیتے تھے۔ مگر بہت سے وضعدار لوگ اس لئے نہیں پیتے تھے کہ ہماری ساکھ پر دھبہ آئے گا، لوگ ہمیں برا سمجھیں گے کہ یہ شرابیوں کی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ بچتے تھے اور اکا دکا آدمی چھپ چھپا کر پی لیتا تھا۔

لیکن جب قانون کی بندش ہوگئی، اور سب کو روک دیا گیا تو سب نے بلیک کر کے اسے چوری سے پینا شروع کیا، تو جو لوگ وضعداری کی وجہ سے کھلم کھلا نہیں پی سکتے تھے، انہوں نے کہا کہ اب جب سارے چوری سے پی رہے ہیں تو ہم بھی چوری سے پینے لگیں، تو پہلے پینے والے پچاس ہزار تھے، اب ایک لاکھ بن گئے۔ یہ گویا اس قانون کا نتیجہ نکلا۔ گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ یہ حکومت کے وقار کے خلاف ہے کہ اس قانون کو واپس لیا جائے۔ قانون جاری رہے اور پولیس داروگیر کرتی رہے تو قانون بھی چلتا رہا۔ اور شراب خوری بھی چلتی رہی۔ دونوں چیزیں اپنی جگہ رہیں۔ انسداد نہیں ہوسکا، بالکل شراب بند نہیں ہوسکی، پینے والے پیتے رہے، چوری سے پیتے رہے گویا وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ اکارت گیا جو صرف کیا گیا تھا۔ جو پہلے صورت تھی وہی اب ہے بلکہ بری ہوگئی کہ چھپ چھپ کر لوگ پیتے ہیں ایک تو یہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ اور ایک دوسرا واقعہ سامنے رکھیئے۔

انسدادِ جرائم میں اسلام کا طریق کار...... اسلام سے پہلے زمانہء جاہلیت میں شراب عام تھی، تمام عرب پیتے

تھے، شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، حتی کہ بچہ پیدا ہوتا تو پہلے اس کو شراب چٹاتے تھے۔ اتنی شراب عام تھی۔ اسلام آنے کے بعد بھی شراب رائج رہی، لوگ پیتے رہے۔ مسلم بھی ہیں اور پیتے بھی رہے۔ لیکن جب وقت آیا کہ شراب کو بند کیا جائے، تو ایکا ایکی حکم نہیں دیا گیا کہ روک دو، سب سے پہلے چیز یہ تھی کہ قلوب میں ایک سوال پیدا ہوا۔ قرآنِ کریم نے اس کو نقل کیا۔ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ ① اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں" ﴿قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ② آپ فرمادیں کہ جوئے اور شراب میں کچھ نفع ہے، کچھ نقصان ہے، مگر نقصان غالب ہے، نفع مغلوب ہے۔ نقصان زیادہ ہے نفع کم ہے۔

﴿اِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ ③ شراب اور جوے کا نقصان زیادہ ہے، نفع کم ہے۔ بس اتنی آیت نازل ہوئی، شراب پینے کی ممانعت نہیں فرمائی گئی، صرف اس کی مذمت بیان کی گئی، تو حدیث میں ہے کہ: بہت سے وہ خواص صحابہ رضی اللہ عنہم جو منشاءِ نبوّت کو سمجھتے تھے، انہوں نے آج ہی سے شراب ترک کر دی کہ جب اللہ تعالیٰ نے نقصان بیان کیا ہے تو شراب پسند معلوم نہیں ہوتی۔

غرض بہت سے حضرات نے تو اسی دن ترک کر دی تھی۔ لیکن کچھ لوگ پیتے بھی رہے۔ چند دن کے بعد ایک دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور ایک دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی﴾ ④ اے ایمان والو! شراب پی کر نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو"۔ تو نمازوں کے اوقات میں شراب ممنوع قرار دی گئی۔ نمازوں کے اوقات کے سوا لوگ پیتے رہے، نماز کی حالت میں شراب پی کر جانا حرام قرار دیا گیا، گویا پانچ اوقات میں بندش ہوئی، باقی اوقات میں جائز ہوئی۔ اس آیت کے اترنے کے بعد ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے شراب ترک کر دی کہ رخ یہ بتلا رہا کہ یہ ممنوع کی جائے گی، اللہ کو یہ پسند نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد تیسرا حکم نازل ہوا ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ⑤ "اے اہلِ ایمان! یہ شراب اور جوا، اور یہ فال نکالنے کے تیر وترکش یہ شیطانی حرکتیں ہیں ان کے پاس بھی مت پھٹکو۔ آج مکمل طور پر شراب حرام ہوئی"۔ حدیث میں ہے کہ: جس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے، جس کے گھر میں دس مٹکے تھے، اس نے وہ پھوڑ دیئے، جس کے ہاں ایک مٹکا تھا، اس نے وہ توڑ دیا، اور مدینے کی گلیوں میں، نالیوں میں شراب اس طرح بہتی پھر رہی تھی جیسے برسات میں پانی برستا ہے۔ ایک قطرہ کسی کے گھر میں باقی نہیں رہا۔

تو آپ نے فرق دیکھا کہ امریکہ نے کئی کروڑ کا بجٹ منظور کیا اور ثمرہ یہ نکلا کہ پینے والے دگنے ہوگئے، اسلام کے دور میں نہ بجٹ منظور ہوا، نہ ایک کروڑ کا، نہ ایک پیسے کا۔ ممانعت کا حکم بھی پوری طرح سے نہیں آیا کہ

①②③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۱۹۔
④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۴۳۔ ⑤ پارہ: ۷، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۹۰۔

لوگوں نے شراب کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ اور ایک ایک گھر پاک اور صاف ہو گیا۔

قانونِ حکومت اور قانونِ الٰہی کا فرق...... فرق کیا تھا؟ وہاں قانون کا دباؤ تھا، یہاں اللہ کا خوف تھا، خوفِ خداوندی آیا تو شراب کا استیصال ہو گیا اور جڑ کٹ گئی، وہاں قانونِ محض کا دباؤ تھا۔ تو قانونِ محض سے جرائم بند نہیں ہوا کرتے جب تک اپنے قلب میں اللہ کا خوف اور ڈر موجود نہ ہو۔ تو شریعتِ اسلام برائیوں اور منکرات سے بچانا چاہتی ہے، مگر دباؤ سے نہیں۔ اس کے ذریعے بچانا چاہتی ہے کہ خود تمہارے ضمیر کے اندر دباؤ پیدا ہو۔ ضمیر خود کہے کہ یہ بری چیز ہے۔ ہم اسے چھوڑنا چاہتے ہیں۔

حقیقتِ معصیت...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''مَاالْاِثْمُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ.'' یارسول اللہ، گناہ کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ شراب پینا گناہ ہے، زنا کرنا گناہ ہے، چوری کرنا گناہ ہے، یہ نہیں فرمایا۔ کیا فرمایا؟ ''مَاحَاکَ فِیْ صَدْرِکَ'' ① ''تم پوچھتے ہو گناہ کیا ہے؟ جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے وہ گناہ ہے۔ اسے ترک کر دو، جس کو تم کھلے بندوں نہ کر سکو، لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے شرماؤ، سمجھ لو، وہ برائی ہے اور گناہ ہے، بس اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ گویا گناہ سے بچنے کا تعلق قلب سے رکھا گیا۔ ماحاکَ فِي صدرِکَ، جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کر دے، اس سے بچو۔ یہ نہیں کہا گیا جس سے پولیس روکے اس سے بچو، جس سے حکومت اور فوج روکے اس سے بچو، اس لئے کہ وہ منظرِ عام کی چیزوں سے روکیں گی، اور دل میں تمہارے کھوٹ رہا تو آنکھ بچا کے پھر تم وہی حرکت کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دل پاک ہو۔ فقط ہاتھ اور پیر کے پاک ہونے سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ جب چور کو جیل میں بند کر دیتی ہے۔ وہ یقیناً اتنے دن چوری سے بچا رہے گا جتنے دن جیل میں رہے، لیکن اس کے قلب سے چوری کا جذبہ نہیں نکلتا، وہ اس ارادے میں ہے کہ جب چھوٹوں گا پھر آ کر وہی حرکت کروں گا۔ بلکہ بعض چور تو یہ کہتے ہیں کہ گھر ویسی اچھی روٹی نہیں ملتی جتنی آزادی سے جیل میں ملتی ہے، اس لئے ایک دفعہ پھر چوری کروتا کہ بڑے گھر میں پہنچ جاؤں، بے محنت روٹی ملے گی۔ اسلام چاہتا ہے کہ قلوب پاک کئے جائیں، قانون فقط بدن کو پاک کرے گا، قلب کو پاک نہیں کرے گا، دنیوی حکومتوں کا قانون بدن پر نافذ ہوتا ہے، لیکن اللہ کا قانون دلوں پر نافذ ہوتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کی حکومت فقط ظاہر پر ہوتی ہے۔ اللہ کی حکومت باطن کے اوپر بھی ہے، اس کا قانون جیسے ظاہر کو روکے گا، ویسے باطن کی برائی کو بھی روکے گا، تو شریعت تو یہی چاہے گی کہ فقط یہ نہ ہو کہ تم زنا سے بچ جاؤ، یہ ہو کہ زنا کا خیال بھی نہ لاؤ، بلکہ یہ ہو کہ تمہارے قلب میں زنا سے اس طرح نفرت ہو جائے جس طرح نجاست سے نفرت ہوتی ہے، شراب خوری سے تمہیں اس طرح نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانے سے نفرت ہوتی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والاثم، ص: ۱۱۲۶، رقم: ۲۵۱۶.

ہے۔ یہ جب ہوگا۔ جب قلب پاک ہوگا۔

تربیّت کا مرکزی نقطہ...... تو سب سے بڑی چیز اسلام میں ''تزکیہء قلوب'' یعنی دلوں کو پاک بنادینا ہے تاکہ جذبات صالح پیدا ہوجائیں، برے جذبات مغلوب ہوجائیں۔ مطمئن ہوکر رہیں، اس لئے فرماتے ہیں کہ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ ① فلاح وہ پائے گا جو اپنے نفس کو پاک کرے گا۔ یہ نہیں کہا کہ فلاح وہ پائے گا جو برائی چھوڑ دے گا اور برے عمل سے بچ جائے گا، عمل چھوڑ دیا مگر دل میں کرنے کی تمنا ہے۔ جبری طور پر اس نے چھوڑ دیا، صلاح اور فلاح پانے والا وہ ہے جس کا قلب پاک ہوجائے، اس میں برائی سے نفرت بیٹھ جائے۔ اور قلب خود یوں کہے کہ اس برائی کو مت کرو۔ اسی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ، شراب اور زنا نہیں بلکہ ماحاک فی صدرک، جب تمہارا دل یوں کہے کہ یہ برائی ہے تو اس برائی کو چھوڑ دو، وہی فی الحقیقت برائی ہے، تو انسان کی پاکی کا دارومدار اس کے قلب کے اوپر ہے، قلوب صحیح ہوگئے تو قالب بھی صحیح ہوگیا، قلب فاسد ہیں تو قالب بھی فاسد ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَفِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.'' ② انسان کے بدن میں گاجر کی شکل کا ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جو بائیں طرف لٹکا ہوا ہے، وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے۔ وہ فاسد ہے تو سارا انسان فاسد ہے۔ فرمایا: ''اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ'' آگاہ ہوجاؤ، وہ انسان کا قلب ہے، اگر آپ کا دل درست ہے تو بدن بھی درست ہے اور دل میں کھوٹ ہے تو سارے بدن میں کھوٹ ہے۔

اس لئے کہ دل ہی کے حکم سے آپ برا یا اچھا عمل کرتے ہیں۔ دل میں خیال آتا ہے، خیال سے ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ ارادے سے عمل ظاہر ہوتا ہے، اگر قلب میں فساد ہے تو خیالات بھی برے پیدا ہوں گے۔ برے خیالات سے برے ارادے پیدا ہوں گے۔ برے ارادوں سے اعمال بھی برے سرزد ہوں گے، اس لئے شریعت چاہتی ہے کہ بجائے اس کہ تم ہاتھ پیر کو مانجھو، دھوؤ اور صاف کرو، تم قلب کو کیوں نہیں دھوتے، اس کو اگر تم نے دھولیا اور پاک کرلیا، تو سارا بدن خود بخود پاک ہوجائے گا۔

تطہیر قلب...... اور قلب کی پاکی ذکر اللہ کی کثرت اور اللہ کے خوف کا مراقبہ کرنے سے ہے کہ آدمی سوچے، بہر حال ایک وقت مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اپنی زندگی کا جواب دینا ہے۔ میں کیا جواب دوں گا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کی حجت میں نے پہلے تلاش نہ کرلی ہو، تاکہ اللہ کے سامنے کہہ سکوں کہ فلاں بات فلاں حجت سے کی۔ محض نفسانی جذبہ سے نہیں کی تھی۔ تو قلب حجت تلاش کرلے کہ جو بھی کرو، اس کی کوئی ایسی قابل قبول وجہ ہو کہ اللہ کے سامنے عرض کرسکو، کہ یہ وجہ پیش آئی۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الشمس، الآیۃ: ۹۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب من استبرأ لدینہ، ج: ۱، ص: ۲۸، رقم: ۵۲۔

تو اللہ سے زیادہ عذر کا سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا عذر لے کر پہنچیں گے، یقیناً آپ کی بات مانی جائے گی۔

کسی بھی گناہ کے کرنے پر یہ نہیں کیا جائے گا کہ ایک دم سزا دے دی جائے، اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔ پوچھا جائے گا، اس کو کیوں کیا۔؟ کوئی عذر تمہارے پاس ہے۔؟ اگر کوئی معقول عذر بیان کیا، معاف کیا جائے گا، کوئی عذر آدمی بیان نہ کر سکا، اور واضح ہو گیا کہ محض شقاوتِ نفس سے کیا ہے، اس وقت سزا جاری کریں گے، اس لئے آپ جو چیز کریں پہلے اس کی حجت تلاش کریں، اور حجت جب تلاش کریں گے جب قلب میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ① اصلاح اور فلاح وہ پائے گا جس نے اپنے قلب کو پاک کر لیا‘‘۔ بدن کی پاکی کافی نہیں ہے۔ کپڑوں کی پاکی کافی نہیں ہے۔ اصل پاکی دل کی ہے۔ وہ پاک ہے تو آپ بدن کو بھی پاک کریں گے کپڑوں کو بھی پاک کریں گے۔

درجاتِ معصیت...... بہرحال فرمایا گیا: ’’اِیَّاکُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ۔ ‘‘ گناہوں سے تو بچو، مگر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہ نسبت بڑے گناہوں کے بہت زیادہ بچو، یہی بڑے گناہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس واسطے شریعتِ اسلام نے گناہ کے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک صغیرہ، ایک کبیرہ، مقصود کا درجہ وہ تو کبیرہ ہے اور وسائل کا درجہ صغیرہ کا ہے۔ زنا کا فعل یہ تو کبیرہ گناہ ہے، اور عورت پر نگاہ ڈالنا، تاک جھانک کرنا، اور اس کے پیچھے چلنا یہ صغائر ہیں۔

درجاتِ توبہ...... اگر کبیرہ سے بچ گیا، تو صغیرہ گناہ نیکیوں سے خود بخود معاف ہو جاتے ہیں: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ② نیکیاں بدیوں کو خود مٹا دیتی ہیں۔ انسان جب نیکی کرے گا، جتنے صغیرہ گناہیں، کبیرہ سے بچنے کی وجہ سے وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ مگر کبیرہ معاف نہیں ہوگا جب تک آدمی توبہ نہ کرے، بلا توبہ کے اس کی گرد انسان کے قلب سے نہیں دھل سکتی۔

اور اس میں بھی اگر کبیرہ گناہ کیا اور اس میں مخلوق کی حق تلفی کی، وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوگا۔ جب تک وہ خود صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ اللہ کی آپ چوری کریں گے تو انسان ہے، توبہ سے معاف ہو جائے گی۔ لیکن بندوں کی چوری کریں ہزار بار آپ توبہ کریں معاف نہیں ہوگی، جب تک اس کا مال اس کو واپس نہ دے دیں جس کا مال چرایا ہے۔ اگر کسی کو گالی دی ہے ہزار توبہ کریں معاف نہیں، جب تک وہ معاف نہ کر دے جس کو آپ نے ناحق گالی دی ہے۔ تو گناہ دو ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ تو صغیرہ معاف ہو جاتا ہے جب آدمی کبیرہ سے بچ جائے، اور کبیرہ توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ اور وہ کبیرہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جس کا تعلق مخلوق سے ہو۔ جب تک اس کو صاحبِ حق سے معاف نہ کرائے۔

قانونی سزا...... مثلاً زنا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس میں آدمی تین گناہ کرتا ہے اور تین کی حق تلفی کرتا ہے، چناں چہ زنا کرنے والے نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کی، اس نے حکم دیا تھا کہ زنا مت کرو، اس نے کیا تو

① پارہ: ۳۰، سورۃ الشمس، الآیۃ: ۹، ۱۰۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۱۴۔

خلاف ورزی کی۔ ایک گناہ تو یہ ہوا کہ اس نے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی۔ دوسرا اس نے پبلک کا گناہ کیا کہ امن اٹھادیا اور ایسا راستہ پیدا کر دیا کہ لوگ زنا کرتے پھریں۔ تو یہ پبلک کا گناہ کیا۔

تیسرا گناہ اپنے نفس کا کیا کہ لازم تھا کہ نفس کو اس برائی سے پاک بناتا۔ اس نے زنا کر کے اپنے قلب کو، نفس کو، بدن کو، سب کو آلودہ کیا اور ملوث کیا۔ تو ایک خدا کی حق تلفی کی۔ ایک عوام کی حق تلفی کی۔ اور اپنے نفس کی حق تلفی کی، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے حق کو اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے۔ لیکن یہ جو نفس میں گندگی بیٹھی ہوئی ہے اور یہ جو پبلک کا نقصان کیا ہے، یہ توبہ سے ختم نہیں ہوں گے، جب تک سنگسار نہ کیا جائے اور رجم نہ کیا جائے، اس کے بعد حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر توبہ کرنی ضروری ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو کہتے ہیں کہ حدِ زنا جاری کر دی گئی، سنگسار کر دیا گیا، گناہ معاف ہو گیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ معاف نہیں ہوا۔ سنگسار کر دینے سے جو پبلک کی حق تلفی کی تھی وہ ختم ہوگئی، لیکن اللہ کی جو حق تلفی کی تھی وہ ابھی باقی ہے۔ وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوگی۔ اور نفس کی جو حق تلفی کی تھی وہ اس کے بغیر معاف نہیں ہوگی، کہ آدمی آئندہ کے لئے عہد کرے کہ میں پھر اس حرکت بد سے بچوں گا۔

بہر حال حدودِ شرعیہ کی قانونی سزا بھی جاری ہوگی اور ساتھ ساتھ توبہ بھی ضروری ہے۔ اس قسم کے جرائم میں ایک انسان بہت سی حق تلفیاں کرتا ہے، خدا کی حق تلفی الگ، عوام کی حق تلفی الگ، ملک کی الگ، اور اپنے نفس کی الگ۔ تو توبہ سے خدا کا گناہ معاف ہوگا، حد جاری کرنے سے وہ گناہ معاف ہوگا جو پبلک کا ہے۔ وہ جو اس نے بدامنی کا راستہ ڈال دیا تھا، حد جاری کرنے سے امن قائم ہوگا۔

نسخہ تطہیر...... مگر دیکھا جائے تو تینوں کا تعلق قلب ہی سے ہے۔ اگر قلب میں پاکی نہیں ہے۔ تو انسان نہیں بچے گا، اگر قلب میں پاکی ہے تو بے شک بچ جائے گا۔ اس واسطے سب سے زیادہ ضروری قلب کو صالح بنانا ہے، اس کے لئے شریعت نے ذکر اللہ کا نسخہ تجویز کیا ہے کہ یادِ خداوندی ہمہ وقت تمہارے سامنے رہے، جتنا اللہ کی یاد سامنے ہوگی، اتنا ہی خوفِ خدا دل میں بیٹھے گا، اتنا ہی آدمی جرائم سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ذکر کی بجائے جتنی غفلت پیدا ہوگی، اتنی ہی معاصی اور گناہوں کی کثرت ہوگی۔ اس لئے بنیادی چیز یہ بتلائی گئی: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① یادِ خداوندی اپنے اندر پیدا کرو۔"

ذکرِ معاشرت...... اور ہمہ وقت یاد ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ: "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ." ② ہر دم اور ہر لحہ آپ ذکر اللہ کرتے تھے۔ امت کو بھی ایسا ہونا چاہئے۔ لیکن آپ یہ کہیں گے کہ ہر وقت کس طرح ذکر کریں۔ دکان پر بھی جانا ہے، تجارت بھی کرنی ہے، زراعت بھی کرنی ہے، بال بچوں میں بھی رہنا

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

② السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب في الرجل يذكر الله على غير طهر ص: ۱۲۲۴، رقم: ۱۸.

ہے۔ ہر وقت ذکر کرتے رہیں، یہ بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ سارے کام کریں پھر بھی آپ ہر وقت ذکر اللہ کر سکتے ہیں۔ ایک تو ذکر اللہ عرفاً ذکر ہے جیسے صبح و شام ایک ایک تسبیح پڑھی، یا نمازیں پڑھیں، یہ تو ذکر ہی ہے دوسرے اوقات میں، بال بچوں میں، دکان پہ جانا ہو، اس میں ذکر کی صورت یہ ہے کہ آپ دوکان پر جائیں، یہ نیت کر کے جائیں کہ میں اس لئے جارہا ہوں کہ چار پیسے ہاتھ لگیں تاکہ بال بچوں کی پرورش کروں، یہ حکمِ خداوندی ہے، تو میں تعمیلِ حکم کے لئے جارہا ہوں، اپنے نفس کے حظ کے لئے نہیں جارہا، اطاعتِ خداوندی کے لئے جارہا ہوں۔ زراعت کرنے والا زراعت کرے اور یہ نیت کرے کہ چار دانے پیدا ہوں گے، بچوں کو بھی کھلاؤں گا مخلوق کی بھی خدمت کروں گا، خدا کی مخلوق کی پرورش کروں گا یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہو جائے گا، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ بازار اور کھیت چھوڑ کے مسجد میں آ کے تسبیح لے کر بیٹھیں، اسی بازار اور کھیت میں نیّت کرلیں۔ اسی طرح سے ہر معاشرت کی چیز عبادت بن جاتی ہے اور اجر وہی ملتا ہے جو عبادت پہ ملتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے، ابتداء میں بسم اللہ کہے اور اخیر میں الحمد للہ کثیرا۔ فرماتے ہیں جب اس طرح سے اول و آخر میں ذکر کے ساتھ کھانا کھائے گا "غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ." اس کے اگلے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔

تو یہ کھانا، کھانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ مگر مغفرت گناہوں کی ہو رہی ہے جیسے نماز پر ہوتی ہے، ذرا سی نیت اور فکر کے بدلنے سے مغفرت مرتّب ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ: "مَنْ قَادَ اَعْمٰی غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ." (1) جس نے اندھے کو راستہ دکھادیا، جتنے اس کے صغیرہ گناہ ہیں، بخش دیئے گئے"۔

اندھے کو راستہ دکھایا بظاہر کوئی نماز، روزہ نہیں کیا، لیکن ثمرہ وہی مرتب ہوا جو عبادت پر مرتب ہوتا تھا، اس لئے کہ نیّت صحیح تھی۔ اسی طرح سے بہت سے اعمال فرمائے گئے ہیں جو معاشرتی ہیں لیکن اجر و ثواب ان پر طاعت و عبادت کا ملتا ہے، چوں کہ وہ ذکر بن جاتے ہیں، اس لئے کہ نیت صحیح ہوتی ہے۔

ذکرِ دائمی...... آپ سے یہ نہیں کہا جارہا کہ نماز روزہ سے فارغ ہو کر آپ مسجد ہی کے اندر بقیہ سارے اوقات بیٹھے رہیں، یا ہمہ وقت ذکر کرتے رہیں۔ یہ نہیں۔ بلکہ دنیا کا جو کام ہو، نیّت درست کرلو، اتباعِ سنّت کرو، وہ سب ذکر میں شامل ہوتا جائے گا، تو آپ بھی ہمہ وقت ذکر اللہ کرنے والے بن گئے، جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت ذکر فرماتے تھے، تمہیں بھی یہ مقام میسّر آ سکتا ہے۔

اسی طرح شریعت نے مختلف اوقات کی کچھ دعائیں بتلائی ہیں۔ انہیں یاد کرلو اور پڑھ لو تو پورے اوقات ذکر میں مشغول سمجھے جائیں گے، سورج نکلتے وقت یہ دعاء، لباس پہنتے ہوئے یہ دعا پڑھ لی، استنجاء کو گئے تو یہ دعا پڑھ

(1) علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الحطیب عن ابن عمرؓ قال المناوی: وفیه عبدالباقی بن قانع، اوردہ الذهبی فی الضعفاء دیکھئے: کشف الخفاء ج:۲ ص:۲۶۹۔

لی، بھائیوں سے مصافحہ کیا تو یہ دو جملے پڑھ لئے، یہ سب اذکار ہیں، ان کی عادت ڈالی جائے تو پوری زندگی ذکر اللہ میں گزر جائے گی۔ غرض ذکر اللہ ہمہ وقت ہونا چاہئے، اور ہمہ وقت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سب کھانے پینے کو چھوڑ دے، سب کاروبار چھوڑ دے، اس کھانے پینے ہی کو ذرا سی نیّت کی تبدیلی سے ذکر بنائے تو پورے اوقات ذکر میں صرف ہو جائیں گے، اس سے قلب میں صفائی پیدا ہوگی، قلب میں جلا پیدا ہوگی۔

تمرینِ ذکر...... اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ آپ اس کی مشق کر کے عادت ڈالیں کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان پر رہے، اوپر چڑھنے لگیں تو ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہنا شروع کر دیا، نیچے اترنے لگیں تو ''سُبْحَانَ اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ'' کہنا شروع کر دیا۔ کوئی تعجب کی بات پیش آئی، آپ کہنے لگے ''سُبْحَانَ اللّٰہِ'' کیسی عجیب بات ہے، آپ نے کسی چیز کی قدر بڑھائی تو کہا ''مَاشَآءَ اللّٰہُ.'' اس کی اگر آپ عادت ڈالیں تو ابتداء میں تو ذرا تکلّف ہوگا اور آپ کو تکلیف ہوگی۔ لیکن جب عادت پڑ جائے گی تو بے ارادہ بھی زبان پر ہر وقت اللہ کا نام جاری ہو جائے گا، عارفین اسی کی مشق کراتے ہیں، ابتداء میں ذرا سا تکلّف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ چیز بے ساختہ جاری ہو جاتی ہے۔

دوامِ ذکر کا ثمرہ...... اور اس کا ثمرہ کیا نکلتا ہے۔؟ پوری زندگی میں جب ذکر کی عادت پڑ گئی اور بلا اختیار زبان پر جاری ہوا تو مرتے وقت بھی اللہ ہی کا نام زبان پر جاری ہوگا، خاتمہ صحیح ہو جائے گا، اس خاتمے کے صحیح کرنے کے لئے یہ ساری جدوجہد اور محنت ہے کہ وہ آخری دم درست ہو جائے۔ ''مَنْ کَانَ اَوَّلُ کَلَامِہٖ وَ اٰخِرُ کَلَامِہٖ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ.'' ① تو جیسے حدیث میں ہے کہ: اوّل کلام اور آخر کلام جس کا ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' بن گیا ہے، وہ شخص جنتی ہے۔ یہ آخر کلام ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کب ہوگا؟ جب زندگی میں خدا کا نام لینے کی مشق ہوگی۔

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا: ''تُحْشَرُوْنَ کَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ کَمَا تَحْیَوْنَ.'' ② تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی، اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر تم نے زندگی گزاری ہے۔

غرض زندگی جس حالت میں گزاری ہے، موت [illegible] حالت پر آئے گی، اور جس حالت پر موت آئے گی میدانِ محشر میں اسی حالت پر آپ اٹھیں گے، اگر کسی نے زندگی میں یادِ خداوندی کی مشق کی ہے، یقیناً مرتے وقت قلب میں اللہ کی یاد ہوگی، اور زبان پر اللہ کا نام جاری ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا۔ تو وہی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا جو کلمہ پڑھتے ہوئے انتقال کر گیا تھا۔ حدیث میں ہے کہ اگر ایک حاجی لبیک لبیک کہتے ہوئے مر گیا ہے، جب قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک جاری ہوگا اور یہ سمجھتے ہوئے اٹھے گا کہ میں میدانِ عرفات میں ہوں۔ مگر زبان پر لبیک جاری ہوگا۔ اسی طرح سے جو کلمہ آدمی زبان پر جاری کر لے اور اللہ کے نام کی مشق کرتا رہے، اللہ کا وہی نام

① السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی التلقین، ج:۸ ص:۳۷۶. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن أبی داؤد ج: ۷ ص: ۱۱۶ رقم: ۳۱۱۶. ② مرقاۃ، کتاب الرؤیاء، الفصل الاول ج:۱۳ ص: ۳۷۷.

خاتمہ کے وقت بھی نکلے گا، اور وہی نام لیتا ہوا آدمی میدانِ محشر میں اٹھے گا۔

قبر وحشر میں ذکر کا محافظتی کردار..... یہی اذکار یہی کلمات اس کے لئے سنتری اور محافظ بنیں گے۔ حدیث میں ہے کہ: جب آدمی قبر سے اٹھے گا تو "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اس کے آگے آگے ہوگا۔ "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" سر کے اوپر ہوگا، "سُبْحَانَ اللّٰهِ" اس کے دائیں طرف ہوگا۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اس کی بائیں جانب ہوگا "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اس کی پشت کی جانب ہوگا، اور یہ کلمات چاروں طرف سے گھیر کر آدمی کو اپنی حفاظت میں لے کر میدان محشر میں لے چلیں گے، ہر طرف سے عذاب سے بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے، اگر سر میں قرآنی آیات محفوظ ہیں جنہیں وہ یاد کرتا رہا تھا، وہ آیتیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا۔ دائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں فرمایا گیا: "اَلصَّلٰوةُ بُرْهَانٌ." ① نماز انسان کی دستاویز ہے، وہ دائیں جانب سے عذاب کو روک دیتی ہے۔ بائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ: "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ" ② روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے، بائیں جانب ڈھال کر کے ہی وار کو روکتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ پیروں کی جانب سے عذاب بڑھے گا تو حدیث میں ہے کہ صدقات اور زکوٰۃ عذاب کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، کیوں کہ یہ انسان کی چلت پھرت کی کمائی ہے، اس لئے پیروں کی طرف سے عذاب کو روکتی ہے۔ غرض قبر میں بھی اگر عذاب کو روکنے والی کوئی چیز ہوگی تو وہ ذکر اللہ ہوگا۔ میدان محشر میں بھی اگر آبرو کے ساتھ انسان کو کوئی چیز لے جائے گی اور بڑھائے گی، وہ بھی ذکر اللہ ہوگا اور اللہ کا نام ہوگا۔ جو خاتمہ اچھا کرے گی وہ بھی انسان کا ذکر اور یادِ خداوندی ہوگی۔ ③

مدارِ محافظت..... مگر سب کچھ جب ہی ہوگا جب زندگی میں ذکر اللہ کی مشق کی ہوگی، اگر زندگی میں غفلت رہی ہوگی، تو موت کے وقت بھی قانوناً غفلت ہی ہوگی۔ ویسے اللہ جانتا ہے کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ مگر حشر میں وہ چیزیں سامنے آئیں گی جن کو جزوِ نفس بنالیا تھا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: میت کو جب قبر میں لٹاتے ہیں اور منکر نکیر سوال وجواب کے لئے آتے ہیں اور اس میں روح ڈالی جاتی ہے اسے یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب نکلا ہوا ہے مگر غروب ہونے کے قریب ہے۔

"يَتَمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ" آفتاب کی صورتِ مثالی سامنے ہوتی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے اور مغرب کا وقت بالکل قریب ہے۔ ملائکہ سوال کرتے ہیں۔

---

① ② السنن للترمذی، کتاب الجمعة، باب ماذکر فی فضل الصلوٰة، ج: ۳، ص: ۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۲ ص: ۱۱۴ رقم: ۶۱۴.

③ السنن للترمذی، ابواب الجمعة، باب ما ذکر فی فضل الصلوٰة، ص: ۱۷۶ رقم: ۶۱۴.

''مَنْ رَّبُّکَ ''؟ تیرا رب کون ہے؟ تو میت جواب دیتی ہے۔''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ.'' ① میاں، پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو، میرا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز قضاء ہو جائے گی۔ ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے، اس سے رب کا کیا سوال کرنا ہے جو رب میں اتنا فنا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے، اس سے کیا پوچھتے ہو کہ تیرا رب کون ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں تو ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جواب سچا دے گا، مگر پوچھنا ہمارا فرض ہے۔ تو یہ جواب دینا کہ ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' پرے کو ہٹو، مجھے نماز پڑھنے دو۔ یہ کون کہے گا۔ جو دنیا میں مشق کر چکا ہو گا کہ میری نماز قضا ہونے نہ پائے وقت پہ ادا ہو۔ اور اگر دنیا میں وقت گزارتے جاتے ہیں۔ وہ ادا چھوڑ قضا چھوڑ سرے سے پڑھتا ہی نہیں، وہ وہاں ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' نہیں کہے گا، اس لئے کہ اسے نماز کی عادت ہی نہیں۔ غرض زندگی میں جو عادت ڈالی جائے گی، وہی عالم قبر اور عالم حشر میں قائم رہے گی اور وہی ذریعہ نجات بنے گی۔

ذکر اللہ کے دو اجزاء...... اس واسطے اتباع شریعت، ذکر اللہ، اور یادِ خداوندی اس زندگی میں رکھی جائے اور اس کے دو جز ہیں۔ ایک منکرات سے بچنا اور ایک معروفات پر عمل کرنا، ایک امر پر عمل کرنا، ایک نہی پر عمل کرنا، اس میں مقدّم یہ ہے کہ منکرات سے بچا جائے، جن چیزوں کو شریعت نے گناہ قرار دیا ہے اور جن چیزوں کو کبیرہ اور صغیرہ کہا ہے ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کی جائے، تو یہ مامورات پر عمل کرنے کا ذریعہ بنیں گی، احکام شرعیہ کے اتباع کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ اور جو منکرات سے نہیں بچتا اسے نیکی کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر توفیق ہوتی ہے تو نیکی اپنا اثر نہیں دکھلاتی، اس لئے کہ مضر چیزیں، استعمال میں آ رہی ہیں۔ اس مجموعے کو کہ نیکی کو کرنے لگے اور بدی سے بچنے لگے، اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''تزکیہ'' ہے کہ اس نے اپنے نفس کو پاک بنالیا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ② اس انسان نے جس نے بدی چھوڑ دی، نیکی اختیار کی، اتباع شریعت اختیار کیا اور محرّمات، مکروہات اور ممنوعات کو چھوڑ دیا، تو اس نے اپنے نفس کو پاک بنالیا۔ وہ صلاح و فلاح کی منزل تک پہنچ گیا۔ ان آیات کے شروع میں فرمایا گیا ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ ③ ''اس ذات کی قسم جس نے نفس کو صحیح صحیح بنایا، اس میں الہام کیا فجور کا بھی اور تقویٰ کا بھی''۔

نیکی کا بھی جذبہ ڈالا اور بدی کا بھی جذبہ ڈالا تاکہ دونوں کے ٹکراؤ سے انسان ترقی کرے۔ یہی چیز میں نے ابتداء میں عرض کی تھی کہ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی دونوں کے مادّے ہیں۔ بدی بچنے کے لئے ہے، نیکی کرنے کے لئے ہے۔ دونوں کو ملا کر انسان میں ترقّی کا مادّہ پیدا ہوتا ہے اور صلاح و فلاح کی منزل سامنے آ جاتی ہے۔ یہ گویا آیات کا اجمالی خلاصہ ہے، تفصیلات بہت ہیں مگر اس کے لیے

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلى ۲ ۱ /۳۲۵ رقم: ۴۲۶۲. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعيف سنن ابن ماجه ج: ۹ ص: ۲۷۲ رقم: ۴۲۷۲. ② پاره: ۳۰، سورة الشمس، الآية: ۹، ۱۰.

③ پاره: ۳۰، سورة الشمس، الآية: ۷، ۸.

وقت نہیں ہے، اس لئے اجمالی طور پر اصول عرض کر دیا۔ اور اس اصول کی قدرے تشریح عرض کر دی۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کے امتثال کی اور بدیوں سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ (آمین)

دعاء...... ''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً. اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ' اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ. وَ اخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ. اَللّٰهُمَّ نَسْئَلُکَ الْخَيْرَ کُلَّهٗ وَنَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّرِّ کُلِّهٖ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَخَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.''

تنبیہ.....: ایک مسئلہ سن لیجئے۔ بعض لوگوں کو عادت ہوتی کہ وہ وعظ میں بیٹھتے ہیں مگر کچھ وظیفہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ مکروہ ہے۔ آداب درس اور وعظ کے خلاف ہے۔ وعظ سننا یہ خود مستقل طاعت وعبادت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نماز بھی پڑھے اور ساتھ میں دوسروں کو پیسے بھی تقسیم کرے، تو نہ نماز ہوگی نہ پیسے ہی صحیح تقسیم ہوں گے، تو آداب مجلس وعظ کے یہ چیز خلاف ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے جو مجلس میں بیٹھے وہ استماع کرے اور سننے کی طرف توجہ کرے اور ان چیزوں کو قلب میں اتارنے کی فکر کرے جو کہی جارہی ہیں۔ اور اگر وظیفے کا ضروری وقت ہے تو دوسرے مقام پر جا کر اپنا وظیفہ پڑھے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔ ''وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.''

(محررہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ بروز جمعۃ المبارک)

جواہرِ انسانیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّابَعْدُ! فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ، وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّاالْعَامِلُوْنَ ،وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ ، وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ اَوْكَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت...... بزرگانِ محترم! یہ جلسہ سیرت کے نام پر منعقد کیا گیا ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ بیان کی جائے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے تا کہ سیرت کے مختلف گوشوں سے لوگ آشنا ہوسکیں۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ درحقیقت ایک ذات یا ایک شخصیّت کی سیرت نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالمِ انسانیت اور پورے عالمِ بشریت کی مقدّس سیرت ہے۔ دنیا میں بہت سی ذوات ایسی گزری ہیں جو ایک ایک جماعت کے قائم مقام ہوتی ہیں یعنی پوری جماعت مل کر جن کمالات کا سبب بنتی ہے۔ بعض دفعہ حق تعالیٰ وہ سارے کمالات کسی ایک شخصیّت میں جمع کر دیتے ہیں۔ بعض شخصیتیں وہ ہیں کہ جماعتوں کی نہیں بلکہ پوری پوری اقوام کے قائم مقام ایک شخصیّت ہوتی ہے۔ اور بعض شخصیتیں پوری ملّت اور امّت کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ یعنی پوری ایک امت میں جو کمالاتِ علم و عمل کے جمع ہوں وہ ایک ذات میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا﴾ ① ابراہیم علیہ السلام پوری ایک امت ہیں۔ یعنی ایک عظیم ترین امت میں جو اخلاق و کمالات جمع ہو سکتے ہیں وہ ایک ذاتِ واحد میں اللہ نے جمع کر دیئے۔ تو آپ اندازہ کیجئے کہ جو ذاتِ بابرکات ملّتِ ابراہیمی کی تکمیل کرنے کے لئے آئے، وہ ذاتِ بابرکات کتنی عظیم ہوگی۔ وہ ایک امّت نہیں بلکہ دنیا کی ساری امتوں کی جگہ وہ ایک ذاتِ واحد ہوگی اور جو ساری امتوں اور اقوام میں مل کر کمالات

① پارہ: ۱۴ ،سورۃ النحل،الآیۃ: ۱۲۰ .

جمع ہیں وہ تنہا ایک ذاتِ واحد میں ہوں گے اور وہ ذات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

سیرتِ انسانیّت...... تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت درحقیقت مکمل انسانیت کی سیرت ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سیرتِ مقدّسہ کے بیان کرنے سے پہلے انسانیت کی سیرت پر گفتگو کروں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی سیرت کے اجزاءِ ترکیبی کیا ہیں؟ اگر وہ سمجھ میں آ گئے تو جو ذاتِ بابرکات پورے عالم انسانیت کی عظیم اور متوازی ہے۔ اس کی سیرت خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔ اس لئے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تلاوت کی ہے جس میں خود اجزائے ترکیبی بیان کئے گئے ہیں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ انسان کے معنی کیا ہیں؟

مادّۂ انسان کے تخلیقی مراحل...... اسے آپ اس طرح سمجھیں کہ انسانیّت کو یا انسان کو جو کچھ فوقیت یا عظمت یا شرف حاصل ہے۔ وہ انسانی مادّے کی وجہ سے حاصل نہیں ہے۔ انسان کی تمام کائنات پر جو کچھ بزرگی، بلندی اور برتری ہے وہ اس کے مادّے کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسانی خلقت کے مادّے جہاں بھی قرآنِ کریم نے ذکر کئے ہیں وہ نہایت ہی گندے اور نجس مادّے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کو کوئی فوقیت یا فضلیت حاصل ہو۔ یہ نہیں۔

کہیں انسان کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ① ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور کہیں فرماتے ہیں ﴿خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا، کہیں فرماتے ہیں ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ ② کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا؟ اور کہیں فرماتے ہیں ﴿خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ ③ ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا"۔

تو کہیں مٹی، کہیں نطفہ، کہیں سڑا ہوا ہو گارا اور کہیں ذلیل پانی۔ یہ انسان کی پیدائش کے ذلیل مادّے ذکر کئے ہیں، تو جن میں خود ذلت اور خود گندگی موجود ہے۔ ان مادّوں کی وجہ سے انسان کو کیا شرافت اور فضیلت حاصل ہو سکتی تھی۔ ایک موقع پر قرآنِ عظیم نے ان سب مادّوں کو یکجا طور پر جمع کر کے ذکر فرمایا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ④ "ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو نطفے کی شکل دے کر رحم مادر میں پہنچایا، پھر ہم نے نطفے کو خون کی شکل میں تبدیل کر دیا، پھر خون کی ہم نے ایک منجمد پھٹک بنا دی۔ پھر اس کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیا پھر اس میں ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور کھال بھر دی۔ اور پھر اس کی ایک اور خلقت تیار کی"۔

تخلیقِ انسان کا پہلا مرحلہ...... تو یہاں ترتیب وار چند مادّوں کا ذکر کیا گیا مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ظاہر

① پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ المرسلات، الآیۃ: ۲۰۔
③ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۲۶۔ ④ پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲، ۱۴۔

بات ہے کہ مٹی کے اندر کون سی چمک دمک ہوتی ہے مٹی تو وہ ہے جس کو ذلول کہا گیا۔﴿هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا﴾ ① اس مٹی کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل کر دیا، پست بنا دیا۔ تو بیچاری پامال ہوتی ہے جوتیوں سے آپ اس کو روندتے ہیں لیکن یہ اف نہیں کر سکتی تو اس کے عجز اور درماندگی کا یہ عالم ہے کہ اس میں کوئی چمک اور نورانیت نہیں۔ کوئی خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ گویا انسان کی پیدائش کا ابتدائی مادہ ہے۔

تخلیق انسان کا دوسرا مرحلہ...... اس کے بعد آگے ترقی کر کے فرمایا﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ ② پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر رحم مادر میں ٹھہرایا۔ تو یہ اور زیادہ گندگی کے اندر ترقی ہوئی۔ اس لئے کہ مٹی ناپاک تو نہیں تھی۔ بہت سے بہت کوڑا کباڑ کی کثافت تھی۔ کپڑے پر لگ جاتی تھی تو دھوتے تھے، بدن پر پڑ جاتی تھی تو آدمی غسل کر کے بدن صاف کر لیتا تھا۔ تو کثافت تھی مگر نجاست نہیں تھی۔ بلکہ ایک حد تک مطہر بھی ہے۔ یعنی دوسروں کو پاک کرنے والی بھی ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کی اجازت ہے، مٹی، پانی کے قائم مقام ہو جاتی تھی۔ غرض خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو پاک بنا دیتی ہے صرف اتنی بات تھی کہ ایک کرکٹ اور کوڑا تھا جو بدن پر پڑ جائے یا کپڑوں پر تو دھونے کی صورت پیش آتی تھی۔

تخلیق انسان کا تیسرا مرحلہ...... لیکن جب اس کو نطفے کی شکل میں منتقل کیا تو ناپاکی پیدا ہو گئی۔ غلاظت اور کثافت کے ساتھ ساتھ نجاست بھی پیدا ہو گئی۔ اور اس درجے کی کہ اگر یہ قطرہ خارج ہو تو قرآن کریم پڑھنے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ مسجد میں جانے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ نماز آپ نہیں پڑھ سکتے۔ اس درجہ گویا گندگی ہے، اسی لئے ایک موقع پر فرمایا﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ ③ ''اس انسان کی جرات تو دیکھو کہ ہم نے اس کو ایک گندے قطرے سے پیدا کیا اور ہمارے ہی مقابلہ پر جھگڑالو دشمن بن کر آتا ہے''۔ گویا اب تک تو مادّے میں کثافت تھی اب نجاست بھی پیدا ہو گئی۔

تخلیق انسان کا چوتھا مرحلہ...... اور آگے ارشاد فرمایا﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ④ تو نطفے کے اندر کم سے کم حضرت آئمہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف تو تھا۔ بعض حضرت آئمہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو پاک کہتے تھے۔ کم سے کم اس کی نجاست متفق علیہ نہ تھی، مختلف فیہ تھی۔ لیکن نطفہ جب خون کی شکل میں تبدیل ہوا تو خون کی پاکی کا کوئی بھی قائل نہیں، تو متفق علیہ نجاست بن گئی۔ گویا نجاست کے اندر اور زیادہ ترقی ہوئی۔ مٹی کا خلاصہ ناپاک نہیں تھا۔ کثیف تھا۔ نطفہ کثیف بھی تھا اور ناپاک بھی تھا۔ مگر مختلف فیہ تھا۔ اور خون بنا تو متفق علیہ ناپاکی ہو گئی۔ اس کے بعد میں لوتھڑا بنا کے ہڈیاں پہنائی گئیں۔ ان تمام چیزوں کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ کوئی پاکیزگی اور کوئی چمک دمک بھی نہیں۔ معنوی چمک تو کیا ہوتی، مادی چمک بھی نہیں کہ ظاہری طور پر کوئی شعاع تو نظر آ جائے۔ یہ انسان کی

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵. ② پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون الآیۃ: ۱۳.

③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۷۷. ④ پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۴.

پیدائش کے مادّے ہیں۔

تخلیق انسان کا پہلا ظلماتی مکان......اور پھران مادّوں کے ساتھ انسان کو کہاں پیدا کیا گیا۔وہ بھی گندی جگہ ہے جس میں تخلیق عمل میں آئی۔ بلکہ گندی اور ظلماتی جگہ بھی ہے۔قرآن کریم میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا:

﴿یَخۡلُقُكُمۡ فِی بُطُونِ أُمَّهَـٰتِكُمۡ خَلۡقࣰا مِّنۢ بَعۡدِ خَلۡقࣲ فِی ظُلُمَـٰتࣲ ثَلَـٰثࣲ﴾ ① اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرتے ہیں، تمہاری پیدائش پر مختلف دور آتے ہیں۔کہاں پیدا کرتے ہیں؟۔فِی ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ۔ تین اندھیری کوٹھڑیوں اور تین ظلمتوں کے اندر پیدا کرتے ہیں۔سب سے پہلی ظلمت ماں کا پیٹ ہے جس کے اندر کوئی چاندنا نہیں۔جس کے اندر کوئی آفتاب کی شعاع نہیں پہنچتی۔اور اندر سے بھی کوئی شعاع نہیں اٹھتی۔

تخلیق انسان کا دوسرا ظلمانی مکان......اس ماں کے پیٹ میں پھر جو اندر کوٹھڑی ہے وہ رحم مادر ہے۔جس کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے۔اس میں اور زیادہ اندھیری۔ ماں کے پیٹ میں ممکن تھا کہ مسامات کے ذریعہ ہی کوئی چیز پہنچ جائے۔مگر رحم مادر تو پیٹ کے اندر ایک اور بند کوٹھڑی ہے۔وہاں نہ باہر سے کوئی چیز پہنچے نہ اندر سے باہر آئے۔

تخلیق انسان کا تیسرا ظلمانی مکان...... پھر اس کے اندر ایک اور تیسری کوٹھڑی ہے۔وہ جھلی ہے جس کے اندر بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔دایا اس کو کاٹ کر بچے کو باہر نکالتی ہے۔تو ماں کا پیٹ خود اندھیری کوٹھڑی، رحم مادر اس کے اندر ایک اور اندھیری کوٹھڑی اور اس کے اندر جھلی ایک اور اندھیری کوٹھڑی۔

فضیلت یا ندامت......تین ظلمتیں ہیں اور تاریک گھرانے ہیں جس میں انسان کو تربیت دی جاتی ہے اور تخلیق کی جاتی ہے۔ان تینوں اندھیری کوٹھڑیوں میں سوائے غلاظت کے اور کیا ہے؟ حیض کا خون غذا بنتا ہے۔گندے پانی میں انسان تیرتا رہتا ہے۔تو پیدائش کے مادّے بھی نجس، مکان بھی گندا پھر جس راستے سے اندر پہنچتا ہے وہ راستہ بھی گندا، جس راستے سے نکالا جاتا ہے وہ راستہ بھی گندا۔تو راستے بھی گندے، مادّے بھی گندے، مکان بھی گندا اور جوہر بھی گندا۔ان گندی چیزوں سے ان گندے مکانوں میں بن کر آپ اندازہ کیجئے کہ انسان میں کوئی فضیلت پیدا ہوسکتی ہے۔انسان کی فضیلت تو بجائے خود ہے اگر وہ ان مادوں کی طرف دھیان کرے تو ندامت سے اس کا سر نیچا ہو جانا چاہئے۔یہ غلاظتوں کا مجموعہ ہے۔اس کے لیے کوئی فخر اور غرور کا موقع باقی نہیں رہتا۔کوئی موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ شیخی کرے یا اترائے۔کیا گندگی پر اترایا جاتا ہے؟ کیا نجاست کے اوپر انسان فخر کرے گا؟

انسان کی خود فریبی......کوئی بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے سامنے ایک شخص جو بہت بڑا مالدار تھا۔اور دنیا کی اصطلاح میں بڑا آدمی تھا۔وہ چلا آ رہا تھا اور اپنی بڑائی کی وجہ سے اتراہٹ کی چال چل رہا تھا۔پیر ڈالتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا، چھاتی ابھارے ہوئے، منہ ابھرا ہوا۔غرض متکبرانہ چال سے چل رہا تھا۔ادھر سے کوئی بیچارہ اللہ والا، سادہ زندگی والا درویش انسان آ رہا تھا۔اس نے خیر خواہی کے طور پر اسے نصیحت کی اور کہا کہ: ''اے عزیز!

---

① پارہ: ۲۳ : سورۃ الزمر الآیۃ: ٦

خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چل۔ ﴿لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ ① اللہ کی زمین پر اینٹھ کر مت چل، اکڑ کر مت چل۔ یہ جو تو اینٹھ کر چل رہا ہے، چھاتی ابھار کر چل رہا ہے۔ ﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ ② تو اینٹھ کر زمین کو نہیں پھاڑ ڈالے گا۔ آسمان کو چیر نہیں ڈالے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا۔ جتنی جگہ میں ہے۔ خواہ مخواہ یہ مصیبت برداشت کر رہا ہے۔ یہ انسانیت کا کام نہیں ہے''۔ اس شخص کو بہت ناگوار گزرا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے ٹوکے، میں تو سب سے بڑا آدمی ہوں۔ اس نے بہت ہی تمک کر اور بہت ہی غصّے سے کہا کہ او جاہل درویش! تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میرے سامنے ایسا گستاخانہ کلام؟ تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ یہ درویش بھی بگڑے ہوئے دل کا آدمی تھا۔ اگر یہ اپنے مال میں مست تو وہ اپنی کھال میں مست۔

انسان کا حقیقی تعارف...... وہ بھی آگے بڑھا اور اس نے کہا جی ہاں میں جانتا ہوں آپ کون ہیں، اور اگر آپ اجازت دیں تو میں بتلاؤں آپ کون ہیں۔ یہ بھی سسک کر کھڑا ہو گیا کہ بھئی! یہ بھی عجیب درویش ہے۔ آخر آپ کیا بتلائیں گے کہ میں کون ہوں؟'' اس نے کہا میں جانتا ہوں آپ کون ہیں؟ آپ ذرا سن لیجئے''۔ ''اَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ وَ اٰخِرُكَ جِيْفَةٌ مَّذِرَةٌ وَاَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ'' آپ کی ابتداء ایک گندے قطرے سے ہوتی ہے جو بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو دھونا واجب۔ آدمی نہ نماز کا رہتا ہے نہ تلاوت کا۔ یہ تو آپ کی ابتداء ہے۔ انتہاء آپ کی یہ ہے کہ قبر میں پہنچ کر یہی بدن پانی ہو کر بہے گا۔ کیڑے اس میں پڑیں گے۔ نجاست یہ بنے گا۔ یہ آپ کی انتہاء ہے۔ اور درمیان میں حالت یہ ہے کہ سیروں گندگی اور نجاست آپ کے پیٹ میں بھری ہوئی ہے، پاخانہ بھی ہے، پیشاب بھی ہے، اور خون بھی ہے یعنی دم مسفوح بھی ہے۔ تو ابتداء گندی، انتہاء گندی اور درمیانی حالت میں گند در گند۔ یہ ہے آپ کی حقیقت۔ اب فرمایئے آپ اپنی حقیقت سمجھ گئے کہ آپ کون ہیں؟ اس کی آنکھ کھلی۔ چونکہ کہنے والا حقانی آدمی تھا۔ دل سے ایک بات کہی تھی تو ؎

از دل خیزد بر دل ریزد ... دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

دل پر اثر کیا اور اس شخص نے کہا کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ... مرا باجانِ جاں ہمراز کردی

خدا تجھے جزائے خیر دے، تو نے میری آنکھ کھول دی، میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ حقیقت ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے مادّے کے لحاظ سے اتنا گندہ اور نجس واقع ہوا ہے۔ اگر وہ اپنے مادّوں پر دھیان کرے تو اس کے لئے منہ اٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ آنکھ اونچی کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے آنکھ نیچی رکھے گا۔

ستّار العیوب کا احسان...... یہ تو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہماری گندگیوں کو چھپا دیا ہے اور

① پارہ: ۱۵، سورۃ اسرائیل، الآیۃ: ۳۷. ② پارہ: ۱۵، سورۃ اسرائیل، الآیۃ: ۳۷.

نہایت خوبصورت کھال کا پردہ ڈال دیا ہے جس سے یہ چیزیں چھپا دی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کھل جائیں تو انسان، انسان کو دیکھ کر نفرت کھانے لگے۔ اسی گندگی کے اگر خدانخواستہ معدے سے بخارات اٹھنے لگیں اور منہ میں بدبو پیدا ہو جائے تو انسان کو انسان سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پاس کھڑے ہوتے ہوئے نفرت آتی ہے۔ وہ معدے کے بخارات ہوتے ہیں جو گندہ ذہنی کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تو جب وہ اجاگر ہوتے ہیں تو آدمی سے آدمی گھبرانے لگتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے گندگیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ انسان کو موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں پر فخر کرے یا شیخی بگھارے یا اتراہٹ کی چال چلے۔ گویا بتلا دیا گیا کہ انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے گندہ واقع ہوا ہے۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس میں کوئی کمال ڈال دے۔ مگر انسان کی ذات کا کوئی کمال نہیں۔ ذات تو انسان کی وہ ہے جو ہم نے پیش کر دی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان مادّوں کے ہوتے ہوئے نہ انسانی سیرت بن سکتی ہے نہ انسان کو کوئی فوقیت اور فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ان مادّوں کے لحاظ سے انسان کے اندر کوئی بھی خوبی نہیں۔

ظاہری خوشنمائی کی حقیقت...... اب آپ یوں کہیں گے۔ یہ تو چھپی ہوئی چیزیں ہیں لیکن ان کے اوپر شکل تو خوشنما پڑی ہوئی ہے۔ کسی جاندار کو وہ خوبصورتی عنایت نہیں کی گئی جو انسان کو کی گئی ہے۔ تو انسان اپنی صورت زیبا کے اعتبار سے افضل اور اونچا ہے اور جتنا بھی وہ دعویٰ کرے کم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صورت درحقیقت ایک عارضی چیز ہے، جلدی سے ختم ہو جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا کہ تین دن آ جاتا ہے تو ساری شکل بگڑ جاتی ہے۔ سارا حلیہ خراب ہو جاتا ہے، نہ رنگ باقی رہتا ہے، نہ روغن باقی رہتا ہے۔ اگر انسان کی شرافت کے یہ معنی ہیں کہ وہ خوشنما ہے تو تین دن بخار آنے کے بعد شرافت چھن جاتی ہے، وہ رذیل بن جاتا ہے۔ تو یہ شرافت کیسی ہوئی کہ تین دن پہلے شریف اور تین دن بعد رذیل۔ پہلے اشرف المخلوقات اور اڑھائی دن گذرنے کے بعد ارذل المخلوقات۔ یہ شرافت کس کام کی ہے؟ یہ صورت کی زیبائی اور رعنائی۔ یہ ایک عارضی چیز ہے۔ بخار آ جائے تو ختم ہو جائے، انسان کو کوئی غم لگ جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ کوئی فکر پیدا ہو جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ تو جس چیز کو آنے والی کیفیت زائل کر دے۔ وہ شرافت کی بناء نہیں ہو سکتی۔ شرافت تو وہ ہے کہ جو ہر میں پڑی ہوئی ہو، تو جو ہر گندہ ہے تو شرافت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

اور اگر فرض کیجئے کہ کوئی بیماری بھی نہ ہو تو بڑھاپا تو کہیں نہیں گیا؟ بڑھاپا آتا ہے تو وہی صورت جو زیبا تھی، وہ بھیانک نظر آنے لگتی ہے۔ چہرہ شومو ہو جاتا ہے۔ صورت اور ہیئت بگڑ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے اور مان لیجئے بڑھاپا بھی نہ آئے، موت تو ہر صورت میں آئے گی؟ وہ بالکل ہی صورت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

عقل کی گمراہی...... یہ عقل کی گمراہی ہے کہ وہ اس صورت پر فخر کرنے لگے جو رات دن تغیر کے اندر ہے۔ ہم رات دن اس صورت کو سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کنگھی اور چوٹی۔ یہ اور وہ۔ اسے آپ کہاں تک سنواریں

گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، جس چیز کو ہر چیز بگاڑ دے آپ اسے کہاں تک سنواریں گے؟ بیماری اسے بگاڑ دے، بڑھاپا اسے بگاڑ دے، فکر اور غم اسے گھلا دے، موت اس کا حلیہ بگاڑ دے، تو آپ ناحق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بگڑنے کے لئے بنی ہے، اسے سنوارنا کوئی دانائی کا کام نہیں ہے۔ اگر آدمی سنوارنے کی کوشش کرے تو اپنی سیرت کو سنوارنے کی کوشش کرے نہ کہ صورت کو۔ پائیدار چیز انسان کی سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو آپ کتنا ہی سجائیں گے، کتنا ہی زیبا بنائیں گے، کتنا ہی آپ آراستہ کریں گے، بالآخر وہ ختم ہوگی۔ اس کی زیبائش بھی ختم ہوگی۔ اگر پائیدار چیز ہے تو وہ انسان کی سیرت ہے۔

نجاست کا عشق...... کسی بزرگ کا واقعہ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ ان کی خانقاہ میں لوگ اپنی تربیّت کے لئے اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، شیخ لوگوں کی تربیّت کرتے تھے۔ اور شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ بیس بیس اور پچاس پچاس مرید اور متوسّلین جمع ہوگئے، کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا، ایک باندی اس کام کے لئے متعیّن تھی، وہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی، ایک نئے مرید آ کر بیعت ہوئے، مقصد تو یہ تھا کہ اللہ اللہ کر کے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ باندی جب کھانا لے کر آئی تو وہ اتفاق سے کچھ ذرا قبول صورت تھی۔ ان مرید صاحب کی اس سے آنکھ لڑ گئی، اس پر کچھ فریفتہ ہوگئے۔ اب جب وہ کھانا لے کر آتی ہے تو بیٹھ کر اسے گھورتے ہیں، نہیں آتی تو منتظر رہتے کہ کب آئے گی۔ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ آئی تو اسے گھورنا شروع کیا۔ شیخ کو اس حالت کی اطلاع ہوگئی۔ تو اہل اللہ علاج کرتے ہیں، وہ زبان سے نہیں ہوتا، طریق عمل سے علاج ہوتا ہے کہ مرض کا استیصال ہو جائے۔ شیخ نے چاہا کہ ان کا یہ مرض دور ہو۔ اگر زبانی نصیحت کر دیتے، فہمائش کر دیتے، بے شک تھوڑا بہت اثر ہوتا مگر جب طبیعت مائل تھی تو طبیعت کا بدلنا مشکل تھا، شیخ نے ارادہ کیا کہ طبیعت ہی کو بدل دیا جائے تاکہ یہ قصّہ ہی ختم ہو۔

تو ایک عجیب وغریب ترکیب استعمال کی۔ اس باندی کو جو کھانا لے کر آتی تھی۔ اسے دستوں کی دوا کھلا دی، صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آ گئے، ایک جگہ متعیّن کر دی کہ اسی جگہ جانا، وہاں قدمچہ رکھ دیا۔ غرض شام تک اسے بہت دست آ گئے۔ اور شام کو حالت یہ ہوئی کہ نہ وہ رنگ باقی رہا نہ وہ روغن باقی رہا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ اس باندی کی صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ عجیب بھیانک شکل بن گئی اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ: اس مرید کے پاس کھانا لے کر جا۔ اور جو کچھ وہ کہے اس کی مجھے آ کر اطلاع کرنا۔

وہ کھانا لے کر بے چاری پہنچی، ناک پکڑو تو دم نکلے، قدم اس کا لرز رہا ہے۔ ضعف کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جاتا اور صورت بھی بھیانک ہوگئی۔ یا تو مرید صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اب جو آئی اور انہوں نے اس کی شکل دیکھی تو انہیں بڑی نفرت سی پیدا ہوئی اور بجائے اس کے اسے گھورتے، منہ پھیر کر کہا کہ کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے۔ وہ بے چاری کھانا رکھ کر چلی گئی۔ اور شیخ کو جا کر اطلاع کر دی کہ آج اس نے مجھے بجائے گھورنے کے نفرت سے کہا کہ چلی جا یہاں سے دور ہو جا۔ میں چلی آئی۔

شیخ نے کہا۔ الحمد للہ علاج ہو گیا۔ مگر ابھی علاج کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ ایک جز تھوڑا سا باقی تھا۔ شیخ مرید کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔ وہ قدمچہ جہاں باندی نے بڑی تعداد میں دستوں کا ملبہ جمع کیا تھا۔ مرید کو وہاں لے کر پہنچے اور فرمایا۔ "یہ آپ کا معشوق ہے۔ یہ جو نجاست ہے اسے احتیاط سے لے جا کر اپنے حجرے میں صندوق میں رکھئے، اس لئے کہ جب تک یہ باندی کے اندر تھا، آپ کو محبت تھی۔ جب یہ نکل گیا۔ آپ کو نفرت پیدا ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے آپ کو محبت تھی۔ اس لئے اسے اٹھا کر لے جایئے۔ یہ آپ کا محبوب ہے۔" حقیقت میں شیخ نے بتلایا کہ صورتوں کا عشق درحقیقت گندگی کا عشق ہے۔

عشقِ سیرت...... اصل عشق، سیرت کا عشق ہے جو پائیدار عشق ہے، وہ وہی ہے جس سے محبت کرنی سکھلائی گئی ہے۔ آج ہمیں اور آپ کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے محبت ہے، حضرت امام شافعی سے، حضرت امام احمد بن حنبل سے، حضرت امام بخاری اور حضرت امام ترمذی سے، حضرت جنید اور حضرت شبلی سے اور تمام اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے، ان کی محبت کو جزوِ ایمان جانتے ہیں، ان سے محبت کرنے کو اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ کیا یہ محبت ان کی صورتوں سے ہے؟ ہم نے تو آج تک ان کی صورت دیکھی بھی نہیں۔ یہ کاہے سے محبت ہے۔ ان کی سیرت اور ان کے کمالات سے محبت ہے۔ اور اتنی پائیدار محبت ہے کہ نہ آج تک ہم نے ان کی شکل دیکھی۔ مگر دل میں قائم ہے۔ اور اتنی شدید محبت کہ اگر ان بزرگوں کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کرے تو ہم اس کا منہ توڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ برداشت نہیں کرتے۔ یہ ان کی سیرت کی محبت ہے، ان کی صورت کی محبت نہیں ہے۔

سیرت کی سرداری...... حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت جو جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ: "مَارَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَآءِ بْنِ أَبِيْ رَبَاحٍ" ① "میں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے زیادہ عالم اور افضل شخصیت نہیں دیکھی"۔

یعنی حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں بڑی زبردست شخصیّت، بڑی علم والی شخصیّت ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص جس کی تعریف کرے تو اندازہ کیجئے کہ وہ کس پائے کی شخصیت ہو گی؟ تو حضرت عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ گویا اپنے زمانے میں اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی وجہ سے سب سے زیادہ افضل ہیں۔

اور خود حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ ایک حبشی غلام ہیں۔ کالی صورت ہے۔ موٹے موٹے ہونٹ ہیں، کرنجی آنکھیں ہیں۔ کوئی زیبا صورت نہیں۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ افضل دنیا میں نہیں دیکھا۔ یہ افضلیّت صورت کے لحاظ سے نہیں تھی سیرت کے لحاظ سے تھی، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کی صورت کو نہیں سراہ رہے تھے، ان کی سیرت کو پیش کر رہے تھے، آج

---

① السنن للترمذی، کتاب العلل الصغیر، ص: ۲۰۵۶.

اگر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نام آ جائے تو رضی اللہ عنہ کہہ کر آپ عقیدت اور نیاز مندی سے گردن جھکا دیتے ہیں، حالاں کہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی صورت کالے رنگ کی تھی موٹے موٹے ہونٹ تھے، جیسے حبشیوں کی صورت ہوتی ہے۔ مگر صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''یَا سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا'' بلال (رضی اللہ عنہ) ہمارے سردار اور ہمارے آقا ہیں۔ یہ کاہے کی آقائی اور سرداری تھی۔ یہ صورت کی سرداری نہیں تھی بلکہ سیرت کی سرداری تھی۔

صورت سببِ فتنہ اور سیرت ذریعۂ نجات ہے...... اگر غور کیا جائے تو فتنوں میں مبتلا کرنے والی چیز انسان کی صورت ہے۔ سیرت فتنے میں مبتلا نہیں کرتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت اور ان کے حسن و جمال میں آپ کو کلام تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی ہے۔ اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی۔ فرمایا گیا کہ: ''جب اللہ نے حسن پیدا کیا۔ آدھا حسن دنیا کو تقسیم کیا، آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو عطاء کیا''۔

اتنی زبردست حسین و جمیل شخصیت کہ قرآن و حدیث نے شہادت دی لیکن جہاں بھی فتنوں میں مبتلا ہوئے، صورت نے مبتلا کیا۔ کنعان کے کنویں میں گرائے گئے تو صورت نے مبتلا کیا۔ مصر کے بازار میں غلام بنا کر بیچے گئے تو صورت نے مبتلا کیا، اور مصر کے جیل خانے میں رہے تو صورت کی وجہ سے قید رہے، تو صورتِ زیبا نے ہر جگہ آفات میں مبتلا کیا۔ لیکن مصری کی حکومت لینے کا وقت آیا، مصر کے بادشاہ بنے اور سلطنت مانگی تو فرماتے ہیں: ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ① مجھے یہ خزانے سپرد کر دو۔ میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ کیوں؟ دلیل میں یہ نہیں کہا کہ انی حسینٌ جمیلٌ اس واسطے کہ میں بڑا خوبصورت ہوں، ملک کا انتظام کروں گا۔ یہ فرمایا کہ انی حفیظ علیم میرے اندر ملک کی نگہداشت کا مادہ موجود ہے، میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو حسنِ صورت نے کام نہیں دیا، حسنِ سیرت سامنے آیا اور جب فتنے میں مبتلا ہوئے تو حسنِ صورت سامنے آیا، حسنِ سیرت سامنے نہیں آیا۔

معیارِ شرافت...... آدمی اگر مبتلا ہوتا ہے تو صورت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سیرت کی وجہ سے کوئی مبتلا نہیں ہوتا، سیرت تو عظمت والی چیز ہوتی ہے۔ بہر حال انسان کے لئے وجہِ شرافت نہ اس کا مادّہ بن سکتا ہے نہ اس کی صورت بن سکتی ہے۔ اور بھلا لباس تو کیا ہی بنتا؟ لباس صورت سے بھی زائد چیز ہے۔ جب انسان کے جوہر میں کوئی کمال نہیں۔ انسان کی صورت میں کوئی خاص کمال شرافت کا نہیں ہے اور ہے تو وہ زائل ہونے والی چیز ہے تو لباس تو اس سے بھی عارضی چیز ہے۔ اگر کوئی لباس پر فخر کرنے لگے اور اپنی شرافت اس سے بیان کرے تو اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ اس لئے کہ لباس تو وہ خود ہی رات کو اتار کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کو شریف اور رات کو رذیل۔ یہ

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

شرافت کس قسم کی ہوئی کہ اسے اپنے ہاتھ سے آدمی کھودے؟ جو لوگ اپنی شرافت کو لباس سے ثابت کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت سمجھے ہی نہیں کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔ غرض انسانی شرافت کا تعلق لباس سے نہیں ہے۔

معیارِ کمال...... سقراط کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا یونانی حکیم بھی ہے، اور مجرّب بھی ہے۔ فنِ طب کا موجد اور بڑا حضرت حضرت امام سمجھا جاتا ہے، اس نے بڑے بڑے تجربات کئے ہیں، رات دن جنگلوں اور پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرتے ہوئے مارا مارا پھرتا تھا۔ اس طرح سے اس نے جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کتابوں کے اندر مدوّن اور مرتب کیں۔ ایک دن جڑی بوٹیوں کے امتحان میں جنگلوں اور پہاڑوں میں تمام دن لگ گیا اور شام کے وقت شہر میں آیا، تھک کے چور ہو گیا تھا۔ ایک سڑک کے قریب کسی بنچ پر بیٹھا تو نیند نے غلبہ کیا، نیند آ گئی۔ پیر اس کے سڑک پر لٹک گئے، اتفاق سے بادشاہِ وقت کی سواری نکلی، نقیب اور چوبدار ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے ہوئے آ رہے تھے، مگر یہ سقراط بے چارہ کب کا تھکا ہوا تھا، نہ اس کے کان میں ہٹو بچو کی آواز آئی، نہ کسی نقیب کی آواز نے اس کے کانوں کو کھٹکٹایا، پڑا ہوا سوتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آ گئی۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا کہ میں سواری پر سوار جا رہا ہوں اور اس کی ٹانگیں سڑک کے اوپر پڑی ہوئی ہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر سواری سے اتر کر اسے لات سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ ''او احمق۔! اٹھتا نہیں ہے؟

وہ بے چارہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بادشاہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ نے کہا۔ ''احمق! تو جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! میں اسی پر تو غور کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور اب تک میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا ہوں کہ شاید آپ جنگل کے کوئی درندے معلوم ہوتے ہیں۔

اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ وہ زمین پر پیر مارتے ہوئے دھول اڑاتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ آپ نے چوں کہ ٹھوکر ماری تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید جنگل کا کوئی درندہ آ گیا ہے۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور کہا کہ ''جاہل! احمق! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہِ وقت ہوں، اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ قباءِ شاہی میرے ہاتھ میں، تاجِ شاہی میرے سر پر ہے اتنے خزانوں کا میں مالک ہوں''۔ اور اس نے اپنی نعمتیں شمار کروائیں۔ سقراط نے کہا کہ: او احمق! تو نے جتنی چیزیں اپنی بڑائی اور بزرگی میں پیش کیں قلعوں کو پیش کیا، دولت کو پیش کیا، تاج کو پیش کیا، قباءِ شاہی کو پیش کیا یہ ساری چیزیں تو تجھ سے باہر باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کون سا کمال ہے جس پر تو فخر کرے۔ یہ باہر کی چیزیں ہیں۔ تاج اگر اچھا ہے تو اپنی ذات سے اچھا ہے۔ تجھے اس سے کیا شرف ملا اور قبا اگر خوشنما لگ رہی ہے تو یہ کپڑے کی خوبی ہے۔ تیری ذات کی اس میں کیا خوبی ہے۔ تو نے اپنی ذات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے باہر کی چیزیں پیش کیں۔ جن کا تیری ذات میں کوئی دخل نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیری شرافت باہر باہر کی ہے۔ تیری ذات کے اندر کچھ نہیں۔''

وہ جو مثل مشہور ہے، اور نحوی لکھا کرتے ہیں کہ حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں جب

پڑھتا تھا تو اس نے بہت سی یادداشتیں مرتب کر رکھیں تھی، استاد سے سنی ہوئی تقریریں اور اپنے مطالعے کی یادداشتیں اور کچھ سوالات وغیرہ۔ غرض بہت سے کاغذات کا ایک پلندہ لکھ رکھا تھا جسے یاد کرتا تھا۔

جب کھانے کا وقت آیا تو اس نے وہ پلندہ لپیٹ کر دسترخوان میں باندھ لیا۔ اس میں ایک آدھ روٹی بھی تھی۔ اتفاق سے کتا آیا اور وہ سارا دسترخوان بندھا ہوا لے کر چلتا بنا۔ یہ حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے، ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ اور کتا بھی کم بخت کچھ ایسا سرکش تھا کہ وہ آگے ہی کو چلا جا رہا ہے، پیچھے کو دیکھتا ہی نہیں۔ اور یہ اس کے پیچھے۔

لوگوں نے کہا کہ بڑا احمق ہے کہ روٹی دو روٹی ہوگی۔ کتا لے گیا تو لے جانے دے۔ اب لاٹھی لے کر پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی طاقت خرچ کر رہا ہے، تو روٹی کھانے سے اتنی طاقت آئے گی نہیں جتنی پیچھے بھاگنے میں خرچ کر ڈالی۔ لوگوں نے کہا کہ بے وقوف واقع ہوا ہے۔

حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''بے وقوف تو تم ہو۔ میں روٹی کی وجہ سے نہیں دوڑ رہا۔ بلکہ دسترخوان میں میرا سارا علم تھا جو کتا لے بھاگا۔ میں جاہل کا جاہل رہ گیا''۔ ''لوگوں نے کہا احمق! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا ساتھ لے جائے''۔ تو حقیقت میں بادشاہ نے اپنی فضیلت تاج اور قبا میں بیان کی۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ اگر کوئی دشمن یا غنیم آئے، تاج چھین لے، قلعے چھین لے، تو بادشاہ کی شرافت ختم ہوگئی، شرافت تو وہ ہے کہ آدمی زمین کے اوپر رہے جب بھی باکمال ہو اور اگر زمین کی تہہ میں اتار دو جب بھی باکمال ہو۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ ادھر جاؤ تو باکمال اور اُدھر کا رخ کر لو تو بے کمال۔ یہ کمال نہیں کہلاتا۔ کمال اپنی ذات کے اندر ہونا چاہئے۔ اپنے اندر جوہر ہونا چاہئے۔ یہ فی الحقیقت کمال ہے۔

مرکزِ محنت...... حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ نے ایک تمثیلی حکایت نقل کی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ واقعہ بھی ہو۔ تمثیل نہ ہو۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم جھگڑا ہوا۔ دونوں آپس میں لڑے، چینیوں نے کہا ہم زیادہ باکمال ہیں، زیادہ صناع ہیں، زیادہ دستکار ہیں۔ رومیوں نے کہا کہ ہم زیادہ صناع ہیں۔ ہم زیادہ دست کار ہیں۔ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ دونوں میں جھگڑا ہوا، دعوے دونوں طرف سے تھے، یہاں تک قریب تھا کہ جنگ ہو جائے۔ لوگوں نے کہا کہ بھائی! باہم لڑتے کیوں ہو؟ کسی کو ثالث اور حکم بنا لو، تو مقدمہ بادشاہِ وقت کے پاس گیا کہ دو قومیں لڑ رہی ہیں۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔ ایک قوم کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔ دوسری کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔ چینیوں نے کہا کہ حکمت ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ اور رومیوں نے کہا کہ ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ بادشاہ نے کہا، دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ دونوں اپنی اپنی صنعت کے نمونے دکھلائیں۔ اسے دیکھ کر ہم فیصلہ کریں گے کہ کون زیادہ باکمال ہے۔ اور تجویز یہ دی کہ ایک ہال بنایا گیا اور اس میں پارٹیشن کر دیا گیا۔ تقسیم کر کے ایک پردے کی دیوار کر دی گئی اور دونوں قوموں سے کہا گیا کہ آدھے مکان میں تم اپنی صناعت دکھاؤ۔ آدھے مکان

میں تم دستکاری دکھلاؤ۔ بیچ میں سے پردہ ہٹا کر پھر ہم موازنہ کریں گے کہ کس کی صناعی اور دستکاری بڑھی ہوئی ہے۔

چناں چہ دونوں قوموں نے اپنی کاریگری کا کام شروع کیا تو چینیوں نے دیوار پر پلاستر کر کے دیوار پر نقش و نگار بنانے شروع کیے اور رنگ برنگ کے پھول اور بوٹے بنائے۔ تو دیوار کو باغ و بہار بنا دیا۔ کوئی بوٹا نہیں چھوڑا جو اس میں بنایا نہ گیا ہو۔ کوئی پھول اور پتی نہیں چھوڑی جو اس میں نہ بنائی گئی ہو۔ کوئی رنگ نہیں چھوڑا جو دیوار میں لگایا نہ ہو۔ تو پوری دیوار کو گلزار بنا دیا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دیوار میں اثر کرنا چاہتی ہے۔ مگر آدمی کی نگاہ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں ہٹ سکتی۔ یہ کاریگری تو چینیوں نے دکھلائی۔

اور رومیوں نے کیا کاریگری دکھلائی؟ انہوں نے آدھے کمرے میں پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا اور مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکدار بنا دیا کہ دیواریں آئینہ بن گئیں کہ اس میں صورت نظر آنے لگی۔ بالکل چمکا کر آئینہ کر دیا۔ نہ ایک نقش بنایا، نہ ایک بوٹا بنایا، نہ ایک پھول بلکہ صیقل کر کے آئینہ کر دیا۔ جو سامنے کھڑا ہوتا۔ اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

جب دونوں اپنی کاریگری سے فارغ ہو گئے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی، بادشاہ نے حکم دیا کہ پردے کی دیوار ہٹا دی جائے تا کہ موازنہ کریں۔ پردہ کی دیوار کا ہٹنا تھا کہ چینیوں نے جتنے نقش و نگار بنائے تھے، دوسری طرف نظر آنے لگے، اس لئے کہ دیواریں تو آئینہ ہو گئی تھیں۔ وہ سارے پھول ادھر نظر آ رہے ہیں۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو بیل بوٹا، ادھر ہے وہی اُدھر ہے۔ جو رنگ اُدھر ہے وہی اِدھر ہے۔ جو نقش و نگار اِدھر ہیں وہی اُدھر ہیں، اب وہ حیران ہے کہ فیصلہ کس کے موافق دوں اور کس کے خلاف دوں؟

آخر رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ رومی اپنی صنعت میں بڑھ گئے، کیوں کہ انہوں نے اپنی صنعت تو دکھلائی تھی، دوسروں کی صنعت بھی چھین لی۔ یہاں بیل بوٹے ہیں اور چمک کے ساتھ ہیں۔ وہاں فقط نقش و نگار ہیں۔ چمک دمک کچھ نہیں۔ تو اپنی صنعت دکھلائی اور دوسروں کی صنعت چھین لی۔ گویا رومیوں نے ڈبل صنعت دکھلائی اس لئے رومی بڑھ گئے۔

یہ حکایت نقل کر کے حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ لکھتے ہیں کہ ''اے عزیز! تو اپنے قلب میں چینیوں کی صنعت مت کر کہ دنیا بھر کے پھولوں اور بوٹوں کو دیکھتا پھرے۔ رومیوں کی صنعت کر کہ اپنے دل کو مانجھ کر آئینہ بنا لے کہ ساری دنیا کی صنعتیں تجھے گھر بیٹھے نظر آنے لگیں، تو دنیا کے اندر نقش و نگار اور پھول پتیوں کو ٹٹولتا ہوا کہاں مصیبت کے اندر پھر رہا ہے۔؟ تیرے اندر تو وہ کائنات موجود ہے کہ ساری دنیا کے پھول اور پتیاں تیرے اندر موجود ہیں۔ تو دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت کی طرح دل کو صیقل بنا لے۔ دنیا تو تجھے وہیں بیٹھے ہوئے نظر آنے لگے گی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ ❊ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ ی در دل بکشا بچمن درآ

تیرے پاس تو دل موجود ہے۔ اس میں اگر تو ایک دروازہ نیچے کا کھولے گا تو ساری دنیا اس میں سے تجھے

نظر آئے گی اور اگر اوپر کا دریچہ کھول دے تو عالم غیب تجھے نظر آئے گا۔ دنیا کے مشاہدات قلب میں آئیں گے اور اوپر کے علوم قلب کے اندر آئیں گے۔ تو قلب عجیب کیمیا ہے کہ اس میں دو۲ دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک عالم غیب کی طرف اور ایک عالم شاہد کی طرف۔ محسوسات کی صورتیں بھی قلب میں ہیں مغیبات کے علوم بھی قلب کے اندر ہیں۔ تو جس انسان کو یہ چیز دی جائے وہ ان پھول پتیوں میں مبتلا ہو کے رہ جائے؟ اسے تو یہ چاہئے کہ ان دریچوں کھول دے تاکہ اسے ساری صورتیں نظر آئیں۔ نہ صرف یہاں کی بلکہ عالمِ غیب کی چیزیں بھی اس پر منکشف ہوں اور نظر آنے لگیں۔

مدارِ علوم...... حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ بیمار ہوئے اور کمر میں پھوڑا نکلا اور اتنا شدید کہ بتیس برس تک وہ پھوڑا رہا۔ اور کیفیت یہ تھی کہ کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی کھا رہے ہیں تو چت لیٹ کر اور استنجاء بھی کر رہے ہیں تو چت لیٹ کر۔ نماز بھی پڑھتے ہیں تو اشاروں سے چت لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ نہ اٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ نہ کروٹ بدل سکتے ہیں اور بتیس ۳۲ برس کامل اس حالت میں گزرے ہیں۔ اندازہ کیجئے کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی عظیم اذیّت ہوگی؟ مگر اس تکلیف کے باوجود چہرہ دیکھا جاتا تھا تو نہایت بشاش کہ تندرستوں کے چہروں پر وہ رونق نہ ہو۔ جو حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ کے چہرہء مبارک پر تھی۔ نہایت ہشاش بشاش اور کھِلا ہوا چہرہ۔

لوگوں نے عرض کیا کہ "حضرت! بیماری تو اتنی شدید کہ اذیّت کی کوئی انتہا نہیں، بیٹھ نہیں سکتے، اٹھ نہیں سکتے۔ اور آپ کی بشاشت کی کیفیت یہ کہ کسی تندرست کا چہرہ بھی اتنا شاداب نہیں ہو سکتا جتنا آپ کا ہے؟" فرمایا، ہاں!" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے مجھے یہ تکلیف دی تو میں نے بجائے جزع فزع کرنے کے اور بجائے اللہ کا شکوہ کرنے کے صبر اور تحمل سے کام لیا اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، جس حالت میں تو رکھے میں اس حالت پر راضی ہوں۔ تو میں نے اس تکلیف پر رضا اور تسلیم کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور صبر سے کام لیا۔ نہ صرف صبر بلکہ شکر بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بتیس ۳۲ برس سے روزانہ اس بستر کے اوپر ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں۔ عالمِ غیب میرے اوپر منکشف ہے۔ رجالِ غیب میرے سامنے آتے ہیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت میرے سامنے ہے۔ اگرچہ میں نے ارادے سے مجاہدہ نہیں کیا، یہ تقدیری مجاہدہ ہے جو اللہ نے مجھے دیا، تو یہ ہے اضطراری مجاہدہ مگر میں نے اس مجاہدے کو قبول کر کے صبر کیا۔ اس مجاہدے کی برکت سے اللہ نے میرے قلب کے دروازے کھل دیئے، مجھ پر عالمِ غیب منکشف ہوا، اور میں ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں"۔

جس انسان کو یہ کائنات دی جائے، اگر وہ ارادی مجاہدے کرے۔ سبحان اللہ! اور اگر اضطراری مجاہدہ ہو تو اس پر صبر اور تسلیم اختیار کرے۔ تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ تو جس کے اندر ایسی آنکھ دی گئی ہے کہ دنیا ہی میں بیٹھے بیٹھے وہ آخرت کی چیزیں دیکھے، اس کے لئے کیا مصیبت ہے کہ وہ پھول پتیوں میں الجھا ہوا

پھرے۔ یہ ساری پھول پتیاں اس کے اندر موجود ہیں۔

معیتِ اہلِ حق سے انکشافِ حقائق ...... نیز اہل اللہ اور کاملین جب اپنے کمالات، اپنے مجاہدات اور ریاضت سے اونچے مقامات پر پہنچتے ہیں تو ان کے قلب کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ تو وہ۔ جو ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں ان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ فائز المرام بن جاتے ہیں۔

میں نے اپنے بزرگوں سے ایک واقعہ سنا اور اس کے روایت کرنے والے حضرت مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مراد آباد کے علماء میں سے ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جو دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے بانی ہیں۔ جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا۔ تو حضرت مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا۔ کوئی راوی بھی بیچ میں نہیں۔ فرمایا کہ

”جب میں دارالعلوم میں طالب علمی کے زمانے میں مقیم تھا اور دارالعلوم کی بالکل ابتداء تھی۔ ابھی قائم ہی ہوا تھا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے میں پڑھتا تھا۔ فرماتے تھے کہ: طلباء میں ایک نوجوان لڑکا بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا، اس سے ان کی آنکھ لڑ گئی۔ اور اس کا عشق ان کے قلب میں پیدا ہو گیا۔ مگر چوں کہ پاک دامن اور عفیف تھے۔ اس لئے برے جذبات سے تو قلب خالی رہا مگر عشق و محبت کی وجہ سے اس میں ایک سوختنی اور ایک اضطراب اور بے چینی ہر وقت ٹھہر گئی۔ ہر وقت ایک کوفت اور ایک سوزش رہنے لگی۔ اس لڑکے کا دھیان اور تصور رہتا“۔

فرماتے تھے کہ: اس کیفیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سجدے میں بجائے ”سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی“ کے اس لڑکے کا نام میری زبان سے نکلا، اس درجہ قلب پر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا۔ فرماتے تھے کہ میرے دل پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میری دنیا گئی تھی تو گئی تھی۔ اب تو میرا دین بھی چلا۔ جب میری نمازیں ایسی ہو گئیں کہ اللہ کے نام کے بجائے غیر اللہ کا نام نکلے تو میرا دین ہی کیا باقی رہا؟

اس کی شکایت لے کر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت! یہ واقعہ ہے۔ حضرت کو پہلے سے معلوم تھا مگر فرماتے نہیں تھے۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میرا دین بھی ضائع ہونے لگا۔ اب میری دستگیری فرمائیے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا۔ یہ اصل میں پٹھان تھے۔ اے جی! مولوی منصور علی! تم تو پٹھان آدمی ہو۔ اتنے ہی میں تم گھبرا گئے۔ اور یہ دھاڑیں مار کر رو پڑے اور کہا حضرت! یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میرا تو دین بھی چلا اور میری دنیا بھی گئی۔ آپ خدا کے لئے میرا علاج کریں۔

حضرت نے فرمایا۔ کل صبح کی نماز کے بعد جب میں مسجد سے نکلوں اور حجرے میں جانے لگوں تو میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بولنا مت۔ میرے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ چناں چہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ چھتے کی مسجد میں جو دارالعلوم سے بالکل ملی ہوئی ہے اور وہیں سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بھی ہوا ہے۔ اسی چھتے کی مسجد میں انار کا ایک درخت ہے۔ جو اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اسی کے نیچے سے دارالعلوم

دیو بند شروع ہوا۔ ایک استاد اور ایک شاگرد سے دارالعلوم دیو بند کی ابتداء ہوئی ہے۔ استاذ کا نام مُلّا محمود رحمۃ اللہ علیہ تھا اور شاگرد کا نام حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ تو چھتّے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دو محمودوں کے نام سے دارالعلوم دیو بند کی ابتداء ہوئی۔ اسی چھتّے کی مسجد میں ان تمام اکابر اہل اللہ کا اجتماع رہتا تھا۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیو بند کے مہتمم اوّل ہوئے ہیں اور نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیو بند کے بانی ہیں۔ یہ چشتی تھے۔ اور ہماری پوری جماعت پر چشتیت ہی کا غلبہ ہے اور سلسلہ ہمارا چشتیہ ہے۔ گو ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں اور چاروں سلسلوں میں تربیت بھی کرتے ہیں۔ جس کو جس سلسلے سے مناسبت ہو، اسی میں بیعت وتلقین کی جاتی ہے۔ تو جامع الطرق ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔ اور اصل سلسلہ ہم لوگوں کا چشتی ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان سے لے کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

غرض، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ چشتیہ خاندان کے اکابر میں سے ہیں۔ تو حضرت مولانا منصور علی خان رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا کہ کل جب میں صبح کی نماز پڑھ کر حجرے میں جانے لگوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ مگر بولنا کچھ نہیں۔ چناں چہ حضرت جب نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے، یہ ساتھ ہو لئے۔ اور حضرت مولانا منصور علی خان مجھ سے کہتے تھے، میں نے اس دن حضرت کی آنکھوں میں سرخی اور کچھ غیر معمولی ہیئت دیکھی جس سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجرے میں گئے اور میں بھی حجرے میں چلا گیا اور میں نے کواڑ بند کر دیئے، فرماتے تھے جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ جا کر بیٹھ گئے۔ اور میں سامنے مودّب بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑا۔ فرماتے تھے میں نے اپنا داہنا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں دیا تو حضرت نے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں کے اوپر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا جیسے کوئی رسی یا بان بٹا کرتا ہے۔

حضرت مولانا منصور علی خان رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے فرماتے تھے میں تم سے حلفِ شرعی کر کے اور اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جب تک حضرت میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پورے آسمان اور زمین کی چیزیں مجھ پر روشن تھیں۔ ملائکہ کی آمد ورفت مجھے نظر آ رہی تھی۔ چڑھ رہے ہیں اور اتر رہے ہیں۔ گویا پورا عالم غیب مجھ پر منکشف تھا۔ یہ میری کیفیت تھی۔ اخیر میں زور سے ہاتھ پھیر کر مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اٹھ جاؤ یہاں سے فرماتے تھے میں باہر آیا، باہر آ کر جب مسجد سے باہر نکلا تو یہ سوچتا ہوں کہ کوئی چیز میرے قلب کے اندر تھی جو نکل گئی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ چیز کیا تھی۔

یہ اس لڑکے کی محبت تھی مگر یہ بھی بھول گئے کہ وہ کیا چیز تھی اور سوچتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز میرے

قلب سے نکلی ہے جو میرے قلب میں جمی ہوئی تھی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ فرماتے تھے کہ: جب دارالعلوم کے قریب پہنچا ہوں جو سڑک پر ہے تو وہ لڑکا نظر آیا اسے دیکھ کر یاد آیا کہ اچھا اس کی محبت تھی جو قلب میں گھسی ہوئی تھی، وہ ایسی نکلی کہ یہ بھی یاد نہیں آ رہا کہ وہ قلب کے اندر تھی بھی یا نہیں۔ تو میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول کے صحابی رضی اللہ عنہم تو بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔ بہت بالاتر ہیں۔ ان کے غلاموں اور خدام کو یہ کیفیت دی گئی ہے کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیں تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو دل ایک ایسی کائنات عطاء کی ہے کہ اگر انسان دل کو سنوار لے تو شاہد ہی نہیں بلکہ غیوب کی چیزیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ بڑے بڑے علوم اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

مرکزِ تجلیاتِ ربّانی...... اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ قلب فی الحقیقت "عَرْشُ الرَّحْمٰنِ" ہے۔ دنیا کے اندر عرشِ عظیم کی کوئی تمثال موجود ہے، اور عرش کا کوئی نمونہ موجود ہے تو وہ انسان کا قلب ہے۔ جس میں تجلیاتِ ربّانی اترتی ہیں۔ انسان کے ہاتھ پر تجلیات نہیں اترتیں، انسان کے دماغ پر تجلیات نہیں اترتیں۔ تجلیاتِ ربّانی کا اگر مرکز ہے تو وہ قلب ہے۔ اس لئے کہ "عرش الرحمٰن" ہے، تو کائناتِ آفاق میں عرشِ عظیم وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مستوی ہے۔ جس کو فرمایا گیا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ① اور کائناتِ انفس میں عرشِ عظیم انسان کا قلب ہے جس پر رحمٰن کی تجلیات آتی ہیں۔ تو جس انسان کو قلب جیسی دولت دی جائے جس کے اندر غائب وشاہد کے سارے نقش ونگار ہوں، اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ دنیا کے نقش ونگار میں گھومتا پھرے کہ ۔

تو طفلی و خانہ رنگین است

اس کو ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا تو کام یہ ہے کہ رومیوں کی صنعت انجام دے۔ اور اپنے دل کو صیقل کرے۔ ساری چیزیں خود بخود نظر آئیں گی۔

سیرتِ انسانی کا جوہرِ اوّل...... اور پھر جب اس میں چیزیں منکشف ہو جائیں گی، اور علم ومعرفت کا کمال پیدا ہو جائے گا تو کہا جائے گا کہ اب اس میں انسانیت آئی ہے۔ اب اس کے لئے شرافت کا راستہ کھلے گا۔ تو انسان نہ اپنے مادّے سے افضل بنتا ہے نہ اپنی صورت سے افضل بنتا ہے، نہ اپنے لباس سے افضل بنتا ہے۔ بنتا ہے تو اپنے دل سے افضل بنتا ہے۔ اور دل کب افضل بنتا ہے۔ اس وقت افضل بنتا ہے۔ جب عرش الرحمٰن بن جائے، اور اللہ تعالیٰ کی علمی تجلیات اس پر آنے لگیں۔ اللہ کی معرفت اس کے اندر اتر جائے۔ تب کہا جائے گا کہ اب انسان حقیقی معنی میں انسان بنا ہے۔

تو صورت سے آدمی، آدمی نہیں بنتا۔ سیرت سے بنتا ہے اور سیرت کا پہلا رکن علم ہے۔ اگر علم نہیں بلکہ قلب میں جہالت پڑی ہوئی ہے تو سیرت کا ابتدائی زینہ طے نہیں ہوا۔ غرض سیرتِ انسانی کا پہلا رکن یہ ہے کہ اس کے

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵.

اندر علم ہو۔ جہالت سے سیرت نہیں بنتی، علم سے سیرت بنتی ہے۔ بے بصیرتی سے سیرت نہیں بنتی ہے۔ بصیرت سے بنتی ہے اور بصیرت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ علم و معرفت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ تو جب آدمی رومیوں کی صنعت جاری کرتا ہے تو یہ انسان کی سیرت کا ابتدائی زینہ ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں۔ سارے انسان تباہ و برباد ہیں۔ اگر بچنے والے ہیں تو اہلِ علم ہیں جو بچیں گے۔

تو انسان کے معنی کیا ہیں؟ مادّے کے لحاظ سے انسان، صورت کے لحاظ سے انسان، لباس کے لحاظ سے انسان؟ فرماتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں ہے۔ خوبصورتی نجات نہیں ولائے گی۔ یہ گندے مادّے نجات نہیں دلائیں گے، یہ فاخرہ لباس نجات نہیں دلائیں گے، اگر نجات دلانے والی چیز ہے تو علم ہے۔ جس سے انسان حق و باطل کو پہچانے، صحیح غیر صحیح میں فرق کرے، جائز و ناجائز کا امتیاز کرے۔ اگر اس میں یہ امتیاز نہیں اور حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ کھانا جانتا ہے مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا، پہننا جانتا ہے مگر حرام و حلال کو نہیں جانتا، پھر بیل میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟

بیل بھی کھانا جانتا ہے مگر جائز و ناجائز کو نہیں جانتا۔ بیل بھی تو مکان چاہتا ہے کہ جس میں رہے، مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا۔ غیر کا مکان ہو جب بھی آ جائے گا۔ اپنے مالک کا مکان ہو جب بھی کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے مالک کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اور غیر کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اسے جائز و ناجائز کی تمیز نہیں۔ آخر بیل ہی تو ٹھہرا۔ اگر انسان میں بھی جائز و ناجائز کی تمیز نہ ہو، حلال و حرام کا امتیاز نہ ہو، تو بیل اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ حیوانیت محضہ ہے۔ تو انسان، انسان جب بنتا ہے کہ جب اس کے اندر علم آ جائے۔

علمِ ضروری کی مقدار...... اور علم بھی وہ کہ وہ محض دانستن کا نام علم نہیں، محض جان لینے کا نام علم نہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا بہت علم تو بیل کو بھی ہے۔ وہ بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے۔ یہ نہیں، یہ مجھے گھاس دانہ ڈالتا ہے، یہ نہیں ڈالتا ہے۔ اس کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ دوسرے کے آگے نہیں۔ اتنا علم تو کتا بھی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے، اس کے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔ اور غیر آ جائے اس پر حملہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تو وہ فرق محسوس کرتا ہے کہ یہ مکان کا مالک ہے اور یہ نہیں۔ اسے مکان میں آنے کا حق ہے اور اجنبی کو نہیں۔ ہاں اگر مالک کتے کو ڈانٹ دے، تو چپکا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مالک نے اجازت دے دی تو اس کے آنے کا حق پیدا ہو گیا۔

ہمارے حاجی محمد شفیع صاحب جن کی کوٹھی پر ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، انہوں نے بڑا زبردست قسم کا جنگلی کتا پال رکھا ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیں تو صرف حملہ نہیں کرتا بلکہ وہ تو ایک دم گلا دبا دیتا ہے۔ کوئی بھی آئے اس نے بھونکنا شروع کیا لیکن حاجی صاحب جب ایک ڈانٹ لگاتے ہیں تو چاہے دس آدمیوں کے ساتھ آئیں، چپکا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ مکان ان کا نہیں، مالک کا ہے۔ مالک اجازت دے گا تو آنے کا حق

حاصل ہے۔نہیں اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل نہیں۔غرض اتنا تھوڑا بہت علم تو کتا بھی رکھتا ہے۔اتنا علم اگرانسان میں آئے تو اتنا علم حیوانیت کے لئے بھی ہے۔حقیقی علم وہ ہے جس سے انسان حلال وحرام کو پہچاننے،حق ناحق کو پہچانے، جائز وناجائز میں فرق کرے۔یہ کام انسانی قلب کا ہے، ہاتھ پیر کا نہیں۔

قلب کا امتیازی ادراک...... امام رافعی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کے اندر سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔صرف ایک قلب ہے جو آخرت کا عضو ہے۔اور حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔ہاتھ اگر مال لے تو جائز مال بھی ہاتھ اٹھالے گا۔ناجائز مال کو ہاتھ ڈالیں وہ بھی ہاتھ پکڑ لے گا۔یہ نہیں ہے کہ رشوت کا مال ہو تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگیں اور جائز مال ہو تو آپ لیے چلے آئیں۔نہیں۔جس طرح سے خوشگواری کے ساتھ پچاس ساٹھ روپے جائز ہاتھ اٹھائے گا، اگر ساٹھ ستر رشوت کے آ گئے، وہ بھی اٹھالے گا۔چوری کے آ گئے وہ بھی اٹھالے گا۔تو جائز و ناجائز میں ہاتھ کو کوئی امتیاز اور تمیز نہیں۔یہ بیچارہ محض مالیت دینے اور پکڑنے کا عادی ہے۔حلال ہو یا حرام۔اگر آدمی ناجائز مال کھائے تب بھی زبان کو وہی لذت آئے گی جو زبان کو جائز مال کھانے سے آئے گی۔کیوں کہ زبان کو یہ تمیز نہیں ہے کہ یہ جائز اور یہ ناجائز ہے۔یہ حلال اور یہ حرام ہے۔

اگر آپ چلیں تو جس طرح سے آپ مسجد کی طرف چلتے ہیں۔یہی پاؤں آپ کو شراب کی بھٹی کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔یہ نہیں ہے کہ شراب کی بھٹی کی طرف جائیں تو پاؤں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی، اور مسجد کی طرف جانے میں قدم ذرا جلدی اٹھیں گے۔بلکہ مسجد کی طرف جانے میں ذرا کم اٹھتے ہیں، شراب کی بھٹی کی طرف جانے میں زیادہ اٹھتے ہیں۔مگر تمیز کی وجہ سے نہیں، عادت کی وجہ سے۔تو پیر کو کوئی جائز و ناجائز کی تمیز نہیں لیکن قلب کے اندر احساس موجود ہے، جب چور چوری کا مال لے کر آئے گا تو ضمیر اس کو ملامت کرے گا کہ کم بخت! تو نے بری حرکت کی، اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے مگر قلب اسے صحیح مشورہ ہی دے گا، تو انسان کا قلب آخرت کا عضو ہے۔وہ حق اور ناحق میں تمیز چاہتا ہے۔وہ اچھے اور برے میں امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔اس لئے اگر اس قلب کو صاف کرلیا جائے تو پھر اللہ کی مرضی کیا ہے اور نامرضی کیا ہے؟ اس کو پہچاننے لگتا ہے۔حق تعالیٰ کس چیز کو پسند کرتے ہیں اور کس چیز کو ناپسند کرتے ہیں۔تو علم کا ابتدائی درجہ تمیز ہے کہ آدمی حق و باطل اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرے۔

حقیقتِ علم...... علم کی حقیقت ہی درحقیقت تمیز ہے۔یعنی دو چیزوں کو ممتاز کیئے رکھنا۔اور دو چیزیں رل مل جائیں اور مشتبہ ہو جائیں تو کہیں گے کہ اس شخص کو علم نہیں ہے۔اگر علم ہوتا تو دونوں چیزوں کو الگ الگ دیکھتا، اور دونوں چیزوں کو الگ الگ سمجھتا، تو امتیاز پیدا کر دینا یہ علم کا مرتبہ ہے۔

علم الفرقان...... اور یہ علم جب اونچا بنتا ہے تو اور زیادہ تمیز پیدا ہوتا ہے۔اور علم میں کمال تقویٰ سے آتا ہے۔جتنا تقویٰ و طہارت ہوگا علم میں کمال پیدا ہوتا جائے گا۔قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ

تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ① اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگو اور متقی بن جاؤ تو اللہ تم میں فرقان پیدا کر دے گا''۔ فرقان: کے معنی اس اندرونی قوت کے ہیں جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کر دے۔ جائز کو ناجائز سے علیحدہ کر دے۔ جب یہ تمیز پیدا ہو جائے تو کہا جائے گا تقویٰ کامل ہو گیا۔ تقویٰ کا اثر یہ ہے کہ انسان کا دل خود بھلائی اور برائی میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔

ترتیبِ استفتاء...... اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَاِنْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ'' ② جب کوئی معاملہ پیش آئے پہلے اپنے دل سے فتویٰ لو''۔ دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے، یہ بات غلط ہے، مفتیوں کے پاس تو بعد میں لے جاؤ، پہلے دل سے فتویٰ لو۔ ایک آدمی بعض اوقات چاہتا ہے کہ فتویٰ میرے مطابق ہو جائے، فتویٰ وہ ہو جس کو میرا نفس چاہتا ہے۔ تو الٹے سیدھے سوال بنا بنا کر مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب مفتی تو جواب وہی دے گا جیسی سوال کی صورت ہوگی۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق جواب حاصل کر لیا اور اس پر عمل کیا۔ ظاہری طور پر آپ کہیں گے کہ بھائی! مفتی کے فتوے پر عمل کر رہا ہے۔ بے چارہ معذور ہے، مگر دیانۃً معذور نہیں ہے، اللہ جانتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر سوال غلط بنایا تھا کہ دنیا کو دکھلانے کے لئے کہہ سکے کہ فتویٰ پر عمل کر رہا ہوں۔ یہ تو اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کر رہا ہے۔ اور جب انسان سب سے پہلے اپنے نفس سے فتویٰ لے۔ پھر مفتیوں سے فتویٰ لے، دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَاِنْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ۔'' بہر حال انسان کے قلب کے اندر جب علم کی طاقت آتی ہے تو امتیاز پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، تو کہا جائے گا کہ انسانی سیرت کا پہلا جوہر قلب کے اندر آ گیا، ابتدائی درجہ یہ ہے کہ انسان میں حق ناحق کا علم اور امتیاز ہو جو جانوروں کو میسّر نہیں ہے۔ اس واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔'' لوگ سب کے سب برباد ہیں۔ نہ ان کا مادہ ان کو بچا سکے گا، نہ ان کی صورت ان کو بچا سکے گی، نہ ان کا لباس ان کو بچا سکے گا۔ غرض لوگ ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اہل علم بچنے والے ہیں۔ جن کے اندر جائز و ناجائز کا امتیاز ہے۔

سیرت انسانی کا دوسرا جوہر..... لیکن اگر آپ غور کریں تو علم محض بھی نجات دلانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ جتنا علم زیادہ ہوگا زیادہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ علم سے مقصد فی الحقیقت عمل ہے۔ اگر علم پر عمل مرتّب نہ ہو تو کہا جائے گا کہ یہ علم لغو، بیکار اور فضول ہے۔ علم کی غرض و غایت اس کا استعمال میں لانا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہے۔ ''اَلشَّیْءُ اِذَا خَلَا عَنِ الْغَایَةِ لَغَا'' جب شے اپنی غرض و غایت سے خالی ہو جاتی ہے، تو وہ لغو اور بیکار ہو جاتی ہے۔ گھوڑے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس پر سواری ہو، جب وہ سوار ہونے نہ دے اور بدکتا

---

① پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۲۹. ② مسند احمد، حدیث وابصۃ بن معبد الاسدی ج: ۳۶ ص: ۴۳۸. السنن للامام الدارمی، کتاب البیوع، باب دع مایریبک الی مالا یریبک، ج: ۸، ص: ۲۸، رقم: ۲۵۸۸. مشکاۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال، ج: ۲، ص: ۱۲۶، رقم: ۲۷۷۴.

شروع کرے، کھانے کو سینکڑوں روپے روز کھا جائے اور جب مالک سواری کے لئے آئے تو دولتیاں مارنا شروع کر دے، تو کہا جائے گا کہ گھوڑے کی غرض وغایت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ گھوڑا گولی مار دینے کے قابل ہے۔ حالاں کہ گھوڑا موجود ہے۔ اور عمدہ شکل میں ہے۔ مگر جتنی اچھی شکل ہوگی، آقا کو اور بری معلوم ہوگی۔ جب غرض پوری نہیں ہوگی۔ غرض اس سے یہ ہے کہ سواری کا کام دے، تو جب شے اپنی غرض سے خالی ہو جاتی ہے، وہ لغو بن جاتی ہے اور گولی مار دینے کے قابل ہوتی ہے۔

اگر انسان بیوی کرتا ہے، اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بنے، گھرستی کا کام کرے، اس کی نسل بڑھے۔ اگر وہ اتنی پھوہڑ ہو کہ گھر کو بھی تباہ کر دے۔ نسل اس سے نہیں چلتی۔ تو سوائے اس کے کہ خاوند اسے طلاق دے یا اس کو ایک طرف بٹھا کے کوئی دوسرا نکاح کرے، اس کے سوا اور کیا کرے گا۔ جو اس کے نکاح کی غرض وغایت تھی، جب حاصل نہ ہوئی تو وہ لغو اور بیکار ہو گئی، کسی نے اگر بہت زیادہ دلداری کی اور ہمدردی کی تو طلاق نہیں دے گا، کچھ روزینہ مقرر کرے گا اور کہے گا چوکی پر بیٹھ کر "اَللّٰهُ اَللّٰه" کرتی رہ، اس کے سوا تو کسی کام کی نہیں ہے اور دوسرا نکاح کرے گا۔ غرض جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہو جاتی ہے تو لغو اور بیکار بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے علم اگر عمل کا فائدہ نہ دے تو وہ علم لغو اور بیکار ہے۔ وہ وبالِ جان بن جائے گا، اور فضول ہو جائے گا، تو جب تک علم پر عمل کی غایت مرتّب نہ ہو، علم بیکار ہے۔ اس سے معلوم ہوا علم محض انسان کو نجات نہیں دلا سکتا۔ نجات دلانے والی چیز انسان کا عمل ہے جو اس علم کے مطابق ہو۔ یہ اصل میں نجات دینے والی چیز ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ" انسان سب کے سب تباہ و برباد ہیں بچیں گے کون؟ صرف علم والے اور پھر فرماتے ہیں: "وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ" علماء بھی سب کے سب وہ بچیں گے جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ تو عمل نجات کا ذریعہ ہے۔ محض کورا علم نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

تجمّل علم کا فتنہ..... کورا علم تو تجمّل ہے۔ اور ایک ترفّع ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: اخیر زمانے میں علم تجمّل کا ذریعہ بن جائے گا، جیسے انسان اپنے کپڑوں سے زینت حاصل کرے گا، اپنی رنگت سے زینت حاصل کرے گا، اسی طرح اپنے علم سے بھی زینت حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہوگا۔ علم کو استعمال میں لا کر انسان نجات کی طرف نہیں چلے گا۔ بلکہ فخر ومباہات کا ذریعہ بنا لے گا۔ تو ایسا علم انسان کے اوپر وبالِ جان ہے۔ اس لئے فرمایا کہ علماء بھی سب کے سب تباہ و برباد ہیں۔ اگر اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں۔ گویا انسانیّت کی غرض وغایت علم ہے اور علم کی غرض وغایت عمل ہے، اگر علم نہیں تو انسانیت لغو ہے۔ اگر علم ہے اور عمل نہیں تو علم لغو اور بیکار ہو گیا۔ غرض علم پر عمل نجات کا ذریعہ ہے۔

سیرتِ انسانی کا تیسرا جوہر..... لیکن اگر آپ غور کریں تو عمل بھی نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عمل ایک ڈھانچہ ہے، جب تک اس کے اندر روح نہ ہو، وہ محض ایک لاش ہے اور لاش کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی ڈھانچے میں روح موجود نہ ہو تو وہ اس قابل ہے کہ اسے جلد از جلد زمین میں دفن کر دیا جائے۔ اگر وہ لاش یوں ہی پڑی رہے گی

تو پھولے گی، پھٹے گی، بدبو پیدا ہوگی دماغ خراب ہوں گے، تو لاش کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اسے جلد سے جلد خاک میں ملا دیا جائے، جلد سے جلد اسے دریا برد کر دیا جائے۔ ورنہ دنیا کا دماغ صحیح سالم نہیں رہے گا۔

اسی طرح سے عمل ایک لاش اور ایک ڈھانچہ ہے۔ اگر اس کے اندر روح موجود ہے تو وہ اخلاص اللہ کی ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو، اس میں شرک کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اگر اس میں شرک کا شائبہ ہے وہ عمل غیر اللہ کے لئے ہے یا وہ عمل مشترک ہے کہ کچھ اللہ کے لئے ہے کچھ غیر اللہ کے لئے ہے تو درحقیقت وہ عمل بے روح کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اور وہ عمل سوائے اس کے کہ پھولے، پھٹے، سڑے اور گلے، آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔ تو عمل کی روح اخلاص ہے کہ خالص اللہ کے لئے ہو، اس میں غیر کی رضا کی آمیزش نہ ہو۔

رضائے خلق کا طریق...... بلکہ غیر بھی جب ہی راضی ہوگا، جب اس کی رضا پیشِ نظر ہو۔ کیوں کہ جب اللہ کی رضا پیشِ نظر ہوگی، اغیار بھی راضی ہوں گے۔ اور اگر صرف غیروں کے راضی کرنے کی فکر کرو گے تو نہ وہ راضی ہوں گے نہ اللہ راضی ہوگا۔ تو کوئی بھی راضی نہ ہوا اور خدا کو راضی کرنے کی فکر کی تو غیر بھی راضی ہو جائے گا، انسان بھی راضی ہو جائے گا۔ انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی راضی ہو جائے گا، نباتات بھی راضی ہوں گے۔ جمادات بھی راضی ہو جائیں گے۔ ''مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ'' ① جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ جس کا اللہ ہو جائے ساری کائنات اس کی ہو جاتی ہے، اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تو۔

تو از حکمِ داور گردن مپیچ ... کہ گردن نہ پیچد ز حکمِ تو ہیچ

تیرا کام یہ ہے کہ مالک کے حکم سے گردن مت پھیر، اگر تو نہ پھرا تو ساری گردنیں تیرے آگے جھک جائیں گی۔ اور اگر تو نے مالک سے گردن پھیر لی تو ساری گردنیں تیرے سے الگ ہو جائیں گی اور اکڑ جائیں گی۔ بہرحال اللہ کو راضی کرے گا تو مخلوق خود بخود راضی ہو جائے گی، اور وہ راضی نہ ہوئے تو کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ اس ''ایک'' کو آدمی پکڑ لے۔

مالک کی نگاہ کی عظمت...... ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے دربار میں ایک دفعہ جوش میں آ کر اعلان کیا کہ آج جو شخص جو کچھ مجھ سے مانگے گا، میں اس کو دوں گا۔ لوگوں نے مانگنا شروع کیا۔ کسی نے کہا مجھے گورنری دے دیجئے، اس نے کہا۔ دے دی۔ کسی نے کہا مجھے فلاں قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا میں نے دے دیا، کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دیجئے، اس نے کہا میں نے دے دیا، ہر ایک نے اپنی اپنی مراد پیش کرنی شروع کی اور بادشاہ نے پوری کرنی شروع کر دی۔

ہارون الرشید کی پشت پر ایک باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے کہا تو نے اب تک کچھ نہیں مانگا؟ اس نے کہا ان احمقوں کو نمٹنے دو، اس کے بعد مانگوں گی، ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ اچھا۔ یہ میری

① احیاء علوم الدین، بیان توکل المعیل ج: ۴ ص: ۲۷۴۔

دولت کے امراء، وزراء سب کے سب احمق ہیں۔اس نے کہا سب پاگل اور بے وقوف ہیں۔انہیں مانگنا ہی نہیں آتا۔ ہارون سمجھا کہ ناقص العقل تو ہے ہی، کون اس کے منہ لگے، خاموش ہو گئے، لوگ مانگنے پر کھڑے ہوئے تھے، کسی نے کچھ مانگا، کسی نے کچھ مانگا، وہ دیتے رہے، جب سب نمٹ گئے تو ہارون الرشید نے کہا، اب تو مانگ کیا مانگتی ہے۔اس نے کہا سارے بے وقوف تو نمٹ چکے ہیں۔اب میرے مانگنے کا موقع ہے، کیا آپ مجھے دیں گے۔؟ ہارون الرشید نے کہا۔ میں تو اعلان کر چکا ہوں کہ جو کوئی آج مجھ سے جو مانگے گا میں اس کو دوں گا، اس نے جا کر ہارون الرشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ ''میں تو آپ کو مانگتی ہوں، آپ میرے ہو جائیے''۔

اس واسطے کہ جب آپ میرے ہیں تو قلعے بھی میرے ہیں، خزانے بھی میرے ہیں، رعایا بھی میری، ملک بھی میرا، اگر آپ میرے نہیں ہیں تو خزانہ آئے گا نہیں، اگر آئے گا تو پھر چھن جائے گا۔اس لئے میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔تو اس نے کہا جتنے مانگنے والے تھے ان میں سے جس نے دس لاکھ مانگے، اسے دس لاکھ مل گئے، آگے کچھ نہیں ملا، کسی نے قلعہ مانگا آپ نے قلعہ دے دیا، آگے اس کی کوئی چیز نہ ہوئی، میں نے جو چیز مانگی، وہ مل گئی۔تو ساری چیزیں میری ہیں۔اور میں نے ان کو بے وقوف اس لئے کہا کہ اگر دس لاکھ مل گئے تو دس لاکھ ہی ہوئے، زائد تو نہ ہوئے، اور وہ دس لاکھ بھی معرض خطر میں ہیں۔اس لئے کہ اگر ہارون الرشید کی نگاہ پھر گئی اور اس نے کہہ دیا کہ ان سے یہ چھین لو، اور قلعہ دیا تھا، بعد میں نگاہ پھر گئی تو قلعہ چھین جائے گا، اگر وزارت دی تھی، بعد میں نگاہ پھر گئی تو بادشاہ کہہ دیں گے کہ اس سے عہدہ چھین لو۔تو اصل میں تو بادشاہ اور صدر کی نگاہ ہوتی ہے۔اس کو دیکھا جاتا ہے، اگر یہ قائم ہے تو یہ سب چیزیں ہیں۔اگر وہ نہیں ہے تو کسی چیز کے آپ مالک نہیں بن سکتے۔

تسخیرِ خلائق...... یہی حالت ہے اللہ والوں کی اور دنیا والوں کی کہ دنیا والے کوئی قلعہ مانگتا ہے، کوئی لاکھ مانگتا ہے، کوئی کروڑ مانگتا ہے اور اللہ والے کہتے ہیں کہ ''یا اللہ! ہمیں تو آپ درکار ہیں، اور کوئی چیز درکار نہیں، جب آپ مل گئے تو ساری دنیا ہماری، سارے قلعے ہمارے، سارے ملک ہمارے ساری مخلوق ہماری، جانور بھی ہمارے سامنے سر جھکائیں گے، اور انسان بھی''۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر جمادات کو حکم کرتے ہیں، وہ فرماں برداری کرنا اپنا فخر جانتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء کی ضرورت محسوس ہوئی اور ریگستان چٹیل میدان تھا، درخت اور سایہ دور دور تک میلوں پر تھا۔آپ نے دو درختوں کو اشارہ فرمایا، تو ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہے، ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہے۔دونوں نے مل کر اپنی شاخیں ملا دیں اور اس طرح سے ملا دیں کہ ہر طرف سے بالکل پردہ سا ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضروریات سے فارغ ہوئے۔اس کے بعد اشارہ فرمایا۔وہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔یہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔حکومت تو یہ ہے کہ ساری کائنات پر حکمرانی ہے اور کیوں ہے؟ اس لئے کہ جو کائنات کا مالک ہے اسے اپنا لیا تو ساری چیزیں اپنے قبضے میں آ گئیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان اور بڑے رتبے ہیں۔ ان کے خدّام وغلام اور ان اولیاء کرام کی بھی بڑی شان ہے کہ جب وہ اپنے کو حق تعالیٰ کے سپرد کردیتے ہیں تو ساری کائنات ان کی تعمیلِ حکم کرنا اپنا فخر جانتی ہے، اپنے لئے سعادت جانتی ہے، جمادات بھی حاضر نباتات بھی حاضر اور انسان بھی حاضر۔ سب چیزیں سامنے حاضر رہتی ہیں۔ یہ اخلاص للہ کی برکت ہوتی ہے کہ اپنے کو خالص اللہ کے سپرد کردے، جس میں غیر کا شائبہ نہ ہو۔

قلبِ مشرک کا تذبذب...... اس لئے کہ جب غیر کا شائبہ ہوگا تو حضرت عیسٰی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: دو۲ آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ جو چند آقاؤں کا غلام ہوگا تو ایک کی خدمت کی طرف جائے گا تو اسے ڈر ہوگا کہ دوسرا ناراض نہ ہوجائے۔ اس کی خدمت کی طرف جائے گا تو فکر پڑے گی کہ تیسرا ناراض نہ ہو جائے، اور سب کو ایک وقت میں راضی رکھنا مشکل ہے۔ تو نتیجہ یہ کہ چار آقاؤں کا غلام کسی ایک آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ خادم وہی ہوگا جو ایک کا غلام ہو۔ سب سے کٹ کر ایک کا ہوجائے گا کہ مرتا ہوں تو اس کے لئے، جیتا ہوں تو اس کے لئے، اس کے قلب میں قوّت ہوگی۔ اس واسطے کہ قوت کا مرکز اخلاص ہے اور قوت یقین سے پیدا ہوتی ہے، تردّد اور تذبذب سے قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے، تو مشرک کے دل میں کبھی جان نہیں ہوسکتی اور موحّد کبھی ضعیف القلب نہیں ہوسکتا، موحّد کے قلب میں اس کی توحید کی وجہ سے قوّت ہوتی ہے اور مشرک کے دل میں جان نہیں ہوسکتی، جس کے کروڑوں خدا ہوں، وہ کسی ایک طرف جھکے گا تو دوسرے کی فکر پڑے گی، اس کے دل میں جان نہیں رہے گی، ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔

قلبِ موحد کا یقین...... اور موحّد کے قلب کے اندر قوّت ہوتی ہے۔ تو موحّد اس کو ہی کہتے ہیں جو ایک کا ہو کر بقیہ سے قطع نظر کرے۔

موحّد چہ برپائے ریزی زرش	کہ فولادِ ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد ز کس	ہمیں است بنیادِ توحید وبس

موحّد کسے کہتے ہیں؟ کہ اس کے قدموں پر لاکھوں روپیہ ڈال دو، یا اس کے سر پر فولادِ ہندی کی تلوار لے کر کھڑے ہوجاؤ۔ اسے نہ کسی کا ڈر ہوگا نہ کسی سے امید ہوگی وہ تو ایک کا ہو چکا ہے نہ طمع مائل کرسکے گی، نہ خوف مائل کرسکے گا۔

روحِ عمل...... تو "ایک کا ہوجانا" اسی کے معنی ہیں "اخلاص"۔ اور عمل کے اندر اخلاص سے روح پیدا ہوتی ہے۔ جس عمل کے اندر شرک کا شائبہ بھی ہو، وہ عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا، اس میں روح ہی نہیں ہے۔

اور شرک فقط یہی نہیں ہے کہ آدمی دو۲ خدا مانے، خدا کو ایک مانے، صفات میں شرک اختیار کرے یہ بھی شرک ہے، صفات میں ایک مانے افعال میں شرک اختیار کرے۔ یہ بھی شرک ہے۔ افعال میں بھی ایک مانے، تو ذات بھی ایک، صفات بھی ایک، صفات میں بھی وحدانیت اور افعال میں بھی، لیکن عبادت میں شرک کرنے لگے

کہ دو کے سامنے سجدہ کرے، یہ بھی شرک ہے۔اور میں کہتا ہوں کہ ظاہر میں سجدہ بھی ایک ہی کے سامنے کرے تب بھی شرک کا ایک مقام ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔وہ یہ کہ آدمی اللہ کی عبادت کر رہا ہے مگر دل میں یہ خیال ہے کہ لوگ مجھے سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ریاء سب سے بڑا شرک ہے۔ دیکھنے میں شرک معلوم نہیں ہوتا مگر حقیقت میں شرک ہے۔اور حدیث میں ارشاد ہے: ''اَلشِّرْکُ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ'' ① بعض شرک ایسا دقیق ہوتا ہے جیسا کہ چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چلے تو اس کی کھسکھاہٹ اتنی دقیق ہوتی ہے کہ کان نہیں سن سکتے۔تو جیسے اس کا ادراک نہیں ہوتا، اس شرک کا بھی ادراک نہیں ہوتا۔وہ یہ کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے، اس کو یکتا جانے، صفات میں بھی یکتا جانے، ریا دکھلاوا بھی نہ ہو، مگر پھر بھی ایک درجہ کا شرک ہے۔اور وہ یہ کہ اس کے اندر عُجب موجود ہو۔یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال موجود ہو کہ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں، کون ہے جو میرے برابر عبادت کر سکے۔ یہ جو عجب اور خود بینی پیدا ہوئی۔ یہ بھی اس سے زیادہ دقیق قسم کا شرک ہے، جو عمل کو ضائع کر دے گا، اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کا ضائع ہونا شرک سے ہے اور عمل کی بقاء اخلاص سے ہے۔تو جس چیز سے شے کی بقا ہوتی ہے اسی کو تو روح کہا جاتا ہے، بدن روح سے باقی رہتا ہے اور اگر عمل اخلاص سے باقی ہو تو اخلاص عمل کی روح ہے، جب تک اخلاص نہیں ہو گا عمل قابلِ قبول نہیں ہو گا، اسی کو فرماتے ہیں کہ: ''وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ''

عمل کرنے والے بھی سب کے سب ہلاک و برباد ہیں۔ اخلاص سے عمل کرنے والے بچیں گے، جن کے اندر خلوصِ نیّت اور اخلاص موجود ہو گا۔تو انسان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں، نجات کا اوّلین درجہ علم ہے۔ علم بھی کارآمد اور کافی نہیں ہے۔ دوسرا درجہ عمل ہے، عمل بھی کارآمد نہیں۔ تیسرا درجہ اخلاص کا ہے۔ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جائیں۔ علم بھی ہو۔ عمل بھی ہو۔ خلوص بھی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ اب انسانیّت کے جوہر اس کے اندر محقق ہو گئے، اب اس میں انسانیّت اور کمالِ انسانیّت آ گئی۔

سیرتِ انسانی کا چوتھا جوہر...... لیکن اگر غور کیا جائے تو اب بھی ایک چیز باقی رہ گئی، اگر وہ نہ ہو تو پھر یہ تینوں چیزیں اکارت بن جاتی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نہ علم نجات دلائے گا نہ عمل، نہ اخلاص للہ جب تک وہ چوتھا جوہر موجود نہ ہو۔اور وہ کیا ہے۔ ایک آدمی علم رکھتا ہے۔ بڑا اچھا عالم ہے، عمل بھی کر رہا ہے اور مخلصانہ عمل کر رہا ہے، لیکن اس عمل کرنے کے بعد مطمئن ہو بیٹھا کہ نجات تو میرے گھر کی باندی ہے۔تو وہ ملے گی، اللہ سے بے فکر ہو بیٹھا۔ یہ نہیں جانتا کہ جس نے اخلاص دیا ہے اگر وہ کل کو ناخوش ہو جائے اور یہ چھین لے تو میری کیا گت بنے گی۔! جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ جو علم دے سکتا ہے وہ لے بھی سکتا ہے۔ جو اخلاص کا عطیہ بخشنے والا ہے اور وہ اسے چھین بھی سکتا ہے، اس لئے مخلص کا کام یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے مودبانہ کھڑا رہے کہ کہیں

---

① مسند احمد، حدیث ابی موسیٰ الاشعریؓ ج: ۴۲ ص: ۴۳۳ رقم: ۲۰۱۳۳.

مالک کی نگاہ نہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے سلب ہو جائیں۔تو جب تک انسان کے اندر مالک کے راضی رکھنے کی فکر نہ، ہو وہ اطمینان سے نہ بیٹھے۔فکر میں رہے کہ معلوم نہیں کل کو کیا بات پیش آئے، اپنے علم کے اوپر غرّہ نہ کرے، اپنے عمل کے اوپر غرّہ نہ کرے، اپنے اخلاص کے اوپر غرّہ نہ کرے۔اسے توفیق خداوندی سمجھے، اگر ذرہ غرّہ کرلیا اور یہ سمجھ لیا کہ علم میرا ہے اور یہ ہنر میرا ہے۔یہ عمل میرا ہے اور یہ اخلاص میرا ہے۔بس یہ اس نے عمل کو اکارت کیا، تو یہ سمجھنے کے بجائے یہ سمجھے کہ یہ توفیق خداوندی ہے۔یہ عطیۂ الٰہی ہے اور جو دینا جانتا ہے وہ چھیننا بھی جانتا ہے۔میں چوبیس گھنٹے اس کی چوکھٹ پر حاضر ہوں۔ایسے نہ ہو کہ اس کی نگاہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے چھین لی جائیں۔اس کا نام ''فکر'' ہے، جب تک یہ فکر نہ ہو اور جب تک اس میں بے اطمینانی کی کیفیت یعنی ''تفکّر'' کی کیفیت نہ، ہو اس وقت تک بقائے علم، بقائے عمل اور بقائے اخلاص کی کوئی صورت نہیں۔

مقرّبین بارگاہ کی گرفت کا اندازہ......اور بالخصوص

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو زیادہ علم والے، زیادہ عمل والے اور زیادہ اخلاص والے ہیں وہ زیادہ ہلاکت کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں کہ ذرا قدم گرے تو ادھر بھی جہنّم، ادھر بھی جہنّم، ان کے خطرات اور ان کے وسواس پر بھی ان کی گرفت ہوتی ہے۔حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: سابق زمانے میں بنی اسرائیل میں ایک عابد زاہد گزرا ہے۔روایت میں جس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بُدُوْرُ السَّافِرَةِ فِیْ عُلُوْمِ الْاٰخِـــرَةِ'' میں یہ حدیث نقل کی ہے۔آخرت کے احوال کے بارے میں ایک کتاب اس نام سے لکھی ہے۔اس میں قبر کے حالات، برزخ کے حالات اور عالم حشر کے حالات ہیں۔اس میں اس واقعہ کی بھی روایت نقل کی ہے۔

پچھلی امتوں میں ایک عابد زاہد گزرا ہے جو ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتا تھا۔عبادت وزہادت کے سوا اسے دوسرا کام نہیں تھا۔اس نے یہ دیکھا کہ میں عبادت تو کرتا ہوں مگر دنیوی اشغال میں بیوی ہے، بچے بھی ہیں، عزیز بھی ہیں نیز کمانا اور کھانا، دنیا بھر کے دھندے ہیں اور مجھے عبادت سے یہ چیزیں غافل بناتی ہیں، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ دھندے ختم ہو جائیں اور میں صرف عبادت کے لئے فارغ ہو جاؤں تو اس نے تمام عزیزوں، رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر سمندر کے بیچ میں ایک ٹیلے کو اختیار کیا اور وہاں جا کر ایک کٹیا ڈال دی کہ بس یہاں پر بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مشغول رہوں گا۔

پچھلے ادیان میں رہبانیت جائز تھی۔اس نے رہبانیت اور گوشہ گیری اختیار کی، عزلت اور انقطاع اختیار کیا اور جا کر بیٹھ گیا، جو چھپر یا ڈالی تھی، اس کے نیچے بیٹھ گیا۔حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس کی غذا کا یہ سامان کیا کہ اسی ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگا یا، اس میں بڑے بڑے انار لگے اور اس کڑوے سمندر میں اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑی پر ایک میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ چوبیس گھنٹے میں ایک انار کھالیا اور ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے اس طرح اللہ کی یاد میں مشغول کہ نہ سونا، نہ آرام کرنا، بس یہی اس کا کام تھا۔ پانچ سو برس اس طرح سے اس کی عمر کے گزرے، گویا خالص عبادت جس میں ریا اور دکھلاوے کا کوئی شائبہ نہیں، ظاہر ہے کہ پہاڑ کے ٹیلے پر کس کو دکھلائے گا؟ وہاں اس کو دیکھنے والا کون ہے؟ تو خالص عبادت کی جس میں علم بھی صحیح تھا، عمل بھی صحیح تھا، اور اخلاص بھی صحیح تھا۔ یہاں تک کہ اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ ''اے اللہ! یہاں کوئی اور تو نہیں ہے جو مجھے نہلائے، کفنائے اور دفن کرے، یہاں تو میں اور تیری ذاتِ بابرکات موجود ہے۔ اس لئے ایک درخواست میری یہ ہے کہ مجھے سجدہ کی حالت میں موت دے۔ تاکہ عین خالص عبادت میں میری موت آئے''۔ اور دوسری درخواست یہ ہے کہ میری لاش کو قیامت تک سجدہ کی حالت میں محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ میں قیامت تک تیرا صورتاً سجدہ گذار بندہ سمجھا جاؤں۔ پانچ سو برس کی عبادت تو نے مجھے عطا کی۔ اب ہزاروں برس قیامت تک بقیہ رہ گئے ہیں۔ اس میں میری لاش سجدے میں پڑی رہے۔ بگڑنے نہ پائے۔ تاکہ قیامت تک اسی طرح سجدے میں پڑا رہوں۔ اور میرا جسم سجدہ گذار رہے''۔

حق تعالیٰ نے دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ سجدے کی حالت میں موت آئی اور اس کا بدن بھی محفوظ ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس کا بدن آج تک محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ نے اس ٹیلے پر اتنے بڑے بڑے عظیم الشان درخت اگا دیئے، اتنی اندھیری ہوگئی کہ اول تو لوگوں کا وہاں پہنچنے کا موقع نہیں، اور کوئی پہنچ جائے تو ہیبت کی وجہ سے اندر نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ اگر لوگوں کو موقع مل جاتا تو لوگ تو مردوں کو نہیں چھوڑتے، قبروں کو نہیں چھوڑتے، اس کے آگے جا کے جانے کیا کیا کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا کہ نہ وہاں پہنچیں گے، نہ خرافات ہوں گی۔ اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''اس عابد کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے بندے، میں نے اپنے فضل وکرم سے تجھے بخشا اور میں نے تجھے جنّت عطاء کی''۔ اس عابد کے دل میں ایک وسوسہ گزرا کہ پانچ سو برس تو میں نے عبادت کی اور خالص عبادت کی، بیوی بچوں کو چھوڑا، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا، اتنی محنت اٹھائی، اب بھی اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا، کم سے کم میری دلداری ہی کے لئے فرماتے کہ: تیری عبادت کے بدلے میں تجھے جنت عطاء کی۔ ذرا میرا دل تو خوش ہو جاتا کہ میں نے کچھ کیا۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ محض اپنے فضل وکرم سے بخشا۔ یہ اس کا کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ نہ کوئی جما ہوا خیال تھا، ایک وسوسے کے درجے میں اس کے دل میں یہ بات گزری تو ؎

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو مقرّبانِ بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں۔ ان کے افعال پر اور ان کے خیالات پر بھی گرفت ہوتی ہے، تم اپنے دل میں یہ خیال کیوں لائے؟ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا۔ اس بندے کو بجائے جنت کی طرف لے جانے کے جہنم

کی طرف لے جاؤ، مگر جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔ بس اتنی دور لے جاؤ کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کا راستہ ہو، مگر جہنم کی ہوا وہاں پہنچتی ہو۔ وہاں لے جا کر اسے کھڑا کر دو۔ تو حدیث میں ہے کہ: ملائکہ لے گئے۔ اتنی دور تک لے جا کر اسے کھڑا کیا۔ جہنم کی ایک لپٹ اور لو آئی تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہوگیا، اور اس نے پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ: غیب سے ایک ہاتھ نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا ہوا آیا کہ اے اللہ کے بندے! یہ پانی مجھے دے۔ جتنا یہ آگے بڑھا وہ ہاتھ اتنا پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ آواز یہ آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے مگر مفت نہیں ملے گا، قیمت سے ملے گا۔ اور قیمت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس پانچ سو برس کی خالص عبادت ہو اگر وہ دے تو یہ کٹورا پانی کا مل سکتا ہے۔ ورنہ نہیں مل سکتا۔

یہ عابد دوڑا اور کہا کہ یہ حاضر ہے۔ میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ یہ اس نے دی اور پانی کا کٹورا لے کر پیا۔ دم میں دم آیا اور جان میں جان آئی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کو ارشاد ہوا کہ اس عابد کو لوٹا کر لاؤ۔ وہ واپس لایا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اے بندے! تیری پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اور وہ تو نے ہی تجویز کی تھی۔ یعنی ایک کٹورا پانی۔ تو تُو نے اپنی پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی تجویز کیا۔ وہ ہم نے تجھے دے دیا، معاملہ برابر سرابر ہوگیا، نہ ہمارے ذمّے کچھ رہا۔ نہ تیرے پاس کچھ رہا۔ اب جو دنیا میں تو نے ہزاروں کٹورے ہمارے پیئے اس کا حساب دے کہ ایک ایک قطرے کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا۔ اور جو اناروں کے لاکھوں دانے کھائے، ایک ایک دانے کا حساب دے۔ ایک ایک دانے کے بدلے کتنے سجدے کیے۔

اور یہ تو دانا اور پانی ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے روشنی بخشی تھی کہ ایک تارِ نگاہ سے سینکڑوں چیزیں دیکھ لیتا تھا، ایک ایک تارِ نگاہ کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو ہم نے ٹھنڈی ہوائیں دی تھی کہ تو سانس لیتا تھا اور تیری زندگی قائم تھی، ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے؟ اور فرمایا کہ: یہ تو اسباب ہیں۔ ان سب کے بعد جو ہم نے تجھے عبادت کی توفیق بخشی اور طاقت دی تھی، اس توفیق کے بدلے میں بتلا تو کیا لے کر آیا ہے؟ یہ عابد تھرّا گیا۔ اور اس نے کہا کہ

مدارِ نجات فضل ہے، عمل نہیں ...... ''اے اللہ! کسی کو کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ تیرا فضل ہی نجات دلائے گا۔ ہر آدمی تیرے ہی فضل سے بخشا جائے گا''۔

اسی کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَنْ يُّنجِيَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهٗ۔'' تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا، محض اللہ کا فضل نجات دلانے والا ہے۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سن کر عرض کیا: ''وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ''؟ یارسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ جس عمل کی قیمت وہ ہے کہ سارے آسمان اور زمین تل جائیں [illegible] ک سجدے کی قیمت نہ پڑ سکے۔ وہ عمل بھی نجات

نہیں دلائے گا؟ فرمایا: ''لَا! اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ.'' مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ کا فضل دستگیری نہ کرے تو جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنی کسی عبادت کے اوپر غرّہ کریں، تو اصل میں اس عابد کو یہ بتلانا تھا کہ عمل نجات دھندہ نہیں ہے، فضل خداوندی نجات دھندہ ہے۔ ①

توفیقِ عمل، علامتِ فضل ہے..... مگر بھائی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ لیجیو کہ جب عمل سے نجات نہیں ہوتی تو لاؤ پھر آج سے عمل وغیرہ سب چھوڑ دو، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوۃ اس لئے کہ نجات تو عمل سے نہیں ہے، وہ فضل سے ہوگی۔ اور فضل کے بارے میں کیسے پتہ ہے کہ کس پر ہوگا۔ اس کے سہارے سے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟ جس کی نجات ہونی ہوگی فضل سے ہو جائے گی نہیں ہونی ہوگی نہیں ہوگی۔ عمل تو کارآمد ہے نہیں۔ تو یہ نتیجہ مت نکال لینا۔

بے شک عمل نجات دلانے والا نہیں۔ عمل سے نجات نہیں ہوگی، فضل سے نجات ہوگی۔ مگر فضل کے پہچاننے کا طریقہ درحقیقت عمل ہے۔ اگر عمل کر رہا ہے تو یہ علامت ہے کہ اللہ کا فضل متوجہ ہے۔ اور جو عمل نہیں کر رہا تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کے اوپر اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے۔ اس واسطے عمل مت ترک کیجئے۔ یہ مت سمجھ لینا کہ جب عمل سے نجات نہیں تو عمل کو چھوڑ دو، بے شک عمل نجات دھندہ نہیں، فضل ہے، مگر فضل کی علامت عمل ہے۔ عمل ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہے۔

دنیا میں فضل کی علامت یہ ہے کہ توفیق مل رہی ہے اور آخرت میں فضل کی علامت یہ ہے کہ جنت مل رہی ہے اور نعمتیں مل رہی ہیں۔ دونوں جہانوں میں دستگیری کرنے والا فضل ہے۔ عمل بھی تو فضل ہی سے کرتے ہیں۔ فضل متوجہ نہ ہو تو آپ عمل کیسے کریں۔؟ اس لئے کہ عمل توفیق سے کرتے ہیں۔ توفیق دینے والے وہ ہیں تو فضل ان کی طرف متوجہ ہو گیا، اگر توفیق نہ دیں تو آدمی عمل نہیں کرسکتا۔ تو سب سے بڑی نعمت انسان کے حق میں توفیق ہے۔

روحِ شکر..... حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ② اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو۔ تو حضرات انبیاء علیہم السلام اللہ کے کلام کو پورا سمجھتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ بے شک میں شکر ادا کروں گا۔ میرا فرض ہے کہ میں ادا کروں۔ یوں بھی فرض تھا اور جب آپ حکم دے رہے ہیں تو بالکل ہی فرض ہو گیا۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ شکر ادا کروں تو کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر کو ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو وہ توفیق ایک نعمت ہو گئی، پھر اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق پھر آپ دیں گے۔ تو پھر ایک نعمت بن گئی، تو اس سے پہلے اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا، وہ بھی

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، ج: ۵، ص: ۲۳۷۳، رقم: ۶۰۹۸.

② پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۱۳.

توفیق آپ دیں گے تو وہ نعمت ہوگئی، تو اس سے پہلے ایک اور شکر نکلا تو ہر شکر سے پہلے ایک اور شکر نکلتا ہے، میں شکر کی ابتداء کروں تو کس طرح سے کروں؟ میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔

ادھر سے جواب آیا کہ ''اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو اپنی ہار مان لینا، یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو نے شکر ادا کر دیا۔ کوئی بندہ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ ہم تو فرض ادا نہیں کر سکتے حق تو کیا ادا کریں گے۔ عاجز ہیں۔ اس عجز کو سمجھ لینا کہ ہم عاجز ہیں۔ یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ اپنی ہار مان لے کہ میں عاجز ہوں''

سندِ شکر...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سیّد الحامدین ہیں جن سے بڑھ کر اللہ کی حمد وثنا کرنے والا عالم میں کوئی نہیں۔ اخیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں کہ: ''اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ '' ① اے اللہ! میں تیری حمد وثناء کا ایک شمّہ بھی نہیں ادا کر سکتا میں تیری حمد وثناء کا احصاء ہی نہیں کر سکتا''۔ بس مختصر یہ ہے کہ تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے آپ کو فرما دیا۔ میں عاجز ہوں کہ تیری حمد اور تیری ثناء وصفت کو ادا کر سکوں۔ اس لئے کہ وہ لامحدود ہے اور بندہ محدود ہے۔ اس کا کمال محدود، اس کی عقل محدود، اور اس کی طاقت محدود، تو محدود سے لامحدود کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ ''اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ '' یہ وہی عجز کا ہی اعتراف ہے کہ میں تیری ثناء ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی کو سب سے بڑی سند سمجھا گیا جس نے ہار مان لی اور عجز تسلیم کر لیا وہی سب سے بڑی ثناء کرنے والا ہے۔ میرا ہی ایک شعر ہے۔ لمبی نظم تھی وہ میں بھول گیا۔ اس میں کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

خدا کی تو ثنا کامل یہی ہے ـــــ کہ ہم سے کچھ ثناء ممکن نہیں ہے

ہم سے کوئی ثناء ممکن نہیں۔ بس ثناء کا ادا کرنا ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ شانہ جب فضل فرماتے ہیں تو توفیق بھی دی جاتی ہے۔ جب توفیق آتی ہے تبھی انسان عمل کرتا ہے۔ تو عمل اُدھر سے ہوا۔ ہماری طرف سے نہ ہوا۔

نفیِ عمل سے اثباتِ عمل...... اس واسطے اس عمل کو زیادہ قبول کرتے ہیں جس میں آدمی سمجھ لے کہ میں نے کچھ نہیں کیا، اور جو خود کہے کہ میں نے سب کچھ کیا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے غرّہ اور غرور کرے اور یوں کہے کہ اے اللہ! دیکھ میں نے تیری نماز پڑھی، میں نے حج کیا، میں نے جہاد کیا، میں نے یہ کام کیا۔ تو جواب میں فرماتے ہیں کہ: ''نالائق! تو نے کیا کیا۔ بدن کے اندر طاقت تو ہم نے دی تھی، توفیق تو ہم نے دی تھی، ارادہ تو ہم نے پیدا کیا۔ تو نے کیا کیا؟ اور اگر کوئی بندہ سب کچھ کر کے کہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے سب کچھ ہوا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں۔ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ'' کوئی حول اور طاقت میرے اندر نہیں، توفیق تیری، طاقت تیری، ارادہ وفیق تیرا، میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ''نہیں۔ عمل تو تُو نے ہی کیا، حرکت تو تو نے ہی کی، مسجد تک قدم اٹھا کر تو ہی گیا تھا۔ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے''۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب الدعاء فی الرکوع، ص: ۱۲۸۸، رقم: ۸۷۹.

غرض جو اپنے عمل کی نفی کرتا ہے اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اور جو خود اثبات کرنے لگے، اس کی نفی کر دیتے ہیں، جو نیچا بنے اسے اونچا اٹھاتے ہیں۔ اور جو خود اونچا بننے لگے اسے زمین کے اوپر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا کہ ؎

پستی سے سر بلند ہوا اور سرکشی سے پست　　　اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو جتنا نیچا بنتا ہے۔ اسے اونچا بناتے ہیں اور جو خود اونچا بننے لگتا ہے اس زمین پر گرا دیتے ہیں۔ تو اونچا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی نیچا بنجائے۔ بلند و بالا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ پست بن جائے۔

طریقِ عزّت...... عزت والا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنی ذلّت پیش کر دے، عزّت آ جائے گی۔ اور جو خود ہی اپنی عزت کو سراہنے لگے، تو پھر ادھر سے پھٹکار برسے گی۔ ذلت برسے گی، اس لئے کہ کوئی عزّت کا مستحق نہیں۔ عزّت تو اللہ کی ہے۔ جو اس کے آگے جھک جائے اس کے لئے عزت آتی ہے۔

﴿فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① تو عزت اللہ کی، اس کے رسول کی اور مومنین کی ہے۔ بہر حال طریقہ عزت کا یہ ہے کہ اپنی ذلت محسوس کرے۔ اگر کوئی مخدوم بننا چاہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ یوں کہے کہ دیکھو لوگو! میں مخدوم ہوں۔ تم سب میرے غلام ہو۔ لوگ کہیں گے۔ نامعقول! تجھے شرم نہیں آتی، ایسا کلام کر رہا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ پست بن جائے گا۔ مخدوم بننے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کا خادم بن جائے، لوگ سروں پر اٹھائیں گے، وہ خود ہی مخدوم بن جائے گا۔ تو مخدوم بننے کا طریقہ خادم بننا ہے نہ کہ مخدومی کا دعویٰ اور ادّعا کرنا۔ دعویٰ کرنے والے کو پٹخ دیا جاتا ہے۔ بہر حال فضلِ خداوندی ہوتا ہے تو توفیق بھی ملتی ہے، توفیق ملتی ہے تو عمل بھی ہوتا ہے اور جس کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ پہلے فضل آیا، پھر توفیق آئی، پھر میرے اندر ارادہ پیدا کیا گیا، پھر میرے اندر طاقت پیدا کی گئی، تب جا کے عمل ظاہر ہوا۔ جو اس سلسلے کو جانتا ہے۔ وہ کبھی دعویٰ نہیں کرے گا کہ میں نے عمل کیا، وہ تو یہ کہے گا کہ یہ سب کچھ اوپر سے ہے۔ میرے اندر تو کچھ بھی نہیں۔

سلسلۂ عمل پر نگاہ کا ثمرہ...... اب اس کی ایسی ہی مثال ہوگئی کہ دو آدمی کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں آئیں، اور یہ ان دونوں کا دعویٰ ہو کہ یہ جو کھیتی کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا دانہ سب میرا ہے۔ وہ بھی کہے کہ میرا ہے اور یہ بھی کہے کہ میرا ہے۔ تو ایک شخص سے مجسٹریٹ پوچھتا ہے کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہے؟ کہ نہیں صاحب! زمین کا میں مالک نہیں ہوں۔ بیج تم نے ڈالا تھا؟ نہیں بیج بھی میں نے نہیں ڈالا۔ پانی تم نے دیا تھا؟ نہ صاحب! پانی بھی اسی نے دیا تھا۔ میں نے نہیں دیا تھا۔ چھ مہینے خون پسینہ تم نے ایک کیا تھا؟ نہیں صاحب! وہ بھی اسی نے کیا تھا۔ باقی دانہ میرا ہے۔ تو مجسٹریٹ کہے گا کہ اس پاگل کو کان سے پکڑ کر نکال دو، نہ اس کی زمین، نہ اس نے بیج ڈالا، نہ اس نے پانی دیا، نہ اس نے محنت کی۔ اور دانے کا دعوے دار ہے۔ یہ کدھر سے دعوے دار ہوگیا؟ جس کی زمین ہے، جس نے بیج

① پارہ: ۲۸، سورة المنافقون، الآية: ۸.

ڈالا ہے، جس نے محنت اٹھائی، دانہ بھی اسی کا ہوگا۔

ایک عمل کرنے والا دیکھتا ہے کہ میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ وہ بھی خدا نے دی، عمل کرنے کا ارادہ بھی میرا اپنا نہیں تھا، وہ بھی خدا نے دیا، توفیق میں نے خود نہیں پیدا کی، وہ بھی اسی نے دی۔ باقی عمل کا مالک میں ہوں۔ تو خدا کہے گا کہ اس نامعقول کو کان سے پکڑ کر نکال دو۔ توفیق ہم نے دی، قوت ہم نے دی، ارادہ ہم نے دیا، یہ عمل کا کیسے مالک ہے؟

اور جس کی نگاہ پورے سلسلے پر ہے کہ آپ ہی فضل کرنے والے، آپ ہی توفیق دینے والے، آپ ہی قوت بخشنے والے، آپ ہی کرا دینے والے، میرا تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب آپ کا فضل ہے۔ تو پھر فرمائیں گے۔ نہیں، تو نے ہی عمل کیا تھا، تو نے ہی حرکت کی تھی، تو ہی چل کر گیا تھا۔ غرض جو اپنے کو خود سراہتا ہے۔ اسے مٹا دیتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو مٹاتا ہے، اسے باقی کر دیتے ہیں، اسے اونچا اٹھا دیتے ہیں۔

دولتِ تفکر...... عرض کرنے کا مطلب یہ نکلا کہ نہ علم میں نجات ہے۔ نہ عمل محض میں نجات ہے، نہ اخلاص میں نجات ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ فکر شامل نہ ہو۔ کہ نہ غرور ہو، نہ اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ ہو، نہ اپنی عبادت اور عمل پر کوئی غرّہ ہو۔ بلکہ ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا، یہ انہیں کا دیا ہوا ہے، اگر وہ چھین لیں تو میں کیا کروں گا۔ یہ فکر جس کو دامن گیر ہوگی اس کا اخلاص بھی کارآمد ہوگا۔ اس کا عمل بھی کارآمد ہوگا۔ اور اس کا علم بھی کارآمد ہوگا۔

روحانیّت کے اربعہ عناصر...... اب انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے۔ ایک علمِ صحیح وعلمِ نافع، ایک عملِ صحیح وعمل صالح، ایک اخلاص کامل اور ایک فکرِ سلیم۔ یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم کی بجائے جہالت ہو تو کہیں گے یہ حیوان ہے۔ علم ہو مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے۔ گردن زدنی ہے۔ عمل ہے مگر منافق ہے، مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے۔ مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو، عمل بھی ہو، اخلاص بھی ہو اور آخرت کی فکرِ صحیح بھی ہو، کہا جائے گا، یہ قابل اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جا سکے اور کہا جا سکے کہ ''یہ انسان ہے''۔ یہ انسانیت کے چار اجزاء نکلے۔ جیسے اس کے بدن کے چار اجزاء تھے، آگ، پانی، ہوا، مٹی، ان چار سے مل کر بدن بنتا تھا۔ اسی طرح سے انسانیت کے چار جوہر ہیں۔ علم نافع، عمل صالح، اخلاصِ کامل، اور فکرِ صحیح۔ یہ چار چیزیں اگر ہیں تو کہا جائے گا، انسان ہے، ورنہ کہا جائے گا کہ حیوان ہے، یا انسان نما حیوان ہے۔

کمالِ علمِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... بس جب یہ چار چیزیں معلوم ہو گئیں اور یہ انسانیّت کا معیار ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے جانچا جائے تو سب سے زیادہ کامل اس معیار سے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نکلتے ہیں کہ جن کا علم فقط علم نافع نہیں بلکہ علمِ قطعی ہے۔ جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کتابوں سے حاصل کیا ہوا علم نہیں بلکہ ان کے علم سے کتابیں بنتی ہیں، وہ براہ راست اللہ کے سرچشمے سے علم لیتے ہیں۔ وحی کا علم ان کے اوپر آتا ہے جو لازوال

دولت ہے۔ جو قطعی دولت ہے۔ جس میں نہ شک کی آمیزش ہے، نہ جہل وتردّد کی آمیزش ہے، نہ شبہات وخیالات کی آمیزش ہے۔ خالص علم جو چشمۂ وحی سے ہے۔ وہ علم کامل اور علمِ قطعی ان کے قلوبِ مبارکہ پر ڈالا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ ① یہ قرآن کریم؟ یہ اللہ کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ تمہاری بنائی ہوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں نے بیٹھ کر نہیں بنائی، یہ کسی پارلیمنٹ کا ریزولیشن نہیں ہے۔ یہ کسی کمیٹی کی تجویز اور مشروعات میں سے نہیں ہے۔

﴿لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے''۔ اور نازل کرنے والا اللہ۔ اور کس کے ذریعے سے؟ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ③ روح الامین (علیہ السلام) اس کو لے کر آئے جس میں خیانت کا کوئی ادنیٰ جذبہ نہیں۔ بلکہ کامل امانت دار فرشتہ جس کی شان ہی امین ہے۔ وہ اس کو لے کر آیا ہے ''عَلٰى قَلْبِكَ. ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر لا کر اتارا۔ جس قلب کے اندر غیر اللہ کے لئے گنجائش ہی نہیں تھی، فقط ایک اللہ کے لئے وہ قلب مستعد تھا، تو اس قلبِ صافی کے اوپر جبریل امین لے کر آئے، اور نازل کرنے والا اللہ ہے۔ اور کیا لے کر آئے۔؟ کلامِ خداوندی اور صفتِ خداوندی لے کر آئے، اللہ کی ایک صفت لے کر آئے جو اس ''عبدِ پاک'' کے قلب پر ڈال دی گئی۔ وہ صفتِ خداوندی سے متصف ہو گیا۔ اور وہ کمالِ خداوندی سے مکمل بن گیا اور وصفِ الٰہی سے موصوف بنا، اس پاک قلب کے اوپر یہ پاک چیز نازل کی گئی کہ اس علم کے اندر نہ شبہ کی گنجائش، نہ شک کی گنجائش۔ نہ وہم کی آمیزش، نہ خیالات کی آمیزش، تو علم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قطعی اور اس کی کثرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ''اُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ '' ④ اگلے اور پچھلے سارے علوم ایک قلبِ مبارک میں جمع کر دیئے گئے۔ تو کمیّت دیکھیں تو اتنی بڑی کہ عالم کے تمام علوم کا سر چشمہ قلبِ مبارک کو بنایا گیا۔ کیفیت کو دیکھا جائے تو اتنی قطعی کہ شبہ کی آمیزش کی گنجائش نہیں۔ تو جس کا علم اتنا کامل ہو کہ نہ کیفاً اس میں نقص کی گنجائش نہ کماً اس میں نقص کی گنجائش، نہ عدد کے لحاظ سے کمی، نہ کیفیت کے لحاظ سے کمی تو اس سے بڑھ کر عالم کون ہوگا۔

اس واسطے اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ مخلوقات کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عالم کوئی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الخلائق اور اعلم البشر ہیں۔ سارے انسانوں میں، سارے ملائکہ میں سب

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۲ تا ۱۹۴۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء الآیۃ ۱۹۲۔
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۳۔ ④ حدیث کی متداول کتب میں یہ حدیث نہیں ملی البتہ علامہ تقی الدین نے اپنی کتاب ''امتاع الاسماع'' میں یہ ذکر کیا ہے: واعطی صلی الله علیه وسلم علم الاولین والآخرین. ولهذا اشار صلی الله علیه وسلم بقوله: علمت علم الاولین، فصل فی ذکر الفضائل الی خص الله تعالی بها نبیة ج: ۳ ص: ۱۷۷، ۱۷۸۔

سے زیادہ علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، آپ کے علم کے مقابلہ میں ساری کائنات کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ کے علم کے مقابلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ، اس لئے کہ جو فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔ وہی فرق خالق اور مخلوق کی صفت میں ہوسکتا ہے۔ وہی فرق خالق و مخلوق کے علم میں ہوسکتا ہے۔ لیکن مخلوق، مخلوق کو جب نسبت دی جائے تو نہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں، نہ ملائکہ میں، نہ اولیاء میں، کسی کے اندر کوئی اتنا بڑا عالم نہیں۔ سب کے علوم کو جمع کیا جائے تو ایک ذاتِ واحد امین بنی ہوئی ہے۔ تو جو اتنا بڑا عالم ہو۔ تو ظاہر بات ہے کہ "اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ"

سارے انسان تباہ و برباد ہیں اور علماء بچیں گے۔ تو علماء کے اندر اتنا بڑا عالم ہو کہ کائنات میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ ہو۔ تو اس سے زیادہ درجہ نجات کا اور کسے مل سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر کمالات اور فوز وفلاح کا درجہ اور کس کے لئے ہوسکتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر کس کی سیرت اور مقدس ہوسکتی ہے، تو سیرت کا ابتدائی جز جو علم کامل تھا، وہ اتنا ہے کہ عالم میں اس کی نظیر کوئی نہیں۔ سیرت بھی ایسی ہوگی کہ عالم میں اس سیرت کی نظیر کوئی نہیں۔ سارے حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو دیکھو تو سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی، سارے حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات اولیاء رحمہم اللہ علیہ کے اخلاق دیکھو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے سامنے کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی۔

کمالِ عملِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... سارے کاملین کے اعمال صالحہ کو دیکھو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل صالح کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں معلوم ہوگی۔ امت کا عقیدہ یہ ہے اور صحیح عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سجدہ ساری امت کی لاکھوں برس کی عبادات سے زیادہ ہے۔

وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی صورت کو نہیں دیکھتے عمل کی حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ جس عمل کے اندر اخلاص کامل اور معرفت کامل ہو، وہی عمل وزن دار ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اخلاص والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عارف باللہ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسن نیت رکھنے والا کون ہے؟ کہ جن کی جوتیوں کی نسبت سے لاکھوں مخلص بن گئے، کروڑوں اخلاص والے بن گئے، جن کی جوتیوں کے طفیل سے حسن نیت کے پہچاننے والے پیدا ہوئے کہ نیّت کہتے کسے ہیں؟ حسن نیّت کے معنی کیا ہیں؟ تو جس ذاتِ بابرکات میں اخلاص وہ ہو جس کی نظیر نہ ہو، اس کے عمل میں جتنا وزن ہوگا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ اس کے ایک سجدے میں اتنا وزن ہوگا کہ عالم کے سارے سجدوں میں اتنا وزن نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے ایک سجدہ عالم کے سجدوں سے بڑھ کر ہوگا، تو سب سے بڑا علم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات میں ہے۔ تو یہ سیرت کا ایک عنصر ہوا۔

معیارِ اعمال...... دوسرا عنصر؟ وہ عملِ صالح ہے ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل صالح سے بڑھ کر

کس کا عمل صالح ہو سکتا ہے۔ جو عمل کا معیار ہے، اور اسوہ اور کسوٹی ہے۔ عامل کے عمل کو پہچاننے کی کسوٹی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ اس کے مطابق ہے تو عمل مقبول ورنہ مردود۔ غرض جس کا عمل معیار اور کسوٹی ہو، جس سے عمل کو پرکھ پرکھ کر عمل کو ناقص اور کامل کہہ سکیں، تو جس عمل کی حقیقت یہ ہے تو حقیقی معنی میں عمل وہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عمل، عمل نہیں، اس لئے کہ وہ عمل دوسرے اعمال کو بنانے والا ہے۔ وہ عمل نہ ہو تو دوسروں کے عمل ہی نہ بنیں۔ تو جو عملوں کا سرچشمہ اور تخم ہو کہ جس سے اعمال سرزد ہو رہے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس عمل کی عظمت اور قدر و قیمت کتنی ہوگی۔ تو علم تو یہ کہ اولین و آخرین کے جامع ہوں اور عمل یہ کہ سب کے اعمال کا سرچشمہ ہوں۔ اگر اس عمل پر منطبق ہیں تو وہ عمل ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اس لئے سیرت کا دوسرا جوہر وہ عمل پاک ہے۔ اس عمل کے بارے میں یہی کہا جائے گا اور یہی عقیدہ رکھا جائے گا اور یہ عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑا سا بھی عمل کریں تو امت کے لاکھوں برس کے عملوں سے بھی وہ عمل اونچا ہے۔

امرِ حقیقت......اور "عِیَاذًا بِاللّٰہِ"!. یہ محض کوئی شاعریت نہیں ہے۔ یا معاذ اللہ! محض حسنِ عقیدت سے نہیں کہا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ امر حقیقت ہے۔ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے جانچنے کا ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ تو تین آدمی آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیتِ نبوت میں موجود نہیں تھے۔ بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے انہوں نے پوچھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ گھر میں آپ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور نماز میں مشغول رہتے ہوں گے۔ تو پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: جواب میں یہ کہا گیا کہ جیسے گھر ہستیوں کی زندگی ہوتی ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ موقع اور ضرورت ہوتی ہے تو گھر میں جھاڑو بھی دے لیتے ہیں، برتنوں کو مانجھ بھی لیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا بھی گانٹھ لیتے ہیں، کپڑا پھٹ جاتا ہے تو بیٹھ کر سی بھی لیتے ہیں۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مزاح بھی فرما لیتے ہیں۔ کبھی ازواج مطہرات سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی کہانی سنا دو، کوئی قصہ سنا دو۔ تو جیسے گھر ہستیوں کی حالت ہوتی ہے۔ ویسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہے۔

تو سن کر "کَاَنَّھُمْ اتَقَالُّوْھَا......" ان تینوں صاحبوں نے اس عمل کو کم سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل کم ہے۔ مگر اپنی طرف سے عذر یہ بیان کیا کہ حضور کی ذاتِ مبارک تو وہ ہے کہ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی زلتیں پہلے ہی معاف کر دی ہیں۔ اس لئے اگر آپ بالکل ہی عمل نہ کریں تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقامات میں سب سے اونچے ہیں اور جنتوں میں سب سے اونچے ہیں۔ مگر یہ عمل کم ہے۔ یہ وہ سمجھے، گویا عذر یہ بیان کر دیا، اگر آپ اتنا بھی عمل نہ کریں تب بھی آپ کے مراتب میں فرق نہیں آ سکتا۔ اس کے بعد تینوں نے باہم ایک

دوسرے کے سامنے عہد کیا۔ اور کہا کہ یہ عمل تو کم ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اب ہم اپنی گھریلو زندگی کیسے بنائیں، تو ایک نے کہا کہ "اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّیَ الَّیْلَ اَبَدًا." میں عہد کرتا ہوں کہ اب عمر بھر کبھی نہیں سوؤں گا۔ اور پوری رات نماز کے اندر مشغول رہوں گا۔ دوسرے نے کہا "اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَّلَا اُفْطِرُ" "میں عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، کبھی بھی افطار نہیں کروں گا"۔ تیسرے نے کہا "اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَآ اَتَزَوَّجُ اَبَدًا" "میں عہد کرتا ہوں کہ عورتوں سے دور رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا"۔

تو یہ ان تینوں نے باہمی عہد و پیمان کیا۔ ہمیشہ قیام و صیام اس شخص کی نسبت جو رات کو سوتا بھی ہو اور قیام بھی کرتا ہو، دن کو روزہ بھی رکھتا ہو اور افطار بھی کرتا ہو، بظاہر اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد جو ذمہ داریاں اور بیوی بچوں کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں اور عبادت کے لئے موانع پیش آتے ہیں تو اس جذبے سے ترکِ نکاح کرنا کہ ہمیشہ عبادت کرتا رہوں اور بیوی بچے مخل نہ ہوں، اس شخص کی نسبت جو بیوی بچوں کے مشاغل کے ساتھ عبادت کرتا ہو۔ اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ گویا مخلوق کے ساتھ تعلق کا کوئی درجہ نہیں حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ہی تعلق محض ہے۔

تو ترکِ تعلقات اور عدد کے لحاظ سے یہ عبادات گویا اونچے درجے کی معلوم ہوتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور استفسار فرمایا: "اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ وَاَتْقَاکُمْ لَهٗ." تم لوگوں نے ایسی ایسی گفتگو کی ہے۔ خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں، تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم میں سب سے زیادہ خوف و خشیت والا ہوں۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ تم لوگوں نے عبادت کے معنی غلط سمجھے، رات بھر نماز پڑھو تو یہ عبادت ہے، دن بھر روزے رکھے جائیں تو یہ عبادت ہے، بیوی اور نکاح چھوڑ دیں تو یہ عبادت ہے۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی اللہ کے احکام کے نیچے گزرے، یہ عبادت ہے۔ دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے، گھر میں بیوی سے معاملہ کرنا بھی عبادت ہے۔ تہجد پڑھنا بھی عبادت ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ جو حق تعالیٰ شانہٗ نے زندگی بنائی ہے اس زندگی کو اللہ کے احکام کے نیچے جاری رکھنا یہ فی الحقیقت حقیقی عبادت ہے اس لئے فرمایا کہ: "فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِاَهْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا. وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا فَصُمْ وَنَمْ وَقُمْ." ①

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے، تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ تم پر تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تو تم جاگ کر اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کا حق ادا ہو، اور تم رات کو سو بھی جاؤ تاکہ نفس کا حق ادا ہو، تم جہاد بھی کرو، تاکہ اللہ کا حق ادا ہو۔ اور تھوڑی دیر اس سے ہٹ کر اہل و عیال میں رہو تاکہ بیوی بچوں کا بھی حق ادا ہو۔ تو تم سوؤ بھی، جاگو بھی، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو۔ یہ سارے کام کرو تو کہا جائے گا کہ تم نے عبادت کی۔ تو عبادت کو تم نے فقط نماز

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم ص ۱۵۴، رقم: ۱۸۷۵.

اور روزے میں محدود کر دیا۔ اپنی پوری زندگی کو اللہ کی رضا کے تحت گزارنے کو عبادت کہتے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرت سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ اس زندگی کو گزارنے والا کوئی اور نہیں۔

کمالِ اخلاصِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ نمازیں پڑھنے والا ہوں، اس لئے میرا اجر زیادہ ہے اور میں تم سب سے زیادہ روزے رکھنے والا ہوں۔ بلکہ اگر گنا جائے اور شمار کیا جائے تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تعداد سے امتیوں کی تعداد بڑھ جائے۔ وہ دن بھر رات بھر یہی کرتے رہے۔ تو ''عبادت کا عدد'' نہیں پیش کیا۔ فرمایا ''اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ بِاللّٰہِ وَ اَتْقَاکُمْ لِلّٰہِ'' میرے اندر اللہ کا خوف تم سب سے زیادہ ہے، تقویٰ تم سب سے زیادہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی روح پیش کی کہ اس کامل تقویٰ اور خوف وخشیت کے ساتھ ایک سجدہ بھی ہوگا تو وہ تم سب کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت شمار ہوگا، گویا عبادت کی اصل بنیاد وہ اخلاص للہ ہے۔ وہ خشیت للہ ہے۔ وہ تقویٰ باطن ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ سے ڈرے۔ اس تقویٰ باطن کے ساتھ جو عبادت ہوگی وہ اکمل ترین عبادت ہوگی۔ غرض جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کامل اور جامع ہے کہ اولین وآخرین کے علم کا مجموعہ ہے اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کامل ہے۔ وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقویٰ اور اخلاص بھی اتنا کامل ہے کہ ساری امتوں کا اخلاص مل کر بھی وہ اخلاص نہیں ہو سکتا جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص عطاء کیا ہے۔ اس لئے کہ جو قلبِ مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا وہ قلب کسی اور کو عطاء نہیں کیا گیا، جو جسد مبارک اور روح پر فتوح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی وہ روح اور جسم کسی اور دوسرے کو نہیں دیا گیا، تو اس ظرف میں جو چیزیں بھریں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ظرف میں بھر سکتی تھیں۔ دوسرے ظروف میں نہیں آسکتی تھیں۔ غرض علم وعمل بھی انتہائی کامل، اخلاص للہ بھی انتہائی کامل۔

کمالِ فکرِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... اور آگے رہ گئی۔ فکر۔ کہ آخرت سے ڈرنا اور مطمئن نہ ہونا۔ اس کا عالم یہ ہے کہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''نماز پڑھ کر جب میں ایک سلام پھیرتا ہوں تو مجھے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دوسرے سلام کا مجھے موقع ملے گا یا نہیں ملے گا''۔ اس درجہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطرہ اور خوفِ آخرت محسوس فرماتے تھے اور اپنی موت کی یادگاری اور تذکر، یہ اس درجہ پر ہے کہ فرماتے ہیں۔ ایک سلام پھیر کر دوسرے کی توقع نہیں ہوتی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکرِ آخرت کی حالت ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ''کَانَ دَآئِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا'' ① آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات دائم الفکر رہتے، جیسے کوئی فکر مند بیٹھا ہو، کوئی غمگین بیٹھا ہو اور حزن وغم میں ہو، وہ فکر آخرت تھی، ہمہ وقت آخرت پیش نظر تھی، تو یہ انبیاء علیہم السلام ہی کو کمال دیا گیا ہے کہ ساری دنیا والوں کے حقوق ادا کریں اور فکرِ آخرت بدستور قائم

---

① الشمائل للترمذی، ج: ۱، ص: ۲۵۵.

رہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے ہیں، بیوی بچوں سے بھی معاملہ ہے۔حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی معاملہ ہے، حکومت کے فیصلے بھی آپ انجام دے رہے ہیں، فصل خصومات اور جہاد بھی ہو رہے ہیں، غنائم بھی تقسیم ہو رہی ہیں۔مگر ''فکرِ آخرت'' ہمہ وقت بدستور ہے، بلکہ سارے اعمال کا وہی منشاء ہے، اسی سے یہ سارے اعمال انجام پا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ متفکر کون ہے؟

روحِ ایمان...... اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان درحقیقت ''خوف اور رجاء'' کے مجموعے کا نام ہے۔یعنی نہ محض ڈرنے کا نام ایمان ہے۔نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے۔بلکہ یہ دونوں کیفیتیں جمع رہیں۔امید بھی بندھی ہوئی ہو اور خطرہ بھی لگا ہوا ہو، تو فکر پیدا ہو جائے گی۔یہی فی الحقیقت ایمان کی روح ہے۔

قرآنِ کریم میں دو لفظ فرمائے گئے۔ایک جگہ فرماتے ہیں ﴿لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ﴾ ① ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔خدا کی رحمت سے مایوس ہونے والے کفار ہیں''۔اس میں امید بتلائی گئی اگر کہ تم میں اللہ سے امید نہیں ہوگی۔تو تم میں ایمان موجود نہیں۔یہ کفار کا کام ہے کہ اللہ سے ناامید ہو جائیں، غرض اس میں رجا بتلائی گئی۔اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا ﴿فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ② اللہ کی خفیہ تدبیر سے مطمئن بیٹھنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے''۔

تو مطلب یہ کہ مطمئن ہو کر مت بیٹھو، خوف اور فکر لگا رہے، تو اس میں گویا خوف بتلایا گیا۔غرض پہلی آیت سے امید بتلائی گئی۔دوسری آیت سے خوف بتلایا گیا اور خوف اور امید کے بیچ میں ایمان ہے۔نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے اور نہ محض ڈرتے رہنے کا نام ایمان ہے۔

فکرِ عظیم......عمل جب بھی کرے گا وہی کرے گا، جسے امید بھی لگی ہوئی ہو۔خطرہ بھی لگا ہوا ہو۔جو محض امید میں غرق ہے وہ خادم کبھی عمل نہیں کر سکتا۔محض خوف زدہ خادم ہو وہ کبھی عمل نہیں کر سکتا، جس کو ہر وقت آقا سے امید ہے کہ چاہے برا کروں چاہے بھلا کروں، چاہے ہزار دم گناہ کر لوں مگر بخشش ہی ہو جائے گی۔آخر میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سوچے گا کہ پھر عمل کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔جب آقا اتنا کریم ہے کہ بخش ہی دے گا، پھر میں خواہ مخواہ کیوں محنت اٹھاؤں، بخشا تو جاؤں گا۔تو وہ عمل سے معطل ہو جائے گا، جس نے فقط امید باندھی۔

اور جسے ہر وقت خوف ہی خوف لگا ہوا ہو کہ کچھ ہی محنت کر لوں مگر جوتیاں ہی پڑیں گی، کچھ ہی محنت کر لو مگر پٹائی ہوگی، وہ کہے گا پھر عمل کی کیا مصیبت؟ جب اوّل بھی جہنم اور آخر بھی جہنم تو کیوں خواہ مخواہ محنت اٹھائی۔وہ بھی عمل سے معطل ہو جائے گا، تو خوفِ محض میں رہنے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔اور امیدِ محض میں غرق ہونے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔عمل کون کرے گا؟

ایک طرف امید لگی ہوئی ہے کہ نیک کام کئے تو اجر ملے گا، اور ثواب ملے گا۔ایک طرف خوف لگا ہوا ہے کہ

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۹۹.

اگر ذرا معصیّت کی تو جہنّم بھی تیار ہے۔ تو ''امید و بیم'' کے مجموعے سے انسان کے عمل کی گاڑی چلتی ہے۔ یہ دو بازو ہیں۔ ان دو بازوؤں سے عمل اڑتا ہے۔ تو ایمان خوف اور رجا کے مجموعے کا نام ہے کہ اللہ سے امید بھی بندھی ہوئی ہو اور ڈر بھی لگا ہوا ہو۔ اس لئے محض ڈر بھی ایمان نہیں اور محض امید باندھنا بھی ایمان نہیں۔ ان دونوں کے بیچ میں رہنا یہی ''تفکّر'' کہلاتا ہے۔ یہی فکرِ عظیم کہلاتا ہے کہ ممکن ہے کہ میرا عمل صحیح نہ ہو، گرفت ہو جائے اور ممکن ہے کہ یہ گناہ بخشا جائے۔ میں توبہ کیوں نہ کرلوں، مالک میرا رحیم و کریم ہے، تو اللہ کی رحمت پر بھی نظر ہو اور اس کے جبر و قہر پر بھی نظر ہو۔ اس پر بھی نظر ہو کہ ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ ① اور اس پر بھی نظر ہو کہ ﴿وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾ ②

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے بندوں کو اطلاع کردو کہ میں بہت بڑا غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی بہت بڑا سخت عذاب ہے۔ ایسا عذاب کوئی دوسرا نہیں دے سکتا جیسا میں دے سکتا ہوں۔ تو دونوں شانیں بتلائی گئیں کہ رحمت کا طالب بنایا اور عذاب سے ڈرنے والا بنایا۔ تو دونوں باتیں ایک حالت میں انسان میں مطلوب ہیں۔ اسی کا نام ایمان رکھا گیا ہے تو فکر کامل ہوگی تو ایمان کامل ہوگا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر کو دیکھا جائے۔ تو فرمایا گیا کہ: ''كَانَ دَآئِمَ الْفِكْرَةِ حَزِيْنًا'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوامی طور پر، ہمیشہ چوبیس گھنٹے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فکر میں غرق اور مستغرق ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سید المتفکّرین ہیں، سید المفکّرین ہیں۔ عالم میں اتنی فکر کسی کو نہیں دی گئی جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اتنا بڑا اخلاص کسی میں نہیں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، اتنا بڑا عمل صالح کسی میں نہیں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ اتنا بڑا علم نافع اور کامل کسی میں نہیں تھا جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

جب انسانیت کی سیرت ان چار جزوں سے بنتی ہے تو جس انسان میں یہ چار جز علی وجہِ الاتم موجود ہوں گے، اس کی سیرت بھی ''اکمل السیر'' ہوگی، اس کی سیرت سب سے اونچے درجے کی سیرت ہوگی کہ کوئی سیرت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، کوئی سیرت اس کے پاس نہیں پھٹک سکے گی۔

دستورِ زندگی...... اس سیرت کے جو لوگ مخاطب بنائے گئے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں، وہ دنیا کے سارے انسان ہیں جن کے سامنے یہ سیرت پیش کی گئی ہے اور اس لئے پیش کی گئی کہ اس سیرت کو کسوٹی بنا کر ہم اپنی سیرتوں کو اس کے اوپر پرکھیں کہ اس سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کس حد تک ہماری عادات اور خصائل مطابقت کھاتی ہیں۔ اور کس حد تک ہم اس سے ہٹے ہوئے ہیں اور منحرف ہیں۔

غرض سیرت کا بیان اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ کوئی کہانی ہے کہ اسے سنا دیا جائے، یہ کوئی قصہ ہے کہ اسے پڑھ کر پیش کر دیا جائے، یہ تو ایک معیار اور دستورِ زندگی ہے۔ اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ گھر جا کر ہر شخص اپنی زندگی کو اس

① پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآية: ۴۹، ۵۰. ② پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآية: ۵۱.

سیرت کے اوپر پیش کرے۔ آیا میرے اندر علم نافع ہے یا نہیں؟ جس سے میں حق و باطل میں امتیاز کرسکوں، آیا میرے اندر عمل صالح ہے یا نہیں؟ جو میرے لئے نجات کا ذریعہ بنے۔ آیا میرے اندر اخلاص ہے؟ نفاق تو نہیں ہے کہ میرا عمل قابل قبول ہو سکے اور آیا میرے اندر فکر موجود ہے؟ یا میں بے فکری سے زندگی گزار رہا ہوں، میری کیفیت کیا ہے؟ انہی کیفیات کو جانچنے کے لئے سیرتِ مقدسہ صلی اللہ علیہ وسلم کسوٹی ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

کتاب وسنّت کی چٹان

قرآن کریم آپ کے سامنے اصول پیش کرتا ہے۔ یہ تو علم ہے اور ذات محمدی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِیَّةٍ وَّسَلَامٍ) کردار پیش کرتی ہے کہ یہ کسوٹی اور معیاری کردار ہے۔ اس پر اپنے عمل کو پرکھو تو عقائد کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں؟ اور عمل کو ذات محمدی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِیَّةٍ وَّسَلَامٍ) کے اسوۂ حسنہ کے اوپر پرکھو کہ کس حد تک عمل مطابقت کھاتا ہے؟ کس حد تک نہیں؟

اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا'' ① میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر تم ان سے تمسک کرتے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، کبھی راستے سے نہیں بھٹک سکو گے''۔ وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ ''كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ'' ''اللہ کی کتاب اور میری سنت اور طریقۂ کار''۔ ان دو چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ثَقَلَيْنِ'' وزنی چیزیں فرمایا۔ یعنی بھاری چیزیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ؟ جب فتنوں کے طوفان آتے ہیں اور فتنوں کا، فسق کا، کفر کا، فجور کا، اور منکرات کا دریا چڑھتا ہے، اس وقت اگر آپ نے کسی تنکے سے تمسک کیا تو طوفانوں میں تنکا بہہ جائے گا اور آپ بھی بہہ جائیں گے۔ اگر جان بچانے کے لئے کسی شہتیر کو پکڑا تو طوفان میں شہتیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ وہ بھی بہہ جائیں گے، آپ بھی بہہ جائیں گے، اسی طرح اگر آپ نے کسی درخت سے تمسک کیا تو درخت کو طوفان جڑ سے اکھاڑ کرلے جائے گا، وہ بھی بہے گا، آپ بھی بہہ جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی ایسی چٹان کو پکڑ لیں جو عظیم الشان پہاڑ کی مانند ہو کہ لاکھ طوفان آئیں مگر اس کو ہلا نہ سکیں، تو نہ چٹان ہل سکے گی نہ آپ بہیں گے، طوفان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''ثَقَلَيْنِ'' فرمایا۔ یعنی اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ کتنے ہی بڑے فتنوں کے اور گمراہیوں کے جھکڑ چلیں لیکن کتاب وسنّت کی چٹان کو جس نے پکڑ رکھا ہے، وہ کبھی اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہے، اس کے علاوہ جس چیز سے بھی تمسک کرو گے، ہر چیز بہنے والی ہے۔ اتنی قوی نہیں ہے، وہ بھی بہے گی اور آپ بھی بہیں گے، تو ایک طرف قرآن کریم کو رکھا اور ایک طرف سنّت کو رکھا، جس کے معنی سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ حسنہ کے ہیں، تو حدیث اسوۂ حسنہ کو پیش کرتی ہے اور قرآنِ کریم علم کو پیش کرتا ہے۔ تو قرآن کریم پر اپنی فکر کو جانچو کہ عقائد صحیح ہیں یا نہیں۔؟ اور عمل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر جانچو، جس حد

① مؤطا امام مالک، كتاب الجامع، باب النهي عن القول بالقدر ج: ۵ ص: ۳۷۱.

تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق ہے، جس حد تک انحراف کرے، سمجھو کہ غلط ہے، دیوار پر مارنے کے قابل ہے، ان کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

اسوۂ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اور زیادہ سہولت پیدا فرمادی۔ اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو معیار اور کسوٹی ہے ہی۔ اس پر علم وعقیدہ اور عمل کو پرکھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی شامل کرلیا کہ وہ بھی معیار اور کسوٹی ہیں۔ اگر آپ اپنے علم وعمل کو ان کے اوپر پرکھو گے تو بھی حق وباطل کا پتہ چل جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ ہر کس وناکس کا پہنچنا تو بجائے خود ہے، اس کی بلندی کو نگاہ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ ان میں تاجر بھی ہیں، زراعت کرنے والے بھی ہیں، فقہاء بھی ہیں، علماء بھی ہیں، حکماء بھی ہیں، گھر میں بیٹھنے والے بھی ہیں، خلوت پسند بھی ہیں، جلوت پسند بھی ہیں، مجاہد بھی ہیں، مجاہدہ پسند بھی ہیں۔ ہر نمونہ موجود ہے۔ تو فرمایا کہ میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

"بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ" تو واضح فرمادیا کہ میری ذات تو ہے ہی معیار، میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تمہارے علم وعمل کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ یعنی بالذات تو میں معیار ہوں، لیکن جسے میں معیار بتلادوں وہ بھی معیار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا۔

معیارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین...... حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ونصاریٰ میں بہتّر فرقے ہوئے اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ "كُلُّهَا فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً" سب کے سب ہلاکت میں پڑنے والے ہوں گے حقیقی معنی میں ایک نجات پائے گا۔ یعنی آخرت میں اعمال کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کو سزا مل جائے گی۔ گو وہ انجام کار چھٹکارا پالیں گے، لیکن عقائد کی وجہ سے جن کو ہلاکت نصیب ہوگی وہ بہتر فرقے ہوں گے تہتر واں فرقہ وہ ہے کہ عقائد کی وجہ سے اس پر کوئی وبال نہیں ہوگا، کوئی عملی خرابی یا کھوٹ ہوا تو معاف کردیں گے؟ یا سزا دے دیں گے۔ تو فرمایا: "كُلُّهَا فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً" یہ سب کے سب ناری ہوں گے، ایک ناجی ہوگا"۔

اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ ناجی فرقہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا اَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَاَصْحَابِيْ" "آج کے دن جس چیز پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں"۔ ①

یہی فی الحقیقت معیار ہے۔ تو اپنی ذات کو پیش کیا اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پیش کیا۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اور میرے عقیدے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا عقیدہ ایک ہے۔ میرے

① جامع الترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الامة ج: ۹ ص: ۲۳۵۔

عمل کی نوعیت میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی نوعیت میں فرق نہیں، جو میرا عمل ہے۔ جو میری فکر ہے وہ ان کی فکر ہے، جو میرے مقاصد ہیں وہ ان کے مقاصد ہیں۔ اپنی نوعیت میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو شریک کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تہتر فرقوں میں سے حق و باطل کو پرکھنے کے لئے ایک میں معیار ہوں اور ایک صحابہ رض اللہ عنہم معیار ہیں۔ ان پر تم اپنے آپ کو پیش کرو، جس حد تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق پر ہے۔ جس حد تک منحرف ہو جاؤ، اس کی اصلاح کرو۔ سمجھو کہ یہ تمہارے اندر باطل ہے اور ناحق کی بات ہے۔ تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کسوٹی بتایا۔

طبقۂ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... گویا کسی طبقے کو من حیث الطبقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز صحابہ رضی اللہ عنہم کے، مقدّس نہیں بتلایا۔ امت کے اندر۔ افراد آئیں گے جو کامل اور مکمل ہوں گے۔ مگر طبقہ کا طبقہ مقدّس ہو۔ اس میں سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا معیار ہے، تو جب یہ معیار قرار پا گیا تو آپ دیکھ لیجئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیار بن گئے۔

جس شخص کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت اور محبت دیکھیں سمجھو کہ حق پر ہے۔ اگر محبت نہیں، انہیں سب وشتم کرتا ہے یا انہیں گالم گلوچ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ ناحق ہے وہ حقانی نہیں کہلائے گا۔ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ سب کے سب متقی، پارسا اور پاکباز ہیں، ان کی نیتیں صادق ہیں۔ ان کے قلوب کا رخ سچا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور جو طبقہ یہ کہے گا کہ معاذ اللہ ان میں تو منافق بھی تھے۔ ان میں تو غلط کار بھی تھے۔ انہیں گالم گلوچ کرے، سمجھ لیجئے کہ وہ ناحق پر ہے۔ گویا ایک سیدھا سادہ معیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرقوں کے حق و باطل ہونے کے بارے میں بتلا دیا۔ تو جو سب وشتم کرے، وہ بھی ناحق، جو قتلِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درپے ہو وہ بھی ناحق، جو یوں کہے کہ ہم معیار ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم معیار نہیں ہیں۔ ہم ان پر نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں وہ ہم پر نہیں کر سکتے۔ سمجھو کہ بطلان کی بات ہے۔ کوئی حقانیت کی بات نہیں ہے۔ غرض ایک سیدھا سا معیار فرقوں کے حق و باطل اور خطا و صواب کے پہچاننے کا بتلا دیا کہ مجھے دیکھ لو۔ اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھ لو۔

اعلانِ رضا...... بہر حال قرآن کریم نے جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ فرمایا کہ: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① وہ مہاجرین وانصار۔ اور بعد میں جو مہاجرین وانصار میں ملتے رہے، وہ سب کے سب۔ کون ہیں؟'' ۔﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ''اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی''۔

مشترکہ اعلانِ رضا کیا۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہوسکتا جن کے دل میں کوئی ادنیٰ کھوٹ اور ٹال ٹیک ہو، ان سے کبھی رضائے مطلق کا اعلان نہیں ہوسکتا۔ رضا کا اعلان ہے۔ اور قرآن کریم میں اعلان ہے۔ اور قرآن

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، ۱۰۰.

کریم قیامت تک بلکہ آگے تک چلنے والی ایک عظیم کتاب ہے۔ گویا ابدالآباد تک یہ اعلان ہوتا رہے گا۔ تو قیامت تک بھی یہ اعلان غلط نہیں ہوسکتا، اور قیامت کے بعد بھی یہ اعلان غلط نہیں ہوسکتا، تو قرآن کریم دُہراتا رہے گا کہ ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اللہ ان سب مہاجرین وانصار سے راضی اور ان سے بھی جو ان میں بعد میں ملے، یعنی کل کے کل مرضیِ خداوندی میں ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ ناراض یا ناخوش ہوں۔ پہلے تو مطلق جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اپنی رضا کا اعلان کیا۔ اور یہ نہیں کہ اولین مہاجرین وانصار کو لے لیا ہو، بلکہ فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ جو احسان کے ساتھ بعد میں ان کے ساتھ ملتے رہے اور ان کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سب اس اعلان رضا میں شامل ہیں۔ گویا مطلق حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس ہوئی کہ وہ سب مرضی اور پسندیدہ ہیں۔

پھر طبقاتی طور پر تقدیس کی، چناں چہ ایک جگہ اصحابِ حدیبیہ کے بارے میں فرمایا ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ② ”اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے راضی ہے جنہوں نے کیکر کے درخت کے نیچے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! تمہارے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔“ ان کے لئے بھی رضا کا اعلان ہے۔

اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس ...... پھر ایک آیت میں ان کے عمل کو سراہا۔ ارشاد فرمایا ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ③ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں، ان کی شان یہ ہے کہ ان میں کفر کے اوپر شدت ہے اور باہمی طور پر ان میں رحمت ہے۔ اور ان کا طریقہ کیا ہے؟ تم انہیں دیکھو گے، کہیں رکوع میں ہیں، کہیں سجدوں کے اندر ہیں۔ اللہ کے فضل کو جابجا تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ خدا کا فضل ان کے پیشِ نظر ہے۔ ابتغاءِ وجہ اللہ اور ابتغاءِ مرضات اللہ، یہ ان کا شیوہ ہے۔

کمالِ معرفتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ...... اور اس درجہ ان میں ایمان بھر گیا اور اس درجہ ان کے قلبی مقامات پاک ہیں کہ بالکل اس طرح ہے کہ جب کسی چیز سے ظرف بھر جاتا ہے تو آخیر میں چھلک پڑتا ہے تو فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس درجہ ایمان سے بھرپور ہیں کہ چھلک کر ان کے ایمان کی ان کی پیشانیوں پر علامت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کو ارشاد فرمایا۔ ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ④ سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں“۔ گویا اندرونی ایمان کی اوپر تک علامت آ گئی ہے اور اندرونی کمالِ معرفت کی علامت اوپر چھلک پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمادیا کہ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ⑤ یہ قرآن ہی ان کے اوصاف کو نہیں سراہ رہا، یہی مثال ان کی تورات میں بھی ہے۔ یہی انجیل میں بھی ہے“۔

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، ۱۰۰۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔ ⑤ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔

تو اوّلین بھی ان کی مدح کرتے آئے ہیں۔ اور آخرین بھی ان کی مدح کرتے چلے جائیں گے۔ تو اللہ کے ہاں جو ممدوح، اللہ کے نیک بندوں کے ہاں ممدوح ہے، اوّلین و آخرین شہادت دے رہے ہیں۔ اور قیامت تک دیتے رہیں گے۔ وہ طبقہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ تو اس طبقہ کے اندر کوئی کھوٹ تسلیم نہیں کیا جا سکتا، ورنہ یہ ساری آیتیں بے محل ہو جائیں گی، اللہ کی ساری رضا معاذ اللہ بے محل واقع ہوگی۔

قلوبِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب، تھے تو ایسے ہی۔ مگر ممکن ہے بعد میں کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہوں۔ ممکن ہے بعد میں کوئی کھوٹ آ گیا ہو؟ تو اوّل تو یہ غلط ہے۔ اور اس لئے غلط ہے کہ یہ قران کریم کی شہادت ہے اور قران کریم ابدالآباد تک اعلان کر رہا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا رہے گا لہٰذا یہ احتمالِ محض ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک موقع پر ان حضرات کے قلوب پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ محض اعمال ہی پر نہیں۔ فرمایا ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ ① یہ وہ طبقہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں کا امتحان کر چکا ہے۔ یہ امتحان میں پاس ہو چکے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور خرابی نہیں ہے۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے۔ اور اجرِ عظیم بھی ہے۔ تو دو چیزیں ہیں۔ مغفرت اور اجرِ عظیم۔ مغفرت آخرت میں ہوگی اور اجرِ عظیم دنیا میں دیا جائے گا۔ تو ان کی دنیا و آخرت دونوں درست ہیں۔

فرقۂ ناجیہ..... غرض جس طبقے کی نسبت ان کے قلوب پر بھی حکم لگایا، ان کے قوالب پر بھی حکم لگایا، ان کے اعمال کو بھی سراہا، ان کے طبقے کی بھی تقدیس بیان کی گئی، وہ طبقہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ پھر اس کے بارے میں کوئی ادنیٰ کھوٹ کا یقین کیا جائے یا کوئی تخیل ہی باندھے۔ جب یہ معیار ہوا وہ سارے فرقے نکل جائیں گے، جو قلوب میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت نہیں رکھتے۔ جن کے قلوب میں عظمت ہوگی، وہی ناجی قرار پائے گا۔ اور وہ طبقہ کون ہے۔؟ جو یوں کہتا ہے کہ "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" ② سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عدول، متقی، پارسا اور پاکباز ہیں۔

خطاءِ اجتہادی...... گو، ان سے خطاءِ اجتہادی ممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اجتہادی طور پر ان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ مگر مجتہد کو تو خطاء پر بھی اجر ملتا ہے، اس کی خطا بھی مقبول ہوتی ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر اجتہادی خطا ہو، وہ ہماری طاعتوں سے بہتر ہے کہ اس پر اجر دیا جا رہا ہے۔ وہ خطا اجتہادی ہے بہر حال نیت کی ان میں کوئی خرابی نہیں ہو سکتی۔

اور اگر دنیا میں ان کی کوئی تھوڑی بہت خرابی ہو، کوئی معصیت یا برائی سرزد ہوئی ہو تو دل ان کا کسی برائی یا نیّت کے کھوٹ سے قطعاً پاک ہے اور اگر کوئی غلطی عمل میں ہوئی اور وہ بھی دنیوی عمل میں تو اس کے بعد ان کی توبہ و استغفار اتنی ہے کہ ہماری عمر بھر کی طاعتوں پر وہ اجر نہیں جو ان کی توبہ واستغفار پر ان کو اجر ملا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ترقی مدارج کے لئے ان سے کوئی ایسی چیز کروا دی ہو۔ غرض ایسی چیز اگر ہے تو وہ دنیا سے متعلق ہے۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳. ② عمدۃ القاری، کتاب الوضوء، باب الماء الذی یغسل بہ الشعر، ج: ۳، ص: ۳۹۹.

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدّس...... لیکن جہاں تک دین کا معاملہ ہے۔ علم اور تبلیغ اور احکام وعقائد کا معاملہ ہے، اس میں سب کے سب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین مل کر متقی، عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے قلوب کا اللہ امتحان لے چکا ہے۔ تو جس ذاتِ بابرکات کے شاگرد ایسے ہوں ان کا استاد کیسا ہوگا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر پھل میٹھا ہے تو درخت قابلِ مدح ہے۔ اگر پھل کڑوا ہے قابلِ مذمّت ہے۔ تو جس درخت کے یہ پھل ہیں اس درخت کا کیا حال ہوگا؟ جس کی شاخوں میں یہ لطف ہے ان کی اصل میں کیا لطف وکرم موجود ہوگا، تو جس ذاتِ بابرکات کی تربیّت سے صحابہ، صحابہ رضی اللہ عنہم بنے، اس ذات کی برگزیدگی اور اس کی سیرت کے تقدّس کا کیا عالم ہوگا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کو دیکھ کر سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہچانی جاسکتی ہے۔ جس ذاتِ بابرکات نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے تیار کردیئے۔ یہ مربی کی کامل تربیت کی علامت ہے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے جیسا بنا دیا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نمونہ بنا دیا۔ اور ایک دو نہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب افراد کا نمونہ جو مقدّسین کی ایک عظیم جماعت ہے۔ جو بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام نبی اور اس جماعت نے عالم کو علم اور دین سے بھر دیا۔ غرض جس اصل کی شاخیں ایسی، اس کی اصل کیسی؟ اور جس ذات کے پھل ایسے وہ درخت کیسا؟ اور جس استاد کے شاگرد ایسے وہ استاد کیسا؟ اور جس شیخ کے تربیّت یافتہ ایسے مقدّس، اس شیخ کے تقدّس کا کیا عالم ہوگا؟

اکمل السِیَر...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کو اگر انسانی اصول پر پرکھا جائے تو انسان کی سیرت کے عناصرِ اربعہ میں نے ذکر کر دیئے۔ ان میں سب سے زیادہ کامل اور اکمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نکلتی ہے۔ یہ تو اصل کے اعتبار سے ہے اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھ لو، جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کا تقدس ایسا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تقدس کا کیا عالم ہوگا؟ تو اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی سیرت اکمل السِّیر ہے۔ اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی وہ سیرت اکمل السّیر ہے۔ جب وہ سیرت ہمارے سامنے آتی ہے، اس کا مقصد کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ معیار پیش کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو پرکھ پرکھ کر اس کے اوپر جانچیں، مسلمانوں میں علم کی کمی نہیں فکر کی کمی ہے۔ علم تو ہے۔ رات دن وعظ سنتے ہیں، کتابیں بھی پڑھتے ہیں، رسالے بھی ان کے سامنے ہیں لیکن تفکّر موجود نہیں ہے کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر غور فکر کریں اور اپنے کو اس نمونے کے اوپر پیش کریں کہ کس حد تک مطابقت ہے اور کس حد تک مطابقت نہیں۔ یہ فکر جب تک پیدا نہیں ہوگی سیرت کا سننا نہ سننا آپ کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ تو آپ محض کانوں سے سنتے ہیں۔ حالاں کہ دل سے اور دماغ سے سننا چاہئے جس سننے میں دل بھی شامل ہو۔ یعنی اس طور پر آپ سیرت کو سنیں کہ ہم اپنا جائزہ لیں۔ نہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد وثناء کرتے رہیں۔ آپ نہ بھی مدح کریں وہ جب بھی واجب

المدح ہیں۔آپ ایک بھی ثناء نہ کریں وہ جب بھی معظّم ومکرّم ہیں۔اس سیرتِ پاک کی عظمت و رفعت آپ کے عظمت کرنے پر موقوف نہیں ہے۔آپ عظمت نہ کریں وہ جب بھی باعظمت و رفعت ہیں' سوال یہ ہے کہ سیرت کو سن کر آپ نے اپنے لئے کیا کیا۔تو آپ سیرت کا بڑا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ سبحان اللہ کہہ کر یہ کہہ دیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یہ عظمت دی، وہ تو باعظمت ہیں ہی۔آپ نہ بھی کہیں جب بھی عظمت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ عظمت آپ کے سامنے کیوں لائی گئی؟ تا کہ آپ بھی باعظمت بنیں، آپ کے اندر بھی خوبیاں اور کمالات پیدا ہوں، اس لئے سیرت سامنے رکھی جاتی ہے۔یہ جذبہ ہمارے اندر مفقود ہے۔اس لئے اپنے جانچنے کی فکر نہیں۔تعریف کرنے کی فکر ہے۔تو تعریف سے زیادہ اپنا جانچیئے کہ خود اپنے کو پیش کریں۔اور سیرت کے مطابق اپنے کو پرکھیں۔اس واسطے میں نے سیرتِ مقدسہ کو دو پہلوؤں سے پیش کیا ایک سیرت کی اصل کے لحاظ سے کہ انسانیّتِ کاملہ اسی سیرت کے اندر ہے اور ایک سیرت کی فرع کے اعتبار سے کہ اس سیرت سے اخذ کر کے جو سیرتیں بنیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد والوں کی ہیں جو دوسروں کو مقدّس بنا سکتی ہیں۔وہ سیرت اس قابل ہے کہ اسے سامنے رکھ کر مقدّس بننے کی فکر کرے، تو دونوں پہلوؤں سے سیرت کامل اور اکمل ہے۔حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اور آپ کو توفیق دیں کہ ہم اپنے کو پرکھنے کی کوشش کریں اور اپنے کو سیرت کے مطابق بنانے کی فکر کریں۔آمین۔

''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ. اَللّٰهُمَّ وَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَامَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.''

ملّتِ اسلامیہ کا المیّہ اور اس کا علاج

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّابَعْدُ.............عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَاذُ رَدِيْفُهٗ عَلٰى رَحْلٍ، قَالَ يَامَعَاذُبْنُ جَبَلٍ! قَالَ لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ يَامَعَاذُ! قَالَ لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ يَامَعَاذُ! قَالَ لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ .... قَالَ مَامِنْ اَحَدٍيَّشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًامِّنْ قَلْبِهٖ اِلَّاحَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ...... (1)

گزارشِ واقعی...... بزرگانِ محترم! میں اس وقت زیادہ دیر تک نہیں بول سکوں گا۔ کچھ تو اپنے ضعف کی وجہ سے اور پر کچھ یہ کہ تقریباً ایک ہفتے سے روزانہ مسلسل تقریریں کرنی پڑیں، اتنی قوت نہیں ہے کہ روز کی تقریریں نبھائی جاسکیں، بمبئی آنے کا میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں آ کر تھکاوٹ دور کروں اور آرام کروں۔ مگر یہاں پہنچ کر بہر حال جلسے کی تیاری ہوگئی، اس لئے اس تعب اور تھکان کی بناء پر زیادہ دیر نہیں بول سکوں گا، صرف جلسہ اور اس کے اعلان کا احترام قائم رکھنے کے لئے چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔

اضطرابِ عام...... اس جلسہ کے لئے جو دعوت نامہ پہنچا تھا اس میں یہ تھا کہ اس وقت مسلمان پریشانیوں میں مبتلا ہیں، اور مختلف قسم کے فتنے اور مختلف قسم کی پریشانیاں ان پر آ رہی ہیں، کچھ اخلاقی لائنوں سے، کچھ سیاسی لائنوں سے، کچھ اعتقادی لائنوں سے، کچھ تمدنی اور معاشرتی لائنوں سے۔ غرض مختلف قسم کے فتنے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو مضطرب، بے چین اور پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ان پریشانیوں کو دور کرنے کا کوئی راستہ تجویز کیا جائے اور کوئی بات کہی جائے جس سے یہ پریشانیاں دور ہوں۔ یہ ہمارے قبضے میں تو نہیں ہے کہ ہم کسی پریشانی کو دور کر دیں۔ ہم اپنی ہی پریشانی دور نہیں کر سکتے، ہم دوسروں کا کیا بنا سکتے ہیں البتہ تدبیر بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ تدبیر اختیار کی جائے تو فتنے ختم ہوں گے، پریشانی دور ہوگی اور دلجمعی پیدا ہو جائے گی۔

(1) الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم کراھیۃ ان لا یفھموا، ج: ۱، ص: ۵۹، رقم: ۱۲۸.

تدبیر بھی ہم خود کیا تجویز کر سکتے ہیں، جو خود فتنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو وہ تدبیر کیا کرے گا۔ تدبیر وہ بتلا سکتا ہے جو فتنوں سے بری اور بالا ہو۔ تو اس کی تدبیر حق تعالیٰ ہی سے پوچھنی چاہئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنی چاہئے وہی ہمارے فتنوں کا رد ہوگا اور وہی فتنوں کے دفعیہ کا ذریعہ ہوگا۔ اس کے بارے میں ایک حدیث سنائے دیتا ہوں، اس کا ترجمہ اور اس کی مختصر سی تشریح عرض کئے دیتا ہوں۔

حدیثِ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ...... حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرما رہے ہیں۔ اور انہوں نے روایت سے پہلے واقعہ بیان کیا کہ میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار تھے۔ عرب میں عامۃً یہ دستور ہے کہ ایک اونٹ پر دو سیٹیں ہوتی ہیں، اسی طرح ایک گھوڑے پر دو سیٹیں، ایک گدھے پر دو سیٹیں۔ تو زین ہی دو سیٹ کا بنایا جاتا ہے، اس کے آگے پیچھے دو آدمی سوار ہو جاتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی سواری پر سوار تھے اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا قریب تھا کہ: ''لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ اِلَّا مُؤْخَرَۃُ الـرَّاحِلِ'' میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں کوئی حائل نہیں تھا، صرف زین اور کجاوے کی ایک ڈنڈی بیچ میں تھی۔ گویا اگلا بیٹھنے والا تو لگام سہار کر بیٹھتا ہے اور پچھلا بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو سہار لیتا تھا تاکہ گر نہ پڑے۔ تو وہ زین ایسے ہی بنائے جاتے تھے کہ دو سیٹیں تھیں، بیچ میں ایک ڈنڈی اس طرح سے لگاتے تھے تاکہ پیچھے بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو تھامے رہے۔ اسے موخرۃ الراحل کہتے تھے۔ گویا کجاوے کا ایک درمیانی حصہ۔ بہر حال حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: زین کی اگلی سیٹ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور پچھلی پر میں تھا میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسی ڈنڈی کا فاصلہ تھا۔ اس کے سوا کوئی فصل نہیں تھا۔

تعدُّ دِ نداء...... تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ: ''یَا مُعَاذُ!'' اے معاذ! میں نے عرض کیا ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ'' میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! اس کے بعد کچھ سکوت فرمایا۔ اور پھر آواز دی کہ یَا مُعَاذُ! اے معاذ! میں نے عرض کیا۔ ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ'' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں اور میری سعادت ہی حاضری میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری آواز دی کہ یَا مُعَاذُ! میں نے پھر عرض کیا ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ'' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو مجھے اس وقت سنانی ہے۔

مقامِ اشتباہ...... اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کسی بعید کو جو دور ہو اسے پکارا جاتا ہے اور جو اتنا قریب ہو کہ ملا ہوا بیٹھا ہو، صرف ایک کجاوے کی ڈنڈی بیچ میں ہو، اسے پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما دیتے، پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پھر پکارنا بھی ایک دفعہ نہیں تین دفعہ ہے۔ اور پھر اس کے باوجود کہ ہر پکار پر وہ عرض کرتے ہیں کہ ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ

اللّٰہِ۔" یارسول اللہ میں حاضر ہوں۔ اگر جواب نہ آتا ممکن تھا کہ پہلی آواز کو نہ سنا ہو، اس لئے دوسری آواز دی، دوسری انہوں نے نہ سنی ہو تو تیسری مرتبہ پکارا گیا ہو۔ لیکن ہر پکار کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلی پکار نہیں سنی ہوگی، تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ تین دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پکاریں۔

اشتیاقِ مقصد...... یہ حقیقت میں ایسے مواقع پر ہوتا ہے جب کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو اور کوئی عظیم مقصد پیش کرنا ہو۔ تو تین تین دفعہ متوجہ کرتے ہیں کہ غور سے سنو تاکہ وہ چیز دل کے اندر اتر جائے۔ بلا پکارے ہوئے اور بلا لبیک کہلوائے ہوئے کسی چیز کا کہنا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کان سے بات کہی اور دوسرے کان سے نکل گئی۔ تین دفعہ متوجہ فرمایا کہ: شوق پیدا ہو جائے اور اس مضمون کی رغبت پیدا ہو جائے جو آگے ارشاد فرمانا ہے۔

اور یہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات نائبان انبیاء علیہم السلام کا خاصہ رہا ہے کہ پہلے دل میں شوق اور تڑپ پیدا کرتے ہیں، اس کے بعد میں مقصد پیش کرتے ہیں تاکہ دل میں اتر جائے۔ بلا طلب کے اگر از خود کوئی چیز کہہ دی جائے تو عادت یہ ہے کہ دل میں اترا نہیں کرتی، آدمی توجہ نہیں کرتا، جب تک اندر سے طلب صادق نہ ہو، تو شوق پیدا کرنے کے لئے ایسے اسباب اختیار کرتے ہیں کہ طلب پیدا ہو جائے اور طلب کے بعد جو چیز دل میں آتی ہے وہ دل میں اترتی جاتی ہے۔ غیرِ طالب کو کچھ نہیں ملتا، اس لئے طلب گار ہونا چاہئے۔

جیسے عارف رومی نے کہا ہے کہ ؎

آب کم جو ، تشنگی آور بدست

پانی کو زیادہ مت پکارو، پیاس اپنے اندر پیدا کرو، پیاس پیدا ہوگی تو پانی ملے گا اور پھر وہ اترے گا اور رگ رگ میں تری پیدا کرے گا پیاس نہ ہو تو پانی پی لو تو بعض دفعہ بیماری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں اپھارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو معدے کی خواہش کے بعد اگر کھانا کھایا جائے گا تو معدے میں اترے گا، پچے گا اور بدن کو لگے گا، اور بلا کسی بھوک کے کوئی کھاتا رہے تو بیماریوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے پانی اور دانے کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ بھوک اور پیاس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معدہ خراب ہوتا ہے اور بھوک کی کمی ہوتی ہے تو طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ تندور پر نہیں جاتے کہ بہت سی روٹیاں لے آئیں، بلکہ طبیب کے پاس جاتے ہیں کہ ان روٹیوں کی گنجائش تو پیدا ہو جائے، علاج کراتے ہیں تاکہ معدے میں طلب تو پیدا ہو جائے۔

انتظارِ رغبت...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ العزیز بانی دارالعلوم دیوبند ان کے مریدوں میں سے حافظ محمد احسن صاحب جو ہمارے عزیزوں میں سے تھے، حضرتؒ سے بیعت تھے۔ نوجوان تھے اور اس زمانے کے نوجوانوں کا جو لباس تھا وہ یہ تھا کہ چوڑی دار پائجامہ جو ٹانگوں پر لپٹا ہوا ہو اور سر کے اوپر دوپٹہ جس کی کناری پر کرن اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا ہوتا تھا اور ہاتھوں پر مہندی، اور پور پور چاندی کے چھلے، یہ اس زمانے میں نوجوانوں کا تمدّن تھا۔ یہی لباس ان کا بھی تھا۔ ان کے بارے میں سنا کہ یہ حضرت کی مجلس میں آتے تھے اور

حضرت کچھ نہیں فرماتے تھے۔

لوگوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ حضرت کے مرید اور خادم، اور لباس غیرِ شرعی، مردوں کے لئے کب جائز ہے کہ مہندی لگائیں یا ہاتھوں میں چاندی کے چھلّے پہنیں۔ یہ سارے ناجائز کام کر رہے ہیں۔ چوڑی دار پائجامہ جو ٹخنوں سے نیچا، جس کی شرعی ممانعت ہے۔ جس کو شرعاً اسبال کہتے ہیں۔ چناں چہ ایک حدیث میں فرمایا گیا، ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا لنگی ڈالنے والا جس کا نام ''مسبل متان'' ہے حق تعالیٰ اسے قیامت کے دن نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے کہ دنیا میں اسبال کرتا تھا، ٹخنوں سے نیچے ازار یا پائجامہ رکھتا تھا، تو اس پر نگاہِ رحمت نہیں فرمائیں گے، اس سے اعراض کیا جائے گا۔

تو حضرت کی مجلس میں وہ آتے ہیں اس حالت میں کہ اسبال موجود، ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی۔ ناجائز چھلّے پہنے ہوئے اور حضرت کچھ نہیں بولتے، نہی عن المنکر نہیں فرماتے، لوگوں کے دلوں میں یہ خطرہ گزرتا تھا، اور ایک دو نے ایک دوسرے سے کہا بھی مگر حضرت پر کوئی اثر نہیں۔ حافظ صاحب آ رہے ہیں اور مجلس میں بیٹھ رہے ہیں۔

حضرت کیوں کچھ نہیں فرماتے؟ دل میں شریعت کے اتباع کا شوق اور طلب پیدا کرنے کے لئے۔ کہ طلب پیدا ہو جائے۔ پھر جب یہ حکم دیا جائے گا تو دل اتر جائے گا۔ اور بلا طلب کے لاکھ تقریریں کرو، وعظ کہو، کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جیسے آج کی دنیا میں سینکڑوں وعظ اور سینکڑوں تقریریں ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں نہ ایسی تقریریں تھیں، نہ مواعظ تھے، نہ جلسے ہوتے تھے۔ اور آج جلسوں کی بھرمار ہے۔

اور جلسوں کا سیزن ہے اور ہزاروں پر انتہا نہیں ہوتی۔ لاکھوں تک اجتماعات میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ لیکن دل ٹس سے مس نہیں کسی کے اندر کوئی تغیر نہیں۔ وہی کی وہی حالت جو پہلے تھی۔ ایک واعظ وعظ کہہ کے وعظ کا ایسا پانی ڈالتا ہے جیسے گنبد پہ ڈال دیا، کہ اِدھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں پہنچتا، بنا اس کی یہ ہے کہ طلبِ صادق نہیں، تفریحاً آ کے وعظوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ گویا بھانڈ کی دیکھتے ہیں کہ مقرّر کیا بولتا ہے، کیسی باتیں کرتا ہے۔ یہ طلب ہو کہ اس کی کوئی بات لے کر ہم اپنی دنیا و آخرت کی نجات کی فکر کریں۔ یہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ ہو گی، ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کو۔ عام طور سے نہیں ہے۔ اس لئے مواعظ اثر بھی نہیں کرتے۔

وعظ، غلط نہیں ہوتا، مگر دل کھلا ہوا ہو جب اس کے اندر کوئی چیز اترے اور اگر دل الٹا ہو تو اس کی تلّی پر جتنا پڑے گا، اِدھر اُدھر بہہ جائے گا۔ بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب چھ مہینے گزر گئے اور دیکھا کہ اب ان کے اندر عقیدت پوری بیدار ہوگئی ہے اور قلب میں گرویدگی آ گئی ہے۔ اور طلبِ صادق آ گئی۔ تو تنہائی میں لے جا کر کیسے عجیب انداز سے کہا، فرمایا۔ ''بھائی! حافظ جی! تم تو ہمارے دوست ہو اور ہم تمہارے دوست ہیں اور دوستوں کے اندر محبت ہوتی ہے۔ اور محبت میں ہر ایک دوسرے کی حرص کیا کرتا ہے۔ اب ہمارا لباس تو یہ ہے کہ ایک معمولی سا کرتہ اور ایک پٹے پائنچوں کا پاجامہ، اور ایک دو پلی ٹوپی۔ تمہارا ماشاء اللہ فاخرہ لباس ہے۔ گوٹے لگا ہوا

عمامہ بھی ہے۔ پور پور چھلّے بھی اور نہایت عمدہ اچکن اور چپل بھی۔ بھائی! دوستی ہے تو یا تو ہم بھی آج سے یہ لباس اختیار کر لیں کہ ہم بھی چوڑی دار پائچوں کا پاجامہ پہن لیں، ہم بھی ہاتھوں کو مہندی سے رنگیں، یا پھر تم اس راستے پر آ جاؤ جس پر میں ہوں۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دوست ہوں، ایک کا رخ مشرق کو ہو اور ایک مغرب کو ہو"

طرزِ نصیحت...... چوں کہ دل میں عقیدت آ چکی تھی اور طلب صادق پیدا ہو چکی تھی، تو حافظ محمد احسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ رونے لگے اور بلا کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔ جا کر وہ چوڑی دار پاجامے تو بیوی کو دیئے کہ رنگ لگا کر اس کو تو پہن لے، اور گوٹے کی کناری کے دوپٹے اس کو دیئے کہ ان کی تو اوڑھنیاں بنا لے۔ اور پندرہ دن گھر سے نہیں نکلے، جب تک مہندی کا وہ رنگ ہتھیلیوں سے زائل نہیں ہو گیا، چھلّے بھی بیوی کو دیئے کہ تو ان کا زیور بنوا لے۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب وہ مہندی کا اثر جاتا رہا تو خالص مولویانہ لباس، وہی مغلیہ قسم کا پاجامہ اور کرتہ، اور دو پلّی ٹوپی اوڑھ کر حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچے۔ بالکل ایسے جیسے ایک طالب علم ہوتا ہے، حضرت نے سینے سے لگایا اور فرمایا بھائی! آج دونوں دوست یکساں ہو گئے۔ اور بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ جو چھ مہینے تک امر بالمعروف نہیں کیا، وہ اس لئے نہیں کیا کہ اس کا انتظار تھا کہ دل میں طلب آ جائے دل میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے تب کہیں تو اثر پڑے گا۔

حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی طریقہ ہے۔ اہل اللہ اور وارثین انبیاء علیہم السلام کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اور وہ لوگ تو اب کہاں ہیں کہ ایک منٹ میں توجہ ڈالی اور کایا پلٹ دی، وہ لوگ گزر گئے، اب تو یہ ہے کہ اخلاق اور بھائی بندی سے کوئی اثر ڈال کر طلب پیدا کر کے کوئی نصیحت کریں تو کارگر ہوتی ہے۔ یوں نصیحت کرنے کو ہر ایک کا فرض ہے کہ نصیحت کرے، وعظ بھی کہے۔ لیکن موثر نہیں ہوتا۔

حکمتِ تربیّت...... حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدّس سرّہٗ۔ ان کے ایک پٹھان مرید جلال آباد کے تھے۔ بڑے خوبرو جوان تھے۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدّن داڑھی منڈانے کا نہیں، داڑھی رکھنے اور چڑھانے کا تھا۔ نماز نہیں پڑھتے تھے، حضرت حاجی صاحب سے شکایت کی گئی کہ حضرت! آپ کے مرید ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ حضرت نے بلایا۔ بڑی شفقت سے کمر کے اوپر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

"بیٹا! نماز پڑھنی چاہئے، نماز ہی تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز اور فرق ہے، جب نماز ہی نہ ہو تو وہ مسلمان ہی کیا ہوا؟" انہوں نے کہا حضرت! مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور سوا گھنٹے میں داڑھی چڑھتی ہے۔ پہلے اسے گوند لگاتا ہوں، پھر اسے سکھاتا ہوں، پھر اس میں کنگھا کرتا ہوں، سوا گھنٹہ لگتا ہے۔ آپ کہیں گے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی، جب وضو کروں گا تو وہ سارا گوند مونددھل جائے گا۔ تو ہر نماز کے بعد مجھے داڑھی چڑھانی ہے۔ تو پانچ نمازیں تو گھنٹے بھر سے کم میں ہو جائیں گی اور پانچ دفعہ داڑھی چڑھانے میں سات گھنٹے صرف ہوں گے۔ یہ مشکل ہے اور آپ کہیں گے کہ بے وضو نماز جائز نہیں۔

اب آ گئے ''حکمتِ تربیّت'' ہے۔ تعلیم تو یہ ہے کہ حضرت فرماتے کہ ہاں بلاوضو نماز جائز نہیں، حدیث میں ہے لَاتُقْبَلُ صَلٰوۃٌ بِغَیْرِ طُھُوْرٍ ① کوئی نماز بغیر پاکی کے قبول نہیں ہوتی''۔ یہ تو تعلیم کا درجہ تھا۔ مگر تربیت کا درجہ دوسرا ہے۔ تعلیم میں ایک حکم ہوتا ہے، سب کو سنا دیا جاتا ہے، تربیّت میں ہر ایک کا مزاج دیکھنا پڑتا ہے، اس کی نفسیات کے مطابق اس سے کلام کرنا پڑتا ہے۔ تو حضرت نے یہ دیکھا کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے اس کا کیا سنانا، وہ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ آپ کہیں گے کہ بلاوضو کے نماز نہیں ہوتی، تو مسئلہ تو معلوم تھا۔ اب حضرت کیا فرماتے جو معلوم ہے اس کا علم کرا دیتے، مگر حکمتِ تربیّت پیشِ نظر تھی۔ حضرت نے فرمایا ''بھائی میں نے تو وضو کا ذکر نہیں کیا، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھا کرو''۔ انہوں نے عرض کیا، حضرت! بے وضو پڑھ لوں؟ فرمایا ''پھر وضو کا ذکر، میں وضو کا نام کب لے رہا ہوں، میں وضو کا تذکرہ کب کر رہا ہوں میں تو نماز پڑھنے کو کہہ رہا ہوں۔'' تو خان صاحب اٹھے، انہوں بے وضو نماز ٹرخانی شروع کر دی، غرض بے وضو نماز پڑھنی شروع کر دی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بے وضو پڑھ رہے ہیں اور انہیں ٹوکتے نہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کی نماز نہیں ہوتی اس لئے کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے کہ نماز نہیں ہوتی۔ پندرہ دن گزر گئے۔ پندرہ دن کے بعد ان کے ذہن میں خود یہ جذبہ پیدا ہوا کہ تو محنت بھی کر رہا ہے۔ اور اکارت جارہی ہے۔ رائیگاں جارہی ہے۔ بلاوضو کے نماز نہیں ہوتی۔ مگر انہوں نے کہا کہ نماز تو اب میں چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ پیر کا حکم ہے۔ اور پٹھان کی زبان ہے جو کٹ سکتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی، لہٰذا نماز نہیں چھوڑوں گا۔ نماز مجھے ہر صورت میں پڑھنی ہے۔ تو یہ کیا صبح کی نماز کے لئے وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے اور عشاء تک اس وضو کو باقی رکھتے اور پانچوں نمازیں وضو سے پڑھتے۔ لیکن یہ ایک نوجوان آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے کہ صبح سے لے کر عشاء تک باوضو رہے، تکلیف شروع ہوئی۔ پیٹ میں نفخ اور اپھارہ شروع ہوا۔

اب انہوں نے یہ کیا کہ ایک وضو تو صبح کی نماز کے لئے کرتے اور ایک ظہر کے وقت کرتے، اسے عشاء تک باقی رکھتے۔ غرض نماز باوضو شروع کر دی۔ لیکن ایک نوجوان کے لئے بڑی مشکل سی بات ہے کہ ظہر سے لے کر عشاء تک باوضو رہے۔ اس سے بھی پیٹ میں تکلیف شروع ہوئی۔ اب انہوں نے کہا کہ نماز تو میں چھوڑ نہیں سکتا، پیر سے وعدہ کر چکا ہوں اور زبان پٹھان کی ہے جو کٹ سکتی ہے، اب بدل نہیں سکتی۔ اس واسطے انہوں نے سوچا کہ یا تو داڑھی چڑھانے کو قائم رکھو یا نماز قائم رکھو، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے داڑھی چڑھانی چھوڑ دی اور نماز باوضو پڑھنی شروع کر دی۔

بیس پچیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحب نے بلوایا اور بہت شاباش دی اور فرمایا ''نوجوان صالح ایسے ہی ہوتے ہیں''۔ اور بڑی دعائیں دیں۔ اس کے بعد فرمایا بھائی! بے وضو کے نماز کتنے دن تم نے پڑھی؟'' انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! پندرہ بیس دن۔ فرمایا۔ اسے لوٹا لینا، یہ ہوئی نہیں۔ انہوں نے عرض کیا ضرور لوٹاؤں گا۔ اس کے

① الصحیح للبخاری، کتاب الوضو، باب لاتقبل صلوۃ بغیر طھور، ص: ۱۴، رقم: ۱۳۵.

بعد فرمایا کہ بھائی! تمہاری عمر کیا ہے؟ خان صاحب نے کہا کہ سولھواں سال شروع ہے۔ پندرہ پورے ہو چکے ہیں۔ فرمایا چودہ برس کے بعد آدمی شرعاً بالغ ہو جاتا ہے اور نماز اس پر فرض ہو جاتی ہے۔ برس دن کی نماز تو پڑھی نہیں ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! نہیں، میں نے تو نہیں پڑھی۔ فرمایا۔ یہ قضاء عمری ہے۔ اسے بھی قضا کر لو۔

اب دل میں لگن تو لگ چکی تھی۔ سرکاری ملازم تھے، انہوں نے ایک ہفتے کی رخصت لی، اور ساری نمازیں برس دن کی انہوں نے قضا کیں، اور ادا نمازوں سے سلسلہ مل گیا۔ گویا بلوغ کے وقت سے جو نمازی بنے تو پھر مرتے دن تک نماز نہیں چھوٹی اور پکے پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو گئے۔ یہ کیسے ہوئے؟

حضرت نے پندرہ دن کی بے وضو نمازیں پڑھوا کے عمر بھی کی نمازیں باوضو پڑھوا دیں۔ اور اگر پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی، وہ کبھی نہ پڑھتے، اور عمر بھر بے نماز رہتے۔ یہ حکمت تربیّت تھی کہ پندرہ دن بے وضو کے نمازیں پڑھوا کے عمر بھر کے لئے پابندِ نماز بنا دیا۔ اگر تربیّت کی یہ صورت اختیار نہ کرتے، وہ کبھی نماز کے عادی نہ ہوتے۔ تربیت کرنے میں بعض اوقات کسی بری اور منکر چیز کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، سکوت کرنا پڑتا ہے کہ طبیعت میں صلاحیت آ جائے، پھر بات کہی جائے، پھر نصیحت کی جائے، وہ قابلِ قبول ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

تربیّت کا امتیاز...... اور سنّت سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک قبیلہ جو کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم اسلام قبول کرنے کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا۔ "بَارَکَ اللّٰہُ" انہوں نے کہا، حضرت! اسلام قبول کرنے کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ ایک صبح کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور ایک عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے، تین نمازیں پڑھواتے رہیں۔ فرمایا۔ شرط منظور ہے۔

حالاں کہ جس طرح سے تین وقت کی فرض تھیں، ویسے ہی بقیہ دو وقت کی بھی فرض تھیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط منظور فرمائی اور وہ تین وقت کی پڑھ رہے ہیں اور صبح وعشاء کی غائب۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ناجائز ہے، ممنوع ہے، حرام ہے۔ مہینہ بھر کے بعد میں از خود ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ جیسے تین وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ ویسے ہی صبح وعشاء کی بھی فرض ہیں۔ تو ہم آدھے دین کو قبول کریں اور آدھے دین کو ضائع کریں، یہ ہرگز مناسب نہیں، چناں چہ مہینہ بھر کے بعد انہوں نے وہ دو بھی پڑھنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد وہ حاضر ہوئے اور نماز کے پابند ہو گئے، تو دو وقت کی نماز نہ پڑھنے کی شرط مان کر عمر بھر کی پانچ وقت کی نمازوں کا پابند بنا دیا، یہ تعلیم نہیں تھی بلکہ تربیّت تھی۔

تعلیم میں تو مسئلہ عام ہوتا ہے، تربیّت میں ہر مزاج کے مطابق اس کو دوا دی جاتی ہے۔ آپ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے ہاں تعلیم پانے جائیں۔ ایک ہی مسئلہ بیان ہوگا، جو کتاب میں ہے وہی سب کے لئے ہے۔ لیکن جب طبیب مطب کرے گا، وہاں یہ نہیں کہ ایک نسخے میں سب کو پار کر دے، ہر مریض کی نبض الگ ہے اور اس کا مزاج الگ ہے، اس کے مطابق نسخہ تجویز کرنا ہوگا۔ غرض تعلیم میں عموم ہوتا ہے اور تربیت میں خصوص ہوتا ہے۔ اس لئے

''مربیانِ قلوب'' بعض اوقات انتظار کرتے ہیں۔ اس کی نفسیات کو دیکھ کر اس کی برائی پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے کہ پہلے اس سے تعلق پیدا ہو جائے، دل میں گرویدگی آ جائے، پھر اس وقت کہا جائے گا۔

خیر وہ بات طویل ہوگئی، میں مختصر بیان کرنا چاہتا تھا، بہر حال حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو تین دفعہ آواز دی، حالانکہ وہ کمر مبارک سے ملے ہوئے بیٹھے تھے، تاکہ تین دفعہ آواز دے کر ان کے دل میں شوق پیدا کر دیں کہ کوئی بڑی اہم بات کہی جانے والی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دل میں ایک طلب، تلاش اور پیاس پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں گے جو مجھے تین دفعہ متوجہ فرمایا۔

اللہ و بندے کا باہمی معاہدہ...... حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**يَا مُعَاذُ! هَلْ تَدْرِىْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ؟**...... '' اے معاذ! اللہ کا بندوں کے اوپر کیا حق ہے؟ انہوں نے عرض کیا ''**اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ**...... '' اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں۔ فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے۔ ''**يَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا**...... '' عبادت صرف ایک اللہ کی کریں جس میں شرک نہ آنے پائے۔ جبھی اللہ کا حق ادا ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا: ''**هَلْ تَدْرِىْ مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ؟**...... '' یہ بھی جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ کے اوپر کیا حق ہے؟ عرض کیا، اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ فرمایا ''بندوں کا حق یہ ہے کہ جب وہ ایک ہی طرف جھک جائیں اور شرک سے بالکل الگ ہو جائیں۔ پوری زندگی ان کی توحید پر آ جائے اور ایک ہی کو کرتا دھرتا سمجھیں، ایک ہی کو نافع اور ضار سمجھیں، ایک ہی کو محی و ممیت سمجھیں، ایک ہی کو رزّاق اور فتّاح سمجھیں، ایک ہی کو مشکلات آسان کرنے والا سمجھیں، ایک ہی کو دافعِ بلیّات سمجھیں، ایک ہی کو حلالِ مشکلات سمجھیں، جب بندے کے دل میں یہ آ گیا، اس نے اللہ کا حق ادا کر دیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ: پھر تمہارا حق میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہیں رزق دوں گا، رزقِ ظاہری بھی اور رزقِ باطنی اقتدار، عزت، عظمت، عرفی حیثیت، دنیا کی اقوام پر رعب داب، یہ میں تمہیں عطاء کروں گا۔'' ①

غرض بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو عبادت کر جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔ میں تمہیں رزق دوں گا جس کے اندر کمی کا شائبہ نہیں ہوگا۔ یہ گویا بندے اور خدا کا ایک معاہدہ ہوا کہ تم میری یاد میں لگو، میں تمہیں رزق دوں گا۔

قانونِ مکافات...... اللہ تعالیٰ کے ہاں مکافات کا قانون ہے کہ جیسا تم کرو گے، ویسا نتیجہ سامنے آئے گا۔ چناں چہ فرمایا گیا ﴿**فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ**﴾ ② ''فرماتے ہیں تم میری یاد کرو گے میں تمہاری یاد کروں گا''۔ ﴿**اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ**﴾ ③ تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے، میں تمہاری مدد کروں گا۔ ''**مَنْ اَحَبَّ**

---

① الصحيح للبخاري، كتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل، ج: ۱۸، ص: ۳۵۴.

② پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۵۲. ③ پارہ: ۲۶، سورة محمد، الآية: ۷.

لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآئَهٗ۔" ① فرماتے ہیں، اگر تمہیں یہ شوق ہے کہ مجھ سے آ کر ملو اور موت قبول کرو تو مجھے بھی یہ شوق ہے کہ کب میرا بندہ آئے اور مجھ سے ملے۔ تم میں میری محبت ہے مجھ میں تمہاری محبت ہے۔ غرض "ادل بدل" اور مکافات کا قانون ہے اس لئے بندے اور خدا کا گویا معاہدہ یہ ہوا کہ تم تو میری عبادت میں رہو اور مجھے تنہا خالق و مالک اور مؤثر سمجھو، مجھے اپنا تنہا بادشاہ اور مالکِ حقیقی سمجھو اور پھر میں تمہیں رزقِ ظاہری اور باطنی بھی دوں گا، روٹی و مکان بھی، اقتدار و عزت بھی اور حکومت و سلطنت بھی۔ اور تمہیں دنیا کے اوپر غالب کروں گا۔ جس کا ایک جگہ وعدہ فرمایا: ﴿وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ ② اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، عقیدہ بھی پکا اور سچا اور عمل بھی سچا، ہم ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا کریں گے، انہیں اقتدار عطا کریں گے، انہیں عزّت عطاء کریں گے، وجاہت دیں گے"۔

یہ گویا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو تنہا میری طرف جھک، کسی کو کرتا دھرتا مت سمجھنا، ڈرے تو مجھ سے ڈر عبادت کر تو میری کر، مانگ تو مجھ سے مانگ، میرا غیر تیری مشکلات کو حل نہیں کر سکتا، غیر اللہ کے ہاں تیرے لئے گنجائش نہیں۔ میرے ہی پاس ساری گنجائش ہے۔ میں ہی دوں گا۔ یہ معاہدہ ہو گیا۔

بندے کا انحرافِ عہد...... معاہدے کا قاعدہ ہے کہ اگر ایک معاہد اپنا عہد توڑ دے تو دوسرے پر ضروری نہیں رہتا کہ اپنا معاہدہ پورا کرے اور اپنا وعدہ پور کرے۔ دو حکومتوں میں معاہدے ہوئے، ایک نے غدر کیا، دوسری کہے گی اب ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، اب خواہ ہم جنگ کریں یا اس ملک پر ہم قبضہ کریں، جب تک معاہدہ رہتا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہیں۔

اسی طرح بندے اور خدا میں معاہدہ ہو گیا، بندے نے عہد کیا کہ میں آپ کا بنوں گا، فرمایا، ہم تیرے بنیں گے، تو ہماری عبادت کر ہم تجھے سب کچھ دیں گے، اب اگر بندہ اس عہد سے پھر جائے کہ بجائے اس ایک کی عبادت کرنے کے اس نے ہزاروں کے سامنے سر جھکانا شروع کر دیا، بجائے اس ایک کی بندگی کے کبھی وہ کسی قبر کے آگے جھک رہا ہے، کبھی کسی پتھر کے آگے جھک رہا ہے۔ کبھی سونے اور چاندی کے آگے جھک رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے عہد توڑ دیا، جب عہد توڑ دیا تو وہ جو وعدہ تھا اس کی پابندی باقی نہیں رہی۔ فرمائیں گے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تجھے رزق دیں، کیا ضرورت ہے کہ تجھے اقتدار دیں، تُو تو ہم سے منحرف ہو جائے اور ہم تجھے اقتدار دیں تُو تو مالک و خالق روٹی گیہوں اور چنے کو اور انسانوں کو سمجھے اور ہم تجھے عزّت و اقتدار دیں؟

﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ ③ کیا ہم اپنی رحمت تیری کمر سے چپکا دیں گے کہ تو بھاگتا

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب من احب لقاء الله...... ص: ٥٤٦، رقم: ٦٥٠٧.

② پاره: ١٨، سورة النور، الآية: ٥٥. ③ پاره: ١٢، سورة هود، الآية: ٢٨.

جا رہا ہے۔ ہم کہیں رحمت لیتا جا تجھے لاکھ دفعہ ضرورت ہو تو ناک رگڑ، تو ہم تجھے رحمت دیں گے، جب تو وعدہ کا پکا نہیں تو ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، جب تک وعدے کی پوری پابندی رہی، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا دور، حضرات تابعین کا دور، حضرات تبع تابعین کا دور، اقتدار بھی آیا، عزت بھی آئی اور وہ اقتدار آیا کہ آج دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، آج آپ فخر کرتے ہیں کہ عرب ہمارا، عراق ہمارا، مصر ہمارا، ترکستان ہمارا، افغانستان ہمارا، شام اور اردن ہمارا، یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ تو ہے جو آپ کو یہ کہنے کو ملا، آپ نے ان کو خود فتح کیا تھا؟ کیا آپ نے خود قوّتِ بازو سے ان ممالک کو قبضے میں کیا تھا؟ یا ان بزرگوں نے جو اللہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے تھے؟ آپ کو فخر کا موقع مل رہا ہے کہ ۔

چین و عرب ہمارا ، ہندوستان ہمارا ۔۔۔ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہان ہمارا

یہ فخر کا موقع ان کی جوتیوں کے صدقے سے مل رہا ہے، آپ کی بات اگر ہوتی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ تو جب تک قوم وعدے پر پختہ رہی وہ اقتدار بھی تھا، وہ عزّت بھی تھی، وہ روزی بھی تھی۔ وہ فتنے بھی نہیں تھے، آپ داعی تھے، دوسرے مدعو، جب آپ نے دعوت چھوڑ دی تو دوسرے داعی بنے آپ کو مدعو ہونا پڑا، آپ بااقتدار تھے، دوسرے ماتحت تھے۔ جب آپ نے اقتدار کے اسباب چھوڑ دیئے، آپ ماتحت بنے، دوسرے آپ کے اوپر غالب کر دیئے گئے۔ یہ وعدہ خلافی آپ نے کی۔ تو جب فتنے آتے ہیں، پریشانیاں آتی ہیں آپ کہتے ہیں کہ تدبیر تو بتلاؤ، تدبیر تو اللہ نے بتلا دی کہ تم میرے بن جاؤ، میں تمہارا بن جاؤں گا اور کیا تدبیر ہو۔ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ رزق ان کے ہاتھ میں ہے، عزّت ان کے ہاتھ میں ہے، اس کی چوکھٹ پر جھکو گے تو یہ چیزیں آئیں گی، اس کی چوکھٹ چھوڑ کر غیروں کے آگے جھکنا شروع کیا تو غیروں نے آپ کی رہی سہی عزّت کو بھی قبضہ میں لے لیا رہی سہی روٹی پر قبضہ کر لیا، آپ کو فتنوں کے میدان میں چھوڑ دیا۔ اب کوئی روٹی کو رو رہا ہے، کوئی پانی کو رو رہا ہے، کوئی صحت کو رو رہا ہے۔ کیوں رو رہے ہیں؟ اس لیے کہ جب ایک کا دروازہ چھوڑا تو پچاس کے آگے جھکنا پڑا اور ان دروازوں پہ کچھ نہیں جو آپ کو دیں، نہ اُدھر کے رہے۔

عظمتِ دَر اور سَر...... مجھے ایک شعر یاد، آیا واقعی بڑا کام کا شعر ہے اور شاعر نے بڑی بلیغ بات کہی ہے، جس نے بھی کہی ہے بڑی اونچی بات ہے اور دو لفظوں میں بڑی زبردست حقیقت کہہ دی ہے، شاعر کہتا ہے ۔

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے دَر نہیں کہتے

دروازہ وہی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی کا جی چاہے کہ جھک جائے۔ اہل اللہ کا دروازہ، انبیاء علیہم السلام کا دروازہ۔ خواہ مخواہ ہی دل چاہتا ہے کہ سر جھکاؤ۔ انکار کی شکل ہی نہیں۔ تو شاعر کہتا ہے ۔

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے دَر نہیں کہتے ۔۔۔ ہر در پہ جو جھک جائے اسے سَر نہیں کہتے

ذلت انحراف...... جو پچاس کو اپنا آقا بنا لے، وہ کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا، ایک ہی آقا کی خدمت ہو سکتی

ہے۔ جب آپ کے پچاس آقا ہیں کبھی اس کی چوکھٹ پہ جھکنا کبھی اس کی چوکھٹ پہ۔ کبھی اس سے بھیک مانگنی کبھی اس سے بھیک مانگنی۔ تو مسلم قوم دنیا میں بھک منگی بن کے تھوڑا ہی آئی تھی۔ وہ دنیا سے کچھ مانگنے کے لئے نہیں آئی تھی۔ دنیا کو کچھ دینے کے لیے آئی تھی، وہ محسن بن کے آئی تھی، سائل بن کر نہیں آئی تھی. جب احسان کا دروازہ بند کر دیا اور ختم کر دیا تو سائل اور بھکاری بننا پڑا۔ اب آپ کی یہ حالت ہے کہ کسی قوم کے آگے جھک رہے ہیں کہ ہمیں تمدّن کی بھیک دے دو، کسی کے آگے جھکتے ہیں کہ ہمیں سیاست کی بھیک دے دو کسی کے آگے آپ جھک رہے ہیں کہ ہمیں اخلاق کی بھیک دے دو، اور سر کے اوپر ٹوکرا رکھا ہوا ہے جس میں رزق موجود ہے۔ مگر در در مانگتے پھر رہے ہو۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ہاتھ اٹھا کے سر کے اوپر سے لے لو، وہ ساری چیزیں اس ٹوکرے میں موجود ہیں۔ قرآن وحدیث سر کے اوپر رکھا ہوا ہے اور دنیا کے در پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ حالاں کہ اس میں سب کچھ موجود ہے۔ اسی نے دنیا میں بین الاقوامیت اور بین الاوطانیت پھیلائی۔

یک سبد پُر زناں ترا برفرقِ سر　　　　تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

سر پہ روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا ہے۔ اور ٹکڑوں کی مانگ کرتے پھر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جب غیر کی چوکھٹ پر سر جھکائیں گے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپ بھکاری بنیں گے، تو مسلمان دنیا میں اقوام کو کچھ دینے کے لئے آئے تھے، مگر سائل اور بھکاری ہو گئے۔ اور بھیک ملتی نہیں۔ تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وعدہ خلافی کی۔ اس معاہدہ کو توڑ دیا جو اللہ سے کیا تھا۔ کہا تھا کہ مجھ ہی پر بھروسہ کرو، مجھے ہی اپنا بادشاہ سمجھو مجھے ہی خالق اور مالک سمجھو۔ میرے ہی قانون کی دنیا کے اندر ڈنڈی پیٹو، میرا ہی قانون سب تک پہنچاؤ۔ آپ نے جو اس قانون کو چھوڑا تو دنیا کی اقوام نے آپ پر قوانین لادنے شروع کئے۔ وہ قوانین جو فطرت کے بھی خلاف، عقل کے بھی خلاف اور ہوش مندی کے بھی خلاف مگر آپ کو جھک مار کر کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ کشاں کشاں جا رہے ہیں۔ اور آپ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ چیز بری ہے۔ مگر آپ کو جانا پڑا۔

کوئی نس بندی کا قانون پاس کرے گا، آپ کو مجبور ہو کے گردن جھکانی پڑے گی، اس لئے کہ جب اپنے قانون کو پس پشت ڈالا تو دوسرے کے قانون پر چلیں، کوئی فیملی پلاننگ لائے گا، آپ کو ماننا پڑے گا۔ اس لئے کہ جو اسلام کا حکم تھا وہ پس پشت ڈال دیا۔ پھر دنیا کی اقوام کے آگے جھکنا پڑے گا۔

اسلامی قانون کی عملی پابندی کی ضرورت...... اگر آپ اس قانون پر عامل ہوتے فقط اعتقادی طور پر نہیں، عمل بھی ہو تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے اندر رخنہ اندازی کرے جب عملاً چھوڑ دیا تو

خانۂ　خالی　رادیومی　گیرد

جب گھر خالی ہوتا ہے تو شیطان ہی اس میں آکر بسیرا کرتا ہے۔ اس لئے ایک ہی قرار واقعی علاج ہے۔ اللہ نے جو قانون دیا ہے آنکھ بند کے اس کی عملی پابندی کرنی شروع کیجئے۔ پھر دیکھئے کیسے تبدیلی آتی ہے۔ آپ چاہتے

ہیں کہ نظری طور پر چیزیں آ جائیں۔ دماغ کو فرحت ہو جائے۔ عمل کا کوئی نام نشان نہیں اور کچھ نہ کرنا پڑے۔ تو دنیا میں بلا کئے کسی کو کچھ نہیں ملتا، دنیا تو دار العمل اور دار الکسب ہے، جتنا کسب ومحنت کریں گے اتنا ہاتھ آئے گا، اور جتنا آپ اسباب کو چھوڑ کر غنی بن کے بیٹھ جائیں گے محتاج ترین بن جائیں گے، آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی، یہ جنت نہیں ہے کہ تخیل باندھنے سے نعمت سامنے آ جائے۔ یہ دنیا ہے یہاں محنت کرنے سے چیز سامنے آ جائے گی۔

اگر کاشتکار چھ مہینے خون پسینہ ایک نہ کرے، وہ چار دانے لے کر گھر میں نہیں آ سکتا، اس لئے کہ دنیا دار العمل ہے۔ اگر کاشت کار برسات کے مہینے میں یہ دیکھ کر کہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، بڑا اچھا خنک موسم ہے۔ لہٰذا یہ چار، چھ مہینے تو سو کے گزار لو۔ تو تخم ریزی کا زمانہ نکل جائے گا، بارش کا دور ختم ہو جائے گا، جب لوگ اناج کے ڈھیر لے کر آئیں گے تو یہ بیٹھ کر قسمت کو روئے گا کہ میں نے تخم ریزی کا سارا وقت سونے میں گزار دیا، اب جب دانہ لینے کا وقت آیا تو جنہوں نے محنت کی تھی وہ لے کر آ رہے ہیں۔ میں خالی اور محروم ہوں۔ اب بیٹھ کر روئے گا مگر اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ملامت کرنے والا یہی تو ملامت کرے گا کہ کمبخت تو نے ان چھ مہینوں میں جا کر کیوں نہیں محنت کی؟

جب نہیں کی تو اب بیٹھ کر اپنی قسمت کو روؤ۔ غرض دنیا کا بازار اور دنیا کا میدان کاشت کاری کے لئے ہے۔ اللہ نے تخمِ سعادت کا بیج دلوں میں بکھیر دیا ہے۔ اس کو بار آور کرنا کہ ایمان و اعتقاد مضبوط کر کے عملاً چلنا، تب جا کے آخرت اور دنیا میں اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔ جب آپ نے نہ بیج کو پانی دیا، نہ بیج کی آبیاری کی تو چند دن کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیج بھی سوخت ہو جاتا ہے۔ جب زمین پر پانی ہی نہ پڑے تو بیج جل جائے گا۔ جو تخمِ سعادت قلوب کے اندر بکھیرا گیا تھا، اسے آپ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کو پانی دے کر اگانے کی فکر میں نہیں ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ ہمیں دانہ کیوں نہیں مل رہا؟ ہمیں رزق کیوں نہیں مل رہا؟ بھائی! جب تم اگاؤ گے نہیں تو کہاں سے ملے گا۔؟ جب تخم ریزی نہیں کرو گے تو دانہ کہاں سے ملے گا؟

حصولِ عزت واقتدار کی تدبیر...... یہ ہر شخص کے دل میں سوال ہے کہ مجھے راحت کیسے ملے؟ مجھے سکون کیسے ملے؟ مجھے عزت اور عرفی حیثیت کیسے ملے۔؟ اقتدار کیسے ملے۔؟ اور عمل کے نام سے آگے کوئی بڑھنا نہیں چاہتا۔ یہ اسی کاشتکار کی سی مثال ہوگئی کہ تخیل باندھ رکھا ہے جو تخم ریزی کے زمانے میں تو پڑ کے سو گیا، اس کے گھر مین دانہ کون لائے گا۔؟ سوائے اس کے کہ وہ دکان دکان بھیک مانگے گا کہ بھائی! میں نے تو اپنی زمین میں نہیں اگایا تم خدا کے واسطے ایک ڈھیری مجھے دے دو، خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو، وہی مثال ہماری ہوگئی کہ جو کام کرنے کا وقت ہے وہ تو ہم آرام میں ضائع کر رہے ہیں، نہ دین کی خبر، نہ احکام کی خبر، نہ خدا کے اور رسول کے اتباع کی خبر۔ نہ وہ معاہدہ یاد ہے جو اللہ سے کر کے آئے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں کیا اور فتنے آ کے پڑے، اقتدار بھی چھنا، دولت بھی چھنی اور ملک بھی چھنا، اب بھیک مانگتے پھر رہے ہیں کہ ہمیں فلاں ریاست دے دو فلاں ملک دے دو۔ ملک و ریاست، دولت وعزت کے ملنے کے جو اسباب تھے، ان اسباب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اب کہتے ہیں کہ کیا تدبیر کی جائے؟ تدبیر موجود

ہے، کرنے کا بھی وقت ہے۔ تدبیر بنانے کی ضرورت نہیں، وہ تو بنی بنائی اللہ نے اتار دی تھی۔

کفر کے دستِ نگر اسلامی ممالک...... غرض جب آپ نے عہد کی خلاف ورزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم پر بھی ضروری نہیں کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں، وہ وعدہ تو اس شرط سے مشروط تھا کہ تم ہماری بندگی کرو، تم قانونِ خداوندی پر عمل کرو، تم اپنی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا دستور اپناؤ۔ ان کی حیات اور دستورِ زندگی کو مشعلِ راہ بناؤ اور تم یہ وعدہ کر کے آئے تھے، جب تم نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ تو ہم پر کب وعدہ پورا کرنے کی پابندی رہی کہ تمہیں اقتدار بھی دیں، عزت بھی دیں اور رزق بھی دیں۔

اسی لئے یہ چیزیں ہاتھ سے چھننی شروع ہوئیں۔ ملک ہاتھ سے چھننا شروع ہوئے، آج یہ ملک نکل گیا۔ کل یہ نکل گیا۔ اور نہیں بھی نکلا تو اقتدار خود آپ کا نہیں، اقتدار اب غیروں کا ہے۔ آپ اپنے ملک میں رہ کر کچھ نہیں کر سکتے، جب تک ان غیروں کی منشاء نہ ہو، تو آپ ان کی منشاء کے غلام اور تابع بنے۔ کہنے کو آپ کہتے رہیں کہ صاحب! ہمارا ملک آزاد ہے اور ہمارا اقتدار ہے۔ مگر تمہارا اقتدار کیا ہے؟ پیسوں کے تم محتاج ہو، وہ اگر یوں کہیں کہ جب تک تم نس بندی نہیں کرو گے، ہم قرضہ نہیں دے گے۔ تمہیں جھک مار کے کرنی پڑی رہی ہے۔ یہ کون سا اقتدار ہے؟ یہ کون سی آزادی ہے؟

آزادیٔ اقتدار...... اقتدار اسی کا نام ہے کہ ''اپنی قدرت سے قادر ہو۔'' ''قادر بقدرت الغیر'' کو قادر نہیں کہتے۔ کیا آپ قادر ہیں جب تک دوسرے کی قدرت استعمال نہ کریں۔؟ یہ کون سی قدرت ہے؟ قدرت وہ ہے کہ اپنے اندر ہو اور آپ اپنی من مانی کارروائی کر سکیں۔ جی چاہی بات کر سکیں۔ یہ قدرت نہیں تو آپ قادر ہی کب رہے؟ ملک اگر آزاد بھی ہو، ہندوستان ہو، پاکستان ہو، کچھ بھی ہو۔ اور انتظام و اثرات غیروں کے غالب ہوں، جب تک وہ مدد نہ کریں چل نہیں سکتے۔ اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی، رزق اور ٹکڑے میں، عزّت اور اقتدار میں۔

پارٹی بندی کا انجام...... تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزقی اور بے عزّتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟ یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اقتدار کیوں نہیں دیا۔؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزّت کیوں چھین لی؟ ہماری روٹی کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں؟۔ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے۔ اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کہ ؎

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جو آفت آتی ہے، وہ انہیں پر آتی ہے۔ اب روتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ برق آئی کیوں۔؟ یوں کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے بھیج دی، اللہ میاں نے بھیجی۔ مگر کب بھیجی؟ جب تم اللہ میاں کے نہ رہے۔ وہ بجلی ہی گرائیں

گے، وہ تو قحط سالی ہی رکھیں گے، وہ تو رزق چھین لیں گے۔ تم نے معاہدہ توڑ دیا، انہوں نے بھی وعدہ پورا نہیں کیا، وعدہ جب ہی تک ہے جب کہ شرط ایمان وعمل صالح کی پوری ہو۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ﴾ ① تو ایمان وعمل صالح اور باہمی اعتماد ومحبت کی شرط پوری ہو تو ایفائے وعدہ ہوگا''۔ ہمیں آپ کو تو لڑنے سے ہی فرصت نہیں۔ اتحاد کہاں رہے گا؟ اختلاف اور نزاع ہر چیز میں ہے۔ اب گویا مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر چیز میں لڑتا جھگڑتا رہے، کوئی مسئلہ آئے گا، تب کھڑے ہو کر لڑیں گے، کوئی حکم شرعی ہوگا، اس میں کھڑے ہو کے لڑیں گے۔ ہر چیز میں لڑائی ہر چیز میں پارٹی بندی، ہر چیز میں نکتہ چینی، اس قوم کا تو پھر یہی انجام ہونا ہے کہ وہ روتی پھرے۔

قومی غفلت...... یہ سوال ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے کہ صاحب! ان فتنوں میں گرفتار ہیں، کیا کریں؟ مگر دل میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے فتنے برسا دیئے۔ بس اللہ تعالیٰ کی شکایت ذہن میں آتی ہے۔ اپنے نفس کی کوئی شکایت ذہن میں نہیں آتی کہ میں نے کیا کیا۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ اس سے بری ہے کہ کوئی اس کا شکوہ کرے، اس کے ہاں تو دروازے کھلے ہوئے ہیں، لینے والا کوئی ہونا چاہئے؟ اقبال نے ایک جگہ ''جوابِ شکوہ'' میں کہا ہے۔ جو گویا اللہ کی طرف سے شکوہ کا جواب آیا ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ؎ راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں

جب کوئی سوال کرنے والا ہی نہ ہو تو وہ کیسے دے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: روزانہ اخیر تہائی رات میں حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ: ''اَنَا الرَّزَّاقُ مَنْ ذَاالَّذِیْ یَسْتَرْزِقُنِیْ، اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِیْ یَسْتَغْفِرُنِیْ'' ② میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرتیں کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت مانگنے والا؟

جن کو اللہ نے توفیق دی، وہ مانگتے ہیں اور انہیں شخصی طور پر ملتا بھی ہے۔ لیکن قوم غافل ہے، نہ وہ مانگتی ہے، نہ اسے ملتا ہے۔ غرض ہاتھ پھیلا کر کہہ رہے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا؟ تو صحیح ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ؎ راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں

جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گِل ہی نہیں

جس مٹی سے انسان کو بنایا گیا تھا، اس مٹی میں ہی پیداوار نہ رہے۔ تو شیطانی روح حلول کر گئی تو نصب العین شیطان سے مل گیا۔ آدم سے کہاں باقی رہا؟

زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت...... اب ذہن میں یہ تو آتا ہے کہ اللہ میاں نے دوسری اقوام کو سب کچھ دے

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵.

② مسند احمد، مسند ابی ہریرۃؓ ج: ۱، ص: ۳۳۷. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، اوقات الاجابۃ ج: ۴ ص: ۴۱۳.

دیا، اور ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ یہ نہیں آتا کہ کیوں چھینا۔؟ اور ہم نے کیا کیا۔؟ تو سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے، ہمارا فرض ہے کہ زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گزاریں اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک تھوڑی بہت تعلیم نہ ہو اور تھوڑی بہت تربیّت نہ ہو۔ سختیں آسمان سے برستی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ گھر گھر میں اتریں۔ وہ تو تعلیم کے راستے سے آتی ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان ہوگیا۔ کتنے ہیں ہم میں جو واقعی قرآن کریم کو اس نیت سے پڑھتے یا سنتے ہیں کہ ہمیں عمل نصیب ہو جائے؟

بہت سے وہ ہیں جو پڑھنا ہی نہیں جانتے، انہوں نے تعلیم ہی نہیں پائی، لفظوں کی بھی تعلیم نہیں۔ معنی کی بات تو الگ ہے اور مفہوم کی الگ ہے۔ سو میں ننانوے وہ نکلیں گے جنہیں مس بھی نہیں کہ دین کیا چیز ہے مگر مدعیِ دین بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ صاحب! ہم دین دار ہیں۔ شاید سو میں کوئی دو چار گنے چنے نکل آئیں گے۔ تو قوم، نیک قوم تب کہلاتی ہے جب اس کی اکثریت نیکی پر ہو۔ ہزار دو ہزار میں سے اگر دس بیس اشخاص نکل آئیں تو وہ قوم کی سربلندی نہیں ہے۔ وہ ان اشخاص کی سربلندی ہے، قوم کی سربلندی جب ہوگی جب کم سے کم اکثریت تو آئے۔ برابر سرابر تو ہو۔ اب ہماری کیفیت یہ ہے کہ ﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ ① مومنین کم ہیں۔ فساق وفجار زیادہ ہیں اور جتنے مومن ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم نے شکایت کی ہے کہ ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ ② بہت سے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ دلوں کے اندر وہی غیر اللہ کی عظمت جمی ہوئی ہے۔ مالک کی عظمت نہیں ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ پیر مجھے اولاد دے گا، کوئی کہہ رہا ہے فقیر مجھے منہ مانگی مراد دے گا۔ جو اللہ کی عظمت تھی وہ فقراء اور اشخاص کے سپرد کر دی۔ اس میں قوم کا کیسے بیڑا پار ہوگا؟ تو یہ طلب ہوتی ہے کہ فتنوں سے بچنے کی صورت بتائی جائے، یہ نہیں ہوتی کہ ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے۔

کم ہمتی کی انتہاء...... اور بڑے سے بڑا کام کریں گے تو یہ کہ صاحب! کہ ایک تعویذ لکھ دیں، دکان میں برکت ہو جائے۔ میں نے کہا تجھے کچھ نہ کرنا پڑے، جو کرے بس تعویذ کھڑا ہو کر کرے، تم اپنا آرام سے بیٹھے رہو۔ تو عمل کی خُو جاتی رہی، بس تعویذ سب کچھ بنا دے گا۔ یا کوئی دعا لٹکا دی، دعا بھی جبھی کارآمد ہوتی ہے جب اپنے اندر کچھ جان ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے کوئی کسی کے پاس جائے کہ حضرت! دعا کرو کہ میرے اولاد ہو جائے اور نکاح کا نام نہیں۔ بیوی پاس نہیں۔ بھائی! دعا بھی جبھی کارآمد ہوتی ہے جب آدمی اسباب مہیّا کرے۔ دعا نتیجے کے لئے کرائی جاتی ہے کہ اسباب پر ثمرہ مرتّب ہو جائے، یہ نہیں ہوتا کہ اسباب بھی دعا ہی سے مہیّا ہو جائیں گے، مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ ''حضرت! مجھے نماز پڑھنے کے لئے تعویذ لکھ دو!'' حضرت نے فرمایا۔ ''بھائی مجھے ایسا کوئی تعویذ لکھنا نہیں آتا کہ میں تعویذ لکھ کے اس میں دو سپاہی بھی بٹھا دوں کہ جہاں نماز کا وقت آیا اور وہ ڈنڈا لے کر تیرے سر پر ہو جائیں کہ چل مسجد میں۔ میرے پاس ایسا تعویذ نہیں

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۱۰۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۶۔

ہے کہ اس میں دو سپاہی بھی بیٹھے ہوئے ہوں۔ اور پھر اس کو ڈانٹا کہ ''نالائق! جو تیرے کرنے کا کام ہے۔ وہ بھی تعویذ ہی کرے۔ تجھے اپنی چار پائی سے ہلنا نہ پڑے۔ تو آرام سے پڑا رہے، بس تعویذ سب کچھ کر دے گا''۔

تو تعویذ کار آمد ہے مگر جبھی جب آپ اسباب مہیا کر لیں۔ نتیجے کے لئے تعویذ ہوتا ہے، دعا ہوتی ہے کہ اللہ ثمرہ مرتّب کر دے، یہ محنت رائیگاں نہ جائے، محنت کے لئے تعویذ تھوڑا ہی بنایا جاتا ہے کہ صاحب! مجھ سے عمل کرالو۔ کان پکڑ کے مجھ سے عمل کرادو، عمل تو آپ کی ہمّت کرے گی۔ دوسرے کے کان پکڑنے سے عمل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

عزم و ہمّت کی ضرورت...... اصل چیز دین میں صرف ہمّت ہے۔ آدمی عزم باندھ لے کہ یہ مجھے کرنا ہے، پھر مددِ خداوندی ہوتی ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے ڈانواں ڈول رہے۔ عزم ہی نہیں، اس کی مدد بھی نہیں ہوتی، تو آپ کے دلوں میں تمنا تو ہے کہ فتنے رفع ہوں مگر دل میں عزم نہیں ہے کہ آپ انہیں رفع کر دیں گے۔ اس لئے عزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیوی معاملات میں بھی اگر محض تمنا ہو کہ مجھے ماہوار ہزار روپیہ آمدنی ہو، کبھی نہیں ہو گی، لیکن جب عزم کریں گے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار کمانا ہے۔ چاہے تجارت کرنی پڑے، چاہے زراعت کرنی پڑے، چاہے ملازمت کرنی پڑے، مجھے ایک ہزار کی آمدنی کرنی ہے۔ اور اس کام میں آپ لگ گئے تو مددِ خداوندی ہو گی۔ ضرور ایک ہزار کی آمدنی ہو جائے گی۔ لیکن اگر نہ دکان پر جائیں، نہ دفتر میں جائیں، نہ کھیت میں جائیں اور تمنا یہ ہے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار ملے تو ایک ہزار روپیہ ماہوار کی کوئی بارش تھوڑا ہی برسے گی؟ کئے کرنے سے آئے گی۔

بلا اسباب دعا موثر نہیں...... دعا بھی جبھی کام دیتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرا کے دعا کرائے کہ صاحب! اتنا کام تو میں نے کر دیا کہ میں وضو کر کے پانچ وقت مسجد میں جاتا ہوں۔ آپ دعا کیجئے کہ میں اس پر جما رہوں مستقیم رہوں۔ اس کی دعا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کہ میرا ارادہ تو نماز پڑھنے کا ہے نہیں۔ آپ دعا کر دیں کہ نمازی ہو جاؤں۔ ایسا بھی دنیا کا کوئی دستور اور فطرت ہے؟ اسی واسطے ایسی دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جس کو مشیّت کے اوپر محوّل کیا جائے۔ یوں کہا جائے ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ......'' ''اے اللہ! میری مغفرت فرما دے، اگر تو چاہے، اے اللہ میرے اوپر رحم فرما، اگر تو چاہے''۔

رحم و مغفرت تو وہ جبھی کریں گے، جب چاہیں گے۔ آپ کا یہ کہنا کہ ''اگر آپ چاہیں میری مغفرت کر دیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو ضرورت ہے نہیں آپ کی مغفرت کی، آپ چاہیں تو مغفرت کر دیں، یا یہ کہ مجھے تو آپ کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے، آپ چاہیں تو میرے اوپر رحم کر دیں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ دعا کو مشیّت کے ساتھ مقیّد کر کے دعا مت مانگو کہ آپ چاہیں تو دے دیں۔ مجھے تو ضرورت نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔ فرمایا کہ دعا مانگو اس الحاح اور قوت کے ساتھ کہ ہم لے کر اٹھیں گے۔ کریم کے دروازے پر آئے ہیں۔ محروم ہو کر نہیں جائیں گے، تو لیچڑ بن کے دعا مانگو تو دعا ضرور قبول ہو گی اور ملے گا۔ تو سائل بن کر اور لیچڑ بن کر سوال کریں اور چوکھٹ پر سر ٹیک دیں کہ میں بغیر لئے اٹھوں گا نہیں۔ تو ایسے بندے کی دعا بے شک قبول ہوتی ہے۔

وہاں حج پر ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ میں ایک بدوی حاضر ہوا۔ بالکل بے پڑھا لکھا۔ اور صاحب! اس نے جو دعا مانگی عجیب تھی۔ اس نے کہا ''یَارَبَّ الْبَیْتِ یَا رَبَّ الْبَیْتِ جِئْتُکَ وَالْاَھْلُ فِی الْبَیْتِ اَنْ تَغْفِرَلِیْ اَنْ تَغْفِرَلِیْ......'' ''اے اللہ! میں تیرے گھر میں آیا ہوں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں''۔

گویا بڑا احسان کیا۔ تو بیوی بچوں کو چھوڑ کے آیا ہوں، وہ گھر میں ہیں اور میں تیرے گھر میں آ گیا۔ لہٰذا بخشنا پڑے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں بلا مغفرت کے جاؤں، میں تو مغفرت لے کر جاؤں گا۔ واقعی ایسے کو مغفرت ملتی ہے۔ غرض الحاح بھی ہو، زاری بھی ہو، قلب کا جھکاؤ بھی ہو، قلب کے اضطراب سے دعا ہو ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾ ① ''جو مضطر ہو کر الحاح تام کے ساتھ دعا مانگے گا، ہم ضرور برائی رفع کریں گے، اس کے اوپر سے فتنہ ضرور ہٹائیں گے۔ اور زمین کی قوت و خلافت بھی دیں گے اور اقتدار بھی دیں گے''۔

تو مانگنے والا ہو، قول سے بھی مانگے، عمل سے بھی مانگے۔ عمل کرے تو وہ کرے جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو، اور دعا وہ مانگے جس میں استغناء کا شائبہ نہ ہو، لیچڑ بن کر مانگے، تو ضرور ملتا ہے۔ تو اب آپ دعا سے بھی مستغنی، تعلیم سے بھی مستغنی، تربیت سے بھی مستغنی، پڑھنے لکھنے سے مستغنی، محنت بھی سے مستغنی، اور تمنا یہ ہے کہ سب کچھ ملے۔ یہ فطرتُ اللہ کے خلاف ہے۔

عزت و اقتدار کا قانونِ عام...... دنیا میں حق تعالیٰ کی کسی سے رشتہ داری تھوڑا ہی ہے کہ اس قوم کو ضرور اقتدار دیں گے، انہوں نے تو اصول وقوانین بیان کر دیئے، جو ان پر چلے گا، اسے ملے گا، جو نہیں چلے گا نہیں ملے گا، قانون عام کا اعلان کر دیا۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ ② مسلمان ہوں یا صابی ہوں یہودی ہوں یا نصرانی ہوں۔ مجوسی ہوں یا کسی اور قوم کا ہو، جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا، اس کے لئے اجر بھی ہے، نہ پھر خوف رہے گا، نہ غم رہے گا، نہ اسے محرومی رہے گی''

تو تدبیر تو یہ آ گئی، اب آپ کو کیا تدبیر بتائی جائے؟ اور کیا کہا جائے؟ اور کون آ کر کہے؟ کیا حضرت جبرئیل علیہ السلام کہنے کے لئے آئیں گے؟ نہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب اتار دی، پڑھو، علم حاصل کرو اور احکام معلوم کرو، تعلیم نہیں پائی، علماء سے پوچھ پوچھ کر احکام حاصل کرو، مگر اتباع کا جذبہ رکھو کہ پابندی کریں گے۔ خواہ پڑھنے سے ہم معلومات حاصل کریں، خواہ مطالعہ سے ہم معلومات حاصل کریں، خواہ علماء سے فتوے لے لے کر ہم معلومات حاصل کریں۔ سوال کر کر کے اپنی تشفی کریں، ہمیں عمل کرنا ہے۔ اور اتنا علم ہم نے حاصل کرنا ہے جس پر ہم عمل کر سکیں۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ہو۔ جب آدمی کے دل میں لگن ہوتی ہے تو دس طریقے اختیار کرتا ہے۔

---

① پارہ: ۲۰، سورة النمل، الآیة: ۶۲. ② پارہ: ۶، سورة المائدة، الآیة: ۶۹.

وہ کہتے ہیں کہ: کسی عورت کا شوہر ملازمت پر گیا، اور وہ سینکڑوں ہزاروں میلوں کے فاصلے پر تھا۔ عورت کو خاوند سے محبت تھی۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ اگر خاوند کا خط آتا، چوں کہ خود پڑھی لکھی نہیں تھی مگر چوں کہ خاوند کی لگن اور محبت تھی تو محلے میں پھرتی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے پڑھ کے سنا دے کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اگر دل میں لگن نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی گھروں کو جا کے نہ جھانکتی، تو بے پڑھی لکھی تھی، مگر چوں کہ خاوند سے محبت تھی، اس کا کارڈ کا ایک پرزا آیا تو گھر گھر پھر رہی ہے کہ اللہ کے واسطے اس کا مضمون سنا دو کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اس لئے کہ لگن ہے۔

اللہ کا آپ کے گھر خط آیا۔ اور وہ قرآن کریم ہے جو اللہ کا فرمان ہے۔ اگر آپ کے دل میں لگن ہوتی اور علم نہ ہوتا، آپ علم کے لئے گھر گھر، مدرسے مدرسے جھانکتے پھرتے کہ اس کا مجھے مطلب سمجھا دو، یہ میرے مالک کا فرمان ہے۔ میرے مالک کا خط آیا ہوا ہے۔ غرض لگن ہو تو سب کچھ ہوتا ہے اور لگن نہ ہو تو پھر آدمی مگن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے اندر کڑھن ہوتی ہے اور پریشانی ہوتی ہے۔

خاصیتِ ذکرُ اللہ...... صاف فرما دیا گیا۔ ﴿اَ لَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ﴾ ① اگر تم دلوں کا اطمینان اور سکون چاہتے ہو تو ذکر اللہ میں لگو، ہماری یاد میں لگو، ہم سکون دیں گے۔ ذکر اللہ میں سکون مخفی ہے، دنیا کے لاکھ اسباب آپ جمع کر لیں۔ سکون قلب کبھی میسّر نہیں ہوگا۔ جو آج تمام اسباب و وسائل کو جمع کئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ پریشان خاطر ہیں، ہر وقت ڈانواں ڈول ہیں کہ یہ اسباب چھوٹ نہ جائیں، اقتدار کہیں چلا نہ جائے۔ رات دن مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور جو اللہ کا ذکر کر کے ان پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ان کو کوئی فکر نہیں ہے، نہایت مطمئن اور ساکن القلب ہیں۔

آپ سکون قلب غیر اللہ میں اور دنیا کے وسائل میں تلاش کریں۔ وہ کبھی میسّر نہیں ہوگا، ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کی یاد ہو۔ اس سے دل کو سکون آتا ہے، آپ گھروں کے اندر کتنا ہی پریشان ہوں، مصیبت زدہ اور مبتلا ہوں مگر جب مسجد میں آتے ہیں اور ایک سجدہ کرتے ہیں، دل ٹھہر جاتا ہے کہ میں نے اپنے مالک کے آگے عرض و معروض کر دی، تو گھر میں سکون نہیں ہوتا، مسجد میں آ کے ہو جاتا ہے، تو ذکر اللہ کا خاصہ قلب کا سکون ہے۔

ذکرُ اللہ اور اسٹالن...... یہ جو اسٹالن تھا، جو کمیونسٹوں کا حضرت امام ہے، جس نے کمیونزم ایجاد کیا، جب یہ مرنے لگا تو خدا کا تو بالکل منکر تھا۔ دین و مذہب کا انکار کرتا تھا جب مرنے لگا تو اس کی زبان سے اللہ اللہ جاری ہوا اور یہ کہنا اس نے شروع کیا۔ لوگوں نے کہا بھائی! تُو تو خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا، اب تو کیسے کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا، میں اب بھی انکار کرتا ہوں۔ کمبخت محروم تھا۔ اس لئے کہا کہ اب بھی انکار کرتا ہوں مگر اسے کیا کروں کہ دل میں سکون اسی نام سے ہوتا ہے۔ اور سکون کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر میں گنّیوں کا نام لوں، روپے کا نام لوں، قلعوں کا نام لوں سکون نہیں ہوتا، ساری چیزیں مجھ سے دور ہونے والی ہیں، چھننے والی ہیں، جب یہ نام لیتا ہوں،

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

دل ٹھہر جاتا ہے۔ تو میں منکر ہوں۔ مگر اس کے باوجود سکونِ قلب اسی سے میسر آتا ہے۔

تو ایک دھریہ اور ملحد تو اس کا احساس کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ اور ایک ماننے والا مسلم اقرار نہ کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ نہ وہ فکر کرے، نہ وہ ذکر اللہ کرے، نہ دل میں یادداشت رکھے تو جب مسلمان اتنے غافل بن جائیں تو انہیں سکون کے ثمرات اور رزق کے اسباب اور اقتدار کے اسباب کہاں سے ملیں گے۔ تو میرے بھائی نے یہ درخواست کی تھی کہ مسلمان مصائب میں گرفتار ہیں۔ کیا علاج کریں؟ بھائی علاج یہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ سب کے لئے ضروری نہیں کہ سارے علماء بن جائیں اور سب کے سب امام غزالی بن جائیں۔

ادائیگیٔ فرض...... مگر اتنا ضروری ہے کہ اللہ نے جو سب کے لئے فرائض رکھے ہیں، ان کی تو پابندی شروع کرو، پانچ وقت کی نماز پڑھو، اگر صاحبِ نصاب اور صاحبِ استطاعت ہو، زکوۃ اور صدقات سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرو۔ روزہ رکھ کر اپنے نفس کو پاک کرو، اگر استطاعت ہو تو حج کر کے اپنے عشق کے جذبات ابھارو، حسن سلوک سے پیش آؤ، ہر ایک سے محبت سے پیش آؤ۔ حسن ظن رکھو۔ دیکھو پھر قوم جڑتی ہے یا نہیں جڑتی؟

ہر ایک کے دل میں جو بدظنی ہے کہ وہ نکما ہے اور ناکارہ ہے۔ بس میں کارآمد ہوں۔ وہ بھی نالائق اور مجھ میں لیاقت ہے۔ جب یہ جذبات ہوں گے۔ محبتِ باہمی کیسے پیدا ہوگی۔؟ اپنی برائی سامنے نہیں اور دنیا کی برائیاں سامنے ہیں اور ہم ایسے مقدس ہیں کہ ہم میں کوئی برائی نہیں۔ ساری برائیاں دنیا کے انسانوں میں ہیں۔ تو یہ سب سے بدظنی ہے تو بدظنی سے نہ کوئی اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کوئی محبت ہوتی ہے، تو حسن ظن سب سے بڑی چیز ہے کہ اپنے کو کمتر سمجھے اور دوسرے کو اعلیٰ سمجھے، اس سے حسن ظن پیدا ہوگا۔

معیارِ اقتداء...... آپ کا آخری بادشاہ ظفرؔ جو مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ کچھ تو اپنی ذات سے بھی صوفی منش اور کچھ حالات نے بھی غریب کو صوفی بنا دیا تھا۔ اس نے ایک قطعہ کہا ہے۔ وہ واقعی بڑی عبرت کا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر ۔۔۔ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

دنیا کو آپ برا جب ہی سمجھیں گے جب اپنی برائی سامنے نہ ہو، جب اپنے عیب سامنے ہوں، ہر ایک آپ کو پاک صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا، اب یہ کہ۔

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

جب دیکھو دوسرے کو نصیحت کر رہا ہے، خود اپنے کو بھلائے ہوئے ہے۔ اس سے کام نہیں چلتا، دنیا کے بارے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کے بارے میں نظر رہنی چاہئے کہ اس بے چارے کی تو سو روپے ماہوار کی آمدنی ہے اور مجھے ہزار پانچ سو روپے کی آمدنی ہے۔ آدمی شکر کرے۔ اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر پر نظر ہونی چاہئے کہ یہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا ہے۔ افسوس، مجھے توفیق نہیں۔ تو دنیا کے بارے میں اپنے سے کم

تر کو دیکھے، اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھے تا کہ زیادہ رغبت پیدا ہو۔

اب لوگوں نے بالکل قصہ برعکس کر دیا کہ دین کے بارے میں تو اپنے سے کمتر کی اقتداء کرتے ہیں۔ میری نمازیں بہت ہیں۔ یہ تو نالائق آدمی ہے، اس کی نہ نماز پوری نہ کچھ، اور دنیا کے بارے میں اپنے سے برتر کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں کہ مجھے سو روپے کی آمدنی ہے۔ مجھے دو سو کی چاہئے۔ جس سے حرص بڑھتی ہے اور حرص کا انجام برا نکلتا ہے۔ غرض لوگوں نے قصہ الٹ کر دیا۔ بہر حال دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھا جائے، تا کہ دین کی حرص پیدا ہو اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو تا کہ شکر کا جذبہ پیدا ہو کہ مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ اس لئے ظفر نے کہا کہ ۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر ۔۔۔ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اور آگے کہتا ہے کہ ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ۔۔۔ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

کہ بڑا مدبر، لیڈر، دانشمند، ذہین ہو، اس کو آدمی نہ جانیئے گا۔ تو کہتا ہے کہ ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ۔۔۔ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ۔۔۔ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

وہ آدمی نہیں ہے، عیش میں آدمی اس پر نگاہ کرے کہ جو دینے والا ہے، اس کا حق ادا کروں، اس سے ڈرتا رہوں، جسے دینا آتا ہے اسے چھیننا بھی آتا ہے۔ جتنا آدمی شکر ادا کرے گا۔ اسے زیادہ ملے گا، کفرانِ نعمت کرے گا، وہ نعمت چھین لی جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① جتنا نعمت پر شکر کرو گے، میں نعمت کو بڑھاؤں گا۔ ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ ② اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو میرا عذاب بھی دردناک ہے۔ پھر وہ ساری نعمتیں چھینی جائیں گے۔

مسلم کے لئے اسبابِ اقتدار ...... سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے، اس کی اطاعت میں رہ کر تھوڑی عبادت پر بھی شکر بہت کرے، تا کہ وہ عبادت بڑھتی جائے، اپنی اطاعت پر غرّہ نہ کرے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب آدمی نماز پڑھ کے یا کچھ ذکر کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے تلاوت کی، میں نے ذکر کیا، گویا غرور اور اتراہٹ ہے کہ میں نے بڑا کام کیا۔ فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا! ارے طاقت میں نے بخشی تھی، ارادہ میں نے پیدا کیا تھا۔ اسباب میں نے مہیّا کئے، تو نے کیا کیا۔ غرض جتنا کیا، اسے بھی رد کر دیتے ہیں۔

① ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷۔

اور اگر سب کچھ کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں بن پایا۔ فرماتے ہیں، نہیں چل کر مسجد تک تُو ہی گیا تھا، طاقت کا استعمال تو نے ہی کیا تھا۔ حج کے لئے سفر کرنے کا ارادہ تُو نے ہی کیا تھا۔ تُو نے سب کچھ کرلیا، تو سب کچھ کر کے جو یوں کہتا ہے کہ کچھ نہیں کیا، اس کا جواب دیتے ہیں کہ تُو نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ تجھے سب کچھ ملے گا۔ اور اگر تھوڑا بہت کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا، اسے فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا۔ قوت میری تھی، ارادہ میرا تھا، مشیت میری تھی، اسباب میرے تھے، تو نے کیا کیا؟

اس لئے ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے مالک کے آگے جھکیں اور جھکنے کے بعد غرّہ نہ کریں، ہر قدم پر سمجھیں کچھ نہیں ہوسکا، توبہ کریں استغفار کریں اور آگے بڑھیں، جب قوم میں یہ جذبہ ہوگا، قوم بڑھے گی۔ اگر یہ جذبہ نہیں۔ وہ لاکھ سوچتی رہے کبھی مرکزِ اقتدار پر نہیں پہنچے گی اقتدار تمناؤں سے نہیں ملا کرتا، نہ تمناؤں سے عزّت ملا کرتی ہے۔ اور نہ غیر اسباب سے عزّت ملتی ہے۔ انہی اسباب سے عزت ملتی ہے جنہیں اللہ نے مسلم قوم کے لئے متعیّن کر دیا ہے۔ غیر اقوام سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ مسلم سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ جو یہ دعوی کرے کہ میں آپ کا ہوں، اس کے ساتھ معاملہ اور قسم کا ہے۔

دشمن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ...... اور جو یہ کہے کہ میں آپ کا نہیں ہوں، اس کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے، دشمن ہے تو آدمی اس کی گالیوں کو بھی سہہ جاتا ہے، کہتا ہے کہ دشمن ہے، اور اس کا کیا کام ہے، گالیاں ہی دے گا اور اپنا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو باپ ڈھول رسید کرے گا کہ تجھ سے توقع نہیں تھی۔ اس لئے مسلم کی ادنی سے ادنی چیز پر گرفت ہوتی ہے، تو ہمارا تھا، تیرا دعوی تھا کہ ''اَنَا مُسْلِمٌ'' میں مطیع خداوندی ہوں اور پھر تو نے یہ حرکت کی؟

اور ایک قوم کہتی ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ انہیں سب کچھ دے دو، ایک وقت آئے گا کہ اچانک عذاب کا پنجہ ان پر گرے گا، جب انہیں پتہ چل جائے گا۔ تو دشمن کو ڈھیل دیتے ہیں اور دوست کو ڈھیل نہیں دی جاتی، جو غلطی کرتا ہے، ہاتھ کے ہاتھ سزا دی جاتی ہے۔ اور کافر کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ گالیاں بھی دے دے، دین کی تکذیب بھی کر دے، دین کا مذاق بھی اڑائے اسے ڈھیل دیتے ہیں کہ اس کے انجام کی خرابی کا وقت آ رہا ہے۔ غرض میرا مطلب یہ تھا کہ بھائی! تدبیر تو سب پوچھتے ہیں لیکن یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اس تدبیر کو عمل میں کون لائے گا؟۔ یہ کہتے ہیں کہ عمل کے لئے یہودی اور نصرانی ہیں۔ باقی ہمیں تو تدبیر بتلا دو، تا کہ ہمارے دماغ میں فرحت آ جائے کہ ہمیں تدبیر معلوم ہوگئی، عمل کرنا دھرنا نہیں ہے۔ یہ دوسری قوموں کا کام ہے۔ جب دوسری قومیں کریں گی تو وہی پائیں گی بھی۔ پھر آپ رشک کیوں کرتے ہیں کہ صاحب! انہیں سب کچھ مل گیا اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے کچھ کیا تھا تو انہیں کچھ ملا، آپ نے نہیں کیا، نہیں ملا۔

تدبیرِ عمل...... اسلام کے معنی مسلم بننے کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی ''مطیعِ حق'' کے ہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ: میں مسلم ہوں، اس کے معنی ہیں کہ میں اپنے پروردگار کا مطیع ہوں، پھر اس اطاعت کو کر کے دکھلائیے۔ تو یہ حدیث معاذ

رضی اللہ عنہ میں فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ''؟...... اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ وہ یہ ہے کہ: ''اَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا......'' تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں، اس کے قانون پر چلیں، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کریں اور جذبہ ولگن ان کے دل میں یہی ہو کہ ہمیں اپنے رب کی اطاعت کرنی ہے اور غیر رب کو ہم شریک نہیں کرنا چاہتے، تو یہ حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَاحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ......'' کیا یہ جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟

فرمایا بندوں کا حق یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہے کہ جب تم عابد بنو گے تو میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔ (۱) رزق معنوی بھی رزق باطنی بھی رزق حسی بھی، رزقِ ظاہری بھی۔ سبھی کچھ ملے گا، دونوں چیزیں ہاتھ آئیں گی۔ اس لئے ساری تدبیر اس ایک حدیث میں فرمادی گئی۔ اگر عمل کرنا چاہیں تو یہ ایک حدیث بھی زندگی درست کرنے کے لئے کافی ہے اور عمل نہ کرنا چاہیں تو ایک ہزار وعظ بیٹھ کر آپ سن لیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ وہ وعظ اور وبال جان بنیں گے۔

دنیا دار علماء...... اس واسطے کہ وعظ میں کچھ مسئلہ تو معلوم ہو گیا۔ اگر آدمی جاہل ہے اور غلطی کر جائے تو ایک عذر ہے کہ صاحب! مجھے مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ معلوم کر کے پھر نہ کرے تو یہ مصیبت اور وبال ہے، وہ متنبی ایک موقع پر کہتا ہے

وَاِنْ كُنْتَ لَاتَدْرِیْ فَتِلْكَ مُصِيْبَةٌ　　　وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ

اگر تم جانتے نہیں ہو، جاہل ہو، یہ ایک مصیبت ہے، اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ ڈبل مصیبت ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو بددعا دی ایک دفعہ اور عالم کو سات دفعہ فرمایا: ''وَيْلٌ لِّجَاهِلٍ مَرَّةً وَوَيْلٌ لِعَالِمٍ سَبْعَ مَرَّاتٍ.'' (۲) جاہل ایک دفعہ برباد اور عالم سات دفعہ برباد، جو علم رکھتا ہے پھر عمل نہیں کرتا۔ اب اگر ایک عالم ہے، اسے حلال وحرام اور جائز وناجائز کا علم ہے۔ وہ اللہ ہی کی رضا کی پابندی کرے گا، غیروں کی رضا کی نہیں کرے گا۔ اب اگر کوئی مولوی یہ کہے کہ صاحب! مسئلہ تو بے شک یہ ہے مگر آمدنی کا تعلق فلاں سے ہے۔ لہٰذا کیا حرج ہے۔ اس کی دلداری کے لئے اس کے مطابق مسئلہ بیان کردو۔ وہ اللہ کا بندہ تھوڑا ہی رہا۔ وہ تو ابلیس کا بندہ بن گیا کہ جس سے چار پیسے مل گئے تو فتوی بھی اس کے مطابق دے دیا۔ وہ مسئلہ کیا ہوا۔ وہ تو موم کی ناک ہوگئی کہ جیسے دنیا کی غرضیں سامنے آتی جائیں ویسے ہی بدلتے جائیں۔ یہ عالم کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہل کا کام ہے۔ جس نے خواہ مخواہ علم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جو واقعی عالم ہے وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔

آدمی عالم ہو اور اپنی حاجات غیروں کے آگے پیش کرے۔ اور غیروں کی رضا اتنی ہو کہ چاہے مجھے دین کا مسئلہ بھی بدلنا پڑ جائے مگر مجھے یہ چار پیسے مل جائیں۔ یہ علم اور علماء کی شان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ درحقیقت علماء ہیں بھی نہیں۔ وہ نام کے علماء ہیں۔ عالموں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ ''وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ......'' جان بوجھ کر عمل

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل، ج: ۱۸، ص: ۳۵۴.

(۲) مرقاۃ المفاتیح، کتاب الدعوات، باب جامع الدعاء، ج: ۸، ص: ۴۲۶.

نہیں کرو گے تو ڈبل مصیبت ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو ایک دفعہ بددعا دی اور عالم کو سات دفعہ۔

جدّ وجہد کا ثمرہ...... بہرحال یہ چند باتیں اس سلسلہ میں عرض کرنی تھیں کہ بے شک فتنوں کی افراط ہے، پریشانیاں ہر طرف سے ہیں۔ مگر وہ ہماری لائی ہوئی تو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں برسائیں، وہ تو پیدا کرنے والے ہیں۔ وہ اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کا بندہ کسب کرے، تو کاسب بندہ ہے۔ خالق اللہ ہے۔ تم کسی کام میں جدّ وجہد کرو گے، وہ پیدا کردیں گے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جدّ وجہد میں لگو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ وہ تخلیق فرمائے گا۔ تو فتنے ہیں بلاشبہ ہیں۔ مگر

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست

یہ تمہارے ہمارے ہی لائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ ① کوئی مصیبت تم تک نہیں پہنچتی جب تک تم ہی اپنی کرتوت سے اس مصیبت کو اپنے اوپر نہ ڈال دو، تمہارے کئے ہوئے کا یہ سب ثمرہ ہے۔ تو ہم نے جو کیا وہ کیا دھرا سامنے آ گیا۔ اور اگر نیکی کا کام کریں گے اور نیکی کی راہ پر چلیں گے تو پھر دوسرا ثمرہ آ جائے گا۔ ثمرہ حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عدل ہے۔ ان کا نام ہی العدل اللطیف الخبیر ہے۔ ان سے زیادہ عادل کون ہے۔ تو کسی کی محنت کو وہ رائیگاں نہیں فرماتے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ② کسی محسن کے احسان کو اور عمل کو ردّ نہیں فرماتے۔ آدمی کر کے دیکھے، تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور کچھ جدوجہد بھی کیجئے، کچھ دین کی معلومات اور تعلیم بھی حاصل کیجئے۔ کچھ اپنی تربیّت کی طرف بھی متوجہ ہو جایئے۔ کسی مربی سے تعلق پیدا کر کے اپنے اخلاق کی اصلاح کرایئے۔ تو خیر انشاء اللہ ظاہر ہوگی۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور وہ شاعر کا قطعہ ہے، وہ پڑھ لیتا ہوں۔

مانصیحت بجائے خود کردیم	روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس	بر رسولاں بلاغ باشد وبس

شاعر کہتا ہے کہ: ہم نے اپنی جگہ بہت نصیحتیں کرلیں۔ ایک بڑا زمانہ ہم نے صرف کیا، ہم نے بڑی نصیحتیں کیں، اب اس کے بعد بھی کسی کے کان میں نصیحت نہ جائے اور دل میں نہ اترے، تو نصیحت کرنے والے کا کام تبلیغ اور پہنچا دینا ہے۔ منوا دینا اس کا کام نہیں ہے۔ آدمی مانے گا تو اپنے اندرونی جذبے اور دیانت سے مانے گا۔ اس واسطے تدبیر میں نے عرض کردی، عمل آپ کو کرنا ہوگا۔ اب یہ کہ تدبیر بھی بتلاؤں اور عمل بھی کرلوں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ بھئی میرے عمل کرنے سے پوری قوم تر جائے گی تو چلو یہ بھی ہو جاتا، مگر قوم ہی کے عمل کرنے سے قوم ترے گی، کسی ایک کے عمل کرنے سے کسی دوسرے کو نجات تھوڑا ہی مل جائے گی۔ ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۱۵.

مَاسَعٰی﴾ ① جو سعی کرے گا وہی انسان پائے گا، سعی تو ایک کرے اور دوسرے کو مل جائے، یہ سنت اللہ کے خلاف ہے، جو کرے گا، اسی کو ملے گا۔ اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں، فتنے اور مصائب واقعی ہیں۔ ان کا علاج جو واقعی ہے وہ عرض کر دیا گیا، اس کی تفصیلات پھر آپ علماء سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس عمل کو کس طرح کریں۔ اس عمل کو کس طرح کریں۔ مثلاً ایک عمل عبادت کا ہے تو پوچھنا پڑے گا کہ کس طرح سے نماز پڑھیں، ایک عمل اجتماعیات کا ہے کہ دنیا کی قوموں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ یہ بھی قرآن کریم سے پوچھئے، اس نے بتلا دیا ہے۔ ایک عمل سیاست کا ہے کہ سیاسی تدبیریں کیا ہوتی ہیں۔ وہ بھی قرآن کریم نے بتلادی ہیں کہ: وہ یہ ہیں جن سے قوم اقتدار پاتی ہے۔ تو سب کچھ ہے، مگر یہ اسی کے لئے ہے جو کچھ کرے۔

ایمان کے سونے کی ضرورت...... اگر ہم یوں کہیں کہ آپ خالی جیب جا رہے ہیں۔ تو بازار میں چاہے کروڑوں روپے کا مال بھرا پڑا ہے۔ تو یہ ٹھیک ہوگا، اس لئے کہ جیب خالی ہے، وہاں سے تو وہ سامان لے کر آئے گا جو جیب میں پیسے لے کر جائے گا۔ تو اگر آپ بازار گئے اور ہم یوں کہیں کہ اس بازار میں کچھ نہیں، کوّے اڑ رہے ہیں، کوئی سامان نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چاہے لاکھوں کا سامان ہو مگر تیرے لئے کچھ نہیں، اس لئے کہ تیری جیب میں پیسہ نہیں، پیسہ ہوگا تو تُو بھی کچھ لے کے آئے گا۔

غرض دل کی جیب میں ایمان کا سونا ہونا چاہئے۔ ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے، پھر دنیا کے بازار میں سب کچھ ملے گا، اور اگر دل خالی کر کے جا رہے ہیں جس میں ایمان باللہ نہیں، عمل صالح، پیروی سنت نہیں، پھر دنیا چاہے کروڑوں کی ہو مگر آپ کے لئے کچھ نہیں، خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا۔

دعاء...... اللہ تعالیٰ ہمیں نیک عمل کی، عبرت پکڑنے کی، عمل کا جذبہ اختیار کرنے کی، عمل کی ہمت باندھنے کی، ہمت کے اسباب پیدا کرنے کی صحبتِ صالحین اختیار کرنے کی، مطالعہ اختیار کرنے کی، سوال کرنے کی، ان سب چیزوں کی توفیق دے، جن سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور عمل میں ترقی ہوتی ہے۔

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ."

تنبیہ...... یہ دعا بھی کر دی ہے اور یہ عزم لے کر جائیے کہ اس پر عمل کرنا ہے، اس کی ٹوہ میں لگنا ہے۔ ہمیں دینی اور اخلاقی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ پھر انشاء اللہ مددِ خداوندی ہوگی۔ اور ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ عام

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔

طور سے عادت یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کیا کرتے ہیں۔تو میں کمزور ہو رہا ہوں۔اور ضعیف ہو رہا ہوں۔آپ میں سے تو ہر ایک کو ایک دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا، مجھے پانچ سو دفعہ، میرے اندر طاقت نہیں ہے لہذا مصافحہ سے معاف رکھیں اور گزر جانے دیں۔بس دل مل گئے، یہ کافی ہے۔ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔

"وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا وَرَسُوْلِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ."

تعلیمِ نسواں

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. ①

اَمَّابَعْدُ! .فَاَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

ترقی کا پہلا زینہ...... عزیز بچیو، محترم بہنو اور استانیو۔! آپ کے اس مدرسہ میں آ کر بے حد مسرت اور خوشی ہوئی۔ تعلیم کا مسئلہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتی۔ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ تعلیم ہے۔ اسلام میں بھی سب سے پہلے پڑھنے ہی کی آیت نازل ہوئی اور فرمایا ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ② اسلام سے قبل کا زمانہ بداخلاقی، بداعمالی، اور برائیوں سے بھرپور تھا لیکن اس زمانے کا نام بداخلاقی اور بداعمالیوں کا زمانہ نہیں رکھا بلکہ اس کا نام جہالت کا زمانہ رکھا، معلوم ہوا کہ برائی کا سرچشمہ جہالت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اسلام کا بنیادی سرچشمہ تعلیم ہے۔ تعلیم کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنا اہتمام کیا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں کیا، سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے کھانے، پینے اور پہننے کا انتظام نہیں کیا بلکہ اولاً تعلیم کا بندوبست کیا جیسے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا﴾ ③ انہیں اشیاء کے نام سکھلا کر ملائکہ سے مقابلہ کرایا اور وہ کامیاب ہوئے تو خلافت سے بہرہ ور کیا اور خلافت کا تاج سر پر رکھا۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿اُسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّةَ﴾ ④ تو رہنے سہنے کا انتظام بعد میں ہوا، پہلے تعلیم کا انتظام کیا۔ معلوم ہوا کہ علم اور تعلیم کا بہت درجہ ہے۔

دنیا ایک تعلیم گاہ ہے...... بغیر تعلیم کے حیوان اور انسان میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کہ باپ کو تعلیم دیتے اور بس کرتے بلکہ اولاد کو بھی تعلیم دی۔ حدیث میں آتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر دایاں ہاتھ مارا تو نیک اولاد نکلی اور بایاں ہاتھ مارا تو بری اولاد نکلی۔ اور اس کے بعد تمام کو وادیٔ ذاران میں

① ۵ محرم الحرام ۱۳۸۲ھ کو جامعہ خیر المدارس ملتان کے شعبہ تعلیم النساء میں خطاب فرمایا۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱.
③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ④ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۵.

جمع کر کے ان (روحوں) سے خطاب کیا۔ اور فرمایا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ ① تو اس سے بھی مقصود تمام کو تعلیم دینا تھی ربوبیّت کے بارے میں کہ میں تمہارا رب ہوں۔ تو اس سے بھی تعلیم کا اہتمام معلوم ہوا۔ گویا دنیا ایک مدرسہ ہے۔ اور تمام انسان اس کے طالب علم ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے معلّم ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے خصوصی شاگرد ہیں۔ تو دنیا کی پیدائش کا مقصد تعلیم ہے اور اس کے بعد عبادت ہے، حسنِ معاشرت ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے کہ طالب علم کے لئے وظیفہ ہوتا کہ کھانا پینا اور رزق حاصل ہو تو اس کے لئے زمین اور دریا بنائے، مطالعہ کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے تو چاند، ستارے اور سورج کو پیدا کیا۔ تو جب ہم اس دنیا سے قبر میں جائیں گے۔ اسی تعلیم سے متعلق سوال ہوگا۔ (مَنْ رَّبُّكَ) اور اس کا امتحان ہوگا۔ یہ اوّل امتحان ہوگا۔ اور بڑا امتحان میدانِ حشر میں ہوگا۔ کچھ کامیاب ہوں گے اور کچھ ناکام۔ کامیاب کو انعامات دیئے جائیں گے۔ اور ناکام کو سزا دی جائے گی اور اس امتحان میں تمام شریک ہوں گے۔

اس میں بوڑھے، جوان اور بچّے کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اگرچہ عالمِ ارواح میں تو تمام کی روح یکساں تھیں مگر آخر عمر کے اعتبار سے کہ جو پیدائش کے بعد جلدی مرے گا تو وہ بچپن اور جو جوانی میں مرے گا وہ جوان اور جو بڑھاپے میں وہ بوڑھا، تو ان روحوں میں بھی جوان بچّے اور بوڑھے اس اعتبار سے تھے، اس لئے تعلیم کا اتنا لحاظ رکھا گیا کہ جوان اور عمر رسیدہ تمام سے امتحان ہوگا۔ تو تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور دنیا کے آباد کرنے کا مقصد یہی ہے۔

عورتوں کی تعلیمی ذمّہ داری اور اس کے نتائج واثرات...... تعلیم کا سلسلہ عورتوں کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔ اس لئے ابتدائی تربیت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ قوم کی تعلیم کا دارومدار ماں کی تعلیم پر ہے۔ اگر وہ جاہل ہے تو قوم جاہل رہے گی۔ الا ماشاء اللہ، جس کی فطرت سلیم ہو اگر وہ عالم ہوئی تو اولاد بھی عالم ہوگی۔ اگر والدہ کے قلب میں تعلیم کی طرف رغبت موجود ہو تو بچے بھی اس کی رغبت سے فیض یاب ہوں گے، اگر ماں خود رغبت سے خالی ہے تو بچے بھی ایسے ہی رہیں گے۔ اسی لیے سب سے پہلے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس وقت بھی سب سے پہلے اس کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ دائیں کان میں اذان دی جاتی ہے جس میں توحید و رسالت اور عبادت کی تعلیم ہے۔ تو اس اذان کے ذریعے اصول و فروع' عقائد و اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے اور حی علی الفلاح میں اس کا انجام اور نتیجہ بھی بتا دیا جاتا ہے۔ کہ فلاح اور کامیابی ہے۔ جو آخرت میں تمہیں میسّر ہوگی۔ تو ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے اسلام میں تعلیم کا کتنا بڑا مرتبہ اور درجہ ہے، اس لئے اس پر زور دیا گیا ہے۔

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ" ② علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد ہر مسلمان مرد و عورت کو معلوم ہو جائے کہ میں کیسا مسلمان ہوں۔ اور

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲. ② المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه: مقدام، قال الطبرانی: لم یروهذا الحدیث عن ابی عروة وهو معمر بن راشد الامفضل بن فضالة، ج: ۱۹ ص: ۱۶۲.

مسلمان کے کیسے اخلاق ہونے چاہئیں چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں سے ادب واحترام سے پیش آنا، رہنے سہنے اور حسنِ معاشرت کا طرزِ عمل معلوم ہو، اس لئے تعلیم واجب قرار دی گئی ہے تمام پر خواہ مرد ہو یا عورت، اس کے بعد دوسرے اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ: جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو عبادت کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

تو حقیقت میں یہ مقصد عورتوں سے ہی حاصل ہوتا ہے کہ جب ماں تعلیم یافتہ ہوگی، بچّہ کو بھی تعلیم سے آشنا کر دے گی۔ جس سے اس کے اخلاق سدھر جائیں گے اور اگر بالفرض ماں بچے کو تعلیم نہ بھی دے مگر وہ ماں نیکوکار اور با اخلاق ہے تو اس کو نیکوکاری اور حسنِ اخلاق کی برکت سے اولاد بھی دیندار بن جائے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ: جو قوم میری فرماں برداری کرتی ہے تو میں اس کی سات پشتوں تک اور نسلوں تک رحمت کو بھیجا کرتا ہوں اور اگر فرماں برداری نہیں کرتی اس کی سات پشتوں تک لعنت بھیجتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی نیکوکاری اور بدکاری کا بڑا اثر ہے جو سات پشتوں تک جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ والدین جیسے ہوں ویسے ہی ان کے بچے بھی اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر والدین عالم ہیں تو بچے میں بھی علم کا اثر ہوگا کہ وہ جائز و ناجائز کے مطابق گفت و شنید کرتا ہوگا۔ اگر دوکاندار ہیں تو بچے میں بھی دکانداری کے اثرات حساب وغیرہ کچھ نہ کچھ موجود ہوں گے۔ اگر والدین کھیتی باڑی کرتے ہیں تو بچے میں بھی اس کا اثر موجود ہوگا۔ تو یہ اثر ہے، ماں کے ماحول کا بچے پر اثر ہوگا۔ اب سب سے پہلا حق انسان پر اپنے نفس کا ہے۔ دوسرا حق اولاد کو پڑھانا کہ وہ صحیح راستہ پر چلے، یعنی مخلوق کا ہے۔ اور تیسرا حق معاشرہ کا ہے۔ اور یہ تینوں علم پر موقوف ہیں۔ تو جتنا علم حاصل کریں گے خاندان علمی بنتا جائے گا۔ اور ماحول خوشگوار ہوتا جائے گا۔

ملکہ کے تقوے کا اس کی اولاد پر اثر...... امیر عبدالرحمٰن خان والیٔ کابل کے دادا امیر دوست محمد کا واقعہ ہے۔ کہ اس کے ملک پر کسی نے چڑھائی کی، اس کی سرکوبی کے لئے اس نے ایک فوج اپنے ولی عہد شہزادے کے ہاتھ بھیجی، دو تین دن بعد اطلاع آئی کہ شہزادے کو شکست ہوئی اور وہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اور دشمن اس کے پیچھے ہے، اس سے بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا اور کئی غم سوار ہوئے۔ شکست کا غم، شہزادے کی کمزوری کا اور قوم کی ملامت کا، تو وہ اس غم کے اندر محو ہو کر گھر آیا اور بیگم صاحبہ سے تمام قصہ سنایا۔ بیگم نے کہا کہ یہ سارا قصّہ غلط ہے۔ امیر نے کہا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپوٹ ہے، وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ مگر بیگم نہ مانی کہ شکست ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تو بادشاہ گھر سے نکل آیا کہ یہ عورت ہے۔ یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے گی۔ دوسرے دن اطلاع آئی کہ وہ خبر غلط ہے۔ شہزادہ فتح پا کر واپس آ رہا ہے۔ اس پر بیگم نے شہزادے کی سلامتی اور فتح یابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

بادشاہ نے پوچھا، تجھے کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ شکست نہیں کھا سکتا۔ کیا دلیل ہے تیرے پاس کہ میری پوری حکومت کو تو نے جھٹلایا۔؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں صرف اللہ تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ یہ میرا راز ہے۔ میں اس کو

فاش نہیں کرنا چاہتی۔ آخر اصرار کرنے پر بتایا، جب شہزادہ میرے پیٹ میں آیا تو میں نے اس وقت سے عہد کرلیا تھا کہ میرے پیٹ میں مشتبہ لقمہ نہیں آنا چاہئے۔ اس لئے کہ حلال غذا سے اچھی طبیعت اور اچھے اخلاق بنتے ہیں اور حرام غذا سے طبیعت فاسد ہوتی ہے اور اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ شہزادہ نو مہینے تک میرے پیٹ میں رہا۔ اور ایک لقمہ غذا کا میں نے ایسا نہیں کھایا جو مشتبہ ہو۔ اس لئے اس کے اخلاق رذیل اور برے نہیں ہوسکتے۔ شہید ہونا یہ اچھا خلق ہے۔ اور پشت پھیرنا یہ اچھا خُلق نہیں ہے۔ تو شہزادہ شہید ہوسکتا ہے اور کٹ کر مرسکتا ہے، مگر پشت پھیر کے فرار نہیں ہوسکتا۔

اور پھر اس پر بس نہیں بلکہ جب یہ شہزادہ پیدا ہوا تب بھی میں نے مشتبہ غذا استعمال نہیں کی تا کہ اس غذا سے دودھ بن کر اس کے اخلاق پر اثر انداز نہ ہو۔ اور جب دودھ پلاتی تو وضو کر کے اور دو رکعت نفل ادا کر کے پلاتی۔ اس لئے ان چیزوں سے شہزادے کے اخلاق بہت بلند ہونے چاہئیں، اس لئے میں نے تمہاری ساری فوج اور حکومت کی بات کو جھٹلایا۔ مگر اپنے قول سے باز نہیں آئی۔

جب امیر دوست محمد کی بیگم اتنی متقی بن سکتی ہے جبکہ آرام وعیش کے تمام اسباب موجود ہیں۔ تخت پر بیٹھ کر متقی بن سکتی ہے تو ہماری آج کل کی بہنیں جھونپڑیوں میں رہ کر کیوں کامل نہیں ہوسکتیں۔ جو رکاوٹیں ان کو تھیں وہ تمہیں نہیں۔ بعض لوگ حیلہ جو ہوتے ہیں اور ہر کام اور ہر بات میں حیلہ تلاش کرتے ہیں، مگر حیلوں سے کچھ نہیں بنے گا۔ اور یہی حیلہ کرنے والے قیامت کے دن بھی حیلہ سازی کریں گے اور کہیں گے کہ ہمیں وقت نہیں ملا، اس لئے اطاعت نہیں کی بلکہ دولت میں مشغول رہے اور اس سے فرصت نہیں ملی تو اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہما السلام کو پیش کریں گے کہ باوجود اتنی دنیا اور دولت کے اللہ کے مقبول بندے اور نبی ہیں۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا علمی مقام...... ایسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے مردانِ باہمّت تھے، ان کی عورتیں بھی ایسی تھیں اور ایسے ہی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، میری وحی کا آدھا علم صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور آدھا علم صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سیکھو، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بہت بڑے بڑے درجہ کے تابعین رحمہم اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ شاگرد رہے ہیں۔ تو جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وحی کا آدھا علم سیکھ سکتی ہیں تو آج کل کی بہنیں ابتدائی حالات اسلام کے اور معاملات کا علم بھی حاصل نہیں کرسکتیں، حضرت امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کی کتاب کا املاء ان کی لڑکی نے لکھا تھا، آج تمام امت پر اس کا احسان ہے۔ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا بڑے صوفیا میں سے گزری ہیں۔

عورت اور منصبِ افتاء...... فقہ کی کتاب "بَدَآئِعُ الصَّنَآئِع" کی وجہ تصنیف یہ ہوئی کہ ایک بہت بڑے محدث کی لڑکی بڑی عالم اور محدث تھی اور اس کے ساتھ ساتھ حسین اور خوبصورت تھی، بہت بڑے بڑے علماء کے

پیغام نکاح کے آئے اور ایسے ہی سلاطین وغیرہ نے بھی پیغام بھیجے۔ مگر تمام سے اس لڑکی کا علم زیادہ تھا، اس لئے پیغام قبول نہیں ہوتا تھا، اس لڑکی نے یہ شرط مقرر کی کہ تمام علماء فقہ میں کتابیں تصنیف کریں۔ جس کی کتاب مجھے پسند ہوگی میں اس سے نکاح کرلوں گی، اس پر ہزاروں کتابوں کی تصنیف ہوئی تو اسے "بَدَآئِعُ الصَّنَآئِع" پسند آئی، اور اسی سے اس نے نکاح کیا۔ آج کل اگر ہماری بہنیں کمال اور مہارت حاصل نہ کرسکیں تو کم از کم حقوق کی ادائیگی کا علم تو حاصل کرلیں کہ خاوند کے یہ حقوق ہیں اور بچوں کے یہ حقوق ہیں۔

مقصدِ علم...... اور وقائع میں لکھا ہوا ہے کہ سلجوقی کے عہد میں مدرسہ نظامیہ بنایا گیا، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اس مدرسہ کے صدر مدرس تھے بعد عرصہ مدید کے معلوم ہوا کہ پڑھنے والوں کی نیتیں فاسد ہیں تو بادشاہِ وقت نے ارادہ کیا کہ مدرسہ کو ختم کردوں مگر خیال آیا کہ ایک دفعہ دیکھ لوں کہ واقعی سب کی نیتیں فاسد ہیں کہ نہیں۔

چناں چہ ایک رات نظام الملک خود آیا، ایک ایک طالب علم سے سوال کرتا رہا، تم کس لئے پڑھ رہے ہو؟ کوئی جواب دیتا کہ میرا والد بادشاہ کا قاضی ہے، میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میں بھی قاضی بن جاؤں۔ کوئی کہتا کہ میرا والد بہت معروف اور مشہور عالم ہے۔ اطراف میں اس کی شہرت کا ڈنکا بج چکا ہے، تو میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میری بھی شہرت ہو جائے۔ وغیر ذلک۔ نظام الملک نے تمام طلباء کو دیکھا کہ ان کی نیتیں فاسد ہیں تو تہیہ کر لیا کہ مدرسہ کو بند کر دیا جائے۔ میرے لاکھوں روپے ضائع ہو رہے ہیں۔ صحیح نیت سے کوئی نہیں پڑھتا کہ ثواب حاصل ہو جائے، اس فیصلہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس کی نظر ایک طالب علم پر پڑی، جو مطالعہ میں مستغرق تھا۔ نظام الملک اس کے پاس گیا، مگر اس طالب علم نے کتاب سے ایک لمحہ کے لئے نگاہ نہ اٹھائی۔ پوچھا "تم بڑے مستغنی ہو"؟ کہا "میرا مقصد کتاب کا مطالعہ کرنا ہے چہروں کا مطالعہ کرنا نہیں"۔ نظام الملک نے پوچھا۔ "تمہارا ایک دومنٹ کے لئے حرج تو ہوگا لیکن یہ بتاؤ آپ کا اس پڑھنے سے مقصد کیا ہے؟" تو اس نے کہا۔ "میں نے ماں باپ سے سنا ہے ہمارا ایک خدا ہے جس نے ہمیں زندگی عطاء کی ہے۔ وہ ایک محسن ہے اور اس کے حقوق مجھے معلوم نہیں، تو میں محسن کے حقوق جاننے کے لئے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔" نظام الملک نے کہا "میرا تو ارادہ اس مدرسہ کے توڑنے اور بند کرنے کا تھا لیکن جب تک تم اس مدرسہ میں پڑھتے رہو گے، تمہاری وجہ سے مدرسہ جاری رہے گا"۔ یہ طالب علم حضرت حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ چناں چہ نظام الملک نے اس مدرسہ کو باقی رکھا۔ معلوم ہوا اصلی مقصد علم سے حقوق کی ادائیگی ہے اور ہم میں سے کون ہے جس پر حقوق نہیں ہیں۔ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا تمام پر حقوق ہیں۔ تو ان حقوق کے بتلانے کے لئے تعلیم سکھائی جاتی ہے۔

تعلیم حق فطرت و عقل ہے...... تعلیم ایک فطری چیز ہے کہ فطرۃً محسن کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اور عقلی بھی ہے۔ تو جو جاہل ہے وہ فطرت اور عقل دونوں کے خلاف کر رہا ہے اور احکامِ شرعیہ وعقلیہ کے خلاف کر رہا ہے۔ ہمیں اپنی بچیوں سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ محسن کشی کریں گی۔ اور عقل و فطرت کو آگ لگائیں گی۔

عورت کی صلاحیت...... اکثر عورتوں کو یہ خلجان اور شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقی اور علم وفضل کا میدان مردوں کے لئے ہے۔ اور عورت تو گھر میں بیٹھنے والی ہے اس کو علم سے کیا واسطہ؟ مگر ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ کتابوں سے عورتوں کے بڑے فضائل معلوم ہوتے ہیں۔

''صِفَةُ الصَّفْوَةِ'' ایک کتاب ہے، اس میں مستقل عورتوں کا ایک باب باندھا گیا ہے، ان کی سیاست، ان کی تعلیم اور جہاد کا بیان ہے حتیٰ کہ عورتوں کی کشتی کا بھی بیان ہے کہ انہوں نے کشتی میں بڑے بڑے بہادر مردوں کو بچھاڑ دیا۔ تو تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ عورتوں نے میدان جنگ میں کام کیا ہے۔

عورت کی نبوت...... دوسری بات یہ ہے کہ دین مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں۔ جیسے رسالت اور ''قَاضِیُ الْقُضَاةِ'' کا عہدہ کہ عورت رسول اور قاضی القضاۃ نہیں بن سکتی۔ کیوں کہ اس کی قابلیت عورت میں نہیں، مگر سب سے بڑا کمال جو نبوت کا ہے، ایک بڑی جماعت اس پر ہے کہ عورت کو نبوت مل سکتی ہے۔ ابن حزم بھی یہی کہتے ہیں۔ اگر چہ جمہور کا یہ مسلک نہیں۔ جس جماعت نے اس کا قول لیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آتی رہی، تو وہ نبی ہیں فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا نبی تھی۔ تو جب اس قول کے مطابق عورت کو نبوت جو ایک اعلیٰ درجہ کا کمال ہے، اس کا حصول ممکن ہے تو اور کیا کمال چاہئے؟ اور کون سی فضیلت ہے جس کو وہ حاصل نہیں کر سکتی، قرآنِ مجید میں ہے: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ...﴾ ① اس آیت میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ عبادات، اخلاق اور معلامات میں یکساں ہیں۔ تو مبداءِ فیاض سے فرق نہیں، عقل اور نقل اس کو جھٹلاتی ہے، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ اہتمام تعلیم کا ہے۔

عورتوں کی دینی ترقی...... انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا اہتمام ہے، امت کے بڑوں اور نامور لوگوں کو بھی اس کا اہتمام ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بچیاں جہل کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی طرف نہیں آ سکتیں، تو مدرسہ خیر المدارس کا یہ شعبہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ عورتیں اور بچیاں بھی ترقی میں حصہ لئے رہی ہیں اور دین کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں کہ اصل ترقی یہی ہے۔

عورتوں کی عمومی تعلیم...... ایک دور میں یہ بات تھی کہ مخصوص گھرانے علم سے مختص ہو گئے اور مائیں اولاد کو تعلیم سکھاتی تھیں۔ مگر اب یہ اختصاص نہیں۔ تو خیر المدارس کا یہ شعبہ پوری قوم کے لئے خوشی کی بات ہے عورتیں اس میں تعلیم حاصل کریں تو آئندہ چل کر نسلیں نیک بنیں گی۔ عورتوں کے لئے اب یہ موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھائیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی عطاء فرمائے۔

''آمِيْن ثُمَّ آمِيْن.''

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۵.

افاداتِ علم وحکمت

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا! اَمَّا بَعْدُ

وصول الی اللہ کے اصول......ان صلاحیتوں کا معیار ہے کہ علائق جتنے کم سے کم ہوں گے، وصول اتنا جلد سے جلد ہوگا، جتنے علائق اور تعلقات بڑھ جائیں گے طبعیت اس میں بٹے گی، یکسوئی کم ہوگی، تو پھر دیر لگ جاتی ہے چاہے استعداد بھی ہو۔

اسی واسطے ان حضرات نے جو اصول رکھے ہیں وہ چار ہی ہیں۔ قلت طعام یعنی کھانا کم کھانا اور کم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو خوراک ہے اس سے بھی آدھا کر دے، یہی دو چار لقمے کم کر دے، یہ کافی ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں۔ پہلا دور جو کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا دور ہے کہ ان کی غذائیں سوکھا ٹکڑا وغیرہ تھی۔ حتی کہ جہاد میں جا رہے ہیں۔ کسی کی زنبیل میں چند ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، کوئی سامانِ رسد نہیں تھا کہ وہاں کیک وغیرہ ملیں۔ بعض کے پاس کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں، بھوک نے ستایا، وہ کھائیں۔ بعض کو یہ بھی میسر نہیں تو چھوہاروں کی گھٹلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں ہی منہ میں ڈال لیا اور چوس لیا، دل کو بہلا لیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں۔ غرض غذا تو یہ تھی اور مجاہدات عظیم کہ دن بھر جہاد میں اور رات کو مجاہدہ میں ہیں اور غذا اکل یہ۔ غالباً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ''اِنَّھُمْ یَبْعُرُوْنَ بَعْرًا وَّاَنْتُمْ تَصْلِطُوْنَ صَلْطاً'' ① وہ فراغت کو جاتے تھے بمشکل دو چار مینگنیاں سی نکل آتی تھیں۔ غذا ہی نہیں اور تم قد مچے بھر دیتے ہو۔ یہ اپنے لوگوں کو جو کہ تابعین تھے، ان کو کہا۔ تو ہر زمانے کی قلّتِ طعام الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی ان کی قلّتِ طعام کی حرص کرنے لگے تو چار پائی پر پڑ جائے گا، اور اس کا انتقال بھی ہو جائے گا، برداشت نہیں کر سکتا۔ ان کے ظرف میں برداشت تھی، فیضانِ نبوّت براہِ راست متوجہ تھا۔ اس سے بڑھ کر طاقت نہیں ہو سکتی۔ اب حال کی قلّتِ طعام یہی ہے جو ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ ہم دو آدمیوں کو کسی ضرورت سے دہلی بھیجا، دو آدمیوں کی آمد و رفت میں پانچ روپے لگ جاتے مگر ہمیں پچاس روپے دیئے کہ خوب کھاؤ اور خوب کام کرو۔ غرض اس زمانے کی قلّتِ طعام یہی ہے، کھانے میں زیادہ کمی نہ کرے۔ معمول کو معتدل رکھے۔ ایک اصول یہی ہے۔ اور ایک ہے قلت منام، یعنی سوؤ کم۔ اس میں بھی یہی بات ہے کہ ان حضرات کا سونا تو مجبوری تھا کہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ سوئیں بھی نہ۔ بس ذکر

① هذا من قول عليؓ: اخرجه البيهقي في سننه، جماع ابواب الاستطابة باب الجمع في الاستنجاء بين المسح، ج: ١، ص: ١٥.

اللہ میں ہی لگے رہیں۔حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر ذکر فرماتی تھیں،ایک رسی چھت میں ٹانگ رکھی تھی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا" جب نیند کے جھٹکولے زیادہ آنے لگتے ہیں تو اپنے کو اس رسی سے باندھ لیتی ہوں"۔

فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔جب نیند آنے لگے پڑ کے سورہو۔جاگ جاؤ پھر اللہ کا نام لینا شروع کرو۔طبیعت کو گھوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔تو شریعت نے طبائع کی رعایت بہت زیادہ کی ہے۔طبیعتوں کا معمول ہر ایک کا الگ الگ ہوتا ہے،اس میں کمی ہوجائے گی تو اس کا برا اثر پڑے گا۔اور بالخصوص اس دور میں،اس واسطے جس کا معمول سونے کا ہے اس میں کمی نہ کرے۔اس لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ:" لَاتَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ" ① نیند میں کمی مت کرو۔جس کو جو عادت ہے اس کو پورا کرلے اور اپنا کام بھی کرے۔مگر نیند میں اتنا وقت لگادے جتنا معمول ہو۔تو طبائع الگ الگ ہیں۔اس لئے ہر ایک کی قلتِ طعام وقلتِ منام مختلف ہوتی ہے،پھر زمانے بھی الگ الگ ہیں،اس کے لحاظ سے ایک طبقہ پر دوسرے طبقے کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

تیسرا اصول ہے قلتِ کلام۔کم بولو۔اس کا حاصل یہ ہے کہ بلاضرورت نہ بولو۔ضرورت کے موقع پر کلام کرنا ضروری ہے۔لیکن خواہ مخواہ کی فضول مجلسیں اور تفریحی باتیں،ان میں وقت ضائع ہوتا ہے اور علائق کی کثرت ہوجاتی ہے،پھر اپنے معمولات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔اور چوتھی چیز ہے قلتِ اختلاط مع الانام۔ملنا جلنا کم، بالخصوص مجاہدات کے زمانے میں۔میل جول،تفریحی مجلس،اٹھنا بیٹھنا،یہ چیزیں مضرت پہنچاتی ہیں،حدیث میں ہے کہ:"مَنْ سَكَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ نَجَا" ② جو چپ رہا وہ صحیح سالم رہا،اور جو صحیح سالم رہا اس نے نجات پالی۔حاصل وہی ہے کہ بلاضرورت بولنا،اسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔جیسے ایک روایت میں ہے کہ عجمیوں کے بکواس سے بچو۔بے ضرورت بول رہے ہیں۔بولے چلے جارہے ہیں۔یہ غلط چیز ہے۔ضرورت کے موقع پر چپ رہنا برا ہے اور چپ رہنے کے موقع پر بولنا برا ہے۔حسبِ ضرورت سکوت وکلام کرے،سب کا حاصل یہی نکلا کہ اختلاط اور علائق کی کمی ہو اس سے وصول جلد ہی ہوجاتا ہے،ذکر کی تاثیر قوی ہوجاتی ہے۔

مجاہداتِ باطنیہ کی مثال......مجاہداتِ باطنیہ کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مدارس میں طلباء تعلیم پاتے ہیں،ان کے لئے بھی کثرتِ علائق بری چیز ہے۔اگر وہ دوستیاں کریں۔مجلسوں میں جائیں تو مطالعہ کون کرے گا؟ استعداد کس طرح پیدا ہوگی۔؟ غرض کسی بھی مقصد کے لئے ضروری ہے کہ دل میں مقصد کی لگن ہو اور مقصد کے لئے عشق ہو اور غیر مقصد سے تنفر اور بُعد ہو۔پھر جاکے مقصد حاصل ہوتا ہے۔جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرمارہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں میں گریہ طاری تھا۔توجہ الی اللہ ہورہی تھی۔تو جوشِ عقیدت میں ایک شخص نے کہا۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب فی من نام عن صلوة،ص: ۱۲۵۵، رقم: ۴۳۷.

② شعب الایمان للامام البیھقی، ج: ۱۱، ص: ۶۸،رقم: ۴۸۶۲. (یہ حضرت اصمعیؒ کا قول ہے۔)

مقصد کی لگن...... ''اے موسیٰ! تم سے بھی بڑا کوئی دنیا میں عالم ہے؟ یعنی نہیں ہے''۔ فرمایا۔ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ اور یہ حق تھا، اس لئے کہ اپنے دور میں پیغمبر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوتا۔ انہی کے طفیل میں دوسروں کو علم پہنچتا ہے، تو اپنے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام افضل الخلائق ہیں۔ بلا کسی غرورِ نفس اور بلا کبر کے حق بات آپ نے فرمادی۔ کہ میں ہی بڑا عالم ہوں۔ اللہ نے بنادیا۔ یہ تکبر نہیں تھا۔ مگر کبر کی صورت پیدا ہوگئی دعویٰ کی صورت پیدا ہوگئی کہ ''میں ہوں'' یہ ناپسند ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم دعویٰ کرتے ہو کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ ''بَلٰی عِنْدَنَا عَبْدُنَا هُوَ اَعْلَمُ مِنْکَ. '' ① ہمارا ایک بندہ ہے کہ جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس سے جا کے علم سیکھو۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے اور حضرت یوشع ابن نون کو ساتھ لیا۔ حق تعالیٰ نے علامت بتلادی کہ فلاں جگہ مجمع البحرین میں جب پہنچو گے تو اس بندے سے ملاقات ہوگی۔ اور یہ فرمایا جو مجھے سنانا تھا کہ ﴿حَتّٰٓی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا﴾ ② میں مجمع البحرین پر پہنچ کر رہوں گا، چاہے لاکھوں برس گزر جائیں، مجھے جانا ہے اور اس بندے سے علم حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصد کی لگن تھی کہ چاہے لاکھوں برس گزر جائیں۔

غرض ایک طالب علم کا جب انتہائی مقصد متعین ہوجائے، اس میں لگن ہونی چاہئے اور مقصد سے عشق ہونا چاہئے۔ جب اس میں منہمک ہوگا تو غیر مقصد کی طرف کبھی توجّہ نہیں کرے گا۔ تو مقصد کی لگن اور دھن یہ اصل چیز ہے۔ جب علوم ظاہرہ میں اس کی ضرورت ہے تو علوم باطنہ میں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے آدمی یہ سوچ لے کہ چاہے عمرِ نوح بھی گزر جائے مگر مجھے ہر صورت میں یہ مقصد حاصل کرنا ہے، پھر حق تعالیٰ بھی مدد فرماتے ہیں اور مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ غرض پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے مقصد سے لگن ہو۔ اس کے لئے پھر ایثار ضروری ہے کہ آدمی اپنی خواہشات مقصد میں فنا کردے۔ اگر رات دن اس میں ہے کہ کھاؤں گا یہ اور پیوں گا یہ، تو وہ آرائش کی فکر میں ہے۔ اسے مقصد سے کیا تعلق؟ جب آدمی مقصد میں لگتا ہے تو ہر چیز سے نگاہ ہٹ جاتی ہے۔ پھر مددِ خداوندی آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' ہمّت کروگے تو اللہ کی مدد شامل حال ہوگی، کم ہمّت ہو کر گھر بیٹھ جاؤگے، اس کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔

اختلافِ استعداد...... تو اس میں احوال بھی مختلف ہیں، استعدادیں بھی مختلف ہیں۔ عزیمتیں بھی مختلف ہیں۔ بعضوں میں عزیمت ہوتی ہے کہ انتہائی لگن ہے۔ بعض میں کچھ ہلکی سی لگن ہوتی ہے، اس کو مقصد کے حاصل کرنے میں دیر لگ جائے گی، اس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ قانونی بات اتنی ہے کہ نصاب پورا ہوگیا تو فارغ التحصیل ہوگئے۔ اب یہ کہ تم میں کتنی علمی قوّت آئی، یہ ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ یہی یہاں بھی ہے کہ جب وہ مجاہدات و افکار صحیح طریقے سے پورے ہوگئے، شیخ کہہ دے گا کہ بھائی تم قانونی طور پر واصل ہوگئے۔ اب یہ کہ تمہارے اندر

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب مایستحب للعالم اذاسئل، ص: ۱۳، رقم: ۱۲۲.

② پارہ: ۱۵، سورة الکهف، الآیة: ۶۰.

جذبہ کتنا ہے۔ عشق خداوندی کتنا ہے۔ یہ ہر شخص کے حالات الگ الگ ہیں۔

اعضاء کی پیوند کاری...... یہ اصل میں اس پر موقوف ہے۔ پہلے یہ سمجھا جائے کہ اس جسم کے ہم مالک ہیں یا یہ جسم ہمیں بطور عاریت کے فائدہ اٹھانے کے لئے دیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ جسم سرکاری مشین ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ اگر آپ مالک ہوتے یا آپ کے قبضے میں ہوتا تو آپ کبھی اس جسم کو بیمار نہ ہونے دیتے، کبھی کسی عضو کو اپنی جگہ سے ٹلنے نہ دیتے، مگر آپ مالک نہیں ہیں۔ بیماری آتی ہے تو آپ کو سر جھکا دینا پڑتا ہے۔ صحت آتی ہے جب بھی سر جھکا دیتے ہیں۔ غرض پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اس بدن کے مالک ہیں یا بطورِ عاریت کے دیا گیا ہے؟ مالک تو ہیں نہیں بطورِ عاریت کے دیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ دیتے ہیں پھر لے لیتے ہیں۔ اگر مالک ہوتے تو کبھی بھی اپنے بدن کو دوسرے کے حوالے نہ کرتے۔ حتیٰ کہ اللہ میاں کے حوالے بھی نہ کرتے اور وہ لینا چاہتے تو کہتے کہ حضور، جب آپ نے ہماری ملک بنا دی تو غیر کی ملک میں آپ تصرّف کیوں کرتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا، ہماری ملک نہیں، جب ملک نہیں ہے تو مالک سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اجازت دے تو ہم کسی عضو کو منتقل کر سکیں گے۔ وہ اجازت نہ دے تو نہیں کر سکیں گے، تو اس اجازت کی ذمہ داری آپ کے پاس کوئی ہے یا نہیں؟ کہ آپ کو اجازت مل گئی ہے یا نہیں؟ اگر وحی یا الہام کے ذریعہ مل گئی ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ملی تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں۔ پھر اس میں ایک سوال تھوڑا ہی ہے۔ آپ نے ایک شخص کو اپنی آنکھ دے دی، قیامت کے دن اس نے کہا کہ اب چونکہ یہ میری ملک ہوگئی، لہٰذا تم اندھے رہو۔ لہٰذا یہ اندھے کا اندھا حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تو نے اپنا ایک عضو منتقل کر دیا۔ واپس لینے کا کیا حق ہے، جب واپس لینے کا حق نہیں تو اندھا رہ، وہاں پھر آپ کیا کریں گے۔ یہ جسم جو ہے، برزخ ہو یا آخرت ہو، عذاب تو اب اسی پر واقع ہوگا تو آپ کو حق کیا ہے کہ آپ جسم کا کوئی عضو کسی دوسرے کو دے دیں۔ اوّل تو مالک نہیں۔ پھر مالک نہ ہونے کی صورت میں جو تصرفات برزخ میں یا حشر میں ہوں گے وہ اسی بدن پر ہوں گے۔ جب آپ یہ بدن دے چکے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جلا کر بدن کو راکھ کر دے۔ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

دین کی بنیاد مسائل پر ہے مصالح پر نہیں...... اب رہا یہ کہ مصلحت یہ ہے تو دین کی بنیاد مصلحتوں پر نہیں ہے۔ مسائل پر ہے۔ کون سی بُری سے بُری چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی مصلحت نہیں۔ شراب پینے میں بھی تو مصلحت ہے۔ صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ بدن میں قوت آ جاتی ہے۔ جوئے میں بھی مصلحت ہے ایک دم تو مال بھی بڑھ ہی جاتا ہے، ایک پیسہ خرچ کیا اور ہزار روپیہ کما لیا تو نفع ہوا۔ اور قرآن کریم بھی اس مصلحت کو مانتا ہے۔ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ① لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ فرما دیجئے ان میں کچھ نفع بھی ہے، کچھ نقصان بھی ہے۔ مگر نقصان غالب ہے نفع مغلوب

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۱۹.

ہے۔غرض قرآن کریم نے نفع کا اقرار کیا، تو کون سی چیز ایسی ہے جس میں نفع نہیں، مگر اس نفع ونقصان پر اگر احکام کا مدار ہوتا تو شراب جائز ہوتی کہ اس میں ایک نفع بھی ہے۔ جو جائز ہوتا، اس میں ایک نفع بھی ہے۔

لیکن باوجود منفعت کے ناجائز قرار دیا گیا، غرض آپ اگر تمدّنی مصالح سے کوئی منفعت ثابت کریں تو دین کا مدار تو منافع اور مصالح پر نہیں ہے، وہ تو مسائل پر ہے۔ ورنہ آپ کل کہیں گے کہ صاحب تمدّنی طور پر شراب میں بھی تو منفعت ہے تو اس کی بھی اجازت دی جائے۔ اور جوئے میں بھی کچھ نفع ہے تو اس کی بھی تھوڑی بہت اجازت دی جائے۔ تو اس اجازت کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ فقط آنکھ، ناک تک نہیں رہے گا، یہ نفس کی خواہشات پر بھی آئے گا۔ طبعی تقاضوں پر بھی آئے گا کہ اس میں مصلحت یہ ہے۔ اگر میری اور آپ کی تجویز کردہ مصلحتیں جو ہم بتلاتے ہیں، اس پر مدار ہوتا تو پھر اس کی اجازت دے دی جاتی مگر اس پر تو مدار نہیں، البتہ مصلحتِ کلی پر مدار ہے کہ بنی نوع انسان کی مصلحت کیا ہے۔ زید، وعمر، بکر کی مصلحت نہیں دیکھی جاتی۔ قانون جب بنتا ہے تو مفادِ عامّہ کو سامنے رکھ کر بنتا ہے۔ زید، عمرو بکر کے لئے نہیں بنتا۔ مثلاً ریلوے کا قانون ہے کہ ایک ٹکٹ میں آپ ۲۵ سیر وزن لے جاسکتے ہیں۔ ایک آدمی یوں کہے کہ میں قوی ہوں، میں دو من وزن اٹھا سکتا ہوں۔ میرے لئے ۲۵ سیر کی کیوں قید ہے۔؟ اس کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔ اس لئے کہ مفادِ عامّہ کی رعایت پیشِ نظر ہے۔ زید، عمرو بکر کی نہیں کہ کون قوی ہے، کون ضعیف ہے۔ تو دنیا کے قانون میں بھی جو مفاداتِ عامّہ ہیں، مصالحِ عامّہ ہیں جو بنی نوع سے متعلق ہیں ان کی رعایت ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کے چند افراد کی رعایت نہیں ہوتی۔

نس بندی یا کنبہ بندی؟...... نس بندی تو باتفاقِ علماء ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں تغییرِ خلق اللہ بھی ہے اور بدنِ انسانی میں اس قسم کے تصرّفات کرنا ہے جن کی فطرت اجازت نہیں دیتی۔ پھر یہ کہ نس بندی سے وہ مادّہ تقریباً ختم ہوجاتا ہے جس سے آدمی کو اولاد ہو۔ کسی کو حق نہیں کہ کسی مادّے کو ختم کردے کہ وہ اولاد بنانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اور مرد سے نامرد ہوجائے۔ اس کا کوئی حق نہیں۔ اور کنبہ بندی جو ہے وہ اختیاری ہے۔ اس میں یہ ہے کہ خاوند بیوی میں بعض مصالح ایسے ہیں کہ وہ اگر اولاد بند نہیں کریں گے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ مثلاً بیوی بہت بیمار ہے۔ اگر اولاد ہوگی تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ یا خاوند بہت بیمار یا جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ رزق کی اتنی کمی ہے کہ کوئی صورت نہیں بن پڑتی اور اولاد روز بروز ہورہی ہے تو تقلیلِ اولاد کے لئے خاوند بیوی مل کر باہمی معاہدہ کرلیں کہ اب ہمیں اولاد کم کرنی ہے۔ مگر یہ قانونی چیز نہیں، یہ تو اخلاقی اور خانگی چیز ہے قانونِ شریعت اس کے اوپر دباؤ نہیں ڈالے گا۔ البتہ شریعت حق دے گی کہ اگر ایسے حالات آئیں تو اس حق کو باہمی رضامندی سے استعمال کیا جائے گا۔ خاوند بیوی مل کر باہم معاہدہ کرلیں۔ غرض نس بندی میں مادّہ زائل ہوتا ہے۔ اس کا کسی کو حق نہیں۔ کنبہ بندی اختیاری ہے کہ خاص حالات میں آدمی تقلیلِ اولاد کی طرف متوجہ ہو۔ مگر وہ قانونی چیز نہیں۔ اخلاقی چیز ہے کیوں کہ ہر گھر کا الگ الگ معاملہ ہے۔

عمومی طور پر تقلیلِ اولاد کی صورت...... تقلیل اولاد کا جو طریق ہے وہ یہ ہے کہ ان اسباب کا انسداد کیا جائے جن سے ہر وقت شہوات ابھرتی رہتی ہیں اور خواہی نخواہی اولاد ہو، حتیٰ کہ جائز ناجائز بھی۔ جب فواحش اور منکرات عام ہوں، بے حجابی اور عریانی عام ہو، عورتوں اور مردوں کا اختلاط عام ہو، کوئی صورت تقلیلِ اولاد کی نہیں۔ آخر پہلے بھی تو لوگ تھے مگر اتنی اولاد نہیں ہوتی تھی، اس لئے کہ ہوسناک نہیں تھے، اب چوں کہ رات دن عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ شب وروز اختلاط ہے تو شہوات اپنے مرکز پر قائم نہیں ہیں، وہ منتشر ہیں، اس لئے لوگ جائز ناجائز میں مبتلا ہیں۔ اور جب کوئی چیز اپنے مرکز کو چھوڑ کر حد سے نکل جاتی ہے، کوئی بھی قوت ہو وہ کسی حد پر رکتی نہیں۔ شہوات جب قبضے میں نہ رہیں تو ہر وقت آدمی شہوت رانی میں پڑا رہے گا۔ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ تو قدرتی طور پر اولاد زیادہ ہوگی۔ اس واسطے تقلیلِ اولاد کی ایک تو خاص صورت ہے کہ بیوی بیمار ہے۔ بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہے کہ اب اگر اولاد ہوگی تو بچے گی نہیں۔ یہ تو ایک خصوصی بات ہے۔ لیکن عمومی طور پر اگر کوئی چاہے کہ اولاد زیادہ نہ ہو اس کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب کو ختم کیا جائے جن کی وجہ سے شہوات اپنی جگہ پر قائم نہیں ہیں۔ بے پردگی، فحاشی اور عریانی روکی جائے۔ مرد و عورت کا اختلاط روکا جائے۔ قدرتی طور پر ہر قوت اعتدال پر آجائے گی۔

مقصود تکثیرِ اولاد ہے، تقلیل کا تعلق عوارض سے ہے...... تقلیل اولاد مقصود تو نہیں۔ مقصود تو تکثیر اولاد ہے۔ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑھے گی، بہتر ہی ہے مگر تقلیل مقصود نہیں ہے۔ عوارض کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ جب کوئی خاص حالت پیش آجائے جیسا کہ میں نے عرض کیا، بیوی بیمار ہے۔ یا مرد کے اندر صلاحیت باقی نہیں رہی یا اور اسباب پیش آئیں۔ غرض تقلیل مقصودِ اصلی نہیں، وہ تکثیر ہی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس پر کیا حالات گزر رہے ہیں، وہ اپنے گھریلو حالات دیکھ لے۔ اور ایک وہ عام چیز ہے، وہ قانونی ہے۔ چاہے تقلیل ہو، تکثیر ہو کہ منکرات کو دنیا سے مٹایا جائے، عریانی، بے حجابی، بے حیائی، اس کے کارخانے بند کئے جائیں۔ یہ قوت اعتدال پر آجائے گی۔

موجودہ تمدن جو مغرب کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک اسلامی تمدن کی ضد ہے۔ یہاں نگاہ بازی حرام، وہاں نگاہ بازی تمدن کا جز یہاں اجنبیہ سے خلوت بالکل ممنوع، وہاں تمدن کا جز، وہاں اگر کسی شخص کی بیوی اندر ہے، اور باہر کسی غیر مرد کے جوتے پڑے ہوئے ہیں تو اسے حق نہیں ہے کہ وہ مداخلت کرے، اسے بیوی کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں ہے۔ اندر نہیں جاسکتا۔ ایک تمدن ہے، غرض اس بارے میں یہ اسلامی تمدن کی بالکل ضد ہے۔

تمدنی مشکلات...... اب مشکل یہ ہے کہ تمدن تو وہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم اسلامی جزئیات کا جوڑ لگائیں۔ وہ جوڑ لگے کیسے؟ وہاں تمدن کی بنیاد نفسانیت اور نفسانی خواہشات ہیں۔ یہاں تمدن کی بنیاد اخلاق اور روحانیت پر ہے کہ اخلاق اعلیٰ ہوں، کردار بلند ہو، ہر شخص خوفِ خداوندی اور تقویٰ وطہارت کی تصویر ہو۔ غرض یہاں کی بنیاد الگ اور وہاں کی بنیاد بالکل الگ۔ وہاں مقصودِ اصلی عیشِ دنیا ہے۔ یہاں مقصودِ اصلی عیشِ آخرت ہے۔ بقدرِ ضرورت شریعت نے دنیا کمانے کی بھی اجازت دے دی۔ چوں کہ یہ ایک دوسرے کے ضد ہیں، اس لئے ایک

میں دوسرے کا جوڑ کیسے لگے؟

وعظ ونصیحت سے شخصی تبدیلی آتی ہے......اب وعظ ونصیحت آتی ہے، کوئی بے چارہ اللہ سے ڈرنے والا ہے، وہ مان لیتا ہے، لیکن محض وعظ ونصیحت سے تمدن میں انقلاب نہیں آ سکتا۔ انقلاب تو قوتِ قہری سے آتا ہے۔ بعض چیزیں طاقت سے پیدا کی جاتی ہیں، محض وعظ ونصیحت سے پیدا نہیں ہوتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام میں خلافت نہ رکھی جاتی۔ چوں کہ جامع اور اجتماعی دین ہے۔ اس واسطے اس کے اندر خلافت ہے، حدود وتعزیرات ہیں. چوں کہ غرض بہت سی چیزوں کا انسداد قوت کرتی ہے، وعظ ونصیحت نہیں کرتی۔ وعظ ونصیحت سے بہت سے بہت کوئی عبادات کی طرف متوجہ ہوگیا، معاملات سچے کر لئے لیکن یہ کہ زمانے کے اندر تمدّنی انقلاب برپا ہوجائے، یہ محض وعظ سے نہیں ہوتا، قوّت سے ہوتا ہے۔

خلافتِ اخلاقی......ایک خلافتِ عامّہ ہے جیسے خلفاءِ راشدین کی خلافت، جو طاقت ور خلافت ہے۔ اور ایک خلافتِ اخلاقی ہے جیسے کسی شیخ نے اپنے مریدین کو خلافت دے دی۔ وہ خلافتِ باطنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کی اصلاح کرو لیکن زمانے کو بدل دو، یہ قبضے میں نہیں ہے۔ اور یوں کوئی روحانیت والا اللہ تعالیٰ پیدا کرے جو سارے عالم کو بدل ڈالے، تو اسے قدرت ہے جیسا کہ ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ اتنی عظیم روحانی قوّت ہوگی کہ پوری دنیا کا تمدّن بدل جائے گا اور انقلابِ عام پیدا ہوجائے گا، سب میں خوفِ خداوندی، خدا ترسی پیدا ہوجائے گی اور سب اتقیا بن جائیں گے۔ چناں چہ فرمایا گیا کہ آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلے گا تو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا کہ میرے گھر میں خوب تموّل ہے۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک انگور کے خوشے میں پورا کنبہ سیر ہوجائے گا۔ تو عدلِ کامل جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو پھر دنیا میں برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ ظلم کے ساتھ برکات کا ظہور نہیں ہوتا۔ غرض خلافت عامّہ اور چیز ہے۔ اسے خلافتِ کبریٰ کہتے ہیں۔ خلافتِ صغریٰ یہ ہے کہ ایک شخص پر آپ کو اطمینان ہوا کہ اس کا قلب صحیح ہوگیا اور یہ اپنی حد تک دوسروں کو بھی صحیح بنائے گا۔ آپ نے خلافت دی تو یہ خلافتِ باطنی ہے خلافتِ عامّہ نہیں ہے۔

علامتِ ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ......ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ کا وقت تو متعیّن نہیں کیا گیا، اس کی علامتیں بتلائی گئی ہیں، جب یہ علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوں سمجھو کہ ظہورِ مہدی قریب ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ "مُلِئَتِ الدُّنْيَا ظُلْمًا وَّجَوْرًا." ① پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہوگی۔ عدل اور سکونِ قلب کا کہیں نشان نہیں ہوگا۔ آثار تک نہیں ہوں گے، ظلم وزیادتی سے دنیا بھری ہوئی ہوگی اور یہ حالت عام ہوگی۔ کسی خطے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یا جیسے فرمایا گیا کہ عرب میں سونے کا ایک پہاڑ ظاہر ہوگا۔ وہ ظہورِ مہدی کا وقت ہوگا۔ تو ایسی کچھ علامتیں بتلائی گئی ہیں۔ مدت متعیّن نہیں کی گئی، وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کب ظہور ہوگا۔ جیسے قیامت کی علامات بتلائی

① السنن لابی داؤد، کتاب المهدی، ج:۲، ص: ۵۰۹، رقم: ۴۲۸۲.

گئیں، وقت نہیں بتلایا گیا۔

ذرائع یقین...... جس درجے میں آپ پہنچ سکتے ہیں پہنچیں، یہ جو منجّم ہیں، یہ اٹکل پچو کے تیر لڑاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جوانمردی تو یورپ والوں نے کی کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر چاند پر پہنچ گئے۔ یا تو طاقت ہو وہاں پہنچ کر حالات معلوم کیجئے۔ باقی فنی اصول سے جو اٹکل پچو حالات بیان کرتے ہیں، وہ ظنی چیزیں ہیں، کوئی قطعی چیز نہیں ہے۔ اس سے روک دیا گیا۔ اس لئے کہ یقین کا ذریعہ یا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آنکھ سے دیکھ لے یا مخبرِ اسلام صادق کی خبر ہوتی ہے۔ جو آنکھ سے زیادہ یقینی ہے، تو یا تو انبیاء علیہم السلام خبر دیں یا پھر آنکھ سے دیکھ لیں۔ باقی یہ کہ فلاں فلسفی یوں کہتا ہے، فلاں یوں کہتا ہے، یہ کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کہے گا تو ہم بھی اس کے مقابلے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری رائے دوسری ہے۔ تو رائے پر دین کا مدار تھوڑا ہی ہے۔ یہ چیز فنِ نجوم سے تعلق رکھتی ہے اور اسے ظنّی کہا گیا ہے کہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ صحیح بھی ہو جاتی ہے، غلط بھی ہو جاتی ہے۔ قطعی بات وہی ہے جو اللہ ورسول فرمائیں یا پھر آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ آدمی کیوں مخمصہ میں پڑے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کا حکم...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَاِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ① دین کی جو بات بھی اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے ہیں، وہ وحی ہوتی ہے، اس کا ماننا فرض ہے، اس میں اس چیز کی نفی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے بھی نہیں ہوتی تھی بہت سی چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی رائے بھی دی ہے جس کا تعلق وحی سے نہیں تھا۔ بہت سی تدابیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عقلی طور پر بتلائی ہیں بہت سے مشورے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر دیئے ہیں۔ اصول تو یہ ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے فرمائیں وہ واجب العقیدہ ہے۔ ماننا فرض ہے اور جو رائے سے فرمائیں اس کا ماننا فرض نہیں ہے، یہ الگ چیز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور محبت کی وجہ سے آپ اسے بھی حکم ہی سمجھیں لیکن قانوناً اس کا ماننا واجب نہیں ہے۔

اس رائے پر عمل نہ کرنا یہ تو ممکن ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ رائے معاذ اللہ غلط تھی، یہ بے ادبی ہے۔ اس سے بچنا لازمی ہے، ماننا نہ ماننا اختیاری ہے۔ لیکن تنقید، توہین یا تنقیص، وہ کسی طرح سے جائز نہیں خواہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی ہو، وہ بھی عظمت کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔

جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باندی تھیں، ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے تھا۔ خاوند بیوی میں موافقت ہوتی نہیں تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں آزاد کر دیا اور مسئلہ یہ ہے کہ منکوحہ باندی آزاد ہو تو نکاح اس کے قبضے میں آجاتا ہے چاہے نکاح باقی رکھے چاہے فسخ کر دے۔ مناسبت تھی نہیں، بریرہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ میں نکاح فسخ کروں اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ ان کے سو جان سے

---

① پارہ:۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ:۳،۴.

عاشق تھے، وہ جگہ جگہ روتے پھرتے کہ نکاح فسخ نہ کرے مگر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں مانا۔ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یارسول اللہ! آپ ہی نے نکاح کیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بریرہ کو حکم دیں کہ نکاح فسخ نہ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ اے بریرہ! نکاح فسخ نہ کرو۔ وہ بہت ذہین تھیں، انہوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کی ذاتی رائے؟ فرمایا! حکم شرعی نہیں۔ مشورہ ہے عرض کیا۔ میں تو نہیں مانتی۔ چناں چہ نکاح فسخ کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے پیش کریں تو ماننے نہ ماننے میں آدمی مختار رہتا ہے۔ ایک ہے محبت کا تقاضا، رائے کو بھی آپ حکم کے درجے میں مانیں مگر قانوناً ماننا لازم نہیں۔ ①

تمدنی چیز کے بارے میں آپ کی رائے کا حکم ...... بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کی باتیں ثابت ہیں۔ مشورے اور ذاتی رائے بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ظاہر بھی فرمایا۔ حدیث میں ارشاد ہے: ''اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ'' ② مجھے بھی ایسے بھول چوک ہوتی ہے۔ جیسے تمہیں ہوتی ہے، میری ذاتی رائے میں تو آپ مختار ہیں لیکن وحیء خداوندی سے جو کہوں گا. وہ قطعی ہے۔ اس میں غلطی ناممکن ہے۔ اس کا ماننا فرض ہے۔ جیسے ''تابیرِ نخل'' کے بارے میں عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ پیوند لگاتے تھے۔ اور انہوں نے نر و مادّہ سمجھ رکھے تھے۔ اور جب پیوند لگاتے تھے تو پھل آتا تھا۔ پیوند نہ لگائیں تو پھل نہیں آتا تھا۔ آپ نے خیال فرمایا کہ یہ کوئی عقیدہ ہے جو انہوں نے جما رکھا ہے کہ یہ نر ہے یہ مادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قلم مت لگاؤ۔ اس کے بعد پھل نہ آیا۔ عرض کیا گیا۔ یارسول اللہ! اس دفعہ تو پھل نہیں آیا؟

تب معلوم ہوا کہ معاشرے کی ایک تمدّنی چیز ہے کہ درخت کو درخت سے ملا کر جو قلم باندھتے ہیں تو پھل پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسباب حسّیہ میں سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ......'' ③ بھائی! یہ دنیوی معاملہ ہے۔ تم اس میں زیادہ بصیرت رکھتے ہو۔ جو مناسب سمجھو کرلیا کرو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی ٹوٹکا یا عقیدہ ہے۔ معلوم ہوا عقیدہ نہیں بلکہ یہ حسی اسباب میں سے ایک چیز ہے، اس لئے اجازت دے دی۔ غرض ایک انبیاء علیہم السلام کی رائے اور ذاتی مشورہ ہے، اس میں انسان ماننے نہ ماننے میں مختار ہے۔ اور ایک ہے حکمِ شرعی۔ جو وحی سے ہوتا ہے۔ وہ واجب الاطاعت ہے۔ تو بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے سے بھی عمل فرماتے ہیں مگر جب وحی روک دیتی ہے، رک جاتے ہیں۔

نبوّت، مجموعۂ بشریّت وملکیّت ...... انبیاء علیہم السلام میں ایک حیثیت بشریّت کی ہے اور ایک ملکیّت کی۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی فی زوج بریرة . ج:۱۶، ص: ۳۳۲.

② الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوة ،باب السهو فی الصلوة ص: ۲۷۶،رقم: ۱۲۷۴ .

③ الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا دون ماذکره من معایش الدنیا،ص:۱۰۹۳، رقم: ۶۱۲۶.

بشریت میں جو عوارض بشر پر آتے ہیں، ان پر بھی آتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت و مرض وغیرہ۔ اور ایک ملکیت ہے کہ حق تعالیٰ وحی اتاریں، اپنا مقرب بنالیں، وہاں انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے بھی بالاتر ہیں کہ فرشتوں کا بھی وہ مقام نہیں، ان دونوں مقاموں کو فرمایا گیا کہ:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ ① میں تمہارے جیسا بشر ہوں، ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ نبوت کی عظمت ہے۔ ایک بشری حیثیت ہے۔ ایک نبوت کی حیثیت ہے۔ بشری حیثیت میں سب لوازم بشریت ان پر آتے ہیں اور ملکیت کی حیثیت میں وحیء خداوندی آتی ہے۔ اور وہ مقربانِ الٰہی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بشریت کو تو لے لے اور یوحی الی کو نہ لے اور معاذ اللہ گستاخی کرنے لگے یہ عین کفر ہے۔ اور اگر کوئی شخص محض یوحی الی کو لے لے اور بشریت کی نفی کردے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں تھے۔ یہ بھی کفر ہے۔ درمیان میں بات ہے کہ بشر بھی مانے مگر عام بشروں جیسا بشر نہیں صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص بشر جس پر اللہ کی عنایات نازل ہیں، وحی ہے، معجزات ہیں۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں پیدائش کے لحاظ سے اور نبی ہیں عطائے خداوندی کے لحاظ سے، اس کی عظمت فرض ہوگی اور بشریت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ماننا بھی فرض ہوگا۔ دونوں چیزیں ہیں۔

حدیثِ ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: ”قَالَ اَضَافَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْاَسْوَدَيْنِ التَّمَرِ وَ الْمَآءِ “(اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ) ② ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ضیافت کی دو اسودین پر۔ کھجور اور پانی پر، کھجور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھا کر اُس مجھے کھلایا اور پانی پی کر مجھے پلایا اور یہ حدیث بیان فرمائی“۔ ”مَنْ اَضَافَ مُؤْمِنًا فَكَاَنَّمَا اَضَافَ اٰدَمَ. “ جس نے اخلاص کے ساتھ کسی ایک مومن کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کی ضیافت کی، اس پر جو اجر ملتا وہ اسے اجر ملے گا۔ آگے فرماتے ہیں۔ ”وَمَنْ اَضَافَ مُؤْمِنَيْنِ فَكَاَنَّمَا اَضَافَ اٰدَمَ وَحَوَّآءَ. “ ”جس نے دو مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے آدم وحوا علیہما السلام دونوں کی ضیافت کی“۔

اس کے بعد فرمایا جس نے تین مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسا جبریل و میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کو مہمان بنایا۔ اور جس نے چار کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کریم کو پڑھ لیا، یہ کتابیں پڑھنے پر اس کو جو اجر ملتا۔ اس نوعیت کا اجر اس کو ملے گا۔ جس نے پانچ آدمیوں کی مہمانی کی وہ ایسا ہے جیسے اس شخص کو اجر ملتا جو اوّلِ خلق سے برابر جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھتا رہا۔ ہزاروں برس نماز پڑھنے پر جو اجر مرتّب ہوتا، وہ اجر پانچ آدمیوں کی دعوت کرنے پر ملے گا۔

اس کے بعد فرمایا جس نے چھ آدمیوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے اولادِ اسماعیل میں سے چھ غلام شدہ

---

① پارہ: ۱۶ سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۱۰۔ ② الحدیث اخرجہ علی المتقی الھندی، وضعفہ، کنز العمال، ج: ۹ ص: ۲۶۹.

انسانوں کو آزاد کر دیا۔ جس نے سات آدمیوں کی دعوت کی تو گویا جہنم کے سات دروازے اس پر بند کر دیئے گئے۔ گویا اس کا جہنم میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اجر مرتب ہوا۔ اور جس نے آٹھ آدمیوں کی ضیافت کی، اس کے لئے گویا جنّت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے اور جس نے نو آدمیوں کی دعوت کی وہ ایسا ہے جیسے اوّلِ خلق سے گناہ گاروں سے جتنے گناہ ہوئے ہیں، اس نے اتنے اجر کما لئے گناہوں کی قید اس لئے لگائی کہ نیکیاں کرنے والے کم ہوتے ہیں، گناہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ تو مبالغہ اسی میں تھا۔ اور فرمایا جس نے دس کی ضیافت کی تو حق تعالیٰ اس کے لئے ان لوگوں کا اجر لکھیں گے جنہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، حج کیا، عمرہ کیا اور قیامت تک کرتے رہیں گے، اتنا عظیم اجر دیا جائے گا۔

گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ: مسلمانوں میں باہمی تعاون اور باہمی امداد اور اعانت کا جذبہ پیدا ہو۔ ایک ہے خود تنہا نماز پڑھ لینا، وہ سب اپنے لئے ہے۔ گویا نماز پڑھ کر اپنی نجات کمالی، اور ایک مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کا سامان کیا جس سے پوری امّت میں قوّت پڑتی ہے۔ اس کے اسباب میں سے بھی ہے کہ ضیافت و مہمانداری بھی ہو۔ تعاون اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ''وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَاكَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ. '' ① اللہ اپنے بندے کی مدد پر رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔ تو نماز تو ذاتی فعل ہے اور دوسرے کی مدد کرنے کا تعلق امّت سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ امّت کے اندر اجتماعیّت پیدا ہو۔ تفریق کی بجائے اتّحاد باہمی ہو۔ جس سے قوت پیدا ہو۔ اعداء اللہ مغلوب ہوں، دین کا کلمہ بلند ہو۔ اس واسطے اس عمل کی زیادہ قدر و قیمت بیان کی گئی۔ ورنہ بظاہر دیکھنے میں سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے حج کیا، عمرہ کیا اور ایک نے دس آدمیوں کو کھانا کھلا دیا۔ بظاہر تو بڑی بات نہ تھی لیکن اگر بنیاد پر نظر ڈالی جائے تو ہزار نمازیں بھی پڑھے گا تو اس کی ذات کے لئے ہیں۔ مہمانداری، تعاون اور ہمدردی کرے گا، اس سے امّت میں اجتماعیّتِ عامّہ پھیلے گی اور مقصودِ شریعت سے یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت، باہمی اخوت رہے تا کہ اعداء اللہ ضعیف ہوں اور ان کے سامنے قانونِ الٰہی پیش کیا جا سکے، اور اگر خدانخواستہ اعداء اللہ غالب آ جائیں تو وہ اپنا کلمہ آپ کے سامنے پیش کریں گے، آپ کا کلمہ تھوڑا سنیں گے قوت کی وجہ سے آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے۔ تعاون تناصر اور باہمی قوت کا اثر پوری امۃ تک پہنچتا ہے۔ اور حج و عمرہ کا اثر ایک آدمی کی ذات تک پہنچتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا عمل ہو۔ اس واسطے اس اجر کو بڑھایا گیا، اگر ایک آدمی نے ہزار حج کئے لیکن ایک کام ایسا کیا کہ اس سے امّت مل گئی، اس کا اجر ہزار حج سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ مقصود اجتماعیّت ہے۔ اس واسطے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھلانا کیسے بڑھ گیا؟

غرض یہ حدیثِ ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مذکور ہے کہ کھجور کھا کر باقی انہیں کھلائی اور پانی پی کر بقیہ انہیں پلایا۔ پھر حدیث بیان فرمائی۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الذكر و الدعا، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، ص: ۱۱۴۷، رقم: ۶۸۵۳.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ میری ضیافت کریں اور یہ حدیث مجھے سنائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی ضیافت کی، کھجور کھلائی۔ پانی پلایا اور حدیث بیان کی۔ آگے شاگرد در شاگرد مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ پہنچ گیا۔ تو مولانا عبدالقیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی ضیافت کی کھجور کھا کر انہیں کھلائی اور پانی پلایا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میرے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ کھجور کھا کے اُسی کھلایا اور پانی پی کر پلایا اور یہ حدیث سنائی اور اس کی اجازت دی۔

اب یہ دو حدیثیں ہوگئیں۔ ایک مسلسل بالمصافحہ اور ایک مسلسل بالماء والتمر۔ قولی طور پر آپ نے حدیث سن لی، اب عملی حصہ رہ گیا کہ ہر شخص جس کو اجازت دی جائے اس سے مصافحہ کیا جائے اور کھجور کھا کر کھلائی جائے اور پانی پی کر پلایا جائے۔ اب یہاں اتنے آدمی ہیں کہ اتنی کھجوریں تو میں نہیں کھا سکتا کہ آدھی کھا کر انہیں کھلاؤں۔ اس واسطے ایک آدھ کھجور کھا کے میں ان کھجوروں میں شامل کردوں گا، اس سے انشاء اللہ برکات شامل ہوں گی۔ پانی پی کر جگ میں ڈال دوں گا، اس میں سے سب حضرات پی لیں۔ ورنہ ہر گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ پیوں تو پچاس گھونٹ میں معلوم نہیں پیٹ کہاں پہنچے گا۔

اسلام کا نظامِ اجتماعیّت ...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِـالْجَمَاعَةِ'' ① اسلام نہیں ہے مگر اجتماعیّت کے ساتھ۔ اسلام نام ہی اجتماعیّت کا ہے۔ اسی واسطے کوئی عبادت ایسی نہیں جس میں اجتماعیت نہ ہو۔ نماز رکھی تو اس میں امام رکھا۔ اقتدار رکھی۔ اجتماع رکھا۔ تاکہ مل کر نماز ادا کریں۔ اسی طرح اگر زکوٰۃ رکھی۔ تو اس میں اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہو تو اسے بیت المال میں داخل کیا جائے۔ وہ عام غرباء میں اس کو تقسیم کرے۔ تاکہ پوری امت تک اس کا اثر پہنچے۔ اب حکومت اسلامی نہیں ہے تو علماء اور اہلِ فتویٰ کو اس کا قائم مقام بنادیا گیا تاکہ ان کے فتویٰ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

اسی طرح حج ہے تو وہ بھی اجتماعیّت کا نام ہے۔ اس میں بھی امام ہے۔ اور امام کے اشاروں پر سب حج کے افعال ادا ہوتے ہیں جہاد ہے، اس میں امام و امیر رکھا گیا، جب تک وہ حکم نہ دے نہ آپ آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے عام گھروں کے اندر فرمایا گیا کہ: ''كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ.'' ② تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا بادشاہ ہے۔ اسی سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعایا (گھروالوں) کا کس طرح سے بندوبست کیا، ان کی تربیّت شرعی کی تھی یا نہیں؟ یہاں بھی اجتماعیّت قائم کردی۔

اسی طرح سفر میں جائے تو اس بات کو سنت قرار دیا کہ چند آدمی ایک امیر بنالیں، اس کے احکام پر عمل کریں تاکہ سفر نظم کے ساتھ ہو۔ غرض اسلام نے ہر چیز میں نظم رکھا، تنظیم و اجتماعیّت رکھی ہے۔ اس لئے فرمایا: ''لَا اِسْلَامَ

① هذا من قول عمرؓ: السنن للدارمي، المقدمة، باب ذهاب العلم، ج: ١، ص: ٢٨٣، رقم: ٢٥٧.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب في القرى والمدن، ص: ٧٠، رقم: ٨٩٣.

اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ ." اسلام بن نہیں سکتا جب تک جماعتی رنگ نہ غالب آ جائے ۔جتنی چیزیں اجتماعیت سے متعلق ہیں ان کے اجر کو انفرادی عبادتوں سے زیادہ بڑھادیا گیا ہے تا کہ پوری جماعت اس کی لپیٹ میں آ جائے ۔

منصب افتاء کی نزاکت...... بہت سی جزئیات ایک دوسرے کے مشابہہ ہوتی ہیں اور احکام جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کے الگ اور اُس کے الگ۔ مفتی پہچان سکتا ہے کہ ان جزئیات میں کون سا باریک فرق ہے جو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہو گیا ہے، چوں کہ مفتی کے سامنے تمام جزئیات ہوتی ہیں اور فن سے واقف ہیں تو جزئیات میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا اور عمل کے طور پر مسئلہ بتلانا ہے۔ ہر پڑھا لکھا بلکہ ہر مدرّس بھی یہ کام نہیں کرسکتا۔ یہ مفتی کا کام ہے۔اسی کو اللہ تعالیٰ یہ بصیرت دیتے ہیں۔اسی لئے بزرگوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ فتویٰ دینے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا تو بتلا دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسئلہ غلط بتلا دیا گیا۔سخت پریشان، گرمی اور بارش میں سارے شہر میں اسے ڈھونڈتے پھرے۔ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شخص رات کو ملا۔تب اس سے کہا کہ بھائی! میں نے مسئلہ غلط بتلایا تھا اصل مسئلہ یہ ہے، جب جا کے انہیں تسلی ہوئی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے یہاں رسالہ ''النور'' میں ایک مستقل باب ''ترجیح الراجع'' تھا۔اگر کسی مسئلہ کے بیان میں کوئی غلطی ہوئی تو شائع کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، حکم یہ ہے اور یہی راجح ہے۔لوگ اسی پر عمل کریں۔ بہر حال سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا ہے۔یہ مفتی کا کام ہے۔ ہر مدرس یا ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

منصبِ تدریس وتبلیغ...... اس سے زیادہ آسان درس دینا ہے۔درس میں کتاب سامنے ہوتی ہے، کتاب کے مطابق مضمون بیان کر دیا، کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی، اس سے زیادہ آسان تقریر کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایک موضوع پر جو یاد تھا، علمی طور پر کہہ دیا۔اور اس سے زیادہ آسان ہے وہ تقریر جو علمی نہ ہو۔ محض دنیاداری کی باتیں۔ اِدھر اُدھر کے واقعات لیکچر میں کہہ دیئے، یہ سب سے زیادہ آسان ہے۔گزرے ہوئے واقعات یوں ہوا تھا، یوں ہوا تھا۔ بیان کر دیا، اور اس سے بھی زیادہ آسان اعتراض کر دینا ہے۔اس کے لئے کسی تکلیف کی ضرورت نہیں، جس پر چاہا اعتراض کر دیا، جس پہ چاہا شبہ وارد کر دیا۔ جاہل سے جاہل اعتراض کرسکتا ہے۔اس میں کسی علمیت کی ضرورت نہیں۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ بعض حضرات مسائل پوچھتے ہیں۔ میں عرض کر دیتا ہوں کہ بھئی مفتی صاحب سے پوچھو۔ میں نہیں بتلا سکتا۔ مسئلہ کا علم بھی ہو تب بھی جرات نہیں ہوتی کہ مسئلہ بیان کر دوں۔مفتی کے سامنے سب چیزیں متحضر ہوتی ہیں۔بعض لوگ برا مانتے ہیں کہ مسئلہ نہیں بتلایا۔ اگر چہ مسئلہ نہیں بتلایا مگر حوالہ تو دے دیا کہ مفتی سے پوچھو۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ایک مسئلہ بتلائے ہی۔ جو بتانے والے ہیں وہ بتلائیں گے، جن کو اس کا فن اور سلیقہ ہے۔ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اس سے بچتا ہوں کہ فتویٰ دوں۔ یہ کام میرا نہیں ہے۔

علم وعمل کا امتیاز...... ایک ہے کسی مسئلہ کی علمی تحقیق کر دینا، وہ الگ چیز ہے، اس سے انکار نہیں ہوتا، جو اپنے

ذہن میں ہو وہ تحقیق کر دی۔ لیکن یہ کہ عمل کیا کرو؟ یہ کام مفتی کا ہے وہ فتوی دے گا کہ فلاں پہلو پر یوں عمل کرو، فلاں پہلو پر یوں عمل کرو۔ اس لئے اگر بعض حضرات سوال کریں اور میں مسئلہ نہ بتلاؤں، وہ برا نہ مانیں۔ ضروری نہیں کہ مجھے مسئلہ کا علم بھی ہو۔ اور اگر علم بھی ہو تو میں احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ فقہی جزئیات پر میری زیادہ نظر نہیں ہے۔ یہ اس کی ہو سکتی ہے جو رات دن اسی میں پڑا ہوا ہو۔ یہ میں نے بطور تنبیہ اور اصول کے عرض کر دیا۔ اس میں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کا ایک مقام ہوتا ہے۔ میں نہیں ہوں اس قابل کہ مسئلہ بتلاؤں۔ کیا ضرورت ہے زبردستی پوچھا ہی جائے، کسی اہل سے پوچھا جائے۔

حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اجماعی مسئلہ ہے...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کا لوگ انکار کیوں کرتے ہیں؟ میرے خیال میں اجمالاً اتنی بات ہے کہ ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کا مسئلہ تو مجمع علیہ ہے۔ یعنی امّت کے اندر کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ اس کی کیفیت میں گفتگو ہے کہ حیات ہے تو کس کیفیت اور کس نوعیت کی ہے۔ تو کیفیات میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اس کو اصل مسئلہ میں اختلاف کنندہ نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں تک انبیاء علیہم السلام کی حیات کا تعلق ہے تو صحیح حدیث موجود ہے۔ ''اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ'' ① ''انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں''۔ یا فرمایا گیا: ''وَنَبِيُّ اللّٰهِ حَيٌّ يُّرْزَقُ.'' ② اللہ کے نبی زندہ ہیں۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس حیات سے مراد اگر وہ عمومی حیات ہے جو برزخ میں عام طور پر ہوتی ہے تو پھر اس تخصیص ذکری کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی پھر یہ کہنا کہ ''نَبِيُّ اللّٰهِ حَيٌّ یا اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَآءٌ'' اس کی ضرورت نہیں۔ یوں کہا جا سکتا تھا۔ ''اَلْمُسْلِمُوْنَ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ یا اَلنَّاسُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ......'' اس لئے کہ حیاتِ برزخی میں سب کے سب شریک ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص کیا جانا اور اس پر حیات کا لفظ بولا جانا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی حیات ہے جو عوام کو حاصل نہیں۔

حیاتِ کامل...... پھر یہ کہ ''حیات'' کے لفظ کو مقید کر کے نہیں لایا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ انبیاء علیہم السلام بحیثیت اس کے حیات ہیں۔ یا فلاں جہت سے حیات ہیں بلکہ مطلقاً حی کہا گیا، تو جب بھی کوئی چیز مطلق بولی جائی گی، اس کا فرد کامل مراد لیا جائے گا پھر فرد کامل کی صورت سمجھنے کی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم جسے دنیا میں زندگی کہتے ہیں وہی وہاں سمجھیں کہ وہ حی اور زندہ ہیں اور وہ اسی انداز کی زندگی ہے جیسے دنیا میں زندہ ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص اور حیات کے لفظ کا اطلاق۔ تو ایک تخصیص اور ایک اطلاق، تخصیص ذکر کی اور خصوصیتِ بیانی اور لفظِ حیات کا اطلاق۔ یہ دونوں مل کر یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ کوئی خاص اور اعلیٰ قسم کی حیات ہے

① مسند ابی یعلی، ثابت البنانی عن انس، ج: ۷ ص: ۴۴۵۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للهیثمی، ج: ۸، ص: ۱۴۴۔

② السنن لابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاته ودفنه، ص: ۲۵۷۵، رقم: ۱۶۳۷۔

جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ اب یہ کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟

قبضِ روح کا امتیاز...... تو ہم کیفیت سے واقف نہیں۔ نہ ہم اس کا پتہ دے سکتے ہیں۔ نہ ہمارے بس کی بات ہے۔ اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی ممات بھی ہماری جیسی نہیں، ان کی حیات بھی ہماری جیسی نہیں، ان کی ممات میں تو یہ بھی ہے کہ ملک الموت آ کر ان سے اجازت لیتے ہیں اور جب تک وہ اجازت نہ دیں اور ان کے علم میں نہ لایا جائے کہ وقت آ رہا ہے اور ہم قبضِ روح کے لئے آ رہے ہیں۔ اس وقت تک ممات کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ عامۃ المومنین سے اس قسم کی کوئی اجازت یا استیذان نہیں کیا جاتا۔

دستِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... پھر یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں جو حیات ہے تو وہ اور لوگوں کی جو دنیوی حیات ہے، اس کے مشابہ نہیں۔ تو جب حیات مشابہ نہیں تو ممات بھی مشابہ نہیں ہوسکتی۔ یوں تو فرمایا گیا ﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ① میں تم جیسا ایک بشر ہوں۔ لیکن اس مماثلت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور ہماری بشریت میں کتنا فرق ہے۔ یہ سیرت کے احوال دیکھنے سے واضح ہوگا۔ ہم بھی کہیں گے کہ ہمارے ہاتھ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بھی ہاتھ ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہیں کہ کوئی معنوی اور روحانی نہیں۔ لیکن ہاتھوں کے اندر خصوصیت سے امتیازی شان موجود ہے جو عام ہاتھوں کو حاصل نہیں۔ ہم اگر کسی کے چپت ماردیں تو چوٹ لگ جائے گی۔ انبیاء علیہم السلام اگر کسی کے چپت مارتے ہیں تو چوٹ لگے یا نہ لگے، لیکن اس سے معنوی حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم اگر آپ کے سینے میں ہاتھ ماردیں تو آپ چوٹ کھائیں گے اور ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا تو ان کو شرحِ صدر نصیب ہوگیا اور ان کے سامنے آسمانوں تک کی چیزیں روشن ہوگئیں۔

جیسے کہ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: غالباً حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ اپنے محلّے کے امام تھے، انہوں نے نماز پڑھائی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی قرأت سنی، تو انہوں نے اپنے قبیلے کے لغت پر قرآت کی۔ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ لغتِ قریش کی قراءت جانتے تھے۔ وہ تو ''اَشَدُّهُمْ فِیْٓ اَمْرِ اللّٰهِ'' ہیں۔ تو خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشکیں کس کے کھینچتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا۔ ''یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے اس منافق کی گردن قلم کردوں، اس لئے کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتا ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ پڑھو۔ انہوں نے وہ آیت اپنی لغت پر سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''هٰكَذَا اُنْزِلَتْ...... '' یوں ہی نازل ہوا ہے۔ ''اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ. '' ② سات لغت پر قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جس

① پارہ: ۱۶، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۱۱۰.

② السنن للنسائی، کتاب الافتتاح، باب جامع ماجاء فی القرآن، ص: ۲۱۴۷، رقم ۹۳۹.

میں بنی تمیم، طے قریش وغیرہ کی لغات شامل ہیں۔ یہ جو عرب میں سات فصیح لغات ہیں، ان ساتوں میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس میں لفظوں میں تغیر ہوتا تھا۔ معنی اور مفہوم میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پڑھا فرمایا: ''ھٰکَذَا اُنْزِلَتْ ......'' ''یوں ہی نازل ہوا ہے''۔

اس سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سینے میں کچھ ریب اور شک کی سی کیفیت پیدا ہوئی کہ یہ کس قسم کا قرآن ہے۔ جس طرح جو پڑھے اسے کہہ دیا جاتا ہے ھکذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔ جیسے شبہ یا وسوسہ پیش آتا ہے۔ ایسی کیفیت پیدا ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''یَا ابْنَ الْخَطَّابِ!'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ لگتے ہی اتنا عظیم شرح صدر ہوا گویا آسمان میرے اوپر روشن ہو گئے۔ اور وہ جو ریب وشک اور وساوس گزر رہے تھے وہ قطعاً ختم ہو گئے۔ تو میں اور آپ کسی کے ماردیں تو چوٹ لگے گی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ مارا تو شرح صدر کی دولت نصیب ہو گئی۔ ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ'' بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ مماثلت نوعیت کے اندر ہے۔ مگر شخصی فرق وہ اتنا ہے کہ ہاتھوں تک میں نمایاں ہے۔ ①

لسانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ...... میری اور آپ کی زبان گوشت پوست کی ہے، انبیاء علیہم السلام کی زبان بھی گوشت پوست کی ہوتی ہے۔ لیکن میں اگر کوئی غذا کھاؤں تو اس سے کھٹے اور میٹھے کا پتہ چل جائے گا۔ جو ایک مادّی ذوق ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تناول فرماتے تھے تو زبان حلال وحرام کا بھی پتہ چلا لیتی تھی۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ انصار میں کہیں میت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنازے میں تشریف لے گئے۔ جب دفن سے فارغ ہوئے تو میت کے وارثوں نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ! ہمارے گھر جا کر کچھ تناول فرمالیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا، تشریف لائے، گوشت لا کے رکھا گیا اور لوگ بھی کھانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چکھا۔ اور ارشاد فرمایا یہ غصب کا مال معلوم ہوتا ہے۔ بات یوں کھلی کہ جس نے دعوت دی تھی اس عورت نے کہا، میں نے خاوند کو بھیجا کہ فلاں جگہ سے جا کر بکری خرید لا، تا کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں۔ لیکن وہاں سے بکری دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد میں نے ایک پڑوسی کے پاس دام بھیجے کہ تو خرید کر لا۔ اس کو بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ تو میں نے پڑوسی کی بیوی سے کہا کہ تو کہیں سے بکری لا دے۔ اس نے خاوند کی بکری جو اس کی ملک تھی، پکڑ کر بلا اجازت بھیج دی۔ میں نے ذبح کر کے پکادی، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک نے پہچانا کہ مال مغصوبہ ہے۔ جو بلا اجازت کے ذبح کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ''قیدیوں کو کھلا دو، ہم یہ کھانا نہیں کھائیں گے''۔

تو زبان کے اندر مماثلت بھی ہے یعنی گوشت پوست اور مادّی ہونے میں، اور عدم مماثلت بھی ہے اس چیز میں کہ ہماری زبان فقط حاسۂ ذوق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ذوق کے ساتھ ساتھ حاسۂ

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب من لم یرباساً ان یقول...... ص: ۴۳۶، رقم: ۵۰۴۱.

معنویّت بھی رکھتی ہے جس سے حلّت وحرمت، جائز وناجائز یا افضل وغیر افضل کا بھی پتہ چلتا ہے۔تو مماثلت بھی ہے مگر مماثلت کے ساتھ عدمِ مثلیّت بھی ہے۔

صومِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّمَآ اَنَآ بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ......'' میں تم جیسا ایک بشر ہوں لیکن حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امت کو صوم وصال رکھنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی کہ بلا افطار روزہ مت رکھو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے، متعدد روزے رکھتے۔اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی اور خود آپ رکھتے ہیں''۔فرماتے ہیں: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ. ''① تم میں مجھ جیسا کون ہیں۔ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے، تو آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے۔''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ. ......'' میں تم جیسا بشر ہوں اور حدیث بالا میں فرماتے ہیں: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ '' تم میں مجھ جیسا کون اور کون میرا مثل ہے۔ میرے ساتھ پروردگار کا دوسرا معاملہ ہے تو مماثلت بھی ہے اور عدمِ مماثلت بھی ہے۔ مماثلت بھی ہے اور امتیازی شانیں ہر ہر عضو کے اندر بھی ہیں۔

چشمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... میری اور آپ کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مادّی آنکھ ہے، شکلیں، صورتیں ہمیں نظر پڑتی ہیں۔انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مادّی آنکھ دی گئی۔لیکن حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نماز میں بعض لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا۔اور فرمایا: ''اِنِّیْ اَرٰی خَلْفِیْ کَمَا اَرٰی بَیْنَ یَدَیَّ. ......'' تم یہ سمجھتے ہو میں دیکھتا نہیں۔ میں پشت کی جانب سے دیکھتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بینائی دو طرف کام کرتی تھی پیچھے سے بھی دیکھتی ہے اور آگے سے بھی دیکھتی ہے۔تو آنکھ آنکھ ہونے میں تو مماثلت ہے مگر آنکھ کی خصوصیات میں کوئی مماثلت نہیں۔ پیغمبر کی آنکھ دوسری ہے، امتی کی آنکھ دوسری ہے۔

حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... اسی طرح جب ایک ایک جزا ور زندگی کے ایک ایک شعبے میں مماثلت کے دعوے کے ساتھ عدمِ مماثلت اور امتیازی شان بھی موجود ہے۔ تو اگر ہم یوں کہیں کہ مجموعۂ حیات میں بے شک مماثلت ہے کہ ہم بھی زندہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو خصوصیات ہیں وہ ہمیں میسّر نہیں۔تو یہ ہم کہہ سکتے ہیں کیوں کہ زندگی کی ایک ایک جزئی میں امتیازی شان موجود ہے۔

حیات بعد الوفات کا امتیاز...... اسی طرح سے ممات کے بارے میں بھی ہم کہیں گے کہ ممات اور موت کے بعد جو حیات آتی ہے اس میں بظاہر مماثلت ہے لیکن پھر امتیازات ہیں، مرنے کے بعد ہمیں وہ حیات میسر نہیں آسکتی جو انبیاء علیہم السلام کو برزخ کی حیات میسّر آتی ہے۔

علاماتِ حیات...... اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ حیات اور زندگی کو پہچاننے کے لئے دو چیزیں ہیں جس سے آدمی

① الصحیح للبخاری، کتاب المحاربین، باب کم التعزیر والادب، ص: ۵۷۱، رقم: ۶۸۵۱.

پہچانا جاتا ہے کہ آدمی زندہ ہے۔ یعنی حسّی زندگی، ایک تو معنوی زندگی ہے کہ روح موجود ہے، وہ تو ہر انسان کو حاصل ہے، جس کی روح موجود ہے، بس وہ زندہ ہے اور روح کسی کی بھی مردہ نہیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دعوی کیا ہے کہ انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے۔ یعنی ہمیشہ سے تو نہیں تھا، پیدا کیا گیا، لیکن پیدا ہونے کے بعد اب مٹے گا نہیں بلکہ وہ زندہ رہے گا، اس کی حقیقت اور روح قائم رہے گی، چولے اور جسم بدل جائیں گے مگر اصل نفس قائم رہے گا۔ تو زندگی کے پہچاننے کی دو ہی علامتیں ہیں ایک کھانا پینا، کھاتا پیتا دیکھ کر ہم کھلے بندوں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی زندہ ہے، اور جس کا کھانا پینا بالکل چھوٹ جائے تو ہم یہی کہا کرتے ہیں کہ بھائی! اس کی زندگی کیا، یہ تو عنقریب مرنے والا ہے، اس لئے کہ اس کی زندگی کے اسباب جب مفقود ہو گئے تو زندگی کیا رہے گی، آج مر جائے، تو کھانا حسی اسباب میں بقائے حیات کی علامت ہے۔

دوسری علامت زندگی کی یہ ہے کہ ہم نقل و حرکت دیکھیں۔ اگر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ ہم اوّل وہلہ میں یہی سمجھیں گے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن اگر وہ ہل رہا ہے، حرکت کر رہا ہے، چلتا ہے پھرتا ہے، کبھی یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ یہ میّت ہے، اس لئے نقل و حرکت زندگی کی بڑی علامتوں میں سے علامت ہے۔ تو زندگی کی دو علامتیں ہوئیں۔ ایک خورد و نوش، کھانا اور پینا، ایک نقل و حرکت چلنا پھرنا، یعنی مختلف افعال کا سرزد ہونا جو حرکت کی علامت ہے اور یہ زندگی کی علامت ہے۔

اب دیکھئے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا: "اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ." انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں حیات ہیں۔ کیوں حیات ہیں؟ اس کی علامت بتلائی گئی کہ نقل و حرکت پائی جاتی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ تو ایک نقل و حرکت مادی ہے کہ ہم ترکاری خریدنے کے لئے بازار میں جائیں یا پڑھنے کے لئے کسی مدرسے میں جائیں، یہ مادّی حرکت ہے اور نماز پڑھنے لگیں، حرکت یہ بھی ہے مگر یہ روحانی عباداتی حرکت کہی جائے گی جو بازار میں جانے کی حرکت سے یقیناً افضل حرکت ہے۔ اور جو کھانے پینے کی حرکت سے یقیناً افضل ہے، کہ اللہ کے آگے جھک رہے ہیں۔ تو اس حدیث نے ثابت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، اس لئے کہ حرکت بدن حیات کے آثار میں سے ہے۔ تو حرکت وہ ہے جو کامل ترین حرکت ہے، تو عباداتی حرکت ثابت ہوئی، محض کھانے پینے کی حرکت ثابت نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ: "کَاَنِّیْ اَنْظُرُ مُوْسٰی یُلَبِّیْ." ① میں موسیٰ علیہ اسلام کو دیکھتا ہوں کہ "لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ" کہتے ہوئے میدان عرفات میں جا رہے ہیں تو انبیاء علیہم السلام گویا حج کرتے ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھتا ہوں کہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور اون اور صوف کی لگام ہاتھ میں ہے اور "لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ" پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں اور حج کر رہے ہیں۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول. ص: ۷۰۷، رقم ۴۲۱.

حدیث میں ہے کہ مطاف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص طواف کر رہے ہیں: ''مَرْبُوْعُ الْخَلْقِ '' یعنی چوڑے چکلے بدن ان کا سینہ نہایت چوڑا اور اس قدر خوبصورت اور اتنا شاداب رنگ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''کَـاَنَّـهٗ خَـرَجَ مِنْ دِيْمَاسٍ...... '' کہ یہ شخص ابھی غسل کر کے حمام سے آیا ہے اور گویا پانی اس کے بالوں سے ٹپک پڑے گا، تو اتنی تر وتازہ اور شاداب صورت، چوڑے بدن، میانہ اور ذرا پستی مائل قدر اور طواف میں مشغول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہے؟'' عرض کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں''۔ ①

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طواف کرتے ہوئے دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ'' پڑھتے ہوئے دیکھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو سرخ اونٹنی پر دیکھا کہ ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ ''پڑھتے ہو جارہے ہیں۔ اور عام طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ .'' انبیاء اپنی قبور میں سب زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ تو نماز بھی ثابت ہوئی، حج بھی ثابت ہوا۔ تو بدن کی نقل وحرکت ثابت ہوئی اور وہ حرکت جو عباداتی حرکت ہے، محض آنے جانے کی حرکت نہیں، اس سے کہیں مکمل عباداتی حرکت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: وَنَبِیُّ اللّٰهِ یُرْزَقُ. اللہ کا نبی زندہ ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ تو رزق کا دیا جانا خود دلیلِ حیات ہے کیوں کہ کھانا پینا دوسری علامت ہے، اب یہ کہ وہ رزق کیسا ہے؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس انداز کا تھا، اس کی کیا کیفیت تھی؟ اس میں پلاؤ زردہ؟ یہ اللہ جانے۔ لیکن رزق بتلایا گیا۔ تو رزق تناول کی چیز ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام گویا تناول بھی کرتے ہیں اور حرکاتِ بدنی بھی ہوتی ہیں۔ تو جیسے حرکات بدنی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں، جو عباداتی حرکت ہیں، ممکن ہے کھانا پینا اعلیٰ ہی قسم کا ہو جو جنّت کی غذا ہو۔ اس دنیا کی مادی غذا نہ ہو۔ تو جب نقل وحرکت بھی ثابت، خورد ونوش اور غذا بھی ثابت ہو تو اب حیات میں کوئی تامل باقی نہیں رہتا، کیوں کہ آثار میں سے یہی دو چیزیں ہیں جو موجود ہیں۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی حرکتِ بدن اور ان کی حیات ہے۔

حیاتِ شہداء...... اسی طرح سے قرآن کریم نے شہداء کی بھی حیات ثابت کی ہے۔ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ ② جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں انہیں مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ یعنی مردہ تو ہیں نہیں، تمہیں کہنے کی بھی اجازت نہیں کہ یہ ان کے حق میں بے ادبی ہے، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی حیات کا شعور نہیں رکھتے۔ یعنی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے کہ کس کیفیت کی زندگی ہے۔ تو قرآن کریم میں شہداء کی زندگی ثابت کی گئی۔

اب کسوٹی پر جانچیے جو ہم نے عرض کی تھی کہ حیات کے پہچاننے کے دو طریقے ہیں، خورد ونوش اور نقل و

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم، ص: ۲۸۱، رقم: ۳۴۳۷۔

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۴۔

حرکت کرتے ہیں اور وہاں کی غذائیں کھاتے ہیں۔ تو رزق بھی دیا گیا اور نقل و حرکت بھی پائی گئی۔ مگر فرق کیا ہے۔؟ انبیاء علیہم السلام کی نقل وحرکت عباداتی تھی، معاشی نہیں تھی کہ کھانے پینے کے لئے جائیں، شہداء کی نقل و حرکت کھانے اور پینے کی ہے کہ جاؤ اور جنتوں میں جا کے چرو۔ انبیاء علیہم السلام کو ان کی غذا وہیں پہنچتی تھی، شہیدوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے جنتوں کے میدان میں جانا پڑے گا۔ اور چوں کہ بطورِ جزاء کے جنت میں بھیجا جارہا اس واسطے پرندوں کا خول دیا گیا، ان کا اصلی بدن نہیں دیا گیا، وہ قیامت کو دیا جائے گا جب بطورِ جزاء کے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا، تو دونوں چیزیں شہداء کے حق میں بھی ثابت ہوئیں، نقل وحرکت بھی اور خورد و نوش بھی۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں معاشی نقل وحرکت نہیں تھی بلکہ عباداتی تھی، یہاں معاشی نقل وحرکت ہے کہ کھانے پینے کے لئے جائیں وہاں انبیاء علیہم السلام کے پاس رزق پہنچتا تھا، شہداء کے پاس رزق نہیں پہنچتا، رزق کے پاس انہیں پہنچنا پڑتا ہے، چوں کہ انہیں جانا پڑتا ہے تو یہ نمبر دو ہو گئے۔

حیاتِ صلحاء...... اب ایک عامۂ مؤمنین ہیں جن کو صلحاءِ امت کہا جائے گا، اس میں درجہ بدرجہ کچھ گناہ بھی ہیں کچھ نیکیاں بھی ہیں مگر ان پر غلبہ نیکیوں کا ہے، ان کے بارے میں کیا فرمایا گیا؟ ان کو نقل وحرکت کی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ علیین کے مقام پر اپنی جگہ موجود ہیں، ان کو جانے آنے کی اجازت نہیں ہے اور روزق کھانے کی بھی ان کو اجازت نہیں، ثابت کیا ہوتا ہے؟ ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب ایک میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور سوال و جواب میں وہ پورا اترتا ہے، تو پہلے جہنم کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے وہ ٹھکانا نظر پڑتا ہے، اسے بتلایا جاتا ہے کہ تیرا یہ ٹھکانہ تھا لیکن تو نے چوں کہ صلاح اور نیکی اختیار کی، اللہ نے ہمیشہ کے لئے یہ تجھ پر بند کر دیا۔ پھر ملائکہ جنتوں کا دروازہ کھولتے ہیں، دور سے ان کی رُوح و ریحان اور نعمتیں نظر پڑتی ہیں اور اس کی خوشبوئیں اور لپٹیں آتی ہیں جو دماغ کو معطر کرتی ہیں اور قوت بخشتی ہیں، تو صلحاءِ مؤمنین کو کھلایا پلایا نہیں جاتا تو دور سے دکھلایا جاتا ہے، کھانے پینے کی امید بندھ جاتی ہے اور کچھ خوشبوئیں آتی ہیں جن سے دماغ میں تاثر پیدا ہوتا ہے، تو معدے کے راستے سے کوئی غذا نہیں جاتی بلکہ دماغ میں بسادی جاتی ہے تاکہ دماغ میں اس سے عطریت اور خوشبوئیں پیدا ہو جائیں، نقل وحرکت نہیں کرسکتے کہ جنتوں میں جائیں لیکن دروازے کھولدئے جاتے ہیں کہ دور سے دیکھتے رہیں تاکہ امید قائم رہے، تو یہ حیات ہے مگر یہ بہت ادنیٰ درجے کی حیات ہے۔

موتِ کفّار...... اب ایک کفّار ہیں، ان پر اتنی پابندی عائد ہے کہ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کرسکتے ہیں، نہ ان کو حرکت دی جاتی ہے۔ نہ غذا۔ حتیٰ کہ ان کے خیال میں بھی حرکت نہیں، یعنی ان کی قوّت خیالی بھی حرکت نہیں کرسکتی۔ قوّتِ خیالیّہ اگر حرکت کرے تو کم سے کم آدمی بیٹھ کر سوچتا ہے کہ میں گرفتار ہوں، میری رہائی کی یہ صورت نکل سکتی ہے تو چاہے نہ نکلے، مگر دل میں ایک گونہ تسلی ہوتی ہے، کچھ امید کی رمق ہوتی ہے، اگر میں نے یوں کرلیا تو شاید میں چھوٹ جاؤں۔ تو جہنمیوں کو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی کہ قوتِ فکریہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ ان کا خیال بھی محبوس

اور مقیّد ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ رہائی کیا صورت ہوسکتی۔ تو نہ بدن نقل وحرکت کرے گا، نہ خیال نقل و حرکت کرے گا۔ نہ غذا ملے گی اور نہ غذا کا تصوّر ملے گا۔ تو حقیقی معنی میں اگر میت کہا جائے، تو کفار کو کہا جائے گا۔ کہ وہ صحیح معنی میں میت ہیں کہ نہ نقل وحرکت کی اجازت، نہ معنوی، نہ مادی، نہ حسی، اور نہ کھانے پینے کی اجازت۔

مراتبِ حیات...... باقی حیات عوام مومنین کے لئے ثابت۔ شہداء کے لئے بھی اور انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی، لیکن درجہ بدرجہ، غرض حضرات انبیا علیہم السلام زندہ ہیں۔ ان کی نقل وحرکت عبادا تی ہے اور غذا ان کی خدمت میں پہنچائی جاتی ہے۔ شہداء زندہ ہیں، ان کی نقل وحرکت مادی ہے، ان کو غذا دی جاتی ہے، مگر غذا کے پاس ان کو جانا پڑتا ہے، عوام مومنین کو نقل وحرکت کی اجازت نہیں۔ وہ اپنے مقام پر رہیں۔ مگر احترام سے رکھے جاتے ہیں اور جنت کی نعمتیں دکھلا دی جاتی ہیں تا کہ ان کی قوت خیالیہ منبسط ہو جائے اور اعلیٰ درجے کی توقعات باندھیں کہ اب قریب میں وہ وقت آنے والا ہے کہ انشاء اللہ ہم ان نعمتوں میں پہنچیں گے۔ تو نعمت سے بڑھ کر امیدِ نعمت ہوتی ہے، توقع لگی ہوئی ہے کہ اب وہ نعمت چندمنٹ کے بعد ملی، اب وقت آیا کہ یہ نعمت مجھے ملی، تو مومنین کی قوّتِ خیالیہ پر پابندی عائد نہیں ہے۔ ان کی قوتِ خیالیہ آزاد ہے، وہ اس سے لذت لیتے ہیں۔ تو یہ لذت انہیں ملتی ہے۔ یہ حیات کے تین درجے ہوگئے، اس معیار سے کہ زندگی کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی نقل وحرکت اور خورد ونوش ہے تو اقویٰ ترین حیات انبیاء علیہم السلام کی ثابت ہوئی۔

متوسط حیات شہداء کی ثابت ہوئی۔ ادنی حیات صلحاء کی ثابت ہوئی، جس جس درجے کی یہ حیات ہے، اسی درجے کے اثرات بھی ہیں، دنیا تک اس کے اثرات پہنچے ہوئے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات اتنی کامل ہے کہ اقویٰ ترین ہے، دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ دنیا سے جاچکے ہیں لیکن ان کی بیویاں بیوہ نہیں ہوئیں، دوسرے خاوندوں سے نکاح نہیں کرسکتیں۔ دنیا سے جاچکے ہیں لیکن ان کے مالوں میں میراث تقسیم نہیں ہوسکتی، کیوں کہ زندہ کے مال میں میراث تقسیم نہیں ہوتی، تو ان کے مال بھی میراث سے مستثنٰی اور ان کی بیویاں بھی زوجیت اور نکاح سے مستثنٰی۔

شہداء کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ ان کی بیویوں کا نکاح نہ ہوسکے۔ ان کے مال میں میراث تقسیم نہ ہوسکے، یہ تو سب ہوگا۔ لیکن ان کے بدنوں کو کچھ ایسی قوت دی جاتی ہے کہ دنیا کے اندر بھی ان کے کچھ ابدان محفوظ رہتے ہیں اور اگرچہ نصِ صریح سے ثابت نہیں مگر تم بات سے اتنا ثابت ہے کہ اصلحاء کے بدن بھی محفوظ رہتے ہیں ان میں تغیر بہت کم سے کم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔

اور عوام مومنین کا دنیا کے اندر کوئی اتنا اثر نہیں ہے۔ ان کے بدن بھی مٹی ہو جاتے ہیں اور گل جاتے ہیں۔ تو جس جس درجے کی حیات برزخ میں ہے، اسی اسی درجے کے آثار دنیا کے اندر پائے جاتے ہیں، اس لئے دنیوی معیار سے دیکھا جائے تو حیات کے مراتب ہیں اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی حیات سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی سی حیات برزخ میں نہیں ہے، جب کہ دنیا کے اندر بھی انبیاء علیہم السلام کی حیات عام لوگوں جیسی نہیں تھی۔ یہاں حیات کی نوعیت دوسری ہے۔

ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... عام طور سے ولادت ہوتی ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آیا، روتا ہوا اور اوندھا نکلا۔ اور حدیث میں ہے کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس طرح سے ہوئی کہ ماں کے پیٹ سے برآمد ہوئے، چہرۂ مبارک آسمان کی طرف تھا، شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی تھی، گویا وحدانیت کا اعلان فرماتے ہوئے تشریف لائے۔ کوئی آلائش نہیں ہوئی۔ نو کے نو مہینے ماں کے پیٹ میں کوئی بوجھ نہیں رہا۔ ہلکا پھلکا رہا، پھر انوار و برکات ظاہر ہوئے کہ پیدائش کے وقت اتنا نور نکلا کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے اس نور اور چاندنے کی روشنی میں شام کے محل دیکھ لئے، تو عام طور سے ولادت کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ ولادت آپ کی بھی ہوئی۔ لوگوں کی بھی ہوتی ہے، مگر باوجود اس مثلیت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت میں اور عام لوگوں کی ولادت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

طفولیت کا امتیاز...... اسی طرح سے طفولیت کی زندگی عام بچوں کی بھی ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہوئی۔ لیکن اس طفولیت میں بھی وہ امتیازات ہیں کہ دنیا کے اطفال کو وہ نصیب نہیں۔ کہیں شقِ صدر ہو رہا ہے۔ کہیں برکتوں کے آثار نمایاں ہیں کہیں حلیمہ سعدیہ کی وہ اونٹنی جس پر وہ سوار ہو کر جا رہی تھی، باوجود لاغر ہونے کے اتنی تیز دوڑنے لگی کہ بڑے بڑے گھوڑے پیچھے رہ گئے۔ قحط سالی عام تھی، دودھ پلانے کے لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر پہنچیں تو اس سال اتنے پھل آئے کہ اس سے پہلے اتنے پھل کبھی نہیں آئے تھے۔ تو یہ برکات بھی ہیں جو عام نہیں ہیں۔

حیاتِ برزخ کا امتیاز...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی دیکھی جائے تو جوان اور بھی ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوئے لیکن پھر جوانی میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے کہ اس کے آثار و برکات جداگانہ ہیں۔

حواس کو دیکھا جائے تو جیسے میں نے عرض کیا کہ ہم حاسۂ بصر سے سامنے کی چیز دیکھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمنا سامنا اور پیچھے دونوں کی چیزیں دیکھتے تھے۔ ہمارا حاسۂ بطش اور ہاتھ کی قوت فقط سختی اور نرمی کو پہچانتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی قوت معنویت اور شرح صدر کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی تھی۔ ہماری زبان مادّی زبان ہے مگر چکھتی ہے تو کھٹا میٹھا محسوس ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک حلال و حرام کا بھی پتہ چلا لیتی ہے۔ تو باوجود مثلیت کے بہت سی خصوصیات ہیں کہ جن پر نبی کو غیر نبی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سے برزخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات نہایت قوی اور اکمل ہے کہ دنیا سے بھی قوی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ احادیث سے جتنے قرائن بیان کر سکتے ہیں، وہ بیان کر دیئے گئے۔ اب اس کا ادراک کرنا کہ نوعیت کیا ہے۔ یہ ہماری قدرت سے خارج ہے، یہ خلاصہ ہے۔

نوعیتِ حیات...... اب اس میں علماء کے دو مسلک ہیں۔ اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد پھر حیات دی گئی ہے، اور وہ ایسی دی گئی جیسے دنیا کی حیات تھی لیکن وفات اور قبضِ روح کے بعد دی گئی۔

اور وہ یہ کہ ہر انسان کو وفات دے دی جاتی ہے اور روح قبض ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وفات دی گئی۔ اور روح قبض ہوئی، اب جب قبر مبارک میں پہنچے تو وہاں جا کر عامۂ مومنین کی شان یہ ہے کہ انہیں پھر زندہ کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کو بھی کہتے ہیں کہ قبر میں پھر زندہ کیے گئے۔ عامۂ مومنین کا یہ حال ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے۔ پھر قیامت کو حیات دی جائے گی۔ انبیاء علیہم السلام اس موت سے مستثنیٰ ہیں، جب قبر میں زندہ ہوئے، اب قیامت تک بلکہ ابدالا باد تک زندہ رہیں گے۔ اب موت نہیں آئے گی۔ اسی کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اللہ نے آپ کو اس سے مکرّم بنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر دو موتیں طاری کرے، بس وہ ایک ہی موت ہے جو آئی۔ اس کے بعد اب جو زندگی آئی ہے تو ابدی زندگی ہے، پھر موت نہیں ہے“۔

اور عوام مومنین پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک یہاں جس کو ہم موت کہتے ہیں، ایک عالم برزخ میں کہ زندہ کرنے کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے، اور فرما دیا جاتا ہے: ”نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ“ ① اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے۔

تو ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام حیات ہیں، ان کی بالکل دنیوی حیات ہے، مگر موت سے انقطاع واقع ہوا اور بعد میں جو حیات آئی، وہ ویسی ہی تھی جیسی دنیا میں تھی مگر وہ ابدی ہے۔ اور ایک جماعت علماء کرام کی یہ کہتی ہے کہ بیچ میں موت کا واسطہ آیا۔ لیکن اس سے سلبِ روح نہیں ہوا۔ یعنی موت واقع ہوئی۔ اس واسطے کہ موت تو قطعی ہے قرآن کریم نے شہادت دی ہے: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ ②

تو موت واقع ہوئی۔ لیکن موت واقع ہونا اور ہے اور سلبِ حیات اور ہے۔ موت واقع ہوا اور حیات کلیۃً سلب نہ ہو، یہ ممکن ہے، اس واسطے کہ موت عارضی طور پر واقع ہوئی۔ اور حیات انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں ڈال دی گئی تھی، تو وہ کلیۃً سلب نہیں ہوئی گو موت بھی واقع ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کہ پانی۔ تو پانی کی ذات میں ٹھنڈک ہے کہ وہ آگ آئے تو اسے بجھا بھی دیتا ہے۔ لیکن پانی میں عارضی طور پر حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اسے آگ پر تپا دیں تو وہ کھول کر اتنا گرم ہو جائے گا کہ جو کام آگ کرتی ہے وہ پانی کرے گا، لیکن اس حالت میں بھی اگر اسے آگ کے اوپر ڈال دیں تو آگ کو بجھا دے گا، معلوم ہوا پانی کے اندر ذاتی برودت باوجود انتہائی گرم ہونے کے موجود ہے، اگر انتہائی گرم ہو کر پانی کی حقیقت اس کے اندر سے نکل جاتی تو آگ کو بجھا نہ سکتا،

---

① جامع الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر، ج: ۴ ص: ۲۳۷. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی، ج: ۳، ص: ۱۷، رقم: ۱۰۷۱۔ ② پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۳۰.

لیکن کھولتا ہوا پانی بھی آگ کو بجھاتا ہے، معلوم ہوا کہ برودت کا مادہ موجودہ ہے، جو اس کے اصل جوہر میں قائم تھا، وہ نہیں نکلا اور اوپر سے حرارت بھی موجود ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں حیات رکھی جاتی ہے۔ موت جب طاری ہوتی ہے تو کلیتہً حیات سلب نہیں ہوتی۔ تو موت بھی ہے اور حیات بھی ہے۔ دونوں جمع ہیں جیسے گرم پانی میں برودت بھی اور حرارت بھی دونوں جمع ہیں، ایک اصلی ہے اور ایک عارضی ہے۔ غرض ایک جماعت علماء کرام کی اس کی قائل ہے کہ موت واقع ہوئی مگر سلبِ حیات واقع نہیں ہوا بلکہ حیات موجود رہی۔ اس کے آثار موجود رہے کیوں کہ وہ اصلی تھی اور موت صرف عارضی طور پر طاری ہوئی۔ تو اس میں دونوں کا اتفاق ہے کہ برزخ کے اندر حیات ہے اور ویسی ہے جیسے دنیا کی لیکن ایک کہتے ہیں کہ وہ مستمر حیات ہے اور ایک کہتے ہیں کہ وہ منقطع ہو کر پھر پیدا ہوئی ہے، نتیجہ دونوں ایک رائے رکھتے ہیں کہ حیات وہی ہے جو دنیوی حیات ہے۔

سلامتی کا راستہ...... یہ علماءِ کرام کا اختلاف ہے، اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم یوں کہیں کہ برزخ میں انبیاء علیہم السلام اسی طرح حیات ہیں، جس طرح ہم دنیا میں حیات ہیں۔ اب یہ کہ وہ حیات از سرِ نو آئی یا وہ پہلی ہی چل رہی ہے، یہ علماء پر موقوف ہے، ان کی آراء ہیں، ان کی وجوہ ہیں۔ ان کے قرائن اور دلائل ہیں، نہ ہم انہیں توڑ سکتے ہیں نہ ان کا خلاف کر سکتے ہیں، ہم گردن جھکائیں گے۔ بس اس قدرِ مشترک کے قائل ہو جائیں گے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں، کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس طرح سے زندہ ہیں۔

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی موت طاری ہوئی اور اس کے بعد جو حیات آئی وہ مستمر اور دائمی ہے جیسا کہ وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مقولے سے استناد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے، عوام مومنین کی یہ صورت نہیں ہے، ان پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ پہلی موت تو وہ جس کہ ہم احتضار کہتے ہیں کہ ایک آدمی انتقال کر جائے۔ دوسری موت وہ جو قبر میں سوال و جواب کے بعد کہ دیا جاتا ہے۔ ”نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ “اور قرآن کریم میں جو فرمایا گیا: ﴿ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ﴾ ① یہاں موت کے معنی سلبِ حیات کے نہیں ہیں، یہاں موت کے معنی عدم ایجاد کے ہیں، یعنی تمہیں وجود نہیں ملا تھا۔ عرف عام میں تو موت اسی کو کہتے ہیں کہ حیات چھین لی جائے یا اس میں کمی کر دی جائے، تو ظاہر ہے جو ابتدائی موت ہے وہ عدم ہے، اس کو آپ موت کہہ رہے ہیں اور قرآن کریم نے جو موت کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ حیات چھینی گئی بلکہ یہ ہیں کہ اس وقت تک حیات دی نہیں گئی تھی، البتہ۔ ﴿ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ ② ”دو موتیں مراد ہیں، ایک دنیوی موت اور ایک وہ جو قبر کے اندر حیات کے بعد واقع ہوگی“

انکشافِ برزخ...... شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”اَنْفَاسُ الْعَارِفِيْنَ “میں اپنے والد بزرگوار شاہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۔ ② پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۱۱۔

عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سے ایک خادم جن کا نام عاشق ہے، کے بارے میں لکھا۔ یہ وہی عاشق ہیں جو ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کے لکھنے کے محرّک بنے ہیں۔تو ''اَنْفَاسُ الْعَارِفِیْن'' میں ایک واقعہ لکھا ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں جنگل میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ چند سوار گھوڑوں پر اچھا فاخرہ لباس پہنے ہوئے اور بڑے اچھے شاندار گھوڑے اور چلے آ رہے ہیں مگر ہر سوار کی کچھ ایسی شکل ہے جیسے کوئی متجسّس ہوتا ہے اور ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں قریب سے گزرا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر تشریف لائے ہیں؟ میں نے عرض کیا۔ کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ کون ہیں؟ اس نے کہا۔ میرا نام ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں عاشق کا قرآن کریم سننے کے لئے جا رہا ہوں۔ ان کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ سوار غائب ہو گئے۔ تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنے والدِ بزرگوار کی طرف منسوب کیا۔ ہوسکتا ہے کہ واقعہ عالم برزخ میں پیش آیا ہو۔ لیکن بعض دفعہ عالم برزخ منکشف ہو جاتا ہے اور اس کی صورتیں ہمیں اس جہان میں بیٹھ کے نظر آتی ہیں۔ تو یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ برزخ سے نکل کر یہاں پہنچتے ہیں۔ بلکہ ہماری نگاہ برزخ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں کے احوال منکشف ہو جاتے ہیں۔

انکشافِ سجّین ...... جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت محدّثانہ روایات سے اس قسم کے واقعات ''کتاب الروح'' میں نقل کئے ہیں۔ ایک جگہ مثلاً لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک اونٹنی پر سوار ہو کر سفر کر رہے تھے، جس وقت بدر کے اس مقام کے قریب پہنچے جس میں کفّار کی لاشیں ڈالی گئی تھیں تو مغرب کا ساوقت ہو گیا تھا۔ تو دیکھا کہ بدر کے کنویں میں سے ایک نہایت ہی سیاہ فام اور بدہیئت شخص نکلا اور اس شان سے نکلا کہ بے حد ہی کریہۃ المنظر اور ڈراونی صورت۔ اور وہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف دوڑا اور کہا۔ ''یَا عَبْدَاللّٰهِ اِسْقِنِیْ.......'' یہ کہہ رہا تھا کہ کنویں کے اندر سے ایک زنجیر پیدا ہوئی اور اس کے پیروں میں جکڑی گئی اور اسے نیچے کی طرف جذب کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس واقعہ کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے، اور اونٹنی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بالکل حمائل ہو گئے۔ اونٹنی وہاں سے بھاگی اور انہیں مدینہ لے کر پہنچی۔ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہوش میں لائے گئے تو واقعہ سنایا۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آرڈر جاری کیا کہ کوئی شخص رات کے وقت بالکل تنہا سفر نہ کرے۔ بالخصوص جب کوئی رفیق سفر ساتھ نہ ہو۔ اس قسم کے واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سجّین سے نکل کر دنیا میں آ گیا، لیکن سجّین منکشف ہو گیا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وہ سارا واقعہ دیکھا جو سجّین میں پیش آ رہا تھا۔ غرض اس قسم کے واقعات حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بکثرت نقل کئے ہیں۔ اور

محدّثانہ انداز سے بھی نقل کیے ہیں۔

عالمِ منام...... نیز بہت سے منامات بھی نقل کیے ہیں۔ جیسے ابن ابی الدنیا جو مشہور محدّث ہیں، ان کا واقعہ نقل کیا ہے، کسی عارف نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا۔ اور وہ شخص بھی عارفین سے میں تھا۔ ان سے پوچھا کہ تم پر کیا گزری؟ اور تم پر کیا گزری ہے تو انہوں نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو جزائے خیر دے کہ اجر وثواب کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ جو ہمارے پاس پہاڑوں کی طرح لگ جاتے ہیں''۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔ ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم ہفتے میں ایک بار ابن ابی الدینا کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور وہاں پہنچ کر یہ تحائف ہم کو ملتے ہیں جو دنیا والے ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ غرض کچھ خوابیں اور منامات اور کچھ محدّثانہ روایتیں، ان سے اس قسم کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

مقامِ میّت کا انکشاف...... ایک واقعہ میں نے اپنے فارسی کے استاذ مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سے خود سنا، جو آپ کے پاکستان کے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب (مرحوم) ان کے والد ماجد تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ تھے اور فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ تو وہ ہمارے بھی استاذ بھی تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ اس واقعہ کا حاصل یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدرس تھے اور عالم جید تھے کہا جاتا تھا کہ وہ فنونِ معقولہ کے امام تھے اور بہت ہی ذکی تھے۔ آپ چھ مہینے تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس بھی رہے۔ ان کے صاحبزادے تھے جن کا نام مولوی مصطفٰی تھا۔ اور ہمارے ہی استاذ حضرت مولانا یسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم جماعت تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ مولوی مصطفٰی صاحب نے ان سے اپنا واقعہ بیان کیا اور مولانا محمد یسین صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا۔ بس راوی بیچ میں ہمارے اور صاحبِ واقعہ کے مولانا محمد یسین صاحب ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ: ''مولوی مصطفٰی جب دہلی وطن پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب جمنا میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ اور جمنا کے کنارے کچھ قبرستان تھے تو ان میں سے بہت سی قبریں بہہ گئیں، ایک قبر جو ٹوٹی تو اس کی مٹی بہہ گئی اور اس کی لاش نمایاں ہوگئی۔ پانی تو ہٹ گیا لیکن وہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ مولوی مصطفٰی صاحب کا بیان یہ ہے کہ اس لاش کے دیکھنے کے لئے آس پاس کے بہت سے دھوبی جو کپڑے دھو رہے تھے، وہاں آکر جمع ہوگئے۔ اور شہرت جو ہوئی تو شہر سے بھی لوگ آئے''۔ ''اس کی کیفیت انہوں نے یہ دیکھی کہ اس لاش کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا کیڑا بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ڈنک مارتا ہے، جب ڈنک مارتا ہے تو لاش ایک دم لرز جاتی ہے اور ایک رنگ آتا اور ایک جاتا ہے۔ اور کئی منٹ بعد لاش اصلی حالت پر آتی ہے۔ جب اصلی حالت پر آئی، پھر اس نے ڈنک مارا، پھر اسی طرح لرز گئی۔ یہ انہوں نے تماشا دیکھا۔ اس میں کسی دھوبی نے اس لاش پر رحم کھا کر ایک کنکری زور سے کیڑے کے ماری۔ وہ کنکری کیڑے کے تو نہیں لگی۔ لیکن کیڑے کے پاس جا کر لگی۔ تو ایک دم اچٹ کر کیڑا اٹھا اور اس دھوبی کی پیشانی پر آبیٹھا اور اسے ڈنک مارا۔ اور اسے ڈنک مار کر پھر اس لاش کے اوپر جا بیٹھا''۔

مولوی مصطفی صاحب کا بیان یہ ہے کہ وہ دھوبی چلّایا اور اس نے کہا: کچھ عجیب قسم کی آگ میرے اندر ہے کہ نہ میں یہ کہہ سکوں کہ سانپ نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ بچھونے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ آگ میں جلا، کہہ کچھ نہیں سکتا کہ وہ کس قسم کی گرمی ہے، مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر رگ میں ہزاروں بچھو پڑے ہوئے ہیں جو ڈنک مار رہے ہیں"۔ خیر اس کے ہاتھ وغیرہ باندھے گئے، اب مجمع بدستور ہے۔ تو مولوی مصطفی صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے یہ سمجھا کہ کیڑا کوئی عالم مادّی کی چیز نہیں ہے، یہ کوئی عذاب خداوندی ہے جو اس میت پر ہے، تو بجائے اس کے کہ اسے کنکر مارتا۔ میں نے اس میت کے قریب بیٹھ کر سورہ یسین پڑھنی شروع کی۔ اس کے علاوہ کچھ قرآن شریف کی آیتیں اور سورتیں جو مجھے یاد آئیں، جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں۔ وہ کیڑا مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے تلاوت کی۔ وہ کیڑا بالکل مضمحل ہو کر ایسا رہ گیا جیسے راکھ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس میت کو دفن کر دیا۔ اور وہ دھوبی دو تین دن زندہ رہا اور یہ کہتا تھا کہ میں اپنے کرب و بے چینی کا بیان نہیں کر سکتا۔

تو یہ اسی قسم کے واقعات ہیں کہ یہ معاملات تو برزخی ہیں لیکن برزخ دنیا میں نہیں آتا۔ نہ میت اپنے مقام پر چھوڑ کر آتی ہے۔ وہ اپنے مقام پر رہے لیکن کبھی کبھی حق تعالیٰ عالم برزخ کی چیزیں منکشف فرما دیتے ہیں اور انسان واقعات دیکھنے لگتا ہے۔ تو وہ برزخ کی چیزیں اسی طور پر دیکھ رہا ہے جیسا کہ خواب میں ہم دوسرے عالم کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ جیسے عالمِ مثال خواب میں دنیا میں نہیں آتا۔ لیکن دنیا والے بعض اوقات سو کر عالمِ مثال کے اندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے واقعات دیکھتے ہیں۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ ① نیند جو ہے یہ موت کی بہن ہے، یعنی جو کیفیات موت میں آتی ہیں، وہی نیند میں طاری ہوتی ہیں قوّت وضعف اور دوام وعدمِ دوام کا فرق ہے۔ تو سونے والا جب خواب دیکھتا ہے اور یہ دیکھے کہ میں کسی شدید عذاب میں مبتلا ہوں اور لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ڈنڈوں سے خبر لے رہے ہیں۔ بعض مرتبہ وہ خواب میں چلّاتا ہے اور چلّاتے ہوئے بعض اوقات اس کی آواز جاگنے والے سن لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں! کیا ہوا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا۔ تو ہم نے نہیں جانا وہ کہاں گیا تھا حالاں کہ وہ اس عالم میں گیا اور وہاں تکلیف اٹھائی مگر اس عالم میں اتنا چلّایا کہ اس عالم کے اندر اس کی آواز منتقل ہوگئی۔ اور اس عالم والوں نے اس کی آواز کو سن لیا، اس لئے بعض برزخ کی آوازیں شروع وہاں سے ہوتی ہیں مگر ہمارے کانوں تک آ کر منتہی ہو جاتی ہیں۔ تو جب بیداری میں یہ صورت ممکن ہے کہ عبرت کے طور پر خواب والا ایک دوسرے عالم میں ہو اور وہاں کی چیزیں ہم یہاں دیکھ لیں یا سن لیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ میّت اپنے مقام پر ہو اور اس کا عذاب یا ثواب بعض دفعہ دیکھنے والے دیکھ لیں۔ خواہ خواب میں دیکھیں یا کشفی نگاہ سے

① البعث والنشور للامام البیهقی، باب قول الله تعالیٰ: لا یذوقون فیها الموت، ج: ۱، ص: ۴۵۲، رقم: ۴۲۴.

دیکھیں۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عالم برزخ سے کسی کی روح منتقل ہو کر دنیا میں آ گئی۔ یا کوئی یہاں چلا آیا۔ یہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر ہے، البتہ اس کا مقام یہاں منکشف ہو گیا۔

تعدّدِ ارض وسماء...... ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کئے اور اس کے مثل سات زمینیں پیدا کیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر میں یہ بات بھی ہے کہ ہر زمین میں آبادی ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی آتے ہیں۔ یہ روایت ہے، اب یہ کہ وہاں یہی چاند سورج کام دیتا ہے یا وہاں کا چاند سورج الگ ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانے۔ جب کہ دنیا کے بہت سے خطوں کے بارے میں بھی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہاں اسی سورج کی روشنی پہنچتی ہے یا نہیں۔ اگر آپ قطبین کے قریب آبادیاں دیکھیں، وہاں چھ چھ اور نو نو مہینے کی رات ہوتی ہے۔ سورج نکلتا ہی نہیں۔ وہاں لوگ اندھیرے میں بسر کرتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ وہ چراغ جلاتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی کرتے ہوں بہر حال اس زمین پر بھی ایسے مواقع ہیں کہ وہاں اس سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ یا پہنچتی ہے تو کئی مہینوں میں جا کر۔ جو سورج اس زمین پر پورا کام نہ دے سکے، اس کے بارے میں آپ یہ کہیں کہ ساتوں زمین میں وہی کام دے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ کام دے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ وہاں شاید کوئی اور سورج ہو۔

میّت کا علم وادراک...... مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود روایت ہے۔ جہاں قبور کے آدابِ زیارت لکھے ہیں کہ میت کی زیارت اس طرح کی جائے کہ قبلہ کو پشت کی جائے اور میّت کی طرف رخ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے۔ اور درجہ بدرجہ تعارف بھی ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں وہ شخصی طور پر پہچانتا تھا تو وہاں بھی شخصی طور پر پہچانے گا۔ کوئی عمومی طور پر پہچانتا ہے تو وہاں بھی عمومی طور پر پہچانے گا۔ جہاں مواجہہ ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے۔

ملائکہ علیہم السّلام کے ذریعے روح کو متوجہ کرا دیا جاتا ہو گا۔ جیسا کہ آپ مثلاً جاگ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی ہوئی ہے مگر خیال دوسری طرف ہے تو باوجود یہ کہ آنکھ کھلی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے۔ بعض دفعہ ہم بازار جاتے ہیں، آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور ایک بڑا تماشا گزر رہا ہے۔ جب گھر آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا گزرا؟ آپ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا؟ کہ وہی جو بازار میں تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ میاں تم آنکھیں کھولے ہوئے تو جا رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ واللہ، مجھے تو خبر نہیں۔ اس وقت آپ کہتے ہیں کہ اَفوہ! میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے بلکہ دھیان دیکھتا ہے۔ اگر دھیان دوسری طرف ہو آنکھ کھلی رہے گی۔ آپ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے، متوجہ ہو جائیں، وہی آنکھ دیکھنے لگے گی۔ اگر آپ غیر متوجہ ہیں۔ کان کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کو آواز نہیں آئے گی۔ توجہ کر لیں تو کانوں میں

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲۔

آواز آنی شروع ہوجائے گی، بعض اوقات آپ آذان کی آواز نہیں سن پاتے، خیال دوسری طرف متوجہ ہے، آپ اسی میں مستغرق ہیں، تو قوتِ خیالیہ کو اگر ان حواس کی طرف متوجہ کرلیا جائے تو وہ ادراک کرنا شروع کرتی ہے۔ اگر متوجہ نہ کیا جائے تو وہ ادراک نہیں کرتی تو ہوسکتا کہ ملائکہ کے ذریعے سے میّت کو توجہ دلا دی جاتی ہو جب متوجہ ہوا تو اس کی قوت خیالی اور حسّی کام کرنے لگتی ہے، نہ متوجہ ہوا، نہیں کرتی اور یہ جب ہوتا ہوگا جب کوئی جا کر سلام کرے۔ مطلقاً نہیں کہ جو قبرستان سے گزرے میّت متوجہ ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔

علیّین وسجّین کا مقام...... علیّین کا آپ اپنے ذہن میں یہ جغرافیہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے۔ علیّین اور سجّین یہیں کھپا ہوا ہے، جیسا کہ ہماری روح بدن میں کھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن کو الگ کردیا جائے اور روح دیکھنے کا کوئی آلہ ہو تو روح کے واقعات آپ کو یہیں نظر آئیں گے۔ اسی طرح علیّین اور سجّین کے مقامات اسی عالمِ عنصری میں عالمِ روح کی طرح کھپے ہوئے ہیں۔ حجابات پڑے ہوئے ہیں۔ اگر حجابات اٹھا دیئے جائیں۔ وہ سارا ثواب وعذاب آپ کو یہیں نظر پڑے گا۔ اوپر نہیں جانا ہوگا۔ غرض یہ تو ایک نگاہ کی چیز ہے کہ نگاہ جغرافیہ بنا لیتی ہے کہ جب علیّین اور سجّین ہیں۔ تو وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہوں گے، یہ ضروری نہیں، وہ یہیں کھپے ہوئے ہیں، مادّی حجابات میں غرق ہیں۔ اگر وہ اٹھا دیئے جائیں آپ دیکھنے لگیں گے۔

حجیتِ کشف...... بعض اہل اللہ پر عذابِ قبر منکشف بھی ہوجاتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو اتنی مقبولیت تھی کہ مجھے منکشف ہوا کہ اس روز دہلی کی ساری قبروں میں سے عذابِ قبر اٹھا دیا گیا تھا۔ اتنی تکریم ہوئی۔ اب یہ انکشاف کی بات ہے، کوئی حجتِ شرعی تو نہیں تھی۔ آخر انکشاف ہے۔ کشف بھی کوئی رد کرنے کی چیز تو ہے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ حجتِ شرعی نہیں۔ نفس وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور صوفیاء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کشف دوسرے کے لئے حجت نہیں مگر اپنے نفس کے لئے حجت ہے، جب آدمی قطعی طور پر دیکھ رہا ہے۔

نیز یہ کہتے ہیں کہ اس حجت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کیا تو آخرت کا کوئی نقصان نہیں۔ اس لئے کہ آخرت کے نفع ونقصان کا تعلق نصوص سے ہے، کشوف سے نہیں، لیکن دنیا میں کوئی نقصان ضرور پہنچ جائے گا۔ ایک چیز واقعی تھی، اس کو دکھلائی گئی۔ اس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا تو اس کا نقصان پہنچے گا مگر دنیوی۔ اخروی کوئی ادنیٰ نقصان نہیں ہوگا۔ یہ علیّین اور سجّین کی بارے میں جغرافیہ کی بحث ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلام کا تو یہ موضوع نہیں البتہ اربابِ کشوف اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں، وہ اگرچہ حجت تو نہیں۔ لیکن اگر خلاف میں کوئی دلیل قائم نہ ہو تو قابلِ ردّ بھی نہیں مانی جاسکتی ہے۔

جنت وجہنم کا جغرافیائی مقام...... حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں اتنا لکھا ہے کہ یہ آسمان سے لے کر زمین تک اور نچلی زمین تک، یہ سارا علاقہ جہنم کا ہے اور قیامت کے دن آگ سے یہی

علاقہ تپے گا۔اور اسی میں وہ سانپ اور بچھو اور وہ سارے عذابات ہوں گے۔اور آسمانوں سے اوپر جنتیں رکھی جائیں گی۔اور آسمان اور زمین کے درمیان جو پانچ سو میل کی مسافت ہے،یہ اعراف ہے۔تو قیامت کے دن اوپر جنت، نیچے نار ہوگی،اب تو جنت ساتویں آسمان میں ہے۔

اس لئے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى" پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو،وہ ساتویں آسمان پر تھی جو مقامِ جبریل علیہ السّلام ہے۔تو سدرۃ المنتہیٰ کا ساتویں آسمان پر ہونا حدیث سے ثابت ہوا۔اور قرآن کریم کہتا ہے۔﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ ① ② "سدرہ المنتہیٰ کے پاس "جَنَّةُ الْمَاْوٰى" ہے"۔

تو اس آیت اور روایت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جنتوں کی ابتداء ساتویں آسمان سے ہے۔اور اوپر نیچے جنتوں کے سو درجے ہیں۔گویا جنتوں کا علاقہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور جہنم کا علاقہ ساتویں زمین کے نیچے تحت الثریٰ میں ہے۔قیامت کے دن جہنم کو کھینچ کر اوپر لایا جائے گا۔جیسے حدیث میں ہے کہ ستر ہزار ملائکہ ایک ایک باگ کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور ستر ہزار ہی اس کی باگیں ہوں گی۔اس کو کھینچ کر اوپر لائیں گے۔اور جنت کو کچھ نیچے اتار اجائے گا۔اور اگر نہیں اتارا جائے گا تو آسمان توڑ پھوڑ دیئے جائیں گے۔تاکہ جنت کے وہ پورے مقامات نظر پڑ سکیں جواب تک حجابات میں ہیں۔تو وہ بالاتر رہے گی۔مگر نظر پڑے گی۔اور جہنم اس زمین کے اوپر لائی جائے گی۔

اسی واسطے حدیث میں ہے کہ میدانِ محشر میں ہر انسان کے آگے دو چیزیں ہوں گی ایک جہنم کی ہولناک آوازیں جو آرہی ہوں گی اور ایک اپنے اپنے اعمال جو مجسم کر دیئے جائیں گے۔قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔یہ دو چیزیں ہر انسان کے سامنے ہوں گی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہنم کو قریب لایا جائے گا۔اور اس کی آوازیں ہیبت کے لئے سنوائی جائیں گی۔غرض قیامت کے دن کچھ تغیر کیا جائے گا کہ جہنم کو اوپر لائیں گے اور جنت کو کچھ نیچے لائیں گے یا اوپر ہی رہے گی،مگر بیچ میں سے آسمان توڑ دیئے جائیں گے تاکہ وہ حجابات ختم ہوں۔ادھر جہنم نظر آئے۔ادھر جنت نظر آئے۔اور ہر ایک کو اپنا ٹھکانہ محسوس ہونے لگے کہ،یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔تو اس وقت یہ زمین و آسمان حائل نہیں رہیں گے۔فی الحال زمین و آسمان حائل ہیں۔اس لئے کچھ نظر نہیں آرہا۔اور اگر فی الحال ہی نظر آجاتا تو عقیدہ باندھنے اور ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی۔عقیدہ تو اسی کو کہتے ہیں کہ آدمی غیب کو سمجھے اور اسی پر ایمان لائے۔

مقامِ ارواح...... جنت اور دوزخ میں داخلے سے پہلے پہلے ارواح اپنے اپنے مقامات پر رہیں گی اور وہ علیّین اور سجّین ہیں،اور اب یہ کہ شھدائ کو جنت میں لے جائیں اور سبز پرندوں کے خول پہنائیں۔یہ تو لے جانا ہوا۔باقی

① پارہ:۲۷،سورۃ النجم،الآیۃ:۱۴،۱۵۔

② الصحیح لمسلم ،کتاب الایمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتھی،ص:۸۰۷، رقم: ۴۳۱۔

داخلہ تو جنت میں قیامت کے دن ہوگا۔ اب تو قبر سے اس کو ٹھکانہ دکھلا دیا جائے گا۔ اور روح و ریحان اور نعیم کی خوشبو اور تعطّر وہاں سے آنے لگیں۔

جنّیہ سے نکاح کا حکم...... حضرت حافظ ابن تیمیہ حرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب ''اٰکَامُ الْمَرْجَانِ فِیْ أَحْکَامِ الْجَانِّ'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں جنّات کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ دنیا کے ہر مکان میں جنات بستے ہیں، کوئی مکان خالی نہیں ہے، فرق اتنا ہے کہ جو شرّ ی ہے، اس کے شر کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جن ہے اور آسیب کا اثر ہے، جو بے چارے صالحین ہیں، وہ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے۔ مگر ہر جگہ موجود ہیں۔ اور ان میں زیادہ شرّ ی ہوتے ہیں۔ نیک بہت کم ہوتے ہیں۔ ان میں شر کا مادّہ ہی غالب ہے جبکہ انسانوں میں شر کا غلبہ نہیں بلکہ مادّے برابر رکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثریت شرّ والوں کی ہے۔ خیر والے اقلیت میں ہیں۔

فقہاء نے اس میں بحث کی ہے کہ جنّیہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ غیرِ جنس ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری یا گائے سے نکاح کرلے۔ وہ منعقد نہیں ہوگا۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ جب وہ صورتِ انسانی میں ہوں تو جنسیت کے اقرب ہو گئے، لہٰذا نکاح جائز ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدّس اللہ سرہٗ سے ایک جن کی ملاقات...... ایک جن سے تو خود ہماری ملاقات قندھار یہ میں ہوئی، وہاں کسی شخص کے اوپر جن کا اثر تھا اور اس کی نسبت مشہور یہ تھا کہ جب اس پر اثر ہوتا ہے تو باوجود یکہ بے پڑھا لکھا تھا۔ اس کے باوجود قرآن شریف کے متعدد رکوع پڑھتا۔ مسائل اور علوم بہت بیان کرنے لگتا تھا اور جب وہ اثر نہیں رہتا تھا تو جاہلِ مطلق ہوتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی کلام اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔

میرا وہاں جانا ہوا۔ صبح کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ وہ جن ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ جن کو میرے سے کیا کام ہے؟ میرے اوپر کوئی اثر ڈالے گا؟ خیر میں نے کہا اگر ملاقات کرنا چاہتا ہے تو اسے بلا لو۔ تو وہ شخص آیا۔ اس کی حرکات کچھ ایسی تھیں باہوش انسان کی نہیں ہوتیں۔ جیسے مدہوش سا ہو۔ اور پھر جب بیٹھا تو اس کی آنکھیں اتنی چڑھیں کہ پتلیاں بالکل غائب ہوگئیں۔ اتنی اوپر چڑھ گئیں کہ سفیدی سفیدی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر اس کا سانس کچھ چلا اور ابھرا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گرا۔ اس کے بعد اٹھا تو اس کا سانس ٹھکانے پر نہیں تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس نے کچھ بولنا شروع کیا اور اس کی آواز میں بھی ایک قسم کا کچھ ڈراؤنا پن سا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا میں نے ''وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ'' کہہ کر جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے معانقہ کرنا چاہا۔ میں نے کہا ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... '' میں جن سے کیا معانقہ کروں؟ لیکن ''طَوْعًا وَّکَرْھًا'' میں نے معانقہ بھی کیا۔ کوئی اثر وغیرہ تو ہوا نہیں، اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے شاید عباس یا ایسا کچھ نام بتایا۔ میں نے کہا آپ رہتے کہاں ہیں؟ اس نے کہا بمبئی

کے قریب ایک جزیرہ ہے، اس میں رہتے ہیں، میں نے کہا، آپ اس شخص کو کیوں ستاتے ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ میں تو نہیں ستاتا۔ مجھے اس سے تعلق ہے۔ اس کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے، جب میں نہیں آتا تو یہ خود مجھے ڈھونڈتا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ ہمیں کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔؟ اس لئے کہ ہم نے آپ کو بہت نفع پہنچایا۔

اس نے کہا وہ کیا؟ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہمارے شاگرد ہیں۔ دارالعلوم میں ہمارے بزرگوں کے سامنے بہت سے جنّات نے پڑھا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کچھ ظاہر بھی ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ ہمارے استاذ بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔ شاگرد تو یوں کہ دارالعلوم میں پڑھا۔ اور استاذ یوں کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے "حَدِیْثُ الْجِنّ" نقل کی ہے، وہ قاضی جن سے سنی ہے۔ میں نے کہا آپ لوگ استاذ بھی ہیں اور شاگرد کثرت سے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ دارالعلوم کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں؟ وہ چپکا ہو گیا کہ میں تو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے کہا۔ پھر آپ جن ہی کیوں بنے؟ پھر وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا، کچھ بولا نہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اس نے اجازت چاہی، میں نے کہا جائیے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو تو بہت بولتا تھا، بولا کیوں نہیں؟ کہنے لگا بس کچھ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب واللہ اعلم وہ واقعی جن ہی تھا یا کیا تھا۔ مگر بہرحال قرائن تو ایسے تھے کہ وہ انسانی حرکتیں نہیں تھیں، اس لئے کہ جب اس کا اثر ختم ہوتا تھا، وہ آدمی بالکل اچھا خاصا ہوش وحواس قائم۔ اور جہاں وہ اثر شروع ہوا، کہیں قرآن پڑھتا ہے۔ حالاں کہ حافظ نہیں ہے۔ اسی طرح مسائل بیان کرتا ہے۔

اقسامِ محبت...... علماءِ کرام محبت کی تین قسمیں لکھتے ہیں۔ ایک محبتِ طبعی ہے۔ ایک محبتِ عقلی ہے اور محبتِ عشقی ہے۔ محبتِ طبعی تو مادّی محبت ہے جیسے باپ کو اولاد سے ہوتی ہے یا اولاد کو ماں باپ سے ہوتی ہے یا عزیزوں رشتہ داروں میں ہوتی ہے۔ اور ایک محبت عقلی ہے۔ اسی کا نام فی الحقیقت ایمان ہے، حدیث میں ہے کہ "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ." ① تم میں کوئی بھی مومن نہیں بن سکتا جب تک میرے ساتھ اتنی محبت ہو، کہ نہ اتنی محبت اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اولاد سے ہو"۔

ظاہر بات ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت عقلی ہوتی ہے۔ طبعی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ دلائل پر مبنی ہے۔ ایمان خود استدلالی چیز ہے اور ایمان کی حقیقت محبت ہے۔ تو وہ محبت عقلی ہے۔ اس محبت کی آدمی جب عملاً مشق کرے اور بڑھائے اور عشق کے درجے میں آجائے تو وہ محبت عشقی کہلاتی ہے۔ جیسے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ② تو اشدِ حب ہی وہی عشق ہے۔ محبتِ طبعی تو غیر اختیاری ہوتی ہے۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول، ص: ۳، رقم: ۱۴.

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۶۵.

جیسے اولاد سے محبت ہے اس میں ارادے اور اختیار کا دخل نہیں۔ خواہ مخواہ آدمی محبت کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن عقلی محبت وہ اختیاری ہے بایں معنی کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ جب اس کے اسباب اختیار کرے گا، وہ محبت پیدا ہو جائے گی اور اس محبت کو جب تمرین میں لائے گا، اس کی مشق کرے گا اور اس کے متعلقہ اعمال انجام دے گا، وہ محبت بڑھ کر عشق کے درجے میں پہنچ جائے گی جیسا کہ مجاہدہ اور ریاضت کرنے والے کی کیفیت ہوتی ہے۔ اصل ایمان وہ تو محبت عقلی ہے۔ جب مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں تو محبت حال کے درجے میں پہنچ جاتی ہے، وہ عشق کہلاتی ہے۔ یہ جو آپ نے سوال کیا کہ قیامت میں آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرے۔ یہ درحقیقت محبتِ عقلی کی طرف اشارہ ہے، یعنی ایمان کی وجہ سے جس کے ساتھ محبت ہوگی۔ آدمی اس کے ساتھ ہوگا۔

مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو محبت ہے، یہ طبعی محبت نہیں بلکہ عقلی محبت ہے۔ ان کے علوم اور کمالات کو دیکھ کر ہے۔ چوں کہ آپ کو کمالات سے محبت تھی تو صاحبِ کمال سے بھی محبت ہے۔ سارے انبیاء علیہم السّلام اور سارے اولیاء نیز اھل اللہ سے محبت۔ یہ محبتِ عقلی ہے۔ آخرت کا تعلق زیادہ تر اسی محبت سے ہے جو امر اختیاری ہے۔ اور غیرِ اختیاری امور پر تکوینی آثار مرتب ہوں گے، وہ دوسرا درجہ ہے۔ اختیاری محبت پر تشریعی آثار مرتب ہوں گے۔ اسی کے بارے میں ہے۔ ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ.'' ① اور اسی کو فرمایا گیا: ''مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ.'' ② ''جس نے محبت کی تو اللہ کی خاطر، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کے لئے، کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے، اس نے ایمان کو کامل کر دیا۔ حبِّ فی اللہ اور بغضِ فی للہ کے کمال پر ایمان کا کمال بتلایا گیا۔ یہ وہی اختیاری محبت ہے جو اعمال سے بڑھتی ہے۔ ترکِ عمل سے گھٹ جاتی ہے''۔

قیامِ میلاد اور عُرس کی تحقیق...... ایسا موقع تو میرے علم میں نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان مسائل میں ابتداء حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے جواز کی تھی۔ قیامِ میلاد یا عرس ان چیزوں میں توسّع تھا۔ بعد میں جب تحقیق بدلی ہے، پھر شدت پیدا ہوگئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدّس سرہٗ جو گویا پوری اس جماعتِ دیو بند کے شیخ طائفہ ہیں۔ ان کے سلسلہء بیعت میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں خود ان چیزوں میں توسّع ہے۔ لیکن جماعت دیوبند کا عمل حضرات فقہاء کرام کے اقوال اور نصوص پر اور کتاب وسنّت پر ہے۔

قیامِ میلاد کی جو اصل بنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو قیام ہے ایک حرکتِ وجدی ہے اور حرکتِ وجدی صرف اسی صورت میں معتبر ہے کہ کسی حال کے تابع ہو۔ اگر رسم یا نقالی کے تابع ہو، اسے حرکتِ وجدی نہیں کہتے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الادب، باب علامة حب الله عزوجل، ص: ۵۲۰، رقم: ۶۱۶۸.

② السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه، ص: ۱۵۶۷، رقم: ۴۶۸۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۱۸۱ رقم: ۴۶۸۱.

اگر کسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت متمثّل ہوا اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے، پھر آگے یہ طریقت کا مسئلہ ہے کہ جتنے بھی اربابِ طریقت موجود ہوں، انہیں بھی کھڑا ہو جانا چاہئے۔ ورنہ اس پر قبض طاری ہو جاتا ہے۔

اب حقیقت میں یہ شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ذوقی اور وجدانی مسئلہ ہے اور طریق کا ایک معالجہ ہے، اس کو جائز وناجائز کے نیچے لانا یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک حرکتِ وجدی ہے۔ اب جو ناجائز کہتے ہیں وہ ان لوگوں کے قیام کو کہتے ہیں جو کہ وجدی نہیں ہے اور کسی کے تابع نہیں۔ محض نقالی ہے، رسوم کی اتباع ہے، کوئی صاحبِ حال نہیں ہے۔ تو جب رسم کی اتباع ہوگی تو رسم پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام اولیٰ ہے۔ اگر کسی پر حال طاری ہوگا، اور وہ مغلوب الحال ہے تو وہ عنداللہ معذور ہے۔ نہ آپ اسے کچھ کہہ سکیں گے نہ ہم کہہ سکیں گے۔ لیکن جو اپنے ہوش وحواس میں ہے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور آپ کے لائے ہوئے قانون کی اتباع کرنی پڑے گی۔ بحالتِ صحتِ حواس اگر رسوم کی اتباع کرنے لگے، وہ نقالی سمجھی جائے گی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کا تمثّل ہوا اور مثالی صورت سامنے آئے۔ خواب میں بھی آپ دیکھ لیتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ رَّانِیْ فِی المنام فَقَدْ رَاٰنِیْ .'' ① 'جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا''۔

اسی طرح سے منام جو ہے وہ ایک ابتدائی درجے کا کشف ہے جو ہر انسان کو میسّر آ سکتا ہے۔ لیکن مجاہدہ اور ریاضت کرنے والوں کا کشف، اس کا اور درجہ ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کسی مغلوب الحال کے سامنے آئے اور متمثّل ہوا اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ اس پر نہ آپ دارو گیر کریں گے نہ ہم کریں گے کیوں کہ وہ اپنے حال میں نہیں، اپنے آپ میں نہیں ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا ناسور...... جامعہ ازہر میں شیعوں کے بارے میں مسئلہ تو چل رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ جو شیعہ سنی کے درمیان منافرت سی ہے، اس کو ختم کیا جائے۔ اور جامعہ ازہر میں شیعوں کو بھی داخلے کا حق دیا جائے۔ یہ مسئلہ وہاں چل رہا ہے۔ وہاں کے شیوخ میں شیخ عبدالواحد واصلی ہیں۔ ایک دعوت میں ہمارا ساتھ ہوا تو اس مسئلہ پر کچھ گفتگو آئی۔ اس پر انہوں نے یہی کہا کہ ایک شیعہ تو وہ ہیں جو بالکل اصول اسلامیہ سے منحرف اور بالکل مختلف ہیں جیسے کوئی تحریف قرآن کا قائل ہے یا بعض حلولِ خداوندی کے قائل ہیں۔ ان سے تو بحث نہیں۔ وہ اسلام سے خارج ہیں۔ لیکن جو لوگ محض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کے قائل ہیں، ان سے اگر منافرت باقی نہ رہے تو کیا حرج ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت الگ ہے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر فقط اتنا ہی مسئلہ ہو، اہم تو یہ بھی ہے، اس واسطے کہ اب فضیلتِ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر اور ان کی خلافت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اجماع کا خرق اور اس کا توڑ ڈالنا یہ بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو برداشت کیا جائے کہ ایک چیز پر اجماع ہو چکا ہے مگر اس کی جو جانب مخالف ہے وہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقال فی الرکوع، ص: ۷۵۴، رقم: ۱۰۹۰.

کوئی حرام یا ممنوع نہیں ہے۔ اگر فقط ایک مسئلہ ہوتو کچھ صبر کرلیا جائے۔

لیکن ان کے ہاں سارے فرقوں کا قدرِ مشترک وہ ''مسئلہ امامت'' ہے اور وہ امامت کو نبوّت سے افضل جانتے ہیں۔ اور امام کو معصوم سمجھتے ہیں کہ امام کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ تو یہ مسئلہ سامنے آئے گا۔ کیا آپ اس کو برداشت کریں گے؟

ظاہر بات ہے کہ جب بنیاد کے اندر ہی اختلاف ہوگیا کہ ہم تمام مسلمان اس کے قائل ہیں کہ نبوّت سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں۔ امامت توابعِ نبوّت میں سے ہے۔ جب نبوّت ختم ہوگئی تو وعدہ دیا گیا۔ ''اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ.'' ① یا یہ کہ بارہ امام گزریں گے۔ یا آئمہ مجتہدین کے بارے میں کچھ پیشین گوئیاں آئیں۔ تو اس کا مطلب یہ کہ نبوّت ختم ہوجانے کے بعد نبوّت کی خلافت باقی رہے گی۔ وہ خلافت خواہ امامت کی صورت میں ظاہر ہو، خواہ علم کی صورت میں، خواہ کسی بھی کمال کی صورت میں ہو۔ بہرحال وہ فروعاتِ نبوّت میں سے ہے۔

یہ امت کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، اس کے اندر اگر ایک فرقہ آکر یہ دعویٰ کرے کہ نبوّت افضل نہیں بلکہ امامت افضل ہے۔ تو پہلے تو اجماع کا خرق ہوا۔ پھر یہ کہ ان کے نزدیک امام کے لئے عصمت لازم ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عصمت لازم ہے۔ تو نبوت کے محاذ اور متوازی ایک دوسرا مقام لاکے کھڑا کردیا۔ تو ہم اس کو شرک فی النبوّت سے تعبیر کریں گے۔ جیسا کہ شرک فی الالوھیّت ممنوع ہے، اسی طرح شرک فی النبوّت بھی ممنوع ہے۔ اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں۔ اس لئے کہ انبیاءِ سابقین میں چوں کہ نبوّت ختم نہیں ہوئی تھی تو حضرات انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس میں اگر کوئی دعویٰ نبوت یا دعویٰ عصمت کرے تو کچھ مناسب بھی تھا۔

ختمِ نبوّت کے بعد جو بھی عصمت کا دعویٰ ہوگا یا نبوّت سے افضلیّت کا دعویٰ ہوگا۔ تو وہ ختمِ نبوّت کے ٹھیک منافی پڑے گا۔ ایک ادھر دعویٰ خرقِ اجماع اور ادھر ایک اسلام کا جو اجماعی مسئلہ ختمِ نبوّت کا ہے، اس کے بھی یہ منافی ہے، کیا آپ اسے برداشت کریں گے؟

تاریخی تخریبی فرقہ...... پھر میں نے عرض کیا کہ دوسری بات یہ ہے کہ ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیجئے، یہ دیکھئے کہ ہر فرقے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس فرقے کا مزاج تخریبی ہے۔ اور تاریخ اس پر شہادت دے گی کہ مسلمانوں کو جتنے بھی صدمات اٹھانے پڑے ہیں، سیاست کو یا خلافت کو جہاں جہاں تباہی ہوئی، نیچے سے یہی فرقہ نکلتا ہے، تو تاریخ کی روشنی میں یہ ایک تخریبی فرقہ ہے۔ جب اس کا مزاج یہ ہے تو ہوسکتا ہے کہ آج وہ آپ کی چاپلوسی کرکے آپ میں شامل ہوجائے۔ لیکن کل کو نوک پنجے نکال کر آپ کو ہی پنج دے۔ آپ کے اوپر غالب آجائے اور آپ دیکھتے رہ جائیں۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے، پھر آپ کیا کریں گے؟

① الصحيح للبخاري، كتاب العلم، باب اثم من كذب على النبي، ص: ١٢، رقم: ١١٠.

ذوقِ دین کی کمی...... آپ نے محض ایک عقیدہ سامنے رکھ لیا یعنی تفضیلِ علی رضی اللہ عنہ یہ کوئی زیادہ اہم نہیں۔ اگر صرف اس مسئلہ تک بات ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا مگر مسائل دوسرے بھی ہیں۔ پھر فرقوں اور طبقات کا مزاج ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر لینا تو ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اخیر میں انہوں نے یہ کہا۔ میں تو انہیں چیزوں کا قائل ہوں، میں تو نمائندگی کر رہا تھا کہ یہ خیالات ہیں۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ اس کی نمائندگی کیجئے گا کہ یہ خیال ہونا چاہیے، تو اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسئلہ تو اٹھ رہا ہے اور کچھ طبیعتیں ادھر چل رہی ہیں۔ اور جب اس ذوق میں کمی آتی ہے جو خالص دین کا ذوق ہے، تو افکار میں اس قسم کی آزادی پیدا ہوتی ہے۔

بشاشتِ ایمان (ایمانی کیفیت)...... دراصل اس کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے کہ اس پر ہم پرکھیں۔ بلکہ صحیح بخاری کی جو روایت ہے، اس میں ایک لفظ یہ ہے۔ جب ہرقل نے ابوسفیان سے مختلف سوالات کئے ہیں تو ان میں ایک یہ بھی تھا۔ ''هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سُخْطَةً لِدِيْنِهٖ.'' ''کیا ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لا کر ان کے دین کو برا سمجھ کر کوئی مرتد بھی ہو جاتا ہے؟''۔ انہوں نے کہا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مرتد ہو گیا ہو۔

ہرقل یہ کہتا ہے کہ ''وَكَذَالِكَ الْإِيْمَانُ إِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ''. ① یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب ایمان کی بشاشت قلب کے اندر رچ جائے۔ پھر ارتداد کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ تو حدیث میں اس کو انشراحِ تام اور بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مختلف الفاظ جو احادیث میں آتے ہیں۔ کہیں ''حلاوۃِ ایمان'' فرمایا گیا۔ جیسے حدیث میں ہے۔ ''مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يَّجِدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوْفَ تَذَلُّلاً لِّرَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ.'' ② جس کو یہ پسند ہو کہ میں ایمان کی مٹھاس چکھوں اسے چاہئے کہ اللہ کے سامنے ذلتِ نفس اختیار کرنے کے لئے اون کا کپڑا پہنے یعنی دکھلاوے کے لئے نہ ہو۔ تو اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس آ جائے گی۔

اب یہ ایک کیفیّت ہے کیفیّت کو ہم الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کہیں اس کو ''شرح صدر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ ③ ''جب اللہ سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور شرح صدر نصیب ہو جاتا ہے تو اس کو ایک خاص نور عطاء کر دیا جاتا ہے''۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ اب قلب کے اندر ظلمت نہیں آ سکتی۔ جب شرح صدر ہو گیا۔ تو کہیں حلاوۃِ ایمان سے، کہیں بشاشتِ ایمان سے، کہیں شرح صدر سے، اس کی مختلف تعبیرات ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ کہ دین کے لئے سینہ کھل جائے اور اس پر طمانیّت میسّر آ جائے اور رضائے کامل حاصل ہو جائے۔ پھر اندیشہ نہیں رہتا۔

---

① الصحيح للبخاری، كتاب تفسير القرآن، باب قل يا اهل الكتاب تعالوا، ج:۱۴، ص:۲۲. ② كنز العمال، ج:۱۵ ص:۳۰۲ (الديلمي عن ابی هريرةؓ) علامہ پٹنیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قلت: الحديث حسن له شواهد فعند البيهقي بوجه آخر نحو "من لبس الصوف وحلب الشاة وركب الاتان فليس في جوفه شيء من الكبر وغيره ذالک دیکھئے: تذكرة الموضوعات، ج:۱ ص:۱۵۷. ③ پارہ:۲۳، سورة الزمر، الآية:۲۲.

کیفیّتِ مقام...... لیکن یہ کہ اس کا قاعدہ کیا ہے۔ یہ قواعد سے متعلق چیز نہیں۔ یہ تو ایک مقام ہے، جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے گا تو یہ ایک قلبی کیفیّت ہے، وہ خود محسوس کرے گا کہ میں کس مقام پر ہوں۔ لفظوں میں کیفیّات ادا نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو ایمانی اور روحانی کیفیّات ہیں۔ مادّی کیفیات کو آدمی الفاظ سے نہیں سمجھ سکتا، کتنی بلیغ تعبیر کیوں نہ ہو؟

میں آپ سے کہوں آپ ذرا مجھے سیب کا مزہ سمجھا دیجئے، تو آپ کتنی ہی فصیح و بلیغ تقریر کریں، آپ نہیں سمجھا سکتے۔ اس لئے کہ کیفیت الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی، آپ یوں کہیں گے کہ صاحب! دو پیسے خرچ کرو، کھا کے دیکھ لو، مزہ معلوم ہو جائے گا، یہ مادّی کیفیّت ہے، یا مثلاً نفسانی کیفیّت ہے۔ جیسے انسان کی عمر کے تین درجے ہیں، طفولیّت، شباب اور کہولت ہے۔ بچہ اگر آپ سے یہ پوچھے کہ جوانی کی کیا کیفیات ہیں، مجھے سمجھا دیجئے۔ کیا آپ اس پر قادر ہیں کہ سمجھا دیں؟ کبھی نہیں سمجھا سکیں گے۔ یہ کہیں گے کہ بیٹا! ایک آٹھ دس برس کا انتظار کرو، جب جوان ہو جاؤ گے، خود محسوس ہو جائے گا کہ کیا کیفیت ہے۔ یا ایک جوان آدمی یوں کہے کہ مجھے بڑھاپے کے کیفیت سمجھا دو۔ ممکن نہیں کہ آپ سمجھا دیں۔ جب تک وہ کیفیت اس پر گزرے نہیں۔ اور وہ خود صاحبِ مقام نہیں بن جاتا۔ یا بوڑھا آدمی یوں کہے کہ مجھے مختصر کی کیفیت سمجھا دو کہ نزع کی حالت کیسی ہوتی ہے تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ بھائی! جب یہ کیفیت آئے گی تو خود سمجھ لو گے، یہ لفظوں میں میں ادا نہیں کر سکتے۔ جب مادّی کیفیّت کو لفظوں میں نہیں لا سکتے، نفسانی کیفیّت کو نہیں لا سکتے، تو روحانی کیفیّات جو مقاماتِ قلب سے تعلق رکھتی ہیں، وہ اتنی لطیف ہیں کہ ناممکن ہے کہ وہ لفظوں میں آسکتی ہوں اور جتنی آسکتی ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ اس کی علامتیں بتلا دی گئی ہیں کہ جب اس درجہ پر پہنچ جاؤ گے تو سمجھ لو کہ صاحبِ مقام ہو گئے۔

کیفیّتِ برزخ...... کسی بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، انہوں نے کہا کہ ہزاروں آدمی مرتے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتلایا کہ مجھ پر گزرا کیا۔ انہوں نے کہا میرا جب انتقال ہو تو تم میری قبر میں کاغذ اور قلم دوات رکھ دینا۔ میں تمہیں ساری کیفیات لکھ کر دوں گا۔ بس تم تیسرے دن آ کر اس کاغذ کو اٹھا لینا۔ اور کہا میں نے تیسرے دن کی قید اس لئے لگائی ہے کہ تین دن میں مجھے اپنا اندازہ ہو جائے گا کہ مجھ پر کیا گزرے گی۔ میں مقبول ہوں یا نامقبول ہوں۔ جب اپنی طرف سے اطمینان ہو تب میں دوسرے کو اطلاع دوں گا کہ یہ کیفیّت میرے اوپر گزری۔ چناں چہ ان کے انتقال کے بعد تیسرے دن لوگ پہنچے تو وہ جو کاغذ اندر رکھا تھا، واقعی اوپر موجود تھا۔ اور اس کے اوپر لکھا ہوا بھی ہے۔ اور لکھا ہوا کچھ ایسے حروف میں ہے کہ وہ روشنائی بھی نہیں ہے۔ بس کچھ حروف سمجھ آتے ہیں۔

غرض لوگ شوق سے دوڑے کہ شیخ نے برزخ کے احوال سے مطلع کیا ہوگا۔ وہ وعدہ کر کے گئے تھے۔ اس میں انہوں نے ایک سطر میں سارا حال لکھ دیا۔ وہ یہ تھا کہ۔ ''یہاں کی حالت دیدنی ہے، شنیدنی نہیں ہے'' ۔ دیکھنے اور گزرنے سے تعلّق رکھتی ہے، سننے سے متعلّق نہیں ہے۔ وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور جتنی بیان میں آسکتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ تو حدیث میں عالم برزخ کے جتنے واقعات بیان کر

دیئے گئے ہیں اس سے زیادہ کوئی بیان کر سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی قوتِ بیانیہ ہے کہ ان کی کیفیات کو پھر بھی لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان سے زیادہ کسی کو قدرت نہیں ہے، تو یہ جواب دیا کہ یہاں کہ حالت دیدنی ہے، شنیدنی نہیں۔ سننے کے لائق نہیں۔ بس دیکھنے کے لائق ہے۔ غرض ہر کیفیاتی مقام کا یہی حال ہے کہ آپ اس کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتے۔ خواہ نفسانی مقام ہو، خواہ مادّی کیفیت ہو۔ صاحبِ کیفیت اور صاحبِ مقام بن جائیں۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

تعبیرِ کیفیت ناممکن ہے...... اور بظاہر اس کی بناء یہ ہے کہ جس قدر بھی کیفیات ہیں وہ امور کلیہ نہیں۔ وہ شخصی چیزیں ہیں، اگر امور کلیہ ہوں تو ان کو تو آپ تقریر و بیان سے بیان کر سکتے ہیں جن کا تعلق سارے انسانوں سے ہے۔ وہ امورِ شخصیّہ ہیں، کسی کی کوئی کیفیت کسی کی کوئی کیفیت ہے کوئی کسی حال میں ہے۔ کوئی کسی مقام پر ہے۔ اور ایک کا مقام دوسرے کے لئے حجت نہیں۔ اپنے آپ کو آدمی خود ہی سمجھتا ہے اور خود ہی محسوس کر سکتا ہے اگر کلیاتی چیزیں ہوں تب تو ان کی تعبیر ہو لیکن جب وہ امورِ جزئیہ ہیں اور ان کا تعلق بھی کیفیات سے ہے تو ان کے لئے تعبیر رکھی نہیں گئی اور جتنی ہو سکتی ہے بس وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دی ہے۔ آگے نہ کسی کی جرات ہے نہ قوت ہے۔

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام   بس سخن کوتاہ باید والسلام

خام کبھی پختہ کار کی کیفیات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ جواب یہی ہوگا کہ تم پہلے پختہ کار بن جاؤ، پھر خود سمجھ لو گے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

کسی نے سوال کیا تھا کہ عاشقی کسے کہتے ہیں؟ عاشقی کیا ہوتی ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست   گفتم کہ چوں ما شوی بدانی

مجھ جیسے عاشق بن جاؤ، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عاشقی کیا ہے۔ لفظوں میں کیسے بتلا سکتا ہوں

انسان کی قوتِ بیانیہ کا عجز...... اچھا یہ تو کیفیات ہیں جو باطنی چیزیں ہیں۔ انسان کے چہرے مہرے کی ایک آن اور شان ہوتی ہے۔ وہ لفظوں میں نہیں آ سکتی یعنی آپ چہرے کی تصویر کھینچ دیں گے لیکن چہرے کی جو آن بان ہے، اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ وہ تو جب سامنے ہوگا۔ اس کی ادائیں سامنے آئیں گی۔ آپ سمجھیں گے یہ محبوب ہے۔ لیکن لفظوں میں یہ آئیں یہ ممکن نہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواہد کشید

آدمی صورت کھینچ سکتا ہے۔

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواہد کشید   لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

صورت آدمی کھینچ سکتا ہے لیکن اس کے ناز و ادا کو کیسے کھینچے گا، الفاظ میں کیسے [illegible] گا۔ کاغذ سے اس کا

کوئی تعلّق نہیں۔اس کا تعلّق احساسات اور ادراکات سے ہے اور وہ ادراکِ باطنی ہے۔تو بہت سی ادائیں جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں، بیان نہیں کی جاسکتیں۔اور کیفیاتِ روحانی ونفسانی، یہ تو آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتیں۔ان کو آدمی کیسے بیان کرے گا۔؟ یہ تو آنکھوں دیکھی چیز ہے جب اسے بیان نہیں کرسکتا۔غرض انسان کو بیان کی قوّت نہایت محدود دی گئی ہے،ہاں جو چیز جسمانی ہو لفظوں میں بھی آسکتی ہو،آواز کی گرفت میں بھی آسکتی ہو،اسے ہم بیان کرسکیں گے،جو نہ آواز کی گرفت میں آئے ،نہ لفظوں کی گرفت میں آئے ،اسے کیسے بیان کریں؟ سوائے اس کے کہ سکوت کرکے صاحب مقام پر محوّل کردیں کہ جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

عدمِ احصاءِ ثناءِ باری کی وجہ......اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہٗ کی مدح وثناء اتنی انتہاء کو پہنچائی کہ عالم میں اتنی مدح وثناء کرنے والا کوئی نہیں۔جتنی حمد وثناء حق تعالیٰ شانہٗ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے اور تعریف، وتوصیف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہے، کسی نے نہیں کی۔لیکن اخیر میں فرماتے ہیں۔ ’’اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ.‘‘ ① ’’اے اللہ! میں تیری ثناء وصفت کا احاطہ کرہی نہیں کرسکتا۔بس مختصر یہ کہ تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے کو فرمایا ہے‘‘۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ثناء وصفت مقاماتِ کمال کی ہوتی ہے۔اور کمالاتِ الوہیّت انبیاءعلیہم السلام جتنے دیکھ سکتے ہیں۔اتنی ثناء کرسکتے ہیں۔باقی کمالاتِ الوہیّت لفظوں کی گرفت میں تھوڑا ہی آسکتے ہیں۔جب بندوں کے مقامات بندوں کے قبضے میں نہیں آتے تو الوہیّت کے مقامات کس طرح سے بندوں کے قبضے میں آجائیں گے،تو سوائے اس کے کہ سپر ڈال دی جائے اور عجز کا اقرار کیا جائے ، کچھ نہیں ہوسکتا ؎

نہ ہر جا مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

ہر جگہ گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا۔بہت سی جگہیں آتی ہیں کہ لگام روک لینا پڑتا ہے اور آدمی سپر ڈال دیتا ہے کہ اس خاردار جنگل میں میں نہیں گھس سکتا،گھوڑا وہیں دوڑے گا کہ زمین سیدھی ہو، گھاس بچھی ہوئی ہو۔اور جہاں اونچ نیچ ہو، پہاڑ ہوں، گھاٹیاں ہوں اور نشیب وفراز ہوں وہاں گھوڑا بیچارہ کیا دوڑے گا، وہاں تو خیال بھی نہیں دوڑ سکتا چہ جائیکہ گھوڑا دوڑے۔میری ایک لمبی چوڑی نظم تھی، وہ تو یاد نہیں ہے۔اس میں،ایک شعر یاد ہے، وہ حق تعالیٰ کی ثناء وصفت کے بارے میں ہے ؎

خدا کی ثناءِ کامل یہی ہے کہ ہم سے کچھ ثنا ممکن نہیں

جو یوں کہہ دے کہ میں آپ کی تعریف کرہی نہیں کرسکتا۔اس نے تعریف کی۔جو تعریف کرنے کا مدعی بن کے بیٹھے، ممکن نہیں کہ کرسکے۔ترکِ دعویٰ کردینا ہی تعریف ہے۔

تسلیم عجز ادائیگیٔ شکر ہے...... اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، ص: ۷۵۴، رقم: ۱۰۹۰.

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① "اے داؤد! ہمارا شکرادا کرو"۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کا وصف اور خلق شکر انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام پر شکر کا غلبہ ہے۔ تو امر کیا گیا کہ شکرادا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے امر اور حکم کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا، وہی سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور کیا مقصد ہے۔ تو عرض کیا کہ اے اللہ! یہ تو میرا فرض ہے کہ میں شکرادا کروں اور جب حکم ہے تب تو میں شکرادا کروں گا ہی۔ مگر حیران یوں ہوں کہ کس طرح شکرادا کروں، اس لئے کہ نعمتوں کے اوپر جب شکرادا کرنے بیٹھوں گا، جب آپ توفیق دیں گے جبھی تو ادا کروں گا۔ اور توفیق دینا یہ خود ایک نعمت ہوگی، تو اس نعمت کا مجھے شکرادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکرادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ یہ ایک اور نعمت بن گئی۔ تو پہلے اس نعمت کا شکرادا کروں گا بعد میں اس کا۔ اور جب اس کا ادا کرنے بیٹھوں گا، اس کی توفیق بھی آپ دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت ہوگئی تو پہلے اس کا۔ اس طرح ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو شکر کی ابتداء ہی نہیں کرسکتا تو کس طرح سے شکرادا کروں، بس میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔ میرے قبضہ قدرت میں آپ کا شکرادا کرنا ہے ہی نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا "اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تم ادائے شکر سے عاجز ہو، تو یہ اقرار کر لینا ہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو شکر کا ادا کرنا یہی ہے کہ عجز تسلیم کرلے"۔

اس لئے کہ کوئی بھی بندہ کمالاتِ الٰہیہ کا حق ادا نہیں کرسکتا، یہی کہے گا کہ اے اللہ! عاجز ہوں۔ تو عجز مان لینا یہی ادائے حق ہے۔ ورنہ اگر واقعی شکر کی ادائیگی لازم ہو تو حقوق تو لامتناہی ہیں اور بندہ متناہی اور محدود ہے، یہ کیسے کرے گا؟ لامتناہی کا حق متناہی نہیں ادا کرسکتا۔ تو حق تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ لامحدود شکر کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنا عجز مان لے کہ ہم عاجز ہیں۔ بس ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے شکرادا کردیا۔ یہی ثناء وصفت کا حال ہے۔ "لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ."

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حمد وثناء کرنے والا عالم میں کوئی نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عارف باللہ کوئی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معرفت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اخیر میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ فرماتے ہیں کہ: "لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ."

یاجوج ماجوج میزانِ تحقیق پر...... یہ امرِ حق ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا، یاجوج ماجوج ایک قوم ہے جو قربِ قیامت میں نکلے گی۔ اور ان کے اوصاف بیان کئے کہ وہ پورے عالم پر چھا جائیں گے اور دریاؤں کا پانی پینے پر آئیں گے تو دریاؤں کو خشک کردیں گے، لوگوں کے اموال پر اس درجے غاصب بنیں گے، ساری اشیاء ان کے قبضے میں آجائیں گی، اس طرح کی علامتیں یاجوج موجوج کی بیان فرمائی گئی ہیں۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۱۳۔

لیکن زیادہ تفصیل نہیں فرمائی گئی کہ کون ہوں گے؟ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانوں میں سے ہی ہوں گے، کوئی جنات میں سے نہیں ہیں۔ صحیح روایات اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو آیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک قوم ہے جو قوی ہوگی، پورے عالم پر چھا جائے گی۔ پورے عالم کے خزائن اور دفائن پر قبضہ کر لے گی۔ اور انسانوں کو عام طور سے قابو میں لے لے گی۔ چاہے ختم کر دے، چاہے باقی رکھے۔ پورے عالم میں اس کا اقتدار پھیل جائے گا اور ساری زمین کے خزائین اور دفائن ان کے قبضے میں آ جائیں گے۔ جسے چاہیں دیں۔ جسے چاہیں نہ دیں تو روایات میں اس قسم کے احوال اور ان کی صفات آتی ہیں۔ اب آگے یہ کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلی روایات ہیں، مستند روایات نہیں ہیں۔

اقوام یورپ کو یاجوج ماجوج قرار دیا جا سکتا ہے؟...... اب اس میں علماء کی بحثیں ہیں۔ بعض محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ یورپ کی اقوام کو ''یاجوج ماجوج'' قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جتنی علامتیں فرمائی گئی ہیں یہ سب ان کے اوپر منطبق ہوتی ہیں۔ پورے عالم اسلام پر ان کا تسلّط بھی ہے، پورے عالم کے خزائن اور دفائن بھی ان کے ہاتھ میں آ گئے۔ دنیا کی ہر قوم گویا ان کے قابو میں ہے، جسے چاہیں نچا کے ختم کر دیں۔ چاہیں آگے بڑھا دیں۔ تو پورے عالم پر اس طرح سے ان کا اقتدار چھایا ہوا ہے۔

سدِّ سکندری...... اب آگے جو چیزیں آتی ہیں کہ وہ سدِّ سکندری کے پیچھے ہیں اس کو وہ چاٹتے ہوں گے اور چاٹ چاٹ کر خستہ کر دیتے ہیں اور قربِ قیامت میں وہ انشاء اللہ کہہ کے بڑھیں گے تو وہ ختم ہو جائے گی اور وہ باہر نکل پڑیں گے۔ اس میں پھر تاویلیں کی گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ، ان کے اوپر ایک روک ڈالی گئی ہے۔ وہ قربِ قیامت میں اٹھا دی جائے گی، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دیوار مادّی ہو۔ اور پہاڑوں کے اندر بنائی گئی ہو۔ بہرحال بعض حقیقت کے قائل ہیں کہ واقعی دیوار ہے اور قوم اس کے پیچھے ہے اور وہ اسے چاٹتی ہے۔ چاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے توڑنے پھوڑنے کی فکر میں ہے۔ مگر قابو نہیں ملتا۔ جب ان کے خروج کا وقت آئے گا تو من جانب اللہ قدرت دے دی جائے گی۔ توڑ کر نکل پڑیں گے۔ اور جو اس کے قائل ہیں کہ یہ موجودہ یورپ کی اقوام ہیں۔ یہی ''یاجوج یاماجوج'' ہیں۔ وہ اس کو مجازات پر محمول کرتے ہیں۔ حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔

آیتِ قدرت...... لیکن قرآن کریم اور احادیث کے الفاظ سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک حقیقت بن سکے، مجاز لینا یہ اصول کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں ہے کہ کوئی قوم ہو اور وہ پہاڑوں کے آگے پیچھے بند ہو اور واقعی میں سد سکندری ہو جس تک ابھی ہماری نگاہیں نہیں پہنچیں۔ اور وہ اس کو توڑنے پھوڑنے میں لگے ہوئے ہوں اور اخیر زمانہ ایسا آئے کہ وہ نکل پڑیں، اس لئے کہ قران وحدیث سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی قوم ہے۔ عام طور پر جیسے انسان ہوتے ہیں، اس انداز کے نہیں ہیں۔ چاہے وہ بشر ہی ہوں مگر غیر معمولی ہیں۔ اور ان کے اسباب ووسائل بھی کچھ غیر معمولی ہوں گے۔ اس کا ایک ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ ان اقوام کو نہ مانا جائے

بلکہ وہ ایک مستقل قوم ہے۔اور حق تعالیٰ نے اس کو محبوس رکھا ہے، وہ اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ جیسے دجال کا ظاہر ہونا اس کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔قربِ قیامت میں آگ کا ظاہر ہونا قدرت کی نشانی ہے۔اسی طرح سے اس قوم کا ظاہر ہونا یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔مگر غیر معمولی چیز ہے۔لیکن صحیح کیفیت کی تفاصیل زیادہ موجود نہیں ہیں، بس قیامت کی علامات میں سے ہے، جہاں اور غیر معمولی سینکڑوں چیزیں ظاہر ہوں گی، ان میں ایک یہ بھی ہے۔﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ ① اِدھر سے اُدھر ہر گھاٹی میں سے نکلتے ہوئے نظر آرہے ہوں گے۔یورپ والوں کی یہ صورت نہیں ہے، ان کا تو ایک مستقل ملک ہے، وہ آتے ہیں، جاتے ہیں مگر تجارت کی لائین سے دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

لیکن یہ کہ وہ ایک غیر معمولی انداز سے اس طرح خروج کریں کہ عالم میں ہر گھاٹی سے نکل کر ایک نئی قوم آرہی ہو، یہ صورت نہیں ہے۔ بہر حال الفاظ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدرت کی غیر معمولی نشانی ہے جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوگی۔اب اس غیر معمولی کو غیر معمولی سمجھ کر ایسے اوصاف بیان کرنا کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے یا ان کے کان لمبے ہوں گے۔یہ سب اسرائیلیات ہیں۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے...... ہمارے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی کچھ اس طرف مائل تھی کہ شاید یہ تو میں مراد ہوں۔قطعی طور پر تو نہیں فرماتے تھے مگر خیال ظاہر فرماتے تھے کہ شاید یہی مراد ہوں۔کیوں کہ بہت سی علامتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اقوامِ یورپ کے مورثِ اعلیٰ کا نام......اور کل ہی یہ ذکر ہو رہا تھا کہ انگلینڈ میں جو اسمبلی ہال ہے، جو بہت پرانا اور قدیمی ہے، اس کے دروازے پر پتھر سے کندہ ہے۔یا گوگ ما گوگ۔اس کو اگر معرّب کیا جائے تو یاجوج ماجوج بنتا ہے۔گویا وہ خود اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ۔ہاشمی صاحب بیان کر رہے تھے کہ روس والے کہتے ہیں کہ ہمارا مورثِ اعلیٰ، جس کی ہم اولاد ہیں، اس کا نام ''ما گوگ'' تھا۔اس قسم کی علامتیں دیکھ کر بعض علماء کا رجحان اس طرف ہو گیا کہ شاید یہی یاجوج ماجوج ہوں۔

ظہورِ خاتم الدجالین کے آثار...... آفتاب کے نمایاں ہونے سے پہلے اس کے آثار نمایاں شروع ہونے لگتے ہیں۔پھر پو پھٹتی ہے۔اسی طرح آفتابِ نبوّت کے طلوع سے پہلے قلوب کے اندر آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔تو جس طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار نمایاں ہوئے تا کہ صلاحیت اور استعداد ان کے دین کے قبول کرنے کی پیدا ہو۔یہی صورت بعینہٖ دجّال کی ہے کہ اس کے ظہور سے پہلے قلوب میں دجل وفساد، ڈپلومیسی، مکاری وعیاری اور دغا بازی، اس کے آثار اور صلاحیتیں پیدا ہونی شروع ہوں گی۔اس درجہ کو ہر انسان اپنی اپنی بساط کے مطابق محسوس کرے گا کہ قلب کے اندر کچھ ظلمت اور کدورت اور کچھ فریب ہے اور دنیا کے تمدن

① پارہ: ۱۷،سورۃ الانبیاء، آیت: ۹۶.

کی بنیاد بھی فریب اور دکھلاوے پر نمایاں ہونا شروع ہوگی۔ تو اس قسم کی چیزیں نمایاں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جب وہ ظہور کرے گا، اس وقت ہزاروں قلوب اس کو ماننے کے لئے مستعد ہوں گے۔ سوائے ان کے جن کے قلوب کے اندر ایمانوں کی صلاحیت بہت اقویٰ ہے۔ وہ نہ جھکیں گے لیکن عام طور سے اثر پیدا ہوگا۔ تو جس طرح سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل صلاح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے تو ضروری ہے کہ خاتم الدجّالین سے پہلے قلوبِ دجل وفساد اور مکروفریب کو قبول کریں، گویا دنیا سے اخلاص مضمحل ہونے لگے اور مکروفریب دنیا پر غالب آنے لگے، یہاں تک کہ وہ ظاہر ہو جائے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے دجّال کا تقابل...... چوں کہ خاتم الانبیاءِ کمالات سے بھرپور ہیں اور ختم کرنے والے یعنی سارے کمالات کے منتہٰی ہیں۔ تو دجّال سارے فسادات کا منتہٰی ہوگا۔ اور اس درجہ کو کہ جیسے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں مونڈھے کے قریب مہرِ نبوت تھی، جس پر یہ لکھا ہوا تھا جیسے کہ بعض روایات میں ہے۔ ”سِرْ حَيْثُ شِئْتَ فَاِنَّكَ مَنْصُوْرٌ.“ ① ”تم جہاں بھی جاؤ، نصرتِ خداوندی تمہارے ساتھ ہوگی“۔

بعض روایات میں ہے کہ لفظ خاتم الانبیاء ”یَا مُحَمَّدُ“ کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسا کچھ مترشح ہوتا ہے، اس کی ہیئت احادیث میں آتی ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس درجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمالاتِ نبوّت سے بھرپور ہیں کہ وہ چھلک کے اوپر آ گئے اور نمایاں ہو گئے، اسی طرح سے خاتم الدجّالین دجل وفریب میں اتنا بھرپور ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا ک۔ف۔ر۔ یعنی کفرِ مجسم۔ تو علامت اوپر آ جائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھیک تقابل ہے۔

تقابلِ اضداد کی حکمت...... اس امّت میں جس درجہ کمالات ظاہر ہوئے، اسی درجہ فسادات کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اوّل تو کمال سے فساد کا تقابل ہوتا ہے۔ ہر کمال کی خوبی تب کھلتی ہے جب اس کے مقابلے میں نقص آتا ہے۔ ایمان کی قوت تب کھلتی ہے۔ جب اس کے مقابلے میں کفر آ جائے۔ ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ ② ہم باطل کو ٹکرا دیتے ہیں حق سے اور جب وہ حق سے ٹکر کھا کر پاش پاش ہوتا ہے تو حق کی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اگر باطل نہ رکھا جائے تو حق کی قوّت نمایاں نہ ہو۔ تو اضداد رکھی گئیں

اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں دجّال رکھے گئے، جس درجے کا نبی اسی درجے کا دجّال۔ بہرحال میری غرض یہ تھی کہ جیسے شیاطن کا مقابلہ ملائکہ سے ہے، دجّالوں کا مقابلہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہے۔ انبیاء کے متبعین میں جو مُقبل لوگ ہیں انہیں آئمہ ہدایت کہتے ہیں۔ ادھر کفر کے سلسلہ میں آئمہ الکفر ہیں۔ تو آئمہء ہدایت کا آئمہء ضلالت سے مقابلہ ہے۔ اسی طرح اتقیاء کا مقابلہ فجّار سے ہے۔ اوپر سے لے

① الحديث اخرجه الشيخ الصالحي الشامي في "سبل الهدى والارشاد" وقال، قال ابن دحية: وهذا غريب واستنكروه ج: ٢ ص: ٥٢. عمدة القاري، كتاب الوضو، باب استعمال فضل وضوء الناس، ص: ٢ ارقم ١٣١. ② پارہ: ١٧، سورة الانبياء الآية: ١٨.

کر نیچے تک تقابل چل رہا ہے۔ بہر حال حضرات انبیاء علیہم السلام سے دجالین کا مقابلہ ہے۔ اسی لئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خاتم الدجالین کا مقابلہ ہے۔

استدراجِ دجال...... ظاہر بات ہے کہ جس پر دجل کے سارے مراتب ختم ہوں گے، معمولی قسم کی روحانیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بڑے بڑے اولیاء کاملین بھی اس کے مقابلے سے عاجز ہوں گے۔ اسی لئے حدیث میں حکم فرمایا گیا کہ: دجال ظاہر ہو تو سیر و تماشے کے طور پر بھی اسے دیکھنے کے لئے مت نکلو۔ وہ ایمانوں کو اس طرح سلب کرے گا جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف جذب کر لیتا ہے۔ تو تماشا دیکھنے کے لئے بھی مت جاؤ۔ بلکہ مفصل اور محبوس ہو جاؤ۔ اس کے سامنے مت جاؤ، گویا یہ اس کی علامت ہے کہ کوئی کتنا بڑا صالح ہوگا، روحانیت والا ہوگا لیکن اس کا دجل اور فریب اور جو اس کے ہاتھ پر کرشمے استدراج کے طور پر ظاہر ہوں گے، وہ اتنے بڑے ہوں گے کہ ولایت کام نہیں دے گی، کوئی کتنا ہی بڑا ولی ءکامل ہو کر اس کا مقابلہ کرے۔ جب تک نبوّت کی قوّت مقابلہ پر نہ آئے۔ کیوں کہ اصل دجال کا مقابلہ ہی نبوّت سے ہے۔

قتل دجّال کی صورت...... اب ایک صورت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینی چاہیئے۔ تب تو وہ قتل ہو۔ عام ولایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ غرض ایک صورت تو یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجّال کو ظاہر کر دیا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کر دیتے۔ وہ قتل تو ہو جاتا۔ لیکن اگر وہ اس زمانے میں ظاہر ہو کر قتل ہو جاتا تو اس کے دجل و فریب کے جو مراتب اور مقامات ہیں، وہ نہ کھلتے کہ ان سے تقابل ہو کر ایمان کی قوتیں ظاہر ہوتیں۔ بلکہ وہ یکدم سامنے آتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔ اور مقصد یہ تھا کہ دجّال ظاہر ہو اور اس کے سبب باطل کی استعدادیں پیدا ہوں۔ اس باطل سے پھر حق کی قوتیں ٹکرائیں۔ اور حق کی قوت نمایاں اور واضح ہو، اگر اس وقت ظاہر ہوتا تو یہ تقابل ختم ہو جاتا بس وہ ہاتھ کے ہاتھ قتل ہو جاتا۔ اس لئے اس کا ظہور آخر دور میں رکھا گیا تا کہ اس کے قلب کے اثرات سے امت میں باطل بھی ظاہر ہوتا رہے۔ اور اسلام اس کا مقابلہ بھی کرتا رہے۔

اب دوسری صورت قتل کی یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک باقی رکھا جاتا کہ وہ ظاہر ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کر دیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے فروتر بات ہے کہ محض قتل دجّال کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم میں باقی رکھا جاتا۔ نیز یہ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھا جاتا تو دجل و فساد کے مراتب سامنے نہیں آ سکتے تھے۔ نبوّت کی قوتیں اتنی پھیلی ہوئی ہوتیں کہ دجل کچھ نہ کر سکے، تو اسے بھی موقع دینا تھا کہ وہ نمایاں ہو اور پھر شکست کھائے تا کہ دجل کا ضعف حق کے مقابلے میں واضح ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو قاتل دجّال بنانے کی حکمت...... اب کئی چیزیں پیدا ہو گئیں۔ دجّال کا قتل بغیر نبوّت کی طاقت کے نہیں ہو سکتا۔ اور نبوّت بھی معمولی نبوت نہیں بلکہ ختم نبوّت کی قوّت ہو جب وہ ختم ہو۔ ولایت کام نہیں دے سکے گی۔ اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا باقی رکھا جانا بھی مصلحت کے خلاف تھا کہ محض اس کے قتل کے

لئے باقی رہیں۔اب اس کے جمع کی صورت حق تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ: حضرت مسیح علیہ السلام کو دجّال کا قاتل قرار دیا۔ان میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں متعدد مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں جو اور انبیاء علیہم السلام میں نہیں ہیں۔

وصفِ خاتمیّت میں مماثلت...... مثلاً پہلی بات یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور خاتمیّت کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔تو ایک گونہ خاتمیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی ہے کہ وہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل گویا ہیں جو سب سے بڑا دور جو نبوت کا ہے،وہ اسرائیلی نبوّت کا ہے۔ہزار ہا انبیاء اس کے اندر پیدا ہوئے اور فرمایا گیا ﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ہم نے اس خاندان کو جہانوں پر برگزیدہ کیا۔اور اس خاندان میں ہم نے نبوت بھی دی اور بادشاہت بھی دی۔﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② نبوت کی دولت دی، ملوکیت کی دولت دی اور وہ نعمتیں دیں جو عالم میں ان سے پہلے کسی قوم کو نہیں دی گئیں،ایک عظیم انسانی خاندان جس میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔اس کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ان پر آ کر اسرائیلی نبوّت منتہی ہوگئی۔تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق نبوّت کے خاتم ہیں۔حضرت مسیح علیہ السلام خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل ہیں۔تو خاتمیّت کے مقام میں ایک گونہ گویا مناسبت ہوئی۔

وصفِ رحمت میں مماثلت...... پھر جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمتِ مجسم فرمائی گئی ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ یہی رحمتِ مجسّم حضرت مسیح علیہ السلام کی شان بتلائی گئی ہے۔جہاں ان کی پیدائش کا ذکر ہے اس میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا﴾ ④ جب حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ ⑤ ”میرے بیٹے کہاں سے ہوسکتا ہے۔بشر نے مجھے چھوا نہیں،زانیہ و باغیہ میں نہیں ہوں“۔﴿قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾ ⑥ یوں ہی ہوگا۔اللہ کا حکم ہو چکا ہے۔اور یہ اس لئے ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو ہم نے اپنی قدرت کی نشانی بنانا ہے،بطورِ نشان قدرت کے ہم نمایاں کریں گے کہ بلا باپ کے بھی پیدا کر سکتے ہیں۔اور یہ امر طے شدہ ہے۔ایسے ہی ہوگا۔جو رحمت مجسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا۔وہی رحمت مجسّم ہونے کی شان حضرت مسیح علیہ السلام کی فرمائی گئی۔

تربیّتِ اِتباع میں مماثلت...... جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان فرمائی گئی ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ⑦ خود ان صحابہ میں رحمت کا غلبہ ہے۔وہی شان متبعین عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں

① پارہ: ۲۵،سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ الآیۃ: ۲۰۔ ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء الآیۃ: ۱۰۷۔
④ پارہ: ۱۶،سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱۔ ⑤ پارہ: ۱۶،سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۰۔ ⑥ پارہ: ۱۶،سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱۔
⑦ پارہ: ۲۶،سورۃ الفتح، آیت: ۲۹۔

فرمائی گئی۔فرمایا گیا﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ ① ''ان کے اتباع کرنے والوں کے قلوب میں ہم نے رافت اور رحمت بھر دی۔'' اتباعِ عیسوی میں غضب کا غلبہ نہیں تھا بلکہ رحمت کا غلبہ تھا۔تو جو غلبہ اصحابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں فرمایا گیا وہی غلبہ اصحابِ عیسوی کے اندر فرمایا گیا۔اس کا حاصل یہ نکلا کہ تربیّت کے اندر مشابہت ہے۔جو شانِ تربیّت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے وہی شانِ تربیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ہے جو شانِ رحمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔اسی کے قریب شانِ رحمت حضرت مسیح علیہ السلام میں ہے،غرض یہ مناسبات ہیں۔

زہدو شوکت کی زندگی میں مماثلت...... اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوی مناسبت یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو زندگیاں عطاء کی گئیں۔ایک مکّی زندگی کہلاتی ہے۔ایک مدنی زندگی کہلاتی ہے،مکہ کہ زندگی تیرہ سالہ اور مدینہ کی زندگی دس سالہ ہے۔اس طرح نبوّت کے تیئیس برس ہوتے ہیں۔تو مکّہ کی تیرہ سالہ زندگی انتہائی زہد اور قناعت کی ہے جس میں تشدد کی اجازت نہیں مار کھاؤ،سہو اور جواب نہ دو۔﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ ② اے نبی درگزر اختیار کرو۔کہیں فرمایا﴿اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ﴾ ③ اگر یہ بک بک بھی کریں تو تم اعراض کرو۔درگذر کرو۔جاہلوں کی باتوں کی طرف دھیان مت کرو۔اگر یہ تمسخر بھی کرتے ہیں تو انہیں ہم پر چھوڑ دو۔انہیں ہم نپٹ لیں گے۔آپ انہیں جواب نہ دیں۔کہیں فرمایا﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا. اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا﴾ ④ اگر یہ ایذائیں پہنچائیں تو آپ تحمّل کریں اور صبرِ جمیل اختیار کریں۔کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا انجام کچھ دور ہے۔حالاں کہ وہ بہت قریب آ گیا ہے۔عنقریب ان کو پتہ چل جائے گا کہ ان کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

غرض جگہ جگہ حکم ہے کہ نہ تلوار اٹھاؤ۔نہ زبان کھولو،نہ ہاتھ ہلاؤ،ماریں تو مار کھاؤ،گالیاں دیں تو چپ ہو جاؤ۔ہاں کیا کرو﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ⑤ ان کے ساتھ جہادِ کبیر کرتے رہو۔اس کے راستے میں مار کھانی پڑے تو مار کھالو،پٹنا پڑے پٹ لو۔گویا تلوار کے جہاد کو جہادِ صغیر کہا گیا۔اور زبان سے اعلائے کلمۃ اللہ کو کہا گیا کہ وہ جہادِ کبیر ہے،وہ جہاد کرتے رہو،لیکن مار کھانے کے لئے تیار رہو،مقابلہ میں اف نہ کرو۔تیرہ سال اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گذری ہے۔

جب مظالم کی انتہاء ہوگئی کہ گالیاں بھی دی گئیں،ساحر بھی کہا گیا۔کذّاب و مجنون بھی کہا گیا اور اشرّ بھی کہا گیا اونٹ کا بوجھ بھی ڈال دیا گیا،کانٹے راستے میں بچھائے گئے۔کتے بھی پیچھے لگائے گئے۔پتھر بھی مارے گئے

---

① پارہ:۲۷،سورۃ الحدید،الآیۃ:۲۷۔ ② پارہ:۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ:۸۵۔

③ پارہ:۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ:۹۴،۹۵۔ ④ پارہ:۲۹،سورۃ المعارج،الآیۃ:۵ تا ۷۔

⑤ پارہ:۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ:۵۲۔

اور اخیر میں وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ تو وطن سے بے وطن بھی کیا۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی تب یہ آیت نازل ہوئی:
﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ﴾ ① اب ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن کی مظلومیت کی حد آ گئی ہے، کہ اب وہ مقابلہ کریں اور جواب دیں۔ بہر حال دس سالہ زندگی شوکت کی زندگی ہے۔ اور تیرہ سالہ زندگی درویشی اور انتہائی فقر وقناعت کی زندگی ہے، تیرہ سالہ زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ مدینے کی زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ لیکن اس شوکت کا پیش خیمہ یہی تیرہ سالہ زندگی بنی اس لیے اس تیرہ سالہ زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین کی تربیّت کی زہد وقناعت، صبر وحیا، شجاعت وسخاوت بھر دی تاکہ تیرہ برس کے بعد جب یہ مجاہد قوم نکلے تو حظِ نفس کی وجہ سے جہاد نہ کرے، نفسانیّت کی وجہ سے نہ کرے بلکہ خالص للھیّت کے جذبہ سے میدان میں آئے۔

تو تیرہ برس تربیّت کی تاکہ مخلص مجاہد پیدا ہو جائیں۔ اخیر میں جا کے انہوں نے تلوار اٹھائی اور قتال کیا۔ پھر فتحِ مکّہ ہوئی، شوکت کا آغاز ہوا اور یہ سارے کام ہوئے۔ غرض یہ دو زندگیاں۔ اور یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں پائی جاتی ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کی چالیس سالہ زندگی ہے یعنی پیغمبری کی ابتداء۔ ان کی تاریخ یہ ہے کہ اگر تمہارے بائیں گال پر کوئی تھپڑ مارے۔ داہنا سامنے کر دو، اف نہ کرو، جواب نہ دو، حضرت مسیح علیہ السلام کی شریعت میں انتقام لینا جائز نہیں ہے بلکہ عفو اور درگزر واجب ہے، غرض تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی مارے تو اور گردن جھکا دو کہ بھئی! ایک اور مارتا جا، خدا تیرا بھلا کرے، یہ گویا مکّہ کی زندگی کے مشابہہ ہے کہ جس کے اندر نہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے، نہ زبان کھولنے کی اجازت۔ لیکن جب مظلومیت کی انتہاء ہوئی۔ یہود نے یہاں تک کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا دو۔ تب حق تعالیٰ شانہ نے دوسرا بندوبست کیا کہ جو پھانسی پر چڑھانے کے لئے اندر گھسا۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈال دی اور وہ پھانسی پا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انتہائی عزّت کے ساتھ اوپر اٹھا لیا گیا۔ دنیا چاہتی تھی کہ انتہائی طور پر ذلیل کریں کہ اس دنیا کے اندر ان کا وجود نہ رہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنی عزّت دیں گے کہ آسمانوں پر قیام کرائیں گے اور زندہ رہیں گے، یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔

﴿وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ ؕ مَالَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًاo بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ﴾ ② نفی کی گئی ہے کہ نہ انہیں پھانسی دی گئی ہے نہ انہیں قتل کیا گیا، جو قتل یا پھانسی کے مدعی ہیں وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس شخص کے اوپر شبیہ ڈالی گئی ہے جو لینے کے لئے اور پکڑنے کے لئے گیا تھا، اس کو قتل کیا گیا۔ انہیں علم نہیں ہے۔ اور اخیر میں پھر مؤکد طریق سے کہا کہ انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ تو جب قتل نہیں کیا اور پھر موت کے سامان نہیں ہوئے تو رفع کا مطلب یہی ہے کہ

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹۔ ② پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۵۷، ۱۵۸۔

جسم کے ساتھ انہیں اٹھایا گیا۔ اگر قتل کر دیئے جاتے اور پھانسی دے دیئے جاتے۔ پھر روحِ محض کا رفع ہوتا۔ لیکن قتل اور پھانسی کی نفی کر کے فرمایا گیا کہ اللہ نے انہیں اٹھالیا تو وہ اٹھانا زندگی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور جسم کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ جیسے مظلومیت کی انتہاء پر حکم دیا گیا کہ زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کرو، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم چاہتی تھی کہ یہ اس مکہ شہر میں نہ رہیں۔ تو ملک میں ہجرات کرائی گئی۔ یہود چاہتے تھے کہ اس دنیا میں نہ رہیں۔ اس واسطے آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی گئی' تو ایک جگہ ہجرت یثرب کی واقع ہوئی ہے اور ایک جگہ آسمان کی واقع ہوئی۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد لوٹایا گیا اور دس سالہ شوکت کی زندگی ہے کہ اس میں تلوار ہاتھ میں ہے اور فاسقین و منافقین اور فاجرین کے مقابلے پر تلوار بھی ہے، حدود بھی ہیں اور قصاص بھی ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ لائیں گے، تا کہ اس زہد کی زندگی کے مقابلے میں اب ان کے ہاتھ میں تلوار بھی ہوگی دجال کا مقابلہ بھی ہوگا، دجال کے متبعین کے مقابلے میں تلوار لئے ہوئے ہوں گے۔ قتل و قتال بھی ہوگا، جہاد میں بھی کھڑے ہوں گے۔ اور استیصال کریں گے، جیسا کہ مشرکینِ مکہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جزیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے اسلام تھا یا قتل تھا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے۔ اس وقت دنیا کی قوموں کے لئے یا اسلام ہوگا۔ یا قتل ہوگا۔ جزیہ کا واسطہ بیچ میں نہیں ہوگا۔ یہ جزیہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ تو ٹھیک مشابہت اور مناسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے، شانِ رحمت میں بھی، وصفِ خاتمیّت میں بھی، اَتباع اور متبعین کی شانِ رحمت کے اندر بھی، ہجرت کے اندر بھی، دونوں زندگیوں کے اندر بھی ابتدائی زندگی عدمِ تشدد کی۔ انتہائی زندگی تشدد کی، ان سب چیزوں میں مشابہتِ تامّہ آپ کو حاصل ہے۔

ولادتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا دخل...... اور اس میں لطیفے کے طور پر ایک چیز اور بھی ہے، وہ یہ کہ شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض تابعین رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اثر نقل کیا ہے۔ وہ اس درجے میں تو نہیں ہے کہ اسے بہت بڑی حجت شرعیہ سمجھا جائے، ایک تو اثر ہے، اور وہ بھی تابعین رحمۃ اللہ علیہ، کا، مگر لطیفے کے درجے میں اور مویدات کے درجے میں اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں جس کا واقعہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: حضرت جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے: ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (1) ایک بشر تام الخلقت و کامل الخلقت نوجوان جس کے کسی جوڑ و بند میں فرق نہیں تھا، نہایت حسین و جمیل صورت کا انسان نمایاں ہوا۔ جس کو

---

(1) پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۷.

دیکھ کر حضرت مریم رضی اللہ عنہا گھبرا گئیں۔اور فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا﴾ ① ''اللہ کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو متقی آدمی ہے''۔تو کہاں ایک نوجوان عورت کے پاس تخلیہ میں آیا؟ ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَ هَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾ ② ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں تیرے پروردگار کا رسول اور قاصد بن کے آیا ہوں تاکہ تجھے ایک بیٹا عطا کر دوں''۔ ﴿قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا﴾ ③ میرے بیٹا کدھر سے ہو جائے گا، بشر نے آج تک مجھے چھوا ہی نہیں، بقول شخصے کسی مرد کی آج تک صورت تک میں نے نہیں دیکھی۔اور ویسے بھی اپنی ذات سے میں کوئی بغیا اور زانیہ نہیں ہوں۔عفیفہ اور پاکدامن ہوں۔کبھی کوئی چیز عفت کے خلاف مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔غرض اپنی ذات سے پاک دامن۔اور مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔زنا کا احتمال تک نہیں، پھر کیسے بیٹے آجائے گا؟ گویا عادتِ عامّہ کے اعتبار سے حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے ظاہر کیا۔مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آنے والے تھے، وہ خرق عادت کے طور پر تھے۔ عادت کے طور پر نہیں تھے۔تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ﴿قَالَ کَذٰلِکِ. قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ④ ''یوں ہی ہوگا اور تیرے رب پر آسان ہے''۔

جو نر اور مادّہ کو ملا کر اولاد دے سکتا ہے، وہ فقط مادّہ سے بھی دے سکتا ہے، وہ فقط نر سے بھی پیدا کر سکتا ہے، دونوں نہ ہوں، ہوا سے پیدا کر دے۔اب میں کہتا ہوں کہ یہ ہزاروں جاندار بھنڈے اور مچھر پسو ہیں، وہاں نر اور مادّہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ہوا سے پیدا ہو جاتے ہیں۔جو پروردگار بلا نر و مادّہ کے جاندار پیدا کر سکتا ہے۔جو حضرت آدم علیہ السلام کو بلا ماں باپ کے پیدا کر سکتا ہے۔جو حضرت حوا علیہا السلام کو بلا واسطہ عورت پیدا کر سکتا ہے۔وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلا باپ کے کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟۔چوں کہ خرق عادت کے طور پر پیدا کرنا تھا۔ مگر حضرت مریم علیہا السلام کو عادت کے طور پر اشکال تھا، اس کو دفع کر دیا کہ ﴿قَالَ کَذٰلِکِ. قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ⑤ ''تیرے رب پر یہ آسان ہے۔اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں۔غرض انہوں نے پھونک مار دی اور وہ حاملہ ہو گئیں''۔

اس پر شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جو بشر سوی یعنی کامل الخلقت بشر کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے بارے میں بعض تابعین کا اثر نقل کیا کہ وہ شبیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، یعنی صورت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بن کر نمایاں ہوئے۔تو حقیقت جبرئیلی تھی اور صورت محمدی تھی۔نفخہ تو جبریلی ہوا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہوا۔اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ دخل ہے اور کچھ مناسبت ضرور حاصل ہے۔اسی وجہ سے بہت سے اوصاف میں

① پارہ:۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ:۱۸. ② پارہ:۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ:۱۹.

③ پارہ:۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ:۲۰. ④ پارہ:۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ:۲۱. ⑤ پارہ:۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ:۲۱.

مناسبت ہے، وصفِ خاتمیّت میں بھی، وصفِ رحمت میں بھی، اِتباع کی شان تربیّت میں بھی، اور زندگیوں کے ادوار میں بھی، یہ اس شبیہِ مبارک کا اثر ہے کہ ساری مناسبتیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔

زوجیّتِ حضرت مریم علیہا السلام...... اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حضرت مریم علیہا السلام بطورِ زوجہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جائیں گی۔ یہ روایات میں موجود ہے۔ اس سے گویا مناسبت نکلتی ہے کہ شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت مریم علیہ السّلام مثل زوجہ کی تھیں۔ اب اس شبیہ کے ساتھ میں وہ حقیقت اور ذات بھی پیش کردی گئی کہ اب وہ اس کے لئے زوجہ بنے۔ بہر حال یہ چیزیں لطیفے کے طور پر عرض کررہا ہوں۔ یہ تو حجت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زوجہ بنا کردی جائیں گی۔ لیکن یہ جو اثر میں نے نقل کیا ہے، یہ اتنی قوی حجت نہیں ہے۔ مگر لطائف اور مویدات کے درجے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اتنی مناسبتیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ تجدید...... جب اتنی مناسبتیں ہیں اور وصفِ خاتمیّت میں بھی مناسبت ہے تو قتلِ دجّال کے لے زیادہ مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جب کہ وہ بمنزلہ بیٹے کے بھی ہوئے۔ تو باپ کے دین اور مشن پر جب آفت آئے تو بیٹا ہی زیادہ حق دار ہوتا ہے کہ باپ کی طرف سے مدافعت کرے اور باپ کی طرف سے حمایت کرے۔ یہ دجّال گویا دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر آفت لائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ مستحق تھے کہ دین کی حمایت کے لئے بطورِ مجدّد کے بڑھیں اور قتل کریں اور دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے اندر برپا کریں۔ چناں چہ اسے قتل کریں گے۔

غلبۂ اسلام...... اور حدیث میں ہے کہ: دجّال کے ساتھ کثرت سے یہود ہوں گے۔ جن کے اندر تھوڑی بہت سعادت ہوگی وہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان قبول کریں گے۔ اس لئے کہ مہدی رضی اللہ عنہ وہ تبرکات نکالیں گے جو "تابوتِ سکینہ" میں ہیں۔ اور تابوتِ سکینہ کی روایات میں ذکر آتا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پگڑی ہوگی۔ اور "الواح تورات" ہوں گی۔ یہ تابوت جو دفن کیا تھا، اس کا پتہ نہیں ہے۔

لیکن حضرت مہدی رضی اللہ عنہ پر منکشف ہوگا، اس میں سے وہ چیزیں دکھلائیں گے۔ تو جس جس یہودی کے اندر ذرا بھی سعادت ہوگی وہ ایمان قبول کرے گا۔ اور جس نصرانی میں سعادت ہوگی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کرے گا۔

تو دنیا میں تین ہی قومیں بڑی ہیں۔ ایک مسلمان، ایک یہود، اور ایک نصاریٰ۔ یہی عظیم قومیں ہیں جو مستند ہیں۔ یہود کا وجود اس طرح ختم ہو جائے گا، جن میں سعادت ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے۔ جن میں نہیں ہے وہ دجّال کے ساتھ ہو جائیں گے اور مقتول ہو جائیں گے۔ ایک قوم ختم ہوگئی۔ نصاریٰ کے بارے میں یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ یہ قوم یوں ختم ہوئی۔ اب ایک ہی قوم مسلم رہ جاتی ہے۔

وَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. ① تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ پورے عالم میں ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب اور ایک ہی پلیٹ فارم ہوگا۔ اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نقطۂ نظر ہو جائے گا۔

غرض جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دس سالہ شوکت قائم ہوئی اور حجاز کے بارے میں فرمایا گیا ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ② ''فوج درفوج اسلام میں داخل ہو جائیں گے''۔ تو حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے پوری دنیا کے انسانوں کا بھی یہی نقشہ ہوگا۔ کہ ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ③

مراتبِ تکمیلِ دین کی صورتیں...... فرق کیا ہوگا؟ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ④ دین کو کامل کر دیا گیا۔ تو تکمیل دین کی دو صورتیں ہیں ایک کیفی طور پر ایک اور کمی طور پر۔ ایک تو کیفیت کے لحاظ سے اتنا مکمل ہو کہ ہر فرد دین کا ایسا مجسمہ بن جائے کہ گویا اسلام مجسّم ہے۔ تو یہ کیفیت کے لحاظ سے ہے۔ اور کمیّت وتعداد کے لحاظ سے اسلام کی تکمیل کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہے۔ ساری تعداد مسلمانوں ہی کی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ عدد کے لحاظ سے اب مکمل ہوا اور کیفیت کے لحاظ سے یوں تکمیل ہے کہ چاہے تھوڑے ہوں مگر ہر ایک اسلام مجسّم ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اسلام کی کیفی تکمیل کی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب قریب ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم پیدا کئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے نمونے تھے۔ اور ایک ایک فرد اسلام مجسّم تھا۔ اس لئے امت کا اجماع ہے کہ نیت، عدل، کمالات واخلاق اور علم ومعرفت کے لحاظ سے۔ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ.'' ⑤ ''ان سے زیادہ متقی اور پارسا دنیا میں نہیں ہے''۔

امت میں بڑے بڑے غوث پیدا ہو جائیں۔ صحابیت رضی اللہ عنہن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے، اس لئے کہ براہ راست آفتاب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیّت کی ہے۔ اور بلا واسطہ آفتاب نبوّت کا نور ان کے قلب پر پڑا ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علہ وسلم نے ایمان کی تکمیل کیفیت کے لحاظ سے کی۔ تعداد تو تھوڑی تھی کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب نفوس قدسیہ نمایاں ہوئے۔ مگر ایک ایک فرد ایک ایک امّت کے برابر تھا۔ لیکن کمی تکمیل باقی تھی کہ عددی طور پر اسلام اتنا پھیلے کہ دنیا میں غیر مسلم کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ تکمیل آخری مجدّد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہوگی۔ وَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. ہر قوم ختم ہو کر ایک قوم رہ جائے گی، اور وہ اسلامی قوم ہوگی۔ تو پورے عالم میں دینِ واحد پھیل جائے گی۔

اسلام کا غلبۂ تام...... اس لئے دعویٰ فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ⑥ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا اور ہدایت بھیجی تا کہ تمام ادیان پر اس دین کو غالب

---

① پارة: ۹، سورة الانفال، الآية: ۳۹. ② ③ پارة: ۳۰، سورة النصر، الآية: ۲.

④ پارة: ٦، سورة المائدة، الآية: ۳. ⑤ عمدة القارى، كتاب الوضو، باب الماء الذى يغسل به شعر، ج: ۳، ص: ۳۹۹. ⑥ پارة: ۲۸، سورة الصف، الآية: ۹.

کردے۔ اور غلبۂ تام کا حاصل یہ ہوتا ہے۔ کہ مغلوب چیز کالعدم اور صفر کے درجے میں ہو جائے، غالب ہی کا وجود رہ جائے۔ تو ایک ہی دین غالب آ جائے گا جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہوگا، اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گوناگوں مشابہتیں اور مناسبتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہیں۔ اوصاف میں بھی، افعال میں بھی، وجود میں بھی، ذات میں بھی۔

اور سب سے زیادہ زمانے کے لحاظ سے اقرب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں کوئی نبوّت نہیں آئی، تو عہد کے لحاظ سے اشبہ ترین بھی وہی ہیں۔ تو وہ زیادہ احق تھے کہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور مدافعت کریں اور اس دجالِ اعظم کو قتل کریں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قتل نہیں کرایا گیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہ کے ہاتھ سے قتل کرایا گیا۔ جس میں وہی طاقت رکھی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کی حکمتیں ...... اور اس کے ساتھ میں ایک فائدہ اور مصلحت یہ بھی حاصل ہوئی کہ یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ ① اگر آج کے دور میں موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا اتباع کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میرے ہی دین میں داخل ہو کر رہنا پڑتا۔ تو حق تعالیٰ نے اس کو عملی طور پر نمایاں کر دیا کہ جس قوم کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی ہے اس کا نچوڑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو امتی بنا کر لایا گیا تاکہ کل اسرائیلی پیغمبر امتی شمار کئے جائیں۔ خاتم سے جو چیز سرزد ہوتی ہے وہ پورے دائرے کی شمار کی جاتی ہے۔ تو یہ بھی اس سے نمایاں ہو گیا۔ غرض خاتم الدجالین کا ظہور خاتم الانبیاء ہی کے دور میں ہونا چاہئے تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کے دور میں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کا حقیقی تقابل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، ولایت کی روحانیت اس کے مقابلے کے لئے کافی نہیں ہے نبوّت کی روحانیت ضروری تھی اور اس میں بھی ختمِ نبوّت کی کچھ نہ کچھ شان موجود ہوتا کہ وہ خاتم الانبیاء کی طرف سے قاتل بنے۔ اس واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع کیا گیا۔

اور اس لئے بھی رفع کیا گیا کہ یہود نے انتہائی تذلیل کا ارادہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انتہائی اعزاز دیا۔ تم ان کو زمین میں بھی رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ ہم زندگی کے ساتھ آسمانوں میں باقی رکھیں گے۔

اب آگے روایتی مسئلہ ہے تو احادیث ان مضامین سے بھری پڑی ہیں، یہ چیزیں لطائف اور اسرار کے درجے میں ہیں کہ اگر کوئی یوں پوچھے کہ مصلحت آخر کیا تھی؟ تو یہ مصالح تھیں۔ لیکن معاملے کی بنا مصالح کے اوپر نہیں ہے۔ بنا تو روایت کے اوپر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو، حکم اپنی جگہ حق ہے۔

اسلام کی شانِ خاتمیّت ...... لیکن یہ اسلام کی ایک خاتمیّت کی شان ہے کہ جو حکم آیا اس میں حکمت ضرور ہے،

① مسند احمد، مسند جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، ج: ۲۹، ص: ۱۵۳۔

جوکوئی امر آیا اس میں کوئی نہ کوئی علّت ضرور ہے۔ جو ہدایت دی گئی اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ ﴿عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ. وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ ① جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اور میرے صحابہؓ معاذ اللہ صُمًّا وَّعُمْیَانًا اندھے بہروں کی طرح سے نہیں گرتے بلکہ حجت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ دین میں بصیرت ہے، دین اسلام رسوم کا مجموعہ نہیں ہے کہ چند رواج جمع ہو گئے جن کی نہ مصلحت معلوم ہو نہ کچھ اور۔ باپ دادا سے سنتے آئے بس عمل کر لیا۔

جیسا کہ دوسرے مذاہب میں رسوم غالب ہیں۔ ان رسوم کی مصلحت پوچھی جائے تو جواب یہ ہوتا ہے کہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآئَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ﴾ ② باپ دادا کو اسی طرح سے کرتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ کوئی علت یا کوئی حکمت جو منجاب اللہ نازل کی گئی ہو نہیں ہے۔ تو اسلام ایسی چیز نہیں ہے۔ اس میں جو حکم بھی ہے اس میں حکمت ہوگی۔ جو امر ہے اسمیں کوئی نہ کوئی علت ہوگی۔ جو ہدایت ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ تو مصالح اس طرح سے عارفین نے بیان کی ہیں۔ حکم کی بناء مصالح پر نہیں ہے۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس سے ایک طمانیت حاصل ہو جاتی ہے جب مصلحت حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ چلو مصلحت بھی سامنے آ گئی۔ لیکن نفس ایمان مصالح کے اوپر موقوف نہیں۔

تعوّذ ِدجّال کی دعاء کی حکمت...... اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجّال پیدا ہو جاتا تو اس کا فتنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر معاذ اللہ کارگر تھوڑا ہی ہو سکتا تھا۔ اس دعاء میں دجال کے پیدا ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں۔ جس میں دجال سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ'' ③ ''اے اللہ! میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتا ہوں''۔ اس میں امت کی تعلیم مقصود ہے۔ یعنی جن لوگوں کو دجال سے سابقہ پڑے گا ان کا فرض ہے کہ وہ یہ دعاء مانگیں۔ یا جیسے فرمایا گیا جو شخص سورہء کہف کثرت سے تلاوت کرے گا بالخصوص جمعہ کے دن تو فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

دوسرے یہ کہ ایک دجّال ذات ہے اور ایک دجّالیت ہے اور اس کے اوصاف اور اس کا فتنہ۔ اوصاف اور فتنہ اس کے ظہور پر موقوف نہیں' اس کی آمد کے قرب میں دجل وفساد کے آثار شروع ہو جائیں گے۔ وہ اس کے ظہور کا اثر ہوگا۔ جیسے آفتاب کا اثر دو گھنٹے پہلے کچھ نہ کچھ سفیدی اور کچھ چاندنا شروع ہو جاتا ہے۔ یا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اِذَآ اَرَادَ اللّٰہُ شَیْئًا ھَیَّاَ لَہٗٓ اَسْبَابَہٗ ...... جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب کا ایک سلسلہ بچھاتا ہے کہ تدریجاً رفتہ رفتہ ایک مدت میں جا کے وہ چیز ظہور کرتی ہے مگر پہلے سے اسباب بچھنا شروع ہو جاتے ہیں، تو دجّال کے ظہور سے پہلے اسباب مہیّا ہوں گے۔ قلوب میں اس کی باتیں قبول کرنے کی استعداد یں پیدا

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸ . ② پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲ .
③ الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، ص: ۶۶، رقم: ۸۳۲ .

ہوں گی تو دجل اور فسادات اس کے آثار میں سے ہیں۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دعاء مانگنا تاسی کے لیے ہے تا کہ امت کو اسوہ معلوم ہو جائے کہ یہ دعاء کرنی چاہیئے۔

عبدیّتِ عیسوی (علیہ السلام)...... احادیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسجدِ اقصیٰ کی چھت کے اوپر ملائکہ کے کندھوں کے اوپر ہاتھ ٹیک کر آئیں گے۔ اور لباس یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اوپر دو چادریں ہوں گی۔ ایک زرد اور ایک گیرو رنگ کی۔ گویا جوزہد وقناعت کا مظاہرہ ہے اسی رنگ کا لباس ہوگا۔ اور آ کر فرمائیں گے کہ سیڑھی لگاؤ' گویا جوّ اور فضا میں تو بواسطہ ملائکہ آئے۔ یعنی باطنی اسباب کے تحت، اور جب چھت کے اوپر آ کر ٹک گئے۔ اب مادّی دنیا کا معاملہ شروع ہو گیا۔ تو اب مادی اسباب کی طلب ہوئی کہ سیڑھی لگاؤ کہ میں اتروں۔ ورنہ ملائکہ کے واسطہ ہی سے نیچے اتر سکتے تھے، لیکن ملائکہ نے جو اور فضا تک پہنچایا جہاں اسباب نہیں پہنچتے۔ اور جہاں سے اسباب شروع ہوئے وہاں سے اسباب اختیار کئے۔ کیونکہ عبدیت کا ظہور اسی میں ہوتا ہے کہ اسباب کو قطع نہ کیا جائے، بلکہ اختیار کیا جائے۔ جب آئیں گے تو نماز کا وقت ہوگا اور حضرت مہدی رضی اللہ عنہ تواضع کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیں۔ فرمائیں گے کہ نہیں۔ یہ امت اللہ کے ہاں بڑی معظم ہے: وَاِمَامُكُمْ مِنكُمْ. ① تمہارے حضرت امام تمہارے ہی اندر سے ہوں گے، آپ ہی احق ہیں کہ نماز پڑھائیں چنانچہ مہدی رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں گے۔ بہر حال یہ سارے واقعات تفصیل سے آتے ہیں۔

مدفنِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی قبرِ مبارک کے درمیان میں جگہ خالی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں دفن ہوں گے۔ اولاد بھی ہوگی۔ اس واسطے کہ جب آسمان پر گئے ہیں جب تک تو نکاح نہیں ہوا تھا۔ آئیں گے تو نکاح بھی ہوگا۔ اولاد بھی ہوگی، پھر وفات ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن ہوں گے۔

یہ تمثیلی طور پر ایسا ہے جیسے کسی کی اولاد کوئی عظیم کارنامہ کر کے باپ کے اوپر سے آفت کوٹلائے اور فاتح بن کے آئے کہ میں نے آپ کے مشن کو بالکل محفوظ کر دیا تو باپ شاباش کے طور پر بغل میں لے لے کہ میرے قریب آجا۔ دجال کو قتل کیا، عالم میں دین پھیلایا۔ فرمایا گیا کہ اب میرے پہلو میں آجاؤ جو تمہارا حق ہے۔

علاماتِ ظہورِ مہدیؓ...... جیسی تفصیل حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے ویسی ہے ظہورِ مہدیؓ کے بارے میں بھی ہے، حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں وہ ساری حدیثیں جن میں بعض صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ مگر ساری قابل احتجاج ہیں۔ وہ سب نقل کر دی ہیں، اس میں تمام علامات ذکر ہیں۔ حضرت مہدیؓ کا نسب نامہ، ان کا حلیہ اور ان کے ظہور کی نوعیت، پھر علاماتِ قریبہ اور علاماتِ بعیدہ بھی بیان کی ہیں۔ بعض وہ علامات ہوں گی جو بالکل ظہور کے قریب میں آئیں گی۔

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسی بن مریم، ص: ۲۸۲، رقم: ۳۴۴۹.

قریب ترین علامت مثلاً یہ فرمائی گئی کہ حجاز کے اندر سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا۔ تو سونے کی کان تو حجاز میں نمایاں ہو چکی ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا زمین اپنے خزائن اور دفائن اگلنا شروع کردے گی، تو آج کوئی حجاز کو جا کر دیکھے تو وہاں پانی بھی ہے، سبزی بھی اگ رہی ہے، اسی طرح معدنیات کے بھی آثار ہیں، وہ بھی نکل رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرزمین حجاز نے سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا کے ملکوں کے پاس آج اتنی دولت نہیں جتنی عربوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دے رہے ہیں۔ یہ علامتیں ہیں۔

منیٰ میں جنگِ عظیم...... مگر قریبی علامت یہ فرمائی گئی کہ: جس سال ظہور ہوگا، وہ مکہ میں ہوگا، اس سال منیٰ میں حجاج میں باہم جنگِ عظیم ہوگی اور اتنا قتل وقتال ہوگا کہ جمرۂ عقبہ خون سے بھر جائے گا اور ہزاروں انسان آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ عدد بھی مذکور ہے کہ ۳۱۳ آدمی باقی بچیں گے۔ باقی سب قتل ہو جائیں گے، اب انہیں فکر پڑے گی کہ کوئی تو ہمارا سرگروہ ہو ورنہ ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی اب ہم کہاں جائیں؟۔ پھر وہ مکہ مکرّمہ میں آئیں گے۔ اور وہ اس علامت کو پہچانتے ہوں گے کہ منیٰ میں قتل ہونا اور جمرہ عقبہ کا خون سے بھرنا یہی ظہور مہدیؓ کی علامت ہے، تو انہیں یقین ہوگا کہ حضرت مہدیؓ ظاہر ہوں گے اور وہ مکے میں ہوں گے، تو حدیث میں ہے کہ وہ حضرت مہدیؓ کی طرف رجوع کریں گے تو حضرت مہدیؓ ان سے چھپ کر مدینے کا راستہ لیں گے، یہ لوگ وھاں پہنچیں گے، وہ پھر چھپ کر مکے میں آئیں گے۔ پھر مطاف کے اندر یہ انہیں پکڑیں گے۔ وہ فرمائیں گے کہ میں ایسی قوم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا جو اس درجہ آپس میں خونریزی کرے۔ تم لوگوں کا کیا اعتبار ہے۔ یہ انہیں بھی دھمکی دینا شروع کر دیں گے۔ پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ اسی کے بارے میں وہ روایت ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ ایک آواز بھی غیب سے ظاہر ہوگی کہ: ''هٰـذَا خَـلِيْـفَةُ اللّٰهِ الْمَهْدِيُّ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْهُ.'' (1) ''یہ خلیفۃ اللہ حضرت مہدیؓ ہیں ان کی سمع وطاعت کرو۔''

شام کی جنگِ عظیم...... جب وہ ان سے بیعت لے لیں گے، پھر یہ آواز پھیلے گی اور شہرہ ہوگا تو پھر نجائب عراق ،ابدالِ شام اور اقطابِ ہند تمام اطراف سے جو مسلمان منتشر ہوں گے اور انتہائی کمزوری کی حالت میں ہوں گے، وہ سب سیاہ جھنڈوں کے نیچے خراسان کی طرف سے شام کی طرف بڑھیں گے تاکہ حضرت مہدیؓ کے لشکر میں داخل ہوں۔ اور حضرت مہدیؓ شام کو اپنا مرکز بنائیں گے اور شام ہی میں وہ ملحمۂ کبریٰ اور جنگ عظیم نمایاں ہوگی جس کے بارے میں احادیث میں فرمایا گیا کہ اتنا لمبا چوڑا محاذ ہوگا کہ کوا جو سب سے زیادہ اڑتا ہے یہ دن بھر اڑے گا اور لاشیں ہی لاشیں اس کے نیچے ہوں گی۔ یہ دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ اتنا لمبا محاذ ہوگا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ محض تیر وتفنگ کی جنگ نہ ہوگی۔ ہزاروں میل کا لمبا محاذِ جنگ جبھی ہوسکتا ہے جب مشین ہو ورنہ اگر ایک میدان میں جنگ ہو جائے، چاہے دو لاکھ آدمیوں کی ہو۔ وہ میل دو میل یا دس

(1) الحديث اخرجه ابن ماجه ولفظه: فاذا رأيتموه فبايعوه ولو حبواً على الثلج فانه خليفة الله المهدى، ج: ۱۲ ص ۱۰۲.

میل میں ہوگی، لیکن ہزاروں میل مقتولین کی تعداد ہوجائے اور پھیلے ہوئے پڑے ہوں۔ظاہر ہے کہ یہ کوئی عظیم الشان اور لمباچوڑا محاذ ہوگا۔

مغرب کی طاقتوں کی شکست......وہ ملحمۂ کبریٰ جس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ مغرب کی طاقتیں ان کے ہاتھ پرٹوٹیں گی۔اور پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور دین واحد ہوجائے گا۔اس وقت سب سے زیادہ طاقت نصاریٰ کی ہوگی۔پورے عالم پرانہیں کا غلبہ ہوگا۔یہ طاقت حضرت مہدیؑ کے ہاتھ پرٹوٹے گی۔اوراس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دوامی مقابلہ اگرکسی قوم سے ہےتو وہ عیسائی قوم ہے

مشرکین سے اسلام کا مقابلہ......اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کومشرکین عرب سے مقابلہ پڑا،لیکن وہ ختم ہوگیااس واسطے کہ جب فتح مکہ ہوئی تویاوہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یاقتل یاہوئے جلاوطن ہوگئے۔توحدیث میں فرمایا گیا کہ آج شیطان مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں اب اس کی پوجا کی جائے۔یعنی اب دوسرا دین نہیں آئے،گامگر مسلمانوں میں آپس میں تفریق اور گروہ بندیاں ہوگی۔مگرکوئی دوسرا دین اسلام کے مدمقابل آجائے یہ نہیں ہوگا۔گویامشرکین سے حجاز میں دوامی طور مقابلہ ختم ہوگیا۔

مجوس سے اسلام کا مقابلہ......دوسرامقابلہ مجوس سے پڑا،ان کی بڑی عظیم شوکت تھی،کسریٰ کی سلطنت تھی اور پورا ایران اورخراسان گویاان کے ہاتھ میں تھا،توحدیث میں ہے کہ آپؐ نے کسریٰ کے نام فرمان لکھ کربھیجا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔اس نے آپؐ کے نامہ مبارک کوٹکڑے کرکے چاک کرکے پھینک دیا۔جب آپؐ کواطلاع ہوئی توفرمایا"جس طرح میرافرمان ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔خدااس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے کرے"۔

یہ پیشن گوئی حضرت عمرؓ کے زمانے میں پوری ہوئی۔اوروہ یہ ہوا کہ کسریٰ پرویز جوایران کابادشاہ تھا،وہ اپنے دوائی خانے میں قوّت باہ کی دوا کھانے لئے گھسا۔مگرغلطی سے وہ معجون کھا گیا جوسمی تھااوروہ وہیں ختم ہوگیا۔اس کے مرنے کے بعداس کی ماں نے حکومت کادعویٰ کیا،سرداروں نے الگ حکومت کادعویٰ کیا' بھائی بھتیجوں نے الگ دعویٰ کیا۔پورے ملک میں طوائف الملو کی پھیل گئی اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔یہ پیشن گوئی فرمائی گئی تھی اوراس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں پوراایران اورخراسان فتح ہوگیا۔اس طرح مجوس سے مقابلہ دوامی نہ رہااورختم ہوگیا۔

یہود سے اسلام کا مقابلہ......تیسرامقابلہ حجاز میں یہود سے مدینے اورخیبروغیرہ میں ہوا۔یہاں یہ لوگ آباد تھےاوردوان کے بڑے عظیم قبیلے بنوقریظہ اور بنونضیر تھے۔جب انہوں نے پے در پے غدرکیااورمعاہدہ شکنی کی۔ تو آخر میں یہ ہوا کہ بنوقریظہ قتل ہوگئےاور بنونضیر جلاوطن کردیئے گئے جومختلف بلاد میں جاکرآباد ہوئے۔توحجاز میں یہود سے بھی مقابلہ ابدی طورپرختم ہوگیا۔

عیسائیوں سے دوامی مقابلہ اوراس کاانجام......اب رہ گئے نصاریٰ۔ان کی روم وغیرہ کی طرف مستقل قوّت تھی اور قیصرحکمران تھا۔ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارامقابلہ ان سے ختم ہو

جائے گا بلکہ یہ فرمایا۔ ''اَلرُّوْمُ ذَوَاتُ الْقُرُوْنِ اِذَا هَلَکَ قَرْنٌ خَلَفَهٗ قَرْنٌ اَلْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سِجَالٌ يَنَالُوْنَ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُمْ'' روم جو ہیں ان کے درجات وقرون اور طبقات ہوں گے، ان کے اور ہمارے درمیان لڑائی ایسی رہے گی جیسے ڈول رسی کہ کبھی ڈول نیچے جائے گا، کبھی اوپر آئے گا، کبھی ہم غالب، کبھی وہ غالب۔ کبھی وہ مغلوب، کبھی ہم مغلوب۔

ہزار برس تک مسلمان غالب رہے، اس کے بعد ان کا غلبہ شروع ہوا۔ تین چار سو برس سے ان کا غلبہ ہے، مسلمان مغلوب ہیں، ظہورِ مہدیؓ کی جو خبر دی گئی ہے اس وقت مسلمان پھر غالب ہوں گے اور یہ مغلوب ہوں گے۔ اور مغلوب بھی ایسے کہ مدغم ہو جائیں گے اور اس پر دور دنیا ختم ہے۔

غرض ان کے بارے میں دوامی مقابلہ فرمایا گیا۔ ورنہ اور کسی قوم سے دوامی مقابلہ نہیں۔ وقتی مقابلے ہوں گے لیکن یہ رہے گا کہ کبھی وہ غالب اور کبھی ہم غالب۔ ایک مجموعی طور پر اور ایک جزوی طور پر کہ کسی علاقے میں وہ غالب آ گئے۔ ہم مغلوب ہو گئے، کسی علاقے میں وہ مغلوب ہو گئے، ہم غالب آ گئے بلقان کی ریاست میں کبھی وہ مغلوب ہم غالب، کبھی ہم مغلوب وہ غالب۔ کاغان میں کبھی ہم مغلوب وہ غالب، کبھی وہ مغلوب کبھی ہم غالب۔ ٹرکی کے علاقوں میں یہی ہوتا رہا، ہندوستان میں بھی یہی رہا، عراق میں یہی رہا، یہ غلبہ ومغلوبیت چلتی آ رہی ہے۔ آخری طور پر اس کے ختم کا نتیجہ ظہورِ مہدیؓ کے وقت نکلے گا، اس وقت اس قوم سے بھی مقابلہ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اور اقوام سے ختم ہوا۔

مقامِ تجدید...... جو بھی مجدّد ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کے علم میں ہو کہ میں مجدّد ہوں مگر جذبۂ تجدید تو اس میں ہوتا ہے اور عمل بھی وہ وہی کرتا ہے جو ایک مجدد کرتا ہے اور بعد میں اس کے اعمال سے کھل جاتا ہے، کہ یہ مجدّد تھا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مجدّد کو اپنے بارے میں معلوم ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدّد دعویٰ کرے کہ میں مجدد ہوں بلکہ اس کا عمل تجدید ہوتا ہے، خود بخود دل میں آ جاتا ہے کہ یہ دین کی تجدید کر رہا ہے، سوائے اس کے کہ جو لوگ مامور من اللہ ہوں اور ان کو اجازت دی جائے کہ تم دعویٰ بھی کرو، وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن نفس مقامِ تجدید کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجدّد کو یہ معلوم ہو کہ میں مجدّد ہوں مگر کام اس سے وہی نمایاں ہوں گے جو ایک مجدّد کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمالِ عدل...... حضرت مہدیؓ عظیم الشان جنگ کریں گے۔ اس جنگ کی تفصیل آتی ہے۔ تین جنگیں ہوں گی۔ عظیم ترین جنگ ''ملحمۂ کبریٰ'' اس میں اتنے مقتولین ہوں گے کہ مسلمان فاتح تو ہو جائیں گے مگر ان کے لئے کوئی خوشی اور مسرّت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے بعد پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور حدیث میں ہے کہ ساٹھ برس حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمرانی کریں گے اور ان کے دور میں اس درجہ گویا امن و امان ان کے کمالِ عدل کی وجہ سے ہوگا۔ جیسا کے روایت میں فرمایا گیا کہ سانپ اور انسانوں کے بچے ایک جگہ کھلیں گے، نہ سانپ کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ مجھے مار دیں گے، نہ انسانوں کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ

کاٹ لیں گے۔ نیز یہ کہ بھیڑ اور بھیڑیا ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ اتنا امن ہوگا کہ بکری اپنے اندر امن کو محسوس کرے گی، عدل کی اتنی برکات ہوں گی کہ فرمایا گیا کہ انگور کا خوشہ اتنا پھیلے گا کہ پورا گھرانہ اور قبیلہ اس سے سیراب ہو جائے گا۔ ایک بکری اتنا دودھ دے گی کہ پورا قبیلہ اس کے دودھ سے سیراب ہو جائے گا۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک مالدار زکوٰۃ صدقات دینے کے لئے نکلے گا تو جس کو دے گا وہ کہے گا کہ میرے گھر میں ڈھیر لگے ہوئے ہیں، تو ہی آ کر لے لے۔ جسے دے گا کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا کہ میرے گھر میں خود بہت موجود ہے، اس درجہ گویا فراوانی اور برکات ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوں گی۔

اس لئے کہ عدل کا اثر اطمانیت ہے، اور جب قلوب میں اطمینان سا ہوتا ہے تو ہر چیز میں آدمی کو برکت محسوس ہوتی ہے۔ اسی واسطے جو بادشاہ اور حکومت عادل ہوتی ہے۔ اس کی علامت ہے کہ قلوب کے اندر اطمینان سا ہوتا ہے ورنہ بے چینی رہتی ہے، ظلم میں کبھی امن و اطمینان نہیں ہوتا عدل میں اطمینان ہوتا ہے، تو جب کسی حکومت میں آدمی محسوس کرے کہ قلب میں تسلی کی کیفیات ہیں تو سمجھ لے کہ حکمران نیک نیت ہے اور عدل کر رہا ہے۔

عدل کی حسّی برکات...... اور حسّی طور پر بھی اس کی برکات ظاہر ہوتی ہیں، چناں چہ ہارون الرشیدؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ شکار کھیلتے ہوئے کسی جنگل میں دور تک چلے گئے اور فوج و لشکر سے بھی الگ ہو گئے، پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو ایک باغ نظر آیا۔ اس میں گھس گئے۔ باغ کا مالک بوڑھا تھا۔ اس سے انہوں نے جا کر کہا کہ بھئی! پانی ہو تو دو۔ وہ لباس سے اور چہرے مہرے سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے کوئی امیر ہے۔

اس نے بہت تہذیب سے بیٹھنے کو جگہ دی اور بٹھلایا۔ اور ایک انار توڑا اور اس کو دبایا تو اس کے عرق سے پورا گلاس بھر گیا۔ وہ ہارون الرشیدؒ کو پلایا وہ نہایت شیریں تھا۔ ہارون الرشیدؒ کے دل میں خیال یہ پیدا ہوا کہ اتنا عظیم باغ میرے پاس بھی نہیں۔ یہ کون امیر ہے جس کا یہ باغ ہے۔ اب جو میں جاؤں گا تو اس باغ پر قبضہ کروں گا۔ یہ باغ بادشاہ کے لئے مناسب ہے، غیر بادشاہ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ خواہ مجھے قیمت دینی پڑے یا دباؤ سے لینا پڑے مگر باغ میرے پاس آنا چاہئے۔

پھر کچھ ستائے اور آرام کیا۔ اس کے بعد جب اٹھنے لگے تو مالی سے کہا کہ بھئی! پانی اور پلاؤ۔ اس نے پھر ایک انار توڑا اب وہ اس کو خوب دباتا ہے مگر آدھے سے زیادہ گلاس بھرتا ہی نہیں۔ ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ درخت بھی وہی ہے۔ انار بھی وہی ہے۔ یہ کیا بات ہے گلاس بھرتا کیوں نہیں۔؟ اس بوڑھے مالی نے کہا کہ۔ ’’ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہِ وقت کی نیت میں فرق آیا ہے‘‘۔

ہارون الرشیدؒ سمجھ گیا۔ بادشاہ تو وہ خود ہی تھا۔ فوراً اپنے دل میں توبہ کی اور استغفار کیا۔ اور کہا کہ اے اللہ! میں مجرم ہوں۔ میں ہرگز قبضہ نہیں کروں جس کا باغ ہے اسی کو مبارک رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو بقیہ عرق تھا وہ بھی نکل آیا اور گلاس بھر گیا، تو بوڑھا کہتا ہے، معلوم ہوتا ہے بادشاہِ وقت کی نیت درست ہو گئی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے زمانے میں اس قدر بشاشت وطمانیت اور اس قدر برکات کا ظہور ہوگا کہ جو فطری طور پر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان میں بھی دشمنی کا احساس باقی نہیں رہے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلفاءِ سبعہ...... یہ جو کلی خیر و برکت کا زمانہ ہے، یہ چالیس برس رہے گا۔ اور اس چالیس برس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سات خلفاء حکمرانی کریں گے۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ فساد کی طرف زمانہ بڑھتا جائے گا۔ جب ساتویں خلیفہ نمایاں ہو کر ختم ہوں گے، اب گویا فساد کا غلبہ شروع ہوگا اور پھر اتنا غلبہ ہوگا کہ لوگ اس درجہ پر آجائیں گے کہ ''شرِ محض'' رہ جائیں گے اور ایمان والے گنے چنے ہوں گے جو اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر پناہ لیں گے۔ شہروں میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ گویا بالکل قربِ قیامت کا وقت ہوگا۔ اور یہ علامت ہوگی کہ اب اس کائنات کے خیمہ کو ختم کرنا اور فنا کرنا ہوگا۔

دَآبَّةُ الْاَرْضِ...... اسی وقت دَآبَّةُ الْاَرْضِ ظاہر ہوگا یا ''نارِ حجاز'' ظاہر ہوگی جو منتشر جگہ سے ہنکار کر مومنوں کو ایک سمت میں لے آئے گی، دابۃ الارض کا جو خروج ہوگا تو یہ عجیب شکل و شباہت کا جانور ہوگا کہ چہرہ انسانوں جیسا اور ہر جانوروں کی شباہت اس میں ہوگی۔ یہ نشان بناتا جائے گا۔ مومن کے چہرے پر مومن کا اور کافر کے چہرے پر کافر کا۔ پھر ایک وباء بھیجی جائے گی جس سے دو تین دن کے اندر اندر جتنے ایمان والے ہوں گے سب ختم ہو جائیں گے اور انتقال کر جائیں گے۔

جن پر قیامت قائم ہوگی...... اب شرار الخلق باقی رہ جائیں گے۔ جو شرِ محض ہوں گے، ان کی شان فرمائی گئی کہ نہ ان کا کوئی دین و مذہب ہوگا۔ ''لَا یَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَّلَا یُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا''...... نہ اچھے برے کی تمیز باقی رہے گی۔ گدھے، کتے کی طرح سے سڑکوں پر بدکاریاں کرتے پھریں گے۔ کوئی انسانیت کی حس نہیں ہوگی، محض شہوانی جذبات ہوں گے، ان پر قیامت قائم ہوگی، یوں عالم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

عالم کی بنیاد...... اس سے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ عالم ذکر اللہ سے تھما ہوا ہے۔ ایک بھی جب تک اللہ اللہ کہنے والا رہے گا، عالم مٹنے والا نہیں ہے۔ غرض عالم کی روح ذکر اللہ ہے۔ جب روح نکل جائے گی تب لاش بن کے پھولے گا، پھٹے گا اور سڑے گا۔ اس سے پہلے نہیں حدیث میں ہے ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ'' ① قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا عالم میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا، اب شرِ محض رہ جائے گا۔ اس وقت قیامت قائم کر دی جائے گی۔

قبولیتِ بعدد...... بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جہاں چالیس آدمی جمع ہوں وہاں ایک نہ ایک، ان میں مقبول ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجے کی بھی قبولیت ہو۔ تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں کوئی بھی مقبول نہ ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مقبولین ہوں گے۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب ذهاب الايمان في آخر الزمان، ص: ٢٠٧، رقم: ٣٧٥.

کیا اہل دنیا آسمان سے آگے جاسکتے ہیں؟...... دیکھئے آسمان میں جانے کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔ نہ شرعی اصول اس کی اجازت دیتے ہیں نہ یہ واقعہ ہوگا۔ آسمان سے نیچے فضا ہے۔ یہ اس دنیا کا دائرہ ہے۔ تو دنیا والے اپنے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اپنے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ آسمان کا دائرہ وہ انسانوں کا دائرہ نہیں ہے۔ وہ ملائکہ کا دائرہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔ پھر شریعت نے آسمانوں کے دروازے بتلائے ہیں ان پر بڑے مستعد دربان ہیں۔ جن میں مقبولین کو بھی بغیر اجازت کے جانے کی صورت نہیں بنتی۔

جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو دروازے بند تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے گویا دروازہ کھٹکھٹایا تو بواب کی طرف سے اندر سے یہ جواب آیا۔ مَنْ اَنْتَ. ...... ''تم کون ہو؟''۔ حالاں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سَیِّدُ الْمَلٰئِکَۃُ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملائکہ ان کی آواز بھی بھول گئے۔ ان کا تو ہر وقت کا آنا جانا ہے۔ پوچھنا اس کی دلیل ہے کہ ڈیوٹی پر اتنے مستعد ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی آئے گا تو وہ قانون کے مطابق ڈیوٹی ادا کریں گے۔ اس لئے پوچھا گیا۔ مَنْ اَنْتَ. ...... ''تم کون ہو؟''۔ فرمایا حضرت جبریلؑ۔ پھر پوچھتے ہیں وَمَنْ مَّعَکَ؟...... اور ساتھ کون ہیں؟''۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے علم میں ہے کہ کوئی ساتھ آرہا ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن ادائے فرض میں اتنی مستعدی کہ یہ پوچھا کہ ساتھ کون ہیں؟۔ جبریل علیہ السلام نے کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

پھر یہی نہیں کہ دروازہ کھول دیں۔ تیسرا سوال اور کیا گیا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں یا ویسے ہی خود بخود آگئے ہیں؟ تو حضرت جبریل نے جواب دیا۔ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَیْہِ...... ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں۔ تب دروازے کھولے گئے اور کہا گیا مَرْحَبًا بِکُمْ نِعْمَ الْمَجِیْئُ جَآءَ. ① ''بہترین آنا ہے جو آپ آئے۔ خوش آمدید''۔ جب مقبولین کے لئے آسمان میں جانے میں اتنی پابندیاں ہیں تو مردودین وہاں کیسے جائیں گے؟ وہ خود بخود ہی پہنچ جائیں گے؟

سیارات کا تعلق اہل دنیا سے ہے...... اس کی بنا یہ ہے کہ جو اس دنیا میں بسنے والے انسان ہیں وہ اپنی دنیا کے دائرے میں رہتے ہیں لیکن دنیا کے دائرے سے نکل کر ایک دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے، اس عالم میں یہ دخل نہیں دے سکتے۔ رہے ستارے تو وہ اس دنیا ہی کے عالم میں ہیں اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ الْکَوَاکِبِ﴾ ② آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں سے آراستہ کر رکھا ہے۔ یہ ستارے اس آسمان کی زینت ہیں۔ اور زینت ہمارے لئے بنائی گئی۔ یہ زینت جبھی ہو سکتی ہے جب یہ ستارے آسمان کی نچلی

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب المعراج، ص: ۳۱۵، رقم: ۳۸۸۷.

② پارہ: ۲۳، سورۃ الصافات، الآیۃ: ۶.

سطح سے نیچے ہوں۔ اگر اوپر کی سطح پر ہوتے تو ہمارے لئے زینت نہ بنتے۔

معلوم ہوا یہ ستارے زمین ہی سے متعلق ہیں۔ سورج اور چاند جو گردش کرتے ہیں یا یہ رات اور دن، یہ دنیا ہی کے لئے ہیں۔ آسمانوں اور جنتوں کے لئے تو رات اور دن نہیں ہیں۔ یہ رات دن کی گردش اس دائرہ دنیا کے اندر ہے اور اس کا تعلق ان سیارات سے ہے۔ یا مثلاً جڑی بوٹیاں ہیں۔ تو ہر جڑی بوٹی میں کسی نہ کسی ستارے کی تاثیر ہے جس سے وہ دفعیہ ءامراض میں موثر ہوتے ہیں، گل بنفشہ میں فلاں خاصیتیں ہیں۔ وہ جب جڑی بوٹیوں پر روشنی ڈالتے ہیں تو ویسی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ویسے ہی امراض کا دفعیہ ہوتا ہے۔ تو یہ سارے ستارے گویا ہمارے لئے بنائے گئے ہیں۔ دنیا سے ان کا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ① ''ستاروں سے ہی لوگ راستہ پاتے ہیں''۔ یہ جہاز رانی کا فن ستاروں ہی کے ذریعے سے ہے۔ سمندروں میں سڑکیں تو نہیں ہوتیں۔ ستاروں سے سمتیں متعین کر کے جہازوں کو چلاتے ہیں۔ معلوم ہوا ستارے ہمارے لئے بنائے گئے ہیں، دائرہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسمان سے تعلق نہیں ہے۔ آسمان کی چھت میں جس طرح سے بھی لٹکا دیئے گئے ہیں۔ غرض جب یہ دنیا سے متعلق ہیں تو دنیا والوں کا ان تک پہنچنا ممکن ہے لیکن اپنی دنیا کے دائرے سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ جائیں۔ انسان میں یہ طاقت نہیں ہے۔ دعوے کوئی کتنے ہی کرے، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے چاند، سورج اور مشتری میں چلے جائیں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے جلدی چلے جائیں تا کہ زمین میں کچھ فساد کم ہو۔ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے؟

توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت...... حدیث میں آتا ہے کہ آفتاب جب مغرب سے طلوع کرے گا اور نصف النہار تک آئے گا اور پھر لوٹ جائے گا اور معمول کے مطابق طلوع کرے گا، جب یہ آیتِ کبریٰ ظاہر ہو جائے گی تب توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے کہ ایمان لانے سے مقصود قلوب کی آزمائش ہے۔ اور جب اتنی نمایاں خرق عادت ظاہر ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد آزمائش کا موقع نہیں رہے گا، اب تو وہ چیزیں سامنے آگئیں جن کی خبریں دی جا رہی تھیں، جن کو محض پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار پر ماننا چاہئے تھا۔ مشاہدے سے مانا تو اس کا نام ایمان نہیں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد پر ماننا چاہئے۔ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ آنکھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ ماننا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غلط نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایمان ہے۔ تو اپنی عقل سے کسی چیز کو سمجھ لینا یہ ایمان نہیں۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ میں ایمان لے آیا کہ دو کا دُگنا چار ہوتا ہے۔ اسے ایمان نہیں کہتے۔ یہ تو قضیہ عقلیہ ہے۔

التفاتِ حقائق اسلام کا موضوع ہے...... اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو، حقائق کی طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔ اسی واسطے تصویر کی ممانعت فرمائی گئی، ہوسکتا تھا کہ اس زمانے میں بھی مصوّر رہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک رکھتے ہوں۔ مگر ممانعت فرما دی گئی کہ صورتوں میں الجھ

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآیة: ۱۶.

جائیں گے اور حقیقت رہ جائے گی، اس لئے مسلمانوں کو صورتوں سے ہی الگ رکھا ہے۔ آج کل سب کچھ مظاہروں اور نعروں میں آ گیا ہے، حقیقت گم ہوگئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کا مذہبی فائدہ...... (ہندوستان میں) سارے مسلمان اکٹھے ہو گئے اور یہ طے پایا کہ مشترک معاملات میں مل کر متفقہ طور پر گورنمنٹ سے مطالبہ کیا جائے۔ جو اپنی خصوصیات ہیں وہ آپ اپنے گھروں میں انجام دیں۔ اس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے گا۔ لیکن جب گورنمنٹ کے سامنے آئیں تو مل کر آئیں اور وہ یہ نعرہ ہو کہ پرسنل لاء اور عائلی قوانین میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ نہ گورنمنٹ کو نہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کو۔ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرا گاندھی کو اعلان کرنا پڑا کہ ''ہم کوئی دخل دینا نہیں چاہتے۔ مسلمان چاہیں کہ دخل دو، تب ہم دخل دیں گے''۔

ہم نے کہا وہ مسلمان کون ہے جو چاہے گا۔ سب تو یہاں آ گئے، سب کے نمائندے یہاں جمع ہیں۔ شیعہ و سنی بھی، اہلحدیث بھی۔ اب وہ کون سے مسلمان ہیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب دب دبا گئے اور وہ جو نعرے لگا رہے تھے کہ ترمیمات ہوں گی سب چپکے ہو کے بیٹھ گئے۔

دیوبندی و بریلوی حضرات کے باہمی قرب کا فائدہ......اس موقع پر ہم نے بریلوی حضرات سے بھی خواہش کا اظہار کیا کہ آپ بھی آئیں عام طور پر وہ مذہبی معاملات میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے نہیں۔ مگر اس موقع پر شریک ہوئے۔ اس لئے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم نہ گئے تو سب نکھٹو کہیں گے اور ہماری بات گر جائے گی تو اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ سب سے بڑے مفتی، مفتی برہان الدین صاحب جو جبل پور کے رہنے والے ہیں، وہ آئے۔ مجھے اس موقع پر صدر بنا دیا تھا۔ میں نے انتہائی ان کی آؤ بھگت کی، جب وہ تشریف لائیں تو بیس قدم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنا، ہر پانچ منٹ کے بعد پان پیش کرنا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد چائے پیش کرنا۔ اور ان کی باتیں بھی بڑی عقیدت کی نگاہ سے سنیں کہ جو سچی بات کہے، اسے ماننا چاہئے۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو انہوں نے کہا۔ میں نے سنا ہے آپ حج کے لئے جانے والے ہیں؟ میں نے کہا ارادہ تو ہے۔ انہوں نے کہا ''روضۂ اقدس پر میرا اسلام عرض کر دینا''۔ میں نے کہا انشاء اللہ ضرور عرض کروں گا۔ خیر میں نے کہا تکفیر تو ختم ہوئی۔ کسی کافر کے ذریعے روضۂ اقدس پر کوئی تھوڑا ہی سلام پہنچاتا ہے، غرض ملنے سے بھی سینکڑوں شبہات رفع ہوتے ہیں۔ بہت سے منافع ان کے ہاں ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔ اور بہت سے منافع ہمارے ہاں ہیں جن سے وہ محروم ہیں، رلے ملیں گے تو ایک دوسرے سے فائدہ تو اٹھائے گا۔

باہمی نفرت اسلام کا ذوق نہیں......یہ باہمی نفرتیں پیدا کرنا یہ اسلام کا ذوق نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ ① ''یہ کفار جن چیزوں کی

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۸۔

پرستش کرتے ہیں ان کو بھی برامت کہو کہ وہ چڑ میں آ کر تمہارے بڑوں کو برا کہیں۔ اس لئے انہیں بھی گالی مت دو‘‘۔ اب یہاں گالم گلوچ بھی ہے اور یہ کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ وہ ایسا وہ ویسا۔ تو اسلام کا یہ ذوق ہی نہیں۔ یہ ایک مصیبت ہے۔ بس جہل عام ہے۔ آدمی دین کچھ پڑھے لکھے تو ذوق پیدا ہو اور پتہ چلے، بس بھیڑ چال ہے، جس نے جو رسم ڈال دی اور دو تین برس کی بعد وہی دین کا جز بن گیا۔

رسوم کا غلبہ...... چناں چہ میرا امریکہ جانا ہوا تو قوم کے کچھ لیڈر ملنے کے لئے بیچارے نیک طینت اور نومسلم آئے۔ میں نے حسب معمول پان کھایا۔ وہ یوں سمجھے کہ کوئی دینی چیز ہے۔ کہنے لگے اب ہم سب پان کھایا کریں گے اور ڈبہ بٹوہ رکھیں گے۔ میں نے کہا! یہ کوئی دینی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک عادت کی بات ہے۔ ایسا مت کرنا۔ اتنے سیدھے سادھے لوگ ہیں، اب اگر وہ پان کا ڈبہ رکھتے اور اسے دین سمجھ کر رائج کرتے تو ان میں یہ رائج ہوتا کہ پان کھانا دین اسلام کا رکن ہے اور جو نہیں رکھے گا وہ کافر ہو جائے گا، اس لئے وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

اختلافی مسائل کا آسان حل...... ورنہ اگر مسائل میں نگاہ ہو تو قرآنِ کریم کا صاف حکم ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ① اگر تم میں تنازع ہو تو اللہ ورسول کو حکم بنا کے رجوع کرو، صحابہؓ کا عمل موجود ہے، رجوع کرو۔ جب وہ عمل پیش کیا جائے تو کہتے ہیں، صاحب! یہ تو سر آنکھوں پر ہے۔ مگر رواج یہی ہے۔ تو رواج پر چلیں گے۔ نہ صحابہؓ کے تعامل پر، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل پر، اس کا کوئی علاج نہیں۔ بس جہالت ہے اور اسلامی ذوق نہیں ہے۔

بریلوی عالم کی توہین بھی درست نہیں...... اب مولانا احمد رضا خان صاحب ہیں۔ ایک دن حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی مجلس میں۔ غالباً خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے یا کسی اور نے یہ لفظ کہا کہ ’’احمد رضا یوں کہتا ہے‘‘۔ بس حضرت بگڑ گئے۔ فرمایا عالم تو ہیں۔ ہمیں توہین کرنے کیا حق ہے؟ کیوں نہیں تم نے مولانا کا لفظ کہا؟

غرض بہت ڈانٹا ڈپٹا۔ بہر حال، ہم تو اس طریق پر ہیں کہ قطعاً ان کی بے حرمتی جائز نہیں سمجھتے، کافر، فاسق کہنا تو بڑی چیز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو خلافِ سنت امور ہیں۔ انہیں ظاہر کرتے ہیں کہ بدعات ہیں۔ خلافِ سنت ہیں، انہیں ترک کرو، لیکن کرنے والے کی توہین کریں، یہ نہیں ہے۔

مولانا احمد رضا خان صاحبؒ دیوبند کے فیض یافتہ ہیں...... مولانا احمد رضا خان دیوبند کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ وہ اس طرح کہ مولانا محمد یٰسین صاحب رحمہ اللہ علیہ جنہوں نے بریلی میں مدرسہ اشاعتِ العلوم قائم کیا، یہ ان کے شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں مگر اسے ظاہر نہیں کرتے۔ اور ابتداء ابتداء میں مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا احمد رضا خانؒ جو خط لکھتے تو نہایت تعظیم سے لکھتے، ایسے جیسے کوئی اپنے شیخ کو لکھ رہا ہے۔ بعد میں ان کے خیالات بدلے۔ کیا بات پیش آئی، وہ اللہ ہی جانے۔ پھر تو کافر سے

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹۔

ورے کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

اپنے کام سے کام...... ہم تو یہ کہتے ہیں کہ نہ ہم مولانا احمد رضا خان صاحب کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں نہ کبھی کہا۔ دارالعلوم میں آپ آ کے دیکھیں، کوئی ذکر یا چرچا ہے ہی نہیں۔ کون بریلوی اور کون وہ۔ سب اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ادھر دیکھو تو ابجد کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ وہ کافر، وہ کافر، وہ فاسق۔ وہاں کفر واسلام کا یہ قصہ نہیں۔ سب تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ برسہا برس نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ اپنا مشغلہ ہی بہت ہے، کہاں اس جھگڑے میں پڑیں کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ ہوگا وہ، ہمیں اس سے کیا؟ وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

لَعُمْرِیْ اِنَّ فِیْ ذَنْبِیْ لَشُغْلًا بِنَفْسِیْ عَنْ ذُنُوْبِ بَنِیْ اُمَیَّۃَ

میرے اتنے گناہ ہیں کہ مجھے شمار کرنے کی فرصت نہیں۔ بنی امیہ کے گناہوں کو کہاں شمار کروں۔؟ برسوں نام بھی نہیں سنیں گے۔ کون ہے بریلوی اور کون ہے رافضی؟

مسجد دھلوانے کا قصہ...... بمبئی میں یہ کیفیت تھی کہ کوئی دیوبند والا مسجد میں چلا جائے تو مسجد دھلوائی جاتی تھی، حالاں کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کفار آتے تھے لیکن دھلوائی کبھی نہیں گئی، جب کہ وہ صحیح کافر تھے۔ اس لئے کہ نجاست اعتقاد کی ہے، بدن کی نجاست نہیں ہے جو مسجد آلودہ ہو۔ پھر بمبئی میں جانا آنا ہوا۔ اب قصہ برعکس ہوگیا، ایک بڑی جماعت پیدا ہوگئی جو معتدل ہے اور ان خرافات کو سمجھ گئی۔

حضراتِ دیوبند اور پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم...... پیر مہر علی شاہ صاحب نے دیوبند سے کوئی استفادہ نہیں کیا، مگر دیوبند کے لوگ ان کے معتقد تھے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ ان سے بڑی عقیدت سے اور بڑی نیازمندی سے ملتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ ایک تو کچھ رسوم ہیں۔ ان بزرگوں میں اگر کوئی رسم بھی ہے تو وہ صرف اس لئے کہ ہمارے بزرگوں نے کیا ہم بھی کریں گے۔ لیکن دوسروں کی تکفیر نہیں کرتے اور برا بھلا نہیں کہتے۔ چوں کہ ان میں اخلاص تھا اس لئے دیوبند کے حضرات بھی ان سے عقیدت سے ملتے تھے۔

ایک بریلوی بزرگ سے ملاقات کے اثرات...... ملتان میں انقلاب سے پہلے ایک دفعہ میرا جانا ہوا۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے خیر المدارس کا جلسہ کیا تھا۔ میں نے جا کے پوچھا، یہاں کوئی بزرگ، کوئی عالم اور بھی ہے جس سے ملیں۔ انہوں نے کہا۔ مولانا محمد بخش صاحب ہیں اور بریلوی فرقے کے ہیں۔ میں نے کہا ہم انہیں فرقہ نہیں سمجھتے۔ نہ ہم فرقہ، نہ وہ فرقہ۔ مولانا عبدالخالق صاحبؒ نے بہت روکا کہ ان کے خلاف تو جلسہ کر رہے ہیں اور تم جا کے ملو گے۔ میں نے کہا خلاف کا وقت آئے گا، خلاف بھی کریں گے۔ اور وہ مسئلہ کی بات ہوگی لیکن ملنے میں کیا حرج ہے۔

ان سے چھپ، چھپا کر، میرے ساتھ حافظ شریف احمد تھے، مغرب کے وقت ان کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہ مصلے

پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک لوٹے میں برف کا پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے میرے آنے کی انہیں اطلاع کر دی۔ بڑی شفقت سے پیش آئے اور اس پانی کے لوٹے کو منہ سے لگا کر پہلے خود پیا اور مجھے کہا تم بھی پیو، میں نے پانی پیا۔

اس کے بعد کہنے لگے، دیو بند کے بزرگوں کے کچھ احوال تو سناؤ۔ میں نے وہاں کے بزرگوں کے حالات سنائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو دارالعلوم میں تعلیم کے لئے بھیجا، مگر ایک کو تو وہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔ واپس چلا آیا اور ایک البتہ سال رہا۔ مگر امتحان سے پہلے وہ بھی چلا آیا۔ خدا جانے کیا مجبوری پیش آئی۔ بہر حال ان کے گھرانے سے تکفیر نکل گئی۔ اس لئے میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھئی منافرت مت پیدا کرو، اپنی رائے ہے، اگر آپ دیانۃً صحیح سمجھتے ہیں تو اس پر عمل کریں، لیکن نفرتیں پیدا کرنا، یہ صحیح نہیں۔

سنت و بدعت کا تاثیری امتیاز......مگر مشکل یہ ہے کہ حدیث شریف میں بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ''مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ'' ① جس قوم میں بدعت آئے گی اس میں دنگا فساد اور جھگڑا ضرور آئے گا۔ یہ بدعت کا خاصہ ہے۔ سنت میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سنت تو ایک ہی ہے، جس کا جی چاہے عمل کرے اور بدعات ہر جگہ کی الگ الگ ہیں۔ تو بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اصل دین ختم ہو جائے گا۔ نزاع وجدال اور گروہ بندی و پارٹی بازی، یہ شروع ہو جائے گی۔

تقسیم ہند کے بارے میں علمائے دیو بند کا اختلاف.....حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو کانگریس کے حامی تھے، کانگریسی تھے اور کانگریس کے کٹر قسم کے حامی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس میں خون خرابے مچیں گے۔ اور مسلمان اِدھر سے اُدھر ہو جائیں گے۔ تو جانیں تلف ہوں گی۔ اور اسی طرح کے دیگر مصالح ان کے پیش نظر تھے۔ لیکن یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو فرمایا، اب اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں، اب ہماری آبرو اسی میں ہے کہ وہ قوی ہو اور مضبوط رہے یہ تو ان کا حال ہے، جو مخالف تھے۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ دیو بندی نہیں تھے؟ حضرت تھانویؒ دیو بندی نہیں تھے؟ مولانا ظفر احمد صاحبؒ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیو بندی نہیں تھے؟ یہ سارے پاکستان کے حامی تھے۔ تو یہ کہہ دینا کہ دیو بند مخالف تھا۔ رائیں ہوتی ہیں، کسی کی کچھ کسی کی کچھ، مگر بن جانے کے بعد مخالفین کی رائیں بدل گئیں کہ اب ہم کسی قسم کا نزاع یا اختلاف نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو ہماری عزت اس میں ہے کہ پاکستان قوی اور مضبوط ہو۔ دیو بند کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اشخاص کے اندر اختلاف تھا، دیو بند تو ایک ادارہ ہے، وہ نہ لیگی، نہ کانگریسی، ہمیشہ غیر جانبدار رہا۔ تو دیو بند اور چیز ہے۔ افراد اور چیز ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حامی تھے اور حامی ہونے کی بناء یہ تھی کہ یہ نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ ہمیں ایک اسٹیٹ چاہئے جس میں اسلامی قوانین جاری کر سکیں، سارے مسلمان

---

① جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة الزخرف، ج: ۱۱ ص: ۵۱.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہوں۔ میرا ان کا اختلاف مسئلہ کا اور حجت کا اختلاف ہے۔ ذاتی اختلاف نہیں ہے، اگر تو نے یہاں آ کے قدم رکھا تو میں حضرت علیؓ کا ادنیٰ سپاہی ہو کر تجھ سے جنگ کروں گا''۔ اور اس کی ساری امیدیں ختم کر دیں۔ اور اگر وہ معاذ اللہ دب جاتے، وہ قیصر ہی غالب آ تا۔ اسی کی حکومت ہو جاتی۔

غیر قوموں کا طریقِ واردات...... غرض ان قوموں کا خاصہ یہی ہے کہ پہلے ملک میں اور قوم میں تفریق ڈالوتی ہیں اور سینکڑوں ملی معاملات میں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔ اسلام نے اخوتِ اسلامی سکھلائی تھی کہ مشرق و مغرب کے مسلمان ایک ہوں۔

انہوں نے کیا کیا۔ وطنیت کا رشتہ الگ ڈالا۔ اب جغرافیائی خطوط پہ لڑائی کرائی، نسلیّت کا رشتہ الگ ڈالا کہ گورے الگ اور کالے الگ، غرض اس قسم کے سینکڑوں اختلاف پیدا کر دیئے۔ اور لوگوں کو لڑا رہے ہیں، جغرافیائی خطوط پر کہیں لڑ رہے ہیں، کہیں رنگ و نسل کے مسئلہ پر لڑ رہے ہیں، کہیں زبان کے مسئلے پر لڑ رہے ہیں۔ لیکن وہ جو اصل وحدت کی بنیاد تھی، اس کو سب چھوڑے ہوئے ہیں جس میں سارے مسلمان ایک ہوتے ہیں۔

ایک تو اختلاف آ رہا ہوتا ہے اور حجت کا اختلاف ہوتا ہے، وہ علماء و عقلاء میں آ رہا ہے، وہ مضر نہیں ہے، اس اختلاف کو نزاع و جدال اور جھگڑے پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا، یہ مضرّ چیز ہے۔ یہ جذبات کا کام ہے۔ مسئلہ کا کام نہیں ہے ، مسئلہ لڑائی نہیں سکھلاتا۔ ہم مسئلہ کو آڑ بناتے ہیں اور جذبات اپنے نکالتے ہیں، پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

اجلاس صد سالہ...... اجلاس صدِ سالہ کو ''جشن'' کہنے سے ہم ہر جگہ احتیاط کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے جشن کا نام نہ دیا جائے۔ یہ ایک دستار بندی کا اجلاس ہے جبکہ جشن ایک رسم ہے۔ دارالعلوم کے اجلاس صدِ سالہ میں شرکت کے لئے یہاں کے لوگوں کا کام ہے کہ وہ صدرِ پاکستان سے ملیں اور اس کی اہمیّت ان پر واضح کریں۔ پھر جو وہ فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے، معلوم ہوا ہے کہ ایک وفد ان سے ملا ہے تو انہوں نے پانچ سو آدمی کی اجازت دے دی ہے۔ ان پانچ سو کا انتخاب کرنا بھی یہاں کے لوگوں کا کام ہے۔

گروہی خصوصیّت کی دعوت کا نقصان...... دعوتیں مختلف ہو گئیں۔ اپنی اپنی خصوصیات کی لوگ دعوتیں دیتے ہیں اور اسے اسلام پکارتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام سب سے زیادہ بلند چیز ہے، جماعتی خصوصیات کا نام اسلام تھوڑا ہی ہے۔ ہر شخص اپنی گروہی خصوصیات کو اسلام کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اسلام کو مسلمانوں سے خطرہ ہے اور کسی سے نہیں ہے۔

اسبابِ اتحاد...... دوسرے میں نے ہر جگہ کہا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے۔ سب مل کر باہم متحد ہو کر اپنے ملک کو مضبوط بنائیں۔ اور یاد رکھئے! اتحاد جو قائم ہوتا ہے کبھی تو وہ قوتِ عقیدت سے قائم ہوتا ہے، کوئی ایک بزرگ شخص ہے، لوگ اس پر جمع ہو گئے۔ ان میں باہمی اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ کوئی عالم ربانی یا شیخ طریقت ہے۔ اس کے متوسّل جمع ہو جاتے ہیں۔ مرکز ایک ہو گیا۔ مگر وہ اتحاد محدود ہوتا ہے۔

ایک قوّت قہری یعنی حکومت کی قوّت ہے، وہ بھی ایک مرکز پر جمع کرتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ سب

اس کے حامی تھے کہ اس سے بہتر کیا بات ہے۔ تو جس نے رائے دی یہ سمجھ کر دی کہ وہاں اسلام رائج ہوگا۔

دوسرے حضرات کی رائے یہ تھی کہ یہ ہوگا، نہیں اس لئے کہ جو لوگ بناء رہے ہیں انہیں خود دین سے مناسبت نہیں ہے، وہ نیک نیتی سے بھی چاہیں کہ اسلام رائج ہو، تب بھی نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ ان کے اندر اسلامی ذوق ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ملک تقسیم ہوگا تو یہ بھی ہوگا کہ کچھ لوگ ادھر آئیں کچھ لوگ اُدھر جائیں، اس میں خون خرابے بھی مچیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو خون کے دریا نظر آتے ہیں۔ اور یہ ہوا۔ لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ لاکھوں مسلمان عورتوں کی آبروئیں بھی گئیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ تو یہ چیزیں ان کے پیش نظر تھیں جس کی بناء پر ان حضرات کی رائے تھی کہ نہ بننا چاہئے۔

اور جن کی رائے تھی کہ بنے تو وہ اس پر تھے کہ جب ایک اسٹیٹ بنے گی، اس میں اسلامی قانون جاری ہو گا۔ تو زیادہ نہ سہی پورے ہندوستان میں ایک جگہ تو اسلامی اسٹیٹ ہو جائے۔ ان کی نگاہ اس پر تھی۔ اور ہم رات دن دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ ملک مضبوط ہو اور ہم وہاں بیٹھ کر دعاء ہی کر سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔؟ اور اس کے متمنی ہیں کہ اس ملک کو سب متفق و متحد ہو کر سنبھالیں، اللہ نے جب ایک ملک دے دیا ہے، باہمی لڑائی سے اسے ختم نہ کریں اور ان لوگوں سے عبرت پکڑیں جن میں نزاع ہوا۔ اور تیسرا آ کر غالب ہوا۔ افغانستان میں یہی ہوا کہ بیس پارٹیاں خلاف میں کھڑی ہو گئیں، باہمی نزاع ہوا۔ تو روس نے آ کر غلبہ پایا، اسی طرح سے اور جگہوں پر بھی ہوا کہ جب باہمی نزاع ہوا تیسرا غالب۔

مسلمانوں کا باہمی اختلاف غیروں کو غلبہ دلاتا ہے...... ملک ابن سعود کا ایک مقولہ ہے، جب ان سے کہا گیا کہ یہود بڑی قوت پکڑتے جا رہے ہیں اور ممالک اسلامیہ کے لئے خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ملک نے جواب دیا۔ ''ساری دنیا کے یہود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، مجھے ذرّہ برابر فکر نہیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم ہی آپس میں لڑو گے اور غیروں کو موقع دو گے کہ وہ آ کر غالب ہوں اور دخل دیں''۔ غرض یہ واقعہ ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت تباہ ہوئی ہے باہمی نزاع اور باہمی رقابتوں سے تیسرے کو موقع ملا۔ اور دوسری قومیں ہمیشہ اس کی ساعی رہی ہیں کہ ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو جائے تو پھر غالب آ جاؤ۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلبِ روم کو جواب...... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جب جنگ ہوئی تو قیصر روم کا پیغام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچا کہ ''میں نے سنا ہے کہ علی تمہارے مقابلے پر ہیں اور میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ فوجی مدد، مالی مدد''۔

اس کا مقصد یہ کہ حضرت امیر معاویہؓ کا ساتھ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو کر ختم ہو جائیں تو انہیں بھی مغلوب کر دینا آسان ہوگا۔ یہ گویا اس کی ذہنی کیفیت تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کا جواب لکھا، اس میں لقب لکھا الی کلب الروم رومی کتے کی طرف یہ خط پہنچے اور لکھا کہ: ''تو یہ سمجھتا ہے کہ میں

لوگ جمع ہو جائیں اور اتفاق کریں اور حکومت کو مضبوط بنائیں۔ اور بیرونی خطرات پہ نگاہ رکھیں۔ اس لئے کہ آپ کے اختلاف سے غیروں کو دخل اندازی کا موقع ملے گا۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سارے مسلمان متحد ہو کر ملک کو اور حکومت کو مضبوط کریں۔

عشرۂ فنڈ...... میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ (زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً) میں حاضر ہوں۔ اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آدمی میرے پاس پہنچا، اور اس نے دس روپے دیئے کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ارسال فرمائے ہیں کہ یہ دارالعلوم میں داخل کر دیئے جائیں۔ میں نے اس آدمی سے عرض کیا کہ یہ زکوٰۃ ہے یا عطیہ؟ اس نے کہا یہ عطیہ ہے۔ خواب ہی میں یہ بات دل میں جم گئی کہ میں اس مبارک رقم کو اجلاس صد سالہ کے سلسلہ میں داخل کروں گا۔

چناں چہ صبح کو میں نے یہ مفصّل خواب لکھ کر اور دس روپے کا نوٹ نتھی کر کے دفترِ اجلاس میں بھجوا دیا۔ وہاں شہر کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو خواب سنا تو بہت سے لوگوں نے کسی نے ماں کی طرف سے، کسی نے بیوی کی طرف سے، کسی نے بہن کی طرف سے دس دس روپے دیئے، جس سے دو ڈیڑھ سو روپے جمع ہو گئے، اس کے بعد گھر میں تذکرہ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو میاں سالم، اسلم اور اعظم تینوں نے ایک ایک بچے اور ایک ایک عورت کی طرف سے دس دس روپے دے کر دو سو سے کچھ زائد انہوں نے جمع کر دیئے۔ پھر طلباء میں چرچا ہوا تو کچھ طلباء میرے پاس آئے کہ اس قسم کے خواب کا چرچا ہے۔ اس کی کیا اصلیت ہے؟ طلباء چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی بیان کر دیا جائے۔ چناں چہ طلباء کا اجتماع ہوا، ڈیڑھ دو ہزار طلباء جمع ہوئے۔ اور میں نے خواب بیان کیا۔ پھر جو پیسوں کی بارش ہونا شروع ہوئی حالاں کہ بے چارے غریب اور غریب الدیار طلباء مگر چودہ سو روپے انہوں نے اسی مجلس میں جمع کر دیئے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تھا تو ہاتھ کی گھڑی اتار کر مجھے دے دی۔ اب شہر میں یہ چیز پھیلی، جو آ رہا ہے دس روپے کا نوٹ لئے آ رہا ہے، صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام کی برکت ہے کہ نام آتا ہے تو لوگ اُمڈ پڑتے ہیں۔ اور عشرہ فنڈ میں خوب پیسہ جمع کراتے ہیں۔

اس پر میں نے دفترِ اجلاس کو لکھا کہ جتنی بھی رقم آئے وہ حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے داخل کی جائے اور دینے والے کا نام معرفت میں لکھ دیا جائے کہ معرفت فلاں کی اور من جانب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اس طرح بہت سا روپیہ جمع ہو گیا۔ اس کے بعد میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ یہاں بھی خواب کا چرچا ہے۔ وہاں بیان کیا تو کوئی چھ سات ہزار روپیہ لوگوں نے دس دس روپے دیکر جمع کر دیا۔ تو میں نے کہا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لاکھوں روپیہ دے سکتی تھیں مگر دس روپے اس لئے دیئے کہ ہر ایک کو دس دینے آسان ہیں۔ اور سو، ہزار دینے مشکل ہیں۔ اس لئے دس روپے عنایت فرمائے۔ تو اس کا نام ہم نے ''عشرہ فنڈ'' رکھ دیا اس کا یہاں پاکستان میں لاہور میں ذکر ہوا تو یہاں لوگوں نے دینا شروع کیا۔ اب تک ''عشرہ

فنڈ'' میں پندرہ، سولہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے، یہ اس خواب کی حقیقت ہے۔

عطیۂ رحمت...... اسی طرح دو روپے کے بارے میں یہ ہے کہ الٰہ آباد کے ڈاکٹر صلاح الدین صاحب، انہوں نے خواب دیکھا اور مجھے خط لکھا۔ ''مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دو روپے عنایت فرمائے اور میرا نام لیا کہ اس کے پاس بھیج دو کہ ایک دارالعلوم میں داخل کرے، ایک صد سالہ اجلاس کے فنڈ میں داخل کرے چناں چہ وہ خود لے کر پہنچے''۔ میں نے اس پر کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، تو ایک دو روپیہ اس لئے رکھا کہ ہر شخص کو دینا آسان ہے۔

انفاق محبوب کا التزام...... اگر خرچ کرو تو محبوب ترین چیز خرچ کرو، محبوب چیز ہو، یہ نہ ہو کہ جسے اپنے نزدیک ردّی سمجھ رکھا ہے اسے اللہ کے نام پر دے دی، اچھی چیزیں خود رکھو، غرض جو دو محبوب چیز ہو، یہ نہیں فرمایا جو محبوب چیز ہو وہی دو۔ اس سے لزوم ہے کہ جو دو وہ محبوب ہو۔ جو محبوب ہو وہ سب کچھ دے دو یہ نہیں ہے۔ کسی کے پاس اگر دس چیزیں ہیں اور وہ محبوب ہیں، ایک چیز دے دے، وہ بھی کافی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ دس کی دس دے دے ترغیب پر عمل کرے گا، درجات ملیں گے۔ امر نہیں ہے کہ اگر نہیں دے گا تو گنہگار ہوگا۔

نعمائے جنت...... جنت میں جو نعمتیں ہیں وہ، وہ ہیں کہ لَا عَیۡنٌ رَاَتۡ...... نہ کسی آنکھ نے دیکھی۔ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتۡ...... نہ کسی کان نے سنی۔ وَلَا عَلٰی قَلۡبِ بَشَرٍ خَطَرَ. ① نہ کسی قلب پر ان کا خطرہ گزرا۔ اس لئے کہ آدمی نے دیکھا تو ہے نہیں جو کچھ سمجھے گا عقل سے سمجھے گا۔ تو یہ سمجھے گا کہ جیسی دنیا میں نعمتیں ہیں ایسی ہی جنّت میں ہوں گی۔ حالاں کہ وہ اس سے بالاتر ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل محض سے سوچتے ہیں۔ لیکن جو ''وحیِ خداوندی'' سے سوچتے ہیں، وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنّت کا معائنہ کرایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری نعمتیں دیکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے، جنت کی ساری نعمتیں دیکھیں، تو ایک ہیں انبیاء علیہم السلام اور مقرّبین، وہ محض عقل سے نہیں سوچتے وہ تو وحیِ خداوندی اور مشاہدے کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔ یہ حکم عوام کے لئے کہ عقل سے جتنا سوچو گے اس کی چیزیں عقل سے بالاتر ہیں، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس میں داخل نہیں ہیں۔

انسان ہر طرف سے عدم میں گھرا ہوا ہے...... انسانی صفات بہت محدود ہیں۔ ہر طرف سے انسان کو عدم نے گھیر رکھا ہے۔ چناں چہ صفتِ علم کی بات ہے۔ ایک انسان کو چار سو، پانچ سو مسائل کا علم ہوگا، ہزار کا ہوگا، اس کے بعد وہی عدم العلم ہے۔ تو جہل نے گھیر رکھا ہے، بیچ میں تھوڑا سا علم ہے۔

یا مثلاً ہماری قدرت ہے۔ ہم آپ سے کہیں گے کہ اگالدان اٹھالاؤ۔ آپ اٹھالائیں گے، قدرت ہے۔ یا آپ سے کہیں گے چارپائی اٹھالاؤ، مشقت سے سہی، آپ اٹھالائیں گے، ہم کہیں گے مکان اٹھالاؤ۔ آپ کہیں

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة الجنة...... ص: ۲۶۳، رقم: ۳۲۴۴.

گے مجھ میں تو قدرت نہیں۔تو بیچ میں قدرت ہے چاروں طرف عدم القدرت ہے۔ زیادہ تر چیزیں وہ ہیں جو قدرت سے خارج ہیں۔

اسی طرح سے دیگر صفات میں بھی۔مثلاً آپ محافظ ہیں، اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ایک بچے کی کریں گے دو بچوں کی کریں گے۔گھر والوں کو ساتھ ملا کر دس کی حفاظت کریں گے۔ہم کہیں گے سارے شہر کی حفاظت کرو، آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں، امیر اور پریذیڈنٹ جو ہے، وہ کر سکتا ہے۔ہم اس سے کہیں گے ساری دنیا کی حفاظت کرو، سمندروں میں جو مچھلیاں ہیں ان کی بھی حفاظت کرو، وہ کہے گا میرے اندر تو قدرت نہیں، تو پھر عدم القدرت آ گئی۔تو بیچ میں تھوڑی سی حفاظت اور قدرت ہے۔غرض ہر انسان کی ہر صفت کمال کو عدم الصفات نے گھیر رکھا ہے، عدم چاروں طرف سے محیط ہے۔بیچ میں تھوڑا سا وجود دیا گیا ہے۔خود ہماری ذات جو ہے، پہلے نہیں تھے۔بعد میں نہیں ہوں گے۔ بیچ میں تھوڑے سے ہیں۔تو دو طرف سے عدم میں گھرے ہوئے ہیں۔بیچ میں تھوڑا سا وجود ہے، جب وجود ہمارا تھوڑا سا ہے تو صفاتِ وجود بھی تھوڑی سی ہیں۔کمالات بھی تھوڑے سے ہیں۔لامحدود کمالات نہیں ہو سکتے۔

وجودِ حقیقی...... لامحدود کمالات اسی کے ہو سکتے ہیں جس کا وجود لامحدود ہے۔ جو ازل سے ابد تک رہے گا۔اور وہ اللہ کی ذاتِ برکات ہے۔یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ حق تعالیٰ کا علم محیط، اس کی قدرت محیط، اسی لئے فرمایا ﴿وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ ① ''ہر چیز اس کے علم کے احاطے میں ہے''۔اور قدرت کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ② ''وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔کہیں فرمایا: ﴿عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ ③ ''اس کا اقتدار ہے، کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے''۔کہیں فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ ④ ''مالک الملک وہی ہے، جسے چاہے ملک دے دے، جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے بادشاہ بنا دے۔ جسے چاہے گدّی سے اتار دے''۔غرض سب کی بادشاہتیں تو حد رکھتی ہیں کہ ہوئیں اور ختم ہو گئیں لیکن جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کی بادشاہت بھی ازلی اور ابدی ہے۔تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

اسلام میں انتخابِ امیر کا ایک طریق...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت کے وقت چھ نام منتخب کئے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی کو امیر بنالو، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔فرمایا ان سے زیادہ کوئی مستحق خلافت نہیں ہے، ان میں سے کسی کو منتخب کر لیا جائے۔مگر انتخاب میں تین دن سے زیادہ دیر نہ کی جائے۔

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲. ② پارہ: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۰.

③ پارہ: ۲۷، سورۃ القمر، الآیۃ: ۵۵. ④ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۲۶.

چناں چہ یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ نے فرمایا۔ چھ میں سے تین کو سب اختیار دے دیئے جائیں، تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنا اختیار حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

پھر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنھما میں سے جو خلافت نہ چاہتا ہو انتخاب کا اختیار اسی کو دے دیا جائے اس پر دونوں حضرات خاموش رہے۔ تو حضرت عبدالرحمنؓ نے فرمایا۔ میں اپنے لئے خلافت نہیں چاہتا لہٰذا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ چناں چہ انہیں یہ اختیار ان دونوں حضرات کی طرف سے سونپ دیا گیا۔ اور انہیں تین دن مہلت دی گئی۔ پھر آراء کی کثرت حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہوئی تو ان کو امیر منتخب کیا گیا۔ اور اہلِ حل وعقد نے تسلیم کر لیا۔ گویا اسلام میں دونوں طریقے ہیں۔ نامزدگی بھی ہے اور انتخاب بھی ہے۔

انتخاب کا مغربی طریقہ...... مگر انتخاب کا ایک تو موجودہ طریقہ ہے کہ جتنے بالغ ہوں سب سے رائے لی جائے، وہ امیر کے بارے میں کیا رائے دیں گے اس میں غیر عالم بھی ہیں، جہلاء بھی ہیں، جنہیں یہ ہی پتہ نہیں کہ امارت کے معنی کیا ہیں۔ یہ مسئلہ اہل حل وعقد کے اوپر رکھا گیا کہ جو قوم کے اندر علم اور دیانت کے لحاظ سے نمایاں طریق پر بڑے ہیں اور ان کی تقویٰ وطہارت پر لوگوں کو اعتماد ہے، وہ مل کر جسے منتخب کر لیں، قوم اس کو مان لیتی ہے۔ اس لئے طریقہ تو سہل ہے اور ایک معقول طریقہ ہے۔ لیکن اس میں نقصان اس سے ہوتا ہے کہ ہر لیڈر اس فکر میں رہتا ہے کہ میں بنوں اور وہ اپنے مناقب وفضائل خود بیان کرتا ہے کہ میرے یہ کارنامے ہیں۔ لہٰذا مجھے منتخب کرو، ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں تو ووٹ حاصل کرنے والا ہی تو اپنے مناقب بیان کرتا ہے کہ میری کارگزاریاں یہ ہیں اور فلاں نے مجھے یوں کہا۔ اس کے بارے میں صراحۃً اسلام نے فرمایا: **انا لا نولی هذا من سأله ولا من حرص عليه** ① جو خود کسی عہدے کا متلاشی اور خواہاں ہو، ہم اس کو عہدے دار نہیں بنائیں گے اس کی بھی جڑ کٹ گئی، یہیں سے نزاع شروع ہوتا ہے، اب اہل حل وعقد جو سیاسی امور سے بھی واقف ہوں اور ان میں دیانت بھی ہو۔ ایک تو ہے کوری سیاست یعنی جوڑ توڑ۔ اور ایک یہ کہ ضمیر کی سچائی اور دیانت وتقویٰ اور قلب کی طہارت اور ضمیر کی صداقت۔ اس سے جو وہ رائے دیں گے وہ خیر وبرکت کی ہوگی، قوم بھی قبول کرے گی۔

امیر تغلّب...... بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی تغلب کے ساتھ امیر بن گیا، زور اور قوّت کے ساتھ اس نے قبضہ کر لیا۔ پھر اس میں لکھتے ہیں کہ وہ بھی امیر بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس کے ہٹانے میں فتنہ ہے اور فتنے سے بچانا ضروری ہے، اس لئے کہ ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ ② اگر خود بھی بن گیا ہو اور اس میں صلاحیت بھی موجود

① الصحيح للبخاري، كتاب الاحكام، باب مايكره من الحرص على الامارة، ص: ۵۹۵، رقم: ۷۱۴۹.

② پاره: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۹۱.

ہو۔ قوم کا فرض ہے کہ اسے مان لے، جھگڑے نہ ڈالے۔

اقتدار میں رسّہ کشی کا سبب...... جھگڑے جو پڑتے ہیں وہ اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں خرابی ہے۔ خرابی سے تو کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ ہر ایک میں کمزوری ہوتی ہے بلکہ اس لئے پڑتے ہیں کہ ہر ایک خواہاں ہوتا ہے کہ میں اس عہدے پر آ جاؤں۔ یہ اقتدار پسندی جھگڑے کی بنیاد ہے۔ تو اس کے لئے پہلے ہی فرما دیا کہ جو طالب ہو گا ہم اسے عہدہ نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ وہ خود غرض ہے، اس کے اندر اغراض پوشیدہ ہیں۔ اب اہلِ حل وعقد جو ہوں، جن کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ہو، یا قوم کو ان کی دیانت وتقویٰ پر اعتماد ہو۔ اور یہ کہ وہ خود غرض نہیں ہیں۔ ان کو جمع کر کے کسی کا انتخاب کر دیا جائے۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری قوم سے کہا جائے۔ جو اوپر کے لوگ ہیں ساری قوم کا وہی تو خلاصہ ہیں۔ وہ حقیقت میں قوم ہی کی نمائندگی ہوتی ہے۔

رائے عامّہ کی ہمواری...... اس میں البتہ یہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں خلاف ہو، اسے رفع کیا جاتا ہے کہ میاں، یہ واقعہ یوں نہیں، یوں ہے۔ قوم سنبھل جاتی ہے۔ اب جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا گیا تو اسی چھ آدمیوں کی مجلس میں طے تو ہو گیا تھا، لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گھر گھر جا کر پوچھا کہ کس کو چاہتے ہو۔؟ چوں کہ بنی امیہ کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں اقتدار بھی بڑھا ہوا تھا، اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند کیا اور اکثریت کی رائے ادھر ہی آئی اور ان کو امیر بنا دیا گیا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے رائے لی۔ حتیٰ کہ لوگوں کے گھر جا کر رائے لی۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ رائے عامّہ کو ایک حد تک ہموار کرنا ضروری ہے اور وہ یہی ہے کہ جو امیر ہے اس کے واقعی فضائل بیان کئے جائیں کہ اس میں اہلیّت ہے۔ اس کے خلاف کوئی جذبہ ہو اس کو دفع کیا جائے۔

امیر کی غلطی کا حکم...... اب ایسا کوئی آدمی جو بالکل مزکّی اور مقدّس ہو، جس میں غلطی کا نشان نہ ہو، عالم بشریّت میں کوئی نہیں ملے گا۔ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی غلطی اور خطاء ہوتی ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہو گا۔ اس کے بارے میں تو یہ فرما دیا گیا کہ اگر امیر کوئی غلطی بھی کر جائے تو حتیٰ الامکان نصیحت کرو، کچھ نہ ہو تو اس کا اتباع کرو، فتنہ نہ پیدا کرو، اگرچہ وہ رائے غلط بھی ہے۔ بنیاد سب کی یہ نکلتی ہے کہ خود غرض نہ ہو۔ دیانت اور تقویٰ قلب میں موجود ہو۔ پھر سب آسان ہے ورنہ جھگڑے پیدا ہوتے رہیں گے۔

یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص میں ملک کے سنبھالنے اور چلانے کی اگر فی الجملہ صلاحیت ہے تو اس کے خلاف نہ کیا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے اور اگر وہ غلطی بھی کرے تو اس غلطی کو اچھالا نہ جائے۔ الا یہ کہ وہ اسلام کی تخریب کے لئے کام کرے، پھر بے شک اس کو بدل ڈالو۔

افراط وتفریط فرقہ واریّت کی بنیاد ہے...... مولانا احمد رضا خانؒ اور بریلویت کے بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آج تک کہیں ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بہر حال وہ مسلمان ہیں۔ ایک ہے کسی چیز میں غلو اور

مبالغہ کرنا اور تشدّد کرنا، اس کو دنیا میں بھی پسند نہیں کیا گیا، اور دین میں بھی پسند نہیں کیا گیا۔ دین کے بارے میں فرمادیا گیا لَاتَغْلُوْافِیْ دِیْنِکُمْ. ① دین کے اندر غلومت کرو۔ سادہ سادہ طریق پر چلتے رہو۔ جس قوم نے غلو کیا ہے، وہ افراط وتفریط سے ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہود نے تو یہ افراط کی کہ انہیں ولدِ غیا کہا کہ معاذ اللہ ولد الزنا ہیں۔ انتہائی گستاخی کی۔ نصاریٰ نے کہا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ تفریط کی۔ تو ایک اِدھر بڑھ گیا اور ایک اُدھر بڑھ گیا۔ جو اصلیّت تھی کہ اللہ کے پاک بندے ہیں اور اس کے پاک رسولؑ ہیں۔ اس کی طرف کوئی نہیں آیا۔ یا خدا بنایا یا معاذ اللہ ایک بدکار انسان ثابت کیا۔ یہ ہے وہ افراط وتفریط جس سے فرقے بنتے ہیں۔

یا جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّ فِیْکَ مَثَلُ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ. تم میں عیسیٰ ابن مریم کی مثال پائی جاتی ہے، بعض فرقے تمہاری محبت میں پڑ کر تباہ ہوں گے اور بعض تمہاری عداوت میں پڑ کر تباہ ہوں گے۔ تو خوارج نے تو عداوت کا راستہ اختیار کیا۔ اور یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کو قتل کر دیں اور روافض کے بعض فرقے ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان میں خدا حلول کئے ہوئے ہے اور حضرت حضرت امام تسلیم کیا اور حضرت حضرت امام کے معنی معصوم کے لئے۔ اور کہا حضرت حضرت امام شریعت میں تصرّف کر سکتا ہے۔ اگر وہ یوں کہے کہ پانچ نمازوں کو تین کرو، تو اسے کر دینے کا حق ہے۔ حالاں کہ اس کا رسول کو بھی حق نہیں، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ﴾ ② ”مجھے اس کا حق نہیں ہے کہ میں قرآن کریم میں اپنے نفس کی رائے سے کچھ تبدیلی کر دوں۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور میں امین ہوں“۔

غرض نبی کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت میں تصرّف کرے اور وہاں حضرت حضرت امام کو حق دے دیا گیا۔ یہ اِدھر غلو ہے اور وہ اُدھر غلو ہے۔ یہیں سے فرقہ بندی شروع ہوگئی۔ یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے کہ بعض مسائل مختلف فیہ ہیں یعنی اختلافی مسائل میں اگر غلو نہ کیا جائے اور اعتدال سے چلا جائے تو میں سمجھتا ہوں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ اب اس اختلاف کو لڑنے جھگڑنے کا ذریعہ ہی بنایا جائے، یہ جذبات کی بات ہوئی مسائل کی بات تو نہ ہوئی۔

عرس کا مسئلہ...... اس میں دیوبند کے حضرات معتدل ہیں۔ مان لیجئے عرس کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرس اپنی ذات سے کوئی بری چیز نہیں۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ اہل اللہ میں سے کسی شیخ طریقت کا انتقال ہوتا تو جو متوسّل ہوتے، وہ جمع ہو جاتے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ جو لوگ ضعیف النسبت ہوتے انہیں قوی النسبت لوگوں سے قوّت پہنچتی تھی اور تقویّت حاصل ہوتی تھی، ان کی نسبت مضبوط ہوتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان کو مختلف ولایات میں بھیجا جاتا تھا کہ تم وہاں جا کے اصلاح کرو، تم وہاں جا کے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله تعالی یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم، ج:۳، ص:۲۶۶ .

② پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ:۱۵ .

اصلاح کرو۔ اورتم وہاں جا کے اسلام پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضراتِ صوفیاء کی بدولت پھیلا ہے۔ ان کے ہاں عرس کا موضوع ہی یہ تھا کہ سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر ہدایت اور تبلیغ حق کے لئے وجود بھیجے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہر قصبے اور ہر ضلع میں تقریباً شاہِ ولایت کی قبر ہے، سہارن پور میں بھی شاہِ ولایت کی قبر۔ دیوبند میں بھی شاہِ ولایت کی قبر۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہوں میں سنا گیا۔ وہ اصل میں یہ تھا کہ جس وفد کو بھیجا جاتا اس کا ایک امیر بنا دیا جاتا۔ اس کا نام شاہِ ولایت ہوتا تھا۔ وہ جہاں انتقال کر گیا، وہاں دفن ہوا۔ تو شاہِ ولایت کے طور پر دفن ہو گیا۔ وہ شاہِ ولایت ہو گیا۔

غرض وہاں ولائتیں تقسیم ہوتی تھیں کہ تبلیغ دین کرو، مسلمانوں کی اصلاح کرو، حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کے بارے میں عیسائیوں کی شہادت ہے۔ مسٹر آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یعنی اسلام کی دعوت کس طرح سے پھیلی۔ اس میں لکھا ہے کہ ''ہندوستان میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے اور ننانوے لاکھ آدمی بلاواسطہ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ اور جو ان کے خلفاء کے ہاتھ پر ہوئے ہیں، ان کی تعداد الگ ہے''۔

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نوسو خلیفہ دکن میں پہنچے، وہاں جا کے اسلام پھیلایا، ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ وہاں جا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں ایسی تنگ جگہ کہ آدمی کا جانا مشکل، مگر کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے یا مزار موجود ہے۔ وہاں تک یہ حضرت پہنچے ہیں، نوسو خلفاء بھیجے جنہوں نے دین پھیلایا۔

تو اصل میں عرسوں کا یہ مقصد تھا لیکن وہ ہوتے ہوتے مثل مشہور ہے۔ الولایۃ سردہ آمد رفتہ رفتہ کچرہ شد، آیا تھا سردہ بن کر، ہو گیا کچرہ، اب عرسوں کے معنی میلے کے ہو گئے، عورتیں اس میں، ناچ گانا اس میں، دکانیں اس میں، ہر طرح کی خرافات۔ اس کو کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں عرسوں کو روکتے ہیں۔ وہ عرسوں کا روکنا نہیں ہے۔ وہ خرافات کا روکنا ہے جو خلافتِ سنّت ہی نہیں بلکہ بدعات ہیں۔ جو رسمیں پڑی ہوئی ہیں اور جہلاء کی ایجاد کردہ ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر عرس ان چیزوں سے پاک ہو جائے، وہاں سے تبلیغ کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مواعظ ہوں، تقریریں ہوں اور تلاوت ہو، کوئی بھی نہیں روکتا۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے، ہر سال سرہند شریف عرس میں جاتے تھے اور دیوبند والا کوئی انہیں نہیں روکتا تھا، اس لئے کہ وہاں یہ خرافات ہی نہیں تھیں۔ یا تلاوت ہے یا تبلیغ ہے یا مواعظ ہیں۔ غرض اصل میں عرس کو نہیں روکا جاتا بلکہ ان خرافات کو روکا جاتا ہے۔ عوام ان خرافات کے خوگر ہیں، وہ اس پر عار دلاتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! عرس کو روک دیا۔ حالاں کہ بزرگوں نے یہ رسم ڈالی ہوئی ہے۔ کیا بزرگوں نے ناچ گانے کی رسم ڈالی تھی؟ اس کا

منشاء تبلیغ وموعظت اور دینِ حق پھیلانا تھا۔ وہ تو رہا نہیں، ناچ گانا رہ گیا۔ بہر حال بہت سی چیزیں جہالت سے پیدا ہوئی ہیں جب شریعت کا علم ہی نہ ہو تو خرافات ہی ہوں گی۔

اسلام کے نام پر رائج رسوم......اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ ان بزرگوں کی دیانت وتقویٰ اور پاکیزہ اعمال کو دیکھ کر تو میں متوجہ ہوئیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں لیکن تعلیم کا بندوبست نہیں ہوا۔ تو جن لوگوں کے گھروں میں ہندوانہ رسمیں تھیں۔ انہیں صورت بدل کر اسلامی رسوم قرار دے دیا۔ وہ گوگال کا جھنڈا نکالتے تھے۔ انہوں نے شیخ سدّو کا جھنڈا نکال دیا، وہ ستیوں پر پرشاد چڑھاتے تھے، انہوں نے قبروں پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ساری ہی اس میں ہندوانہ رسمیں ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ اسلام کے نام سے رائج ہیں۔ یہ عرسوں پہ ہونے والی چیزیں درحقیقت کچھ ہنود سے آئی ہوئی چیزیں ہیں۔ کچھ اِدھر کی کچھ اُدھر کی۔ وہ پھیل گئیں۔ اب انہیں کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوں کی تعظیم نہیں کرتے۔ بزرگوں نے یہ چیزیں تھوڑا ہی پھیلائی تھیں۔ وہ تو مقدّس لوگ تھے۔

ذکرِ میلاد یا جشنِ میلاد......اسی طرح مثلاً میلاد شریف ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ولادت تو طاعت وعبادت ہے، اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ذکرِ میلاد کے معنی جشنِ میلاد کے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھیں گے جگہ جگہ سبز مینار سے بنے ہوئے ہیں، روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ یہ سیرت پھیل رہی ہے۔ سیرت تو ان تکلفات کو مٹانے کے لئے آئی تھی۔ نہ ان کو رواج دینے اور مظاہرے کرنے کے لئے آئی تھی، دل میں تو سیرت کا نشان نہیں، مگر بازاروں میں جھنڈوں کے اوپر، میناروں اور برجوں کے اوپر گھوم رہی ہے، سیرت آدمیوں کے لئے آئی تھی، یا جھنڈوں اور قمقموں کے لئے آئی تھی۔؟ اس میں لگے ہوئے ہیں اور مظاہروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب اس سے روکو تو کہتے ہیں کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی نہیں اور محبت کے معنی یہ ہیں کہ یہ خرافات کرو تب تو محبت ہے۔ نہ کرو تو محبت نہیں ہے۔ اب انہیں کس طرح سمجھایا جائے۔ حدود قائم نہیں رہیں۔

اب اس میں علمائے کرام اگر ان خرافات سے ٹوکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نیا اسلام کہاں سے لا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تو ان کے گھروں سے جو اسلام آیا ہے۔ وہ یہ رسوم ہیں۔ اور جو لوگ رسوم سے روکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نئے لوگ کہاں سے رسوم کو روکنے کے لئے آ گئے ہیں۔ حالاں کہ ان رسوم کو روکتے ہیں جو جاہلانہ طریق پر مروّج ہیں۔ اصل شئے کو نہیں روکتے۔ اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تجربہ لکھا ہے کہ جو لوگ قبروں پر طواف اور سجدے کرنے جاتے ہیں انہیں حج کی توفیق کم ہوتی ہے اس لئے کہ جو جذبہ اُدھر خرچ کرنا تھا وہ اِدھر خرچ ہو گیا۔

جو لوگ گانے بجانے میں رہتے ہیں، انہیں تلاوتِ قرآن کریم کی کم توفیق ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ جذبہ اِدھر لگ گیا۔ اور اسلام اس لئے آیا تھا کہ یہ جذبات دین کے بارے میں صرف ہوں۔ قرآن وحدیث کے بارے

میں صرف ہوں، تو نہ تو تعلیم ہے کہ مسائل معلوم کریں جس سے سیرت کی حقیقت معلوم ہو، اس پر عملدارآمد کریں۔ نہ تمرین وٹریننگ ہے۔ بس جو رسمیں چل پڑیں، جس نے بھی ایجاد کر دیں بس سبحان اللہ بہت عمدہ چیز ہے۔ چند دن کے بعد وہی دین بن گیا۔ تو ان چیزوں کو روکتے ہیں نہ کہ اصل دین سے روکتے ہیں۔

دیوبندی بریلوی کوئی فرقہ نہیں...... اس لئے میری سمجھ میں اب تک بھی نہیں آیا کہ وہ اختلاف ونزاع ہے کیا چیز جس کو بریلویّت اور دیوبندیّت کے نام سے کھولا جارہا ہے۔ دیوبندیّت کوئی فرقہ تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو اہلسنت و الجماعت ہیں۔ دیوبندیّت کی جو نسبت ہے وہ تعلیمی نسبت ہے کہ دیوبند میں تعلیم پائی، دیوبندی مشہور ہو گئے، جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم وہ علیگ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ندوہ میں تعلیم پائی وہ ندوی کے نام سے مشہور ہو گئے، باقیات صالحات مدارس میں تعلیم پائی تو وہ باقوی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اب یہ فرقہ تھوڑا ہی ہیں کہ ندوی ایک فرقہ، باقوی ایک فرقہ اور دیوبندی ایک فرقہ یہ تو تعلیمی نسبت ہے مگر فرقہ بنا دیا۔

انگریز کا انتقام...... بنیاد اصل میں ساری یہ ہے کہ دیوبندی جماعت انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ تلوار لے کر جہاد کیا۔ تو انگریزوں کے دل میں اس جماعت سے عداوت تھی مگر یہ قوم بہت دانش مند ہے۔ کھلے بندوں مقابلہ نہیں کرتی۔ تدبیر ایسی کرتی ہے کہ وہ آپس میں الجھ جائیں اور باہمی نفرتیں پیدا ہو جائیں۔ اس نے لوگوں کو ہموار کیا کہ ان کو بدنام کرو، چناں چہ جو لوگ رَدِّ بدعات کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں جو بدعات میں مبتلا تھے۔ ان کو موقع ملا کہ تم ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ، وہ کھڑے ہو گئے۔ اب یہ بدعات کا رَدّ کرتے ہیں۔ وہ لوگ مقابلہ پر آ گئے بس پھر فرقہ بندی کی ٹھن گئی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بدعات رَدّ کرنے کی ہی چیز ہے۔

رد بدعات اور اتباعِ سنّت...... مسلمان تو اتباعِ سنّت کے لئے آیا ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اس نمونے پر میں عمل کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ صلوا نماز پڑھ لیا کرو، یہ فرمایا صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ (1) ''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو''۔ اس طریق پر نماز ہوگی مقبول ہے، نہیں ہوگی نامقبول ہے۔ حج کرو جس طرح مجھے کرتے ہوئے دیکھو۔ خود ساختہ طریق پر کرو گے، وہ حج نہیں ہوگا، غرض ہم تو پیروی سنّت کے لئے آئے ہیں۔ قرآن سے علم لیا، حدیث سے عمل لیا، فقہ سے اس کی تشریح لی۔ بس اس پر عمل کرو۔ اس کے جو خلاف ہے ظاہر بات ہے کہ وہ عمل کے قابل نہیں۔ جو ان کے خلاف کہے گا وہ اسے بدنام کریں گے، اس لئے کہ وہ ان کی رسوم کے خلاف پڑتا ہے۔ اور لوگ رسموں کے عادی ہو گئے۔ دین کی حقیقت قلوب میں نہیں۔ یہ ساری بنیاد ہے۔ ورنہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نزاع کیا ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے تم بھی۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ تمہارے ہاں بھی، طریقت تمہارے ہاں بھی۔ یہ ساری چیزیں مشترک ہیں۔ آخر نزاع کیا ہے۔؟۔ عرس و میلا، یہ نزاعی مسئلے ہیں؟ فروعی چیزیں ہیں۔ ان میں جو خرافات آئی

(1) الصحيح للبخاري، كتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا كانو جماعة، ج: ١، ص: ٢٢٦.

ہیں وہ جاہلوں کے راستے سے آئی ہیں۔ جو واقعی چیزیں ہیں اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کرو۔

اِتباعِ آباء...... اب مثلاً جنازے کی نماز ہے۔ تو اس میں سنّت طریق یہ ہے کہ نماز پڑھ لی۔ اور میت کو لے جا کر دفن کرو۔ اب اس کے بعد مستقل ایک دعاء مانگی جاتی ہے حالاں کہ وہ نماز بھی تو دعاء ہے، اس نماز میں یہ تو نہیں ہے کہ اس میں رکوع وسجدہ ہو، وہ تو شفاعت وسفارش اور دعاء ہے۔ اب اس کے بعد پھر دعاء اور بعض نے قبروں پر اذانیں دینی شروع کر دیں۔ سنّت سے کہیں اس کا ثبوت نہیں۔ اب اگر کہو تو کہتے ہیں کہ یہ دین تو ہم نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے۔ تو کفارِ مکّہ جو کہا کرتے تھے ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا﴾ ① باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا ہے۔ تو قرآن کریم نے جواب دیا۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآءُ هُمْ لَايَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَايَهْتَدُوْنَ﴾ ② ''کہ تمہارے باپ دادا چاہے نہ علم رکھتے ہوں اور نہ راستے پر ہوں پھر بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ یہ تو تعصّب ہے''۔ حق پسندی تو یہ ہے کہ حکمِ رسول آ جائے تو اسے مانو۔ اور اتباعِ سنّت کو غالب رکھو۔

غلبۂ آدابِ شریعت...... ہم نے ان دیوبندی بزرگوں میں یہ دیکھا جو صاحبِ حال بھی تھے، دلوں میں سوز بھی تھا، مگر شریعت کا ادب غالب ہے۔ اس سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ کوئی سنّت ترک ہو جائے۔ خواہ جان پہ بن جائے۔ مگر سنّت ترک نہ ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو انگریز کے خلاف ہونے والے جہاد میں امیر جہاد تھے۔ گورنمنٹ عدل وانصاف کی تھی نہیں۔ ذرا ذرا سے حیلوں پر علماء کو پھانسیاں دی جارہی تھیں۔ اور حضرت کھلے بندوں پھرتے، چھتّے کی مسجد میں گئے، مخبر نے خبر دی کہ اس وقت چھتّے کی مسجد میں موجود ہیں تو پولیس نے آ کر مسجد کو گھیر لیا۔ ایک سارجنٹ اندر آیا۔ آ کر حضرتؒ سے پوچھتا ہے کہ مولوی محمد قاسم کہاں ہوں گے؟

دو قدم پیچھے ہٹ کر حضرت نے فرمایا ''ابھی تو یہیں تھے۔ دیکھ لیجئے یہیں ہوں گے''۔ وہ دیکھتے رہے اور آپ شاہ رکن الدین کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں پولیس نے گھیرا ڈالا تو وہاں سے نکل کر شاہ ولایت کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بس یوں ہی چکر دیتے رہے۔ ان کے سالے شیخ نہال احمد صاحب مرحوم جو گاؤں گیاؤں کے مالک تھے۔ دیوبند سے کوئی آٹھ دس میل پہ جو چکوالی گاؤں ہے، وہ ان کا تھا۔ انہوں نے منت خوشامد کی۔ کہ ٹھیک ہے تم یہاں تو رکتے نہیں۔ میں تمہیں لے جا کے گاؤں میں رکھوں گا، ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔

چناں چہ مخبر نے پھر خبر دی کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ چکوالی میں ہیں۔ تو پولیس نے آ کر سارے گاؤں کا گھیرا ڈال لیا۔ اب وہ یورپین افسر تھا۔ وہ اندر آیا، حضرت نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ فرمایا۔ آیئے، تشریف لایئے۔ فرمایا، چائے بنواؤ۔ چناں چہ ان کے لئے چائے بنی اس نے کہا آپ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے واقف ہیں حضرت نے فرمایا۔ جی ہاں خوب واقف ہوں۔ اس نے کہا کیسے آدمی ہیں؟ فرمایا نیک آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ اس نے کہا میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ فرمایا شوق سے لیجئے۔ تو جس کی تلاش تھی وہی تو تلاشی

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۰.

دلا رہے تھے۔ایک ایک کمرہ دیکھا، پتہ نہیں چلا۔خیر وہ شکریہ ادا کر کے واپس ہوا۔ باہر جا کے اس نے کارڈ نکال کر حلیہ دیکھا تو اس نے کہا کہیں یہی تو نہیں تھے؟ واپس ہوا تو حضرتؒ نانوتہ جا چکے تھے، وہ نانوتہ گیا۔تو حضرت دیوبند آ چکے تھے، آخر کار عزیزوں نے مل کر مجبور کیا کہ چند دن روپوش ہو کر گھر میں رہیں۔تو حضرتؒ کی سسرال دیوبند میں تھی، دیوان کا محلہ ہے۔ بہت بڑا محل ہے۔وہ بڑے رئیس لوگ تھے، انہوں نے مجبور کر کے ٹھہرایا۔

تین دن بعد پھر گھر سے نکل آئے۔لوگوں نے کہا کہ حالات مخدوش ہیں۔فرمایا تین دن سے زیادہ چھپنا خلاف سنّت ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو ہجرت کے لئے تشریف لے گئے ہیں تو تین دن غارِ ثور میں چھپے ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ اس کا اتباع بھی نصیب ہو گیا، تو انہیں جان کی پرواہ نہیں تھی، اتباعِ سنّت غالب تھا۔ میں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ سبق پڑھا رہے تھے، جتنی دیر طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے، اتنی دیر ذکر کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی ہے۔یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون ذکر کر رہا ہے۔وہ خود حضرتؒ ذکر کرتے تھے۔جب وہ عبارت پڑھ چکا۔تقریر کی، مطلب بیان کیا، اس نے اگلا صفحہ پڑھا، پھر ذکر میں مشغول ہو گئے۔

اور اس میں کیفیت یہ تھی کہ رقتِ قلب سے آنسو آئے تو اس کو اس طرح پیتے تھے کہ دوسروں پر نہ کھلے کہ آنسو آئے ہیں۔ بالکل ضبط کرتے تھے۔آدابِ شریعت اتنا غالب تھا کہ وہ اپنے حال وقال کو آگے نہیں رکھتے تھے۔بلکہ شریعت کو حضرت حضرت امام رکھتے تھے۔یہی طریقہ ہم لوگوں کا ہے کہ حال بھی پیدا کرو، سوز وگداز بھی پیدا کرو۔ ذکر اللہ بھی پیدا کرو، قلب میں رقّت بھی ہو، مگر ادب شریعت کا غالب رہے۔اب کوئی اگر بالکل ہی مغلوب الحال ہو جائے تو مستثنیٰ ہے۔وہ معذور ہے، اس پر کوئی گرفت نہیں۔لیکن جہاں تک ارادے اور حواس کا تعلق ہے تو حال کو مغلوب کرو، اور شریعت کو اس پر غالب کرو۔

اَبُو الْحَالِ اور اِبْنُ الْحَالِ......اس لئے ان حضرات کے ہاں دو لقب ہیں۔ایک ابو الحال اور ایک ابن الحال، ابو الحال تو وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور سنّت کو غالب کر کے رکھے، یہی ان کا طریقہ تھا، اور ابن الحال وہ ہے جو حالات سے مغلوب ہو جائے، غرض ان کے ہاں بیعت وارشاد بھی تھی، حَالَ وَقَالَ بھی تھے ساری چیزیں تھیں مگر اتباعِ سنّت کا غلبہ تھا۔دین کی عظمت، دین کا ادب یہ ہر چیز سے مقدّم تھا۔

اور ہم تو مختصر لفظوں میں یہ کہا کرتے ہیں۔کہ ایک ہے قانونِ عام جو سب کے لئے عام ہے، وہ قانون شریعت ہے، ہر کس وناکس کے لئے پیغام ہے۔اور ایک طریقت ہے، وہ شخصی احوال کا نام ہے۔اور ایک شخص کا حال دوسرے پر حجّت نہیں ہوتا، اس واسطے وہ نظیر میں نہیں پیش کیا جائے گا کہ فلاں ایسے ہے، تم بھی ایسے کرو، ہر ایک کا حال الگ الگ ہے، جو سب کے لئے یکساں ہے وہ قانون شرعی ہے۔تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ کوئی بہت بلند پہنچ گیا، کوئی نیچے رہ گیا، نیچے والا یہ چاہے کہ میں کود پھلانگ کر اس تک پہنچ جاؤں، فطرت کے خلاف ہے۔کوشش کرنی چاہئے۔اللہ پہنچا دے، پہنچ جائے۔

بس یہ فرق ہے، ورنہ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا اختلاف ہے؟ ایک طوفان برپا ہے اور تکفیر جاری ہے، فلاں کافر، فلاں کافر، لوگوں نے اپنی خصوصیات کا نام اسلام رکھ لیا ہے۔ حالاں کہ اسلام بہت بلند و بالا چیز ہے۔

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ مصر سے حج بیت اللہ شریف کے لیے حجاز پہنچے، روضۂ مبارک پر حاضری کے لئے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینۂ منورہ کے قیام کے ایام میں جامعہ مدینۂ منورہ کے سربراہوں نے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء (مولانا منت اللہ صاحب رحمانی وغیرہ) کو جامعہ میں تشریف آوری کی دعوت دی۔ جامعہ کے ایک خاص اجتماع میں حضرت موصوف نے یہ تحریر پیش کی جس میں دارالعلوم دیوبند کے ضروری تعارف کے ساتھ جامعہ مدینہ منورہ کا خیر مقدم فرمایا گیا ہے۔ ادارہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا."

اَمَّا بَعْدُ!

نعمت کبریٰ...... یہ ساعت بڑی ہی مبارک ہے کہ میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا قلب جذباتِ تشکر و احسان سے معمور ہے۔ کیوں کہ آپ حضرات نے اپنی مخلصانہ دعوت کے ذریعہ مجھے اس عظیم الشان دینی ادارے میں شرفِ حاضری بخشا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میری مسرت و شادمانی دوگنا ہوگئی ہے۔ کیوں کہ میں ایک عظیم اسلامی علوم کے مرکز سے چل کر قابلِ قدر دینی مرکز میں پہنچ گیا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی مچھلی پانی سے نکال کر دوبارہ پانی میں ڈال دی جائے تو اسے محض سرور و نشاط ہی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جسم میں ایک نئی روح کارفرما ہو جاتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی قسم کی تازگی اور نشاطِ روحانی محسوس کر رہا ہوں۔ جو فی الحقیقت ایک نعمتِ کبریٰ (بڑی نعمت) ہے جس کے لئے میں بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتا ہوں۔

مبارک احساس...... میں برِ اعظم ایشیا کے ایک ممتاز اور زبردست اسلامی ادارے سے حاضر ہوا ہوں، جس کی تاسیس پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔

۱۲۴۸ھ میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر تسلط جمایا اور مغربی تہذیب کا طوفان ہندوستان کی ہر سمت

میں پھیلنے لگا، تو اس وقت علماءِ امّت نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا جو اس تہذیب کے نتیجہ میں امّتِ مسلمہ کو گھیر چکا تھا۔ چناں چہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مغربی تہذیب کے اس خوفناک طوفان سے بچانے اور دین سے آشنا کرنے اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا احساس کیا۔ جو اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کے ذریعے صالح اور غیرت مند علماء کی ایسی جماعتیں تیار کرتا رہے۔ جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر میدان میں مغربی تہذیب اور مذہب دشمن تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو کر (ڈٹ کر) امّتِ مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس دور کے خدا رسیدہ بزرگ اور عالم فاضل، شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کتاب وسنّت کے زبردست عالم اور امامِ وقت تھے۔ جو دارالعلوم میں سب سے پہلے مُحدّث ہوئے اور انہی کی سند پر دارالعلوم میں سلسلۂ روایت ودرایت حدیث جاری ہوا۔

اس وقت آپ کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین تھے، جن کے بعد اس مسند پر ہندوستان کی معروف شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ متمکن ہوئے۔ جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے ذریعے دارالعلوم میں درسِ حدیث نے نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا، اور آپ ہی نے اس دینی ادارہ کو علومِ ربّانیہ کی تعلیم کے ذریعہ استحکام عطاء فرمایا اور کتاب وسنّت کی تعلیم سے اس کے در و دیوار کو منور کیا۔

دارالعلوم کا امتیاز...... اس دارالعلوم کا طرۂ امتیاز (امتیازی شان) یہ ہے کہ اس کے تمام شیوخ واساتذہ مدرسین وطلبہ، کتاب وسنّت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور کتاب وسنّت ہی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وہ ایسے احکام وامور کی تاویلات نہیں کرتے جو مخالفِ کتاب وسنّت ہوں۔ اسی بناء پر اہلِ بدعت ہمیشہ اس ادارے اور اس کے شیوخ کے خلاف معاندانہ محاذ بنائے رہے۔ لیکن ان کی اس مخاصمانہ روش کے باوجود اس ادارے کے شیوخ وعلماء نے کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے علوم کی ترویج واشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت (نظر انداز) نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کتاب وسنّت کی اشاعت اور امر بالمعروف اور نہی عنِ المنکر کو اپنا شعار اور وظیفۂ حیات بنائے رکھا جس پر آج پورا برِّ اعظم ایشیا شاہد (گواہ) ہے۔

دارالعلوم کا تعارف...... اِس وقت اس ادارے میں مختلف ممالک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ جو ہندوستان، افغانستان، پاکستان، انڈونیشیا، برما، جنوبی افریقہ، روس، ترکستان اور چین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، زیرِ تعلیم ہیں۔

اس ادارے میں بنیادی علوم جن کی تعلیم دی جاتی ہے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علومِ عقلیہ ونقلیہ (قدیم وجدید) کی تعلیم دی جاتی ہے، ساٹھ مدرسین تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں جو سب اسی ادارے کے فیض یافتہ ہیں۔

دار العلوم کا انتظام و انصرام ۲۲ شعبوں پر منقسم ہے جن میں اہم شعبہ جات یہ ہیں: تعلیم، محاسبی اوقاف، مطبخ، صفائی، بجلی، تعمیرات، نشر و اشاعت اور کتب خانہ۔ اس کے علاوہ دار العلوم میں فضلاءِ قدیم کا بھی ایک شعبہ ہے جو ان کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور مختلف امور میں ان کی معاونت و راہنمائی کرتا ہے۔

دار العلوم اپنے حسنِ کارکردگی اور عظیم الشان علمی و دینی خدمات کی بدولت ایشیاء میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے حتیٰ کہ اسے ''ازہر الہند'' کہا جانے لگا۔ پوری ایک صدی میں اس دار العلوم سے بیس ہزار سے زائد علماء پیدا ہو چکے ہیں جن میں مفسّر بھی ہوئے ہیں اور محدث بھی مفتی و فقیہ بھی ہوئے اور واعظ و مرشد بھی۔ جنہوں نے ہند و بیرونِ ہند میں ہر جگہ کتاب و سنّت کے چراغ روشن کئے اور لاکھوں انسانوں نے ان کے ذریعے اپنی رشد و ہدایت کا سامان فراہم کیا۔

حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ...... میں اس عظیم دینی ادارے کے ایک خادم کی حیثیت سے آپ کی جامعہ اسلامیہ میں حاضر ہو کر سرور و انبساط کی ایسی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ جس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے نہ قلم سے۔ کیوں کہ الفاظ خواہ کتنے ہی معنی خیز و پر شوکت کیوں نہ ہوں، وہ صحیح جذبات اور مسرت آفریں احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کا مدینۂ منورہ میں قیام ایک ایسا مبارک اقدام ہے جس کی خبر تمام علمی حلقوں بالخصوص حلقہءِ دار العلوم میں انتہائی فرحت و مسرت کے ساتھ سنی گئی۔ کیوں کہ اس مبارک سرزمین میں صدیوں کے بعد ایسے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا۔

بلاشبہ حکومت سعودیہ نے جہاں حجّاج کی راحت و آرام کے لئے تمام ضروری سہولتیں مہیا کیں اور حج کی تمام راہیں آسان بنائیں اور سعودی مملکت کو اقتصادی اور تعمیری، ہر اعتبار سے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا، اسی کے ساتھ تاسیسِ (قیام و بنیاد) جامعہ اسلامیہ بھی اس کا قابلِ قدر اور تاریخی کارنامہ ہے۔

حقیقتاً مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جو ان زریں کارناموں کی انجام دہی کے لئے مناسب ہوسکتا ہے اور یہی خطۂ ارض وراثتِ نبوی کی اشاعت کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہیں سے علومِ نبوت کے چشمے پھوٹے اور یہیں وہ علوم پروان چڑھے اور اسی سرزمین سے خلافتِ راشدہ کی شعاعیں نکلیں۔ اسی لئے مسلمانانِ عالم کے لئے یہ مبارک شہر ہمیشہ پرکشش رہا اور اسی کے خزانہائے علومِ شریعت سے وہ مالا مال ہوتے رہے۔ جس طرح مکہ کے پہاڑوں سے نداءِ ابراہیمی کی گونج چہار دانگِ عالم (اطراف عالم) میں پھیلی، تو مسلمانوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے اور ان کے قافلے اس نداء پر لبیک کہتے ہوئے سرزمینِ پاک کی طرف ہر چہار سمت سے رواں دواں نظر آنے لگے۔ اسی طرح جب مدینۂ منوّرہ کی وادیوں سے علومِ نبوت اور تعلیماتِ الٰہی کی صدائیں بلند ہوں گی تو کون ہے جو اس طرف رواں دواں نظر نہ آئے گا اور اس صدائے علم پر لبیک نہ کہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے قیام کا ہندوستان کے تمام علمی اور دینی اداروں میں دلی خیر مقدم کیا گیا ہے۔
اسی بناء پر انہوں نے اپنے فرزندانِ علم کو اس جامعہ میں بھیج کر اپنے لئے سعادت محسوس کی اور بلاشبہ ان فرزندانِ علم کا جامعہ کے سرچشمہ ہائے علم سے فیض یاب ہونا، ان کے لئے مرتبۂ سعادت وخوش نصیبی کا باعث ہوگا۔
مستحکم رابطہ..... حضرات! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارسِ دینیہ، بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی تعلق دیرپا اور مستحکم ہوسکتا ہے تو وہ صرف علمی تعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں، اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہو، جو دونوں اداروں کے درمیان طلبہ اور اساتذہ کے تبادلے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔
اخیر میں میں آپ حضرات کے جذبۂ اخوت اور اخلاقِ کریمانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتری اور راست روی کی توفیق عطاء فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مؤتمرِ اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ کا بصیرت افروز مقالہ

ذیل میں ہم وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے مؤتمر اسلامی قاہرہ میں پیش فرمایا۔ اصل مقالہ عربی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ اس مقالہ میں حضرت حکیم السلام رحمتہ اللہ علیہ نے ان دینی اور فقہی مسائل پر ابتدائی بحث فرمائی ہے، جن پر علماءِ اسلام کو متحدہ غور وفکر کے بعد اپنا ایک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مقالہ ہندو پاکستان کے علماءِ اسلام کو بھی زمانۂ حال کے مسائل کی طرف متوجہ کرے گا اور یہ حضرات زمانۂ حال کی ان طبعی ضرورتوں پر شرعی رہنمائی فراہم کرسکیں گے۔ (ادارہ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!

جامعۂ ازہر کی خوش نصیبی...... بزرگانِ محترم! الحمدللہ: آج ہم علماءِ کرام کے ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو صدرِ جمہوریہ عربیہ، السید جمال عبدالناصر کے عہد میں جامعہ ازہر میں ادارۂ بحوثِ اسلامیہ کی دعوت پر مختلف ممالک سے بعض اہم عصری مسائل پر غور وخوض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ عظیم الشان اجتماع جو درحقیقت زبردست اسلامی یکتائی کا نمونہ پیش کر رہا ہے، ایسے وقت میں جبکہ دشمنانِ اسلام، ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن سعی کر رہے ہیں۔ جامعہ ازہر کی خوش نصیبی اور عظیم کامیابی ہے جو اسے السید جمال عبدالناصر کے عہد میں حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ہم بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے دشمنان اسلام کی تمام مساعی کو ناکام بنا کر ہم خادمانِ دین کو جسمانی وروحانی یکتائی کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے باہمی ملاقات کا یہ زرّیں موقع عنایت فرمایا۔

مصر، اسلام کا نشانِ قوت...... بزرگانِ محترم! سرزمین مصر جہاں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہو رہا ہے محض سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے، بلکہ اسے زبردست دینی اہمیت بھی حاصل ہے جس کے باعث

مسلمانانِ عالم کا آپس میں ہمیشہ ایک قلبی رابطہ رہا ہے اور مصر کی اس دینی اہمیت کا اندازہ حدیثِ نبوی سے بھی کیا جاسکتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اسلام نے حجازِ مقدس کو دین کا مرکز، ملک شام کو اسلام کا نشانِ عظمت اور ملکِ مصر کو اسلام کا نشانِ قوت قرار دیا''۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کو عبادت کا مرکز بنایا اور شام کو اسلامی شان وشوکت کا مظہر اور مصر کو افواجِ اسلامیہ کا مستقر (چھاؤنی) اور حلقہ بگوشانِ اسلام کی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

حجاز۔ مقدس مرکزِ عبادت...... چوں کہ حرم مکہ مرکزِ عبادت تھا اس لئے اسے بلدِ مامون بنایا گیا تا کہ اس میں عبادت کرنے والے پورے سکون واطمینان کے ساتھ مصروفِ عبادت رہیں اور کسی قسم کا نزاع وفساد اور قتل وقتال اس کی فضاءِ عبادت کو مکدر نہ بنائے۔ اس لئے اس بلدِ مامون (پرامن شہر) میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:۔

''بے شک مجھ سے پہلے اس (حرم) میں کسی کو قتال کی اجازت نہیں ملی صرف میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت میں قتال کی اجازت دی گئی تھی سو وہ اب بھی بدستورِ سابق خدا کا حرم ہی ہے۔ نہ اس کے درخت کاٹے جائیں اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے''۔ (اَوْ کَمَاقَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) ①

شام...... عظمتِ اسلامی کا مظہر...... اور شام چوں کہ عظمتِ اسلامی کا مظہر تھا اس لئے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ''اے شام تو میری شمشیرِ غضب اور میرا درۂ عذاب ہے، تو ہی منتشر کرنے والا اور تو ہی یکجا کرنے والا ہے''۔ ② اور شام ہی کے بارے میں دوسری حدیث ہے: ''میری امت میں ایک جماعت ایسی ہوگی جو دمشق، نواحِ دمشق اور بیتُ المقدس کے دروازوں پر برابر قتال کرتی رہے گی، اسے کسی کی رسوا کن کوششیں رسوا نہ کرسکے گی''۔ ③

دوسری روایت میں ہے: ''کسی کی مخالفت اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی، وہ دشمنانِ خدا سے برابر قتال کرتی رہے گی ایک لڑائی ختم ہوگی تو دوسری شروع ہو جائے گی''۔ ④ معلوم ہوا کہ ملکِ شام کفار کے لئے غداب کا کوڑا اور عتاب (غصہ) کی تلوار بنا رہے گا جب تک کہ اہل شام اس کی امتیازی خصوصیت کو ختم نہ کریں۔

استحکامِ مصر عالمِ عرب کے امن کا ضامن ہے...... اور مصر چوں کہ فوجی مرکز ہے اس لئے اس کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''جب خدا تم کو مصر پر فتح عطا فرمائے تو تم اس میں زیادہ سے زیادہ فوج بنانا کیوں کہ وہ فوج روئے زمین کی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب الاذخر والحشیش فی القبر ج:۵، ص:۲۳۱.

② کنز العمال، ج:۱۲، ص:۲۸۰، رقم۳۵۰۴۳. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد باب ماجاء فی فضل الشام ج:۴ ص:۳۴۹. ③ کنز العمال، ج:۱۲، ص:۲۸۳، رقم:۳۵۰۵۰. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الشام ج:۴ ص:۳۵۰.

④ سنن ابن ماجہ ،باب اتباع سنۃ رسول اللہ ﷺ ،ج:۱، ص:۱۲.

تمام افواج سے بہتر ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لئے کہ وہ اوران کی ازواج قیامت تک حفظ وامان میں رہیں گے"۔ ①

معلوم ہوا کہ امن کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عظمت وشوکت قائم نہ ہواور یہ عظمت و شوکت فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خطۂ عرب کا امن وامان مصر کے استحکام اوراس کی فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں اور وہی تنہا ملک ہے جو حجاز وشام کا دفاع کرسکتا ہے۔ اس لئے ان تینوں ملکوں حجاز، شام اور مصر کا اتحاد ہی فی الحقیقت اسلام اور مسلمانانِ عالم کی طاقت وقوت کا نشان بن سکتا ہے۔

اس بارے میں صدر متحدۂ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر جو مخلصانہ سعی کرر ہے ہیں وہ یقیناً لائقِ استحسان اور قابلِ ستائش ہیں اور سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور لائقِ آفرین بات یہ ہے کہ وہ جہاں عربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماءِ اسلام کوایک نقطہ پرجمع کرنے اور موجودہ دور کے مسائلِ دینیہ کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں جوقدم اٹھایا ہے، وہ یقیناً باعث مسرت اور لائق امتنان ہے۔

جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ...... بزرگانِ محترم! مؤتمر کے اجتماعات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے مسئلہ اجتہاد اور مسئلہ تلفیق اور بعض علمی وعملی ہیں، جن پران کے اصحابِ نگارش یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے مسائل ومباحث جوزمانۂ ماضی میں تنقیح وتحقیق کی مختلف راہوں سے گزر چکے ہیں، وہ اپنی علمی اور تحقیقی اہمیت کے باوجود موجودہ ضروریات کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جوروز بروز دنیا کی مادی ترقیات کے باعث نت نئی شکلوں میں ہمارے سامنے آرہے ہیں اور جن کا حل کرنا ہمارے لیے اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح آج سے پہلے ہر دور میں علماء ومفکرین امت نے اپنے عمومی مسائل کو حل کیا اور جس طرح کہ فقہاءِ امت نے اپنے اپنے ملکوں میں پیش آمدہ واقعات (پیش آنے والے واقعات) کے تحت اپنے فتاویٰ اور فقہی مسائل کے ذریعے امتِ مسلمہ کی رہنمائی کی۔ بلاشبہ آج ضرورت ہے کہ ایسے فقہی اصول کلیہ پرغور وخوص کیا جائے جن کے ذریعے کتاب وسنّت کی روشنی میں امتِ مسلمہ کو پیش آمدہ نئے مسائل کا حل کرنا آسان ہواور اصول وقواعد جن دلائل کے ذریعہ مرتب کئے جائیں وہ بھی قرآن وحدیث سے مستفاد ہوں۔ تاکہ امتِ مسلمہ کے سامنے اسلامی شریعت کی راہ آسان ہوجائے اور کسی کے لئے عملی میدان میں عذر کرنے کی گنجائش باقی نہ رہےاور ساتھ ہی خداتعالیٰ کی یہ حجت "قرآنِ کریم جو ہر چیز کے لئے ایک واضح بیان ہے" بندوں کے لئے پوری ہوجائے۔

---

① کنزل العمال، ج: ۱۴، ص: ۱۶۸، رقم: ۳۸۲۶۲. علامہ متقی الھندی فرماتے ہیں: ابن عبدالحکم فی فتوح مصر، کر وفیہ ابن لھیعة عن الاسود بن مالک الحمیری عن بحر بن داخر المعافری، ولم ار لہ الترجمة الاان ابن حبان ذکر فی الثقات انہ یروی عن بحربن داخر ووثق بحراً.

منصب نبوت کا بیان کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں سے وہ احکام بیان فرمادیں جو ان کے لئے نازل کیے گئے ہیں''۔ ①

نیز بارگاہِ خداوندی میں مقبول بندوں کی اتباع کے سلسلے میں ارشاد فرمایا: ''آپ ان لوگوں کے راستے پر چلیں جنہوں نے میری طرف رجوع کیا''۔ ② اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے لوگوں پر اہل علم اور اہل فتویٰ کی اتباع لازم قرار دی۔ پس ان تین بنیادی امور کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اس میدان میں قدم اٹھائیں اور چوں کہ ہمارے تیار کردہ حل اور مرتَّب کردہ اصول وقواعد کی بنیاد یہی تین ماخذ ہوں گے اس لئے لامحالہ ہر شخص ان پر عمل کرنے کا پابند ہوگا اور اس بحث کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے؟ اسی طرح اجتہادِ کلی اور اجتہادِ جزئی کی بحث بھی بند ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ مسائل ومشکلاتِ حیات کو شریعت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر منطبق کرنے کے سعی کی جانی چاہئے۔

اسلامی تہذیب وثقافت اپنانے کی ضرورت...... بزرگانِ محترم! ہمارے اسلاف کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی ملک یا شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں کی تہذیب وتمدن، ادب، معاشرت اور زبان وعلم پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ خود غالب ہوئے اور دوسروں کو مغلوب بنایا۔ اس طرح انہوں نے دین کی روح اور اسلام کے جوہر کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا، بلکہ ہر اس چیز کا استیصال کر ڈالا جو روحِ اسلام کے منافی نظر آئی۔ چنانچہ اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ واقعہ شاہد ہے کہ جب انہیں دریائے نیل میں ایک نوجوان لڑکی کو بھینٹ چڑھانے کی جاہلانہ رسم کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے متاثر ہوئے بغیر اس بھینٹ کے جاہلانہ اور بے بنیاد عقیدے کا استیصال کر کے اسلام کے صحیح عقیدے کا تحفظ فرمایا (کہ کسی دریا کا جاری ہونا یا نہ ہونا محض خدا کے ہاتھ میں ہے، لڑکی کی بھینٹ کو دریا کی روانی کا مدار بنانا غیر اسلامی اور جاہلانہ عقیدہ ہے)۔

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گرا تو انہوں نے فوراً اٹھالیا، اس پر ان کے فارسی غلام نے اسے معیوب سمجھتے ہوئے کہا کہ: ہمارے یہاں یہ بات معیوب اور نامناسب ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: کیا میں اپنے حبیب کی سنّت ان احمقوں کی خاطر ترک کردوں؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر کبھی بھی دوسروں کی معاشرت اور طور طریق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنی قوتِ علم سے دوسروں کی معاشرت پر اپنی معاشرت کو غالب کیا۔ اس لئے اگر ہم اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ ثقافت وتہذیب کو دل سے اپنالیں اور دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے لگیں تو لوگ ہماری تقلید و اتباع پر مجبور ہوں گے اور اگر بالفرض ہم مذکورہ تمام اوصاف پر عمل کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور

---

① ② پارہ: ٦، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ٤٨.

ہونا چاہئے کہ غیروں کی تہذیب وثقافت سے صرف وہی اصول اپنائیں جو تعلیمات اسلام اس کی روح اور مزاج کے خلاف نہ ہوں اوران کے ساتھ ہمارا تعامل انہی حدود میں ہو جو مخالفِ اسلام نہ ہوں نہ یہ کہ ہم ہر میدان اور ہر معاملہ میں انہی کے دوش بدوش اورانہی کے قدم بہ قدم چلتے رہیں۔

مقصد اجتہاد......اوراپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل تلاش کرنے کا (غیر صحیح) اجتہاد کریں کہ جس کا مقصد اپنے افعال پر قواعد واصولِ دین کو منطبق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا اجتہاد محض خدمتِ دین ہو نہ کہ دنیا کو دین سے منطبق ثابت کرنے کی کوشش۔ جو شخص اپنا دین تباہ کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتا ہے دین اس کے پاس نہیں رہتا اور نہ اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔

بزرگانِ محترم! اس میں شک نہیں کہ دین کا دامن نہ تنگ ہے اور نہ اس میں دنیا سے بالکلیہ لاتعلق بنانے والی رہبانیت ہے۔ لیکن علمی اور عملی زندگی میں اس کی کچھ خصوصیات ہیں جن کا مقتضیٰ (غرض) ہے کہ وہ ہمیشہ ہر میدان میں واضح اور نمایاں رہیں۔ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فی الحقیقت ایسے تمام آداب واصول اور تعلیمات جامع ہے کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لئے عہدِ نبوت میں بعض مشرکین نے کہا: ''کیا تمہارا نبی تم کو ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کی بھی؟''۔ ①

اس طرح انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے واضح نہ کردیا ہو اور ایسے اصول عطا فرمائے کہ جن کی روشنی میں تمام معاملات کے حسن وقبح (بدصورتی) کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ادارۂ بحوثِ اسلامیہ نے حقیقتاً علماء اسلام کو عصری مسائل پر غور وخوض کرنے کی دعوت دے کر ایک عظیم الشان دینی وملّی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے ہم اس ادارہ اور جامعہ ازہر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے شکر گزار ہیں۔اس سلسلہ میں چند اہم تجاویز ادارے کے سامنے پیش کرتا ہوں، جو امید ہے کہ ادارے کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں گی۔

تجاویز...... **1** ضرورت ہے کہ ایسے مسائل کو مرتّب کیا جائے جو ہماری سوسائٹی اور معاشرے کا ایک جزو بن چکے ہیں اوران کے بغیر زندگی گزارنا آج کے دور میں مشکل نظر آتا ہے، جیسے بینکوں کا سود، انشورنس اور بیمہ کے مسائل، مال کی درآمد و برآمد وغیرہ کے مسائل۔ یہ سب مسائل واقعاتی شکل ورنگ میں مرتّب کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے فرضی احتمالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

2 اس قسم کے سوالات مختلف ممالک کی نمائندگی کرنے والے علماء میں تقسیم کئے جانے چاہئیں۔تا کہ وہ ان پر کتاب وسنّت کی روشنی میں غور وخوض کرنے کے بعد جوابات اور تحقیقی مقالات پیش کریں، پھر جب تمام علماء کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ مقالات وجوابات مرتب ہو جائیں تو مجمع البحوث

① الصحیح لمسلم ، کتاب الطهارة، باب الاستطابه، ج:٢، ص:٧٦.

الاسلامیہ ان علماء کے دستخطوں سے تمام ممالک میں امتِ مسلمہ کے افادہ کے لئے ان جوابات ومقالات کو شائع کرے۔ اس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک متفقہ اور قابلِ قبول حل سامنے آسکے گا۔

3 ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت مادی وسائلِ حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلّط جما کر انہیں ایک نقطہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں اور تمام لوگ وحدتِ نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کریں کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلا امتیاز رنگ ونسل زمان ومکان کی حدود سے بالاتر ہو کر مساویانہ برتاؤ کرتا رہے۔ وہ جس طرح جمود وتقشّف (غربی) سے دور ہے، ایسے ہی تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

اسلام کے تین مرکزی نقاط...... حضرات! اسلام کے تین مرکزی نقاط ہیں۔ اول: قرآنِ کریم جو کتاب آسمانی ہے اور دوئم: جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور سوئم: خانہ کعبہ جو قبلہ عبادت اور امتِ مسلمہ کا ذریعہ وحدتِ نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① ''سب جہانوں کے لئے ذریعۂ نصیحت''۔ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''سب مخلوقات کے لئے باعث رحمت''، ﴿لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ ③ ''سب مخلوقات کو انجام سے ڈرانے والا''، اور خانۂ کعبہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ④ ''سب جہانوں کے لئے ذریعۂ ہدایت''

اسی طرح گویا اسلام نے ایک عالمی بلکہ عالمین امت کو ان تین بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد اسے تمام انسانوں کے لئے ظاہر کیا اور اسی لئے اس وقت کے اجماع کو (دین میں) حجت قرار دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی''۔

پس جبکہ اس امت کی بنیاد ان مہتم بالشان امور پر ہے جو ہر قسم کے مادی، وطنی، قومی اور رنگ ونسل کے امتیازات سے بلند وبالا ہیں تو ضرورت ہے کہ عام لوگوں میں ان کی دعوت وتبلیغ کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

امید ہے کہ اس ضرورت کے لئے مجمع البحوثِ الاسلامیہ اپنا دائرہ کار وسیع تر کرے گا اور اس کام کے لئے مختلف ممالک میں عیسائی مبلغوں اور مشنریوں کی طرح وہ بھی اپنے دعوتی اور تبلیغی مشن اور وفود روانہ کرتا رہے گا۔

توقع ہے کہ ہر ملک کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ان تبلیغی وفود کا خیر مقدم کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اس دعوت و تبلیغ میں مخلصانہ تعاون بھی کریں گے اور اس دعوت وتبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۹۰. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷.

③ پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۱. ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

اسلامی تعلیمات اور اسلامی رسم و رواج، مغربی تہذیب سے مس کئے بغیر رچ بس جائیں گے۔

ارشادِ خداوندی ہے: ''تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں بہترین نمونہ زندگی ہے'' ①

اسلام کا اجتماعی دفاع...... حضرات! ہماری دلی تمنا اور دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ کی سرگرمیاں اسلام کے دفاع اور اس کے تحفظ میں تیز ہوں اور مستشرقین اور وہ دشمنانِ اسلام کے اعتراضات و جوابات کے لئے سرگرمِ عمل ہوں، نیز ہماری دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ اور ان حضرات مندوبین کے درمیان ایک دائمی اور مستحکم رابطہ قائم رہے اور اسلام پر مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے شبہات و اعتراضات ان تمام حضرات کے پاس بھی روانہ کئے جائیں تا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جوابات تحریر کر کے ادارے کو روانہ کریں اور وہ ان کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس طرح اسلام کا یہ دفاع یقیناً اجتماعی اور مضبوط ترین ہوگا۔

مناسب ہوگا کہ اگر تمام مندوبین حضرات میں سے بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی جائے جو اس قسم کے مسائل پر غور و خوض کرنے کی مکلّف ہو اور پھر اس کمیٹی کی وساطت سے وہ سوالات ادارہ کو بھیجے جائیں تو اسلام کا یہ ایک شاندار عالمی نظام ہو جائے گا۔

ادائے فرض...... بہرحال ہمیں توقع ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ ایسے مسائل کا ایک عمومی ادارہ ہوگا اور ان شاء اللہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے موضوع پر مفید تالیفات مختلف زبانوں میں شائع کرے گا۔

یہ چند خیالات مختصر الفاظ میں ذمہ دارانِ ادارہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد میں سب سے پہلے صدر متحدۂ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد رئیسِ اجتماعاتِ مؤتمر اور جناب ڈاکٹر محمود حسب اللہ صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمر کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

① پارۃ: ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہند کے دلی جذبات کا اظہار

حضرت حکیم الاسلام نوّر اللہ مرقدہٗ کی ایک تحریر

ذیل کی تجویز وتحریر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے غزہ (مصر) میں پیش فرمائی جس میں فلسطین کی ناجائز تقسیم اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار اور اسرائیل کے جارحانہ حملوں کے سلسلہ میں مصر اور دوسری اسلامی ریاستوں سے مسلمانانِ ہند کی دلی ہمدردی اور اپنے سرگرم تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔ وحدتِ اسلامی کا تقاضا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ ان کے جسم چاہے کروڑوں، اربوں سے متجاوز ہوں مگر روح ایک ہی ہو۔ امید ہے کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی یہ تحریر و حدت اور اخوتِ اسلامی کی دعوت کو بھی زندہ کر سکے گی۔

(ادارہ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

بزرگانِ محترم...... مسلمانانِ عالم بالخصوص ممالکِ اسلامیہ کے لئے وہ حادثہ بڑا ہی المناک تھا، جب کہ حکومت برطانیہ نے یہود کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے فلسطین کے حصّے بخرے کر دیئے اور یہود کے لیے یہودی وطن کا خواب پورا کر دیا۔ برطانیہ کی اس حرکت کے خلاف ہر ملک کے مسلمانوں نے صداءِ احتجاج بلند کی۔

حتیٰ کہ ان ممالک کے مسلمانوں نے بھی جو برطانیہ کے زیرِ تسلط تھے۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں اور برطانیہ کی ناگواریوں کے باوجود احتجاجی ریزولیشن پاس کئے۔ چنانچہ اسی ذیل میں بمبئی میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔

میں نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ مسلمان تقسیم فلسطین کو کسی صورت بھی منظور نہیں کر سکتے۔ نہ دینی حیثیت سے، نہ جغرافیائی اور نہ تاریخی اعتبار سے بھی۔ اب یہ بات اسی طرح درست ثابت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ تاریخ نے دوسری بار اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ ایک طاقت اور ایک ملّت ہیں کہ جس کی وحدت کو وطن

اور انسان کا اختلاف ختم نہیں کر سکتا۔ اس لئے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ مسئلہ فلسطین صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ پر جو سہ طاقتی جارحانہ حملہ ہوا، وہ درحقیقت دشمنانِ اسلام کے مخفی ارادوں کا انکشاف اور ''کفر ملتِ واحدہ ہے'' کا اظہار تھا۔

اس حملہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ عرب ممالک پر دوبارہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ وہ عربی اور اسلامی ممالک کو نوآبادیات بنانے کی اور اسرائیل کے لئے راستے صاف کرنے کی ایک نئی سامراجی چال تھی۔

لیکن خداوندی نصرت و تائید نے السید جمال عبدالناصر کو اس سہ طاقتی حملہ کے مقابلہ میں بے مثال اور عظیم الشان کامیابی عطاء فرمائی اور دشمنانِ اسلام کو ایسی رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

اس حادثہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے امتِ مسلمہ عربیہ کو اس کی غفلت سے چونکا دیا اور اس نے بخوبی سمجھ لیا کہ فلسطین اور ایسے ہی دیگر اسلامی معاملات کا دفاع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سب مسلمان اس سلسلہ میں متحدہ و متفق نہ ہوں۔

میں ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے مہتمم کی حیثیت سے اور میرے رفقاء مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا منت اللہ رحمانی امیرِ شریعت صوبۂ بہار، ہم تینوں مسلمانانِ ہند کی جانب سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب مسئلہ فلسطین کی جدوجہد میں اخلاقی، مادی اور روحانی ہر قسم کی ممکنہ معاونت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

عمید دارالعلوم دیوبند (نزیل فلسطین غزہ)

عالمی مؤتمرِ اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصبِ اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زورِ صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آ جائیں اور ان کے قبول وعدمِ قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔

ازحضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

احوال واقعی...... حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۶ مارچ ۱۹۶۴ء کو سفرِ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے حجازِ مقدس ہوتے ہوئے بعد فراغت حج ۱۹ مئی ۱۹۶۴ء کو ورود فرمائے دیوبند ہوئے۔ اسٹیشن دیوبند پر بسلسلۂ استقبال طلبہ، اساتذہ کارکنان دفاتر اور اہلِ شہر کا ہجوم تھا۔ طلبہ خوشی کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ملاقات، مصافحہ اور دعاء کے لئے خاص نظم قائم کیا گیا تھا جو حضرات اساتذہ کی نگرانی میں عمل آیا۔ طلبائے دارالعلوم کی درخواست پر ایک عظیم الشان جلسہ میں، جو دارالحدیث میں منعقد ہوا تھا اور حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، حضرت ممدوح نے خطاب فرمانا منظور کر لیا۔

جلسہ کی صدارت حضرت مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دارالعلوم نے فرمائی۔ ابتداء میں طلباء اور بعض اہل شہر کی طرف سے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں۔ جن میں شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری کی نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا مجمع پر کافی اثر پڑا۔ آخر میں حضرت ممدوح نے نعروں کی گونج میں ایک بلیغ اور جامع تقریر شروع فرمائی جو تقریباً دو اڑھائی گھنٹہ جاری رہی، آپ نے اس شاندار خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفرِ مصر وحجاز کے تاثرات اور عالمی مؤتمرِ اسلامی قاہرہ اور اجتماعِ مدینہ یونیورسٹی کے احوال وکوائف پر روشنی ڈالی۔

مؤتمر کے اغراض ومقاصد...... آپ نے فرمایا کہ: قاہرہ کی اس عالمی مؤتمر کے اغراض ومقاصد کی کوئی تفصیل

اس دعوت نامہ میں نہ تھی، اجمالی طور پر دعوت کا مقصد جدید تمدُّن سے پیدا شدہ مسائل کی شرعی تنقیح وتحقیق اور اس سلسلہ سے علماءِ عالمِ اسلامی کا ربط باہمی ظاہر کیا گیا۔ جس سے اتحاد بین المسلمین کا جذبہ مفہوم ہوتا تھا، نیز مصر کے مرکزی شہروں کی سیر۔ البتہ مؤتمر کے اجلاس اور رفتارِ عمل سے جو اغراض ومقاصد ہمارا ذہن اخذ کرسکا، ان کا خلاصہ یہ تھا:

1 ...... نئے تمدن اور جدید اکتشافات سے پیداشدہ مسائل کے بارے میں اصولی طور پر جامعۂ ازہر کا موقف علماء کے سامنے رکھ کر ان کی فکر سے اس میں استفادہ۔

2 ...... بلادِ مختلفہ کے علماء اور دینی حلقوں میں بین الاقوامی رابطہ کے ساتھ ساتھ مؤتمر سے ان کی علمی وابستگی ہوتا کہ وہ پورے عالمِ اسلام کے عوامی اتحاد کا ذریعہ ثابت ہو۔

3 ...... جامعۂ ازہر کی نئی تعمیر کا سنگ بنیاد اور اس کی ہزار سالہ خدمت وعظمت کا تعارف

4 ...... حکومتِ مصر کے بعض اہم دینی اقدامات کا اعلان وتبشیر۔

5 ...... فلسطین کی ناجائز تقسیم کی مذمّت اور مغصوبہ فلسطین کی عربوں کے حق میں بازیابی کے لئے ایک عالمی تجویز کی منظوری۔

6 ...... مصر کی جدید ترقیات اور مصری قوم کے شعور بیداری کا مطالعہ۔

7 ...... ان مقاصد کے ساتھ مؤتمر کا اجلاس مبنی محافظۃ القاہرہ کے فلک بوس قصر میں شروع ہوا۔ جس میں ۳۸ ملکوں کے ستر نمائندہ علماء نے شرکت کی، مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ مجموعی طور پر سوا سو علمی نمائندے شریک جلسہ ہوئے۔ ہندو پاکستان کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیوبند تھے، اجلاس کی کارروائی نہایت منضبط اور باقاعدہ تھی۔ پہلے ہی دن آرٹ پیپر کا ایک خوش نما کتابچہ برنامج (پروگرام) کے نام سے طبع شدہ، مندوبین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ جس میں پہلے دن سے لے کر آخری دن کا نظامِ عمل بقیدِ گھنٹہ ومنٹ پیش کردیا گیا تھا، اس کے مطابق کانفرنس چلی اور چلتی رہی۔ ہر روز کی کارروائی اور خواندہ مقالات ومباحث طبع ہو کر اگلے روز مندوبین کے سامنے آجاتے تھے جس سے رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

مؤتمر کے زیرِ بحث مسائل ...... پہلے نمبر کے تحت مؤتمر میں جن مسائل کو بذیلِ برنامج اہمیت دی گئی اور ان پر حضراتِ خطباء نے خطاب کیا وہ یہ تھے:

1 ...... اسلام میں مالیات کا نظامِ تقسیم۔

2 ...... عرب اور اسلام کے عالم گیر نفوذ کے طبعی اسباب۔

3 ...... اسلام میں اراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔

4 ...... اغنیاء کے مال میں غریبوں کے حصہ کی نوعیت۔

5 ...... اسلام میں حسبت (احتساب) یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا نظام

6 ......اسلام میں اجتہاد کا ماضی وحال۔

7 ......اسلام میں دولتی علاقے۔

تقریباً ان سب ہی عنوانوں پر مقالے پڑھے گئے اور زبانی خطابات بھی ہوئے۔

مسلۂ اجتہاد...... لیکن نئے حوادث ومسائل وغور وفکر کے سلسلے میں چھٹے نمبر (مسئلۂ اجتہاد) پر زیادہ زور دیا گیا جو باوجود چھٹا نمبر ہونے کے، پہلے ہی دن کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی بحث میں کانفرنس کی پوری مدت کا دوتہائی حصہ صرف ہوا۔ فکر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اس وقت تک وقت کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوسکیں گے۔ کیوں کہ آج کی صورتِ حال جدید اکتشافات کی وجہ سے بالکل نئی ہے۔ پچھلا نقشِ قدم اس کا تصفیہ نہیں کرسکتا۔

اس موضوع پر اجتہاد کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے بطورِ تحریک الاستاذ علی عبدالرحمٰن ازہری وزیرِ سوڈان نے ایک پر مغز اور طویل مقالے سے اس کی ابتداء کی اور اس کے بعد اجتہاد، تقلید اور تلفیق سے متعلق مقالے اور مناقشات سامنے آنے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنا وقت لیا کہ کانفرنس کا زیادہ تر وقت اسی مسئلہ میں لگ گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کانفرنس کا بنیادی موضوع یہی ایک مسئلہ ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ناظمِ جامعہ اسلامیہ کراچی فاضل دارالعلوم ورئیسِ وفدِ پاکستان کا جوابی مقالہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو نہایت پر مغز اور محققانہ تھا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: دسویں دن (۱۲ مارچ ۶۴ء) کو ان کا نام پکارا گیا اور مقالہ پڑھنے کی خواہش کی گئی۔ یہ مقالہ تقریباً بیس منٹ میں پڑھا گیا۔ یہی وہ بیان تھا جو مؤتمر میں آپ نے ذمہ دارانہ طریقے پر بطور نمائندۂ دارالعلوم دیا اور مصری اخبارات نے اس کے اقتباسات ''خطاب رئیس الوفد الہندی'' کے عنوان سے شائع کئے۔

آپ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں، میں نے امکانی حد تک تمام پیش شدہ مسائل کے بارے میں اجمالی اور اصولی طور پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ اس وقت مقالہ سنانے کا موقع نہیں ہے، وہ اپنے موقع پر شائع ہو جائے گا۔ مگر میں اس میں پیش شدہ امور آپ کے سامنے عرض کئے دیتا ہوں، گو اختلافِ لغت والفاظ سے عنوان اور اسلوبِ بیان کچھ مختلف ہو جائیگا اور اجمال وتفصیل کا بھی فرق پڑ جانا ممکن ہے، لیکن روح مقالہ کی قائم رہے گی۔

مجتہد فیہ مسائل کا حل قوّتِ فکر وعمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے...... آپ نے اس مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد وتقلید کی بحث میرے خیال میں موضوع سے متعلق نہیں ہے، گو اس سلسلہ میں خواندہ مقالات نہایت قیمتی اور پر از معلومات ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کہ اس وقت یہ بحث اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیوں کہ

اجتہاد کا دروازہ بند ہو یا کھلا ہوا ہو۔ اور کھلے ہونے کی صورت میں یہ باب مفتوحِ اجتہادِ مطلق کا ہو یا اجتہاد خاص کا ،ضرورت اس بات کی ہے کہ آج جو مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں اور انہیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے ان کے ضمن میں ہر وہ شخص جو کوئی اجتہادی قوت رکھتا ہے، اسے عملاً پیش کرے تا کہ ارباب فکر ونظر اس قوت کو پرکھ کر کوئی فیصلہ دے سکیں۔ کیوں کہ اجتہاد مُطلق ہو یا اجتہاد فی المذہب، ہر ایک کی شرائط کتبِ فن میں محفوظ ہیں جو اجتہاد کی صحت وسقم کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر کوئی اجتہاد فی الواقع اپنی ساری شرائط کے ساتھ کسی شخص کے پاس موجود ہے اور وہ مسائل کے ضمن میں سامنے آ جائے جو مسائل کے اجتہادی حل میں اصول وتفقُّہ کے مطابق ہوگا تو کون جانتے بوجھتے اس سے انکار کر سکے گا اور اگر شرائط ہی نہ پائی گئیں تو کون اس کے اعتراف وتسلیم پر مجبور کیا جا سکے گا؟

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا پورا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تا کہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آ جائیں اور ان کے قبول وعدمِ قبول کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کیے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے مسائل کے تنقیحی سوالات، واقعاتی سلسلوں سے مرتب کر کے کافی مدت پہلے سے مندوبین کے پاس بھیج دیئے جاتے یا اب بھیج دیئے جائیں۔ اگر مسائل کا مجوزہ تصفیہ پیش نظر ہے تا کہ متعلقہ مواد فراہم کر کے ہر شخص علیٰ وجہِ البصیرت بحث وتنقیح میں حصہ لے سکے اور مؤتمر کے بنیادی فیصلہ تک پہنچ جائے۔

ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل پیش کیا جاتا رہا...... حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے خطاب کا یہ حصہ بھی پیش کیا جو مؤتمر میں پڑھا گیا۔ نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے نئے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور نئے نظریات وافکار نئے واقعات واحوال کی وجہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہر دور میں مفکر علماء اور مبصر مفتی اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصولِ فقہ اور منضبط مسالکِ فقہیہ کی روشنی میں ان کے فیصلے دیتے رہے اور امّت انہیں قبول کرتی رہی ہے۔ چناں چہ ہر دور کے فتاویٰ کا ذخیرہ اس کا شاہد عدل ہے، آج بھی نئے حوادث ومسائل کی تنقیح وافتاء میں علماء امّت نے کوتاہی نہیں کی۔ ''حوادث الفتاوی'' اور ''آلات جدیدہ'' کے شرعی احکام کے نام سے مستقل کتابیں بھی منضبط کر کے شائع کر دیں۔ جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں، نیز جزئی مسائل پر الگ الگ مقالات و رسائل بھی مرتب کر کے شائع کیے جو امّت کے زیرِ عمل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

فکر وعمل کی یکسانی وحدتِ امّت کا موجب ہے...... البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی، کہ اب ایسے احکام کی اشاعت اور تنقیح مزید عالمی پیمانے پر ہو اور یہ اشاعت وتنقیح بجائے مقامی ہونے کے بین الاقوامی انداز میں سامنے لائی جائے۔ کیوں کہ وسائل نقل وحمل کی آسانیوں کی وجہ سے پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کی مانند

ہوگئی ہے۔اس لئے آج کی ایک پورے ملک کی جماعتی بات بھی پوری دنیا کی نسبت سے شخصی اور انفرادی ہی بات کہلائی جارہی ہے اور جب تک وہ بین الاقوامی نہ ہو جائے جماعتی نہیں بنتی۔اس لئے موزوں ہوگا کہ ان جدید فتاویٰ کا مؤقف خواہ وہ کسی بھی ملک کے ہوں، پورے عالمِ اسلام کے سامنے آجائے اور عالمی فکر ونظر سے یہ احکام عالمی انداز سے امّت کے سامنے پیش ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر اور کون انجام دے سکتا ہے۔وہی اپنے عالمگیر اثرات سے ملک کے جدید فتاویٰ، مقالات اور کتب کے ذخیرے فراہم کر کے، بذریعہ تراجم، اعضاءِ مؤتمر کے سامنے رکھ سکتی ہے۔تاکہ فکر میں عالمیت اور یکسانی پیدا ہو کر امّت کے عمل میں بھی یکسانی کی جھلک آجائے جو وحدت امّت کے لئے ایک مؤثر ترین وسیلہ کا کام دے سکتی ہے اور یہی وہ عالم اسلامی کا مضبوط اتحاد ہوگا جو پائیدار بنیادوں پر قائم ہو کر پائیدار ثابت ہو سکے گا۔

انسانیت کو عالمی دین کی تلاش...... آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے مقالہ میں یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ہی جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ نفس اسلام سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔جبکہ آج کی کائنات پسند دنیا ایک فطری اور جامع دین و دنیا مذہب کی تلاش میں خود بھی سرگرداں اور متلاشی ہے اور جبکہ وسائلِ نقل وحمل کی وسعت وسہولت کی وجہ سے پوری دنیا ایک خاندان کی مانند ہوگئی ہے جس کے تمام تمدّنی امور میں یکسانی آتی جارہی ہے، ملکوں کی مقامی خصوصیات مٹتی جارہی ہیں اور اشتراک کی ایک وسیع فضا پیدا ہو رہی ہے جس سے دنیا کا پلیٹ فارم بھی ایک ہوتا جارہا ہے اور جذبات کی رو اس طرف آرہی ہے کہ تمدّن وتہذیب سب کا ایک ہو، معاشرت ایک انداز کی ہو، حتیٰ کہ سیاست بھی سب کی ایک رنگ کی ہو اور ایک ہی پلیٹ فارم سے چلے اور آگے بڑھے۔چنانچہ عملاً ایسا ہوتا جارہا ہے اور پوری دنیا ایک ہی عالمگیر تمدن اور ہمہ گیر معاشرت اختیار کرتی جارہی ہے۔

اس اشتراکِ فکر کی وجہ سے طبعًا دنیا کے جذبات ادھر بھی آرہے ہیں کہ مذہب اور دین بھی سب کا ایک ہو، دینی پلیٹ فارم بھی سب کا ایک ہو اور اسے کوئی ایسا عالمگیر دین ہاتھ آجائے جس میں نہ وطنی حد بندیاں ہوں، نہ قومی نسلی اور وطنی تحدیدیں ہوں اور نہ لونی (رنگ کی) تخصیصات۔بلکہ وہ نفسِ انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا نام لے کر پوری ہی دنیا کو آواز دیتا ہو۔ظاہر ہے کہ ایسا مذہب اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس نے یہی عالمگیر نعرۂ اخوّت ومساوات لگایا اور دنیا کو دین میں پیوست کر دیا ہے اِس لئے دنیا دوسرے لفظوں میں اسلام کو پکار رہی ہے اور اس کی خواہاں ہے۔اس صورت میں ہمارا فرض ہے اصل اسلام کو ان عالمگیر وسائل سے پورے عالم کا دین بنانے کی ہمت لے کر اٹھیں۔

ظاہر ہے کہ اس اہم ترین مقصد کے لئے جس قوت اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ مجمع البحوث کے پاس موجود ہیں اور غیرِ موجود کو با آسانی فراہم بھی کر سکتی ہے، جس کے لئے سارا عالمِ اسلام اس کے ساتھ تعاون کرنا

اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔

اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالۂ شبہات......آپ نے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:
اس سلسلہ میں جیسے اس مثبت پہلو پر کام کرنا ضروری ہے ایسے ہی منفی انداز میں یہ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام سے بے خبر یا باخبر معاندین خواہ وہ مستشرقینِ یورپ ہوں یا مستغربینِ ایشیا، جو شکوک وشبہات یا اعتراضات اسلام کے بارے میں پھیلا کر قلوب کو تشویش وتذبذب اور منافرت کا شکار بناتے رہتے ہیں ان کو بھی عالمی پیمانہ پر ہی دفع کیا جائے۔ جبکہ وہ شکوک کی رو بھی عالمی انداز میں بہا رہے ہیں۔ بلاشبہ علماءِ ازہر نے اس سلسلہ میں شاندار اور وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن وہ لسان کی اجنبیت کی وجہ سے سب کے سامنے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خدمت بھی بین الاقوامی ہی رنگ سے ہو جس میں پورے عالمِ اسلامی کے علماء کے فکریات شامل ہوں اور جس طرح مختلف ممالک کے مسیحی مبشرین ان شکوک کو عالمگیر انداز میں پھیلا رہے، ہیں اسی طرح مختلف بلاد کے علماء کی طرف سے ان کے جوابات بھی عالمگیر ہی انداز میں سامنے آئیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت پورے عالم میں اسلام اور مسیحیت کی یہ نظریاتی اور فکری جنگ ہے، اس لئے اس کا مقابلہ بھی برابر ہی کے ہتھیاروں سے ہونا چاہئے جب ہی وہ مؤثر اور کارآمد ثابت ہوگا۔ اس لئے مجمع البحوث کے برنامج میں یہ نمبر بھی مقصدی حیثیت سے شامل رہنا چاہئے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے فکر واجتہاد کا دائرہ صرف فقہیات وجزئیاتِ مسائل تک محدود نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ پوری دنیا کو سامنے رکھ کر پورے اسلام کی تعلیمات کی توسیع واشاعت کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

دائرۂ اجتہاد میں اتباعِ اسلاف......حضرتِ ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اور مقالے کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ: ہم میں اجتہاد کی کچھ نہ کچھ قوتیں ہماری بساط کے مطابق آج بھی موجود ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا، اس لئے موجودہ اجتہاد کو استعمال کر کے اضافہ کا منتظر رہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہمیں اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہئے کہ ہم آج کے مغربی تمدن اور اس کی مصنوعی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کرلیں اور پھر قرآن وحدیث سے ان کے مؤیدات تلاش کر کے ان کو حدودِ جواز میں لانے کی فکر کریں۔ جو آج ایک عالمگیر وباء کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ کتاب وسنّت کا اتباع نہیں۔ بلکہ کتاب وسنّت سے اپنا اتباع کرانا ہے جو علاوہ بے ادبی کے، ایک مہلک اور خطرناک حرکت بھی ہے۔

ہمارے لئے اس فکر ونظر یا طریقِ استنباط میں جہاں اصول وقواعدِ فن کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی کے ساتھ ان کے ترکہ سے پہنچا ہوا وہی ذوق تھامے رہنا بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا اور بطورِ توریث (وراثت) ہم تک پہنچایا۔ ورنہ اس کے بغیر دین کا وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو

"وَیُزَکِّیْھِمْ" کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بخشا۔ اس لئے طبعاً ہم اجتہاد کے دائرہ میں رہ کر بھی اتباع سلف کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے۔ تا آنکہ ایک ایک سنّت اور ایک ایک اسوۂ سلف ہمارے جہد واجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہئے۔ اس پر حضرت ممدوح نے مقالہ کی چند مثالیں بھی نقل فرمائیں جو مقالہ میں آپ پڑھ سکیں گے۔

عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت ...... تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بلادِ مختلفہ کے علماء کے جمع ہونے سے قدرتی طور پر ربط واتحاد کا ایک مظاہرہ ہوا جو خوش آئند تھا اور ساتھ ہی مؤتمر کے مقاصد میں بھی داخل تھا۔ آپ نے اتحادِ عالمِ اسلامی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے زیادہ تر عرب اتحاد اور اس میں بھی خصوصیت سے مصر، شام اور حجاز کے اتحاد پر اہمیت کے ساتھ زور دیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے شرعی اشارات سے مصر وشام اور حجاز کی خصوصیات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم ان تین مرکزی ملکوں کو محض سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ دینی اور مذہبی حیثیت سے اہم اور مقدس جانتے ہیں۔ شریعت نے حجاز کو مرکزِ عبادت بتایا ہے شام کو مرکز شوکت کہا ہے اور مصر کو مرکزِ عسکریت فرمایا ہے۔ حجاز مرکزِ امن اس لئے رکھا گیا کہ عبادت بغیر امن کے نہیں ہوسکتی، شام کو مرکز جنگ ودفاع اس لئے رکھا گیا کہ شوکت بغیر مدافعت وہجوم کے قائم نہیں ہوسکتی اور مصر کو مرکزِ عسکریت اس لئے رکھا گیا کہ مشرق میں مغرب کے سیاسی اقدامات کی روک تھام بغیر عسکری قوت کے نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہ تین ملک تین اقسام کی مخصوص مرکزیتوں کے حامل ثابت ہوئے۔ اس صورت میں ان کے باہمی ربط کی صورتِ حال خود بخود کھل جاتی ہے اور وہ یہ کہ امن عبادت کے لئے شوکت ضروری ہے اور شوکت کی بقاء کے لئے عسکریت ضروری ہے۔ تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حجاز کا تحفظ بلادِ شام کی شوکت کے بغیر ممکن نہیں اور شام کی شوکت کی برقراری مصر کی عسکری قوت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے جب تک مصر کی فوجی طاقت مضبوط نہ ہو اور شام وحجاز سے ان کا اتحاد نہ ہو، نہ شام وحجاز کا تحفّظ ہوسکتا، نہ خود مصر کا۔

اور جب کہ یہ تمام نقاط خود احادیث میں دکھائے گئے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نقاطِ بحث محض سیاسی یا جغرافیائی نہیں بلکہ دینی ہیں۔ اس لئے ہم مصر وشام اور حجاز کا باہمی اتحاد دینی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اندریں صورت اگر آپ عالمِ اسلام کا اتحاد چاہتے ہیں تو اس کے لئے عرب اتحاد پہلا زینہ ہے اور عرب اتحاد کا پہلا قدم مصر وشام اور حجاز کا اتحاد ہے، آج جبکہ صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ السید جمال عبدالناصر نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگایا ہے اور بالفاظ دیگر اسلامی اتحاد کا پرداز ڈالا ہے تو ہمیں ان کے اس نعرے کی قدر کرنی چاہئے اور اس کے لئے یہ مؤتمر بلا شبہ ایک مبارک قدم ہے۔

مصر کی صنعتی ترقی ...... آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: مؤتمر کے ان جلسوں کے دوران ہی دو تین دن کے بعد مصر کے مختلف مرکزی شہروں کے سفر کا پروگرام رکھا گیا تھا موٹر کاروں سے اور کہیں ہوائی جہاز کے ذریعے۔

سب سے پہلا سفر "اَلْمَحَلَّةُ الْکُبْریٰ" کا ہوا جو مصر کا صنعتی مرکز ہے اور اس میں پارچہ بافی اور قالین بافی

وغیرہ کی مل اور فیکٹریاں ہیں۔ دوسرا سفر "طنطا" کا ہوا جو مصر کا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، تیسرا سفر نہر سوئیز اور فلسطین کا ہوا جو مصر کی فوجی قوت کا مرکز ہے۔ اس سفر میں اولاً عریش آیا جو نہر سوئیز کے کنارے ایک پر فضا شہر ہے اور اس سے ایک میل آگے بڑھ کر نہر سوئیز ہے جس کے کناروں پر چلتی پھرتی گودیوں کا انتظام ہے۔ نہر سوئیز مصر کی ایک عالمگیر شوکت کا قدرتی نشان ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اس سمندری نہر سے یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے جہاز گزرتے ہیں جن کا کسٹم لیا جاتا ہے اور تلاشی لینے کے بعد ڈیوٹی بھی وصول کی جاتی ہے۔

نہر سوئیز سے گزر کر صحرائے سینا آیا جس سے گزرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے گزرنے کا تصور بندھا رہا اور اس مقدس وادی کی برکات سے قلب و روح متاثر ہوتے رہے۔ اس کے بعد غزہ آیا جو فلسطین کا آخری سرحدی شہر اور فوجی حیثیت سے ایک اہم مقام ہے۔ یہی شہر امام شافعی رحمۃ اللہ کا مولد و منشاء (جوان ہونے کی جگہ) بھی ہے۔ چنانچہ ہمیں وہ بلڈنگ دکھلائی گئی جو آج حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکانِ ولادت پر بنی کھڑی ہے۔

غزہ میں فلسطینی عربوں نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ شب میں ہم وہاں پہنچے تو غزہ کے ایک پر تکلف اور وسیع ہوٹل میں طعام و قیام کا انتظام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک مختصر سا استقبالیہ جلسہ اسی ہوٹل میں ہوا۔ صبح کو ہم نے کئی لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی جھونپڑیاں دیکھیں جن میں فلسطین کے تباہ حال عرب عسرت و تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر فلسطینی عربوں کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ان عالمی علماء کو "مرحبا" کہا گیا، خیر مقدمی نعرے لگائے گئے، تقریریں ہوئیں اور آخر میں تقسیم فلسطین کے خلاف ایک عالمی تجویز پاس ہوئی۔

واپسی پر مؤتمر کے دو تین اجلاسوں کے بعد پھر ہوائی جہاز سے اسوان کا سفر ہوا، جہاں دریائے نیل پر بند باندھا جا رہا ہے اور جدید اسوان شہر کی تعمیر کی جا رہی ہے، جس سے مصر کی ٹیکنیکل ترقی کا پروگرام سامنے آیا اور ہم نے دیکھا کہ پندرہ بیس میل کی حدود میں لوہے اور سیمنٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے وسیع پیمانے پر تعمیر ہو رہے ہیں۔

اس سفر سے واپسی کے بعد "مُدِیْرِیَۃُ التَّحْرِیْرِ" کا سفر ہوا جو مصر کی زراعتی ترقیات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں فوجی دستہ نے مہمانوں کو خیر مقدمی سلامی دی، بچوں نے فوجی کرتب دکھلائے اور ورزشی کھیلوں کا مظاہرہ کیا، مہمانوں کو عطر کی شیشیاں پیش کیں اور یہ اجتماع چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ شام تک وہاں سے واپسی ہوئی اور صبح سے پھر بدستور مؤتمر کے اجلاس جاری رہے۔

دار القرآن کا سنگِ بنیاد...... اعضاءِ مؤتمر کے اس مبارک اجتماع کے موقع پر قاہرہ میں دو اہم اور عظیم الشان عوامی جلسے بھی منعقد کیے گئے، ایک دار القرآن کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے جو جامعہ ازہر سے متعلق ہے اور اسے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے، تاکہ قرآنِ کریم کی تعلیم ذیلی اور ضمنی نہ رہے بلکہ ایک مستقل نصب العین کی حیثیت

سے سامنے آئے۔ اس جلسہ کی صدارت نائب صدر جمہوریہ السید حسین شافعی نے فرمائی۔ تلاوت، اور تاسیس کے بعد اس جلسہ میں تمام مہمانوں کو مصر کے مطبوعہ قرآن شریف بطورِ ہدیہ پیش کیے گئے۔

مدینۃ الازہر...... دوسرا عظیم الشان جلسہ جامعہ ازہر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے مدینۃ النصر میں منعقد ہوا جس کا پنڈال غیر معمولی طور پر وسیع اور پرشوکت بنایا گیا تھا اور اس میں تقریباً بیس سے پچیس ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ یہ پنڈال جھنڈیوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر مندوب علماء کی کرسیاں تھیں۔ اسٹیج کے نیچے ایک طرف مصری زعماء و علماء بٹھلائے گئے تھے اور دوسری جانب سفراءِ دول (ممالک کے سفیروں) کی نشستیں تھیں، صدارت کے لئے اعلان صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ السید جمال عبدالناصر کا تھا لیکن وہ بعض ہنگامی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے، تو ان کے امر سے سید حسین شافعی نائب صدر جمہوریہ نے ان کی نیابت کی اور جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کے لئے سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ ایک پورا شہر مدینۃ الازہر کے نام سے تعمیر کیا جارہا ہے۔ جس میں جامعہ ازہر کے تمام کالج، مدارس، دارالاقامے اور دفاتر یکجا ہوں گے جو اب منتشر ہیں اور جامعہ ازہر نے سولہ کروڑ روپیہ کا تخمینہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔

ہزار سالہ علمی عظمت...... اس اجتماع میں اجمالاً جامعہ ازہر کی ہزار سالہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی جس کا سب نے اعتراف کیا کہ اس ہزار سالہ جامعہ نے بلاشبہ بڑے بڑے ائمۂ علوم وفنون پیدا کیے۔

ظاہر ہے کہ جب اس کے فضلاء اور فارغین میں جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے ائمۂ علم وہدایت ہوں تو اس کی زرّین خدمات سے کون انکار کرسکتا تھا۔

صدر ناصر خدمات اور کردار...... اسی دوران ملک میں الیکشن کا ہنگامہ بھی برپا ہوا۔ نئی پارلیمنٹ چنی گئی اور اس میں السید جمال عبدالناصر صدر مملکت چنے گئے۔

نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس نئے صدرِ منتخب (السید جمال عبدالناصر) کی صدارت میں ہوا جس میں صدر مملکت نے تقریباً تین گھنٹے تقریر کی اور اس میں مصر کے جدید دور کی ﴿جو شاہیت کے خاتمہ کے بعد کا ہے﴾ ترقیات کا مفصل تذکرہ کیا اور قوم نے بے پناہ محبت اور تالیوں کی گونج میں صدر کا خطاب سنا اور اس سے متاثر ہوئی۔

مصری قوم اپنے موجودہ صدر سے کافی محبت رکھتی ہے۔ اولاً صدر کی خدمات کی وجہ سے، جن میں سے عظیم ترین خدمت اتحادِ ثلاثی (اسرائیل، برطانیہ، فرانس) کے حملہ سے مصر کو بچانا اور اندرونی طور پر مصر کو مہلک قسم کی سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نجات دلانا، نیز پوری قوم کو یکسانی کے ساتھ ہر ممکنہ ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور مصر کو صنعتی، زراعی اور علمی ترقیات کے راستہ پر ڈال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے صدر کے ذاتی کردار کی پختگی اور سادگی کا مصر والوں پر خاص اثر ہے کہ جمال عبدالناصر نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے آج تک کوئی سرکاری عمارت استعمال نہیں کی اور جاہ وجلال کی رسمی نمائش سے الگ تھلگ رہے بلکہ ابھی تک وہ اپنے ہی قدیم ذاتی مکان میں رہائش رکھتے ہیں۔ جو شہر میں اور مکانوں کے ساتھ ایک عام

مکان کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی اولاد اور بچوں کے لئے اسکول وغیرہ جانے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح یہ بچے بھی سائیکلوں پر اسکول جاتے آتے ہیں۔ اسکولوں کا عام قانون ان پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح قوم کے دوسرے بچوں پر۔

صدرِ مملکت خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مساجد میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں نہ کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے اور نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے جہاں جگہ ملتی ہے آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

مصر کی عمومی مذہبی حالت...... اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عمومی طور پر نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں۔ قاہرہ، طنطا، اسکندریہ اور غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آئی، مساجد کے نقشے نہایت پُرشوکت اور تعمیریں معیاری ہیں، ساتھ ہی ان مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ ائمہ و موذنین حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں اور ہر وقت کی نماز میں نمازی جوق در جوق آتے ہیں اور مساجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد ائمہ مساجد آدھ پون گھنٹہ وعظ بھی کہتے ہیں۔

مصری قوم میں ملنساری اور محبّت کا مضمون کافی ہے، جب تک زبان وغیرہ کی اجنبیت رہتی ہے، بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ضمائر سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

اکرامِ ضَیف...... اکرامِ ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا مزاج ہی ہے۔ جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خُو طبیعتِ ثانیہ ہے۔ اعضاء مؤتمر کی مدارات وضیافت میں بھی مصر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وزراء، امراء اور انجمنوں کی طرف سے دعوتیں عموماً ہوٹلوں میں دی جاتی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں ہوٹلوں کا انتخاب اور ترتیب خاص سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ہر اگلے دن کا ہوٹل پچھلے ہوٹل سے زیادہ عظیم اور عالی شان ہوتا تھا، ہر پہلا ہوٹل دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ اس سے بہتر ہوٹل دوسرا نہ ہوگا۔ لیکن اگلے دن کا دوسرا ہوٹل نگاہوں میں پہلے کو گرد بنا دیتا تھا۔ شخصی طور پر بھی متعدد علماء وفضلاء کے لئے دعوتیں ہوئیں مگر سلیقہ مندی ہر حرکت سے محسوس ہوتی تھی۔ کاموں میں مستعدی اور ادائے فرائض میں چُستی نمایاں نظر آتی تھی۔ قوم کا علمی شعور عام طور پر بیدار ہے۔

مصر کا سرکاری مذہب...... سیاسی سوجھ بوجھ انفرادی حد تک نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی ہے، قومی الیکشن کے سلسلہ میں جن امور کی خاص طور پر مؤتمر کے اجلاس میں مندوبین کو بشارت دی گئی وہ یہ ہے کہ دستورِ مملکت میں مستقل دفعہ رکھدی گئی ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے، اور سرکاری زبان عربی ہوگی۔

اِشتراکیت کا پروپیگنڈہ...... یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کرلی گئی ہے اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لفظِ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں، ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کی بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں۔ جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا لیکن کمیونزم کا نہیں ہوگا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت وعمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے، کمیونزم نہیں کہلائی جاسکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کی ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کردیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصّہ جسے مصرِ جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے، وہ کم وبیش صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشنلائز کردیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہر حال شخصی املاک کی افراط کو جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بڑا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو، ختم کر کے حدودِ اعتدال میں لے آنا قابل ملامت نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابل ستائش کہا جاسکتا ہے۔ بہر حال مؤتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔

مصری قوم کی قرآنِ کریم سے والہانہ محبت...... یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآنِ کریم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوت قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ چناں چہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جاچکا تھا، قاری محمد خسری نے جو مصر کے مشہور مجود (تجوید کے ماہر قاری) ہیں یہ تلاوت شروع بھی کردی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں۔ جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور مُجَوِّد جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے۔ وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل، جامعہ شافعیہ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینت میں دوسرے ایک مشہور مجود اس عمل کے پابند ہیں۔ اسی طرح اور تمام جوامع کا یہی دستور ہے۔ سماعِ قرآن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے عربی ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتّٰی کہ ایک سپاہی جو سڑک کے چوراہے پر پہرہ دے رہا ہے اسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسسٹر نکال کر قرأت سننے میں مصروف ہوجاتا ہے۔

جامعہ ازہر میں ہر مدرّس کے انتخاب میں حافظِ قرآن ہونے کی شرط رکھی گئی ہے۔ دار القرآن کا سنگِ بنیاد ہی مستقلاً حفظ کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی ہے وہ دوسرے عربی ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

حفاظتِ قرآنِ کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری کارنامہ...... پھر نہ صرف تلاوتِ قرآن بلکہ حفاظتِ قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ یہود بے بہبود نے اپنی روایتی تلبیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے، ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلا دیا جس میں سے کئی سورتیں خارج کر دیں۔ کتنی ہی آیتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے تا کہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رو رک جائے اور جو مسلمان ہوں وہ غلط اور مخالفِ اسلام عقائد واعمال کے حامل داعی ہوں تا کہ اسلام کی تعلیمات کو سن کر تو میں ہنسیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اُسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآنِ کریم چھپوایا اور اس کے سرِ ورق پر یہود کی شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف یہی بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریابُرد کر کے یہ صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچا دیا۔ جس سے عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظت خداوندی کھل کر نمایاں ہو گئی۔

مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میرا یقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کو اس قرآنی شغف ہی نے تیرا رکھا ہے جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود تھمی ہوئی ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال مؤتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے، حکومت کی زبان لسان قرآن ہے، حکومت کا نصب العین اشاعتِ قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظتِ قرآن ہے۔ جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زائد مصر کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

مغربیت سے مرعوبیت...... مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کے لئے ان ساری مسرّتوں کے ہجوم میں کوفت اور سوہانِ روح کا سبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہو جانا ہے، جب تک ان کے ضمائر اور ما فی الضمیر کا اندازہ نہ ہو، ظاہر طور پر قاہرہ و پیرس اور لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔ جہاں مساجد نمازوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دے گا۔ نمازیں بھی پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر، آداب شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے۔

اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے۔ عورت مرد کا اختلاط عام ہے، جلسوں بازاروں اور دفتروں حتیٰ کے مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔

جامع ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا مستقلِ حلقہ تھا۔ جس میں وہ کھلے منہ شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظر عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ ملی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن گو بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے مگر اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے، اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے سے یہ یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔

تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جاتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں۔ اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جارہی ہے۔ کیوں کہ قدیم فقہ یقیناً بہت سی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کرتا ہے تو سعات میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے، اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا ہے۔ اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے حالاں کہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صاف بات مغربیت سے مرعوبیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔

ممکن الزّوال خرابیاں...... ان فکری اور عملی بے راہ رویوں کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔ یہ توسعات درحقیقت فکر کی آزادی سے چلتے ہیں:

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روادارد ۔۔۔ زنند لشکر یانش ہزار مرغ بہ سیخ

کا معاملہ سامنے آیا ہوا ہے، اس لئے جائزات کی تلاش بلکہ جائزات سازی کی کثرت ہے اور عوام کی حد تک کوئی ممنوع و مکروہ ناجائز کی حدود میں نظر نہیں آتا۔

گو اس میں امید کی کرن یہ ضرور نظر آتی ہے کہ اوپر کی ذکر کردہ خوبیاں اصلی ہیں اور یہ خرابیاں یورپ اور یورپیوں سے ہمہ وقتی قرب اور غلط ماحول کا نتیجہ اور اس کا رسوخ تنبیہ و اصلاح کی کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ سمجھانے پر قلوب متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور رفتار کے بدل جانے کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے مقالات وخطابات میں ان امور پر شائستہ انداز میں نکیر و ملامت کی۔ جس پر کسی بیزاری نظر نہیں آئی، بجائے ہمیں شرمساری محسوس ہوئی۔ اس لئے اصلاح اور مصلح کے لیے یقیناً گنجائشیں ہیں۔ مگر مصلح کی کامیابی صرف صحیح عمل کی نشاندہی سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ استدلالی قوت سے صحیح فکر کی نشاندہی نہ کی جائے اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کوئی علمی رنگ کا اقدام نہ کیا جائے اور وہ بھی مسلسل جب تک کچھ اہلِ دل خواص ان کے پیچھے نہ لگ لیں اور استدلال و

نظر کے ساتھ اپنے عمل وتقویٰ کا نمونہ ان کے سامنے نہ رکھتے رہیں، اصلاح وتعدیل مشکل ہے۔

بہر حال جیسے دنیا کی ہر قوم میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں، اسی طرح مصری قوم میں بھی کچھ خوبیاں ہیں جو کافی حد تک ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں مگر ممکن الزوال مؤتمر کے عالمی رابطہ کو اس میں استعمال کیا جائے۔

بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت...... حضرت محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بہر حال میں نے مصر پہنچ کر اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کر کے جو کچھ اندازہ لگایا، میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، اس غلبہ سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر ومغلوب ہو چکا ہے، کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ۔ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو ہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کے ساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو وہاں کی قدرتی آب وہوا کا نتیجہ ہے، دونوں کی مضبوطی نے انہیں استحکام اور قیادت کے راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ ﴿زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ کے مصداق ہو کر (اَحَقُّ بِالْمُلْکِ) کے حق دار بن گئے ہیں، اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا اثر ورسوخ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا چلا جائے گا اور بالخصوص مڈیسٹ کے ممالک کو ان کی اٹھائی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔

ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلا شبہ ان کے حسن تدبُّر کی قابلِ ستائش مثال ہے۔

حضرت ممدوح نے اس تقریر میں مصر کے احوال ومشاہدات پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس بارے میں چونکہ حضرت موصوف کے مشاہدات مصر وحجاز سے آئے ہوئے خطوط میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس لئے مشاہدات کے بجائے اس تحریر میں تأثرات اور مقالات کو جمع کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جن میں بنیادی چیز آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے مؤتمر میں پڑھ کر سنایا۔

اس تقریر میں آپ نے اپنے اس مقالہ کے بُنیادی نکات کی ضروری حد تک نشاندہی اور مزید تفصیل فرما دی مگر پھر بھی مقالہ میں جو تعمیری تجویزیں اور ضروری نکات مؤتمر کے سامنے رکھے گئے تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت ممدوح ہی کے اصل عربی الفاظ میں مع ترجمہ کے پیش کر دیا جائے تا کہ اس متن کے ساتھ، زبانی بیان کردہ حالات ومشاہدات اس کی شرح کی حیثیت سے سامنے آجائیں۔

اس عربی بیان کا سلیس ترجمہ ہمارے دار العلوم کے صفِ عربی کے استاذ مولانا وحید الزمان صاحب نے کیا ہے جس میں اصل مقالہ کی رُوح کو پوری طرح باقی رکھا گیا ہے۔ (مقالہ رسالۂ دار العلوم کے اسی شمارے میں شامل ہے)

اس سلسلہ میں فلسطین اور غزّہ کے سفر میں آپ نے تقسیم فلسطین کے خلاف بھی اپنی رائے بذیلِ تحریر منضبط

فرمائی تھی۔ لیکن جبکہ فلسطین سے متعلق تجویز کے سلسلے میں وہ سب امور موجود تھے جو اس مقالہ میں درج کئے گئے تھے اور اس تجویز پر حضرت ممدوح کے دستخط بھی ہوئے، اس لئے مقالہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اس بارے میں حضرت موصوف کا زاویۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ مقالہ بھی مع ترجمہ کے ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔ (جسے خطبات کے صفحہ: ۷۷ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔)

سفر حجاز...... یکم اپریل ۶۴ء کو حضرت موصوف قاہرہ سے بقصدِ حج بیت اللہ حجازِ مقدس روانہ ہوئے اور اس تاریخ میں براہ جدہ ہوائی جہاز سے اولاً مدینہ طیبہ پہنچے اور وہاں چودہ دن قیام کے کر کے ۱۶ اپریل کو مکہ مکرمہ پہنچے اور ۲۱/ اپریل کو ادیگی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اس تقریر میں آپ نے مدینۂ طیبہ اور مکۂ مکرّمہ کے اجتماعات کا بھی ذکر فرمایا جن کا اجمالی خلاصہ علمی دنیا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ: مدینۂ منورہ کے قیام کے دوران اس دفعہ خصوصیت سے جامعہ اسلامیہ مدینۂ منورہ کے متعدد اساتذہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے اور وسعتِ اخلاق کے ساتھ ملے۔

دوسرے روز مدینہ یونیورسٹی کے رجسٹرار الاستاذ الشیخ عبود بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بغایتِ کرم وعنایت پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں انہوں نے یونیورسٹی کی طرف سے دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ خیر مقدم کے طور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہوں اور آپ کچھ خطاب بھی کریں، حضرت ممدوح نے یہ کہہ کر کہ میں تو خود ہی جامعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، اس دعوت کو بصد شکریہ قبول فرمالیا۔

مقرّرہ وقت پر کاریں آگئیں اور آپ اپنے رفقاءِ سفر خصوصیت سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت صوبۂ بہار، صاحبزادہ محترم مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالحق صاحب پیش کار اہتمام دارالعلوم کو ساتھ لے کر یونیورسٹی روانہ ہوگئے۔ یونیورسٹی کے وسیع صحن اور چمن میں الاستاذ عبود اور دوسرے حضرات نے خوش آمدید کہا اور یونیورسٹی کے نائب الرئیس الشیخ بن باز کے دفتر میں پہنچایا جو ایک متبحّر عالم اور قادر الکلام خطیب ہیں۔

شیخ بکمال شفقت وعنایت پیش آئے۔ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑا، حضرت مہتمم صاحب حالات بیان کرتے رہے جس سے شیخ متاثر ہوئے۔ شیخ بن باز نے متعدد قیمتی کتابوں کے ہدایا حضرتِ ممدوح اور ان کے تمام رفقاء کو عنایت فرمائے۔

پھر شیخ عبود نے یونیورسٹی کا معائنہ کرایا اور آخر میں یونیورسٹی ہال میں لے گئے جہاں تمام طلبہ، اساتذہ اور الشیخ بن باز پہلے پہنچ چکے تھے، اولاً شیخ بن باز نے تقریباً نصف گھنٹہ تقریر فرمائی اور فرمایا کہ: میرا ارادہ تھا کہ میں اس خطاب میں مناسکِ حج پر روشنی ڈالوں۔ لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ رئیس دارالعلوم دیوبند ہم میں موجود ہیں۔ ہم بہ صد طوع ورغبت، ان کے افکار وخیالات سننے کے آرزومند ہیں۔ اس تقریر کے بعد صدرِ جلسہ نے حضرت مہتمم صاحب کا تعارف کرایا اور تقریر کے لیے ایماء کیا۔

مدینہ یونیورسٹی میں خطاب...... حضرت ممدوح نے اسٹیج پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں شکریۂ اربابِ جامعہ کے بعد دیوبند کے حالات، تعلیمات، مسلک اور دینی رُخ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور آخر میں جامعہ مدینہ منورہ کے بارے میں ستائش کے وہ کلمات فرمائے جو اس مقدس یونیورسٹی کی شایان شان تھے۔

دارالعلوم کے حالات، معاملات اور مسلک کی تفاصیل کے جملوں پر اکثر اسٹیج اور طلبہ کی طرف سے ماشاءاللہ اور الحمدللہ کے کلمات بلند ہوتے رہے۔ یہ مقالہ بھی دارالعلوم کے اسی شمارہ میں شامل کیا جارہا ہے (جسے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

بے اصل بات...... اس مقالہ کے اختتام پر صدرِ جلسہ حضرت ممدوح کے شکریہ اور کلماتِ خطاب کی تحسین کے لئے اٹھے مگر خطاب شروع کرنے سے پیشتر اسٹیج پر اتر کر حضرت مہتمم صاحب کی کرسی کے پاس آئے جو شیخ بن باز کے پاس بچھی ہوئی تھی، اور جھک کر اپنی ایک کچی یادداشت کو سامنے رکھ کر استفساری لہجہ میں فرمایا: ''کیا یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اہلِ حدیث طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے اور کوئی داخل ہوتا ہے تو اسے خارج کردیا جاتا ہے چنانچہ ایک سال اس کا کھلا مظاہرہ بھی ہوا کہ آٹھ دس طلبۂ اہلِ حدیث دارالعلوم سے خارج کردیئے گئے۔ یہاں یہ پروپیگنڈہ عام ہے، کیا اس کی کوئی اصلیت ہے''؟ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے فرمایا: ''یہ بے اصل بات ہے جو جناب کے کانوں میں ڈالی گئی ہے، مسلک کے اختلاف کی بناء پر نہ کبھی اہلِ حدیث طلبہ کا داخلہ دارالعلوم میں روکا گیا ہے اور نہ کسی مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔

جس واقعہ کی طرف جناب اشارہ فرمارہے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ اہلِ حدیث اور حنفی طلبہ میں مسلکی تنازعہ ہوا۔ نوبت ایک دوسرے کے بزرگوں کے حق میں سخت کلامی بلکہ بدکلامی کی آئی اور اس نزاع کا اثر دارالعلوم کے عام ڈسپلن پر پڑنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ یہ معاملہ عام ہنگامہ کی صورت اختیار کرلے۔ تو نظم (ڈسپلین) برقرار رکھنے کے لئے ان جھگڑالو طلبہ کو جھگڑے کی بناء پر خارج کیا گیا، جن میں اہلِ حدیث بھی تھے اور حنفی بھی۔ اگر مسلک کے تفاوت کی بناء پر یہ اخراج ہوتا تو حنفی کیوں خارج کئے جاتے اور اگر مسلک اختلاف کی بناء پر اہلِ حدیث خارج کئے جاتے تو انہیں داخل ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پھر خارج کرنے کا بار سر لیا جاتا۔ اور اگر یہ سب کچھ مسلک کے اختلاف کی بناء پر ہوتا تو جو اہل حدیث اس نزاع میں شریک نہیں تھے، انہیں بدستور دارالعلوم میں کیوں داخل رکھا جاتا؟ اس لئے یہ واقعہ سرتاپا غلط ہے کہ ان طلبہ کے اخراج کی وجہ تفاوتِ مسلک ہے''۔ اس سے صدرِ جلسہ بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر اوّلاً حضرت مہتمم صاحب کے مقالہ کے بارے میں بھرپور تحسین کے کلمات فرمائے، پھر دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آخر میں اس واقعہ کا ذکر کرکے فرمایا کہ:

''دارالعلوم دیوبند کے بارے میں جو یہ شہرت دی گئی اور بارہا کان میں پڑا کہ وہاں اہل حدیث کا داخلہ ممنوع ہے یا وہ اس بنا پر خارج کئے جاتے ہیں، غلط ہے ہم نے اسی وقت رئیس دارالعلوم سے اس کی تحقیق کی تو

شہرت بے اصل ثابت ہوئی۔ایسی افواہوں کا پھیلانا نامناسب ہے"۔

حضرت مہتمم صاحب نے جب یہ تفصیل اپنے اس خطاب میں ارشاد فرمائی تو مجمع میں اس سے خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور افسوس اس کا ہوا کہ لوگ غیر ممالک اور بالخصوص حجازِ مقدّس پہنچ کر بھی اس قسم کے غلط پروپیگنڈوں سے احتراز نہیں کرتے۔

لیکن حق تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان غلط شہرتوں اور تشہیروں کا پردہ خود ذمہ دارِ دارالعلوم کی زبانی، ذمہ دارانِ مدینہ یونیورسٹی کے مواجہہ میں، خود مدینہ کی فضاء میں چاک کر دیا اور اصل حقیقت کھل گئی۔حضرت ممدوح کا وہ جامع مقالہ جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھا گیا، وہ بھی اسی شمارے میں پیش کیا جارہا ہے۔

اَلرَّابِطَةُ الْاِسْلَامِیَۃُ کے اجلاس میں شرکت...... پھر آپ نے مکہ مکرمہ کے اس بین الاقوامی اجتماع کا ذکر فرمایا جو قصر الملک میں الرابطۃ الاسلامیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا کہ اس میں شرکت کی گئی اور رابطہ کے ذمہ داروں کے مقالات اور خطابات سنے گئے۔ جن میں خصوصیت سے قابل ذکر خطاب السید امین الحسینی مفتی فلسطین اور الاستاذ سعید رمضان کا ہے۔ نیز خصوصیت سے قابل ذکر عراق کے ایک بلیغ شاعر کا تاریخی قصیدہ ہے جس میں انہوں نے وقت کے حالات سنا کر عالم عرب کو بیداری کا پیغام دیا جس سے پورا مجمع متاثر ہوا۔

اجتماع کے بعد جدہ الرابطہ کے سیکرٹری صاحب سے ایک دعوت میں جو سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سیکریٹری سفارتخانۂ ہند کی طرف سے دی گئی تھی، ملاقات ہوئی۔ جس میں انہوں نے "الرابطہ" کے اغراض و مقاصد کے ضروری کاغذات اور اس کا دستور نامہ ایک ریشمی رومال میں رکھ کر عنایت فرمایا۔

دارالعلوم کا بین الاقوامی تعارف...... بہرحال مجموعی حیثیت سے حضرتِ ممدوح کا یہ سفر شاندار اور کامیاب رہا اور اس مُبارک سفر میں بین الاقوامی طور پر جو اہم کردار آپ نے ادا کیا وہ دارالعلوم دیوبند کا بین الاقوامی تعارف تھا۔ جو مڈیسٹ اور یورپین ممالک کے سربرآوردہ زعماء اور علماء کو کرایا گیا۔ آپ کے ساتھ دارالعلوم کی عمارتوں کے البم کے نسخے بھی تھے جو ممتاز اور مشاہیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

صومالی لینڈ، کینیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز اکابر اس البم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے جس سے بہت سے خطوں میں دارالعلوم جانا پہچانا ہو گیا۔

دارالحدیث دیوبند کے اس جلسہ میں طلبہ اور شہر کے لوگوں نے حضرتِ ممدوح کے ان اقدامات پر نظم ونثر میں مبارک باد دی۔ اس لئے یہ جلسہ حج کی مبارک باد سے زیادہ غیر ممالک کے ان قلوب کو ہموار کرنے کی حجِ اکبر کی مبارک باد پر مشتمل تھا جو اس سفر میں دارالعلوم کے لئے ہموار ہوئے۔ جلسہ خیر وخوبی کے ساتھ تقریباً شب کے ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

مذہب اور سیاست

قرنِ اوّل کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علمِ نافع (حکمتِ نظری) خلقِ عادل (حکمتِ اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمتِ عملی) تھے۔ جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالَم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافتِ ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عِباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد، امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

پیش لفظ..... پیشِ نظر خطبۂ صدارت حضرت فخر الامت، امیر البیان حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیتِ صدرِ اجلاس جمعیت علماء صوبہ سندھ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو سندھ کے تاریخی شہر حیدر آباد میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے، ان کے علاوہ مجلسِ احرار مسلم لیگ اور جماعتِ خاکسار کے ارکان بھی موجود تھے۔ عام شرکاء میں ہر طبقہ، خیال کے افراد حاضر تھے مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی، عرفانی، اصلاحی اور سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متاثر تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ خطبہ پڑھنے کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا: ''میں خطبۂ صدارت سننے ہی کے لئے شریکِ اجلاس ہوا تھا، اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچا دیا''۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مخلصانہ شکریہ..... بزرگانِ محترم! اللہ کی حمد و سپاس، اللہ کے آخری نبی پر درود و سلام اور آپ سب حضرات کے

کرم فرمایانہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں نالائق کو بخشا گیا ہے، مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطورِ یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تا کہ اکابرِ قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور وفکر میں مدد دے سکوں۔

زمانۂ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں...... حضرات محترم! آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے۔ دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں الجھ رہی ہے، دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رو رہے ہیں۔ معمورۂ ارضی کے وہ حصے جنہوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا، آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ ان پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسانیت اپنے نشانِ مزار پر کھڑی ہوئی رو رہی ہے، اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہولناک نمونوں سے تھرا رہے ہیں۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوسِ بندگی بنایا تھا، مگر شیطان اور اس کی ذریت نے اسے جنگِ غلامی کا جہنّم بنا دیا ہے۔

گزشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنّم تیار کیا تھا، آج اس کے شیدا اس میں جل رہے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، بچے، بوڑھے، سب کراہ رہے ہیں، اور ان کی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سنی جا رہی ہے جو مذہبی رہنماؤں کی رُوح کو تڑپا رہی ہے۔

مذہب اور سیاست...... وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مذہب اور سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی، آج خدا سے آبِ حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں اور جو لوگ خداوندِ عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے، زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں، بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ آج جب اس کی واپسی عمل میں آ رہی ہے تو اس کے ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی، مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبرِ مطلق۔

جنگ کا آخری فیصلہ...... جنگ ہو رہی ہے، یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتی کہ چرچل روز ویلٹ اور ہٹلر ٹوجو خود بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی، جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدان جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی ہے۔ عباد ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں، مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبرِ اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارت عظمٰی کے زمانہ میں کہا تھا کہ: "اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے، ہماری سلطنت اور ہمارا تمدن بھی برباد ہو جائے گا۔"

واقعات سامنے رکھ کر دنیا اس قضیۂ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی

جاری رہے گی۔ گوڈیلی میل نے اپنے مقالہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء میں لکھا ہے کہ: ''جنگ کے اچانک ختم ہو جانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے''۔ اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ کیوں کہ دنیا کے دوا رب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، دنیا کے مدبّرین ان کو بہم پہچانے سے قاصر رہے ہیں۔

آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیّت...... دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رُو سے کسی کمزور قوم کی آزادی سلب نہ ہو سکے۔ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کی بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو۔ دنیا کو اپنی ساری پیداوار کسی ایک ملک کی بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت ہے جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں۔ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیّت کی بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین الملی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو سکے۔ اگر متحارب قومیں (لڑنے والی قومیں) ان نکتوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہے گی اور اگر آج جنگ ختم بھی ہوگئی تو یہ خاتمہ ایک اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدّمہ ہوگا۔ ہاں! مگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں خدا کی حکومت کرے گی اور اس کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہے گی۔

ہندوستان کی صورت حال...... ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک صدی سے بہانے تلاش کر رہی ہے، دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کی شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ دلخراش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبّر کو غلامی کی قوتوں کے سامنے مفلوج بنا دیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفانِ مصائبات ہے جو علماء کے سروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان مرکّب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع میسر آیا ہے تا کہ ہم اس ہمہ گیر درد دکھ کا کوئی ہمہ گیر مداوا سوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی تھپیڑوں سے نکال لے جائیں:

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفان — کہ از طغیان موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟...... میں ایک سیاسی آدمی سے زائد ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم و فہم کے مطابق جہاں تک غور کر سکا ہوں، دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور گھن بن کر ان کی فلک بوس عمارتوں کو پیوند خاک بنایا ہے، اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔ 1 جہل 2 ظلم 3 اور غلامی۔

جہل...... جہل سے حدودِ اشیا نامعلوم رہ جاتی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، کوئی قانونِ زندگی سامنے نہیں آتا اور انسان اپنے اس امتیازی فرق کو مٹا دیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حد فاصل کے

قائم فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ایک انسان بہائم میں مل جائے تو انسانی حلقوں میں اس کی کوئی پرسش نہیں ہو سکتی۔

ظلم ...... ظلم، عدل کی ضد ہے۔ اس سے میری مراد ظلمِ اخلاق یعنی اخلاق کا عدل و اعتدال پر قائم نہ ہونا اور جبلی افراط و تفریط ہے، جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل اخلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے، قوم کی ساکھ اکھڑ جاتی ہے۔ خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گر جاتی ہے اور بالآخر ان بداخلاقیوں کے جراثیم سے پھر یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جا سکے۔

غلامی ......غلامی کی تباہ کاریاں فوضویّت سے شروع ہوتی ہیں۔ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو، مرکزیت نہ، ہو اس کا کوئی سرگروہ باقی نہ رہے۔ قوم کا ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے۔ باہمی تعاون و تناصر ختم ہو جائے۔ اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ طوائف الملو کی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقت ور اقوام اس پر خروج کر کے مسلط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کے لئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھٹکار ہے اور پھر اس غلامی سے بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ، کلچر، تہذیب، تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھتی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو اس طرح نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چندے دنیا میں کوئی اس کے نقشِ پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

قرآنِ حکیم کا فیصلہ...... قرآنِ حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں، جن میں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ ①

”جم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے وہ غضبِ الٰہی کے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ سے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان کہ لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل نکل جاتے تھے“۔

ذلت و مسکنت کا فردِ کامل یہ تھا کہ ان سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کر دی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں کے غلام، کبھی بخت نصر کے غلام، کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باج گزار، کبھی مسلمانوں کے زیرِ حکومت اور کبھی نصرانیوں کے۔ کہیں ہٹلر کے رحم و کرم پر اور کبھی امریکنوں کی لفظی ہمدردیوں پر۔

غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اس نے کبھی ان کی کوئی ایسی بھی توقیر نہیں کی جو کم از کم آدمیت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انہیں جلا

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۱۔

وطن کیا ہے، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، ایک ایک کا مال و اسباب ضبط شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے مواقع پر بورڈ چسپاں کیئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ برطانیہ نے انہیں پناہ ضرور دی۔ مگر ان کی کسی ادنیٰ توقیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیوں کہ برطانوی مدبروں کے انداز سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجے کی ذلیل و رسوا قوم جانتے ہیں اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ ان کے ساتھ ہو، مگر کوئی اچھی رائے ان کے ساتھ نہیں۔ پس غلامی کے ساتھ انتہائی ذلت و مسکنت اور رسوائی بھی ان کے لئے قرآن نے مخصوص کر دی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآنِ حکیم نے عصیان بتلایا ہے جو عملی سیہ کاری ہے اور اس کا سبب اعتداء فرمایا گیا۔ جس کی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہو یا ہو تو معاملہ ان کے ساتھ لاعلمی کا کیا جاوئے اور یہی وہ جہل ہے، جس سے خیر و شر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

پس یہود کی ذلت و مسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بداعمالیوں سے اور بداعمالیوں کا منشاء ظلم اخلاق اور جہلِ نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی سے بڑی قوم کو برباد کرنے کے ضمانت دار ہیں، ظلم اور جہل اور غلامی نکلے اور تینوں کا ایک ہی آیت سے ثبوت بھی ہو گیا۔

دوسرے مواقع پر قرآنِ حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مستقلاً بھی بیان فرمایا ہے، جس سے ان کی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت الٰہیہ کا حامل بناتے ہوئے اس کی بنیادی شرط ان دو چیزوں، ظلم و جہل کو قرار دیا ہے کہ انہیں کی اصلاح کے لئے اس جذبۂ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہو گیا۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا.﴾ ①

''ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی، سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا''۔ یعنی اس میں قوت علمیہ اور قوت عملیہ (اخلاقِ حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت، اس میں علم اشیاء اور عدل اخلاق کی استعداد تھی جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دائر فرمایا۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ.﴾ ②

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۷۲. ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۸۳.

''یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے''۔

ظاہر ہے علو وکبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو اور فساد ضد صلاح ہے اور صلاح ورشد کا فقدان وہی ظلم نفس ہے۔ خواہ علمی ہو، خواہ اخلاقی، پس آثارِ جہل وظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جاسکتی ہے تو وہی اس کا جہل وظلم ہے گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی وزیر دستی پیدا کرسکتی ہے تو یہی ظلم و جہالت۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل وظالم طبیعت کو محسوس کر کے اس کی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ. ﴾ ①

''اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگ جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے''۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفا کی، حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے۔ پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔

غلامی کے متعلق قرآنِ مجید کا حکم...... ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض میں غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو درحقیقت اسی ظلم وجہل کا ثمرہ ہے۔ بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ ②......

''اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتے رہیں گے''۔

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلّط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوءِ عذاب یعنی بدترین عذاب بتلایا ہے۔ بہر حال ان آیات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی وبربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں۔ ظلم وجہل اور غلامی اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے پچھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل...... آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انہیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی بھلی قوم میں

① پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۶۷۔

شمار کئے جانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کی توبہ تو جہالت نے ان میں سے خیر و شر کی تمیز اٹھادی اچھے برے کا فرق مٹادیا۔ حدودِ اشیاء ان کے قلوب پر مخفی ہوگئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے۔ مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مان کر انواع واقسام کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد (جمع) ہوگیا تھا۔ کعبۃ اللہ سینکڑوں بتوں کا بت خانہ تھا جو انسانی زندگی کے مالک تصور کئے جاتے تھے، انہی سے مرادیں مانگی جاتی تھیں، ان ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ان کے سامنے سرعبودیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور امتی کا فرق مٹاچکے تھے، رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دے دیا تھا اور سنن انبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیرِ دین کی تمیز اٹھ چکی تھی۔ دین کو غیرِ دین سمجھ کر الحاد کا شکار تھے اور غیرِ دین کو دین جان کو بدعات ومحدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلمِ اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاقِ فاضلہ کا ان میں کوئی شمہ (کم مقدار) باقی نہ رہا تھا۔ اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط وتفریط کی بدولت نہ ان میں حیا رہی تھی نہ غیرت، نہ ہمدردی تھی نہ مروت، نہ ایثار، نہ تواضع، نہ بے نفسی، نہ للّٰہیت، نہ صبر وشکر، نہ اعتماد نہ توکل۔ ہاں رات دن کا شیوہ تھا، تفاخر واتراہٹ، بے رحمی و قساوت، شیخی ورعونت، کبر ونخوت، سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی، ہوسنا کی وخودستائی اور ان بداخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا، وہ لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت، زنا وشراب، جوا اور قمار، قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنہوں نے ان کی دینی ودینوی زندگی کو تباہ کرڈالا تھا۔

ادھر فوضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ ان میں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی، نہ قومی نظام تھا، نہ ملکی تمدن نہ شہریت تھی نہ شہری حقوق، نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ، پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا، جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ بدویت و بربریت، طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انہیں اسی ذلت وخواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہنچادیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام، کبھی غیروں کے گرفتار اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم وجہل نے ان میں آثار نبوت مٹادئے تھے اور فوضویّت وغلامی نے ان میں آثارِ سلطنت محو کردیئے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی، نہ سیاست، جس کا خون انہی تین امراض، ظلم وجہل اور غلامی کے سر تھا۔

رحمتِ الٰہی کا ظہور علم نبوّت، مکارم اخلاق، اسوۂ حسنہ..... آخر کار رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل، تاریک پیکر، اور تاریک روش قوم پر ختم نبوت کا آفتابِ جہاں تاب چمکا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کافور ہو۔ اپنا خلقِ عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے۔ چناں چہ اپنی یہی تین شاخیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں۔ ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے

ہوئے ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا.'' ① ''میں بلاشبہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ.'' ② ''میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کردوں''۔ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد الٰہی ہوا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.﴾ ③ ''البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم و اخلاق و عمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں''۔

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود واشگاف ہوئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور روا اور ناروا کا امتیاز ہوا۔ اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے جائز اعمال کے دواعی دلوں میں ابھریں، عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمتِ حیات بخشی گئی ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس علم کا اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت واستقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جس میں مرکزیّت کے ساتھ اس علم و اخلاق کی نشر و اشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت، مادی و روحانی طاقت اور غلبہ و تسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کردے۔

بہرحال قرنِ اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علمِ نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمتِ اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمتِ عملی) جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالدی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا' اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان تین طاقتوں کے ذریعے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد، امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتح عالم...... چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی۔ فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج لیا اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم، مقوقس بادشاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوک عمان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیج کر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھاٹک

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٦٥.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب آداب القاضي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها، ج: ١٠، ص: ١٩٢.

③ پاره: ٢١، سورة الاحزاب، الآية: ٢١.

کھلا تو لسان نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کرلیا۔ دورِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر بہت سے بلادِ فارس (ملک) ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر متعدد بلادِ شام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر کتنے ہی بلادِ مصر فتح ہوئے۔ دورِ فاروقی (رضی اللہ عنہ) آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیارِ مصر، تمام اقلیم فارس اور روم و قسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اسلامی شعائر بلند ہوگئے، دولت عثمانی (رضی اللہ عنہ) کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کرلی، زمین کے مشارق و مغارب تک یہ روجا پہنچی۔

بلادِ مغرب سے اقصاء اندلس، قبرص، قیروان، بلادِ سبتہ اور بحرِ محیط تک۔ ادھر ناحیہ مشرق سے اقصائے بلادِ چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق و خراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہوگیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشن گوئی ارشاد فرمایا تھا کہ:

"اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا وَسَیَبْلُغُ مُلْکُ اُمَّتِیْ مَازُوِیَ لِیْ مِنْھَا۔" ①

"اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے تمام مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امت کا ملک اس حد تک پہنچ کر رہے گا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق و مغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا، بہت سے وہ ناچیئے کونے باقی رہ گئے جن تک نگاہ نبوت پہنچ چکی تھی، اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتح کا سیلاب بڑھتا رہا۔ چناں چہ ہندوستان، افغانستان، جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے۔ جن کے کلچر، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم ان کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ لیکن پھر بھی نگاہ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت و بر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہوکر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں لے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے۔

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا.﴾ ② ...... "وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت کی اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے (باعتبار حجت و دلیل بھی اور بلحاظ شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرن اول میں ہوا "کَیْفًا" اور قرن آخر میں ہوگا "کَمًّا")"۔

بہرحال یہ سب مادی و روحانی برکات اسی مقدس قوم کے دست حق پرست پر ظاہر ہوئیں، جنہوں نے برکات نبوت سے متبرک ہوکر ہوا پنے ظلم کو عدل و اخلاق سے، جہل کو علم نافع سے اور علم کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال

① مسند احمد، حدیث شدا دبن اوس رضی اللہ عنہ، ج: ۳۴، ص: ۴۷۹. ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۸.

سے متنیر (روشن) کیا۔

زمانۂ جاہلیت......آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہیں جس کا قبل از بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔

وفورِ جہل......وفورِ جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے۔ اسباب علم جتنے بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے امّت کا جہل ترقی کرتا جا رہا ہے۔ آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنا دیا ہے۔ اصول اعتقادات تک میں شکوک وشبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ کسی کو خدا کے وجود میں کلام ہے، کسی کو اس کی صفات میں، کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوت یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیت کے عدل وثقہ میں، کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے اور کوئی سرے ہی سے اسے دل کے بہلاوٴ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلے میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں ہیں۔ اس سے کوئی ناواقف نہیں، دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں اور پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں، قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دو ان کی قدر کرتے ہیں تو فی صدی ۹۹، علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کیے ہوئے ہیں۔ کوئی انٹی ازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی مولوی کا غلط مذہب کہہ کر اس روش کو ہی اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنے کی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر کو اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ اس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم واہل علم سے بیزاری، اس سے زیادہ مہلک مرض ہے جو مسلمانوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس صورت حال میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ ان پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟

اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جماعتی واجتماعی طاقت میں روز بروز خلل اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

فقدان اخلاق...... ادھر اخلاقی بے مائگی علمی تہی دستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رسمی گدیاں اور تحصیل وصول (چندہ لینے) کی چوکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لے کر لوگ نکلیں۔ سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائر دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لے کر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب وسنّت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے۔ عادت وعبادت کی بدعات ومحدثات میں طبائع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھ کر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ ان میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال وکیفیات اور نہ مقامات واقوال جبلّی۔ پھر بداخلاقیاں، حسد وریا، کبر وحرص، اسراف وبخل، جبن ودوں ہمتی جاہ پرستی وجاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ نہ ان کی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل وتتمیم جو مقصد نبوت تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اصول کی بجائے نفسانی جذبات اور ان کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے۔ اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سر پھٹول اور نااتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے، اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سر پھٹول، باہمی ناچاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے، آج امّت اس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص ان کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامہ قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع وجدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے، توافق اور توافق کی راہ میں غم خواری۔ دوسروں کی دل داری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لیے شفقت وایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمرات غلامی...... ادھر فوضویت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال وخودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے۔ نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت ہے۔ نہ معیشت، نہ تنظیم ہے، نہ قومی وحدت۔ طبقاتی انتشار دھوئیں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق وتحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقۂ عمل کا بھی اختلاف آ جاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع وجدال بنے بغیر نہیں رہتا۔ پھر یہ اختلاف کسی اصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء وقیاسیات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولا خود اسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعۂ نزاع وجدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت وسیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد...... بہر حال قوم کا نظام علم واخلاق جو مجموعۂ دیانت ہے ایک طرف مختل ہے (درہم برہم) اور نظام آزادی جو خلاصہ سیاست ہے، دوسری طرف مضمحل (کمزور) ہے۔ اس لئے

آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست، دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار بد نمایاں ہونے چاہیے تھے، وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے امن وسکون گھروں شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا (نایاب) ہو چکا ہے۔ بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار دانگ عالم پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت وخواری اور پستی میں آ چکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت وعیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اسے آسمانی بم، زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے۔ نہ اسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دار فولادی بارش سے اسے سنگوا لیتے ہیں۔ نہ اسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تارپیڈو تحت البحریاں اسے اور زیادہ تہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات، نباتات، حیوانات سب اس کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں۔

پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے تو طرح طرح کے امراض ومصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء (دشمن) اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اسے نجات نہیں ملتی۔ غرض انسان کے لئے نہ آج انسان کارآمد ہے نہ غیر انسان، حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ① ”خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل ہی ہیں تا کہ اللہ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تا کہ وہ باز آ جائیں“۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ ”اور جو کچھ بھی تمہیں دکھ پہنچتا ہے سو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب سے“۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا، تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے ہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے؟ اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اس نے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.﴾ ②

”اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے خدا کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی جانوں سے انہیں بھول میں ڈال دیا یہی لوگ نافرمان ہیں“۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۱۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹۔

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک ومفاسد کی جڑ، بنیاد وہی تین غلطیاں نکلیں گی جو زمانۂ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل، ظلم اور غلامی اور دوسرے لفظوں میں بدیانتی اور بدسیاستی، اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کے لئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا، وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کر سکتا ہے۔ بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ: "لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" ① "اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی"۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ جہل ظلم اور غلامی کو ان کی تین اضداد علم احکام عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں تین اجزا نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہیں تین اجزا کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ ② ......"وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے"۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال...... آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جس کا تعلق قرآن حکیم کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے امّت کی اصلاحی اسکیم کے تین تین بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلہ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر امّت کے علم وفکر کی تکمیل وترقی موقوف ہے۔

دوسرا مسئلہ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لاکر جن پر قلوب کی استقامت موقوف ہے، درست کیا جائے۔ تیسرا مسئلہ تلقین حکمت جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع (پیغمبر) کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ امّت کے سامنے لے آنے کے ہیں، جس کے مجموعہ پر امّت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام...... پس، قرآن کریم کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔ ۱۔ تعلیم احکام ۲۔ تہذیبِ اخلاق ۳۔ تنظیم اعمال۔ عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے، دوسرے کا طریقت اور تیسرے کا سیاست، گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں۔ جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت...... شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت (راستہ طے کرنا) کیسے

① تخریج گذر چکی ہے۔ ② پارہ: ۲۸، سورة الجمعة، الآية: ۲.

ممکن ہے؟ طریقت سے اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر راہ روی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پر خار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے۔ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائے گی، منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے، طریقت قوت راہ روی ہے اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور وشغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ:

طریقت...... طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مبانی واصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعاً تخلی وخلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے، اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح وفلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انہیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے، بہر حال خلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اداءِ حقوق پر ہے۔ ہدایت وارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا، ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھس کر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے، شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے۔ وہاں "فرار عن الخلق" ہے اور یہاں "ذهاب اِلی الخَلْق"۔ پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو، بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا۔ اسے درد ہوگا اپنے گھر پھر اپنے قبیلہ کا پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست...... ادھر سیاست کے دائرے میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید ومدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر عباد تک آیا تھا اور یہاں سیاست میں عباد سے نکل کر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحراء وجبال، زمینوں اور ان کی پیداوار، دریاؤں اور ان کے بہاؤ، حیوانات اور ان کے منافع۔ غرض ساری کائنات کے اجزاء اور ان کی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود وقصاص الگ ہے اور جہاد وجانبازی الگ، احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا، مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سر بلند کرنا۔ مبطلوں (باطل والوں) کا زور توڑنا اور محقوں (حق والوں) کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی وروحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلابات کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوت کہاں؟

یہاں تو عباد سے گزر کر بلاد، انسانوں سے گزر کر حیوانات، حیوانات سے گزر کر نباتات اور سب سے گزر کر ایک ایک چپہ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کی جاتی ہیں، جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک خاص دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوت محض ہے۔ سیاست جلوت محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت درانجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوت درانجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوت کا مخزن (طریقت) ہو اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع (سیاست) ہو۔ ورنہ خلوت درانجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی امتزاج کے مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پر پڑ جائے گی۔

اگر طریقت محض رہ جائے جس میں شریعت و سیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور خجالت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت و سیاست نہ ہو تو وہ شدت و جمود محض ہے۔ اگر سیاست کے ساتھ شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ نخوت و تجبّر محض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونے کی جامعیت ہی سے پیدا ہوسکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے اور اسی لئے دین نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے، پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت و سیاست ہے۔ جن کی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر و قہر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت و طریقت کی کسمپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے سیاست: جس کی مادی شوکت ان دونوں کے لئے سرمایۂ عظمت و حفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہوگئی۔ شریعت کے ذریعہ علم احکام اور تعلیم غیر کا جذبۂ شفقت قائم ہوگیا اور سیاست وقوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفیذ کی قدرت پیدا ہوگئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت و تجبر نکل کر وقار و خودداری اور شہامت (بہادری) آ جائے گی۔

طریقت میں سے رسم خلوت نکل کر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اور ادھر اتباع شریعت میں خشکی و جمود، تنگ نظری اور تقشف سے نکل کر وسعت نظر، جامعیت ہمہ گیر، تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات ابھر آئیں گے جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائے گا، جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔

جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیک دم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جا رہی ہیں اور ان کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جا رہے

ہیں اور اس طرح شریعت و طریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مدمقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ مل کر کسی ایسی طاقت کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں، جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں اور نہ صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم امیختہ (یکجا) نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص، صوفی، صافی اور سیاسی مخلص ہو جائے اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں...... وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جزو علم اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اِک کٹ کھنا اور جور و استبداد کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور علی شرف الزوال ہو جائے گی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا کبھی امن وچین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالم بشریت کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پر امن ہوتا۔ کیوں کہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں، کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لیے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسناکی قانون کے دائرہ میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم و ستم خوب خوب سیکھتے جا رہے ہیں، اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہوا و ہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے۔ پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی نمونۂ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں اور عالم گیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت وخواری فقدان

سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے، جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو محض سیاست اس کے دل ودماغ کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم واخلاق بلاشوکت بے بس کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کرسکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف آور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر واستہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ فساق وفجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں، ان حالات میں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء وتمسخر کی سنّت سیۂ کو اور مضبوط بنادیتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقوی وتقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو، وہ بھی فجور کا غلبہ واستیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم واخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس بے بس رہ جاتا ہے۔ جن میں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آکر بالآخر ادھر ہی جاملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کردیتی ہے۔ غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت وشوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلاشرکت غیرے غالب آجاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت وراست بازی کی کمی نہیں، بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار ومددگار اور زیر تشنیع وملامت ہے۔

مولوی کا غلط مذہب، جذبات، اینٹی ملاازم، تکفیر اہل حق، ازالۂ اثرات علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد وشرک، بدعات، محدثات، منکرات وفواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترعیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی، یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے کھول دے اور جب چاہے بند کردے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت ہلاکت، طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے، تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات الحاد، دہریت بے دینی شرک وبدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم واخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن وچین کا سانس نہیں لے سکتی۔

اس لئے اسلام نے یدین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنچایا، جس سے دیانت وسیاست کا ایک حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہوگئی اور سیاست کا جور واستبداد دیانت سے پامال ہوگیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ایک جگہ ارشاد ہے"اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَان." ① "ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے"۔ایک جگہ ارشاد ہے:"بُعِثْتُ مَرْحَمَۃً وَّمَلْحَمَۃً." ② (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم)"میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ جو بنا کر بھی۔

ایک جگہ ارشاد ہے:"اَنَا الضَّحُوْکُ الْقَتَّالُ" ③ "میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی"۔ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا:"لَایَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ (اَیِ الدِّیْنِ) حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰہِ. (اَیِ الْقِیٰمَۃُ) ④ اَلْجِہَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ." ⑤ "میری اُمّت میں ہمیشہ ایک قوم تا قیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی (میری امّت میں) جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔"

قرآن نے نبوّت کی بھی مدح سرائی کی، جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرمنشا ہے۔﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا وَّاٰتٰکُمْ مَّالَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ.﴾ ⑥

"اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے، یاد کرو جب کہ اللہ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں"۔

دین، سیاسی نظام کی حیثیت میں...... اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں کلمۂ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے، ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے، جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، جہاد۔

اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس، انسانی ذات البین اور قلوب و ارواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات و عبادات، اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے۔وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا جس سے بین الملی احوال درست ہوں۔فتن کا استیصال اور قانون الٰہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص تعزیرات و کفارات، جہاد اور سدّ ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔

① علامہ صغانی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔الموضوعات للصغانی، ض: ۱، ص: ۲. ② حلیۃ الاولیاء، الجزء الرابع، وھب بن منبہ، ج: ۲ ص: ۱۰۵ قال ابونعیم: ھذا حدیث غریب من حدیث الثوری، تفردبہ حسن.

③ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ کسی راہب کی حضور کے متعلق پیشن گوئی تھی دیکھئے۔دلائل النبوۃ لابی نعیم، ج:۲، ص: ۱۱. (ومن الانصار فی غزوۃ احد من الدلائل) ④ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب سوال المشرکین ان یریھم النبی ﷺ ج: ۱۱، ص: ۲۶۶. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الجھاد، باب فی الغزو مع ائمۃ الجور، ج:۷، ص: ۶۳.

⑥ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ الآیۃ: ۲۰.

اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ، نگراں اور امام بنادیا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری، دیوانی، نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوۃ امامت جنائز، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاذ کے بھی ہوگا تا کہ ان کی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیت اللہ، خوف الٰہی، طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے، تا کہ سیاسی الجھنوں میں پڑ کر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں۔ اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا وآخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھ دی گئی ہے تا کہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی...... بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے، جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ سے الگ کر کے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے۔ ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات، تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھر بار، اولاد بنیاد عزیز وا قارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کی جاسکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت ناتمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو، بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر اداء حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروؤں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا اور اسے رہبانیت کب برداشت ہوسکتی تھی؟

پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہے اور مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب اور سیاست کی یہ تفریق ایسے ہی غلط ہے جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی جنہوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق، تمدنی ضرریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو، اسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی مدد ومعاون خادم ہے۔ ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے۔ البتہ اس سیاست کے معنی سیاست عصریہ کے نہیں، بلکہ سیاست شرعیہ کے

ہیں۔ جس کی بنیاد علم واخلاق، تقویٰ وطہارات اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق واعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں۔

یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے۔ جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جا سکتی، ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کی بقاء واستحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں جیسے نبی اسرائیل، وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ، شاذ و نادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لا کر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی، مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء وترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ① "یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے"۔

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض وغایت دیانت کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے۔ جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض وسماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا۔ اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سد راہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔

علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنۂ شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے، تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا اور فتنۂ شہوات جبکہ عمل صالح میں مخل ہے، تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔ اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم و جہل ہے اور امانت مجموعۂ علم واخلاق۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد چوں کہ امانت پھیلانا ہے، جس کی راہ میں یہ

① پارہ:۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱۔

فتنہ خلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا اور یہ فتنہ یعنی ظلم وجہل جبکہ انسان میں جبلی تھا، تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات وشہوات سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ وپند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی، پس طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق نبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا، تاکہ خلق خدا امن وسکون کے ساتھ اس علم وخلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت وعبادت الٰہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق...... اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین زر اور ذاتی اقتدار۔ آج اس کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چوں کہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہٰذا اسے ملنا چاہیے، یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہئے یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہئے، ورنہ پھر جنگ ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین، دوسری صورت میں زر اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے، جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کی دو ثلث آبادی انہیں تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ...... اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں، کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین، کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور بے وزنی ہیں۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے کا اسے حق ہو۔ زمین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ.﴾ ① ''بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے''۔ یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وراثت حصہ پا سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً.﴾ ② ''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں''۔

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی، یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے، اس کی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے، ذاتی طور پر نہیں۔ مال کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىْۤ اٰتٰكُمْ.﴾ ③ ''اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔

③ پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۳۔

ہے''۔ یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے، جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے، ذاتی موجبات سے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ① ''اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا''۔

یہاں رازقیت اللہ کے لیے ثابت کی گئی ہے جو اس کی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کے دلیل ہے۔

حکومت الٰہی ...... اسی طرح حکومت واقتدار اور انتداب کے بارے میں فرمایا گیا کہ۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ② ''حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں''۔ اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ ③ ...... ''اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں، کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ اوامرِ الٰہی کے بعد بندہ کے چون و چرا اور ''لِمَ و کَیْفَ'' کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تأمل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔

قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت، آمریت، اور اقتدار، حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطہ ملکیت (ملکیتی حدود) میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو، ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جدوجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر ہجوم کریں گے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد...... چنانچہ قرن اول (پہلی صدی) کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ورنہ اعلان جنگ ہے، بلکہ کسی رقبہ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کر لو۔ یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعہ دیانت و سیاست اور چشمۂ علم واخلاق ہے، یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کر لو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آ جاؤ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب و

① پارہ:۳، سورة البقرة، الآية:۲۵۴. ② پارہ:۱۲، سورة يوسف، الآية:۴۰.

③ پارہ:۲۲، سورة الاحزاب، الآية:۳۶.

سلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کرلو اور اپنے ملک میں آباد رہو۔ ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نائبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض و غایت...... پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اس کے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا، خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا، اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

﴿لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ ①

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد، اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کون سی دانشمند قوم اعراض کرسکتی ہے۔ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساس مقاصد ہے۔ گریز اگر ہوسکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے جبکہ انسان، انسان اور اقوام، اقوام سب برابر ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے یا اسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے۔ لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کرکے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی۔ بلکہ صرف اس لیے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو، اسے ملک گیری اور طمع جاہ و جلال سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ وہ ہزار ملک فتح کرکے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زر و جواہر نہیں بلکہ زہد و قناعت سے دنیا کو ہمکنار کرنا ہے۔ اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے۔

تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع و فساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کردیا جائے۔

ایک لمحہ غور و فکر...... اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت، قومی اقتدار یا کسی خاص خطۂ زمین پر مخصوص انتداب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لے کر کھڑے ہوں گے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی مقاصد نہ ہوں، وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کرسکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان و تسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پرسکون ہو جاتا ہے اور خود

① الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير، باب من قاتل لتكون كلمة الله... ج: ١، ص: ٢٩٢ (الطاف سنز).

مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرن اول کا تھا۔ یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت، اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنی اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعویٰ میں معنی بھی پیدا ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آ جائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد...... میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط و تنزل یا اقدامات میں جس قدر بھی ناکامی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے۔ یعنی ناکامی، یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعد (جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا) مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں، پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے، پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زیردستی کے ایام آنے لگے۔

یہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی، یا رہی تو راہ مقصود نا معلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت نہ رہی، اور یا وہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض ان تینوں عنصروں علمی قوت، اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال...... تفصیلات کا موقع نہیں، لیکن اصولی طور پر اب اس کے مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی باگ دوڑ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتاوٰی عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا، تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جہالت، ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اٹھے بڑھے اور شہید بھی ہو گئے۔ مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۸۵۷ء میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر پڑ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی، ناتجربہ کاری اور ناتیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم وتربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کھل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم وتہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردۂ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن ومصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلابات کے تحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم واخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریص عمل...... اس سے انکار نہیں کہ جذبات وعواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے۔ رفتار زمانہ نے انہیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں۔ لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انہی عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے، مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی: تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوۂ حسنہ۔ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت دین الٰہی اقامت حکومت الٰہی تنظیم حیات انسانی۔

اشاعت دین الٰہی

تعلیم:.......اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کرسکیں۔ یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے، جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔
جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھ کر مسلمان نونہالوں کو کتاب وسنّت اور اس کے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کرسکیں۔

قاسمی علوم اور فلسفہ......میں اس میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھ کر نئی ضروریات نظر انداز نہ کی جائیں اور انہیں سامنے رکھ کر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اتر سکیں۔

مرکز علوم دارالعلوم دیوبند......ہم اپنے تجربہ اور سالہا سال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیا گیا ہو۔اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانئ دارالعلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللہ کی حکمتوں کا نچوڑ اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے، تو یہ اس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔یہ فکر شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چل کر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے۔اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند ہے۔ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجت اللہ البالغہ اور تقریر دل پذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

مستقبل کا تعلیمی پروگرام......اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست، مبادیات سائنس، سیاسیات حال کے اصول، اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تاکہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے ان پر رائے زنی کرسکیں۔

بہر حال یہ کام مدارس کا ہے۔قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تا کہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

مسجدی تعلیم......مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اس کی ضرورت بھی ہے۔اس لئے مدارسی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر ہر محلّہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے، ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں میں ہوں، بلکہ دیہات میں بھی جابجا قائم ہونے ضروری ہیں۔مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کر دیں جن میں قرانی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخل درس کر دیئے جائیں، جو ضروریات دین ،عقائد فرائض ، اخلاقیات، معاملات ومعاشرات اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں۔

درس قرآن......بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے۔لیکن عوام رہ جاتے ہیں۔اس لئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے۔جس میں قرآنِ کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بہ ذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تا کہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہ جائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

تبلیغ......لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب ومساجد کی، بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لے کر جائیں۔ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔اسی لئے اس کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لے کر نکلیں اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں۔جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور انبیا علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے۔

تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں......تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت واکثریت کا فیصلہ کیا ہے۔مکہ میں کلیت کفار کی تھی، تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی، پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی۔مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی۔ابتداء جمرۂ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی، پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت۔ یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت واکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اس کا حل کر دیا۔

ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہو گئی۔ غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر واشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان، مسلم وغیر مسلم

کشا کشی سے نجات پا گئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھیں بند کر لی گئیں۔ جو تبلیغ سے ممکن تھیں، وہیں یہ کشمکش قائم ہے۔

مسلم سلاطین کا قصور...... اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت و اکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنہوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں۔ بلکہ باہم مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

نقطہ اتحاد...... بہرحال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئے گا۔ اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے لے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور مل کر متحدانہ عمل شروع کر دیں۔ بہرحال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہے جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا، تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انہیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کر دیا جائے، جو آئندہ دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈال دے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ ان کی تبلیغ میں موثر ہوں گی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزو اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ: ﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① ’’اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے‘‘۔

اس کے لئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں۔ جن کی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اصول پر قائم کیا جائے اور اس کی تدریجی آمدنی میں اس کی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اس اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے، جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانے پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے۔ تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بن جائے گی۔

طریق تبلیغ...... تبلیغ میں اسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اسے اصولاً پیش کیا یعنی تبلیغ الاقرب فالاقرب (جو قریب سے قریب تر ہو) کے قاعدہ سے ہو۔ اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے پھر اپنے اہل بیت کو، پھر اہل قربت کو، پھر اہل شہر کو، پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔

یہ صورت حال اس طرح سہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰۹.

تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتار تبلیغ قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنا دے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہئے بلکہ خاموش طریقہ پر عملی شکل میں۔

تذکیر...... اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاددہانی کریں۔ موعظت ونصیحت کا بازار گرم ہو کہ ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ.﴾ ①

''بار بار یاددہانی کرو۔ کیوں کہ یاددہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے''۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی، مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہرصورت اس میں ایک جزو اہم اور لازمی رکھا جائے اور وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر کرنا اور ان کی شان دار روایات سلف سے انہیں آشنا بنانا، جس کا مرکز ومحور سیرت مقدسہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو صورتیں ان کے دل ودماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر جائے گا۔ بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزو جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم وتبلیغ اور درس وتذکیر میں سکھلایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ: ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا'' اور ''دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں''؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی، جن پر قابو پالینے کا راستہ بہ سہولت سامنے آسکے گا۔

عسکریت...... ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس ومکاتب وغیرہ میں ایک اہم جزو کی اشاعت وترویج بلکہ عملی مشق وریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے۔ مگر جسے آج کے عیش افزاء تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے سست اور مضمحل بنادیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ کھلائے جانے کی ضرورت ہے، وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کماحقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ آج کل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈال کر صلح وجنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کون سا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر مسلمانوں کو ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا دفعیہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر ضرورت استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵.

ضرورت ہے۔ وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے، جس کی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے۔ یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے جس سے قرآنی نظریات امّت میں پھیل سکتے ہیں۔ لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہے۔

تزکیۂ نفوس اور اصلاح عالم...... اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں، اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کارآمد ہوسکتا ہے؟

اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لاسکتے ہیں، جبکہ ان کے اپنے قلوب مزکی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تبلیغ، اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق وعفاف، للّٰہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھ کر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے۔ آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام لانے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر...... مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہ و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گزرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہوسکتے"۔

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں سے غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی دفع ہوجائے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ.﴾ (1) "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدلے"۔

خانقاہیں...... پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنی اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ و ریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند، عامۂ دوکانداری کے اصول پر قائم ہوگئی ہیں۔ رسمی گدیاں ہیں جن میں مریدوں سے تحصیل وصول (چندہ) کے سوا کسی تربیت کا کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان کے نذرانے بدستور قائم رکھ کر کہ بہرحال ان کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے

(1) پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱.

کہ ان کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں۔ جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو انہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں۔ ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح اپنا شعار بنائیں۔ اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔

علاوہ ازیں اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تا کہ قوم کی گاڑی آگے چلے۔ ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ وجلال کی ہوس، نفاق تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بدنے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔

اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اسلامی فریضہ ہے لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کرے، جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا رہے۔ خلاف شریعت امور دیکھ کر صبر نہ کرے بلکہ پیار ومحبت سے نصیحت کرے اور مخاطب کے دل کی راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزو اصلاح اخلاق ہے، ورنہ اس کی سیاست بھی اپنے حقیقی نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں (مصلح) نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ انہوں نے طریق اصلاح میں الہام کی بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے۔ پس سیاسی مساعی میں تہذیب نفس سے چارہ کار انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم...... بہر حال یہ ضروری شعبے اشاعت دین الٰہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جن کی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔

قرآن نے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے تعلیم کی ضرورت ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ سے تبلیغ کی ضرورت ﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ① سے تذکیر کی ضرورت اور ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ② سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ ③ اور ﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ﴾ ④ سے تعلیم صنعت وحرفت کی ضرورت جو آج کی سائنس کا عملی موضوع ہے۔ ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ⑤ سے تصفیۂ باطن کی ضرورت ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ⑥ سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت اور حدیث (اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ) ⑦ سے جزئی روک

---

① پارہ:۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ:۵۵. ② پارہ:۹، سورۃ الانفال، الآیۃ:۶۰. ③ پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ:۸۰. ④ پارہ:۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ:۱۳. ⑤ پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲. ⑥ پارہ:۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ:۱۷. ⑦ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ الدین النصیحۃ للہ ولرسولہ، ج:۱، ص:۲۵.

ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کھلے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے، جس پر صرف عمل ہی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ پروگرام بنا بنایا موجود ہے، ہاں پروگرام کے لئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تا کہ قلوب کے لئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عملی دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الٰہی ......سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف وہی کر سکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو۔ اس لئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تا کہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک پر جمع ہو جائیں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کے لئے اپنا مرنا اور جینا متعین کر لے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔

ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہے گی۔ کیوں کہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی واحد ذات، اسی کے واحد کلام، اسی کے واحد کعبہ، اسی کے واحد رسول کی طرف تمام امّت کو علمی، اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے۔ تا کہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریت پر ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ، حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا۔ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی ''کتاب اللہ'' کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق (اخلاق یافتہ) ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے۔ کیوں کہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو، اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہو سکتی اور نہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ مشعل راہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اس کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے۔ جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلّہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو۔ ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو، ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کر دے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنا دیا ہو، آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہری کی پادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوت کے بغیر طے نہ ہو سکیں، گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی ......کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکمت الٰہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح وطلاق تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ اپنے گھر بار، جائداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی سلسلوں میں بھی اس مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اس کے بالمقابل رواج

کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الٰہی کے ادعاء کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع ورغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون الٰہی سے بغاوت نہ رکھا جائے۔

پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو، وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعویدار کس منہ سے ہوسکتی ہے؟

حکومت الٰہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں۔ ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جاسکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد

حفاظت نظام زندگی...... ''آزادی'' اس نصب العین (حکومت الٰہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے۔ سو اس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے، جو دلوں کے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیوں کہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رسمی ماحول کے اثرات سے آزاد کر دینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت الٰہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ ساری آزادیاں اس میں پنہاں ہیں۔ آزادئ ضمیر اس کا پہلا قدم ہے کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴾ ①
﴿لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ﴾ ② ''یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ یہ سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے، پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔ (دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں)''۔ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ ③ ''کفار پر سخت اور آپس میں مہربان''۔

بہر حال صلہ رحمی، تعاون باہمی، ایثار مروت، ہمدردی ومحبت، غریبوں کی مدد، چھوٹوں پر رحمت، بڑوں کی توقیر، علماء سے حیا، ربانیوں کی تعظیم، اطعام طعام، تحیہ وسلام، عبادت الٰہی، شفقت علی الخلق، پڑوسیوں کی خبر گیری، یتامیٰ ومساکین کی اعانت، بیماروں کی عیادت، جنازوں کی مشایعت، مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی بیخ کنی، اداء حقوق، دفع مظالم، سادگی بے تکلفی، قناعت وزہد، حب آخرت، طلب حق، انصاف وحق پرستی، امت مرحومہ کے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۹. ② پارہ: ۲، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۵۴.
③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ، وہ ابواب ہیں جو اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی و تنظیم ہے۔

اس اسوہ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کافور ہوجاتی ہے۔ آزادی مذہب، آزادی ضمیر اور آزادی علم وعمل حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امت ہی ہوسکتے ہیں اپنی جماعتی قوت سے امّت کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لاکر باآسانی کرسکتے ہیں، کہ وہ اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں ''اشاعت دین الٰہی،، اور ''اقامت حکومت الٰہی'' کی عرض کردہ دفعات شامل کرلی جائیں تو قوم اسی طرح عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرون اولیٰ میں پہنچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی...... دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے ۱۹۱۹ء جب سے تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور ان پر عمل درآمد ہوا، جمعیت العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی راہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیت علماء ہند کے پچیس سال...... اس دوران آج تک کون سی تحریک ہے جس میں جمعیت علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چاٹگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہنچادیا۔ جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ چلایا۔ جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی۔ جس نے شدھی کی تحریک سنگھٹن کے ہنگاموں نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور سارداایل کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا؟ کیا وہ جماعت جمعیت علماء ہند ہی کی نہ تھی؟

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی، اس کا نصب العین مستقل، اس کا نظام عمل مستقل تھا۔ اس لئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھ کر اس نے رائے قائم کی۔ کسی ادارے سے اس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہوسکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے۔ جو اس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اس پرواز پر اس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بقدر استطاعت کررہی ہے۔ جب کہ اس کے

کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جارہی ہیں۔

بہر حال جمعیت العلماء کوئی آج کی جمعیت نہیں ہے۔اس کی تشکیلات بدلتی رہتی ہیں۔لیکن اس کا قوام آج کے سارے سیاسی اداروں سے قدیم ہے۔

جمعیت علما ہند تاریخ کے آئینے میں...... جمعیت علما ہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز شاداب درخت کی مانند ہے، جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو "بعون اللہ" حیات تازہ ملتی ہے۔اس جماعت کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسمی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالا کوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا اور شہادت کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی۔اسی جماعت کے اکابر تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے۔خانماں برباد ہوئے اور اس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔کیوں کہ ماضی وحال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بزرگان دیو بند...... حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالا کوٹ کے اس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کر سکتے۔جہاں خاندان ولی الٰہی کی چشم و چراغ چند جانباز ہستیاں رداء شہادت اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہو سکتی ہیں، جہاں حجت الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانی دار العلوم دیو بند ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جا سکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے دوچار رہے۔نہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جا سکتی ہے۔جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاری اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔جو آج جمعیت علماء ہند کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۴ء کے مجاہدین...... ۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم وعمل میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا حبیب اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگاریں ہیں۔جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر گواہ ہے۔آپ حضرات کا ناز پروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر ان مصائب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔جو ممدوح نے سرحد افغانستان سے لے کر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھ کر اٹھائی ہیں۔اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج بھی کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونے کی امید میں گزار رہے ہیں۔انہوں نے حجاز، افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا۔روس کا انقلاب ماسکو پہنچ کر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ

انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لمحہ اس ساری سیاست کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علماء کے وجود کو ختم کر دینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ...... حضرت شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں اور آپ کے قلوب ان کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نینی تال جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت محترم اس وقت جمعیت العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلہ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔

حضرت ممدوح اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہ مہاجر مکی کے مجاز، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ ان کے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص وایثار سے ان کے مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ...... اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں، حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم وتدبر کا روشن مینار ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم ان کی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پا لیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیت علماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقع ہے اور زمانہ ان کی خدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہر حال جمعیت علماء کی رسمی اور غیر رسمی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتداء حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہر حال جمعیت علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اسی ساعت سے آزادی کے لئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی، گو اس کی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب جدا جدا رہے۔ آج کے دور میں اس کی وہی جدوجہد عسکری رنگ کی بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیت العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کر دوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیت کے سامنے پیش کرنے کے لئے۔ تاکہ ذمہ داران جمعیت اس پر غور وفکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ...... اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص، تعلیم عوام اور شہرو

دیہات میں اس کی ہمہ گیری، درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ، مسئلہ تذکیر وموعظت، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الٰہی کی تنفیذ۔ فصل خصومات محکمۂ قضاء شرع، حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوہ حسنہ، توحید مطلب، عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بدنظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائے گا، لیکن اس کو چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگرام کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں، جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسری انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہے۔ لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے، اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد واختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے۔ اس نے تمام بنیادی ازم مثلاً نیشنلزم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے، جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں، قومیں سب برابر تھیں، اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان، انسان سب برابر تھے۔ پھر ان میں حاکم ومحکوم کی تفریق کیسی؟ اور اگر کی جاتی تو وہ نوع ورعیت سے چل کیسے سکتی تھی۔ بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کر دیا، جس کا قانون اسلام اور عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعہ اتحاد مسلمانوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟

اس لئے اگر مسلمان خلوص دل سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوتوں کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں اور اختراعی اور دل آفریں نصب العین سامنے لا لا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کے چلانے کے لئے بہرحال جماعت اور اس کے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیت العلماء پر۔

کانگریس اور لیگ...... کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا، اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسلمانوں اور سوراجی ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اس کو پھل پھول لگے۔ گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر منقح آزادی کے سوا نیزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت

مالویہ اور سوامی شردھانند نے اسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لے جا کر غرق کر دیا۔

کانگریس کی تاسیس......کانگریس کا قیام درحقیقت ۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا، حکومت برطانیہ دولت عظمٰی بننا چاہتی تھی اور اسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی، جو ہندوستان کے انقلابی رجحانات کا رخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کر دے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا۔ چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز) چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہوگئی اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی۔

کانگریس ۱۹۱۶ء میں......۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اسے زندگی کا نصب العین دیا اور آزادی کا پر جوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہہ دیا جانا بے جا نہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس کے موجد کا کمال تھا کہ اس کے دونوں پلے نصف صدی گذارنے اور سو بار پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہے اس کی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلے میں جو نام پیدا کیا، مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں، مگر کماحقہ پھلوں کی فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ......یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست و گریبان ہے۔ یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجود بھی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلے میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں، دوسروں کے لئے اپنا پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہ جاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جس میں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ آج یہ جھولا پاکستان پر آ کر رکا ہوا ہے۔

مسئلہ پاکستان......ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے الہام نہیں ہے۔

دنیا میں جب کوئی اسکیم ابھرتی ہے تو اس کو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کر دیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم لیگی خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں، جن کا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے۔ لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جس کی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔

تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کروں گا کہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اس کی تمام دفعات واضح کر دیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسے غور و بحث کے لئے پیش کر دیں۔ تا کہ جن مسلمانانِ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے، وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

مخالفین پاکستان...... ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کروں گا کہ جب کہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نااتفاقی اور اختلاف ہے۔ جب تک تمام ہندوستان متحد نہ ہو جائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا انمول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کر سکیں۔ اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انہیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کر لینا چاہئے، فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائے گا اور اسے چلتا ہوا دیکھ کر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے نیچے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں، اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائے گا۔ محض آپ کے مان لینے سے اس کی کوئی ہستی قائم نہیں ہو جائے گی۔ جب تک کہ خود اس کی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔

بہر حال یا اس کی توضیح و تشریح سامنے آئے تا کہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جا سکے اور یا اس کے ابہام و اجمال کے باوجود اس کی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کر کے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تا کہ منزل مقصود سامنے آئے اور اس کی حقیقت کو خود کھولنے کی بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھل کر یا دنیا کی سر آنکھوں پر آجائے یا اس کے قدموں سے پامال ہو جائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ، سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر عرض کروں گا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان

ہی عائد ہوگی۔ کیوں کہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض ان کی خاطر یا بوجہ الاتحاد قبول کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع وضرر کے وہ ہی ذمہ دار ہوسکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کردیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بناء پر پھر بھی ذمہ داری انہیں پر ہے، جو نہ اسے واضح کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے کھلی منڈی میں کھول کر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس کی صحت وسقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کرلے تو پھر بلاشبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے جس کا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہوسکے گا۔ ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھول دینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور وفکر کرلیں، مگر آزادیٔ وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھ کر۔

لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہوجائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے۔ بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول وعدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے، جس کو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم...... اس لئے ناگریز طریقہ پر اس شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کرسکتی ہے جو مسلم اقوام کی اسلامی تعمیر کی لائنوں سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے۔ جس نے اس وقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی راہنمائی کی، جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس لئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے تو سیاسی جہاد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیت العلماء کے اور کون ہے جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اس لئے بھی کہ تجربہ اور عمل پیہم اس کے ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب وسنّت کے سوا اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہوسکتا اور کتاب وسنّت کے صحیح علم کے لئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ (حقیر کوشش) کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں۔ کہ وہ اس کے کھرے کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو ان عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کردے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کرسکتی ہے۔ اس نے اب تک جس طرح دفاع ملی کی زریں خدمات انجام دی ہیں، جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اب بلحاظ وقت ومصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیت علماء ہند کی قدر وقیمت...... ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب وسنّت کے اصول پر ہو

اور پھر اسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کی جائے۔ بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع، دواعی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پر حوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للّٰہیت و بے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھ کر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں۔ یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند، کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیا خبر ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہو اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ ﴿وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ﴾

آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل وعقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقع دیا کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں۔

ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے امت کا علمی میدان۔ یہ محض ان کی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرہ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آ رہا ہے۔

گدا بہ تخت نشانند و بادشاہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص و للّٰہیت سے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

﴿فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ. اَلَآ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْہِ فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ①

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دار العلوم دیوبند
۱۵ اپریل ۱۹۴۴ء

① پارہ:۱۸، سورۃ النور، الآیۃ:۶۳،۶۴.

مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو "اسلامی معاشرت،، ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے سارے مل کر اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل در آمد ہو اس کے اوپر۔ اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کرسکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں، مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾ [1] . صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

حسن مقام...... بزرگانِ محترم! آپ کے اس عظیم الشان شہر میں جو اپنے حسن و خوبصورتی، فضا کی وسعت، آب و ہوا کے اعتدال اور مناظر کی خوبی کے لحاظ۔ سے ہندوستان کے شہروں میں ایک ممتاز ترین شہر ہے اس کی طرف قدرتی طور پر قلوب اور طبائع کی کشش ہوتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر میں وزارت عظمیٰ سے ریٹائرڈ ہوا تو بنگلور میں جا کر قیام کروں گا، اس سے بہتر ہندوستان میں دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہر حال یہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک ممتاز شہر ہے۔

مرکز جہاد و شہادت...... سلطان ٹیپو کا یہ وطن ہے، ان کے مجاہدانہ کارناموں کا یہ مرکز رہا ہے۔ ان کی شہادت اسی مقام پر ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک سلطان وقت کی شہادت تنہا ایک کی شہادت نہیں ہوتی، معلوم نہیں کتنے

[1] پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۱۴۔

افراد کو انہوں نے جام شہادت پلایا ہوگا اور کتنے لوگ یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ ان ہی شہداء کی اولاد آپ ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے جذبات آپ کے اندر نہ ہوں۔

وہ ولولہ، وہ جوش جہاد، وہ شہادت کا ذوق آبائی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے خواہ آپ کو احساس نہ ہو "الولد سر لابیہ" باپ کے جو جذبات ہوتے ہیں وہ قدرتی طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ تو اپنی معنویت کے لحاظ سے یہ زمین جوش اور جذبہ اور دینی ولولہ بھی رکھتی ہے۔

اکرام ضیف...... اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہم لوگوں کے سامنے آئی وہ آپ کے اخلاق کی وسعت ہے۔ ہم لوگ حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ مہمانوں کی مدارات میں، ضیافت میں، اکرام اور توقیر میں یہاں کے لوگوں نے جو جذبہ دکھلایا ہے، وہ ایک ممتاز قسم کا جذبہ ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ﴿مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ.﴾ ① "جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے"۔ اس تعلیم نبوت کے ماتحت آپ نے مدارات میں انتہاء کی خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کی خوبی کے ساتھ، مہمانوں کا قیام، ان کی آمد، ان کی توقیر، یہ ایک ممتاز صورت رہی ہے۔

یہاں اس سے بھی بڑھ کر عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ آنے والوں کا آپ شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں اور محض ظاہر داری کے طور پر نہیں بلکہ دلوں کے جذبہ سے حضرت مولانا ابوالسعود صاحب جو صدر استقبالیہ ہیں، انہوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے بھرپور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ تو حیرت یہ ہے کہ مالی قربانیاں آپ نے دیں، جانی محنت آپ نے کی، مہمانوں کو راحت پہنچانے میں انتہاء آپ نے کی۔ اوپر سے شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں یہ عالی ظرفی اور قدر شناسی کی انتہاء ہے کہ آدمی سب کچھ کرے اور پھر یہ کہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔

ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ بادل وہ ہے جو برسے اور گرماوے یعنی برس کر گرماتا ہے کہ وہ پھر آمادہ ہے برسنے پر، اس کا جذبہ یہی ہے کہ میں مخلوق کو پانی دوں اور حیات بہم پہنچاؤں، دوسرا مصرعہ ہے کہ سخی وہ ہے جو دیوے اور شرماوے تو سب کچھ دے رہے ہیں اور شرما بھی رہے ہیں۔ ندامت کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے۔ لیکن ہمارا فریضہ بھی آپ ہی نے ادا کر دیا اب ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیا چیز ادا کریں اور ادا کریں بھی تو واقعہ یہ ہے کہ جتنے جامع طریق پر آپ نے مہمان داری فرمائی، جلسہ کو کامیاب بنایا ہمارے پاس الفاظ اتنے جامع نہیں ہیں کہ جو حاوی ہو جاویں آپ کے شکریہ کے اوپر۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر...... لیکن شکریہ کا ایسا طریقہ کیا ہو کہ جب انعام اور نعمت تو ہو بے انتہاء اور شکریہ کے الفاظ ہوں محدود۔ ایسے موقع کے لئے خود شریعت نے ہمیں بتلا دیا کہ لامحدود شکریہ کس طرح ادا کر دیں۔

ایک طریقہ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بتلایا۔ حق تعالیٰ نے جب ارشاد فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ

① الصحيح للبخاري، كتاب الادب، باب من كان يومن بالله واليوم الآخر، ج: ۱۸، ص: ۴۳۶.

شُکْرًا﴾ ① ''اے داؤد! میری نعمتوں کا شکر ادا کرو''۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حقائق الٰہیہ کی جو سمجھ اور فہم انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں دی جاتی۔ بلکہ جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب ان کی ہی جوتیوں کے صدقے سے آتی ہیں اور ان ہی کی برکات سے آتی ہیں۔ تو داؤد علیہم السلام کو حکم دیا گیا کہ میرا شکر ادا کرو۔ انہوں نے عرض کیا، یا اللہ! کس طرح ادا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ جب ہی تو شکر ادا کر سکوں گا۔ اس کی طاقت بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق دینا، طاقت دینا خود ایک مستقل نعمت ہوگئی پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت پہلے نکل آئی، پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ تو ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں عاجز ہوں کہ شروع کس طرح سے کروں شکریہ کو اور ادا کس طرح سے کروں۔ ہر شکر سے پہلے ایک شکر اور ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو میں عاجز ہوں شکر ادا کرنے سے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اے داؤد! جب تم نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور تم شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے، کون ہے جو شکر کا حق ادا کر سکے۔ ②

نعمتیں لامحدود اور شکر ہمارا محدود، طاقتیں ہماری محدود، ممکن نہیں کہ اللہ کا شکر کما حقہ ادا کر سکیں۔ اس لئے صورت یہی ہے کہ اپنے عجز کا اظہار کرے اور اپنے قصور کا اعتراف کرلے کہ بھائی ہم شکر کو ادا نہیں کر سکتے، تو یہی ادائیگی شکر ہے۔ یہ تو طریقہ داؤدی ہے جو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب شکر بہت سا لازم ہو جائے اور ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو اعتراف کو لو عجز کا کہ بھائی! عاجز ہیں۔ نہیں ادا کر سکتے شکر کو، یہی شکر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ...... ایک طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر نعمتیں لامحدود ہوں تو تم بھی لامحدود شکریہ ادا کرو۔ مگر بندہ ہے محدود، وہ لامحدود شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ تو الفاظ ایسے ارشاد فرمائے کہ وہ لفظ اس شکر کو لامحدود بنا دیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور شکر ادا کیا کہ:

''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَآئِمًا مَّعَ دَوَامِکَ'' ''اے اللہ! تیرے لئے حمد ہے اور دائمی ہے جب تک کہ تو دائم ہے'' اور تیرے دوام کی کوئی حد نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی حد نہیں۔ اور فرمایا کہ: ''وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَّعَ خُلُوْدِکَ'' ③ (الحدیث) ''اور تیرے لئے حمد ہے جب تک کہ تو رہنے والا ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے'' ''تو میری حمد بھی ہمیشہ رہے گی تیرے ساتھ۔ اور فرمایا کہ: ''وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَّامُنْتَھٰی لَہٗ دُوْنَ مَشِیْئَتِکَ''۔ ''اور تیرے لئے حمد ہے ایسی حمد جو تیری مشیت کے ساتھ ساتھ چلے''۔ اور تیری مشیت کی کوئی

① پارہ: ۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳۔ ② تفسیر روح المعانی، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳، ج: ۱۶، ص: ۲۷۳۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمہ محمد، ج: ۱۲، ص: ۲۷۴۔

انتہاء نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی انتہاء نہیں۔ تو آدمی جب پوری حمد اور پورا شکر ادا نہ کر سکے، تو اعتراف عجز کے بعد یہ بھی کہہ دے کہ یہ حمد دوامی ہے، تو اللہ ان لفظوں کو ہی دوامی بنا دیتے ہیں اور وہ شکر بھی دوامی بن جاتا ہے۔

اظہار تشکر...... اس لئے کہ اگر ہم آپ لوگوں کا اس مہمانداری پر شکریہ ادا کریں اس لیاقت پر اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے پر، تو ایک تو یہ عرض کریں گے کہ ہم عاجز ہیں آپ کا شکر ادا کرنے سے۔ یہ تو ہے سنتِ داؤدی علیہ السلام اور ایک یہ عرض کریں گے کہ جب تک آپ باقی ہیں، آپ کی نسلیں باقی ہیں ہمارا شکریہ آپ کے ساتھ ہے، تو یہ دوامی شکر ہو گیا۔ اپنی طرف سے عجز کا اظہار بھی ہے اور دوامی شکریہ بھی ہے۔ پھر ان شاء اللہ دوامی طور پر ساتھ بھی رہے گا۔

پرسنل لاء کا مفہوم...... بہر حال اس عظیم الشان شہر میں جس کے اندر ظاہری اور باطنی خصوصیات ہیں، جس کے باشندوں کے اندر اخلاقی بلندیاں ہیں، اس عظیم الشان پنڈال میں یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ جس کا موضوع ہے مسلم پرسنل لاء، یہ جلسہ ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کا میں ابھی اپنے بزرگوں سے پوچھ رہا تھا کہ پرسنل کے حقیقی معنی کیا ہے؟ اس لئے کہ لفظ انگریزی کا ہے، ہم تو پوری طرح انگریزی جانتے نہیں۔

تو میں نے تحقیق کی کہ پرسنل کے معنی کیا ہیں۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ مخصوص قانون جو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو، اسے پرسنل لاء کہتے ہیں۔ مگر کہا یہ گیا کہ پرسنل کے معنی ذاتی کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذاتی قانون، مسلمانوں کا شخصی قانون۔ ان کے احوال شخصیہ کے بارے میں مذہبی ہدایات پر مبنی قانون اس میں ذاتی قانون آجاتا ہے، ذاتی افعال واحوال کے متعلق بھی باتیں آجاتی ہیں۔ خاندانی اور عائلی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ نکاح ہو، طلاق ہو، ہبہ ہو، میراث ہو، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں تو مسلم پرسنل لاء کے معنی یہ نکلے کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ذاتی قوانین، خاندانی اور عائلی قوانین یہ ہیں جن کا تحفظ آپ کو مقصود ہے۔ یہ مسلمانوں کا قانون کہا جاتا ہے۔

دنیائے انسانیت کا قانون...... لیکن میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون ہی نہیں۔ قانون درحقیقت اسلام کا ہے، مسلم قوم کا کوئی قانون ہی نہیں، جو مان لے۔ اس کا نام مسلم ہے۔ جو نہ مانے اس کا نام غیر مسلم ہے۔ لیکن قانون خود مسلمانوں کا شخصی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی قانون وضع کیا ہے نہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ قانون اسلام کا ہے اور اسلام کا قانون پوری دنیائے انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی مخصوص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ آپ کا قانون نہیں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کا قانون ہے۔ ان لفظوں سے کہ ''مسلمانوں کا قانون'' ایک تعصب اور ایک حد بندی ٹپکتی ہے۔ تو غیر مسلم کہے گا کہ مجھے اس سے کیا تعلق یہ تو مسلمان کا قانون ہے۔ اس سے تعصب چلے گا، وہ غور کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا۔ چوں کہ مسلمانوں کا قانون ہے میرا قانون نہیں۔ مجھے اس پر غور وفکر کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ مسلم قوم کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون نہیں، وہ تو خدا کا قانون ہے جیسے ہمارے لئے آیا ہے تمہارے لئے بھی آیا ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ إِلَى

النَّاسِ کَافَّةً" ① ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ کسی پیغمبر کا دائرۂ عمل خاندان ہوتا تھا جیسے نبی اسرائیل کے انبیاء کہ وہ بنی اسرائیل کے خاندان کے لئے آتے تھے۔ غیر اسرائیلی سے انہیں تعلق نہیں تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں، باقی دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں نہ اور قوموں سے میری غرض ہے میں تو اسرائیلیوں کی اصلاح کے لئے آیا ہوں''۔ تو بعض انبیاء تو خاندان کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے اور بعض انبیاء وطنوں کی اصلاح کے لئے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام، کہ چار شہروں کی اصلاح ان کے سپرد فرمائی تھی۔ تو'' کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّةً''

ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''وبعثت الی الناس کافۃ'' ''میں دنیا کی تمام اقوام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں''۔ اسی واسطے قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاں عبادت عامہ کی ہدایت فرمائی یا ایمان لانے کی ہدایت فرمائی، تو اس جگہ انسانوں کا لفظ استعمال فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ ② ''اے دنیا کے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو''۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ ③ ''اے دنیا کے انسانو! جو آج موجود ہیں یا آئندہ جو تمہاری نسلیں آئیں گی ان سب کے لئے میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ تو آپ علیہ السلام کسی خاص نسل خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، کسی خاص وطن کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آئے ہیں۔

مبنائے تعصب...... اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو تعصبات ہیں اس کا مبنیٰ یہی ہے کہ ان کا دین و مذہب ہی اس قوم کے لئے مخصوص ہو کر آیا ہے۔ تو وہی خاندان اپنے دین کو لئے بیٹھا رہا ہے۔ دوسرے خاندان والوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا تعلق، ان کے وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس پر عمل کریں، لیکن جب یہ اعلان کیا گیا کہ میں کسی خاص وطن یا خاص قوم کی طرف نہیں آیا، میں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آیا ہوں، تو اب دنیا کی قوموں کو دعوت مل گئی فکر کی کہ جب ہمارے لئے بھی یہی قانون ہے تو ہم بھی اس میں فکر کریں اور اطاعت کریں۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی محرومی ہوگی۔ پیغام اللہ کی طرف سے عام ہے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ کوئی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔

قانون فطرت...... بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ شخصی قوانین، تو مسلمان کا من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے۔ وہ خدا کا قانون ہے۔ ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچالے جائیں، نہیں

---

① السنن للنسائی، کتاب الغسل والتیمم، باب التیمم بالصعید، ج: ۲، ص: ۲۰۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۲ ص: ۶۷رقم: ۴۳۲. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۲۱.
③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸.

ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو خواہ وہ شخصی چیز ہو، خواہ خاندانی چیز ہو، اس لئے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں زبردستی کے قانون نہیں کہ عقل نہ مانتی ہو اور دل نہ مانتا ہو اور زبردستی اس کے اوپر ڈالا جائے، یہ بات نہیں بلکہ آدمی جب غور کرے گا، فطرت کے مطابق پائے گا۔ اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے۔ اس ماننے والے انسان کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک اور اس کے درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں، سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایت ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو۔

ذات انسان پر نفاذ قانون...... افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں۔ آج پیدا ہونے والا بچہ جو بالکل ہی مضغہ گوشت (گوشت کا لوتھڑا) ہے نہ اسے عقل ہے نہ تمیز، مگر اسلام کا قانون اس پر لاگو ہوا کہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو۔ سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچاؤ اور کہو کہ اللہ اکبر، اللہ ہی بڑا ہے اور کسی میں بڑائی نہیں ہے اس کے دل میں بٹھا دیا جاتا ہے کہ عظمت خداوندی یہ تیرا جو ہر ہے۔

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔" "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں"۔ جب آدمی ان بنیادی عقیدوں پر آ گیا اور یہ بات ایک بچے کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب آگے عمل ہے، فرمایا کہ "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ" سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ عبادت خداوندی ادا کرو۔ جب یہ بھی اس کے دل میں جما دیا آپ نے، آگے عام زندگی کے بارے میں ہے "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" عام فلاح و بہبود کی طرف آؤ۔

ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت...... اب رہا یہ کہ وہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ آپ کو فائدہ کیا ہے کہ دائیں کان میں اذان کہیں اور بائیں کان میں تکبیر کہیں، یہ تو ایسا ہے جیسے آپ نے کسی دیوار کے سامنے وعظ کہہ دیا، وہ دیوار کیا سمجھے گی۔ لیکن یہ چیز غلط ہے، بے شک اس بچہ کو عقل نہیں شعور نہیں، لیکن اس بچہ کا قلب ایک سفید تختی کی مانند ہے، جو اس پر چھاپو گے وہی چھپ جائے گا اور جب ہوش سنبھالے گا تو وہی کلمات کہتا ہوا ابھرے گا۔ جو آپ نے اس کے دل پر چھاپ دیئے ہیں۔ تو اگرچہ عقل و شعور نہیں مگر استعداد قبولیت کی ہے، جو کلمہ اس کے کان میں ڈالیں گے وہ چھپ جائے گا اس کے دل کی سفید تختی پر، جیسے یہ ریکارڈنگ مشین ہے، ہم جو تقریر کر رہے ہیں وہ اس میں چھپتی جا رہی ہے۔ اسے نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ ایک جامد محض چیز ہے لیکن ساری تقریر اس میں جم جائے گی۔ جب آپ اس کی کل اینٹھیں گے وہ ساری اگل دے گی جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے۔

تو کیا ایک انسان کے بچے کا دل اس مشین سے بھی گیا گزرا ہے۔ انسان نے اپنی عقل سے اس کی تخلیق کی

ہے تو وہ عقل خود کتنی بڑی ہوگی اور اس بچے میں عقل تو ہے مگر نشو ونما پائی ہوئی نہیں ہے۔لیکن جو ہر موجود ہے جو آپ اس کے کان میں ڈال دیں گے وہ اس کے دل میں چھپ جائے گا۔

دور تربیت...... اس سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ یہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ پانچ برس کا ہو تو مکتب میں بٹھا دو، اب تربیت شروع ہوتی ہے۔نہیں، فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔فرق اتنا ہے کہ وہ مخاطب نہیں بن سکتا ہے۔مگر ماں باپ کا کام ہے کہ ڈالیں اس کے اندر ایسی چیزیں کہ جو حقی اور سچی ہوں۔

تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے کوئی برا کلمہ نہ کہیں، جو کلمہ کہیں گے وہی اس کے قلب میں چھپ جائے گا، وہی نشو نما پا کر ابھرے گا اور وہی کہے گا۔اس لئے جو بات بھی اس کے سامنے کریں وہ حقی اور سچی کریں، عمدہ کریں تا کہ اس کے دل میں وہی بات چھپ جائے، اسی طرح سے اس کی آنکھیں ایک آئینے کی مانند ہیں اس کے دل میں گو شعور واحساس نہیں لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ماں باپ بچے کے آگے کوئی بے حیائی کی حرکت نہ کریں۔اگر بے حیائی کے کام کرتے ہیں تو وہی اس کی آنکھ کے راستے سے جا کر اس کے دل میں چھپ جائیں گے اور جب وہ ہوش پائے گا تو وہ بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کرتا ہوا ابھرے گا۔تو کان میں اچھی بات ڈالو اور آنکھ کے سامنے اچھے نقش پیش کرو۔خیالات اس کے دل میں اچھے جماؤ تا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اچھا بنے۔اقوال بھی اس کے اچھے ہوں، افعال بھی اس کے اچھے ہوں۔تو تربیت کا زمانہ یہ نہیں کہ پانچ چھ برس کے بعد آتا ہے بلکہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون......فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں مخاطب ہیں ماں باپ کیوں کہ اس بچے کے اندر مخاطب بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔اس کا حاصل یہ نکلا کہ اسلامی قانون ایک انسان کے صرف افعال پر لاگو نہیں ہوتا، بلکہ ذات پر بھی لاگو ہے، اس لئے کہ یہ بچہ افعال ادا کرنے کے تو قابل نہیں مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔

اسلام کا قانون اس کی ذات پر آ گیا تو وہ قانون زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔آپ نے اذان کہہ دی، تکبیر کہہ دی، اب نماز باقی رہ گئی۔علماء لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ وہ نماز ہے اس نے اذان اور تکبیر کی۔آج تو آپ نے تکبیر اور اذان کہی اور جاتے ہوئے اسے آپ نے نماز پڑھ کر رخصت کیا۔تو ایک مسلمان کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان میں ہے۔گویا ابتداء میں بھی اسے اللہ کے نام نے گھیر رکھا ہے اور انتہاء بھی خدا کی عبادت پر جا کر ہوئی تو ابتداء کرو اس کی اذان اور تکبیر سے اور انتہاء کرو اس کی نماز کے اوپر، تو ساری زندگی اس کی دو چیزوں کے درمیان آ جائے گی، عظمت خداوندی، توحید خداوندی توحید الٰہی، اقرار رسالت اور نماز کا جذبہ اور ختم ہوگا وہ نماز کے اوپر تو ظاہر بات ہے کہ جنازہ کی نماز تو آپ ہی پڑھیں گے میت کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے وہ تو بیچارہ کفن پہنے لیٹا ہوا ہے مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔نفس تو موجود ہے۔تو اسلام کا قانون اس کی ذات پر لاگو ہوا۔افعال تو بعد کی چیزیں

ہیں۔تو جو قانون ذات پر لاگو ہو وہ افعال پر کیوں لاگو نہ ہوگا۔وہ اقوال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا۔وہ اعمال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا تو انسان کی ذات اور افعال سب گھرے ہوئے ہیں اسلامی قانون کے تحت۔

تعلیم فطرت......ظاہر بات ہے کہ یہ قانون اگر غیر مسلم بلکہ سارے انسان تسلیم کریں تو کیا یہ کوئی برائی کی چیز ہے کہ ابتداء ہی میں خالق کی عظمت دل میں بیٹھ جائے۔یہ تو ہر قوم کے غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ پیدا ہوتے ہی توحید الٰہی اور رسالت کی شہادت اس کے دل میں ڈال دو۔''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ'' کہہ کر اسے عبادت خداوندی پر آمادہ کرو۔معاذ اللہ یہ کوئی بری چیز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ فطرت کے مطابق تعلیم ہے اور یہ تعلیم قوم مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔کوئی غور نہ کرے یہ اس کی محرومی کی بات ہے لیکن اسلام نے تو غور کا دروازہ کھول دیا ہے۔

مگر جب آپ یوں کہیں گے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور وہ ہمارا قانون ہے،میری قوم کا قانون الگ ہے اور جب آپ یہ کہیں گے کہ نہ ہمارا قانون نہ تمہارا قانون۔یہ تو خدا کا قانون ہے جس کے مکلف ہم سب قرار دیئے گئے ہیں،اب موقع آئے گا ان کے غور وفکر کا کہ جب ہمیں بھی پیغام دیا گیا ہے تو بھی اس پر غور کریں۔

اسلامی پرسنل لاء......اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ماننے کے لحاظ سے یہ مسلم پرسنل لاء ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ اسلامی پرسنل لاء ہے،یہ خدا کا قانون ہے جو سب کے لئے عام ہے۔بچپن سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر میدان حشر تک،اور میدان حشر سے لے کر جنت تک اور جنتوں میں داخل ہونے کے بعد ابدالآباد تک یہی قانون چلتا رہے گا اور اسی میں ترقی ہوتی رہے گی۔حشر میں اور ہوگی،جنتوں میں جا کے کچھ اور ہوگی۔مگر بنیادی طور پر یہی قانون رہے گا اور انسان کی ترقی اسی سے ہوتی رہے گی۔

پرسنل لاء کا تحفظ......بہر حال مسلم پرسنل لاء کا اصل مقصد یہ ہے کہ عائلی قوانین جو ان کی ذات پر لاگو ہیں ان کا تحفظ ہو،حقیقت یہ ہے کہ ہماری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہم کسی قوم سے لڑتے ہیں۔ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس قانون کو تم بھی اختیار کرو اور اگر نہیں اختیار کرتے تو کم سے کم ہم کو تو عمل کرنے دو،تم اس میں کیوں رکاوٹیں ڈالتے ہو؟

ان رکاوٹوں کا دور کرنا یہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہمیں عمل کرنے دو،اگر تم محروم رہنا چاہتے ہو اور نہیں عمل کرتے تو عمل کرنے والوں پر پابندیاں کیوں عائد کرتے ہو؟ کیوں اس میں رکاوٹ ڈالتے ہو تو مقصد اصلی ان قوانین کا تحفظ ہے۔

اب اگر اس تحفظ کے سلسلے میں آپ لفظوں سے دباؤ ڈال سکیں تو لفظوں سے دباؤ ڈالیں،کوئی اور تجویز ہو اثرات ڈالنے کی آپ اسے اختیار کریں،مگر مقصود اصلی حفاظت ہے اس قانون خداوندی کی تو اس کو ہم محسوس کریں اور اس کا احساس ہمیں ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قانون کوئی بت یا تصویر ہے،وہ رکھا ہوا اور آپ شور

مچائیں کہ صاحب! وہ ہے قانون پرسنل لاء کا، اس کی حفاظت آپ کریں۔

طریق تحفظ...... قانون کی حفاظت یہ ہے کہ آپ اس کو استعمال کرنا شروع کر دیں، پس وہ محفوظ ہو جائے گا اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ لیکن شور مچاؤ کہ وہ رکھا ہوا ہے قانون، تو قانون کوئی بت ہے جس کی حفاظت کر رہے ہیں یا کوئی وہ تصویر ہے؟ سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ آپ اسے اپنے اندر رچا لیں، اس پر عمل درآمد شروع کر دیں تو قانون مجسم بن جائیں گے۔

ذرائع حفاظت کی سعادت...... پرسنل لاء کوئی مٹنے والی چیز نہیں ہے، کوئی کتنا ہی مٹائے وہ خود مٹ سکتا ہے اس لئے کہ پرسنل لاء کے قانون کی جڑیں قرآن اور حدیث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اسلام ہے اور اسلام دوامی زندگی لے کر آیا ہے مٹنے کے لئے نہیں آیا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی ہے۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ.﴾ ① ”ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں“۔ تو حفاظت ہوگی اللہ کی، اس میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا ہے۔ ہمارے لئے سعادت یہ ہے کہ ہم ذریعہ اور سبب بن جائیں اس کی حفاظت کا۔ حافظ حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں لیکن اگر ہم وسیلہ بن گئے تو ہمیں سعادت حاصل ہو جائے گی ورنہ اگر ہم عمل نہ کریں اور نہ حفاظت کریں پھر بھی مٹنے والا نہیں ہے۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْآ اَمْثَالَكُمْ.﴾ ② ”تم اگر سب مل کر اس دین کی حفاظت سے پھر گئے تو تمہیں نکال دیا جائے گا اس دین سے اور دوسری قومیں لا کھڑی کر دی جائیں گی“۔

وہ اس دین کی حفاظت کریں گی، اس لئے سعادت تو ہماری ہے اگر ہم سبب اور ذریعہ بنیں اس کی حفاظت کا۔ ہم خود حافظ نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ حفاظت کرنے والا حفاظت کر رہا ہے۔

اس قانون کے خلاف کتنے کتنے مصائب، کتنے بڑے بڑے دشمن کھڑے ہوئے، لیکن آج ان دشمنوں کا نام ونشان نہیں اور قانون خداوندی پھر اسی شان سے موجود ہے، قرآن بھی محفوظ، حدیث بھی محفوظ، فقہ بھی محفوظ ساری چیزیں اپنی جگہ ہیں، انکار کرنے والے گزر گئے، آج کوئی نقش پا بھی ان کا پتہ بتلانے والا نہیں یہ قانون تو اپنی جگہ رہے گا حفاظت خداوندی سے، ہم اگر ذریعہ بن جاویں اس کی حفاظت کا ہمیں سعادت حاصل ہو جاوے گی۔ انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو جاویں گے ورنہ یہ تو محفوظ رہنے والی چیز ہے۔

ہم جو شور مچا رہے ہیں وہ درحقیقت اپنی حفاظت کے لئے، پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے نہیں، وہ تو محفوظ ہے ہم جتنا اسکا دامن پکڑ لیں گے اتنا ہی محفوظ ہو جائیں گے کیوں کہ محفوظ کا دامن پکڑ کر آدمی خود محفوظ ہو جاتا ہے آپ سے پرسنل لاء کی حفاظت نہ ہوگی، بلکہ پرسنل لاء سے آپ کی حفاظت ہوگی تو ہم اپنی حفاظت کے لیے اسے دانتوں سے مضبوط پکڑیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کوئی خلل انداز ہو۔ ابھی تو ہم مدمقابل سے لڑنے کو تیار

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: سورۃ محمد، الآیۃ: ۳۸۔

ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے اندر کوئی خلل ڈالے۔ حکم خداوندی یہی ہے۔

تو واضح ہوگیا کہ پرسنل لاء کا قانون اسلامی قانون ہے کسی مخصوص قوم کا قانون نہیں، ماننے والے کا نام مسلم ہے تو وہ مسلم قانون کہلائے گا نہ ماننے والے کا نام غیر مسلم ہے۔ تو غیر مسلم کا قانون نہیں رہا اور نہ وہ حقیقت میں انسانی قانون ہے، انسان کی برتری اور اس کی حفاظت اور ان کی خوبی اور دنیا وآخرت کے بھلائی کے لئے یہ قانون بھیجا گیا۔

دین اور رسمی قوانین کا فرق...... اس قانون کا حاصل فقط یہی نہیں کہ آپ چند رسمیں ادا کرلیں۔ بلکہ قانون کی حفاظت اور تحفظ کا حاصل یہ ہے کہ اس پر عملدرآمد کرکے آپ ظاہرا افعال بھی ادا کریں، مگر ہر فعل میں قربت اور تعلق پیش نظر رہے، یہی فرق ہے دین میں اور رسمی قانون میں۔

رسمی قوانین جو سلطنتیں طے کرتی ہیں وہ صرف افعال پر لاگو ہوتے ہیں۔ لیکن خدائی قانون دلوں کے اوپر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی کو چوری کرتے ہوئے پکڑلیا تو قانوناً اس کو سزا دیں گے۔ لیکن اس کے دل میں سے کوئی چوری کا جذبہ نکال دے۔ یہ کوئی دنیاوی قانون نہیں کرسکتا، جیل خانے میں جاکر بھی چور کا جذبہ یہی رہے گا کہ اب اگر چھ مہینے کے بعد چھوٹ جاؤں گا تو پھر اس سے بڑی چوری کروں گا۔ پھر چھ ماہ جیل میں رہوں گا۔ مگر اس کے بعد میں ایک اور زبردست ڈاکہ ڈالوں گا۔

تو بھائیو! دنیا کا قانون تو جذبات پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ ذات پر تو کیا ہو وہ تو اور بھی اوپر کی چیز ہے۔ صرف افعال پر لاگو ہوتا ہے۔ منظر عام پر وہ قانون چلتا ہے۔ لیکن دینی قانون اور انبیاء کا قانون وہ ہے کہ وہ فقط چوری ہی سے نہیں روکتا بلکہ چوری کی نفرت بھی دل کے اندر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ڈاکہ زنی ہی سے نہیں روکتا بلکہ ڈاکہ کی غلاظت اس کی سامنے ایسی آتی ہے جیسے پاخانہ کی غلاظت۔ تو جرائم کی نفرت بٹھا دینا، جرائم سے بیزار بنا دینا یہ قانون خداوندی کا کام ہے۔

مسلم پرسنل لاء کا منشاء..... مسلمانوں کا شخصی قانون ہو یا عائلی قانون ہو اس کا منشاء فی الحقیقت یہی ہے کہ ظاہر میں یہ عمل کرو اور باطن میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ قانون دونوں چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ تمہارے دلوں پر بھی، تمہاری زبانوں پر بھی، تمہارے ہاتھوں اور چہروں پر بھی۔ نہ فقط دل کی اصلاح، نہ فقط ہاتھ پیر کی اصلاح، نہ فقط زبان کی اصلاح بلکہ انسان کے مجموعے کی اصلاح پیش نظر ہے کہ اس کا ہاتھ پیر بھی درست ہو، اس کا قلب بھی درست ہو۔ ظاہر و باطن سے وہ اس پر عمل درآمد کرے، تو یہ شور مچانا محض اس لئے نہیں کہ چند رسمیں ہیں جنہیں ہم پورا کرنا چاہتے ہیں یا چند رسمی باتیں ہیں جن کی حفاظت کرنا ہمارا مقصود ہے نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا دین ہے، جس کے پیش نظر انسان کی فلاح و بہبود ہے ہم اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ ہم اس کی حفاظت کرکے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ موازنہ اور مقابلہ کرکے دیکھ لو، ذاتی زندگی ہو یا افعال کی زندگی ہو یہ زندگی

بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو تم تجویز کر رہے ہو۔ یہ بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد...... تو پرسنل لاء کے خلاف ایک شور اٹھا، اس سے لوگ پریشان ہوئے اور آل انڈیا مسلم بورڈ قائم کر دیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ شور مضر نہیں ثابت ہوا گو وہ فی نفسہٖ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ جنہوں نے پرسنل لاء کی مخالفت کی واقعی انہوں نے سخت غلطی کی۔ گویا ایک شر اٹھا۔ مگر اس شر میں سے ہمارے لئے خیر نکل آئی۔

پہلی خیر تو یہ نکلی کہ سارے مسلمان متحد ہو گئے کہ ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ آج آپ کے سامنے یہ سربراہان مذاہب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے علماء موجود ہیں، ہر تنظیم کے سربراہ موجود ہیں۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں، اس شر میں سے ہی تو یہ خیر نکلی ہے۔ اگر پرسنل لاء کے مخالف نہ کھڑے ہوتے تو ان کے دل میں یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اتحاد جیسی نعمت اس شر نے ہمیں بخشی، تو یہ شر ہمارے لئے مضر ثابت نہیں ہوا۔ ہم تو انہیں محسن سمجھتے ہیں جو ایک درجے میں پرسنل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہم میں جذبۂ اتحاد پیدا ہو گیا ؎

خدا شرے بر انگیزد کہ خیرے دراں باشد

بعض دفعہ شر اٹھتا ہے مگر اس شر میں سے خیر نکل آتی ہے۔ ہمارے لئے بھی اس میں سے خیر نکل آئی کہ ہم کو نعمتِ اتحاد ملی۔

یہ بات نہیں کہ رسمی طور پر ہم اتحاد کو اچھی بات سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ایک نعمت خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے نعمت فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ لڑتے تھے، آپس میں عداوتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، لڑائیاں ٹھنی ہوئی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر جنگیں اٹھتی تھیں۔ پانی پلانے پر جھگڑا، پہلے پانی کون پلائے، اس پر قبیلے لڑ پڑتے تھے اور یہ لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس جاری رہتی تھی، اور مرنے والے وصیت کر جاتے تھے کہ لڑائی بند نہ ہونے پائے، اسے جاری رکھنا ہمارے خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں مگر لڑائیاں بہت بڑی بڑی۔ عناد و دشمنی عام، آپس میں رقابتیں مزاج بن گیا تھا، اسلام نے آ کر انہیں متحد کر دیا۔ تو اس اتحاد کو حق تعالیٰ نے ایک آیت میں نعمت فرمایا ہے کہ:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ ''اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، ایک دوسرے کے نام سے بیزار تھے''۔ ﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾ (1) سو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ اس کی دی ہوئی نعمت تھی کہ تم خود آپس میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

---

(1) پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

نعمت تالیف قلوب......تو اس اتحاد اور تالیف قلوب کو حق تعالیٰ نے انعام خداوندی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے ساری تنظیمیں آپ اکھٹی کریں مگر دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کہ آپ کی تائید سے بڑھ کر اور کس کی تائید قومی ہو سکتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ:﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ.﴾ ① ''اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر زمین بھر کر بھی سونا خرچ کر دیتے تو دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے۔دلوں کا جوڑنا اللہ کا کام ہے''۔

یہ جو ہمارے بزرگ جو بیٹھے ہوئے مختلف مسالک، مختلف فرقوں کے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کندھے سے کندھا ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ دل بھی ان کے جڑے ہوئے ہیں۔ دلی جذبہ بھی یہی ہے کہ واقعی ہم حفاظت کریں اپنے دین کی، تو تالیف قلوب یہ تو اللہ ہی کا کام تھا اور واقع جب ہوا، جب شر اٹھا اور پرسنل لاء کے مخالف کھڑے ہوئے، تو ہم کو اللہ نے اس شر سے ایک بڑی نعمت عطا کر دی اور اسلام کا شیوہ ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی وہ ابھرا ہے مخالفتوں میں ابھرا ہے۔ اگر مخالفین نہ ہوں اور ان سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس کی برکتیں نہیں کھل سکتیں، اس کے اندر جو خیر کے پہلو ہیں وہ نمایاں نہیں ہو سکتے تھے۔

مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد......غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ترقی نام ہی ٹکراؤ کا ہے۔ اگر دنیا میں ٹکراؤ نہ ہو تو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پانی، ہے، ہزاروں برس سے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس میں کوئی ترقی نہیں کہ پہلے سمندر کی موجیں اٹھتی تھیں پہاڑوں کی شکل میں اور اب گلدستوں کی صورت میں آنے لگی ہوں، پھول بوٹے بن گئے ہوں۔ ویسی ہیں موجیں ہیں جیسی دس ہزار برس پہلے اٹھتی تھیں، ویسے ہی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کوئی ترقی نہیں۔ آگ ہے اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے لپٹ اٹھتی تھی ویسے ہی آج بھی لپٹ اٹھ رہی ہے۔ وہ پھول بوٹے نہیں بناتی، زمین ہے اگر تنہا چھوڑ دو تو اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے پامال تھی ویسے ہی آج بھی پامال ہے۔ آپ جیسے اسے روندتے ہیں روندی جاتی ہے۔ لیکن پانی کو اگر آپ ملا دیں مٹی سے اور ٹکرا دیں تو گارا بنے گا اور گارا بننے کے بعد کہیں برتن بنیں گے، کہیں اینٹیں بنیں گی، کہیں سامان بنے گا۔ بس ترقی شروع ہوگئی۔

تو آگ پانی کے ٹکراؤ سے ترقی ہوتی ہے، الگ الگ رہنے میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ آگ کو آپ ہوا سے ٹکرا دیں تو جو (فضا) کے عجائبات پیدا ہوں گے کہیں گرج ہوگی، کہیں بادل ہوں گے، کہیں بجلیاں چمکیں گی۔ اگر ہوا اور آگ دونوں الگ الگ رہیں تو نہ بجلی نظر آئے گی نہ کڑک نظر آئے نہ بارش برسے گی۔ تو بہر حال ٹکراؤ ہی میں ترقی ہے۔

ایک بہت بڑا عالم ہے وہ ہزار ہا مسائل جانتا ہے لیکن پھر اس کے اندر ترقی نہیں۔ لیکن اگر اس کو کسی جاہل

① پارہ: ۱۰، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۶۳.

سے ٹکرا دیا جائے اور وہ اعتراضات کرے، تو اعتراضات کے جواب میں نئی نئی چیزیں کھلیں گی اور نیا علم سامنے آئے گا۔اس طرح سے ایک عالم کے علم کی ترقی شروع ہو جائے گی۔

تو جہالت بھی ایک نعمت ہے بغیر اس کے ٹکراؤ کے علم کے اندر ترقی پیدا نہیں ہوتی۔ایک حکیم کا مقولہ ہے کہ:"اَلْقَلْبُ مَيِّتٌ وَّحَيَاتُهُ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَيِّتٌ وَحَيَاتُهُ بِالْمُنَاظَرَةِ" "دل مردہ ہے اس کی زندگی ہے علم اور علم مردہ ہے اس کی زندگی بحث اور نظر اور ٹکراؤ سے ہے"۔

اور علم کی ٹکر جہالت ہی سے ہوگی۔علم تو علم سے ٹکراتا نہیں۔تو جتنا جاہل ٹکرائے گا عالم سے اتنا ہی اس کے علم میں وسعت شروع ہو جائے گی۔

ایک بہت زبردست پہلوان ہے، ہزاروں داؤ پیچ جانتا ہے جو اس کی جھولی میں محفوظ پڑے ہوئے ہیں، اگر کشتی لڑنے پر آجائے تو داؤ پیچ میں ترقی ہوگی وہ اپنے بچانے کے لئے نئے نئے داؤ پیچ ایجاد کرے گا۔نئی نئی صورتیں پیدا کرے گا، تو جب تک دو پہلوانوں کی ترقی نہ ہو تو فن کی ترقی نہیں ہوتی۔ترقی درحقیقت نام ہی تصادم کا ہے۔اگر تصادم نہ ہو تو ترقی ناممکن ہے۔اس لئے حق تعالیٰ نے اسی تصادم کو بھی فضل خداوندی ظاہر فرمایا ہے اور فرمایا کہ:﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① "اگر اللہ ایک قوم کو دوسری قوم سے نہ ٹکرائے تو زمین فاسد ہو کر رہ جائے اور قومیں بیٹھ جائیں"۔

ان کی ترقی رک جائے، لیکن اللہ ٹکراتا ہے ٹکرانے کے بعد پھر نئے نئے عجائبات تمدن کے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو جنگ کے بعد نئے نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔تمدنی ترقی ہوتی ہے۔اگر کوئی قوم قوی ہے۔تو اس ٹکرانے سے اس کی نخوت (بھرم بازی) ٹوٹتی ہے۔

اور جو ضعیف ہے اس کی غفلت ٹوٹتی ہے۔تو دونوں فرقوں کی بھلائی ٹکرانے کے اندر ہوتی ہے۔ٹکریں نہ ہوں تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔تو پرسنل لاء کو ٹکرایا، لوگوں نے مخالفت کی، اعتراضات کئے۔اس سے ہر فرقے کے علماء کھڑے ہوئے۔ہر تنظیم کے سربراہ کھڑے ہوگئے، انہوں نے ان اعتراضات کے جواب دیئے۔اس سے مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پھیل گیا اور اتنی شقوق کھل گئیں کہ اس سے پہلے ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنی شقوق ہیں۔آج سینکڑوں رسالے شائع ہوگئے، سینکڑوں مضامین چھپ گئے۔سارے پہلو کھول کر رکھ دیئے۔پتہ نہیں تھا کہ اس پرسنل لاء میں اتنا علم بھرا ہوا ہے۔ہر ایک نے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق علم نکالا۔اتنے پہلو واشگاف کئے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو کبھی یہ پہلو ہمارے سامنے نہ آتے بس، اتنا جانتے تھے کہ قانون اللہ کا ہے۔ بھائی عمل کرلو اس پر، مگر ٹکر سے آپس میں ترقی ہوئی، عجیب لطائف اور نکات پیدا کئے علماء نے۔اگر یہ ٹکر نہ ہوتی تو پرسنل لاء کا مسئلہ واضح نہ ہوتا۔حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ اسلام کے کسی مسئلہ کو کھول کر واضح کریں تو جہلاء کو ٹکرا

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۱.

دیتے ہیں کہ تم اعتراضات کرو اور مخالفت کرو، جتنی مخالفت ہوگی علماء اس کے جواب میں کھڑے ہو جائیں گے اور جو گوشے چھپے ہوئے تھے وہ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

اسی لئے کفار کو ٹکر دی گئی مسلمانوں سے، فساق کو ٹکر دی گئی متقیوں سے، منافقوں کو ٹکر دی گئی مخلصوں سے تاکہ مخلص کا اخلاص کھل جائے، منافق کا نفاق کھل جائے اور جو چیز اصل ہے وہ کھل کر برسرِ عام آ جائے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی مخالفت ہمارے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا اتحاد جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ نہ ہوتا۔ اس اتحاد سے جو حفاظت ہو رہی ہے پرسنل لاء کی وہ نہ ہوتی۔ اس حفاظت سے رعب کی جو کیفیت مخالفین کے دلوں میں پیدا ہو گئی وہ نہ ہوتی۔ ہزاروں مسلمان جو پرسنل لاء کو سمجھتے ہوئے نہ مانتے تھے وہ اچھی طرح مان گئے۔ تو ایک نعمت کیا ہزاروں نعمتیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے تو ہم شکر گزار ہیں مخالفت کرنے والوں کے کہ اگر وہ مخالفت نہ کرتے تو ہمیں یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ اور وہ زیادہ مخالفت کر کے دیکھیں، مسئلہ اور زیادہ واضح ہوگا۔

اور ممکن ہے کل کو اس کھلے ہوئے مسئلے کی لپیٹ میں وہ بھی آ جائیں اور وہ بھی کہیں بھائی! وہی بات تو تھی جس سے لڑ رہے تھے، اسے دیکھو اور جب دیکھیں گے تو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاویں گے۔ تو یہ مخالفت ذریعہ بن جائے گی ان کی موافقت کا، یہی مخالفت ذریعہ بنے گی پیروی کرنے کا۔ تو ان کے لئے بھی راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

مبنی بر حقیقت قانون ...... اور ہمارے لئے تو اللہ نے علمی اور نظری راستہ پیدا کر ہی دیا، بہت سوں میں اب استعداد پیدا ہو رہی ہے غور و فکر کی اور استعداد کے بعد جب وہ غور و فکر کریں گے تو فطری قانون پر آ کر رہیں گے۔ یہ مصنوعی قوانین سب ختم ہو جائیں گے۔

باپ کا بیٹا ہونا یہ کوئی فرضی بات تھوڑا ہی ہے کہ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ بیٹا ہے بس وہ بیٹا بن گیا۔ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ باپ ہے وہ باپ بن گیا۔ باپ بیٹا ہوتا ہے جزئیت کے تعلق سے کہ وہ باپ کا جزو ہے، اس کے نطفے سے ہے اس لئے وہ اس کا بیٹا ہے۔ محض منہ کے بولنے سے جز نہیں بن جائے گا۔ کسی شخص کا محض نام لینے سے بیٹا بنا دینا درحقیقت فرضی اور مصنوعی بات ہوگی۔ حالاں کہ اس کا تعلق خلقت سے ہے۔ خدا ہی باپ بناتا ہے خدا ہی بیٹا بناتا ہے، وہی ایک کے اندر سے دوسرے کو نکالتا ہے، اس کے اجزاء منتقل ہوتے ہیں دوسرے کے اندر جس سے وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ بیٹی بن جاتی ہیں۔ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ① ''وہ مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے، ایک قطرہ پانی سے جو مردۂ محض ہے''۔

زندہ انسان پیدا کرتا ہے اور اس زندہ انسان میں سے پھر وہ قطرہ آگے کو چلتا ہے تو زندہ میں سے مردہ کو نکال دینا اور مردہ میں سے زندہ کو پیدا کرنا، یہ تو اللہ کا کام ہے کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تو ایک انسان کا جزء بن جائے گا دوسرا انسان۔ وہ جزء زبان کی حرکت سے تھوڑا ہی بنے گا۔ وہ تو خلقتاً بنا ہوا ہے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۹۔

جو بیٹا ہے وہ بیٹا ہے، جو باپ ہے وہ باپ ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جب اس حقیقت پر وہ غور کریں گے وہ خود نادم ہوں گے اگر عقل رکھتے ہوں گے کہ بھائی! محض منہ سے بیٹا کہہ دینے سے بیٹا کیسے بن گیا اور بیٹا بھی حقیقی کہ وراثت میں بھی شریک اور حقوق میں بھی۔ یہ سب فرضی کارخانہ ہے کہ ہم نے بیٹھ کر خیال کر لیا بس ہو گیا تو باپ بیٹا ہونا خیالات سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو خلقت ہے تخلیق خداوندی ہے، جتنی چیزیں قانون کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مصنوعی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جو آتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسری قومیں اپنے اقتدار کی وجہ سے، اپنے تحفظات کی وجہ سے قانون ایسے بناتی ہیں کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ دوسرا چاہے پامال ہو جائے لیکن اللہ کے تو سب بندے ہیں، وہ تو سب کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے وہ قانون بھیجتا ہے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے، اس لئے سب ہی بنی آدم کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

پرسنل لاء کی خدمت ...... بہر حال اب اس لحاظ سے میں عرض کروں گا کہ اہل بنگلور نے جو مدارات کی ہے آنے والوں کی اور جو مہمانداری کی اور اخلاقی بلندیوں کا ثبوت دیا وہ فی الحقیقت ہمارے گوشت پوست کی خدمت نہیں۔ بلکہ وہ خدمت کی ہے پرسنل لاء کی۔ وہ خدمت کی ہے اتحاد طبقات کی، وہ خدمت کی ہے تمام فرقوں کے متحد ہونے کی، تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی انسان کے اوپر فرض ہے کہ شکریہ ہی ادا کرے اللہ کا بھی اور بندوں کا بھی۔ "مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ." ① "جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں"۔

اس لئے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کیا ہے اللہ ہی کی توفیق دینے سے تو اولاً اللہ کا شکر ہوتا ہے پھر وسائل کا شکر ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم آپ کا شکر ادا کرتے یہ آپ کی عالی حوصلگی ہے کہ آپ ہمارا شکر ادا کر رہے ہیں۔ ؎

دے بھی رہے ہیں شرما بھی رہے ہیں

فی الحقیقت یہ شکریہ آپ کے لئے ہے اس وقت تک جب تک آپ کی نسلیں باقی ہیں، آپ کے لئے دعاء ہے، اس وقت تک جب تک دنیا میں آپ کا نام ونشان باقی ہے۔ تو اللہ آپ کو بھی دوامی کرے اور خدا کرے کہ ہمارا شکر بھی دوامی ہو۔

دوامِ شکر ...... انسان تو ہے ہی دوامی، انسان ازلی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ ازلی تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا تو ہو گیا۔ اس سے پہلے انسان کا نام ونشان نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ ② "انسان پر ایک بڑا زمانہ گزر چکا ہے کہ لاشی محض تھا اور اس کا چرچا بھی نہ تھا زبانوں پر"۔ کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ زید کون ہے اور بکر کون ہے ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ﴾ ③ "ہم

① السنن للترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک، ج:۷، ص: ۲۰۹.

② پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۱. ③ پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۲.

نے پیدا کیا انسان کو ایک بوند کے لچھے سے، پلٹتے رہے اس کو“۔

تو ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم معدوم تھے۔اس سے پہلے ہمیں اپنے عدم کا بھی علم نہ تھا۔زمانہ دراز گزر چکا ہے کہ انسان نہیں تھا۔اللہ نے پیدا کیا،لیکن جب پیدا کر دیا تو اب وہ مٹنے والا نہیں اب وہ ابدی ہے۔

موت کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ آدمی موت آنے کے بعد فنا ہو گیا، یا ختم ہو گیا ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے معنی منتقل ہو جانے کے ہیں۔اس دار سے دوسرے دار میں،اس جہان سے دوسرے جہان منتقل ہونا۔تو انتقال ایک دار سے دوسرے دار کی طرف،ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف یہ تو ہوتا رہے گا،مگر مٹ جائے انسان، یہ نہیں ہوسکتا،نو مہینے آپ ماں کے پیٹ میں رہے ایک عالم میں تھے۔اس سارے عالم کی عمر نو مہینے کی تھی وہاں سے انتقال ہوا تو دنیا میں آگئے۔اب دنیا میں آپ کی عمر ساٹھ،ستر اسی سو برس کی ہے یہاں رہے، یہاں سے انتقال ہوا تو عالم برزخ میں پہنچ گئے، جسے آپ قبر کہتے ہیں۔وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ اس میں کتنی مدت رہیں گے۔قیامت تک تو رہنا ہی ہے۔پھر قیامت آگئی تو آپ عالم برزخ سے عالم حشر کے اندر منتقل ہوں گے اور عالم حشر میں ایک دن قیام کرنا ہے اور وہ ایک دن ہوگا پچاس ہزار برس کا،لہٰذا پچاس ہزار برس اس عالم کی عمر ہے۔اس عالم میں آپ پچاس ہزار برس گزرنے کے بعد منتقل ہوں جنتوں کی طرف۔

تو انسان مٹنے والا نہیں ہے۔باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ سے چلا تو چلتا رہے گا ابدالآباد (ہمیشہ) تک۔ اس لئے آپ بھی باقی،ہم بھی باقی،آپ کے اخلاق بھی باقی،ہمارا شکریہ بھی باقی۔دونوں چیزیں دوامی ہیں جو چلتی رہیں گی اور جنت تک ساتھ جائیں گی۔

وحدتِ خیال و وحدتِ قلوب......بہر حال آپ نے فی الحقیقت یہ خدمت مہمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسئلہ عظیم کی خدمت کی ہے۔آپ نے مسلم پرسنل لاء کی خدمت کی ہے،اس کو عام کیا،اس کو پھیلایا اور آپ نے چاہا کہ ساری پبلک اس سے واقف ہو جائے۔اس کے لئے یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔یہ جلسہ درحقیقت وعظ و تقریر کا نہیں ہے۔وعظ و تقریر میں ہوتی ہے تربیت۔یہ جلسہ ہے اعلان کا کہ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو قانون کے اوپر آنے والے ہیں۔ان کی بچاؤ کی صورتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں۔ان صورتوں پر آپ متفق اور متحد ہو کر چلیں۔یہ جلسہ اس اعلان کے لئے ہے،وعظ و تقریر کے لئے تو ہزاروں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ان میں عبادات،معاملات وغیرہ سب چیزوں کی نصیحت بھی ہوتی ہے۔لیکن یہ محض وعظ و نصیحت کا اجلاس نہیں یہ تو جلسہ اِذنِ عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔تو بہت سے خطرات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ فلاں مسئلے کو اگر بدلا گیا تو یہ خطرات ہوں گے،پرسنل لاء کے مسئلے میں مداخلت کی گئی تو یہ خطرات رونما ہوں گے۔

ان خطرات پر تجویزیں آرہی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو یہ جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ آپ کا اتحاد باقی رہے۔یہ ظاہر بات ہے کہ اتحاد زبان سے نہیں ہوتا۔آپ نے کہا کہ میں آپ کا دوست

ہوں، میں نے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کا دوست ہوں۔ یہ دوستی قائم نہیں رہ سکتی کیوں کہ یہ تو لفظوں کی دوستی ہے، دوستی واقعی جب ہے کہ واقعی دل میں دوستی آ جائے، جگر کے اندر پیوست ہو جائے وہ دوستی باقی رہ سکتی ہے، اور وہ دوستی کب ہوگی؟ جب وحدت خیال پیدا ہو۔ اگر خیالات بدلے ہوئے ہیں، آپ کا رخ ایک طرف میرا رخ ایک طرف، کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا اور جب خیالات میں آ گئی وحدت تو خود بخود اتحاد پیدا ہوگا۔ تو پرسنل لاء اور قانون الٰہی اور قرآن کے ایک ایک جز کی حفاظت ایسی چیز ہے کہ اس کے اوپر سارے متفق ہیں۔ اس کے معنی میں چاہے اختلاف کریں، رائے الگ ہیں۔ لیکن نفس قانون قرآن وحدیث اس پر سارے متحد ہیں۔

تو اس وقت آنچ آپ کے میرے خیالات پر نہیں آ رہی ہے اس وقت تو آنچ آ رہی ہے کتاب وسنّت پر ان کے مسائل پر لوگ تغیر وتبدل چاہتے ہیں۔ تو کون سا فرقہ رہ جائے گا جو اسے گوارہ کر لے قرآن وحدیث میں کوئی شخص تغیر کرے، اس واسطے سارے کے سارے متحد ہو گئے لہٰذا وحدتِ خیال بھی ہے اور وحدت قلوب بھی۔

اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی...... اور باہمی اخلاص بھی ہے ایک دوسرے سے، بغیر اخلاص کے اس طرح جمع نہیں ہو سکتے اور اخلاص اس لئے ہے کہ مقصد ہے مشترک، الگ الگ مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہی مقصد ہے کہ یہ قرآن وسنت ناقابل تغیر ہے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا ہے۔ تغیر وتبدل تو کیا کرتے اس کا حق تو خود صاحب شریعت کو بھی نہیں دیا گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد فرمایا گیا کہ آپ بھی اعلان کردیں: ﴿قُلْ مَايَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ.﴾ ① ''میرے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس کے کسی شوشے کو بدل دوں''۔

میں تو ناقل اور امین اور داعی بن کر آیا ہوں، اللہ کی طرف سے، جو حق تعالیٰ فرمائیں گے بلا کم وکاست تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ اس کے اندر میری طرف سے کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی جس تغیر و تبدل کے مجاز نہیں، میں اور آپ اس کے مجاز کیسے ہو جاویں گے؟ اور جب میں اور آپ نہیں تو دوسری قومیں کیسے ہو جاویں گی؟ یہ تغیر وتبدل کرنے کھڑی ہوں گے، تو لامحالہ مقابلہ بھی ہوگا اور مقابلہ ہوگا تو ہماری مدد بھی ہوگی۔

بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی...... مدد حاصل کرنے اور لڑنے کا ایک خاص اصول ہے۔ اگر آپ ضعیف اور کمزور ہیں، مد مقابل ہے، بہت قوی اور آپ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں اس سے۔ تو اصول یہ ہے کہ کسی قوی کو اس کے مقابلہ پر ڈال دیجئے۔ وہ لڑتے رہیں گے آپ بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہیں گے تو آج قانون پر آنچ آ رہی ہے، آپ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اقوام کو اللہ سے بھڑا دو اور کہہ دو کہ یہ قرآن وحدیث میں تغیر کرنا چاہتے ہیں، قرآن والا خود ان کو سمجھ لے گا۔ لڑائی ان کی شروع ہوگی۔ ہم آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے، خدا کو کون مغلوب کر سکتا ہے؟ اس کے قانون کو کون نیچا دکھا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہی ہے کہ ہم آڑ لیں قرآن وحدیث کی۔ اپنی

① پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۱۵.

طرف سے کوئی بات نہ کہیں۔ نہ ہماری عقل کوئی چیز ہے، نہ ہمارا خیال کوئی چیز ہے۔ ہم تو قانون کے حق میں امانت دار ہیں اس قانون کو پہنچائیں گے۔ قانون قانون والے کا ہے۔ اگر کوئی لڑے گا تو وہ قانون سے اور قانون ساز سے لڑے گا۔ ہم تو قانون ساز نہیں ہیں۔ ہم تو بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔

جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا۔ مقابلہ ہوا مشرکین مکہ سے ظاہر بات ہے کہ مسلمان تعداد میں بھی تھوڑے، سامان بھی ان کے پاس نہیں اور مقابلہ اس قوم سے کہ سارے وسائل زندگی اس کے ہاتھ میں ہیں، اقتدار حجاز کا اس کے ہاتھ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ.﴾ ① ''اے پیغمبر! مجھے چھوڑ دو اور میرے مقابلہ پر انہیں چھوڑ دو''۔

ہم نمٹ لیں گے تم بیٹھ کر دیکھو تو ہمارا بھی کام یہ ہے۔ بھائی تم ہماری جائیداد ہماری ذات پر حملہ نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو براہ راست قانون پر حملہ ہے اور قانون الٰہی ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے تو تم لڑلو۔ اگر تمہارے اندر طاقت ہے اللہ میاں سے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم پیش کر دیں کہ یہ خدا کا قانون ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے پھر بھی کرو گے تو مجرم ٹھہرو گے خدا کے، ہمارا کوئی جرم نہیں کہ ہم خواہ مخواہ تم سے لڑیں، تم نمٹ لو۔

بہر حال اصول بھی یہی ہے کہ جب آپ کے اندر طاقت نہیں تو کم از کم اتنی طاقت ہے کہ اپنے دین کو مضبوطی سے سنبھال لیں اور دوسروں میں اعلان کر دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ ناممکن التغیر ہے، بس اتنا آپ کرتے رہیں۔ اب آگے جھگڑنے کے بعد کون مغلوب ہو کون نہیں۔ اس کو قانون والا اپنے آپ جان لے گا۔

شاہ حبش کی شکست...... آپ کے سامنے تو واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر جب دھاوا بولا ہے ابرہہ نے یہ یمن کا بادشاہ تھا اور اس نیت سے آیا تھا کہ بیت اللہ شریف کو منہدم کرے۔ (معاذ اللہ) تا کہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف سے ختم ہو کر اس مکان کی طرف ہو جائے جو اس نے یمن میں بنایا تھا، تو وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کا لشکر لے کر آیا اور مکہ کے اردگرد اس نے گھیرا ڈال لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ معاذ اللہ بیت اللہ مسمار کر دے اور ڈھا دے۔ تو اس نے عبدالمطلب کو اطلاع دی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو آ کر کہو۔ مکہ کے باشندوں کے تم سردار ہو۔ عبدالمطلب آئے، ان کی بڑی تعظیم کی، بڑی توقیر سے پیش آیا اور کہا کہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کہیں۔ انہوں نے کہا میرے چند اونٹ ہیں، میری چند املاک ہیں، ان کی آپ حفاظت کریں۔ ان پر آپ ہاتھ نہ ڈالیں اور میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اسے حیرانی ہوئی کہ یہ اپنے چند اونٹوں کو لے کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ جیسی چیز کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ صاحب! اسے مسمار مت کرو، اس پر حملہ مت کرو، تو اس نے عبدالمطلب سے کہا کہ آپ اپنے چند اونٹوں کے بارے میں آئے ہیں اور اپنی ایک شخصی ملک کو سامنے رکھا ہے۔ حالاں کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس مرکز کو ڈھا دوں جس سے آپ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۴.

تو عبدالمطلب نے کہا کہ بیت اللہ میری ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خدا کا گھر ہے۔ خدا آپ سے خودنمٹ لے گا، میں تو اپنی ملک کے بارے میں کہنے آیا ہوں، خدا کی ملک کے بارے میں کہنے نہیں آیا۔ وہ جانے آپ جانیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس کے ہاتھیوں کے پرخچے چند چڑیوں کے ذریعے اڑا دیئے۔ بیت اللہ اسی طرح قائم رہا اس کے ہاتھیوں کے اور اس کے لشکر کے پرخچے اڑ گئے، ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہا۔

پرسنل لاء میں مداخلت کی وجوہ...... ہم اور آپ اس چیز کے ذمہ دار ہیں کہ پہلے تو اس قانون پر ہم اور آپ عمل کریں اور اپنے اندر اس کو رچالیں، اس کے بعد اس کا اعلان کریں کہ یہ خدائی قانون ہے۔ اس میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کو خدا کے مقابلے پر ڈال دیں کہ ہم تو اسی پر عمل کریں گے اور اسی کا اعلان کریں گے، جو تمہارا جی چاہے کرلو، تو حقیقت یہ ہے کہ کوتاہی ہماری ہے۔ عامل ہم نہیں۔ پرسنل لاء کے نام سے ہم واقف نہیں۔ شخصی اور عائلی قوانین کیا ہیں ان پر عمل درآمد نہیں، اگر عمل درآمد ہو تو دوسرے خود مغلوب ہو جاویں گے۔ لیکن خود آپ عمل نہ کریں تو دوسروں کو جرأت ہوتی ہے کہ دخل اندازی کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کو پتہ نہیں کہ پرسنل لاء کیا ہے۔ لہٰذا جس طرح سے چاہو اس کے روپ کو بدل دو۔

ہماری بدعملی نے یہ راستہ دکھایا ہے، اگر آج سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو اسلامی معاشرہ ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے۔ پھر کروڑ ہا کروڑ انسان جن کو سات کروڑ کہا جاتا ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ دس بارہ کروڑ سے کم نہیں۔ یہ سارے مل کر اگر عمل درآمد کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دے دی جائے کہ اس قانون میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا ہے اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

فریضۂ مسلم اور ادائیگی شکر...... یہ اعلان کر دینا آپ کا فرض ہے، اس پر جم جانا آپ کا فرض ہے، اس لئے یہ جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں۔ پرسنل لاء کے مسائل کے بارے میں مجھے کوئی تحقیق عرض کرنی نہیں تھی۔ بلکہ مقصد آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور ایک یہ کہ پرسنل لاء کے اوپر آپ کو جم جانا چاہئے۔ علماً بھی عملاً بھی اور اعلاناً بھی اور اذنِ عام بھی آپ کریں، مطلع کر دیں کہ یہ قانون خداوندی ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس میں تغیر وتبدل گوارہ نہیں کر سکتے۔ یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ کوئی تقریر یا وعظ نہیں کرنا تھا۔

ایک خادم بورڈ کی حیثیت سے یہ بھی میرا فرض تھا کہ آپ حضرات کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کروں۔ اپنی طرف سے بھی اور ان سب بزرگوں کی طرف سے بھی۔ اصل میں تو یہی سارے بزرگ ہیں، انہوں نے مجھے لا کر آگے بٹھلا دیا ہے کہ تو یہ کام کر۔ صدر تو اصل میں وہی ہیں جو صدر بنا سکتے ہیں کیوں کہ وہ کرسی پر جسے چاہیں بٹھا

دیں۔ میں تو ایک علامتی نشان ہوں کام کرنے والے تو یہی سارے بزرگ ہیں جو کام کررہے ہیں اور انہوں نے ہی کیا ہے۔ اس لئے اداشکر کے اندر میں ان کی طرف سے نیابت کررہا ہوں۔ حق تعالٰی آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔ آپ کے احوال میں برکت عطا فرمائے!۔ (آمین)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَ تُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ.

وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرات کی فضا پیدا کی، تا کہ اسی جرات و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضا پر محیط ہو جائے۔ اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں۔ بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی وحریت کا مناد (دعویدار) ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ !

آزادی کا مفہوم...... بزرگان محترم! اسلام آزادی کا سب سے بڑا حامی و علمبردار ہی نہیں، بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیوں کہ عقل کی تگ وتاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک پیسٹری، توس مکھن، کھیل تماشا، گانا بجانا، آلات لہو ولعب، نفسانی عیش ونشاط، ملکوں میں آمد ورفت، ہوائی یا بری و بحری سیر و سیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے حریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام وطبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے نہیں ہیں۔ ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ بلکہ آزادی کے معنی حق وصداقت، عدل و انصاف اور ایثار ورواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں۔ تا کہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور

قوی کو ظلم وزیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت وقدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے، جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست وپائی ختم ہو جائے۔

آزادی کا اسلامی نصب العین...... آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھئے تو وہ یہ ہے کہ: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ○ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ○ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ.﴾ ①

''فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف (پارٹیاں) بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کی بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا، ہم ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو مالک بنا دیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں۔ فرعون اور ہامان اور ان کی اہالی وموالی کو (زوالِ قوت وشوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے، اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقت وروں نے زور قوت کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کیے جائیں۔ تاکہ کمزور آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون وہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں، ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت وقوت کا یہی مقصد ہے اور بلا شبہ یہی ہے نہ کہ فراعنۂ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جن کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گزری، تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت واخلاق کے ساتھ دنیا میں لے کر آیا ہو؟

اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے نعرہ کے بعد، حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اٹھائی۔

پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن ان کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں، جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام بھی سامنے رکھا ہے۔ اس لئے دعوائے آزادی میں اسی کو سچا مدعی کہا جائے گا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادیٔ ضمیر...... اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہو سکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور یہ اس

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۴، ۵، ۶.

کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل و دماغ اور ضمیر آزاد ہو، ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو۔ عقل وفہم اور شعور، ادراک آزاد ہوتا کہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر وقہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عمل درآمد کرے وہ اسی کا عمل درآمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں۔ یہ آزاد ہے تو اس کی پوری دنیا آزاد ہے، ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اس کی پوری دنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اس کے عقل وفہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا، مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اسے بھی دلیل نبوت تو ٹھہرایا ہے۔ لیکن دلیل صداقت کو مسائل نہیں بنایا۔ کیوں کہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجت و برہان سے واضح ہوتی ہے۔ خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی، بغیر حجت و دلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جیسے اکراہ واجبار کہا جاتا ہے۔ جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اس کے ردّ وقبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔ نکاح وطلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے، بیع و شراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز۔ امن و جنگ کے یہ اوقات و مواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں اور دلیل یہ بیان کر کے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اس کی معنوی قوت ضروری کھل جائے گی، مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتی اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آ جائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرا دینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کر لے۔ کیوں کہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے۔ خوارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ ہونا تو ضرور واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آ جائے بلکہ ان کا معقول اور موافق فطرت ہونا دلائل سے واضح ہوگا۔ معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔

آزادیٔ عقل وفہم...... پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔ اور عقلی بصیرت کو استدلال کی راہ سے گزر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا، جس سے عقل کی آزادی میں فرق آ جاتا۔ دراں حال یہ کہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لئے خوارق کو نبی کی نبوت کی دلیل تو کہا گیا۔ لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انہیں دلیل نہیں ٹھہرایا گیا، بلکہ اس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادت ہی بہترین دلیل

بن سکتا تھا۔ حجت و برہان اور فراست و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تو لنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قرطاس مستقیم ہے، چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوت یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ اسے غیر معقول بھی جانتا ہو، بلکہ یہ بیان کیا گیا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ ۔① ''اور یہ (مومن بندے) ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل و فہم کے ساتھ) متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ماننے کے ساتھ ان کا سمجھ لینا بھی ساتھ ساتھ رہے''۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہہ دینے کا ارشاد ہوا کہ: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ② ''آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے، میں خدا کی طرف سے اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں۔ میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل مانے اور منوائے جاؤں)''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردوسلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادت کے، نمرود سے استدلالی بحث و مناظرہ فرمایا جو حجت و برہان کی لائن تھی۔ کسی معجزہ سے اسے چپ کرانے کی سعی نہیں فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضا کے چمکتے ہوئے خوارق عادت نشان پیش کئے تاکہ ان کا پیغمبر ہونا واضح ہو جائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ فرعون سے مکالمہ حجت و برہان سے کیا جس کی تفاصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزار ہا معجزات دکھلائے ہیں۔ وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت و برہان اور عقلی و حسی طرق استدلال سے بھرپور ہے۔ بس آپ کو بوجہ خاتم النبیین ہونے کے طریق استدلال معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں۔ خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کو منوانا، ایک ایسا دباؤ ہوتا، جس سے عقل و خرد کی آزادی سلب ہو جاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہو جاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا، بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اس کے ضمیر کو آزاد کیا، اس کی عقل کو آزاد کیا اس کے فہم کو آزاد کیا اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بو دیا اور اسے مجسم آزادی بنا دیا۔ بہر حال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے۔ جس کے اوپر سے اس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔

آزادیٔ رائے...... آزادی ضمیر کے بعد مافی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیانتاً ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرت کا کام تھا۔ ضمیر کی آواز دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں ابھاری جاتی بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے ابھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کردے۔ اس کی تصدیق وتکذیب یا تصویب وتردید کا حجت کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لیکن اسے ابھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں، اگر رائے کو آزاد نہ کیا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔

حد ہے کہ عام انسانی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں، بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا، نہیں مشورہ ورائے ہے۔ عرض کیا: تو میں آزاد ہوں۔ ① یہ رائے مانوں نہ مانوں اور بالآخر نہیں مانی۔ ایک طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہے جو خاتم الانبیاء ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں۔ دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے۔ لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادی رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہرحال اسلام کی آزاد فطرت نے انسان کی آزادی کے لئے سب سے پہلے اس کے باطن کو آزادی بخشی ہے، اس کی عقل اس کے ضمیر اور اس کی رائے کو آزاد رکھا ہے اور اس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا، جو اس کے فطری ابھار اور تقاضوں کو پامال کردے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوت اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیر ہی کے رجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اسے واجب القبول نہ سمجھ لے۔ تو وہی اسلام اسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ، سونے چاندی اور زر و جواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ تیر وتفنگ اور بم وگیس کے دباؤ کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا اور برداشت کرسکتا ہے اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور اتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اس نے صاف اعلان کردیا ہے کہ: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ.﴾ ② ”دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے“۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.﴾ ③ ”سو کیا

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الطلاق، باب خيار الامة اذا اعتقت، ج:٦، ص:٢٦٠. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج:٥ ص:٧٥ رقم:٢٠٧٥. ② پارہ:٣، سورة البقرة، الآية:٢٥٦. ③ پارہ:١١، سورة يونس، الآية:٩٩.

آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں''۔

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے، وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کرے گا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرون انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا اور انسانی ضمیر، انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں ابھرنے اور ابھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے...... ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے۔ بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو، لفظی ترجمانی نہ ہو، جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرون نفس میں آتی ہے پھر اس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے قرآن حکیم نے سائنٹیفک (ٹھوس) حقیقت واشگاف فرمادی کہ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. ﴾ ① ''واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے، جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے''۔

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے، جب اندر آ چکتی ہے، باہر انقلاب جبؒ ہی رونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے، باہر غلامی اس وقت آتی ہے، جب نفوس کے اندر سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی اس لیے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی۔ تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی وحریت کا مناد ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

باطنی آزادی...... پس باطن میں تو اسلام آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسویٰ سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے۔ ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آجائے۔ اگر یہ اختیار حق اور ردِ باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے، تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستارانِ حق کا غلبہ ہو جائے گا اور پرستارانِ باطل کی شکست، صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔

ذلیل قسم کی غلامی...... لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہے، یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں۔ بلکہ بیرونی اثرات سے متاثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے۔ گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اس نوع کی آزادی باہر نمایاں

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱.

ہوگی۔ فرعون وہامان برسر اقتدار ہوں گے، صلحاء وصدیقین بے یار مددگار بن جائیں گے اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی۔ جس کو احادیث صحیحہ میں علامات قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے اور جو اقوام عالم اور عالم کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریل علیہ السلام نے علامت قیامت دریافت کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ رِعَآءَ الشَّآءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ'' ① ''(قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالکہ کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشت منزلی کی) اور سیاست مدن یعنی ملکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ) تم دیکھو کہ ننگ پیرے ننگ سرے (ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے چرواہے یعنی کمینے قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں''۔

یعنی کمینے برسر اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔ تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا، مگر بنگاہ غور ذلیل قسم کی غلامی ہوگا، جو غلامی حق کی بجائے غلامی نفس کی دل دل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔ بہرحال اسلام کی نگاہ میں آزادی باطن کے معنی ضمیر کی آزادی، عقل وخرد اور فہم وفکر کی آزادی ہے۔ جس سے انسان بذات خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جری اور بیباک ہو جائے اور آزادی ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت وقوت پیدا ہو جانا ہے۔ جو امر حق کے نافذ کرنے میں کسی پس وپیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لَوْمَةَ لَآئِمٍ کی پرواہ رہے نہ نُصْحِ نَاصِحٍ کی۔

صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے...... اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا۔ بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس وشیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت، پھر اس منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے۔

پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہوا وہی آزاد ہوا اور جو اس سے آزاد ہوا وہی غلام ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت وبرہان سے پابند حق بن جانے کے ہیں۔

آزادی کا معیار...... آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا ملک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوق خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے۔ اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنجہ استبداد کو توڑ کر

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام والاحسان، ج: ۱، ص: ۸۶.

اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سدراہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہوا و ہوس کا غلام ہے اور ظاہر ہے یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزادی شدہ ملک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے، تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت، رنگ، نسل، وطن، ہوسِ زر، ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ ملک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیرپا بناتی رہے گی۔

پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں، اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعا میں رطب اللسان ہوں مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ ﴿ یُرْضُوْنَکُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ. ﴾ ①

اسلامی آزادی کے آثار...... اسلام بھی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جونہی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا وہیں پسماندہ ابھر پڑے، پست بلند ہو گئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے، غلام اور آقا میں فرق نہ رہا، یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آ گیا۔ مظلوموں کی فریادیں عرش سے ٹکرانے لگیں، صنفِ نازک باندیوں سے حرہ (آزاد) ہو گئیں۔ بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنہیں سونے کے لئے فرشِ خاک بھی مشکل سے میسر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے اور جو خود ہل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے، وہ خادمِ خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا، بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و تو کے قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیم یکسانی، مالی توازن، جاہی ہم رنگی، امیر غریب کے سنگم، اونچے اور نیچے کے ملاپ، آقا و غلام کی ہم آہنگی، شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا، جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے اور اس طرح ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کی بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزاد روشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کیساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کارفرما تھا، جو خود انسان کے نفس کی عظمت اصطلاحی خودداری سے نہیں ابھاری۔ بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۸.

عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامی نفس یا غلامی غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامی حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے، لیکن اس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور باہم بعید تر ہیں۔

''اسلام اور آزادی'' کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تا کہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیّز ہو سکے۔

عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے، لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے، جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو۔ کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں ہی، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

عروج وزوال کا معیار...... ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی وتنزل اور فنا وبقاء پہچانی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے۔ گردوپیش کے حالات، ہنگامی حوادث یا شخصی آراء معیار کا درجہ نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج وزوال کو پہچانا جائے۔ پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آسکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے۔ جس حد تک امت اس کے مطابق ہو اسے قوم کی بقاء باور کیا جائے گا اور اس میں اس کی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹی ہوئی ہو، اسی کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور راستہ بدلنے کی سعی کی جائے گی اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر، ان کے سامنے سائل اور بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی، چہ جائیکہ بڑھے اور پھلے پھولے۔ لیکن استغناء کے معنی یک سوئی انقطاعیت، گوشہ گیری اور علیحدگی پسندگی نہیں بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں کہ یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستغنی بھی ہوں، سائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے جمگھٹوں میں کندھے سے کندھا ملا کر ان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ سائل بن کر نہیں محسن بن کر

اور ایثار پیشہ بن کر گھسیں، جسے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو، کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

معلم وامام اقوام...... اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں۔ اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجہ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں صلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کی دعوت عام، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے۔ اس لئے اس کی ترقی وتنزل اور عروج وپستی کے پہچاننے کا بھی یہی معیار ہو سکتا ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں خواہ دیانت و سیاست ہو یا تمدن ومعاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ وصلح، امن ہو یا بدامنی، سرمایہ داری ہو یا ناداری، وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے، نہ احسان وایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

اب اگر مسلم قوم کا نظریہ محض کسی خطۂ زمین پر آرام وآسائش یا زیادہ سے زیادہ کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے کے ساتھ گذر بسر کر لینا ہے تو اس ملک کی مختلف اقوام کے ہجوم میں اس کا نتیجہ اس کے حق میں رشک، احساس کمتری، حرص وآز اور پھر اس سے قلبی بے چینی، اندرونی تشویشات، ماتم سرائی، اضطراب وگھبراہٹ اور پراگندہ خاطری کی صورت میں نمایاں ہوگا، جیسا کہ ہو رہا ہے اور وہ کبھی چین اور امن کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ اسی لئے اسلامی زندگی میں اس گذر بسر کے تصور کی کوئی خاص قدر وقیمت نہیں۔ جبکہ اس کے ساتھ وہ معیار جذبہ نہ ہو جس پر اس قوم کی بنیاد ہے اور جس کی خاطر دنیا میں اسے مبعوث کیا گیا تھا۔

قلبی تمکین...... ہاں اگر وہ ہے تو پھر ان مذکورہ خطرات کی بجائے قوم میں قلبی تمکین، اطمینان خاطر ودل جمعی اور استغناء اور تفوق (برتری) لازمی ہے اور اسی کے ہوتے ہوئے قوم کی امتیازی شان یا وجاہت، حیثیت عرفی اور اقوام کے قلوب میں اس کی ہیبت قائم رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسے بار بار دہرا چکی ہے۔

اندریں صورت اگر اس ملک میں دائیں بائیں بازو کے ساتھ ایک تیسری قوت مسلمان بھی ہیں تو انہیں اور ان کے تمام افکار ونظریات زندگی کو پہلے اسی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہوگی۔ جس معیار کی رو سے وہ مسلمان کہلائے۔ اس لئے سوالات کی یہ نوعیت باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کے کس خطے میں مسلمانوں کی اخلاقی یا سماجی حالت کیسی ہے یا دوسری اقوام سے ان کے تعلقات کیسے ہیں اور ان کی سیاسی پالیسی کیا ہے؟ یا وہ نادار اور بے روزگار ہیں یا سرمایہ دار اور برسر کار؟

بلکہ سوال کی صحیح نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں، وہ اس قوم کے بنیادی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہے تو ان کے دلوں میں ان کا بنیادی نصب العین کس طرح پیدا کیا جائے اور انہیں مختلف مصنوعی نصب العینوں سے ہٹا کر کس طرح اصلی اور حقیقی نصب العین کی طرف لایا جائے۔ غیر مسلموں کی نظر ہمارے حالات پر نہیں بلکہ کردار اور اخلاق اور قومی خصوصیات پر ہے جنہیں وہ تاریخ سے جانتے ہیں۔

عظیم تعمیری خدمت ...... میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک موجودہ حالات اور کردار اور اخلاق کی گراوٹ، نیز منصب سے روگردانی ہی نے انہیں اسلام کی اور مسلمانوں کی طرف سے شکوک وشبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کردار واخلاق معیار کے مطابق ہوتا اور اپنے منصبی فریضہ سے وہ غافل نہ ہوتے تو شکوک کی گنجائش نہ تھی۔ ہر شبہ کا جواب مسلمانوں کا کردار بن جاتا، جیسا کہ پہلے بنتا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد وتنظیم کے بغیر ان کا مستقبل تاریک ہے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہ اتحاد بھی تجربہ اور قرآنی شہادت کی رو سے محض رسمی تنظیموں سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کی صورت بھی ایمان وعمل صالح اور بالخصوص دعوت الی اللہ ہی سے ہویدا (ظاہر) ہوتی ہے۔ جس حد تک ہماری مخلصانہ توجہ اغیار کی طرف ہوگی اور ہم اسلامی حلقوں کی توسیع کی طرف متوجہ رہیں گے، اس حد تک طبعی طور پر باہمی خلفشار سے بچے رہیں گے۔ اگر جناب ان سوالات پر بھی خود بھی غور فرما کر یا ملک کے اہل فضل وکمال سے ان کے جوابات طلب فرما کر ان کے حل کی طرف متوجہ ہو جائیں گے تو یہ یقیناً قوم کے امتیاز وتفوق اور اس کے کردار کی بلندی کی ایک عظیم تعمیری اور بنیادی خدمت ہوگی۔

سوالات گرامی دیکھ کر جہاں ان سے استفادہ کی توفیق ہوئی، وہیں یہ چند سوالات بھی ذہن میں ابھر آئے۔ گو طالب علمانہ ہیں مگر پھر بھی پیش کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی تربیت میں خواہ وہ سیاسی اور اقتصادی ہو یا مذہبی، اگر یہ معیار پیش نظر رہے تو امید ہے کہ ان کی حالت بدل جائے گی اور ان میں حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

والسلام

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۳/ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

تیونس و مراکش کی جدّ وجہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو، یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے، اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

احوال واقعی...... بزرگانِ محترم! ہم یہاں انسانی تاریخ کے ایک اہم مرحلے پر ایک بڑے مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، میں خداوند برتر وتوانا کا اور اس کے بعد آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقعہ پر صدارت کی عزت سے سرفراز فرمایا اور یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے دو قوموں کی آزادی کے معاملہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔

حق خود ارادیت...... زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہمارے میدان، ہمارے کھلیان، ہمارے گاؤں کے چوپال اور بڑے بڑے شہروں کے ہال اس نعرہ سے گونج رہے تھے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج جبکہ ہمارا ملک آزاد ہے اور اس کی آزادی کے ۶ سال گذر چکے ہیں تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگیں قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔

آزادی کی حمایت...... حضرات! ہم یہاں ملک کی مشہور اور مؤقر جماعت جمعیت علماء ہند کی ہدایت پر تیونس اور مراکش کی آزادی کی حمایت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملک کے قومی اور مذہبی رہنماؤں

نے ’’ہندوستان چھوڑ دو‘‘ کا نعرہ لگایا تھا۔ آخر کار غلامی کی فوجوں نے ہندوستان چھوڑ دیا اور انگریزوں کو ہندوستان سے بوریا بستر باندھنا پڑا۔ آج ہم اس شہر میں فرانس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تیونس اور الجزائر کو چھوڑ دے اور یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح ’’ہندوستان چھوڑ دو‘‘ کا نعرہ کامیاب ہوا۔

تیونس کی صورت حال...... محترم حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیونس اور مراکش کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کر دوں، تیونس ۴۸ ہزار مربع میل کا اسلامی علاقہ ہے جو شمالی افریقہ میں بحر روم کے کنارے اٹلی اور فرانس کے سواحل کے سامنے واقع ہے۔

یہاں آخری مردم شماری کے مطابق ۲۶ لاکھ انسان آباد ہیں۔ اب یہ آبادی اندازاً ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں ایک لاکھ آٹھ ہزار فرانسیسی موجود ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں۔ یہاں برائے نام ایک سلطان موجود رہتے ہیں مگر اصل راج فرانسیسی شہنشاہیت کا ہے۔ پچاس سال کا عرصہ ہوگیا کہ غیر ملکی طاقتیں تیونس کے معاملہ میں بے جا اور ظالمانہ طور پر دست اندازی کر رہی ہیں۔ تیونس کی جنگ آزادی نئی دستور پارٹی کی رہنمائی میں لڑی جا رہی ہے مجھے اس تحریک کے اسیر رہنما جناب حبیب بورقیبہ سے گذشتہ سال اسی شہر بمبئی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب کہ انہوں نے خلافت ہاؤس کے ایک نمائندہ اجتماع میں اپنے مطالبات آزادی کی شرح فرمائی اور مجھے ان کی تائید میں تقریر کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ اس مختصر تقریر میں انہیں یقین دلایا گیا کہ ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اور بالخصوص مذہبی حلقہ آپ کے مطالبات کی تائید میں ہے۔ آج ایک سال کے بعد اسی وعدے کو دہرانے کا پھر موقع مل رہا ہے، آپ کے شہر میں تیونس امدادی کمیٹی موجود ہے۔ جس کا اعلان آپ تین چار روز پہلے اخباروں میں دیکھ چکے ہیں جو ان نعروں اور وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔

مراکش کا مسئلہ...... تیونس سے زیادہ مراکش کا مسئلہ بین الاقوامی ہنگامۂ آزادی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراکش شمالی افریقہ میں مغرب اقصیٰ کا ملک ہے۔ یہ ملک عرض البلد شمالی کے (۲۸) اور (۳۶) درجے کے درمیان اور طول البلد غربی کے (۳) اور (۱۴) درجے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحر روم اور آبنائے جبل الطارق، مغرب میں اٹلانٹک سمندر، جنوب میں صحرائے اعظم اور شمال مشرق میں کوہستان واقع ہے، اس کا رقبہ ۵ لاکھ ۸۱ ہزار کلومیٹر مربع میل ہے۔

مراکش کو فرنگی اقوام نے جو بدقسمتی سے اس وقت جمہوریت کے نام پر دنیا کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہیں۔ تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کی سالمیت، طاقت اور صلاحیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ایک حصہ فرانسیسی مراکش ہے جو فرانس کی غلامی میں ہے۔ اس حصہ کا دارالسلطنت فیض ہے اور اس کی آبادی ۸۴ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ دوسرا حصہ اسپینی مراکش ہے جو اسپین کی غلامی میں ہے، جس کا پایۂ حکومت رباط ہے اور اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔

تیسرا حصہ سفید فام بین الاقوامی غلامی کے ماتحت ہے جس پر انگریز، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، امریکی، ڈچ

اور بلجیم شہنشاہیت پسند طاقتیں حکومت کرتی ہیں۔اس کا دارالخلافہ طنجہ ہے اور اس کی آبادی دس ہزار ہے، ایک عام اندازے کے مطابق مراکش کی آزادی کا مسئلہ کم یا زیادہ ایک کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔

دو نئی سلطنتیں...... پس آج شمالی افریقہ کے نقشہ پر اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر دو نئی سلطنتیں ابھر رہی ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق اب دونوں قوموں کی آزادی ایشیا کی طاقت میں ایک نیا اضافہ کرے گی اور ان دونوں ملکوں کی آزادی سے دنیا کے امن کو ایک نئی ضمانت مل سکے گی۔

اس نقشے کے پیش نظر ہم آج یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آزادی کا وہ نعرہ جو ساری دنیا میں گونج رہا ہے، تیونس اور مراکش کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

ہم دنیا کی رائے عامہ کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فرانسیسی شہنشاہیت کو تیونس، الجزائر اور مراکش سے دستبردار ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برطانیہ ہندوستان اور پاکستان سے، امریکہ فلپائن سے، اٹلی طرابلس اور حبش سے اور ہالینڈ انڈونیشیا سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

مطالبات اور تائید...... ہمارا یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ:

1 ...... تیونس کی نئی دستوری پارٹی اور مراکش کی استقلال پارٹی دونوں ملکوں کے عوام کی طرف سے آزادی کا مطالبہ کر چکی ہیں اور یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

2 ...... اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت تیونس اور مراکش کی آزادی، آزاد دنیا کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے اور اقوام متحدہ کی اسمبلی میں دو نئے ملکوں کے داخلہ سے خود اقوام متحدہ کی ساکھ بڑھے گی اور شکوک و شبہات کم ہو جائیں گے جن سے دنیا کے امن کو خطرہ درپیش ہے۔

3 ...... عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتیں تیونس اور مراکش کی آزادی کے لئے اقوام متحدہ کی راجدھانی (دارالحکومت) میں سرگرم کار ہیں اور ان طاقتوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو سلامتی کونسل میں دونوں ملکوں کی آزادی کا مقدمہ پیش کر دیا ہے۔ان ملکوں کے ساتھ آزاد ہندوستان بھی شامل ہے، نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہے۔اس لئے یہ ہماری قومی پالیسی کا بھی تقاضا ہے کہ ہم ان دونوں ملکوں کے جہاد آزادی میں پوری پوری حمایت کریں۔

4 ...... ٦ ستمبر کے اجلاس میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اقوام متحدہ میں عرب ملکوں کے نمائندوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ پرزور طریقہ پر پیش کریں اور اپنے دوست ممالک سے اس مسئلہ میں کمک حاصل کریں۔

فرانس کا دیوالیہ پن...... سیاسی واقعات کے اس صاف و صریح نقشے کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک تجویز کی صورت میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں جبکہ ابھی ماضی قریب میں پچاس کروڑ انسان (جو دنیا کی آبادی کا

پانچواں حصہ ہیں) اپنی آزادی کے مالک بن چکے ہیں۔فرانس کا ایک کروڑ انسانوں کا غلام بنائے جانے پر اصرار کرنا اس کے سیاسی دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے، جسے آج کل کے دور میں آزاد قوموں کی منظوری نہیں ہوسکتی۔ اندریں حالات ہندوستانی عوام اوران کی حکومت جنہوں نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اور آج مصراور فلسطین کی آزادی کی حمایت میں ہمنوائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔تیونس اور مراکش کے مطالبۂ آزادی کی تائید و حمایت سے بھی کسی طرح چشم پوشی اور سکوت نہیں کرسکتے۔

آج دنیا میں امن، انصاف، حق خودارادیت، مساوات اور انسانیت کے الفاظ سب سے زیادہ یورپ کی آبادیوں کے زبان زد ہیں۔اگران کے یہاں ان الفاظ کے کچھ معنی ہیں اور حقیقتاً یہ الفاظ مہمل اور بے معنی بنا کر استعمال نہیں کئے جارہے ہیں، تو فرانس، اٹلی، بلجیم، اسپین، انگلستان، امریکہ اور تمام ان یورپین طاقتوں سے جو تیونس اور مراکش پر اپنا پنجۂ استبداد (قبضہ) جمائے ہوئے مطمئن بیٹھے ہیں۔ہم یہ اپیل کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انسانیت پروری کے دعویدارو! اے امن وانصاف کے ٹھیکیدارو! اوراے خودارادیت اورانسانی حقوق کے علمبردارو! تمہیں تیونس اور مراکش کی آبادیوں کو غلام بنائے رکھنے پر آخر کیوں اصرار ہے؟

اگر تمہیں حقیقی امن وانصاف اورانسانیت کی لاج نہیں تو کم ازکم اپنے ان لفظی دعوؤں ہی کی پاسداری کرواورایک کروڑ انسانوں کے ایک ایسے جائز مطالبہ کی راہ میں حائل نہ ہو، جن کی کمک پر پوری جمہوریت پسند دنیا کھڑی ہوئی ہے۔

مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن...... حضرات! مجھے چوں کہ ہندوستان میں بلکہ ایشیا کے سب سے بڑی مذہبی اور علمی مرکز دارالعلوم دیوبند سے ذمہ دارانہ تعلق ہے اوراسی کے ایک ذمہ دار اور خادم کی حیثیت سے میں نے اسلامی اخوت کا حوالہ دے کر تیونسی لیڈر جناب حبیب بورقیبہ کو یقین دلایا تھا کہ اس مطالبہ میں ہندوستان کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔اس لئے بے موقعہ ہوگا اگر میں اس اہم ترین مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن واضح کئے بغیر اس افتتاحیہ کو ختم کردوں۔جبکہ کسی بھی ایسے اجتماعی یا سیاسی مسئلہ میں جس میں مسلمان بالاستقلال یا دوسری اقوام کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں، اسلام نے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ صاف، واضح اور روشن ہدایات دی ہیں۔جہاں تک کسی قوم کی آزادی اور ظالم قوموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس کا سب سے بڑا حامی ہے۔فرعون سے بنی اسرائیل کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبۂ آزادی اس بارے میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔ اسرائیلوں کو مصر کی فرعونی حکومت نے غلام بنا رکھا تھا۔انہیں اچھوت بنادیا گیا تھا، اقتصادی حالت ان کی زبوں (بدتر) تھی۔اوپر سے انہیں پارٹیوں میں منقسم کردیا گیا تھا تا کہ ان کی سالمیت اوراجتماعی صلاحیت ختم ہوجائے۔اس کا نرینہ اولادوں پر کنٹرول تھا اور پیدا ہوتے ہیں تہ تیغ کردیا جاتا تھا تا کہ آئندہ بھی ان میں کوئی اولوالعزم سپوت پروان نہ چڑھنے پائے، جو اپنی قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر ابھر جائے اور اس غلام قوم میں کوئی صحیح لیڈرشپ قائم نہ ہوجائے۔جو ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے، لیکن غاصب قوم کی اپنی سفاکیوں اور چالاکیوں کے اندھیریوں

میں بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مقدس ہستی اسرائیلیوں میں پیدا ہوئی اور ابھری جسے فرعون جیسے قاتل بنی اسرائیل کے دربار میں شاہانہ طریق پر بلوایا گیا۔ اور آخر انہوں نے قوم کی اس بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر فرعونی دربار میں اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ فرعون نے اپنے کچھ سابقہ احسانات پر رورش جتا کر اور نعمتوں کے تذکرہ سے مطالبۂ آزادی کو ٹلانا اور رلانا چاہا۔ جس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''ہاں میری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے شاید یہی ہوگی کہ تو نے میری قوم کے لاکھوں افراد کو غلام بنا رکھا ہے'' پھر اس نے دھمکیوں سے مطالبہ آزادی کو دبانا چاہا جو ظالم قوموں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے اور کہا: ''اے موسیٰ! میں تجھے جیل بھیج دوں گا''۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اگر چہ میں روشن دلیلیں بھی اپنے مطالبات کے جواب میں پیش کر دوں یعنی جیل اور قید و بند کی دھمکیوں سے ایک مدلل دعویٰ کا جواب تھوڑا ہی ہوسکتا ہے؟''

ان غلط حیلہ جوئیوں سے کوئی اثر نہ لیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرعون کے سامنے یہ مطالبۂ آزادی رکھ دیا ہے کہ میں بحکم خداوندی کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ کر دے اور ان کو غلامی کا عذاب دینے سے دست کش ہو جا۔ درصورت خلاف ورزی فرمایا کہ: ورنہ پھر اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی اور حق و صداقت کے مطالبات جھٹلانے کا وبال جھٹلانے والے ہی کو بھگتنا ہوگا۔

اس واقعہ میں خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو مطالبۂ آزادی دے کر بھیجنے سے واضح ہے کہ مظلوم قوموں کا مطالبۂ آزادی ایک مذہبی حق ہے جس کو خدا کی طرف سے تائید ہی حاصل نہیں، بلکہ اس کا حکم اور امر شامل ہے جو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ ایسے مطالبات کو لے کر اٹھنے والا درحقیقت ایک مذہبی تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر جہاں تک کسی دبے ہوئے وطن اور سرزمین کو ظالموں کے ناجائز قبضہ سے نکالنے اور حق دار کو قبضہ دلانے کا تعلق ہے۔ اسی واقعہ میں اس کی بھی صاف و صریح ہدایت ملتی ہے۔

استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار پر عتاب الٰہی...... سرزمین فلسطین پر عمالقہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور بنی اسرائیل کو جن کی وہ سرزمین تھی، اس سے محروم کر دیا تھا۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسرائیلیوں کو حکم بھیجا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارا حق ہے، اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرو اور عمالقہ کی غاصب اور جابر قوم کا قبضہ وہاں سے اٹھا دو۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ کے تن و توش اور ظاہری قوت سے مرعوب ہو کر تعمیل حکم میں پس و پیش کیا اور غاصب قوم کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر اپنے وطن میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک یہ جابر قوم ہمارے وطن کو خود نہ چھوڑ دے گی ہم اس میں داخل نہ ہوں گے۔ ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا﴾ ①

---

① پارہ: ٦، سورة المائدة، الآية: ٢٢.

قوم کو سمجھایا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس پر بھروسہ کرو، وعدہ ہے کہ جب تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تم ہی کو دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی بنی اسرائیل جی چرا گئے اور استخلاص وطن کے لئے جدوجہد کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر انہیں خدا کی طرف سے سزا دی گئی۔ ایک تو یہ غلبہ و قبضہ چالیس برس مؤخر ہو گیا۔

اور دوسرے ۴۰ سال کی اس لمبی مدت میں بنی اسرائیل وادیٔ تیہ میں بھٹکتے پھرے، گویا سزا کے طور پر گھر سے بے گھر بھی رہے اور معتوب الٰہی بھی ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ظالم قوموں سے اپنی سرزمین کا چھڑانا ایک ایسا مذہبی فریضہ ہے کہ اس میں پس و پیش یا انکار کرنے سے اقوام معتوب خداوندی ٹھہر جاتی ہیں اور انہیں مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس مقصد کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔

آزادی، مذہبی اور انسانی حق ...... پس! آج تیونس اور مراکش کے باشندے اگر فرانس سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے ان سے اپنی سرزمین چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے ملک پر خود اپنا قبضہ چاہتے ہیں تو یہ ان کا شرعی اور مذہبی حق ہے جس کو انہیں بہر صورت حاصل ہی کرنا چاہئے۔ اور اگر ہم یا دنیائے اسلام کے تمام باشندے خواہ وہ عرب لیگ کے ممبر ہوں یا عرب ممالک کے سرکاری نمائندے اس مطالبۂ آزادی کی حمایت میں فرنچ حکومت اور یورپین اقوام کے غاصبانہ اقتدار کے مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ان کا یہ فعل نہ صرف بین الاقوامی قانون، آزاد ممالک اور جمہوریت پسند اقوام کی متفقہ خواہشات کے مطابق ہے، بلکہ مذہبی اصول اور اسلامی قانون کے منشاء کے بھی عین مطابق بلکہ اس کے امر و حکم کے تحت ایک شرعی فریضہ ہے۔

بہر حال تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی یہ حمایت خود ان ملکوں کی ذمہ دار عوامی جماعتوں، اقوام متحدہ کے چارٹر، عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتوں، عرب لیگ کمیٹی کی تجویز، ہندوستان کی جمہوریت پسند پالیسی اور بالآخر مذہب کی صاف و صریح ہدایت کے تحت نہ صرف واجبی بلکہ واجب اور انسانیت کے حقوق کی صحیح حفاظت ہے۔

جہاد آزادی میں شرکت ...... ہم جمعیت علماء ہند کے شکر گزار ہیں کہ اس نے عین وقت پر اس ملک کے لوگوں کو، مساوات کا شور برپا کرنے والوں کو کہا، اگر تم واقعی ان الفاظ سے دنیا کو دھوکا نہیں دے رہے ہو ان کا قومی اور مذہبی فریضہ یاد دلایا۔ ہم ان تمام جماعتوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس عظیم مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور آئندہ کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں اس کام کو قانونی پوزیشن کی حد تک اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی اور اپنی قومی پالیسی کی رہنمائی میں جاری رکھنا چاہئے اور بمبئی کے اس نمائندہ اجلاس میں ایک مکمل اور جامع تجویز سلامتی کونسل میں بھیج کر شمالی افریقہ کے اس جہاد آزادی میں اپنی شرکت کا واضح یقین دلا دینا چاہئے۔ نیز مجھے امید ہے کہ ذمہ داران اجلاس اس موقع پر اپنی سیاسی اور مذہبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بارہ میں ہندی عوام کے نقطہ نظر سے تیونس اور مراکش کے تمام باشندوں کو بھی باخبر کر دینے کا خوشگوار فریضہ ادا کریں گے۔ (وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ)

آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند

پیچیدہ حالات میں متضادعناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشمکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے، جوان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب ونظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حَکَم کے ہو جو سب کے قضیئے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے۔ مذہب اور بالخصوص ''دین فطرت'' (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء وقیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

شکریہ اکابر..... زرگان ملت واعیان امت! اس مقدس جلسہ کی صدارت کا یقیناً میں اہل نہ تھا۔ پھر بزرگان اور اکابر شیوخ کی موجودگی نے تو میری ذات ہی کو درجۂ صفر میں پہنچا دیا ہے، اس صورت میں کسی نام نہاد اہلیت کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جرات نہیں ہوتی کہ اس مقام پر کھڑا ہوں چہ جائیکہ کچھ عرض ومعروض کروں۔ ساتھ ہی اس مقام کی ذمہ داریاں اور وہ بھی بحالات موجودہ جن وسیع معلومات اور جس ہمہ گیر فکر وتجربہ کی متقاضی ہیں وہ اپنے اندر مفقود ہیں۔ اس لئے رہی سہی ہمت بھی جواب دے دیتی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ جن بزرگوں نے بنام صدارت یہ عزت افزائی فرمائی ہے وہی اس کی سرپرستی بھی فرمارہے ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہونے کی جرأت کی اور اکابر واعیان کے شکریہ کے بعد ذیل کی چند معروضات پیش کرنے کی ہمت ہوئی۔

نظریاتی فتن کا دور..... حضرات محترم! آج کے حالات جن سے ہم گذر رہے ہیں نہایت پیچیدہ اور نازک ہیں، سطح پر سکون ہے مگر سطح کے نیچے آب زیر کا مضمون ہے۔ اوپر سے سبزہ زار ہے مگر اندر خارزار، اگر کوئی مخملین سبزہ

زار میں گھس جاتا ہے تو نیچے کے چبھتے ہوئے خار اسے زخمی کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ خصوصیت سے مسلمانوں کا معاشرہ چند در چند فتن میں گھرا ہوا ہے شریعت نے دین کے بارے ہمیں خبر دی تھی کہ دور فتن میں دین کا سنبھالنا ہاتھ میں چنگاری سنبھالنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن آج دنیا کا تھامنا دین تھامنے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ کشمکشوں اور مصادمتوں کا دور دورہ ہے۔ قوم میں باہم جماعتی کش مکش علیحدہ ہے قومی رجحانات اور ہیں اور سرکاری کچھ اور، کچھ ان دونوں لائنوں سے الگ ہو کر دونوں کے مدمقابل ہیں، افراد و جماعت ہی میں کش مکش نہیں بلکہ نظریات بھی باہم دست وگریباں ہیں۔ ان کشمکشوں میں مسلمان ؎

''دوگونہ رنج و عذاب است جان مجنون را''

کا مصداق ہے اور اس کی ہدف ہونے کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ: ؎

ہر بلائے کز آسماں آید   بر زمین نارسیدہ می پرسد

خانۂ   انوری   کجا   باشد؟

یعنی مسلم آزار اغیار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر مسلم آزاروں کی فہرست تیار کی جانے لگے تو اغیار کے ساتھ مسلمان بھی اس میں نظر آئیں گے۔

متضاد عناصر کی ہمہ گیر راہنمائی...... ظاہر ہے کہ پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی رہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں، البتہ اس تضاد اور کش مکش کے میدان میں وہ جماعت آگے آسکتی ہے جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو، اس کی وسعت قلب ونظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو، سب کے قضیے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہوسکتی ہے، جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے، مذہب اور بالخصوص ''دین فطرت'' (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء وقیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

اس ہندوستان کی سرزمین میں اگر حضرت سلطان الہند خواجہ اجمیری، نور ہند خواجہ کلیری، قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ہر قرن کے علمائے ربانی ومشائخ حقانی قدس اللہ اسرارہُم، نے ہر پارٹی ہر فرقہ اور ہر فریق کو آخر اپنی وسعتوں میں گم کر کے رکھ دیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سسٹم کا ثمرہ نہ تھا بلکہ پارٹی فیلنگ (سوچ) سے بالاتری کا کرشمہ تھا۔ آج بھی اگر مسلم اقوام کی صحیح رہنمائی ہوسکتی ہے تو خواہ وہ کسی لائن پر ہو، انہیں اعیان امت کے اس ہمہ گیر رنگ اور انہی کے سچے جانشینوں کے اسوہ پر کارآمد اور موثر ہوسکتی ہے۔

جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت...... جمعیت علماء اپنی اصل فطرت سے ایک خالص مذہبی

جماعت ہے۔ گو اس نے ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا۔ قربانیوں کا لگا تار سلسلہ صفحۂ تاریخ پر ثبت کیا اور آزادی کے میدان جنگ میں نہ صرف یہی کہ کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سب سے آگے ہو کر کام کیا۔ لیکن پھر بھی اس کی بنیاد مذہب تھی اور مذہب ہی کے معیار سے اس نے یہ کچھ کیا۔ وقتی ضرورت ختم ہو جانے پر بالآخر اس نے پھر اسی اصل کی طرف رجوع کیا جو اس کی اصل سرشت تھی یعنی مذہب اور مذہبی رجحانات۔

جمعیت علماء نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے علیحدگی کا جو نظریہ قائم کیا وہ یقیناً قومی تعمیر کے لحاظ سے موزوں ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ نہ اس لئے کہ سیاست کوئی شجر ممنوعہ تھی یا وہ اسکے حق میں عدم جواز کے تحت میں آ گئی تھی، بلکہ عام سیاسی مصالح کے علاوہ اس لئے کہ انقلاب کے بعد کسی قوم کو بنانے والے طبقہ کے لئے سیاسی الجھنوں سے یکسو ہونا ہی طبعاً ضروری ہوتا ہے اور وہ سیاسی اتار چڑھاؤ میں گھر کر تعمیری کاموں کے لئے وقت نہیں دے سکتا۔

قومی تعمیر کی دفعات ...... قومی تعمیر کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام کو جو اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سمیٹ کر ذیل کے عنوانات کے تحت میں لا سکتے ہیں:

نظام تعلیم، نظام تبلیغ، اصلاح معاشرہ اور مذہبی وتمدنی حقوق کا سیاسی تحفظ۔ قومی تعمیر کی ان دفعات میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے جس سے کسی قوم کا دل ودماغ بنایا جاتا ہے۔ تمام کامیابیاں اور ہر نوع کی عزت وسربلندی کا ابتدائی زینہ علم ہے، حق تعالیٰ نے انبیاء ومرسلین کا سلسلہ اسی علم کی نظر واشاعت کے لیے قائم فرمایا۔ اسلام میں سب سے پہلی آیت ہی "اقـــرأ" نازل ہوئی جس کا حاصل پڑھنے پر ابھارنا ہے۔ اسلام سے قبل کا قریبی دور گو ساری ہی بشری خرابیوں پر مشتمل تھا مگر اسے "دور جاہلیت" کا نام دے کر یہ بتلایا گیا کہ ہمہ نوع شرور وآفات کا سرچشمہ جہل اور ہمہ نوع کمال وخوبی کا سرمنشا علم ہے، اس لئے دینی تقاضوں کے اعتبار سے سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔

سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ ...... وقت کے لحاظ سے یہ بھی مسئلہ مسلمانوں بلکہ ہر مذہبی فرقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ توجہ طلب ہے، کیوں کہ جبری تعلیم کے قوانین کے تحت جو نصاب حکومت نے تیار کیا ہے اس سے سیکولر ازم کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا عام رخ بلکہ اس کے بہت سے اجزاء اسلام کے عقائد واعمال پر براہ راست ایک مستقل زد ہیں۔ جس سے ایک مسلمان بچہ کا عقیدہ وعمل کے لحاظ سے مسلمان باقی رہنا دشوار ہے۔ اس لئے بتقاضائے وقت بھی اس کی شدید کی ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی کفالت قومی طور پر کی جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی اکابر امت اور نبض شناسان قوم کی یہی اعلیٰ ترین سیاست تھی کہ وہ جابجا دینی مدارس قائم کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے سنبھال لیا۔ یہ مدارس آج بھی بحمد اللہ کامیابی کے ساتھ جاری اور اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان میں سے کتنے ہی مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسے دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہانپور، مدرسہ شاہی مراد آباد وغیرہ، ان مدارس کا مقصد جامع علماء تیار کرنا ہے، جو قوم کی ہدایت ورہنمائی کے فرائض انجام دیں۔ لیکن موجودہ دور اور اس کے حالات کے لحاظ سے ان مدارس کے علاوہ ایسے مکاتب کی بھی اشد ضرورت پیش آگئی ہے جو مختلف پراگندہ بلکہ گندہ لٹریچروں کے زہریلے اثرات سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ اگر مدارس دینیہ علماء تیار کریں تو یہ مکاتب دینیہ پڑھے لکھے دین دار تیار کرسکیں جو گو عالم نہ ہوں مگر دین کی سمجھ رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم اور ذریعۂ تعلیم...... جمعیت نے ان ہی مقاصد کی روشنی میں کافی عرق ریزی سے ایک جامع نصاب تیار کرلیا ہے جو بتدریج ملک میں اپنی جگہ کرتا جارہا ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبے جمعیت کے ساتھ اس بارے میں تعاون کریں اور اس کے پروگرام کے مطابق یہ نصاب رائج کرنے پر تل جائیں تو بہت حد تک اس زہر کو نکالا جاسکتا ہے۔ جو ان غیر معتدل نصابوں یا مروجہ بلیک تعلیم (اندھی تعلیم) کے ذریعہ دل ودماغ میں پیوست کیا جارہا ہے۔

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو کے سوا دوسرا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ اسکا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اردو ایک ہلکی اور شریں زبان ہونے کے علاوہ یہاں کی مادری زبان بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سے علوم وفنون کی خزینہ دار بھی بن چکی ہے، اس کا تحفظ علوم وفنون کا تحفظ ہے جو بہر حال مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی کی رکھی اور تفہیم اردو کی، اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی، بلکہ دنیائے اسلام کے ہزار ہا افراد ان مدارس کی بدولت اردو دان ہوگئے اور آج افغانستان، ایران چینی ترکستان، روسی ترکستان، حجاز، افریقہ، عراق، جاوا، ساٹرا وغیرہ دور دراز ممالک بھی اردو زبان سے بے گانے اور بے تعلق نہیں۔ اور اس لئے جتنے ادارے آج اردو کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں ہمیں ان سب کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ پچھلے دونوں انجمن ترقی اردو نے تحفظ اردو کے سلسلے میں جو کامیاب مہم شروع کی، جمعیت علماء اور مدارس دینیہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور تا بحد مقدور اس میں تعاون سے کام لیا جس کے اچھے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

ذوق عربیت کی اہمیت...... مجھے اس سلسلہ میں ادھر بھی توجہ دلانا ہے کہ جیسے اردو ہماری وطنی اور علمی زبان ہونے کی حیثیت سے اس ملک میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عربی زبان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے جو ہمارے دین و مذہب کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس حد تک مذہب میں فنائیت کا مقام رکھتے ہیں، اسی حد تک وہ اس مذہبی زبان سے نابلد اور بے پرواہ بھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن اور اس کے محاورات سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی، جو بہت حد تک ان کے دینی ذوق کے لئے حجاب اور کتاب وسنّت سے بے تعلقی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر اقوام وملل اور دنیا کے ممالک میں ربط باہمی کا ذریعہ زبان کے سوا دوسرا نہیں تو کتاب وسنّت کے لگاؤ اور ربط پیدا کرنے کا ذریعہ بھی عربی زبان کے سوائے دوسرا نہیں۔

ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمان بچوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بے گانہ نہ رکھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس ضرورت کو مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سکریٹری نے پورا کر دیا ان کے عربی نصاب کا پانچ کتب پر مشتمل سیٹ عربی کی ایک قابل قدر پنج گنج ہے جس سے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ قلیل مدت میں قرآنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھی اس اردو نصاب کے ساتھ جو جمعیت علماء نے مرتب کیا ہے مکاتب کا جزو بنا دیا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو یہ اہم ضرورت پوری ہو سکتی ہے، جو کتاب وسنّت ہی کی حد تک نافع ثابت نہیں ہوگی بلکہ دنیائے اسلام کے باہمی رابطہ کے لئے بھی مؤثر اور کارآمد ثابت ہوگی۔

تربیت عوام...... لیکن تعلیم پھر بھی تربیت خواص کا ذریعہ ہے اس سے تذکیر عوام کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس کا ذریعہ تبلیغ ہے۔ بشرطیکہ وہ جماعتی خصوصیات کی نہ ہو کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور مسائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خالص اسلامی مسائل کی نشر و اشاعت اور الاہم فالاہم کے قاعدے سے جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں انہی کے مناسب حال شریعت کے مسائل سے دماغوں کو روشنی بخشی جائے۔

جمعیت علماء اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی اس کی رپورٹوں میں تبلیغی خدمات کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے۔ فی الحال ایسے مبلغ تیار کئے جانے کی ضرورت ہے جو جھگڑالو نہ ہوں، ضدی نہ ہوں، سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ مسائل کو سلجھا کر دماغوں میں سلجھاؤ پیدا کر دیں۔ آج جبکہ پرچار اور تبلیغ کے نام پر بہت سے پراگندہ خیالات اور غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں، اشد ضرورت ہے کہ صحیح مسائل کو پیش کر کے دلوں کو تشتت و پرگندگی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

اصلاح معاشرت...... آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عامۂ مسلمانوں کی معاشرت غیر اسلامی ہوتی جارہی ہے۔ ان کا رہن سہن چال چلن رفتار گفتار وغیرہ غیر اقوام کے نمونہ کا ہوتا جارہا ہے۔ روحانی آداب کے بجائے جذبات نفسانی دل و دماغ پر چھاتے جا رہے ہیں۔ شادی غمی کے اجتماعات اور خانگی زندگی میں غیر اسلامی رسوم اور منکرات بطور جزء زندگی کے داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلم قوم کا صحیح کیریکٹر اور مقام مشخص (خاص) نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

اور وہ محض وعظ و پند یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہر ہر مقام پر برادریوں میں سے با اثر لوگوں کو چن کر ان کی عملی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ برادری کے بڑوں کی اصلاح پر زور صرف کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ اس اثر کو پھیلایا جائے جس میں عملی مشقت اور جدو جہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جمعیت علماء قیامِ مکاتب اور تبلیغی نظام کے سلسلہ میں یہ خدمت باحسن اسلوب انجام دے سکتی ہے۔ پس قیام مکاتب اور تنظیمی مساعی کے وقت اس اصلاحی تنظیم کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہ سہولت کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ اصلاحی کام خود اتنا وسیع اور اہم ہے کہ جو طبقہ بھی اس کام میں ہمہ تن لگ جائے گا، اسے دوسرے میدانوں میں کودنے کا وقت نہیں مل سکتا۔

بنا بریں ان امور کے لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔ قومی کاموں کے سینکڑوں شعبے ہیں اگر کارکنوں کا ایک ہی طبقہ سارے کاموں کو سنبھالنے کی فکر میں لگ جائے تو کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تقسیم عمل کے اصول پر کارکنوں کی جماعت کو بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔

جمعیت علماء ان تعمیری خدمات میں لگ کر یقیناً سیاسی میدانوں میں پہلے کی طرح نہیں اتر سکتی، لیکن اس کے معنی کلی یکسوئی کے بھی نہیں۔ اگر جمعیت علماء مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور عام اجتماعی خدمت کے لئے کمربستہ ہوگی تو لامحالہ مثبت پہلو کے ساتھ اسے منفی پہلو بھی سامنے رکھنے ہوں گے اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حقوق پر کس راستہ سے زد پڑ رہی ہے؟ اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ اگر قانون ان حقوق پر اثر انداز ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا اور اسے اپنی پوری آئینی جدوجہد سے بدلنے کی سعی کرنا بھی اسی کا کام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس منفی پہلو کی روک تھام کے لئے اسے سیاست اور سیاسی رفتار سے کلی علیحدگی کئے بغیر، اس پر گہری اور تنقیدی نظر بھی رکھنی پڑے گی اور ساتھ ہی سیاسی حلقوں سے کچھ نہ کچھ قریب بھی رہنا ہوگا۔ اس لئے جمعیت علماء کے سیاست سے کلی علیحدگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاسی میدان سے اس حد تک تعلق اس کے ۱۹۴۷ء کے اعلان علیحدگی سیاست کا مخالف نہیں، کیوں کہ سیاست سے اس کا اتنا تعلق کسی عام عملی جدوجہد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹری سیاست کا تعلق ہے جس سے جماعتی علیحدگی کا اعلان ۴۷ء میں کیا گیا ہے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ گذارش کئے بغیر نہ رہوں گا کہ خاص افراد کو چھوڑ کر کم از کم جمعیت کے عام عہدیداران اور اس نظریہ میں عملی ہم آہنگی قائم رہنی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صورت حال غلط اور صحیح ہر قسم کے الزامات کا منشاء بنتی رہے گی۔

جو جماعتیں خالص سیاسی یا دفاعی لائنوں پر کام کرنا چاہتی ہیں، ہمارے لئے ان سے الجھنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ تعمیری کام کتنے بھی ضروری ہوں، دفاعی ضرورتوں سے خالی نہیں رہ سکتے۔ بالخصوص جبکہ دور ہی کشاکشی اور کش مکش کا ہو۔ تقسیم عمل کے اصول پر اگر کوئی جماعت اپنے اندرونی دواعی اور سچے ارادوں سے ایسی کوئی لائن اختیار کرتی ہے تو اس کے مسائل پر ہمیں جانچ اور تنقید کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن خود اس کمیونٹی یا جماعت کو رد کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ اگر وہ آئین کے دائرے میں اپنے کام کے لئے کوئی وجہ جواز رکھتی ہو تو کلمہ خیر کہہ دینے کا بھی مضائقہ نہیں۔

جمعیت کا منتہائے نظر...... جمعیت علماء اپنے نام و رسم کے اعتبار سے اہل علم کی جماعت ہے، جس کا منتہائے نظر مذہب اور دین ہے۔ اس لئے وہ صرف اپنے ہی حلقہ کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام کارکن جماعتوں کے لئے ایک مفتی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لیے اس کا اخلاقی ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی آئینی ربط بھی ملک کے ذی رائے طبقہ اور مسلمانوں کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے قائم رہنا مناسب ہوگا۔ تاکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی مذہبی ضروریات اور ان کی مواقع و مشکلات خود ان ہی حلقوں کی زبانی براہ راست جمعیت علماء کے سامنے آتی رہیں اور ادھر

جماعتی مسائل میں جمعیت کو بھی ہر طبقے سے فکری مدد ملتی رہے۔ اس سلسلہ میں اگر جمعیت کے انتخابات کی صورتیں امکانی حد تک رسمیات سے آزاد ہو کر سادہ اور بے تکلف رہیں تو ان میں ہمہ گیری بھی بڑھ جائے گی۔ خود اس عوام کی کشش میں بھی اضافہ ہوگا اور کسی طبقہ کو بھی عقیدت سے اس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار...... ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء کے ذمہ دار کارکنوں نے مسلمانوں کے پرسنل اور مخصوص معاملات کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں نہ وہ نظر انداز کی جاسکتی ہے اور نہ ہی صفحہ عالم سے مٹ سکتی ہیں۔ ایسے معاملات کا سلسلہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک برابر قائم رہے گا جب تک کہ حالات کلیۃً سازگار نہ ہو جائیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی حجاج اور زائرین حرم کے پاسپورٹ کے ساتھ انکم ٹیکس کے فارم کی خانہ پری کی قید بھی ہے جو اس سال سے لگائی جارہی ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے حجاج کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوگی اور اس کا اثر زائرین کی تعداد اور حج کے ابھرتے ہوئے ذوق و شوق پر بھی پڑ سکتا ہے۔

امید ہے کہ جمعیت علماء اس بارے میں پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے حج کے پاسپورٹ سے اس قید کو اٹھا دیئے جانے کی پوری پوری جدوجہد کرے گی۔

بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ...... اس سلسلہ میں ایک مسئلہ مسلمانوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ہے جو ان کے لئے باعث تشویش و پریشانی بنا ہوا ہے۔ اس میں الجھ کر کبھی ان میں ترک وطن کے وساوس ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی آئندہ نسلوں کے بارے میں پریشان کن خیالات انہیں ستاتے ہیں اور یوں بھی بے کاری بہت سے فتنوں کی آبیاری (افزائش) کی جڑ ہوتی ہے۔ برسرکار اور باروزگار ہو جانے سے خود ہی بہت سے مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے۔ جمعیت علماء اس کی کوئی ذمہ داری تو نہیں لے سکتی۔ لیکن اگر زیر غور مسائل میں یہ مسئلہ بھی سامنے رکھ لیا جائے تو قوم کے اغنیاء یا حکومت کے ذریعہ غرباء کی بیکاری کا مسئلہ حل کرنے کی کیا کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس مسئلہ میں مسلمانوں کو تسلی دلائی جاسکے اور ان کے اطمینان خاطر کا کم از کم استدلالی سامان ہی فراہم کیا جاسکے۔

قیام مکاتب اور اصلاح معاشرت کی مساعی کے سلسلہ میں اگر یہ مسئلہ سامنے رہے تو ہر جگہ کے اغنیاء اور غرباء کے ارتباط (رابطہ) سے اس مشکل کے آسان ہونے کی صورتیں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوں گی۔

جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت...... بہر حال جمعیت علماء کی سابقہ بیش قیمت خدمات کے ساتھ آج بھی اگر اس کے تعمیری پروگرام اور کام کو سامنے لایا جائے تو اس کی وسعتیں سابق سے کم نہیں ہوئیں۔ یہ کہنا کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا کہ اگر جمعیت علماء نے سیاسیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، تو اب اس کے کشکول میں کچھ باقی نہ رہا اور اس کی کائنات ختم ہوگئی اگر اس کی سیاسیات حقیقۃً مذہب کے ماتحت اور بلاشبہ تھیں تو یہ کہا جاسکتا

ہے کہ پہلے بھی وہ مذہب ہی کا کام کر رہی تھی اور آج بھی مذہب ہی اس کے سامنے ہے۔ ضرورت ختم ہو جانے یا بدل جانے پر کام کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے، اصل موضوع و مقصد میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور اس لئے آج بھی اس کے نصب العین کا دامن پہلے ہی کی طرح بھرپور ہے اور اس لئے جس طرح ۴۷ء سے پہلے اس کے نظام میں شامل ہونے کی ضرورت تھی، اسی طرح آج بھی ہے۔

بالخصوص اس کے تعلیمی پروگرام کو عملاً جاری کرنے اور پھیلانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان جمعیت علماء کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور پوری امنگ اور حوصلہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم پر مسلمان اپنے تمام دینی، معاشرتی، تمدنی اور دوسرے تمام جماعتی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک شاندار تاریخ ہے جو سب کے سامنے ہے، کل کی طرح آج بھی اس سے بے اعتماد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے نئی نئی جماعتیں بنانے کی بجائے یہی زیادہ بہتر ہے کہ اس بنی ہوئی جماعت سے کام لیا جائے۔ اس کے نظام کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نظام سے وابستہ ہو کر اسے کامیاب بنایا جائے۔

رائیوں کے تفاوت اور اختلاف خیال سے نہ کوئی ادارہ خالی رہ سکتا ہے نہ کوئی جماعت۔ لیکن یہ کسی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مخل نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کا عزم ہو اور نیت صادق ہو، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جمعیت علماء کے مقاصد مسلمانوں کی کسی خاص جماعت یا خاص پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتے، اس لئے تمام مسلمان اس ارادہ کو بلا تفریق خیال و مشرب اپنا سکتے ہیں۔

سرمایۂ جمعیت...... جمعیت علماء اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتی ہے۔ اس کے نظریات ہندوستان کے ان چیدہ علماء کے ذہنوں کا سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کامیاب خدمت اور تربیت کی ہے۔ اس لئے اس کے نظریات کی حد تک بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کسی بھی نظریہ کو مان کر مسلمانوں کو پچھتانا نہیں پڑا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے نظریات اور ہمارے اعتماد و تعاون میں کوئی خلیج حائل نہیں ہو یا ہم اس کی تنظیم میں شامل ہونے سے کوئی جھجک محسوس کریں، اگر رکاوٹ کی کوئی وجہ بھی سامنے ہو تو اس کے دفعیہ کا طریق بھی اعتراض یا دور بیٹھ کر کچھ کہنے سننے کی بجائے یہی زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ یگانگت کے ساتھ قریب ہو کر اس کی اصلاح کی جائے۔

جو چیزیں اس وقت عرض کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں، پہلے بھی بارہا کہی جا چکی ہیں اور ان کا بہت سا حصہ خود جمعیت علماء کے پروگرام میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ مقصد صرف تذکیر و تجدید اور آپ سے طلب عمل ہے، کسی آئین و اصول کی خوبی کھلنے کا راستہ صرف عمل ہے، اگر عمل نہ ہو تو قرآنی اور قطعی اصول بھی اپنی جگہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں، نافع ثابت نہیں ہو سکتے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ جزوی آراء و قیاسات کے اختلافات کو یک قلم ترک کر کے راہ عمل پر قدم بڑھائے

جائیں، بلکہ اب اس کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جمعیت علماء لوگوں کو بلانے اور کام میں لگنے کی بار بار اپیل کرے بلکہ لوگ از خود اپنی خدمات پیش کر کے اس کا ہاتھ بٹائیں، اگر بالفرض کارکنان جمعیت کے عمل میں کوتاہی اور فروگذاشت بھی ہے جس سے کوئی فرد اور کوئی جماعت بری نہیں، تو وہ بھی آپ حضرات کے مستعد ہو جانے اور عمل کا مطالبہ کرنے پر رفع ہو جائے گی جس سے اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

بزرگان جمعیت علماء کی یہ صدارت بخشی اپنے ایک کمر بستہ خادم کی محض حوصلہ افزائی ہے، ورنہ اس مجمع اکابر و اعیان کے سامنے ایک ناکارہ و نااہل کا کرسی صدارت ہی نہیں بلکہ اس صف کی کسی کرسی پر آبیٹھنا بھی جرأت و بے ادبی ہے۔ میں اس بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ان سطور کو ختم کرتا ہوں اور ''جمعیت علماء زندہ باد، کہتا ہوں۔

نصاب تعلیم کی تدوین

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور تھا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا۔ جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔ آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو میں بطور خلاصہ ان الا سکتا ہوں کہ ''مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں'' ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان مین لائیں گے۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

عربی وفارسی نصاب تعلیم کے متعلق اسمبلی ہال لکھنؤ میں
حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی معرکۃ الآرا تقریر

پس منظر...... حکومت ہند نے مدارس عربیہ کی تنظیم اور ترمیم واصلاح نصاب تعلیم علوم مشرقیہ کے متعلق جو قدم ٹھایا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور لائق تشکر وامتنان ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے ۷ ربیع الاول ۶۶ھ کو ایک مفصل مکتوب عالی جناب حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وزیر تعلیمات انٹریم گورنمنٹ ہند کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا جس میں دارالعلوم دیوبند کی سند فراغ اور سند تکمیل کو معتبر اور موثر قرار دیئے جانے کے متعلق موصوف کو خصوصی توجہ دلائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آج اگر فضلائے دارالعلوم اپنی معاشی ضروریات کے ماتحت حکومت کے کسی محکمہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو وہ خواہ کتنی ہی بہترین استعداد رکھتے ہوں، انہیں مولوی فاضل یا اسی کے مساوی کوئی سرکاری امتحان پاس کئے بغیر سرکاری ملازمت کا موقع میسر نہیں آتا۔ حالاں کہ دارالعلوم کے فضلاء علمی قابلیت کے اعتبار سے ہر حیثیت سے یونیورسٹیوں کے رسمی ڈگری یافتہ لوگوں سے لائق وفائق ہوتے ہیں، اگرچہ دارالعلوم کی تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمتوں کا حصول نہیں ہے، مگر جو لوگ ضروریات سے مجبور ہو کر اس کے خواہش مند ہوتے ہیں ان کے حقوق مولوی فاضل، بی اے، ایم اے کے مساوی اور سند تکمیل کو ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مساوی تسلیم کئے جانے میں حکومت کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ دارالعلوم ہر حالت میں اپنے نظام تعلیم، امور انتظامی اور حکومت کی امداد سے جس طرح اب تک بے تعلق اور آزاد رہا ہے یہی پالیسی اس ادارہ کی مستقبل میں بھی بدستور رہے گی۔

حضرت مہتمم صاحب کے اس مفصل مکتوب کے جواب میں مولانا آزاد صاحب کی جانب سے جواب موصول ہوا کہ میں خود اس بارے میں جناب والا سے ملاقات اور مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا، چوں کہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اسمبلی ہال لکھنؤ میں عربی وفارسی نصاب تعلیم کے متعلق ایک سرکاری تعلیمی کمیٹی کے زیر سرکردگی ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوگی۔ جس میں دارالعلوم کے نمائندے بھی شریک ہوں گے، اسی میں جناب والا سے بھی اس معاملہ میں تبادلہ خیال ہوگا۔ براہ کرم اس موقع پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔

چنانچہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اس تعلیمی کانفرنس میں دارالعلوم کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی دارالعلوم اور دیوبند شریک کانفرنس ہوئے۔ ان حضرات کی معیت میں مولانا فخرالحسن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب مدرسین دارالعلوم، مولانا عزیز احمد صاحب مبلغ دارالعلوم اور احقر خلیق احمد صدیقی مدیر ماہنامہ دارالعلوم، مبلغ وناظم شعبہ صنعت وحرفت دارالعلوم بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یوپی کے مختلف مشرقی تعلیمی اداروں کے نمائندوں سے اسمبلی ہال بھرا ہوا تھا۔ حکومت یوپی کے وزیراعظم اور دیگر متعدد وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری صاحبان بھی شریک کانفرنس تھے، ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کانفرنس مولانا آزاد صاحب نے ایک مبسوط (جامع) تقریر صدارت تقریباً پونے دوگھنٹہ فرمائی جس میں تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کے علمی تفوق اور اس کے تنزل کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی، اور بتلایا کہ اس طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں۔ جنہیں بہت جلد پورا کر دینے کی ضرورت ہے، طریق تعلیم املا ہونا چاہئے۔ کتاب کی پابندی ایک فضول اور مضر چیز ہے۔ جس سے علم چند سطروں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ نظر وفکر اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہونا مفقود ہو چکا ہے۔ مولانا کی اس تنقید سے بعض حضرات علماء پر گرانی کا اثر ہوا اور وہ ایک حد تک بجا تھا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ختم تقریر پر خود مولانا آزاد صاحب نے بھی اس کو محسوس فرمایا کہ موصوف اس تنقید میں حدود سے ایک حد تک تجاوز فرما گئے ہیں۔

اور انہوں نے فرمایا کہ: مجھے ابھی اور بھی کچھ کہنا تھا اور پھر آپ حضرات کی آراء سے مستفید ہونا تھا لیکن چونکہ وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کانفرنس کا ایک دوسرا اجلاس کل ۲۳ فروری کو ڈیڑھ بجے سہ پہر سے اور رکھ لیا جائے۔ چناں چہ دوسرے روز ٹھیک ڈیڑھ بجے سہ پہر کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم اور دوسرے حضرات علماء کرام، اسمبلی ہال میں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ تقریباً پونے دو بجے مولانا آزاد صاحب نے تقریر صدارت کا سلسلہ شروع فرمایا جس میں نصاب تعلیم کے مسئلے کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج علم کو محض علم کے لئے جو طبقہ پڑھتا ہے جس کی غرض علم سے کسب معاش نہیں ہے، بلکہ صرف علم اور علمی کمال پیدا کرنا ہے۔ وہ صرف یہ قومی مذہبی آزاد مدارس ہیں۔ جو دینیات کی تعلیم انتہائی استغناء اور لاغرضانہ

طریق پر دے رہے ہیں۔ جن میں خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند ایک اعلیٰ ترین مرکزی درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے گزشتہ اسی (۸۰) سال میں نہایت شاندار علمی خدمات انجام دی ہیں، اس مرکزی علمی ادارے نے مشرق و مغرب میں اپنے علمی آثار پھیلائے اور افغانستان، بخارا، بلخ، جاوا، ساٹرا، عرب، ترکستان، وغیرہ تک اس کے فضلاء پھیل گئے جنہوں نے اسلام کی سچی اور حقیقی خدمت انجام دی۔

میرے پاس اس بارے میں ایک جچی تلی تحریر بھی پہنچی ہے جس میں یہی دکھ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان فضلائے دارالعلوم کو ان کی اعلیٰ ترین قابلیت کے باوجود آخر وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے وہ اہل اور مستحق ہیں (یہ اشارہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اس خط کی طرف تھا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) یہ خود میرے دل کی آواز ہے۔ مگر ضرورت اسکی ہے کہ وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے آگے بڑھیں اور ان کی تعلیمی زندگی میں کچھ خفیف سا تغیر ہو۔ ان کے نصاب تعلیم میں وقت کے تقاضوں کو کچھ پورا کیا جائے۔ زیادہ نہیں بہت تھوڑا سا تغیر کافی ہوگا۔ نصاب کی اصلاح، طریق تعلیم میں قدرے تغیر اور تعلیمی رنگ کی ذراسی تبدیلیاں۔ بہرحال اس طرح مولانا آزاد صاحب نے آج کی تقریر میں دردمندانہ انداز میں علمائے کرام سے اپیل کی کہ وہ اصلاح نصاب تعلیم کے مسئلہ پر غور کریں اور پہلے دن کی تقریر میں جو شدت آگئی تھی اس کی کافی حد تک تلافی فرمادی۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے بعد متصلاً ہی خان بہادر مولوی مہدی حسن صاحب شیعی مدارس عربیہ لکھنؤ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کے لئے باجازت صاحب صدر کھڑے ہوئے اور انہوں نے تحریری یادداشت سامنے رکھ کر مولانا آزاد کی حرف بحرف تائید کی۔ صرف انگریزی زبان کی تعلیم پر بحیثیت زبان ثانوی مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانے کی مخالفت کی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (جو تمام علماء دیوبند، علمائے مظاہر العلوم سہارنپور اور مرادآباد کی طرف سے اس بارے میں اظہار خیال کے لئے نمائندہ بنائے گئے تھے) اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور صدر محترم مولانا آزاد سے تقریر کی اجازت چاہی۔

صاحب صدر نے نہایت خوش دلی اور آرزومندانہ انداز کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کو تقریر کی اجازت دی۔ چونکہ ابتداء میں آواز کسی قدر دھیمی تھی جسے صاحب صدر نہیں سن سکے۔ اس لئے صاحب صدر نے فرمایا کہ جناب! میرے پاس اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور یہاں سے تقریر فرمایئے۔ چناں چہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اسٹیج پر مولانا آزاد کی کرسی کے قریب کھڑے ہو کر اپنے مخصوص خداداد دلنشیں انداز میں نہایت فصیح و بلیغ جامع مانع تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

خلاصۂ تقریر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ علیہ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (اس کانفرنس میں صرف اسی تقریر کی خصوصیت تھی کہ وہ اللہ کے نام سے شروع کی گئی) صدر محترم و معزز حاضرین! تعلیمی کمیٹی کا یہ عملی اقدام جو عظیم الشان کانفرنس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے اور کانفرنس میں صدر گرامی قدر کے

ارشادات جو کل سے اب تک آپ نے سنے ہیں، ایک نہایت ہی مبارک اقدام اور تعلیمی سلسلہ میں مستحسن قدم ہے۔

صحیح تعلیم کے اسباب و عوامل...... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی برتری اور ترقی اس کی بقاء نہیں بلکہ اس کا قیام جس بنیاد پر استوار ہے، وہ صرف صحیح تعلیم ہے۔ صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصاب تعلیم موزوں ہو، طریق تعلیم موثر ہو، ذریعۂ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظام تعلیم درست ہو۔ اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہوتو یہ ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی، نصاب تعلیم اگر غلط ہوتو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہوسکتا، طریقۂ تعلیم غلط ہوتو تعلیم کا پورا اثر نہیں ہوسکتا۔

استاذ قابل نہ ہوتو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا۔ سب کچھ ہو اور نظام تعلیم درست نہ ہوتو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزاء کا ہونا از بس ضروری اور یہ تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت وسقم پر ان سب امور کی صحت وسقم موقوف ہے اور وہ ہے ”تعلیم کا نصب العین اور مقصد“ اس نصب العین کی خوبی وخرابی سے ان بنیادوں میں خوبی و خرابی پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور نا اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے۔ اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال ونقصان کا فیصلہ کیا جائے۔

نصب العین کی اہمیت...... نصب العین کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثلاً گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری تعلیم گاہوں کا نصب العین ملازمت قرار دیا تا کہ اس تعلیم کے ذریعے سستے کلرک اور محرر یا دفتری کارکن تیار کر لئے جائیں۔ یقیناً حکومت برطانیہ کا نصب العین انسانیت کی خدمت یا دیانتداری اور حق وصداقت کی خدمات نہ تھا، اس لئے ہم سرکاری اداروں کو اسی کے نصب العین کے ماتحت پرکھ سکتے ہیں۔

ہمیں سرکاری اداروں سے نکلے ہوئے لوگوں کو اس معیار پر جانچنا ہی نہ چاہئے کہ وہ کس قدر سچے اور کتنے بہی خواہ ملک وقوم ہیں۔ پس خود اپنے مقرر کردہ معیار سے گورنمنٹ اور اس کے ادارے کامیاب رہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے معیار سے ان کو جانچیں۔ ہاں ہمیں اعتراض کا حق اس سرکاری نصب العین پر ہوسکتا ہے نہ کہ اس کے پروردہ افراد پر کہ وہ تو اپنے معیار پر کامیاب ہیں۔

اس کے بالمقابل قومی اداروں اور دینی درس گاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی، نہ کرسی بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو انسانیت کے سچے خدمت گزار ہوں، اور عالم بشریت کی بہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ان افراد کی کامیابی اور ناکامی اور ان اداروں کے کمال ونقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیص کریں۔

قومی اور سرکاری اداروں کا نقطۂ اشتراک...... قومی اداروں کے فضلاء اور حکومت کے تعلیمی اداروں یا عام

سرکاری محکموں میں آئندہ باہمی ربط کیا رہے گا؟

اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ آج ایک تیز رفتار انقلابی ہوا چل رہی ہے اور اقتدار بدل رہا ہے۔ موجودہ حکومت قومی حکومت سے تشکیل پا رہی ہے۔ سو اس کے تعلیمی اداروں کا نصب العین اگر وہی ہوگا جو بدیسی حکومت کا تھا کہ چند کلرک، چند سرکاری مشین کے کل پرزے حکومت کی دفتری مشین کے لئے تیار ہو جائیں تو مدارس کے طلبہ کا جو رویہ سابق حکومت کے ساتھ رہا ہے وہی اس حکومت کے ساتھ بھی رہے گا۔ لیکن اگر موجودہ گورنمنٹ کا نصب العین تعلیمی دفتری کارکن تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے ذہن وطبیعت کے لوگ تیار کرنا ہے جو حقیقی انسانیت سے آراستہ ہو کر انسانیت کے سچے خادم ہوں، آشتی ومسالمت اور پریم وصلح کے خوگرہ (عادی) کر ملک کو آسمان ترقی پر پہنچا دینے کے جذبات رکھیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصب العین ان قومی مدارس کے قریب آ جائے گا اور یہ ایک نقطہ سنگھم کا پیدا ہو جائے گا۔ تعاون کے لئے قرب ضروری ہے اور قرب اس اشترا کی (مشترک) نقطہ پر ممکن ہوگا۔ اس لئے میرے خیال میں دینی عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کو تبدیل کیا جائے۔ یہی ایک مشترک نقطہ ہے جو سرکاریت اور قومیت کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے۔ اس صورت میں قومی مدارس کو اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ کسی سرکاری ڈگری یا امداد کی طرف جھکیں بلکہ شاید خود گورنمنٹ کو اس کی حاجت ہوگی کہ وہ وہاں کے فضلاء کی خریدار بن جائے اور ان کی تلاش میں رہے۔ سو اس صورت میں دینی مدارس ہر اخلاقی امداد کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی آزادی کو برقرار رکھ کر وہ جیسے ہمیشہ سے آزاد رہے ہیں اب بھی ان کی تعلیم اور نظام تعلیم دونوں آزاد رہیں گے۔ یہ ان کی آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ جب حضرت مولانا آزاد نے آزادی سے انہیں اور ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ اگر وہ آزاد نہ ہوتے تو قابل ستائش بھی نہ ہوتے اور جو آزاد نہیں انہیں یہ مقام حاصل بھی نہیں۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ...... اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہو سکتا ہے۔ کہ جن تعلیمات کا وحی الٰہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے۔ باقی جو فنون یا کتابیں قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، اس دور میں تصوف کا زور رہا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو بطور خلاصہ ان الفاظ میں لا سکتا ہوں کہ مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں...... ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔ پس تبدیلیٔ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کر دیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جا سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ اس لئے وقت

کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سدلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی۔خود درس نظامی کی تدوین ہی تبدیلی نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے، کیوں کہ بہرحال یہ نصاب قرن اول کا نہیں ہے۔وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے۔جب اس کے آغاز کے وقت تغیر وتبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔نصاب کا مسئلہ بہرحال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔میں نے خود ۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلہ میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلی نصاب کے متعلق اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔

بہرحال نصاب تعلیم میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا۔لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں۔جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں ہاں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سرکاری اداروں کے لئے قابل تقلید ہونا چاہئے،جس سے وہ قومی مدارس کے قریب لائے جاسکتے ہیں۔

نصاب کا تغیر وتبدل ہر دور میں ہوتا آیا ہے جو اس امر کی مستقل دلیل ہے علماء میں فکر ونظر کو ہر زمانہ میں اہمیت حاصل رہی ہے اور ہر دور میں مفکر ومبصر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔جنہوں نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ قرون اولیٰ،قرون متوسط،اور قرون اخیرہ میں اہل فکر ونظر کی امّت میں کمی نہیں رہی اور نہ ہوسکتی ہے کیوں کہ خود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔''مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَایُدْرٰی اَوَّلُهٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُهٗ.'' ①
جس سے واضح ہے کہ اہل نظر کسی خاص قرن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خلف میں سلف کے ہمرنگ ارباب نظر پیدا ہوسکتے ہیں۔اسی طرح صاحب شریعت (فداہ ابی وامی) نے ارشاد فرمایا:''یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ.'' ② اسی طرح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:''اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا.'' ③
اور دین کا حاصل جبکہ ایمان عقائد،اسلام واحکام،تزکیہ اخلاق اور اعلائے کلمۃ اللہ تو ناممکن ہے یہ مجدد اس سے ناآشنا ہوں یا ان کے زیر تجدید تربیت یافتہ مفکر نہ بنیں،اس لئے بہرحال فکر ونظر کا دروازہ ہر آن کھلا رہے گا۔مگر ہاں اپنی ہی بساط اور اپنی ہی استعداد کے مطابق ہم حدود سے گزرے ہوئے فکر کو فکر ونظر نہیں بلکہ تو ہم کہیں گے۔

بہر نوع بنیادی چیز نصب العین ہے۔اس سے ادارے بنتے ہیں اور اس کے بگڑ جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔ اس نصب العین کے ماتحت پھر دو بنیادی چیزیں ہیں جن کی تفاصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے۔

---

① مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ، ج:۷، ص:۴۹۵، رقم: ۳۳۸۱. بزار کے طریق سے یہ روایت حسن ہے۔دیکھئے:مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الامة ج:۴ ص:۳۵۶.

② السنن الکبریٰ للبیهقی، ج:۱۰ ص:۲۰۹. (جماع ابواب من تجوز شهادته ومن لاتجوز..)

③ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المئة، ج:۱۱، ص:۳۶۲.

میں اپنے ذہن میں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات پاتا ہوں، لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں کیوں کہ جناب صدر محترم ان تفاصیل پر بحث کرنے کے لئے خود ہی ایک کمیٹی کا تقرر منظور فرما رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس میں آسکتی ہیں۔ اس لئے اس اجمال پر قناعت کیا جانا کافی خیال کرتا ہوں۔

تاثرات تقریر...... حضرت حکیم اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر مسئلہ تعلیم کے ہر پہلو پر اصولی حیثیت سے اس درجہ جامع تھی کہ بعد کے آنے والے مقررین کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ تعلیم کے بنیادی نقطوں میں حضرت موصوف کی تقریر کا حوالہ دے کر پرزور تائید کریں۔ چناں چہ حضرت موصوف کی تقریر کے بعد مولانا محمد رضا صاحب فرنگی محل نے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کی طرف سے تقریر فرمائی، جن کی اصل تقریر کا ماحصل مناظرانہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پر غم وغصہ کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب تعلیمی نقطہ کی بات آئی تو انہوں نے بالآخر حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی پرزور تائید کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبد الحلیم صاحب عربی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی والے نے بھی مناظرانہ انداز میں تقریر فرماتے ہوئے مولانا آزاد کی تقریر پر نکتہ چینی کی اور آخر میں حضرت مہتمم کی تقریر کا بنیادی نقطہ تعین نصب العین لے کر اس کی تائید وتصویب نہایت پرزور الفاظ میں کی۔

آخر میں علامہ سید سلمان صاحب صدر قاضی وڈائریکٹر علوم مشرقیہ ریاست بھوپال تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور موصوف نے ایک نہایت مفصل ومدلل تقریر فرماتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کا یہ جملہ دہراتے ہوئے کہ "مسائل پرانے اور دلائل نئے ہوں" فرمایا یہ کہ اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تغیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔

علامہ موصوف کی تقریر کی بعد مولانا عبد المجید صاحب بنارسی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تقریر فرماتے ہوئے نہایت پرشوکت الفاظ میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی تائید کی۔

سب سے آخر میں مولانا آزاد صاحب نے اختتامی تقریر فرمائی اور حضرت مہتمم صاحب کی تقریر سے اس حد تک اپنے تاثر کا اظہار فرمایا کہ گویا اپنی اختتامی تقریر صدارت کا متن حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کو قرار دے کر اس کے مختلف جملوں کو بار بار اپنے الفاظ میں دہرانا شروع فرمایا جیسا کہ ابھی مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا اور یہ مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل بجا درست فرمایا۔

مولانا آزاد صاحب نے فرمایا کہ محمد طیب صاحب کی تقریر کا یہ جملہ کہ "مسائل قدیم ہوا ور دلائل جدید ہوں، ہمارے ان تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرحیں کرتے چلے جائیں، تفاصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔

مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہاں! مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل درست اور نہایت ہی بجا فرمایا کہ مدارس عربیہ کو اپنے نصاب تعلیم اور نصب العین میں اصلاح کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ سرکاری تعلیمی اداروں کو

ضرورت ہے۔ یہ اگر اپنا نصب العین اور طریقۂ تعلیم وتربیت درست کرلیں تو وہ قومی مدارس کے قریب آجائیں گے۔اس کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ ان قومی اور دینی مدارس کا تفوق ان کی آزادی اور آزادروش پر منحصر ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ ان کا آزادرہنا ہی ان کا اونچا اور بلند مقام ہے اورانہیں اسی مقام پر رہنا چاہئے۔

پھر مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے صحیح فرمایا کہ تعلیم کی غرض وغایت اگر محض کلرک اور محرر یا دفتری لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کم مرتبہ غرض کوئی دوسری نہیں ہوسکتی اور یہ ملک کی کوئی صحیح خدمت نہ ہوئی۔

بہر حال حضرت مولانا آزاد صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے جملہ جملہ کو لے کر اس کی شرح نہایت وقیع اور شاندار انداز سے اپنے الفاظ میں فرمائی جس سے مولانا کے تاثرات قلبی کا اظہار ہوتا رہا اور جس کا تمام حاضرین نے نہایت اچھا اثر قبول کیا۔

ہم جملہ وابستگان دارالعلوم کے لئے بالخصوص انتہائی مسرت وخوشی کا مقام ہے کہ اس پوری تعلیمی کانفرنس کا ہیرو دارالعلوم دیوبند رہا اور دارالعلوم کے حلقہ میں پوری کانفرنس کے ہیرو حضرت مہتمم صاحب رہے۔ جن کی تقریر کے ہر ہر جملہ بلکہ ایک ایک لفظ کو سنجیدہ اور باہوش علماء کرام نے دہرایا۔ پرزور تائیدیں فرمائیں اور تقاریر میں اس کی تشریح وتفصیل کرتے رہے اور ایک مرکزی تعلیمی ادارے کی تعلیمی لائنوں میں جو حیثیت ہونی چاہئے تھی وہی رہی۔

"فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْمِنَّةُ"

خاتمۂ تقریر پر مولانا آزاد صاحب نے اعلان فرمایا کہ میں ایک عملی تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں وہ یہ کہ ۱۵ تا ۲۱ ارکان پر مشتمل ایک تعلیمی کمیٹی بنا کر جلد سے جلد نصاب تعلیم کی اصلاح وترمیم کا عملی کام شروع کردیا جائے۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی اور نہایت خیروخوبی کے ساتھ یہ تعلیمی کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

احقر: خلیق احمد صدیقی
مدیر ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند)

تصویر سازی کی مذہبی وتمدُّنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ، دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے، مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے، ایران کے مجوسی یزدان واہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت ورہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سرنیاز ختم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا۔ (از: حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ)

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّابَعْدُ!

مہلک دستکاری...... بزرگان محترم! آج تصویر اور صورت سازی اپنی غیر معمولی شیوع کی بدولت موجودہ تمدن کا ایسا جزء لاینفک بنی ہوئی ہے کہ اس کا کوئی شعبہ اپنی رونق کو تصویر کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا۔ مکان، دوکان، خطوط، کتب، رسائل، سکہ، تمغہ، رقعہ، دستاویز، تلوار، ہتھیار، چھری، چمچہ، لیول مارکہ کوئی چیز نہ تصویر سے خالی اور نہ تصویر بغیر اس میں کوئی کشش ہی محسوس کی جاتی ہے۔ پس جاذبیت کی ساری ہی طاقتیں آج تصویر کے ایک رخ میں پنہاں ہو چکی ہیں اور تقریباً دنیا کی ہر قوم بلا استثناء اپنی پوری ہی گرویدگی وشغف کے ساتھ تصویر کی طرف پروانہ وار دوڑتی چلی جا رہی ہے۔

اقوام متحدہ (اقوام عالم) کے اس اجماع میں جو تصویر کے ساتھ فدائیت پر منعقد ہو چکا ہے، ہم تصویر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس اجماع کے خلاف ہم ایک ایسے نظریہ کے ماتحت تصویر کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے تصویر نہ صرف بدترین منکر ہی دکھلائی دیتی ہے جسے معروف کی لائن سے کوئی مناسبت نہیں۔ بلکہ ایسی مہلک اور مخرب دستکاری نظر آتی ہے جسے ایک مسلم کی مسلمانہ ذہنیت تبدیل کر دینے میں کافی مداخلت حاصل ہے۔

صورت محض وسیلۂ تعارف ہے...... یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کا ظہور اور اس کے لئے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیائے صور واشکال میں کوئی حقیقت بغیر صورت کے شناسا نہیں ہو سکتی۔ پس

صورت ایک درمیانی خادم ہے، جس کا منصبی فرض صرف حقیقت تک پہنچا دینا ہے اور بس۔

زید اور عمر کی صورتیں، حیوانات اور نباتات کی ہیئتیں (شکلیں) صرف اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ دنیا کو اپنے باطنی حقائق سے شناسا بنا دیں۔ جس کے صاف معنی یہ نکل آتے ہیں کہ کوئی صورت بلا حقیقت یا بلا ترجمانی ہی نہیں کہ کہ صورت محض نہ بذاتہ مقصود ہے اور نہ مقصودیت کی شان رکھتی ہے۔

اس اصول پر یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ مقصود واقعی صرف حقیقت ہے صورت نہیں۔ صورت وسائل تعارف میں سے ایک وسیلہ ہے، اگر بالفرض ہم بلا صورت ہی کسی حقیقت پہچاننے پر قادر ہو جائیں تو شاید پھر صورت کی طرف التفات بھی ہم پر شاق گزرنے لگے اور ہم اسے اضاعت وقت سمجھنے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صورتوں کی طرف توجہ کرنا فی الواقع حقیقت پر براہ راست قدرت نہ پا سکنے کا ثمرہ اور ہمارے قصور ادراک کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ہم تاج محل آگرہ کا اصلی نقشہ آنکھوں میں رکھنے کے لئے اس کی تصویر سامنے رکھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ذریعے سے ہم خود تاج محل کو یہاں اٹھا کر لا سکتے ہوں یا ہمہ اوقات ہر جگہ سے اسے دیکھتے رہنے کی قدرت رکھتے تو شاید ہمارا دھیان اس کاغذی تاج محل کی طرف کبھی بھی نہ منعطف ہوتا۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ صورت وہیئت سامنے رکھنا اصل کی یادآوری کا ایک ذریعہ اور ساتھ یہ صورت بین کے قصور ادرک کا ثمرہ ہے کہ وہ براہ راست اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس جب کہ ایک ایسی صورت بھی جو کسی واقعی حقیقت کا عنوان یا ترجمان بھی بنی ہوئی ہے۔ واسطۂ محض سے زائد کوئی درجہ نہیں رکھتی تو وہ تصویر جو صورت ہی صورت کی ترجمانی کر رہی ہو اور حقیقت سے اسے کوئی بھی واسطہ نہ ہو یا تصویر ہی فرضی ہو جس کے نیچے کسی واقعی صورت کا بھی وجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بے اصل محض، بے وزن محض اور بے التفات محض ہونی چاہئے، کہ وہ حقیقت کی بجائے باطل اور بے بنیاد شے یا لاشے محض کی ترجمانی کر رہی ہے۔ پھر بھی اگر ایسی بے بنیاد اور باطل صورتوں کو مرکز توجہ بنا لیا جائے تو یہ مقصود سے اعراض اور وسائل میں شغف کے سوا کون سے لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور کون نہیں جانتا کہ مقصود کے ہوتے ہوئے وسائل محض میں انہاک وشغف رکھنا یا بالفاظ دیگر اپنے قصور ادراک اور عجز تصور کو باوجود ازالہ کی قدرت کے پالتے رہنا، دانائی کی بجائے انتہائی سادہ لوحی بلکہ اس سے بھی آگے ہی کا درجہ ہے۔

شرک فی المقصود......بس اسی قلب موضوع سے کہ وسائل مقصود کا درجہ حاصل کر لیں اور خود مقصود غیر اہم ہو جائے، شرک فی المقصود کی بنیاد پڑتی ہے۔ جس کی ذمہ داری تنہا تصویر پر عائد ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب قلب جو باطن اور غیبی امور میں منہمک ہو کر ذوقی مشاہدوں کا شائق بنایا گیا ہو۔ تصویر آرائی کے ذریعے گرفتار صورت بنا دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی جمعیت کھو کر کچھ باطن کا ہو رہے اور کچھ ظاہر کا ہو رہے۔ کچھ حقیقت کی طرف مائل ہو اور کچھ صورت کی طرف۔ گویا اپنی اصل جبلت سے تو غیبات اور حقائق کی طرف جھکے اور ان غیر جبلی قواسر سے ظاہری نمود اور صورت واشکال کی طرف مائل ہو اور اس طرح توحید

مطلب کے بجائے تعدد مطالب کا مجرم ہو جائے جو شرک کی حقیقت ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مقصود کے مقصود باقی رہتے ہوئے شرک فی المقصود سے نہ بچنا، عقل کی گمراہی اور فہم سلیم کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ ہاں جس درجہ کا مقصود ہوگا، اسی درجہ غیر مقصود کا اس میں ساجھا قائم کرنا خلاف فطرت اور جرم ہوگا۔

تصویر پرستی...... یہاں پہنچ کر دنیا کی قوموں کے دو راستے ہو گئے۔ ایک طبقہ نے جو تلاش معبود میں سرگرداں اور تعارف غیب کا دلدادہ تھا، اپنی خوگر محسوس ذہنیت سے مغلوب ہو کر تصویر کو خدائے برتر و توانا کے تعارف کا ذریعہ قرار دیا اور معرفت رب کے لئے ابتداء تصویر کو مرکز تصور بنایا۔ لیکن عادت جاریہ کے موافق انسان کی خوگری احساس اور مغلوبیت عقل و معرفت نے پہلے تصویر کو اس کا ساجھی بنایا اور پھر رفتہ رفتہ تصویر میں مقصودیت اور معبودیت کی شان پیدا کر دی۔ وہ تمام افعال عبودیت، رکوع و سجود، نذر و نیاز، بھینٹ اور قربانی وغیرہ جو اس بے چون و بے چگون ذات کے لئے ہوتے۔ اب اس کی نام زد صورتوں اور فرضی مجسموں کے لئے ہونے لگے۔ کل تک جو حظ و کیف اس کے نام اور اسی کے لطیف دھیان سے روح میں پیدا کیا جاتا تھا۔ آج اس کی فرضی صورتوں سے حاصل کیا جانے لگا۔

دنیا کی سب سے پہلی بت پرست قوم (امت نوح علیہ السلام) جس نے پانچ مردانِ حق (ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر) کی تصویروں کو ذریعہ خدا شناسی بنا کر اپنے معبدوں میں نصب کیا۔ آخر کار انہی مجسموں نے اس خوگر محسوس قوم کی ذہنیت پر فتح حاصل کر لی اور ایک لطیف و خبیر خدا کی جگہ پانچ کثیف الاجسام معبود جم گئے اور ایسے جمے کہ پھر مستقلاً انہی سے استمداد (مدد طلب) کی جانے لگی۔ وہی اولاد دہندہ شمار ہوئے۔ وہی ابر و باراں کے مالک ٹھہر گئے اور انہی کی سنگین صورتوں سے ہر ایک مراد مانگی جانے لگی۔ جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ قوم حقیقت الحقائق تک تو کیا پہنچتی، عام حقیقتوں سے بھی محروم ہو کر محض صورت پرستی کے جال میں پھنس گئی۔ اور اس کی ذہنیت غائر ہونے کی بجائے اس درجہ سطحی ہو کر رہ گئی کہ نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ و پند (وعظ و نصیحت) سے سوائے چند روزہ ظاہر داری کے، کوئی ایک عبرت اور کوئی ایک انجام بینی بھی ان کے دل و دماغ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر نہ صرف قوم نوح بلکہ ہر تصویر کی پجاری قوم جو قوم نوح کے نقش قدم پر گامزن ہوئی، اسی سطح پرستی کا شکار ہوئی۔

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتۂ نیاز جوڑنے والے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے۔ مغرب کے تثلیث پرست کنواری مریم کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے۔ ایران کے مجوسی یزداں و اہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا اور خالص شرک کے راستہ پر لا کھڑا کیا۔ جس سے یہ اشرف المخلوقات اپنی توحید مطلب کو یکسر فنا کر بیٹھا اور قلبی پراگندگی و تشتت کے مہلک جال میں پھنس کر اپنی طمانیت و بشاشت خاک میں ملا دی۔

تصویر بازی...... دوسری قوم کو اپنی تصویر بازی اور صورت پسندی کے ذریعے خدا کی تلاش نہ تھی اور نہ انہوں نے

تصاویر سے مظاہر غیب کی جستجو شروع کی۔ تاہم تمدن و معاشرت کے سلسلہ میں ساری کائنات کو اس کی تصاویر کے ذریعہ پہنچاننے کے جذبہ نے ان کو بھی اصل سے ہٹا کر نقل پسندی، اور پھر خالص صورت پرستی یا حقیقت سے بے تعلقی میں الجھا دیا۔ یہ قوم پہلے سے بہت ادنیٰ اور ذلیل مرتبہ پر آ کر رکی۔ پہلی قوم نے اگر صورتوں اور مجسموں کو قبلہ استقبال بنایا تو خداشناسی کے لئے گویا حقیقت رسی کم از کم جذبات میں تو مرکوز تھی۔ گویا تلاش حقیقت ہی کے سلسلہ میں صورتوں کے ساتھ انہیں شغف پیدا ہوا۔ لیکن دوسری قوم کی تصویر بازیوں میں ابتداء ہی سے حقیقت بینی کا کوئی جذبہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کے تصویری جذبات صرف تزئین و آرائش یا نمائش و زیبائش ہی تک محدود ہیں۔ جس کا تعلق صورت در صورت ہی سے ہے اور بس۔

یعنی اس قوم کے یہاں تصویروں سے کسی مستور اور غیبی حقیقت کا ظہور تو کیا مطلوب ہوتا اس مشاہد کائنات کی بھی صرف صورتوں ہی سے شناسا ہونا منتہائے مقصود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کائنات کی حقیقت و صورت میں صورت کا درجہ خود فانی اور عارضی تھا اور جب کہ فانی کا بھی، فانی درجہ، یعنی تصویر کو منتہائے مقصود بنا دیا جائے تو ایسی قوم صرف واقعیت ہی سے دور نہیں ہوگی۔ بلکہ باطل سے باطل اور بے حقیقت بنیاد پر کھڑی ہو کر اپنے وزن اور طاقت اور جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کمزور کر دینے کی مرتکب ٹھہرے گی۔

یورپ کی تمدن پرست قومیں اسی باطل سازی اور تصویر بازی کی لعنت میں سب سے زیادہ گرفتار ہوئیں۔ ان اقوام کو اس بنیاد صورت پرستی اور نمائش پسندی نے اس درجہ سطحی اور بے بنیاد قوم بنایا، کہ آج وہ کسی حقیقت تک تو کیا پہنچتیں اپنی مصنوعی صورتوں کے سامنے قدرتی صورت کے ساتھ پورا شغف قائم نہ رکھ سکیں۔ کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو واقعیت کی شان ضرور تھی۔ ان کی ذہنیت اور جذبات کا بہت بڑا حصہ اپنی ہی خود ساختہ صورتوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ تصویروں کی ساخت و پرداخت اور خریداری پر لاکھوں روپیہ صرف کرنا تصویریں سامنے رکھ کر عالم خیال میں ان سے باتیں کرنا، عشق و محبت کے جذبات کاغذ کے رنگین عکوس پر نچھاور کرنا ان کا شعار ہو گیا۔

سطح پرستی کی انتہاء...... آج عریاں تصویروں کو سامنے رکھ کر شہوانی جذبات اس طرح مشتعل کئے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی اصل صورت کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے مجسمے صرف بازاروں ہی کے چوک میں نصب نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اس درجہ گھس چکے ہیں کہ ان کی کسی ادنیٰ توہین پر اسی طرح ازالہ حیثیت کے مقدمات چلائے جاتے ہیں، جس طرح اصل شخصیت کے بارہ میں مقدمہ چل سکتا ہے۔

آخر لارنس کے بت کا مقدمہ دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ وکٹوریہ کے بت کی توہین پر تحقیقاتی پولیس کا مقرر کیا جانا اس دور صورت پرستی کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ حالاں کہ اصل کا آج کوئی پتہ نشان بھی نہیں، یہ تمام معاملات صرف مصنوعی پیکروں کے ساتھ اسی شد و مد سے کئے جا رہے ہیں، جس طرح قدرتی مجسموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض نایاب اور پرانی تصویری شاہکاروں کی قیمتیں اسی مقدار میں اٹھ جاتی ہیں کہ شاید اس

مصور کو اگر نیلام کیا جاتا تو اس کے عشر عشیر بھی دام نہ اٹھ سکتے۔ حتیٰ کہ ان تصویری جذبات نے فلم سازی کا ایک مستقل فن ہی پیدا کر دیا جس کے لئے خزانوں کا ایک مستقل حصہ وقف ہے۔ ایک ایک فلم پر ہزار ہا روپیہ کی لاگت ہے، فلم سازوں کی بیش قرار تنخواہیں اور سینما کی قیمتی عمارتیں، باب تمدن کا ایک نہایت ہی شاندار اور خوشگوار اضافہ سمجھی گئیں۔ آدمیوں سے وہ اثر نہیں لیا جاتا جو سینما کی محرک تصویروں سے لیا جا رہا ہے۔

نمائش و سطح پرستی کی یہ وہ انتہائی حد ہے کہ آج کا انسان گویا خود بھی اپنے نزدیک اس لئے باطل محض ہو گیا کہ اس کے شغل کے لئے خود اس کی قدرتی شکل بھی کافی نہ رہی، جب تک کہ اس صورت کی بھی خود ساختہ صورت اس کے سامنے موجود نہ ہو۔ غرض حب و بغض، نفرت و رغبت، عشق و محبت اور خرید و فروخت کے تمام وہ معاملات جو ایک سطح پسند انسان، انسان کی اصلی اور قدرتی صورت سے قائم کرتا، آج اس سطح کی بھی نقلی اور فرضی سطح و صورت کے ساتھ جوڑتا جا رہا ہے، کیا یہ صورت پسندی کی انتہا نہیں ہے؟ اور جب ایسا ہے تو کیا یہ حقیقت سے بے خبری اور بیگانگی کی بھی انتہا نہیں ہے؟ اور پھر ایسی قوم کے حق میں جو حقائق سے بے گانہ محض بن کر محض صورتوں اور صورتوں کی بھی نقالی میں الجھ کر رہ جائے، عقل و دانش کیا فیصلہ کرے گی؟

صورت پسندی کی آخری منزل...... بہرحال قوموں کے ان دونوں طبقات میں تصویر نے اپنی طبعی رفتار کے ماتحت اصل کو پردۂ نسیان میں چھپا کر زبردستی اس کی جگہ سنبھال لی۔ اور اس طرح دونوں جگہ اس توحید مطلب کی جڑیں اکھاڑ کر شرک کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا۔ متدین اقوام میں شرک عبادت پیدا کر دیا اور متمدن اقوام میں شرک عادت۔ پھر یہ شرک بھی اس تصویر پسندی کا درجہ اول ہے۔ صورت پسندی کی آخری منزل یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے صورتیں ہی حقائق کی جگہ سنبھال کر بالاستقلال خود مقصودیت کی شان پیدا کر لیں۔ چناں چہ مذہبی اقوام کے سامنے اصنام ہی مستقل حاجت روا بن کر قبلۂ قلوب ہو گئے، اور تمدنی قوموں کے سامنے فوٹو اور تصویریں ہی مستقل محبوب و مطلوب بن گئے۔

آج کوئی ڈیزائن اور نمونہ مقبول نہیں جس میں تصویر کو دخل نہ ہو، کوئی رسالہ جاذب نظر نہیں جب تک تصاویر اور خصوصاً عریاں تصاویر سے مزین نہ ہو، گویا ادبی رسالوں کی جان اب بجائے علو مضامین کے، رنگینی تصاویر قرار پا گئی ہے۔ علم میں طاقت نہیں کہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے گھسیٹ سکے۔ مگر تصویر اپنی خالص محبوبیت کی بناء پر یہ جذب و کشش ضرور رکھتی ہے کہ تجارتوں کو فروغ دے سکے، دوکانوں کی رونق بڑھائے اور لوگوں کا وقت اپنے اوراق کے لئے خرید سکے۔

خزائن مخفیہ سے محرومی...... خلاصہ یہ نکلا کہ تصویر بالخاصہ حق پسندی سے ہٹا کر بہ سہولت باطل پسندی کی ذہنیت پر لے آتی ہے، واقعی جذبات کو بے ثمرہ بناتے ہوئے انجام کار عاقبت کی بہرہ مندیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، پس کہاں تو انسان غیب سے نکل کر عالم شہود میں اس لئے آیا تھا کہ ہر حسی شاہد سے کنارہ کش ہو کر غیب کی قلبی مشاہدوں

میں مصروف ہو۔ ہر صورت سے اعراض کر کے حقیقت کی طرف جائے، اور ہر باطل سے نگاہ ہٹا کر حق کی طرف دوڑے تا کہ اس کا لگاؤ فانی کے بجائے باقی سے ہو اور اس طرح وہ خود بھی باقی بن جائے اور اسے اپنی اصل سے وابستگی رہے۔ اور کہاں ان تصاویر کی بدولت اس کج راہی میں گرفتار ہوا کہ غیب کے ہر مرتبہ سے کنارہ کش (الگ) ہو کر اس نے محسوسات ہی کو اپنا قبلۂ نظر بنالیا۔ مخفیات کے ہر خزانہ سے محروم ہو کر حسیات ہی کو منظور نظر کر لیا اور روحانیت کے تمام لذیذ مشاغل سے بے پرواہ ہو کر مادیات کی کثافتوں میں دھنستے رہنا ہی اپنا سب سے زیادہ لذیذ مشغلہ قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ جب باقیات صالحیات سے اعراض کر کے فانی چیزوں میں جا پھنسا تو اپنی اصل سے منقطع ہو کر خود بھی بے اصل بن گیا۔

شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ...... اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر بارگاہ حق کے حقیقت شناس اور ان کے حقیقت رس قلوب صورتوں سے بے لگاؤ اور تصویروں سے متنفر ہوں تو کون سی جائے تعجب ہے؟

ملائکہ جیسے حقیقت شناسان بارگاہ حق تصویروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ ''**لَاتَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَّلَا تَصَاوِيْرُ**'' ① ''جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے''۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حقیقت شناس بارگاہ قدس کا ان رسوم ونقوش کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ ''**اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَتْرُكُ فِيْ بَيْتِهٖ شَيْئًا فِيْهِ تَصَالِيْبُ اِلَّا نَقَضَهٗ**'' ② (رواہ البخاری) ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی شے جس میں تصویر ہو بلا توڑے نہیں چھوڑتے تھے''۔

تصویر سازی کا اخروی انجام...... حق تعالیٰ شانہ تصویر سازوں کے ساتھ یوم آخر میں کیا طریق عمل اختیار فرمائیں گے؟ **اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْنَ يُضَاهُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ** ③ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) **اَلْمُصَوِّرُوْنَ** ④ ''یوم قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی شان تخلیق میں اپنے کو اس جیسا بنانا چاہتے تھے (یعنی مصورین)''۔ یہ تو صورتوں کی تصویروں کے متعلق ارشادات شریعت تھے۔ لیکن حقائق کی تصویریں خود ہماری صورتیں ہیں، ان کے متعلق بھی منشاء حق یہ ہے کہ ہم انہیں مستقلاً مرکز التفات نہ بنادیں۔

''**اِنَّ اللّٰهَ لَايَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ**.'' ⑤ ''اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے (جو تم میں غیب کی چیزیں ہیں)''۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کا بلاشرکت غیرے اصل وجود اور اپنی حسی کائنات کی اصل الاصول کی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب التصاویر، ج:۲، ص:۱۶۷۹. ② الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب نقض الصور، ج:۲، ص:۱۶۷۸. ③ الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ماوطئی من التصاویر، ج:۱۸، ص:۳۳۲.
④ الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب عذاب المصورین یوم القیامة، ج:۱۸، ص:۳۲۶. ⑤ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره، ج:۱۲ ص:۴۲۷.

فکر و دھیان میں رہنا جب ہی ممکن تھا کہ صورتوں سے اپنی حسی آنکھ بند کر کے فہم وفراست اور قلب کی آنکھ کھولے تاکہ غیبی وجود اور مخفی اسرار اس کے مشاہدے میں آسکیں۔

حقیقت الحقائق کی جستجو...... پس اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ نکلا کہ صورتوں کی تصویریں تو بالکلیہ نا قابل التفات اور تشتت کی جڑیں ہیں۔ رہیں قدرتی صورتیں سو گو کچھ نہ کچھ عارضی واقعیت رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی تم کائنات کی اس حسی اور صوری خوشنمائی سے یکسو ہو کر اس کی حقیقی خوبی کو توجہات کا مرکز بناؤ۔ بلکہ پھر ان حقائق سے بھی قطع نظر کر کے اس حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی سعی کرو جو تمام کمالات وجمالات کا سر منشاء اور حقیقی خوبیوں کا سر چشمہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے شہود سے ہٹا کر غیوب کی طرف انسان کو بڑھانا چاہا ہے، اجسام سے ہٹا کر حقائق کی طرف اور بالآخر مخلوقاتی حقائق سے بھی ہٹا کر حقائق الٰہیہ کی طرف لانا چاہا ہے۔ جن کا مشاہدہ بجز صورتوں سے قطع تعلق کیے ہوئے دشوار و ناممکن تھا۔

پس کہاں اسلام کی یہ حقیقت رسانی اور حق نمائی کہ بطون در بطون اور غیب در غیب کی طرف بڑھا کر انسان کو حقیقت سے ہم کنار کر دیا، اور کہاں انسانی تخیل کی یہ کج راہی کہ نمائش وزیبائش اور نمود در نمود کی طرف دھکیل کر انسان کو حق اور حقیقت سے بعید و بے گانہ محض کر دیا۔ حقیقت الحقائق سے جدا کر کے جزوی حقائق پر اور ان سے بھی بے بہرہ بنا کر صور واشکال پر اور پھر ان سے بھی ہٹا کر تصویری خدوخال پر لا کھڑا کیا۔ پس وہاں اگر اصل الاصول تک پہنچ جانے کی وجہ سے توحید در توحید حاصل ہوتی تھی تو یہاں غیر حق کی طرف بڑھتے چلے جانے سے شرک در شرک پیدا ہو گیا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تصویر اشراک (شرک) کی جڑ ہے اور صورت پسندیاں انسان کی توحید کو بجائے خود کبھی باقی نہیں چھوڑ سکتیں تو یہ ایک بجا اور مطابق واقعات دعویٰ ہوگا۔

توحید پسند کا تصاویر سے تنفر...... اس لئے اگر توحید پسند طبقہ مطلقاً تصویر کا دشمن اور اس سے متنفر (نفرت کرنے والا) ہو تو یہ اس کا ایک قدرتی جذبہ اور فطری حق ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام جیسے کامل موحدین نے انسان کو انہماکِ صور واشکال سے دور در دور رکھنا ہی اپنے مسلک کا ایک جلی اور روشن نشان قرار دیا ہے اور انہوں نے:

1 تصویر ذی روح کو حرام قرار دیا۔ 2 ملائکہ کی نفرت اس سے ظاہر کی۔ 3 خود اپنا بغض اس سے بتلایا۔ 4 تصویر سازی اور مصور (فوٹو گرافر) پر لعنت کی۔ 5 تصویر بنا دیئے جانے پر اس کے مٹا دینے کی تعلیم دی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شجرۃ الرضوان جیسے متبرک شجرہ کو کٹوا دیا کہ کہیں اس سے صورت پرستی کی بنیاد نہ پڑ جائے۔ مطاف مقدس میں حجر اسود کو یہ جتلا کر چوما کہ: ”میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ ضرر، اگر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز نہ چومتا“۔

حقیقت پسندانہ ذہنیت...... پس اسی لئے حقیقت شناسانِ باطن نے تصویر پسندوں اور صورت دوستوں کو ایسے مظان (گمان) سے بھی بچانے کی سعی کی ہے جہاں ان کے گرفتار صورت ہو کر بعید از حقیقت ہو جانے کا ذرا سا

بھی خطرہ تھا۔

سالک ابتدائے سیر الی اللہ میں جبکہ حقائق کو مختلف باطنی صور واشکال کے جامہ میں مشاہدہ کرتا ہے جو خود بھی ایک حد تک غیبی ہی چیز ہیں اوران کا مشاہدہ بھی غیب ہی میں ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی اس کا راہنما اور مربی اسے ان صورتوں سے بے التفات بنانے کی سعی کرتا ہے، کہ کہیں ان نقوش کی رنگینیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے بے گانہ نہ رہ جائے ؎

کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

غرض صورت پسندی، تصویر دوستی، تصویر سازی، تصویر بازی اسلامی مقاصد کے منافی اوراس کے بنیادی مقصد رجوع الی الغیب یا سیر الی اللہ کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ہے۔اس لئے کم از کم مسلم قوم کو اپنی حقیقت پسندانہ ذہنیت چھوڑ کر صورت پرستانہ جذبات پیدا کر لینا بلاشبہ قلبِ ماہیت (حقیقت کو بدلنا) اور قلبِ موضوع (مقصد سے ہٹنا) ہے۔

حق تعالیٰ توفیق دے کہ ہم صحیح اسلامی جذبات کا احترام کریں اور کم سے کم ایسی پگڈنڈیوں سے کترا کر چلنے کی سعی کریں جو اسلامی شاہراہ سے دور پھینک رہی ہوں اور منزل مقصود کو بعید سے بعید تر بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہوں۔

وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق

اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا، وہی کامیاب ہوگا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّابَعْدُ!

اشتراک ذہن...... بزرگانِ محترم! اس وقت آپ جانتے ہیں کہ سائنس نے پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر بہت مختصر بنا دیا ہے۔ پوری دنیا ایک چھوٹا سا کنبہ بن گئی ہے۔ ایجادات نے ملنا جلنا اور چلنا پھرنا سہل بنا دیا ہے۔ پہلے بیل گاڑی وغیرہ کے سفر میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے سے حج کے لئے پیدل چلنے میں دو تین سال لگتے تھے۔ دوسری سواریوں میں نو مہینے لگتے تھے، لیکن آج سائنس کی ترقیات نے سفر کو سہل بنا دیا۔ رتھوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ ریلیں چلیں اور اب تو ہوائی جہاز چلنے لگے جو بمبئی سے جدہ تک ۹ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں، حالاں کہ دریا کے راستہ سے یہ سفر (۹) دن میں ہوتا ہے اور اب تو ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز چلانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ یعنی انسان بالکل پرندوں جیسے ہو جائیں گے اور گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے ہوگی۔ اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بات کہنے کے لئے کہیں جائیں، کسی شہر میں جلسہ ہو تو مقرر وہیں پہنچ کر تقریر کرے بلکہ ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا ہے اور سارے ممالک محلوں کی حیثیت میں ہو گئے ہیں۔ ان ایجادات کا اثر یہ پڑا کہ ملکوں کی خصوصیات مٹتی چلی گئیں اور ایک ملک کا اثر اور اس کے رجحانات دوسری جگہ اثر انداز ہونے لگے۔ خیالات میں بھی اشتراک پیدا ہوتا جا رہا ہے یعنی جذبات ایک سے، افکار ایک سے، خیالات ایک سے یعنی ساری دنیا یہ چاہتی ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں۔ برما کے وزیر صحت ہمارے یہاں آئے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا دہلی کیسے تشریف لانا ہوا تھا، تو انہوں نے

فرمایا کہ: ہمیں حکومت ہند سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک اپنے داخلی معاملات میں بھی خارجی ممالک کی پالیسی کے ماتحت ہے۔ گویا کہ سیاست داخلی سیاست خارجی سے پوری طرح متاثر ہے۔ چناں چہ یونائیٹڈ نیشن کا ادارہ (یو این او) یعنی مجلس اقوام متحدہ قائم ہے جو اشتراک ذہن کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی قوموں کے تعصبات ختم ہوتے جارہے ہیں۔ حد بندیاں اور خصوصیات ختم ہو رہی ہیں۔

تبدیلیٔ اصول...... چناں چہ اب یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اگر عالمی امن چاہتے ہو تو چھوت چھات مٹاؤ اور امتیازات کو ختم کرو، اسی وقت امن قائم ہوگا۔

گاندھی جی جب دلی میں آتے تھے بھنگی بستی میں قیام کرتے تھے۔ محض یہ ظاہر کرنے کے کے لئے کہ اب امتیازات ختم کرنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

پنڈت پنت صاحب جب رنکھنڈی میں آئے تو انہوں نے ایک ہریجن کے مکان پر قیام کیا اور اس کے گلاس میں دودھ پیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوا کہ تمام قوموں کے اصول بدل رہے ہیں۔

پہلے عوام تابع تھے خواص کے اور اب خواص تابع ہیں عوام کے، پہلے چراغ تلے اندھیرا تھا اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہے۔ پہلے جو چیز چھپانے کی تھی وہ اب برسر عام آ گئی، مثلاً دولت، عورت، پہلے خواص کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ اب عوام کی رائے کو اہمیت ہے، لہٰذا خواص کو نیچے اترنا پڑے گا اور عوام کو اوپر اٹھنا پڑے گا۔

اشتراکِ مذہب...... حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائیگی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو، جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا وہی کامیاب ہوگا۔ چناں چہ ایک مذہب نے اعلان کیا کہ۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى﴾ ① الخ. گویا تمام اقوام مل کر ایک بدن کے اعضاء ہیں۔ ’’بنی آدم اعضائے یک دیگر اند الخ۔

’’ہم نے تم میں قبیلے بنائے تا کہ پہچان باقی رہے نہ اس لئے کہ تفاخر کا ذریعہ ہو۔ تم میں نسل کے اعتبار سے کوئی بڑائی چھوٹائی نہیں، البتہ عمل کے اعتبار سے بڑائی چھوٹائی رہے گی، پیدائشی اعتبار سے کوئی چھوٹائی بڑائی نہیں، آفتاب اگر چمکتا ہے تو وہ روشنی تقسیم کرنے میں اونچ نیچ نہیں برتتا بلکہ سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق روشنی سے مستفید ہوتے ہیں، شیشہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے روشن ہوتا ہے اور کالا توا اپنی صلاحیت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ عبادت گاہیں کسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ جو زیادہ خشوع سے عبادت کرے گا وہ بڑھ جائے گا اور جو ایسا نہ کرے گا وہ نیچا رہے گا۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳.

عمومی مساوات...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا'' ①۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا کہ سنو اور مانو! ایک بڈھے نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے، تم خائن ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میں نے کیا خیانت کی؟ تو اس نے کہا، بیت المال سے سب کو ایک ایک چادر ملی ہے لیکن آپ کے بدن پر دو چادریں ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ دے گا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اپنے باپ کو دے دی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر اعتراض کرسکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر پر اعتراض کرسکتا ہے۔ غور کی بات ہے کہ آج کے دور میں یہ اعلان مناسب ہوگا کہ اے انسانو! تم ایسے کام کرو جن میں سب کے لئے نفع سب کے لئے عزت سب کے لئے راحت ہو۔

یا یہ اعلان مناسب رہے گا کہ اے ہندیو! اے عربو! تم صرف اپنا نفع دیکھو، بہرحال اونچ نیچ جو کچھ بھی ہے عمل کے امتیاز سے ہے، لہٰذا وہی مذہب چل سکے گا جس میں عمومی مساوات موجود ہو۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس وقت دنیا نے اسی اصول مساوات سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا اب زمانہ کا تقاضہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی اور روحانی ہر اعتبار سے یکسانیت ہو، جو کہ وہ پہلے ہی سے اس ہمہ گیر ذہنیت کو لے کر چل رہا ہے۔ اسے کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی، وہ سب کو اپنے اندر سمو سکے گا۔

حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول...... بہرحال تعصب سے بچنا پڑے گا۔ تعصب مختلف اسباب سے قوموں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ اس سے بھی تعصب پیدا ہوجاتا ہے کہ دوسرے کے مقتداء کو برا کہا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس آیت قرآنی میں یہی کہا گیا ہے کہ ''ہم نے مان لیا اللہ کو اور اس کی کتاب کو جو ہماری طرف اتری ہے''۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ پہلوں پر نازل ہوا اس کو برا کہو بلکہ یہاں تک ہے کہ جو کچھ نبیوں، رشیوں، منیوں پر نازل ہوا ہم ان سب کو بھی ان کے وقت کے لئے سچا سمجھتے ہیں۔ حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول یہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں جتنی سچائیاں ہیں انہیں قبول کرے اور کتابوں کو سچا سمجھے اور جو کچھ ان لوگوں نے بعد میں اضافہ یا ترمیم کی ہے، اس کو رد کرے۔ قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام اقوام میں رسول بھیجے ہیں، شام، دمشق، عرب وغیرہ میں پیغمبر آئے۔ پھر کیا ہندوستان میں کوئی پیغمبر نہیں آیا؟ ضرور آیا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام ہی آئے جو لنکا میں اترے۔ گویا مذہب کی ابتداء ہندوستان سے ہوئی ان کی کنیت ابوالبشر ہے (یعنی مہادیو) ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر جودھیا میں ہے، پھر ہر ملک اور قوم میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، آخر میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے، تو

---

① السنن للنسائی، کتاب قطع السارق، باب ذکر اختلاف الفاظ الناقلین لخبر الزهری. ج:۱۵، ص:۶۱.
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج:۱۰ ص:۴۶۶ رقم:۴۹۶۶.

گویا ہندوستان سے پیغمبری کی ابتداء ہوئی اور عرب پر ختم ہوئی۔

مہاتمابدھ کی پیشین گوئی...... حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک دو جگہیں بہت مقبول ہیں، ایک وہ جگہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام اترے، دوسری وہ جگہ جس میں کعبۃ اللہ ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "النبی الخاتم" اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہاتمابدھ نے ہندوستان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی تھی۔

چنانچہ بدھ کی جانکنی کے وقت بدھ کے ایک شاگرد نندا نے ان سے پوچھا کہ تمہارے بعد اب ہماری راہنمائی کون کرے گا؟ تو مہاتمابدھ نے کہا کہ ہم سے پہلے بہت بدھ آچکے ہیں اور اب ایک آخری بدھ آئے گا جس کا لقب متریا ہوگا۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا چاہئے۔ متریا کے معنی ہیں رحمت کے۔ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کہا گیا ہے۔ چناں چہ بدھ مذہب والوں نے اکثریت سے اسلام کی تعلیمات قبول کیں۔

اجمالی ایمان...... قرآن پاک میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل فرمایا گیا، مولانا مناظر احسن نے اس کے متعلق اپنے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے یہ مقام کپل ہے اور کپل وستو اسی سے بنا ہے کفل اور کپل میں زیادہ فرق نہیں، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہر حال مشرقی ممالک نے اس بشارت کو قبول کیا اور مغربی ممالک مادیات میں پھنس کر تباہ ہوگئے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سرہند شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہاں دو پیغمبر ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گنگا کے پانی میں خصوصی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ گنگا کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی تلاش میں چل دیئے اور گنگوتری پہنچے، وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس آکر فرمایا کہ جہاں گنگا کا دہانہ ہے وہاں کسی پیغمبر علیہ السلام کے انوار نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ گنگا کسی پیغمبر کی دعا سے نکلی ہو۔ جیسے زمزم کا چشمہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی برکت سے جاری ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کو برا مت کہو۔ ممکن ہے یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں، اس لئے نام لے کر انہیں کبھی برا نہ کہو۔ چنانچہ ان کے پیغامات میں بہت سی باتیں حق ہیں۔ ممکن ہے بعد کے لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہو۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تعلیمات میں خلط کر دیا ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ جن کا نام قرآن وحدیث میں صراحۃً موجود ہے ان کا نام لے کر مانو اور جن کا نام نہیں آیا ان پر اجمالاً ایمان لاؤ۔

مذہب کی بنیاد...... اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی بنیاد ماننے پر ہے، یعنی تصدیق پر مدار ہے تکذیب پر نہیں۔ بخلاف اس کے یہودیوں کا مدار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر ہے اور عیسائیوں کا مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر۔ مگر اسلام نے اپنی بنیاد ماننے پر رکھی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب کی بنیاد ماننے ہی پر ہوسکتی ہے نہ ماننے پر نہیں، یعنی مذہب کی بنیاد مثبت پہلو پر ہونی چاہئے منفی پہلو پر نہیں۔

بہر حال چوں کہ پوری دنیا ایک قبیلہ بن گئی ہے اس لئے اب حد بندیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہی حال روحانی

خیالات اور عقائد کا بھی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تعصبات مٹانے پڑیں گے اور تفریق ختم کرنی ہوگی اور وطن کی حد بندی ختم کرنی ہوگی۔ مدار ملک کا کلی امور پر ہوتا ہے، جزوی امور پر نہیں ہوتا۔ اور کلی امور عالمی امور ہیں۔ ان ہی پر ملک کا دار مدار ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی ملک والے کو دوسرے ملک والے پر فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

احترام انسانیت...... انسانیت کا احترام اسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح مذہبیت کا احترام، لہٰذا چھوت چھات اور تعصب کو مٹانا پڑے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ بن ایہم شاہ غسان مسلمان ہو کر طواف کر رہا تھا، اس وقت کسی اعرابی کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس اعرابی کو طمانچہ مار دیا۔ اعرابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ اعرابی اپنا بدلہ اس طرح لے سکتا ہے کہ جبلہ کے ایک طمانچہ لگائے۔

یہ وہی مساوات کا معاملہ تھا۔ جبلہ نے اس حکم کو سن کر کہا کہ مجھے مہلت دی جائے، جب اس کو مہلت دی گئی تو وہ بھاگ گیا اور پھر کفر کو اختیار کر لیا۔ لیکن اسلام نے بڑے اور چھوٹے، اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کے لئے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

مذہب واحد...... بنی اسرائیل کو ہر طرح کی دولت اور حکومت دی گئی تھی۔ انہوں نے عیش پرستی میں زندگی گزارنی شروع کر دی۔ پیغمبروں نے بہت سمجھایا، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر عراق کے بادشاہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور ان کا قتل عام کیا اور کئی لاکھ بنی اسرائیل گرفتار کئے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر بھی اسیروں میں سے تھے ان کی دیانت و امانت و راست بازی، صدق و صفا اور عبادت و زہد کو دیکھ کر حکام جیل ان کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے اور کمال احترام سے پیش آنے لگے۔ اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اس کے دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے دربار کے کاہنوں اور ساحروں کو طلب کیا اور اپنی قلبی بے چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھیں، ان سے خواب کی تعبیر طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ خواب بیان فرمائیے کہا، کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے کہا کہ پھر ہم تعبیر کیسے بتلائیں؟ اس نے غضبناک ہو کر کہا کہ ”میں نے تمہیں اسی قسم کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس رتبہ تک پہنچایا تھا (جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟) جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اگر تم نے اس مدت میں خواب اور تعبیر بتلا دی فبہا، ورنہ تم سب قتل کر دیئے جاؤ گے“۔ اس واقعہ کا چرچا ہو گیا شدہ شدہ یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی۔ آپ علیہ السلام نے جیلر سے فرمایا جو ان کا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دے۔ کیوں کہ میرے پاس اس کے خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تیرا رتبہ اور منصب بڑھ جائے گا اور میری رہائی کی صورت نکل آئے گی (جس سے میری قوم اس قید و بند کے عذاب سے چھٹکارا پا سکے گی) جیلر

نے کہا، مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصہ کا ڈر ہے کہ کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے فرمارہے ہیں یا واقعی آپ کو علم ہے۔ حالاں کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے۔ فرمایا، تم میرا خوف نہ کھاؤ اور بےفکر ہوکر بادشاہ سے میرا تذکرہ کردو (میں قطعاً اس کے خواب اور تعبیر خواب کو جانتا ہوں) جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے ان باتوں کی خبریں دے دیتا ہے، جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جیلر نے بادشاہ سے جا کر تذکرہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیال علیہ السلام کو طلب کرلیا اور وہ شاہی دربار تک پہنچا دیئے گئے۔ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا، بادشاہ کو سجدہ کرے۔ لیکن دانیال علیہ السلام داخلِ دربار ہوکر کھڑے رہے اور سجدہ نہ کیا۔ تھوڑے وقفہ سے بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور تخلیہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ فرمایا: اس کی وجہ ہے کہ میرا ایک رب ہے، اس کا حکم ہے کہ میں اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کروں۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کرلوں اور وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے سلب کرلے، تو میں تیرا خواب نہ بتلانے کے سبب تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں اور تو مجھ سے اس علم کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور مجھے قتل کرڈالے۔ اس لئے میں نے ترک سجدہ قتل سے آسان سمجھا اور ترک سجدہ کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اس بےچینی میں مبتلا رہے۔ جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب مبتلا ہے، پس میں نے ترک سجدہ کو تیرے اور اپنے دونوں ہی کے لئے مفید سمجھا۔

بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ اپنے الٰہ و معبود کا وفادار دوسرا نہیں اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے رب کے عہد و میثاق کو پورا کرتے اور وفادار رہتے ہیں۔ ہاں تو کیا تیرے پاس میرے خواب اور اس کی تعبیر کا علم ہے؟ فرمایا: ہاں ہے۔

''تو نے خواب میں دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک عظیم الشان بت معلق ہے۔ جس کے پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں اور سر آسمان میں۔ اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے، درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے، ٹانگیں لوہے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ تو اس کی خوبصورتی، حسن و جمال اور بےنظیر ساخت کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت کی ٹوپی پر آکر اس زور سے پڑا کہ یہ بت پاش پاش ہوکر سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا۔ اس کا سونا، چاندی، تانبہ، لوہا اور مٹی سب ایک رَل ہوکر اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہوگئے کہ یہ سب دھاتیں رل مل کر ایک ذات ہوگئیں اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اب اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہوکر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کردیں تو نہیں کرسکتے۔ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو (یہ دھاتیں پس کر اس درجہ سرمہ ہوگئی ہیں

کہ ہوا بھی ان ذرات کو اڑا سکتی ہے۔

اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر (اس بت کو پیس دینے کے بعد) اچانک فضائے آسمانی میں پھیلنا شروع ہوا، اور پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہوگیا کہ پوری زمین پر چھا گیا، اور زمین اس سے چھپ گئی یہاں تک کہ آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

بخت نصر نے کہا بالکل درست، یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر فرمایئے! حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا (سنیے) وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں (مختلف درجات و مراتب کے ساتھ آئیں گی اور) موجود ہیں۔ سو اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے، جس پر تو حکمرانی کر رہا ہے اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے، جس پر تیرا بیٹا حکمرانی کرے گا۔ اور تانبے کا حصہ رومی قوم ہے اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے۔ اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکمرانی کریں گی۔ ایک مشرقی یمن میں اور ایک مغربی شام اور وہ پتھر جو اس خوش نما بت کے اوپر آسمان سے پھینکا گیا، وہ دین ہے جو کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آویں گے وہ اور ان کی امت اس دین کو ان قومیتوں کے بت پر پھینک مارے گی تاکہ اس دین کو تمام اقوام کے ادیان پر غالب کر دے۔ (قومیتوں کی اونچ نیچ کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دے) پس اللہ تعالیٰ ایک نبی امی کو عرب میں مبعوث کرے گا جو تمام امتوں قومیتوں اور متخالف مذہبوں کو توڑ پھوڑ کر مذہب واحد کر دے گا۔ جس طرح اس پتھر نے بت کی تمام اونچی نیچی دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا (اور پھر وہ آخری دین) اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ جس طرح وہ پتھر بت کو توڑ کر خود ساری فضاء میں چھا گیا۔

حق تعالیٰ اپنے دین کو خالص کر دے گا، باطل کا سر نیچا ہو جائے گا، راہ ہدایت سامنے آ جائے گی۔ ضلالت گم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ امیوں (ان پڑھوں) کو اس دین کی تعلیم دے گا اور دین کے ذریعہ ضعفاء کو (جنہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا) قوت عطاء کرے گا۔ ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کو اس سے مدد ہوگی۔

(بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے) عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا، جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت (دہشت و بے چینی) کو اس طرح چھانٹ دیا ہو اور اب میرے دربار میں آپ سے زیادہ کوئی بارتبہ نہ ہوگا۔ میں آپ کو اس احسان عظیم کے بقدر ہی صلہ دوں گا۔ (1)

دین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم...... اس حدیث صاف سے واضح ہے کہ خاتم الانبیاء کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہوگا (جیسا کہ ہو چکا ہے) ان تمام قومی نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا اور اس

(1) تفسیر الطبری، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۷، ج:۱۷، ص:۳۷۷.

طرح دنیا کی متفاوت قومیتیں اور اونچی نیچی ذاتیں رل مل کر ایک ذات ہو جائیں گی۔ چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ وہی قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات تھا، خود اپنے اس مذہب پر لعنتیں بھیجنے لگیں گی۔ حتیٰ کہ سارے رجعت پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو نہیں لوٹا سکیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہوگی، ایک ازم ہوگا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہوگی۔

پھر جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو چکی کہ سارے عقلاء و مدبرین اصول مساوات کو تمدنی، معاشی اور معاشرتی حیثیت سے قولاً وعملاً وقلباً قبول کرتے جا رہے ہیں اور اس کے فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں۔ تو جس اسلام میں اس کی مکمل تعلیم تیرہ سو برس سے موجود ہے۔ اس مذہب کے دوسرے اصول بھی قابل غور ہو جاتے ہیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ چیز پیش کر رہا ہوں کہ یقیناً اسلام کے تمام اصول اسی طرح مکمل اور بہترین ہیں۔ پھر جس طرح دنیاوی ضروریات کے لئے سب نے وصولِ اسلام کو قبول کر لیا ہے تو کیوں نہ روحانی حیثیتوں سے بھی اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے۔ تعصبات سے ہٹ کر سنجیدگی سے گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ اسلام ہی ایسا مذہب ظاہر ہوگا جو شخصی جذبات کو تو نہیں، لیکن سلیم الطبع ہر مدبر و سنجیدہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیاوآخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ. ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ جیسا بیج یہاں ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل آئے گا۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ○ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۗ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ ② صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

احوال واقعی...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی تقریر کرنی نہیں ہے۔ وقت بھی تھوڑا ہے۔ اور میں بھی اس وقت تھکا ہوا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوں اور عوارض کے لحاظ سے بھی۔ اس لئے زیادہ بولنے کی ہمت نہیں، مختصر طریق پر اس آیت کریمہ کی روشنی میں ''چند باتیں'' آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کرنی ہیں۔

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم اقف علیه مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وقال القاری: قلت معناه صحیح مقتبس من قوله تعالیٰ "من کان یرید حرث الآخرة نزد له فی حرثه" دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص ۴۱۲. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیة: ۶۴، ۶۵، ۶۶.

تذکرۂ دنیا کا مقصد......اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ، نے دو عالموں کا ذکر فرمایا ہے۔ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت۔عالم دنیا کا ذکر اس لئے کیا کہ ہم اس میں آباد ہیں۔ہمارے فرائض بتلانے کے لئے دنیا کا ذکر کیا گیا ہے، دنیا کو منوانے یا دنیا پر ایمان لانے کے لئے تذکرہ نہیں کیا گیا۔اس لئے کہ ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔"انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی چیز کو ماننا" یہ ایمان ہے آنکھ سے دیکھ کر ماننا یہ ایمان نہیں ہے یا عقل سے سمجھ کر مان لینا، اسے ایمان نہیں کہتے۔کوئی یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایمان لایا کہ دو کا دگنا چار ہوتا ہے۔یہ ایک عقلی چیز ہے، ایمان لانے کی چیز نہیں، محسوسات میں سے ہے، یا جب صبح آفتاب نکلے تو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ میں ایمان لایا کہ سورج نکل آیا ہے وہ ایمان لانے کی چیز نہیں، وہ تو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے۔غرض ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔اور وہ بھی پیغمبر کے منہ پر اعتماد اور اطمینان کر کے جیسے وہ فرمائیں ویسے مان لینا اسے ایمان کہتے ہیں۔

بہر حال اس آیت کریمہ میں دنیا کا ذکر ایمان لانے کے لئے نہیں فرائض بتلانے کے لئے کیا۔

تذکرۂ آخرت کا مقصد......اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا ہے کیوں کہ وہ آنکھوں کے سامنے موجود نہیں۔آخرت کی پہلی منزل "عالم برزخ" ہے جسے قبر کہتے ہیں۔اس کے حالات کو نہ عقل معلوم کر سکتی ہے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔بجز اس کے کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خبر پر اطمینان کیا جائے اور کوئی صورت نہیں۔عالم آخرت کا برپا ہونا، میدان محشر کے حالات، جنت و دوزخ کا وجود، پل صراط اور میزان کا وجود آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ عقل نے دریافت کیا۔اس کو ماننا یہ ایمان ہے۔غرض دنیا کا ذکر احکام کو بتلانے کے لئے کیا گیا ہے اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا گیا ہے۔

آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان......جن قوموں نے آخرت کو عقل سے سمجھنا چاہا ہے، انہوں نے بہت ٹھوکریں کھائیں اور وہ حقیقت حال نہیں سمجھ سکیں کیوں کہ عقل غیبی امور کا ادراک نہیں کر سکتی۔

عقل تو ان محسوسات میں آنکھ سے دیکھی چیز، کان سے سنی چیز یا ناک سے سونگھی چیز ان میں سے کچھ نتائج نکالتی ہے۔لیکن غیبی امور کو پالینا یا پرکھ لینا یہ عقل کا کام نہیں ہے یہ وحی کا کام ہے اور وحی ہی یہ خبر دے سکتی ہے۔کہ غیب کیا چیز ہے؟ عالم غیب میں کیا واقعات پیش آئیں گے؟ اس میں عقل درکار نہیں ہے نہ عقل کارآمد ہے نہ عقل اس میں چل سکتی ہے، غرض جن قوموں نے آخرت کو محض نشانہ بنایا، انہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔

منکرین آخرت کا نظریہ......بعض قوموں نے تو یہ سمجھا کہ آخرت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، صرف دنیا ہی کا عالم ہے، آگے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں جب آدمی مر گیا تو فنا ہو گیا، اب وہ نہ آئے گا نہ پہلے تھا، نہ آئندہ ہوگا، بس قصہ ختم ہوا۔وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں کہ جزا و سزا ہوگی، حساب و کتاب ہوگا اور اللہ کے آگے بندوں کی پیشی ہوگی۔وہ نہیں مانتے۔اس لئے کہ کرام انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اطمینان نہیں رکھتے بلکہ وہ عقل پر پرکھتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ عقل مرنے کے بعد کی چیزوں کی کوئی خبر نہیں دے سکتی، اس واسطے انہوں نے انکار

کر دیا۔ اور موت کے معنی ''فنائے محض'' کے سمجھے کہ بس گیا سو گیا، جیسے پہلے نہیں تھا ویسے ہی آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ غرض بعض اقوام نے ایک نظریہ یہ قائم کیا کہ جو کچھ ہے معاذ اللہ وہ دنیا ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔

دنیا کو فقط ''راہ گزر'' ماننے کا نظریہ...... بعض قوموں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اصل آخرت ہے، دنیا اس کا راستہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی عالم آخرت آئے گا۔ جو دنیا میں نہیں آیا، پیدا نہیں ہوا اس کے لیے آخرت بھی نہیں۔ جو دنیا میں آ گیا، پیدا ہو گیا پھر اس نے انتقال کیا اس کے لئے عالم آخرت ہے۔ غرض دنیا ایک راستہ اور راہ گزر ہے، آنے والی چیز آخرت ہے۔ وہی اصل منزل و مقصد ہے وہیں جانا ہے۔ تو ایک یہ نظریہ کہ آخرت کو مانا مگر اس کے ساتھ دنیا کو محض ایک راہ گزر مانا۔

پہلے نظریئے کے دنیوی آثار...... ان دونوں نظریات کے اقوام پر دو اثر پڑے، جنہوں نے کہا کہ فقط دنیا ہی کا عالم ہے آخرت آنے والی نہیں۔ وہاں سے تمدن کا غلو برپا ہوا۔ انہوں نے کہا جب دنیا ہی دنیا ہے تو عیش اڑانے میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

بابر بہ عیش کوش کہ ایں عالم دوام نیست

کھانا، پینا، پہننا اور رہنا سہنا، نیز کوٹھی اور بنگلے، یہی ان کی دنیا ہے اور یہی ان کی آخرت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ نہ ان کو حلال اور حرام کی تمیز کی ضرورت۔ جب دنیا ہی دنیا ہے آگے کہیں جانا نہیں۔ کوئی حساب دینا نہیں۔ اس لئے جائز و ناجائز کی بحث ہی نہیں آتی، بس جس طرح سے ہو عیش اڑاؤ۔ اس طرح سے تمدن کا غلو اور تمدن میں مبالغے برپا ہوئے کہ فقط یہی نہیں کہ آدمی اچھا کھا لے، پی لے اور اچھا پہن کر گزر کر لے۔ بلکہ کھانے اور پینے میں اتنا مبالغہ اور اتنے تکلفات بھی جہاں عقل بھی نہ پہنچے، وہ تکلفات بھی پیدا کئے جا رہے ہیں۔ غرض دنیا کو سجا دینے کا نام زندگی ہے۔ وہ نہ سجے تو انسان کی زندگی نہیں ہے۔ تو تمدن کے مبالغے، عیش و آرام کی چیزیں، کھانے اور پینے کے سامان، رہنے اور سہنے کے سامانوں میں مبالغے اتنے ہوئے کہ پچھلوں کی عقل میں بھی نہیں آ سکتے تھے کہ دنیا ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جائے گی، عیش و آرام کے اتنے سامان برپا ہو جائیں گے۔ غرض اس نظریئے کے تحت تمدن کا غلو پیدا ہوا کیوں کہ دیانت اور دین کوئی چیز نہ رہا۔ اللہ کے آگے حاضری اور حساب دینے کا کوئی سوال نہ رہا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی تو جس طرح سے چاہو اس کو برپا کر لو۔ جتنا چاہو اس کو برپا کر لو، جتنا چاہو اس میں عیش اڑا لو، بقول شاعر کہ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوام نیست

جتنی عیش اڑانی ہے اڑا لو آگے کچھ نہیں ہے۔ تو تمدن و مدنیت اور تمدنی سامانوں کی افراط پیدا ہوئی۔ اس لئے جو لوگ اس تمدن کے موجد ہیں انہیں شاید بھول کے بھی موت کا خیال نہیں آتا۔ بھول کر بھی قبر یا آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ ایک ہی تصور ہے کہ دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، بس جس طرح چاہو اسے چلا لو۔ غرض ایک نظریہ تو یہ تھا اور

اس کا یہ اثر پڑا کہ دین ختم ہو گیا، دنیا رہ گئی۔ آخرت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، فقط دنیوی سامان سامنے رہ گئے۔

دوسرے نظریئے کے دنیوی آثار...... دوسرا نظریہ یہ تھا کہ آخرت ہے اور وہی مقصود ہے۔ دنیا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر جانا ہے۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ نہ صرف یہ کہ تمدن اختیار نہ کرو۔ بلکہ جتنا جسم کو عذاب دو، جتنا اسبابِ عیش کو ترک کرو، جتنی رہبانیت اختیار کرو وہی آخرت بنانے والی ہے۔ تو بعض اقوام نے یہی کیا۔

چنانچہ ہم نے برما میں دیکھا کہ ان کے جو مذہبی پیشوا ہیں جنہیں "بھکشو" کہتے ہیں، وہ نہ گھر بناتے ہیں، نہ نکاح نہ شادی نہ بیاہ۔ بلکہ کھانا پینا بھی خود نہیں پکاتے، بھیک بھی نہیں مانگتے۔ ان کا کام یہ ہے کہ صبح کو وہ نکل گئے، قوم جانتی ہے کہ کھانے کے لئے آئے ہیں۔ تو ہر گھر میں کھانے سے پہلے ایک آدھ روٹی ان کے نام کی رکھ لی جاتی ہے اور کچھ سالن رکھ دیا۔ جہاں وہ آئے انہیں دے دیا۔ یہ ان کا کھانا ہے۔ پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے ہیں۔ ایک دھوتی انہوں نے باندھ لی اور وہی اوڑھ لی۔ اور کہتے ہیں دنیا راہ گزر ہے۔ جتنا اس میں تکلف کیا جائے گا اتنا ہی آخرت فراموش ہو جائے گی۔ اور ہے اصل میں آخرت۔ بہر حال یہاں تمدن سرے سے ختم ہو گیا۔ پہلے نظریئے کے تحت تو تمدن ہی تمدن رہ گیا تھا اور دوسرے نظریئے کے تحت سرے سے تمدن ختم ہو کر دنیا لاشی، ہیچ اور فانی بن گئی کہ اس کے اندر ذرا سا بھی آرام کرنا یہ گویا آخرت کو کھو دینا ہے۔

عیسائیت اور دنیا...... عیسائیوں میں دیکھا گیا، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جتنا بدن کو تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی آخرت بنتی ہے۔ چنانچہ ان میں بعض رہبان دیکھے گئے، تاریخوں میں یہ موجود ہے کہ ایک گڑھا ہے اور اس میں گارا ہے اس میں پڑے کے برس گزارتے ہیں اور بڑی مکھیاں انہیں کاٹ رہی ہیں، بدن کے اوپر ورم چڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ گارے کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم آخرت میں جا رہے ہیں، دنیا سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ شادی بیاہ سے غرض نہیں، مکان بنانے سے غرض نہیں۔ اگر گرجا میں کوئی عورت "نن" (NUN) بن کے گئی تو وہ یہ عہد کر کے جاتی ہے کہ نہ شادی کرے گی نہ بیاہ کرے گی۔ لذاتِ دنیا سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مرد جاتا ہے تو وہ عہد کر کے جاتا ہے نہ نکاح کرے گا نہ عورت اس کے گھر میں آئے گی، نہ گھر در ہوگا۔ غرض ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا برپا ہوا کہ آخرت فراموش ہو گئی۔ اور ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا مٹا کہ دنیا بے رونق ہو گئی۔ بس آخرت ہی آخرت پیش نظر ہے۔ وہ بنتی ہے یا نہ بنے، یہ الگ بات ہے۔ یہ دو متضاد نظریئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے، آخرت ہی ایک چیز ہے۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہے دنیا ہے، آخرت کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ...... اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو راستہ ہے، یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ." "دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل۔

گندم از گندم بروید جوز جو   از مکافات عمل غافل مشو

گیہوں کا بیج ڈالو گے تو گیہوں اگے گا، کیکر کا بیج ڈالو گے تو کانٹے دار درخت اگے گا۔ سینڈھ کا بیج ڈالو گے بدبودار درخت اگے گا۔ غرض جیسا یہاں کروے گا ویسا ثمرہ سامنے آ جائے گا۔ تو آخرت سے دنیا بنتی ہے، یہ نہیں ہے کہ دنیا کا تعلق آخرت سے نہیں اور آخرت کا تعلق دنیا سے نہیں۔

دنیا میں رہنے کا انداز...... اب یہ کہ دنیا میں کس طرح سے رہو؟ تو اسلام نے یہ نہیں بتلایا کہ تم پھٹے حال سے رہو، تم بھک منگے بن کر رہو، گھر گھر بھیک مانگ کر معاذ اللہ اپنا پیٹ پال لیا کرو۔ فرمایا: ''اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی.'' ① ''اونچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے''۔ مانگنے والا ہاتھ وہ کم رتبہ ہے اور عطاء کرنے والا ہاتھ بہتر ہے۔

اور فرمایا: ''کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ.'' ② ''حلال مال کا کمانا ایسا ہی فرض ہے جیسا نماز روزہ فرض ہے''۔ آدمی کا فرض ہے کہ وہ کمائے، وہ مانگ کر نہ کھائے، بلکہ دس کو کھلا کر کھانے کے بھی قابل ہو اس درجے پر آئے۔ غرض مسلمان کوئی بھک منگا نہیں بنایا گیا، کوئی سائل بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ بھکاری بنے۔ بلکہ عطاء کرنے والا بنا کر بھیجا گیا کہ دنیا کی اقوام کو کچھ دے، ان سے مانگنے کا روادار نہ ہو بلکہ معطی بنے، عطاء کرے اور وہ چیزیں دے جس کی دنیا محتاج ہے۔ ان کو دین کی طرف دعوت دے، اس دین کی طرف جس میں دنیا بھی برابر کی ہے اور آخرت بھی برابر ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ'' ③ اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس کے اوپر کچھ آنا چاہئے۔ کچھ ڈھنگ کا لباس ہو، کچھ ڈھنگ کا کھانا پینا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو۔ ڈھنگ سے ہو اور جمال کے ساتھ ہو۔ مبالغے کو تو روکا ہے کہ حدود سے مت گذرو۔ جیسے دین کے بارے میں فرمایا: ''لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ.'' ④ ''دین میں زیادہ مبالغے مت کرو کہ تحمل سے باہر ہو جائے۔ اتنا ہی عمل اختیار کرو جسے عمر بھر نبھا دو'' اسی طرح دنیا کے بارے میں فرمایا کہ اتنا مبالغہ مت کرو کہ وہ آخرت کے بھلانے کا ذریعہ بن جائے۔ اتنی دنیا اختیار کرو کہ عیش و آرام سے گزر بسر کرو۔ دوسرے کو کھلا کر خود کھا سکو۔ یہ ضرور کرو۔ مگر اپنی آخرت کو مت بھلاؤ کہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جاؤ کہ دل سے موت کا تصور ہی نکل جائے۔ اس سے روکا ہے۔ یہ غلو اور مبالغہ ہے۔

دولت و عبادت کا باہمی ارتباط...... حدیث میں فرمایا گیا (جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے) تم اس طرح

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلیٰ ج: ۱، ص: ۳۳۲.

② شعب الایمان للبیھقی، الستون من شعب الایمان وھو باب فی حقوق الاولاد، ج: ۱۸، ص: ۱۲۶.

③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ تعالیٰ یحب ان یریٰ، ج: ۱۰، ص: ۲۰.

④ پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۷۱.

زندگی بسر کرو اور زہد و قناعت کے یہ معنی سمجھو کہ جب دنیا سے جاؤ تو کوئی چیز پیچھے چھوڑ کے نہ جاؤ، (اور نہ یہ کہ) اولاد بھک منگی ہو۔ فرمایا۔ ''یہ بہتر نہیں ہے'' ۔ یہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے لئے کچھ سامان کرتے جاؤ۔

یہ جبھی تو ہوگا جب آدمی کچھ کمائے گا، کچھ دولت فراہم کرے گا، کچھ بچوں کے لئے چھوڑے گا، کچھ ان کی خدمت کرے گا، کچھ عزیز و اقرباء کی خدمت کرے گا۔ ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں، آپ زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ تو ایک فرض سے محروم ہوگئے۔ آپ کے ہاتھ میں مال نہیں حج کیسے کریں گے؟ تو حج کی دولت سے محروم ہوگئے۔ آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں تو غرباء کی خدمت کیسے کریں گے؟ تو عطایا سے آپ محروم ہوگئے غرض ہزاروں عبادتیں ہیں، جو دولت پر موقوف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جو مساجد میں آپ نماز پڑھ رہے ہیں یہ بھی تو دولت پر موقوف ہے، دولت ہاتھ میں نہ ہوتی تو اتنی خوشنما مسجد کہاں سے بنتی؟ اللہ کا گھر اتنا آراستہ کیسے ہوتا؟ اور یہ بہترین قالین کی جانمازیں جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر کو سجا رکھا ہے۔ یہ دولت ہی کا تو کرشمہ ہے۔ تو دولت پر نماز بھی موقوف، حج بھی موقوف، زکوٰۃ بھی موقوف اور صدقات بھی موقوف، ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اسلام جامع دین تھا وہ دولت کو حرام کیسے قرار دیتا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی کو ساری عبادتوں سے محروم بناتا۔ اس واسطے اس سے نے حکم دیا۔ ''کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ'' ''حلال کی کمائی کرنا انسان کے اوپر ایسا ہی فرض جیسا نماز روزہ فرض ہے''۔

مقصد تو یہ ہو کہ میں کسی کا محتاج بن کے نہ رہوں اتنا کمائے، مگر اب اللہ برکت دے اور لکھ پتی بنا دے تو اس کی اجازت بھی نہیں دی کہ اس مال کو ضائع کر دو یا سمندر میں بہا دو۔ اس کو اس کے مصرف میں جائز اور حلال طریق پر خرچ کرو۔ غرض حلال ہی طریق پر کماؤ اور حلال طریق پر اسے صرف کرو تو یہ صرف کرنا اور کمانا یہ سب عبادت میں داخل ہوگا۔ اس لئے کہ یہ عبادت کا وسیلہ ہے۔

وسائل عبادت کا حکم...... اور وسیلہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقصد کا ہوتا ہے، جب مقصد عبادت ہے تو اس کا وسیلہ بھی عبادت ہے۔ آپ جو نماز پڑھ رہے ہیں اس کا وسیلہ وضو ہے اس لئے وضو بھی عبادت میں داخل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وضو پر کوئی ثواب نہ ملے۔ البتہ نیت شرط ہے۔ بلا نیت وضو کریں گے تو پاکی تو حاصل ہو جائے گی، نماز بھی جائز ہوگی، مگر وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ جب تک آپ یہ نیت نہ کریں کہ اس لئے وضو کر رہا ہوں کہ یہ نماز کا وسیلہ ہے، تو وضو بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز کا وسیلہ ہے۔

دنیا وسیلۂ آخرت...... اسی لئے ساری دنیا مسلمان کے لئے دین کا وسیلہ بنائی گئی ہے۔ ''اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ.'' ① ''دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو''۔

---

① شعب الایمان للبیهقی، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵. حدیث منقطع ہے۔ دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۷.

تو دنیا آخرت کے لئے کماؤ۔خدمت واطاعت کے لئے۔اور یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔غرض کمانا اور خرچ کرنا یہ سب طاعت میں داخل ہے، بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور رضائے خداوندی مقصود ہو۔

اسی لئے قرآن کریم میں بعض آیتوں میں تو مذمت کی گئی ہے اور بعض میں مدح کی گئی ہے۔ایک جگہ ارشاد فرمایا۔﴿إِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ① ''یہ تمہاری اولادیں اور یہ تمہارے مال تمہارے لئے فتنہ ہیں اور آزمائش کی چیزیں ہیں''۔تو اس سے ایک گونہ مذمت نکلی۔دوسری جگہ حدیث میں ارشاد فرمایا۔''نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ.'' ② ''اچھے انسان کا اچھا مال وہ بہترین متاع اور بہترین پونجی ہے''۔تو یہاں مال کی تعریف کی ہے۔غرض ایک جگہ ہے مذمت اور ایک جگہ مدح ہے۔مذمت اس لئے ہے کہ رضائے خداوندی اور جائز طریق پیش نظر نہ ہو۔مدح اس لئے کہ رضائے خداوندی مقصود ہے اس کے لئے آدمی بڑھ رہا ہے اور اس کے دائرے میں رہ کر کما رہا ہے۔وہ مال بھی مبارک اور کمانے والا بھی مبارک۔

اگر مال مطلقاً مذمت کی چیز ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی دولت مند نہ ہوتا۔حالاں کہ ان میں لکھ پتی بھی ہیں، ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، ہزار پتی بھی ہیں۔اسی طرح ائمہ ہدایت کے اندر کروڑ پتی، لکھ پتی لوگ موجود ہیں۔

کروڑ پتی امام...... آپ ہی کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن کی فقہ پر آپ چل رہے ہیں، کے ہاں ریشمی کپڑے کی تجارت تھی اور یہ نہیں کہ کوئی ایک آدھ دکان لگی ہوئی ہو کہ ریشمی کپڑا فروخت ہو گیا، بلکہ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے اور ملکوں میں کپڑا اسپلائی ہوتا تھا۔جس کی وجہ سے امام صاحب گویا کروڑ پتی تھے، حتیٰ کہ وفات ہوئی تو مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے خزانے کے اندر کروڑوں روپیہ جمع تھا جس میں کچھ وصیتیں تھیں۔ان میں سے کچھ اولاد پر تقسیم ہوا۔

تجارت میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط...... بایں ہمہ کمانا بھی انتہائی حلال کا تھا۔چنانچہ ان کے واقعات میں موجود ہے کہ امام صاحب نے ایک شخص کو تجارت کے لئے وکیل بنا کر بھیجا اور فرمایا مصر میں جا کر اس مال کو بیچو۔اول تو اس شخص نے یہ کیا کہ بیچنے میں کچھ تاخیر کی کہ ذرا مانگ کچھ بڑھ جائے اور مال کچھ گراں ہو، تب بیچوں۔چنانچہ مہینہ بھر روکے رکھا۔مہینہ بھر کے بعد قیمت چڑھ گئی تو ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ کمایا، کافی نفع ملا۔

دوسرا اس نے یہ کیا کہ جب مانگ بڑھی تو اس نے ایک پیسہ فی روپیہ اس کی قیمت بڑھا دی۔گاہک زیادہ تھے تو دو لاکھ کے اڑھائی لاکھ وصول ہوئے۔یہ رقم لا کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدمت میں پیش کی۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اندازہ یہ تھا کہ ستر، اسی ہزار روپیہ نفع ہوگا، وہاں اڑھائی لاکھ نفع سامنے آیا۔فرمایا اتنا نفع کیسے ہوا؟ اس نے کہا، اول تو میں نے بیچنے میں تقریباً ایک ماہ کی تاخیر کی تا کہ کچھ مانگ بڑھ جائے، کچھ گرانی ہو جائے

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ التغابن، الآیۃ: ۱۵.

② مسند احمد، حدیث عمرو بن العاصؓ، ج: ۳۶، ص: ۱۶۵.

اوراس کے ساتھ میں نے ایک پیسہ فی روپیہ بڑھادیا۔

فرمایا: ''نعوذ باللہ!۔ پہلی صورت ''احتکار'' کی تھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کروتا کہ گاہک مجبور ہو کر خریدے۔ تو گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یہ حرام خوری ہے۔ غرض احتکار کیا جو شریعت میں ممنوع ہے کہ مال بیچنے میں اس لئے تاخیر کرو کہ اس کی قیمت زیادہ اٹھے گی۔ بلکہ اپنے وقت پر بیچو۔ عام طور سے جتنی قیمت ہے اس پر فروخت کردو۔ مال کا انتظار میں رکھنا کہ قیمت چوگنی ہو جائے، شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے''۔ پھر فرمایا کہ۔ ''ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا کر تم نے غبن فاحش کیا، شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی''۔ فرمایا۔ ''اب یہ تو مشکل ہے کہ تمہیں اڑھائی لاکھ روپے دے کر بھیجوں کہ لوگوں کو واپس کرو، خدا جانے کوئی گاہک کہاں کا ہوگا کوئی کہاں کا؟ لہٰذا ایک پائی بھی میرے خزانے میں داخل نہ کی جائے۔ ابھی اس مال کو غریبوں پر صدقہ کر دیا جائے''۔ تو اڑھائی لاکھ روپے اسی وقت غریبوں میں تقسیم کر دے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ کمائی کی صورت تھی کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فروختگی ہوتی اور مال کمایا جاتا۔

مصارف سے مداخل کا اندازہ...... جب جائز طریق پر مال آتا تھا اس کے بعد میں تو جائز ہی طریق پر خرچ بھی ہوتا تھا۔ جیسے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ''میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ جس جگہ صرف ہوتا ہے سمجھ لیتا ہوں کہ اگر یہ اچھی جگہ ہے تو آیا بھی اچھے طریق سے ہے۔ اگر حرام جگہ صرف ہو رہا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ حرام ہی کی کمائی ہے۔ غرض مصرف دیکھ کر اس کے مدخل کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس طرح سے آیا ہوگا''۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مال پاک اور انتہائی پاکیزہ طریق پر آتا تھا تو خرچ بھی ایسے راستوں میں ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں...... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس بنائی جس میں تقریباً چار، پانچ سو علماء کرام اور محض علماء نہیں بلکہ اپنے اپنے فن کے امام اس میں جمع کئے۔ کوئی تفسیر کا امام، کوئی حدیث کا امام، کوئی لغت کا امام اور کوئی فقہ کا امام۔ ان سب پر مشتمل مجلس بنائی اور فقہ کے مسائل مرتب ہونا شروع ہوئے۔ اجتہاد اور استنباط سے مسائل نکالے گئے۔ ایک مسئلہ اس مجلس میں پیش ہوتا اور ہفتوں اس پر بحث ہوتی۔ نکھر نکھرا کر جو اخیر میں نکھری ہوئی بات نکلتی ہو، مرتب کر کے لکھی جاتی کہ یہ قرآن وحدیث سے قریب تر ثابت ہے۔ یہی آپ کا فقہ حنفی ہے۔ تو ان چار، پانچ سو علماء کرام کی تنخواہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خزانے سے دی جاتی۔ کسی کے ایک ہزار ماہوار مقرر، کسی کے دو ہزار اور کسی کے تین ہزار اس طرح لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ اس پر ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا غرباء پر خرچ...... پھر یہ الگ تھا کہ صدقات وخیرات کے اندر کوفے کے جتنے گھرانے تھے، ان کی فہرستیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں لکھی ہوئی تھیں کہ فلاں گھر میں اتنے بڑے

ہیں، اتنے بچے ہیں، اتنی عورتیں ہیں اور اتنے مرد اور غریب ہیں۔ بس روز روز کا کھا پی لیتے ہیں اور پس انداز ہ (بچایا ہوا) اور پیچھے کچھ چھوٹا ہوا نہیں۔

ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے اور کوفے کے اندر جتنے غریبوں کے گھر ہیں سب کے لئے لباس ان کی قد و قامت کے مناسب رمضان میں تیار ہوتے۔ عید کا چاند دیکھا گیا اور فجر کی نماز سے پہلے ہر گھر میں گھر کے افراد کی تعداد کے مطابق لباس پہنچ جاتا تھا۔ تو غرباء کہتے تھے کہ ہم غریب نہیں، ہماری عید بھی امیروں کی سی ہے۔ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ غرض یہ خرچ الگ تھا کہ کوئی غریب گھرانہ خالی نہ رہتا تھا کہ ان کی عید نہ ہو۔ اعلیٰ ترین لباس جتنا اس کے مناسب حال ہے پہنچتا تھا۔ تو علماء پر لاکھوں کا یہ خرچ تھا اور غرباء پر یہ خرچ تھا۔

ایک مقروض سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ...... پھر اوپر سے قرض کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ قرض لیتے تھے۔ کسی کو پچاس ہزار کی ضرورت ہے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ دے دیتے تھے، تیس ہزار کی ضرورت ہے تو دے دیتے تھے۔

اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ لینے کے بعد ان کی نیت بدل گئی، دینے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ ایک شخص نے پچاس ہزار کا قرض لیا۔ اب یا تو یہ کہ دینے کی قوت نہیں رہی تھی یا یہ کہ اتنی بڑی رقم کیسے واپس کروں۔ تو کترانا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے ہیں تو کسی گلی میں گھس گیا۔ پھر دیکھا کہ ادھر سے آ رہے ہیں تو دوسری گلی میں گھس گیا۔ سامنے نہیں ہوتا تھا، شرمندہ ہوتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے کہ اس کی نیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے تھے وہ دیکھ کر دوسری گلی میں گھسا۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ لپک کر اسی گلی میں گھسے اور جا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

''بھائی! ہم نے کیا قصور کیا جو ہم سے کترانے لگے؟ ہم کوئی اچھوت اقوام میں سے ہیں کہ ہم سے کنارے کنارے چلو؟ آخر کیا وجہ ہے؟'' اب وہ چپ، کیا کہے دل میں چور تھا ہی۔ فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے پیسے واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا''۔ یہ نہیں فرمایا کہ پاس نہیں ہیں۔ وہ خود مالدار آدمی تھا۔ یہ فرمایا کہ قرض ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کترانے کی یہ وجہ ہے۔ فرمایا: مال بھی ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے تعلقات خراب کیے جائیں؟ پچاس کا پچاس ہزار روپیہ بالکل معاف۔ مگر تعلقات پہ پانی نہیں پھیرنا چاہئے۔ آمد و رفت ویسی ہی جاری رکھنی چاہئے۔ بالکل معاف ہے۔ تمہیں ایک پائی بھی دینی نہیں پڑے گی'۔

سینکڑوں واقعات ہیں کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قرضے معاف کر دیئے۔ یہ سخاوت کا دریا جاری تھا۔ تو کمانا بھی انتہائی احتیاط کا اور خرچ کرنا بھی انتہائی احتیاط کا تھا۔

عبادت مالیہ کی توفیق کا معیار...... اس لئے شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میں مال کے مصرف کو دیکھ کر اس کے آنے کے راستہ کا پتہ چلا لیتا ہوں، اگر مصرف صحیح ہے تو آیا بھی صحیح راستہ ہے اور اگر مصرف غلط

ہے تو آیا بھی غلط راستہ سے ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

جو ناجائز یا غیر محتاط طریق پر کمایا جاتا ہے وہ خرچ بھی ایسے ہی مصارف پر ہوتا ہے، اس مال کے لئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو ناجائز طریق پر کمایا گیا ہو۔

اظہار نعمت کا موقع ...... بہرحال میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام نے دنیا کو لاشی اور ہیچ نہیں قرار دیا کہ آخرت کو پیش نظر رکھو اور دنیا میں بھک منگے بن کے رہو، دنیا میں بالکل ژولید (پریشان) حال ہو کر رہو اور پھٹے حال سے رہو، یہ نہیں فرمایا بلکہ: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ.'' ① ''جس بندے کو اللہ نعمت دے تو اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا کچھ اثر آئے''

کچھ لباس ڈھنگ کا ہو۔ کچھ کھانا بھی ڈھنگ کا ہو۔ کچھ رہنا سہنا بھی ڈھنگ سے ہو۔ اور کچھ معاشرت بھی اچھی ہو۔ یہ نہیں کہ پھٹے حال سے رہے۔

شخصی احوال قابل اتباع نہیں ...... اب بعض کو یہ شبہ ہوگا کہ بعض احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے تو ٹاٹ تک پہنا ہے۔ اچھے کپڑے چھوڑ دیئے۔ وہ ان کا حال قانون نہیں ہوتا۔ یہ قانون شریعت ہے، باقی کسی پر زہد و قناعت کا حال غالب آجائے اور وہ سارا مال دولت صدقہ کر کے قبرستان میں جا بیٹھے، وہ اس کا حال ہے۔ اسے برا نہیں کہا جائے گا۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے لیکن اسے قانون نہیں بنایا جائے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے۔ دعوت اس چیز کی دی جائے گی جس کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قانون غیبی پیش کیا، قانون وہی رہے گا۔ لوگوں کے احوال قانون نہیں بن سکتے، ان لوگوں کی عظمت کی جائے گی، انکی عزت کی جائے گی۔ ان کے اس فعل کو بڑا سمجھا جائے گا، مگر قانون نہیں بنایا جائے گا کہ اس فعل کی آپ تبلیغ کریں کہ فلاں نے سارا گھر چھوڑ دیا تھا لہٰذا تم بھی چھوڑ دو۔ غرض یہ قانون نہیں، شخصی حال ہے۔ آپ کے اندر وہ حال آجائے گا، آپ اس پر عمل کریں پھر کوئی روکنے والا نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی اتباع ...... بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کو اپنا مذہب قرار دیا۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان وہ ہے کہ کون ان کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سید الانبیاء ہیں، تو آپ کی زندگی اور بھی اونچی ہے اور بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے ہر ایک اس کے اوپر چل نہیں سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ گنے چنے ہیں جو اس شان پر چلے ہیں، جو خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی شان تھی اس لئے وہ شہروں میں نہیں رہ سکے۔

چنانچہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا زہد و قناعت مشہور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ

---

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ تعالیٰ یحب ان یری، ج: ۱۰، ص: ۲۰.

عنہ کا دور خلافت تھا۔ یہ شام میں گئے اور شام میں تمدن و تکلفات اور کھانا، پینا خوب تھا۔ وہ غریبی تھوڑا ہی رہی تھی جو عربوں میں تھی۔

مکانات اور بلڈنگیں بھی ہیں کھانے پینے کی بھی متعدد چیزیں ہیں، لباس بھی عمدہ ہے۔ اب جس کے ہاں دیکھا کہ دسترخوان پر دو کھانے تھے، بس ڈنڈا لے کر وہاں پہنچے اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر کب دو کھانے آئے؟ ابھی صدقہ کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین ڈر کے مارے صدقہ کر دیتے تھے۔ کسی کے گھر میں ایک لباس کے علاوہ دوسرا جوڑا بھی موجود ہے، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دوسرا جوڑا کب تھا؟ تو تمہارے لئے رکھنا کب جائز ہے؟ یا کسی کے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کب دولت جمع تھی جو تم نے جمع کی، ابھی صدقہ کرو''۔ حتیٰ کہ لوگ عاجز آ گئے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ: ''انہوں نے ہماری زندگی تنگ کر دی۔ ہم قانون شریعت پر چلتے ہیں، قانون میں گنجائش ہے، توسعات ہیں''۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک ...... اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت اعلیٰ عزیمت کی زندگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہو بہو اس کی پیروی کر سکے۔ ہر ایک کی قوت نہیں۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''مغرب کی تکبیر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلے پر تھے، تکبیر ہو چکی نماز شروع کرانے سے پہلے ایک دم گھبرا گئے اور گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑے سے وقفے کے بعد تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھائی''۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ''آج خلاف عادت تکبیر کے بعد کچھ وقفہ کیا، گھر میں تشریف لے گئے پھر واپس تشریف لائے، کچھ دیر لگی کیا وجہ پیش آئی؟۔ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے طاق میں ایک دینار پڑا ہے اور نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے گھر پر رات گزرے اور سونا، چاندی اس کے گھر میں ہو''۔ وہ ایک دینار تھا جو سات درہم کا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ہمارے لحاظ سے دو اڑھائی روپے کا سونا تھا۔ فرمایا: ''جا کے اسے صدقہ کیا، گھر کو اس سے پاک کیا تب آ کر میں نے نماز پڑھائی نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ نبی کے گھر پر رات گزرے اور سونا یا چاندی اس کے گھر میں ہو''۔ ① تو آج کون ہے جو اس ذاتی چیز پر عمل کرے کہ بیوی کا سارا زیور لے کر ابھی صدقہ کرے، جو کچھ تجوری میں رکھا ہے سب غریبوں کو بانٹ دے۔ یہ کس کی مجال ہے اور کس کی ہمت ہے؟

توسعات شریعت ...... شریعت نے جب اجازت دی کہ زکوٰۃ دے دو، صدقات دے دو، بقیہ مال تمہارے لئے حلال ہے، عام لوگ تو اسی پر چلیں گے۔ اب یہ کیفیت کہ ایک پائی گھر میں نہ رہے، یہ جب حال ہو گا کیفیت

① السنن للنسائي، كتاب السهو، باب الرخصة للامام في تخطي رقاب الناس، ج:٥، ص: ١٩١.
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحيح وضعيف سنن النسائي، ج:۴ ص: ۹ رقم: ۱۵۰۹.

ہوگی اور حال کسی کا حجت نہیں بنا کرتا، وہ قانون نہیں بنا کرتا، حجت قانون شریعت ہے۔ ہاں اللہ تمہیں وہ حال دے دے سبحان اللہ! تم یہ کام کرو، تمہاری بھی تعظیم کریں گے، لیکن تم قانون بنا کر اس کو اسٹیج پر پیش کرنے لگو کہ سارے گھر کی چیزیں ابھی صدقہ کر دو یہ جائز نہیں ہوگا، بلکہ یہ قانون کا مقابلہ ہوگا۔ بہر حال شرعی توسعات الگ چیز ہیں اور لوگوں کے ذاتی احوال الگ چیز ہیں، ہر کس و ناکس کے لئے جو پیغام ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا۔ حال اس کے لئے حجت ہوگا جو صاحب حال ہے، وہ عمل کرے، اس کی عظمت کی جائے گی۔

اتباع بلا حال...... ورنہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ایک شیخ طریقت جن کے بہت سے مرید تھے۔ شیخ بیمار ہوئے اور اطباء نے کہا اگر آپ نے وضو کیا تو بیماری بڑھ جائے گی یا کھڑے ہونے کی قوت نہیں تھی، تو شریعت نے اجازت دی ہے، انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

اگلے دن مریدین نے اعلان کیا کہ شیخ نے بیٹھ کر نماز پڑھی ہے لہٰذا آج سے سب لوگ بیٹھ کر نماز پڑھا کریں گے اور قیام جو فرض تھا وہ ترک کر دیا۔ یہ حرکت کی جو بالکل ناجائز تھی۔

اس لئے کہ فعل میں نقالی کی۔ نقالی فعل پیغمبر کی ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کے فعل کی۔ پھر یہ کہ اگر نقل اتارنی تھی تو شیخ کی سی بیماری کا حال بھی اپنے اندر پیدا کرتے اتنی بیماری آنی چاہئے تھی، جو شیخ پر آئی تھی تو انہیں بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی۔ بیماری تو ندارد ہٹے کٹے اور فعل میں شیخ کی نقل اتاری۔ تو ایسی نقالی محض روپ بنانا ہے۔ حقیقت اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی قانون ہی سب کے لئے حجت ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اسی پر چلا جائے گا۔

تعظیم صاحب حال...... البتہ صاحب حال کی تعظیم کی جائے گی۔ اس پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی، اللہ ویسا حال سب کو نصیب کر دے تو وہ خوش نصیبی ہوگی۔

توسعات شرعیہ کا دائرہ کار...... بہر حال شریعت اسلام نے وسعتیں اور گنجائش دی ہیں۔ صرف یہ کہا ہے کہ ایک تو حرام کے دائرے میں مت پڑو، حلال کے دائرے میں رہو۔ دوسرے یہ کہ سامانوں میں مبالغہ مت کرو، اتنا رکھو کہ زندگی بھی آراستہ اور اچھی ہو اور قلب بھی اٹکا ہوا نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ آدمی ان سامانوں کا بندہ بن جائے۔ ایسے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے۔ فرمایا: "تَعِسَ عَبْدُالدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُالدِّيْنَارِ تَعِسَ عَبْدُالْخَمِيْصَةِ." (1)

"برباد ہو پیسے کا بندہ، برباد ہو گنی یا درہم مراد (سونے کا سکہ) کا بندہ، برباد ہو شالی چادروں کا بندہ"۔

یعنی جس کا دل ان چیزوں میں اٹکا ہوا ہے کہ ان میں پڑ کر نہ موت یاد نہ آخرت یاد نہ فرائض یاد۔ ایسی دولت تو وبال جان ہو جائے گی۔ تو ایسے آدمی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے۔ لیکن جائز حدود میں رہ کے۔ "جمال پسندی" جو انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ پھٹے حال سے رہنا پسند نہیں کرتا، بلکہ خوبصورتی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کھانا زمین پر ڈال کے اور منہ لگا کے کھالے بلکہ رکابی ہو، پھر رکابی ذرا نفیس اور کچھ اچھی بھی

(1) السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب في المكثرين ج: ١٢ ص: ١٦٤.

ہو، دیکھنے والوں کی نظر میں نہ چبھے۔ تو تھوڑا بہت جائز حد تک تکلف بھی کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ مبالغہ نہ کرے کہ صبح کی رکابیاں اور ہوں، شام کی اور ہوں دوپہر کی اور۔ اسی طرح رات کے سونے کا لباس اور، دوپہر کا اور یہ تو لباس کی اور برتن کی بندگی ہے حالاں کہ بندگی اسے اللہ کی کرنی تھی۔

دولت دنیا کی مدح وذم کا معیار...... بہر حال مطلب یہ ہے کہ دولت دنیا کی مذمت بھی آئی ہے اور مدح بھی آئی ہے، اس دنیا کی مذمت آئی ہے جو آخرت سے غافل کر دے اور اس دنیا کی مدح آئی ہے جو آخرت تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔ اسی لئے عارف رومی نے مثال دی ہے کہ جیسے ایک سمندر ہے تو کشتی جب اس میں پڑی ہوئی ہو تو پانی اگر کشتی سے باہر باہر ہے تو کشتی کے لئے مددگار ہوگا۔ کنارے پر جالگائے گا اور منزل آجائے گی۔ لیکن اگر پانی کشتی کے اندر آ گیا تو کشتی بھی ڈوبی اور کشتی والے بھی ڈوبے، دونوں کی تباہی ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ انسانی قلوب کشتیوں کی مثل ہیں اور دنیا کی دولت اور سامان مثل دریا اور سمندر کے ہیں۔ تو قلب سے جب تک دولت باہر رہے گی، وہ قلب کو کنارے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی اور اگر اندر آ گئی تو قلب بھی ڈوبا اور قلب والا بھی ڈوبا۔

استعمالِ دنیا...... مطلب یہ کہ ایک دنیا کا استعمال ہے، اس کی شریعت نے ممانعت نہیں کی۔ ایک دنیا کی محبت ہے کہ اس میں پڑ کر محبت خداوندی رہ جائے، محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہ جائے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

محبت طبعی...... پھر یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم نے توسع کر دیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ مال کی محبت بالکل نکال دو، یہ تو طبعی بات ہے کہ جب آدمی کمائے گا تو کچھ نہ کچھ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے، اپنے سامان سے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ بالکل محبت نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

یہ تو طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو چیز انسان کے پاس ہے اس سے تھوڑی بہت محبت ہو جاتی ہے، اجنبی بھی اگر پڑوسی بن جائے اور چند دن رہنا سہنا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے، تو اپنے گھر اور مکان سے تو طبعاً محبت ہوگی تو قرآنِ کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

کیوں کہ ایک مطلقاً محبت ہونا ہے، یہ ممنوع نہیں ہے۔ ایک ہے ایسی محبت ہونا جو فرائض اور واجبات میں حارج ہو جائے، اس سے بچو، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ ①

”حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم! (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے فرما دیجئے یہ تمہارے آباء و اجداد، یہ تمہاری آل و اولاد، یہ تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے بیوی اور بچے، یہ تمہاری دولت اور مال تجارت جس کی

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۲۴.

کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار مندا نہ ہو اور رات دن جوڑ توڑ میں ہو کہ نفع زیادہ ہو اور یہ تمہاری بلڈنگیں اور مکانات جن کے اندر تم راحت اٹھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں اگر ''احب'' بن جائیں اور اتنی محبوب بن جائیں کہ خدا اور رسول سے غفلت پیدا کریں، تو عذاب خداوندی کا انتظار کرو کہ یہ دولت چھننے والی ہے''۔ لیکن اگر یہ نہ ہو کہ ''احب'' نہیں بلکہ مطلق محبت ہے تو وہ فطری اور طبعی ہے، اس کو شریعت نے نہیں روکا کہ فطرتاً اپنے مال اور گھر بار سے تھوڑی بہت محبت تو ہوگی، تو مطلق محبت کو منع نہیں کیا، احبیت کو روکا ہے۔ ''احب'' ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مجھے صرف یہ محبوب ہے، نہ خدا محبوب نہ رسول محبوب نہ فرائض محبوب، نہ واجبات۔ اس محبت کو روکا ہے۔ لیکن اگر اتنی محبت ہے جو طبعی ہے اور ساتھ میں دین کی محبت بھی دل کے اوپر چھائی ہوئی ہے کہ دولت بھی ہے اور ساتھ میں نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔ روزے بھی رکھ رہا ہے، حج بھی کر رہا ہے، اور ذکر میں بھی مصروف ہے، یہ دولت ممنوع نہیں نہ اس کی فی الجملہ محبت ممنوع ہے۔

دولت دین و دنیا...... خدا کا شکر ہے کہ ہم افریقہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دین بھی دی اور دولت دنیا بھی دی ہے، تجارتیں بھی ہیں، منافع بھی ہیں، گھر بار بھی اچھے ہیں، پہننا، رہنا سہنا اچھا ہے اور اس کے ساتھ میں مساجد بھی ہیں اور نمازیں بھی ہیں۔ بلکہ مساجد کو اتنا آراستہ کیا ہوا ہے کہ شاید لوگوں نے اپنی کوٹھی بنگلوں کو بھی اتنا نہ سجایا ہو۔ قالینوں کی جانمازیں بچھی ہوئی ہیں۔ راحت کا ہر سامان موجود ہے، جتنا اپنے گھر کی فکر ہے اس سے زیادہ اللہ کے گھر کی فکر ہے کہ وہ بھی آراستہ ہوں اور سجے سجائے ہوں۔

اللہ میاں کے بنگلے...... میں نے تو یہاں آ کر کہا کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے، میں نے کہا یہ اللہ کے گھر نہیں یہ تو اللہ میاں کے بنگلے ہیں، آراستہ پیراستہ قالینوں سے سجے ہوئے۔ بجلی کی روشنی اور چھتیں بھی منقش اور آراستہ۔ یہ گھر تھوڑا ہی ہیں۔ گھر تو ہم جیسوں کے ہوتے ہیں، یہ تو بنگلے ہیں۔

ہمارے ہاں جو مسجدیں ہیں وہ تو اللہ میاں کے گھر ہیں۔ یہاں جو مسجدیں ہیں وہ اللہ میاں کے بنگلے ہیں، جو بنگلے بنانے والے ہیں وہ اپنے لئے بنگلہ بنالیں تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی مضرت نہیں ہے۔ جو اللہ کے گھر کو سجا رہے ہیں وہ تھوڑا بہت اپنے گھر کو بھی سجالیں، اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح اپنے لباس کو بھی سجا لیں، اللہ کے گھر میں قالین بچھائے۔ اگر اپنے گھر میں بھی قالین بچھالیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ بس یہ ہے کہ مبالغہ نہ ہو اور اتنا تعلق نہ ہو کہ اس سے دینی کاموں میں خلل پڑیں گے۔ ورنہ اگر یہ چیزیں بھی ممنوع ہوتی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہ میں ایک بھی متمول نہ ہوتا۔ حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مال دار لوگوں میں سے ہیں، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مال دار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔

حضرت جابر کا تمول اور قلبی کیفیت...... مگر قلب کی کیفیت کیا ہے؟ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن گھر میں تشریف لائے، کچھ اداس، غمگین اور چہرہ اترا ہوا۔ تو بیوی نے پوچھا آج آپ غمگین کیوں ہیں؟

فرمایا: ”خزانے میں دولت اتنی جمع ہوگئی ہے کہ میرے دل کے اوپر بار پڑ رہا ہے اور میرا قلب پریشان ہو رہا ہے“۔ وہ بھی صحابیہ رضی اللہ عنہ تھیں۔ انہوں نے کہا پھر آپ نے کیا کیا۔؟ فرمایا: ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا“۔ فرمایا۔ ”گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، صدقہ کرنا شروع کر دو، غریبوں کو دینا شروع کر دو“۔ فرمایا: ”واقعی تدبیر تو اچھی بتائی۔“ چنانچہ جا کر خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم شروع کر دو۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں غرباء کے اوپر چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو آ کر بیوی کے ہاتھ چومے کہ اللہ تجھے جزائے خیر دے کیسی اچھی تدبیر بتائی، میرا دل ہلکا ہو گیا۔ تو اتنے دولت مند بھی تھے، مگر قلب متوجہ الی اللہ تھا، زیادہ دولت بڑھتی تھی تو ان کے دل پر بار پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں کم ہو جائے تو دل پر بار پڑتا ہے۔ زیادہ ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ وہاں قصہ الٹا تھا اور واقعہ بالکل برعکس تھا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا...... حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوسری صحابی سے زمین خریدی۔ قیمت ادا کر دی زمین قبضے میں آ گئی عمارت بنانے کے لئے جو بنیاد کھودی تو ایک بہت بڑا دیگچہ نکلا جس میں سونا اور چاندی بھرا ہوا تھا۔ گویا لاکھوں روپے کا مال نکلا۔ اسے لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی۔۔ اور فرمایا: ”یہ آپ کا دیگچہ ہے؟“ انہوں نے کہا: ”کیسا دیگچہ ہے“۔ فرمایا: ”وہ جو زمین میں نے خریدی تھی اس میں سے نکلا ہے اور میں نے زمین خریدی تھی، دیگچہ تھوڑا ہی خریدا تھا۔ یہ آپ کا حق ہے“۔ انہوں نے کہا: ”جب میں نے زمین بیچی تھی، زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ تھا وہ سب بیچنے میں آ گیا، لہٰذا یہ آپ کا حق ہے میرا حق نہیں“۔ اب لڑائی اس پر ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا حق ہے۔ انہوں نے کہا نہیں میرا حق نہیں یہ آپ کا حق ہے۔ آخر کو وہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟“۔ تو ایک کے ہاں بیٹا اور ایک کے ہاں بیٹی تھی۔ فرمایا ”دونوں کی شادی کر دو اور اس میں اس دولت کو خرچ کر دو! بس سکون ہو گیا“۔ [1]

ہمارے ہاں تو اس پر لڑائی ہوتی ہے کہ میرا حق ہے تمہارا نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا حق ہے۔ وہاں لڑائی اس پر تھی کہ آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ دوسرے کہہ رہے ہیں آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ ان میں اور ہم میں فرق ہے۔ دولت مند وہ بھی تھے ہم بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے دل دولت کے ساتھ اللہ رب العزت میں اور محبت دین میں فانی تھے۔ ہمارے قلوب میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن اس حد تک کہ اگر تھوڑی، بہت محبت ہو اور دین کی محبت زائل نہ ہو، شریعت نے اجازت دی ہے کہ جمع بھی کر لو اور خرچ کر لو۔ کچھ اچھا کھا پہن لو، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے...... بہر حال مطلب یہ ہے کہ جو آیت میں نے پڑھی تھی تو اس کے ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ دنیا کا راستہ اور ہے اور ختم ہو جانے والا ہے اور ہمیں تو گزر جانا ہے۔ چاہے چورا ہے میں پڑ کے گزرے، چاہے میلے میں پڑ کے گزرے، چاہے بھیک مانگ کے گزرے، بس آخرت میں پہنچ جائیں

[1] الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار، ج: ۱۱، ص: ۲۹۱.

گے، اس کا نام تو رہبانیت ہے اور سرے سے دنیا کی حیثیت ختم ہے، اگر اس مذہب پر دنیا چلتی ہے تو ویران ہوتی ہے اور جگہ جگہ ویرانی کے اثرات ہوتے، دنیا آباد نہ ہوتی۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے بس دنیا ہے۔ لہٰذا حلال وحرام کی تمیز نہ کرو، بس کھاؤ، اڑاؤ، عیش کرو اور مزے کرو۔ اس کا بھی شریعت اسلام نے رد کیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ: ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''

جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی آخرت میں پھل کما لو گے، اگر دولت کا بیج پاک مصرف میں ڈالا ہے تو وہاں پاک ثمرات اور پاک پھل نمایاں ہوں گے۔ ناپاک جگہ میں ڈالا ہے، بیج بھی ناپاک اور وہاں کانٹے دار درخت ملیں گے اور ''زقوم'' ملے گا جس کا تحمل کرنا مشکل ہوگا، یوں کہ وہ عذاب کی صورت اختیار کرے گا۔

غرض دنیا کو نہ تو راستہ بتلایا کہ بھئی! مسافر کی طرح گزر جاؤ نہ کماؤ نہ دھماؤ اور نہ ہی اصل قرار دیا بلکہ کھیتی قرار دیا جس میں ''بونا'' ضروری ہے۔

کاشتکار کا فریضہ...... ظاہر بات ہے کہ جب کاشتکار بوئے گا تو کچھ نہ کچھ محنت تو کرنا پڑے گی۔ خون پسینہ ایک رنگ بھی کرنا پڑے گا بیج بھی ڈالنا پڑے گا، پانی بھی دینا پڑے گا، اچھی خاصی محنت اٹھانا پڑے گی۔ تب جا کے وہ چھٹے مہینے غلہ کمائے گا اور اس سے پھر پیسہ کمائے گا۔ غرض دنیا کو فرمایا یہ کھیتی ہے اور تم کاشتکار ہو۔ کاشتکار کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر پر پڑا رہ جائے، ورنہ پھر لوگ غلے لے آئیں گے تو وہ بیٹھ کر روئے گا اور کہے گا کاش! بیج ڈالتا تو میں بھی غلہ کماتا، اس وقت حسرت میں مبتلا ہوگا۔ لہٰذا حکم دیا کہ دنیا میں رہو اور کچھ کام کرو۔

مقامِ آخرت...... اور اس دنیا ہی سے اپنی آخرت پیدا کرو۔ اس لئے یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا یہ عالم ہے اور آخرت ساتویں آسمان پر رکھی ہوئی ہے۔ بلکہ آپ کی آخرت اسی دنیا میں سے نکلے گی، نکالتے رہو۔ انہی افعال میں سے نکلے جو ادا کر رہے ہو۔ نیت اچھی ہونی چاہئے، اتباع سنت ہونا چاہئے، اسی دنیا میں سے آخرت پیدا ہوگی۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: آدمی دسترخوان پر بیٹھے ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے شروع کرے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقْنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةَ'' پر ختم کرے: ''غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.'' ② ''اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے''۔ تو کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے تو اس روٹی میں سے ہی آخرت نکلی۔ اگر روٹی نہ کھاتا اور سنت طریق پر حمد وثناء سے ابتداء وانتہاء نہ کرتا، تو یہ مغفرت گناہ کا وعدہ کہاں سے ہوتا۔؟ تو روٹی میں سے آپ کی آخرت نکلی۔

---

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم اقف علیه مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وقال القاری: قلت معناه صحیح مقتبس من قوله تعالیٰ '' من کان یرید حرث الآخرة نزد له فی حرثه'' دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۴۱۲. ② السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب مایقول اذا فرغ من الطعام، ج: ۱۱ ص: ۳۵۹.

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر کوئی شخص شفقت و محبت اور پیار سے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ ① دیکھا جائے تو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا تو ایک دنیوی فعل ہے۔ مگر نیت کی سچائی سے نیکیوں کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ نہ رکھتا یا اسے دین نہ جانتا تو بالوں کے برابر نیکیاں کہاں سے آتیں؟۔ تو یتیم کے سر میں سے آپ کی آخرت نکلی اور آپ کے ہاتھ میں سے آخرت نکلی۔ آپ یہ ہاتھ یتیم کے سر پر نہ رکھتے تو نیکیوں میں یہ اضافہ نہ ہوتا۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر کسی شخص نے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا اور ''زوج'' (جوڑا) بنا کے صدقہ کیا، یعنی پیسہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے، روپیہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے کپڑا دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے: ''مَنْ اَنْفَقَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ زَوْجَيْنِ'' ② ''ہر چیز میں سے جس نے جوڑا جوڑا صدقہ دیا''۔ تو فرماتے ہیں جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔ تو دنیا میں دو چیزوں کا یعنی جوڑے کا صدقہ کیا، اس سے ہی تو آخرت بنی، تو آخرت آپ کے فعل سے نکلی، آخرت کہیں الگ تو نہیں رکھی ہوئی تھی۔ بہر حال دنیا آخرت کے کمانے کا ذریعہ ہے اور اس دنیا ہی میں سے آپ کی آخرت نکلے گی۔

تجارت میں مخفی آخرت...... آپ تجارت کر رہے ہیں، نیت صاف رکھیں۔ یہ تجارت آخرت کا ذریعہ بنے گی، چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاء'' ③ ''ایک سچا تاجر جو امانت دار ہو اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا جنت میں ان کے ساتھ جائے گا'' کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اگر دیانت کے ساتھ تجارت نہ کرتے تو یہ فضیلت ان کو کیسے ملتی؟ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا: ''غَفَرَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ كَانَ قبلكم سَهْلًا اِذَا اشْتَرٰى سَهْلَ وَاِذَا بَاعَ سَهْلَ.'' ④ ''اللہ اس شخص پر مغفرت اور رحم کرے جو شفقت کے ساتھ خریدتا ہے اور شفقت کے ساتھ بیچتا ہے،، بیچنے میں اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے گاہک کو نقصان نہ ہو۔ گاہک خریدتا ہے تو اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے تاجر کو نقصان نہ پہنچے۔ دونوں کے دل میں نیک جذبہ ہے تو دونوں کے لئے دعا دی کہ: غَفَرَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ ''اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے بیچ رہا ہے اور اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے خرید رہا ہے''۔ اگر یہ تجارت نہ ہوتی تو یہ آخرت کا وعدہ آپ کے لئے کہاں سے پورا ہوتا۔؟ اسی میں سے تو آخرت نکلی ہے۔ یہ نہیں کہ آخرت کہیں عرش کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور دنیا یہاں ہے۔ اسی دنیا میں آخرت چھپی ہوئی ہے، نکال لینا آپ کا کام ہے جیسے اسی زمین کے اندر یہ پھل پھول

① مسند احمد، حدیث ابی امامة الباهلی، ج:۴۵، ص:۱۲۷، رقم:۲۱۱۳۲.
② المعجم الکبیر للطبرانی، باب الجیم، ابو ذر غفاریؓ، ج:۲، ص:۲۱۰.
③ الجامع للترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، ج:۱، ص:۲۲۹.
④ السنن للترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی استقراض البعیر، ج:۵، ص:۱۵۹.

چھپے ہوئے ہیں، نکال لینا کاشتکار کا کام ہے کہ بیج ڈالتا رہے، پانی ڈالتا رہے، پھل نکالتا رہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا کہ یہ تو زمین ہے اور یہ جو پھلوں کی دنیا ہے کہ یہ آسمان پر رکھی ہوئی ہے۔ وہاں سے پھل برسیں گے تو کبھی بھی اسے پھل نہیں ملیں گے، اسی زمین پر محنت کرنی پڑے گی۔ تو انسان دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ رد کر کے پس پشت ڈال دے بلکہ اس سے اپنی آخرت کا کام لے۔ ہر چیز سے کام لے۔ حیات سے بھی کام لے، موت سے بھی کام لے۔

موت میں مخفی آخرت...... چنانچہ جب انسان کا کوئی عزیز گزر جاتا ہے تو طبعی طور پر آدمی کو صدمہ پیش آتا ہے۔ لیکن دانش مند وہ ہے جو اس صدمے سے اپنے لئے اجر نکال لے، وہ یہ ہے کہ نہ تو جزع فزع کرے نہ بین کر کے روئے نہ یہ کہ بالکل پتھر ہو جائے کہ اس کی آنکھ سے آنسو تک نہ نکلے، قلب کی سلامتی کے ساتھ جتنا طبعی غم ہے وہ ہو، اور عبرت پکڑے کہ جہاں آج یہ گیا ہے مجھے بھی کل کو جانا ہے۔ اس کی موت کو اپنی موت کی یادگاری کا ذریعہ بنائے تو اس کی موت دین کی ترقی کا ذریعہ بن گئی۔ اگر یہ میت نہ ہوتی تو اسے یہ اجر کیسے ملتا۔؟

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا، وہ واویلا کر رہی تھی۔ سر کے بال نوچ رہی تھی کہ ہائے ہائے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم گزرے۔ فرمایا: ''بڑی بی! صبر کرو''۔ بڑی بی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس نے کہا:

''ہاں! تم نے یہ کہہ دیا کہ صبر کرو، تمہارے گھر میں یہ آفت آتی جب میں جانتی تم صبر کرتے۔ مجھے صبر کرانے کے لئے آئے ہو؟ میں نہیں صبر کر سکتی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اچھا تو جان!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے گئے۔ اگلے دن اس کو پتہ چلا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تب حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ ہیں، آپ نے صبر کی تلقین فرمائی تھی۔ میں اب صبر کرتی ہوں''۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى.'' ① ''جب صدمہ پیش آیا تھا، جب صبر کرتی تو اجر ملتا''۔ یوں تو دو چار برس کے بعد خود بخود ہی صبر آ جاتا ہے۔ کوئی ساری عمر آدمی تھوڑا ہی روتا رہتا ہے۔ تو وہ مجبوری کا صبر ہے اور صدمہ کے وقت اختیاری صبر ہوتا ہے۔ جو نفس کا ضبط کرنا ہے وہی اجر کا باعث ہے۔ مجبوری کی چیز اور بے اختیار چیز پر کوئی اجر نہیں ہوتا۔ جس چیز میں ارادہ واختیار صرف کیا جائے اور طبیعت کے خلاف جدوجہد کی جائے اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔ غرض موت تک کو آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے زندگی کو بھی آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔

دوسرے کی نیکی ذریعۂ ترقی...... علماء کرام لکھتے ہیں کہ کسی کی اچھائیاں دیکھو تو حرص کرو۔ برائیاں دیکھو تو حرص مت کرو۔ مثلاً آپ نے کسی کو دیکھا کہ نوافل بہت پڑھ رہا ہے اور دل میں حرص آئی اور دعاء کی کہ یا اللہ! مجھے بھی اتنے نفلوں کی توفیق دے۔ اور توفیق ہوگئی تو اس کے نوافل آپ کو نوافل پڑھوا دینے کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی نیکی بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور لوگوں کی موت بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور، ج: ۵، ص: ۲۹.

دوسرے کی برائی ذریعۂ عبرت......اور اگر برائیوں کو دیکھ کر آپ نے عبرت پکڑی اور ان سے بچ گئے تو لوگوں کے گناہ بھی ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ بن گئے۔ غرض دنیا کی ہر چیز میں عبرت، نصیحت و موعظت موجود ہے، انسان اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو مٹا کر ختم کردے۔ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی ہر چیز سے عبرت پکڑے۔ ہر ہر چیز سے نصیحت حاصل کرے۔ ہر ہر چیز سے اپنی آخرت بنائے اور اپنی آخرت کو یاد کرے۔ یہ جبھی ہوگا جب دنیا بچی ہوئی ہو۔ اس کو دیکھ دیکھ کر ہم عبرت پکڑیں۔

حضرات کا احترام......اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔ وقت بھی تھوڑا تھا، اور کچھ زیادہ ہمت بھی نہیں تھی اور ضعف بھی کافی تھا اور کچھ کام بھی زیادہ ہے اور سفر کی آخری رات بھی ہے۔ اس واسطے ارادہ کیا جب اعلان ہو گیا تو کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اعلان کے احترام اور حضرات کے جمع ہونے کے احترام میں یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔

اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور ہمیں علم و عمل کی توفیق دے۔ ہماری دنیا بھی درست فرمادے اور آخرت بھی درست فرمادے اور ہمیں عدل واعتدال پر قائم رکھے۔ افراط وتفریط اور مبالغوں سے ہمیں محفوظ رکھے، آمین!

دعاء

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَیْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَیْرِ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ اٰمِیْنَ

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ خَیْرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ.

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ خَیْرَ الْحَیٰوةِ وَخَیْرَ الْمَمَاتِ وَ ثَقِّلْ مَوَازِیْنَنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا

اَللّٰھُمَّ انْصُرْنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا بِالْفَوَاحِشِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ.

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

(۶ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ)

عالم اصغر

انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں ۔

آسماں ہاست در ولایت جاں | کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہست | کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے: میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾. (1) صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

اقسام عالم اوران کے حصص...... بزرگان محترم! انسان عالم صغیر ہے۔ عالم کبیر کے جملہ نمونے اور نقشے اس میں موجود ہیں، چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد اور عالم غائب عالم شاہد اجسام کا مجموعہ ہے جو آنکھوں سے مشاہد اور محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً دریا، پہاڑ، زمین، آسمان وغیرہ۔ انسان میں عالم شہادت بدن ہے۔ جس میں گوشت پوشت، ہڈی، چہرہ وغیرہ اور دیگر اعضاء بدن وغیرہ۔ پھر جیسے اس دنیا میں عالم شہادت کے دو حصے ہیں۔ سفلیات (نچلے)، جیسے زمین اور اس کے سبزہ زار دریا، پہاڑ وغیرہ۔ علویات (اوپر کے) جیسے آسمان، چاند، سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں فوقانی حصہ جس میں قلب اور دماغ ہے، اس کے علویات ہیں۔ اور تحتانی حصہ جس میں مختلف حسی اعمال وحرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں، پیٹھ وغیرہ یہ اس کے سفلیات ہیں۔

(1) پارہ: ۲۶، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۲۱.

عناصر اربعہ کی کارفرمائی میں کمال درجہ تشابہہ...... پھر جس طرح عالم انسانی کی بنیاد عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے مادوں پر ہے بعینہ انسان میں انہی چار مادوں کے اثرات حرارت، برودت، یبوست اور رطوبت کارفرما ہیں۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی بجنسہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔

مٹی کی جملہ انواع...... مثلاً زمین ایک تودہ خاک ہے۔ ایسے ہی انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے۔ پھر جس طرح زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول وعرض اور عمق (گہرائی) سب کچھ ہی ہے۔ ایسے ہی انسان کا بدن ہے۔ پھر جس طرح زمین کھودو تو تری نکلنا شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کاٹنے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے۔ سفید، سیاہ، سرخ، زرد۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے۔ مستور حصے جیسے زیر بغل، کنج ران سیاہ ہے۔ چہرہ پر سرخی رہتی ہے۔ ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے پوری نوع بشر پر نگاہ ڈالو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید، مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد اور عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے، جیسے تفریح گاہ اور کوئی گندا جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں، ایسے ہی انسان کا لطیف اور صاف ستھرا حصہ چہرہ اور ہاتھ ہے جسے عزت سے چومتے ہیں۔ اور گندا حصہ زیر بغل یا اعضاء نجاست ہیں۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات وکیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کی جملہ انواع...... پھر جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے۔ بعینہ بدن انسانی میں حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اسی حرارت غریزی وطبعی پر انسانی زندگی قائم ہے پھر جیسے مٹی اور پتھر اور لوہے کے آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی انسانی ران یا ہاتھ کے آپس میں رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات یعنی سورج کا۔ یعنی سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں۔ ایسے ہی بدن انسانی میں حرارت اس کے علویات یعنی قلب اور دماغ کا فیض ہے۔ قلب ہی حرارت غریزی تیار کرتا ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے اور قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کی جملہ انواع...... پھر یہ پانی جیسے زمین کے گوشے گوشے میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی انسانی بدن میں رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے۔ پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں کوئی بڑے دریا ہیں، کوئی چھوٹے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بڑی اور چھوٹی رگیں گویا دریا ہیں۔ پھر جیسے زمین میں نہریں، ندی نالے، پانی کے ڈونگرے مثلاً تالاب ہیں، ایسے ہی انسانی بدن میں وہ رطوبات کا پانی رہتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں شیریں، نمکین اور شور مختلف قسم کے چشمے ہیں ایسے ہی انسانی بدن میں منہ سے آب شیریں اور آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے۔ پتے سے کڑوا اور معدہ سے ترش پانی چلتا ہے۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ سے یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں ہے کہیں کا جما ہوا ہے جیسے بحر منجمد شمالی تو بلغم وغیرہ منجمد چشمے ہیں۔ پھر جیسے کہیں

گندا پانی ہوتا ہے۔انسان میں پیشاب یا سنک گویا گندہ پانی ہے۔جو گند صفائی سے بہتا ہے۔پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے ہیں۔اور کہیں گرم جہاں گندھک کا زور ہے۔ایسے بدن انسانی میں ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری۔زبان سرد پانی کا چشمہ اور پیشاب گرم پانی کا چشمہ۔پھر دنیا میں مجمع البحرین ایک مقام ہے۔جس کا ایک حصہ شیریں اور دوسرا تلخ وشور ہے۔ایسے ہی انسان کے دماغ کی حس مشترک میں شیریں چشمہ قوت ذائقہ اور نمکین چشمہ قوت باصرہ موجود ہے۔پھر جس طرح دنیا میں برسات ہوتی ہے ایسے ہی بدن انسانی میں پسینہ ہے۔

ہوا کی جملہ انواع...... پھر جس طرح عالم کا ہر خلا ہوا سے پر ہے۔ایسے ہی انسانی بدن کا ہر خلا ہوا سے بھرپور ہے۔پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں سانس کے ذریعے جو ہوا اندر جاتی ہے وہ سرد ہے اور جو ہوا باہر نکلتی ہے وہ گرم ہے پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی۔ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو خوشبودار ہوتی ہے اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار۔پھر جیسے زمین پر حبس اور گھٹن ہونے سے انسان کا دل گھبراتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ایسے ہی ریاح بند ہونے کے وقت حالت ہوتی ہے۔پھر جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا کھینچ لی جائے تو سارا عالم ختم ہو جائے ایسے ہی انسانی بدن میں سانس کھینچ لی جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔غرض ہوا کی جملہ انواع انسان میں موجود ہیں۔

انواع جمادات...... جمادات میں ہڈیوں کا سلسلہ گویا پہاڑ ہیں۔جن میں سے پہاڑوں کی طرح کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی۔پھر جس طرح پہاڑوں پر مٹی جمتی ہے ایسے ہی اقلیم بدن پر گوشت چڑھا ہے۔پھر پہاڑوں کے بعض خطے گرم ہیں، بعض سرد، ایسے ہی انسانی بدن کے مستور حصے گرم ہیں اور سطح بدن کے تمام نمایاں حصے سرد۔پھر پہاڑوں کے مقامات مقدسہ کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض سے کراہت کی جاتی ہے۔ایسے ہی انسانی بدن میں چہرہ مرہ کی ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے اور بعض حصوں کو دیکھنا شرعاً وعقلاً ننگ وعار سمجھا جاتا ہے۔پھر زمین کے بعض حصوں کو دیکھنے کی قوت ہے۔لیکن ایسا کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ایسے ہی بدن انسانی کے بعض حصوں کو دیکھنا (مثلاً پیٹھ وغیرہ) حماقت ہے۔پھر جیسے پہاڑ پر نباتات اگتے ہیں، ایسے ہی انسان بدن پر بال اگتے ہیں۔پھر جس طرح زمین پر کہیں گھنا جنگل ہے، کہیں جھنڈ، ایسے ہی انسانی بدن کے چہرہ اور سر پر گھنے بال ہیں اور عام بشرہ بدن پر چھید ہیں۔

پھر جس طرح زمین پر بعض نباتات برابر بڑھتے اور نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں۔لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں یکساں رہتا ہے۔پھر بعض جگہ زمین کے جھاڑ جھنکار کے صاف کئے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی۔ایسے بدن انسانی کے موئے بغل اور موئے زہار ہیں۔

پھر زمین کے بعض حصے قائم رکھنے سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور بعض حصوں کی تراش خراش سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ایسے ہی بدن انسانی میں موئے ریش ہیں جن کے رکھنے سے انسانی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔نیز ان کی اصلاح اور موئے شوارب (مونچھوں کے بال) کی تراش سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انواع حیوانات...... پھر جس طرح زمین کے مختلف قسم کے حیوانات کی غذا زمین کی رطوبات ہیں۔ ایسے ہی انسانی جہاں میں سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدے میں ریسمانی کیڑے، بدن کے خون کو چوستے اور بڑھتے ہیں۔

پھر جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں مختلف صورتوں کے حشرات الارض ہیں۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں مختلف رنگوں کے جراثیم ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں۔ پھر جس طرح دنیا کے ہر خطہ کے جانور مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایسے ہی انسانی بدن کے ہر حصہ میں نئی نئی شکل وشائل کے جراثیم ہیں۔ پھر جس طرح زمین کی مخلوقات زمین میں پیدا ہو کر مر کر زمین میں ہی دفن ہو جاتی ہیں، ایسے ہی جراثیم بدن میں پیدا ہو کر مرتے اور بدن میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

آثار زلزلہ...... پھر جس طرح زلزلہ سے ساری زمین حرکت میں آتی ہے ایسے ہی بدن میں جھر جھری آنے سے پورا بدن اچانک متحرک ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح زلزلہ کا سبب آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی اندرونی گرمی، بھڑکاہٹ یا پریشانی دل سے انسان کے پورے بدن میں جھر جھری آ جاتی ہے۔

پھر جس طرح اقلیم عالم میں عناصر کے غلبہ سے غیر معتدل آثار پیدا ہوتے ہیں مثلاً قحط سالی، آندھیاں، آگ برسنا، ایسے ہی اقلیم بدن پر غیر طبعی آثار مثلاً بخار، زکام، سرسام اور خارش وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔

عقل وحکمت کے آثار...... پھر جس طرح عقل وحکمت کی کمی اور شہوات عضلات کی زیادتی سے انسان، انسان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض دفعہ بحرانی مرض پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے بدن کو نوچنے لگتا ہے۔ پھر جس طرح کسی ملک پر بادشاہ کی حکومت ہوتی ہے اور وزراء جنود وعساکر (افواج) اس کے مددگار ہوتے ہیں، ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے۔ دماغ اور حواس خمسہ اس کے وزراء اور مشیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں۔ پھر جس طرح علویات میں چاند اور سورج روشن ہیں۔ بعینہ اقلیم بدن میں سر میں دو آنکھیں منور ہیں پھر جس طرح ستاروں سے راستہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کے نتائج اور نظریئے ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں۔

ستاروں کے آثار...... پھر جیسے ستارے مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں، ایسے ہی دماغی فکر غم ومسرت پیدا کرتی ہے۔ پھر جس طرح آسمان کے اوپر غیب میں جنت ہے۔ جس میں سوائے مسرت واطمینان کے غم کا کہیں نشان نہیں۔ بعینہ انسان میں آثار فرحت ومسرت اور بشاشت وطمانیت (خوشی واطمینان) مثل جنت کے ہیں۔ جن میں مگن ہو کر نفس دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح غیب میں جہنم ہے۔ جہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں۔ ایسے ہی انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات، مثل جہنم کے ہیں۔ پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق ترعرش ہے، جہاں حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات کا بلاواسطہ دور دورہ ہے ایسے ہی فوقانی اشیاء میں انسان کا لطیفہ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے۔ جس میں بلاواسطہ اسرار الٰہی متجلی اور منکشف ہوتے ہیں۔

ملائکہ وشیاطین...... پھر جس طرح آسمان پر فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں جن میں عصیان کا کہیں نشان نہیں۔ایسے ہی دماغ میں حواس خمسہ ملائکہ کی طرح خدمات انجام دیتے ہیں۔ پھر جس طرح غیبی عالم میں آسمان کے نیچے گمراہ شیاطین ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے نہیں جھکتے ،ایسے ہی انسانی دماغ کے نیچے نفس ظلمانی ہے، جو قلب کے اشاروں پر نہیں چلتا اور فانی لذات میں منہمک ہو کر سارے اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا ہے۔

عالم غیب سے تشابہہ...... دوسرا عالم، عالم غیب ہے جو جسمانیت سے پاک ہے اور صرف دل کی آنکھوں سے نظر آتا ہے، مثلاً ذات وصفات حق، ملائکہ، عالم اسرار غیب وغیرہ، انسان کا عالم غیب روح انسانی ہے۔ جس میں علم کے سرچشمے ہیں اور لطیفہ روح معنویات وروحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔ گویا اس روح میں کمالات باطن کے نمونے ہیں جو اس کو ودیعت کئے گئے ہیں۔ جس طرح ذات بابرکات مدبر وحکیم اپنی حکمت وقدرت سے سارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا توجہ ہٹالے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

اسی طرح روح انسانی بدن کی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اگر ذرا بھی اپنا رخ بدن سے پھیرے تو اقلیم تن گل سڑ جائے، پھر جس طرح وہ مختلف رنگ کے جہانوں کے لئے ایک مدبر ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح روح بھی انسانی بدن میں وحدہ لاشریک ہے۔ پھر جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود انسانوں سے اوجھل ہے اور ادراک سے قاصر ہے۔ ایسے ہی روح انسانی ہے۔ پھر جیسے وہ خالق اکبر عالم کے ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ ہونے کے باوجود کوئی اشارے سے نہیں بتلا سکتا کہ ذرا ادھر یا ادھر۔ ویسے ہی روح انسانی رگ رگ میں سمائے ہونے کے باوجود کوئی نہیں بتلا سکتا کہ کس کونے میں بیٹھی ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہ کو جو تعلق عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں۔ جو بیت اللہ سے ہے وہ عام جہان سے نہیں۔ چنانچہ اگر مقامات مقدسہ پر آنچ آجائے تو سارا عالم زیروزبر ہو جائے۔ ایسے ہی روح انسانی کا سب سے زیادہ تعلق قلب سے ہے۔ پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ ملائکہ مقربین کو مامور فرماتے ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حکم الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ اسی طرح روح انسانی کی صفت بھی رشد وہدایت ہے۔ پھر جس طرح ہر ادراک اور حواس خمسہ اس کے ملائکہ ہیں، جن کی قوتیں دماغ میں پوشیدہ ہیں اور جن اعضاء کے ذریعے قوتیں نمایاں ہوتی ہیں، وہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ بمنزلہ انبیاء علیہم السلام کے ہیں۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی گوناں گوں صفات وکمالات ہیں۔ کسی نہ کسی خاص غلبہ کے تحت ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے۔ ایسے ہی روح بھی کسی نہ کسی صفت سے ان کارکنوں پر متجلی ہوتی ہے اور ہر عضو آنکھ، کان، ناک اس کی اس قوت احساس وادراک کا مظہر ہے۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ کی سب سے زیادہ جامع تجلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم وکمالات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ تجلی قلب پر ہے اور قلب مجمع العلوم ہے۔ حواس خمسہ میں ادراک وشعور کا فیض قلب ہی کا ہے۔

پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت و معرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و معرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ ایسے ہی ان اعضاء حواس کا علم قلب کی قوت علم سے مستفاد اور وابستہ ہے اور قلب بالذات مدرک ہے، چناں چہ آنکھ، کان بند کر کے تنہا قلب تدبر و فکر کرتا ہے اور ساری کائنات کے نقشہ کو عالم خیال میں دیکھتا ہے اور حواس خمسہ کا محتاج نہیں۔

پھر جس طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے حاکم اور جملہ ادیان کے ناسخ ہیں۔ ایسے ہی قلب تمام اعضاء رئیسہ مروسہ پر حاکم اور ان کے علمی ذخیروں پر ناقد اور متصرف ہے کہ آنکھ نے صحیح دیکھا یا نہیں، کان نے صحیح سنا یا نہیں اور قلب کے علوم پر اختیار نہیں۔ پھر جس طرح کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر اولاً اترے۔ اسی طرح روح کا فیضان بھی اولاً قلب پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حیات و زندگی بھی پہلے قلب پر اترتی ہے۔

پھر جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر عمل کے لئے جبر و اکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی روح انسانی اشیاء کا حسن و قبح دکھلا کر اعضاء بدن میں استعداد عمل کی قوت پیدا کر کے نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتی ہے اور عمل کے لئے نفس پر جبر و اکراہ نہیں کرتی۔ پھر جس طرح غذا کے اثرات بدن پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح روح بھی اپنی تربیت سے اس کے (خیر و شر کے) ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے۔

آخر میں بطور تبرک حضرت قاری صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ غرض مبداء ہو یا معاد، نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا و جزاء، حق تعالیٰ کے کمالات و صفات ہوں یا افعال، ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ اور ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج (نمونے) قائم ہیں ۔

آسماں ہاست در ولایت جاں ۔۔۔ کارفر فرمائے آسمان جہاں

در رہ روح پست وبالا ہست ۔۔۔ کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے۔ ؎

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔ (ماخوذ از ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک)

افادات علم وحکمت

مختلف مواقع پر کیے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کے علمی جوابات

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلَى اللّٰهِ كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ ① . صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

قرآن حکیم اور انسانی نفسیات...... ظاہر بات ہے کہ آیت میں ظاہری پاکی وناپاکی تو مراد نہیں ہے کہ جس کے کپڑے پاک ہوں وہ تو طیبین میں داخل ہو گیا اور جس کے کپڑے ناپاک ہوں وہ خبیثین میں داخل ہو گیا۔ طیبین وہ خبیثین بلحاظ عقائد واعمال اور افکار کے مراد ہیں کہ طیبین وہ ہیں جن کے عقائد بھی درست، اعمال بھی درست اور جن کا فکر بھی درست اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ اور اگر انبیاء علیہم السلام کی بھی اولاد ہو اور وہ کفر میں مبتلا ہو وہ خبیثین میں شامل ہو گئی، طیبین میں شامل نہیں ہو گی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمادیا گیا: ﴿إِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ ② وہ آپ کے اہل میں سے نہیں آپ کا اہل وہ ہے جو آپ کا مطیع ہو۔ جیسے کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ اَطَاعَنِيْ فَهُوَ اٰلِيْ.'' جو میری اطاعت کرے گا وہ میری آل اولاد میں داخل ہے، جو اطاعت نہیں کرے گا وہ آل اولاد سے خارج ہے۔ یہاں پر نسبی اولاد مراد نہیں، روحانی اولاد مراد ہے جو میرے دین پر ہوا اور اس دین پر چلے وہ میری اولاد ہے۔

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۶. ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۴۶.

اور بعض روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا بھی ہے کہ: ''اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ.'' [1] ''میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں،،۔اس سے بھی نسبی باپ مراد نہیں۔ بلکہ نسبتی اور روحانی باپ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو میرا دین پہنچا اور وہ اس پر چلا تو میں اس کے حق میں باپ ہوں اور وہ میرے حق میں اولاد ہے اور جو اس سے نکل گیا نہ میں اس کے حق میں باپ ہوں اور نہ وہ میرے حق میں اولاد ہے۔ یہی معنی طیب وخبیث کے ہیں کہ جو اس فکر وعقیدے اور عمل سے خارج ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ جو اس میں داخل ہے وہ طیبین میں داخل ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جو طیبین میں داخل ہیں۔ وہ دین پسند ہیں۔ وہ طیبات ہی کو پسند کریں گے کہ ان میں بھی دین ہو۔ کوئی نیک صالح یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی فاحشہ آجائے یا بدکردار آجائے۔ بخلاف خبیثین کے جو خبث میں مبتلا ہیں انہیں عورتیں بھی وہی پسند ہوں گی جو خبث میں مبتلا ہوں۔ پاک صاف اور طاہرات ہوں تو ان کی طبیعت کبھی رجوع نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ دلوں کے اندر خبث بھرا ہوا ہے تو یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو قرآن نے اٹھایا ہے کہ نیک آدمی نیک چیزوں کی طرف توجہ کرے گا اور بدآدمی بد چیزوں کی طرف۔ وہ چیزیں عورتیں ہوں یا اشیاء ہوں جب دل میں بدی ہے تو بدی ہی پسند آ گے گی۔ دل میں پاکی ہے تو پاکی ہی پسند آئے گی۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان کی طبائع ہی پاک پیدا کی گئیں ہیں بالطبع جب نبی علیہ السلام کی طبیعت چلے گی خیر کی طرف چلے گی۔ شر کی طرف کبھی نہیں جائے گی۔ اس لئے کہ بنیاد پاک ہے۔ اسی طرح سے اگر ان کے طفیل سے کسی کی بنیاد پاک ہے۔

یا ریاضت ومجاہدہ سے اپنی طبیعت پاک کرلی تو وہ پاک ہی چیزوں کو پسند کرے گا، ناپاک چیزوں کو کبھی نہیں پسند کرے گا۔ غذا بھی ہو، تو پاک غذا پسند کرے گا ناپاک نہیں، لباس ہو تو جائز لباس پسند کرے گا، ناجائز نہیں، ہر چیز میں یہ اصول چلے گا کیوں کہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔

یورپ کے ایک ریفارمر نے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے جس نے نفسیات سے بحث کی ہے اور کتابوں میں احکام دیئے گئے ہیں یہ ناجائز ہے یہ حلال ہے یہ حرام ہے اور قرآنِ کریم نے صرف حلال وحرام بیان نہیں کیا، حلال تک پہنچے کا جو نفسیاتی طریقہ ہے ادھر بھی توجہ دلائی ہے، حرام تک پہنچنے کے جو نفسیاتی اصول ہیں ان کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات...... جیسے مثلاً ایک حدیث ہے جو قرآنِ کریم کی شرح ہے۔ اس میں فرمایا گیا صحابہ رضی اللہ عنہ کا مجمع تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآئُکُمْ'' لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فاسق وفاجر بن جائیں گے اور عورتیں آزاد ہو

---

[1] السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب کراھیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ، ج: ۱، ص: ۱۰۲، حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۱ ص: ۸۶.

جائیں گی اور تمہارے کہنے میں نہیں رہیں گی۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تو خیر القرون میں ہیں، ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ حیران ہوئے عرض کیا یارسول اللہ! کیا یہ ہو جائے گا؟ "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ" "یہ بھی ہوگا اور اس سے زیادہ سخت بات ہوگی"۔ "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ." اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اچھی باتوں کی نصیحت چھوٹ جائے گی اور بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے گا۔ تو صحابہ میں حیرانی پیدا ہوئی کہ یہ کیسے ہوگا۔ وہ تو پاک زمانہ ہے، رات دن معروفات میں ہیں، بدی کا تو ان کے ذہنوں میں تصور بھی نہیں آتا۔ تو حیران ہوئے اور عرض کیا: "وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَّارَسُوْلَ اللّٰهِ؟" "یارسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟" "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ." "یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا"۔ "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ." اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب منکرات کی تو ہدایت کرنے بیٹھ جاؤ گے اور معروفات کے روکنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے، اب تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پہلے سے بھی زیادہ تحیر بڑھا اور عرض کیا: "وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَّارَسُوْلَ اللّٰهِ؟" "یارسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟" "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ." "بھی ہوگا "کَیْفَ بِکُمْ اِذَارَأَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا "① "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ اچھی چیزوں کو تم برا جاننے لگو گے یعنی فہم ہی الٹ جائے گا کہ اچھی چیزیں بری نظر پڑیں گی اور بری چیزیں دلوں کے اندر اچھائی بن جائیں گی۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا۔"

تو اس حدیث میں درجات بتلائے گئے ہیں کہ سب سے پہلے عمل سے ابتداء ہوتی ہے کہ عملی طور پر آدمی فسق و فجور اور تعدی و زیادتی کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ عمل خراب ہوتا ہے۔ نوجوان فاسق و فاجر ہو گئے، عورتیں سرکش اور آزاد بن گئیں۔ خاوند کی سنتی ہیں نہ باپ کی سنتی ہیں نہ اولاد کی سنتی ہیں، جو ان کے جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ تو عملی خرابی ہے۔

عملی خرابی جب جڑ پکڑ جاتی ہے تو نصیحت کا کارخانہ رک جاتا ہے۔ نصیحت کرنے والے کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کہہ دیا تمہارا عمل نہیں ہے تم کس منہ سے نصیحت کر رہے ہو۔ تو نصیحت کا کیا منہ رہے گا۔ تو نصیحت رک جائے گی تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو گیا۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اچھی باتوں سے روکنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور بری باتوں کی ہدایت کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور چوتھا مقام فہم کے الٹ جانے کا ہے کہ جو اچھائی کی چیزیں ہیں، وہ بری بن جائیں اور جو بری چیزیں ہیں وہ اچھی نظر آنے لگیں۔

① مسند ابی یعلی الموصلی، شهر بن حوشب عن ابی هریرةؓ، ج: ۱۳، ص: ۱۸۴. علامہ ہیثمیؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب فی أیام الصبر و فیمن یتمسک ج: ۳ ص: ۳۱۴.

یہاں آکر فہم کا الٹا پن ظاہر ہوتا ہے، غرض خرابی پہلے عمل سے شروع ہوتی ہے، پھر عقیدے پر پھر نصیحت پر، پھر عقل وفہم پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، انجام کار آدمی الٹا چلنے لگتا ہے قلب میں زیغ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب یہ نفسیاتی اصول ہے کہ عمل اول بگڑے گا فکر بعد میں بگڑے گی، عقیدہ اس کے بعد بگڑے گا اور پھر فہم الٹ جائے گا۔ تو فقط یہ نہیں فرمایا کہ برائی سے بچو۔ برائی سے بچنے کا نفسیاتی راستہ بھی بتلا دیا کہ عمل کی حفاظت کرو تا کہ فکر محفوظ رہے فکر کی حفاظت کرو تا کہ عقیدہ محفوظ رہے۔ عقیدے کی حفاظت کرو تا کہ فہم میں کجی نہ پیدا ہو۔ تو یہ ایک سلسلہ ظاہر فرمایا۔

تو یورپ کے ریفارمر نے یہی کہا کہ دنیا کی ساری کتابوں میں احکام موجود ہیں، قرآنِ کریم میں احکام کے ساتھ نفسیات سے بحث کی گئی ہے۔ جو کسی کتاب میں نہیں کی گئی۔ فطرت کے راستے دکھلائے گئے۔

اب جب قرآنِ کریم کی تعلیم ہی چھوٹ جائے تو احکام کیسے معلوم ہوں۔ احکام نہ معلوم ہوں تو عقائد کیسے درست رہیں۔ عقائد درست نہ ہوں تو فکر کیسے صحیح رہے اور جب فکر صحیح نہیں رہے گی۔ الٹی ہو جائے گی۔ تو دل ہی الٹ جائیں گے۔

اسی کو فرمایا گیا ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ ① ''بہت سے وہ لوگ ہیں جو مومن ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں''۔ شرک میں مبتلا ہیں یہی تو وہ مقام ہے۔

گائے علامت حیات ہے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ گائے ذبح کر کے اس میت سے ملاؤ، وہ زندہ ہوگا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہو۔ فرمایا۔ ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ② ''مذاق مسخرہ ہم نہیں کیا کرتے۔ میں تو وحی الٰہی سے کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا اس کی شان کیا ہوگی؟ فرمایا: ''وہ نہ بوڑھی ہو نہ بن بیاہی بلکہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہو''۔ انہوں نے کہا رنگ کیا ہوگا؟ ﴿صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ ③ نہایت زرد خوش رنگ جو نگاہوں کو خوش کرتی ہو اور یہ کہ وہ نہ کسی کھیتی میں جڑی ہوئی ہو نہ کسی محنت میں لگی ہوئی ہو۔ یہ ساری شانیں ایک ہی گائے میں پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک صالح آدمی کی ملک تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے یتیم بچے تھے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بس یہی ایک گائے تھی۔ سارے بنی اسرائیلی جمع ہو کر وہاں پہنچے اور کہا کہ اس گائے کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا اس کو ذبح کر کے اس کھال بچھائے دیتا ہوں، اس میں سونا بھر دو، تو لاکھوں روپے کا سونا ان کو ملا اس کو ذبح کر کے اس کو میت سے ملایا گیا وہ زندہ ہوا اس نے قاتل کا پتہ دیا، غرض گائے علامت حیات ہے۔

سامری نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دریائے نیل میں فرعونی غرق ہوئے۔ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام مع بنی اسرائیل کے پار ہو گئے، پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور پانی رک کر بارہ راستے بن گئے۔ اور بارہ قبیلے اس

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۶. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷. ③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۹.

سے گزرے جو ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے۔ فرعون جب نکلا تو ہامان نے کہا کہ آپ کے اقبال سے دریا میں راستے ہوئے ہیں۔ وہ جھجکتا تھا کہ میرا اقبال کیا۔ یہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ ہے۔

مگر وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دوسرا وزیر گھوڑی یعنی مادہ پر سوار تھا، وہ گھوڑی جو تھی آگے بڑھی۔ گھوڑا بھی لپک کے اس کے پیچھے پڑا، اور وہ دریا میں کود گئے، تو یہ سارے قبطی کود دے اور وہاں غرق ہو گئے اس کے بعد سامری نے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کے سم کے نیچے اگر خاک بھی ہوتی تو سبزہ اگ آتا تھا اس نے سمجھا کہ اس میں حیات کا مادہ ہے۔ اس نے چٹکی اٹھا کے رکھ لی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے زیوارت جمع کرو، سونے چاندی کے زیوارات جمع کر کے اس کا بچھڑا بنایا۔ اس میں وہ خاک پھونکی تو کودنے لگا اور اس میں آواز بھی نکلی۔ اس نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) خدا کو دیکھنے وہاں گئے۔ خدا تو معاذ اللہ یہاں آ گیا۔ وہاں سے گو (گاؤ) کی پوجا شروع ہوئی۔

ہندوستان میں جو گاؤ پرستی کی وبا آئی ہے تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چند بنی اسرائیل جو مرتد ہو گئے تھے، بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں، تو جو کلمات حقہ حضرت موسی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے سنے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ اپنی چیزیں مل ملا کر لوگوں کو سمجھایا تو وہاں سے گوسالہ پرستی شروع ہو گئی۔ بہر حال اتنی بات معلوم ہوئی گائے جو ہے اسے حیات سے مناسبت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا دودھ نہیں ہوتا تو بچوں کو گائے کا دودھ پلواتے ہیں۔ اس کے اندر وہی مادہ ہے یعنی حیات آفرینی جو ماں کے دودھ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے خواب میں گائے وغیرہ دیکھنا انشاء اللہ حیات کی علامت ہے۔

تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت...... تعبیر خواب کا تعلق کچھ موسموں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ دیکھنے والے کی صفات سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اعداد وشمار کا بھی تعلق ہوتا ہے تو معبر (تعبیر دینے والا) اگر صحیح ہے تو وہ قواعد کی رو سے تعبیر دے گا۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر ایک سے خواب مت کہو جو پہلے تعبیر دے دے گا وہی واقعہ ہو جائے گا۔ اسی لئے سمجھدار اور خیر خواہ سے خواب کہتا کہ وہ اچھی تعبیر دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ وہ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ ایک بہت بڑا دنبہ جو گائے کے برابر ہوان کے مدمقابل آیا، تو مولانا نے اس کے سینگ پکڑ لئے اب کبھی وہ ریلتا ہے تو یہ پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی یہ ریلتے ہیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی مقابلہ میں اس نے مولانا کے سینگ مارا تو مولانا کی بائیں ران میں لگا اور ایک قطرہ خون کا نکلا۔ یہ خواب دیکھا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کو خواب کی تعبیریں دیا کرتے تھے، وہ بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ بھائی صاحب! میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول کے مطابق فرمایا۔ ''موت کو دنبے کی شکل (قیامت میں) دی جائے گی موت سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ کبھی تم اسے ہٹا دیتے ہو کبھی وہ تمہیں ہٹا دیتا ہے۔

جو سینگ بائیں ران پر لگا اور قطرہ خون کا نکلا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ عرب کا محاورہ ہے، کہ جدی رشتوں کو بطن سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ بطون کا اور پیٹ کا رشتہ ہے اور بنی اعمام جو چچا تائے کی اولاد ہے ان کو افخاذ سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ران کی اولاد ہے، یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔ فرمایا کہ بائیں ران میں جو سینگ لگا تو ''ران'' سے میں یہ سمجھا کہ بنی اعمام میں کوئی حادثہ پیش آئے گا چوں کہ ایک قطرہ خون کا نکلا تو آپ کی چچا تائے کی اولاد میں چھوٹی عمر کا بچہ گزر جائے گا اور چونکہ عورت بائیں پسلی کی پیدائش ہے اور بائیں جانب خون لگا تو وہ لڑکی ہوگی اور چوں کہ ایک قطرہ خون ہے تو لڑکی چھوٹی عمر کی ہوگی''۔ جب وہ تعبیر دی تو تھوڑی دیر میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں جو آپ کے چچازاد بھائیوں میں بچی پیدا ہوئی تھی وہ گزر گئی۔ فرمایا تعبیر آ گئی۔

تو تعبیر میں گویا احادیث کا بھی دخل ہوا۔ جیسا کہ حدیث شریف سے انہوں نے استنباط کیا۔ اس لئے تعبیر دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ اسی طرح تعبیر خواب میں اختلاف موسم کو بھی دخل ہے تو معبر پہچانے گا اور موسم کے لحاظ سے تعبیر دے گا۔

تعبیر خواب میں اعداد وشمار کا دخل...... اسی طرح اعداد وشمار کا بھی دخل ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب مرض وفات میں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام علماء کا حلقہ بہت پریشان تھے، مگر مولانا نے اطمینان دلایا کہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوگا، اب مطمئن تو ہو گئے مگر انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ علیہ۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انتقال نہیں ہوگا اور انتقال ہو گیا۔ فرمایا:

''میاں! کشف تو صحیح تھا۔ تعبیر میں غلطی ہوئی۔ فرمایا جب میں نے مراقبہ کیا تو لفظ ''مہدی'' میرے سامنے نمایاں ہوا اور مہدی کے جو اعداد وشمار ہیں وہ ساٹھ سے بھی اوپر پہنچتے ہیں اور مولانا کو جو مرض لاحق ہوا تو عمر انچاس سال کی تھی۔ تو میں نے کہا۔ ابھی عمر کافی باقی ہے۔ لیکن اس سے مراد لفظ مہدی نہیں تھا بلکہ مہدی کی ذات مراد تھی چناں چہ حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ کی عمر ۴۹ سال کی ہوگی۔ غرض ذات مراد تھی، نام مراد نہیں تھا۔ اس لئے تعبیر میں غلطی ہوئی ہے۔ کشف میں غلطی نہیں تھی''۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کشف میں اعداد وشمار کو بھی دخل ہے۔ اس لئے معبر کو بہت سی چیزیں دیکھنی ہوتی ہیں، آیات واحادیث سے استدلال، موسمی اختلاف کو سامنے رکھنا، اعداد وشمار کا خیال رکھنا۔ بہرحال یہ ایک مستقل فن ہے جو معبر ہی جانتا ہے۔ اس لئے خواب ہمیشہ کسی ایسے آدمی سے ذکر کرنا چاہئے جس کو اس عالم شہادت سے بھی مناسبت ہو اور عالم مثال سے بھی ہو، تو وہ مطابقت اور تطبیق دے کر صحیح تعبیر دے سکتا ہے۔

روحانی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... حضور سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت عامہ ہونے کی بڑی دلیل تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ. (۱) ''اللہ نے سب سے پہلے میری حقیقت پیدا فرمائی''۔

(۱) حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ ''نور'' سے مراد حسی نور تو نہیں ہوسکتا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے جیسے چاند اور سورج کا نور، اس حسی نور کی نورِ معنوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اپنے نور اور روشنی سے صورتیں اور شکلیں دکھاتا ہے اور نورِ علم سے اشیاء کی حقیقتیں اور ماہیتیں کھلتی ہیں، اس لئے علم کا نور آفتاب و ماہتاب کے نور سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اول میرے نور کو پیدا کیا۔ کہ وہ ''نور علمی'' ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوندیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''مجسم علم'' بنایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی شریعت کے ہر ہر حکم کے نیچے حکمت ہے۔ ہر حکمت کے نیچے حقیقت ہے ہر حقیقت کے نیچے علت ہے جس پر حکم کا مدار ہے۔ اس طرح پوری شریعت علم سے لبریز ہے۔ حتی کہ معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا۔ جہاں ہزاروں معجزات دیئے گئے جن کا اثر آسمانوں میں بھی ظاہر ہوا۔ زمین میں بھی ظاہر ہوا۔ حجر و شجر اور حیوانات میں بھی ظاہر ہوا۔ اسی لئے حیوانات نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دی۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزات کا اثر آسمانوں تک پہنچا، غرض یہ معجزات تو ایک طرف ہیں۔ لیکن سب سے بڑا معجزہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء کیا گیا یہ علمی اور کلامی معجزہ ہے جو قرآنِ کریم ہے، جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی جامعیت احکام کے لحاظ سے غرض ہر اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے۔ تو حقیقت میں علم گوندیا گیا اور معجزہ علمی دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا علم ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ علم ہی سے دنیا چل رہی ہے۔ حق تعالیٰ کے علم و حکمت اور مشیت ہی پر یہ سارے کاروبار اور کارخانے چل رہے ہیں۔ اس لئے علم اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔ ویسے تو ساری صفات ان کی بلند ہیں مگر علم سب سے اونچی صفت ہے۔ اس واسطے کہ ہر صفت اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہے۔ مثلاً ارادہ ہے تو اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک مراد معلوم نہ ہو۔ قدرت ہے جب تک مقدور معلوم نہ ہو اس پر قدرت کیسے حاصل ہوگی؟ تو ارادہ و قدرت علم کا محتاج ہوا۔ فعل ہے جب تک علم نہ ہو وہ سرزد نہیں ہوسکتا۔ لیکن علم اپنا کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔ نہ ارادے کا نہ قدرت کا۔ مثلاً آپ ریل میں جا رہے ہیں اور ایک بڑا دریا نظر پڑے۔ تو ارادہ کریں تب معلوم ہو کہ یہ دریا ہے۔ ارادہ نہ کریں تب معلوم نہ ہو یہ دریا ہے۔ وہ تو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے علم اپنا کام کرنے میں ارادے کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے قدرت کا محتاج نہیں کہ اس تالاب پر آپ کو قدرت ہو جائے۔ تو معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے۔ ورنہ معلوم نہ ہو۔ قدرت ہو نہ ہو جب سامنے آئے گا تو علم ہو جائے گا۔

غرض ہر صفت علم کی محتاج ہے کہ وہ علم کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ علم کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ اس لئے ساری صفات اور سارے کمالات علم ہی کے تابع ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوندیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبوت اور ولایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ نے علمی اور عملی کمالات دیئے ہیں۔ اگر ایک بھی ولی دنیا میں نہ ہو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور ہیں۔ اگر ایک بھی صحابی رضی اللہ عنہ نہ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور تھے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی کمالات کسی چیز کے محتاج نہیں۔ آپ کے اندر غناء ہے جبکہ ہر چیز علم کی محتاج ہے۔ جب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بتلانے سے پتہ چلے گا۔ غرض ساری دنیا محتاج ہوئی، حتیٰ کہ نبوتیں بھی محتاج ہوئیں۔

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جو ہے وہ ذاتی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے تابع ہیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان ہے، تو آپ کے فیضان سے پچھلوں میں تو نبوتیں پیدا ہوئیں اور اگلوں میں ولائتیں پیدا ہوئیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی محتاج اور اولیاء بھی محتاج۔

یہی وجہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا۔ اور اس میں انبیاء علیہم السلام نے تقریریں کیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اللہ نے ''صفی اللہ'' بنایا اور مجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ مجھے اولاد دی تو دنیا اولاد سے بھر دی۔ یہ میرے فضائل ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے اللہ نے کلام کیا۔ مجھے مکلم (بات کرنے والا) بنایا، کلام کی توفیق دی اور طور پر مجھ سے بات چیت ہوئی، مجھے اور میرے ماننے والوں کو بحر قلزم میں نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ غرض انہوں نے یہ اپنے فضائل بیان کئے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ملک دیا کہ کسی کو ویسا ملک نہیں ملا۔ ہواؤں پر مجھے قدرت دی جانوروں پر مجھے قدرت دی، سب میری رعایا میں داخل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ مجھے اللہ نے ''روح اللہ'' بنایا مجھے بلا باپ کے قدرت سے پیدا فرمایا۔ جب یہ سب بیان کر چکے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل بیان فرمائے کہ مجھے ''رحمۃ للعالمین'' بنایا، مجھے ''شفیع المذنبین'' بنایا۔ مجھے ''خاتم النبیین'' بنایا۔ میری نبوت کو اصلی بنایا اور نبوتیں تابع کیں، تو سب نے کہا کہ یہی وجہ ہے اور بنیاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء علیہم السلام پر افضل ہیں۔

غرض پہلی رحمت تو یہی ہے کہ دنیا میں ہر کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی وساطت سے پیدا کیا گیا، دنیا میں جو کچھ ہے وہ کمال ہی سے چل رہا ہے، نقصان اور عیب سے دنیا نہیں چل رہی اور کمالات سارے علم کے تابع ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے ازل سے لے کر ابد تک روشنی پھیلی۔ تو پہلی رحمت تو یہی ہوئی۔

مادی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... دوسرے یہ کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث نے روایت نقل کی ہے کہ: ﴿لَوْلَاکَ یَا مُحَمَّدُ لَمَا خَلَقْتُ اٰدَمَ﴾ ① اے محمد! (صلی اللہ علیہ

① علامہ عجلونی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال الصغانی موضوع، واقول لکن معناہ صحیح وان لم یکن حدیثاً، دیکھئے: کشف الخفاء ج:۲ ص:۱۶۴۔

وسلم) اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گویا پیدائش اور وجود درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوا۔ تو وجود اور زندگی کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تو جب وجود سب سے بڑی نعمت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ غرض مادی اعتبار سے دیکھا جائے تو وجود کی دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں بٹی۔ روحانی نعمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کمالات علمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں پیدا ہوئے۔ تو مادی لحاظ سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ روحانی طور پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔

عالم آخرت میں رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... پھر یہ کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیا جائے گا۔ تمام امتوں کے صلحاء کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے۔ میدان محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے اور زمین پر ساری مخلوق اس طرح سے ہوگی کہ نہ جھک سکتے ہیں، نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں۔ اور آفتاب کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ لوگ پسینے میں غرق ہوں گے۔ اور اس طرح چالیس برس کا عرصہ گزر جائے گا۔ اس وقت لوگوں کے دلوں میں آئے گا کہ کسی سے شفاعت کراؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ:

''اللہ نے آپ کو ہم سب کے لئے باپ بنایا۔ باپ کی شفقت والفت معلوم ومتعین ہے۔ آپ علیہ السلام ہماری سفارش کریں کہ اس مصیبت سے نجات ملے''۔

وہ فرمائیں گے: ''لَسْتُ لَهَا.'' ''میں اس کا اہل نہیں ہوں'' میں نے ایک غلطی کی تھی۔ گو وہ معصیت تو نہیں کی تھی مگر ایک لغزش تھی، جس درخت کی ممانعت کی گئی تھی وہ کھالیا تھا۔ اور معصیت نہیں تھی کہ معصیت حکم کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ شیطان نے اس میں تاویل سکھائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کو دوامی زندگی ملتی ہے۔ تو یہ ممانعت جو تھی وقتی تھی۔ آپ میں اس وقت تک اتنی استعداد نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے استعداد پیدا ہوگئی، اب کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔

تو تاویل کے راستے سے کھایا اور تاویل کے راستے سے کوئی کام کرنا معصیت نہیں ہوتا، خطاء فکری اور خطاء اجتہادی ہوتی ہے اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ مجتہد اگر صواب کرے تو دوہرا اجر ملتا ہے، خطا پر ایک اجر ملتا ہے۔ تو معصیت پر اجر تھوڑا ہی مل سکتا ہے؟ اس لئے معصیت تو نہیں تھی۔ خطاء فکری واجتہادی تھی۔ وہ مجھ سے سرزد ہوگئی۔ تو اسے پیش کریں گے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے، کہ میں اللہ سے جا کر تمہاری سفارش کروں۔ میں اس کا اہل نہیں، تم حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ پھر لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے وہ بھی عذر کر دیں گے کہ:

"لَسْتُ لَهَا:" "میں اس کا اہل نہیں"۔ میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کو بلایا لیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ.﴾ ① "جب یہ کفر میں مبتلا ہے تو تمہاری اولاد نہیں رہا"۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ جاہلوں کی سی باتیں مت کرو، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسی وقت استغفار کیا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ مجھ سے یہ خطاء سرزد ہوئی تھی۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں سفارشی بن کر جاؤں اگر مجھے کہا تم نے تو غلطی کی تھی تمہاری شفاعت کا کیا منہ ہے، تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

وہ بھی عذر کر دیں گے کہ "لَسْتُ لَهَا" "میرے سے فلاں لغزش ہو گئی تھی"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے میں نے ایک قبطی کو تھپڑ مارا تھا۔ اس کی گردن اڑ گئی حالانکہ وہ خطاء عمداً نہیں کی تھی کہ اسے قتل کیا ہو مگر نبی کا ہاتھ اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑ گئی۔ اس لئے میرا منہ نہیں ہے کہ میں جا کر سفارش کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے قتل کیا تھا۔ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ مگر جب لوگ ان کے پاس آئیں گے تو وہ فرمائیں گے۔ "لَسْتُ لَهَا" "میں اس قابل نہیں ہوں"۔ میری قوم نے مجھے خدا اور اس کا بیٹا کہا۔ اگر یہ فرما دیا گیا کہ اچھا آپ وہی ہیں جنہیں ہماری مسند پر خدا بنا کر بٹھایا گیا تھا؟ کیا وہ آپ ہی ہیں جنہیں خدا کا بیٹا کہا گیا تھا؟ حالانکہ اللہ بیٹے اور باپ سے بری ہے۔

تو میرا منہ اس قابل نہیں کہ میں سامنے ہوں۔ اس لئے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ "اَنَا لَهَا اَنَا لَهَا" "میں اس کا اہل ہوں" میں سفارش کروں گا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام محمود پر فائز کئے جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سات دن رات کی لمبی مدت تک میں سجدے میں پڑا رہوں گا اور اللہ کی وہ حمد وثناء بیان کروں گا کہ عالم میں کسی نے نہیں کی ہوگی اور اب میرے دل میں بھی نہیں ہے۔ اسی وقت القاء کی جائے گی۔

مگر اس قدر رغنا کا دن ہوگا کہ سات دن آپ سجدے میں رہیں گے اور کچھ نہیں کہا جائے گا۔ سات دن کے بعد اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ:

"يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ" ② "سر اٹھاؤ۔ سوال کرو ہم عطا کریں گے۔ شفاعت کرو تو ہم قبول کریں گے"۔ غرض پورے عالم میں صلحاء کے لئے خواہ وہ کسی بھی امت کے ہوں آپ شفاعت فرمائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم اب حساب شروع کرتے ہیں اور جس کا جو ٹھکانہ ہوگا۔ وہ وہاں پہنچ جائے

① پارہ: ۱۲، سورۃ ہود، الآیۃ: ۴۶. ② الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: لما خلقت بیدی، ج: ۲۲، ص: ۴۱۸.

گا۔غرض یہ شفاعت کبریٰ کا مقام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا۔اس دن آخرت میں سب اولین وآخرین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آپ کی سیادت پورے عالم پر ظاہر ہوگی۔اس وقت جو منکر کفار ہوں گے وہ حسرت میں پڑیں گے کہ کیوں نہ ہم ایمان لائے۔تو یہ تیسری ''رحمت عامہ'' ہے جو پورے عالم پر متوجہ ہوگی۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی آثار......اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا میں ہوں گا جو جا کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور کہوں گا کہ دروازہ کھولو۔پھر امتیں داخل ہونا شروع ہوں گی۔گویا جنت میں داخلہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طفیل ہوگا،اسی طرح ابد تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت پہنچی ہوئی ہے۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ازلی آثار......اور ازل سے رحمت یہ ہے کہ جب ''عہد اَلَسْتُ'' کیا گیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ''۔کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ساری مخلوق کو آدم علیہ السلام کی کمر سے نکالا اور جمع کیا اور فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ کیا جواب دیں۔ اس لئے کہ آدم کی کمر سے نکلے ہوئے اس وقت کوئی عقل وشعور نہیں تھا اور صفت ربوبیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو حیرانی پیدا ہوگئی تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جواب دیا کہ۔''بَلٰی''''کیوں نہیں،بیشک آپ ہمارے رب ہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب دیتے ہی تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان پر جاری ہوگیا،''بَلٰی بَلٰی'' بے شک آپ ہی ہمارے رب ہیں۔اس کے بعد ساری مخلوق نے زبان سے کہا ''بَلٰی'' آپ ہی ہمارے رب ہیں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں اور تمہارے باپ کو گواہ کرتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا اس آسمان وزمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا۔اور اس ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے اقرار کیا۔جب تم دنیا میں پہنچو تو اس اقرار کو یاد رکھنا اور میرے رب ہونے کو ماننا اور میری تقدیر پر راضی رہنا۔ غرض اس وقت سب نے بَلٰی کا لفظ اختیار کیا اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اختیار کیا۔

تو رحمۃ للعالمین ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے جواب دینے کے قابل جب ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سکھلایا۔تو حق تعالیٰ نے تو تعلیم کے ذریعے سے ربوبیت کا اقرار کرایا۔اس لئے رحمت عامہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے؟۔غرض ازل میں بھی رحمت،دنیا میں تشریف لائے تب رحمت،برزخ میں پہنچیں گے تب رحمت۔شب معراج میں پہنچے تب رحمت،قیامت کے دن شفاعت کبریٰ ہوگی تب رحمت اور''اَوَّلُ مَنْ يَّدُقُّ بَابَ الْجَنَّةِ''۔① ''کہ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے''۔تب رحمت،غرض اول سے لے کر آخر تک رحمت ہی رحمت ثابت ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم......اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ''

① کنز العمال، ج:۱۱، ص:۴۰۴، رقم:۳۱۸۸۶. (ابن النجار عن انسؓ.)

رحمۃ للعالمین'' ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے لئے بھی رحمت، عالم جنات کے لئے بھی رحمت، عالم حیوانات کے لیے بھی رحمت، عالم بشر کے لیے بھی رحمت، غرض جتنے عالم اللہ نے بنائے ہیں سب کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں۔ جب وجود ہی ہر چیز کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ہوا تو ہر چیز مرہون منت اور مرہون احسان ہے، اس واسطے آپ کی رحمۃ للعالمینی ازل سے چلی اور ابد تک چلتی رہے گی۔ قیامت پر ختم نہیں ہوگی بلکہ جنتوں میں بھی چلے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ۔ ① ''تلاوت کرتا جا اور جنت کے درجات طے کرتا جا''۔ ظاہر بات ہے کہ قرآنِ کریم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی لے کر تشریف لائے۔ تو مدارج کی ترقی قرآنِ کریم کے ذریعے ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے دنیا کو پہنچا۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ قرآنِ کریم کی جتنی آیات ہیں، جنت کے اتنے ہی درجات ہیں۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جو آیتیں ہیں یہی بعینہ جنت میں درجات کی صورت میں منکشف ہو جائیں گی۔ یہاں یہ آیتیں علمی شکل میں ہیں، وہاں جا کر باغ و بہار کی شکل اختیار کریں گی۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ اور قومیں تو جنت میں داخل کی جائیں گی اور مسلم حفاظ کے سینوں میں خود جنت آئی ہوئی ہے۔ جو یہ قرآنِ کریم ہے۔ اس کی آیات ہی جنت بنیں گی۔

تو یہ سب رحمۃ للعالمین ہی کی شان کا ظہور ہے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت قلوب سے لے کر قوالب تک (ڈھانچہ) ازل سے لے کر ابد تک، دنیا سے لے کر برزخ تک پھیلی ہوئی ہے، اسی لئے رحمۃ للعالمین کہا گیا، رحمۃ للعالم نہیں کہا گیا۔ اس میں تمام عالم داخل ہیں۔

اللہ نے سب سے بڑا ابد یہ جو مخلوق کو دیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مسعود ہے جو عطا کیا گیا۔ اور اسی لئے فرمایا کہ جب کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئے یا کوئی غم طاری ہو تو وہ میری وفات کو یاد کرے، کہ اس سے بڑا صدمہ عالم کے لئے نہیں ہے۔

حقیقت توسل...... توسل کا ایک تو مطلب یہ ہے جو دنیا میں ہوتا ہے کہ جو شفاعت کے طور پر کسی کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ حاکم پر اس کا اثر ہے۔ حاکم اس کی بات کو مان لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔ یہ شرک میں بھی داخل ہے۔ حق تعالیٰ پر کس کا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ خود موثر بالذات ہیں ان پر کون موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وسیلہ کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا۔ یہاں تو توسل کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رحمت سے آپ نے ان لوگوں کو نوازا ہے، اس میں مجھے بھی حصہ عطاء فرما دیجئے کہ میں بھی اس رحمت سے نوازا جاؤں۔ وسیلے کے یہاں یہ معنی ہیں تو یہ معنی کہ وہ وسیلے والا حق تعالیٰ پر اثر رکھتا ہے، اس کے دربار میں تو سب بندے ہیں اور سب محتاج ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جو سب سے زیادہ مقدس طبقہ اور حق تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں۔

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن، ج: ۱۰، ص: ۱۵۶۔

لیکن قیامت کے دن صورت یہ ہوگی کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس طرح تھرتھرائے ہوئے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہو پتہ۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ تورات کہاں ہے؟ وہ عرض کریں گے میں نے تو موسیٰ علیہ السلام کو پہنچادی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جائے گا کہ آپ کو تورات پہنچی؟ وہ عرض کریں گے، جی ہاں پہنچی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے۔ میں نے امت کو پہنچادی۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب طلب کیا جائے گا تو کیفیت یہ ہوگی کہ اس طرح تھراتھرائے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ تھرتھر کانپتا ہے۔ یہی صورتحال اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوگی۔

اسی طرح سے قرآن کریم کے بارے میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ قرآن کریم کہاں ہے؟ عرض کریں گے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پہنچادیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلب کئے جائیں گے اور پوچھا جائے گا آپ تک قرآن کریم پہنچا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرض کریں گے، جی ہاں پہنچا۔ فرمایا جائے گا، آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے، میں نے امت کو پہنچادیا۔ فرمایا جائے گا کہ اب بیٹھ کر سناؤ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرش کے نیچے منبر بچھایا جائے گا۔ سارے اولین وآخرین کے مجمع میں، آپ پورا قرآن کریم تلاوت فرمائیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ قران کریم کے اندر ایک تو لفظ ہیں، لفظوں کے نیچے ان کے معانی ہیں۔ معانی کے نیچے ان کے حقائق ہیں۔ حقائق کے نیچے اسرار ومصالح اور حکمتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں مجسم کر کے نمایاں کی جائیں گی اور قرآن کریم ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک باغ وبہار کھڑا ہوا ہے۔ ہزاروں رنگ کے پھول اس میں کھلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں خوشبوؤں سے معطر ہے۔ تو لوگ کہیں گے یہ قرآن تو آج تک ہم نے سنا ہی نہیں، یہ تو عجیب وغریب قرآن ہے۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ شانہ، موجود حضرات انبیاء علیہم السلام موجود، اور ملائکہ علیہم السلام موجود تو روحانیت کی کیا انتہا ہوگی؟ پڑھنے والے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو روحانیت کا کیا مقام ہوگا؟ غرض جو ساری چیزیں علمی طور پر قلوب میں تھیں مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ تو ایک عظیم باغ وبہار کی صورت میں قرآن نمایاں ہوگا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہ بھی کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے آج تک سنا ہی نہیں تھا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت انبیاء علیہم السلام کی شان بھی یہ ہوگی کہ وہ مصیبت کی وجہ سے تھرتھرائے ہوئے ہونگے تو پھر میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ اس واسطے توسل کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ صاحب وسیلہ کا اثر اللہ تعالیٰ پر پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی حکومتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تو صرف، توسل کے یہ معنی ہونگے کہ جس رحمت وبرکت سے آپ نے ان بزرگوں کو نوازا ہے، اس میں ہم غریبوں کو بھی شامل فرمالیجئے، کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے نہ یہ معنی کہ ہم اثر ڈالتے ہیں اور حق تعالیٰ ہماری سفارش سے مجبور ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ

جابر ہیں مجبور نہیں ہیں۔ قاہر ہیں مقہور نہیں ہیں۔

مقہور و مجبور تو بندے ہیں۔ اس لئے توسل کے یہ معنی کہ اللہ پر اثر ہو یہ تو شرک ہے اور ایک یہ کہ اس توسل کی نعمت میں ہمیں داخل فرما لیجئے، یہ دعا اور استدعاء ہے یہ عبدیت اور بندگی میں داخل ہے۔ اس توسل میں کوئی حرج نہیں ہے اس کی شریعت نے اجازت دی ہے توسل کے اس معنی کے لحاظ سے آپ یہاں بیٹھ کر دعا مانگیں، خواہ کسی قبر پر جا کر مانگیں وہ جائز ہے یہاں بھی جائز ہے، قبر پر بھی جائز ہے۔ قبر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ حق تعالیٰ سے مانگے کہ جس نعمت سے آپ نے انہیں نوازا ہے اس نعمت سے مجھے بھی نواز دیجئے۔ اس توسل کی اجازت دی گئی ہے۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟...... عید میلاد النبی پر جلوس اور مجلس وغیرہ یہ سارے مظاہرات ہیں جیسے دنیا میں نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی مزاج کے مطابق ہوتیں، تو سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کرتے، تابعین رحمہم اللہ کرتے، آئمہ مجتہدین کرتے۔

لیکن کسی سے منقول نہیں بلکہ چند صدیوں کے بعد یہ مظاہرے شروع ہوئے۔ ان مظاہروں میں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ بھائی! کر لیا۔ لیکن یہ جو نمائشی صورتیں ہیں اور غلو ہے یہ اسلامی مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسری اقوام سے لیا گیا ہے جیسے ہندوؤں میں جلوس نکلتے ہیں۔ ان کے جو مقتدیٰ ہیں ان کی صورتیں بنا بنا کر اونٹوں پر اور ہاتھیوں پر رکھتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔ اسلام تو حقائق لے کر آیا ہے، صورتوں اور شکلوں کی نمائش لے کر نہیں آیا۔ اپنے اندر حقیقت پیدا کرو۔ نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام کا موضوع تو یہ ہے کہ جو خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں ان میں بھی زیادہ مت الجھو۔ اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں اگر صورتوں کے عشق ومحبت مبتلا ہوا تو حسن خاتمہ کے اندر فرق پڑ جائے گا۔ اس لئے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کا وقت ہے اور آپ صورتوں میں الجھے ہوئے ہیں تو صورتیں حقیقت سے روکیں گی۔ اس واسطے اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو۔ حقائق کا طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔

اکمال دین کا طریق...... سوال اوّل...... ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾۔ (1) یہ آیت قرآن میں اپنی جگہ سب سے آخر میں چاہتی ہے، ورنہ اس کی موجودہ جگہ قرآن کے غیر مرتب ہونے پر دال ہو گی؟

جواب اَلْيَوْمَ سے خاص یوم نزول آیت مراد نہیں، بلکہ مطلقاً دور حاضر مراد ہے اور وہ عام ہے، وقت نزول کو بھی اور نزول آیت کے ماقبل و مابعد کے زمانے کو بھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ ''آج بڑا نازک زمانہ ہے'' یا ''آج لوگوں کو بھلا کام کرنا دشوار ہو گیا ہے''۔ ''یا آج کا دن تو وہ ہے کہ بھیڑیوں نے بھی انسانوں سے پناہ مانگی ہے''۔ ظاہر ہے کہ اس سے یوم تکلم کی تاریخ مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ دور مراد ہوتا ہے جس سے متکلم اور

(1) پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۳۔

مخاطب گزر رہے ہوتے ہیں۔ پس یہاں بھی ''الیوم'' سے مراد وہ دور حاضر ہے جس سے مخاطبین قرآن گزر رہے تھے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری حصہ نہ کہ خاص یوم نزول آیت۔ چناں چہ اس آیت کے نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اس صورت میں اگر اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی کچھ آیتیں اتریں تو وہ اکمال دین کے منافی ثابت نہیں ہوسکتیں اور نہ ہی دائرہ اکمال سے خارج ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یوم نزول آیت سے پہلا اور پچھلا سارا دین ''اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' میں داخل رہے گا۔ گویہ آیت درمیان میں آجائے اور سب سے اخیر میں نہ رہے۔

تشہیر اکمال دین...... رہا یہ کہ اس آیت کے نزول کا وقت کلیۃً آخر میں، بلکہ یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیوں نہ رکھا گیا کہ ظاہر طور پر بھی اس آیت سے پورے دین کی تکمیل کا اعلان ہو جاتا اور ''الیوم'' کے معنی مطلقاً دور حاضر کے نہ لینے پڑتے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے فقط اکمال دین کی کوئی علمی یا اعتقادی خبر ہی دینی مقصود نہ تھی۔ بلکہ اکمال دین کا پورا پورا اشتہار بھی مقصود تھا اور اس کے لئے یوم نزول سے بڑھ کر دوسرا کوئی وقت موزوں نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ یہ یوم عرفہ تھا جس میں حج کے لئے اطراف سے لوگ جمع ہوئے تھے، پھر اوپر سے یوم جمعہ بھی تھا۔ جو خود یوم جامع ہے اور اس پر مزید یہ کہ حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن تھا جس میں ایک لاکھ سے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم کے عدد کی اکثریت حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے شریک حج ہوئی۔

پس اس یوم جامع میں تمام جمع شدہ مسلمانوں کے روبرو ہیئت اجتماعی کے ساتھ عین وقت اجتماع میں ذات جامع پر یہ آیت اتار دی گئی، تاکہ بیک دم تمام مسلمین اولین اکمال دین کی اطلاع بھی پالیں اور اس کے نزول کا مشاہدہ کرکے ان کے دلوں میں یہ چیز اتر جائے کہ اب جبکہ یہ دین کامل ہو چکا ہے، تو اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی نیا نبی و دین آنے والا ہے اور نہ آئے ہوئے دین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ ہونے والی ہے۔ پس یہ اکمال دین کی اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ اس کی تشہیر و دعایت اور نزول آیت کا مشاہدہ کرا کر اور ''عَلٰی رُءُوْسِ الْاَشْهَادِ'' مراد (واضح ثبوت) اسے نازل فرما کر یہ خبر شائع بھی کرنی تھی کہ اب نجات کا انحصار اسی دین میں ہے اور بس۔ ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ.﴾ ①

اکمال دین کے بارے میں ازالہ تشکیک...... اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی دعویٰ (اکمال دین) عین یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے آخر میں نازل کیا جاتا، تو قطع نظر اس کے بروقت اعلان عام نہ ہوسکنے کا ایک مفسدہ یہ بھی محتمل تھا کہ اگر اس دعویٰ کے اعلان میں کسی کو شبہ پیش آتا اور اس کی وہ شرح سامنے نہ آتی جو نزول آیت کے ۹۰ دن بعد تک ہوتی رہی، تو اس شبہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی اور ہوسکتا تھا کہ خود غرض تکمیل دین کے بارے میں شبہات ڈال کر دین کے اتمام و کمال کو مشتبہ بنا

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۵.

دیتے اور بعد میں آنے والے تیس دجال جو بہ نص حدیث ادعاء نبوت کے ساتھ آنے والے تھے اپنا مطلب یہ کہہ کر نکال لیتے کہ دین کے آخری اور کامل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں کوئی نبی نہ آسکے یا اس دین کے بارے میں کوئی بیان اور شرح بھی نازل نہ ہو سکے۔ لیکن جب کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹۰ دن اس دنیا میں قیام فرمایا اور اکمال دین کی حقیقت بعد کے کلمات سے اور زیادہ واضح فرما دی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کا آخری اور مکمل ہونا شرح صدر کے ساتھ سمجھ گئے اور گویا اس کی گنجائش دے دی گئی کہ اگر کسی کو اس اکمال میں شبہ یا شک ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابھی دنیا میں موجود ہیں اور ان پر وحی بھی آ رہی ہے۔ وہ اس شبہ کو رفع کر سکتا ہے۔ اس چیز نے دعوئے اکمال کو ہر قسم کے احتمالی شک وشبہ سے بھی پاک کر دیا۔ ورنہ جیسے حدیث قرطاس یوم وفات نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، اور اس کے بارہ میں بعد کے بیان سے لوگ تشنہ رہ گئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی ہو گیا جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روافض نے اسے ملعبہ اور ایجاد فتنہ کا حیلہ بنا لیا۔ محض اس لئے کہ قرب وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اس کا کوئی بیان یا کوئی شرح سامنے نہ آسکی جو عوام کی زبان بندی کر سکے۔

ایسے ہی اگر یہ آیت بھی جس میں اسلام کی تکمیل اور مدار نجات ہونے کا بنیادی دعویٰ تھا۔ عین وفات کے دن آخری ساعتوں میں نازل ہوتی اور بعد کی شرح سامنے نہ آتی تو ممکن تھا کہ اکمال دین کے بارہ میں احتمالات اور تشکیک پیدا کر کے عوام کو فتنے میں مبتلا کیا جاتا اور دجالین وقت اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ جبکہ نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد تک حضور کو دنیا میں رکھا گیا۔ وحی اترتی رہی اور اس مقصد کی شرح حد تکمیل کو پہنچتی رہی۔ تو اس قسم کے احتمالات اور شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

بہر حال آیت کا نزول تو حجت الوداع کے موقع پر رکھا گیا تا کہ ایک وقت میں ''ایک مکان میں مسلمانوں کے تمام خواص وعوام کے جمع شدہ مجمع میں اکمال دین کا اعلان ہو جائے کہ اس اجتماع کے بعد حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر ایسا اجتماع ہونے والا نہ تھا۔ پھر بعد نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ عرصہ دنیا میں قائم رکھ کر متعلقہ شکوک وشبہات کے تمام احتمالات کو قطع کرنا منظور تھا، کہ عین یوم وفات میں نزول ہونے سے ایسے محتمل شبہات قطع نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر ''الیـــوم'' سے یوم خاص نہیں بلکہ دور حاضر مراد لیا گیا تا کہ بعد کی اترنے والی بھی ساری آیتیں اس دائرہ اکمال میں داخل رہیں اور دین پورے کا پورا اپنے اجزاء سمیت کامل پکارا جائے، اندریں صورت قرآن کی ترتیب میں خواہ وہ نزول کی ترتیب ہو یا تدوین کی ترتیب ہو، کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

خلق وکسب...... سوال دوم...... ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ ① آیت سے بندہ کے جبر اور اس کے مجرم نہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کفر خدا کی طرف سے ہے۔ جواب۔ اس آیت سے بندہ مجبور محض

① پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۷۔

ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ ختم اور مہر زدگی اگر چہ خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق وایجاد سے عمل میں آئی ہے۔ مگر اس کا یہ خلق مرتب ہوا ہے بندہ کے کسب پر یعنی بندہ نے کفریہ حرکات کرتے کرتے اپنی استعداد قبول حق فنا کرلی، تو خدا کا آخری فعل اس پر بصورت ختم مرتب ہوا۔ پس بندہ اس فناءِ استعداد کا سبب ہے اور خدا خالق ہے، پھر نہ صرف اس آخری فعل پر بلکہ ابتداء سے لے کر انتہا تک یہ کسب وخلق جمع چلے آ رہے ہیں۔ جب بھی بندہ کسی ایمانی یا کفری حرکت کا اکتساب کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے فعل کو وجود دے دیتے ہیں یعنی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ارادہ کرتا ہے تو اسکے ارادے کو وجود دیدیتے ہیں، ارادے کے بعد وہ فعل کرتا ہے تو اس کے فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا بندہ جیسے اپنے افعال میں آزاد ہے، ایسے ہی اس کے افعال قلب وقالب کے ظہور اور وجود پر بھی حق تعالیٰ نے کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ ورنہ اگر بندہ کے کسب پر اللہ کا خلق وایجاد اور وجود بخشی مرتب نہ ہو تو بندہ مجبورِ محض ٹھہر جائے اور وہ کچھ کر ہی نہ سکے۔

اور اسی طرح اس کے اندر جو خلقی جوہر اور مادے رکھے گئے تھے وہ نمایاں نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ بخل بھی ہے اور خلافِ عدل ایک ظلم بھی ہے کہ ایک شئے میں خدا تعالیٰ اچھے برے مادے تو رکھ دے مگر انہیں نمایاں ہونے کا موقع نہ دے۔ حالاں کہ اس کی بارگاہ بخل اور ظلم سے پاک اور بری ہے۔ پس بندہ کی مجبوری اس میں تو نکل سکتی ہے کہ وہ کسی فعل کا قصد کرے اور وہ فعل نمایاں نہ ہو، نہ اس میں کہ وہ جب بھی کوئی فعل کرنا چاہے تو اس کے ظاہری وباطنی قوی پر کوئی پابندی عائد نہ ہو، بلکہ قدرت ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار ہے کہ ادھر اس نے عزمِ فعل کیا اور ادھر اچانک وہ فعل اس سے نمایاں ہوگیا۔ یعنی بندہ کے کسب اور خدا کے خلق میں کوئی فاصلہ یا وقفہ درمیان میں حائل نہیں ہوتا، ادھر کسب عبد ہوا ادھر معاً خلق ظاہر ہوگیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے بجلی کی روشنی میں سوئچ اور قمقمہ کی نسبت ہے کہ جیسے ہی سوئچ ہلایا ویسے ہی معاً آن کی آن میں قمقمہ روشن ہوگیا۔

پس حرکت سوئچ کسب عبد کی مثال ہے اور قمقمہ میں روشنی خلق الٰہی کی مثال ہے۔ یعنی جیسے سوئچ ہلانے والے کا روشنی بنانے یا پاور ہاؤس سے اس قمقمہ میں لا کر جلوہ گر کرنے میں کوئی ادنیٰ دخل نہیں۔ ایسے کسب افعال کرنے والے بندے کو ظہورِ افعال اور وجودِ نتائج میں کوئی دخل نہیں۔ اس کا کام صرف کسب ارادہ وفعل یعنی اکتسابی حرکت کرنا ہے، اس ارادے کی تخلیق وایجاد اور اس فعل کو وجود دینا خود بندے کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔

پس ایک بدعمل نے ظالمانہ اور کافرانہ حرکات کا کسب شروع کیا تو خدا نے ان حرکات کو وجود بخشا شروع فرمایا اور جب وہ اکتساب کفر کرتے کرتے اس حد پر آ گیا کہ اس کی قبول حق کی صلاحیت واستعداد ہی فنا ہوگئی۔ تو خدا نے اس فنا اور بطلانِ استعداد کو بھی وجود دے دیا اور پیدا کر دیا۔ بس اسی فناءِ استعداد کے فعل وایجاد کا نام ختم ہے کہ خدا نے اس پر مہر لگا دی کہ اب اس میں ایمان داخل نہ ہوگا۔

پس ایمان کے دروازے بندے نے خود اپنے اوپر اپنے کسب سے بند کئے۔ خدا تو اس کی حرکات کو وجود بخشا

رہا نہ کہ خدا اس پر ایمان کے دروازے بند فرماتا رہا اور ظاہر ہے کہ جرم اور معصیت کسب شرور ہے نہ کہ خلق شرور کیوں کہ خلق کے معنی صرف وجود بخشنے اور عطاء وجود کے ہیں اور عطاء وجود کسی حالت میں بھی جرم یا برا نہیں ہوسکتا، ہاں خود شئے وجود یافتہ کبھی اپنی ذات سے بری ہوگی کبھی اچھی۔ مگر اسے وجود دینا کسی حال میں بھی برا نہ ہوگا کیوں کہ عطاء وجود احسان ہی احسان ہے، کہ وجود جیسی نعمت کسی شئے کو بخشی جائے، اور عدل ہی عدل ہے کہ ہر شئے کو اپنے چھپے ہوئے خلقی جوہر دکھلانے کا موقع دیا گیا ہے اور اس کی خاصیتوں کے ظہور پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پس مجرم اگر ٹھہرتا ہے تو یہ کسب شرور کرنے والا بندہ ٹھہرتا ہے نہ کہ اس کسب کو وجود بخشنے والا خدا۔ حاصل یہ کہ اس بندہ کا کفر بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے مگر تخلیقاً نہ کہ اکتساباً اور مجرم کاسِب ہوتا ہے نہ کہ خالق اور معطی وجود۔

قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ...... سوال سوم...... قرآن مجید حمد اور تسمیہ (بسم اللہ) سے شروع کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کلام باری نہیں لوگ اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں مگر چوں کہ اس تاویل کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس وجہ سے مخالف اس کو تسلیم نہیں کرسکتا اور نہ دل کو طمانینت حاصل ہوتی ہے۔

جواب...... تقریر اعتراض کو واضح نہیں کیا گیا کہ اس کے مطابق جواب دیا جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معترض خود بھی اپنے اعتراض کو سمجھتے ہوئے نہیں ہیں۔ بظاہر تقریر شبہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بھلا کوئی خود ہی اپنے کلام کو اپنے نام سے شروع کیا کرتا ہے یا اپنے نام سے خود ہی برکت حاصل کیا کرتا ہے یا مدد چاہا کرتا ہے؟ یعنی یہ اندازہ کلام عرف عام کے خلاف ہے۔

اول تو شبہ یوں بے اصل ہے کہ عرف ہر جگہ کا ہر قوم کا الگ ہوتا ہے، اگر ایک جگہ ایک دستور نہ ہو تو دوسری جگہ ممکن ہے کہ وہ ہو۔ پس ہوسکتا ہے کہ یہ قرآن کا عرف ہو کہ اپنے نام سے کلام کا آغاز کیا جائے۔

پھر یہ کہ شروع میں بسا اوقات متکلم اپنا نام ذکر کرتا ہے تا کہ بعد کے کلام کا تعارف اور نسبت مخاطبوں پر واضح ہوجائے جیسے اکثر خطوط اپنے نام سے شروع کئے جاتے ہیں، تا کہ باوّل وہلہ مخاطب سمجھ لے کہ یہ فلاں کا مضمون ہے۔ اس الجھن میں نہ رہے کہ لکھنے والا یا کہنے والا کون ہے؟

اس لئے آغاز کلام بہ تسمیہ الٰہی اس اصول پر قابل اعتراض نہ ہوا۔ مزید غور کیا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی عظیم یا مہم کام کا کسی بڑے نام یا بڑی نسبت یا بڑی صفت سے شروع کرنا عقلاً مستحسن ہی نہیں، بلکہ مطلوب سمجھا گیا ہے اور ایک فطری امر ہے چناں چہ اس پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ آپ اسے مستحسن اور معقول جانتے ہوں گے کہ بندے اپنے کلام کو خدا کے نام اور خدا کی ثناء وصفت سے شروع کریں جس سے اس امر کا فطری اور معقول ہونا واضح ہے۔

اور ظاہر ہے کہ فطرت اللہ کی ہے جس پر بندوں کو مفطور کیا گیا ہے۔ پس بندوں میں ہر فطرت خود اللہ ہی سے آتی ہے اس لئے اصل میں یہ ڈھنگ کہ آغاز کلام کسی بڑے نام یا بڑی نسبت وصفت سے ہو، اولاً خدا کے کلام کا ہونا چاہئے، بندے تو محض اس کی نقل اتاریں گے کیوں کہ نہ خود اصل ہیں نہ ان کا وجود ہی اصلی ہے۔ نہ ان کی ذات وصفات اور افعال

ہی اصل ہیں۔اصل ہر چیز کی اللہ ہے۔اسی کی ذات وصفات وافعال اصل ہیں۔اس کے سواہر چیز مجازاوراس کاظل محض ہے۔اس لئے آغاز کلام کا یہ ڈھنگ اگر مستحسن ہے اور بلاشبہ ہے تو اولاً یہ ڈھنگ کلام الٰہی ہی میں مستعمل ہونا چاہئے بندوں میں یہ ڈھنگ محض ظلی اور مجازی طور پر خدا سے آئے گا وہ ناقل محض ہوں گے نہ کہ اصل۔

پس ادھر تو یہ اصول معقول کہ کلام کا آغاز کسی بڑے نام یا بڑی صفت وتوصیف سے ہونا چاہئے اور ادھر یہ مسلم کہ نہ خدا سے کوئی بڑا، نہ خدا کے نام سے کسی کا نام بڑا۔نہ اس کے صفات وافعال سے کسی کے افعال وصفات بڑے اور نہ ہی اس کی توصیف وتعریف سے کوئی ثناء وصفت بڑی۔

اس لئے کلام الٰہی میں اس امر مستحسن کے استعمال کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہو سکتی کہ خدا اپنے کلام کو اپنی ہی صفات اور اپنے ہی نام اور اپنی ہی توصیف سے شروع فرمائے، بلکہ اگر آپ غور کریں تو بندے بھی اپنے کلام کو خدا کے نام اور ثناء وصفت سے اسی لئے شروع کرتے ہیں کہ اس کے نام سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اور کلام کا بڑے ہی کے نام سے شروع کیا جانا فطری اور عقلی ہے۔اس صورت میں بندوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے کلام کو بھی اور اپنے کام کو بھی اسی کے نام سے شروع کریں۔چناں چہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ

"كُلُّ اَمْرٍ ذِىْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ اَقْطَعُ." ① ......"جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے"۔

پس بڑے نام سے آغاز کلام عقلی بھی ہوا شرعی بھی ہوا اور عرفی بھی ہوا۔اس لئے آغاز کلام خداوندی بنام خداوندی اسی فطرت کے ماتحت ہے کہ امر مہم کو بڑے نام اور بڑی ثناء سے شروع کیا جانا ہی فطرت ہے اور اس کے نام سے بڑا نہ کسی کا نام ہے اور نہ اس کی شان سے بڑھ کر کسی کی شان ہے۔تو پھر آغاز کلام میں خواہ خود اس کا کلام ہو یا اس کے بندوں کا ہو اس کے نام کے سوا اور کس کا نام لیا جائے؟

فرق اتنا ہو گا کہ بندے اپنے کلام میں خدا کا نام لے کر برکت حاصل کریں گے اور خدا اپنے کلام میں اپنا نام لے کر برکت ظاہر فرمائے گا۔وہاں حصول برکت کا سوال یوں نہیں، کہ وہ خود سرچشمہ خیر وبرکت ہے اور یہاں اظہار برکت کا یوں سوال نہیں کہ بندے اپنی ذات میں کوئی خیر وبرکت نہیں رکھتے جسے ظاہر کریں۔اس لئے ہم بسم اللہ کہیں گے تو مقصد برکت ومدد کا حاصل کرنا ہو گا اور خدا بسم اللہ فرمائے گا تو مقصد برکت ومدد کا اظہار اور پھیلانا ہو گا۔اس لئے تو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو محض تعلیم پر محمول نہیں کرتے، بلکہ عملاً اس فطرت پر محمول کرتے ہیں کہ آغاز کلام کسی پر عظمت نام یا لفظ سے کیا جانا ہی عقل سلیم اور طبع مستقیم کی خواہش ہے اور یہی عین فطرت ہے۔

﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ ②

① تخریج گذر چکی ہے۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۳۰.

چونکہ سوال میں اعتراض کی کوئی تقریر اور بنا ظاہر نہیں کی گئی اس لئے یہ اجمالی تحقیق عرض کر دی گئی، اعتراض کا کوئی موجہ پہلو سامنے آتا تو اس پر کچھ اور عرض کیا جاتا۔

سوال چہارم...... ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى.﴾ ① خدا کی مکانیت اور اس کے احتیاج الی المکان کو بتاتا ہے اور یہ جسم وحدوث کا خاصہ ہے، لوگ اس کو تشابہات میں سے کہتے ہیں۔ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ مُرَادِهٖ.﴾

عقیدت مند دل تو اس کو مان لے گا مگر عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ متکلم ہی اس کے مطلب کو جانتا ہے کہ ایسی صورت میں تخاطب ہی اس کا بے کار ہوگا اور ترجمہ بھی اس کا صاف ہے، یہ ضروری مسائل ہیں جن کے حل وانشراح کی جناب کو تکلیف دیتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

تعیینِ مراد میں احوال متکلم کا دخل...... جواب: ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اس کی حیثیت عرفی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ پس کلام کا مقصد سمجھنے کے لئے محض متکلم کے الفاظ ہی سامنے نہیں رکھے جاتے، بلکہ اس کے احوال واوصاف اور شُؤُوْن کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، فرعون نے بھی اَنَا الرَّبُّ کہا اور منصور رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اَنَا الْحَقُّ کہا۔ دعوئ دونوں کا ایک ہے۔

لیکن ایک کو اس دعوی کے سبب آپ ملعون قرار دیتے ہیں اور ایک کو اس دعوی کی بناء پر مقبول بتاتے ہیں۔ یہ فرق دعوی وکلام کے فرق سے نہیں جب کہ وہ دونوں کا ایک ہے بلکہ احوال کے فرق سے ہے۔ فرعون کے مجموعی احوال کفر وجحود اور اللہ ورسول علیہ السلام (موسٰی) کی تکذیب وتردید کے ہیں۔ اس لئے اس کا اَنَا الرَّبُّ کہنا بمقابلہ خدا اپنا استقلال وجود ثابت کرنا ہے یعنی خدا کا کفار (انکار) اور اپنا اثبات (ثابت کرنا) ہے، گویا فرعون کے متمردانہ احوال سے تو اس کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں از خود ہوں کسی اور کا محتاج نہیں، میں اپنے اندر بھی خود ہوں اور اپنے سے باہر بھی میں ہی میں ہوں۔ نہ میرے اندر ہی کسی اور کا وجود ہے اور نہ میرے سے باہر ہی ہے اور منصور کے مطیعانہ احوال سے، جن کا حاصل خدا اور رسول کی تصدیق ومحبت ہے، ان کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں فانی محض اور بے ثبات ہوں، باہر تو باہر خود اپنے اندر بھی میرا اپنا کچھ نہیں، وجود ہے تو اس کا ہے اور بقاء ہے تو اس کی ہے۔ گویا میں اندر بھی خود نہیں ہوں وہ ہے۔ تو فرعون کے انا سے اثبات باطل اور نفی حق نکلتی ہے اور منصور کے انا سے اثبات حق اور نفی باطل نکلتی ہے۔ مگر دونوں کے کلاموں کے معنی کا یہ عظیم فرق، الفاظ اور دعوی کے فرق سے نہیں بلکہ صرف احوال کے فرق سے ہے۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کے کلاموں کا مطلب لیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم وکافر کے افعال بالخصوص معاشی افعال یکساں اور بالکل ایک ہوتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، وہ بھی رہن سہن کے وہی سامان فراہم کرتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ مگر ایک کے تمام افعال مقبول اور موجب زیادت اجر اور ایک کے تمام افعال مردود اور موجب زیادت وزر۔ فرق اگر ہے تو صرف احوال کا ہے۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵.

پس کسی کے افعال ہوں یا اقوال ان کا مطلب ان کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی لیا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی، جس کے عام احوال نیکی وتقویٰ کے ہوں، اگر اتفاقاً کوئی غلطی بھی کر گزرے تو اس کی بھی تاویل حسن کرتے ہیں اور ایک بدآدمی جس پر بدی اور فجور کا غلبہ ہوا تفاقاً کوئی نیک حرکت بھی کرے تو اسے بھی خودغرضی اور بدی پر محمول کرتے ہیں۔ بناء ہی نکلتی ہے کہ کسی کے کام اور کلام کا مطلب اس کے احوال وشؤن اور اوصاف کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ از خود ہے یعنی کسی کے بنائے سے وہ نہیں ہوا، بلکہ خود سے ہے، وجود صرف اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس لئے کہیں بھی کوئی ہو، وہ اسی کے دائرہ میں ہوگا۔ باہر نہیں ہوگا اور اس لئے لامحالہ اس کا وجود لامحدود بھی ہوگا۔ اگر محدود ہو، جس کی کوئی حد ہو تو حد سے باہر دوسروں کا وجود ہوگا۔ تو وجود صرف خدا کا نہ رہا اور معطی وجود صرف وہ نہ رہا، دوسرے بھی بن سکیں گے اور اس سے خالقوں کا تعدد نکلے گا۔

اس لئے اگر وجود اصلی صرف اُس کا ہوگا تو اسے لامحدود بھی ماننا پڑے گا اور ہر شئے کو اس کے وجود سے موجود اور اس کے احاطہ وجود میں تسلیم کرنا پڑے گا، پھر اس سے دوسروں کا وجود اس شان سے نہ ہوگا کہ اس کے وجود کے ٹکڑے کرکر کے دوسروں کو بانٹے جائیں۔ ورنہ ٹکڑے ہونے کے بعد اس میں حد بندیاں ہو جائیں گی اور وہ لامحدودیت باقی نہ رہے گی جو اس کی خودی کے لئے لازم تھی۔ بلکہ دوسرے جب اس سے وجود پائیں گے تو بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی سے جہان والے روشنی پاتے ہیں کہ خود سورج کی روشنی کے ٹکڑے نہیں ہوتے اور ہر چیز اس سے روشنی حاصل کرتی ہے، یعنی اس کی روشنی کے صرف پرتوؤں ہی سے منور ہو جاتی ہے۔ خود اس کا نور اسی کی ذات میں قائم رہتا ہے۔

پس خدا از خود ہی ہے کسی کے بنائے نہیں بنا ہے۔ اس کا وجود اصلی ہے، کسی کا بخشا ہوا نہیں ہے اور وجود اصلی جب سب پر محیط ہے تو وہ ہر زمان ومکان میں ہے یعنی لامحدود ہے اس سے موجودات وجود پاتے ہیں۔ تو خود اس کے وجود کے ٹکڑے نہیں ہوتے، جو اس کے جسم اور جسمانیت سے بری ہونے کی علامت ہے۔ کیوں کہ وجود خود لطیف ترین شے ہے، جو خود آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔

پس خدا کا از خود ہونا، محیط الکل ہونا اور جسم نہ ہونا اس کی اصلی شان اور صفت ہے۔ اگر "اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کا کلام سامنے آئے گا تو اسی سابقہ قاعدے سے، اس کلام کا مطلب اس کے الفاظ محض سے نہیں، بلکہ ساری شانوں کو سامنے رکھ کر ہی لیا جائے گا اور شان اس کی یہ ہے کہ نہ وہ محدود ہے نہ جسیم (جسم والا) ہے نہ کسی کے احاطہ میں ہے نہ کسی کی گرفت میں ہے، بلکہ سب اس کے احاطہ میں اور اس کی گرفت میں ہیں۔ تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" ① سے آخر اس کی جسمانیت کیسے ثابت ہو جائے گی اور اس کا حدوث کیسے مفہو[م ہو]ا؟ ہاں! جب ہوگا کہ اس پاک متکلم کے کلام کے صرف یہی الفاظ سامنے رکھ کر اور اس کی ساری ثابت شدہ شا[نوں] [کو نظر انداز کر دیا جائے]

① پارہ: ١٦، سورة طٰهٰ، الآية: ٥.

صفات سے قطع نظر کر کے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کے معنی لئے جاویں۔ لیکن اگر الفاظ کے ساتھ احوال بھی ملائے جاویں جو عرض کردہ قاعدہ کے مطابق ضروری ہیں تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا جسمانیت اور حدوث سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔

عرش رحمت خاصہ کا مظروف ہے...... بلکہ غور کیا جائے، تو عرش سے اگر ثابت ہوتی ہے تو اللہ کی صرف ایک ہی صفت یعنی صفت رحمت کا تعلق خاص ثابت ہوتا ہے نہ کہ ذات کا اور وہ بھی مظروفیت کا کیوں کہ "اَللّٰهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" نہیں فرمایا گیا، بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى جس کا حاصل یہ ہے کہ عرش پر اللہ کی صفت رحمت پھیلی ہوئی ہے اور وہاں اس کی اسی خاص شان کا ظہور اور تجلی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عرش محل تدبیر ہے اور تخت شاہی ہے۔ جس سے سلطنت الٰہی کے کاروبار چلتے ہیں اور جہانوں کی تدبیر کی جاتی ہے۔

پس بتلانا یہ ہے کہ ساری سلطنت رحمانیہ ہے، رحم وکرم اور رافت وترحم پر مبنی ہے۔ غضب پر یا کورے قانونی داؤ پیچ پر مبنی نہیں ہے اور بالفاظ دیگر کائنات کی ہر چیز ہمارے رحم وکرم پر ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے حسی طور پر نمایاں اس طرح فرمایا ہے کہ عرش کو تو ساری کائنات پر محیط بنا دیا، کہ اس سے باہر کوئی جہان میں نہیں اور عرش پر صفت رحمت کو محیط کر دیا، تو گویا رحمت سارے جہانوں پر محیط نکلی۔ جس سے واضح ہو گیا کہ ہماری سلطنت قہر وسیاست پر مبنی نہیں، بلکہ رحمت وکرم پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بندے رات دن اور ہمہ وقت کفر ومعصیت بھی کرتے ہیں مگر رزق اور باران رحمت بند نہیں ہوتا۔ گو کسی خاص وقت جبکہ اقوام کا ظلم وستم انتہاء کو پہنچ جائے، تو بطور تنبیہ سزا بھی دلائی جاتی ہے۔ سو اس کا منشاء بھی رحم وشفقت ہی ہوتا ہے۔

بہرحال کلمہ عرش پر استواء کے معنی جسمانی تمکن کے نہ ہوئے جو شُئُوْنِ اِلٰهِيَهْ کا مقتضیٰ ہے اور وہ استواء معنوی بھی ذات کا نہ ہوا، بلکہ صفت رحمت کا ہوا۔ تو اس سے خدا کی جسمانیت یا محدودیت یا حدوث کا کیا تعلق کہ یہ شبہات آیت پر وارد کئے جائیں۔

کیفیت استواء غیر معلوم ہے...... ہاں! اس شان رحمت کے عرش پر چھائے ہونے کی کیفیت لامعلوم ہے کہ اس کا کیا انداز ہے اور کیا نوعیت ہے اور کیفیت ہی کی لاعلمی کی بناء پر "اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بذلک" کہا جاتا ہے، نہ یہ کہ "اِسْتِوَآءِ عَلَى الْعَرْشِ" کا مفہوم نامعلوم ہے، "اِسْتِوَآءِ عَلَى الْعَرْشِ" صفت رحمت کا ہے اور یہ استواء محیط الکل ہے۔ کیوں کہ جسمانیت میں عرش تمام اجسام پر محیط ہے، تو صفت رحمت محیط الکل ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس انداز سے جیسے ہماری روح ہمارے بدن کو محیط ہوتی ہے اور بدن کا کوئی ایک جز بھی روح کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کیفیت کا پتہ نہیں جس کیفیت سے روح بدن پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے اس ساری کائنات بدن کو گھیر رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم روح کے احاطہ کو نہیں جانتے یا اس کو یقینی نہیں سمجھتے ہیں۔ روح کے تعلق اور احاطہ کو یقینی جان کر اگر لاعلمی ظاہر کرتے تو اس کی کیفیت اور نوعیت

احاطہ سے، نہ کہ اصل تعلق کے علم سے۔

پس ہم یقیناً جانتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ شان رحمت عرش پر اور بواسطہ عرش ساری کائنات اجسام اور ارواح پر محیط ہے۔ مگر ہم اس احاطہ کی کیفیت اور نوعیت کو نہیں جانتے۔ اللہ اعلم کہہ کر بحوالہ خدا کر دیتے ہیں۔

پس جتنا ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے ہم سے اس آیت میں تخاطب کیا گیا ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور جتنا نہیں جانتے اتنا سپرد خدا کر دینے ہی کے مکلف بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم اس نوعیت کی بھی کھود کرید کر کے اصلیت کا سراغ لگائیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پس خدا کی بھی یہ شان رحمت ہے کہ بقدر استطاعت تو ہمیں تکلیف دی اور بغیر استطاعت ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

"فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ"

پس منظر...... جناب محترم ومکرم زید! سلام مسنون، نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ موصولہ ۴ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ باعث شرف ہوا۔ آپ کے سلسلہ تالیفات میں "داستان عمل" اور "اخلاق وآداب" جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافے سے بے حد مسرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کر کے ان پر اضافہ وتشریح کا ایماء فرمایا ہے۔ جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپ کا ہی ایماء کیا کم تھا کہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ تو اسے ضعیف کندھوں پر لادے پھرنے کی ناقابل برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تعمیل کروں۔ پھر بھی جو تاخیر ہوئی وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنو کا سفر پیش آ گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ سر پر آ گیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو علی گڑھ کانپور کا سفر درپیش ہو گیا۔

اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعد عشاء جو کچھ بن پڑا بطور تعمیل ارشاد سطور ذیل قلمبند کیں اور بلا نظر ثانی ہی ارسال ہیں۔ مناسب ہو کہ جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ ان پر ایک اصلاحی نظر فرمائیں۔

یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے ان تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں۔ اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

علم کی غایت عمل ہے۔ اس کا جوہر تقویٰ ہے۔ اس کا زیور ادب ہے شعراء کا ادب لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شستہ کلامی اور بلاغت بیانی کے ہیں۔ حفظ اشعار، حفظ لغات اور حفظ اسماء واصطلاحات اس ادب کو پونجی ہے۔ شاعری یا مرصع نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کی صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعی جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے۔ معنویت یا

واقعیت براہ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگزاری اور خیال آفرینی مطمح نظر ہوتی ہے۔

اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعیت جمع ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لفظی دنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض وغایت اکثر وبیشتر دادخواہی اور زرطلبی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین وآفریں اور مدح سرائیوں پر ممدوحوں کی دادودہش اس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہوسکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ایک پرلے درجے کا بے ادب اور علم سے بے بہرہ حتیٰ کہ فاسق وفاجر بھی اپنی طبعی ذہانت وذکاوت اور موزوں طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہوسکتا ہے۔ اس حال میں کہ اس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہ ہو۔ جہلاءِ عرب بلند پایہ شاعر، پرگو، برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پتلے تھے۔ اس وقت کی دنیا میں ان کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کے لئے عجم (گونگا) کا لقب تجویز کیا تھا۔ مگر بایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی، حتیٰ کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی ان کے زمانے کا نام تک زمانہ جاہلیت ہوا کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔

تا ادب و تقویٰ چہ رسد

اس ادب کے ہزار ہا ادیب امراء وسلاطین کے درباروں میں نظر آتے تھے جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے۔ زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ آج کی دنیا میں جب کہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے، شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے، تو قومی اسٹیجوں اور عوامی نشرگاہوں سے اسی ادب کے باربردار سینکڑوں ادیب، مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیوں کہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں، زیورِ علم کا تو سوال کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فریبی یا اپنی خواہش داد اور مخاطب کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے ﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ.﴾ ① ''وہ تمہیں اپنے مونہوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں''۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب اور اس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے الگ اور دور رکھا اور فرمادیا کہ یہ شاعری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقت الحقائق تک رہنمائی تھی۔ عارف وکامل شعراء جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ، سعدی رحمۃ اللہ علیہ، عطار رحمۃ اللہ علیہ اور سلف وخلف کے دوسرے شعر گو اکابر دلوں میں اگر باعظمت ہیں تو شاعری کی بدولت نہیں، بلکہ معرفت کی بدولت، یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمال باطن کے۔ اس لئے اس قسم کا اکابر سے مذکورہ بالا

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۸.

نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

عوام کا ادب......عوام الناس کے عرف میں ادب کے معنی احترام وتعظیم کے ہیں۔ مگر انہی کے مروجہ اقوال و افعال اور بندھی جڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ ان ہی رسوم تعظیم کے ساتھ جب کوئی ان سے پیش آتا ہے تو وہ اسے باادب اور مہذب کہتے ہیں۔ ورنہ بے ادب اور گستاخ کہہ کر خشمگین (غضب ناک) ہو جاتے ہیں۔

برادریوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا منڈی گود میں ڈال دینا یا اصطلاحی الفاظ میں تعظیمات وتسلیمات اور اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا یا ہاتھ جوڑ کر سروقد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا ان کے یہاں ادب اور ان الفاظ وہیئات کو من وعن ادا کر دینے والا متادب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے کتنے ہی مناقشات اور عصبیاتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو، جو اپنے وقت پر کافی جوش وخروش سے ابھرتے ہوں۔ اور محبت کی بجائے عداوت کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں، جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اسے متادب ہی کہا جائیگا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل دنیا سازی اور ظاہرداری ہے۔ جس کے نیچے حقیقت ومعنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی روح خود غرضی نفس اور رضا جوئی غیر تو نہیں ہوتی، بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھرکم ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

مخاطب کی حقیقی عظمت وتوقیر کا اکثر وبیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اسکی برائیوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس رسمی شائستگی اور ظاہرداری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ.﴾ ① ''یہ لوگ دنیا کی زندگی کی صرف ظاہرداریوں کو جانتے ہیں اور انجام وعاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں،،۔

تلبیس ادب......مدعیان علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں۔ بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین دین ودنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال وہیئات اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے بارے میں انہیں صراحۃً لفظوں میں کوئی حکم مل جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۷.

یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جارہی ہو۔ لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیان علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کیے ہیں۔ مگر اس کی حقیقی کیفیات سے ان کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پرواہ رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہوا وہوس کا غلبہ ہے۔

نیز جذبات نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی ان کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیات جھلکنی ناگزیر ہیں جوان کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں۔ وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ وحسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں جذبات نفس اور جبلی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شعری رسوم کی پابندی ان ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرح محض رسمی اور نمائشی ہو کر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے۔ فرق اتنا ہوگا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ عوام اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابل تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دنیادار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ مدعیان علم بھی بلاخشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے، چناں چہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہل علم قلبی عقیدت وانقیاد جذبہ عشق وگرویدگی اور حقیقی نیازمندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب واحترام اور رسمی آداب وتعظیمات سے گریز نہیں کرتے۔ مگر ان کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر وغرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں۔ جس سے کبھی تو ان کی زبان قال پر فعلی شیخی اور اپنے علم وادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں۔ گویا وہ خدا اور رسول پر اور ان کے نام لیواؤں پر احسان جتا رہے ہیں کہ وہ ان کا کتنا ادب کرتے ہیں اور کبھی وہ ان ہی مخاطبوں کے بارے میں جن کے ادب کے وہ زبان اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب ولہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔

پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور بباطن بے ادبی، کیوں کہ بظاہر تو وہ اتباع رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگ بے ادبی شامل ہو جانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداع بن جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انہیں اتباع نہیں بتلایا تھا بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی۔ ویسے ہی ان کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگر چہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔

بہرحال اس رنگ تعلّی وکبر اور عجب وریا کے ڈھنگ کی رسوم شرعیہ کی پابندی حقیقی ادب وتعظیم نہیں۔ بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب وتقویٰ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ مگر وہ تقویٰ کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔ پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلبیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے جس سے ہزارہا بے بصر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہل علم کے لئے فرمایا ہے:

”فَسَادٌ کَبِیْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّکٌ وَاَکْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّکٌ هُمَا فِتْنَةٌ فِی الْعٰلَمِیْنَ کَبِیْرَةٌ لِمَنْ بِهِمَا فِیْ دِیْنِهٖ یَتَمَسَّکُ.“ ”دنیا میں وہ عالم فساد عظیم ہے جو پردہ دری کرے اور بے ادب ہو اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادت کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا) یہ دونوں کے دونوں دنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اس شخص کے لئے جو دین میں ان سے رہبری حاصل کرے اور حجت پکڑے“۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ”اِحْذَرُوْا مِنَ النَّاسِ صِنْفَیْنِ عَالِمٌ قَدْ فَتَنَهُ هَوَاهُ وَصَاحِبُ دُنْیَا قَدْ اَعْمَتْهُ دُنْیَاهُ.“ ”دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اس عالم سے جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہو اور ایک اس دنیا دار سے جسے دنیا نے اندھا کر دیا ہو“۔ ظاہر ہے کہ اس ادب کو اس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے کیوں کہ اس ادب میں صورت تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقوی باطن ندارد ہوتا ہے۔ کیوں کہ تقوی باطن کے ساتھ دعویٰ، شیخی، کبر نفس، غرور اور علم پر گھمنڈ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فنائیت، محویت، کمال تواضع، اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت وتوقیر کے جذبات نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگ ادب سے خالی ہے اور ذوق ادب سے مبرا، یعنی صورت ادب ہے، ادب نہیں، حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوق ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

کمال ادب ...... لیکن اگر ادب کی شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں موجود ہو اور یہ صورت ادب، بے روح ڈھانچہ نہ ہو، بلکہ با کیف رسم ہو تو یہ حقیقی ادب کہلائے گا اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متادب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر واحکام ہی کو پیش نظر رکھے گا۔ بلکہ اس کے منشاء اور اشارۂ خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی ذاتی عظمت و برگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس سے اس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گزر کر حقائق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئت بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا، بلکہ دل و دماغ اور نفس و روح سے بھی ادب وتوقیر کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز اس مقام کے لحاظ سے اس پر ادب وعظمت کے وہ دقیق دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیان علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آسکتے۔ بلکہ اس صاحب معرفت پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو وہ باغ دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وہ اگر بدن کا ادب مانگے تو یہ روح سے بھی ادب کرے گا۔ وہ افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کر دے گا، یعنی ظاہر و باطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمال ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو ہم اہل تدین اور عالموں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔

پس عالموں اور دین داروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفاظی یا نقاشی یا لفظ و ہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز

مندی، باطنی اور فدویت روح وطبیعت کے ساتھ شرعی آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندی احکام کے ساتھ ساتھ احکام کی آخری اور قدرتی حدود کو جو ذوق سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں۔ ہمہ وقت زیر نظر رکھنا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اس میں ادعاء ہو، نہ گھمنڈ، نہ شیخی، نہ اتراہٹ، نہ اپنی توقیر ہو، نہ دوسروں کی تحقیر، نہ روایت ہو، نہ حکایت، بلکہ محویت وگرویدگی ہو اور فنائے نفس کے ساتھ رضائے حق کے جذبات کام کر رہے ہوں۔

پس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حسن و جمال زیور سے آراستہ ہو کر دُگنا تگنا ہو جاتا ہے اسی طرح علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب ان احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور انتہائی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرنا ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق وتکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت واشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر ظواہر نصوص کے تعبیری حکم کو فتوی کہا جائے گا تو اس اقتضائی، دلالتی اور اشارتی حکم کو تقویٰ کہا جائے گا۔ پس صحیح معنی میں ایک متادب اسی وقت ادب داں بنتا ہے، جبکہ عملی طور پر اسکے سامنے ادب کے یہ تمام ظاہری و باطنی اور فتویٰ وتقویٰ احکام اور حدود موجود ہوں اور دل کی آمادگی اور امنگ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوق حدود بھی اس پر منکشف ہو جائیں۔

زیور علم ...... یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فنافی الادب ہو جائے۔ یہی وہ ادب ہے جس کو علم کا زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اس کا ادب اس میں شامل نہ ہو اور وہ احتیاطی اور تقوی حدود زیر عمل نہ ہوں جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال وجمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور جوہر ہے۔ اس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینہ پیکر ہے جس کی طرف رغبت وشوق کی نگاہیں نہیں اٹھ سکتیں۔ اس سے بہ سہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور ان کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا۔ پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے۔

ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود تو نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارات میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان پر مستمراً عملدرآمد کی مشق سے جبکہ ذوق اور نیازمندی اور فدویت کا ملکہ راسخہ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ادب کی سی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارات سے گزر کر ان کی دلالات واشارات میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ادب اسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ جن سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سرتاپا ادب بن جاتا ہے اور پھر اس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے

سامنے نہیں ہو یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں، بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی حدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیادیں استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیوں کہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات (احکام) کا ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک حصہ منہیات (نواہی) کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کے لئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہو جانے ہی سے اصل ماموروں منہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام ''آداب شرعیہ،، ہے۔ اس لئے یہی آداب درحقیقت امر و نہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جب تک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا۔ اصل احکام پر آنچ نہ آئے گی اور جوں ہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے۔ وہیں اصل مقاصد احکام کا قلعہ مسمار ہو جائے گا۔

حدود ادب...... البتہ یہ حدود آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارت ہی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدان صحیح سے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ذوقی بمعنی اختراعی نہیں بلکہ بواسطہ ذوق ہو۔ ان ہی نصوص کتاب وسنّت کی دلالت واشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے، جو ایک طرف تو فطرۃً سلامتی وصحت لئے ہوئے ہو اور دوسری طرف شرعی اتباع، پیروی ءِ سنّت اور محبت نبوی اور عشق خداوندی نے اسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کر دیا ہو۔ جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔

پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہوئے ہیں مگر شریعت میں سے ان کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃً تشریعی ذوق سے مناسبت وقرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً نادانوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور ان کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق انقیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعے اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب ودواعی زنا سے بھی رک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہ چاہے ممنوع نہ ہوں، مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آ کر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے نامحرم عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، اس کی خوشبو پر ناک رکھنا، اس کی طرف چل کر جانا، اس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترک زنا کے آداب کہلائیں گی اور اگر فعل زنا کبیر گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب ودواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے، ان میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے، ورنہ فی نفسہ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ

اس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہو جائے گا جو اس شخص کو نامحرم عورت کے تصور سے بھی بچالے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس نامحرم کے جمال کی طرف فکر ودھیان دوڑانا بھی جائز نہیں، بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن زنا سے پاک رہے۔

اور جبکہ باطن کا عمل فکر وتصور ہے تو باطن کا زنا دراصل اجنبیہ کا دھیان اور خیال زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحۃً اسے زنا کے تصور ودھیان سے روکنے کا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوال قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوق احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے جب کہ ظواہر اعمال کی مشق وتکرار سے اس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اسے گناہ ہی سے نہیں خیال گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل (خیال) سے بھی باز آجائے عمل یا شریعت یا شریعت کی حدود سے بے متعلق نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسی سلسلہ عمل کا ایک باطنی کنارہ تصور کیا جائے گا۔

اور جب کہ اسی باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اٹھتی ہے تو اسے اس شرعی ممنوع کی اساس و بنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آداب شرعیہ کہیں باہر سے لاکر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے۔ بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقع پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔

تحفظ دین کا طبعی نظام...... اسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اس سے بچنے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دیئے، جو شراب خوری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے۔ تاکہ ان کے سامنے نہ رہنے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترک شراب) کو محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خوری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اس کے تخیل پر بھی لاحول پڑھے گا۔ حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نظر نہیں آتا، لیکن جب وہ اصل ممنوع اور معصیت کبیرہ تک پہنچا دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اس لئے اس ذوقی حکم (ترک تخیل) کو بھی راہ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ انتظام شریعت کی لائنوں پر اسے احتیاطی حکم کہا جائے گا۔ جس کے لئے فتویٰ کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تقویٰ کا کلمہ استعمال کریں گے۔ سطح پرست نگاہوں میں تقویٰ کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیالی نظر آئیں لیکن دوربین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظ دین کا ایک طبعی اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو محارم شریعت [illegible] ہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں، تاکہ غیر محتاط چرواہے ان ڈول بندیوں سے بھی باہر ہی باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ پس عقلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے روکنے کا طریقہ

اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے یہ دقیق حدودعمل بھی جو بظاہر کتاب وسنت کے الفاظ میں صراحۃً نظر نہ آئیں معانی کتاب وسنت کا جز بن کر ماموارت ومنہیات کا ہی جز کہلائیں گی۔

ذوق ادب کا نتیجہ...... فقہاء ومجتہدین رحمہ اللہ علیہم نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نوراجتہاد سے کھول دیا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے۔ حالانکہ ان سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کران کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا وشراب کے جزئیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعل مباشرت اس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تخیل سے زنا کرلیا۔

پس اگر نصوص کتاب وسنت میں لفظوں میں اس خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ممانعت زنا کی ان ہی کھلی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیز کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوق ادب اور ذوق تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کر دیا ہے۔ گویا یہ اسی ممانعت زنا کا ایک انتہائی مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے۔ جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مبصر نگاہوں نے اسے پالیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگیں شربت پیتے ہوئے (جو بلاشبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی کیوں کہ اس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی اور اگر اس پر قضاء ظاہر شریعت کی رو سے شراب خوری کا حکم نہیں لگایا جائے گا تو دیانتاً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے اس کے باطن کو ضرور شراب خور کہا جائے گا۔

مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات...... ہاں پھر جیسے افعال زنا وشراب پر حد شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی، ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا، قضاء نہ سہی تو دیانۃً ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دی جائیں تو انفسی (ذاتی) ہی سہی یعنی فعل زنا وشراب پر اگر سنگساری اور درّہ زنی کی حد جاری ہوتی، تو اس ذہنی زنا کاری اور شراب خوری پر انفسی بیماریاں، آفات غم والم، تشویش وپراگندگی، فتنے اور پریشانیاں باطن پر ہجوم کر آئیں گی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت وکدورت کے بادل امنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے۔

"نیست بیماری چو بیماری دل"

پس یہ تشریعی رنگ کی سزائیں نہ ہوں گی تو تکوینی رنگ کی ہوں گی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو

باطنی وسائل سے دی جائیں گی کیوں کہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکر وخیال) سے عمل میں آئے تھے۔وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے، من اللہ ہی ہیں۔بہر حال ظاہر وباطن میں سے جس سے بھی شراب خوری وزنا کاری کا صدور ہوگا اور ان میں سے کسی پر بھی آدمی مؤاخذۂ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔﴿وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآ ءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ۔وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.﴾ ① ’’اور جو باتیں نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کرو گے یا دل میں پوشیدہ رکھو گے، حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے، پھر بجز کفر و شرک کے جس کے لئے بخشنا ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں‘‘۔حاصل یہ نکلا کہ: قانون الٰہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور جسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب وارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔پس ظاہری شریعت کی رو سے تو شراب وزنا کبیرہ گناہ تھے اور ان کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود وتعزیرات جاری ہوتی تھیں۔لیکن حاکم حقیقی حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت وجلال اور ظاہر وباطن میں اس کے حاضر وناضر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا وشراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبرالکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہوگی۔

وسائل عبادت پر اجر وثواب ......آداب کے سلسلہ میں دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں، یہی صورت ماموارت کی بھی ہے کہ ان میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے، مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے۔لیکن اس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دواعی میں مثلاً جماعت ہے جو موجب پابندیٔ نماز اور باعث ترقی اجر وقرب ہے تو وہ سنّت موکدہ قرار دی گئی، پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی ٹوہ اور اجابت موذن (یعنی کلمات اذان سننا اور موذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے انہیں دہرانا مستحب قرار دیا گیا) جس سے شرکت جماعت کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارت اور ضروریات سے فراغت ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت موذن اور حاضری مسجد کی توفیق ہو تو اس کی بھی ترغیب وتاکید کی گئی۔

غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت وسیلہ ہے اجابت موذن کا اور اجابت مؤذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اقدام جماعت کا اور یہ اقدام جماعت وسیلہ ہے پابندی صلوۃ کا جو اصل مقصود ہے، اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔

طہارت کو نصف ایمان اور مزیل معاصی قرار دیا گیا اور اجابت موذن کے اختتام پر قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا، حاضریٔ مسجد کے اقدام پر قدم قدم پر ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹا دیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا۔

① پارہ:۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۲۸۴.

حاضریٔ مسجد اور انتظار صلوٰۃ کو حکم میں صلواۃ کے رکھا گیا، شرکت جماعت پر ستائیس درجہ اجر وثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا اور اصل نماز کو نور اور دستاویز ایمان کہہ کر اسے فحش ومنکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام امور چونکہ اس کی تحصیل وتکمیل کے وسائل اور حدود ہیں، اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو نماز قائم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی اور آدمی کو اس کی پابندی نصیب نہ ہوگی۔

تارک آداب تارک شریعت ہے...... پس ادب کا حاصل یہ نکلا کہ وہ سلسلہ مامورات میں تو محافظ فرائض ہے اور سلسلہ منہیات میں مدافع محرمات ہے، فرائض کے آداب امتثالی حدود کہلائیں گے اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔

محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجالانے سے فرائض میں جماؤ میسر آئے گا، فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی۔ اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تحلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے اور محرمات کے آداب تخلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جبلی عیوب ونقائص زائل ہوتے ہیں۔

اور اس طرح آداب کی ترکیاتی نوع تو نفس کو مانجھتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اس پر قلعی کر کے اسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات۔ گویا تارک آداب درحقیقت تارک فرائض ومحرمات اور بالفاظ دیگر تارک شریعت ہے، اس لئے کتاب وسنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہر باب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے۔ جن میں بعض آداب قرآن وحدیث کی عبارت میں صراحتاً موجود ہیں اور بعض ان کی دلالت واشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہاملت اور حکمائے امت کی مدد کے ہر کس وناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اسی لئے بطور مثال ہم نے تخیلاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب کی توجہ رہے اور یہ بغیر فقہائے امت کا دامن سنبھالے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔

فقہاء کا مقام معرفت...... الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جوا یا سر سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کی الفاظ کی آڑ لے کر کم از کم اپنے باطن کو اس کی باطنی قیود وبند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو شِـرْکٌ فِي النُّبُوَّةِ وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے ان کی علمی کاوشوں اور توفیقی ریاضتوں کی بے قدری کریں۔ لیکن حقیقت شناس مبصر جوان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ

کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان فقہانے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے۔ بلکہ احکام کے ظاہری و باطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کر دینے پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری و باطنی مراتب احکام اور ان کی ان آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ جو بظاہر نظر شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر ان کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف با، کے بتیس حروف میں ہزار ہا کلمات وعبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف با، سے گذر جانے والا مبصر ہی ان حروف کی ترکیب وتحلیل سے مختلف معانی نمایاں کر دیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ایسے ہی یہ معانی شرعیہ کے مبصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے ان میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔

پس یہ فقہاء امت کسی ناتمام طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آ جانے پر محض دوا بتلا دینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض پہچان کر نسخہ نویسی کر دینے تک محدود نہیں رہ جاتے۔ بلکہ امت کے امراض کے ساتھ ان کے اسباب وعلل اور پھر آثار ونتائج سے باخبر رہ کر ہر شرعی دوا کی خاصیت اور اس کے درجہ تاثیر کو بھی جانتے ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزء کی تشخیص اور دوا و مرض کے اجزاء میں تطبیق دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ جس سے ان کا مطب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا اور آج تک دنیا اپنے مختلف امراض کا علاج ان ہی کے اصول وقواعد پر کرتی آ رہی ہے تا آنکہ دوست دشمن کوئی بھی ان کی ان قابل قدر مساعی سے مستغنی بن کر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بننا نہیں کہ تجویز احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی ان کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ راسخین فی العلم مجوز احکام نہیں بلکہ مظہر احکام ہیں۔ اختراع احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے ان کا اتباع ان کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے، اس لئے آداب شرعیہ کے سلسلے میں کتاب وسنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع قیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرے بھی پیش نظر رکھے جائیں گے، ورنہ ظواہر نصوص کو لے کر باطن نصوص کو ترک کر دیا جانا اور فقہاء کی مساعی سے فائدہ نہ اٹھانا نہ صرف حرمان (محرومی) ہی ہے بلکہ خسران (نقصان) بھی ہے۔

ذوقی آداب...... پھر ان چاروں شرعی حجتوں کے آداب سے متادب بن کر اور گویا۔ ذوق ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں، جو دوسروں کے لئے خواہ حجت نہ ہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجیت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قال سے نہیں بلکہ خود اس

کے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جھک جاتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی سرادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اس کے آگے بھی ادب سے گردن جھکا دیتا ہے۔ اگر کوئی مکان اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے۔ جیسے بیت اللہ و بیت الرسول یا آثار ومشاہد اہل اللہ۔

اگر کوئی شخص اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لگ جائے تو وہ ان کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا اور رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث و دینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے بطوع ورغبت جھک جاتا ہے، گو ظواہر شریعت میں ان آداب کے الفاظ دستیاب نہ ہوں۔

ہجرت کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت خانہ کے نچلے حصہ میں فروکش ہوئے، بالائی منزل پر وہ اور ان کے اہل وعیال فروکش تھے۔ تمام رات حضرت ابو ایوب مکان کے ایک ایسے کونے میں سکڑ کر بیٹھے رہتے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سیدھ میں نیچے نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ انہیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوق ادب نے اس طرز عمل پر انہیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔ ① تو یہ ذوق ادب ہی مانع تعمیل ہوا۔ جو ہزار تعمیلوں سے بڑھ کر تعمیل وطاعت تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زیارت مدینہ کے موقعہ پر گیارہ دن مدینۂ منورہ میں قیام پذیر رہے، مگر بول و براز نہ کیا محض اس جذبۂ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مرقد صحابہ رضی اللہ عنہ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو امام دار الہجرت ہیں ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے عرصہ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جوتہ پہن کر کبھی نہیں گھومے، کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اس مقام پاک پر پڑ جائیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض جوش ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوش زن تھا ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے مکہ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب ھذا ماصالح فلان بن فلان، ج: ۹، ص: ۲۰۲.

معظمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا کہ یہی رنگ غلاف کعبہ کا ہے، میں اسے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا، مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو رڑکی سے پانچ میل پا پیادہ ننگے پیر سفر فرماتے۔ ظاہر ہے کہ شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں، مگر تبعین اوامر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے جو ان کی ذات کی حد تک انہیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔

اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ...... حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو روضہ اقدس کی گیلری کا جھڑاون (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس وخاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اس کی سلائی آنکھوں میں پھیرتے رہے، ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں ذوقی جذبات ادب تھے۔ آداب شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے، اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ تقلید واتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بن جانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں کیوں کہ یہ ان اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اس لئے واجب الاحترام اور لائق صد ادب ہی نہیں بلکہ درجہ حال میں قابل اتباع و پیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اٹھے تھے اور جن آداب کی دعوت شریعت اسلام نے پیش کی خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا ان کی دلالت واشارات میں مخفی ہوں یا اہل اللہ کے پاک ذوق وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ ان کی اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری، تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ وبیان کے مقررہ کلمات ادا کر دیتا یا سر جھکا دیتا ہوں۔ بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزائے ترکیبی فکر ونظر کے ساتھ نصوص کے بعید محتملات کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عمل درآمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال وتصور وریاضت نفس مجاہدۂ عمل، تادیب جوارح، تزکیۂ باطن وتصفیہ قلب اور لوجہ اللہ ترک شہوات ولذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا، صلحا نے لیا، صدیقین نے اسے اپنایا اور اسی کے ذریعہ سے اپنے دین ودیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

سرچشمۂ ادب...... اس مقام ادب پر پہنچ کر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے، نہ تزئین الفاظ وفقرات، نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے ہیں، نہ سلاست بیانی کے، نہ مروجہ رسوم ہیئت وبدن باقی رہتی ہیں، نہ بناوٹی تعظیم وتوقیر بلکہ سادگی وبے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت وادب اور حقیقی اظہار ضمائر باقی رہ جاتا ہے جس میں زینت کی بجائے خلوص آرائش کی بجائے فنائیت ومحویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر بھرپور کلام وبیان کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت ورطۂ حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گنگ بنا دیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عشق کے لئے زبان کی

ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہار ہے اور وہاں اعلان ادب کی ضرورت نہیں، کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب اور سر چشمہ ادب ہے۔

پارسی گو گرچہ تازی خوشتراست عشق راخود صد زبان دیگراست
بوئے او دلبر چو پراں می شود ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

رسمی علم وادب کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تجمل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے علامات قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجمل اور زینت حاصل کرنے لگیں۔ اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم وادب بھی محض رونق محفل کا آلہ بن کر رہ جائے، نہ رونق باطن بنے اور نہ باطن نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔

پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسوم شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قائم رکھا جاتا ہے، رسوم شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں۔ مگر حقائق شرعیہ کلیۃً گم ہو جاتی ہیں، اسلئے الفاظ ورسوم ادب کا یہ بے روح نقشہ، ایک مردار لاشہ کی طرح ہو جاتا ہے جس کا کوئی نفع نہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دل کا ادب ہے، اور نہ ان کے شایان شان ہے اور نہ اسے جوہر عمل کہا جا سکتا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جا سکے جوہر عمل اور روح تقویٰ وہی ادب ہے جو ان رسمیات سے بالا رہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی روح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ، عامیانہ، رسمیانہ، متکبرانہ اور منافقانہ رسوم آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آداب واخلاق اور منکسرانہ حدود ورسوم پر لگا دے تا کہ انسان میں فناء نفس اور رضاء حق کے جذبات ابھر جائیں اور نفس انسانی صحیح معنوں میں شائستہ اور ربانی بن جائے۔ جس سے اسے مطلوبہ سعادت حاصل ہو جائے اور شقاوت سے بچ کر حقیقی نجات سے ہمکنار ہو جائے۔

نماز پورے اسلام کی میزان

نماز میں عبادت کا پہلو......شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ نماز میں دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیئات جو اعضاء بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء سے فاتحہ' سورت تک پھر تسبیحات سے لے کر التحیات تشہد تک اپنی عبودیت، غلامی، اور فدویت یا اللہ کی عظمت اور برتری اور لامحدود بزرگی کے سوا کسی اور چیز کا بیان نہیں ہوتا۔ اور ہیئات کے لحاظ سے نیاز مندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً ہیئۃً اعتراف ہے جو عبادت کا اصل مقصود یعنی خدا کے آگے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی ہے۔

نماز تمام کائنات کو جامع ہے......ارشاد ربانی ہے: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ.﴾ ① یعنی ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض تصانیف میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے۔ تاکہ اس کی نماز، اس کی خلقی وضع قطع سے طبعًا ادا ہوتی رہے، مثلاً درختوں کی نماز قیام ہے، ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ چوپایوں کی نماز رکوع ہے، وہ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں، جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑوں مکوڑوں مثلاً سانپ، بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑے کی نماز بصورت سجدہ ہے، ان کی خلقی ہیئت سجدہ نما بنائی گئی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں۔ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں رہتے ہیں، پہاڑوں کی نماز تشہد ہے۔

گویا ہر وقت زمین پر دوزانو جمے بیٹھے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں۔ پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے ہیں۔ جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے، پرندوں کے انتقالات ہی عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر سیاروں اور آسمانوں کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر آ جاتے ہیں۔ جیسے ایک نمازی رکعت پڑھ کر پھر عود کرتا ہے۔ پھر

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱.

زمین کی نماز تکوینی جمود اور سکون ہے۔ گویا ساکت اور صامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہے جو انتہائی تذلل اور خشوع ہے۔ پھر جنت و نار کی نماز سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں ہمارے مکان کو پُر کر دے پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف یعنی صف بندی ہے کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔

پھر یہی سب ہیئتیں جو ان جمادات ونباتات وحیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں۔ بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں، مثلاً کسی قوم کی نماز محض قیام، کسی قوم کی نماز نیم قیام کہ گھٹنوں کے بل ڈنڈوٹ کھیلنا، کسی قوم کی نماز محض رکوع، کسی قوم کی نماز اوندھا لیٹ جانا، (یعنی سجدہ) اور کسی قوم کی نماز مجموعۂ صلوٰۃ اقوام ہے۔ ہیئات میں درختوں کا سا قیام، چوپایوں کا سا رکوع، فرشتوں کی سی صف بندی، آسمانوں اور سیاروں کی سی گردش اور پہاڑوں کا سا قعود ہے، اذکار میں ہر مخلوق کی تسبیح اور ذکر ان کی خلقت اور استعداد کے مطابق جدا جدا ہے، جس کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ.﴾ (1) یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح ہر قوم کو اس کے مناسب ہی اذکار تلقین کئے گئے کسی قوم کو تعوذ کا حکم تھا، کسی پر سوال ودعاء کا غلبہ۔ چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل کر دیا گیا۔ اس لئے مسلم کی نماز تمام اقوام کی جامع کر دی گئی، جو فطرتِ الٰہی نے اقوامِ عالم میں مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔

اوقات کی جامعیت...... اوقاتِ نماز بھی جامع ہیں یعنی جو وقت فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے۔ ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نمازِ فجر نے اسے لیا، ظہر کا وقت سہل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلابِ آفتاب کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نمازِ عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا، پھر نفل نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیت کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار واطاعت کی بجائے صرف ان مقررہ واجب ونفل اوقات میں نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ نماز میں روزہ، اعتکاف، حج اور زکوٰۃ کی حقیقت موجود ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے، صبح صادق سے کھانے پینے اور عورتوں سے متفع ہونے سے بچنا، یہ چیزیں نماز میں بھی ممنوع ہیں۔ بلکہ نماز میں ان کے علاوہ سلام، کلام، عورتوں کو چھو دینا، ہنسنا، بولنا، چلنا، پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے۔ اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف صوم میں ضروریات بستر پہ پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے اور کھانے پینے کی اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور مفسدِ صلوٰۃ ہیں۔ بلکہ مسجد میں ٹہلنے اور نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں اس لئے نماز کا اعتکاف زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرمِ محترم ہے۔

---

(1) پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴.

نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط وصحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوسکتی پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں، بعینہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے تعظیماً رفع یدین کر کے نماز شروع کرتے ہیں، پھر جس طرح طواف اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے، نماز میں ہمہ قسم اذکار (تلاوت، درود شریف، تسبیحات وغیرہ) موجود ہیں۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا بحدِ عرفات یادِ حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں رہ کر ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں پھر جس طرح حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے، بعینہ نماز کے ذریعے شیطان کے شر کو معنوی ہتھیار کے ذریعے دفع کیا جاتا ہے، پھر جس طرح حج میں طواف وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے۔ بعینہ نماز میں سلام ودعاء کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بعینہ یا بمثلہ موجود ہے، زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے، یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا، نماز میں بھی تزکیۂ نفس اور تزکیۂ روح ہے کہ نفس ماسویٰ اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل ذکرہ کا ہو رہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت اس طرح نماز میں موجود ہے اور زکوٰۃ کی صورت یوں ہے کہ نماز کے لئے مسجد، چٹائی اور حوض پر فی سبیل اللہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے، جس طرح زکوٰۃ میں بھی فی سبیل اللہ مصارف لازم ہیں۔

نماز سے انانیت نفس کا ازالہ..... نماز سے انانیت اور کبر نفس کا ازالہ ہوتا ہے جو ہزارہا بدخلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس ہے کیوں کہ کبر نفس جب تک باقی رہ سکتا ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو، اور نماز سے حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجاتی ہے اور جب کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر وغرور پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

نماز میں فن تصوف کا موضوع..... فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے یعنی نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوں، اور نماز میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں، نفس اور رب، نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی عظمت مطلقہ نماز سامنے کر دیتی ہے۔ تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں، اور وہ اپنے فضائل سے نوازتا ہے، اس سے واضح ہوگیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لئے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

روحانی اور اخلاقی مقامات..... نماز چونکہ تزکیۂ نفس کر دیتی ہے، اس کے بعد نفسانی احوال ومقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہوجاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے، لیکن بلاواسطہ بھی نماز میں تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہوجاتے ہیں، آدمی بلند پایہ ہوجاتا ہے۔ شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے، صبر کو لو تو آدمی نماز میں ہر ایک لذت سے صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزے سے زیادہ مکمل ہے، اخلاص کو لو تو نماز کی روح ہی ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ“ (1) ہے۔ جس کی حقیقت ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے۔

(1) پارہ: ۱، سورۃ الفاتحہ، الآیۃ: ۱۔

تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس سامنے ہے وہاں تواضع کی کیا حقیقت ہے، "رَضَا بِالْقَضَاء" کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا اور اس سے صبر کر لیتا ہے۔ شجاعت کو لو تو اس میں سخت ترین مقابلہ اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق

نزاع کا خاتمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اجماعی مسلک......امابعد! برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ مشہور ومعروف اور جمہور علماء کا اجماعی مسئلہ ہے۔ علماء دیوبند حسب عقیدہ اہل سنّت والجماعت برزخ میں انبیاء کرام کی حیات کے اس تفصیل سے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی اپنی پاک قبروں میں حیات جسمانی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اور ان کے اجسام کے ساتھ ان کی ارواح مبارکہ کا ویسا ہی تعلق قائم ہے جیسا کہ دنیوی زندگی میں قائم تھا۔ وہ عبادت میں مشغول ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ قبور مبارکہ پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ وسلام بھی سنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

علماء دیوبند نے یہ عقیدہ کتاب وسنّت سے پایا ہے اور اس بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بھی متوارث ہی رہا ہے۔ حتی کہ بریلوی حلقوں سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ برزخ میں حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے منکر ہیں اور اس افتراء سے علماء حرمین شریفین کو ان کی طرف سے بدظن بنا کر اور دھوکہ دے کر ان کے خلاف فتویٰ بھی حاصل کر لیا گیا، لیکن جب علماء حرمین پر اس دھوکہ دہی کی حقیقت کھلی اور انہوں نے اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں از خود ایک مفصّل استفتاء مرتب کر کے علماء دیوبند سے جواب مانگا جس میں حیات انبیاء کا سوال بھی شامل تھا۔

تو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مفصل جوابی فتویٰ بنام ''اَلْمُهَنَّدُ عَلَى الْمُفَنَّدُ'' مرتب فرما کر علماء حرمین کے پاس ارسال فرمایا۔ جس میں مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بھی علماء دیوبند کا نقطۂ نظر غیر مشتبہ اور واضح الفاظ میں تحریر فرمایا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور برزخ میں ان کی یہ حیات، حیات دنیوی ہے۔ نیز اسی ذیل میں اس نقطۂ نظر کو مزید واضح اور مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے رسالہ ''آب حیات'' کا بھی حوالہ دیا جو اس موضوع پر ایک مستقل اور پُر از حقائق ومعارف کتاب ہے جس کا مقصد اس مسئلہ کی ایک مستحکم تائید کے علاوہ یہ بھی تھا کہ علماء دیوبند کا یہ عقیدہ (حیات انبیاء) انہیں ان کے اسلاف سے بطور توارث کے ملا ہے۔ کوئی انفرادی رائے یا وقتی اور

ہنگامی فتویٰ نہیں ہے جو حوادث کے پیش آنے سے اتفاقاً سامنے آ گیا ہو۔

مفاہمت کی بنیاد...... پھر اس مسئلہ اور اس کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ کے حوالہ کی تائید میں اس وقت کے تمام اکابر علماء دیو بند کے توثیقی دستخط بھی اس میں ثبت کرائے۔ جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ مسئلہ حیات انبیاء کے بارے میں یہ مذکورہ عقیدہ صرف ان کے سلف ہی کا نہیں بلکہ خلف بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سلف قائل تھے اور اسی طرح یہ مسئلہ (اثبات حیات انبیاء) بطرز مذکور سلف سے لے کر خلف تک یکسانی کے ساتھ مسلمہ اور متفق علیہ رہا ہے اور تمام علماء دیو بند کا یہ اجماعی مسلک ہے جس سے کوئی فرد منحرف نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض علماء دیو بند یا متقدمین میں سے بعض حضرات کی عبارتیں اس بارے میں کچھ مبہم یا موہوم ہوں۔ سو اگر اس سلسلہ میں ان کی کچھ صاف اور واضح عبارتیں بھی پائی جاتی ہوں تو ان کے مبہمات یا مجملات کو واضح عبارتوں کے تابع کر کے مبہمات کی تفسیر کی جاسکتی ہے، لیکن اگر صرف مجملات ہی ہوں جن سے مسئلہ کے دونوں پہلو نکل سکتے ہوں یا واضح ہوں مگر مخالف پہلو صاف اور نمایاں ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، تو پھر اپنے مفہوم کو سامنے رکھ کر مخالف پہلو اختیار کرنے والوں پر ایسی نکیر کی گنجائش نہ ہوگی۔ جو مخالف پہلو کے ناممکن ہونے کی صورت میں کی جاسکتی تھی۔ کیوں کہ اس صورت میں یہ تفصیلاتی یا کیفیاتی اختلاف ایک علمی اور نظری اختلاف ہوگا جسے مسلکی اختلافات سے تعبیر نہیں کیا جاسکے گا۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں ایسے اختلاف کی گنجائش ہے جو علماء میں ہر وقت ہو سکتا ہے۔

البتہ عوام سے ایسے اختلافات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ صرف نفس مسئلہ اور اس کی قدر مشترک کے مکلف ٹھیرائے جاتے ہیں جو مسلک کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لئے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں زیر نظر مصالحت اور مفاہمت باہمی کی بنیاد تفاصیل مسئلہ کے اختلافی پہلوؤں سے الگ رہ کر نفس مسئلہ کی قدر مشترک پر رکھی گئی جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوگی جیسا کہ آئندہ مفاہمت کی عبارت کے متن سے واضح ہوگا۔

اجتماعی نقصان...... بخت و اتفاق سے وقت کے بعض فضلاء دیو بند نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں کچھ اس قسم کا اختلاف فرمایا جس کا مبنیٰ متقدمین کی ایسی ہی عبارتیں یا نصوص کے مدلولات کی اسی قسم کی تعبیرات ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش کلیۃً مسلوب نہیں سمجھی جاسکتی، جس کا ظہور تین چار سال سے ہوا۔ یہ اختلاف رائے مضر، لیکن سوئے اتفاق سے یہ اختلاف اسٹیج پر آ گیا اور اس میں رد و قدح کی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور آخر کار اس مسئلہ کی بحث علماء سے گذر کر عوام میں ان کے رنگ سے پھیل گئی جس سے قدرۃً اس اختلاف نے نزاع وجدال کی باہمی صورت اختیار کر لی۔ گروپ بندی شروع ہوگئی اور یہ بحث آخر کار ایک جماعتی فتنہ کی صورت میں آ گئی جس سے مسئلہ تو ایک طرف رہ گیا اور فساد آگے آ گیا، اور خود جماعت دیو بند میں تفریق و تفرق اور تخریب کے آثار نمایاں ہونے لگے، جانبین سے رسالے لکھے گئے، اخباری

بحثیں چھڑ گئیں، جس سے جماعت کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ گیا۔

مساعی طیبہ...... یہ صورت حال دیکھ کر اور اخبارات و رسائل سے ان مناقشات کی خبریں معلوم کر کے دل زخمی ہوتا رہا، اور جوں جوں یہ فتنہ بڑھتا گیا ووں ووں دل کا غم بھی ترقی کرتا گیا۔ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح فتنہ نزاع و جدال کی یہ صورت ختم ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ کو احقر کو پاکستان حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور اسی ماہ میں بزمانہ قیام لاہور، جناب محترم مولانا غلام اللہ خان صاحب اور محترم مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری احقر سے ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے، دوران ملاقت احقر نے اس نزاع و جدال کا شکوہ کرتے ہوئے اس صورت حال کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی، اور عرض کیا کہ یہ صورت بہر نہج ختم ہونی چاہئے جبکہ یہ مسئلہ کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اسٹیج پر لایا جائے، اور اس کی وجہ سے تفریق و تفرق و تخریب کے ان مضر اثرات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مسئلہ یا تو اسٹیج پر آئے ہی نہیں یا اگر اتفاقاً آ جائے تو اس کا عنوان نزاعی نہ رہے۔

اس پر ان دونوں بزرگوں نے نہایت مخلصانہ اور درد انگیز لہجہ میں کہا کہ ہم خود بھی اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں، کاش آپ (احقر) ہی درمیان میں پڑ کر اس نزاع کو ختم کرا دیں۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے سوا یہ قصہ کسی دوسرے کے بس کا ہے بھی نہیں۔ اس بارہ میں آپ کی اب تک کی تحریرات نہایت معقول انداز سے سامنے آئی ہیں جن کو دونوں فریقوں نے احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے، اب بھی اس بارے میں آپ کی مساعی احترام و قبول کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

احقر کو ان مخلصانہ جملوں سے نزاع کے ختم ہونے کی کافی توقع پیدا ہو گئی اور ارادہ کر لیا گیا کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر کوئی مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے۔ چناں چہ جواب میں یہی عرض کیا گیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ، شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان سے مل کر اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کروں گا۔

کراچی پہنچ کر احقر نے اس سلسلے میں مولانا غلام اللہ خان صاحب سے مراسلت شروع کی تا کہ معاملہ کے ابتدائی مبادی طے ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں مفاہمت کے معنی خلاف دیانت رائے تبدیل کر دینے یا مسئلہ کو کم و بیش کر کے کسی اجتماعی نقطہ پر آ جانے کے تو ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے طریق مفاہمت اور فریقین کے لئے نقطہ اجتماع ذہن میں یہ آیا کہ اولاً یہ مسئلہ عوام میں لایا ہی نہ جائے اور اگر بیان مسئلہ کی نوبت آئے تو اس کا قدر مشترک پیش کر کے اس کی تفصیلات اور اختلافی خصوصیات پر زور نہ دیا جائے بلکہ عوام کو ان کی گہری خصوصیات میں پڑنے سے روکا جائے تو کم از کم عوام میں سے یہ نزاعی صورتیں ختم ہو جائیں گی، جو مضر ثابت ہو رہی ہیں، پھر اگر علماء کی حد تک تفصیلات میں کچھ اختلاف باقی بھی رہ جائے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو تو گروپ بندی کے مضر اثرات ختم ہو جائیں گے جو فتنہ کی اصل بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے احقر نے اپنی محدود معلومات کی حد تک اس مسئلہ کے قدر مشترک کا ایک عنوان تجویز کر کے مولانا ممدوح کو لکھا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں تا کہ دوسرے حضرات کی رائے بھی حاصل کی جاسکے۔

اس عریضہ کا جواب مجھے ملتان پہنچ کر مدرسہ خیر المدارس میں ملا۔ جس میں مولانا غلام اللہ خان صاحب نے احقر کے عنوان کو رد کئے بغیر خود بھی ایک عنوان لکھ کر بھیجا۔ اس موقع پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مولانا محمد علی صاحب جالندھری اور دوسرے معتمد علماء جمع تھے، جن کے سامنے احقر نے اپنا منصوبہ اور یہ دونوں عنوان علیحدہ علیحدہ رکھ کر گفتگو کی۔ طے یہ پایا کہ قیام ملتان کی قلیل مدت اس مسئلے کے لئے کافی نہیں ہے اور بعض ضروری افراد بھی یہاں موجود نہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو جہلم کے قیام میں رکھی جائے اور وہاں ایک مستقل دن اس کام کے لئے فارغ رکھا جائے اور ساتھ ہی احقر نے ملتان ہی سے اپنی تقریروں میں اس منصوبے کے لئے فضا ہموار کرنی شروع کر دی۔

ملتان، جہلم، سرگودھا اور راولپنڈی میں خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں اصلاحی عنوانات اختیار کئے گئے۔ احقر نے اس سلسلے میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری سے جہلم تشریف لے چلنے کے لئے عرض کیا۔ جس کو ان حضرات نے بہ خوش دلی منظور فرما لیا، مقررہ تاریخ پر یہ سب حضرات جہلم میں جمع ہو گئے اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قدر مشترک زیر غور آیا، طے یہ پایا کہ قدر مشترک کم از کم اتنی تفصیل ضرور لئے ہوئے ہونا چاہئے، جس سے مسئلہ کے تمام بنیادی گوشوں پر روشنی پڑ سکے اور عوام بطور عقیدہ کے اسے سمجھ سکیں۔

چنانچہ گفتگو کے بعد ایک جامع تعبیر احقر نے قلمبند کی اور ارادہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ان حضرات ممدوحین کی موجودگی میں دوسری جانب کے ذمہ دار حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا قاضی نور محمد صاحب، مولانا قاضی شمس الدین اور مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو جمع کر کے اس منصوبہ اور مجوزہ عنوان پر گفتگو کی جائے۔

قدر مشترک...... چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ء یوم جمعہ دونوں جانب کے یہ سب بزرگ احقر کی قیام گاہ (مدرسہ حنفیہ عثمانیہ) میں جمع ہو گئے، اس مجلس میں احقر نے اس معاملہ کی اوّل سے آخر تک ساری روداد بیان کر کے مسئلہ کا وہ متفق قدر مشترک دونوں جانب کے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے رکھا۔ گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور ختم مجلس تک الحمد للہ یہی ماحول قائم رہا، نہ اس میں ہار جیت کے جذبات تھے نہ غلبہ و مغلوبیت کے تصورات تھے بلکہ مسئلہ کو سلجھانے اور نمٹانے کے جذبات نمایاں تھے اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں نے احقر کی پیش کردہ قدر مشترک کے عنوان کو قبول کر لیا۔ اور اس قدر مشترک تحریری یادداشت پر جو احقر نے اپنے دستخط سے پیش کی، فریقین نے دستخط فرمائے اس یادداشت کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

''عامۂ مسلمین کو فتنۂ نزاع وجدال سے بچانے کے لیے مناسب ہوگا کہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں۔ یہ (عنوان) مسئلہ کا قدر مشترک ہوگا،

ضرورت پڑنے پر اسی کو عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، تفصیلات پر زور نہ دیا جائے، عبارت حسب ذیل ہے:

وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں یہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں"۔

احقر: محمد طیب

وارد حال راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

(مولانا قاضی) نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ

لاشی (مولانا) غلام اللہ خان...... (مولانا) محمد علی جالندھری

اس مختصر عبارت کی کافی تفصیل چوں کہ قاضی شمس الدین صاحب (برادر مولانا قاضی نور محمد صاحب اپنے مکتوب میں لکھ کر مولانا محمد علی جالندھری صاحب کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس لئے یہ عبارت بالا ان کی مسلمہ ہے، بناء بریں اس عبارت پر ان کے دستخط کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عبارت بالا کو ان کا مسلمہ سمجھا جائے۔

حق گوئی اور انصاف پسندی...... چوں کہ اس موقع پر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری بوجہ علالت راولپنڈی تشریف نہ لا سکے۔ اس لئے احقر کے عرض کرنے پر اور مسودہ پیش کرنے پر حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ صاحب نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر دستخط کر کے بندہ کو عنایت فرمائی جس کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

"ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں۔ اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس تحریر کی حد تک ان پر برأت کا اعلان کر دیں گے، نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریر نہ کرائیں گے اور اگر اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے"۔ نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ لاشی غلام اللہ خان (۲۲ جون ۱۹۶۲ء) اس تحریر پر ہر دو دستخط کنندہ بزرگوں کی حق پسندی اور حق گوئی ظاہر ہے۔ باوجود یہ کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ان بزرگوں کے قوی ترین تعلقات اور مخلصانہ روابط ہیں مگر اس بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں بے لوثی نمایاں ہے۔

سکوت مصلحت...... تاہم سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں۔ صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود وسلام کے حضور کے سمع مبارک تک پہنچنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل

نہیں۔ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے اس لئے انہیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا بلکہ مئوول سمجھا جائے گا۔گوان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور، اس ناچیز اور ہر دو دستخط کنندہ بزرگان ممدوحین بالا کے نزدیک قابل تسلیم نہیں لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے جبکہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے۔ان پر زبان طعن وملامت کھولنا یا تشنیع کرنا کسی طرح قرین انصاف وصواب نہیں۔بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنّت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں، اس لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر سکوت اختیار کرلیا جانا ہی قریب مصلحت اور جانبین کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ساتھ ہی مجھے اپنے محترم صدر سید صاحب ممدوح سے بھی پوری توقع ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ مسئلہ حیات کی ان تفصیلات میں جمہور اہل السنّت والجماعت کے مسلک کا احترام قائم رکھنے کے لئے اپنے کسی خصوصی مفہوم کو (خواہ وہ ان کی دانست میں مفہوم اہل السنّت والجماعت ہی ہو مگر جمہور علماء کے نزدیک وہ ان کا خصوصی مفہوم شمار کیا جارہا ہے اور خواہ وہ کتنی بھی دیانت پر مبنی ہو) ضروری الاشاعت نہ سمجھتے ہوئے سکوت کو کلام پر ترجیح دیں گے یہ مسئلہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی عقائد کا نہیں ہے کہ اس میں سکوت روانہ رکھا جائے۔

فروعی اختلاف کی حیثیت...... اس طرح عام مسلمانوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسائل اور ان میں علماء کے جزوی (معمولی) اختلافات کو مناقشات اور جدال ونزاع (لڑائی جھگڑے) کا ذریعہ نہ بنائیں۔اس قسم کے اختلافات امّت کے لئے آسانیوں کا ذریعہ بنائے گئے ہیں نہ کہ نزاعات اور مناقشات کا۔اس لئے عملاً واعتقاداً جمہور سلف وخلف کا دامن تھام کر دوسری جانبوں سے مصالحت اختیار کریں اور لڑنے اور لڑانے کی خو پیدا نہ کریں۔

آج امّت کے بہت سے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جو ان کی ہیئت اجتماعی کی متقاضی ہیں اور یہ ہیئت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اسے اس قسم کے فروعی اختلافات میں بصورت گروہ بندی ضائع نہ کیا جائے۔

خوشی کی لہر...... آخر میں دونوں جانب کے بزرگوں اور بالخصوص فریقین کے نامبردہ اکابر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گذارشات کو پوری توجہ اور التفات خاطر اور سمع قبول کے ساتھ سنا اور ملت کو بہت سے مفاسد اور مہالک سے بچالیا۔

"فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّيْ وَعَنْ جَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَآءِ."

اس نئی اصلاحی صورت کا سب سے زیادہ شاندار مظاہرہ راولپنڈی کے اس عظیم الشان جلسہ عام میں ہوا جو احقر کی تقریر کے سلسلے میں مدرسہ حنفیہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک بڑے میدان میں زیر صدارت حضرت مولانا خیر محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان، منعقد کیا گیا تھا۔

احقر کو منظوم سپاس نامہ دینے سے جلسہ کا آغاز ہوا اور احقر کی تقریر شروع ہوئی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔تقریر کے آخر میں احقر نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس نزاع کے ختم ہونے کی بشارت تفصیل سے سنائی

جس سے عوام میں خوشی کی اک بے پناہ لہر دوڑ گئی اوران ہزار ہا انسانوں کے ہجوم نے بے تحاشا تبریک وتہنیت کے نعرے لگانے شروع کردیئے جس سے فضا گونج اٹھی۔

اعتراف شخصیت...... ختم تقریر پرایک جانب سے مولانا غلام اللہ خان صاحب نے اور دوسری جانب سے مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے اپنی تقریروں سے اس بیان کی توثیق کی اور نہایت فراخدلانہ اور مخلصانہ لب ولہجہ سے فرمایا، کہ ہم نے مہتمم دارالعلوم کے درمیان میں پڑ جانے سے اس مسئلہ کی نزاعی صورت حال کوختم کردیا ہے اور جو چیز ہمیں ناممکن نظر آرہی تھی وہ اس شخصیت (احقر ناکارہ) کے درمیان میں آجانے سے نہ صرف ممکن ہی بن گئی بلکہ واقعہ ہوکر سامنے آگئی۔اور ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مہم کومہتمم دارالعلوم ہی کی شخصیت انجام دے سکتی تھی جس میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے علمی و مذہبی مرکز کی سرابرہی کی نسبت موجود ہے جو ہم سب کا مرکز قلوب ہے اور دوسری طرف بانی دارالعلوم دیوبند حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی وہ قاسمی نسبت موجود ہے جو پوری قاسمی برادری کواس پر متحد کئے ہوئے ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے سوادوسرے سے یہ مہم انجام نہیں پاسکتی تھی۔

جذبات مسرت...... بہرحال ہم نے اس نزاع کوختم کردیا ہے اور ہم اس بارے میں عوام کومطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ان دوتقریروں کے بعد ہزاروں آدمیوں کا عظیم اجتماع جذبات مسرت سے ابل پڑا اور اس نے ''مہتمم دارالعلوم زندہ باد'' ''دارالعلوم دیوبند زندہ باد'' اور ''علماء دیوبند زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کئے۔ کئی منٹ تک فضا نعروں سے گونجتی رہی اور مجمع میں جذبات مسرت کی ایک عجیب حرکت تھی، جس سے مجمع متموج دریا کی طرح متحرک نظر آرہا تھا اور نعروں میں تقریریں بند ہوگئیں۔ بالآخر جلسہ شاندار کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جوتحریک احقر کے قلم سے کراچی سے شروع ہوئی تھی وہ ملتان، سرگودھا اور جہلم میں اپنے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی راولپنڈی میں حداتم تک پہنچ گئی۔خدائے برتر وتوانا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چارسال کی مکدر فضا صاف ہوئی اور اس کے المناک آثار روبہ زوال نظر آنے لگے۔(''وَالْحَمْدُلِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا.'')

حق تعالیٰ اس یگانگت کو پائیدار اور برقرار رکھے اور مسلمانوں کوتوفیق عطا فرمائے کہ وہ دین ملت کے اہم کاموں کوجزئیات فرعیہ کے مقابلے میں اہم سمجھتے ہوئے اپنی جماعتی قوتوں کوان پر لگائیں۔

احقر: محمد طیب غفرلہ

(۱۹۶۲/۶/۲۴ء) مولانا مدنی قدس سرہٗ

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں ——— اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم

آہ! صد آہ! کل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے، آج مولانا مدنی قدس سرہٗ کہہ رہے ہیں مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دار دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور

وابستگان کو غم واندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقام کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیاء کی سب سے بڑی جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر، جمعیت علماء ہند کے صدر، جماعت دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعت دیوبند کی صد سالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی، دینی، روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۸۵۷ء ہی پر انتہا ہو گئی۔ اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہو گیا۔

کمال جامعیت..... حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے۔ جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور اٹھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم وثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ، علم وبصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی۔ آپ نے آج کے لادینی مادی دور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص وعوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وآداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری وباطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے۔ جو اس مرکز علم وفن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی، آپ اپنے اساتذہ وشیوخ کے ابتداء ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر وشیوخ انہیں اطمینان واعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اس لئے آپ مختلف ماہر فن اساتذہ وشیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، ادب وخطابت، منطق وفلسفہ کی مہارت وحذاقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی۔ آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔ باطنی سلسلوں میں پارسائی، پاکیزگی، نفس، تقویٰ وطہارت، ضبط اوقات، تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی وقومی مشاغل کے ان کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک سہل ممتنع مشغلہ تھا۔

حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ ''ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہو'' آپ کی ذات گرمی میں عملی صورت سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔

ایک حسین امتزاج..... مادی دنیا سامان راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اس کی راہنما اور مربی نہ بنے۔

حضرت ممدوح کی ذات ان دونوں سائنسوں کا ایک معتدل امتزاج تھی، آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے رہتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درس حدیث وقرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے۔ ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ ان کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کرسکتا تھا۔

دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی، اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں سے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع ان کے کام کا نصب العین تھا۔ اسی لئے آپ نے درس وتدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کے میدان کو بھی سر کرلیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کر دکھلایا۔ اس جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندو بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا۔ اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا، ان کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عزت وعظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہر وباطن کے معترف رہے۔

شیخ العرب والعجم...... حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب وعجم میں پھیلا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پاکر حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس قرآن و حدیث اور تدریس علوم فنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمہ علوم نبوت میں بیٹھ کر علوم نبوت کی خدمت کی، جس سے عرب وعجم کے لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے، آخر کار عمر کے آخری حصہ میں ۳۲ برس کامل دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر فائز رہ کر مشرق ومغرب کے لوگوں کو علوم کے آب حیات سے سیراب فرمایا۔

سیاسی نقطۂ نظر...... ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے، جنہوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ آپ اس سلسلہ میں حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی، سیاسی فلسفہ و حکمت کے امین اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے، جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور اور آخر کار جانشین شیخ الہند ہی کے لقب میں یاد کئے جانے لگے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں راہنما ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی ہر

محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیا اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیاء کا قصر آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔

چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیاء بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ پھر اس ترقی آزادی کی وہ روح جوان کی روح میں پیوست تھی، صرف سطحی آزادی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط واقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی، لامذہبیت، دہریت، الحاد، بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستاں کو اجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے کبھی نہیں مٹ سکتی اور اس فاسد مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تندرستی اور اس کا اصل سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ انہیں یقیناً یہ احساس تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی۔ لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزوی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہر حال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی تھی اور اس کی روح اخلاقی، اسی لئے جہاں آزادی کی جنگ ان کے دست و بازو کا اثر تھی، وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرت الٰہیہ کی عطاء فرمودہ حدود و قیود کے دائروں میں انہیں محدود ومقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی ان کے عمل کا ایک مستقل محاذ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق و مغرب کے مزاج الگ الگ ہیں، لیکن فوجی اقتدار کے غلبہ نے مشرق کے مزاج کو فاسد کر دیا ہے، اگر یہ بیماری رفع ہوگئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بزرگوں کی ظاہر و باطنی رہنمائی میں کام کیا اور علم و تحقیق کا ایک نیا باب کھولا۔

اس طاقت ور نصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلا دیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہر حال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیا و مشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ ان میں خاطر خواہ ابھر آیا۔ آج مغرب کی طاقتیں اگر کلیۃً نہیں ٹوٹیں، تو ان کو توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والا ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال حضرت شیخ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی، ایشیا کی آزادی اور آخر کار اخلاق وانسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں ان کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جوہری قدریں کبھی نہیں ابھر سکتیں۔

مرکب نصب العین ......اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے تو دوسری طرف جمعیت علماء ہند کے صدر بھی تھے۔ اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم ان کی

سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دارالعلوم دیو بند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب وسنّت کی ترویج میں بھی اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشین بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح وتربیت اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم قانت بنانا ان کا نصب العین تھا۔

کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی، لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑ رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا جس کی سطح سیاسی اور ماہیت اخلاقی تھی۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کی بابت رائے قائم کی وہ رائے صحیح اور واقعاتی رائے ثابت ہوئی۔

مینارۂ نور...... بہرحال حضرت شیخ اس دور الحاد و بے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے اور اگر بقول امیر امان اللہ خان سابق بادشاہ افغانستان "شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس نور کی ضیاء اور چمک تھے"

یہ نور ان سے منتشر ہو کر ان کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کارفرما ہوتی تھیں۔ منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تر یہ کہ اس جوش وجلال کے باوجود نہ ان کی محبوبیت میں فرق آتا تھا نہ مطلوبیت میں۔ کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے تھے جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور ۲ بجے کے قریب روح پرفتوح اس جسد خاکی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاوداں ہوگئی۔ "رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً۔"

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی۔ بعد مردن چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی۔ روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا، لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آسکتی۔ جو یقیناً مقبولیت عند اللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشاشت وطمانیت کی کھلی علامت تھی۔ جو مقبولیت زندگی میں تھی وہی موت کے بعد بھی ہے، مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔ حتی کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آناً فاناً ہوا پر دوڑ گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہندو بیرون ہند سے تعزیتی فون، تار، اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کہ دارالعلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے ابل پڑا۔ ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہوگیا، لوگ جس شخصیت کے اردگرد پروانہ وار جمع رہتے تھے اب اس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وابستگان حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں

اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقتاً مرتے ہی نہیں، صدیاں گذر جانے پر بھی دلوں میں ان کی روح دوڑتی رہتی ہے اور ان کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے۔ جس کی بناء ان کا پیکر یا جثہ نہیں ہوتا جو مٹ جاتا ہے، بلکہ ان کی معنویت ہوتی ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں، اس لئے موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مر کر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

معنوی معیت...... آج حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں جبکہ ان کا مشن موجود، ان کا نمونہ عمل موجود، ان کا علم موجود، ان کی مجاہدانہ کارنامے موجود اور ان کی محبوبیت موجود۔ اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبت عظیمہ ہے۔ وہیں ان کی معنوی معیت وجہ سکون وقرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے، ان کی معنویت موجود، اس سے استفادہ اور اس کا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار و تسلی ہوگا۔ اور ایصال ثواب کے ذریعے حضرت مرحوم کے لئے وجہ سرور وانبساط ہوگا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اور ان کے حق میں سکون وراحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گذر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اس کو دعاء وایصال ثواب میں یاد رکھتا ہے، اس لئے غم غلط کرنے اور حضرت اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غم محض یا غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہو سکتا بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمر بستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہ، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب ودرجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل، اجر جزیل اور ذوق تعمیل عطاء فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئیں کہ ان سطروں میں ان کے مناقب کب آ سکتے تھے، بلکہ محض غم اور دل کو ہلکا کرنے اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے ذکر اور یاد سے ''اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ'' کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرت مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روا نہ رکھا جائے گا۔ (وَهُوَ الْبَاقِيْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ)

انٹرویو

قندیل راہنمائی...... انسانی عظمت کی تعریف اور تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کوئی دولت مند آدمی کو بڑا مانتا ہے، کسی کے نزدیک سیاست دان اور ارباب اقتدار بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کوئی بڑی بڑی علمی ڈگریاں اور فنی ڈپلومے حاصل کرنے والوں کو بڑا سمجھتا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عظمت کی کسوٹیاں (معیار) بناتا ہے، لیکن بڑائی کا جو معیار مولانا قاری محمد طیب کو دیکھ کر دستیاب ہوتا ہے وہ اتنا جامع اور واضح ہے کہ اس کے بعد عظمت کا مفہوم تشریح طلب نہیں رہتا اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ خدائے ذوالجلال سے جو شخص جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔ کیوں کہ اس کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو سب سے بڑی لاثانی اور لافانی ہے۔

قاری محمد طیب عشق الٰہی کی تصویر اور خلق خدا کی ہدایت کے لئے راہنمائی کا نور ہیں۔ وہ علم وعمل کا جیتا جاگتا پیکر ہیں۔ دینی علوم پر ان کی نظر عالمانہ ہی نہیں محرمانہ بھی ہے۔ انہیں قدرت نے قرآن فہمی کی غیر معمولی استعداد بخشی ہے۔ علم حدیث میں ان کے ادراک کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ تاریخ کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح آگاہ ہیں، زمانے اور زندگی کا ہر اتار چڑھاؤ جانتے ہیں اور قدیم وجدید کا ہر تیور پہچانتے ہیں۔ خطابت ان کی لونڈی ہے، لاکھوں کے مجمع میں بولتے ہیں تو پورا مجمع خاموش ہو کر یوں گوش بر آواز ہو جاتا ہے جیسے دور دور تک کوئی متنفس موجود نہ ہو۔ کوئی سا موضوع ہو وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے بے تکان تقریر کرتے ہیں اور فکر ونظر کے دریچے کھولتے چلے جاتے ہیں۔

یہی محاسن ہیں جن کی بدولت وہ محض دارالعلوم دیوبند ہی کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے قندیل راہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1 ...... اسلام پاکستان کی تقدیر ہے۔ 2 ...... پاکستان اسلام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

3 ...... اسلام ہی زندگی کا وہ واحد اور کامل دستور ہے جو پورے اعتماد سے ہمارے مادی اور روحانی تقاضے پورے کرتا ہے۔

جب تک اسلام نافذ نہیں ہوگا ہم زبوں حال رہیں گے

نفاذ اسلام کا مرحلۂ ترتیب...... یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے خیالات کا اظہار بڑی مدت سے سب ہی

مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ اسلام کس طرح اور کس مرحلہ وار ترتیب سے نافذ ہو؟ یہ آج کے دور کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ خوش قسمتی سے قاری محمد طیب گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے تو خیال گزرا کہ متذکرہ بالا سوال پر ان کے علم ونظر سے استفادہ کیا جائے۔

یہ خواہش ہمیں کشاں کشاں قاری صاحب تک لے گئی۔ وہ ملتان روڈ کے ایک مکان پر تشریف فرما تھے۔ آس پاس بہت سے عقیدت مند بیٹھے تھے۔ میں نے قاری صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تو بڑی شفقت اور بے تکلفی سے میرے سوالوں کا جواب مرحمت فرمانے لگے۔ اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں فرمایا: ''فی زمانہ اسلام کے نفاذ کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ (۱) اجتماعی سطح پر حکومت وقت قدم اٹھائے، مروجہ قوانین کا جائزہ لے اور وہ تمام قوانین یک قلم منسوخ کر دے جو قرآن وسنّت کے منافی یا ان سے متحارب ہوں، مزید برآں ایسے قوانین بنائے جائیں جن کا مقصد کلی طور پر دین کا نفاذ اور اس پر عملدار آمد ہو۔ (۲) انفرادی سطح پر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی جلوہ گاہ بنائیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام الٰہی پر دل کی گہرائیوں سے کار بند ہوں۔ رہن، سہن، شادی، بیاہ، خوشی، غمی، خرید وفروخت، لین دین، غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہی احکام کی پابندی کریں، جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور ان چیزوں سے باز رہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے''۔

علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت...... ان دونوں امور کی تشریح کرتے ہوئے قاری صاحب نے بتایا کہ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، اس لئے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ دینی علوم کو اس قدر عام اور سہل الحصول بنا دیا جائے کہ کوئی بھی دین سے ناآشنا نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص عالم فاضل ہی بنے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ دینی فرائض کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو بھرپور معلومات ہونی چاہئیں، اگر کوئی کسی معاملے کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو وہ اہل علم سے رجوع کرے اور درپیش معاملے میں رہنمائی حاصل کرے۔

قرآن کریم کے سترہویں پارے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.﴾ (۱) ''اگر تم نہیں جانتے تو اہل دانش سے دریافت کرو''۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ لگن پیدا کی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھیں، جب دلوں میں یہ لگن پیدا ہو جائے گی تو وہ یقیناً عالمان دین سے رجوع کریں گے۔ جب وہ دینی تقاضوں سے آگاہی حاصل کر لیں گے تو اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس طرح ماحول اور معاشرے میں خود بخود اصلاح کے رجحانات پیدا ہوں گے اور یہی رجحانات فلاحی برگ وبار لائیں گے۔ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہی تھا۔ وہ جس چیز کے بارے میں لاعلم ہوتے تھے اس کا ایک

(۱) پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷.

ایک پہلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرتے تھے اور پھر اسے حرزِ جان (عزیز سمجھنا) بنالیتے تھے۔

قاری صاحب نے فرمایا کہ: یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ جب تک ماحول ٹھیک نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں ہوگا اور ماحول اسی صورت میں سنور سکتا ہے جبکہ پوری قوت اور مکمل فرض شناسی سے کام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ماحول بہتر بنانے کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور دین پر عمل پیرا ہونے کا کام اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کرے۔

کسی محلے میں اگر ایک گھر عملاً اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن جائے تو وہ گھر چراغ راہ ہو جاتا ہے جس کی کرنیں پڑوس کے گھروں کو بھی منور کرنے لگتی ہیں۔ سعادت اور فلاح کے دیئے اس طرح دھیرے دھیرے جلتے ہیں۔ جب ایک گھر میں اسلامی تعلیمات کی برکتیں جلوہ گر ہوں گی تو دوسرے گھرانے اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے یوں گلی گلی، محلے محلے، قریہ قریہ اور شہر در شہر دین کا اجالا پھیلتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ پورا ماحول اور معاشرہ دینی رنگ میں ڈھل کر بقعہ نور بن جائے گا۔

نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری...... قاری صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر چیز کی ذمہ داری حکومت وقت کے کندھوں پر ڈال دینا درست نہیں۔ نجی گھریلو، اور خاندانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا انقلاب لانا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے جس میں کوئی خلل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر فرد اپنی ذات اور خاندان میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ اٹل کر لے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے یا اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ لہٰذا اسلام کے عملی نفاذ کی پہلی اور بنیادی ذمہ داری فرد پر ہے۔

قاری صاحب نے کہا کہ آج کل ایک افسوسناک حالت یہ ہے کہ:

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

لوگ خود تو نیک عمل کرتے نہیں البتہ دوسروں کو نصیحت کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں، نیک عمل سے گریز مگر نیکی کی زَبانی تبلیغ کار بے خیر ہے۔ کیوں کہ قول مؤثر نہیں ہوتا، اصل اور مؤثر قوت عمل ہے، صرف عمل۔

لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ پہلے وہ اسلامی معاشرت، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا علم حاصل کرے اور پھر اس کا عملی نمونہ بن جائے۔ اکل حلال کو اپنی زندگی کے لئے لازم جانے اور حرام کی کمائی سے دور بھاگے۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائے گی اور جب مسلمان اچھی طرح دینی رنگ میں ڈھل جائیں گے تو پھر حکومت کا کام معمولی رہ جائے گا۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت ہی سے ہر مطالبہ کرنا سراسر غیر ضروری ہے۔ حکومت تو صرف اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کا اقدام یا اہتمام کر سکتی ہے۔ اولین ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو دینی معاشرت کا سچا نمونہ بنالیں۔

نفاذِ اسلام میں حکومت کا کردار...... جہاں تک اجتماعی سطح پر حکومت کے کردار کا تعلق ہے۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف قرآن اور سنّت کو ٹھہرایا جائے، عوام قانون پر چلتے ہیں۔ لہٰذا ایسا کوئی قانون نہ تو برقرار رہنا چاہئے اور نہ ہی آئندہ بننا چاہئے جو منکرات پر مبنی ہو یا قرآن وسنّت کے احکام کی نفی کرتا ہو۔

ثانیاً حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس کے ابتدائی مدارج میں دینی عقائد، اخلاق اور معاملات کی کما حقہ، تعلیم دی جائے۔ پرائمری اور ہائی اسکولوں میں طلباء کو وہ دعائیں اور ان کا مفہوم یاد کرایا جائے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ اگر ہر بچے کو ایک ایک دعاء چار چار روز میں بھی یاد کرائی جائے تو چھ مہینے میں وہ ساری دعائیں اچھی طرح یاد کرلے گا۔ ان دعاؤں کی پہلی اور لازمی برکت یہ ہوگی کہ عملی توحید کا رنگ قائم ہو جائے گا اور ہماری نئی پود کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ شروع ہی سے راسخ ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ چیز اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطۂ نظر...... اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ: اسلام، انسان کی بنیادی ضرورتوں کا مکمل حل پیش کرتا ہے، شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''البدر'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: زندگی بسر کرنے کے لئے تین چیزیں لازماً درکار ہیں۔

1 کسرۂ خبز۔ روٹی کا ٹکڑا۔ 2 قطعۂ ثوب۔ بدن ڈھانپنے کا کپڑا۔ 3 قطعۂ ارض۔ رہنے کے لئے زمین کا ٹکڑا۔

اسلام کسی فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضروریات سے محروم نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو رزق رسانی کے سلسلے میں اسلامی نظام کا حال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کمر پر غلے کی بوری لاد کر ضرورت مندوں کے جھونپڑوں تک پہنچایا کرتے تھے، جہاں تک کامل مساوات کا تعلق ہے تو وہ ایک غیر فطری چیز ہے۔ اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے۔ وہ کسی کا حد سے زیادہ امیر یا حد سے زیادہ غریب ہونا پسند نہیں کرتا، اس سلسلے میں اسلام کی غرض وغایت یہ ہے کہ جو لوگ دولت کے اعتبار سے بہت بلندی پر ہیں انھیں کچھ نیچے اتارا جائے اور جو مفلوک الحال انتہائی پستیوں میں ہیں انہیں کچھ اوپر اٹھایا جائے اس طرح توازن اور اعتدال کی فضاء قائم کی جائے۔

اتحادِ مسلم...... مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی ضرورت واہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ''مسلمانوں کے تمام فرقوں میں گہرا اتحاد بے حد ضروری ہے۔ ضمنی اختلافات کے باعث مسلمانوں کا آپس میں کوئی رنجش رکھنا سخت افسوسناک اور بے جواز چیز ہے۔ کیوں کہ ہمارا دین ہمیں جڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کٹنے اور بچھڑنے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں وحدت کے اسباب بے پناہ ہیں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں مقابلہ ومجادلہ نہ کرو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر فرقہ مثبت اور معروف پہلو پر اکٹھا ہو جائے اور ملت اسلامیہ کے مشترکہ مشن میں تعاون کرے۔ جہاں تک تمام فرقوں کے اپنے اپنے جداگانہ

لیکن ضمنی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ ان پر اپنی اپنی حدود میں عمل پیرا رہ کر بھی مضبوط دینی وحدت بن سکتے ہیں۔اس کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ منفی اندازِ فکر ترک کر کے تکفیر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخدلی اور وسعت قلبی کا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ سرداران قریش کی تکریم کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیا کرتے تھے،جب ہمارے آقائے نامدار کا یہ سلوک کفار کے ساتھ تھا تو ہمارا اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ محتاجِ وضاحت نہیں''۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کے حالیہ اقدامات کے بارے میں استفسار پر قاری صاحب نے کہا کہ: جو شخص یا جو حکومت اسلام کے عملی نفاذ کا اہتمام کرے گی وہ ہر حال میں قابل تکریم قرار پائے گی۔

اکابر دیو بند کا مشن......مزید فرمایا کہ: دین کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے:''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے'' مزید فرمایا کہ اکابر دیو بند کا مسلک اور مشن یہی تھا،جس کے لئے وہ مدت العمر کوشاں رہے۔حتیٰ کہ انہوں نے اپنی جانیں اس مشن کی خاطر کھپا دیں''۔

ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر......ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں قاری صاحب نے بتایا کہ دینی غلبے اور اسلامی حمیت کے لحاظ سے وہ روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ان کی آواز میں یکسانیت اور خود اعتمادی کا لہجہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔مسلمانوں کے اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ سابق بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی صاف صاف یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئیں کہ ہم مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔بات مزید آگے بڑھی تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اہل پاکستان کی ترقی اور فلاح کے لئے دعا گو ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں سے ان کی محبت قدرتی ہے،اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ مسلمانانِ ہند پورے عالم اسلام کے لئے دردمندی کے جذبات رکھتے ہیں اور پاکستان عالم اسلام کا ایک اہم ملک ہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ایک دوسرے کے رشتہ دار شروع ہی سے موجود ہیں۔اس لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں کی خوشحالی کی دعاء مانگتے رہتے ہیں، پھر پاکستان کے لئے ان کی خیر اندیشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نہایت قریبی ہمسائے ہیں اور دو آزاد اور خود مختار ہمسایہ ممالک کو جس انداز اور اخلاق سے رہنا چاہئے۔اس کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات تازہ اور بیدار رکھیں۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور قیام پاکستان......شاید بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قاری صاحب اپنے عظیم مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اندازِ فکر کی پیروی میں قیام پاکستان کے حامی تھے۔ماضی کی کچھ باتیں چھیڑیں،تو راقم نے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام کے

سیاسی افکار کا تذکرہ کیا اور قاری صاحب سے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ اپنی دینی وجاہت اور جہاد حریت کے باعث ہمارے ماضی کی رونق ہیں۔لیکن یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں قیام پاکستان کے خلاف تھیں۔آخر کیوں؟

اس پر قاری صاحب نے فرمایا کہ: فکری اور نظری اختلاف کسی بھی معاملے پر ہوسکتا ہے۔بلاشبہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔تاہم جب پاکستان بن گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب پاکستان کو مضبوط بنایا جائے۔حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلافات ہوسکتے ہیں۔اس کی ساخت بناوٹ اور موقع محل پر مختلف آرا ہوسکتی ہیں لیکن جب مسجد تعمیر ہوجائے تو پھر اس کی تقدیس کا خیال ہردم لازم ہے۔پھر مسجد کے بنانے یا نہ بنانے پر بحث نہیں کی جاسکتی یہی حال قیام پاکستان کا ہے۔حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب چونکہ پاکستان قائم ہوگیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میری رائے کا اختلاف بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ختم ہوگیا تھا۔اب خدا تعالیٰ پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنائے۔

مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان......مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ بٹوارے کے بعد پاکستان کے لئے کیا جذبات رکھتے تھے؟اس سلسلے میں قاری صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی معرفت پیغام ملا کر مولانا ابوالکلام مجھے یاد فرمارہے ہیں۔میں دہلی پہنچا اور سیدھا ان کے دفتر گیا۔مولانا اپنے روایتی اخلاق کے مطابق نہایت تپاک سے پیش آئے۔میں نے پوچھا کہ آپ نے کیوں یاد فرمایا؟انہوں نے فرمایا کہ اب پاکستان قائم ہوچکا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اچھے اور لائق لوگ پاکستان چلے جائیں اور اس نوزائیدہ مملکت کا نظام سنبھال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

اتنا فرمانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں بخوشی آپ کو بھجوانے کا انتظام کرسکتا ہوں۔اس بارے میں آپ کو بلاجھجک اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہیے۔لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ طور پر پاکستانی ہائی کمشنر سے ملاقاتیں کی جائیں۔

قاری صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم کی یہ باتیں سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور ان سے کہا کہ یہ قطعی غلط اور جھوٹا الزام ہے۔اس پر مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں ڈوب گئے میں نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی نے حکومت کو ہمارے بارے میں جان بوجھ کر یا نادانستگی میں غلط اطلاع دی ہے۔اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چندہ جمع کرنے والے سفیر چندہ کے سلسلہ میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔اور اسی ضمن میں انہوں نے ہائی کمشنر سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔سی آئی ڈی والوں نے اس بات کو زیب داستان کے لئے بڑھایا اور یہ افسانہ بناڈالا کہ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ جب یہ حقیقت مولانا کے علم میں آئی تو وہ بہت متاسف ہوئے اور انٹیلی جنس کے

عملے پر بڑا ملال ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ یہی سی آئی ڈی کے جھوٹے لوگ تھے۔ جو ہمارے بارے میں بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

خدا حافظ...... قاری صاحب باتوں باتوں میں فکر ونظر اور علم وخبر کی پھول لٹار ہے تھے، خاصا وقت بیت چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی پھیلتی چلی جا رہی تھی راقم نے اجازت چاہی تو انہوں نے شفقت ومرحمت کے ایک نادر لمس کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور گراں قدر دعائیں دے کر خدا حافظ کہا اور میں یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ قاری صاحب ۸۶ برس کے لیل و نہار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ایسی عظیم اور فیض رساں شخصیتوں کو تادیر زندہ اور باعث برکت بنائے رکھے۔ (آمین)

از: شاعر شیریں مقال

جناب انور صابری (مرحوم)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب ''قدس اللہ سرّہٗ العزیز''

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخش علوم نو ہے
تری جبیں پر جبینِ قاسم کی دل نواز و حسین ضو ہے

تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کر دیا ہے
''حکیم الامّت'' نے ایک نظر میں حکیم الاسلام کر دیا ہے

خدا کے فضل و کرم سے دین کا مقام محمود مل گیا ہے
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے

ترے تفکر میں قرن اول کی عظمتوں کا نشان ملے گا
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا

مری نظر میں نئے زمانے کا فخر مصر وحجاز تو ہے
کیا جسے منکشف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے

رشید کے باغ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے
ملا دوام بہار جس کو گل ریاض رسول تو ہے

فریضہ حج کے بعد اپنے وطن میں باعز وشان آیا
لئے ہوئے دل میں معرفت کا تخیل نوجوان آیا

جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگ اعزاز دیں بڑھایا
رہے گا تا عمر تیرے سر پہ خدا کی رحمت کا خاص سایہ

حوادثِ دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

اساسی عبادات

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

بنیادی عبادات...... بزرگانِ محترم! اسلام میں بنیادی طور پر عبادتیں، دو ہی ہیں۔ جن پر پورے اسلام کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، ایک نماز، دوسرے حج۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی لامحدود صفاتِ کمال کو اگر اصول طور پر سمیٹا جائے تو دو ہی نوعوں میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک صفاتِ جمال اور دوسرے صفاتِ جلال۔

منشاءِ عبادات...... صفات جمال مہرولطف کی صفات ہیں جیسے رحمت ورأفت، عفووکرم، حلم وصبر، خلاقی ورزاقی، گہداشت وحفاظت، راہنمائی وہدایت، ستاری ومغفرت، جودوعطاء، انعام واحسان، نصرت واعانت وغیرہ اور صفات جلال قہری صفتیں ہیں جیسے قہروغضب، جبروتشدد، مواخذہ وانتقام، غلبہ واستیلاء، عزت وجبروت، مالکیت و ملکیت، حکومت حاکمیت، سلب ومنع وغیرہ۔ قرآن حکیم نے حق تعالیٰ کی ان دونوں شانوں کی طرف جن کے نیچے یہ دونوعیں آئی ہوئیں ہیں، ان جامع اور معجزانہ الفاظ میں ارشارہ فرمایا ہے ﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِى الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ ① جلال کے نیچے قہری صفتیں آجاتی ہیں اور اکرام کے نیچے مہری صفات رہتی ہیں۔ ایک جگہ صراحت کے ساتھ ان دونوں شانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾ ②

ایک جگہ فرمایا ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِى الطَّوْلِ ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ③ ایک جگہ صفاتِ جمال کے افعال بیان فرمائے گئے کہ ﴿لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الرحمن، الآیۃ: ۷۸. ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰.

③ پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۳.

جَمِیْعًا ﴾ ① اور اسی کے آگے صفات جلال کے افعال کا تذکرہ فرمایا گیا کہ ﴿وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ ② اسی طرح ایک موقع پر صفات مہر کے تحت امیدیں باندھتے رہنے کا حکم دیا اور مایوسی ختم فرمادی کہ ﴿اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ③ ''بلاشبہ کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں''۔ اور صفاتِ قہر کے تحت بے خوف ہو جانے سے روکا گیا کہ ﴿فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ④ ''اور (آدمی) مطمئن نہ ہو بیٹھے اللہ کی مخفی تدبیر سے''۔

منشاء جلال و جمال...... ایک جگہ صفاتِ جلال اور صفاتِ جمال دونوں کے منشاء پر مطلع فرمایا گیا کہ صفاتِ قہر کے ظہور کا منشاء جرائم ہیں اور صفات مہر کے نزول کا منشاء ایمان ہے۔ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ⑤ ایک جگہ اولاً شان رحمت کے تحت افعال خیر پر انعام کا ذکر فرمایا گیا اور آگے اسی کے ساتھ شان غضب کے تحت شر پر سزا و انتقام کا ذکر کیا گیا ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا﴾ ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ﴾ ⑥ بہر حال صفات کمات کی یہی دو بنیادی نوعیں ہیں جن کے نیچے تمام صفات ربانی آئی ہوئی ہیں۔ جلال و جمال اور مہر و قہر، صفاتِ جمال کا سر چشمہ رحمت ہے۔ اور صفات جلال کا سر منشاء غضب ہے۔ اسی لئے اس کی ذات بابرکات رحمٰن بھی ہے اور غضبان بھی۔ رحمت کی شان سے کرم فرماتا ہے۔ اور غضب کی شان سے تنبیہہ و مواخذہ۔ ظاہر ہے کہ بندوں کو دونوں ہی کی ضرورت ہے کیونکہ مخلوق خیر و شر کے دو مادوں سے مرکب ہے، بندہ کی خیر رحمت خداوندی کو جذب کرتی ہے اور اس کا شر غضب الٰہی کو اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں نوعوں کے جمع ہوئے بغیر ربوبیت اور پال پرورش کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ ماں ایک طرف بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اسے گھور کر طمانچے بھی مارتی ہے کیونکہ نرم اور گرم دونوں کے جمع کرنے سے ہی تربیت ہوتی ہے۔ ﴿بَلْ یَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ﴾ ⑦ ''(اس کے دونوں ہاتھ، مہر کے بھی اور قہر کے بھی) کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے صَرف فرمائے''۔

جلال و جمال کے آثار و لوازم...... یہ دونوں شانیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اس لئے ان کے آثار و لوازم اور تقاضوں میں بھی یہی تقابل اور تضاد کی شان پائی جاتی ہے صفات جمال یعنی مہر و لطف کا قدرتی اثر انس و محبت اور گرویدگی و شیفتگی ہے کہ بندہ رام ہو جائے، جھک جائے اور الفت میں سرشار ہو جائے، محو ہو مٹا ہوا ہو، نہ اپنا ارادہ ہو نہ خواہش، نہ اپنی خبر نہ اپنے نام لگے ہوؤں کی پروا، سوختہ جانی ہو اور سوختہ روانی۔ ربودگی میں نہ اپنا باہر کا ہوش ہو اور نہ اندر کا جوش۔ مطمع نظر اور مقصد دل ہمہ وقت محبوب ہو اور اس کی ادائیں، اس کی طرف دوڑنا اور

① پارہ: ۲۴، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۵۳۔ ② پارہ: ۲۴، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۵۴۔ ③ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷۔

④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۹۹۔ ⑤ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷۔

⑥ پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۸۹، ۹۰۔ ⑦ پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۶۴۔

اسی کی طرف بھاگنا، سوتے جاگتے اس کا دھیان اور اس کے تصور میں محویت و سرشاری ہو۔ کہ صفات جمال کا یہی قدرتی تقاضا ہے اور صفات جلال یعنی قہر و غضب کا قدرتی اثر رعب و ہیبت، فکر و مغلوبیت، سرنگونی اور سرافگنی ہے کہ بندہ خوفزدہ اور لرزاں و ترساں رہے، گردن جھکی ہوئی ہو، ناک نیچی ہو اور دربار شاہی (مسجد) میں حاضر ہو تو نگاہ اعضاء کا ادب پیش نظر ہو، زبان خاموش ہو، چال میں سکون و مسکنت ہو، چہرے سے خوف و خشیت نمایاں ہو، ادب سے دایاں قدم پہلے ہو اور بایاں پیچھے، قیام دست بستہ ہو، ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، نشست ہو تو دوزانو ہو، کھڑا ہونا اور چلنا ہو تو سکون و تواضع سے ہو، نہ دوڑنا، بھاگنا، لپکنا، نہ تھرکنا، سکینت و متانت میں ہمہ وقت غرق اور جوش کے ساتھ ہوش میں ہو، ہر آن محو و مستغرق، غرض ہر نقل و حرکت اور ہیئت و وضع میں ادب و خاکساری، ذلت و انکساری اور عجز و نیازمندی رچی ہوئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ صفات قہر جلال چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے سامنے خوف و خشیت اور مرعوبیت کے ساتھ نیازمندانہ حاضر ہوں جن کے روئیں روئیں سے بندگی و مسکنت، غلامی و محکومی اور تمام ضوابط حکومت کی عاقلانہ پابندی ٹپکتی ہو اور صفات مہر و جمال چاہتی ہیں کہ خدا کے بندے اس کے سامنے انس و محبت، فنائیت و محویت اور استغراق و استہلاک کے ساتھ حاضر ہوں، جن کی ہر ایک نقل و حرکت سے ربودگی، خودگزاری از خودرفتگی، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا، عاشقانہ انداز سے نمایاں ہو، پہلی صورت مہذب اور باادب محکوم کی ہے۔ دوسری صورت ایک از خود رفتہ اور از خودگزشتہ عاشق کی ہے یعنی ایک شان کے نیچے آدمی عاشق فناپسند ہوتا ہے۔ ایک کے نیچے عاقل فکرمند اس لئے اللہ کی ان دونوں صفات (جلال و جمال) کے تقاضوں سے انسان پر دو ہی قسم کی عبادتیں فرض ہوئیں۔ صفات جلال کے تحت اظہار عجز و نیاز اور مظاہرہ ذلت و مسکنت کی عبادت رکھی گئی جس کی صورت نماز ہے۔ اور صفاتِ جمال کے تحت اظہارِ عشق و محبت اور مظاہرہ محویت و فنائیت کی عبادت فرض ہوئی جس کی صورت حج ہے۔

نماز شان کبریائی کا مظہر...... چنانچہ نماز کے ایک ایک عمل سے اپنی ہی فدویت و عبدیت، لجاجت و سماجت اور مرعوبیت و ہیبت زدگی نمایاں کی جاتی ہے جس میں فکر و عقل کے ساتھ ادب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ ابتداء نماز ہی سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بیزار ہونا اور اس کے ساتھ اپنے حاکم مطلق اور بادشاہ عالمین کی بڑائی کا اعلان کرنا ہے جس کا نام تکبیر تحریمہ ہے۔ پھر چاکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا جس کا نام قیام ہے۔ پھر ذلیلوں کی طرح سر کو جھکا دینا جس کا نام رکوع ہے پھر انتہائی پستی کے ساتھ ہاتھ، ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا جس کا نام سجدہ ہے۔

پھر انتہاء ادب و تعظیم کے ساتھ اس کی یکتائی کی شہادت دینا جس کا نام تشہد ہے۔ پھر انتہائی بے بسی اور محتاجگی کے ساتھ اسے پکارنا جس کا نام استغاثہ و فریاد ہے۔ پھر کمال ضعف و بے زوری اور انتہائی خوشامد کے ساتھ بھیک مانگنا جس کا نام دعا ہے پھر انتہائی تعلق و نیازمندی کے ساتھ اس کے نائبوں اور خلفاء (انبیاء و اولیاء) تک پر

صلوٰۃ وسلام بھیجنا جس کا نام درود اور صلوٰۃ وسلام ہے۔ پھر انتہائی عقیدت و نیاز سے حاضرین دربار (شرکاء جماعت اور ملائکہ) کو دوطرفہ سلام دے کر رخصت ہونا، جس کا نام تحلیل وتسلیم ہے وغیرہ وغیرہ، وہ عاجزانہ اور محکومانہ افعال ہیں جو بلحاظ حقیقت اللہ کی صفت حکومت ومالکیت اور حاکمیت وبادشاہت کا طبعی تقاضا ہیں۔ پس نماز اس کی شان کبریائی۔ اور شان جلال وحکمرانی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ میں خوف وخشیت کی تخم ریزی کرتی ہے جس سے وہ قانون الٰہی کی نافرمانی اور فواحش ومنکرات سے بچ کر مقرب بارگاہ بن جاتا ہے۔

حج' ذاتی محبوبیت کا مظہر...... ادھر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک سنت وواجب سے عاشقی، محبت وانس اور محبوب پر مر مٹنے کا والہانہ اور شیدایانہ انداز سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حج میں مشغول انسان کی عاشقانہ کیفیات اور ازخود رفتگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تن من دھن کی کچھ پروانہیں رہتی نہ کپڑوں کی خبر، نہ آرائش وزیبائش کی پروا نہ وضعدار لباس نہ قطع وبرید کی بو پاس بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، لبیں پھیلی ہوئیں۔ رواں چکٹا ہوا، ننگے سر، ننگے پاؤں، کپڑے گرد آلود، بدن پر میل کچیل کی نمود، در محبوب پر سر بہ سجود، گھر سے بے گھر، تارک مال وزر نہ کھانے کی پروا، نہ پینے کی خبر، دل پر لذت نکاح کا اثر نہ تن پر آثار دولت وزر، نہ صفائی وستھرائی سے سروکار، نہ عطر وخوشبو کا روادار، نہ غسل کا دھیان نہ نظافت کا وہم وگمان، آثار محبت سے وارفتہ، گریہ وبُکا سے سوختہ۔ رسمی وقار سے دل گرفتہ، خانہ محبوب کے تصور میں ازخود رفتہ، حضوری ہوتو حاضر حاضر کہہ کر چلانا۔ غیبت ہوتو دم بخود ہو جانا اور محبوب سامنے آئے تو لپکنا، خانہ محبوب کے اردگرد چکر لگانا، در و دیوار کو چھونا، پردہ ہائے دیوار سے لپٹنا اور رونا کہیں شوق میں لپکنا، کہیں خوف سے تھمنا، کہیں ذوق سے دوڑنا کہیں رعب جمال سے رکنا، خدام محبوب نمایاں ہوں تو نعرہ مستانہ کے ساتھ سر جھکا دینا اور دشمنان محبوب کا تصور آئے تو اکڑنا اور سینہ تان لینا، تجلی محبوب نمایاں ہوتو سرنگوں ہو جانا اور دشمن محبوب (شیطان) کا مقام سامنے آجائے تو کنکر پتھر لے کر لپکنا اور مارنا، ہر لذت ہر زینت اور ہر رسمی صورت سے بیزار رہنا، کسی ایک جگہ قرار نہ پکڑنا، کوچہ ہائے محبوب کے در در کی خاک چھاننا، کبھی مکہ تو کبھی منیٰ، کبھی عرفات، کبھی مزدلفہ نہ چال میں سکوں، نہ انداز میں قرار کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ اپنے کو مٹا دینے کا جذبہ اور تن من دھن کو خاک میں ملا دینے کا داعیہ اور آخر فدائیت وجاں سپاری کی انتہا پر اپنے نفس کو بھی باذن محبوب فدیہ حیوان دے کر فدا کر دینا ذرا بھی کوتاہی ہوتو مال وزر دے کر خوشامد سے تلافی کرنا، وسیلہ محبوب کا دھیان آئے جس کی بدولت رسائی ممکن ہوتو سو جان سے وہاں حاضر ہونا، سلام کرنا، لجانا اور شوق وذوق سے عرض ومعروض کر کے وسیلہ لینا وغیرہ وہ عاشقانہ افعال ہیں جو عشق ومحبت کے جذبہ میں فطرتاً عاشق سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفات جمال اور ذاتی محبوبیت کا مقتضا ہیں۔

حسنِ تعبیر...... ان میں سے ترک آسائش وآرائش اور ترک لذت وزیبائش کے مجموعہ کا نام احرام ہے خانہ محبوب کے اردگرد گھومنے کا نام طواف ہے۔ تصور اعداء کے موقعہ پر سینہ تان کر اکڑنے کا نام رمل ہے۔ ذوق وشوق میں

دوڑنے کا نام سعی ہے کوچہ ہائے محبوب کے دروں کی خاک چھاننے کے نام سیاحت حج ہے۔خاک صحن پر ٹھہر کر گریہ وبکاء کرنے اور شوق وصال کے اظہار کا نام وقوف ہے۔شیطان پر پتھر برسانے کا نام رمی ہے۔اور فدیہ حیوان کے ذریعہ خود فدا ہو جانے کا نام نحر ہےان میں سے کسی بھی عاشقانہ فعل میں فروگزاشت کا نام جنایت ہے۔اوراس کے تدارک وتلافی کا نام صدقہ وکفارہ ہے۔اور پھر افعال کے مجموعہ کا نام مناسک ہے۔اور پھر وسیلہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار (مدینہ) میں حاضر ہو کر زیارت کرنے اور صلوۃ وسلام کے بعد ہزار خوشامد سے وسیلہ لینے کا نام زیارت وتوسل ہے۔

عجز وعشق کے مظاہر...... بہرحال پہلا مظاہرہ عجز ونیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس وبنیاد بنائی گئی ہیں۔جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دو نوعوں (جلال وجمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کے ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔اس لئے اصولاً اسلام میں یہ دو ہی عبادتیں اصل ٹھہرتی ہیں کہ بلحاظ حقیقت ان کے سوا کوئی دوسری صورت عبادت کی ہے بھی نہیں' کہ عبادت کی متقاضی صفات کی نوعیں ہی یہ دو ہیں دو سے زائد نہیں۔

زکوۃ وروزہ کی حیثیت...... رہ گئی زکوۃ اور روزہ کہ عبادت انہیں بھی کہا گیا، بلکہ نماز وحج کی طرح مبانی اسلام میں شمار کرایا گیا ہے،سو بلاشبہ وہ عبادت ہیں اور اسلام کی اساسی ہی عبادت ہیں لیکن پھر بھی ان کے اور نماز حج کے عبادات ہونیکی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے غور کیا جائے تو زکوۃ اور روزہ خود اپنی ذات سے نہ عبادت ہے نہ اپنی ذات سے براہ راست مطلوب ہیں بلکہ نماز وحج کی خاطر مطلوب اور انہی کی بدولت عبادت بنی ہیں زکوۃ تو نماز کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت بنتی ہے اور روزہ حج کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت ہوتا ہے بالفاظ دیگر زکوۃ نماز کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور روزہ حج کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور وسیلہ چونکہ حکم میں مقصد ہی کے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں بھی نماز وحج کی وجہ سے عبادت بنادی گئیں خود اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔

موانع نماز اور ان کا تدارک...... وجہ یہ ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت میں اگر کوئی چیز حارج اور سدراہ ہے تو وہ سامان عیش اور وسائل عشرت ہیں جن کی لذتوں میں پڑ کر انسان میں نماز سے غفلت اور سستی وکسل پیدا ہوتا ہے اور آدمی جماعت سے ہی نہیں بلکہ نماز ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ نفس کی توجہ ایک آن میں دو طرف نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ نفس کے مرغوبات جب نفس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے تو مرغوب روحانی کی طرف کیسے متوجہ ہو سکے گا؟ اس لئے اکثر وبیشتر امراء ہی نماز سے غافل ہوتے ہیں۔کیونکہ ان کے اردگرد جب اسباب عیش ونشاط اور لذات نفس کا ہجوم رہتا ہے تو انکے نفس کو طبعاً مسجد کی طرف دوڑنے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ نماز کی طرف رخ کریں،

البتہ غرباء قلیل العیش اور محروم الوسائل ہوتے ہیں اس لئے عموماً وہ تعیش سے فارغ رہتے ہیں تو ان کا فارغ نفس بھی بے تکلف نماز کی طرف دوڑ سکتا ہے۔

امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اس لئے شریعت نے مال وزر اور وسائل عیش وعشرت میں (جن میں لگ کر آدمی نماز اور مسجد سے غافل ہوتا ہے) توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور انہیں کم کرنے اور دلوں سے ان کی محبت وشغف نکال دینے کے لئے زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھی تا کہ مال دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے اور لٹانے کے علاقے سے انسانی نفس میں سے زر پرستی اور اس سے پیدا شدہ تعیش پسندی کے غیر معتدل جذبات نکل جائیں اور مال لٹانے کی سالانہ عبادت، پھر روز مرہ کے صدقات کی خوبیاں سے خود نفس کو بھی راہ خدا اور راہ عبادت میں لٹا دینے کے جذبات پیدا ہو جائیں۔

پھر چونکہ وسائل عیش کا تعلق صرف نقد وزر ہی سے نہیں بلکہ زمینی پیداوار اور پالتو جانور، سواریوں کے حیوانات، زرتار لباسوں، زریں برتنوں حتی کہ ہر تجارتی سامان سے ہے اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کا دائرہ بھی صرف نقود سونا، چاندی اور دولت زر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام وسائل عیش میں اپنی اپنی شرائط وحدود کے ساتھ زکوٰۃ رکھی، چنانچہ پالتو جانور، گھوڑے، اونٹ، گائے بھینس، بکری وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی۔ کھیتوں کی پیداوار وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی جس کا نام عشر ہے معدنیات اور کانوں میں زکوٰۃ رکھی دفینہ اور ہاتھ آجانے والے خزانہ میں بھی زکوٰۃ رکھی جسکا نام خمس ہے، پھر ہر ایک مال تجارت پر زکوٰۃ رکھی خواہ وہ مٹی ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے زر و مال بڑھنے اور اس کے بڑھنے سے وسائل عیش اور سامان راحت بڑھنے کا قدرتی تعلق ہے اور وہی تعلق نفس کو عیش پرستی میں مبتلا کر کے عبادت سے غافل اور بے تعلق بنا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ جب رکاوٹ کے اسباب ہٹ جاتے ہیں تو شے وجود پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جب راہ عبادت کا حارج یعنی زر و مال اور وسائل عیش وعشرت کو بہ صورت زکوٰۃ و صدقات راہ خدا میں فنا کر دینے کی عادت پڑ گئی اور دل میں ان کی رغبت میں شدت اور ہوس قائم نہ رہی تو نماز سے رکاوٹ ڈالنے والے اسباب ختم ہو گئے، اس لئے نماز آسان ہو گئی پس زکوٰۃ وصدقات درحقیقت نماز کو بروئے کار لانے کے لئے فرض کی گئی ہے، اس لیے وہ وسائل نماز میں سے ہوئی جو آدمی کو کھینچ تان کر نماز تک پہنچا دیتی ہیں اس لئے عبادت کی لائن میں نماز اصل ہوئی اور زکوٰۃ اس کے تابع ہو کر عبادت بنی جب کہ وسیلہ مقصود حکم میں مقصود ہی کے ہوتا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ زکوٰۃ مبادی نماز میں سے ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ. اس انداز کی بکثرت آیتیں اس کی شاہد عدل ہیں۔

نماز کی تمہید...... یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال وزر نہ ہو اور وہ خود ہی نان شبینہ کا محتاج ہو تو اس پر زکوٰۃ کی فرضیت ہی نہیں حالانکہ نماز بدستور فرض رہتی ہے کیونکہ علاوہ تکلیف مالا یطاق کے یہاں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں

کیونکہ زکوٰۃ نماز کے موانع رفع کرنے کے لئے رکھی تھی، جب یہاں موانع صلوٰۃ ہی نہیں تو رفع موانع (زکوٰۃ) کی حاجت ہی کیا ہوسکتی ہے؟ چنانچہ اس قسم کے غریب مسکین انسان عام حالات میں نماز سے بھی بیگانہ نہیں ہوتے کیونکہ جب وسائل عیش ہی مفقود ہیں جو عبادت اور بالخصوص نماز میں حارج ہوتے تھے تو ایک بے زر اور بے پر آدمی طبعی طور پر خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور نماز میں کبھی سست نہیں ہوتا اسی لئے مسلم کو عام حالات میں زہدو قناعت کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ وہ جس قدر قلیل العیش ہوگا، اسی قدر طاعت وعبادت کی طرف رخ کئے ہوئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی اسے زکوٰۃ سے بیگانہ بنانے کے ہوئے، اگر زکوٰۃ بذاتہ مقصود ہوتی تو بجائے زہدو قناعت کے تمول اور تکاثر مال کی ترغیب دی جاتی بہرحال دولت ہوتو اس پر اندرون حدود زکوٰۃ وصدقات کے احکام عائد ہوکر اسے قلیل العیش بنادیتے ہیں اور نہ ہوتو اس پر احکام زکوٰۃ وصدقات اس لیے لاگو نہیں ہوتے وہ پہلے ہی قلیل العیش ہے۔ اس لئے ان دونوں ہی صورتوں میں آدمی اپنے مقصد تخلیق (عبادت) کی طرف توجہ کئے ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ دولت ومال چونکہ راہ عبادت میں حارج ہوتا ہے اور اس کے نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں کارخانہ عبادت میں خلل نہیں پڑتا۔

اس لئے زہدو قناعت اور مال کو لٹانے یا گھٹانے کی ترغیبیں دی گئیں جس سے زکوٰۃ کا وسیلۂ عبادت اور بالخصوص وسیلۂ نماز ہونا نمایاں ہے۔ اور ثابت ہوجاتا کہ حقیقی عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہی ہے جس کے بغیر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہوسکتا اور زکوٰۃ اس کا وسیلہ اور اسے بروئے کار لانے کی ایک تمہید ہے خود اصل نہیں۔

موانع حج اور ان کا تدارک...... ادھر حج کی عاشقانہ عبادت چونکہ مظاہر محبت ہے اور محبت میں سب سے پہلی چیز ماسوا اور غیر محبوب کا ترک ہے ورنہ اگر عاشق غیر محبوب کی طرف مائل ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کی طرف اس کا میلان یا سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو کمزور ہے تو اسے عاشق ہی کیوں کہیں گے۔

پس ایک حج کرنے والے عاشق خداوندی کا پہلا قدم خدا کے ماسویٰ کو ترک کردینا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ماسویٰ اللہ مرغوبات نفس ہی ہوسکتے ہیں۔ جن میں بڑا مرغوب جس سے انسان کا دل اٹکا ہوا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور عورت سے لذت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے سارے جھگڑے انہیں چند مرغوبات نفس کے لئے آدمی سر لیتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک دل میں ان چیزوں سے شغف اور کمال رغبت باقی رہے گا۔ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ شانہ) کا شغف وعشق اس دل میں کہاں سے جگہ پاسکے گا؟ اس لئے اس محبت وعشق کی عبادت یعنی حج کے ابتدائی مراحل میں ایک عاشق خداوندی کے لئے سب سے پہلے کھانے پینے اور بیوی کی لذت اٹھانے کے شغف اور غیر معمولی لگاؤ سے الگ رہنا قدرتاً ضروری ہوجاتا ہے۔

ورنہ عشق الٰہی کا مظاہر جسے حج کہتے ہیں شروع ہی نہ ہوسکے گا۔ اس لئے شریعت نے حج کے مہینوں سے قبل متصلاً ہی رمضان کا مہینہ رکھا تاکہ تیس دن تک نفس کے ان اولین مرغوبات کھانا پینا اور لذت جماع کی غیر معمولی

خواہش کو روزہ کے ذریعے کم سے کم کر دیا جائے۔ پس مہینہ کے تیس دنوں میں دن بھر تو یہ لذتیں روزہ کے ذریعہ بالکل ہی چھڑا دی جاتی ہیں اور بھوک پیاس سے کمزوری لاحق ہو جانے سے رمضان کی راتوں میں بھی آدمی ان لذتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا ادھر راتوں میں تراویح اور تلاوت قرآن پاک کا شغل مقرر کر دیا گیا جس سے ان لذات کے لئے کچھ وقت بھی پورا نہیں ملتا کہ آدمی کا دل ان میں پھنسے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک ان لذتوں سے بیگانہ رکھ کر رمضان میں یہ بنیادی لذتیں چھڑا دی جاتی ہیں تا کہ ان مرغوبات نفس کی خواہش ابھری ہوئی نہ رہے بلکہ ان کی محبت و رغبت کا دھیان دب جائے اور آدمی ان سے بیگانہ ہو کر محبت حق کے مظاہرہ کے قابل ہو جائے۔

حکمتِ اعتکاف...... لیکن اس کے بعد بھی گھر بار کی محبت بدستور باقی رہتی تھی مکان کی آسائش اور گھریلو سامان کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ حالانکہ یہ بھی وہی ماسوی اللہ ہے جو محبت الٰہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے ہی درجہ میں سہی، اس لئے رمضان کے بیس دن گزرنے کے بعد عشرۂ آخر میں اعتکاف کی سنت کے ذریعہ گھر بھی چھڑا دیا جاتا ہے تا کہ آدمی گھریلو زندگی چھوڑ کر خانہ خدا میں پہنچے اور رات دن وہیں بسر کرے اور اس طرح کھانے پینے اور لذت جماع سے بیگانگی کے بعد وہ گھریلو سامان سے بھی دستبردار ہو جائے اور اس طرح نفس کے اور دوسرے محبوبات بھی ترک کرنے کی اس میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔

خطابِ حج...... پس! ماہ رمضان میں ان بنیادی لذات کے ترک کر دینے کی مشق سے جب آدمی کا دل محبوب حقیقی کی طرف بڑھ گیا اور اس کی طرف دوڑنے کی اس میں قریبی استعداد پیدا ہو گئی تو رمضان ختم ہوتے ہی اشہر حج (حج کے مہینے) شروع ہو جاتے ہیں اور افعال حج کے آغاز کا وقت آ جاتا ہے کہ آدمی دیار محبوب کی طرف دوڑ پڑے گویا اس عاشق خداوندی کی طرف کھانے پینے بیوی بچوں اور گھر بار سے دل ہٹا لیا تھا۔ شرعی خطاب متوجہ ہوتا ہے کہ اس عشق کی راہ میں کھانا پینا بیوی اور گھر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے، اب وطن بھی ترک کر دو اور دیار محبوب کی طرف کوچ کرو کہ وطن بھی ایک بڑا بت ہے جو راہ خدا میں حارج ہوتا ہے۔

حکمتِ احرام...... پھر یہ عاشق خداوندی جب وطن چھوڑ کر جنگلوں بیابانوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا دیار محبوب میں داخل ہو گیا تو حرم الٰہی کی میقات آتے ہی محبوب حقیقی کا حکم یہ ملا کہ یہ کھانے پینے زن و فرزند گھر بار اور وطن و ملک کا چھوڑ دینا بھی اس راہ عشق میں کافی نہیں بلکہ لباس زینت بھی ترک کر و سلے ہوئے کپڑے بھی چھوڑ دو کہ اس لذت کا شغل بھی محبوب حقیقی کے وصال میں حارج اور عشق کی غیرت کے خلاف ہے۔ صرف تن ڈھانکنے کی حد تک احرام کی کفنی پر قناعت کرو، ایک چادر بدن کا نصف بالا ڈھانکنے کے لئے اور ایک چادر بدن کا نصف زیریں۔ چھپانے کے لئے ہو نہ سر پر ٹوپی اور عمامہ ہو جو سر کو ڈھانپ دے نہ پیر میں کوئی گھیرا جوتا جو پورا ڈھانپ لے تا کہ جیسے رمضان میں اس عشق الٰہی کا باطن گرویدہ محبت ہو چکا تھا، اب اس کا اظہار

بھی آثار عشق سے ہو جائے اور اس عاشق الٰہی کو عشق میں تن من دھن کی کوئی خبر نہ رہے۔

عاشقانہ بول...... لیکن اس ظاہر و باطن کے درمیان کی ایک چیز ابھی باقی تھی جو ابھی تک آثار عشق سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور وہ زبان ہے جو کسی حد تک ظاہر ہے اور کسی حد تک باطن یعنی ظاہر و باطن کے درمیان ایک برزخ ہے جو باطن کی تو ترجمان ہے اور ظاہر کی نگہبان ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اسے بھی اس عشق سے حصہ ملے اور ظاہر ہے کہ زبان کا حصہ قول اور بول ہی کی شکل کا ہوسکتا تھا اس لیے اسے عاشقانہ بول دیا گیا کہ وہ قدم قدم پر خود اپنی ترجمانی کی بجائے محبوب حقیقی کی محبت کی ترجمانی کرے اس لئے احرام باندھتے ہی زبان کو لبیک لبیک کے کلمہ سے ذکر محبوب کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ زبان کے ذریعے نفس اور خواہشات نفس کی ترجمانی نہ ہو بلکہ حضوری حق کے جذبات کی ترجمانی ہو اور اس قینچی کی طرح چلنے والی زبان کے تقاضے آزاد نہ رہیں کہ وہ جتنا چاہئے اور جو چاہے بولتی رہے اس لئے عاشق کے ان ایام عشق میں ہر تغیر اور ہر موڑ پر لبیک کا نعرہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نیچائی اونچائی ہر پہاڑ ہر غار ہر قافلہ ہر جماعت کی مڈبھیڑ پر یہی عاشقانہ و والہانہ نعرہ زبان پر چھایا ہوا رہے کہ لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک پس اس طرح کی آزادلذت بھی اس عاشق حق سے ترک کرادی گئی اور یہ عاشق اپنی زبان اپنے دل اور اپنے تمام تر اعضاء وجوارح سے صرف اپنے محبوب حقیقی ہی میں مشغول ومنہمک ہو گیا۔

حکمتِ طواف...... اب جب کہ خانہ محبوب تک رسائی ہوگئی۔ آدمی مکہ محترمہ اور حرم محترم میں پہنچ گیا اور خانہ خدا کے سامنے آ گیا جس میں جمالات حق تجلی ریز ہیں تو پھر شرعی خطاب متوجہ ہوا کہ تم نے اب تک محبوبات نفس گھر بار وسائل عیش اور اسباب راحت وعیش کی خاطر بہت چکر لگائے تھے اب یہ چال اور چکر ان سب چیزوں سے ختم کر کے خانہ محبوب کے لیئے مختص کر دو اور عشق کی وارفتگیوں میں غرق ہو کر محبوب کے گھر کے اردگرد پروانوں کی طرح چکر لگاؤ ایک دو پھیروں سے نہیں بلکہ سات پھیرے پھر جوفن حساب کی رو سے عدد زائد ہے اور کبھی گھٹنے والا نہیں پھر طواف بھی ایک دو بار نہیں بلکہ ان پاک ایام اور مکہ کے قیام کی اعلیٰ ترین عبادت ہی یہ چکر لگانا اور خانہ محبوب کے اردگرد گھومتے پھرتے رہنا ہے جس کا نام طواف ہے۔

حکمتِ وُقوفِ عرفات...... پھر مکہ کے مقدس شہر کا قیام گو وطن کا قیام نہیں مگر بہر حال شہر کا قیام ضرور ہے۔ اس میں وطن کی عمارتیں نہ سہی بلدِ الٰہی کی ہی سہی جو شہری زندگی کی ساری راحتیں لذّتیں اور زینتیں لئے ہوئے ہیں اور عاشق کی شان غیرت کے یہ بھی خلاف تھا کہ عاشق کا دل عمارتوں اور سامان عیش وتمدن میں کسی بھی درجہ میں اٹکا رہے اس لئے اصل حج کے لئے جو حقیقی طور پر شان عشق کا مظاہرہ تھا ایام حج میں حکم یہ ملا کہ مکہ کی شہری آبادی بھی ترک کرو اور عرفات کے ریگستان میں ننگے سر ننگے پاؤں کفنی پہنے ہوئے پہنچو کہ اصل حج یہی ہے کہ ایک چٹیل میدان میں گھر بار بیوی بچے سامان تمدن اور وسائل عیش کی متقاضی ہوتی ہے بلکہ ایک کپڑے کا مسافر خانہ یعنی خیمہ ہو اور تم ہو۔ تاکہ اعلیٰ ترین ترک لذات کا مقام حاصل ہو جائے جو ایک عاشق کے لئے سزاوار واجبات عشق کے لئے درکار ہے۔

فدیۂ جان...... ہاں مگر پھر بھی سب تروک کے بعد عاشق کانفس ابھی عاشق کے پاس ہی تھا جس کی رو سے وہ اپنے کو "انا" اور "میں" کہہ سکتا تھا۔ دارانحالیکہ کمال عشق کے لئے یہ بھی ایک چیلنج ہے کہ عاشق اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر بمقابلہ محبوب اس کا تصور بھی دل میں قائم رکھے۔ بلکہ اس کا آخری فریضہ یہ ہے کہ راہ محبوب میں اپنے نفس کو بھی ایثار کردے اور اس ظاہری ہستی سے بھی سبکدوش ہو جائے تو خطاب شرعی متوجہ ہوا کہ عرفات سے لوٹ کر منی پہنچو اور اس کے قطعہ جاں سپاری میں پہنچ کر جسے منحر کہتے ہیں نثار ہونے کے لئے اپنی جان بھی پیش کردو، یعنی اسے بھی ترک کرنے کا عزم باندھ لو، اب یہ محبوب حقیقی کا لطف وکرم ہے کہ اس سچے عاشق کی طرف سے جس نے اپنی ساری زندگی کی تمام لذات اور آخر کار خود زندگی ہی کو پیش کر دیا، قبول فرما کر اس کی جان کے بدلے قربانی کے جانور کی جان بطور فدیہ قبول فرمالے اور اس کے بعد پھر گھر لوٹ جانے اور متروکہ وسائل عیش سے لذت اندوز ہونے کی اجازت عطا فرمائے۔ اس لئے منی میں قربانی کا حکم ہوا کہ جان کا فدیہ جان سے دیدو۔ یہ خود تمہارا اپنے نفس کا فدا ہونا ہی سمجھا جائے گا پس محبوب کے لئے آخر میں جان بھی پیش کردی جاتی ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے۔

مقدمۂ حج...... بہرحال اس سے واضح ہے کہ حج تروک کا مجموعہ ہے، ترک لذت، ترک زینت، ترک راحت خانہ ترک لباس ترک وطن ترک جاہ۔ اور ترک مال وغیرہ جس کی ابتداء کھانے پینے اور عورت اور گھر کے ترک کرنے سے ہوتی ہے، یہی دینوی زندگی کی لذات کا اعظم ترین حصہ ہے بلکہ دوسری لذات کا سرچشمہ ہے، جسے اشہر حج سے قبل کے مہینے (رمضان) میں حج کی خاطر چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے تروک کی استعداد پیدا ہو جائے، اگر کھانے پینے اور بیوی۔ سے کنارہ کشی کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو اگلے کسی ترک پر بھی آدمی مستعد اور آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے روزہ کی عبادت درحقیقت حج کا مقدمہ ثابت ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی عبادت نماز کا مقدمہ ثابت ہوئی تھی جس سے پوری طرح کھل جاتا ہے کہ اسلام میں اصل عبادتیں دو ہی ہیں نماز اور حج۔ ایک صفاتِ جلال کا تقاضا ہے اور ایک صفات جمال کا اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے وسائل اور مبادی میں سے ہیں۔ جنہیں ان دو کی وجہ سے عبادت بنا دیا گیا ہے۔ خود بذاتہ عبادت کے بارہ میں اصل نہیں ہیں۔

زکوٰۃ وروزہ "عبادت لغیرہ" ہیں...... یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز اور حج میں وسائل دولت یا وسائل لذت کے حارج ہونے کا امکان نہ ہو وہاں نماز اور حج تو ہو گا مگر زکوٰۃ وروزہ کی عبادت نہ ہو گی جیسے ملائکہ کو نماز بھی دی گئی ہے وہ ہر وقت رکوع وسجود اور قیام میں ہیں اور حج بھی دیا گیا ہے۔ کہ وہ روزانہ ساتویں آسمان پر "بیت المعمور" کا حج اور طواف کرتے ہیں بلکہ ہر آسمان میں بیت المعمور کی سیدھ میں ایک ایک قبلہ ہے جس کا اس آسمان کے باشندے طواف کرتے ہیں مگر ملائکہ میں چونکہ نہ مال ودولت کا قصہ ہے نہ شہوت وزینت اور غضب کا کہ وہ نماز اور حج سے روکیں اس لئے انہیں نہ زکوٰۃ کا پابند کیا گیا نہ روزہ کا کہ وہ خود ہی پاک ہیں، پھر مال دلوا کر اور روزہ رکھوا کر انہیں پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس سے صاف نمایاں ہے زکوٰۃ اور روزہ درحقیقت نماز اور حج ہی کے لئے رکھا گیا

ہے اور یہ ان کے مبادی میں سے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ نفس کو پاک اور صالح بنا کر نماز اور حج کے لئے مستعد بنایا جائے پاکی اور صفائی پہلے سے حاصل ہے وہاں نماز اور حج تو قائم رہے زکوٰۃ اور روزہ درمیان میں سے نکال لیا گیا، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نماز اور حج تو صفات الٰہیہ کا تقاضا ہیں۔ ایک صفات جلال کا اور ایک صفات جمال کا لیکن زکوٰۃ اور روزہ صفات نفس کا تقاضا ہیں کہ جب تک زکوٰۃ اور روزہ کے ذریعے انسانی نفس کو پاک نہ کیا جائے وہ نماز اور حج کے قابل نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ حقیقی معنی میں عبادت وہی ہوتی ہے جس کا تقاضا معبود کی صفات کریں نہ کہ وہ جن کا تقاضا خود عابد کی صفات کریں، گو معبود ہی کے لئے کریں، اس لئے نماز اور حج تو بذاتہ یا خود عبادت ثابت ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزہ بذاتہ عبادت نہیں بلکہ ان دو اصلی عبادتوں کا وسیلہ بن کر لغیرہ عبادت ثابت ہوئیں اور یہی مقصود تھا اس بیان کا۔

نماز و حج میں باہم نسبت تضاد......اب ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں مزید غور کیا جائے تو جیسے ان میں بلحاظ منشاء کے فرق ہے کہ ایک جلالی صفات سے پیدا شدہ ہے اور ایک جمالی صفات سے ایک میں گرمی ہے اور ایک میں نرمی ویسے ہی ان کے آثار ولوازم میں بھی کافی فرق بلکہ تضاد کی نسبت ہے، جو چیزیں نماز میں مستحسن اور ضروری ہیں وہ حج میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ ممنوع اور قبیح ہیں، اور جو باتیں حج میں مطلوب اور ضروری ہیں وہ نماز میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔

نماز چونکہ احکم الحاکمین کے شاہی دربار کی حاضری ہے اس لئے اس میں تو آداب شاہی کی رعایت کی گئی ہے پنج وقتہ وضو جو غسل کے قائم مقام ہے لباس کی صفائی اور ستھرائی اور اس پر خوشبویات کا استعمال، وقار اور متانت کے ساتھ مساجد کی حاضری کی بھاگتے دوڑتے نہ آویں بلکہ متین چال سے چل کر پہنچیں، سنجیدگی سے نشست و برخاست ہو، بے ڈھنگا پن نہ ہو، سکوت و خاموشی یا ذکر خفی کے ساتھ بیٹھنا ہو، شوروشغب یا آواز کی بلندی نہ ہو، بخلاف حج کے کہ وہ محبوب کے در پر عشاق کی حاضری ہے اس لئے وہاں عشق و محبت کی وارفتگی، سوز و گداز افروختن و سوختن و جامہ گذیدن اور بیتابی و تڑپ کے ساتھ وجدی حرکتیں مطلوب ہیں تا کہ عقل و مصلحت بنی کی باتیں یا اپنی آرائش و زیبائش اور زیب و زینت جس سے عاشق کو اپنی دھن میں مٹے رہنے کے سبب کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس لئے اگر نماز میں صفائی ستھرائی اصل تھی تو یہاں بے زیب و زینت رہنا اصل ہے کہ "اَلْحَجُّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ" ① وہاں لباس عمدگی کی مطلوب تھی تو یہاں سرے سے سلا ہو لباس ہی ممنوع ہے، وہاں لباس کی زینت مطلوب تھی تو یہاں ترک زینت مطلوب ہے وہاں خوشبو لگانا مستحسن تھا یہاں احرام کے بعد خوشبو حرام ہے، وہاں نمازوں اور بالخصوص جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لئے بدن کی معتدل زینت ضروری تھی جو حجامت سے حاصل ہوتی

① السنن للترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی فضل التلبیة والنحر. ص: ۱۷۲۹، رقم: ۸۲۷.

ہے۔ یہاں محرم کے لئے سرے سے بدن کی آرائش، اصلاح خط اور حجامت ہی ناجائز ہے، وہاں سکوت اور سروخفا ضروری تھا یہاں لبیک لبیک کا شور ہے وہاں سکون اعضاء وجوارح ضروری تھا کہ ایک جگہ جم کر کھڑے رہیں یا فکر میں مستغرق رہیں اور بیٹھیں تو گردن جھکا کر سکون سے بیٹھے رہیں۔ یہاں نقل وحرکت بلکہ بھاگ دوڑ ضروری ہے۔ کہیں صفا مروہ پر دوڑنا کہیں طواف میں چکر کاٹنا، وہاں تواضع سے گردن جھکانا ضروری تھی اور یہاں سعی سے پہلے کے طواف میں گردن تاننا اور اکڑ اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجبات میں سے ہے، وہاں نمازوں کا اکثر حصہ جیسے سنتیں اور نفلیں گھر میں پڑھنا مستحب تھا، یہاں سرے سے گھر چھوڑ دیا محبوب میں آنا ضروری ہے کہ حج فرض ہو یا نفل گھر بیٹھ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

وہاں خون گرانے سے بچنا ضروری تھا اور یہاں اہراق دم یعنی منیٰ میں خون بہانا ہی اصل عبادت ہے، وہاں شیطانی وسوسوں کا مقابلہ ناپسند بلکہ دفع الوقتی اور ادھر سے خیال ہٹا دینا ہی وسوسہ کا علاج ہے۔ یہاں خود شیطان کے مواقع ومحل کے بھی مدمقابل آ کر اسے کنکروں سے سنگسار کرنا ضروری ہے، غرض وہاں افعال ہی افعال ہیں اور یہاں تروک ہی تروک۔

وہاں بقاو شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضاء ہے اور یہاں فناء ومحویت کی شان وھاں بقاء شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضہ ہے اور یہاں فناو محویت کی شان لازمی ہے جو عشق کا مقتضاء ہے غرض ان دونوں عبادتوں کے لوازم وآثار میں تضاد کی نسبت ہے، جیسا کہ عقل اور عشق کے تقاضوں میں تضاد کی نسبت ہے، بادشاہ کے دربار میں عقل وہوش کے ساتھ آنا پڑتا ہے، اور محبوب کے در پر عقل وشعور سے بالا ہو کر محویت وربودگی کے ساتھ حاضر ہونا ہوتا ہے غرض یہ واضح ہو گیا کہ ادھر حق تعالیٰ کی صفات کمال کی دو شانیں تھیں، صفات جلال اور صفات جمال اور ادھر ہر بندہ میں بھی دو ہی جوہر رکھے گئے تھے۔ ایک عقل اور ایک عشق یعنی اگر اللہ کی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حاکم بھی ہو اور محبوب بھی۔ تو بندہ کے ان دو جوہروں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا محکوم بھی ہو اور عاشق بھی۔

ان دونوں تقاضوں سے یہ دونوں عبادتیں مقرر ہوئیں، ایک نماز جس میں حاکم حقیقی کے سامنے اپنی محکومیت وفدویت اور نیازمندی وعبدیت پیش کی جاتی ہے، اور ایک حج جس میں محبوب حقیقی کے سامنے اپنی محویت اور رلودگی اور جاں نثاری اور جاں سپاری پیش کی جاتی ہے، اس لئے دونوں عبادتیں اسلام کا بنیادی موضوع ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لئے جن میں اسلام سمجھانے کے لئے تحریری مواد فراہم کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ اولاً عبادات اور خصوصاً نماز وحج کے لئے سب سے پہلے مواد فراہم کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں عبادتیں اسی کی مستحق بھی ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں۔ چنانچہ نماز پر بھی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن میں نماز کے مسائل نماز کے افعال، نماز کی روح، نماز کے اسرار، نماز کے مصالح، نماز کی غرض وغایت، نماز کے ثمرات ونتائج وغیرہ جمع کئے گئے ہیں اور ایسی کتابوں کا ایک بڑا عدد تاریخ کے اوراق میں دستیاب ہوتا ہے۔

اسی طرح مناسک حج پر بھی کتابوں کا ایک ذخیرہ ملے گا جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مرتب ہوا ہے۔ فضائل حج، مسائل حج، دلائل حج، اسرار حج، آثار حج، شعائر حج، مقامات حج، تاریخ حج، جغرافیہ حج، طریق حج وغیرہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دونوں موضوع اسی کے مستحق بھی تھے کہ ان پر سفینے مرتب ہوں اور ان کے حقائق محض سینوں کی امانت نہ بنے رہیں جب کہ یہی دو عبادتیں اسلام کی اساس اور حقیقی عبادتیں تھیں جن سے دوسری عبادتوں نے جنم لیا، پھر اس میں بھی خصوصیت سے حج کی عبادت چونکہ نقل وحرکت اور سیر وسیاحت کی عبادت تھی جس میں ایک حاجی کو اپنی نظر وفکر کی مستعدی کی حد تک مختلف رنگ کے تجربات بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے حج سے متعلقہ تصانیف میں سفرناموں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اہل علم حجاج نے بوقت سفر حج قلمبند کیا اور اپنے تجربات سے مابعد کے حجاج کو مستفید ہونے کا موقع بخشا تا کہ ان کے تجربات سے بعد کے لوگ مختلف معلوماتی فوائد بھی حاصل کریں اور پچھلوں کے تجربات اگلوں کے لئے راہ حج میں مدد اور آسانیوں کا ذریعہ ثابت ہوں۔

علمی حج...... خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے بھائی مگر بزرگ بھائی دوست اور مخلص دوست متدین اور متقی عالم مولانا محمود حسن صاحب گیاوی دام مجدہ فاضل دیوبند نے بھی اپنے سفر حج میں اپنے عملی حج کو علمی حج بنانے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے سفر حج کے کوائف وتجربات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سفرنامہ کی صورت میں مرتب فرمایا نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ شرعی اور فنی طور بھی حج کے مختلف پہلوؤں کو اپنے علم وعمل اور تجربہ کی روشنی میں جمع فرمایا ہے، جس کے عنوانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں حج کے تمام مَالَهٗ وَمَاعَلَيْهِ سے بحث کرتے ہوئے مسائل، فضائل، دلائل، شمائل، شعائر آثار، وقائع حوادث وضروریات وغیرہ کا ایک معتدبہ اور بڑا ذخیرہ جمع فرمادیا ہے جو ان کے علم وعمل اور اخلاص وایثار کا شاہکار ہے اس لئے یہ سفرنامہ تاریخ، تحقیق، فقہ، کلام، روایت اور درایت ہر پہلو سے حج کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے حج کو'' آئینہ'' بنا کر طالبوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور خصوصیت سے یہ مصنف ممدوح کا خاص احسان ہے کہ انہوں نے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات سے بھی دنیا کو فائدہ پہنچانے کی سعی فرمائی ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنَّا وَعَنْ جَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَآءِ.

آئینۂ حج اور آئینۂ نمائی...... محترم مصنف کی خواہش تھی کہ میں اس رسالہ'' آئینہ حج'' پر بطور مقدمہ چند سطریں لکھ کر پیش کروں میرے لئے سب سے بڑی مشکل وقت نکالنے کی تھی، پھر اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسے اہم اسلامی موضوع پر قلم چلانے کی تھی اور اوپر سے کتاب اپنی جامعیت اور مکمل تفصیلات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے بھی مقدمہ وتمہید سے بے نیاز بھی تھی جب کہ اس میں جن کا پہلو خود ہی موجود ہے اس لئے تعمیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی پھر بھی یہ چند سطریں کسی نہ کسی طرح سفر وحضر میں تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر پوری کیں اور محض'' آئینہ حج'' پیش کردینے کے لئے پیش کردی گئیں تا کہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر لوگ خود ہی اس کا اور اپنا اندازہ لگاسکیں۔ ورنہ جہاں تک حج کے

پہلوؤں کا تعلق ہے یہ "آئینہ" سارے حج کا خود ہی آئینہ دار ہے، جس کے جوہروں میں حج کے سارے ہی پہلو جلوہ گر ہیں، نہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی، نہ تمہید کی، نہ مقدمہ کی، پس یہ مقدمہ آئینہ حج میں خود اپنے کو دیکھنے کے لئے بطور آئینہ کے پیش کیا جا رہا ہے نہ کہ حج کو دیکھنے کے لئے۔ کہ حج نمائی کا آئینہ بنانا۔

مصنف محترم جیسے عالم و فاضل کا کام تھا جنہوں نے آئینہ حقیقتاً بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ میرا کام صرف آئینہ نمائی تھا جو برے بھلے انداز سے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنف ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور سفرنامہ کی اس علمی سعی کو مشکور فرمائے۔ (آمین)

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

پس منظر...... جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر امیر جامعہ اور منتظمین جلسہ کے اصرار پر حضرت مہتمم صاحب (رحمۃ اللہ) نے ایک نہایت ہی مختصر مگر نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا جو اس درجہ موثر و مقبول ہوا کہ اساتذہ کرام جامعہ ملیہ اور دیگر حضرات نے حضرت موصوف سے اس کے قلمبند کرنے کی فرمائش کی۔ تا کہ اشاعت کے ذریعہ اس کو غائبین تک بھی پہنچایا جائے اور وہ بھی اس سے اسی طرح مستفیض و محظوظ ہوں جس طرح حاضرین نے فیض حاصل کیا۔ چونکہ وہاں مصروفیت زیادہ رہی اور قیام گاہ پر زائرین اور ملاقاتیوں کا برابر ہجوم رہا۔ اس لئے اس خطبہ کو قلمبند کرنے کا موقع نہ ملا۔

دیوبند مراجعت فرمانے کے بعد احقر کے اصرار پر باوجود انتہائی عدیم الفرصتی کے حضرت موصوف نے یہ خطبہ قلمبند فرما کر مرحمت فرمایا ہے کہ اگرچہ تقریر کا بعد از وقت بعینہ تحریر میں آ جانا تو عادتاً ناممکن ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چونکہ یہ تحریر حضرت موصوف کے قلم سے ہو کر شائع ہو رہی ہے اس لئے ایک حد تک اصل تقریر کی غمازی کر سکے گی۔

(احقر: مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

اہمیت نماز

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ○﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْامَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

کائنات کا انتہائی مقصد...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی تقریر کرنا منظور نہیں ہے اور نہ اس کا پروگرام ہی ہے، مجھے امر کیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات سے مسجد کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں دعا کراؤں یہ ظاہر ہے کہ دعا کرانے کی چیز نہیں ہے۔ کرنے کی چیز ہے۔ آپ بھی خود ہی دعا کریں گے اور یہ بھی دعا کرنے میں آپ کے ساتھ شامل ہوگا۔ اس لئے دعا کرانے کے لئے بھی میں نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ مقصد دعا سے پہلے دعا کے نقاط پر توجہ دلانا ہے کہ کن پہلوؤں پر دعا کریں گے۔ اور حق تعالیٰ سے کن مقاصد کا سوال کریں گے۔ کیونکہ اس وقت مطلقاً دعا مقصود نہیں ہے بلکہ دعا خاص مقصود ہے۔ سو اس دعا کے نقاط اور پہلوؤں پر اس طرح سے غور کیجئے کہ اس ساری کائنات کا پھل اور آخری مقصد انسان ہے جس کے لئے زمین و آسمان کا یہ سارا خیمہ تانا گیا ہے۔ اگر انسان کی تخلیق منظور نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق بھی عمل میں نہ آتی۔ پس ساری کائنات انسان کی خاطر بنائی گئی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ. ② "ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے"۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ ③. "اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہیں"۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۳.

② شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۹.

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ﴾ ①

''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی کو اتارا اور اس سے پھل اگائے تمہارے رزق کے لئے اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگایا تا کہ اس کے حکم سے وہ دریا میں چلیں اور دریا تمہارے کام میں لگائے اور آفتاب ماہتاب تمہارے کام میں جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے کام میں لگا دیا اور وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے اس سے مانگا۔(خواہ دعا قولی سے یا دعا عملی یعنی اختیار و اسباب سے)''

پس زمین و آسمان، رات دن کا لوٹ پھیر، شجر و حجر اور بحر و بر کا کارخانہ سب کچھ انسان ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا انتہائی مقصد انسان ہے۔ پھر یہ انسان کس لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات کے لئے نہیں۔ ورنہ وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جائے گا اور یہ خلاف نقل و عقل اور خلاف مشاہدہ ہے جیسا کہ واضح ہوا۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ ہے کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بلکہ خالق کائنات کے لئے ہے یعنی اس کی عبادت کے لئے۔ اس کے سامنے جھکنے اور گڑ گڑانے اور اس کے آگے سر عبودیت خم کرنے کے لئے پس انسان کا مقصد تخلیق عبادت نکلا اور اب منطقی اصول پر نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے لئے تو ساری کائنات کی یہ تنظیم و تخلیق صرف عبادت کے لئے عمل میں آئی ہے۔

عبادت کا فرد کامل...... عبادت پر اگر آپ غور کریں گے تو اس کا فرد کامل نماز ہے۔ گویا ساری دنیا نماز کے لئے بنائی گئی ہے کہ یہی عبادت کا فرد کامل اور مظہر اتم ہے بلکہ میں ترقی کر کے یہ عرض کروں گا کہ سلسلہ عبادت میں عبادت صرف نماز ہی ہے اور کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کے معنی غایت تذلل اور انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جو انتہائی عزت والے کے سامنے اختیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے نماز کے سوا کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں نکلتی۔ مثلاً روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں کیونکہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور تمام لذات نفسانیہ سے مستغنی ہو جانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنا اور عدم احتیاج ذلت نہیں۔ کیونکہ غنا تو خود خالق کی شان ہے تو خالق کی شان اختیار کرنا عیاذاً باللہ ذلّت تھوڑا ہی ہے۔ یا صدقہ و زکوٰۃ دینا عطا ہے اور عطا تو خود اللہ کی صفت ہے اور معاذ اللہ ذلت کیسے ہو سکتی ہے؟ یا سچ بولنا خدا کی شان ہے تو اسے عبادت اور غایت تذلل کیسے کہہ دیں گے۔ اسی طرح اور تمام اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ بذاتہ ذلت نہیں کہ انہیں عبادت کہا جائے پھر بھی جو انہیں عبادت کہا جاتا ہے محض امتثال امر خداوندی کی وجہ سے نہ کہ بالذّات۔ ہاں نماز بالذّات عبادت ہے، کیونکہ اس کی ہیئت کذائی قیام، قعود، رکوع اور آخر کار سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیکنا انتہائی ذلت اور عبودیت کا اظہار ہے، اس کے اذکار مشتمل ہیں یا اظہار فدویت نفس پر یا اعلان عزت رب پر۔ اور یہ خود شان تذلل ہے۔ غرض نماز کی

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراهيم، الآية: ۳۲، ۳۳.

ہیئت اور حقیقت سب مظہر ہے شؤن تذلل اور احوال عبودیت پر۔

حاصل یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق عبودیت یعنی نماز کے واسطے ہوئی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے نماز ہی کا ساری کائنات کو پابند ظاہر فرمایا ہے نہ کہ زکوۃ و حج اور صوم و صدقہ کا۔ فرمایا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ① ''ہر چیز نے (خلقۃً اور تکوینی ہدایت سے) اپنی نماز اور تسبیح (یعنی ہیئتِ نماز اور اذکارِ نماز) کو جان لیا ہے''۔ جس سے واضح ہے کہ ساری کائنات نمازی ہے، بھلا پھر انسان کو تو کیوں نہ نمازی بنایا جاتا۔ فرق اتنا ہے کہ اور مخلوق غیر عاقل ہے تو اس میں نماز کا داعیہ جبلی اور تکوینی طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انسان ذی عقل و ہوش ہے۔ تو اس کی نماز اختیاری ہے، جس کے لئے ہدایت و رہنمائی اور وعظ و پند کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس اگر انسان نمازی نہ ہو تو گویا اس نے اپنے مقصد تخلیق کو فوت اور ضائع کر دیا۔ اس لئے فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام رعایائے اسلام کے نام فرمان جاری فرمایا تھا کہ:

نماز ہے تو کل دین ہے...... إِنَّ أَهَمَّ أُمُوْرِكُمْ فِيْ دِيْنِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهٗ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ ② ترجمہ: میرے نزدیک تمہارے دین میں سب سے زیادہ اہم چیز نماز ہے، جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسرے دینے کاموں کو اس سے بھی زیادہ ضائع کرے گا۔ اس سے واضح ہے کہ دین کے دوسرے کاموں کی بقاء بھی درحقیقت نماز ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے، اسی سے عظمت حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔ غرض نماز ہے تو کل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں، اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہان ہے ورنہ حرمان و خسران ہے۔ بس اسی مقصدِ نماز کی تکمیل کے لئے یہ سنگِ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نماز اپنے مشروع طریق سے اسی مقدس جگہ میں ادا کی جائے۔

نماز تعلق مع اللہ کی مظہر اتم ہے...... اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو جامعہ نے اپنے پروگراموں میں رسوم ادا کی ہیں اور اب حقیقت ادا کی ہے وہ سب چیزیں نمائشی تھیں۔ حقیقت اگر ہے تو صرف یہ، جیسے اس وقت انجام دے رہے ہیں کہ اس سے مقصد زندگی تکمیل پا رہا ہے۔ نماز مظہر اتم ہے تعلق مع اللہ کی۔ اگر نماز اور تعلق مع اللہ قائم ہے تب تو یہ ساری رسمیں جو ہم نے ادا کی ہیں باروح اور زندہ کہی جائیں گی، ورنہ یہ سب چیزیں جو رسم کی شکل سے ادا کی گئی ہیں ایک بے جان لاش ثابت ہوں گی۔ اور لاش کا انجام یہ ہے کہ وہ چند ہی دن بعد گلے، سڑے، پھولے اور پھٹے اور اس کی بدبو سے دماغ متعفن ہوں اور احساسات گندے ہو جائیں۔

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱۔

② المصنف لعبدالرزاق، ج: ۱ ص: ۵۲۶ رقم: ۲۰۳۸۔ مشکوۃ المصابیح کتاب الصلوۃ، الفصل الاول، ج: ۱، ص: ۱۲۹، رقم: ۵۸۵۔

نیز یہ تعلق مع اللہ ہے جو ان رسموں کی شکلوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ بلا تعلق مع اللہ اور بلا واسطہ اوامر الٰہیہ کے یہ رسمیں بھونڈی اور بدشکل متصور ہوں گی پس اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر اور نمازی بن کر در حقیقت ہم اس کا تہیہ کر رہے ہیں کہ اپنی رسوم کی صورتوں کی بھی اصلاح کریں اور اس میں حقیقت و روح بھی پیدا کریں۔ تاکہ ہمارا ہر عمل پائیدار اور عواقب کے لحاظ سے نتیجہ خیز ہو۔ اور بے جان لاش کی طرح ضائع اور بے جڑ درخت کی طرح بے ثمر نہ رہے۔

قیامِ نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے...... اس لئے ہمیں دعا اس کی کرنی ہے کہ اے اللہ ہمیں نماز کی توفیق دے اور نماز کے لئے ہمارے اس مکان مقدس یعنی مسجد کی تکمیل کرا دے اور اس مسجد کو بنانے والوں، اس کی تعمیر کرنے والوں، اس میں امداد دینے والوں، اور اس کے منتظموں کا یہ عمل قبول فرما۔ ہمیں اللہ سے یہ مانگنا ہے کہ وہ اس نماز کے ذریعے ہمارے ہاتھوں جامعہ میں ایسی فضا پیدا کر دے کہ جس میں نیکیاں پھلیں پھولیں اور بدیاں اپنی موت مر جائیں۔ آج کا دور وہ ہے کہ نیک نیکی کر کے شرماتا اور منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ جیسے گویا اس نے کوئی بڑا بھاری جرم کیا ہے اور مجرم بدکاریاں کر کے فخر سے سر اونچا کرتا ہے کہ گویا اس نے دنیا کا کوئی محترم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں اللہ سے واسطہ پیدا کر کے اور نماز کو قائم کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ نیکی کر کے نیک سر ابھارے اور مجرم اور بدکار خلاف شریعت امور کر کے منہ چھپاتا رہے اور اپنی برائی کو محسوس کرے۔

آج کے دور میں ایمان سے کورے آدمی کا لقب ہے دانا، عالی ظرف اور بہادر، اور ایماندار کا لقب ہے احمق بےوقوف مجنون اور دیوانہ۔ حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ **"يُقَالُ لِلرَّجُلِ مَآ اَعْقَلَهٗ وَمَآ اَظْرَفَهٗ وَمَآ اَجْلَدَهٗ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ"** (1) "آدمی کے لئے کہا جائے گا کہ کس قدر دانا ہے کس قدر عالی ظرف ہے اور کیسا بہادر ہے۔ درانحالیکہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا نشان نہ ہوگا"۔ اور دوسری روایات میں فرمایا گیا ہے کہ امین کو خائن کہا جائے گا اور خائن کو امین علم والے کی اتنی بھی عزت نہ رہے گی جتنی کہ ایک مردار گدھے کی لاش کی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں آج مشاہدہ میں آ رہی ہیں۔ اہل تقویٰ کا نام مذہبی دیوانے، احمق ملانے وغیرہ ہیں اور اہل فجور کے القاب اعقل، اظراف اور اجلا ہیں تو ہمیں تعلق مع اللہ والوں کی کثرت کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے صحیح لقب سے یاد کیا جائے اور اسی کے مرتبہ کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے۔ پس دعا میں ایک نقطہ یہ بھی ہمیں لانا ہے کہ اے اللہ ہمیں اہل تقویٰ میں سے اور نمازی کر کے ہمیں اہل سعادت کر اور اہل سعادت کی عزت و توقیر اور شوکت دنیا میں قائم فرما۔ ہماری مادی شوکت اگر ہمیں حاصل ہو اور جس کا ہم فوجی انداز میں مظاہرہ کر کے گویا اس کی تحصیل کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اس کا ثمرہ اور آخری غایت بھی نماز ہی ہے یعنی خدا سے تعلق۔

سلطنت اسلامی کا مقصود...... حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿**اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ**

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة والایمان. ج: ۱، ص: ۴۴۷.

﴿وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ① پس ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا دنیوی عروج اور تمکین فی الارض یعنی سلطنت و امارت اس لئے نہیں کہ کیک، پیسٹری کی فکر میں مستغرق ہوں۔ کوٹھی بنگلوں کی تعمیر ان کا منتہائے نظر ہو اور انڈا مکھن ان کا آخری مطلب ہو۔ بلکہ ان کا عروج اس لئے ہوگا کہ وہ خدا کی چوکھٹ پر جھکیں اور اس کی مخلوق کو جھکا دیں۔ دنیا میں معروف اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برائی سے دنیا کو پاک کریں صدقہ و خیرات سے غریبوں کی غربت مٹا دیں سائلوں اور محتاجوں کے دلوں کو تھامیں۔ اخوۃ ہمدردی سے عالم کو بھر دیں۔ تفوق اور علو و فساد کا قلع قمع کریں۔

نمازی یا نماز کے ثمرات...... پس محض اس کی دعا کرنی ہے کہ خداوندا ہمیں عروج دے تا کہ ہم تیرے اس مقدس مکان میں جمع ہو کر تیری یاد کریں اور اس بھولی ہوئی اور غافل دنیا کو تیرے بارے میں ہوشیار بنا دیں۔ پس یہ کام ہم اس مسجد مقدس میں جماعتی حیثیت سے انجام دینے کی توفیق اللہ سے مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی دعا میں نماز کی، مکان نماز کی تکمیل کی توفیق، نماز کے شوکت کے وسائل قائم کرنیکی توفیق، نماز کے لئے مادی شوکت فراہم کرنیکی توفیق اور نماز کے ذریعے اپنی صورت و سیرت اور ہیئت و حقیقت کے پاکیزہ اور مطلوب انداز پر لانے کی توفیق مانگنا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ نمازی یا نماز کے ثمرات ہیں یا نماز کے مبادی اور وسائل ہیں۔ ہم صرف نماز ہی دنیا میں چاہتے ہیں اور نماز ہی کے لئے ہر کام بھی چاہتے ہیں۔

اگر حقیقتاً ہمیں یہ زندگی میسر ہو جائے تو اسی زندگی کا نام قرآن کی زبان میں حیات طیبہ ہے۔ اسی کا نام اسوہ حسنہ اور پاک سیرت ہے جس کے لئے اسلام آیا اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

پس دعا کے یہی چند نقاط تھے جن پر توجہ دلانے کے لئے میں کھڑا ہوا تھا، مجھے کوئی تقریر یا نماز کے موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کرنا منظور نہیں تھا۔ نہ اس کا وقت ہے اور نہ کوئی پروگرام اس لئے اب آپ سب حضرات ہاتھ اٹھائیں اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں ان مطلوبہ نقاط پر مخلصانہ دعا فرمائیں۔

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱.

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ).

اصلاحِ طینت...... بزرگانِ محترم! ایک اعلیٰ ترین باغ کا بہار آفریں نشوونما، اس کی دلکش اور نظر افروز سرسبزی شادابی، تازگی اور بار آوری اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کی زمین کو خودرو گھاس پھونس اور خس وخاشاک سے پاک نہ کر دیا جائے، اسی طرح ایک پاکیزہ برتن پر قلعی سے اس وقت تک چمک نہیں آئیگی جب تک اس کے جگری زنگ کو دور نہ کر دیا جائے اور اس پر چھائی ہوئی کدورتوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے ہو بہو اسی طرح ایک قیمتی کپڑے پر کوئی نظر فریب رنگ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک کہ میل کچیل اور آئے ہوئے دھبوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے۔ اصول یہ نکلا کہ کوئی شی بھی تہذیب وتمدن اور اصلاح عمل کے ذریعہ اعلیٰ جوہروں سے اس وقت تک شائستہ اور آراستہ نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے اندر سے ابھرنے والی خرابیوں کے مادوں کو سنت سے مغلوب اور مضمحل کر کے اس کی طینت کو صاف نہ کر دیا جائے۔

سعادت کی بنیاد...... ٹھیک اسی فطری اصول کے مطابق اس کائنات کے اشرف اصول اور افضل ترین رکن انسان کو بھی دیکھو کہ اسے بھی سعادت وشرافت، بزرگی اور برتری اور ظاہر و باطن کے فضل وکمال سے اس وقت تک آراستہ نہیں کیا جاسکتا، جب تک کہ اس کے اندرونی شر وفساد اور جبلی عیبوں اور اخلاقی خرابیوں کے ناپاک مادوں سے اسے صاف نہ کر لیا جائے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق اور نیکوکارانہ افعال کے مادے اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتے جب تک اس کے ظاہر و باطن کو زنگ خودی اور زنگ ہوا وہوس سے پاک نہ بنالیا جائے اور اس کے دل کی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵.

زمین میں ایمان و ہدایت کا شجرہ طیبہ اس وقت تک نشو ونما اور ثمر نہیں پاسکتا جب تک کہ اس میں سے خود رو وساوس واوہام ہوائے نفس اور فانی لذتوں کی ہولناکیاں کھرچ کر باہر نہ پھینک دی جائیں۔

تخلیہ و تحلیہ ......اس صورت میں قدرتی طور پر انسانی تہذیب و تربیت کے دو عمل قرار پائے جاتے ہیں، افعال اور تروک یعنی کچھ کرنے کی چیزیں جو اس سے کرائی جائیں گویا اس کے نفس میں بھری جائیں اور کچھ بچنے کے چیزیں جو اس سے چھڑائی جائیں گویا اس کے نفس میں سے نکالی جائیں کرنے کی چیزوں سے اس کا نفس خیر و خوبی سے آراستہ ہوگا اور بچنے کی چیزوں سے اس کا نفس شر اور شیطنت سے پاک ہوگا۔ اسی طرح تربیت انسانی دو عملوں کا مجموعہ بنتی ہے ایک تحلیہ اور ایک تخلیہ (یعنی خالی کرنا اور بھرنا) تخلیہ کے ذریعے اس رذائل نفس سے پاک کیا جاتا ہے اور تحلیہ کے ذریعے اس کو فضائل سے آراستہ کیا جاتا ہے جب تک کہ دونوں مثبت اور منفی عمل اس میں جاری نہ کئے جائیں نہ ان کی تہذیب مکمل ہوسکتی ہے اور نہ وہ سعادت و رشد کے نور سے روشن ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت خداوندی جو انسان کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے، دو ہی اجزاء سے مرکب ہو کر نازل ہوئی ہے، ایک امر، اور ایک نہی یعنی ایک حصہ اس میں مامورات کا ہے جن کے کرنیکا امر کیا گیا ہے تا کہ نفس کو اس کی سعادت ملجائے اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا اسے پابند کیا گیا ہے، تا کہ نفس کی شقاوت دور ہو۔ پس مامورات کو از قسم افعال سمجھو اور منہیات کو از قسم تروک، یہی مامورات نیکیاں ہیں جن کا نوع اور اصل نام شریعت کی زبان میں معروف ہے اور یہی منہیات بدیاں ہیں۔ جن کا نوعی اور اصول نام اصطلاح شرع میں منکر ہے اور یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغی اصطلاح بنتی ہے۔ جسے سب پہنچانتے ہیں۔

اور قرآن نے جابجا اس کی تاکید کی ہیں، کہیں اس کا امر کیا ہے۔﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۔ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ① ’’اچھی باتوں کا حکم کرو اور برائیوں کو روکو اور کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے‘‘۔ کہیں امت کی خیریت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دائر کردی ہے۔﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② ’’ان تمام امتوں میں تم بہترین اُمّت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو‘‘۔ کہیں رفعت و برتری اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے فرمایا گیا کہ﴿اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ③ ’’نبی امی کہ جس کی بات وہ تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے‘‘۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمن، الآیۃ: ۱۷۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۱۰۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۷۔

نظام سعادت...... شریعت کے یہ تمام مامورات یا معروفات جس کا شمار نیک افعال میں ہے، اصلاح شریعت میں ان کے افعال کا نام بر ہے اور وہ تمام منہیات یا منکرات جو از قسم تروک ہیں ان سے بچنے کا اصطلاحی نام تقویٰ ہے اس لئے گویا پوری شریعت کا خلاصہ بر و تقویٰ نکل آتا ہے جس پر انسانی سعادت کا نظام قائم ہے۔

اگر افعال بر یا امورِ خیر کو معطل کر دیا جائے تو حصول خیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کو شرعی زبان میں اثـــم کہتے ہیں اور یہ اثم یا گناہ ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور اگر تقویٰ کو معطل کر دیا جائے تو دفع شر کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جس کا اصطلاحی نام "عُـدْوَان" ہے (یعنی حدود سے تجاوز اور زیادتی) اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان حدود سے تجاوز کرنا ہی تمام فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کی جڑ ہے۔ پس کوئی انسان محض بر سے یا نیک کاموں سے کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس میں تقویٰ کے تروک نہ ہوں اور کوئی فرد بشر محض تروک تقویٰ سے کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک اس میں بر (نیکی) کے افعال اور تاثیرات نہ ہوں۔

اب چونکہ برّ و تقوی نیکی اختیار کرنے اور برائیوں سے بچنے کے اس مثبت و منفی عمل کے مجموعی نظم ہی سے دین اور تہذیب و تمدن کا نظام استوار ہوتا ہے، اس لئے شریعت اسلام نے ان دونوں میں باہمی تعاون کی اور انکی اضداد یعنی اثم و عدوان سے عدم تعاون کی دعوت دی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ ساری بنیادی تفصیلات بلکہ پوری شریعت کے امر و نہی کے نظام کو ان دو جامع اور معجزانہ جملوں میں ادا کر دیا ہے جن سے ان انواع کے یہ اصطلاحی نام بھی متعین ہو جاتے ہیں۔ ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ ① "تعاون کرو نیکی اور تقویٰ پر اور گناہوں اور سرکشی پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والے ہیں"۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ بر و تقویٰ کے یہ افعال و تروک محض ان کے نظم (الفاظ) کی جوہری خوبی اور برتری سے انسانوں میں قائم نہیں ہو سکتے، جب تک کہ خود انسانوں میں بھی بر و تقویٰ کو قبول کرنے اور ان سے اثر پذیر ہونے کا مادہ اور صلاحیت نہ ہو۔ اور اس میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی نہ ہوں جو اس بر و تقویٰ کے جذب کرنے پر جھکی ہوئی ہوں اور اسے برداشت کریں جس سے نفس انسانی پر بر و تقویٰ کا رنگ چڑھ سکے، ورنہ اگر اندرونی قابلیت کے بغیر ہی بر و تقویٰ کا خطاب صحیح ہوتا یا محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کو خوبی اور برتری ہی نفوس میں اسے جاگزیں کر دیا کرتی تو حیوانات آخر اس تکلیف شرعی سے الگ کیوں رکھے جاتے؟ ان کو بر و تقویٰ کا مکلّف نہ بنائے جانے کی اس کے سوا وجہ ہی کیا ہوسکتی ہے کہ ان میں بار اور متقی نیک اور پرہیز گار بننے کی یا بر و تقویٰ قبول کرنیکی کوئی استعداد اور کوئی قوت موجود نہیں اس لئے محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کا اعلیٰ اور منضبط ہونا ان کے لئے کارآمد نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکل آنا قدرتی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو بر و تقویٰ کا مکلّف ٹھہرایا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں بھی بر و تقویٰ کے نظام کو

① پارہ: ٦، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ٢.

قبول کر لینے کی قوتیں بھی ہوں جن پر یہ نظام بر وتقویٰ اپنا عمل کرے اور انسان بارو متقی ۔نیکوکار اور پرہیز گار بنے ،اسی طرح انسان میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہونے ضروری ہیں جن سے وہ اثم وعدوان کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہوتا ہو اور شریعت اسے ان قبیح حرکات سے روکے ، ورنہ اس میں ان گناہ کاریوں کے مادے ہی نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہوسکتا اور ایسی صورت میں اسے اثم وعدوان سے بازر ہنے کا حکم دیا جانا بالکل ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کسی جنگلی جانور شیر اور بھیڑیئے کہ کہا جائے کہ خبردار گناہ مت کرنا اور اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہونا۔ظاہر ہے کہ جیسے یہ حکم غیر حکیمانہ ہے ایسی ہی اثم وعدوان کے مادے کے بغیر انسان کو یہ حکم دیا جانا لغو اور لایعنی ہوتا ہے ، جس سے اللہ کی شریعت بری ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہوں اور وہ ان قبیح حرکات کا مرتکب ہوسکتا ہو بلکہ ہوتا ہو اور پھر اسے روکا جائے جس سے وہ اپنے اختیار سے خود رکے ، تا کہ یہ رکنا شریعت کے لئے حکیمانہ فعل ثابت ہو اور رکنے والے کے لئے امر حسن باعثِ اجر وکمال بنے ۔

ایمان وامانت...... اس اصول کے بعد سمجھئے کہ انسان میں جو قوت افعال بر کا تحمل کرتی ہے بلکہ افعال بر کا مصدر ہے جس سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں ان کا نام شریعت کی اصطلاح میں امانت ہے اور جو قوت تقویٰ کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اس سے متقیانہ تروک کا ظہور ہوتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں حیاء ہے۔ پس امانت امر حسن اور اچھے کام کی رغبت کے مادے کا نام ہے اور حیاء امر قبیح سے انقباض کے مادہ کا نام ہے۔

پس ایمان اور اس کے سارے عملی شعبے عبادۃ ،اطاعۃ ،تفویض وغیرہ درحقیقت امانت کے کندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ اگر امانت نہ ہو یعنی دل میں ان امور حسنہ کی رغبت وقبول کا مادہ ہی نہ ہو تو آدمی نہ ایمان قبول کر سکتا ہے نہ عمل صالح نہ دین دیانت ۔

پس امانت کی وہی نوعیت ہے جو رنگریزوں پھٹکری کی ہوتی ہے کہ وہ ہر رنگ کے لئے زمین ہے اگر رنگ کو پھٹکری نہ دی جائے تو کوئی رنگ بھی نہ کپڑے پر چڑھ سکتا ہے نہ کھل سکتا ہے۔یا جیسا کہ عطاروں میں تل کے تیل کو ہوتی ہے کہ ہر خوشبو کے لئے یہ سادہ تیل زمین ہے جو گلاب ، چمبیلی اور کیوڑہ ہر خوشبو کو قبول کر لیتی ہے ، اور مختلف عطر بن جاتے ہیں۔ اگر یہ زمین (تل کا تیل) نہ ہو تو کوئی عطر تیار نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح امانت زمین ہے ، ایمان اور ایمانیات کے لئے جس پر ایمان کا رنگ چڑھ جاتا ہے یا ایمان اور ایمانیات کی خوشبو میں جم جاتی ہیں ، اگر قلب یں یہ امانت کا مادہ نہ ہو تو نہ ایمان ہو نہ ایمانیات ، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ ...... ''اس میں ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو''۔

پس ایمان وایمانیات کو امر حسن اور مرغوب سمجھوانے والی طاقت اور پھر اسے جذب کرنے والی قوۃ یہ امانت ہی کی قوۃ ہے۔امانت کی ضد بددیانتی اور خیانت ہے جس کے معنی ہیں امور خیر کی رغبت نہ کرنا انہیں مستحسن نہ سمجھنا اور قبول نہ کرنا اور نتیجہ کے طور پر لہوولہب اور خرافات میں مبتلا رہنا اور زندگی کو برباد کر دینا۔اس خیانت کی قوت کو جو

امور خیر کو بالا بالا دفع کر دیتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں فتنہ کہتے ہیں جو درحقیقت امانت کی ضد ہے۔ پس امانت، ایمان اور عمل صالح کو جذب کرتی ہے اور فتنہ اسے دفع کرتا ہے۔ فتنہ کا ماحصل بد دیانتی، اور خیانت ہے اور خیانت امر خیر میں ہوتی ہے۔ امر شر کو دفع کرنے کا نام خیانت نہیں۔ ایمان کے نظام صالح اور حسن معاشرت میں رخنہ اندازہ اوراس کے نظام میں افراتفری پھیلانا ہی خیانت ہے جسے فتنہ کہتے ہیں۔ پس بر ہونے کی قوت کا مادہ امانت ہے اور ہر نیکی کو دفع کرنے کے اور توڑنے درہم برہم کرنے کے مادہ کا نام فتنہ ہے اور دونوں مادے انسان میں موجود ہیں۔ شریعت مادہ امانت کو اجاگر کرنے اور مادہ فتنہ کے استیصال کے لئے آئی ہے۔

جہاد و قتال انسانوں کے گلے کاٹنے کے لئے نہیں رکھا گیا بلکہ دفع فتنہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ تاکہ کوئی فتنہ زدہ قوم نظام صالح کو برباد نہ کر پائے۔ یہ جدا بات ہے کہ اس کی بربادی اور رخنہ اندازی انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے تو وہ فتنوں کو مٹانے والی طاقت بالا خران ہی کی گردنوں پر مسلط ہوتی ہے ورنہ اصل مقصود دفع فتنہ ہے قتل انسان نہیں۔ چنانچہ یہی فتنہ زدہ انسان اگر فتنہ سے ہٹ کر امانت پر آجائیں تو قتال فوراً بند ہوجاتا ہے۔ بہرحال امانت امور حسنہ کے امتحان کی قوت ہے اور فتنہ امور حسنہ کے استہجان وتخریب کی قوت ہے۔

حیاداری اور فحش کاری...... تروک تقویٰ کو بروئے کار لانے والی قوت جو انسان کے باطن میں رکھی گئی ہے حیاء ہے جس سے انسان امر قبیح کے ارتکاب سے سکڑتا اور منقبض ہوتا ہے جس سے قبائح متروک ہوجاتے ہیں اگر حیاء کا مادہ نہ ہوتو امور قبیحہ سے رکنے بچنے کی صورت نہ ہو۔ پس منکرات کو برا ثابت کرنے والی اور بچانے والی طاقت حیاء ہے حیاء کی عدم موجودگی میں نہ آدمی قبیح کو قبیح کہتا ہے اور نہ اس سے رک سکتا ہے اس لئے فرمایا گیا **اِذَا فَاتَکَ الْحَیَآءُ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ** ① ''جب تجھ سے حیاء جاتی رہے تو جو تیرا جی چاہے کر''۔ اسی لئے حدیث میں **اَلْحَیَآءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ** ② (حیاء کل کی کل خیر ہی خیر ہے) فرمایا گیا اور اسی لئے حیاء کو ایمان کا عظیم ترین شعبہ قرار دیا گیا ہے کہ خلاف ایمان حرکات سے بچاؤ اس قوت کے بغیر میسر آنا ممکن نہ تھا۔

حیاء کی ضد فحش ہے جو ہر امر قبیح پر بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کو بروئے کار لاتی ہے اور حیاء دارانہ امور کا نظام گڑبڑ ہوجاتا ہے، زنا کار، شراب خوری، جوئے بازی، نقب زنی، کذب بیانی اور بدگوئی وغیرہ سارے قبائح پر آمادگی اور ان کا ارتکاب اسی قوت فحش سے ہوتا ہے۔ پس حیاء منکرات سے دور کرتی ہے اور فحش منکرات کے قریب لاتا ہے۔ پس منکرات شرعیہ کا مصدر اور سرچشمہ فحش ہے اور ان سے بچاؤ کا سرچشمہ اور مصدر حیاء ہے۔

خلاصۂ کلام...... خلاصہ یہ نکلا کہ امور خیر یعنی معروفات کی رغبت وتعمیل کا سرچشمہ امانت ہے اور ان کی خلاف ورزی اور درہمی برہم کا سرچشمہ فتنہ ہے اور تمام امور شر یعنی منکرات سے بچاؤ کا سرچشمہ حیاء ہے اور ان کے

---

① الصحیح للبخاری کتاب الادب، باب اذالم تستحی فاصنع ما شئت. ج: ۱۹، ص: ۷۹.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها، ج: ۱ ص: ۱۴۳.

ارتکاب اور سیہ کاری کا سرچشمہ فحش ہے۔ پس امانت و فتنہ حیاء وفحش کی یہی چار قوتیں ہیں جس سے معروف منکر اور بر و تقویٰ کا تعلق ہے۔ اول دو طاقتوں کا تعلق افعال بر کے کرنے اور چھوڑنے سے ہے اور آخر کی دو قوتوں کا تعلق متروکاتِ تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے۔ اس لئے شریعتِ الٰہی کا کام جو بنی آدم کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ افعال بر کا امر کر کے امانت کی طاقت کو مضبوط بنائے اور اس کی ضد فتنہ کا استیصال کرے اور تروک تقویٰ سے نہی کر کے حیاء کی طاقت کو مستحکم بنائے اور اس کی ضد فحش کا استیصال کر کے کہ یہی عین عدل و احسان ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ① ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا' اور روکتا ہے برے کاموں اور منکر سے' اور نصیحت کرتا ہے تم کو شاید کہ یاد کرو''۔

بر و تقویٰ سے انقلابِ باطن...... پس یہ امر بالمعروف یا امر بالبر براہ راست قوت امانت پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے آدمی امین بنتا ہے اور امین بن کر ایماندار ہوتا ہے ایماندار ہو کر مامون ہوتا ہے جس سے خیر کے عناصر ابھر جاتے ہیں اور فتنے دب جاتے ہیں اور نہی عن المنکر یا ہدایت و تقویٰ براہ راست قوت حیاء پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے آدمی باحیاء بنتا ہے اور حیاء دار بن کر برائیوں اور منکرات سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے شر کے عناصر دب جاتے ہیں اور ایمانداری کے موانع دور ہو کر ایمان اور عمل صالح کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

الحاصل بر و تقویٰ کے عمل سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تا کہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پشت کرتا ہے اور اصلاح کے اسی مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔ الحاصل بر و تقویٰ کے عملی سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تا کہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ افعال و تروک انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پست کرتا ہے اور اصلاح کے اس مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جسن سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

اب افعال و تروک یا بر و تقویٰ (احکام اور امتناعی احکام نیکوکاری اور پرہیزگاری) کے اصولی نقشہ کے عملی پہلو پر نظر ڈالو۔ تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں ایمان باللہ۔ اخلاص للہ، ذکر اللہ تذکر بایام اللہ، تلاوت کلام اللہ، تعظیم شعائر اللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور حضور مع اللہ یا (نماز و دعا اور مجاہدہ و مراقبہ وغیرہ) ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، احسان للہ، اطعام لوجہ اللہ، اخوۃ فی اللہ اور النصح لدین اللہ یعنی عام خیر خواہی بنی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰۔

نوع انسان عدل و انصاف وفاءِ عہد اور ایفائے عہد وغیرہ سب کے سب امور بر کے اجزاء ہیں جن کے کرنے سے انسانی نفس سر بلند مقبول اور محبوب خدا و خلق بنتا ہے عند اللہ اس کی وجاہت قائم ہوتی ہے، اور عند الناس اس کی بالا دستی اور برتری مسلم ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا و آخرت کے بلند مناصب و مقامات کا حق دار ہو کر ابرار و اخیار کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن بر (نیکوکاری) کا یہ سارا لمبا چوڑا سلسلہ اس وقت تک کارگر اور موثر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ نفس انسانی میں سے نفسانیت اور اس کے رذائل کا خاتمہ نہ ہو جو اس امور بر کے حق میں سم قاتل اور قوی مانع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی انسان کو ان سر بلندیوں پر نہیں پہنچنے دیتے مثلاً جب تک انسانی نفس سے باہ کے رذائل جیسے حرص و ہوا، ہوس رانی اور بدمستی سے کھانے پینے کی لذتوں میں غرقابی جنسی خواہشات اور نفسانی عیش میں ہمہ وقت سرگردانی کے جراثیم خارج نہ کئے جائیں یا جاہ کے رذائل جیسے ہوس اقتدار، نمائشی وقار کی ہمہ وقت بھوک، جذبات انانیت و خودی اور ہوس ریاست و امارت زائل نہ ہوں گے۔

نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی...... خلاصہ یہ نکلا کہ ایک طرف زن، زر، زمین کی جاہ پسندانہ بدمستیوں اور دوسری طرف نفس و ہوائے نفس کی جاہ پسندانہ خودی، خود بینی اور خود آرائیوں کا سودا انسان کے سر سے نہ نکالا جائے یا کم از کم ان کے ترک کا خوگر نہ بنایا جائے اس وقت تک انسان پر اعمال بر کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اگر بتکلف چڑھ بھی گیا، تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتا اور اگر اتفاقاً کچھ جم بھی گیا تو پختہ نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی شوب میں اڑ جائیگا۔

بہر حال نفس میں روحانیت اور ملکیت کی خیر اس وقت تک جاگزیں نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں سے نفسانیت کا یہ جبلی شر کھرچ کر باہر نہ پھینک دیا جائے، بالفاظ دیگر افعال بر کی قلعی سے اس وقت تک نفس پر چمک دمک نہیں آسکتی جب تک کہ تروک تقویٰ سے اس کا رنگ خودی اور زنگ انانیت اتارا نہ جائے اور اس تک قلب کے آئینہ میں انوار الٰہیہ منعکس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس صیقل کر کے شفاف نہ کر لیا جائے ؎

دل را اگر تو صاف کنی ہچو آئینہ ‌ ‌ ‌ درد لے جمال دوست بہ بینی چو آئینہ

عباداتی سال کا آغاز و اختتام...... اس لئے شریعت نے اپنے آغاز کار سے لے کر انجام کار تک افعال و تروک اور (مثبت اور منفی احکام) کا رشتہ ملا جلا رکھا ہے۔ اور افعال بر کو تروک تقویٰ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہونے دیا چنانچہ شریعت کا آغاز نزول قرآن سے ہوتا ہے اور نزول قرآن ماہ رمضان سے ہے۔ اس لئے ماہ رمضان گویا شریعت اور اس کی عبادتوں کا سن آغاز سے بالکل اسی طرح جیسے اداروں و کارخانوں اور تعلیم گاہوں وغیرہ میں سال کا آغاز کسی خاص مہینہ سے مقرر کر لیا جاتا ہے، اور اسی ماہ سے اس کے کاروبار کا آغاز سمجھتے ہیں اور اسی سے رجسٹر دفتر اور بہی کھاتے شروع کرتے ہیں مثلاً اسلامی اداروں میں حسابی سال عموماً محرم سے شروع کر کے ذی الحجہ پر ختم کیا جاتا ہے تعلیم گاہوں میں تعلیمی سال عموماً شوال سے شروع کر کے رمضان میں ختم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اداروں میں دفتر

سال جنوری سے شروع کر کے دسمبر پر ختم کیا جاتا ہے، ایسے ہی اسلامی شریعت کا دینی اور عباداتی سال ماہ رمضان سے شروع ہو کر شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نزول قرآن جو اساس شریعت ہے، ماہ رمضان میں ہوا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ① ''رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ اس میں قرآن اترا ہے''۔

اسی لئے رمضان گویا عباداتی سال کا نقطۂ آغاز نکلا جس سے انسان کا ایمانی نشو و نما متعلق ہے۔ اور شعبان نقطۂ اختتام ثابت ہوا۔ جو اس ایمانی شباب کے بلوغ کی حد ہے۔ اس لئے بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے میں عمروں کے اختتام کا اعلان عالم غیب میں ہو جاتا ہے۔ جو درحقیقت اعمال کے انقطاع کا اعلان ہے کہ عمل کا تعلق عمر سے ہی ہے، بلکہ عمر دی ہی گئی ہے عمل کے لئے اس لئے جس آن یہ زندگی ختم ہوگی، اسی آن انسان کا عمل، رزق اور کسب وغیرہ سب منقطع ہو جائے گا۔ یوں بھی ہر سال پچھلے رزق کا حساب ختم کر کے نئے سال کے لئے روزی رزق اس کا ماہ میں تعین کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ پس شعبان اعلان اختتام طاعات وانقطاع اعمال کا مہینہ نکلا جسے عباداتی ال کا نقطۂ اختتام کہنا چاہئے۔ جس طرح کہ رمضان اس کا نقطۂ افتتاح وآغاز تھا۔

ماہ رمضان نیکیوں کا مرکز اِتصال...... اب رمضان کو لیجئے تو اس میں افعال بر اور تروک تقویٰ کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح گوندھ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہلال رمضان نظر آتے ہیں اول شب ہی سے اس ماہ کا افتتاح دو چیزوں سے کیا گیا ہے جو اعمال بر کی جان ہیں یعنی تلاوت قرآن اور نماز تراویح، یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسانی نفس کو قرب خداوندی اور لذت وصال کی دولت میسر آتی ہے۔ نماز تراویح سے تو انتہائی قرب ہوتا ہے۔ کیونکہ بنص قرآن وبتصریح حدیث سجدہ ہی کمال قرب کا ذریعہ ہے جو افعال صلوٰۃ کا اصلی مقصود ہے۔

ارشاد قرآنی ہے ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ ② ''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ''۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ''اِنَّ اَقْرَبَ مَایَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ'' ③ ''بے شک بندہ اپنے رب سے قریب تر اس وقت ہوتا ہے کہ وہ سجدے میں ہو''۔ اور قرب بمعنیٰ اتصال ہی نہیں بلکہ بمعنیٰ الصاق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تصریح ہے کہ بحالت سجدہ انسان کا سر اللہ کے قدموں پر گرتا ہے۔ پس اقربیت یعنی کمال قرب وبقا تو نماز سے ملا اور پھر اس کمال قرب کی بھی تکمیل اور باثمرہ ہو جانا روزانہ کے چالیس سجدوں سے ہو جائے گا۔ کیوں کہ بیس رکعت میں چالیس سجدے ہوتے ہیں اور چالیس کے عدد کو تکمیل شے میں خاص دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دینے کا وقت آیا تو چالیس دن کا چلہ کرا کر مناسبۃ مع الغیب کی تکمیل وتقویہ کرائی گئی۔ اور بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلب سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے یعنی قلب کی ایک خاص علمی تکمیل کے لئے چالیس دن کا مخلصانہ عمل تجویز فرمایا گیا جس سے حضرات صوفیاء کرام نے چلہ کشی کا اصول اخذ کیا۔ غرض چالیس کے عدد

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۹۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب ما یقول فی الرکوع والسجود، ج: ۳، ص: ۲۹۔ ۱

کو تکمیل حال وخیال میں خاص دخل ہے۔ اس لئے رمضان کی تراویح میں روزانہ چالیس سجدے پیاپے کرائے گئے۔

بندہ وخدا میں ربط باطنی...... پھر اس کمال قرب کو بے ثمر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ کمال وصال کی سبیل تلاوت قرآن سے کی گئی کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کو اللہ کے باطن کی چیز فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے "تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ" ① "قرآن سے برکت حاصل کرو، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ اس سے واضح ہوا کہ قرآن اللہ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے جو تلاوت کے ذریعے ہمارے اندر پہنچ جاتی ہے یعنی اس کے باطن سے چلتی ہے اور ہمارے باطن میں پہنچ جاتی ہے، جس سے اللہ اور اس کے بندے کے درمیان باطنی ربط پیدا ہوتا ہے۔

کامل ترین ملاپ...... ادھر ایک دوسری حدیث میں تلاوت قرآن کو محادثہ مع اللہ یعنی اللہ سے باتیں کرنا بتلایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بات کر کے متکلم اور مخاطب اپنا اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں، جسے علمی قرب کی انتہائی منزل کہنا چاہئے۔

پس! تلاوت کے ذریعے ہمارے اور اس کے باطن کا ریل میل کچھ اس شان سے ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ توافق اور تواصل کی دوسری صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ جسمانی میل میلاپ اور وصل صرف اطراف بدن کے مل جانے کی حد تک ہوتا ہے ایک جسم دوسرے جسم میں سما نہیں سکتا، گویا جسمانی وصال بھی محض سطحی ہوتا ہے۔ اور اس میں لذت بھی اگر ہوتی ہے تو سطحی اور عارضی، لیکن روحانی ملاپ ہے کہ جسمانی میل ملاپ تو بجائے کود ہے، روحانی میل ملاپ تو بجائے، خود ہے، روحانی میل ملاپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس وصل و وصال اور میل ملاپ کو بھی اگر دیکھا جئے تو وہ بھی وسیلہ ہی ہے۔ اصل مقصد قبول ہے نہ کہ وصول۔ اگر وصول ہوا اور قبول نہ ہو تو وہ وصول بے کار ہے۔ بادشاہ کے یہاں وصول تو شاگرد پیشہ اور کم مرتبہ ملازمین کو بھی ہو جاتا ہے مگر قبول نہیں ہوتا وزیر اعظم اور امراء شاہی اگر واصل ہوتے ہیں تو یہ محض وصول ہی نہیں بلکہ ان کا قبول بھی ہوتا ہے۔

اعترافِ قبولیت...... سو اس تلاوت تراویح میں جبکہ فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے اور ہر رکعت میں ضروری ہے۔ خواہ بلا واسطہ ہو یا بواسطہ امام، اور اس کی ایک آیت پر ادھر سے قبولیت کا بروقت اعتراف واعلان کیا بھی جاتا ہے۔ بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری تعریف کی) وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو فرتے ہیں اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ' میرے بندہ نے میری ثناء وصفت بیان کی۔ جب یہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو فوراً فرماتے ہیں مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) جب یہ کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو فرماتے ہیں هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ (یہ میرا اور بندہ کے درمیان کا معاملہ ہے) جب وہ سوال کرتا ہے اور اِهْدِنَا سے آخر تک پڑھ جاتا ہے تو

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

فوراً فرماتے ہیں۔ وَلِعَبْدِیْ مَاسَاَلَ (میرے بندہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے) تو یہ بروقت اقرار واعتراف اور بندہ کو اپنا کہہ کر اس کی بات کو سراہنا ہی قبول ہے جس کے لئے وصول کی تمنا کرتے ہیں۔ ①

بشری عروج کا نقطۂ کمال...... پس تراویح وتلاوت میں ابتدائی مرتبہ قرب اتصال کا ہے جو نماز سے حاصل ہوتا ہے پھر قرب سے وصول ووصال کا ہے جو تلاوت سے حاصل ہوتا ہے اور پھر وصول سے قبول ورضا کا ہے جو تلاوت خاص کے مکالمہ سے حاصل ہوتا ہے غرض تراویح وتلاوت سے حضرت حق کی ہم نشینی، معانقہ اور مکالمہ، تراضی طرفین کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس سے آگے بشری عروج وکمال کا کوئی اور مقام نہیں۔ لیکن نظر اس پر کیجئے کہ جہاں رمضان کی راتوں میں نماز وتلاوت سے وصول وقبول کی لذتیں دی جاتیں ہیں۔ وہیں اس مبارک مہینہ کے دنوں میں نفس کی ہوسنا کیوں اور نفسانی لذات کو بھی قوت سے ترک کرایا جاتا ہے۔ کھانا پینا بھی ترک، مقاربت نسواں بھی بند حتی کہ ان چیزوں سے خالی لذت لینا بھی ناپسندیدہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ شب کی غیر معمولی لذۃ وصول و قبول، جو افعال بر میں سے فعل تراویح وتلاوت سے ملتی تھی بغیر ان تقوائی تروک کے میسر آنی ناممکن تھی۔

پس رمضان کے مہینہ میں دن بھر روزہ کے ذریعہ جو مجموعہ تروک ہے نفس کو مانجھا اور صاف کیا جاتا ہے اور شب کو اس صاف شدہ ظرف پر تلاوت وتراویح سے جو مجموعہ افعال بر ہے قلعی کی جاتی ہے جس سے وہ چمک اٹھتا ہے اور اس میں قرب واتصال اور قبول ووصال کی اس چمک دمک سے انوار خداوندی منعکس ہونے لگتے ہیں گویا نفس انسان۔ میں نفس رحمان نظر آنے لگتا ہے۔ پس ماہ رمضان جیسے بر کا مہینہ ہے ویسے ہی تقویٰ کا بھی مہینہ ہے۔ اور جیسے اس میں اثم سے بچاؤ میسر آتا ہے ویسے ہی اس میں عدوان سے بچاؤ کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ اور ماہِ روزہ کا ثمر...... اس لئے قرآن حکیم نے جب رمضان کے روزوں کا ذکر کیا تو اس کا سب سے بڑا ثمرہ تقویٰ بتلایا ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ② ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پچھلوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ''۔ اور جب خود ماہ رمضان کا ذکر کیا جس میں دنوں کے ساتھ راتیں بھی شامل ہیں تو نزول قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا سب سے بڑا ثمرہ نور ہدایت، نور دلائل اور نور معرفت ظاہر فرمایا جو در حقیقت انسانی نفس کی چمک دمک اور قلعی کا سب سے اعلیٰ سامان ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ③ ''مہینہ رمضان کا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کے کھلے دلائل کا مجموعہ اور قوت تمیزی کا علم ہے''۔ گویا روزہ کا ثمرہ تقویٰ اور ماہ کا ثمرہ بر نکلا اور اس طرح قرآن کریم سے ماہ رمضان بر وتقویٰ کا مہینہ ثابت ہوا جس سے اثم وعدوان کا خاطر خواہ دفعیہ ہو جاتا ہے۔ حتی کہ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوة، باب وجوب قراة الفاتحة فی کل رکعة. ج: ۲، ص: ۳۵۲.

② پارہ: ۲، سورة البقرة، الآیة: ۱۸۳. ③ پارہ: ۲، سورة البقرة، الآیة: ۱۸۵.

اثم وعدوان کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ نفس کا دانہ پانی بند ہو جاتا ہے۔ اور شیاطن قید کر دیئے جاتے ہیں جو اثم وعدوان پر ابھارتے تھے۔ ایک دانا دشمن کی حیثیت سے اور ایک نادان دشمن کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ دونوں دشمنوں کے اسیر ہو جانے پر اثم وعدوان کا دفعیہ قدرتی تھا۔

صیام و قیام کا باہمی تناسب...... اس لئے روزہ تلاوت تراویح یعنی صیام و قیام کا تناسب اور ایک سے دوسرے کا رابطہ بھی واضح ہو گیا کہ ایک تخلیہ کا مقام ہے یعنی روزہ جو انسان کو رذائل نفس سے پاک کرتا ہے اور ایک تحلیہ کا مقام ہے یعنی قرآن اور تراویح جو نفس انسانی کو چمک دار اور نورانی بناتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صیام وقرآن کی شفاعت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بطور قرین وعدیل کے ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ مضمون حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن صیام وقرآن دونوں مل کر بندہ کے شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ خداوندی! ہم نے دن بھر اس بندہ کو کھانے پینے اور شہوانی لذتوں سے محروم رکھا تو اس کے حق میں ہماری شفاعت کو قبول فرما، قرآن کہے گا۔ خداوند! میں نے اس بندہ کو راتوں میں نینداور آرام سے محروم رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی شفاعت کا انجام سوائے قبولیت شفاعت کے دوسرا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قرآن کلام الٰہی اور صفت خداوندی ہے۔ تو اس کی شفاعت ایک صفت الٰہی کی شفاعت ذات سے ہے، جو ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی اپنی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ تو کون ہے کہ اس شفاعت کو رد کر سکے؟ اور وہ خود کیسے رد فرمائے گے ؎

چوں خدا از خود سوال و کد کند　　　پس دعائے خویشتن چوں رد کند

ادھر روزہ کو تمام عبادات میں حق تعالیٰ نے اپنی چیز فرمایا ہے۔ اور یہ کہ میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا اور ظاہر ہے کہ اپنی چیز کو آنا کہہ کر کون بے آبرو کیا کرتا ہے کہ اسے رد کرے۔ اس لئے صیام وقرآن کی شفاعتیں رد ہونی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ شریعت نے اپنے عباداتی سال کا افتتاح افعال وتروک دونوں سے کیا ہے جو تربیت انسانی کے دربازو ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دونوں میں ترک کو اصل رکھا اور افعال اس کے ضمن میں رکھے، اور راتوں میں افعال کو اصل قرار دیا اور تروک اس کے ضمن میں بقدر ضرورت آجاتے ہیں، جو بوقت تلاوت وصلوۃ قائم رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اس کی راتیں روشنی میں دونوں سے کم نہیں ہیں بلکہ لَیْلُھَاوَ نَھَارُھَا سَوَآءٌ کی مصداق ہیں۔

ہلالِ عید...... جب رمضان کے یہ معدودے چند ایام اس شان سے پورے ہو جاتے ہیں کہ اس کے دن تروک میں مصروف اور اس کی راتیں افعال میں مشغول تو ہلال عید تکمیل عبادت کا مسرت بخش پیغام لے کر فضاء آسمان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا منجاب اللہ آسمان سے اطلاع دیجاتی ہے کہ اے بندگان الٰہی! تم نے وہ فرض پورا کر دیا جو ہلال رمضان نے تمہارے ذمہ عائد کیا تھا۔ تم نے اپنے دنوں کو نفسانی لذتوں (طعام وشراب اور مقاربت) سے بے نیاز رکھ کر خداوندی قرب ووصال کی لذتوں کو ترجیح دی اور اپنی راتوں کو لہوالحدیث اور قصہ کہانیوں میں گنوانے

کی بجائے خیر الحدیث اور احسن القصص کے کہنے اور سننے میں مشغول رکھا اس لئے تمہیں ہلال عید کے نورانی حروف کے ذریعے مبارک باد دی جاتی ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور منزل تک پہنچ گئے اس پر بندوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے قدرداں اور مشکور پروردگار کا جان و مال سے شکریہ ادا کریں چنانچہ عید کی صبح ہوتے ہی اولاً صدقہ فطر ادا کر کے مال سے اور پھر دوگانہ عید ادا کر کے جان و مال سے اپنے محسن رب اور منعم پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے تیس دن کی یہ حقیر اور ناچیز قربانی قبول فرمائی اور دوران قربانی میں تو خصوصی طور پر لذت قرب ووصال سے نوازا۔ اور بعد تکمیل ہلالی حروف سے اپنی خوشنودی کا علان عام فرمایا۔

تتمۂ رمضان...... پس عید درحقیقت رمضان کے افعال و تروک کا ایک عملی شکریہ ہے جو بندوں کی جانب سے جناب خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شکریہ پر حسب وعدہ الٰہی ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① (اگر تم شکر گزار ہو گے تو تمہاری نعمت میں اضافہ کروں گا) بسلسلہ اضافہ نعمت شش عید یعنی شوال کے ۶ روزوں کا مزید اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں رمضان تو نہیں تتمہ رمضان کہا جائے گا۔ کیونکہ رمضان کی مدت ایک ماہ کی مدت جو ایک منضبط اور معتدل مدت ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔

سال سے کم اور ہفتہ سے زیادہ ایک درمیانی مدت ہے۔ اس میں اگر ایک دن کا بھی اضافہ ہو جاتا تو دوسرا ماہ لگ جانے سے رمضان کی مدت دو ماہ ہی کہلاتی۔ اور روزے ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کے کہلائے جاتے جو یقیناً طبائع پر بھی شاق گذرتے، مدت بھی معتدل نہ رہتی اور اس میں کسر بڑھ جانے سے مدت کا انضباط بھی فوت ہو جاتا۔ اس لئے روزہ کا ایک ماہ پورا کرا کر اور درمیان میں ایک دن خوشی اور کھانے پینے کا دے کر بطور تتمہ رمضان ۶ روزے اور دیئے اور وہ بھی غایت رحمت سے اختیاری دیئے گئے جن میں کوئی جبر وا کراہ نہیں تا کہ بندوں پر بھاری بھی نہ ہو اور خدا کی طرف سے اس شکر گذاری پر حسب قانون الٰہی زیادت نعمت کا وعدہ بھی پورا ہو جائے۔ گویا اس طرح اس عباداتی سال کا افتتاح ۳۶ روزوں اور ۳۰ دن کی تراویح سے کر دیا گیا۔ یعنی ۳۶ تروک ۳۰ افعال سے انسانی عبادت کا سال شروع ہوتا ہے۔

عبادت کا ہمہ گیر نقطۂ آغاز...... غور کرو تو رمضان میں عبادت کا یہ جمع شدہ ذخیرہ رمضان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ سال بھر تک یہی ذخیرہ توفیق و برکات کا کام دیتا ہے اگر یہ ذخیرہ اس ماہ میں جمع نہ ہوتا تو پورا سال عبادت سے بیگانگی اور برکات باطن سے محرومی میں بسر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصولاً ہر شے کے نقطہ آغاز ہی میں اس کا انجام اور وسط پنہاں ہوتا ہے۔ وہ نقطہ پھیل کر وسط سے گذرتا ہوا انجام تک جا پہنچتا ہے یعنی آخر تک اسی کا نقطہ فیض کام کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہر کلمہ اور کلام کا نقطہ آغاز حروف مقطعات (حروف تہجی) ہیں اس لئے ہر کلمہ و کلام اور لمبی سے لمبی عبارات میں فیض ان ہی حروف ہجا کا ہوتا ہے درخت کی ہر شاخ اور پھول پتی کا نقطہ آغاز اس کا تخم ہے، تو

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

وہی تخمی مادہ پھیل پھیل کر پھول پتیاں اور برگ و بار بنتا رہتا ہے۔ وہ نہ ہو تو نہ شاخ ہو نہ برگ و بار، گویا سارے برگ و بار درحقیقت اس تخم کا فیض ہوتی ہیں۔

اعداد کا نقطۂ آغاز واحد ہے وہی (ایک) مکرر سہ کرر ہو کر دو اور تین اور سوا لاکھ بنتا رہتا ہے، وہ نہ ہو تو دو نہ ہوں نہ سو اور نہ لاکھ گویا ارب ہا ارب اور کھرب در کھرب فیض صرف ایک ہی کا ہوتے ہیں۔ خود بذاتہ کچھ نہیں، اس اصول پر سمجھو کہ عباداتی سال کا نقطہ آغاز رمضان المبارک اور اس کے افعال و تروک ہیں۔ (جیسا کہ ابھی واضح ہوا) یہی ایک حصہ افعال و تروک کا ذخیرہ درحقیقت سال بھر کی عبادت کا نقطہ آغاز ہے اس لئے یہی مادہ عبادت پورے سال کی عبادت کا مادہ ہے جو رنگ بدل بدل کر مختلف طاعات میں ظہور کرتا رہے گا۔ گویا سال بھر کی مختلف الانواع عبادتیں اور بر و تقویٰ کے مختلف مظاہر اس ماہ کے صبر و استقامت کا فیض ہوتے ہیں، یہ نہ ہو تو سال بھر کی توفیق و برکت درجہ صفر میں رہ جائے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

ماہ رمضان کے اعداد کا اثر...... شاید اس لئے اس ماہ مبارک کے افعال و تروک کے اعداد کچھ ایسی مناسب سے رکھے گئے ہیں کہ برکۃً ہی نہیں عدداً بھی پورے سال پر پھیل سکیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک اکائی دوسرے مہینوں کی دہائیوں کے برابر ثابت ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ آخر رمضان میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے۔ ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ خَصْلَةً مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فِيْمَا سِوَاهُ'' (۱) ''اے لوگو! تم پر سایہ گستر ہوا ہے ایک عظمت والا مہینہ ایک برکت والا مہینہ، وہ مہینہ جس میں ایک رات، ہزار رات سے بہتر ہے اللہ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں اور قیام لیل (تراویح) نفل رکھی ہے جس نے اس مہینے میں کوئی بھی بھلائی کی بات کی تو وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے ماسوا رمضان کے (بقیہ سال میں) کوئی فریضہ ادا کیا۔ اور جس نے اس ماہ میں فریضہ ادا کیا مثلاً (روزے رکھے) تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں (بقیہ سال) میں ستر فریضے ادا کئے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس ماہ کی نفل بقیہ سال کے فرض کے برابر ہے اور اس کا فرض بقیہ سال میں ستر فرائض کی برابر ہے۔ گویا بلحاظ برکت ہی نہیں بلکہ بلحاظ اجر اور عدد بھی اس مہینہ کی طاعت کی ایک اکائی دوسرے مہینوں کی طاعت کی دہائیوں کے برابر ہے۔ ماہ رمضان کے دنوں کو دیکھئے تو ان میں ۳۰ روزے رکھے گئے ہیں اور شریعت کی بخششیں بے کراں نے ایک نیکی کو دس نیکی کے برابر شمار کیا ہے۔ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (۲)

اس اصول پر یہ ۳۰ روزے ۳۰۰ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر عید کے بعد شش عید جو بطور تتمہ و توابع رمضان کے ساتھ لاحق کئے گئے ہیں (گو بوجہ تسہیل و رحمت انہیں اختیار رکھا گیا اور جزو رمضان نہیں بنایا گیا) اصول مذکورہ

(۱) شعب الایمان للبیهقی، فضائل شهر رمضان، ج: ۸ ص: ۱۲۰۔ (۲) پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۰۔

پر ۶۰ ہو جاتے ہیں تو رمضان کے اصل اور ملحقہ روزوں کا مجموعہ بھی وہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔اوراس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے اوپر ۳۶۰ دنوں کے مساوی ہیں اور رمضان کے یہ اصل اور توابع روزے پورے کر دینے والا سال کے تمام روزے رکھنے والا بن کر صائم الدہر بن جاتا ہے۔اسی مضمون کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ ذیل میں ارشاد فرمایا ہے۔جس کو حضرت انصاریؓ روایت فرمار ہے ہیں''مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ'' ① ''جس نے رمضان کے روزے پورے رکھے۔پھر شوال میں ۶ روزے ان کے ساتھ اور ملا لئے تو تو یہ عمر بھر روزے رکھنے کی مانند ہے'' (رواہ مسلم)۔② حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے''اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِّمَا بَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ'' ③ ''پانچ نمازیں جمعے سے جمعہ رمضان سے رمضان تک درمیانی دنوں کے گناہوں کا کفارہ یہ رمضان ہی ادا کر دیتا ہے جبکہ کبیرہ گناہوں بچتا رہے''۔

اس سے واضح ہو گیا کہ رمضان ہی کی اطاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔اور یہی فیض منتشر ہو کر سال بھر کے دنوں راتوں کی عبادات اور توفیق کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔نہ صرف برکۃً یا اثرًا بلکہ عددًا بھی رمضان سال عبادت کا نقطۂ آغاز اور تخم توفیق تھا۔اس لئے مادہ توفیق وطاعت سال بھر کی عبادت کے برگ وبار کی آبیاری کرتا ہے اور پورے سال پر چھایا ہوا رہتا ہے۔

رمضان اور اشہر حج کا باہمی ارتباط...... یہی وجہ ہے کہ رمضان کے ایام نے جن تروک (ترک طعام ترک شرب اور ترک خواہشات) کا پرداز ڈالا وہ رمضان ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان تروک سے دوسرے اور تروک نشو نما پاتے ہیں اور تقویٰ کے آگے کی منزلیں سامنے چلی جاتی ہیں، جو اگر رمضان میں نہیں ہوتیں مگر رمضان ہی کے تروک کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ماہ رمضان میں طلب حق نے محبت حق کی خاطر اپنے نفس کی عظیم آرزوؤں یعنی کھانے پینے اور لذت نفسانی کی چیز کو ترک کر کے ترک ہوائے نفس کی استعداد پیدا کر لی تو تروک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔کھانے پینے اور قرب ووصال کی لذتوں کے سوا اور بھی بہت سی لذات ہیں جن کی خواہش نفس میں ہمہ وقت موجزن رہتی ہے یہ تو صرف باہ کے سلسلہ کی لذتیں تھیں۔جنہیں رمضان نے ایک دم چھڑا کر فی الجملہ صبر کر لینے کی قوت انسان میں پیدا کر دی تھی۔لیکن ان سے زیادہ سخت اور ہولناک جاہ کے سلسلہ کی لذتیں ہیں۔جو انسان کو مغرور ومتکبر بنا کر مشاہدہ حق ہی سے نہیں جادہ حق سے بھی بھٹکا دیتی ہیں۔اور قرب ووصال کے درجات میں سدراہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام من شوال... ج:٦ ص:٦٦.

② الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام من شوال ج:٦ ص:٦٦.

③ الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة. ج:٢ ص:٢٣.

ہو جاتی ہیں کبھی مکان اور بلڈنگ سے اپنے کو باوقار کہلانے کی کوشش کرتا ہے کبھی اپنے قبیلے اور دوست احباب کے اجتماع اور جمگھٹوں سے اپنے لئے شیخی اور فکر کا سامان بہم پہنچاتا ہے کبھی اپنی متانت اور سنجیدگی و بامعنی خاموشی کی نمائش سے اپنے سے وقار کی نمائش کرتا ہے کبھی اپنی زینت وآرائش اور خوبصورتیوں پر گھمنڈ کر کے اپنے خیال میں بدقسمت ہو جاتا ہے اور پھر ان ہی جاہ پسندانہ اندازوں سے دوسروں پر ظلم وتعدی وغیرہ کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں جن سے دنیا میں فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اور دنیا امن وسکھ سے محروم ہو جاتی ہے۔

غرض جاہ پسندی اور دوسروں پر بڑا بننے اور عوام میں امتیازی شان نمایاں کرنے کے مختلف ڈھنگ ہیں اور مختلف راستے ہیں جس سے گزر کر ایک مغرور انسان قرب الٰہی اور وصال حق سے محروم ہو جاتا ہے اس لئے ان کا ترک ان تروک سے بھی زیادہ ضروری ہے جن کی رمضان نے مشق کرائی تھی۔

اس لئے جونہی ان باہی اور شہوانی لذات کے افراط سے نجات پا جانے کی استعداد پیدا کر کے رمضان رخصت ہو جاتا ہے ویسے ہی حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہی، جو حج کا پیغام دیتے ہیں جس طرح ہلال رمضان نے اعلان کیا تھا کہ اگر دربار الٰہی میں حاضر ہو کر قرب ووصال شاہی منظور ہے تو شہوانی لذات سے پاک وصاف ہو کر اور انہیں ترک کر کے دربار شاہی (مساجد) میں تراویح وتلاوت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اسی طرح ہلال شوال اعلان کرتا ہے کہ محل سرائے شاہی (حرم کعبہ) یعنی سید المساجد میں حاضری اور خلوت محبوب مطلوب ہے تو ان جاہ پسندیوں کو ترک کر کے عاشقانہ وارفتگی پیدا کرو اور خدا کے گھر کی طرف پروانہ وار بڑھو مگر ع

شرط اول قدم آن ست کہ مجنون باشی

یہ سامان وقار چھوڑو، اسباب جاہ ترک کرو۔ وسائل غرور وگھمنڈ کو خیر باد کہو اور دیوانہ وار محبوب حقیقی کی طرف چلو، سب سے پہلے گھربار اور وطن ترک کرو اور اپنا گھر چھوڑ کر محبوب کے گھر کی طرف کوچ کرو اپنا شہر چھوڑ کر خدا کے بلد امین کی طرف بڑھو عزیز واقرباء کی موانست مانع وصال الٰہی ہے تو اسے بھی چھوڑ دو مسافرت اور غربت اختیار کرو جتھے اور قبیلے کی طاقتوں پر بھروسہ تھا تو اسے بھی خیر باد کہو کسمپرسی اور بے کسی کی شان سے گھر سے نکل کھڑے ہو۔ پھر نکلو تو دیوانوں کی طرح عاشقوں کی طرح نکلو۔

عاشقی، درویشی اور سرشاری...... سب سے پہلا سامان وقار لباس اور اس کا فیشن ہے اس ترک کر کے احرام باندھو اور ایک لنگی کندھے پر اور ایک لنگی گھٹنوں میں یعنی شاہانہ رئیسانہ اور منعمانہ ٹھاٹھ چھوڑ کر فقیروں کا بھیس بھرو اور مسکینوں کی سی وضع بناؤ کپڑوں کی بو کا بھی دھیان نہ رہے۔ کہ خوشبو کی فکر ہو۔ عاشق کو ان نمائشی چیزوں سے کیا واسطہ اگر وہ عشق سے مغلوب ہے۔ بدن کی صفائی ستھرائی کے دھیان کو ترک کرو الحج العج والثج حج تو نام ہی ہے میلے کچیلے رہنے یعنی صفائی ستھرائی کے خیال کو غیر سمجھ کر ان سے بے نیاز ہو جانے کا بدن کے بناؤ سنگار کی فکریں چھوڑو نہ غسل کی پرواہ نہ حجامت کی خبر نہ خط کی اصلاح نہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے کی فکر حتی کہ میلے بدن میں جوئیں بھی

پڑجائیں تو انہیں بھی مت چھیڑو کہ تم محبوب کے عاشق بن کر چلے ہو تمہیں جانداروں کے قتل و غارت سے کیا سروکار؟ چہرہ غبار آلود پیر گرد آلود نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتہ نہ کندھوں پر عباء وقباء نہ بال سنوارے ہوئے نہ مانگ نہ پٹی نہ ان میں تیل پھر بولنے میں نہ آواز بنانے کی فکر نہ الفاظ کے سنوارنے کی فکر نہ کلمات کی سجاوٹ، نہ عبادت کی زینت، بلکہ سرے سے ہی فضول کلام ترک کردو، ورد زبان ہو لبیک کبھی پست آواز سے ہو تو کبھی بلند آواز سے کبھی آہستہ سے اور کبھی شور کے ساتھ یعنی آوازیں بھی عاشقانہ۔

مگر دیوانگی پیدا کرو۔ قافلے میں ہو تو لبیک لبیک کا شور ہو۔ زمین کی اونچ نیچ آجائے تو چلا پڑو تا کہ آواز کا وقار جس کی بناوٹ اور سجاوٹ کی فکر تھی مٹ کررہ جائے غرض نہ بات اپنی نہ کلام اپنا۔ بات ہو تو محبوب کی اور کلام ہو تو شوق محبوب اور ذوق عشق کا، یعنی زبان اور گلا صرف اسی کے لئے وقف ہو۔ محبوب کا گھر آجائے تو آواز شوق بلند کرو، شوق وذوق میں کبھی خانہ محبوب کے پتھروں کو چومو، کبھی پردہ دیوار کو تھام کر روؤ اور چیخو، کبھی اس گھر کے اردگرد پروانوں کی طرح گھومو، نثار ہو، کبھی یاد میں غرق ہو کر سرنگوں ہو اور کبھی بھکاری بن کر بانگ سے سرفراز ہو، کبھی فریاد اور کبھی یاد کرو، کبھی قرب کا شکریہ کبھی بعد کا شکوہ، پیر چکر میں ہوں اور زبان عشق کی حرکت میں، پھر ان چکروں میں چال بھی ایک انداز کی نہ ہو جس سے چال کی خوشنمائی کا وقار آگے آئے، اگر چند پھیروں میں سیدھے چلو تو چند پھیروں میں اکڑ کر مونڈھے ہلا ہلا کر سینہ تان کر چلو۔ یعنی کبھی در محبوب کے مسکین بن جاؤ۔ اور کبھی محبوب کے سپاہی ہو جاؤ، صورت وسیرت ہی نہیں مرضی بھی تمہاری کوئی اپنی نہ ہو۔ ایک مرضی محبوب ہو اور تم ہو، مرضی حق ہو اور اس کی پیروی تا کہ اندرون میں کوئی شیخی وغرور نہ رہ جائے اور نہ بیرون پر کوئی اتراہٹ اور ناز وانداز کی نمود آئے۔

صورت وقار کی بھی ممانعت...... پھر یہ کفنی کا لباس بھی ان پھیروں میں کبھی ایک ہیئت ورنگ پر نہ ہو کہ صورت وقار پیدا ہو جائے اگر پہلے تین پھیروں میں وہ بر جائے خود نہ ہو۔ تو چار پھیروں میں اسے دائیں کندھے کے اوپر کو لیا جائے۔ تا کہ اس کفنی کے اوڑھنے اور پہننے میں بھی کوئی اتفاقی پھبن اور سجاوٹ پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی عاشقی کے شایاں نہیں یعنی اگر غیر اختیاری پھبن بھی سجاوٹ بن جائے تو وہ بھی یکسر مٹ کر رہ جائے۔ پھر ان گھومنے کے پھیروں میں گو دیوانگی تھی مگر چال ڈھال اور رفتار معمول کی مطابق تھی اس لئے اس کو بھی ختم کرو۔ صفا ومروہ پہنچو تو چال کہیں آہستہ ہو تو کہیں دوڑ بھاگ بھی ہوتا کہ چال کا انداز بھی ایک انداز پر باقی نہ رہے جیسا کہ طواف میں ہیئت بدن کا اپنا انداز مٹا دیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح اس عاشق حق کے لباس، بدن، زینت، چال ڈھال، سیرت وصورت، کلام، آواز، رفتار، گفتار وغیرہ میں کوئی شائبہ نمائشی وقار ومتانت کا باقی نہ رہ جائے۔

خانہ بدوشی...... پھر اگر چہ تم نے وطن اور وطن داروں کا انس چھوڑ دیا، بلد امین میں پہنچ گئے، مگر بلد امین بھی تو بہر حال آبادی ہے جس میں اپنا نہیں تو اس شہر والوں کا سامان زینت، لذت بخش، انکی آوازیں انس افزائے سمع و گوش اور ان کی ملاقاتیں، انس افزائے دید ودل تو ہوتی ہیں جو وصال یار میں حائل ہو سکتی ہیں۔

اس لئے مکہ کی آبادی بھی ترک کرو کہ وہ پھر وطن اقامت اور محل موانست ہے جنگل بیاباں میں بسر کرو جہاں نہ گھر ہو نہ در، نہ تمدن، نہ عمارت نہ سامان معاش، نہ اسباب رفاہیت، عرفات کے ریگستان میں جلتی دوپہر میں دھوپ کے سمندر میں گزارو، کسی کپڑے، خیمہ سے اگر دھوپ سے بچاؤ ہو جائے تو فبہا ورنہ سایہ کی لذت بھی ترک کردو، تپش کو ترجیح دو اور خنکی کی راحت بھی چھوڑ دو، مسکن اور جائے سکون کی فکر میں مت رہو۔ ویرانہ نشین اور صحرا نورد ہو جاؤ۔ خانہ بدوشوں کی طرح یہ دن منیٰ میں گزارو تو رات مزدلفہ میں بسر ہو۔ نہ وہاں پورا دن، نہ یہاں پوری رات، پھر مزدلفہ کی رات بھی اس فکر کے ساتھ گزارو۔ کہ صبح ہی یہاں سے کوچ ہے، مزدلفہ بھی طلوع آفتاب سے پہلے چھوڑ دو، گویا عرفات کے دن کی طرح یہاں کی رات بھی بے فکری سے نہ گزارے کہ عاشق کو چین اور لطف اندوزیوں سے کیا واسطہ؟ پھر مزدلفہ کی آدھی تہائی رات میں خدمت محبوب پیش نظر رہے، علاوہ طاعت وعبادت کے اس میدان کی کنکریاں بھی چنو تا کہ اس میگزین سے دشمن الٰہی اور خود عشاق کے پشتینی دشمن شیطان رجیم کو سنگسار کر سکو جو راہ محبوب میں حائل اور ناصح نادان بن کر سامنے آتا ہے۔ مزدلفہ سے منی میں آؤ تو گویا وہاں دو تین شب قیام ہو، مگر اس کو بھی سفر در انجمن کا مصداق رکھو، ایک جگہ چین سے بسیرا نہ کرو۔ کبھی یہاں سے پھر در محبوب پر جاؤ۔ خانہ محبوب کے گرد پروانہ وار گھومو، واپس ہو تو روزانہ اس شیطان سے لڑائی مول لو جو راہ جاں سپاری میں حائل ہوتا ہے تا کہ صلح جوئی سے بیٹھے رہنے کا سکون وقار بھی ختم ہو جائے، اور وہ بھی رمی جمار سے تا کہ سپاہیانہ وقار کا غرور بھی مٹ جائے اور دنیا دیکھ لے تیر و تفنگ چلانے والا سپاہی آج چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے پر اتر آیا ہے۔

فدیۂ جان......تو اب وقت آ گیا کہ سر سے اس نفس ہی کو راہ محبوب میں نثار کردو اور خود اسی کے گلے پر چھری چلادو، اگر سب کچھ کھو کر جان باقی رہ گئی تھی تو اس سے بھی دریغ نہ کرو، یہ الگ بات ہے کہ محبوب حقیقی محض اپنی شفقت بے پایاں سے ذبیحہ جان کا فدیہ ذبیحہ حیوان سے قبول فرمالے، ورنہ اس راہ میں یہ جان جان آفریں کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتی اور وہ جب کہ اسی کو بخشی ہوئی ہو تو سودا بہت ہی ارزاں ہو جاتا ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہر حال شکر محبوب کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق منحر میں پہنچ کر اپنا فدیہ ایک جان کی قربانی سے دیدو کہ یہ آخری ترک ہے تروک میں سے جس کے ذریعے وصال محبوب کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ بہر حال شہر رمضان نے اگر باہی لذات ترک کرائی تھیں تو اشہر حج نے جاہی لذات کے ترک کا پروگرام پیش کیا، جو ترک وطن، ترک مسکن اور ترک لباس، ترک زینت، ترک راحت، ترک فیشن، ترک نمائش، ترک وقار، ترک جاہ، ترک افتخار ترک نشاط اور ترک مال سے شروع ہو کر ترک جان پر ختم ہو جاتا ہے۔

ایام حج میں یاد رمضان......مگر ساتھ ہی ساتھ باہ کی ان لذات کے ترک سے بھی چشم پوشی نہیں کہ جو رمضان نے سکھلائی تھیں، بلکہ اشہر حج میں خاص تروک کے ساتھ رمضان کے تروک کو بروئے کار لانے کے لئے گویا

نصف ماہ رمضان کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ یعنی چھ روزے شوال کے اور نو روزے عشرہ ذی الحجہ کے اشہرِ حج میں رکھ کر پندرہ روزوں کا پروگرام اشہرِ حج میں رکھ دیا گیا ہے، تا کہ ان مہینوں میں بھی آدمی رمضان کو فراموش نہ کر سکے، حتیٰ کہ بعض روایات میں عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کو رمضان کے دنوں پر فوقیت اور فضیلت دی گئی ہے۔ دونوں کی لذتوں کا سلسلہ منقطع کرایا جاتا ہے۔ تب آدمی خانہ محبوب کی حاضر باشی اور مشاہدہ حق کے قابل بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رمضان ابتدائی تروک کا مہینہ ہے۔ اور اشہرِ حج ان تروک کی تکمیل و انتہا کے مہینے ہیں۔

حکمتِ عیدِ قربان...... ہاں پھر جس طرح رمضان کے تروک و افعال کی تکمیل پر یکم شوال کو دوگانہ شکر ادا کیا گیا تھا اور مالی شکریہ میں صدقہ فطر سے عیالِ محبوب (غرباء و احباب) کی خدمت کی گئی تھی، اسی طرح یہاں بھی حج کے تروک و افعال کی تکمیل پر جو نویں ذوالحجہ تک ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کو اسی انداز سے بجان و دل دوگانہ شکر ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صدقہ اضحیہ (قربانی) سے غربا و احباب کی خدمت کی جاتی ہے تا کہ مالی شکریہ بھی ادا ہو جائے۔

شانِ جلال و جمال کا شکریہ...... پس عیدین کے تہوار اسلام میں رنگ رلیاں منانے کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ رنگ رلیوں کو مٹانے اور اس قسم کے تمام مادی اور نفسانی لذتوں اور خواہشوں کو ختم کر کے روحانی قرب و وصال کے شکریہ کے طور پر قائم کئے گئے ہیں، فرق اتنا ہے کہ رمضان کے تروک کے ساتھ افعالِ بر کے سلسلہ میں نماز (تراویح) کا فعل رکھ لیا گیا جو حق تعالیٰ کے جلال و عظمت کے سامنے اظہارِ نیاز و عبودیت کے لئے ہے تا کہ اس کی علی الاطلاق آقائی اور حکمرانی کے ساتھ اپنی علی الاطلاق ذلت و نیازمندی اور محکومیت کا ثبوت پیش کیا جائے اور اشہرِ حج کے تروک کے ساتھ افعالِ بر کے سلسلہ میں مناسکِ حج رکھے گئے جو حق تعالیٰ کے جمال و محبوبیت کے سامنے اپنی شیفتگی اور گرویدگی اور اپنے عشق و محبت کے جذبات پیش کرنے کے لئے ہیں تا کہ اس کے علی الاطلاق جمال و خوبی کے سامنے اپنا علی الاطلاق عشق و محبت پیش کر دیا جائے۔

دوسرے رخ سے دیکھئے تو ترک کے سلسلہ میں محکوم اور غلام کو بسلسلہ حاضری ملازمت نفس کی مرغوبات اور خواہشات ترک کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ کھانے کمانے اور اڑانے کے کام کا نہیں رہتا۔ ورنہ اسے خدمت کا وقت کیسے ملتا اور عاشق و محب کو محض خواہشات نفس ہی نہیں سرے سے نفس ہی کو تج دینا پڑتا ہے، نفس کی شخصیت اور تشخص ہی کو عشق میں گم کر دینا پڑتا ہے اسکی حیثیت عرفی اور طبعی، غرور و قار تو دور کی چیز ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نماز تو شاہی خدمات بجالانے کے لئے سرکاری طور پر حاضری دربار شاہی ہے جس کے لئے وقت اور عیش کی قربانی کافی ہے مگر شاہی آداب بجالانے کے ساتھ اور حج عاشقی کے جوش میں حرم سرائے شاہی میں شخصی حاضری ہے جس کے لئے جان و مال دونوں کی قربانی ضروری ہے۔ مگر آدابِ عشق کے ساتھ جس کا حاصل خودگزاری اور خود فراموشی ہے۔

نماز میں سکون و متانت مطلوب ہے کہ دربار اور دفترِ معبودیت میں حاضر ہوتی ہے اور حج سے اسی سکون

ومتانت کو مٹایا جاتا ہے کہ عاشقانہ رنگ سے در محبوب کی حاضری ہے، پس تلاوت وتراویح رمضان کے لئے تو باہی تروک رکھے گئے جن کا تعلق عیش سے تھا سکون ومتانت سے نہ تھا، اوراس کے لئے وقت کی قربانی کافی تھی، لیکن حرم سرائے میں پہنچ کر قرب ووصال کے لئے جاہی تروک بھی ضروری ہو گئے جن کا تعلق جاہ وباہ، عیش ووقار، متانت وہیبت سب ہی سے تھا، تا کہ عاشق کی مسکنت اور خود گزاری پیدا ہو جائے تو اس کے لئے محض وقت کی قربانی کافی نہ تھی جب تک کہ عین نفس کی قربانی نہ کر دی جائے۔

پس عید الفطر سے شئونِ جلال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو غلام بننا میسر آ گیا اور عید الاضحی سے شئونِ جمال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو عاشق ہونا میسر آ گیا۔

اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے...... اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ علی الاطلاق مالک الملک اور آقا وحاکم ہیں ایسے ہی وہ علی الاطلاق محبوب ومطلوب اور جمیل ومرغوب بھی ہیں اوراس لئے جہاں ایک بندہ کو ان کے شاہی دربار (مساجد) میں حکمبر دار اور نیاز مند بن کر حاضر ہونا ضروری ہے وہیں اس کے لئے انکے شاہی حرم (مسجد حرام) میں عاشق وگرویدہ بن کر بھی پہنچنا ضروری ہے، یعنی اس کی بندگی تام وکامل نہیں ہوگی اگر ان میں سے ایک نوع بھی بندگی کی رہ جائے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام میں حج نہ ہوتا اسلام ناقص رہ جاتا کہ شئونِ جمال کے تقاضے منعدم رہ جاتے پس جہاں اسلام کی تکمیل وتتمیم نماز اور حج کے بغیر ممکن نہ تھی، وہیں مسلمان کی تکمیل بھی بغیر ادائیگی نماز وحج کے ممکن نہ تھی۔

اس لئے اسلام کی دو ہی بنیادی عبادتیں اصل نکلتی ہیں، نماز اور حج، ایک جلالی عبادت ہے اور ایک جمالی، بقیہ دو عبادتیں زکوٰۃ وصوم یہ خود اصل نہیں ہیں بلکہ ان دونوں اصلی عبادتوں کے تابع اور ان کے مقدمہ وتمہید کے طور پر ہیں، زکوٰۃ مقدمہ نماز ہے جس سے نماز قائم ہوتی ہے کیونکہ نماز اور حاضری دربار میں اگر حارج ہے تو مال ومنال اوراسی کی عیش کوشیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے اس لئے اسے زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے ترک کرا کر دل سے اس کی محبت نکال جاتی ہے تا کہ موانع مرتفع ہو کر مقصود کا جمال سامنے آ جائے۔

ادھر روزہ مقدمہ حج ہے سرائے شاہی میں حضوری اور قرب خاص سے لذت اندوزی میں اگر حارج ہے تو نفس اور نفسانیت کے تقاضے یعنی وہ جاہ واقتدار اور کبر وغرور ہوتے ہیں۔ اس لئے روزہ سے تروک کی ابتداء کی جاتی ہے اور اشہر حج پر لا کر انہیں مختتم کر دیا جاتا ہے، تا کہ موانع ختم ہو کر مطلوب ہو جائے اس لئے اشہر حج کو رمضان سے متصل رکھا گیا کہ ابتدائی تروک ختم ہوتے ہی انتہائی آ لگیں اور تروک کا سلسلہ متصل رہے۔

پس اسلام میں بنیادی عبادتیں دو ہیں، نماز اور حج اور عبادتیں ان کے مقدمات اور تمہید ہیں یعنی زکوٰۃ اور صوم، بنیادی عبادتوں میں اصل حصہ افعال کا ہے جو مقصود اصلی ہیں اور نفس ان سے آراستہ ہوتا ہے اور تمہیدی عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور صیام میں اصل حصہ تروک کا ہے جو مبادی ہیں جن سے نفس کا رذائل سے صاف ہونا ہے۔

اجتماعی دین...... اسلام چونکہ اجتماعی دین ہے اس لئے اس کی یہ اصل عبادتیں نماز اور حج تو اجتماعی رکھی گئیں چنانچہ دونوں میں اصل اجتماع ہے اور دونوں کے لئے امام و امیر ناگزیز ہے جو اجتماعی رنگ کا خاصہ لازمہ ہے اور تمہیدی عبادتیں چوں کہ محض ان اجتماعی عبادتوں کے لئے نفس کو تیار کرنے کے لئے تھیں اور نفس ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ دونوں عبادتیں (صوم و زکوٰۃ) بھی انفرادی رنگ کی رکھی گئیں چنانچہ ہر ایک کا مال اور اس کی مقدار الگ الگ ہے۔ اس لئے ہر ایک کی زکوٰۃ بھی مقدار و مدت کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ اسی طرح ترک طعام و شہوات بھی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے روزہ بھی ہر شخص کا اپنا اپنا الگ ہے۔ غرض اسلام کے اجتماعی دن ہونے کا مقتضی بھی یہی تھا کہ اس کی بنیادی عبادتیں تو اجتماعی ہوں اور تمہیدی عبادتوں میں اجتماعیت کی شرط نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تربیت میں ایک مسلم کا عباداتی سال افعال و تروک اور برو تقویٰ سے مخلوط اور ملا جلا رکھا گیا ہے اگر اس کی بنیاد عبادتوں میں سے دو عبادتیں افعال کی قسم سے رکھی گئی ہیں۔ یعنی نماز اور حج تو دو تروک کی قسم سے رکھی گئی ہیں یعنی صوم و زکوٰۃ اور اگر اس عباداتی سال کے ابتدائی مہینے (رمضان) میں افعال بر، تلاوت و تراویح وغیرہ رکھے گئے ہیں تو اسی ماہ میں تروک تقویٰ (ترک طعام و شہوات) بھی رکھے گئے۔

عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت...... اسی طرح اگر اس عباداتی سال کے درمیانی حصوں مثلاً اشہر حج میں بر، طواف و زیارت اور صلوٰۃ و تلاوت کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے تو ان ہی مہینوں میں جا بجا و باہی دونوں قسم کے انتہائی تروک بھی جمع کئے گئے ہیں جن میں صیام عشرہ ذی الحجہ اور بالخصوص صوم یوم عرفہ خاص اہمیت رکھتے ہیں یا مثلاً اشہر حج کے بعد محرم میں جہاں افعال بر تلاوت و نماز اور اذکار وغیرہ معمولاً رکھے گئے ہیں۔ وہیں تروک کے سلسلہ میں یوم عاشورہ کا روزہ بھی اہمیت کے ساتھ رکھا جاتا ہے جس سے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے ان درمیانی مہینوں میں بسلسلۂ افعال بر خاص فرائض ہی پر نہیں قناعت کی گئی' بلکہ عام نوافل و تطوعات بھی رکھے گئے ہیں ایسے ہی بسلسلہ تروک تقویٰ محض خاص روزوں صوم یوم عرفہ اور صوم یوم عاشورہ وغیرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ماہ میں ایام بیض کے تین روزے اور ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے روزے بھی رکھے گئے ہیں تاکہ درمیان سال کا کوئی مہینہ بھی افعال بر اور تروک تقویٰ سے خالی نہ رہے اور رمضان کی یاد فعل و ترک دونوں حیثیتوں سے تازہ ہوتی رہے، اسی طرح اسی عباداتی سال کے نقطہ اختتام یعنی شعبان میں شب برات کے افعال بر بصورت صلوٰۃ و تلاوت اور مجاہدہ مراقبہ رکھے گئے ہیں جس سے اس رات کا احیاء ہوتا ہے۔

تو وہیں یوم برات کا روزہ بھی سنت اسلام قرار دیا گیا اور پھر بطرز سابق اس خاص فعل و ترک ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ افعال بر کے ساتھ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کی تھی۔ گویا شعبان افعال و تروک سے بھرپور رہتا تھا۔ جس میں شب برات کے افعال اور یوم برات کے تروک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہ و سال کا توازن...... بہر حال سال جس کی ابتداء میں رمضان اور اس کے افعال و تروک ہوں اور جس کے

درمیانی مہینوں میں اشہرحج اور محرم وغیرہ کے جامع ترین افعال وتروک ہوں اور جس کی انتہا میں شعبان اوراس کے مخصوص افعال وتروک ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سال کی برکت وہدایت اور نورانیت کی کیا انتہا ہوسکتی ہے؟ کیونکہ جس چیز کا اول وآخر اور وسط درست وصحیح ہو وہ یقیناً محفوظ اور نجات یافتہ اور ہلاکت سے دور ہوتی ہے۔

پس جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مرحومہ کے اول وآخر اور وسط کا ذکر کرکے بحیثیت مجموعی امت کی نجات اور عدم ہلاکت کا یقین دلایا اور فرمایا: ''کَیْفَ تَهْلِکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُهَا''...... ''وہ امت کیسے ہلاک ہوسکتی ہے جس کا اول میں ہوں اور جس کے درمیان مہدی ہوں اور جس کا آخر حضرت مسیح علیہ السلام ہوں''۔ ① ایسے ہی بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرد مومن کیسے ہلاک ہوسکتا جس کے عباداتی سال کا اول رمضان المبارک ہو اور جس کا اوسط اشہرحج اور محرم الحرام ہو اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مومن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہیں تا آنکہ اس کی عمر پوری ہوجائے تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول وآخر اور وسط کے ساتھ جاہ وباہ کے تروک کے ذریعہ نفسانی خس وخاشاک سے پاک ہوگی اور افعال طاعت وعبودیت اور بر کے ذریعہ نور وبرکت سے چمک اٹھے گی، اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے۔ وہ نار سے بچ جائے گا اور نور سے سرفراز ہوگا جو حقیقی فوز وفلاح ہے۔ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ② ''جو نار سے نکالا گیا اور جنت (نور محض) میں داخل کردیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکہ کے سامان کے اور کچھ نہیں''۔

ان اوراق پریشان سے امید ہے کہ ناظرین پر رمضان عید اور مناسک حج کی حقیقتیں اور حکمتیں اور ان کے آثار ونتائج ایک حد تک واضح ہوگئے ہوں گے جو ان سطور کا مقصد اور اس زیر نظر رسالہ کا نصب العین ہے۔ زیادہ تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہ تھے اس لئے اسی قدر قلیل پر قناعت کی گئی۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِیْنُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقِ

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے بیان کیا۔ جب رمضان آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ان کلمات کی تعلیم دیتے۔ ''اَللّٰهُمَّ سَلِّمْنِیْ لِرَمَضَانَ وَسَلِّمْ رَمَضَانَ لِیْ وَسَلِّمْهُ لِیْ مُتَقَبَّلًا'' ③ ''اے میرے اللہ! مجھ کو رمضان کے لئے محفوظ کردے اور رمضان کو میرے لئے محفوظ کردے۔ اور اس رمضان کو بحفاظت میرے لئے قبول فرما''۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ.

① مشكوٰة المصابيح، كتاب المناقب، باب تسمية من سمى من اهل البدر، ج:٣، ص: ١٧٣.

② پاره:٤، سورة آل عمران، الآية: ١٨٥.

③ كنز العمال، ج:٨ ص: ٥٨٤ رقم: ٢٤٢٧٧ (طب في الدعاء والديلمي وسنده حسن)

فضیلتِ تقویٰ

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَحَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْجَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

احوال واقعی...... بزرگانِ محترم! یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بیماری کا سلسلہ شروع ہوگیا اورنزلہ زکام بخار وغیرہ کی وجہ سے کچھ کمزوری پیدا ہوئی تو میں نے معذرت کردی کہ بھائی! آج رہنے دو پھر دیکھی جاوے گی' چنانچہ ہمارے بھائی رشید نے یہ بھی فرمایا کہ واپسی میں ایک دن دیا جائے اس میں کچھ بیان وہ جائے گا۔ میں نے اس پر کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آج میں نے سوچا کہ شاید بھول گئے ہوں گے اور یہ دیکھ کر کوئی سامان بھی جلسہ واجلاس کا نہیں بالکل مطمئن تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سب جمع ہیں تو اچانک ایک چیز سامنے آئی اور مجمع کے احترام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کچھ بیان کر دیا جائے چاہے ہو مختصر ہی ہو۔ اس لئے زیادہ وقت بھی نہ لے سکوں گا۔ مختصر طریق پر چند باتیں گزارش کروں گا۔

طریقِ سلف اور وصیتِ تقویٰ...... سلفِ صالحین یعنی حضرات صحابہؓ اور حضرات تابعینؒ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تو کہتے تھے کہ کچھ نصیحت کیجئے چھوٹے اپنے بڑوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے اور بڑے اپنے چھوٹوں سے نصیحت طلب کرتے تھے، عام طور سے سلف کی یہ نصیحت ہوتی تھی کہ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ. ''میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں''۔

یہ سلف کا عام جواب ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳.

اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس کے لئے مشکلات میں ایسے راستے کھولتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہے ہر طرف سے راستے بند ہیں غیب سے سامان ہوتا ہے اور راہ نکل آتی ہے اور وہ مشکل سے نکل جاتا ہے۔

نتائج تقویٰ...... اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ ① ''تقویٰ پر مرتب شدہ پہلا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے کام آتے ہیں''۔ اور دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② ''حق تعالیٰ اس کو ایسے انداز سے رزق دیتے ہیں کہ اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ میرا رزق یہاں سے پہنچ جائے گا اور پہنچتا ہے وہیں سے''۔ تیسرا وعدہ یہ فرمایا ہے ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ﴾ ③ ''کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں''۔ اور چوتھا ثمرہ اور نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے ﴿وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا﴾ ④ ''اللہ اس کے اجر وثواب کو بہت بڑھا دیتا ہے''۔

تو تقویٰ اختیار کرنے پر ان آیات میں چار وعدے دیئے گئے ہیں مشکلات میں راستہ کھول دینا، رزق بے شان وگمان پہنچانا، معصیت کا کفارہ کر دینا، اجر وثواب کو بڑھا دینا، تقویٰ کے ایک معنی تو لغت میں ڈرنے اور خوف کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ''اللہ سے ڈرو اور خوف وخشیۃ اختیار کرو''۔ کسی حالت میں بے فکر ہو کر مت بیٹھو، خواہ دولت مند ہو خواہ مفلس ہو۔ ہر حالت میں اللہ کا ڈر انسان کو رہنا چاہئے۔

تقویٰ، امن عالم کا ضامن ہے...... اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی جرائم اور معصیتیں ہیں وہ اللہ کے ڈر سے ہی ختم ہوتی ہیں۔ جرائم کو نہ پولیس روک سکتی ہے نہ فوج روک سکتی ہے اور نہ ہتھیار روک سکتے ہیں۔ جب تک کہ دل میں ڈر اور خوف خداوندی نہ ہوگا۔ آدمی جرائم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر محض پولیس اور فوج کی طاقت سے جرائم بند ہو جایا کرتے تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوجوں کی کمی ہے اور نہ پولیس کی کمی ہے اور نہ ہتھیاروں کی کمی ہے بلکہ آج کل ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں کہ دنیا نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ توپیں بھی ہیں بم بھی ہیں، غرض ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کے اثرات دور دور تک جاتے ہیں۔

ایک بم سے لاکھوں آدمی ختم ہو سکتے ہیں، اگر ان ذرائع سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا اور جرائم مٹ سکتے تو آج کی دنیا میں کوئی جرم باقی نہ رہتا، سب کے سب متقی اور پرہیزگار ہوتے لیکن جتنی پولیس بڑھتی جاتی ہے اور جتنی فوج اور ہتھیار بڑھائے جاتے ہیں اس سے دگنے جرائم بڑھتے جاتے ہیں اور عام طور سے دنیا میں فسق وفجور مار دھاڑ اور بدامنی، بدنیتی اور فسادات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ارتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے، بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے۔ اگر یہ ہو تو آدمی کو اتکارب جرائم کی ہمت ہی

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳۔
③ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۵۔ ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۵۔

نہیں ہوگی خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

تقویٰ کے بغیر قیام امن ناممکن ہے...... مثلاً آپ کے سامنے لاکھوں روپے کا خزانہ رکھا ہوا ہے اگر آپ اٹھا کر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں کیونکہ وہاں نہ پولیس ہے نہ فوج ہے مگر آپ اسے نہیں اٹھاتے! کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر دل میں گھر کئے ہوئے ہے کہ میں نے اگر ایسا کیا تو اللہ کے سامنے قیامت کو کیا جواب دوں گا۔ جب پوچھا جائے گا کہ تو نے غیر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا تھا۔ تو سب سے بڑی پولیس جو دلوں پر بیٹھی ہوتی ہے وہ خوف خداوندی ہے۔ وہی تمام جرائم سے بچانے والی ہے اور معصیت سے روکنے والی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی صورت نہیں ہے جرائم سے روکنے کی اور جرائم سے بچنے کی۔ اسلام نے آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو ہر وقت یہ تصورر ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ہر شخص سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ زندگی کس طرح سے گزاری۔ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے انسان حرکات ناشائستہ سے رک سکتا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ اور ہر شخص ارتکاب جرائم سے بچ سکتا ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے اختیار کرنے سے جرائم سے بچ سکتے۔

باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے...... جبلی طور پر انسان درندہ واقع ہوا ہے مارکاٹ چیر پھاڑ اس کا خاصہ ہے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور حضرت حواؑ بھی اتریں تو فرمایا ﴿اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (1) جاؤ تم دنیا کے اندر اور ایک دوسرے کی دشمنی تمہارے اندر ڈال دی گئی ہے۔ اس لئے انسان ایک دوسرے کا دشمن بھی ہے اور برا چاہنے والا بھی۔ اس کے قلوب میں کہیں حرص رکھی گئی ہے کہیں بغض رکھا گیا ہے کہیں حسد رکھا گیا ہے کہیں تکبر رکھا گیا ہے۔ ان اخلاق رذیلہ کی بناء پر جب آدمی حریص ہوگا تو دوسرے کے مال پر نگاہ ڈالے گا۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا پھر اسے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ ہوگی، چوری ڈکیتی بے تحاشہ کرے گا، اس لئے کہ اس کے اندر حرص کا مادہ موجود ہے اور اگر انسان میں حسد کا مادہ موجود ہے تو وہ اپنے کسی بھائی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہے گا۔ دنیا میں کوئی عزت کے اعتبار سے ذرا بڑھا تو دلوں میں حسد شروع ہوجاتا ہے کہ یہ کیوں بڑھ گیا، لوگ اس پر تو غور نہیں کرتے کہ اس نے اپنی صلاحتیں استعمال کیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔ ہم بھی وہ صلاحتیں پیدا کریں مگر یہ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ترقیات و مراتب اس کے پاس نہ رہیں چاہے مجھے ملیں یا نہ ملیں، یہ حسد کا خاصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کو زائل ہوتا دیکھ کر خوش ہو، چاہے خود بالکل محتاج اور مفلس کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی تکبر، طمع لالچ وغیرہ ہیں۔ ان اشیاءِ رذیلہ پر اگر بریک لگانے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ اور خوف خداوندی ہے اگر یہ نہ ہو تو سوائے مار دھاڑ کے اور ڈکیتی ڈالنے کے اور کیا کرے گا تو اس سے دنیا میں ایک عجیب

---

(1) پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۴.

انار کی پھیل جائے گی۔ یہ اخلاق عام ہیں اور یہ انسان کی جبلت ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنا قانون اتارا کہ ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزارو۔

اس لئے حکم ہے کہ حسد ختم کرو اور ایثار اختیار کرو، اگر اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ دولت ملی ہے تو اس پر اتنے ہی خوش ہو جیسے کہ یہ دولت مجھے ہی مل گئی اور یہ سمجھو کہ وہ میری ہی دولت ہے اگر کسی کو عزت ملی ہے تو یہ سمجھو کہ یہ میری عزت ہے، اگر خدانخواستہ یہ ذلیل بنا تو یہ میری ذلت ہے۔ یہ جذبہ دین نے پیدا کیا ہے کہ حسد کو چھوڑ کر ایثار اختیار کرو۔ لالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو کہ جتنا تمہیں اللہ نے دیا ہے اس پر خوش رہو، شکر کرتے رہو اللہ تعالیٰ اسے بڑھادے گا۔ اسی طرح کبر سے بچا کر دین نے تواضع کی تعلیم دی ہے کہ خاکساری برتو، ہر ایک کے سامنے چھوٹے بن کر پیش ہو کر تم بڑے ہو، میں چھوٹا ہوں۔ لڑائی دنگا جب بھی ہوتا ہے تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور قاعدہ ہے کہ دو بڑے ایک جگہ نہیں سما سکتے۔ یقیناً ایک گھٹے گا ایک بڑھے گا۔ ایک ختم ہوگا ایک آگے آئے گا۔ لیکن جب ہر ایک یوں سمجھے گا کہ میں بڑا نہیں۔ بڑا تو وہ ہے۔ جو یہ کہے کہ میں بڑا نہیں یہ بڑا ہے۔ تو پھر لڑائی جھگڑا کس چیز کا ہوگا۔؟

اس لئے امن وامان کا ذریعہ تواضع اور خاکساری ہے اور لڑائی جھگڑوں کا سبب تکبر اور نخوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان میں موجود ہیں ان کا علاج اگر کیا ہے تو دین نے کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں آ کر اس کی تعلیم دی اس کے طریقے بتلائے ہیں کہ اگر یہ طرز اختیار کرو گے تو تمہاری حرص زائل ہو جائے گی اور یہ طریقہ اختیار کرو گے تو تمہارا حسد ختم ہو جائے گا۔ یہ تمام طریقے دین کے بتلائے ہوئے ہیں۔

تقویٰ محاسبۂ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے ...... یہ دو بنیادی باتیں ہیں ایک دل میں اللہ کا ڈر، دوسرے آخرت کے عقیدے میں مضبوطی اور پختگی کہ جو کچھ دنیا میں کر رہا ہوں مجھے جواب دینا ہے اور حق تعالیٰ کے پاس ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ حتیٰ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی نعمت ہے اسکا بھی احسان جتلایا جائے گا کہ ہم نے سردیوں میں گرم پانی دیا تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی نعمت ہے اس کا حساب ہوگا کہ تم نے اس ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے کیا شکریہ ادا کیا۔ وہاں ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ تمہیں اتنی عمر دی تھی تم نے کاہے میں صرف کی۔ تمہیں اتنی دولت دی گئی تھی تم نے اس کو کاہے میں صرف کیا۔ تو سب چیزوں کو الگ الگ پوچھا جائے گا۔

یہ نہیں کہ سارے بنی آدم سے مشترکہ طور پر سوال ہوگا اور وہ سب مل کر جواب دیں گے نہیں بلکہ ہر کسی کی پوری زندگی سامنے کر دی جائے گی اور پھر اسی کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔ یہ عقیدہ جب ایک مومن کے دل میں جما ہوا ہے تو وہ جرات و ہمت نہیں کر سکتا۔ خیانت کی بدیانتی کی۔ اور جب بھی یہ حرکت کرے گا تو معلوم ہوگا کہ عقیدے میں ڈھیلا پن آ گیا ہے۔ وہ عقیدہ دل میں چھپ گیا ہے۔ سامنے نہیں رہا ہے لیکن اگر سامنے ہو تو پھر

یقیناً جرات نہیں ہوگی اور اگر کر ہی گزرے گا تو پھر جلدی سے توبہ کی توفیق ہوگی اور ندامت ہوگی کہ میں نے بہت بری حرکت کی ہے۔ اس کے نتیجے میں توبہ کرے گا، استغفار کرے گا۔ یہ ندامت توبہ واستغفار اسی وجہ سے کہ یہ دو بنیادیں ہیں اس کے ذہن میں۔

تقویٰ میں احتیاط کا پہلو..... تقویٰ کے ایک معنی ہیں ڈرنے کے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور یہ ہی گویا جرائم سے انسداد کا طریقہ ہے۔ تقویٰ کے دوسرے معنی ہیں احتیاط۔ کہ میں آدمی محتاط زندگی بسر کرے جس میں بڑے جرائم سے بچنے کے لئے چھوٹے جرائم کو چھوڑ دے کہ اگر میں نے مکروہ فعل کیا تو ممکن ہے کہ کل کو فعل حرام کروں اور مکروہ سے بچنے کے لئے بعض جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑتی ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ جائز میں گھر گھرا کر مکروہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام سد ذرائع ہے یعنی ذرائع اور وسائل کو ترک کر دو تا کہ نا جائز مقاصد تک پہنچنے نہ پاؤں اور پہلے ہی رک جاؤں۔

مثلاً زنا کاری ایک فعل خبیث ہے اور حرام ہے۔ اس سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ اجنبی عورت پر نگاہ بھی مت ڈالو۔ اجنبی عورت سے خلوت بھی مت اختیار کرو۔ اجنبی عورت کی آواز پر کان بھی مت لگاؤ یہ ساری چیزیں سد ذرائع ہیں۔ جو ان چیزوں میں پڑا تو اندیشہ ہے کہ مبتلا ہو جائے گا۔ اصل گناہ سے بچانے کے لئے شریعت نے یہاں سے روکنا شروع کیا کہ نگاہ ہی مت ڈالو کان ہی مت لگاؤ۔ اور اگر عورت خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اپنی ناک کو موڑ لو۔ گویا ہم خوشبو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ خوشبو ذریعہ بنتی ہے خیال کے متوجہ ہونے کا۔ یہ ہے احتیاط جسے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت وضو کرے اور اس کا بچا ہوا پانی لوٹے میں موجود ہے اس سے وضو مت کرو۔ دوسرا نیا پانی لو۔ اس لئے کہ اس کے بچے ہوئے پان سے دھیان جا سکتا ہے کہ یہ فلاں عورت کا وضو ہے۔ اس خیال کو اگر متوجہ کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ دل کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے شریعت نے احتیاط کی رو سے حکم دیا کہ تم اس پانی کو چھوڑ دو نیا پانی الگ لو۔ کیوں اپنے خیال کو گندہ کرتے ہو۔ خیال گندہ ہوا تو ارادہ گندہ ہوگا اور ارادہ گندہ ہوگا تو فعل ناپاک ہو جائے گا۔ اس لئے شروع اور ابتداء ہی سے بچتے ہیں۔

زنا گناہ کبیرہ ہے اور یہ جو ابتدائی وسائل ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہوں سے اس لئے بچایا گیا ہے کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ احتیاط کی زندگی ہے۔ چوری کے اندر جو اصل فعل ہے اور جس کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غیر کے مال کو بلا اس کی مرضی کے اٹھا لائے لیکن شریعت نے اس سے بچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا ہے کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے سامان کو مت دیکھو ممکن ہے خیال پیدا ہو کہ آنکھ بچا کر اٹھا لوں یہ تا نک جھانک پیش خیمہ ہے اور چوری تو انجام کار اور آخری فعل ہے جو اصل میں ممنوع ہے۔ اس سے بچانے کے لئے یہ لمبا سلسلہ قائم کیا ہے۔ ہاں اگر خود مالک ہی دکھلائے کہ مجھے اللہ نے یہ نعمت دی ہے تو آدمی شوق سے دیکھے اور دیکھ کر شکریہ ادا کرے اور خوشی کا اظہار کرے گویا کہ یہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے ہمیں ہی دیا ہے لیکن از خود تا نک

جھانک کرنا یا یہ غور کرنا کہ کس مکان میں ہے مال اور یہ دھیان جائے کہ اگر نقب لگاؤں تو یہاں سے مناسب رہے گا یہاں سے یہ نقب لگانے کا دھیان اور تانک جھانک کرنا اور نگاہ ڈالنا۔ صغیرہ گناہ ہیں۔ شریعت نے ان صغیرہ گناہوں سے روکا ہے تاکہ اصل گناہ جو کہ چوری ہے اس تک نہ جانے پائے۔ اسی کو کہتے ہیں سد ذرائع اور وسائل پر پابندی تاکہ اصل مقصد تک نہ پہنچنے پائے۔

درجاتِ تقویٰ...... یہ ہی ہے وہ سد ذرائع کہ ابتداء میں جو ہلکی صورت ہے اسے بھی اختیار مت کرو تاکہ بڑی صورت تک نہ پہنچ سکو۔ تو شریعت اسلام نے ایک سلسلہ کبائر کا رکھا ہے۔ کہ یہ حرام ہے مثلاً زنا کاری، چوری، بے ایمانی اور کچھ اس کے دواعی واسباب ہیں ان تک کو روکا ہے تاکہ اصل مقصد تک پہنچنے نہ پائے، اب اگر تقویٰ کے لغوی معنی بھی مراد لئے جاویں۔ یعنی ڈرنے کے تو بھی اپنی جگہ درست ہیں اس لئے کہ ڈر سے معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور اگر تقویٰ سے احتیاط کے معنی لئے جاویں تو بدرجہ اولیٰ معصیت سے حفاظت ہو جائے گی کہ بعض جائز چیزیں بھی چھوٹ جاتی ہیں۔

پھر اس کے بعد آدمی کی زندگی پاک بن جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آدمی کو جہنم سے ہٹا کر جنت میں ابدالاباد والی نعمتوں میں داخل کر دیتی ہے اور آدمی کو اللہ کا مقرب بنا دیتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اس درجہ کا حصول موقوف ہے بادشاہ حقیقی کے مرتبے کے معلوم ہونے پر یہ محتاط زندگی والا تقویٰ تو بڑوں کا نصیب ہے۔ ہم اور آپ جیسے بہت مشکل سے اس کی طرف جاسکیں گے کہ ناجائز سے بچنے کے لئے جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیں یہ تو بہت اونچا مقام ہے مگر ابتدائی درجہ ہر ایک کے بس کا ہے کہ اللہ سے ڈرے۔

حصولِ تقویٰ...... اور ڈرنے کی صورت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار اور قبضے کو تصور میں لاتا رہے کہ وہ مالک ہے جس طرح چاہے کرے۔ جب چاہے موت دیدے جب چاہے حیات دے، جب چاہے صحت دے دے، جب چاہے بیماری مسلط کر دے، جب چاہے امن دے دے اور جب چاہے بدامنی مسلط کر دے۔ اسی کی یہ قدرت ہے اور اس کی اس قدرت کا جب دھیان ہوتا ہے تو ڈر پیدا ہوتا ہے کہ میں بڑے قادر کے قبضے میں ہوں معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو آدمی حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور کرتا رہے اس سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جاہل مقامِ تقویٰ سے ناآشنا ہے...... اگر کوئی بالکل انجام اور جاہل محض ہے اسے کبھی بھی ڈر نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے بادشاہ کے اقتدار سے۔ ایک دیہاتی اگر بادشاہ کے دربار میں آئے تو وہ زیادہ نہیں ڈرے گا۔ اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا ہیں اس کا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کو یوں ہی سمجھے گا کہ مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر وزیراعظم تھرائیگا، کپکپائے گا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ کے اختیار واقتدار کو جانتا ہے۔ وہ آنکھ نیچی رکھے گا۔ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھے گا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میری گردن نہ ماردی

جائے۔ تو جس کو علم اور پہچان ہوگی باری تعالیٰ کی بڑائی اور اقتدار کی اور اس کے جلال کی' اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہوگا۔ اور جو جاہل ہے اس کے دل کے اندر کچھ بھی پیدا نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے مشاعرہ کی مجلس کی کہ شعراء آئیں اور اپنا اپنا کلام سنائیں اور اعلان کیا کہ جس کی نظم عمدہ ہوگی اسے انعام دیا جائے گا۔ سینکڑوں شعراء نے نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بہت بڑا دربار ہوا۔ گاؤں کے ایک دیہاتی نے بھی ارادہ کیا کہ میں بھی کچھ تک بندی کر کے لے جاؤں تو مجھے بھی بادشاہ انعام دے گا۔ تو چودھری صاحب بھی دربار میں کچھ لکھ کر لائے۔ وزیر اعظم نے دیہاتی آدمی سمجھ کر اسے بلایا اور پوچھا کہ تو کیا لایا ہے اسے شبہ ہوا کہ پتہ نہیں کیا اناپ شناپ لکھ کر لایا ہوگا، الٹا بادشاہ ناراض ہو کر اس کی گردن نہ ماردے۔ اس بنا پر وزیر اعظم نے دیہاتی سے کہا۔ کہ چودھری صاحب! تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مجھے سنادو۔ اس نے کہا اچھا سن لو۔ چودھری صاحب نے وہ قطعہ سنایا۔ قطعہ یہ تھا کہ ۔

سب درکھت ماں بجرگ بڑ ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

یعنی سارے درختوں میں جو بڑا درخت ہے وہ بڑ کا درخت ہے جس کی ڈاڑھی اور چھالیں لٹکی رہتی ہیں اور اس کے سبز سبز پتے ہوتے ہیں اور سرخ سرخ پھل ہوتے ہیں۔ گویا یہ قطعہ کہا اور اس قطعہ کے اخیر میں کہا کہ ۔

اکبر بادشاہ گیدی خر

یعنی اکبر بادشاہ حرام زادہ ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم تو کانپ گیا کہ اس کمبخت نے خود بھی جان کوئی اور مجھے بھی پٹوائے گا، تو خیر وزیر اعظم نے کہا کہ چودھری صاحب! شعر بڑے عمدہ ہیں مگر یہ جو اخیر کا شعر ہے (اکبر بادشاہ گیدی خر) یہ نہ لکھو۔ اس نے کہا کہ اور کیا لکھوں؟ وزیر اعظم نے کہا کہ یہ لکھو کہ......

اکبر بادشاہ بحر و برّ

یعنی اکبرؔ بحر و برّ کا بادشاہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا اونچا بادشاہ ہے۔ اس نے کہا جی اچھا کہہ دوں گا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اعلان ہوا کہ چودھری صاحب بھی ایک قطعہ پڑھیں گے۔ چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک قطعہ پڑھا کہ

سب درکھت ماں بجرگ بڑ ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

اکبر بادشاہ بحر و بر

اکبر نے کہا چودھری صاحب! یہ مصرع تو بہت عمدہ ہے مگر یہ اخیر کا مصرع ہے ۔

اکبر بادشاہ بحر و بر

یہ بہت بڑا مصرع ہے۔ اکبر سمجھ گیا کہ مصرعہ اس کا نہیں ہے۔ یہ اس کو کسی نے بتایا ہے تو چودھری نے وہیں کھڑے کھڑے وزیر اعظم کو ماں کی گالی دے کر کہا کہ اس حرام زادے نے کہا تھا کہ اس طرح کہنا ورنہ میں تو یوں

لکھ کر لایا تھا۔

اکبر بادشاہ گیدی خر

اکبر بادشاہ نے کہا یہ بہت عمدہ ہے وہ ٹھیک نہیں تھا۔

چودھری صاحب نے کہا جی ہاں! میرا تو یہ ہی مصرعہ ہے پھر اس کو بادشاہ کی طرف سے بہت انعام واکرام ملا۔ اس نے یہ مصرعہ ''اکبر بادشاہ گیدی خر'' کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ دیہاتی ہے۔ نہ اکبر کی جاہ وجلال سے واقف اور نہ اس کی عظمت واقتدار سے واقف فقط ایک دیہات کا رہنے والا ہے۔ تو دیہاتی لوگ بیچارے بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں چھل فریب مکروفریب دغابازی دھوکہ دہی کچھ نہیں ہوتی ہے۔ سادہ زندگی ہوتی ہے جو دل میں آیا بے تکلف کہہ دیا۔

قدرِ تقویٰ بقدرِ عظمت...... اس واسطے احادیث میں آیا ہے کہ حضرات صحابہؓ انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آ کر سوال کرے تاکہ علوم کھلیں اور ہم سب کو اس کی بدولت تازہ علوم حاصل ہوں۔ صحابہؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ وجلال کی عظمت غالب تھی اس لئے ہر ایک کو سوال کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ شان نبوت سے واقف تھے۔ اس لئے ان کی دل پر ہیبت تھی اور خوف تھا۔ اور دیہات والے بیچارے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی جو چاہے آ کر پوچھ لیا جو چاہے آ کر کہہ دیا۔ جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے ایک دیہاتی بھی آ گیا اس کو دینے میں دیر لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوروں کو دے رہے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر فوراً کہا کہ ''اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے اس میں ہمارا بھی تو حق ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''چودھری صاحب تمہیں بھی ملے گا گھبراؤ مت''۔

یہ کہہ دینا کہ یہ مال تیرا نہیں اور نہ تیرے باپ کا ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے شان نبوت کا پتہ نہ ہو۔ اس لئے صحابہؓ منتظر رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آ جائے اور آ کے سوال کرے حضورؐ جواب دیں گے اور ہمارا علم بڑھے گا، جتنا جلال وعظمت دل میں پیدا ہوگی اور ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمت خداوندی سے جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی آزاد ہوگا جو چاہے کر گزرے۔

تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ...... تو اس کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں خوف خداوندی پیدا کریں تاکہ جرائم سے بچیں اور خوف پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہم تصور کریں کہ اللہ مالک الملک ہے۔ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ موت وحیات اسی کے قبضے میں ہے۔ صحت وبیماری اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تونگری ومفلسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ''جو کچھ وہ کر دے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ کیوں کیا ہے؟''۔ وہ بری ہے ان سب چیزوں سے تو جب یہ یقین وتصور ہوگا بندہ کو کہ وہ غنی مطلق ہے جو چاہے کرے، تو دل میں ہیبت پیدا ہوگی کہ میں ایک بندہ ذرہ بے مقدار ہوں اور مالک الملک کے سامنے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بے ادبی ہو جائے۔ تو دل میں ڈر بیٹھ جائے گا

تو پہلا درجہ یہ ہے تقویٰ کا جس کے معنی خوف کے ہیں کہ دل میں اللہ کا ڈر اختیار کرے تاکہ معصیت سے بچ جائے۔

فقر وغنا میں تقویٰ کی ضرورت...... بہر حال خوف خدا جب دل میں ہوگا تو آدمی مالداری میں بھی گناہ سے بچے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور کیسی پاک نصیحت ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث قدسی ہے آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اپنے بندوں سے کہ ''اے بندے! تو نگری اور دولت مندی کے زمانے میں تو مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مفلسی کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ میں تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں''۔

اس سے معلوم ہوا کہ تو نگری کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے اور مفلسی کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے۔ اگر تو نگری میں خوف خدا نہیں تو ڈر ہے کہ تو نگری چھن جائے اور اگر مفلسی میں خوف ہے تو ممکن ہے کہ وہ تو نگر بن جائے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہے جسے چاہے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ جس کو دینا بہتر سمجھتے ہیں اس کو دے دیتے ہیں مگر دیتے ہیں اسی حد تک جس حد تک باری تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اجازت دیتی ہے۔ معاذ اللہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جسے چاہیں لکھ پتی بنا دیں اور جسے چاہیں مفلس۔

تقسیم دولت احوالِ قلوب کے مُطابق ہے...... اس نے جیسی خلقت بنائی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ دینا مصلحت ہے اور اس کو نہ دینا مصلحت ہے اسے تو نگر بنانا حکمت ہے اور اسے مفلس بنانا مصلحت ہے۔ قلوب کی حالت کو وہی بہتر جانتا ہے جس نے خلقت بنائی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ چار پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہی اور دوسروں کو حقیر جاننے لگتے ہیں ایسوں کو اگر دنیا کی دولت دیدی جائے تو ظلم کا کارخانہ کھل جائے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لاکھوں روپے آجائیں پھر بھی انسان بنے ہوئے ہیں پھر بھی ان میں وہی دینداری ہے پھر بھی ان میں وہی جذبہ ہے۔ پھر حق تعالیٰ ان کو دولت دنیا میں ترقی دیتے ہیں۔ تو باری تعالیٰ جسے دولت دیتے ہیں اسے جانتے ہیں کہ کس مصلحت کے تحت اسے دولت دی گئی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا۔'' ① بعض دفعہ فقر وفاقہ کفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور آدمی اللہ کی شکایتیں کرنے لگتا ہے اور ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو پیسے دے دیئے جائیں تا کہ ایمان محفوظ رہے اور بعض ایسے ہیں کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں انہیں مفلس رکھا جاتا ہے تا کہ وہ آپے میں رہیں۔

تو مفلس اور تو نگری من جانب اللہ ہے۔ جیسی جیسی جس کی خلقت بنائی ہے اس کی مناسبت سے اسے دیتے ہیں۔ ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ② ہم نے ہی رزق تقسیم کیا ہے ہم نے ہی معاش تقسیم کی ہے اور ہم نے ہی درجے قائم کئے ہیں بعضوں کو اونچا بنایا بعضوں کو نیچا بنایا۔ اب اونچے کا کام یہ ہے

---

① شعب الایمان للبیھقی، الثالث والاربعون من شعب الایمان وھو باب فی الحث علی ترک، ج:۱۴ ص:۱۲۵، مشکوۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب السلام، الفصل الاول، ج:۳ ص:۹۵ رقم:۵۰۵۱. ② پارہ:۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ:۳۲.

کہ وہ جھکے اور شکر کرے اور نیچے کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دعاء کرے اور مانگے۔ اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔ اللہ نے دونوں کے لئے راستہ رکھ دیا ہے۔ تو نگر بھی نجات پائے اور مفلس بھی نجات پائے۔

باطنی دولت...... حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک کے کچھ درجات ہیں، کچھ نعمتیں دولت مندوں کو بھی ملیں گی اور کچھ مفلسوں کو بھی ملیں گی یعنی مایوس نہ ہوں کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھنے کی دوسری چیزیں ان کو دے دیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے صدقات وخیرات کے فضائل بیان فرمائے کہ صدقات دیں گے، زکوٰۃ دیں گے، دین کا کام ان سے چلے گا۔ وہ بہت دین کا کام کریں گے انکا مال آخرت کا ذریعہ بنے گا، درجات کمائیں گے، ان فضائل سے مفلسوں کا دل ٹوٹنے لگا۔ کہ بھائی یہ تو نگر تو بڑے اچھے رہے کہ دنیا میں بھی انہوں نے مزے کی زندگی گزاری اور آخرت میں بھی ان کے درجات بلند ہیں اور ہم نے دنیا میں بھی مصیبت جھیلی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے کچھ نہیں۔ یہ مالدار لوگ بڑھ گئے اور ہم رہ گئے۔ تو یہ گروہ مفلسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ۔ "یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! سَبَقَ اَھْلُ الْاَمْوَالِ الدُّثُوْرِ بِالْاَجْرِ". ① یہ مالدار تو جیت گئے ہم سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مالدار اپنی دولت کا حساب دیتے رہ جائیں اور تم پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو"۔

انہوں نے کہا کہ بس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لئے کافی ہے۔ ہمیں دولت نہیں چاہئے تو بہت سی دولتیں مفلسوں کو بھی دی گئی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ تو نگروں کو ہی نعمتیں دی گئی ہیں۔ نہیں بلکہ سب کو دی گئی ہیں۔ کسی کو یہاں دی گئی ہے کسی کو وہاں کیا گیا سب کو برابر۔ یہ مالک کی حکمت ہے کہ کسی کو یہاں بڑھا دیا مگر فیضان سب کے اوپر عام ہے، اگر کسی کی ظاہری دولت بڑھا دی تو کسی کی باطنی بڑھا دی۔ وہ اپنے رنگ میں خوش ہے یہ اپنے رنگ میں خوش اور بسا اوقات باطنی نعمت مال سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایمان کی دولت مضبوط ہے اور توکل کی دولت مضبوط ہے تو ہزاروں مال اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور یہ دولت سب اونچی ہو جاتی ہے۔

دولتِ معرفت کا تفوق...... ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے۔ بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔ دیکھا کہ سارے دروازے بند ہیں۔ اور ہزاروں مال گاڑیاں ادھر رکی ہوئی کھڑی ہیں اور ہزاروں مال گاڑیاں اندر رکی ہوئی کھڑی ہیں۔ دن کا وقت ہے اور شہر میں بالکل آمد ورفت نہیں ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا تجارتی شہر ہے کہ کروڑوں کا بیوپار ہے اس میں اور دروازے بند ہیں۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی شہر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب! بادشاہ کا باز گم ہو گیا ہے (باز ایک شکاری پرندہ ہوتا ہے) اس لئے بادشاہ نے کہا ہے کہ شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ جا سکے اور پھر ڈھونڈتے پھریں۔

بزرگ بڑی حیرت میں رہ گئے کہ بادشاہ بے وقوف ہے کہ ایک پرندہ کے لئے دروازے بند ہیں۔ بھلا وہ

① مسند الحمیدی، احادیث ابی ذرؓ، ج:۳، ص:۲۹۷. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۳ص:۱۱۷.

اڑ کر نہیں جا سکتا چھتوں کے اوپر سے؟ دل ہی دل میں کہا کہ بڑا بیوقوف ہے بادشاہ اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ ''خدایا تیری قدرت! کہ کندہ ناتراش کو تو نے بنا دیا بادشاہ' جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ جانور کو روکنے کے لئے جال ڈالنے کی ضرورت ہے یا شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کی۔ اسے تو نے ملک دے دیا اور ہم جیسا فضل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے جس کے اندر علم بھی ہے' معرفت بھی اور کمالات بھی بھرے ہوئے ہیں ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں، ایک وقت کھالیا اور ایک وقت فاقہ ہے۔ تو جس میں یہ دولت موجود ہے وہ جوتیاں چٹخاتا پھرے اور جو ایسے احمق اور کندہ ناتراش ہیں وہ تخت سلطنت پر بیٹھ جاویں۔ آپ کی عجیب قدرت ہے''۔

یہ گویا ایک سوال اور خلجان اللہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اچھا کیا۔ تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم، تمہاری معرفت، تمہارا ایمان چھین کہ اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی ساری سلطنت تمہیں دیدیں۔ تیار ہو؟ انہوں نے کہا نہیں اس پر تیار نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی قوت زیادہ تھی اور توکل کی قوت زیادہ تھی دولت سے ورنہ راضی ہو جاتے کہ میں نے علم بھی دیا ایمان بھی دیا۔ لائیے مجھے تخت سلطنت دیجئے نہیں بلکہ تخت سلطنت پر لات ماردی اور ایمان وعلم اور معرفت نہیں چھوڑی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی دولت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دونوں دولتیں دے دے کہ مال کی دولت بھی ہو اور ایمان کی قوت بھی ہو اور اللہ پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے پاس اللہ نے دین دنیا دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ تو بہرحال دولت دنیا بھی ایک نعمت ہے اور دولت دین اس سے بڑھ کر نعمت ہے اور جمع ہو جاویں تو سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔

صبر وشکر کے ذریعے ترقی درجات دونوں کے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ مالداری کے اندر آدمی غرور میں نہ پڑے اور ہر وقت شکر گزار رہے اپنے پروردگار کا اس لئے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ محض عطاء خداوندی ہے۔ اللہ کے اوپر کسی کا حق نہیں۔ جب فضل سے ملے تو شکر واجب ہوتا ہے لہذا ملنے پر شکر ادا کرے اور جس کو مفلسی دی ہے وہ عدل سے دی۔ گویا حکمت وانصاف کا یہی تقاضا تھا کہ اس کو اس حالت میں رکھا جائے تاکہ وہ صبر کرے کیونکہ دونوں ہی راستے جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ صبر اپنے راستے سے جنت میں پہنچائے گا اور شکر اپنے راستے سے جنت کی طرف لے جائے گا، ہیں دونوں کامیاب اور ناجی! اور محبوب خداوندی شاکر بھی ہے اور صابر بھی۔ علماء میں ایک عالم گذرے ہیں فن نحو کے بہت بڑے امام جن کا نام ہے اخفش اور انتہائی درجہ بدصورت تھے۔ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ سب ان میں جمع تھیں، رنگ بے حد کالا، دانت بہت چوڑے چوڑے، آنکھیں نہایت چھوٹی اور کرنجی اور آنکھوں میں چیپڑے لگے ہوئے، دانتوں میں زردری لگی ہوئی غرض جتنی بدصورت کی علامتیں ہوسکتی ہیں ساری ان میں جمع تھیں اور علم وہنر کا یہ عالم کہ بہت اونچا اور بہت بلند، ان کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی کہ دور دور تک اس کی نظر نہیں تھی، جب خاوند اور بیوی آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے

دھوپ چھاؤں، کہ ایک طرف دھوپ نکل رہی ہے اور ایک طرف سایہ ہے اور ایک طرف نور اور ایک طرف ظلمت۔

تو آمنے سامنے بیٹھ کر بیوی سے کہتے ہیں کہ میں بھی قطعی جنتی ہوں اور تو بھی قطعی جنتی۔ بیوی کہتی کہ کیا بات ہے۔ فرماتے کہ میں تو اس لئے جنتی کہ تجھ جیسی مجھے بیوی ملی میں رات دن شکر ادا کرتا ہوں اس شکر کے راستے سے جنت میں پہنچوں گا اور تو اس لئے جنتی کہ مجھ جیسا بدصورت خاوند تجھے ملا تو رات دن صبر کرتی ہے کہ کس بلا میں گرفتار ہوگئی۔ اسلئے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچے گی۔ تو میں نے بھی جنتی اور تو بھی جنتی۔ اس بناء پر دولت مند کے لئے اللہ نے شکر کا راستہ رکھا ہے اور وعدہ ہے۔ ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾ ① ''جتنا تم شکر کرو گے اتنا ہی میں اس نعمت کو بڑھاتا چلا جاؤں گا''۔ یہ صاحب دولت کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

غریب اور مفلس کو حکم ہے کہ تو کسی دولت مند کی دولت پر نگاہ مت کر، صرف میرے اوپر نگاہ رکھ اور صبر اختیار کر میں نے کتنی دولت تیرے لئے جمع کر رکھی ہے۔ تجھے معلوم نہیں ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عنقریب ملنے والی ہے۔ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے دے، مجھے دولت دے دے، فاقے اتر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ دعا پوری نہیں ہوتی مہینے گزر گئے، برس گزر گئے، حتیٰ کہ عمر گزر گئی۔ اب اس نے کہا کہ کچھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے، مانگتے مانگتے تھک گیا، نہیں ملا، قیامت میں جب میدان محشر میں پہنچے گا تو دیکھے گا کہ اجر وثواب کے ڈھیر کے ڈھیر بھرے ہوئے ہیں، ہزاروں، لاکھوں کو وہ نعمتیں نہیں ملیں جو اس کے لئے جمع ہیں۔

عرض کرے گا کہ اے اللہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں۔ میں نے تو کوئی عمل نہیں کیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تو دعائیں نہیں مانگا کرتا تھا؟ اس دعا کو ہم نے پالا پرورش کیا، بڑھایا۔ یہ تیری ان دعاؤں کے ثمرات ہیں۔ وہاں دنیا میں اگر دیدیتے تو تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے تیری دعا کو ذخیرہ کیا۔ اب تو ابدی طور پر عیش و آرام کر تیرے لئے انتہائی درجات ہیں۔ تو غریب کے لئے موقعہ مایوسی کا نہیں اور امیر کے لئے موقعہ کفران نعمت کا نہیں، اس پر شکر واجب ہے، اس پر صبر واجب ہے اور دونوں کے اوپر اعتماد علی اللہ واجب ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو میرا کوئی حق نہیں محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اسے اگر نہیں دیا تو کوئی ظلم نہیں ہے وہ عدل ہے جس کی وجہ سے نہیں دیا ہے، دونوں انشاء اللہ کامیاب ہیں۔ باقی جسے بھی جو ملتا ہے وہ ملتا ہے، فضل خداوندی سے کسی کا کوئی حق اللہ کا اوپر نہیں کہ وہ مجبور کرے بھلا اللہ پر کس کا جبر چل سکتا ہے، بہرحال تقویٰ اور اس کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے۔ (آمِيۡن يَا رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ.)

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

اسلام میں عید کا تصور

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ! فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِيْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِيْدَ لَالِمَنْ لَبِسَ الْجَدِيْدَ (صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

اجتماعیّتِ عامّہ !...... بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر قوم تہوار رکھتی ہے، اور اپنی حد تک اسے شاندار طریقے سے مناتی ہے، پارسیوں میں نوروز اور مہرجان کی عیدیں ہیں، عیسائیوں میں کرسمس اور بڑے دن وغیرہ کے نام سے عید ہے، ہندوؤں میں ہولی، دیوالی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں تہوار اور آئے دن کے میلے ٹھیلے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عیدین (عید الفطر اور عید قربان) کے تہوار عطاء فرمائے، فرق یہ ہے کہ اقوام عالم میں عید اور تہوار کے معنی رنگ رلیاں منانے یا اپنی قومیت کو مستحکم کرنے اور یا کسی مقتدا شخصیت کی یاد تازہ کرنے کے ہیں۔ اسلام میں عید اور تہوار کے معنی اجتماعی طور پر خدا کی یاد کرنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کے نام پر غریبوں کی مدد کرنے کے ہیں۔ تاکہ اجتماعیت عامہ کا ظہور عادت اور عبادت دونوں میں ہو جائے، پس اگر مذاہب کے ناموں کے سلسلہ میں ہر مذہب کا نام اس کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے، ہندومت کے لفظ سے طنیت پر روشنی پڑتی ہے، عیسائیت کے لفظ سے ایک ہادی اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے، یہودیت کے لفظ سے ایک قومیت کا تصور بندھتا ہے، پارسیتا سے ایک ملک کا دھیان دلوں میں جمتا ہے جس کا حاصل حدود بندی اور محدودیت ہے تو اسلام کے لفظ سے نہ وطن سامنے آتا ہے نہ ملک، قوم نہ شخصیت بلکہ اطاعت حق میں فنائیت اور مالک الملک میں محویت کے جذبات کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس کی طرف صاف اشارہ ہے کہ دنیا کے مذاہب نسل و قوم، وطن اور شخصیت پرستی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن اسلام نے اپنے سادہ عنوان

---

① مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ العیدین، وانما قال: لیس العید لمن لبس الجدید انما العید لمن أمن الوعید، ج: ۵، ص: ۱۲۳.

ہی سے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالمگیر تصور سامنے رکھا اور وہ اطاعت حق ہے کیوں کہ حق خود لامحدود اور وسیع ہے اس کی اطاعت کا دم بھرنے والی قوم بھی اپنے کو مسلم کہہ کر عبادت گزار بن کر اور عبادت غیر سے منقطع ہو کر گویا اعلان کرتی ہے کہ وہ ایسی ذات سے تعلق رکھتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہے دنیا کی پوری زمین اور اس کے رقبے اور رقبوں پر بسنے والی قومیں اپنی حد بندیوں سے اس کی لامحدود وسعتوں میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔

حکمتِ دوگانہ...... ٹھیک اسی طرح تہواروں اور عیدوں کے سلسلہ میں اپنے تہواروں سے ہر قوم اگر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر اپنی نفسیات کی پابند ہے یا کسی بڑی شخصیت کا میلاد منا کر وہ صرف اس عظمت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے جو اس کے دل میں اس شخص کو موجزن ہے گویا وہ اپنی شخصی عقیدت مندیوں کی پابند ہے یا کسی وطن اور قوم کا نام اجاگر کر کے اپنے کی اس کا اسیر اور پابند دکھانا چاہتی ہے۔ تو مسلم قوم عیدوں کے تہواروں میں خدا کی جناب میں دوگانہ ادا کر کے اور اسکے نام پر قربانی دے کر حاجت مندوں پر فطرہ کا صدقہ اور قربانی کا صدقہ بانٹ کر گویا یہ بتلانا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو وہ صرف خدائی نام لیوا ہے اور اس کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔

حکمتِ فطرانہ و قربانی...... اور دوسری طرف دنیا کے مفلوک الحال انسانوں کو اس خوشی کے موقع پر صدقہ اور خیرات دے کر یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ ایک عوامی اور عالمی قوم ہے جس کو نہ قبیلے تقسیم کر سکتے ہیں نہ ملکوں کی حد بندیاں بانٹ سکتی ہیں۔ نہ شخصیتوں کی عقیدت مندیاں اسے دوسری شخصیتوں کی عظمت و عقیدت سے روک سکتی ہیں۔ اور یہ ہی وہ جماعت کبریٰ ہے جسے لے کر اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا اعلان اس نے اپنے نام اور اپنے کام سے قدم قدم پر کیا ہے۔

روحِ عید...... بہر حال اسلامی تہوار نفسیانی یا قومیتی یا شخصیاتی تصورات کے آئینہ دار نہیں بلکہ اجتماعیت عامہ کے حامل ہیں اور یہ اجتماعیت عامہ وطن، قوم، نسل شخصیت کے تصور سے نہیں بن سکتی تھی بلکہ ان سب سے بالاتر اور مافوق ذات سے وابستگی سے ہی بن سکتی تھی جس کا نام پاک اللہ رب العزت ہے۔ تو ان تہواروں کی روح اسی کا نام اور اسی کی عظمتِ مطلقہ قرار دی گئی ہے چنانچہ عید کی نماز کے لئے جب مسلمان چلتے ہیں تو رنگ پھینکتے ہوئے۔ یا کسی شخصیت یا قومیت کے نعرے لگاتے اور جے کار کرتے ہوئے نہیں چلتے بلکہ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

عید الفطر میں آہستہ آہستہ اور عید قربان میں بآواز بلند تہوار کے لئے روانگی ہوتی ہے تو تکبیر یا والٰہی عظمتِ خداوندی اور توحید کے اعلان کے ساتھ ہوتی ہے اس میں نہ شور ہے نہ شر نہ ہنگامہ آرائی نہ میلوں، ٹھیلوں کی شان ہے بلکہ قدوسیوں، سبوحیوں اور مقدس ملائکہ کی صفوں کی طرح تسبیح الٰہی اور تقدس ربانی کہتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں عیدگاہ میں پہنچ کر بھی تسبیح و تہلیل جاری رہتی ہے اس کے بعد امام آگے بڑھتا ہے اس کے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں مکبر

تکبیرات کی آوازیں بلند کرتے ہیں، تلاوت قرآن ہوتی ہے سب مقتدی سکون وخشوع کے ساتھ اسے سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رکوع وسجود سے اپنے مالک کے سامنے بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور آخر کار سلام پھیر کر پھر تکبیرات کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

عظیم اجتماعیت......نماز سے فارغ ہوتے ہی امام خطیب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ممبر پر کھڑے ہوکر وعظ ونصیحت اور احکام سناتا ہے، جس کو تمام مقتدی سماع عظمت وقبول سے سنتے ہیں۔ اس عبادت سے فارغ ہوکر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس خوشی کے موقع پر جبکہ ہر طرف چہل پہل اور روحانی مسرتوں کا دلوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس میں کسی نفسانی تفریح یا دنیاداری کے جذبات کی آمیزش ہوجائے، تو ان تہوار منانے والوں کے لئے مسنون کیا گیا کہ قبرستان میں جاکر اپنے مردہ بھائیوں کی ارواح سے ملاقات کریں۔ ان کو ثواب پہنچائیں ان سے قریب تر ہوں تاکہ ان کو آخرت کے گھرانے دیکھ کر خود بخود اپنی آخرت کی یاد تازہ ہوجائے اور دنیا میں اس خوشی کے موقع پر ادھر سے دھیان نہ ہٹ جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بتلانا ہے کہ مسلمان اجتماعیت کبریٰ کو لے کر اٹھا ہے اس کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ عالم برزخ کے اربوں کھربوں انسان بھی اس کی اجتماعیت کے ممبر ہوں اس کی بنیاد ڈالی ہے جو دنیا سے گزر کر برزخ سے گزر کر عالم حشر تک جا پہنچتی ہے جس میں دنیا کے کسی ایک قرن کے ہی انسان نہ ہوں گے۔ بلکہ آدمؑ کی ساری اولاد اور اولین وآخرین کی ساری شخصیتیں مجتمع ہوں گی۔

عوالم گیر اجتماعیت......پس جو لوگ مسلمانوں سے سن کر اجتماعیت کا نام لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ علمی اجتماعیت کا دم بھریں گے اور وہ بھی صرف اپنے زمانے کے ملکوں اور قوموں سے کوئی سیاسی رابطہ قائم کرلیں گے۔ لیکن حقیقتاً جو قوم اجتماعیت کے لئے دنیا میں برپا کی گئی ہے وہ عید کے وظائف کی رو سے گویا اس اجتماعیت کو پھر ایک غیر محدود اجتماعیت ظاہر کرتی ہے اور اس کا رابطہ اجتماعی دنیا سے اتر کر برزخ کے ان تمام پاکباز انسانوں سے قائم ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ اس عالم سے گزر کر اس عالم میں پہنچ گئے ہیں اور گویا وہ محض دنیا والے بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اس ساری اجتماعیت کی حقیقی روح جس سے یہ عالم گیر ہی نہیں عوالم گیر اجتماعیت بن جاتی ہے۔ خدا کا نام ہے کہ اس سے زیادہ واسع اور وسیع کوئی نہیں۔ اس لئے عید کے لئے جیسے اس دنیا میں ایمان کی قید ہے ایسے آخرت کے باشندوں کی ملاقات کے لئے بھی وہی ایمان کی شرط ہے اور ایمان کے معنی بجز اس کے دوسرے نہیں کہ اللہ رب العزت کی ذات وصفات، افعال واوامر ونواہی اور اس کے قوانین کو مانا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ وسعت واجتماعیت قائم ہی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس سے زیادہ وسیع رشتہ اور معیار ہی دوسرا نہیں۔

خوش قسمت قوم......اس لئے عید تہوار تو ہے، مگر محض لفظ ''تہوار'' کی وجہ سے اسے دنیا کی عام اقوام کے تہواروں کی نظر سے نہ دیکھا جائے، کہ اس کی غیر معمولی وسعتیں ان دوسرے ظرفوں میں کسی طرح نہیں سماسکتیں۔

پس خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے تہوار دیئے جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد، جو ان تہواروں میں ان کی شرعی حدود و شروط کے مطابق شرکت کریں، تہوارِ عید بندگی حق اور خدمت خلق ہے۔ نہ کہ محض نیا اور فاخرہ لباس' عطر و خوشبو اور شیریں چیزیں کھا پی لینا۔ اسی لئے حدیث نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ واصحابہ وسلم) میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "اَلْعِیْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِیْدَ لَا لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِیْدَ"...... ترجمہ:"یہ عید اس کے لئے ہے جو خدا سے ڈرا اور اس کی طرف جھکا نہ کہ اس کی جس نے عمدہ اور نئے کپڑے پہن لئے"۔

عید کا اصلِ اصول...... پس عید کا حاصل؟ ذکر الٰہی، ذکر ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیت دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا نہ کہ ظاہرداری اور دنیا سازی، تا کہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اصول ثابت ہو۔

سال بھر کے لئے نورانی اثرات...... ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادتیں دو طرح کی ہیں ایک فعلی اور ایک ترکی، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ فعلی ہیں جس میں کچھ افعال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ترکی عبادت روزہ ہے جس میں ترک اکل، ترک شرب اور ترک لذات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورے ایک ماہ تک محبت حق میں دنیا کے اس معظم حصے کو ترک کئے رہنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں بلکہ نفس کی ایک عظیم قربانی ہے۔ جیسے بغیر مدد خداوندی پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ماہ رمضان المبارک میں دن بھر اس مجاہدے سے نفس کو رگڑ کر اور مانجھ کر اس میں صفائی پیدا کی جاتی ہے لیکن کسی ظرف میں محض صفائی آ جانا اور میل کچیل دور ہو جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں آب نہ آ جائے اور وہ چمک نہ اٹھے ایک قلعی گر بھی برتن کو اول رگڑتا اور مانجھتا ہے، اینٹ، پتھر سے برتن کو رگڑ کر اپنے پیرول تک اسے پامال کرتا ہے تا کہ برتن کا میل صاف اور زنگ دور ہو جائے لیکن محض صفائی کے لئے برتن قلعی گر کے یہاں نہیں بھیجا جاتا بلکہ اصل مقصود اس کی آراستگی اور جگمگاہٹ ہوتی ہے چنانچہ قلعی گر بھی اس صفائی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ صاف برتن کو آنچ دیتا ہے اور تپا کر جب صاف شدہ برتن پر قلعی پھیرتا ہے تو اسی دم برتن چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے اور قلعی گر کے پاس برتن بھیجنے کا مقصد اب آ کر پورا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ظرف قلب کو صاف کرنے کے لئے تو رمضان کے روزے رکھے گئے ہیں تا کہ نفس کی محبوبیت اس سے چھڑا کر اسے رگڑ دیا جائے' اور غیر اللہ کی محبت والفت کی ان آلائش سے اسے صاف کیا جائے پس روزے کے یہ تروک نفس کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے اینٹ، پتھر اور مٹی کام کرتی ہے۔ دن بھر جبکہ نفس کی رگڑائی ہوئی اس کا دانہ پانی بند کر کے اس کی نفسانی لذات کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس عمل سے اس کی روحانی آلائشوں کا میل کچیل نکال دیا گیا تو شب کو اس پر قلعی کا سامان تراویح اور تلاوت قرآن سے کیا جاتا ہے تا کہ دن بھر تپائے ہوئے نفس پر کلام خداوندی کی قلعی سے آب اور چمک پیدا کر دی جائے اور اس کی روح نور الٰہی سے جگمگا اٹھے۔ یہ تیس کے تیس دن دن بھر کی کمائی رگڑائی اور منجھائی اور پھر شب بھر قلعی ایک ماہ میں انسانی

نفس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس چمک دمک سے فائدہ اٹھاتا رہے اور میل کچیل سے مبرا رہ کر ان نورانی اثرات کو سال بھر تک استعمال کرے بشرطیکہ اس مجاہدہ کے اثرات کو سال بھر باقی رکھنے میں ساعی رہے۔

اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ...... بہر حال یہ ایک ماہ سال بھر کی نورانیت کی کفالت کرتا ہے اور بندے کے خدا سے قریب تر ہونے کے تمام موانع کو دور کر دیتا ہے تا کہ اس سے قریب ہو کر بندہ وسیع الظرف اور وسعت عامہ کا اہل ہو جائے اور اس کی ذات اسلام کی اجتماعیت کبریٰ کی طویل و عریض زنجیر کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہو۔ پورے ایک ماہ کی اس مشقت محنت اور اس پر مرتب شدہ اجتماعیاتی صلاحیت جیسی عظیم نعمت ملنے پر جو محض خدا کی مدد اور اس کی توفیق ہی سے اسے میسر ہو سکتی تھی، اتنی ہی بڑی شکر گزاری کا فریضہ بندے پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ادائے شکر کا طریقہ دوگانہ عید کو قرار دیا تا کہ ادھر رمضان کامیاب ہو کر ختم ہوا ادھر اسی دم ہلال عید آسمان سے سر نکال کر یہ اعلان کرے ''اے بندو! اس عظیم کامیابی پر جو تمہیں اجتماعیت کبریٰ کی صلاحیتوں کے ملنے کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ اپنے مالک کا شکر ادا کرو، یا بالفاظ دیگر رمضان میں جو صلاحتیں تمہیں عطاء کر دی گئی ہیں ان کو عید کے میدان میں فعلیت میں لا کر ان صلاحیتوں کا عملی ثبوت دو اور اجتماعیت عامہ کی صورت اور حقیقت اجتماع عید میں توجہ الی اللہ کے ساتھ نمایاں کر کے دکھلاؤ۔

حقیقتِ رمضان...... پس رمضان المبارک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مہینہ ہے اور ماہ عید اُن صلاحیتوں کے عملی آغاز کا مہینہ ہے جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہتا ہے، اس درمیان میں اگر کچھ کمی یا کوتاہی راہ پاتی ہے تو اگلا رمضان پھر اگلے سال کے لئے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ان صلاحیتوں کی تجدید کر دیتا ہے تا کہ نہ مجاہدے کا سلسلہ ختم ہو، نہ اجتماعیت کی روح مضمحل ہونے پائے اور انسانی عمر اسی مبارک سلسلہ میں ختم ہو جائے۔

فرد مسلم کا درجہ اُمت...... تا کہ جب وہ اپنے رب سے ملے تو تنہا اپنا نفس ہی ساتھ نہ لے جائے بلکہ اس کے ساتھ اجتماعی نسبتوں کی ایک عظیم کمک ہو۔ لاکھوں دعائیں ہوں جو اس اجتماع میں مل کر کی گئی تھیں۔ ہزاروں ایصال ثواب ہوں جو عید کے موقع پر اموات تک پہنچائے گئے تھے۔ کروڑوں باطنی ہمتیں ہوں جو صف بندیوں میں ایک کی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دنیا و برزخ کے تعلقات کے بے شمار رشتے ہوں جو اس کے لئے جناب باری میں سفارشی اور مساعی ہوں تا کہ اس فرد پر جو اجتماعی صلاحیتوں سے ایک امت بن کر اپنے خدا کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اللہ کی لاکھوں رحمتیں متوجہ ہوں اور وہ اسی طرح اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر کے سرخروئی کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ①

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۸۵.

محبّت ومعیّت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَـنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَـعَـالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰـہُ عَـلَیْـہِ وَسَـلَّـمَ لَایُـؤْمِـنُ اَحَـدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ وَقَالَ اللّٰہُ جَلَّ ذِکْرُہٗ: فَلاوَرَبِّکَ لَایُـؤْمِـنُـوْنَ حَتّٰـی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْافِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ.

حقیقت ہرشئی...... بزرگانِ محترم!دنیا کی ہر چیز بلکہ ہم اور آپ بھی دو چیزوں سے مرکب ہیں۔ایک ہمارا ظاہری حصہ ہے جس کو ہم بدن کہتے ہیں یہ ہیئت وشکل ہے مثلاً آنکھ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کی شکل وصورت دیکھ کر پہچانتے ہیں۔یہ ظاہری حصہ اور ظاہری پیکر ہے اور ایک اس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے۔وہی درحقیقت انسان ہے۔اس صورت ظاہری کا نام انسان نہیں۔انسان حقیقت کا نام ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے اس کے دکھلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت بنادی ہے جو کہ دراصل ذریعہ تعارف ہے اصل مقصود نہیں ہے۔پھر مقصود کہاں ہے؟ شریعت اسلام پتہ دیتی ہے کہ اندرون باطن ایک قلب ہے اسی میں ساری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسی کا نام انسان ہے،اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے جب پھیلایا اور صورت وشکل دی تو قالب نمودار ہوگیا۔شکل بن گئی۔اب اسے دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ فلاں ہے یہ فلاں ورنہ حقیقت میں انسان قلب ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔

تائید ونکتہ چینی......حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا اور بدن بنایا۔ابھی اس میں روح بھی نہیں ڈالی تھی تو ملائکہ علیہم السلام اس کی زیارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عجیب شکل وصورت بنائی ہے اور بہت ہی عمدہ ہے اور سب کے دل میں ایک عظمت ومحبت اس صورت کی بیٹھ گئی۔ادھر ابلیس کو بھی حکم ہوا کہ تو بھی اس صورت کو جاکر دیکھ۔اس کے دل میں عداوت چھپی ہوئی تھی،اس نے جاکر دیکھا اور حضرت آدمؑ کے پتلے کے اندر گھسا

① پارہ:۵،سورۃالنساء،الآیۃ:۶۵.

اور ریزے ریزے میں سرایت کی، بعد میں اس نے کہا کہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے اور کہا کہ نَفۡسٌ لَا تَتَمَلَّکُ یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہے جب تک کہ باہر سے اس کی مدد نہ ہو اور غذا، ہوا، گرمی باہر سے نہ پہنچے اس کے اندر کوئی طاقت نہیں۔ اس ابلیس نے اپنی شیطنت اور عداوت کے مطابق رپورٹ دی۔

سارے ملائکہ نے تو تائید کی اور مدحت کی اور اس کمبخت نے آ کر نکتہ چینی کی مگر یہ کہا کہ میں نے سارے بدن میں گھس کر دیکھا ہے یہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے البتہ اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی ہے اس میں سب کچھ ہو گا اگر ہوا۔ وہاں میں گھس نہ سکا۔ اشارہ تھا قلب کی طرف کہ جو کچھ حقیقت ہے وہ اس قلب میں رکھی گئی ہے اس کی حقیقت اس لعین کے سامنے نہ کھل سکی وہاں جا کر مجبور ہو گیا۔

اقلیم بدن کا بادشاہ...... چنانچہ سب سے بڑی چیز انسان میں قلب ہے۔ اور باقی جتنے اعضاء ہیں سب اس کے خدام ہیں۔ قلب میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ سب خدام اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں آیا کہ کسی چیز کو دیکھوں تو دل آنکھ کو زبان سے آرڈر نہیں دیتا کہ تو دیکھ بلکہ دل میں خیال آتے ہی آنکھ اپنا کام شروع کر دیتی ہے، دل میں خیال آیا کہ میں چلوں، تو دل کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ پاؤں کو زبان سے حکم دے کہ چلو، بلکہ دل کا منشاء ہوا اور پیروں نے حرکت شروع کر دی۔ دل نے کسی چیز کو پکڑنا چاہا تو دل ہاتھوں کو لفظوں میں حکم نہیں دے گا کہ اے ہاتھو! تم پکڑو۔ بلکہ دل میں جذبہ آیا اور ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو انسان کے تمام اعضاء خدام ہیں۔ اصل حاکم اعلیٰ اور اس اقلیم بدن کا سلطان وہ دل ہے اور دل میں ہی سب کچھ ہے۔

قلب اصل ہے یا دماغ؟...... اس میں اطباء اور موجودہ زمانے کے ڈاکٹروں کا اختلاف ہوا ہے کہ اصل انسان میں دماغ ہے یا قلب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل انسان میں دماغ ہے کیونکہ اسی سے تمام چیزیں چلتی ہیں اسی میں شعور ہے، اسی میں ادراک ہے، اسی میں علم ہے، اسی میں احساس ہے اور قلب صرف ایک آلہ ہے جو خون کے ذریعے سے دماغ کو بنا دیتا ہے اور دماغ کے اندر کچھ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہرحال وہ کہتے ہیں کہ قلب آلہ کار ہے اصل نہیں ہے۔ یہ بعض اطباء کا بھی خیال ہے اور اس زمانے کے ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ بالکل صحیح ہے۔ بہت سی اس میں صحت بھی ہے اور بہت سی اس میں غلطیاں بھی ہیں۔

مدارِ اعمال قلب ہے...... چنانچہ ہم بنانے والے کی طرف رجوع کریں گے کہ اس نے کس چیز کو اصل کہا ہے حق تعالیٰ خالق ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے اور کس لئے بنائی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو علم دیا گیا ہے اس بات کا کہ دل کیا ہے اور دماغ کیا ہے اور ہاتھ پیر کیا ہیں اس لئے ہم نے رجوع کیا کہ بنانے والے سے پوچھو کہ اصل کیا چیز ہے قلب ہی اصل ہے یا دماغ اصل ہے۔ تو شریعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب ہی اصل ہے وہی حاکم مطلق ہے اس اقلیم بدن کا۔ بدن کی ساری حکومت اسی سے چل رہی ہے۔ حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اِنَّ فِی الۡجَسَدِ مُضۡغَۃً اِذَا صَلُحَتۡ

صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ" ① ''انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے وہ اگر صحیح ہو تو سارا انسان صحیح ہے وہ اگر غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور فرمایا کہ وہ قلب ہے''۔

تو انسان کی خوبی وخرابی کا دارومدار قلب پر ہوتا ہے۔ دل ہی کے اندر نیت پیدا ہوتی ہے اور نیت سے سارے اعمال بنتے ہیں اور فرمایا گیا کہ ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" ② ''سارے اعمال کا مدار نیت پر ہے''۔ نیت اچھی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور نیت اگر بری ہے تو عمل بھی برا ہوگا اور نیت کا دارومدار قلب کے اوپر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے اعمال وافعال کا دارومدار انسان کے قلب پر ٹھہر گیا اور فی الحقیقت زندگی بھی قلب ہی سے چلتی ہے۔

مدارِ حیات قلب ہے...... جیسے اعمال کا مدار قلب پر ہے ایسے ہی حیات کا مدار قلب پر ہے، کیونکہ قلب پہلے زندہ ہوتا ہے پھر حیات دماغ میں پہنچتی ہے۔ تو اس بناء پر مدار حیات دل کے اوپر رکھا گیا ہے اور اطباء بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اطبّاء کہتے ہیں کہ آدمی جو غذا کھاتا ہے وہ اولاً معدے کے اندر پہنچتی ہے۔ معدے کے اندر خار ہوتے ہیں جو اسے پیستے ہیں اور پیس کر حریرہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں جو حصہ فضلات کا ہے وہ زائد ہے وہ انتڑیوں میں چلا جاتا ہے اور بول وبراز ہو کر نکل جاتا ہے اور جو رقیق جوہر ہے اس کو قلب معدے کی طرف سے جگر کی طرف بھیجتا ہے۔ معدے کی طرف سے جگر کی طرف کو جانیوالی نالیوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں ان کے ذریعے سے وہ غذا جگر میں پہنچتی ہے۔

جگر کو کہتے ہیں کہ وہ طباخ اور بدن کا باورچی ہے' جگر میں گرمی اور حرارت ہے وہ اس گرمی سے حریرے کو پکاتا ہے اور خوب گرمی پہنچاتا ہے جب وہ ہنڈیا پکتی ہے تو اس میں ایک حصہ ابال کا آتا ہے جھاگ کی شکل میں ایک حصہ نیچے بیٹھ جاتا ہے جسے تلچھٹ کہتے ہیں۔ ایک حصہ بیچ میں پانی میں رہتا ہے وہ کھولتا رہتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ جو اوپر کا حصہ ہے جھاگ کا وہ بلغم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور نیچے کا حصہ جو تلچھٹ ہے سیاہ ہوتا ہے اسے سوداء کہتے ہیں اور بیچ میں جو رقیق اور پتلا حصہ ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ وہ صفراء ہے۔

تو سوداء' صفراء' بلغم. یہ تین حصے ہیں جن کو جگر تیار کرتا ہے اور پکاتا ہے ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے خون بنتا ہے تو جگر کا کام ہے خون بنانا، معدہ کا کام تھا غذا کو پیسنا۔ پھر جگر اسی خون کو بھیجتا ہے قلب کی طرف۔ جگر سے قلب کی طرف جانے والی بہت باریک رگیں ہیں جن کو طب کی اصطلاح میں شرائین کہتے ہیں (شرائین جمع ہے شریان کی) ان ہی باریک رگوں سے خون قلب کے طرف پہنچتا ہے۔ اور قلب کی شکل تو مڑی کی سی ہے کہ اوپر سے پتلا، بیچ میں سے موٹا، پھر نیچے سے پتلا۔

اوپر کے حصے کو کہتے ہیں بطن عالی اور نیچے کے حصے کو بطن سافل۔ ان میں باریک اور رقیق خون پہنچتا ہے اور قلب

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه، ج: ۱، ص: ۹۰.

② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی، ص: ۱ رقم: ۱.

ستھرا شہر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ دوست کہے گا کہ خدا کے بندے آنکھیں تیری کھلی ہوئی تھیں۔ چیزیں سامنے تھیں اور تو ہتا ہے کہ نہیں دیکھیں تو جواب میں کہتا ہے کہ اوفوہ میرا دھیان دوسری طرف تھا، مجھے خبر نہیں ہوئی کہ میرے سامنے کیا چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں نہیں دیکھتی بلکہ دل دیکھتا ہے اگر دل ہی دھیان نہ کریں تو آنکھوں کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی گھنٹے بج رہے ہیں آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ سارے سن رہے ہیں مگر آپ کو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا لوگ کہتے ہیں کہ بہت گھنٹے بجے آوازیں آئیں، آپ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نے تو سب کچھ سنا ہے، وہ کہتا ہے کہ افوہ اصل میں میرا خیال دوسری طرف متوجہ تھا، مجھے سننے کا خیال ہی نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ کان نہیں سنتا بلکہ دل سنتا ہے۔ دل متوجہ ہو جائے تو ساری آوازیں کان میں آئیں گی اگر دل ہی متوجہ نہیں تو کوئی چیز بھی کان میں نہیں آئے گی ذائقہ ہے وہ بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں کھائیں اور دل متوجہ ہو دوسری طرف نہ کھٹے کا پتہ چلے گا نہ میٹھے کا پتہ چلے گا۔ اگر کوئی کھٹے میٹھے کا پتہ پوچھے گا تو کہے گا کہ بھائی میرا دل تو دوسری طرف تھا مجھے کچھ خبر نہیں۔

مجھے ذائقہ پر ایک حکایت یاد آ گئی کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ایک سالے تھے حاجی مقبول صاحب بہت نیک صالح تھے اور حضرت ہی کے یہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اتفاق سے چار پانچ روز تک مسلسل چنے کی دال پکتی رہی۔ اور روزانہ تو آدمی سے پلاؤ کھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے جب تک کہ غذا نہ بدلے۔ انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ کیا تمام دالیں مٹ مٹا کر ایک ہی چنے کی دال رہ گئی ہے ہفتہ بھر ہو گیا ہے اس ایک دال کو ہی کھاتے ہوئے اور جی بھر گیا کبھی دوسری دال بھی پکالیا کرو۔ انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی۔ کھانے کے بعد کہنے لگے۔ آج پھر وہی چنے کی دال پکائی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ مار کر کہا آنکھیں ہیں کہ نہیں چنے کی دال ہے یا ماش کی؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کچھ دھیان نہیں رہا میں سمجھا کہ وہی چنے کی دال کھا رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چکھنا دل سے ہوتا ہے۔ زبان نہیں چکھتی۔ کھٹے میٹھے کا ذائقہ اس کا احساس اور اس کا ادراک یہ سب دل سے متعلق ہے۔ اس لئے اصل چیز انسان کے بدن میں دل ہے اور باقی سب اعضاء اس کے تابع ہیں۔

مرکز اصلاح قلب ہے ...... دماغ بہت اعلیٰ چیز ہے مگر دماغ تفصیل کرتا ہے اس علم کی جو قلب کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قلب اپنے اس علم اجمالی کو دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے وہ دماغ کی نالیوں میں چکر کھاتا ہے پھر نظریہ بن جاتا ہے اور نظریہ سے پروگرام بن جاتا ہے پروگرام سے اس کی اشاعت ہو کر پارٹی بن جاتی ہے۔ قلب اگر دماغ کے اندر علم نہ بھیجتا تو نہ نظریہ بنتا، نہ پارٹی وجود میں آتی۔ اسی لئے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ دل اصل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ ہاتھ پیر بھی اس کے تابع ہیں۔ پیٹ اور پیٹھ بھی اس کے تابع ہیں۔

اسی بناء پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اصلاح کا مرکز دل کو بنایا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نگاہ بھی

میں گرمی، جگر سے بھی زیادہ ہے اور دل پھر اس لطیف جوہر کو پکاتا ہے اور پکانے سے ایک لطیف بھاپ اٹھتی ہے، جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ بھاپ رگ و پے میں سرایت کرتی ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ یہ روح حیوانی ہے اسی روح سے آدمی میں حس ہے، احساس ہے عقل ہے زندگی ہے۔ اطباء کی اصطلاح میں اس کو روح حیوانی کہتے ہیں۔

اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام روح نَسَمَۃ ہے اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ نفس کے معنے پھونکنے اور پھیلنے کے ہیں چونکہ یہ پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مدار ہے۔ انسان کی زندگی کا، وہی حیوانی پیدا کرتا ہے، جس سے انسان کے بدن میں حس، حرارت اور احساس وغیرہ طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بدن میں قلب اصل ہے دماغ اصل نہیں ہے۔ تمام اعضاء کا تعلق قلب سے ہے دماغ سے نہیں اور زندگی کا مدار بھی دل ہی پر ہے۔ عمل کا جذبہ بھی دل ہی سے ابھرتا ہے۔ محبت اور عدوات بھی دل ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔

دماغ قلب کے تابع ہے...... تو شریعت کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز انسان میں قلب ہے دماغ نہیں بلکہ دماغ قلب کا تابع ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قلب میں جو علم اور شعور ہے وہ اجمالی ہے، مختصر ہے اور مجمل ہے۔ دماغ میں جا کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور پھیل کر جزئیات نکلتی ہیں۔ پھر آدمی ان سے نظریات قائم کرتا ہے۔ نظریات سے پھر پروگرام بنتے ہیں۔ تو علم اجمالی قلب میں ہے دماغ میں آکر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور چونکہ تفصیل ہوتی ہے اجمال کیلئے اس لئے دماغ تابع ہے قلب کے، برعکس نہیں۔ یہ شریعت کا منشاء ہے اس لئے شریعت اسلام کا موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جاوے، اگر دل درست ہو گیا تو دماغ بھی درست ہے۔ ہاتھ پیر بھی درست ہیں۔ اخلاق بھی درست ہیں۔ اگر انسان کا دل بگڑ جائے تو نہ زندگی ہے اور نہ عمل ہے، نہ ہنر ہے نہ کمال ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے ۔۔۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل زندہ ہے تو سارا انسان زندہ ہے۔ دل مردہ ہے تو سارا انسان مردہ ہے تو دارومدار حقیقت میں دل ہی کے اوپر ہے کیونکہ ہر چیز دل سے چلتی ہے، اس لئے شریعت نے دل کو اپنا موضوع بنالیا ہے اگر دل درست ہوگا تو اعمال شرعیہ بھی درست ہوں گے اور سارا بدن درست ہو جائے گا اور دماغ بھی صحیح ہو جائے گا اور اگر قلب بگڑ گیا تو دماغ بھی خراب رہے گا اور تمام اعضاء بھی خراب رہیں گے۔

مُدرکِ حقیقی قلب ہے...... یہ ہی وجہ ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ تو اطباء کہتے ہیں کہ یہ سارا دماغ سے ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دل سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بھرے بازار میں جائیں اور اچھی اچھی بلڈنگیں دیکھیں بڑے اچھے اچھے مناظر سامنے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کا دوست کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑی بڑی عمدہ عمدہ بلڈنگیں دیکھی ہیں۔ یہاں تو بڑے اعلیٰ اعلیٰ مناظر ہیں۔ بڑی بہترین سڑکیں ہیں، صاف

ٹھیک ہو جاتی ہے کان بھی درست، ناک بھی درست، یہ غلط ہے تو ساری چیزیں غلط ہیں۔ اگر دل میں خرابی ہے اور نیت بری ہے تو نگاہ بھی لامحالہ غلط جگہ پر پڑے گی اور دل میں تقدس، تقویٰ اور طہارت ہے تو نگاہ بھی غلط جگہ نہیں جائے گی۔ اگر دل میں صلاح تقویٰ ہے تو غلط قسم کی آوازیں باجے گاجے کبھی نہ سنے گا۔ اس طرف توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر دل میں دیانت وتقویٰ نہیں ہے تو اس کے لئے جائز وناجائز سب برابر ہے۔ باجے گاجے بھی سنے گا، حرام آوازیں بھی سنے گا، حلال آوازیں بھی سنے گا۔ اگر دل میں دین ہے تو راستہ درست رہے گا، اچھی چیزوں کی طرف طبیعت جائے گی بری چیزوں سے ہٹ جائے گی۔

افتائے قلب...... چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ'' ① کہ جب تمہیں کوئی معاملہ در پیش ہو تو تم اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو، دل آدمی کا مخلص ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ بات صحیح ہے کہ غلط ہے۔ آپ نے دوست کے اوپر دعویٰ کر دیا کہ یہ جائیداد میری ہے فلاں کی نہیں۔ حالانکہ دل سے جانتا ہے کہ یہ اسی کی ہے میری نہیں ہے۔ آپ نے قانونی طور پر مقدمہ بنایا تاکہ جائیداد میرے نام پر آجائے۔ اس پر وکلاء بحث کریں گے، ممکن ہے آپ کامیاب بھی ہو جائیں، جائیداد آپ کی ہو جائے گی، مگر دل آپ کا ملامت کرے گا کہ کمبخت تو غیر کا حق مار رہا ہے۔ دل فتویٰ دے رہا ہے کہ زمین تیری نہیں ہے۔ اگر آدمی دل کی طرف متوجہ ہو جائے تو سارے قصے ختم ہو جائیں لیکن بات تو یہ ہے کہ لوگ مطلب کے پیچھے رہتے ہیں۔

ایک عالم نے فتویٰ دیا جو کہ مرضی کے خلاف تھا۔ اب اس سوال کا دوسرا رخ بدل کر فتویٰ بھیج دیا۔ اب اس فتوے کا دوسرا جواب آ گیا وہ بھی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ اب پھر تیسرے مفتی کے پاس بھیج دیا تو جو فتویٰ مرضی کے مطابق ہوا اس پر عمل کر لیا اور جو مرضی کے مطابق نہ ہوا اس پر عمل نہ کیا۔ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے؟ یہ کیا شریعت کا پیرو ہے؟ یہ تو اپنے نفس کا تابع ہے، نفس میں جو چیز آ گئی چاہتا ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ مل جائے، اس لئے شریعت نے کہا کہ مفتیوں سے فتویٰ بعد میں لینا پہلے اپنے دل سے فتویٰ لے لو، دل انسان کا مخلص ہے وہ سچا مشورہ دے گا اور صحیح فتویٰ دے گا۔

ایمان کا موردِ اوّل قلب ہے...... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے دل کو پکڑا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے کہ انسان کے ضمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور بحث سے اور نفسانی خواہشات سے جو بھی رائے قائم کرے دل اس کو جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، ہاتھ چوری کرتا ہے مگر دل ملامت کرتا ہے کہ تجھے حق نہیں دوسرے کے مال چرانے کا، اگر دل کی بات مانے تو کبھی چوری نہ کرے۔ بہر حال دل انسان کا اصل ہے اس لئے شریعت نے دل کو تاکا ہے کہ اس کی اصلاح کر دو، بنیاد درست ہو جائے تو سارا انسان ہی درست ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے انسان درست نہیں ہو سکتا۔

---

① مسند الامام احمد، حدیث وابصة بن معبد الاسدی ج: ۳۶ ص: ۴۴۳۔

شریعت نے دل کی اصلاح کے لئے ایمان رکھا ہے، اس لحاظ سے ایمان کا محل بھی قلب انسان ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دل کے اندر ہوتی ہے یہی محبت آدمی سے عمل کراتی ہے۔ دل کے اندر جذبے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی جذبے کے مطابق انسان چلتا ہے۔ تو اولاً ایمان قلب انسان پر وارد ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ ترقی کر کے دوسرے مقامات پر پہنچتا ہے، اس کی تاثیر سارے بدن پر پہنچتی ہے تو پھر ہاتھ بھی مومن بن جاتا ہے اور کان بھی مومن بن جاتا ہے اور سب اعضاء میں ایمانداری پیدا ہو جاتی ہے، اگر دل میں بے ایمانی گھسی ہوئی ہو تو ہاتھ پیر بھی بے ایمان ہوں گے اور بے ایمانی کی حرکتیں کریں گے اور دماغ بھی بے ایمان ہو جائیگا، سوچے گا تو بے ایمانی کی باتیں سوچے گا اس لئے کہ دل کی نیت خراب ہے۔

چنانچہ دل کو اصل قرار دے کر انبیاء اسی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کہ اس کے اندر نور و چمک پیدا کریں تا کہ اس کے اندر علم غیب کی چیزیں روشن ہو جائیں اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ قلب پر ایمان وارد ہو۔ اور قلب چونکہ پاک ظرف ہے اس لئے اس میں پاک چیز یعنی ایمان داخل ہوتا ہے اور پھر عمل بھی ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر دل میں خوشی ہے تو چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں گے چونکہ خوشی درحقیقت قلب کی صفت ہے، مگر چہرے سے نظر آتی ہے۔ دل میں اگر غم بھرا ہے تو چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آج تم بڑے غمگین نظر آتے ہو حالانکہ غم چھپی ہوئی چیز ہے وہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے چوں کہ دل کا اثر چہرے پر پڑتا ہے تو ہر جاننے والا جان لیتا ہے کہ یہ غم زدہ ہے اور واقعی وہ غم زدہ ہوتا ہے۔ تو غمی و خوشی، محبت و عداوت اور کرنا نہ کرنا یہ چیزیں انسان کے قلب سے متعلق ہیں۔ اگر دل درست ہے سب چیزیں درست ہیں۔ اگر دل خراب ہے تو اس کی وجہ سے سب چیزیں خراب ہیں اور اسی وجہ سے ہاتھ پیر پر اثر پڑتا ہے اور وہ اثر جو قلب پر وارد ہوتا ہے وہ متعدی ہو کر اعضاء و جوارح پر طاری ہوتا ہے، اچھا ہو یا برا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی کے انتقال کا وقت قریب آتا ہے اور ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ہاتھوں اور پیروں کو سونگھتے ہیں اور دماغ کو دیگر بدن کو بھی سونگھتے ہیں اور ایمان کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔ دل میں اگر ایمان ہے تو ہاتھ پیر میں بھی ان کے اثرات رچے ہوئے ہوتے ہیں، ہاتھوں کو بھی سونگھتے ہیں کہ ان میں بھی ایمان کی خوشبو ہے یا نہیں، اصل خوشبو کا مرکز تو دل ہے مگر اعضاء پر اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں، جیسے خوشبو کا مخزن تو باغ ہے اور پھول ہے مگر کپڑوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے اور باغ والی خوشبو کے اثرات سے جہاں جہاں ہوا پہنچے گی وہ شے معطر ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دل اصل ہے اس کو درست کیا جائے اور اسکی درستگی کی پہلی بنیاد ایمان ہے، ایمان رہتا ہے کہ قلب کے اندر اور ان کے اثرات ہاتھ پر عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

محل اسلام...... اس سے معلوم ہوا کہ دل ایمان کی جگہ ہے اور ہاتھ پیر اسلام کی جگہ ہیں۔ ایمان چھپی ہوئی شے

ہے جو دل میں رہتا ہے اور اسلام کھلی ہوئی شئے ہے جو ہاتھ اور پیروں پر آتا ہے۔ آپ نے نماز پڑھی ہاتھ پاؤں سے پڑھی۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھی مگر اس فعل کا سرچشمہ قلب کے اندر ہے۔ اگر اس میں جذبہ عقیدت کا، محبت کا اور اللہ کی چاہت کا پیدا نہ ہوتا تو کبھی نماز نہ پڑھتے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں نماز پڑھنے والا دل ہے لیکن عمل کی صورت ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتی ہے، ایمان کا محل دل ہوتا ہے اس کے اثرات جب ہاتھ پاؤں پر آتے ہیں تو وہ اسلام بنجاتے ہیں۔

چونکہ ایمان پوشیدہ شے ہے اور اسلام ظاہر شئے ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ اَلْإِيْمَانُ سِرٌّ وَالْإِسْلَامُ عَلَانِيَةٌ...... کہ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جس کو دل لئے ہوئے ہے اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ پاؤں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہی اندرونی شئے جب تک چھپی رہتی ہے اسے ہی ایمان کہتے ہیں اور وہی شئے جب ہاتھ پاؤں پر آتی ہے تو اسے اسلام کہتے ہیں۔

حقیقت ایمانیہ...... ایمان کے معنٰے کیا ہیں؟ اور کس طرح سے ہمارے اندر آتا ہے؟ اور اس کے آثار کیا ہیں؟ اور کیسے پہچانا جاتا ہے؟ تو سنئے! ایمان کی حقیقت ہے محبت اگر اللہ کی محبت کامل ہے تو کہیں گے کہ اس کا ایمان کامل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں رچ گئی ہے تو کہیں گے کہ ایمان آ گیا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اللہ کی محبت اور عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اگر عشق ومحبت نہ ہوتا تو ایمان کبھی نہ آتا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کے رگ وپے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بس گئی ہے اور اللہ کی محبت جم گئی ہے۔

تو محبت درحقیقت ایمان کا دوسرا نام ہے۔ ایمان نہیں محبت نہیں۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ اصل چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ یہی چیز ایمان بناتی ہے یہی اعتقاد قائم کرتی ہے۔ اسی کو فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ل "اَيُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ". ② کوئی بھی تم میں مومن نہیں بنے گا جب تک قلب میں میری اتنی محبت نہ ہو کہ اس کو اتنی نہ اپنے ماں باپ سے اور نہ اولاد سے محبت ہو اور نہ کسی اور سے اتنی محبت ہو۔ بغیر حب نبی کے ایمان کامل نہیں ہوتا۔

آثارِ ایمانیہ...... علامت اس کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہے اولاد کی محبت ایک طرف اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، جب ٹکرا جائیں تو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اختیار کرے اور اولاد کی محبت چھوڑ دے، یہ علامت ہوگی کہ واقعی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے اگر آدمی نے اولاد کی محبت کو اختیار کیا اور رسول کی محبت کو چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ رسول سے محبت نہیں بلکہ اولاد سے محبت ہے تو ٹکراؤ سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی محبت

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۶۵۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ص: ۳، رقم: ۱۴۔

غالب ہے، مثلاً آپ لحاف میں آرام سے پڑے ہوئے ہیں بڑی خوشگوار نیند آرہی ہے۔ اچانک مؤذن نے آواز دی: حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ. حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ. ...... ''دوڑو نماز کی طرف' دوڑو کامیابی کی طرف''۔ آپ نے لبیک نہیں کہا تو کہیں گے کہ نفس کی محبت غالب ہے اور اگر آرام چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور وضو کیا اور مسجد میں گئے نماز پڑھی تو کہیں گے کہ محبت خدا اور رسول غالب ہے۔ تو ٹکراؤ کے وقت ہی آدمی جدھر مائل ہوتا ہے اسی طرف کی محبت کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم مومن نہیں بن سکتے جب تک میری محبت اولاد، ماں باپ وغیرہ سب کی محبت سے غالب نہ ہو جائے کہ جب ماں باپ کی محبت میری محبت سے ٹکرائے تو مجھے اختیار کرو، ماں باپ کو چھوڑ دو اور جب میری محبت اولاد کی محبت ۔سے ٹکرا جائے تو مجھے اختیار کرو، اولاد کی محبت کو چھوڑ دو۔ یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرامؓ میں محبت نبوی اتنی غالب تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو صحابہؓ نے بھی اس محبت کی وجہ سے وطن چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا۔ عزیز و اقارب چھوڑے، جائیدادیں چھوڑیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہولئے مکہ میں ساری تجارتیں ترک کیں اور مدینہ میں غربت کی زندگی اختیار کی ان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ یہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تو تھی۔ اس محبت کی وجہ سے عیش و آرام کا سب سامان ترک کیا، مفلس و قلاش ہو کر رہنا گوارہ کیا مگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔

مقام صدیقیت ...... حدیث میں ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں ۳۱۳ صحابیؓ شریک تھے۔ ان میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بیٹے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے بعد میں وہ ایمان لائے وہ اس غزوہ میں کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے تھے' ایمان لانے کے بعد ایک روز صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ ابا جان غزوہ بدر کے موقع پر کئی موقعے ایسے آئے کہ آپ بالکل میری تلوار کی زد پر تھے اگر میں وار کرتا تو آپ بچ نہیں سکتے تھے۔ مگر نے سوچا میرے باپ ہیں کس طرح ان پر حملہ کروں تو میں ایک طرف ہو گیا، یہ بات بیٹے نے باپ سے کہی: ''حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اچھا یہ موقعے آئے ہیں کہ میں اور تو آمنے سامنے آ گئے تھے۔ بیٹے نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ مجھے خبر نہ ہوئی اگر تو میری زد پر آتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا۔ اس واسطے کہ تو دشمن تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور رسول کی محبت کے مقابلے میں اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہے''۔

غلبۂ محبت ...... معلوم ہوا ہے کہ ایمان جب کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے اور محبت غالب آجاتی ہے تو اپنے کو اس محبت کے بدلے فروخت کر دیتا ہے۔ پھر محبوب کی ہر ادا سے محبت ہو جاتی ہے اس کے مقابل میں نہ اولاد سے محبت رہتی ہے اور نہ ماں باپ کی محبت کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ سب کی محبتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی محبت غالب آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے ہجرتیں کیں۔ جائیدادیں چھوڑیں، تجارتیں ترک کیں، یہ سب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

محبت کا نتیجہ تھا۔ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ کی اس لئے کہ رسول کی محبت غالب تھی۔

تو پہلا حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ محبت ہو۔محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ایمان نہیں تو پھر اسلام ہی نہیں۔تو بنیادی چیز محبت ہے۔اسی واسطے محبت پر زور دیا گیا ہے۔یہی صحابہ ؓ کا طریق تھا اور یہی بعد میں اہل اللہ کا طریق رہا ہے۔یہ قاعدے کی بات ہے کہ جس شخص کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔اس کا چلنا پھرنا بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا لباس بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا ذکر اور چرچا بھی محبوب بن جاتا ہے۔فقط محبوب سے ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کے نام سے جو چیز منسوب ہو جاتی ہے، اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ لیلیٰ کے مکانوں کی اینٹ اینٹ کو چومتا پھر رہا ہے کسی نے کہا۔احمق! تو یہ کیا کر رہا ہے اینٹوں میں کیا رکھا ہوا ہے اور اینٹوں کو چومنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس نے دو شعر میں جواب دیا۔

اَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى ۔۔۔ اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَذَا الْجِدَارَا

کہ میں لیلیٰ کے مکان پر جب گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں۔کبھی اس دہلیز کو چومتا ہوں اور کیوں چومتا ہوں۔

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِىْ ۔۔۔ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ نَّزَلَ الدِّيَارَا

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ہے وہ جو ان اینٹوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس سے محبت ہے اس کی وجہ سے ان اینٹوں سے محبت ہوگئی ہے، اس کے کتے سے محبت ہوگئی ہے۔اس کی بلائیں لینے کو بھی تیار ہوں۔تو جب محبت ہوتی ہے تو ایک محبوب ہی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جو چیز اس کے نام سے لگ جاتی ہے وہ بھی محبوب بن جاتی ہے۔

چونکہ آپ کو محبت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو گنبد خضراء بھی محبوب ہوگا۔اس کی زیارت کو آپ عبادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ایک آنکھ گنبد پر پڑ جائے تو دنیا و آخرت کی سعادت مل جائے گی۔وہ کیوں؟ اس لئے کہ گنبد خضرا خود محبوب نہیں بلکہ اس میں جو آرام فرما ہیں اصل میں وہ محبوب ہیں۔چونکہ اس گنبد پر نام لگ گیا ہے ان کا اس لئے وہ بھی محبوب ہوگیا گنبد تو پھر قریب ہے، مدینہ سے محبت ہے، شہر اء کو دیکھو تو مدینہ تو صرف ایک شہر ہے جیسے ہمارے یہاں شہر ہیں۔یہ شہر زیادہ خوبصورت ہیں، وہ شہر اتنا خوبصورت بھی نہیں مگر پھر بھی محبت ہے اصل میں محبت ہے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے گنبد خضراء بھی محبوب ہوا۔اس محبت کی وجہ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی محبوب ہوئی اسی محبت کی وجہ سے مدینہ بھی محبوب ہوا۔تو سلسلہ بسلسلہ ہر چیز تک محبت پہنچ جاتی ہے۔

آپ بیت اللہ شریف کی اینٹ اینٹ کو چومتے ہیں۔کیوں؟ اس لئے کہ بیت اللہ کے مقام پر تجلی ربانی اتری ہوئی ہے۔اصل میں محبت اللہ سے ہے چونکہ بیت اللہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اس لئے اس سے بھی محبت ہوئی ہے اور جب خانہ کعبہ محبوب ہوا تو پوری مسجد حرام بھی محبوب ہوگئی اور اس کی محبت ظاہر ہوئی اس طرح پر کہ آپ اس

کی عظمت کرتے ہیں۔ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، جب مسجد حرام محبوب ہوئی تو مکہ محبوب بن گیا کہ وہ شہر پناہ ہے اس مسجد حرام کا، لہٰذا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔ اور چونکہ حجاز میں واقع ہے تو ہم حجاز مقدس کہتے ہیں کیونکہ سارے حجاز سے محبت ہوگئی ہے۔ تو حجاز کے جتنے باشندے ہیں ان سب سے محبت ہوگئی۔ یہ پڑوسی ہے اس کا لہٰذا یہ بھی محبوب ہے تو جب آدمی کے دل میں محبت آتی ہے تو فقط ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا، بلکہ محبوب کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں، چال ڈھال بھی محبوب، لباس بھی محبوب، کھانے کا طرز بھی محبوب، رہن سہن کا طرز بھی محبوب، وہ تمام چیزیں محبوب بن جاتی ہیں جو محبوب کی پسندیدہ اور محبوب ہیں۔

آثارِ محبت...... بہر حال یہیں سے اتباع سنت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ محبت کا اثر ہے اگر محبت ہے تو اتباع سنت اختیار کرے گا ورنہ نہیں۔ محبت ہی آمادہ کرتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کرنے پر کہ جس طرح آپ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اسی طرح بیٹھ کر کھانا کھایئے۔ جس طرح آپ آرام فرماتے تھے اسی ڈھنگ سے آرام ہو۔ جس ڈھنگ سے دشمنوں سے برتاؤ کرتے تھے وہی ڈھنگ تم بھی اختیار کرو۔ ان چیزوں سے اتباع سنت کا جذبہ غالب ہو جائے گا۔

اگر محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ غالب ہے تو بدعات سے نفرت ہو جائے گی، سنت کی پیروی سے محبت ہوگی کیونکہ محبوب کی ذات محبوب ہے اور جب ذات محبوب ہے تو ذات کی ادا بھی محبوب ہوں گی۔ آپ کا طرز سلام و کلام بھی محبوب ہوگا۔ ہر چیز محبت کے نیچے آتی چلی گئی اس کا نام اتباع سنت ہے کہ ہر شعبہ میں پیروی ہو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اس میں خیر و برکت ہے حتیٰ کہ معاملات و معاشرت میں بھی جب پیروی کریں گے تو صدیق بن جائیں گے۔

سونے کا مسنون طریق اور قوت ارادی...... میں کہتا ہوں۔ مثال کے طور پر ہم سوتے ہیں اس میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں پابند ہیں سنت کے کہ اس طرح سے سوئیں جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے۔ سونا تو ہے لیکن حضور کے طریقے پر سوئیں گے تو عبادت بن جائے گا۔ اور آدمی چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر سوئے گا۔ چت لیٹ کر سوئے آیا اوندھا لیٹ کر یا دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ پر سوئے گا۔ بس یہی چار طریقے سونے کے ہیں۔ کوئی الٹا لٹک کر تو سونے سے رہا۔ ان چار طریقوں میں ہم آزاد نہیں بنائے گئے بلکہ پابند ہیں سنت کے۔

اوندھا لیٹنے کو شریعت میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ مسجد میں اوندھے لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیروں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ اوندھے لیٹ کر مت سوؤ اس لئے کہ یہ دوزخیوں کی ہیئت ہے کہ ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اس لئے مومن کا کام نہیں کہ وہ جہنمیوں کی ہیئت اختیار کرنے اور جہنمیوں سے مشابہت اختیار کرے۔ اور پھر اوندھا لیٹنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اس سے انتڑیاں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں ممکن ہے کہ کسی انتڑی میں گرہ لگ جائے اور

پیٹ میں درد شروع ہو جائے یا کوئی تکلیف ہو جائے اس لئے شریعت نے مکروہ سمجھا ہے۔ اگر سوتے سوتے اوندھا ہو جائے وہ دوسری بات ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اپنے ارادے سے آدمی اوندھا نہ لیٹے۔ ①

اب رہ گیا چت لیٹنا تو چت لیٹ کر سونا جائز تو ہے۔ شرعاً ممنوع نہیں حرام نہیں مگر شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ چت لیٹنا بے قابو ہو جانے کی علامت ہے۔ اور جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو چت لیٹ جاتا ہے اسی واسطے اگر کوئی پہلوان کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں کہ چاروں شانے چت گرا۔ کوئی نہیں کہتا کہ چاروں شانے پٹ گرا کیونکہ جو پٹ ہوتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے اسے کچھ قابو ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جائے۔ مگر چت لیٹنے والا بالکل بے قابو ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ضعیفوں کی ہیئت پسند نہیں کی گئی، مومن کا کام ہے مضبوط ہونا، مومن کا کام بیماروں کی طرح پڑنا نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ'' ② قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے، قوت ہوگی تو جہاد کرے گا، قوت ہوگی تو مجاہدہ کرے گا اور ضعیف بیچارہ چار پائی پر بس پڑا ہوا ہے۔ نہ جہاد کے کام کا، نہ جنگ وجدل کے کام کا، نہ مجاہدے کے کام کا کسی کام کا نہیں، یہ شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ پسند کیا ہے کہ ہر معاملہ میں بہادرانہ افعال صادر ہونے چاہئیں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: آدمی مریضوں اور ضعیفوں کی چال نہ چلے بلکہ اس طرح چلے بلکہ اس طرح چلے کہ دیکھنے والا دیکھے کہ اس کے بدن میں کچھ جان ہے، کچھ قوت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوتے تو رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجگی ہے کہ آدمی بغیر رکاب کے سوار نہ ہو سکے بلکہ کود اور اچھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ شجاعت اور بہادری ظاہر ہو۔

بہرحال اسلام نے مومن کے لئے کوئی ایسی حرکت پسند نہیں کی جس سے ضعف ٹپکتا ہو۔ مجبوری ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ چت لیٹنا بے قابو ہونے کی علامت ہے۔ ضعیفوں اور بیماروں کی علامت ہے اس لئے جائز تو ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت نہیں کی مگر اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ اب رہ گیا بائیں کروٹ سونا تو مخالفت تو اس کی بھی نہیں، جائز ہے مگر پسندیدہ یہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ بائیں جانب قلب ہے۔ جب بائیں کروٹ پر سوئے گا تو آدمی کے قلب کو راحت زیادہ ملے گی اور جب راحت زیادہ ملے گی تو نیند گہری آئے گی اور جب نیند گہری آئے گی تو اندیشہ ہے کہ تہجد قضا ہو جائے اور صبح کی نماز بھی قضا ہو جائے۔ اور دوسرے معمولات قضا ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ آدمی اتنی زیادہ راحت کرے کہ گھوڑے بیچ کر سو جائے اور مردوں سے شرط باندھ کر سو جائے۔ آدمی کو چوکنا ہو کر سونا چاہئے تاکہ جس وقت چاہے آنکھ کھلے۔ آدمی کا قلب مضبوط ہو۔

---

① السنن لابن ماجه، کتاب الادب، باب النهی عن الاضطجاع علی الوجه، ص: ۲۶۹۹، رقم: ۳۷۲۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف ابن ماجه ج: ۸ ص: ۲۲۳. ② السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب التوکل والیقین ،ص: ۲۷۳۰، رقم: ۴۱۶۸، وزاد: المؤمن القوی خیر و احب الی الله.

راحت میں غرق ہوکر بے قابو نہ بنے۔

اسی واسطے عزم پیدا گیا کہ اگر آدمی سوتے وقت یہ ارادہ کر کے سوئے کہ ہماری آنکھ صبح کو چھ بجے کھلنی چاہئے تا کہ جماعت قضا نہ ہو تو ٹھیک چھ بجے آنکھ کھلے گی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ کھلے۔ اٹھنا نہ اٹھنا تو آدمی کے نفس کی بات ہے۔ سستی سے نہ اٹھے مگر آنکھ ضرور کھل جائے گی۔ تو مضبوط عزم وارادہ ضرور کام کرتا ہے اس کے لئے شریعت نے طریقہ یہ بھی رکھا ہے کہ سورۂ کہف کی جو آخری آیتیں ہیں وہ پڑھ کر سویا کریں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ ① تا آخر سورۃ۔ ان آیتوں کا اثر یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کو پڑھ کر ارادہ کرے کہ فلاں وقت اٹھنا ہے تو ضرور آنکھ کھلے گی۔ مگر پہلی چیز عزم اور عزیمت ہے کہ ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے اٹھنا ہے اور اگر ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے تو سونا ہے چاہے اٹھے نہ اٹھے تو آٹھ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی۔ انسان کے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت دی ہے، انسان کی عزیمت کو بڑی طاقت بخشی ہے۔ ارادے پر ان آیتوں کو بھی پڑھ لے تو زیادہ مدد ہوگی۔ بہر حال شریعت کا منشاء یہ ہے کہ گہری نیند مت سوؤ کہ سارے اذکار، سارے اعمال، ساری نمازیں نیند کی نذر ہو جائیں، اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ انسان بائیں کروٹ پر سوئے اور گہری نیند سوئے۔

اب دائیں کروٹ رہ جاتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی سارے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ آپ دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ جب آدمی دائیں کروٹ سوئے گا تو قلب معلق رہے گا اور جب دل لٹک گیا تو زیادہ راحت نہیں ملے گی قلب چوکنا رہے گا۔ ایسی نیند نہیں آئے گی کہ جس میں آدمی غرق ہو جائے اس لئے دائیں کروٹ پر لیٹنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دیا ہے اور دوسری ہیئتوں کو ممنوع قرار تو نہیں فرمایا مگر پسندیدہ نہیں فرمایا کیونکہ دوسری ہیئتوں میں مومن کا مقصد اصلی فوت ہو جاتا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز روزہ تو بجائے خود عبادت ہے مگر عام زندگی میں بھی آپ آزاد نہیں پیدا کئے گئے بلکہ قانون خداوندی کے پابند بنائے گئے ہیں کہ سوتو اسی ہیئت سے سو جس ہیئت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے، کھانے بیٹھو تو اسی ہیئت سے کھاؤ جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر کھاتے تھے۔ جب آپ کوئی کام کریں تو اسی ہیئت سے کریں جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو کرتے تھے۔

اِبتدا بالتیمن...... چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی جیسے کہ روایت میں ہے: ”كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ“ ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے کاموں میں ہمیشہ دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ اگر کنگھا کرتے تو پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب، اگر جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پیر میں پھر

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۰۷. ② السنن للنسائی، کتاب الزینۃ، باب التیامن فی الترجل، ص: ۲۴۲۳، رقم: ۵۲۴۲. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۱ ص: ۲۵۶.

بائیں پیر میں اگر کرتہ پہنتے تو پہلے آستین میں دایاں ہاتھ ڈالتے پھر بایاں۔ دانتوں میں اگر مسواک کرتے تو پہلے دائیں جانب لے جاتے پھر بائیں جانب۔ ہر اچھی چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب کو پہلے اختیار فرماتے تھے۔ یہی کام مومن کا ہونا چاہئے کہ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پہلے اختیار کرے گا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کوئی چیز آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تقسیم فرماتے تو دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ دائیں جانب تقسیم فرما کر پھر بائیں جانب متوجہ ہوتے۔ اور ہر بری اور خسیس ترین شئے کی ابتداء بائیں جانب سے فرماتے ناک صاف کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے استنجا کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ یہ ہے سنت، اگر آپ سنت پر عمل کریں تو آپ کی ساری دنیا دین بن جائے گی، نیہ کھانا پینا، رہنا سہنا اتباع سنت کی وجہ سے دین بنتا چلا جائے گا۔ اور اتباع سنت کب ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے محبت کے غلبے کی وجہ سے اگر محبت غالب نہ ہوتو آدمی کبھی بھی اتباع سنت نہ کرے بس یہ سوچے گا کہ مطلب نکل جانا چاہئے، کہاں کی محبت اور کہاں کا اتباع محبت غالب رہے گی تو قدم قدم پر خیال رہے گا۔

معیار عقل...... حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ تھے وہ سہارنپور سے سوار ہوئے۔ جانا تھا ان کو کانپور، پہلے سہارنپور کے گنے بہت مشہور تھے۔ اب وہ گنا نہیں ہوتا وہ گنے بہت ملائم۔ بہت میٹھے اور بڑے ہی عمدہ ہوتے تھے، تحفے کے طور پر لوگ بہت دور دور تک لے جاتے تھے تو انہوں نے بھی گنے خریدے کہ کانپور جا کر احباب میں تحفے کے طور پر تقسیم کردوں گا۔ مگر گنوں کا وزن چالیس سیر سے بھی زیادہ تھا اور ایک ٹکٹ سے اتنا وزن نہیں لے جاسکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ زائد محصول دے دوں گا۔ بابو سے انہوں نے ذکر کیا تو بابو نے ایک نیک صورت دیکھ کر کہ بھولا بھالا ہے۔ بڑا مقدس آدمی ہے، کہا کہ آپ لے جائیں۔ کوئی محصول وغیرہ نہیں ہے۔ گویا اس نے اپنے نزدیک بڑی عقیدت سے کام لیا کہ نیک صالح آدمی ہے کیا اس سے پیسے لئے جاویں۔ اس نے کہا کہ معاف ہے آپ لے جائیں۔

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ محصول لے لیں اگر ریل میں چیکر آ گیا تو محصول بھی لے گا اور جرمانہ الگ وصول کرے گا۔ وہاں ڈبل دینا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! جب میں غازی آباد اسٹیشن پر دوسری گاڑی بدلوں گا تو دوسرا چیکر آئے گا، وہ جرمانہ وصول کرے گا۔ مال زیادہ ہے ٹکٹ میں اتنی گنجائش نہیں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہوگا اتنا ہی جرمانہ بھی ہوگا تو وہاں مجھے چوگنا دینا پڑے گا۔ آپ مجھ سے یہیں لے لیں اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ اس چیکر سے کہہ دے گا۔ وہ آپ کو کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جب میں کانپور میں اتروں گا اور گیٹ سے پاس ہوں گا تو وہ گیٹ بابو کہے گا کہ بلٹی (BUILETY)؟ وہ میرے پاس ہوگی نہیں وہ مجھ سے چوگنے وصول کرے گا اتنے میری جیب میں ہوں گے بھی نہیں۔ اس بابو نے کہا کہ اس چیکر سے کہلوادیں گے وہ اس گیٹ بابو سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں

کہیں گے۔انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہوگا؟ بابو نے کہا پھر تمہارا گھر آ جائے گا۔انہوں نے کہا کہ گھر تو گر جائے گا۔

مگر خداوند عالم نے اگر یوں پوچھ لیا کہ ریلوے کی چوری کیوں کی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔ تو اب وہ بے چارہ خاموش ہوا اس بابو نے کہا کہ یہ بیچارہ مجنوں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اس کو مجنوں ہی کہتے ہیں۔

اہل دنیا عقلمند اس کو کہتے ہیں جو بے ایمانی زیادہ کرے، چالاکیاں زیادہ کرے، دھوکہ زیادہ دے اسے کہتے ہیں کہ بڑا بھاری دانشمند ہے۔ اور اگر بے چارہ بھولا بھالا سیدھا ایمانداری اور امانتداری سے پیش آئے اسے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ پہلے زمانہ کی روح اس میں آگئی ہے مگر حقیقت میں عقلمند وہی ہے جو اپنی آخرت کو پیش نظر رکھے۔ وہ عقلمند نہیں جو انجام کو بھلا دے اور بعد میں مصیبتیں اٹھائے جس کو مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ ۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شدُ   اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شدُ

دیوانہ وہی ہے جو کہ دیوانہ نہ بنا اور عقلمند، وہ ہے جو عقلمند بننا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیوانگی ہی چاہتا ہے۔ حقیقت میں دانشمندی وہی ہے جو شخص اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام زیادہ لے گا وہی لقب پائے گا مجنونوں کا خبطیوں کا۔ اور جو شخص چالاکیاں زیادہ کرے گا وہ لقب پائے گا اہل دنیا کے نزدیک دانشمند اور عقلمند ہونے کا۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''يُقَالُ لِلرَّجُلِ مَآ اَعْقَلَهٗ وَمَآ اَظْرَفَهٗ وَمَآ اَجْلَدَهٗ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ'' ① ''ایک آدمی کو کہا جائے گا کہ کتنا بڑا دانشمند ہے اور کتنا بڑا عقلمند ہے اور کیا وسیع الظرف ہے اور کیسا دانا ہے اور کیسا مدبر ہے حالانکہ اس کے قلب میں ذرہ برابر ایمان نہ ہوگا''۔ اور دنیا کہے گی کہ بڑا عقلمند ہے بڑا دانش مند ہے، مگر چونکہ اس میں ایمان کا نشان بھی نہ ہوگا جو کچھ ہوگی وہ خود غرضی ہوگی۔ دنیا داری اور دنیا سازی ہوگی اس لئے وہ عقلمند نہیں ہے۔ شریعت اسے عقلمند کہتی ہے جو اپنے انجام کو سوچے اور دنیا کے بارے میں خیال کرے کہ بھلی بری جیسی بھی ہوگی گزر جائے گی وہاں جو مصیبت ہے وہ ابدی ہے وہ ہمیشہ جھیلنی پڑے گی جو کہ قابل برداشت نہیں ہے نہ یہاں کی مصیبت باقی رہنے والی ہے اور نہ یہاں کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔ اس لئے جو آدمی آخرت کے مصائب کی رعایت کر کے دنیا کے مصائب کا تحمل کرے وہ عقلمند ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى﴾ ② ''آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور شدید ہے''۔ اور یہاں کی مصیبت نہ شدید ہے اور نہ دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

راستے کا رنج وراحت اور منزلِ مقصود...... اکبر نے کیا خوب بات کہی ہے اور بڑی عمدہ بات کہی ہے لقب ہی اس کا لسان العصر ہے۔ اس بناء پر ان کی بات بڑی حکمت کی بات ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب رفع الامانة والايمان من بعض القلوب، ص: ۲۰۲، رقم: ۳۶۷.

② پارہ: ۱۶، سورۃ طه، الآية: ۱۲۷.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ۔ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

یہ کام تمہیں بھی کرنا ہے اور مجھے بھی کرنا ہے اور سب کو کرنا ہے کیونکہ سب ہی کو جینا اور مرنا ہے۔آگے کہتا ہے ۔

رہ گئی بحث رنج و راحت کی ۔ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جائے گا اور راحت بھی گزر جائے گی، بڑی ہی حکیمانہ بات کہی ہے کہ راستہ کے رنج وراحت پر نظر مت رکھو اور انجام پر نظر رکھو۔منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرو۔اگر منزل پر پہنچ کر مصیبت میں مبتلا رہے تو وہ نا قابل برداشت ہے۔تو اکبرؒ نے کہا ہے کہ راستے کا رنج وراحت فقط وقت کے گزر جانے کا نام ہے۔

یہاں میرے دل میں ایک خلجان یہ پیدا ہوا کہ بات تو بڑی حکیمانہ کہی ہے راستے کے رنج وراحت کا خیال مت کرو مگر منزل مقصود نہیں بتلائی کہ جانا کہاں ہے۔اسی بناء پر دو تین شعر میں نے اس میں جوڑ دیئے ہیں اپنی طرف سے اکبر نے راستہ کا پتہ دیا ہے، میں منزل کا پتہ بتا دیتا ہوں میں کوئی شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر کہنا میرا مشغلہ ہے، پھر اکبر جیسا شاعر اور اس کے شعر میں اپنا شعر ملانا ایسا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگادیں۔بس ایک تک بندی ہے جو میں نے کردی ہے اور میں نے اکبر کے اشعار پر اضافہ کر دیا ہے۔تو دو ان میں راستے ہی کے بارے میں ہیں ان میں ایک آخری منزل کے بارے میں۔اکبرؒ نے تو کہا ہے کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ۔ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

رہ گئی بحث رنج و راحت کی ۔ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں ۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا ۔ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یعنی عزت ہم کہتے ہیں یہ فقط خیالی شئے ہے اور خیال بھی دوسرے کا۔اگر ہمارے خیال سے ہماری عزت ہو تو چوبیس گھنٹے ہم خیال کئے بیٹھے رہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔مگر مشکل یہ ہے کہ دوسرا بڑا مانیں تو عزت ہوتی ہے ہمارے خیال باندھنے سے عزت نہیں ہوتی اور دوسروں کا خیال آپ کے قبضے میں نہیں۔اگر خیال بدل گیا بس جب ہی ذلیل ہوگئے۔آج خیال یہ ہے کہ فلاں آدمی بہت بڑا ہے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتے ہیں، لیڈر بن جاتے ہیں اور کل کو خیال بدل گیا تو دوسرے کے گلے میں ڈال دیا۔پہلے کی ساری عزت ختم ہوگئی۔بس ذلیل ہو گیا یہ صرف خیالی عزت ہے۔

اصل عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (1) تو اصل عزت یہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کردی ہے، اس لئے میں نے کہا کہ ۔

رہ گیا عز و جاں کا جھگڑا ۔ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

(1) پارہ:۲۸،سورۃ المنافقون،الآیۃ:۸.

اور میں آگے کہتا ہوں۔

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد نوش　　　　یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ کوئی قابل ذکر نہیں اس لئے کہ یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ چوپائے بھی کھاتے پیتے ہیں اگر آدمی نے کھالیا تو کونسا کمال کیا ہے۔ جانور کی حد سے نہیں نکلے گا۔ وہ بھی کھاتے ہیں تو کھانا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ بہرحال تین چیزیں ہوگئیں اکبر نے کہا تھا کہ راستے کے رنج وراحت کی پرواہ مت کرو، یہ گزرجانے والی ہے، میں کہتا ہوں کہ کھانے پینے کا خیال مت کرو یہ تو جانوروں کی علامت ہے نہ عزت وذلت کا خیال کرو کیونکہ وہ خیالی شے ہے بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرو اور کوشش کرو۔ آخری شعر میں اسی کا پتہ دیا ہے:

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق　　　　نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

مدارِ نجات...... اصل مقصد اطاعتِ خداوندی ہے یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا اگر محنت کرکے دنیا کا جغرافیہ یاد کرلیا اور اس پر عبور بھی ہوگیا کہ بنگلور میں اتنے درخت ہیں، فلاں شہر ایسا ہے، آخرت میں ایک بھی نہ پوچھا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کونسی سنت پر عمل کیا۔ علم دین کیا سیکھا تو آپ کہیں کہ حضور! عبادت تو نہیں کی البتہ دنیا کا جغرافیہ لے کر آیا ہوں یہ کام نہیں دے گا کیونکہ اس سے نجات نہ ہوسکے آپ کہیں گے کہ معلوم کرکے آیا ہوں کہ دنیا میں اتنے پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں دنیا میں پہاڑ گننے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ تم کو طاعت وعبادت کے لئے بھیجا تھا۔ قانونِ خداوندی کی پابندی کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ بتاؤ کتنی کی ہے۔ نجات کا مدار اسی پر ہے نہ جغرافیہ پر نہ سائنس پر نہ جدید تعلیم پر اس آخری شعر میں مقصد زندگی اور منزل کا پتہ دیا گیا ہے۔

محبت کی تلخیاں...... میں یہ عرض کررہا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر محبت سے ایمان بنتا ہے پھر اس ایمان ہی کی وجہ سے اعمال ہاتھ پیر پر آتے ہیں اور انسان کی زندگی بنتی ہے۔ محبت سے ہی سارا کام چلتا ہے۔ آدمی اس محبت میں مصائب بھی جھیلتا ہے۔ تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے، مگر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہے تو پرواہ بھی نہیں ہوتی کسی چیز کی۔ اہل اللہ جیل خانے میں بھی گئے مگر انہیں پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تعلق مع اللہ قومی ہے۔ فقروفاقہ آیا مگر انہیں پرواہ تک بھی نہیں اس لئے کہ دل میں تعلق موجود ہے۔ قلب مطمئن ہے اور اگر دل کا تعلق اللہ سے نہ ہو تو انسان ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ ہمیشہ اس پریشانی اور پراگندگی وتشتت میں ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ کسی اور چیز میں نہیں۔

کروڑوں کا مالک ہو اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ بلکہ قلب بے سکون، غیر مطمئن، پریشان، پراگندہ ہی رہے گا کہ اس کی حفاظت کیسے کروں اسے ڈاکو نہ لے جائیں کہیں پہریدار ہیں۔ کہیں چپراسی ہیں کہ چوروں سے حفاظت کرتے ہیں، مگر قانونی چوری بھی تو ہوتی ہے اس سے کیسے حفاظت کرے گا؟

بہت سے لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر چوری کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں مثلاً کہیں فیس کی شکل میں

رقم وکلاء کے پاس جارہی ہے۔ کہیں بیرسٹروں کے پاس جارہی ہے۔ کہیں ڈاکٹروں کے پاس جارہی ہے۔ غرض روپیہ کیا ایک وبال جان بنا ہوا ہے ہر وقت پریشانی ہی پریشانی ہے۔ نہ اس سے سکون ملتا ہے نہ بلڈنگ سے سکون ملتا ہے اگر سکون ملتا ہے تو صرف اللہ کے نام میں ملتا ہے۔ ﴿ اَلَا بِـذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ ① ''اللہ ہی کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں''۔

دنیا کے ذکر سے چین نہیں ملتا وہ تو استعمال کی چیز ہے اسے کھاؤ پیو، استعمال کرو مگر مقصود مت بناؤ۔ اس سے محبت مت کرو۔ اس میں دل مت لگاؤ اس کو جائز طریق پر استعمال کرو۔ اچھا کھانا بھی کھاؤ۔ اچھے مکان میں بھی رہو۔ مگر مکان کو خدا مت سمجھو۔ لباس کو کعبہ مت بناؤ، خادم سمجھو، محبت کے لئے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اختیار کرو۔ ہماری زندگی یہ ہے'' کہ دل بیار دست بکار'' ہاتھ اور پاؤں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور دل لگا ہوا ہے خالق و مالک کے اندر کہ دنیا میں رہو تجارت بھی کرو، زراعت بھی کرو۔ جب تک انسان دنیا میں رہے گا سب ہی کام کرے گا اور کرنے بھی چاہئیں مگر دل کی توجہ اللہ کی طرف رہنی چاہئے، اس سے تجارت بھی بابرکت بنے گی۔ سب چیزیں عبادت بنتی چلی جاویں گی۔ تو اصل چیز ہے قانون کی پیروی اور وہ ہو نہیں سکتی جب تک محبت نہ ہو۔ تو محبت اصل ایمان اور اصل اسلام ہے اور۔

در محبت تلخہا شیریں بود

یعنی محبت میں تلخیاں بھی شیریں بن جاتی ہیں کیونکہ آدمی کا دھیان محبوب کی طرف رہتا ہے تلخیوں کی طرف نہیں رہتا، اس لئے وہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ اور محبوب کی ہر ادا محبوب بن جاتی ہے۔

غلبۂ ادب ...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ جو ہماری ساری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں اکابر اولیاء میں سے ہیں سن ۱۸۵۷ میں انہوں نے جہاد کیا ہے پھر حضرت نے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مکہ معظمہ میں پہنچ کر پوری عمر کبھی سیاہ جوتا نہیں پہنا۔ لوگوں نے شروع شروع میں تو اتفاقی بات سمجھا مگر جب کالے رنگ کا جوتہ لاتے تو ان سے فرماتے کہ دوسرے رنگ کا لاؤ یا سفید لاؤ یہ جوتا نہیں پہنوں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا طریقہ ہے تو پوچھا کہ حضرت! سیاہ جوتے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ بیت اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے ادب مانع ہوتا ہے کہ وہ رنگ میں اپنے پیروں میں استعمال کروں، حالانکہ سیاہ جوتا پہننا شرعاً جائز ہے کوئی قباحت ونقصان نہیں ہے مگر چونکہ ادب کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو آدمی بعض جائز چیزوں کو بھی ترک دیتا ہے کیونکہ اس جائز چیز کے استعمال کرنے میں ادب مانع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ مجھے حیا آتی ہے۔ ہے کہ وہ رنگ جو بیت اللہ کے غلاف کا ہے اس کو پاؤں میں ڈالوں۔

تو ظاہر بات ہے کہ جائز وناجائز کی بحث نہیں یہ تو محبت کا غلبہ ہے چونکہ محبت خداوندی اتنی غالب تھی اسی

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

کے مطابق محبت کعبہ بھی اسی قدر غالب تھی کہ اس رنگ کو پاؤں میں لانا گوارہ نہ کیا۔ کیا ادب کی انتہاء تھی۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کلیر شریف جاتے تھے۔ حضرت صابر کلیریؒ کے مزار کی زیارت کرنے کے واسطے۔ کلیر، رڑکی سے پانچ میل دور ہے، نہر کی پٹری پٹری پر چلے جاتے تھے۔ اب تو سواری کا بھی انتظام ہے اس زمانے میں لوگ عموماً پیدل ہی جاتے تھے، تو حضرت جب نہر کی پٹری پر جاتے اور سامنے کلیر ہوتا تو جوتے اتار کر بغل میں دبا لیتے اور ننگے پیروں جاتے۔ تو کیا جوتے پہن کر جانا ناجائز تھا؟ نہیں بلکہ محبت کا غلبہ تھا۔ حضرت صابر کلیریؒ کی محبت دل میں جاگزیں تھی۔ ادب کا غلبہ تھا۔ جب روضہ نظر آتا تھا تو جوتا پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے۔ چونکہ ادب کا غلبہ تھا۔ اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے۔

جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابر اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا۔ آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیبہ بالکل سامنے آجاتا ہے اور حرم شریف کے مینارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس آخری منزل کا نام ہے ''بیرِ علی'' یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے مینارے سامنے آجاتے ہیں۔ تو یہ قافلہ جب ''بیرِ علی'' پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اچھل کر کر زمین پر گر پڑے جوتے اتار کر رکھے اونٹ کے کجاوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جارہے تھے۔ عرب کی کنکریاں جو ہیں وہ نوکیلی ہیں۔ پیروں میں ایسے چبھتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہولہان ہوگئے۔ مگر حضرت محبت وعشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔

دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں۔ سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے۔ یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم پر چل کر رک گیا۔ کوئی سو قدم چل کر رک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا مشکل ہے مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ معذور ہے اسے تو کچھ خبر نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش و حواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اتر سکتے۔ اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا۔ اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرتؒ حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہولہان اور خون خون بھی ہو گئے تو۔ درمحبت تلخہا شیریں بود۔ یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔

اِستغراقِ محبت...... غزوۂ اُحد میں جنگ شروع ہوئی۔ اُحد کے پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر چالیس تیر اندازوں کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ وہ یہاں بیٹھے رہیں، فتح ہو خواہ شکست ہو۔ ہر صورت میں وہاں سے بغیر اجازت نہ ہٹیں۔ چنانچہ صحابہؓ وہاں بیٹھے رہے، جنگ شروع ہوگئی۔ ان حضرات نے سوچا کہ ہم خالی

بیٹھے ہیں کچھ کام ہی کر لیں، دوسرے حضرات نے کہا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ صرف بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا کہ ایسے بیٹھنے سے تو عبادت میں لگنا اچھا ہوگا۔ یہ سوچ کر نفلوں کی نیت باندھ لی اور نفلیں پڑھنا شروع کر دیں ترکیب یہ کی کہ چار نفلیں پڑھیں اور باقی حفاظت کریں۔ اسی طریقے سے رات گزاری اور نوافل پڑھتے رہے۔

مشرکین مکہ نے تاک لیا کہ یہ صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں، کفار نے ان پر تیروں کی بارش کی، جو لوگ نماز میں مصروف تھے وہ سامنے تھے، اسی لئے کسی کی گردن میں لگا، کسی کے سینے میں لگا اور کسی کی پیٹھ میں لگا، بدن لہولہان ہو گئے اور کپڑے خون میں رنگ گئے مگر ان کو کچھ خبر نہیں وہ اپنی نماز میں مستغرق ہیں۔ نہ تیروں کی خبر اور نہ نیزوں کی خبر جب اخیر شب میں سلام پھیرا تو معلوم ہوا کہ کپڑے رنگے ہوئے ہے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیر یہاں گھسا ہوا ہے۔ کوئی تیر سینے میں۔ کوئی تیر پشت میں، پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ نے تیر مارے ہیں۔

اتنا استغراق اور غلبہ تھا محبت کا نہ انہیں تیروں کا پتا چلا اور نہ انہیں نیزوں کا پتہ چلا، نماز کے اندر غرق ہے اور حق تعالیٰ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو آدمی ساری تلخیاں جھیل جاتا ہے جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے پھر نہ زخم کی پرواہ نہ تلواروں کی نہ نیزوں کی پرواہ ہوتی ہے یہی شان اہل اللہ کی بھی ہوتی ہے کہ حب محبت خداوندی اور محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم غالب آجاتی ہے تو نہ عیش کی پرواہ نہ آرام وراحت کی پرواہ ساری چیزوں کو تج دیتے ہیں۔

ظرفِ محبت...... چنانچہ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز محبت ہے اور محبت کا ظرف دل ہے جب دل میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آجائے گی تو ہاتھ پاؤں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اعمالِ صالحہ بھی صادر ہوں گے اور اگر دل میں محبت نہیں تو نہ ایمان بنے گا اور نہ اعمال بنیں گے۔ مسلم نام کے تو ہوں گے مگر کام اسلام کے نہیں ہوں گے۔ جب دل میں ایمان ہوگا جب ہی کام اسلام کا ہوگا۔ اس لئے ہمیں نام کا مسلمان نہیں ہونا چاہئے، دل میں محبت رچی ہو اور ہاتھ پیر پر عمل ہو یہی عمل شہادت دے گا ایمان ایک چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے۔

دعویٰ محبّت کا ثبوت...... جب قیامت میں آدمی اپنے مومن ہونے کا دعوی کرے گا تو اس سے دلیل طلب کی جائے گی کیونکہ کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابل سماعت ہوتا نہیں۔ اس بنا پر اس سے پوچھا جائے گا کہ تیرے ایمان کا ثبوت کیا ہے وہ کہے گا کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں، زکوٰۃ دی ہے، حج کئے ہیں، یہ ثبوت ہوگا ایمان کا پھر اسے نجات ہوگی۔ مگر آپ نے اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور دلیل طلب کی گئی مگر وہاں نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوٰۃ ہے، نہ حج ہے۔ تو یہ دعویٰ بغیر دلیل کے رہ جائے گا وہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ اس کی گردن ناپی جائے گی اور اس کے دعوے کی تکذیب کی جائے گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہوں تمہارے اندر ایمان کہاں ہے، اگر ایمان ہوتا تو اس کے آثار ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتے، حالانکہ کوئی اثر ظاہر نہیں اس لئے کہ اندر کچھ نہیں۔ لہٰذا انتہائی ذلیل ہوگا اور کہا جائے گا کہ اپنے کئے کو بھگتو۔ پھر وہاں کی سزائیں دی جائیں گی۔ مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس لئے جب دعویٰ ہو تو اس کی دلیل بھی مہیا ہونی چاہئے۔ اطاعت، عبادت، اتباع سنت حضور

کی پیروی ہونی چاہیۓ۔آگے قبول کرنا نہ کرنا مالک کا کام ہے مگر ہمیں ثبوت مہیا کر دینا چاہیئے اور اس ثبوت پر ناز نہ ہو کہ میں نے اتنی عبادت کی بلکہ یہ کہنا چاہیۓ کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بڑوں کی بڑی بات...... حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد اولیاء کبار میں سے ہیں وہ رات دن طاعت وعبادت میں لگے رہتے ہیں لوگوں نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں کہ راتوں کو ذکر اللہ دن بھر ذکر اللہ۔ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟

جب ہم نے یہ سوال پڑھا تو ہم یہ سمجھے کہ حضرت نے یہ جواب دیا ہوگا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اس لئے میں یہ عمل کر رہا ہوں مگر یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب اور ہے۔ یہ تو ہمارے فہم کی رسائی تھی حضرتؒ نے وہ جواب دیا جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اور اپنے مرتبے کے مطابق جواب دیا کیونکہ بڑوں کی بات بڑی ہی ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے ان پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ میں رات دن اس لئے عمل کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیا گیا ہوں عمل کرنے کی خاطر۔ یعنی مقصد زندگی ہی میرا یہ ہے، راضی ہونا نہ ہونا ان کا کام ہے۔ راضی ہونا یا ناراض ہونا یہ فعلِ خداوندی ہے۔ ہم کون ہیں ان کے فعل میں دخل دینے والے۔ ہمارا کام تو ہونا چاہیۓ جس کے لئے ہم پیدا کئے ہیں اور ہم پیدا کئے گئے ہیں طاعت وعبادت کے لئے، بس ہم اپنا کام کئے جائیں۔ اگر وہ راضی ہوں تو ان کا فضل ہے اگر وہ ناراض ہوں تو ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ اس سے فریادی ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل مت دو۔ صرف اپنا کام کرتے رہو۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن

اپنے کاموں میں لگے رہو قبول کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے۔

محبت آمیز عمل...... یحییٰ بن اکثم بہت بڑے عالم گزرے ہیں امام کے درجے کے عالم ہیں ان کی وفات ہوئی تو بعض اہل اللہ نے انہیں خواب میں دیکھا اور خواب بھی کشف جیسا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی ہے۔ ''حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا چیز لے کر آئے ہو ہمارے لئے؟ جواب دیا کہ اے اللہ تعالیٰ میں نے پچپن ۵۵ حج کئے ہیں۔ فرمایا: ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا: باری تعالیٰ میں نے ایک سو باون ۱۵۲ قرآن ختم کئے ہیں۔ فرمایا ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ پوری زندگی کے اعمال ذکر کئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک بھی قبول نہیں۔ اور بتاؤ کیا لے کر آئے ہو۔ آپ عاجز ہو گئے۔ آخر میں کہا کہ اے اللہ! بس تیری رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ لے کر نہیں آیا۔ فرمایا کہ اب بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ وَجَبَتْ لَکَ رَحْمَتِیْ میری رحمت تیرے لئے واجب ہو گئی ہے جا تیرے لئے جنت اور مغفرت ہے'' تو اس عمل کے ساتھ ساتھ رضاء خداوندی اور رحمت خداوندی کی توقع اور امید بھی ہونی چاہیۓ، اعمال پر گھمنڈ اور ناز نہیں ہونا چاہیۓ، جس عمل میں محبت کی آمیزش اور رحمت کی امید نہ ہو وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر

اس کے بعد عمل کا مرتبہ ہے۔ اور اس محبت سے ہی عمل پیدا ہوتا ہے عمل ہی محبت کی علامت ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دل میں محبت ہے یا نہیں۔

دوامِ معیّتِ نبوی کی بشارت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: "مَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ اَطَاعَنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ" ① "جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا اور جو میری سنتوں کی پیروی کرے گا وہ میرے ساتھ بھی جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو۔ کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ میری اطاعت کر رہا ہے اور میری اطاعت کرنا علامت ہے اس بات کی ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ." ② " تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ میری اس آدمی کو اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی اس کی نہ اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اپنی اولاد سے ہو، نہ اپنے سامان سے ہو، نہ اتنی محبت اس کو اپنے عزیز واقارب سے ہو"۔ جب دو محبتوں کا ٹکراؤ ہو تو ترجیح دے میری محبت کو، تو کہا جائے گا کہ یہ مومنِ کامل ہے کہ اصل شے محبت ہی ہے۔

محبت وخواہش کا ٹکراؤ!...... ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ" ③ "کہ تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں بن سکتا اس وقت تک جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میرے لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں"۔ ایک طرف شریعت ہے اور ایک طرف خواہش نفس ہے۔ اگر خواہش نفس کو ترجیح دی تو معلوم ہوا کہ خواہش کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی مرضی کو ترجیح دی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اس لئے یہ خواہشات نفس اور ہوائے نفس کا تابع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہوتا تو اسی کو ترجیح دیتا۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ مومن کامل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا تابع ہونا چاہئے۔ جو کچھ کرے اتباع میں کرے، نماز پڑھے تو اتباع میں پڑھے روزہ رکھے تو اتباع سے، سوئے تو اتباع سے، جاگے تو اتباع سے، کھائے پیئے تو اتباع میں، غرض یہ کہ پوری زندگی پر اتباع چھا جائے جب ہی اس کے ایمان میں کمال آئے گا اور اس کو مؤمن کامل کہیں گے۔

صُدورِ معصیت اور تقاضائے محبّت...... اب رہی بات غلطی سے گناہ کا صادر ہونا تو بندہ بشر ہے۔ معصوم تو

---

① السنن للترمذی، ابواب العلم عن الرسول، باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ، ص: ۲۸۸، رقم: ۱۶۹

③ مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ۱ ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷.

صرف انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ہم تو دن رات سینکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور گناہ بے شک ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل یہ فرمایا کہ جب گناہ ہوجائے تو توبہ کرلے پھر اتباع شریعت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔اتباع کررہے ہیں اور درمیان میں گناہ ہوگیا کہ یا اللہ میری توبہ پھر نہیں کرونگا۔اللہ تعالیٰ سے عہد کیا۔پھر اتباع میں مصروف ہوگئے۔اتباع سنت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کبھی بھی غلطی نہ ہواور گناہ نہ ہو۔یہ شان تو انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ہم سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور ہم گناہ کرتے بھی ہیں مگر اس کا حل یہ ہے کہ فوراً توبہ کرلے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے:اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ. (1) گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔توبہ کرتے ہی اس کا ریکارڈ صاف ہوگیا۔حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کی وہ گناہ پھر باقی نہیں رکھا جاتا۔اسی لئے جب بھی کوئی گناہ ہوجائے فوراً توبہ کر کے پاک ہوجائے۔یہ مومن کی شان ہے اور یہ محبت اور ایمان کی کمال ہے۔بس دعاء کیجئے کہ اللہ رب العالمین اپنی رضا نصیب فرمائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور معیّت عطا فرمائے اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر فرمائے۔(آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(1) السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبه ،ص: ۲۷۳۵،رقم: ۴۳۵۰. حدیث حسن ہے۔دیکھئے:صحیح الترغیب والترهیب ج:۳ ص: ۱۲۲.

تعلیم جدید

”اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿ اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَابِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَاوَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا، اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ﴾ [1] صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ.

بے انتہا خوشی...... بزرگانِ محترم! خیال یہ تھا کہ اس وقت کالج کی جو جدید عمارت تیار کرائی جارہی ہے، اس کو دیکھنا اس سے مستفید ہونا اور مسرور ہونا ہے۔ اسی غرض سے حاضری ہوئی تھی، جلسہ کا کوئی تصور اور اس میں بھی کسی تقریری اور خطاب کا کوئی گمان حاشیہ خیال نہیں تھا۔ بہر حال جب جلسہ کی صورت بن گئی ہے تو اس کے کچھ نہ کچھ لوازم پورے کرنے پڑیں گے اور ذمہ داروں نے اپنے محبت اور خلوص سے جو شکل پیدا کر دی ہے اس کا احترام تو کرنا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی جدید عمارت میں حاضر ہو کر غیر معمولی مسرت ہوئی اور شارم کے زندہ دل مسلمانوں کے حوصلے اور جذبات خیر سامنے آئے اس سے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

تعمیر معنوی کی علامت...... ظاہر میں یہ ایک تعمیر ہے جو اینٹ اور پتھر سے کی جاری ہے۔ اور سیمنٹ اور چونا ہی میں ڈالا جارہا ہے لیکن اگر حقیقت پر نگاہ کی جائے تو یہ علم کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ یہ تعمیر دراصل علم کی ہے۔ درسگاہ کا وجود حقیقۃً علم کے لئے ہے۔ اس لئے یہ حسی تعمیر علامت ہے معنوی تعمیر کی جو اس کے اندر کی جائے گی ظاہر تعمیر سے قوالب کی ایک ہیئت بنائی جارہی ہے اور معنوی تعمیر سے قلوب کی ایک ہیئت بنائی جارہی ہے۔ اس ہیئت ظاہری میں نفسانی اخلاق وجذبات کی اصلاح کی جائے گی اس اعتبار سے یہ بہت مستحسن اقدام اور مبارک عمل ہے۔

---

[1] پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷، ۲۸.

اقسام علم......امام شافعیؒ کا مشہور مقولہ ہے۔ اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ......یعنی اللہ کی طرف سے جو علم دنیا کے اندر آئے وہ دو طرح کے ہیں ایک ادیان کا علم۔ جس کا نام شریعت ہے اور ابدان کا علم جس کا تعلق انسان کے ظواہر بدن اور اس کے عوارض بدن سے ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں علم جزء ہیں شریعت کے۔ شریعت اسلامی نے جس طرح سے شریعت اور دین کے علم کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح سے ابدان کا علم اور ضرورت زندگی کے علوم مثلاً سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیان کا علم اصل مقصود ہے اور ابدان کا علم اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور دونوں کا مقصد ہے معرفت خداوندی۔ حدیث شریف میں ہے رَأْسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللّٰہِ. یعنی علم کا رائس المال اور خلاصہ خدا کی معرفت اور اس کی پہچان ہے۔

علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است!

جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ حقیقت میں جہالت ہے اس کو صورت علم کہا جائے گا۔ حقیقت علم نہیں کہا جا سکتا۔

علم دین کے ساتھ علم دنیا کی ضرورت......جس طرح حقائق کا علم ضروری ہے اسی طرح معاشیات و معاشرت اور کائنات کے علم کے سلسلہ میں ان علوم کی بھی ضرورت ہے جن کو آج کل علم سائنس، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو آیت ہے ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا.﴾ ① اس میں حصر کر دیا گیا ہے کہ علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ یعنی خوف و خشیت انہیں کے قلوب میں ہے۔ یہاں علماء سے مراد علماء فقہ ہی نہیں ہیں جو جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے مسائل سے واقف ہوں۔ بلکہ قرآن کریم کے ان نشانوں سے بھی واقف ہوں جو ضروریات زندگی کے سلسلے میں دنیوی علوم کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس میں ستاروں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس زمین کے مخفی عجائبات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن خلا و فضا کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور ان کی طرف اشارات بھی کئے گئے ہیں۔

نظام محکم کی شہادت......ان سب کا مقصد بھی درحقیقت معرفت الٰہی اور اللہ کو پہچاننا ہے اس کہ آثار کو دیکھ کر ہی ذی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کہیں دھواں دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہاں آگ موجود ہے ورنہ دھواں نہ ہوتا۔ کہیں آپ رطوبت اور ٹھنڈک محسوس کریں گے ضرور یقین کریں گے کہ قریب میں کوئی دریا موجود ہے ورنہ برودت نہ ہوتی تو آثار کو دیکھ کر موثر کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کائنات کے نظام محکم اور عجیب وغریب انتظامات کو دیکھ کر دل خود بخود شاہد ہوتا ہے اور گواہی دیتا ہے کہ کوئی بہت بڑا اصناع اور حکیم ہے جس نے یہ نظام کائنات بنایا ہے اور عجائبات قدرت کو نمایاں کیا۔ یہ محض مادہ اور اس کی حرکت کا کام نہیں ہے اس لئے کہ مادہ خود اندھا اور بہرہ ہے نہ اس کو اپنی خبر اور نہ دوسرے کی خبر۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایک اندھی بہری اور اپاہج چیز کوئی نظام محکم تیار نہیں کر سکتی۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸.

اور مادہ کی حرکت بھی وہ ہے کہ بغیر محرک کے وہ واقع نہیں ہو سکتی۔ حرکت ایک وصف ہے وہ اسی وقت پایا جائیگا جب اس کا موصوف موجود ہوا گر وہ ذات موجود نہ ہو جو موصوف ہے تو صفت یعنی وہ حرکت بھی نہیں پائی جائے گی۔ تو چونکہ مادہ اپاہج اور لایعقل ہے اس لئے اگر حرکت تعلق مادہ سے ہوگا تو عجائبات اور نظام علم کی نئی نئی چیزیں نہیں پیدا ہوں گی جب تک کہ علم اللہ اور قدرت الٰہی اس کے اندر شامل نہ ہو۔ بہر حال عجائب کی طرف بھی قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ روحانی عجائبات ہیں جن کو ارباب حقیقت نے کھولا ہے اور معرفت وبصیرت سے ذات خداوندی کا پتہ چلایا ہے۔

متقدمین کی بنیاد پر متاخرین کی تعمیر......اسی طرح سے مادیات میں عجائبات رکھے ہوئے ہیں وہ تدریجاً کھلتے ہیں اور کھل رہے ہیں۔ جس طرح سے قرآن کے عجائبات دور نبوت میں ظاہر ہوئے وہ سب اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے عقدے صحابہؓ نے کھولے اور ان کے بعد تابعینؒ نے ان کو کھولا اور اس میں شاخیں پیدا ہوئیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعینؒ متوجہ ہوئے اور ان عجائبات میں علمی عجائبات نکالے۔ یہاں تک کہ بے شمار تصانیف وجود میں آ گئیں جن میں ان علوم کو مدون کیا گیا جنکے اندر یہ عجائبات اور حقائق الٰہیہ تھے اسی طرح سے کائنات کے سلسلے میں بھی ابتداء سادہ سادہ تحقیقات تھیں۔ ان سادہ تحقیقات پر اگلوں نے دوسری تعمیر کھڑی کی کہ اس کے اندر سے اور عجائبات نکلے یہاں تک کہ صدیاں اور قرون گزرنے کے بعد اب اس میں اتنی شاخیں پیدا ہوگئیں کہ انسان زمین میں ہی نہیں بلکہ فضا میں گھوم رہا ہے۔ فضا میں ہی نہیں آسمانوں کے قریب پہنچ رہا ہے اور چاند تک اس کی پرواز ہو چکی ہے تو فضا کے عجائبات بھی قرآن شریف کی روشنی میں سامنے ہیں یہ اتنا جو کچھ ہوا پچھلوں کی تحقیقات پر تعمیر کی گئی ہے۔ اگر پچھلے بنیاد نہ رکھتے تو اگلی تعمیریں نہیں ہو سکتیں تھیں جس طرح سے حقائق الٰہیہ کے بارے میں بھی پچھلوں نے بنیادیں رکھیں اس پر بعد والوں نے تعمیریں کیں اور نئے نئے حقائق کھولے۔

اسی طرح مادی حقائق کے بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی درحقیقت انہیں پچھلوں کا طفیل اور صدقہ ہے۔ اور انہیں کے فکر کا ثمرہ ہے انہوں نے بنیادیں قائم کیں اور اس سے آگے ہم نے دیواریں اٹھائیں اور دیواروں پر چھتیں ڈالیں اور پھر دو منزلہ، سہ منزلہ تعمیر کی، اگر بنیاد رکھنے والے بنیاد نہ رکھتے تو ہم آج یہ تعمیریں نہیں بنا سکتے تھے۔

دونوں علوم کا حقیقی نقطہ......تو اس پوری گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں علوم کا حقیقی نقطہ یہ ہے بنانے والے کو پہچانا جائے اور یہ تمام ثمرات وآثار دلالت کرتے ہیں اس موثر حقیقی کی معرفت پر تاکہ اس کی طرف جھکا جائے اور اس کے قانون پر چلا جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دوسو کے قریب آیتیں ذکر کیں جن میں عجائبات کائنات ذکر کئے ہیں۔ کہ زمینوں سے لے کر فضاؤں اور آسمانوں تک اور زمین کی گہرائیوں میں اور آسمان کی بلندیوں میں عجائبات قدرت پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کی آیتوں میں حقائق الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی آیتوں میں احکامات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اور چوتھی قسم کی آیت میں قصص وعبر اور امثال بیان کی گئیں ہیں تاکہ لوگ

عبرت پکڑیں نصیحت حاصل کریں۔

حقائق شریعت اور عجائبات کائنات کا باہمی تعلق ...... بہر حال مقصد یہ ہے کہ کسی سکول یا کالج میں صرف ایک چیز کا ہونا کافی نہیں اس لئے کہ شریعت اسلام اور اس کے حقائق کا تعلق کائنات کے ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ اگر ان عجائبات قدرت کی طرف توجہ نہ کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان دوسری آیتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے جن میں مادی کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی اور علماء نے اس میں تحقیقات کی ہیں۔ علم ابدان اور علم ادیان میں سے ہر ایک کے مختلف گوشے ہیں۔

مثلاً مختلف ضروریات بدن ہیں جن کا ایک علم بن گیا کہ اگر بدن کو بیماری یا کوئی روگ لاحق ہو جائے اس کے علاج کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے لئے علم طب ہے تا کہ اصل بدن کی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی اصلاح نہ ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ بدن جو روحانیت کا سفر کر رہا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ بدن ہی تو اس کے لئے سواری ہے۔ بدن کا یہ گھوڑا اگر چلنے والا نہ ہو تو شرعی اعمال بھی انجام نہیں پا سکتے۔ پھر طب کے سلسلے میں ہزاروں حقائق ہیں جو انسان کی تکوین سے متعلق ہیں کہ کس طرح انسان پیدا ہوا اور باری تعالیٰ نے کن عجائبات میں سے اس کو ظاہر کیا یہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو بہت سے حقائق شریعت نہیں کھل سکتے جن کا مدار ان طبی تحقیقات کے کھلنے پر ہے تو انسان میں سب سے پہلے بدن کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ صلاح اور صحت ہے اور وہ موقوف ہے علم طب پر۔ اس بناء پر اس کے لئے علم طب ضروری ہے۔

اور علم طب انبیاء علیہم السلام پر بھی اترا ہے۔ وحی کے ذریعہ اس کے اصول آئے ہیں اور پھر تجربہ کاروں نے اس کو بڑھایا۔ اسی طرح بدن کے دوسرے عوارض ہیں مثلاً تن ڈھانپنے کا قصہ ہے اس کے لئے کپڑا بننا یا بنانا ہے۔ اسی طرح سے اثاث البیت ہے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ہیں۔ کھانے پینے سے رہنے سے۔ مکان بنانے سے متعلق قرآن کریم میں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور احسانات خداوندی کے تحت مکانات کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ (۱) یعنی کپڑوں کے گھر اور اینٹ پتھر کے گھر اور پہاڑوں کے گھر دیئے گئے تا کہ ان میں سکونت حاصل کرو تم۔ اسی طرح قرآن کریم نے ہر چیز کی طرف توجہ فرمائی ہے خواہ لباس ہو، خواہ کھانے پینے کی شئے ہو خواہ رہن سہن اور صحت و مرض، اور تمام مستقل فن بن گئی ہیں اور ہر فن ایک مستقل موضوع پر مشتمل ہے اور ان کے احکام الگ ہیں اس کے عوارض الگ ہیں اس کے احوال الگ ہیں۔ تو کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو، اسلام نے ان چیزوں کی طرف

(۱) پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآیة: ۸۰.

توجہ محض عیش کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں، یہ تو چندروزہ قصہ ہے۔

منزل مقصود اوراس کائنات کی حقیقت...... آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چونکہ راستے کے نشیب وفراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس دنیا کے عجائبات کا دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی تو راستہ ہے کہ جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔ تو ہماری منزل بھی آخرت ہے وہ اسی دنیا میں سے بنتی ہے۔ یہ تصور غلط ہوگا کہ آخرت کا کوئی مکان الگ ہے اور دنیا کا مکان الگ ہے۔ بلکہ اسی دنیا میں سے آخرت نکلتی ہے۔ اور اسی میں سے وہ اعمال پیدا ہوتے ہیں کہ جس سے آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے، مثلاً دولت کمائے گا تو اسی دولت کے ذریعہ وہ زکوۃ صدقات دے گا۔ اور دیگر کار خیر انجام دے گا۔ تو دولت میں سے ہی اس کی آخرت نکل رہی ہے۔ اگر دولت سامنے نہ ہوتی تو یہ آخرت کا محل کیسے تعمیر ہوتا۔ اسی طرح سے دوسری چیزیں ہیں۔ بدن کی صحت ہے اگر بدن صحیح نہ ہوگا تو آخرت کے اعمال کیسے انجام پائیں گے۔ اسی لئے دنیا کو رہ گزر فرمایا ہے اسی بناء پر راستہ کے نشیب وفراز سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ رہنے کا طریقہ جاننا بھی ضروری ہے۔

انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد...... بلڈنگ انسانوں کے لئے بنتی ہے۔ اور انسان اخلاق سے بنتا ہے۔ جب تک انسان کا کردار اور کریکٹر اچھا نہ ہو اور اونچا نہ ہو اور اس کی اخلاقی حالت بلند نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہے۔ انسان اچھے کپڑوں کا نام نہیں ہے۔ انسان نام ہے اچھے کردار کا اچھے کریکٹر کا اور سب سے پہلی چیز ہے انسانیت اور انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد ہے انس ومودۃ اور اخوت کا باہمی سلوک کہ تمام آدمی بھائی بھائی بن کر رہیں اور آدمی ایک دوسرے کی ہمدردی میں غرق ہو اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لئے مستعد ہو اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہو کہ میں خود تکلیف اٹھالوں گا اپنے بھائی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے خود راحت اٹھانا انسانیت نہیں اور نہ حقیقت میں راحت ہے بلکہ اس کا نام خود غرضی ہے۔

معرفت الٰہی...... غرض ان تمام چیزوں کا مقصد معرفت الٰہی ہے اور معرفت الٰہی نہیں ہوسکتی جب تک کہ معرفت نفس نہ ہو اس لئے کہ صوفیاء کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' (1) جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس کو پروردگار کی معرفت حاصل ہوگئی۔

اسی ذیل میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جس کا نام علم النفس ہے جس سے نفس کے اتار چڑھاؤ نشیب و

(1) مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، ج: ۱، ص: ۳۵۰. علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: قال النووی: غیر ثابت، وقال ابن السعانی: هو من کلام یحی بن معاذ الرازی رضی الله عنه دیکھئے: الدرالمنتشرة فی الاحادیث المشتهره حرف المیم ج: ۱ ص: ۸۱.

فراز کو پہچانا جائے کہ کیا کیا چیزیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ان علوم سے نفس کی کمزوریوں اورانسانی طبائع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے ان کا حاصل کرنا مفید ہے اگر نقطہ نظر صحیح ہواور کسی علم وفن کی اصل بناء میں کوئی فساد نہ ہوتو اس علم کو کار آمد بنایا جاسکتا ہے۔لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور اصل نقطہ کو سامنے رکھ کران علوم کو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں!

متاع مشترک...... بہر حال اس کی بہت زیادہ مسرت اور خوشی ہوئی کہ مسلمانان میل شارم نے اپنی حوصلہ مندی سے اوراپنے ظرف کی وسعتوں سے ایک اتنی بڑی تعمیر کھڑی کر دی۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ معنوی تعمیر کو بھی اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔انسانیت اور علم کی تعمیر کو بھی اونچا لے جانا چاہتے ہیں۔حق تعالیٰ شانہٗ ان کے ارادوں میں برکت دے، آمین۔اور جو جوان کے مقاصد ہیں ان کی تکمیل فرمائے۔اس سے نہ صرف میل شارم کے لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ آس پاس کے علاقہ اور تمام لوگوں کو توفیق دے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔تعلیم گاہ درحقیقت سب کے لئے ہوتی ہے علم کسی خاص قوم کی وراثت نہیں بلکہ علم سارے انسانوں کی ایک مشترک پونجی ہے۔مسلم ہو غیر مسلم ہو۔کسی بھی ملت کا ہو علم سب کی ایک مشترک متاع ہے۔کسی کالج یا سکول کا قیام اسی لئے ہوتا ہے کہ نبی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا جائے۔خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔تو ایک بڑی خوشی کی بات ہے کہ میل شارم میں اس قسم کا کالج قائم ہوا۔

اور جہاں تک میرے علم میں آیا اس کا فیضان عام ہے کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بلاامتیاز مذہب وملت ہر قوم کے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔اس کی ضرورت بھی ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقاصد حسنہ میں کامیاب کرے اوران مقاصد کی تکمیل فرمائے۔آمین۔

شہ کا مصاحب...... میں آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں ذمہ داران کالج کا کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو یاد فرمایا۔میرا تعارف اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔اس کے سوا اور کچھ میری اصلیت نہیں اور نہ کوئی تعارف ہے۔اگر کوئی کام بن پڑتا ہے تو وہ درحقیقت اثر ان اکابر اوران بزرگوں کا ہی ہے۔

بقول غالب کے علماء کے لئے ان کا ایک شعر کافی ہے۔اس نے کہا۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرا ہے اتراتا ‍ ‍ ‍ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذاتی اور شخصی کوئی آبرو نہیں ہے۔البتہ بڑوں کی ایک جماعت ہے۔اور وہ جماعت بین الاقوامی بزرگوں کی ہے۔ان کی شخصیتیں بہت بلند ہیں۔ان سے وابستگی اوران سے نسبت ایک بڑی چیز ہے۔ذرے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

نسبت کی عظمت...... لیکن چونکہ اس کو نسبت ہے آفتاب سے اور وہ نسبت بڑی ہے اس لئے اس درجہ کی بھی بڑی حیثیت ہوتی ہے اور وہی ہم بھی کہتے ہیں۔

اگرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرہٗ آفتاب تا بانیم

ہم تو خورد اور لاشی ہیں لیکن نسبت ایک بڑی چیز سے قائم ہے اور وہ نسبت بڑی ہے جو اس کے لپیٹ میں آ جائے گا وہ بڑا دکھائی دے گا۔ حقیقت میں بڑائی انہیں بزرگوں کی ہے۔ ہماری کوئی بڑائی نہیں۔ مخلص بزرگوں کی ایک جماعت ہے وہ بہت سچے لوگ تھے ان کی سچائی آج تک چل رہی ہے۔ اخلاص سے جو روح انہوں نے پھونکی وہ اسی شان سے قائم ہے، اسی کی چمک اور روشنی میں جو آ گیا بن گیا۔ اس کے نتیجے میں اہل علم بنے اہل فضل بنے، اہل کمال بنے۔

تو ہمارا اس سے زیادہ تعارف کچھ نہیں کہ دارالعلوم دیو بند سے اور وہاں کے بزرگوں سے ایک تعلق ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی قدر دانی اور قدر افزائی فرمائی درحقیقت ان ہی کی قدر فرمائی ہے۔ میں صرف ایک واسطہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدر دانی انہیں بزرگوں کی طرف جا رہی ہے۔ آپ نے جو کچھ اچھے اور اونچے کلمات فرمائے۔ درحقیقت میں واسطہ ضرور ہوں میرے ذریعہ سے یہ کلمات خیر وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں اخیر میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں آپ حضرات کا کہ یاد فرمایا اور کچھ خیالات ظاہر کرنے کا بھی موقع عنایت فرمایا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مرکزِ سعادت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!......عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا.(صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

فاتحۃ الکلام...... بزرگانِ محترم، برادرانِ عزیز! آپ حضرات کی دعوت پر میں حاضر تو ہو گیا لیکن سوچتا ہوں کہ آپ کے سامنے کیا کہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ کہوں گا وہ آپ جانتے ہیں۔ ایسی کوئی نئی بات سمجھ میں نہیں آتی جو آپ کے علم میں نہ ہو اور میں اسے علم میں لاؤں۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے اور علم کی روشنی سب سے بڑی روشنی ہے۔ آپ کو سورج کی روشنی سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ پورے عالم میں پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس کے ذریعہ صرف رنگ اور صورت کا علم ہوتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی اسلام اور کفر کا فرق بتلاتی ہے، سنت اور بدعت میں امتیاز سکھاتی ہے۔ حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا طفیل ہے۔ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان حضرات کا لاکھ لاکھ کرم و احسان ہے کہ انہوں نے علم کی روشنی پیش کی جو ہمارے لئے اچھائی، برائی، بھلے اور برے کے درمیان تمیز کا ذریعہ بنی۔

تحصیل حاصل...... آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ علم، تعلیم سے آتا ہے اور آپ سب ہی حضرات تعلیم میں مشغول ہیں۔ اسباق میں حاضری ہے، مطالعہ ہے، آپس میں مذاکرہ ہے۔ غرضیکہ رات دن آپ علم ہی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ اس لئے اسکی نصیحت کرنا تحصیل حاصل ہے اور اگر عمل کے سلسلے میں کچھ کہا جائے تو آپ کہیں گے کہ سب سے بڑا عمل خود علم کا حصول ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کے درمیان جب یہ بحث ہوئی کہ کثرت نوافل افضل ہے یا زیادت علم۔

---

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

تو کثرت سے فقہاء زیادت علم ہی کی افضلیت کے قائل ہوئے۔ آپ حضرات تحصیل علم میں لگے ہوئے ہیں، جو سب سے بڑا عمل ہے۔ اس کے علاوہ فرائض وغیرہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ نماز کے لئے آپ جوق در جوق آتے ہیں، ہر وقت مسجد بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دارالعلوم کی مسجد تو آپ سے پر رہتی ہی ہے۔ شہر کی مسجدیں بھی آپ لوگوں سے آباد ہیں، لہٰذا اگر عمل کے سلسلے میں کچھ عرض کروں تو بھی آپ کہیں گے کہ عمل تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

جہاں تک آپ لوگوں کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے وہ بھی درست ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہم پچھلوں کے اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن اگر ہم دور حاضر کے دوسرے طبقوں کے اخلاق و کریکٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف یہ کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، بلکہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ حضرات ہی کا وہ طبقہ ہے جو اس اخلاقی قحط کے دور میں بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کچھ کہنا فائدے سے خالی ہی ہوگا اور اصولی ونوعی طور پر یہی کچھ دائرے تھے کہ جن کے متعلق کچھ کہا جا سکتا تھا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی چیز آپ کے سامنے رکھی جائے جو مفید ہو۔

محروم القسمت کا حال...... اس وقت مجھے مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اور مقولہ یاد آیا وہ یہ کہ آپ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہو کر واپس ہوئے تو کافی عرصے تک کوئی خط وکتابت نہیں کی۔ آخر کار حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا کے پاس ایک خط لکھا، کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایک مدت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہوسکی، اپنے حالات لکھئے تاکہ اندازہ ہوسکے۔ مولانا نے جواب دیا اور ابتداء اس طرح کی: ''حضرت مجھ محروم القسمت کا تو کوئی حال ہی نہیں اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا''۔ پھر اخیر میں لکھا کہ البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک یہ کہ امور شرعیہ امور طبعیہ بن گئے ہیں، گویا نماز، روزہ اور دوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔ دوسری بات یہ کہ مدح وذم یکساں نظر آتے ہیں کوئی ہزار تعریف کرے، ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے اس کی نہ کچھ پرواہ ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا۔ تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کلی اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست دکھائی دیتی ہے۔

مرکز سعادت...... امور شرعیہ امور طبعیہ بن جائیں یہ قوت عملیہ سے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی تعریف و برائی کا یکساں معلوم ہونا قوت اخلاقی کا تقاضا ہے۔ قوت عملی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہو جائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے۔ قوت اخلاقی کی انتہا یہ ہے کہ اس درجہ غنا پیدا ہو جائے کہ

لوگوں کی تعریف اور برائی یکساں معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح قوت علمی کی انتہا یہ ہے کہ قرآن وسنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل درست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعت اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو۔ سعادت انسانی کے لئے انہیں تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ (۱) علمی قوت (۲) عملی قوت (۳) اخلاقی قوت اور آپ ایسی جگہ میں ہیں جو علمی، عملی، اخلاقی قوتوں کا مرکز ہے۔ جہاں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جو ہر اعتبار سے کامل ومکمل تھیں۔ میں اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسی باکمال شخصیتوں کی شکلیں دیکھی ہیں۔ بعض سے کچھ استفادہ کا بھی موقعہ ملا۔ استاذ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اللہ ''اکبر'' چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ اتباع سنت کا یہ حال کہ ان کے عمل کو دیکھ کر مسائل نکالے جاتے تھے۔ ایسے ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، ان تمام حضرات کی زیارت کے شرف کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ استفادہ کا بھی موقع ملا۔ استاذ محترم حضرت تھانویؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور حسب توفیق استفادہ کا بھی شرف نصیب ہوا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کا ایک ایک شخص پوری پوری قوم کے برابر ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ملک کے گوشے گوشے میں مواعظ کہے اور ایک ہزار کے قریب تصانیف کیں۔ بہت سے علماء مل کر بیٹھیں تو بھی اتنا کام مشکل سے ہو سکے گا۔ حق تعالیٰ نے آپ سے ایسے کام لئے جس کا ایک قوم اور ایک جماعت سے ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جائے بزرگان بجائے بزرگان!...... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان بزرگوں کے اثرات اس جگہ اور اس ادارہ میں نہ ہوں ایک پھول کپڑے کو لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دیر تک کپڑے سے خوشبو آتی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شجرۃ الرضوان کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو صحابہؓ سے بیعت لی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تھوڑے سے قیام کی وجہ سے اس جگہ کو آپ سے ایک نسبت حاصل ہوئی تھی اور وہ جگہ مقدس ومتبرک ہوگئی تھی۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ ان برکات کو محسوس کرتے تھے، اس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے دعائیں مانگتے تھے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ابھی تو خیر القرون ہے اور اس درخت کے ساتھ امت کی عقیدت کا یہ حال ہے، بہت ممکن ہے کہ کل کو ایسی نسلیں آئیں جو عقیدت میں غلو سے کام لیں اور اس کی وجہ سے شرک و بدعت کا دروازہ کھل جائے اس درخت کو کٹوا دیا۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بتانا تھا کہ جائے بزرگان بجائے بزرگان، والا مقولہ بالکل صحیح ہے۔ پس یہ ادارہ جہاں اکابر اولیاء اور اپنے وقت کے مسلم قطب اور ولی رہ چکے ہیں ان کے پاکیزہ اثرات سے اس کے در و دیوار کب خالی رہ سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آپ ایک ایسے ادارے میں ہیں جسے طرح طرح کی نسبتیں اور تقدس حاصل ہے جو برکات یہاں ملتی ہے وہ دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ دار العلوم کی ایک ایک جگہ کے بارے میں اکابرین کے مکاشفات ہیں۔ نودرہ کی عمارت کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ عرش سے ایک مسلسل لڑی ہے جو نودرہ کی درسگاہوں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا یہاں بیٹھ کر کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔

دوسری جگہ نہیں آتیں۔نو درہ کے سامنے کی جگہ جہاں جنازہ رکھا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ جس جنازے کی نماز یہاں ہو جائے وہ مغفور ہوتا ہے۔

الہامی درسگاہ...... بھائی! یہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا ہے۔اس کی تعمیر بھی الہام سے ہوئی اور طلباء کا داخلہ بھی الہام سے ہی ہوتا ہے، بلکہ بعض واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے اساتذہ کا تقرر اور تعین بھی خاص زاویوں میں ہوتا ہے اور یہاں کی خدمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔اس مدرسہ کا آغاز اور مدرسوں کی طرح کی رسمی مشورے سے نہیں ہوا بلکہ وقت کے اکابر ومشائخ کا ایک اجماع سا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس کے وقت میں کسی کو کشف ہوا کہ یہاں پر ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔کسی نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر ایک مدرسہ کا قیام ہونا چاہئے۔کسی پر القا ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام کا تحفظ دینی اداروں سے ہی ہوسکتا ہے۔اسی طرح تعمیر کے وقت بنیاد کھودنے کے لئے کچھ نشانات لگا دیئے گئے۔جتنا اب ہے اس سے آدھے پر نشان لگایا گیا تھا۔

الہامی اہتمام...... دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تارک الدنیا اور نہایت ہی قوی النسبت بزرگ تھے۔نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ کتاب پڑھ سکتے تھے۔مولانا نانوتویؒ نے انہیں بلایا اور اہتمام پیش کیا، آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نہ تو لکھنا جانتا ہوں، نہ پڑھنا، مجھے مہتمم بنا کر کیا کیجئے گا۔حضرتؒ نے فرمایا نہیں۔منجانب اللہ یہی مقدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اہتمام قبول کریں۔چنانچہ آپ نے قبول فرمالیا۔

الہامی طلباء..... حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطہ میں جو کنواں ہے اس کی منڈیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔دودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چلو ہی سے پی لیتا ہے۔حضرت جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دودھ صورت مثالی علم کی ہے۔اور قاسم العلوم نبی اکریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ علم تقسیم فرما رہے ہیں اور طلباء فرق مراتب کے ساتھ علم حاصل کر رہے ہیں۔اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ احاطہ مولسری میں کھڑتے تھے ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ آپ کے سامنے لے کر آیا اور اسے پھینک کر کہنے لگا۔''نہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ ہے اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دیدیں یہ ہے آپ کا اہتمام؟''

جب وہ طالب علم چلا گیا تو آپ نے پوچھا کیا یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں حضرت! یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے اور مطبخ سے اس کا کھانا ہے اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے۔آپ نے فرمایا نہیں! یہ مدرسہ کا طالب علم معلوم نہیں ہوتا۔تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسی نام کا ایک دوسرا طالب علم

ہے۔ اصل میں کھانا اس کا تھا۔ لیکن نام میں اشتراک کی بناء پر غلطی سے ٹکٹ اسے مل گیا تھا۔ طلبہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! بات تو وہ ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپ نے دودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو میں ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا۔ اس طالب علم پر میں نے تین مرتبہ نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں شریک نہیں تھا۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مدرسہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا اور طلباء کا انتخاب بھی الہام سے ہوتا ہے۔

الہامی سنگ بنیاد...... اور اس کا سنگ بنیاد بھی الہام ہی سے رکھا گیا۔ بنیاد کے لئے لوگوں نے جو نشان لگایا تھا اس پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ عصائے مبارک ہاتھ میں ہے اور فرماتے ہیں کہ ''یہ احاطہ تنگ رہے گا کافی نہیں ہوگا''۔

چنانچہ آپ نے مولانا نصیر احمد صاحب کی درسگاہ کے پاس نشان لگایا۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لکیریں بالکل اسی طرح موجود ہیں۔ پھر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بنیاد اسی پر کھودی جائے گی، اب مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حقائق و کیفیات کا فرق...... آپ حضرات ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جسے سینکڑوں بزرگوں کی نسبتیں حاصل ہیں۔ مجموعی اور غیر شعوری طور پر وہ ساری نسبتیں کام کر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ جو علم اور جو خیر و برکت یہاں ہے دوسری جگہ نظر نہیں آتی، کتابیں وہی ہوتی ہیں، الفاظ وہی ہوتے ہیں، مگر حقائق و کیفیات میں فرق ہو جاتا ہے۔

میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد مرحوم مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھی ہے۔ والد صاحبؒ جس وقت برزخ، موت، قیامت، حشر و نشر سے متعلق احادیث پر پہنچے اور تقریر شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدان قیامت سامنے ہے، یہ قبر ہے، حساب، کتاب ہے، عذاب و ثواب ہے۔ اس انداز اور ایسی کیفیت سے تعلیم ہوتی کہ ہم محسوس کرتے کہ یہی حالات ہمارے اوپر طاری ہو رہے ہیں۔

نسبتوں کا چمن...... دارالعلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب اہل نسبت بزرگ تھے۔ حاجی عبداللہ صاحبؒ دربان تھے۔ نوشت و خواند کچھ نہ تھی، لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے۔ صبح صادق پر جو دارالعلوم میں گھنٹہ بجتا ہے، اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا، دوسری پر الحمدللہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں ۔۔۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔ حاصل یہ کہ یہ ایک مثالی جگہ ہے۔ اسے نہ جانے

کیسی کیسی نسبتیں حاصل ہیں۔ یہاں کم سے کم درجے کا طالبعلم آتا ہے، اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے، اس جگہ پر رہ کر محروم رہنے کا کوئی سوال نہیں۔ تو بھائی اگر نسبتوں کے بارے میں کچھ بات کی جائے تو بفضلہٖ تعالیٰ وہ بھی موجود ہے۔

زیادۃ فی العلم...... مگر ہاں اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ ایک تو اصل علم اور راس العلم ہے، جسے آپ حاصل کر رہے ہیں اور جو آٹھ دس سال میں حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ اضافہ کی برابر کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ جس طرح اصل علم مطلوب ہے ویسے ہی زیادۃ فی العلم بھی مطلوب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے ﴿ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴾ ① حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ علوم دیئے گئے تھے جو ساری کائنات میں سے کسی کو نہیں دیئے گئے، چونکہ یہ انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات غیر محدود ہیں اس لئے آپ جتنا بھی علم حاصل کرتے جائیں گے، جہالت دور ہوتی چلی جائے گی اور آگے میدان مزید نظر آئے گا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ مرض وفات میں ہیں۔ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے۔ مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپ فوراً مطالعہ میں مشغول ہو جاتے لوگ کہتے کہ حضرت! ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ تو فرماتے بھائی! کیا کروں یہ مرض مطالعہ کا بالکل لاعلاج مرض لگا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ چند ساعت ہی ترکِ مطالعہ کرتے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ آپ کی دلالت اولیٰ مطالعہ پر ہی تھی، حضرت کو زیادۃ فی العلم کی ایک دھن لگی ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حفظ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی۔ خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گزر جاتی ہے پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں مشہور و معروف کتب تو در کنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ بقیہ صفحات و سطور اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گذشتہ رات ہی حضرتؒ نے ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اس قدر قوت حفظ کے ہوتے ہوئے حضرتؒ نے تیرہ بار فتح الباری کا از اول تا آخر مطالعہ کیا تھا۔ بتایئے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی مستحضر، تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا۔ آپ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا۔ افسوس کہ آپ کی بتائی ہوئی باتیں اور تقریر محفوظ نہ رکھ سکا۔

علم کی دھن...... تو بھائی! علم آدمی کو محنت سے ملتا ہے، دھن سے ملتا ہے۔ یہ دھن پیدا ہو جانی چاہیئے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس کو سود در سود کر کے بڑھاتے ہی چلے جانا ہے۔ جب دھن پیدا ہو جائیگی تو آپ زیادہ سے زیادہ کتب بینی کریں گے اور جب آپ کتب بینی کے عادی ہو جائیں گے، تو پھر آپ میں تفقہ پیدا ہوگا۔ اور جب تفقہ پیدا ہو جائے گا، تو آپ کسی شے کے محض حکم ہی پر قناعت نہ کریں گے بلکہ اس کی حکمت کو بھی معلوم کرنے کی

① پارہ: ١٦، سورۃ طہ، الآیۃ: ١١٤۔

کوشش کریں گے۔ اور جب حکمت معلوم کرلیں گے تو اس سے بڑھ کر علت معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جب علت معلوم ہو جائے گی تو آپ اسی پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس علت کا رابطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کس صفت سے ہے۔

علم وعمل کی سند...... ایک بات آپ حضرات سے کہدوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے مجاہدہ کرتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا، جب تک سلسلہ عمل کو بھی متصل نہ کیا جائے۔ ایک عالم میں اگر کبر ہو، حسد ہو، بغض ہو، کینہ ہو، حب جاہ ہو، تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا۔ اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے۔ خود دارالعلوم پر نصف صدی ایسی گزری تاوقتیکہ شیخ کامل سے اجازت نہ ہوتی دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا گویا علم وعمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔

علم وخشیت...... میں نے آپ کے سامنے جو حدیث پڑھی تھی۔ یعنی نہ تو کوئی طالبعلم کبھی سیر ہوتا ہے اور نہ طالب دنیا سیر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالب مال کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے۔ اور نہ طالب علم کو بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس سو روپیہ ہے تو وہ دوسو کی خواہش میں لگا ہوتا ہے۔ اگر دوسو ہیں تو چارسو کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہو گئے تو دوسو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (1) جس قدر علم بڑھتا جائے گا خشیت بڑھتی جائے گی۔ اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے۔ اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے۔

راہنمائی کی تیاری کا زمانہ...... اب تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے ابھی آپ دوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں۔ مگر یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگران بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، آپ کے سامنے ملک وقوم کے حالات ہوں گے اور آپکو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں کون سی بیماریاں ہیں؟ کیا کوتاہیاں ہیں؟ ان کے اسباب کیا ہیں؟ اور ازالہ کی تدابیر کیا ہوں گی؟

ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپکے سامنے شرک وبدعت کا میدان ہوگا اور عیسائیت و یہودیت سے بھی مقابلہ رہے گا۔ اگر آپ نے ان کاموں کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت ومشقت کر کے میدان کو ہموار نہ کر لیا، تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

میری خواہش ہے کہ آپ یہاں سے صرف عالم اور صالح بن کر نہ نکلیں بلکہ معلم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش

(1) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

کریں۔ اس لئے کہ قوم منتظر ہے کہ ہمارے نونہال دارالعلوم میں پڑھنے گئے ہیں، وہ آئیں گے ہماری اصلاح کریں گے۔ ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوں گے۔ لہٰذا پہلے ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں۔ اس کا حل نکالیں۔ اپنے اساتذہ سے سوالات کریں پھر نہ آپ کو ایسا وقت ملے گا نہ ایسے اساتذہ ملیں گے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم یہ سب کرتے رہتے ہیں تو خیر کوئی حرج نہیں، اس لئے میں نے یہ چند باتیں آپ لوگوں سے عرض کر دیں۔

خلوص ومحبت کا شکریہ...... آپ نے جس محبت وخلوص سے یاد فرمایا میں اس کا شکرگزار ہوں اور صرف شکرگزار ہی نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک وقتی اور رسمی چیز ہوگئی ہے۔ میں آپ حضرات کے لئے خلوص قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔ میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔ بس ایک نام ایک نسبت لگ گئی ہے، ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل میں ہم اور آپ آج یہاں موجود ہیں۔ غالب نے کہا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا ـــــ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے۔ ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں۔ تو انہیں بزرگوں کے طفیل میں، سپاسنامے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اس میں ایران توران کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ آپ لوگوں کی جانب سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

امتیازِ دار العلوم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ①

ایک بڑی کمی...... بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز طلبہ! پروگرام میں عربی تقریروں اور نظموں کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نمبر تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ورنہ ارشادات گرامی سے مستفیض فرماتے۔ اگر حضرت موجود ہوتے تو ہم سب کے لئے کارآمد اور مفید ہوتا۔ میں نے حضرت مولاناؒ سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ جلسہ انعام کی تاریخوں میں شرکت نہ فرما سکیں تو جلسہ کو موخر کیا جائے۔ مگر حضرت نے پسند نہ فرمایا اور وعدہ کیا کہ حتی الامکان شرکت کی سعی فرمائیں گے۔ اس وقت ہمیں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے جلسہ کی غرض و غایت تقسیم انعام اور طلباء کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور جس شعبہ کے طلبہ کو یہ انعام دیا جاتا ہے اس شعبہ کے صدر حضرت مولاناؒ ہیں۔

مہمانوں کا شکریہ...... جلسہ کے واجبات کے متعلق چند ضروری باتیں بھی مجھے عرض کرنا ہیں۔ دار العلوم کی جانب سے باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کا شکرگزار ہوں کہ اس سخت اور تکلیف دہ گرمی کے موسم میں انہوں نے شرکت کے لئے زحمت گوارہ فرمائی۔ بالخصوص دہلی سے آنے والے حضرات کاروباری لوگ ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر ہماری طلب پر تشریف لائے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات ہمارے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ ان حضرات کا یہاں آنا کسی مالی غرض کی بناء پر نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کا سبب وہ محبت ہے جو انہیں دار العلوم سے ہے۔

امسال جلسہ کے انعقاد میں کچھ موانع تھے اور خیال تھا کہ جلسہ نہ ہو سکے گا مگر ابھی چند دن ہوئے کہ یہ ارادہ ہوا۔ اس لئے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے دعوت مختصر دی جائے۔ مجھے آپ

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۲۲.

حضرات سے دارالعلوم کا تعارف کرانا نہیں ہے اور نہ آج دارالعلوم کسی تعارف کا محتاج ہے۔

تاسیسِ دارالعلوم کا امتیاز...... مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہے۔ جو ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ چند اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ سے سوچ کر ایک چیز طے کرتے ہیں۔ مگر دارالعلوم کی تاسیس اس سے مختلف ہے۔ دارالعلوم الہام غیب اور اہل اللہ کے قلوب پر انکشاف واردات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ سنا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر اہل اللہ اور بزرگ تھے ان سب کے قلوب پر یہ منکشف ہوا۔ غرض یہ کہ اس طور پر ان حضرات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انکشاف اور منجانب اللہ الہام کا اظہار فرمایا۔ اس طرح پر یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ دارالعلوم کی بنا الہامی طور پر ہے رسمی اور حسی طور پر نہیں ہے۔ دارالعلوم کے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ تھے جو اگرچہ امی محض تھے مگر نہایت باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے۔ دارالعلوم کے لئے جب بنیادیں کھودی گئیں تو وہ احاطہ جو اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا بہت مختصر تھا۔ رات کو حضرت مولانا خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طویل وعریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ بلا کسی مشورہ کے ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر کا کام شروع کرا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کی بنیاد الہامات پر قائم ہو اس کی کیفیت یقیناً دوسرے اداروں سے مختلف ہوگی۔

طلباءِ کرام کا امتیاز...... یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر جاتے ہیں ان کا تعین بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو طلباء یہاں پڑھتے ہیں وہ بھی منجانب اللہ منتخب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم مطبخ سے کھانا لیکر آیا اور شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے اوندھا کر کے کہنے لگا کہ ''یہ شوربا کھانے کے لئے ہے یا وضو کے لئے؟'' اس طرح تند وتیز باتیں کر کے چلا گیا۔ مولاناؒ نے دریافت فرمایا یہ کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں طالب علم ہے۔ مولاناؒ نے وثوق کے لہجے میں فرمایا کہ یہ طالب علم نہیں ہے اور نہ یہ طالب علم ہو سکتا ہے چنانچہ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے فرضی طالب علم ظاہر کر کے دھوکہ سے کسی طرح مطبخ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوالیا ہے اور فی الحقیقت طالب علم نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ نے وثوق کے ساتھ کس طرح اس کے طالب علم ہونے سے انکار کیا تھا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ یہاں جس قدر طالب علم پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سب کی شکلیں مجھے دکھلا دی گئی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے اس شخص کو بغور دیکھا تو دکھلائی ہوئی شکلوں میں اس صورت کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرگز طالب علم نہیں ہے۔

حصولِ علم کا امتیاز...... احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے اس کے متعلق مولاناؒ نے خواب میں دیکھا کہ کنواں

دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرمار ہے ہیں۔ بعض کے پاس چھوٹے برتن میں اور بعض کے پاس بڑے برتن ہیں۔ ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جاتا ہے۔ مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعبیر یہ فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا ظرف علم مراد ہے۔ جس شخص کا جس قدر ظرف ہے اس مقدار میں علم اس کے نصیب وحصہ میں آئے گا۔

دار العلوم کے انتظام وانصرام کا امتیاز......اس ادارہ کے اصول وفروع بھی الہامی طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے ۲۵۔۲۶ سال کے زمانہ اہتمام کا تجربہ ہے۔ اس دوران یہ چیز نہایت شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارہ کو چلا رہی ہے اور اس کا دارومدار ظاہری جدوجہد سے بالاتر کوئی باطنی قوت ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے، ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے ورنہ آج کے دور میں علوم دینیہ کا ذوق رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانہ میں ملامیہ فرقہ تھا۔ اسی طرح آج جس کو ملامت سننی ہو وہ مولوی ہو جائے۔ عدم اعتناء دین کے اس دور میں جب کہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے۔ اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال نسبتاً زیادہ آیا اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور پرفتن میں دار العلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد واعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

غالباً سن ۴۹ ہجری کا واقعہ ہے اور یہ پہلا سال ہے میرے اہتمام کا، مولوی گل محمد خان صاحبؒ جو خزانہ کے تحویلدار اور تقسیم تنخواہ کے ذمہ دار تھے۔ رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی نہیں ہے اور کل پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کی صورت میں تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا۔ ان کو رخصت کر کے حضرات مدرسین کو میں نے کوٹھی پر بلا کر دریافت کیا کہ آپ دار العلوم مین کیوں پڑے ہوئے ہیں اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے یا تنخواہ حاصل کرنا۔

مُدرّسینِ کرام کا امتیاز......سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس مقدس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے۔ حاشا وکلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ فاقہ کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ مطمئن رہیں۔ دار العلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہیں بھی ملتی رہیں گی خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے۔ دعاء کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے مین اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔ سب نے مل کر خشوع خضوع کے ساتھ دعا کی جس کا اگلے دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کا وقت نہ آیا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دو ہزار روپے کلکتہ کے ایک تاجر کی طرف سے تھے اور پانچ سو میرٹھ کے مشہور رئیس خان صاحب شیخ رشید خان صاحب آرمی کنٹرکٹر کے جو اتفاقیہ دہرہ دون جاتے ہوئے دیوبند تشریف لائے اور پانچ سو کا عطیہ دے گئے۔ غرض یہ کہ

دار العلوم کی بناء بھی غیبی امور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی منجانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز دار العلوم آگے بڑھ رہا ہے۔ عرصہ سے یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جلسہ انعام عظیم الشان پیمانہ پر کیا جائے اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو دعوت دی جائے اور قدیم طلبہ کو بھی بلایا جائے۔ مگر ملک کے ہنگامی موانع نے ہمیں باز رہنے پر مجبور رکھا۔ بہت ممکن ہے کہ سال آئندہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

روح دار العلوم...... تعلیمی اداروں کی اصل قابل اعتناء چیز روح ہے عمارات نہیں ہیں۔ یہاں کی اصل روح تعلیم ہے۔ اگر دار العلوم تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہے تو اس نے اپنے مقصد کو پورا کر دیا اور اس روپیہ کو ٹھکانے لگا دیا جو قوم نے اس کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ امتحانات کے نتائج سے ہو سکے گا جو ابھی آپ کے سامنے بیان کئے جانے والے ہیں۔ اس سال دار العلوم میں تین مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے۔ ایک شعبہ صناع کا ہے جو طلبہ کو صناع سکھلائے گا۔ عام طور پر علماء کا نفقہ قوم پر ہے۔ جو لوگ فی سبیل اللہ کار خیر میں محبوس ہیں قوم کا فرض ہے کہ وہ ان کی امداد کرے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کو ان کی معاش سے مطمئن کر دیا جائے۔ اس شعبہ میں ۷ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا جز فن کتابت ہے۔ اس کی بنیاد سن ۶۴ ہجری میں ڈالدی گئی تھی۔ اس شعبہ میں اس وقت ۴ آدمی کتابت کا فن سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ ورزش کا ہے روحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا کے لئے شعبہ ورزش کھولا گیا اس شعبہ میں دو استاد کام کر رہے ہیں۔ آج صبح اس شعبہ کے معائنہ میں دہلی کے حاجی محمد یوسف صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے تیس روپے بطور انعام کے طلبہ کو دیئے ہیں۔

تیسرا شعبہ جمعیت الطلبہ کا ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت قدیم ہے مگر اس سال اس کو باضابطہ بنا دیا گیا ہے۔ سال آئندہ اس کی کارگذاری تفصیل کے ساتھ معائنہ کرائی جاسکے گی۔ اس کے چار شعبے ہیں۔ 1 عربی تحریر 1 اردو تحریر 3 عربی تقریر 4 اردو تقریر

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے اب انعام تقسیم کیا جائے گا۔ تاکہ کامیاب طلبہ میں شوق اور ترغیب پیدا ہو اور جو لوگ ناکام رہے وہ شرمندہ اور خجل ہو کر آئندہ محنت سے تعلیمی امور میں منہمک ہوں۔ اگرچہ یہ سلسلہ نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر اصل میں یہی تعلیم کے نتائج کا نچوڑ اور معیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری توجہ سے اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

آزادی ہند کا خاموش راہنما

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ!

آزادی کی خوشی کی تکمیل...... آج ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی، جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی۔ اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی، بلکہ کتنے ہی صبر آزما دِنوں مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اولین علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دار و رسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی۔ اس لئے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روشوں کا تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

آزادی کا ہیرو...... ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے موقعہ پر سرفروشی کے جوہر دکھلائے اور ایثار قربانی سے گو اپنے کو ختم کر لیا۔ مگر آنے والی نسلوں کے لئے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کر گئے، ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرپور ہے۔ میں اس موقعہ پر اس نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اُصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالار فوج

کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ جنگ کی فتح وشکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتیں آزادیِ ضمیر، آزادیِ زبان وقلم اور آزادیِ ملک وملت کے جذبات کی اساس راہ پر پڑ گئیں اور جو فتح شاملی کا میدان کارزار تیغ وسناں سے نہیں پا سکا تھا' وہ ان اصولوں کے ہتھیاروں سے قلم وزبان کے میدان میں نظر آ گئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہو گئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے۔ جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ کے دل ودماغ کے علماً وعملاً امداد اللہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامہ رست وخیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم کی رونمائیوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی...... گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔ فرق تیغ وسناں اور قلم وزبان کا تھا۔ وہاں تشدد کے ساتھ آزادی ملک وملت اور آزادی مذہب ودین کا نصب العین سامنے تھا۔ اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصبُ العین کے لئے افراد استعمال کئے جا رہے تھے۔ اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے۔ وہاں نام میدان جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسہ، مکتب امن وصلح کا تھا۔ وہاں قلب ودماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کر رہے تھے اور یہاں براہ راست دل ودماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔ غرض حضرت والا نے میدان شاملی کے نتائج پیش نظر رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز میں اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا تھا وہ اب ہو جائے۔

سیاسی محکومیت کے ازالہ کی واحد تدبیر...... حضرت والا نے دارالعلوم دیوبند بلکہ ۵۷ کے بعد تمام دینی مدارس کے لئے آٹھ اصول کا ایک دستور اساسی مرتّب فرمایا۔ جو دارالعلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے۔ جو ایک طرف اگر علاقہ کے خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطہ عوام سے تھی، ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ حضرت والا ان اصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراء عصر سے بے نیاز کر کے حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے، کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر جیتی ہے۔ اور وہ جینا زندگی نہیں، موت بصورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک وسیاست کے ساتھ علم واخلاق اور ذہن وفکر میں بھی حق خود ارادیت باقی نہ رہا' تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار

بن کر نہ ابھر سکے گی۔ اس لئے حضرت والا کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعۃً یہی تھی کہ قوم کو علم و دین کے راستے سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کے بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے تا کہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظام تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والا دل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے۔ حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اگر یہ صورت حال خودرو طریق پر ہوئی تو اسی عوامیت میں لادینی کے جراثیم کارفرما ہو جائیں گے جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی۔ اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔ اس لئے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی۔ اور نظام تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے، تا کہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خود اختیاری قوت پیدا ہو جائے کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَانِ (ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شاملی کے رُخ کی تبدیلی...... حضرت والا کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت و شکست کا منظر آپ کے سامنے ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت متسلطہ شکست خوردہ قوم کے حقوق آزادی کو کچل رہی ہے۔ اور اس کے بنیادی تشخص اور حق خودارادیت کو ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی جن کا سلسلہ ۵۷ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

حضرت والا نے ۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے مقابلے کا وقت نہیں ہے۔ تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں۔ اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدان مقابلہ میں آ جاتے ہیں، گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔ اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی، جبکہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لئے اس جدید اقدام میں تعلیم و تربیت کے راستے سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے اثرات زائل کرنے تھے، احساس کمتری کو دلوں سے دور رکھنا تھا تا کہ حوصلوں میں فرق نہ آ جائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ...... دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت پاکیزگیٔ نفس اور جذبات حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تا کہ آزادیٔ ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہو جائے۔ تیسرا قدم علم و عمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریت نفس اور آزادیٔ ملک و ملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر و بصیرت کے ساتھ اخلاص و ایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت واضح فرمائے، جبکہ نئے تسلط و اقتدار کے زیر اثر سربرآوردگان ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر طاقت متسلطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے ''حریت کاری'' کے بجائے ''وفاداری'' کا خمار خودسروں کے سروں میں بھر چکا تھا۔ اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ حضرت نے اس وقت ان آٹھ اصولوں کے راستہ سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کا پرداز ڈالا۔ اور ملک کے اونچے طبقہ سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستہ سے کرلیا۔ ان اصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم اور اخلاق اور قال اللہ وقال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟ اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی رجحانات اور ان کے علمی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہنمائی کے آٹھ اُصول...... سو ان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لئے پہلے ان اُصولِ ہشت گانہ کا متن پڑھیے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھیے! اُصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے۔ حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے: وہ اُصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس عنوان کے نیچے حسب ذیل آٹھ اُصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

1...... اصل اوّل یہ ہے کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

2...... اِبقاءِ طعام طلبہ مل کر افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی تر رہیں۔

3...... مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اُسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا پر تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اسکی پس پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کی سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم اُمورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔ یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیراندیش ہو۔ اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش

نہ ہو کہ مجھ کو کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

4 ...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

5 ...... خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

6 ...... اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع إلی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

7 ...... سرکار کی شرکت اور اُمرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

8 ...... تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ ...... ان اصول ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے: 1 سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تاکہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کی بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے۔ پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی۔ جس کا سلسلہ واسطہ بلا واسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستغنی نہ ہو اور عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیرِ چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی، جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تاکہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلس شوریٰ کو (جو اس نظم ونسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہل چندہ اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام نہ صرف چندہ بلکہ بواسطہ مجلسِ شوریٰ اس کے مالی مصارف کے نگران اور مجوّز بھی ہیں اور اوّل سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل دخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطہ عوام کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس رابطہ کی صورت آخر اس کے سوا کیا باقی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے۔ اور انہی کے حصہ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رکنیت کی فیس رکھ

دی کانگریس کمیٹی رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۱۰۰ ۴ ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطہ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کی بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔ کیا اسی طریق کار کو بعد کے مبصروں نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے نہیں اپنایا، فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی۔ اور اس ادارہ کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادی وطن کے ساتھ آزادی مذہب وملت کی روح بھی قائم کر دی۔

بہر حال اس اولین اصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا تھا۔ تا کہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ہر اجتماعی کام کا مدار اس رائے عامہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اصول مذکور کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر درحقیقت آزادی ملک وملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کر لی گئی۔ اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری اِمداد کا بدل...... 2 اسی کے ساتھ دوسرے اُصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش وتکثیر ضروری قرار دی تا کہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطہ سے قوم اور ملک کی اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اُصول اگر رابطۂ عوام کا رکھنا مقرر کیا جو پچاس برس بعد کے انقلاب اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا۔ تو دوسرے اُصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقع دیا۔ تا کہ اس دوطرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف اس عوامی چندہ کی تحصیل ووصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لئے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی۔ اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دارالعلوم ہی تھا جو ۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۶۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن حضرت والا اپنے نورِ فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اور اس سرکاری امداد کا بدل بجز قومی چندہ کے دوسرا فاصلہ نہیں اس لئے ان مطاعن کی پرواہ کئے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرّغم اُدارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطہ عوام کی ضرورت واہمیت سمجھا دی۔ اور بھیک مانگنے اور بھک منگے بنانے کا سسٹم بالآخر ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لئے

کہا جا سکتا ہے کہ اس بارہ میں دارالعلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیفِ خواص...... 3 رابطۂ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقہ خواص بھی ناگزیر تھا۔ تو حضرت والا نے تیسرا اصول تالیفِ خواص کا رکھا۔ جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کی بجائے شورائی قرار دیا۔ تاکہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں، کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقا پذیر رہتا ہے۔ ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے ردو قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لئے ہوئے ہوں۔ اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں۔ بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آوٹ کا جذبہ اُبھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں، کہ اپنی رائے کے اظہار میں بھی حق نظر آئے تو گردن جھکا دیں۔

پس آزادی ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں۔ اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آ جانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس آزادی ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہو گی تو آزاد نظم و نسق بھی ہو گا تو آزاد۔ اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔

پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہو گئی۔ پھر اس تالیفِ خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر وارد و صادر، ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لئے کھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقہ خواص میں رابطۂ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا، تا کہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالآخر نظم میں محدودیت و استبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں جو آزادی کے حق میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا گیا جو اصول آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اِتحادِ مشرب...... 4 مرکز میں مربیوں کا کارکنوں کا اتحاد مشروب لازمی قرار دیا تا کہ اتحاد خیال سے جماعت کا نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ درصورت اختلاف مشرب تقابل باہمی پھر اس سے خود بینی و خودستائی اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم ابھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں، انتظامات کی پارٹی فلیئنگ شروع ہو جاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو زیادہ مستحکم کر دیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور

حریت طلب جماعت کے لئے سم قاتل ہے۔اس لئے حضرت والا نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرما دیا یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کر لی۔ جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہو جاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی اِستعداد...... 5 تجویز نصاب، مقدارِ خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامۃ الناس کے عامیانہ آراء و قیاسیات کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیاتِ وقت سے معرّیٰ ہو۔ بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہلِ علم اور اہلِ تجربہ کی رائے پر مبنی رکھا جو مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے آزار نہ ہوں تا کہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامۂ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظ نظر رہے، ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات و مقتضیاتِ تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہو سکتے تھے جو اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جا سکتی تھی ملک کی ساری قوموں کے لئے قابلِ قبول اور اپنے اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو۔ جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا، نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کر دی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لائی گئی۔ یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانسٹی ٹیوشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے۔ اور متعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے، انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرستی کے۔ اس لئے حضرت والاؒ نے نصاب کو کوری آزادی و بے باکی اور خالص بستگی و غلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیان میں رکھا جو دل و دماغ میں ہر طبقہ کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کر سکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔

روحانیت و اخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل...... 6 عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں اُمراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے، تا کہ مرعوبیت اور اسیری دل و دماغ کے جراثیم پرورش نہ پا سکیں اور اداروں یا خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے، جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کے دعوؤں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں بھی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج

ہوتی ہے۔ حضرت والاؒ نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔ حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے، اس لئے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جس کو اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے، سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا تا کہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ اور ادھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے، کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی موہوم اور فساد یقینی تھا۔ اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن و اصلاح کے ساتھ نیز پہلی صورت میں شور و شر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم۔ اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے۔ اور دعوؤں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے۔ اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔ حضرت والاؒ نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن و سلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اُتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کر سکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند در حقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی، ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہوگئی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہو گئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لئے حضرت والاؒ نے ادارہ کی آمدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سروسامانی توکل اور اِستغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تا کہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آجائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے۔ اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔ پس حضرت والاؒ نے اس اصول کے ذریعہ حصولِ آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی۔ مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت و اخلاق کے راستہ سے۔

سرکاری امداد سے اِحتراز کی حکمت...... 7 ادارہ کے لئے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے، جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے۔ اس لئے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترک موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بسلسلہ تحریک آزادی وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیشی کپڑے سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا؟ اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں؟ تاکہ خود اپنے ملک کی تجارت وصنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج وغلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں، ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی تاکہ یہ قومی رنگ کے سرمایہ کا دست نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہا ہے، بہر حال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مخفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت والا کی دور بین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضرب کاری...... 8 اس آٹھویں اُصول میں کارکنان اِدارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے۔ جیسا کہ چھٹے اُصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفع کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے اور انہیں کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لئے یہی پائیداری اور پختگی کا سامان ہے۔ گویا اس دفع کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برداری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلا انداز تقابل ورقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت ہی میں رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کئے رہتے ہیں۔ اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب اکثریت اپنے کمال قناعت وتوکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہو جائے تو قدرتاً سرمایہ دار اس کے محتاج ہو جائیں گے اور بشوق ورغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر نثار کرنے کے آرزو مند ہو جائیں گے جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بخود باہر آ جائے اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔ اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک ضرب کاری ہے مگر

موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کی دراڑ بنے۔ اس لئے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہو جاتا ہے۔

تنظیم مدارس آزادی کی خشتِ اوّل...... 9 یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اُصول کی تشریح تھی لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اُصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیم مدارس کا اصول ہے کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصول ہشت گاہ کے نیچے جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے جو رابطہ مدارس کی ایک معقول اور موثر صورت ہے اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے اس لئے اس اصول میں تنظیم مدارس کے راستہ سے علمی فضلا اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کر دی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لئے خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والاؒ نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلا دیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔ گویا ۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کئے جائیں اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کئے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ: ’’ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں‘‘۔ تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ: ’’ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں‘‘۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لئے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا۔ تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا، سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔ غرض جہاں جہاں حضرت والاؒ خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطے سے بتاکید تمام آزاد مدرسے قائم فرمائے جس سے اطراف میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقش قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں، جس سے آپ صرف بانی دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے بانی مدارس ثابت ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جن کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر ابھرے۔

جمعیت علماء کا پس منظر...... چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی طور پر بھی منظم ہو گئیں۔ اور انہوں نے جمعیت العلماء کے نام سے جنگ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ جمعیت العلماء کے افراد پر

شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن اس کے اصول و مقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق در جوق آوازہ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادۃً مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لئے مذہبی آواز ہی میں جذب وکشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش برآواز نہیں ہوتا۔ اسی لئے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی صورت میں اس وقت منظم تھے جب عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصورات سے خالی تھے۔

ملت کا وقار بازیافت کرنے کے اُصول..... یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والاؒ ہی کے ان اصول ہشت گانہ اور طرز عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے اور جوں ہی اس مدارسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیت کے پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے وہیں عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش وخروش کے حیرت ناک منظر سامنے آگئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی وطن دے سکتی ہے۔ بہر حال حضرت والاؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شاملی میں مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہوسکتا تھا جو بناءِ مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔

سوانح مخطوطہ (۱) عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتی کہ مخالفین تک بھی اس وقت جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہوسکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کے مرکزی حیثیت کے تباہ ہو جانے سے پورے ملک کے حال و مال کی تباہی عیاں تھی، صاحب سوانح مخطوطہ نظام مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اور جو فوائد معاش و معاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم سے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لئے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور

---

(۱) سوانح مخطوطہ کے مولف جناب حاجی فضل حق صاحب مرحوم ہیں جو دار العلوم کے اولین طبقہ میں ممبر کی حیثیت سے مجلس کے رکن رہے پھر ایک زمانہ تک دار العلوم کے مہتمم بھی رہے۔ ممدوح دیوبند کے باشندہ اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے معتقدین خاص میں سے تھے۔ آپ نے حضرت والا کی سوانح مرتب کی جو زمانہ کی دست برد سے ضائع ہوگئی۔ اس کے کچھ بچے کھچے اور پھٹے ہوئے اوراق پرانے کاغذات میں دستیاب ہوئے جن سے کافی معلومات بہم پہنچیں اور سوانح قاسمی میں ان سے کافی مدد ملی۔ اس مضمون میں جہاں سوانح مخطوطہ کا لفظ آئے اس سے یہی سوانح قاسمی مراد ہوگی۔

مجرب نسخہ کوئی نہیں''۔ گویا اس دور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی، ان اصولوں کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کی جا چکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ آج اجتماعی مساعی کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اس نے بدیشی غلامی سے نجات پائی۔ وہ سرموان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والاؒ تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجراء مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے۔ اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد وطبقات اپنی زندگی حکومت متسلطہ کے رحم وکرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت ووفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھے ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوت کا پرداز ...... پھر حضرت والاؒ نے ان اُصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جبکہ ملک کے بارسوخ طبقات، بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشاء حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراک عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد وسر بکف علماء ومفکرین کے ساتھ تحقیر وتمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جارہا تھا۔

گویا ''اینٹی مُلّا ازم'' کا پروانہ بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جارہا تھا لیکن حضرت والا کے ان اساسی اصول پر قائم شدہ نظام میں جہاں بدیشی اقتدار کی شکست وریخت کے نتائج مخفی تھے وہیں ان میں اس تحقیر وتمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطۂ حکومت نہ تھا بلکہ رابطۂ عوام کا استحکام تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلط اقتدار کے خلاف مشینی قوت کی بجائے عوامی قوت ہی موثر ثابت ہوسکتی جسے حضرت والاؒ نے پرکھ لیا تھا۔ جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوت براہ راست انہیں علماء کے ہاتھ میں تھی اور رہے ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھکتا جو اس عوامی قوت پر قابض اور جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ جن علماء کو نکما اور بیکار یا قوم پر ناحق بار باور کرایا جارہا تھا جونہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوت سے حکومت متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو وہی ''اینٹی مُلّا ازم'' والے طبقات ملاؤں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور اسٹیجوں پر وہی تمسخر ونفرت اظہار عقیدت ونیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علماء جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے وہ بالآخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چاروناچار ان کے کارآمد ہونے کو تسلیم کرلیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر وبیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ ..... ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علماء بالآخر

آزادیٔ ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے اور جو کام شاملی کے میدان میں تلواروں سے پورا نہ ہو سکا تھا وہ امن کی زبان وقلم سے پورا ہو گیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند نے جو مسجد چھتہ کے عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر تھے حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ ''اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا''۔ ارشاد فرمایا: ''حاجی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں''۔

یعنی تشدد اور تلوار کے راستہ سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدم تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۵۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکہ کو ان اصول ہشتگانہ کی دفعات کے تعلیمی رنگ سے بھر دیا۔ جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے اور بقول صاحب سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور موثر تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی قدر و قیمت...... اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کیساتھ مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ناظم جمعیت علماء ہند نے اپنی مشہور تصنیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدین شاملی نے بنایا اور ۵۷ء کے بعد ان کے پیشرو حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے ابھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصول ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا۔ جو اس اقامتی تربیت گاہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے لئے آپ نے وضع فرمائے۔ دارالعلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہنڈیا کا ابال چھلکا تو چولہے کے گرد و پیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبید اللہؒ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلا واسطہ سنا کہ ''میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی، بالخصوص یورپ و ایشیا کے متعدد انقلابات کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پا سکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کر دوں گا''۔

رئیس الاحرار کا غایتِ تاثر...... رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۴ء میں جب بسلسلہ تحریک خلافت دیو بند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے۔ اور غایت تاثر سے بیساختہ فرمایا کہ ''یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا عقل محض سے کیا واسطہ''؟ چنانچہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوق اخفاء کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل نکل گئے ہیں کہ ''یوں معلوم ہوتا ہے'' اور ''یوں نظر آتا ہے'' اور ''ایسا ہو جائے گا'' وغیرہ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحب اصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

انقلاب ۴۷ء کے اولین ہیرو...... بہرحال ان اُصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے۔ اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو قدرتاً وہی سمجھے جا سکتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے۔ جس پر آزادی خواہ، طبقے بعد میں آئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول وعمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر رہے۔

بہرحال حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقدار کو پامال کر چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ، ضعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھایا۔ صف کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں صبح کو جاگے قومی حکومت میں اور اسی طرح ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی گئی۔ گو متسلطہ طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کر دیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی تلافی والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لئے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جہاد کی قوت قائم رہے۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا۔ مدرسہ حربیہ ہو گیا تو حضرت والاؒ نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالت شرعیہ کا قیام...... دوسری طرف قومی محکمہ قضا قائم فرمایا تاکہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقہ اثر میں عدل وقسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ

میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ ابھرا رہے چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہل دیوبند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ ''کوئی مقدمہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے۔ اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسمؒ صاحب تھے''۔

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برسہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں الجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس دارالعلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ جب اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیوبند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہوگئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلط قوت کا اثر ورسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دارالعلوم میں صنعت وحرفت کے شعبہ کا مقصد...... اسی کے ساتھ حضرت والاؒ نے دارالعلوم میں صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاکہ ادارہ کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔

بظاہر یہ مقابلہ تھا اس ردکا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطہ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکاری جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا ردعمل صحیح معنی میں یہی ہوسکتا تھا کہ لوگ اس غلامی امور تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء واستغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت وحرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دارالعلوم کے ذریعے ''ہندو مسلم'' کا پرداز...... ایک طرف دارالعلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہوسکیں۔ چنانچہ دارالعلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت والاؒ کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلاتفریق مذہب وملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم کو عنایت کریں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع نول کشور لکھنو تھے جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دارالعلوم میں بھیجا۔ جس پر دارالعلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ ودعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کر کے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس ادارہ کو عوامی نہیں بلکہ ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پرداز بھی ڈال دیا گیا۔

دارالعلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر...... بلکہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس دارالعلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لئے حاصل ہوں بلکہ اسے عالمگیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس علمی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ترکی کی خلافت جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی سے انتہائی شد ومد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی جنگ روس سے ہوئی تو حضرت والاؒ نے ترکی کے لئے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ' اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز، کپڑا، زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لئے قربان کر دیا۔

تنظیم ملت کا نیا خاکہ......اس سے اندازہ کرلیا جائے کہ اس دارالعلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خود مختاری' حق خود ارادیت، معاشی استغناء، وسائل قوت کی فراہمی، رابطہ عوام، تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کارفرما تھے۔ اور دارالعلوم کی تاسیس ایک خاص مکتب فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والاؒ کے اصول ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہو سکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیرداروں پر تکیہ کر کے ان کے فخر رانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ کہ حکومت وقت کے علی الرغم رابطہ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیم ملت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم و تعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فن سپہ گری کے شعبہ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جسے حضرت والاؒ نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والاؒ صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے؟ جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والاؒ شرعی محکمہ قضا قائم فرما کر اعضاء مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کئے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہئے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بلا تخصیص مذہب و ملت چندے قبول کئے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا و شکریہ سے

ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض محض کتابی درس وتدریس تھی تو حضرت والاؒ اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ترکی سے رشتہ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتہ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتہ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتب درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرت اسے ایک ملی جلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرما رہے تھے جن کے نظام کار میں علم وعمل، معاش ومعاد، قوم ووطن اور دین ومذہب کی حمایت ونصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے جو حضرت والاؒ کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلا متوسلین میں حسب استعداد وقابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیام دارالعلوم کا بنیادی محرک!...... بہر حال دارالعلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کار اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کر رہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لیکر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لئے بقول حضرت شیخ الہندؒ یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ، حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی اور حاجی صاحبؒ کے لوگوں میں بالآخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب ودماغ کا جوہر بن گئی جنہیں حاجی صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقاوترویج اور اظہار واعلان کی توقع ہوسکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول ونظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصول آزادی کی امین شخصیت...... بہر حال ان اصول ہشت گانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دارالعلوم دیوبند ہے اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی تلافی کر دکھائی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر دنیا اس کے نصب العین پر آ کر رہی اور آزادی ملک وملت کے لئے جو خاموش راہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپگنڈوں کے شور محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لئے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منا رہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا، آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو ہو

کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے تا آنکہ آزادی سامنے آکھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقعہ ملا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند (۱۵ اگست ۱۹۵۷ء)

اکابر دیوبند اور آزادی ہند

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّـا بَعْـــدُ !

شیریں ثمر کے حصول پر تبریک...... بزرگانِ ملت! علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم! یہ آج کا مبارک (۱) دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندہ گلید سلون نے اپنے ایام زندگی میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذروں کے اڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوان بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانی اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

اکابر ملت اور جہاد آزادی...... ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر ہم ان اکابر ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب کہ آزادی کے تصور سے بھی اس ملک کے دل ودماغ خالی تھے وہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہے تھے۔ آخر میں ۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اسی تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔

۵۷ء میں بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ بقول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت امداد اللہ

(۱) ہندوستان کی آزادی کے موقع پر ۱۵؍۱۶ اگست ۴۷ء کی درمیانی شب میں نماز تراویح کے بعد علماء وطلباء دارالعلوم اور اہل شہر سے خطاب۔

قدس سرہ کی قیادت میں تلوار اٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اتر پڑے۔لیکن وقت مقررہ نہیں آ پہنچا تھا اس لئے فتح کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا۔ ملک آزاد نہ ہوا۔ لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے الگ نہ ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دنیا وفاداری کے جذبہ سے سرشار تھی۔انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن سے آیات جہاد کو خاوج کر دینے کے مشورے اور منصوبے قائم کئے جارہے تھے۔ دیوبند کے لمبے کرتے والے مولویوں کو باغی کا نام رکھ کر مطعون کیا جارہا تھا لیکن یہ جماعت اپنی دھن میں تھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس دنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے جوان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے۔اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریک آزادی اس وقت جاری رکھی جب کہ انگریزوں کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا۔ نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آ گئے اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق ’’شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثے میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا‘‘۔

بہرحال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ ومنصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ایک جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حق بحقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے۔

شیخ الحدیث دارالعلوم کی پیشین گوئی...... ان بزرگوں کا ہر وقت یہی ذکر تھا اور یہی فکر، اسی کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں عام نظم اور انتظام چھتہ کی مسجد میں یہ سب بزرگ جمع تھے اور انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں نے گہرے پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ فرمایا ’’حاجی صاحب آپ کس خیال میں ہیں؟ وہ وقت دور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالت امن وسکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا اور انقلاب ہو جائے گا۔ رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں!‘‘۔

لیکن آج دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پندرہ اگست کی رات لوگ حسب معمول دس گیارہ بجے سوئے تو انگریزوں کی عملداری میں تھے۔ اور جب پندرہ اگست کی تاریخ شروع ہوئی تو ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر دوسری

عملداری تھی۔ سوئے ایک عملداری میں اور جاگے دوسری عملداری میں۔

آزادی ہند کی جدوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے کی...... میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج کی آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں ببانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا کہ ''ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا''۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخہ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا۔ شیخ الہندؒ نے اسی نسخہ کو معجون مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کر دیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کر سکے۔ چنانچہ وہ استعمال عام شروع ہو کر عام ہو گیا۔ تحریک خلافت میں بھی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہر حال استعمال عام شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گزر کر ابناء وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرہ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، جن کی تخم ریزی اور تردد سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات...... ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ ملک کی آزادی کی یہ پہلی قسط ہے۔ اس کی دوسری قسط جون اڑتالیس میں سامنے آنے والی ہے۔ لیکن ان اکابر مرحومین کا مقصد اس سے بھی آگے ہے۔ ہمیں آزادی کی دوسری قسط اور پاک نصب العین کی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے اور اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی کمر کھولنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہماری مبارک باد کی مستحق ہندوستان و پاکستان دونوں سلطنتیں ہیں۔ ''ہم پاکستان کو مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارکباد دیتے ہیں''۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل...... میں اس تصور کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمان اب ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات...... وہیں اس فکر کا موقعہ بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کر کے ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہو جائیں اور اسلام کے کلمہ پر ایک ہوں ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں۔ صرف ظاہری طور پر ایک نہ ہوں بلکہ حقیقی طور پر ایک

ہوں۔اسی ایک جملہ میں ان کی حیات اجتماعی کی لمبی چوڑی داستان پنہاں ہے۔ان کے لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کردیئے جائیں طعن وطنز کا سلسلہ ترک کردیا جائے ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ رکھیں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ انہیں متحد ہو جانے کے لئے اخوت ومساوات کی کتنی تدابیر ہوسکتی ہیں جو وہ آج عمل میں لاسکتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں وحدت جماعت کی ضرورت......میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب وقت ہے کہ ہم متحد ہوں پہلے سے زیادہ اب امکانات ہیں کہ ہم متحد ہوسکیں۔وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں۔اس انقلاب سے منقلب ہو چکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں۔اس لئے اب بجائے اس کے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدت جماعت کا سنگ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں۔میں آخر میں مکرر مبارک باد پر جو مسلمانوں کے لئے اور پورے ایشیاء کے لئے ہے اس تقریر کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

پس منظر......حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی تحریک اور نائب مفتی احمد علی صاحب سعید کی تائید سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی قرات سے جلسہ کا آغاز ہوا۔حافظ اخلاق احمد صاحب محرر دارالافتاء نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی جانب سے فارسی کا قصیدہ خیر مقدم پڑھ کر سنایا۔محمد حسیب دیوبندی طالب علم نے اردو نعت اور فضل الرحمٰن ابن قاری حفظ الرحمٰن نے عربی قصیدہ سنایا۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو ۔۔۔ تو کجا بہر تماشا مے روی

نہایت خوشی کا مقام ہے جس جگہ ہم سب جمع ہیں یہ کوئی معمولی نہیں ہے۔تذکرۃ الرشید میں ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ۔

''میں خانہ کعبہ کے در پر کھڑا ہوں اور میرے پیروں کے نیچے سے نہریں نکل کر تمام عالم میں پھیل رہی ہیں''۔اس خواب کا مصداق دارالعلوم اور اس کی شاخوں کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے خلیفہ اعظم تھے۔شاہ عبدالغنی صاحبؒ تلامیذ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ پر اور خلفاء میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر فخر کیا کرتے تھے۔چنانچہ تصوف میں مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا بڑا درجہ تھا۔انہوں نے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ علم کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دی گئیں وہ تعجب کرتے تھے کہ میرا علم میں کوئی بڑا درجہ نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہوا؟ مگر جب وہ دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعہ سے علم دنیا میں پھیلا۔

ایک دوسرا خواب انہوں نے ہی یہ دیکھا تھا کہ ''مدرسہ کے چمن میں خانہ کعبہ ہے اور لوگ اس کا طواف کر

رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی معنوی حیثیت اسلام میں وہ شان رکھتی ہے جو عالم میں خانہ کعبہ کے انوار و برکات لئے ہوئے ہیں''۔ ہماری عملی حالت گو بہت گری ہوئی ہے مگر خدا کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے ہم سے اس مرکز کی خدمت لی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ کے ان مکاتیب میں جو ابھی چھپے نہیں ہیں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب جہانگیر نے ان کو قید کر کے دہلی بلایا تو ان کا دیو بند سے گزر ہوا تو فرمایا کہ ''اس جگہ سے علم نبوت کی بو آتی ہے''۔

چنانچہ اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے علم شریعت وعلم نبوت کا مظہر قرار دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے جب ہمارے مہتمم صاحب کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرمائیں تو بگڑ کر فرمایا کہ ''کیا خوب! تمہارے مدرسہ کے لئے؟ نہ معلوم ہماری کتنی راتیں اس دعا کی نذر ہوئی ہیں۔ اور اب مدرسہ اپ کا ہو گیا۔ فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا خیال تھا کہ علم شریعت کا کوئی مرکز بننا چاہئے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دیو بند کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے''۔

بہر حال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم سب سے یہ خدمت لی۔ دارالعلوم کو جو فضیلت ان بزرگوں کے ذریعہ سے حاصل ہے وہ کسی دوسری جگہ کو نصیب نہیں ہے۔ علم کے اللہ نے بڑے بڑے مرکز مقرر فرمائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عراق، شام، مصر، خراسان، بخارا اور سمرقند وغیرہ۔ پھر دیو بند کے حصہ میں یہ دولت آئی۔ دینی علوم کی ترقی جس قدر آپ کو یہاں ملے گی وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے۔ ﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ ①

یہاں کے دیہات میں علم کا جو اثر ہے وہ دوسری جگہ کے شہروں تک میں نہیں ہے۔ ہمارے محترم بزرگ حضرت مہتمم صاحب گو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ان کو خاندانی جو نسبت حاصل ہے اور ان کا جو منصب ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ ہمارے سب کے سردار ہیں۔ ہمارے لئے افسوس کا موقع تھا کہ وہ دوسری جگہ پاکستان رہ جاتے۔ اگر چہ جانا عارضی تھا مگر یہ افواہیں سن سن کر اب واپسی نہیں ہوگی ہم کو تکلیف ہوتی تھی مگر۔

یوسف گم گشتہ باز آ یا بکنعان غم مخور

الحمد للہ! ہمارے صدر مہتمم صاحب حضرت نانوتوی کی آنکھوں کے تارے تشریف لے آئے ہیں۔ ہم جس قدر بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے۔ ان کا قیام اگر پاکستان میں ہوتا تو بھی فیض سے خالی نہ ہوتا مگر ہمارے لئے قلق کا باعث ہوتا۔ آپ کے لئے سر چشمہ فیض خانہ کعبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے سفر کے تاثرات سے بھی مستفیض فرمائیں گے تا کہ وہ مستقبل میں ہمارے کام آئیں۔

حضرت مولانا کی تقریر کے بعد مولوی غلام حیدر اور مولوی عبدالاحد صاحبان کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد ذیل کا شعر پڑھ کر اپنے تاثرات بیان فرمائے۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۱.

حدیث پاکستان

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّـا بَعْــــــدُ !

عظیم الشان نفع ...... بزرگانِ محترم!

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

میں حیران ہوں کہ بیان تاثرات کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤں مجمع اکابر کا ہے۔اساتذہ کا اجتماع ہے۔ بزرگوں کے اجتماع میں قوت گویائی یارانہیں دیتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ارشاد ہے کہ اپنے ان تاثرات کا اظہار کروں جو ہر شخص کچھ نہ کچھ سفر سے لے کر آتا ہے۔

اول تو پاکستان جانے میں جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا وہ دعائیں ہیں جو بزرگوں نے فرمائیں۔اگر میں پاکستان نہ جاتا تو یہ دعائیں حاصل نہ ہوتیں۔پھر بزرگوں کے حوصلہ افزا کلمات میسر نہ ہوتے۔حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب نے اپنی نظم میں جس تاثر کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔اور حضرت شیخ مدظلہ العالی کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں وہ تو ہم سب کے لئے انشاء اللہ وسیلہ نجات ہیں۔حضرت نے اس ناکارہ کے بارے میں جو کلمات فرمائے ہیں۔"میری درخواست یہ ہے کہ وہ انہیں یاد رکھیں اور قیامت میں انہی الفاظ میں گواہی دے دیں تاکہ میرے لئے وہاں نجات کا باعث ہوں کہ یہ کلمات ہی میرے لئے دستاویز نجات ہیں"۔

(اس موقع پر وفور جذبات سے حضرت مہتمم صاحب پر رقت وگریہ طاری تھا۔ممدوح کی اس حالت کا مجمع پر بھی زبردست اثر پڑا اور لوگوں کے بے ساختہ آنسو نکل آئے) چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔

پاکستان جانے کے مقاصد ...... میں یہاں سے پاکستان تین مقصد لے کر گیا تھا۔ایک عزیز اقرباء سے ملاقات تھی،جن کا عرصہ سے تقاضا تھا۔وہاں کے مدارس سے بھی طلب تھی اور جلسوں میں شرکت کے کے خطوط بھی برابر آرہے تھے۔اس مرتبہ کوشش کی کہ ہو آؤں۔چنانچہ سفر کا یہ مقصد میں نے حکومت کے سامنے بھی ظاہر کر دیا تھا۔

دوسری غرض دارالعلوم کا مفاد تھا۔دارالعلوم ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہاں سفر بھی

کئے۔اور بساط کے موافق جتنی کوشش ہوسکتی تھی کی اس کے اثرات اور منافع بھی بحمد اللہ ظاہر ہوئے۔

تیسرے تبلیغ واصلاح کا سلسلہ جو ہر شخص کا فرض ہے اور قدرتی طور پر میرے دل میں بھی ہے ایک اہم مقصد سفر تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور اصلاح دینی کی سعی کی گئی۔ میں نہ سیاسی آدمی تھا، نہ ہوں۔اس لئے زیادہ تر اجتماعات، اخلاقی مواعظ و پند پر مشتمل ہوتے تھے۔

دنیا کا عمومی دینی انحطاط......دینی حالت پاکستان و ہندوستان کیا، ساری دنیا کی یکساں ہے۔آج حقیقی طمانیت تمام دنیا سے مفقود ہے۔ دنیا اس وقت ایک بے اوڈھک کرہ کی طرح اضطراب اور حرکت میں ہے۔ ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے۔آج جہاں سے بھی خبریں آتی ہیں وہ عام بدامنی، عام طور سے بے چینی، بے سکونی، لڑائیوں اور فسادات کی تو آتی ہیں۔ صلاح ورشد کی اطلاعات کہیں سے نہیں آتیں حجاز سب سے بڑا مرکز دین ہے۔خود وہاں کی حالت بھی دینی اور اخلاقی حیثیت سے بلند پایہ نہیں۔

تیسرے سال جب مجھے وہاں حاضری کا موقع ہوا تو میں نے دیکھا کہ عصر کے بعد ہزاروں آدمی جبکہ طواف بیت اللہ اور ذکر اللہ میں مشغول تھے۔مکہ کے چند نوجوان جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔حرم محترم میں انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔جس میں عریاں تصویریں تھیں۔ان تصویروں کی خوبیاں بیان کرنے اور یورپ ولندن کے تمدنی مسائل کی بحث میں مشغول تھے۔گویا وہ ان طواف و ذکر کرنے والوں کو احمق سمجھ رہے تھے۔اور ان کے نزدیک ان عریاں تصاویر کی دید بیت اللہ کی دید کے مقابلہ میں زیادہ باوقعت تھی۔ مجھے بڑی ضیق ہوئی۔حرم محترم میں بیٹھ کر بیت اللہ کے سامنے قبولیت کے اوقات میں تصاویر پر بحث کرنا بہت ہی ناگوار گزرا۔میں چپ رہا یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی اور لوگ نماز میں مشغول ہوگئے۔نماز کے بعد دیکھا تو انہوں نے پھر یہ مصور اخبار سنبھالے اور پھر وہی بحث چھیڑی تنگ ہوکر میں نے عرض کیا کہ ''عزیزو! مشرق ومغرب کے لوگ جو آپ کی تقلید کرنے یہاں آتے ہیں جب آپ عمل کا یہ نمونہ پیش کریں گے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ آپ کو اپنا مقام خود سمجھنا چاہئے۔آنے والے آپ سے اسلام کا نمونہ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں''۔حاصل یہ ہے کہ اخلاقی حالت آج ہر جگہ یہ ہے تو ہندوستان اور پاکستان تو پھر بعد کی چیز ہے۔ بہرحال ہر ملک کی طرح پاکستان بھی دین کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاج اصلاح ہے۔

اصلاح کی ذمہ داری......اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہے؟ حقیقت میں مسلمانوں پر، مسلم کو خیر الامم کہا گیا ہے جس طرح جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء ہیں۔اسی طرح آپ کی امت بھی امام الامم ہے۔اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو مقتدیوں کی تو نماز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔پھر مسلمانوں میں سب سے زیادہ اصلاح خلق اللہ کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری بھلادی ہے۔اگر وہ خود خلیق ہوں تب دوسرے بااخلاق بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے......وہاں اس وقت دینی حیثیت سے تین فتنے مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ایک قادیانی فتنہ۔دوسرا شیعیت کا فتنہ۔اور تیسرا مغربیت کا فتنہ۔

قادیانیوں نے اپنا مرکز کوئٹہ بلوچستان کو بنالیا ہے۔مرزا بشیر الدین نے اعلان کر دیا ہے کہ قادیانی بلوچستان کو سنبھالیں۔چنانچہ انہوں نے کوئٹہ میں اپنا مرکزی دفتر کھول دیا ہے۔جو ایران، مصر اور دوسرے ممالک اسلامیہ کا دہانہ ہے۔انہوں نے ملتان میں ایک عظیم جلسہ کا اعلان کیا ہے جس میں ان کے نزدیک پچاس ہزار قادیانیوں کے جمع ہونے کا امکان ہے۔جلسہ کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا میں پھیل کر قادیانی مسلک کی اشاعت کی جائے۔

انہوں نے اپنے چند افراد مصر وغیرہ بھیج کر انہیں عربی بول چال کا ماہر بنالیا ہے۔اور بطور شو کے ان کی عربی تقریریں پبلک کے سامنے کراتے ہیں۔تبلیغ کا نظم سامنے لاتے ہیں اور اپنی مساعی کی روداد پیش کرتے ہیں۔اس طرح سے اہل حق اس باطل کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ادھر ان عربی دانوں کے ذریعہ ممالک اسلامیہ میں اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دوسری طرف شیعوں نے ملک میں مختلف انداز سے شیعیت کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔جس سے سادہ لوح عوام شیعیت کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ فتنہ بھی فروغ پا رہا ہے۔

تیسرا فتنہ مغربیت یا آزادی اور بے قیدی کا ہے جس کے راستہ سے بے دینی اور بے حیائی کی تخم ریزی ہو رہی ہے۔اس جماعت کے نزدیک سرے سے مذہب ہی کی اہمیت نہیں۔مغربیت کے اس فتنہ سے الحاد اور بے دینی بڑھ رہی ہے۔گویہ فتنہ اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔تاہم ہمیں اور جگہ سے بحث نہیں۔

فتنوں کا سدِ باب......ایک زمانہ میں ان فتنوں کا دار العلوم نے سدباب کیا تھا اور آج بھی دار العلوم ہی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے ذیل میں کمیونزم اور کیپٹل ازم وغیرہ کے سیاسی فتنے پھر سر ابھار رہے ہیں۔جن کا سدباب علمائے حق کا کام ہے۔میں نے تو وہاں کے علماء کو توجہ دلائی کہ اگر مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست ہو جائے تو دوسری اقوام کی حالت درست ہو جائے گی بلکہ اخلاق درست کر لئے جائیں تو پاکستان و ہندوستان دونوں کے درمیانی معاملات کی حالت بھی درست ہو سکتی ہے۔

ایک حدیث قدسی میں یہ فرمایا گیا ہے''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی قوم کی بدعملی پر ناخوش ہوتا ہوں تو دوسری اقوام کے دل میں اس بدعمل قوم کی طرف سے بغض وعداوت بٹھا دیتا ہوں اور وہ جلاد بن کر مجرم قوم پر مسلط ہو جاتی ہیں۔اور قتل وغارت کے ذریعہ اسے سزا دیتی ہیں۔پس اگر تمہیں یہ سزا اور بے کسی اور مغلوبیت ناگوار ہے تو تم کسی قوم کو برامت کہو۔میرے ساتھ معاملہ درست کرو، میں اقوام کے قلوب میں پھر تمہاری محبت ڈال دوں گا''۔اس لئے میں تو دوسری اقوام کی بدحالی کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد کرتا ہوں۔اگر یہ قوم درست ہو جائے تو سب اقوام درست ہو جائیں۔

اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات...... بہر حال جیسے عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاج اصلاح ہے۔ جو علمائے حقانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آ گئی ہے اور اصلاح کے راست کچھ بند سے ہو گئے ہیں۔ طلباء کا ادھر سے آنا منقطع ہو گیا ہے اور دارالعلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کی سعی پر حکومت ہند نے طلباء کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔

اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دارالعلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلبائے علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ نہ صرف وہاں سے طلبہ کی آمد پر ہی سے پابندی ہٹا لینے کی ضرورت ہے بلکہ یہاں سے وہاں مبلغین کی آمد و رفت کو بھی آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے خیر سگالی کے وفود سے زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوگا۔ کیونکہ مبلغین ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کریں گے اور اخلاق جس حد تک درست ہوں گے اور کردار جس حد تک کسی ملک کا اونچا ہوگا۔ اسی حد تک دوسرے ممالک اس سے مطمئن ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیں گے۔

بڑی امید افزاء خوبی...... آج کل اخلاقی حالات کے بگڑ جانے سے ہی عموماً بگاڑ آیا ہوا ہے۔ ہاں! مگر جہاں عام دنیا کی حالت ہے وہاں دینی حیثیت سے یہ خرابیاں ہیں وہیں ایک بڑی امید افزاء خوبی بھی ہے جو اور جگہ کم پائی جاتی ہے اور وہ ہے طلب اصلاح اور حسن قبول یعنی وہاں پر ہر بڑے چھوٹے میں اصلاح کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے لئے ہر قسم کے علماء کی ضرورت ہے۔ ایک خالی الذہن کے لئے خطابات سے سمجھا دینا کافی ہوگا۔ ایک عقلیت پسند کے لئے حکمت و استدلال کی ضرورت ہوگی اور ایک کٹ حجت کے لئے الزامی جوابات اور خود اس کے مسلمات سے اس پر حجت قائم کرنا ضروری ہوگا۔ قرآن نے ان ہی تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ ① پس جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی زبان میں انہیں سمجھانا ہوگا۔ اس لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔

اعلان استغناء...... ہاں! پھر اسی کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کو قلبی استغناء کی بھی حاجت ہے۔ اصلاح میں جس قدر بھی رکاوٹ یا تاثیر میں جتنی بھی روک ہوتی ہے وہ مصلح کی طمع سے ہوتی ہے۔ مخاطب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مصلح غرض مند تو نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی غرض مندی کا شبہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اس لئے جہاں قلبی استغناء درکار ہے وہیں اعلان استغناء بھی ضروری ہے تا کہ اصلاح محض لوجہ اللہ ہونے سے قلوب پر اثر انداز ہو، گویا تبلیغ کی تاثیر کے لئے استغناء بالخاصہ ضروری ہے۔ اس لئے قران حکیم نے بتلایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موعظت و اصلاح کے وقت خصوصیت سے اعلان استغناء فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ

① پارہ: ۱۵، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۲۵.

اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ ① اگر اس طرف سے طلباء آنے لگیں اور اس طرف سے مبلغین جانے لگیں تو دونوں حکومتوں کے کردار پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے جیسا کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

دیانت عمل کی تاثیر..... تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے جلسہ کی صدارت کے لئے میرا حیدر آباد سندھ جانا ہوا تھا، جلسہ کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کرنا چاہا جس کو مان لیا گیا۔ عصر کے بعد موٹریں آئیں۔ شہر سے باہران کی کوٹھی پر پہنچے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اس لئے طبیعت نماز کے لئے بے چین ہوئی۔ جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور کہا کہ غالباً آپ لوگ نماز کی وجہ سے مضطرب ہیں تو مسجد یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے۔ مسجد تک جاتے جاتے نماز کا وقت جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو نماز ہمارے مکان ہی میں پڑھ لیجئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساری زمین ہمارے لئے مسجد ہے۔

اس قرارداد کے بعد کا منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ وہ لوگ پانی وغیرہ لا رہے تھے سفید تولئے لا رہے تھے، چادریں بچھا رہے تھے۔ قبلہ کی سمت بھی انہوں نے تشخیص کر کے بتلائی۔ ہم نے اذان دی اور نماز ادا کی۔ اور وہ سب مرد، بچے، بڑے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ جب ہم لوگ نماز اور معمولات سے فارغ ہو چکے تو وہ آگے آئے اور کہا کہ ”ہماری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ہمارے گھر پر بھگوان کا نام لیا جائے“

مجھے ان کے ان الفاظ کی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ یہ آپ کی نیکی کی بات ہے مگر عام طور سے تو لوگ نماز کے بارے میں اور مسجدوں کے معاملہ میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مسجد اور باجہ وغیرہ کا جھگڑا روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا' جیسے آدمی ہوتے ہیں ویسا ہی ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے چڑانے کو نماز پڑھیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے۔ بہر حال اگر مسلمان دیانت عمل کا مجسمہ بن جائیں تو خود بخود لوگوں کے دل میں کشش پیدا ہو جائے۔ غلط نمونہ پیش کر کے خود ہم نے لوگوں کو دین سے دور کر دیا ہے۔ گویا ہم مبلغ بننے کی بجائے تبلیغ دین کے حق میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا نمونہ عمل دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کے یہی معنی ہیں تو ہمارا اسلام کو سلام ہے۔ بہر حال دارالعلوم اپنی بنیادوں کے لحاظ سے مصلح ہے اور لوگ اس کی اصلاحی مساعی سے اثر لیتے ہیں۔ اس وقت اسے اخلاقی اور دینی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

قدر دارالعلوم...... ہم کو دارالعلوم کی قدر یہاں بیٹھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ دارالعلوم سے باہر جا کر قدر ہوتی ہے کہ وہ کیا نعمت ہے؟ جب مجھے واپسی کی راہ کچھ مسدود سی نظر آئی تو اس وقت دارالعلوم کی فضا ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے لگی کیونکہ یہ ماحول ہر جگہ میسر نہیں۔

مجھے عید الاضحیٰ کراچی ہی میں پڑھنے کی نوبت آئی اور ظاہر ہے کہ چودہ لاکھ کے شہر میں عید کے اجتماع کا منظر کتنا اعلیٰ ہوتا ہوگا۔ لاکھوں کے مجمع میں ایک جگہ عید پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تلاش طلباء و علماء کے ماحول کی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰۹۔

رہی۔ اور میں اس عید کا متلاشی تھا جس میں دارالعلوم جیسا ماحول ہو۔ میں نے مولانا محمد صادق صاحب کے مدرسہ کے مجمع کے ساتھ نمازِ عید پڑھی کہ وہاں کا ماحول کچھ طلباء اور علماء کا تھا مگر پھر بھی کمال تسکین واطمینان حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مدارات میں کمی نہیں کی۔ قدم قدم پر وسائل راحت تھے۔ پبلک نے مجھے دارالعلوم قائم کرنے کو کہا اور تین لاکھ کا فنڈ بھی پیش کیا۔ لوگ وہاں کے قیام کے لئے مضبوط دلائل بھی بیان کرتے تھے مگر اس کے باوجود قلبی رجحان اور وجدان دارالعلوم کے ماحول کا متلاشی تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصرّف...... میرے اصرار واپسی کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قلب میں قیام سے توحش کی بنا در حقیقت حضرت شیخ مدنیؒ کا تصرف ہے جو وہاں بیٹھ کر وہ کر رہے ہیں۔ اور اس لئے آپ یہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ بہر حال میرا قلبی رخ کسی بھی وجہ سے ہو یہی تھا کہ میں حاضر ہوں۔ الحمدللہ کہ حاضری ہوگئی۔ اور آپ بزرگوں اور دوستوں کی زیارت کا حق تعالیٰ نے موقع میسر فرما دیا۔ پھر بھی وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی محبانہ مہمان نوازی اور غرباء پروری کے نقوش دل میں نقش رہیں گے۔ باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کی حاضری حضرت شیخ کی ظاہری وباطنی توجہ بلکہ تصرف سے ہوئی اور دارالعلوم کی خدمت کا دوبارہ موقع ملا۔

قمیص عثمانی...... میرے محترم بھائی مولانا عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی نبیرۂ حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اس خدمت دارالعلوم کو قمیص عثمانی سے تشبیہ دیتے ہوئے مجھے وہاں لکھا تھا کہ آپ کو اپنے ارادہ واختیار سے اس قمیص عثمانی کو نہ اتارنا چاہئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قمیص عثمانی کو اتارا نہیں ہے بلکہ تھوڑے وقفے کے لئے۔ جیسے غسل کے لئے کپڑے اتارے جاتے ہیں اور پھر پہن لئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے برائے تطہیر کچھ وقفہ کے لئے یہ لباس اتار کر رکھا ہے۔ عنقریب پہن لیا جائے گا۔

جذبات تشکر...... آخر میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ آپ حضرات نے کل سے اب تک جن پرخلوص جذبات محبت کو ظاہر فرمایا اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور اس کو اپنے لئے وسیلہ نجات تصور کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

امارت شرعیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (1) (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

روزِ مسرت...... بزرگانِ محترم! میرے لئے خصوصیت سے آج بہت ہی مسرت وخوشی کا دن ہے کہ اس مقدس مجمع میں کہ جس میں اس نواح کے امیر شریعت اور دوسرے بزرگان تشریف فرما ہیں۔ مجھے ان کی معیت کا بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ اوران کی برکات سے مستفیض ہونے کا بھی موقع ملا اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی رعیت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے کہ امیر شریعت کے سامنے تو سب رعایا ہی ہوتی ہے وہ باہر کے ہوں یا اندر کے ہوں۔

بہرحال ایک رعایا کی حیثیت سے اپنے امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ایک مستقل سعادت اور برکت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امارت کے سلسلہ میں چند طالب علمانہ باتیں آپ کی خدمت میں گزارش کروں زیادہ دیر تک تو عرض نہیں کرسکوں گا اس لئے کہ کچھ تو علیل ہوں اور باعتبار علم کے قلیل ہوں اوراسی کے ساتھ ساتھ صبح سے دماغی کاوش کا بار بھی اوپر پڑا ہوا ہے جس وجہ سے تعب اور تکان بھی پیدا ہوگیا۔

معالجوں کی طرف سے بھی مجھے ہدایت ہے کہ عشاء کے بعد نہ کسی جلسے میں تقریر کروں۔ اور نہ شرکت کروں لیکن بہرحال بزرگوں کا حکم ڈاکٹروں کے حکم سے زیادہ اونچا ہے کیونکہ ڈاکٹر معالج جسمانی ہیں اور یہ بزرگان دین معالج روحانی ہیں اور روح کو جسم پر قدرتی طور پر فضیلت حاصل ہے اس لئے معالجین روح کا حکم زیادہ واجب الاطاعت ہے بہ نسبت معالجین جسم کے۔ اس لئے تعمیل حکم کے طور پر بھی کچھ عرض کرنا ضروری تھا۔ مگر میں زیادہ

(1) پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

وقت نہیں لے سکوں گا صرف تھوڑی دیر چند طالب علمانہ باتیں مختصر طور پر گزارش کروں گا۔

اسلام کی بنیاد...... اسلام وسیع ترین اور عالمگیر دین ہے اور ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے۔ اور اس کی عمارت پانچ شعبوں پر قائم ہے۔ گویا اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں کہ جس پر اسلام کی تعمیر کھڑی ہے۔

1 ......اعتقادات 2 ......عبادات 3 ......اخلاقیات 4 ......معاملات 5 اجتماعیات

عقائد...... پہلا شعبہ اعتقادات کا ہے کہ آدمی کے عقائد درست ہونے چاہئیں اور عقیدے کی تین بنیادیں ہیں۔

1 مبداء 2 معاد 3 نبوت مبداء کے معنی یہ ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے۔ ہم کس طرح دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معاد کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ عمر گزار کر جائیں گے کہاں؟ اور نبوت کا حاصل یہ ہے کہ اس آمد وشد کے درمیان ہم زندگی کیسے گزاریں۔ یہ تین بنیادیں ہوئیں عقائد کی۔ مبداء ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ جس سے ہمیں ہستی ملی ہے اور وجود ملا ہے۔ اور وہ ہمارے وجود کی اصل ہے اور معاد بھی وہی ہے کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو مبداء بھی وہی ہے۔ اور معاد بھی وہی ہے۔ اور ہدایت کرنے والا بھی وہی ہے۔ کہ ہم زندگی کیسے گزاریں۔ تو سب سے پہلی چیز عقائد ہے کہ جس سے قلب انسانی صحیح ہو جائے۔ کیونکہ تمام اعمال عقائد ہی کے تابع ہیں۔ عقیدہ اگر غلط ہے تو عمل خود بخود غلط ہو جائے گا خواہ آدمی اچھی نیت ہی سے کرے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو سارے اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ جب اعمال صحیح ہوں گے تو احوال بھی صحیح ہوں گے۔ اور جب احوال صحیح ہوں گے تو انجام بھی صحیح ہو جائے گا۔ تو ابتداء سے انتہاء تک انسان عقائد کی صحت کی بناء پر صحیح ہوگا۔ اس لئے سب سے بڑی بنیادی چیز اسلام میں عقائد کا درجہ ہے جو قلب کے اندر پیوست کیا جاتا ہے۔

عبادات...... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے کہ ان عقائد کے تحت اللہ تعالیٰ کو کس طرح سے یاد کیا جائے، عبادت کس طرح سے کی جائے۔ عبادت کے معنی ہیں غایت تذلل یعنی معبود کے سامنے ایسے ذلت اختیار کر لینا جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عزت لامحدود ہے۔ کوئی عزت کا درجہ نہیں جو اس کی ذات میں موجود نہ ہو۔ اس کے یہاں عزت کامل ہے اس لئے اس کے یہاں ذلت کامل یعنی ایسی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے کہ آدمی اس کے سامنے ذلیل نہ ہو جائے۔

تو عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس عزیز مطلق کے سامنے ذلیل مطلق بن جائے۔ اس کی عزت کسی حد تک رکی ہوئی نہیں۔ ہماری ذلت کسی حد پر رکی ہوئی نہ ہو اور یہ غایت تذلل اور انتہائی ذلت اللہ کے سامنے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی میں انتہائی محتاجگی ہو کیونکہ غنی کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا:

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج ‌ ‌ ‌ ‌ احتیاج است و احتیاج است و احتیاج

جو شیروں کو بھی لومڑی بنا دے وہ حاجت مندی ہے۔ غنا کے ساتھ کوئی کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ حق

تعالیٰ شانہ غنی مطلق ہیں، رفیع المرتبت ہیں، انسان ان کے سامنے ذلیل مطلق ہے اس کا کام ان کے سامنے ہر وقت جھکنا ہے کہ دل سے بھی جھکے، روح سے بھی جھکے، بدن سے بھی جھکے، قول سے بھی جھکے، فعل سے بھی جھکے ہر اعتبار سے اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر دے۔ یہ ہے عبادت۔ عبادت کے معنی فقط نماز روزہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ قانون اسلام کے تحت ذلت کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہ اگر کہیں کہ گھر میں فلاں کام کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اسی طرح کریں۔ اگر وہ فرمائیں کہ مسجد میں جاؤ تو ہمارا فرض ہے کہ مسجد میں جائیں اگر وہ کہیں کہ تخت سلطان پر امیر شریعت بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا فرض ہے کہ امیر بن کر بیٹھ جائیں اگر وہ کہیں کہ غلام بن جاؤ، فلاں کے تو ہم غلام بننے کو تیار ہوں۔ تو اظہار ذلت کے یہ معنی ہیں کہ عمل سے قول سے، فعل سے، حال سے، چال سے ہر اعتبار سے آدمی اپنی پستی، اپنی احتیاج اور اپنی حاجت مندی کا اظہار کر دے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔

اخلاقیات...... تیسرا شعبہ اخلاقیات کا ہے۔ عبادات اور عقیدہ درست نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ قلب کی حالت درست نہ ہو اور قلب محل اخلاقیات ہے۔ لہٰذا جب تک اخلاق انسانی صحیح نہ ہوں گے یعنی جب تک صبر نہ پیدا ہو، حیا نہ پیدا ہو، شکر نہ پیدا ہو۔ سخاوت نہ پیدا ہو، شجاعت نہ پیدا ہو، توکل علی اللہ نہ پیدا ہو۔ انابت الی اللہ نہ پیدا ہو۔ یہ ملکات جب تک ذہن میں نہ جمیں گے عقیدہ درست نہ ہوگا۔ عقیدہ درست نہ ہوگا تو عمل درست نہ ہوگا۔ اور عبادت درست نہ ہوگی۔ تو مدار آ کر ٹھہر جاتا ہے اخلاق پر۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاق کا ہے۔ لہٰذا اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اخلاق کو بلندی پر پہنچایا جائے۔ اور انسان کو جبلی طور پر جو بداخلاقیوں کے روگ لگے ہوئے ہیں یہ دور کر کے پاکیزہ اخلاق سے بدلا جائے۔ جبلی طور پر انسان میں حرص بھی ہے۔ بخل بھی ہے۔ حسد بھی ہے۔ کبر و رعونت بھی ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو مخلوق کے آگے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کو نکال کر کبر کی بجائے تواضع پیدا کی جائے۔ بخل کی بجائے سخاوت پیدا کی جائے۔ خود غرضی کی بجائے ایثار پیدا کیا جائے ہوس رانی کی بجائے قناعت کا جذبہ پیدا کیا جائے جب یہ اخلاق درست ہوں گے تو عقائد درست ہوں گے پھر اعمال درست ہوں گے اور جب اعمال درست ہوں گے تو انجام درست ہوگا۔ پھر زندگی بھی صحیح ہو جائے گی اور موت بھی صحیح ہو جائے گی۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاقیات کا ہے۔

معاملات...... چوتھا شعبہ معاملات کا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس طرح کا برتاؤ کریں معاملات میں نزاع ہو، جھگڑا ہو، اس کا سلجھاؤ کس طرح سے کریں۔ ہم ایک دوسرے سے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کریں، لین دین کس طرح سے ہو، قرض ادھار کے طریقے کیا ہوں گے، امانت رکھنے کے طریقے کیا ہیں اور ادائیگی کے طریقے کیا ہیں، اجارہ کے احکام کیا ہیں، اور زمین کے احکامات کیا ہیں تو معاملات کا شعبہ بھی اہم شعبہ ہے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے، اگر دیانت نہ ہو، امانت نہ ہو۔ لازمی طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوگا اور جب فساد پیدا ہوگا تو بدامنی پیدا ہوگی، جب بدامنی پیدا ہوگی تو نہ جان کی خیر رہے گی نہ

مال کی خیر رہے گی۔ ہر شخص غیر مطمئن رہے گا۔ پریشان رہے گا۔ اضطراب اور بے چینی قلب کا جوہر بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے معاملات کی صحت اور خوبی یہ بھی اسلام کا اہم ترین شعبہ ہے۔

اجتماعیات...... پانچویں چیز اپنی قومیت کو سنبھالنا ہے، یعنی اجتماعی حالت کو درست کرنا ہے قوم میں اجتماعی طور پر ایک تنظیم ہو، قوم ایک نظم کے تحت زندگی گزارے، بدامنی نہ ہو کہ ایک کا رخ ادھر کو ہو اور ایک کا رخ ادھر کو ہو، ایک مشرق کو جارہا ہے اور ایک مغرب کو جارہا ہے۔ یا ایک ادھر سے آرہا اور ایک ادھر سے دونوں ٹکرائیں آپس میں اور جھگڑیں اور خونم خون ہوں، بلکہ ایک نظم کے اندر پوری قوم جڑی ہوئی ہو۔ ایک نظام کے تحت چل رہی ہو۔ ہر ہر چیز اپنے محل کے اوپر قائم ہو۔

یہ پانچ شعبے ہو گئے ہیں۔ اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور اجتماعیات۔ ان پانچ شعبوں کو علماء کے ایک ایک طبقہ نے سنبھالا ہے اور لاکھوں علماء ایک ایک شعبے کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سنبھالا اور اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

متکلمین اسلام کی خدمات...... اعتقادات کو سنبھالنے اور ان کو ثابت کرنے کے لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ کھڑا ہوا جنہیں متکلمین کہتے ہیں، انہوں نے عقلی اور نقلی انداز سے عقائد کو حق ثابت کیا، استدلالات سے عقائد کا فطری ہونا ثابت کیا سب عقیدے فطرت کے مطابق ہیں، کوئی عقیدہ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اسلام میں اس کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ یہ ہی عقیدہ ہونا چاہئے۔

فطرتیں مطمئن ہیں کہ یہی عقیدہ درست ہے۔ ان حکماء اسلام نے حسی، عقلی، نقلی، فطری۔ ہر طریقے سے ثابت کر دکھایا، ایک ایک عقیدے کے لئے ہزار ہا دلائل قائم کئے اور اس سلسلے میں بڑی بڑی، ضخیم ضخیم، عظیم عظیم کتابیں لکھی گئیں اور حجت و برہان سے عقائد مضبوط ہو گئے۔ اس لئے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کے سامنے اور ان کے عقائد کے سامنے، اللہ جزائے خیر دے متکلمین حکماء اسلام کو کہ انہوں نے اس سلسلہ میں خدمت کی اور اس دائرہ اعتقادات کو سنبھالا اور ثابت کر دکھایا کہ حق یہ ہی ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

ائمہ اجتہاد کی خدمات...... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے اس کو سنبھالا ہے فقہائے اسلام نے اور ائمہ مجتہدین نے اور پھر ان کے نیچے دوسرے ائمہ کھڑے ہوئے اور فقہ کے بڑے بڑے اکابر نے اس کو مدون کیا اور مرتب کیا۔ باب وار فصل وار مسائل مقرر کئے، اپنی ترتیب کے ساتھ مسائل کو ترتیب دیا، ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں مستقل ایک فن بن گیا جس کے اندر ہزار ہا فروع داخل ہوئیں، ائمہ اجتہاد نے اپنے تفقہ کے اصول سے قرآن و حدیث سے مسائل کا استخراج کیا، خود مسائل کو نکال کر پیش کیا اگر کہیں اصول فقہ میں اختلاف ہوا تو فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہوا مگر سب ائمہ ہیں دین حق پر ہیں اور حق ان میں دائر و سائر ہے۔

اگر امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلافات ہیں تو وہ حق و باطل

کے نہیں کہ ایک سمت حق ہو اور ایک سمت باطل ہو، ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ خطاء اور صواب کے اختلافات ہیں کہ ایک طرف صواب ہے اور ایک طرف خطاء، لیکن ساتھ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ یہ صواب ہے مگر احتمال ہے کہ خطا بھی ہو اور یہ خطا ہے مگر احتمال ہے کہ صواب بھی ہو۔ اسی لئے حق دائر وسائر ہے تمام ائمہ کے اندر اور تمام کے تمام نجوم ہدایت ہیں جس کا دامن آپ تھام لیں گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی، اگر کوئی شافعی المسلک ہے تو وہ بھی نجات یافتہ ہے۔ اگر کوئی حنفی ہے تو وہ بھی نجات کے مراتب طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مالکی یا حنبلی ہے تو وہ بھی نجات کے راستے پر جا رہا ہے اور سب اللہ و رسول کی طرف دوڑ رہے ہیں، اس لئے کہ بنیاد سب کی ایک ہے وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ البتہ استخراج مسائل میں اصول الگ الگ ہو گئے ہیں۔

اختلافِ مشرب...... اور یہ خود شریعت کی عین حکمت ہے اس لئے کہ ائمہ کے اختلاف سے امت کے اندر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اتنے راستے نکل آئے ہیں کہ جو جس ذوق کا ہے اسی راستے پر چل کر حق کو پا سکتا ہے، اگر ایک عظیم دریا ہو اور بہت بڑا لمبا چوڑا اتھاہ سمندر ہو لیکن پانی پینے کا گھاٹ ایک ہی ہو تو لوگ ہزاروں میل سے سفر کر کے آئیں گے جب ہی پانی مل سکتا ہے ورنہ وہ پانی سے محروم رہیں گے لیکن دریا اگر ایسا ہے کہ ہزاروں مشرب اور گھاٹ موجود ہیں جس سمت سے آئے وہی پانی، وہی مزہ، وہی ذائقہ ہے۔ صرف سمت بدلی ہوئی ہے۔ ایک مشرق کی طرف ہے ایک مغرب کی طرف ہے تو کچھ آسانی ہوگی کہ دریا بڑا ہے اور مشرب اور گھاٹ بہت ہیں۔ ہر طرف سے پانی مل سکتا ہے تو اسلام ایک اتھاہ سمندر ہے اس کے مشارب بہت ہیں۔ ایک مشرب حنفی ہے اور ایک مشرب مالکی ہے۔ ایک مشرب حنبلی ہے اور ایک مشرب شافعی ہے۔ اور یہ چار ائمہ وہ ہیں کہ حسن تدبیر کہئے یا تقدیر خداوندی کہئے کہ یہ چار مذہب دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔ ورنہ ائمہ اجتہاد سینکڑوں پیدا ہوئے امام بخاریؒ خود مجتہد ہیں۔ عبداللہ بن مبارکؒ خود مجتہد ہیں۔ حماد بن سلمہؒ خود مجتہد ہیں۔ سفیان ثوریؒ مجتہد ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ مجتہد ہیں۔ ہر ایک کی فقہ الگ الگ ہے۔ لیکن یہ خدا کی طرف سے بات ہے کہ بقیہ فقہیں مندرس ہو گئیں اور باقی نہ رہے اور یہ چار فقہیں دنیا کے اندر رائج ہو گئیں۔

فقہائے اسلام اور ان کا تادب...... امام ابوحنیفہؒ کوفہ میں پیدا ہوئے خراسان کی طرف ان کا فقہ چلا تو پورا خراسان حنفی پورا افغانستان حنفی، ہندوستان کا اکثر حصہ حنفی، پورا ترکستان حنفی، جہاں جہاں ان کا فقہ پھیلا وہاں وہاں حنفی ہو گئے۔ چونکہ اللہ و رسول کی محبت انتہا پر تھی اسی لئے ادب بھی بے حد تھا۔ چنانچہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئے، مدینہ منورہ روضہ اقدس پر بھی حاضری دی تو سات دن کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر تمام اہل مدینہ سر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ جب سارے مصر ہو گئے تو ٹھہر گئے، دس دن ہو گئے تو پھر اجازت چاہی۔ مگر اہل مدینہ نے پھر گھیرا ڈال لیا کہ ہم ابھی اجازت نہیں دیں گے، گیارہویں دن آپ نے فرمایا کہ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اس پر اہل مدینہ نے معلوم کیا کہ ناطاقتی کی کیا بات ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ

جب سے مدینہ میں آئے ہیں۔ استنجاء نہیں فرمایا ہے۔ نہ پیشاب نہ پاخانہ کہ مناسب نہیں۔ مدینہ کی ارضِ مقدس کو نجاست سے آلودہ کرنا اس لئے اب میرے اندر طاقت نہیں تو پھر اہل مدینہ نے خود باعزت واحترام رخصت کیا۔

یہ تھا ائمہ کا ادب واحترام کہ جتنی محبت غالب تھی ان حضرات میں اتنا ہی ادب واحترام تھا۔

اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ...... آپ کی پیدائش ہوئی مصر میں مقام غزا میں، ابتدائی زمانہ مصر میں گزرا اور عمر کا اکثر حصہ حجاز میں گزرا اور عمر کا آخری حصہ بھی مصر میں گزرا۔ مصر تقریباً سب کا سب شافعی المسلک ہے۔ حجاز میں بھی تقریباً سب فقہ شافعی پر چل رہے ہیں۔ محبت وادب میں ان کا بھی وہی حال تھا۔ جو دیگر ائمہ کا ہے۔ خوف و خشیت غالب اور تقویٰ اونچے درجے کا۔

اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ...... امام مالک امام دارالہجرہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ مدینہ سے ان کو شغف تھا اور مدینہ شہر میں کبھی جوتے پہن کر نہ چلے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو اور وہاں میرا جوتا گزرے اور مدینہ منورہ میں کبھی پاخانہ پیشاب بھی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مدینہ منورہ سے کئی میل دور نکل جاتے تھے۔ یہ ادب تھا اور تمام ائمہ میں اسی طرح سے ادب کی انتہا تھی۔ امام مالکؒ نے مدینہ منورہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور وہیں ہجرت فرمائی۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ مجھے مدینہ کی زمین قبول کرلے اور میں وہیں دفن ہو جاؤں۔ نفلی حج بھی نہیں کرتے تھے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں باہر میری وفات نہ ہو جائے اور میں مدینہ کی زمین سے الگ نہ ہو جاؤں۔

امام مالک نے ایک روز خواب دیکھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار مبارک قائم ہے اور امام مالک حاضر ہیں، عرض کیا یارسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کرلے اور مجھے معلوم ہو جائے کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں۔ سال ہے یا دو سال ہیں تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے اور میں عمرہ کرآؤں اور حج کرآؤں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ اٹھایا کہ پانچویں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اب امام مالک حیران ہیں کہ پانچ انگلیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی ہیں تو آیا یہ مطلب ہے کہ پانچ دن باقی ہیں میری عمر کے۔ یا پانچ مہینے یا پانچ برس ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ امام مالک کے ہم عصر امام محمد بن سیرین ہیں جو تعبیر خواب کے امام ہیں اور خواب کی تعبیر پر انہوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جلیل القدر امام ہیں اور ایسی تعبیر دیتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ان کو یہ مناسب تعبیر سے تھی۔ اس قسم کے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ تو امام مالک نے ایک شخص سے کہا کہ تم جا کر ابن سیرین سے میرا خواب بیان کرو مگر میرا نام مت لینا۔ یہ کہنا کہ مدینہ میں رہنے والے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہے۔

چنانچہ وہ شخص حاضر ہوا اور اس نے ابن سیرین سے کہا کہ مدینے کے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ دن مراد ہیں یا پانچ مہینے یا پانچ برس مراد ہیں؟ ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب تو

بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ جاہل کا کام نہیں کہ اس قسم کا خواب دیکھے اور نہ جاہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب دے سکتے ہیں۔ یہ جواب تو بڑے عالم کو ہی دے سکتے ہیں۔ اور مدینہ میں اس وقت امام مالک سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ تو کہیں یہ خواب امام مالک نے تو نہیں دیکھا؟ اب وہ شخص خاموش کیونکہ اسے تو روک دیا گیا تھا کہ میرا نام مت لینا، اس نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے اجازت لے آؤں۔ فرمایا ہاں اجازت لے کر آ داؤ۔ پھر ہم خواب کی تعبیر بتلائیں گے۔ وہ گیا اور جا کر عرض کیا کہ حضرات! وہ تو پہچان گئے کہ یہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں اور نام بھی لے دیا، مگر یہ کہا کہ پوچھ کر آ جاؤ پھر تعبیر بتاؤں گا۔ فرمایا اچھا جاؤ میرا نام لے دینا کہ مالک بن انس نے یہ خواب دیکھا ہے۔

اس شخص نے جا کر عرض کیا کہ حضرت! امام مالک نے ہی یہ خواب دیکھا ہے ابن سیرین نے فرمایا کہ ہاں امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ یہ خواب دیکھے فرمایا کہ: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھائیں اس سے نہ پانچ دن مراد ہیں نہ پانچ مہینے نہ پانچ برس مراد ہیں بلکہ اشارہ ہے کہ اس طرف کہ ﴿هِیَ خَمْسٌ لَایَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ① یعنی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ﴿وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ② کسی کو پتہ نہیں کہ میرا انتقال کس زمین پر ہوگا اور میں کہاں دفن ہوں گا اور کیا وقت ہے میرے انتقال کا۔ قرآن کریم کے اندر فرمایا گیا کہ اصول غیب کے پانچ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا فرمایا گیا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾. ③ اس کے نظام کو صرف اللہ جانتا ہے قیامت کب آئے گی۔ کسی کو پتہ نہیں حالانکہ قیامت کا عقیدہ قطعی ہے، قرآن سے ثابت ہے ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر وقت کا پتہ کسی کو نہیں حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ جبرئیل امین نے آپؐ سے پوچھا مَتَی السَّاعَةُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ”مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّآئِلِ“ ④ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ مجھے علم نہیں ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ قیامت آئے گی مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ یہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تو امام ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب امام مالک ہی دیکھ سکتے تھے، خواب بھی علمی ہے جواب بھی علمی ہے اور حدیث کی طرف اشارہ ہے، امام مالک ہی اس کے مخاطب بن سکتے ہیں۔ ابن سیرین نے اس آدمی سے فرمایا کہ امام مالک سے کہہ دینا کہ حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ موت کہاں آئے گی کس زمین میں آئے گی۔ اس کا علم ان پانچ چیزوں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴. ③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.
④ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ ج: ۱، ص: ۸۷، رقم: ۴۸.

امام مالک یہ جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور پھر گھر سے نہیں نکلے یہاں تک کہ وفات ہو گئی اور مدینہ کی زمین نے قبول کیا اور جنت البقیع میں مزار ہے جو ہر مسلمان کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔تو بہر حال امام مالک امام دارالہجرہ ہیں اور ان کا زیادہ تر فقہ مغربی ممالک میں پھیلا ہوا ہے جو عرب کے مغربی حصے ہیں ان میں زیادہ تر مالکی ہی آباد ہیں۔

اِمامِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ......امام احمد بن حنبلؒ کا قیام نجد میں رہا ہے۔اسی لئے نجد اور یمن کے لوگ بکثرت حنبلی ہیں اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں۔

احسانِ عظیم......تمام ائمہ برحق ہیں جس کا دامن تھام لوگے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی یہ سب حضرات حقانی ہیں۔ان بزرگوں نے اپنے اصولِ فقہ اور اپنے اجتہاد سے کتاب وسنت سے مسائل اخذ کئے اور مسائل نکال کر دین کو باغ وبہار بنا دیا اور ایک لاء اور ایک قانون کی صورت میں فقہ کو مرتب کیا۔جن کے ابواب الگ الگ ہیں۔ باب الافاضات، باب المعاملات ،باب المساقات، باب المزارعۃ، باب الاراضی وغیرہ۔ سارے مسائل ان ابواب کے نیچے جمع ہیں۔ساری چیزیں استخراج کر کے جمع کر دی ہیں۔ان کا بھی امت پر احسان عظیم ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مقابر کو نور سے منور فرمادے اگر یہ استخراج نہ کرتے تو اتنی جزئیات ہمارے پاس فقہ میں موجود نہ ہوتیں۔بڑی دقت اور دشواری پیش آتی۔

عُرفاءِ اسلام کی خدمات......عرفاء اسلام جن کا دوسرا نام صوفیاء کرام ہے۔ان حضرات نے اخلاقیات کو سنبھالا ہے اس طرح پر کہ بال کی کھال نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کر دی۔روح کی حکمت بیان کی اور بتایا کہ نفس میں اتنی مکاریاں ہیں ان کا توڑ یہ ہے۔کہ اگر نفس میں یہ کید پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے اور نفس میں یہ خواہش پیدا ہو تو اس کا دفعیہ یہ ہے۔اور کوئی رغبت اور تمنا پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے۔یہ ان حضرات صوفیاء ہی کا طفیل ہے کہ حکمت قلب کی انہوں نے تعلیم دی اور انہوں نے دلوں کو منور کیا اخلاق سے اور ان ہی اخلاق کے ذریعہ تزکیہ نفس کیا اور انسان کو انسان بنایا۔ **فَجَزَا هُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ**

اُمراءِ اسلام کی خدِ مات......اُمراء اسلام انہوں نے شعبہ معاملات کو سنبھالا۔لین دین اور جھگڑوں کے فیصلوں پر امراء اسلام مقرر ہوئے ،دنیا بھر کے جھگڑے نمٹائے۔لوگوں کے مقدمات فیصل کئے ،فوجداری کے الگ دیوانی کے الگ ہر ہر دائرے کے مقدمات سنبھالے اور مستقل کتابیں لکھیں گئیں، حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ہے ’’السیاستہ الشرعیۃ‘‘ اور اسی طرح بہت سے ائمہ علوم نے کتابیں لکھیں کسی نے سیاست کے اصول واضح کئے ہیں، فصل خصومات اور مقدمات کا فیصلہ کرتے کے لئے اس لئے ان امرا نے بہت اونچا کام کیا ہے کہ اس شعبہ کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ **فَجَزَا هُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ**

خُلفاءِ اسلام کی خدمات......اس پانچویں شعبہ کو سنبھالا ہے خلفاء اسلام نے جیسے صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ وغیرہ یہ حضرات درحقیقت ذمہ دار تھے ملک کے نظام کے تنظیم ملت اور تنظیم امت کے ان حضرات نے پوری امت

کو اور مغرب و مشرق کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا کہ نہ آپس میں لڑیں نہ جھگڑیں نہ تعصبات برتیں نہ آپس میں گالم گلوچ کریں نہ سب وشتم کریں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو محبت سے پیش کردیں، دوسرا محبت سے جواب دے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے معذور سمجھے اور یہ خیال کرے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ دوسرا حق پر ہو۔ یہ کہنا کہ میں ہی حق پر ہوں، دوسرا غلطی پر ہے۔ رائے دہی کے معاملہ میں بالکل غلط چیز ہے۔

خلفاء کیلئے طریق عمل...... سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنے ایک خلیفہ کو خلافت عنایت فرمائی اس زمانے کے دستور کے مطابق پگڑی باندھی اور کچھ وصیتیں کیں اور کہہ دیا کہ تم میری طرف سے نائب اور خلیفہ ہو جا کر لوگوں کی تربیت کرو، اصلاح کروان خلیفہ نے رخصت کے وقت عرض کیا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرمایئے تا کہ میں اس نصیحت پر کاربند رہوں۔ حضرت نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ: نہ تو نبوت کا دعویٰ کرنا اور نہ خدائی کا دعویٰ کرنا۔

خلیفہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوئے کہ حضرت آپ کا خادم غلام برسوں آپ کی صحبت میں رہا کیا مجھ سے یہ ممکن ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا غلام ہو وہ کب نبوت کا دعویٰ کرے گا؟ تو حضرت نے یہ کیسی نصیحت فرمائی۔ نصیحت فرماتے کہ بھائی عبادت میں ثابت قدم رہنا اخلاق کی حفاظت کرنا مخلوق کی اصلاح کرنا اور یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا یہ تو ہم لوگوں سے ممکن ہی نہیں اس نصیحت سے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کہ اس کے معنی سمجھ لو پھر بات سمجھ میں آجائے گی۔

فرمایا: کہ خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہہ دے وہ اٹل ہو۔ اگر وہ چاہے کہ زمین بنے تو زمین بن کر رہے۔ ناممکن ہے کہ نہ بنے۔ ارادہ خداوندی پر مراد کا مرتب ہونا قطعی اور لازمی ہے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ ارادہ فرمائیں اور وہ پورا نہ ہو وہ تو قادر مطلق ہیں۔ ﴿اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ ① اگر وہ ارادہ کرے کہ جہان بنے تو اسے محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسباب فراہم کریں، وہ اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب کے تو وہ خالق ہیں وہاں تو منشاء ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو اللہ کی ذات وہ ہے کہ جو وہ ارادہ کرے اور کہہ دے وہ اٹل ہو ٹلنے والی چیز نہ ہو۔

اور دعویٰ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ جو فرما دے وہ حق ہو۔ یوں ممکن ہی نہیں کہ نبی کی زبان سے کوئی ناحق چیز نکلے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے وہ حق ہوگا اور جو کر کے دکھائیں گے وہ بھی حق ہوگا۔ ناحق کا وجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ نبی جو کہے گا وہ حق ہوگا اور اس کے خلاف باطل ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کبھی خلاف حق نہیں ہو سکتی ہے، اگر تم نے جا کر یہ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اور میری رائے اتنی حق ہے کہ دوسرا سامنے نہیں آسکتا۔ تو یہ در پردہ نبوت کا دعویٰ ہوگا۔ میں تم کو اسی کی

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۸۲.

نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ نہ کرنا۔ نبوت کا دعویٰ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں کہو کہ میں نبی ہوں بلکہ اپنے اندر خاص وہ شان پیدا کر کے جو نبی کے اندر ہوتی ہے یوں کہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اس کیخلاف سب باطل ہے۔ اس چیز کا مدعی بننا در پردہ نبوت کا دعویٰ ہے اور جو یوں کہے کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مخلوق کٹ جائے، خون بہہ جائے مگر یہ ہو۔ یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کرنا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے ارادے کو یوں مت سمجھنا کہ یہ اٹل ہے اور ہونا ہی چاہئے اور اس کیخلاف ممکن نہیں حالانکہ ہر چیز میں تمہارا اخلاف ممکن ہے، یہ تو ہوا دعویٰ خدائی کا حاصل۔ اور دعویٰ نبوت کا حاصل یہ کہ جو تمہاری زبان سے نکل جائے اس پر جمے رہو گویا کہ اس کیخلاف باطل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے وہ خدا کا مقام ہے اور یہ نبی کا مقام ہے۔

تو حضرت شیخ نے بڑے بلیغ پیرائے میں نصیحت فرمائی۔ ظاہر میں تو بڑی وحشت ناک نصیحت تھی کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا، نبوت کا دعویٰ مت کرنا، مگر جب معنی بیان کئے خدائی اور نبوت کے تو سمجھ میں آ گیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی در پردہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جو جمود کرتے ہیں کہ وہی صحیح ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ وہ در پردہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ورنہ ان پر کوئی وحی یا الہام آ رہا ہے کہ وہی حق کہہ رہے ہیں دوسرا حق کہہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن وحدیث سے ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہی حق ہے اس کیخلاف ہرگز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فکر کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ ہی حق ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ان جھگڑوں کا فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب امت کا نظام بنا ہوا ہو پھر اس قسم کے مدعی مغلوب ہو جائیں گے اور واقعی جو حقانی لوگ ہیں وہ غالب آ جائیں گے۔ یہ کام ہے نظام وتنظیم کا جب تک تنظیم نہ ہو، نظام نہ ہو اس وقت تک معاملہ نہیں سلجھ سکتا ہے۔ اس خدمت کو انجام دیا ہے خلفاء اسلام نے یہ ہی درحقیقت ملک کے نظام اور تنظیم ملت کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی حضرات نے امت کو جوڑا ہے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔

محافظین شئون نبوت کی تعظیم ضروری ہے...... خلفاء اسلام نے تنظیم ملت کی ذمہ داری قبول کی۔ امراء اسلام نے جھگڑوں اور فیصلوں کو نمٹایا عرفاء اسلام نے اخلاق درست کئے فقہاء اسلام نے عبادات کو صحیح کیا اور حکماء اسلام نے عقائد کو درست کیا۔ یہ پانچ طبقے اکابر اہل اللہ کے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان پانچ شعبوں کو مضبوط کیا اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور امت کے سامنے پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ہوا تفصیل اس میں بہت ہے مگر میں زیادہ تفصیل نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ طالب علمانہ انداز میں کہوں گا یہ تو محض طالب علمانہ انداز ہے جو درس وتدریس میں طالب علموں کے سامنے کہا جا سکتا ہے اگرچہ آپ عرفی طور پر طالب علم نہیں ہیں مگر حقیقتاً تو طالب علم ہیں ورنہ جلسوں میں کیوں آتے؟ علم کی طلب ہی تو آپ کو لے کر آئی ہے۔ آپ بھی طالب علم ہیں اور میں بھی ایک طالب علم ہوں۔ اور آپ سے کم رتبہ ہوں درس وتدریس نہ سہی مگر کچھ تو سمجھ جائیں گے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اتنی بات تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جو میں نے کہی ہے کہ پانچ شعبے ہیں اور ان پانچوں شعبوں کو پانچ طبقات نے اٹھایا ہے اور وہ طبقے سب کے نزدیک معظم ومکرم ہیں اس لئے امراء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔اسی طرف عرفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔اور خلفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔تو آدمی اپنی کس آنکھ کو پھوڑ لے؟ سب کو یکساں طور پر ہم کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا اسی بنا پر سب ہمارے نزدیک معظم ومکرم ہیں سب کے آگے گردن جھکانا ہمارا کام ہے۔

اگر کوئی شخص محدث کے آگے گردن جھکا دے۔اور فقیہ کیخلاف کرے۔وہ درحقیقت امتی ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ہے، امت کا صحیح فرد وہ ہے کہ حکماء فقہاء صوفیاء عرفاء امرا خلفاء سب کو واجب التعظیم سمجھ کر سب کے آگے گردن جھکا دے۔اس لئے کہ یہ پانچوں طبقے وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک شان کو سنبھالا ہے آپ کی ایک شان عقیدے کی ہے۔ایک شان عبادت کی ہے ایک شان اخلاق کی ہے ایک شان معاملات کی ہے ایک شان خلافت و تنظیم ملت کی ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ شانیں ہیں، انہیں ٹکرانے کا یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانوں میں تعارض پیدا کر رہے ہیں جو لوگ ان میں باہم ٹکر دے رہے ہیں یہ سوائے جہل کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ شؤن نبوت میں ٹکراؤ پیدا کرنا علم والے کا کام نہیں ہے اور نہ علم والے کا کام یہ ہے کہ طبقات امت میں ٹکراؤ پیدا کرے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے گردن جھکا دے اور ہر ایک تعظیم وتکریم ضروری سمجھے۔

نظم مسائل......ایک دوسری بات اور سمجھ لیجئے وہ طالب علمانہ ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طبقے نے کتاب وسنت سے نظم قائم کیا ہے یعنی اسلامی مسائل بے تکے نہیں ہیں ہر مسئلہ ایک لڑی کے اندر پرویا ہوا ہے اور مسائل کا ایک نظام ہے۔اور پورے مسائل منظم ہو کر ایسے ہیں جیسے موتیوں کا ایک ہار ہوتا ہے اگر ایک موتی بیچ سے نکال دو تو ہار ناقص ہو جائے گا اور چونکہ ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے لہٰذا ہر شعبہ نہایت منظم ہے۔

تنظیم بلا امام ممکن نہیں......آپ جانتے ہیں کہ نظم و تنظیم بغیر امام کے نہیں ہوتی مثلاً اگر تسبیح میں ایک ہزار دانے ہیں مگر امام نہ ہو جسے القند کہتے ہیں۔وہ ایک لمبا دانہ ہوتا ہے تسبیح کے درمیان وہ اگر بیچ میں نہ ہو تو وہ تسبیح نہ ہوگی بلکہ مالا کہلائے گی۔اگر تسبیح ہی بنانی ہے تو ایک گرہ بیچ میں ضرور ہونی چاہئے جسے آپ امام کہیں اسی سے سارے دانے جڑے ہوئے ہوں گے۔وہ گرہ آپ اگر کھول دیں تو سارے دانے بکھر جائیں گے۔جھاڑو میں ہزاروں سینکیں ہوتی ہیں ایک سینک کو آپ چٹکی سے مسل دیں تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر بندھن باندھ کر جھاڑو بنائیں تو گھر کا کوڑا کباڑ آدھ گھنٹے میں صاف کر دیں گی۔ایک سینک یہ کام نہیں کر سکتی ہے ساری سینکیں مل کر پھینکیں گی۔اور ملنے کی شرط یہ ہے کہ ان میں بندھن بندھے وہی بندھن ان کا امام ہے اگر ان میں بندھن نہ ہو تو وہ منتشر ہو جائیں گی۔بکھر جائیں گی کوڑا کباڑ تو کیا صاف کرتیں وہ خود کباڑ بن جائیں گی۔لیکن اگر بندھن باندھ دیا اور ایک ڈورے کے تابع کر دیا ان کو تو سارے گھر

کا کوڑا صاف ہو جائے اور جھاڑو ایک جگہ رکھی ہوئی موزوں نظر آئے گی۔ گویا کہ صاف کرنے کا آلہ موجود ہے۔ جو بڑے سلیقہ سے رکھا ہوا ہے۔ بغیر امام و بندھن کے نظام قائم نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ہر چیز میں اس نے نظم قائم کیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھوں اور جماعت کے اندر بھی پھر ترتیب قائم کی ہے کہ امام کیا کرے گا اور تم کیا کرو گے۔ امام کیا پڑھے گا اور تم کیا پڑھو گے اس میں تمہیں آزادی نہیں بلکہ ایک نظم کے تحت نماز پوری کرنی ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے: اِذَا قَالَ الْاِمَامُ وَ لَاالضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ. یہ حدیث کا آخری ٹکڑا ہے مطلب یہ ہے جب امام اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے سب اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہو جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، وہ سجدے کرے تم بھی سجدہ کرو، وہ قیام کرے تم سب قیام کرو اور جب امام وَ لَاالضَّآلِّیْنَ کہے تم آمِیْن کہو اور جب وہ سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔

تو تم کلیۃً امام کے تابع ہو ہر نقل و حرکت میں اگر تابع نہ ہوئے اور اطاعت نہ کی تو آپ جماعت سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا تو بس گئی آپ کی نماز اس لئے کہ آپ امام سے منحرف ہو گئے۔ جماعت کی نماز بن نہیں سکتی جب تک آپ اطاعتِ کامل نہ کریں۔ لیکن اِنفرادی طور پر بھی اللہ نے اجازت دی ہے کہ پڑھ لیا کرو جتنی چاہے پڑھو لیکن جماعت سنتِ موکدہ ہے اور بعض ائمہ کے یہاں واجب قرار دی گئی ہے اور بعض کے یہاں فرض ہے کہ اگر نماز با جماعت ترک کر دی تو وہ اس کا مستحق کہ اس کو قتل کر دو یا جیل میں ڈال دو۔ امام ابو حنیفہؒ کے یہاں یہ سہولت ہے کہ وہ جماعت کو سنت موکدہ کہتے ہیں جو قریب واجب کے ہوتی ہے تو جماعت بن نہیں سکتی جب تک امام نہ ہو اور امام، امام نہیں ہو سکتا جب تک کہ سب مطیع نہ ہوں امام بنا دیا اور مقتدی کھڑے ہو گئے، لیکن کوئی تکبیر کہتا ہے تو کوئی تکبیر کے بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتا ہے۔ کسی نے سجدہ کیا تو کسی نے رکوع کیا۔ کسی نے مغرب کی طرف منہ کیا تو کسی نے مشرق کی طرف منہ کیا تو امام ہوا نہ ہوا برابر ہے۔ امام جب ہی بنتا ہے جب سب مطیع ہوں۔

سمع و طاعت...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَلَوْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبْشِیٌّ مُجَدَّعُ الْاَطْرَافِ" ① "سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر امیر مقرر کر دیا جائے کسی ایسے حبشی غلام کو جس کے ہاتھ پیر بھی کٹے ہوئے ہوں"۔ کوئی صورت وجاہت کی نہ ہو اور قوم مل کر اسے امیر بنا دے تو مامورین پر سمع و طاعت فرض ہے اس کے خلاف مت کرو امت کا نظم جب ہی باقی رہ سکتا ہے، نماز فرض کی تو اس میں جماعت کا حکم دیا اور جماعت کے لئے امام بنانے کی لازمی طور پر ضرورت پڑے گی۔

فرائض امیر...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما ہیں اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے چند صحابہ کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھائی کسی کو امیر مقرر کر لو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے

---

① السنن للترمذی، ابواب الجهاد والسير، باب ماجاء في طاعة الامام، ج: ٦، ص: ٢٩٨، رقم: ١٦٢٨.

زیادہ افضل ہم میں کون ہے؟ کہ جس امیر بنا دیں آپ افضل الصحابہؓ ہیں فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کوئی اور بن جائے۔عرض کیا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔آخر کار سب نے مل کر حضرت صدیق اکبرؓ کو ہی امیر بنا دیا۔

حضرتؓ نے فرمایا کہ جب میں امیر بن گیا تو اطاعت کرو گے۔عرض کیا کہ لازمی طور پر کریں گے عہد و پیمان لیا کہ منحرف تو نہیں ہو گے؟ عرض کیا کہ قطعاً نہیں۔جب منزل پر پہنچے تو سب کے بستر کھول کر بچھانے شروع کیے لوگوں نے کہا حضرت ہم بچھائیں گے فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو امیر کی اطاعت واجب ہے کسی کو بسترہ نہیں بچھانے دیا کبھی جگہ صاف کر رہے ہیں کبھی کپڑا بچھا رہے ہیں جہاں کوئی آیا کہ حضرت میں کروں گا یہ کام فرماتے کہ میں امیر ہوں امیر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

لوگ عاجز آ گئے کھانا پکانے کا وقت آتا۔تو جنگل سے لکڑیاں لا رہے ہیں کبھی بازار میں گوشت خریدنے جا رہے ہیں لوگوں نے عرض کیا حضرت! ہم یہ کام کریں گے۔فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو لوگ عاجز آ گئے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ہمارے امام مقتداء بڑے اور ساری خدمات انجام دے رہے ہیں ہمارے جوتے بھی سیدھے کر رہے ہیں بستر بھی بچھا رہے ہیں کھانا بھی پکا رہے ہیں اور کوئی بول بھی نہیں سکتا اور جہاں کوئی بولا تو انہوں نے کہا کہ میں امیر ہوں واجب الاطاعت ہوں اس لئے لوگ عاجز آ گئے۔

عجیب لطیفہ......اس سفر میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا۔وہ بھی سنا دوں۔گو مضمون سے متعلق نہیں مگر اس واقعہ کا جز ہے کہ ایک روز حضرت صدیق اکبرؓ نے کھانا وغیرہ پکا دیا مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی کام سے باہر تشریف لے گئے۔ایک صحابیؓ کو بھوک بے تحاشہ لگی۔انہوں نے کھانے کے نگران سے کہا کہ بھائی کم از کم مجھے ایک روٹی دے دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔نگران نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے اور ان کی جازت نہیں ہو گی تو میں کھانا نہیں دوں گا۔انہوں نے بہت منت سماجت کی کہ بھائی مجھے ضعف طاری ہو رہا ہے۔بھوک ستا رہی ہے۔ایک آدھ روٹی دے دو! کچھ سہارا ہو گا۔انہوں نے پھر انکار کیا اور ان کو روٹی نہیں دی۔

تو صحابہؓ جیسے مقدس ہیں ویسے ہی اندر خوش طبعی بھی ہے۔فرمایا کہ اچھا میں تجھے سمجھوں گا نہ دے تو روٹی۔ اسی حال میں بھوکے بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ جنگل کی طرف اٹھ کر چلے، اچانک دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔لباس سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاؤں کا بڑا آدمی ہے اور اچھی خاصی عمدہ اونٹنی پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ان صحابیؓ نے کہا کہ چودھری صاحب کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے ایک غلام خریدنا ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے۔انہوں نے کہا کہ میرے پاس غلام موجود ہے اور پانچ سو درہم میں بیچ سکتا ہوں۔چودھری صاحب نے کہا کہ پانچ سو درہم کوئی بڑی بات نہیں۔اگر غلام اچھا ہے انہوں نے کہا کہ بہت سمجھ دار ہے معاملہ طے ہو گیا اور پانچ سو درہم لے کر اشارہ ان کی طرف کیا جنہوں نے روٹی نہیں دی تھی کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو جا کر پکڑ لو اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے دماغ میں تھوڑی سی سنک ہے جب کوئی پکڑنے جاتا ہے تو کہتا ہے

کہ میں غلام کب ہوں؟ میں تو آزاد ہوں۔اس کا خیال نہ کیجئو انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا۔بعضوں کے دماغ میں ہوا ہی کرتی ہے۔ایسے میں انہوں نے کہا کہ چلائے گا بھی کہ میں غلام کب ہوں؟۔ میں تو حر ہوں۔آزاد ہوں اس کا بھی خیال نہ کیجئیو یہ اس کی عادت ہے۔انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

چودھری صاحب نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل میرے ساتھ! اس نے کہا کہ: کہاں چلوں؟ چودھری صاحب نے کہا کہ: میرے گھر، اس نے کہا کہ: کیوں؟ کہنے لگے: میں نے تجھے خریدا ہے۔اس نے کہا کہ: واللہ میں غلام نہیں ہوں، میں تو آزاد ہوں، اس نے کہا: مجھے معلوم ہے کہ تیری عادت یہی ہے۔اب یہ چلا رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔حر ہوں۔مگر چودھری صاحب نے ایک نہ سنی۔چودھری صاحب چونکہ طاقت ور تھے، زبردستی اٹھا کر اونٹ پر سوار کیا اور لے جانا شروع کیا اور اس نے ہائے وائے شروع کی کہ مجھے غلام بنا دیا، میں تو آزاد ہوں۔اس نے کہا کہ میں تیری ساری داستان سن چکا ہوں۔تیری عادت ہی یہ ہے۔

ادھر سے صدیق اکبرؓ چلے آرہے تھے دیکھ کر یہ چلائے کہ امیر المومنین میرا تو ناطقہ بند کر دیا ہے اور مجھے غلام بنا دیا ہے اور یہ چودھری مجھے لئے جا رہا ہے۔صدیق اکبرؓ کا سبھی لوگ احترام کرتے تھے۔چودھری اترا سواری سے اور سلام عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میرا ساتھی ہے اسے تو کہاں لئے جا رہا ہے۔کہنے لگا حضرت جی میں نے تو اسے پانچ سو درہم میں خریدا ہے۔فرمایا کہ یہ غلام نہیں، یہ آزاد ہے یہ کس نے بیچا ہے۔اشارہ کیا کہ فلاں صاحب نے بیچا ہے۔میں نے رقم بھی ان کو ہی دی ہے۔انہوں نے کہا کہ غلام موجود ہے لے جاؤ، حضرت صدیق اکبرؓ سمجھ گئے کہ کسی نے مذاق کیا ہے ان کے ساتھ جب واپس آئے تو جنہیں روٹی نہیں ملی تھی انہوں نے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اب کہو کیا حال ہے۔تو نے مجھے روٹی سے عاجز کر رکھا۔اب بتا۔صدیق اکبرؓ جب پہنچے تو فرمایا: کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی میں نے اس کی بہت منت کی کہ بھائی آدھی ہی روٹی دے دو، کچھ سہارا ہو جائے گا۔اس نے کہا: جب تک امیر نہیں آئیں گے میں نہیں دوں گا، تو میں نے بھی ایک مذاق کیا کہ اس کو پانچ سو درہم میں بیچ دیا۔تو حضرت صدیق اکبرؓ بہت ہنسے وہ پانچ سو درہم واپس کئے گئے، جب اس کی گلوخلاصی ہوئی۔یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سنایا گیا تو آپ مسکرائے اور منہ پر رومال رکھ لیا جب بھی اس واقعہ کا ذکر آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے اور منہ پر رومال رکھ لیتے۔گویا یہ عجیب لطیفہ بن گیا۔

نظم اجتماعیت...... یہ واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ نماز کے اندر بھی جماعت رکھی ہے اور اس جماعت کا ایک امام مقرر کیا ہے اور وہ بھی مطاع جس کی اطاعت کی جائے سفر پیش آئے تو اس میں ایک امام بنا لیا جائے تا کہ سفر منظم ہو گھر میں اگر ہو تو ایک کو بڑا سمجھ لو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو گھر میں نظام پیدا ہو گا۔حج رکھا تو اس میں امام الحج مقرر کیا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔زکوۃ رکھی تو بیت المال میں ایک کو امام مقرر کیا کہ وہ ہر چیز کی زکوۃ وصول کیا کرے تو ہر چیز میں ایک جماعتی اور

اجتماعی نظم قائم کیا اور اس کا ایک ایک امیر مقرر کیا اور اس کی سمع وطاعت واجب قرار دی کہ اس کی اطاعت کرو۔

اس طرح ہر فن کا ایک امام مقرر ہے عقیدہ میں مرکز حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے اس میں امام مقرر کئے گئے۔ چنانچہ عقائد میں دو بڑے بڑے امام ہیں۔ ایک امام ابو منصور ماتریدی ہیں اور ایک امام ابوالحسن اشعری ہیں یہ دو امام ایسے سمجھے جاتے ہیں کہ جن کی رائے فن عقائد میں فن کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اشعری ہیں اور بعض لوگ اپنی نسبت دوسرے امام کی طرف کر کے اپنے آپ کو ماتریدی کہتے ہیں ان میں آپس میں کچھ تھوڑے بہت اختلافات بھی ہیں مگر وہ اختلافات لفظی کے قریب قریب ہیں۔ عقائد سب کے ایک ہی ہیں، جب اس فن کا کوئی بڑا مسئلہ پیش آوے تو رجوع کرو اس کی طرف کہ امام ابوالحسن نے یہ کہا ہے۔ فقہ کا مسئلہ ہو تو اس میں ایک امام مقرر کر وامام شافعیؒ ہوں، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ ہوں جب کوئی مسئلہ اختلافیہ آئے تو کسی ایک کی اطاعت کرلو تاکہ تمہارے اندر نزاع نہ پیدا ہو۔

مبنی بر حجت اختلاف مذموم نہیں...... اس لئے کہ مسئلہ میں نزاع نہیں۔ مسئلہ میں اگر اختلاف ہو تو اختلاف حجت کا ہوتا ہے اور نزاع وجدال جو ہوتا ہے وہ نفسانی جذبے کے تحت ہوتا ہے اور وہ برا ہوتا ہے اور حجت سے جو اختلاف ہوتا ہے وہ برا نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ہر اختلاف برا نہیں ہے۔ مثلاً چور اور ڈاکو اتفاق کرلیں تو یہ اتفاق اچھا نہیں ہے۔ برائی میں اگر لوگ متحد ہو جائیں تو وہ اتحاد بھی برا ہوگا اور اگر بھلائی کے اوپر لوگ جمع ہو جائیں تو وہ اتحاد اچھا ہوگا۔

اب اختلاف کو لے لو اگر اختلاف حجت سے ہو اور اللہ ورسول کا حوالہ دیانت سے ہو تو وہ ایک پہلو ہوگا دین کا۔ وہ اختلاف ہوگا مگر جھگڑا نہ ہوگا۔ کیونکہ حجت اس میں موجود ہے۔ یہ جھگڑے اصل میں ہم اپنے جذبات سے کرتے ہیں اور مسئلوں کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑنا نہیں ہے اگر مسئلوں کی خاصیت لڑنا ہوتا تو پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی کہ کوئی رفع یدین کر رہا ہے کوئی نہیں کر رہا ہے۔ کوئی امین بالجہر کر رہا ہے کوئی امین بالسر کر رہا ہے۔ کوئی فاتحہ کو امام کے پیچھے واجب قرار دیتا ہے اور کوئی ناجائز قرار دے رہا ہے تو سب سے پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی اگر مسئلہ کی خاصیت لڑنا ہوتا۔ مگر سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت بھی قلب میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد ائمہ مجتہدین میں ڈنڈا چلتا جن میں اختلاف ہے۔ خوب لڑائی ہوتی مگر سارے ائمہ باہم متحد ہیں اس لئے کہ وہ اختلافات فروعی ہیں اور بنیادیں سب کی ایک ہیں۔ اس لئے قلوب میں سب ایک دوسرے کی عظمت لئے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ بغداد میں امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا۔ وہیں مسجد تھی جب نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھی اور اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھی اور امام شافعیؒ کا مسلک جو کہ مستحب کے درجہ میں تھا یعنی رفع یدین نہیں کیا اور آمین زور سے نہیں کہی۔ پوچھنے پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ''مجھے صاحب مزار سے حیاء آتی ہے کہ ان کے قریب ہو کر ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔ جس جس مسئلہ میں گنجائش تھی اس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی اور جہاں جہاں جائز وناجائز کا

اختلاف تھا اس میں وہ معذور تھے"۔ چونکہ ان کی عظمت قلب میں موجود تھی اس لئے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ مسئلہ کہ خاصیت لڑائی نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات سے لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔

آمین بالشر...... ہمارے بچپن کا زمانہ تھا ہمارے ہاں سہارنپور میں مارچ نام کا ایک کلکٹر تھا۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا نسلاً یورپین تھا۔ مگر مذاق وذوق اس کا ایشیائیت کا تھا کیونکہ اس کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ اس کے زمانے میں ایک جھگڑا پیش آیا کہ ایک حنفی کہیں اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ انہوں نے زور سے آمین کہی۔ اس نے آہستہ سے کہی۔ وہاں سب جہلا جمع تھے انہوں نے اس کی مار پٹائی کی کہ اس نے زور سے آمین نہیں کہی۔ پٹتے پٹتے وہ چلایا کہ حنفیو! دوڑو، دوڑو، تمام حنفی جمع ہو گئے انہوں نے اہل حدیث پر حملہ کر دیا۔ اب اہل حدیث چلائے کہ اے اہلحدیث دوڑو! ادھر سے اہل حدیث آ گئے۔ غرض لاٹھی چلی کتنوں کے ہی سر پھٹے۔ بلوہ عام ہو گیا فریقین سے رپورٹ درج کرائی۔

مارچ کا زمانہ تھا اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین کے وکلاء نے بحث کی آمین کے مسئلہ میں۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آئی اس نے کہا کہ بھائی کیا آمین کسی جائیداد کا نام ہے؟ یا کوئی جاگیر ہے؟ یا کوئی بلڈنگ ہے؟ آخر تم کس چیز پر لڑ رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلے پر کیوں لڑتے ہو؟ لڑائی عورت پر ہوتی ہے دولت پر ہوتی ہے۔ جائیداد پر ہوتی ہے۔ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو۔ آخر یہ لڑائی کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہ صاحب ایک حدیث میں آیا ہے کہ آمین زور سے کہو اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ آہستہ سے پڑھو۔ اس نے کہا بھائی، جسے زور سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ زور سے پڑھے اور جسے آہستہ پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ آہستہ سے پڑھے۔ آپس میں لڑتے کیوں ہو۔ اپنی اپنی حجت پر عمل کرو۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ آمین پر لڑائی کیسے ہو سکتی ہے۔ بات بھی ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے کی تھی۔ اس نے تحقیق کر کے فیصلہ لکھا اور فیصلہ بڑا دانش مندانہ لکھا۔ اس نے لکھا کہ میں روداد مسلہ کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ: "مسلمانوں کے یہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ **1** آمین بالجھر یعنی زور سے امین پڑھنا۔ **2** آمین بالسر یعنی آمین آہستہ سے پڑھنا **3** امین بالشر یعنی جھگڑا اٹھانے کے لئے آمین پڑھنا۔ یہ جتنا جھگڑا ہے نہ آمین بالجھر کا ہے اور نہ آمین بالسر کا کیونکہ دونوں کے بارے میں پیغمبرؐ سے حدیث وارد ہے اور یہ جھگڑے کی چیز نہیں۔ یہ سارا جھگڑا آمین بالشر کا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں فریق مفسد ہیں۔ میں دونوں کو سزا کرتا ہوں"۔

مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا...... مطلب یہ کہ ہم لوگ آپس میں نفسانی جذبے کے تحت لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑائی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کی حجت ہے اس پر عمل کریں۔ لڑائی کے کیا معنی اور نفرت کے کیا معنی؟ آپس میں مل کر رہو اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو جبر تھوڑا ہی ہے۔ ان کے پاس بھی حجت ہے وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ فاسق ہے۔ کافر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ لہٰذا میری بات مانو۔ دوسرا باطل محض ہے۔ اس لئے وہ حق پر نہیں۔ یہ کہنا غلط بات۔ یہ

مسائل صرف آڑ ہیں ورنہ حقیقی لڑائی تو نفسانی جذبات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔لڑلڑ کر مسلمانوں نے حکومتیں برباد کیں۔اپنی جائیدادیں تباہ کر دیں۔اپنی بلڈنگیں برباد کر دیں، جب یہ دنیا چلی گئی تو رہ گیا دین اور لڑنا ضروری تھا۔ اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔کہا کہ اب دین کو آڑ بناؤ۔اب جائیدادیں نہیں تو مسئلوں پر لڑو۔فروعات پر لڑو۔یہ صرف نفسانی جھگڑے ہیں۔اگر حجت ہاتھ میں ہے تو اس میں جھگڑا ہی نہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اس لئے زور سے آمین کہتا ہوں۔امام ابوحنیفہؒ کہیں گے کہ آپ معذور ہیں کیونکہ آپ کے پاس حجت ہے۔میرے پاس حدیث ہے۔میں آہستہ سے آمین کہتا ہوں چونکہ میرے پاس حجت ہے امام شافعیؒ کہیں گے آپ بھی معذور ہیں چونکہ آپکے پاس بھی حجت ہے۔آپ بھی حق پر عمل کرر ہے ہیں۔میں بھی حق پر عمل کرر ہا ہوں۔معاملہ ختم ہوا نہ دوستی گئی، نہ نفرت پیدا ہوئی۔نہ جھگڑا پیدا ہوا اس لئے کہ حجت ہے۔جہاں اختلاف بلا حجت ہوتا ہے۔تعصب سے،عناد سے، پارٹی بندی سے وہاں اصل میں لڑائیاں نفسانی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔وہ مسئلے کی لڑائی نہیں ہوتی۔وہ تو مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنا اندرونی بخار نکالنا مقصود ہوتا ہے۔

توحید مقصد...... میں عرض کرر ہا تھا کہ فقہ کے مسئلے میں بہر حال کسی کو امام بنانا پڑے گا، جہاں اختلافی مسئلہ آوے کسی امام کی طرف رجوع کرے اور یہ فطری چیز ہے۔مثلاً آپ علاج کرائیں اور چار طبیبوں کی چار رائیں ہوجائیں۔ایک کہے کہ میں گرم دوائیں دوں گا۔ایک کہے کہ میں ٹھنڈی دوائیں دوں گا۔ایک کہے میں خشک دوائیں دوں گا۔ایک کہے کہ میں تر دوائیں دوں گا۔کیا کبھی آپ نے یہ کیا ہے کہ چونکہ طبیب آپس میں لڑ رہے ہیں۔لہٰذا مجھے انتقال کر کے قبر میں چلا جانا چاہئے۔میں علاج نہیں کراؤں گا۔چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ان اطباء میں سے آپ انتخاب کرتے ہیں کہ کسی ایک کی طرف رجوع کریں خواہ انتخاب کی کوئی بھی وجہ ہو۔خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ جامعہ طبیہ کا پڑھا ہوا ہے جو بہت بڑا طبی ادارہ ہے۔لہٰذا یہ طبیب حاذق ہوگا۔اس لئے اس کا علاج کراؤں گا۔

یا اس وجہ سے کہ اس کے مطب سے شفاء پانے والے بہت ملتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے تیر بہدف ہیں لہٰذا اس کا علاج کراؤں گا یا یہ وجہ ہو کہ یہ طبیب خاندانی طور پر طبیب ہے اس کے یہاں جدی طب چلی آرہی ہے۔لہٰذا طب سے جو مناسبت اسے ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔اس بنا پر میں اس کا علاج کراؤں گا کہ کوئی بھی وجہ ہو مگر آپ انتخاب کریں گے۔اس لئے کہ جان عزیز ہے محض اس بناء پر کہ اطباء میں اختلاف رائے ہے۔ آپ موت کو ترجیح نہیں دیتے زندگی پر۔کہتے ہیں کہ زندگی رہنی چاہئے اور علاج ہونا چاہئے۔تو ان اطباء میں سے کسی کو بھی منتخب کرلو۔

اگر علماء میں اختلاف رائے ہو اور آپ یہ کہیں کہ علماء تو لڑ رہے ہیں لہٰذا ہم دین اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابدی موت کو ترجیح دیتے ہیں اور موت کو قبول کرتے ہیں۔یہ آج تک کسی نے کیا ہے؟ انتخاب کرنا پڑے گا۔جس کی طرف آپ جائیں یہ دیکھیں کہ اس کا علم مستند ہے۔اس کے مشائخ سند صحیح کے ساتھ نبی کریمؐ تک پہنچے ہوئے

ہیں۔اور جو احکام یہ بیان کرتے ہیں ان کی سند کا سلسلہ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہے۔لہٰذا ہم ان کے مسائل پر عمل کریں گے۔دوسروں کے مسئلے پر عمل نہیں کریں گے۔کوئی بھی وجہ ہو مگر انتخاب کرنا پڑے گا۔

اطباء میں اختلاف رائے ہو تو ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اگر علماء میں اختلاف ہو تو دین سے بدظن ہو جاتے ہیں کہ صاحب! کس کی مانیں؟ مولوی تو آپس میں لڑ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جان زیادہ عزیز ہے ایمان زیادہ عزیز نہیں ہے۔وہاں چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ڈاکٹروں میں کتنے ہی شدید اختلافات ہوں کسی کا انتخاب ضرور کریں گے۔یہاں اگر ایمان عزیز ہوتا تو کتنا ہی اختلاف ہوتا علماء میں کسی نہ کسی کا انتخاب ضرور کرتے اور اس کی پیروی کرتے چونکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ جان تو عزیز ہے مگر ایمان عزیز نہیں ہے۔

بہر حال اپنا امام ضرور بنانا پڑے گا اور اشخاص میں سے انتخاب ضرور کرنا پڑے گا اور ایک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔طب کے اندر ہو تو رجوع کرنا پڑے گا کسی طبیب کی طرف۔ایک دم چار کا علاج جاری کریں تو آپ کا مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا اور جلد ہی آپ قبر میں تشریف لے جائیں گے۔اس لئے کہ ایک طبیب صبح کو ٹھنڈی دوا دے گا تو دوسرا شام کو گرم دوا دے گا، تیسرا تر دوا دے گا، چوتھا خشک دوا سے علاج کرے گا تو مریض تختۂ مشق بن جائے گا اور وہ قبر میں جانے کی تیاری شروع کر دے گا۔اس لئے ایک ہی کا علاج کریں۔

توحید مطلب......طریقت میں آپ نے بیعت کی تو وہاں بھی توحید مطلب ہے کہ جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کریں یہ سمجھیں کہ میری دنیا و آخرت کی خوبی اسی شیخ میں ہے دوسرے کی طرف رجوع مت کرو۔ہاں عظمت سب کی کرو۔احترام سب کا کرو مگر قلب کا علاج ایک ہی سے کراؤ۔صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام توحید مطلب ہے۔یہ ہے کہ وحدت ہونی چاہئے اس شخص کے لئے جس کو آپ نے شیخ بنالیا ہے۔شیخ دو یا تین نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہوگا اور ایک ہی کے طریق پر چلنا پڑے گا۔

ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شیخ واقعی اہل سنت میں سے نہیں ہے بلکہ مبتدع ہے تو ترک کر سکتے ہیں۔اس کے بعد پھر حضرات صوفیاء لکھتے ہیں کہ ترک کر کے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرو مگر اس پہلے کی شان میں بے ادبی مت کرو، چاہے وہ اپنی ذات میں کیسا ہی ہو، گستاخی مت کرو۔ادب سے پیش آؤ۔تو طریقت کے اندر توحید مطلب ہے اور طب کے اندر توحید مطب ہے۔تو آخر علم کے اندر توحید مقصد کیوں نہیں ہونا چاہئے اور کسی ایک امام کو کیوں مقرر نہیں کرتے کہ آپ اس کے فقہ پر عمل کریں۔اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ ڈانواں ڈول رہیں گے، کبھی ادھر، کبھی ادھر اور یہ نفس کی اتباع ہوگی کسی امام کا اتباع بالکل نہ ہوگا اور شریعت میں نفس کا اتباع مطلوب نہیں۔

تو شریعت نے ہر معاملے میں نظم قائم کیا، عقائد میں الگ نظم ہے۔اور فقہ کے مسائل میں الگ نظم ہے۔مقصد یہ کہ امت جڑ جائے۔چاہے اختلاف رائے بھی ہو مگر باہم متفق و متحد ہو جائیں۔اسی طرح سے جب آپ حضرات صوفیاء کے پاس جائیں گے اور اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں گے تو ان کے بھی مختلف طرق پائیں گے۔

چشتیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ سہروردیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ قادریہ کے وظائف اور ہیں مگر ہیں سب حضرات اہل اللہ اور سب حضرات اہل حق ہیں۔ لیکن چاروں میں آپ ایک دم بیعت کر کے چاروں سے علاج کرائیں تو دین فاسد ہو کر رہ جائے گا اس لئے کہ متضاد چیزوں پر عمل کیسے کریں۔ لہٰذا ایک ہی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہاں عظمت و احترام سب کا کرنا پڑے گا اور خادم سب کا بننا پڑے گا مگر علاج ایک سے کرائیں۔ تو تصوف کے اندر بھی توحید مطلب ہے جیسے طب کے اندر توحید مطب ہے۔ اور فقہ کے اندر توحید مقصد ہے۔

امیر معاملات...... اسی طرح سے جب معاملات پیش آئیں تو کسی نہ کسی کو امیر تو بنانا پڑے گا مثلاً کوئی جھگڑا ہو، اب راستہ چلتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی کیسے فیصلہ کروں، ایک نے کہا کہ یوں کرو، دوسرے نے کہا کہ یوں کرو، تیسرے نے کہا کہ یوں کرو۔ اگر تینوں کی رائے پر عمل کیا تو وہ جھگڑا تو یوں ہی رہ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ گھر بھی فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک متدین شخص کو اپنا امیر بنا لیا کہ بھائی! ہم تم سے فیصلہ چاہتے ہیں جو تم فیصلہ کرو گے ہمیں منظور ہے۔ اگر صحیح کرو گے۔ تب بھی عمل کریں گے۔ اور اگر کوئی فکری غلطی بھی واقع ہو گئی تب بھی عمل کریں گے۔ مگر کرائیں گے فیصلہ آپ سے ہی۔ تو ایک قسم کا اطمینان و سکون ہو جائے گا۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گی۔ قاضی جب حکم کر دے کہ یہ ہے مسئلہ تو وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی نافذ ہو جاتا ہے یعنی اس کے خلاف پھر کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر بعد میں یہ بھی ثابت ہو کہ رائے کی غلطی تھی تو یہ بات نہیں کہ فیصلہ ٹوٹے گا، ایسا نہیں بلکہ جو فیصلہ ہو چکا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ چونکہ وہ فیصلہ من جانب اللہ ہے اور اس کے بغیر سکون و اطمینان قلبی اور یکسوئی نہیں ہو سکتی اس بنا پر قاضی کی قضا ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے تو امراء اسلام اس لئے مقرر کئے گئے تاکہ وہ جھگڑوں کے فیصلے کر سکیں۔

حق امارت...... اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے پھر جن کو وہ امیر مقرر کریں وہ امیر بن جائیں گے۔ اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اگر سارے ملک کے مسلمان ایک امیر پر جمع نہ ہو تو خطوں کے امیر بنا لئے جائیں۔ ہر صوبہ کا الگ امیر ہو اور تمام مامورین پر اپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ① یہاں پر تین اطاعتیں واجب اور فرض قرار دیں۔ اللہ کی اطاعت، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، اولی الامر یعنی امیر کی اطاعت۔

اطاعت ذاتی اور وصفی...... قرآن تو قرآن ہی ہے وہ تو سرچشمہ ہے بلاغت و فصاحت کا اور معجزہ ہے اس نے جہاں اللہ کی اطاعت فرض کی وہاں تو اللہ کا نام ذکر کیا کہ اطیعوا اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرو۔ اسکے معنی یہ ہیں اللہ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں کسی وصف کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت نہیں ہے کہ جب اللہ کا نام آئے تو گردن جھک جاتی

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

چاہئے اطیعوا اللہ علم ذات کا ہے۔اس لئے کہ وہ بالذات واجب الاطاعت ہیں۔ہم اور آپ کسی وصف سے واجب الاطاعت بنتے ہیں۔آپ میں اگر علم آ گیا تو علم کی وجہ سے آپ کی اطاعت ہوگی۔ورنہ آپ کی اطاعت نہ ہوگی۔ مثلاً کوئی جاہل ہے اس کی کوئی بھی اطاعت نہیں کرتا ہاں علم کا وصف اگر آ جائے تو اطاعت کرنے لگیں گے۔

اگر کوئی باپ ہے تو باپ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت شروع ہو جاتی ہے۔کوئی استاذ ہے تو استاذ ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت ہوگی کوئی شیخ ہے۔تو شیخ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی تو انسان بذاتہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ بالاوصاف واجب الاطاعت ہے۔جب کوئی وصف کمال پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی۔

لیکن حق تعالیٰ شانہٗ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں۔صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں کیوں کہ وہ ذات کا پرتو ہیں۔دراصل سرچشمہ کمالات کا ذات ہے اور صفات اس لئے مقبول ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں مگر اصل ان سب کی ذات ہی ہے اور جب آگے کی اطاعت بتلائی گئی تو یوں نہیں فرمایا گیا کہ۔اَطِیْعُوْا عِیْسٰی یا اَطِیْعُوْا مُوْسٰی یا اَطِیْعُوْا مُحَمَّدًا۔ بلکہ فرمایا اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ یعنی رسول وصف رسالت کی وجہ سے واجبُ اُلاطاعت ہیں۔اسی وجہ سے اگر وہ کوئی ذاتی مشورہ دیں تو واجبُ اُلاطاعت نہیں ہوں گے۔یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی محبت کی وجہ سے اس کی منشاء کی بھی اطاعت کریں۔لیکن قانون شریعت یہ ہے کہ اگر رسول کوئی ذاتی رائے دیں تو واجبُ اُلاطاعت نہیں البتہ جب یہ فرمائیں کہ میں حکم خداوندی پہنچا رہا ہوں تو وہ واجبُ اُلاطاعت ہے جب رسالت پہنچائیں گے تو اطاعت کرنا فرض ہے اور جب یوں فرمائیں کہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو آپ مختار ہیں۔اور معذرت بھی کر سکتے ہیں،ادباً چاہے آپ عمل کر لیں مگر آپ کے ذمے واجب نہیں ہے۔

جیسے کہ حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہوا۔یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں اور ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ سے کر دیا تھا۔حضرت بریرہؓ حسین وجمیل اور بہت خوبصورت تھیں اور حضرت مغیثؓ کالے کلوٹے اور بدصورت تھے۔اس لئے آپس میں بنتی نہ تھی۔رات دن آپس میں کھٹ پٹ رہتی تھی اور رات دن لڑائی ہوتی رہتی تھی۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرماتے تھے مگر بہرحال قصہ چل رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کر دیا اب وہ باندی نہیں رہیں اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ منکوحہ باندی جب آزاد ہوتی ہے تو نکاح اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔چاہے تو باقی رکھے چاہے تو فسخ کر دے۔اب جب کہ آزاد ہو گئیں تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ میں نکاح کو باقی نہیں رکھوں گی بلکہ فسخ کر دوں گی کیونکہ حضرت مغیثؓ سے ان کی موافقت نہیں ہوتی۔پکا ارادہ کر لیا کہ اب میں ان کے نکاح میں نہیں رہوں گی۔

اور حضرت مغیثؓ ان پر سو جان سے عاشق تھے جب انہیں معلوم ہوا تو پریشان ہو گئے۔کبھی صدیق اکبرؓ سے سفارش کراتے ہیں کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس جاتے ہیں کہ آپ ان کو سمجھا دیں کہ وہ نکاح باقی رکھیں۔

انہوں نے سب کو جواب دے دیا کہ نہیں میں نکاح باقی نہیں رکھتی۔آخر میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ! آپ نے ہی یہ نکاح باندھا تھا۔اب بریرہؓ اس نکاح کو توڑ رہی ہیں۔آپ ان سے فرمادیں کہ اس نکاح کو باقی رکھو۔اور حضرت مغیثؓ بے حد پریشان حال ہیں۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ وقت دیکھنے کے قابل تھا کہ حضرت مغیثؓ مدینے کی گلیوں میں روتے ہوئے پھر رہے تھے۔آنکھوں میں آنسو ہیں۔داڑھی پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں کہ ہائے بریرہؓ جدا ہوگئیں۔اس درجہ عشق تھا۔تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ آپ فرمادیں نکاح باقی رکھنے کو۔حضورؐ تشریف لے گئے اور فرمایا: بریرۃ نکاح مت توڑو مغیث سے۔میں نے ہی وہ نکاح قائم کیا تھا تم اب بھی قائم رکھو۔وہ بھی بڑی ذہین تھیں۔انہوں نے کہا: ''یارسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ آپ نے فرمایا: کہ نہیں حکم شرعی نہیں شرعاً تو تم آزاد ہو۔نکاح رکھو چاہے توڑ دو۔یہ میرا ذاتی مشورہ ہے''۔ ①

بریرہؓ نے کہا پھر تو میں نہیں مانتی۔آخر کار نہیں مانا اور نکاح توڑ دیا تو معلوم ہوا کہ اگر نبی اپنی ذات سے کوئی مشورہ دیں تو وہ قانون واجب الاطاعت نہیں ہوتا، اگر رسالت پیش کریں کہ یہ حکم خداوندی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ جب انبیاء بھی ذاتی طور پر واجبُ الُاطاعت نہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے اور میں ذاتی بات کہوں اور اس پر ضد کروں کہ نہیں اس کو ماننا ضروری ہے۔قطعاً ضروری نہیں ہے۔صرف ایک رائے ہے آپ کی، میری بھی ایک رائے ہے۔ہاں یہ ضروری ہے کہ جو حق ہو اس پر عمل کریں۔تو اللہ نے جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا وہاں اپنا نام لیا ہے اور فرمایا اَطِیْعُوا اللّٰہَ کہ اللہ کی ذات واجبُ الُاطاعت ہے۔آگے رسول کا نام نہیں لیا بلکہ ﴿ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾. ② فرمایا یعنی وصفِ رسالت کا تذکرہ کیا کہ اسی وصفِ رسالت کی وجہ سے وہ واجبُ الُاطاعت ہیں کہ جب رسالت خداوندی پیش کریں تو گردن تسلیم خم کردو۔

اطاعتِ امیر کا معیار...... ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یہاں اَطِیْعُوْا﴾ ③ کا لفظ بھی خصوصیت سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ ﴿ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾. ④ میں ذکر کیا تھا یہ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ پچھلے اَطِیْعُوْا کے نیچے ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اُولِی الْاَمْرِ ہوگا وہ تابع ہوگا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چونکہ آپ کا نائب بن کر آیا ہے۔اس لئے واجبُ الُاطاعت ہے۔مستقلاً اس کی اطاعت نہیں۔اللہ کے رسول کا فرمان نافذ کرے گا تو واجبُ الُاطاعت ہوگی ورنہ محض ذاتی مشورہ ہوگا کوئی واجبُ الُاطاعت نہیں اور اولی الامر کا لفظ آخر میں ہے۔اس کے بعد کوئی اطاعت نہیں ہے۔اس بناء پر تین اطاعتیں ہوگئیں۔اللہ کی اطاعت۔رسولؐ کی اطاعت۔اولی الامر کی اطاعت۔ہاں اگر اولـــی الامـــر کوئی غلط حکم دے۔تو اس کی اصلاح کی جائے۔اس لئے ذاتی حکم

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی ﷺ زوج بریرة، ج:١٦، ص: ٣٣٢، رقم: ٤٨٧٥.

② پارہ :٥، سورة النساء ، الآیة: ٥٩ ③ پارہ :٥، سورة النساء ، الآیة: ٥٩. ④ پارہ :٥، سورة النساء ، الآیة: ٥٩.

واجبُ الاُ طاعت نہیں۔ جب وہ یوں کہے کہ قرآن شریف میں یوں آیا ہے تو پھر وہ واجبُ الاُطاعت ہے چاہے وہ استنباط ہی سے کہتا ہو۔ نص صریح نہ ہو کیونکہ وہ قرآن ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن ہی کا مصداق ہے۔ اس لئے اس سے گردن پھیرنا جائز نہیں ہے۔

صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جب امیر المومنین تھے تو دربار خلافت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین! میرے خاوند کی آپ کیا بات پوچھتے ہیں۔ صَآئِمُ الدَّھْرِ ہے۔ قَآئِمُ الَّیْلِ ہے۔ تمام راتیں عبادتیں کرتا ہے اور تمام دن روزے رکھتا ہے۔

فرمایا کہ ماشاءاللہ اللہ مبارک کرے بڑا اچھا خاوند ہے کہ عبادت گزار ہے، راتوں کو تہجد پڑھتا ہے۔ دنوں کو روزے رکھتا ہے مبارک ہو۔ وہ بچاری چپکی ہو کر چلی گئی۔ دربار میں ایک صحابیؓ موجود تھے جن کا نام اکثمؓ تھا وہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ امیر المومنین! آپ سمجھے بھی! یہ کیا کہہ کر گئی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خاوند کی تعریف کر کے گئی ہے اور کیا کہتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت! اسے کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ دربار خلافت میں آ کر خاوند کی تعریف کرے کہ نمازیں اتنی پڑھتا ہے۔ روزے اتنے رکھتا ہے۔

کہنے لگے پھر کیا کہ کر گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا: خاوند کی تعریف کرنے نہیں آئی تھی بلکہ استغاثہ اور دعویٰ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دعویٰ کیا کر کے گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا کہ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ساری رات تو رہتا ہے عبادت میں اور سارے دن رہتا ہے روزے میں یہ اللہ میاں کے کام کا تو ہے میرے کام کا نہیں ہے۔ یہ ہے اس کا منشاء وہ استغاثہ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور فرمایا کہ مجھ جیسے کو امیر بنا دیا ہے معاملہ سمجھنے کی بھی طاقت نہیں۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ امیر بنایا جاتا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی سمجھ دی ہے تو تو ہی فیصلہ کر اس مقدمے کا جب اس نے استغاثہ دائر کیا ہے اور خاوند کی شکایت کی ہے تو کیا حکم شرعی ہونا چاہئے؟

انہوں نے فوراً ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کیا کہ ''امیر المومنین! اس کے خاوند کو حکم دیا جائے کہ چار دن میں سے ایک دن ضرور افطار کیا کرے اور خوب کھانا کھایا کرے اور چار راتوں میں سے ایک رات بالکل نہ جاگے۔ بیوی کے پاس سویا کرے۔ تین راتوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب تہجد پڑھے اور تین دنوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب روزہ رکھے۔ تو ہر چار دن میں سے ایک دن اور ہر چار راتوں میں سے ایک رات خالی چھوڑے''۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اکثمؓ! یہ حکم تم نے کہاں سے نکالا ہے۔ انہوں نے کہا قرآن سے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ کہ اگر کسی بیوی کا خاوند رات دن عبادت کرے تو وہ چار رات دن میں سے ایک رات دن بیوی کے پاس گزارے۔ عرض کیا قرآن میں حکم ہے۔ ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (1) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اگر

---

(1) پارہ: ۴، سورة النساء، الآية: ۳.

چار بیویاں ہوں تو چار راتیں انکے گھر جائیں گے۔ اگر چار میں سے ایک بیوی ہو تو تین راتیں خدا کی اور ایک رات بیوی کی۔ فرمایا: سبحان اللہ کتنا اچھا فیصلہ ہے۔ مجھ جیسے کو امیر بنا دیا جس نے قرآن سے اتنا فیصلہ نہیں کیا۔ اس دن حضرت عمرؓ نے ان کو چیف جسٹس یعنی قاضی القضاۃ بنا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سمجھ کو تیز کیا ہے۔ اس لئے تم ہی فیصلے کرو آج سے مسلمانوں کے مقدموں کے۔ ایک چاول سے پوری دیگ پرکھی جاتی ہے جب ایک فیصلہ کیا کہ جو کہ معمولی مسئلہ تھا قرآن سے پیش کیا۔ فرمایا کہ تیری سمجھ اس قابل ہے کہ آج سے تو مسلمانوں کے فیصلے کرے۔ اس بناء پر ان کو قاضی القضاۃ بنا دیا۔

انحرافِ اطاعت موجب تفریق ہے...... بہرحال اطاعتیں تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کے جو نمائندے اور نائب ہیں ان کی اطاعت جب کہ وہ رسول کی رسالت کو جاری کریں اور ان کے علم پر اعتماد ہو تو وہ واجبُ الاطاعت بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنا قوم کے اندر تفریق ڈالنا ہے اس لئے مامورین کے ذمہ ہے کہ ہر صورت میں جب کہ وہ حکم شرعی بیان کریں تو ان کی اطاعت کریں۔ لہٰذا جب ہم نے اپنا امیر شریعت بنالیا ہے اور بحمد اللہ ان میں امیر شریعت کے اوصاف بھی موجود ہیں جو اوصاف کہ واقعی طور پر ایک امیر کے اندر ہونے چاہئیں۔ خدا نے ان کو اہل بنایا ہے۔ جب آپ کو ایک اہل ملا تو آپ کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ اب ایسے اشخاص تو آنے سے رہے جو کبھی بھی غلطی نہ کریں۔ ہمیں اپنے ہی میں سے ہر ایک کو بنانا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہاں اتنا دیکھ لو کہ وہ بشر عمدہ ہو جس کی تمام زندگی تقویٰ وطہارت سے گزری ہو۔ جس کی زندگی میں صلاح اور رشد پایا جاتا ہو وہ بے شک اس قابل ہے کہ وہ ہمارا مطاع بن جائے اور غلطی سے تو کوئی بشر خالی نہیں ہر ایک انسان غلطی بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود واجب الاطاعت ہے تو بہرحال اللہ تعالیٰ نے ایک امیر بنا دیا آپ کے لئے جو اہل ہے امامت کا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر ان سے کوئی اور افضل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ امیر سب سے افضل ہو۔ اگر دوسرا کوئی افضل بھی ہو تو اطاعت اسے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ قوم نے مل کر ان کو امیر مقرر کر دیا ہے۔

امارت کی بنیادی شرط...... اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب! میں ان سے زیادہ کامل ہوں۔ اس لئے امیر میں بنوں گا۔ تو مدعی کو امیر بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ خود شریعت میں مسئلہ موجود ہے "لَانُوَلِّیْ اَمْرَنَا هٰذَا مَنْ طَلَبَهٗ" (۱) جو خود عہدے کی طلب کرے اسے کبھی عہدہ نہیں دیں گے۔

جو شخص عہدے سے بچے اور الگ رہے وہ اس قابل ہے کہ عہدہ اس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس واسطے کہ جب مسلمانوں نے عہدہ ڈال دیا اس کے ذمے اور امیر بنا دیا اور امیر نے پھر ایک قاضی مقرر کر دیا تو قوم کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات سامنے آئے کہ صریح قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ

(۱) الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب النهي عن طلب الامارة والحرص عليها، ص: ۱۳۳۳.

دیا اور تخریب کر دی تو بھائی اس وقت غور کرنا! کہ ایسے کو امیر کیوں بنایا، لیکن قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کر رہا ہے۔ تو اس بیچارے سے کیوں انحراف کریں؟

اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری...... امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اپنے معاملات مین ان کی طرف رجوع کریں اور سمع وطاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔ وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہوگی اور ایک کے تابع ہوگی تو اغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد و منظم قوم۔ جب عید کی نماز ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے پچاس پچاس ہزار آدمی ہوتے ہیں تو بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ یہ نظام کسی قوم کو نصیب نہیں ہے جو اس قوم کو دیا گیا ہے کہ ایک کے اشارے پر لاکھوں آدمی جھک رہے ہیں۔ حرم محترم میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک امام کے پیچھے تیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک امام زکوٰۃ کے پیچھے سارے اپنی زکاتیں پیش کر رہے ہیں۔ تو اسلام نے ہر ہر جزئی میں ایک نظم قائم کیا ہے اور نظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک جماعت نہ ہو اور جماعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور امیر نہ ہو اور امیر ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ سمع وطاعت نہ ہو۔ تو سمع وطاعت ہم سب کا فرض ہے ہمیں اور آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالی نے ہمیں اس کی توفیق دی کہ ہم نے اپنا ایک امیر مقرر کیا اور امیر بحمد للہ ایسا کہ قابل اعتراض نہیں ہے۔

انتخاب امیر کے لئے مجموعی زندگی کو پیش نظر رکھا جائے...... دنیا میں کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اعتراض سے بچی ہوئی ہو۔ اعتراض سے کوئی خالی نہیں۔ اعتراض جس پر چاہو کر دو۔ حتی کہ اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول پر بھی اعتراض کر دیئے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

قَـدْقِيْـلَ اِنَّ الـلّٰـهَ ذُوْ وَلَـدٍ   وَقِيْـلَ اِنَّ الـرَّسُوْلَ قَدْ كَهَنَ

مَـانَـجَـا الـلّٰـهُ وَالرَّسُوْلُ مِنْ   لِّسَـانِ الْـوَرٰى فَـكَيْفَ اَنَـا

کہنے والے نے کہا کہ اللہ صاحب اولاد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیٹے ہیں اور باپ ہیں۔ اور حضرت مریم بیوی ہیں۔ رسول کے بارے میں کسی نے کہا کہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ساحر ہیں، کسی نے کہا کہ مجنون ہیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ جب اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول کو بھی نہیں چھوڑا تو میں کون ہو۔ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ دنیا میں کون ہے ایسا جس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ بھائی تھوڑا بہت تو اعتراض سب پر ہوتا ہے۔ مجموعی زندگی کو دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی زندگی سچائی سے گزر رہی ہے یا مکر و فریب سے۔ صلاح وتقویٰ پر گزر رہی ہے یا جہالت پر اس لئے اگر تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جائے تو وہ قابل عفو ہے۔ ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ① جن کی نیکیاں غالب ہیں وہ اللہ کے یہاں بھی نجات پا جائیں گے۔ معصوم تو انبیاء علیہم

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۸۔

الصلوٰۃ والسلام کی ذوات گرامی ہیں۔

لیکن انبیاء کے بعد اولیاء محفوظ ہیں۔ پھر اولیاء کے بعد جتنے ہم اور آپ ہیں نہ محفوظ ہیں نہ معصوم ہیں۔ کبھی نہ کبھی کوئی غلطی ہو ہی جائے گی مجموعی زندگی کو دیکھ کر حکم لگے گا۔ ایک ایک غلطی نہیں پکڑی جائے گی۔ یہ بدنیتی ہوگی کہ ساری زندگی کی اچھائیوں میں سے ایک برائی پر نظر پڑی تو اس کو آپ نے اچھال دیا یہ تو عناد کی بات ہے۔ یہ کوئی آدمیت نہیں ہے۔ یہ ہے خِلّتِ ما کرہٗ نبی کریمؐ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا کہ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اَعُوْذُبِکَ مِنْ خَلِیْلٍ مَّاکِرٍ عَیْنَاہُ تَرَیَانِیْ وَقَلْبُہٗ یَرْعَانِیْ اِنْ رَّاٰی حَسَنَۃً دَفَنَھَا وَاِنْ رَّاٰی سَیِّئَۃً اَفْشَاھَا۔'' ② ''اے اللہ! میں ایسے مکار دوست سے تیری پناہ لیتا ہوں جس کی آنکھیں مجھے دیکھیں اور اس کا دل میری ٹوہ میں لگا رہے اگر نیکی دیکھے تو اسے چھپالے اور اگر برائی دیکھے تو اس کو پھیلاتا پھرے''۔

ایسا دوست پسندیدہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی برائی آپ کے سامنے ہو تو اس کی اچھائیوں کو بھی دیکھنا چاہئے اور ان اچھائیوں کی وجہ سے اس کی برائی نظر انداز کر دینی چاہئے۔ یہی قرآن کا فیصلہ بھی ہے۔ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ① کہ نیکیاں تمام برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب ختم ہو گئی پھر برائی رہ ہی کہاں گئی جس کو اچھالا جائے۔ لیکن کہنے والے اور اعتراض کرنے والے تو ہر وقت اور ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ کام کرنے والے اگر اس کی پرواہ کریں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ قیامت میں جب باری تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی تو اعتراض کرنے والے بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والے بھی کھڑے ہوں گے۔ مگر کامیاب وسرخرو کام کرنے والے ہوں گے، تو شکریہ ادا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ہمیں اپنا امیر بنانے کی توفیق دی اور آگے ہم اس کی توفیق بھی بارگاہ صمدی سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے امیر کی سمع و طاعت کریں اور ہم کو راہ راست پر چلائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ ہمیں اسلام پر قائم ودائم رکھے، ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

آمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

① کنز العمال، ج: ۱، ص: ۴۷۹، رقم: ۳۷۶۶. ابن النجار عن سعید المقبری مرسلاً.

② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۱۴.

اَلواعظ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ، وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے...... بزرگانِ محترم! آج بعض ضروری کام کی وجہ سے وعظ کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر چونکہ موذن صاحب نے اعلان کر دیا اس لئے موذن صاحب کے اور دوسرے حضرات کے اس جذبہ اور شوق کے پیش نظر کہ آپ لوگوں کو وعظ سننے کا شوق ہے اور اس خیال سے آپ لوگ جمع ہو گئے ہیں کہ خدا کی، دین کی اور شریعت کی کوئی بات کان میں پڑ جائے۔ آج میں آپ لوگوں کو ایسی بات بتلا دوں کہ کوئی واعظ ہو یا نہ ہو۔ مقرر ہو یا نہ ہو آپ لوگ وقت صرف کر کے کہیں جمع ہوں یا نہ ہوں جس حال میں بھی ہوں خود وعظ کہہ لیں اور خود سن لیں۔ خدا اور رسول کی بات کہہ اور سن کر اس پر عمل کر لیں کہ مقصود عمل ہے۔ فائدہ نہ صرف کہنے سے ہوتا ہے اور نہ سننے سے ہوتا ہے فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے۔ فرمایا۔

عقل فکر ونظر کا واعظ...... انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اس کی عقل ہے۔ اگر انسان عقل وتدبر اور تفکر سے کام لے، انقلابات زمانہ اور لیل ونہار کی گردش پر غور کرے اور سوچے تو اس سے اس جہان کے خالق اور اس کی مخلوقات، عجیب وغریب کرشمہ سازیوں اور بوقلموں ایجادات کی طرف رہنمائی ہوگی۔ علوم وحقائق کا انکشاف ہوگا۔ رشد وہدایت کی راہ کھلے گی۔ حیات، زندگی اور دنیا کی ناپائیداری اور ناثباتی کا پتہ چلے گا۔ موت اور بعد الموت پیش آنے والے واقعات کا علم الیقین حاصل ہوگا۔ خدا اور آخرت کی طرف طبیعت رجوع کرے گی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ② آفاق اور انفس میں خدائے برتر وبزرگ کی ہزار

① پارہ:۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ:۱۸۵ . ② پارہ:۲۵، سورۃ فصلت، الآیۃ:۵۳.

ہا نشانیاں اور علامات موجود ہیں اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے دھیان دیا جائے۔قلب کو متوجہ کیا جائے۔عالم کی ایک ایک جزئی سے خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور بالغ النظری نمایاں ہوگی۔مگر شرط دھیان اور توجہ ہے، جب تک دھیان اور توجہ سے دیکھا نہ جائے اور غور نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ کوئی حکمت ظاہر ہوگی اور نہ کسی مصلحت و دانائی کا پتہ چلے گا۔دن رات کا مشاہدہ ہے۔بازار میں، مدرسہ میں، گھر میں، جب تک آپ دھیان نہ دیں کسی کام یا چیز کو خیال اور توجہ سے نہ کریں اور نہ دیکھیں۔اس وقت تک آپ کو اسکا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔حالانکہ وہ واقعات آپ کی نظروں کے سامنے گزر رہے ہیں۔آپ کے کان آپ کی آنکھیں اسے سن اور دیکھ رہی ہیں۔لیکن پوچھنے پر آپ انہیں بتلا نہیں سکتے، اس واسطے کہ آپ نے اسے دھیان اور توجہ سے نہیں دیکھا۔قلب کو متوجہ نہیں کیا۔تو اصل قلب ہے۔قلب اگر متوجہ نہ ہو تو نہ کوئی دکھائی دے اور نہ کان کچھ سن سکے۔

یہ آنکھ اور کان قلب کی عینک اور چشمہ ہیں۔انسان اگر صرف اپنے نفس، اس کے عدم، پھر وجود اور پھر عدم پر غور کرے اور دیکھے کہ دن اور رات میں، صبح اور شام میں اس خاک کے پتلے پر کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔اور کن کن حالات سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔کوئی پیدا ہوتا ہے کوئی مرتا ہے۔کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار و مریض، کسی کی زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی ہے اور کسی کی تنگی اور عسرت سے۔بہر حال اگر انسان آفاق و انفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے، اس کے حوادث و واقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔عقل و بصیرت، تدبر اور تفکر سے کام لے۔تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی۔اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔اس عالم کون و فساد، اس کے حوادث، واقعات، انقلابات اور صبح و شام کے تغیرات پر نظر ڈالو، غور کرو، دھیان اور توجہ سے سوچو۔یہ انقلابات تمہیں خالق کا، صانع کا، اور مالک کا پتہ دیں گے، خالق کے اقرار کے بعد اس کی قدرت، حکمت، علم اور ملوکیت کا نشان ملے گا۔اس کے بعد اس سے محبت عقیدت اور تعلق پیدا ہوگا۔پھر اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت کی طرف میلان پیدا ہوگا۔آخرت، دین اور خدا اور رسول کی طرف طبیعت رجوع کرے گی اور یہی حاصل ہے وعظ کا، نصیحت کا اور تقریر کا۔غرض عقل اس عالم میں غور و فکر انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اور مفت کا واعظ ہے۔

موت ایک خاموش واعظ...... دوسرا بڑا واعظ موت ہے۔اگر انسان موت پر اس کے احوال پر اور یہ کہ موت کے بعد کیا پیش آنے والا ہے؟ اور یہ کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیا رہا؟ اور موت کے بعد خدا ہم سے کیا معاملہ کرے گا؟ ان احوال پر غور کرنا خود دین اور منشاء شریعت ہے۔موت کی یاد سے خدا یاد آتا ہے، آخرت کی یاد آتی ہے، دنیاوی لذات سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔اور یہی حاصل ہے وعظ کا اور نصیحت کا۔حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا. انسان کے لئے بڑا واعظ موت ہے۔دوسری حدیث میں ارشاد ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ لذتوں کو مٹانے والی (موت) کا ذکر زیادہ کیا کرو۔موت سے غافل نہ ہو۔موت کا دھیان ہر وقت

رکھا کرو۔اس سے دنیا میں اس کی لذات اور آرائشوں میں انہاک کم رہے گا۔آخرت کی توجہ ہوگی۔عبادت اور اطاعت میں جی لگے گا اور یہی اصل ہے وعظ کا۔غفلت بہت بری چیز ہے۔غفلت سے انسان خسارہ اور نقصان میں رہتا ہے، دنیاوی معاملات میں رات دن کا مشاہدہ ہے، بارش کے وقت اگر کاشتکار آرام میں رہے۔ٹھنڈی ہوا اور سہانے وقت کے عیش میں پڑا رہے، نہ کھیت پر جاوے اور نہ بیج ڈالے نہ نولائی کرے اور نہ کھیت کی دیکھ بھال کرے تو ظاہر ہے کہ جب دوسرے کاشت کار اپنی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھ کر خوش ہوں گے اسے کاٹیں گے۔غلہ اور اناج گھر لائیں گے تو یہ غافل کاشت کار کف افسوس ملے گا اور شرمندہ ہوگا لیکن اس نے وقت کھو دیا وقت کو ضائع کر دیا۔غفلت اور لا پرواہی برتی۔افسوس اور پچھتانا اب کچھ کام نہیں دے گا۔بعینہ یہی حال آخرت کا ہے۔حدیث میں ہے ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔

دنیا میں اگر انسان توجہ سے دھیان سے کام کرتا رہے۔غفلت نہ برتے، وقت کو ضائع نہ کرے، قلب میں ایمان کا بیج ڈالے، اعمال سے اس کی آبپاشی کرے، خیر خیرات اور صدقات سے اس کی دیکھ بھال اور نولائی کرتا رہے، موت کو یاد رکھے، اعمال کا محاسبہ اور نفس کا مراقبہ کرتا رہے تو آخرت میں سرخرو ہوگا۔کامیاب ہوگا اور فائز المرام ہوگا ورنہ نقصان میں رہے گا۔حدیث میں فرمایا گیا ''اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا فَانْتَبَهُوْا'' ② لوگ سو رہے ہیں۔غفلت میں ہیں۔جب مریں گے حساب و کتاب دیں گے۔سوال و جواب ہوگا۔اس وقت چونکیں گے، غفلت سے بیدار ہوں گے لیکن دوراندیش اور عاقبت میں وہ انسان ہے جو سوال و جواب، حساب و کتاب اور محاسبہ سے پہلے ہی اپنا حساب پاک وصاف رکھے نفس کا مراقبہ کرتا رہے۔

روزمرہ کے واعظ..... فرمایا گیا: ''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا'' ③ مرنے سے پہلے اپنے کو مرا ہوا سمجھو۔محاسبہ سے پہلے اپنے اعمال اور احوال کا حساب کرلو، پاک وصاف ہوکر جاؤ۔خدا کے دربار میں سرخرو پاک وصاف ہوکر حاضر ہو۔غرض موت بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہے۔موت سے پہلے مرض، بیماری، بڑھاپا، مصائب اور تکالیف بھی کم از کم مسلمان کے لئے واعظ اور مذکر کا درجہ رکھتے ہیں۔انسان کو غور وخوض، دھیان اور توجہ کی ضرورت ہے۔غفلت اور سستی چھوڑو۔ہمت اور عزم واستقلال سے کام لو۔تم تھوڑا کرو۔خدا زیادہ توجہ کرے گا۔تم خدا کی طرف ایک قدم بڑھو گے تو خدا دو قدم بڑھے گا۔''مَنْ اَتٰـی اِلَیَّ شِبْرًا اَتَیْتُهٗ

---

① المقاصد الحسنة، قال السخاوی لم أقف علیه مع ایراده الغزالی له فی الاحیاء، حرف الدال ، ج: ۱، ص: ۱۱۸.

② یہ حضرت علی کا قول ہے۔دیکھئے: کشف الخفاء ۲/۳۱۲.

③ حدیث کے پہلے حصے ''موتوا قبل ان تموتوا'' کے بارے میں علامہ عجلونی فرماتے ہیں: قال الحافظ ابن حجر هو غیر ثابت وقال القاری: هو من کلام الصوفیة، دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۱ جبکہ دوسرا حصہ ''حاسبوا قبل ان تحاسبو'' حضرت عمرؓ کا قول ہے، دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبه، کلام عمر بن الخطابؓ ج: ۸ ص: ۱۴۹.

ذِرَاعًا وَمَنْ اَتٰى اِلَيَّ ذِرَاعًا اَتَيْتُهٗ بَاعًا وَمَنْ اَتٰى اِلَيَّ مَشْيًا اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً"۔ ① "جو میری طرف ایک بالشت آوے میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آوے میں اس کی طرف ایک قدم یا ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف متوسط رفتار سے چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"۔ (الحدیث) کیا ٹھکانا ہے اس کی رحیمی اور کریمی کا۔ البتہ اس کی رحمت اور کرم لینے کو لینے کی اہلیت کے ساتھ ساتھ سعی اور کوشش کو بھی دخل ہے۔ تمہاری ادنیٰ توجہ سے خدا کی زیادہ توجہ ہوگی اور تم انشاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر دنیا سے جاؤ گے۔

نصیحت اور دعا پر تقریر ختم فرمائی۔

① الصحيح للبخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالىٰ: ويحذركم الله نفسه ج: ۲۰۲ ص: ۴۰۹.

اظہار تعزیت

''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُـہٗ،أَرْسَلَـہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. أَمَّـا بَعْـــــدُ! فَأَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰـنِ الرَّحِیْمِ ﴿کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ﴾① (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

موت کا جام......

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی ۔۔۔ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

بزرگانِ محترم! دنیا میں موت وحیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینش عالم سے جاری ہے، ولادتیں بھی ہو رہی ہیں اور موتیں بھی آ رہی ہیں، ولادت کے بعد موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عالم میں ہر کلیہ میں کچھ نہ کچھ مستثنیات نکلتے ہیں۔ مگر جس کلیہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں وہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ...... کا کلیہ ہے، جب انبیاء اور اولیاء اور دنیا کے بڑوں میں امراء وسلاطین مستثنیٰ نہیں رہے تو کون ہے کہ موت کے پنجے سے اسے بچا ہوا باور کر لیا جائے۔ پس جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی آخری منزل موت ہی ہے۔

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید ۔۔۔ ز جام دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

یعنی جو بھی پیدا ہوا ہے اسے بہر حال موت کا جام نوش کرنا ہے۔

فَاِنَّ الْمَوْتَ غَایَۃُ کُلِّ حَیٍّ ''موت ہی ہر زندہ کی آخری منزل ہے''۔ اسی لئے ولادتوں کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی دنیا میں قائم ہے اور رہے گا۔

کسی کا کندہ نگینہ پر نام ہوتا ہے ۔۔۔ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے

عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام وسحر ۔۔۔ کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

فرقِ مراتب......لیکن ولادت وموت سب کی یکساں نہیں ہوتی بلکہ جیسے پیدا ہونے اور مرنے والے مختلف

① پارہ : ۲۱،سورۃ العنکبوت،الآیۃ:۵۷.

مراتب کے لوگ ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی ولادتوں اور موتوں میں تفاوت اور فرق مراتب ہوتا ہے کسی کی پیدائش صرف ماں باپ کے لئے خوش کن ہوتی ہے۔ کسی کی خاندان بھر کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ کسی کی ولادت پر پورا شہر خوشی کرتا ہے اور کسی کی پیدائش پر ملک بھر اور دنیا میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی موت بھی برابر نہیں۔ کسی کے مرنے پر کوئی بھی رونے والا اور میراث بانٹنے والا نہیں ہوتا۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد ہے قَلَّتْ بَوَاكِيهِ وَقَلَّ تُرَاثُهُ. ''نہ اس کے رونے والے نہ میراث لینے والے''۔

کسی کی موت پر صرف اس کے ماں باپ یا قریبی عزیز غم کر لیتے ہیں۔ کسی کی موت صرف خاندان کے لئے غم ساتھ لاتی ہے، کسی کی موت سے شہر کا شہر سوگوار ہو جاتا ہے اور کسی کی موت پر شہر ہی نہیں ضلع اور صوبہ روتا ہے۔ خان بہادر مرحوم انہیں لوگوں میں سے تھے کہ جن کی ولادت بھی صرف ایک گھر کی خوشی نہ تھی بلکہ کئی خاندانوں اور ایک پورے علاقہ کی خوشی تھی۔

احسانات کا غم...... اور آج جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا غم بھی صرف ان کے گھر کا غم نہیں بلکہ خاندانوں پورے شہر والوں پورے ضلع والوں بلکہ بعض حیثیات سے پورے صوبے کا غم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی ذات کو نہیں روتا، بلکہ اس کے اوصاف کو، اس کے احسانات کو اور اس کی خوبیوں کو روتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کہ اچھے اوصاف کا انسان مرنے کے وقت ہنستا ہوا اور خوش ہوتا ہوا اپنے اللہ سے ملتا ہے اس وقت دنیا روتی ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو	ہمہ خنداں شوند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو	ہمہ گریاں شوند تو خنداں

تجھے یاد بھی ہے کہ تیری پیدائش کے وقت تو تو رو رہا تھا اور سب خوشی سے ہنس رہے تھے۔ بس زندگی ایسے گزار کہ مرنے کے وقت تو تو خوشی سے ہنستا ہوا ہو اور سب روتے ہوئے ہوں۔'' تو یہ واقعہ ہے کہ خان بہادر مرحوم اسی شعر کے مصداق تھے کہ وہ تو انشاء اللہ اپنے نیک کردار کے سبب ہنستے ہوئے اپنے مالک سے جا ملے اور دنیا آج ان کے ماتم میں رو رہی ہے تو یہ رونا ان کی ذات کا نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خوبیوں کا ہے جو آج ہم سے چھن گئی ہیں۔

سلامتی فطرت...... خان بہادر مرحوم کی جوانی اور پیری میرے سامنے گزری ہے۔ میرا لڑکپن تھا اور وہ جوان تھے ان کی زندگی کا ایک عجیب اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ لڑکپن میں بلا مربی کے رہ گئے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک نونہال جو خاندانوں کی آنکھ کا تارا ہو اور دولت سے گھر بھرپور ہو تمام وسائل زندگی اور مال و جاہ خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہو اور اوپر سے کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں مال و دولت کی فراوانی کی جو بری لت بھی پڑ جائے وہ حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ہزاروں رئیس زادے اس طرح بگڑتے دیکھے گئے کہ سر پر بڑا اور مربی نہ رہا اور خاندانی دولت بلا محنت ہاتھ لگ گئی تو

بدکاریوں اور برائیوں میں مبتلا ہو کر دولت بھی برباد کر دی، جائیداد بھی ضائع کر دی اور خاندانی وجاہت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن یہ خان بہادر کی ہستی تھی کہ گھر کی ریاست ہاتھ میں ہے سر پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں لیکن اپنی سلامتی فطرت سے وہ کسی بری لت کے شکار نہیں ہوئے، کسی عیاشی کسی تعیش، کسی فضول خرچی، کسی نمود و نمائش کے چکر میں نہیں پھنسے ان کی جائیداد نہ صرف یہ کہ محفوظ ہی رہی، بلکہ باغ و راغ کا اس میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ بلا شبہ ان کے قلب کی سلامتی اور فطرت کی خوبی تھی کہ وہ خود بخود اسی راہ پر چلے جس پر نیک دل رئیس کو چلنا چاہئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے انہیں دولت کے ساتھ عزت کے خزانے بھی بخشے، وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہوئے، چیئرمین بھی ہوئے اور برسہا برس رہے۔ صوبائی کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ اونچی سوسائٹی میں ان کا مقام بھی بنا اور شہر یا ضلع ہی کے نہیں صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ صوبہ بھر کے بڑوں میں شمار ہوئے، دوسرے لفظوں میں انہوں نے پوری صوبائی ملت کا اعتماد حاصل کر لیا جو ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔

ضمیر کی سچائی...... ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ وہ جس حالت میں قوم کے معتمد علیہ تھے اسی حالت میں گورنمنٹ کے بھی معتمد علیہ تھے۔ اعتماد کا آخری ڈپلومہ سرکاری خطاب ہے۔ سو وہ بھی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں عطاء ہوا اور پھر عجیب تر یہ ہے کہ قوم اور گورنمنٹ کا ان پر اعتماد بیک وقت اس وقت بھی بدستور قائم رہا جب کہ قوم اور حکومت میں کشمکش اور مقابلہ ٹھن گیا اور جو لوگ قوم میں معتمد تھے ان کا اینٹی گورنمنٹ ہونا لازمی تھا اور جو گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہوتے تھے ان کا اینٹی قوم ہونا ضروری تھا لیکن خان بہادر کے قلب کی یہ جامعیت اور صفائی حیرتناک ہے کہ وہ اس کشمکش کے دوران میں بھی بدستور قوم اور گورنمنٹ دونوں ہی کے معتمد علیہ رہے۔ کس طرح رہے؟ بعض لوگ دور خا اعتماد نفاق سے حاصل کرتے ہیں کہ جدھر جاتے ہیں ادھر ہی کی کہہ کر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں انسان دونوں جانب سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ خان بہادر نے ان دونوں متضاد جانبوں کا اعتماد اپنے ضمیر کی سچائی سے حاصل کیا۔ وہ گورنمنٹ اور قوم کے سامنے سچائی سے وہی بات کہتے تھے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔ بے غرض کہتے تھے، وہ کسی لالچ یا طمع سے کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔ وہ گورنمنٹ پر تو قوم کے اثرات کا دباؤ ڈال کر گورنمنٹ کو قوم کی بھلائی کے لئے ہموار کرتے تھے اور قوم کو سچائی کے ساتھ اس کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی بات پہنچا دیتے تھے جس میں ان کے نزدیک قوم کی بھلائی و بہبودی ہوتی تھی، ان کی یہ سب باتیں اس قدر سلجھی ہوئی اور بااصول ہوتی تھیں کہ انہیں مانے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا تھا، اس لئے قوم اور حکومت دونوں ان پر اعتماد کرنے میں مجبور تھے۔ بہر حال انکے پیچھے جاہ و مال کی کوئی بری لت نہ تھی، جس سے ان کی دنیوی جاہ و عزت بڑھی، دولت نے ترقی کی اور اونچی سوسائٹی نے انہیں قبول کیا اور دنیاوی حیثیت سے وہ کبھی کسی تنزل سے دوچار نہیں ہوئے۔

دینی مقبولیت...... ہاں! جوانی میں اگر ان کے پیچھے کوئی دولت لگی تو وہ بزرگانِ دین کی طرف رجوع ان کی

مجلسوں میں بیٹھنا ان کی عادت بنی۔ یہ بھی ان کے ضمیر کی خوبی اور دل کی ہدایت کی بات تھی کہ لت بھی لگی تو وہ جو دنیا و آخرت میں مقبولیت کا ذریعہ بنے اور ان کی عزت کو پر چاند لگا دیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس نشینی۔ میرے والد صاحب قبلہ کی مجلس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اکثر و بیشتر والد مرحوم کے ساتھ ان کے گھر پر آنا مجالس میں بیٹھ کر کچھ حاصل کرنا ان کا امتیاز بن گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نیکوں میں بیٹھ کر آدمی نیک اور بدوں میں بیٹھ کر بد ہوتا ہے۔ خان بہادر جیسے سلیم الطبع انسان کو دل کی سلامتی کے ساتھ جب مجلسیں بھی اہل خیر کی ملیں تو ان کی طبعی نیکی اور زیادہ دوبالا ہوگئی۔ ماہ رمضان میں مجھے یاد ہے کہ کئی کئی بار میرا قرآن شریف سننے مسجد دارالعلوم میں آتے اور تراویح کے بعد ان بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر طویل صحبت حاصل کرتے تھے جس سے دنیوی مقبولیت کے ساتھ انہیں دینی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

اعتماد اکابر......اور وہ جس طرح گورنمنٹ اور قوم میں معتمد علیہ تھے اسی طرح دینی طبقہ اور جماعت علماء میں بھی معتمد علیہ بن گئے، ان کی زندگی کا عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جس طبقہ میں بھی پہنچ جاتے تھے اس کا اعتماد لے کر واپس ہوتے تھے۔ جو ان کی طبیعت کے بے لوث اور صاف ہونے کی دلیل ہے۔ گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ خطاب یافتہ ہوئے۔ قوم کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ کونسل کے نمائندہ (ممبر) منتخب ہوئے، شہر کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ دیوبند کے چیئرمین ہوئے تو علماء کا اعتماد حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۳۵۳ء سے ۱۳۷۴ء تک اکیس برس انہوں نے رکنیت کی یہ خدمات اس خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں کہ ان کے دوست اور مخالف سب ان سے خوش رہے، جس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ وہ ہر اقدام اپنے ضمیر کی سچائی سے کرتے تھے۔ کسی رور عایت سے ان کے یہاں کام کی انجام دہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے بڑے اور چھوٹے سب ان کے مداح تھے۔ کوئی بھی ان سے نالاں اور گریاں بریاں نہ تھا کیوں کہ نہ وہ خود غرضی سے کام کرتے تھے نہ انتقامی جذبات سے کام لیتے تھے، بلکہ اصول پسندی سے ان کی رائے اور عمل کا کام انجام پاتا تھا۔ اس دینی سلسلہ کی رکنیت اور علماء کی صحبت و معیت کا انجام دنیوی بہبود و فلاح کے ساتھ اخروی کامیابی کی صورت میں نمایاں ہوا، نماز، روزہ کی پابندی، زکوٰۃ کا حساب کتاب، حج کی توفیق، مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد کے کام ان سے بے تکلف سرزد ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے غرباء کی امداد گھر بیٹھ کر کرتے تھے۔ دو مرتبہ ان کے عطیات کا امین میں خود بنا اور ان کے منشاء کے مطابق ان کی رقم مدینہ منورہ میں تقسیم کی گئی۔ پس مرحوم ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہیں دنیا کے ساتھ دین اور جائز عیش کے ساتھ طاعات و عبادت کی توفیق بھی بخشی گئی۔

انفرادی اعتماد......آج اگر یہ شہر اور ضلع خان بہادر کو رو رہا تھا تو وہ ان کی ذات کو نہیں بلکہ ان کے اوصاف کو رو رہا ہے جن کی بدولت وہ ہر طبقہ میں مقبول، ہر طبقہ کے معتمد علیہ تھے اس پر مزید خوبی ان کی بے تکلفی تھی بڑے ہی نہیں

چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ چھوٹا انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ وہ خود اپنی نگاہ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ برادری میں برابر کے بھائی کی طرح، بزرگوں میں نیک سرشت خوردوں کی طرح اور خوردوں میں مشفق بزرگوں کی طرح پیش آتے تھے جس سے انفرادی اعتماد بھی ان کا افراد میں قائم تھا۔

بہر حال یہی وہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے شہر اور ضلع سوگوار ہے اور غم میں گریاں ہے۔ چنانچہ آج کی مجلس میں بھی وہی مجلس غم اور تعزیت کی مجلس ہے جو شہر کی طرف سے منعقد ہوئی ہے۔ اس مجلس کا موضوع یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے غم کو جو چھپایا نہیں جاسکتا اور دل میں اس کی سمائی مشکل نظر آ رہی ہے کھول دیں۔ اور آنکھیں اگر روتے روتے تھک گئی ہیں تو دل کو ہی گریہ و بکا سے ہلکا کرلیں۔

لیکن میں اپنے بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا کہ رونا اور غم کرنا نہ کوئی فائدہ مند بات ہے نہ اس سے دنیا و آخرت کا کوئی نفع متعلق ہے اگر رونے اور غم کرنے سے جانے والا واپس ہو جایا کرتا تو سو برس تک بھی رونا بند نہ کیا کرتے۔ بقول عرفی کے ؎

عرفی گر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

''اے عرفی اگر رونے سے مرنے والا مل جایا کرتا تو سو سال بھی ہم رونے سے نہ تھکتے اور روتے رہتے''۔

رسمی نوحہ و بکاء...... لیکن رونا اور غم کرنا کسی کو واپس نہیں لاسکتا اسی لئے شریعت کے نزدیک غم لے کر بیٹھنا اور بہ تکلف اسے نمایاں کرنا جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ بڑے لوگ مرتے وقت وصیت کر جایا کرتے تھے کہ ہمیں برس دن رویا جائے تا کہ دنیا پر واضح ہو کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ برس دو برس کون ہے کہ دل سے روئے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں اور انہیں اجرت دے دے کر رلایا جاتا تھا، جب کوئی تعزیت اور پرسہ کے لئے آتا تو وہ جلدی سے حلقہ باندھ کر بیٹھتیں اور آوازیں ملا کر نوحہ و بکاء کرنا شروع کر دیتیں۔ موثر اشعار اور غم افزا کلمات سے دلوں کو پگھلاتیں اور لوگ آنسو پونچھ کر یہ کہتے ہوئے چلے جاتے کہ حقیقتاً ایک بڑا آدمی دنیا سے اٹھ گیا جس کا یہ سوگ کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسمی رونے میں نہ رونے والیوں کا دل شریک ہوتا نہ رونا دیکھنے والوں کا۔ دونوں سازی سے روتے تھے برادری یا شہر کو دکھلانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے۔

میت کی راحت رسانی...... اس لئے ہماری مجلس اور ہماری انفرادی نشست کا موضوع غم و ماتم نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسم جاہلیت ہے۔ بلکہ موضوع یہ ہونا چاہئے کہ ہم سے تو میت کو نفع پہنچے اور میت سے ہمیں نفع پہنچے۔ شریعت نے ہم سے میت کو نفع پہنچنے کی صورت تو ایصال ثواب بتلائی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ''قبر کے اندھیرے گھرانے میں میت اپنے گھر والوں سے آس باندھتا ہے کہ شاید مجھے کوئی یاد کرے اور شاید مجھے کوئی ثواب پہنچا دے''۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''قبر میں میت کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بچہ دریا میں منجدھار

کے ہچکولے کھا رہا ہو اور اسے تنکا بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بھی اپنا سہارا سمجھتا ہے، ٹھیک اسی طرح میت قبر میں راحت و نجات کی خاطر اپنے وارثوں اور دوستوں سے آس لگائے رہتا ہے کہ کاش مجھے کوئی یاد کرے اور ثواب پہنچائے جو میرے لئے تنکے کا سہارا ہو جائے''۔ سو خان بہادر کی خیر خواہی یا ان کے حقوق کی ادائیگی جو ہم سب کے ذمہ ہے یہ نہیں ہے کہ اس نیک ہستی کے غم میں ہم چار آنسو بہالیں اور رومال سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے گھر روانہ ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی راحت رسانی کا سامان بہم پہنچائیں اور وہ ایصال ثواب ہے۔

ایصال ثواب کی آسانی...... کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر ہر شخص روزانہ یا دوسرے تیسرے، روز قل ھو اللہ شریف تین بار پڑھ کر مرحوم کو ثواب اور دعا میں یاد کرلیا کرے۔ قل ھو اللہ کو تین دفعہ پڑھنے کا ثواب حدیث شریف میں ہے کہ ''ایک پورے قرآن کے ثواب کے برابر ہے''۔

اللہ نے کس قدر آسانی فرمادی کہ دو منٹ میں تین دفعہ قل ھو اللہ پڑھو اور ثواب حاصل کرو جو دس بارہ گھنٹے کی محنت سے پورا قرآن شریف پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس لئے چند آنسو بہالینا یا چند کلمات تعزیت زبان سے ادا کر دینا مرحوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ ایصال ثواب کرنا حقیقی خیر خواہی ہے خواہ جان سے جیسے تلاوت نماز اور دوسری عبادات کا ثواب پہنچانا یا مال سے جیسے غرباء و مساکین کو بہ نیت ایصال ثواب کھانا یا کپڑا پہنچانا وغیرہ۔

محاسن مرحوم...... پس ہماری مجلس یا انفرادی نشست کا ایک موضوع تو بحکم شریعت یہ ہونا چاہئے کہ ہم میت کو نفع پہنچائیں اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ میت سے ہم خود نفع حاصل کریں اس کی صورت شریعت نے یہ بتلائی ہے کہ **اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ** (1) ''اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو''۔ تا کہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔ پس! ایصال ثواب سے میت کو ہم سے کچھ ملتا ہے اور میت کے عمدہ تذکرہ سے ہمیں میت سے کچھ ملتا ہے۔ اس لئے ہماری اس مجلس کا موضوع رونا اور اظہار غم کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ خان بہادر مرحوم کو نفع پہنچانا اور ان سے خود نفع حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

مرحوم کی یادگار...... خان بہادر مرحوم کی عمدہ ترین یادگار ''یہ ہائی اسکول ہے جو تنہا انکی کوششوں سے قائم ہوا۔ اور اس وقت قائم ہوا جب کہ سب اس کے قیام سے مایوس تھے لیکن ان کی ہمت مردانہ تھی کہ مایوسیوں کے ہجوم میں پامردی کے ساتھ وہ کھڑے ہوئے اور اسکول قائم کر کے چھوڑا، جس کا نفع آج قصبہ کے ہندو، مسلمان دونوں کو پہنچ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں ایسا وقت بھی آیا کہ اسکول باقی رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، مرحوم نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ لوگوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ میں نے بھی ان کے بزرگانہ ارشاد کی

(1) السنن لأبي داؤد، كتاب الادب، باب في النهي عن سب الموتىٰ ج:١٣ ص: ٥١.

تعمیل میں اسکی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی ہوئی جس پر ہمیشہ ممدوح مسرت کا اظہار فرماتے تھے لیکن حقیقتاً یہ کام صرف ان کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا کہ اسکول کو مایوسیوں کے ہجوم میں بھی چلاتے رہے۔ حتی کہ انہیں کتنے ہی ماہ تنخواہ میں اپنی ذات سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ مگر اس کار خیر سے نہ ہٹے۔ علم کی بقاء کا راستہ پیدا کرنا خواہ وہ کسی بھی چیز کا علم ہو امر خیر ہے۔ جبکہ حسن نیت سے ہو اور صدقہ جاریہ ہے کیوں کہ عمل تو عامل کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن علم عالم کے ساتھ یا علم کا انتظام کرنے والے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا ملکہ باقی رہتا ہے۔ یہ مادی دولت نہیں ہے کہ اسے جتنا خرچ کرو گھٹتی ہے بلکہ روحانی دولت ہے کہ جتنا خرچ کرو بڑھتی ہے۔

اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے اور محاسن کے ساتھ ان کے اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے کی امکانی سعی کرتے رہیں، جس سے مرحوم کی روح خوش رہے گی اور اجر دائمی سے متنفع ہوتی رہے گی۔ بہر حال رونے اور غم والم کے اظہار کے بجائے ہمارا کام ایصال ثواب اور ذکر محاسن ہونا چاہئے کہ یہی ان کے دلوں میں ہمہ وقت زندہ رہنے کی سبیل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان بہادر مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقامات عطا فرمائے اور جس طرح انہیں دنیا میں اس نے قبول فرمایا تھا اس طرح آخرت میں انہیں قبول فرمائے اور ان کے پسماندگان اور تمام وارثوں اور عزیزوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے اور صبر و تسلی عطاء فرمائے۔ ہم سب ان کے دکھ درد کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جامع مذہب

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ !فَأَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

جامع مذہب...... آیت کے ذیل میں دین اسلام کو جامع بتلایا۔ یہود و نصاریٰ کی مختلف جزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ دین اسلام پچھلے تمام آسمانی دینوں اور ملتوں کا جامع بنایا گیا ہے، اس دین میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی سختی موجود ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نرمی اور درگزر بھی موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہیں اگر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم بھی ایک تھپڑ مارو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہارے گال پر اگر کوئی ایک طمانچہ لگائے تو تم دوسرا گال بھی پیش کردو۔

دین اسلام میں نہ وہ سختی ہے اور نہ یہ نرمی ہے، بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا۔ ہے: ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ② ''برائی کا بدلہ برائی لیکن اتنا ہی''۔ اس کی وضاحت دوسری آیت میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہاری کوئی ایک آنکھ پھوڑے تو تم بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو تمہاری ناک پر اگر کوئی گھونسہ مارے تو تم بھی اس کی ناک پر ایک گھونسہ مار دو تمہارے کوئی اگر دانت توڑ دے تو تم بھی اس کا ایک دانت توڑ دو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاف کردیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے گویا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور معاف کردینے کی بھی اجازت ہے۔ اس طرح اس دین میں شریعتِ موسوی بھی آگئی ہے اور شریعتِ عیسوی بھی آگئی۔ متعدد واقعات اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے اس جز کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے مختلف ادیان اور مختلف شریعتیں جاری تھیں اور آپس میں اختلاف اور عداوتوں کی خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام نے آکر اختلاف اور عداوتوں کی خلیج کو پاٹا، اتفاق و اتحاد پیدا کیا اور تمام اقوام عالم کو

① پارہ: ٦، سورۃ المائدہ ، الآیۃ: ٣. ② پارہ: ٢٥ ،سورۃ الشوری، الآیۃ: ٤٠.

ایک دین پر جمع کر دیا۔

طبقاتی اِجتماعیّت ...... اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات بلکہ اُمراء کو، صوفیاء کو، سلاطین کو، وزراء کو، غرض ملک میں پھیلے ہوئے تمام منتشر طبقات کو جمع کرنے کی کوشش کی، خطوط روانہ فرمائے پیغامات روانہ کئے اور ملت کے تمام طبقات کو ایک نقطہ پر جمع فرمایا۔

دارالعلوم کی شانِ اجتماعیّت ...... یہ دارالعلوم دیو بند بھی اپنے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز پر قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیو بند سے پہلے ہندوستان میں اہلِ علم کے مختلف طبقے تھے۔ کوئی متکلم اور کوئی منطق تھا۔ اور کوئی اہل حدیث تھا۔ کوئی اہل قرآن تھا۔ کوئی فلسفی تھا۔ مگر دارالعلوم کے اکابر، اس کے بانیوں نے ایک ایسا نصاب جاری فرمایا جس سے ملک کے تمام طبقوں میں وحدت اور یکسانیت پیدا ہوئی۔ دارالعلوم دیو بند نے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں محدثین پیدا کئے، ہزاروں مفسرین قرآن اور متکلم پیدا کئے جنہوں نے دین اسلام کی حقانیت، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی۔ دارالعلوم کا فاضل بیک وقت محدث بھی ہے مفسر بھی ہے، متکلم بھی ہے، مبلغ اور صوفی بھی ہے، حق تعالیٰ نے دارالعلوم دیو بند کو ایسی جامعیت اور مرکزیت عطا فرمائی ہے کہ اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی خدمت کر رہے ہیں یہ وہی جامعیت اور مرکزیت ہے جس پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ملک کے تمام طبقات کو جمع فرمایا۔

وفاق المدارس ...... دارالعلوم دیو بند نے اجلاس صد سالہ کے موقع پر متعدد اہم و مفید اور کار آمد تجاویز منظور کرائیں۔ ان تجاویز میں سے ایک اہم تجویز وفاق المدارس کی بھی ہے اس تجویز کا مقصد بھی ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، اگر ہندوستان کے تمام مدارس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیو بند پہلے سے بنا بنایا مرکز موجود ہے تو اس میں نفع دونوں کا ہے۔ مدارس اور مکاتب کا بھی اور دارالعلوم دیو بند کا بھی، ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کی خدمات سے دارالعلوم باخبر رہے گا۔ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ حضرات کی شہرت اور ان کی خدمات سامنے آئیں گی۔ مدارس اپنے مرکز دارالعلوم دیو بند کی خدمات، حالات اور کارگزاریوں سے واقف ہوں گے۔ تو یہ وفاق مدارس کی تجویز ایسی تجویز ہے۔ جس کے روبہ عمل آجانے کے بعد فضلاء کی تنظیم بھی قائم ہو جائے گی۔ تنظیم فضلاء نہ تنہا کوئی مقصد ہے نہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اصل وفاق المدارس اور تنظیم مدارس ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب منظم ہو کر اپنے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو فضلاء کی تنظیم خود بخود قائم ہو جائے گی کیوں کہ ان مدارس اور مکاتب کے چلانے والے اس کے اساتذہ اور ذمہ دار اکثر و بیشتر فضلاء دارالعلوم ہی ہیں۔

افادات علم وحکمت

مختلف علمی سوالات کے جوابات کے سلسلے میں
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کا اظہار خیال

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا

حسن نیت سے حرام حلال نہیں بنتا...... ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا، مثلاً لاکھ دو لاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطورِ قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے سودی قرض لیتا ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تا کہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اجتہادی یا فروعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ ① ”اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا“ (القرآن) سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہے گا اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبال جان بنے گی دنیا میں بھی آخرت بھی میں، کسی عمل کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں جب تک کہ وہ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو۔ اچھی نیت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیت کا کوئی اعتبار ہوگا۔

جب دو چیزیں تھیں بیع اور سود۔ ایک کو حلال قرار دیا اور ایک کو حرام۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا کریں۔ اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیں، خواہ ایک شخص وکیل بن جائے۔ سب کی طرف سے نفع ونقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ راس المال کو بھی حرام اور ناجائز کر دے تو اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہنچے گا، یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو۔ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۷۵.

جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہنچے، لیکن وہ تو شریعت کے مکلف ہی نہیں مگر جولوگ شریعت کے مکلف ہیں اوراس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر بھی ہے۔ پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اوراس پر اعتماد بھی کر لینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کی بجائے درپردہ دشمنی ہے، دنیاوی بھی اور اخروی بھی۔

عملِ مشروع میں ہی حسن نیت کا اعتبار ہے...... لہٰذا کسی کام کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں۔اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی نفع ہوگا، تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر ماردی جائیں گی۔تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے۔حسن عمل یا عمل صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اخلاص اور حسن نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی ہو جو شریعت سے ثابت ہو۔

اسی لئے سورہ ملک میں فرمایا گیا ہے: ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ① برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی۔(القران) کسی کو وجود دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مردہ کیا۔اس کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ دوڑ۔عالم میں یہ تغیرات، موت، حیات، نعمت، سلب نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی: ﴿لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ② تاکہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا برا۔جب تم اس کے ملک میں ہو، اس کے اقتدار کے نیچے ہو، اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کے حکم کی اتباع کرو گے یا نہیں اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیرات رکھے ہیں تاکہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں اَحْسَنُ عَمَلًا ہے۔

عمل صالح کی دو بنیادیں...... اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے کی ہے کہ ''اَیُّ اَخْلَصُہٗ وَاَثْبَتُہٗ'' ③ حسن عمل اور علم صالح وہ ہے کہ خالص ہو، رضاء خداوندی کے لئے اخلاص کے ساتھ ہو مخلوق کی رضاء یا اپنی رضاء نفس شامل نہ ہو۔

اگر رضاء خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت بالسند ہو اور بطریق صواب ہو یعنی اس نہج پر ہو کہ جس طرح شریعت نے بتلایا ہے، تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں ایک اخلاص للہ کو جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ. اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہی برحق ہے۔اسی کا حکم ماننے کے قابل ہے۔اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جز مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے نکلتا ہے اتباع سنت۔اس لئے کہ بطریق صواب وہی ہے۔جس کو سرکار

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۲-۱. ② پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۲.

③ قال البغوی: قال فضیل فی تفسیرہ: اخلصہ و اصوبہ، ج:۸، ص۱۷۶، تفسیر البغوی، سورۃ الملک۔

دو عالمؑ نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپ کے متبعین حضراتِ صحابہ کا تعامل ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ. مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ شامل ہوگا وہی عملِ صالح ہوگا۔

عمل صالح اسے کہتے ہیں کہ میں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے، رفاہِ عام کا کام کیا بہت ہی عمدہ کام کیا ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عملِ صالح نہیں بنے گا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے بلکہ عملِ صالح بنتا ہے دو بنیادوں سے اخلاص للہ اور دوسری بنیاد ہے اتباع سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباع سنت بھی ہے وہ عملِ صالح ہوگا۔

شرک و بدعت کی بُنیاد...... اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضا خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہوگئی۔ یا نفس کی رضا مخلوط ہوگئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا، اس لئے جس درجہ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہوگی، شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاوے گی اور شرک فی العمل ہو جائے گا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے معنی ہیں اتباع ہو رسالت خداوندی کا۔ اب جس درجہ اتباع میں کمی آتی جائے گی اسی درجہ اتباع اور بدعت کی بنیاد پڑتی جائے گی جو شرک تک پہنچائے گی۔ تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں اخلاص اور اتباع سنت۔ اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں شرک اور بدعت۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ. میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ. مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ شامل ہے یا نہیں؟ جس پر اس کا ایمان ہے، اگر ہے تو عملِ صالح ہے۔ نہیں تو پھر وہ عملِ طالح۔ تو ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحۃً ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا وہ کام رضا حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیر باد کہہ دیا کہ وہ ریاست کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہوگی؟

اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے اس لئے کہ معدہ ہی درحقیقت حوض بدن ہے اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معدہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہوگی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے، ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو، پیروں کو، منہ کو ٹانگوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی کس قدر خوشبو ہے؟

ابتدا سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو۔ اور ہر عمل میں اتباع کا دخل ہو۔ ایمان میں کمی آئی۔ شرک پیدا ہوا۔ اتباع میں کمی آئی تو بدعت پیدا ہوئی۔ اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پہلے ہی خیر باد کہہ دے۔ یہ ہمدردی

کیا ہوئی، یہ تو نہ اپنی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

قوم کے اخلاق کا تحفظ...... محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذائیں پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنانا، کمینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کون سی ہمدردی ہے؟ لہٰذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع کیا محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہئے کہ تاکہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق پیدا نہ ہوں اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

اگر اس کی غذا لقمہ صحیحہ ہے تو اخلاق صحیح ہیں، لقمہ ناپاک ہے تو اخلاق بھی ناپاک ہیں، اس لئے ہم نے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے، کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں ہے کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو، پہلے اس سے توبہ کرو، جب بیعت کریں گے۔ اس لئے کہ جب غذا ہی تمہاری مشتبہ ہوگی تو ذکر اللہ تمہارے اندر کیا اثر کرے گا، اگر اللہ کا نام لوگے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہوگی۔ اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی ظرف چاہتا ہے ناپاک ظرف کے اندر پاک چیز نہیں بھری جاتی۔ وہ بھی ناپاک بن جائے گی تو غذا پر اور اکل حلال پر دارومدار ہے اخلاق حسنہ کا۔

ظلمتِ اخلاق...... اسلام نے سب سے زیادہ زور اکل حلال پر دیا ہے۔ اس لئے جتنی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حرمت پیدا ہو۔ کوئی ناجائز شکل پیدا ہو۔ ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا۔ سود کو حرام کر دیا۔ احتکار کو حرام قرار دے دیا۔ احتکار کے معنی ہیں، گرانی کی امید پر مال کو روک رکھنا، احتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ "کرہی" ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا ہو۔ کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے، دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے، وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد میں بھی گندگی آجائے گی وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہوگا۔ اسی لئے مقصودِ اصلی آخرت ہے۔ گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے اس کے قواعد بنا دیئے ہیں کہ جائز طریق پر کمائیں۔ جائز طریق پر خرچ کریں۔ ناجائز اور حرام، مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچیں، نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے۔ عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے...... اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کر دیں یا صریح حرام چیزیں داخل کر دیں تو اس سے برکت کیا ہوگی؟ بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے، غلاظت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی خیر وبرکت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تاکہ قوم کو فائدہ پہنچے۔

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے، یہ شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے؟ مضاربت کی صورت کر لیں۔ دو چار افراد اپنی تجارت میں لگا دیں اور حسب رقم اس کا منافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ مسلمان نفع کمائے تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے؟ جبکہ وہ اللہ اور رسول کو مانتا ہے۔ اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز اور حلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو تو بھید یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب! سود سے کریں گے قوم کی خدمت کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی۔ ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

حرام میں شفاء نہیں...... بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ لَمْ یَجْعَلْ شِفَآءَ کُمْ فِیْمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ'' ① اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی، جو دوائیں حرام ہیں۔ شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جوا ہے، ان میں شفا نہیں ہے۔ اگر ظاہری طور پر شفا ہوئی بھی تو روح اتنی بیمار ہو گی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہو گا۔ پھر بیمار پڑے گا جب مادی امراض کی شفا بھی حرام میں نہیں تو روحانی امراض کی شفا کیسے ہو جائے گی حرام کے اندر؟ اور وہ بھی قطعی حرام، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہئے۔ نیت نیک ہے۔ جذبہ نیک ہے۔ پھر قومی خدمت کرے۔ تو کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت ہو۔ ذرا سا تغیر کر دو وہی نفع رہے گا۔ مگر جائز بن جائے گا۔

متبادل صورت...... تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سا تبدیل کر کے حد جواز میں لے لیا جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔ تو مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ معاملہ ہو۔ اطاعت ہو، عبادت ہو، اس میں حرام و مکروہ سے بچ کر حد جواز کی طرف آئے، یہی معنی اس کے اسلام کے ہیں ورنہ تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا رہ گیا۔ وہ بھی سود خور، تم بھی سود خور، وہ بھی حرام خور اور تم بھی حرام خور۔ تو ہم تمہیں حلال خور بھی نہیں بنانا چاہتے (بر سبیل لطیفہ فرمایا) اور حرام خور بھی نہیں بنانا چاہتے۔ آدمی اکل حلال پر رہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نیت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک ذرا سا تغیر کر کے اس کو حد جواز میں لے لیں۔ کیوں حرام کی طرف جا رہے ہیں؟ کہ قوم کی روح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مواخذہ الگ کوئی بینک قائم کر دیں یا کوئی ایسی صورت قائم کر دیں کہ اپنی تجارت میں لگا لیں، یا کوئی کمپنی تجارت کی بنا دیں اور اس میں شرکاء ہوں نفع نقصان کے شریک رہیں اور پھر وہ رفاہِ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے راس المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اسلام ہے جو اس پر آمادہ کر رہا ہے؟

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج:۱۷ ص:۱۵۲ رقم:۱۹۲۱۰.

مطالعہ کا علم لائقِ اعتماد نہیں...... سوال: حضرت کہا جاتا ہے کہ اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ربوا ہے صرف ربوا حرام نہیں ہے۔ اس پر حضرت نے دریافت کیا کہ یہ علماء کہتے ہیں۔ یا تاجر کہتے ہیں۔ سائل نے کہا کہ حضرت! یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہی تھی۔ رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے اس کا بہانہ بنایا جا رہا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مضامین آتے رہتے ہیں۔ اہل حق کے بھی اور اہل باطل کے بھی مُتَوَّلِیْن کے بھی اور مُکَذِّبِیْن کے بھی، کہیں ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدین علماء کا کام ہے۔ اور تاجر جو متہم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو ایسی چیزوں میں حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے۔ یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدین ہوں۔ ملک وقوم کو جن کے دین ودیانت پر اعتماد ہو اور ان کا علم مستند ہو۔ قوت مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے جو چاہے کرے اور نفس ہے نا تہذیب یافتہ اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں ڈاکٹر منسٹر صاحب نے یہ کہہ دیا۔

تو جس کے آخر میں ''ٹر'' ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔ (برسبیلِ لطیفہ فرمایا) کوئی عالم متدین کہے یا فتویٰ دے یا مستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دے دیں تو آپ بے تکلف کریں۔ فلاں نے کہہ دیا، اس نے کہہ دیا یہ قابل اعتبار بات نہیں۔

مسلم وحربی کے درمیان سودی معاملہ...... سوال: ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حدیث لَا رِبٰـوا بَیْنَ الْـمُسْلِمِ وَالْـحَرْبِیِّ کے تحت مسلم اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ہو سکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ کہاں ہے؟ اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔ یہ ائمہ میں خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں، اب جو کہتے ہیں لا ربو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ربو جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ربوا ہوتا ہی نہیں۔

مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دارالحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو، حالت امن نہ ہو۔ اس وقت کا یہ مسئلہ ہے، ایک دارالحرب کا یہ معنی ہیں کہ شعائر اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔ اس کے مسائل دوسرے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دارالحرب مان لیا جائے تو دارالحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں؟

دارالحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا...... دارالحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے۔ ملک چھوڑ کر دارالسلام کی طرف جائے۔ اس کی تو جرات نہیں کرتے کہ یہ دارالحرب ہے، اسے چھوڑ کر دارالامن اور دارالاسلام میں جانا چاہئے اس کا دھیان کسی کو نہیں آتا، جب دھیان جائے تو پیسہ کی طرف جائے۔ تو دارالحرب کا حیلہ مل گیا ہے، پیسہ بٹورنے کو۔ یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے۔

اگر دارالحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے۔ مثلاً تجارت ضروری ہے وہ قوت پیدا

کرنی ضروری ہے جس سے دارالحرب دارالاسلام بنے، کفار سے جنگ کرو اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو، اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں، کوئی صاحب آمادہ نہیں۔ دارالحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور اب تک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دارالحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ ہجرت بھی ہے۔ جہاد بھی ہے، قومی معاملات بھی ہیں۔ کتنے ہی مسائل دارالحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا کہ ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دارالحرب حیلہ ہے اور جذبات دوسرے ہیں، دارالحرب کی آڑ لے کر پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی کا فتوی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں ہے، پھر ان کا کیا جواب ہوگا، اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی فتوی ہے، تو کیا ان کا یہ بھی فتوی ہے کو سودی لین دین کرو، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا۔ لیکن کیا انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کر دو۔

سوُد پر دلچسپ مباحثہ...... حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندی پوریؒ لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور صحیح دین دار لوگوں میں سے تھے۔ بی اے بھی تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا ''سودمند'' نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت وطباعت کی گئی۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لونڈے کی بات کا کیا اعتبار، ذکر کرنے والے نے کہا کہ حضرت! لونڈا ہے؟ وہ تو مولانا طفیل صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام طفیل ہے (طفیل کے معنی ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لونڈا نہیں تو اور کیا ہے؟ تو خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہنچے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم (ایڈیٹر زمیندار) اور ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان صاحبؒ بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحبؒ کا تھا۔ انہوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مدلل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے، ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا، ان کی بات تو ایسی تھی۔ فرمایا کہ: ''بھائی ہم پل نہیں بننا چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے۔ ہماری گردن پر پیر رکھ کر نہ جائے''

یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے۔ علامہ اقبال بھی مولانا ظفر علی خان صاحب بھی، کسی کو بولنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ پھر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصل تقریر کی جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حکم شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے...... یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے۔ اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گزر بھی گئے۔ اور دوسرے بھی پیدا ہوئے اور بھی گزر گئے۔ اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ بھی گزر جائیں گے۔ مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خلجان ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ جو معتمد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کرلیں۔ اس میں منشاء ظاہر کردیں کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشاء یہ ہے کہ قوم کی خدمت اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے۔ تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ جو وہاں سے مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کا فائدہ بھی ہوگا۔

مدارِ دین حجت ہے...... ایک صاحب نے پوچھا اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کردیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے۔ اس میں کچھ حرج نہیں تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار مجاریٹی پر یا سروں کی گنتی پر نہیں۔ یہ کوئی کونسل یا اسمبلی کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سر گنے جاتے ہیں۔ سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلے ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے۔ اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحبؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

بتّرس از طرز جمہوری ایبرِ پیر دانا شو ۔۔۔ کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسان نمی آید

کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیر دانا کے قیدی بن جاؤ اگر دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو انسانی فکر تھوڑا ہی ان کے دماغ سے نکلے گی۔ دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا، انسانی فکر کہاں سے نکلے گا؟ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے۔ تو بے وقوفی کا خیال ذہن سے برآمد ہوگا۔

اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ① زمین میں بے وقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کررہے ہیں، حق کے راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہوسکے گا۔ خواہ پوری

① پارہ:۸، سورۃ الانعام، الآیۃ:۱۱۶.

دنیا کے انسان فیصلے کو مل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہٰذا سود حرام ہی رہے گا، جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پاخانے کو کتنا ہی دھولو۔ صاف کرلو وہ پاخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا۔ ناپاک ہی رہے گا۔ اور اس پانی کو بھی ناپاک کر دے گا۔ جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہوگی۔ اوپر سے ان اذھان کو بھی اپنی رو میں بہا کر گندہ کر دے گی جن اذھان میں اس قسم کے تصورات ذہن میں نہ جمانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہیں، جب کوئی شئے حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں؟ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں۔ اس قسم کے خیالات سے۔

مراتبِ عصمت......سوال: ایک صاحب نے سوال کیا انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام باجماع امت معصوم ہیں۔ ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں اور قبل البلوغ بچے از روئے شرع معصوم ہیں۔ کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعل شنیع پر داروگیر نہیں کی۔ لہٰذا ان کی عصمت بھی متفق علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں، اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہو گئے تو اب حضور والا وضاحت فرما دیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی عصمت ایک ہی قسم کی ہے؟

جواب: اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں وہ ابھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ ابھری ہوئی نہیں ہے صرف مادہ موجود ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کر کے گناہ سے بچتے ہیں۔ اور یہ کمال ہے۔

منشاءِ گناہ......فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشاء صرف دو چیزیں ہیں: حب جاہ اور حب باہ۔ اسی لئے بعض گناہ تو سرزد ہوتے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے۔ تذلیل کرتا ہے، زبردستی دباتا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں۔ یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے۔ پھر چاہے دوسروں کا خون ہو مگر اسے کرسی ملی۔ اسے عزت ملی۔ ہزاروں مخلوق برباد ہوتی، کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشاء ہوتا ہے حب جاہ اور حب اقتدار۔ ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے کو عار محسوس کرے گا، وہ چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں۔ میں بڑا آدمی ہوں۔ یہ چھوٹے ہیں، ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں۔ تو کبر کے معنی فقط بڑا بننے کے نہیں ہیں بلکہ تحقیر ناس یعنی لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر اور بڑا جاننا۔ یہ حقیقت ہے کبر کی۔ اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے، اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں۔ لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ، مار پیٹ، قتل وغارت گری اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں، آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔

ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت ہے، ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔

ایک شہوت بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے۔ اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش رتا ہے۔ تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے گا۔ چوری ہو، رشوت ہو، سود ہو، بہرحال کسی طرح سے پیسہ جمع ہوں اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہو سکیں تو شہوت بطن کا حاصل ہے۔ مرغوباتِ نفس کو بٹورنا اور جمع کرنا۔ مال ہو، لباس ہو، سامان ہو۔ آدمی اسے حاصل کرے جس طرح سے بھی ہو سکے۔ جب اس وقت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کے حرام وحلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں۔ چوری کرنے والے چوری کرتے ہیں۔ ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بٹورا جاتا ہے۔ خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ کہ جرم ہو نہ ہوا سے ڈرایا دھمکایا اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں ایک شہوت فرج یعنی شرم گاہ کی شہوت ہے۔ اس سے آدمی بدکاری، زنا کاری، فحش، عریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جیسے شہوت بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں اسی طرح شہوت فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش...... عالم ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدم سے سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشاء تھا جاہ طلبی جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدمی کو سجدہ کرو۔ تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں؟ یہ حکم عدولی کی۔ اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کر دی ہو۔ بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں ''مین میخ'' بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلاف فطرت ہے۔ ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ﴾ ① آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے۔

اور آگ کی فطرت ہے سر اونچا کرنا۔ اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سربلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں؟ یہ گناہ حکم عدولی کا سرزد ہوا ابلیس لعین سے جس کا منشاء تھا جاہ طلبی، عزت، حسد، کبر، رعونت فرعونیت۔ اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ حقیقتاً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی اور وہ یہ کہ شجرہ ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس جانا تک ممنوع تھا۔ کھانا تو درکنار، وہ درخت حضرت آدم نے کھالیا لیکن حکم عدولی کا کوئی واہمہ بھی نہ تھا۔

تلبیس ابلیس...... حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً وسوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کر کے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت ابدی نہیں ہے۔ بلکہ خاص وقت تک تھی وہ وقت نکل گیا۔ اب تمہارا معدہ اس نعمت

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۷۶.

کو ہضم کرنے کا متحمل ہے۔ اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھالے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اس نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔ جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی۔ ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم کھالو گے تو ابدی طور پر جنت میں رہو گے۔ اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ اور ان کو سمجھایا کہ ابدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب و ہوا آپ میں اثر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھالیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرت تھی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں کیسے کھاؤں اور حکم خداوندی کے خلاف کیسے کروں؟

مگر ادھر تو اس کمبخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام پاک قلب ہیں۔ سچے قلب والے ہیں۔ نہ دھوکے سے واقف نہ فریب۔ اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے یہ تو گویا ان کے وہم میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہی بات ہو اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ وہ تو جھوٹ کو بہت بری چیز سمجھتا ہے۔ اس لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔

اسی واسطے محدثین لکھتے ہیں۔ اِنَّ اَكْذَبَ الْحَدِيْثِ حَدِيْثُ الصَّالِحِيْنَ کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (معاذ اللہ) وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا نام لے کر کوئی روایت کرے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ تو ان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب دھوکہ سے، فریب سے پاک ہے تو ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سمجھائی بلکہ قسم بھی کھائی۔ ادھر آدم پاک قلب ہیں۔ دھوکہ سے فریب سے واقف نہیں۔ اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ تو حضرت آدم کا وہم بھی نہیں جھوٹ بولنے پر۔

ادھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا۔ ادھر حضرت حوا نے کہا کہ اجی کھالو! ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی سنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف بھی نہیں کرتا اتنا کہنے سننے سے حضرت آدمؑ کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہ ہی بات ہو کہ اس کی ممانعت ابدی نہ ہو۔ ابتداء میں ہو اب جب کہ یہاں کی آب و ہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھالینے میں کیا حرج ہے۔ اوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور بیوی نے دیا سہارا تو کھالیا درخت۔

خطاءِ اجتہادی اور عصمت...... اس لئے حقیقتاً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ حضرت آدمؑ جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہوسکتا ہو کہ حکم خداوندی کے

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

معنی اور مطلب یہی ہوں جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں آ کر مبتلا ہو کر وہ کھالیا۔ یہ لغزش ہوئی صورۃ اور حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ خطا فکری ہے، یا خطاء اجتہادی ہے۔ یہ سرزد ہوگئی ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطاء اجتہادی ہوسکتی ہے۔ فرق صرف اتناء ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھ جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مطلع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کوئی مجتہد خطاء اجتہادی کرے تو ہوسکتا ہے کہ عمر بھر اسے صواب سمجھتا رہے اور ہو وہ حقیقت میں خطاء تو غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے وہ درخت کھالیا۔

لغزش اور گناہ کا فرق...... مگر اس کا منشاء کبر اور جاہ نہیں تھا۔ خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروں لیکن معنی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیئے اور چیز تھی کھانے پینے کی اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوت باہ اور شہوانی قوت آگے بڑھتی ہے۔ کبر ونخوت اس میں نہیں ہوتا۔ شیطان کے گناہ کا منشاء کبر تھا اور تکبر تھا۔ اور آدم کی لغزش کا منشاء حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر درحقیقت شیطان کی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے وہ معاف نہیں ہوسکتا جب تک متکبر پوری توبہ نہ کرے۔ اس نے توبہ نہ کی ابدالاباد کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور ابدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدم سے جو لغزش سرزد ہوئی اس میں کبر اور نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اوپر سے غلط فہمی اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سرزد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے تو آدم کی خصوصیت ہے اور کبر سے سرزد ہوا تو وہ تکبر ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ ''لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْكِبْرِ'' (1) وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو، (جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے)۔

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر ونخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشاء حرص ہے۔ حرص سے سرزد ہونا یہ تو آدمی کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا کہ آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں۔ اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔ اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے؟ ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہوسکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابدالاباد کے لئے ملعون ہوگیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه، ج: ١، ص: ٢٤٧، رقم: ١٣١۔

حد توبہ واستغفار کیا۔ حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔

عصمت اطفال...... بچوں میں جاہ طلبی اور باہ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتی، نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں صرف کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر ابھرا ہوا بیدار نہیں ہوتا۔ بلوغ سے قبل اس میں ابھار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی ابھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشاء ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام...... انبیاء علیہم السلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں۔ پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے جبر سے، کمال نیت سے اور کمال استقلال سے اور کمال عظمت خداوندی سے۔ یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام مجبور ہیں گناہ کرنے سے وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا کمال یہی ہے کہ ہر قسم کی قوت ہے اور پھر بچتے ہیں حکم خداوندی کی عظمت میں اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی مجبور کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ مگر سارے مادوں کو وہ کلیتہً تابع کر لیتے ہیں حق تعالیٰ کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کریں گے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رک جائیں گے۔ تو انبیاء میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان کے حق میں کمال ہے اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا۔

کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ دوسرا کہے گا کہ کمبخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے۔ تو مجبوری میں بچا ہوا ہے۔ تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو۔ اور پھر آدمی خوف خداوندی کی وجہ سے بچے۔ ایک لنگڑا لولا آدمی جو چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا۔ اس سے پاک ہوں۔ لوگ کہیں گے تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے۔ تجھے آج قوت مل جائے تو ڈکیتیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں۔ تو تو کرے گا کیا۔ محض چارپائی پر بیٹھا رہے گا۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم وعقل کی روشنی میں بچے اسے تو بچنا کہتے ہیں اور جہاں روشنی ہی نہ موجود ہو اور بچے اسے بچنا نہیں کہتے۔

عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کا فرق...... بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں۔ پھر

وہ معصوم ہیں ارادے سے، اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔

یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم، وہ ناطاقتی سے معصوم اور انبیاء کمال طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں۔ اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے۔ لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں۔ اس لئے وہ بیچارہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کرسکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال۔

باعث تعجب ایمان...... اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے۔ اور ایک ہے یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی موجود ہیں۔ تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں، زیادہ قابل قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بتلاؤ "وَاَيُّهُمْ اَعْجَبُ اِيْمَانًا" ① سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہوگیا جو وہ ایمان نہ لائیں؟ عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے، جنت ان کے سامنے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہوگا؟ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر عرض کیا یارسول اللہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انبیاء کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں گے؟ وحی ان کے اوپر آ رہی ہے۔ فرشتے انہیں نظر آ رہے ہیں۔ مشاہدہ حق میں وہ مشغول ہیں۔ جلال و جمال کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے وہ بھی انکار کریں گے تو کون اقرار کرے گا اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب؟ پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ؟ پیغمبر تمہارے سامنے موجود۔ وحی تمہارے سامنے اتر رہی ہے۔ معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا؟ اس لئے تمہارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔ پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد میں آئیں گے نہ رسول ان کے سامنے، نہ معجزے ان کے سامنے، نہ ان کے سامنے وحی اتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ اور موانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے۔ کوئی دل میں تردد پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کفار، کہیں

---

① المعجم الكبير للطبراني، ج: ١٠ ص: ٢٣٦. دلائل النبوة للبيهقي، جماع ابواب اخبار النبي ﷺ بالكوائن بعدهٗ، ج: ٨، ص: ٢. حدیث صحیح ہے۔ السلسلة الصحيحة (مختصرة) أول الكتاب ج: ٨ ص: ٢٣٠.

منافقین، کہیں نفس کے جذبات ہزاروں رکاوٹیں موجود اور داعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جمے ہوئے ہیں۔ تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

جبری عصمت...... اس سے معلوم ہوا کہ کثرت موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابل قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ دواعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں ہوں گی، تو بچے اگر گناہ سے بچتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتے بوجھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کر کے بچتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ نفس میں تو ان کے جذبہ ہی نہیں ہے گناہ کا۔ نہ شہوت کا جذبہ ہے۔ نہ کبر ونخوت کا جذبہ ہے۔ لہٰذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں اسے بچنا نہیں کہتے ہیں وہ تو گناہ سے الگ تھلگ ہیں۔ بچنا اس کو کہتے ہیں کہ قوت ہو۔ ارادہ بھی ہو۔ قوی کی اس پر قدرت بھی ہو کہ اس کام کو کر گزرے اور پھر بچے، تو بچوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاء کے اندر عصمت ہے ارادی اور اختیاری۔ تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا ارادے کا اور غیر ارادے کا خبر کا اور بے خبری کا۔

حفاظت اولیاء کرام...... رہے اولیاء اللہ، صلحاء متقین جو گناہ سے بچتے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاء بھی بچتے ہیں اور بچے بھی اور اولیاء اللہ بھی فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس معنی میں وہ معصوم ہیں۔ اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں اس معنی پر کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں۔ لہٰذا وہ بھی معصوم ہیں۔ اب رہے اولیاء اللہ ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ حتی الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے۔ منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور بناء حفاظت کی کثرت ذکر ہے۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ رہتا ہے ان کو جلال وجمال کا قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصور اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کریں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار میں بعض دفعہ غلبہ نفس ہوا اور معصیت سرزد ہو گئی۔ خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا عبرتناک واقعہ...... حضرت شبلیؒ اکابر اولیاء میں سے ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ سرداران اولیاء میں سے ہیں اور ہزاروں خانقاہیں حضرت شبلی کی خانقاہ سے آباد تھیں اور تقویٰ وطہارت کا ایک کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔ وقت کے تمام اولیاء ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک روز وہ مریدین کے ساتھ سیر وتفریح کو نکلے جب ایک بستی پر گزر ہوا جو نصاریٰ ومجوسیوں کی بستی تھی۔ دیکھا کہ وہ لوگ خنزیر چرا رہے ہیں۔ دل میں خیال آیا کہ "یہ کیا انسان ہیں۔ نہ ان میں ایمان ہے نہ انہیں گندگی اور پاکی کی تمیز۔ سور چرا رہے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں۔ اصل میں مومن ہم لوگ ہیں کہ ہر برائی سے اللہ نے ہمیں بچا لیا ہے اور ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں اور دین کے اندر ہم غرق ہیں"۔ دل میں یہ خیال پیدا ہوا ایک وسوسہ کے درجہ میں تھا ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

کے اصول سے جو جتنا مقرب ہوتا ہے اسکے دل میں اگر خطرہ بھی آتا ہے تو اس پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ عمل پر اتنی گرفت نہیں ہوتی جتنی کہ مقربین کے خطرات پر ہوتی ہے اور عتاب ہوسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بستی میں جب یہ پہنچے تو دیکھا کہ کنویں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں عیسائی کی ایک لڑکی بہت ہی حسین وجمیل تھی۔ شیخ کی طبیعت اس پر مائل ہوگئی اور اتنی مائل ہوگئی کہ ضبط نہ کر سکے جا کر اسے نکاح کا پیغام بھی دے دیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نکاح جب کروں گی جب میرا باپ اجازت دے دے۔ شیخ نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں ہے۔ تو اس کے گھر پہنچے اس سے جا کر درخواست کی۔ اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر نکاح کرسکتا ہوں وہ یہ کہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنی ہوگی۔

شیخ نے کہا منظور ہے اور اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور مرتد ہو گئے۔ معتقدین اور مریدین نے آ کر شیخ سے منت لجاجت کی لیکن شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور شیخ مبہوت سے رہ گئے۔ خدام نے پوچھا کہ فلاں آیت آپ کے ذہن میں ہے۔ شیخ نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی آیت نہیں گویا پورا قرآن ذہن سے نکل گیا کوئی آیت ہی یاد نہیں آتی۔ پھر مریدین نے احادیث کے حوالے دے کر سمجھانا چاہا۔ شیخ نے اس پر بھی یہی کہا کہ مجھے کوئی حدیث بھی معلوم نہیں۔ گویا حدیث بھی ذہن سے نکل گئی اور اس کے عشق میں مستغرق ہیں۔ حتیٰ کہ کل جس لکڑی سے سہارا دے کر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تھے۔ آج دیکھا گیا کہ اسی لکڑی سے خنزیر چرا رہے ہیں۔ شیخ کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ رو دیئے۔ چیخیں نکل گئیں اور پورے ملک میں خانقاہیں غیر آباد ہوگئیں اور جہاں جس مرید کو پتہ چلتا رہا وہیں وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ خبر سنتے ہی اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ کچھ معمولی صدمہ نہ تھا کہ ایک شیخ وقت مرتد ہوگئے۔ فکر تھی کہ دوسروں کے ایمان کے کیا ہوگا۔ اس لئے سب لوگ دعا کر رہے ہیں۔ کہیں انفراداً کہیں اجتماعاً اور ایک خاص تعداد تو ہر وقت شیخ کے پاس ہی خدائے مالک الملک کے دربار میں دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد شیخ کو تنبہ ہونا شروع ہوا کہ میں کس حالت میں ہوں اور مریدین سے دریافت فرمایا کہ میں کس حالت میں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ عیسائیت میں ہیں۔ شیخ نے کہا معاذ اللہ، استغفر اللہ، توبہ واستغفار کی اور اسی وقت کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤ۔ کلمہ تو تھا ہی ذہن میں بس ایک چیز غالب آ گئی۔ اب جو دھیان دیا تو پورا قرآن شریف ذہن میں موجود ہے۔ پوری احادیث محفوظ۔ کہا کہ میں یہاں آ کر کیسے پھنس گیا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ واقعہ ہے فوراً توجہ کر کے وہاں سے واپس ہوئے اور استغفار میں مصروف رہے۔ تمام خانقاہوں میں خوشیاں منائی جانے لگی اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اللہ نے شیخ کو پھر اسلام میں لوٹا دیا۔

ادھر تو یہ واقعہ ہوا اور ادھر یہ ہوا کہ اس عیسائی گھرانے پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود اپنی لڑکی کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ حضرت اس کو مسلمان کرلیں اور اپنے نکاح میں قبول فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو نکاح کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو بیوی موجود ہے نہ وہ عشق، نہ وہ محبت۔ بعد میں جب سوچا تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو خطرہ آیا تھا ایک زعم کا کہ ''اصل میں ہم ہیں انسان۔ یہ عیسائی کیا کرتے ہیں'' اس کا جواب دیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے ولی سے گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔

حفاظت اولیاء کا طریق...... چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ ① جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو ورغلا لیتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوت ایمانی سامنے آتی ہے تو لاحول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جارہا ہے۔ جیسے (معاذ اللہ) زناکاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں۔ اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا۔ البتہ ماحول سے متاثر ہوکر گھر گھرا کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو وہ ہزار توبہ کرے گا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہوگی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ واستغفار سے بلند ہوئے۔ اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہوجائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کرلیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

وجوہ عصمت...... مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہوجائے۔ ہاں خطاء فکری ہوسکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو۔ اس سے وہ بری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو بدن تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے۔ تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خمیر بھی پاک۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبعیت میں پاکی ہوگی اور ظاہر بات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے۔ شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے، لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہوگا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہوکسی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گزرے گا۔ تو مادہ پاک ہے۔ بدن بھی پاک ہے۔ لازمی بات ہے کہ ان بدنوں سے جو اعمال اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

جب ابدان طاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہر بات ہے ارواح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ترین ہیں

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۰۱.

اوران روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالات حق کا ہروقت حق تعالیٰ کے سامنے حضوری ہے کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصور کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو۔ اس کی عظمت، اس کا جلال دیکھ رہا ہو، وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انبیاء علیہم السلام تو ہروقت مشاہدہ کی حالت میں ہیں۔ ملائکہ ان کے سامنے وحی ان پر آرہی ہے۔ تو وہ بیچارہ نفس کرے گا کیا۔ گو مادے سارے موجود ہوں۔ نفس مغلوب ہی رہے گا تو مادہ بھی پاک، روح بھی پاک اور اوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالم غیب کا اور وحی کا نزول اور علم الٰہی براہ راست اتر رہا ہے اوپر سے پھر حفاظت خداوندی بھی شامل ہے۔ چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لینا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہوا تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کو بری رکھا گیا ہے، ان کے مادے پاک، روحیں پاک، احوال پاک، ماحول پاک اور اوپر سے مشاہدات اور ہروقت حضوری شاہی دربار میں اس لئے وہاں عادتاً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو۔ زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ سے صدور گناہ خلاف تقویٰ نہیں...... اولیاء اللہ سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادتاً بھی اس لئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں۔ من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں۔ نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں۔ اور نہ وحی ان پر اتر رہی ہے۔ اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے۔ بعض ائمہ صحابہؓ سے گناہ سرزد ہوا۔ جیسے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا۔ اوران کو رجم کیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوئے بھی نہیں۔ ماحول سے متاثر ہو کر ایک حرکت سرزد ہوگئی۔

لیکن پھر اتنی توبہ کی اتنی توبہ کی کہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالکؓ نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلا دی جائے تو سب کے گناہ معاف ہو جائیں ① اس ایک توبہ کے اثر سے۔ تو اولیاء کے اندر فقط امکان عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے، کہ گناہ سرزد ہو جائے، مگر حفاظت خداوندی شامل ہوتی ہے، تو گناہ ہوتا نہیں۔ اور اگر ہو جائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہنچائے۔ تہجد کے لئے آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا۔ حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں۔ اس لئے کہ امتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب۔ مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا اگر ایک تہجد بھی قضا ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہوگئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آپڑا۔ تو حضرت امیر معاویہؓ اس تہجد کے قضا

① الصحیح لمسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسة الزنی، ج: ۹، ص: ۶۸، رقم: ۳۲۰۷۔

ہونے پر تمام دن روئے۔ استغفار کیا دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔

غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انگوٹھا ہلایا کہ ”حضرت امیر! تہجد کا وقت ہوگیا ہے اٹھیئے تہجد پڑھ لیجئے“۔ حضرت امیرؓ نے اجنبی آواز محسوس کرکے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میری مجلس رائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنان خانے میں تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہے؟ اس نے کہا کہ ”میں شیطان ہوں ”تہجد کیلئے اٹھانے آیا ہوں“ فرمایا کہ کم بخت تو اور تہجد کیلئے اٹھائے۔ اس نے کہا جی ہاں خیر خواہی کا جذبہ ابھرا اور مجھے گوارا نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا ہو۔

فرمایا کہ تو اور خیرخواہی کرے۔ اللہ نے فرمایا ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا ہے اس لئے تو اور دوستی کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ سچ سچ بتا تو کیوں آیا ہے؟ ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ تیری گردن مروڑ دوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تب وہ اصلیت کھلی۔ اس نے کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے ہی کل ایسی حرکت کی تھی کہ آپ کا تہجد قضا ہوگیا۔ میں نے کچھ ایسے وساوس اور آثار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آ گئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا تو تہجد سے اتنے درجے بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے۔ اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج قضا ہوگیا پھر توبہ کریں گے پھر درجے بلند ہوں گے۔ تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو یہی اچھا ہے کچھ تو درجات میں کمی ہوگی۔ جب اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؓ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ بہرحال اولیاء کاملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادتاً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں۔ وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھرا کر شاذونادر واقع ہوسکتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام سے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔

مقام عصمت اور شیطان...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ یہ خیر کے وعدے دیتا ہے۔ اور شیطان شر سمجھاتا ہے۔ دونوں کی جنگ ہوتی ہے۔ صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے؟ فرمایا کہ ہاں لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہوگیا۔

اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں کہ ہے وہ شیطان ہی، مگر میں اس سے بچا لیا جاتا ہوں۔ اس کا کید ومکر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ان کی صورت بھی اختیار نہیں کرسکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر خواب میں کسی نے مجھے دیکھا

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۶.

تو اس نے مجھے ہی دیکھا۔ شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لے کر کہے کہ میں ہوں۔ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ صورت بھی نہیں بنا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کے حقائق میں اثر انداز ہو سکے۔

حفاظت اولیاء اور شیطان...... شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں۔ اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے، لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آ کر یا تو اس گناہ سے بچا دیتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

حاصل کلام اور درجات عصمت...... مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ عصمت اختیاری کے ساتھ۔ اولیاء اللہ محفوظ ہیں، حفاظت خداوندی کے ساتھ۔ اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادتاً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام میں عادتاً ممکن نہیں۔ صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہوگا نہیں اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطاء فکری ہے۔ جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ عصمت اضطراری کے ساتھ کیونکہ ان میں مادہ ہی ابھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا، نہ شہوانی قوتیں ابھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے۔ کھیل کود کرتے ہیں لیکن کوئی ارادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکر و فریب کر کے دنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی طبیعتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں۔ تو عصمت دونوں میں ہے ایک میں خلقی عصمت ہے ایک میں ارادی عصمت ہے، ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں قوت وتمام وکمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی ناتمامی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام میں بھی مگر یہ فرق ہے اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

بندۂ حکم پر انکشافِ اسرار ہوتا ہے...... ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے اس پرچہ کو پڑھا۔ سوال یہ تھا کہ کفار ومشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کر جائے ان کا کیا حشر ہوگا۔ آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اسرار وحکم بیان کیجئے۔

سوال کا آخری جز "مع اسرار وحکم بیان کیجئے"۔ حضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اس لئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے "مع اسرار وحکم بیان کیجئے"۔ اسرار وحکم ہم پر کب ضروری ہیں ہم تو ناقل ہیں احکام کے، حکم بیان کر دیں گے۔ یہ اسرار وحکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالب اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتے۔ خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جا کر یوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے۔ اور بیگمات

شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے۔اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں؟ تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو۔ یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا؟ اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع وفرماں بردار ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا۔ حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ وہ کہتے بہت اچھا۔ حکم دیا کہ گھر چلے جاؤ وہ کہتے بہت اچھا حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہو جاؤ۔ وہ کہے بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ہر وقت ماننے کو تیار ہے۔ بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر اطاعت کرتے کرتے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے۔ بڑا مطیع ہے۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرائے میں ہر وقت آسکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں۔ تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔

اگر وہ گھروں میں آ رہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح کی جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے۔ اسی طرح دو برس گزر گئے تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے۔ اس پر بادشاہ خوش ہو کر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمہیں اپنے خزانے دکھلائیں گے، خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں یہ سونا ہے، یہ چاندی ہے لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری وساری ہے، چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ ہے اور یہ بھی ہے، اور یہ حکمت عملی ہے تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کو کان پکڑ کر باہر نکال دو، اس کو پھانسی دے دو یہ کون ہے اسرار طلب کرنے والا؟

تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ حکم معلوم کرے یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ! اس کا راز بھی بتاؤ؟ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے؟ جب اللہ کا حکم آ گیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز معلوم نہ ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل سے راز مجھ میں آ گیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو رہ گئے۔ یہ نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتایئے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرتے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے۔ دین پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ فرائض وواجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم، عقل بھی خادم اور ارادہ بھی اللہ کا غلام، مشیت بھی غلام، پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے۔ تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے؟

مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی ہے یا جہنمی؟...... اولاد مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدثین ذراری مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں کہ مشرکین کی نابالغ اولاد آیا جنتی ہے یا جہنمی؟ اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں۔ ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فطرت پر حکم لگا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا اور جنت ونار عمل کے اوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اس لئے فطرت پر حکم لگا کر داخل

جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزا یا جزا کے طور پر نہ ہوگا بلکہ محض انعام وتکریم ے طور پر ہوگا اور انہیں خدمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا۔ وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خادم کے رہیں گے اور یہ ہی ان کے حق میں بڑے اعزاز کی بات ہوگی کہ انہیں جنت میں خدمہ بنا کر داخل کرلیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی ہیں۔ ٹھیک نہیں، اس لئے سکوت اختیار کیا جائے معاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالیٰ کے اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوگا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا۔ ان کے آباؤ اجداد کے یعنی ملحق کر دیا جائے گا۔ اگر آباؤ اجداد جہنمی ہیں تو وہ بھی جہنمی ہیں۔ اور اگر آباؤ اجداد جنتی ہیں تو وہ بھی جنتی ہیں۔ تو وہ بھی جنت میں جائیں گے۔ اس دنیا میں جب مردم شماری ہوتی ہے تو نابالغ بچوں کو بھی گنتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہیں اسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ اہل مذہب قیاس کرتے ہیں قرآن کی اس آیت پر ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباؤ اجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے۔ گو عمل ان کے ٹھیک نہیں۔ تو جب مومن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جاویں گے لہذا وہ بھی جہنمی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار۔ وہ حقیقت میں نفس کا جز ہوتا ہے ماں باپ کے۔ ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں اور باپ کما کے کھلاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب کہا جائے گا کہ اب اس میں استقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا وہ مسلم ہیں تو یہ بھی مسلم وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر واسلام جب ہی معتبر ہوگا جب وہ عقل وارادے اور اختیار سے قبول کرے گا۔ تو نابالغ اولاد ماں باپ کے توابع ہیں لہٰذا جوان کا حکم ہے وہ ہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنتی ہیں نہ وہ دوزخی بلکہ وہ بیچ میں اعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ جنت ہے نہ دوزخ۔ ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائے گی اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی جانب سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ آگ میں کود پڑو تو جن کے مزاج میں سلامتی ہوگی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ حکم خداوندی سے باغ وبہار بن جائے گی۔ اور بعضے تامل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں۔ ڈریں گے جھجکیں گے ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کودو اور وہ کودتے نہیں۔ معلوم

① پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۲۱.

ہوگا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔ ایک مذہب یہ ہے اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا عمل سرزد نہیں ہوا۔ صرف جانچ کر لی جائے گی کہ فطرتوں کا رخ کیا ہے؟ اسی اعتبار سے وہ جنتی یا جہنمی ہوں گے۔

اسلم ترین مذہب...... بہرحال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے۔ حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگا دیں۔ چاہے وہ عمل پر حکم لگا دیں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ شریعت ظواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کاہے پر حکم لگا دیں۔ رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا۔ اور ہم حکم لگانے والے۔ تو اسلم طریق یہ ہی ہے کہ توقف کیا جائے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہل جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

نس بندی......سوال: آج کل مسلمانوں میں ضبط ولادت اور نس بندی کا رجحان پایا جا رہا ہے۔ شرع میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ نس بندی شرعی اصول کے تحت ممنوع ہے اس لئے کہ شریعت کا منشاء تکثیر اولاد ہے۔ اسی بناء پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ" (۱) یعنی ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن سے اولاد زیادہ پیدا ہوتا کہ قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں۔ اس لئے قانون عام تکثیر نسل ہے اور اسلام چونکہ جامع اور معتدل مذہب ہے اسی لئے اس نے دوسری جانب کی بھی رعایت رکھی وہ یہ کہ اگر خاوند اور بیوی اتنے کمزور ہو جائیں کہ اولاد ہوگی تو جان کا خطرہ ہے اور وہ آپس میں طے کر لیں اور اولاد نہ ہونے کی دوا کھالیں تو وہ کر سکتے ہیں۔

استثنائی حکم......استثنا کو کوئی قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے نس بندی کو جائز قرار دیا ہے تو یہ خیانت ہوگی۔ اور یہ ایسے ہوگا، جیسے کہ شراب ہے اور نجس العین ہے اور نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کی جان بچ نہیں سکتی جب تک یہ شراب نہ پی لے۔ تو شراب پلانے کی اجازت ہے اس لئے کہ جان بچانا فرض ہے۔ یہ ایک استثنائی حکم ہے لیکن اگر کوئی اس کو قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے شراب جائز قرار دی ہے۔ یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہوگی۔ اسی وجہ سے قانون عام اپنی جگہ ہوتا ہے اور استثنائی حکم اور ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں موجود ہے کہ اپنی زبان سے کلمہ کفر مت نکالو اس قسم کا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن آگے فرماتے ہیں۔ کہ اکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دل میں اطمینان کے ساتھ ایمان موجود ہو اور کسی نے گلے پر تلوار رکھ دی اور کہنے لگا یا تو کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دو ورنہ ابھی ذبح کر دوں گا تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ کفر کا کلمہ کہہ دو اور دل میں ایمان رکھو اور مطمئن رہو تمہاری کوئی گرفت نہ ہوگی۔

اب کوئی کہے کہ اسلام میں کفر کا کلمہ کہنا جائز ہے اور قانون عام بنا کر پیش کرے تو سراسر خیانت ہے یہ

---

(۱) السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء، ج:۵، ص: ۵۳۱، رقم: ۱۷۵۴.

صرف ایک استثنائی حکم ہے۔خاص حالت میں اس کی اجازت ہوگی اسی بناء پر حکم عام اور قانون عام اور ہوتا ہے اور استثنائی احکام الگ ہو جاتے ہیں۔استثناء کو استثناء رکھا جائے گا اور قانون کو قانون عام رکھا جائے گا۔اسلام میں فرض ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھو۔اگر بیماری غالب ہے اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔اب اگر اس کو کوئی قانون کے طور پر یوں کہہ دے کہ اسلام کا قانون ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔تو یہ خیانت ہوگی۔حکم عام وہی رہے گا کہ کھڑے ہو کر پڑھو اور اگر کوئی خاص حال پیش آ جائے تو اس کی وجہ سے اجازت ہے مگر وہ شخصی بات ہوگی عام حکم نہ ہوگا یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک تو تکثیر نسل ہے یہ تو قانون عام ہے۔اور ایک ہے استثناء وہ شخصی حالت کے تحت ہوتا ہے۔اس کے لئے بھی فتویٰ ہوتا ہے اور اگر مفتی اجازت دے دے تو وہ حکم عام سے نکل کر اجازت شخصیہ کے اندر آ جاتا ہے۔قانون عام اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔یہ تھی واقعہ کی قانونی بحث!

منظم فساد سے روٹی کی بچت......میرے پاس سہارنپور کے دو ڈپٹی کلکٹر آئے اور نس بندی کے سلسلے میں گفتگو کرنی شروع کی۔اس بارے میں انہوں نے سوال کیا جس کا ایک جواب میں نے ہنسی کا دیا اس سے وہ بے حد شرمندہ ہوئے۔وہ یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ فکر لاحق ہے کہ اولاد اور آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور روٹی گھٹتی جا رہی ہے۔اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط بہر حال آپ کو فکر آبادی کے بڑھنے اور روٹی گھٹنے کی ہے۔میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ مصیبت جو پیش آ رہی ہے۔موجودہ نسل ہی سے پیش آ رہی ہے۔اس پر میں نے کہا کہ آنے والوں کا راستہ تو بعد میں روکنا۔ان کی پہلے (موجودہ) میں کمی شروع کر دو۔اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ جو ملک میں فسادات پیش آ رہے ہیں ان کو منظم اور باقاعدہ کر دیجئے۔ہر ایک شہر میں روزانہ ایک دو فساد ہوتے رہیں اور معتدبہ افراد قتل ہوتے رہے تو دس برس میں انشاء اللہ کافی کمی ہو جائے گی اور آپ کی روٹی بچ جائے گی اس جواب سے وہ جھینپ گئے۔

تقسیم دولت میں عدم توازن......اس کے بعد میں نے کہا کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ تو اصل میں آپ لوگ کرتے نہیں۔اور نہ کرنے کے کاموں میں آپ لوگ چل رہے ہیں۔روٹی کی کمی اس لئے نہیں کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔آج تو زمینوں میں اتنی کاشت ہو رہی ہے جتنے افراد بڑھ رہے ہیں رزق بھی بڑھ رہا ہے۔

پھر بھی جو کمی ہے اس کی بناء یہ ہے کہ آپ کے ملک میں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔جو غریب ہے وہ بے حد غریب ہے۔اور جو امیر ہے وہ بے حد امیر ہے۔ملک کے وہ خاندان جو اربوں کھربوں کے مالک ہیں قانون پر ان کا قبضہ ہے۔پارلیمنٹ کے ممبران ان کے ممنون ہیں وہ قانون ایسا بنواتے ہیں کہ ان کا سرمایہ بڑھتا رہے۔اور غریب فٹ پاتھ پر پڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔اس سے معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔اگر آپ دولت کی تقسیم صحیح کر دیں کہ امیر اور سرمایہ دار کو ذرا نیچے اتار دیں۔اور غریب کو ذرا اونچا اٹھائیں۔اس سے توازن

پیدا ہو جائے گا اور یہ شکایت رفع ہو جائے گی۔ یہاں ہزاروں بورے غلے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔ جب وہ غلہ پرانا ہو جاتا ہے۔تو معلوم ہوا کہ غلہ اور رزق کی کمی نہیں بلکہ نیتوں کی خرابی ہے۔یا طرز عمل کی خرابی ہے۔آپ ان دولت مندوں پر اور سرمایہ داروں پر پابندی عائد کر دیں اور ان کی دولت میں ایسے راستے نکالیں کہ غرباء پلیں اور ملک میں ایک بھی فٹ پاتھ پر پڑنے والا نہ رہے۔

آج بمبئی کے فٹ پاتھ پر آٹھ لاکھ آدمی سوتے ہیں جن کا نہ گھر ہے نہ در ہے وہیں ان کے بچے روتے رہتے ہیں بارش ہوتی ہے تو ایک طرف کو سکر جاتے ہیں کوئی کھلی اوساتھ لیتا ہے کوئی کسی کا سہارا لیتا ہے تو ایک ایک شہر میں آٹھ آٹھ لاکھ آدمی فٹ پاتھ پر پڑنے والے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک میں غرباء کتنے ہیں ان کی کیا حالت ہے؟ نہ ان کے پاس روٹی نہ کپڑا نہ گھر نہ در۔اور دوسری طرف دیکھو، برلا، ٹاٹا، باٹا وغیرہ کو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ دولت کتنی ہے۔ وہ بڑھ رہے ہیں دولت میں۔اور یہ بڑھ رہے ہیں غربت میں۔ یہ نظم کی خرابی ہے آپ اس خرابی کو ڈالنا چاہتے ہیں ماؤں کے پیٹوں پر کہ آنے والوں کو روک دو، اس کا ان سے کیا تعلق اپنا نظم صحیح کیجئے۔اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے کچھ بیان حاصل کریں۔ میں ان کو بیان تو کیا دیتا، مگر وہ وہاں سے چپ ہی ہو کر اٹھے، میں نے ان سے کہا کہ بس دو ہی صورتیں ہیں یا فسادات کو منظم کرو۔ اچھے خاصے افراد ہر روز قتل ہوتے رہیں دس بارہ سال میں کمی آ جائے گی۔اور یہ نہیں کرتے تو نظام صحیح کرو، دولت کی تقسیم صحیح کرو۔

سرمایہ دار کا طریق واردات......اور میں نے یہ بھی کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان سرمایہ داروں نے اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ شوشے چھوڑ رکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نس بند کرو یہ کرو اور وہ کرو تا کہ ان کی دولت پر زور نہ آئے اور ان کے پیسے میں کمی نہ آئے۔ یہ اس کو چھپانے کے لئے چالاکی کرتے رہتے ہیں تا کہ پبلک دھوکہ میں مبتلا رہے۔ہم دھوکہ میں آنے والے نہیں۔اپنا نظم درست کیجئے آپ کا نظام صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی کیا تو بیس برس کے بعد سر پکڑ کر روئیں گے جب اولاد کی کمی ہوگی' نہ فوج میں آدمی ڈھنگ کا ملے گا اور نہ پولیس میں پھر بعد از خرابی بسیار اضافہ نس پر سوچیں گے۔

کثرت اولاد پر انعام......میں نے کہا کہ آپ یہاں رزق کی کمی کی وجہ سے آنے والوں پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ قانون ہے کہ جتنی اولاد زیادہ ہوگی اتنا ہی والدین مستحق انعام سمجھے جاتے ہیں۔یعنی اگر کسی کے یہاں دس بچے ہیں تو اتنے فی صد انعام دیا جائے گا۔اور بارہ ہیں تو اتنا۔ یہ رزق کی کمی وہاں کیوں نہیں؟ وہاں لوگ کیوں فاقے نہیں بھرتے۔ اس لئے کہ دولت کی تقسیم میں نابرابری نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس مصیبت سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

استثنائی اجازت......سوال: استثنائی شکل میں نس بندی کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب: استثنائی شکل دوسری بات

ہے اس میں نس بندی ہی کیا بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے کھانے سے اولاد نہیں ہوتی جب آدمی اس حال پر پہنچ جائے کہ بیوی اس قابل نہ ہو اور اس کی جان کا خطرہ ہو اور وہ کہے کہ مجھے تحمل نہیں اور آئندہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف سے جان جانے کا اندیشہ ہے تو اسے شریعت کی جانب سے اجازت ہے کہ کوئی ایسی دوائی کھالے جس سے بچہ پیدا نہ ہو مگر استثنائی حکم رہے گا اور اس کو قانون عام کی شکل نہیں دی جاسکتی ہے۔

انٹرویو

ضبط وتحریر......حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ

علامہ قاری محمد طیّب صاحب قاسمی قدس اللہ سرہٗ سے ایک ملاقات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام

دعوت وتجدید، علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارنامے

① پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ ''الحق'' کے لئے مرکز اسلام کے مدیر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم واسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ ادھر یہ خواہش ادھر حضرت کی مصروفیات اردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تکان سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد، مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

دارالعلوم کا مستقبل......حضرت والا سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز ہی سہی۔ لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں۔ اور پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ کہ:

عشق ست و ہزار بدگمانی

جس شجرہ طوبی کے لئے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہا اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہم اللہ تعالی اجمعین اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی جس کی داغ بیل حجۃ اسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اسلام مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سراپا اخلاص وعمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام

① حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم نے یہ انٹرویو حاصل کیا۔ عنوانات کا اضافہ مرتب کی طرف سے ہے۔ ماہنامہ ''الحق'' کے شکریہ کے ساتھ اسے جزو کتاب بنایا جارہا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالی اجمعین جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارف کے امین اور بانی دارالعلوم کے حفید رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا۔ جسکی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔

''جی ہاں، اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے ان شاء اللہ۔ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا۔ بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا''۔

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکا یک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر اول دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دارالعلوم اپنی زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے، تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوندی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارہ میں پوچھا کہ ''حضرت! کسی بزرگ غالبا مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو''۔

حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکا یک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہو گئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ ''نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی امید باندھے ہوئے ہیں''۔ پھر حضرت نے فرمایا ''یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک پوری ہوتی چلی آ رہی ہے''۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ وضاحت فرما رہے تھے اور چشم تصور نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکت اسلام کے تصور ہی سے جھوم اٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندہ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسری پیرائے میں دہرائی۔

تجدید دین کا مظہر اتم...... حضرت! تجدید دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے۔ تو یہ تو دین اور علوم دین کا ایک مجدد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔ ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ کہ حضرت نے ایسا امید افزاء اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدہ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا۔ ''میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لئے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ اوران اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدد ہیں۔ جنہوں نے سنت بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی، اوراس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہراتم یہ دارالعلوم ہے۔ اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدید دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دارالعلوم، اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قطب الرحٰی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے۔ تو اس کے اردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے، وہی مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ کہ یہ دارالعلوم چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے‘‘۔

ظرافت آمیز شکوہ...... حضرت ابھی اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب ① رحمہ اللہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویوں نگاروں کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ ’’ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگو گے دن کو بھی نہیں سونا چاہئے آج بھی جاگنا چاہئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے‘‘۔ بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آ گئی ہے، اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری ’’قدر شناس میزبان حکومت‘‘ نے آپکے تقریر و بیان پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فروانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کے بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ ’’جی ہاں یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے، اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی۔ گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آرہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا‘‘۔ عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین سے اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس ’’پذیرائی‘‘ کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علوم اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا ایک ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگی دامن کو دیکھ کر مسکرانے

① شیخ الحدیث حضرت محترم مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک (پشاور)

لگے۔ ’’ارے بھائی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے‘‘۔ مگر ایک سدا بہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز وشاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

امام دعوت وعزیمت...... سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا تعالیٰ نے ظلمت کدہ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا۔ اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم وتہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولی ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔

ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی، اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ، شعرانی کا علم الکلام غزالی کا سوز وگداز، ابن تیمیہ کا صولت بیان، ولی اللہ کی حکمت ودانش، احمد سرہندی کی غیرت وحمیت اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کر دی تھیں۔ اور بقول حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ’’ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے‘‘۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت وعزیمت، سرخیل ارباب صدق وصفا' علمبردار جہاد حریت اور نابغہ روزگار شخصیت کے مقام دعوت وعزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرما رہے تھے کہ۔

تین بڑے کام...... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ خلافت اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے۔ گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی اس لئے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے۔ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ سارے بزرگ رطب اللسان رہے۔ اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے، کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔

تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح

بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا۔

ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے۔ جو اورنگ زیب کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرت نے وعظ فرمایا بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے تھے کہ کیا کہتا ہے؟۔ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجاء وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھی، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا میں بہر حال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آج ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنت رسول کی احیاء میری وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجئے۔ فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں کمر جھک گئی۔ ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے تو فرمایا کہ اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور انکے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنا دیئے گئے اس میں کچھ دیر لگ گئی۔ پھر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہیئے اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟

فرمایا: کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لئے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر اسی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

روح دار العلوم...... تو پہلی چیز تو دار العلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علوم نبوت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے، مراد آباد میں مدرسہ شاہی، امروہہ میں مدرسہ عربیہ، بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم، انبیٹھ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور اگلاوٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا۔ اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اصلاح معاشرہ اور خلافت اسلامیہ...... ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرت کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود نبود قائم رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا۔

افغانستان سے رابطہ...... اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ''جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں۔ میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں۔ بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہ کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا۔ امیر بڑی عنایت وشفقت سے پیش آئے جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ شائد ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا۔ لیکن یکا یک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آرہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معانقہ دایاں بایاں مونڈھا چومنا، پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا ''بفرمائید'' آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا ''نے نے خلاف ادب است'' فرمایا نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو رسمی کرسی تھی، اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ۔ کابل کی یہ حکومت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے، اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے

سے گنگوہ آکر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرمادیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا ''جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا''۔ انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟

امان اللہ کی حکومت تھی یہ لوگ بنی اعمام میں سے تھے، تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھی۔ مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی۔ امان اللہ خان معزول ہوئے۔ کیونکہ اسی نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے۔ وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہوگئے۔ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدر اعظم نے فرمایا کہ

''ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اوڑھاتی تھی اور ہمیں شفاء ہوجاتی۔ آج ڈاکٹر رفقی بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی اور فرمانے لگے۔ کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہوگیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدر اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں''۔

ترکوں سے روابط...... یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہوجائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہوکر ترک اور افغانستان سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور۔ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین ناتربیت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاذ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تو گویا حضرت جوش جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں، شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک عملی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب وتعلیم ہی کے سلسلہ میں سہی مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے۔

انگریزی دور میں محکمہ قضاء کا قیام......اس سلسلہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر انگریز نے آخر میں توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک

تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا چنانچہ وہ آیا۔ رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا۔ اس نے آ کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کیا اور بہت جرات کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟

حضرت نے بڑی نرمی سے کہا کہ ''یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے۔ ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیئے''۔ مگر اس نے کہا نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ ''کان پکڑ کر اسے نکال دو''۔ طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے''۔

بہر حال عید کا دن آیا، تھانیدار کے ہاں دودھ کے بالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہو گئی ہے۔ اس کو فوری برخاست کیا جائے۔ اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی۔ پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا کہ ''افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی، مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی''۔

تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہو گئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔ تو حضرت کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو۔

اسی کے تحت دار العلوم کے اکابر رحمۃ اللہ علیہ نے جب لنڈن سے مسٹر مانٹے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا' تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ) علماء کا ایک وفد لیکر ان سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ ''ہندوستان میں محکمہ قضاء قائم کر دیا جائے۔ جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں''۔ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ وقتی بات تھی نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ..... مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سہی، قائم ہو جائے۔ تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی سابقہ بڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے، تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی شرکاء مجلس ذکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکا یک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک

پڑے اور حضرت کے ضعف نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مخصوص شان ''علمی کمالات'' کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے مگر دل بضد تھا کہ۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید......حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرط نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ ''سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت قلعی کھولنے کے لئے کافی ہوگی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کرسکتا۔ اتنی حجتیں جمع فرمادیں، تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی، جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں''۔ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا حصہ ہے''۔ ''حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی''۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، اور انکے ہاں اخفاء تھا نہیں، جو واردات ہوتی صبح طالب علموں کے سامنے پیش کردیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا، یہ الہام ہوا، یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ ''بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی''۔ طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات پیش آئی؟ فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کرسکتا تھا''۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ ''میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے، ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا''۔ اور اس کے بعد خود فرمایا کہ ''جس شخص کی توجہ کا یہ اثر کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہوسکے، تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے''۔

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اساتذہ دارالعلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمہ فنون تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام معقولات سمجھے جاتے تھے۔ ان سب نے مل کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھادیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب تو صدر مدرس تھے۔

علوم کا عروج......تو حضرت نے منظور فرمایا، چھتہ کی مسجد میں حضرت نے درس شروع کر دیا۔ الٓمٓ سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دو اڑھائی گھنٹہ تقریر فرمائی اور عجیب وغریب علوم و معارف ارشاد فرمائے۔ اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہٰذا تکرار کیا جائے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا، مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر شروع کی۔ بیچ میں ایک جگہ رکے، بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی۔ تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا۔ تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آ رہے تھے تو مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا۔ تو کھڑے کھڑے حضرت نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ تو عرض کیا حضرت ذرا نازل ہو کر فرمایئے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمایئے ہم وہاں تو نہیں پہنچے۔ تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت آیئے گا۔ تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہو گا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آ رہا تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔ فرمایا۔ ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں۔ اس لئے کہ علماء کی توجہ نہیں وہ کہتے کہ یہ مغلق مضامین ہیں۔ میں نے کہا بھئی حمد اللہ اور ملا حسن، اور قاضی تو سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کے مطابق کام کرنے کی صورت نکل آئے، حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی، پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔ الغرض بڑے عجیب و غریب علوم و حقائق ہیں۔

کچھ اپنی زندگی کے بارے میں......حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرات کی گئی۔

پیدائش کا پس منظر......حضرت مسکرا کر فرمانے لگے۔ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل چلے، تو دوسری

شادی دیوبند میں کرائی۔اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو۔

تو فتح پورہ سو میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔تو حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ، کہ مولانا حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب اولاد ہوں۔وہ سفر کر کے گئے۔جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔انہوں نے فرمایا کہ ''رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا''۔

مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے، صبح آئے اور خوش ہوئے۔فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا۔جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا اور میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔اس تانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور میں تھا۔مولانا نے کہا کہ بھئی! میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ ''جب تو حافظ قرآن ہو گیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمدللہ قبول ہو گیا۔پھر تو نے قرات کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا۔پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا، الحمدللہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا۔آج تو حج کو جا رہا ہے۔تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے''۔آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا۔میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے، ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، انہوں نے کان میں اذان دی۔حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاجزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔وہ دیوبند تشریف لائے اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دعا کیا کروں، قبول کر چکا ہوں۔اب اللہ جانے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ظاہر صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی بسم اللہ......اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا۔دور دور سے مہمان آئے۔تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہند کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع۔مطلع تو یہ تھا ۔

حبذا مکتب طیب کے مبارک تقریب ۔۔۔ کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے تھا۔

ربِّ یسرّ جو کہا اس نے تو بے روئے رہا　　　فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

ناز برداری...... بہر حال ان اکابر کی توجہات تھیں، میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے گزارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اس طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب...... یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ ''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب'' ایک ایسا موضوع جس پر بحث وفکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ومحرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی، منبر ومحراب کو لیجئے یا میدان صحافت وانشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغریٰ نے بھی ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے۔ مگر۔ ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔ یہی تصور حضرت قاری صاحب مرحوم کے سامنے آ چکا ہوگا کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا۔

''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب؟'' اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملا کی رائے کیا معتبر ہوگی۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج وزوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا حق سمجھتی ہے۔

حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا۔ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کے بجائے اپنے معاشرہ کی چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا ہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینی چاہی، اور

نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی۔ بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی، جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کرسکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے؟

افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ سہ کر ان کی ساری غور وفکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفہ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ ابھی دو تین برس کا وقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال۔ دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا: ہاں! سبب ہے۔ کہا: کیا سبب ہے؟ میں نے کہا: بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور بر سر اقتدار انسان۔ آپ ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے اسباب تنزل...... تو میں نے کہا سن لیجئے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں۔ اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے۔ دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے۔ لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی اس وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہوگی کیا اس میں شرم وحیاء اور غیرت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ آدمی ہیں جانور۔ اس قدر بے ہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کرسکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بداخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں۔ سو پچاس اترے کسی نے سو گنے، کسی نے دو سو گنے کسی نے پچاس، کسی نے گٹھڑی باندھ لی، اور قطعاً انہیں یہ احساس نہیں کہ یہ ہماری چیز ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا باران کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ ہے۔ تو جب تاجروں میں خیانت آ جائے تو ملک کی برقراری کیسے ہوسکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانب داری، اقرباء پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آ جائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا؟ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔ کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے اور حکومت سیکولر یعنی لا مذہب ہے۔ وہ آ نہیں سکتی بیچ میں۔

نقطۂ نظر کا اختلاف...... تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لا مذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے۔ تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہوگا نہیں، میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں۔ اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں۔ بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔

برسرِ اقتدار طبقہ کی اصلاح کا طریق...... اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمد اللہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان

لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کر وا اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے۔ کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آ جائے حکومت، تو وہ پھر چڑ آتی ہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈال دی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حکومت سے کام لینے کا طریق!...... حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

''پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے؟ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے کہا تھا کہ جو مفکر قسم کے لوگ چند علماء ہیں اور بااثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کی بقاء کے لئے فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک وقوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اس سے قائم ہے''۔

اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں۔ مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے۔ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور بازیابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد ہو، نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو، ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔ کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لئے آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ صالحین روحانی اطباء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے؟

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت موخر ہے۔ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں، مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں اور یہ بھی تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں۔ آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزو تمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں۔ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گنے چنے ہیں، ان کے علاوہ عامتہ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا۔ اس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا۔ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ لگے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جا سکتا ہے، تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ نہ وہ طلب کریں گے۔

حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز..... حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے پر گھمنڈ اور غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو، تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقتدار کی خاطر اس خلا کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا ''حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے۔؟ حضرت نے فرمایا! ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں حارج ہے۔ بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کار آمد ہو۔

اسلام اس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دنیا کے ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں۔ زنا کاری، جواء، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جس کی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلام کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسیع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کی جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو"۔ پھر قاری صاحب نے فرمایا۔ مقصد اصلاح حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں۔ اخلاص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے، ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کردے۔

تعمیری انداز میں اصلاح...... رات ڈھل رہی تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والی ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی مشین ہے، جو ایک ایسے نامہ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے۔ جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور زلزلۃ الساعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہوسکیں گی اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا۔ ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ ①...... ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا، مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے اور پوچھ بیٹھا کہ "الحق" کے لئے کون سا طریقہ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا وہی پالیسی میں نے جو عرض کردی۔ توافق سے کام چلے گا، تقابل سے نہیں۔ تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہوسکیں گی۔

حضرت! جب الحاد اور بے دینی غالب ہوچکی ہے، پھر کیسی موافقت۔؟ برجستہ فرمایا۔ اسی کی اصلاح کے لئے تو توافق کی ضرورت ہے۔ اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھا گئی ہے۔ اصلاح کی مساعی بار آور معلوم نہیں ہو رہیں؟ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

کام کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوا جائے آپ تو ورثہ انبیاء ہیں۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے۔ تب حضرت نوح نے بددعا دی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۴۹۔

دیگر بلادِ اسلامیہ تو دہریت، مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آ ہی گئے اور ہو گئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلادِ اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیر باد کہہ دیا وطنیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے؟

ورثہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم...... حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو اربابِ عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ ”تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا“ [1]

دار العلوم کی ترقی...... حضرت! اس مدرسہ دار العلوم حقانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا! آپ لوگ جو اختیار کئے ہوئے ہیں، بحمد للہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں۔ ہر وقت ”قَالَ اللّٰهُ “ اور ”قَالَ الرَّسُوْلُ “ ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہو گی۔ خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو الحمد للہ دین مجسم ہیں۔

حضرت! مادر علمی دار العلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے اور بجٹ؟...... فرمایا! انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے، انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے، پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیس شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ اڑتیس تھے، اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دار العلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں؟ فرمایا اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دوران گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سیاست اور دین میں بیر ہے۔ اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابل پر ہیں دین کے جو چیز دین میں حرام ہیں۔ اس کے ہاں

[1] الحديث اخرجه الامام مالك في "المؤطا" ولفظه: تركت فيكم امرين لن تضلوا ماتمسكتم بهما كتاب الله وسنة نبيه، كتاب القدر، باب النهي عن القول بالقدر ج: ٢ ص: ٨٩٩.

واجب ہیں۔ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ۔ ''مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے''۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادل ناخواستہ اس پرلطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

نبی اُمّی علیہ السلام

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللہُ فَلا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ○ ﴿ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ ①

صَدَقَ اللہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

تمہید...... بزرگانِ محترم! آپ اس مقدس مجلس میں سیرت سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سیرت کس کی؟ میری یا آپ کی نہیں یا مطلقاً انسان کی نہیں.... بلکہ عالم بشریت کے سردار اور آقائے دو جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیرت پاک'' سننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

حضور علیہ السلام کی سیرت ظاہر ہے کہ آپ نبوت کی حیثیت سے سننا چاہتے ہیں یعنی حضور علیہ السلام میں ایک حیثیت بشر اور انسان ہونے کی ہے اور ایک حیثیت پیغمبر اور رسول ہونے کی ہے، آپ محض انسانی سیرت سننے کے لئے نہیں آئے بلکہ ''پیغمبرانہ سیرت'' سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ گویا نبوت کی سیرت آپ کا مقصد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نبوت کی سیرت اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کہ کچھ تھوڑا بہت نبوت کا مفہوم آپ کے سامنے آجائے۔ جب آپ نبوت کو کسی حد تک سمجھ لیں گے تو پھر نبوت کی سیرت خود بخود سامنے آجائے گی۔ اسی بنا پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔

موضوع تقریر...... اس میں حق تعالیٰ شانہ، نے پہلے حضور علیہ السلام کی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے بعد ''نبوت کی دلیل'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ''اجزائے نبوت'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد ''مقاصد نبوت'' بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے کچھ اجزا ہوں گے۔ ایک دعویٰ نبوت، ایک نبوت کی دلیل، ایک نبوت کا تجزیہ کہ اس کے اجزا کیا کیا ہیں اور کن کن چیزوں پر نبوت مشتمل ہے۔ نبوت کی حقیقت

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

کیا ہے؟۔ اور پھر نبوت کے دنیا میں آنے کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟۔ یہی چند اجزا ہیں جو اس وقت تقریر کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوع اس آیت کا بھی ہے۔ تو تقریر درحقیقت اس آیت کی توضیح اور اس کی تشریح ہوگی، آیت بہت سے علوم پر مشتمل ہے اور ہم جیسوں کا کام نہیں کہ ان علوم اور ان معارف کو بیان کر دیں یا بیان کا حق ادا کر دیں۔ لیکن بالاجمال تھوڑا تھوڑا ان تمام موضوعات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

دعویٰ نبوت اور دلیل نبوت...... پہلی بات دعویٰ نبوت ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے خود دعویٰ کیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا﴾ ① اللہ'' وہ ذات ہے جس نے اُمّیوں میں رسول بھیجا۔ ان پڑھوں میں رسول بھیجا۔'' تو بعثت کا دعویٰ یہی درحقیقت دعویٰ نبوت ہے۔ اللہ جس کو بھیجتا ہے وہ نبی ہوتا ہے رسول ہوتا ہے۔ یہ تو گویا ایک دعویٰ ہوا کہ ہم نے ایک رسول بھیجا، لیکن رسالت کی دلیل کیا ہے۔؟ جو ذاتِ مقدس آئی اور جس کے لئے اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اپنا رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول ہوں: ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ ② اے انسانو! خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، کسی قوم کے فرد ہوں آج کے ہوں یا آئندہ قیامت تک کے ہوں۔ میں ان سب کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تو اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔

اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت تسلیم کی جائے؟ وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ: اُمّیوں میں اُمّی رسول آیا، یعنی ان پڑھوں میں ایسا رسول بھیجا جو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ ان پڑھ ہونا درحقیقت نبوت کی دلیل ہے۔ آپ سوال کریں گے کہ ان پڑھ ہونا تو بظاہر عیب کی بات ہے۔ اگر ہم کسی پڑھے لکھے کو یوں کہہ دیں کہ تم ان پڑھ ہو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گا ان پڑھ ہونا یا بے پڑھا لکھا ہونا بظاہر تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے، عرف عام میں اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، عیب سمجھا جاتا ہے اور یہاں اتنے بڑے منصب کے لئے یہ دلیل بیان کی جا رہی ہے کہ جس منصب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصب نہیں ہے۔ آخر اس دعویٰ میں اور دلیل میں ربط کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پڑھ ہیں اور عالم میں سب سے زیادہ بڑے ہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پڑھا لکھا ہونا ہی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عالم بشریت میں اونچے اور سارے انسانوں میں مقدس ترین انسان ہیں۔ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم سیکھنے کے لئے نہیں آتے سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی استاذ نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اور مخلوق کو دیتے ہیں۔

تو پیغمبر کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔ صرف حق تعالیٰ ان کے استاذ ہوتے ہیں۔ پھر وہ دنیا کو اپنا شاگرد بناتے ہیں اور تلمیذ بناتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے کے لئے آتے ہیں، علم لینے کے لئے نہیں آتے۔

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸.

نبوّت اِنسانیت کے لئے ذریعۂ علم...... اسی واسطے کوئی بھی علم ایسا نہیں ہے جس کی بنیادیں پیغمبروں نے قائم نہ کی ہوں۔ یعنی آخرت کا علم ہو معاد کا علم ہو، مبدا کا علم ہو، معاشیات کا ہو، اقتصادیات کا ہو، عمرانیات کا ہو، غرض کوئی بھی علم ہو سب کی بنیادیں انبیاء علیہم السلام نے قائم کی ہیں۔ پہلے تو میں اپنے ذہن میں ایک دلیل سمجھا کرتا تھا کہ شاید میرا مفہوم ہو اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں سب انسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ ① ''اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حال میں کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے۔'' تو انسان دنیا میں بے علم آتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی علم لے کر نہیں آتا۔ جاہل پیدا ہوتا ہے۔ ﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ عربیت کے قاعدے کے مطابق یہاں نکرہ نفی کے نیچے آرہا ہے، جس کے معنی عُموم کے ہوتے ہیں کہ ذرہ برابر بھی انسان علم نہیں رکھتا، جب آتا ہے تو ایک مضغہ گوشت ہوتا ہے نہ اس میں شعور ہے نہ عقل نہ علم ہے صرف حس ہے۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ ② پھر ہم تمہیں ایک ایسی عمر کی طرف لوٹاتے ہیں جو ارذل ترین عمر ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود پھر تم بے پڑھے لکھے ہو جاتے ہو، علم کے باوجود پھر بے علم بن جاتے ہو''۔

جب انسان انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے تو آج قوت حافظہ رخصت ہو گئی تو پہلا علم ختم ہو گیا۔ حواس میں خلل آ گیا تو جدید علم آنے کی صورت نہ رہی کہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے تو پچھلا سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور آئندہ کے آنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ تو جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ گویا اعلان کرتے ہیں کہ جب تم آئے تھے تو اس وقت بھی عالم نہیں تھے اور جب جا رہے ہو تو جب بھی نہیں۔ تو علم تمہارا ذاتی نہیں، اگر تمہارا ہوتا تو ماں کے پیٹ سے آتا اور قبر کے پیٹ تک ساتھ جاتا۔ علم ہمارا ہے، جتنے زمانے تک ہم چاہتے ہیں تمہارے اندر ڈال دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔ تو کسی انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ تو جب سارے انسان ایسے ہی فرض کر لئے جائیں تو عالم انسانیت میں علم نہ رہا تو سرچشمہ علم کا اللہ کی ذات نکلتی ہے۔

علوم دنیوی کا ذریعہ بھی نبوت ہے...... اس واسطے کہ انسان جانوروں سے تو علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ کم رتبہ ہیں نباتات، جمادات سے حاصل نہیں کرتا، وہ جانوروں سے بھی کم حیثیت ہیں۔ تو ماتحت اور ارذل سے علم حاصل نہیں کیا جاتا۔ افضل سے حاصل کیا جاتا ہے، تو انسان کے اوپر جو افضل ذات ہے وہ تو اللہ ہی کی ذات ہے تو سوائے اس کے کہ خدا سے انسان میں علم آئے اور کوئی شکل نہیں اور خدا سے علم آنے کی صورت یہی ہے کہ کچھ مخصوص بندے ایسے ہوں جن کو براہ راست اللہ میاں اپنا علم سکھائیں۔ وہی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ تو ہر علم لوگوں کو پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے آ سکتا ہے۔ تو پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا ہی مفہوم ہو گا مگر بعد میں دیکھا کہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے جلیل القدر عالم ہیں نے ''ملل ونحل''

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۰۔

میں دعویٰ کیا ہے کہ: ''تمام علوم معاش کے ہوں یا معاد کے۔ سب انبیاء لے کر آئے ہیں''۔

چناں چہ حضرت آدم علیہ السلام پر لغت کا علم اترا۔ فرمایا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① حضرت ادریس علیہ السلام پر ھندسہ اور ریاضی کا علم اترا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے صناع کا علم سکھلایا۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ: كَانَ بَعْضُ الْاَنْبِيَآءِ يَخُطُّ خَطًّا بعض انبیاء خط کشی سے خطوط سکھلاتے تھے۔ یا تو لکھنا مراد ہے کہ لکھنا ان سے چلایا خط کشی کا علم مراد ہے کہ خطوط کھینچ کر آئندہ کے بارے میں باتیں بتلانا اور قواعد سے ان کا استخراج کرنا جس کو رمل اور جفر کا علم کہتے ہیں۔ بہر حال مختلف قسم کے علوم احادیث میں آتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں اور سب کے استاذ حق تعالیٰ شانہ ہیں۔

مُعَلّمِ الانبیاء...... اس لئے قرآن میں جہاں بھی پیغمبروں کے علم کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہاں انہوں نے معلم اپنے آپ کو ظاہر کیا: حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ② ''اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ناموں کا علم سکھلا دیا''۔

حضور علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ، وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ③ ''اے پیغمبر! اللہ ہی نے تمہیں علم دیا، تم پہلے سے نہیں جانتے تھے؟ فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ④ ''اے پیغمبر! تمہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ ایمان کیا چیز ہوتی ہے لیکن ہم نے تمہارے قلب میں نور ڈالا، جس سے تم پر یہ تمام چیزیں روشن ہوگئیں۔ تو ہم ہیں ہدایت کرنے والے''۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ تو کہتے ہیں: ﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ⑤ ''اے میرے پروردگار! آپ ہی نے مجھے مصر کی سلطنت عطا کی اور آپ نے ہی مجھے خواب کی تعبیر کا علم بخشا''۔ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ⑥ ''ہم نے خضر علیہ السلام کو علم فراست سکھلا دیا تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کہتے ہیں: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑦ ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم سکھلا دیا۔ اور یہ اللہ نے ہم کو سکھلایا۔

تو یہ تمام علوم جو انبیاء علیہم السلام میں آئے۔ ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی کالج میں تعلیم پائی، نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری ان کے ہاتھ میں تھی۔ براہ راست اللہ کی تعلیم تھی اور پیغمبر شاگرد تھے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے اور سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ سیکھنے کے لئے نہیں آتے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔ ③ پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۱۳۔

④ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ ۵۲۔ ⑤ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف: الآیۃ: ۱۰۱۔

⑥ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۱۶۔ ⑦ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

نبوت اور طبیعت...... انبیاء علیہم السلام کی فطرت پیدائشی طور پر منور ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جدھر علم اور کمال ہو۔ نقص اور عیب کی طرف پیغمبر کی طبیعت فطرۃً نہیں چلتی۔

سیر کی روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پانچ سال کی عمر کے ہوئے تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں پڑھنے کے لئے مکتب میں بھیج دیا۔ مکتب میں جا کے شاگردوں کی لائن میں بیٹھ گئے۔ تو استاذ نے کہا کہ: کہو ''الف''۔ فرمایا: الف کے معنی کیا ہیں۔؟ استاذ نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: کیا تو مہملات کی تعلیم دینے بیٹھا ہے۔ استاذ نے کہا کہ: کیا الف کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: معنی نہ ہوتے تو اسے شی کیوں کہتے؟ بے معنی چیز کا وجود نہیں ہوتا، جو چیزیں علم کا سرچشمہ ہیں اگر وہی علم سے تعلق نہ رکھیں تو پھر علم کہاں سے آئے گا؟ انہی حروف سے تو علم پیدا ہوتا ہے۔

استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ بچہ کہاں سے آ گیا ہے، اس نے مجھے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ: کیا تو جانتا ہے کہ الف اور ب کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا، ہاں میں جانتا ہوں۔ پوچھا کیا معنی ہیں، فرمایا ایسے تھوڑا ہی بتلاؤں گا۔ استاذی کی جگہ چھوڑ اور شاگردی کی لائن میں آ، اور میں تیری جگہ بیٹھوں۔ اس کو اٹھایا اور اٹھا کر شاگردوں کی جگہ بٹھایا اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ پھر الف سے جو توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنے شروع کئے ہیں تو استاذ بھی حیران تھا اور مکتب والے بھی حیران تھے کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام طبعی طور پر اور فطری طور پر علم کی طرف چلتے ہیں۔ یہ ان کی طبیعت ہے۔ باوجود یہ کہ فلاسفہ یہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے۔ طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں، شعور نہیں ہوتا، مثلاً آپ کو بھوک لگتی ہے، یہ ایک طبعی جذبہ ہے لیکن آپ دلیل سے بھوک نہیں لگاتے۔ طبیعت خود بخود ابھر آتی ہے، پیاس لگتی ہے تو دلائل سے نہیں لگتی۔ آپ یوں نہیں کہتے کہ چونکہ یہ وجہ ہے۔ لہٰذا مجھے پیاس لگنی چاہئے، بلکہ بلا دلیل پیاس لگتی ہے، اس لئے کہ طبعی جذبہ ہے۔ بلکہ اگر پیاس اور بھوک لگی ہوئی ہو اور دلائل سے ثابت کیا جائے کہ ہرگز پیاس نہیں لگ سکتی۔ تب بھی نہیں رکے گی۔ آپ جتنی چاہیں دلیلیں بیان کریں۔ وہ تو طبیعت سے ابھر رہی ہے۔ تو طبیعت جذبات کا سرچشمہ ہے۔ طبیعت سے شعور اور علم نہیں پیدا ہوتا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بھی شعور کی طرف چلتی ہے۔ عقل تو بڑی چیز ہے، ان کی طبائع میں شعور ہوتا ہے۔ طبعی جذبات خود عاقلانہ ہوتے ہیں۔

نبوت اور بچپن کا دور...... آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے واقعات قرآن کریم میں سیارات کے بارے میں بیان فرمائے گئے ہیں تو ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔ اب گہوارے میں لیٹا ہوا بچہ، عقل تو بڑی چیز ہے، اس کی تو طبیعت بھی پختہ نہیں ہوتی۔ مگر گہوارے میں لیٹے ہوئے جب دیکھتے ہیں کہ کچھ روشن چیزیں سامنے آئیں۔ تو طبعاً انسان روشنی کی طرف بڑھتا ہے، ظلمت کی طرف نہیں جاتا۔ اسے چاندنا اور روشنی محبوب ہوتی ہے، تاریکی محبوب

نہیں ہوتی، اور طبعی طور پر یہ بھی تمام انسان جانتے ہیں کہ روشنی ظلمت سے برتر ہے۔ اس لئے اس کی طرف کشش ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: ﴿هٰـذَا رَبِّـىْ﴾ ① یہ پروردگار معلوم ہوتا ہے جو اتنی چمک دمک کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں رفعت و بلندی اور اونچائی بھی ہے اور روشنی بھی ہے۔ تو جس میں رفعت و عظمت اور نورانیت ہو۔ بس وہ رب ہوگا۔ تو فرمایا: ﴿هٰـذَا رَبِّـىْ﴾ لیکن جب ستارے طلوع ہو کر بالآخر غروب ہونا شروع ہوئے تو فرمایا: ﴿لَآ اُحِـبُّ الْاٰفِلِيْـنَ﴾ ڈوبنے والی چیز رب اور خدا نہیں ہوسکتی۔ جو چیز وجود پائے اور پھر وہ زائل ہو جائے، یہ شان رب کی نہیں ہے۔ اس کے بعد چاند نکلا فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّىْ﴾ یہ رب ہوگا اس لئے کہ یہ تمام ستاروں سے بڑھ گیا ہے۔ اس ایک نے وہ روشنی کی کہ سارے ستارے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ تو فرمایا: ﴿هٰـــذَا رَبِّىْ﴾ ''یہ میرا رب ہوگا''۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِىْ رَبِّىْ لَاَ كُوْ نَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ﴾ ② جب وہ اپنی چمک دمک دکھا کر گم ہوگیا اور نیچا پڑ گیا اور آنکھوں سے چھپ گیا۔ تو فرمایا کہ یہ بھی میرا رب نہیں ہوسکتا۔ بس اب تو اگر میرا رب ہی مجھے ہدایت نہ دے تو معلوم نہیں میں کس کس چیز کو رب سمجھتا رہوں گا۔

اس کے بعد آفتاب نکلا جس نے پوری دنیا کو جگمگا دیا، جس رات کو لاکھوں کروڑوں ستارے مل کر زائل نہیں کر سکتے تھے کتنا ہی چاند نا کیا مگر رات ہی رہی۔ سورج کی ایک کرن نکلی اور رات غائب ہوگئی۔ اور کرن بھی ابھی نہیں نکلی، وہ تو صبح صادق ہوئی جبھی رات بھاگنی شروع ہو جاتی ہے بہرحال جب سورج نکلا تو اس کی چمک دمک دیکھ کر فرمایا ﴿هٰـذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ﴾ ''یہ بڑا رب معلوم ہوتا ہے''۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ط﴾ ③ جب وہ بھی اپنی چمک دکھلا کر اور پورا عروج پا کے گرنے لگا اور زوال کے طرف چلا، عصر کے وقت اس کا چہرہ فق ہونے لگا۔ روشنی ماند پڑ گئی اور بالآخر منہ چھپا کے رخصت ہوا تو فرمایا: ''ان تمام چیزوں کو رب ماننا درحقیقت شرک میں مبتلا ہونا ہے۔ میں ان چیزوں سے بری ہوں جن میں تم شرک کرتے ہو اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں اس شرک کا ساتھی نہیں''۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے میں لیٹے ہوئے بچپن کی حالت ہے اور آسمان کے حقائق میں غور فرما رہے ہیں اور خدا کی بڑائی اور اس کے وجود پر استدلال کر رہے ہیں، اگر مفسرین کا یہ قول مان لیا جائے کہ آپ گہوارے میں ہیں اور مہد کی حالت میں ہیں تو اس سے یہ مدعا ثابت ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بالطبع علم کی طرف چلتی ہے وہ پالنے میں ہوتے ہیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ مکتب میں پہنچا دیئے جائیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے ہیں تو بعض روایات میں پیدائش کی کیفیت آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس شان سے پیدا ہوئے، نگاہیں آسمان کی طرف تھیں اور شہادت کی انگلی

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۶. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۷. ③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۸.

اٹھی ہوئی تھی۔ گویا توحید کا اعلان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ گویا طبعی چیز ہے۔ لیکن طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جو حقیقت ہے، گویا انبیا علیہم السلام کی طبیعت حقائق کی طرف جاتی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ ① ''حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بچپن تھا کہ ہم نے حکم دیا''۔ یعنی علم اور معروف لدُنی اور کمالات ربانی عطا کر دیئے گئے حالانکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بھی بچپن تھا اس لئے بعض علماء نے تو دعویٰ کیا ہے کہ سنت اللہ سے مستثنیٰ کر کے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت بھی دے دی گئی۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کی طبیعت پیدائشی طور پر پاک ہوتی ہے۔ وہ نیکی ہی کی طرف چلتی ہے۔ کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ ہمیشہ خیر کی طرف اور علم وشعور کی طرف بالطبع چلتی ہے۔ بہر حال پیغمبر دنیا میں آ کر کسی سے سیکھتے نہیں، کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتے نہ کسی مدرسہ میں جا کر پڑھتے ہیں، ان کے معلم براہ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی اور ان پڑھ تھے یعنی کسی مدرسہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں پائی۔ کسی استاذ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔

خاندانی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ...... پھر ساتھ میں یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی اور بے پڑھے لکھے تھے۔ لیکن پڑھنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کو تعلیم دیا کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ خود بچہ اپنے طور پر تعلیم کی طرف نہیں جاتا:

طفل بمکتب نمی رود ولے ورندش

بچہ مکتب کی طرف خود نہیں جاتا اسے زبردستی بھیجا جاتا ہے، بعض اوقات ماں باپ مار پیٹ کے بھیجتے ہیں۔ بہر حال باپ کا فرض ہوتا ہے کہ بچے کو تعلیم دلائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے باپ کو اٹھا لیا گیا کہ ہمارے پیغمبر پر یہ تہمت ہی نہ آنے پائے کہ باپ نے تعلیم دلا دی ہوگی۔ اس سے امیت اور زیادہ مضبوط ہوگئی کہ خود بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اور جو پڑھنے لکھنے کا ذریعہ تھا، باپ۔ وہ پہلے ہی اٹھا لئے گئے۔

اب یہ ہو سکتا تھا کہ ماں تعلیم دلائے اور ایسا ہو سکتا ہے، جو دانش مند مائیں ہوتی ہیں، اگر باپ دنیا سے رخصت ہو جائے اور وہ باپ کے قائم مقام ہو کے تعلیم دلاتی ہیں اور بعض دفعہ بچے کی تعلیم وتربیت میں باپ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ علماء اسلام میں ایک بڑے جلیل القدر عالم اور امام ہیں۔ جن کا نام نامی امام ربیعہ ہے، سلف صالحین میں مشہور ہیں۔ ربیعۃ الرّائے ان کا لقب ہے۔ یہ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ کو اتفاق سے سفر پیش آ گیا، اس زمانے کا تجارتی سفر تھا۔ آج کے وسائل سفر تو مہیا نہ تھے کہ موٹروں میں بیٹھے اور پہنچ گئے۔ ریلوں میں بیٹھ گئے اور ہزاروں میلوں کے سفر کی مسافت طے کر لی۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ہزاروں میل گھوم لئے یہ تو تھا

① پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۲.

ہی نہیں وہی اونٹوں کا سفر تھا۔ بہت زیادہ ہوئے گدھے پر سوار ہو گئے اور تیز چلے گھوڑا مل گیا۔

اس طرح سے سفر کرتے تھے۔ غرض امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو سفر پیش آیا، تجارتی سفر تھا اور سفر بھی لمبا چوڑا۔ دس برس لگ جائیں، بیس برس لگ جائیں تو خود ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے ربیعہ کی والدہ سے کہا کہ: مجھے سفر درپیش ہے۔ تجارت کا سفر ہے اور کئی ملکوں میں جانا ہے۔ بہت ممکن ہے مجھے دس بارہ برس لگ جائیں تو بیس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو دیا۔ دس پندرہ برس مجھے آنے میں لگ جائیں تو اس سے اپنا خرچ چلاتی رہنا اور اس کا حساب رکھنا۔ چناں چہ یہ دے کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے چار پانچ ماہ بعد امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ جب ان کی چار پانچ برس کی عمر ہوئی تو ماں نے انہیں مکتب میں بٹھلا دیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مستقل استاذ مقرر کئے اور ان کی تنخواہ مقرر کی اور رقم خرچ کرنا شروع کر دی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت جید عالم بنے۔ حافظ بنے، محدث بنے مفسر بنے اور فقیہ و مفتی بنے حتی کہ بارہ برس کی عمر میں فتوی انہیں سپرد کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی مسجد نبوی (عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) میں ان کا درس شروع ہوا۔ بڑے بڑے جلیل القدر علماء ان کے درس میں آ کر بیٹھتے تھے۔ خود یہ لڑکے۔ ابھی ڈاڑھی بھی نہیں نکلی۔ مگر بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے لگے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا شہرہ اور چرچا ہوا۔ تقریباً پندرہ برس کے بعد ان کے باپ لوٹے۔

جب گھر پہنچے تو امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ گھر میں تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہو گئے تھے، قد و قامت تھا۔ باپ نے دیکھا کہ ایک اجنبی مرد میرے گھر میں گھسا ہوا ہے۔ باپ کو آیا غصہ۔ اس نے کہا کہ: تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا ہے؟ بیٹا، باپ کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا: کم بخت! تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا چلا آ رہا ہے؟ باپ بیٹے میں سر پھٹول شروع ہوئی۔ وہ اسے کہتا کہ تو اجنبی مرد میرے گھر میں کیوں آیا ہے؟ اور بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے۔

آوازیں جو بلند ہوئیں تو ماں نے اندر سے سنا۔ جھانک کر دیکھا تو پہچان گئی کہ میرا خاوند آ گیا ہے۔ جلدی سے آ کر بیچ بچاؤ کیا اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کو اشارہ کیا کہ تم باہر چلے جاؤ اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے باپ کے غصہ کا یہ عالم کہ بیوی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا کہ یہ کون مرد تھا جو گھر میں گھسا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ: تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں سب کچھ سمجھاؤں گی۔ خیر بمشکل تمام ٹھنڈ گیا مگر وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کون تھا؟ اور آتے ہی یہ سوال کیا کہ جو روپیہ میں دے گیا تھا۔ اس کا حساب دے۔ اس نے کہا کہ میں روپیہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گی۔ حساب بھی آپ سن لیں اور اس شخص کے بارے میں بھی آپ سن لیں۔ مگر آپ جلدی نہ کریں۔ کچھ دم لیں، بمشکل تمام خاوند کو ٹھنڈا کر کے کھانا وانا کھلایا۔ اور کہا کہ: آپ لباس تبدیل کریں غسل کیا لباس تبدیل کیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ کہا مسجد نبوی (عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) میں آپ نماز پڑھ آئیں۔ اس کے بعد

آپ کو سارا حساب سمجھا دوں گی۔

یہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گئے۔ تو نماز کے بعد وہاں ربیعۃ الرائے رحمۃ اللہ علیہ کا درس شروع ہوا تو بڑے بڑے اجلہ علماء ان کے سامنے بیٹھے اور اتنا بڑا درس مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی عالم کا نہیں ہوتا تھا جتنا ربیعۃ الرائے کا ہوتا تھا۔ تو باپ بیٹھ گیا۔ انہیں کیا خبر کہ یہ میرا بیٹا ہے سنتے رہے، سنتے رہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب درس سے اٹھے تو گھر آئے اور آ کر یہ کہا کہ: ''آج میں نے ایک ایسے جلیل القدر عالم کا درس سنا ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا عالم نہیں دیکھا اور میری روح تازہ ہوگئی۔ میری تمام کدورتیں دھل گئیں میں نے تو ایسا کوئی امام نہیں دیکھا۔ بہت تعریفیں کیں''۔

بیوی نے کہا کہ آپ کے نزدیک ایک اتنا بڑا عالم کتنے روپے میں تیار ہو سکتا ہے؟ کہا کتنے روپے میں؟ اگر خزانے بھی ختم ہو جائیں تو وہ خزانہ ہلکا پڑ جائے گا اور وہ عالم بھاری ہوگا۔ پوری دنیا خرچ کر کے بھی اگر ایسا عالم بنا دیا جائے تو سستا سودا ہے۔ کہا کہ: ''یہی ہے وہ آپ کا بیٹا اور بیس ہزار روپے میں نے اس کے عالم بنانے پر خرچ کئے ہیں''۔ تو بیوی کے ہاتھ چوم لئے۔ اور جب بیٹا آیا تو اس سے معافی مانگی اور بیٹا باپ سے معافی مانگ رہا ہے کہ میری گستاخی معاف کیجئے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ آپ باپ ہیں۔ باپ کہہ رہے ہیں تو عالم کا استاذ ہے تو میرا بھی استاذ ہے، اتنا بڑا عالم ہے۔

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر باپ نہ ہو مگر ماں سلیقہ مند ہو تو وہ بیٹے کو پڑھاتی تھی۔ ربیعۃ الرائے جیسا بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ماں پڑھاتی۔ لیکن ابھی چند ہی سال کے ہونے پائے تھے۔ کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ وہ سہارا بھی ختم ہو گیا جو علم کا ذریعہ بنتا۔ باپ بھی نہیں رہے، ماں بھی نہیں رہی۔ اب دادا نے اپنی کفالت میں لیا۔ مگر ظاہر ہے کہ دادا پھر ایک واسطہ ہوتا ہے جو لو اپنے باپ کو یا ماں کو لگتی ہے واسطہ کے ساتھ اتنی لو نہیں ہوتی۔ لیکن جتنی بھی لگتی ہے مگر آٹھ ہی برس کی عمر تھی کہ دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ابو طالب کے سپرد کر دیا گیا کہ آپ نگرانی اور تربیت کریں۔ ابو طالب نے عمر بھر نگرانی اور دیکھ بھال کی۔ بہر حال گھرانے میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو تعلیم دے سکتا۔

قومی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ...... اب اگر گھر میں ماں باپ اور دادا بھی نہ ہو کوئی تعلیم دلانے والا نہ رہے لیکن ملک و قوم میں علم کا چرچا ہو، تب بھی آدمی کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ سکتا ہے۔ وہاں ملک بھی جاہلوں کا ملک تھا، دنیا کی قوموں میں ان کا لقب ہی جہلائے عرب تھا۔ یہ بھی کوئی نہیں کہتا تھا کہ: عرب کے دانش مند ہیں۔ عالم نہ کہتے تو دانش مند تو کہتے جہلائے عرب ان کا خطاب تھا اور اس زمانے کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ گویا اوپر سے لے کر نیچے تک قوم پر جاہلیت چھائی ہوئی تھی اگر حضور علیہ السلام کے لئے گھرانے میں کوئی مربی نہیں تھا تو ممکن تھا کہ قوم کے اندر کوئی مربی بن جاتا۔ کوئی معلم بن جاتا، تو تہمت آجاتی کہ یہ جتنا علم ہے یہ تو قوم کا سکھلایا ہوا

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ''خیر القرون'' ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیرِ مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذات اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گونا گوں خیریں یکجا اور مجتمع ہوگئیں تو خیر الکتب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا: ''خَیْرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ'' ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، اردگرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی...... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ (او کما قال علیہ الصّلوٰۃ والسلام). ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات و برکات مخلوقِ خداوندی ہیں، مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطنِ خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیْعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللہِ'' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے، باطنِ حق

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم...... ص ۴۳۸.

② الجامع الکبیر للسیوطی حدیث رقم: ۳۳۸۶. کنز العمال، ج: ۱ ص: ۳۲۱.

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

④ الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن ابی طالبؓ ج: ۱۲ ص: ۱۳۴.

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ وحروفِ قرآن کی جنت میں گل وگلزار سے تبدیلی...... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: "رَتِّـلْ وَارْتَقِ" ① پڑھتا جا اور درجے چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر اسا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی بگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالَمِ آب وگل میں موجود ہیں، خزانۂ علم وعرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ، گل وگلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون وراحت تھے اور انہیں علم وعرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنتِ نگاہ باغ و بہار اور لعل وجواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارۂ شادمانی ومسرت بنا دیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور وقصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ و بہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ ج: ۴ ص: ۲۶۳.

عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ. ① ''اگلوں اور پچھلوں کے علوم بھی مجھے عطا کر دیئے گئے''۔ اتنے بڑے علم کے لئے اتنی بڑی عقل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے ظاہر کرنے کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ایک تو وحی الٰہی کے ذریعے پیغمبرانہ کارنامے ہیں لیکن جو خالص عقل سے فیصلے فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس سلسلے میں واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے...... چناں چہ اس ذیل میں ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ جب غزوۂ بدر ہوا۔ ادھر سے مسلمان تو تین سو تیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تھے اور ادھر ایک ہزار کا لشکر تھا تو تین سو تیرہ کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا۔ دونوں کے کیمپ الگ الگ تھے۔ پہاڑ کے اس دامن میں مشرکین مکہ کا کیمپ تھا اور ادھر صحابہ کرامؓ تھے۔ اتفاق سے دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی صحابہؓ کے کیمپ میں نکل آیا مشرکین کا کوئی نوجوان ادھر آ گیا راستہ بھولا یا قصداً آیا۔ بہر حال ادھر آیا تو صحابہؓ نے اس کو تھام لیا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہوتی ہے کہ دشمن کے کیمپ کا کوئی فوجی آدمی آ جائے تو فوراً اس کو پکڑ لیا، پکڑ کر اس سے پوچھنا شروع کیا کہ تمہارے کیمپ میں کتنے آدمی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ دشمن کی قوت کا اندازہ کیا جائے۔ تو یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب بھی دو جماعتیں لڑتی ہیں تو ہر ایک چاہتا ہے کہ میں اندازہ کروں کہ دشمن کی طاقت کتنی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ چاہا کہ طاقت کا اندازہ ہو جائے۔ تو پوچھا کہ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں؟ اس نے مرعوب کرنے کے لئے کہا کہ: وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بڑا مجمع ہے، بڑی جمعیت ہے، پھر پوچھا۔ دباؤ ڈال کر پوچھا۔ سختی سے پوچھا۔ مگر اس نے بتلا کے نہیں دیا۔ بس یہ کہتا رہا: وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ خدا کی قسم بہت بڑا مجمع ہے۔

غرض پوچھنے میں ناکام ہو گئے۔ اس میں جو کچھ آوازیں بلند ہوئیں تو حضور علیہ السلام اپنے خیمہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: یہ شور کیسا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مشرکین میں سے ایک شخص ادھر آ گیا ہے۔ ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے یہ بتا کے نہیں دیتا۔

فرمایا: اسے چھوڑ دو! کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کرتے ہو؟ اس کو چھڑوا دیا۔ اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تو دو منٹ کے بعد پوچھا کہ: تمہارے لشکر میں اونٹ کتنے ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ فرمایا: ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ایک اونٹ کو سو آدمی کھا سکتے ہیں اور دس اونٹ روز ذبح کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک ہزار آدمی ہیں۔

غرض وہ بات جو سب مل کر حل نہ کر سکتے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں حل کر دی۔ یہ وحی سے نہیں بتلایا، عقل سے بتلایا۔ محض تدبّر اور دانش سے بتلایا۔ یہ ایک تجربہ اور اندازہ سے بتلایا۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مصفی بھی بہت اونچی تھی اور علم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اونچا تھا ہی۔ حدیث میں ہے کہ

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ: میرا پڑوسی مجھے بہت زیادہ ستاتا ہے۔ میں عاجز آ گیا ہوں میں نے منتیں کیں خوشامدیں کیں، ہاتھ جوڑے، مگر وہ باز نہیں آتا اور ہر طور پر مجھے ستاتا ہے۔ اب میں کیا کروں عاجز ہو گیا ہوں، حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ''تدبیر میں بتلاتا ہوں اور وہ یہ کہ اپنے گھر کا سارا سامان نکال کر سڑک کے بیچ میں رکھ دے اور اس کے اوپر بیٹھ جا اور جو آنے والا پوچھے کہ بھئی تم نے گھر کے ہوتے ہوئے سامان کیوں باہر ڈالا؟ اسے کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: گھر چھوڑ دے۔ سڑک کے بیچ میں بیٹھ جا۔

چناں چہ اس نے جا کر سامان نکالا اور سڑک کے بیچ میں رکھ کر خود سامان کے اوپر بیٹھ گیا۔ اب جو آ رہا ہے پوچھتا ہے کہ بھئی! گھر تمہارا موجود ہے کیوں سڑک کے بیچ میں بیٹھے ہو۔ اس نے کہا صاحب! پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا، گھر چھوڑ دو، سڑک پر بیٹھ جاؤ، لوگوں نے کہا لعنت ہے اس شخص پر جو اپنے پڑوسی کو ستائے۔ اب جو آ رہا ہے وہ اس پر لعنت کر رہا ہے، صبح و شام ہزاروں لعنتیں اس پر برسیں شام کو اس نے ہاتھ جوڑے، اللہ کے واسطے تو اپنے گھر چل اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔ خود جا کے اس کا سامان رکھا اور وعدہ کیا کہ عمر بھر خدمت کروں گا اور اللہ کے واسطے دے کر اس کا سامان رکھا۔ یہ بات وحی سے نہیں ارشاد سے فرمائی تھی بلکہ یہ دانش کا اثر تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کی طرف سے علم لے کر آتے ہیں۔ ویسے ہی کمال دانش لے کر آتے ہیں۔ تو جتنا بڑا علم اتنی ہی بڑی دانش۔ چونکہ سید الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم سب سے بڑا تھا تو دانش بھی سب سے بڑی تھی۔ اس لئے حضور علیہ السلام کی دانش مندیوں پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

وصف امیت کو مفاخر کے مواقع پر ذکر کیا گیا...... بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور امیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کو مفاخر کے مواقع اور مدح کے موقع پر ذکر فرمایا ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾ (1) توراۃ و انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک رسول آئیں گے وہ نبی ہوں گے اور امی ہوں گے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہا جا رہا ہے اور پوری انسانیت کو خطاب ہے کہ جن کا تم توراۃ اور انجیل میں ذکر پاتے ہو۔ وہ نبی امی بے پڑھے لکھے ہیں۔ تو یہ ان پڑھ ہونا اور بے پڑھا ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا علم پیش فرمایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوچا سمجھا نہیں تھا بلکہ من اللہ تھا۔ حق تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوا تھا۔

جیسی بعثت ویسا علم...... اور پھر وہ علم کیسا تھا؟ اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جمع کر دیئے گئے تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: كَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ

---

(1) پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآیة: ۱۵۷.

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن و ماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے ناآشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آگئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضَو فشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیرِ مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیرِ مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیرِ مطلق۔ یہی بات اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: "خَیْرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" "قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے"۔

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ...... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان "اویسیہ خاندان" کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، من جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے "یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔" تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیم قرآن کا مشغلہ اختیار کرلیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام "اللہ بندہ" تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: "اللہ بندہ" فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی! اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے: اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال و جواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لَو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ "دنیا و مافیہا" سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ و ریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے، نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے گاڑ دیتے تا کہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہو گیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کرلو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرالیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔ یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ وخیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے "اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ" ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اَوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی...... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدّعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب کو اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ جیت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دُکھنے لگیں، دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آ گیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہو گیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہو گیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زیرک و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولیے بینائی واپس آ گئی ہے۔ بینائی

وہ گیارہ بھائی محتاج ہو کر پہنچے انہوں نے ہی سر پرستی کی اور بالآخر حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پہنچے۔ آپ نے جا کر تعظیم و تکریم کی۔ تو ابتداء خواب سے ہوئی تھی تو خواب کا علم ایک مستقل علم کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا جو وحی کے ذریعہ ان پر اترتا تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام کو جتنے علوم عطا کئے گئے وہ سارے کے سارے حضور علیہ السلام کو عطا کئے گئے، تو تمام علوم کا جامع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا دیا گیا، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں تشریف لائے اور ظاہر بات ہے کہ جب تمام ماتحت عدالتوں سے فیصلہ چلتا ہے اور اپیل چلتی ہے تو آخری عدالت میں آ کر آخری حکم ہوتا ہے پھر اس کے بعد کسی اور جگہ مقدمہ نہیں جاتا۔ وہاں بالکل انتہا ہی جاتی ہے۔

خاتم النبیین علیہ السلام کے لئے کمالِ جامعیت ضروری ہے...... کسی اسکول یا کالج میں جب اساتذہ جمع ہوں تو کچھ اساتذہ درجہ ابتدائی کے ہوتے ہیں، وہ ابتدائی علوم کچھ سکھلاتے ہیں، کچھ لغات بتلا دیتے ہیں۔ اس کے بعد درجہ وسطانی کے استاذ ہوتے ہیں جو اوپر کی باتیں بتلاتے ہیں۔ جو آخری مدرس ہوتا ہے۔ جس کو پرنسپل کہنا چاہیے وہ سب سے اخیر کا مدرس ہے جو سب سے اونچی چیزیں بتلاتا ہے۔ تو قاعدہ کی بات ہے کہ پرنسل کو ان تمام چیزوں کا علم ہونا چاہیے جو ماتحت مدرس بتلا رہے ہیں۔ لیکن ماتحت مدرس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اتنا بڑا علم رکھتا ہو جتنا صدر مدرس رکھتا ہے۔ اسکی جماعتیں چھوٹی ہیں وہ ابتدائی چیزیں سکھلائے۔

تو حضرت آدم علیہ السلام آئے بچے کو جب آپ کچھ سکھلاتے ہیں تو پہلی چیز سکھلانے کی یہ ہے کہ آپ نام سکھلا دیتے ہیں کہ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے، یہ زمین ہے۔ یہ آسمان ہے، تو سب سے پہلا علم ناموں کا ہے۔ اس کے بغیر اشیاء میں تمیز نہیں ہوسکتا۔ اس لئے سب سے پہلے نبی علیہ السلام نے آ کر اسماء سکھلائے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ''آدم علیہ السلام کو ناموں کی تعلیم دی گئی''۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ وہ اسماء جان چکے تھے۔ اب انہیں آگے کا علم دینا چاہئے انہوں نے اسماء کی مسمیات اور اشیاءِ مدلولہ کو سامنے کرا کر معرفتِ خداوندی کرائی جن کے نام پہلے سے سیکھے ہوئے تھے۔

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ ① ''اے لوگو! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کیسے آسمان کو تہہ بہ تہہ پیدا کیا اور چاند اور سورج کے انڈے اس میں جلائے''۔ ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ زمین سے تمہیں اس طرح سے اگا دیا جیسے کہ درخت اگائے جاتے ہیں زمینی اجزاء جمع کر کے تمہیں انسان مجسم بنا دیا۔ تو اللہ نے تمہیں زمین سے پرورش کیا اور پروان چڑھایا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام نے آسمان اور زمین کے نام نہیں سکھلائے بلکہ نام والی چیزیں سامنے کر رہے ہیں کہ انہیں دیکھ کر اس بنانے والی ذات کا پتہ چلاؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فقط نام سکھلائے تھے۔ حضرت

① پارہ: ۲۹، سورۃ نوح، الآیۃ: ۱۵، ۱۶.

نوح علیہ السلام نے اسماء والی چیز دکھلانا شروع کر دیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا تو انہوں نے فقط زمین و آسمان کی صورتیں نہیں دکھلائیں۔ فرمایا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ ① آسمان و زمین کا نہیں بلکہ ان کے ''ملکوت'' کا علم دیا۔ ''ملکوت'' حقائق کو کہتے ہیں، یعنی زمینوں کی حقیقتیں نمایاں کیں، آسمانوں کے نفوس نمایاں کئے اور حقائق منکشف کئے۔ تو پہلے پیغمبر نے اسماء سکھلائے۔ دوسروں نے صورت دکھلائی۔ تیسرے نے حقیقت کا پتہ دیا کہ صورت کے اندر کیا حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ سیارات کے نفوس کا پتہ دیا۔ زمین کے نفوس اور حقائق کا پتہ دیا۔

اب جبکہ شی کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت بھی معلوم ہو گئی۔ اس کی حقیقت اور ماہیت بھی معلوم ہو گئی۔ اب یہ معلوم ہونے کی ضرورت تھی کہ ان کے احکام کیا ہیں؟ ان کی خاصیتیں کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکام کی تفصیل بیان کی جس کو فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو تورات دی۔ ﴿تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ جس میں ہر چیز کی تفاصیل بتلا دی گئیں۔ ہر چیز کا حکم ان کے سامنے کر دیا گیا۔ تو جب ایک شئے کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت کا بھی پتہ چل گیا، حقیقت کا بھی پتہ چل گیا، خاصیت اور حُکم بھی معلوم ہو گیا۔ اب حکم کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ اس کے عِلَل و اَسرار اس کے دلائل اور حقائق شرعیہ کا پتہ چلے۔

نبی اُمّی کے دین کا امتیاز...... تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقائق شرعیہ کا علم دیا گیا۔ یعنی اسماء بھی معلوم، صورتیں بھی معلوم، حقیقتیں بھی معلوم، احکام بھی معلوم، مگر احکام کے حقائق کا پتہ نہیں تھا۔ تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ قرآن کریم کا نام ہے۔ ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ② تبیان دعویٰ مع الدلیل کو کہتے ہیں۔ جو دعویٰ کیا اس میں علت چھپی ہوئی ہے۔ جو حکم پیش کیا اس میں حِکمت پوشیدہ ہے، اس سے مجتہدین نے کام لیا اور اس سے علل و اسرار نکال کر اس سے فقہ نکالنا شروع کیا اور احکام کا استنباط کیا۔ تو انبیاء علیہم السلام پر شرائعِ اصلیہ اُتاری گئیں اور اس اُمت کے ربانی علماء اور آئمہ پر شرائع وضعیہ اتاری گئیں کہ اصلی شریعتوں سے استنباط کر کے وضعی شریعتیں پیدا کریں۔ استنباط و اجتہادِ احکام کریں۔

تو اجتہاد فقط حکم میں نہیں ہوتا۔ حکم کی علت میں ہوتا ہے کہ جب یہ علت یہاں ہے اور اس پر حکم دائر ہے تو یہ علت اگر کسی اور جگہ پہنچ گئی تو یہ حکم وہاں بھی پہنچ جائے گا اسی کو قیاس کہتے ہیں کہ کسی علت جامعہ کی وجہ سے حکم مشترک کیا جائے کہ جو حکم یہاں ہے وہی وہاں ہے، اسی وجہ سے ائمہ اجتہاد پیدا ہوئے۔ غرض پچھلی شرائع میں صرف احکام تھے، وہ احکام جزوی طور پر اقوام کو معلوم تھے۔ وہ رسوم کے طور پر ان پر عمل کر لیتی تھیں۔ لیکن اس شریعت میں احکام کیساتھ علل و اسرار بھی دیئے گئے تا کہ ایک حکم پر قیاس کر کے ہزاروں احکام پیدا کئے جا سکیں۔

نبی اُمّی کے علم کی شانِ جامعیت...... اب ظاہر بات ہے کہ جو احکام کی علتیں بیان کرے گا۔ احکام اسے

① پارہ: ۷ سورۃ الانعام: الآیۃ ۷۵۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۹.

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع ...... تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء وانتہا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کیے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزار دی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود ومحبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، یہ غمی کی چیز کب ہوسکتی ہے غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ ① اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہارِ مسرت وخوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) ② موت درمیانی پل ہے جو محبّ کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعث کرب وملال کیسے ہوسکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے وہ منقطع ہوگیا، اس سے محروم ہوگئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہرحال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہوجائے، اس کا حافظ وعالم ہوجائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

---

① کنز العمال، حرف المیم، ص: ۱۷۰. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادة: والدرہم والدینار مع المنافق وھمازا دہ الی النار... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰.

② لباب الحدیث للامام السیوطی، ج: ۱، ص: ۳۴. یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت وانتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صناع وکاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسبِ توقعات کامیاب گزار کر سلامتی ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت تمنائے موت...... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ② "اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے"۔ (اٰمِيْن ثُمَّ اٰمِيْن بِجَاهِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِيْمُ)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ③ "تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: "اِنَّا نَكْرَهُ الْمَوْتَ" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد ومصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جسکے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

① پارہ ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶۔ ② المعجم الکبیر للطبرانی، باب الحاء، شریح بن عبید الحضری عن ابی مالک، ج: ۳ ص: ۴۷۸۔ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱۰ ص: ۳۰۹۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المرضیٰ، باب تمنی المریض الموت ج: ۱۷ ص: ۴۲۳، رقم: ۵۲۴۱.

اس طرح کرو جیسے تم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ صورت نہیں تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے''۔ یہ جو دیکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے کہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ تمنا ہر شخص کے دل میں ہے۔ نماز کے ذریعے دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نظر ہوتی ہے چٹائی کے اوپر اور حقیقت میں نظر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے چہرے کے اوپر لیکن آج نمازی کو محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ میں اللہ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں مگر جب قلب میں جمتے جمتے اخیر وقت آئے گا اور عمر اس تصور میں گزر جائے گی تو اچانک وہ جلوہ نگاہ کے سامنے آجائے گا جس کی تمنا میں آدمی عبادت کیا کرتا تھا تو عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو جائے۔ تو اس حدیث میں اس کی تدبیر بتلائی گئی کہ دل میں تصور یہ باندھے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ ہے میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت ہوتی ہے نماز میں اس سے حق تعالیٰ شانہ کے اوصاف و کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾

ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے جہانوں کا جو رحمان و رحیم ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ جس میں سارے اولین و آخرین جمع ہوں گے۔ آج بھی اس کی حکومت ہے مگر اس روز اس کی حکومت نمایاں ہو جائے گی سارے بنی آدم کے اوپر۔ تو حق تعالیٰ شانہ کو دیکھنے کی مشق کرتے رہنے سے جب عمر بھر یہ تصور بنے گا تو ایک نہ ایک دن وہ چیز سامنے آجائے گی جسے دل میں جما رکھتا تھا۔ یہ ایک انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کا وہ تصور دل میں جما لیتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے...... اسی طرح سے جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے حق تعالیٰ کا دھیان دل میں جمائیں گے، وہ جم جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ جس چیز کو دل میں جمایا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ دنیا کی چیزیں چالیس دن بعد آجائیں گی سو دن بعد آجائیں گی۔ لیکن چونکہ یہ اعلیٰ ترین جمال ہے۔ اس لئے اس میں پوری عمر چاہیے اگر پوری عمر تصور جمائے تو پھر وہ شے سامنے آجائے گی اور جمال خداوندی نمایاں ہو جائے گا۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ: جس کو یہ شوق ہو کہ میں حق تعالیٰ کی زیارت کروں اس کا طریق یہی ہے کہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے ہر ہر حرف پر اس کا دھیان جمائے اور جما کر اس کو دل میں راسخ کرلے تو دنیا میں بھی جلوے نمایاں ہوں گے اور آخرت میں بھی دیدار ہو جائے گا۔ تو آپ نے بہت بڑا اقدام کیا ہے اور بڑی سعادت کا اقدام ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

دستورِ حیات...... اگر ترجمہ سرسری طور پر سنا جائے تو ثواب تو ملے گا ہی لیکن اس دھیان سے ترجمہ ہو کہ میرے اللہ نے کیا کہا ہے۔ یہ کیا دستور العمل ہے۔ جس پر میں چلوں تو ایک تو ہے محض معنی سمجھ لینا ایک ہے اس معنی کو دستور

العمل بنانا، کہ اس پر مجھے چلنا ہے چونکہ قرآن کریم قانون کی کتاب ہے اور قانون محض اس لئے نہیں پڑھایا جاتا کہ آدمی اس کورٹ لے اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے احکام اور اس کی پالیسیاں معلوم ہوں تاکہ جرائم سے بچے اور صحیح طور پر چلے قانون کے اوپر۔ تو اللہ نے اپنا کلام نازل فرمایا مگر محض تلاوت کے لئے نہیں کہ اس کورٹ لیا جائے۔ یہ تو ابتدائی درجہ ہے اصل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں کیا کہا جارہا ہے۔؟ یہ کلام کیوں ہے؟ اس میں خطاب کیا ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گزارنی ہے یہ میرا دستور العمل ہے اس نیت اور قصد سے اور اس عزم سے جب آپ پڑھیں گے تو کیفیات کچھ اور ہوں گی تو اس لئے۔ میں نے عرض کیا کہ: ایک بہت بڑی سعادت کی بات آپ نے کی ہے کہ ترجمہ شروع کیا ہے۔

الفاظ قرآن کمالات خداوندی کے مظہر ہیں...... قرآن کریم کے بارے میں حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ① ”برکت حاصل کرو اس کلام خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے“۔ کلام جو ہوتا ہے وہ متکلم کے اندر سے نکل کر سامنے آتا ہے وہ اس کے جذبات ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ میں کوئی ہنسی کی بات کہوں تو آپ ہنس پڑیں گے۔ یہ لفظوں کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ اس جذبے کا اثر ہے جو میرے قلب میں موجود ہے کہ میں آپ کو ہنساؤں۔ لفظوں کو تو آڑ بنایا ہے۔ اگر جی چاہا کہ آپ کو رلایا جائے تو ایسا کلام کیا جائے کہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں تو وہ لفظوں کا محض اثر نہیں وہ ان جذبات کا اثر ہوتا ہے جن کا بولنے والے نے قصد کیا ہے آپ نے لفظوں کو آڑ بنایا۔ اور جذبات اپنے پیوست کر دیئے قلب کے اندر کہ رو پڑا آدمی۔ پھر آپ کے دل میں جذبہ آیا کہ فلاں کو خوش کر دوں اور ہنسا دوں تو کچھ ایسے بول بولے کہ خواہ مخواہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا۔ وہ محض لفظ نہیں ہیں بلکہ وہ اندر کے جذبات ہیں، جنہوں نے الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے دل میں اثر ڈالا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کے الفاظ نازل فرمائے ان الفاظ میں وہ کمالات چھپے ہوئے ہیں جو بولنے والے کے اندر تھے، وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں ان الفاظ کے ذریعہ دنیا میں کوئی بھی جذبہ بغیر لفظوں کے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے لفظوں کو بیچ میں لانا لازمی ہے اور ان ہی الفاظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کھپایا ہے اپنے کمالات کو اور ان ہی الفاظ کے ذریعہ ان کمالات کو بندوں تک پہنچایا ہے اور ان کے دل میں اتارا ہے ان کمالات کو اپنے دل میں حاصل کرنے کی نیت سے اگر آپ تلاوت کریں گے اور دھیان اس پر دیں گے کہ کیا کہا جارہا ہے اور میرے دل میں کمالات کس طرح اتر رہے ہیں تو پھر اور ہی شان ہوگی۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ② ”برکت حاصل کرو اس قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ بولنے والا جو بولتا ہے وہ اندر سے بولتا ہے لفظ آڑ ہوتے ہیں۔

① ② حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں انکا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت ...... ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جانا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبت خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آ سکتا ہے، اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ: یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔

امتحانِ محبت، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے ...... اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ'' (1)
''تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو''۔

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔ اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آ رہی ہے، نہ اُٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کر لیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ میں جاتا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم من الایمان، ج: ۱ ص: ۲۳.

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدا اور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آ گئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز و اقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدا اور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آ جائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ: مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یارسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے، تنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہو گا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دلا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند ـــ زبانیاند و نانیاند و جانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگر کی

اب تم میرے چہرے اور جمال کو دیکھتے رہو اور ابدالا باد تک تمہاری بینائی آج کھول دی گئی اور فرمایا جائے گا کہ ''یمین عرش (عرش کی دائیں جانب) میں آ کر قیام کرو۔ تم ہمارے مہمان ہو''۔

ان کے سامنے نعمتیں رکھی جائیں گی خدا کا کتنا بڑا احسان ہوگا کہ میدان محشر بپا ہے۔ مخلوق کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور یہ نابینا لوگ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں اور اللہ کے یہاں مہمان ہوں گے اور نعمتیں استعمال کر رہے ہوں گے۔ تو جب ان نابینا حضرات کی جماعت اس شان سے آئے گی اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرما کر مہمان بنائیں گے ٹھیک اسی وقت میں علماء کی جماعت آگے بڑھے گی اور علماء کہیں گے کہ ہماری ہی تلقین سے اور ہمارے ہی بتلانے سے انہوں نے صبر کیا، ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ان اندھوں کو یمین عرش میں جگہ دے دی گئی حق تعالیٰ ان نابینا حضرات سے فرمائیں گے کہ انہیں کہنے دو تم آؤ یمین عرش میں وہ عرش کی دائیں جانب نعمتوں میں ہوں گے علماء وہیں کھڑے رہیں گے۔

اس کے بعد بلایا جائے گا ان کو جو جذام کے مرض میں مبتلا تھے کہ دنیا والوں نے ان کو اچھوت بنا دیا تھا۔ محشر کے دن ان کے بدن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت ایوب علیہ السلام کو اور ان کو سبز جھنڈا دیا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور بہت بیماریاں سہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: تم بھی یمیں عرش میں آ جاؤ۔ پھر علماء ابھریں گے کہ ہمارے ہی کہنے سے تو انہوں نے صبر کیا اور دل میں تسکین پیدا ہوئی اور ہمیں ہی کوئی پوچھتا نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، کہنے دو تم ان علماء کو، تم آگے چلو۔ اسی طرح سے معاملہ ہوگا۔

اہل علم کا اخروی مقام...... اور اہل مصیبت جب سب نمٹ جائیں گے۔ پھر حق تعالیٰ علماء کو خطاب فرمائیں گے کہ: تم صرف نعمتیں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم صرف اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ صرف اپنی ذات کا ہی نفع ڈھونڈو؟ بلکہ تم بھیجے گئے تھے دنیا کی ہدایت کے لئے یہاں لوگوں کی شفاعت کرو کھڑے ہو کر جب سب کو بخشوالو گے تب تم آگے بڑھنا۔ تم اپنے کام کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ دنیا کے کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دنیا کے انسانوں کو نفع پہنچاؤ۔ اس وقت ان کا رتبہ ظاہر ہوگا۔ وہ شفاعتیں کریں گے اور لاکھوں آدمی ان کی شفاعت کی بدولت بخشے جائیں گے۔ رب العالمین فرمائیں گے کہ: اب تم نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ دنیا میں ہدایت کی، یہاں شفاعت کی۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی عہدہ مل جائے، کوئی نعمت مل جائے۔ یہ تمہارا کام نہیں تھا۔ تمہارا کام یہ تھا کہ دنیا کو سب کچھ ملے اور تم الگ کھڑے رہو اس کے بعد تمہیں اجر ملے تو بہر حال یہ جو یمین عرش میں جائیں گے یہی ہیں وہ جسے میں نے عرض کیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ کے پہلو میں جگہ مل جائے گی کہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھا تھا، قبر میں اس کے جلوے دیکھے، میدان محشر میں اس کی تجلی دیکھی اور آخر میں جا کر مل جائیں گے یمین عرش میں حق تعالیٰ کے پہلو میں بیٹھ جائیں گے۔

تجلیات قرآن کریم کے ظہور کے ترتیب...... یہ قرآن کا اثر ہوگا کہ آپ پڑھیں گے، پڑھ کر اس کی چیزیں

جمائیں گے، دل میں اللہ تعالیٰ کے کمالات آئیں گے، عظمت بیٹھے گی، ایمان مضبوط ہوگا۔ اس کے انوار و برکات قلب کے اندر آئیں گے اور پھر وہ انوار محسوس طریق پر نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر قبر میں نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر تجلیات کی صورت میں میدان محشر میں نمایاں ہوں گے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا پہلو ہے کہ بس ہمارے پاس آ جاؤ۔ تو وہ ساری چیزیں پوری ہو جائیں گی جو عبادت سے مطلوب تھیں کہ دیکھ بھی لیں، اپنے معبود کے قریب بھی ہو جائیں۔ اس سے مل بھی لیں۔ اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں۔ یہ صرف قرآن کریم ہی کے ذریعہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ تو آپ نے ترجمہ شروع کرا کر قرآن کریم کا در حقیقت راستہ کھولا ہے مسلمانوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور مل بھی لیں اور اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں اور اس سے ملاصق ہو جائیں۔ آپ نے یہ بہت بڑی سعادت کا کام کیا ہے۔

قرآن کریم کتاب انقلاب...... یہی قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے۔ دلوں کو بدل دیتی ہے۔ روحوں کو بدل دیتی ہے۔ جنہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا وہ تو نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے استعمال نہیں کیا اس کو اور جب تک کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے اس کے فوائد معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر ظاہر ہو سکتا ہے جیسے قیمتی سے قیمتی دوا ہو لیکن اس کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ کیا اثر کرے گی۔ مثلاً شہد کو کہا گیا ہے کہ: اس میں شفا ہے لیکن کوئی شخص شہد سے گھبرائے اور خیال کرے کہ شہد میرے گھر میں بھی داخل نہ ہو تو کیا فائدہ ظاہر ہوگا۔ ایسے ہی اگر قرآن کریم سے بچتے رہیں کہ قرآن کریم کو سنے بھی نہ اور اس کے پاس پھٹکے بھی نہ تو کیا اس کا نور ظاہر ہوگا، اسی کے لئے نور ظاہر ہوگا جو اس کو آ کر سنے اس کو پڑھے، اس کو دل میں جمائے۔ اسی سے اس کے انوار و برکات ظاہر ہوں گے تو اس لئے دیکھا جائے تو قرآن کریم ایک انقلاب کی کتاب ہے، دلوں کو بدل دیا، روحوں کو بدل دیا، کایا پلٹ دی، زمانۂ جاہلیت جو اسلام سے قبل کا زمانہ ہے اس کے اندر دلوں میں روحوں میں ہر برائی جمی ہوئی تھی، شرک میں وہ مبتلا تھے۔ بدعات میں وہ مبتلا تھے، منکرات میں وہ مبتلا تھے۔ چوری، ڈکیتی، زناکاری ساری حرکتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل صحیح نہ مال درست بس جیسے جانور گزارتے ہیں۔ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا۔ رات دن ڈکیتی رات دن مار دھاڑ قبیلوں میں جنگ اور کشت و خون، ہر وقت کا یہی مشغلہ تھا، قرآن کریم آیا، جن دلوں نے اس کو قبول کیا اور اس سعادت کو حاصل کیا تو ایک دم کایا پلٹنا شروع ہوگئی۔ پہلے ان کا نام تھا جہلائے مکہ۔ جب اس کو قبول کر لیا اب ان کا نام ہوگیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

تو جہلائے مکہ سے بن گئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا وہ زمانۂ جاہلیت تھا اب اس کا نام ہوگیا خیر القرون کہ دنیا کے سارے زمانوں میں بہترین زمانہ ہے یہ وہ لوگ جو جہالت میں مبتلا تھے۔ وہی حضرات علماء کے استاذ بنے، عرفاء کے شیخ بنے۔ پوری دنیا کو نور سے منور کر دیا۔ ایک دم کایا پلٹ ہوگئی۔ جو ایک ایک پیسے کے لئے ڈکیتیاں ڈالتے تھے گردنیں کاٹتے تھے اور مرتے تھے پیسے کے اوپر، آج یہ کیفیت ہے کہ گھر بھرے ہوئے ہیں

خزانوں سے اور وہ رخ کر کے بھی نہیں دیکھتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک مرتبہ خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع تھا۔ سونے چاندی کو خطاب کر کے فرمایا۔ یَادُنْیَا غِرِّیْ غَیْرِیْ. ① ''اے دنیا! دھوکہ کسی اور کو دینا''۔ ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں اور خزانچی کو اسی وقت حکم دیا کہ غرباء میں دولت تقسیم کی جائے۔ رات بھر دولت تقسیم ہوئی۔ یہ لوگ تھے جو پہلے ایک ایک پائی کے لئے جان دیتے تھے۔ آج خزانے پڑے ہوئے ہیں اور اس کو خطاب کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر ریجھنے والے نہیں۔ ہم تجھ پر مرنے والے نہیں ہیں۔ یہ کایا پلٹ کہاں سے ہوئی؟ اس قرآن نے ہی تو دلوں کو بدل دیا تھا، روحوں کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے مال کی محبت تھی اب کمال کی محبت ہوئی، پہلے مخلوق کی محبت تھی اب خالق کی محبت شروع ہوئی اور محبت میں مستغرق ہو گئے، غرق ہو گئے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ پتی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کچھ غمگین اور اداس ہیں۔ پوچھا کہ آج آپ اداس کیوں ہیں فرمایا کہ: خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے دل کے اوپر بوجھ پڑ رہا ہے کہ اتنی خرافات کہاں میرے سر پر لد گئی۔ اس کی وجہ سے غمگینی ہے۔ بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ: پھر غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر غرباء کو تقسیم کر دو۔ بس تشریف لے گئے اور خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ غرباء میں روپیہ تقسیم کیا جائے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی جائے۔ تمام رات مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو گھر پہنچے تو بہت ہشاش بشاش۔ بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا کہ: بہت عمدہ تدبیر بتلائی تھی میرا دل ہلکا ہو گیا۔ تو پہلے یہ کیفیت تھی کہ ان کا دل ہلکا ہوتا تھا جب دولت زیادہ ہوتی تھی یا آج ہلکا ہونے لگا جب دولت ختم ہو جائے۔ یہ کایا پلٹ نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ دل بدل گئے۔

عورتوں میں اِنقلاب...... دولت کی محبت سب سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے اور ان ہی سے یہ روگ مردوں کو بھی لگتا ہے اگر عورتیں نہ ہوں تو یہ بھی اس روگ میں مبتلا نہ ہوں اور یہ محبت عورتوں میں اس لئے ہوتی ہے کہ پیدا ہوتے ہی زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں۔ آج اس کے کان میں سوراخ کر دیئے تو بالیاں پڑ گئیں۔ ناک پھوڑ دی تو اس میں لونگ گھس گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ بندھ گئیں۔ تو پیدائش سے لے کر وہ مبتلا ہوتی ہیں سونے چاندی میں اس لئے ان کے دل میں محبت بیٹھ جاتی ہے سونے چاندی کی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ② ''کیا یہ عورت

---

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه علی ج: ۹ ص: ۱۳۴. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: فیه جا العجفی وهو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۳۱. ② پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸.

جورات دن زیوروں کی جھنکار میں پرورش پارہی ہے یہ عقل کامل رکھتی ہے؟''

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر خاوند سے تو تو میں میں ہو جائے تو خاوند تو اپنے دلائل پیش کرے گا اور یہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جائے گی۔ نہ دلیل نہ حجت، یہ اسی پر جمی رہے گی۔ تو جو کلام کی ایک قوت ہوتی ہے وہ نہیں رہتی۔ کیوں کہ علم نہیں اور علم اس لئے نہیں کہ مال یعنی سونا چاندی اندر گھسا ہوا ہے۔ علم نورانی ہے اور دولت سیاہ چیز ہے اور سیاہی کے ساتھ نور جمع نہیں ہوتا ہے اور سیاہی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ اب تو خیر وہ روپیہ نہیں رہا سونے چاندی کا اب تو کاغذ رہ گئے ہیں مگر جب سونے چاندی کے سکے تھے تو اگر پچاس روپیہ گن لیں تو انگلیاں سیاہ ہو جاتی تھیں۔ تو سونے چاندی میں کالک بھری ہوئی ہے۔ گنتے گنتے ہاتھ پیر سیاہ ہو جاتے تھے۔

جو عورتیں رات دن پیروں میں زیور پہنتی ہیں تو ان کے ٹخنوں پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے سنا اسی کے بارے میں فرمایا کہ ''دست زر آلود ایں قدر بدبو میکند۔ قلب زر آلود چہ قدر بدبو خواہد کرد''۔ یعنی جو ہاتھ سونے چاندی کو لگتے ہیں ان میں اس قدر بدبو آ جاتی ہے اگر کوئی اٹک جائے سونے چاندی میں تو دل میں کتنی بدبو پیدا ہوگی اور کتنا تعفن پیدا ہوگا۔ تو عورتوں کے بارے میں فرمایا ﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ ''جب وہ عورتیں زیورات میں ہی نشوونما پاتی ہیں تو ان کے اندر علم وکلام کی قوت کہاں سے ہو سکتی ہے۔ وہ تو مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائیں گی نہ حجت نہ دلیل۔ دوسرا لاکھ دلیل بیان کرے وہ اپنی ہی ہٹ پر رہیں گی۔ چونکہ دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے عورتوں کے دل اتنے بدل دیئے تھے کہ بجائے محبت کے بیزاری پیدا ہوگئی تھی سونے چاندی سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے حاکم ہو گئے تھے تو انہوں نے دو بورے بھر کر گیہوں اور زیوروں کے اپنی خالہ کے ہاں ہدیہ کے طور پر بھیجے۔ تو اندازہ کیجئے کتنے ہزاروں اور کتنے لاکھوں روپے ہوں گے جبکہ دو بوریاں بھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف سونا اور ایک طرف چاندی یہ تمام سامان لے کر خالہ کے گھر پہنچے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: میں کیا کروں گی اتنی دولت کو، اس کو غریبوں میں تقسیم کر دو۔ وہ دولت غریبوں کو تقسیم ہونی شروع ہو گئی صبح سے تقسیم ہونی شروع ہوئی اور شام تک دو بوریاں خالی ہو گئیں۔ باندی نے عرض کیا کہ ام المومنین! آپ پر فاقہ ہے کچھ آپ نے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ: بیوقوف پہلے سے کیوں نہیں کہا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔ تو حالت یہ کہ ذہن میں یہ بھی نہیں کہ اتنے وقت سے فاقہ میں ہوں اور مجھے کچھ رکھ لینا چاہئے۔ اس قدر گویا کہ غنی ہو گئی تھیں زر سے اور دولت سے کہ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے فاقہ ہے کہ کچھ مجھے بھی رکھنا چاہیے باندی کے یاد دلانے پر یاد آیا۔

تو عورتوں کے دل میں زیادہ محبت ہوتی ہے یہ انقلاب تھا قرآن کا پیدا کیا ہوا کہ عورتوں کے قلوب کو اتنا پاک بنا دیا کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ پیسہ پاس نہیں، ہم فاقہ سے ہیں۔ یہ قرآن کا ہی تو انقلاب تھا۔ تو قرآن کریم دنیا میں

بھی انقلاب پیدا کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو یہ کہ دل کے اندر بجائے کفر و معصیت کے ایمان کی حلاوت پیدا کرتا ہے اور آخرت میں جہنم سے بچا کے جنت میں پہنچا تا ہے۔ فتنوں سے نکال کر امان میں پہنچا تا ہے، قرآن یہاں بھی انقلاب لاتا ہے اور آخرت میں بھی انقلاب لائے گا اور برزخ میں قبر کے اندر بھی انقلاب لائے گا۔

قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورہ تَبَارَکَ الَّذِیْ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عشاء کے بعد اس کی تلاوت کر کے سویا کرو۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا۔ هِيَ الرَّافِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ هِيَ الْمَانِعَةُ ① یہ رَافِعَةُ بھی ہے کہ عذاب کو رفع کرتی ہے۔ یہ مَانِعَةُ بھی ہے کہ روک لگاتی ہے مصیبتوں پر، یہ مُنْجِیَہ بھی ہے جو نجات دلاتی ہے عذاب سے۔ تو قبر کے اندر نجات دلا دینا، عذاب کو دفع کر دینا اور روک دینا یہ خاصیت ہے تَبَارَکَ الَّذِیْ کی۔ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سوتے وقت سورہَ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھ کر سویا کرو۔ اس لئے کہ سونا اور مرنا برابر ہے۔ سونے والا گویا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ موت سہل ہونے کے لئے ہی فرمایا کہ سورہَ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھو۔ یہ ''برزخ'' میں بھی نجات دلائے گی۔ میدان محشر میں بھی بچائے گی، یہ امر ہے شریعت کا، اگر کوئی حافظ ہے تو حفظ پڑھ لیا کرے اور حافظ نہیں ہے تو دیکھ کر پڑھ لیا کرے۔ پانچ منٹ کی کیا بات ہے۔ عشاء کے وضو ہوتے ہی پڑھ کر سو جائے اس سے برکات حاصل ہوں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹایا جائے گا اور عذاب کے فرشتے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت سورہَ تَبَارَکَ الَّذِیْ کو ایک شکل دے دی جائے گی وہ اس شکل میں آ کر کہے گی کہ: خبردار جو تم آگے بڑھے اس عذاب کو فوراً روک لو تو ملائکہ عذاب کہیں گے کہ ہم کو تو اللہ کا حکم ہے آپ کے کہنے سے کیسے رک جائیں وہ کہے گی کہ میں اللہ کا کلام ہوں۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ آپ اللہ کا کلام ہیں مگر وہاں سے ہمیں کلام والے کا آرڈر ہے تو عذاب سے ہم کیسے رک جائیں تو یہ سورت غضبناک ہو جائے گی۔ اس پر ملائکہ عذاب کہیں گے کہ آپ اللہ سے کہیں۔ ہمیں نہ روکیں۔ ہم آپ کے کہنے سے رک نہیں سکتے۔ ہم تو آرڈر کے پابند ہیں وہ سورت کہے گی کہ: ایک منٹ رک جاؤ۔ اس وقت عروج ہوگا اور پہنچے گی حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ میں اور جا کے کہے گی بہت غصے سے کہ یا تو اے اللہ: مجھے اپنے کلام سے نکال دے کہ میں آپ کے قرآن کی سورت نہ رہوں اور اگر میں سورت ہوں تو اس کے کیا معنی ہیں کہ ملائکہ میری تعمیل نہیں کرتے میں تو آپ کا کلام ہوں میں آرڈر دیتی ہوں کہ وہ روکیں عذاب کو مگر وہ رکتے نہیں یا تو مجھے قرآن سے نکال دیجئے اور رکھنا ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ میرا حکم نہ چلے۔ حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔

میں دیکھتا ہوں تو بہت غصہ میں بھری ہوئی ہے، تو کہے گی۔ وَحَقٌّ لِّيْ اَنْ اَغْضَبَ. ② ''مجھے حق ہے کہ

---

① السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورة الملک، ج:١٠، ص:١٢٦.

② الدرالمنثور، سورة الملک ج:١٠ ص:٦٣.

میں غصہ کروں''۔ میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں میں آپ کا کلام ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ میری تعمیل نہ کی جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: میں نے اس میت کو تیرے سپرد کر دیا جو مناسب سمجھے تو کر، اب آئے گی آرڈر لے کر کے اور ملائکہ عذاب سے کہے گی خبر دار: جو تم آگے بڑھے، یہ آرڈر ہے۔

تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ملائکہ منہ بسورتے ہوئے رخصت ہونگے جیسے کوئی شرمندہ شکست کھا کر جاتا ہے کہ ہماری کچھ بات بھی نہ چلی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے واپس ہوں گے اور قبر خالی ہو جائے گی ملائکہ عذاب سے۔حدیث میں ہے کہ یہ سورت میت کے منہ پر اپنا منہ رکھے گی جیسے کوئی بوسہ لیتا ہے اور کہے گی کیسا مبارک منہ ہے کہ جس سے میری تلاوت کی گئی تھی۔ پھر سینے پر منہ رکھے گی کہ کیسا مبارک سینہ ہے کہ جس میں میں محفوظ تھی۔ پھر قدموں پر منہ رکھے گی کہ کیسے مبارک قدم ہیں کہ جن سے کھڑے ہو کر میری تلاوت کی گئی تھی اور اس وقت میت سے کہے گی کہ تو آرام سے اور اطمینان سے رہ کوئی تیرے اوپر بار نہیں میں موجود ہوں فکر کرنے کی بات نہیں۔تو قرآن کریم دنیا میں کایا پلٹ کر کے قلوب کو نورانی بنا دیتا ہے۔ برزخ میں کایا پلٹ کر کے عذاب کو دفع کرتا ہے اور میدان محشر میں اللہ کے یمین میں پہنچا دیتا ہے۔تو قرآن کریم میں ایک تبدیلی اور انقلاب کا مادہ ہے کہ دلوں کو بدل دے روحوں کو بدل دے، ناپاک کو پاک بنا دے۔ یہ انقلاب کا مادہ قرآن میں موجود ہے۔

انقلاب عظیم...... دنیا میں کتنا بڑا انقلاب بپا ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کریم کی تلاوت کی ہے تو لوگ بدل گئے جو جاہلین مکہ تھے وہ صحابہ کرام بن گئے۔زمانہ بدل گیا جاہلیت کے بجائے خیر القرون اس کا نام ہو گیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام پر پہنچے کہ امت کا عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ. ''سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم متقی پارسا پاک دامن اور قلوب کے اندر کامل تقویٰ لئے ہوئے ہیں''۔حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ: امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں یا عمر بن العزیز افضل ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں اور عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں۔انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ہاں حضرات صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔مگر عادل اتنے بڑے تھے کہ لوگ ان کو عمر ثانی کہتے ہیں۔یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور لوٹ آیا تھا۔ان کے زمانہ خلافت میں عدل وانصاف انتہائی درجہ پر تھا۔اس عدل وانصاف کے باوجود تین سو نفلیں بھی ثابت ہیں جو روزانہ پڑھتے تھے۔اور علمی مشغلہ الگ رہا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بہت ہی اونچا مقام ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے دور خلافت میں کچھ خطا اجتہادی اور خطائے فکری بھی ہوئی ہیں اس بناء پر لوگوں نے حضرت حسن بصری سے دریافت کیا کہ ''حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟ حضرت حسن بصری نے جواب دیا کہ: اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑے کی ناک میں کچھ پانی آ جائے اور اس پانی پر کچھ گرد بیٹھ جائے وہ گرد ہزار درجہ افضل ہے عمر بن عبدالعزیز سے۔اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں اور معاویہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ صحابی اور اور کوئی شخص کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا''۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ...... صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ قرآن اخذ کیا، دل بدل گئے، روح بدل گئی، جذبات بدل گئے، پھر جہاں یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا، قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کر لیا، قیصر کا ملک فتح ہو گیا، رومی ماتحت بن گئے کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا۔ ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پہنچے ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا زبان بدل دی، ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گی۔

آج آپ ممالک عربیہ کہتے ہیں مصر کو، شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی، مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ شام عیسائیوں کا ملک تھا اس کے اندر رومی زبان بولی جاتی تھی، فلسطینی بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی۔ مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہو گئی۔ تمدن تک بدل دیا، تہذیب تک بدل دی۔ تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں کہاں سے آئی۔؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اسی کو دستور العمل بنایا۔ تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

انقلاب شر...... آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جا رہا ہے کہ لوگ خیر سے شر کی طرف آ رہے ہیں۔ علم سے جہالت کی طرف آ رہے ہیں۔ تہذیب سے بد تہذیبی کی طرف۔ تو انقلاب خیر اور انقلاب حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلاب شر ترک قرآن پیدا کرتا ہے۔ قرآن کو ترک کر دو گے تو دوسرا انقلاب آتا جائے گا، تہذیب سے بد تہذیبی ہوتی چلی جائے گی۔ شائستگی بدل جائے گی ناشائستگی سے۔ علم ختم ہو جائے گا جہالت سے۔ اخلاق حسنہ جاتے رہیں گے، بد اخلاقیاں پیدا ہوتی جائیں گی اس لیے علم اخلاق اور کمالات یہ قرآن ہی سکھاتا ہے۔ جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شاخیں سامنے کہاں سے آ جائیں گی۔ بہر حال قرآن برکت بھی ہے، ہدایت بھی ہے، نور بھی ہے اور وہ انقلاب بھی ہے کہ جب آتا ہے تو کایا پلٹ دیتا ہے۔

جنات میں انقلاب...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنات اور شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک پہنچ جاتے اور ملائکہ کی گفتگو سن لیتے۔ اس میں کچھ جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں میں اس کی تبلیغ کرتے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہ سلسلہ ان کا منقطع کر دیا گیا اب کوئی آسمان پر اگر جاتا ہے تو اسے آگ کے بم مارے جاتے ہیں جس سے وہ بھسم ہو جاتا ہے، فرشتے ان کو آسمان کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ یہ جنات

اس جستجو اور ٹوہ میں تھے کہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کو روک دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھتے تھے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا، مگر کون سا حادثہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا تھا۔ اس کی جستجو تلاش میں نکلے اور ان جنات کا وفد مکہ مکرمہ پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرمارہے تھے قرآن کریم کی۔ انہوں نے قرآن کریم کو سنا اور سمجھ گئے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نازل ہونے کی وجہ سے ہمارے راستے بند ہوئے ہیں تاکہ ہم اس میں خلط ملط نہ کرسکیں۔

تو انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا: ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا﴾ ① ''ہم آج ایسا کلام سن کر آئے ہیں کہ جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے راہنمائی کرتا ہے کمالات کی طرف۔ ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے اور ہم شرک نہیں کریں گے''۔ ہمیں تو توحید کامل نصیب ہوگئی اس کلام کو سن کر یہی ہے وہ کلام جس کی وجہ سے ہمارے راستے روکے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں مشرکین بھی تھے۔ مشرکین آئے انہوں نے قرآن سن کر توبہ کی کہ ﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا﴾ ''اب ہم شرک نہیں کریں گے'' یہ کمال جو آج ہمیں معلوم ہوا کہ توحید اتنی کامل ہے جس کو قرآن لے کر آیا ہے۔ ﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ ② ''اور ہم توبہ کرتے ہیں اس سے جو ہم نے عقیدہ جما رکھا تھا کہ اللہ کے یہاں کوئی بیوی ہے اللہ کے کوئی اولاد ہے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر عیسائی بھی تھے جو عقیدہ ابنیت کے قائل تھے، اس سے توبہ کی جنات نے۔ تو قرآن کے وہ الفاظ کان پڑے تھے کہ ایک انقلاب پیدا کر دیا کفر سے ایمان کی طرف آ گئے شرک سے توحید کی طرف آ گئے، ناشائستگی سے شائستگی کی طرف آ گئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآن کریم کے انقلاب کی ایک جھلک...... یہی قرآن کریم ہے جو لوگوں کے دلوں کو بدلتا ہے، اگر اس کو پکڑے ہوئے ہیں تو خیر کی طرف پھرتے رہیں گے اگر اسے ترک کر دیا تو شر کی طرف بڑھیں گے، فتنوں کی طرف بڑھیں گے، ایک سے دوسرے کو چین نہیں ملے گا، تو قرآن نے پیدا کیا، ایثار ہمدردی، محبت، خدمت گزاری، جذبہ اطاعت، اپنے نفع پر اپنے بھائی کے نفع کو ترجیح دینا۔ یہ جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ خودغرضی مٹا کر لاغرضی پیدا کر دی اور اس درجہ کہ موت گوارہ مگر اپنے بھائی کا نقصان گوارہ نہیں۔

غزوہ بدر کے اندر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم زخمی ہو کر گرے، لشکر میں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجاہدین کی ضروریات پوری کرتے ہیں مثلاً مرہم پٹی وغیرہ۔ انہوں نے آ کر مرہم پٹی کی، ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو فرمایا، پانی، اس وقت ایک آدمی کٹورہ بھر کر پانی کا لایا منہ کے قریب لے گئے کہ قریب سے ایک اور آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں لے گئے ان کے منہ سے لگایا ایک تیسری آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں پہنچے تو چوتھی آواز آئی۔ وہ نہیں پینے پائے کہ پانچویں آواز آئی۔ وہاں پہنچے تو چھٹی آواز آئی۔ غرض سات آوازیں آئیں،

① پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۱، ۲۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۳۔

ساتویں تک پہنچے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ چھٹے کے پاس لوٹ کر آئے تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ پھر لوٹے کہ پانچویں کو پلادوں وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ اسی طرح لوٹ کر واپس آتے رہے اور دیکھتے رہے کہ شہید ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ساتوں کے ساتوں پیاسے شہید ہوئے مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ میں پانی پیوں اور میرا بھائی برابر میں پیاسا لیٹا رہے۔ موت گوارہ کی مگر دوسرے کا پیاسا رہنا گوارہ نہ کیا۔ وہی لوگ جو ایک پائی کے لئے دوسروں کے گلے کاٹتے تھے آج ان میں اس درجہ ایثار پیدا ہو گیا کہ موت گوارہ کی مگر دوسرے کی پیاس گوارہ نہیں۔

قرآن انقلاب عظیم کا سرچشمہ...... یہی وہ عظیم انقلاب ہے جو قرآن کریم نے پیدا کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اندر۔ ان ہی مشت خاک کو کیمیا بنا دیا، سونا چاندی بنا دیا اور ایسا بنا دیا کہ دنیا کی کایا پلٹ دی انہوں نے۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ''تَبَرَّکُ بِالْقُرْاٰنِ'' برکت حاصل کرو قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے، یہ پیدا کی ہوئی چیز نہیں کلام خداوندی اس کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس سے صادر ہو رہا ہے، اس نے سورج پیدا کیا، اس نے چاند پیدا کیا زمین پیدا کی اور کلام خود بخود اندر سے نکل کر آیا ہے۔ اس لئے کلام مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق میں تو روح بن کر کلام بھرا ہوا ہے جسکی وجہ سے اشیا اپنی اصلیت پر قائم اور صحیح معلوم ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کہ کلام اللہ سے برکت حاصل کرو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پیدا کئے ہوئے ہم اور آپ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنے اندر کی چیز نکال کر دی ہے تا کہ ان کے اندر اس کلام کی برکت سے تہذیب پیدا ہو، شائستگی پیدا ہو۔ تو اس اعتبار سے دو عالم ہوئے ایک عالم خلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ایک عالم ارواح ہے کہ اپنے حکم سے اپنے کلام سے اس کے اندر روح ڈالی ہے، تو قرآن کریم درحقیقت روح الٰہی ہے، روح خداوندی ہے جس سے اقوام زندہ ہوئیں۔ جس نے اسے لیا وہی زندہ ہوا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس روح کو لیا اس لئے وہ ایسے زندہ ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں مردوں کو زندہ کر دیا، انہوں نے، ہم نے آج اس روح کو نکال دیا ہے ایسے پڑے ہوئے ہیں بے جان، جس کا جی چاہے مارے جس کا جی چاہے کاٹ دے، جس کا جی چاہے کچھ کر لے، چونکہ ہمارے اندر جان ہی باقی نہیں ہے اور نہ ہی روح باقی ہے۔

قرآن بلند ہے اور اس پر کوئی چیز بلند نہیں ہو سکتی جیسا کہ: اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی ① اسلام بلند ہے اسے کوئی پست نہیں کر سکتا، اس کی روح جس میں آجائے گی، وہ بھی بلند ہو جائے گا۔ جس میں سے نکل جائے گی وہ پست ہو جائے گا۔

صحیح اِنقلاب کی تمنا میں اُلٹی زقند...... تو آج ضرورت اس کی ہے کہ قرآنِ کریم کو سنبھالا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کچھ دولت ہو ہمارے پاس، کچھ بلڈنگیں ہوں، کچھ جائیدادیں ہوں۔ جب ہی ہم پنپ سکتے ہیں حالانکہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، ج: ۵، ص: ۱۳۹.

پہنچنے کی یہ صورت نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں چھن بھی سکتی ہیں، انقلابات میں گھر تک چھن جاتے ہیں جائیدادیں تک چھن جاتی ہیں، دکانیں تک بک جاتی ہیں، بازار تک جلا دیئے جاتے ہیں، اگران سے شوکت وابستہ ہوتو وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ اگر اندر روح بھری ہوتی ہے تو لاکھ بازار جلیں تو وہ جلتے رہیں، پھر سینکڑوں قائم ہو جائیں گے۔ مگر مومن کو ذرہ برابر فکر نہ ہوگی۔ نہ جلنے کی نہ آنے کی، اس واسطے جہاں اور تدابیر کرتے ہیں وہ ثانوی درجہ کی ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان تو بنے اور بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن کی روح کو اپنے اندر جذب کرلے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تعلیم ...... بہر حال یہ سلسلہ جو آپ حضرات نے قائم فرمایا ہے مبارک سلسلہ ہے مگر اس کو رسمی نہ بنایا جائے بلکہ پڑھایا جائے اور پڑھانے کے ساتھ سنا بھی جائے یعنی پڑھانے والا اور ترجمہ کرنے والا کبھی کبھی امتحان بھی لیتا رہے کہ کل ہم نے کیا بتایا تھا۔ فلاں آیت کا کیا مطلب ہے۔ اس پر آپ نے کچھ عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے محض پڑھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ تربیت بھی ضروری ہے علم کے ساتھ ساتھ۔ پھر اس کو دستورِ زندگی بنانا بھی ضروری ہے، علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کو دستورِ زندگی نہ بنایا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔

آپ نے قرآن کا ترجمہ پڑھایا احکام سمجھائے اخلاق بتلائے۔ پھر چند دن کے بعد جانچ بھی کرتے رہیں پوچھ گچھ بھی کرتے رہیں کہ بھئی کتنا عمل ہوا کتنا نہیں ہوا تو اس کی ترکیب بتلائیں جیسے کہ احادیث میں دعائیں وارد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام لکھا دی جائیں اور پھر سنی بھی جائیں ان سے معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے اخلاق درست ہوتے ہیں ماحول بنتا ہے اس لئے محض ترجمہ پڑھا دینا ہی ذمہ داری نہیں ہے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تربیت ...... میں تو یہ کہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھانے والا عمل بھی دیکھتا رہے اور تربیت بھی کرتا رہے، یہ نہ دیکھے کہ بس ان کو علم ہو گیا ہے۔ یہ تو اور مصیبت بن جائے گی، حکمت کے ساتھ ان کی تربیت کرتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض تعلیم ہی نہیں دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہ صرف قرآن کے معنی بتلا دیئے ہوں یا سمجھا دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی بھی مشق کرائی ہے اور عمل کی نگرانی بھی فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ تعلیم اور حکمت عملی ...... حدیث میں ہے کہ ایک قبیلہ حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ہم ایمان لانا چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بسم اللہ اہل قبیلہ نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ نماز نہیں پڑھیں گے فجر اور عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے باقی تین وقتوں کی پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا اور وہ اسلام قبول کر کے چلے گئے۔ انہوں نے نہ صبح کی نماز پڑھی اور نہ عشاء کی۔ ظہر، عصر، مغرب کی پڑھتے رہے۔

لوگوں کو تعجب ہوا کہ جیسے تین وقت کی نماز فرض ہے ویسے ہی دو وقت کی بھی فرض ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط کیسے مان لی۔ اس پر سب کو حیرت تھی۔ مگر ایک مہینے کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں خود یہ خیال

پیدا ہوا کہ بھائی فرض تو ساری نمازیں ہیں، ہم تین نمازیں ادا کر رہے ہیں، دو ادا نہیں کر رہے ہیں اس پر گناہ گار ہو رہے ہیں، تو فائدہ کیا ہوا اسلام لانے سے؟ یہ سوچ کر پڑھنی شروع کی اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد پانچوں نمازوں کے پابند ہو گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے انوارِ باطن سے پہچان لیا تھا کہ یہ اس شرط پر رہیں گے نہیں اور پڑھنی شروع کر دیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط مان لی تھی۔ تو یہ حکمت تربیت کی تھی تعلیم میں تو سب برابر ہیں۔ تعلیم میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی جیسے ظہر، عصر، مغرب فرض ہیں، ویسے ہی عشاء اور فجر بھی فرض ہیں مگر اس سے آگے عمل کی بات ہے اور عمل میں تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور تربیت میں حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم تو ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے طب کی کتاب پڑھا دی ہو اور علاج ہوتا ہے مطب میں، تعلیم میں تو طبیب سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ بیان کرے گا لیکن کرنے بیٹھے گا تو ہر ایک کا نسخہ الگ الگ لکھے گا۔ چونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہے، بیماری الگ ہے، تو تعلیم کے درجہ میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن عمل کرانے کے درجے میں ہر ایک کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کی رعایت کرنی پڑے گی اور اسی مناسبت سے نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مربی بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج پہچان کر مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شرط کو قبول کر لیا اور انوار باطن سے پہچان بھی لیا تھا کہ بعد میں اس کو یہ قبول کر لیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی رد نہ فرمائی اور ہوا یہی اور بالآخر وہ ساری نمازیں پڑھنے لگے۔ یہ کچھ حکمت تھی تربیت کی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ: ترجمہ کرانے والے تعلیم کے درجہ میں تو سب کو ایک ہی طرح سمجھائیں گے مگر اس میں تربیت کی شان بھی ہونی چاہئے اور وہ ہونی چاہئے جداگانہ۔ ہر ایک کے مزاج کی مناسبت سے ہفتہ میں دو ہفتہ میں جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہئے کہ عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ نہیں کر رہے ہیں تو کیا رکاوٹ ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس طرح سے تربیت ہو کر اچھے خاصے مسلم بن جائیں گے۔

اس وجہ سے محض علم کافی نہیں جب تک کہ استعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے اور عمل کرا کے اس کی مشق نہ کرائی جائے اس وقت ثابت ہوگا کہ قرآن کریم نے نفع پہنچایا اور کس طرح سے اس نے کایا پلٹ دی ہے۔

تبریک...... بہر حال یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کر دی ہیں کہ آپ حضرات قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمہ کلام اللہ کا آغاز کیا ہے یہ نہایت مبارک اقدام ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے: خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَهٗ. ① ''پڑھنے والا بھی خیر ہے پڑھانے والا بھی خیر ہے'' ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ ② قرآن کریم کے نہ دائیں طرف سے باطل آ سکتا ہے نہ بائیں سے نہ سامنے سے نہ پیچھے سے

① الصحيح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خير كم من تعلم، ج: ۱۵، ص: ۴۳۹.

② پارہ ۲۴: سورة حم السجدة: الآية: ۴۲.

یہ چیز باطل سے بری ہے حق محض ہے اس لئے جس میں سرایت کر جائے گا اس کے پاس باطل نہ آسکے گا وہ بھی حق کے اوپر جمے گا، تو آپ نے خیر کا کارخانہ کھولا ہے، پڑھانے والا بھی خیر ہوگا۔ سننے والے بھی خیر ہوں گے پھر اگر اس کے ساتھ عمل بھی مستقیم ہو جائے تو اس کے اثرات اندر اتر جائیں گے اور پھر اس کے فوائد ظاہر ہوں گے۔

یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو میں نے عرض کردی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے اس کے فوائد و برکات دنیا و آخرت میں ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ''آمین''

دُعا

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا صَالِحًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَآءً مِّنْ كُلِّ دَآءٍ وَارْزُقْنَا يَارَبِّ حُسْنَ الْخَاتِمَةِ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِکَ وَلَاتُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

عظمتِ حفظ

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ○ ﴿الٓمّٓ ○ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ.﴾① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

ظلمت کدہ میں روشن چراغ...... بزرگانِ محترم! آج ہم سب کے لئے بے انتہا خوشی اور مسرت کا دن ہے کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی گئی اور سند عطا کی گئی اور ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے اپنا کلام مبارک اتار دیا۔ حق تعالیٰ کا کلام کسی بندے کے سینے میں آجانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے حق تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اور اس کی صفاتِ کمال نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمتِ محض اس ظلمت کدہ میں یہ چراغ روشن ہو جانا اور نورِ مطلق کی کرنیں اس میں گھومنا اور اِنشراحِ قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے اور قرآنِ کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔

سرچشمہ حیات......اگر غور کیا جائے تو یہ ایک حیات اور ایک زندگی ہے، اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا، اقوام کو بھی زندہ کیا اور عربوں کو بھی زندہ کیا اور ان میں زندگی کی روح ڈالی، خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ② ''اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی روح آپ کے اندر ڈالی، مراد ہے قرآن کریم۔ آگے فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتٰبُ وَلَاا لْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ''آپ اس سے پہلے یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آپ واقف نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اس وحی اور اس روح کو نور بنا کر آپ کے اندر ڈالا۔ جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے۔

① پارہ : ۱ ،سورۃ البقرۃ ،الآیۃ : ۲. ② پارہ : ۲۵ ،سورۃ الشوریٰ ،الآیۃ: ۵۲ .

تو قرآن کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ روحِ خداوندی ہے اور نوعیت اس کی علم اور کمال ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں علم کو روح بتلایا گیا ہے۔

ہم اور آپ اپنے عرف میں جانتے ہیں کہ روح باطنی چیز ہے اور وہی زندگی ہے بدن کی، بدن کی کوئی زندگی نہیں اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے، اسی دن یہ بدن بھی لاش ہو کر گندگی میں شمار ہوتا ہے۔ تو حقیقۃً یہ زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس روح کے روپ میں اللہ کے کمال کی ہے۔ تو قرآن کریم میں جس کو روح کہا گیا ہے وہ روحِ خداوندی ہے اور حقیقت میں ایک معدنِ حیات اور سرچشمہ زندگی ہے۔

یہ روحِ خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی جو پُشت ہاپُشت سے مُردہ چلی آرہی تھی، دنیا جس کو حقیر و ذلیل جانتی تھی۔ کوئی ان کو اونٹ کی مینگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا۔ کوئی ان کو جُہلائے عرب کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی جاہلینِ مکہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابات سے ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ روح ان کے اندر بھر گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام جُہلائے عرب تھا ان کا نام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو گیا۔

پہلے ان کو نفرت سے یاد کیا جاتا تھا، اب ان کو ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (۱) کے اعزاز کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس روحِ خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا "زمانہ جاہلیت" اب اس کا نام "خیرُ القرون" ہے۔ تو زمان میں بھی زندگی آئی، مکان میں بھی زندگی آئی اور اَعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا کو زندہ کیا۔

سپرُ طاقتوں کی شکست کی بنیادی وجہ...... اور دُنیا کی مُردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلا دی اور مُردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پا کر بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصر و کسریٰ کا کبر و غرور خاک میں ملا دیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خُرافات کو مِٹانا تھا جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ قیصریت و کسرویّت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے اپنے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تا کہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں چناں چہ رعایا کا ہر فرد آ کر سجدہ کرتا تھا اور فریاد کرتا کہ: میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں۔ تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا ہے، وہ قیصر و کسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا۔ رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی۔ اس غلامی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند اُمراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند

(۱) پارہ: ۳۰، سورۃ: البینۃ، الآیۃ: ۸.

افراد فائدہ اٹھائیں، مساوات تھی نہ عدل وعلم تھا۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جنگیں مُلک گیری کے لئے نہیں تھیں، وہ تخت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں مِلانا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں عدل و مساوات کی راہ میں حائل تھا۔ اور اس وقت دنیا میں قیصرِ روم اور کسریٰ کی دو بڑی بڑی حکومتیں تھیں جو اللہ کے دین کی سر بلندی میں سب سے بڑی رُکاوٹ تھی، اس وقت دنیا میں وہی دو ہی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ اوصافِ کمال، عالَم میں نہیں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔ یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت وکسرویّت ہے اس لئے ان حضرات نے ملک سے قیصریّت وکسرویّت کو مٹایا، بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ جا کے اُلٹا۔ جب جا کے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام پھیلا دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عَبد بنے ہوئے تھے وہ عباد اللہ بنے، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنے، سب میں مساوات آئی، ان میں زندگی آئی۔ تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا ہے اور روح ہی معدنِ حیات ہے۔ اس سے گویا واضح ہو گیا کہ قرآن کریم زندگی ہے اور جس قوم میں یہ سرَایت کر جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مُردہ ہو جائے گی۔

حافظِ قُرآن کا باطل سے تحفُّظ ...... اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہوگا۔ باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اس واسطے کہ قرآن کی شان مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَانُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ① ”وہ جو ایمان لے آئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز پر قرآن پر فرمایا: ﴿وَهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾. ”وہ اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اُتارا گیا ہے“۔

تو مثبت طریق پر تو قرآن کو حق کہا ہے۔ اصل میں حق یہی ہے۔ دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ ﴿لَّايَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ ② ”یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں باطل نہیں پھٹک سکتا“۔ یہ حق ہی حق ہے۔ اندر سے بھی حق اوپر سے بھی۔ نہ باطل اس کے اندر ہے نہ اس کے آس پاس آسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سرتاپا حق۔ اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی کے سینے میں گھسے گا تو اس کے سینے میں بُطلان کہاں سے آجائے گا۔

اور دوسرے جب یہ حق ہے تو اس میں باطل نہیں آسکتا۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے، کل کو معانی اس کے پڑھ لیں گے تو معانی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قُرب خداوندی مِلا۔ دوسرا وصف یہ کہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۲۴: سورۃ حم سجدہ، الآیۃ: ۴۲.

مشابہت ملی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ مجسم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کے اندر قرآن رُوح بن کر سرایت کر گیا ہے اور وہ حق ہی حق ہے۔ بُطلان اس کے آس پاس نہیں باطل دُور سے ہی بھاگے گا۔

حافظِ قرآن کی حیات دائمی ہے...... اگر اس پہلو کو دیکھیں کہ وہ حیات ہے اور آپ نے حیات کو اپنے اندار ڈال لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ ہیں مُردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مُردنی بدن پر طاری ہوگی اور بدن پہلے ہی سے باطل ہے۔ اسے موت آجائے تو کون سے بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کا زندگی کا سامنا تو وہ دوامی زندگی ہے۔ تو حافِظ اور قاری مَرنے والا نہیں۔ روح اس کی جاری وساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے نہ قاری مرتا ہے نہ عالِم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے۔ اس کی روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اس روح کا فیضان اس عالَم میں پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس بھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے وہاں بھی غذا مِل رہی ہے۔ یہاں بھی مِل رہی ہے۔ یہاں بھی اس کی غذا عِلم ومعرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا علم ومعرفت ہے اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ عِلم ومعرفت ہوگی، تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے۔ برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہوگا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر و قیمت نہیں۔

تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عَالَمِ آخرت میں بھی زندہ اور روح کی غذا یہی قرآن کریم ہے جس سے حیاتِ اَبدی ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظِ قرآن مرتا نہیں وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں، ایک جِسی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ مگر روح جو لے کر گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ وہ اس سے ہٹنے والی چیز نہیں وہ قرآن ہے جو روح ہے بلکہ روحِ خداوندی ہے۔ تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا، جس حد تک وہ قرآن کو لے چکا ہے اور حیات اس کی دائمی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے کس کے ایسے نصیب ہیں۔ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہوگا۔

حافظِ قرآن کے والد کی تاجپوشی...... حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاجپوشی کی جائے گی یعنی میدانِ حشر میں جہاں اوّلین وآخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا محشر منور ہوگا۔ اعلان ہوگا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔ یہ آج اس کی عزّت افزائی ہو رہی ہے، جو تاج پوشی کی گئی ہے۔

دنیا میں اگر کسی کی تاجپوشی کی جائے تو یہ عظیم ترین اعزاز ہے اس سے بڑھ کر کوئی فخر و اعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن

کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہوتو اس ملک کے جو اعیان ہیں وہ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے۔اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے۔اور ایک یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آویں گے یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں گے پھر تاج پوشی ناقص رہی۔

مگر میدان محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہوگی۔اول سے آخر تک۔اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہوگا۔صدر حق تعالیٰ شانہ ہوں گے۔ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے،جلسہ کے تمام آفاق پر زمینوں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوئی ہوں گی۔بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔اس میں مسلم غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہوگا۔اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا اس کی تاجپوشی کی جائے گی۔تو اولین و آخرین جمع تاج پہنانے والے خدا تعالیٰ تو اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کون سا موقعہ ہوگا۔ حافظ کو اپنی ذات سے جو تھا وہ تھا ہی۔اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنا دیا گیا ان کی تاج پوشی کی گئی اور اولین و آخرین میں شور یہ ہوگا، بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔تو بہر حال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آسکتا جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہوئی حضور سے صلی اللہ علیہ وسلم اسے القاب ملے حق تعالیٰ شانہ کے حیات ملی اسے دائمی۔اس کے اثرات متعدی ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے۔اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی۔اولین و آخرین میں شہرت ہوئی۔تو گویا قران کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں۔

قرآن حکیم کی ابدی حکومت......اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا جنت کے درجات کماتا جا۔اس کی جزا یہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے۔ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں۔لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآنی آیتوں کی تعداد ہے۔اب جیسے قرآن کی کوئی آیت ہے چار حرفوں کی۔اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔لطائف الگ نکل رہے ہیں۔علل الگ نکل رہی ہیں۔ اسرار الگ۔معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی آیت ایک ہی ہے۔تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا۔لیکن مجمل دیکھا جائے تو انواع علوم کی اتنی ہیں جتنی آیات ہیں۔اور درجات جنت کے اتنے ہی ہیں جتنی آیتیں ہیں۔تو فرمایا جائے گا اس حافظ قرآن سے کہ تلاوت کرتا جا۔جہاں تک تیری طاقت ہے۔درجات کماتا جا اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے۔جیسے آیت کے اندر تفصیلات ہیں۔

لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں۔تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حد ونہایت نہیں ہے ابدالاباد گزر جائے گا۔مگر وہ سیر وسیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں کما تا رہے گا۔تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں برزخ میں ہی نہیں حشر میں ہی نہیں بلکہ جنت میں ابدالاباد تک رہے گی۔اس واسطے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

قرآن کریم کے ابدی آثار کی وجہ...... ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے تو وہ گم نہیں ہوتا وہ مٹتا نہیں، اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ساری فضا کو گھیر لیتا ہے ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے۔تو فرق یہ ہے کلام اللہ تعالیٰ نے فضا کو گھیرا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جیسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا۔اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا، اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔جیسے قرآن کریم نے فرمایا ہے۔﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ ① کوئی لفظ کوئی ہاں ہوں تم اپنے منہ سے نہیں نکالتے مگر ٹانکنے والا اسے ٹانک لیتا ہے، محفوظ کر لیتا ہے ہر ہر لفظ محفوظ ہے، ہر ہر ادا محفوظ ہے اور آواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی، وہ عمل بھی وہ ہیئت بھی وہ قول بھی اس قول کی آواز بھی وہ زمانہ بھی ہر چیز محفوظ ہے۔تو بہر حال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو گم نہیں ہوتی۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ہمارے اور آپ کے کلام کو تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں، جس میں وہ کلام خدا جذب ہوگا۔وہ انشاء اللہ تعالیٰ گم ہونے والی چیز نہیں ہے آخرت تک اس کے آثار و برکات چلتے ہی رہیں گے۔

حافظ قرآن کا حق شفاعت...... حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے دس کی شفاعت کرِ خواہ وہ ماں باپ ہوں، بھائی بند ہو۔تجھے حق ہے دس آدمیوں کی شفاعت کا جس کی چاہے شفاعت کرا اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا ہے تو پچاس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہوگا ان کو اگر گھر میں پچاس آدمی نہیں تو باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔گھر والے تو بخشے ہی جائیں گے۔باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی۔

کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزت وعظمت کی بات ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ بخشا بخشوایا ہے۔جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جا رہا ہے کہ تو شفاعت کر دس آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا۔شہداء کو حق دیا جائے گا کسی کو سات کسی کو دس آدمیوں کی شفاعت کا۔اب اگر سارے ہی گھر والے حافظ ہیں تو ان کی شفاعت کہاں تک پہنچے گی۔آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

① پارہ:۲۶، سورۃ ق، الآیۃ:۱۸.

ابدی سربلندی...... بہرحال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حفظ کرایا ہے۔ وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ یہاں بھی ان کے لئے برکات ہیں وہاں بھی ان کے برکات ہیں۔ بچہ ابھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب پیش کرتے ہیں پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ بچہ یہ ہے باپ یہ ہے۔ اس باپ کا احسان ہے جو اس بچہ کو قرآن حفظ کرایا۔ تو دنیا میں بھی سرنام ہوا اور آخرت میں تو تشہیر ہوگی ہی۔ اولین میں آخرین میں تو بچہ بھی اور ماں باپ بھی سارے کے سارے ہی سرنام ہوں گے۔

عظمت قرآن کریم...... بہرحال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے وقت اتنا نہیں ہے کہ اور سارے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آ بھی نہیں سکتے۔ یہ دو چار پہلو ذکر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے پہلو ہیں جن سے قرآن کریم کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن میں آئیں کہ بڑی اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی، کہ حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطاء فرمائی۔ اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آکر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کی پگڑی باندھے اور آپ نے سپاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کر دی؟ حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ: مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ہے اور آپ لوگ بری ہیں خدانخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ نے تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہی ہیں۔

نگاہ محبت...... مگر یہ کہتا ہوں کہ: آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بری نہیں لگتی ہے۔ اس کا عیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبت کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبت اور اخلاص سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عیب دار کے عیب بھی چھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں ہی خوبیاں نظر پڑیں تو خوبیاں سراہنی شروع کر دیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں؟ اور سادگی سے میں یہ کہتا ہوں کہ: یہ تو آپ نے اپنی تعریف کی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھایا آپ میں وسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھادیا۔ تو وسعت قلبی کا ثبوت آپ دیں تو شکریہ میں کیوں ادا کروں؟ یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

برکت سے بڑھ کر برکت...... اور میں کہتا ہوں کہ نہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو اور نہ ہم تمہارا شکریہ ادا کریں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا۔ ہمیں توفیق دی کہ ان کو پگڑی باندھیں، ہمیں توفیق دی کہ ان کو سند دیں اور اس قرآن کریم کی تعلیم کو ہم آگے چلائیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے جو ہمیں توفیق عطاء فرمائی۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کر دیا کہ مسلمانوں کا اجتماع یہ خود ایک مستقل نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے۔ اور قرآن سے بھی افادے کے لئے وہ آگے

بڑھیں تو یہ برکت در برکت ہے۔

تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطاء فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکر کے وہ ہیں۔ وَلَـهُ الثَّنَآءُ الْـحَسَنُ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. عزت والا وہ شکر کا مستحق وہ حمد وثنا اس کے لئے۔ تو ہم سب مل کر اس کی حمد وثناء کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلم اور ہمارے قاری صاحبؒ کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطاء فرمائے اور ہمارے اس قصبے اور علاقے کے لوگوں کو اور زیادہ توجہ عطاء فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِمَعْرِفَةِ سُبُلِ الْاِجْتِهَادِ وَتَقْلِیْدِهٖ وَاَرْشَدَنَآ اِلٰی طَرِیْقِ اتِّبَاعِ الْاَئِمَّةِ وَتَآئِیْدِهٖ، فَنَوَّرَ قُلُوْبَنَا بِشُمُوْعِ اَعْلَامِ السُّنَنِ وَجَنَّبَنَا بِهَا عَنْ فِتَنِ الضَّلَالَةِ وَالْغَوَایَةِ مَاظَهَرَمِنْهَا وَمَا بَطَنَ. وَاخْتَارَلَنَا بِحُسْنِ تَوْفِیْقِهٖ سُنَّةَ الْاِتِّبَاعِ وَیَسَّرَلَنَا التَّجَنُّبَ عَنْ وَرْطَةِ الْبِدَعِ وَالْاِخْتِرَاعِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ حَبَّبَ اِلَیْنَا اِقْتِدَآءَ الْمُنِیْبِیْنَ بَعْدَ اتِّبَاعِهٖ وَرَضِیَ لَنَا الْاِهْتِدَاءَ بِهَدْیِ الرَّاسِخِیْنَ بَعْدَ الْوُقُوْفِ عَلَیْهِ وَاطِّلَاعِهٖ. فَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ، لَاشَرِیْکَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ شَهَادَةً تُنْجِیْنَا عَنِ الْفُسُوْقِ بَعْدَ الْاِیْمَانِ. وَتَکُوْنُ عِدَّةً لِّلتَّقْلِیْدِ بِطُرُقِ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعِرْفَانِ.

اَمَّا بَعْدُ!

شکریہ وتمہید...... محترم حضرات! میں اس تصور سے بھی خجل اور شرمسار ہوں کہ صدارت کے نام سے مجھ جیسے نااہل کوایک ایسی جگہ پر لا بٹھایا گیا ہے جو کسی اہل ترین فرد کے لئے سزاوار ہوسکتی تھی اوراسی لئے مجھے اس منصب کے قبول کرنے میں حددرجہ تامل اور تردد تھا جس کا میں نے اعتذار کے لہجہ میں اظہار بھی کر دیا تھا لیکن وہ درخور پذیرائی نہیں ہوا۔ آخر کار اس جماعتی ارشاد سے روگردانی کو بے ادبی خیال کرتے ہوئے میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور ہوگیا اور آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ آپ کے حضرات سامنے ہوں۔ مجھے ان بے نفس بزرگوں کے اخلاص اور ایثار کی برکت سے جو اپنی صدارت کی دولت کو بے دریغ لٹا کر ہم جیسے نااہلوں کو مسند صدارت پر بٹھا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ قادر وتوانا جو رسوم حسنہ میں حقیقت حسنہ ڈالتا ہے اور جو اچھی صورتوں کے سانچہ میں اچھی سیرتیں القاء فرمادیتا ہے۔ اس رسمی اعزاز کو حقیقت کا پیش خیمہ بنادے اوراس مبارک ہیئت کو جو بزرگانِ کانفرنس کی عزت افزائی سے بصورتِ موجودہ نظر آرہی ہے عین حقیقت کردے۔ وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ

بنابریں میرا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ میں ان تمام بزرگوں کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھے بایں بے بضاعتی قبول فرمایا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَیْرَ الْجَزَآءِ وَاَحْسَنَ اِلَیْهِمْ اَحْسَنَ الصِّلَةِ. آمین

حضرت! اس مختصر تحریر سے میری غرض حنفیہ یا فقہ حنفی کی دعوت وتبلیغ یا دعایت واشاعت نہیں یا اس کے منکرین یا غیر حنفی مسالک پر کوئی ردوانکار نہیں ہے کیونکہ یہ فقہی مسالک کچھ شرائع مستقلہ نہیں ہیں کہ ان کی دعوت و

تبلیغ کا سلسلہ چھیڑ کر ایک سے دوسرے مسلک پر ردوطعن یا ایک سے دوسرے کا ابطال کیا جائے یہ اجتہادی مسالک محض عملی راستے ہیں جو چلنے کے لئے صاف کئے گئے ہیں نہ کہ جنگ کے میدان ہیں جو لڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور نہ موجودہ نازک زمانہ جب کہ مسلمانوں میں ہزاروں مابہ النزاع موجود ہیں اس کے لئے موزوں ہی ہوسکتا ہے کہ ایک اور نزاع کو ہوا دی جائے۔

تحریر خطبہ کی غرض وغایت...... اس مختصر نوشتہ سے غرض اصولی طور پر اجتہاد وتقلید کے بارہ میں نقلِ صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی معتبر اور مستند یعنی شرعی اجتہاد کی تقلید کوئی بدعت سیئہ نہیں ہے کہ اسے قابل ملامت اور اس کے مرتکب کو مستوجب نکیر تصور کیا جائے بلکہ وہ ایک ایسا مسلوک راستہ ہے جو سلف سے لے کر آج کے خلف تک اجماعی طور پر دینی راہ گزر بنا رہا ہے اور امت نے اس کے سوا اپنے دین کے تحفظ کی کوئی اور صورت نہیں سمجھی۔ یہ غرض نہیں کہ تقلیدی مسلک سے انکار رکھنے والے کیسے ہیں اور کس حکم کے مستحق ہیں؟ میں اس سلسلہ میں ابتداءً چند تمہیدی جملے اور بعد میں اصل مقصد کی چند باتیں عرض کروں گا جس کے خطاء وصواب کا فیصلہ حضرات علماء کے ہاتھ میں ہے۔ فَاِنْ یَّکُ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ یَّکُ خَطَآءً فَمِنْ نَفْسِیْ وَالْمَرْجُوُّ الْمُسَامَحَةُ وَالْاِصْلَاحُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ.

اللہ کا کام اور اس کا کلام...... حضرات! اس عالم کی زندگی اور آبادی ورونق صرف دو چیزوں سے ہے بلکہ عالم میں آبادہی صرف دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا کام اور ایک اس کا کلام خدا کے کاموں سے کائنات عالم میں حسی نظام بنا ہے جسے عالم خلق کہتے ہیں اور اس کے کلاموں سے اقوام عالم کا یہ شرعی نظام استوار ہوا ہے جسے عالم امر کہتے ہیں۔ ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① پس عالم خلق ہو یا عالم امر دونوں میں اسی کی ذات وصفات اور کمالات علم وعمل کی جلوہ گری ہے اور تکوین وتشریع کے ان گوناگوں مظاہر میں اسی باطن مطلق کے محاسن اقوال وافعال ظہور کر رہے ہیں۔

ہر چہ دیدم در جہاں غیر تو نیست — یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

تکوین وتشریع کا مبداء ومعاد واحد ہے...... یہی وجہ ہے کہ تکوینی نظام بھی اسی سے چل کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور تشریعی انتظام بھی اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تکوین وتشریع اور امر کا مبداء اور معاد وہی اور صرف وہی ہے۔ عالم خلق کے بارے میں اپنے مبداء ہونے کو اپنے کلام پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا ﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ﴾ ② ''وہی ہے جو آغاز فرماتا ہے خلقت کا''۔ پھر اسی آیت سے ملحق اپنے معاد خلق ہونے کی یوں تصریح فرمائی کہ ﴿ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ﴾ ''پھر وہی ہے جو خلقت کو (اپنی طرف) لوٹا لیتا ہے اور وہ اس پر بالکل سہل ہے''۔

---

① سورة الاعراف، الآية: ۵۴. ② پاره: ۲۱، سورة الروم، الآية: ۲۷.

جس سے واضح ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہا صرف اسی سے ہے کوئی غیر اس میں دخیل نہیں اس طرح عالم امر کے بارہ میں اپنا مبداء ہونا یوں ظاہر فرمایا ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ ① ''اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں اور انہی کی مانند زمینوں کو بنایا، اترتا رہتا ہے امران کے درمیان'' اور دوسری آیت میں اپنے مرجع الامور اور معاد امر ہونے کی یوں تعبیر فرمائی کہ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ② ''اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹ جاویں گے''۔

جس سے نمایاں ہے کہ اوامر اور شرائع کا نازل کرنا اور آخر کار اپنی طرف اٹھالینا صرف اسی کا کام ہے اس میں کوئی مخلوق یا کوئی بشر شریک نہیں۔ پس نہ تخلیق وتکوین میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک ہے اور نہ تشریع وتعمیر میں کوئی اس کا سہیم وندیم ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ③

تکوین وتشریع کے اصول بھی ایک ہیں...... یہاں سے خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے کہ تکوین اور تشریع کو بروئے کار لانے والے ایک ہی اصول فطرت ہو سکتے ہیں جو ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ④ کی فطرت سے ناشی ہیں کہ وہی ان دونوں کا مبداء اور انتہا ہے انہی اصول کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا تو عالم مخلوقات مکمل ہو کر سامنے آ گیا اور انہی کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالم مشروعات تیار ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

چناں چہ حق تعالیٰ کی صفت تانی وتدریج یا صفت ربوبیت کا اصول جس کے معنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی شئے کو اس کی حد کمال تک پہنچانے کے ہیں جب تکوین کے ساتھ ہم کنار ہوا تو بتدریج مخلوقات کا نظام مکمل ہو کر اس ہیئت کذائی پر آ گیا جو آج زمین وآسمان، شجر وحجر، حیوان وانسان اور پوری منظم کائنات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور وہی تدریج کا اصول جب تشریع سے ہم آغوش ہوا تو بتدریج ہی شرائع کا نظام بھی کامل وتام بن کر اس ہیئت کذائی پر سامنے آ گیا۔ جو اسلام کی صورت میں ہمارے آگے ہے۔ مخلوقاتی نظام کی اس تدریجی ساخت اور تمہیلی مدت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ ⑤ ''بلاشبہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں، پھر چھا گیا عرش پر کہ امر کی تدبیر فرمائے''۔ اس کی تفصیلات دوسری آیات اور احادیث میں موجود ہیں کہ کتنے دن اور کون سے دن میں کیا چیز بنی اور اس نے اپنی تکمیل میں کتنی مدت لی۔ آیت سے بالا جمال یہ واضح ہے کہ یہ مجموعہ کائنات چھ (۶) دن میں تیار ہوا، اس کے ساتھ جب یہ آیت بھی ملالی جائے کہ۔ ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ⑥ ''اور ایک دن آپ کے پروردگار کا مثل ہزار برس کی مدت کے ہے جو تم شمار کرتے ہو''۔

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲. ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۹. ③ پارہ: ۷، سورۃ انعام، الآیۃ: ۵۷.

④ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۱. ⑤ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳. ⑥ پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۷.

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات خلق کی تکمیل رفتہ رفتہ چھ ہزار برس میں ہوئی۔ ادھر شرعیاتی نظام کی تدریجی ترقی و تکمیل کی طرف بھی قرآن نے اشارہ فرماتے ہوئے تعلیمات الٰہیہ کا اولین مورد اور خلافت ربانی کا پہلا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بتلایا ان کی علمی خلافت کے بارہ میں جو عالم امر کی ابتداء ہے۔ قرآن عزیز کا ارشاد ہے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ ① اور خلافت نبوۃ کے بارہ میں جو عالم امر کی آخری کڑی ہے۔ حدیث ابوذر غفاریؓ میں جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے آدم علیہ السلام کو اول الانبیاء اور نبی مکلف فرمایا گیا جن پر آسمانی صحف نازل ہوئے ② غرض قصر نبوت کی تعمیر آدمؑ سے شروع ہوئی جو نبوت اور علم نبوت کے پہلے مرکز تھے جن سے عالم امر کا آغاز ہوا۔ پھر اس قصر نبوت کی آخری خشت جس سے یہ قصر مکمل ہوا۔ حدیث ابی ہریرہؓ میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ: خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ (وَفِیْ رِوَایَۃٍ) فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ ③ ”مجھ سے قصر نبوت مکمل کر دیا گیا اور رسول ختم کر دیئے گئے (اور ایک روایت میں ہے) پس میں وہ خشت ہوں جس سے یہ قصر مکمل ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس علم نبوت اور ختم نبوت کے آخری مرکز تھے جن پر عالم امر کا اختتام کر کے اس کی تکمیل کر دی گئی۔ چناں چہ قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری اور وداعی حج کے دن دین کی اس تدریجی تکمیل کے آخری نتیجہ کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ ④ ”آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں تم سے دین کے بارے میں اسلام سے راضی ہو گیا“۔

اگر مورخین کا یہ قول اختیار کیا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سال بعد دور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہوتا ہے اور آپ ساتویں الف کے آغاز میں مولود اور مبعوث ہوئے ہیں (جس پر بعض آثار صحابہؓ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیات کی طرح تشریعیات کی تکمیل بھی چھ ہزار سال میں ہوئی ہے اور جس طرح تکوین و تشریع میں تدریج و تانی کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدت بھی مشترک اور یکساں ثابت رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے چھ دن یا دنیا کے چھ ہزار سال کی مدت میں مخلوقات اور مشروعات کا نظام مکمل ہو کر اس درجہ پر پہنچا دیا گیا کہ اب اس میں نہ کمی کی گنجائش رہی نہ زیادتی کی نہ ترمیم کی نہ تنسیخ کی کہ ﴿لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ﴾ یعنی جس طرح کائنات عالم کے کلی مواد آب و خاک و باد و آتش پھر مواد کے کلی موالید جمادات، نباتات، حیوانات،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② مسند احمد، حدیث ابی ذر الغفاریؓ. ج: ۴۴ ص: ۳۲.
③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۶۶ والصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین ج: ۱۱ ص: ۲۰۲. ④ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

پھران کے علویات اور سفلیات۔ پھر مواد علوی وسفلی کی جامع انواع واجناس، انسان، شیر، بکری، شجر حجر اور بحر وبر، جن، ملک سیارات وثوابت، ارض وسماء وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی قبول نہیں کر سکتے۔اسی طرح دین کے اصول وکلیات اساسی قواعد وضوابط اور تمام منصوص عقائد واحکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم وتنسیخ ممکن نہیں کہ ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ ①

ایجاد اور اجتہاد...... مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان مرتب مواد اور علوی وسفلی ذخائر سے بواسطہ فکر وتدبیر نئے نئے عجائبات کا اکتشاف کیا جاسکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جاسکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ۔ لَاتَنْقَضِیْ غَرَآئِبُهٗ ②

اسی طرح تشریع کے منظم احکام ومسائل اور قواعد وکلیات کے مخفی علوم واسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف وظرائف اور حقائق ومعارف پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ قرآن کی شان بھی لَاتَنْقَضِیْ عَجَآئِبُهٗ وارد ہوئی ہے۔اس تکوینی اکتشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃ موجدین کی طبائع ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ دوڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔ایسے ہی اجتہاد کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے مقتضیات کے مطابق ہوتا ہے۔مجتہدین کے قلوب فطرۃً چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو گذر چکا ہے کہ زمانہ اس کی ضرورت سے فارغ ہو چکا ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

اجتہاد کی انواع...... مثلاً اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج علل وکلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ قدرۃ ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراج مسائل اور تدوین قانون کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے۔اور پھر اگر ان مستخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح وانتخاب فتاویٰ کی ضرورت پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے۔مگر یہ ضروری ہے کہ جو درجہ بھی اجتہاد کے ذریعہ پردہ ظہور پر آجائے گا اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔اس لئے قدرۃً بعد کے مجتہد دماغ اس کی طرف چل ہی نہ سکیں گے کہ ان کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی نہ ہوگی کہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے کیونکہ حاصل شدہ شئے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ کہ اسے حاصل کرنے کی۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۶۲.

② السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، ج: ۱۰ ص: ۱۴۷.

مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے......اس سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے ہوں گے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی امور کا دیکھ لینا نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں میں گھس کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے۔ موجد کائنات کی اشیاء کی صورت سے گزر کر ان کی مخفی خاصیات کا پتہ چلائے گا تا کہ اس کی باطنی کلیت اور اندرونی وسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے اور مجتہد مسائل شرعیہ اور نصوص کے ظواہر سے گزر کر ان کے باطن میں گھسے گا تا کہ علل کلیہ اور اسرار جامعہ کا سراغ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔ خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہنچنا اور کلیات سے پھر نئے جزئیات نکالنا ان دونوں طبقات کا کرم ہوگا نہ کہ سامنے آئی ہوئی جزئیات کا یاد کر لینا کہ یہ در حقیقت حفظ ہوگا علم نہ ہوگا یا علم ادنیٰ ہوگا علم اعلیٰ نہ ہوگا۔

مثلاً تکوین کے سلسلہ میں دنیا کی بے شمار جزئیات وافراد زید، عمر، بکر، شجر، حجر اور بحر و بر کا دیکھ لینا یا سن کر معلوم کر لینا کوئی قابل ذکر علم نہیں کہ یہ ہر عامی سے عامی انسان کو میسر آ سکتا ہے بلکہ یہ علم ہی نہیں حس ہے۔ خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے ہاں یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے۔ اس کی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات سے ہو رہی ہے اور اس کی ماہیت میں کون کون سے کلیات حصہ دار ہیں۔ پھر زید جزئی کا اس کی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے حقیقۃً علم ہے جو حس کے مقام سے بالاتر ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ زید اور زید کی طرح عالم کی جزئیات منتشر اور بے جوڑ نہیں بلکہ ہر جزئیت میں بیسیوں کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سب جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی نوع کے تحت میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر ساری انواع سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں۔۔ پھر اجناس جمع ہو کر کسی جنس عالی اور جنس الاجناس کے تحت میں آ جاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہ غائر وہ ایک مستقل جہاں ہے جس میں ترتیب وار یہ سینکڑوں کلیات اور عمومات سمائی ہوئی ہیں اور اس کی زیدیت کی تشکیل و تکمیل کر رہی ہیں۔

اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے۔ جس میں زید کی طرح لاکھوں افراد انسانی لپٹے ہوئے پڑے ہیں۔ پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اس کے اوپر حیوان ہے جس میں حیوان کی طرح لاکھوں نمودار نباتی انواع کھپی ہوئی ہیں۔ پھر نامی کی اصل جسم ہے جس میں نامی کے ساتھ لاکھوں غیر نامی اور بے نمو جمادات شریک ہو گئے ہیں۔ پھر اس جسم مطلق سے اوپر جوہر ہے جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجردات بھی آ جاتے ہیں۔ پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنس الاجناس ہے جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آ جاتے ہیں پس ساری کائنات کے یہ مختلف الماہیات اور شاخ در شاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گزرتے ہوئے وجود میں جمع ہو جاتے ہیں جو ان سب کی اصل اصول ہے اور اس طرح ایک زید کے بنانے میں کس قدر کلیات نے اپنا کام

کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وجود نے جوہر کا لباس پہنا، جوہر نے جسم کی قبا اوڑھی، جسم نے نمو کی رداء پہنی۔ نامی نے حیوانیت میں قدم رکھا۔ حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا اور انسان نے ان سارے تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پس زید مجموعہ اصول وکلیات نکلا جس کی جزئیت میں کتنی ہی کلیات سمائی ہوئی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متمثل ہو کر نمایاں ہو رہی ہیں۔

پس ایک عامی تو صرف زید کو دیکھ لے گا، لیکن ایک مفکر زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اس کی گہری نظر ان مخفی کلیات واسرار تک پہنچ کر رہے گی جن سے زید کا قوام بنا اور وہ بایں ہیئت کذائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا۔ اس لئے عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مُبصِر کہیں گے لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا مُبصِر ہی نہیں مبصّر بھی کہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ زید کے جثہ کا دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی کلی حقیقت کو پالینا اور پھر ان جزئی زید کا اس کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو ہر کس وناکس کا کام نہیں۔

شریعت حد درجہ مرتب اور منظّم ہے...... بالکل یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ ہیئت کذائی محض سطحی اور نمائشی نہیں بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتب اور منظّم ہے کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہے جس میں یہ سارے اصول وفروع اور جزئیات وکلیات درجہ بدرجہ ترتیب وار پروئے ہوئے ہیں۔

شریعت کا کوئی جزئیہ نہیں جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو۔ ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصل کے ماتحت ہے۔ پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصل اصول سے مربوط ہے اور سارے اصول وکلیات سمٹ کر کسی ایک اصل اصیل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس سے پوری شریعت ایک محیر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجرِ واحد کی صورت دکھائی دیتی ہے جس کی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصل واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور ہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے پھلوں سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔ ﴿مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ٥ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾ ① ''مثال کلمہ طیبہ کی اس پاک درخت کی مانند ہے جس کی جڑ تو تہہ میں گھسی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ پھل دے رہا ہو ہر آن اپنے پروردگار کی جانب سے۔

پس آیات واحادیث میں جس قدر بھی جزئی احکام مذکور ہوتے ہیں جو زید عمر، بکر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان کی تشکیل وہ اصول وکلیات وعلل واسرار کرتے ہیں جو ان جزئیات میں مستور ہوتے ہیں کہ ہر جزئی میں ایک علم کلی ہوتا ہے اور ہر علم کلی میں کوئی حکمت مصلحت کلیہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہر مصلحت کا تعلق کسی نہ کسی شان کمال

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۴۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰۔

سے ہوتا ہے۔ پھر ہر شان کمال کسی نہ کسی صفت الٰہی سے مربوط ہوتی ہے جس سے نفس انسانی کی صفات نقص اس جزئیہ شریعت کی تکمیل کے ذریعہ کمال کا اثر قبول کرتی ہیں اور پھر یہ صفات کمال ذات بابرکات سے مربوط ہیں کہ کمالات کا منبع ہی وجود ہے جیسے شروع کا منبع عدم ہے۔

حرف حرفش راست اندر معنے　　　معنے در معنے در معنے

اسی طرح ساری شریعت بالاخران درمیانی اصول وکلیات اور شؤون وصفات سے گزرتی ہوئی اپنے وجود سے جا کر جڑ جاتی ہے۔ یعنی شریعت کے تمام اوامر ونواہی جو بمنزلہ افراد کے ہیں اپنی اپنی علل کے نیچے ہیں جو بمنزلہ انواع کے ہیں۔ پھر یہ تمام انواع سمٹ کر دو جنسوں کے نیچے آ جاتی ہیں۔ معروف اور منکر پس سارے ماموارت کا سرچشمہ معروف ہے اور سارے منہیات کا سرمنشاء منکر ہے۔ اسی کو قرآن عزیز نے یوں واضح کیا ہے کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ① ”وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نبی امی ہے پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات وانجیل میں، جو انہیں معروف کا امر کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔

پس اصل میں مامور بہ معروف اور منہی عنہ، منکر ہے اب جس چیز میں معروفیت ہوگی وہ مامور بہ بن جائے گا اور جس میں منکریت ہوگی وہ منہی عنہ، ہو جائے گا۔ اس لئے بالذات مامور ذہنی معروف ومنکر ہے کہ وہی حسن بالذات اور قبیح بالذات ہوتے ہیں اور بالعرض وہ چیزیں مامور ذہنی بنتی ہیں جن میں وصف معروفیت اور وصف منکریت موجود ہو کہ ان کا حسن وقبح ذاتی نہیں ہوتا لغیرہ ہوتا ہے۔ پس یہ معروف ومنکر کی دونوں اجناس اللہ کی صفت عدل کے نیچے آئی ہوئی ہیں۔ عدل الٰہی کا تقاضا ہے کہ معروفات برسرکار آئیں اور منکرات زیر ترک رہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ”اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل اور احسان کا اور روکتا ہے فحشاء ومنکر سے“۔

پس دین کے حق میں یہ صفت بمنزلہ جنس عالی کے ہے اور ظاہر ہے کہ عدل حصہ ہے اس کے وجود کا یعنی وجودی کمال ہے اس لئے گویا سارے اوامر اور نواہی وجود الٰہی سے مربوط ہو گئے اور اس طرح پوری شریعت ذات بابرکات سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے ذیل کی امثلہ پر غور کیجئے۔

تنظیم شریعت کی چند امثلہ...... 1 ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ (زنا کے پاس بھی مت پھٹکو) اور ساتھ ہی اس کی علت نقل فرمائی کہ ﴿اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً﴾ ② (کیونکہ زنا فحش ہے) پس بظاہر تو ﴿لَا تَقْرَبُوْا﴾ کا حکم زنا پر لگ رہا ہے مگر حقیقۃً فحش پر لگا ہوا ہے کہ فحش ہی کی وجہ سے زنا حرام ہوا ہے۔ اگر اس میں فحش کی شان نہ ہوتی تو وہ ہرگز حرام نہ ہوتا۔ چناں چہ دوسری جگہ کتاب مبین میں اس کی تصریح بھی ہے کہ ﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۲۔

وَالْمُنْكَرِ﴾ ① ''اور اللہ روکتا ہے فحش سے اور منکر سے'' پس حکم کی شکل یوں ہوگئی کہ ﴿اَلزِّنٰى فَحْشٌ وَّالْفَحْشُ حَرَامٌ فَالزِّنٰى حَرَامٌ﴾ ''زنا فحش ہے اور فحش حرام ہے لہٰذا زنا حرام ہے''

پس اصل میں فحش کی جنس حرام نکلی اس کی وجہ سے زنیٰ کا جزئیہ حرام بن گیا۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ فحش کی علت کلیہ جن جن افعال میں پائی جاتی رہے گی اور وہ حرام ہوتے جائیں گے لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں جزئیہ میں فحش کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ہر ایک کا کام نہیں یہاں سے مجتہد کے کام کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ فحش کی شان کسی فعل میں ثابت کر کے اس پر حرمت کا حکم لگا دے یہ ایسے ہی مجتہد دماغوں کا کام ہے جنہیں تشریع سے فطرۃً اور ذوقاً مناسبت ہو اور اللہ نے وہ ملکہ ان میں قدرۃً ودیعت فرمایا ہو۔

پھر فحش کے حرام ہونے کی بھی ایک علت ہے جس کی وجہ سے فحش میں حرمت آئی اور وہ اللہ کی صفت حیاء ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ سَتِيْرٌ. ② صفت حیاء کا فطری تقاضہ ہے کہ اس کے بندوں میں فحش نمایاں نہ ہو۔ پس حکم جزئی یعنی حرمت زنیٰ حرمت فحش سے ناشی ہے اور حرمت فحش اللہ کی صفت حیاء سے نکلی ہے۔ اس لئے زنیٰ کے ساتھ اور بھی تمام فواحش کی حرمت کی علت کلی خدا کی ایک صفت کمال نکلی جو اس کے وجود لامحدود کا ایک حصہ ہے۔

پس جس شخص میں حیاء درجہ حال کو پہنچ چکی ہو اور وہ ظاہراً و باطناً فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اور فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ حیاء کامل کے لئے مضطر ہو چکا ہے۔ ادھر قلب میں ذوق اجتہاد رکھتا ہو اور دماغ میں کمال عقل تو بلاشبہ وہی اس حیاء اور اس کے تقاضیٰ سے حرمت فحش اور اس کے تقاضیٰ سے حرمت زنیٰ اور پھر حرمت زنیٰ کے تقاضیٰ سے عموماً دواعی زنیٰ کو جو ہر زمانہ میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں، پہچان کر حرمت کا حکم لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اجتہاد سے تشریع کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا اور ایک حکم زنیٰ سے کس قدر احکام پیدا ہو جائیں گے جو مجتہد کی دیانت و امانت اور فقہ و اجتہاد کا ثمرہ ہوں گے۔ پس ایسے احکام میں جہاں یہ علل کلیہ ظاہر نص میں موجود ہوں۔ مجتہد کا کام قیاس ہے کہ علت کے اشتراک سے اس جزئیہ پر دوسرے جزئیات کو قیاس کر کے ان پر حرمت کا حکم لگا دے اور احکام کا دائرہ وسیع تر کر دے۔

1 اور کبھی نص میں صرف حکم ہی مذکور ہوتا ہے اور اس کی علت حکم میں مستور و مخفی بھی ہوتی ہے لیکن جن چیزوں پر یہ منصوص حکم لگایا جاتا ہے ان میں خلقی طور پر کچھ اوصاف ہوتے ہیں جو حکم میں موثر ہوتے ہیں۔ گویا علت حکم ان اوصاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس کو مجتہد کی گہری نظر ان اوصاف میں سے نکھار کر نکال لیتی ہے اور علت حکم کھل جانے پر یہ حکم جزئی بمنزلہ کلیہ کے ہو کر دوسری جزئیات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک مجتہد کے نور اجتہاد سے یہ جزئی حکم ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیتا ہے جس سے شریعت کی تفصیلات اور ترتیبات نمایاں ہوتی ہیں۔

---

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۹۰. ② السنن لابی داؤد، كتاب الحمام، باب النهی عن التعری ج: ۱۱ ص: ۲۶. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۹، ص: ۱۲، رقم: ۴۰۱۲.

مثلاً احادیث ربوا میں اشیاءِ ستہ ا۔گندم،۲۔جَو،۳۔چھوہارہ،۴۔نمک،۵۔سونا،۶۔چاندی، میں سُود لینا حرام فرمایا گیا۔لیکن حرمت کی لِمَ اور علت کسی حدیث میں مذکورہ نہیں اس لئے مجتہدین متوجّہ ہوئے کہ حکم کی حکمت یا وجہ حرمت نیز اشیاء مذکورہ کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟ یعنی شارع نے آخر حرمتِ ربوا کے لئے انہی اشیاء کو کیوں خاص فرمایا؟ تو سوائے اصحابِ ظواہر کے جو قیاس کے منکر ہیں۔ ہر ایک نے ان اشیاء کے اوصاف میں قوت اجتہادی سے غور کر کے کچھ ایسے جامع اوصاف نکالے جو علت حکم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ وصف جامع قدر مع الجنس ہے۔امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: وہ طعمیت اور ثمنیت ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ اقتیات وادخار ہے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وہی فرمایا: جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

بہر حال ہر ایک نے ایک علتِ حکم برآمد کی جس پر حرمت ربوا کا حکم دائر ہے،اب جہاں جہاں جس کی نکالی ہوئی علت پائی گئی وہاں وہاں اس نے سُود کی حرمت کا حکم لگایا۔ایسے مواقع پر مجتہد کا کام پہلے استنباط علت ہے اور پھر قیاس حکم۔

3 کبھی نص میں حکم کے سوا علّت نہ منصوص ہوتی ہے نہ مکحوم نہ اس میں کوئی وصف ہی ایسا ہوتا، جس سے علت حکم کا استنباط کیا جا سکے۔ایسی صورت میں مجتہد محض اپنے ذوق اجتہاد سے آگے بڑھتا ہے اور عام قواعد شرعیہ اور وضع تشریع کی مدد سے جن کے استحضار سے اسے تشریع سے مناسبت اور اس کی اجتہادی قوت کی تشکیل ہوتی ہے۔علت کا استخراج کرتا ہے اور حکمِ جزئی کو اس سے مربوط سمجھ کر پھر اس علت سے مختلف ابواب کو اَحکام قیاس کی مدد سے ظاہر کر دیتا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے فرمایا:﴿وَاْتُـوا الْبُیُـوْتَ مِـنْ اَبْـوَابِهَـا﴾ ① ''گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو''۔اجتہادی ذوق سے اس کا کلیہ جس سے یہ حکم ناشی ہے یہ ہے: اِفْعَلُوْ الْاُمُوْرَ عَلٰی مَنْوَالِهَا یَاضَعُوا الْاَشْیَآءَ فِیْ مَجَالِهَا'' کاموں کو ڈھنگ سے کرو، بے ڈھنگے پن سے مت کرو یا ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو''۔

ظاہر ہے کہ دوازہ ہوتے ہوئے گھروں میں دیواریں پھلانگ کر گھسنا حد درجہ بے ڈھنگا پن، بد سلیقگی، ناشائستگی اور بے محل کام کرنا ہے۔پس اصل میں ممانعت ہوئی ناشائستگی اور بے ڈھنگے پن کی۔چونکہ یہ بے ڈھنگا پن دیواریں توڑ کر یا پھلانگ کر داخل خانہ ہونے میں پایا جاتا تھا۔لہٰذا یہ فعل ممنوع ہوا کہ اس کی علت ممنوع تھی اور علت اس لئے ممنوع ہوئی کہ اللہ کی صفت جمال اور صفت عدل کا تقاضا ہے۔کیونکہ جمال کے معنی حقیقی موزنیت اور کامل توازن کے ہیں اور عدل کے معنی ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَحَلِّهٖ '' ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے ڈھنگا پن اور بد سلیقگی اس کے خلاف ہے،اس لئے ناپسندیدہ حق ہوئی کہ'' اِنَّ اللّٰـهَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ'' ② پس جس کے دماغی قویٰ میں توازن حقیقی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو۔گویا وہ اللہ کی اس صفتِ

① پارہ: ۲،سورۃ البقرہ،الآیۃ: ۱۸۹۔

② الصحیح لمسلم: کتاب الایمان،باب تحریم الکبر وبیانه، ج: ۱، ص: ۲۴۷۔

جمال سے مستنیر اور اس کے اس خلق سے متخلق ہے، ادھر قلب میں وہ وہبی ملکہ اجتہاد بھی رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کلیہ کے انکشاف کے بعد صرف اسی جزئی حکم پر قناعت نہیں کرے گا، جو آیت میں مذکور ہے بلکہ ہر باب کے ہر اس فعل کو ممنوع قرار دے گا جس میں یہ بے ڈھنگے پن کی علت پائی جائے گی۔ البتہ یہ معلوم کرنا کہ آیا اس میں یہ علت غیر موزونیت ہے بھی یا نہیں؟ نہ ہر ایک کا کام ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اس میں معتبر ہے۔

بہر حال علت کے انکشاف پر حکم جزئی کی توسیع موقوف ہے پس اگر یہ علت کلی ہوگی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مجتہد پر ایک کلیہ منکشف ہوگا جس سے بہت سی غیر معلوم جزئیات معلوم ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے لئے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ ہوگی کہ اس نے کلیات کیوں بنالئے کیونکہ وہ کلیات بناتا نہیں بلکہ بتاتا ہے۔ بنے ہوئے تو وہ خود ہی موجود ہیں کیونکہ علم میں جتنا خفا بڑھتا جائے گا اتنی ہی کلیت آتی جائے گی، پس مجتہد کا کمال یہ ہوگا کہ وہ ان خفیات کو نکال لے نہ یہ کہ کلیات کا پیش کرنا اس کے حق میں کوئی عیب اور نقص سمجھا جائے۔

انکشاف علوم میں نبی اور امتی کا فرق...... ہاں! اس موقع پر یہ فرق سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر تو بذریعہ وحی اوّل علل وکلیات منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان سے متعلقہ احکام کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مصفی اذھان میں مقاصد وکلیات پہلے آتے ہیں اور ذرائع بعد میں کیونکہ ان کا تعلق ابتداء ہی جاذبہ حق کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ذات سے صفات کی طرف اور صفات سے افعال واحکام کی طرف آتے ہیں۔ لیکن مجتہدین اور امت کے محدثین کے روشن ضمیروں میں اول بذریعہ درس وتدریس اور روایات کے احکام جزئیہ جمع ہوتے ہیں اور پھر علم وعمل کی مزاولتہ۔ تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب کی برکت اور ہمہ وقت کے ذکر وفکر اور استمرار تفکر وتدبر سے علل وکلیات کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ان کے لئے استنباط وقیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے کیونکہ امتی کا تعلق ابتداءً ذاتِ حق سے نہیں ہوتا بلکہ نبی وقت اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے احکام سامنے آتے ہیں ان پر پھر عمل کی برکت سے علوم واسرار کا انکشاف ہوتا ہے بمصداق حدیث: مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ ① ''جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا''۔

اور اس پر علم وہبی سے بواسطہ اسرار وکلیات صفات حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تب کہیں ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ امت میں دین بحیثیت مجموعی پہلے تو مجتہدین اور راسخین فی العلم کے اذہان میں مرتب ہوتا ہے اور پھر وہ پوری ترتیب وتنظیم سے اس کی تشکیل کر کے امت کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے دنیا کو دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور شریعت کا وہ یسر واضح ہوتا ہے جس کے جگہ جگہ قرآن وحدیث میں دعاوی موجود ہیں۔

① الحديث اخرجه ابو نعيم في "الحلية" وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابي الحواري ج: ۴ ص: ۲۵۰.

بہر حال کسی جزئیہ کے واسطے سے اس کے کلیہ کا سراغ لگانا اور پھر اس کلیہ کے نیچے دوسری جزئیات لانا اور اس مرتب سلسلہ کی درمیانی ترتیب اور رابطہ کا پہچان لینا فقیہ کا کام ہے۔ گویا فقیہہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جبکہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور علت نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ کلیات سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ ایاب وذہاب عوام اور علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اس لئے فقیہ مجتہد ان کی نگاہوں میں شریعت ذاتی رائے سے متصرف دکھائی دیتا ہے، کوئی ناسمجھ اسے ازراہ طعن قیاس کہتا ہے اور کوئی صاحب الرائے وغیرہ حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس عقلی محض نہیں ہوتا اور نہ محض قوت فکریہ کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اسے تصرف ذاتی کہا جائے بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم وعمل کی مزاولت سے بطور جذبہ صادق اس کے قلب میں من اللہ تعالیٰ القاء کی جاتی ہے۔

پس وہ تصرف خود شریعت ہی کا عین شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے تمام شرائع سماویہ کا ظہور محض من اللہ ہے۔ مگر ہوتا ہے نبی ہی کے لسان وقلب پر اور نہ یہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت وتعجب کی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت میں محدث بھی ہوئے ہیں جن کی خبر دی گئی، انبیاء علیہم السلام کو لسانِ شریعت میں مکلم فرمایا گیا ہے اور غیر انبیاء کو جو ان کشوف الٰہی اور علم تشریعی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاح شریعت میں مُحدَثْ کہا گیا ہے۔ بہر حال ان محدثین کے ذریعہ حکم شریعت اور اللہ کے درمیان تمام کلیاتی سلاسل منکشف ہوتے ہیں جس سے پوری شریعت کا رابطہ کلیات اور کلی الکلیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کائنات خلق کی طرح عالم امر کا یہ پھیلاؤ بھی بے جوڑ نہیں بلکہ شریعت کا ہر ہر جزئیہ اپنے نوعی اصول وعلل پھر بالائی جنس معروف ومنکر پھر فوقانی جنس کی صفت الٰہی اور پھر جنس الاجناس عدل اور اس میں بھی بالائی علم محیط اور اس سے اوپر لامحدود وجود باجود سے سے ہوتا ہوا ذات بابرکات سے مربوط ہو جاتا ہے گویا جیسے تکوین کی جزئیات زید، عمرو، بکر وغیرہ کا آخری مرجع جسم وجوہر سے گزرتا ہوا وجود حق نکلا تھا، ایسے ہی تشریع کے تمام مسائل کا سر منشاء بھی ان درمیانی انواع سے ہوتا ہوا وہی نکل آتا ہے اور تکوین وتشریع کا مبداء ومعاذات حق ٹھر جاتی ہے جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ابتدا میں ہم نے نقل کیا ہے نیز واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات آئینہ جمال حق ہے جس میں اس کا فعلی ظہور ہے اسی طرح پوری شریعت آئینہ کمال حق ہے جس میں اس کا قولی اور علمی ظہور ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

نصُوصِ کتاب وسنت کا ظہر وبَطن ...... پس امر ونہی کے اس طویل سلسلہ میں سے امر ونہی یا حکم منصوص کا جان لینا کمال علم نہیں بلکہ اس سلسلہ میں سے اس جزئیہ کی فوقانی علل وکلیات اور پھر ان کی فوقانی شؤن وصفات سے اس کا ربط اور کیفیت ارتباط کا پتہ چلا لینا اور اس حکم کی نسبت اور کیفیت نسبت کا انکشاف کر لینا اس کی معروفیت ومنکریت کا درجہ معلوم کر کے صفت ونوعیت وجوب، فرضیت، سنیت اور استحباب وغیرہ کی تعیین کرنا کمالِ علم ہے جو

صرف راسخین فی العلم اور دائرہ علم کے اولوالامر اصحاب کے حصہ میں آیا ہے۔

نصوص کے اسی سلسلہ حکم وحکمت یا معانی جلیلہ اور مدلولات خفیہ کو جس طرح عرض کردہ آیت شجرہ نے کلمہ شریعت کو شجرہ سے تشبیہ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے شجرہ میں فروع واصول ہوتے ہیں فروع نمایاں اور اصول مستور و مبطن اور فروع میں اصول ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ گویا فروع درحقیقت مظاہر اصول ہوتے ہیں جن کی صورت میں اصول کے قوی ظہور کرتے ہیں۔ اسی طرح ذیل کی احادیث ظہر وبطن سے تعبیر کر رہی ہیں۔ قرآنی نصوص کے بارہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ ①. ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کے لئے طریقہ اطلاع جداگانہ ہے۔ (یعنی مدلولِ ظاہر کے لئے علومِ عربیہ اور مدلولِ خفیہ کے لئے قوتِ فہمیہ)''۔

حدیث بالا میں ظہرِ آیت اور بطن آیت دونوں کے لئے ایک ایک مطلع کی خبر دی گئی ہے مطلع جھروکے اور جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں جیسے جھروکوں اور جھانکنے کی جگہوں سے وہ تمام چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ان کے مقابل ہوتی ہیں اور ان کے وسیلہ سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی آیات کے ظواہر یعنی مدلولاتِ لفظی معلوم ہونے کے لئے جھروکہ عربیت ہے کہ کلام عرب کی اصناف اور اسالیب کلام پر عبور۔ محاورات اور محاسن کلام سے واقفیت ہو، قواعد فصاحت وبلاغت زیر نظر ہوں، صیغ اداء اور ان کے تعریفات پر اطلاع ہو تو ان کی مدد سے آیت قرآنی کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے بشرطیکہ ذوق سلیم بھی سازگار ہو۔

لیکن بواطنِ آیت یعنی مدلولاتِ خفیہ اور احکام سریہ جو بطون در بطون کے پردوں میں مخفی ہیں، ان کے لئے مطلع اور جھروکہ بھی علل واحکام ہیں جن پر مجتہد اپنے نور فہم اور ذوق اجتہاد سے وقوف حاصل کرتا ہے ان علل کے جھروکوں کے ذریعہ تمام وہ احکام خفیہ منکشف ہو جاتے ہیں جو ان علل کے بالمقابل ہوئے یعنی ان علل کے معلولات ہوتے ہیں خواہ یہ علل قریبہ ہوں یا علل بعیدہ یعنی بطنِ آیت قریبی ہوں جیسے علت حکم یا بعید ہوں جیسے کلیات عامہ یا ابعد ہوں جیسے صفات حق جو علل اصلی ہیں کیونکہ ثبوت حقوق اللہ یا حقوق العباد کی اصل مقتضی یہ صفات الٰہیہ ہی ہیں، جیسے خدا کی صفت ربوبیت وعظمت عبادت اور تعظیم کی خواستگار ہے، خدا کا بصیر ہونا بندہ سے حیاء اور ترک فحشاء کا مقتضی ہے اور خدا کا جمیل ہونا بندہ سے عشق ومحبت کا متقاضی ہے اور خدا کا مالک وملک ہونا بندہ سے انفاق مال اور صدقات کا مطالب ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جو شخص بھی ان علل بعیدہ وقریبہ پر مطلع ہوگا وہی عالم

① مسند ابی یعلی، مسند عبداللہ بن مسعودؓ ج: ۱۱ ص: ۱۶۱۔ مشکاۃ، کتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱، ص: ۵۱، رقم: ۲۳۸.

اور حکیم کے لقب کا مستحق ہوگا اور اسی کو ﴿ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ ① کا حقیقی مصداق کہا جائے گا، بہر حال اس حدیث بالا میں علم کے اس مخفی مرتبہ و بطن آیت سے اور اس آیت میں حکمت سے اور آیت شجرہ میں اقتضاء اصل (جڑ) سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جس طرح علم کا یہ عمیق مرتبہ آیات قرآنی میں پایا جاتا ہے، اسی طرح کلام نبوت میں بھی موجود ہے اور حدیث کا بھی ایک ظہر ہے اور ایک بطن کہ وہ بھی افصح البشر کا کلام ہے چناں چہ حدیث کے بارے میں خود صاحب حدیث ارشاد فرماتے ہیں: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَّرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ ② ”ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تروتازہ فرماویں اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور دوسرے کو پہنچا دے کیونکہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں“۔ اس حدیث میں بعض شاگردوں کا استاذ سے افضل ہونا بیان فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ صرف ظاہری معنی کے اعتبار سے شاگرد کے استاذ سے افضل و افقہ ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لئے افضلیت کا معیار وہی بطن حدیث یعنی مدلولات خفیہ اور اسرار و علل نکل آتے ہیں جن کو فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس علم شریعت کے دو درجات ظاہر و باطن اس حدیث سے بھی واضح ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابہؓ کی افضلیت تمام اُمت پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: كَانُوْٓا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرُّهَا قُلُوْبًا وَّاَعْمَقُهَا عِلْمًا وَّاَقَلُّهَا تَكَلُّفًا. ”صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تمام امت سے افضل تھے، سب سے زیادہ ان کے قلوب پاک تھے، سب سے زیادہ ان کا علم عمیق تھا اور سب سے کم ان کا تکلف تھا“۔

اس سے واضح ہے کہ علم کا ایک درجہ عمقیت اور گہرائی بھی ہے جو علماء کے لئے معیار فضلیت ہے، چناں چہ اسی معیار سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو افضل فرمایا گیا اور یہ درجہ ہی بطن نص کا ہے جسے مدلولاتِ خفیہ اور اسرار و عللِ سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی علم کی بدولت علماء دقیقہ شناس اور نکتہ وَر بنتے ہیں اور اسی سے ان میں فضلیت کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کو قرآنِ حکیم نے لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا ایک حکم ہے اور ایک اس کی اندرونی حکمت ہے۔ ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ③ ”اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی“

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خیر کثیر کو جو یہاں حکمت کا ثمرہ ظاہر کی گئی ہے تفقہ کا ثمرہ کہا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ④ ”جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ

① پارہ:۳، سورة البقرة، الآية: ۲۶۹۔ ② السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من بلغ علما ج: ۱ ص: ۲۷۳۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ۱ ص: ۳۰۲ رقم: ۲۳۰۔

③ پارہ:۳، سورة البقرة، الآية: ۲۶۹۔ ④ الصحيح للبخاري، كتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱ ص: ۱۱۹۔

کرتا ہے اسے دین کا فقہ عطاء فرماتا ہے''۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکمت اور فقیہ ایک ہی چیز ہے کہ ثمرہ دونوں کا ایک ہے، پس ایک فقیہ حکیم دین ہوتا ہے اور ایک حکیم اسلام فقیہہ دین۔ بہر حال اس آیتِ کریمہ سے بھی علم کا یہ مستور اور خفی درجہ ثابت ہو گیا جو حکماء اسلام، فقہاء دین اور مجتہدین شرع متین کے ساتھ خاص ہے۔

علماء شریعت کے دو طبقات اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن ...... ظاہر ہے کہ جب علم النص کے دو مراتب نکلے ایک ظاہر اور ایک باطن یا ایک مدلول جلی اور ایک مدلول خفی تو لامحالہ علماء نصوص کے بھی دو طبقات ہونے قدرتی تھے۔ ایک عالم جزئیات اور ایک عالم کلیات یا ایک عالم ظاہر اور ایک عالم بطن یا ایک عالم حکم اور ایک عالم حکمت۔ یعنی ایک وہ کہ جس کی نگاہیں نص کے مدلول ظاہر تک رہ جائیں اور ایک وہ کہ جس کی عمیق نگاہیں اس ظاہری جزئیہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ چلالیں جس کے وسیع سلسلہ میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے منسلک ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علم کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اسی ایک منصوص جزئیہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس علت جامعہ کے سبب ہزار ہا وہ جزئیات بھی اس پر کھل جانی ممکن ہوں گی جو اس منصوص جزئیہ کی طرح اس امر کلی کے عموم میں لپٹی ہوئی پڑی تھیں، اس لئے یہ عالم جزئیات اگر چہ ہزار جزئیات کا حامل ہو پھر بھی انصافاً عالم نہیں حافظ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا، عالم اسے مجازاً ہی کہیں گے، ہاں جو شخص کلیات و جزئیات پر حاوی ہو، پھر ان کی باہمی نسبت اور کیفیت نسبت کا مدرک اور مکتشف اور پھر اس نسبت سے سیکڑوں نامعلوم جزئیات کا مستخرج ہوگا وہی حقیقی معنی میں عالم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پس حافظ آیات و نصوص محض راوی اور محدث ہوتا ہے اور مدرک مخفیات و سرائر مجتہد اور فقیہ ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کو ذیل کی حدیثوں میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْھُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَکَانَتْ مِنْھَا طَآئِفَۃٌ طَیِّبَۃٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ وَاَنْبَتَتِ الْکَلَأَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ. وَکَانَتْ مِنْھَا اَجَادِبُ اَمْسَکَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰہُ بِھَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا. وَأَصَابَ مِنْھَا طَآئِفَۃً اُخْرٰی اِنَّمَا ھِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِکُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ کَلَأً، فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ فَقُہَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ وَنَفَعَہٗ بِمَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ یَرْفَعْ بِذٰلِکَ رَأْسًا وَلَمْ یَقْبَلْ ھُدَی اللّٰہِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ ①. ترجمہ ''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری مثال اور میرے لائے ہوئے علم و ہدایت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موسلا دھار بارش زمین پر برسی تو زمین کا ایک حصہ تو نہایت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کیا اور طرح طرح کے پھول پتے اور خشک و تر اگایا اور ایک حصہ سخت تھا جس نے پانی تو جمع کر لیا (مگر گھاس

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم ج: ۱ ص: ۱۴۱.

وغیرہ اگا نہیں سکا) تو اللہ نے اس زمین سے لوگوں کو پانی ہی کا نفع پہنچایا کہ انہوں نے پانی پیا بھی اور سیراب بھی ہوئے اور ان سے کھیتوں میں آبپاشی بھی کی اور ایک حصہ اور تھا جو بالکل چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو روکتا ہی تھا اور نہ گھاس پھونس اگاتا ہی تھا۔ بس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور انہیں اس علم نے نفع دیا جسے لے کر میں مبعوث ہوا ہوں اور مثال ہے ان کی جو سرے ہی سے اس انتفاع کے درجہ کو نہ پہنچ سکے اور انہوں نے خدا کی وہ ہدایت ہی قبول نہیں کی جسے لے کر میں آیا تھا''۔

اس حدیث میں علم کو بارش سے اور قلوب بنی آدم کو زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لوگوں کی دو اقسام بیان فرمائی گئی ہیں، ایک دین سے منتفع اور ایک غیر منتفع۔ پھر منتفع کی دو اقسام ارشاد فرمائی گئیں، منبت اور غیر منبت یعنی ایک وہ کہ جنہوں نے علمِ وحی حاصل کر کے اسے اپنے قلوب میں بھرا، جمع کیا اور اس سے استنباط و اجتہاد کے ذریعہ طرح طرح کے علوم و معارف اور علل و حکم نکالے اور نکات و اسرار بیان کئے پھر ان باطنی علوم کے ذریعے سیکڑوں نامعلوم مسائل امت کے سامنے لا رکھے جس سے دین منقح اور مدون ہو کر ایک قانون کی صورت میں آ گیا اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پوری امانت داری سے بلا کم و کاست دوسروں تک پہنچا دیا تا کہ ان میں جو بالغ نظر ہو وہ اس سے پھل پھول نکال سکے۔ پہلا طبقہ فقہاء مجتہدین اور علماء راسخین کا ہوا اور دوسرا محدثین اور حفاظ کا ہوا۔ محدث اور حافظ کا کام حفظ و امانت اور بلا کم و کاست روایت ہے اور فقیہ مجتہد کا کام فہم اور تفقہ اور محققانہ درایت ہے کہ تخم علم کی آبیاری کر کے دریا کو بصورت باغ و بہار دکھلا دے۔ اسی حدیث میں فَكَانَتْ طَيِّبَةً کے کلمہ سے مجتہد اور فقیہ محقق کی فضیلت بھی غیر مجتہد حافظ پر ظاہر فرما دی گئی جس کی وجہ بجز اس علمِ باطن کے اور کچھ نہیں۔

ان روایات سے علما کے دو طبقات بھی واضح ہوئے۔ مجتہد اور غیر مجتہد اور ساتھ ہی فقیہ مجتہد کی غیر فقیہ و مجتہد پر یا راوی محض پر صاحبِ درایت و تفقہ کی افضلیت بھی نمایاں ہو گئی جس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقیہ کلامِ الٰہی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتا ہے جو کتاب کے متعلق ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① سے اور حدیث کے متعلق اعطیت جَوَامِعَ الْكَلِمِ ② سے واشگاف فرمائی گئی ہے گویا ایک فقیہ کے ذریعہ کلام وحی کی وجوہ اعجاز نمایاں اور فراہم ہوتی ہیں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور مقام ختم نبوت کی حقیقت اور رفعت شان کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

پس علم اولیٰ حفظ و روایت ہے تو علم حقیقی فقہ و درایت اور اس لئے طبقات علماء کے سلسلہ میں حافظ حدیث یا اہل حدیث یا محدث مبتدی ہے جو وحی کا مواد جمع کر کے ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور فقیہ و مجتہد منتہی ہے جو اس ذخیرہ کی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۹.

② الصحیح لمسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب (بلا ترجمہ) ج:۳ ص:۱۰۴.

تہہ کی چیزیں نکال کر جسے فقہ کہتے ہیں ہمہ گیر جزئیات سے امت کی تربیت کرتا ہے اور اس مواد سے مختلف صورت کے دینی سامان بنا کر دین کو سجاتا اور امت کے حق میں اسے قابل استعمال بناتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اہلِ علم کے دو طبقات...... یہ دونوں طبقات حضراتِ صحابہؓ میں بھی موجود تھے۔ کوئی حافظ حدیث تھا، جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، اور کوئی فقیہ و مجتہد تھا جیسے عبادلہؓ اربعہ اور حضرات شیخینؓ وغیرہ پھر فقہاء صحابہؓ میں بھی فرقِ مراتب تھا بعض کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم، چناں چہ صحاح کی مشہور روایت ہے:

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ سَاَلْتُ عَآئِشَةَ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ قُلْتُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلٰى اَحَدٍ جُنَاحٌ اَنْ لَّا يَطُوْفَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَقَالَتْ بِئْسَ مَا قُلْتَ يَا ابْنَ اُخْتِيْ اِنَّ هٰذِهٖ لَوْ كَانَتْ عَلٰى مَا اَوَّلْتَهَا كَانَتْ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطُوْفَ بِهِمَا وَفِي الْحَدِيْثِ قَالَ الزُّهْرِيُّ فَاَخْبَرْتُ اَبَا بَكْرِ بْنَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ مَا كُنْتُ سَمِعْتُهٗ. ① ترجمہ ”حضرت عُروۃ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا: اِنَّ الصَّفَاوَ الْمَرْوَةَ الخ اور میں نے کہا کہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ کا طواف نہ کرے تو اس کو گناہ نہ ہوگا (جیسا کہ ظاہر ترجمہ سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ گناہ نہیں ہے جو طواف کرے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ طواف مباح ہے اگر نہ کرے تو بھی جائز ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے بھانجے! تو نے بڑی غلط بات کہی اگر یہ آیت اس معنیٰ کو مفید ہوتی جو تم سمجھے ہو تو عبارت یوں ہوتی لا جناح علیه ان لا یطوف بهما یعنی طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن کو اس کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ علم میں نہ سنا تھا“۔

اس سے واضح ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں فہم متفاوت ہوتے ہیں کوئی ظہر نص تک رہ جاتا ہے۔ کوئی بطن نص تک پہنچ جاتا ہے۔ چناں چہ اس آیت میں جو دقیقہ تھا باوجود یہ کہ وہ زیادہ خفی نہ تھا مگر حضرت عروہؓ اسے نہ سمجھ سکے اور حضرت عائشہ سمجھ گئیں۔ بات چونکہ لطیف تھی اس لئے ابوبکر بن عبدالرحمنؒ نے سن کر اس پر مسرت ظاہر کی اور اسے علم کہا۔ اسی تفاوتِ فہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَّرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ بعضے پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے بھی زیادہ فہیم ہوتے ہیں“۔

مگر ساتھ ہی یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہیے کہ اس تفاوتِ افہام کے سلسلہ میں زیادہ فہم کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہ نہیں کہلایا جائے گا بلکہ اس بارہ میں فہم کا صرف وہی درجہ معتبر ہوگا جو متعد بہ ہو اور محض موہبت ربانی

① الصحيح للبخاري، كتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروة ج: ٦ ص: ٨٣.

ہو جو بطور علم لدنی قلبِ مجتہد میں القاء کیا گیا ہو یعنی جس طرح کائناتِ خلق کے سلسلے میں نہ ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجد ہو سکتا ہے۔ نہ ہر دور میں موجدین کی بھر مار ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب کبھی تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرون ودُہور میں چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔

اسی طرح کائناتِ امر کے سلسلہ میں نہ ہر فہیم وذہین مجتہد ہو سکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمتِ ربانی جب کبھی دین کے کسی مخفی گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوقِ اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہبی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کر امت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جن کے اظہار کی ضرورت تھی۔ فہم خاص یا ذوقِ اجتہاد کے اسی وہبی درجہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِیٍّ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ھَلْ عِنْدَکُمْ مِنْ سَوْدَآءٍ فِیْ بَیْضَآءٍ لَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ قَالَ لَا وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّۃَ وَ بَرَأَ النَّسَمَۃَ مَا عَلِمْنَا اِلَّا فَھْمًا یُّعْطِیْہُ اللّٰہُ رَجُلًا فِی الْقُرْاٰنِ. ① ''ابی جحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شگاف دیا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں، لیکن فہم خاص ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطاء فرما دیں''۔

ملکہ اجتہاد وہبی ہے کسبی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں اور بعض نہیں......اس سے جہاں کتاب اللہ میں دقیق معانی کا ثبوت ہوتا ہے جنہیں غیر معمولی ہی فہم کا آدمی سمجھ سکتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فہم کوئی اکتسابی چیز یا فن نہیں ہے جسے محنت سے حاصل کر لیا جائے بلکہ ایک عطاء الٰہی ہے جو خاص خاص افرادِ امت کو عطاء ہوتا ہے۔ بعینہ اس طرح جیسے رسالت ونبوّت کوئی فن نہیں کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے نبی بن جائے۔ چناں چہ قرآن نے رسالت کے بارہ میں تو یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ﴾ ② ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھتا ہے''۔ اور اس قسم کے صاحبِ فہم یا صاحبِ علم اسرار وحقائق کے بارہ میں حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا.﴾ ③ ''اور ہم نے انہیں (خضر علیہ السلام کو) اپنے پاس سے مخصوص علم دیا''۔

غرض دونوں امور کو یعنی علم نبوت اور علم حقیقت کو اپنی طرف منسوب فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ علم کا یہ مرتبہ اکتسابی نہیں بلکہ محض عطاء الٰہی اور موہبت ربانی ہے جس کے لئے من جانب اللہ ہی افراد کا انتخاب فرمایا جاتا ہے،

① الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فكاك الاسیر، ج:١٠، ص:٢٥٨.

② پاره:٥، سورة النساء، الآية:٦٧. ③ پاره ٨: سورة الأنعام، الآية:١٢٤.

چناں چہ ارشادِ علویؓ میں یُعطِیهِ اللّٰهُ اور رَجُلًا سے اسی طرح اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرنِ اوّل میں جب اجتہاد و قیاس اور استنباط کا دروازہ کھلا اور حضرات صحابہؓ نے نصوص نہ ہونے کی صورت میں اپنی رائے وقیاس پر عمل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں ہر ایک کی رائے کی تصویب وتوثیق نہیں فرمائی۔ بعض کے اجتہاد کو قبول فرمایا اور بعض کے اجتہاد کو رد فرما دیا۔

گویا انہیں اجتہاد کا اہل اور مجتہد نہیں سمجھا کہ وہ اس فہم خاص کا وہ وہبی درجہ نہیں رکھتے تھے جس کی رو سے شرعیات میں صحیح حقیقت کو سمجھ کر استدلال کر سکیں، چناں چہ ابوداؤد میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر القرون میں ایک زخم زدہ شخص کو احتلام ہو گیا ساتھیوں نے اسے غسل کرا دیا وہ غسل کرتے ہی مر گیا۔ علم ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی رائے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ: خدا انہیں قتل کرے اسے قتل کر ڈالا اور اس کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ تیمم کر لیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر مسح کر لیتا اور باقی بدن دھو لیتا۔ ① ان لوگوں نے بظاہر غسلِ جنابت کی آیت ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ کو تو معذور اور غیر معذور کے حق میں عام سمجھا اور آیت تیمم مریض ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى﴾ ② کو حدثِ اصغر کے ساتھ مخصوص سمجھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ اس جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں اور اس لئے اسے غسل کرنے پر مجبور کیا۔

یا مثلاً حضرت عدیؓ بن حاتم کے واقعہ میں جسے بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ خَيْطِ اَبْيَضِ خَيْطِ اَسْوَد سے سفید وسیاہ ڈورے سمجھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی وسیاہی ممتاز نہ ہو جاتی سحر کا کھانا کھاتے رہتے حالانکہ ان ڈوروں سے مراد رات اور دن تھے، پس باوجود اہلِ زبان ہونے کے چونکہ قوت اجتہادیہ نہ تھی اس لئے نفسِ مرادِ قرآنی تک کے سمجھنے میں غلطی کی، چہ جائیکہ کہ حقائق تک پہنچتے۔

تو ان کی رائے اور قیاس دین میں کس طرح سند ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برنگ مزاح اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِيْضٌ ③ "تمہارا تکیہ بڑا ہی لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے ابیض اور اسود یعنی رات اور دن آ گئے" کے جملہ سے ان کے فہم پر رد فرما دیا۔ نیز پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض حاملِ فقہ خود غیر فقیہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر فقیہ کی رائے بھی دین میں معتبر نہیں ہو سکتی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض کی رائے وقیاس کو رد فرما دینا اس کی واضح دلیل ہے کہ نہ ہر ایک مجتہد ہوتا ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اور قیاس پائیہ اعتبار کو پہنچ سکتی ہے جب تک کہ وہبی طور پر فہم وذوق کا وہ خاص درجہ نہ پیدا ہو جائے جو شارع کی نظر میں متعین ہے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ تقسیم ہو سکتی تھی تو آج کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کا فہم معتبر اور حدِ اجتہاد تک پہنچا ہوا تسلیم کیا جائے۔ آج بھی یہ تقسیم لازمی ہوگی پس اسی ذوقی نور اور علمِ خفیات و

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی المجروح یتیمم ج: ۱ ص: ۴۱۱. ② پارہ: ۶، سورة: المائدة، الآية: ۶. ③ الصحيح لمسلم، کتاب الصيام، باب بيان ان الدخول فی الصوم .... ج: ۲ ص: ۷۶۶.

سرائر اور تصرف کو شرعی الفاظ میں کہیں بطن سے جیسے حدیث "لِكُلِّ آيَةٍ ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ ① میں ہے کہیں فہم سے جیسے حدیث " اِلَّا فَهْمًا يُّعْطِيْهِ اللّٰهُ ② میں ہے۔ کہیں رویت ورائے سے جیسے حدیث" رَاَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ رَاٰى عُمَرَ ③ میں ہے۔ کہیں تفقہ سے جیسے حدیث"مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ④ میں ہے۔

کہیں حکمت سے جیسے آیت "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ ⑤ میں ہے۔ کہیں فرقان سے جیسے آیت ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ⑥ میں ہے۔ کہیں شرح صدر سے جیسے حدیث " فَشَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِلَّذِيْ شَرَحَ صَدْرَ عُمَرَ ⑦ میں ہے اور کہیں انبات سے جیسے حدیث " قَبِلَتِ الْمَآءَ وَاَنْبَتَتِ الْكَلَا ⑧ میں ہے۔

اور جامع عنوان کے ساتھ کہیں اجتہاد سے جیسے حدیث " اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَ يُصِيْبُ میں تعبیر کیا گیا ہے جس پر عام عرفِ شریعت میں یہی اجتہاد واستنباط کا عنوان غالب اور معروف ہو گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد ایک ملکہ اور فہمِ خاص کی ایک قوت اور علم کا ایک مخصوص وہبی درجہ ہے جس کی وساطت سے اس کے اہلِ نصوص کے دقیق اور خفی معانی اور احکام کے اسرار وعللِ کو سمجھ کران پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے مقتضی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

علمِ باطن ہی مورثِ طمانینت ہے..... چناں چہ ظاہر ہے کہ علم کا یہ مرتبہ جس کا تعلق براہ راست شرح صدر اور علم الٰہی سے ہے جس حد تک مورثِ طمانینت اور مسائل میں موجب اطمینان ہو سکتا ہے وہ اکتسابی درجہ نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ قرآن کے بارہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جو مسلّمہ فقیہ اور مجتہد ہیں استدلالی علم سے وہ طمانینت نہ ہوئی جو اس حالی علم سے میسر آئی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ دقیقہ کافی وضاحت کے ساتھ حل ہوتا ہے۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ اَرْسَلَ اِلَيَّ اَبُوْبَكْرٍ مَقْتَلَ اَهْلِ الْيَمَامَةِ فَاِذَا عُمَرُ جَالِسٌ عِنْدَهٗ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ عُمَرَ جَآءَنِيْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرَّآءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ يَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّآءِ فِيْ كُلِّ الْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبَ مِنَ الْقُرْاٰنِ كَثِيْرٌ وَاِنِّيْ اَرٰى اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ فَقُلْتُ وَكَيْفَ اَفْعَلُ مَالَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ يُرَاجِعُنِيْ فِيْ ذٰلِكَ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِلَّذِيْ شَرَحَ لَهٗ صَدْرَ عُمَرَ وَرَاَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ رَاٰى. ⑨ ترجمہ" حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بن ثابت کی روایت ہے کہ

---

① مسند ابی یعلی، مسند عبداللہ بن مسعودؓ ج: ۱۱ ص: ۱۶۱ .مشکاۃ، کتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱ ص: ۴۸۳ رقم: ۲۱۳۳ . ② الصحیح للبخاری، کتاب الجھاد و السیر، باب فکاک الاسیر، ج: ۱۰، ص: ۲۵۸.

③ الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ج: ۱۵، ص: ۳۸۵. ④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۹ . ⑤ پارہ: ۳، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹.

⑥ پارہ: ۹، سورۃ: الانفال، الآیۃ: ۲۹. ⑦ الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب یستحب للکاتب ان یکون امینا عاقلا، ج: ۲۲، ص: ۱۲۷ . ⑧ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم، ج: ۱، ص: ۱۴۰.

⑨ الصحیح للبخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ لقد جاء کم رسول من انفسکم... ج: ۱۴ ص: ۲۵۲.

زمانہ جنگ یمامہ میں حضرت ابوبکرؓ نے میرے بلانے کے لئے آدمی بھیجا وہاں جا کر دیکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے قصہ بیان فرمایا کہ: حضرت عمرؓ نے میرے پاس آ کر یہ صلاح دی کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قراء قرآن کام آ گئے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح سب جگہ یہ لوگ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا امر فرما دیں۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا، واللہ یہ کام خیر محض ہے اور برابر اسی کو بار بار کہتے رہے حتیٰ کہ جس باب میں ان کو شرح صدر اور اطمینان تھا مجھ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی بات مجھے محسوس ہوئی جو انہیں ہوئی تھی''۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اولاً جمع قرآن کے بدعت ہونے کا خیال تھا احادیث ذم بدعت ان کے سامنے تھیں اس لئے انہیں جمع قرآن میں تردد تھا۔ مگر جب استدلال سے گزر کر ان کے قلب میں باطنی علم منکشف ہوا کہ جمع قرآن کا یہ جزئیہ تحفظ دین کے عام کلیہ کے ماتحت ہے اور ذم بدعت کے ماتحت نہیں آ سکتا۔ تو شرح صدر کے ساتھ اس فعل کو کر گزرے اور آج تک دنیائے اسلام ان کے اس احسان عظیم سے مستفید ہو رہی ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ مجتہد کے لئے علم کا یہ خفی درجہ بعض اوقات جلی درجہ سے بھی زیادہ موجب طمانینت ہوتا ہے اور وہی اطمینانی کیفیات اس کے متبع افراد میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ وہ اس کی اتباع کریں۔

بہر حال اتنا واضح ہو گیا کہ امت کے لئے ایک درجہ علم خفی کا بھی پیغمبر نے وارثت میں چھوڑا ہے جو کلیات سے استخراج مسائل اور جزئیات سے استنباط دلائل کا ہے اور اس کے افراد مخصوص ہیں، نیز وہ ایسے مواقع کے لئے ہے جہاں یا نص ہی موجود نہ ہو یا ہو مگر معانی مختلفہ کو محتمل ہو یا متعین المحتمل ہو مگر یہ محتمل دقیق اور غامض ہو یا محتمل بھی واضح ہو مگر اس کی علت مستور ہو۔ جس کا انکشاف ہر فہم نہ کر سکتا ہو تو ایسے مواقع میں بجز اجتہاد و استنباط کے چارہ کار نہیں اور ضرورت تھی کہ امت کو اس فہم خاص کا رتبہ بھی عنایت ہو جو درحقیقت تشریع ہی کا ایک دقیق حصہ ہے اور جو علماء کے لئے عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے معزز اور بابرکت خطاب کے ماتحت ثابت کرتا ہے کہ علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کے سے کام کریں گے۔

اگر تبلیغ دین اور تربیت خلق کریں گے تو ایک ایک عالم خطوں کو رنگ دے گا اور ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کر دے گا ان میں دینی رنگ پیدا کر دے گا، تعلیم مسائل پر آئیں گے تو انبیاء جو امور وحی سے کہتے تھے یہ بالہامِ وحی، وحی سے استنباط کر کے کہیں گے یعنی احکام تکلیفیہ کی طرح احکامِ وضعیہ امت کے سامنے لا رکھیں گے اور یہ صورت بغیر اجتہاد و قیاس کے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے امت میں یہ علم غامض القاء کیا گیا اور قرن اول سے شروع ہو گیا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہلِ اجتہاد...... چناں چہ جب ان لوگوں کا اجتہاد سامنے آیا جو اس کے اہل تھے اور تشریع کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اجتہاد و استنباط کی تحسین فرمائی۔ چناں چہ

نص سامنے نہ ہونے کی صورت میں عمومات اور کلیات سے استدلال کرتے ہوئے جو رائے پر عمل کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی اس کی مثال یہ ہے کہ: عَنْ طَارِقٍ اَنَّ رَجُلًا اَجْنَبَ فَلَمْ يُصَلِّ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ لَهُ ذٰلِكَ فَقَالَ اَصَبْتَ. فَاَجْنَبَ اٰخَرُ فَتَيَمَّمَ وَصَلّٰى فَاَتَاهُ فَقَالَ نَحْوَمَا قَالَ لِلْاٰخَرِ يَعْنِيْ اَصَبْتَ. ''حضرت طارق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نہانے کی حاجت ہوگئی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور اس قصہ کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو اسی طرح نہانے کی حاجت ہوئی اس نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ویسی ہی بات فرمائی۔ جو ایک شخص سے فرما چکے تھے یعنی تو نے بھی ٹھیک کیا''۔

اس حدیث سے اجتہاد و قیاس کا جواز صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر ان کو نص کی اطلاع ہوتی تو پھر بعد عمل کے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے اپنے اپنے قیاس واجتہاد پر عمل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب و تحسین فرمائی اور ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام کی تقریر یعنی کسی چیز کو سن کر رد نہ فرمانا بلکہ صراحۃً اس کی تصویب فرما دینا اس کی مشروعیت کی واضح دلیل ہے اس لئے نصِ صریح نہ ہونے کی صورت میں جوازِ اجتہاد و قیاس میں کوئی شبہ نہ رہا۔

اسی طرح بروایت ابوداؤد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوہ ذات السلاسل کے موقع پر سردیوں کی ایک رات میں جان کے خوف سے بحالتِ جنابت بجائے غسل کے تیمم سے نماز پڑھا دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر عرض کیا کہ: میں نے اللہ کے اس قول پر عمل کیا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ. ''اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو''۔

حضور نے مسکرا کر سکوت اختیار فرمایا۔ ① جس سے واضح ہے کہ نص صریح نہ ہونے کی صورت میں رائے پر عمل کرنا عمومات وکلیات سے استدلال کرنا یعنی اجتہاد سے کام لینا خلاف حدیث نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکیر فرماتے کہ تم لوگ دین میں رائے اور قیاس کو کیوں دخل دیتے ہو۔ یا نص تو موجود ہو مگر محتمل الوجود ہو تو اجتہاد سے کسی ایک وجہ کا تعین کر کے اس پر عمل کرنا بھی خلاف نص یا خلافِ حدیث نہیں۔ چناں چہ حدیث ذیل اس پر شاہد ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْاَحْزَابِ لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدٌ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ فَاَدْرَكَ بَعْضُهُمُ الْعَصْرَ فِي الطَّرِيْقِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا نُصَلِّيْ حَتّٰى نَاْتِيَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ نُصَلِّيْ لَمْ يُرِدْ ذٰلِكَ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُضَعِّفْ وَاحِدًا. ② ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب کے موقع پر صحابہؓ

① الصحيح للبخاري، كتاب التيمم، باب اذا خاف الجنب على نفسه المرض، ج: ۲، ص: ۷۲.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب صلوٰة الطالب والمطلوب راكبا، ج: ۳، ص: ۴۹۹.

سے فرمایا کہ: عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچنے سے ادھر کوئی نہ پڑھے بعض صحابہ کو راہ میں عصر کا وقت آ گیا تو باہم رائے مختلف ہوئی۔ بعض نے کہا کہ: ہم نماز پڑھیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب تاخیر صلوٰۃ نہیں تھا بلکہ مقصود تاکید تھی کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرو، پھر یہ قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی''۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بعض نے اپنی قوت اجتہادیہ سے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی غرض کو سمجھ کر جو کہ نص کی ایک محتمل وجہ تھی نماز پڑھ لی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ملامت نہیں فرمائی کہ تم نے حدیث کے ظاہر الفاظ کے خلاف کیوں عمل کیا؟ یعنی ان کو عمل بالحدیث کا تارک قرار نہیں دیا یا نص صریح بھی موجود ہو اور اس کا محمل بھی متعین ہو مگر مجتہد اس حکم کو کسی علت سے معلول سمجھ کر علت باطنیہ پر عمل کرے اور ظاہر نص کو ترک کر دے تو یہ بھی خلاف حدیث نہیں۔

چناں چہ حدیث انسؓ اس پر شاہد عدل ہے۔ عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَجُلًا کَانَ یُتَّھَمُ بِاُمِّ وَلَدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِعَلِیٍّ اِذْھَبْ فَاضْرِبْ عُنُقَہٗ فَاَتَاہُ فَاِذَا ھُوَ فِیْ رُکِیٍّ یَبْرُدُ فَقَالَ اُخْرُجْ فَنَاوَلَہٗ یَدَہٗ فَاَخْرَجَہٗ فَاِذَا ھُوَ مَجْبُوْبٌ لَیْسَ لَہٗ ذَکَرٌ فَکَفَّ عَنْہُ وَاَخْبَرَ بِہِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَسَّنَ فِعْلَہٗ (زَادَ فِیْ رِوَایَۃٍ) وَقَالَ یَرَی الشَّاھِدُ مَالَا یَرَی الْغَائِبُ ① ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی ام ولد کے ساتھ متہم تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: جاؤ اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس آئے تو اس کو دیکھا کہ وہ کنویں میں اترا ہوا بدن ٹھنڈا کر رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا باہر نکل۔ اس نے اپنا ہاتھ دے دیا۔ آپؓ نے اس کو نکالا تو وہ مقطوع الذکر نظر پڑا تھا۔ آپؓ اس کی سزا سے رک گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے اس فعل کو مستحسن فرمایا (اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حاضر ایسی بات دیکھتا ہے جو غائب نہیں دیکھتا''۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اور صاف حکم موجود تھا مگر حضرت علیؓ نے اپنے ذوقِ اجتہاد سے اسے ایک علت سے معلول سمجھا اور جب علت کا وجود نہ پایا تو حکم سزا بھی جاری نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل ظاہراً اطلاق حدیث کے خلاف تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حدیث کی لِم اور علتِ حکم سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اور الفاظِ حدیث کے ظاہر کو ترک کر دینا، خلاف حدیث نہیں بلکہ وہ عمل بالحدیث ہے مگر بطن حدیث پر ہے جو خود حدیث سے ثابت شدہ چیز ہے، اس کی نظیر یہ بھی ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو بشارت دی کہ جو بھی صدقِ دل سے کلمہ طیبہ پڑھ لے گا وہ نارِ جہنم پر حرام ہو جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں لوگوں کو اس کی بشارتِ عام نہ دے دوں؟ فرمایا نہیں، لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں

① الصحیح لمسلم، کتاب التوبہ، باب براءۃ حرم النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الریبۃ، ج:۱۳، ص: ۳۴۹.

گے۔(اور عمل چھوڑ دیں گے۔)

اس ممانعت تبشیر میں کسی زمانہ کی قید نہ تھی مگر حضرت معاذؓ نے اپنے نورِ اجتہاد سے دوسرے دلائل کلیہ پر نظر کر کے اس ممانعت کو اس زمانہ کے ساتھ مقید سمجھا جس میں اس پر بھروسہ کر بیٹھنے کا احتمال باقی رہے اور وفات کے وقت جب کہ وہ زمانہ ان کے زعم میں باقی نہیں رہا تھا، اس بشارت کا اعلان عام کر دیا۔

یا مثلاً (بروایتِ مسلم) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: ایک لونڈی کو جس نے بدکاری کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درے مارنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زچہ تھی۔ اس لئے درے نہ لگائے کہ کہیں مر نہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی تحسین فرمائی۔ اس سے واضح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نصوص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کو مذموم نہ جانتے تھے ورنہ ظواہر احکام کو مقصود جان کر ان باطنی علل اور علومِ کلیہ سے بحث ہی نہ فرماتے۔ چہ جائیکہ ان بواطن پر عمل کرتے۔ یہ نظائر اس پر شاہد عدل ہیں کہ اگر مجتہد اپنی قوتِ اجتہادیہ سے کسی حدیث کے مدلولِ ظاہری کے خلاف یعنی اس سے بالاتر کوئی دقیق معنی سمجھ جائے جس تک عوام علماء کی رسائی نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

اُمّت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے...... بہر حال جب یہ واضح ہو گیا ہے کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعین الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس کے لئے افراد من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیق پیغمبر حجت شرعیہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے خود ان مخفی دلائل اور علل نہیں تک پہنچ سکتا۔ تو دانایانِ اسرار و عللِ کے سامنے جھک جائے، کیونکہ مراتب علم کے دو ہی ہیں یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی وہ دو مراتب بلا کسی واسطہ کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ قیامت کے دن کفار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔ ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ ① ''اور کہیں [illegible] اے کاش ہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے''۔

بس یہی درجہ سمع و طاعت [illegible] والے کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق عمل میں لاتا ہے، تقلید کہلاتا ہے، جو فی نفسہٖ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام اور غیر اہل اجتہاد کے حق میں اب بھی اہلِ اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو اجتہاد کا حجت شرعیہ ہونا لغو ہو جائے اور اس آیت کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہیں کہ: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ② ''اگر تم لاعلم ہو تو علم والوں سے سوال کرو''۔ اور اس حدیث کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے کہ: اَلَمْ يَكُنْ شِفَاءُ الْعَيِّ السُّوَالَ ③ ''کیا عاجز کی شفاء سوال نہیں ہے''؟

---

① پارہ: ۲۹، سورة الملک، الآیة: ۹. ② پارہ: ۱۷، سورة الانبیاء، الآیة: ۷.

③ السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی المجروح یتیمم ج: ۱ ص: ۴۱۲.

پس اگر اجتہاد بنصِ حدیث شرعی چیز ہے اور غیر مجتہد بنص حدیث دنیا میں موجود ہیں کہ قرنِ اوّل تک میں موجود تھے۔ ادھر غیر مجتہد کا علاج وشفاء بنص حدیث سوال وتعمیل ہے تو غیر مجتہد کے لئے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تقلید کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مستقلاً موجود ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ . ① ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دے دے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے کو ہوگا''۔ ظاہر ہے کہ اگر تقلید نہ جائز ہوتی اور کسی کے فتوی پر بدونِ معرفتِ دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گناہگار ہونے میں مفتی ہی کی کیا تخصیص تھی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے اور بلا تحقیق عمل کرنے کا گناہ ہوتا۔ پس جبکہ شارع علیہ السلام نے سائل کو باوجود تحقیق دلیل نہ کرنے کے عاصی نہیں ٹھہرایا تو جوازِ تقلید بلاشبہ ثابت ہوگیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تقلید رائج تھی...... چناں چہ حضراتِ صحابہؓ میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد، مجتہد کے فتویٰ پر بلا تحقیق دلیل محض اس حسنِ ظن کی بناء پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے اور بلا دلیل فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔ عَنْ سَالِمٍ سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ رَجُلٍ یَّكُوْنُ لَهُ الدَّیْنُ عَلٰی رَجُلٍ اِلٰی اَجَلٍ فَیَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ لِیُعَجِّلَ الدَّیْنَ فَكَرِهَ ذٰلِكَ وَنَهٰی عَنْهُ. ② ''حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ دین میعادی واجب ہے اور صاحبِ حق اس میں سے کسی قدر اس شرط سے معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا۔ چونکہ اس مسئلہ جزئیہ میں کوئی حدیث مرفوع صریح منقول نہیں۔ اس لئے یہ حضرت ابن عمر کا قیاس ہے اور چونکہ سائل نے دلیل نہیں پوچھی اس لئے اس کا قبول کرنا تقلید ہے نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا دلیل بیان نہ کرنا خود تقلید کو جائز رکھتا ہے، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے قیاس وتقلید دونوں کا جواز ثابت ہوگیا۔

اسی طرح بروایتِ مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کردے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرما کر منع فرمادیا اور فرمایا کہ: بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ چونکہ اس بارہ میں بھی کوئی صریح حدیث مرفوع مروی نہیں لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ جواب قیاس سے تھا اور چونکہ جواب کا ماخذ نہ آپؓ نے بیان فرمایا نہ سائل نے پوچھا بدونِ دریافتِ دلیل قبول کرلیا تو یہی تقلید تھی۔

پس جوازِ قیاس وتقلید حضرت عمرؓ کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اسی طرح بروایتِ مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا ج: ۱۰ ص: ۷۱. ② جامع الاصول، ج: ۱، ص: ۴۰۶.

ایوب انصاری رضی اللہ عنہ حج کے لئے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہوگئیں اور حج کا وقت نکل جانے پر پہنچے۔ حضرت عمرؓ سے سارا قصہ بیان کر کے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ: افعالِ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دے دو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہؓ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہؓ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے حضرت عمرؓ سے صرف حکم سن لیا اور دلیل کی تحقیق نہیں کی جو تقلید کا حاصل ہے۔ یہ ہی صورت تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ کتبِ احادیث سے مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قرونِ خیر میں اجتہاد وتقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد واشخاص الگ الگ تھے۔ یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس وناکس کے لئے اجتہاد جائز نہیں تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس وناکس کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں۔

اجتہاد وتقلید کی حدود...... نیز اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ شریعت نے امت میں بیک وقت اجتہاد وتقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی جس سے واضح ہے کہ شریعت نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد اور یہی اس کی جامعیت اور عدل واعتدال کا تقاضیٰ بھی ہے ورنہ اجتہاد بلا تقلید افراط تھا اور تقلید بلا اجتہاد تفریط تھی۔ عدل کا مقتضیٰ یہی تھا کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں پھر ساتھ ہی اس اجتہاد وتقلید کا شریعت ایک نظم بھی چاہتی ہے کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مطیع رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت اسلام چونکہ کمال اعتدال اور جامعیت کی شان رکھتی ہے اور اسی لئے یہ امت بھی اعدل الامم اور جامع اقوام ہے جس کا لقب ہی قرآنی زبان میں امت وسط ہے۔ اس لئے منشاء شریعت یہ ہے کہ امت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور یہ اجتماعیت نظام لئے ہوئے ہو۔ خواہ وہ نظام سیاسی ہو۔ خواہ دینی اس انداز کا ہو کہ نہ اس میں تشتت اور پراگندگی ہو جو بدنظمی ہے اور نہ جمود واستبداد ہو جو اجتماعیت اور جمہوریت کے منافی ہے۔ اس لئے اس نے امت کے سیاسی اور دینی دونوں نظامات میں یہی معتدل صورت قائم کی ہے۔ مثلاً امت کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تا کہ قوم میں فوضویت اور لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندی اور بدنظمی کی روح ہے۔ اس سے تو حکومت میں شخصیت قائم ہوئی۔

ادھر اس امارت کے لئے شوریٰ لازم قرار دیا تا کہ امیر میں استبداد بھی نہ پیدا ہو سکے اور قوم کے اجتماعی فکر کے قویٰ معطل اور بے کار نہ ہوں۔ اس صورت سے قوم میں جمہوریت باقی رہے۔ پس اسلامی امارت میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بے کار بنا دے اور عوام بھی اس پر حکومت کرنے لگیں۔

پس امیر کی شخصیت اور آمریت سے تو قوم کی طوائف الملوکی اور پراگندگی دفع کی اور قوم کی شورائی تشکیل

سے امیر کے استبداد کی روک تھام کر دی۔ اس طرح شخصیت اور جمہوریت دونوں کو ایک معتدل درجہ کے ساتھ امت کے سیاسی نظام میں شامل کر دیا گیا یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کر لئے گئے جو کمال اعتدال ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت کے دینی نظام میں شریعت نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام افکار کو اس درجہ آزاد چھوڑا کہ امت کا ہر شخص مجتہد ہو اور کتاب و سنت میں ہر کس و ناکس کے آراء و قیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس امت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کے قویٰ فکر و اجتہاد سرے ہی سے معطل ہو جائیں بلکہ ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضاء زمانہ آتی اور مختتم ہوتی رہیں گی تا کہ امت کے قویٰ فکر و تدبیر سست نہ ہونے پائیں۔

اور ایک طرف تقلید کو قائم رکھا تا کہ عامی اور ناواقف اپنی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے دین ہی کو آراء و قیاسات کا مجموعہ نہ بنادے اور اس طرح دین میں تشتت و پراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں پس امت کے علمی تشتت کو تقلیدی سمع و طاعت سے رفع کر دیا اور تقلیدی جمود کو شان اجتہاد و تحقیق سے دفع کیا اس طرح اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے بچا کر امت کو درمیان کے معتدل نقطہ پر قائم فرما دیا جس میں نافع پہلو سب قائم ہیں۔ چناں چہ امت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اسوہ سلف کی مقلد بھی۔ غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شان تحقیق نمایاں ہے۔ اس لئے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس سے جنس اجتہاد کی تردید کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر رد و انکار کوئی خوبی قرار دی جا سکتی ہے۔

اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح دلیل...... باقی یہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباط علل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لئے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ائمہ نے اسے اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تلاش و تحقیق کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی اصول ہے کہ جو مقصد دنیا میں مکمل ہو جاتا ہے اس کی متعلقہ قوت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ دین کی بنیادیں دو ہی ستونوں پر قائم تھیں۔ روایت اور درایت، روایت کا تعلق حافظہ سے ہے اور درایت کا تعلق فہم سے۔ اوئل اسلام میں جب کہ اسلام کا روایتی حصہ مکمل ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے محدثین کو جو مخصوص حافظہ عطاء فرمایا کہ آج اسے بجز کرامت اور خرق عادت کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ایک ایک محدث کو لاکھوں کی تعداد میں احادیث یاد ہوتی تھیں اور نہ صرف متون و حدیث بلکہ مع اسانید و رجال اور نہ صرف رجال کے اسماء بلکہ ان کی سوانح اور صفات بھی از بر ہوتی تھیں جیسا کہ کتب طبقات سے واضح ہے۔ انہیں سینوں سے وہ سفینے مدون ہوئے جو آج کتب حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

جب دین سینوں کے ذریعہ سے سفینوں میں منضبط ہو گیا اور محض حفظ پر مدار نہ رہا تو قوت حافظہ قدرتی عوامل

کے ماتحت گھٹنی شروع ہوئی اور آج اس حد پر آ گئی کہ اگر ہم روزانہ کی معاشرتی زندگی میں نوٹ بک اور ڈائری جیبوں میں نہ رکھیں تو کاروبار صفر ہو جائے۔ پس جس حد تک اس محیر العقول قوت حافظہ کا کام پورا ہو گیا جو اس امت کو بطور اعجاز کے دی گئی تھی تو قوت کی وہ نوع بھی قدرتی طور پر ختم ہو گئی۔ گو جنس حافظہ آج بھی موجود ہے جس کی باقی ماندہ نوعیت مناسب وقت کام کر رہی ہے۔

دور روایت کے بعد اسی طرح جب کہ اسلام کا درایتی حصہ مکمل ہونا شروع ہوا اور روایات سے دین کو استنباط کر کے مبوّب اور مفصل کرنے کی نوبت آئی تو حق تعالیٰ نے اس امت میں وہ ارباب درایت وفقہ اور ائمہ اجتہاد پیدا کئے کہ ان کے مصفّٰی اذہان کا سرعت انتقال ونفوذ ان کے حیرتناک استنباطات اور ان کے فقہ نفس کے عجائبات بھی خرق عادت ہی کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسائل ہی مستنبط کئے بلکہ وجوہ استنباط بھی علی وجہ البصیرت ظاہر کیں۔ کیفیت استنباط پر بھی روشنی ڈالی۔ پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط بھی معلوم کیا اور اس ربط کے واسطہ سے ہزاروں نئے مسائل کلیات سے اور ہزار ہا علل کلیہ جزئیات سے استخراج کیں جس سے پوری شریعت شاخ در شاخ ہو کر ایک ہی شجرہ اور متصل واحد شئے دکھائی دینے لگی اور یہ سب کچھ اس شان سے ہوا کہ ارباب فہم آج ان حضرات کی رسائی فہم پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے ان کا کوئی اکتسابی کارنامہ نہیں بلکہ محض وہبی عمل کہنے پر مجبور ہیں جس کے لئے خدا نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔

جب دین کا یہ فقہ اپنی مکمل صورت میں آ گیا۔ امہات مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب وار مرتب ہو گئے اور ائمہ فقہ کے سینوں سے نکل کر سفینوں میں مدون بھی ہو گئے تو ان ہی قدرتی عوامل کے ماتحت وہ خاص قوت فہم بھی کم ہونی شروع ہو گئی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور رفتہ رفتہ زمانہ آج اس درجہ پر پہنچ گیا کہ جدید استنباط تو بجائے خود ہے مستنبط شدہ مسائل کے خفی رشتہ کو جو متعلقہ کلیات سے قائم ہے بلکہ جزئیات وکلیات کے سلسلہ کے تسلسل اور صورت انسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا فہم عامہ خلائق میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے اجتہاد کی وہ نوع بھی باقی نہیں جس کا تعلق استخراج علل واستنباط مسائل سے تھا کہ یہ ضرورت زمانہ نے پوری کر کے ختم کر دی اور اس بناء پر وہ قوت بھی مضمحل ہو گئی۔

ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد...... اس فقدان قوت کے بعد بھی اگر مدعیان زمانہ کو اجتہاد کی اس نوع میں آزادی مل جائے جس کے لئے لوگ تڑپتے ہیں تو قطع نظر استنباط مسائل کی ضرورت وعدم ضرورت کے فساد مذاقِ غلبہ ہوا وہوس اور جذبہ خود مختاری کے ماتحت ہر ایک فاضلِ ہر ایک گریجویٹ ہر ایک وکیلِ ہر ایک بیرسٹر ہر ایک ایڈیٹر جو چند پیسوں میں لوگوں کا کچھ وقت خرید سکتا ہے بلکہ ہر ایک خواندہ ناخواندہ مجتہد عصر ہو گا اور اجتہادات کے ایسے ایسے انوکھے نمونے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اسلام کی اصل شکل پہچانی بھی مشکل ہو جائے گی۔

چناں چہ حسبِ مضمون ''الاقتصادِ'' ایک شخص کہے گا کہ: جس طرح سابق مجتہدین نے نصوص کو کسی علت

سے معلول سمجھا اور بسا اوقات ظاہر نص کو چھوڑ کر باطنی علت پر عمل کیا اور کرلیا مجھے بھی اس کا حق ہے لہٰذا میرے نزدیک مثلاً وضو کا حکم معلل ہے جس کی علت یہ تھی کہ عرب کے اکثر لوگ اونٹ بکریاں چراتے تھے۔ان کے ہاتھ پیران جانوروں کے بول و براز کی چھینٹوں سے آلودہ ہو جاتے تھے وہی ہاتھ منہ پر بھی لگ جاتا تھا اس لئے ان کو وضو کا حکم دیا گیا تھا۔اس لئے اعضاء وضو وہی رکھے گئے جن کی آلودگی عادتاً اکثر و بیشتر تھی۔لیکن ہم ضروریات تمدن کے ماتحت روزانہ غسل کرتے ہیں محفوظ مکانوں میں کرسی نشین رہتے ہیں اور وہ آلودگی کی علت ہم میں نہیں پائی جاتی۔لہٰذا وضو ہم پر واجب نہیں۔ایک کہے گا کہ: مثلاً نکاح میں شہود اور اعلان نکاح فی نفسہٖ ضروری نہیں بلکہ اس علت سے تھا کہ زوجین میں اختلاف و نزاع کے وقت تحقیق حال میں سہولت ہو۔

پس جہاں اس کا احتمال نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔جیسا کہ آج کہا جا رہا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر یہی علل و اسرار دین کے ہوں گے اور ان ہی علل پر احکام مبنی ہوں گے تو ان مجتہدین عصر کی بدولت غریب اسلام کو تو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے گی کیونکہ اس کا انجام احکام کی تحریف، اجماع کی مخالفت و تخریب نصوص کی تبدیلی اور اصلی اسلام کا انہدام ہے۔یہ آج کے اجتہادات کے عریاں نمونے ہیں جنہیں ہر شخص ادنیٰ تامل سے پہچان سکتا ہے اور بعض نمونے علمی رنگ کے ہوں گے جن کے اہمال کو خواص پہچان سکیں گے مگر اس قسم کے اجتہادی مفاسد پیش آنے کی وجہ وہی ہے کہ تکوینی طور پر وہ استخراج علل کی قوت تو بوجہ انقضاء ضرورت کے ختم ہو چکی ہے اور یہ علم کہ کون سا حکم معلل ہے علت کے ساتھ اور کون سا تعبدی ہے جس قوۃ فہم پر مبنی تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس کا ادعاء اور اوپر سے استعمال ایسے ہی نتائج پیدا کرے گا جو تمثیلاً عرض کئے گئے۔ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں آج بھی جنس اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق و تلاش کتاب و سنت میں تدبر، ان کے لطائف و حقائق کا استخراج ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا۔ معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک و شبہات کی تردیدات نصوص سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات و تحقیق کے لئے کتاب و سنت سے مویدات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی و رآج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ قرآن کی شان لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ (1) فرمائی گئی ہے جس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں۔

پس جس طرح کتب روایت میں آج کسی جدید چھان بین اور رووات پر نئی جرح اور تعدیل کی کوئی ضرورت نہیں۔حسب ضرورت صرف ائمہ فن سے ان کی عرق ریزیوں کا ثمرہ پیش کر دینا کافی حجت ہے ورنہ تحصیل حاصل ہوگی۔اس طرح کتب درایت میں بھی آج پھر سے اس اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی جو کیا جا چکا ہے۔

بلکہ حسب ضرورت ائمہ درایت سے ان کی کاوشوں کے ثمرات کا نقل کر دینا اور اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔ وہاں ہم روایت میں تقلید ائمہ پر مجبور ہیں۔یہاں درایت میں مجبور ہیں۔گویا نہ نئی حدیث کی ضرورت ہے نہ نئے فقہ

(1) السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، ج: ۱۰، ص: ۱۴۷.

کی۔ محدثین نے کوئی روایت نہیں چھوڑی جس کا صحت وسقم کھول کر نہ رکھ دیا ہو۔ فقہاء نے کوئی درایتی احتمال اور بعید سے بعید صورت عمل ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کو نکھار کر بدلائل سامنے نہ رکھ دیا ہو اور کسی جویائے عمل کے لئے تشنگی کی کوئی ادنی صورت بھی باقی رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئے سے نئے مسائل پیش آئے اور آرہے ہیں مگر مفتیین کو فتاویٰ کے لئے اب تک کوئی جدید فقہ مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی فقہ سے جو ایک لاء اور قانون کی صورت میں مدون ہے اور ان ہی اصول سے جن کے ماتحت یہ فقہی ترتیبات عمل میں آئیں زمانہ کی ساری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں خواہ اس کے منصوص حصہ سے اور خواہ اس کے اجتہادی حصہ سے۔ یہ خود اس کی ایک مستقل دلیل ہے کہ اجتہادی دور اپنا کام پورا کر کے منقضی ہو چکا ہے جو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اجتہاد فی الدین کا دور ختم ہو چکا تو ہو جائے مگر اس کی تقلید کا دور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تقلید ہر اجتہاد کی دوامی رہے گی خواہ وہ موجود ہو یا منقضی شدہ کیونکہ تقلید عین اجتہاد میں نہیں کی جاتی بلکہ اس سے پیدا شدہ مسائل میں کی جاتی ہے اور وہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے تقلید پر کوئی دور بھی اختتام وانقضاء کا نہیں آ سکتا۔ خلاصہ یہ کہ جنس اجتہاد وتقلید میں سے کسی کو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی وقت بھی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس لئے آج بھی وہ دونوں اپنی اسی نوعیت کے ساتھ جس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی دنیا میں موجود ہیں کہ دین کی جامعیت تو ان دونوں کے وجود کو مقتضی ہے جبکہ یہ دونوں شرعی چیزیں ہیں اور دین کا اکمال واتمام ان دونوں کے درجہ اعتدال کو مقتضی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ درمیانی نقطہ پر لا کر دونوں کو قائم رکھا جائے جس کی صورت ابھی عرض کی گئی۔

اختلاف ائمہ باعث رحمت ہے...... یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب اجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء بتفاوت افہام متعدد اور مختلف ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلہ میں آراء کئی ہو جائیں اور اجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں تو کیا اس اختلاف رائے کا دروازہ کھلنا امت کی تفریق بلکہ تخریب اور تمذہب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورت اختلاف نہ فی نفسہ مضر ہے نہ دین کے لئے مضر ہے نہ امت کے لئے مضر ہے۔ بلکہ علم علماء اور پوری امت کے خواص وعوام کے لئے موجب ترقی اور باعث سود بہبود ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم وتزاحم کے نہیں ہوتی بلکہ ترقی نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے۔ اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزاحم آراء اور تصادم افکار کے نمایاں نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے۔ ''اَلْقَلْبُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْبَحْثِ وَالْمُنَاظَرَةِ'' ''دل آدمی کا مردہ ہے اس کی زندگی علم سے ہے اور علم انسان کا مردہ ہے اس کی زندگی بحث ومناظرہ سے ہے''

ظاہر ہے کہ بحث ومناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے۔ جس سے علم کے مختلف مخفی گوشے کھل جاتے ہیں۔ تکوین الٰہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلہ میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تا کہ کفر باطل کے جتنے پہلوؤں سے اسلام

سے ٹکرائے، اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہو جائیں اور انجام کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں۔ علم کے مقابلہ پر شبہات کا لشکر اسی لئے صف آراء کیا گیا کہ جہل اپنے جس جس حصہ سے علم سے ٹکراتا رہے علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دنیا کے سامنے ہوتے رہیں۔ پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکر دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔ شریعت نے مشورہ کا اصول اسی لئے رکھا کہ آراء کے تصادم سے مسئلہ کے موافق اور مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھنا کر منقح ہو جائے۔ غرض اگر اصول کے مقابلہ پر اضداد نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور قویٰ واشگاف ہو سکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضداد کی قلعی کھل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے دین میں ایک حصہ محلِ فکر و بحث رکھ کر اجتہاد و تحقیق اور تزاحم آراء کے لئے چھوڑ دیا تاکہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی علل اور اسرار پر مشتمل ہے ''لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ'' کی حد تک کھلتا چلا جائے اور امت کے مخصوص دماغوں کی جولانیاں اور قلوب صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیت اور اسی کے ساتھ کتاب و سنت کی ہمہ گیری بھی کھل جائے۔ اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر مصفّٰی قلب و دماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار ہے جس سے ''أُعطيت جَوَامِعَ الْكَلِمِ'' ① اور ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ ② کا پورا پورا ظہور ہو جائے۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب و سنت کے بلیغ جملات اور ذی وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعد عربیہ اور اصول لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقۃً پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام محتملات بعض احتمالات میں نہ رہیں۔ بلکہ ہر ایک محتمل قابل عمل اور ایک مستقل اسوہ بن جائے اور احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تاکہ کلام الٰہی اور کلام رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی امام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ امت کے زیر عمل آ جائے۔ پس آج اختلاف آئمہ کی بدولت احادیث کا ہر ہر محمل اجتہادی مسائل کی صورت میں امت میں معمول ہے اور کلام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو۔ اسی لئے اس اختلاف کو رحمت واسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلام نبوت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا ''والاعمال اَولیٰ من الاھمال'' نیز امت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ ہر مذاق کا امام اپنے مناسب مذاق علمی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے اس صورت میں اسلام ایک ایسے دریا کی مانند ہوگا جس کا یک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے مزہ بھی وہی ہے۔ البتہ سمت اور رخ بدلا ہوا ہے ایک عظیم

① الصحيح لمسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب (بلاترجمه) ج:۳ ص:۱۰۹.

② پاره: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۸۹.

الشان درخت کے مشابہ ہوگا جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تا کہ جدھر سے بھی کوئی آئے پھل کھا سکے۔ یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگریز طریقے پر ایک ہی سمت خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح ہے جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے ہر سمت سے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس کے سامان سے راحت اٹھا سکتے ہیں جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اختلاف ائمہ ہی کی بدولت امت کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف ائمہ اصول کا نہیں بلکہ اتحاد اصول کے ساتھ سمتوں اور جہات و کیفیات کا اختلاف ہے تا کہ علم کی اس وسعت سے اسلام کی ہمہ گیری اور امت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے۔ نیز ہر مذاق کے انسان کو الوان فہم کے مذاق کے مطابق مربی اور سامان تربیت بھی میسر آ جائے۔

بس اس حکمت بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے آئمہ اجتہاد میں تعدد بھی پیدا فرما دیا اور ان میں متعدد حضرات کے مذاق اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا۔ اصول استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لمیات اور پھر ان لمیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلاف ذوق سے پیدا ہوئے جو ائمہ کو قدرت الٰہی نے تکوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رونما ہوا کہ ان ائمہ کی مختلف شئون سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوع شئون نبوت واشگاف ہوئیں۔ گویا وہ ساری شئون جو ایک ذات بابرکات نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک امتی انفرادی طور تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ پوری امت کے راسخین فی العلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شان نبوت نے ایک ایک مجتہد کے ذریعہ ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر امت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ اور شئون نبوت کے یہ تمام الوان ایک صدرنگ گلدستہ کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے بنظر بریں فقہاء امت کا یہ اختلاف امت کے حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علماً وعملاً مفید ثابت ہوا۔ فہیم شخصیات کے مکنون جوہر کھلے کتاب وسنت کی بلاغت و جامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا۔ امت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں۔ پیغمبر کے متنوع علم کی شئون واضح ہو گئیں، غرض امت، پیغمبر، دین، مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروعی تنوع بہر نہج مفید ہی مفید اور رحمت ثابت ہوا، اسی لئے شریعت نے کھلے الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمت واسعہ کہا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''اِخْتِلَافُ اَصْحَابِیْ رَحْمَةٌ وَّاسِعَةٌ''۔ (1) ''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اختلاف بڑی رحمت ہے۔

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ ہر اس اجر وثواب کے مواعید دے کر امت کو اس کی رغبت دلائی گئی۔

(1) علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بیہقی نے ''المدخل'' میں ذکر کیا ہے، اس حدیث کی سند میں جویبر ہے چنانچہ فرماتے ہیں: وجويبر ضعيف جداً دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۱۴، حرف الهمزة.

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهُ اَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ ثُمَّ اجْتَهَدَ ثُمَّ اَخْطَأَ فَلَهُ اَجْرٌ. ①
''حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی حکم والا حکم کرے اور اجتہاد میں مصیب ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر خطاء ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے''۔

قرآن کریم نے بھی اپنے نظم میں اس اختلاف کی مشروعیت کی طرف اشارہ فرمایا گویا فروعی اختلافات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.﴾ ② ''اور تم لوگ ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا واضح احکام پہنچ جانے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی''۔ ﴿مِنْ بَعْدِمَاجَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم ہے جو دلائل کھل جانے کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول کا اختلاف ہو سکتا کیونکہ اصول خود فی نفسہ کھلے ہوئے اور واضح ہوتے ہیں اور یا ان فروع کا ہو سکتا ہے جن کے دلائل واضح ہو جائیں۔ پس اصول واضحہ اور فروع واضحۃ الدلائل میں اختلاف آیت بالا سے مذموم اور ممنوع ثابت ہوا کہ وہ اختلاف محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہ ہوئے ہوں خواہ اس طرح کہ ان کے بارہ میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو یا نص ہے مگر اس سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو جن میں وجہ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو۔ تو اس قسم کی فروعات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوحِ بینات سے پہلے پہلے کا ہوگا اس لئے مذموم بھی نہیں ہو سکتا یہی وہ اجتہادی اختلاف ہوگا جو اتحادِ اصول کے ساتھ محض فروعاتی ہوگا اور مجبوری ہوگا جسے لسانِ نبوت پر رحمت واسعہ کہا گیا ہے اور جس کی خطاء پر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے پس ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث کے تو منطوق اور قرآن کے مفہوم سے ثابت ہو گئی۔

مسائلِ فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی...... بہر حال جبکہ اجتہاد مشروع بھی ہوا، اجتہادی اختلافات بھی شرعی اور مطلوبِ شرعی ٹھہرے تو آئمہ اجتہاد کے ذریعے ایسے اجتہادی اختلافات کا ظہور بھی نہ قابلِ ملامت ہو سکتا ہے نہ ایسے مسائل کی تدوین ہی قابلِ طعن ہو سکتی ہے۔ اگر کسی مجتہد کے تلامیذ اپنے عمل کے لئے اس کے اجتہادات کو ایک جگہ جمع کر لیں گویا بالفاظِ دیگر ان شرعیات کے مسائل کی تدوین کرنے لگیں تو آخر اس میں کون سی شرعی قباحت ہے کہ اس پر انہیں قابلِ سرزنش شمار کیا جائے۔ بس ایسے ہی اجتہادی مسائل کے ایک جگہ جمع شدہ مجموعہ کا نام فقہ ہے جس کو کسی مجتہد کے متوسلین نے باب وار اوراق میں ذخیرہ کر لیا ہو۔ پھر یہ نام بھی کوئی اختراعی نام نہیں بلکہ حدیثِ نبوی سے ثابت شدہ اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز فرمودہ نام ہے جیسا کہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب اجر الحکم اذا جتهد، ج: ۲۲، ص: ۳۳۵.
② پارہ: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۱۰۵.

حدیث رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اورحدیث مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اورحدیث مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ سے تفصیلی طور پر اس فقہ کی نوعیت عرض کی جا چکی ہے۔

متبعین فقہ کے لقب ''اہل السنّت والجماعۃ'' کا ماخذ...... ہاں پھر چونکہ یہ فقہ مجموعہ سنن تھا جس میں سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو بطور ماخذ کے شامل تھیں اور سنن صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بطور ماخذ کے جمع تھیں اس لئے اس میں سنیت کا بھی نور تھا اور جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا جماعتی نور بھی مجتمع تھا اس لئے عاملین فقہ نے اپنا نام اہل السنہ والجماعۃ رکھ لیا تو کیا برا کیا بلکہ غور کرو تو یہ نام بھی حدیث ہی سے ماخوذ ہے، حضرت عمروؓ بن عاص کی روایت میں ارشاد نبوی ہے۔وَاِنَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَّ تَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلٰثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ. ① ''اور بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرق پر منقسم ہو جائے گی سب فرق ناری ہونگے بجز ایک کے۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں اس پر چلنے والا ناجی ہے''۔

ظاہر ہے کہ اصحاب کے لفظ سے جو جمع لایا گیا ہے اس سے جماعت مفہوم ہو رہی ہے اور مَا سے مراد طریقہ اور سنت ہے جو پیغمبر اور صحابہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔اس لئے فرقہ ناجیہ کا ترجمہ ہوا ''سنت نبی و جماعت نبیؐ'' ظاہر ہے کہ جب اہل فقہ کی فقہ میں یہی سنت نبی اور جماعت نبی جمع ہے اور انہوں نے اس لفظی اور معنوی مناسبت سے اپنا لقب اہل سنت والجماعت تجویز کر لیا تو اس میں کیا برائی ہے کہ یہ لقب ان کے حق میں مستوجب ملامت شمار کیا جائے بلکہ اس لقب کی ترکیب پر غور کیا جائے تو ایک اور شرعی حقیقت بھی اس لقب سے واشگاف ہوتی ہے جو دینی جماعت کے جسم کے لئے بمنزلہ روح کے ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت اور اہل الجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں جو حاملین حدیث ہیں جن کی زبانوں پر تو حدیث وقرآن کے الفاظ ہیں اور سینوں میں ان الفاظ کے مخفی حقائق ودقائق ہیں۔گویا الفاظ کتاب وسنت کے ساتھ صحبت ومعیت اساتذہ بھی ضروری ہے۔

اگر صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن وحدیث سنا اور ان کے حقائق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے لیا پھر تابعین نے صحابہؓ کی زبان سے تو قرآن وحدیث لیا اور ان کے قلوب سے اس کی صفائی واسرار کو حاصل کیا ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ② وہم بھی اس توارث کے ماتحت الفاظ کتاب وسنت تو کتب سے لیتے ہیں اور ان کے حقائق ان روشن ضمیر اساتذہ کے قلوب سے جو خلفاً عن سلف اس باطنی نور کو اخذ

---

① المستدرک، ج: ۱، ص: ۲۱۸، رقم: ۴۴۳. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۱ ص: ۲۰۲، رقم: ۲۰۳.

② پارہ: ۲۱، سورة العنکبوت، الآیة: ۴۹.

کرتے چلے آئے ہیں۔پس اہل السنّت والجماعت کے لفظ سے طریقہ اور مذہب بھی نکلتا ہے اور طریقہ کے ساتھ اہل طریق کی معیت ملازمہ بھی مفہوم ہوتی ہے جو حقائق کے سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چناں چہ قرآن کریم نے دینی سلسلہ میں تعلیم وتربیت کے بھی دو اصول ذکر فرمائے ہیں۔ایک کتاب اور ایک استاذ۔گویا کتاب کے ساتھ ایک عالم کتاب رسول،ضرور لازم رکھا ہے تاکہ وہ کتاب کے جلی وخفی حقائق سمجھائے بھی اور کرکے دکھلائے۔

چناں چہ ارشادِ ربانی ہے۔﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ.﴾ ① ’’بلاشبہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تاکہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں‘‘۔اس لئے اہل السنّت والجماعت کا عنوان ایسا جامع عنوان نکلا کہ اس میں دینی تربیت کے ان دونوں بنیادی اصول (کتاب اور شخصیت) کی طرف اشارہ ہوگیا جن سے ایک سچی جماعت یا صادق فرقہ کی تشکیل ہوتی ہے کہ اس کے لقب میں طریق اور اہل طریق دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ جو اہل السنّت والجماعت ہے وہ اہل حدیث اور اہل قرآن بھی ہے کہ یہ کتاب کا مرتبہ ہے۔اہل عترۃ بھی ہے کہ یہ شخصیت کا درجہ ہے لیکن ہر اہل حدیث اور اہل قرآن کا اور اہل عترۃ کا اہل السنّت والجماعت ہونا ضروری نہیں کہ ان القاب میں کسی میں فقط کتاب کی طرف اشارہ ہے اور کسی میں محض شخصیت کی طرف۔پس حدیث میں جہاں بھی مسلمانوں کو اہل حدیث فرمایا گیا جیسے حدیث انسؓ سخاوی سے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ’’اَنْتُمْ اَهْلُ الْحَدِيْثِ سے خطاب کیا گیا یا قیامت میں کیا جائے گا یا کسی حدیث میں مسلمانوں کو اہل قرآن کہا گیا ہے جیسے حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ فاوْتروْا يَآ اَهْلَ الْقُرْاٰنِ. ’’اللہ وتر ہے،وتر کو پسند کرتا ہے پس وتر پڑھو اے اہل قرآن‘‘۔②

یا کسی حدیث عترت کے اتباع کی دعوت دے کر گویا انہیں اہل عترت کہا گیا یہ سب اسماء جزوی اور نسبتی ہیں کہ یا مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا اصحاب واہل بیت کی طرف ایک دم اشارہ بلکہ صراحۃً موجود ہے۔دراں حالیکہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے القاب والی روایات میں اس لقب سے کسی اصطلاحی جماعت کی طرف اشارہ نہیں ورنہ چکڑالوی اہل قرآن اور شیعان اہل عترت کو اپنی حقانیت پر استدلال لے آنے کا کافی موقع مل جائے گا۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نسبت محض ہے جو ملابست کی وجہ سے فرمائی گئی ہے جیسے جنت میں مختلف دروازوں باب الصلوٰۃ باب الجہادِ باب الریان وغیرہ سے داخل ہونے والوں کو محض ان اعمال یا ان دروازوں کی طرف منسوب ہوجانے کے سبب مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔بعض کو اہل الصلوٰۃ کہا گیا بعض کو اہل الصیام کہا گیا

① پارہ:۲۷،سورۃ الحدید،الآیۃ:۲۵.

② السنن للترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء ان الوتر لیس بحتم ج:۲ ص:۲۵۵.

اور بعض کو اہل الجہاد کہا گیا۔ یا بعض روایات میں انہیں اہل دین کہا گیا ظاہر ہے کہ ان القاب سے فرق اور مذہبی گروہ مراد نہیں ہیں بلکہ محض نسبتوں کا اظہار ہے جس سے مسلمانوں کی امتیازی شان اور تشریف مقصود ہے نہ کہ عقائد و مسائل کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرمانا۔ اسی طرح حدیث میں اہل الحدیث اہل القرآن فرمانے سے اصطلاحی جماعتیں چکڑالوی یا امرتسری مراد نہیں بلکہ نسبتوں کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے بھی نسبت ہے۔ حدیث سے بھی ہے۔ صحابہؓ سے بھی ہے صلوٰۃ سے بھی ہے صیام سے بھی ہے جہاد سے بھی ہے ، دین سے بھی ہے کلمہ طیبہ سے بھی ہے۔ پس ایک مسلمان اہل حدیث بھی ہے اہل قرآن بھی ہے اہل عترت بھی ہے ، اہل صلوٰۃ بھی ہے اہل صیام بھی ہے۔ اہل جہاد بھی ہے، اہل دین بھی ہے، اہل علم بھی ہے اور اہل

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی ہے۔ لیکن "مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِىْ" کا جملہ جس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا لقب مستنبط ہوتا ہے بولا ہی گیا ہے فرق کے تذکرہ کے سلسلہ میں اور اس لقب سے ایک ہی فرقہ کی تشخیص منظور ہے جو عنداللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ پس یہ لقب محض نسبت ہی نہیں بلکہ ایک جماعت کا شرعی سرنامہ اور عنوان ہے، اس لئے میرے خیال میں اہل السنّت والجماعت نے اس لقب کو اپنے لئے اختیار کر کے اپنے کمال تفقہ کا ثبوت دیا ہے کہ مسلک کا لقب بھی منصوص ہی انتخاب کیا یعنی اہل السنّت والجماعت اور پھر لقب بھی وہ اختیار کیا جو لقب ہی کے طور پر حدیث میں مذکور ہوا ہے نہ کہ محض نسبت کے طور پر "فَمَآ اَحْسَنَ فِقْهُهُمْ وَاَحْسَنَ بِدِرَايَتِهِمْ" پس جس طرح حدیث کی اس نسبت "اہل حدیث" سے "اہل قرآن" کی نفی نہیں ہوتی اور اہل قران کے لفظ سے اہل حدیث کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل حدیث کے لفظ سے آخر اھل السنت والجماعت کے لقب کی یا ان کے مسلک فقہ کی یا اس کے لوازم اجتہاد و تقلید کی نفی کیسے ہو جائے گی اور حدیث کی یہ مراد ہی کب ہے کہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے لقب کو بمقابلہ لقب اہل السنّت والجماعت استعمال کیا جائے؟ نہیں بلکہ سوچا جائے کہ اگر فرقہ ناجیہ کے لقب (اھل السنت والجماعت) سے نسبت محض اہل حدیث یا اہل قرآن کی نفی کی جاتی تو موقع بھی تھا لیکن نسبت محض کے عنوان سے ایک جماعتی لقب کے عنوان کی نفی کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے جبکہ وہ منصوص بھی ہو۔ بہرحال اھل السنت والجماعت بحمداللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ فرقہ ضالہ نہیں۔ اس کا لقب شرعی ہے بدعت نہیں۔ اس کے دستور العمل کا لقب (فقہ) منصوص ہے، اختراعی نہیں۔ اس لئے اگر یہ شرعی جماعت اپنے شرعی مسلک کے مسائل کو بنام فقہ ایک جگہ مرتب اور جمع کر دے تو اس میں ملامت کی کیا بات ہے؟ چناں چہ آئمہ مجتہدین کے فقہیات مرتب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ کروڑوں مسلمانوں کے لئے دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور کبھی بھی امت نے ان کو ذریعہ مطاعن و ملامت نہیں بنایا۔ بلکہ ہر طبقہ نے امت کی اس محنت کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے قرآنی معجزہ کی حجت سمجھا کہ اس کے ذریعے سے قرآن کے علوم سربستہ جو اس کے اعجاز کی روح اور وجوہ اعجاز کا اہم جزء تھے، کھل گئے اور کتاب وسنت کے جوامع کلم کی اعجازی بلاغت و جامعیت نمایاں ہوگئی۔

تقلید شخصی اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے...... بہرحال جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ اجتہاد مشروع، اجتہاد پر عمل مشروع، ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کیا جانا شرعی چیز، اس کا نام رکھنا شرعی بات اور ان سارے اجتہادات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر اور ساتھ ہی یہ کہ ہر اجتہادی مسئلہ میں دو آراء کا ہونا ممکن اور دائرہ شرع میں داخل بلکہ مستحسن اور مطلوب ہے۔ تو یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل میں پھر تقلید شخصی بھی ناگزیر طریقہ پر ضروری ہو کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں دائر و سائر کبھی رہ ہی نہیں سکتا، نہ اعتقاداً نہ عملاً آخر ایک ساعت میں ناسخ ومنسوخ، راجح ومرجوح، اولیٰ غیر اولیٰ، حقیقت ومجاز، مشترک، مؤول، واجب اور مکروہ، فرض اور حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے؟ چاروناچار ایک ہی جانب کو اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غیر مجتہد کو اختلافیات میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنا پڑے گی۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسئلہ میں ایک امام کی تقلید ہو اور دوسرے میں دوسرے کی تو میں کہوں گا کہ: جس مسئلہ میں بھی کسی کی تقلید ہوئی ایک کی ہوئی اور وہی تقلید شخصی پھر باقی رہی۔ زیادہ سے زیادہ امام کئی ہو گئے۔ مگر ہر ہر مسئلہ میں امام ایک ہی رہا اور تقلید بھی واحد ہی کی رہی۔ یہ تو نہ ہوا کہ کسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعددہ ہوگئیں امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واقع ہوئی وہ رہی شخصی ہی۔ یا اگر ایک شخص ایک مسئلہ میں صبح کو ایک امام کا مقلد ہے اور اسی مسئلہ میں شام کو دوسرے کا، جبکہ وہ دونوں مختلف الرائے بھی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اب بھی وہ تقلید شخصی ہی رہی کیونکہ جس صبح کو اس نے ایک امام کی تقلید کی تو اس صبح کو وہ یقیناً دوسرے امام کے نظریہ سے ہٹا ہوا اور اس کے عمل سے الگ تھلگ۔ شام کو جب اس نے دوسرا امام اختیار کیا، تو یقیناً صبح کا مذہب اور صبح کا امام بھی بدل دیا۔ اس لئے صبح کو تقلید شخصی ہی کی اور شام کو بھی تقلید شخصی ہی رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عقلاً کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کون سی مذموم ہے اور کون سی مستحسن؟ مگر مختلف فیہ مسائل میں کوئی نوعیت ہی لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لئے اور تحقیق شخصی کے سوئے مجتہد کے لئے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ عقلاً آدمی بیک وقت نقیضین میں دائر وسائر کبھی نہیں رہ سکتا۔ نیز دین میں شرعاً تناقض غیر ممکن ہے۔ جو بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے علماً اس کی ایک جانب کو بڑھا ہے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً وعملاً مسئلہ کی ایک جانب کو اختیار کر رہا ہے وہ ناگریز ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے ورنہ وہ اور اس کا دین تناقض کا شکار ہو جائے گا۔ جو عقلاً وشرعاً محال ہے جس کی دین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہاں اس کے نظائر ملیں گے کہ ایک جانب سے رجوع کر کے دوسری جانب اختیار کر لی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی جانب کو ترک کرنا پڑے گا۔ اور وہ تقلید شخصی یا تحقیق شخصی پھر آ جائے گی۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک کے زیر عمل ہوتے ہوئے دوسری بھی معمول بن جائے۔

تقلید شخصی کون سی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟...... رہا یہ کہ ان ساری شخصی تقلیدات میں مطلوب کون سی تقلید ہے یا عقلاً اور نقلاً قابل قبول بلکہ قابل وقوع کون سی ہے؟ سو اس کے متعلق اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صرف ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ عمل کے دائرہ میں ایک ہی فقہ کے تمام مسائل پر عمل کیا جانا یا بالفاظ دیگر کل مسائل اجتہادیہ میں ایک ہی امام کی تقلید کیا جانا ضروری ہے کیونکہ علمی نظر میں یہ غیر ممکن ہے کہ اجتہادیات میں تقسیم کر کے بعض مسائل میں ایک امام کی اور بعض میں دوسرے کی تقلید کی جا سکے۔ بلکہ جس فقہ کو بھی اختیار کیا جائے گا اسے پورے ہی کو اختیار کرنا پڑے گا ورنہ وہی تناقض محال کسی نہ کسی جہت سے سر پر پڑ جائے گا۔ بعض مسائل میں جزئیاتی تناقض نمایاں ہوگا۔ بعض میں ان جزئیات کے مبادی اور تعلقات کا تناقض رونما ہوگا اور بعض میں ان جزئیات کے کلیات اور اصول میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیوں کہ:

1 ...... بعض مسائل اجتہادیہ تو وہ ہیں کہ خود ان ہی میں کھلا تناقض ہوتا ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے۔ مثلاً مس مراۃ (عورت کا چھودینا) کہ حنفیہ کے یہاں ناقض وضو نہیں اور شوافع کے یہاں ہے یا خارج من غیر السبیلین شوافع کے یہاں ناقض وضو نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا ہوا تناقض ہے جو حکم کے لحاظ سے بھی ہے اور بناء حکم یعنی دلائل وغیرہ کے اعتبار سے بھی۔ پس ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ وہ ان مسائل کی ان دو متناقض جہات کو متناقض مانتے ہوئے بیک وقت نہ دونوں پر عمل کر سکتا ہے نہ دو اعمال کے درمیان دائر سائر رہ سکتا ہے کہ دین میں ایسے تناقض کی کوئی حجت اور کوئی نظیر ہی موجود نہیں الا یہ کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے دو متناقض باتوں میں صراحۃً امت کو خیار دے دیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں دو فقہیات یا دو فقہا میں دائر سائر رہنا کھلا تناقض قبول کر لینا ہے گویا دو متعارض چیزوں کو بیک وقت حق جان کر قابل عمل ماننا ہے جو عقلاً بھی باطل ہے اور شرعاً بھی محال ہے اس لئے ناگریز ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عامی آدمی کھلے طور پر مسئلہ کی ایک ہی جانب اختیار کر کے ایک ہی امام کی تقلید پر مجبور ہوگا۔

2 ...... دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ کی دو متخالف جانبین میں سے ایک وقت ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے وقت دوسری پر۔ یا ایک امام اور ایک فقہ کا پابند رہتے ہوئے اسی نوع کے کسی ایک آدھ مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے اور جبکہ اس مسئلہ کی وہ جانب ہی چھوڑ دی جائے گی جو اپنے امام کی اختیار کردہ تھی اور صرف وہی جانب لی جائے گی جو دوسرے امام کی مختار ہے تو اس میں وہ مذکور تناقض حکم بھی پیدا نہ ہوا اور ایک امام کی تقلید سے بھی آدمی باہر نہ ہوا کہ بہر حال اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً کل ہی مسائل میں بجز اس ایک آدھ مسئلہ کے اپنے ہی امام کی تقلید موجود ہے تو ایسی معدودے چند جزئیات میں دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک حنفی تمام مسائل فقہیہ میں حنفی رہتے ہوئے مفقود کے مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب پر عمل کرنے لگے اور حنفیہ کا مسلک اس بارے میں ترک کر دے تو اس میں وہ تناقض یا جمع بین الضدین کب لازم آیا جس سے بچنے کے لئے دو تقلیدیں

غیر معقول سمجھی گئی تھیں لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو وہ تناقص اب بھی موجود ہے اس خاص جزئیہ میں نہیں تو اس کے مبادی اور متعلقات میں موجود ہے وجہ یہ ہے کہ ہر ایک امام جب کسی مسئلہ میں کوئی اجتہادی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے سامنے اس باب کے تمام مسائل کا ایک سلسلہ مستحضر ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذوق اور اصول سے ان تمام مسائل باب میں ایک خاص تناسب محسوس کرتے ہوئے اور اپنے ذوق اجتہاد سے اسی تناسب کو قائم رکھ کر اس باب کے تمام مسائل کی کڑیاں جوڑتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے امام کی ذوقی نظر میں بھی مذکورہ تناسب کا مذہبی رنگ قائم ہو بلکہ وہ تناسب وتوازن کا کوئی اور رنگ لئے ہوئے ہو جو اس رنگ سے بالکل جداگانہ ہو اس لئے اگر ایک امام کا مقلد کسی ایک مسئلہ میں بھی دوسرے امام کی تقلید کرے گا تو اس خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے ہمرنگ اور مبادی دوسرے مسائل میں تناقض رونما ہوگا اور اس نئے مقلد کے سر ان متعلقات مسائل کی تقلید بھی لازم آ جائے گی جن میں تقلید کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ مفقود کے مسئلہ میں یہی صورت ہے کہ مالکیہ کے یہاں چار سال میں تفریق اس پر دائر ہے کہ ان کے یہاں اکثر مدت حمل چار سال ہے اس لئے چار سال تک براءۃ رحم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز چار سال کے بعد اعسار بھی موجب تفریق ہو جاتا ہے لیکن فقہ حنفی میں اکثر مدت حمل دو سال سے زائد نہیں اور اعسار موجب تفریق نہیں پس مفقود کے اعتبار سے چار سال پر تفریق کا فتویٰ دیا جانا گویا مدت حمل بھی چار سال مان لینا اور اعسار پر تفریق کا ترتب کر لینا ہے حالانکہ یہ حنفی بحیثیت حنفی ہونے کے اکثر مدت حمل دو سال مانے ہوئے ہے جس سے ابھی تک منکر نہیں اور اعسار کو موجب تفریق ہی نہیں کہتا۔

پس وہ مسئلہ مفقود کے معانی میں حنفی بھی ہے اور مالکی بھی ہے۔ دو سال کا بھی قائل ہے اور چار سال کا بھی، تفریق اعسار کا بھی قائل ہے اور عدم تفریق کا بھی قائل ہے اگر نفس مسئلہ مفقود کے فتویٰ میں وہ گرفتار تناقض نہ ہوا تو اس کے مبانی اور متعلقات میں ہو گیا جس کے رفع ہونے کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ میں حنفی رہے یا ہر مسئلہ میں مالکی بن جائے۔

3 ...... تیسری صورت یہ ہے کہ نہ ایک مسئلہ کی دو جانبین میں دائر رہے نہ ایک مسئلہ کے دو اجتہادی پہلوؤں میں دو وقتوں میں دائر رہا جائے بلکہ دو باب کے الگ الگ مسائل میں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو دو اماموں کی تقلید کی جائے مثلاً فروع صلوٰۃ میں ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور فروع حج میں مثلاً دوسرے کے اجتہاد پر تو اس میں بظاہر تناقض کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور تقلید شخصی کی مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں گو جزئیاتی تعارض نہیں مگر اصولی اور کلیاتی تعارض سے یہاں بھی مفر نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر امام کے اصول استنباط الگ الگ ہیں جو اس کے فطری مزاج اور افتاد طبع سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس لئے وہی رنگ اس کے پورے فقہ میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شرائع میں انبیاء علیہم السلام کا رنگ سمایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شریعت جبکہ نبی کے دل و دماغ سے ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے تو نبی کا فطری رنگ شریعت

میں جھلکنا ناگزیر ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان جلالی تھی تو شریعت کے احکام میں بھی تشدد اور شدت غالب ہے۔عیسیٰ علیہ السلام کی شان جمالی اور رافت و رحمت کی تھی تو ان کی شریعت میں بھی لین (نرمی) کا غلبہ ہے۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جامع شئون تھی جن کا غالب رنگ عدل واعتدال اور رحمت و یسر تھا تو شریعت محمدی کے ہر ہر مسئلہ میں یہ جامعیت اور مظاہرہ عدل و رحمت بھی نمایاں ہے۔غرض مذہب کے اصول وفروع میں صاحب مذہب کی فطری ذہنیت کا الگ رنگ اس لئے جھلکنا ضروری ہے کہ یہ تمام الہامی اصول وفروع اسی کی ذہنیت کے راستے سے گزر کر آتے ہیں۔اس لئے باوجود دین انبیاء کے واحد ہونے کے ہر نبی کی شریعت کا ایک ممتاز رنگ ہے اور اس کے کمالات وکرامات کا ایک خاص لون ہے جو دوسروں میں نہیں۔ اور اس رنگ کے ماتحت اس کے تربیت یافتوں میں بھی وہی رنگ سرایت کرتا ہے جو مقتداء اعظم کا ہوتا ہے چناں چہ مختلف امم کی شئون اور آثار وخواص بالکل ممتاز اور باہم متخالف بھی ہیں اور اپنے اپنے نبی کی شئون کا مظہر اتم بھی ہیں۔اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے ایک دریا باوجود ایک ہونے کے جس جس خطہ زمین سے گزرتا ہے اس کی خصوصیات اور وہاں کی ہواؤں کے مخصوص اثرات لیتا جاتا ہے اور اس کے سیراب ہونے والوں کے مزاج میں بھی وہی کیفیت سرایت کرتی ہے۔

پس شرائع تکلیفیہ کی طرح یہ شرائع وضعیہ (اجتہادی مسالک) بھی باوجود متحد الاصول ہونے کے جس امام کے دل و دماغ سے گزر کر وجود کا جامہ پہنتی ہیں اس کا ذوقی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اور اسی کے ذوق سے نکلے ہوئے اصول استنباط سے مستنبط ہوتی ہیں۔۔پس اس مجتہد کا پورا فقہ اور فقہ کے سارے ابواب اسی ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔جو انجام کاران عملی جزئیات کے واسطہ سے اس فقہ کے ہر متبع میں سرایت کرتا ہے۔گویا اس فقہ کے تربیت یافتوں کی ذہنیت بھی اسی رنگ کی ہو جاتی ہے جو اصلی مربی اور بانی فقہ کی ہوتی ہے۔مثلاً کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا۔کسی میں شدت ہے اور کسی میں لین۔ کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا۔۔کسی میں دیانات کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست ونظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے۔کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے۔۔اور کسی میں باطنیت کا۔۔کسی میں تأسی یا اسوۃ السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات کے تتبع واستقراء کا۔ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہر روایت ہوں گے اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جہاں تأسی کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح تعامل سلف ہوگا اور جہاں شرعی جمہوریت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح سلف کی اکثریت ہوگی۔بہر حال جس امام کی جو بھی ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عمل ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا

ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔

پس اگر دو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کر دے تو گو وہ جزئیاتی تناقص میں گرفتار نہ ہوا مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں اور ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اگر فی الحال تناقض مضر ہے اور وہ جزئیات کو ناقابل عمل بنا سکتا ہے تو وہی تناقض کلیات کو ناقابل نظر کیوں نہیں بنا دے گا؟ اور جبکہ عمل نظر کے تابع ہے تو بالواسطہ اس کے عمل میں مفاسد پیدا ہوں گے جو بعد چندے ظاہر ہونے لگیں گے۔

ائمہ کے اختلاف مزاج سے پیدا شدہ مختلف اصول...... ائمہ کے اس اختلاف مزاج کو امثلہ سے واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ مثلاً تعارض روایات کے وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ قوت سند ہے وہ روایات متعارضہ میں عموماً قوت سند کے معیار سے ترجیح دیتے ہیں۔ پس جس حدیث کی سند اصول روایت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگی وہ اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دے کر دوسری ضعیف السند روایات کو جو اس کے خلاف ہیں یا ترک کر دیں گے یا مرجوح قرار دیں گے یا اس کی کوئی توجیہ کریں گے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرۃ کا ایسی صورت میں سب سے بڑا اصول تأسی باسوۃ السلف ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان دو متخالف روایات میں اہل مدینہ کا تعامل کس طرف ہے۔ یہ تعامل جس روایت کے ساتھ ہوگا وہ اختلافی مسائل میں اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دیں گے اور بقیہ روایات کو ترک کر دیں گے ان کی کوئی توجیہہ کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اصولی معیار ایسے اختلافی مواقع پر رجحانات سلف کا تتبع ہے کہ کثرت سے فتاویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ علیہ کس طرف ہیں۔ جدھر بھی یہ صورت ہوگی وہ اسی روایت کو مذہب کی اصل قرار دے کر بقیہ روایات کا اسی سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ اصول ایک خاص جامعیت کے ساتھ تطبیق و توفیق بین الروایات ہے۔ یعنی وہ ایک باب کی تمام متعارض روایات کو جو قابل احتجاج ہوں بیک دم سامنے لا کر ان کے مجموعہ سے شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کا پتہ چلاتے ہیں اور نور اجتہاد سے یہ دیکھتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ سے شارع علیہ السلام کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت میں زیادہ واضح ہوتا ہے اس کو مذہب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ سنداً کچھ ضعیف ہی ہو اور بقیہ روایات کو اس طرح اس کلی غرض و غایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایات اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات میں مسئلہ ایک ہی

ہے مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے کسی میں اس کی حکمت ہے اور کسی میں اس کی کیفیت ہے اور کسی میں اس کی کمیت ہے، کسی میں اس کی اصلیت ہے اور کلیت ہے اور کسی میں اس کے احوال وعوارض ہیں۔غرض روایات کو غرض شارع کے سلسلہ سے ترتیب وار جوڑ کر انہیں جمع کر دینا امام رحمۃ اللہ علیہ کا اصل اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پیغمبر کا ہر گوشہ تا بحد امکان زیرِ اعمال آ جائے زیرِ اہمال نہ رہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ کی چند امثلہ......مثلاً صوم سفر کے سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہوئیں کسی حدیث میں نمایاں ہے کہ سفر میں صوم افضل ہے افطار سے۔ چناں چہ حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَنْ اَخَذَبِهَا فَحَسَنَ وَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّصُوْمَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ.** ① ''افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہوگی اور جو روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ عزیمت روزہ ہی رکھنا ہے مگر جائز افطار بھی ہے۔ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے صوم سے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں بزمانہ رمضان ہم سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہجوم دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ایک روزہ دار کی حالت گرمی سے بہت بگڑ رہی ہے۔ فرمایا **لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ.** ② ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں''۔

دوسری حدیث میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ کچھ لوگ روزہ دار تھے، کچھ بے روزہ، منزل پر پہنچ کر روزہ دار تو بے دم ہو کر گر پڑے اور بے روزہ لوگوں نے کام کئے، خیمے گاڑے، جانوروں کو پانی پلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ **ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ بِالْاَجْرِ** ③ ''بے روزہ لوگ اجر سمیٹ لے گئے''۔

اور بعض روایات میں صوم اور افطار میں تخییر معلوم ہوتی ہے کہ خواہ روزہ رکھ لو خواہ افطار کر لو، دونوں برابر ہیں۔ چناں چہ ان ہی حضرت حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ **اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَ اِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ** ④ ''بحالت سفر جی چاہے روزہ رکھ لو اور جی چاہے افطار کر لو''۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب التخيير في الصوم ج:٥ ص: ١٥١.
② الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لمن ظلل عليه ج:٧ ص: ٢٩.
③ الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير، باب فضل الخدمة في الغزو، ج: ١٠، ص: ١٥.
④ الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب الصوم في السفر والافطار، ج:٧، ص: ٣٣.

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ واوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث انس ؓ کو اختیار کر کے کہا کہ: سفر میں افطار افضل ہے تو انہوں نے افضل صوم اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض افضلیت صوم کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض تخییر کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور افضلیت صوم دونوں کی نفی کر دی اور معیار انتخاب روایات ان حضرات کے یہاں وہی حدیث کی سند کی قوت وضعف یا تعامل کی مطابقت وغیرہ ہے۔ لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تطبیق وتوفیق روایات کے ماتحت تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما کر سب کو قابل عمل بنا دیا اور کسی ایک جہت کی نفی نہیں کی۔ انہوں نے نور اجتہاد اور ذوق تشریع سے دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع علیہ السلام کی غرض مختلف احوال میں مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنی ہے۔ پس حدیث تخییر کو تو مساوات فی الجواز پر محمول فرمایا کہ اس سے شارع کی غرض صوم وافطار دونوں کو بلا کراہیت جائز بتلانا ہے کہ نفس جواز صوم وجواز افطار میں کوئی تفاوت نہیں اور افضلیت صوم کی روایت کو اصل پر محمول فرمایا کہ بالذات صوم ہی افضل ہے کیونکہ رمضان زمانہ ہی صوم کا ہے اس میں افطار کسی طرح اصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اصلی افضلیت صوم ہی کو حاصل رہے گی جس کو اس روایت سے ظاہر فرمانا مقصود ہے اور افضلیت افطار کی روایت کو عوارض پر محمول فرمایا کہ جب حالت پریشان کن ہو جائے اور روزہ رکھنے میں تعب حد اعتدال سے گزرنے کا خطرہ ہو تو پھر عارضی فضیلت افطار ہی میں ہے۔ پس تخییر ہوئی جواز میں۔ افضلیت صوم ہوئی اصلیت صوم اور وقت میں اور افضلیت افطار ہوئی احوال صائم میں اور ظاہر ہے کہ جب مسافر پر یہی تین احوال آ سکتے تھے تو شارع نے تینوں حالات کا حکم بیان فرما دیا پس ان تین حالات کی تفسیر نے ساری روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھا دیا۔ تخییر بھی باقی رہی۔ افضلیت صوم بھی قائم رہی اور افضلیت افطار بھی ثابت رہی کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہ ہوئی۔

پس امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس علم دقیق سے ساری احادیث کو جمع کر کے قابل عمل بنا دیا نہ ان میں اور نہ کسی حدیث میں دور از کار تاویل وتوجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ یا مثلاً شک کے بارہ میں تین قسم کی احادیث وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب شک ہو جائے کہ کتنی رکعات پڑھی ہیں تو نماز کا اعادہ کرنا چاہئے ''اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْتَأْنِفْ'' جب کسی کو نماز کی رکعات میں شک پڑ جائے تو نماز لوٹا لے''۔

دوسری یہ کہ بصورت شک نماز ہی میں تحری کرنی چاہئے یعنی اٹکل لگا کر غور کرنا چاہئے کہ کتنی رکعات ہوئیں۔ جدھر غلبہ ظن ہو، اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے۔ ''اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلْیَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْیُتِمَّ عَلَیْہِ'' جب کسی کو تم میں سے نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے تو اٹکل لگانی چاہئے۔ اور اسی پر (جو اٹکل میں غلبہ ظن سے دل میں آ جائے) نماز پوری کر لینی چاہیے''۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب شک ہو جائے اور اٹکل سے غلبہ ظن بھی کسی جانب سے حاصل نہ ہو کہ تین رکعت ہوئی ہیں یا چار تو جانب اقل کو اختیار کر کے اس پر نماز کی بناء کرو۔ تین اور چار میں اقل عدد تین کا ہونا

بہرصورت یقینی ہوگا۔ اس لئے یقینی جہت لے لو۔ چناں چہ عطاء بن یسار کی حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلَمْ یَدْرِ کَمْ صَلّٰی؟ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا فَلْیُطْرِحِ الشَّکَّ وَلْیَبْنِ عَلٰی مَا اسْتَیْقَنَ''. ''جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار، تو شک کو چھوڑ کر جو جانب یقینی ہے (یعنی اقل) اسی پر بنا کرنی چاہیے''۔

ان تینوں احکام میں سے ایک ایک کو ایک ایک مجتہد نے اختیار کرلیا ہے بعض نے شک کی صورت میں اعادۂ صلوٰۃ کا حکم اختیار کرلیا ہے تو انہیں قدرتی طور پر تحری (عمل بغلبہ ظن) اور بناء علی الاقل کی نفی کردینی پڑی ہے۔ جمہور نے تحری اور غلبہ ظن کا اعتبار کیا ہے تو انہیں استیناف اور بناء اقل کا حکم ترک کردینا پڑا ہے لیکن جب کہ یہ تینوں صور حدیث میں آچکی ہیں تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جمع بین الروایات کے اصول کے ماتحت تینوں احکام کو بیک دم اختیار کرکے تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما دیا۔ اگر عمر میں پہلی بار شک پڑا تو اس کے لئے اعادہ صلوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ بار بار کے شک اور اعادہ سے جب شک کا وقوع عادۃً ضروری ہے نماز وبال جان ہو جائے گی جو تیسیر دین کے خلاف ہے اور حرج شرعاً مدفوع ہے اگر ایک سے زائد بار شک پڑنے لگے تو تحری کا حکم ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کیا جائے اور اگر غلبہ ظن کسی جانب نہ ہو بلکہ دونوں جانبین میں شک مساوی رہے تو جانب اقل کو اختیار کیا جائے جو یقینی ہے۔ اس صورت میں اعادہ صلوٰۃ، تحری اور بناء اقل تینوں حکم جمع ہوگئے اور روایات میں کسی کا رد اور کسی کا قبول لازم نہ آیا جس کی فقہی روح یہ ہے کہ شک ہو جانے پر اعادۂ صلوٰۃ، تحری اور اختیار اقل در حقیقت حصول یقین اور دفع شک کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی شک میں جو ایک مرض نا آشنا کی طرح نماز میں طاری ہوا حصول یقین اعادہ صلوٰۃ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ پچھلی مشکوک نماز ترک کردی جائے۔ کیونکہ جس کے لئے شک کا مرض ہی نیا ہے وہ ابتداءً ہی اس کے علاج پر غور کرسکتا ہے۔ ہاں بار بار کے شک میں جبکہ عادۃً اس کی حقیقت کھل گئی اور وہ عادت بھی بن گئی۔ نماز میں رہتے ہوئے بھی اس کا علاج ممکن ہوگیا اور وہ تحری اور اٹکل سے غلبہ ظن معلوم کرلینا ہے جدھر بھی غلبہ ہوگیا خواہ تین رکعت کی طرف یا چار کی طرف۔ پس امام صاحب کے طریق کے مطابق حدیث کے یہ تینوں احکام ایک دوسرے کی نفی اور تردید کے لئے نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے مختلف احکام بن جاتے ہیں جن میں نہ تعارض ہے نہ تدافع اور تینوں احادیث اپنی اپنی جگہ چسپاں ہو کر قابل عمل ہو جاتی ہیں۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق اجتہادیات میں یہ ہے کہ تابحد امکان ہر حدیث زیر اعمال آئے۔ زیر اہمال نہ رہے۔ اس لئے وہ عامۃ متعارض روایات میں سند کی قوت وضعف کے معیار سے ترجیح وانتخاب کی صورت اختیار نہیں فرماتے کہ اس میں کسی نہ کسی جہۃ سے ترک حدیث یا ترک عمل بالحدیث لازم آجانا یقینی ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ترک ہو۔ جس کی صورت انہوں نے یہی اختیار فرمائی کہ ایک باب کی تمام احادیث سے وہ پہلے شارع کی غرض وغایت کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر اسی بنیادی غرض

پر تمام احادیث کو دائر فرما دیتے ہیں۔ متعارض روایات میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تطبیق اور جمع بین الروایات اور دوسرے حضرات ائمہ کی ترجیح وتعلیل روایات کی امثلہ بکثرت ہیں جن سے فقہ حنفی بھری پڑی ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ دو مثالیں جو اس وقت سامنے آ گئیں عرض کی گئیں۔

اس طولانی بحث سے غرض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصول اجتہاد ائمہ کے فطری مزاج کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں جامعیت ہے تو اصول بھی جامعیت کے وضع ہوں گے۔ طبیعت میں ظاہریت ہے تو اصول میں بھی ظاہریت کا رنگ رہے گا اور طبیعت میں تاسی بالاسوہ کا مزاج ہے تو اصول میں بھی وہی رنگ نمایاں ہوگا اور ان ہی اصول پر مجتہد کا پورا فقہ مرتب ہوتا ہے جس سے متبعین فقہ اور مقلدین کی ذہنی اور عملی تربیت ہوتی ہے۔ پس اصول میں تخالف ہوگا تو مقلد کی ذہنیت پر عملی جزئیات کا اثر بھی متضاد ہی پڑے گا۔ گو ابتدا سے اسے کوئی جزئیاتی تخالف اور تضاد محسوس نہ ہو کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ مربوب میں سامان تربیت اثر انداز نہ ہو یا مثلاً متعارض روایات میں امام صاحب کا ایک خاص اصول یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلیہ اور ضابطہ عامۃ کا رنگ لئے ہوئے ہو اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں اور اس کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں کلیہ کو افعال جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کہ وہ معلوم السبب اور معلوم العلت ہے اور افعال جزئیہ واقعہ حال ہوتے ہیں جن میں کوئی عموم نہیں ہوتا کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ فرما دیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں بخلاف دوسرے آئمہ کے کہ وہ ان جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً آداب خلاء کے سلسلہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ ارشاد فرمایا گیا اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَلٰكِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا۔ ① ''جب تم استنجاء کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ پشت ہو کر لیکن شرقاً غرباً بیٹھو (تا کہ قبلہ بغل میں رہے)''۔

یہ ایک حکم عام ہے جس میں استقبال واستدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیونکہ یہ حکم عظمت بیت اللہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے تا کہ افعال خسیسہ کے وقت قبلہ کا استقبال واستدبار نہ ہو کہ وہ صورت توہین بیت اللہ ہے اور تعظیم بیت اللہ فی نفسہٖ حسن اور ہر زمان ومکان میں مطلوب ہے۔ چناں چہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث میں صراحتاً مذکور بھی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْبَرَازَ فَلْيُكْرِمْ قِبْلَةَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ ② ''جب تم میں سے کوئی استنجاء کے لئے جائے تو چاہیے کہ قبلہ الٰہی کا اکرام کرے اس کا استقبال نہ کرے یعنی قبلہ رخ ہو کر نہ بیٹھے''

① الصحيح للبخارى، كتاب الصلوٰة، باب قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق ج:٢ ص:١٥٣.

② السنن الكبرى للبيهقى، كتاب الطهارة، باب ماورد فى الاستنجاء بالتراب، ج:١، رقم:١١١.

پس جبکہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالت بول و براز استقبال و استدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے مقید نہ تھی تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب کی اساس اس کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال و استدبار کی حرمت کا فتویٰ دے دیا خواہ مکان ہو خواہ جنگل ہو بحالت قضاء حاجت استقبال قبلہ اور استدبار دونوں غیر جائز ہیں جس کیلئے اس حدیث کو بطور ایک کلی ضابطہ اور دستور العمل کے پیش فرمایا۔ مگر اس کلیہ کے خلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ افعال ثابت ہوئے۔ چناں چہ حسب روایت بخاری رحمۃ اللہ علیہ و مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور شام کی طرف رخ کئے ہوئے پیشاب کرتے خود دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوق خاص سے جن کا ذہن کلی انضباط اور تعلیمات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ اس جزئیہ سے متاثر ہوئے بغیر ضابطہ کلیہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور اس جزئی واقعہ کی ایسی توجیہات فرمادیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے کیونکہ کلیہ کا حکم جس علت پر دائر ہے یعنی تعظیم بیت اللہ وہ مکان اور صحراء ہر جگہ موجود ہے تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہے نہ سبب کا۔ لیکن دوسرے ائمہ نے جن کا ذہن تخصیصات کی طرف زیادہ چلتا ہے اس کلیہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کلیہ کا ہم پایہ جزئیات کو بناتے ہوئے یا اس جزئی واقعہ سے کلیہ سابقہ کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا کہ استقبال و استدبار مکان میں جائز اور اور صحرا میں غیر جائز۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ استدبار ہر جگہ جائز اور استقبال ہر جگہ غیر جائز۔

بہر حال یہ اختلاف اسی اصول استنباط کے اختلاف کے تابع ہے کہ اور حضرات نے صرف علم حدیث پر نظر فرمائی اور امام صاحب نے حکمت حدیث پر، اوروں نے ظہر حدیث لیا اور امام نے بطن حدیث کو آگے رکھا اور شارع علیہ السلام کا یہ منشاء پاکر کہ اصل مقصود حرمت بیت ہے اسے ہی بنیاد قرار دے دیا اب جو روایت اس کے خلاف آئی اس کی وجہ سے بنیاد کو منہدم نہیں ہونے دیا بلکہ اسے ہی بنیاد سے جوڑ دیا۔ پس ایک مقلد جو اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرے گا وہ درحقیقت ان اصول کی تقلید کرے گا جو ان مسائل میں سمائے ہوئے ہیں اور جبکہ ان میں تخالف ہے تو ان کی جزئیات میں بھی ہے یا مثلاً کہیں کہیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک باب کے اصل موضوع کی روح پر مطلع ہوتے ہیں جو نصوص کتاب وسنت سے ان پر منکشف ہوتی ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر اس باب کی تمام روایات کے انتخاب کا معیار اسی روح کو قرار دیتے ہیں اور خلاف روایات کی ایسی توجیہ فرمادیتے ہیں کہ اس روح پر کوئی اثر نہ پڑے لیکن دوسرے ائمہ مثلاً اس باب کی روح دوسری سمجھتے ہیں تو احکام میں اختلاف اس روح کے تفاوت سے پڑجاتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کے بارے میں جب فعلی اور ترکی احادیث آتی ہیں تو امام صاحب اکثر و بیشتر ترکی احادیث کو اختیار کرتے ہیں اور فعلی احادیث کو ان کے تابع کرتے ہیں جیسے قراۃ فاتحہ خلف الامام اور ترک قرآۃ فاتحہ کی

روایات میں ترک قراۃ کو، رفع یدین اور ترک رفع یدین میں ترک رفع کو، جہراً آمین اور ترک جہر میں ترک جہر کو جہر بسم اللہ اور ترک جہر میں ترک جہر کو، نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لئے جمع بین الاشارۃ والتسبیح کی بجائے ترک جمع کو اختیار فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام کے نزدیک نماز میں فعل پر ترک کو یا حرکت پر سکون کو ترجیح ہے۔ شاید اس بناء پر کہ امام کے نزدیک نمازی کی بناء سکون پر ہے حرکت پر نہیں اور یہ لطیفہ امام پر آیات و روایات اور نماز کے انداز تشریع سے منکشف ہوا۔ مثلاً نماز کی اصلیت کے بارہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ ① ''نماز بھاری ہے مگر خشوع والوں پر''

اور خشوع کی حقیقت سکون ہے جو اولاً قلب میں آتا ہے اور پھر قالب پر، پھر اسی کے ساتھ امام نے نماز کی رفتار تشریع پر نظر فرمائی ہو کہ اس میں بھی حرکت سے سکون کی طرف آئے مثلاً پہلے نماز میں نقل و حرکت جائز تھی بعد میں نص حدیث سے منسوخ ہوئی اور سکون آ گیا، پہلے سلام کلام جائز تھا بعد میں بنص حدیث اس سے روک کر سکوت کا حکم دیا گیا، پہلے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) جائز تھا بعد میں منسوخ ہو کر اس بارہ میں سکوت پیدا کر دیا گیا، اولاً نشہ کی حرکات کے ساتھ نمازیں جائز تھیں بعد میں انہیں منسوخ کر کے نماز میں سکون پیدا کر دیا گیا۔

بہر حال رفتار تشریع حرکت سے سکون کی طرف آنا تھا تو امام کے اس قلب صافی نے جو ایک اساسی رنگ تشریع سے منصبغ (رنگا ہوا) اور افتاد شریعت کا محرم راز تھا یہ اخذ کیا کہ نماز میں اصل چیز سکون ہے۔ لہٰذا جتنا سکون ترقی کرتا جائے گا نماز کی حقیقت سے انتفاع زیادہ ہوتا جائے گا۔ شارع کی اس غرض کو پیش نظر رکھ کر امام کے نزدیک جب امام کے فعلی اور ترکی امور میں اختلاف و تزاحم واقع ہوا تو انہوں نے اسی رفتار اور لون اجتہاد کے ماتحت جانب سکون کو ترجیح دی اور تمام وہ روایت اختیار کر لیں جو اس رنگ پر مشتمل تھیں کہ ان کے نزدیک یہی روایات غرض شارع سے زیادہ موافق تھیں۔ خواہ سنداً وہ کسی درجہ کی ہوں، مگر قابل احتجاج ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فعلی اور ترکی روایات میں سے عموماً فعلی روایات کو ترجیح دی ہے۔ قراۃ فاتحہ کو اختیار کیا، رفع یدین کو ترجیح دی، جہراً آمین کو منتخب فرمایا، جہر بسم اللہ کو اولیٰ کہا وغیرہ وغیرہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی ہیئت کذائی پر غور کر کے اسے فعل سمجھا ہے اور جب وہ از قسم فعل ہے تو اس میں افعال جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا حسن بڑھتا جائے گا۔

حج میں اس کے برعکس قصہ ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ حج کی عبادت ہی حرکت ہے گھر سے نکلنا، بیت اللہ کے گرد گھومنا، صفا مروہ میں دوڑنا، عرفات کا سفر اختیار کرنا، منیٰ میں رمی جمار کرنا وغیرہ۔ غرض پوری عبادت ایک مستقل سفر اور متعدد انواع حرکات کا مجموعہ ہے۔ پس جتنے بھی افعال اور حرکات زائد ہوں گے، حج میں حسن پیدا ہوگا۔ اس لئے اس عبادت میں ان روایات کو ترجیح دی ہے جو کسی حرکت اور فعل پر مشتمل ہیں

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۵۔

بخلاف امام شافعی رحمہ اللہ، کہ انہوں نے حج میں اس کے برعکس جانب سکون اور تقلیل حرکت کی جہت کو اختیار فرمایا ہے شاید اس لئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حج مظاہرہ محبت ہے اور محبت کا ثمر ربودگی اور ترک ہے۔ ترک وطن، ترک لباس، ترک زینت، ، ترک خوشبو، ترک راحت، ترک لذت وغیرہ اس لئے اس عبادت میں جتنے تروک بڑھتے جائیں گے۔ اس کی حقیقت تام ہوتی جائے گی مثلاً قارن کے حق میں امام صاحب کے یہاں دو طواف اور سعی ہے اور شوافع کے یہاں ایک طواف اور سعی ہے وہ تکثیر فعل کی طرف گئے اور یہ تقلیل فعل کی طرف۔ اس قسم کی صدہا امثلہ کتب فقہ سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔ بہر حال حال حجت احوال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غائر نظر ہمیشہ اصول اور تہ کی طرف دوڑتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کی لم اور اس کی اندرونی بنیاد تک پہنچ کر غرض شارع کا پتہ چلاتے ہیں۔ اسی باطنی غرض اور حکمت کے معیار سے روایات کے احکام کے درجات قائم کرتے ہیں اور ان میں تطبیق و توفیق دیتے چلے جاتے ہیں اسی لئے ان کے فقہ میں کلیات، تعمیمات اور ہمہ گیری بہت زیادہ ہے، دوسرے حضرات حکم دیکھتے ہیں اور اسی کو اصل قرار دے کر روایات پر نظر کرتے ہیں تو احکام میں تعداد اور تکثیر تو زیادہ ہوتی ہے مگر انضباط تسلسل اور ترتیب اس طرح کی نہیں آتی کہ ہر ہر جزیہ کسی نہ کسی اصل اصل سے جڑا ہوا نظر آئے اور ہر ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے مربوط دکھائی دے۔

ظاہر ہے کہ تسلسل اور ترتیب میں انضباط ہوتا ہے اور دوسری صورت میں تکثیر احکام، اسی لئے فقہ حنفی میں ترتیب و تسلسل اور جامعیت و اجتماعیت کا رنگ غالب ہے اور دوسری فقہیات میں تکثیر احکام اور تکثیر جزئیات کا رنگ غالب ہے اور کلیاتی دائرہ محدود ہے، ظاہر ہے کہ جب یہ مخصوص رنگ کے اصول اپنے اپنے فقہ کے تمام ابواب اور ساری ہی اجتہادی فروع میں رچے ہوئے ہوں گے گویا ایک فقہ کے سارے مسائل کی تشکیل یہ ایک ہی رنگ کے اصول کریں گے تو اس پوری فقہ کا ایک مزاج قائم ہو جائے گا جو اپنے امام کے ذہنی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پھر وہی ذہنی مزاج ان کا بھی بنے گا۔ جو اس فقہ کی تقلید کریں گے، کیونکہ مربوب کی ذہنیت مربی ہی کی ذہنیت سے بنتی ہے۔ اس صورت میں دو فقہوں کی جزئیات خواہ کتنی ہی غیر متبائین ہوں اور بظاہر سطح تناقض سے کتنی ہی بعید ہوں، مگر یہ ذوقی الوان اور اصول استنباط کا تناقض ان میں رچ کر انہیں اصولی طور پر متضاد بنادے گا اور یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تقلید حقیقۃً جزئیات کے پردہ میں ان اصول کی ہوتی ہے جو ان جزئیات کو پردہ ظہور پر لاتے ہیں اور وہ متعارض ہیں تو وہی تضاد پھر باقی رہا، جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول وکلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد اس سے اشد ہوگا جو جزئیاتی تھا کہ جزئیات تقلید کے بارہ میں اصل ہی نہ تھیں۔ یہ اصول ہی اصل تھے اور اصل کا فساد فرع کے فساد سے عقلاً وشرعاً مہلک تر ہوتا ہے۔

پس ایسے اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے دو فقہین کی بیک دم تقلید کیا جانا اور بالفاظ دیگر ایک فقہ کی تربیت کے ہوتے ہوئے دوسرے فقہ کی تربیت کا رنگ اس پر چڑھایا جانا علاوہ تربیت کی دوعملی اور تضاد حالی کے ہر مربی

امام کی تربیت کو ناقص اور نکما بنالینا ہے۔

مثلاً اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان ہی اصول استخراج پر نماز کے ذریعہ سکون اور حج کے ذریعہ حرکت کا ذوق حامل فقہ میں راسخ کرنا چاہتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے برعکس اور اس ہرجائی مقلد نے نماز حنفی اصول پر پڑھ کر حج شوافع کے طریق پر کرلیا تو ذوق حرکت اسے کسی طرف سے بھی نہ مل سکے گا کیونکہ اس کی نماز تو ساکن رہی حنفی اصول پر اور حج ساکن رہا شافعی اصول پر۔ حالانکہ جو امام اپنے ذوق اجتہاد سے اس میں نماز کا سکون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اسی ذوق سے اس میں حج کی حرکت بھی راسخ کرنا چاہتا تھا کہ اس مجموعہ ہی سے اس کے نزدیک مقلد کی ذہنیت میں صحیح توازن پیدا ہوسکتا تھا اور اسی میں اس کی روحانی فلاح تھی لیکن جبکہ اس مقلد نے آدھی تربیت ایک سے کرائی اور آدھی ایک سے اور وہ بھی دونوں جانبین کے سکون عبادت ہی کی جہت لے لی تو اول تو کسی امام کے رنگ پر بھی اس کی تربیت مکمل نہ ہوئی اور جتنی ناقص بھی ہوئی وہ بھی دورخی مقام کی طرح ایک ہی جانب پر مشتمل رہی گویا یہ مقلد ناقص بھی رہا اور ایک جہت سمجھنے سے بھی خالی رہا اور اوپر سے کلیاتی تضاد حال کا شکار بھی ہوگیا، جو اس کے فساد مزاج کا پورا پورا سامان ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض، یونانی طبیب کا علاج کراتے ہوئے بعض ڈاکٹری ادویہ بھی استعمال کرنے لگے ظاہر ہے کہ ادویہ میں کوئی تعارض نہیں لیکن ادویہ کے مخفی سلسلہ میں جس کو روش علاج اور طریق تدبیر کہنا چاہئے اصولی تعارض ضرور موجود ہے جو مریض کے مزاج کو فاسد کردینے کے لئے کافی ہے کیونکہ ڈاکٹر اپنے اصول اور روش علاج کے ماتحت مثلاً مریض کو۔ دودھ کی تاکید کرے گا اور طبیب اپنی روش فن کے لحاظ سے اس سے روکے گا، ڈاکٹر مثلاً پھلوں کا استعمال ضروری قرار دے گا طبیب اس سے مانع آئے گا ڈاکٹر ایک غذا تجویز کرے گا، طبیب اس کے خلاف دوسری، غرض ایک جزوی دوا کے استعمال میں تو بظاہر کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا تھا مگر یہ دوا جس مجموعی روش اور جس ڈاکٹری اصول کے نیچے آئی ہوئی ہے وہ یقیناً اس روش و اصول کے معارض ہے جو طب یونانی کی ادویہ کی پشت پر ہیں اس ایک جزوی دوا کے راستہ سے یہ اصولی تعارض مریض پر متضاد آثار ڈالے گا اور مریض اس حالت میں زیادہ دن اپنی خیر نہیں منا سکے گا، مگر اس مخفی مضرت کو عوام نہیں صرف اطباء ہی پہچان سکتے ہیں جن کے قول پر اعتماد کرنے کے سوا مضرت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

عدم تقلید یا تقیضین میں دائر سائر رہنے کے چند واضح مفاسد..... ساتھ ہی اس پر غور کیجئے کہ اس ہرجائی پن اور تقیضین میں دائر رہنے کی عادت کا طبعی اثر ایک دوسری نوعیت مفاسد کی یہ ہوگی یہ شخص کئی کئی ائمہ اور مفتیین کی طرف رجوع کرتے رہنے کی حالت میں اپنے نفس کے لئے سہولیات تلاش کرنے کا عادی ہوجائے گا جدھر سہولت دیکھی ادھر ہی سے فتوی لے لیا اور ادھر کا مقلد بن گیا، اس صورت میں گویا یہ تقلید غیر معین غلبہ ہوا و ہوس کے ماتحت اس کی مطلب برآری کا ایک آلہ اور حیلہ ہوگی اور ان کئی ائمہ کے پردہ میں درحقیقت مقلد اپنے نفس کا ہوگا، جس کے سامنے طاعت حق نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اپنی راحت و سہولت و نفسانی شہوت ہوگی مثلاً ایک شخص نے وضو کیا اور پھر خون

نکلوایا جس پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضوٹوٹ گیا تو اس نے کہا کہ: میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضونہیں ٹوٹتا۔ اس کے بعد عورت کوشہوت سے ہاتھ لگایا جس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضوٹوٹ جاتا ہے تو اس نے کہا کہ: میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی لیتا ہوں کہ اس سے وضونہیں ٹوٹتا اور بلاتجدید وضونماز پڑھ لی چونکہ اس شخص کا وضو بالا جماع ٹوٹ چکا ہے گوسبب مختلف ہوئے اس لئے اس کی نماز سب کے نزدیک باطل ہوئی مگر یہ اپنے نزدیک پھر بھی اپنے کومتوضی اور مصلی سمجھ رہا ہے جس سے علاوہ خرقِ اجماع کے مفسدہ کے اس شخص کی ساری تحقیق اور تقلید کا حاصل حظ نفس اور مطلب برآری کے سوا کچھ نہ نکلا گویا اس کا دین اس کے ہوا کے تابع ہوگیا نہ کہ ہواء نفس دین کے تابع ہوئی حالانکہ صریح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ. ① ''عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے''۔ پھر فروع میں اس قسم کی آزادی کا خوگر ہو جانے سے اصول میں ایسی آزادی کا آجانا غیر مستبعد نہیں رہتا بلکہ عادۃً ایسا ہوتا ہے حالانکہ بنصِ حدیث شبہات میں پڑنے والا بالآخر حرام میں پڑ کر رہتا ہے۔

بہر حال ایسا مقلد عام جو بلاتعیین مختلف ائمہ کی تقلید کا خوگر ہے وہ یقیناً نقیضین میں دائر سائر رہے گا خواہ وہ تناقض جزئیاتی ہو یا کلیاتی۔ ساتھ ہی ان متخالف اجتہادات کے آثار سے اس کا روحانی مزاج بھی فاسد ہوئے بغیر نہ رہے گا یا ہواء نفس اس کے دین پر غالب آجائے گی یا وہ رضاء حق کا طالب نہ رہے گا یا اجماع امت کا ربقہ گلے سے نکال پھینکے گا اور نتیجہ فروعات کی آزادی اصول تک پہنچ جائے گی اور اصول کو بھی حظ نفس اور مطلب برآری ہی کا ذریعہ بنا کر بالآخر سرے سے دین کو کھو بیٹھے گا یہی وجہ ہے کہ روحانی تربیت اور نفسانی معالجہ کے سلسلے میں جس کے اطباء حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہیں ایک نبی کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے دوسری شریعت اور نبی کو حق جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے کی خاص طور سے ممانعت فرمائی گئی ہے ادب تو اتنا کہ ایک نبی اور اس کی شریعت کے انکار پر پورا دین حبط لیکن احتیاط اس پر یہ کہ اس سچے نبی کے ایک جزئیہ پر بھی بلا اجازت نبی زمان عمل غیر جائز اور ممنوع جس کا راز یہی ہے کہ ہر شریعت کی تربیت کا رنگ جدا جدا ہے۔ نفس میں ان کے متضاد آثار پیوست ہونے سے اس نفس کی ہلاکت ہے نہ کہ تقویت، چناں چہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود کی بعض باتیں ہمیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں اگر اجازت ہو تو لکھ لیا کریں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى قَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا

---

① مشکاۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ١، ص: ٣٦، رقم: ١٦٧. علامہ تبریزیؒ فرماتے ہیں: رواہ فی شرح السنۃ وقال النووی فی اربعینہ: ھذا حدیث صحیح رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح.

بَیْضَآءَ نَقِیَّةً وَلَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ. ① ''کیا تم اپنے احکام دین کے بارہ میں ابھی تک حیرت میں پڑے ہوئے ہو کہ دوسروں کی باتیں لکھنا چاہتے ہو؟ بلاشک میں تمہارے پاس ایک صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی آج زندہ ہوتے تو انہیں میرے اتباع کے سوا چارہ کار نہ تھا تو پھر تمہیں ان کا اور ان کی شریعت کا اتباع کب جائز ہے''؟

اس اصول پر مربیان باطن، حضرات صوفیا کرام قدس اللہ اسرارھم نے اپنے طریق تربیت کی بنیاد بھی توحید مطلب پر رکھی جس کا حاصل یہی ہے کہ ایک شیخ سے وابستہ ہو کر دوسرے کی طرف عملی رجوع کرنا باعث تباہی نفس ہے۔ ادب وتعظیم بالاستثناء سب کا ضروری ہے لیکن اتباع صرف ایک کی کہ ہر مربی باطن کا رنگ ذات ہی الگ ہے۔ اس سے پیدا شدہ اصولی تربیت کا رنگ بھی جدا جدا ہے اور اسی رنگ کے مطابق پروردوں کے نفوس پر احوال وکیفیات بھی اسی رنگ کے طاری ہونے ضروری ہیں۔ پس اگر توحید مطلب باقی نہ رہے بلکہ طالب وسالک اپنے تلون کے تحت مختلف مشائخ میں دائر سائر پھرتا رہے تو اس میں یکسوئی، ایک رنگی اور دل جمعی کی دولت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو تمام کمالات باطن کی اساس ہے اور اس لئے اسے تمام عمر کبھی بشاشت وتمکین میسر اس آسکتی جس کے لئے ساری ریاضات کی جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ طریق نبوت ہو یا طریق ولایت دونوں میں توحید مطلب کے بغیر تربیت کا کام نہیں چل سکتا، پھر اسی طریق کی روشنی میں اطباء جسمانی کو بھی توحید مطلب بنام توحید مطب اختیار کرنی پڑی کہ اس کے بغیر مریض کی صحت ہی متوقع نہیں ہو سکتی۔

پس جو انتظام انبیاء علیہم السلام نے اپنی شان تربیت کو موثر بنانے کے لئے کیا، اولیاء نے اپنی شان معالجہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔ اطباء نے اپنے طریق علاج کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے کیا جس کا نام توحید مطلب یا توحید مطب ہے وہی انتظام بعینہ فقہاء ملت نے اپنی شرعی راہنمائی اور دینی تربیت کو پر اثر اور مثمر بنانے کے لئے فرمایا اور اپنی فقہی توحید مطلب کا نام تقلید شخصی یا تقلید معین رکھ کر یہ شرعی مطب کھول دیا تا کہ ایک ہی فقہ کو اپنا دستور زندگی ٹھیرا کر اور کئی کئی فقہیات اور فقہاء کے مخالف آثار تربیت کا شکار نہ بن کر اپنے دین پر یکسوئی اور طمانینت سے عمل پیرا رہے کہ اس کے بغیر تشویش و پراگندگی اور مذکورہ مفاسد کے بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہیں یہی وجہ ہے کہ قرون خیر گزر جانے کے بعد دانایان امت نے نظم ملت قائم رکھنے اور اسے تشتت و پراگندگی سے بچانے کے لئے نئے اجتہاد وتقلید کا یہ ایک خاص نظام قائم کیا کہ نہ امت کو اجتہاد میں آزاد چھوڑا کہ ہر شخص مجتہد بن کر کتاب و سنت کو اپنی آراء وقیاسات کا کھلونا بنالے اور نہ تقلید میں آزاد چھوڑا کہ جس کی چاہے اور جتنوں کی چاہے تقلیدات میں چکر کھا کر اپنے نفوس کو تباہ کرلے بلکہ اجتہاد کا دائرہ بھی محدود رکھا جیسا کہ وہ تکوینا بھی محدود تھا اور تقلید کا دائرہ بھی تنگ کیا جیسا کہ وہ عقلاً تنگ ہی تھا کہ غیر معین نہ ہو اور معین ہو کر بھی ایسے فرد کی ہو جو علم وعمل، ورع وتقوی،

① شعب الایمان للبیهقی، ذکر حدیث جمع القرآن ج: ۱ ص: ۱۹۴.

شعور تشریع علم لدنی، ادراک خواص واحکام، انکشاف اسرار وعلل وجدان ظواہر وبواطن احساس وجزئیات وکلیات، شریعت میں یگانہ ہو، حاذق ہو اور اوپر سے اس کی یہ علمی وعملی قوت اسباب سے بالاتر ہو کر ایک موہبت الٰہی ہو جس کے ماتحت وہ اس آیت کا سچا مصداق ہو کہ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ ① ''اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں''۔ یہاں صبر کے لفظ سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام طاعات کا مبداء صبر ہے، یعنی وہ صبر علی الطاعات۔ اور صبر بین الشہوات میں راسخ القدم ہو جو مطلق عمل سے آگے کا مرتبہ ہے اور جس کو حدیث جبریل علیہ السلام میں احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ادھر ایقان سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ علوم کی اساس یقین صادق ہی ہے، یعنی وہ پوری شریعت اور اس کے جزوی اور کلی مقاصد کے بارہ میں کمال یقین کے ساتھ درجہ معرفت پر آیا ہوا ہو جو ایمان سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو قرآن نے اطمینان سے تعبیر کیا ہے۔

سلف میں تقلید معیّن عام تھی...... چناں چہ سلف سے لے کر خلف تک اخلاقی مسائل میں ایسے ہی جامع افراد کی تقلید معین بطور دستور العمل کے شائع ذائع رہی اور قرن صحابہ ہی سے اس کا وجود شروع ہو گیا تھا مثلاً حدیث حضرت حذیفہؓ میں جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: إِنِّي لَا أَدْرِي مَا قَدْرُ بَقَائِي فِيكُمْ فَاقْتَدُوا بِالَّذِينَ مِنْ بَعْدِي وَ أَشَارَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَّ عُمَرَ ② ''مجھے نہیں معلوم کہ میں تم لوگوں میں کب تک زندہ رہوں گا؟ سو تم لوگ ان دونوں کی اقتدا کیا کرنا اور اشارہ سے ابوبکرؓ وعمرؓ کو بتلایا''۔ ظاہر ہے کہ مِنْ بَعْدِي سے ان دونوں حضرات کی حالت خلافت مراد ہے کیونکہ بلا خلافت تو ہر دو حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی موجود تھے، مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کی اتباع کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ہی ہوں گے نہ کہ دونوں اکٹھے۔

اس لئے حاصل یہ ہوا کہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں ان کی اور خلافت فاروقی میں ان کی اتّباع کرنا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ خاص تک ایک معین شخص کے اتباع کا دین میں حکم فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان سے دلیل بھی ہر مسئلہ کی تحقیق کیا کرنا اور نہ یہ عادتِ مستمرہ تھی۔ یہی تقلید شخصی ہے کہ عملی مسئلہ پیش آنے پر کسی ایک عالم سے رجوع کر کے اس کے فتوی پر عمل کیا جائے لیکن دلائل کے پوچھنے کا کوئی التزام نہ تھا چناں چہ لوگوں کے سوال کرنے پر ان کے جو فتاوی روایات میں مذکور ہیں ان میں دلیل کا سوال ہے نہ دلیل کا اظہار۔ یہی تقلید شخصی تھی کہ ایک پر پورا ملک جمع ہو گیا اور بلا استفسارِ دلیل اس کے فتاوی پر عمل کرنے لگا، بخاری کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا۔ تو انہوں نے

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۲۴.

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمرؓ کلیھما ج: ۱۲ ص: ۱۲۲.

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف بتایا جب حضرت ابو موسیٰ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جب تک یہ حبر تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ مت پوچھا کرو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تمام مسائل میں ایک طرف لگا دینا اور لوگوں کا اس پر عمل درآمد کرنا جس میں مطالبہ دلیل کا کوئی سوال نہیں، پس یہی تقلید شخصی ہے۔

اہل مدینہ عموماً حضرت زید بن ثابتؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے۔ چناں چہ عکرمہؒ کی روایت بخاری میں ہے کہ لوگوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ: ہم حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے، جس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کے امام و مفتی حضرت زید بن ثابت تھے اور لوگ ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرتے تھے خواہ وہ نص سے حکم دیں یا عدم نص کی صورت میں قیاس سے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کے سبعة احرف کو حرف واحد پر مقتصر فرما دینا اور تمام محروسہ ہائے اسلامی میں صحابہؓ و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا اسی کو عملاً قبول کر لینا اِتباع و تقلیدِ معین نہیں تھا تو اور کیا تھا؟۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح حکم حدیث تو موجود نہ تھا۔ ایک علت پر جس کو حضرت ذی النورین کے تفقہ نے ادراک کیا یہ حکم دائر تھا جبکہ ان کے نزدیک اس علت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ حکم سبعة احرف بھی ختم ہو گیا۔ چناں چہ اس واقعہ کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس قیاسی حکم کو سب نے قبول کر لیا اور کسی نے بھی مطالبہ دلیل نہ کیا۔ اسی طرح اور قیاسی احکام میں بھی قرن صحابہؓ میں تقلید شخصی کی گئی ہے جیسا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلہ اس شرط پر قرض دینے کو ناپسند کیا کہ وہ دوسرے شہر میں ادا کیا جائے اور فرمایا کہ کرایہ بار برداری آخر ادا کرنے والا کس سے لے گا؟ اس فتویٰ پر لوگوں نے عمل کیا۔ اور یہ قیاس سے فتویٰ دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ پس تقلید بھی ہوئی اور ہوئی قیاسی حکم میں۔

بہر حال تقلید شخصی کا عمل قرنِ سلف میں رائج تھا آج چونکہ اس کے بغیر لوگ طرح طرح کے علمی و عملی مفاسد کا شکار ہیں جن کی تشریح ابھی عرض کی گئی کہ اجتہاد کی آزادی سے فتنہ شبہات پھیلتا ہے اور تقلید کی آزادی سے فتنہ شہوات بڑھتا ہے۔ اس لئے قدرۃً اس میں وجوب کی شان پیدا ہو گئی کہ وہ واجب کا مقدمہ بن گئی اور اس کے بغیر اتباعِ ہواء سے محفوظ رہنا عادۃً محال ہو گیا، اس لئے تقلید شخصی بھی ضروری اور واجب ہو گئی ہے۔ مگر واجب بالغیر۔ قرونِ اولیٰ میں یہ غیر یعنی فتنہ شبہات و شہوات شائع نہ تھا۔ اس لئے یہ تقلید معین جواز کے درجہ میں تھی۔ آج شائع ہے اس لئے واجب کے درجہ میں ہے، الحاصل مطلق تقلید تقلید معین کتاب و سنت کی روشنی میں ایک ثابت شدہ اور معمول بہ مسئلہ واضح ہوئی۔ مطلق تقلید تو بنص قرآنی ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ①
”علم والوں سے سوال کرو اگر تم علم نہیں رکھتے“

اور تقلید معین بوجہ مفاسدِ مذکورہ اصول کتاب و سنت، احادیث باب، تعاملِ سلف، اجماع امت اور بنص

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷۔

شناسان امت مرحومہ کے تجربات وغیرہ سے واجب ثابت ہوئی اور غیر مجتہد کے حق میں ضروری نکلی۔ مگر صرف مسائل اختلافیہ میں کہ انہیں مسائل میں کوئی نقیضین کا اجتماع یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کی صورت پیدا ہوتی تھی جو دین کے نقطۂ نظر سے محال ہے کہ دین میں تناقض محال ہے۔ اسی لئے عامۃً تمام اکابر امت اور ہر قرن کے علماء فحول جو اجتہادی شان تک رکھتے تھے تقلید معین کے دائرے سے باہر نہیں ہوئے، بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکثر و بیشتر ارباب سنن و جوامع مقلد ہی ہوئے ہیں، ہندوستان کے عام محققین اور خصوصاً ولی اللہی خاندان اور سلسلہ کے تمام وہ اکابر جن کی تحقیقات اور لطائف و معارف ائمہ اجتہاد کا دور یاد دلاتی ہیں، خود اپنے لئے اور اپنے حلقہ اثر کے لئے تقلید معین ہی کو ضروری سمجھتے رہے اور کبھی اس کے حلقہ سے باہر نہیں ہوئے۔

دین کے بارہ میں یہی وہ اسوہ ہے جو بطور توارث علماء دیو بند تک پہنچا اور اسی راہ پر امن پر دارالعلوم دیو بند نے راہ روی اختیار کی۔ حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم قدس سرہ، بانی و سرپرست اوّل دارالعلوم، حضرت مولانا محمد رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ صدر مدرس اول و سرپرست ثالث دارالعلوم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ صدر مدرس ثانی و سرپرست رابع دارالعلوم، حضرت علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سرپرست خامس دارالعلوم، حضرت علامہ محمد انور شاہ قدس سرہ صدر رابع دارالعلوم وغیرہ وغیرہ جن کی تقاریر اور تحریرات دریائے اجتہاد کی نہریں معلوم ہوتی ہیں بایں تحقیق نظر وفکر تقلید معین کے دائرہ سے نہ کبھی خود باہر ہوئے نہ اپنے حلقہ ہائے اثر کو باہر ہونے دیا۔ پھر ان حضرات کے ہزار ہا تلامذہ اور شاگردان رشید۔ پھر دارالعلوم کے ہزار ہا فروعی مدارس جو ہند و بیرون ہند میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، ان کے محقق علماء اور ان کے حلقہ ہائے اثر اسی پرانے مسلک پر جمے رہے اور لوگوں کو جماتے رہے۔

بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم (قاسم العلوم والخیرات) نے اپنے مخصوص رنگ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کی تقلید بھی کی اور ساتھ ہی محققانہ انداز سے تمام فقہ اور کلام کا اور اصولی فلسفہ بھی اسی انداز سے کھل کر دکھلایا کہ تقلید ایک مستقل تحقیق نظر آنے لگی اور جس کی بدولت دارالعلوم کے یہ ہزار ہا فضلاء اور شاگردان شاگرد مقلد بھی رہے اور محقق فی التقلید بھی ہوئے، اسی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعے سے لوگوں کے دین کی حفاظت کی۔ ورنہ ایک طرف سے ملک کا جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر وخیال پر اس درجہ قید و بند عائد کر چکا تھا، کہ اپنی آبائی رسوم کو اسلام اور انہی کی کورانہ تقلید کو پیروی اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں گرفتار تھا جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و محدثات رچ گئی تھیں۔

اور دوسری طرف سن ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور اس سے پیدہ شدہ آزاد خیالی کے سبب فکر وخیال کی وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہد مطلق ہونے کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی عقول دماغوں پر اس درجہ مسلط ہو چکی تھیں کہ مذہبی نقل و روایت کے ردو قبول کا معیار ہی یہ عقول رہ گئی تھیں۔ غرض ایک طبقہ تقلید جامد کا شکار

تھا اور ایک طبقہ اجتہادِ مطلق کے خیال میں غرق تھا۔ ایک نے طبقہ تقلید بلکہ ربقہ تقلید ہی کو گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ایک نے تقلیدی افراط میں گرفتار ہو کر ہر ہر صاحب سجادہ و دلق بلکہ ہر ہر مدعی کی تقلید مطلق کرنے کا نام دین رکھ چھوڑا تھا۔ پس جامد مقلد یا بہت سوں کے سامنے جھکنے والے بہت سوں کے افعال کی اقتدا کرتے کرتے بدعات و محدثات کا شکار ہوئے اور فتنہ شہوات میں جا گرے اور آزاد خیال کسی ایک کے بھی سامنے نہ جھکنے کی خو پیدا کر کے اپنی عقل کے بندے بن گئے تھے، جو ان کی عقل میں آیا مان گئے جو نہ آیا انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ لوگ فتنہ شبہات میں جا پھنسے تھے۔

اگر یہی لیل و نہار رہتے تو ہندوستان کی پوری دنیا شبہات و شہوات میں پھنس کر کلیۃً اپنا دین کھو چکی ہوتی۔ خدا رحمتیں نازل کرے ان اساطین امت اور مجددین دین پر کہ انہوں نے اجتہاد و تقلید کا وہی معتدل اور درمیانی نکتہ پکڑ کر جو حقیقتہ کتاب و سنت کی روح تھا اس امت کو سنبھالا اور ہند اور بیرون ہند میں حنفیت اور حنفیت کی جڑیں مضبوط کر دیں، دائرِ تقلید معین کو بھی نہ چھوڑا اور شانِ تحقیق کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور پھر ایک طرف کتاب و سنت کے علم وسیع کا روشن مینارہ دلیل راہ بنایا اور دوسری طرف ریاضت و مجاہدات کر کے معرفتِ نفس اور معرفتِ ربّ کی منازل طے کیں جس سے ان کا علم منقول سے معقول بنا اور پھر معقول سے محسوس ہو کر مشاہدہ میں آ گیا یعنی جو علم اوپر والوں سے سنا تھا پہلے اسے استدلال سے سمجھا اور پھر اس کے استعمال سے اسے اپنا حال بنا لیا جس سے پوری شریعت اپنے ظہر و بطن کے ساتھ ان پر منکشف بھی ہوئی اور ان کا حال ہو کر ان کی طبیعت بھی بن گئی۔

لیکن غور کیجئے کہ اس انکشاف تام اور کمالات ظاہر و باطن کے ہوتے ہوئے بھی جبکہ ان جیسے مانے ہوئے محققین اور عارفین نے بھی تقلید کا دامن دینی تحفظ کی خاطر کبھی نہ چھوڑا تو ایک ایسے دور میں جبکہ ہم لوگوں کا علم تو مضمحل ہو کر رسمی سا رہ گیا ہے اور اسلام کمزور ہو کر اسمی سا ہو گیا ہے، تقوی و طہارت اور عمل کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ فہم عالی گویا کہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ کام کا وجود نہیں ہے اور دعاوی بے شمار ہیں۔

حیرت ہے کہ آج کے بہت سے بزرگوار اس سیدھے سادھے محافظ دین طریق عمل یعنی تقلید معین سے جو سلف کے وقت سے اسی تحفظ دین کی خاطر معمول بہ ہے کس سہولت سے روگردانی فرما رہے ہیں؟۔ مناسب تو یہ تھا کہ خود بھی اس طریق عمل کو اختیار فرماتے کہ اس میں کوئی برائی نہ تھی لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم اس رہ کے اختیار کرنے والوں پر ملامت نہ فرماتے کہ اختیار کرنے والوں نے بہر حال کسی بدعت یا شرعی مذموم کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ایک حجت کے ساتھ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں جیسا کہ سلف نے بھی اور بعد میں پوری امت نے بھی امن اسی میں دیکھا تھا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس مسلک اور اس کے سالکین کو ہر طعن کا مخاطب بنایا گیا اور کسی قسم کے حملوں سے احتراز بھی نہیں کیا گیا۔

کہیں کہا گیا کہ مقلد جھگڑالو ہوتے ہیں اور لڑتے ہیں، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین نے غیر مسلک والوں پر

تعدیات کیں جس کے لئے تاریخی شواہد لائے جاتے ہیں تا کہ منافرت کا تخم کافی مضبوطی کے ساتھ دلوں میں جم جائے اور برگ لے آئے، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین یا احناف نے حکومت کے زور سے اپنے مسلک کو پھیلایا ہے گویا فقہ حنفی یا دوسرے فقہیات عیاذاً باللہ خرافات کا مجموعہ تھے جن میں نہ کوئی معقولیت تھی نہ کشش، اس لئے جبری اشاعتوں کی بدولت زور زبردستی سے دنیا میں پھیلائے گئے؟

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مذاہبِ اربعہ اور ان کے ماننے والوں کی نسبت شائع کئے جاتے ہیں۔ مجھے ان خیالات کا اس تحریر میں جواب دینا نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس تحریر کا موضوع کوئی ردوقدح یا مناظرہ نہیں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قسم کے خیالات وافکار کم سے کم محقق علماء اور مربیانِ امت کے شایانِ شان نہیں۔ اگر کسی فرد یا جماعت میں شخصی یا جماعتی کمزوریاں ہوں تو اس میں مسلک یا مذہب کا کیا دخل ہے کہ وہ اس کی طرف منسوب کر دی جائیں؟ اگر آج مسلمان اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں سر پھٹول روا رکھتے ہیں تو اس میں اسلام کا کیا دخل ہے اور کس طرح جائز ہوگا کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو اسلام کا ثمرہ کہا جائے۔

بہر حال مقلد یا غیر مقلد کسی وقت بھی باہم غیر مناسب انداز سے باہم آویزش کرنے لگیں تو اس میں تقلید اور عدم تقلید کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ یہ محض ان کے جذبات ہیں جو اپنے ہی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کا نہ کسی شرعی مسئلہ سے تعلق ہے نہ کسی شرعی مسلک سے اجتہاد و تقلید جیسے شرعی مسائل اپنی جگہ ہیں اور یہ کمزوریاں اپنی جگہ، ان کمزوریوں پر اعتراض اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو مگر ان شرعی مسائل یا ان کے ماننے والوں پر کسی حالت میں بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ہر وقت حاصل ہے لیکن اسی حد تک کہ مبتلی متنبہ ہو جائے نہ اس حد تک کہ یہ امر بالمعروف ہی ایک مستقل نزاع بن کر محاذ قائم کر دے اور باہمی منافرات کی تخم ریزی اور آبیاری کرنے لگے۔

اس لئے میری دردمندانہ گذارش ہے کہ مسائل کو مسائل کے درجہ میں رکھ کر تمام حضرات خواہ وہ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں یا ترک تقلید سے تعلق رکھتے ہوں۔ نفس دین کے تحفظ میں اجتماعی جدوجہد صرف کرنے کی فکر فرمائیں اور فروعی مسائل کے اختلافات میں جو آج سے مختلف فیہ نہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی کے وقت سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں۔ ایک اختلافی جہت کے ماننے والوں کی طرف سے یہ حجت کافی خیال فرمالیں کہ فلاں طبقہ، فلاں فقیہ کے فتاویٰ پر عمل کر رہا ہے۔ مخترع اور مبتدع نہیں ہے یہ حجت ہر زمانے میں ایسے مسائل میں قاطع نزاع سمجھی گئی ہے نہ کہ مورثِ نزاع، اس لیے خدارا آج بھی اس حجت کو قاطع نزاع ہی بنائیے نہ کہ موجبِ نزاع۔ ضرورت ہے کہ سب حضرات باہمی اشتراکِ عمل سے پوری قوم کی تعمیر کی فکر فرمائیں اور یہ سب مل کر ایسے لائحہ عمل پر غور کریں جو مسلمانوں کو ایک سطح پر لا سکے اور معاندینِ اسلام کی مخفی ریشہ دوانیوں کا کسی حد تک سدِ باب کر سکے۔

حضرات! اپنے باہمی اتحاد میں کم سے کم حضرات صحابہؓ کے اس اُسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالینا چاہئے کہ قرآن کریم کی بعض شاذ آیات جن کو صحابہؓ کے اجماع نے قرآن کریم کا جزو تسلیم نہیں کیا۔ بعض حضرات صحابہؓ کے پاس موجود تھیں جو انہیں خلاف اجماع قرآن کا جزو جانتے تھے لیکن کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ارباب اجماع نے مخالفین کے اجماع کے خلاف یا مخالفین اجماع نے اربابِ اجماع کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔

پس حضرات مقلدین جبکہ ترکِ تقلید کو خلاف اجماع سمجھتے ہیں تو وہ تارکین تقلید کے بارہ میں ان حضرات صحابہؓ کا اُسوۂ اختیار فرمائیں۔ جنہوں نے اپنے اجماع کے باوجود مخالفین اجماع کے خلاف نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کسی جنگ کا آغاز کیا۔ بلکہ تفہیم کا حق ادا کردینے کے بعد ان کی تحقیق پر انہیں معذور سمجھ کر ہمیشہ چھوڑے رکھا۔ ادھر حضرت منکرینِ تقلید اگر تقلید کو باجود اجماعِ امت کے قابلِ قبول نہیں سمجھتے تو وہ ان حضرات صحابہؓ کا راستہ اختیار فرمائیں جنہوں نے شاذ آیات کے بارہ میں اپنی تحقیق نہیں چھوڑی تو اجماع کنندوں کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے اور انہیں ان کے عمل کے لئے آزاد چھوڑا۔ تقلید کے فریقین بلکہ تمام فرق اسلامیہ جب تک حضرات صحابہؓ کی اس پرحوصلہ رواداری کا اسوہ اختیار نہیں فرمائیں گے۔ امت کے اجتماعی مسائل کا حل کبھی نہیں ہوسکتا۔

آج امت مسلمہ کو تعلیم عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ جہالت کے جراثیم نے اس کے قومی جسم کو مثل ایک بے جان لاشہ کے کردیا ہے۔ اسی طرح آج تبلیغ عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ مسائل سے عدم واقفیت نے انہیں اندھیرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح امت کو اصلاحِ اخلاق کی قوی ترین ضرورت ہے کہ بداخلاقیاں ناسُور ہوکر اس قوم کو لگ گئی ہیں۔ اسی طرح صفائی معاملات کی آج حد درجہ ضرورت ہے کہ بدمعاملگی نے قوم کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی ہے۔ اسی طرح سیاسی حقوق کے تحفظ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس کے فُقدان نے قوم کی شوکت وقوت کو قطعاً زائل کردیا ہے۔

لیکن سارے اجتماعی معاملات آپ حضرات جب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جبکہ ان فروعی اختلافات کو نزاعات نہ بنائیں اور رواۃ کے بادیانت اختلافات کو اس کی حدود میں قائم رکھ کر اسلام کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی فکر کریں اور امت کی اس اجتماعی ساکھ کو پھر از سرنو قائم کرنے کی کوشش کریں جو بہت حد تک پامال ہوچکی ہے اور ان نزاعات کے ذریعہ ہی روبزوال ہورہی ہے۔ میں اس کی امید رکھوں گا کہ ’’آل انڈیا احناف کانفرنس ان عمومی اور اجتماعی مہمات کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کرکے انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ عمل میں لے لے گی۔

مجھے آل انڈیا احناف کانفرنس کے دعوتی پوسٹر کو دیکھ کر جس میں غیر مسلک کے علماء کو بفراخ دلی وفراخ حوصلگی دعوت دی گئی ہے۔ یقین کامل ہے کہ اس کانفرنس کے مخلصانہ جذبات عمل انفرادیت سے بالاتر اجتماعی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اس کے مخلص کارکن اتحاد بین المسلمین کے زیادہ سے زیادہ خواہش مند ہیں۔ اس لئے اس کانفرنس سے یہ توقع بے جانہیں ہے کہ عرض کردہ مقاصد اس کے اساسی مقاصد قرار پاسکیں گے اور اس کے ہاتھوں

پھلیں پھولیں گے۔

آخر میں تمام ذمہ داران کانفرنس کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فراخ دلی سے مجھ ناچیز کو اپنے کج مج خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمایا اور میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود مجھے قبول فرما کر میری انتہائی عزت افزائی فرمائی۔ حق تعالیٰ شانہ، ذمہ دارانِ کانفرنس، کارکنان جلسہ اور تمام حاضرین اجلاس کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

پس منظر

اجلاس جمعیّت العلماء صوبہ بمبئی

منعقدہ ۴، ۶، ۷ صفر المظفر ۱۳۶۴ ہجری

اَزفخرُ الاماثل حضرت الحاج مولانا قاری حافظ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

جمعیت العلماء صوبہ بمبئی نے گزشتہ سال ۴۴ء میں اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا تھا۔ ممدوح نے اس اجلاس میں ارتجالاً زبانی جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس نے اہل بمبئی کے مذہبی اور سیاسی احساس وشعور کو بیدار کرنے میں حیرت انگیز کام کیا۔ قبول وتاثر کی ایک روتھی جو چالیس پچاس ہزار سامعین کے قلوب میں گھر کرتی چلی گئی تھی۔

مشرقی ومغربی تعلیم ونظریات دونوں کے حامل و دِلدادہ اس خطبہ سے یکساں متاثر تھے۔ سیاسی وغیر سیاسی، سرکاری وغیر سرکاری، مذہبی اور غیر مذہبی مسلم اور غیر مسلم کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس پر حقائق ومعارف کے اس آب حیات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا ہو اور وہ خواب گراں سے ہوشیار نہ ہو گیا ہو۔ بمبئی کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا سیاسی پروگرام سنا جو قرآن وسنت اور صرف قرآن وسنت سے مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس میں انسان کے لئے دنیا کے موجودہ حالات میں فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی حاصل کرنے کے سہل الحصول اور یقینی طریقے بھی موجود تھے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی۔

بمبئی۔! جہاں کے باحوصلہ اور نیک دل مسلمانوں کو ایک خود غرض جماعت نے اپنی نفس پرستی اور جلبِ منفعت کے لئے مبتلائے فریب کر رکھا تھا اور مخلصانہ مذہبی جذبات کو غلط راستوں پر ڈال کر سچا دین پیش کرنے والوں اور کلمہ حق کہنے والوں سے اس درجہ متنفر اور متوحش کر دیا تھا کہ وہ ان کے قریب جانے یا ان کی کوئی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے، انہوں نے جب جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے اس بیدار کن صدائے حق کو سنا تو وہ چونک اٹھے، انہوں نے محسوس کیا کہ اربابِ غرض نے سالہا سال سے ان کے مذہبی جذبات کو جن راہوں پر ڈال کر علماء دیوبند کے خلاف جو اشتعال اور نفرت پیدا کر دی ہے وہ سراسر باطل ہے۔ حق یہی ہے کہ دین ودنیا کی خیر و فلاح اور تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح اسوہ اگر کسی کے پاس ہے تو انہیں علماء حق کے پاس ہے۔

اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر کے گوشہ گوشہ سے طالبانِ حق گروہ در گروہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ التجا لے کر حاضر ہونے لگے کہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں کے کان بھی اس صدائے حق سے آشنا کئے جائیں جس سے وہ اب تک مختلف حیلوں، اور گمراہ کن تدبیروں سے محروم رکھے گئے ہیں، اہل بمبئی کی اس طلب صادق اور التجائے شدید نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پروگرام میں مخلصین وطالبین بمبئی کے لئے جتنا وقت نکال سکیں نکالیں۔ چناں چہ حضرت ممدوح نے جتنا ممکن ہو سکا بمبئی میں قیام فرمایا اور وہاں کے تقریباً ہر حصہ کے تشنگانِ حقیقت ومعرفت کو اپنے ارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ کے شیریں اور صاف وشفاف آب رواں سے سیراب کرنے کی کوشش کی۔ پیاسوں کی پیاس کا یہ عالم تھا کہ جام پر جام پیتے جاتے تھے اور ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'' پکار رہے تھے۔ چونکہ مولانائے ممدوح کی ذات گرامی پر دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان مرکزی ادارہ کی اہم ذمہ داریوں کا بارِ گراں بھی ہے اس لئے تقریباً تین ہفتہ سے زیادہ بمبئی میں قیام نہ فرما سکے اور بمشکل دیوبند واپس تشریف لائے۔

اس سال جمعیت کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ذمہ داران جمعیت نے پھر حضرت ممدوح سے صدارت اجلاس قبول کرنے کی باصرار درخواست کی اور اہل بمبئی کے والہانہ شوق کا شدومد کے ساتھ اظہار کیا چناں چہ مخلصین بمبئی کی دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ممدوح نے بمبئی تشریف لے جا کر فرائض صدارت انجام دیئے، اس سال مسلمانان بمبئی کا ذوق وشوق المضاعف تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حاضرین جلسہ کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اجلاس جمعیت کے ختم ہونے پر اہل شہر کی جانب سے علاقہ وار جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان میں حضرت ممدوح نے انسان کی نجات اور اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں فلاح وخیر کا وہ پروگرام پیش فرمایا جو قرآن وسنت کا مرتب کردہ ہے۔ ان خطبات ومواعظ نے مسلمانان بمبئی کے ایمانوں میں جلا پیدا کر دی۔ ارباب باطل نے تدلیس وتلبیس اور افتراء وبہتان پر جماعت دیوبند کے خلاف سالہا سال میں عناد وعداوت کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی اور بمبئی کے سنجیدہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دیوبند کی محبت وعقیدت کا گہرا نقش قائم ہو گیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ .

۵ صفر ۶۴ھ کو جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے سالانہ اجلاس میں حضرت ممدوح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا دیوبند سے بمبئی تشریف لے جاتے ہوئے راستہ میں قلم برداشتہ تحریر فرمالیا تھا، اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ مسودہ پر نظر ثانی کی جاسکتی۔ دراصل یہ خطبہ صدارت کے مضامین کا ایک اجمالی خاکہ تھا جو رواروی میں بطور یادداشت مرتب کرلیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ سامعین کو طبعاً تحریر کے سننے میں الجھن اور ضیق ہوتی ہے۔ نیز تحریر کے ذریعہ مسائل کی تفہیم میں مختلف الخیال اور تفاوت الخیال حاضرین کی کما حقہ رعایت نہیں رکھی جاسکتی۔ اس لئے ممدوح نے اس مرتب کردہ تحریری خاکہ پر زبانی خطبہ ارشاد فرمانا زیادہ مناسب خیال فرمایا۔ اس زبانی خطبہ میں بہت سے مضامین تحریر کردہ خطبہ سے زائد بیان ہوئے اور مجمع پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ممدوح کا خیال تھا کہ خطبہ پر نظر ثانی

کے وقت تقریر کے زائد نکات ومضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔لیکن حضرت ممدوح نے جلسے ہی تقریر ختم فرمائی۔ مُدیرانِ جرائد نے اصرار کیا کہ مسودہ جس حالت میں بھی ہے انہیں دے دیا جائے کہ انہوں نے تقریر کے جونوٹ لئے ہیں یہ مسودہ یقیناً ان سے زیادہ مفصل ہوگا اس لئے مسودہ دے دیا گیا اور اسے بمبئی کے اردو، انگریزی، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ اخبارت نے نمایاں طور پر اور بعض نے پورا اور بعض نے اس کے خاص خاص حصے شائع کئے بلکہ بعض اخبارات نے پبلک کے شدید مطالبہ کی بناء پر اس مکمل مسودہ کو ایک سے زائد مرتبہ شائع کیا۔

بمبئی سے واپسی پر اثناء سفر ممدوح نے اس مسودہ پر نظر ثانی کر کے اس میں ان مضامین کا اضافہ بھی فرما دیا جو تقریر میں خاص طور پر آ گئے تھے۔اب حذف واز دیار، اور ترمیم و تنسیخ کے بعد یہ مسودہ اپنی مکمل صورت میں مرتب ہو گیا ہے۔چونکہ اس خطبہ کی حیثیت عام رسمی خطبات صدارت سے مختلف ہے اور اس میں زمانہ حال کی ضروریات میں مسلمانوں کی بہترین مذہبی وسیاسی راہنمائی کی گئی ہے۔اس لئے مدیر رسالہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوح نے ترمیم شدہ مسودہ دفتر رسالہ کو مرحمت فرما دیا جس کو بالاقساط رسالہ میں شائع کیا گیا۔

دارالعلوم کے جن نمبروں میں یہ خطبہ صدارت شائع کیا گیا ہے اور اطراف واکناف ہند سے ان کی فرمائش اس کثرت سے آئیں کہ وہ نمبر بہت جلد ختم ہو گئے اور فرمائشات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔اس لئے شائقین کے اصرار پر بہ منظوری حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ خطبہ صدارت کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

ناظم کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.٥

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ٥ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ٥ يَفْقَهُوْاقَوْلِيْ ٥ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ٥ هٰرُوْنَ اَخِي ٥ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ٥ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ٥ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ٥ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ٥ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا٥ قَالَ قَدْاُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى٥﴾ (اِلٰى اَنْ قَالَ تَعَالٰى)﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ٥ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَاتَنِيَافِيْ ذِكْرِيْ ٥ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ فَقُوْلَالَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُاَوْ يَخْشٰى ٥ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآاَوْاَنْ يَّطْغٰى٥ قَالَ لَا تَخَافَآاِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى٥ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآاِنَّارَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ٥ وَلَاتُعَذِّبْهُمْ ، قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ، وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ٥ اِنَّاقَدْاُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى.﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

ترجمہ: "اے موسیٰ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے عرض کیا اے میرے رب! میرا حوصلہ فراخ کیجئے اور میرا کام آسان فرما دیجئے اور میری زبان پر سے بستگی ہٹا دیجئے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے کام میں شریک کر دیجئے تا کہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں بلاشبہ آپ ہم کو خوب دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ: تمہاری درخواست

---

① پارہ: ١٦، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ٢٢، ٦٨.

منظور کی گئی اے موسیٰ (پھر آگے حق تعالیٰ نے فرمایا) اور میں نے (اے موسیٰ) تم کو اپنے لئے منتخب کیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے پروردگار: ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ ارشاد ہوا کہ: تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں اور سب دیکھتا ہوں۔ سو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ پر چلے۔ ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے۔

میری سب سے بڑی عزت وسعادت...... بزرگانِ محترم! آپ حضرت نے ایک سال بعد پھر مثل سابق میری عزت افزائی فرما کر مجھے اسی جگہ لا بٹھایا ہے جس جگہ گزشتہ سال مجھے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حوصلہ افزائی پر آپ سب بزرگوں کا شکریہ ادا کروں۔ **فجزاکم اللہ عنیّ خیرا**

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری سب سے بڑی عزت افزائی یہ ہے کہ خواہ میری ذات کو حقیر ترین سمجھا جائے جیسا کہ واقعہ میں وہ ہے لیکن اس پیام کو گوش ہوش سے سن کر دل کی گہرائیوں میں جگہ دی جائے جو میں اس کرسی پر بیٹھ کر دینا چاہتا ہوں تو یہی میری سب سے بڑی عزت وسعادت ہوگی۔ گو ذات کسی نگاہ سے بھی دیکھی جائے۔ سلاطین کا پیغام عام پبلک کے کانوں عموماً بھنگی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں بھنگی کی ذاتی حقارت کبھی مانع نہیں آتی۔

مجھے آپ ختمی مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کا ایک ادنیٰ بھنگی تصور کریں۔ بلکہ وہاں کے بھنگی کا مرتبہ بھی یہاں کے سلاطین سے بڑھ کر ہے۔ میں کیا چیز ہوں، تاہم ایک معمولی بھنگی کی بے حیثیتی اگر پیغام حکومت ماننے سے مانع نہیں ہوسکتی تو میری کم حیثیتی بھی پیغامِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سننے اور ماننے سے مانع نہ ہونی چاہئے۔ میں اپنے لئے اس وقت وہی مثال دے سکتا ہوں جو ایک تبلیغ خاص کے موقع پر مولانا اسمٰعیل شہید کی ہوئی کہ وہ طوائفوں کو تبلیغ حق کرنے پہنچ گئے تو ان کے خدام ومتوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت: ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹانا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تھا کہ: ''خدا کی قسم! اگر اسمٰعیل کو گدھے پر سوار کر کے اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے ہر لود یتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور اسمٰعیل قال اللہ وقال الرسول کہتا ہوا جا رہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت وسربلندی ہے جس کے بعد اسے کسی عزت کی ضرورت نہیں''۔

تو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ: آپ اگر کسی درجہ میں بھی میری کوئی توقیر نہ فرماتے اور اپنے اخلاق

کریمانہ کا کسی درجہ میں بھی ثبوت نہ دیتے مگر اس پیغام کی عظمت کرتے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں تو بلاشبہ یہی میری ایک انتہائی عزت افزائی ہوتی کہ اس کے بعد مجھے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔

تذکیر قدیم...... حضرات! مجھے جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے اس پلیٹ فارم سے کوئی نیا اور انوکھا پیغام دینا نہیں ہے جواب تک نہ دیا گیا ہو کیونکہ اول تو پیغام قرآنی ہے اور قرآن چودہ صدی کی پرانی کتاب ہے تو اس کا پیغام نیا کب ہوسکتا ہے؟ پھر قدامت کی یہ محدود مدت بھی قرآن کے کلام لفظی ہونے کے لحاظ سے ہے۔ جس کی عمر چودہ سو برس ہے۔ ورنہ کلام نفسی کے درجہ میں تو کلام اللہ اور اس کا پیغام ازلی اور قدیم مطلق ہے کہ صفت الٰہیہ ہے جس کی قدامت کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ سرتاپا قدیم اور ازلی محض ہے اس لئے میرے پیغام میں کوئی ادنیٰ جدت نہ ہوگی۔ اور پھر اس پرانے پیغام کو بھی دینے والے بارہا دے چکے ہیں کہ اس چودہ صدی میں قرآن اور اس کے ضمن میں یہ پیغام ہر عالم و عامی کی زبان پر ہزار بار آیا ہوا ہے۔ اس لئے بلحاظ تبلیغ بھی یہ پیغام نیا نہیں۔ ہاں صرف عنوان بیان اور طریق استدلال کے لحاظ سے شاید نیا ہو اور اس لحاظ سے بھی نیا نہ ہو تو نہ سہی۔ مقصود اصلی تو تذکیر ہے اور تذکیر ہمیشہ پرانی ہی بات کی ہوتی ہے۔

اجمالی پیغام...... یہ پیغام قرآن حکیم کی مرقومہ بالا آیتوں سے چند نمبروں میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں آیات مذکورہ کے الفاظ اور سیاق و سباق سے استنباط کر کے نمبروار مرتب کر دیا گیا ہے تفصیلات سے پہلے پیغام کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ ہم غلامی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کی نعمت حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے میری اس ساری عرضداشت کا حاصل غلامی اور آزادی کی شرعی بحث شرعی حیثیت سے غلامی اور آزادی کا مفہوم دونوں کے اثرات حصول آزادی کی ضرورت اور طریقہ حصول وغیرہ کی تفاصیل چند نمبروں میں عرض کرنا ہے۔

1 پیغام اور اس کی نمبروار دفعات برطانیہ کی سرکشی...... آیات مندرجہ عنوان کا ترجمہ آپ نے سمجھ لیا اب سلسلہ وار ان آیات کے مدلولات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.﴾ ”اے موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔

اس حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ پس قرآن کا اس غلام سازی کو اور فرعون کے استعبادی جذبہ کو طغیان سے تعبیر کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم کا کسی قوم کو اپنا غلام بنانا خالق کائنات سے بغاوت اور سرکشی ہے جو مورد قہر و عتاب ہے کیونکہ طغیان مورد غضب ہی ہوسکتا ہے نہ کہ مورد رحمت و شفقت، اس سے یورپ کی ان اقوام کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے جن کے شب و روز کا ذکر و فکر اور مشغلہ ہی دنیا کی اقوام کے گلے میں یورپ کی غلامی کے پھندے ڈالتے رہنے کی اسکیمیں سوچتے رہنا اور انہیں عمل میں لاتے رہنا ہے۔ جس میں برطانیہ کو بالخصوص یدطولیٰ حاصل ہے اسی کو قرآن نے فساد انگیزی سے تعبیر فرمایا ہے۔

ارشادربانی ہے:﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآئَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ.﴾ ① ”فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اوراس نے وہاں کے باشندوں کومختلف قسمیں کرر کھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زورگھٹار کھا تھا۔ان کے بیٹوں کوذبح کراتا تھااوران کی عورتوں کوزندہ رہنے دیتا تھاواقعی وہ بڑا مفسد تھا“۔

2 اسباب غلامی......اسی سے دوسرامسئلہ یہ بھی واضح ہوگیا کہ عند اللہ خودغلامی بھی قابل نفرت چیز ہے کیونکہ جب اس کے برپا کرنے والے کوطاغی اورسرکش کہا گیا ہےتو کیسے ممکن ہے کہ اس کی برپا کردہ چیز (غلامی) کسی درجہ میں بھی مستحسن اور پسندیدہ ہو۔وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی غلامی قوموں کے لئے ہرممکن بےعزتی کی جڑاور ہر محتمل بےوقعتی کی بنیاد ہے کیونکہ دنیامیں ایک قوم کے لئے اسباب عزت چار ہوتے ہیں۔

1......ایک اس کا اپنااساسی علم جس سے اس کی معنویت قائم ہوتی ہے۔

2......دوسرے اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔

3......تیسرے اس کی عرفی حیثیت جس سے اس کاوقار قائم ہوتا ہے۔

4......چوتھے اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی آتی ہے۔

ایک مسلط قوم جب کسی ملک یاقوم کواپناغلام بنالیتی ہےتوغلام قوم کی عزت کے یہ چاروں سوت بند کردیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت، مادیت، وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہوجاتی ہےاور پھرنتیجہ کے طور پراس محکوم قوم میں پستی اخلاق وکردار کے ایسے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہی کی نہیں خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔تاآنکہ غیرت خداوندی جوش میں آئے۔اس کا حال زبوں اور بدسے بدتر ہوتارہتاہے۔اس کےاپنے قومی علم کا سرچشمہ خشک ہوجاتا ہے۔جس سے نہ اسے اپنی قومی روایات یادرہتی ہیں نہ قومی مذاق ملحوظ رہتا ہےاور نہ قومی مزاج ہی باقی رہتا ہےاور اگراسے علم کی تلاش بھی ہوتی ہےتوفاتح قوم کاعلم سیکھ لیناہی اسکے نزدیک سب سے بڑافخر بن جاتا ہے جس کے لئے وہ مجبور کردی جاتی ہے۔اوراب اگراس جدیدعلم کی بناء پراس کی کوئی رسمی عزت ہوتی ہےتووہ درحقیقت خوداس کی قومی عزت نہیں بلکہ حکمران قوم ہی کی عزت کاایک ظل ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس کی مالی حیثیت کچل دینے کے لئے ایسے قوانین بنادیئے جاتے ہیں کہ روز بروز محکوم قوم افلاس کے گڑھے میں گرتی رہےاوراس کی سیرچشمی استغناءاورغیرت وحمیت کاخون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے تاآنکہ اس افلاس و بے مائیگی کی بےچارگیوں میں اس کاایمان سستے داموں خریدلیا جائے اور انجام کارخودداری واستغناء کااس میں تصور بھی باقی نہیں رہتا۔جب تک کہ وہ خودمشکلات کامقابلہ کرکے اسے باقی

① پارہ:۲۰،سورۃ القصص،الآیۃ:۴۔

رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ حیثیت عرفی اور ساکھ مٹانے کے لئے اسکے قوائے عمل کم مرتبہ امور اور ذلیل پیشوں میں مصروف کر دیئے جاتے ہیں۔ ملک کی اونچی سوسائٹی اور بلند عہدوں میں نہ خود اس کی جگہ رہتی ہے نہ اس کا اپنا علمی و اخلاقی سرمایہ ہی کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اور آخر کار اس غلامی کی پیدا کردہ جہالتوں اور بداخلاقیوں نیز حکمران قوم کی مخفی خواہش و مساعی کی بدولت محکوم قوم کے باہمی روابط بھی خراب ہو جاتے ہیں اور بیرونی تعلقات بھی مضمحل پڑ جاتے ہیں اسے اپنوں سے منقطع کر کے ایسا بے دست و پا کر دیا جاتا ہے کہ کوئی اس کا ہمنوا باقی نہیں رہتا اور اس کی ساری زندگی حکمران قوم کے رحم و کرم پر دائر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے داخلی اور خارجی وسائل منقطع ہو جائیں جس کی بقاء و ترقی کے مادی معنوی اسباب مفقود ہونے لگیں اس کے مریض جسم و روح کے گھل گھل کر قریب بہ مرگ ہو جانے میں تامل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قوموں کے تختے الٹتے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی اس غلامی کا جو فرعون اور قبطیوں کی آقائی سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے ذیل کے الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے۔ ﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ ① ''وہ وقت یاد کرو (اے بنی اسرائیل) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو کہ تمہیں بدترین عذاب (غلامی) کا مزہ چکھاتے تھے۔''

علم کی تباہی...... چناں چہ فرعونی قوم نے فاتح بن کر بنی اسرائیل کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جو ہر آقا قوم اپنی غلام قوم کے ساتھ اختیار کرتی ہے۔ یعنی غلامی کے عناصر اربعہ پورے ہو کر رہے۔ سب سے اول بنی اسرائیل کا آبائی علم ختم ہوا۔

فرعون کو کیا ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کی روایتی تعلیم کو رواج دیتا۔ اس کی اشاعت کے لئے مدارس جاری کرتا یا ابراہیمی اور اسرائیلی طریق زندگی کے مطابق تربیت گاہیں قائم کرتا ورنہ اس کی خدائی کو کب فروغ حاصل ہوتا؟ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہونا تھا کہ ان کے اسلاف اولین جب تک زندہ رہے پیغمبروں کی پند و نصائح بھی انکے ذہنوں میں زندہ رہیں۔ جوں جوں وہ رخصت ہوتے گئے اسی حد تک وہ روایتیں بھی ختم ہوتی رہیں تا آنکہ بنی اسرائیل کے افق پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھا گئی جسے فرعون نے بڑھا چڑھا کر انتہاء تک پہنچا دیا تا کہ وہ اپنی خاندانی روایات کو سرے سے بھول جائیں اور ان میں قومی خود اختیاری کا احساس پیدا نہ ہو۔

یہی تو وجہ ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قانون زندگی کے علم و عمل کی درخواست کی اور تورات لا کر دی گئی جس سے واضح ہے کہ ان کے پاس کوئی قانون اور اس کا علم باقی نہ تھا ورنہ اس درخواست کی ضرورت نہ ہوتی۔ چناں چہ یہی برس ہا برس کی جہالت اور مصری بت پرستوں کی صحبت جو زمانہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۵۰.

غلامی کی یادگار تھیں۔ باوجود صحبت موسوی کے پھر بھی جاہلانہ حرکات پر انہیں گاہ بگاہ آمادہ کر دیتی تھی۔ اریحاء پر گزر ہوا اور گائے کی صورت کے پیتل کے بت پجتے ہوئے دیکھے تو جھٹ فرمائش کر دی کہ ﴿یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ﴾ ① ''اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی خدا بنا دیجئے جیسے (ان اریحاء والوں) کے خدا ہیں''۔

جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی جہالت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کیا کہ ﴿اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ.﴾ ''تم ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتے ہیں''۔

اس پر بھی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب سامری نے سونے چاندی کا بچھڑا بنایا تو قوم کا ایک بڑا حصہ اسی کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا۔ نہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں یاد رہیں نہ ان کے توحیدی پند و نصائح کا کوئی دھیان رہا۔ ایمان باللہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ کلام الٰہی کی خبر دی گئی تو بولے کہ: ہم کلام خداوندی کو کیسے مانیں جب تک کلام خود نہ سن لیں۔ تورات لا کر دی گئی تو عبادت کے لئے آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہاڑ سروں پر لا کھڑا کیا گیا کہ مانو ورنہ کچل دیئے جاؤ گے۔ تب کہیں عمل پر آمادہ ہوئے۔

غرض برس ہا برس کی جہالت کا یہ اثر تھا جو زمانہ غلامی کی یادگار تھی کہ ان کا تصور جب کبھی جاتا تو اللہ کی بجائے غیر اللہ ہی کی طرف جاتا تھا۔ معنویت کی بجائے صورت و حسیات کی طرف اور لطیف و خبیر خدا کی جگہ محسوس و مصور خدا ہی کی طرف طبائع چلتی تھیں جو لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہے۔

حیثیت عرفی کی بربادی...... ادھر جب کہ اپنا علم نہ رہا اور ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی جب کہ حکومت اس علم کی نہ تھی تو مالی حیثیت کیسے درست رہ سکتی تھی۔ مفلس و نادار ہوئے۔ احساس خودداری نہ رہا۔ اولاً تو مجبور ہو کر اور بعد میں خود طبیعت کی جدید افتاد سے ذلیل خدمات سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ یعنی چپراسی، خانساماں، بیرا، مزدور وغیرہ بن کر گزران کی اور اونچی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی حتیٰ کہ وہ اسی کو بہت کچھ جاننے لگے۔

فرعون کی سیاست نے صورت حال یہ کر دی کہ قبطیوں کے لئے تمام اونچے عہدے تھے بڑی بڑی تنخواہیں تھیں۔ زمینداریاں تھیں اور سبطیوں کے لئے یہ ذلیل خدمات تھیں۔ وہ مثل اچھوت کے تھے جیسا کہ آیت گزشتہ میں ﴿یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ﴾ کا یہی مفہوم سامنے آچکا ہے۔ ہاں سبطیوں میں سے اگر کوئی ترقی پا سکتا تھا تو نہ اپنے خاندانی علم و روایات کے لحاظ سے بلکہ وہی فرعونی حکومت کے قانون کے علم سے۔ چناں چہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا اور ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بنی اعمام میں سے تھا۔ فرعون کا پیش کار بنا۔ اس کا علم کوئی پیغمبری علم نہ تھا۔ ورنہ اس علم سے اسے یہ عہدہ فرعونی حکومت میں کیسے مل سکتا تھا بلکہ وہ علم وہی غیر سماوی علم تھا جو فرعونی ماحول کا نتیجہ تھا۔ قرآن نے اسی علم کی طرف قارون کے قول میں اشارہ فرمایا جب کہ اس نے کہا تھا ﴿اِنَّمَآ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۸.

اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ ① ''یہ مال و دولت مجھے میرے علم و ہنر کی بدولت دیا گیا ہے جو خود میرا اپنا ہے''۔

جو ظاہر ہے کہ فرعون کے عہد کے رائج شدہ رسمی علم کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا تھا ورنہ یہ عزت افزائی ممکن نہ تھی بلاشبہ اس کے لئے مال اور خزائن کے دروازے کھل گئے اور اس نے بے شمار مال سمیٹا جس کی قرآن نے شہادت دی ہے اس سے واضح ہے کہ متسلط طاقت چونکہ اپنا تمدن اپنا کلچر اور اپنا علمی سرمایہ پھیلاتی ہے، اس لئے مفتوح اقوام کے علوم کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے اعزاز و تکریم سب اپنے ہی رائج کردہ علم کے لئے مختص کر دیتی ہے تاکہ اس کا کلمہ گھر گھر میں داخل ہو جائے اور محکوم قوم کی حیثیت عرفی، حیثیت اقتصادی سب اس نئے علم کے تابع ہو جائے اور محکوم قوم اس علم سے عزت بھی پائے تو اپنی نہیں بلکہ فاتح کی عزت کا سایہ حاصل کرے۔

اقتصادی تباہی...... اور اسی غلامی کی بدولت بنی اسرائیل کی عام اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی۔ چناں چہ بنی اسرائیل جب مصر سے بھاگ کر نکلے تو اپنے قبطی محلہ داروں سے ہی ان کا زر و زیور لے کر باہر جانے کی ان میں ہمت ہوئی جو بنام قرض و عاریۃً لیا گیا ورنہ اگر خود اپنا مال و متاع کافی ہوتا تو انہیں اسے ہی منگوانے سے فرصت نہ ملتی، اگر ان کی اپنی اقتصادی حالت اعلیٰ ہوتی تو کیا وہ اسی طرح مفلس و قلاش ہوتے جس کا انہوں نے مصر سے ہجرت کرتے ہوئے ثبوت دیا۔

خارجی تعلقات سے محرومی...... پھر بیرونی تعلقات بھی بنی اسرائیل کے منقطع تھے حتیٰ کے خود ان کا اصل وطن اور ابراہیم علیہ السلام کا مدفن (شام اور بیت المقدس) تک ان کے لئے اجنبی ہو گیا تھا اگر وہ خود اپنے وطن جا سکتے اور وہاں کا رابطہ قائم رہتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ﴾ کے فرمان پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی پس نہ وہ جا سکتے تھے نہ عزت سے رہ سکتے تھے اور اسی لئے بعد نجات فتح بیت المقدس کے لئے انہیں مستقلاً ارض مقدس پہنچنے پر آمادہ کیا گیا اور کہا گیا ﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ﴾ ② ''اے قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہارے حصہ میں لگایا ہے''۔

بہر حال فرعون کی حکومت نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی علمی حیثیت اور تعلیمی منصب کو برباد کیا جس سے ان میں قومی روایات باقی نہ رہیں۔ ان کی منصبی حیثیت باطل کی جس سے اس میں احساس خودداری باقی نہ رہا۔ ان کی اقتصادی حالت برباد کی جس سے ان میں استغناء نہ رہا جو اخلاق فاضلہ کی اساس ہے۔ ان کے تعلقات ساری دنیا سے منقطع کئے رکھے حتیٰ کہ ان کے وطن اصلی سے بھی انہیں منقطع کر دیا جس سے ان میں غربت اور بے کسی قائم ہو گئی۔

برطانیہ کا طرز عمل...... اگر حقیقۃً یہ چار چیزیں غلامی کے عناصر اربعہ ہیں اور ضرور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی طرف اشارے کئے ہیں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ: کیا ہندوستان کے مسلمان غلام نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر ایک اجنبی شہنشاہی مسلط نہیں؟ ضرور ہے اور جب ایسا ہے تو کیا فی الحقیقت مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۲۱۔

پیروں میں غلامی کے انہی ارکان اربعہ کی چار میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہیں؟ ضرور ہیں اور بلاشبہ خصوصیت سے مسلمانوں کو ان چار مقاصد کے لحاظ سے اس وجہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کی روایتی تعلیم برباد کرنے کی کوشش کی گئی کہا گیا کہ: جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جنون کم نہیں ہوسکتا، جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساس خودداری سے بیگانہ نہیں ہوسکتے۔ چناں چہ ابتدائے عہد حکومت میں تو متسلط حکومت نے مسلمانوں ہی کے طرز تعلیم کو جاری رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جدید طریق تعلیم رائج کر کے قدیم تعلیم اور طرز تعلیم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش...... اس سلسلہ میں خود انگریزوں کی شہادت زیادہ وقیع ہوسکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور چہارگانہ شعبہ ہائے زندگی میں انہیں کس درجہ تک کچلا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان لکھ کر اس سلسلہ کے بہت سے حقائق سرکاری کاغذات سے واشگاف کر دیئے ہیں۔ موصوف مسلمانوں کی تعلیمی سلسلہ کی بابت ایک جگہ لکھتا ہے۔

''ہم اپنے دور حکومت کے پچھلے ۷۵ سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم (مسلمانوں کے طرز تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہوگئی۔ ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیر باد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہوگیا۔ (۱)

پھر اسی ہنٹر کی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دارومدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لئے مسلمان امراء اور حکام وقف کر جاتے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ''صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جو ان معافیات کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پاسکی۔ بیالیس برس بعد ۱۸۱۵ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرات نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۳۸ء میں ۸ لاکھ پونڈ کے خرچ و مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پالیا اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ گویا تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا۔

یہ آمدنی جب مسلمانوں کے قدیم صیغہ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی اور تعلیم قدیم کا اسٹاف اس سے محروم ہوگیا تو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ: ۲۴۷۔

نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا تہ وبالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ ①

آگے چل کر لکھتا ہے "لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔ ② اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب ایک صوبہ میں تعلیمات پر ۴۵ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا تو دوسرے صوبوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اور جب ۴۵ لاکھ کی رقم ایک صوبہ سے اڑائی گئی تو دوسرے صوبوں سے آمدنی کیا کچھ ہوتی ہوگی اور اس سے جدید تعلیم کی ترویج میں کس درجہ مدد ملی ہوگی۔

پھر جدید تعلیم اور جدید طریقہ تعلیم رائج کیا گیا اس میں مسلمانوں کے رجحانات کی رعایت کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ انگریز اپنے رجحانات رائج کرتے یا مسلمانوں کے رجحانات کی پرواہ کرتے جن کے مٹانے ہی کے لئے قدیم تعلیم مٹائی گئی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیم کا کوئی جزو اس تعلیم میں نہیں رکھا گیا، ہنٹر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے۔ "تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں"۔ ③

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ "ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے: کیا اسکے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

بہر حال مسلمانوں کی قدیم تعلیم مٹا کر اور جدید تعلیم کو اسلامی رجحانات سے کلیۃً خالی رکھ کر مسلمانوں کو جس تعلیم میں لگایا گیا اس کا مقصد لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ میں اس کے سواء کیا تھا کہ "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگریز ہوں"۔ چنانچہ یہ ثمرہ نمایاں ہو گیا آج اس تعلیم کے بعد کون سا ہندوستانی ہے جو مشرقیت یا ایشیائیت کا دلدادہ ہو۔ تہذیب انگریزی، تمدن انگریزی، لباس انگریزی، خیالات انگریزی، عقائد انگریزی اور مذہب تک انگریزی ہے۔

برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ...... بہر حال مسلمان علم سے تو یوں گئے اب مالی حیثیت ہو سکتی تھی جس سے دنیا میں انہیں فارغ بالی ہو سکتی تو اس کو ختم کر ڈالنے کی انتہائی سعی یہ کی گئی کہ صوبہ بنگال کے متعلق ہنٹر کہتا ہے۔ "آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل

---

① ہمارے ہندوستانی مسلمان، صفحہ: ۲۵۷۔ ② ایضاً صفحہ: ۲۵۸۔ ③ ایضاً صفحہ: ۲۵۲۔

یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں''۔

آگے چل کر لکھتا ہے''گزشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائل دولت منقطع کردیئے جانے کے سبب) یا تو صفحۂ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائل دولت سے) سربلند کیا ہے''۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر ۱۷۹۳ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے کے لئے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت کیا گیا لکھتا ہے۔''بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پرفریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو''۔

اس پرفریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ خود کہتا ہے''اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے رہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔

آگے آخری نتیجہ لکھتا ہے جو اس سارے تغیر و تبدل کا انتہائی مقصد تھا۔''مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔

اس دور میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے محکمہ فوج اور محکمہ دیوانی دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کئے گئے تا کہ وہ مالی حیثیت سے انتہائی طور پر پست ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے۔''ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے ازحد ضروری تھا۔

آگے ملازمتوں اور عہدوں کا ایک نقشہ دیا ہے جس میں مسلمانوں کو دوسری اقوام ہند کے مقابلہ میں میں صفر کے برابر کر دیا گیا۔ جب ان پر خود ان کے علم کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے اور دولت بھی ان کی پرفریب طریقوں اور کھلے اندازوں سے چھین لی گئی تو ظاہر ہے کہ ان کا وقار منصب اور حیثیت عرفی کیا باقی رہ سکتی تھی۔

چناں چہ ہنٹر لکھتا ہے کہ''دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں''۔

ہاں جو ان کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر دل و دماغ انہیں دینے پر پختہ ہو گیا اور اس نے حکومت کی ڈگریاں حاصل کر لیں وہ بلاشبہ ان کا منظور نظر ہوا۔ اس نے مالی حیثیت سے ترقی کی اور غلامی کے باوجود کچھ مناصب پائے، جیسا کہ قارون بھی فرعون کے دربار میں بار پا گیا تھا۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے ہنٹر نے یہ احوال صوبہ بنگال کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے بقیہ خطوں کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ اولاً صوبہ بنگال ہی کی سرداری انگریزوں کے قبضہ میں آئی، اس لئے انہوں نے سب سے اول صوبہ بنگال ہی کو تباہ و

پامال کیا اور غداری سے تباہ کیا۔ جس کا ہنٹر کو کھلا اقرار ہے۔ جب ان کی روش ایک صوبہ میں یہ رہی اور ایک مقرر شدہ پالیسی کے ماتحت یہ صورتیں عمل میں آئیں جو حکومت کی پالیسی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ یہ پالیسی دوسری صوبوں میں بدل جاتی۔ لہٰذا جہاں بھی یہ حکومت پہنچتی وہ ایسا ہی کرتی چناں چہ اس کا جواب ہنٹر ہی اپنے الفاظ میں دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''میں یہ بھی بتادوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کہ کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہے کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے''۔

اس سے واضح ہے کہ یہ حال صرف صوبہ بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا ہے۔ بنگال صرف نقش اولین کا محل رہا ہے۔ نقش ثانی اس سے بھی زیادہ مکمل ہو کر دوسرے صوبوں میں پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار......

بہر حال ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم ''دین دیانت منصب اور دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی۔ مگر خارجہ پالیسی اس سے بھی زیادہ بربادکن رہی ہے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا اور افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا احتمال تھا کہ وہ باہر سے ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے غم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔

چناں چہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج داخل ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام میں بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران وافغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران وترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی وعربستان کا مسئلہ، کہیں شام وفلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔ چناں چہ آس پاس کی آویزش سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ترکی کے حصے بخرے ہوتے رہتے تھے۔ دوسری طرف خلافت اسلامیہ کے مٹانے کا مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ کہیں افغانستان پر دانت رہتا تھا۔ کہیں ایران جو بالآخر ہضم ہو کر رہا خلافت مٹ کر رہی۔ ایسے ایسے مسلمان کھڑے کئے گئے جوان مسائل کو خود اٹھاتے اور آخر میں فیصلہ برطانیہ کے ہاتھ میں آجاتا۔ برطانوی شہنشاہی سے دوستی کے رنگ میں وہ احکام صادر ہوتے جس سے نہ مدعی باقی رہتا نہ مدعا علیہ بلکہ دونوں کی میراث جج کے ہاتھ میں آجاتی۔

آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم...... ادھر ہندوستان میں جن دردمندوں نے دین اور ملک کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی اور کھڑے ہوئے تو ان کے تعلقات عام مسلمانوں سے منقطع کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ سو وہ ہنٹر کے کتاب دیکھنے سے واضح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ درجہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان

آزادی پسند جماعتوں کو حسب بیان ہنٹر انگریزوں کی طرف سے باغی اور آخر میں وہابی کا لقب دے کر بدنام کرنے کی مہم جاری کی گئی جس کی تفصیلات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ اسکیم عملاً آج تک جاری ہے۔ اب کیا کوئی اس کے خلاف بھی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند کی پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی حکومت، ثروت، شوکت، حشمت اور دولت اور دیانت و دین اندرون و بیرونی تعلقات میں جو گھن لگا اور وہ بالآخر ان تمام چیزوں کو کھا گیا وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کے نظام حکومت کے سوا کوئی اور چیز تھا؟

پس فرعون نے جو معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کہ انہیں ان کے علم سے بے بہرہ کیا پھر ان کی دولت کے چشمے خشک کئے پھر ان کی حیثیت عرفی زائل کر کے انہیں قلی، چپراسی، اور معمولی خدمت گاروں کے درجہ پر پہنچایا اور پھر ان کے تعلقات باہمی و بیرونی منقطع کئے وہی معاملہ برطانوی شہنشاہی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جس کی تفصیلات میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب سے خود انگریزوں کے مسلمات پیش کر چکا ہوں۔ غلامی کے ان اثرات کے بعد کون کہہ سکتا ہے؟ کہ غلامی پر کسی غلام قوم کا قناعت کئے رہنا موت کے مترادف نہیں ہے؟ اس لئے قرآن نے اسے بدترین عذاب اور اسے برپا کرنے والوں کو بدترین طاغی اور سرکش کا لقب دیا ہے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ابتدائی کلمات ہی سے واضح ہو گیا۔

بنیادی مسئلہ...... ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لئے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے نہ اقتصادیات کا نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے مسلمانوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا سرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں اور پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قانونی اور بین الاقوامی قوانین کی جکڑ بندیوں اور ساتھ ہی اندرونی ریشہ دوانیوں کی پھانسیاں لٹکی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو پنپنے نہیں دیتیں جس میں بلاشبہ ایک ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ برطانوی شہنشاہی اور استبداد و استعباد ہے جس کی گرفت کھول دینے کی ضرورت ہے۔

اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی نہ اور امور کی طرف زیادہ التفات فرمایا جن سے حیثیت و عزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ ﴿اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ.﴾ [1] ''بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ بھیج''۔ تاکہ یہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود کرنے پر قادر ہو جائیں۔

---

[1] پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷.

پس آج بھی ہندوستانیوں کے لئے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادیٔ دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند سے متعلق ہے تاکہ مسلمانانِ عالم اپنے دین ومذہب، اپنی سیاست اور اپنی اقتصادی ومعاشرتی حالت کو اپنی مرضی کے مطابق درست کرسکیں۔ پس مسلمانوں کے لئے حصولِ آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے انہیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

3 جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ...... ادھر جب کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جا کر کہو ﴿اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ.﴾ ''کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے انہیں نجات دے''۔ تو آیت سے صراحۃً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لئے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے مستقلاً ایک اولوالعزم پیغمبر علیہ السلام کی معیت عمل میں آئی، کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لئے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھہرتی؟ اگر اس وقت کی مصر کی اجنبی حکومت سے بنی اسرائیل کی آزادی تقریباً ضروری تھی تو آج ہندوستان کی اجنبی حکومت سے بھی مسلمانوں کی آزادی مذہباً ضروری ہے۔ بہر حال اس آیت ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ سے غلامی کا اپنی ذات اور آثار کے لحاظ سے امرِ قبیح ہونا بھی واضح ہوا اور ساتھ ہی اس کے دفعیہ کی جدوجہد کا مشروع اور وظیفہ شرعی ہونا بھی نمایاں ہوگیا۔

4 حصول آزادی کا پروگرام...... اس کے بعد حصول آزادی کے پروگرام کا سلسلہ رہ جاتا ہے تو قرآن نے انہی آیات میں اصولاً اس پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چناں چہ اس خطاب خداوندی ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ سے جو بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ ازالۂ غلامی کی تدبیر کے وقت اولاً غلام قوم کو اس مرض کے سرچشمہ کی طرف نظر دوڑانی چاہئے کہ یہ غلامی کے جراثیم چلتے کہاں سے ہیں؟

آیت نے واضح کیا کہ بنی اسرائیل کی غلامی کا سرچشمہ فرعون کا طغیان تھا۔ جس کے رکن تھے استبداد اور استعباد استبداد کے ماتحت اس نے اپنی شخصی حاکمیت مطلقہ کا جال پھیلا رکھا تھا جس کا انتہائی ثمرہ اس کا دعوائے الوہیت تھا جس میں حاکمیت مطلقہ کے تمام حقوق اس نے اپنے لئے ثابت کئے اور کہا ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ ① ''میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں''۔ پھر اپنے سوا ہر ایک غیر سے اس منصب کی نفی کرتے ہوئے کہا ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ﴾. ② ''میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں سمجھتا ہوں''۔

پھر جس ذات بابرکات کا یہ واقعی تنہا حق تھا یعنی حق جل مجدہ، اس سے نہ صرف مقابلہ ہی کی ٹھانی بلکہ معاذ اللہ اس کی الوہیت کو بزعم خود مٹانے پر تل گیا اور اپنے وزیر ہامان سے کہا ﴿فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۲۴. ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸.
③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲.

﴿فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ.﴾ ③ ''تو اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی کو آگ میں پکواؤ (یعنی پختہ اینٹیں بنواؤ) پھر میرے واسطے ایک عمارت بنواؤ تا کہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں''۔

اور استعباد کے ماتحت بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا جذبہ تھا جو فرعون میں کام کر رہا تھا۔ قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقولہ کے ضمن میں اس کی بھی حکایت فرمائی اور کہا ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.﴾ ④ ''اور (مجھے پرورش کرنے کا احسان جتلانا'')

سو وہی یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ (اس کے بدلہ میں) تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (حالانکہ وہ نعمت نہیں وہ بھی تیرے ظلم ہی کا نتیجہ تھا نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتا نہ میری ماں مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی نہ وہ تیرے محل میں پہنچتا اور نہ تو مجھے پرورش کرتا۔ پس میری پرورش کا منشاء قتل اولاد بنی اسرائیل تھا جو تیرا انتہائی ظلم تھا۔

برطانیہ کا جمہوری استبداد......ان آیات سے واضح ہے کہ استعباد (بنی اسرائیل کی غلام سازی کا) منشاء فرعون کا استبداد یعنی اس کی شہنشاہی تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ سے متنبہ فرمایا گیا۔

اسی طرح آج غلام ہندوستان کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس کی غلامی کا منشاء برطانوی شہنشاہی اور اس کا استبداد ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں استبداد شخصی تھا یہاں قومی ہے۔ وہاں انفرادیت تھی یہاں اس پر جمہوریت کا پردہ پڑا ہوا ہے، مگر استبداد و استعباد کا جذبہ وہی ہے جو فرعون میں کارفرما تھا۔ فرعون نے اگر ملک مصر کی سلطنت پر مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ اور خدائے برتر سے مقابلہ کی ٹھانی تو آج کی یورپین مغرور بدمست قومیں بھی اسی سر یرآرائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر خدائے حقیقی کے مقابلہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ جولشویک کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انہوں نے بالفاظ خود اپنی سلطنت میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیئے جانے کا اعلان کیا۔ جرمنوں کے ہاتھ میں خدا کی بخشی ہوئی حکومت آئی تو انہوں نے وطنی تعصب کے جذبہ سے کہا کہ: اگر خدا جرمن ہوتا تو جرمن قوم اسے مان سکتی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھ میں وسیع ملک آیا تو اس کے بعض ذمہ داروں نے اپنی سلطنت کے طول عرض کو دیکھ کر کہا تھا کہ: اگر آسمان بھی ہمارے ملک پر گرنا چاہے گا تو ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اسے رکھ لیں گے۔

غرض یہ استبدادی دعوے وہی ہیں جو فرعون نے کئے تھے۔ ادھر جو استعبادی جذبہ اس کا تھا وہی آج کی بدمست اقوام کا بھی ہے جس کے ماتحت آج دنیا کی اقوام کو غلام بنائے رکھنے اور بنائے جانے کے منصوبے گانٹھے جاتے رہتے ہیں اور اس معاملہ میں آپس میں سودا بھی ہوتا رہتا ہے جو کہیں کھلے قبضہ کی صورت میں کہیں انتداب کی صورت میں اور کہیں مداخلت اور داخلی اثرات کی صورت میں نمایاں ہے اور: ﴿يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۴.

④ کا وہی ظہور ہو رہا ہے جو فرعون کے وقت میں ہوا تھا۔ غرض سرچشمہ غلامی یہاں سے متعین ہو جاتا ہے۔

5 **پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت**...... بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اور مبعوث من اللہ ہونا اور انہیں ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ کا حکم دیا جانا اس کی صاف دلیل ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے پیغمبری سے مدد لیا جانا ضروری ہے، یعنی پیغمبر کی قیادت میں حصول آزادی کا راستہ طے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر علیہ السلام اختراعی راستے نہیں بتاتا بلکہ وحی الٰہی سے پیش کرتا ہے جس سے خدا کا بتلایا ہوا پروگرام سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت حصول آزادی کے تمام سیاسی نظریات وفکریات جو اختراع محض سے منصۂ ظہور پر آتے ہیں اور آ رہے ہیں۔ ختم ہو جاتے ہیں اور منشاء خداوندی یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلہ کی لیڈر شپ کسی فلسفی یا طبیعی یا معاشی عالم کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے ہی ربانی اور حقانی فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو وحی الٰہی کی مدد سے پروگرام بنانا جانتا ہو تا کہ وہ قوم کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی کر سکے جس کے فساد ہی سے یہ غلامی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں ورنہ بلا اصلاح نفوس نجات کے بعد اس مرض کے عود کر آنے کا خطرہ پھر قریب ہی رہتا ہے۔

پس جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے حصول آزادی کی تدبیر کی پہلی کڑی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبوت وقت یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قیادت میں گامزن ہو۔ جس کا واضح ترین پروگرام یہ قرآن اور اس کی مدونہ شریعت ہے جس کا ایک بازو اس کی اولین تفسیر یہ حدیث رسول اور دوسرا بازو اس کی فقہی تشریحات ہیں۔ لہٰذا مسلمان کسی ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کتاب وسنت سے الگ کوئی نیا راستہ بتاتی ہو۔ ہاں کتاب وسنت کے معیار پر پرکھ کر بلاشبہ اس کے ردوقبول کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ:۔

6 **غاصب قوم سے حکم جہاد**...... اب حصول آزادی کے لئے نبوت کا لایا ہوا پروگرام ظاہر ہے کہ اصولاً دو ہی نوعوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ تشدد اور عدم تشدد۔ سو اس کے مواقع اور محل میں تفصیل ہے اگر فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ہو اور اس کے ملک ہی نہیں املاک پر بھی قبضہ کر لیا ہو جس سے وہ بے یار و مددگار ہو کر وطن سے بے وطن ہو کر دربدر بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس صورت میں استخلاص وطن کی صورت بقیادت پیغمبری تشدد ہے کہ قتال و جہاد کے ذریعہ اس ظالم اور غاصب قوم سے نبرد آزما ہوا جائے اور اپنا وطن واپس لیا جائے۔

چناں چہ ارض مقدس (بیت المقدس) کے استخلاص کے لئے (جس پر عمالقہ نے قابض ہو کر بنی اسرائیل کو بے وطن بنا دیا تھا) جہاد کا حکم ملا مگر بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل نہ کی اور چالیس برس تک میدان تیہ میں سرگردانی اور حیرانی کی زندگی بسر کرنے کی سزا بھگتی جیسا کہ قرآن پاک نے چھٹے پارہ میں اس کی پوری تفصیلات بیان فرما دی ہیں یا جیسے حضرت سموئیل کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے وطن پر جب جالوت نے قابض ہو کر انہیں ان کے دیار سے نکال باہر کیا تو بحکم پیغمبر طالوت کی قیادت میں انہیں استخلاص وطن کے لئے قتال و جہاد کا حکم ملا ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى

الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی، اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا، قَالُوْا وَمَالَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا﴾ ① ”(اے مخاطب) تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا؟ جب ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ: ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ: کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ حالانکہ اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں“۔

یا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن خیر میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالا گیا اور آپ وطن سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تو مدینہ سے قوت فراہم کر کے استخلاص وطن کے لئے قتال کا حکم ملا تا کہ مکہ کو کفار سے آزاد کرایا جائے۔ ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ o نِالَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ.﴾ ② ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے“۔ بہرحال بے وطنی کی صورت میں استخلاص وطن کی صورت بعد فراہمی قوت تشدد ہے جو پیغمبر علیہ السلام یا مورین پیغمبر علیہ السلام کی قیادت میں کیا جائے۔

عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج...... لیکن اگر فاتح قوم نے محض سلطنت وحکومت چھینی ہے محکوم قوم کو ان کے گھروں سے نہیں نکالا وہ بدستور اپنے وطن میں آباد ہیں مگر غلام بن کر نہ انہیں با اختیار خود باہر جانے دیا جاتا ہے اور نہ داخلی آزادی سے انہیں زندگی بسر کرنے دی جاتی ہے تو اس کا حل بقیادت پیغمبر عدم تشدد ہے یعنی پرامن رہ کر حصول آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

فرعون کی شہنشاہی میں بنی اسرائیل کی یہی نوعیت تھی کہ نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت سے حکومت مصران کی تھی۔ مصران کا تھا جس پر فرعون نے قبضہ پایا اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔ انہیں مصر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام یہ خواہش کیوں کرتے کہ ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ.﴾ ③ ”(اے فرعون بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے)“ اور مصر میں امن وراحت سے رہنے کی بھی اجازت نہ تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کیوں فرماتے کہ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (اور بنی اسرائیل کو ستا مت)۔ پس ایسے ہی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۴۶۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹، ۴۰۔
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷۔

برطانوی شہنشاہی میں بھی مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، تو استخلاص وطن کے لئے بھی موسوی طریقہ عدم تشدد اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے احتجاج کیا جائے گا کہ انہیں آزاد کردو۔

7 عدم تشدد کے پانچ ہتھیار...... مگر جس طرح تشدد کے اسلحہ تیر و تفنگ اور توپ و بندوق ہیں ایسے ہی عدم تشدد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں۔ جو اس جنگ آزادی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہٗ سے طلب فرمائے اور ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ کی تعمیل کے لئے جواب میں عرض کیا کہ مجھے چند اسلحے درکار ہیں۔ جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہیں جن کو ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ سے شروع فرمایا۔

یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے۔

پہلی چیز شرح صدر ہے کیونکہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدمی زور قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کرسکتا۔

دوسری چیز تیسیر امر ہے کیونکہ اگر باوجود انشراح صدر کے ادھر سے اعانت و توفیق اور تہیأ اسباب و وسائل نہ ہو تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حل عقدہ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی ہے بلکہ وہ تصدیق کی بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی چیز اعانت کار اور اشتراک عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراک عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین و یاور ساتھ نہ ہو تو انفرادیت کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین و مددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑ سکتی۔ ساتھ ہی قلبی و باطنی مقاصد میں انفراح و استقلال بھی میسر نہیں آ سکتا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عمرین میں سے ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جو ان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذات بابرکات حق کی تسبیح و تقدیس ہے کیونکہ اگر توجہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرح صدر ہو، نہ تیسیر امر نہ حل عقدہ ہو نہ اشتراک عمل کی توفیق و تاثیر۔

یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ...... (الف) اس سے صاف ظاہر ہے کہ استخلاص وطن کی مساعی کا آغاز ذکر اللہ، دعا، یاد حق اور توجہ الی اللہ سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ کے اجتماعات کی تقریریں مکالمے وغیرہ سب میں ذکر حق کی روح دوڑی ہوئی ہونی چاہئے اور ساری جدوجہد کا رجوع اور رخ بالآخر ذات حق کی طرف ہونا چاہئے تاکہ اس اخلاص کی بدولت یہ کام نتیجہ خیز بھی ہو اور ظاہر و باطن کی صلاح و فلاح کی راہیں خدا کی طرف سے کھلتی رہیں۔

خلاصہ یہ کہ استخلاص وطن کی مہم دینی رنگ اور اسلامی ڈھنگ سے شروع کی جائے نہ کہ یورپ کی نقالی اور نمائشی مظاہروں سے، کام ٹھوس ہونا چاہئے نہ کہ رسمی۔ ورنہ جس غلامی سے گلوخلاصی کے لئے حرکت کی جائے گی وہی غلامی اور گلوگیر ہو جائے گی۔ گویا یورپ سے بچنے کے لئے یورپیت کا پھندا گلے میں آپڑے گا جو بچنا نہیں کہلائے گا بلکہ اور پھنسنا کہلائے گا اور ثمرہ یہ ہوگا کہ ظاہر کی غلامی کے ساتھ باطن کی غلامی بھی سر پر پڑ جائے گی۔

اشتراک عمل کی ضرورت...... ان مرادوں میں کچھ چیزیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے طلب کیں جیسے شرح صدر، تیسیر امر، حل عقدہ لسان۔ لیکن جو چیز سب سے اہم طلب کی وہ ﴿اَشْرِکْهُ فِیْ اَمْرِیْ﴾ ① ہے یعنی میرے اس کام میں میرے بھائی کو شریک کر دیا جائے جس سے واضح ہے کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں اشتراک عمل اولین منزل ہے اور وہ بھی اپنوں کے ساتھ۔ اس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ آج مسلمانون کو باہمی اشتراک عمل کی اشد ضرورت ہے۔ غیروں سے پہلے انہیں اپنوں کو اپنانا چاہئے۔ جمعیت العلماء سے زیادہ کون اس کا حق دار ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف وداد و محبت کا ہاتھ بڑھائے اور درمیانی رکاوٹوں کو آئینی اور رسمی انداز سے نہیں بلکہ واقعاتی انداز سے دور کر کے ٹوٹے ہوؤں کو ملانے کے لئے خود اقدام کرے۔ معاذیر نہ پیش کرے۔ بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اجتماعیت کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دے اور خود جھک کر دوسروں کو اپنے سامنے جھکا دے۔ خواہ وہ لیگی ہوں یا احراری۔ حق تعالیٰ نے یہ تمام باطنی اسلحہ موسیٰ علیہ السلام کو عطاء فرما دیئے اور ارشاد ہوا۔ ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی.﴾ ② ''فرمایا بلاشبہ تمہاری مراد تمہیں دی گئی اے موسیٰ۔

اور اس کے بعد تسلی آمیز کلمات فرما کر پھر اس ابتدائی حکم کو اس طرح دہرایا گیا ﴿وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ ٥ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ وَلَاتَنِیَافِیْ ذِکْرِیْ ٥ اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ٥﴾ ③ ''اور میں نے تم کو (اے موسیٰ) اپنے لئے منتخب کر لیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کے جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت چل نکلا ہے''۔

8 معیار قیادت...... اس سے واضح ہوا کہ اس اجتماعی کام کے شرکاء اور وہ بھی منصب داران قیادت ذاکرین کی جماعت ہو، غافلین کی نہ ہو جنہیں نہ اللہ کی معرفت ہو نہ اس کی محبت ہو اور نہ اس کے طریق اور راہ سے واقفیت ہو کہ وہ مسلمانوں کے کام اسلامی حیثیت سے کبھی نہیں بنا سکتے۔ مگر ساتھ ہی اسے فراموش بھی نہ کرنا چاہئے کہ قوم میں جو لوگ کسی نہ کسی ہیئت سے بڑائی پیدا کر چکے ہیں اور مخلص بھی ہوں ان کی ادنیٰ توہین یا بے وقعتی بھی گوارا نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اجتماعی کام میں افراد ہی کا نہیں اجتماعات کا وابستہ رکھا جانا بھی ناگزیر چیز ہے۔ ورنہ اجتماعیت عامہ پیدا نہیں ہو سکتی جو قومی حریت کے لئے اولین زینہ ہے۔ ہاں ان کی تقویم اور غلط روش کی اصلاح، شفقت و

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰه، الآیۃ: ۳۲. ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰه، الآیۃ: ۳۶. ③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰه، الآیۃ: ۴۱، ۴۳.

محبت اور خلوص کے ساتھ ضروری ہے تا کہ وہ بھی بلا کسی جھجک کے امر حق کی طرف جھک آئیں اور لاعلمی کے سبب ان میں جو بعد سوء اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا وہ مبدل بہ قرب ہو جائے۔ غرض اس طرح سے دو پیغمبروں کو قائد بنا کر فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔

⑨ **مذاکرات کی بنیاد**...... یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حکمران کے پاس جانے والے (جو آزادی مانگنے کے لئے جا رہے ہوں) بحیثیت فرستادہ خدا جائیں نہ کہ ذاتی تقاضے سے روانہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ازخود نہیں گئے، بھیجے ہوئے گئے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت الٰہی پر عائد ہو جائے گی۔ قوم پر کوئی برائی اور آنچ نہیں آئے گی۔ غرض ان تمام کیفیات کے ساتھ ارشاد ہوا کہ فرعون کے پاس پہنچو۔ اسی موقع کے لئے دوسری جگہ قرآن میں یوں ارشاد ہے۔ ﴿وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ o قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا یَتَّقُوْنَ.﴾ ① ''اور جب آپ کے ربّ نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ان ظالم لوگوں یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ کیا یہ لوگ نہیں ڈرتے''۔

⑩ **حکومت اور قوم سے افہام وتفہیم کی ضرورت**...... اس سے واضح ہوا کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں نہ صرف حکمران ہی کے پاس جانے کی ضرورت ہے بلکہ حکمران قوم کے پاس بھی جانے اور ان سے مل کر گفت وشنید کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ حکومت اپنے غرور میں مدعا پر کان نہیں دھرتی مگر حکومت کی قوم سمجھ جاتی ہے اور کبھی برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال حکومت اور قوم دونوں سے اس بارے میں گفت وشنید ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں احکام سے دو خطرے لاحق ہوئے جن کو انہوں نے صفائی سے عرض کر دیا۔ حکومت سے تو زیادتی اور تعدی کا کہ فرعون کوئی جابرانہ کارروائی نہ کر بیٹھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی تو عرض کیا ﴿قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی.﴾ ''دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

اور قوم سے خطرہ ہوا تعصب اور ہٹ دھرمی کا کہ بات نہ مانے اور مجھے چھوڑ دے کیونکہ وہ مستغنی تھی تو عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ.﴾ ② ''کہا اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں حق تعالیٰ نے جواب میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا ﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی.﴾ ③ ''اور ارشاد ہوا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ﴿کَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ.﴾ ④ ''کیا مجال ہے سو تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر فرستادہ خدا ہونے کی حیثیت سے احکام اور حکمران قوم سے ملا جائے گا تو مضرت کی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۱۰، ۱۱. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۱۲.
③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۶. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۱۵.

ذمہ داری اللہ پر ہوگی۔ یعنی کام خدا کے نام اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر شروع کیا جائے تو پھر اس کے اثرات ونتائج دوسرے ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اختراعی پروگراموں اور خود اپنی ذوات کے بل بوتہ پر کام شروع کریں تو اس کے نتائج اور ہیں۔ ان میں وہ قوت نہیں آ سکتی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔

11 **شعار قیادت**...... اس لئے آیت بالا میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو نہ صرف یہی حکم دیا گیا کہ بحیثیت فرستادۂ خدا ہونے کے دربار فرعونی میں جاؤ۔ اپنی طرف سے مت جاؤ اور نہ صرف یہی کہ ہمارا ہی پیغام پہنچاؤ اپنی طرف سے کچھ نہ کہو یعنی اختراعی پروگرام مت اختیار کرو بلکہ یہ بھی ارشاد ہے کہ انداز پیام رسانی بھی ہمارا ہی متعین کردہ اختیار کرو بطور خود طریق ابلاغ بھی متعین نہ کرو اور وہ یہ کہ ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ ① ''پھر اس (فرعون) سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

یعنی مکالمہ میں بھی تشدد کا پیرایہ نہ آنے پائے۔ جبکہ یہ جنگ عدم تشدد کی جنگ ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس جنگ آزادی کے قائد اعظم تھے طبعاً تیز مزاج تھے اور ان کی شان جلالی واقع ہوئی تھی۔ افتاد طبع میں حدت اور شدت تھی۔

چناں چہ اس تشدد پسندی کے چند واقعات بھی ان سے ظاہر ہو چکے تھے، قبطی کو جوش میں تھپڑ مارا تو اس کی گردن الگ جا پڑی اور مر گیا، بچپن میں فرعون کا دعوائے الوہیت سن کر ایک دو چپت اسے بھی رسید کئے اس کی داڑھی پکڑ لی وغیرہ تو اندیشہ تھا کہ فرعون کے بے باکانہ اور گستاخانہ جوابات سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی طبعی رفتار پر کہیں اکھاڑ پچھاڑ کر کے نہ چلے آئیں اور نصیحت وشفقت یا اتمام حجت کا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے، اس لئے بہ تاکید دونوں حضرات کو شیریں زبانی اور نرم گوئی کا حکم دیا گیا تاکہ یا دشمن اس خوش اخلاقی سے مسخر ہو جائے اور یا پھر برملا اس کی تعدی واضح ہو کر کھلے بندوں اس پر حجت تمام ہو جائے۔

کون نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جوش وخروش عیاذاً باللہ نفسانی نہ تھا کہ نبوت کی بارگاہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ بغض فی اللہ تھا جو شرعاً مطلوب ہے لیکن موقعہ کی نزاکت اور اجتماعیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ اس جذبہ کو اگر چہ وہ دینی تھا مستور کر کے دوسرے دینی جذبہ رافت فی اللہ اور صبر وتحمل کو بروئے کار لایا جائے کیونکہ مقصود اصلی صرف اتنا ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کر کے اپنا ذمہ بری کر لیں اور فرعون کو کہہ سن کر فارغ ہو جائیں بس فرض تبلیغ ادا ہو جائے، آگے فرعون اور فرعونی جنت میں جائیں یا جہنم میں، نہیں بلکہ مقصود اصلاح اور تکمیل کا رتھی اور فرعون کے پاس اس جذبہ کے ساتھ جانا تھا کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آ جائے نہ یہ کہ ہم پیام پہنچا کر بری الذمہ ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ قصدِ اصلاح وتربیت کے ساتھ مخاطب کے احوال کی رعایت کی جاتی ہے نہ کہ اپنے احوال

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۴۔

کی۔اس صورت حال سے یہ مسئلہ نمایاں ہوتا ہے کہ آج بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے قائدین اور زعماء کا خواہ وہ کسی اجتماعی ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا خود اپنے کام کے، شعار رافت ورحمت ہونا چاہیے، قول لین اور نرم گوئی ان کی شان غالب ہوتا کہ اپنے ٹوٹنے نہ پائیں اور غیر بیگانے نہ رہیں، غلظت قلب اور شدت ہمیشہ قطع کا باعث ہوتی ہے اور رافت ولینت ہمیشہ وصل وملاپ کا سبب بنتی ہے بشرطیکہ اس میں مداہنت اور استرضاء غیر اللہ نہ ہو۔ پس زعماء مسلمین زیادہ احق ہیں کہ ﴿ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ﴾ ① کے مصداق بنیں اور ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ ہو کر حکمت اور رافت اور نصیحت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اِقتدار کے فرعون سے طرزِ گفتگو......اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں حکومت متسلطہ کے مظالم اور آئینی انداز کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کی شوکت کو تباہ کرنے کی وسیع کاریاں، بلادِ اسلامیہ کو چن چن کا پامال کرنا اور اسلامی شوکت کو مٹا کر نصرانی عظمت واستذاب کو قائم کرنا۔ مقاماتِ مقدّسہ کی بے حرمتی کرنا۔ ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے کیئے ہوئے معاہدوں کو پس پشت ڈال کر ان کی صریح خلاف ورزی کرنا، ہندوستانی اقوام سے جھوٹے وعدے کر کے انہیں احمق بنانا اور اپنا الوسیدھا کرتے رہنا، انہیں لڑا لڑا کر حکومت کی بنیادیں استوار کرنا وغیرہ وہ امور ہیں کہ جمیت اسلامی کے ماتحت ان پر مسلمانوں اور ان کے زعماء کو جس قدر بھی جوش ہو کم ہے اور جس قدر بھی وہ غیظ وغضب کا اظہار کریں انہیں حق ہے۔فان لصاحب الحق مقالاً لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقصود اصلی جوش کا مظاہرہ کر لینا نہیں بلکہ اپنی آزادی اور متقابل قوم کو حق سے متاثر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب میں تاثر اور سیلان اظہار غضب سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ رقت ولین سے، موسیٰ علیہ اسلام سے زیادہ ہم بغض فی اللہ کے حامل نہیں ہو سکتے، لیکن انہیں بھی عدم تشدد کی جنگ کی صورت میں قول لین کا حکم دیا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون بغض فی اللہ سے متخلق ہوسکتا ہے اور وہ بھی بمقابلہ مشرکین مکہ جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی حتی کہ آخر کار وطن اور گھر بار تک سے محروم کر دیا لیکن مکہ کی زندگی میں جو عدم تشدد کی زندگی ہے، خود حضور کو بار بار حکم ملتا رہا کہ صبر سے کام لو، تحمل سے کام لو، کسی جذبہ کا اظہار نہ کرو۔ شفقت وخیر خواہی خلق اللہ کو ہاتھ سے رہاں مالیاں کھا کے بے مزہ مت ہو۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ ② ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ.﴾ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِ يْنَ.﴾ ③ ''سو آپ صبر کیجئے جیسے اُولو العزم انبیاء نے صبر سے کام لیا اور جلدی نہ کیجئے۔ سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے۔ غرض آپ کو جس چیز کا کا حکم دیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور ان مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے یہ لوگ جو ہنستے ہیں۔

① پارہ: ۲۶، سورة الفتح، الآية: ۲۹. ② پارہ: ۲۶ سورة الاحقاف، الآية: ۳۵. ③ پارہ: ۱۴ سورة الحجر، الآية: ۹۴.

④ شعب الایمان للبیهقی، فصل فی اسمائه صلی الله علیه وسلم ج: ۳ ص: ۴۴۱ (قال البیهقی رحمه الله: هذا مرسل)

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہی رحمت اللعالمین ہوا۔ آپ کا لقب ہی رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ ﴿۴﴾ ہوا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور خیر خواہی خلق اللہ کا یہ عالم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس غیر معمولی شفقت سے روک کر اس کی تعدیل فرمانی پڑی کہ: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.﴾ ① ''شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔

بہر حال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس عدم تشدد کی جنگ میں دشمنوں اور فرعون صفت دشمنوں کے سامنے قول لین کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار غیظ وغضب کی اور خود انہیں بھی ہدایت کرنے کی ضرورت ہے نہ تنہا اپنی گلو خلاصی کی، اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خطرہ ظاہر کیا کہ فرعون ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یعنی باوجود اس نرمی اور لینت کے بھی اس سے مان جانے کی توقع نہیں۔ بلکہ تمرد اور ڈھٹائی کا ہی خطرہ ہے گویا ایسے سرکش کے لئے پھر نرمی کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی ارشاد ہوا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں کہ تم پر اس کی کوئی زیادتی اثر انداز نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ تم تو ناصحانہ اور مشفقانہ انداز ہی سے بات کرو۔ مصلحت اور حکمت یہی ہے۔

⑫ **بلند بانگ دعووں کی ممانعت......** اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنگ آزادی کے سلسلہ کے قائدین متواضع اور بے تکلف ہونے چاہئیں جو اپنے دل کی ہر کھٹک کا بے تکلف اظہار کر سکیں حتی کہ اپنی کمزوری صاف صاف کہہ سکیں اور کوئی رسمی وقار انہیں اظہار حال سے مانع نہ ہو نہ کہ فخر وشیخی خورے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بایں قوت نبوت اپنے خوف کا اور دشمن کی طرف سے متوقع زیادتیوں کا جو خطرہ دل میں گزرا اس کا برملا اور بے تکلف اظہار فرمادیا کہ مجھے فرعون سے زیادتی کا خطرہ ہے اور اس کی قوم سے تکذیب اور ہٹ دھرمی کا۔

اس لئے آج ہمارے لئے بھی جبکہ ایک جابر حکومت کے سامنے مطالبے لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اِدّعاء اور یہ فخر یہ لب ولہجہ یا شیخی کے کلمات کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے یہ دعوے کبھی زیب نہیں دیں گے کہ نہ ہم حکومت سے ڈرتے ہیں نہ ہم پھانسی سے خوف کھاتے ہیں نہ ہمیں جیل کا ڈر ہے، ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کچھ کر گزریں گے۔ خدا کرے ہمارے قلوب غیر اللہ سے ایسے ہی نڈر اور بے باک ہوں لیکن اعادہ تو پھر بھی ممنوع ہے جب تک کہ ادعا کی کوئی شرعی ضرورت ہی پیش نہ آجائے۔ ہمیں عموماً ہر حالت میں اور بالخصوص قوی دشمن کے سامنے پڑ کر اللہ کے لئے اعلان تواضع اور اعتراف ناتوانی میں ہرگز کوئی ادبی باک نہ کرنا چاہئے اور پروردگار کے سامنے بلا ریب وشک اپنی صحیح حالت کا نقشہ رکھ کر ادھر سے امداد کی استدعاء کرنی چاہئے، کیونکہ تصنع کی بہادری کار آمد ہے نہ تصنع کا مظاہرہ ہمارا راستہ حقیقت واقعہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آیت بالا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ سے واضح ہے تا کہ ساری ذمہ داری حکومت حق پر رہے اور ہم محض خدا کے ایک کارندے اور کارگزار کی حیثیت سے حکومت متقابل کے سامنے پیش ہوں۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۳۔

13 **مسلم قیادت کا اولین فرض**......ان ابتدائی معاملات کے طے ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا: ﴿فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ﴾ ① ''سو تم دونوں (فرعون) کے پاس جاؤں اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ قائدوں کی جماعت دربار حکومت اور حکمران قوم کے ایوانوں میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پوزیشن صاف صاف واضح کردے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ جاتے ہی پہلے فرعون کو یہ بتلاؤ تم کون ہو؟ یعنی صاف صاف کہہ دو کہ ہم رسول ہیں اور فرستادۂ خدا ہو کر آئے ہیں یعنی ہم خود نہیں آئے بھیجے ہوئے آئے ہیں ہم مذہبی پیغام لے کر آئے ہیں۔ اپنی کوئی رائے یا اپنی جماعت کی کوئی پاس کردہ تجویز پیش کرنے نہیں آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان قائدوں کا جو اوصاف مذکورہ سے متصف ہوں اولین فرض یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت اور حکمران قوم سے ملتے وقت صفائی سے اپنی پوزیشن واضح کردیں کہ ہم مسلمان ہیں یعنی ہم بحیثیت ہندوستانی کے وطنی جذبہ سے نہیں آئے بلکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی جذبات سے آئے ہیں ہم اول و آخر مسلمان ہیں نہ کہ اول مسلمان اور پھر ہندوستانی۔ ہم مذہبی اشارات پر آئے ہیں نہ کہ آراء و اختراعات پر۔ ہم ذاتی افکار و قیاسات سے کوئی پاس کردہ رزیولیوشن لے کر نہیں آئے بلکہ اس مذہب کی دفعات لے کر آئے ہیں جو خدائے حاکم اور ملک الملوک کا بھیجا ہوا ہے اور جس کو آزاد رکھنے کے تم بھی اپنی زبان سے مدعی ہو۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا مفاد تو یہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن وزنی اور موثر ہو جائے گی کیونکہ ترجمانی حق کی پوزیشن کا جو اثر مخاطبوں پر پڑ سکتا ہے وہ خود ہماری اپنی بنائی ہوئی رسمی پوزیشن کا خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی ہو نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ اسلامی پوزیشن بے ساختہ اور قدرتی ہے اور غیر اسلامی پوزیشن بہرحال بنائی ہوئی ہے اور بہ تکلف اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی انہی غیروں کی نقالی سے جن کے سامنے ہم احتجاج کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مخاطب اس سے کسی عظمت و میلان کا اثر نہیں لے سکتے۔ بلکہ تضحیک کا جو ہمارے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر اور سخت خطرناک ہے کہ اس میں ہوا خیزی ہے، کا اثر لے لیں گے۔

قیادت علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے...... نیز اسلامی اور خالص دینی پوزیشن لے کر جانے اور اسے صاف لفظوں میں پہلے ہی واضح کردینے کا دوسرا مفاد یہ بھی ہوگا کہ قیادتِ عامہ مخلوط نہ رہے گی بلکہ نکھر جائے گی اور قدرتی طور پر اس نوع کی قیادت اور دعوت لے کر وہی اٹھ سکیں گے جو حقیقۃً اس پوزیشن کے اعلان کی قوت اور اہلیت رکھتے ہوں گے، ہر کس و ناکس کو اس کی جرات نہ ہوگی کہ وہ پیغام بردار الٰہی بن کر اپنے یا اغیار کے پلیٹ فارم پر پیش ہو اور اس قیادت کی اہلیت صرف انہی افراد میں پائی جا سکے گی جو دینی اور روحانی رنگ میں اس پیغام کے

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷۔

اثبات وایضاح اوراس کی طرف سے دفاع کی قدرت اور عملی ہمت رکھتے ہوں گے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ایک طالب علم یا علماء کا نام لیوا ہونے کی حیثیت سے کسی جماعتی تعصب سے کام لے رہا ہوں اور خواہ مخواہ علماء کی قیادت اور مطاعیت کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ الزام اس وقت صحیح ہوسکتا ہے کہ میں امت کو علماء کی ذوات کا پابند ہو جانے کی دعوت دوں۔ حالانکہ میری غرض علماء کی ذوات کی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں اور نہ مجھے اس کا حق ہے بلکہ میں علماء حق کی زبان پر جاری شدہ قانون الٰہی کی اطاعت پر مجبور ہو جانے کی دعوت دے رہا ہوں، اس صورت میں قیادت قانونِ الٰہی کی آنکلتی ہے نہ کہ علماء کی۔ مگر چونکہ قانونِ علماء کی ہی زبان سے مسموع ہوتا ہے اور کتابِ الٰہی کی صحیح ترجمانی وہی کر سکتے ہیں اس لئے ضمناً ان کی اطاعت وقیادت بھی نکل آتی ہیں مگر بالذات نہیں بلکہ بالغیر۔

ساتھ ہی تعصب کا الزام دینے والے اس پر بھی غور کریں کہ علماء کا کوئی مخصوص خاندان یا قبیلہ نہیں کہ دوسرے قبائل کو ان کی طرف جھکنے پر مجبور کیا جائے، علم الٰہی کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر مسلمان ہر وقت عالم دین بن سکتا ہے پس اگر کسی غیر عالم کو کسی عالم کی اطاعت سے عار آئے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ قانونِ الٰہی کو رد کرنے لگے بلکہ یہ ہے کہ خود عالم بن کر قائدوں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور قانونِ حق کی اطاعت کر کے دوسروں سے اطاعت کرائے مگر بہر صورت مسلمان رہتے ہوئے قوانین الٰہی کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ خواہ عالم ہو یا غیر عالم۔ پس جہاں میں غیر علماء کو پابندی قانون الٰہی کی دعوت دے رہا ہوں وہیں وہ دعوت علماء کے لئے بھی ہے، اس لئے تعصب کا الزام بے معنی ہوگا۔

14 ترجمانِ رسالت حاملِ معرفت ہونا چاہئے...... یہاں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ ہارون علیہما السلام بفحوائے: اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ ''ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں''۔

فرعون کے سامنے بحیثیت رسول کے پیش ہوئے نہ کہ بحیثیت اسرائیلی ہونے کے اور رسول مربی مخاطبین اور ناصح اقوام ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنی قوم کی گلوخلاصی چاہتا ہے، اسی طرح مخاطب اقوام کی بہبود وفلاح کی فکر بھی ہمدردانہ کرتا ہے۔ چناں چہ موسیٰ علیہ اسلام جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑانے کے لئے فرعون کے پاس گئے اسی طرح خود فرعون اور فرعونیوں کی اصلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر تھی کیونکہ رسول کے معنی ہی مربی خلائق اور ناصح مشفق کے ہیں تو اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ مسلمانوں کے جو قائد بحیثیت ترجمان رسالت حکومت کے سامنے پہنچیں وہ صرف اپنی قوم کی گلوخلاصی پیش نظر نہ رکھیں بلکہ حکمران اقوام کی اصلاح و بہبود بھی ان کے سامنے رہے اور وہ جس طرح پیغام الٰہی کے واسطے سے وہاں پہنچیں اسی طرح اس پیغام الٰہی سے خود اس قوم کو بھی آشنا اور متاثر بنانے کی فکر کریں وہ صفائی سے مگر بحکمت یہ کہیں کہ ہم جس اسلام کو اور اس کے واسطہ سے مسلم قوم کو آزاد کرانے آئے ہیں، اسی اسلام کا تحفہ خود تمہارے لئے بھی لے کر آئے ہیں۔ مغلوب کا محارب کی صورت سے

سامنے آنا اور اثر رکھتا ہے اور اپنی خیر جوئی کے ساتھ مقابل کی اصلاح کا پرواز اختیار کرنا اور اثر رکھتا ہے۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکمران قوم تک محکوم قوم کے پیغامات اور مطالبے یا پہنچتے ہی نہیں یا پہنچتے ہیں تو کورے سیاسی رنگ میں پہنچتے ہیں اور وہ سیاسی رنگ بھی خود حکمران قوم کا ہوتا ہے جس سے حکمرانوں پر ان مطالبات کی اصل دینی حیثیت واضح ہی نہیں ہوتی اور کسی درجہ میں ہوتی بھی ہے تو صرف اِدّعاء کے رنگ میں نہ کہ کیفیت اور حال کے درجہ میں یا کم از کم استدلال کے درجہ میں جو انہیں اس حیثیت میں متاثر کر سکے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالبات پہنچانے والے جو مسلمانوں کی نمائندگی کا فخر اپنے قلوب میں محسوس کرتے ہیں، نہ خود دین سے واقف ہوتے ہیں نہ دین کا کوئی رنگ اور حال و کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے مسلم قوم کے اصلی مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق وہ پیغام پہنچانے پر قادر ہی نہیں ہوتے بلکہ جیسے اور مختلف اقوام کی سیاسی پارٹیوں کے مطالبات رسمی طور پر حکومت کے کانوں تک پہنچتے رہتے ہیں اس طرح مسلمانوں کے مطالبات بھی قومی اور سیاسی رنگ میں انگریزیت کے ساتھ انگریز کے سامنے آجاتے ہیں جن میں کوئی حقیقی اسلامی روح نہیں ہوتی جو دوسروں کو متاثر کرے۔

پس جو لوگ حکومت کے کانوں تک قوم کا پیغام لے کر جاتے ہیں وہ دین سے ناآشنا اور انگریز سے اس کی زبان میں بات چیت کرنے کے عادی اور ادھر جو لوگ دین سے واقف اور اس کا رنگ ڈھنگ لئے ہوئے ہیں وہ انگریز کی زبان اور اس کی ذہنیت سے ناواقف پھر اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بعید اور الگ تھلگ جن میں باہم کوئی سنگم نہیں بلکہ ہے تو بے اعتمادی باہمی ہے اور اسے بھی بڑھاتے رہنے کی کوششیں اپنوں اور اغیار کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں نہ کہ کم کرنے کی۔ ادھر ایسے جامع افراد مفقود ہیں جو دونوں رُخوں کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا صحیح پیغام اپنے اصلی رنگ میں مدعیان حکومت کے سامنے نہیں پہنچتا۔

طرزِ نبوت اپنانے کی ضرورت...... ہاں ان سب کا نعم البدل یہ ہے کہ علماء میں سے صرف وہ افراد جو عالم باللہ اور عالم بامر اللہ یعنی عارف ہوں روحانیت سے بھرپور ہوں، باخدا ہوں۔ اس پیغام کو لے کر اٹھیں اور اپنے مخلصانہ اور بے غرضانہ رنگ میں بطرزِ انبیاء اس پیغام کو اپنوں اور متسلط اقوام کے دلوں میں اتارنے کا عزم باندھ لیں اور عامۂ علماء ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو پھر وہ جس زبان میں بھی کہیں گے تاثیر نمایاں ہوگی۔ دل معترف ہوں گے۔ خواہ زبانیں اعتراف کریں یا نہ کریں ۔

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است　　عشق راخود صد زبان دیگر است
بوئے او دلبر چو پراں می شود　　ایں زبان ہا جملہ حیران می شود

پس اگر صحابہؓ کی طرح عرفاء اس میدان میں آجائیں اور استدلال کے بجائے حال سے کام لیں رسمیات کی بجائے حقائق استعمال میں آنے لگیں اور رسمی لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو زبانوں اور ذہنیتوں کی بحثیں ہی درمیان

سے اٹھ جائیں گی، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تحریکات کا قالب اور ڈھانچہ کچھ بدل جائے گا اور روح بھی اس میں اسی کی مناسب پیدا ہو جائے گی اور پھر انداز حضرات صحابہؓ کی مساعی کا ہو جائے گا جس میں جذب و کشش باہمی بھی پیدا ہوگی اور دشمنوں پر ہیبت بھی پڑے گی۔

بہر حال جب تک اسلامی تحریک میں تبلیغی رنگ اور ناصحانہ ورحیمانہ انداز نہ ہو اور دین کو آگے بڑھا کر رسمیانہ انداز مغلوب نہ کیا جائے، اسلامی رنگ کا نتیجہ نہیں نکل سکتا مگر صد حسرت کہ یا اب ایسے افراد عنقاء ہیں یا سامنے نہیں ہیں یا ان کی پرسش نہیں ہے۔

قوّت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام......۱۶۔ پھر اس پیغام اور مطالبہ کا ابلاغ کیا ایک آدھ دفعہ کافی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تبلیغ میں برسہا برس گزارے اور مختلف اندازوں سے مدعا سمجھایا اور واضح کیا۔ اسے ثابت کر کے خدا کی طرف سے اِتمام حجت کیا اس مستمر اور مسلسل مطالبہ وتبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ حق مختلف جہتوں سے واضح ہو گیا۔ منکر فرعون اور فرعونیوں پر خدا کی حجت تمام ہوتی گئی اور بالآخر پھر بھی اس کے انکار وجُحود پر خدا کی طرف سے تنبیہات اور عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا، قحط سالیاں اور مال و دولت وغیرہ کی تباہیوں نے فرعون پر یہ واضح بھی کر دیا کہ یہ ساری بلائیں ان شرعی اور خدائی مطالبات نہ ماننے ہی سے نازل ہو رہی ہیں۔

چناں چہ موسیٰ علیہ السلام سے وقتاً فوقتاً اعتراف قصور کر کے فرعون دعا اور معافی کا طالب بھی ہوا مگر ساتھ ہی چرچل کی پالیسی پر جما رہا اور سارے ہی مطالبے ٹھکرا دیئے جس سے موسیٰ اور موسویوں کے صبر واستقلال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ان کی مظلومیت سورج سے زیادہ نمایاں ہوگئی۔ آخر کار قبطیوں اور سبطیوں دونوں کے اعمال کے مطابق نتائج دونوں کے سامنے آگئے ضعیف قوم غلامی سے رہا ہو کر برسر اقتدار آئی اور قوی قوم غلامی نفس میں گرفتار ہو کر دنیا وآخرت کے مصائب کا شکار ہوئی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کے واقعات کا جو جامع نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے اور ترجمہ غور سے دیکھئے جو درحقیقت حاصل طلب اور مختصر سی تفسیر ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ٥ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.﴾ ① ''اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں تا کہ وہ سمجھ جائیں۔ سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ، جب بھی ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں''۔

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۰، ۱۳۱.

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ.﴾ ① ''تو پھر ہم نے (کثرت بارش کا) طوفان بھیجا (اس سے گھبرا کے موسیٰ سے فرعونیوں نے عہد و پیمان کیا مگر طوفان کھلنے پر پھر اسی انکار پر اڑے رہے تو ہم نے ان پر) ٹڈیاں مسلط کیں (جو کھیتوں کو چاٹ گئیں پھر عہد و پیمان کیے مگر یہ بلا دور ہونے پر پھر بدستور اسی سرکشی پر جمے رہے تو ہم نے لائے ہوئے غلہ میں) گھن کا کیڑا پیدا کر دیا (پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور یہ بلا دُور ہو کر جب مطمئن ہوئے کہ اب غلہ پیس کر کھائیں گے تو ہم نے ان پر) مینڈک مسلط کیے (جو ہجوم کر کے کھانے اور برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہونے لگا اور گھروں میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، پھر پینا یوں مشکل ہو گیا کہ) ان کا پانی خون ہو جاتا یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے سو وہ تکبر کرتے رہتے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ''۔

﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.﴾ ② ''اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ: ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے اگر آپ اس عذاب کو ہم سے اٹھا دیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) آپ کے ساتھ کر دیں گے۔ ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ.﴾ ③ ''پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک وقتِ خاص تک (کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا) اُٹھا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ٥ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا، وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ، بِمَا صَبَرُوْا، وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ.﴾ ④ ''پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے اس زمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر (یعنی مصائب سے نہ گھبرانے اور احکام نبوّت پر جمے رہنے) کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا''۔

فرعون اور بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ قرآنی نقشہ سامنے رکھئے اور پھر برطانیہ اور ہندوستان کے کمزور

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۳. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۴.

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۵. ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۷.

غلاموں کے باہمی معاملات پر غور کیجئے۔ جس درجہ میں انہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے میں مطالبات اور احتجاج سے کام لیا گو کہ وہ عشر عشیر بھی ابھی تک زیر عمل نہیں آیا اور نہ کچھ پورے صحیح اُسلوب پر پیش کیا گیا تاہم جس حد تک بھی کیا اور اس میں قید و بند کے مصائب کو جھیل کر صبر و استقلال سے کام لیا گیا۔ اسی حد تک ظالم قوم پر حجت قائم ہو کر خدا کی طرف سے تنبیہات اور ظالم قوم کی طرف سے تھوڑا بہت مُڑ مُڑ کر دیکھنے اور کبھی کبھی جھک جانے کا ظہور ہوتا رہا، گو ساتھ میں انکار وجحود بھی بدستور قائم رہا۔

گذشتہ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ اعظم تنبیہات کا ایک سلسلہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے ذریعہ فرعونی دور کی طرح حکمران قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور صنعت گاہوں کو وقتاً فوقتاً تباہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی اونچی اونچی سر بفلک عمارتیں زمین بوس بھی کی گئی ہیں۔

ان کے لاکھوں بڑوں اور چھوٹوں کو دریا برد بھی کیا گیا، اس سلسلہ میں جب کبھی شکست کا رخ سامنے آتا ہے تو یہ قوم فوراً مڑ کر غلام ہندوستان کی طرف دیکھنے بھی لگتی ہے اور دفع الوقتی کے طور پر کچھ پارلیمنٹری پارٹیاں آزادی ہند کا مسئلہ بھی چھیڑ دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جانے لگتی ہے۔ کبھی کرپس صاحب نمائشی آزادی کا کھلونا لے کر ہندوستان کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سیاسی اسیروں کی رہائی کا مسئلہ بھی زیر غور آجاتا ہے۔ کبھی ہندوستان کو طفل تسلی دینے کے لئے انہیں اختتامِ جنگ پر کسی حد تک نام کی آزادی کے وعدے دے دیئے جاتے ہیں، لیکن جوں ہی شکست کا پہلو کمزور ہو کر فتح مندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر وہ سارے عہد و پیان سارے رجوع ایسے کافور ہو جاتے ہیں کہ گویا کسی زبان و قلم پر کبھی آئے ہی نہ تھے، وہی ایک چڑ چلی رٹ اور ہٹ سامنے رہ جاتی ہے، یعنی جب عذاب سامنے آتا ہے تو فرعونیوں کی طرح مظلوموں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ: وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَکَ ''ہم عنقریب آزادی دینے والے ہیں''۔

اور جب وہ ایک تھوڑی سی مدت کے لئے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور یہ قوم اطمینان کا سانس لیتی ہے تو ﴿اِذَا هُمْ یَنْکُثُوْنَ﴾ ① پھر وہی عہد شکنی اور الغاءِ مواعید۔ لیکن اس لَیْتَ و لَعَلَّ اور ان حقیقت پوشیوں سے خدا کا آخری انتقام ٹلنے والا نہیں ہے۔ ضرور بالضرور یہ ہو کر رہے گا کہ جو لوگ کمزور شمار کئے جا رہے ہیں انہی کو اس زمین کے پورب اور پچھم کا مالک بنایا جائے گا مکمل آزادی ظاہر ہو کر رہے گی اور جو قوت پر گھمنڈ کر کے کسی مطالبہ پر غور نہیں کرتے ان کے ساختہ پرداختہ کارخانے کلیۃً درہم برہم ہوں گے۔ ان کی اونچی اونچی بلڈنگیں سرنگوں ہو کر رہیں گی اور خدا کا نیک وعدہ کمزور اقوام کے حق میں پورا ہو کر رہے گا۔ ﴿وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی﴾ بشرطیکہ ان اقوام نے اُسوۂ موسوی اور اُسوۂ محمدی علیہما الصلوٰۃ والسلام سے روگردانی نہ کی۔

جُہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں...... اور وہ یہی کہ خدا کے بھروسہ پر اور اس کے بتائے ہوئے رنگ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۵.

ڈھنگ پر تبلیغ اوراظہارمطالبات میں ایک آدھ دفعہ پر قناعت نہ کی جائے بلکہ موسوی انداز پر تسلسل کے ساتھ یہ مساعی زوراور ہمت باطنی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔غرض تبلیغ پیغام میں اگر تسلسل اور دوام پیدا ہو جائے اور مطالبات کا زور بندھا رہے ادھر اپنی قوم کی تعمیر بھی ممکنہ حد تک ہوتی رہے تو قدرتی طور پر اِتمامِ حجت اور فیصلہ کن نتائج کی ایسی صورتیں سامنے آجائیں گی جن کا فی الحال بظاہر اسباب تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ① میں یہ نہیں کہتا کہ علماء حقانی کے بتائے ہوئے قرآنی پروگرام پر چلنے سے پہلے ہی دن میں کامیابی سامنے جائے گی یا ساری مشکلات اگلے ہی دن ختم ہو جائیں گی یا مشق وتعب سے دو چار نہ ہونا پڑے گا۔لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پر صبر واستقلال کے ساتھ جم جانے سے غیبی امداد ساتھ ہوگی اور نتائج یقینی اور قطعی ہوں گے۔اُسوۂ موسوی میں اس حقیقت کو بھی دیکھئے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ② ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ:خدا کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنادیں اپنے بندوں میں سے اور آخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں''۔

اس پر قوم موسیٰ علیہ السلام نے ذرا گھبرا کر بے صبری سے کہا جیسے آج بھی کمزور دل کے انسان لگتے ہیں:
﴿قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا﴾ ③ ''قوم کے لوگ کہنے لگے کہ:ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (یعنی آپ کی پیروی سے آخر نتیجہ کیا نکلا؟ غلامی بھی بدستور باقی ہے اور فرعونی چیرہ دستیاں بھی'')۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:﴿قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ ④ ''موسیٰ نے فرمایا:بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کریں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے۔پھر تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے یعنی ایسے کاموں میں جلد بازی نہیں چاہئے کام کئے جاؤ اور غیبی لطائف کے منتظر رہو''۔

پس آج بھی بنی اسرائیل کی طرح پیروی نبوت کے سلسلہ میں ابلاغ عام اور مسلسل مطالبات اور ضروری جدوجہد کی طویل مدت سے نہ گھبرانا مناسب ہے نہ تبلیغ کے تسلسل میں سستی دکھانا مفید وعدہ الٰہی پر بھروسہ اور اس کے جوارح کی حیثیت سے جنگ آزادی میں حصہ لینا اور لیتے رہنا اور دینی انداز میں آگے بڑھنا اپنی قوم کی گلو خلاصی کے ساتھ مقابل قوم کو خدا کا سچا پیغام موثر پیرایوں میں پہنچاتے رہنا ہی اصل مشن ہے،جس پر وعدہ الٰہی کے

---

① پارہ:۲۸،سورۃ الطلاق،الآیۃ:۲، ۳. ② پارہ:۹،سورۃ الاعراف،الآیۃ:۱۲۸.
③ پارہ:۹،سورۃ الاعراف،الآیۃ:۱۲۹. ④ پارہ:۹،سورۃ الاعراف،الآیۃ:۱۲۹.

مطابق کامیابی یقینی ہے۔

دینی پیشواؤں کی قیادت میں آ کر اگلے ہی دن کہنے لگا کہ:﴿ اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَاجِئْتَنَا. ﴾ ④ ''آپ کی رہنمائی سے قبل بھی یہی مصائب تھے۔اور آپ کی رہنمائی کے بعد بھی ان میں کچھ فرق نہ پڑا''۔منشاءِ نبوت کے بھی خلاف ہے اور فطری اُسوۂ حسنہ (صبر واستقلال) کے بھی خلاف ہے پس خدا پر بھروسہ کر کے اور رسمیات سے گزر کر حقائق کا دامن سنبھالتے ہوئے احتجاجی تبلیغی اُسوۂ اور تسلسل تبلیغ کی ضرورت ہے تا کہ اُمتِ اسلامیہ کا پیغام ہر کان میں گونج اٹھے اور گونجتا رہے۔

مطالبۂ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت...... آج ہم تبلیغی سلسلوں میں اگر سوچتے بھی ہیں تو صرف اسی حد تک کہ اپنی قوم کو تبلیغ مسائل کر کے اس کی اصلاح کی فکر کریں اور بلاشبہ یہ بھی اہم فرائض میں سے ہے یا کوئی اونچا قدم اٹھاتے ہیں تو یہ کہ یورپ وامریکہ میں ہمارے مبلغ پہنچنے چاہئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کیا ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ سارے یورپ وامریکہ کا خلاصہ جو ہندوستان اور اس کی اقوام کو جونک بن کر چوس رہا ہے اور دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔ ہماری بدبختی سے ہندوستان ہی کے تختہ پر جمع ہے کیا وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کے کان حقیقی انسانیت کے پیغام سے آشنا کئے جائیں تا کہ وہ خود بھی اس انسان نما حیوانیت کی دلدل سے باہر آئے اور اسی کے واسطے سے پھر پورا یورپ وامریکہ بھی متاثر ہو؟ کیا آج ہمیں ضرورت نہیں کہ جس اسلام کو ہم دنیا کا جامع ترین قانون سمجھتے ہیں، اور جسے ہم محض دیانتی ہی نہیں بلکہ سیاسی دین بھی جانتے ہیں، ہم اسی شدومد سے اس کو آج کی سیاست کے بنائے ہوئے اڈوں تک بھی پہنچائیں اور ڈپلومیٹک دماغوں میں بھی اسے اتارنے کی کوشش کریں جنہوں نے دنیا کو فطری سیاست سے ہٹا کر عیاری اور فریب بازیوں کی مصنوعی اور مہلک سیاست کے کیچڑ میں پھانس دیا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جہاں اپنی قوم کو سیاسی ابھار ادیں اور سیاسی جمود تعطل کو دور کرنے کی فکر کریں وہیں ایک مستقل مشن اور مقصد کی حیثیت سے ان کا دائرۂ عمل یہ بھی ہو کہ قوم کے قابل افراد کرسی حکومت پر بیٹھنے والوں کے کانوں کو نہ صرف مطالبہ آزادی ہی سے بلکہ اس خدائی قانون سے بھی آشنا کرتے رہیں۔یعنی تبلیغ دین بھی کریں۔اور نہ صرف دس بیس دن بلکہ مطالبہ آزادی اور احتجاج کے تسلسل کے ساتھ یہ پیغام رسانی بھی اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان مطالبوں کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہو جائیں۔

مثلاً اگر دس پانچ برس مسلسل طریق پر اسلام کے قانونی اور سیاسی پہلو اس کے ساتھ دینی وروحانی پیغام اخلاقی رنگ میں ان کے ذہنوں میں ڈالے جاتے رہیں اور اس تسلسل تبلیغ کے طبعی اثر سے دیانتدارانہ طور پر یہ سمجھ جائیں کہ امن عالم کا راز اسی قانون الٰہی کے اجراء میں مخفی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود حکمران قوم کے بہت سے

---

④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۹.

فہیم افراد دل سے ہمارے ہمنوا بن جائیں؟

اور پھر وہ کام جو حکومت سے باہر رہ کر ہم انجام دے رہے تھے خود حکومت کے دفتروں سے انجام پانے لگے اور جو امور قومی پلیٹ فارم سے ہم بمشکل حکومت کے دل میں اتار سکتے تھے وہ حکومت ہی کے اپنے امور بن جائیں۔ ہاں اگر اپنی ان تھک مساعی کے باوجود پھر بھی ایسا نہ ہو یعنی فرعونی حکومت کی طرح موجودہ حکومت کا انحراف واستکبار ہی بڑھتا رہے تو پھر یہ ہو کہ اس تسلسل پیغام رسانی سے من اللہ اتمام حجت ہو کر ایسی غیبی صورتیں نمودار ہوں کہ یہ قوم یا جھک جائے یا اس کا کروفر یک لخت خاک میں مل جائے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے اور اس وعدہ الٰہی کا ظہور ہو جائے کہ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ.﴾ ① ''سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم ہوئے تھے اور ایمان والوں کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا''۔

لیکن یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ترجمان ملت خود دینی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے کردار اور رفتار و گفتار نیز وضع و قطع وغیرہ سے بندگی کے آثار نمایاں ہوں۔ چہروں پر قلبی صداقت چمک رہی ہو اور زبان پر کلمات حق و حکمت جاری ہوں۔ وہ اپنے ظاہر سے فرشی ہوں اور باطن سے عرشی ہوں اور پھر ان کا دیا ہوا پیام سیاسی اتار چڑھاؤ ڈپلومیسی اور قول کے خلاف قلب کے مخفی اغراض لئے ہوئے ہونے کے بجائے واضح صداقت وحقانیت اور دیانت وللہیت کا نشان لئے ہوئے ہو جس میں واقعی طور پر اپنی اور ساری اقوام عالم کی سچی خیر خواہی ملحوظ خاطر ہو جیسا کہ اُسوۂ موسوی سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کے پاس حصول آزادی کے لئے بھی جا رہے ہیں اور ساتھ ہی کمال روحانیت وتقدس کے ساتھ پیغام الٰہی خود فرعون کو بھی پہنچا رہے ہیں اور اسے ربوبیت الٰہی سے آشنا بنا رہے ہیں اس کے دلائل ذکر فرما رہے ہیں کہ: ﴿رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى.﴾ ② رسالت کی حقیقت سمجھا رہے ہیں، پھر فرعون سے شفقت فرما رہے ہیں اور دلی خیر خواہی سے فرمائے رہے ہیں جس میں کسی رسمیت اور ضابطہ پری کا ادنیٰ شائبہ نہیں۔

فرعونانِ وقت کو قیادتِ موسوی ہی شکست دے سکتی ہے...... پھر عنوان بیان میں کوئی ادنیٰ جابرانہ یا تحکمانہ انداز نہیں کہ۔ ﴿هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى.﴾ ③ ''کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تو درست ہو جائے اور میں تجھ کو تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو ڈرنے لگے؟'' ظاہر ہے کہ اس صاف وصریح اور مقدس طریق خطاب کا جو اسوۂ موسوی اسوۂ محمدی اور اسوہ جمیع انبیاء ونائبان نبوت ہے جو قدرتی اثر عام صلاحیت مند قلوب پر پڑ سکتا ہے وہ ہمارے سیاسی اتار چڑھاؤ کا کبھی نہیں پڑ سکتا ہے کہ ان رسمی طریقوں میں دشمن ہم سے زیادہ ماہر اور زیادہ سے زیادہ چالاک واقع ہوا ہے چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷. ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۰.
③ پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۱۸، ۱۹.

ہے ﴿اِنَّكُمْ لَنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَخْلَاقِكُمْ﴾ ۔ ''تم اقوام دنیا پر اپنے مالوں (یعنی مادی وسائل) سے غالب نہیں آسکتے البتہ اپنے خالق (یعنی معنویت) سے غالب آسکتے ہو۔ پس ایک شخص کی رائے یا ایک جماعت کی پاس کردہ تجویز پھر انفرادی واجتماعی ڈپلومیسی زیر بحث لائی جاسکتی ہے، لیکن خدائی پیغام میں جو صاف وصریح ہو آسانی اور معقولیت سے کوئی بحث نہیں کی جاسکتی، آراء وقیاسات کے اختراعات کردہ پروگراموں کے سلسلہ میں ایسے سرکاری افراد کھڑے کئے جاسکتے ہیں جو ان تجاویز میں بحثیں اٹھانے، انہیں رلانے کے لیے اپنی دماغی قابلیتیں جو اسی دن کے لئے ان میں پیدا کی جاتی ہیں صرف کریں یا ان کے خلاف مطالبات لے آئیں تا کہ حکومت کو گریز کے لئے سہارا مل جائے لیکن مذہب کے صاف وصریح پیغام کا جب کہ وہ ہمہ گیر اصلاحی رنگ اور روحانیت لئے ہوئے ہو، ان رسمی افراد سے معارضہ کرایا جانا آسانی سے ممکن نہیں۔

ہاں اس صورت میں یہ ضرور ممکن ہے کہ استبدادی شان سے سرے سے پیغام ہی رد کر دیا جائے اور فرعون کی طرح موسیٰ صفت افراد کو یہ کہہ کر سامنے سے ہٹا دیا جائے کہ: ﴿وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ.﴾ ① ''میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یا فرعون کی طرح یہ کہہ کر آزادی خواہوں کو دھمکا دیا جائے کہ: ﴿لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ.﴾ ② ''ہم تمہیں جیل بھیج دیں گے۔ یا یوں کہہ دیا جائے کہ ﴿وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ.﴾ ''تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر پھانسی لگوا دیں گے''۔ یا یہ دھمکی دی جائے کہ ﴿سَنُقَتِّلُ اَبْنَآئَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ.﴾ ③ ''ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے کیونکہ ہم کو ہر طرح کا غلبہ حاصل ہے''۔

یہ سب کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا اور کیا گیا لیکن حقیقی حجت کو حجت سے رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس صورت سے پیغام کی جڑیں اور مضبوط ہوتی ہیں اور مخاطب قوم کی جڑیں غیر محسوس طریق پر کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں۔

چناں چہ فرعون نے اگر مذکورہ دھمکیاں دیں تو اس سے خدائی پیغام یا پیغام لے جانے والے کا سر کب نیچا ہوا؟ بلکہ یہ ساری شکست ومغلوبیت آخر کار اس فرعون کے حصہ میں آئی جو قہر وغلبہ کا دعوے دار تھا۔

پس اگر آج بھی امت اسلامیہ کا پیغام اسی کے قائد موسیٰ صفت بن کر فرعونان وقت کے پاس لے جائیں اور لے جاتے رہیں تو یہ ممکن ہے کہ انہیں جیل، پھانسی، قتل وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں لیکن اس سے خدائی پیغام اور پیغام بروں کا سر نہیں نیچا ہوسکتا اور نہ پیغام میں کوئی معقول حجت نکالی جاسکتی ہے بلکہ یہ امت کی جیت اور ان کے دشمنوں کی کھلی ہار ہوگی جس سے غیبی نتائج کا برملا ظہور ہوگا اور یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ﴾ ④ ''پس حق ظاہر ہوگیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۹۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۷۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۱۸، ۱۱۹۔

سب اکارت گیا پس وہ لوگ ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے''۔

خلاصہ یہ کہ عدم تشدد کی جنگ کے سلسلہ میں سب سے بڑا ہتھیار مطالبہ آزادی کے ساتھ مخاطب قوم کو پیغام حق مسلسل طریق پر پہنچاتے رہنا اور مقابل کی بھبکیوں سے اور ہم چشموں کے استہزاء و تمسخر سے بے نیاز ہو کر نبوی رنگ میں ہدایت دیتے رہنا ہے جس کے نتائج قطعی موعودہ حق ہیں اور ساتھ ہی نصرت غیبی یقینی ہے۔

اسلام میں آزادی کی غرض وغایت...... بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو رسول الٰہی بتلا کر تعارف کرانے اور اپنی پوزیشن واضح کر دینے کے بعد فرعون کو اولین پیغام یہ پہنچایا کہ ﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ.﴾ ① ''(اے فرعون) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دے انہیں آزاد کر دے اور انہیں ستا مت''۔

15 ......اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام میں محکوم قوم کو حکمران قوم کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کرنا اور غلامی کے بدترین عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔ چناں چہ بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کے لئے ہی اللہ نے ایک اولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں آکر یہ مطالبہ صریح الفاظ میں پیش کیا جیسا اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

16 ......اس موقع پر ایک نکتہ اور سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ کہ اس قومی استخلاص یعنی بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کی غرض کوئی وطنی یا قومیت کی آزادی نہ تھی بلکہ مذہب کی آزادی تھی قوم کو بھی آزاد کرانا تھا تو مذہب ہی کی آزادی کے لئے بالفاظ دیگر اس آزادی سے کوئی دنیوی ترفہ یا لذائذ دنیا کی تحصیل و تکمیل یا کسی قسم کا بھی جاہ و منصب مقصود نہ تھا کیونکہ اول تو حصول آزادی کے لئے پیغمبر کا انتخاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیغمبر سرتا پا دین ہوتا ہے اس کے افعال بھی دین اور ان کی غرض وغایت بھی دین۔ اس لئے پیغمبر کا آزادی مانگنا دنیوی اغراض کی خاطر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کو عنوان آیت سے یوں سمجھئے کہ ﴿اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ ۔ اس آیت میں ارسال بنی اسرائیل کو دعوائے رسالت پر بذریعہ فا کے متفرع فرمایا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ میں پیغمبر ہوں اس لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہوں اس سے واضح ہوا کہ مطالبہ آزادی کا منشاء پیغمبری ہے اور ظاہر ہے کہ دنیوی آزادی یعنی آزاد ہو کر متاع دنیا سے آزادانہ انتفاع حظوظ دنیا کی ہوسنا کیاں، تعیش اور ترفہ وغیرہ کی آزادی پیغمبری کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پیغمبر ایسی آزادی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس سے یہ مسئلہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام میں حصول آزادی کی غرض وغایت نہ روٹی ہے نہ مال و منال۔ اگر آج ہم اپنے اسٹیجوں سے روٹی اور معاشی رفاہیت کی خسیس اغراض لے کر اٹھیں اور انہی فانی اور چند روزہ بہاروں کی کمزور بنیادوں پر اپنی مساعی کی عمارتیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ دن دور نہیں ہے کہ ہمیں اس بے جڑ تعمیر سے نادم ہونا پڑے گا اور ہم عیاذاً باللہ اس کے مصداق ٹھہریں گے کہ: ﴿اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ

① پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷۔ ② پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷۔ ③ پارہ: ۱۶ سورۃ الکھف، الآیۃ: ۱۰۴۔

الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾ ③ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استخلاص قوم کی مساعی کا آغاز تبلیغ دین سے شروع کیا۔ ربوبیت ورسالت کو بیچ میں لاکر آزادی کا مطالبہ کیا گویا غم وغصہ اس کا نہ تھا کہ ہماری دنیا آزاد نہیں بلکہ اس کا تھا کہ دین آزاد نہیں، ربوبیت ورسالت کے شعائر بلند نہیں ہیں۔ ربوبیت و رسالت کے منکر دنیا پر غالب آ گئے۔ انہوں نے لادینیت کا فساد دنیا میں برپا کر دیا کہ جس سے دنیا مادیت کی خسیس اغراض میں پڑ کر سرکشی اور بغاوت حق میں مبتلا ہوگئی۔ ادھر ان دونوں دینی بنیادوں کے ماننے والے مغلوب ہوگئے، جس سے دیانت وامانت بے کس ہوگئی اور وہ دیانت کے احکام کو دنیا میں پھیلانے سے عاجز رہ گئے اور دین کے اجراء میں دست و پابستہ ہوگئے ہیں۔ پس یہ شکایت نہ تھی کہ ہماری دنیوی راحت وآرام یا روٹی اور رہائش میں فرق پڑ گیا ہے۔

ہمیں کوٹھی اور بنگلے میسر نہیں رہے۔ ہمارے گھروں پر موٹر کاریں کھڑی ہوئی دکھلائی نہیں دیتیں یا ہم اقلیت میں ہیں اور اکثریت ہمیں فنا کر دے گی۔ یا ہماری توہین ہو رہی ہے اور عزت وجاہ دوسروں کے حصہ میں آ گئی ہے بلکہ شکایت فی الحقیقت صرف دیانت کے مغلوب ہو جانے اور آزاد نہ رہنے کی تھی اور جس حد تک اکثریت کی طلب یا عزت وجاہ کی طلب یا غلبہ واقتدار کی طلب تھی وہ بھی صرف غلبہ دین کی خاطر تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تو مشاغل دنیا کے انہاک کی وجہ سے عذاب خداوندی سے ڈراتے اور پھر خود ہی اپنے مطالبہ آزادی کی غرض وغایت وہی شغل دنیا قرار دیتے عیاذاً باللہ۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ آزادی کا حاصل یہ ہوا کہ او فرعون! چونکہ تو خدا پرست نہیں اس لئے تیری ماتحتی میں بنی اسرائیل بھی خدا پرست نہیں رہ سکتے نہ ان کا شرعی علم باقی رہ سکتا ہے نہ ان کی روایات مذہب قائم رہ سکتی ہیں نہ ان کے عملی شعائر بلند ہو سکتے ہیں نہ ان کے مادی وسائل باقی رہ سکتے ہیں جو تقویت دین میں استعمال ہوں۔ اس لئے بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں خدا پرستی کی راہ پر پختہ کرسکوں اور تو بھی اپنے رب اور اس کے فرستادہ رسول کو پہچان اور مان۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبہ آزادی میں شکایت دنیا یا مصائب دنیا یا اقلیت واکثریت کی بحثیں یا روٹی اور بوٹی کے مقاصد کا دخل نہ آنا چاہئے اگر یہ باتیں آئیں بھی تو غلبہ دین کے وسائل کی حیثیت سے نہ کہ مقاصد کے درجہ میں۔

مطالبۂ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے...... پس مسلمانان ہندوستان کو صاف وصریح الفاظ میں مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر کرنا چاہئے ان کے نزدیک مصائب دین اہم ہونے چاہیے نہ کہ مصائب دنیا کہ وہ دینی مصائب زائل ہونے پر خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اغیار کے تسلط واقتدار کو اگر ہولناک باور کرایا ہے تو وہ دینی مصائب کی وجہ سے نہ کہ دنیوی مصائب کی بناء پر۔ چناں چہ ذیل کی دعاء نبوی میں گو اقلیت واکثریت، اکرام وتوہین اور غلبہ ومغلوبیت کا ذکر ہے مگر مقصود اولین مصائب دین کے

ازالہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان سارے دنیوی مصائب کو بھی اگر تکلیف دہ سمجھا ہے تو دین کی خاطر نہ کہ دنیا کی خاطر۔ ارشاد نبوی ہے ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَآ اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا.﴾ ① ''اے پروردگار! ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا اہم مقصود نہ بنا اور نہ اسے ہمارا مبلغ علم بنا (کہ اس کے مادی اکتشافات واختراعات اور دنیوی زندگی کے جوڑ توڑ ہی کو سب سے بڑا علم سمجھنے لگیں) اور نہ ہماری رغبتوں کی آخری حد دنیا کو کر اور ہم پر کسی ایسے کو مسلط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کھائے''۔ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا. ② ''اے اللہ ہماری تعداد زیادہ کر کم نہ کر ہمیں اکرام نصیب فرما، توہین سے بچا، ہمیں غالب کر مغلوب نہ کر''۔

ذیل کی حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: روٹی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور فقر وفاقہ کوئی بنیادی مصیبت نہیں اصلی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کے دروازے کھل کر دین ضائع ہو جائے ارشاد نبوی ہے: وَاللّٰهِ مَآ اَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ مِمَّآ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِيْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا تُفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَتُهْلِكُكُمْ كَمَآ اَهْلَكَتْهُمْ ③ ''خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر وفاقہ کا کوئی ڈر نہیں لیکن جو چیز مجھے اپنے بعد خائف بنا رہی ہے وہ ہے دنیا کی سرسبزیاں جو تم پر کھلیں گی اور تمہیں اس طرح ہلاک کریں گی جس طرح پچھلی اقوام کو انہوں نے ہلاک کیا (اور جیسے آج کی قوموں کو برباد کر رہی ہے'')۔

اس حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پر ظاہر فرمایا جبکہ ایلاء کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک خانہ نشین رہے ہیں اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر دیکھا کہ بیت نبوت میں کل سامان ایک چمڑے کا مشکیزہ ہے جس میں کچھ شہد ہے اور ایک چٹائی ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور اس کی تیلیاں بدن مبارک پر ابھر آئی ہیں تو آزردہ ہو کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یہ قیصر وکسریٰ دشمنان حق تو نرم نرم گدیلوں پر آرام کریں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چارپائی بھی میسر نہ ہو۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کشائش فرمائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو خطاب فرماتے ہوئے تنبیہ کے طور پر فرمایا اَفِيْ شَكٍّ اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ عَجِلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (اَوْ كَمَا قَالَ) ④ ''اے خطاب کے بیٹے! کیا تو ابھی تک شک میں پڑا ہوا ہے (یہ قیصر وکسریٰ) تو وہ لوگ ہیں جن کی نعمتیں دنیا ہی میں دے کر ختم کر دی گئی ہیں اور آخرت میں ان

① السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة المؤمنون ج: ١٠ ص: ٤٥٢.

② السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المومنون، ج: ١٠، ص: ٤٥٢.

③ السنن لابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة المال، ج: ١١، ص: ٤٩٩. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ٨ ص: ٤٩٥ رقم: ٣٩٩٥. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء، ج: ٧، ص: ٤٤٧.

کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے (کیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے)''۔

اہل اللہ چونکہ وارثان نبوت ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی یہ شان غالب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جب مکہ کے حرم محترم میں برطانیہ کے کارندوں نے اسیر کیا اور گرفتاری کا پروانہ دیا گیا تو فرمایا کہ الحمدللہ:

بہ مصیبتے گرفتار آمدم نہ بہ معصیتے ''خدا کا شکر ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوا نہ کہ معصیت میں''۔

جس سے واضح ہے کہ معصیت دینی مصیبت ہے اس لئے اس میں مبتلا نہ ہونے پر شکر الٰہی ادا فرمایا۔ اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیا کی مصیبت کوئی چیز نہیں نہ وہ کوئی قابل شکایت امر ہے کہ تغیرات دنیا ہیں اور منجانب اللہ بنی آدم کے ہی مصالح کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے کفارہ سیات مقصود ہوتا ہے اور کبھی ترقی درجات۔

اہم مصیبت دینی مصیبت ہے اور دینی مصیبتوں کا انتہائی اور جامع درجہ یہ ہے کہ دین آزاد نہ رہے اور دین دار غلامی میں مبتلا ہو کر شعائر دین کو آزادانہ برپانہ کر سکیں۔ پس آج بھی جبکہ ہندوستان میں دین آزاد نہیں۔ اس کے شعائر کو مسلمان خاطر خواہ قائم نہیں کر سکتے نہ اپنے اختیار سے شعائر دین کو بلند کر سکتے ہیں۔ تو آیت بالا کی رو سے حسب اسوہ موسوی ان کا اسلامی فرض ہے کہ مکمل آزادی کی جدوجہد کریں دین کے نام پر کریں۔ دینی رنگ میں کریں، دینی افراد کے ذریعہ کریں، عام افراد میں دین اور دین کی اہمیت کے جذبات پیدا کریں کہ مطالبہ آزادی کی غرض وغایت ہی اسلام میں دین کی آزادی ہے۔ جس پر دنیا کی آزادی بطور خاصیت کے خود بخود مترتب ہوتی ہے۔

اسلامی آزادی کے دو راستے..... چناں چہ اسلام میں حصول آزادی کے دو ہی راستے ہیں۔ جہاد اور ہجرت پھر ان دونوں کے دو دو فرد ہیں۔ جہاد بالسنان یعنی اسلحہ سے جنگ کرنا اور جہاد باللسان یعنی کلمہ حق ظالم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دینا۔ ایسے ہی ہجرت کے بھی دو ہی فرد ہیں۔ ایک ہجرت مکانی یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے ہجرت ارکانی یعنی معاصی چھوڑنا اور موطن طبیعت سے منتقل ہو کر موطن شریعت میں جانا ظاہر ہے کہ ان دونوں امور جہاد اور ہجرت میں سے کسی ایک کی غرض وغایت بھی روٹی یالذائذ دنیا یا رفاہیت و تنعم یا حظوظ عاجلہ نہیں بلکہ صرف دین کی آزادی وبرتری کا قیام ہے۔ جہاد کی غرض تو واضح ہی ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ کتاب وسنت کی سینکڑوں تصریحات اس بارے میں موجود ہیں۔ ہجرت بھی اس لئے نہیں کرائی گئی کہ لوگوں پر وسائل معاش تنگ ہو گئے تھے اور ان کی روٹیوں میں گھاٹا آنے لگا تھا تو انہیں دارالکفر ترک کر دینے کا حکم ملا ہو بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے دین پر مصیبت آنے لگی تھی۔

چناں چہ اوائل اسلام میں دو ہی ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ مگر دونوں کی غرض مشترک تحفظ دین تھی نہ کہ تحفظ معاش۔

چناں چہ ہجرت مدینہ میں چونکہ یہ غرض زیادہ علومرتبہ کے ساتھ نمایاں ہوئی اس لئے ہجرت مدینہ، ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہجرت حبشہ میں تو مہاجرین کو صرف اپنا دین محفوظ کرنا تھا اور اس کی صورت فرار عن الفتن کی تھی یعنی دین میں فتنہ مخل ہوتا تھا تو جائے فتنہ کو چھوڑ دیا گیا تا کہ دین محفوظ رہ جائے اور ہجرت مدینہ میں نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین کی شوکت کا مقصد سامنے تھا یعنی محض اپنا دین بچالے جانا مقصود نہ تھا بلکہ شوکت کے ساتھ دوسروں تک دین کی منادی اور تبلیغ کر دینا بھی مقصود تھا بلحاظ مقصد دونوں ہجرتیں محمود و مستحسن تھیں کہ محض اپنا دین محفوظ رکھ لینے کی خاطر دارالکفر کو چھوڑنا بھی عین دین ہے اور دین کو سربلند کرنا بھی دین ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ایک حد تک اپنے ضعف اور کمزوری کا اعلان بھی ہے جس کو براہ راست اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں کہہ سکتے اور دوسری صورت میں نصرت نبی کی خاطر گھر بار چھوڑنا ہے۔ جو بلا واسطہ اعلاء دین ہے۔ اس لئے یقیناً ہجرت مدینہ ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا لفظ بول کر تبادر کے ساتھ علی الاطلاق ہجرت مدینہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ وہی ہجرت کا فرد کامل ہے۔ غرض کوئی سی بھی ہجرت لے لی جائے کسی ایک کا مقصد بھی تنگی معاش سے بچنا یا مصائب دنیا سے تنگ آ کر گھر چھوڑنا نہ تھا اور کسی حد تک یہ چیزیں اگر پیش نظر بھی ہوئیں تو صرف دین کی غرض سے ہوئیں اس لئے ہجرتین کا مقصد بھی آخر کار وہی اعلاء کلمۃ اللہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرماتے ہوئے اس کا کوئی افسوس ظاہر نہیں فرمایا کہ میرا آبائی وطن اور جدی گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے، عزیز و اقرباء چھوٹ رہے ہیں، مانوس سرزمین چھوٹ رہی ہے بلکہ بیت اللہ کو حسرت سے دیکھ کر یہ فرمایا کہ ''اگر میری قوم مجھے وطن سے نہ نکال دیتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا''۔

جس سے واضح ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن پیش نظر تھا نہ قبیلہ و خاندان بلکہ اللہ اور بیت اللہ مکہ کا شہر یا ملک حجاز اور قوم بھی اگر کسی درجہ میں نگاہوں کے سامنے تھی تو وہ اللہ اور ذکر اللہ یعنی دین اور اعلاءِ دین کے لئے تھی نہ کہ براہ راست اور بالذات۔

خلاصہ یہ کہ جہاد اور ہجرت حسی ہوں یا معنوی اور ان کا کوئی سا فرد ہو صرف اس بناء پر عمل میں آتے ہیں کہ لادین قومیں جمعہ و جماعات، تبلیغ و موعظت، اقامت حدود اور سد ثغور وغیرہ میں حارج ہوئیں اور دین کے سربلند ہونے میں آڑے آئیں نہ اس لئے کہ وسائل معاشی کی تنگی روٹی اور کپڑے کی گرانی۔ عیش و لذت، راحت کی کمی اور اس کی تحصیل و تکمیل میں فرق آ گیا تھا اور اس سے بچنا مقصود تھا۔ اگر اس سے بچنا مقصود ہوتا تو اسلام میں فقر و فاقہ اور خشونت عیش کے فضائل ہی کیوں بیان کئے جاتے۔ اس لئے آج جو جہاد اکبر یعنی اعلاء کلمہ حق عند سلطان جائر کا مقصد لے کر مسلمان کھڑے ہوں اور کھڑے ہیں تو اس میں بھی ایک لمحہ کے لئے ان کے قلوب میں شکایت معاش یا شکایت ترفہ و تنعم پیش نظر نہ رہے۔ صرف تحفظ دین اور اعلاء کلمہ حق ملحوظ رہنا چاہئے اور وہی ساری جدوجہد

کی غرض وغایت ہو جسے غیر مشتبہ الفاظ میں بھی واضح کر دیا جائے۔ پھر ایسے ہی تدابیر کے سلسلہ میں اقلیت و اکثریت یا اہانت وتکریم کا سوال پیدا نہ ہونا چاہئے یعنی ان رسمیات سے مغلوب نہ ہونا چاہئے بلکہ ان پر غالب آنا چاہئے جس انداز سے بھی ممکن ہو جیسا کہ آیت بالا کے اشارہ اور نصوص وحدیث سے واضح کر دیا گیا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی دربار میں جو کچھ نیابت الٰہی میں ارشاد فرمایا وہ حجت ودلیل سے فرمایا: اور اپنی رسالت پر خدا کی آیات پیش کیں یعنی معجزے دکھلائے۔ عصاء موسوی دکھلائی جو لاٹھی سے سانپ اور سانپ سے لاٹھی بن جاتی تھی۔ ید بیضا دکھلایا جو گریبان میں ڈالنے سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا جس کی جواب دہی سے فرعون عاجز ہوا اور اس کے سوا اسے کچھ بھی جواب نہ بن پڑا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادوگری کا الزام لگائے۔ چناں چہ یہی کیا اور ملک کے جادوگر جمع کر کے مقابلہ کرایا۔

اور انہوں نے بھی اس لاٹھی کے سانپ کی شکل کے ہزار ہا سانپ جادو کے زور سے بنائے مگر چوں کہ ان میں حقیقت کچھ نہ تھی اس لئے جادوگر سب کے سب عاجز ہو گئے اور انہیں تسلیم ورضا کے سوا چارہ نہ رہا۔

(17) مطالبۂ آزادی میں اعجازی حجت کی ضرورت...... اس سے صاف ظاہر اور واضح ہوا کہ آج بھی جبکہ استخلاص قوم کے لئے متسلط اقوام کے حلقوں میں قائدین اسلام جائیں، تو ہر دعوے کے ساتھ حجت بھی پیش کریں اور وہ بھی معجزہ کی تاکہ مخاطب قومیں اس کے ماننے پر عقلاً مجبور ہو جائیں اور جواب نہ لا سکیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون کے سامنے معجزہ موسوی پیش کیا گیا تھا جو لاٹھی کا تھا اور فرعونانِ وقت کے سامنے معجزہ محمدی پیش کرنا چاہئے جو کہ قرآن کریم ہے اور تمام دلائل وبراہین کا مجموعہ۔ ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً﴾ کیونکہ فرعون کا رنگ حاکمانہ تھا تو وہ لاٹھی ہی سے قائل ہو سکتا تھا اور فرعونانِ وقت کا رنگ حکیمانہ ہے تو علم وحکمت سے ہی قائل ہو سکتے ہیں۔

فرعون نے اپنے ملکی جادوگروں کو تقرب درباری، کرسی اور انعام واکرام کے وعدوں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈال کر عصاء موسوی کے سانپ کے ہم شبیہ لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنوائے مگر وہ محض "تخیلاتی تھے۔ ﴿فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعٰى.﴾ (1) "بس یکا یک ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں (جو سانپوں کی صورت میں ان کی نظر بندی سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے چلتی دوڑتی ہوں"۔ اس لئے یہ سب کید ومکر ختم ہو گیا اور سارے سانپوں کو موسوی اژدھا نگل گیا۔ معجزہ کے سامنے سب جادوگروں نے سپریں ڈال دیں۔

بعینہ آج بھی یہی صورت ہوگی کہ جب فرعونانِ وقت کے سامنے معجزہ محمدی (قرآن) کے دلائل وبراہین پیش کئے جائیں گے یا پیش کئے گئے ہیں تو انہوں نے اسی ملک کے جاہل مولویوں مگر جادو بیان لیکچراروں کو کھڑا کر دیا کہ وہ مضامین قرآن ہی کے ہم شبیہ مضامین اور اسی کے استنباطات کے مشابہ وجوہ مستنبطہ پیش کر کے تلبیس

---

(1) پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۶۶.

ابلیس کریں جس پر ان کے لئے انعام واکرام اور ہر قسم کی سرکاری رعایتوں کے وعدے ہوتے ہیں۔ مخفی نالیوں سے اس روپیہ کا یہ گندہ پانی ان کے گھروں میں بہتا ہوا پہنچتا رہا ہے۔ ان ائمہ معلین سے فرقے بنتے ہیں وہ کتاب و سنت ہی کے نام پر اہل حق کے مقابلہ پر آتے ہیں اور عصاء قرآنی کے مشابہ ہزار ہا عصی (لاٹھیاں) تخیلاتی بنا بنا کر میدان میں پھینکتے ہیں۔ ہزاروں ٹریکٹ رسالے اور تفسیریں، قرآنی تفسیروں اور فقہیات کے مشابہ سامنے آتی ہیں۔ حتی کہ نبی قرآن کی طرح انبیاء بھی کھڑے کردیئے جاتے ہیں جو اہل حق کو کذاب و مبطل کہہ کر اپنی گورنمنٹ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بعثت ہی اس حکومت کی حمایت کے لئے ہوئی ہے۔ ہم اگر اس کے فضائل بیان کریں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔

کوئی کہتا ہے کہ: قرآن میں مومن قانت، متقی وغیرہ کے الفاظ کا مصداق ہی موجودہ گورنمنٹ کے افراد واجزاء ہیں۔ ان جادوگروں اور ان کی میدان میں ڈالی ہوئی ان لاٹھیوں اور سانپوں سے جو اہل حق کے خیال میں کبھی کبھی چلی دوڑتی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ مسلمانوں میں خیالات کا تشتت اور تفرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دل جمعی خاک میں مل کر قوت منتشر ہو جاتی ہے اور حکمرانوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ اور جم گئے۔ لیکن جب یہ ثعبان قرآنی اپنی پوری شان کے ساتھ کسی موسیٰ صفت عالم کے ہاتھ پر نمایاں ہوتا ہے تو بالآخر ان سارے سانپوں کو نگل لیتا ہے اور ﴿ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ کا ظہور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جادو بیان لیکچرار گورنمنٹ سے کٹ کر حق کے سامنے سر بھی جھکا دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم اب تک غلطی اور تلبیس میں پھنسے ہوئے تھے ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴾ جس سے اس قسم کی تلبیسات کا آئے دن پردہ چاک ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ آزادی خواہ طبقہ جو مطالبہ اور جو نصیحت بھی فرعونی درباروں میں پیش کرے، حجت و برہان یعنی احادیث اور آیات قرآن سے پیش کرے، دینی رنگ میں پیش کرے، سلف کے انداز میں پیش کرے۔ اس تمسک واستدلال کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ہر ہر جملہ کی دلیل کتاب وسنت ہوتا کہ اس کا منجانب سرکار الٰہی ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی بات مذہبی سمجھی جائے جس کا کسی سے بھی جواب نہ بن پڑے اور جواب دیا تو جواب کی جادوگری کا پردہ اسی آیت الٰہی سے چاک ہو جائے۔

پس ہمارے لئے اس میں کوئی فخر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی تقریر وتحریر کو عین اس سیاسی اور معاشی انداز میں پیش کیا جس انداز سے عصری سیاست کے وکلاء اپنے مقالے پیش کرتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قرآن وحدیث کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا نہ تصیصاً نہ استنباطاً اور محسوس ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ مقالہ کسی طالب علم اور منہمک کتاب وسنت کا ہے کیونکہ اس کا آغاز وانجام قومیت محضہ، معاش، خالص ملکی مفاد اور صرف رسمی تعاون سے ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے اول وآخر اور ظاہر وباطن کی ہر ایک جنبش صرف کتاب وسنت اور اس کے صحیح استنباط سے ہو اور یہی رنگ ہماری طرف خواص وعوام میں منسوب ہو جائے

کیونکہ ان کے ہر خطاب وابلاغ ہر پیام اصلاح وتہذیب اور ہر ایک مطالبہ واحتجاج کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ: ﴿قَدْ جِئْنٰکَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکَ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی.﴾ ''ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور سلامتی ایسے شخص کے لئے ہے جو راہ پر چلے''۔

یعنی نہ خود آئے نہ کوئی اختراعی حجت لے کر آئے بلکہ دونوں چیزیں من اللہ ہیں اور اسی لئے صحیح وسالم وہی رہے گا جو اس رسالت الٰہی کی پیروی کرے گا ورنہ ہمارے ہی ہاتھ پر اس کی تباہی من اللہ نمایاں ہوگی کیونکہ ﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی.﴾ ① ''ہمارے پاس خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچا ہے کہ (قہر خداوندی) کا عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلادے اور روگردانی کرے''۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ساری پیغام رسانی میں جو منجانب اللہ اور بامر اللہ تھی، اولین مقصد فرعون سے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ ﴿اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج۔ اور اپنے پنجہ ظلم سے انہیں رہا کر کے انہیں آزادی دے) ظاہر ہے کہ اس ارسال بنی اسرائیل اور انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیج دینے کا یہ مطلب نہ تھا کہ انہیں مصر سے شام بھیج دے یا ہم ملک مصر چھوڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو تجھ سے لینے آئے ہیں بلکہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا پابند اور غلام رکھنے کی بجائے میرے ساتھ ہونے دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر جس طرح چاہیں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

⑱ انتخاب امیر اور تشکیل مرکزیت...... اس سے واضح ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے اوپر سے فرعون کی امامت ہٹا کر رسول خدا کی امامت وامارات قائم فرمانا چاہتے تھے کیونکہ فرعونی امارت سے ان میں غیر اللہ کی پرستش کے مہلک جراثیم سرایت کر جاتے اور موسوی امامت سے ان میں صرف خدائے واحد کی اطاعت وعبادت کے پاک جذبات گھر کرتے۔ تو کیا اس سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ حصول آزادی کے سلسلہ میں مسلمان اپنا ایک امام اور امیر منتخب کریں جو ایک طرف تو حسب استطاعت اطاعت شریعت کے ساتھ ان کی دینی تربیت کرے ان کی اسلامی تنظیم کرے ان کے معاملات ومحاکمات کو شرعی دائرہ میں رکھے اور ایک طرف دشمنان دین سے جائز مطالبات بھی کرے اور نہ صرف اپنے مامورین بلکہ ان ناجائز آمرین کو بھی راہ حق دکھلائے۔ رب اعلیٰ اور اس کی رسالت حقہ سے انہیں بھی آشنا بنائے۔ اگر مسلمان فوضویت اور لامرکزیت کی زندگی بسر کرتے رہے تو نہ ان کا دینی تشتت زائل ہو سکے گا نہ دنیوی تفرق۔ یہ غرض نہیں کہ مسلمان اس مغلوبیت کے عالم میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بنائیں کہ اس کے لئے طاقت اور قہر غلبہ شرط ہے بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک مرجع الامر تسلیم کرلیں جو ان میں دینی تشتت اور افتراق نہ ہونے دے اور حتی الامکان ان کو اخلاقی قوت سے معاملات شرعیہ پر جمائے رکھے تاکہ وہ جب بھی غلبہ پائیں تو انہیں اس انقلاب کے تشویش ناک دور میں از

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۸۔

سرنو کسی نظام اور مرکزیت کی تشکیل کرنی نہ پڑے بلکہ پہلے ہی سے ان کا ایک قائم شدہ نظام کا ڈھانچہ بنا بنایا موجود ہو اور وہ اسی میں حسب غلبہ وطاقت، طاقت کی روح پھونک دیں۔ چناں چہ آزادی کے سلسلہ میں چونکہ خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنا پڑا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زیر قیادت ان کے نظام کی تشکیل ایسی قائم شدہ موجود تھی کہ ایک اشارۂ موسوی پر چھ سات لاکھ بنی اسرائیل نے راتوں رات مصر چھوڑ دیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ بحر قلزم کے کنارے پر تھے۔

پھر فرعون اور فرعونیوں کی غرقابی کی بعد جب کہ بنی اسرائیل کی طاقت کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انہیں کوئی نیا نظام بنانا نہ پڑا تھا۔ امام حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جن سے قوم میں مرکزیت قائم تھی اور مقتدی سارے بنی اسرائیل تھے جس سے سمع وطاعت کا نظام قائم تھا، ڈھانچہ موجود تھا۔ روح آتے ہی وہ زندہ ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں اشدترین ضرورت ہے کہ حسب طاقت مسلمان بھی اپنے لئے کسی ایک شخصیت کو پہلے ہی سے امیر تسلیم کئے رہیں اور اس کے ذریعہ اپنی شرعی تنظیم کئے رہیں۔ آج وہ اخلاقی ہے کل کو وہ رسمی ہو جائے گا جس میں قہر وغلبہ پیدا ہو جائے۔

19 صفات قیادت...... مگر ہاں اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ امیر موسیٰ صفت ہونا چاہئے یعنی دور نبی کے بعد امیر وامام نائب نبی اور وارث نبی ہونا چاہئے جس میں اوصاف نبوت کا پورا پورا ظل ہو اور ظاہر ہے کہ نبی کے بے شمار اوصاف کمال کا خلاصہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک علم لدنی جس پر نبوت کا مدار ہے یعنی وہ علم اکتسابی اور کتابی نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بلاتوسط اسباب القاء خدا ہوتا ہے جس کا چشمہ نبی کے قلب سے پھوٹتا ہے جو محسوساتی علوم کے اوہام وظنون اور شبہات سے پاک ہوتا ہے اور قطعیت ویقین کی ٹھنڈک لئے ہوئے ہوتا ہے جس سے سینے معمور ہو جاتے ہیں اور سکون و طمانیت قبول کرتے ہیں۔

دوسرے معصومیت کہ نبی کی ہر نقل وحرکت حظ نفس سے پاک ہوتی ہے ہر چیز اللہ کے لئے کی جاتی ہے جس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ گمراہی کا شائبہ ہوتا ہے نہ ضلالت کا۔ غرض علم خدائی ہو جو اسی کے مخفی راستوں سے آیا ہو اور عمل عبدیت خالصہ کا ہو جس میں ضلالت نہ ہو تو یہی کمالات نبوت کا سر منشاء ہے۔ جس سے آگے تمام کمالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پس حقیقی ورثا انبیاء بنص حدیث اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ.[1] ''علماء وارثان نبی ہیں''۔ علماء ہیں تو ان سے اس قیادت وامارات کے سلسلے میں وہی علماء مراد ہو سکتے ہیں جن میں یہ دونوں باتیں حسب درجہ واستعداد پائی جاتی ہوں جن کا علم لدنی ہو، جن میں علم کے ساتھ معرفت بھی ہو، جن کا قلب مورد علم خفی ہو، وہ اسرار تشریع کے مفکر اور مبصر ہوں اور علوم ظاہری کے ساتھ انہیں علوم باطنی سے بھی کافی مناسبت ہو، وحی کی

---

[1] السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۶.

بجائے القائے ربانی اور الہام باطنی ان کا مربی ہو اور ساتھ ہی نبض شناس امت بھی ہو۔ حوادث ووقائع اور مخاطبین کی ذہنیتوں پر انہیں عبور حاصل ہو اور جو مصداق ہوں حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کے ۔

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　بے کتاب و بے معید واستاد

گویا مطلقاً عالم ہونا یا کتابوں کے درس وتدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ باین معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور ترددات سے بالاتر ہو۔

ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو۔ تقویٰ وطہارت اور احتیاط وحزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا وہ ضَـلُّوْا وَاَضَـلُّوْا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں۔ پھر جبکہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کر لیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ''۔ ① ''میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی (یعنی ساری امت کامل کر کسی گمراہی پر اجماع کر لینا ناممکن ہے بلکہ ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی وہی جماعت منصور ہوگی)''۔

جس سے واضح ہے کہ اہل حق اور ان میں بھی علمائے حق کہ جن کی بدولت لوگ اہل حق بنتے ہیں اور ان میں بھی پھر جماعت علماء جبکہ خود ایک اجتماعی شان بھی پیدا کر لے یعنی جمعیت بنا لے وہ انشاء اللہ سب کے سب مل کر امت کو گمراہی کی لائن پر نہیں ڈال سکتے۔

پس اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقی معنی میں نبی کا صحیح قائم مقام پوری امت اجابت اور اس امت میں بھی اس کی بقاء کی اصلی روح علماء ربانی کی جماعت ہوتی ہے اور اسی کو امت کا امام یا امیر کہنا چاہئے لیکن مرکزیت قائم کرنے کے لئے اگر یہی جماعت اپنے میں سے کسی ممتاز شخصیت کو امیر بنا لے اور خود اپنے اسی محفوظ بلکہ ایک حد تک معصوم اجتماعی علم وفہم سے اس کی مشیر ومعین ہو جائے تو صحیح معنی میں یہی امیر بواسطہ جماعت نائب اور وارث رسول ہی کہلوائے گا، جو ماتحت جماعت، اجتماعی نصرت، وتفہیمات کے سبب کمالاتِ جماعت کا مجموعہ اور اس جامعیت کمالات کے سبب نبی کے ان دونوں اوصاف کمال باطن اور عصمت کا وارث ہوگا۔ اسے حق ہوگا کہ امت کی قیادت اور شرعی تربیت کرے اور ان کا امیر کہلائے۔ پس امت کے لئے سہل علاج یہی ہے کہ مبصر اور مفکر اور تقویٰ وطہارت کے پیکر علماء ربانی کی قیادت میں رہے اور ان کے زیر سایہ یہ اپنی شرعی زندگی بسر کرے۔

صالح قیادت سے روگردانی کی پاداش...... یہ جماعت اگرچہ نبوت کی سی معصومیت نہیں رکھے گی چہ جائیکہ ان میں کوئی ایک شخصیت، البتہ اس کی شان محفوظیت کا یہ ثمرہ قدرتی ہوگا کہ وہ جو امر بھی طے کرے حظ نفس اور ذاتیاتی مفادات کے لئے نہ کرے بلکہ لوجہ اللہ اور مفاد مسلمین کے لئے کرے پھر بھی اگر اس کے فیصلوں میں کوئی

① تخریج گذر چکی ہے۔

گوشہ خطاء فکری کا نکل آئے تو مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی یہ زیبا نہ ہوگا کہ وہ اس خطاء کے سبب اس کے سارے صوابات سے محرومی اختیار کرلیں اور اصل جماعت ہی کو غیر معتبر ٹھہرا کر سرے سے اس کی قیادت ہی سے باہر آ جائیں بلکہ مزید برآں وقار کو زائل کرنے کے منصوبے باندھنے لگیں اور اگر چند نااہلوں میں اس بے توقیری کی مقبولیت ہو جائے تو اس پر فخر کرنے لگیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ.

اگر وہ ایسا کر کے جماعت علماء یا ان کے منتخب کردہ صدر و امیر کی قیادت سے باہر ہوں گے تو اس کی پاداش میں ان کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ جماعت جہلاء یا فساق و فجار کی امارت کے تحت میں آ جائیں اور اپنا رہا سہا دین بھی کھو بیٹھیں۔ پس یہ کیا کم حیرت کی بات ہوگی کہ جو لوگ کسی ایک آدھ جزئیہ کی مزعومہ خطا تک کو معاف نہیں کر سکتے تھے اب انہیں اپنی خوشی سے کلیاتی خطاؤں اور عمومی فسق و فجور کی حکومت و قیادت کو بطوع و رغبت قبول کر لینا پڑے گا اور اب وہ اسی کے زیر سایہ ساری زندگی غیر شرعی طور پر بسر کرنے لگے۔

میرے خیال میں علماء صالحین کے برملا تخطیہ کی ایک کھلی سزا ہے کہ ایک ایک جزئیہ میں تقویٰ وطہارت کے طالب کلی طور پر فسق و فجور کی امامت کے نیچے آ جائیں اور پھر انہیں خطا و صواب کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ اصول دانش کی رو سے ایسی جزئیاتی خطا بہتر ہے کہ جس کو ترک کرنے سے کلیاتی معاصی میں ابتلاء ہوتا ہو۔

پس ضروری ہے کہ امت اسلامیہ زیر قیادت صلحائے امت و جماعت (جس کا رسمی نام جمعیت العلماء رکھ لیا جانا کوئی مذموم بات نہیں ہے) شرعی زندگی گزارے منہیات شرع سے ہجرت کر کے مامورات شرعیہ کی حدود میں رہے۔ جہالت رفع کرے تفقہ فی الدین پیدا کرے۔ اپنے سیاسی مستقر اور حقیقی امارت کو جو علماء حقانی کا جامع ہو جس میں دینی رنگ کا غلبہ قوی اور وسیع سے وسیع تر کرے، جزئیات مسائل پر لڑنا جھگڑنا ترک کر کے بنیادی مقاصد میں خلل نہ ڈالے۔ عمل میں رواداری قائم کرے تو پھر حقیقی امارت و امامت قائم ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔

مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دو اصول ...... اس جامع علم وتقویٰ جماعت کے اصولاً دو کام سب سے بڑے اور سب سے اہم ہو جانے چاہئیں ایک یہ کہ کسی جماعت میں مدغم ہوئے بغیر جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آئے خواہ کسی بھی پلیٹ فارم سے اٹھے تو وہ ان کی غیر مشروط حمایت کرے اور نصرت کے لئے اپنی پوری قوت عمل سے کھڑی ہو جائے اور جب آزادی ملک کا سوال اٹھے خواہ کسی غیر مسلم پلیٹ فارم ہی سے اٹھے تو اس کی غیر مشروط حمایت کرے اور اپنی پوری قوت اور اک وعمل سے اس کو آگے بڑھائے کہ اس ملک کے تمام مادی و نفسانی امراض کی اصلی جڑ صرف غلامی ہے اور اس کی حقیقی بہبود و فلاح صرف آزادی ہے۔

اس طرز عمل سے اس جنگ آزادی کے سلسلہ میں تو باہم ربط و اتحاد قائم رہ سکتا ہے جو حصول آزادی کے لئے رکن اولین ہے اور غیر مسلم جماعتوں سے تصادم ونزاع قائم نہیں ہو سکتا جو حصول آزادی کے لئے شرط اولین ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ رکن کی خاطر شرط سے قطع نظر کی جا سکتی ہے اور نہ شرط میں لگ کر رکن چھوڑا جا سکتا ہے۔ رسمی لفظوں

میں اس حقیقت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جمعیت العلماء کا تمام آزادی پسند مسلم جماعتوں کو اپنے سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے اور نوائے آزادی میں غیر مسلم آزادی خواہ جماعتوں کا ہموار رہنا بھی از بس ضروری ہے۔

غیر مسلم سے اشتراک عمل...... غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل شرعاً ممنوع یا حرام نہیں ہے جبکہ حدود شرعیہ میں ہو، آج ملکی معاملات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم اشتراک عمل نہ ہو پھر ملکی آزادی جیسے عظیم مقصد میں ہندو مسلم اشتراک عمل ممنوع وحرام کیوں بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک طرف تو ملک تمام جزوی امور میں عملاً اسی اشتراک عمل کی تائید میں ہے اور دوسری طرف حکومت نے بھی اس کا کھلا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں کسی مشترکہ اور متفقہ مطالبہ پر ہی غور کر سکتی ہے۔

تو کیا ان حالات میں شرعاً یا سیاسۃً یہ چیز ناجائز یا ممنوع ٹھہر سکتی ہے کہ تمام اقوام ہند باہمی اعتماد رواداری کے ساتھ بیک آواز اس موجودہ شہنشاہی اور نظام حکومت سے کھلی بیزاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے ملک کی آزادی کا مطالبہ کریں اور اس سلسلہ میں اندرون حدود اشتراک عمل کریں اگر غیر مسلم سے اشتراک عمل ممنوع ہے تو گورنمنٹ کے ماتحت ہر سیاسی ادارہ میں ممنوع رہنا چاہئے کیونکہ اصول ہر جگہ اصول ہے۔ ہاں حدود وقیود کی ہر جگہ ضرورت ہے کہ غیر محدود عمل ہمیشہ مضرتوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

پس اس بارے میں بھی باہمی معاہدہ سے حدود عمل کی اصولی دفعات ایسی ضرور مشخص کر لی جائیں کہ ان دو قوموں میں نزاعات واعتراضات کا سد باب ہو جائے جو آئے دن باہمی بے اعتمادی اور آپس کی سر پھٹول کا باعث ہوتا رہتا ہے اور خصوصیت سے جمعیت العلماء خدشات واعتراضات کا مورد بنی رہتی ہے۔ پھر یہ معاہدہ بھی دفاع اور جنگ کی حد تک ہونا چاہئے۔ تعمیری معاہدوں کے لئے آزادی کا زمانہ موزوں ہوتا ہے نہ کہ غلامی کا۔

ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریق کار...... بہر حال جمعیت العلماء کو اپنے ہمہ گیر مقصد اور بلند پایہ منصب کے لحاظ سے ملک کی ہر قومی جماعت سے درجہ بدرجہ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسلم جماعتوں سے یگانگت واتحاد کا اور آزادی پسند غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل کا۔ مگر ساتھ ہی خود اپنے پروگرام اور اپنے پلیٹ فارم کا استقلال محفوظ رکھنا بھی اس کا عقلی وشرعی فریضہ ہے ایک منٹ کے لئے نہ اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ جمعیت العلماء اپنی خصوصیات فنا کر کے اپنا استقلال کھودے اور کسی دوسری مسلم یا غیر مسلم یا نیم مسلم جماعت میں مدغم یا اس کے پسرو ہونے کا دھبہ اپنے دامن تقدس پر لگائے اور نہ کسی حالت میں اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے محدود جماعتی استقلال میں محو ہو کر ہر دوسری جماعت سے مستغنی ہو جائے اور اپنے یا دوسروں کے تعلق منقطع کر دینے پر آسانی سے صبر کر کے بیٹھ جائے کیونکہ پہلی صورت میں اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کی منصبی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے ایک ہمہ گیر راہنما اور قائد ہونے کے صرف ایک چھوٹی سی پارٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ پس اسے اپنا مستقل اور غیر تابع وجود قائم رکھ کر دوسروں کی طرف ملاپ اور اشتراک کا ہاتھ بہر صورت

بڑھاتے رہنے ہی کی ضرورت ہے۔ پھر خصوصیت سے مسلم اداروں سے تو اسے وداد و تعلق کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے کے ساتھ اخلاقی لجاجت وسماجت سے بھی کام لینا پڑے اور شدید سے شدید تعدیوں پر بھی جو اس کی ذات پر کی جائیں مسامحت سے کام لینا پڑے تب بھی اسے ہرگز گریز نہ کرنا چاہئے کہ یہ خود اس کی اخلاقی عظمت اور عمومی راہنمائی کا ایک جزء لاینفک ہے کہ ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ کا صحیح نقشہ علماء کی جماعت بھی نہ کھینچے گی تو پھر اس کا سلیقہ اور کس میں تلاش کیا جائے گا؟ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی عالمگیر اخلاقی شفقت سے کفار تک کو اپنا کر انہیں مسلم وقانت کر سکتے ہیں تو کیا نائبانِ انبیاء اسی شفقت ورحمت کے ظل سے اپنوں کو بھی اپنا نہیں بنا سکتے؟

باہمی ربط وتعاون کی بنیاد اتحاد مقصد اور تقسیم عمل پر ہونی چاہئے...... مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات جبکہ لوگوں کے قلوب پر غرض مندیوں یا غلط فہمیوں کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ اپنے ہی مربیوں اور مصلحوں کے خلاف عناد تک کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو علماء کو تعاون اور تعلق سے مایوسی تک کی نوبت بھی آ جاتی ہے لیکن پھر بھی فرائض نصیحت وموعظت اور روابط شفقت ورحمت قطع کرنے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی الا یہ کہ شفقت وموعظت کے تمام مراحل سے گزر کر قلوب دیانۃً اس یاس پر شاہد ہو جائیں اور یکسوئی کے سوا چارہ کار باقی نہ رہے تو سکوت میں مضایقہ نہیں لیکن انقطاع تعلق یا طنز آمیز نکتہ چینیاں پھر بھی شان علم اور وراثت نبوت کے منافی رہیں گی صِدِّیْقِیْنَ وَلَعَّانِیْنَ (کیا سچائی کی علمبرداری بھی اور طعن وتشنیع بھی؟ یہ دو چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟) بہر حال جیسے جمعیت العلماء کا قیام اور اس کی منصبی حیثیت کے وقار کا وجود امت کے لئے ضروری ہے ایسے ہی دوسری جماعتوں سے حسب حیثیت ومرتبت اس کا تعلق اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ ادھر اپنے شرعی نظریوں کی تبلیغ اور امت کو رحمت ویسر کے ساتھ ان پر لانا بھی از بس ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ جمعیت العلماء کی قیادت کے یہ معنی ہیں کہ دوسری مسلم جماعتیں توڑ دی جائیں اور یہ ممکن بھی کب ہے جبکہ آزادی جیسے بنیادی مقصد کے لئے اور بھی بہت سے مبادی اور مقاصد طبعی طور پر ضروری ہیں جن سب کو نہ تنہا جمعیت العلماء انجام دے سکتی ہے اور نہ بہت سے وظائف کی انجام دہی اس کی منصبی حیثیت پر چسپاں ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ان مختلف مقاصد کے لئے اتحاد مقصد کے اور تقسیم عمل کے اصول پر دوسری جماعتیں بھی موجود نہ ہوں اور ان کا اور جمعیت کا باہمی ربط وتعاون نہ ہو اصل مقصد کی تکمیل دشواری ہی نہیں ناممکن ہے۔

جمعیت العلماء کا شرف وامتیاز...... ہاں مگر یہ بھی میں ضرور کہوں گا اور شرعی راہنمائی کی روشنی میں کہوں گا کہ: یہ تمام دوسری مسلم جماعتیں جمعیت العلماء کے سامنے مستفتی ہوں گی نہ کہ مفتی۔ نہ بلحاظ ذوات علماء بلکہ اس لحاظ سے کہ امت کے ہر مرض کی دوا بالآخر کتاب وسنت ہے اور اس کی حامل حقیقۃً یہی علماء کی جماعت ہے جبکہ وہ اپنے علمی وقار، فکر صحیح اور اخلاق کی بلندیوں کو محفوظ رکھ کر خالص کتاب وسنت کی روشنی امت کے سامنے پیش کرتی رہے۔ ایسی صورت میں افراد امت ہوں یا جماعات امت انہیں سمع وطاعت کے سوا چارہ کار نہیں کہ ارشاد ربانی

ہے ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ ① ''اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا، وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

پس تمام مسلم جماعتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے مسئلہ میں جمعیت العلماء کی شرعی راہنمائی بالضرور حاصل کریں جس میں ذرا بھی اصول یا فروع اسلام سے ٹکرا جانے کا کوئی احتمال ہو بلکہ ان کے لئے بہر حال یہی ضروری اور مصلحت ہے کہ وہ صرف جمعیت العلماء ہی کی طرف رجوع کریں تا کہ مسلم مجالس سے ربط باہمی قائم ہونے کے ساتھ ان کے کام بھی جمعیت کے علم میں آتے رہیں اور خود جمعیت کی بھی کوئی چھوٹی بڑی تجویز ان مجالس کی تجاویز سے متصادم نہ ہو سکے۔

پھر اگر جمعیت العلماء کی کسی تجویز سے کسی مسلم جماعت کو کوئی ادنیٰ سا بھی اختلاف پیدا ہو تو وہ جب تک کہ اس میں جمعیت سے آخری حد تک رجوع کر کے مسئلہ صاف نہ کر لے کتابت وخطابت سے کوئی ادنیٰ پہلو تہی نہ کرے یعنی ابتداء ہی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ کر لے اور انتہا کسی انقطاع یا بے گانگی یا بے مروتی کا معاملہ نہ کرے اور ادھر جمعیت بھی فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے خلاف تنقید سننے اور معقول ومنقول تنقید کو مان کر اس کی تلافی کے لئے تیار رہے کہ ''كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا''. ② ''کلمہ حکمت مومن کی گم کردہ پونجی ہے جہاں مل جائے وہ اس کا مستحق ہے''۔

افہام وتفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت...... خلاصہ یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے امام قوم بن کر جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت وتعمیر کی اور ان کا وکیل شرعی بن کر فرعون سے ان کی آزادی کے بارے میں گفت وشنید اور مطالبہ واحتجاج کیا اور تمام بنی اسرائیل نے جن میں اسباط کی متعدد جماعتیں تھیں، سمع وطاعت سے کام لے کر حضرت موسیٰ وہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مشترک ومختصر جمعیت پر اعتماد کیا جس کی بدولت بالآخر وہ آزاد ہوئے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں بھی مسلمان افراد اور جماعات نائبان نبی کی اجتماعی قیادت میں اور اگر وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کر لیں تو اس کی امارت میں اس کی تعمیر وتربیت پر اعتماد کریں اور شک اندازوں یا خود غرضوں کی تفرقہ پردازیوں سے جزئیات میں پڑ کر اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ کھوئیں تا کہ جماعت یا امیر جماعت ان کی آزادی کے لئے بانبساط خاطر پوری جدوجہد کریں اور آزادی کو ان کے قریب لے آئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت العلماء نے ان وظائف کو اپنے مقدور بھر ادا کیا ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ مگر یہ کارخانہ بشری ہے اس لئے فروگذاشت یا اجتہادی خطا ممکن ہے۔ سو جن حضرات پر بھی ایسی کوئی خطا واضح ہو وہ

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیة: ۳۶. ② الحدیث اخرجه الامام الترمذی فی سننه وضعفه، کتاب العلم باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۳۰۱.

اعتراض ومطاعن اوراخباری پروپیگنڈوں کا راستہ چھوڑ کر دل سے جمعیت کی طرف رجوع کریں اور جذبات کے بجائے دلائل واصول سے افہام وتفہیم کر لیں اور ابتداء سے فریقین میں نیت مناظرہ کے بجائے تحقیق مسئلہ کا عزم ہوتو بات نہیں بڑھ سکتی۔ ﴿اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا﴾ ①

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض غلامی ہے جس کی جڑوں کو ایک پردیسی حکومت رات دن مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے جس نے شعائر اسلامیہ ہی کو نہیں شعائر انسانیت کو بھی مٹا دیا ہے۔ اس غلامی سے ہماری تعلیم، روایات، مذہب، اقتصادیات، تہذیب وتمدن، قومی وقار، آبرو اور اندرونی و بیرونی تعلقات سب برباد ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اس غلامی کو بدترین عذاب قرار دیا تھا اور اس لئے ہمارا اولین فریضہ ہے کہ اس مہلک مرض سے بعجلت ممکنہ نجات حاصل کر کے آزادی کے مقام رفیع تک پہنچیں جیسا کہ اس کی فرضیت وضرورت ابتدائی نمبروں میں عرض کی گئی تھی۔

حصول آزادی کا مختصراً پروگرام...... حصول آزادی کے پروگرام کا حاصل یہ ہے کہ:۔

1 ......سب سے اول غلامی کے منشاء کو سمجھنا چاہئے کہ وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کی استبدادی پالیسی ہے۔

2 ......حصول آزادی میں نبوت وقت سے مدد لینی چاہئے تاکہ پروگرام اختراعی نہ رہے بلکہ الہامی ہو جائے اور قیادت وحی الٰہی کی قائم ہو۔

3 ......پہلے اپنوں سے اتحاد اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ پھر غیروں سے بقدر حاجت اشتراک عمل مگر حدود وقیود وشریعت میں رہ کر اور اس کا بصورت معاہدہ ہندو مسلم اعلان کر کے۔

4 ......موجودہ صورت حال میں جنگ آزادی عدم تشدد سے لڑی جاسکتی ہے جس کے اسلحہ اخلاقی ہیں۔ ذکر اللہ، دعا، رجوع الی اللہ، استمداد باہمی واتحاد اور احتجاجی ومطالباتی جدوجہد، نیز مسلمانوں کی تنظیم۔

5 ......باہمی اشتراک عمل میں شرکاء عمل کا عاقل وباخدا ہونا ضروری ہے، غافل اور چالاک ہونا مضر ہے۔

6 ......اس اخلاقی جنگ میں بحیثیت حزب اللہ اور فرستادۂ خدا کام کرنا چاہئے نہ کہ حظ نفس سے۔

7 ......متسلط قوم سے خطاب میں نرمی برتنی چاہئے نہ کہ تشدد اور اظہار غیظ۔

8 ......خطاب کنندہ قائدوں کا متواضع اور بے تکلف ہونا ضروری ہے جن کی نظر اپنی کمزوریوں اور عیوب پر بھی ہو اور متکبر یا رسمی وفور ہونا مضر ہے۔

9 ......قائدین کی جماعت کو متغلب قوم کے درباروں میں پہنچ کر اپنی اسلامی پوزیشن اور اپنی تحریک کی دینی پوزیشن علی الاعلان واضح کر دینی چاہئے۔

10 ......آزادی کی طلب مذہب کے لئے کرنی چاہئے نہ کہ ترفہ وتنعم دنیوی کے لئے۔

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۵.

11 ......آزادی خواہ ذمہ داروں کا عاقل وفہیم ہونا، دین سے متاثر ہونا اور دین دار ہونا ضروری ہے ورنہ مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ جو مقصود بالذات ہے بلکہ صرف قومی آزادی ملے گی جو مقصود اصلی نہیں ہے۔

12 ......اپنوں کی اصلاح وتعمیر ان کی اخلاقی تربیت اور جزئیات عمل کی تہذیب مسلم جماعتوں کی تقویم از بس ضروری ہے کہ ناتربیت یافتہ فوج بالآخر تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

13 ......متسلط قوم کو بھی تبلیغ دین ضروری اور تا حصول آزادی مسلسل ضروری ہے کہ اس سے نصرت غیبی اور ذمہ داریٔ حق تعالیٰ ہو جاتی ہے اور مطالبات کی جڑ مضبوط ہو جاتی ہے۔

14 ......مصائب دنیا کی شکایت زبان پر نہ آنی چاہئے بلکہ عنوان مطالبات موانع دین کی شکایت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام میں آزادی کی ضرورت صرف دین کے لئے ہے دنیا تابع محض ہے۔

15 ......ہر مطالبہ اور احتجاج کی حجت قرآنی معجزہ یعنی کتاب وسنت کے براہین سے پیش کی جائے۔

16 ......شرعی امارت اور دینی قیادت کا قیام ضروری ہے تاکہ قوم میں مرکزیت آجائے۔ ایک مرجع الامر مشخص ہو کر پوری قوم کو بجائے تشتت وپراگندگی کے تعمیل شرائع میں یکسوئی نصیب ہو جائے اور قلوب میں تشویش کی جگہ سکون و طمانیت پیدا ہو سکے۔

17 ......قائد علماء مفکر ومبصر، دانایان مسائل ودلائل، عارفان حوادث ووقائع مستند وجید اور ساتھ ہی صلحاء واتقیاء ہونے چاہئیں نہ کہ محض خطیب اور زعیم۔

18 ......علماء مفکرین کی حیثیت اجتماعی کا وجود ضروری ہے جس کا رسمی نام جمعیت العلماء ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس کے اہل حل وعقد مستند علماء ہوں۔ رسمی یا متکلف علماء نہ ہوں جن کے سامنے آنے سے غیر شرعی چیزیں باور ہونے لگیں اور تلبیس حق بالباطل کا بازار گرم ہو جائے۔

19 ......اس وقت جمعیت العلماء کا بڑا کام حقوق مسلمین کی غیر مشروط حفاظت اور آزادی ملک کی غیر مشروط حمایت کرنا ہے۔

20 ......ہر آزادی خواہ کی حمایت وہم نوائی کی جائے مگر اپنا پروگرام مستقل رکھا جائے۔ معاہدہ کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے اشتراک عمل بحالات موجودہ ضروری ہے۔ اس اشتراک سے وہ بھی اسلام سے قریب لائی جاسکتی ہیں۔ اپنے استقلال تام کی صورت میں سب ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہم صرف خدا کے ساتھ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب کے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ کوئی نہ ہو۔

21 ......حصول آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام اشد ضروری ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو تحصیل آزادی کے لئے بھیجتے ہوئے فرمایا ﴿وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ﴾ ① ”میرے ذکر میں

---

① پارہ: ١٦، سورة طٰه، الآية: ٤٢. ② پارہ: ١٦، سورة طٰه، الآية: ١٤.

سستی مت کرنا"۔ اور ذکر اللہ کا فرد کامل نماز ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ. ② "میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو اور اقامت صلوٰۃ کا جزءِ اعظم جماعت ہے۔فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ. ① "جماعت کی صفوں کو سیدھا رکھنا اقامت صلوٰۃ میں سے ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ تسویہ صفوف بلا جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لئے حصول آزادی کی جدوجہد کے وقت تعلق مع اللہ اور اکمل فرد نماز با جماعت ناگزیر ہے تا کہ نصرت غیبی شامل حال رہے۔

22 ...... تبلیغی مساعی کی منظم طریق پر ضرورت ہے۔تبلیغ دین سیاسی پلیٹ فارموں سے ہونی چاہیے اور حکومت و رعایا کے کانوں میں مساوی طور پر اسلام کی آواز پہنچنی چاہئے جس سے دیانات کے ساتھ اسلامی قوانین وسیاسیات کو بھی اصولی طور پر کرسی نشینوں کے کانوں تک پہنچایا جائے تا کہ ان کے مقصد سے دشمنوں میں بھی ہمدردی پیدا ہونے کا راستہ پڑ جائے اور حصول مقصد دور نہ رہے۔ بہر حال یہ بائیس نکات ہیں جو تلاوت کردہ آیات سے مستنبط ہوتے ہیں جن میں غلامی کی قباحت وشناعت ازالۂ غلامی کی فرضیت طریق احتجاج ومطالبات اور اس کی نوعیت، آزادی کی برکات، حصول آزادی کی سعی، سعی میں خلوص وللٰہیت۔

حصول آزادی کا پروگرام، دشمنانان آزادی کا انجام اور غلام وضعیف قوم کی کامیابی وغیرہ کے مہمات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ میں نے اپنی ضعیف بساط کے مطابق یہ مضامین آیات بالا سے استنباط کر کے عرض کئے ہیں جن میں اصولی طور پر مسائل حاضرہ کی بحث بھی موقع بموقع آ گئی ہے مگر سیاسی زبان کی بجائے دینی اور قرآنی زبان میں آئی ہے اور یہ زبان سیاسی اور غیر سیاسی افراد کے لئے یکساں مقبول اور جاذب توجہ ہے۔ اہل تفکر اور اذکیاء علماء اس سے بہت زیادہ حقائق ان آیات سے نکال سکتے ہیں کہ آخر کلام الٰہی ہے جس کی گہرائیوں کی کوئی حدود نہایت نہیں ہو سکتی۔

سیاست شرعیہ کی عظمت...... میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈھچر اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے۔ جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہیے جس سے اس پرمکر عصری سیاست کی ظلمت دور ہو سکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اٹھ جائے، کیونکہ آج اس کی مخالفت کرنے والے بھی بوجہ اس کی شوکت کے وقیع اسی کو سمجھتے ہیں اور اسی میں خود اپنی شوکت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مزے لے کر اس کا ذکر اور اس کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کتاب وسنت کے منصوص پروگراموں سے ہی یہ عظمت زائل ہو کر حقیقی عظمت خدائی پروگراموں کی قائم ہو سکتی ہے۔

تعمیری سلسلہ کا پروگرام میں کافی تفصیل کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت جمعیت العلماء صوبہ سندھ میں پیش کر

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب اقامۃ الصف من تمام الصلوٰۃ ج:۳ ص:۱۵۰۔

چکا ہوں۔ اگر اس کی تمام دفعات ان ۲۲ نمبروں کے ساتھ شامل کر لی جائیں تو دفاعی اور تعمیری پروگرام کی تمام مہم اور بنیادی دفعات سامنے آجائیں گی جو نصوص کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں گی۔

بزرگان محترم! میں نے بہت سا وقت آپ کا لیا جس کی میں معذرت کرتا ہوں اور اس تمغہ صدارت پر جو آپ حضرات کی ذرہ نوازی نے مجھے عطاء فرمایا ہے، بکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فَجَزَاكُمُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ الْجَزَاءِ ......

ہندوستان آزاد، اسلام زندہ باد، جمعیت العلماء آباد۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

تکمیل انسانیت

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

تقریب تکمیل...... بزرگانِ محترم! یہ تقریب ہمارے عزیز محمد ازہر صاحب کے ختم قرآن شریف کے لئے ہو رہی ہے۔ اسی مجلس میں انہوں نے قرآن کریم ختم کیا اور اس میں دعاء کی گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے یہ عزیز قرآن شریف شروع کرنے کی ابتداء کر رہے تھے اور اس کے حفظ کا قصد تھا۔ یقیناً وہ بھی خوشی کا دن تھا جس میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کرنے کا آغاز کیا۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں حافظ بنایا اور انشاء اللہ "حافظ جید" بھی ہوں گے اور ان کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قاری مجود بھی ہوں گے۔ تو ایک ابتداء تھی اور ایک انتہا اور یہ دونوں چیزیں خوشی کی ہوتی ہیں۔

ابتداء اور تکمیل پر خوشی...... ابتداء کی خوشی توقع کی بناء پر ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے کو مکتب میں بٹھاتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں مگر یہ خوشی توقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ پڑھے گا، چند دن بعد حفظ کریگا اور اس اس میں کمال پیدا کرے گا۔ غرض ابتداء میں امید کی بناء پر خوشی ہوتی ہے اور انتہاء میں تکمیل کی بناء پر خوشی ہوتی ہے کہ جو توقعات باندھی گئی تھیں وہ اللہ نے پوری فرمادی۔ اس لئے انتہائی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ تو ہر ابتداء بھی خوشی کی چیز ہے، اور پھر انتہاء بھی خوشی کی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابتداء میں خوشی توقع پر ہوتی ہے اور انتہا میں تکمیل پر ہوتی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ تکمیل بہ نسبت توقع کے زیادہ خوشی کی چیز ہے اور توقع اور امید تو مبہم ہوتی ہے، پوری ہو یا نہ ہو، لیکن تکمیل کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ساری توقعات پوری ہوگئیں۔ تو وہ امیدِ محض ہوتی ہے، یہ واقعہ ہوتا ہے، تو واقعہ پر

---

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٦.

جو خوشی ہوگی وہ یقیناً اس سے بڑھ کر ہوگی جو محض توقع پر ہوتی ہے۔

تکمیل پسند امّت ...... ویسے بھی مسلمان کچھ تکمیل پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ دین ہی اس کا کامل ہے۔ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ ① دین کی ابتداء تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل وانتہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ہوئی۔

عالم بشریت کی طفولیت اور اس کا ابتدائی علم ...... ابتداء کے وقت بالکل ابتدائی چیزیں تھیں، جو بچوں کے لئے ہوتی ہیں، بچے کا سب سے بڑا علم یہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ چیزوں کے نام سکھلا دئے جائیں۔ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے، یہ زمین ہے، یہ آسمان ہے۔ تو اگر بچے کو نام یاد ہو جائیں تو یہ اس کا سب سے بڑا علم ہوتا ہے اور علم کا پہلا درجہ بھی ''علم الاسماء ہی کا ہے کہ اشیاء کے نام معلوم ہوں۔ اگر کسی چیز کا نام ہی معلوم نہ ہو تو وہ مجہول مطلق ہوتی ہے اس کی طلب ہی نہیں ہو سکتی۔ غرض علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔ اس کے بعد پھر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس اسم کا مسمّٰی کون ہے۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جب مسمی کی صورت دیکھ لی تو طبعاً جی چاہتا ہے کہ اب۔ یہ معلوم ہو کہ اس مسمی کی خصوصیات کیا ہیں۔ تو آدمی ان خصوصیات کا علم حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بھی حاصل ہو گیا تو پھر آگے یہ درجہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ تو پہلے اسم ہے اس کے بعد معانی مدلولہ ہیں۔ اس کے بعد اس کے خواص اور آثار ہیں۔ اس کے بعد اس کے حقائق ہیں۔ اس طرح درجہ بدرجہ علم ترقی کرتا ہے۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے میں عالم بشریت کی طفولیت تھی۔ انسانیت کے لڑکپن کا زمانہ تھا اور بچوں کا سب سے بڑا علم ناموں کا یاد کرانا ہے۔ اس لئے آدم علیہ السلام پر جو وحی اتاری گئی اس میں زیادہ تر اسماء ہی تھے۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا﴾ ② آدم علیہ السلام کو نام یاد کرا دیئے گئے۔ ناموں کے کچھ مسمیات بتا دیئے گئے مسمی پہچنوا دیا گیا۔ تو علم کی ابتداء اسماء سے ہوئی حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے اتارے۔ جیسے اس امت مرحومہ پر قرآن کریم کے تیس سپارے اتارے گئے۔ تو تیس صحیفے اترے۔ ان میں زیادہ تر رہائشی امور کی تعلیم تھی۔ کھیتی یوں کرنی چاہئے۔ باغ یوں لگانا چاہئے، کپڑا یوں بننا چاہئے۔ لکڑی کا کام یوں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایک ہزار صنعتیں سکھلائیں۔ وہ ان کی اولاد میں پھیلیں۔ ہر طبقے نے اپنی مناسبت سے ایک صنعت اختیار کر لی۔ کسی نے لکڑی کا کام، کسی نے لوہے کا کام کسی نے تعمیر کا کام، کسی نے کھیتی باڑی کا، بنی آدم میں مختلف صنعتیں پھیل گئیں۔ مگر سب کی سب وحی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔

ابتدائی عبادت ...... بہر حال آدم علیہ السلام پر تیس صحیفوں میں جو وحی کی گئی، اس میں زیادہ تر رہائشی امور تھے، حلال وحرام کے احکام فقہیہ بہت اقل قلیل تھے، اس لئے کہ بچوں کا ابتدائی علم ناموں ہی کا سکھلانا ہے، حلال وحرام زیادہ نہیں بتلاتے۔ وہ تو معصومیت اور فطرت پر ہوتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد فطرت پر تھی،

---

① پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔

نیک اور صالح تھی۔ جو نام یاد کرا دیئے گئے انکو پڑھ لینا یہی سب سے بڑی عبادت تھی۔

جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو کچھ اسماء کی تلقین کی کہ یہ پڑھا کرو۔ تو اس دور کی سب سے بڑی عبادت یہ تھی کہ اسماء خداوندی کو رٹا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔ غرض ابتداء علم یہی تھا کہ ناموں کا علم ہو جائے اور اسماء معلوم ہو جائیں۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا.﴾ ① اس پر شاہد ہے۔

عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم ...... اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا۔ تو طبعی طور پر جذبہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس اسم کا مسمّٰی کیا ہے۔ یہ نام کس چیز پر صادق آتا ہے۔ اس کا مسمّٰی کون ہے اس کی طلب ہوتی ہے۔ تو آدم علیہ السلام نے تو ناموں کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کرائی اور نوح علیہ السلام نے مسمیات کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کی طرف پہنچایا۔ چناں چہ فرمایا گیا۔ ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاo وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًاo وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًاo ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًاo وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًاo لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا.﴾ ② ''زمین کو اللہ تعالیٰ نے پھیلایا۔ تمہیں اس طرح سے پیدا کیا جس طرح نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی''۔

تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اسماء سکھلائے گئے تھے، یہاں مسمیات سامنے رکھے گئے کہ ان کے ذریعے معرفت خداوندی حاصل کرو۔ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصور بندھتا ہے۔ اگر مصنوع بہت عمدہ ہو تو تعریف کی جاتی ہے کہ صناع بڑا کامل ہے۔ جس نے ایسی بڑی صنعت دکھلائی۔ تو آسمان اور زمین وہ چیزیں ہیں کہ بجز اللہ کے کوئی نہیں بنا سکتا۔ اس واسطے ان کی طرف متوجہ کیا گیا کہ انکے ذریعے سے صانع کو پہچانو کہ وہ، کیسا حکیم و خبیر ہے اور کیسا قادر مطلق اور قدیر علے الاطلاق ہے کہ جس نے آسمان کا خیمہ تان دیا اور زمین کا فرش بچھا دیا۔

آپ چھوٹا سا بھی ایک شامیانہ کھڑا کرتے ہیں تو بانس کے بیسیوں ستون لگاتے ہیں تا کہ وہ تھمے۔ مگر آسمان کا یہ اتنا بڑا خیمہ جسکی مسافت پانچ سو برس کی ہے۔ نہ اس کے نیچے کوئی بانس ہے نہ ٹیک ہے اور ہوا کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا بڑا قادر ہے جس نے یہ خیمہ تان دیا۔ ﴿بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا.﴾ ③ نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی لکڑی۔ بہرحال نوح علیہ السلام نے اسماء کے بعد مسمیات کی طرف متوجہ کیا اور مسمیات کے ذریعے سے حق تعالیٰ کو پہچانوا دیا۔ معرفت خداوندی کرائی۔ اب گویا عالم بشریت کو نام بھی معلوم ہیں اور مسمیات بھی معلوم ہو گئے۔

عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم ...... پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اس درجے کے بعد اب طبعی طور پر یہ خواہش ہوتی۔ ہے کہ ان مسمیات کے خواص کیا ہیں؟ انکے آثار کیا ہیں؟ یہ کیوں بنائے گئے؟ ان کی

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۹، سورۃ نوح، الآیۃ: ۱۵، ۲۰.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۰.

غرض وغایت کیا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نفسیات کی طرف متوجہ کیا۔نفوس فلکیہ،نفوس ارضیہ۔اوران کے ذریعے سے معرفت خداوندی کرائی۔اس لئے کہ اسم اور مسمی تو معلوم ہو چکے تھے۔اب تو خواص وآ ثار سامنے تھے۔تو خواص وآ ثار کی طرف متوجہ کر کے انہیں معرفت خداوندی کی طرف بڑھایا۔

دور موسوی اوراس کا علم......طبعی طور پر جذبہ یہ ہوتا ہے کہ نام یہ ہے،مسمی یہ ہے،خواص یہ ہیں ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہو؟ کس طریقے سے استعمال کریں۔ان کے احکام کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آ گیا اور تورات نازل ہوئی اوراس شان سے کہ ﴿تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ . ہر چیز کے احکام کی تفصیل بتلائی گئی کہ اسے یوں استعمال کرو،یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے،یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔غرض احکام کی تفصیل آ گئی۔

احکام کی حقیقت کا دور......اب یہ کہ نام بھی معلوم ہو گیا،خاصیتیں بھی معلوم ہو گئیں اوراحکام کا بھی پتہ چل گیا تو طبعی طور پر ذہن اس کی طرف جاتا ہے کہ احکام کی علت کیا ہے جس پر یہ مبنی ہیں؟ کیونکہ حکم کا تعلق بہر حال کسی حقیقت اور علت سے ہوتا ہے۔اس لئے کہ جب علت سامنے آتی ہے تو فقط ایک ہی چیز کا حکم معلوم نہیں ہوتا،جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی احکام معلوم ہوتے رہیں گے۔تو ایک علت سے سینکڑوں ابواب کے احکام سامنے آ جاتے ہیں۔

دور نبوی (علیہ السلام) اجتہادِ انسانیت کا دور......پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آ گیا۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفاصیل ارشاد فرمائیں کہ ہر حکم کے نیچے حکمت،ہر حکمت کے نیچے علت ہر علت کے نیچے ایک حقیقت،اور ہر حقیقت کے نیچے ایک صفت خداوندی جس سے اس علت اور حقیقت کا رابطہ ہے۔تو علمی طور پر گویا بنی آدم اس قابل بن گئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔صورت دکھلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ مسمیات پہچانے جائیں۔وہ تو پہچان چکے تھے۔اس طرح نام بتلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ وہ معلوم ہو چکے تھے۔زیادہ احکام بتلانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے تھے۔علل احکام بتلانے کی ضرورت تھی تا کہ یہ امت مجتہد بنے اس امت کے اندر یہ قوت پیدا ہو کہ اس ایک علت سے ہزاروں چیزوں کے احکام نکالے اور یہ اس لئے کہ ختم نبوت کا دور ہے کوئی نبی آنے والا نہیں۔کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں۔تو اس امت کے علماء کو یہ قوت دی گئی کہ قیامت تک کے حوادث کا فیصلہ اسی قرآن کریم سے کریں۔انہی اصول وکلیات اورانہی علل سے اورانہیں حقائق سے فیصلہ کریں۔چودہ سو برس گذر گئے ہیں اورامت فیصلے کرتی آ رہی ہے،ہر صدی میں نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں نت نئے حوادث سامنے آتے ہیں،لیکن کبھی امت میں عجز پیدا نہیں ہوتا،اسی قرآن مجید،اسی حدیث،اسی فقہ سے احکام نکلتے چلے آتے ہیں،انہی علل سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے،تو یہ مجتہدین کی امت ہے۔

امت محمدیہ میں آثار نبوت......اور جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا: عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَآءِ

یُــلَ. ① گواس روایت کی سند میں کچھ کلام کیا گیا ہے، مگر باوجود اس کے علماء اس سے استدلال واستشہاد کرتے ہیں کہ سنداً گو یہ روایت کچھ ضعیف ہو مگر اس مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔ اگرچہ عنوان بدلا ہوا ہو۔ اس لئے مضمون کی حیثیت متواتر ہے، گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہو، ایک حدیث سند کے لحاظ سے اگر ضعیف بھی ہو مگر اس معادل دوسری چیزیں مل جائیں تو درجہ حسن پر پہنچ ہی جاتی ہے، بہرحال سند کچھ ضعیف بھی سہی مگر معنی ضعیف نہیں ہے تو امت کے علماء نبی تو نہیں ہیں۔ مگر کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ جہاں ایک بھی عالم بیٹھ گیا، ہزاروں کو ایمان اور معرفت سے رنگ دیا۔

ایک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے، ان کے علمی آثار کوفہ سے خراسان اور ایران کی طرف پہنچے اور ایران سے افغانستان کی طرف اور افغانستان سے ہندوستان کی طرف۔ تو ہندوستان، افغانستان کی اکثریت حنفی ہے، حتی کہ شام کی اکثریت بھی حنفی ہے، آپ کی فقہ وہاں پہنچی اور اس فقہ نے ان ممالک کی اکثریت کو اپنے ذوق میں رنگ دیا اور لاکھوں کروڑوں حنفی بنے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک امام حق اور امام مجتہد ہیں، آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی اور حجاز میں زیادہ تر قیام ہوا ہے، تو حجاز کی اکثریت شوافع ہے، مصر کی اکثریت شافعی ہے۔ پھر وفات بھی مصر میں ہی ہوئی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الھجرۃ ہیں۔ تو عرب کے جو مغربی قطعات ہیں، وہ اکثر و بیشتر مالکی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نجد اور یمن میں قیام ہوا ہے، تو وہاں اکثریت حنبلیوں کی ہے۔ غرض ایک عالم ربانی بھی جہاں پہنچ گیا، لاکھوں کے اندر ایمان کا نور پیدا کر دیا۔ لاکھوں کو ایمان میں رنگ دیا تو: عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ. ایک نبی کی ذات بابرکات آتی ہے تو امتیں بن جاتی ہیں، لاکھوں، کروڑوں کو ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس دور میں چونکہ نبوت نہیں رہی تھی، تو علماء کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام بنا دیا گیا، یہ وہ کام کریں جو انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ وہ انہی کی طرز پر تبلیغ کریں۔ وہی تربیت ہو۔ وہی تعلیم ہو۔ وہی تزکیہ نفوس ہو۔ اس طرح سے ان علماء اور مشائخ ربانی نے کام کیا اور صحیح معنی میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کا قائم مقام بن کر دکھلایا۔

شرائع اصلیہ اور وضعیہ..... علم کے ساتھ قرنِ اول میں ظاہر بات ہے کہ ساری جزئیات تو نہیں آئی تھیں۔ ہزاروں حوادث بعد میں پیدا ہوئے مگر علل وکلیات کی صورت میں احکام موجود ہیں اور وہ منصوص ہی کے حکم میں ہیں۔ تو یہ امت گویا مجتہدین کی امت ہے۔ جس کو علماء نے دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا کہ: ''ایک شرائع اصلیہ ہیں وہ وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل ہوئیں۔ اور ایک شرائع وضعیہ ہیں کہ ان شرائع اصلیہ سے احکام نکال نکال کر فقہ مرتب کر دیا گیا۔ کتابیں مدون ہوگئیں، ہزاروں کتابیں لکھی گئیں وہ کتاب وسنت ہی سے نکلے ہوئے احکام ہیں۔ معاذ اللہ کوئی مجتہدین کا ذاتی اختراع تھوڑا ہی ہے''۔

① حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں: لا اصل لہ دیکھئے: الدرر المنترۃ فی الاحادیث المشتھرۃ، حرف الفاء ص: ۱۴.

انہوں نے اصول سے احکام کا استنباط کیا۔ تو وہ بھی درحقیقت کتاب وسنت ہی کے احکام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مجتہد کا ذہن پہنچتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا نہیں پہنچتا، ہم سوائے اس کے کہ ان کا اتباع کریں اور کربھی کیا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی تقلید کریں اور کربھی کیا سکتے ہیں۔

تو اصل میں ان حضرات نے کتاب وسنت سے علوم اخذ کئے اور دین کو باغ و بہار بنایا، ابواب مرتب ہوئے، فصول مرتب ہوئیں اور ان فنون پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ فقہ مرتب ہوا تو ہزار ہا کتابیں فقہ میں آ گئیں، اصول فقہ مرتب ہوئے تو وہ ایک مستقل فن ہو گیا۔ اس طرح سے علم در علم اور شاخ در شاخ ہوتے ہوئے عالم کے اندر علم پھیلا تو جو شان انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کر کے مخلوق کو دیتے ہیں۔ وہی شان مجتہدین کی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام سے علم حاصل کر کے امتوں کو بانٹ رہے ہیں۔

عالم بشریت کا شباب...... میں نے اس پر عرض کیا کہ: علم کا ابتدائی درجہ ''علم الاسماء تھا۔ یہ عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب مراہقت کا زمانہ آیا جو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا تو ''مسمیات'' کا دور آ گیا۔ اور پھر بیچ میں شباب آ گیا تو حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام مبعوث ہوئے۔ اس وقت عمر بھی زیادہ قد وقامت بھی زیادہ، قوم عاد پر جب عذاب آیا اور وہ ہوا سے پچھڑ پچھڑ کر گرے ہیں تو فرمایا گیا ﴿كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾۔ ①

اتنے لمبے لمبے قد جیسے کھجوروں کے تنے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار۔ ڈیڑھ ہزار برس کی عمر ہے۔ ہم اور آپ ایک ایک مکان بناتے ہیں۔ تو سو دو سو برس میں ہماری کئی نسلیں اس میں گذرتی ہیں اور وہاں تین سو برس۔ چار سو برس گذرے مکان گر گیا، پھر مکان بنایا، پھر چار سو برس کی عمر ہوئی پھر مکان بنایا، تو ایک ہی آدمی چار چار دفعہ مکان بناتا تھا۔ کیونکہ عمر ہی ڈیڑھ ہزار برس کی ہوتی تھی۔ تو مکانات بھی نئے نئے بنتے تھے۔ بہرحال عمریں بھی زیادہ تھیں۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ: حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ تو عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ ہے اور عاد وثمود کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے۔

جوانوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ پنجے لڑا رہے ہیں۔ اکھاڑے کر رہے ہیں، کشتیاں کر رہے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ: مجھ سے طاقت میں کون زیادہ ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ: میں تجھ سے طاقت میں زیادہ ہوں۔ یہی ان قوموں کی حالت تھی: ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ ''ہم سے زیادہ کون قوی ہے''؟۔ اور ان کے کام دیکھو تو جنات جیسے۔ فرمایا گیا: ﴿وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا﴾ ② ''پہاڑوں کو تراش تراش کر بلڈنگیں بناتے تھے''۔ دنیا کی بلڈنگیں نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ وہ اوپر سے بناتے ہوئے نیچے لاتے، پہاڑوں کو کھود کھود کے اور تراش تراش کے بلڈنگیں تیار کیں، بہرحال یہ جوانی کا زمانہ ہے کام وہ کئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الحاقۃ، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۸ سورۃ اعراف، الآیۃ: ۷۴۔

عالم بشریت کی طفولیت کے لئے اندازِ تعلیم ...... اور ظاہر بات ہے بچوں کے سامنے، اگر وہ بدشوقی اختیار کریں، تو کچھ پیار کرتے ہیں، کچھ ترغیب دیتے ہیں کہ مٹھائی کھلائیں گے، پیسے دیں گے تو بچہ تعلیم میں لگ جاتا ہے، تو کھیل کود کے اسباب سامنے زیادہ رکھتے ہیں تا کہ بچہ متوجہ ہو جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے جو صحیفے تھے تو اس میں صنائع وحرفت کی تعلیم تھی کہ دنیا کی چیزیں یوں بناؤ۔ تو دنیا کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ. ﴾ ①

یہ دنیا تو کھیل کود ہی ہے۔ تو کھلونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے تا کہ ان کا دل راغب ہو اور اس راستہ سے علم کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ یہ گویا حکمت تربیت ہے کہ اسی مزاج سے اللہ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: تم پہلے جو ان بنو۔ تب اللہ تک پہنچو گے بلکہ طفولیت ہی میں اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ تو مربی کامل وہی ہے کہ انسان جس حالت میں ہے۔ اسی حالت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنا دے۔

مولانا محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم اور شاعر بھی بہت بڑے گذرے ہیں اور نعت میں ان کے اشعار واقعی بڑے عالمانہ اور اونچے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ لکھنو میں ہر سال پتنگ بازی کا ایک موسم آتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے اُمراء کنکلے اُڑا رہے ہیں اور کنکلوں کے میچ ہو رہے ہیں کہ دوسرے کے مانجے کو کاٹا تو انہوں نے کہا کہ: وہ جیت گیا۔ تو ہار جیت ہوتی تھی۔ میچ ہوتے تھے۔ ہوا میں پتنگ اُڑاتے تھے۔ تو مولانا محسن کہتے ہیں کہ: ہمارا بچپن تھا تو ہمیں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا مگر یہ پتنگ بازی علماء کے گھرانوں کی شان کے مناسب نہیں تھی۔ اس لئے والد ماجد نے روکا بھی مگر اس میں سے اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا راستہ نکال دیا۔ چناں چہ فرمایا: ''تم چاہتے ہو کہ تم جیت جاؤ اور تم دوسرے کے مانجے کو کاٹ دو؟ انہوں نے کہا جی! یہ چاہتے ہیں۔ فرمایا اس کی تدبیر میں تم کو بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رات کو اخیر شب میں اٹھ کر پہلے تو چار رکعات پڑھو اور اس کے بعد قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھ کر مانجا سوتتے رہو اور اللہ کا نام لیتے رہو۔ پھر جو لڑو گے تو تم ہی جیت جاؤ گے۔

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ: اب ہم اخیر شب میں اٹھتے وضو کرتے، نماز پڑھتے، قل ہو اللہ پڑھ کر مانجا سوتتے۔ اب جو صبح میچ ہوتا۔ اکثر کامیاب ہو جاتے۔ فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان ہونے کے بعد پتنگ بازی تو چھوٹ گئی۔ مگر تہجد باقی رہ گیا۔ اور معرفت باقی رہ گئی۔ غرض یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: جب تم بڑھو گے تو تم خدا کو پہچانو گے۔ نہیں بلکہ لڑکپن ہی کی نفسیات اور کیفیات سے تم اللہ کو پہچانو۔ تو اس راستے پر ڈال دیا۔

اسی طرح سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں اسماء کے ذریعے اللہ تک پہنچایا گیا اور نوح علیہ السلام کے زمانے میں مسمیات کے ذریعے پہنچایا۔ قوم عاد اور قوم ثمود جوان قومیں تھیں۔ ان کو ان کی قوت کے راستے سے پہنچایا۔

عالم بشریت کے شباب کے لئے اندازِ تعلیم ...... یہ قاعدے کی بات ہے کہ بچہ اگر بدشوقی دکھلائے تو ایک

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۳۶.

آدھ تھپڑ مار دیا۔ کچھ ترغیب دیدی۔ لیکن اگر جوان آدمی سستی دکھلائے تو استاذ صبر نہیں کر سکتا، سخت سزا دیتا ہے کہ جب جوانی میں کام نہیں کیا تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے؟ جوانی اور مانجا ڈھیلا۔؟

تو اس عمر میں پیار وغیرہ زیادہ نہیں کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے کہ پھر تمہارے کام کرنے کی کونسی عمر آئے گی۔؟ تو قوم عاد اور ثمود نے جب سرکشی دکھلائی تو یہ نہیں کہ انہیں کھیل کھلونے دیئے گئے ہوں۔ بلکہ آندھی مسلط کی گئی اور ہوا سے تباہ کیا گیا۔ قوم ثمود کو چنگھاڑ سے تباہ کیا گیا کہ جوان ہو کر جب عمل نہیں کرو گے تو کیا عمل کرنے کے لئے بڑھاپے کا زمانہ آئے گا؟ اس واسطے جوانوں پر ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں ترغیبات زیادہ دیتے ہیں اس لئے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

عالم بشریت کا بڑھاپا قوتِ فکریہ کا اِزدیاد...... درجہ بدرجہ یہاں تک کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آیا۔ تو عالم بشریت کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ گویا بنی آدم ضعیف ہو چکے ہیں۔ نہ وہ قد وقامت رہے نہ ہی وہ عمریں رہیں نہ وہ طاقتیں رہیں جو پچھلوں میں تھیں۔ مگر بوڑھے آدمی کا دماغ تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ عقل بڑی ہوتی ہے اگر چہ کام کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے گرم اور سرد سے گزر چکے ہیں اور تجربات ان کے سامنے ہیں۔ تو جوانوں کا کام یہ ہے کہ وہ علم میں لگیں لیکن جب رکاوٹ پیش آئے تو بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ وہ کام کی بات بتائیں گے۔

بڑھاپے میں علم کی وُسعت...... وہ کہتے ہیں کہ کہیں بارات گئی اور بارات میں سو دو سو آدمی تھے۔ جس گھر میں گئی وہ بہت کھاتا پیتا گھرانہ تھا تو انہوں نے یہ شرط لگائی کہ: بارات جو آئے تو اس میں کوئی بوڑھا ساتھ نہ ہو۔ سارے جوان ہوں۔

دولہے والوں کے ہاں مشورہ ہوا کہ بڑا بوڑھا ساتھ نہ ہو اور کوئی مشکل آن پڑی تو مشورہ کون دے گا؟ تو بوڑھے کو ڈھول میں بند کر کے لے گئے تا کہ ان کی بات کا بھی خلاف نہ اور بوڑھا بھی پہنچ جائے۔

بارات جب پہنچی تو صاحب خانہ نے کہا کہ: لڑکی تو دی جائے گی مگر۔ شرط یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے ایک بکرا تل کر رکھا جائے گا اور وہ اس کو پورا کھانا پڑے گا۔ اگر نہ کھا سکیں تو ہم بیٹی نہیں بیاہیں گے۔

اب یہ بے چارہ پریشان ہوئے کہ اتنا معدہ کس کا ہے کہ پورا بکرا اپنے اندر اتار لے۔ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! سوچ کر جواب دیں گے، تو ڈھول والے کے پاس پہنچے اور بڑے میاں کو ڈھول میں سے نکالا اور کہا کہ شرط لگائی ہے کہ ایک آدمی ایک بکرا کھائے۔ ہم میں تو اس کی طاقت ہے نہیں۔ اگر شرط رد کرتے ہیں تو پھر نکاح نہیں ہوگا۔ مانتے ہیں تو ہم میں طاقت نہیں۔

بڑے میاں نے کہا کہ: نہیں تم مان لو اور ان سے کہو کے ایک ایک کر کے تل کر دیتے جائیں۔ اب جونہی ایک بکرا آتا تو وہ ساری بارات میں بوٹی بوٹی آتی اور بکرا ختم ہو جاتا۔ اس طرح کر کے بڑے میاں کے مشورہ سے ان

کی شرط بھی پوری ہوئی اور بارات دلہن لے کر واپس ہوئی۔

بوڑھی اُمّت پر بارِ عمل کی کمی...... یہ امّت بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس واسطے عملی طاقت تو اگرچہ گھٹ گئی مگر دماغی اور قلبی طاقت بڑھ گئی، تجربات وسیع ہوگئے دنیا کی امتوں کے احوال قرآن وحدیث کے ذریعے سے اس کے سامنے ہیں۔ تو یہ امت عالم بھی ہے اور مجتہد بھی اور تجربہ کار بھی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا یہی کام ہوتا ہے کہ عملی بات تو ان پر ڈالی نہیں جاتی۔ ان کے ذمہ معمولی کام لگایا جاتا ہے مگر ان کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے کہ بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔

چناں چہ اگر شادی بیاہ ہو تو دیگ کے اوپر بڑے میاں کو بٹھا دیتے ہیں۔ آپ نگرانی فرماتے ہیں۔ جوان آدمی کھانا لے جا رہے ہیں۔ رکھ رہے ہیں، مگر بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں اور شام کو کہتے ہیں کہ: ''صاحب! بڑے میاں کی حکمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ صبح سے شام تک نگرانی فرمائی۔ حالانکہ بڑے میاں نے کیا کیا بیٹھے ہی تو رہے۔ کوئی حرکت تو نہیں کی''۔

مگر بڑی تحسین کرتے ہیں کہ بڑے میاں کی ہمت ایسی، تو بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کیجاتی ہے۔ عمل کا بار کم کر دیا گیا۔ وہ پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال، وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی کہ ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور دس کے بعد سات سو تک۔ اور: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ.﴾ ''اور اللہ جتنا چاہے اجر بڑھا دے''۔ غرض اجر اور بڑھا دیا تحسین بڑھا دی مگر عمل کا بار گھٹا دیا ہے، اس لئے کہ امّت بوڑھی ہو چکی تھی۔ تو عمل کا بار بہت کم اور اجر بہت ہی زیادہ۔

تکمیلِ دین...... بہر حال مطلب یہ کہ درجہ بدرجہ عالم بشریت نے ترقی کی تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ابتداء ہوئی اور یہ انتہا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی۔ اس وقت توقعات تھیں کہ امتیں بڑھیں گی اور اس دور میں آ کر وہ توقعات عملی شکلوں میں آ گئیں کہ امت کامل ہوگئی۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.﴾ ① دین کامل کر دیا گیا۔ بلحاظِ عقائد کے بھی، بلحاظِ اخلاق کے بھی، بلحاظِ اعمال کے بھی اور بلحاظِ احوال وسُنن کے بھی۔ تو ہر حیثیت سے اس امت کی تکمیل کی گئی۔ یوں دین کامل ہوا۔

انتہاء زیادہ خوشی کی چیز...... تو میں شروع میں عرض کر رہا تھا کہ: یہ امت تکمیل پسند ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر تکمیل پسندی کا جذبہ ہے، اس لئے اس کو ابتداء سے زیادہ انتہا پر خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت تکمیل کا ہوتا ہے۔ گو ابتدا اور انتہا دونوں ہی خوشی کی چیزیں ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت مٹھائی بانٹتے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب انتقال ہو تو انتہائی خوشی کریں کہ بھائی! آج تکمیل ہوگئی! گویا کتنا خوشی کا وقت ہے۔ مگر آپ کہیں گے اس وقت تو کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ سارے بیٹھ کر روتے ہیں۔ لیکن چونکہ تکمیل کو پہنچ گیا تو خوش ہونا چاہئے۔

---

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٦.

میں کہتا ہوں کہ: موت پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ انتقال پر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ موت اگر اچھی ہوتی تو سب کہا کرتے ہیں کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت کوئی رونے کی ایسی چیز ہوتی تو یہ دعائیں کیوں کرتے کہ ایسی موت ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔ اللہ کے راستے میں کوئی شہید ہوا۔ کہتے ہیں بڑے رتبے کی چیز ہے۔ اللہ ہمیں بھی ایسی موت نصیب کرے۔ معلوم ہوا موت غم کی چیز نہیں۔ موت تو خوشی کی چیز ہے۔ غم اپنے عزیز کی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا عزیز جدا ہو گیا۔ اس کے فیض سے محروم ہو گئے۔ اس کے انتقال کا صدمہ نہیں ہوتا، انتقال سے تو وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی صدمہ کی چیز ہے، ایک آدمی خدا سے جا ملا، یہ کون سی رونے کی بات ہے، یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ عمر جس کام کے لئے رکھی گئی تھی آج وہ کام پورا ہو گیا کہ وہ اللہ تک پہنچ گیا۔

اس بات کو حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ. ① سب سے بڑا تحفہ مومن کے لئے موت ہے۔ اور کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ: اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يَصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ. ②

موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے، تو محبوب سے کسی عاشق کا مل جانا، یہ غم کی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے۔ آپ روتے ہیں اس لئے کہ ایک عزیز جدا ہو گیا۔ تو جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ چونکہ ایک وقت میں دو چیزیں ہیں تو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ موت پہ رو رہے ہیں۔ موت پر کوئی نہیں روتا وہ تو تحفہ ہے۔

تمنائے اِنتہاء...... یہی وجہ ہے کہ موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے۔ جتنے اولیاء ہیں وہ موت کی تمنا رکھتے ہیں۔ فُساق و فجار موت سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امیدیں سامنے نہیں آ رہیں۔ اولیاء کرام اور ربانی لوگ وہ تمنا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں برویم تا در میکدہ شاداں و غزل خواں برویم

کون سی مبارک گھڑی ہو گی جو اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑیں گے اور اس شہر مطلوب میں ہم پہنچیں گے جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے۔

تو موت کی تمنا علامت ولایت ہے اس لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ. ③ ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو''۔ جس حدیث میں موت کی تمنا سے ممانعت کی گئی ہے۔ وہ اس لئے کہ دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اللہ کی ملاقات کے شوق میں جو تمنا مطلوب ہے، اس کا حکم دیا گیا ہے:

یوم تکمیل کا انتخاب...... اس امت کے مزاج میں چونکہ تکمیل پسندی ہے۔ تو سید الایام کے انتخاب میں امم کے

---

② تخریج گذر چکی ہے۔ ③ تخریج گذر چکی ہے۔ ① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۳ ص: ۴۷۸. علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۳۰۹.

امتحان کے وقت اس امت نے اپنی عبادت کے لئے یوم تکمیل خلائق یعنی جمعہ کو پسند کیا۔ یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو، مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں جو منتخب دن تھا وہ یوم جمعہ تھا جو یوم تکمیل ہے اور وہ اس امت مسلمہ نے پسند کیا: حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے نظام بنا دیا گیا تھا، گھر بار سجا دیا گیا تھا۔ ضرورت مہیا کر دی گئیں تھیں، کھانا، دانا پانی غذا وغیرہ سب چیزیں زمین میں پھیلا دی گئی تھیں۔ اخیر میں مہمان کو لایا گیا۔ اور اسی پر تخلیق کی تکمیل ہوگئی۔ غرض اس امت نے یوم تکمیل کو پسند کیا۔ اس لئے کہ تکمیل پسند تھی تو دن بھی وہ اختیار کیا جس میں کمال تھا۔

ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز...... بہر حال بات دور جاتی ہے، تو ابتدا بھی خوشی کی چیز اور انتہاء بھی خوشی کی چیز۔ تو بحمد اللہ ہمارے عزیز محمد ازہر نے قرآن کریم ختم کیا تو یہ یوم تکمیل ہے، جس وقت یہ شروع کر رہے تھے تو اساتذہ کرام نے ماں باپ نے امیدیں باندھی تھیں کہ انشاء اللہ حافظ ہوگا۔ توقع ہے کہ وہ حافظ ہو جائے۔ آج وہ توقع پوری ہوگئی۔ یہ انتہائی خوشی کا دن ہے۔

بہر حال آج یہ تقریب ہے اور تقریب خوشی کی ہے اور خوشی بھی تکمیل کی ہے آغاز اور ابتداء کی نہیں بلکہ حدِ کمال پر پہنچ جانے کی ہے۔ تو ان کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ نہیں حافظ جید بنائے اور قاری مجود بنائے۔ عالم باعمل بنائے، صاحب اخلاق وصی ونقی وتقی بنائے اور وہ ساری امیدیں پوری ہوں جو ماں باپ اور اساتذہ کرام نے باندھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان چیزوں کو بھی اسی طرح سے مکمل فرمادے جس طرح سے قرآن شریف کے حفظ کو آج انہوں نے مکمل کر دیا۔

آج اس کے الفاظ ان کے سینے میں جمع ہوگئے، کل کو اِنشاء اللہ اس کے معانی جمع ہوں گے، معانی کے بعد اس کے حقائق جمع ہوں گے، حقائق کے بعد ان کی علل آئیں گی، علل کے بعد پھر اسرار و مصالح اور حکم بھی منکشف ہوں گی۔ تو اس طرح علم بڑھے گا۔ غرض ایک درجہ میں یہ آغاز ہے یعنی معانی سمجھنے کے لئے اور ایک درجے میں یہ تکمیل ہے یعنی الفاظ کے حفظ کی۔

عُلوم وشخصیات کے مَراتِب...... تو الفاظ سینے میں آگئے اور قرآن کریم دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے نہ محض الفاظ کا نام قرآن ہے اور نہ محض معانی کا نام۔ بلکہ الفاظ مع المعانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس میں الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور معانی سمجھے جاتے ہیں، تو ایک میں قوت حافظہ کام کرتی ہے، ایک میں قوت عاقلہ کام کرتی ہے، تو قوت حافظہ کا کام یہ ہے کہ الفاظ بعینہ اپنے اندر محفوظ کرلے اور قوت عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کے اندر سے معانی نکالے اور معانی کے بھی اندر سے معانی نکالے۔ اس لئے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے۔ معانی در معانی اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

حرف حرفش راچند در معنی   معنی در معنی در معنی

ابتدا میں ایک لفظ ہے جو قشر کی مانند ہے اور مغز اس کے معنی ہیں۔ پھر معنی بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معنی ہیں، پھر وہ بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معانی ہیں۔ غرض جیسے علوم کے مراتب ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ نے شخصیات کے بھی مراتب قائم کئے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ الفاظ کے فقط مدلول کو سمجھ لیتا ہے وہ بھی اونچے درجے کا آدمی ہے، ایک یہ کہ مدلول سے آگے بڑھ کر وہ حقائق تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سے اونچا عالم ہے، اور ایک وہ ہے کہ حقائق کے بعد علل واسرار کو بھی سمجھتا ہے وہ اور بھی اونچے درجے کا عالم ہے تو جیسے آیات قرآنیہ میں مراتب ہیں ایسے ہی شخصیات میں بھی مراتب ہیں، ایک لفظوں کا عالم، ایک معانی کا عالم، ایک علل واسرار کا عالم، پھر سینکڑوں قرآن کریم کے علوم ہیں جن کا آدمی عالم بنتا ہے۔

غرض یہ ایک خوشی کا دن ہے۔ کہ ہمارے ایک عزیز کے قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد حفظ معنی کا درجہ شروع ہوگا۔ اب ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معانی کا عالم بھی بنائے۔ پھر یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر نفسِ مزکی بھی پیدا کرے تا کہ حقائق اور علوم ومعارف ان پر کھلیں۔

تبریک...... بہرحال اس خوشی کے موقع پر میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی خدمت میں ان کے والدین اور ان کے اساتذہ کرام کی خدمت میں ''مبارک باد'' پیش کرتا ہوں۔

حسن طلب نہیں بیانِ واقعہ...... مگر بھئی! ہمارے ہاں تو یہ دستور ہے کہ جب مبارک باد ہوتی ہے تو منہ میٹھا ضرور کراتے ہیں۔ فقط چائے پہ ٹرخا دینا یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میٹھے منہ سے جو دعا نکلتی ہے اس میں چپک زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ منہ میٹھا کرایا جائے تا کہ دعا جا کے اچھی طرح چپکے۔ اور یہ حسن طلب نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کہنے سے ایسا کریں۔ بلکہ یہ دستور ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے وہ اس کا درجہ ہے۔ بہرحال ہمارا کام تو یہ ہے کہ جب حاضری ہوئی تو مبارک پیش کریں اور خوشی کا اظہار کریں۔ حق تعالیٰ شانہ۔ ان جیسے اور بھی حفاظ اس مدرسے سے پیدا کرے۔

حُسنِ نیّت کے ثمرات...... ہمارے بھائی مولانا (محمد یوسف) بنوری مرحوم، جس خلوص سے انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور جس ضبط ونظم اور منظم طریق پر اسے چلایا اور بہترین قواعد واصول بنائے یہ حقیقت میں ان کی نیت کے ثمرات ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ بلڈنگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ نظم بنا ہوا ہے علماء وطلباء جمع ہیں، درس وتدریس بھی ہے۔ ایک مخلص پیدا ہوتو ہزاروں اس سے بن جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں نبی ایک ہی ذات آتی ہے۔ مگر لاکھوں لوگ ایمان سے رنگے جاتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ اس امت میں شخصیات پیدا فرماتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ذریعے سے آگے شخصیتیں بنتی ہیں۔ بہرحال یہ مولانا مرحوم کی نیت کے ثمرات ہیں۔

اَخلافِ صدق کا وعدہ...... جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اسی طرح سے شخصیات کے بھی پیدا کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ حدیث میں اس کا وعدہ موجود ہے۔ یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ

خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ. ① سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ سلف کا علم حاصل کرتے رہیں گے۔ غرض شخصیات کے پیدا ہونے کا وعدہ دیا گیا۔ یہ ناممکن ہے کہ نہ ہوں۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب! زمانہ خراب آ گیا۔ اب خلف صحیح پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ: علی الاطلاق یہ غلط ہے۔ بے شک خلف ویسے نہیں جیسے سلف ہیں، تو نوعیت قائم رہے گی۔ کبھی مٹنے والی نہیں۔ علماء کے بعد علماء حفاظ کے بعد حفاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔

چناں چہ حدیث میں فرمایا گیا: خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ② بہترین دور میرا دور ہے، جو صحابہؓ کا دور ہے۔ پھر تابعین ہیں۔ پھر تبع تابعین ہیں تو جو مقام صحابہؓ کا ہے وہ تابعین کا نہیں۔ جو تابعین کا ہے وہ تبع تابعین کا نہیں۔ یہ شخصیات میں درجات اور فرق مراتب کا قصہ ہے۔ لیکن نوعیت قیامت تک یکساں رہے گی۔ جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا: ''میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلا قطرہ زیادہ نافع ثابت ہوا کہ بعد کا قطرہ۔ بارش ہے۔ اول و آخر قطرات پڑ رہے ہیں، زمین سیراب ہو رہی ہے۔ غرض امت میں خیر باقی رہے گی۔ فرق مراتب ہوتا رہے گا۔ اس سے خیر کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت اور شخصیات کے ذریعے سے معیار قائم کرایا۔ ان کے ذریعے حق کی راہیں نظر آئیں گی۔

اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ: اگر اہلِ حق میں اختلاف ہو جائے۔ تو اختلاف اس کا عذر نہیں کہ حق کو چھوڑ دیا جائے۔ جد و جہد ختم کر دی جائے۔ اگر آپ خدانخواستہ بیمار ہو جائیں اور اطباء کی رائے میں اختلاف ہو جائے تو کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو انتقال کرتے ہیں اور قبر میں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اطباء میں اختلاف ہے۔ آپ منتخب کرتے ہیں۔ خواہ اس لحاظ سے کہ یہ طبیب فلاں طبیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے یا اس معیار سے کہ لوگ اس کے یہاں زیادہ شفایاب ہوتے ہیں یا اس لحاظ سے کہ ان کے خاندان میں جدی طور پر طب چلی آ رہی ہے اس کو طب سے زیادہ مناسبت ہے، کوئی نہ کوئی معیار لے کر آپ انتخاب کریں گے یہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے کہ اطباء میں اختلاف ہے لہٰذا انتقال فرما جانا چاہئے۔ لہٰذا قبر کو آباد کرنا چاہئے۔ غرض جسمانی صحت اور اطباء کے بارے میں ان کے اختلاف سے آپ گھبراتے نہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ تو علماء میں اگر اختلاف ہو تو آپ کیوں انتخاب نہیں کریں گے؟ وہاں کیوں یہ فیصلہ کریں گے کہ چونکہ علماء اختلاف کر رہے ہیں لہٰذا دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہاں بھی انتخاب کرنا چاہئے۔

معیارِ انتخاب...... اب انتخاب کا معیار الگ ہے۔ اصل چیز آپ کی طلب صادق ہے۔ جس عالم کی دیانت پر آپ کو اعتماد و اطمینان ہو۔ دین اس کے سپرد کریں اور اس سے پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔ آپ کو حکم کس نے بنایا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو آپ ثالث بنیں کہ جب ان کا اختلاف ختم ہو تو میرا دین سنبھلے گا۔ تو نہ اختلاف رفع ہو گا نہ

---

① السنن الکبریٰ للبیھقی، ج: ۱۰ ص: ۲۰۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۸۱.

آپ کا دین سنبھلے گا۔ان لڑنے والوں میں اوراختلاف کرنے والوں میں جس فرد یا جس جماعت اور طبقہ پر آپ کا دل مطمئن ہو۔اس کی طرف آپ رجوع کریں اوراس سے آپ آنکھ بند کرلیں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

عوام کے لئے حجت...... میں تو ایک مختصر بات کرتا ہوں کہ عالم کے لئے تو کتاب وسنت حجت ہے ان میں وہ مسائل تلاش کریں۔عوام کے لئے حجت خود وہ عالم ہے۔عوام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن وحدیث کو سمجھیں۔انہیں تعلیم نہیں اسے کیا سمجھیں گے؟ عوام کا کام یہ ہے کہ عالم ربانی جوفتوی دیں اس پر عمل کریں۔اور مان لیجئے کہ کسی نے غلط فتویٰ دیا۔آپ کی ذمہ داری نہیں،آپ کے لئے نجات ہے،اس عالم کی گردن نپے گی کہ اس نے کیوں غلط فتوی دیا؟ ﴿مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَاِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتٰی وَقَالَ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ﴾ (1) حدیث میں ہے کہ جس نے غلط فتویٰ دیا تو مفتی کو پکڑا جائے گا عمل کرنے والے کو نہیں پکڑا جائے گا، اس نے دیانت داری سے عمل کیا،تو آپ اپنی جدوجہد صرف کریں، ان اختلاف کرنے والوں میں کون سا طبقہ ہے،کون سا فرد ہے جو واقعی متدین ہے،اس کا ظاہر وباطن یکساں ہے۔آپ دین کے بارے میں اس سے مدد لیں۔ علماء میں اختلاف ہے وہ ان پر چھوڑ دیں آپ کوئی حکم نہیں ہیں کہ بیٹھ کر فیصلہ دیں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے آپ میں اس کی سکت اوراستطاعت نہیں ہے۔ان میں فیصلہ کا حکم وہ بنے گا جو ان دونوں عالموں سے بڑھ کر عالم ہو۔وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ صحیح کہتا ہے یہ غلط،آپ الف سے ب نہیں جانتے اور علماء کے اندر فیصلہ کرنے کے لئے چلے۔

تو آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ آپ کا کام اطمینان کے بعد انتخاب ہے اس سے سن کر اپنا دین چلائیں،فتوی اور مسئلہ پوچھنے کے ذریعے اپنا دین سنبھالیں۔جب دین اور علم آگیا اب آپ ذمہ دار ہیں جس راستے پر آپ چلیں گے۔دیانت سے چلیں گے۔اس لئے بڑی خرابی یہ ہے کہ اختلافات کو دیکھ کر لوگ اس فکر میں ہیں کہ دین کو چھوڑ دیا جائے کہ صاحب! ہم کہاں جائیں؟ سوال یہ ہے کہ جب بیمار ہوتے ہو تو اطباء میں اختلاف ہو جائے تو کہاں جایا کرتے ہو؟ کیا قبر میں جایا کرتے ہو؟ ان میں سے کسی کو حکم اور منتخب کرتے ہیں، یہاں کیوں نہیں انتخاب کر لیتے؟ دین کے بارے میں خود مفتی بننے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔

اِتحادِعلماء کی ضرورت...... اس واسطے علماء کے حق میں تو یہی عرض کیا جائے گا کہ وہ آپس میں اتحاد کریں۔کوئی بھی قدر مشترک لے لیں۔مگر اتفاق کریں۔اپنی ذاتی خصوصیات اپنے گھر میں رکھیں۔خود عمل کریں اور جو آپ کے زیر اثر ہے،اس سے عمل کرائیں،لیکن جو قدر مشترک ہے۔اس میں متفق ہو کر سامنے آؤ۔دشمنانِ اسلام بہت ہیں،اعداء اللہ بہت ہیں جو رات دن دین پر حملہ آور ہیں اور استیصال کی فکر میں ہیں۔آپ ان کے مقابلے میں کیوں نہیں آتے۔تمام تر جدوجہد آپس کی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔غرض آپس میں کسی بھی قدرِ مشترک پر اتفاق کر کے سامنے آؤ۔مثلاً اللہ واحد، رسول صلی اللہ علیہ وسلم واحد کتاب اللہ واحد۔اب اگر کسی میں مفہوم کا

---

(1) السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا ج:۱۰ ص:۷۱.

اختلاف ہے تو ہوتا رہے۔ آپ اپنی دینی زندگی کی فکر کریں۔

طلبِ صَادِق...... بہر حال علماء میں اتفاق کرانے یا علماء میں اتفاق ہو جانے کے انتظار میں آپ اپنی دینی زندگی کے بارے میں بے فکر نہ ہوں۔ طلبِ صادق سے آپ کو با اعتاد علماء مل جائیں گے۔ آج بھی ایسا نہیں کہ دنیا میں علماء ربانی آپ کو نہ ملیں۔ اگر چہ وہ تھوڑے ہیں مگر ضرور موجود ہیں۔ ان کا دامن پکڑ پکڑ کر پوچھ پوچھ کر اتباع کرتے چلے جائیں۔ آپ کی اپنی زندگی سنورتی چلی جائے گی۔ غرض علماء کے اختلاف کو دین سے بیزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انتخاب کا طریق اپنایا جائے۔ یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عمل مرحمت فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنا نصیب فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

(کتبہ، ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تاریخ اسلام کی ایک زندہ جاوید شخصیت

آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا وعقبیٰ دونوں کے اکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ،)

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحین امت کے تعارف کے لئے ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق براڈ کاسٹ ہوئی، نذر قارئین ہے۔

موضوع تقریر...... میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دار العلوم دیوبند ہے۔

حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سن ۱۲۴۸ھ، بمطابق سن ۱۸۳۲ء میں اور وفات سن ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدت میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلے میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے، جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انگریزی اقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست...... سن ۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی لیکن جنگ میں شکست ہوگئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا، اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساس کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنریوں نے عیسائی اقتدار کے زیر سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا عطیہ اور امانت ہے، اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اتہامات کی بوچھاڑ بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد و دہریت کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل ونہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ

آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب وکلچر سے بیگانہ محض ہوکر رہ جائیں گی۔

مذہبی انقلاب کی ضرورت...... حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے نور معرفت سے وقت کی رفتار اوراس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشارات غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطہ نظر پرڈال دینے اور قوم میں ایک مذہبی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تاکہ یہ احساس کمتری دور ہو۔اس کے لئے آپ نے تعلیم وتربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرراور رسمی سیاست سے دور تھا۔

چناں چہ سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ایمانی فراست سے چھینے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریت فکر کے بقاء وارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد سن ۱۲۸۳ ہجر بمطابق سن ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر با آسانی حاصل کرلیا۔اس الہامی نقطہ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریت فکراور استقلال وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتب فکراور عظیم تحریک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانے پر مدارس قائم فرمانا شروع کیے اور بنفس نفیس خود جا کر مرادآباد، گلاوٹھی، امروہہ، مظفرنگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جابجا اپنے متوسلین کو زبانی اور خطوط کے ذریعے قیام مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چناں چہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں قائم ہوگئے۔

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی......اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے حریتِ فکر کے امین فضلاء نے پورے ملک میں حتیٰ کے انہی فضلاء نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرز فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے۔ عالمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے، جس کیلئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صاحب دل علماء اور صداقت شعار رفقاء کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔یہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتب فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت وعظمت کی حامل ہے۔

مدارسِ عربیہ کی معنوی بُنیاد...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روز اول سے یہ درسگاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اصول اپنے دست مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دور میں بانی دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری پوری حفاظت ورعایت کی جاتی رہی ہے۔یہ اصول درحقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیاد ہیں، جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی۔

اور نہ صرف دارالعلوم ہی بلکہ ان تمام مدارس عربیہ کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوران کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چناں چہ ان اصول ہشت گانہ پر حضرت اقدس نے سرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ:''وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں''۔

یہی ہمہ گیر اصول قیام مدارس کی اس اجتماعی تحریک کی بنیاد بنے جس سے سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشاۃ ثانیہ ملی۔ ان اصول کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندہ پر قائم فرمایا تا کہ اس میں ابتدا ہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو۔ ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے پر امدادِ غیبی منقطع ہو جائے گی۔ رجوع اِلی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جس کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنی طویل نظم کے بعض اشعار میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا کہ:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے	کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ	یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائے گا

ان اصولوں میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد رہے جو کہ اجتماعیت کی روح ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اصولاً معاملات دارالعلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرما کر اس کو عہد استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنا دیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقررہ اہل شوریٰ کے ایسے واردین، صادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہ اور ان سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی فکر کے ناقابل انکار شواہد ہیں اور انہیں سے دارالعلوم دیوبند کی نوعیت، واہمیت بھی واشگاف ہو جاتی ہے۔

خلافتِ ترکی کی تائید..... انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ہمہ گیر سیاسی راہنمائی سے اس دور کی خلافت اسلامیہ یعنی خلافت ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا۔ سلطان ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کو ان کی طرف مائل کرتے رہے اور اس دور میں جنگ روم و روس ہوئی تو خود بہ نفسِ نفیس دورے کر کے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر کا تقریباً بڑا سامان بطورِ چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرمایا تا کہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بندر ہے۔

اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ جب مسلمانانِ ہند نے احیاءِ خلافت کی تحریک شروع کی تو بلا تفریق مذہب وملت ملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق ومتحد ہو کر اس میں برابر کی

شریک رہیں۔اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذاتِ خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تا کہ مشرق ومغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اوران کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو اور ساتھ ہی ترکی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔

فکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی عناصر...... یہ تفصیل فکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے ان تین بنیادی عناصر کو واشگاف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملت کی بقاء وارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری، ذوقِ اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اوران کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ قاسمی فکر کے امین بنے اوران کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حلف الرشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ اس کے علمی امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ریشمی خطوط کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔ان کے بعد ان کے ہزار ہا شاگردوں میں بھی یہی رنگ جو ہر نفس ہوتا رہا۔

جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری وغیرہ تھے (رحمہم اللہ اجمعین) جنہوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا اورانجام کار ان بزرگوں کا وہ وحدتِ عالمِ اسلام کا خواب اب تعبیر کے قریب ہوتا جارہا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دورۂ یورپ کی تمنا...... آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ میں پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو۔بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا وعقبیٰ دونوں کے اِکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

مباحثہ شاہجہاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہندو،مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دور کے ہندو زعماء نے یہ کہہ کر کیا کہ: ''یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی''۔یہ روشن حقائق ان عظیم حقیقت کو طشت از بام کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اوران کے شیخ ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کا یہ قول کہ: ''کئی صدیوں کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے''ان کی عظمت واہمیت کے باب میں بلا خوف تردید حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔

افادات علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حَامِدًا لِّلّٰهِ الْعَظِيْمِ وَمُصَلِّيًا عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بعد

اَحوالِ واقعی...... اس مجلس کا موضوع مذاکرہ تھا۔ کوئی تقریر اور وعظ نہیں ہے۔ جیسا کہ بمبئی میں بھی یہی صورت ہوتی ہے کہ عشاء کے بعد کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں، اس میں جس نے کوئی سوال یا شبہ پیش کیا تو جو اپنے علم میں ہوا وہ عرض کر دیا گیا۔ وہی موضوع اس مجلس کا بھی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مختلف لوگ مختلف باتوں کے سوالات کریں، بعض حضرات نے کچھ سوالات مجھے لکھ کر دیئے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ اور یہ سوالات اکثر غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور علماءِ دیوبند...... پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ علماء دیوبند، اولیا اللہ اور بزرگان دین کی قبروں اور مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ و دعا کو منع کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کذب محض اور بالکل جھوٹ ہے اور افتراء باندھا جاتا ہے۔ علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ اولیاء اللہ اہل اللہ کی قبروں پر جانا انتہائی برکت کا ذریعہ ہے، فیض کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور علماء دیوبند کے ہاں خود بیعت وارشاد کا سلسلہ ہے، ہم لوگ ویسے تو چشتی کہلاتے ہیں، لیکن چاروں خاندانوں میں ہمارے بزرگ ریاضتیں بھی کرواتے ہیں اور اجازت بھی دیتے ہیں یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ ہمارے دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندی تھے اور ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس کے موقع پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ دار العلوم کے مفتی اعظم تھے۔

تو ایک سلسلہ مین ہمارے ہاں نقشبندیت کا ہے۔ دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ نقشبندیہ ہیں اور عامہ دیوبند کے بزرگ جیسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ سب چشتی ہیں۔ ہمارا سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت صابر

کلیری رحمۃ اللہ علیہ، ان بزرگوں سے ہوتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، یہ حضرات تقریباً سلسلہ کے جس قدر اولیاء اور بزرگ ہیں ان کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے اور استفاضہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند اکثر و بیشتر سال میں کلیر شریف حاضر ہوتے اور اس انداز سے کہ میرے خیال میں آج بھی کوئی بزرگوں کا معتقد شاید اس انداز سے نہ جاتا ہو۔ رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ کا مزار ہے اور نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نہر کے کنارے پٹڑی پر پہنچ کر جوتے اتار لیتے تھے۔ چھ میل ننگے پیر طے کرتے تھے اور وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز کے بعد روضہ میں داخل ہوتے۔ پوری رات مزار پر گزارتے تھے۔ اس میں ریاضتیں، مجاہدہ اور استفاضہ وحصول فیض کرنا اور صبح کی نماز کے لئے وہاں سے نکلتے تھے۔۔ بہرحال یہ کہنا انتہائی غلط بیانی اور افتراء پردازی ہے کہ علماء دیوبند اولیاء اللہ کو نہیں مانتے اگر نہ مانتے تو ان کے سلسلے میں کیوں داخل ہوتے؟ بیعت وارشاد کا سلسلہ کیوں قائم کرتے؟ اگر مزارات کی حاضری پر جانے کو وہ ناجائز سمجھتے تو خود ننگے پیر اد با مزارات کے لئے کیوں پیدل جاتے؟

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، جس قدر بھی ہندوستان میں سلسلے کے اکابر ہیں سفر کر کے ان مزارات پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ محب اللہ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار الہ آباد میں ہے۔ تو وہاں گئے۔ اس طرح کلیر شریف گئے اور اجمیر شریف الگ گئے۔ اسی طرح خود میں نے بھی ان تمام مزارات کی حاضری بھی دی اور جب موقع ہوتا ہے حاضر ہوتا ہوں۔

چناں چہ ایک بار اجمیر شریف میں حاضر ہوا اور کسی کو اطلاع نہیں دی اور یہ خیال تھا کہ ایصال ثواب کر کے بس دو گھنٹوں کے بعد واپس ہو جاؤں گا جمعہ کا دن تھا جب میں وہاں پہنچا تو مزار پر حاضر ہوا۔ دو، اڑھائی گھنٹے وہاں قیام کیا، اس کے بعد باہر نکلا تو تقریباً جمعہ کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ گاڑی رات کو آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس بناء پر ارادہ تھا، چونکہ یہاں کسی سے خاص کوئی تعارف بھی نہیں۔۔ لیکن جب میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو بعض لوگوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ شاید کسی نے پہچان لیا ہو۔ نماز جمعہ کے بعد ایک جماعت نے آ کر مجھے گھیر لیا اور اس میں دیوان صاحب آگے آگے تھے۔ جو وہاں کے سجادہ نشین ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ''اپنوں سے یہ اجنبیت کیوں؟ کہ نہ کوئی اطلاع ہے نہ خبر ہے اور چپکے چپکے آنا اور آ کر چلے جانا۔ آخر ہم لوگوں سے یہ اجنبیت کیوں برتی گئی؟''۔

میں نے عرض کیا کہ: میں نیاز مندانہ اور خادمانہ حاضر ہوا تھا اور خادم اعلان کر کے نہیں آیا کرتے، نیاز مند اطلاعیں دے کر نہیں آتے، حاضر ہونا ان کا فرض ہے۔ تو میں اطلاع دے کر کیسے آپ حضرات کو تکلیف دیتا۔ نیاز مندانہ حاضر ہوا ہوں ہزاروں یہاں خدام آتے ہیں۔ ایک خادم اور آ گیا۔ اس میں اطلاع کی ضرورت نہیں تھی،

بہرحال انہوں نے اصرار کر کے ٹھہرا دیا۔

مجھے رات کو واپس ہونا تھا۔ ریزرویشن بھی ہوا ہوا تھا۔ اس لئے سب کو منسوخ کروایا۔ میں نے کہا: مجھے دہلی لازمی پہنچنا ہے۔ وہاں جلسہ کا پروگرام ہے۔ تو انہوں نے فون اٹھا کر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ) سے بات کی کہ آپ چاہے جلسہ کریں نہ کریں مگر اسے نہیں آنے دیں گے۔ چناں چہ انہوں نے روک لیا۔

پھر خانقاہ میں وہیں تقریر کا اعلان کیا۔ چناں چہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل پر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر بھی کی۔ اگر علماء دیوبند بزرگوں کے مزارات پر جانے سے روکتے، تو مجھے کیوں جانے کی توفیق ہوتی اور ہمارے بزرگوں کو کیوں توفیق ہوتی؟

مانعین زیارت قبور سے جنگ...... ہم لوگوں کی ان لوگوں سے جنگ تھی اور ہے جو واقعہ میں مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور محض تعصباً جنگ نہیں تھی بلکہ دلائل سے جنگ ہے اور حدیث کی رو سے جنگ ہے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اوّل مطلقاً فرمایا۔ **کنت نَهَیْتُکُمْ عن زِیارۃ القبور. فزوروھا فان فیھا عبرۃ.** ① ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا لیکن اب میں اجازت دیتا ہوں۔ قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہاں جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور آدمی کے سامنے خود اس کی موت آ جاتی ہے جس سے طاعت اور عبادت کی طرف جھکتا ہے''۔

غرض فرمایا کہ پہلے روکتا تھا اب اجازت دیتا ہوں۔ گویا ممانعت منسوخ ہوگئی اور اجازت ثابت ہوگئی۔ غرض اول تو اس حدیث کی رو سے حق ہے اور ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ قبور پر جائے اور آخرت کی یاد تازہ کرے۔

زیارت قبور کے لئے سفر...... دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قبر کو مستقل مقصد سفر بنا کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کہتی ہے کہ ناجائز ہے۔ ہمارے بزرگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ مستقلاً اگر زیارت قبور ہی کے لئے سفر کیا جائے تو جائز ہے۔ بحث اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ، مَسْجِدِ الْاَقْصٰی، وَ مَسْجِدِیْ هٰذَا.** ② ''سفر جائز نہیں ہے مگر تین مساجد کی طرف۔ ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف، ایک مسجد اقصیٰ یعنی شام میں بیت المقدس اور ایک میری مسجد۔ یعنی مسجد نبوی''۔ (**عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِیَّةٍ وَّ سَلَامٍ**)

اس سے بعض لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ علماء دیوبند یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں کو مقصد بنا کر سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کی قید ہے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر جائز نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو ان مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔

---

① السنن لابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی زیارۃ القبور ج:۵ ص:۴۵.

② السنن للترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی ایّ المساجد افضل، ج:۲، ص:۴۸.

ان تینوں کو کیوں جائز رکھا گیا؟ اس لئے کہ ان تین مساجد کی جو خصوصیت ہے وہ عالم میں کسی مسجد کی نہیں۔ بیت اللہ شریف کی تو یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز اس میں پڑھی جائے تو دس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ بقیہ اللہ کی سب مسجدیں برابر ہیں اور محترم ہیں۔ خصوصیت سے کسی مسجد کو مقصد بنا کر جانا، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس میں کوئی خاص ثواب ہے۔ حالانکہ کوئی خاص ثواب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کوئی معاملہ کریں کہ گویا ہم زیادہ ثواب سمجھتے ہیں جہاں بھی جائیں گے نماز برابر ہوگی اور اجر ملے گا۔

تو جو لوگ قبروں کا سفر ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: اس حدیث میں استثناء منقطع ہے۔ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر جائز نہیں، مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔ گویا مسجدوں کی طرف سفر کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان تین مسجدوں کی اجازت ہے۔ بقیہ کی نہیں اس واسطے کہ مسجد کا مفہوم عام لے لیں۔ چاہے اس میں قبر ہو چاہے کچھ ہو۔ تو کسی قبر کی طرف بھی جانا جائز نہیں۔ صرف ان تین مسجدوں کی طرف جانا جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں استثناء میں اصل متصل ہے۔ سفر کر کے مساجد کی طرف جانے سے روکا گیا۔ صرف تین مسجدوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اس روایت میں قبروں کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے قبروں کا مسئلہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس حدیث سے قبروں کے سفر کی ممانعت یا قبروں کی طرف سفر کی اجازت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث صرف مساجد کے بارے میں ہے۔

رہا قبروں کا مسئلہ تو اول تو حضور علیہ السلام نے خود فرمایا کہ پہلے تو میں تمہیں روکتا تھا۔ اب اجازت دیتا ہوں۔ اس اجازت میں یہ قید نہیں لگائی کہ اگر شہر میں ہوں تو کر لو اگر باہر ہوں تو مت جاؤ (یعنی کجاوہ کس کر شہر سے باہر مت جاؤ) تو عمومی طور علماء دیوبند اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ قبروں کو مقصد بنا کر اگر سفر کیا جائے تو جا سکتے ہیں۔ گویا یہ حضرات دوسروں سے اس بارے میں لڑتے ہیں کہ دوسرے کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف سفر جائز نہیں اور علماء دیوبند کہتے ہیں کہ جائز ہے، برکات کا موجب ہے اور ان سے استفاضہ ہوتا ہے۔ ایک عام استفاضہ ہے، وہ ہر مسلمان کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہاں پہنچ کر آخرت کی یاد تازہ ہوگی۔ ایک خاص استفاضہ ہے جو اہل حال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ صاحب قبر سے برکات کا اخذ کرنا اور لینا، تو جو لوگ صاحب مراقبہ ہیں یا صاحب کشف ہیں روحانیت سے اخذ کرنا جانتے ہیں۔ اس طریقہ سے واقف ہیں۔ وہ فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

غرض ان حالات میں یہ کہنا کہ: علماء دیوبند قبروں پر جانے سے روکتے ہیں بالکل ایک سفید جھوٹ ہے کوئی اس کی اصلیت نہیں۔ شریعت جب ممانعت نہیں کرتی تو علماء دیوبند کیا چیز ہیں کہ ممانعت کریں۔ وہ تو شریعت کے تابع اور غلام ہیں۔ جو شریعت حکم دے گی کریں گے، جس سے روک دے گی، روکیں گے۔ بہر حال اجازت بھی

دیتے ہیں اوران کا عمل بھی ساتھ ساتھ ہے۔یہ سب حضرات گئے ہیں جاتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں، محض عوام کو اشتعال دلانے کے لئے اس قسم کی افتراء پردازیاں کی جاتی ہیں۔جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی جھوٹ بول دیا جاتا ہے۔تو کوئی اس کی اصلیت نہیں۔

تعظیم جائز اور عبادت ناجائز......ہاں!ایک ہے قبروں پر جا کر بے ادبی سے پیش آنا،اس کو ہم بھی روکتے ہیں اور ساری دنیا روکے گی،قبریں اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ان سے ہم بندگی سیکھیں اور وہی کام کریں جوان اصحاب قبور نے کیا تھا۔حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تھے،انہوں نے خدا کے ٹوٹے ہوئے بندوں کو اللہ سے جوڑا اور کہا کہ صرف اللہ کے آگے جھکو!

ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو سجدہ کریں۔ہم اس کو شرک جانتے ہیں۔ہم اس لئے جاتے ہیں کہ برکات حاصل کریں۔حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنے لئے سجدہ جائز نہیں سمجھا تو اولیاء اللہ اس کو کس طرح سے جائز سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔بعض صحابہؓ حاضر ہوئے اور آتے ہی حضور علیہ السلام کو سجدہ کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:یہ کیا حرکت کی؟انہوں نے عرض کیا،یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!ہم نے قیصر اور کسریٰ کے درباروں کو دیکھا یہ سلاطین اپنی مسندوں پر ہوتے ہیں اور لوگ آکر ان کو سجدہ کرتے ہیں۔جب یہ لوگ سجدے کرائیں تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ہم اس کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''کبھی ایسا مت کرنا،اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔لیکن دنیا میں کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں بجز اللہ کے۔عبادت صرف ایک ذات کی کی جائے گی اور توقیر و تعظیم سب اللہ والوں کی حسب درجہ و مرتبہ کی جائے گی۔تو حضرات انبیاء علیہم السلام جیسی قدسی ذوات ان کے لئے بھی جب سجدہ جائز نہیں ہے تو اولیاء اللہ کے لئے کس طرح جائز ہوگا؟اور عوام تو بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔تو قبروں پر جا کر قبروں کو سجدے کرنا اس کو علماء دیو بند شرک جانتے ہیں۔۔حاضر ہو کر برکات حاصل کرنا،ان اللہ کے بندوں کے نام لے کر اللہ سے دعائیں مانگنا،اس سب کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ عبدیت کے خلاف نہیں بلکہ یہ''عین عبدیت ہے۔

اگر یہ اہل اللہ اور بزرگ دنیا میں موجود ہوتے اور ان کی بارگاہ میں ہم لوگ حاضر ہوتے جب بھی سجدہ نہ کرتے۔اس لئے کہ اگر ہم سجدہ کرتے تو وہ حضرات خود ہمیں اپنی مجلس سے نکال دیتے کہ''میں تمہیں اللہ کے لیے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں یا اپنے لئے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں؟نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم،تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صلحاء کے بارے میں قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ

الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ.﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''کسی بشر کے لئے جائز نہیں، جس بشر کو اللہ نے کتاب دی ہو، علم دیا ہو۔ فضل وکمال دیا ہو۔ کیا جائز نہیں ہے؟ یہ کہ لوگوں سے یوں کہے کہ میرے بندے بنو اور میرے سامنے جھکو''۔

بلکہ اللہ کا بندہ جس میں علم اور حکمت ہوگی، کہے گا کہ اللہ والے بنو، اس کے آگے جھکو، اس کو اپنا رب سمجھو، اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو، صرف اس کے آگے جھکو، یعنی عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں، عبد بننا صرف اللہ کے سامنے جائز ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

اسماء شرکیہ سے احتراز...... اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ. ② ''اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں''۔

کیونکہ اس میں خدا کے سامنے عبدیت اور بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بندے کے نام کے سامنے آدمی عبد لگا دے۔ مثلاً عبدالنبی کہہ دے یا کوئی چیز کہہ دے کہ کسی بندے کا نام لے کر عبد لگا دے وہ جائز نہیں رکھا۔ چاہے اس کے دل میں نہ ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، مگر نام رکھنا بھی جائز نہیں۔ ممنوع قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نام سے شرک کی بو آئے گی۔ توقیر اور تعظیم کا ذکر آئے گا تو انبیاء علیہم السلام کی بھی عظمت کی جائے گی، اولیاء اللہ کی بھی عظمت کی جائے گی، صلحاء مومنین کی بھی عظمت کی جائے گی۔

تعظیم اولیاء کرام...... مومن کا اکرام اور تعظیم شریعت نے فرض قرار دی ہے۔ فرمایا المسلم على المسلم حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ. ③ ''ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ یعنی اس کی جان اور اس کا خون بھی حرام اور اس کی آبرو بھی حرام''۔ نہ خون گرایا جائے نہ آبرو ریزی کی جائے نہ گالم گلوچ کی جائے۔ گویا ہر مسلمان کو باآبرو سمجھا گیا۔ تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ اولیاء کرام ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کی عزت اور حرمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اولیاء سے بڑھ کر حضرات انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے کہ وہ سارے عالم بشریت کا خلاصہ ہیں۔ ان کے حق میں ظاہر بات ہے کہ انتہائی تعظیم فرض قرار دی گئی ہے۔ اگر ذرا توہین ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

غرض ایک تعظیم وتوقیر ہے ایک عبادت ہے۔ اس میں یہ فرق ہے کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے تعظیم اور توقیر بندوں کے لئے ہے۔ پھر جس درجے کے بندے ہوں گے، اسی درجے کی تعظیم کی جائے گی، لیکن جس تعظیم میں عبادت کی بو آنے لگے وہ تعظیم ممنوع ہو جائے گی۔

جزءِ عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں...... فقہاء حنفیہ لکھتے ہیں کہ سلام اتنا جھک کر کرنا کہ رکوع کی سی

---

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹. ② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغیر الاسماء، ج: ۱۳، ص: ۱۱۴. ③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء مایستحب من الاسماء ج: ۱۰ ص: ۴۶.

صورت ہو جائے یہ ناجائز ہے۔ اسی لئے کہ اس میں عبادت کی بو آنے لگی اور اس میں عبدیت اور بندگی کا شبہ پیدا ہو گیا اور عبدیت اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ تو سلام بھی اتنا جھک کر مت کرو کہ رکوع کی شکل ہو۔ کیونکہ رکوع عبادت کا جز ہے۔ رکوع کسی بندے کے آگے جائز نہیں۔

قیام و سجدہ کی ممانعت...... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات جس درجہ عظیم وکریم ہے، اسی درجہ تعظیم کی بھی مستحق ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. ① ''جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ میرے آگے ہاتھ باندھ کے تعظیم سے کھڑے ہوں وہ جہنم میں جا کر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لے''۔

تو اس کی ممانعت فرمائی کہ لوگ میری بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ فرمایا، میں بھی بندہ ہوں، تم بھی بندے ہو، اللہ نے مجھ پر وحی کی یہ عظمت دی۔ اس کی تعظیم کرو، سامنے کھڑے ہو کر قیام کرنا، یہ اصطلاحی عبادت کا ایک جز ہے، اس واسطے شریعت اسلام نے مستقلاً قیام کو روکا۔ غرض انبیاء علیہم السلام دنیا میں موجود ہوں سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر سجدہ کیا جائے وہ خود ناخوش ہو جائیں گے۔ رکوع نہیں کیا جائے گا۔ وہ رکوع کرنے والے کو خود اپنی بارگاہ سے نکال دیں گے۔ ہاتھ باندھ کے قیام نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے دھتکار دیں گے۔

اولیاء اللہ سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے اولیاء اگر یہاں موجود ہوں تو ان کی بارگاہ میں ایسی حرکت جائز نہیں ہو سکتی تو وفات کے بعد کس طرح سے جائز ہو سکتی ہے۔؟

سجدۂ قبر کی ممانعت...... اسی واسطے حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ وَثَنًا يُعْبَدُ. ② ''دیکھو میری قبر کو بت مت بنا لینا کہ اسے سجدہ کرو یا جا کر اس کی پوجا کرو''۔ اس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ قیام دنیا میں بھی سجدہ سے روک دیا۔ جیسا کہ میں نے حدیث بیان کی اور وفات کے بعد بھی روکا کہ میری قبر کو سجدہ گاہ مت بنانا کہ اسے بت بنالو اور اسے سجدہ کرو۔

درود شریف کی عمومیت کی حکمت...... چناں چہ فرمایا صَلُّوْا عَلَیَّ حَيْثُ شِئْتُمْ. ③ ''درود شریف پڑھو، جہاں سے بھی پڑھو گے میرے پاس پہنچ جائے گا''۔ بہر حال ہم یہ دلائل شرعیہ سے سمجھے ہوئے ہیں کہ اولیاء اللہ کی تعظیم جزء ایمان ہے۔ ان کی محبت جزء ایمان ہے، لیکن عبادت حرام ہے چاہے وہ دنیا میں موجود ہوں یا وہ آخرت میں تشریف لے گئے ہوں، نہ ان کی عبادت کی جائے گی نہ ان کی قبروں کی عبادت کی جائے گی۔ ان کی ذات کی

---

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی کراھیة قیام الرجل للرجل ج: ۹ ص: ۴۱۷.

② مؤطا مالک، کتاب النداء للصلوٰة، باب جامع الصلوٰة ج: ۲ ص: ۴۱. (مرسل)

③ مسند ابی یعلی، مسند الحسن بن علی بن ابی طالب، ج: ۱۴ ص: ۲.

تعظیم زندگی میں بھی واجب اور وفات کے بعد بھی واجب۔ اس لئے قبروں پر بے ادبی کے ساتھ جانا یہ بھی بے ادبی ہے۔ ادب کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے اور اسی طرح سمجھ کر کہ گویا وہ حضرات موجود ہیں۔

آدابِ زیارتِ قبور...... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسند ابی حنیفہ میں روایت نقل کی ہے کہ آدابِ زیارت میں سے ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرو اور میت کی طرف منہ کرو اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تمہاری بات سنے گا۔ تو جب یہ تفصیل موجود ہے تو اولیاء وصلحاء کے مزارات پر بے ادبی اور گستاخی کسی طرح جائز نہیں اور اولیاء تو بڑی چیز ہیں، صلحاء مؤمنین کی قبروں کے ساتھ گستاخی جائز نہیں۔

چناں چہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قبر کو تکیہ لگا کر بیٹھنا یہ ممنوع ہے۔ قبر کو پھلانگ کر جانا یہ ممنوع ہے یا ادھر سے جائے یا ادھر سے جائے۔ قبر کے اوپر سے پھلانگ کر جانا یہ صاحب قبر کی بے حرمتی ہے۔ تو جس شریعت نے مؤمنین، صالحین اور اولیاء اللہ کی اتنی توقیر کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی تہذیب سے پیش آؤ۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبروں سے توقیر وتعظیم کا معاملہ کرو۔ تو کون ہے جو ان کی قبروں کی بے ادبی جائز رکھے گا۔؟ کون مسلمان ہے جو کسی درجہ میں بھی اولیاء اللہ کی حیاً ومیتاً گستاخی جائز قرار دے گا؟ علماء دیوبند نہ صرف جانا بلکہ مستقل مقصود سفر بنا کر جانا جائز قرار دیتے ہیں۔

وھابی اہل نجد کا عقیدہ...... البتہ نجد کے لوگ جو خود کو وہابی کہلواتے ہیں۔ وہ ممانعت کرتے ہیں اور بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ وہ روضۂ اقدس کے پاس جانے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ: مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کر کے جاؤ۔ مزارِ اقدس کی نیت کر کے نہ جاؤ۔

زیارتِ روضۂ اطہر کی نیت سے سفر...... تو علماء دیوبند ان کا خلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: جانا ضروری ہے جو شخص بھی حج کو جائے وہ قبر شریف کو مقصد بنا کر مدینہ منورہ حاضر ہو۔ مسجد کی حاضری تو جداگانہ عبادت و طاعت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت سے سفر کرے۔ احادیث میں ایسے عنوانات موجود ہیں۔ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ۔ ① ”جس نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس کے حق میں واجب ہوگئی“۔ بعض روایات میں ہے کہ مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ۔ ② ”جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔“

علماء دیوبند تو فقط زیارت قبر شریف ہی کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ زیارت قبر کے لئے سفر کر کے بھی جانا جائز قرار دیتے ہیں۔ تو جو جماعت اس درجہ آگے بڑھی ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ روکتی ہے سوائے

---

① سنن الدارقطني، كتاب الحج، باب المواقيت ج:٦ ص:٣٧٤. ② علامہ سیوطیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ابن عدی، والدارقطني في "العلل" وابن حبان في "الضعفاء" والخطيب في "رواة مالك" بسند ضعيف جداً عن ابن عمرؓ دیکھئے: الدرر المنتثره في الاحاديث المشتهره، حرف الميم ج:١ ص:١٩.

جھوٹ، اتہام اور افتراء کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

علماء دیوبند کے خلاف بے جا اشتعال......بس میں نے یہ عرض کیا کہ جماعت علماء دیوبند بے ادبیوں کو ناجائز کہتی ہے اور قبر پر جا کر سجدہ کرنا یہ صاحب قبر کی گستاخی ہے۔ اس لئے کہ جس صاحب قبر نے کبھی قبر کو سجدہ نہ کیا ہو اس کی قبر پر جاکے آپ سجدہ کریں، اس کا کتنا دل دکھے گا، جس نبی اور پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر یہ تعلیم دی ہو کہ غیر اللہ کے آگے کبھی سجدہ مت کرنا۔ اس نبی کی قبر پہ جاکے آپ سجدہ کریں تو اس نبی مکرم کے اوپر کیا گزرے گی؟ ان کو اس بندے سے کتنی نفرت پیدا ہوگی۔ جو شرک میں مبتلا ہوا۔ تو بدعات ومنکرات کو روکا جاتا ہے۔ لوگ اس کو اصل کا روکنا قرار دیدیتے ہیں اور یہ محض اشتعال دلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ دوسرے لوگ، لوگوں کو ان منکرات و بدعات کے اندر مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بدعات سے روکتے ہیں تو وہ ہمارے خلاف اشتعال دلانے کو کہتے ہیں کہ: یہ تو قبروں پر ہی جانے سے روکتے ہیں۔ یہ تو اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔ جسے جائز کہتے ہیں وہ الگ ہے، جسے ناجائز کہتے ہیں وہ الگ ہے۔ گستاخی کرنا ناجائز ہے۔ زیارت کرنا عین طاعت ہے۔ زیارت قبور کرنا عین مقصد دین ہے۔

ایصال ثواب کی ممانعت کا الزام......سوال: یہ بھی کہتے ہیں کہ قبروں پر فاتحہ اور درود کو منع کرتے ہیں۔ اگر فاتحہ پڑھنے سے منع کریں تو قبروں پہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر قبروں پر تو فاتحہ ہی پڑھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں ایصال ثواب کریں اور یہ فاتحہ کا عنوان بھی کچھ نیا عنوان ہے۔ ایصال ثواب کے لئے فاتحہ کا لفظ بعد میں لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔ اصل لفظ ایصال ثواب ہے۔ بلکہ ایصال ثواب کے سلسلہ میں جن سورتوں کے تذکرے آتے ہیں ان میں فاتحہ کا ذکر تک بھی نہیں۔ اخلاص، زلزال اور کافرون کا ذکر آتا ہے۔ سورت فاتحہ کا ذکر نہیں۔ نامعلوم فاتحہ کا لفظ کہاں سے استعمال کیا گیا ہے۔ سیدھا جو لفظ شرعی ہے۔ وہ ''ایصال ثواب'' ہے کہ ثواب پہنچاؤ۔ اب اس میں جس کو جو سورت یاد ہو۔ اخلاص (قل ھو اللہ) کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مختصر سورت ہے۔ ایک دفعہ پڑھنے پر۔ ایک تہائی قرآن کا اجر ملتا ہے، اگر تین دفعہ پڑھ لے تو گویا پورے قرآن کا اجر حاصل ہوگیا، گویا پورے قرآن کا ثواب پہنچائے گا۔ اور سورت کافرون کا فرمایا گیا کہ: یہ ربع قرآن یعنی چوتھائی ہے۔ تو قرآن کے چوتھائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اگر کسی نے چار دفعہ یہ سورت پڑھ لی تو گویا پورے قرآن کا ثواب ہوگیا اور وہ پہنچا دیا۔

سورت زلزال کے بارے میں فرمایا گیا کہ: اس کا ثواب نصف قرآن کے برابر ہے۔ تو اگر کسی نے دو دفعہ سورت کو پڑھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پورے قرآن کا ثواب ہوگیا۔ تو ان سورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ تھوڑے سے وقت میں ثواب زیادہ ہوجائے۔ اور جو اس سے زیادہ پڑھے مثلاً سورتِ یٰسین ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کے پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ اگر کوئی باہمت آدمی یہ سورت پڑھ لے تو سبحان اللہ نور علی نور ہے۔ دس قرآن کا ثواب پہنچائے۔ اور اس میں اچھی صورت یہ ہے کہ اگر وقت کم ہو تو قبر کی زیارت کو گھر

سے چلے تو اسی وقت سورتِ یٰسین پڑھنا شروع کر دے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔ وہاں جا کر ثواب پہنچا دے۔ تو یہ جو چند سورتوں کی تخصیص کی گئی۔ یہ اس لئے کہ وقت کم لگے اور ثواب زیادہ ہو۔ ورنہ جو بھی آیات پڑھ کے ثواب پہنچائے گا۔ ہر حرف پر دس نیکی کا وعدہ ہے۔ اگر الم کا لفظ پڑھ کر ثواب پہنچائے تو تیس نیکیوں کا ثواب ہو گیا۔ تو جتنا چاہے ثواب پہنچائے۔ تو یہ کہنا کہ فاتحہ سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل کذب محض، افتراء اور دوسروں پر اتہام ہے۔ اور خدا جانے یہ چیزیں کہاں سے لی گئی ہیں۔ ان حضرات کا نہ یہ عمل ہے نہ یہ عقیدہ ہے۔ تو کسی شخص کے اوپر یا کسی جماعت کے اوپر اس کے عقیدے یا اس کے عمل کے خلاف اس پر تہمت باندھنا، افتراء پردازی سوائے اس کے کہ عوام کو بٹورنے کے لئے یہ حرکت کی جائے۔ اس کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہ ان کا اس میں کوئی فائدہ ہوگا۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر یہ علماء دیو بند جانے لگیں تو ہمارا یہ فائدہ رک جائے گا۔ تو فائدے میں ہم حارج نہیں ہیں۔ تم فائدے اٹھاؤ مگر افتراء پردازی کی کیا ضرورت ہے؟ غرض یہ چیز بالکل غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی...... دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعوذ باللہ یہ کہتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد مٹی میں مل گئے ہیں۔ یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔ یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے معتقدین کا ہے۔ جن کو ''وھابی'' کہا جاتا ہے۔ علماء دیو بند اس عقیدے سے بری ہیں۔

علماء دیو بند کہتے ہیں کہ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بدنوں کو زمین کے اوپر حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ مٹی ان کو نہیں کھا سکتی۔ تو یہ کہنا کہ مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے، بالکل جھوٹ ہے اور علماء دیو بند پر جھوٹ نہیں بلکہ حدیث پر جھوٹ لگانا ہے۔ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ وہی عقیدہ علماء دیو بند کا ہے۔

اور علماء دیو بند صرف یہی نہیں کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مٹی میں بالکل صحیح وسالم محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا بلکہ علماء دیو بند کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اسی طرح سے جسم کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح سے جسم کے ساتھ دنیا میں تھے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ فقط یہ نہیں کہ بدن محفوظ ہے بلکہ بدن میں وہی حیات محفوظ ہے جو حیات دنیا کے اندر محفوظ تھی۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم حی اور زندہ ہیں۔

علامات حیات...... صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَنَبِیُّ اللّٰہِ یُرْزَقُ. ''اللہ کا نبی زندہ ہے اور اس کو رزق دیا جا رہا ہے''۔ تو کھانے پینے کے لئے رزق عطاء کیا جا رہا ہے۔ اب جیسا وہاں کا عالم ہے رزق بھی ویسا ہی ہوگا اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پلاؤ زردہ اور گیہوں کی روٹی ہو۔ جیسے روح پاک اور جسم پاک لطیف ہے۔ تو لطیف ترین غذائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی ہیں وہ پہنچتی ہیں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں فرمایا گیا اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ. [1] ''انبیاء علیہم السلام

[1] مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ، ج:۷، ص:۴۴۷.

اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں''۔تو حیات کے لئے دو چیزیں علامت ہوتی ہیں۔ایک خورد ونوش وہ بھی حدیث سے ثابت ہے اور ایک حرکت وہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

بلکہ اعلیٰ ترین حرکت حرکت عباداتی ثابت ہے۔غرض حیات آج بھی ثابت ہے۔البتہ یہ ہے کہ آثار و افعال کو روک دیا گیا ہے۔کہ وہ جو دعوت وتبلیغ کے لئے جاتے تھے وہ روک دیا گیا۔اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمقمہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کر دیں تو اس کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اس کی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہو گئیں۔وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں تشریف لے گئے،حیات اور روشنی اور فیضان کی وہی نوعیت ہے جو اس عالم میں تھی۔مگر اب عالم قبر میں محدود کر دی گئی اور اس عالم سے منقطع کر دی گئی۔مگر اس کے باوجود ہم اس کے قائل ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں تشریف نہیں لاتے لیکن روحانی فیض جاری ہے۔یہ جو ہمارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان سنبھلا ہوا ہے یہ اسی فیض سے تو سنبھلا ہوا ہے۔اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ادھر توجہ نہ ہو تو ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اور لوگ مومن ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا پرتو پڑ گیا جو ہم مومن کہلانے لگے۔ورنہ اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔وہ جو ایمانی فیض ہے وہ برابر جاری ہے۔غرض یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔(العیاذ باللہ)

یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے ہمارا عقیدہ نہیں۔ہمیں زبردستی اور خواہ مخواہ وہابی اور نجدی بنا دیا۔یہ فقط اشتعال انگیزی ہے اور یہ محض اس لئے کہ چونکہ ہم بدعات کا رد کرتے ہیں تو اس کے جواب میں نجدیوں اور وہابیوں سے نسب نامہ جوڑ دیا،حالانکہ کہاں نجدی وہابی اور کہاں دیوبندی؟۔

غرض یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے کہ مٹی میں مل گئے۔ہم اس کا رد کرتے ہیں کہ یہ غلط عقیدہ ہے۔انبیاء علیہم السلام اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔

استدلال حیات......اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت نہیں بٹتی۔نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَآءِ لَانُوْرِثُ. ① ''انبیاء علیہم السلام وہ گروہ ہیں کہ ہم وراثت میں کسی کو وارث نہیں بناتے''۔اس لئے کہ وراثت مردہ کی بٹا کرتی ہے۔زندہ کی وراثت بٹنے کے کیا معنی؟ جب آپ اسی طرح سے زندہ ہیں تو جو اس وقت آپ کی ملک تھی آج بھی آپ کی ملک ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح جائز نہیں۔اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں تو کسی زندہ کی بیوی سے کس کی مجال ہے کہ نکاح کرے۔بیوہ سے نکاح ہوتا

① الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی نضیر، ج: ۱۲، ص: ۴۲۰.

ہے نہ کہ زندہ خاوند کی بیوی سے۔

غرض جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو آپکے مال میں وراثت نہیں بٹ سکتی۔ یہ دلائل ہیں جو آپ نے حیات انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں جو ان دلائل کے قائل ہوں، ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہنا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہتے کہ قبر میں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ تو یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ عقیدہ کسی کا ہو اور جوڑ دیا کہیں۔ تو جو لوگ اتنی بے تحقیق بات کہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ کس کا عقیدہ ہے اور کس کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا وہ اسی طرح سے اسٹیج پر مسلمانوں کی تربیت کریں گے؟

ہاں یوں کہو کہ فلاں کا عقیدہ ہے اور فلاں کا نہیں ہے۔ ایک لاٹھی سے ہانک دینا یہ تو کذب محض اور افتراء محض ہے اس لئے یہ سوال بھی بالکل بے محل ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

نذر ونیاز یا ایصال ثواب...... ایک یہ سوال کیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ انکے نام کی نذر و نیاز اور ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں۔ یہ بھی وہی بات ہے۔ ایصال ثواب کو تو ہم خود کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ ایصال ثواب کو روکتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم لوگ چشتی ہیں اور چشتیہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب صبح و شام بیٹھ کر اپنے معمولات کو پڑھو کوئی ذکر و شغل کرو یا نفی اثبات کرو۔ تو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کم سے کم تین مرتبہ ''سورۃ اخلاص'' پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ کے تمام بزرگوں کو ثواب پہنچاؤ اور پھر دعا مانگو کہ یا اللہ! ان کے طفیل سے ہمارے قلب میں بھی نورانیت پیدا فرما دے۔ تو جن کے صبح و شام روزانہ کا معمول یہ ہو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ثواب پہنچاتے ہوں اور اولیاء سلسلہ کو بھی۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ: وہ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ ایک بے وجہ کی تہمت لگائی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان سے نفرت دلانے کے لئے جہاں جیسا موقع ہوا ویسا ہی اٹھا کے جھوٹ بول دیا۔ بالکل بے اصل چیز ہے۔ غرض ایصال ثواب کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کے معمولات میں داخل ہے۔ جیسے روزانہ تسبیح وتہلیل معمولات میں ہے۔ خود ہم لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے معمولات شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیران سلسلہ کو ثواب پہنچائے اب آگے رہ گئی نذر و نیاز؟

تو اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ بھائی! مال دے دو اور ثواب پہنچاؤ تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ تو جائز ہے۔ آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلا دیا اور یہ نیت کی کہ اس کا ثواب فلاں فلاں بزرگ کو پہنچے۔ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ وہ پہنچے گا علماء دیوبند بھی اس کے قائل ہیں اور نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا بھی ان کے ہاں معمول ہے۔ تقریباً سال میں ایک دو مرتبہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کر کے کھانا پکایا اور غریبوں میں ایصال ثواب کے لئے تقسیم کر دیا۔

جو صاحب حیثیت ہیں وہ بڑا جانور ذبح کر کے بہت سوں کی دعوت کر دیتے ہیں جو بے چارے کم حیثیت ہیں انہوں نے دو چار پیسے صدقہ کر دیئے۔ بہر حال اگر نذر و نیاز کے معنی یہ ہیں کہ مالی عبادت کا ثواب پہنچاؤ تو اس

میں کوئی حرج نہیں۔ ہم اس کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں اور ہمارا معمول ہے۔

مشرکانہ نذر و نیاز...... ایک نذر و نیاز کے معنی بھینٹ چڑھانا ہے کہ کسی بکرے کو لے جا کر قبر پر باندھ دے یا کسی بزرگ اور فقیر کے نام پر چھوڑ دو اس کو ہم شرک جانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی نذر و نیاز صرف اللہ کے نام کی ہو سکتی ہے۔ صرف اللہ کے نام پر جانور چھوڑا جا سکتا ہے۔ جیسے آپ حج پر جائیں تو "ھدی لے کر جانا یا ھدی کو چھوڑ دینا، یعنی اونٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دینا یہ اللہ کے لئے جائز ہے۔ غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ مشرکین مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے جانور اپنے بزرگوں اور بتوں کے نام پر چھوڑا کرتے تھے۔ ایک کو سائبہ، ایک کو وصیلہ اور ایک کو حام کہتے تھے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

مثلاً جس اونٹنی نے دس دفعہ بچے جن دیئے ہوں۔ جب وہ جن چکی اب اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ جس نے پہلا حمل جنا اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اس کو کچھ نام دیدیتے تھے اور اسکے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ فلاں بت کے لئے اور یہ فلاں بت کے لئے قرآن کریم نے اس کا رد کیا۔ فرمایا ﴿مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَاسَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ.﴾ ① "اللہ نے نہ سائبہ رکھا نہ بحیرہ نہ وصیلہ، نہ حام رکھا کہ بتوں کو نذر و نیاز کرو۔ یہ اللہ پر افتراء ہے کہ بھینٹ چڑھاؤ بتوں کے نام پر اور یہ کہو کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا. اللہ نے ہمیں امر کیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم نے اس کا امر نہیں کیا۔

غرض نذر و نیاز کے معنی اگر مالی عبادت کے ہیں کہ کھانا پکا کے غریبوں کو کھلاؤ اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔ یہ جائز ہے، اگر کپڑا دینا ہو تو ثواب کی نیت کر دو۔ یہ بھی جائز ہے۔ تلاوت قرآن کریم کر کے ثواب پہنچاؤ، یہ بھی جائز ہے، غرض بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت ہو، دونوں کا ثواب پہنچتا ہے۔ اگر مالی عبادت کو آپ نذر و نیاز کہتے ہیں، علماء دیوبند اس کے منکر نہیں اور اگر نذر کے معنی چڑھاوے کے ہیں کسی کے نام پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی ہو یا نبی ہو۔ اس کو قرآن کریم نے روکا ہے اور اس کو علمائے دیوبند بھی روکتے ہیں۔ تو مطلقاً یہ کہہ دینا کہ نذر و نیاز سے روکتے ہیں یہ غلط ہے۔ ایک خاص نذر ہے جس میں شرک ہے اس کو روکتے ہیں۔ مطلقاً مالی عبادت کا ثواب پہنچانا اس کو کسی نے نہیں روکا۔ یہ جائز ہے اور ان حضرات کا بھی یہ عمل جاری ہے۔

ذبیحہ کی نامزدگی...... اسی طرح کسی بزرگ کے نام پر ذبیحہ کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔ فقط اللہ کے نام پر ذبح ہوگا۔ جب بھی آپ ذبح کریں گے تو یوں کہیں گے۔ بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ. یا جب بھی قربانی کرتے ہیں، اس میں بھی آپ اللہ کا نام لیتے ہیں۔ تو ذبیحہ تو صرف اللہ کے نام پر ہوگا لیکن جس کو ثواب پہنچانا چاہیں آپ نام لے سکتے ہیں کہ "اے اللہ! میں اس ذبیحہ کو کرتا ہوں تاکہ ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے یا فلاں بزرگ کو پہنچا دے"۔

① پارہ: ۷، سورة المائدة، الآية: ۱۰۳۔

تو ایک ہے ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کرنا کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کر رہا ہوں۔ یہ جائز ہے اور ایک ہے کسی کے نام پر ذبح کرنا یہ عبادت ہے۔ تو ذبح تو اللہ کے نام پر ہوگا اور ثواب کے لئے کسی ایک یا دو یا بیس کو نامزد کر دیں اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اگر نذر کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو ثواب کے لئے نامزد کردے کہ مثلاً میں فلاں بزرگ کو ایصال ثواب کے لئے یہ کھانا پکار ہا ہوں۔ اس میں کچھ حرج نہیں۔ ایک کو نامزد کرو، دو کو نامزد کرو، بے شک تمام اولیاء امت کے نام لگاؤ۔ اور یہ کہ فلاں کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور ثواب کا کوئی ذکر نہیں۔ جو نام پر ذبیحہ ہوگا وہ صرف اللہ کے نام پر چھوڑا جائے گا وہ کسی بزرگ کے نام پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

بہر حال میں نے عرض کیا کہ: اگر نذر و نیاز کے معنی ایصال ثواب کے ہیں یا نامزد کرنے کے ہیں کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے اس بکرے کو ذبح کر رہا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں اور فلاں بزرگ کے نام پر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ جائز نہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشرکین مکہ بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور قرآن کریم نے اس کا رد کیا ہے۔

ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصال ثواب...... اگر ایصال ثواب کے لے کچھ پکائیں تو وہ غرباء کا حق ہوگا۔ اغنیاء کا حق نہیں ہے کہ وہ کھائیں اس لئے کہ یہ صدقہ ہے۔ یہ رسم ہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور برادری کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا۔ یہ صدقہ کیا ہوا۔ یہ تو نام ونمود کی دعوت ہوگئی۔ صدقہ اس کو کہتے ہیں کہ آپ فقیروں کو کھلائیں تا کہ آپ کو ثواب ہو۔ اور اغنیاء کو اگر کھلائیں تو اس میں ثواب نہیں ہوگا۔

ہاں اس طرح ثواب ہوسکتا ہے کہ آپ ہدیہ کی نیت کریں کہ خوشی کے طور پر دعوت کر رہا ہوں۔ اس میں ایصال ثواب کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ غرض ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو دعوت پہ بلانا۔ تو یہ ضیافت اور ان کے لئے ہدیہ ہے جو آپ ان کے لئے گویا پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوئی اور ایک ایصال ثواب کے لئے صدقہ کرنا ہے اس کو ہدیہ نہیں کہتے۔ تو صدقہ کے لئے غریب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ اغنیاء اور مال داروں کو بلا کر کھلا دیں گے تو وہ کھانا بھی کھا جائیں گے اور ثواب بھی سارا کھا جائیں گے۔ وہ کسی اور کو نہیں پہنچے گا۔

ایصال ثواب کے لئے ایام کی تخصیص...... سوال نمبر: ایسے عزیز و اقارب اور متوفیاں کے لئے اگر تیسرے یا دسویں اور چالیسویں کوئی کھانا وغیرہ پکا کر اس پر فاتحہ دیں اور برادری وغیرہ کو جمع کر کے کھلائیں۔ اس کو بھی علماء دیوبند منع کرتے ہیں؟

(جواب) تو اتنی بات معلوم ہوگئی کہ ایصال ثواب سے تو نہیں روکتے۔ اس لئے کہ شریعت نے اجازت دی ہے کسی کو روکنے کا کیا حق ہے۔ اب اس میں اپنی طرف سے قیدیں بڑھانا کہ تیسرے دن کرو، چوتھے دن کرو، اگر یہ اتفاقاً ہے تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے آپ کے دل میں آیا کہ میں میت کو ایصال ثواب کروں اور وہ تیسرا دن تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں یا دسواں اور چالیسواں دن اتفاق کے طور پر تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اگر یہ سمجھ کر آپ کریں کہ چالیسویں دن تو پہنچے گا ورنہ نہیں۔ تو یہ غلط ہے کہ یہ عقیدے میں خلل اندازی ہے، عقیدے میں برابر قرار دیا گیا ہے کہ چالیسویں دن پہنچائے، جب پہنچے گا۔ انتالیسویں دن پہنچائے، جب بھی پہنچے گا تو جس چیز کو شریعت عام قرار دے اس کو خاص بنا دینا یہ امت کا حق نہیں۔ یہ صرف رسول کا حق ہے۔ جس چیز کو اللہ کا رسول خاص قرار دے۔ اس کو عام کرنا یہ امت کا حق نہیں۔

مثلاً رمضان شریف کے لئے شریعت نے تیس روزے خاص کر دیئے امت کو حق نہیں کہ وہ شعبان کے بھی روزے رکھا کرے کہ ہم اس کو بھی رمضان سمجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح شریعت نے نماز کے پانچ اوقات مقرر کئے ہیں۔ بندہ پابند اور مقید ہے کہ انہی اوقات میں نماز ادا کرے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ: میں آج ظہر کو عشاء کے بعد ادا کروں گا یا عصر کے بعد پڑھ لوں گا اور یہ کہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس میں حرج یہ ہے کہ اللہ نے نمازوں کے اوقات خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ ① اللہ نے نماز وقت کی قید کے ساتھ فرض کی ہے تو وقت کی قید اٹھانے والا کوئی دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا تو قید لگائے اور وہ اٹھائے۔ یہ تو اللہ کا مقابلہ ہے تو جہاں شریعت نے قید لگا دی اسے اٹھانے کا حق نہیں اور جہاں قید نہیں لگائی اور بے قید رکھا۔ وہاں قید لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ دونوں چیزیں برابر ہیں تو مقید کو مطلق کرنا اور مطلق کو مقید کرنا یہ صرف شارع علیہ السلام کا کام ہے۔ اللہ ورسول کا کام ہے کسی غیر کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوام والتزام کا فرق...... پھر اس میں دوسرا فرق یہ کہ ایک ہے وقت کا تقید کرنا اپنی سہولت کے لئے۔ مثلاً میرے پاس فلاں مہینہ کے فلاں دن آمدن زیادہ ہوتی ہے۔ اس دن میں اپنے حالات کے لحاظ سے کر سکتا ہوں۔ ورنہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کریں اور دوسرے کو ملامت نہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ سب دنوں کو برابر سمجھتا ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسے مثلاً آپ حضرات تاجر ہیں اور سیزن کا کوئی مہینہ آ گیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے اور بکری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس مہینے میں غرباء کو کھانا کھلایا کروں گا۔

تو یہ ایک عمل ہے اس عمل پر آپ نے اتفاقی احوال کے لحاظ سے دوام کر لیا آپ کے عقیدے میں یہ نہیں ہے کہ اس دن ثواب پہنچاؤں گا تو پہنچے گا۔ ورنہ نہیں پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر کوئی شعبان میں کرتا ہے تو اس کو بھی صحیح قرار دے رہے ہیں اور ایک نے اتفاق سے شوال میں کیا۔ آپ نے کہا اس نے بھی ٹھیک کیا۔ اب آپ خود جس مہینے میں دواماً کر رہے ہیں تو اس کے خلاف کو بھی جائز سمجھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

بہر حال یہ سمجھنا کہ اس مہینے میں ہوگا اور اس کے خلاف کو ناجائز سمجھنا یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بنانا جائز نہیں جب تک اللہ کا رسول عقیدہ نہ بتلائے۔ غرض ایک ہے دوام اور ایک ہے التزام۔ دوام اور التزام میں فرق ہے تو

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۰۳۔

ایک یہ ہے کہ آدمی کسی مہینے کا پابند بن جائے اور عقیدے میں یہ سمجھے کہ یہ کام اسی مہینے ہوسکتا ہے، یہ مہینہ نکل گیا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ ہے اور ایک التزام کے بغیر دوام ہے کہ میری مصلحت کے لحاظ سے میں اس مہینے میں کھلاسکتا ہوں اور عمر بھر اس کا پابند ہوگیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ جائز اس میں بھی ہے دوسرے میں بھی جائز ہے۔ یہ ایک ذاتی مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مشابہت سے احتراز...... بس اب اتنی بات دیکھی جائے گی کہ اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو اس خاص مہینے میں یا اس وقت کو لازم سمجھتی ہے اور آپ نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ عمل کریں گے تو آپ پر تہمت یہ آئے گی کہ ان کا بھی وہی عقیدہ ہے۔ ایسے میں مشابہت کی وجہ سے ترک کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر سارے ہی ایسے ہوتے کہ فی نفسہ ہر مہینے میں جائز سمجھتے لیکن اپنی مصلحت کی وجہ سے کسی نے کوئی مہینہ اختیار کرلیا کسی نے کوئی۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ فی نفسہ عقیدہ بنائے بغیر عمل کا اپنے کو پابند کر لینا جائز ہے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے ترک کرایا جائے گا، اگر کوئی قوم دنیا میں اسے لازم سمجھتی ہے اور آپ اسے لازم نہیں سمجھتے مگر عملاً وہی کر رہے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کا بھی وہی (لازم سمجھنے کا) عقیدہ ہے تو لوگ اس سے حجت پکڑیں گے تو ایسے مواقع پر ممانعت کی جائے گی۔ مگر وہ ممانعت مصلحتاً ہوگی حرام یا ناجائز ہونے کی وجہ سے اس فعل کی ممانعت نہیں ہوگی۔ بہر حال اس سے آپ سمجھ گئے کہ عزیز واقرباء یا متوفیان کے لئے تیسرے دسویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر فاتحہ دے کر برادری کو بلا کر دعوت کھلانے سے جو علماء دیوبند روکتے ہیں اس کا آپ تجزیہ کرلیں کہ کیوں روکتے ہیں۔ بات کو گول مول نہ رکھئے۔ اب تک میں نے تیسرے، دسویں اور چالیسویں دن کے روکنے کے بارے میں کلام کیا کہ ان کو عقیدہ بنا کر مخصوص کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی مصلحت کی وجہ سے خاص کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

چہلم، برسی ہندوانہ رسم ہے...... مگر یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کو فرض کیجئے تیسرے دن اور محرم کے مہینے کی سہولت ہے تو کیا ضروری ہے کہ جس کا عزیز مرے وہ محرم ہی کے مہینے میں مرے، اتفاق سے وہ شعبان کے مہینے میں انتقال کر گیا تو وہ کون سا دن ہوگا جس میں آپ کو سہولت ہوگی۔ تجارت کا تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو یہ تیسرا دسواں اور چالیسواں بلکہ چہلم یہ کوئی قید شریعت میں نہیں ہے۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت۔ یہ ایک بے اصل سی چیز ہے۔

بلکہ اگر ثابت ہے تو یہ ہندوؤں سے ثابت ہے۔ ان کے ہاں تیسرا بھی ہے، چوتھا بھی ہے، چالیسواں بھی ہے، برسی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسم وہیں سے لی گئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ...... اور اس کی بناء درحقیقت یہ ہوئی ہے اور بھی بہت سی رسمیں اسی طرح ہیں۔ غرض اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس کی بناء یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کرام کے صدقے پھیلا ہے تو ان حضرات کے طفیل سے ہندوستان کے جو لوگ مشرک تھے، وہ دائرہ اسلام

میں داخل ہوئے۔ چناں چہ ننانوے لاکھ آدمی تنہا حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو ہوئے ہیں وہ تعداد اس کے علاوہ ہے۔ اسی طرح اور حضرات صوفیاء ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں ان حضرات کی دیانت، امانت، سچائی، خلوص اور بزرگی دیکھ دیکھ کر خود بخود جوق در جوق لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئے۔ لیکن ان کی تعلیم کا بندوبست پورا نہیں ہوسکا۔ حکومتوں نے توجہ نہیں کی۔ عوام مسلمین نے دھیان نہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں تو داخل ہو گئے، مگر مسائل کا علم نہیں ہوسکا۔

تو جو رسمیں انہوں نے اسلام کے نام سے کرنی شروع کر دیں۔ مثلاً ان کے دیوالی کی چھڑی نکلتی تھی انہوں نے بھی بعض بزرگوں کے نام پر جھنڈا نکالنا شروع کر دیا۔ ان کے ہاں ستی کے اوپر پرشات چڑھتا تھا انہوں نے جا کر قبروں پر مٹھائی چڑھا دی۔ ان کے ہاں کسی دیوتا کے نام پر کوئی کام ہوتا تھا انہوں نے وہ کام کسی بزرگ کے نام پر کر دیا۔

تو اسلام کا ایڈیشن بنا دیا جب کہ حقیقت وہی تھی جو پہلے سے آ رہی تھی۔ غرض اس کی بنا یہی ہوئی کہ اسلام میں داخل تو جوق در جوق ہوئے مگر ان کی تعلیم نہ ہوسکی۔ تو وہ عورتیں اور مرد جو رسمیں ان کے گھروں میں تھیں ان کے اپنے ذہن سے یا کسی کے کہنے سے انہی کا نقشہ بدل کے وہ سب اسلام بنا دیا۔ اب وہ ساری رسمیں اسی طرح سے چلی آ رہی ہیں۔ اب جبکہ کوئی عالم اس کو ناجائز کہتا ہے تو خفا ہوتے ہیں کہ باپ دادا سے تو ہم یہ رسمیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے منع کرنے والا؟

پھر اس کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے حالانکہ وہ ان کی خیر خواہی میں یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین اصلی وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے۔ یہ رسوم وغیرہ یہ شرکیہ مزاج ہے۔ لوگ اس کو نہیں سنتے۔ بلکہ اس رسم پر زور دیتے ہیں۔

ہندو مسلم اختلاط کے اثرات..... تو زیادہ تر یہ رسمیں ابنائے وطن (ہندوؤں) سے آئی ہیں اور پورے ہندوستان میں اس کا مسلمانوں کے دین پر اثر پڑا ہے۔ بعض چیزیں انہوں نے بھی آپ کی قبول کیں اور رفتہ رفتہ ان میں توحید آئی کہ ایک ان میں مستقل ایسا فرقہ (آریوں کا) پیدا ہو گیا۔ جو شرک اور بت پرستی کو روکتا ہے اور مسلمانوں میں شرک اور بت پرستی اسلام سے پیدا ہو گئی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اسلام سمجھ کر رہے ہیں اور حقیقت میں وہ شرک ہو جاتا تو یہ چیزیں وہاں سے چلیں۔ ورنہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں کہیں اس کا وجود نہیں کہ کہیں دسواں اور چالیسواں ہے۔ اسی طرح تابعین کے زمانہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ آئمہ مجتہدین میں کہیں اس کا ذکر نہیں اسی طرح فقہ میں نہیں۔ البتہ فقہ میں رد موجود ہے کہ یہ غلط اور یہ غلط۔

دین اور رواج کا امتیاز...... بس ایک رواج چلا آ رہا ہے۔ تو رواج کا نام دین نہیں۔ دین تو رواجوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے تاکہ خدائی رواج قائم ہو۔ خدائی قانون قائم ہو۔ اس واسطے جب بھی کوئی عمل کیا جائے تو دیکھا جائے کہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے یا نہیں؟ سنت صحابہؓ میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟

اگر معلوم ہو جائے تو آدمی سر آنکھوں پر کرے اور اگر نہ نکلے تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ اور اگر نہیں ہے۔ مگر غیروں کے اندر ہے اور عمل کریں تو ان سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کو پوری طرح سے ترک کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ مسلم اقوام کا مزاج بدل دے گا۔ جو ان کا موحدانہ مزاج ہے اور اسلام نے توحید کا مزاج بنایا ہے۔

حاصل کلام...... غرض دو باتیں میں نے عرض کیں، ایک یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو شریعت نے مطلق چھوڑ دیا ہو اور اپنی طرف سے قید لگانا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کون ہیں کہ خواہ مخواہ اس کو مقید کریں؟

لیکن اگر آپ کوئی دن اپنی مصلحت سے مقید کر رہے ہیں کہ مجھے آج کے دن سہولت ہے اور آپ اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔ اپنی سہولت دیکھتے ہیں تو کر لیں لیکن یہ بھی جائز سمجھتے ہوں کہ اگر اس کے کوئی خلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اس میں یہ ہوگا کہ اگر کسی قوم نے اس کو لازم سمجھ رکھا ہے تو احتیاطاً آپ کو رکنا پڑے گا کہ اس وقت یہ فعل آپ کے واسطے موضع تہمت ہو جائے گا۔ اس لئے آپ کو اس سے بچ جانا چاہئے۔

اور اس کے بچنے میں کوئی دشواری نہیں۔ اور بچنے سے آدمی جب رکے کہ اس دن تو ثواب پہنچتا ہے پھر نہیں پہنچے گا۔ جب ثواب اب بھی پہنچتا ہے اور چار دن بعد بھی پہنچتا ہے تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر ایک بلالی جائے اور اپنے سر پر تہمت رکھی جائے۔

دوسری بات یہ کہ فاتحہ کے معنی اگر ایصال ثواب کے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ ہونا چاہئے۔ حدیث میں میت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے دریا میں ڈوبتا ہوا آدمی کہ تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے وہ آس کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ میرا کوئی عزیز مجھے ثواب پہنچاتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کو اس کی آس پوری کرنی چاہئے۔ اس کو ثواب پہنچانا چاہئے۔

ایصال ثواب کا تعلق نیت سے ہے...... ایصال ثواب کا تعلق قلب سے ہے۔ آپ نیت کریں گے تو ثواب پہنچ جائے گا۔ اگر آپ اس ثواب پہنچانے میں چند قیدیں لگائیں کہ کھانا یوں رکھا جائے اور اس پر یوں پڑھا جائے۔ بعض سہاگنیں جمع ہوں جن کے اب تک بچہ نہ ہوا ہو اور وہ ایک ایک یا سات سات چاول کے دانے اٹھائیں۔ یہ محض رسوم ہیں۔ شریعت کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ غرض ایصال ثواب کا تعلق قلب کی نیت سے ہے۔ آپ نے نیت کی، کھانا پکا کے بانٹ دیا۔ فقیر سے بھی یوں نہ کہا کہ میں کیوں کھلا رہا ہوں؟

بس قلب کی نیت یہ ہے کہ ثواب پہنچے، بس پہنچ جائے گا۔ یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ جب تک مسجد کا ملا نہ آئے گا ثواب نہیں پہنچے گا۔ یہ سب کھانے پینے کی باتیں ہیں۔ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ ثواب پہنچانا ہے اور یہ صدقہ ہے۔ اسی واسطے مستحقین کو کھلائے۔ یہ جو ساری برادری کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا یہ تو وہی رسمی بات ہوگئی۔ ثواب سے اس کا کیا تعلق ہوگا وہ تو کھانے کے ساتھ ثواب کو بھی کھا کر چلے جائیں گے۔ میت غریب کے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔ میت کو جب پہنچے گا جب آپ مستحق کو صدقہ دیں۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ......اس واسطے اگر دعوت کرنی ہے، شوق سے کیجئے اور آپ ہر روز دعوت کیا کیجئے۔ آپ کے عزیز ہیں، اقربا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ جتنی چاہیں آپ دعوتیں کریں۔ دس بیس سوسو کو جمع کریں۔ مگر ثواب پہنچانے کی عبادت کو کیوں آپ کر کرا کرتے ہیں کہ اس میں خلط ملط کریں۔ کچھ مستحق کچھ غیر مستحق کچھ امراء کچھ غرباء۔ معلوم ہوتا ہے دل کے اندر کچھ نمود کا جذبہ ہے۔ برادری کی اٹک ہے کہ نہیں کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی، تو جس میں ناک کٹنے کا خوف ہو وہ عبادت ہوتی ہے؟

ناک کٹنے کا خوف ہو تو وہ مخلوق کی اطاعت ہوگئی۔ نہیں کریں گے تو برادری والے نام رکھیں گے۔ تو نماز، روزہ اور صدقہ نام رکھنے اور ناک کٹنے کے خوف سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، تو آدمی عبادت بھی کرے اور اس کو کر کے کھودے، تو اس کے کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ صحیح طریق سے کیجئے۔

تو یہ کہنا کہ یہ علماء دیوبند منع کرتے ہیں تو وہ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے ان رسموں سے منع کرتے ہیں۔ تو یہ اشتعال دلانا ہے اور یوں نہیں کہتے کہ: علماء دیوبند ایصال ثواب کو جائز بلکہ ضروری کہتے ہیں مگر جو رسوم باندھ رکھی ہیں، ان سے روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان کے کھانے پینے کا نقصان ہے۔ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ مطلق ثواب سے روکتے ہیں تا کہ عوام میں اشتعال پیدا ہو۔ ایصال ثواب جیسی مطلق چیز کو تم مقید کرتے ہو تو اس تقیید کو روکتے ہیں کہ تم کو اس کے مقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے عام کر رکھا ہے اس کو عام رکھنا پڑے گا جس کو وہ خاص کر دے اس کو خاص رکھنا پڑے گا۔ ہم عیاذاًباللہ شارع نہیں ہیں کہ شریعت وضع کریں۔ شریعت وضع کرنے والا اللہ ہے اور اس کو پہنچانے والے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کے بعد کسی کو شریعت کے وضع کرنے کا حق نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یا آئمہ مجتہدین بھی اس شریعت میں سے مسائل نکال سکتے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت وضع کر دیں یہ کسی کا حق نہیں۔

علم غیب کا تنازع......سوال: علماء دیوبند سرکار دو عالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں، دیوانوں اور جانوروں کے مشابہہ کہتے ہیں؟ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ اور معاذ اللہ شیطان کے علوم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے زیادہ بتاتے ہیں۔

جواب: یہ بھی بالکل افتراء اور بالکل کذب ہے۔ یہ دعویٰ اصل میں وہی لوگ کرتے ہیں جو علماء دیوبند کو الزام دے رہے ہیں۔ اور یہ قصہ یہاں سے چلا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارا علم حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ علم غیب کلی اور جزئی جزئی کا وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کو ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرا اور میرے ساتھ ساری مخلوق کا علم ملا کر اللہ کے علم کے سامنے ایسا ہے کہ جیسے ایک بے پید سمندر پر ایک چڑیا آئے اور اس میں چونچ لگائے۔ اس کی چونچ کو جو تری لگ جاتی ہے تو اس تری کو سمندر سے کوئی نسبت نہیں۔ ساری مخلوقات کا علم مل کر اللہ کے علم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو چڑیا کی چونچ کی تری کو سمندر

سے ہے۔ تو حضور علیہ السلام تو یہ فرمائیں اور ہم دعویٰ یہ کریں کہ جتنا اللہ تعالیٰ کو علم ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ عقلاً بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی لامحدود اور صفات بھی لامحدود صفات کاملہ میں سے علم بھی ہے۔ تو علم بھی اس کا لامحدود، اس کی کوئی حد ونہایت نہیں۔ بندہ خود محدود، عمر محدود، ذات محدود، صفات محدود اور قوتیں محدود، تو لامحدود چیز، محدود چیز میں کس طرح سما سکتی ہے؟ تو شرعاً میں نے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک پیش کیا اور عقلاً بھی یہ مجال ہے تو عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔

علماء دیوبند کا عقیدہ...... علماء دیوبند کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے ساری کائنات میں سے وہ علم کسی کو نہیں دیا۔ نہ اتنا زیادہ کسی کو ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الخلائق ہیں۔ تمام ملائکہ کو بھی وہ علم نہیں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ تو کائنات میں سب سے زیادہ علم والی ذات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ ایک تو اعلم الخلائق ہونا ہے کہ ساری مخلوق سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم ہیں اور ایک اللہ کے برابر ہونا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

مخلوق، خالق کی کسی صفت میں اللہ کے برابر ہو جائے۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی اور ایک یہ کہ مخلوقات میں سے سے زیادہ افضل ہونا۔ تو وہ ذات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ غرض مسئلہ یہاں سے چلا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کلی حاصل ہے۔

علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ...... اس کے بارے میں بعض بزرگان دیوبند نے لکھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ''علم کلی حاصل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر علم کلی کا یہ مطلب ہے کہ ساری کی ساری جزئیات اور کلیات حاصل ہیں۔ یہ عقلاً بھی اور نقلاً بھی غلط۔ خود حدیث کے بھی خلاف۔ قرآن کریم کے بھی خلاف۔ اور اگر یوں کہتے ہیں اور آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل میں سے بعض علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے تو وہ بعض کچھ کو اور بعض کچھ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ تھوڑا بہت علم اللہ نے ہر انسان کو دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم ہر فرشتے کو دیا۔ تھوڑا بہت علم جنات کو بھی دیا۔ پھر اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضلیت کیا رہی؟

تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ اگر تمہارے دعوے کا یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط۔ یہ مطلب علمائے دیوبند کا تھوڑا ہی ہے یہ تو خود بریلوی حضرات کا مطلب ہے جن کو ہم رد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سر پر تھوپ دیا کہ تم یوں کہتے ہو کہ معاذ اللہ جانوروں کے برابر علم ہے۔

اور جنات کے برابر علم ہے'' عیاذاً باللہ، عیاذاً باللہ، نقل کفر، کفر نہ باشد۔ شیطان کے برابر علم ہے۔ تو یوں کہا گیا ہے کہ: اگر تم علم کے معنی یہ سمجھتے ہو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر جانور کو بھی علم ہے۔ ہر فرشتے کو بھی علم ہے۔ جنات کو بھی یہ علم ہے۔ اس میں فضلیت کیا رہی؟

غرض تمہارے مطلب کی دو شاخیں بیان کر کے اسے رد کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ اپنے مطلب کا کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ تھوپ دیا ہمارے سر کہ تم یہ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہم سے یوں کہیں کہ صاحب! فلاں آدمی آیا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں جگہ وبا پھیل گئی ہے خدانخواستہ کوئی باقی نہ رہا۔

تو ہم اس کو کہیں گے کہ بھائی! ''سوچ لو کہ کوئی باقی نہیں رہنے کا کیا مطلب ہے''۔ آیا یہ مطلب ہے کہ ایک بھی باقی نہیں۔ یہ تو بظاہر خلاف بات ہے کل کے اخبار میں آ چکا کہ بہت سارے زندہ ہیں اور اگر یوں کہو کہ بعض آدمی انتقال کر گئے تو کون سا شہر ایسا ہے جس میں روز بعض لوگ انتقال نہیں کرتے۔ تو یہ جو ہم نے الزام قائم کیا یہ آپ کے دعویٰ پر ہم نے قائم کیا۔ ہم نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ تو مطلب تو آپ کے دعویٰ کا بیان کیا جا رہا ہے اور آپ ہمارے سر تھوپ رہے ہیں کہ تمہارا یہ مطلب ہے۔ ہمیں اس مطلب سے کیا تعلق؟

علمائے دیوبند کا دعویٰ...... ہم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوقات سے زیادہ علم دیا گیا ہے نہ اتنا علم انبیاء علیہم السلام کو ہے نہ اولیاء کو ہے، نہ فرشتوں کو ہے۔ لیکن اللہ کے علم کے سامنے وہ جز ہے۔ کلی علم تو فقط اللہ کو ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس کا ایک جز اور ایک شمہ ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو جو علم دیا گیا ہے وہ بھی ایک جز ہے تو اس فرق کو سمجھ لیجئے کہ ایک ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری کائنات سے بڑھ کر عالم ہونا اور ایک ہے حضور علیہ السلام کے علم کا اللہ کے علم کے برابر ہونا۔ یہ برابر تب ہوگا جب ذات برابر ہو، صفات برابر ہوں، احوال برابر ہوں۔ جب کہیں برابری نہیں ہے تو صفات میں کیسے برابری ہوگی۔؟ صفات میں سے علم بھی ہے تو علم میں برابری کیسے ہوگی؟

یہ ناممکن اور محال ہے۔ خود قرآن کریم بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہا ہے، حدیث بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہی ہے۔ تو یہ عجیب چیز ہے کہ ان کے دعویٰ کے مطلب کی ایک شق کو بیان کیا جائے۔ اور وہ اس کو ہمارے سر تھوپیں۔ بھائی! تمہارا یہ دعویٰ تھا اور اس کی وضاحتیں تھیں۔ تم دونوں کا انکار کر دو۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ''اعلم الخلائق ہیں'' باقی تمام مخلوقات کا علم مل ملا کر ایسا بھی نہیں ہے جیسے سمندر کے سامنے چڑیا کی چونچ کی تری ہوتی ہے۔ لیکن یہی نسبت حضور علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم کے ساتھ ہے۔

نماز کے بعد مصافحہ...... سوال: نماز کے بعد مصافحہ کو منع کرتے ہیں؟ جواب: نماز کے بعد مصافحہ کو واجب کس نے کیا ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ کسی جائز چیز کو اگر آپ واجب سمجھیں گے تو منع نہیں کیا جائے گا تو اور کیا جائے گا۔ نماز کے بعد مصافحہ کرنا نماز کی سنتوں میں داخل نہیں، سنن وضو میں داخل نہیں، سنن دعا میں داخل نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے کوئی لازمی چیز نہیں اتفاقاً کر لیا تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ کبھی عقیدت و محبت میں کر لیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نہ کرے اس کو آپ ملامت کریں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے واجب جانتے ہیں۔ تو جو چیز واجب نہ ہو آپ اسے واجب جان کر کرنے لگیں تو روکا

نہیں جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا؟

تو یہ ساری باتیں وہی تو ہیں کہ جس چیز کو اللہ جائز قرار دیں اسے جائز رکھو۔ جسے واجب قرار دیں اسے واجب رکھو۔ جسے حرام قرار دیں اسے حرام رکھو۔ واجب کو جائز بنا دے اور جائز کو واجب بنا دے۔ اس کا آپ کو حق نہیں۔ مصافحہ کرنا جائز ہے۔۔ لیکن نہ کرنا بھی جائز ہے جائز کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب کرو جب بھی مضائقہ نہیں۔ نہ کرو تب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی کرنے پر زور دینے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے واجب جانتا ہے۔ تو اس کو روکا جائے گا اگر نہ کرنے پر زور دینے لگے تو اسے بھی روکا جائے گا۔ کیونکہ اسے ترک پر زور دینے کا حق نہیں، اللہ نے برابر رکھا ہے۔ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں نہ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ روکنا فرض بنا کر کرنے سے ہے اور سنن نماز سمجھ کر کرنے سے روکتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم نے مصافحہ کو رواج سمجھ لیا ہے اور جہاں کسی نے رواج سے روکا وہ کافر۔ تکفیر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ضروریات دین کا جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ تمہارے مصافحہ کو روک دیا وہ کافر، کھانا پکانے کو روک دیا وہ کافر۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس مصلحت سے روکا ہے۔ کون سی حد بندی کے لئے روکا، اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تکفیر کرنا یہ آپ کے لئے بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد دعاءِ ثانیہ......سوال: نماز کے بعد دعاء ثانیہ کو منع کرتے ہیں۔ جواب: دعاء ثانیہ کے لازم ہونے کو منع کرتے ہیں۔ جائز ہونے کو تو منع نہیں کرتے۔ دعاءِ ثانیہ اگر اتفاق سے کوئی کرے اور ثانی کیا چیز ہے۔ کوئی دس دفعہ کرلے، چار دفعہ کرلے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔۔ لیکن اس کو اس طور پر لازم قرر دے کہ جو نہ کرے تو اسے کہے کہ یہ غلط آدمی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ لازم تو نہیں۔ غرض جواز ہے، لزوم نہیں۔ جواز کو منع نہیں کیا جاتا، لزوم کو منع کیا جاتا ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. حَرَّرَهٗ، ۸/۵/۱۲ ا ھجری)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ شخصیت و کردار میری سعادت......حضرت الاستاذ علامہ شبیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عباسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں، تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقص المعلومات کی چند سطریں اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کرسکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ ان کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آجائے۔ گو چند نا تمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگارانہ تشکیل نہیں۔ قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا، اسے سپرد کاغذ کر دیا ہے۔ پس یہ سوانح یا سوانح کا عرفی نہیں۔ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلی اور تنشیط مقصود ہے۔ (وباللہ التوفیق)

ذوق علم کا رنگ...... حضرت علامہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مولانا اپنی جامعیت علوم کے ساتھ خصوصیت سے علوم عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ: اگر میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ، کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو نہ معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم نے مجھے سنبھالا علوم عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمت قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا راستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں متکلمانہ رنگ کا غلبہ ہوگیا۔ اسی لئے اسلام کے اصول وکلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر ان کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب وسنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد، لطیف وشیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ ان کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر وحدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کو سہل عنوانات کے ساتھ حل فرما گئے ہیں۔ جس سے حضرت ممدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقریر وبیان کا رنگ...... تقریر وبیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوت استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی، معمولی سی بات کو اس خوبصورتی اور قوت سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہو جاتے تھے۔ تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانہ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کہنگی، حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا، جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا۔ بلاغت کلام، کلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اپیل کرتی تھی۔

طرز تدریس...... درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے، کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اس کے تمام شقوق وجوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی۔ اس لئے درس میں کمیت پر نہیں، کیفیت پر نظر رہتی تھی سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تمام ہو اسی لئے درس وتدریس کے سلسلے میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، تنقیح مسئلہ اور اس میں تدبر وتفکر پر وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخلل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کیفی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہو جاتا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران حضرت والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا اور مجھے فرمادیا کہ: منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چناں چہ خصوصیت صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہنچے، گویہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں۔ لیکن جس قدر پڑھایا اتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہوگئی کیونکہ ان کی ابحاث کا نقطہ نظر کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کی حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

احقر جب کہ متوسط کتابیں ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھا

دیجئے۔ دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور ملتجی ہیں۔ فرمایا کہ اول اول تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخرکار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ: کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمائیے۔ نہ میں ناغہ کروں گا نہ بدشوقی دکھلاؤں گا، مگر آپ بھی پابندی فرماویں، وعدہ فرمالیا اور بڑی شفقت سے قرآن شریف کا درس شروع کرادیا۔ ابتداء میں سو، سوا سو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہوگیا، مگر آخرکار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں میں تنہا رہ گیا، قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی امنگ بھی کم ہوگئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ وطیرہ اختیار کرلیا کہ اس گھنٹہ میں مولانا جہاں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتا، خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانہ مدرسہ میں اور وہ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گزار دیتا تھا، کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرمادیتے مگر میں یہ وقت ان کے پاس پورا ہی کر دیتا۔ آخرکار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور تو جیت گیا، تو نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔

کمال اخلاق...... اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے خلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش اور اگر ناخوش ہیں تو اعلانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ بشرہ سے ہوجاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے دارالعلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم (جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہوجاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ خفا ہوکر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔ ایک دفعہ ناخوش ہوکر گھر بیٹھے رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کردیا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے طے فرمایا کہ: تو ہی جا کر لاسکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اُس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لمحہ گرانی رفع ہوکر حقیقۃً بشاشت چہرہ پر نمودار ہوجاتی اور ایسے خوش اور منفرح ہوجاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بہ تکلف نہیں بلکہ بلاتصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالیٰ نے علم وفضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بارہا دیکھا کہ انکے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو اف کبھی نہ کرتے تھے، اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے۔

حق پسندی...... قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہوکر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ: بھائی نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے، جو

اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کر لی تو سن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے ایک جذبہ للّٰہیت سے اور ایک نفسانیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو میں انہیں اپنی زندگی باور کراؤں؟ اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ: حضرات ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ: الحمد للہ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمائیے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جب کہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آ جاتی ہیں یہی فیصلے کر لیں کہ ہم کو کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمائیے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آ گئی اور فرمایا: ہاں یہ تو نے صحیح کہا، بس! میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دارالعلوم پہنچ کر کام کروں گا، چناں چہ علی الصبح حسب وعدہ تشریف لائے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی، قلب کی صفائی اور حقیقت پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

انداز تحریر...... بہر حال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھا دی تھی، قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا خود بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ: کیا کام کروں میں تو کتابوں کا کیڑا بن کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دو اہم اور عظیم الشان کام یادگار زمانہ چھوڑے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف، العقل والنقل، الاسلام، الشہاب الثاقب، صدائے ایمان، اعجاز القرآن، ۔ اور دوسرے مفید ترین رسائل و مسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیان مسائل کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نور اللہ مرقدہ انہیں اس لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔

ذکاوت و ذہانت طبعی تھی، فہم تیز اور طبیعت سادہ تھی۔ علم کی بنیاد فہم ہی ہے جب اسے کتاب وسنت میں

استعمال کیا گیا تو علم کا دوچند ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلّم تھی، ایک ہی مضمون کئی آدمی لکھتے اور اسی کو وہ قلم بند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مالٹا سے واپسی کے بعد ترک موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتوی یہ حضرات مرتب کریں اور غایت احتیاط و تدین سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارے میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر ان کے بغض وعداوت کا غلبہ ہے ہوسکتا ہے کہ فتویٰ میں جذبات کا رنگ آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.﴾ ① ”تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے کام نہ لو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے“۔

اس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چناں چہ تینوں حضرات نے قلم بند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا کہ: جواب تو ماشاءاللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں۔ لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔ بہر حال ان کی تحریر کی جامعیت شگفتگی اور بلاغت کو خود ان کے اکابر بھی مانتے تھے اور اس کی کافی داد دیتے تھے۔

نظم وشعر...... مولانا نظم اور شعر وشاعری سے بھی عاری نہ تھے، گو اس کا ذوق نہ تھا، چند مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ جذباتِ دلی کی ترجمانی آپ نے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر ”نالۂ دل کے نام پر ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلم بند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہو چکا تھا، نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی، حالت نازک دیکھ کر غلطی، یا غلط فہمی سے وہاں سے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیوبند میں صف ماتم بچھ گئی، تیسرے دن تار پہنچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔

اس پر بساط شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلسے گھروں میں اور مدرسہ میں ہونے شروع ہو گئے۔ تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی وتہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مبارک بادی کی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی اور سنائی، جس کا واقعاتی شعر یہ تھا:

غلط ایک تار برقی پہنچی تھی جے پور سے، جس نے ‏ ‏ ‏ جلایا خرمن مقصود کو برق تپاں ہوکر

اسی طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی۔ بہر حال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم ونثر

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، رکوع: ٣۔

اور علم وفضل کی ایک مجسم تصویر تھی، جس کے اٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اٹھ گئے۔ یوں حق تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ کرتے رہیں گے لیکن جن کے سامنے علم وفضل کی ہستیاں اٹھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل وکمال سے مانوس اور مالوف ہوتے ہیں اس کے اٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہ جاتے ہیں۔

سیاسی خدمات...... آخر میں سیاسی راہوں پر ان سے جو مہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت ان کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ ان کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا۔ اختلاف رائے اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ہر شخص اپنی حجت سے مجبور ہے لیکن عزم وعمل کی جو طاقتیں مولانا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے انہیں خلاف توقع سمجھتے تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ حصہ ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء دین کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا انہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا اور ان سے وہ کام لیا جو مرکزی شخصیتوں سے لیا جاتا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت اور ہوتی۔ یہاں کے لوگ ان کی رائے سے تو اختلاف رکھتے مگر ان کے جذبات اور صدق و خلوص کی قدر بھی کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہوسکتا۔

خراج تحسین...... غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم وفضل کا سکہ ملک بھر نے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شہرہ پہنچا ہوا تھا جس کے سامنے اہل علم وفضل سر جھکانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔

ان کے تفسیری فوائد کا حکومت افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا درحقیقیت ان کے فضل وکمال کے سامنے جھک جانا تھا، فتح الملہم کو علامہ زاہد کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی انکے فضل وکمال کا اعتراف تھا۔ بہرحال جہاں جہاں بھی ان کے فضل وکمال کا کوئی اثر پہنچا وہیں اعتراف وتسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے مایہ ناز نہ تھی بلکہ دنیائے اسلام کے لئے سرمایہ ناز تھی۔

تعمیل حکم...... اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سطور سپرد قلم ہوگئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے مگر سوئے اتفاق سے وقت ختم ہوگیا۔ میں بہار کے سفر کے لئے پابرکاب ہوں، ریل کا وقت آ گیا اس لئے قلم کو روک دینا پڑا، اگر قلم چلتا ہی رہتا تب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہوسکتی اور اسے رک جانا پڑتا۔ اس لئے اگر رک بھی گیا تو مضائقہ نہیں، تکمیل فہرست نہ جب ہوتی نہ اب، اس لئے یہ سطور بے ساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آ گئیں اور محترم

عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہوگئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولانا کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہوگیا، جو میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا.﴾ ترجمہ: ''اے ربّ ہمارے، مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے''۔ (آمین)

فلسفۂ نماز

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.o

تمہید...... اما بعد ! مجھے جس عنوان پر لب کشائی کی ہدایت کی گئی ہے اور جو عنوان میرے مضمون کے متعلق شائع کیا گیا ہے وہ ہے "فلسفۂ نماز" سال گذشتہ بھی اسی خیر المدارس کے سالانہ جلسہ پر جو مضمون مجھے دیا گیا تھا اس کا عنوان تھا "فلسفۂ ارکانِ اسلام".....

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کی مجالس سے فلسفہ ہی میرے حصے میں کیوں آیا ہے؟ حالانکہ نہ تو میں فلسفی ہوں اور نہ میری تعلیم پر فلسفہ کا غلبہ ہے اور نہ جس جماعت کی طرف میرا انتساب ہے وہی کوئی فلسفیوں کی جماعت ہے اس لیے کسی نہج سے میری طرف یہ تفلسف اور فلسفہ کا انتساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔

فلسفے کے تین (۳) طبقے...... قدیم فلاسفہ کے (۲) دو ہی مشہور طبقے ہیں۔ 1 مشائیہ اور 2 اشرافیہ۔ مشائی کائنات کی حقیقت پر عقلی سوچ بچار سے بحث کرتے ہیں اور استدلال کے رنگ سے دنیا کی حقیقت کا سراغ لگانے کی تگ ودو میں رہتے ہیں۔ نظر وفکر ان کا علمی سرمایہ ہے اور دماغی اختراعات کا ذخیرہ ان کی پونجی۔

فلسفہ اور دین...... ظاہر ہے کہ دین اور اس کی حکمیات کو نہ دماغی اختراع سے تعلق ہے اور نہ نظر وفکر اور سوچ بچار سے وہ معرض وجود میں آیا ہے۔ وہ تو ایک خدائی پروگرام ہے جس کا تعلق نظری عقیدت اور عملی اکتساب سے ہے، اس کے حقائق برتنے سے کھلتے ہیں نہ کہ دماغ لڑانے اور عقلی گھوڑ دوڑ سے۔ اس لیے اسے مشائیہ کی عقلی تگ وتاز سے بھی کوئی نسبت نہیں ہوسکتی۔

ہاں! اگر دین کی جمع وترتیب عقلی اتار چڑھاؤ کا ثمرہ ہوتی اور وہ کسی رسمی فلسفی کی کاوش ودماغ کا ثمرہ ہوتی تو اسے عقلی چیستانوں سے حل کیا جاسکتا تھا۔ جیسے ہندو مذہب کہ اس کی موجودہ ہیئت ترکیبی کا پرداز رہی فلسفیانہ انداز

کا ہے اور فلسفیوں ہی کی کاوشوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ نیز ہندوستان کا فلسفہ مشہور بھی ہے اس لیے ان کے مذہب پر فلسفہ کا دباؤ بعید از قیاس بھی نہیں۔ اس لیے اگر اس جیسے مذہب کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایک بات بھی ہے لیکن اسلام ایک سادہ اور صاف خدائی مذہب ہے جس کی ابتداء وانتہاء اور اصول وفروع سب کچھ نقل صحیح اور عقل کلی کا ثمرہ ہیں۔ اس لیے جزوی عقلوں کے تفلسف کے اندازوں سے کلیۃً بالاتر ہیں اور اس لیے اس کے احکام کو مشائیانہ فلسفہ کے طرز وانداز سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہو سکتی کہ مجھ سے اس کی کسی عبادت کا فلسفہ بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے، یوں بھی دین کی اساس عشق ومحبت حق پر ہے اور عقل اور فلسفہ کی غرور نفس پر۔ متدین دیندار مبتلائے حق ہوتا ہے اور فلسفی مبتلائے نفس........ یہاں دماغی الجھنیں ہیں اور وہاں رسائی قلب۔ عشق ومحبت سے بڑھنے اور دوڑنے کا جذبہ ابھرتا اور کوری عقل سے مصلحت اندیشیوں میں الجھ کر پیچھے ہٹنے اور رکنے کے دواعی پیدا ہوتے ہیں۔

پس کہاں عشق کی وارفتگی اور کہاں سوچ بچار کی گھمبیر؟ اور جب کہ دونوں کی بنیادیں الگ الگ ہیں اور دین وفلسفہ میں اساسی تباین موجود ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں دین میں سے فلسفہ کس طرح پیدا کر سکتا ہوں کہ نماز جیسی خالص دینی عبادت کے فلسفہ کا مجھ سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ نیز عقل وفلسفہ کا دائرۂ حسیات تک محدود ہے اس لیے عقل کی کارگزاری بھی صرف محسوسات کی ترکیب وتحلیل تک محدود رہے گی۔ پس وہ دین جو خدا کی اس فطرت سے نکل کر بندوں تک آیا ہے، جہاں حسیات کے پر نہیں جم سکتے تو یہ تو حسیات کا مزدور (فلسفہ) ان لطیف معنویات کا بار اپنے ضعیف کندھوں پر کیا اٹھا سکتا ہے؟ کہ ہم دین کی عبادتوں کو فلسفہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ بہر حال مشائی فلاسفہ کے اصولوں پر یہ عنوان ''فلسفۂ نماز'' کوئی با معنی عنوان ہی نہیں رہتا کہ میں تقریر میں اس کا حق ادا کر سکوں۔ ہاں دوسرا طبقہ اشراقی فلاسفہ کا ہے جو محض عقلی ڈھکوسلوں پر نہیں چلتے بلکہ کسی حد تک روشن وجدان سے بھی کام لیتے ہیں۔ یعنی یہ طبقہ محض سوچ بچار کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محنت وریاضت اور مجاہدات سے تزکیۂ نفس کر کے اپنے اندر کچھ جلا وصفا پیدا کرتا تھا اور نظر وفکر کے بجائے مراقبہ سے کام لیتا تھا تو ان پر کچھ اسرار منکشف ہو جاتے تھے، گویا وہ اس زمانے کے صوفیا تھے جنہیں فی الجملہ صوفیاء اسلام سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور ان کے فلسفہ کو زیادہ سے زیادہ مکاشفات کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں لیکن کشف محض خود کوئی حجت شرعیہ نہیں کہ اس سے مہمات دین کے بارہ میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ اس کے رد وقبول کا معیار دین اور اس کے قواعد ہیں۔ اگر کشف ان کے موافق ہے تو قبول ہے، ورنہ قابل رد...... لیکن قابل قبول ہو جانے کے بعد حجت شرعی پھر بھی نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ مؤیدات کے درجہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

پس عقل محض تو بجائے خود ہے جو مشائیہ کا فلسفہ تھا۔ کشف محض بھی مدار دمعیار شریعت نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ عقل محض سے جس کی تگ وتاز ان کائنات اور محسوسات سے آگے ہے ہی نہیں۔ اور جبکہ شرعی احکام کے اسرار کے

انکشاف سے فلاسفۂ اشراقیہ بھی عاجز رہے ہیں جن کو فی الجملہ دینی ریاضت سے قرب بھی ہے اور گویا دوسرے لفظوں میں فلسفہ محض شریعت کے آس پاس بھی پھٹک نہیں سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کے عنوان کے ساتھ یہ فلسفہ کا کلمہ کیوں بڑھایا گیا ہے اور کیوں مجھ جیسے طالب علم سے جو فلسفیت سے کوسوں دور ہے، نماز کا فلسفہ بیان کرنے کی خواہش کی گئی ہے.....؟۔

اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ جب مشائی اور اشراقی فلاسفہ بھی جن کا فلاسفہ نظری ہے، نظریات شرعیہ کے ادراک سے عاجز ہیں تو وہ فلاسفہ جن کا فلسفہ محض عملی جزئیات کے استقراء وتتبع تک محدود ہے اور وہ نظریات وکلیات میں کوئی شعور اور سلیقہ ہی نہیں رکھتے یعنی فلاسفہ یورپ تو اپنے فلسفہ سے حقائق شرعیہ کو کیا پا سکتے ہیں۔ فلاسفۂ حال کا فلسفہ درحقیقت صنعت وحرفت اور سائینٹفک ایجادات تک محدود ہے۔ عناصر اربعہ اور جمادات ونباتات یا معدنیات میں عملی ترکیب وتحلیل اور اس سے نئی صورتیں اور معیشت کے نئے نئے سامان پیدا کرتے رہنا ان کے فلسفہ کی روح ہے۔ کلّیات یا الٰہیات میں قدیم فلاسفہ کے سامنے ان کی حیثیت طفل مکتب کی بھی نہیں۔ جیسا کہ ان کی تصانیف سے واضح ہے۔

پس جبکہ نظری فلاسفہ نے بھی اس میدان الٰہیات میں سپر ڈال دی تو یہ عملی مزدور جنہیں دستکار کہنا تو صحیح مگر فلسفی کہنا فلسفہ کی توہین کرنا ہے، اس میدان میں کیا چل سکیں گے کہ ہم ان کے فلسفہ کی رو سے حکمیات شریعت کو پرکھنے لگیں۔ غرض قدماء ہوں یا متاخرین، نظری فلاسفہ ہوں یا عملی، کسی صورت سے بھی ان کے اختراعی اصول اسرار شرعیہ کو سمجھنے کے لیے معیار نہیں بن سکتے۔ کہ میں فلسفہ کے عنوان سے نماز کی حقیقت کو سامنے لا سکوں یا فلسفۂ نماز کے عنوان کی تصویب کرسکوں۔

ہاں اگر عنوان رکھا جاتا حکمت صلوٰۃ، یا حقیقت صلوٰۃ یا اسرار صلوٰۃ تو یہ ایک شرعی رنگ کا عنوان ہوتا ہے، کیوں کہ حکمت یا حقیقت، یا سر کا تعلق ان ظواہر یا حسیات سے نہیں بلکہ باطنیات اور مغیبات سے ہے اور اس حکمت کی تلاش اگر ہم کر سکتے ہیں تو نہ یہ چیز مشائیہ سے مل سکتی ہے نہ اشراقیہ سے اور نہ ہی فرنگیت سے۔ بلکہ حکمائے اسلام اور محققین دین کے یہاں ملے گی۔ جن کے قلوب بجائے اس خاکی اور مکدر عالم سے وابستہ ہونے کے غیب کے۔ لطیف عالم سے وابستہ ہیں اور ان کی روحوں کا براہ راست حق جل مجدہ کی صفات کمال سے کنکشن ہے وہ علم کے اس پاک وصاف سرچشمہ سے علمی موتی نکال کرلاتے ہیں جس میں نہ شک کی آمیزش ہے نہ تردد اور تذبذب کی بلکہ عین یقین کے پھیلے ہوئے زلال حیات سے ہے۔

بہر حال اشراقیت اور مشائیت یا فرنگیت اور بالفاظ دیگر فلسفیت یا عقلیت دین کے لیے بھی معیار نہیں بن سکتی کہ اس پر پرکھ پرکھ کر ہم دین کو قبول کریں یا اسے دینی حظ حاصل کرنے کا راستہ بنائیں۔

حتی کہ میں تو یہ دعویٰ کر چکا ہوں اور وہ اپنی جگہ ایک صحیح دعویٰ ہے، کہ یہ حکمیت یا کشف صحیح بھی دین کے رد

وقبول کا معیار نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ دین کا مبنیٰ وحی ہے اور قطعیت میں وحی کا مقابلہ سچے سے سچا کشف بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ عقل جو رات دن دھوکے کھاتی رہتی ہے اور غلط فتوے دیتی رہتی ہے۔ اس لیے عقل تو عقل سچا کشف بھی حجت شرعیہ نہیں ہے کہ اس کو دین کے ردّ وقبول یا دینی امور کے حقیقی اسرار وغوامض کی کسوٹی بنایا جا سکے بلکہ خود کشف کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار قواعد شرعیہ ہیں۔ تاہم اگر کسی حد تک دین کے حقائق میں بصیرت اور دل میں طمانیت پیدا کرنی ہو تو اس کا سراغ مشائیت اور اشراقیت یا فرنگیت سے نہیں بلکہ صرف حکمتِ اسلام سے مل سکتا ہے اور بس .... جس کا نام فلسفہ نہیں بلکہ حکمت یا حقیقت ہے۔

اس لیے نماز کے بارہ میں کسی فلسفیت میں پڑے بغیر اپنی بساط کے موافق اس مضمون کا حق ادا کرنے کے لیے حکمت یونان کے بجائے صرف حکمت ایمان کے چند نقطے اور دقیقے پیش کروں گا۔ جن کو فلسفیانہ غوامض کے بجائے حکیمانہ رموز سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے اس مضمون کا عنوان ''فلسفۂ نماز'' کے بجائے اگر حکمت صلوٰۃ رکھا جاتا تو زیادہ قرین صواب ہوتا۔

نماز کی حقیقت اور آپ کے الفاظ میں اس کا فلسفہ واضح کرنے کے لیے پہلے ایک مقدمہ اور مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے جس سے اس کی حقیقت جلد تر آپ کے سامنے آسکے گی اور وہ یہ کہ پہلے ان افراد کی حقیقت پر غور کیجیے جن پر نماز کا فریضہ عائد کیا گیا ہے یعنی خود انسان کی حقیقت کو سامنے لائیے۔ کیوں کہ نماز کی حقیقت کا تعلق خود انسان کی حقیقت سے ہے کہ جیسی حقیقت خدا نے جس مخلوق کی بنائی ہے ویسی ہی عبادت اس پر عائد کی ہے۔ ناقص الحقیقت افراد پر ناقص طاعت، کہ جو ان کے حق میں کامل ہے اور کامل الحقیقت مخلوق پر کامل عبادت جو واقع میں کامل ہے۔

پس غور اس پر کرنا ہے کہ خود انسان اپنی خلقت اور حقیقت سے کامل ہے یا ناقص۔ اگر کامل ہے تو ضروری ہے کہ عبادت بھی اس کی کامل ہو۔

سو ہم نے جہاں تک انسانی حقیقت پر غور کیا اسے ''حقیقتِ جامعہ'' پایا۔ یعنی انسان تمام کائناتی حقیقتوں کا مجموعہ اور خلاصہ ہے اور عالم میں جس قدر بھی حقائق ہیں ان سب کے نمونے اس میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ گویا ایک انسان خود تنہا ایک مستقل عالم اور پورا جہان ہے۔ اس لحاظ سے اگر پورے جہان کو عالم اکبر یا شخص اکبر کہیں گے تو اسے عالم اصغر یا شخص اصغر کہیں گے۔ کہ انسان خود ایک ایسا عالم ہے جو مجموعۂ عوالم ہے۔ چنانچہ غور کیجیے کہ عالم کائنات کی دو (۲) ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد [1] اور عالم غیب [2] عالم شہادت یہ اجسام کا عالم ہے، جو آنکھوں سے مشاہدہ اور محسوس ہوتی ہے اور عالم غیب وہ عالم ہے جو جسمانیت سے پاک ہے۔ اور آنکھوں سے اوجھل صرف دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے یعنی اس پر یقین رکھنا پڑتا ہے جیسے آسمان سے اوپر روحانیت کا عالم، ملائکہ علیہم السلام، ذات وصفات حق اور عالم اسرار غیب۔ نزول وحی، کلام الٰہی، رسالت ونبوت کا اعطاء علوم ومعارف، کمالات حق وغیرہ ہیں۔

ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ انسان میں ایک عالم شہادت ہے جو محسوس ہے، وہ بدنی عالم اور جسمانی جہان ہے جس

میں گوشت پوست، ہڈی، چہرہ، اعضاء بدن اور اجزاءِ زمین شامل ہیں۔ ایک عالم غیب ہے جو آنکھوں سے محسوس نہیں جیسے روح انسانی کہ اس میں علوم کے سرچشمے ہیں، صفات کمال۔ جواس خمسہ اور مشاعر ادراک وغیرہ ہیں۔

پھر جیسے اس دنیا کے عالم شہادت میں دو (۲) حصے ہیں۔ سفلیات 1 جیسے زمین اور ان کے سبزہ زار دریا اور پہاڑ وغیرہ اور علویات 2 جیسے آسمان، چاند سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں بھی (۲) دو حصے ہیں۔ ایک فوقانی حصہ ہے جس میں دماغ اور قلب ہے کہ یہی اس کے علویات ہیں اور دوسرا تحتانی حصہ ہے جس میں مختلف حسی اعمال وحرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں جیسے ہاتھ پاؤں پیٹ اور پیٹھ وغیرہ۔ پھر جیسے زمین کے سفلیات میں حسی مادوں کی کار فرمائی ہے یعنی عناصر اربعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کہ عالم جسمانی کی بنیاد ہی ان مادوں پر قائم ہے اور علویات میں معنوی مادوں کی کارگزاری ہے۔ جیسے علوم ومعارف تدبیر وتصرف، رحمت وغضب وغیرہ ٹھیک اسی طرح انسان کے سفلیات یعنی بدن میں بھی ان ہی چاروں کے اثرات، حرارت، برودت، یبوست ورطوبت کارفرما ہیں کہ اس بدن کی بنیاد ہی ان عناصر اربعہ پر ہے اور اس کے علویات یعنی قلب ودماغ میں حواس خمسہ اور قوائے علوم وادراکات اور بدن کی تدبیر وتصرف کی قوتیں ودیعت شدہ ہیں۔ وہاں قہر بھی ہے اور مہر بھی رحمت بھی ہے اور غضب بھی۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی بجنسہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔ چنانچہ جیسے زمین ایک تودۂ خاک ہے ایسے انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے کہ یہ بنا ہوا مٹی سے ہے۔ بدن پر سے میل کچیل جھڑتا ہے، وہ مٹی کے سوا اور کیا ہے۔ پھر جیسے زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول وعرض اور عمق سب ہی کچھ ہے کہیں اونچ ہے اور کہیں نیچ۔

ایسے ہی انسان کے بدن میں بھی اونچ نیچ، گہرائی اور اونچائی سب ہی کچھ موجود ہے، پھر جیسے زمین کے نیچے رطوبات اور پانی بھرا ہوا ہے کہ ذرا زمین کھودی تو تری نکلنی شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کی زمین بھی ہے کہ اس کے نیچے بھی رطوبات ہیں۔ ذرا بدن کاٹ دو تو خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے، سفید، سیاہ، سرخ، زرد، ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے، مستور حصے جیسے زیر بغل، کنج ران سیاہ ہے، چہرہ پر سرخی رہتی ہے، ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے اور پوری نوع بشری پر نگاہ ڈال لو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد، عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پس نوع انسانی میں بھی ہر رنگ کے افراد موجود ہیں اور ہر ہر فرد کے بدن پر بھی مختلف رنگوں کا تفاوت ظاہر ہے، پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے جو تفریح گاہ ہوتا ہے اور کوئی گندہ ہے جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں۔ ایسے ہی بدن انسانی کا کوئی حصہ تو ایسا لطیف اور صاف وستھرا ہے کہ اسے عزت سے چومتے ہیں جیسے چہرہ اور ہاتھ اور کوئی حصہ گندہ ہے جیسے زیر بغل اور اعضائے نجاستہ یا معدہ کہ کوڑیوں کی جگہ ہے۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات وکیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کو لو تو جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی ہر جگہ حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اس حرارت غریزی وطبعی پر ہی انسانی زندگی قائم ہے۔ پھر جیسے پتھروں اور مٹی یا لوہے کو رگڑنے سے آگ نمایاں ہونے لگتی ہے، ایسے ہی اگر انسانی بدن سے بدن یا ہاتھ سے ہاتھ رگڑنے لگے تو آگ نکلنے لگتی ہے اور بدن کا وہ حصہ خوب گرم ہو جاتا ہے اور جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات کا، یعنی سورج کا، اگر سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں چنانچہ جہاں سورج کی گرمی پوری نہیں پہنچتی یا دیر تک نہیں پہنچتی۔ وہاں کی چیزیں سیل جاتی ہیں اور نمناک ہو کر جھڑنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن میں بھی حرارت فیض ہے "علویات" کا یعنی قلب ودماغ کا، قلب ہی وہ حرارت غریزی تیاری کرتا ہے جو عروق میں بہ صورت بخار پھیلتی ہے اور روح ہوائی کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے یا اگر قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کو لو تو جیسے اقلیم عالم کے گوشہ گوشہ میں پانی زمین میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی بدن انسان میں بھی رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے جو بدن کاٹتے ہی نکلنا شروع ہو جاتا ہے پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں، کوئی بڑا دریا ہے کوئی چھوٹا۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں رگیں اور عروق ہیں اور یہ بڑی چھوٹی نہریں بہہ رہی ہیں جن سے اقلیم بدن سیراب ہو رہی ہے۔ پھر جیسے زمین میں ماء جاری کے علاوہ "ماء راکد" یعنی ٹھہرا ہوا پانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے تالاب یا دونگڑے جو بھرے پڑے رہتے ہیں۔ ایسے بدن انسانی میں بھی دونگڑے ہیں جیسے معدہ کہ اس میں پانی ٹھہرا رہتا ہے، پھر جیسا کہ زمین میں مختلف چشمے جاری ہیں کسی کا پانی شیریں ہے کسی کا شور اور نمکین ہے کسی کا تلخ اور کڑوا ہے اور کسی کا ترش ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی مختلف المذاق چشمے جاری ہیں۔ منہ سے آب شیریں کا چشمہ جاری ہے اگر وہ تلخ ہوتا تو منہ ہر وقت کڑوا رہتا اور زندگی تلخ ہو جاتی، آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے جس کا نمکین پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ آنسو منہ میں چلا جاتا ہے تو نمک کا مزا آنے لگتا ہے۔ پتے سے کڑوا پانی چلتا ہے اگر وہ اپنے مستقر کو چھوڑ کر سارے بدن میں بہہ جائے تو سارا گوشت پوست بھی تلخ ہو جائے معدے سے ترش پانی چلتا ہے۔

چنانچہ ڈکار کے ذریعے اگر کبھی معدہ چھلک پڑتا ہے اور پانی منہ میں آجاتا ہے تو اس میں کافی ترشی اور کھٹیذ ہوتی ہے جس سے سارا منہ کھٹا ہو جاتا ہے غرض انسان میں ہر ذائقہ کا پانی اور اس کے چشمے موجود ہیں۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت وبرودت کے غلبہ یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں اور کہیں کا جما ہوا، جیسے بحر منجمد شمالی اور بحر منجمد جنوبی۔

ایسے ہی انسانی بدن میں کچھ تو چشمے جاری ہیں جیسے تھوک، سنک آنسو وغیرہ اور کچھ منجمد ہیں جیسے بلغم کہ کبھی وہ سینہ پر جمتا ہے کبھی دماغ میں۔ پھر دنیا میں کہیں کے چشمے پینے کے قابل ہوتے ہیں اور کہیں گندہ پانی بہتا ہے، جن سے سب نفرت کرتے ہیں جیسے گندے نالے وغیرہ۔ ایسے ہی بدن انسانی میں ایک تو منہ سے چشمہ جاری ہے جو ہر وقت پیا جاتا ہے اور ایک پیشاب یا سنک ہے جو گندہ پانی کو یا گندی نالی سے بہتا ہے، وہ رک جائے تو اور زمین بھی

خراب ہو جائے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے بہتے ہیں جیسے ٹھنڈے پہاڑوں پر اور کہیں گرم چشمے بھی بہتے ہیں، جہاں گندھک کا زور ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے زبان سے اور گرم پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے آنسو یا پیشاب کہ وہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

اور جیسا کہ زمین پر بعض جگہ ایسا مرج البحرین ہے کہ ایک ہی دریا میں ایک حصہ شیریں پانی ہے اور اسی سے ملا ہوا۔ دوسرا حصہ شور و تلخ ہے: ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ ① ایسے ہی بدن انسانی میں دماغ کو دیکھو کہ قوت ذائقہ جس سے شیریں چشمہ جاری ہے۔ اور قوت باصرہ جس سے نمکین چشمہ جاری ہے دونوں الگ الگ اور آپس میں بون بعید رکھتی ہیں۔ ایک کا دریا شیریں اور ایک کا نمکین لیکن اس کے باوجود پھر بھی دونوں دماغ کی حس مشترک میں جمع ہیں اور منبع ومخزن دونوں کا ایک ہی ہے۔ گویا چشمہ ایک ہی ہے مگر ایک حصہ تلخ ہے اور ایک شیریں۔ پھر جیسے عالم میں برسات ہوتی ہے کہ ہر ہر خطہ میں پانی ٹپکتا ہے، زمین ہی سے مانسون (مون سون) چڑھتا ہے۔ اور زمین ہی پر برس پڑتا ہے۔ ویسے ہی بدن انسانی میں بھی برسات ہوتی ہے کہ پسینہ ہر ہر جگہ ٹپکتا ہے بدن سے ابھرتا ہے اور بدن ہی پر برس پڑتا ہے، اور جیسے وہاں برسات کا موسم ہے کہ پانی اس میں خوب برستا ہے۔ دوسرے مواسم میں کبھی کبھی برس جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کی برسات کا موسم بھی وہی عالم اکبر کی برسات کا زمانہ ہے کہ خوب پسینہ بہتا ہے اور یوں ہر موسم میں تھوڑا بہت پسینہ آتا ہی رہتا ہے، غرض پانی کے جتنے ڈھنگ جتنے رنگ اور جتنی انواع شیریں، تلخ، نمکین، پاک ناپاک، جاری، راکد، نازل، مخلوط، غیر مخلوط، گرم و سرد زمین پر ہیں اتنی ہی انواع خود انسان میں بھی ہیں۔

ہوا کو لو تو جیسے اس بڑے عالم کے ہر ہر خلا میں ہوا بھری ہوئی ہے ایسے ہی انسان میں بھی جتنے خلا ہیں وہ بھی ہوا سے پر ہیں اور پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں بھی چلتی ہیں۔

چنانچہ سانس کی آمد و رفت اس کی شاہد ہے، پھر جیسے کرۂ ارض پر نسیم اور صبا یا پروا اور پچھوا، ٹھنڈی اور گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ایسے ہی انسان میں سانس کے راستہ جو ہوا اندر جاتی ہے وہ نسیم ہے اور جو باہر آتی ہے وہ صبا ہے۔ جانے والی سرد ہے اور اندر سے آنے والی گرم ہے۔ پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو ہوا خوشبودار اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین میں کبھی تو حبس اور گھونٹ ہو جاتا ہے جس سے جی گھبرانے لگتا ہے اور کبھی آندھیاں چلتی ہیں جس سے جہان الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے ایسے ہی انسان میں کبھی حبس ہوتا ہے، ریاح بند ہو جاتی تو آدمی کا قلب پریشان ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی سانس اکھڑ جاتا ہے یا دوڑنے کے سبب سانس چڑھ جاتا ہے تو سانس کی ہوا آندھی کی مثل اندر باہر سے بشدت تمام چلنے لگتی ہے، جس سے سارا آدمی ہی الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے اور جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا بالکل کھینچ لی جائے تو یہ سارا عالم ختم

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان: الآیۃ: ۵۳.

ہو جائے، ایسے ہی اگر انسان میں سے سانس سرے سے نکل جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔

غرض ہوا کی بھی جس قدر انواع زمین میں وہ سب کی سب انہی نمونوں اور انہی کیفیات کے ساتھ انسانی عالم میں بھی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عناصر اربعہ کی جو کیفیت اس بڑے عالم میں ہے بجنسہٖ اس چھوٹے عالم میں بھی ہے اور جن جن اندازوں سے اس پورے جہان میں عناصر کی کارفرمائی ہے، اسی انداز سے تنہا انسان میں بھی ہے جس میں سرمو فرق نہیں پڑتا۔

انسانی بدن کے جمادات ...... پھر جیسا کہ ان عناصر اربعہ سے زمین پر موالید ثلاثہ پیدا ہوتے ہیں یعنی جمادات، نباتات، حیوانات، ٹھیک اسی طرح انسان میں بھی یہ تینوں موالید موجود ہیں، جمادات کو دیکھو تو مٹی پتھر اور ریت وغیرہ سب انسان میں ہیں۔ یہ ہڈیوں کا سلسلہ انسان میں پہاڑی سلسلہ ہے، گویا بدن کے پتھر ہیں، کوئی چھوٹا پہاڑ ہے کوئی بڑا اور پوری اقلیم تن میں یہ سلسلہ اسی طرح پھیلا ہوا ہے جس طرح پوری زمین پر کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے۔ پھر بعض اوقات تو انسان میں سے یہ متعارف پتھر اور ریت اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ بھی نکلنے لگتے ہیں۔ جیسے گردہ میں سے پتھریاں آنے لگتی ہیں اور مثانہ میں سے ریگ آنے لگتا ہے۔ جنہیں دواؤں یا اپریشن کے ذریعہ خارج کیا جاتا ہے، پھر جس طرح ان پہاڑوں پر مٹی جمی ہوئی ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں ہڈیوں پر گوشت چڑھا ہوا ہے۔ جو خاک کے ان تودوں کے ان پہاڑیوں پر چھایا ہوا ہے۔ پھر جیسے زمین اور پہاڑوں کے بعض حصے گرم ہوتے ہیں اور بعض سرد۔ ایسے ہی انسانی بدن کے بعض حصے بہت گرم ہوتے ہیں جیسے مستور حصے اور بعض حصے سرد ہوتے ہیں۔ جیسے سطح بدن کے تمام نمایاں حصے۔

پھر جیسے زمینی پہاڑ کے بعض حصے واجب الاحترام ہیں جیسے مقامات مقدسہ کہ ان کی زیارت کی جاتی ہے اور محبت وآداب سے انہیں چوما جاتا ہے اور بعضوں سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی اقلیم میں بھی ایسے ہی دو (۲) حصے ہیں۔ بعض قابل زیارت ہیں جیسے چہرہ مہرہ کہ اس کی زیارت کے لیے سفر کیے جاتے ہیں اور ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے، دست بوسی کی جاتی ہے اور بعض حصے قابل کرامت ہوتے ہیں جن کو دیکھنا بھی شرعاً وعقلاً ننگ و عار سمجھا جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین کے بہت سے حصے مستور ہیں کہ جن کو دیکھنے کی کوشش کرنا عبث سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی بہت سے اعضاء ہیں جنہیں دیکھا جا سکتا ہے جیسے پیٹ اور پیٹھ وغیرہ مگر اس کی کوشش کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔

انسانی بدن کے نباتات ...... پھر جیسے پہاڑیوں اور عام خطہ ہائے زمین میں اگانے کی خاصیت ہے اور اس پر بھی طرح طرح کے نباتات اگتے رہتے ہیں، ایسے ہی اس اقلیم تن کے ہر ہر خطہ میں نباتات کا سلسلہ بھی قائم ہے جیسے بدن پر اون اور اگے ہوئے بال ہیں۔ اور جیسے زمین کے خطوں میں کہیں گھنا جنگل ہے کہیں چھیدا۔ ایسے ہی بدن پر کہیں گھنے بال ہیں جیسے سر اور منہ پر اور کہیں چھیدے بال ہیں جیسے عام بشرۂ بدن پر ہیں۔ اور جیسے زمین میں

بعض ایسے ہیں جو برابر نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں، نہ بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں۔ جیسے پہاڑی خودرو سبزہ اور درخت۔ ایسے ہی بدن انسانی میں سر ڈاڑھی اور مونچھ وغیرہ کے بال وہ ہیں جو بڑھتے رہتے ہیں لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں وہ ہے جو ہمیشہ یکساں حالت پر رہتا ہے۔ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں بعض مقامات مثل جھاڑ جھنکاڑ کے ہوتے ہیں جنہیں صاف کئے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی اور وہ پاک نہیں ہوتی اور بعض حصے ایسے ہیں جنہیں قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ زمین کا حسن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بدن میں بھی بعض رواں ایسا ہے جس کا صاف کرنا ہی زمین تن کی مصلحت ہے جیسے موئے بغل اور موئے زہار کہ یہ بودار جھاڑیاں ہیں۔ اور بعض کا رکھا جانا ہی حسن بدن ہے جیسے موئے سر اور موئے رخ۔ اور جیسے دنیا کے پالے ہوئے باغوں میں جب تک کہ مالی کاٹ تراش نہ کرتا رہے ان کا حسن وکمال باقی نہیں رہ سکتا بلکہ وہ اور زمین ہی کو بدنما کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی باغ بدن میں ایسے نباتات ہیں جن کی اصلاح اور کتر بیونت ہی سے بشرہ قائم ہوتا ہے جیسے موئے ریش اور موئے شوارب (مونچھ) ان کی کاٹ تراش اور اصلاح ہی سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انسانی بدن کے حیوانات ...... پھر جیسے جنگلوں اور پہاڑوں میں مختلف قسم کے حیوانات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے نشیمن میں رہتے ہیں اور چرتے پھرتے ہیں۔ زمین کی رطوبات ان کی غذا ہوتی ہے ایسے ہی انسانی جہان کی اس نباتات میں بھی طرح طرح کے جانور پیدا ہوتے ہیں جیسے سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدہ میں ریسمانی کیڑے وغیرہ جو بدن ہی کے خون کو چوستے ہیں اور پلتے ہیں۔

اور جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں حشرات الارض رہتے ہیں جن کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن کے اندر لاکھوں حوینات ہیں۔ جو خوردبین سے نظر آتے ہیں جن کی ہیئتیں مختلف اور شکلیں رنگ برنگ ہیں جنہیں جراثیم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی رو سے خون کی ہر ہر بوند میں کروڑہا جراثیم تیر رہے ہیں جو خوردبین سے تیرتے نظر آتے ہیں۔

پھر جیسے دنیا کا ہر ہر خطہ اور ہر ہر اقلیم ایک نئی شان رکھتی ہے اور وہاں کے جانور مختلف ہوتے ہیں ایسے ہی جدید تحقیقات کی رو سے ہر ہر حصہ بدن کے جراثیم کی شکلیں بھی جداگانہ ہیں اور خاصیتیں بھی الگ الگ ہیں ان سے امراض بھی نئی نئی قسم کی پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹری اصول پر خون نکال کر ٹیسٹ کیا جاتا ہے تو ہر حصۂ بدن کے خون میں سے نئی نئی شکل وشمائل کے جراثیم نظر آتے ہیں۔

بہرحال جیسے زمین کے اوپر رنگ برنگ حیوانات ہیں اور اندر مختلف الہیئۃ حشرات الارض۔ ایسے ہی انسان میں ظاہر بدن پر بھی حوینات پیدا ہوتے ہیں، اور قعر بدن میں بھی موجود ہیں اور جیسے زمین کی مخلوقات یہیں پیدا ہوتی ہیں اور مر کر یہیں دفن ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی یہ جراثیم بھی بدن ہی میں پیدا ہوتے ہیں، اسی میں پلتے ہیں اور مر کر اسی زمین بدن میں دفن ہو جاتے ہیں۔

انسانی بدن میں زلزلے اور طوفان وغیرہ...... عوارض واحوال کو لو تو زمین میں کبھی کبھی زلزلے آتے ہیں جس سے ساری زمین خود بخود حرکت میں آجاتی ہے۔ ایسے ہی بدن میں جھرجھریاں آجاتی ہیں جن سے پورا بدن اچانک اور ایک دم متحرک ہوجاتا ہے۔ وہاں زلزلے کا سبب زمین کے اندر کی حرکات کا بھڑ کنے کے لیے زور کرنا یا کسی اندرونی کوہ آتش فشاں کا پھٹنا کہا جاتا ہے، یہاں بھی اندرونی گرمی یا بھڑ کاہٹ سے دل پریشان ہوجاتا ہے یا کسی غیر متوقع حادثہ سے دل ایک دم گھبرا اٹھتا ہے۔ اور اس گھبراہٹ ہی سے ایک دم پورے بدن میں جھرجھری آجاتی ہے۔

پھر جب زمین پر کبھی طوفان سے غیر معتدل طور پر پانی زیادہ بہنے لگتا ہے، غیر معتدل طور پر کبھی خشکی اور قحط سالی نمایاں ہوجاتی ہے کہ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے غیر معتدل طور پر کبھی آگ برستی ہے کہ ذرہ ذرہ گرما جاتا ہے اور غیر معتدل طور پر کبھی آندھیاں اٹھتی ہیں جن سے گردوغبار اڑ کر دنیا کی فضا کو مکدر کردیتا ہے اور سارا عالم اس سے بھرپور نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی کبھی غیر معتدل طور پر پانی کا طوفان آتا ہے تو امراض مائیہ مثل زکام ونزلہ وغیرہ رونما ہوتے ہیں کہ ناک آنکھ ہر طرف سے پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی غیر معتدل طور پر یبوست کا غلبہ ہوتا ہے تو خارش شروع ہوجاتی ہے اور سارے بدن پر سے مٹی اور بھوسی جھڑنے لگتی ہے۔

کبھی غیر معتدل طور پر حرارت کا غلبہ ہوتا ہے تو امراض حارہ مثل بخار وسرسام وغیرہ ہوتے ہیں کہ بدن کی رگ رگ گرما جاتی ہے اور تپتی دکھائی دیتی ہے، کبھی غیر معتدل طور پر ہوائی مادہ بڑھتا ہے تو اورام بدن کو گھیر لیتے ہیں اور ساری اقلیم بدن پھولی ہوئی نظر آتی ہے۔

غرض عناصر کے غیر معتدل غلبہ سے جو غیر معتدل آثار اقلیم عالم میں آتے ہیں وہی اقلیم بدن میں بھی رونما ہوتے ہیں۔ پھر جیسے عالم پر کبھی کبھی ایسا دور بھی گذرتا ہے کہ اس میں عقل وحکمت کی کمی اور شہوات وغفلات کی زیادتی ہوجاتی ہے۔ جس سے خود انسان انسانوں کے حق میں وبال بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنگ وجدل اور ایذاء رسانیوں کی گرم بازاری ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی بعض دفعہ ایسے بحرانی امراض پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے ہی بدن کو نوچنے اور اپنے ہی اعضاء کو کاٹنے لگتا ہے۔ کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے اور اسے اچھے برے کی کچھ خبر نہیں رہتی اور جیسے ان حالات اور عام اوقات میں زمین پر بادشاہت کام کرتی ہے، عام رعایا کی طاقت سے نظم ملک باہر ہوتا ہے نیز بادشاہ کے لیے وزراء اور جنود وعساکر ہوتے ہیں جو نظام ملک قائم رکھنے میں اس کے مددگار ہوتے ہیں ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے جس کے حکم پر یہ ساری کائنات چلتی ہے۔ دماغ اور اس کے حواس وزیر ومشیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے جس سے مادی رزق ساری اقلیم میں تقسیم ہوتا ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں جن کی مدد سے ملک بدن کا نظم درست کیا جاتا ہے اور عام غیر معتدل حالات میں عملی تدبیر کی جاتی ہے۔ غرض انسانی بدن میں مادی عوارض بھی بعینہٖ ویسے ہی ہیں جیسے کہ مادہ کی اس بڑی کائنات کے ہیں۔

علویات وفلکیات...... اب ارضیات کے بعد فلکیات یا سفلیات کے بعد علویات کو لو، انسان میں علویات کی

بھی وہی تفصیل ہے جو اس کے باہر کے آسمان پر ہے۔ آسمان پر چاند اور سورج ہیں کہ جن سے عالم میں روشنی ہوتی ہے۔ یہاں اقلیم کے بدن آسمان یعنی سر میں (۲) دو آنکھیں ہیں جو مثل چاند اور سورج کے روشن ہیں کہ ان ہی سے جہان میں چاندنا (روشنی) ہے اور اچھی بری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں ستارے ہیں جن سے لوگوں کو رستہ ملتا ہے اور راستوں کی راہنمائی ہوتی ہے۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کی بینات ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں، گویا ہزار نظریات آسمان دماغ کے ستارے ہیں جو ہدایت کی راہ استوار کرتے ہیں۔ اور جیسے ستارے دنیا میں مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں۔ جڑی بوٹیوں اور مزاجوں میں مختلف گرم وسرد اثر ڈالتے ہیں ایسے ہی آسمان دماغ کے یہ فکری ستارے بدن پر اچھے برے اثر ڈالتے ہیں۔

فکر غم ہے تو بدن گھلنے لگتا ہے۔ فکر مسرت ہے تو بدن تروتازہ ہو جاتا ہے اور عملی قوت بڑھ جاتی ہے حتی کہ مزاج تک بدل جاتے ہیں۔ پھر جس طرح آسمانوں کے اوپر عالم غیب میں جنت ہے جس میں سوائے مسرت واطمینان کے کسی غم کا نشان نہیں اور غیب ہی میں جہنم بھی ہے کہ وہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں اسی طرح انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات مثل جہنم کے ہیں۔ کہ انسانی نفس ہر وقت کوفت اور کلفت کا شکار رہتا ہے اور آثار فرح وسرور اور بشاشت وطمانیت مثل جنت کے ہیں کہ ان میں منہمک ہو کر انسانی نفس مگن اور دنیا ومافیھا سے بے فکر ہو جاتا ہے، غرض جیسے جنت مجموعۂ لذات ہے ایسے ہی انسان کا باطن بھی مجموعۂ لذات ہے اور جیسے جہنم مجموعۂ آفات ہے، ایسے ہی باطن انسان بھی مجموعۂ آفات ہے۔

پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے جس پر خالق کی تجلیات کا بلا واسطہ دور دورہ ہے۔ اسی طرح یہاں تمام فوقانی اشیاء اور علویات سے بالاتر آدمی کا لطیفۂ قلب ہے، جو تجلی گاہ ربانی ہے یعنی فلکیات بدن کا عرش۔

اور جیسے آسمان میں فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں کہ ان میں عصیان کا نشان نہیں اور وہی مدبرات امور ہیں ایسے ہی انسانی آسمان یعنی دماغ میں حواس خمسہ ہیں جو اقلیم بدن کی مخفی خدمات ملائکہ کی طرح انجام دیتے ہیں اور مدبرات بدن ہیں اور قلبی احکام کے سامنے ان میں عصیان کا نشان نہیں۔ بلکہ قلب کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مثلاً قلب نے دیکھنے کا اشارہ کیا تو اسے آنکھ کو حکم دینے کی ضرورت نہیں بلکہ آنکھ قلب کا ایما پاتے ہی مصروف دیدار ہو جاتی ہے۔ ذرا بھی عصیان نہیں کرتی کان قلبی اشارہ سے مصروف شنید ہو جاتے ہیں۔ نام کو عصیان نہیں کرتے اسی طرح تمام حواس خمسہ کو سمجھ لیا جائے اور پھر جیسے آسمان کے نیچے اس غیبی عالم میں شیاطین بھی ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے کبھی نہیں جھکتے بلکہ خود گمراہ ہو کر پوری کائنات کو بھی گمراہ کر دینا چاہتے ہیں اور معاصی کو طرح طرح کی مزین صورتوں میں پیش کر کے عالم کے سامنے قابل قبول بناتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی اقلیم بدن میں آسمان دماغ کے نیچے انسان کا نفس ظلمانی مثل شیطان کے ہے اور ہوا وہوس وساوس اس کے آلات کار ہیں کہ نہ وہ اپنی جبلت سے قلب کی صلاح مانتا ہے نہ اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ بلکہ ہمیشہ

فانی لذات میں منہمک ہوکر ساری اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا رہتا ہے۔ معاصی اور اسراف عمل کی صورتیں خوب لذیذ بنا کر آدمی کے سامنے کرتا رہتا ہے اور آدمی عاجل لذات اور فانی صورتوں کی رنگینیوں پر فریفتہ ہوکر ان میں منہمک ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کی عارضی لذت ضرور مل جاتی ہے مگر انجام کی ندامت وپشیمانی اور بعد کا بھگتان مفت میں سر پڑ جاتا ہے جس کا پھر کوئی تدارک نہیں ہوتا۔ بس انسانی کائنات میں جیسے جنت ونار تھی ویسے ہی ملائکہ وشیاطین کے نمونے بھی نکلے۔ غرض فرش خاک سے لے کر عرش پاک تک مخلوقات کے جتنے رنگ ڈھنگ، ان کے احوال وعوارض کے جتنے اتار چڑھاؤ اور جس قدر بھی احوال وکیفیات ہیں خواہ وہ عنصریات کے ہوں یا مجرورات کے، حیوانوں کے ہوں یا نباتات وجمادات کے، سفلیات کے ہوں یا علویات، ارضیات کے ہوں یا فلکیات، حسیات کے ہوں یا حقائق کے، سب ہی کے نمونے انسان میں موجود ہیں۔ اور یہ انسان مخلوقات کے تمام نمونوں کا جامع ہوکر گویا مجموعۂ مخلوقات یا خلاصۂ کائنات ہے۔

انسان میں کمالات خالق کے نمونے ...... لیکن اگر اور عمیق نگاہ ڈالو اور فکر کو گہرائی کی طرف لے جاؤ تو اس مشت خاک میں ایک مخلوقات ہی کے نمونے نہیں بلکہ خالق جل وعلا کے کمالات کے بھی سارے ہی نمونے ودیعت کیے گئے ہیں اور جس طرح وہ مجموعۂ انواع واحوال مخلوقات ہے۔ اسی طرح ازسرتا پا مظہر تجلیات الٰہی بھی نظر آتا ہے۔ گویا اگر انسان کا عالم شہادت یعنی بدن حسیات کے تمام نمونوں کا مرکز ہے تو اس کا عالم غیب اور غیب الغیب یعنی لطیفۂ روح معنویات اور روحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔ اور جو رنگ اللہ کی تدبیر وتصرف، علم وخبر، حکمت وصنعت، ایجاد وابداع اور پھر قدوسیت وتنزہ کا ہے وہی انسانی روح کا بھی ہے، چنانچہ اگر ساری کائنات کے لیے وہ ذات بابرکات مدبر اور حکیم ہے جو اپنی حکمت وقدرت سے عالم کو سنبھالے ہوئے ہے کہ اگر ذرا رخ ہٹائے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

ایسے ہی روح انسانی اس بدن سے اپنا رخ پھیر لے تو یہ ساری بدنی اقلیم بے جان ہوکر گل سڑ جائے اور جیسے ان تمام مختلف رنگ جہانوں کے لیے وہی ایک مدبر ہے، جس کے ساتھ کوئی دوسرا سہیم وشریک نہیں۔ ایسے ہی بدنی عالم کے لیے صرف ایک ہی روح مدبر بدن ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری روح سہیم وشریک نہیں۔

اور جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود نگاہوں سے اوجھل اور بصری ادراک کے احاطہ سے بالاتر ہے۔ ایسے ہی روح انسانی بھی باوجود متیقن ہونے کے خود یقین کنندوں کی نگاہوں سے اوجھل اور احاطۂ بصر سے باہر ہے اور جیسے وہ خالق یکتا عالم کو نئی نئی صورتیں دیتا رہتا ہے مگر خود صورت سے پاک ہے ایسے ہی روح انسانی بدن کو طرح طرح کی حرکاتی ہیئتیں دیتی رہتی ہیں، مگر خود ہر قسم کی ہیئت وصورت سے پاک ہے۔ پھر جیسے خالق اکبر نے باوجود یکہ عالم کو بوقلمون رنگینیاں اور رنگ برنگ کے جلوے دے رکھے ہیں مگر خود ہر رنگ سے پاک ہے۔ ایسے ہی روح انسانی بدن کو تو طرح طرح کی رنگینیاں اور تازگیاں دکھلاتی رہتی ہے مگر آج تک اس کا رنگ کسی نے

نہ پایا کہ اس کی لطافتوں میں رنگ و بو کا نشان ہی نہیں۔

پھر جیسے خالق اکبر باوجودیکہ عالم کے ذرہ ذرہ میں جلوہ فرما ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ سمایا ہوا ہے مگر کوئی اشارہ کر کے نہیں بتلا سکتا کہ وہ ادھر ہے یا ادھر؟ ایسے ہی روح بھی بدن کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ لیکن اگر بدن کی گہرائیوں میں گھس کر بھی کوئی یہ چاہے کہ اشارہ کر کے بتلا دے کہ روح وہ بیٹھی ہے یا فلاں کونے میں ہے تو نہیں بتلا سکتا اور اس اقرار کے سوا چارہ نہ دیکھے گا کہ وہ ہر کونہ میں اور بدن کے ہر ہر رگ و ریشہ میں ہے۔ تو پھر جیسے وہ ذات، بابرکات باوجودیکہ ہر مخلوق سے تعلق رکھتی ہے لیکن پھر بھی اس کے تعلقات کی نوعیتیں الگ الگ ہیں۔ جو تعلق اسے عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں، جو بیت اللہ سے ہے وہ عام مساجد سے نہیں۔ جو معابد سے ہے وہ عام مواطن سے نہیں۔ اسی لئے قوی التعلق مقامات میں عظمت وقوت کے جو آثار ہیں وہ ضعیف التعلق مقامات کو حاصل نہیں۔ چنانچہ اگر وہ نقطۂ تعلق جسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں دنیا میں باقی نہ رہے تو عالم ہی باقی نہ رہے گا۔ ایسے ہی روح کا تعلق گو ساری ہی اقلیم بدن سے ہے مگر جو اس جہان کے عرش یعنی قلب سے ہے وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ سے ہے وہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے نہیں اور جو اعضائے رئیسہ سے ہے وہ اعضائے مرؤسہ سے نہیں۔ اس لیے روح کے جو آثارِ حیات قلب میں ہیں وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ میں ہیں وہ دوسرے اعضاء میں نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر قلب تک ذرا بھی کوئی برا اثر پہنچ جائے تو زندگی کی کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دماغ میں اگر چوٹ پڑ جائے تو حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ بخلاف دوسرے اعضاء کے جیسے ہاتھ پیر کہ اگر کاٹ بھی دیئے جائیں تب بھی زندگی ختم ہو جانا ضروری نہیں اور سب سے نازل درجہ کا عضو ایڑی کہ اگر اسے کاٹ بھی دیں تو قطع حیات تو بجائے خود ہے، تکلیف کی کوئی شدت نہیں ہوتی اور اس سے بھی گرے ہوئے اجزاء بال یا ناخن ہیں کہ اگر وہ کاٹ دیئے جائیں تو سرے سے کوئی اذیت وکلفت ہی آدمی کو نہیں پہنچتی۔

پس روح کے تعلق کی قدر ہی اعضاء بدن میں آثارِ حیات ہیں اور بقدر آثار ہی اعضاء کو راحت وکلفت ہوتی ہے۔ پس جو نوعیت تعلق مع اللہ کے درجات ومراتب کی اجزائے عالم کے ساتھ ہے۔ وہی نوعیت روح کے تعلق کی اعضائے بدن کے ساتھ بھی ہے۔ پھر جس طرح عالم میں کتنا ہی شر ہو اور گندگی اچھلے لیکن اس ذات اقدس کی پاکیوں تک برائی کی رسائی نہیں ''وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ'' ایسے ہی نفسانی غلاظتیں کتنی ہی اچھلیں مگر روح کی پاکی تک کسی کدورت وغلاظت کا اثر نہیں پہنچتا، وہ اسی طرح لطیف غیر مرئی اور حاکم ومتصرف رہتی ہے۔

پھر جیسے حق تعالیٰ کی صفت دایت وارشاد ہے جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کائنات کو مضرات مادی وروحانی سے بچانے کے لیے اپنے ملائکہ مقربین کو مامور فرماتا ہے وہ قاصد بن کر بنی آدم کے منتخب اور جوہر افراد حضرات انبیاء علیہم السلام کے پاس علم الٰہی لے کر اترتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اپنے بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی کرتے ہوئے انہیں راہ ہدایت دکھاتے ہیں جس سے سعید انسان سعادت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح روح کی صفت بھی

ارشاد و ہدایت ہے اس نے بھی اس کائنات بدن کی اصلاح کے لیے اپنے کچھ قاصد مقرر کیے ہوئے ہیں جو اس کے علمی خزانے ہیں اور وہ مشاعر ادراک اور حواس خمسہ میں یعنی دیکھنے سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں۔

وہ ملائکہ کی طرح دماغ کے عالم غیب میں مخفی اور مستور رہتی ہیں۔ یہ قوتیں اپنے اپنے متعلقہ اعضائے ظاہری پر اترتی ہیں اور انہیں اپنا جلوہ گاہ بناتی ہیں گویا روح یہ طاقتیں حساس اعضاء پر جو تمام اعضائے بدن میں منتخب اور برتر ہیں القاء کرتی ہے۔ مثلاً حاسہ بصر آنکھ پر، حاسۂ سمع کان پر، حاسۂ شم ناک پر، حاسۂ نطق زبان پر اور حاسۂ لمس ومس عام اعضاء پر، مگر بتفاوت اور پھر حاسۂ فہم، قلب پر، یہ اعضاء ان مختلف طاقتوں کے ذریعے پوری کائنات بدن کی حفاظت کرتے ہیں اور جلب منفعت و دفع مضرت کی مہمات انجام دیتے ہیں۔ اگر کائنات بدن ان کے علم پر صحیح صحیح چلتی ہے تو محفوظ رہتی ہے ورنہ ہلاکتوں کے گڑھوں میں جا گرتی ہے۔ پس قوائے احساس دماغ کے غیب میں جو اس کائنات بدن کا فوق اور سما ہے بمنزلہ ملائکہ کے ہیں۔ اور ان قوتوں کے مظاہر یعنی وہ اعضاء جن کے ذریعے یہ قوتیں نمایاں ہوتی ہیں بمنزلہ انبیاء کے ہیں۔ پس جیسے ذات بابرکات کے کچھ پیغامبر ظاہر ہیں ایسے ہی روح کے بھی کچھ قاصد باطنی اور کچھ ظاہری نکلے۔ اور گویا رسالت و نبوت کا سلسلہ کائنات بدن میں بھی جاری ہوا۔ اور جیسے انبیاء کرام علیہم السلام جنس بنی آدمؑ میں سے ہوتے ہیں ایسے ہی یہ اعضائے حواس بھی جنس بدن میں سے ہیں۔

پھر جیسے کہ حق تعالیٰ کی گوناگوں صفات و کمالات میں سے کسی نہ کسی خاص صفت کے غلبہ کے ساتھ ہر ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے گویا ہر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی مخصوص صفت کا مظہر اتم ہے۔ ایسے ہی روح بھی اپنی کسی نہ کسی صفت سے ان ظاہری کارکنوں پر متجلی ہے اور ہر ہر عضو، آنکھ، ناک، کان اس کی ایک ایک قوت احساس و ادراک کا مظہر اتم ہے۔ مگر جیسے حق تعالیٰ کی سب سے زیادہ جامع تجلی جس میں اور کمالات بھی مندرج ہیں، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قرار پائے۔

ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ جامع تجلی قلب پر ہے جس سے قلب مجمع العلوم بنا ہوا ہے۔ چنانچہ حواس خمسہ میں جو بھی ادراک و شعور کا فیض ہے وہ قلب ہی کا ہے۔ اگر قلب توجہ نہ کرے تو آنکھ، کان کھلے رہنے کے باوجود نہ کسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ گویا قلب میں وہ تمام احساسات جمع رہتے ہیں جو ان حواس کے ذریعے نمایاں ہوتے ہیں، خود قلب کے اپنے مفہومات اور علوم مخصوصہ الگ ہیں جو آنکھ، ناک، کان کو میسر نہیں۔

چنانچہ علوم معقولہ اور وجدانیہ وہ قلبی علوم ہیں جو آنکھ، ناک، کان کے حصہ میں نہیں آئے۔ صرف قلب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پس جو علوم ان آنکھ، ناک، کان کے ہیں وہ درحقیقت قلب ہی کے علوم ہیں اور جو مخصوص قلب کے ہیں وہ تو قلب کے ہیں ہی، اس لیے قلب خاتم الادراکات قرار پایا۔ اور اس کی فضیلت تمام اعضائے ادراک پر نمایاں ہوئی۔ جبکہ باہم بھی ان اعضائے حواس میں تفاوت مراتب واضح ہے۔ گویا جیسے رسولوں میں باہم فرق

مراتب تھا اور آخری رسول سب سے افضل تھے کہ خاتم الکمالات تھے۔ایسے ہی ان بدنی رسولوں میں بھی باہمی فرق مراتب نمایاں ہوا۔اوران میں ایک رسول (قلب) خاتم الادراکات اور خاتم الکمالات نکلا جس سے تفاضل رسالت اور ختم رسالت کا سلسلہ بھی اس کائنات میں جاری نظر آیا۔پھر جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء بوجہ جامع کمالات علم ہونے کے سارے انبیاء پر حاکم اوران کے ادیان کے لیے ناسخ ہیں۔ایسے ہی قلب بھی ان تمام اعضائے رئیسہ ومرؤسہ پر حاکم اوران کے ذخیروں نافذ اور متصرف ہے،آنکھ دیکھتی ہے اوراپنے مبصر کو قلب کی طرف روانہ کرتی ہے۔یہ فیصلہ قلب ہی کرتا ہے کہ آنکھ کے دیکھے ہوئے سے کام لینے کا یہ وقت ہے یا نہیں؟

کان سنتا ہے اور مسموعات قلب کے پاس ارسال کردیتا ہے،آگے قلب ہی اس میں غور کرتا ہے کہ آیا یہ اس وقت کارآمد ہیں یا نہیں؟اورانہیں باقی رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟بہر حال اعضائے حواس تو قلب کے علوم پر نقد وتبصرہ نہیں کرسکتے مگر قلب ان پر تنقید رکھتا ہے کہ خاتم الادراکات ہے پس نسخ شرائع وعلوم بھی اس کائنات بدن میں مثل کائنات آفاق کے جاری نظر آیا۔پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اورانبیاء کرام علیھم السلام کی نبوت ومعرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ومعرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے ایسے ہی یہاں بھی ہے کہ ان اعضاء کو اس کا علم قلب کی قوتِ علم سے مستفاد اور وابستہ ہے۔اور قلب بالذات مدرک ہے۔چنانچہ جب آنکھ، کان بند ہوجاتے ہیں تو تنہا قلب سوچتا اور تدبر کرتا ہے تو ساری کائنات کے نقشے عالم خیال میں خود ہی دیکھنا شروع کردیتا ہے۔کسی طرح ان اعضائے حواس کا دست نگر نہیں ہوتا لیکن اگر قلب بند ہوجائے یا کسی انقباض کے سبب توجہ چھوڑ کر ربودگی کے عالم میں چلا جائے تو یہ سارے اعضاء بے کار محض رہ جاتے ہیں۔نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں جس سے صاف واضح ہے کہ ان اعضاء کا علم تو قلب کا فیض ہے مگر قلب کا علم ان اعضاء کا فیض نہیں، قلب علم میں ان کا محتاج نہیں،مگر یہ سب اپنے ادراک میں قلب کے محتاج ہیں۔پھر جیسا کہ مختلف انبیاء کے مختلف علوم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوجاتے ہیں اور وہیں سے شروع ہوتے ہیں یعنی اللہ کے کمالات کے لیے نقطۂ فیض ذات محمدی ہے کہ خدا کے کمالات اولاً آپ کی ذات بابرکات پر اترتے ہیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم وحکمت سب کو حسب الاستعداد بتفاوت درجات تقسیم ہوا ہے۔

اسی طرح روح کے بھی تمام علوم وکمالات کا نقطۂ فیض قلب ہے کہ روح کے کمالات کا فیضان سب سے اوّل قلب پر ہوتا ہے حتی کہ حیات وزندگی بھی اوّل اسی پر اترتی ہے،اور پھر اس کے واسطے سے تمام اعضاء کو یہ وجودی کمالات حسب حیثیت تقسیم ہوتے ہیں پس یہ تمام اعضاء قلب سے کسب فیض کرتے ہیں۔اور قلب براہ راست روح سے کسب فیض کرتا ہے،اس لیے تعین اول کی نظیر بھی کائنات بدن میں نکلی،پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی تعلیمات سے مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر نفع ونقصان سمجھا دیتے ہیں کوئی جبر واہ کراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کرکے عمل کرنا لوگوں کے ارادہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ایسے ہی یہ بدنی رسل (اعضائے حواس اور قلب) بھی اشیاء

کے حسن قبح کو دکھلا کر نفس میں برائی سے بچنے اور بھلائی کو سمیٹنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، نفس پر جبر نہیں کرتے۔ بلکہ نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کرے۔ سعید نفوس ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر فلاح دارین حاصل کر لیتے ہیں اور شقی نفوس اس سے بے پرواہ ہو کر اپنے کو ابدی ہلاکت میں مبتلا کر لیتے ہیں تو گویا ''لا اکراہ فی الدین'' کا نقشہ بھی ہمارے اندر نکلا۔ پھر جس طرح انبیاء علیھم السلام کی تعلیمات کے مطابق نفس انسانی روحانی غذائیں جب باطن میں پہنچاتا ہے تو حق تعالیٰ ان نفوس کے لیے ان غذاؤں کے نیک و بد ثمرات آخرت میں سامنے کر دیں گے اسی طرح بدنی کائنات میں بھی جب نفس اپنے ارادے سے بدن کی زندگی قائم رکھنے کے لیے مادی غذائیں معدہ میں پہنچاتا ہے تو روح اپنی تربیت سے اس کے ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے، اچھی غذاؤں کے اچھے ثمرات، صحت وقوت اور نشاط کی صورت میں ردی غذاؤں کے ردی ثمرات مرض وضعف اور حزن وملال کی صورت میں یعنی ذرہ ذرہ خیر وشر سامنے آجاتا ہے۔ گویا سزا وجزا اور معاد کے نمونے بھی انسان میں موجود ہیں۔ غرض مبداء ہو یا معاد۔ نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا وجزا۔ حق تعالیٰ کے کمالات وصفات ہوں یا افعال۔ ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ.... انسان ایک ایسی حقیقت جامع ہے کہ اکوان واعیان کی ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع، الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں اور ہر ہر انسان گویا مستقل جہان ہے جس میں ظلماتی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں۔

آسمانہاست در ولایت جان	کار فرمائے آسمان جہان
دورہ روح پست وبالاہست	کوہ ہائے بلند وصحراہست

غرض...... میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

تمہید سے مقصود کا استنباط...... اب غور کرو کہ جب انسان ایک طرف تو مخلوقاتی نمونوں کا جامع ہے اور ایک طرف ربانی نمونوں کا مظہر ہے۔ کل مخلوقات کی بھی ساری شانیں اس میں علی وجہ الاتم جمع ہیں اور الٰہیات کی بھی تمام شئون اس میں موجود ہیں تو ان دونوں نمونوں کی جامعیت کے لحاظ سے دو ہی فریضے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایک مخلوقاتی کام اور ایک الٰہیاتی کام۔ یعنی ایک وہ کام جس کو الٰہیات چاہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مخلوق کا بحیثیت مخلوق الٰہی ہونے کے اس کے سوا کیا کام ہو سکتا ہے کہ اپنے خالق کے سامنے جھکے، گڑگڑائے اور گریہ وزاری کرے۔ اسی کو اصطلاح مذہب میں عبادت کہتے ہیں، کیوں کہ عبادت کے معنی ہی انتہائے تذلل اور اظہار عجز ونیاز واعلان احتیاج کے ہیں اور نمونۂ الٰہیات ہونے کی حیثیت سے اس کا کام وہ ہوگا جسے شان الٰہیت چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا کام اپنی مخلوق پر توجہ کرنا، رحم کھانا، اس کی تربیت کرنا اور اس کے نفسانی نقائص دور کر کے اسے پاک بنانا ہے۔ اس لے جہاں تک بھی ہو مخلوق اس کی اطاعت کرے، جس کی وجہ یہ ہے کہ خالق منبع کمالات ہے اور کمالات کا نتیجہ عجز

نہیں بلکہ غنا ہے۔ مالک کمالات میں تاثر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا حق تاثیر ہے۔ اس لیے خالق کا کام کسی کی توجہ حاصل کرنا نہیں بلکہ خود توجہ فرمانا ہے۔ کسی سے کمال لینا نہیں بلکہ مانگنے والے کو خود کمالات کا حصہ دینا ہے۔

پس انسان بھی جب کہ نمونہ ہائے الٰہیہ کا جامع ہے تو اس حیثیت سے اس کا کام بھی یہی ہوگا کہ وہ عالم پر توجہ مبذول کرے، اس پر اپنا نظام قائم کرے اس کے ذرے ذرے کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر ہر ہر چیز کو اس کے محل پر رکھے اور اسی کے مناسب حال اس کی تربیت کرے، اسی کو اصطلاح مذہب میں **خلافت** کہتے ہیں۔ بس خلاصہ یہ نکلا کہ بحیثیت مخلوقیت کے نمونوں کے انسان کا فریضہ عبادت نکلتا ہے اور بحیثیت الٰہیت کے نمونوں کے اس کا فریضہ خلافت ہوتا ہے۔ ہاں پھر جبکہ انسان محض ایک مخلوق ہی نہیں بلکہ مخلوقیت کے تمام نمونوں کا جامع تھا گویا اس کی مخلوقیت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو اس کی عبادت بھی اتنی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں ساری ہی مخلوق کی عبادتیں مجتمع ہوں اور ایسے ہی جبکہ وہ الٰہیات کا کوئی معمولی یا ناتمام سا نمونہ نہ تھا بلکہ ربانی کمالات کے تمام ہی نمونوں کا جامع تھا، جیسا کہ خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ سے ظاہر ہے اور اس لیے یہ مسجود ملائکہ بھی بنا تو اس کی نیابت وخلافت بھی اتنی ہی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں خلافت کا ہر پہلو بلکہ ہر ہر نوع جمع ہو۔ خواہ وہ خلافت روحانی ہو یا خلافت مادی۔ اور خواہ وہ خلافت ظاہری ہو یا خلافت باطنی۔

پھر خواہ وہ خلافت انفرادی ہو یا خلافت اجتماعی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو تعجب سے دیکھیں گے کہ ایسا جامع کام جس سے عبادت وخلافت کے دونوں فریضے بیکدم انجام پا سکتے ہوں اور پوری جامعیت کے ساتھ ادا ہو سکتے ہوں وہ صرف نماز ہے کہ نہ اس سے زیادہ کوئی دوسری عبادت ہے اور نہ اس سے زیادہ جامع اسلوب پر کوئی عمل نیابت وخلافت الٰہی کا حق ادا کرنے والا ہے۔

عبادت صرف نماز ہی ہے...... نماز میں عبادت کا پہلو نمایاں طریق پر سامنے لانے کے لیے پہلے نفس عبادت کی حقیقت کو سمجھئے تا کہ نماز کی تعبدی حیثیت بھی کھل جائے اور بحیثیت عبادت اس کی جامعیت بھی نمایاں ہو جائے۔ شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل۔ یعنی ایسی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے کا کوئی درجہ ہی باقی نہ رہے کیوں کہ یہ عبادت اس ذات بابرکات کے سامنے پیش کی جاتی ہے جو عزت کے ایسے انتہائی مقام پر ہے کہ اس کے آگے عزت کا کوئی درجہ نہیں۔

پس عزیز مطلق کے سامنے محض ذلیل بن جانا کافی نہیں۔ بلکہ ذلیل مطلق بننے کی ضرورت ہے پس اسی ذلت مطلقہ کا نام عبادت ہے۔ پس عبادت کی حقیقت انتہاء درجہ کی نیازمندی کے ہوئے، اب اگر آپ عبادت کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اسلام کی عبادت پر ایک نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں نماز کے سوا کوئی عمل عبادت ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو صرف نماز ہی ہے جسے حقیقی طور پر عبادت کہہ سکتے ہیں کیوں کہ عبادت اسلامی جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے چار ہی ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج۔ ان میں سے اگر آپ زکوٰۃ کو دیکھیں تو وہ کسی طرح

بھی اپنی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ زکوٰۃ کے معنی خدا کے لیے مال خرچ کرنے کے ہیں۔ جس کا حاصل مال سے مستغنی ہونے کا اعلان ہے اور ظاہر ہے کہ مستغنی ہونا کوئی ذلت کی بات نہیں کہ غنا تو خدا کی صفت ہے یا پھر اس میں عطا اور داد و دہش پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ داد و دہش اور جود و کرم بھی کوئی ذلت کی چیز نہیں کہ اسے عبادت کہیں بلکہ حق تعالیٰ کی ایک پاک صفت ہے اور خدا کی صفات سے متصف ہونا ظاہر ہے کہ کمالات خداوندی سے تشبیہ پیدا کرنا ہے کہ جیسے خدا ان تمام وسائل مال وغیر ہا سے غنی ہے اور جیسے وہ معطی ہے اپنے پروردوں کے لیے، ایسے ہی ہم بھی غنی اور معطی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسے ذلت یا عبادت کون کہہ سکتا ہے؟ یہ تو اعلیٰ عزت کا مقام ہے، چہ جائیکہ انتہائی ذلت کا ہو، جسے عبادت کا نام دیا جائے۔ اس لیے زکوٰۃ کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں کہیں گے۔ ہاں زکوٰۃ کا عبادت ہونا محض امتثال امر اور حکم ماننے کی وجہ سے ہے کہ اللہ کے فرمودہ کی اطاعت کرتے ہوئے آدمی نے اپنا مال خرچ کر دیا، پس امتثال امر کے معنی نے اسے عبادت بنا دیا ہے۔ ورنہ اپنی ذات کے لحاظ سے اس میں عبادت ہونے کی کوئی بھی شان نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح روزے کو لے لو تو اس کی ذات میں بھی عبادت ہونے کے کوئی معنی نہیں پائے جاتے، کیوں کہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور جماع کرنے سے رک جانے اور نفس کو ان تینوں خواہشات اور حوائج بشریہ سے پاک، منزہ اور مقدس بنا لینے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی کسی طرح ذلت کی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ یہ احتیاج نہیں، بلکہ استغناء ہے اور غناء خدا کی صفت ہے کہ وہ کھانے پینے اور تمام حوائج سے مبرا اور منزہ ہے۔ پس اس تنزہ اور تقدس پر آ جانا کمالات الٰہیہ کے ساتھ مناسبت اور مشابہت پیدا کرنا ہے نہ کہ مخلوقیت کے اوصاف میں پھنسنا پھر اسے عبادت کون کہہ دے گا؟ کہ اس پاکی اور تنزہ میں ذلت کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ہاں پھر بھی روزہ اگر عبادت ہے تو محض اس لیے کہ اس میں حکم الٰہی کی اطاعت اور امر ربانی کی بجا آوری پائی جاتی ہے۔ اور یہ ترک حوائج محض اس کے فرمان کی تعمیل کے لیے پایا جاتا ہے کہ اس کے حکم کی بجا آوری میں یہ ترک اختیار کیا گیا ہے جس سے روزہ دار کی نیاز مندی واشگاف ہوتی ہے۔ اس لیے روزہ بھی بذاتہٖ کوئی عبادت نہ نکلا صرف اضافی طور پر اس پر عبادت کا اطلاق آ گیا کہ اس میں یہ نسبتی اور اضافی ذلت پائی جاتی ہے جس کو حکم کی بجا آوری کہا گیا ہے اور جس سے وہ عبادت بن گیا ہے۔

اسی طرح حج کا فریضہ بھی اپنی ذات سے تعبد کی کوئی شان نہیں رکھتا کیوں کہ حج بھی چند تروک کا مجموعہ ہے، ترک وطن، ترک زینت، ترک لذائذ، ترک راحت وغیر ہا حتیٰ کہ آخر میں بصورت قربانی ترک زندگی بھی گویا کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان تمام تروک کا حاصل بھی وہی بے نیازی اور ان حوائج لباس، وطن، راحت لذت وغیرہ سے استغناء ہے اور اس کے بعد محبت حق کا مظاہرہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ استغناء و محبت نہ ذلت ہے نہ نیاز مندی بلکہ عین عز و کرم ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں محبت و غنا شان حق ہیں نہ کہ شان عبد۔ اس لیے افعال حج سے بھی انسان کی احتیاج ظاہر نہیں ہوتی کہ اسے عبادت کہا جائے۔ وہ بھی عبادت ہوگا، تو اسی اطاعت حکم اور امتثال امر کی

وجہ سے غرض ان تمام اساسی عبادتوں میں سے کوئی ایک عبادت بھی اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان میں اضافی اور نسبتی معنی کے لحاظ سے عبادت کا نام آ گیا ہے جس سے انہیں عبادت کہہ دیا گیا ہے۔ ہاں وہ فعل جس سے سرتا پا نیاز مندی، عبودیت کیشی، بے بسی و بے چارگی اور انتہائی ذلت وخواری کے سوا کوئی اور چیز ہی ظاہر نہ ہو وہ صرف نماز ہے۔

نماز میں عبات کے پہلو...... کیوں کہ نماز کے اندر (۲) دو ہی بنیادی چیزیں ہیں۔ ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیئات جو اعضائے بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء (سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ) سے لے کر فاتحہ وسورۃ تک۔ پھر تسبیحات سے لے کر التحیات وتشہد تک اپنی عبدیت، غلامی اور فدویت۔ یا اللہ کی عظمت وبرتری اور لامحدود بزرگی کے سواء اور کسی چیز کا بیان ہی نہیں ہوتا اور ہیئات کے لحاظ سے دیکھو تو نیاز مندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز ناک اور پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت مطلقہ کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً وہیئۃً اعتراف کرنا بندگی اور غلامی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

چنانچہ جب کسی کی انتہائی ذلت اور رسوائی ہو جاتی ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کی ناک کٹ گئی۔ یا فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔

پس جبکہ انسان اپنے ان شریف اور باعزت اعضاء کو حسی طور پر ذلت کے ساتھ خاک میں رگڑنے لگتا ہے اور معنوی طور پر قلب وزبان سے اپنے ذلیل ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اس سے زیادہ اپنے کو ذلیل بنانے کی اس کے پاس اور کیا صورت ہو سکتی ہے اور جب اسی حقیقت کا نام عبادت ہے اور یہ صرف نماز میں پائی جاتی ہے تو حقیقی طور پر اگر عبادت کہلائے جانے کی مستحق ہے تو وہ صرف نماز ہی.... ہوسکتی ہے کہ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے عزت نفس یا اپنی تنزیہ وتقدیس کہا جا سکے، یا کسی درجہ میں بھی اسے خدائی کمالات کے ساتھ تشبہ اور تخلق بتلایا جا سکے کہ خدا کی شان کسی کے آگے جھکنا وغیرہ نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں احتیاج سے پیدا ہوتی ہیں اور وہاں غنائے مطلق کے سوا کسی ادنیٰ احتیاج کا نشان نہیں؛۔

غرض نماز ہی ایک چیز نکلتی ہے کہ اس میں ذاتی طور پر تشبہ بالخالق کا پتہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف تذلل للخالق اور صرف اعلان عبدیت وفدویت ہے اس لیے صحیح معنی میں عبادت کا لقب دیئے جانے کی مستحق بھی صرف یہ نماز ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں پھر جب کہ نماز کا امر خدا کی طرف سے ہے تو امتثال امر کی نسبت بھی نماز میں آئی جس نے حج وزکوٰۃ اور صیام کو بھی عبادت بنا دیا تھا اس لیے نماز جہاں حقیقی عبادت تھی وہاں اضافی عبادت بھی ثابت ہوئی۔ پس حقیقت وصورت اور اضافت ونسبت ہر ایک کے لحاظ سے اگر عبادت کہلائی جا سکتی ہے تو وہ صرف نماز ہے۔

نماز ساری کائنات پر لازم کی گئی ہے...... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق کو صرف نماز ہی

کا پابند بنایا ہے کہ عبادت ہی وہ تھی ارشاد ربانی ہے: كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ. ① ترجمہ ”ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا۔

بعینہ اسی طرح کہ جس طرح ہر ایک چیز نے خلقی اور پیدائشی طور پر اپنے کھانے پینے کے ڈھنگ اور اپنی طبعی خصوصیات کے رنگ کو پہچان لیا ہے کہ کوئی ذی حس بھی طبعیات میں کسی تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا“۔

غرض یہاں یہ نہیں فرمایا کُلٌّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهُ وَزَكٰوتَهُ بلکہ صلوٰۃ فرمایا ہے یعنی ہر ایک نے اپنے حج وصیام وزکوٰۃ کو نہیں بلکہ نماز کو جان لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلیّہ کے عموم میں جمادات، نباتات، حیوانات، عنصریات اور مجردات سب آجاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے اپنی بعض مصنفات میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے تاکہ اس کی نماز اس کی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے۔ مثلاً درختوں میں چلنا پھرنا جھکنا نہیں ہے۔ اس لیے درختوں کی نماز صرف قیام ہے یعنی ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کی نماز تشریعی ہے کہ اس میں فہم وخطاب کا مادہ ہے اور درختوں کی نماز تکوینی ہے یعنی بجائے خطاب کرنے کے انہیں بنایا اس طرز پر گیا ہے کہ وہ گویا ہمہ وقت قیام کی حالت میں حکم الٰہی کے سامنے سروقد کھڑے ہوئے اپنی نیاز مندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

پھر چوپایوں کی نماز صرف رکوع ہے یعنی ان کی خلقی ہیئت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت گویا اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔

پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑے مکوڑوں کی نماز بصورت سجدہ ہے جیسے سانپ بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑوں کی خلقی ہیئت ہی سجدہ نما بنائی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں، گویا یہ جانور ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں ہیں اور خلقی سجدوں سے اس کی یاد اور امتثال حکم میں مصروف ہیں جس سے کسی حال انحراف نہیں کر سکتے۔

پھر جبال اور پہاڑوں کی نماز بحالت تشہد وقعود ہے۔ گویا یہ ہر وقت زمین پر دوزانو جمے ہوئے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں، ان کی خلقت اور صورت نوعیہ ہی یہی ہے کہ وہ رکوع وسجود اور قیام نہ کریں۔ بلکہ قعود کے ساتھ عبادت میں مصروف رہیں اور جس ہیئت پر انہیں لگا دیا گیا ہے، لگے رہیں۔

پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے یہ انتقالات بھی عبادت ہی گنے جاتے ہیں۔ پس یہ پرندے بھی جب اوپر سے نیچے کی طرف اڑتے ہوئے آتے ہیں یا اگر زمین پر ٹھیرتے ہیں تو گویا

① پارہ:۱۸، سورۃ النور: الآیۃ: ۴۱.

رکوع میں ہیں۔اور نیچے سے اوپر اڑتے ہیں تو گویا رکوع سے قومہ وقیام کی طرف جاتے ہیں اور پر پھیلا کر زمین پر اوندھے پڑ جاتے ہیں تو گویا سجود میں ہیں۔پس ان کی نماز انتقالات محض ہیں۔یہ مستقلاً رکوع میں نہ سجود وقعود میں بلکہ اڑتے ہوئے عروج ونزول کرتے رہتے ہیں۔اس لیے ایک ہیئت سے دوسری ہیئت کی طرف منتقل ہونا ہی ان کی خلقی پیدائشی نماز ہے۔پھر سیاروں اور آسمانوں۔کو دیکھو تو ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر لوٹ آتے ہیں اور پھر وہی سابقہ حرکت شروع کر دیتے ہیں۔پھر زمین کی نماز سکون ہے جسے انسان کی نظر دیکھتی ہے اور یہ بالکل مبتدیوں کی سی نماز ہے۔کیوں کہ نماز کی تمام حرکات کا مبداء سکون ہی ہے پہلے آدمی ساکن ہوتا ہے، پھر حرکت کرتا ہے پس زمین بھی گویا ساکت وصامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہوئی ہے اور یہ جمود وسکون اس کی تکوینی نماز ہے کہ یہ انتہائی تذلل اور خشوع ہے جو پوری نماز میں مطلوب ہے۔ارشاد ربانی ہے: وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ① ''نماز بھاری ہے مگر سکون قلب رکھنے والوں پر''۔اور یہی وہ خشوع و سکون ذلت دوسری جگہ قرآن نے زمین کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ارشاد حق ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا. الملک ۱۵ ''وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ذلیل بنایا ہے''۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے واضح ہے کہ زمین کی نیازمندی اور نماز یہی جمود اور سکون ذلت ہے۔پھر جنت ونار کی نماز۔سوال ہے کہ (اے اللہ! ہمیں ہمارے سکان سے پر کردے) چنانچہ حدیث میں ہے کہ جنت ودوزخ دونوں نے اللہ سے یہی سوال کیا ہوا ہے کہ قیامت کے دن ہمیں پر کر دیا جائے اور دونوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمہیں پر کر دیا جائے گا۔نار کو کفار سے اور اس کی باقیماندہ جگہ پتھروں اور پہاڑوں سے اور پھر بھی خلا رہ جائے گا اور وہ ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ ہی کہی چلی جائے گی۔تو حق تعالیٰ اپنے قدم اور ایڑی سے پر کر دیں گے جس سے وہ قط قط (بس بس) چلانے لگے گی،ادھر جنت جبکہ دنیا کے تمام اطاعت شعار ایمانداروں سے پر نہ ہوگی تو اس کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کر کے اسے بھر دیا جائے گا۔

غرض ان دونوں عالموں کی نماز سوال اور دعا ہے۔پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف ہے یعنی صف بندی کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ہاں اس اصطفاف کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جتنی ہیئتیں ان جمادات ونباتات وحیوانات کی نمازوں میں رکھی گئی ہیں اتنی سب ملائکہ علیہم السلام کی مختلف الالوان نمازوں کو دی گئی ہیں۔لاکھوں کی جماعت اپنے بدخلقت؟ سے قیام ہی میں ہے اور بس یہی ان کی نماز ہے۔ان گنت افراد رکوع ہی میں ہیں اور یہی ان کی صلوٰۃ ہے۔بے شمار فرشتے سجود میں ہیں اور انہیں صرف سجدہ ہی کی نماز دی گئی ہے۔بے تعداد قعود میں ہیں اور اسی کو ان کی نماز مانا گیا ہے، کتنے ہی عروج ونزول اور آسمان وزمین کے درمیان شب وروز اترنے چڑھنے میں مصروف ہیں اور یہی ان کی نماز ہے لاتعداد جو سکون وخشوع کے ساتھ ساکن ہیں اور صرف یہی ہیئت

① پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۴۵.

ان کی نماز ہے۔ غرض اس صف بندی میں عبادت کی شاخیں مختلف ہیں جو ملائکہ کو دی گئی ہیں۔ پھر یہی سب ہیئتیں جو، ان جمادات و نباتات و حیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں، بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں۔ کسی قوم کی نماز میں محض قیام ہے۔

کسی قوم کی نماز نیم قیام کے ساتھ گھٹنوں کے بل ڈنڈوت کرنا ہے۔ کسی قوم کی نماز محض رکوع ہے، کسی قوم کی نماز میں محض اوندھا لیٹ جانا گویا سجدہ ہی کرنا ہے، کسی قوم کی نماز میں دوزانوں ہو جانا یعنی قعود ہے، پھر جب کہ نماز کی ہر ایک ہیئت کے مناسب ہی اس میں ذکر اور تسبیح رکھا گیا ہے تو ان موالید ثلاثہ اور ملائکہ اور اقوام عالم کی نمازوں کی ان ہیئتوں اور شانوں کے مناسب حال ہی ان میں سے ہر مخلوق کو نماز کی تسبیح اور ذکر بھی اس کی خلقت واستعداد کے مناسب جدا جدا عطا کیا گیا ہے۔ ہر ایک کی اصطلاح الگ اور لغت علیحدہ ہے کہ ایک کی زبان دوسرا نہیں سمجھتا۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح سے ایک وطن کا انسان دوسرے وطن کے آدمیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے سیکھ نہ لے۔

پس اگر ایک شخص اپنی وطنی زبان میں اللہ کو یاد کر کے اس کی پاکی بیان کرنے لگے تو دوسرے ملک والے یقیناً اس کی یہ بولیاں نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس لیے قرآن حکیم نے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ① (دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)۔

اس آیت میں تعمیم کے ساتھ ذرہ ذرہ کو تسبیح خواں بتلایا گیا ہے جس میں کسی نوع کی تخصیص نہیں ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بہت سی تفصیلات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ پانی جب تک جاری رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے درخت جب تک سرسبز رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے، کپڑا جب تک صاف ستھرا رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔ کھانا جب تک تازہ رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔ کنکر پتھر سب یاد الٰہی میں تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی میں چند کنکریاں اٹھائیں تو وہ زور سے تسبیح کرنے لگیں۔ یعنی ان کی تسبیح سنائی دینے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کے ہاتھ میں دے دیں تو بدستور تسبیح مسموع ہوتی رہی۔ اسی طرح فاروق اعظمؓ کے ہاتھ میں بھی، پھر اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ میں بھی۔

غرض نماز میں بھی ایک ہیئت ہے اور ایک حقیقت۔ اس کی ہیئت یہ افعال وارکان ہیں اور اس کی حقیقت ذکر اللہ۔ یہی دونوں چیزیں قرآن نے ہر مکون اور پیدا شدہ چیز کی طرف منسوب کی ہیں كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ صلوٰۃ اور تسبیح یعنی ہیئت ووضع صلوٰۃ اور اس کی روح یعنی تسبیح اور ذکر الٰہی اور نماز کی ہیئت وحقیقت کو ہر ایک مخلوق پر لازم کر دیا ہے۔ جب کہ ہر ایک مخلوق بحیثیت مخلوق ہونے کے نمازی بنادی گئی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ

① پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔

انسان پر نماز نہ عائد کی جاتی نہیں بلکہ انسان جب کہ جامع نمونہ ہائے مخلوق تھا یعنی مخلوقیت میں حد کمال کو پہنچا ہوا تھا تو ضروری تھا کہ اس کی نماز ساری مخلوقات کی نمازوں کی بھی جامع ہو اور اس میں نماز کے سب نمونے موجود ہوں جو غیر انسان میں منتشر تھے۔

نوع بشر کی نماز...... چنانچہ نوع بشر میں مذاہب نے وہ ساری ہی ہیئتیں مختلف اقوام کو تقسیم کیں۔ جو ان مخلوقات میں منقسم تھیں، کسی قوم کو قیام کی نماز کسی کو قعود کی کسی کو رکوع کی اور کسی کو سجود کی۔ پھر ایسے ہی اقوام کی ان مختلف نمازوں میں اذکار بھی مختلف رکھے گئے جو ہر ایک قوم کی فطرت کے مناسب حال تھے۔ کسی پر تعوذ کے اذکار کہ وہ ہر مضر چیز سے پناہ مانگتی رہیں اور صرف دفع مضرت کا پہلو سامنے رکھیں۔ کسی پر سوال و دعا کا غلبہ کہ وہ ہر نافع چیز کو سامنے رکھ کر خدا سے منافع جلب کرتی رہیں۔ کسی پر اپنی ذاتی اغراض چھوڑ کر محض خدا کی پاکی بیان کرنے کا غلبہ کہ وہ ثنا وصفت کے بھجن گاتی رہیں۔ کسی پر تضرع کا انتہائی غلبہ کہ نیاز اور زاری کرتی رہیں اور اسی میں مخمور رہیں۔ غرض ہر قوم کو اس کی ذہنیت کے مناسب ہی اذکار تلقین کیے گئے اور ان کے مناسب شان ہیئات اور اوضاع صلوٰۃ دی گئیں۔ مگر بہر حال نوع بشر میں یہ سب امور جمع کر دیئے گئے۔ تنہا ایک قوم کوئی ایسی عارف اور شئون الٰہیہ کو پہچاننے والی نہ تھی کہ سارے اذکار و اوضاع اور ساری ہیئات ایک ہی نماز میں جمع کر کے اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

اسلامی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں جمع ہیں...... لیکن حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی اپنا معجزہ قرآن لا کر پیش کیا جو تمام کتب سماویہ کے علوم کا جامع تھا اور اس سے بنی نوع بشر کی ذہنیت اس درجہ منور ہوئی کہ ساری اقوام کی ذہنیتیں یکدم اس کے سامنے سرنگوں تھیں اور اس معرفت کاملہ سے اس کی ذہنیت مکمل ہوئی۔ جس سے وہ تمام شئون ربانی ان پر کھل گئیں جو مختلف اقوام پر مختلف قرون و دہور میں کھلی تھیں، تو فطرت الٰہی نے وہ تمام اوضاع واطوار جو اقوام عالم کی مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔ مسلم قوم کی نماز میں ساری لا کر جمع کر دیں۔ گویا یہ قوم جیسے معارف اقوام کی جامع ہوئی اور جیسے کہ معارف الٰہی کی جامع ہوئی، گویا ایسے ہی تمام عبادات اقوام کی بھی جامع ہوئی اور اس کی صلوٰۃ گویا مجموعہ صلوٰۃ اقوام ہو گئی۔

نماز جامع ہیئات ہے...... چنانچہ اس کی جامع نماز کی ہیئات میں قیام تو درختوں کا سا ہے، رکوع چوپایوں کا سا ، صف بندی فرشتوں کی سی اور گردش و دوران آسمانوں اور سیاروں کا سا ہے کہ ایک رکعت سے چل کر پھر ویسی ہی دوسری رکعت کی طرف لوٹ آتا ہے، وہی افعال پھر کرتا ہے، جو پہلی رکعت میں کئے تھے اور یہی فرائض صلوٰۃ میں سے ہے کیوں کہ ایک رکعت نماز نہیں کم سے کم نماز ایک شفعہ ہے اور جبکہ نماز ہی کی ساری ہیئتیں جمادات، حیوانات ، نباتات میں منتشر تھیں۔ تو یوں کہا جاتا ہے کہ مسلم کی نماز میں موالید ثلاثہ کی نمازیں جمع تھیں۔ پھر یہی ہیئتیں جبکہ ملائکہ کی نماز میں بھی ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ ملائکہ کی تمام نمازیں بھی اسلامی نماز میں جمع ہیں اور یہی ہیئتیں جبکہ اقوام عالم میں منقسم تھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی نماز میں دنیا کی ساری قوموں کی نمازیں بھی جمع ہیں۔

نماز جامع اذکار بھی ہے......ادھر اذکار کو دیکھو تو ملائکہ کے طبقات ہوں یا انسانوں کے پرند ہوں یا چرند ہوں کسی پر تسلیم وتقدس کا غلبہ ہے کسی پر تحمید وتمجید کا، کسی پر تعوذ کا غلبہ ہے اور کسی پر سوال کا غلبہ ہے اور کسی پر دعا کا، کسی پر کتاب کا غلبہ ہے اور کسی پر اسمائے الٰہی کی یاد کا، کسی پر درود شریف کا غلبہ ہے اور کسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پاک کا۔غرض مختلف استعدادیں ہیں اور مختلف اذکار۔ مسلم کی استعداد اپنے پیغمبر کی جامع فطرت کے طفیل میں۔چونکہ جامع مقامات تھی اس لیے اسلامی نماز میں ذکر الٰہی کی ہر ہر نوع جمع کر دی گئی ہے، اس میں تسبیح بھی ہے کہ اس کی ابتداء تسبیح سے ہے اور تحمید بھی ہے کہ الحمد اس کے لیے لازم ہے اس میں تعوذ بھی ہے کہ اعوذ باللہ سے قرأت شروع ہوتی ہے اور تسمل بھی ہے کہ اس کے بعد بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔اس میں تکبیر بھی ہے کہ وہ شعار صلوٰۃ ہے اور اس میں سوال بھی ہے کہ سورۂ مسَلہ (فاتحہ) اس نماز کا جزواعظم ہے اور دعا بھی ہے کہ اس کا اختتام بھی دعاؤں پر ہے اس میں تلاوت کتاب اللہ بھی ہے کہ وہ فریضۂ صلوٰۃ ہے اور اسماءِ حسنیٰ کی یاد بھی ہے کہ رکوع وسجود وغیرہ میں تسبیح الٰہی مختلف اسماء عظمت سے کی گئی ہے اس میں درود شریف بھی ہے کہ تشہد اس سے بھرپور ہے اور ذکر پاک نبوی بھی ہے کہ التحیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سب سے زیادہ بلند پایہ سیرت یعنی معراج کا ذکر ہے جو انتہائی قرب اور اللہ سے اعلیٰ تقرب کے وقت ہوا تھا۔

نماز جامع صلوٰۃ اعضاء ہے......پھر اعضاء واجزائے بدن کو لو تو ان سب پر بھی نماز حاوی ہے، زبان اس میں ذاکر ہوتی ہے قلب اس میں خاشع ہوتا ہے، دماغ اس میں متفکر ہوتا ہے ہاتھ پیر اس میں متحرک ہوتے ہیں چہرہ اس میں نگونسار ہوتا ہے انگلیاں غیر منتشر ہوتی ہیں۔غرض ہر عضو اپنے مناسب حال اس عبادت میں حصہ لیتا ہے اس لیے نماز تمام ان افعال کی بھی جامع ثابت ہوتی ہے جو اعضائے بدن سے متعلق اور ان کے مناسب ہیں۔

نماز جامع اوقات بھی ہے۔!......پھر ساتھ ہی نماز اوقات عبادت کی بھی جامع ہے یعنی جو وقت بھی فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لے لیا، ظہر کا وقت کسل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔مغرب کا وقت انقلاب آفات کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا۔

پھر نفلی نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیات کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔گویا اگر ایک انسان تمام اذکار، عبادات کے بجائے صرف ان مقررہ واجب ونفل اوقات نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ میں تو ترقی کر کے یہاں تک کہوں گا کہ یہ اوقات زندگی ہی میں نماز موت کے اوقات کو بھی گھیرے ہوئے ہے یعنی قبر میں اگر کوئی عبادت جاری رہتی ہے یا جس کی ادائیگی کا دھیان بندھ جاتا ہے تو وہ صرف نماز ہے۔حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے **اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ** اسی طرح حدیث میں

ارشاد ہے کہ مومن کو قبر میں عین سوال و جواب کے وقت غروب آفتاب کا قرب دکھلایا جاتا ہے تو وہ گھبرا کر ملائکہ (نکیرین) سے کہتا ہے دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پس قبر میں عامہ مؤمنین کو دھیان آتا ہے تو نہ حج کا، نہ روزہ کا، نہ زکوٰۃ کا، بلکہ صرف نماز کا، اور فعل کے درجہ میں اگر کوئی اطاعت قبر میں ادا ہوتی ہے تو وہ نماز ہے پس نماز کا احاطہ زندگی کے اوقات پر نہیں بلکہ بعد الموت کی زندگی پر بھی حاوی ہے۔

غرض ہیئتیں بھی نماز میں وہ سب موجود ہیں جو تکریم و تعظیم اور نیاز مندی کے اظہار کے لیے عقلاً ممکن ہیں اور اذکار بھی وہ سب ہیں جو اللہ کی شان اقدس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اطہر کے لیے ممکن ہو سکتے ہیں، اوقات بھی وہ سب ہیں جو عبادت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسلامی نماز جامع اذکار ثابت ہوتی ہے جس سے کمال جامعیت خوب نمایاں ہو جاتا ہے۔ پھر بایں معنی بھی اس کی جامعیت واضح ہے کہ یہ تمام افعال واذکار کا جو سارے عالم سے لا کر اس میں جمع کیے گئے ہیں وہ نماز میں پہنچ کر فی نفسہٖ بھی اتنے کامل بن گئے ہیں اور اس کی حالت کی نسبت زیادہ مکمل طریق پر بیان کیے گئے ہیں جس قدر وہ نماز سے باہر یا قدیم نمازوں میں مامور ہو کر تھے، جن کا ہر گوشہ مکمل اور پر ہیئت اور جس سے نماز بذاتہٖ نہایت مہذب بن گئی ہے۔

ہیئتِ نماز کی خوبصورتی ...... چنانچہ اس کے قیام کی خوبی اور خوبصورتی دوسری اقوام کے قیام سے بدرجہا زائد و مکمل ہے۔ جس میں چہرہ کا رخ جاء مستقیم پر، آنکھوں کی نگاہ سجدہ گاہ پر، ہاتھوں کی بندش ناف پر جو ادب کی انتہا ہے پیروں کی سیدھ اور فاصلہ مناسب، انگلیوں کی توجہ کعبہ کی طرف، بدن کا سڈول رکھا جانا، جس میں پیچ و تاب نہ ہو، غرض قیام کی ہر ادا موزوں اور قاعدہ میں جس سے نیاز مندی انتہائی نمایاں اور خوبصورتی کافی عیاں، رکوع میں مسطح، نہ اس میں کوب نکلا ہوا، نہ گڑھا پڑا ہوا۔ سر کمر کی برابر، نہ ابھرا ہوا نہ نیچے لٹکا ہوا۔

گویا پورا انسان ایک قوس بن جاتا ہے جس سے نیاز مندی بھی واضح ہوتی ہے اور چستی اور چابک دستی بھی مترشح ہوتی ہے جیسا کہ چاکران خدمت گزار پوری تواضع کے ساتھ چاق و چوبند ہو کر اپنے آقا کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ سجود میں ناک اور پیشانی زمین پر۔ ہاتھ منہ سے الگ ہوتا ہے کہ منہ ہاتھوں پر نہ ٹکے اور خشوع میں فرق نہ آئے۔ بدن کشادہ نہ کہ سکڑا ہوا۔ تا کہ کسل مندوں اور سست آدمیوں کی وضع نہ بننے پائے۔ ہاتھوں کی انگلیاں غیر منتشر کہ بے فکری نہ ٹپکے کہنیاں رانوں پر ٹکی ہوئی نہیں کہ کم ہمتی نمایاں ہو، قعود میں چوکڑی کی نشست نہ ہو کہ تکبر واضح ہو۔ نہ ہاتھ کی ٹیک ساتھ ہو کہ آرام طلبی نمایاں ہو۔

نہ سرین زمین پر ٹکے ہوئے ہوں کہ جانوروں کی ہیئت پیدا ہو، نہ پیروں کے پنجوں پر نشست ہو کہ جلد بازی کھٹکے۔ بلکہ دوزانوں ہو جو ادب و تعظیم کی انتہائی نشست ہے۔ پھر اس نشست میں بھی دونوں پیروں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہوں تا کہ ہاتھ ادب سے زانوں پر ہو اور انگلیاں جڑی ہوئی ہوں تا کہ تہذیب کا دائرہ قائم رہے۔ شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی ہو تا کہ توحید کا شعار بلند رہے۔ پھر نماز سے خروج اور واپسی بھی اللہ کے نام سے ہو یعنی جیسا کہ

اس کی ابتداء اللہ کے نام سے ہوئی تھی یعنی اللہ اکبر سے۔ پس تکبیر سے شروع اور تسلیم پر ختم۔ تَحْرِیْمُهَا التَّكْبِیْرُ وَتَحْلِیْلُهَا التَّسْلِیْمُ ۔تا کہ ابتداء وانتہا میں فطرت وکبریاءِ حق کا آوازہ بلند ہو۔

نماز کے اجزاء میں ترتیب عقلی ...... پھر ترتیب افعال کیسی پاکیزہ کہ عقلاً بھی اس کے سوا دوسری نہیں ہوسکتی۔ اول قیام جو رکوع کی تمہید ہے پھر رکوع جو سجدہ کی تمہید ہے۔ پھر سجدہ جو اصل مقصود ہوتا ہے۔ گویا ہر اگلا رکن پچھلے سے نیازمندی میں ابلغ اور بلیغ تر۔ پھر قیام فی نفسہٖ عبادت نہ تھا کہ اس میں انتہاء تذلل نہ تھا تو اس میں فاتحہ اور ثناء رکھ دی۔ تا کہ اس میں ذکر ہی سے نیازمندی اور سوال کی الحاح وزاری پیدا ہو جائے۔ رکوع وسجود عبادت تھے تو انہیں تسبیح الٰہی سے بھرپور کیا گیا، تا کہ بندے اپنے کو ملوث اور خدا کو تلوث سے پاک جانیں۔

غرض جو تقسیم ابھی ہم نے نماز میں کی کہ اور عبادتیں فی نفسہٖ عبادتیں نہیں۔ اور نماز بذاتہٖ عبادت ہے۔ وہ دونوں نمونے بھی عین نماز یں جمع کر دیئے گئے کہ اس کے بعض اجزاء بذاتہٖ اطاعت نہیں جیسے قیام وقعود اور بعض بذاتہٖ عبادت ہیں جیسے رکوع وسجود وغیرہ۔ اس لیے قیام میں تعبدی ذکر غالب رکھا گیا ہے اور رکوع اور سجود فی نفسہٖ عبادت تھے تو ذکر قلیل کافی سمجھا گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ قیام تعظیمی کو جائز رکھا گیا کہ یہ فی نفسہٖ عبادت نہیں اور رکوع وسجود تعظیمی کو بھی جائز نہیں رکھا گیا کہ وہ فی نفسہٖ عبادت ہیں اور چونکہ ان ارکان میں نیازمندی تدریجاً بڑھتی گئی ہے اس لیے قرب بھی بتدریج بڑھتا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِذَا قَامَ الْعَبْدُ فِیْ صَلَاتِهٖ ذَرَا الْبِرُّ عَلٰى رَأْسِهٖ حَتّٰى یَرْكَعَ فَاِذَا رَكَعَ غَلَبَهٗ رَحْمَةُ اللّٰهِ حَتّٰى یَسْجُدَ وَالسَّاجِدُ یَسْجُدُ عَلٰى قَدَمَیِ اللّٰهِ فَلْیَسْأَلْ وَلْیَرْغَبْ. (1)

غرض جس ہیئت کو دیکھو خود بذاتہٖ اپنی وضع اور ساخت کے لحاظ سے اتنی مکمل اس قدر مہذب اور ایسی شائستہ کہ جانور تو بجائے خود رہے، ملائکہ تو الگ رہے خود اشرف المخلوقات انسان کی پچھلی اقوام کی نمازوں کے منقسم اجزاء میں اس تہذیب وشائستگی اور خوبصورتی کا پتہ نہیں ملتا۔ اس لیے اسلامی نماز بایں معنی بھی جامع ہے کہ اس نے کوئی نیازمندانہ ہیئت نہیں چھوڑی جو نماز نے نہ لے لی ہو۔ اور بایں معنی بھی جامع ہے کہ اس کی ہر ہیئت خود اپنے طبعی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی اس قدر جامع ہے، اور مکمل ہے کہ کوئی گوشہ غیر فطری نہیں ہے۔ پس اسلامی نماز اس طرح اعلیٰ جامعیت کے ساتھ ہر قسم کی نیازمندیوں کا مجموعہ نکلتی ہے۔

نماز جامع عبادت بھی ہے ...... پھر یہی نہیں کہ وہ اقوام عالم کے اذکار وطاعت کا ایک جامع مرقع ہے بلکہ اگر غور کرو تو خود اسلام کی بھی جس قدر عبادات اور طاعات ہیں ان سب کو بھی اس نماز میں لا کر جمع کر دیا گیا ہے۔ روزہ کو دیکھو تو نماز میں موجود۔ کیوں کہ روزہ کی حقیقت نیت صادق کے ساتھ کھانے پینے اور عورتوں سے منتفع ہونے سے بچنا ہے۔ غور کرو تو یہ ساری چیزیں نماز میں لازم ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک چیز مفسد صلوٰۃ ہے

(1) کنز العمال ج:۷ص: ۲۸۹، ۵۲۶۔ (ص عن عمار مرسلاً)

بلکہ نماز کا روزہ رمضان کے روزہ سے بھی زیادہ مکمل ہے کیوں کہ روزہ میں تو یہ تین چیزیں ہی ممنوع ہیں لیکن نماز میں ان تین کے علاوہ سلام وکلام، عورتوں کو چھونا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے۔ یعنی نماز میں ان سب چیزوں کا بھی روزہ ہوتا ہے، اس لیے نماز میں روزہ اپنی انتہائی مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف کو لو تو وہ بھی نماز میں مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے کیوں کہ اعتکاف صوم میں ضروریات بشریہ کو پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے، کھانے پینے کی تو اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب، امور ممنوع اور مفسد صلوٰۃ ہیں۔ حتی کہ بحالت نماز بیرون مسجد تو بجائے خود ہے، خود مسجد میں بھی ٹہلنے اور نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ نماز کا اعتکاف روزہ کے اعتکاف سے بھی زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔

پھر حج کو لو تو وہ بھی نماز میں موجود ہے، کیوں کہ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔ سو نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط صحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ استقبال قبلہ بھی قبلہ کی اعلیٰ تعظیم ہے۔ چنانچہ یہ ہیئت تعظیم ایسے اوقات میں ممنوع کی گئی ہے جو گندے اور خسیس افعال کے اوقات ہیں جیسے کہ استنجاء کرتے وقت استقبال قبلہ ممنوع قرار دے دیا کہ تعظیمی ہیئت افعال تعظیمی کے وقت سزاوار ہے نہ کہ افعال خسیسہ کے وقت، پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں سمت بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کا دوران شروع کرتے ہوئے تعظیماً رفع یدین کرتے ہیں۔ حتی کہ بنص حدیث طواف کو حکم میں نماز کے فرمایا گیا۔ الا یہ کہ اس میں سلام وکلام جائز ہے نماز میں نہیں اور پھر جس طرح طواف طرح طرح کے اذکار وادعیہ سے معمور ہے ایسے ہی نماز بھی ہر طرح کے اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا بحد عرفات یادِ حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جس طرح وہاں حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے اسی طرح نماز میں اولاً ہی اعوذ پڑھ کر اس کے فتنوں سے پناہ مانگی جاتی ہے، اسی طرح نماز میں سلام وداع کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے ہی اجزاء کے ساتھ نماز میں بجنسہٖ یا بمثلہٖ موجود ہے اس لیے نماز حج کی عبادت پر بھی مشتمل نکلی۔

اسی طرح زکوٰۃ بھی نماز میں اپنی پوری حقیقت اور پوری صورت کے ساتھ قائم ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا جس کا معظم حصہ مال ہے تاکہ محبت حق کے لیے جگہ خالی ہو۔ پس مال نکال کر قلب کو حظوظ دنیا سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ نماز کا ماحصل ہی حب ماسوی اللہ سے آزاد ہو جانا ہے، وہاں ابتداء ہی سے رفع یدین کر کے گویا بندہ ساری دنیا کی نسبت کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے کہ میں سب سے بیزار ہوں اور صرف اللہ کی طرف آتا ہوں اور ظاہر ہے کہ یہی تزکیۂ نفس کی روح ہے کہ نفس ماسوا اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل

ذکرہ کا ہو کر رہے، اس لیے نماز، حقیقتِ زکوٰۃ پر حاوی نکلی۔ حقیقت زکوٰۃ کی تو نماز میں واضح ہو گئی۔ لیکن غور کرو تو زکوٰۃ کی صورت بھی نماز کے ساتھ وابستہ ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی صورت اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ نماز کے لیے فی سبیل اللہ مصارف بھی لازم ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے وضو شرط ہے اور وضوء کے لیے پانی جمع کرنا بغیر تھوڑے بہت خرچ کے ممکن نہیں اور خصوصاً جن ممالک میں پانی کی قلت ہے جیسے حجاز وہاں پانی کے لیے بہت کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی نماز کے لیے جگہ لازمی ہے اور زمین کا ٹکڑا بغیر مصارف کے ممکن الوصول نہیں، پھر اس پر مسجد کی تعمیر مصارف چاہتی ہے۔ پھر مسجد کی ضروریات راتبہ یعنی مقررہ حوائج تیل، بتی، فرش، لوٹے، پانی۔ اگر ان مصارف کا اوسط لگایا جائے تو اس کی کچھ نہ کچھ مقدار ہر نمازی پر بقدر حصہ لازم نکلتی ہے بلکہ بعض اوقات زکوٰۃ کے مصارف سے بھی ان کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ پس زکوٰۃ کی حسی صورت یعنی انفاق فی سبیل اللہ بھی موجود ہے۔ اس لیے زکوٰۃ بھی حساً و معناً اور صورتاً و حقیقتاً نماز کے اندر موجود نکلی۔ اسی طرح جہاد بھی نماز میں جیسا کہ آئندہ اس کی تفاصیل آنے والی ہیں اسی طرح اس میں ہجرت بھی ہے کیوں کہ ہجرت کی حقیقت موطن طبیعت سے نکل کر موطن فطرت پر آنا ہے، یعنی معاصی کو ترک کر کے طاعات کی طرف اقدام کرنا ہے اور اسکی صورت مکان غفلت سے منتقل ہو کر مکان طاعت کی طرف چلا جانا ہے۔ غور کرو کہ نماز کی صورت میں ہجرت کی صورت بھی موجود ہے۔ آدمی گھر بار چھوڑ کر بیوت الٰہی میں جا پہنچتا ہے اور حقیقت ہجرت بھی قائم ہے کہ معاصی سے تا ادائے صلوٰۃ تو بچا و رہتا ہی ہے پھر خود نماز کی خاصیت بھی معاصی سے بچانا ہے۔ اس لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے عَلَيْكُمْ بِالصَّلٰوةِ فَاِنَّهَا اَفْضَلُ الْجِهَادِ وَالْهِجْرَةِ (نماز کو مضبوط پکڑ لو کہ وہ افضل ترین جہاد اور عمدہ ترین ہجرت ہے۔)

غرض جس طرح سے کہ مسلم انسان جامع ادیان اور جامع حقائق عالم تھا تو اس کے لیے نماز بھی ایسی ہی جامع ہونی چاہیے تھی کہ جس میں تمام ہی انواع عبادات جمع ہوں اور ہر ایک کی نماز کی ہر ممکن سے ممکن صورت اور محتمل سے محتمل حقیقت موجود ہو۔ اگر نباتات اور درختوں کی نماز قیام تھا اور نباتات کے نمونے خود انسان میں موجود تھے تو ان کی نمازوں کا قیام بھی اس کی نماز میں آنا چاہیے تھا، اگر حیوانات کی نمازوں میں رکوع و سجود تھا۔ اور انسان میں خود حیوانات کے ہی سارے نمونے موجود تھے تو اس کی نماز میں رکوع و سجود بھی آنا لازم تھا اور اگر پہاڑوں کی نماز میں قعود، ملائکہ کی نمازوں میں صف بندی، زمین کی نماز میں سکون، سیارات اور اسماء کی نماز میں دوران اور جنت و نار کی نماز میں سوال و دعاء ہے اور ان تمام چیزوں کے نمونے انسان میں موجود ہیں تو ان کی نمازوں کی یہ ساری ہی حقیقتیں اور نمونے اس کی نماز میں بھی موجود ہیں حتیٰ کہ اگر شیاطین کا کام اضلال و گمراہی پھیلانا اور وسوسہ اندازی تھا اور گویا تکوینی طور پر ان کی اطاعت تھی کہ وہ سرکشی کرنے ہی میں پابند تخلیق الٰہی ہیں اور اس سے سر مو تجاوز نہ کریں تو انسان اس سے بھی خالی نہیں، کیوں کہ انسان میں یہ شیطان نفس امارہ کی صورت میں موجود ہے جو اسے ہر وقت بغاوت و طغیانی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی نماز میں یہ شیطانی کارگزاری بھی موجود ہے یعنی عین

صلوٰۃ میں نفسانی تخیلات، وساوس اور طرح طرح کے ہواجس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اس کے خشوع و خضوع میں خلل ڈالتے۔ گویا نفس تخیل آفرینی اور نماز میں خلل اندازی کرنے کی تکوینی طاعت اور تکوینی نماز میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی نماز وساوس و خطرات سے پر رہتی ہے اور جو بات کہیں بھی یاد نہ آئے وہ لازمی طور پر نماز میں ضرور یاد آ جاتی ہے۔ حتی کہ بعض بزرگوں کا مقولہ سننے میں آیا ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور یاد نہ آتی ہو تو نماز شروع کر دے وہ خواہ مخواہ بھی یاد آ جائے گی۔

بہر حال جیسا مسلم انسان تکوین و تشریع کے لحاظ سے جامع تھا ویسے ہی نماز بھی اسے جامع دی گئی۔ اور اس لیے دی گئی کہ ساری کائنات کے ذرہ ذرہ پر اسے فائق بنانا تھا تا کہ خلافت کا شرف سنبھالنے کے قابل ہو اور یہ فوقیت بغیر عبدیت کاملہ کے ناممکن تھی اور عبدیت کاملہ اس کے بغیر ناممکن تھی کہ عبادت کی تمام انواع اس کی نماز میں موجود نہ ہوں۔

نماز اور عالم النفس ...... پھر یہی نہیں کہ نماز صرف انسان سے باہر باہر کی اشیاء کی نمازی ہیئتوں کی جامع ہے بلکہ خود انسانی نفس کے تمام پہلوؤں کی عبادات کو بھی جامع ہے کہ اس کے جوارح قیام و قومہ اور رکوع و سجود میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی زبان ذکر اللہ کی عبادتوں میں سرگرم ہوتی ہے اس کی انگلی توحید کے اشاروں پر عبادت میں لگی ہوتی ہے۔ اس کے حواس خمسہ تصور کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا قلب اخلاق کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔ اس کی روح معرفت کی عبادت میں لگتی ہے۔ اس کا سر مشاہدہ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے۔ غرض نفس کا ہر ہر مقام اپنے مناسب حال عبادت کرتا ہے اور یہ ساری عبادتیں اسلامی نماز کے اجزاء ہیں۔ اس لیے نماز جیسے آفاقی نمازوں کے نمونوں پر مشتمل تھی۔ ایسے ہی انفسی نمازوں کے بھی سارے ہی نمونوں پر مشتمل نکلتی ہے کہ نماز صرف بدن اور قالب ہی کو شائستہ بناتی ہے بلکہ قلب اور اخلاق قلب کو بھی مہذب اور مزکی کرتی ہے جس کے یہ سب ثمرات ہیں۔ کیوں کہ اگر اخلاق پاک نہ ہوں تو کوئی باطنی اور ظاہری حرکت شائستہ اور مہذب نہیں ہو سکتی۔

نماز اور تہذیب اخلاق ...... پس اصلاح نفس کے لیے نماز ایک فائق ترین مجاہدہ بھی ہے جس سے اخلاق نفس درست ہو جاتے ہیں اور بد خلقی کافور ہو جاتی ہے جس کا راز یہ ہے کہ نفس کی بد خلقی کی بنیاد انانیت اور کبر نفس پر ہے جس سے غدر نفس پیدا ہوتا ہے اور کتنی ہی بد خلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس قائم ہوتی بالخصوص ذات البین کے فساد کی بنیاد ہی اس خلق پر ہے کیوں کہ کبر یا تعظیم نفس سے اول تو تفاخر کی عادت پڑتی ہے اور جب آدمی اپنے کو سب سے بڑا اور سب سے فائق سمجھتا ہے تو بجز اس کے پینگیں بڑھاتا اور ڈینگیں بگھارتا رہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس فخر وریا کا قدرتی اثر تحقیر غیر اور دوسروں کی تنقیص ہے جس سے ان اغیار کا برانگیختہ ہونا، جھنجھلانا اور ان کے دلوں میں غبار کا بھر جانا ایک قدرتی امر ہے اس کا اثر نفرت اور منافرت باہمی ہے اور منافرت کا طبعی اثر نزاع باہمی اور جدال وقتال ہے۔ یہ جدال و نزاع اول زبان سے ہوتا ہے تو بدگوئی اور سب و شتم کا دروازہ کھلتا ہے جس سے زبان قابو میں نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے حق میں غائبانہ بدگوئیوں کا سلسلہ قائم ہوتا ہے جس سے ایک

دوسرے کی غیبت، چغلی اور دوسرے مختلف معاصی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قولی سلسلہ میں ان معاصی سے بڑھ کر کوئی بھی معصیت اخلاق کو گندہ کرنے والی اور انسانی آبرو کو گرانے والی نہیں۔ پھر نزاع آگے بڑھتا ہے تو ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے اور زدوکوب شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظاہری اعضاء کا یہ انتہائی فساد ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بنی آدم کو کسی وقت بھی امن نہیں مل سکتا۔ اس سے آگے بڑھا تو جارحہ واسلحہ اور آلاتِ حرب وضرب کی نوبت آتی ہے جس سے قتل وغارت نمایاں ہو کر خونریزی سرزد ہوتی ہے جو ذات البین کے لیے انتہائی مفسدہ اور دنیا کے امن کے لیے انتہائی خطرہ ہے۔

غرض اس سلسلہ میں کبر نفس کا آخری نتیجہ خونریزی نکلتا ہے جو فسادِ ذات البین کی آخری سے آخری حد ہے۔

اور پھر یہی خلق اگر کسی قوم میں اجتماعی طور پر سرایت کر جائے یعنی قوم کی قوم متکبر اور دوسری اقوام کی تحقیر کنندہ ہو جائے، تو پھر یہ جدال وقتال بھی ہوگا جس سے پورا ملک یا پوری دنیا ہی جہنم زار بن جائے گی۔

پھر اگر اس متکبر کے سامنے کوئی اور مغرور جو اس کے اثرات میں دب نہ سکے بلکہ خود اس کی بھی وہی حیثیت مستقل ہو تو اس سے متکبر میں حسد کی بنیاد پڑتی ہے اور اس صورت میں جبکہ یہ متکبر غیر کو نہیں جلا سکتا تو خود بیٹھ کر آتش حسد میں جلتا ہے اور گھٹتا ہے کہ کسی طرح اپنے محسود کو نیچا دکھائے۔ لوگوں کو اس کے خلاف اکسا اور بھڑکا کر چاہتا ہے کہ اس کے بارہ میں سب کو مبتلا کر دے تاکہ اس کے غیظ کو کسی طرح شفا حاصل ہو سکے۔

پس حسد سے بدخواہی خلق ابھرتی ہے اور اس سلسلہ میں حاسد میں طرح طرح کی چالاکیاں، عیاریاں اور مکاریاں کرتے رہنے سے مکر وفریب کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ غیظ میں بے صبری اور از خود رفتگی نمایاں ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ظاہر ہوتا ہے جو شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں حسد سے کیا۔

غرض کبر نفس سے بدگوئی، مفاخرت، ریاکاری، بدخلقی، سب وشتم، غیبت، چغلی، ہذیان اللسانی، حسد کاری، مکاری، فریب بازی، ایذادہی، آبروریزی اور انجام کار خونریزی غرض جب حسد، بغض، مکاری، جعلسازی، بے صبری اور از خود رفتگی کے اخلاق واعمال ظہور پذیر ہوں، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ انسانی اخلاق ہیں یا ان اخلاق سے دنیا میں امن چین کا منہ دیکھ سکتی ہے؟ بلکہ یہ وہ شیطانی خلق ہے جس کے ماتحت اس نے ازل میں ''انا خیر منہ'' کہا تھا اور اسی انانیت کی بنا پر مردود ابدی ٹھہرا۔

پس انسان کو بھی بارگاہِ حق سے کلیۃً مردود ٹھہرانے میں یہی انانیت مؤثر ہوتی ہے اور اس لیے ہوتی ہے، کہ اس سے یہ مختلف الانواع معاصی پیدا ہوتے ہیں جس سے دنیا کے بدامنی کا گہوارہ بن جانے سے لوگوں کی عافیت تنگ ہو جاتی ہے اور ادھر انسانی قلوب سیاہ اور ظلماتی بن جاتے ہیں۔

پھر اسی تحقیر غیر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسرے کو اپنے سے کم رتبہ سمجھ کر اس پر اپنا ہر قسم کا حق سمجھنے لگتا ہے اور ان حقارت زدہ انسانوں کا کوئی بھی حق اپنے اوپر نہیں جانتا اس کا اثر یہ ہے کہ دوسروں کے حق کو

پامال کرنا۔ ان پر ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھنا۔ اور لونڈی غلاموں سے بدتر حالت میں انہیں دیکھتے رہنا اور ان کی املاک کو اپنی ملک تصور کر کے ان میں ہر قسم کا تصرف کرنا۔ مال چھین لینا۔ عورتوں پر ہاتھ ڈالنا، بچوں کی خدمات کے لیے قبضہ لینا وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں جاہ کے ساتھ ساتھ باہ کے جذبات بھی بھڑکتے ہیں جن کی اساس حرص ہے اور حریصانہ خصلتوں کے آثار اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ ہر ایک چیز پر آدمی کی نگاہ ہو اور جس طریق پر بھی ممکن ہو اس سے چھین لینے کے دواعی دل میں ابھرے ہوئے ہوں۔ اس سے غصب، نہب، ڈکیتی، سرقہ، رشوت، شہوت، پھر بخل، طمع، جمع اموال وغیرہ کے جذبات دل میں راسخ ہوتے ہیں۔ یہ خلق بلاشبہ انسانی نفس کا ذاتی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام بھی نسیاناً مبتلا ہوئے۔ لیکن کرامت انسان کے بہر حال خلاف ہے جس کا اعلان وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ میں کیا گیا ہے بلکہ ایک فتنہ افزاءِ خلق ہے جس سے عالم میں فساد پھیلتا ہے۔

غرض کبر نفس کا آخری اثر ایک طرف تو انجام کار خونریزی اور دوسری طرف آخر کار فساد ہے اور یہی وہ دو (۲) اصولی مفاسد ہیں جن سے فرشتوں نے نوع بشر کو خلافت دیئے جانے سے خوف کھایا تھا اور بکمال ادب بارگاہ حق میں عرض کیا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ ①

جس سے واضح ہے کہ فساد فی الارض (بدامنی) اور سفک دماء (خونریزی) تمام مفاسد کی جڑ ہے۔ خونریزی، جاہ پسندی یعنی کبر نفس سے سرزد ہوتی ہے یہ ایک انتہا درجہ کا فحش ہے جو باہ کو بھڑکاتا ہے اور ایک انتہاء درجہ کا منکر ہے جو جاہ کو ہیجان میں لاتا ہے۔

اور انہی دو بنیادوں سے جاہ و باہ کے ہمہ قسم معاصی پھیلتے ہیں جن کی جڑ بنیاد کبر نفس اور انانیت نکلتی ہے، یہ سلسلہ سمجھ لینے کے بعد اب نماز کو دیکھئے تو اس کا ہر ہر رکن اور ہر ہر فعل اس کبر نفس کے لیے تبر اور تیشہ ہے۔ کیوں کہ اس کی ہر ہر ادا سے آدمی نہ صرف ذلت نفس کا اظہار ہی کرتا ہے بلکہ دل سے باور کرنے کی عادت ڈالتا ہے کہ حق کے سامنے میری کوئی ادنیٰ عزت اور کوئی معمولی سی بھی حرمت نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی۔ ترفّع و کبر تو بجائے خود رہے میں تو انتہائی پستی اور آخری ذلت کے لیے ہوں کہ ناک اور پیشانی تک بھی خاک پر رگڑ رہا ہوں۔

پس جب کہ نماز کبر نفس کو اس طرح مٹا دیتی ہے جیسے آفتاب شبنم کو اور نور ظلمت کو تو ظاہر ہے کہ کبر کے یہ آثار خبیثہ یعنی جاہی اور باہی معاصی بھی کیسے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جو دنیا میں فساد اور خونریزی کے کفیل اور فحش و منکر کے ضامن دار تھے، اسی لیے قرآن نے نماز کی خاصیت فحش و منکر ہی کا ختم ہو جانا بتلایا ہے ارشاد حق ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ ② اس سے واضح ہے کہ اگر دنیا نمازی بن جائے تو فحش، و منکر، جاہ و باہ کی بدمستیاں قولی اور فعلی معاصی قلبی اور اخلاقی کھوٹ کو دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی اور بدامنی و بے چینی عالم میں محض بے کس ہو کر ہی رہ سکتی ہے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ: العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

قرن اول میں نماز کی اہمیت...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور کو خیر القرون، ان کی زندگیوں کو خیر الحیات اور ان کی ذوات کو خیر اھل الارض اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس میں ان دونوں انواع کے معاصی کا پتہ نہ تھا، جاہ اور باہ دونوں خیر سے مغلوب اور دین کے ماتحت تھیں۔ اس لیے جو امن اس دور میں تھا وہ عالم کو پھر نصیب نہیں ہوا۔ اس کا راز یہی ہے کہ ان کی عام ترقی نماز کے ذریعہ تھی اور زندگی کا مقصد اعلیٰ اور اصلی نماز ہی تھا، نماز ہی معیار عبادت تھی اور نماز ہی معیار خلافت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لیے جس میں عبادت وخلافت کے دونوں منصب شامل ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب یہ کہہ کر فرمایا کہ وہ خیر الامت بعد الانبیاء ہیں تو انہیں اپنے سامنے امام صلوٰۃ ہی بنایا تھا جو بالآخر ان کے خلیفہ ہونے کی دلیل ثابت ہوئی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت ہی یہ کہہ کر کی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارا امام صلوٰۃ بنا کر ہمارا دین ان کے سپرد کر دیا اور اس پر ہم راضی ہو گئے تو ہمیں پھر دنیا انہیں سونپ دینے میں کون مانع ہوسکتا ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام دین کی بقاء نماز کی بقاء میں اور تمام دین کی اضاعت نماز کی اضاعت میں سمجھی اور خلافتی حکم کے ساتھ اس کا اعلان فرمایا اِنَّ اَھَمَّ اُمُوْرِکُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ فَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَ لِمَا سِوَاھَا اَضْیَعُ. (1) نیز تمام صحابہؓ کی دینی ترقی اسی نماز کے مجاہدہ سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اوائل عہد اسلام میں تمام راتوں کے بڑے حصہ میں صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام فرماتے یہاں تک پیروں پر ورم آجاتا۔ اور پیر پھٹ کر خون بہہ نکلتا۔ جس کا قرآن نے یوں اعتراف کیا ہے: اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَار (2)

بہر حال صحابہ رضی اللہ عنھم کی دینی وانتظامی ترقی کی ضمانت دار نماز ہی نکلتی ہے اور نماز ہی ان جاہی وباہی مفاسد اور انواع معاصی کے لیے ضرب کاری ثابت ہوتی ہے: اس لیے نتیجۃً کہا جاسکتا ہے کہ جو قوم نماز گذار نہیں وہ کتنی ہی ترقی کر جائے یا تو وہ خالص دنیا کی ترقی ہوگی جس میں سرے ہی سے اخلاقیت نہ ہوگی اور اگر روحانیت یا مذہبیت لیے ہوئے ہوگی تو فحش ومنکر سے پاک نہ ہوگی جس کا انجام پھر وہی جاہ وباہ، فساد وخونریزی اور فحش ومنکر ہوگا۔

نماز سے تہذیب نفس کی کیفیت...... رہا یہ سوال کہ یہ کبر نفس آخر نماز پڑھنے سے زائل کس طرح ہو جاتا ہے؟ سو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ کبر نفس جبھی تک باقی رہ سکتا ہے جب اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو۔ اگر کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر وغرور پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔

چنانچہ بڑے سے بڑا نواب بادشاہ کے آگے جھک جاتا ہے وہاں اپنے نفس کی بڑائی باقی نہیں رہتی۔ کیوں کہ مسلمہ بڑا سامنے ہے۔ ایک بڑے سے بڑا افاضل وعالم اپنے استاد کے آگے جھک جاتا ہے کہ اپنے سے بڑا سامنے

---

(1) مؤطا مالک، باب وقوت الصلاۃ ج: ۱ ص: ۷. السنن الکبریٰ للبیھقی، باب کراھیۃ تاخیر العصر ج: ۱ ص: ۴۴۵. (2) پارہ: ۲۹، سورۃ: المزمل، الآیۃ: ۲۰.

ہے۔یہاں اس کے دل میں اب اپنے علم وفضل کا خطرہ بھی نہیں گذر سکتا۔ایک چپراسی تھانہ دار کے سامنے تھانیدار انسپکٹر پولیس کے سامنے، کلکٹر کمشنر کے سامنے اور کمشنر گورنر کے سامنے، وائسرائے کنگ کے سامنے جھک جاتا ہے کہ اب وہ سامنے ہے جس کی عظمت سے دل لبریز ہے۔غور کیجئے کہ جب انسان، انسان کے آگے دوسرے کی عظمت سے جھک کر اپنے کبروخودی کو پامال کر دیتا ہے۔حالانکہ یہ عظیم انسان اسی صغیر انسان جیسا ہے، نہ اس کی ذات میں کوئی مادر نہ خوبی ہے نہ اس کی ذات میں، تو پھر اگر وہ ذات پیش نظر ہو جائے جو خوبیوں کی مالک، کمالات کا سرچشمہ، بھلائیوں کا مخزن، اور تمام ہی اخلاق حسنہ اور صفات مستحسنہ کا منبع ہے۔بلکہ جہاں بھی خوبی کا کوئی کرشمہ ہے وہ اسی کا ہے جسے بھی کوئی خوبی ملی ہے اسی کی دہلیز کا فیض اور اسی کے یہاں کی دریوزہ گری کا اثر ہے تو سوچئے کہ اس کے سامنے کبر نفس کا کوئی نشان باقی رہ سکے گا؟ یہ نہیں کہ کبر مغلوب ہی ہو جائے گا بلکہ جڑ سے نکل جائے گا اور بے نفسی اور بے لوثی سامنے آ کھڑی ہوگی۔

اب آپ غور کرلیں کہ نماز میں جس چیز کو سامنے رکھا جاتا ہے وہ بجز عظمت حق کے اور کیا چیز ہے؟ نماز کے ہر ہر کلمہ سے اسی کی عظمت، اسی کا علو مراتب، اسی کی ثناو صفت، اسی کی تقدیس وتمجید، اسی کی شان کبریائی ورفعت اور اسی کی ہمہ قسم بزرگیوں کا اظہار، ہر ہر ادا سے اعلان اور قلب کی گہرائیوں سے اقرار واعتراف کیا جاتا ہے۔پس جس قلب کے رگ وریشہ میں حق کی یہ عظمت راسخ ہوگی اس قلب میں اس نفس ناپاک جاہل ازلی اور بے کمال حقیقی کی وقعت کیا باقی رہ سکتی ہے، کہ کبروغرور پاس بھی پھٹک سکے اور جب نفس نہ رہا تو وہ تمام فتنے بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اس کبر سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کی تفصیل ابھی عرض کی گئی ہے۔اس کو محققین کی اصطلاح میں تخلیہ کہتے ہیں یعنی نفس کا رذائل سے پاک ہو جانا۔

اور ظاہر ہے کہ جب نفس خالی ہو کر اور اس کے پیرایہ میں طالب حق ہو کر حق تعالی کے سامنے ہے تو ظاہر ہے کہ اب جو کچھ اثرات بھی نفس میں راسخ ہونگے وہ حق ہی کے ہو سکتے ہیں کیوں کہ نفس کے اثرات تو زائل ہو چکے اور نفس کے بعد درجہ حق ہی کا ہے۔جیسا کہ ایک بزرگ نے حق تعالی سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! میں آپ تک کیسے پہنچوں؟ فرمایا گیا۔دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالَ (خواہشات نفس اور ہوائے نفس کو چھوڑ دو اور آ جاؤ) گویا نفس گذاری اور وصول بحق میں صرف ایک ہی قدم کا درمیانی فاصلہ ہے کہ نفس کو چھوڑ دو اور واصل ہو جاؤ۔ ع:

تو خود حجاب خودی حافظ ازمیاں برخیز

اور جب کہ آثار نفس یہ رذائل تھے تو ظاہر ہے کہ آثار حق فضائل ہوں گے۔رذائل کا سرچشمہ کبروغرور نفس تھا تو فضائل کا سرچشمہ تواضع للحق ہوگی۔جو کبر کی ضد ہے اور جیسے آثار کبر وہ بداخلاقیاں تھیں جن کی تفصیل ابھی ذکر کی گئی تو تواضع کے آثار ان رذائل کی ضد ہوں گی یعنی اس تواضع سے جو نماز کے ذریعہ حاصل ہوگی، حرص نہیں بلکہ قناعت ہوگی، ہوسنا کی نہیں جس سے فساد پھیلتا ہے۔بلکہ سیر چشمی نمایاں ہوگی جس سے صلاح تمام اور رفاہ عام پیدا ہوتا ہے

۔پھر تواضع کا اثر خونریزی نہیں بلکہ عصمت دم اور حفظ اموال ہے۔خودغرضی نہیں بلکہ خیر خواہی خلق اللہ ہے بدزبانی نہیں بلکہ حق گوئی ہے ،نزاع وجدال نہیں بلکہ محبت باہمی ہے ۔لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ ایثار ہے ۔حق تلفی نہیں بلکہ ادائے حقوق ہے،فسادات نہیں بلکہ صلاح ذات البین ہے۔آبروریزی نہیں بلکہ تحفظ عرض وآبرو ہے مکروفریب نہیں ،بلکہ دانش وحق پسندی ہے۔بغض وعناد نہیں بلکہ محبت ومودت ہے۔حسد نہیں بلکہ بہی خواہی اور طلب ترقی غیر ہے۔

غرض وہ تمام مفاسد جو آثار نفس میں سے تھے،مٹ کر وہ تمام مصالح انسانی نفس میں داخل ہوجاتے ہیں جو آثار حق میں سے ہیں ۔اور انسان مظہر کمالات الٰہی اور مرکز اخلاق ربانی بن جاتا ہے جس سے دنیا امن وچین کا سانس لینے لگتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز کے سلسلہ میں دو چیزیں سامنے ہوتیں ہیں،ایک نفس،ایک رب۔نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی رہتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی جب عظمت مطلقہ سامنے کردیتی ہے تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں اور رب کریم اپنے فضائل سے نوازتا ہے تو آثار حق زندہ ہوجاتے ہیں۔

اس لیے یوں سمجھئے کہ نماز کا ایک جز وتحقیر نفس تو رذائل نفس کو مٹاتا ہے جسے تخلیہ کہتے ہیں اور ایک جز وتعظیم حق فضائل کو پیدا کرتا ہے۔جسے تجلیہ کہتے ہیں پس تخلیہ اور تجلیہ دونوں مقاموں کے لیے نماز ہی کفیل وضامن نکلی اور سب جانتے ہیں کہ فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے اور تہذیب نفس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوجائیں۔

اس لیے واضح ہوگیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لیے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ جس سے ایک طرف معرفتِ نفس اور دوسری طرف معرفت رب حاصل ہوکر اخلاق ظلماتی مفلوج ہوجاتے ہیں اور اخلاقِ نورانی پیدا ہوجاتے ہیں.....(جس نے اپنے نفس کے عیوب ونقائص کو پہچان لیا اس نے اپنے رب اور اس کے کمالات ومحامد کو پہچان لیا)

نماز اور نفس کے مقامات واحوال......نماز کے اس تزکیۂ نفس کے بعد قدرتی طور پر خود بخود نفسانی احوال ومقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہوجاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے۔لیکن بلا واسطہ بھی نماز میں یہ تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہوجاتے ہیں اور آدمی بلند پایہ ہوجاتا ہے۔

مثلاً شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے،صبر کو لو تو نماز میں ہر ایک لذت سے آدمی صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزہ سے زیادہ مکمل ہے۔اخلاص کو لو تو نماز کا موضوع ہی ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' جس کی حقیقت ماسوا اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے،تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس تک سامنے ہو وہاں تواضع تو پھر اوپر کی بات ہے۔رضا بالقضاء کو لو تو جہاں عبدیت محضہ اور خالص عبادت عمل میں آرہی ہو وہاں رضا وتوکل تو ادنیٰ درجہ ہے۔

سخاوت کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا ہے اور اس سے صبر کرلیتا ہے۔شجاعت کو لو تو اس میں

سخت ترین مقابلہ خود اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔ صدق وعفاف کو لو تو ریا کاری، نفاق اور فریب وکذب سے تکبیر تحریمہ ہی کے وقت کانوں پر ہاتھ دھر لیے جاتے ہیں اور سچائی کے ساتھ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضری ہوتی ہے۔

شوق وذوق اور انس کو لو تو جہاں سرچشمۂ کمالات وعنایات سامنے ہوا اور اسی کی طرف عاشقانہ دوڑ ہو رہی ہو، تو وہاں لذت وشوق اور انس وذوق کی کیا کمی ہو سکتی ہے؟

غرض اوّل تو یہ تمام مقامات صالحہ انانیت کے ازالہ ہی سے نفس میں فی الجملہ پیدا ہو جاتے ہیں کہ نماز خلق تواضع کو مکمل کر دیتی ہے اور یہ تمام محاسن اخلاق تواضع ہی کے سرچشمہ سے نکلتے ہیں، لیکن نماز بالخاصہ بھی اپنے افعال سے ان مقامات کو انسان میں پیدا کرتی ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں نماز نے جو خاص جوہر پیدا کیا تھا وہ یہی تھا کہ وہ وقار مجسم بننے کے ساتھ ہی تواضع مجسم اور بے تکلف اخلاق کے بھی مالک بن گئے تھے۔ بڑے سے بڑے کروفر کا وجود انہیں تواضع وسادگی سے بیگانہ نہیں بناتا تھا اور وہ نفس انسانی کی اصلیت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار تھے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رکاب تھام کر ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ گھبرا کر بولے کہ اے عم رسول اللہ! یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے علماء کی اسی طرح عظمت کرو۔ اس کے بعد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے گھوڑے سے اتر کر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیر پکڑ لیے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ گھبرا گئے وہ کیوں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور گھبرا کر بولے کہ اے حضرت! یہ کیا غضب کیا؟

فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی طرح تکریم کرو۔ پس وقار کے ساتھ تواضع اور منصب ارشاد وتربیت کے ساتھ یہ ذاتی عبدیت اور اخلاق ستودہ اس نماز ہی نے ان حضرات کو سکھائے تھے۔

بہرحال واضح ہوا کہ نماز جیسے تمام کائنات کی عبادت کو جامع ہے اور جیسے تمام اجزائے انسانی کی عبادت کو جامع ہے۔ ایسے ہی کائنات انسانی کے تمام اوصاف حمیدہ اور اخلاق ستودہ کی عبادت کو بھی جامع ہے جس سے انسانی نفس میں جامعیت بھی پیدا ہوتی ہے اور جمعیت بھی یعنی نفس انسانی خود اپنے اوپر حاوی ہو جاتا ہے اور اپنے غیر پر بھی۔ اس کی عبادت بھی مکمل ہو جاتی ہے اور خود اس کی شان عبدیت بھی کامل بن جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان پر اس وجہ سے کہ وہ تکوینی حقائق کا جامع ہے اور مخلوقاتی نمونوں کا مجموعہ تھا یعنی اس کی شان مخلوقیت مکمل تھی، نماز جیسی جامع عبادت اس پر عائد کی گئی جس میں عبادت کے سارے نمونے جمع ہیں، خواہ وہ نفسی ہوں یا آفاقی،

اس لیے ثابت ہو گیا کہ حقیقی طور پر اس کے مخلوقاتی فریضہ کی ادائیگی نماز کے بغیر ممکن نہیں۔

نماز اور اجتماعیات...... لیکن اب ادھر آؤ کہ جب اس میں خالق کے صفات و کمالات کے نمونے بھی سب کے سب رکھے گئے ہیں۔ گویا مادیت کی طرح اس کی استعداد روحانیت بھی مکمل ہے، جس میں خدائی کمالات کے جلوے سمائے ہوئے ہیں، تو ان ربانی نمونوں کی وجہ سے اس پر ویسا ہی فریضہ عائد ہوتا تھا جیسا کہ اس کے خالق کا عمل اپنی مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تربیت خلائق ہے، اگر انسان بنی نوع کی ہمدردی اسی نمونے پر کرنے لگے تو اسی کا نام خلافت ہے، اس لیے بالفاظ دیگر انسان پر عبادت کے ساتھ دوسرا فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے، جبکہ وہ کمالاتِ الٰہیہ کے نمونوں کا جامع بھی بنایا گیا ہے۔ غور کرو تو اس فریضہ کی ادائیگی بھی نماز ہی سکھلاتی ہے کیوں کہ نماز ہی کے ذریعہ خدا نے بھی اپنے خدائی کاموں کو چھیڑا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ خالق کا کام اپنی مخلوق کی نگہداشت فرمانا اپنی تمام صفات کمال کے ساتھ ان کی تربیت فرمانا انہیں مادی اور روحانی رزق دے کر ہر ایک کے مناسب حال اس کی تکمیل فرمانا اور اپنے فطری اصول پر حق داروں کو حقوق پہنچانا اور شریروں اور ناحق کوشوں کو سزا دینا۔ اور مختصر یہ کہ تمام جہانوں پر قوت و متانت کے ساتھ اپنے عدل کا نظام قائم رکھنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سب کا منشاء رحمت خداوندی اور فضل ربانی ہے کہ یہ سب کچھ خدا پر واجب اور لازم نہیں ہے۔ محض اپنے فضل و کرم سے اس نے مخلوق کے منافع کی خاطر یہ کام کیا جس کو رحمت کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے حتی کہ شریروں کی سزا دہی بھی گو بظاہر غضب اور قہر نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً اس غضب کا منشاء بھی......... رحمت ہی ہے کہ اس سے بھی مخلوق ہی کی بھلائی مقصود ہے۔ خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا وہاں کوئی سوال نہیں کہ وہ ذات پاک ہر نفع وضرر سے بری و بالاتر ہے۔

بہرحال اس سے واضح ہے کہ جہانوں کی تربیت کا نظام صفت رحمت کے بازوؤں پر قائم ہے اور غلبۂ رحمت ہی ان نظاموں کو برقرار رکھے ہوئے ہے، ورنہ خالص غضب وقہر عالم کی بیخ و بنیاد ہی باقی نہیں چھوڑ سکتا۔ چہ جائیکہ اس کی ترقی ہوتی۔ اب سمجھو کہ اسی رحمت عامہ کو جس سے جہانوں کی تربیت متعلق تھی، خدا نے اپنی نماز فرمایا ہے اور گویا اس ربوبیت کو صلوٰۃ سے تعبیر فرماتے ہوئے خود اپنے ذمہ بھی نماز لازم فرمالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ①

”وہ ذات وہ ہے جو تم پر صلوٰۃ (رحمت) بھیجتی ہے اور اس کے فرشتے بھی تا کہ تمہیں (ظلم و جہل کی) تاریکیوں سے (علم و عدل کی) روشنی میں لے آئے کیوں کہ وہ ایمان والوں پر بہت مہربان ہے“۔

یہ الگ بات ہے کہ یہاں صلوٰۃ کی حقیقت عجز و نیاز مندی نہیں کہ وہ ذات بابرکات ہر عجز و نیاز اور ہر ایک احتیاج سے بری و بالا ہے بلکہ وہی رحمت بھیجنے اور تربیت کرنے والے ہیں چنانچہ آگے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا سے اسی کی طرف صاف اشارہ موجود ہے مگر بہرحال اس کو تعبیر صلوٰۃ ہی کے عنوان سے فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہو گیا

① پارہ: ۲۲، سورۃ: الاحزاب، الآیۃ: ۴۳۔

کہ اگر بندے نماز ادا کرتے ہیں تو حق تعالیٰ بھی فعل صلوٰۃ کی ادائیگی فرماتے ہیں گو حقیقت صلوٰۃ دونوں جگہ جدا جدا ہے۔ بندوں میں صلوٰۃ کی حقیقت تذلل ومسکنت ہے اور خالق میں اس کی حقیقت ترحم وشفقت یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تمام صفات کمال میں ہر ایک صفت ایک ہی اسم سے بندہ پر بھی بولی گئی ہے اور اسی اسم سے خدا پر بھی مگر حقیقتیں اور کیفیتیں دونوں جگہ الگ الگ ہیں۔ مثلاً سمیع وبصیر وعلیم وخبیر ورحیم ومنعم وغیرہ بندوں کو بھی کہتے ہیں اور خدا کو بھی۔ ہاتھ پاؤں کوکھ پنڈلی چہرہ اور آنکھ وغیرہ بندہ کے لیے بھی ثابت ہے اور خدا کے لیے بھی۔ عوارض میں عروج ونزول، ہنسنا، بولنا، خوشی اور خفگی بندہ کے لیے بھی ہے اور خدا کے لیے بھی شریعت نے مانی ہے، مگر باوجود اس اسمی اشتراک کے حقیقتوں اور کیفیتوں میں اتنا ہی بعد بعید ہے، جتنا بندہ اور خدا میں ہے۔ چنانچہ یہ سب احوال واوصاف بندوں میں انفعال ہیں اور خدا میں فعل۔ وہاں تأثرات ہیں اور یہاں تاثیرات۔ ٹھیک اسی طرح صلوٰۃ کا فعل شریعت نے بندہ کے لیے ثابت کیا ہے اور خدا کے لیے بھی، مگر بندہ میں بمعنی عبادت ہے اور خدا میں بمعنی عنایت ورحمت۔

لیکن بہر حال صلوٰۃ کا عنوان دونوں جگہ یکساں قائم ہے۔ جس سے صلوٰۃ کی یہ ہمہ گیری واضح ہونے کے علاوہ کہ وہ تمام مخلوق سے گذر کر عالم قدس کے بھی چپہ چپہ پر چھائی ہوئی ہے، یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ نماز میں عبدیت کے پہلو کے ساتھ ایک پہلو رحمت وشفقت اور بعنوان دیگر خلافت کا بھی نکلتا ہے جس کی صورت بندہ میں یہ ہے کہ اگر وہ منفرداً نماز پڑھے تو اس کی نماز کا جو رخ خدا کی طرف ہے وہ بلاشبہ عبودیت ہے اور جو رخ خود اپنے نفس کی طرف ہے وہ بلا ریب شفقت ورحمت ہے کہ خود اپنے کو پاک بنایا جا رہا ہے اپنے کو بلند مقامات پر پہنچایا جا رہا ہے۔ اور اپنے نفس کے لیے دارین کی صلاح وفلاح حاصل کی جارہی ہے تاکہ نفس امارہ ان افعال صلوٰۃ سے تربیت پا کر اپنی حد کمال کو پہنچ جائے اسی کو ہم خلافت انفرادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اگر نماز با جماعت ہے تو امام نماز جو تمام مقتدیوں کا ضامن ہے اور اس دربار الٰہی میں ان کا وکیل ہے۔ اس کی نماز کا وہ رخ جو خدا کی طرف ہے عبودیت کا ہے یعنی وہ اپنی نیازمندی اصالتاً اور اپنے مقتدیوں کی وکالتاً اللہ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اسی امام کی نماز کا وہ رخ جو بندوں کی طرف ہے وہ خلافت ونیابت کا حق ہے کہ اسے جو کچھ رحمتیں ادھر سے دستیاب ہو رہی ہیں وہ خدا سے لے کر پہلے۔ اپنے نفس کو اور پھر مقتدیوں کو پہنچا رہا ہے۔ تاکہ وہ خود بھی اور اس کے مقتدی بھی اس اجتماعی تربیت سے اپنی حد کمال کو پہنچ جائیں اور مقصد حیات بالآخر حاصل ہو جائے پس یہ صلوٰۃ جماعت اپنے بالائی رخ کے لحاظ سے اجتماعی عبادت ہوئی اور اپنے تحتانی رخ کے لحاظ سے اجتماعی شفقت ہوئی جو اپنے بنی نوع پر متوجہ ہوئی، جیسا کہ خود اللہ اپنے بندوں پر بلا واسطہ رحمت وشفقت فرماتا تھا۔

پس امام جماعت کی بحیثیت نائب حق یہ رحمت وشفقت ہی خلافت اجتماع کہلاتی ہے۔ اسی لیے خلافت الٰہی کا مکمل نمونہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نماز کی بدولت عالم انفس میں نمایاں ہوا، جس کی حقیقت تربیت وربوبیت عامہ وخاصہ نکلی جسے رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی شانِ رحمت وربوبیت جس کو قرآن نے صلوٰۃ الٰہی سے تعبیر کیا ہے عالم کے نظام کو چلا رہی ہے اور سارا جہان فطرت کے اصولوں کی پیروی کرتا ہوا ان کے اقتداء میں دوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ تا کہ اس تکوینی تنظیم وتربیت کے ماتحت کائنات کا ہر ہر مقتدی ذرہ ذرہ اپنی حد کمال کو مقررہ وقت پر پہنچ جائے گویا حق تعالیٰ اس صلوٰۃ وتربیت میں اپنی ساری کائنات کے لیے امام الکل ہیں اور بذات خود امام اور قبلہ توجہات ہیں۔ اور یہ سارا اسباب ومسبباب کا جڑا ہوا سلسلہ صف بندی کیے ہوئے ان کا مقتدی ہے جو ان کے تکوینی اشاروں کی اقتداء کرتے ہوئے اپنی ترقی وتکمیل کی خاطر ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

ٹھیک اسی طرح نماز باجماعت میں امام نماز نائب حق کی حیثیت سے اپنے سے پہلے پچھلی صفوں کے لیے امام الکل ہے، اور اس کے سارے مقتدی اس کے اشاروں پر راہ خدا میں دوڑ رہے ہیں۔ تا کہ اپنا اپنا مقررہ روحانی حصہ پا کر اپنے نفس کو اس مقام معلوم پر پہنچا دیں جو ان کے لیے اس سعی پر مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ امام اس جہت میں اسی رحمت وربوبیت الٰہی کا مظہر اتم ہوتا ہے جس سے نظام عالم کی تربیت کی جا رہی ہے، اسی لیے نماز میں عبادت کے پہلو کے ساتھ خلافت کا پہلو بھی کھل جاتا ہے خواہ وہ خلافت انفراد ہو جیسے منفرد کی نماز یا خلافت اجتماع ہو جیسے جماعت کی نماز۔

نماز اور اجتماعی معاشرہ...... نماز کی اس شیرازہ بندی اور پانچ وقت جماعتی مظاہرہ سے قدرتاً جو آثار نمازیوں پر پڑتے ہیں وہ معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے سے میل ملاپ، ہمدردی اور باہمی تعاون وتناصر کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ یعنی لوگ قدرتی طور پر اجتماعی حیات کی طرف آنے لگتے ہیں کیوں کہ جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے انفراد اور خلوت کو چاہتی ہے، اسلام نے یہ اجتماع اور جلوت پیدا کی ہے کہ جس سے نماز عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ خلافت کا بھی حق ادا کرنے لگے تو معاشرہ ومدنیت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے جلوت واجتماع چاہتی ہے ایک نمازی انسان کیسے انفراد پسند بن سکتا ہے۔ اس لیے اسلامی نماز کا خاصۂ لازمی ہی یہ ہے کہ وہ مسجد کے فرش پر اجتماعیت کا سبق پڑھا کر خدا کی پوری زمین پر جوامت کے لیے مسجد عامہ بنا دی گئی ہے، اجتماعیت عامہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور نماز کی اس خلافت صغریٰ ہی سے خلافت کبریٰ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پختہ نمازی جو نماز کی حقیقتوں کو دل میں حاضر کر کے نماز ادا کرتا ہو اور جو حاضری مساجد کے التزام کے ساتھ حضور مساجد کے اجتماعی تصور کو بیدار کر کے مسجد میں آتا ہو وہ یقیناً زندگی کے اس اجتماعی مرحلہ پر پہنچ کر رہے گا جو مسلمان کی زندگی میں اسلام کو پیش نظر ہے۔ اور وہ یہی ہے اس نے مسلمان کی زندگی کے ہر ہر شعبہ کو خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتا ہو یا سیاست ومدن سے، عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اجتماعی بنانا چاہا ہے۔ مثلاً باہمی تعلقات اور آپس کے تعاون کو استوار کرنے کے لیے کہیں اسلام نے عیادت مریض رکھی تا کہ ایک کی دوسرے کے دل میں جگہ ہو اور قطع راہ ورسم کی صورت نہ ہونے پائے۔ کہیں جنازوں کی متابعت عامہ رکھی کہ میت کی خدمت بھی کسی ایک گھرانے یا قبیلے سے مخصوص نہ رہے بلکہ عامۂ مسلمین کا فریضہ ہو جائے۔

کہیں تعزیت میت عمومی رکھی تا کہ سب کے سب مرنے جینے میں ایک دوسرے کے شریک حال رہیں۔

کہیں زیارت اخوان اور دوستوں سے ملاقات رکھی تا کہ محبت باہمی کی تجدید ہوتی رہے۔ کہیں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کی رسم قائم کی تا کہ دلوں کی کدورتیں صاف ہوتی رہیں اور اجتماعی مقاصد میں فرق نہ پڑے۔ ادھر ہر یگانہ و بیگانہ کے لیے تحیہ وسلام رکھا تا کہ ایک دوسرے سے قریب رہیں۔ مصافحہ پر مغفرت کے وعدے دیئے تا کہ ایک دوسرے سے ہاتھوں کی طرح خود بھی ملے رہیں۔

صلۂ رحمی رکھی تا کہ قرابتیں مضبوط رہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو گھروں پر بے تکلف پہنچ کر کھانے پینے کی رسم قائم کی تا کہ باہمی بشاشت و بے تکلفی مستحکم ہو ساتھ مل کر بلکہ ایک برتن میں کھانے کا ڈھنگ ڈالا تا کہ ایک کو دوسرے سے کراہت اور آپس کی چھوت باقی نہ رہے۔

جماعت میں سے ایک کا وعدہ سب کا وعدہ اور ایک کا ذمہ سب کا ذمہ قرار دیا تا کہ باہمی بے اعتمادی کو راہ نہ ملے۔ قرابتوں اور اخوتوں کے حقوق قائم کیے تا کہ ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ بناوٹی مراتب کی تفرقتیں مٹائیں تا کہ باہمی یگانگت قائم ہو کر ایک دوسرے کے کام میں بے تکلف حصہ لے سکے۔ سوء ظن، غیبت چغلی اور آپس کے مخفی حالات کی ٹوہ ممنوع قرار دی تا کہ کوئی ایک دوسرے سے غیر مطمئن نہ ہونے پائے۔ مہمان داری اور اس کے فضائل پر جھکایا تا کہ ملکوں اور وطنوں میں اجنبیت باقی نہ رہے۔ ابن السبیل اور مسافروں کی خدمت رکھی تا کہ کوئی بے وطن اپنے کو غریب اور بے وطن نہ سمجھے، سائلوں کو جھڑکنے سے روکا تا کہ امیر غریب میں منافرت کی تخم ریزی نہ ہونے پائے۔

حتی کہ ہدایت جیسی چیز جو ہر انسان کا شخصی فریضہ ہے اور بلاشبہ ایک کا ہدایت پانا کسی حالت میں بھی دوسرے کے ہدایت پانے پر معلق نہیں۔ لیکن اس جیسے فرض عین کو اللہ سے مانگنے کا طریقہ بھی سکھلایا گیا تو وہ بھی اجتماعی اور جماعتی رنگ سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے ہدایت کے الفاظ حسب ذیل تلقین فرمائے: اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيْ مَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنَا فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنَا فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْمَآ اَعْطَيْتَ وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ. ①

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! میں ہدایت بھی تنہائی کی نہیں چاہتا کہ میں تنہا ہدایت چاہتا ہوں اور سب گمراہ ہوں بلکہ جماعتی چاہتا ہوں۔ میں عافیت بھی انفرادی نہیں مانگتا، میں برائیوں سے بچاؤ بھی اکیلا نہیں چاہتا''

غرض مثل مشہور ہے کہ تنہا رونا بھی برا اور ہنسنا بھی برا۔ اس لیے ہدایت پانا اور بالفاظ، دیگر اسلام میں آنا اور اسلامی اعمال کے راستہ پر پڑ جانا باوجود یکہ عینی اور شخصی فرض تھا جس میں قدرتاً انفرادیت تھی۔ لیکن اسے بھی انفراد کے ساتھ مانگنا پسند نہیں کیا گیا، بلکہ اجتماعی صیغوں کے ساتھ اس کا سوال کرنا سکھلایا گیا۔ تا کہ ایک انسان اپنی حقیقی خلوتوں کے اوقات میں بھی اجتماعیات کے تصور سے خالی نہ رہنے پائے اور اس کی ساری زندگی جماعتی زندگی کی

---

① صحیح ابن حبان، ذکر الزجر عما یریب المرء ہذہ الدنیا الفانیۃ الزائلۃ ج: ۳ص: ۲۳۹رقم: ۷۲۳.

صورت اختیار کر لے۔

اسلام کے اس اجتماعی پروگرام کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو یہ پروگرام اپنی دینی حقیقت کے ساتھ صرف ایک نماز ہی کا پروگرام پائیں گے اسی میں یہ نظام عمل حقیقی للہیت وایثار کے ساتھ کارفرما نظر آئے گا۔ کیوں کہ نماز ہی اپنے پانچ وقت کے اجتماعی مظاہرہ سے جو نماز جماعت کے ضمن میں اس کے سامنے ہوگا اور خود اسی سے سرزد ہوگا۔ اپنی طبیعت کو عام احوال زندگی میں اجتماعی رنگ پر ڈھلتا ہوا دیکھے گا۔ تو معاشرہ میں بھی ان ہی اجتماعی جذبات سے کام لے گا۔

غرض نماز سے پیدہ شدہ جذبات عام انسانی ہمدردی کو ایک ایسی حد پر قائم کر دیتے ہیں کہ خدمت خلق عبادت رب کے ہم پلہ نظر آنے لگتی ہے اور اس میں انفرادیت کے بجائے اجتماعی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس خدمت خلق اللہ ہی کی تنظیم کے لیے امامت کبریٰ اور خلافت رکھی گئی ہے تا کہ جماعتی شیرازہ بندی ہو کر خلق اللہ کی ہر ایک خدمت خواہ وہ مادی ہو یا روحانی۔ امام اور خلیفۂ حق کے ذریعہ منظم طریق پر وجود میں آتی رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز کی یہ امامت صغریٰ جبکہ ہر طرح سے امامت کبریٰ کی کامل صلاحیت پیدا کر سکتی ہے اور جماعت صلوٰۃ ہی میں مشترک مفاد اور اجتماعی حیات کے جذبات بالخاصہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے نمونہ ہے اللہ کی صلوٰۃ جس کی حقیقت تربیت عالم ہے۔

چنانچہ جس طرح وہ صلوٰۃ ربانی باجماعت تھی کہ سارا عالم تکوینی طور پر اس احکم الحاکمین کی امامت کے تحت اس کے منشاء کی اقتداء کرتا ہے اور اسی تنہا کو عملاً مرکز مانتا ہے۔ اسی طرح یہ انسانی نماز بھی باجماعت ہو کر دنیا میں جماعتی زندگی اور مرکزیت قائم کرتی ہے۔ تا کہ یہ انسان بحیثیت خلیفہ الٰہی اسے پیچھے لا کر اس پر اپنا کنٹرول قائم کر کے اس میں قانون الٰہی جاری کرے اور تشریعی طور پر بھی اسے مالک الملک کے سامنے اسی طرح جھکا دے ۔جس طرح کہ وہ تکوینی طور پر اس کے آگے جھکی ہوئی تھی اور جیسے وہاں تربیت الٰہی اس خدائی نماز یعنی رحمت وشفقت سے ہی ممکن تھی ایسے ہی یہاں بھی تربیت بنی آدم صرف نمازی انسانوں کی نماز ہی سے ہو سکتی ہے جو عبادت کے پہلو سے ادھر کی رحمت وشفقت جذب کرتے ہیں۔

غرض جو آثار خدا نے اپنی صلوٰۃ سے عالم پر ڈالے اگر ایک انسان خود بھی وہ آثار اس دنیا پر ڈالنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ بھی صلوٰۃ ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح نماز بر نگ عبادت انسان کے خلوت پسندانہ جذبات کی تربیت کرتی ہے۔ جس سے اس کی شان جمعیت نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ برنگ رحمت وتربیت اس کی جلوت پسندی کے دواعی کو بھی ابھارتی ہے جس سے اجتماعیت کا نظام پیدا ہوتا ہے اور خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ جس طرح نماز کے وصف جامعیت نے اسے ایک مکمل ترین عبادت ظاہر کیا تھا اسی طرح اس کی شان اجتماعیت نے اسے مکمل ترین خلافت الٰہی بھی ثابت کیا ہے اور اس طرح نماز کی اس جامعیت اور اجتماعیت سے

جہاں عبادت کا حق ادا ہوتا ہے وہیں خلافت کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

بلکہ اگر نماز میں یہ شان اجتماعیت نہ ہوتی اور وہ عبادت رب میں لگا کر خدمت خلق سے بیگانہ بنا دیتی تو شاید وہ اسلامی رنگ کی عبادت ہی نہ کہلائی جا سکتی، کیوں کہ اس کا ثمرہ وہی رہبانیت اور گوشہ گیری نکلتا ہے جسے مٹانے اور اس کی جگہ عبادت و ہدایت تک میں جلوتیں اور اجتماعیتیں پیدا کرنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا، اسی لیے اس نے عادت و عبادت کو اس طرح باہم ملا دیا کہ یہ دونوں متقابل چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئیں اور ایک شے کے دو (۲) پہلو نظر آرہے ہیں ہر عادت سے عبادت اور ہر عبادت سے عادت کا رنگ جھلکتا ہے۔

تو نماز جیسی اکمل ترین عبادت ان اصول اجتماعیات سے کس طرح خالی رہ سکتی تھی کہ وہ محض انفرادی راہ پر انسان کو ڈال کر خاموش ہو جاتی نہیں اس نے اپنے ہر ہر پہلو سے اجتماعیات انسانی کے وہ فطری اور محیر العقول اصول قائم کئے ہیں کہ ایک بڑی سے بڑی سلطنت کا نظام اجتماعی بھی صرف ان ہی اصولوں پر چلایا جا سکتا ہے جن کو اس عبادت (نماز) نے اپنی تنظیم کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔

نماز سے اصول اجتماعیات کا استخراج...... مثلاً سب سے پہلے نماز نے جو اسوہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ فرض نمازیں گھروں میں ادا نہ کی جائیں۔ بلکہ مساجد میں حاضر ہو کر، یعنی ادائیگی نماز کے لیے سب سے پہلی چیز گھر کی چہار دیواری سے باہر ہو جانا ہے۔

ترک خلوت...... گویا نماز نے سب سے پہلے خانگی خلوت توڑ کر ایک انسان کو میدان میں نکالا اور جلوتوں کے ہجوموں میں دیکھنا چاہا۔ جس کا راز ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں محدود رہ کر انسان کی نگاہ اس کا تخیل، اس کی سعی اور اس کا علم سب محدود اور تنگ رہتے ہیں اس کی نگاہ گھر میں رہ کر خانگی ہی امور تک محدود رہ سکتی ہے۔ اسے عام شہر یا قوم سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز نے گھروں سے مساجد کی طرف سفر کرایا تا کہ انسان کے باطن اور ظاہر میں وسعتیں نمایاں ہوں۔ اور کوئی ایک مسلم بھی تنگ دل، تنگ ظرف اور تنگ حوصلہ باقی نہ رہے کہ جس کے سامنے صرف اس کا نفس اور اس کا گھر ہو۔ بلکہ اس کے ظرف میں گھر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے پورے جتھوں اور جھمگٹھوں کی گنجائش ہو اور اس کے دل میں صرف اپنا اور اپنے بچوں ہی کا خیال نہ ہو نیز فی نفسہٖ بھی اس کا تجربہ اور علم گھر کی چہار دیواری تک محدود نہ ہو بلکہ بیرونی مجامع میں پہنچ کر سب کو دیکھ کر اور سب کی سن کر اس کا علم خیال اور تجربہ وسیع تر ہو جائے جس سے اس میں عالی حوصلگی اور وسیع الظرفی کے نورانی آثار نمایاں ہوں اور جب کہ گھر سے محلّہ کی مسجد تک کا یہ مختصر سفر ان مبارک نتائج کا پیش خیمہ تھا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے سفر کی مزید وسعت ان نورانی آثار میں کس قدر مزید اضافہ کر سکتی تھی، سو اسلام کی حکیم شریعت اس سے کیسے اغماض کرتی؟ اس نے تدریجاً اس سفر میں مزید وسعتیں پیدا کیں۔ ہفتہ بھر تو ایک نمازی کو مسجد محلّہ ہی کی طرف سفر کرایا لیکن ہفتہ میں جمعہ کا ایک دن رکھ کر اس سفر کو اور وسعت دی کہ شہر بھر کے مسلمان گھروں سے نکل کر ایک ہی مسجد جامع کی طرف سفر کریں۔ اگر

چہ انہیں محلّہ بھی چھوڑنا پڑے اور مسجد جامع اور جمعہ کے فضائل بیان کر کے ایک طالب اجر نمازی کومخمور ومسرور بنا دیا اور پھر اس سفر کو اور وسیع کیا تو سال بھر میں عیدین رکھ دیں کہ مسلمان نہ صرف گھروں سے اور نہ صرف محلوں سے بلکہ شہر سے بھی باہر نکل کر عیدگاہ (مصلّٰی) میں جمع ہوں اور پھر آخر اس سفر کو اور وسعت دی تو شہر چھوڑ کر ایک اقلیم تک محدود نہ رکھا بلکہ حکم دیا کہ مسلمان عمر بھر میں ایک دفعہ مسجد حرام کی طرف سفر کریں، یعنی گھر بھی چھوڑیں، محلّہ بھی چھوڑ دیں، شہر بھی چھوڑ دیں، صوبہ بھی چھوڑیں، حتیٰ کہ اپنا ملک بھی چھوڑیں، اور دوسری اقلیم میں پہنچ کر مسجد حرام میں حاضری دیں اور پھر اس میں بھی وسعت دی تو مسجد حرام کے بعد حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس کو بھی شامل فرما دیا کہ: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا. ① ’’سفر عبادت صرف تین مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔ مسجد حرام (بیت اللہ) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس اور میری مسجد‘‘ (بیت الرسول)

ظاہر ہے کہ جب محلّہ کی مسجد تک نکلنے میں گھریلو خلوت ٹوٹ کر آدمی کا دل ودماغ روشن اور وسعت پذیر ہوتا تھا تو مسجد جامع پھر مسجد عید، پھر مسجد حرام، پھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر مسجد اقصیٰ تک نکلنے میں گھریلو کیا شہری اور ملکی خلوت بھی ٹوٹ جائے گی اور کسی درجہ میں بھی آدمی میں تنگ دلی اور تنگ حوصلگی کا وجود باقی نہ رہے گا ۔ بلکہ اگر اس سفر کا شرعی حق ادا کیا جائے ۔ تو ایک عظیم الشان جلوت پیدا ہو کر کس درجہ آدمی کا دل ودماغ روشن ہو جائے گا؟ بہر حال نماز نے اس اسوہ سے اس اصول کی طرف رہنمائی کی کہ مسلمانوں کا گھر اور باہر سفر اور حضر وطن اور غیر وطن سب برابر ہیں ۔ اور جب تک وہ اپنی انفسی اور خانگی زندگی چھوڑ کر باہر نہیں نکلیں گے وہ کبھی اپنے دین، اپنی قوم، اور اپنے ملک کا حق ادا نہیں کر سکتے ۔ بس اجتماعیات کے لیے جب کہ سب سے پہلی چیز خلوت کا توڑ پھینکنا تھا، تو نماز نے پہلے اسے ہی توڑا ۔ اور اجتماعیات کی اولین اساس قائم کر دی۔

قطع انفرادیت ...... پھر مسجد میں لا کر یہ نہیں کہا گیا کہ مسجد میں ہر ایک شخص اپنی اپنی نماز الگ الگ پڑھ کر چلا جائے کہ اس میں خلوت تو ٹوٹ جاتی مگر انفرادیت باقی رہ جاتی جو معنوی خلوت وتنگی ہے اور اجتماعی زندگی کے منافی ۔ اس لیے نماز نے دوسرا، اسوہ یہ پیش کیا کہ مساجد میں پہنچ کر نماز مل کر پڑھی جائے اور ایک جماعت بن کر فریضۂ نماز جماعتی ہیئت سے پیش کیا جائے ۔ چنانچہ نماز کے بارہ میں مختلف عنوانوں سے تنبیہیں اور تاکیدیں فرمائی گئی ہیں ۔ قرآن پاک نے فرمایا: وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ . ② ’’نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو‘‘۔

جس سے جماعت کا وجود اور اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے خواہ سنت موکدہ ہو کر ہو جیسا کہ ائمہ حنفیہ کا قول ہے یا واجب ہو کر جیسا کہ شوافع کا دعویٰ ہے یا فرض قطعی ہو کر جیسا کہ بعض دوسرے ائمہ کا مذہب ہے۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الجمعة، باب مسجد بیت المقدس ج: ۴ ص: ۳۸۸ رقم: ۱۱۲۲.

② پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۴۳.

بہر حال جماعت کی تاکید اور شدت تاکید بطور قیدِ مشترک ہر مذہب کے مطابق قرآن شریف سے ثابت ہو رہی ہے۔حتی کہ صلوٰۃ خوف میں بھی ترک جماعت کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ مستقلاً قرآنی حکم آیا کہ عین جہاد کے میدان میں بھی جماعت سے نماز پڑھو، گو اس میں جماعت کے دو حصے کر کے آسانی بھی پیدا فرمادی۔

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی ضرورت کے ساتھ اس کے سہل الوصول بنانے کی صورتیں ذکر فرمائیں۔اور اسباب ترغیب ذکر فرمائے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ صَلٰوةَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ اَزْكٰى مِنْ صَلٰوتِهٖ وَحْدَهٗ وَصَلٰوتُهٗ مَعَ الرَّجُلَيْنِ اَزْكٰى مِنْ صَلٰوتِهٖ مَعَ الرَّجُلِ وَمَتٰى كَثُرَ فَهُوَ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ ① ''آدمی کی نماز دوسرے کی نماز سے مل کر یعنی (دو کی جماعت سے) اس کی تنہا نماز سے زیادہ پاکیزہ ہے اور دو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ ایک کے اجتماع سے زیادہ پاکیزہ ہے اور پھر جس قدر بھی جماعت بڑھ جائے اتنی ہی اس نماز کی محبوبیت اللہ کے یہاں بڑھ جاتی ہے''۔

اسی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر نماز میں احادیث سے وقت کا وہ حصہ اختیار کیا ہے جس میں اجتماع زیادہ ہو سکے۔فجر میں غلس کے بجائے اسفار کو ترجیح دی کہ چاندنہ ہونے پر آدمی زیادہ مجتمع ہو سکیں گے۔ظہر میں تعجیل کے بجائے ابراد کو اختیار کیا کہ جماعت طویل ہو سکتی ہے...... عصر میں ایک مثل کے بجائے دو مثل کو جس میں ہر پسماندہ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔

ادھر عشاء میں اگر تاخیر کے بجائے قدرے تعجیل کی تو وہاں تکثیر جماعت کا مقصد پیش نظر ہے تا کہ لوگ سو نہ رہیں۔صرف مغرب رہ جاتی ہے سو اس میں گو عملاً تاخیر نہیں چاہی مگر وسعت وقت کے بارہ میں احادیث کی تفسیر وہ اختیار کی جس کی رو سے مغرب کا وقت غروب شفق تک تھا تو شفق سے مراد شفق ابیض لی نہ کہ شفق احمر کہ وقت ذرا آگے کو سرک کر وسیع ہو جائے اور لوگ زیادہ سے زیادہ جمع ہو سکیں کیوں کہ شفق ابیض شفق احمر کے بعد غروب ہوتی ہے اور وقت وسیع ہو جاتا ہے۔غرض حنفیہ کے یہاں ہر نماز میں تاخیر مستحب ہے بجز مغرب کے اور مقصد سب کا وہی جماعت کی زیادتی ہے کہ عبادت میں جتنا زیادہ سے زیادہ اجتماع ہوا تنا ہی اس کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے۔

پھر نصوص شرعیہ میں مختلف عنوانوں سے جماعت کی ضرورت اس کی فضیلت اور اس کے ترک کی مذمت پر مؤثر پیرایوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔کہیں فرمایا گیا کہ جماعت سنن ہدیٰ میں سے ہے اگر تم جماعت چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہو گے تو تم منافق ٹھہرو گے۔کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں عشاء کی جماعت قائم کر کے اپنے نوجوانوں کو حکم دیتا کہ ان گھروں اور گھر والوں کو آگ دے دیں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے حتی کہ نابینا تک کو جماعت چھوڑنے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

پھر کہیں فرمایا گیا کہ اگر کسی دیہات اور جنگل میں صرف تین ہی آدمی ہوں اور نمازیں جماعت سے نہ ہوں تو

① السنن للنسائي، كتاب الامامة، باب الجماعة اذا كانوا اثنين ج: ٣ ص: ٣٥٦.

ضرور ہے کہ ان پر شیطان غالب آ کر رہے گا۔ کہیں فرمایا کہ جماعت ہی کے سہارے آدمی کی یہ عبادت قائم رہ سکتی ہے کہ ریوڑ سے الگ نکلی ہوئی بھیڑ ہی کو بھیڑیا اچک کر لے جاتا ہے۔ پورے گلے یا گلہ میں منسلک شدہ بکری پر ہاتھ ڈالنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی۔ بہر حال نماز میں امت کو تفرق کلمہ اور انتشار سے بچا کر وحدت کلمہ پیدا کرنے کی اشد تاکید کی گئی ہے۔ اس سے واضح طور پر نماز سے اجتماعیت عامہ کا اصول نکلا۔ اور نتیجہ خود بخود ذہن نشین ہو گیا کہ اس اصول کے تحت جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے خلوت کو چاہتی ہے۔ یہ جلوت پیدا کی گئی ہے تو اسی اصول کے تحت خود جلوت کے کاموں میں شریعت کو جلوت و اجتماعیت کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا؟ چنانچہ اجتماعی معاشرت کی متعدد مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں جن کی طرف نماز با جماعت ادا کرنے سے طبعیت خود بخود چل پڑتی ہے اور اجتماعیت عامہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ پس نماز با جماعت ہمیں دن میں پانچ مرتبہ عملی طور پر بتلاتی ہے کہ جس طرح خدا کے اس گھر (مسجد) میں تم مل کر اسے یاد کر رہے ہو۔ اسی طرح خدا کے بنائے ہوئے اس بڑے گھر (دنیا) میں بھی مل کر ہی اسے یاد رکھو یعنی جماعتی زندگی اختیار کرو، اور انفرادو وحدت کو ترک کر دو کہ برکت وخیریت، قوت ونصرت، معاملات معاشرت، قومی کلمہ وحدت پھر قومی وبرتری فضیلت صرف جماعتی زندگی میں ہے۔

اگر قوم میں جماعت نہیں تو اس قوم میں کوئی فضیلت بھی نہیں۔ پس نماز با جماعت پوری معاشرتی زندگی کو بھی جماعتی کر لینے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ مل کر کام کرنے کی خو پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ مساجد میں پانچ وقت کی حاضری اور اجتماع سے دن رات میں پانچ مرتبہ ایک دوسرے کی آنکھ سامنے ہوگی تو سامنے پڑی آنکھ کا اثر لینا اور لحاظ و پاس کرنا ہے۔ جس کا اثر وہی تعاون باہمی اور تناصر ہے اور ظاہر ہے کہ تمدن کا دارومدار اسی تعاون وتناصر اور مل کر کام کرنے پر ہے کہ ایک دوسرے کے لیے باعث اذیت ہونے کے بجائے باعث راحت ومعاونت ہو۔ معاشرت کے تمام شعبوں، تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت میں ایک دوسرے کا دست وبازو بنے اور مددگار ہو۔ اور جب کہ نماز سے یہ تمدنی روح ریل میل اور تعاون وغیرہ کی خوبی بالخاصہ پیدا ہوتی ہے جس سے مدنیت کی اساس قائم ہوتی ہے تو نماز کے ذریعہ اصول اجتماعیت صاف طور پر پروان چڑھتا ہوا محسوس ہو جاتا ہے۔

نماز باجماعت میں معیار اجتماعیت ...... اب نماز کے اس پہلو پر غور کرو کہ کسی مسجد میں نماز کے لیے مجتمع ہونے کے وقت ہرگز یہ شرط نہیں کہ وہ اسی مقام کا باشندہ ہو جہاں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑی ہے۔ نہیں:۔ بلکہ باہر سے آنے والا ہر جگہ کا مسلمان اپنے پورے حق کے ساتھ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شرط بھی نہیں کہ وہ اسی قوم کا ایک فرد ہو جو مسجد کا متولی ہے بلکہ ہر قوم اور قوم کے ہر طبقہ کا آدمی جماعت میں شریک ہونے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ یہ شرط نہیں کہ ایک مسجد کے شرکائے جماعت کسی ایک ہی نسل کے ہوں، بلکہ ہر نسل کا ایک انسان ایک دوسرے کے دوش بدوش شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اس سے گویا نماز روزانہ اس اصول کا اعلان کرتی ہے کہ

مسلمانوں میں اجتماعیت کا معیار نہ وطن ہے نہ قومیت، نہ نسل ہے نہ رنگ، نہ خون ہے نہ قرابت بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ مسلمانوں کی قوم قوم ہی من حیث المذہب ہے، نہ کہ من حیث الوطن، من حیث النسل جس کی مصیبت التزءِ تفریقوں میں آج دنیا کے سارے مشرقی اور مغربی وطن پرست گرفتار ہیں اور سر پھٹول انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اگر مسلمانوں کی قوم کا معیار اجتماعیت وطن یا نسل ہوتا تو اسلام نہ حجاز سے باہر نکلتا اور نہ عربی النسل افراد سے تجاوز کرتا۔ اور پھر بھی اگر وہ مختلف وطنوں میں بکھرے ہوئے اور بود و باش اختیار کئے ہوئے ہوتے اور اسلام انہیں خون یا وطن کے رشتہ سے جوڑنے کی کوشش کرتا تو اس صورت میں اسلام کوئی دین یا مذہب نہ ہوتا بلکہ وہ ایک قومی تحریک ہوتا جس کا مقصد نسل یا وطن کے لحاظ سے اپنی قوم کی شیرازہ بندی یا فوقیت یا برتری ہوتی، نہ کہ للّٰہیت اور دیانت عامہ۔ پس نماز نے ہمیں اجتماعیت کے ساتھ معیار اجتماعیت بھی بتلایا کہ وہ وطن اور نسل نہیں بلکہ صرف دین ہے اور یہ کہ اسلام کوئی رسمی تحریک نہیں بلکہ خدائی مذہب ہے، جو ہر وطن اور ہر نسل پر خود چھایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم اجتماعیت جبکہ مذہب اور دین کے معیار سے تھی، تو اس کی اجتماعیت میں اگر ٹکڑے ٹکڑے بھی ہوئے تو وہ بھی مذہب ہی کے معیار سے ہوئے۔ کیوں کہ قدرتی طور پر جو جماعت مذہب کے نام پر بنتی ہے وہ مذہب ہی کے نام پر بگڑتی ہے اور جو مذہب کے اعتبار سے مجتمع ہوتی ہے۔ وہ اسی کے نام پر منتشر بھی ہوتی ہے۔

پس مسلمانوں میں اگر بے نظیر وحدت اور اجتماعیت اسلام اور دین کے لحاظ سے تھی تو اس میں فرقے بھی مذہبی ہی پیدا ہوئے، یعنی مذہبی عقائد اولاً بگڑے جن سے قوم میں اختلاف رونما ہوا اور وہ بلحاظ عقائد گروہ در گروہ ہوگئی کہ اس میں جیسی وحدت تھی ویسی ہی فرقت بھی ہوئی۔

چنانچہ حدیث میں اگر ۷۳ فرقوں کی خبر دی گئی ہے تو وہ اختلاف عقائد ہی کی رو سے دی گئی ہے۔ جو بلاشبہ مذہبی عقائد ہیں۔ کیوں کہ ان ۷۳ فرقوں میں سے ایک کو جنتی اور بقیہ کو ناری فرمایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اخروی لحاظ سے عقائد مذہب ہی کے حسن و قبح سے ممکن تھا۔ نہ کہ محض خیالات معاشرت اور طرق مدنیت سے کہ یہ چیزیں فی نفسہٖ دین اور دیانات نہیں بلکہ محض مقامات دین یا دینی شوکت کے ذرائع میں سے ہیں جو نیت دین سے دینی بنتی ہیں ورنہ دنیائے محض رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے دیانات و معاشرات اور معاملات کی تقسیم میں دیانات کو معاملات اور معاشرت کا قسیم اور مدمقابل بنایا گیا ہے۔ جو ان کے باہمی تغایر کی دلیل ہے۔ پس جبکہ مسلمانوں کی فرقہ بندی بنص حدیث دیانت کے معیار سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ معاشرت و اقتصادیات اور سیاسیات کی رو سے۔ اس سے صاف ظاہر و واضح ہے کہ یہ قوم، قوم ہی بلحاظ دین ہے جس کا اجتماع بھی معیار دین ہی سے ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی جو وحدت و اجتماعیت مطلوب ہے، وہ اسلامی اور دینی حیثیت ہی کی مطلوب ہے، جو دینی معیار سے ہو۔ اس سے ایک نکتہ یہ حل ہوتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں تمدنی اور سیاسی حیثیت سے فرقہ بندی ہو رہی ہے تو اس عرض کردہ اصول پر یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ اب ان کی وحدت کا بھی معیار بدل گیا ہے۔ وہ آج متحد ہونا

ضرور چاہتے ہیں لیکن عصری سیاسی مقاصد کے معیار سے۔ نہ کہ دینی عقائد کے معیار سے آج ان کا وہ دینی معیار سست پڑ چکا ہے اور وہ اپنی بنیاد سے ہٹ چکے ہیں۔ کیوں کہ آج کل ان کی فرقت سیاسی ہے تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ وحدت بھی سیاسی ہی چاہتے ہیں اور سیاسی بھی وہ جو محض قومیت کی رسم لیے ہوئے ہو۔ نہ وہ جو اسلامی دیانت سے پیدا شدہ اور لادینی سے دور خالص للہی سیاست ہو، جس کا حاصل دنیا میں خدائی اخلاقی اور خدائی قانون کا رواج دنیا اور انسانی دساتیر کی ظلماتی بندشوں سے بنی آدم کو رہائی دلانا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسلامی نقطۂ نظر سے اس لیے سخت افسوس ناک ہے کہ اجتماعیت تو امت میں برسوں سے گم بلکہ صدیوں سے مضمحل ہے اور عرصہ ہائے دراز سے اس قوم کو تفرق اور انتشار کلمہ نے گھیر رکھا ہے، جو آج بھی موجود ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ پہلا انتشار یا تحزب مذہبی اور دینی حیثیت سے تھا جو اس کی دلیل تھا کہ ابھی تک ان کا معیار اجتماعیت بھی دینی ہے اور جب بھی مجتمع ہوں گے تو دینی اساس ہی پر تعمیر اجتماع کریں گے۔

لیکن آج کا انتشار ملکی، تمدنی، اقتصادی اور عصری سیاست کے معیار سے ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی قومیت اور اجتماعیت کا معیار خالص دین نہیں رہا ہے بلکہ اس میں خالص دنیا کا دخل آ گیا ہے۔ گویا پہلے تو آفات ان کی دنیا پر پڑتی تھیں، دین محفوظ تھا اور اب آفات ان کے دین پر ہیں۔ اور دنیا کے تحفظ کی فکر ہے جو یقیناً امت کے لیے قابل تحسین پہلو نہیں ہے۔ اس سے میری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں قوم کو سیاسیات یا اجتماعیات میں حصہ لینے سے روکنا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرا تو موضوع ہی اس وقت اجتماعیات ہیں جیسا کہ اس تقریر سے آپ سمجھ رہے ہیں، نیز میرے نزدیک قوم میں ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو سیاسی شعور سے آراستہ ہوں اور نہ صرف شرعی سیاست بلکہ عصری سیاست کو بھی پوری طرح سمجھتے ہوں۔ نیز ایسے افراد کی بھی میرے نزدیک سخت ترین ضرورت ہے، جو سیاسی میدان میں بھی بے جگری کے ساتھ کودے ہوئے ہوں۔ پس میرا مقصد سیاسی اقدامات سے روکنا نہیں، غرض صرف یہ ہے کہ ایک سیاسی مسلمان کا ہر ایک اقدام خالص شرعی ہدایات کے ماتحت اور شرعی رنگ میں ہو اور سیاسیات میں رہ کر بھی اسوۂ ہائے سلف کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تا کہ اس کے دماغ میں دیانت کی اہمیت بھی باقی رہے کہ وہی مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی ہے۔ نیز یہ کہ اس کا معیار اجتماعیت محض سیاست اور وہ بھی عصری سیاست نہ رہ جائے جس کا دوسرا نام مکر و فریب اور دھوکہ دہی یا ہوسنا کی ہے بلکہ اس کا معیار اجتماعیت وہی ہو جو قرون اولیٰ کی اجتماعیت اور شیرازہ بندیوں کا تھا، جس کی روح اخلاص و دیانت اور پاک بازی وللٰہیت تھی۔

پس اس تنقید سے میری غرض سیاسی جذبات کا فنا کرنا نہیں، بلکہ ان جذبات کی بے ڈھنگی رفتار اور بے اصول کردار کو روکنا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج مسلمانوں کا معیار اجتماعیت بدل گیا ہے یعنی دین کے بجائے دنیا اور حظوظ آخرت کی جگہ حظوظ دنیا نے معیاری صورت اختیار کر لی جس سے لوگ فتن اور مہالک کا شکار ہو رہے ہیں اور

دنیا میں ہیبت ناک آفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس صحیح معیار اجتماعیت کے سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف جماعت میں غور کر لینا کافی تھا۔ اور اب بھی تصحیح خیال کی مختصر صورت یہی ہے کہ ہم نماز پڑھ کر اس کے شرعی جوڑ بند پر دھیان کریں اور غور کریں کہ وہ ہمیں کس رفتار پر لے جانا چاہتی ہے تا کہ اسی رفتار کو ہم اپنی پوری دنیا اور اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کر سکیں۔

اجتماعیت، معیار اجتماعیت اور نوع اجتماعیت......نماز کا اہم بنیادی حصہ جماعت کی صورت یہ ہے کہ جو بھی مسجد میں آ جائے وہ اگلی جماعت میں داخل ہونے اور شریک جماعت ہونے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی وطن کا باشندہ ہو اور خواہ اس کی اقتصادی حالت اور سیاسی نظر کچھ بھی ہو شرط صرف یہ ہوگی کہ وہ مسلم ہو اور اس میں اسلامیت ہو، اس صورت حال سے نماز سے اجتماعیت بھی ثابت ہوئی اور معیار اجتماعیت بھی واضح ہو گیا کہ نہ وہ وطنیت ہے، نہ رنگ و نسل بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ اسی کے ساتھ اگر نماز ہی میں غور کریں گے تو اجتماعیت کی نوعیت بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز کے اجتماع میں اجتماعیت کے معنی محض جمع ہو جانے یا بھیڑ بھڑ کا کے نہیں ہیں بلکہ نظم و تنظیم کے ساتھ خاص قسم کے اجتماع کے ہیں۔ ورنہ یوں تو مسجد میں جماعت کھڑے ہونے سے پیشتر بھی اجتماع ہوتا ہے اور کافی بھیڑ ہوتی ہے مگر نہیں کہا جاتا کہ جماعت ہو رہی ہے جبکہ تک کہ اس میں تنظیم اور ایک منظم ہیئت پیدا نہ ہو جائے۔

اس نظم کا پہلا رکن جو ظاہر نظم سے تعلق رکھتا ہے، اصطفاف ہے یعنی صف بندی اور پرا باندھ کر کھڑے ہونا۔ جیسا کہ ملائکہ صف بندی کرتے ہیں تا کہ مجمع میں ترتیب قائم ہو کر یکسانی کی صورت نمایاں ہو۔ ورنہ بغیر اس کے نظم جماعت ہی قائم نہیں ہو سکتا، چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حقیقت کو تفصیل سے واشگاف کیا گیا ہے جس کو حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ: **خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَاٰنَا حِلَقًا فَقَالَ مَالِيْ اَرَاكُمْ عِزِيْنَ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ اَلَا تَصُفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلٰٓئِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ تَصُفُّ الْمَلٰٓئِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا قَالَ يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰى وَيَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ** ①

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ہمیں حلقہ در حلقہ اور ٹولیاں بنے ہوئے دیکھا، فرمایا کیا بات ہے کہ میں تمہیں منتشر دیکھ رہا ہوں؟ پھر تشریف لائے تو فرمایا تم صف بندی کیوں نہیں کر لیتے جیسا کہ فرشتے اپنے پروردگار کے پاس صف بندی کیے رہتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اور فرشتے کیسے صف بندی کرتے ہیں اپنے رب کے پاس؟ فرمایا پہلے اولین صفوف کو پورا کرتے ہیں اور صفوں میں گھتا کر اور مل کر کھڑے ہوتے ہیں''۔ (مشکوٰۃ)

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوٰة، باب الامر بالسكون في الصلاة والنهي عن الاشارة باليد، ج: ۱۰ ص: ۳۶۲ رقم: ۴۳۰.

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس پر ملامت فرمائی کہ تم لوگ متفرق کیوں بیٹھے ہو، جو اس کی علامت ہے کہ تمہارے دلوں میں مل بیٹھنے کی خواہش نہیں ہے گویا حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو۔ پھر فرمایا کہ محض مل جانا اور جمع ہو جانا یا اکٹھے ہو جانا بھی کافی نہیں بلکہ اس اجتماع میں ترتیب نظم پیدا کرو، یعنی صف بندی کرو۔ پھر محض صف بندی بھی کافی نہیں بلکہ صفوں کا اتمام کرو جب تک صف اولیٰ مکمل نہ ہو دوسری صف مت بناؤ کہ آدھی تہائی اور ادھوری صفیں بھی بدنظمی اور بدسلیقگی ہے اور پھر تمام صفوں کا اس منوال پر مکمل کر لینا بھی کافی نہیں جب تک کہ ان میں تراص یعنی گتھ کر کھڑے ہونے کی صورت پیدا نہ ہو۔ یعنی ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے نہ ہوں جس سے ذرا بھی درمیانی فرجہ باقی نہ رہے کہ یہ بھی نظم کے منافی ہے اور پھر ان سارے آداب اجتماعیت کے بعد بھی یہ اجتماعیت کافی نہیں جب تک اس میں عِنْدَ رَبِّهَا کی قید نہ پائی جائے۔ یعنی اللہ کے سامنے حاضر ہو کر حضور قلب اور خشوع باطن کے ساتھ قرب و نزدیکی کی نیت سے یہ اجتماعیت ہو کہ اس کے بغیر یہ ساری تنظیم محض ایک رسمی ہوگی۔ جس میں کوئی بھی حقیقت نہ ہوگی۔ پس صورت تفریق مٹانا، صورت وحدت قائم کرنا، اس میں نظم و ترتیب کا لحاظ رکھنا۔ پھر درجہ بدرجہ اپنی ترتیبات کو تدریجاً مکمل کرنا۔

پھر تواصل باہمی پیدا کرنا جس میں میل ملاپ ظاہری بھی ہو۔ اور پھر ان سب مہمات میں للّٰہیت اور بے نفسی سے کام لینا۔ کیا عام نظام ملت قائم کرنے کے لیے اس اصول کے سوا بھی کوئی اور راستہ ہو سکتا ہے جس پر حیات اجتماعیت کی عمارت کھڑی کی جائے؟ ہرگز نہیں۔ پس نماز فرش مسجد پر اجزائے ملت کا ایک ایسا با اصول اور مکمل نظام روزانہ تیار کرتی ہے کہ اس سے ان اصول پر مطلع ہو کر نمازی قوم اگر پوری ملت کا نظام قائم کرنا چاہے تو بآسانی کر سکتی ہے، کیوں کہ عمل کے بدل جانے سے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ورنہ اصول کا اصول ہونا ہی باقی نہ رہے۔

اس لیے یہ اصول مسجد میں جماعت صلوٰۃ بنائیں گے۔ اور بیرون مسجد نمازی ملت کی مکمل تشکیل کر دیں گے۔ جس سے حیات اجتماعی کا نقشہ خود بخود ملت میں نمایاں ہو جائے گا۔ پس ان اصول سے گویا نماز ہمیں عملاً ہدایت کرتی ہے کہ میری جیسی تنظیم جو تم مسجد میں آ کر کرتے ہو۔ اپنے گھروں میں اور اپنے ممالک میں بھی اختیار کرو، تمہاری خانگی زندگی اور ملکی زندگی بھی ایسی ہی ایک صف اور ایک لائن کی ہونی چاہیے جس میں تم باہم گتھے ہوئے ہو، تمہارے درمیان فرجے اور تفرقے نہ ہوں، تم میں اجتماعیت ہو، تفرق کلمہ نہ ہو، گروہ بندیاں نہ ہوں بلکہ تمام مسلمان مل کر ایک ہوں اور ایک جسد کی طرح ہوں، اس قومی جسم میں اعضاء مختلف سہی مگر روح سب کی ایک ہو، پھر اس وحدت یا قوم کی وحدانی شکل کے لیے کسی پنڈال یا مقام پر جمع ہو جانا یا زائد سے زائد کسی خاص نقطۂ خیال اور نظریہ پر آ جانا اور ایک پارٹی بن جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں نمازی اصول کے مطابق تنظیم نہ ہو۔ یعنی خیالات کی رو یکسانی کے ساتھ کسی نظم کے ماتحت نہ دوڑ رہی ہو یا جماعت کی عملی سطح اور افکار ایک نہ ہوں پوری قوم صف صلوٰۃ کی طرح ایک آہنی دیوار کی طرح سے نہ کھڑی ہو۔ جس میں کسی دیکھنے والے کو کوئی ادنیٰ فتور یا خلل نظر نہ

آئے۔ پھر صفوف نماز کی استقامت اور سیدھ کی طرح اس مسلم جماعت میں بھی جماعتی استقامت ہو یعنی قلوب میں زیغ نہ ہو، خیالات میں تزاحم اور تخالف نہ ہو، مقاصد ایک ہوں، دل ایک لائن پر چل رہے ہوں، اور وہ بھی صرف اپنی ہی لائن پر جمے ہوئے ہوں۔

پھر ساتھ ہی نماز کے عِندَ ربھا کی طرح اس اجتماعی حیات میں بھی مسلمانوں کا شعار رجوع وانابت الی اللہ اور اخلاص وللّٰہیت ہو۔ یعنی وہ جو کچھ بھی کر رہے ہوں دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت کی خاطر۔ نفس کے لیے نہیں بلک اللہ کے لیے اور نفسانیت سے نہیں بلکہ للّٰہیت سے کر رہے ہوں۔ غرض عند ربھا کا یہاں بھی پورا ظہور ہو۔

نماز اور مرکزیت ...... ادھر نماز نے ان منتشر افراد کو جمع کر کے ایک پہلو یہ اختیار کیا کہ ان سب جمع شدہ افراد کے آگے ایک فردِ واحد کو بنام امام آگے بڑھا کر ساری قوم کو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس سے ایک اصول یہ نکلا کہ اس جماعتی تنظیم کا قوام ان تمام مذکورہ شرائط اور حدود وقیود کے باوجود پھر بھی قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس جماعت کا شیرازہ بند اور بندھن موجود نہ ہو۔ یہ صف بندی، یہ لائنوں کی یکسانی، یہ گتھ کر کھڑے ہونا جب ہی تو وجود پذیر ہوسکتا ہے کہ کوئی طاقت اس کو بروئے کار لائے اور اس میں سے تشتت کی راہیں مسدود کر دے، کیوں کہ محض اصول کتنے ہی معقول ہوں کافی نہیں ہوسکتے، جب تک کہ ان اصول کو چلانے والی کوئی طاقت نہ ہو۔

پس نماز کی ان صف بندیوں اور عام تشکیلات کو جو طاقت بروئے کار لاتی ہے اور اس میں صورت نظم یا اجتماعیات قائم کرنے کے لیے بندھن کا کام دیتی ہے وہ نصب امام ہے۔ اگر امام نہ ہو تو جماعت ہی نہیں بلکہ ایک بھیڑ ہے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت رو کار کی ساتھ کھڑی ہو۔ کیوں کہ وہ سب چلنے والے ہیں، چلانے والا تو امام ہی ہوسکتا ہے۔

چنانچہ فقہاء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ مسجد میں جماعت کو کھڑے ہو کر صف بندی ہی اس وقت کرنی چاہیے جب کہ امام مصلّٰی پر پہنچ جائے۔ ورنہ بلا امام جماعت کا اقدام گویا جماعتی نہ ہوگا بلکہ انفرادی ہوگا گو بہت سے افراد کے ایک دم اکٹھے ہوجانے کے سبب اس کی شکل جماعت کی سی ہوجائے۔

اب سمجھ لیجئے کہ نصب امام کا جو اصول اس امامت صغریٰ میں ضروری تھا۔ بعینہٖ وہی اصول امامت کبریٰ میں بھی ناگزیر ہے۔ گویا نماز نے ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کتنی ہی خوبصورت تنظیم کی رسم پیدا کرلے وہ جماعت نہیں کہلائی جاسکتی۔ جب تک کہ اس کے لیے کوئی امیر اور امام منتخب نہ کیا جائے جو سب کو ایک خاص لائن پر چلائے اور ان کی اول وآخر کی نگرانی کرے۔ نیز امام کے بغیر ایک جماعتی نظم ہی نہیں بلکہ باہمی ربط بھی قائم نہیں ہوسکتا جو نظم کی بھی روح ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ ایک اصل کے چند شریک جس طرح سب کے سب اصل سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ باہم بھی مربوط ہوتے ہیں۔ جیسے ایک باپ کے چند بیٹوں میں محبت واخوت ہوتی ہے۔ ایک جد کے چند قبائل میں جد کے ساتھ ساتھ باہم بھی قبائل میں نسلی تعلق ہوتا ہے۔ گو قرب وبعد کا تفاوت بھی ہو کہ اصل قریب کے شرکاء کا باہمی ربط زیادہ مضبوط ہوتا ہے بہ نسبت اصل بعید کے۔ مگر

نفسِ رابطہ قدرتی ہے۔ایسے ہی معنوی رشتوں میں بھی یہ فطری اصول کارفرما ہے بلکہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ ۔چنانچہ ایک استاد کے چند شاگرد استاد سے بھی اور باہم بھی مربوط ہوتے ہیں کیوں کہ استاد ان کی معنوی اصل ہے ۔ایک پیر کے چند مرید پیر سے بھی اور آپس میں بھی متحد ہوتے ہیں کہ پیران کی معنویت کی اصل ہے۔اسی طرح امام صلوٰۃ تمام مقتدیوں کی نماز کی اصل ہے تو اس اصول کی رو سے لازمی ہے کہ مقتدیوں کو امام سے بھی اور بواسطۂ امام آپس میں بھی ایک رابطۂ اخلاص واتحاد ہو۔

بشرطیکہ امام ومقتدی اپنی شرعی شرائط پر پورے اترتے ہوں کیوں کہ امام مقتدیوں کی نماز کا اصل اصول ہے گویا اصل نماز اس کی ہے اور اس کے ضمن میں پھر نماز مقتدیوں کی ہے،اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے:اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ ① امام (بحقِ جماعت) ضامن ہے۔

پس امام ضامن ہے اور مقتدی مضمون ہے جو اس کے ضمن میں لپٹا ہوا راہ صلوٰۃ میں چلا جارہا ہے۔امامت کا یہ اصول جو اس امامت صغریٰ میں بتایا گیا ہے بعینہٖ امامت کبریٰ کی بھی روح ہے اور اس میں بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ امام المسلمین یا امیر المؤمنین تمام مسلمانوں کی ایک اصل کلی ہے۔اور بمنزلہ مربی باپ کے ہے جو ان کی علمی، دینی، سیاسی اور اخلاقی تربیت کا ذمہ دار اور ان مدارج کی روحِ رواں ہے کیوں کہ وہ خلیفۂ الٰہی اور خلیفۂ رسالت پناہی ہے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ:اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ② ''میں تمہارے لیے بمنزلہ (روحانی) باپ کے ہوں''۔

اس لیے لازمی ہے کہ مشرق ومغرب کے تمام مسلمان اس امیر عامہ سے مربوط ہوں تاکہ وہ اسی ربط کی قدر آپس میں بھی مربوط ہوجائیں۔بشرطیکہ امیر بھی ان شرائط وصفات سے موصوف ہو جو شریعت نے اس کے لیے تجویز کی ہیں اور رعایا بھی اس کی تربیت سے اسی لائن پر ہو جو اس کے لیے شریعت نے بچھائی ہے۔چنانچہ اسی بناء پر ایسے امیر اور رعایا سے شریعت نے بیزاری کا اظہار کیا ہے جن میں یہ باہمی ربط نہ ہو اور یہ صورت اسی وقت ہے کہ راعی اور رعایا دونوں مقررہ شرعی اوصاف سے عاری ہوں۔ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَ شِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تَبْغُضُوْنَهُمْ وَيَبْغُضُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ ؟قَالَ اَلَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ اَلَا مَنْ وُّلِيَ عَلَيْهِ مِنْ وَّالٍ فَرَاٰهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَايَاْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ. ③

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجب علی المؤذن من تعاھد الوقت ج:۲ ص:۱۰۱.

② السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب کراھیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ ج:۱ ص:۱۲.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الائمۃ،باب خیار الائمۃ وشرارھم ج:۳ص:۱۴۸۲ رقم:۱۸۵۵.

”تمہارے بہترین امراءوہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو۔اور وہ تم سے،تم انہیں شفقت سے یاد کرو اور وہ تمہیں، اور تمہارے بدترین امراءوہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے،تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر۔ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو کیا ایسے امراء کو ہم چھوڑ دیں؟ فرمایا نہیں! جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کرتے رہیں ہرگز نہیں،لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص کسی پر والی (امیر) بنایا جائے اور وہ امیر میں کسی معصیت کا مشاہدہ کرے تو اس گناہ کو تو برا سمجھتا رہے مگر امیر کی اطاعت سے منہ نہ موڑے“۔

اس سے جہاں امام کی شرائط واضح ہوئیں کہ وہ اپنے مامورین کا محب ہو یعنی اخلاق ربانی رکھتا ہو اور معصیت کار نہ ہو، وہیں مقتدیوں اور رعایا کی شرط بھی واضح ہوگئی کہ وہ بہر حال محبِ امیر اور بااخلاق بن کر اس کی اطاعت پر کمربستہ رہیں اور گاہے بگاہے امیر کی ذاتی حرکات ناشائستہ بھی دیکھیں تو اطاعت سے منحرف نہ ہوں جب کہ وہ اقامت دین کرتا ہے۔جس کی بڑی زبردست علامت یہ ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ مل کر نماز قائم کرتا رہے۔

پس جو اصول نماز نے اپنی امامت میں بتلایا تھا وہی بعینہٖ امامت کبریٰ کے لیے بھی ناگزیر نکلا۔یعنی امام کا خلیق ومتواضع اور ساتھ ہی مہمات دین سے باخبر ہونا۔اس کے بعد نماز نے امامت کے سلسلہ میں شرائط امام کے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ امام صلوٰۃ کے لیے کسی حد تک امتیازی نشان بھی ہونا چاہیے تاکہ مقتدیوں پر امام کو کوئی نہ کوئی فوقیت وبرتری حاصل رہے۔جس کے سبب مقتدیوں کو اس کی اقتداء میں عار نہ پیدا ہو۔چنانچہ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا کہ: يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِنًّا. ① ”امامت قوم کی وہ کرے جو،ان میں سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو اگر قرآءت قرآن میں سب برابر کا درجہ رکھتے ہوں تو پھر امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ عالم سنت ہو۔اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جو ہجرت میں سب سے مقدم ہوں اور اس میں بھی سب مساوی ہوں تو جو عمر میں سب سے زیادہ ہو“۔

آگے اسی اصول پر فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر سن میں بھی سب برابر ہوں تو نسب میں جو اعلیٰ ہو۔اور اگر نسب میں بھی سب مساوی ہوں تو حسن وجمال میں جو سب سے بہتر ہو۔اس سے اصول یہ نکلا کہ امام میں کوئی نہ کوئی امتیازی فضیلت ایسی ہونی چاہیے کہ مقتدی اسے اپنے سے بڑھا ہوا تسلیم کرلیں اور اس کی اقتداء سے گریز نہ کرسکیں،ہاں! اگر اس ساری تعلیم کے باوجود کوئی شخص خواہ مخواہ ازراہ زبردستی امامت کے مصلیٰ پر جا کھڑا ہو، درحالیکہ اس میں کوئی بھی خاص فضیلت یا خصوصیت نہ ہو۔

بلکہ فرض کرلو کہ اس میں فسق وفجور بھی پایا جاتا ہو تو پھر یہ نہیں کہا گیا کہ جماعت ترک کردو، یا اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹاؤ، جب تک کہ وہ نماز ہی خراب کرنے کی فکر میں نہ پڑ جائے۔کیوں کہ اس میں فتنہ ہے اور فتنہ قتل سے

① الصحيح لمسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب من احق بالامامة ج:٣ص:٤٢٨.

بھی بڑھ کر شدید اور ناقابل برداشت ہے۔ الا یہ کہ فتنہ کا خوف نہ ہو تو پھر بلاشبہ ایسے امام کو بدل دینا چاہیے۔

غور کرو تو یہی اصول حیات اجتماعی کی بھی روح ہے اور اس کے بغیر سیاسی اور ملکی زندگی میں بھی کوئی نظم قائم نہیں ہو سکتا۔ یعنی امامت کبریٰ کے سلسلے میں بھی امیر میں کچھ اوصاف امتیازی اور فضیلتیں ممتاز ہونی چاہئیں تا کہ لوگ اس کے سامنے گردن اطاعت خم کر سکیں۔ قرآن نے ان امتیازی فضائل کی دو جامع نوعیں ذکر فرمائی ہیں کہ وہ وجاہت ظاہری اور وجاہت باطنی یا جسمانی قوت وصحت اور روحانی علم ومعرفت میں امتیازی شان رکھتا ہو۔

چنانچہ طالوت کے بارہ میں فرمایا گیا جب کہ اسے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا گیا تھا وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ. ① گو آگے یہ بھی ارشاد ہے کہ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ (خدا جسے چاہے اپنا ملک سونپ دے) جس سے واضح ہے کہ نفس امارت وملوکیت مطلقاً کسی نہ کسی بادشاہ کے برسر اقتدار آ جانے سے بھی معتبر ہو جاتی ہے، ہاں مطلوب امارت وہی ہے جس میں امیر اپنے منصوص اوصاف کے ساتھ تخت امارت پر جلوہ گر ہو۔ جن کی مزید تفصیلات احادیث میں اور تشریحات فقہ میں مذکور ہیں۔ جن کے بارہ میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے کسی غیر اصلح شخص کو امیر منتخب کرے گا تو وہ بلاشبہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کا مرتکب ہوگا۔

بہر حال اصولی ضابطہ یہی ہے کہ کسی اصلح اور فائق فرد کو امام بنایا جائے خواہ نماز ہو یا غیر نماز، امامت صغریٰ ہو یا امامت کبریٰ۔ لیکن اس کے خلاف کوئی امیر متغلب ہو کر زبردستی قوت کے سہارے خلافت کی گدی سنبھال لے تو پھر اسے ہٹانا بھی جائز نہیں کہ اس میں فتنہ اور اجتماعیت کی تخریب ہے۔ اس کے بعد نماز نے یہ پہلو پیش کیا کہ نماز میں اس پیش امام کی اقتداء کرو اور سمع وطاعت سے پیش آؤ کہ اس کی اطاعت فرض ہے اور جو ذرا بھی اس کی اطاعت سے گریز کرے گا۔ اس کی نماز نہ ہوگی۔ گویا یہ عباداتی زندگی رائگاں ہو جائے گی۔ ہاں اس کی اطاعت سے انحراف ایسے وقت کیا جائے گا جب کہ وہ نماز ہی کو خراب کرنے کے فکر وعمل میں لگ جائے ظاہر ہے کہ اس اصول سے اجتماعی زندگی میں بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ امیر کی اطاعت واجب ہے کہ وہ طاعت حق ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ ② جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

ہاں امیر کی اطاعت سے صرف اس وقت انحراف وگریز جائز بلکہ واجب ہے کہ وہ کفر صریح اور اسلام کی کھلی تخریب پر اتر آئے کہ لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ ③ (خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں) جس کی وجہ یہ ہے کہ نصب امام کی غرض وغایت شوکت دین اور اقامت حدود اللہ ہے،

① پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۴۷. ② الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: واطیعو اللہ واطیعوا الرسول ج: ۶ ص: ۲۶۱۱ رقم: ۶۷۱۸.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء ج: ۹ ص: ۳۷۱ رقم: ۳۴۲۴.

جب وہی نہ رہے تو خود امام کی ذات مقصود نہیں۔اس لیے ایسے مخرب دین امام کا عزل واجب ہو جائے گا۔ ورنہ بہر صورت سمع وطاعت واجب رہے گی۔ چنانچہ کثرت سے احادیث وآثار سمع وطاعت کے حق میں آئے ہیں۔

نیز کثرت سے احادیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ فتنہ اور اختلاف ونزاع کے وقت امام کی جانب اختیار کرو، نظم کا ساتھ دو، غدر کے ساتھی مت بنو، اور مسلمانوں کے کسی قائم شدہ نظام کی تخریب مت کرو۔ ہاں کفری نظام بہر صورت بقدر استطاعت توڑ پھینکنے ہی کے لائق ہوتا ہے اور وہ عالم بشریت کے حق میں مرض ہے اور مرض ازالہ ہی کے لیے ہے نہ کہ پالنے کے لیے۔

بہر حال جماعت بغیر مرکزیت کے نہیں ہو سکتی اور مرکزیت بغیر انتخاب امیر اور نصب امام کے ناممکن ہے اور یہ سب اصول نماز نے قائم کر دیئے۔ اس کے بعد نماز نے ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ نماز میں اسی مرکز جماعت امام کو مطاع تو اس درجہ میں مانا گیا کہ ایک ہی آواز پر جماعت کے لاکھوں افراد جھک جائیں جو وہ کرے سب وہی کرنے لگیں اور جو وہ کہے سب وہی کہیں۔

اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِہٖ فَاِذَارَکَعَ فَارْکَعُوْا وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَاِذَاقَالَ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا آمِیْن ① ”امام اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، وہ سجدہ میں جائے تو تم سجدہ میں چلے جاؤ، وہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو“۔

غرض! اس کے ایک اشارہ پر لاکھوں گردنیں خم ہو جائیں اور اس کی ایک حرکت بدن پر لاکھوں بدن حرکت میں آجائیں، کسی ایک مقتدی کی مجال نہیں کہ امام سے انحراف کر سکے۔ ورنہ نماز نہیں ہو سکتی، لیکن ساتھ ہی اس مطاعیت کے باوجود امام کو استبداد سے بھی اتنا ہی دور رکھا گیا ہے جتنا کہ اسے واجب الاطاعت بنایا گیا ہے۔ چنانچہ یہی مطیع جماعت اس کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ اگر امام کی کوئی غلطی کسی رکن صلوٰۃ میں دیکھ پائے تو جماعت کے لیے ہرگز اجازت نہیں کہ اس غلطی پر صبر کر کے خاموش ہو رہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ امام کو ٹوکے اور اس کی غلطی پر اسے متنبہ کرے مثلاً امام، قرآءت میں غلطی کر جائے تو مقتدی اسے لقمہ دیں اور اگر ارکان وافعال صلوٰۃ میں کوئی غلطی یا سہو کرے تو فوراً پیچھے سے سبحان اللہ وغیرہ پکار کر اسے متنبہ کریں۔

حتی کہ اگر عورتیں بھی مقتدی ہوں تو وہ بھی امام کی اصلاح سے نہ چوکیں مگر قول سے نہیں کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔ بلکہ تالی بجا کر، اور امام کا فرض ہے کہ قوم کی اس تنبیہ پر اپنی غلطی کو مانے اور عملاً اس کا اعتراف کرتے ہوئے سجدۂ سہو میں جھک جائے۔ یہ عملی طور پر اپنی خطاء کا اعلان واعتراف بھی ہے اور تدارک بھی اس سے اصول یہ نکلا کہ امام کا استقلال تو اتنا ہونا چاہیے کہ اس کے اشاروں پر صفوں کی صفیں جھک جائیں مگر ساتھ ہی قوم کا وقار بھی

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب النھی عن مبادرۃ الامام بالتکبیر وغیرہ ج: ۱ ص: ۳۱۰ رقم: ۴۱۵۔

اتنا ہی ہونا چاہیے کہ امام کی غلطی دیکھ کر اعتراض سے نہ چوکے کیوں کہ امامت و امارت خود قوم کی امانت ہے جو امیر کے پاس ہے، اس کی ذاتی ملک نہیں کہ اس میں کسی کو دم زدن کی مجال نہ ہو۔

نماز نے اسی اصول کو قائم کر کے ملت کو متنبہ کیا ہے کہ جماعت کبرائے اور ملت مسلمہ کا نظام بھی اسی اصول پر قائم کرو کہ امت کا امام و امیر مطاع تو اتنا ہو کہ اس کے اشاروں پر پوری امت نقل و حرکت کرے، کسی طرح جائز نہ ہو کہ سمع و طاعت کے دائرہ سے باہر نکلے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا. ① ''اگر تم پر کسی ہاتھ پیر کٹے ہوئے ناکارہ غلام کو بھی امیر بنا دیا جائے تو سمع و طاعت سے کام لو اور اس کی اطاعت کرو''۔ کسی کو حق نہیں کہ اس امیر جماعت کی مرجعیت اور مرکزیت میں فرق ڈالے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ اَتَاکُمْ وَاَمْرُکُمْ جَمِیْعٌ عَلٰی رَجُلٍ وَّاحِدٍ یُّرِیْدُ اَنْ یَّشُقَّ عَصَاکُمْ اَوْ یُفَرِّقَ جَمَاعَتَکُمْ فَاقْتُلُوْہُ. ② ''جب کہ تم ایک شخص واحد پر مجتمع ہو اگر کوئی شخص اس مرکزیت میں خلل انداز ہو اور تمہاری بندھی بندھائی لاٹھی کے دو ٹکڑے کرنا چاہے تو اسے قتل کر دو''۔

پس امیر کی حفاظت و طاعت تو یہ ہو مگر اسی کے ساتھ قوم کی عظمت و شان بھی ایسی ہو کہ امام میں استبداد کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اسے کوئی حق نہ ہو کہ وہ اپنی ہر من مانی بات منوا کر قوم کو جس راہ اس کا جی چاہے چلا سکے، کیوں کہ وہ بحیثیت ذات قوم کا مرکز نہیں بلکہ خلافت و نیابت قوم کا مرجع ہے اس لیے جس کا وہ خلیفہ اور نائب ہے، اسی کے قانون اور بتائے ہوئے راستہ پر وہ قوم کو چلانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ قانون الٰہی کے ماتحت احکام جاری کرے اور حکم کا جو گوشہ اس پر مخفی رہ جائے اس میں قوم سے مشورہ کرے۔ اس لیے تجویز احکام میں امام کے لیے تو مشورہ لازمی ہے۔ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ. اور قوم کے لیے امام پر تنقید اور اسی روک ٹوک یا نصیحت کا حق حاصل ہے تاکہ امام میں شائبہ استبداد باقی نہ رہے۔ جیسا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا کہ ''اگر میں حکم دوں تو کیا تم اطاعت کرو گے؟ سب نے کہا، کریں گے، فرمایا کہ ''اگر کتاب اللہ کے خلاف حکم کروں؟ کہا گیا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم تکلے کی طرح اس تلوار سے تمہارے بل نکال دیں گے۔ بہر حال اسلام نے امیر کو مرتبۂ عظیمہ بھی دیا ہے کہ وہ نائب حق ہے مگر جب کہ وہ مقام معصومیت پر پہنچا ہوا نہیں ہے تو اس کا ہر کہا ہوا علی الاطلاق واجب الاطاعت بھی نہیں ہے۔ جبکہ قانون الٰہی کے معیار پر پورا اترا ہوا نہ ہو۔

غرض امامت میں جمہوریت تو یہ کہ قوم کو حق رائے دہندگی حاصل ہے اور ساتھ ہی شخصیت یہ کہ صاحب عزم صرف امام ہی ہوگا جس کی اطاعت لازم ہوگی۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرۃ العقبۃ ج: ۲ ص: ۹۴۴ رقم: ۱۲۹۸.

② الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب حکم من فرق امر المسلمین وھو مجتمع ج: ۳ ص: ۱۴۸۰ رقم: ۱۸۵۲.

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. ① ’’اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ لوگوں سے مشورہ فرمائیں اور جب عزم فرمالیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کریں‘‘۔

پس امام کو مفروض الاطاعت بھی رکھا ہے جبکہ وہ راہ راست پر چلے اور اس کی تقویم واصلاح بھی جماعت پر واجب کی ہے۔ جب کہ وہ بے راہی پر آجائے کہ اس کے بغیر جماعت کا نظام حق وصداقت پر قائم نہیں رہ سکتا ۔غرض نماز نے نظام ملت کے اس اہم رکن کے لیے بھی ایک طبعی اور عقلی اصول پیش کیا ہے جو نظام کی روح ہے ۔ہاں اس کے بعد نماز نے ایک اور اصولی راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اگر قوم کے متنبہ کرنے پر امام صلوٰۃ اپنی غلطی کو تسلیم کرے اور تدارک کی طرف متوجہ ہو یعنی سجدۂ سہو کرے جس میں گویا علانیہ اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔تو پھر قوم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس غلطی تک میں امام کا ساتھ دے اور اس کے تدارک میں بھی اتباع کرے۔

گویا قوم بھی اپنے عمل سے اعلان کردے کہ باوجودیکہ امام کا یہ فعل غلط اور سہو سے سرزد ہوا مگر جب کہ وہ علانیہ اس غلطی کا معترف اور تدارک پر آمادہ ہے۔تو ہم سب اس کے اس مخلصانہ رجوع کے سبب اس کے ساتھی اور حامی ہیں، کیوں کہ اس نے جان بوجھ کر صلوٰۃ کی تخریب کرنا نہیں چاہی تھی، گویا قوم عمل سے اعلان کرتی ہے کہ ہم منشط ومکرہ میں اپنے امام کے ساتھی اور مطیع ہیں اور یہی نظم صلوٰۃ کی اساس ہے حتی کہ اگر امام سے کوئی مخفی غلطی ہوجائے جس پر قوم مطلع بھی نہ ہو اور وہ سجدۂ سہو کرلے،تو اس میں بھی قوم کو ساتھ دینا واجب ہے اور اس غلطی اور تدارک میں اپنے کو بھی شریک امام بنانا ناگزیر ہے تاکہ نظم صلوٰۃ میں انتشار اور دوعملی واقع نہ ہو۔

نماز نے بتلایا کہ یہی صورت امامت کبریٰ میں بھی ہونی چاہیے کہ اگر کسی خطاء اجتہادی پر قوم، امیر کو متنبہ کرے تو امیر کا فرض ہے کہ اس غلطی کے تدارک کی فکر کرکے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور جب ایسا کرلے تو قوم اسے تنہا نہ چھوڑے، بلکہ اس کا ساتھ دے اور اطاعت میں فرق نہ آنے دے،خواہ یہ غلطی مخفی طور پر ہوئی ہو یا علانیہ ،جس پر قوم نے متنبہ کیا ہو کہ نظام ملت اس معتدل راستہ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔اگر قوم مطلقاً امیر کی مطیع بن جائے خواہ وہ برا کرے یا بھلا تو یہ بھی نظام ملت کی تباہی ہے اور اگر ذرا ذرا سی جزئیات پر امیر کی اطاعت چھوڑنے پر آمادہ رہے تو یہ بھی تخریب نظم اور ملت کی بربادی ہے۔معتدل راستہ یہی ہوسکتا ہے کہ امیر کی اطاعت منشط ومکرہ میں واجب اور اس کی اغلاط پر صحیح مشورہ بھی واجب۔تاکہ نہ؟ لامرکزیت پیدا ہو، نہ استبداد کا ظہور ہو۔

شرائط امام یا مناصب امام کے سلسلہ میں نماز نے ایک اور زرین اصول یہ رکھا کہ وہ مقتدیوں میں ممتاز ہے۔ مگر منصب امامت پر پہنچ کر اس کے لیے یہ امتیاز کافی ہے کہ امام ہے۔رسمی امتیازات،ظاہری شوکتیں اور نمائشی اقتدارات کی اسے حاجت نہیں،مثلاً امام کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کرنا کہ سب میں اونچا نظر آئے مکروہ کہا گیا حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے مدائن میں امامت کی اور کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے جس سے مقتدی سب نیچے تھے،تو

① پارہ:۳،سورۃ :آل عمران، الآیۃ:۱۰۹.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عمار رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار لائے۔ جب جماعت ہو چکی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جب آدمی کسی قوم کی امامت کرے تو قوم سے اونچا نہ کھڑا ہو، عمار رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ پھر اسی بناء پر تو میں نے کوئی چون و چرا نہیں کی اور تمہارے اشارہ پر نیچے اتر آیا۔ نماز کے اس جماعتی مسئلہ نے بتلایا کہ امامت کبریٰ کے امیر کو بھی امارت کی عزت کافی ہے۔ ظاہری کروفر، حشم وخدم اور عجم کے رسمی تکلفات اسلامی امیر کا شیوہ نہیں۔ اس کی امارت جب تک کہ صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی امارت کی سی سادگی اور بے تکلفی اور حقیقی عظمت لئے ہوئے نہ ہو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے خلافت نہیں ہے۔ ملوکیت ہے جو اسلام میں مطلوب نہیں۔

غرض جماعتی زندگی کے تمام اہم مقامات امیر کی سادگی، امیر کی امتیازی شان، امیر کی حق پسندی، امیر کی امتیازی فضیلت، جماعت کی اطاعت، مطیع جماعت کی حریت ونصیحت کیشی۔ امیر کا اعتراف حق اور جماعت کا منشط ومکرہ میں ساتھ دینا، نماز کے مختلف پہلوؤں سے ثابت ہو جاتے ہیں اور صرف نماز ہی کو سامنے رکھنے سے ملت کا پورا اجتماعی نظام تشکیل پا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نماز نے اپنے اجتماعی نظام میں فرق مراتب کا سسٹم بھی قائم کیا ہے تاکہ مساوات عامہ کے ساتھ مراتب کے فروق بھی نظر انداز نہ ہوں کہ اس کے بغیر عدل کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

نماز نے جماعت میں مثلاً مرد وعورت کا فطری درجہ اور مرتبہ قائم رکھا، مردوں میں بالغ ونابالغ کے مراتب کے فروق ملحوظ رکھے۔ بالغوں میں تقدم وتاخر کا فرق قائم کیا۔ تقدم صفوف میں یمین ویسار کے درجات قائم کئے۔ یمین میں قریب وبعید کا تفاوت پیش نظر رکھا۔

قریب میں امام کے محاذی اور غیر محاذی کی تفریق سامنے رکھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لِيَلِيَنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ① ”(چاہیے کہ (جماعت صلوٰۃ میں) عقلاء اور بالغ مجھ سے قریب رہیں یعنی صف اولیٰ میں رہیں، پھر جوان سے قریب ہوں، اور پھر جوان سے قریب ہوں“۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: عَنْ أَبِيْ مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ أَلَا أُحَدِّثُكُمْ بِصَلٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟قَالَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَفَّ الرِّجَالُ وَصَفَّ بِهِمُ الْغِلْمَانُ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا صَلٰوةُ أُمَّتِيْ ۔ ② ”ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تمہارے سامنے بیان نہ کروں؟ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز قائم فرمائی، تو مردوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اولین صف بندی کی اور لڑکوں نے ان بالغوں کے پیچھے صف بنائی، پھر

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتھا ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۴۳۲.

② السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب مقام الصبیان من الصف ج: ۲ ص: ۳۲۱.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو نماز پڑھائی اور فرمایا اسی طرح ہے نماز میری امت کی‘‘۔

اس روایت سے واضح ہے کہ اولین صفوف بالغ مردوں کی ہونی چاہئیں اس کے بعد لڑکوں اور نابالغ بچوں کی۔

دوسری ترتیب کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ فِيْ بَيْتِ اُمِّ سُلَيْمٍ فَقُمْتُ وَيَتِيْمٌ خَلْفَهُ وَاُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا. ① ’’ام سلیم کے گھر میں، میں نے اور ایک یتیم لڑکے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (صف بنا کر) نماز پڑھی اور ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی تھیں‘‘۔

اس سے واضح ہوا کہ عورتوں کا مقام لڑکوں سے بھی پیچھے ہے، کیوں کہ لڑکوں کی نوعیت بہر حال مردوں کی ہے، بلحاظ عقل وفہم کے جو عورتوں کی نوعیت سے اکمل ہے گو فی الحال وہ حد بلوغ پر نہیں ہے۔

یمین ویسار کے فرق کے بارہ میں ارشاد ہے کہ دائیں جانب کے مقتدی عنایات خاصہ کے مورد ہوتے ہیں۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ. ② ’’اللہ اور اس کے فرشتے صفوں کے دائیں جانب پر رحمت بھیجتے ہیں‘‘۔

پھر میامن اور دائیں جانب کے مقتدیوں کے بارہ میں فرمایا کہ جو امام ہے وہ رحمت سے زیادہ قریب ہے، پھر ان مقربین کے بارہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ:۔ وہ رحمت اولاً امام کے سر پر آتی ہے، اس سے پھر صف اولیٰ میں اس شخص کی طرف چلتی ہے جو ٹھیک امام کی سیدھ میں ہے اور اس سے پھر دائیں جانب جو قریب ہے اول اس کی طرف۔ پھر اسی طرح ترتیب وار درجہ بدرجہ صف اولیٰ کے دائیں جانب آخر تک چلتی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسی صف اولیٰ کی بائیں جانب کے مقتدیوں کی طرف اسی ترتیب سے لوٹتی ہے۔

بہر حال نماز نے بتلایا کہ قرب وبعد کے معیار سے مقتدیوں کے مراتب میں تفاوت ہے، اور اس قرب وبعد کا معیاری نقطہ امام ہے کہ قرب وبعد کا اعتبار امام سے کیا جاوے گا جو اس سے قریب ہوگا وہ قریب سمجھا جائے گا اور جو اس سے بعید ہوگا بعید شمار ہوگا۔ پس اس سے یہ اصول واضح ہوا کہ جماعت کے قلوب تھامنے کے لیے من اللہ اس اجتماع صلوٰۃ میں بھی جو مساواۃ کا انتہائی مظاہرہ ہے۔ فرق مراتب معتبر مانا گیا ہے۔ ورنہ مختلف المراتب اشخاص کبھی جماعتی لائن میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ان میں باہم کبھی اعتماد واطمینان اور بشاشت کی لہر نہ دوڑ سکتی۔

ادھر فرق مراتب سے ممکن تھا کہ اعلیٰ مراتب پانے والے اشخاص کے قلوب میں غرور نفس سے ادنیٰ مراتب کے افراد کی تحقیر سما جاتی تو اس فرق مراتب کو ساتھ ہی ساتھ کلمۂ صلوٰۃ نے مظاہرۂ عامہ مساوات ہی کا قائم کر لیا ہے اور ان متفاوت المراتب اشخاص کو حکم یہی دیا ہے کہ سب کے سب رہیں، ایک ہی صف میں ایڑی ٹخنہ ایک سیدھ میں کر کے اور مونڈھے سے مونڈھا ملا کر کھڑے ہوں۔ اگر صف میں ذرا آگے پیچھے ہوئے تو انہیں دھمکی دی گئی ہے

---

① الصحيح للبخاری، كتاب الاذان، باب صلاة النساء خلف الرجال ج: ۳ ص: ۳۸۱ رقم: ۸۲۴.

② السنن لابی داؤد، كتاب الصلوٰة، باب من يستحب ان يلی الإمام، ج: ۲ ص: ۳۱۹.

کہ تمہارے دلوں میں بھی اللہ ایسا ہی اختلاف ڈال دے گا، جیسا یہ ظاہر میں تم نے پس و پیش ہو کر گوارہ کرلیا۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَکُمْ اَوْ لَیُخَالِفَنَّ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ. ① ''یا تو تم اپنی صفیں سیدھی کرلو اور یا پھر اللہ تمہارے دلوں میں اختلاف ڈال دے گا''۔ چنانچہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو باہم مختلف اور لڑتا جھگڑتا دیکھ کر تسویۂ صفوف کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا کہ: فَاَنْتُمُ الْیَوْمَ اَشَدُّ اخْتِلَافًا. ② ''تم آج کے دن سب سے زیادہ اختلاف کے شکار ہو'' (کیوں کہ صفیں برابر کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔) کہیں تاکید فرمائی گئی کہ: حَاذُوْا بِالْاَعْنَاقِ : کہ دونوں کو ایک سیدھ میں رکھو ③ کہیں فرمایا: حَاذُوْا بَیْنَ مَنَاکِبِکُمْ. ④ ''مونڈھوں کو ایک سیدھ میں رکھو''۔ پھر مونڈھے درست کرنے کے لیے جو شخص بھی بڑھے یعنی صفوں کی سیدھ کی خاطر یا ان کے ملانے کی خاطر اس کے بارہ میں نرمی برتنے یعنی اطاعت کا حکم دیا۔ لِیْنُوْا فِیْ اَیْدِیْ اِخْوَانِکُمْ. ⑤ ''اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کے بارہ میں نرمی اور نرم خوئی اختیار کرو''۔ اس میں اطاعت کرنے والے کے لیے فرمایا: خِیَارُکُمْ اَلْیَنُکُمْ مَنَاکِبَ فِی الصَّلٰوةِ. ⑥ ''تم میں بہترین وہ ہے جو صف بندی صلوٰۃ میں مونڈھوں کے بارے میں نرم ہو یعنی کہتے ہی مونڈھے سے مونڈھا ملا لے اور صف سیدھی کرلے''۔ پھر ایک لائن کے لوگوں کو ہدایت ہوئی کہ ایک صف میں قریب قریب اور مل کر کھڑے ہوں کہ تمہارے قلوب میں بے گانگی اور چھوت نہ پیدا ہو۔ لہٰذا تقطیع صفوف مت کرو۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ وَّصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ. ⑦ آگاہ ہو کہ جس نے صف ملا لی یعنی صف میں مل کر کھڑا ہوا، اسے اللہ اپنے سے ملا لے گا اور جس نے صف کاٹ دی یعنی مل کر کھڑا نہ ہوا تو خدا بھی اسے اپنے سے قطع کردے گا۔

کہیں فرمایا کہ اتمامِ صف بھی کرو۔ یہ نہ ہو کہ پہلی صف مکمل ہوئے بغیر ہی دوسری بنالی جائے کہ اس عمل سے کہیں پیچھے رہنے کی خو نہ پڑ جائے کہ پھر جو خود پیچھے ہوا تو اللہ بھی اسے پیچھے کر دیتا ہے۔

نیز صفوں کا ادھورا چھوڑنا، بدنظمی اور بدہیئتی بھی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِیْ یَلِیْهِ فَمَا کَانَ مِنْ نَّقْصٍ فَلْیَکُنْ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰة، باب تسویة الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۴۳۶.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰة، باب تسویة الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۴۳۲.

③ السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰة، باب تسویة الصفوف، ج: ۲ ص: ۳۱۰. ④ مسند احمد، حدیث ابی امامة الباهلی الصدی، ج: ۴۵ ص: ۲۲۸. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۲۸۶. ⑤ مسند احمد، حدیث ابی امامة الباهلی الصدی، ج: ۴۵ ص: ۲۲۸. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۲۸۶.

⑥ السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰة، باب تسویة الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۴.

⑦ السنن للنسائی، کتاب الامامة، باب من وصل صفا ج: ۳ ص: ۳۱۸.

فِي الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ. ① ''صف اولیٰ مکمل کرو، پھر اس سے پچھلی صف، جو بھی کمی رہے وہ سب سے پچھلی صف میں رہنی چاہیے''۔ پھر باہمی میل اور شدت تواصل کے لیے تراص کا حکم دیا کہ آپس میں گتھ کر کھڑے ہوں، بیچ میں فاصلہ ذرا سا بھی نہ ہو۔ أَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَتَرَاصُّوْا. ② صفوں میں گتھ کر اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: سُدُّوا الْخَلَلَ. ③ درمیانی فاصلہ کو بھرو۔

بہر حال ایک طرف اگر یہ منشاء تھا کہ فرق مراتب قائم رہے اور قریب وبعید کا فرق جیسے حسی ہے ویسے ہی بلحاظ ثمرات واجر بھی رہے تا کہ مقربین کی امنگ قائم رہے اور متاخرین کا تکاسل ٹوٹے اور نہ ٹوٹے تو پھر ندامت قائم رہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی منشاء ہے کہ ان متفاوت المراتب افراد جماعت کی مساوات باہمی اور قانونی یکسانی میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے تا کہ متقدمین مغرور نہ ہوں، اور متاخرین دل شکستہ نہ ہوں، نماز نے اپنی جماعت میں جو یہ اصول اعتدال قائم کیا جس میں فرق مراتب بھی ہے اور آئینی یکسانی بھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس اصول کے بغیر ملت کا جماعتی نظام بھی قائم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے نماز ہی سے ملت کی شیرازہ بندی اور وحدت بندی اور وحدت عمل پر بھی اصولی روشنی پڑی۔ کیوں کہ جب اجتماع عبادت اس اصول کے بغیر ناممکن تھا تو اجتماع ملت یا تمدنی اور اجتماعی زندگی اس اصول کے بغیر کیسے قائم ہوتی؟

ضروری تھا کہ ایک طرف امیر المسلمین لوگوں کے مراتب میں فرق قائم رکھے تا کہ وہ بکھرنے نہ پائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مراتب ومناقب پر روشنی ڈالی اور ان کے واقعی اوصاف کمال کو جو فیضان نبوت سے ان میں قائم ہوئے، خوب خوب سراہا اور درجات مراتب کا تفاوت واضح فرمایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے رتبہ اور اپنے ساتھ قرب خاص کے بارہ میں ارشاد فرمایا: عُرِجَ بِيْ إِلَى السَّمَآءِ فَمَا رَأَيْتُ شَيْئًا إِلَّا وَجَدْتُ اسْمِيْ مَكْتُوْبًا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَأَبُوْبَكْرِ ﹰالصِّدِّيْقُ خَلِيْفَتِيْ. ④ ''مجھے آسمانوں کی معراج کرائی گئی تو میں نے کوئی چیز ایسی نہ دیکھی جس پر نہ لکھا ہوا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور ابوبکر صدیقؓ ان کے خلیفہ ہیں''۔ شیخین کے بارہ میں فرمایا: أَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ. ⑤ ''ابوبکر وعمر میرے لیے آنکھ اور کان جیسے ہیں''۔ کہیں فرمایا: اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ أَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرُ. ⑥ ''میرے بعد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہم کی اقتداء کرو''۔ پھر خلفاء اربعہ کے مراتب کے بارہ میں ارشاد

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۳. ② السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب الامامة والجماعه ج: ۱ ص: ۲۸۸ رقم: ۸۸۹. ③ مسند احمد، مسند عبدالله بن عمر بن الخطاب رضی الله عنه ج: ۱۲ ص: ۳. ④ کنزالعمال، ج: ۱۱ ص: ۵۴۹ رقم: ۳۲۵۸ (الحسن بن عرفة فی جزئه، عدوابو نعیم فی فضائل الصحابه عن ابی هریرةؓ) ⑤ المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه: قیس ج: ۱۱ ص: ۲۳۳. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: وفيه حماد بن عمر النصيبي وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۵۶.

⑥ السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمرؓ ج: ۱۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۳۵۹۵.

فرمایا: يَاعَلِيُّ! اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَتَّخِذَ اَبَابَكْرٍ وَّزِيْرًا وَّعُمَرَ مُشِيْرًا وَّعُثْمَانَ سَنَدًا وَّاِيَّاكَ ظَهِيْرًا اَنْتُمْ اَرْبَعَةٌ ، فَقَدْ اَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَكُمْ فِيْ اُمِّ الْكِتَابِ لَا يُحِبُّكُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا يُبْغِضُكُمْ اِلَّا فَاجِرٌ اَنْتُمْ خَلَائِفُ نُبُوَّتِيْ وَ عَقْدُ ذِمَّتِيْ وَحُجَّتِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ . ①

''اے علیؓ! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ابوبکرؓ کو وزیر اور عمرؓ کو مشیر اور عثمانؓ کو سند وحجت اور تجھے مددگار بناؤں، تم چار ہو تمہارے بارہ میں اللہ نے میثاق وعہد دیا ہے لوح محفوظ میں کہ تم سے صرف مؤمن ہی محبت کر سکے گا اور تم سے بغض رکھنے والا فاجر ہوگا، تم چاروں میری نبوت کے خلف رشید ہو اور میری ذمہ داریوں کی مضبوطی ہو اور میری حجة ہو، میری امت پر''۔ (الحديث ابن السمان في الموافقة (من رواية الرياض)

غرض خلیفۂ اول کا مرتبہ پھر شیخین رضی اللہ عنہ کا رتبہ پھر خلفاء کا درجہ ترتیب وار ارشاد فرمایا۔ پھر ان حضرات کے علاوہ بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا فرق مراتب بھی کھولا، فقہاء صحابہؓ کا امتیاز واضح فرمایا۔ اصحاب بدر کی تفصیل بیان فرمائی۔ اصحاب حدیبیہ کے مقامات پر روشنی ڈالی، شہداء احد کی فضیلت ظاہر فرمائی مہاجرین اول کا رتبہ کھولا۔ پھر عامۂ صحابہ تک کے باہمی مراتب وفضائل بیان فرمائے، مثلاً فرمایا: اَنَا سَابِقُ الْعَرَبِ وَصُهَيْبٌ سَابِقُ الرُّوْمِ وَسُلَيْمَانُ سَابِقُ الْفُرْسِ وَبِلَالٌ سَابِقُ الْحَبَشِ ۔ ② ''میں عرب میں اول ہوں، صہیب روم والوں میں، سلمان، فارسیوں میں اور بلال حبش میں سب سے مقدم ہیں دین میں''۔

غرض ہر صاحب منقبت کے مناقب کھول دیئے، جس سے ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ ہر ایک کے کمالات سے دوسرا منتفع ہوا۔ اور ان کے باہمی مراتب کا فرق نمایاں ہوگیا، لیکن ساتھ ہی ان کی منصبی مساوات قائم رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا کہ: اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ ، ③ ''میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ستاروں کی مانند ہیں، جس کی بھی اقتداء کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے''۔

جس سے ان کے ہادی مہدی ہونے کی شان مساوات کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ اسی طرح ان کے منصبی اور آئینی حقوق میں بھی کوئی تفاوت نہ تھا۔ مجلس نشینی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ معاشرتی اجتماعات میں کسی قسم کی تمیز اور تفریق نہ تھی۔

غرض ایک طرف حضرت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماً مومنین اور قوم میں فرق مراتب کو بھی کھول کھول کر نمایاں کر دیا اور دوسری طرف ان میں مساوات اور یکسانی کی روح بھی بدرجۂ اتم پھونک دی۔

---

① كنز العمال، ج:١٣ ص:٢٣٤ رقم:٣٦٧٠٣. (الزوزني، خط وابو نعيم في معجم شيوخه وفي فضائل الصحابة والديلمي، كروابن النجار من طرق كلها ضعيفة)

② المعجم الكبير للطبراني ج:٧ ص:١٨ رقم:٧١٣٥. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب فضل صهيبؓ وغيره ج:٩ ص:٣٠٥. ③ تخریج گذر چکی ہے۔

پس مساوات وتفاضل کا جو اصول امامت صغریٰ میں تھا وہی بعینہٖ امامت کبریٰ میں رہا۔ اور نماز نے جماعتی زندگی کے اس اہم پہلو کو بھی واشگاف کر دیا۔

اسی کے ساتھ نماز نے ہمیں یہ بھی بتلایا کہ امام نماز کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مقتدیوں کو خدا کے سامنے لے جا کر ڈال دے اور جھکا دے اور انہیں رجوع الی اللہ، انابت اور تضرع وزاری کے مقام پر لا کھڑا کرے۔ دوسرا یہ ہے کہ کلمات ربانی باآواز بلند سب کو سنا دے اور اعلائے کلمۃ اللہ سے سب کے کان کھٹکھٹائے۔ قرأت قرآن یعنی ارشادات الٰہی اور ان کی معنوی ہدایت مقتدیوں کے کانوں تک پہنچا دے۔

اس سے نماز نے رہنمائی کی کہ امامت کبریٰ اور نظم ملت میں بھی امیر کا وظیفہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کو تفوق اور تعیش کے مرض میں مبتلا کرے یا امارت کو اپنے لیے ذریعہ جاہ وباہ بنالے۔ بلکہ اس کا اولین اور آخری فریضہ اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کے نام کی عالم میں منادی کرنی ہے، نیز اس کے بندوں کو اس کی بارگاہ تک پہنچانے کے لیے انہیں نصیحت کرنا، انہیں معروف اور نیکیوں کا آرڈر دینا اور بدی سے باز رکھنا ہے۔ تاکہ دنیا میں خدا کا نام اور اس کا قانون عام رائج ہو اور ساری دنیا اس کے زیر سایہ زندگی بسر کر کے امن ورفاہ کی فضائے عام پیدا کر سکے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ①

غرض نماز نے جماعتی زندگی امامت وامارت، امام کی شان وصفت رعیت کے فرائض، امام کا نصب العین اور جماعتی زندگی کے دوسرے لوازم پر ایسی اصولی روشنی ڈالی ہے کہ اگر امیر قوم صرف نماز ہی کو سامنے رکھ کر امارت شرعیہ کے اصول وضع کرنا چاہے تو وضع کر سکتا ہے۔

پھر جماعتی شیرازہ بندی کو توڑنے اور فاسد کر دینے والے محرکات بھی نماز میں موجود ہیں۔ سب سے پہلے جو چیز جماعتی نظام کو تباہ کرتی ہے وہ افراد جماعت کا کبر نفس ہے کہ متکبر انسان دوسرے سے کبھی مربوط نہیں ہو سکتا۔ یہ کام صرف متواضع انسان ہی کا ہے کہ وہ اپنے سے فائق انسان کے سامنے حق پسندی کے ساتھ جھک جائے اور بغاوت وسرکشی سے کنارہ کش رہے۔ سو نماز سے زیادہ کبر توڑنے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے، جس کا موضوع ہی تواضع لِلّٰہ ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔

دوسری چیز ہوائے نفس ہے کہ بسا اوقات انسان اپنی اغراض اور خواہشات کی بناء پر جماعتی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ گو اس میں کبر نفس نہ ہو، سو ہوائے نفس کو نماز کی عبادت سے زیادہ فنا کرنے والی چیز اور دوسری کیا ہو سکتی ہے کہ وہاں سرے سے نفس ہی کو شکست دی جاتی ہے۔

تیسری چیز سوء ظن ہے کہ بلاتبین اندھیرے میں رہ کر آدمی کسی کی نسبت کوئی بری رائے قائم کرے اور پھر اس

① پارہ: ۱۷، سورۃ: الحج، الآیۃ: ۴۱.

سے متارکت کر بیٹھے جس سے جماعتی نظام برباد ہو جائے سو نماز میں اس کا علاج بھی موجود ہے۔ جب کہ وہ نمازی کو بے لوث اور بے غرض بنا کر اس کے قلب میں ایسی نورانیت پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی خیر و شر میں خود ہی امتیاز پیدا کر لیتا ہے اس کے دل میں بے اصول اور مضر چیز کوئی جگہ اور وقعت نہیں پاتی کہ وہ مبتلائے سوءِ ظن ہوا اور ہوتا ہے تو بغیر تحقیق و تفتیش اسے کسی کی نسبت بری رائے قائم کرنا خلاف عدل محسوس ہونے لگتا ہے۔ بہر حال نماز کی تنویر اور روشنی سے جہاں ساری کائنات کے حقائق کھلنے لگیں وہاں ظنی گنجلکوں کا وجود کیا رہ سکتا ہے؟

چوتھی چیز درجاتی امتیازات، نسلی تفریقیں اور جماعتی تعصبات ہیں جو نظام کو درہم برہم کرتے ہیں تو نماز کی مساوات اور صفوں کی یکسانی اس تہلکہ کو بھی مٹا ڈالتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسباب تفریق و اختلاف کو بھی اگر دیکھا جائے تو نماز میں اصولی طور پر ان کا علاج بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں جہاں اجتماعیت کا ثبوت ہے وہاں مہلکات اجتماعیت کا مداوا بھی تنقیح کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے نماز اجتماعیت اور نظم ملت کے مالۂ و ماعلیہ کے لیے بھی جامع نکلی۔ جس سے نمایاں ہوا کہ ایک نمازی انسان جس درجہ نظام ملت کی بقاء و استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے بے نمازی آدمی نہیں بن سکتا، کیوں کہ نماز تمام مخربات نظم کا ایک مکمل علاج ہے۔ اس لیے بانماز انسان میں تخریب نظم کے جراثیم کبھی بھی قوت سے نہیں ابھر سکتے۔ غرض نماز نے اصول تقویت نظام پر فکری روشنی بھی ڈالی اور عملاً بھی وہ نظام ملت کے لیے ایک آہنی دیوار ثابت ہوئی۔

ہاں پھر نظام ملت کے لیے جہاں اصول کی ضرورت ہے وہاں طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی نظام بغیر طاقت کے نہیں چل سکتا۔ اصول کتنے ہی معقول ہوں لیکن طبائع کی ظلمت انہیں بلا مادی شوکت و طاقت کے قبول نہیں کرتی۔ شریر النفس انسان ہر دور میں موجود رہے ہیں جنہوں نے اصول حق اور عمل صالح کو اپنی اغراض پر بھینٹ چڑھانے کی سعی کی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے افراد کا مقابلہ محض اخلاق سے نہیں ہو سکتا کہ وہ اخلاقی انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ طاقت سے ہوتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس نماز جیسی عبادت خالصہ نے مقابلہ اور مقابلہ کے اصول جنگ اور جنگی تدبیر سکھلانے میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ شاید نماز کو جس قدر مناسبت جہاد سے ہے اتنی کسی اور عبادت سے نہیں ہے۔ چنانچہ ایک حقانی اور راست باز انسان کے دو ہی قسم کے دشمن ہیں جو اسے راہ حق سے ہٹاتے ہیں۔ ایک ظاہری دشمن جیسے کفار و فجار اور ایک باطنی اعداء جیسے شیاطین یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ انسان کی حق و صداقت کے دشمن شیاطین، مگر شیاطین دو قسم کے ہیں ایک بصورت انسان جو نوع انسان میں سے ہوں اور ایک جنات جو نوع شیطانی میں سے ہوں۔

قرآن نے شیاطین ہی کی دو نوعیں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کہہ کر قائم فرما دی ہیں۔ یعنی شیاطین الانس اور شیاطین الجن۔ شیاطین کی یہ دو نوعیں ایک منٹ کے لیے بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتیں کہ دنیا میں اللہ کا کوئی مطیع بندہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کامیاب ہو شیاطین جن چونکہ مخفی دشمن ہیں اور انسانی نفس میں اپنی جیسی سرکشی اور

ظلمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ذکر اللہ اور یادِ حق سے طرح طرح سے ہٹاتے ہیں۔ اور پھر خصوصیت کے ساتھ نماز جیسی قرب افزاء عبادت میں تو ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس رابطہ کو قطع کر دیں جو اللہ اور بندہ کے درمیان نماز سے قائم ہوتا ہے۔ حتی کہ نماز اور متعلقات نماز کے لیے شیاطین کا ایک مستقل لشکر کمربستہ ہو کر آتا ہے جو وضوء کے وقت سے انسان کے گھات میں لگتا ہے۔ وضوء میں وسوسے ڈالنے والے شیطان کا نام ہے وَلَھَان اور نماز کو خراب کرنے والے شیطان کا نام خِنزَب ہے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے ولھان اور کتنے خنزب پرے باندھ کر نمازی انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہوں گے۔ کہ ان کو قربِ الٰہی کے ملک سے باہر نکال دیں۔ اس لیے نمازی کو بھی پوری تیاریوں کے ساتھ صفوفِ صلوٰۃ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے تا کہ اس جنگ میں ان دشمنانِ جنی سے ہزیمت نہ اٹھائیں۔

چنانچہ بعض اوقات حسی طور پر بھی یہ خفی دشمن آ جاتے ہیں اور آنکھوں سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اللہ اپنے مخصوص بندوں کو قدرت دیتا ہے کہ وہ انہیں پکڑ کر سزا دے سکیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اِنَّ عِفْرِيْتًا مِّنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلَىَّ صَلٰوتِىْ فَاَمْكَنَنِى اللّٰهُ مِنْهُ فَاَخَذْتُهٗ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَرْبِطَهٗ عَلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِى الْمَسْجِدِ حَتّٰى تَنْظُرُوْا اِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَرْتُ دَعْوَةَ اَخِىْ سُلَيْمَانَ ”رَبِّ هَبْ لِىْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِىْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِىْ فَرَدَدْتُّهٗ خَاسِيًا ① ”ایک شیطان جنات میں سے رات میرے سامنے آ گیا کہ میری نماز کو قطع کر دے، اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تا کہ تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ مگر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعاء یاد آ گئی کہ ”الٰہی! مجھے ایسی سلطنت دے جو میرے بعد کسی کو نہ ملے یعنی جنات تک پر قدرت حاصل ہو جائے۔ سو میں نے اسے نامراد بنا کر چھوڑ دیا“۔

جس سے صاف واضح ہے کہ نماز میں مقابلہ ان دشمنانِ خفی سے ہوتا ہے اور نماز فی الحقیقت ایک معنوی جہاد ہے جو خصوصیت سے شیاطین اور ان کی اندرونی فتنہ پردازیوں کو روکنے کے لیے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کے کل معاملات میں رخنہ اندازی اگر ہے تو شیطانوں ہی کی طرف سے ہے۔ حتی کہ اوقاتِ نماز تک کے سلسلہ میں شیطان مقابلہ سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ طلوع وغروب اور استواء کے اوقات نماز کے لیے اسی لیے ممنوع قرار دیئے گئے ہیں کہ ان میں شیطان کے اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ گویا یہ اوقات شیطان کے معنوی اثرات کی غیر محسوس چھاؤنیاں ہیں جن میں اس کے ناپاک اسلحہ شرک وکفر وغیرہ جمع رہتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے نمازی کو جو شیاطین کے مقابلہ میں خدا کا سپاہی ہے حکم دیا کہ وہ دشمن کی چھاؤنی میں نہ گھسے کہ مغلوب ہو کر اسے واپس آنا پڑے، اس لیے ان اوقاتِ ثلثہ میں گھس کر نماز پڑھنا ممنوع ہوا۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الاسیر او الغریم یربط فی المسجد ج: ۲ ص: ۲۵۹.

ہاں جب شیاطین خود آ کر نمازی کے اوقات میں خلل ڈالے تو اسے مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیے بلکہ اس کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعتی تدابیر اختیار کر لینی چاہئیں۔ چنانچہ نماز کے حقیقی اوقات شروع ہوتے ہی شیاطین ہجوم کر کے آنے شروع ہوتے ہیں تو اذان رکھی گئی جس کا آغاز تکبیر الٰہی سے ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ اذان کے وقت شیطان آتا ہے کہ اعلان حق میں خلل اندازی کرے تو اذان کی تکبیر سے اس کے سر پر زد پڑتی ہے۔ اور بنصِ حدیث گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے پھر نماز شروع ہونے پر عین صلوٰۃ میں صفوں میں آ کر گھستا ہے کہ اس باہمی ریل میل اور ملاپ میں فرق ڈالے۔ پھر نمازیوں کو کچھ سنگھا کر مدہوش کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذکر اللہ سے غافل ہو جائیں پھر جماعت سے کوئی رہ جائے تو اس کی نماز کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ جیسے ریوڑ سے رہی ہوئی بکری بھیڑیا اچک کر لے جاتا ہے۔

پھر وسوسہ اندازی الگ کرتا ہے تا کہ نماز میں دل جمعی اور یکسوئی باقی نہ رہے۔ کبھی رکعتیں بھلا دیں۔ کبھی قرأت میں شک ڈال دیا۔ کبھی رکوع وسجود میں شبہ پیدا کر دیا۔ بہرحال نماز کے مبادی سے لے کر مقاصد تک اول سے لے کر آخر تک شیطان کی سعی ہوتی ہے کہ پورا مقابلہ کر کے آدمی کو اس راہ حق اور طریق وصال ربانی سے ڈگمگائے اس لیے بندوں کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بھی نماز میں اس ظالم کا پورا مقابلہ کریں۔ صف بندی کر کے اجتماعی صرب وضرب کے لیے تیار ہو جائیں، اور مسلح ہو کر کمر بندی کر لیں، تا کہ اس دشمن انسانیت شیطان کی کمر ٹوٹ جائے۔ اور وہ اس جنگ میں شکست کھا کر ہزیمت پر مجبور ہو جائے۔

حدیث میں ارشاد ہے: اَلصَّلٰوةُ تُسَوِّدُ وَجْهَ الشَّيْطَانِ وَالصَّدَقَةُ تَكْسِرُ ظَهْرَهُ وَالتَّحَابُّ فِي اللّٰهِ وَالتَّوَدُّدُ فِي الْعَمَلِ يَقْطَعُ دَابِرَهُ فَإِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ تَبَاعَدَ مِنْكُمْ كَمَطْلِعِ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا. ① "نماز شیطان کو روسیاہ کر دیتی ہے اور صدقہ اس کی کمر توڑ دیتا ہے اور لوجہ اللہ باہمی محبت اور عمل میں باہمی رسائی اس کی جڑ کاٹ دیتی ہے پس جب تم یہ عمل کرو گے تو شیطان تم سے اتنا ہی دور ہو جائے گا جتنا کہ مشرق ومغرب میں بعد ہے"۔

نماز نے اس جنگ معنوی کے سلسلہ میں جن معنوی اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا ہے ان میں سب سے بڑا ہتھیار تعوذ ہے کہ اللہ کی پناہ میں آ جاؤ اور پہلے ہی اعوذ باللہ پڑھ لو جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص حسی دشمن ہو تو آدمی سامنے جا کر مقابلہ کرے کہ ہتھیار نہ ہو تو ہاتھ ہی سے لڑے، حملہ کی قدرت نہ ہو تو صرف بچاؤ ہی کر لے۔ دشمن بھی سامنے ہے اور اس کا حملہ بھی سامنے ہے۔ لیکن جب کہ دشمن گھات میں ہو پیچھے سے آئے اور اس طرح اچانک حملہ کر بیٹھے کہ ہم اسے دیکھ بھی نہ سکتے ہوں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ② "وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے"۔ تو بجز اس کے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ایسی ذات کی پناہ لیں جو اسے بھی دیکھتی

① کنز العمال، ج: ۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۸۸۹۳، (فر عن ابن عباس) ② پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۲۷.

ہو اور ہمیں بھی دیکھ رہی ہو اور ساتھ ہی اس کے زبردست حملے اور ہمارے عجز ولاعلمی سے بھی خوب واقف ہو اور اوپر سے قدرت والی ایسی ہو کہ سارے جن وانس اور بحر وبر مل کر بھی آجائیں تو اس کے ملک میں ذرہ برابر کمی نہ کر سکیں۔ بلکہ اسے پا بھی نہ سکیں۔ لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ① ''نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک رکھتا ہے اور وہ لطیف وخبیر ہے''۔ اسی لیے آغاز صلوٰۃ ہی میں جب کہ ثناء کے بعد قرأت کا آغاز ہوتا ہے جو قیام صلوٰۃ کا اصل مقصود ہے، پہلے اعوذ پڑھی جاتی ہے۔ گویا شیطان کے مقابلہ کے لیے تعوذ کا ہتھیار سنبھال لیا جاتا ہے نماز کے اس عام طرز عمل نے ہمیں بتلایا کہ دشمن کی اپنی چھاؤنی بھی ہوتی ہے۔ جیسے شیطان کے مخصوص اوقات، تو ان میں خود نہ گھسو کہ تمہیں اس کی اندرونی طاقت کا علم نہیں ہے۔ دشمن کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعت کا بھی بندوبست رکھو۔ جیسے اذان کا اصول ہے دشمن تمہارے مورچوں میں شگاف بھی ڈالے گا۔ جیسے شیطان صفوں کے بیچ میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو خوب گتھ کر صف بندی کرو۔ دشمن پروپیگنڈا کر کے تمہارے خیالات بھی تبدیل کرے گا جیسے شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے سو ذکر اللہ سے بیدار رہو۔ دشمن تم پر خواب آور گیس بھی پھینکے گا، جیسے شیطان صفوں کے درمیانی فاصلوں میں گھس کر غفلت آور شیشیاں سنگھاتا ہے۔ جس سے معنوی ہوش جاتے رہتے ہیں تو درمیانی خلل ہی مت چھوڑو کہ اسے آنے اور شیشی سنگھانے کی نوبت آئے چونکہ دشمن اور اس کی چالیں غیر مرئی ہیں تو ایک ایسی طاقت کے قلعہ سے قلعہ بند ہو جاؤ جو دشمن کی طاقت سے لامحدود فوقیت و برتری رکھتی ہو۔ جیسا کہ تعوذ سے پناہ خداوندی کے قلعہ میں آجانے کی تدبیر سے واضح ہے کیا اگر امارت عامہ کے ماتحت پوری ملت اسلامیہ کا نظام قائم کیا جائے اور معاندین حق کے مقابلہ پر جنگی طاقت فراہم کی جائے تو کیا ان اصول جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار ہے جو نماز نے ہمیں تلقین کیے ہیں؟ اس لیے نماز جہاں ایک بزمی عبادت ہے، جس میں سکون ہی سکون ہے، وہیں ایک رزمی عبادت بھی نکلی جس میں ہجوم ہی ہجوم اور حرکت ہی حرکت ہے۔

پھر اس مجموعی تفصیل سے جو کلی اصول نکلتا ہے وہ یہ کہ جیسا شیطان ہو ویسے ہی اسلحہ بھی فراہم کیے جانے چاہئیں۔ اور ویسی ہی بچاؤ کی مناسب تدبیریں بھی اختیار کی جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس اصول سے جہاد میں بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ضروری ہوگا کہ اسی ڈھنگ پر جہاد میں بھی پہلے ہی سے ہتھیار درست کر لیے جائیں اور وہ بھی دشمن کے طاقت کی مناسب حال۔

پس جہاد میں جبکہ دشمن حسی ہیں تو ہتھیار بھی حسی فراہم کیے جانے ناگزیر ہوں گے۔ اور پھر جس قسم کے ہتھیاروں سے یہ دشمنان انسی آراستہ ہوں گے اسی نوع کے ہتھیار ملت کو بھی فراہم کرنے پڑیں گے۔ جیسے نماز میں دشمن خفی تھا۔ تو ہتھیار بھی خفی اور معنوی ہی سنبھالے گئے۔

---

① پارہ: ۷۔ سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۱۰۴۔

پھر اس سلسلہ میں مزید غور کرو تو معلوم ہوگا کہ نماز میں وسوسہ انداز شیطان کے لیے ابتداء ہی جنگ کی اجازت نہیں۔ بلکہ پہلا حکم یہ ہے کہ اسے طرح دو فلینتہ و لیتعوذ (شیطان وسوسہ ڈالے تو ادھر دھیان بھی مت کرو۔ صرف خدا سے پناہ مانگو) یعنی اس سے اعراض کرو۔ اور ایک طرف قلب کو کرلو۔ جب نہ مانے تو پھر تعوذ کے ساتھ اسے تھتکار دو۔ گویا ابتداءً عدم تشدد اور پھر تشدد اور کھلی جنگ ہے کیا جہاد میں بھی اس اصول کے سوا کوئی دوسرا طریق کار ہوسکتا ہے کہ اگر کفار تعدی پر آمادہ ہوں تو ابتداءً انہیں طرح دی جائے۔ امن قائم رکھنے کی سعی کی جائے لیکن جب وہ حملہ آوری کی ٹھان ہی لیں تو پھر جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے: لَاتَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِ ...... فَاِذَا لَقِیْتُمُوْھُمْ فَاصْبِرُوْا. ① "دشمن سے بھڑنے کی تمنا مت کرو، لیکن اگر سامنے آجائے تو پھر جم جاؤ" (اور جم کر مقابلہ کرو) غرض نماز کے ایک ایک اصول نے جہاد کے جنگی اصول پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے اور عبادت کی صف میں بھی پورا نقشۂ جنگ ایک بہادر انسان کے پیش نظر رکھا ہے تاکہ وہ عین عبادت کی خلوتوں میں بھی جہاد کی ہنگامہ خیزیوں کو فراموش نہ کرسکے۔ پس نماز کا ہر ہر جزو گویا جہاد کا ایک ایک پہلو ہے۔ نماز کی جماعت میں اگر صف بندی ضروری ہے تو جہاد میں بھی لازمی ہے، پھر نماز کی صفوف میں جو امام سے متصل ہیں وہ مرتبہ میں اعلیٰ ہیں اور پچھلی صف والے ادنیٰ، ایسے ہی جہاد میں بھی صف اولیٰ افضل ہے صف آخری سے جو سب سے پہلے گولی اپنے سینے پر لیتی ہے اور امام سے قریب رہتی ہے، پھر نماز کی صفوں میں اگر یمین و یسار ہے تو صفوف جہاد میں بھی میمنہ اور میسرہ ہے نماز میں میمنہ اور میسرہ کے درمیان صف اولیٰ کا وہ مقتدی جو امام سے اقرب اور اس کا محاذی ہے، بمنزلہ قلب کے ہے تو جہاد میں بھی یمین و یسار کا درمیانی لشکر قلب ہے جو امام جہاد سے اقرب اور بمنزلہ اس کے پیش دست کے ہے۔ پھر نماز میں اگر گتھ کر کھڑے ہونے کا حکم ہے تاکہ صفوں میں کوئی رخنہ نہ رہے تو عسکری صفوف کے رخنہ بند کرنے کا بھی حکم ہے تاکہ دشمن درمیان میں گھس کر کسی مورچہ کو کمزور نہ کردے۔

پھر اگر نماز کی صفوں کے آداب ہیں کہ ادھر ادھر مت دیکھو صرف سجدہ گاہ پر نظر رہے آسمان کی طرف نگاہیں مت اٹھاؤ۔ جانوروں کی ہیئت مت اختیار کرو، چنانچہ تدبیح حمار (رکوع کے وقت گدھے کی طرح کمر میں کوب نکال دینا) بروک جمل (اونٹ کی طرح اگلے ہاتھ ٹیک کر بیٹھنا) اقعاء کلب (کتے کی طرح سرین زمین پر رکھ دینا) افتراش ثعلب سجدہ میں لومڑی کی طرح بازو اور پہنچے زمین پر رکھ دینا، نقر دیک (ادائیگی ارکان میں جلد بازی کرتے ہوئے رکوع و سجود میں مرغے کی سی ٹھونگیں مارنا) تخصر شیطان (کوکھ پر ہاتھ رکھ کر شیطان کی طرح کھڑے ہونا)

غرض جیسے نماز کے لیے قواعد ہیں اور صفوف صلوٰۃ میں یکسانی اور تسویہ پیدا کیا جاتا ہے۔ تاکہ پوری جماعت ایک آہنی دیوار نظر آئے، ٹھیک اسی اصول پر جہاد کی صفوف کے بھی عسکری قواعد رکھے گئے ہیں کہ ہیئتوں کی یکسانی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب کان النبی ﷺ اذالم یقاتل اول النھار اخر القتال حتی تزول الشمس ج:۱۰ ص:۱۲۳ رقم:۲۷۴۴.

ہو۔نقل وحرکت میں معیت اور تساوی (برابری) ہو، ادھر ادھر التفات نہ ہو۔مجاہدین کی صفیں ایک سیدھ میں رہیں، ساری فوج ایک دیوار نظر آئے ،سب کا فعل ایک ہو،ایک ساتھ سب کا ہاتھ اسلحہ پر پڑے، یکبارگی سب کا حملہ ہوتا کہ ترتیب میں فرق نہ آئے۔

غرض یہاں بھی قواعد اور پریڈ اسی طرح یکسانی قائم رکھنے کے لیے وضع کی گئی ہے تا کہ اس قوی دشمن جنی (شیطان) پر متحدہ زد پڑے اور اس کی ہزیمت سے خدا کا یہ لشکر کامیاب ہوکر اپنی مراد کو پہنچے۔

پھر جیسے نماز میں امام کی آواز پر رکوع وسجود کی طرف انتقالات ہوتے ہیں جو شیطان پر سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہوتے ہیں اور وہ خائب ہوکر بھاگتا ہے۔ٹھیک اسی اصول پر جہاد میں بھی امام کے اشاروں پر فوجی نقل وحرکت اور اقدام رجوع رکھا گیا ہے جس سے دشمن کے چھکے چھوٹتے ہیں۔

پھر جیسے صلوٰۃ کا شعار نعرۂ تکبیر ہے کہ نماز کے سارے انتقالات اسی نعرہ سے ہوتے ہیں۔ایسے ہی جہاد میں بھی نعرۂ تکبیر ہی شعار بنایا گیا ہے جو عموماً اقدام وہجوم کے وقت لگایا جاتا ہے۔اور جس طرح نماز کی تکبیر سے شیاطین بھاگتے چلے جاتے ہیں۔حتی کہ اذان میں بھی جب اللہ اکبر کہا جاتا ہے تو بنص حدیث شیطان میلوں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی جہاد میں نعرۂ تکبیر سے کفار کے دل لرز جاتے ہیں اور وہ بھی چھوٹے ہوئے دل سے بھاگتے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر سچے قلوب کی گہرائیوں سے یہ نعرہ سرزد ہو۔پھر جو آثار نماز کے اہتمام پر مرتب ہوتے ہیں وہی جہاد پر ہوتے ہیں مثلاً حدیث میں ہے کہ نمازیوں کی صف آرائی کے وقت حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے (کَمَا یَلِیْقُ بِشَانِہٖ) کہ دیکھو میرے بندے کس طرح اپنے عیش وآرام کو چھوڑ کر میرے گھر کی طرف دوڑ رہے ہیں اور میرے دشمن شیطان کو مار بھگانے کے لیے آمادہ ہیں۔ٹھیک اسی طرح بنص حدیث مجاہدین کی صف بندی کے وقت بھی حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ دیکھو میرے بندے کس طرح سروں کو ہتھیلی پر لیے ہوئے میری راہ میں جان دینے کے لیے آرہے ہیں۔

پھر جیسے نماز کی جماعت اور شیاطین کی اجتماعی مدافعت گھروں میں نہیں رکھی گئی ۔ بلکہ اس کے لیے مخصوص مکانات ہیں جنہیں مساجد کہا جاتا ہے اور انہی میں اس کی ادائیگی کی ضرورت اور افضلیت ہے۔ٹھیک اسی طرح جہاد بھی گھر کے کونوں میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے مخصوص میدان ہوتے ہیں جن میں یہ اجتماعی مقابلے عمل میں آتے ہیں، پھر جیسے نماز کے ختم پر اوراد واذکار اور تسبیح وتہلیل وغیرہ رکھی گئی ہے جو مثل ایک غنیمت باردہ کے ہیں کہ اصل نماز کا ثواب لینے کے بعد یہ زوائد ...فوائد اور فاضل برکات ہیں جنہیں لوٹنا اور ان میں حصہ قائم کر لینا نمازیوں کے لیے لھم الحسنی وزیادۃ کا مصداق ہوتا ہے۔اور گویا یہ روح صلوٰۃ کا تتمہ ہیں جنہیں کما لے جانا غنیمت ہے اور فضیلت ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کی عبادت کا تتمہ احراز غنیمت (مال غنیمت لوٹنا ہے کہ اجر وثواب بھی اور مادی منفعت بھی ہے پھر جیسے نماز کا آغاز وانجام سب ہی ادعیۂ واذکار پر ہے بلکہ اس کی روح ہی ذکر اللہ ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صدہا انواع اذکار وادعیہ مروی ہیں جو نماز کے اول وآخر اور درمیان میں پڑھے

جاتے ہیں۔ ایسے ہی جہاد کا آغاز وانجام بھی ذکر اللہ اور مختلف قسم کی دعاؤں پر رکھا گیا ہے۔

چنانچہ احادیث میں یہ اذکار مختلف مواقع جہاد کے لیے روایت کیے گئے ہیں، پھر جیسے نماز کے مقدمہ سے لے کر خاتمہ تک انتشار معاصی یعنی گناہوں کے بکھرنے کی صورتیں رکھی گئی ہیں کہ بندہ کے گناہ بھی معاف ہوں اور ساتھ ہی اس کے لیے نشاط خاطر کی صورت بھی پیدا ہو جائے جس سے وہ مسرور ہو کر بار بار اس عبادت کو شوق کے ساتھ ادا کرے۔ مثلاً وضو میں ایک ایک عضو دھونے سے اس کے کیے ہوئے گناہ جھڑتے ہیں۔ نیز عین صلوٰۃ میں بنص حدیث نمازی جب رکوع میں جاتا ہے تو اس کے کندھوں پر اس کے گناہوں کو لادتے ہیں۔ اور جب وہ کھڑا ہوتا ہے یا سجدہ میں جاتا ہے تو وہ گناہ دونوں طرف سے خشک پتوں کی طرح گرنے اور بکھرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کے بارہ میں فرمایا گیا کہ اَلسَّیْفُ مَحَّآءٌ لِلذُّنُوْبِ. (تلوار سارے گناہوں کو ختم کر دینے والی ہے۔)

جس سے ایک ایک گناہ جھڑ جاتا ہے اور خون کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ آدمی کا نفس دھل کر صاف ستھرا اور چمک دار ہو جاتا ہے۔ غرض نماز اور جہاد میں مناسبت ہی نہیں بلکہ مشابہتوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ قائم ہے اور اس کا جزو جزو اس کے جزو جزو سے مطابقت کھاتا ہے۔ پس اگر جہاد کے اصول معلوم کرنے ہوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں جنگی اسپرٹ تیار کرنی ہو تو نماز ہی اس کی بھی اسکیم اپنے اندر رکھتی ہے، اور دن میں پانچ مرتبہ اس جنگی اسپرٹ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس کے آداب وقواعد سکھاتی ہے، شاید اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جہاد کے متعلق ضروری ترتیبات نماز میں سوچ لیتا ہوں۔ حالانکہ یہ صورت اگر اسی معنی کر لی جائے کہ نماز میں انہیں بے فکری ہوتی ہوگی جس سے طبیعت میں یکسوئی آجاتی ہوگی اور کافی سوچ بچار کا موقع مل جاتا ہوگا تو بظاہر یہ برمحل نہ ہوگا۔ کیوں کہ نماز از قسم افعال ہے، از قسم تروک نہیں ہے۔ افعال میں تو خود انہی افعال کی طرف طبیعت متوجہ رہ سکتی ہے نہ کہ دوسرے افعال کی طرف۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ افعال صلوٰۃ کی طرف سے توجہ ہٹا کر افعال جہاد کی طرف منعطف کرتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ عین صلوٰۃ میں افعال صلوٰۃ سے گریز کر کے افعال جہاد کو سوچنا حضرت عمر جیسی برگزیدہ شخصیت سے بعید ہے کیوں کہ منافی خشوع صلوٰۃ ہے ہاں ایسا سکون تروک میں تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کی نیت کے ساتھ کچھ کاروبار ترک کر کے بیٹھ رہے اور فارغ شدہ طبیعت کو دوسرے افعال کی طرف لگا دے۔ مثلاً صوم تروک کا مجموعہ ہے فعل اگر ہے تو وہ صرف قلب کا ہے یعنی نیت، اور اس کا استحضار ہر آن ضروری نہیں ہے اس لیے سوچ بچار کی فراغت روزہ میں زیادہ ہو سکتی ہے نہ کہ صلوٰۃ میں۔ نیز ایام صیام میں شیاطین بھی قید ہوتے ہیں کہ وسوسوں کا خطرہ ہو اور نفس کا دانہ پانی بھی بند ہوتا ہے کہ وہ تخیلات وافکار میں مبتلا کرے۔ اس لیے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرماتے کہ میں روزہ کی حالت میں جہاد کی تشکیلات سوچ لیتا ہوں تو ایک برمحل بات بھی تھی۔ یہ نماز کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں جنگی تشکیلات کو ترتیب دیا جائے۔

جبکہ اس عبادت میں علاوہ افعال صلوٰۃ کے خود بہت سے شیاطین مستقلاً مصروف وسوسہ اندازی رہتے ہیں جس سے طبیعت کی یکسوئی اور دوسرے امور کی سوچ بچار کے لیے نماز کو کیوں خاص فرمایا گیا؟ سو بخیال احقر اس کی دل لگتی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ نماز خود ایک جنگی اسپرٹ اپنے اندر رکھتی ہے اس کے ہر ہر رکن کو جہاد سے مشابہت کامل ہے۔ ایک نماز گزار اگر حقیقت صلوٰۃ کو پیش نظر رکھ کر نماز ادا کرے تو وہ خود ہی تمام مراحل جہاد سے گزرے گا، گو وہ معنوی اور غیر حسی ہوں، مگر نوعیت تو جنگ ہی کی رکھتے ہیں کہ جہاد معنوی ہے سو اگر اس کی طبیعت اس جہاد معنوی سے جہاد حسی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ ان مختلف جہادی مقامات پر گزرتے وقت جہاد حسی کے ان ہی مقامات کی طرف توجہ کرے جن کی طرف قدرتاً بھی اس کی طبیعت متوجہ ہے اور پھر ان حسی جہادیات کی وہی ترتیب وتشکیل سوچنے لگے۔ جس کی نوعیت کی طرف بلا سوچے سمجھے بھی اس کی طبیعت چل رہی تو یہ نہ صرف غیر عجیب ہی نہیں بلکہ ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ کیوں کہ نماز کو اگر کسی چیز سے جزئی جزئی مطابقت ہے تو وہ صرف جہاد ہی سے ہے اس لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خاص کر نماز میں جہاد کی تشکیلات سوچ لینا کسی بے فکری یا خشوع صلوٰۃ سے اعراض کی دلیل نہیں بلکہ عین صلوٰۃ میں توجہ کی دلیل ہے کہ صلوٰۃ اور جہاد اصولاً ایک دوسرے پر کلیۃً منطبق اور ایک دوسرے سے بالکلیہ متشابہ ہیں پس فاروق اعظم کا مقولہ درحقیقت نماز و جہاد کی ایک مستقل مشابہت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ہمارے عرض کردہ مضمون کی زبردست تائید بلکہ برہان ہے۔

بہرحال اس سے واضح ہوا کہ نماز کے افعال اور حقائق میں پورا نظام سیاست، امام اور امیر ملت کی صحیح پوزیشن، شخصیت اور جمہوریت کی حدود، نصب امام، پھر امام کا مقام پھر قوم کا منصب، سمع وطاعت، امام کے ساتھ تعاون، قومی وحدت۔ اتفاق واتحاد۔ پھر سیاست کا جنگی پروگرام۔ فوج کے جنگی پروگرام، فوج کے جنگی قواعد تشدد اور عدم تشدد، فوج کی صف بندی ویکسانی، پھر اس میں مرکزیت، جنگی مورچے اور ان کا استحکام، جنگ کے آداب، جنگ میں خالص اللہ کے لیے لڑنا، احراز غنیمت دشمن کے ساتھ مناسب حال معاملہ، خلاصہ یہ کہ تعمیری اور تخریبی پروگرام کی ساری ہی اصولی تفصیلات کھپی پڑی ہیں۔ پس اگر ایک شخص اپنی ذاتی اصلاح چاہتا ہے تو بھی اس کا درماں نماز ہی ہے۔ اور اگر ایک شخص نظام سیاست اور نظم مملکت قائم کرنا چاہتا ہے تب بھی اسے ساری راہنمایاں نماز میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں پس نماز ایک طرف تو اللہ سے ملاتی ہے۔ ایک طرف مخلوق سے بھڑاتی ہے ایک طرف انفرادیت اور تبتل سکھاتی ہے اور ایک طرف اجتماعیت تو صل پر لاتی ہے۔ ایک طرف سلم وسلامتی دکھاتی ہے اور ایک طرف حرب وضرب پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک طرف شخصی حالت درست کرتی اور ایک طرف جماعتی ڈسپلین اور نظام قائم کرتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ نماز میں جہاں جمعیت ہے وہاں جامعیت ہے اور جہاں جامعیت ہے وہاں اس میں اجتماعیت بھی ہے۔ جمعیت سے شخصی نفوس قرار پکڑتے ہیں جامعیت سے جماعتی تشکیل ہوتی ہے اور اجتماعیت سے نظام و ڈسپلین قائم ہو کر جماعت باعزت وشوکت بن جاتی ہے۔

اب دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادات اور عادات کا جو مفصل پروگرام سارے اسلام میں پھیلا ہوا ہے وہ سب کا سب تنہا ایک نماز میں سمٹا ہوا موجود ہے۔ پس اگر اسلام اسلام کبیر ہے تو نماز اسلام صغیر ہے، پس نماز خود بذات مکمل اسلام بھی ہے اور پورے اسلام کی میزان الکل بھی ہے کہ اسلام کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں، اقوال کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور اکوان کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور افعال کی اس میں اور اقوال کی اس میں ہیئات کی عبادتیں اس میں ہیں اور اشارات کی اس میں ہیں۔ پھر انسان کی شخصی عادات کا مداوا اس میں ہے اور جماعتی خصائل وشمائل کی اصلاح اس میں۔ خلوت اس میں ہے اور جلوت اس میں تبتل اس میں ہے اور تواصل اس میں۔ صلح اس میں ہے اور جنگ اس میں۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اصولاً نماز میں موجود نہ ہو۔ پس اگر اسلام محض اس لیے دنیا کا ایک جامع ترین مذہب ہے کہ اس میں ہر شعبۂ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ اسلامی مذہب صرف اس لیے اکمل ترین مذہب ہے کہ اس میں جمعیت نفوس جامعیت اقوام اور اجتماعیت نظام کے سارے اسوے موجود ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ نماز کو مستقل اسلام نہ کہا جائے اور کلیۃً اسے پورا دین کہہ کر نہ پکارا جائے کہ یہی سارے سارے شعبہ ہائے حیات اس میں عجیب وغریب کمال تشریع کے ساتھ جمع فرما دیئے گئے ہیں پس اسی کیفیت کے ساتھ نماز گویا ایک تخم ہے پورا اسلام اسی تخم میں سے نکلا ہوا ایک شجرۂ طیبہ ہے۔ جو چیز نماز میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہی سب چیزیں اسلام میں تفصیلی جزئیات کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ پس پورا دین بڑا اسلام ہے اور صرف نماز چھوٹا اسلام ہے یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک ومسلم کے درمیان میں اگر کسی چیز کو فارق فرمایا ہے تو وہ نماز ہے: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ ① ''ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق نماز ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت کے ترک کو آپ نے کفر سے تعبیر نہیں فرمایا، بجز نماز کے۔ ارشاد ہے: مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ. ② ''جو قصداً تارک صلٰوۃ ہوگیا، اس نے کفر کیا''۔ کیوں کہ نماز جب پورے اسلام کی میزان الکل ہے اور بلحاظ حقیقت خود اسلام ہے تو ظاہر ہے کہ اس ترک اسلام کو کفر کے سوا اور کیا لقب دیا جاسکتا تھا، اس لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نماز کا گرا دینا پورے دین ہی کو منہدم کر دینا ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ اَقَامَهَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّیْنَ. ③ ''نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین قائم رکھا اور جس نے اسے منہدم کر دیا اس نے دین کی عمارت منہدم کر دی''۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ ج: ۱ ص: ۲۲۸.

② المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ جعفر ج: ۷ ص: ۲۶۲. ③ شعب الایمان للبیهقی، الحادی والعشرون من شعب الایمان وهو باب فی الصلوٰۃ. علامہ پٹنیؒ امام سخاویؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''الصلوٰۃ عماد الدین فمن ترکها فقد هدم الدین'' البیهقی، ضعیف دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات ج: ۱ ص: ۳۸.

جس کا راز وہی ہے کہ فی الحقیقت پورا اسلام اور جامع عبادات اسلام ہے اس سے یہ لطیف نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب نماز جامع عبادات ہے تو گویا نماز کا ادا کرنا درحقیقت ساری عبادتوں کا اجمالاً ادا کرنا ہے، اور ساتھ ہی تفصیلی ادائیگی کے لیے مستعد ہو جانا ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز ہی کی پرسش ہوگی، اگر نمازیں پوری نکلیں تو فرمایا جائے گا کہ اب دوسری عبادتیں تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نمازیں پوری نہ ہوں تو فرمایا کہ اس کی اور عبادتیں بھی پوری نہ ہونگی لہٰذا سب کی پڑتال اور چھان بین کی جائے۔
اس کا راز بھی وہی ہے کہ نماز میں ساری عبادتوں کے نمونے موجود تھے جب وہ ادھوری رہی تو ساری عبادتیں ادھوری رہیں۔ پس اور ساری عبادتیں نماز کے لحاظ سے جزوی نکلیں اور نماز سب طاعات کے لحاظ سے کلی نکلی کہ یہ سب عبادتیں اس کے دامن میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا ادا کرنا گویا اس سب کا اجمالاً ادا کر دینا ہے اور تفصیلی عمل کے لیے تیار ہو جانا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی وضح ہو گیا کہ تارک نماز گویا ساری ہی عبادتوں کا تارک ہے اور سب سے بڑا ظالم ہے۔ جیسا کہ فاعل صلوٰۃ ساری ہی عبادتوں کا فاعل ہے کہ وہ سب عبادتیں اس میں بھی تھیں اور سب سے بڑا عادل ہے اور شاید اسی لیے نماز کو شغف سے ادا کرتے رہنے سے اور عبادتوں کی ادائیگی کی طرف خود بخود میلان اور رجحان ہوتا ہے کہ آدمی ان کے اجمال کو نماز ہی میں انجام دے لیتا ہے اور گویا ان کا مزہ چکھ لیتا ہے جس سے اسے تفصیلی ادائیگی کا شوق پیدا ہو جانا چاہیے۔ مزید غور کرو تو نماز پڑھنے کی ذاتی خاصیت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اور عبادتیں بھی سہولت سے ادا ہونے لگیں اور تمام حسنات کی توفیق ہو، گویا نماز علاوہ جامع عبادات ہونے کے مفتاح عبادات بھی ہے، اس کے کرنے سے اور طاعات کی ادائیگی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کاموں کو مستمراً چلاتے رہنے کا راز انضباط اوقات میں مضمر ہے یعنی اوقات منضبط کر لینے سے تمام کام بروقت ہوتے رہتے ہیں اگر کسی کے کاموں کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں جب جی میں آیا کر لیا، جہاں یاد آیا انجام دے لیا۔ نہ وقت مقرر، نہ جگہ معین۔ تو قدرتی بات ہے کہ کاموں میں ناغہ بکثرت ہوگا۔
اور ناغہ کی خاصیت ہے کہ بالآخر کام رہ جاتا ہے۔ اور جب ایک کام اپنے وقت سے ٹلا تو دوسرے کاموں پر بھی طبعاً اثر پڑتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے شخص کے سارے ہی کاموں کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور جہاں یہ عملی زندگی منتشر ہوئی وہیں اس کا اثر یہ ہے کہ قلب کا سکون واطمینان جاتا رہتا ہے۔
پس جیسا کہ ضبط اوقات اور نظام عمل کی برکت ہے کہ ہر ایک کام اپنی اپنی جگہ بروقت گویا خود بخود انجام پاتے رہنے سے قلب کو تسکین اور بشاشت وطمانینت حاصل رہتی ہے۔ اب سمجھو کہ نماز کے بارہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۔ (۱) ”نماز مؤمنوں پر ایک باوقت فریضہ ہے“۔ نماز وقت کی عبادت ہے، جس کے لیے زمانہ بھی متعین ہے اور مکان بھی یعنی مسجد، جب ایک شخص کے مہم کے

(۱) پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۱۰۳۔

اوقات جو درحقیقت دن رات میں صرف اوقات نماز ہی ہیں، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، نماز میں مصروف ہو گئے تو علاوہ اس کے کہ اسے پابندیٔ اوقات کی عادت پڑے گی، قدرتی طور پر نمازوں کے درمیان کے اوقات کے کام بھی خود بخود متعین اور منضبط ہو جاویں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ درمیانی کام نیکیوں ہی کے متعین ہوں گے بدیوں کے نہیں، کیوں کہ دو نمازیں نمازی کے قلب کو اس درمیانی فاصلہ کے لیے اتنا منور اور متاثر کر دیتی ہیں کہ اس کی اندرونی رہنمائی عموماً نیک ہی کام کی طرف ہو سکتی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ توقیت نماز سے عین نمازوں ہی کے اوقات نہیں بلکہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی انضباط پیدا ہو جانا ضروری ہے اور یہ کہ یہ اوقات نیکیوں ہی سے بھرپور رہیں گے جس سے واضح ہوا کہ نماز مفتاح طاعات ہے کہ باعث انضباط اوقات ہے۔

پس جبکہ نماز گویا دوسری طاعات کو مستلزم ہے تو اگر اس لحاظ سے بھی قیامت کے دن نمازوں کو مکمل دیکھ کر حکم لگایا جائے کہ اس کی اور عبادتیں درست اور پوری ہیں۔ تو اس میں کیا غیر موزونیت ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ نماز نے ان سب طاعات کو ضبط اوقات اور تنظیم عمل کی وجہ سے سہل الوصول اور بے تکلف معمول بنایا ہوا ہوگا جس سے وہ یقیناً پوری ہی ادا شدہ نکلیں گی۔ بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نمازی آدمی درحقیقت تمام اعمال دین اور تمام اوصاف ایمان کا جامع اور تمام امور دنیا کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے اور تارک نماز ان سب خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے تمام اوصاف، کمال اعمال، اسلام بلکہ اس کے تمام دنیوی امور بھی پراگندہ رہتے ہیں جس سے اس کے قلب میں نہ سکون ہوتا ہے نہ سلامتی، طمانیت، نہ بشاشت اور نہ نورانیت بلکہ وہ ایک مریض قلب ہوتا ہے جس کا علاج ہو تو درست بنے ورنہ ابدی موت مر جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

غرض تعلق مع اللہ کے جتنے شعبے ہیں نماز میں ان سب کی تکمیل ہو جاتی ہے اور عبادت کی تمام انواع اس مختصر اور سہل عبادت کے اندر لپٹ کر خود بخود ادا ہو جاتی ہیں اس لیے نماز کو تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت کا فرد کامل کہنا چاہیے گویا عبادت صرف نماز ہی ہے اور بالذات عبادت ہے۔

پس اس معنی کر بھی عبودیت کا حصر نماز ہی میں نکلا کہ نماز کے سوا اور دوسری عبادتیں محض اضافی عبادتیں ہیں جنہیں امتثال امر نے عبادت بنا دیا ہے ورنہ بذات خود عبادت نہیں اور اس معنی کر بھی عبادت کا انحصار نماز ہی میں نکلتا ہے کہ اس کی ادائیگی سے اور عبادتوں کی تقویم بھی ہوتی ہے اور ساری عبادتیں اسی ایک عبادت کے ذیل میں آ جاتی ہیں، گویا یہ اصل ہے اور سب دوسری اس کی فرع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فروع کے وجود اور ثبوت کا دار و مدار اصل پر ہوتا ہے اس لیے اصلی وجود اصل ہی کا ہوتا ہے نہ کہ فروع کا فروع گویا اصل کے سامنے معدوم اور بے وجود ہوتی ہیں اس لیے بھی عبودیت کا انحصار نماز ہی میں نکلا۔ پس تنہا ایک نماز ہی اس لیے عبادت ہے کہ اور عبادتوں میں عبادت کے معنی ہی نہیں پائے جاتے، صرف اس میں پائے جاتے ہیں اور اس لیے بھی وہی تنہا عبادت ہے کہ

اگر کسی عبادت میں کچھ بھی عبودیت کی شان پائی جاتی ہے تو وہ نماز کی بدولت ہے۔

غرض جو معنی ہوں بہر صورت تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں فردِ کامل اور جوہرِ فرد نماز ہی ثابت ہوتی ہے جس سے معارف الٰہیہ کھل کر ذات وصفات کے کمالات نہ صرف عیاں ہوتے ہیں بلکہ بندے میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں نماز ہی سے نظام ملک وملت درست ہوتا ہے، تمدن کی روح آجاتی ہے یعنی میل ملاپ، تعاون وتناصر اور توارد باہمی پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر تعلق مع النفس کے سلسلہ میں بھی نماز ہی سے نفسانی اخلاق ومقامات درست ہو جاتے ہیں آدمی بہیمہ (جانور) اور شیطان نہیں رہتا بلکہ آدمی بن جاتا ہے۔ پس آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جیسا کہ انسان عالم صغیر تھا کہ اس میں عالم کبیر کے تمام نمونے اور نقشے مجتمع تھے۔ اسی طرح نماز اسلام صغیر ہے جس میں اسلام کبیر کے تمام نمونے اور نقشے جمع ہیں، اگر انسان تکوینیات میں جامع الحقائق تھا تو نماز تشریعیات میں جامع الحقائق ہے۔ اس لیے جامع کا رشتہ جامع ہی سے ہونا چاہیے تھا تو انسان کو منتخب کیا گیا کامل نماز کے لیے اور مسلم انسان کو منتخب کیا گیا، اسلامی نماز کے لیے جو جامع الصلوٰۃ ہے کہ مسلم انسان ہی معرفت میں سب اقوام سے اکمل تھا اور اگلوں پچھلوں کے تمام معارف اسلام کی بدولت اس پر منکشف تھے کہ یہ آخری قوم تھی اور اسلامی نماز تمام اقوام کی نمازوں کو جامع تھی کہ آخری نماز تھی۔

پس مسلم انسان کا اسلامی نماز کے لیے انتخاب کیا جانا امر طبعی تھا تا کہ اس کی ہر ہر تشریعی حقیقت سے نورانیت اور جلا پیدا ہو۔ اور انسانیت کا ہر ہر گوشہ نماز کے ہر ہر گوشہ سے منور ہو جائے، تو پھر جس طرح یہ انسان نماز کی جامعیت کی وجہ سے تشریع کی ہر ہر عبادت کا ادا کنندہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی ذاتی جامعیت کے ہر ہر نورانی پہلو کے سبب تکوین کی ہر ہر حقیقت کے علم کا جامع اور اس سے آشنا ثابت ہوگا۔ یعنی تکوینیات کی تمام حقائق نماز کی وجہ سے اس میں چمک اٹھیں گی، اور جمادات نباتات، حیوانات، سب ہی کی حقیقتیں اس پر پوری طرح کھل جائیں گی تو اس کی باخبری اور علم ومعرفت کے اس وفور سے اس کی فوقیت بھی ان پر ثابت ہوگی اور نمایاں برتری کے سبب اس کی حکومت بھی ان پر قائم ہوگی جس سے خلافت الٰہیہ کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اسی لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، نے تمام محروسہ ہائے اسلامی میں ضابطہ کا فرمان نافذ فرمایا تھا: اِنَّ اَھَمَّ اُمُوْرِ دِیْنِکُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ فَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَلِمَا سِوَاھَا اَضْیَعُ. ''تمہارے دینی امور میں میرے نزدیک سب سے اہم نماز ہے جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسری طاعات کو اس سے زیادہ ضائع کرے گا''۔ گویا ضیاع صلوٰۃ کو ضیاع دین سمجھا، جس سے نماز کی غیر معمولی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام عبادات تو اسلام میں اس طرح نازل ہوئیں کہ کسی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الہام فرمایا گیا۔ کسی عبادت کو وحیٔ ملک کے ذریعہ نازل کر دیا گیا، کسی عبادت کو خواب کے ذریعہ منکشف کیا گیا.... کسی کو دوسروں کے فعل اور حضور تقریری سکوت سے شروع کیا گیا۔ لیکن نماز کی فرضیت کے لیے ان سب سے نرالا اور جدا اور ایک ممتاز طریقہ اختیار فرمایا

گیا اور وہ یہ کہ نماز کی فرضیت کے لیے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اپنے پاس بلا بھیجا۔ شب معراج میں عرش عظیم پر مدعو فرمایا۔ اور پھر انتہائی قرب سے مقرب بنا کر یہ نماز کا ہدیہ عطا فرمایا۔ اور عبادتیں تو خود اوپر سے نیچے اتریں اور اس عبادت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچے سے اوپر اٹھایا گیا۔

اور عبادتوں کی وحی زمین پر ہوئی اور نماز کی وحی آسمانوں سے بھی اوپر ہوئی اور عبادتیں تو بواسطۂ ملائکہ مشروع ہوئیں اور نماز بلا واسطہ خود معبود حقیقی نے بطور شرعی تحفہ عنایت فرمائی۔ اس سے نماز کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ حق تعالیٰ کو اس عبادت کا کس قدر اہتمام ہے جس کا راز وہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع طاعات خود ایک مستقل مذہب اور پورا مجمل اسلام ہے، اس لیے حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ. ”نماز مؤمن کی معراج ہے“۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کوئی تشبیہ و تمثیل نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ نمازی کو نماز میں معراج ہوتی ہے خواہ اسے ابھی فوری احساس ہو جائے اگر وہ کاملین میں سے ہے یا بعد مرگ احساس ہو اگر ناقص ہے۔ مگر معراج بہر حال ہر ایک نمازی کو نصیب ہوتی ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ساتھ ہی بایں معنی بھی معراج ہونا واضح ہے کہ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو برکات اور روحانی سربلندیاں عطا ہوئی ہیں ان کا خلاصہ تین چیزیں ہیں۔ ایک مشاہدۂ حق جیسا کہ قرآن نے کہا: مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (۱) (قلب نے جو کچھ دیکھا وہ اس میں جھوٹا نہیں تھا) دوسرے قرب انتہائی۔ قرب کا ارشاد ہے: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی . (۲) تیسرے مکالمۂ حق۔ چنانچہ التحیات میں اسی مکالمہ کی حکایت کی جاتی ہے جو تشہد میں ابد الدھر تک دہرایا جائے گا۔

اگر باخبری سے کام تو سرور کائنات علیہ افضل التحیات والتسلیمات کی جوتیوں کے طفیل میں ہر نمازی مسلمان کو یہ تینوں مقامات دن میں پانچ مرتبہ نماز میں عطا ہوتے ہیں۔ اول مشاہدہ، تو حدیث میں ارشاد ہے کہ بحالت قیام بندہ کی نظر اللہ کے چہرہ پر ہوتی ہے جیسا بھی چہرہ اس کی شان کے مناسب ہے۔

دوم قرب کی انتہاء ہو جاتی ہے کہ بنص حدیث اللہ کے قدموں پر بندہ کا سر پڑا ہوتا ہے۔ جیسے بھی قدم اس کی شان کے مناسب ہیں۔

سوم کلام، تو وہ ہر رکعت میں میسر ہوتا ہے کیوں کہ ہر رکعت میں فاتحہ لازم ہے اور فاتحہ کے بارے میں حدیث میں صریح ارشاد ہے۔ کہ اس کے ایک ہر جملہ کا جواب اللہ کی طرف سے ہاتھ در ہاتھ دیا جاتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وہ فوراً فرماتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فوراً فرماتے ہیں اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ ، بندہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو وہ فوراً فرماتے مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو وہ فوراً فرماتے ہیں ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (الی آخر السورۃ) تو فرماتے ہیں ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ. نیز یوں بھی نماز میں قرآن کی تلاوت فرض ہے۔ اور

(۱) پارہ ۲۷، سورۃ: النجم الآیۃ ۱۱ (۲) پارہ ۲۷ سورہ النجم الآیۃ ۸، ۹

تلاوت قرآن بنص حدیث اللہ سے ہمکلام ہونا ہے۔

پس جبکہ نماز میں بھی قرب انتہائی ہے، مشاہدہ بھی حقیقی ہے اور کلام بھی منہ در منہ اور یہی تین چیزیں معراج کی روحیں تھیں تو پھر نماز کو مؤمن کی معراج فرمانا محض تشبیہ واستعارہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ جب کہ معراج کی سب حقیقتیں واقعیت کے ساتھ نماز میں موجود ہیں جس کو اہل مشاہدہ تو دنیا ہی میں محسوس کر لیتے ہیں اور اہل مراقبہ معرفت کے درجہ میں پہچان لیتے ہیں اور اہل مجاہدہ ایمان رکھتے ہیں جن کے مشاہدہ کا وقت مجاہدۂ موت کے بعد آتا ہے۔

اس وقت انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حقیقتاً ہم نے دنیا میں بسلسلۂ نماز اللہ سے کلام بھی کیا تھا جس کا حظ ہم میں اب راسخ نظر آ رہا ہے۔ اس کا قرب بھی ہمیں انتہائی ہوا تھا۔ جس کی ٹھنڈک ہم اب محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی ہم کرتے تھے جس کا انس اس وقت ہم میں رچا ہوا ہے اور اب ہم اس معرفت بلکہ استحضار پر ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کی تجلیات ہمارے سامنے آ جائیں تو ہم فوراً پہچان لیں گے کہ یہ وہی تجلی ہے جو روزانہ ہماری روحوں پر کھلا کرتی تھی اور ہم اس سے وابستہ ہوتے تھے۔ چنانچہ حدیث حشر سے واضح ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ایک خاص صورت سے متجلی ہوں گے اور فرمائیں گے انا الرحمٰن (میں رحمٰن ہوں) تو یہ سب کہہ دیں گے کہ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْکَ) ہم اللہ کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتے ہیں) پھر (یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ) کے وعدہ کے مطابق پنڈلی والی تجلی منکشف ہوگی تو سب سجدہ میں گر پڑیں گے اور اس کے رحمٰن ہونے کا اعتراف کریں گے اس سے واضح ہے کہ کوئی نہ کوئی جلوہ حق ان کا متعارف اور پہچانا ہوا ہوگا۔ جب ہی تو ایک جلوہ سے وحشت اور ایک سے انس کا اظہار کریں گے، پنڈلی والے جلوہ کو سب پہچان جائیں گے اور سب سجدہ میں گر جائیں گے۔ شاید یہ پنڈلی کی تجلی وہی ہو جس کے نچلے حصے (قدم) پر یہ لوگ سجدہ میں روزانہ سر دھرا کرتے تھے اور ان کا سر اللہ کے قدموں پر پڑتا تھا۔ اسی لیے اسے ہر شخص پہچان لے گا کہ عادتاً روزانہ اسی تجلی کے سامنے سربسجود ہوا کرتا تھا اور اس تجلی سے روح نے کافی مناسبت پیدا کر لی تھی..... خلاصہ یہ کہ عوام الناس اگر قدم الٰہی کا یہاں مشاہدہ نہیں کر سکتے تو یہ بھی نہیں کہ وہ اس قدم اور ساق کو بالکل پہچانتے ہی نہیں ہیں۔

اسی پر مکالمۂ الٰہی اور قرب حق کو بھی قیاس کر لیجئے۔ غرض یہ نماز میں مکالمۂ حق اور یہ انتہائی قرب اور یہ مشاہدۂ تجلی قدم کوئی استعارۂ و تشبیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے اور یہی تین چیزیں معراج کی روح ہیں اس لیے ہر مؤمن کو حقیقتاً روزانہ پانچ مرتبہ نماز میں معراج ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک لطیفہ یہ بھی کھلا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ مراتب عبودیت سب ختم تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد کامل تھے اور عبدیت وتواضع للہ ہی میں رفعت وسر بلند ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بقدر عبدیت ہی رفعت دی گئی۔ یعنی عبدیت انتہائی تھی تو رفعت بھی انتہائی عطا ہوئی۔ جسے معراج کہتے ہیں۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش تک رسائی میسر ہوئی اور پھر اس معراج میں نماز کا ہدیہ عطا ہوا۔ تو اس سے واضح ہوا

کہ نماز کو کچھ عروج ومعراج ورفعت اور بلندی سے کافی ربط ومناسبت ہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ جب مطلقاً تواضع اور عبدیت کے لیے رفعت کا ثمرہ ہے اور رفعت وبلندی بقدر تذلل وپستی ملتی ہے تو نماز میں تو آدمی اپنی ذلت کی انتہا کر دیتا ہے، اس لیے نماز کے ذریعہ رفعت کی بھی انتہا ہونی چاہیے۔ اس لیے اگر مطلق تواضع وعبدیت سے مطلقاً رفعت ملتی ہے تو نماز جیسی انتہائی تواضع وعبدیت سے رفعت بھی انتہائی ملنی چاہیے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس جبکہ تذلل للہ میں انتہائی درجہ رکھتی تھی تو معراج بھی انتہائی ہوئی اور اوپر سے نماز میسر ہوئی تاکہ تذلل للہ اور بڑھتا جائے تو مقامات رفعت وعروج بھی اور ترقی کرتے جائیں، اس سے واضح ہوا کہ نماز کی ابتداء میں بھی عروج ومعراج ہے۔ اور انتہاء میں بھی عروج ومعراج ہے اور نماز کو دوطرفہ معراجوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس بناء پر اگر بقدر قابلیت واستعداد ہر مسلمان کو نماز میں عروج نصیب ہو اور روحانی طور پر نماز میں اسے معراج نصیب ہوا کرے تو یہ نماز کا ایک طبعی خاصہ اور ناقابل تعجب بات ہوگی۔

چنانچہ اس حقیقت کو کسی قدر صاف لفظوں میں حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نماز کو دو طرفہ عروج ومعراج سے نہ صرف مناسبت ہی ہے بلکہ اس کا اثر ہی معراج ہے اور نہ صرف پیغمبر ہی کے لیے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل میں ہر ایک نمازی مسلمان کے لیے۔ پھر نماز کو اس سے نرالے ڈھنگ سے فرض کر دیئے جانے کے بعد نماز کا عملی اسوہ قائم کرنے کا بھی نرالا ہی ڈھنگ یہ اختیار کیا گیا کہ ہر عبادت فرض ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب منور کی رہنمائی اور حق تعالیٰ کے الہام سے اس کا عملی نمونہ خود قائم فرمایا اور امت کو وہ عبادت کر کے دکھلا دی تاکہ دنیا اس کی عملی شکل کو پہچان لے اور اس کے عملی گوشوں کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے سمجھ لے۔ لیکن نماز کے بارہ میں یہ صورت کافی نہیں سمجھی گئی، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی نماز کا ایک نمونہ لا کر رکھا گیا تاکہ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملاً سمجھا تھا ویسے ہی رجال غیب کے عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہر ہر گوشۂ عمل کو محفوظ فرمالیں اور اس میں کسی ادنیٰ لغزش کا احتمال نہ رہے۔

چنانچہ کسی عبادت کو کر کے دکھلانے کے لیے فرشتے نہیں بھیجے گئے لیکن نماز کی عبادت کو کر کے دکھلانے نیز اس کے اوقات کی تحدید کرنے کے لیے سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دو دن تک دنیا میں بھیجا گیا جنہوں نے اوقات نماز کی تشخیص کے لیے اس کے اوقات کا اول وآخر عملاً متشخص کر کے دکھلایا۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی تفاصیل موجود ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ عند اللہ اس عبادت کی کس درجہ اہمیت تھی، گویا حضرت جبرئیلؑ پورے اسلام کا تو وحی کے ذریعہ محض علم ہی لے کر دنیا میں آئے مگر نماز کا پورا عمل اور پورے اوقات کی تحدیدات بھی دے کر بھیجے گئے کہ اس کا علم براہ راست حق تعالیٰ نے شب معراج میں عطا فرما دیا تھا اس کو لے کر آنے کی ضرورت ہی نہ تھی جس سے نماز کا اہتمام شان واضح ہے کہ تعلیم اس کی براہ راست حق تعالیٰ دیں بیت نبوت میں نہیں بلکہ اپنے گھر عرش پر بلا کر دیں۔ اور عمل

اس کا سید المقربین جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ بھیجیں، ظاہر ہے کہ ایسی عبادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس درجہ تک وجہ تسلی ہوسکتی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلٰوةِ. ① ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے''۔ اور اس لیے صرف نمازی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر کوئی شخص دن میں پانچ مرتبہ نہر میں غسل کرے جو اس کے دروازے کے سامنے بہ رہی ہو تو کیا اس کے بدن پر میل کچیل باقی رہ سکتا ہے؟ عرض کیا گیا، ہرگز نہیں! فرمایا کہ نماز درحقیقت روحانی غسل ہے جو دن میں پانچ مرتبہ ہوتا ہے تو اس کے بعد روح میں معاصی کا میل کچیل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا کہ: اَلصَّلٰوةُ اِلَى الصَّلٰوةِ كَفَّارَةٌ .... ② ایک نماز دوسری نماز تک کے درمیانی گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

اور جبکہ یہ نماز اس درجہ کی اہم عبادت تھی کہ اس کے سلسلہ میں براہ راست حق تعالیٰ کا یہ اہتمام، ملائکہ کی مساعی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عروج اور اس کے علم وعمل دونوں کے لیے دوڑ دھوپ ہوئی۔ وہ اسلام کا مرکزی نقطہ تھی اور بلاشبہ تھی کہ اسلام کا موضوع عبادت ہے اور عبادات کا فرد کامل نماز ہے۔ تو پھر ضرور تھا کہ اس مرکزی نقطہ کے لیے اسلام کا کوئی حسی مرکز قائم ہو جو پورے اسلام کا حسی شعار ہو۔ جیسا کہ نماز اس کا عملی شعار ہے۔ تو یہیں سے کعبہ کی بنیاد نماز ہی کے لیے رکھی گئی جس کا نام مسجد حرام ہے۔ مسجد کے معنی سجدہ گاہ کے ہیں اور سجدہ مکان کا اصل مقصود ہے اس لیے مسجد حرام بیت اللہ کی بنیاد فی الحقیقت نماز ہی کے لیے ڈالی گئی اگر اس کے اردگرد طواف ہوتا ہے تو طواف میں بھی یہ اہمیت اسی لیے آئی ہے کہ وہ حکم میں نماز کے ہے، چنانچہ حدیث میں صراحتہً فرمایا گیا ہے کہ طواف بھی حکماً نماز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس حکمی نماز میں سلام وکلام جائز ہے، اصل صلوٰۃ میں جائز نہیں۔

بہر حال بیت اللہ کی بنیاد کی غرض وغایت اگر طواف کو بھی رکھا جائے تو وہ بھی چونکہ حکماً صلوٰۃ ہی ہے۔ اس لیے اس کے واسطہ سے بھی مسجد حرام کی بنیاد نماز ہی کے لیے رہتی ہے۔ غرض اس مرکزی عمل کے لیے جگہ بھی مرکزی بنائی گئی ہے کہ جیسے نماز کی طرف ہر ہر مخلوق کا رجوع ہے۔ ایسے ہی نماز حقیقی وحکمی کی خاطر اس بیت عتیق کی طرف بھی سارے ہی عالم کا رجوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کر کے اس کے اردگرد اپنی اولاد کو آباد کرنے کی غرض وغایت صرف نماز ظاہر فرمائی ہے۔ اور صرف نماز ہی کے ذریعہ سے اولاد کی مقبولیت چاہی جس کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نقل فرما دیا ہے۔ ارشاد حق ہے: رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ اِلَيْهِمْ ③ ''اور آخر میں پھر

① المعجم الصغير للطبراني، باب الفاء، من اسمه الفضل ج: ۲ ص: ۳۷۲.

② مسند احمد، مسند ابی هريرةؓ ج: ۲۱ ص: ۲۱۵. ③ پاره: ۱۳، سورة: ابراهيم، الآية: ۳۷.

مستقلاً جو دعا کی ہے وہ صرف یہی ہے کہ مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنا دیا جائے''۔

غرض ابوالانبیاء سے لے کر خاتم الانبیاء علیہ السلام تک اور جبرئیل علیہ السلام سے لے کر عام فرشتوں تک نماز کا ایک خاص اہتمام نظر آتا ہے۔نماز کے لیے مساجد کی تعمیر الگ ہو رہی ہے۔نماز کے لیے شہر الگ بنائے جارہے ہیں،نماز کے لیے انبیاء علیہ السلام التجائیں کرر ہے ہیں۔

غرض دین کا اول وآخر اور عالم کا مقصود واحد نماز ہی نماز نظر آتی ہے۔اور تو اور انتہائی بات یہ ہے کہ نماز سے حق تعالی نے بھی اپنے کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔یہ الگ چیز ہے کہ اس کی صلوٰۃ کے معنی عیاذاً باللہ تذلل کے نہیں ہیں کہ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر احتیاج وذلت سے منزہ ومقدس ہے،وہاں صلوٰۃ کے معنی انزال رحمت ہی کے ہو سکتے ہیں اور ہیں۔لیکن بہر حال عنوان ہی کے درجہ میں سہی،اللہ نے اپنے کو صائم یا مزکی یا حاجی نہیں فرمایا مگر مصلّی ضرور فرمایا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ارشاد ربانی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [1] خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جامعیت انتہائی ہے جمعیت بھی اعلیٰ ترین ہے اور اجتماعیت بھی فوق العادت ہے اور اس لیے اس میں تہذیب نفس بھی اکمل ترین ہے۔تدبیر منزل کے اصول بھی بہترین انداز سے جمع ہیں اور سیاست مدن کے قواعد ومقاصد بھی انتہائی کمال کے ساتھ جمع ہیں جس سے آدمی مہذب بن کر اپنی خانگی اور شہری زندگی کا نظام درست کرنے کے قابل ہو جاتا ہے،خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی عبادات ادا کرنے سے انسان میں تہذیب نفس کے ذریعہ خدائی کمالات اجاگر ہوتے ہیں اور وہ خدا کے ان کمالاتی نمونوں کی وجہ سے اس قابل بنتا ہے کہ جو کام خدا کا اپنی مخلوق کے ساتھ یعنی ان پر رحم وکرم اور شفقت کر کے ان کا دینی ودنیوی نظم درست فرمانا اور ان کی ظاہری وباطنی اور مادی وروحانی تربیت کر کے انہیں حد کمال پر پہنچانا۔وہی کام ان خدائی نمونوں کے جامع ہونے کی حیثیت سے انسان کا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ خود صالح بن کر دوسروں کو صالح بنائے ان کا نظام تہذیب وتمدن درست کرے اور ان پر قانون الٰہی کا کنٹرول کرے،انہیں خدائی حکومت کی وفادار رعایا بنائے اور اس کی شہنشاہی کا ڈنکا دنیا میں بجادے۔جس سے واضح ہوا کہ نماز ہی کے ذریعہ آدمی عبادت الٰہی کا فریضہ بھی ادا کرسکتا ہے اور نماز ہی کے ذریعہ آدمی خلافت الٰہی کا مقصد بھی پورا کرسکتا ہے،قرن اول اس صلاح واصلاح کو لے کر اٹھا جو نماز کی برکت سے ان میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے فقیری میں بادشاہتیں کیں اور بادشاہتوں میں فقیری کی شانیں دکھائیں۔یعنی بادشاہتوں کے وقت تو ان کی نماز سے پیدا شدہ تواضع نہیں جاتی تھی اور تواضع وغنائے نفس کے وقت ان کی نماز سے پیدا شدہ اجتماعیت اور تنظیم ملت فنا نہیں ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور کندھے پر پانی کی مشک ہے اور رعایا کے گھر میں پانی بھرتے پھر

[1] پارہ: ۲۲،سورۃ: الاحزاب، الآیۃ: ۴۳.

رہے ہیں۔ عرض کیا گیا کہ امیر المؤمنین بیت المال کے کسی خادم کو حکم فرما دیتے۔ فرمایا کہ کل روم کا سفیر میرے پاس آیا تھا اور وہ مجھ سے مرعوب ہوا جس سے میرے نفس میں ایک قسم کا عجب اور خود پسندی کا نزعہ پیدا ہوا، اس کا علاج کرتا پھر رہا ہوں، دیکھ جو کہ وہ مسند خلافت پر بھی ہیں مگر خوئے عبادت اور تواضع نفس دامن کی ساتھ ساتھ ہے۔ ایک دن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شب میں گشت کر رہے تھے تا کہ رعیت کے احوال سے باخبر ہوں۔ سڑک پر ایک مکان میں سے گنگنانے کی آواز آئی کہ کوئی عورت یہ شعر پڑھ رہی ہے:

فَوَاللّٰہِ لَوْ لَا اللّٰہُ تُخْشٰی عَوَاقِبُہٗ ۔۔۔ لَزُحْزِحَ عَنْ ھٰذَا السَّرِیْرِ جَوَانِبُہٗ

خدا کی قسم! اگر اللہ کے عذاب کا ڈر نہ ہوتا تو آج اس چارپائی کی چول چول ڈھیلی ہو جاتی یعنی میں کسی کے ساتھ اس چارپائی پر ہم بستری میں مشغول ہوتی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ بے باکانہ شعر سن کر غضبناک ہوئے۔ اور جوش ایمان میں ایک دم بند مکان میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور زور سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قسم کا فحش اور ممنوع شعر پڑھ رہا ہے؟ وہ عورت گھبرا گئی مگر جرأت کے ساتھ بولی کہ امیر المؤمنین! آپ مجھے تو کہہ رہے ہیں کہ میں نے خلاف شریعت اقدام کیا لیکن آپ خود اپنے کو نہیں دیکھتے کہ اس وقت کھڑے کھڑے تین باتیں خلاف شریعت کی ہیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور فرمایا، میں نے کیا کیا؟ اس نے کہا سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہے: (غالبًا یہ دو واقعے مخلوط ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر کا مکان میں گھسنے کا واقعہ کسی اور شخص کے ساتھ پیش آیا تھا، دیکھئے حیاۃ الصحابہ)

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَھْلِھَا ①

آپ نے نہ استیذان کیا نہ سلام کر کے ہی گھر میں داخل ہوئے) دوسری بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ② اور آپ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوئے آپ کو اس کا کیا حق تھا، تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَلَا تَجَسَّسُوْا ③ اور آپ نے گھر میں گھس کر خصوصی طور پر اسرار کا تجسس کیا۔ اور ایک گھر میں پڑی ہوئی عورت کے مخفی احوال پر مطلع ہونا چاہا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہیں کھڑے کھڑے رو پڑے اور اس عورت سے معافی چاہی، واپس ہوئے اور تمام رات استغفار میں مشغول رہے، صبح ہوتے ہی اس عورت کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ اب بحیثیت امیر المؤمنین کے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ شعر تو نے کیوں پڑھا، جس سے بے حیائی کی بو آ رہی تھی؟ اس نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین میں نوجوان ہوں اور شادی کو ابھی ایک ماہ گزرا ہے۔ میرا خاوند آپ کی فوج میں جہاد پر گیا ہوا ہے۔ اپنے جوش جوانی اور اس کے فراق میں بے ساختہ یہ اشعار زبان پر جاری تھے۔ ورنہ الحمد للہ زنا اور بدکاری سے پاک ہوں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اپنی بیوی سے جا کر پوچھا کہ جوان عورت خاوند سے کتنے دن صبر کر سکتی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تین ماہ، اسی وقت امیر المؤمنین نے حکم فرمایا کہ فوج میں

① پارہ: ۱۸، سورۃ: النور، الآیۃ: ۲۷. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ: الآیۃ: ۱۸۹. ③ پارہ: ۲۶، سورۃ: الحجرات، الآیۃ: ۱۲.

کوئی شخص تین ماہ سے زائد نہ روکا جائے، تین ماہ ہوتے ہی اسے رخصت دی جائے اوراس کی جگہ دوسرا پہنچ جائے۔

اس واقعہ سے یہ واضح ہے کہ ان پاک باز افراد اور مقدس حضرات کے ہاتھوں امارت وخلافت کے فرائض بھی انجام پارہے ہیں کہ رعایا کی تربیت اور ان کے اخلاق کی نگہداشت خود امیر المؤمنین راتوں رات گھوم کر فرمارہے ہیں جو اجتماعی زندگی کا راس المال ہے کہ ایک غریب عورت تک پر شفقت ایسی ہی مبذول ہے جیسے قوم کے ایک بڑے سے بڑے فرد پر ہوسکتی تھی، جس سے شفقت علی الخلق واضح ہے مگر ساتھ ہی عبدیت کا عالم یہ ہے کہ اسی عورت کے ڈانٹنے پر رو بھی رہے ہیں اوراس سے معافی چاہ رہے ہیں۔اور معذرت کر کے رخصت ہورہے ہیں جو جامعیت احوال کی انتہاء ہے کہ نہ دوسروں کو بھول رہے ہیں نہ اپنے کو اور حالت مقتضا کا حق ادا کررہے ہیں۔ پھر عبادت کا یہ عالم ہے کہ پوری رات کھڑے ہوکر استغفار اور توبہ میں مصروف ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی تین نافرمانیاں کیں۔حالانکہ وہ عصیان نہ تھا۔اور فرائض کے سلسلہ میں امیر کو تفتیش اسرار کا حق حاصل ہے جبکہ صلاحِ خلق پیش نظر ہو، مگر اپنے بلند مراتب کے لحاظ سے اسے گناہ ہی سمجھ رہے۔اور رات بھر توبہ وزاری میں بھی مصروف ہیں جو جمعیت خاطر کا اعلیٰ مقام ہے۔پس اجتماعیت اور جمعیت تینوں مقامات ایک دم موجود اور زیر عمل ہیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ کیفیت اسی تعلق مع اللہ نے پیدا کی تھی جس کا مظہر اتم نماز تھا، چنانچہ ان کی ابتداء نماز ہی سے ہوتی ہے اور تمام تمام رات نماز میں رہ کر انہوں نے اپنے صالح نفوس کو مانجھا اور صاف کیا تھا۔

بہر حال نماز کی جامعیت دیکھو تو تمام احوال بشری کے مناسب اس میں شرعی حقائق کا اجتماع ہے اور اجتماعیت کو دیکھو تو ہر قسم کے معاملات باہمی کی اصلاح کے اصول اس میں موجود ہیں اور جمعیت کو دیکھو تو اس سے زیادہ دلوں کے گوشوں کو سکون وطمانیت اور حقائق کائنات اور حقائق الٰہیات کے علم ومعرفت سے بھر دینے والی چیز دوسری نہیں ہے۔جس سے آدم زاد کی عبادت ونیابت دونوں مکمل ہوجاتی ہیں جو اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہے اور ان ہی تینوں مقامات جامعیت، اجتماعیت اور جمعیت اور پھر ان کے دوموالید عبادت ونیابت کی یہ شرح ہے جو تفصیل وار عرض کی گئی ہے۔

یہی ہے نماز کی وہ حقیقت جس کو آپ فلسفہ کے عنوان سے سننا چاہتے تھے لیکن کیا حقیقتاً فلسفہ ہمیں ان حقائق تک پہنچا سکتا ہے؟ کبھی نہیں! فلسفیت نژاد عمل کی رسائی ان امور تک کبھی نہیں ہوسکتی کہ یہ عقل کی پرواز ہی سے بالا چیزیں ہیں۔اسی لیے کسی فلسفی کے کلام میں آپ اس قسم کے معارف آلٰہیہ ملاحظہ نہیں کرسکتے۔یہ چیزیں محض انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت، ان پر ایمان لانے کے طفیل اور وحی کے اتباع سے میسر آسکتی ہے۔کیوں کہ یہ معرفت کی چیزیں ہیں تعقل کی چیزیں نہیں۔ان کا دائرہ عقلیات کا دائرہ نہیں بلکہ وجدانیات کا دائرہ ہے جو سمعیات سے پیدا ہوتی ہیں۔میں کوئی چیز نہیں ہوں۔کہاں میں اور کہاں علمی حقائق۔یہ محض اپنے بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ اس موضوع کے چار حرف زبان پر آگئے اور انہی کے کلام وفیض کا طفیل ہے کہ ہماری زبان کو

کچھ رسائی مل گئی اور ذہن کو کچھ راستہ ہاتھ آ گیا؟ فَلِلّٰهِ دَرُّهُمْ .

ہاں پھر نماز کے یہ تمام مقامات بندہ میں کب آتے ہیں جبکہ وہ ذکر اللہ اور یادِ حق کی خاطر نماز ادا کرے اور اس کے جزو جزو میں ذکر اللہ رچا ہوا ہو ورنہ اگر ذکر کی بجائے غفلت ہو تو پھر نہ جمعیت آ سکتی ہے نہ جامعیت نہ اجتماعیت، بلکہ غفلت اور قساوت بڑھ جاتی ہے اور غفلت آمیز نماز منہ پر مار دینے کے قابل ہو جاتی ہے چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''بعض نماز پڑھنے والے نماز سے پورا حصہ لے کر لوٹتے ہیں، بعض نصف، بعض پاؤ اور بعض خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں، انہیں کچھ بھی نہیں ملتا، اور وہی ہیں جنہوں نے ذکر کے بجائے غفلت کو نماز میں لحاف کی طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا اور فرش کی طرح بچھا لیا ہو'' اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل فلسفہ اور حقیقت وغایت ذکر اللہ ہے، پھر ذکر اللہ کی برکت سے یہ تینوں مقامات مذکورہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان تینوں مقامات ہی سے عبادت وخلافت کے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس لیے شروع میں میں نے یہ آیت پڑھی وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ① (نماز قائم کرو میری یاد کے لیے) جس سے ذکر اللہ کا روحِ صلوٰۃ، حقیقتِ صلوٰۃ، منشائے برکاتِ صلوٰۃ۔ اور مرکزِ آثارِ صلوٰۃ ہونا واضح ہو جاتا ہے مگر یہ ذکر اللہ کی روح نماز میں کب پیدا ہوتی ہے؟ اس وقت جبکہ نماز کو اس کی حقیقی ہیئت وکیفیت کے ساتھ ادا کی جائے۔ اس کے آداب وشروط اور سنن وواجبات کی کما حقہ رعایت کی جائے۔ یہ چیز محض فعلِ صلوٰۃ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اقامت کے معنی نماز کو درست کر کے پڑھنے کے ہیں۔ اور درستی کی حقیقت وہی استیفاء شروط اور اقامت حدود ہے، اسی لیے قرآن حکیم نے آیت مذکورہ میں یوں نہیں فرمایا کہ صَلِّ لِذِكْرِىْ بلکہ فرمایا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ جس کا حاصل وہی ہے کہ نماز میں ٹکریں مت مارو، بلکہ اس کے آداب وسنن اور واجبات وفرائض کا حق ادا کرو۔ اس کے سنن ومستحبات کی رعایت کر کے پڑھو، تاکہ اس کے حقیقی ثمرات اس پر مرتب ہوں، پس خلاصہ یہ نکلا کہ اقامتِ صلوٰۃ پر ذکر اللہ موقوف ہے اور ذکر اللہ پر یہ تین مقامات معلق ہیں، اور ان تین مقامات پر خلقتِ آدمؑ کے دو مقاصد عبادت وخلافت مبنی۔ اگر اقامتِ صلوٰۃ نہیں اور اس میں ذکر اللہ نہیں تو جمعیت جامعیت اجتماعیت کچھ بھی نہیں اور جب یہ تینوں چیزیں نہیں تو عبادت وخلافت نہیں۔ اس لیے نماز کی اصل اساس جس پر اس کی یہ ساری عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے، جو پورے اسلام کے ہم پلّہ ہے محض ذکر اللہ ہے۔ اگر فی الحقیقت نماز اس روح کو لیے ہوئے ادا ہو تو اس کا اثر اس لیے ہم پر ہی نہیں غیر اقوام پر بھی پڑتا ہے، میں نے ایک ہندو سے کہا کہ میاں تم لوگ مساجد کے سامنے باجہ وغیرہ پر مسلمانوں سے لڑتے ہو اور چاہتے ہو کہ مساجد کے آگے باجے زور شور کے ساتھ لے جاؤ کیا تم اس معقول بات کو نہیں سمجھتے کہ نماز عبادتِ الٰہی ہے مخلوق کو ستانا نہیں ہے؟ پھر کیوں اس پاک چیز کو تم نے جھگڑے اور فساد کا حیلہ بنا رکھا ہے؟ اس کی تو حرمت ہر مذہبی انسان کو کرنی چاہئے۔ اس نے جواب دیا کہ میں کٹ گیا اور ندامت سے بجز

① پارہ: ۲۰، سورۃ: طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴.

سکوت اختیار کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا۔اس ہندو نے کہا کہ مولوی صاحب نمازی رہے کہاں ہیں اگر سچی نمازیں پڑھنے والے ہوں تو ہمارے گھر بھی ان کے لیے حاضر ہیں۔اور کس کی مجال ہے کہ بے حرمتی کر سکے مگر اب تو ہر چیز سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے رہ گئے ہیں۔دین سے اللہ کے نام سے،نماز کے اسم سے،اسلام کے لفظ سے اپنی اغراض پورے کرنے والے رہ گئے ہیں اس لیے دوسری قوموں کا معاملہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی ہو گیا جیسے وہ ہیں۔حقیقتاً اس نے صحیح جواب دیا اور مجھے ساکت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں پڑا،اگر سچی نماز والے سچے مسلمان ہوں تو اللہ اکبر! غیر اقوام تک پر رعب پڑتا ہے۔جب کہ نماز شیاطین کو پسپا کر دیتی ہے اور ان سے جنگ کرتی ہے۔تو شیاطین الانس کی اس کے سامنے کیا حقیقت ہے کہ وہ ٹھہر سکیں،یا مرعوب نہ ہوں؟

کلکتہ کے گول میدان میں جب عید کی نماز ہوتی ہے اور غالباً بارہ لاکھ آدمی جمع ہو کر ایک امام کے پیچھے اقتداء کرتے ہیں،تو یہ منظر دیکھنے کے لیے اکثر غیر مسلم بھی جمع ہوتے ہیں۔ایک مرتبہ ان تماش بینوں میں مسز سروجنی نائیڈو بھی آئی جو اس وقت کے لیڈروں میں شمار ہوتی ہے۔وہ یہ منظر دیکھ کر حیران تھی اس نے کہا کہ یہ ڈسپلن اور یہ نظام کہ لاکھوں کی مرتبہ صفیں صرف ایک لیڈر کی آواز پر حرکت کر رہی ہیں؟ کیا ٹھکانہ ہے اس نظم کا؟ یہ نظم آج کسی قوم کو بھی میسر نہیں جو مسلمانوں کو مذہباً میسر ہے۔سو یہی حقیقت ہے کہ اس صورت صلوٰۃ میں رعب اندازی کے آثار ہیں اگر کہیں اقامت صلوٰۃ میسر ہو جائے جس کی روح ذکر اللہ ہو اور مسلمانوں کا اتنا عدد ہو تو کیا دنیا کا نقشہ یہی رہ سکتا ہے جو آج ہے؟

پس میرے خیال میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے صرف ایک نماز اور اس کی یہ عرض کردہ حقیقت وخصوصیت ہی کافی ہے۔اور غیروں میں بھی کوئی منصف مزاج انسان ہو تو وہ اس اعتراف کے سوا چارہ نہ دیکھے گا۔کہ یہ عبادت یقیناً منجانب اللہ ہے۔جس میں اس قسم کی رعائتیں رکھی گئی ہیں کہ کسی انسان کی عقل انہیں کبھی تجویز نہیں کر سکتی۔اور متفرق طریق پر کچھ کر بھی سکے گی تو سہل ممتنع کے طور پر اس مختصر سے عمل میں ان سب کو جمع کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔کوئی بھی انسان خواہ وہ کیسا ہی فلسفی ہو اپنی کسی مجوزہ اسکیم میں اتنی لامحدود رعائتیں نہیں رکھ سکتا کہ جن میں دین،دنیا،اخلاق،معاشرت،عبادت،عادت،خلوت،انفراز سیاست،حکومت،صلاح واصلاح،اعلاء کلمۃ اللہ اور اسفال کلمۂ کفر۔سب ہی چیزیں بیک آن جمع ہیں۔اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نماز باجماعت کو دانتوں سے پکڑ لیں۔کہ اس سے ان شاء اللہ فتن ان کے پاس کھڑے نہ رہیں گے،اور اسی سے پورے اسلام میں گھس جانے کا انہیں راستہ مل جائے گا۔بس اب میں دعائے توفیق پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ .وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ .

محمد طیبؒ غفرلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔۲۱ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ

آدابِ نماز ماخوذ از تبلیغِ دین

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میری یاد کے لیے نماز قائم کرو'' اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''نماز دین کا ستون ہے'' خوب سمجھ لو کہ تم نماز میں اپنے پروردگار سے باتیں کرتے ہو۔ لہٰذا دیکھ لیا کرو کہ نماز کیسی پڑھ رہے ہو۔ اور چونکہ اللہ پاک نے اقامۃ صلوٰۃ یعنی نماز کے درست کرنے کا حکم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور نماز کے متعلق تمام ضرورتوں کی پوری رعایت کرو، لہٰذا نماز میں ان تینوں باتوں کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اول: نماز سے پہلے وضو کی نگہداشت کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو میں جس قدر سنتیں اور مستحبات ہیں ان کو بجالاؤ اور ہر عضو کے دھونے کے وقت وہ دعا پڑھو جو حدیث میں آئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کپڑوں کا اور وضو کے پانی کا خیال رکھو کہ دونوں پاک ہوں۔ لیکن اس میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ وسواس تک نوبت پہنچ جائے کیوں کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان اکثر عبادت کرنے والے نیک بندوں کے اوقات شش و پنج میں ضائع کرتا ہے۔

وضو کرنے اور کپڑوں کی طہارت میں ایک عجیب حکمت...... جاننا چاہیے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کا چھلکا اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری اور مغز۔

ظاہر مقصود مغز ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس ظاہری پاکی سے بھی قلب کا پاک ہونا اور نورانی بتانا مقصود ہے۔ شاید تم کو یہ شبہ ہو کہ کپڑے کے دھونے سے قلب کس طرح پاک ہوسکتا ہے۔ لہٰذا سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری تعلق کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب چاہے دیکھ لو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوئے۔ ہوتو اپنے قلب میں ایسی صفائی اور انشراح پاتے ہو جو وضو سے پہلے نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ وضو ہی کا اثر ہے جو بدن سے بڑھ کر دل تک پہنچتا ہے۔

نماز پڑھنے سے بہرحال نفع ہے اگرچہ اس کے اسرار کو نہ سمجھے...... دوم: نماز کے جمع ارکان وہ سنتیں ہوں یا مستحبات اور ذکر یا تسبیح سب کو اپنے قاعدے پر ادا کرے اور یاد رکھو کہ جس طرح بدن کی ظاہری طہارت نے قلب کی باطنی صفائی میں اثر دکھایا تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نماز کے ارکان کا اثر قلب میں ہوتا ہے اور نورانیت پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح مریض کو دوا پینے سے ضرور نفع ہوتا ہے اگرچہ دوا کے اجزاء کی تاثیروں سے واقف نہ ہو اسی طرح تم کو نماز کے ارکان ادا کرنے سے ضرور نفع پہنچے گا اگرچہ تمہیں اس کے اسرار اور رموز سے واقفیت نہ ہو۔

نماز کی روح اور بدن...... جاننا چاہیے کہ جاندار مخلوق کی طرح حق تعالیٰ نے نماز کو بھی ایک صورت اور روح

مرحمت فرمائی ہے چنانچہ نماز کی روح تو نیت اور قلب ہے اور قیام وقعود نماز کا بدن ہے اور رکوع وسجود نماز کا سر اور ہاتھ پاؤں ہیں اور جس قدر راذ کار وتسبیحات نماز میں ہیں وہ نماز کے آنکھ، کان وغیرہ ہیں اذکار۔ وتسبیحات کے معنی کو سمجھنا گویا آنکھ کی بینائی اور کانوں کی قوت سماعت وغیرہ ہے اور نماز کے تمام ارکان کو اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنا نماز کا حسن یعنی بدن کا سڈول اور رنگ وروغن کا درست ہونا ہے۔

الغرض اس طرح پر نماز کے اجزاء اور ارکان کو بحضور قلب پورا کرنے سے نماز کی ایک حسین وجمیل اور پیاری صورت پیدا ہو جاتی ہے اور نماز میں جو تقرب نمازی کو حق تعالی سے حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے کوئی خدمتگار اپنے بادشاہ کی خدمت میں کوئی خوبصورت کنیز ہدیۂ پیش کرے اور اس وقت اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل ہو۔ پس اگر تمہاری نماز میں خلوص نہیں ہے تو گویا مردہ اور بے جان کنیز بادشاہ کی نذر کر رہے ہو اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی گستاخی وبے با کی ہے کہ ایسا گستاخ شخص اگر قتل کر دیا جائے تو عجب نہیں۔ اگر نماز میں رکوع وسجدہ نہیں ہے تو گویا لنگڑی لولی اور اپاہج لونڈی پیش کرتے ہو.... اور اگر ذکر وتسبیح اس میں نہیں ہے تو گویا لونڈی کے آنکھ کان نہیں اور اگر سب کچھ موجود ہے مگر ذکر وتسبیح کے معنی نہیں سمجھے اور نہ دل متوجہ ہوا تو ایسا ہے جیسے کہ اعضاء تو سب موجود ہیں لیکن اس میں حس وحرکت بالکل نہیں، یعنی حلقۂ چشم موجود ہے مگر بینائی نہیں ہے اور کان موجود ہیں مگر بہرے ہیں کہ سنائی نہیں دیتا، ہاتھ پاؤں ہیں مگر شل اور بے حس ہیں۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اندھی بہری کنیز شاہی نذرانہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شاید تمہیں یہ شبہ ہو کہ جب نماز کے فرض اور واجب ادا کر دیئے جاتے ہیں تو علمائے شریعت اس نماز کے صحیح ہو جانے کا فتویٰ دے دیتے ہیں خواہ معنی سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں اور جب نماز صحیح ہو گئی تو جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا سمجھنا نماز میں ضروری نہیں لہٰذا سمجھ لو کہ علماء کی مثال طبیب کی سی ہے پس اگر کوئی لونڈی اپاہج اور کیسی ہی عیب دار کیوں نہ ہو اگر اس میں روح موجود ہے تو طبیب اس کو دیکھ کر ضرور یہی کہے گا کہ یہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔

بلا حضور قلب والی نماز کی صحت پر علماء کا فتویٰ اور شبہ کا جواب...... اسی طرح نماز کی روح اور اعضائے رئیسہ کے موجود ہونے سے علماء فتویٰ دے دیں گے کہ نماز صحیح ہے اور فاسد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں طبیب نے اور عالم نے اپنے منصب کے موافق جو کچھ کہا ہے مگر نماز تو شاہی نذرانہ اور سلطانی تقرب حاصل ہونے کی حالت ہے اور اتنا تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عیب دار کنیز اگر چہ زندہ ہے مگر سلطانی نذرانہ پیش کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ ایسی کنیز کا تحفہ پیش کرنا گستاخی ہے اور شاہی عتاب کا موجب ہے۔ اسی طرح اگر ناقص کے ذریعہ سے اللہ کا تقرب چاہو گے تو عجب نہیں کہ پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح لوٹا دی جائے اور منہ پر پھینک ماری جائے۔

الغرض نماز سے مقصود چونکہ حق تعالی کی تعظیم ہے۔ لہٰذا نماز کے سنن اور مستحبات وآداب میں جس قدر بھی کمی ہو گی، اسی قدر احترام وتعظیم میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔

نماز کی روح اور اعضاء......سوم: نماز کی روح کا زیادہ خیال رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک اخلاص اور حضور قلب[2] قائم رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک جو کام اعضاء سے کرتے ہو ان کا اثر دل میں بھی پیدا کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رکوع میں بدن جھکے تو دل بھی عاجزی کے ساتھ جھک جانا چاہیے اور جب زبان سے اللہ اکبر کہے تو دل میں بھی یہ ہو کہ بے شک اللہ سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جب الحمد للہ پڑھو قلب بھی اللہ کی نعمتوں کے شکریہ سے لبریز ہو۔ جس وقت زبان سے ایاک نعبد و ایاک نستعین . نکلے تو دل بھی اپنے ذلیل وضعیف اور محتاج ہونے کا اقرار کرے۔ یعنی قلب میں بھی یہی ہو کہ بے شک بجز خدا کے کسی چیز کا نہ مجھے اختیار ہو نہ کسی دوسرے کو غرض تمام اذکار وتسبیحات اور جملہ ارکان وحالات میں ظاہر وباطن یکساں اور ایک دوسرے کے موافق ہونا چاہیے اور سمجھ لو کہ نامۂ اعمال میں نماز وہی لکھی جاتی ہے جو سوچ سمجھ کر پڑھی گئی ہو۔

پس جتنا حصہ بغیر سمجھے ادا ہو گا وہ درج ہو گا ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں پوری طرح حضور قلب قائم رکھنے میں تم کو بہت دشواری معلوم ہو گی لیکن اگر عادت ڈالو گے تو رفتہ رفتہ ضرور عادت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کی طرف توجہ کرو اور اس توجہ کو آہستہ آہستہ بڑھاؤ مثلاً اگر تمہیں چار فرض پڑھنے ہوں تو دیکھو کہ اس میں حضور قلب تم کو کس قدر حاصل ہوا۔

حضور قلب حاصل کرنے کی تدبیر......فرض کرو کہ ساری نماز میں دو رکعت کی برابر تو دل کو توجہ رہی اور دو رکعت کے برابر غفلت رہی تو ان دو رکعتوں کو نماز میں شمار ہی نہ کرو، اور اتنی نفلیں پڑھو کہ جن میں دو رکعت کی برابر حضور قلب حاصل ہو جائے۔

غرض جتنی زیادہ غفلت ہو اسی قدر نفلوں میں زیادتی کرو، حتی کہ اگر دس نفلوں میں چار فرض رکعتوں کا حضور قلب پورا ہو جائے تو امید کرو کہ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے فرائض کا نقصان ان نفلوں سے پورا فرما دے گا۔ اور اس کمی کا تدارک نوافل سے منظور فرمالے گا۔

تفسیر سُورۃ المُلک

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز

حق تعالیٰ شانہٗ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی ہے۔ کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظّم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پر یہ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں۔ پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پر آ رہے ہیں سورج اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔ چاند اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرچے پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بد کرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے۔ دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی۔

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥

تمہید...... پہلے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کارگزاری ہے وہ حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات کمال ہیں۔ ہر صفت کمال سے جلوہ گر ہیں اور ہر صفت اپنا کام کر رہی ہے، ان میں سے ایک صفت حق تعالیٰ کی ہے "ملک" ہونا کہ وہ بادشاہ ہیں، جیسے وہ معبود ہیں۔ جیسے رحمٰن اور رحیم ہیں اور جیسا کہ قدوس اور سلام اور مؤمن اور مہیمن ہیں، اسی طرح سے وہ ملک بھی ہیں، بادشاہ بھی ہیں اور ساری کائنات کے، ان کی جیسے اور صفات اس عالم میں جلوہ گر ہیں وہ اپنی اپنی کارگزاری دکھلا رہی ہیں۔

خدائی بادشاہت کی جلوہ گری ...... اسی طرح سے صفت ملوکیت، بادشاہت کی صفت (ہے) جو کہ جلوہ گر ہے

اس عالم میں، اور ذرہ ذرہ میں اللہ کی حکومت، حکمرانی اور بادشاہی نمایاں ہے اور اس سے ایک نظام قائم ہے۔ یہ نظام اجتماعی فطرت اللہ ہے۔ یعنی کائنات حق تعالیٰ نے جو بنائی اور اس کو چلایا عیاذاً باللہ کوئی بدنظمی سے نہیں چل رہا۔ بلکہ ایک نہایت ہی محکم نظام ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اس نظام کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک چیز بھی اپنے نظم سے نہیں ہٹ سکتی۔

نظام تکوین...... فرق اتنا ہے کہ ایک نظام ہے تکوینی جس کا تعلق اللہ کے افعال سے ہے یہ نظام اس قدر محکم ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً اس کائنات میں اللہ نے سورج پیدا فرمایا، روشنی کے لیے اس کی ایک حرکت قائم رکھی اس حرکت سے رات اور دن بنتے ہیں اور پھر رات اور دن کے مجموعے سے مہینے بنتے ہیں اور مہینوں کی ایک خاص تعداد سے سال بنتے ہیں جس سے ہم سن اور مہینے اور دن گھنٹے متعین کرتے ہیں تاکہ ہمارے جتنے کاروبار ہیں یہ اس نظم کے اندر بندھے رہیں اور ضبط وانتظام کے ساتھ ہماری زندگی گذرے۔

اس سورج کی حرکت میں اور دن رات بنانے میں کبھی کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا۔ یہ اللہ نے ایسی گھڑی بنائی ہے کہ جب اسے چابی دی ہے دوبارہ کبھی چابی دینے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ نہ اس گھڑی کی بال کمانی کبھی بگڑتی ہے نہ کبھی اس میں مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ گھٹا اور بڑھا دیں۔ ایک سلسلے کے ساتھ نظام عالم چل رہا ہے۔ **لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ** ① ”نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ کوئی جلدی کر بیٹھے“ چاند کو جا پکڑے، نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ ذرا آگے تو بڑھ کر دن پر قبضہ کرلے“۔

نظام الاوقات...... دن اپنے وقت پہ آرہا ہے۔ رات اپنے وقت پہ، پھر ان رات اور دن سے یہ زمانہ بن رہا ہے، موسم بن رہے ہیں۔ یہ موسم اپنی اپنی جگہ سب محکم اور استوار ہیں، گرمی اپنے وقت پہ آئے گی۔ سردی اپنے وقت پہ ہے، برسات اپنے وقت پہ ہے، پھر ہر موسم سے متعلق جو پھل اور پھول اور دانے ہیں وہ اپنے ہی وقت پر نکل رہے ہیں۔ بہت سے پھل ہیں جو کہ برسات کے ہیں۔ بہت سے ہیں جو سردیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے ہیں جو گرمیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے اپنے وقت پر اگ رہے ہیں اور نکل رہے ہیں، لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

تقسیم اوقات...... اسی طرح سے دن بنایا تاکہ ہمارے کاروبار چلیں، تو دن کی روشنی میں ہم اپنے کاروبار چلا رہے ہیں، تجارت کے زراعت کے کارخانے داری کے اور چونکہ انسان کی قوت محدود ہے وہ خرچ ہونے سے گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ اس لیے تعب اور تکان بھی پیدا ہوتا ہے کہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو رات کا وقت رکھا اور اس کو فرمایا: **وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا.** ② ”رات کو ہم نے سکون کا ذریعہ بنایا“۔

کہ اس میں تھکے ماندے آرام کریں اور جو سو رہے ہیں وہ پھر اگلے دن کے لیے تازہ دم ہو کر کھڑے

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ: یٰس: الآیۃ: ۴۰۔ ② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۶۔

ہو جائیں اور اپنے کاروبار میں لگیں۔

حکمت اوقات ...... تو رات کو سکون کے لیے رکھا، دن میں بھی پانچ چھ گھنٹے کام کر کے طبعاً آدمی تھک جاتا ہے تو وقت نہار دن کا بیچ کا حصہ قیلولہ کے لیے رکھا اور اسے سنت قرار دیا گیا۔

بلکہ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ دن کے بارہ بجے جب آدمی سوتا ہے تو اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج کے تمدن میں بارہ بجے کا قیلولہ ہی باقی نہیں آج ٹھیک بارہ اور ایک بجے کھانا کھاتے ہیں، ظہر کے وقت پھر قیلولہ کا وقت تو گزر جاتا ہے کھانے کے انتظار میں اور کھانے کا وقت آتا ہے تو اس کا اثر کام پر پڑتا ہے ظہر اور عصر کے درمیان میں جو کام کر سکتے ہیں اس میں فرق پڑے گا۔ تو غرض جو کھانے کا وقت تھا وہ انتظار میں گزرا، جو کام کا وقت تھا وہ کھانے میں گذرا اور اس کے بعد جو آگے کام کا وقت تھا یا بے کاری میں گذرا، یا تعب اور تکان میں گذرا اور اس واسطے روایت میں فرمادیا کہ بارہ بجے کا وقت ہے سکون کا، اور اس میں آدمی دس منٹ آدھ گھنٹہ بھی اگر قیلولہ کر لے تو نشاط پیدا ہو جاتا ہے طبیعت میں اور جو ایک پسماندگی سی پیدا ہو جاتی ہے تھکن و تعب، وہ نکل جاتا ہے، پھر آدمی بقیہ آدھے دن کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

تو گویا رات رکھی سکون کے لیے اور دن میں بارہ بجے کا وقت رکھا سکون کے لیے ...... پھر تین حصوں پر منقسم فرمایا کہ دو حصے دن کے ہیں، وہ کاروبار کے لیے بیچ کا حصہ سکون کے لیے اور رات پوری سکون کے لیے اس رات میں پھر واجب نہیں فرمایا۔

اوقات مقبولہ ...... مگر افضلیت اس کی بیان کی، استحباب بیان کیا کہ تہجد پڑھے آدمی کہ رات بھی دو حصوں میں منقسم ہو جائے، ایک حصہ سکون و آرام کا، ایک حصہ طاعت و عبادت کا، اور وہ طاعت و عبادت کا جو رات میں وقت رکھا گیا ہے وہ سب سے زیادہ مقبول وقت ہے۔

حدیث میں فرمادیا ہے کہ آخری تہائی رات میں حق تعالیٰ اترتے ہیں آسمان دنیا پر، جیسا اترنا ان کی شان کے لائق ہے۔

وقت تہجد نزول باری تعالیٰ ...... وہ اترنا اس طرح کا نہیں ہے کہ جیسے ہم اوپر کے محلہ سے نیچے کے محلہ میں آجائیں درجہ بدرجہ سیڑھی بہ سیڑھی اترتے ہیں۔ یہ اجسام کے متعلق ہے، حق تعالیٰ شانہٗ پاک ہیں جسم سے وہ بری وبالا ہیں اس لیے ان کا اترنا انہی کی شان کے مطابق ہے اترنے کا لفظ حقیقت پر محمول ہوگا۔ لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس کیفیت سے اترتے ہیں۔ جیسی ان کی جناب قدوس ہے اسی انداز کا ان کا اترنا بھی ثابت رہا ہے، ہم کیفیت نہیں بیان کر سکتے۔ اتنا ہم جانتے ہیں دنیا میں کہ بہت سی چیزوں کی طرف اترنے کی نسبت کی جاتی ہے۔

کیفیت نزول ...... مگر ہر ایک کا اترنا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے، اگر آپ یوں کہیں کہ میں پانچویں محلے سے اترا اور نچلے محلے پہ آیا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک سیڑھی ہوتی ہے جس پر درجہ بدرجہ آپ اترتے ہیں، لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ میرے دل میں ایک مضمون اتر آیا تو کیا وہاں مضمون کے لیے بھی سیڑھی لگائی گئی؟ مضمون

ایک لطیف چیز ہے، معنوی چیز ہے، اس معنوی چیز کے اترنے کا طریقہ بھی معنوی ہے، وہ جسمانی نہیں ہو سکتا کہ جسم اترتے ہیں جسمانی سیڑھیوں سے اور معنویات اترتی ہیں معنوی انداز سے۔

آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی، اتر آئی تو وہ کوئی سیڑھی سے نہیں اتری، وہ اپنی شان کے مطابق اتری ہے، جیسے محبت ایک معنوی چیز ہے، ویسے ہی اس کا زینہ بھی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وہ ہے کہ جسم سے بھی بری ہے اور پاک اور جس کو آپ روح کہتے ہیں اس سے بھی بری اور پاک روح بھی ان کی پیدا کی ہوئی ہے اور جسم بھی ان کا پیدا کیا ہوا ہے کہ روح اور جسم دونوں محدود چیزیں ہیں اور ہر محدود چیز کچھ نہ کچھ مرکب ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ ترکیب سے بری ہیں، مرکب ہونے سے بھی بری، مجرد، ہونے سے بھی بری، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ. ①

ان کی کوئی مثال نہیں کہ بیان کی جا سکے۔ اس لیے کہ مثال جو بھی دے گا ان کے سواء، وہ مخلوق ہوگی اور خالق اور مخلوق میں زمین اور آسمان سے بھی لاکھوں گنا زیادہ فرق ہے تو ان کا مثل تو کوئی نہیں ہو سکتا، مثال البتہ ہو سکتی ہے، لیکن اگر کچھ سمجھا جائے مگر وہ مثال بھی محض فہم کے قریب لانے کے لیے بولی جاتی ہے مثال پوری طرح ان پر منطبق نہیں ہو سکتی، وہ ہر مثل سے بری، مثال سے بری ہیں تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات منزہ اور مقدس ہے، ان کا اترنا آسمان دنیا پر ان ہی کی شان کے مطابق ہے جس کو ہم نہیں جانتے، نہ ہم اس کیفیت کو بیان کر سکتے ہیں لیکن حاصل یہ کہ اترتے ہیں اور پھر یہی نہیں کہ اتر آتے ہیں آسمان دنیا پر بلکہ انتہائی رحمت اور شفقت سے۔

مقصد نزول...... حدیث میں ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلانا بھی انہی کی شان کے لائق ہے جیسا کہ ان کی جناب کے مناسب ہے اور فرمایا کہ دونوں ہاتھ کھول کر پھیلا کر فرماتے ہیں کہ اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَطْلُبُ مِنْهُ میں بادشاہ ہوں، کوئی ہے مانگنے والا مجھ سے اَنَا الرَّزَّاقُ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَسْتَرْزِقُ مِنْهُ ② میں رازق ہوں، رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق کا طلبگار اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَسْتَغْفِرُ مِنْهُ. میں بخشنے والا ہوں کوئی ہے بخشش مانگنے والا، پھر خود فرمایا کرتے ہیں کہ مانگو مجھ سے اور گویا جھنجھوڑتے ہیں سونے والوں کہ کوئی ہے مانگنے والا، کوئی ہے پکارنے والا، پھر ایک تو یہ کہ بادشاہ کی ڈیوڑھی پر آپ خود حاضر ہوں اور جا کر اطلاع کرائیں کہ حاضر ہونا چاہتے ہیں ممکن ہے اجازت ملے، ممکن ہے نہ ملے محروم واپس آنا پڑے۔ لیکن بادشاہ عالمین خود آتے ہیں اتر کر آپ کی طرف عرش عظیم سے اتر کر آسمان دنیا پر اور یہ آسمان دنیا آپ کی چھت ہے اس دنیا کی جس کے اوپر اور آسمان ہیں سب سے نیچے آسمان ہے یہ آسمان دنیا، آسمان و دنیا......

ہی اس لیے ہی کہلاتا ہے کہ دنیا کی چھت ہے تو گویا آپ کے مکان کی چھت پر آ کر آواز دیتے ہیں کہ سونے والو! کوئی ہے مانگنے والا۔

① پارہ: ۲۵، سورۃ: الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱. ② مسند احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ج: ۲۱ ص: ۲۸۲.

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

تو ایک تو یہ کہ ہم سوال کریں تو کچھ عطا فرمائیں وہ خود سوال فرماتے ہیں کہ کوئی مانگنے والا ہو تو مانگے، ہم دینے کے لیے آگئے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس وقت کوئی مانگے گا تو وہ سوال اور دعا خالی نہیں جاسکتی، رائیگاں نہیں جائے گی۔ کیوں کہ بادشاہ کہہ کر دعا منگوا رہے ہیں آپ سے سوال کرا رہے ہیں خود سوال کرائیں پھر محروم کردیں اسے عقل قبول نہیں کرتی اس واسطے یہ وقت خاص مقبولیت کا ہوتا ہے۔ اس وقت جو مانگا جائے ملتا ہے۔

عطا کا وقت حکمت کے مطابق ہے...... باقی کوئی آدمی امتحان لینے کے لیے جائے اللہ میاں کا کہ اچھا میں مانگ رہا ہوں تو کل کو آٹھ بج کر پانچ منٹ پر مجھے مل جانا چاہیے تو وہ آپ کے پابند نہیں ہیں۔ وہ جیسے دینے والے ہیں ویسے ہی حکیم بھی ہیں، حکمت کے تحت دیتے ہیں۔ اگر حکمت کا تقاضا ہے کہ فوراً دے دیا جائے، فوراً منہ مانگی مراد مل جائے گی اور اگر حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ وقفہ کیا جائے تو وقفہ لگتا ہے اس میں اور اگر حکمت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ چیز نہ دی جائے جو آپ مانگ رہے ہیں اس سے کوئی بڑی چیز دے دی جائے تو پھر وہ دے دیتے ہیں۔ اور بعد میں آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا، کیسی قبولیت کا وقت تھا میں تو یہی مانگ رہا تھا مجھے تو اس سے زیادہ مل گئی۔ میں تو پھول مانگنے گیا تھا مجھے پورا باغ ہی مل گیا۔ میں ایک ٹکڑا مانگتا تھا وہاں پوری روٹیوں کا دستر خوان ہی مل گیا۔ تو کبھی فوراً منہ مانگی مراد ملتی ہے کبھی دیر لگتی ہے اور دیر سے ملتی ہے کبھی وہ چیز نہیں ملتی جو مانگی گئی تھی اس سے بڑھ کر دی ہے۔ یہ حکمت کے تحت ہوتا ہے آپ اپنے نفع نقصان کو نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے آپ کے نفع نقصان کو، تو وہ دیتا ہے، مگر آپ کی مصلحت دیکھ کر۔

اب یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک باپ لکھ پتی ہو اور بیٹا اس سے یوں کہے کہ مجھے سو روپے روزانہ جیب خرچ کے لیے آپ دیا کرو تو کبھی تو ایسا ہے، کہ باپ نے محبت میں عنایت میں آکر فوراً مقرر کردیا، روزانہ سو روپے ملنے لگے لڑکے کو کبھی ایسا ہے کہ وہ مانگ رہا ہے مانگتے مانگتے دو مہینے گزر گئے، لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ بس جی باپ کے دل میں کوئی شفقت نہیں رہی میری طرف سے، نہ وہ محبت باقی رہی، مانگ رہا ہوں دو مہینے ہوگئے کچھ بھی نہیں ملتا۔ لیکن دو مہینے کے بعد اچانک باپ نے جاری کیا سو روپے ماہوار کا وظیفہ...... تو بیٹے نے کہا کہ میں تو دو مہینے سے مانگ رہا تھا، دیا اب آپ نے؟......

باپ کہتا ہے کہ بے وقوف! تو جگر کی بیماری میں مبتلا تھا، جگر بڑھا ہوا تھا، معدہ خراب تھا اگر میں سو روپے روز دیتا تو تو کھانے اڑانے میں لگاتا اور بیماری بڑھ جاتی، اس لیے میں نے روک لیا اور علاج کیا تیرا، بجائے اس کے کہ سو روپے میں اعلیٰ اعلیٰ چیزیں لے کر کھاتا میں نے کڑوی دوائیں پلانا شروع کیں۔ اب دو مہینے میں تیری صحت قابل اعتماد ہوگئی۔ سو روپے چھوڑ کر تو دو سو روپے روز لے لیا کر، تیرے ہی واسطے کما رہا ہوں میں .... تو بیٹا ممنون ہوگا کہ واقعی میں اپنی ناتجربہ کاری سے نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہ نہ ملنا چاہیے مگر باپ جانتا تھا، اگر اس وقت

دے دیتا تو ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا اب جبکہ مجھے اس نے دیا تو اب میں بھی اطمینان سے سوروپے خرچ کروں گا اور باپ کی خوشی کا باعث بھی ہوگا۔

عطاء کا وقت خود متعین کرنا باعث نقصان ہے......اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے اور مانگتے مانگتے ایک دو مہینے نہیں چار پانچ ماہ نہیں، دس بیس برس گزر گئے اور بیٹے کے دل میں یقین ہو گیا کہ باپ کے دل میں کوئی شفقت باقی نہیں ہے۔ کروڑ پتی ہے، اگر دو سو روزانہ بھی دے تب بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر نہیں دیتا۔ معلوم ہوا بخیل ہو گیا۔ لیکن دس برس کے بعد باپ نے پچاس ہزار روپے کی تھیلی بھر کر رکھ دی اور یہ کہا کہ تو جا کر جیب میں ڈال، اگر میں تجھے سو روپے دو سو روپے روز دیتا تو کھانے اڑانے میں خرچ کر دیتا، مال ضائع ہوتا اور تیری عادتیں بگڑ جاتیں، پھر فضول خرچی کا عادی ہو جاتا تو عمر بھر یہ لت نہ چھوٹتی۔ اب اس دس برس کے اندر تجھے تجربہ پیدا ہو گیا، نفع نقصان کی خبر ہو گئی۔ اس واسطے پچاس ہزار دیتا ہوں تجارت کرلو۔ سو چھوڑ تو تو پانچ سو روپے روز کمالے گا۔ تیرا اصل مال بھی باقی رہے گا اور نفع میں سینکڑوں روپیہ روزانہ تجھے ملے گا، یہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے کہ سو روپے دو سو روز دیتا اور تو ضائع کر دیتا، تو بیٹا ممنون ہوگا، کہ میں اپنی غلط فہمی سے سمجھ رہا تھا کہ باپ بخیل ہو گیا، مگر وہ تو انتہا سے زیادہ سخی ہے میں اس دس برس میں اگر سو روپے روز لیتا تو اتنے بیٹھتے اور اب مجھے ایک لاکھ روپیہ مل گیا جو سو روپے میں روز میں نہ پڑتا۔ یہ میرے نفع کے لیے ایسا کیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ بھی اسی ح دیکھتے ہیں کہ اگر بندہ میں بری عادتیں ہیں، گناہ گاریاں ہیں، بدکاری کی عادت پڑی ہوئی ہے تو بعض دفعہ دولت دینے کی بجائے جو دی ہوئی ہے وہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ عیاشی میں مبتلا ہے تو مفلس ہو گیا اور مانگتا ہے باپ سے باپ نہیں دیتا۔ لیکن دو چار برس میں دھکے کھا کر عیاشیوں کے برے نتیجے سامنے آنے کے بعد اب اس پر منکشف ہوا کہ میں بری زندگی گزار رہا تھا، اس نے توبہ تلافی راستہ درست ہو گیا، اب باپ نے دینا شروع کر دیا کہ اب تیرے ہی لیے ہے جو کچھ ہے مگر اس حالت میں تیرے لیے مضر تھا۔

سرمائے کے جمع اور ظہور کا وقت......تو میرا مطلب یہ ہے کہ مانگنے کے بعد کبھی وہ فوراً مل جاتا ہے، کبھی دیر لگتی ہے اور کبھی دیر کے باوجود وہ چیز نہیں ملتی اس سے بڑی مل جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمر بھی نہ ملی، مانگتا رہے آدھی عمر گذر گئی۔ لیکن جب انتقال کرے گا تو حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اجر و ثواب کے عظیم ڈھیر اس کے سامنے لگے ہوئے ہونگے عرض کرے گا کہ: ''اے اللہ! میں نے تو کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کا یہ نتیجہ ہوتا۔''

فرمائیں گے کہ تو مانگتا تھا، تو دعائیں کرتا تھا، تیری دعائیں ہم نے ذخیرہ کر رکھی تھیں تاکہ ہم اس وقت دیں تاکہ ابد الآباد تک تیرے لیے نفع کا باعث بنے دنیا تو گزرنی تھی گزر گئی عیش سے گزارتا جب ختم ہو جاتی مصیبت سے گزاری جب ختم ہوئی، لیکن زندگی اصل یہ ہے کہ ہم نے تیرا سرمایہ اس زندگی کے لیے جمع رکھا۔ تو اس وقت یہ کہے گا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری دعا اس وقت قبول نہ کی، اب جا کر کی، وہاں میں ضائع کر دیتا اپنی عمر کو

بھی، اپنی دولت کو بھی اور یہاں میری عمر بھی دوامی بن گئی اور میری دولت بھی دوامی بن گئی۔

بلکہ حدیث میں ہے کہ بعض اہل مصیبت حسرت میں ہوں گے اس دن اور کہیں گے جب ان کے سامنے اجر وثواب کے ڈھیر آئیں گے مصیبتوں کے ثمرہ میں تو وہ کہیں گے کہ: ''اے اللہ! اس سے بڑی بڑی مصیبتیں ہم پر کیوں نہ نازل کیں آپ نے؟ اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ قینچیوں سے ہماری کھالیں کاٹی جاتی۔ جب تھوڑی مصیبتوں پر یہ اجر وثواب مل رہا ہے تو بڑی مصیبتوں پر معلوم نہیں کیا ملتا۔''

تو بعضوں کو حسرت ہوگی کہ مصیبت کم کیوں پڑی ہمارے اوپر، زیادہ کیوں نہ آئی، اس وقت قدر آئے گی کہ یہ مصائب بھی بڑی نعمتیں تھیں۔ یہ ذریعہ بنادی گئیں ہمارے لیے ترقیٔ درجات کا، آخرت کے درست ہونے کا۔

تو غرض آدمی جب بھی مانگے، مانگنے میں کسر نہ چھوڑے، مگر امتحان نہ لے قدرت کا کہ دیکھو! مانگ رہا ہوں، ملتا ہے یا نہیں ملتا۔

دعا کے وقت قدرت کا امتحان نہ لے...... امتحان لینا گستاخی اور بے ادبی ہے، اس میں ایسا نہ ہو کہ سرے سے دعا ہی رائیگاں کردی جائے کہ ہم سنتے ہی نہیں ایسے لاابالی شخص کی دعا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰـهَ لَایَقْبَلُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ لَاهٍ. (۱) ''جو لہو ولعب میں پڑے ہیں ان کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی نہ سنی جاتی''۔ جو مانگ رہا ہے اللہ سے، تخیلات میں مبتلا ہے، نہ اخلاص ہے نہ صدق ہے، نہ تضرع اور زاری اور ابتہال ہے کہ متوجہ ہوں، اس کی دعا نہیں قبول کی جاتی۔

اسی طرح سے وہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی جس میں قیدیں اور شرطیں لگائی جائیں کہ اسی وقت ملے، فلاں ہی دن ملے، فلاں موقعے پہ ملے۔ فلاں چیز ملے۔ سائل کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیٹھ بیٹھ کر متعین کرے کہ یہ چیز دیجئو، یہ نہ دیجئو۔ یہ دعا مانگنا نہیں، یہ تو مشورے دینا ہے اللہ میاں کو کہ جیسے جب آپ دیں تو فلاں چیز دیں، جیسے حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے دعا مانگی کہ: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْقَصْرَ الْاَبْیَضَ فِی الْجَنَّةِ یا اللہ! مجھے جنت میں سفید رنگ کا محل دیجئو، وائٹ ہال دیجئو جو بالکل سفید انڈہ سا ہو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا دعا ہے کہ اپنی طرف سے قیدیں لگا رہے ہو، سفید اور سرخ اور سبز، تم بنانے والے ہو جنت کے؟ تم بنانے والے ہو درجات کے؟ تمہارا مشورہ چلے گا وہاں؟ وہاں تو ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو دنیا و مافیھا سے بہتر ہے، تم قیدیں لگا رہے ہو تو وقت کی قید لگانا یا کسی نوعیت کی قید لگانا یہ بے ادبی اور گستاخی ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت مانگے آدمی اور خوب الحاح سے مانگے، نیچا بن کے مانگے۔

دعا کے وقت استغناء نہیں بلکہ تضرع چاہیے...... اس واسطے کہ اگر یوں مانگنے لگے کہ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ اِنْ شِئْتَ. یا اللہ! مجھے دے دیجئے اگر آپ چاہیں، میری مغفرت کردیجئے اگر آپ

---

(۱) السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۸۳.

چاہیں۔تو یہ دعا مانگنا نہیں یہ تو استغناء کا اظہار کرنا ہے۔سائل تو محتاج ہوتا ہے نہ کہ غنی،آپ جب یوں کہہ رہے ہیں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ بخش دیں اگر آپ چاہیں،اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل چاہے تو بخش دیں تو بخش دیں نہیں تو مجھے تو ضرورت ہی نہیں آپ کی مغفرت کی۔اس میں استغناء نکلتا ہے کہ سائل بھی ہو آدمی اور مستغنیٰ بھی بنے۔یہ تو اجتماع ضدین ہے۔اس واسطے دعا مانگنے میں سوائے عجز وانکسار کے،سوائے بندگی کے ابتہال کے اور انتہائی زاری اور تضرع کے،نہ کوئی قید ہو نہ کوئی شرط ہو۔بس مانگے آدمی۔اور میں کہتا ہوں کچھ بھی نہ ملے دعا مانگنے کی توفیق ملی۔دعا بھی تو عبادت ہے۔یہ تھوڑی چیز ملی کہ دعا منگوادی گئی آدمی سے۔اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ :۔''دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا''۔①

اوقاتِ مقبولہ میں غفلت سے احتراز......خیر بہر حال یہ بات دور جا پڑے گی۔میں عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا!ہم دینے کے لیے تیار ہیں جو خوش قسمت ہیں اور اس وقت جاگتے ہوئے ہوتے ہیں وہ مانگتے ہیں اور منہ مانگی مراد ملتی ہے۔اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا۔

اے لوگو!تمہارے پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً قبولیت کی ہوائیں چلتی ہیں تم سب ڈھونڈتے رہو،ایسا نہ ہو کہ وہ ہوا چلے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے سوتے رہو،ان اوقات کو ضائع نہ کرو۔اور ضائع نہ جانے دو،بلکہ ٹوہ میں لگے رہو کون سا وقت مقبولیت کا ہے۔''

تو کچھ ساعتیں ہوتی ہیں مقبولیت کی،کچھ اوقات ہوتے ہیں قبولیت کے اس میں جب آدمی مانگتا ہے تو مانگنا بھی خود عبادت،عظیم عبادت بنتا ہے اور منہ مانگی مراد بھی ملتی ہے۔تو یہ کہہ کر وہاں آسمان دنیا پر اترتے ہیں کہ:اَنَا الْمَلِکُ ۔ میں بادشاہ ہوں۔یعنی آپ کسی رئیس سے مانگ لیں،دو چار روپے دے دے گا،کسی بڑے جاگیردار سے مانگ لیں۔ممکن ہے سو پچاس ہزار روپے دے دے،لیکن بادشاہ وقت جو پورے ملک کا حاکم ہے اس سے اگر مانگیں اور وہ خود یوں کہے کہ بھلا مانگو مجھ سے تو اندازہ کیجئے،کیا کچھ نہیں دے گا،بادشاہ،اور بادشاہ بھی وہ جو عالموں کا بادشاہ ہو،بادشاہوں کا بادشاہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی کی کنجیاں ہوں وہ اگر یوں کہے کہ مانگو مجھ سے میں دوں گا تو پھر کیا کچھ نہیں ملے گا۔

ماہِ رمضان کا امتیازی بدلہ......یہی وجہ ہے کہ یہ روزہ جو ہے اس کے جہاں اور ہزاروں فضائل اور برکات ہیں۔من جملہ ان کے بڑی عظیم برکت اور روزے کی فضیلت یہ بھی ہے کہ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ:اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ ۔ ②''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا''یعنی اور طاعتوں اور عبادتوں کا بدلہ تو ضابطہ کا ہے کہ ملائکہ کو حکم دیں گے کہ ضابطہ کی اجرت تقسیم کردو،ایک عمل کے دس عمل

---

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات ،باب ماجاء فی فضل الدعاء، باب منہ ج: ۱۱ ص: ۲۲۱ رقم: ۳۲۹۴.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام ،باب فضل الصیام ج: ۲ ص: ۸۰۷ رقم: ۱۱۵۱.

ہوں تو دس گنا دے دی۔لیکن روزے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ روزہ میرا ہے اور میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا۔یعنی ملائکہ بیچ میں نہیں خود عطا کروں گا روزہ دار کو اس کا اجر اور اس کا ثواب۔تو روزہ فرمایا کہ میرا ہے۔

یہ اس واسطے فرمایا کہ اور عبادتوں میں امکان ہوتا ہے کہ آدمی دکھلاوے کے لیے کرے،نماز پڑھے یہ دکھلانے کو بڑا عابد زاہد آدمی ہے۔زکوٰۃ دے یہ دکھلانے کے لیے کہ بڑا سخی داتا ہے،لیکن روزے کی کوئی شکل ہی نہیں کہ دکھلائے،وہ تو اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے اور اگر روزہ رکھ کر آدمی کہتا پھرے کہ جناب میں روزہ دار ہوں تو بجائے عزت کے اور تذلیل ہوگی۔لوگ کہیں گے کہ بھئی کسی پر احسان کیا ہے جو روزہ رکھا ہے جو ڈھول پیٹتا پھر رہا ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہے تو جب تک آدمی زبان سے نہ کہے روزے کا روزہ ہونا معلوم نہیں ہوتا،زبان سے نہ کہے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔اور کہے گا تو اور رسوائی ہوگی،اس لیے خواہ مخواہ دم بخود رہے گا،لیکن یہ ہے کہ روزہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا اور جب روزہ کسی کے آگے ظاہر نہیں ہوسکتا۔تو اس میں نہ ریا کاری کا دخل ہے،نہ سنادے کا نہ دکھلاوے کا،نہ شہرت کا۔یہ تو خاص اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے،تو چونکہ یہ عبادت خالص اللہ کے لیے ہے اس واسطے فرماتے ہیں کہ جب اس میں ریا کا دخل نہیں،دکھلاوے کا دخل نہیں۔خالص میرے لیے ہے تو میں ہی اس کا اجر بھی دوں گا یہ ضابطہ کا اجر نہیں ہوگا۔بادشاہ جب خود بانٹنے کے لیے بیٹھے وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے آپ کی حیثیت کے مطابق نہیں۔اور اللہ کی جو شان ہے وہ لامحدود ہے تو پھر دے گا بھی اتنا کہ اس کی کوئی حد نہایت نہیں ہوگی.....تو بانٹنا جب خود چاہیں اور فرمائیں کہ میری چیز ہے،میں بانٹوں گا تو وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے،تو جب یہاں اخیر رات میں یہ فرمایا کہ اتر کر کہ اَنَا الْمَلِکُ میں بادشاہ ہوں۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَدْعُنِیْ ؟. ہے کوئی مانگنے والا؟ تو مانگنے والا جب مانگے گا تو اپنی شان کے مطابق اسے دیں گے،آپ کی شان کے مطابق نہیں۔آپ کتنا ہی مانگیں وہ محدود چیزیں ہوں گی وہ جو دیں گے وہ اپنی شان کے مطابق دیں گے وہ لامحدود ہوں گی،تو برکات کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔بہر حال بادشاہت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر سائل کو دیں،ہر فریادی کی فریاد سنیں اور جب خود کہیں کہ میں سننے کے لیے موجود ہوں۔کہو،تو پھر ظاہر بات ہے کہ کیا کچھ نہیں ملے گا۔

مظلومیت کے وقت کی بددعاء......لیکن مظلوم کے بارے میں فرمادیا کہ:اِتَّقُوْا دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّھَاتَحمل علی الغمام یقول اللہ وعزتی وجلالی . ''مظلوم کی بددعاء سے بچو اس لیے کہ اس کی دعا سیدھی جا کر عرش سے ٹکراتی ہے اور پھر اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں جب مظلوم جس پر ظلم ہو رہا ہے وہ ہاتھ اٹھا کر فریاد کرتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ میری عزت اور جلال کی قسم :اَنْصُرُکَ وَلَوْبَعْدَ حِیْنٍ۔میں تیری مدد کروں گا۔گھبرانا مت،خواہ تھوڑا سا وقت لگ جائے حکمت کے تحت۔ (۱) مایوس مت ہو جانا کہ دیر لگ گئی

(۱) السنن للترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ ونعیمھا ج: ۹ ص: ۶۸.

تھوڑی سی مظلومیت چلے گی مگر پریشان مت ہونا، میں تیری مدد کے لیے پہنچا۔

ضرورت خلافت ......تو بہر حال حق تعالی شانہٗ ملک ہیں۔اور ملوکیت کے بہت سے لوازم ہیں۔اس سورۂ مبارکہ میں اللہ کی شہنشاہی بیان فرمائی گئی ہے، اس شہنشاہی کے لوازم اور اس کے آثار اور طریقے، یہ اس پوری سورت میں ظاہر فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں جب ہم نظام قائم کریں کوئی تو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق اس نظام کو چلائیں، اس لیے کہ حقیقی معنیٰ میں حکمرانی اور بادشاہت صرف اللہ کا حق ہے انسان کو بادشاہت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

اسی واسطے اسلام میں ملوکیت نہیں رکھی گئی، خلافت رکھی گئی ہے۔خلافت کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اللہ تعالی ہیں، ان کے نائب بن کر ان کے قانون کو ہم چلا رہے ہیں۔خود بادشاہ نہیں ہیں۔اقتدار ان کا ہے۔ان کے اقتدار کے زیر سایہ ہم چل رہے ہیں۔نظام ان کا ہے، ان کے نظام کو.......ہم چلا رہے ہیں، بادشاہی ان کی ہے، ہم ان کی ڈھنڈوری پیٹ رہے ہیں، دنیا میں راج کر رہے ہیں تو ہم خود بادشاہ نہیں ہیں، ہم خود صاحب اقتدار نہیں ہیں، اقتدار اللہ کا ہے۔اس کو چلانے کے لیے دنیا میں انسان خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے ایسے ظاہری اسماء جن سے کسی اور کے لیے اقتدار مطلق کی بو آتی ہو یا ایہام ہی ہوتا ہو اس کو ناپسند سمجھا گیا اسی لیے سب سے زیادہ بغض اور عداوت اللہ کو جس نام سے ہے وہ مَلِکُ الْاَمْلَاک یعنی شہنشاہ کا کوئی لقب اپنے لیے رکھے، کنگ رکھے اور کہے کہ وہ شہنشاہ ہے۔یہ سب سے زیادہ اللہ کو مبغوض ہے، اس لیے کہ یہ لقب تو اس کا ہے۔وہ ہے شہنشاہ، وہ ہے دونوں جہانوں کا بادشاہ۔تو انسان کے لیے شہنشاہی اور بادشاہت نہیں رکھی گئی، عبادت اور بندگی رکھی گئی ہے اور بندگی یہ ہے کہ اس کے نظام کو اس کا آلۂ کار بن کر، اس کا خادم بن کر چلائے، اسے خلیفہ کہیں گے، اسے نائب کہیں گے۔

نظام عالم چلانے کے لیے اوصاف شاہی ......تو اس سورت میں اللہ تعالی شانہٗ نے اللہ کی بادشاہی کے اصول بیان فرمائے ہیں، اللہ کی شاہی کا نظام ارشاد فرمایا تو نظام بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف کہ بادشاہ کیسا ہونا چاہیے اور حق تعالی شانہٗ بادشاہ ہیں تو شان کیا ہے، ان کی بادشاہی کی۔تو بادشاہی کے مناسب کون سی شان ہے حق تعالیٰ کی کہ جس سے بادشاہت انہیں کے لیے سزاوار ہے، دوسرے کے لیے نہیں، تو پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف اور کمالات کہ بادشاہ کس کمال کا ہونا چاہیے۔وہ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ جب بادشاہ ہے تو اس کی بادشاہت کے لوازم کیا کیا ہیں، کون کون سی چیزیں بادشاہت کے لیے لازم ہیں۔اس کے بغیر بادشاہت عالم اسباب میں نہیں چلتی۔

تیسرے یہ ہوگا کہ بادشاہت کہ ان لوازم کے آثار کیا ہیں، جس ملک میں بادشاہ، بادشاہی کر رہا ہے تو اس کی بادشاہی کے آثار کیا پڑ رہے ہیں، اچھے پڑ رہے ہیں یا برے پڑ رہے ہیں مخلوق سکون واطمینان سے ہے یا پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہے، کیا آثار پڑ رہے ہیں؟ ان آثار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ بادشاہت بہت اونچی

ہے اس لیے سکون اور اطمینان ملک کے اندر ہے یا معاذ اللہ! بادشاہ بہت خراب ہے اس لیے کہ ملک میں تو بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔

تو حق تعالیٰ شانہٗ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پہ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں، پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پہ آ رہے ہیں، سورج اپنے وقت پہ نکل رہا ہے، چاند اپنے وقت پہ نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرچے پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بدکرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے۔ اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے، دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی، تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی، جب ایک شخص یوں چاہے گا کہ میں بڑا بنوں اور دوسرے چھوٹے رہیں تو دباؤ میں آ کے، قہر میں آ کے ممکن ہے چھوٹے بن جائیں، لیکن دلوں میں نفرت ہو گی کہ اسے حق کیا ہے ہمارے اوپر حکمرانی کرنے کا؟ جیسے ہم ویسا یہ ہمارے برابر کا ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ مجھے بادشاہ مانو، تو گوارہ نہیں کرے گی مخلوق، مخلوق کرے گی تو دباؤ میں، اور اگر یوں کہے کہ بھئی نہ میں بادشاہ نہ تو بادشاہ ہم سب کا بادشاہ اللہ ہے۔ قانون اس کا ہے میں تو چلانے والا ہوں، سب کے دلوں میں عظمت بیٹھ جائے گی، تو اپنی جاہ پسندی اپنے اقتدار دوسری مخلوق پر لا دنہیں سکتے، لیکن زور دباؤ میں آ کے اپنا اقتدار چلاتے ہیں۔

تو مخلوق فکر میں رہتی ہے کہ کوئی موقع پڑے تو اس کے اقتدار کو ختم کر دو، پلٹ دو، اس نے پارٹیاں بنالیں، اس نے ایجی ٹیشن شروع کیا، اس نے پبلک کو ہموار کیا، بغاوت پھیلائی تو یہ جو بدنظمی ملک میں ہوتی ہے، اس کا سبب ہم ہیں، اللہ کی حکومت سبب نہیں۔ جہاں بلاواسطہ اس کی حکومت ہے اس میں تل برابر فرق نہیں ہاں! حکومت تمارے واسطے سے کرنا چاہتے ہیں تا کہ تمہاری عزت قائم ہو اور وہاں ہم اپنی ذاتی عزت سمجھ کر اس نظام کو بگاڑتے ہیں۔ وہیں سے بدنظمی پیدا ہوتی ہے تو بدنظمی کا ذمہ دار دنیا میں انسان ہے جہاں حق تعالیٰ شانہٗ نہیں، ان کی بلاواسطہ بادشاہت میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

جہاں تمہیں واسطہ بنایا وہیں تم نے اپنی کدورتوں کو داخل کر دیا۔ تو نظام بگڑ جاتا ہے اس لیے اس سورت میں اصول بیان فرمائے گئے ہیں کہ نظام عالم کن اصول پر چلنا چاہیے۔ وہی اصول ہیں جو اللہ کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ انہی پر چلو گے، تو تمہارا نظام درست رہے گا۔ ان سے ہٹو گے درست نہیں ہو گا۔

وصف اول...... اس لیے پہلی چیز تو بادشاہ کے اوصاف۔ بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قابلیت اور لیاقت ہونی چاہیے۔ کسی جاہل کو آپ بادشاہ بنا کر بٹھا دیں۔ تو جاہل کی بادشاہت جاہلانہ ہی ہو گی اور ان جاہلانہ

چیزوں کا اثر برا پڑے گا تو نظم کی بجائے بدنظمی پھیل جائے گی، تو بادشاہت کے اندر خود قابلیت اور کوئی کمال ہونا چاہیے کہ جس کی وجہ سے لوگ بھی اس کے آگے جھکیں اور اس کا کام بھی چلے۔ اور وہ یہ کہ "خیر" جو چیز ہے وہ بادشاہ کے اندر ہونی چاہیے، اگر معاذ اللہ وہ شرور کا مجموعہ ہوا برائیوں کا، وہ برائی پھیلے گی اس واسطے کہ مثل مشہور ہے کہ: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ۔ جیسا راجہ ویسی پرجہ، جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔ اگر بادشاہ نا ہنجاز ہے تو رعایا میں بھی نا ہنجاری پیدا ہوگی۔ اگر بادشاہ کے اندر بھلائیاں ہیں تو رعایا میں بھی بھلائیاں پیدا ہوں گی رعایا تو کوشش کرتی ہے کہ بادشاہ کے قریب تر چلے۔

اوصاف شاہی کے قوم میں آثار...... جب جنگ عظیم جاری تھی تو قیصر جرمنی نے تقریر کی اور اس نے تقریر میں چند جملے کہے تھے اس میں کہا تھا کہ اگر دنیا سے ترک مٹ جائیں تو شجاعت اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جہاں بھی بہادری پھیلی ہوئی ہے وہ ترکوں کی بہادری کا اثر ہے۔ تو اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ، اور اگر جرمنی مٹ جائیں تو سائنس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (اس زمانے میں اول نمبر پر سائنسی ایجادات میں جرمنی کا ملک تھا۔ امریکہ اب بعد میں بنا ہے۔)

تو اس نے کہا کہ اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ... اور اگر جرمنی مٹ جائے تو سائنس کا خاتمہ) اور اگر فرانس مٹ جائے تو عیاشی اور بے حیائی کا خاتمہ ہو جائے گا........ اور اگر انگریز دنیا سے مٹ جائیں تو ڈپلومیسی، مکاری، فریب، دغابازی ان چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو ہر قوم کی، ہر حکمران قوم کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور جب وہ قوم حکومت کرتی ہے تو پبلک میں وہ خصوصیت پھیلتی ہیں۔ اگر مکار بادشاہ ہے تو پوری قوم کے اندر مکر وفریب اور چالاکی اور بے ایمانی اور دغل فسل؟ یہ چیزیں پھیل جائیں گی، اور اگر بادشاہ دیانتدار ہے، متدین ہے تو پوری رعایا کے اندر دیانتداری کا اثر ہوگا۔

رعیت بادشاہ وقت کا ذوق اپناتی ہے...... خلفاء بنی امیہ میں سلیمان بن عبدالملک یہ بہت بڑا اونچے درجے کا خلیفہ ہے اسے نکاح کرنے کا بہت شوق تھا، بہت جوان اور بڑا مضبوط تھا، تو شرعی حدود میں نہ رہتا اگر چار سے زیادہ بیک وقت کرتا لہٰذا) چار سے زیادہ بیویاں تو کرتا نہیں تھا، مگر چھ مہینے میں طلاق دی، مہر ادا کیا، ایک اور سے نکاح کر لیا، پھر پانچ مہینے اسے رکھا، طلاق دی، پھر تیسری سے تو سینکڑوں نکاح کیے۔

گویا جائز عیاشی کہنا چاہیے، قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوا، مگر سینکڑوں نکاح کر ڈالے، تو اس زمانے میں امراء جب جمع ہوتے تھے کسی مجلس میں تو پوچھا جاتا تھا کہ آپ کتنے نکاح کر چکے ہیں؟ تو اس نے کہا بیس۔ آپ نے کتنے کیے؟ میں پچاس کر چکا ہوں، تیسرے کہتے ہیں۔ میں جناب ساٹھ نکاح کر چکا ہوں ایک صاحب کہتے ہیں میں نے سو نکاح کیے ہیں اب تک، تو اس زمانے میں مابہ الفخر یہی چیز بن گئی تھی کہ کتنے نکاح کیے، اس لیے کہ بادشاہ کا طریقہ یہی تھا کہ دے نکاح پہ نکاح، دے نکاح پہ نکاح۔

تو رعیت کے اندر بھی یہی جذبہ پھیل گیا کہ یہ ہی کوئی بڑی شان وشوکت کی چیز ہے... حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وہ خلیفہ عادل ہیں اور تین سو نفل رات میں روزانہ ان کی ثابت ہیں۔ باقی ان حضرات کے اوقات میں اللہ برکت دیتا ہے، دن بھر تو پبلک کی خدمت میں، مقدمات فیصل کرنے میں، ملک کے تحفظ میں، بقاء میں اور رات کو تین سو نفلیں بھی ..... تو کس وقت سوتے ہوں گے، معلوم ہوتا ہے چوبیس گھنٹے عبادت میں ہی گذارتے ہیں، تو تین سو نفلیں رات میں ثابت ہیں....... اس زمانے میں امراء میں فخر کی بات کیا تھی؟ جب کسی مجلس میں جمع ہوئے، آپ رات میں کتنی نفلیں پڑھتے ہیں، انہوں نے کہا بیس، آپ کے پڑھتے ہیں، میں تو چالیس پڑھتا ہوں، تیسرا کہتا ہے کہ میں پچاس نفلیں پڑھتا ہوں، میں سو نفلیں پڑھتا ہوں تو فخر کی بات یہ ہوگئی تھی کہ نفلیں زیادہ پڑھی جائیں تو ایک اصول ہے۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ویسی رعیت۔

خیر و برکت والی شاہی...... ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہوں تو وہاں تو شر اور برائی کا نشان بھی نہیں۔ اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ. ''ساری خیر و برکت تو اس کی ہے جہاں بھی خیر ہے وہ اس کی ہے، شر اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی''۔ نہ اس کی ذات میں ہے نہ باہر کی شر وہاں تک جاسکتی ہے۔ وہ بری ہے ہر شر سے تو جب خیر مطلق بادشاہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ عالم میں خیر پھیلے گی۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ بادشاہ کے اندر خیر کا غلبہ ہونا چاہیے اور جب اللہ بادشاہ ہے تو وہاں خیر ہی خیر ہے، وہاں شر کا کوئی نشان ہی نہیں، پھر وہ خیر ایسی ہونی چاہیے کہ اپنی ذات ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ نکل کر دوسروں تک بھی پہنچے، اگر اپنی ذات سے ایک شخص بہت باخیر ہے مگر دوسروں کو اس کی خیر سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو دوسروں کے حق میں خیر ہونا نہ ہونا برابر ہوا، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی خیر یہ ہے کہ:

پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے ذرے ذرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ بنانے والے تو وہ ہیں وجود انہوں نے دیا اور وجود ہی سرچشمہ ہے ساری خیر و برکت کا تو جس کو وجود دیا اس میں خیر پھیلی ہوئی ہے...... تو اللہ کی خیر وہ ہے جو اس کی ذات بھرپور ہے خیر سے، اور ذرے ذرے پر خیر اس کی پھیل رہی ہے، اسی کا نام ہے شریعت کی اصطلاح میں ''برکت''

برکت کا مفہوم...... برکت کہتے ہیں کہ کسی چیز کی خاصیت، بھلائی تو اس میں ہو اور وہ پھیل کر دوسروں تک پہنچے تو کہیں گے وہ شی مبارک ہے۔ اگر اس میں خیر نہ ہو یا اس میں کوئی اچھا خاصہ نہ ہو اور دوسروں تک نہ جائے تو کہیں گے خیر و برکت کی بات نہیں۔ پانی ہے مثلاً اس کی خاصیت ہے، ٹھنڈک اس لیے کہ ٹھنڈا خود بھی ہے دوسروں کے دلوں میں بھی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے اگر پانی پئیں اور ٹھنڈک نہ پہنچے تو کہیں گے کہ منحوس پانی ہے۔ برکت والا پانی وہ ہے جو خود بھی ٹھنڈک ہے اور دوسروں کو بھی پہنچ رہی ہے ہوا کے اندر خیر یہ ہے کہ اس کے میں رطوبت ہے اور خیر یہ ہے کہ جہاں جہاں ہوا پہنچتی ہے رطوبت پہنچتی ہے، اگر ہوا چلے اور رطوبت کے بجائے خشکی پھیل جائے، خشک سالی

کہیں گے بڑی منحوس ہوا چلی اور اپنی خاصیت نہ دکھلائی اس نے۔

تو جس شے میں خیر چھپی ہوئی ہو اور وہ خیر دوسروں تک پہنچ رہی ہو اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو اس کو کہتے ہیں ''برکت'' اس کو ظاہر فرمایا گیا کہ تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ. برکت والی ذات ہے اللہ کی۔

یعنی وہ، وہ ذات ہے کہ ہر خیر اس میں ہے اور اس کی ہر خیر اس کی مخلوق کو پہنچ رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ برکت والی ذات ہے۔ اگر ساری خیر اس میں ہوتی اور مخلوق کو نہ ملتی، تو نہیں کہا جاسکتا تھا برکت والی ذات خود بھی خیر سے بھرپور اور دوسروں کو خیر پہنچ رہی ہو، وہ مبارک ذات ہے۔

خیر میں مثلاً علم بہت بڑا کمال ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ سرچشمہ ہیں علوم کا اور اس نے ذرے ذرے کے اندر علم دے دیا ہے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق، تو برکت والی ذات ہے جو خود بھی علم سے بھرپور اور عالم کے ذرے ذرے میں اس کی شان کے مطابق علم بھیج دیا۔ عمل ہے تو خود بھی اس کی صناعی بے غبار اور بے داغ۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ. ① اللہ کی صنعت اتنی مضبوط ہے کہ اس میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی عیب نکال دے آسمان کو جو جیسا بنایا بس ویسا ہی بننا چاہیے، نہ کمی ہے نہ زیادتی، زمین کو جیسا بنایا ویسی ہی بنی چاہیے تھی، نہ کمی نہ زیادتی، زمین و آسمان کے اندر جتنا فضل ہے اتنا ہی رہنا چاہیے تھا، اس سے کم ہو تب بھی مضر تھا، زیادہ ہو تو بھی مضر تھا تو ہر چیز اپنے اپنے موقع پر فٹ اور اپنی اپنی مقدار پر ہے۔ جس فرماتے ہیں: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ: ② ''ہر چیز کے خزانے ہمارے ہاں بے انتہاء ہیں مگر ہم اتارتے ہیں عالم میں ایک مقدار اور اندازے کے مطابق''۔

جس کا تحمل کر سکے کائنات اتنا ہی دیتے ہیں، تو روشنی لامحدود ہے مگر سورج کو اتنی دی جتنا وہ برداشت کر سکے، اس کے ذریعے سے ہم تک اتنی پہنچائی کہ ہم تحمل کر سکیں۔ اگر اتنی تیز روشنی دیتے کہ ہر وقت لوگ چندھیائے رہتے اور بینائیاں زائل ہو جاتیں۔ تو کہتے کہ سورج برکت والا نہیں ...... یہ تو نحوست ہے، بینائیاں چھن گئیں تو اتنی روشنی دی کہ جس کو وہ تحمل کرے اور جس کو ہم برداشت کریں۔

چاند میں اتنی ٹھنڈک دی کہ جتنی اس کے مناسب تھی اور اتنی ہم تک پہنچائی کہ جس کو ہم برداشت کریں۔ تو خیر بھی ہے اور خیر پھیل بھی رہی ہے اور اس خیر میں اضافہ بھی ہے، مخلوق آرہی ہے اور جارہی ہے مگر خیر میں کمی نہیں ہے ایک سے دوسرے کو، دوسرے سے تیسرے۔ کو، تو علم کی خیر، صنعت کی خیر، عمل کی خیر، اخلاق کی خیر، یہ ساری چیزیں پھیل رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہی ذات بادشاہت کے لیے مناسب اور موزوں ہوسکتی ہے جو ہر خیر سے بھرپور ہو، علم ہے تو لامحدود، صفت ہے تو لامحدود اخلاقی کمالات ہیں تو لامحدود، برکات ہیں تو لامحدود تو مبارک حقیقت میں اللہ کی ذات ہے، جس میں کچھ اثر آجائے گا اسے کہیں گے برکت والا ہوگیا، مبارک ہوگیا دن میں ایک چیز اچھی

① پارہ: ۲۰، سورۃ: النمل، الآیۃ: ۸۸. ② پارہ: ۱۴، سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۲۱.

ڈال دی تو کہا جاتا ہے کہ بڑا مبارک دن ہے آج، اس میں تو بڑی بھلائیاں پہنچیں مخلوق کو۔ رات میں جو کوئی بھلائی نکل آئے، کوئی اچھا واقعہ پیش آئے تو کہا کرتے ہیں بھئی بڑی مبارک رات تھی آج کی، دیکھو کیسا واقعہ پیش آیا، تو مبارک وہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے اندر خود بھی خیر ہو اور وہ خیر دوسروں کو پہنچے اور اس میں گھٹنا نہ ہو بلکہ بڑھنا ہو، اضافہ ہی اضافہ ہو اس کو ''برکت'' کہتے ہیں۔

بادشاہت کی پہلی شرط...... تو جب اللہ کی ذات برکتوں سے بھرپور ہے تو بادشاہت کے لائق بھی وہی ہے، اور کوئی بادشاہی کے لائق نہیں۔ اگر ہوسکتا ہے تو اس کا نائب بننے کے لائق جیسے انبیاء علیہم السلام کو مبارک بنایا، ان کے علم میں برکت، ان کے عمل میں برکت، ان کے اخلاق میں برکت، ان کے افعال میں برکت، وہ کھانا سامنے رکھ دیں، اس میں برکت کہ ایک کا دو کو، دو کا دس کو کافی ہو جائے، برکت ہی برکت ہے....... تو وہ نائب بننے کے لائق ہیں، بادشاہ انہیں بھی نہیں بنایا۔ یوں فرمایا کہ بادشاہت ہماری ہے ہماری نیابت میں یہ حکمرانی کریں گے ...... تو بادشاہ کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ خیر سے بھرپور ہو، ارادے بھی اس کے نیک ہوں، بدنیت نہ ہو، علم بھی اس کا صحیح ہو غلط نہ ہو، اخلاق بھی اس کے اونچے ہوں گھٹیا نہ ہوں، افعال بھی اس کے صحیح ہوں بے قاعدہ اور بدنظمی لیے ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہا جائے گا کہ وہ بابرکت ہے تو فرماتے ہیں تبارک مبارک ہے اللہ کی ذات..... کیوں کہ ساری اس میں ہے، ساری خیر اس میں ہے، ساری خیر پہنچ رہی ہے اور خیر میں اضافہ ہے، کوئی کمی نہیں ہے، تو پہلی چیز تو آ گئی کہ بادشاہ کے لیے شرط تھی کہ اس کی ذات خیر سے بھرپور ہو، اس میں برائی کا نشان نہ ہو تو تَبَارَکَ کے لفظ سے تو اپنی ذات کی نوعیت بیان فرمائی کہ برکت والی ہے اور برکت کہتے اسے ہیں کہ ہر خیر جمع ہو اور دوسروں تک پہنچے۔

بادشاہت کی دوسری شرط...... دوسری چیز بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ جس ملک میں حکمرانی کرے وہ قبضہ میں ہو۔ اور جو قبضہ ہی سے باہر نکلا ہوا ہو یعنی حکام ہاتھ میں نہیں بدنظمی پھیل رہی ہے، بھاؤ غلط ہو رہے ہیں دَغَلُ فَسَل ہو رہا ہے تجارت میں، رشوتیں لی جا رہی ہیں اور حکومت کو قابو حاصل نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ ملک اس کے قبضہ میں نہیں ہے زبردستی لیا قبضہ میں مگر حکومت اپنے قبضے کو چلا نہیں سکتی، ہاتھ پلے کچھ نہیں پڑا، نہ پبلک کے ہاتھ پلے پڑا، نہ بادشاہ کے ہاتھ پلے پڑا اور یوں ڈگر اپنا چل رہا ہے تو چلتا رہا لیکن حقیقتاً جسے قابو میں آنا کہتے ہیں وہ وہ ہے کہ حکام کی اس پر گرفت ہو۔

ذرا ادھر ادھر نہ ہٹ سکے اور تھوڑا ہٹے تو بادشاہ کا علم وسیع ہے، تو وہ فوراً داروگیر کرتا ہے اور سب سنبھل جاتے ہیں۔ تو بادشاہ کے لیے علم کی وسعت اور قبضے اور اقتدار کی وسعت ہونی چاہیے، اگر ملک قابو میں نہ آئے تو ظاہر بات ہے کہ حکومت نہیں چل سکتی اور چلے گی تو ظلم اور جور کی حکومت ہوگی، بدنظمی کی حکومت، تو پہلی شرط یہ ہے کہ بادشاہ باخبر ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا قبضہ صحیح ہو، قابو سے نکلی ہوئی بات نہ ہو۔

شاہجہان کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ...... کہتے ہیں کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے ولی عہد بنانا چاہا تو دو بیٹے ہیں ایک اورنگ زیب اور ایک دارا شکوہ، تو دارا شکوہ کے لیے شاہ جہان کا خیال تھا کہ وہ اورنگ زیب سے بھی بڑا تھا اور باوجاہت بھی، اور ملکہ بھی یہی چاہتی تھی کہ دارا شکوہ ہندوستان کا بادشاہ بنے، اور عام پبلک کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے۔

لیکن وزیر اعظم کی رائے یہ تھی کہ اورنگ زیب بادشاہت کے لائق ہے، دارا شکوہ بادشاہت کے لائق نہیں، ملک کو سنبھال نہیں سکے گا، اس کے قلب میں اتنی جان نہیں۔ بہر حال یہ قصہ چل رہا تھا تو وزیر اعظم نے خیال کیا کہ دونوں کا امتحان کراؤں اور ساتھ میں ایک پارٹی کو لیا تا کہ جو امتحان ہو سب کے سامنے آ جائے، تو اس نے سب سے پہلے دارا شکوہ کے یہاں اطلاع کرائی کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

دارا شکوہ نے استقبال کا سامان کیا، ملک کا وزیر اعظم آ رہا ہے۔ تو بڑے حشم خدم اور بڑی آ ؤ بھگت کے ساتھ وزیر اعظم کو لایا اور اس کی شایان شان اس کا استقبال کیا اور مسند بچھائی اور اپنے برابر اس کو بٹھایا، قریب کیا، خیر وزیر اعظم بیٹھ گیا۔ اب وزیر اعظم نے کچھ سوالات کرنے شروع کیے کہ دکن میں چاولوں کا کیا بھاؤ ہے تو دارا شکوہ جواب نہ دے سکا، بنگال میں کیا بھاؤ ہے؟ پتہ نہیں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ کچھ پتہ نہیں.......... مگر تعظیم و تکریم بہت کی، خیر وزیر اعظم وہاں سے واپس آئے اس کے بعد اطلاع کرائی اورنگ زیب کے یہاں کہ میں آنا چاہتا ہوں، اس نے کہا آ جاؤ۔ اورنگ زیب نے نہ کوئی استقبال کا سامان کیا جیسا اس کا مکان تھا ویسے ہی بیٹھے رہے بلکہ اور ذرا لاابالی پن میں سر ور پھیلا کر بیٹھ گئے۔ وزیر اعظم آئے تو بہت استغناء تھا، کوئی تعظیم و تکریم خاص نہیں۔ اس واسطے کہ جانتے تھے اورنگ زیب کہ امتحان لینے آ رہا ہے تو ممتحن کی آ ؤ بھگت کے معنی تملق اور خوشامد کے ہوتے کہ میں ہوں تو نہیں اس قابل مگر پاس کر دینا نمبر دے دینا۔

اورنگ زیب چونکہ خود ملک کی تمام اطراف و جوانب کا علم رکھتا تھا، اس لیے اس میں استغناء تھا اور استغناء کے ہوتے ہوئے ضرورت نہیں کہ تملق اور خوشامد کرے، تو بہت استغناء سے بیٹھا۔ وزیر اعظم آئے تو خاص تکریم نہیں کی کہا:

السلام علیکم .... وعلیکم السلام !...... بیٹھ جاؤ!.... اب اس نے پوچھنا شروع کیا، تو اس نے چار ہی سوال کیے اورنگ زیب نے پورے ملک کی حقیقت بتلا دی کہ فلاں جگہ یہ بھاؤ ہے، فلاں جگہ حکام بد نظمی میں مبتلا ہیں اور فلاں جگہ عدل و انصاف ہو رہا ہے۔ فلاں حاکم صاحب ہیں، اس کی ذہنیت ایسی اور اس کی ذہنیت ایسی ....اور اس کی ذہنیت ایسی۔ الغرض پورے ملک کا ایک نقشہ کھینچ دیا، اب یہ بے چارہ چپ! اسے تو خود اتنی معلومات نہیں تھیں۔ حالانکہ وزیر اعظم تھے، جتنی اس شہزادہ کو معلوم تھیں۔

شاہ جہاں کے پاس آئے، شاہ جہاں نے پوچھا کیا اثر لے کر آئے، اس نے کہا جہاں پناہ تو یہ چاہتے ہیں کہ

بادشاہ داراشکوہ ہو۔اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ ہو اور اللہ ہی کا چاہا پورا ہوگا۔اس کے بعد حالات سنائے،تو بات وہی تھی کہ جو قابو پا سکے ملک پر وہی بادشاہ بنانے کے لائق ہے اور قابو وہ پائے گا جس کا علم صحیح ہو،علم کے وسائل صحیح ہوں کہ کہاں کیا چیز گزر رہی ہے؟ رعایا میں بے چینی ہے،بدنظمی ہے،سکون ہے،امن ہے،بدامنی ہے،حکام ظلم تو نہیں کر رہے،تاجروں کو دیکھا جائے کہ بلیک میں تو مبتلا نہیں ہیں،نفع خوری میں تو مبتلا نہیں ہیں،حکام رشوت ستانی میں تو مبتلا نہیں تمام چیزوں کی اطلاع ہو۔

اور علم ہونے کے بعد قدرت اور قوت بھی حاصل ہو کہ طاقت سے ان کو برائی سے ہٹایا جا سکے،اگر قبضے میں ہی نہیں ملک تو حکومت نہیں چل سکتی،اس لیے حق تعالی نے پہلی تو اپنی ذات کی شان فرمائی۔

تَبَارَکَ... مبارک ذات ہے،جس میں ہر خیر جمع ہے۔

ہر خیر کا سرچشمہ ہے اور اس سے خیر پھیل رہی ہے.....اور دوسری شان یہ ہے کہ اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ۔ اس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ذرا برابر ادھر ادھر نہیں چل سکتا۔ممکن نہیں ہے کہ اس کی منشاء کے خلاف کوئی چل جائے،ٹھیک ٹھیک اس کی منشاء پر چلے گا،جو قضاء و قدر اس نے کر دی دنیا اس کی پابند ہے،کائنات پابند ہے سارے جہان مل کر اسی کے اردگرد گھومیں تو بِیَدِہِ الْمُلْکُ

بادشاہت کی تیسری شرط......اور تیسری چیز فرمائی کہ: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ . ہر چیز پر وہ قادر ہے۔

اور جب قدرت اسے ہر چیز پر حاصل ہے،اقتدار ہر چیز پر حاصل ہے تو با اقتدار کوئی چوں نہیں کر سکتا،اسے تو ڈر ہوگا کہ کہیں مجھے معزول نہ کر دے تو تین وصف بیان فرمائے،ایک برکت اور ایک قدرت (قبضہ) اور ایک چیز اپنا اقتدار،تو تین چیزیں انتہائی ضروری ہوتی ہیں حکومت کے لیے۔یہ لامحدود طریق پر اسی کی ذات میں موجود ہیں تو بادشاہت کے لائق بھی اس کی ذات ہے۔

سورۃ ملک کے دیگر نام......یہ سورۂ ملک ہے جس کی تفسیر شروع کی گئی ہے۔اس سورۃ کا نام ''سورۂ مَانِعَہ'' ہے اور سورۂ مُنْجِیَہ بھی ہے۔مانعہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ عذاب قبر کو منع کرتی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قبر بیتِ ظلمت ہے،اندھیریوں کا گھرانہ ہے،یہاں تاریکی کے سوا کسی اور چیز کا نشان نہیں۔اور سورت تَبَارَکَ الَّذِیْ یہ قبر کی روشنی ہے،یا اس کا پڑھنے والا قبر کی روشنی مہیا کرتا ہے۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ سوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تَبَارَکَ الَّذِیْ اور الٓمّٓ سَجْدَۃ یہ دونوں سورتیں آپ پابندی کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں سورتیں قبر کی روشنی ہیں۔اس لیے اس سورۃ کا نام رکھا گیا ''مَانِعَۃ ''یعنی مانعت ظلمت،تاریکیوں کو دفع کرنے والی اور قبر میں اندھیری کوٹھڑی کو ایک روشن میدان بنا دینے والی ہے۔اس وجہ سے بھی کہ اس کی تلاوت کا خاصہ طبع نورانی ہے تو گویا تاریک قبر اس کی تاثیر سے روشن ہو جائے گی۔

کمالِ مملکت......اس کا نام سورۂ ملک بھی ہے جس میں اللہ کی حکومت کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں اور اللہ کی حکومت لامحدود ہے، سارے جہانوں میں اسی کی حکومت ہے تو ملک کی اندر وسعت داخل ہے۔ملک کہتے ہی اس کو ہیں کہ پھیلا ہوا ہو، پھیلا ہوا نہیں ہوگا تو اسے ہم صوبے کی حکمرانی اور ریاست کہیں گے، اور تنگ ہو جائے گی تو اسے ضلع کی حکومت کہیں گے، اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قصبے کی حکومت کہیں گے...اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قبیلے کی حکومت کہیں گے، اور زیادہ تنگ ہو جائے گی تو اسے گھر کی حکومت کہیں گے تو حکمرانیوں میں ملک کی حکومت سب سے زیادہ وسیع ہے۔اور اللہ کا ملک ہی ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے، جہاں غیر اللہ کی حکمرانی ہے وہ (بھی) سب اسی کا ملک ہے اسی لیے اس کی وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں، اس ملک میں عالم دنیا بھی داخل ہے اور دنیا کہتے ہیں دنی کو یعنی خسیس اور ذلیل کو، تو سب سے زیادہ ذلیل عالم یہ ہے اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔اِنَّ الدُّنْيَا لَا تَزِنُ عِندَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ. ① کہ پوری دنیا مل کر اللہ کے یہاں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتی جیسے مچھر کی ایک ٹانگ ہوتی ہے:۔تو یہ بے وقعت عالم ہے۔

کمالِ قدرت......یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس بے وقعت عالم میں ایسے افراد پیدا کیے کہ وہ سارے جہانوں پر اپنے کمالات کے سبب سے بڑھ جائیں....تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اس سے اس دنیا کو اظہار قدرت کے لیے بنایا۔اگر انسان کو پیدا کرتے اور وہ فرشتوں میں رہتا تو وہاں اگر نورانیت ہوتی تو زیادہ عزیز بات نہ سمجھی جاتی اس لیے کہ فرشتے بھی نورانی ہیں، ان کا ملک بھی نورانی، وہ خود بھی ایمانی ملک ہے، وہاں کفر کی کھپت ہی نہیں۔

وہاں غلاظت نہیں، نجاست نہیں، صاف ستھرا ملک ہے، پاک وصاف، تو اس میں رہ کر انسان ترقی کرتا تو قدرت کا پوری طرح سے نمونہ ظاہر نہ ہوتا۔لیکن لا کر رکھا انسان کو اس جہان میں کہ یہ گندگیوں کا عالم ہے، ہر طرف نجاست حتیٰ کہ انسان کی پیدائش بھی نجاست سے، ایک گندے قطرے سے ہے۔

پھر اس گندے قطرے کو پرورش دیتے ہیں، نو مہینے تک ایک گندے عالم میں جسے رحم مادر کہتے ہیں جو ماسوائے حیض اور گندے پانی کے اور کچھ نہیں، غذا انسان کی وہ گندی، حیض کا خون بند ہو جاتا ہے وہ غذا بنتا ہے۔اسی سے اجزاء بنی آدم کے بنتے ہیں...نہایت ہی ظلمانی عالم ہے، نہ اس میں روشنی ہے، نہ چمک، سوائے اندھیریوں کے اور پھر اندھیریوں میں بھی تین اندھیریاں فرمائی گئیں۔يَخْلُقُكُمْ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِىْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ② "تمہیں ہم نے پیدا کیا ہے ماں کے پیٹ میں دور بہ دور یعنی تمہاری خلقت میں مختلف دور آئے ہیں"۔

کبھی انسان نطفہ ہے، بنص حدیث چالیس دن گذرنے کے بعد خون کی بوند بن گیا، پھر چالیس دن گذرے تو ایک مضغۂ گوشت بن گیا.......پھر چالیس دن گذرے تو اس میں ہڈیاں پہنا دی گئیں، پھر چالیس

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی فی سننه ولفظه: لو كانت الدنيا تعدل عندالله جناح بعوضة ماسقى كافراً منها شربة ماءٍ ج:۸ ص:۲۹۹. ② پارہ:۲۳ سورة: الزمر، الآية:۶.

دن گزرے تو کھال بنادی گئی ،اس کے بعد روح ڈالی جاتی ہے .....تو پیدائش بھی گندے قطرے سے ،غذا بھی گندی، مکان گندااور وہ مکان بھی اندھیرااور اندھیریاں بھی تین، ایک اندھیری کوٹھڑی کہ ماں کا پیٹ ہےاس میں کوئی چمک نہیں، کوئی نورانیت نہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے جس کو رحم مادر کہتے ہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ تنگ اور تاریک ہے، اور اس میں پھرایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے وہ ہے مشیمہ وہ جھلی جس میں لپٹاہوا بچہ پیدا ہوتا ہےاور دایہ اس کو کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ، اس میں رحم مادر، رحم مادر میں وہ مشیمہ یعنی وہ جھلی ،تو تین اندھیری کوٹھڑیوں میں انسان کو بنایا اور گندے قطرے سے بنایا اور گندی غذا سے بنایا اس گندے انسان کو جب پاک بنایا تو اتنا پاک بنایا کہ فرشتوں سے بھی بازی لے گیا،تو اس میں اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انسان کو جنت ہی میں رکھتے اور وہیں ترقی دیتے تو کوئی زیادہ کمال نہ سمجھا جاتا۔

ایک پاک عالم ،نورانی عالم اس میں اگر نورانی مخلوق بن گئی تو یہ بنا کوئی تعجب انگیز نہیں، عجیب چیز یہ ہے کہ ظلمتوں میں سے، گندگیوں میں سے پاک باز انسان نکالا ،تو اس سے خدا کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کو لاکر رکھا دنیا میں کہ دنیا میں خود گندگی ، کھانا پینا ، بول و براز ،نجاست اور گندگی اس سب کے اندر رہ کر پھر انسان پاکباز بنتا ہے۔تو اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔

سورۃ ملک میں وسعت قبر اور مانع عذاب قبر ہونے کی تاثیر کیوں ہے؟......تو ملک حق تعالیٰ کا یہ ساری کائنات ہے، اس میں کم تر عالم یہ دنیا ہےاس سے بڑے بڑے عالم ہیں:

تاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ایک ایک ستارے کو دیکھو، سورج کو دیکھو، آج کل کی تحقیقات کے مطابق چار کروڑ گنا بڑا ہے زمین سے، یعنی چار کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں اس میں اور یہ چھوٹا ستارہ ہے اور بڑے بڑے ستارے ان گنت ہیں، ان کی بڑائیوں کی کوئی انتہا نہیں، پھر ان کے اوپر آسمان ہیں سات، ان کے اوپر جنتیں ہیں سو (۱۰۰) اور ان کے اوپر پھر عظیم الشان دریا ہے کہ جس کی ایک ایک موج پورے آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہوتی ہے اس کے اوپر عرش عظیم ہے اور کرسی ہے۔

تو حق تعالیٰ بادشاہ ہیں اور شہنشاہ ہیں، فقط ایک ملک کے نہیں ہفت اقلیم کے نہیں ۔صرف دنیا جہان کے نہیں بلکہ کروڑوں جہانوں کے بادشاہ ہیں اور اتنی بڑی بادشاہت میں کوئی ذرہ بھی بغیر ان کی مشیت کے، اور ان کے حکم کے اور اذن کے حرکت نہیں کرسکتا۔تو ملک کے اندر وسعت داخل ہے اللہ کے ملک میں تو کوئی حد وسعت کی نہیں۔ اس سورۂ ملک میں کیونکہ اللہ کے ملک کی وسعت بیان کی گئی ہے۔اس واسطے کہ اس میں خاصیت یہ ہے کہ یہ وسیع کر دیتی ہے قبر کو یہ قبر کو اتنا وسیع بنا دیتی ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: مؤمن جب سوال و جواب میں پورا اترتا ہے تو اس کی قبر وسیع کی جاتی ہے...اتنی وسیع کہ تا حد نظر وہ میدان ہی میدان باغ و بہار نظر آتا ہے۔

تو تنگ جگہ کو اتنا وسیع بنا دیا کہ حد نظر تک وہ وسعت محفوظ ہوتی ہے اور حد نظر حسی تو یہ ہے کہ آدمی جب لیٹتا ہے

تو ایک دم اس کی نگاہ آسمان تک پہنچ جاتی ہے...

بہرحال وسعت نظر اتنی ہے کہ وہاں تک پہنچتی ہے یہ حسی نظر ہے اور وہاں کی نظر روحانی ہوتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی ہوگی۔ تو قبر کو اتنا بڑا عالم بنادیتے ہیں کہ وہ دنیا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے تو گویا اس سورۃ کو ''مانعہ'' کہا گیا ہے کہ وہ ظلمت کو روکتی ہے اور اتنی نورانیت پیدا کرتی ہے کہ تاحد نظر نور ہی نور نظر آتا ہے، تو ''مانعہ'' اس بناء پر فرمایا گیا ہے۔

اس سورۃ کے منجیہ نام رکھے جانے کی وجہ...... اور اس سورۃ کا دوسرا منجیہ نام ہے، یعنی نجات دینے والی تو عذاب قبر سے بھی نجات دیتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ بائیں طرف سے عذاب آتا ہے تو روکتی ہے، دائیں طرف سے آتا ہے تو روکتی ہے اور اوپر سے، نیچے سے، غرض چہار طرف سے روکتی ہے تو بندے کو عذاب قبر سے نجات دے دیتی ہے۔ تنگی سے نجات دیتی ہے ظلمت سے نجات دیتی ہے، عذاب سے نجات دیتی ہے، اس واسطے اس کا نام منجیہ بھی ہے۔

برکات در برکات...... اور ملک اس واسطے اس کا نام ہے کہ اللہ کی شہنشاہی کے اصول اس میں بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں اسی انداز سے ہم نظام قائم کریں اور خلیفۃ اللہ بن کر اللہ کی حکومت کو دنیا میں پھیلائیں۔ اس واسطے اس کا نام ملک ہے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ ملک میں سب سے پہلے چیز جو آتی ہے وہ ہے بادشاہ کی ذات، اس کے بعد بادشاہ کی صفات آتی ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ کے افعال آتے ہیں۔ اور اس کے بعد افعال کے آثار کہ اس سے ملک میں اس کی حکومت کے کیا اثرات پھیلے۔

اس میں سب سے پہلے تو اللہ کی ذات کو بیان کیا گیا ہے ''تبارک'' کے لفظ سے کہ بڑی مبارک ذات ہے، برکت والی ذات ہے تو برکت کے معنی میں نے یہ عرض کیے تھے کہ ساری خیر کا مجموعہ اور پھیلنے والی خیر تو خود ذات بادشاہ خیر کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اور اس سے خیر پھیلتی ہے تو جہانوں میں پھیل رہی ہے، ولادتیں ہو رہی ہیں، حیات ہو رہی ہے، زندگی ہو رہی ہے۔ زندوں میں سے زندہ پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر ان میں سے اور پیدا ہو رہے ہیں انسان میں سے انسان، پھر انسان کی ضرورت کے لیے جانور بنائے۔ تو جانور میں سے ایک جانور اس میں سے دوسرا، اس میں سے تیسرا، کروڑوں جانور پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر انسان کی ضرورت کے لیے مثلاً درخت اور نباتات ہیں تو درختوں میں یہ برکت کہ ایک درخت میں قلم لگایا تو دوسرا، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا، لاکھوں کروڑوں، اربوں، کھربوں درخت بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جمادات کو دیکھو کہ پہاڑ ہیں، پہاڑوں میں پتھر ہیں، پتھر بڑھ بڑھ کر پہاڑ بن گئے ہیں۔ ریت جمع ہوا وہ پہاڑ ہو گیا، پہاڑوں میں سے پہاڑ نکلتے چلے جا رہے ہیں تو برکت والے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ عالمین کی ذات بھی بابرکت کہ ہر خیر کا مجموعہ اور سرچشمہ اور اس برکت کے آثار اتنے کہ برکت در برکت پھیلتی چلی آ رہی ہے، ملک بھر میں برکات کا ظہور ہے۔ تو اللہ کی ذات یعنی بادشاہ بحیثیت ملک اور بادشاہ ہونے کے اس کی شان یہ ہے کہ وہ خیر کا سرچشمہ اور پھیلنے والی خیر ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ''برکت

’’کہ خود ذات میں بھی خیر اور اور وہ پھیلے اتنی کہ کوئی انتہا نہ ہو، تو اللہ سے مبارک کس کی ذات ہے؟ برکت والی کس کی ذات ہے؟ تو فرمایا: ’’تبارک‘‘ بڑی برکت والی ذات ہے جدھر دیکھو برکت پھیل رہی ہے۔ پھر فرمایا کہ اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ اس کی ذات وہ ہے جس کے قبضے میں ہے ملک۔ اور ملک چھوٹا موٹا نہیں۔ کروڑوں، اربوں، کھربوں جہان ہیں۔ اور ان کی یہ شاخ در شاخ برکات سب اس کے قبضے میں ہیں کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا کہ جب تک کہ اس کی مشیت نہ ہو، تو قبضے کا یہ عالم ہے ملک کے اوپر۔

پھر نظام حکومت بھی ہے کہ جو چیز جس طرح بنادی وہ اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ سورج چاند ہے، زمین ہے، اپنے ایک مرکز کے اردگرد سارے اس کے افعال چکر کھا رہے ہیں۔ حرکت کر رہے ہیں۔ تو بِیَدِہِ الْمُلْکُ ساری چیزیں اس کے قبضے میں ہیں۔ نظام اس کے قبضے میں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب نظام پر بادشاہ کا قابو ہے تو ذرہ نہیں ہل سکتا۔ تو اس کی مملکت کتنی پر امن ہوگی، کتنی بابرکت ہوگی۔

عالمی بے برکتی کے عوامل...... اب جو بے برکتی پیدا ہوتی ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ جہاں انسان کا دخل آ گیا ہے (اسے حکم تو دیا گیا تھا) کہ تو ہمارے نمونہ پر چل، وہ اپنی حرص و ہوا سے اپنا ذاتی اقتدار چاہتا ہے اور اللہ کے اقتدار کو بھول کر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرتا ہے۔ اس کی طاقت کو فراموش کر کے اپنی طاقت پر غرہ کرتا ہے۔ جب وہ اپنی طاقت پر غرہ کرے گا، دعویٰ کرے گا۔ دوسرے اس کے مخالف بنیں گے تو ملک میں بدنظمی پھیلے گی، اگر وہ اپنی جاہ چاہے گا تو ہر انسان جاہ پرست ہے، وہ بھی جاہ کی طرف چلے گا اگر دو نگاہیں جمع ہوں گی تو ٹکرائیں گی، ایک دوسرے کو گرانا چاہے گا، وہیں سے فتنہ و فساد پھیلے گا۔ تو جہاں پر حق تعالیٰ کی تکوینی حکومت ہے اس میں کوئی بدنظمی نہیں، ہر چیز اپنے محور پر چل رہی ہے اور جہاں تکمیلی چیز آئی جس میں انسان کو واسطہ بنایا تو اگر انسان درست، پاکیزہ ہیں، تب تو اللہ کے نظام کو چلائیں گے، جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ ذرہ برابر ان کے دلوں میں اپنی ذات کا اقتدار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ نے انہیں سب سے زیادہ با اقتدار بنایا ہے، اپنی ذات کے بارے میں انبیاء علیہ اسلام کو جاہ پسندی کا خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا اسی طرح سے جو انبیاء کے بلاواسطہ متبعین ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وہ بھی اسی انداز پر اللہ کی حکومت کو چلاتے ہیں کہ ان میں نہ جاہ پسندی ہے۔ نہ مال پسندی ہے نہ مال کی محبت، نہ جاہ کی محبت۔ فقط جاہ ہے تو اللہ کے سامنے ہے، ملک ہے تو اللہ کے سامنے ہے، اپنے کو خادم کی حیثیت سے رکھتے ہیں ان کے دل میں قطعاً نفسانیت کے وسوسے نہیں ہوتے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔

نظام حکومت میں تزکیہ کے آثار...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ تنہائی میں ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے یہ بھی نہیں کہ کوئی سامنے ہو کہ دکھلانے کو کہہ رہے ہوں، تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں حیرت سے بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے کو خطاب کر کے: بَخٍ بَخٍ یَاابْنَ الْخَطَّابِ اَصْبَحْتَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ. (1) حیرت ہے اے

(1) كتاب الزهد لابن ابى عاصم، زهد عمر بن الخطاب رضى الله عنه ج: ١ ص: ١١٥.

عمر تو امیر المؤمنین؟ تیری بھی یہ قابلیت ہے کہ تو خلیفہ بنایا جائے (امیر المؤمنین بنایا جائے) اس درجہ بے نفسی کہ تنہائی میں بیٹھ کر حیرت میں ہیں کہ مجھے کس طرح خلیفہ بنادیا۔ مجھ میں تو یہ لیاقت نہیں تھی۔

تو ان لوگوں کے قلوب اتنے پاک اور صاف ہیں کہ سلطنت اتنی بڑی کہ سلاطین عالم کانپتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر......اور خود حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھو تو ان کے دل میں خیال بھی نہیں کہ میں کوئی چیز ہوں۔ حیرت سے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ تو امیر المؤمنین........؟

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور بلا واسطہ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن قلب کی صفائی اور تزکیہ کا یہ عالم ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی زبان باہر نکال کر ایک ہاتھ سے پکڑا، دوسرے ہاتھ سے اسے لکڑیاں مارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: هٰذِهٖ اَوْرَدَنِیْ الْمَوَارِدِ. ① یہ زبان ہے جس نے مجھے مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے، مصائب میں پھینکا اور ہلاکتوں میں ڈالا۔ خدا جانے میری زبان کیا بکواس کرتی ہو، کیا چیزیں کہتی ہو، میرے عمل کہیں ضائع نہ ہو جائیں، اس درجہ بے نفسی کا عالم ہے کہ زبان پر اعتماد نہیں کہ کوئی کلمہ خلافِ شرع نہ نکل جائے، کوئی جھوٹ نہ نکل جائے، تو زبان کو لکڑیاں مار رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس دن کچھ ذرا سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، کپڑا کوئی کم خواب کا نہیں تھا، کوئی اعلیٰ نہیں تھا، یہی معمولی زمینداروں کے کپڑے، بیٹھے بیٹھے ایک دم گھبرا کر فرمایا کہ قینچی لے آؤ، قینچی لائی گئی۔ تو ایک آستین یہاں سے کاٹ دی اور ایک یہاں سے کاٹ دی، بدہیئت بنا دیا کرتے کو، لوگوں کو حیرت ہوئی۔ عرض کیا کہ:۔

امیر المؤمنین! ایک اچھے خاصے کرتے کو آپ نے خراب کر دیا، بدہیئت بنا دیا، اگر آستین برابر کاٹ دیتے تو چلو نیم آستین ہی کا کرتا ہو جاتا۔ ایک ہیئت تو رہتی، ایک کو تو مونڈھے سے کاٹ دیا، ایک کو آدھے سے کاٹ دیا۔ فائدہ کیا ہوا؟۔

فرمایا: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی کپڑا پہن کر اترانے لگتا ہے تو غضب خداوندی اس پر اترتا ہے اور منڈلانے لگتا ہے۔ اگر توبہ نہ کی تو غضب آپڑتا ہے، توبہ کی تو غضب واپس ہو جاتا ہے۔

تو یہ کپڑا پہن کر میرے دل میں اتراہٹ کا وسوسہ گزرا کہ میں بھی کوئی چیز ہوں۔ میں نے دیکھا کہ غضب الٰہی اوپر آرہا ہے اس لیے میں نے گھبرا کر قینچی منگوائی، بدہیئت بنایا، جس سے میرے قلب کا وسوسہ دور ہو گیا اور غضب خداوندی اوپر واپس ہو گیا۔ تو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے نفس کے بارے میں انہیں خطرہ بھی نہ گزرے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔ وہ تو اللہ ہی کی حکومت چلائیں گے، اپنی حکومت نہیں چلائیں گے، نہ جاہ کے خطرات ہوں نہ مال کی محبت ہو۔

حکومت کی اہلیت...... حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، خراج کی رقمیں اور فئے کی رقمیں اور جزیہ کی رقمیں بھری ہوئی تھیں تو دیکھ کر فرمایا: یا دنیا غری

① مؤطا مالک، باب ماجاء فیما یخاف من اللسان ج: ۲ ص: ۹۸۸ رقم: ۱۷۸۸.

غیری اے دنیا! دھوکہ میں کسی اور کو ڈالنا، ہم تیرے دھوکے میں آنے والے نہیں ہم رکھنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ تقسیم غربا میں شروع کرو، صبح سے شام تک پورا خزانہ خالی ہو گیا اور یہ کہہ کر واپس ہو گئے یَا دُنْیَا غُرِّیْ غَیْرِیْ دھوکا کسی اور کو دینا اے دنیا! ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں نہ ہم اتراہٹ میں آنے والے ہیں نہ کبر ورعونت میں۔ تو جن لوگوں کے قلوب اتنے صاف تھے کہ نہ محبت مال کا نشان، نہ محبت جاہ کا نشان، وہی اہل اور احق تھے کہ اللہ کے نائب بنیں اور اس کی حکومت چلائیں۔ تو جہاں تکمیلی حکومت ہے یعنی انسانوں کے واسطے سے حکومت ہے، اگر ایسے انسان ہوں تو وہ حکومت پاکباز ہے، اس حکومت میں امن ہے، امان ہے، برکات ہیں، خیر ہے، ساری چیزیں ہیں، لیکن اگر دوسری قسم کے انسان آجائیں جو اللہ کے اقتدار کو چھوڑ کر اپنا ذاتی اقتدار چاہیں، بجائے بندگی کرنے کے خدائی شروع کریں مال کی محبت میں غرق ہوں ....اور خود غرضی کی وجہ سے مال بٹورنے کی فکر میں ہوں تو رعایا کا ناس ہوگا۔ ظاہر ہے ملک کے اندر بدنظمی پیدا ہوگی، تو یہ بدنظمی، اللہ کی حکومت میں نہیں ہے۔ اس نے اپنی حکومت میں جب انسان کو واسطہ بنایا تو اس انسان نے بدنظمی پھیلائی۔

جب تک وہ انسان رہے جو غیر محبّ جاہ اور غیر محبّ مال تھے جنہوں نے خالص اللہ کی حکومت دنیا میں کی، اور جب ایسے آگئے جن کے قلوب صاف نہیں تھے نہ مال کی محبت سے بری تھے، نہ جاہ کی محبت سے، وہیں آکر خرابی واقع ہوئی۔ تو اللہ نے بتلا دیا کہ حکومت تو ہماری ہے، مگر کوئی اس کو ڈھنگ سے چلاتا ہے اور کوئی بے ڈھنگے پن سے چلاتا ہے، مگر چلوائیں گے تمہارے ہاتھ سے تاکہ نظام تمہارے ہاتھوں قائم ہو، اگر ہمارے ہاتھ سے نظام رہے، تمہارا واسطہ نہ ہو تو انسان مجبور محض ظاہر ہوگا۔ کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اگر مجھے اپنی خلافت و نیابت دیتے تو میں یوں چلا کے دکھاتا، مگر اب نہیں کہہ سکتا۔ ہم بتلائیں گے کہ جنہوں نے چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں اور جنہوں نے نہیں چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں۔ یہ مستحق ہیں ہماری رحمت کے اور یہ مستحق ہیں ہمارے عذاب کے، تو ایک بلا واسطہ حکومت الٰہی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین نظم رکھتی ہے۔ ایک بالواسطہ ہے تو واسطے جیسے ہوں گے ویسے حکومت بنے گی مگر اصول انہیں وہی اختیار کرنے پڑیں گے جو اللہ کی حکومت کے ہیں۔ اس لیے اس سورۂ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کے اصول بیان فرمائیں ہیں کہ شہنشاہی کس طرح چلتی ہے۔

عناصر بادشاہت ......تو ذات کو بیان کیا کہ بادشاہ وہ ہونا چاہیے کہ جو 1 خیر کا سرچشمہ ہو، 2 نیت بھی پاک ہو، 2 علم بھی اعلیٰ ہو، 4 عمل بھی صاف ہو، 5 اخلاق بھی بلند ہوں، اس کے اندر سخاوت بھی ہو اور عدل بھی ہو، سخاوت میں آکر فضول خرچی میں نہ آئے، عدل اس کی روک تھام کرے اور عدل میں آکر اسراف نہ داخل ہو۔ ہر چیز اپنے محل پر ہو تو بادشاہ کے اوصاف میں یہ ہے کہ بخیل نہ ہو، اگر بخیل ہوگا تو رعایا تنگ ہو جائے گی، سخی ہوگا تو رعایا کے اندر تَرَفُّ الْحَالِی پیدا ہوگی، مگر اس کے ساتھ عدل ہو، کیوں کہ اگر ظلم کے ساتھ سخاوت ہو تو بادشاہ جانب داری کرے گا، ایک طبقے کو دے گا اور ایک کو محروم کرے گا، ملک میں بدنظمی پیدا ہوگی، لیکن اگر سخاوت کے

ساتھ عدل کرے گا تو سب کو برابر برابر ملے گا، کسی کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے ماں باپ کے لیے کہ اولاد کے اندر سخاوت کرو، مگر عدل کے ساتھ، سب کو برابر برابر دو، ایک نظر سے دیکھو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ محبت تو ساری اولاد سے انسان کو طبعاً ہوتی ہے مگر ایک سے کچھ زیادہ دوسرے سے نہیں ہوئی،........غیر اختیاری طور پر لیکن معاملہ کرلے میں چاہے تو مساوات کہ جتنا ایک کو دے اتنا ہی دوسرے کو، اگر برابری نہ رکھی تو ان میں باہم لڑائی اور منافقت پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر دونوں مل کر باپ کے مدمقابل آئیں گے تو گھر کی حکومت میں بدامنی پیدا ہو جائے گی۔ بدنظمی پیدا ہوگی، اس لیے بادشاہ کو چاہیے کہ سخی بھی اعلیٰ درجے کا ہو اور ساتھ ہی عادل بھی اعلیٰ درجہ کا ہو۔

سخاوت میں اسراف سے عدل روکتا ہے، اور عدل کی برکت سے سخاوت اپنے اصل محور پر چلتی ہے، اسی کے ساتھ بادشاہ میں دو چیزیں اور ضروری ہیں ایک مدبر اور شجاعت، بہادر بھی ہو، قلب کا جری بھی ہو، اگر بادشاہ بزدل ہوگیا تو پھر وہ کسی پر غالب نہیں آسکتا، اس میں وہ عناصر ابھر جائیں گے کہ جو ظالم ہیں اور فسادی ہیں انہیں کا غلبہ ہوگا اور تدبر کے بے بیچارے پیچھے رہ جائیں گے۔

لیکن اگر بادشاہ کے اندر تدبر ہے تو وہ اپنی تدبیر سے سب کو یکساں، اپنی جگہ قائم رکھے گا، ساتھ میں شجاعت اور بہادری بھی ہو، بزدل نہ ہو، اگر بزدل ہوگا تو دشمن ملک کا راستہ دیکھ لے گا اور مدافعت کی قوت نہیں ہوگی تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔ تو چار چیزیں لازمی ہیں بادشاہ کے لیے، ایک سخاوت اور ایک عدل اور ایک شجاعت اور ایک تدبر ، یہ چار چیزیں جمع ہوں گی تب بادشاہی اصول پر چلے گی تو ان چاروں کے مجموعہ کو کہا گیا ہے برکت اور خیر، تو تَبَارَکَ الَّذِیْ برکت والی ذات خیر ہے کہ ہر چیز حد کمال پر ہے اور نہ صرف حد کمال پر بلکہ وہی سرچشمہ تمام خیر و برکت کا ہے ، دوسروں کو خیر ملتی ہے تو اسی سے ملتی ہے۔ اور بِیَدِهِ الْمُلْکُ ملک اس کے قبضے میں ہے، اس کے ہاتھ کے نیچے ہے کہ ایک ذرہ بھی ادھر ادھر نہیں ہل سکتا، اس کے ساتھ ساتھ قدرت بھی ہے کہ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کی قدرت بھی بڑی وسیع ہے، قابو ہی میں نہیں بلکہ قادر بھی ہے ہر چیز پر۔ اور قدرت عام بادشاہوں میں تو یہ ہوتی ہے کہ جب جیل بھیجنے کو لایا تو جیل بھیج دیا، کسی کو سزا دے دی، کسی کو انعام دے دیا۔ قدرت ہے۔

بلندیٔ قدرت...... لیکن اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ موت اور زندگی کی باگیں بھی اس کے ہاتھ میں ہیں، کسی انسان یا کسی بھی مخلوق کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ڈور نہیں ہے کہ جس کو چاہے زندہ کر دے جس کو چاہے موت دے دے۔

اور زندگی اور موت دینے کے یہ معنی نہیں جو نمرود نے سمجھے کہ یہ مرگیا، ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اس کے دربار میں آکر کہا کہ خدائی کا دعویٰ مت کر، وہ بھی خدائی کا مدعی تھا، خدائی کا دعویٰ مت کر، خدا کو مان اور اپنے مالک کو پہچان، کہتا ہے کہ کون مالک ہے میرے سوا؟ فرمایا: اَلَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ ''وہ مالک ہے جو زندگی

بھی دیتا ہے اور موت بھی دیتا ہے''۔

اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں، اسی وقت دو قیدی نکلوائے جیل سے ایک کے قتل کا حکم دیا اور ایک کو چھوڑ دیا، کہنے لگا، دیکھو ایک کو مار دیا، ایک کو زندہ کر دیا، اس کوڑھ مغز نے یہ نہ سمجھا کہ وہ جو زندگی تھی جس کو تو نے قتل کیا وہ تیری دی ہوئی تھی؟ پھر قتل ہی تو کیا، قتل سبب بنتا ہے موت کا، لیکن موت نہیں دے سکتا کوئی

موت کہتے ہیں جان نکالنا، اپنے قبضے سے اور قدرت سے رگ رگ سے اندر سے حیوۃ کو نکال دینا، یہ تھوڑا ہی کر سکتا تھا، اس نے قتل کر دیا، قتل پر موت مرتب ہوئی مگر دینے والے موت کے حق تعالیٰ ہی تھے۔ اگر یہ قتل کر دیتا، گردن کاٹ دیتا اور وہ یہ چاہے کہ زندگی نہ نکلے نہیں نکل سکتی۔ واقعات ہیں ایسے شہداء کے بہت سے کہ ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا انہوں نے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرا ہاتھ کٹ گیا جھنڈا انہوں نے منہ میں لے لیا اور اس کے بعد جھنڈا منہ سے گر گیا تو انہوں نے لیٹے ہی لیٹے لڑھک کر کئی ایک کو مار ڈالا، اس کے بعد کہیں جا کر جان نکلی۔ تو محض قتل ہونے سے جان نکلنا ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہے تو جان جاتی ہے، ورنہ مقتول کے اندر بھی جان رہتی ہے، تو بہر حال اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (القرآن) موت بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، حیات بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جس کو چاہے زندگی دے جس کو چاہے موت دے۔

زندگی کی حقیقت ...... زندگی دینے کے معنی ہیں ''عطائے وجود'' وجود دے دینا دوسرے کو تو ظاہر بات ہے کہ انسان میں قدرت نہیں ہے کہ دوسرے کو وجود دے دے، اس لیے کہ خود اس کا وجود ہی اس کے قبضے میں نہیں۔ اگر بالفرض اس نے اس کو اولاد دی تو وجود دینے والا باپ یا ماں نہیں، وہ زندگی دینے کا اور وجود دینے کا سبب بنا ہے۔ لیکن دینے والا دوسرا ہے، اگر اس کے ہاتھ میں، قبضے میں وجود ہوتا تو یہ خود کبھی نہ مرتا، کون موت کو پسند کرتا ہے، اگر حیات قبضے میں ہو تو آدمی موت کو روک لیا کرتا۔

اگر زندگی دینا قبضہ میں ہو۔ تو جن کے اولاد نہیں ہوتی وہ ضرور اولاد کو پیدا کر لیا کرتے، اولاد پیدا ہونے کے اسباب سارے مہیا کرتے ہیں اور برس گزر جاتے ہیں اولاد نہیں ہوتی، کوئی دعائیں کراتے ہیں، کوئی تعویذ کراتے ہیں کوئی طبیبوں کے پاس جاتے ہیں۔ اگر قبضے میں زندگی تھی تو کیوں نہ دے دی اور بچے کو پیدا کر لیا، پھر اگر کوئی مر رہا ہو تو کسی کے قبضے میں نہیں کہ پل بھر کے لیے روک لے زندگی کو۔ ساری دنیا کے خزانے جمع کر لو اور یہ چاہو کہ ایک منٹ کے لیے اس میت کو روک لو، جان نہ نکلے تو یہ قبضۂ قدرت میں نہیں، سب عاجز بنے ہوئے دیکھتے ہیں۔

نزع ہو رہا ہے، سانس چل رہا ہے، ماں باپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور حیات ان کے قبضے میں نہیں ہے، اسباب زندگی کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، اسباب موت کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، لیکن خود موت و حیات ان کے ہاتھ میں نہیں۔

تو اللہ کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ موت اور حیات اس کے قبضے میں ہے جسے چاہے وجود دے دے جس سے

چاہے وجود چھین لے، تو جو ایسا قادر مطلق ہوگا حکومت اس کے سزاوار ہے، حکمرانی اسی کا حصہ ہے، اسی واسطے اسلام میں حکومت اس کی ہوگی، چلانے والے تم ہوگے تاکہ تمہیں اجر ملے، ثواب ملے۔ تم خود حاکم نہیں اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ صرف اللہ کا کام ہے اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ملک صرف اسی کا ہے، تو ملک کا مالک کوئی نہیں، قدرت کا مالک کوئی نہیں، زندگی اور موت کا مالک کوئی نہیں یہ صرف اللہ رب العزت ہے کہ وجود اور عدم موت اور حیات دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو فرمایا کہ اس سے زیادہ اقتدار والا بادشاہ کون ہے کہ موت وحیات بھی قبضہ میں ہے۔ تو خود ذات مبارک تَبَارَکَ اور اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ قبضہ پورے ملک کے اوپر ہے اور وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ . ہر چیز پر قادر ہے حتیٰ کہ موت اور حیات پر قادر۔

مقصد موت وحیات...... اور یہ موت وحیات کیوں دی، کیا ضرورت تھی اس سلسلے کی کہ کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے، کسی کو غم ہے، کسی کو خوشی ہے، یہ کیوں کیا: لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ اللہ جانچ لے کہ تم میں کس کا عمل اچھا ہے، کس کا برا ہے، اس واسطے کہ انسان سب سے پہلے میت ہی تھا، کوئی تھا ہی نہیں وجود اس کا، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا وجود دیا تو وہ عدم سے وجود میں آیا، اس کے بعد پھر موت دی تو قبر میں چلا گیا۔ اس کے بعد پھر حیات دیں گے تو حشر میں پہنچ جائے گا۔ تو دو دو موتیں اور دو دو حیاتیں واقع ہوتی ہیں۔

موت وحیات کے تدریجی نظام کی حکمت...... اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! حیات بھی مسلم اور موت بھی مسلم، مگر یہ سارے انسان ایک دم پیدا ہو جاتے ہیں، ایک دم ایک دن میں سب کا انتقال ہو جاتا ہے، روز روز کی جھک جھک نہ رہتی، کوئی مر رہا ہے کوئی جی رہا ہے، تو ایک ہی دفعہ موت دے دیتے، ایک ہی دفعہ زندگی۔ (آخر ایسا کیوں نہیں کیا؟) اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر ایک دن سب مرتے، عبرت پکڑنے والا کوئی نہ رہتا، تو موت کو جہاں ذریعہ بنایا ثمرات ظاہر ہونے کا، وہاں عبرت کا بھی تو ذریعہ ہے، کہ دوسرے کی موت دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے کہ مجھے بھی اس راستے جانا ہے تو میں کوئی اچھا عمل کرلوں۔ تو عمل پر ابھارنے کے لیے ضرورت تھی کہ موت اور حیات کا سلسلہ مسلسل رہے (ایسا نہ ہو کہ) ایک ہی دن میں سب پیدا ہوں اور ایک دن میں سب مریں (بلکہ) کوئی مرے کوئی جئے، کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے تو آنے پر خوشی، جانے پر رنج آنے پر توقع کہ اچھے اعمال کا ظہور ہوگا۔ جانے پر عبرت کہ جب یہ جارہا ہے اور اب یہ بھگتے گا تو ایسا نہ ہو کہ ہم جانے لگیں اور کوئی ایسی بری حرکت کر کے جائیں کہ ہمیں بھگتنا پڑے تو عبرت کا مقام نہ ہوتا، اگر موت وحیات کا مسلسل سلسلہ نہ رہتا، تو موت پر قادر، حیات بھی قادر اور موت اور حیات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ بیک دم نہ موت نہ بیک دم حیات رکھی، تاکہ عبرت موعظت، ترقی درجات مدارج، یہ انسانوں کو حاصل ہوں اور یہ جب ہی ہوں گے کہ میت کو دیکھے اور عبرت پکڑے کہ کل کو ہمارے لیے بھی یہ دن آنے والا ہے۔ تو اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا .

محبوب القلوب بادشاہ......اور فرمایا کہ یہ ہم کیوں قادر ہیں؟ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ. اس لیے کہ ہم عزت والے ہیں، عزت کی ہمارے یہاں کوئی انتہاء نہیں، تو جس کی عزت اور جس کا اقتدار ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ تو جو بے عزت ہو اس کی وقعت ہی نہیں ہوگی تو وہ حکمرانی کیا کرے گا......

عزت والا ہی تو حکمرانی کرتا ہے۔ اگر بادشاہ کی نسبت تو ہین بیٹھ جائے کہ یہ تو بڑا ذلیل آدمی ہے، اس کے تو بڑے بڑے افعال ہیں تو وقعت ہی نہیں ہوگی، تو حکم ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ جو سلاطین بداخلاق گزرے ہیں یا سیہ کار گزرے ہیں، مخلوق لعنتیں بھیجتی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے یہ ختم ہو جائے۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایسے کا حکم ماننا زبان سے تو ممکن ہے، مگر سو رغبت سے کوئی ماننے والا نہیں۔ اور حق تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ انسان جب ہمارا نائب بن کر حکومت کرے تو وہ اتنا محبوب القلوب ہو کہ رعایا اس کے لیے دعا مانگے، اس کے لیے یوں کہے کہ اس بادشاہ کی عمر دراز ہو، برکتوں کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، پورے ملک کے اندر برکات پھیل رہی ہیں۔

تو بادشاہ کے لیے محبوب القلوب ہونا ضروری ہے، جب بادشاہ کی محبت نہیں ہوگی، کام نہیں چلے گا، اور محبت جب ہوگی جب سرچشمۂ خیر و برکت ہوگا، تب محبت ہوگی ورنہ عداوت ہوگی......تو محبت ہونی چاہیے، محبت جب ہوگی، جب عزت والا ہو، اور عزت والا وہی ہے جو خیر و برکت کا حامل ہے، خیر نہ ہوئی شر ہوا، تو عزت کے بجائے ذلت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ وہ عزت والا بھی ہے اور اقتدار اور جلال والا بھی ہے کہ سب ہیبت زدہ بھی ہیں، محبت والے بھی ہیں، مگر اس کے بعد فرمایا کہ جلال محض نہیں۔ بخشنے والا بھی بہت ہے، سخی بھی بہت ہے، داتا بھی بہت ہے (چاہے) اس کا نام لینے کو برا کہیں، اس کے مقابلے پر لوگ آگئے ہیں، لیکن نہ سورج نکلنا بند ہوتا ہے، نہ سبزیاں اگنی بند ہوتی ہیں، نہ بارشیں برسنی بند ہوتی ہیں۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست   چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

اس کا دسترخوان پھیلا ہوا ہے، دوست اور دشمن سب کھا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ سورج نکلے تو دوستوں کے گھر پر تو دھوپ ڈالے اور جو اللہ کے دشمن ہیں ان کے گھر میں اندھیرا ہے وہاں بھی سورج پہنچ رہا ہے۔ بارش میں یہ نہیں رکھا گیا کہ دوستوں کے گھر پر اور ان کے کھیتوں پر تو بارش ہو اور دشمن کے کھیت خشک ہو جائیں۔ جب بارش آتی ہے تو سب کے کھیتوں پر جاتی ہے تو ایسا عام دسترخوان ہے کہ دوست دشمن سب پل رہے ہیں۔ تو مغفرت والا بھی ہے، رحم و کرم والا بھی ہے۔ اپنی مخلوق کے اوپر بے انتہا شفیق بھی ہے۔

جلال و جمال کی جامع بادشاہت......جیسے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے بیان فرمایا: ایک شخص نے ایک چڑیا کے بچے پکڑ لیا، وہ بچوں کو لے کر آیا تو اس کی ماں چڑیا وہ اس کے سر پر منڈلا رہی ہے اور وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی پھر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اسے بچوں کی محبت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! اتنی بڑی محبت ہے اس کے دل میں اس لیے پھڑ پھڑا رہی ہے اور اپنی جان دینا گوارا کرے گی مگر بچوں

پر آنچ آنے کو گوارا نہیں کرے گی۔ فرمایا بے حد محبت میں یہ پھڑ پھڑا رہی ہے اس کو سامنے رکھ کر فرمایا: سمجھ لو کہ جب ایک جانور اور ماں بنا جانور اور یہ محبت ہے تو اللہ جو سرچشمہ ہے سب کے وجود کا جس نے بنایا اسے کیسے محبت نہ ہوگی اپنی مخلوق سے اسے کہیں زیادہ محبت ہے اپنی مخلوق سے جتنا کہ جانور کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ جب وہ محبت والا ہے، جبھی تو بخشش عام ہے، مسلم ہو یا کافر ہو، مطیع ہو یا فاسق، دھوپ، بارش، غلہ، کھانا، پینا، اور پھل سب کے لیے عام ہے، ورنہ دوستوں کے لیے کرتے، دشمنوں کے لیے نہ رکھتے، وہ بحیثیت مخلوق کے ان پر بے حد شفیق ہے۔ تو: اَلْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (القرآن) عزت والا بھی ہے اور چشم پوشی کرنے والا بھی ہے۔

اخیر میں جب کوئی نہیں مانے گا تو فطرت کے مطابق سزا دیں گے، لیکن عین گناہ کی حالت میں فوراً سزا نہیں دیتے کہ شاید اب بھی سنبھل جائے، اب بھی سنبھل جائے، بخشش کا دروازہ عام ہے، تو یہاں چار وصف ہوگئے، ایک تو یہ کہ ذات بادشاہ یعنی اللہ کی ذات مبارک ہے، برکت والی ہے۔ دوسرے یہ کہ قادر ہے۔ بِيَدِهِ الْمُلْكُ. اس کے قبضے میں ہے۔ تیسرے یہ کہ: عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. قدرت اور اقتدار اس کا انتہائی ہے۔

اور ساتھ میں یہ کہ عزیز بھی ہے عزت والا بھی ہے جس کی وجہ سے سب مغلوب ہیں اور ساتھ میں غفور بھی ہے کہ محبت بھی کرتے ہیں، تو محسن بھی ہے، صاحب جلال بھی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ. ① اے پیغمبر! مطلع فرما دیجئے مخلوق کو اور اپنی امت کو، میں کون ہوں؟ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ ..... (میں بہت ہی بخشش کرنے والا ہوں)

تو جمال متوجہ ہوتا ہے، تو بادشاہ اگر محض جابر و قاہر ہی ہو کہ جبر و قہر ہی کرے، تو رعایا کا ناس مارا جائے، اگر محض جمیل ہی جمیل ہو کہ رحم و کرم کرتا رہے، غصہ نہ کرے، تب بھی ناس مارا جائے۔ اس لیے کہ بہت سی حرکات غصہ اور قہر سے رکتی ہیں، محض انعام و اکرام سے نہیں رکیں، دونوں شانیں ہونی چاہی ہیں، بادشاہ میں کہ جلال بھی ہو اور اکرام بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی ہو، عزت و اقتدار اور قہر بھی ہو اور مغفرت و بخشش اور تدبر بھی ہو۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ. یہ پانچ اوصاف بیان کیے گئے، یہ ذات بادشاہ کے اوصاف تھے۔

لوازم بادشاہت ...... اور یہ کہ اس کے افعال کیا ہیں وہ اس سے اگلی آیت میں ہیں وہ انشاء اللہ پھر کل بیان ہوں گے۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ یہ سورت شہنشاہی خداوندی کے اصول پر مشتمل ہے اور حکمرانی کے اصول اور لوازم ارشاد فرمائے گئے ہیں، سب سے اول بادشاہ عالمین کی ذات کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ مبارک ہے، پھر اس کی صفات کمال کا تذکرہ کیا گیا جو حکومت کے لیے ضروری ہیں، ان کی کل تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ آج کی آیتوں کی تفسیر کا حاصل لوازم بادشاہت ہوگا۔

یہ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ جب کوئی حکومت قائم کی جاتی ہے تو سب سے اول دار الحکومت کی بنیاد

① پارہ: ۱۴، سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰.

ڈالتے ہیں، دارالسلطنت یا دارالخلافہ کہ جس کو باب عالی یا باب حکومت کہا جاتا ہے وہ قائم کرتے ہیں، اوراس کو نہایت مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں۔ دشمنوں کا حملہ سب سے پہلے دارالسلطنت پر ہوتا ہے اگر وہ قبضہ میں آجاتا ہے تو پورا ملک فتح مند سمجھا جاتا ہے، اس لیے دارالحکومت کو بہت ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم بنایا جاتا ہے، بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں اوراگر کوئی بڑی سلطنت ہے تو ساتھ ساتھ شہر پناہیں قائم کی جاتی ہیں اور ہر شہر پناہ کے اندر بڑی بڑی فوجیں رکھی جاتی ہیں۔ جن کے ساتھ میں سامان جنگ ہوتا ہے، جس زمانے کے مناسب جو کچھ سامان ہو یا جس ملک کے مناسب جو سامان ہو وہ فراہم کیا جاتا ہے۔ گولہ اور بارود اور آج کے دور میں مثلاً بم اور بڑی بڑی دور مار توپیں اور مشین گنیں جیٹ طیارے یہ زیادہ سے زیادہ دارالسلطنت کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں ۔اور ضرورت کے مطابق اطراف ملک میں بھی یہ قوتیں قائم کی جاتی ہیں مختلف چھاؤنیاں بناتے ہیں .....مگر دارالسلطنت کو مضبوط رکھتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ غنی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے کوئی دارالسلطنت بنے یا ان کے لیے قلعے بنائے جائیں وہ تو خود حافظ وحفیظ ہیں وہ خود جہانوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، ان کی حفاظت کے کوئی معنی ہی نہیں۔

لوازم سلطنت......لیکن چونکہ ان کی صفت ہے ''مَلِک '' اور بادشاہ ہونا ہے۔اس صفت کے اظہار کے لیے تمام لوازم سلطنت قائم کئے جاتے ہیں ۔تو سب سے پہلے شاہی قلعہ تعمیر کیا گیا۔اور وہ بھی سات پناہوں کا جن کو سات آسمان کہتے ہیں ۔تو آسمان زمین سے زیادہ مضبوط ہے، زمین کمزور ہے لیکن آسمان مضبوط ہے۔زمین میں روزانہ آپ تصرف کرتے ہیں، کہیں کھود کر کنویں بنا رہے ہیں کہیں سڑکیں نکالی جارہی ہیں، روزانہ تغیر وتبدل زمین میں ہوتا ہے، لیکن آسمان میں کوئی تغیر وتبدل نہیں، جب سے آسمان بنائے گئے ہیں، ہزاروں برس سے اس وقت تک یکساں حالت پر قائم ہیں۔

بادشاہ کی سات شہر پناہیں اور انسان کی وہاں تک رسائی؟......اب یہ کہ وہ آسمان کہاں ہیں؟ تو ہوسکتا ہے کہ یہ جو نیلگوں اور چھت سے نظر آتی ہے یہی آسمان ہو، لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ آسمان نہیں، تو ہمیں بھی کوئی اصرار نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں چھت جو ہے اس کے اوپر آسمان ہو اور یہ نیلگوں چھت ایسی ہو جیسے ایک بڑی چھت کے نیچے شہتیری لگا دیتے ہیں اور شامیانہ تان دیتے ہیں۔تو ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں آسمان نہ ہو، آسمان اس سے بالاتر ہو۔

اس لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو برس کی مسافت ہے اور چونکہ مبالغہ اوراستحسان ظاہر کرنا مقصود ہے۔اس واسطے وہ پانچ سو برس کی مسافت تیز سواری پر طے ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ تیز سواری ہو وہ پانچ سو برس میں وہاں تک۔ آج بڑی سے بڑی تیز رفتار سواری اگر ہوسکتی ہے تو راکٹ ہوسکتا ہے کہ جو ایک گھنٹے میں، پچیس سو میل یا پچیس ہزار میل جانے والی سواری ہے اور ممکن ہے کل کو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار

سواری بن جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پانچ سو کے بجائے پانچ ہزار یا پچیس ہزار کے بجائے پچاس ہزار میل طے کر لے، ایک لاکھ میل طے کر لے، پل بھر میں پہنچ جائے تو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سواری پر اگر سوار ہو کر جایا کرے تو پانچ سو برس میں آدمی آسمان پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کی نہ اتنی عمر ہے کہ وہ اس سواری پر سوار ہو کر اور پانچ سو برس طے کرے، آج بڑی سے بڑی عمر ہے تو وہ ساٹھ ستر برس کی ہے، سو برس کی ہو جائے گی تو اس عمر پر انسان طے نہیں کر سکتا جب تک کہ مدد خداوندی شامل حال نہ ہو۔ اسی واسطے ایک موقعہ پر قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ. ① اے جنو! اور انسانو! اگر تم یہ کوشش کرنا چاہتے ہو کہ زمین اور آسمانوں کے فاصلے طے کر لو اور ان کی اقطار سے گزر جاؤ۔ قطر کہتے ہیں اس خط کو جو دائرے کے بیچ میں ہوتا ہے، اس سے پار ہو جاؤ تو ہو سکتے ہو، محال نہیں، لیکن ہو نہیں سکتے، اِلَّا بِسُلْطٰنٍ. جب تک کہ اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہ دی جائے تمہیں۔ کوئی حجت تمہارے ہاتھ میں نہ ہو، اس وقت تم آسمانوں تک نہیں جا سکتے، آسمان سے نیچے نیچے جہاں تک تمہارا جی چاہے چلے جاؤ، جہاں تک طاقت ہو۔

بادشاہ کا نظام کواکب...... آج اگر کوئی چاند پر پہنچنا چاہے تو وہ پہنچ سکتا ہے۔ شریعت کے اصول سے کوئی بعید بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نظام کواکب، ستاروں کا نظام سب آسمانوں سے نیچے ہے...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صریح روایت میں موجود ہے اس میں ہے کہ یہ تمام ستارے یہ آسمان کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں اور ان میں سونے اور چاندی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اور ملائکہ کے ہاتھ میں ہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن جب آسمان ٹوٹیں گے اور ملائکہ علیہم السلام کو بھی وفات دے دی جائے گی، زنجیریں چھوٹ جائیں گی، وہ سارے ستارے ٹکڑے ہو کر نیچے آ پڑیں گے قیامت قائم ہو جائے گی۔

آج کی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ ستارے باہمی کشش سے قائم ہیں، ایک دوسرے ستارے کو کھینچ رہا ہے اس لیے وہ معلق ہیں۔ تو انہوں نے اسے کشش سے تعبیر کر دیا شریعت نے اس کشش کی حقیقت بتلا دی کہ وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے اپنی طاقت سے ستاروں تھام رکھا ہے۔ تو ہمیں کشش سے انکار کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ پھر حسیات پر پہنچے ہے حسی چیزوں میں کشش ہوتی ہے، شریعت اس کا انکار کیے بغیر اس کی حقیقت بتلاتی ہے کہ اس پر کشش کو تھام رکھا ہے فی الحقیقت ملائکہ علیہم السلام نے ان کی معنوی قوت نے ستاروں کو لٹکا دیا۔ تو یہ سارا نظام کواکب آسمانوں سے نیچے نیچے ہے آسمان اس سے بالاتر ہے تو سات آسمان تعمیر کیے گئے، گویا سات شہر پناہیں بنائی گئیں۔

عظیم بادشاہ کا عظیم دارالسلطنت اور اس کے حفاظتی انتظامات...... اس لیے کہ جب بڑی حکومت ہوتی ہے تو چھوٹا موٹا قلعہ کام نہیں دیتا، جب تک کہ ساتھ ساتھ شہر پناہیں نہ ہوں۔ تو سات شہر پناہ کا ایک

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ: الرحمٰن، الآیۃ: ۳۳.

دارالسلطنت بنایا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آخری حصہ میں تخت شاہی رکھا جاتا ہے تو ساتوں آسمانوں کے اوپر جا کر عرش عظیم قائم کیا گیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے قلعے جب تعمیر ہوتے ہیں تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے ان کے اردگرد خندقیں کھودی جاتی ہیں، پانی بھرا جاتا ہے ان میں اگر کوئی قریب بھی پہنچے تو دیوار تک نہ پہنچ سکے قلعے کی۔ سب سے زیادہ گہری خندق ڈالتے ہیں اور اس میں بہت گہرا پانی ہوتا ہے۔ اب اس میں کوئی کشتیاں بنائے اتنے بنائے گا قلعے والے اوپر سے گولیاں برسا کر اس کا استیصال بھی کر دیں گے۔ تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے اول تو سات قلعے بنائے گئے اور پھر اس کے باہر جا کر ایک بڑی خندق بناتے ہیں جس میں پانی بھرتے ہیں تو پانی کے اوپر نرم مخلوق ہے۔ اس پر چلنا آسان نہیں ہے اس واسطے پانی پر آ کر دشمن رک جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے سات آسمان بنائے گویا سات قلعے تعمیر کیے اور اس کے بعد ایک عظیم الشان سمندر بنایا۔

تخت شاہی کا مقام...... اس سمندر کی بڑائی حدیث میں آتی ہے کہ ''آسمانوں اور زمینوں کے برابر اس دریا کی ایک ایک موج ہے'' اس سے اوپر عرش عظیم قائم کیا، تو سات قلعے ہیں اس کے، اس کے بعد خندق بنائی گئی اور وہ خندق بھی جیسا قلعہ ہے ویسی خندق، جیسا بادشاہ ہے ویسا ہی اس کے لیے سامان۔ تو خندق ایک عظیم سمندر ہے اور اس سمندر کی ایک ایک موج آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔

اس کے اوپر عرش عظیم قائم کیا گیا، تو گویا دارالسلطنت قائم کرنے میں پہلے قلعے بناتے ہیں، قلعے کے بعد خندق بناتے ہیں اور ساتویں قلعے میں پھر تخت شاہی رکھا جاتا ہے جو بادشاہ کی علامت ہوتی ہے۔ اسی تخت سے احکام جاری ہوتے ہیں، تو وہ تخت شاہی عرش عظیم ہے، ساتویں آسمان کے اوپر سمندر ہے، ان پر عرش عظیم قائم کیا گیا ہے۔

تو عرش کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے یہ سات آسمان قبوں (گیند) کی طرح سے ہیں، ایک دوسرے کے اوپر، اور عرش نے سب کو گھیر رکھا ہے، سارے آسمان، ساری زمینیں، سارے سیارات اس عرش کے نیچے ہیں تو ترتیب معین ہوگئی کہ نیچے زمین، اوپر آسمان، اوپر سمندر، اس سے اوپر پھر عرش عظیم ہے، تو ایک شاہی قلعہ بنا اور تخت شاہی رکھا گیا۔

سرکاری مہمانوں کے لیے گیسٹ ہاؤس...... تو یہ بھی قاعدہ ہے کہ بہر حال حکومت کے مہمان بھی آتے ہیں تو ان کے لیے ایک ایک گیسٹ ہاؤس بنایا جاتا ہے، ایک بہت بڑا مہمان خانہ، اتنا بڑا کہ جو سارے مہمانوں کے لیے مناسب ہو۔ اس لیے کہ بادشاہ کے پاس چھوٹے موٹے قسم کے لوگ تو پہنچتے نہیں، وہاں والیان ملک اور بڑے بڑے نواب، راجہ ہی پہنچ سکتے ہیں کہ جو بادشاہ کے مہمان ہوتے ہیں تو ان کے مناسب حال ضرورت تھی کہ گیسٹ ہاؤس بنے، سرکاری مہمان خانہ بنے۔ تو وہ سرکاری مہمان خانہ اسی کا نام جنت ہے یہ جنت جو ہے یہ عرش عظیم کے نیچے ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سات آسمان ہیں۔ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتھیٰ ہے اور یہ ساتویں آسمان

پر ہے۔اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى o عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى﴾ ① سدرۃ المنتھٰی کے پاس سے جنت الماوٰی شروع ہوتا ہے، تو حدیث اور آیت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور جنتیں ایک دوسرے کے اوپر سو (۱۰۰) ہیں ایک ایک جنت آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے، تو اندازہ کیجئے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے تو لاکھوں آسمانوں کے برابر ایک جنت ہی ہوگی۔ یہ ہے سرکاری مہمان خانہ کہ جس میں سرکاری مہمان رکھے جائیں گے۔

آمدِ مہمانان......اور سرکاری مہمان کب پہنچیں گے؟ جب آسمان بیچ سے نکال دیئے جائیں گے جَب ہی تو پہنچیں گے، اس لیے کہ اصل مہمان ملائکہ تو ہیں نہیں، یہ تو خدام ہیں جو کام کر رہے ہیں۔ مہمان تو وہ جو اللہ کے بتلائے ہوئے طریق پر اور راستے پر چل کر اس تک پہنچیں گے۔ وہ راستہ شریعت ہے اس پر چلنے والے انسان ہیں، تو حقیقت میں سرکاری مہمان یہ انسان ہوں گے جو ٹھیک اس راستہ پر پہنچ کر جو جنت کو جا رہے ہیں وہیں پہنچ جائیں۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد جتنے اہل جنت ہیں وہ جنت میں بطور مہمان کے داخل کیے جائیں گے۔

خصوصی مہمانی......اور خوب ان کی مہمانی ہوگی کہ ان کے لیے زمین کی روٹی اور مچھلی کے جگر کا سالن بنایا جائے گا اور تین دن کی مہمانی اس انداز سے ہوگی کہ ان کو روٹی تو دی جائے گی اس زمین کی یعنی یہ پوری زمین اس کی ایک روٹی بنا دی جائے گی اور زمین جس پر قائم ہے وہ ایک عظیم الشان مچھلی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے اس کے جگر کے کباب ہوں گے، تو زمین کی روٹی اور مچھلی کے کباب اور وہ بھی اس کے جگر کے جو سب سے زیادہ لذیذ گوشت ہوتا ہے، وہ غذا دی جائے گی۔

مہمانی کے لیے زمین کی روٹی کا انتخاب......آپ سوال کریں گے کہ یہ زمین تو مٹی ہے اور اس کی روٹی تو بڑی چڑ چڑی ہوگی تو کھائی کس طرح سے جائے گی؟ اللہ میاں کے یہاں مہمانی ہو اور چڑ چڑی روٹی ملے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ آج جو آپ غذا کھا رہے ہیں، وہ بھی تو زمین ہی کھا رہے ہیں اس لیے کہ زمین ہی میں غلہ بھی دانے بھی، چنے بھی، گیہوں بھی، پھل پھول فروٹ سب زمین سے نکلتے ہیں تو یہ زمین کے ٹکڑے ہیں جو آپ کھاتے ہیں۔ لیکن اللہ نے کچھ ایسی مشینیں لگا رکھی ہیں، قدرتی کہ ان کے ذریعے چڑ چڑا مادہ صاف کر کے خالص مزے کی چیز بنا دی جاتی ہے۔

سیب کے کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن محسوس نہیں ہوتا، انگور کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن نہیں، حالانکہ یہ وہی مٹی ہے۔ اسی کا اللہ نے جوہر بنا کر چڑ چڑا پن، باطنی مشینوں سے نکال دیا اور صاف ستھرا مادہ خوشبو دار سیلا بنا کے آپ کو دیا۔ تو جب آج بھی آپ مٹی کھا رہے ہیں۔ اور چڑ چڑا مادہ نہیں آتا تو کیا تعجب ہے کہ حق تعالیٰ اس دن ساری زمین

① پارہ:۲۷، سورۃ النجم: آیت: ۱۴، ۱۵۔

کا چڑ چڑا مادہ نکال کر اس کا اصل جو ہر بنادیں۔اس لیے کہ سارے مزے اس زمین ہی میں تو چھپے ہوئے ہیں، یہ سیب، انگور، انار، امرود جو ہے زمینی ہے، تو زمین ہی میں یہ سارے ذائقے چھپے ہوئے ہیں، مشینوں کے ذریعے ان ذائقوں کو الگ الگ کر کے چڑ چڑا مادہ نکال دیتے ہیں تو سارے ذائقوں کا مجموعہ یہ زمین ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حق تعالی اس دن اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کے سارے مزے ایک جگہ جمع کر کے چڑ چڑا مادہ الگ کر دیں۔اور ان سارے مزوں کی ایک روٹی بنادیں، تو دنیا کے جتنے پھل اور فروٹ ہیں سب کے ذائقے اس روٹی کے اندر ہوں گے، کوئی ذائقہ نہیں چھوٹا ہوا ہوگا، سارے ذائقے آجائیں گے۔

زمینی روٹی اور مچھلی کے سالن کی حکمت ......اور یہ اس لیے کریں گے کہ اول تو دنیا میں ہر انسان نے دنیا کا ہر پھل نہیں چکھا ہر ملک کے الگ الگ پھل ہوتے ہیں، جو ترکی میں ہے وہ ہندوستان میں نہیں جو ہندوستان میں ہے وہ ایران میں نہیں، جو ایران میں ہے وہ افغانستان میں نہیں۔تو لاکھوں کروڑوں انسان وہ ہیں جو اپنے اپنے خطے کے پھل تو کھائے ہوئے ہیں لیکن ساری زمین کے سارے ذائقوں سے واقف نہیں، ہوسکتا ہے کہ شکایت کرے بنی آدم کہ ہمیں آدھے تہائی پھل دیئے، وہ انہیں دیئے۔

کچھ ہمیں دیئے، ہم تو واقف نہیں زمین کے سارے ذائقوں سے، اس لیے سارے ذائقے جمع کر کے بنی آدم کو جو روٹی ہے وہ کھلا دیں گے تا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اور سالن بنائیں گے مچھلی کے جگر سے، اس لیے کہ غذائیں دو ہی ہیں دنیا میں یا بری یا بحری، تو بحری غذاؤں میں سے سب سے اعلیٰ ترین غذا مچھلی اور بری غذاؤں میں سب سے اعلیٰ ترین غذا یہ فروٹ اور پھل اور دانے، تو زمین کا جو ہر نکال کے تو سارے فروٹ اور دانے جمع کر دیئے اور ان کا مزہ ایک جگہ ہو گیا۔اور بحری چیزوں میں وہ مچھلی کہ ساری مچھلیوں کی ماں ہے، وہ اور اس میں سے ساری مچھلیاں نکلی ہیں اور مچھلیوں کی اقسام ہیں۔ کسی مچھلی کا کچھ ذائقہ ہے، کسی کا کچھ ہے۔اقسام ہیں وہ ساری قسمیں جمع ہو جاتی ہیں اس مچھلی میں جا کے جس پر زمین قائم ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دریائی غذاؤں کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اور بَرّ اور خشکی کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اس کی روٹی بنادی اور اس کا سالن بنادیں گے، تو بحر و بر کی ساری غذائیں سارے بنی آدم نے چکھ لیں۔اور یہ کیوں چکھائیں گے؟ ابتدا ہی میں جنت کی غذائیں کیوں نہ دے دیں؟ بتلانا یہ ہوگا ساری زمین کے ذائقے کھلا کر بس یہ ہیں وہ ذائقے جن پر تم رات دن لڑتے مرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بس سب کچھ یہی ہے۔اب یہ کھا کر اب ہمارے بنائے ہوئے ذائقے کا مزہ چکھو جو ہم نے تیار کیے ہوئے ہیں، جنت میں مقیمین کے لیے تا کہ توازن اور تقابل کر سکو۔ وہ موت کی تلخی نے سارے ذائقے بھلا دیئے، کوئی چیز ذہن میں نہیں کہ کیا کھائے کیا نہیں کھایا۔اس واسطے ان سارے ذائقوں کو عین جنت میں کھلا کر تازہ کر دیں گے کہ بس یہ تھے وہ ذائقے جن پر آپ جی جی کر سر پھٹول کیے رہے، اور مارا ماری کیے رہے۔اور ایک افراتفری کی یہ تھے وہ ذائقے اسی

کے لیے تو لڑائی ہوتی تھی۔ یہ کل ذائقے چکھ لیے یہ کل تمہاری لڑائی کی کائنات تھی۔

دنیوی لذتیں چھڑانے کی حکمت ...... اور جس کائنات کا اور جن نعمتوں اور لذتوں کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے اب وہ چکھو تو اس وقت مخلوق کو حیرانی ہوگی۔ جب مٹی ملا ہوا گھونٹ اس قدر ذائقہ دیتا ہے، تو جب مٹی بالکل صاف ہو کر خالص ذائقہ دیں گے تو اس میں کیا کیفیت ہوگی اور کیا سرور ہوگا؟ لیکن اس سرور کو سمجھانے کے لیے پہلے یہاں کے مزے چکھا دیں گے کہ اب تقابل کرو کیا چیز ہم نے چھڑوائی تم سے اور کیا ہمیں دینا ہے؟

ہم اگر چھڑوا رہے تھے دنیا کی لذتیں تو معاذ اللہ! تمہارے ساتھ عداوت نہیں تھی بلکہ یہ تھا کہ ادنیٰ کو چھوڑ کر اعلیٰ کی طرف جاؤ۔ جنہوں نے چھوڑا انہوں نے تو اسے پایا، اور جنہوں نے نہیں چھوڑا تو بیچ میں دھکے کھائے اس چیز کے تئیں۔ مگر بہر حال جب وہ بھول بھال چکے اب ہم وہ اپنے ذائقے چکھاتے ہیں، مگر یاد دلانے کے لیے پہلے ان ذائقوں کو سامنے کیے دیتے ہیں تا کہ تمہیں جنت کی قدر محسوس ہو، تو بہر حال اہل جنت کو جنت میں تین دن مہمان رکھا جائے گا اور اس میں غذا وہ دی جائے گی جس سے وہ مانوس تھے اور برس ہا برس کھائے ہوئے آ رہے تھے۔

ابدی قیام کی بشارت ...... تین دن کے بعد جب مہمانی پوری ہو جائے گی، تو قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ارشاد فرما دیتے کہ اب نکلو جنت سے کہ بس تین دن کی مہمانی، تین دن سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں، لیکن کریم کی شان سے یہ بعید ہے کہ کوئی نعمت دے کر پھر اسے واپس لے۔ اس لیے فرمائیں گے کہ جس نے جس محل پر قبضہ کیا، آج سے ابدالآباد تک وہ محل اسی کا ہے، وہ سارا رقبہ اسی کا ہے، اب ہم واپس نہیں لیں گے...... یہ کریم کی شان سے بعید ہے کہ گھر میں رکھ کر اور پھر کہے نکلو گھر سے، بس جس گھر میں آ گئے وہ آج سے تمہارا گھر ہے اور وہ محل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہوگا۔

جنت کی ادنیٰ بادشاہت کا عالم ...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو رقبہ اور حصہ دیا جائے گا وہ دس دنیا کے برابر ہوگا، گویا دس دنیائیں بن جائیں اس کے اندر سے مع زمین اور بحر اور بر اور پہاڑوں سے تو دس گنا ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے دس گنا کا اجر بھی رکھا ہے دنیا میں۔ اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی، یہ ضابطہ کا اجر ہے اور دس سے بڑھا دیں تو یہ ان کے فضل سے بعید نہیں۔ چاہے سات سو گنا کر دیں۔ چاہے ستر ہزار گنا کر دیں، مگر دس گنا وہاں قاعدے میں ہے داخل، ضابطہ میں اسی قاعدے کے مطابق کم سے کم حصہ دنیا کا دس گنا ہوگا۔ یہاں ہفت اقلیم پوری دنیا کی بادشاہت اور اسے دس جگہ جمع کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا آدمی وہاں اور وہ اقلیم بھی وہ کہ جہاں کوئی کدورت نہیں، کوئی غبار نہیں، کوئی طمع نہیں، کوئی پرانا پن نہیں۔ بلکہ بالکل صاف ستھری ابدی نعمت ہوگی اور دس دنیا کے برابر۔ تو یہ حق تعالیٰ کی کریمی ہے کہ مہمان بنا کر داخل کریں گے اور جو جہاں پہنچ گیا پھر اس سے واپس نہیں لیں گے کہ اب یہیں رہو اور ابدالآباد تک رہو، کوئی تمہیں نکالنے والا نہیں، یہ ہے سرکاری مہمان خانہ۔ اور سرکاری مہمان خانہ ظاہر ہے کہ شاہی محلات کے قریب ہی ہوتا ہے تا کہ مہمانوں کو بادشاہ کے پاس آنے جانے میں دشواری نہ ہو، دوری نہ ہو۔

سرکاری جیل خانہ اور زیارۃ خداوندی سے محرومی ......جیل خانہ میں البتہ دور رکھتے ہیں، اس لیے کہ قیدیوں سے ملنے کے کوئی معنی نہیں، قیدی تو دور ہی رہے تا کہ اس کو حسرت ہو کہ میں نعمت کے گھر کے قریب بھی نہیں۔ تو جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے، ایسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''جہنم'' ہے۔ اس میں وہ رہیں گے جو مجرم اور قیدی ہیں۔ اس کو ساتویں زمین کے نیچے رکھا گیا ہے جنت رکھی گئی ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم رکھا گیا ساتویں زمین کی تہہ میں۔ تا کہ وہ اللہ کی رحمت سے بعید سے بعید ہو جائے اور اس کے قرب کی لذت کا تصور اس کے قلب میں نہ آسکے اور قید کو اور عذاب کو اچھی طرح سے چکھے، تو بعد بھی ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ اول تو اللہ سے بعید ہونا یہی ایک مستقل عذاب ہے اور بعید ہو کر بھی حسی عذابات بھی ہوں اور یہ عذاب در عذاب اور وہ عذاب ابدی اور دائمی ہوں۔ تو یہ عذاب در عذاب ہے تو بعد بھی ہوگا، عذاب کی نوعیت بھی شدید ہوگی۔ اور ابد الآباد کا عذاب ہوگا۔

مہمان خانہ میں زیارۃ خداوندی کے درجات ......اس کے بالمقابل سرکاری مہمان خانوں کے لیے قرب بھی انتہائی، کہ ہر وقت بادشاہ کی زیارت کرسکیں، حدیث میں ہے کہ بعض تو وہ ہوں گے جن کو چوبیس گھنٹے حق تعالیٰ کا مشاہدہ رہے گا۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کہ ایک لمحہ کے لیے بھی تجلیات خداوندی ان کی نگاہوں سے غائب نہیں ہوں گی۔ ہر وقت اللہ کو دیکھتے رہیں گے اور بعض وہ ہوں گے کہ ہفتے میں دو تین بار زیارت ہوگی جیسے اکمل اولیاء اللہ، اور عامۂ مؤمنین وہ ہوں گے کہ ہفتے میں ایک بار ان کو زیارت کرائی جائے گی، دربار منعقد کیا جائے گا، انہی سو جنتوں کے اوپر دریا ہے اور دریا پر عرش عظیم ہے اور عرش عظیم کے بازو میں ایک میدان ہے جس کا نام میدان مزید ہے۔

میدان مزید کی وسعت ......اس میدان کی بڑائی کا یہ عالم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو سید الملائکہ ہیں اور چھ سو بازو کے فرشتہ ہیں، چھ سو بازو ہیں اور جثہ ان کا وہ ہے کہ اصلی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو دفعہ جو دیکھا۔ ایک دفعہ شب معراج میں اور ایک دفعہ وحی کی آمد کے وقت، وہ اس شان سے دیکھا کہ زمین سے آسمان تک جتنی فضا ہے سب بھری ہوئی ہے جبرئیلؑ کے بدن سے۔ مشرق میں مونڈھا ہے اور مغرب میں دوسرا مونڈھا ہے اور سر آسمان کے قریب ہے اور پیر زمین کے قریب اور ایک نورانی چہرہ ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے اور تاج ان کے سر اوپر ہے اور سبز رداء (چادر) ان کے بدن کے اوپر۔ اس شان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا تو اتنے ڈیل ڈول کا فرشتہ، حضرت جبرئیل علیہ السلام وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس میدان میں گھومتا ہوں، مگر اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں کہ یہ میدان کہاں تک ہے۔ وہ میدان دربار خداوندی کا میدان ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے وسط میں بچھائی جائے گی کرسی حق تعالیٰ کی، جس کا ذکر ہے قرآن کریم میں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ . ① وہ کرسی آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے۔

① پارہ: ۳، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵.

حدیث میں ہے کہ کرسی جو سات زمین اور ساتوں آسمانوں سے زیادہ بڑی ہے۔وہ ایسی ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھلا ڈال دیا جائے تو میدان کی بڑائی اور عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ کرسی بچھائی جائے گی میدان کے وسط میں۔اس کے چاروں طرف منبر ہوں گے نور کے، وہ انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے اور گول دائرہ بنایا جائے گا، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام ان پر بیٹھیں گے اور ہر نبی کے منبر کے پیچھے اس کی امت کی کرسیاں ہوں گی، درجہ بدرجہ، جو دنیا میں جتنا زیادہ اطاعت گزار تھا اتنا ہی قریب ہوگا پیغمبر علیہ السلام کے۔تو ہفتہ میں ایک دن جو جمعہ کا دن ہوگا، دربار خداوندی کا ہوگا۔

سرکاری سواریاں......اس دن میں تمام اہل جنت اپنی اپنی سواریوں پر اس میدان میں آنے کے لیے چلیں گے اور کوئی نیچے کی جنت میں ہے، کوئی بیچ کی جنت میں ہے اور کوئی اوپر کی جنت میں ہے اور زمینوں اور آسمانوں سے بڑی سو جنتیں ہیں۔اس لیے ان کو سواریاں دی جائیں گی اور وہ سواریاں براق ہوں گی۔رفرف ہوں گے، تخت رواں ہوں گے کہ بڑی بڑی مسندیں بچھی ہوئی ہیں اور قوت خیال سے وہ اڑیں گے۔کوئی مشین نہیں ہوگی کہ کل گھمانی پڑے اور پیٹرول دینا پڑے۔اس کا سارا پیٹرول مشینری ہماری قوت خیال ہوگی۔وہ اتنی مضبوط بنادی جائے گی کہ خیال یہ کیا کہ وہاں پہنچیں، پل بھر میں وہاں پہنچ گئے، پل بھر میں نیچے آگئے، تو پلوں میں یہ مسافتیں طے ہوں گی، سب اس میدان کے اندر جمع ہوں گے۔

نشست گاہیں اور مقامات قلبیہ سے ان کا تعین......اور فرمایا گیا ہے حدیث میں کہ ہر ایک کی سیٹیں متعین ہوں گی جیسے درباروں میں سیٹیں بچھائی جاتی ہیں، تو کارڈ چھپے ہوئے لگے ہوئے ہوتے ہیں جن پر نمبر تک پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔بٹھلانے والے اسی نمبر پر بیٹھنے والے کو بٹھاتے ہیں، یہ نہیں کہ کسی دوسری پر کوئی جا بیٹھے۔اپنی سیٹ پر، وہاں بٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ہر ایک شخص اپنے مقام کو اپنی طبعی اور قلبی کشش سے پہچانے گا اور وہیں جا کر رکے گا جو اس کی سیٹ ہے اور اس کی کرسی۔یہ نہیں ہے کہ غلطی کر جائے اس لیے کہ وہ مقامات متمثل ہوں گے جو اپنے قلب کے مقامات ہیں۔مقامات قرب حق تعالیٰ کے نزدیک کتنے ہیں قوت ایمانی کے مقامات، ہر شخص اپنے مقام کو خوب پہچانتا ہے کہ میرا ایمان کس درجہ کا ہے، میرے اخلاق کس مرتبہ کے ہیں، وہی اخلاق، وہی مقامات، وہ متمثل کیے جائیں گے سیٹوں کی صورت میں ہر شخص اپنے اپنے مقام پر بیٹھے گا۔انبیاء اپنے مقامات پر ہوں گے۔اب یہ دربار پر ہوگیا، بھر گیا، کرسیاں ہوں گی اور ان کرسیوں کے پیچھے اس میدان کے کناروں پر بڑے بڑے قالین ہوں گے۔چبوتروں پر اور چبوترے ہوں گے۔مشک اور زعفران کے اور ان پر وہ غالیچے ہوں گے۔عوام جو کم درجہ کا ایمان رکھتے تھے ان کے پاس کرسیاں نہیں ہوں گی، بلکہ وہ ان قالینوں پر بیٹھیں گے۔

میدان مزید میں کرسی حق پر تجلیات کا ظہور......اب گویا پورا میدان بھر گیا۔سیٹیں پر ہیں۔انبیاء علیہ السلام

اپنی جگہ اور کرسی حق تعالیٰ کی خالی۔ جب دربار پر ہوگا اس کے بعد تجلیات کا ظہور کرسی کے اوپر شروع ہوگا، اور یہی طریقہ بھی ہے کہ درباری جب ایک جگہ جم جاتے ہیں تب بادشاہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ بادشاہ پہلے بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی ہو نہ ہو، لوگ آئیں تو بیٹھیں، جب سب جم جاتے ہیں، تب بادشاہ نکلتے ہیں اور سراپردہ کھولا جاتا ہے اور نقیب اور چوبدار آوازیں دیتے ہیں اور بادشاہ آتے ہیں تو سب تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ کے حکم سے کچھ تحائف تقسیم ہوتے ہیں، کچھ کھانے پینے کو دیا جاتا ہے یہی صورت یہاں بھی ہوگی کہ تجلیات ربانی کا ظہور شروع ہوگا۔

احادیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح سے چڑ چڑائے گی کہ جیسے ٹوٹ کر گرنے والی ہے۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہے، بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے کرسی چڑ چڑائے گی۔ تجلیات کا ظہور ہوگا اور بندے اپنے قلوب کی بصیرت سے پہچان لیں گے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں

دربار خداوندی میں مشروب تواضع...... حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے ملائکہ کو کہ جس شراب طہور اور پاک شربت کا ہم نے وعدہ کیا تھا وہ پلاؤ، تو ملائکہ وہ نورانی صراحیاں لے کر شراب طہور تقسیم کریں گے۔ شراب کے معنی مطلق پینے کی چیز کے ہیں۔ اسے شراب نہیں کہتے جو نشے والی ہو۔ اسے خمر کہتے ہیں عربی زبان میں۔ شراب ہر پینے کی چیز کو شربت کو بھی شراب کہیں گے، دودھ کو بھی شراب کہیں گے کہ پینے کی چیز ہے۔ خیر پینے کی کوئی چیز دی جائے گی۔ اس میں سرور کی یہ کیفیت ہوگی کہ پینے کے بعد یہ محسوس ہوگا کہ غم والم کا تو نشان ہی نہیں ہے۔ رگ رگ میں فرحت اور سرور بڑھ رہی ہے اور ہر ایک میں ایک عجیب امنگ ہوگی اور معرفت بڑھ جائے گی اور حق تعالیٰ کی پہچان بڑھ جائے گی۔

سُکرِ معرفت میں ازدیاد...... اور اسی میں یہ بھی فرمائیں گے، داؤد علیہ السلام کو یہ بھی فرمائیں گے کہ ان کو معجزہ دیا گیا تھا آواز۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی حضرت داؤد علیہ السلام کی کہ جب وہ مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند پرند ان کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے، محو اور مست ہو جاتے تھے یہ معجزہ تھا۔ ان کو فرمایا جائے گا کہ اہل جنت کو وہ مناجاتیں سناؤ جو اللہ کی مدح اور ثناء میں تمہیں دی گئی تھیں اور حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر اور آواز بھی بڑی معجزانہ اور قرب خداوندی، ملائکہ کا قرب، اللہ کا قرب اور اللہ کی حمد و ثناء۔ وہ جو پڑھیں گے اپنی لے میں تو کیفیت یہ ہوگی کہ تمام اہل جنت گویا گم ہوں گے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں ہوگا کہ کہاں ہیں، وہ محو ہوں گے حق تعالیٰ شانہٗ میں، ایک اور عجیب کیفیت یہ طاری ہوگی مشابہ اس کیفیت کے کہ جو اہل اللہ پر معرفت کے نشے میں کیفیت طاری ہوتی ہے۔ سکر کی اور نشے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت طاری ہوگی جس سے روحانیت ہزار گنا بڑھ جائے گی۔ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ سَلُوْنِیْ مَا شِئْتُمْ. ''جس کا جو جی چاہے مانگے''۔

اہل علم کی احتیاج...... اب سب حیران ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ عرض کریں گے کہ اے اللہ! کونسی نعمت ایسی ہے جو جنّت میں آپ نے عطا نہیں فرمادی، باقی کیا ہے کہ جس کو ہم مانگیں۔ فرمائیں گے نہیں مانگو جس کی جو مرضی

ہو مانگے، تو اب سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا مانگیں، ہر نعمت کھانے پینے کی مل چکی، محلات، شہر، حکومت، جاہ، عزت ساری مل گئیں۔ کیا چیز مانگیں اور قربِ خداوندی اس سے بڑھ کر نعمت نہیں اور کیا مانگیں۔ جب سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب لوگ علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ اہلِ علم سے مشورہ کریں، وہ اپنے علم کی طاقت سے کچھ بتلائیں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے، کہ مانگیں؟

گویا مولویوں کی محتاجگی وہاں بھی جا کر رہے گی، لوگ یہاں اپنا پیچھا چھڑانا چاہیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے، وہاں بھی محتاجگی رہے گی۔ یہ محتاجگی علم کی ہوگی، کسی ذات کی نہیں ہوگی۔ آج بھی اگر ہم علماء کے محتاج ہیں تو گوشت پوست کے محتاج نہیں ہیں، وہ تو ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ ان کے علم کے محتاج ہیں، وہ راہنما ہے، راہ دکھلانے والا ہے کہ علم سے کسی جہان میں بھی آدمی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ جتنے بڑے جہاں میں پہنچے گا اتنے ہی بڑے علم کی ضرورت ہوگی، وہاں کی راہیں طے کرنے کے لیے ضرورت ہوگی۔ تو سب علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ ادھر سے تو حکم ہے کہ مانگو اور ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چیز باقی نہیں جو ہمیں نہیں مل گئی۔

جمالِ خداوندی کے دیدار کا سوال...... وہ کہیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے، وہ مانگو اور وہ ہے دیدارِ خداوندی۔ اس کا سوال کرو کہ اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ جس کی طمع میں ہم رات دن عبادت کرتے تھے اور عبادت میں یہ جوش ہوتا تھا کہ کس طرح اللہ کو دیکھ لیں، تو پہلے ہم دیکھتے تھے عقل کی آنکھ سے، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے ایمان اور عقیدہ کی آنکھ سے، اس کے بعد دیکھتے تھے خواب میں، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے کشف کے ساتھ، اب یہ سارے مراتب طے ہوگئے، اب یہ چاہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں، یہ مانیں گے، جب سوال سمجھ میں آجائے گا ایک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ: ''اے اللہ! سب کچھ آپ نے دے دیا، سب کچھ مل گیا، اب جمالِ خداوندی دکھلا دیجئے، پس ہم اس کو مانگتے ہیں۔''

کیفیتِ جمال...... یہ دعاء و درخواست قبول کی جائے گی۔ اور حدیث میں ہے کہ پہلے حق تعالیٰ فرمائیں گے: اَنْ کَمَآ اَنْتُمْ. ''ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے'' اس لیے کہ اگر یہ نہ فرمائیں تو: لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَابَيْنَ يَدَيْهِ. ① اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیں۔

چوں سلطان عزت علم بر کشد جہاں سر بزیب علم در کشد

جب سلطانِ عزت نمایاں ہوگا پھر کس کا وجود باقی رہ سکتا ہے۔ ایک آفتاب جو اس کی مخلوق ہے، اگر ٹکٹکی باندھ کر ایک منٹ دیکھ لو تو غیر آفتاب سب نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ تو آدمی جدھر نگاہ کرتا ہے آفتاب ہی کی ٹکیہ نظر آتی ہے، سرخ یا سبز یا زرد۔ غیر آفتاب محو ہو جاتا ہے، آنکھوں میں کسک نہیں رہتی کہ دیکھے۔ اپنے اندر بھی نگاہ ڈالے گا وہاں بھی آفتاب نظر آئے گا، ادھر دیکھے گا وہاں بھی آفتاب، تو آفتاب ایک مخلوق ہے۔ اس کی نورانیت کا یہ عالم ہے

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب فى قوله عليه السلام ان الله لاينام ج: ۱ ص: ۴۱۹ رقم: ۲۶۳.

کہ اگر پل بھر دیکھ لے تو ہر ماسوا غائب ہو جاتا ہے۔ تو اللہ رب العزت کا جمال منکشف ہو اور تجلی کھلے اور پھر غیر کا کہیں وجود رہ جائے؟ ممکن نہیں وجود ہی باقی نہ رہ سکتا۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کو دیکھنے کے بعد اشیاء کا وجود تو ختم نہیں ہوتا ہماری نگاہ میں ختم ہو جاتا ہے، ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن وہاں وجود نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وجود کا سرچشمہ حق تعالیٰ ہے جب اصل وجود آئے گا تو ضمنی وجود کا پتہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے پہلے ہی فرمادیں گے۔ اَنْ کَمَآ اَنْتُمْ . ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اور اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ بس صرف ایک حجاب کبریائی و عظمت کا رہ جائے گا۔ باقی سب حجابات اٹھ جائیں گے اس وقت بندے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔

کیفِ جمال ...... اور اتنے گم ہوں گے کہ نہ جنت یاد رہے گی نہ اور کوئی نعمت یاد رہے گی بلکہ یوں محسوس ہوگا کہ اب تک کوئی نعمت ملی ہی نہیں تھی۔ سب چیزیں ردی تھیں جو ہمیں ملی تھیں۔ اب نعمت ہمیں ملی ہے۔ اس دیدار کا اثر یہ ہوگا کہ قلب کے اندر قوت واطمینان پورے انشراح کے ساتھ رک وپے میں اور زیادہ پھیل جائے گی چہروں کا نور اور جمال اتنا بڑھ جائے گا کہ لوگ سو فیصد خوبصورت اور حسین بن جائیں گے۔ اس طرح سے یہ دربار ہفتے میں ایک دن ہوگا۔

اور اس کے بعد فرمائیں گے کہ اہل جنت! اب اپنے اپنے محلات کو جاؤ۔ اور ہفتہ بھر بعد پھر دربار منعقد ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام ہر وقت گویا حاضر باشان دربار رہیں گے، اکمل اولیاء اللہ ہفتے میں تین بار حاضر باش ہوں گے۔ عامہ مؤمنین کو ہفتے میں ایک دن دیا جائے گا، تو سرکاری مہمان خانہ اتنا قریب ہونا چاہیے کہ بادشاہ کے پاس آمد ورفت پائی جائے۔ اس لیے جنتوں کو عرش عظیم کے نیچے رکھا گیا۔

جنت کی لائٹ کا نظام ...... حتی کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنتوں میں جو چاندنا ہوگا، آفتاب اور ماہتاب نہیں ہوں گے۔ آفتاب بے چارہ کی کیا حقیقت؟ عرش عظیم کی روشنی سے جنت روشن رہے گی اور یکساں روشنی رہے گی وہاں رات نہیں آئے گی یکساں روشنی رہے گی۔

اور اس کی مثال احادیث میں دی گئی ہے کہ صبح صادق کے بعد جو چاندنا ہوتا ہے سورج نکلنے سے پہلے ٹھنڈا چاندنا، تو اس کے اندر آنکھیں خیرہ بھی نہیں ہوتی آنکھوں میں چبھن نہیں ہوتی، بلکہ فرحت کا اثر پیدا ہوتا ہے، وہ نوعیت ہوگی جنت کے چاندنے کی اور بارہ مہینے ایک سا چاندنا رہے گا۔

وہاں دن اور رات کا ہیر پھیر نہیں، تو جنت میں روشنی عرش کی ہوگی اس سے گویا قرب دکھلایا گیا ہے کہ سرکاری مہمانان خانہ ہے تو مہمان خداوندی قریب میں رہیں گے، تو بعید نہیں ان کو رکھا جائے گا۔ بعید تو مجرم رہا کرتے ہیں۔ تو مجرمین البتہ ساتویں زمین کی تہ میں جہنم میں رکھے جائیں گے، تو میں نے عرض کیا کہ جب دارالسلطنت بنتا ہے تو سب چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ قلعہ بناتے ہیں، قلعہ کے اندر تخت رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کے سامان رکھتے ہیں اور سرکاری مہمان خانہ بنتا ہے، تو قلعہ شاہی کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ: اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا. ”وہ ذات ہے بادشاہ۔ اللہ کی ذات شاہانہ وہ ہے کہ اس نے سبع سات آسمانوں کے تہہ بہ تہہ قلعے بنائے“۔ اور فرماتے ہیں مضبوط اتنا

کہ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ "تم اگر غور سے دیکھو تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں"، کوئی دراڑ نظر آ رہا ہے، کوئی اونچ نیچ نظر آ رہی ہے، کچھ بھی نظر آ رہا ہے یکساں ہے ہزاروں برس سے یکساں ہے، نہ اس کی کوئی مٹی جھڑتی ہے، نہ پلستر گرتا ہے نہ کوئی اینٹ گرتی ہے۔ جس حالت میں ہے اسی حالت میں ہے۔

شاہی قلعوں کی مضبوطی اور ان کا میٹریل......اس لیے کہ وہ دھاتوں سے بنائے گئے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ۔ پہلا آسمان چاندی کا ہے، دوسرا سونے کا ہے، تیسرا زمرد کا ہے، چوتھا یاقوت کا ہے پھر الماس کا ہے اور ساتواں آسمان خالص ایک موتی کا ہے، لیکن کیسا ہوگا چاندی سونا؟ یہ یہاں کا چاندی سونا نہیں۔ دنیا میں چاندی سونے میں کچھ نہ کچھ کدورت، کچھ نہ کچھ سیاہی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ روپیہ گننے بیٹھے تو دس پانچ منٹ میں انگلیاں کالی ہو جاتی ہیں، انگلیوں میں بو آنے لگتی ہے۔ تو وہاں کا سونا اور چاندی کدورت ملا ہوا نہیں خالص سونا، تو وہ آسمان زمین سونے اور چاندی جواہرات اور خالص موتی کے ہیں۔ اس واسطے ان میں کوئی جوڑ بھی نہیں، کہ بھئی اینٹ ہی گر گئی، چونا نکل گیا، یہ نہیں ایک ذات ہے سارا آسمان مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ تم کوئی فرق نہیں دیکھو گے اللہ کی بناوٹ میں۔ اس لیے کہ یہ شاہی قلعہ ہے تمہارا مکان نہیں بنا ہوا۔ اللہ نے اپنا مکان بنایا ہے۔ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ۔ پھر دوبارہ لوٹا کر نگاہ کرو۔ کوئی فطور نظر آتا ہے تمہیں؟ پھر لوٹاؤ نگاہ کو...... دو مرتبہ دیکھ نگاہ لوٹ کر آئے گی۔ اور نامراد واپس ہوگی، کوئی عیب لے کر نہیں آئے گی، چونکہ دار السلطنت کو انتہائی طور پر مضبوط بناتے ہیں، فطرت یہی ہے تو فطرت الٰہی، سے تو یہ فطرت انسانوں نے لی ہے، وہاں اصل فطرت نے کام کیا۔

دارالحکومت کی افواج......تو سب سے پہلے دارالحکومت کی تعمیر کی گئی اور اس میں سات شہر پناہیں بنائی گئیں اور شہر پناہوں کے اندر فوجیں رکھی گئیں اور فوجیں ہیں ملائکہ، جو نہایت ہی قوی فوج ہے کہ اگر سارے جہان، ساری کائنات، سارے شیاطین بھی مل جائیں تو ایک فرشتہ ان کے قابو میں نہیں آ سکتا۔

حدیث میں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کی دو صفتیں قرآن کریم میں بیان کی گئیں ہیں۔ ایک قومی اور ایک امین کہ وہ قوی بھی ہیں اور امانت دار بھی ہیں، تو امانت کے بارے میں تو یہ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل کہ اللہ کے لاکھوں اسرار میرے سینے میں ہیں، آج تک میں نے ظاہر نہیں کیے۔ حق تعالیٰ ہی کا امر ہوتا ہے تو کسی مخصوص بندے پر کوئی ایک چیز ظاہر کرتا ہوں، جسے ہم لوگ عارف کہنے لگتے ہیں کہ فلاں بزرگ معرفت رکھتے ہیں۔ اور اسرار خداوندی کو جاننے والے ہیں تو کروڑوں اسرار میں سے بذریعہ ملائکہ کے کوئی ایک آدھ چیز قلب میں ڈال دی جاتی ہے۔ وہ ہماری معرفت بن جاتی ہے تو اس ذات کے بارے میں قیاس کیا جائے کہ جبرئیلؑ کتنے بڑے عارف اور کتنے بڑے صاحب معرفت ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لاکھوں اسرار میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آج تک میں نے انہیں کسی سے ظاہر نہیں کیا، وہ امانت خداوندی ہیں، تو امانت کا تو یہ حال ہے۔

اور قوت کا یہ عالم ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تو جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ تم ان کی بستیاں پلٹ دو، انہوں نے ایک ہاتھ ڈال کے وہ سارے شہر اور اقلیم ایک ہاتھ سے اٹھا کر اوندھے کر دیئے، ان کو پلٹ دیا، یہ حال قوت کا ہے تو فرشتے کی یہ طاقت ہے تو جیسا بادشاہ ویسی اس کی فوج، بادشاہ لامحدود قوت والا ہے تو اس کی فوج بھی اتنی قوت والی ہے کہ ایک فرشتہ پورے جہان کے لیے کافی ہے۔ سب کو اٹھا کر لوٹ دے، تو ملائکہ علیہم السلام ان آسمانوں میں مقیم کیے گئے، جیسے فوجی۔

فوج کی عظمت وتقدس...... چونکہ بادشاہ سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ ہے اور پاک ہے اس لیے فوجیں بھی پاک، دنیا کی فوجوں میں تو ایک درجے کا تعین بھی ہوتا ہے آزادی بھی ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ فوجی کو تو سات خون معاف ہیں، جس پر چاہے گولی چلا دی، کسی بستی میں گھس گئے تو ناموس تباہ ہوتا رہتا ہے، آبروئیں جاتی رہتی ہیں، کھیت اجڑ جاتے ہیں، باغ اجڑ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کی فوج ہے، اس کے قلعوں کے محافظ ہیں، وہ پاکباز مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ نہایت ہی کرام والے مکرم بندے ہیں، کرامت والے بندے ہیں۔ سب صاحب کرامت ہیں۔ اور: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۔ ① ”کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی ہمیشہ احکام ربانی کے پابند ہیں“۔ منشاء ربانی کو پاتے ہیں تو کر چلتے ہیں، تو مخلوق بھی نہایت پاکباز ہے، جس کی فوج بنائی گئی ہے کہ اس سے زیادہ مطیع اور مقدس مخلوق دوسری نہیں اور ان کا کام دن رات اطاعت اور عبادت ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے، کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔ تو اتنی فوجیں رکھی گئیں ہیں کہ چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے کہ کوئی سپاہی موجود نہ ہو، تو ان گنت فوج اس لیے کہ جیسا بادشاہ ویسی بادشاہی، ویسی ہی اس کی فوج، ویسی ہی پاک باز فوج۔ گویا سات قلعے بنے اس میں فوجیں رکھی گئیں اس کے اوپر وہ خندق ہے جو سمندر ہے جس کی ایک ایک موج زمینوں آسمانوں کے برابر ہے۔ اور اس کے اوپر جا کر ہے کرسی اور کرسی اتنی بڑی کہ سارے آسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے چھلا۔ وہ پائیدان ہے عرش کا۔

مرکز نفاذ احکام...... کرسی کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ تخت پر چڑھنے کے لیے جو سیڑھی بنائی جاتی ہے وہ کرسی درحقیقت عرش پر چڑھنے کا پائیدان ہے، تو جب سیڑھی اتنی بڑی ہے تو عرش کتنا ہوگا۔ جو ساری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے، تو یہ تخت شاہی جس سے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ ② اللہ نے عرش پیدا کیا۔ اور اس پر سے ہی تدبیرات الٰہیہ جاری ہوتی ہیں۔

ان جہانوں میں جو کچھ چیزیں ہیں وہ دنیا ہو یا ستارے ہوں، ان سب میں جو امر خداوندی جاری ہے وہ عرش سے چلتا ہے احکام وہاں سے نافذ ہوتے ہیں يُدَبِّرُ الْاَمْرَ تدبیر امر وہاں سے ہوتی ہے۔

تو عرش عظیم گویا سب سے بڑی علامت ہے حکومت کی، اسی واسطے کہا کرتے ہیں کہ تخت کے سامنے ادباً

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ: التحریم، الآیۃ: ۶. ② پارہ: ۱۱، سورۃ: یونس، الآیۃ: ۳.

نذریں پیش کی جائیں۔ یوں نہیں کہتے کہ بادشاہ کو نذر دے رہے ہیں۔ درباری تخت کے سامنے نذر پیش کر رہے ہیں۔ یعنی بادشاہ تو بڑی چیز ہے۔ وہاں کس کی پہنچ، تخت شاہی کے پائے کو چومتے ہیں وہی اظہار عقیدت ہوتا ہے بادشاہ سے، تو عرش عظیم گویا علامت ہے شہنشاہی الٰہی کی اس کے سامنے نذریں پیش کرتے ہیں، اس کے سامنے اطاعت کے لیے جھکتے ہیں۔

سورج مرکز سے باجازت طلوع ہوتا ہے...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سورج جب چلتا ہے تو اذن حاصل کرتا ہے، پہلے سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے اور پھر کہتا ہے: اجازت ہے جانے کی۔؟ اجازت مل جاتی ہے تو پھر اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ دورہ کے بعد پھر پہنچا، پھر اذن چاہا، قیامت کے دن فرمائیں گے کہ آگے جانے کی اجازت نہیں۔ پیچھے لوٹ جا، تو آفتاب طلوع کرے گا مغرب سے اور وسط میں آکر پھر لوٹ جائے گا، اس کے بعد پھر حسب معمول طلوع ہونے لگے گا یہ علامت کبریٰ ہوگی قیامت کی......

بہر حال تخت کے آگے جھکنا یہ بادشاہ کے آگے جھکنا ہے۔ تو سب سے بڑا نورانی کرہ اس عالم میں آفتاب ہے وہ روزانہ سجدہ کر کے عرش کے نیچے اجازت طلب کرتا ہے، تب اسے جانے کی اجازت ملتی ہے۔ تو سرکاری مہمان خانہ بھی ہو گیا اور شاہی قلعہ بھی ہو گیا اور شاہی قلعہ کی فوج بھی ہو گئی اور عرش عظیم بھی اس کے اوپر تک گیا۔

حکومت الٰہی کی پالیسی...... اب بادشاہ کے لیے تاج بھی درکار ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کے لیے تاج مناسب نہیں کہ تاج بادشاہ کے سر کے بھی اوپر ہوتا ہے اور اَللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ہے اس سے بلند کوئی چیز نہیں۔ اس لیے وہاں تاج کی مثال ایسی رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرش پر حق تعالیٰ نے ایک لوح اور تختی رکھی کہ جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں سے بھی کہیں زیادہ ہے، اس پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ. ①

''میری رحمت ہمیشہ میرے غضب کے اوپر غالب رہے گی''۔

اگر گنہگار آئے کہ نیکیاں کی بھی ہوں اور جرم بھی۔ پہلے رحمت بڑھے گی کہ نیکیوں کا صلہ لے، غضب نہیں بڑھے گا کہ اس کو سزا دے۔ اگر کسی نے جرائم ہی جرائم کیے ہوں تو مجبوری کو غضب بڑھے گا، ورنہ رحمت ہی بڑھے گی اور آغوش رحمت میں اٹھائے گی۔ تو یہ دستاویز رکھی، یہ وہ ہے جیسے کہا کرتے ہیں، حکومت کی پالیسی حکومت جب پالیسی بناتی ہے، منشور بناتی ہے تو فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا اور فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا۔ وہ پالیسی طے ہو جاتی ہے۔ تو پھر وزراء امراء سب اسی پر عمل کرتے ہیں تو پالیسی حکومت الٰہی کی یہ طے ہوئی کہ رحمت الٰہی غالب رہے گی، غضب پیچھے رہے گا۔

استحکام حکومت کا اصول...... اسی واسطے عرش عظیم پر جب بادشاہی کی حیثیت سے حق تعالیٰ نے استویٰ فرمایا تو

① الصحیح لمسلم، کتاب التوبۃ، باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانھا سبقت غضبہٗ ج:۴ ص:۲۱۰۸ رقم:۲۷۵۱۔

فرماتے ہیں: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى . ① رحمٰن چھا گیا عرش کے اوپر۔ یوں نہیں کہا: اَلْقَهَّارُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى. قہر والا چھا گیا۔ اَلْغَضَّابُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى .غضب والا چھا گیا۔

اگر غضب کی تجلی چھاتی تو ساری کائنات ختم ہو جاتی، رحمت کے ساتھ سب کے ساتھ معاملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ رحمت کے ساتھ ہے تو شکل ایسی بن گئی کہ ساری کائنات، اس کے اوپر آسمان اس کے اوپر دریا، اس کے اوپر عرش ،عرش کے اوپر رحمت خداوندی تو گویا پوری کائنات کو رحمت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ رحمت نے چلا رکھا ہے۔ اس سے گویا اشارہ نکلتا ہے کہ جو بادشاہ غضبناک ہو وہ ملک کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتا۔ وہی بادشاہ چلا سکتا ہے جس میں شفقت اور کرم غالب ہو اور جس کے اندر قہر اور غضب اور تعصب اور عناد غالب ہو گا زیادہ دیر اس کی حکومت نہیں چل سکتی وہ ختم ہو جائے گی۔ گویا اصول نکل آیا کہ پائیدار حکومت بنانا چاہتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بناؤ جو رحیم وکریم ہو۔ جس کی رحمت غالب ہو، غضب مجبوری کو جائے، جب مجرمین تنگ ہی کر دیں تب جا کر غضب کے احکام نازل کرے ورنہ رحمت چلتی رہے تو پہلے تو فرمایا: اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا بادشاہانہ وہ ذات ہے اللہ کی جس نے سات طبق میں آسمان بنائے، اور: مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ. تم اللہ کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں محسوس کرو گے۔ اور ہم کہتے ہیں: فَارْجِعِ الْبَصَرَ نگاہ کو لوٹاؤ، غور کرو، ہے کوئی فرق؟ نہیں ہے۔ پھر لوٹاؤ، دوبارہ لوٹاؤ، تو لوٹ کر آ جائے گی نگاہ مگر کوئی عیب اور فرق نہیں نکال سکے گی۔

بے مثال روشنی کا انتظام ...... اب ظاہر بات ہے کہ قلعے تو بن گئے مگر اس میں اندھیرا بھٹ پڑا ہو تو رہنے والے کیسے رہیں گے، ظلمت ہو، تاریکی ہو تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا کام کیسے چلے گا اس لیے آگے فرمایا: وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ . بڑے بڑے چراغوں سے اور ہنڈوں سے ہم نے روشن کیا۔ آسمان دنیا کو، اور وہ چاند اور ہنڈے وہ چاند سورج ہیں، ستارے ہیں اور وہ ہماری ضرورت اس لیے کہ آسمان سے بالاتر جو عرش عظیم کی روشنی ہے جنتوں میں بھی، وہاں خوبصورت چاند کی نہیں چلتی۔ یہ تو معمولی درجے کی روشنی ہے، تو دنیا والوں کو ضرورت تھی، انہیں کے لیے چھت بنایا آسمان دنیا کو، اور طبعی طور پر لالٹینیں چھت میں ٹانگی جاتی ہیں۔ زمین میں چراغ کوئی نہیں رکھا کرتا یا دیوار پر لگاتا ہے یا چھت کے قریب اور جب بجلی کی روشنی ہو تو قمقمے تو چھت ہی میں ٹانگے جاتے ہیں۔ تکلف کے طور پر وہ دیوار میں لگا لے لیکن اصل مقام چھت ہے۔ اسی واسطے دنیا کی چھت بنایا آسمان دنیا کو اور اس آسمان سے نیچے یہ تمام ہنڈوں کا ایک نظام سجا دیا، کوئی زیادہ روشن، کوئی کم روشن۔ سورج تیز روشن ہے تاکہ کام کاج کر سکیں۔ دن کا وقت ہے۔ رات میں ضرورت پڑتی ہے سونے کی تو سورج نہیں چمکایا چاند چمکایا تاکہ ٹھنڈی روشنی ہو۔ بالکل اندھیرا گھپ ہو گا تو وحشت بڑھے گی، نیند نہیں آئے گی۔ کچھ چاندنا بھی ہو، مگر نگاہوں میں چبھنے والا نہ ہو۔ تو چاند کی روشنی رکھی۔

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ: طٰہٰ، الآیۃ: ۵.

یہ وہی روشنی ہے مگر وہ ریفریجریٹر کے۔ اندر کو نکل رہی ہے کہ جو ٹھنڈی کر کے پیش کی جاتی ہے۔ تو وہی سورج کی روشنی یہاں چاند میں ٹھنڈی بنادی گئی اور اگر چاند بھی نہ ہو تو کروڑوں ستارے روشن کر دیئے کہ کچھ نہ کچھ چاندنا رہتا ہے زمین پر، اگر ایک بھی ستارہ نہ ہوتا تو گھپ اندھیرا ہو جاتا، اس لیے فرمایا کہ ہم نے کائنات بنائی تو روشنی کا بھی سامان کیا۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۔

دفاعی نظام ...... اب ظاہر بات ہے کہ جتنی بڑی سلطنت ہوتی ہے اتنے ہی بڑے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ تو فوجیں بے شک قوی ہیں، سلطنت بڑی عظیم ہے مگر جتنی بڑی حکومت ہے اتنے بڑے ہی دشمن بھی۔ سارے شیاطین دشمن ہی تو ہیں، یہ کب چاہتے ہیں کہ اللہ کا حکم چلے، انبیاء علیہم السلام احکام لے کر آتے ہیں، ساتھ ہی انہیں چلانا چاہتے ہیں لیکن قدم قدم پر شیطان رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ تو ایک پل بھر کے لیے شیطان نہیں چاہتے کہ احکام خداوندی دنیا میں چلیں بلکہ سارے آدمی مل کر اللہ کے دشمن بن جائیں، مدمقابل آجائیں۔

تو حق تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا کی، حالانکہ اس کی حکومت کو ضرورت نہیں تھی مگر ایک مخالف پارٹی پیدا کی تا کہ اس کا کام یہی ہو کہ اللہ کی حکومت میں دین میں اعتراضات نکالتی رہے۔ تا کہ دوست تو یہ سمجھیں کہ یہ اعتراض کی چیز ہے، اس کا یہ جواب دیں گے تو ان کا علم وسیع ہے اور دشمن جتنے ہیں وہ بھول بھلیاں میں رہیں تا کہ اچانک جب پنجۂ گرفتاری کا عذاب آئے تو اس وقت اچانک گرفتار کر لیا جائے۔ تو دوست بھی اپوزیشن پارٹی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دشمن عداوت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، دوست محبت اور دوستی میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال ایک مخالف پارٹی کا وجود فطرت ہے ضروری ہے۔ ترقی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مخالفت کرنے والی کوئی جماعت نہ ہو۔ اس واسطے شیاطین کی جماعت پیدا فرمائی جس کا کام مخالفت ہے اور جب ہے تو وہ جیسے دنیا میں نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو۔ وہ آسمانوں میں بھی نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو، لیکن آسمان قلعے ہیں۔ اگر وہاں حکومت ختم ہو تو دنیا میں بھی باقی نہیں رہے گی، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ وہیں سے مٹانے کی کوشش کرو، اس لیے حق تعالیٰ نے حفاظتی سامان بنایا تو فرمایا کہ ستارے جو ہم نے مصباح اور چراغ بنادیئے ہیں انہی سے بموں کا بھی کام لیتے ہیں وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ۔

جہاں شیاطین آسمان کے کناروں تک پہنچے اور یہ بم ان کے اوپر برسنے شروع ہوئے شہاب ثاقب اور یہ بھسم ہو جاتے ہیں۔ تو گویا ملائکہ علیہم السلام سارا گولہ بارود کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ بم بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں دشمن الٰہی آسمانوں کے قریب پہنچا وہیں سے انہوں نے وہ گولہ پھینک کے مارا اور وہ بھسم ہوا

تو فرماتے ہیں کہ ان چراغوں سے ہم دو کام لیتے ہیں۔ ایک روشنی کا اور اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے دفع کرنے کا، تو مدافعت کا سامان بھی ہمارے یہاں پورا ہے اور پوری طاقت موجود، ساری دنیا کے شیاطین جمع ہو جائیں وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ دروازے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہ تو ذرا قریب پہنچے وہیں سے ان کے

اوپر بم پڑا وَجَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ .

دنیا میں حق کے ساتھ باطل کو بھی باقی رکھا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد شیاطین تو پٹ پٹا گئے ،مگر وہ انسانوں کے دشمن ہیں وہ تو چاہتے ہیں..... کہ انہیں بھی اللہ سے جدا کرو، تو بہت سوں کو ورغلانے سے خدا کی دشمنی پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام کی بھی مخالفت کریں، اولیاء اللہ کی بھی مخالفت کریں، علماء ربانی کی بھی صلحاء امت کی بھی سب کے مدمقابل آئیں اور ایسی ایسی چیزیں کریں گے کہ حق کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ ایسا کرتے رہتے ہیں، تو فرماتے ہیں انہیں ہم دنیا میں تباہ نہیں کریں گے، دنیا تو آزمائش گاہ ہے، اگر وہیں یہ تباہ ہو جائیں تو حق کے علو کا سامان کیا رہے حق تو باطل ہی کے مقابلے میں اونچا ہوتا ہے تو باطل بھی باقی رکھیں گے۔ باقی اخیر میں ایک جیل خانہ ہم نے ان مجرموں کے لیے تیار رکھا ہے، تو یہ شیاطین مع اپنے شتونگڑوں کے مع اپنی پارٹی کے سب اس کے اندر جائیں گے اور وہ اپوزیشن پارٹی وہ ساری کی ساری ختم کر دی جائے گی۔ اس لیے کہ حکمرانی کا جنتوں میں کارخانہ خالص حق کا ہوگا وہاں باطل کا نشان نہیں۔ دنیا میں حق اور باطل کی آمیزش تھی۔ دونوں پارٹیاں گڈمڈ کیں۔

آخرت میں حق و باطل کا امتیاز کر دیا جائے گا...... جب مخلوط عالم ختم ہو: اب رہ گئے خالص عالم۔ تو جنت خالص حق کا عالم ہے اور جہنم خالص مصیبت کا عالم ہے۔ ساری اپوزیشن وہاں اور سارے مطیع یہاں الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ وَجَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ ''ان کے لیے ہم نے ایک نہایت کھولتا ہوا عذاب تیار کر رکھا ہے تو وہ وہاں پہنچا دیئے جائیں گے''۔ وَلِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ . اور جتنے ان کی پیروی کریں گے ان شیاطین کی ان کے لیے وہ ہی کارخانہ موجود ہے وہ سرکاری جیل خانہ کہ جس میں مجرموں کو رکھا جائے گا۔

سرکاری جیل خانہ کی اندرونی کیفیت...... اور ساتھ میں ان کی کیفیت بھی بیان کی کہ اِذَآ اُلۡقُوۡا فِیۡهَا سَمِعُوۡا لَهَا شَهِیۡقًا وَّهِیَ تَفُوۡرُ . جب داخل کئے جائیں گے جہنم میں تو جہنم کے جوش کا یہ عالم ہوگا کہ جیسے غضب ناک ایک چیز ہوتی ہے اور جوش سے پھٹ پڑے۔ ہیبت ناک آوازیں اور اس کی ہیبت ناک لپیٹیں اور اس کی ہیبت ناک تیزی سے یہ معلوم ہوگا کہ جیسے وہ کھول رہی ہے اور غضب ناک ہے پھٹ پڑے گی۔ تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الۡغَیۡظِ '' گویا غیظ کے سبب سے پھٹ جائے گی''۔

ملائکہ جہنم کا اپوزیشن سے مقابلہ...... کُلَّمَآ اُلۡقِیَ فِیۡهَا فَوۡجٌ سَاَلَهُمۡ خَزَنَتُهَآ جب کفار کی کوئی پارٹی ڈالی جائے گی تو جہنم کے جو محافظ اور نگران ملائکہ ہیں سوال کریں گے کہ: اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَذِیۡرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا؟ جس نے اس جہنم سے تمہیں ڈرایا ہو اس عذاب خداوندی سے؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ڈرانے والے پہنچے، مگر ان پر تمام حجت کے لیے اور ان میں حسرت پیدا کرنے کے لیے کہ عذاب دوگنا تگنا ہو جائے ان سے

کہیں گے کہ: اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں پہنچا کسی نے نہیں بتلایا کہ اللہ کا جیل خانہ بھی تیار ہے: قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَ نَانَذِیْرٌ . شرمندگی سے کہیں گے کہ ہاں پہنچے۔ ہمارے پاس ڈرانے والے آئے۔

جنہوں نے حق کا راستہ دکھلایا، محبت اور پیار سے سمجھایا بَلٰی قَدْ جَآءَ نَا نَذِیْرٌ فَکَذَّبْنَا ۔ ہم نے انہیں جھٹلایا۔ وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ اللہ نے کوئی چیز نہیں بھیجی ہے یہ تمہارے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں،...... کچھ مولویوں نے بنالیا ہے، کچھ علماء نے بنالیا ہے۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی چیزیں، خدا نے کوئی چیز نہیں بھیجی اس نے تو عقل بھیجی وہ ہمارے پاس موجود ہے ہم اس سے سمجھتے ہیں۔ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ ○ وَقَالُوْا. اس وقت وہ کہیں گے: لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ کہیں گے: اے کاش! ہم کچھ سوچ لیتے یا مان لیتے تو یہ عذاب کا دن ہمیں نصیب نہ ہوتا۔

تلاشِ حق کے (۲) دو راستے ...... اس لیے کہ حق کے ماننے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ کہ آدمی بلا چون وچراں مان لے کہ یہ کہنے والا حق پر ہے، اس کے ساتھ علامت حقانیت تھی تو مان لے تو سمع اور طاعت تھی کہ کانوں سے سنا اور اطاعت کی اور اگر محض سن کر اطاعت نہ ہو، کچھ چھان بین کی ضرورت ہے تو پھر عقل دی ہے۔ اللہ نے اس عقل سے غور کرے اور حق کے طلب کرنے کی کوشش کرے تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جب عقل لڑا کر چاہے گا آدمی کہ ہدایت پا جاؤں تو ضرور ہدایت دیں گے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْافِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا . (القرآن) جو ہمارے راستے میں جدوجہد کرے گا ہم ضرور اسے راستہ دکھلائیں گے۔ تو دیکھنے کے راستے کی دو ہی صورتیں ہیں یا سمع وطاعت کہ سن کر اور مان لے اطمینان کر لے آدمی یا یہ کہ پھر عقل لڑا کر غور کر لے اور سوچ سمجھ کر مانے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دونوں سے کام نہ لیا۔ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ یا ہم سن لیتے انبیاء کی بات یا خود اپنی عقل سے سوچتے کہ کوئی فرمانروا موجود ہے، کوئی بادشاہ عالمین موجود ہے تو: مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ " پھر ہم ان جہنم والوں میں سے نہ بنتے" ۔ مگر ہم نے وہ چیز کھودی، وہ وقت گزار دیا . لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ○ فَاعْتَرَفُوْابِذَنْبِهِمْ .

اعتراف بے وقت ...... اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا مگر اس وقت اعتراف کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ مثل مشہور ہے کہ اب پچھتائے کیا حوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، جب کھیت ہی نہ رہا اور چڑیاں ہی نہیں ہیں اب اگر تم نے پرکھا کہ چڑیاں نہیں ہیں تو اب کیا پرکھنا، یہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔

وہاں تو ہر ایک مؤمن بن جائے گا جا کے۔ آزمائشی ایمان تو دنیا میں تھا کہ مخالف اسباب موجود تھے۔ مگر پھر انبیاء علیہ السلام کی حقانیت کو سامنے رکھ کر سب چیزوں کو پرے ڈال کر آدمی اطاعت کرتا سنتا، تو کہیں گے کہ افسوس ہم نے وقت کھودیا۔ فَاعْتَرَفُوْابِذَنْبِهِمْ (مُلک) "اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا"۔ مگر اس وقت جواب کیا ہوگا۔ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ . (ملک) پھٹکار ہو ان لوگوں کے لیے، ان کو دور دھکیل دو، یہ

قریب بھی نہ آنے پائیں اور زیادہ بعید (دور) سے جہنم میں ڈال دو فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ .

اطاعت کے پاکیزہ ثمرات...... اب جب مجرموں کی بات بتلادی تو سوال پیدا ہوا کہ مطیعوں کا حشر کیا ہوگا؟ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ. ① اور جو لوگ غیب سے ڈرتے تھے، غیب مطلق یعنی حق تعالیٰ کو مانا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کو ہم آنکھوں سے دیکھ لیں جب مانیں گے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً. ② ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اللہ کو آنکھ سے نہ دیکھ لیں۔ تو غیبی چیزیں دیکھ کر نہیں مانی جاتیں، سمجھ کر مانی جاتی ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ جو ڈرتے بھی تھے اللہ سے اور انہیں خطرہ لگا ہوا تھا کہ وقت آخر آنے والا ہے، جس غیب سے ہم یہاں آئے ہیں لوٹ کر پھر اسی غیب میں جانے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ جنہوں نے خوف اور خشیت اللہ اختیار کیا قلب کی رقت اور نرمی اختیار کی اور جب کوئی حق بات سامنے آئی تو گردن جھکا دی کہ حق ماننے ہی کے لیے ہوتا ہے۔

ان کے لیے مغفرت بھی ہے، یعنی اگر ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہوئے وہ بخش دیئے جائیں گے اس لیے کہ نیت ان کی نیک ہے۔ عقیدت ان کے قلب میں موجود تھی، بشریت سے کچھ لغزشیں ہوگئیں تو ہماری طرف سے مغفرت تیار ہے اور جو نیکیاں کیں اس کے لیے اجر عظیم تیار ہے، پاکیزہ ثمرات تیار ہیں۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ. ٥ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

عالم انکشاف...... آگے پھر ایک کلیہ فرمادیا کہ تم کسی بات کو چھپاؤ یا کھول کر کہو وہ تمہارے دلوں کی کھٹک سے واقف ہے کوئی چیز تم اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ وہاں مخلوق سے تم نے پردہ ڈال لیا، چھپالی چیزیں مگر وہاں جا کر تو سب عیاں ہو جائیں گی وہ ساری پردہ داریاں، وہ سارے پردے وہاں چاک ہو جائیں گے تو اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ کیا پیدا کرنے والا جانے گا نہیں کہ میں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟

پہلے تو اسی کو علم ہوگا کہ اس مخلوق میں کیا چیزیں رکھ رہا ہوں، کتنی عقل رکھی ہے میں نے کتنا فہم رکھا ہے۔ کتنا علم رکھا تو جو بنانے والا ہے مخلوق کا وہ تو اس کے اندر باہر سے سب طرح واقف ہے، ورنہ وہ خالق ہی کیسا جو واقف نہ ہو، تو عقلی دلیل بھی بیان فرمادی اور نقلی بھی، فرمادیا کہ وہ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. ہے اور کیوں نہیں ہوگا عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا خالق بھی نہیں جانے گا مخلوق کو اور کون جاننے والا ہوگا.....؟ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ اور اس کے لیے پھر دلیل یہ کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ جسم سے بھی پاک اور روح سے بھی پاک اس لیے وہ تو ہر چیز کی رگوں کے اندر سرایت کیئے ہوئے ہے رگ رگ کی اسے اطلاع ہے اور پتہ ہے۔

اس کی ذات ہی منبع انکشاف ہے اسے کوئی باہر سے خبر نہیں دیتا، اس کی ذات میں سے علم پھوٹتا ہے۔ جیسے

① سورة النساء : آیت : ۱۵۳ ② پارہ: ۱، سورة : البقرة، الآية: ۵۵.

آفتاب میں سے کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۔ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ یہ ہوا گویا پہلے رکوع کا خلاصہ کہ جس کے اندر ذات بابرکات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے۔ پھران صفات کو جو بادشاہی کے لیے ضروری ہیں پھران لوازم سلطنت کو جو بادشاہت کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اس کا ایک رکوع کا خلاصہ یہ ہے اب دعا کر لیجئے۔

ھُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِھَا وَکُلُوْامِنْ رِّزْقِہٖ ۔ وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُo ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا ھِیَ تَمُوْرُo اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِo وَلَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ ۔

وہی ہے جس نے تمہارے آگے زمین کو پست کیا، اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اس کی طرف جی اٹھنا ہے، کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں، پھر تب ہی وہ لرزنے لگے یا نڈر ہو گئے؟ اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسا دے تم پر مینہ پتھروں کا، سو جان لوگے کیسا ہے میرا ڈرانا۔ اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے، پھر کیسا ہوا میرا عذاب؟۔

ظاہر و باطن پر اس کی حکومت...... ایک حصہ تو وہ ہے جو ان آنکھوں سے نظر آتا ہے اور آ سکتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے جو حصہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اس کا نام ہے ملک اور جو حصہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے اس کا نام ہے ملکوت، دو حصے ہوئے حکمرانی کے ایک ملک اور ایک ملکوت۔ جیسا کہ شروع میں فرمایا گیا کہ تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ تو ملک کے جتنے حصے ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں ملک میں داخل ہیں اور عرش سے لے کر فرش تک اور فرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جتنے حصے ہیں۔ ان سب کا نام ہے ملک اور جو روحانی آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں یعنی عالم روحانیت ہیں اس کو ملکوت کہتے ہیں جس کو سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا کہ: فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ" پاک ہے وہ ذات کہ جس کے قبضے میں ہے ملکوت ہر چیز کا"۔ دونوں پر اسی کی حکمرانی ہے۔ ظاہر کا ملک عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جس میں عرش عظیم، کرسی، جنتیں آسمان اور پھر زمین کے نیچے جہنم۔ یہ سب عالم ملک ہے اور ان کے اندر جو روحانیت اور معنویت کام کر رہی ہے عرش سے لے کر فرش تک، اسی کا نام ہے ملکوت، وہ باطنی حصہ ہے۔

ملک کے تین علاقے اور ان کے ذمہ دار...... تو اس ملک کے تین حصے قرار دیئے گئے ہیں ایک آسمانوں سے اوپر اوپر، جس میں جنتیں، عرش، کرسی سب داخل ہیں اور ایک آسمانوں سے نیچے نیچے جس میں زمینیں اور دنیا اور اس کے نیچے جہنم یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ ان سب کے کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کرتے ہیں۔ حکم اس کا چلتا ہے وسائل وہ ہوتے ہیں۔ جیسے آسمانوں میں ملائکہ علیہم السلام ہیں تو سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جن کی حکومت پورے عالم سمٰوات میں ہے۔

اس دنیا کے اندر کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں، تو اصل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور ان کے ماتحت ہیں، ان کی وفات کے بعد پھر جو رہتے ہیں ان میں پھر عہدے ہیں، کسی کا نام ابدال ہے۔ کوئی اقطاب ہے، کوئی اغواث ہے، اس طرح سے تفصیل ہے۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں کہ جن کا باطنی طور پر حکم چلتا ہے۔ ظاہری حکام کے قلوب میں وہی چیز ڈالی جاتی ہے جو ابدالوں میں طے ہوتی ہے۔ ابدالوں کے نیچے پھر اقطاب ہیں، جو چالیس ابدال ہیں وہ شام میں رہتے ہیں جو ایک وفات پاتا ہے، نیچے ترقی دے کر ابدالوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ ۴۰ کا عدد پورا رہتا ہے۔ پھر اقطاب ہیں ان کے نیچے پھر اغواث ہیں۔ درجہ بدرجہ یہ گویا اس دنیا کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ تو ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی مشیت وارد ہوتی ہے اور وہ اسی مشیت سے پھر قلب سے ہمتیں متوجہ کرتے ہیں ان ہمتوں سے ظاہری حکام کے دل میں وہ چیزیں پڑتی ہیں کہ جو ظاہری حکم چلتا ہے۔

اللہ کا خلیفۂ اعظم ...... اور پھر حق تعالیٰ کی جانب سے ایک شخصیت وہ بنائی گئی ہے کہ ملک سے لے کر ملکوت تک اسی کی حکمرانی قائم کی گئی ہے۔ وہ اللہ کا خلیفۂ اعظم ہے اور وہ ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ سمٰوٰت وارضین میں آپ کے اثرات ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے چار وزیر ہیں: وَزِيْرَایَ فِي السَّمَآءِ وَوَزِيْرَایَ فِي الدُّنْيَا. ① دو وزیر میرے آسمانوں میں ہیں اور وہ ہیں جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام اور دو وزیر میرے دنیا میں ہیں اور وہ ہیں ابوبکر صدیق، اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما جو ان کے قائم قام چلتے ہیں دنیا میں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وزارت عالم سمٰوٰت میں بھی قائم ہے اور عالم ارض میں بھی قائم۔ جیسے بادشاہ کے ماتحت ایک نائب السلطنت ہوتا ہے کہ پوری سلطنت میں اس کا حکم اور اس کے اثرات غالب ہوتے ہیں، وہ ذات بابرکات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ...... تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کے دو وزیر آسمانوں میں ہیں اور دو وزیر دنیا میں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وزیر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بادشاہ کے نائب السلطنت کے زیر اثر رہ کر احکام چلائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی سب کے اوپر قائم کر دی گئی۔ اس کا ظہور شب معراج میں فرمایا گیا۔ کہ مسجد اقصیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا اور تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام ملائکہ اور حضرت جبرئیل علیہ جو ان کے ذمہ دار ہیں، انہوں نے اقتداء کی۔ گویا ظاہراً بھی دکھلایا گیا کہ آپ بالادست ہیں اور آپ کے ماتحت ہیں انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام تو اس طرح سے عالم ملک کا انتظام بٹا ہوا ہے۔

لیکن ایک شخصیت ملک اور ملکوت دونوں میں کام کر رہی ہے اور مشیت خداوندی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہے۔ تو اس کا ایک حصہ تو ہے آسمان اور ایک حصہ ہے زمین اور ایک حصہ ہے بیچ میں جو اور فضا یا خلا جسے کہتے ہیں یہ تابع ہے

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمر رضی الله عنهما کلیهما ج: ۱۲ ص: ۱۳۹.

آسمانوں کے اور زمینوں کے۔ گویا زمین کا پہلے ہے آسمان پہ جو فضا ہے اور آسمان کا ماحول ہے زمین پر وہی فضا، بیچ میں دونوں جہانوں کے، اس لیے اصل دو عالم نکل آئے ایک عالم سمٰوات اور ایک عالم ارضین.. تو عالم سمٰوات کا ذکر تو پہلے رکوع میں کیا گیا ہے جس کی کچھ تفصیل ابھی کی گئی کہ اس میں جنتیں بھی آ جاتی ہیں، جہنم بھی، ماننے والے بھی نہ ماننے والے بھی۔ قانون خداوندی ذات وصفات حق تعالیٰ کی یہ پہلے رکوع میں بیان کی گئی ہیں۔

تسخیر خزائن...... اس دوسرے رکوع میں زمین کا ذکر ہے۔ جس کو فرمایا کہ: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۔انسانوں کو خطاب فرمایا جا رہا ہے کہ زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل (مراد تابع) بنا دیا تمہارے کام میں لگا دیا، کتنا عظیم کُرّہ ہے زمین کا جس میں ہزاروں پہاڑ ہیں جنگل ہیں بحر ہے، بَر ہے۔ وہ سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا کہ اس مادے سے تم کام کرو، سب سے پہلی چیز ہے انتفاع، اس سے نفع اٹھانا۔

تو زمین میں رزق کے خزانے رکھ دیئے گئے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں وہ سب زمین سے نکلتی ہیں۔ اسی طرح سے معدنیات ہیں، جواہرات ہیں وہ زمین سے نکلتی ہیں، سونا چاندی ہو، اسی طرح سے اور معدنیات ہیں جیسے تیل کے چشمے ہیں، پیٹرول ہے، کوئلہ ہے۔ یہ سب چیزیں انسانوں کے کام میں آتی ہیں اور اللہ نے انسانوں کے اندر فطرت میں ان چیزوں کا تصرف ڈال دیا کہ وہ کھود کرید کر کے پتہ چلاتا ہے کہ تیل کے خزانے کہاں ہیں، جواہرات کہاں چھپے ہوئے ہیں، سونا کہاں سے نکلے گا؟ چاندی کہاں سے نکلے گی؟ اس کی تدبیریں ذہن میں ڈال دی گئیں کہ مشینوں کے ذریعہ یا ہاتھ سے دستکاری کے ذریعہ مٹی سے سونے کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ چاندی کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔

تیل اگر نکلے اس میں اجزاء زمین کے ملے ہوئے ہیں تو صاف کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ پہلے لوگ اپنی دستکاری سے صفائی کرتے تھے۔ اب دور مشینی دور ہے تو مشینوں کی بات اللہ نے ذہنوں میں ڈال دی اور ایسی ایسی مشینیں انسان نے ایجاد کر لیں کہ منٹوں میں ہزاروں من مٹی میں سے سونا نکال لیتے ہیں، چاندی نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح سے جواہرات، اسی طرح سے قسم قسم کے پتھر، سنگِ خارا اور سنگِ مرمر۔ اور مرمر کی پھر اقسام ہیں، سرخ اور سبز اور زرد، وہ سب انسان نکالتا ہے اور اپنے کاموں میں لاتا ہے تاکہ دنیا میں تصرفات چلیں۔

تو فرمایا کہ ہم نے ذلیل کر دیا تمہارے لیے زمین کو وہ چوں نہیں کر سکتی، حالانکہ تمہاری اصل ہے تم سے کہیں زیادہ بڑی ہے لیکن اس کو کھودے جاؤ اس میں نہریں بناؤ، کنوئیں بناؤ، ذرا بھی چوں وچراں نہیں کرتی اور تمہارے ہاتھ میں مسخر ہے اس کے اخلال طبعی یعنی جگر کے ٹکڑے۔ سونے چاندی نکالے جاؤ وہ ذرا بھی چوں نہیں کرتی، یہ سب تمہارے لیے حاضر ہے۔

ایجاد وتصرف...... پھر اس میں تصرف کی طاقت بھی رکھی کہ دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز پیدا کر لو، یہی

انسان کی ایجاد کی حقیقت ہے۔ایجاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی مادہ خود انسان پیدا کردے، سونے کو خود پیدا کردے، چاندی کو پیدا کردے، یہ نہیں ہے۔ بلکہ چند چیزوں کو ملا کر ایک چیز نکالتا ہے، یا دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز بنالیتا ہے۔ دو درخت ہیں، دو قسم کے پھل ہیں، ان میں قلم لگایا اور ایک تیسری نوع تیار کرلی۔ سونے اور چاندی کو ملایا تو اس سے طرح طرح کے ظروف اور برتن بنالیے تو انسان کی ایجاد کی حقیقت ترکیب اور تحلیل دو چیزوں کو ملا کر تیسری چیز بنالینا یا ایک چیز کا تجزیہ کر کے اس سے اجزاء نکال لینا اور اس سے چیزیں بنانا، تو ترکیب کردینا دو کی، یا ایک کی تحلیل کر کے اس کے اجزاء کردینا، یہی انسان کی ایجاد کا حاصل ہے۔ایک ذرہ برابر زمین نہیں پیدا کرسکتا آدمی۔ پیدا شدہ میں سے کام نکال سکتا ہے آفتاب کی ایک کرن ساری دنیا کے انسان ملیں تو نہیں بناسکتے، لیکن ان کرنوں کی گرمی اور روشنی سے طرح طرح کی چیزیں بناسکتے ہیں۔

ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل نکل آتا ہے اس میں تصرف کیے جاؤ اور نکالے جاؤ، تو پیدا کی ہوئی تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں، ان کو جوڑنا، کھول دینا، ملا دینا الگ کردینا اس کی طاقت انسان کو دی گئی ہے اس سے وہ اپنے کام نکالتا رہتا ہے۔تو زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل بنادیا ہے اور زمین ہی میں سارے خزانے چھپے ہوئے ہیں، ان خزانوں کو تمہارے ہاتھ میں مسخر کردیا اس کے لیے ضرورت پڑتی ہے کہ آدمی زمین میں چلے اور پھرے تاکہ ان معدنیات کا پتہ چلائے کتنے سفر کرنے پڑتے ہیں۔

زمین اور فضا آسمانی کی تسخیر جدید......اس لیے فرمایا کہ: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا، زمین کے کندھوں پر چلو اور پھرو، سفر کرو اور سیر کرو، کہیں آدمی پیدل چلتا ہے، پیدل نہیں چل سکتا تو سواریاں، کچھ قدرتی سواریاں ہیں کہ گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آدمی جائے، جس کو فرمایا۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ''گھوڑے اور گدھے اور خچر یہ سب کے سب ہم نے تمہارے لیے بنائے''۔ لِتَرْكَبُوْهَا تاکہ تم سواری بھی کرو ان پر وَزِيْنَةً اور اپنا ٹھاٹ اور کروفر بھی دکھلاؤ۔ جب جلوس نکلتے ہیں تو گھوڑوں پر، ہاتھیوں پر بڑی بڑی جھولیں، دھرپال ڈالی جاتی ہیں تاکہ حشم خدم پیدا ہو، تو زینت بھی ہے اور سواری بھی۔ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ . (1) فرمایا: یہ تو وہ سواریاں ہیں جو آج موجود ہیں اور جو آگے اللہ پیدا کرے گا وہ اور بہت ہیں۔

سو برس پہلے دو سو برس پہلے کس کو خبر تھی کہ موٹر ایجاد ہو جائے گی، ریلیں ایجاد ہو جائیں گی۔ یہ اونٹ جو سواریاں ہیں ان پر سواریاں شروع کیں، جب یہ ریل اور موٹر ایجاد ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایروپلین ایجاد ہو جائیں گے۔ آج ہوائی جہاز ایجاد ہو گئے تو مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں آدمی طے کرلیتا ہے

پھر ان جہازوں میں نئی نئی ایجادات ہیں کہ ایک جہاز ڈھائی سو میل چلتا تھا تو پانچ سو میل کی رفتار فی گھنٹہ میں نکال لیا۔ اب اس کے بعد اطلاعات آرہی ہیں کہ ایک گھنٹہ میں ایک ہزار میل ہوائی جہاز اڑے گا، یا پندرہ سو میل

(1) پارہ: ۱۴، سورة: النحل، الآية: ۸.

اڑے گا، تو پندرہ سو میل ایک گھنٹہ میں طے ہوں گے، ڈھائی ہزار میل ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہو جائیں گے۔ گویا یہاں سے آدمی ڈیڑھ گھنٹہ میں جدہ پہنچ جائے گا اور جدہ سے آدھ گھنٹہ میں مکہ پہنچ جائے گا۔

اور ایک وقت آئے گا کہ آدمی چاہے پی کر گھر سے کہے گا کہ میں ذرا عمرہ کر آؤں جا کے اور کھانا یہیں آ کے کھاؤں، تو وہ چائے پی کے جائے گا ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچ گیا، عمرہ کیا اور جہاز سے واپس آ کر گھر پر کھانا کھالیا تو جو مسافت کہ آدمی اپنے پیروں سے نہیں طے کر سکتا تھا۔ حق تعالیٰ نے قلوب میں ایسی حکمتیں القاء فرمائیں کہ نئی سے نئی سواری آدمی نے ایجاد کی: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔ اور زمین کے تابع ہے فضا تو فضا میں اڑو، وہ بھی اس کے ساتھ میں آ گئی تو آسمان زمین کے درمیان میں جو اور خلا ہے اس میں انسان اپنے سواریاں پہنچا رہا ہے حتی کہ اس نے ہمتیں باندھیں کہ میں تو چاند پر پہنچ جاؤں گا اور اگر وہ پہنچنا چاہے اور اللہ تعالیٰ قدرت دے تو آدمی پہنچ بھی سکتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہے کوئی وہ چیز ممنوع نہیں ہے، تو: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔

یادِ حق کے ساتھ انسانی تصرفات منشاءِ خداوندی ہیں...... اب اس سارے سیر و سفر کا حاصل کیا ہے: کہ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ''زمین کے رزق سے فائدہ اٹھاؤ''۔ کھانے کی چیز سے کھانے کا فائدہ، استعمالی چیز سے استعمال کا فائدہ، زینت کی چیز سے زینت کا فائدہ، کچھ چیزیں پیٹ میں جاتی ہیں، کچھ چیزیں بدن کے اوپر رہتی ہیں اور کچھ بدن کے باہر رہتی ہیں۔ پیٹ میں کھانا جاتا ہے، بدن کے اوپر لباس رہتا ہے، لباس سے باہر باہر مکان اور بلڈنگ اور بنگلے رہتے ہیں اور یہ سب زمین ہی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ سب کے مادے زمین ہی سے نکل رہے ہیں، تو زمین کو ایک عجیب و غریب خزانہ حق تعالیٰ شانہٗ نے بنا دیا اور انسان کے ہاتھ میں دے دیا کہ تصرف کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی تصرف سے روکا نہیں گیا بلکہ منشاء قدرت ہے کہ تصرف کرو۔

مگر ایک چیز بتلا دی کہ سب کچھ کرو، مگر ہمیں مت بھولو، اس لیے کہ ہم ہی تو ہیں محسن حقیقی، ہم نے ہی تو یہ زمین بنائی، ہم نے ہی تو تمہارے دلوں میں یہ چیزیں ڈالیں کہ کس طرح اس زمین کے مادے کو، اس کی نعمتوں کو استعمال کرو۔ تو یہ سارا جو کچھ بھی ہے ہمارے انعام اور احسان کا ثمرہ ہے تو بدفطرت ہوگا وہ انسان کے منعم کا انعام کھائے اور منعم کو بھول جائے، محسن کے احسان سے فائدہ اٹھائے اور محسن کو بھلا دے، وہ بدفطرت کہلائے گا۔ سلیم الفطرت انسان وہ ہے کہ جتنی نعمت بخشی جائے اتنا ہی شکر بڑھتا جائے، اتنی ہی طاعت بڑھتی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ سلیم الفطرت انسان ہے، دنیا کی ہر چیز کو اللہ نے نعمتوں سے مالا مال کیا۔

کرامت انسانی...... مگر سب سے زیادہ نعمتیں جو دیں وہ انسان کو عطا کیں، سب سے زیادہ چہیتی مخلوق اللہ کی اور پیاری مخلوق وہ انسان ہے اس لیے اسے وہ کچھ دیا کہ وہ کسی کو نہیں ملا، اسی کو ایک جگہ فرمایا گیا کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ

مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا. ① ہم نے انسان کو معظم اور مکرم بنایا اور بحر و بر میں اسے اٹھایا کہ بر میں جہاں چاہے چلا جائے اور بحر میں بھی جہاں چاہے چلا جائے۔ بر کے لیے سواریاں الگ......دریا کے لیے سواریاں الگ دیں، فضا کے لیے سواریاں الگ دیں۔ دنیا کا ہر جاندار اپنے پیروں سے چلتا ہے، آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ گھوڑا گھوڑے پر سوار ہو کر جائے، شیر شیر پہ، سانپ سانپ پر، بچھو بچھو پر، ہر ایک چیز اپنے پیروں پر سفر کرتی ہے۔ حتیٰ کہ دریا میں بھی اگر گر جائے تو تیر کر نکلتی ہے، یہ کرامت انسان کو دی گئی کہ دریا میں جائے تو سواریاں موجود، خشکی میں چلے تو سواریاں موجود، فضا میں جائے تو سواریاں موجود حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ. پھر دنیا کے جس جاندار کو آپ دیکھیں گے اس کی ایک غذا متعین ہے، مثلاً شیر خون ہی پیئے گا، گوشت ہی کھائے گا، پرندے ہیں وہ دانہ چگیں گے وہ گوشت نہیں کھاتے، حیوان چرندے ہیں وہ گھاس کھائیں گے، لیکن انسان کے لیے ساری چیزیں وقف ہیں، گھاس یہ کھا جائے، ماس یہ کھا جائے، مٹی یہ کھا جائے پتھر یہ کھا جائے۔ سونا اور چاندی یہ کھا جائے، جواہرات یہ کھا جائے، اول تو ساری چیزیں مٹی سے بنی ہوئی ہیں.........تو آدمی ویسے بھی مٹی کھاتا ہے۔ اب یہ پان کھاتے ہیں ہم یہ چونا مٹی کے سوا اور کیا ہے، پتھر بھی کھا لیا آدمی نے، پھر سونے اور چاندی کہیں ورق بن رہے ہیں تو وہ دواؤں میں کام آ رہے ہیں سونے اور چاندی کے زیور تو الگ ہیں، کھانے میں بھی سونا اور چاندی استعمال کیا جاتا ہے۔ جواہرات ہیں تو یاقوتیاں بنتی ہیں وہ مقوی باہ ہوتی ہے، وہ مقوی بدن ہوتی ہیں۔ تو یاقوت اور زمرد آدمی بھی کھا جاتا ہے۔ تو گھاس بھی کھا جائے، ماس بھی کھا جائے، پتھر بھی کھا جائے، مٹی بھی کھا جائے، پھر کون سی سبزی ہے جو آدمی نہیں کھاتا۔ ترکاریاں ہر قسم کی بجز اس کے کہ کوئی کڑوی ہو اور نہ منہ میں چلے تو چھوڑ دے اس کی عنایت ہے۔ کھانے والے اسے بھی کھا جاتے ہیں تو غرض دنیا کی ہر چیز انسان کھاتا ہے۔ تو فرمایا کہ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ہر پاکیزہ چیز ہم نے انسان کو دی۔

ناپاک چیز سے روک دیا کہ وہ مت کھاؤ، کھانے کے لیے بہتیری پاک چیزیں ہیں۔ مردار مت کھاؤ، خنزیر مت کھاؤ، شراب مت پیو کہ یہ چیزیں نجس بنائی گئی ہیں، تم نجاستوں کے استعمال کے لیے نہیں بنائے گئے، تم بنائے گئے ہو پاکباز، معظم اور مکرم، تو تمہاری غذا بھی پاک ہونی چاہیے۔ نہ کہ ناپاک چیزیں۔ تو پاک چیزیں اتنی بنا دی ہیں کہ ان کی حد و نہایت نہیں، تو یہ کیا مصیبت ہے کہ ناپاک کی طرف آدمی جائے۔ ناپاک کی طرف جب جائے کہ جب پاک چیزیں نہ ہوں۔ حرام خوری جب کرے کہ جب حلال چیزیں نہ ہوں۔ ناجائز پیشہ جب اختیار کرے کہ جب جائز پیشہ نہ ہو۔ تجارت ہے، زراعت، صحافت، ملازمت، صنعت ہے، حرفت ہے، کیا ضروری ہے کہ آدمی سود ہی لے اور بٹہ ہی لے اور چوری اور ڈکیتی کرے، اور ڈکیتی، یہ ناجائز پیشے ہیں۔ تو جائز پیشے اس لیے ہم نے بنا دیئے ہیں کہ تم ان کے اندر محدود ہو، تاکہ حرام اور ناجائز کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہ صرف حرص و ہوس ہے کہ انجام سے بے

① پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۷.

خبر ہو کر حرام چیزوں میں بھی آدمی پڑ جاتا ہے جس سے دنیا بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

استعمالِ اشیاء میں جائزاتِ شرعیہ سے تجاوز ممنوع ہے...... اس لیے فرمایا کہ زمین مسخر، سارے خزانے تمہارے، استعمال کرو مگر اللہ کو مت بھولو، یعنی ان اصول کے تحت رہو جو اللہ نے حرام وحلال کے اصول بنا دیئے جائزات کے حدود میں رہو، اسراف مت کرو۔ اپنے استعمال میں چیز لاؤ، مگر فضول خرچی سے نہیں بلکہ حدود کے اندر، دوسرے کو استعمال کے لیے دو، عنایت کرو، ہدیہ دو مگر حدود کے اندر، یہ ہدیہ نہیں ہے کہ سارا گھر لٹا دے آدمی، اور یہ بھی نہیں ہے کہ امساک اور بخل میں آ کر ایک پائی بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے، تو دینے میں عطا کرنے میں بھی درمیانی چال ہونی چاہیے، اپنے استعمال میں درمیانی چال ہونی چاہیے، حتیٰ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر دریا کے کنارے بیٹھ کر وضو کرو: لَا تُسْرِفْ فِي الْمَآءِ۔ اسراف مت کرو کہ خواہ مخواہ پانی اچھال رہے ہو۔ بیٹھے ہوئے اور ایک لوٹے میں وضو ہو سکتا ہے تو دو گھڑوں میں وضو کر لیا وہ اسراف میں شمار ہوگا، کپڑا پہنو مگر حدود کے اندر۔ فرمایا گیا ہے کہ جو آستین پہنچوں سے نیچے لگی ہوئی ہو وہ اسبال اور سدل کے حکم میں ہے وہ فضول خرچی ہے اس پر عنداللہ مواخذہ ہوگا... تو کپڑا پہننے میں بھی حد بندی کر دی، کھانے پینے میں بھی حد بندی کر دی، خزانے پر بیٹھے ہو مگر حدود کے اندر استعمال کرو، یہ مت سمجھو کہ جب دس لاکھ روپے ہیں میرے پاس تو جس طرح چاہے خرچ کرلوں۔ اس میں بھی حد بندی ہے کہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرو، نہ اتنا خرچ کرو کہ کل کو تم خود بھک منگے بن جاؤ، نہ اتنا امساک اور بخل کرو کہ نہ اپنے کام آئے نہ غیر کے کام آئے۔ ایک درمیانہ چال رہے۔ انہیں اصول پر چلنا اور جائزاتِ شرعیہ کے اندر رہنا یہی ہے حد بندی اور اللہ کو یاد کرنا۔

ذکر اللہ کے دو معنی...... تو ایک اللہ کو یاد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ استعمال کرتے وقت قلب میں غفلت نہ ہو، ذکر جاری ہو کوئی اچھی چیز کھائی تو الحمدللہ کہے، کھانے کی ابتداء کرے تو بسم اللہ سے کرے، لباس پہنے آدمی تو بسم اللہ سے لباس پہنے، اور جب پہن لے تو حمد وثناء کرے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا "اللہ کی حمد ہے کہ جس نے مجھے پہننے کو دیا"۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَنِیْ "اللہ کی حمد ہے اس پر کہ مجھے کھانے کو دیا"۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانِیْ "اللہ کی حمد کہ مجھے پینے کو دیا" گھر میں داخل ہوں تو ذکر اللہ یہ ہے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ ھٰذَا الْبَیْتَ۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ بلڈنگ دی، یہ مجھے مکان دیا۔ تو قدم قدم پر یہ دعائیں بتلائیں تاکہ مالک یاد رہے تو ایک تو ذکر اللہ کے یہ معنی ہیں کہ آدمی پڑھتا رہے۔ مختلف اوقات کی جو دعائیں بتلائی گئی ہیں، ان کو استعمال کرتا رہے، حمد وثناء کرتا رہے۔

اور دوسرے یہ ہے کہ اس شے کو اصول شریعت کے مطابق استعمال کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے چاہے زبان سے ذکر اللہ ہو یا نہ ہو مگر جب جائز کی حد میں ہے، طریقۂ شرعیہ پر چل رہا ہے، سنت کے مطابق چل رہا ہے وہ عملی ذکر ہے..... اگرچہ زبان پر ذکر نہیں، تو ذکر اللہ کے اور منعم اور محسن کو یاد کرنے کے دو طریقے بیان کیے گئے

ہیں۔ ایک یہ کہ زبان سے یاد کرو اس کے لیے وہ دعائیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیں۔
ذکر اللہ کی نہایت سہل صورت......اور اگر کسی کو وہ دعا نہ بھی یاد ہو تو ہر کام میں جو نعمت ہو کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ تو کہہ سکتا ہے استنجاء کر کے واپس آئے اگر دعاء یاد نہ ہو تو کم سے کم کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے میرے اندر سے تو نے فضلات نکال دیئے ہیں ہلکا ہو گیا۔ یہ تو کہہ سکتا ہے زبان سے، سونے کے لیے لیٹے اگر وہ دعا یاد نہ ہو تو آیۃ الکرسی پڑھ کر سو جائے۔ بسم اللہ پڑھ کر سو جائے، غرض اللہ کے نام سے سوئے جاگ جائے تو گویا موت کے بعد زندگی دی (اللہ نے) تو چاہیے کہ وہ دعا پڑھے جو حدیث میں فرمائی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَا تَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ. ① ''حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے موت کے بعد زندگی دی اور میں اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہوں''۔

لیکن اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کلمہ ہی پڑھتا ہوا اٹھے آدمی، سبحان اللہ کہتا ہوا اٹھے، الحمدللہ کہہ کر اٹھے۔ تو ایک ہے لسانی ذکر اس میں اعلیٰ طریقہ وہ ہے کہ سنت کے مطابق جو الفاظ ثابت ہیں انہیں یاد کر لے، بچوں کو یاد کرا دیئے جائیں، بآسانی یاد کر لیں گے، جو بچے پورا قرآن شریف یاد کر لیتے ہیں وہ کیا دعائیں حدیث کی یاد نہیں کر سکتے، مہینے بھر میں سب دعائیں یاد ہو جائیں گی اور اگر نہ ہو تو کم سے کم اللہ کا نام زبان پر ہو یہ لسانی ذکر ہے۔
اور ایک یہ کہ ہر چیز کے استعمال میں یہ دیکھ لے کہ شریعت کے مطابق کر رہا ہوں استعمال یا نہیں، وہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے، کمانے کے لیے بیٹھے آدمی تو یہ دیکھ لے کہ جائز پیشہ اختیار کیا ہے یا ناجائز، جائز کو اختیار کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہے یہ بھی اللہ کی یاد ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ نعمتیں استعمال کرو، کوئی روک نہیں، مگر حدود میں رہ کر، اسراف نہ ہو فضول خرچی نہ ہو، جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا کہ: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا. ② ''اے رسولوں کے گروہ پاک غذائیں استعمال کرو، کھانے کی ہوں، پہننے کی ہوں لیکن عمل صالح کرتے رہو''۔ وہ ذکر اللہ آ گیا تاکہ محسن کا حق ادا ہوتا رہے۔ اور اس کا احسان دل کے اندر تازہ بہ تازہ رہے۔
یہ جو نمازیں پڑھتے ہیں یہ بھی وہی ذکر اللہ ہے کہ اے اللہ! ہم نے نعمتیں استعمال کیں مگر آپ کو نہیں بھلایا، جو اوقات فرض کر دیئے حاضر ہیں آپ کی بارگاہ میں، مؤذن اذان دیتا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر۔

یہ محض اعلان نہیں کہ اطلاع دے دی کہ آ جاؤ نماز کے لیے، یہ یاد دلانا ہے ذکر اللہ کا کہ تم ہر وقت اللہ کی کبریائی اور عظمت دل میں رکھو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. توحید اپنے دل میں رکھو، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ نبوت کی عظمت اور عقیدت اپنے دل میں رکھو، حَیَّ عَلَى الصَّلٰوۃ نماز کی طرف جھکو، حَیَّ عَلَى الْفَلَاحِ دنیا و آخرت کی بہبود اور فلاح کی طرف آؤ، تو کبریا خداوندی، توحید الٰہی، نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ یاد دلانے کے لیے مؤذن

① الصحيح لمسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب مايقول عندالنوم وأخذ المضجع ج:١٣ ص:٢٣٧ رقم:٤٨٨٦. ② پارہ ٢٤، سورة: المومنون، الآية: ٥١.

پانچ وقت کھڑا ہوتا ہے تاکہ بندے غفلت میں نہ پڑ جائیں اور اگر اپنی نعمتوں میں پڑے ہوئے ہوں تو اذان کی آواز سنتے ہی چونک جائیں ایک دم کہ اب ہمیں حق بھی ادا کرنا ہے اس محسن کا جس نے یہ ساری نعمتیں دیں اس لیے فرمایا کہ زمین کی نعمتیں استعمال کرو اس کے کندھوں پر سیر و سیاحت کرو، سفر کرو، مگر ہمیں مت بھلاؤ۔

سفر تنہائی...... اس لیے کہ اگر تم بھول گئے تو وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ دیکھو کل کو آنا ہے ہمارے سامنے، اگر یہیں رہنا ہوتا دنیا میں ابدالآباد تک کے لیے تب بھی انسان یہ غور کرتا کہ جانا تو مجھے ہے ہی نہیں (چاہے یاد کروں چاہے نہ کروں زمین میری۔ لیکن ایک دن زمین کو چھوڑنا ہے اور موت کا منظر سامنے ہے، ہزاروں لاکھوں انسان گزر رہے ہیں اس زمین کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جو لکھ پتی تھے وہ بھی جا رہے ہیں جو بھک منگے تھے وہ بھی جا رہے ہیں۔ غرض ایک نہ ایک دن اس زمین کو چھوڑنا ہے اور اس کی ساری نعمتوں کو چھوڑنا ہے اور چھوڑ کر جانا کہاں ہے؟ فرماتے ہیں ہمارے ہی پاس تو آنا ہے جہاں سے گئے تھے وہیں تو لوٹ کر آؤ گے، تو اس دن کو بھی یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اسے بھلا دو اور اس کو فرماتے ہیں؛ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ⓵

ہمارے پاس تم تنہا تنہا آؤ گے کوئی لشکر ساتھ نہیں ہوگا، بادشاہ ہے وہ بھی اسی زمین فرش خاک پر ہمارے پاس آئے گا۔ اور فقیر ہے وہ بھی اسی فرش خاک پر کوئی لاؤ لشکر تمہارے ساتھ نہیں ہوگا، تو جیسے تنہا ہم نے بھیجا تھا تمہیں کہ ماں کے پیٹ میں تم ہی تھے، اسی طرح سے زمین کے پیٹ میں جو اصل ماں ہے تم تنہا ہی آنے والے ہو۔ فرماتے ہیں کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى پھر اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی تمہارے ساتھ لاؤ لشکر ہوگا جو ہمارے مقابلہ میں تمہاری مدد کر دے گا، تنہا آؤ گے اور اگر ساری دنیا کا لشکر لے کر بھی آؤ تو ہمارے مقابلہ میں تمہاری کیا چل سکتی ہے؟ ہم تو خالق ہیں، پیدا کرنے والے ہیں، جب چاہیں موت دے دیں، جب چاہیں ضعیف کر دیں، کمزور بنا دیں، تو مقابلہ اس کا کرو جو عاجز ہو، قادر مطلق کا کیا مقابلہ؟ اول تو تم تنہا آؤ گے، یہ سارا لاؤ لشکر یہیں رہ جائے گا اور اگر کسی کے ساتھ بالفرض ہو بھی لشکر ہمارے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا، اس لیے فرمایا: وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔

لشکر الٰہی سے بے خوفی کی کوئی صورت نہیں...... یہاں سے انسان کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اللہ کا لشکر جو ہے وہ تو فرشتے ہیں جو دارالسلطنت میں رہتے ہیں آسمانوں کے اندر جو میں ہیں فضا میں ہیں۔ بھلا اتنے لشکر آئے گا اتنے میں ہم اپنا کام کر لیں گے، تو کیا ضرورت ہے یاد کریں، مقابلہ کے لیے تیاری کر لو، اس سے ہم اپنا کام کر گزریں گے، بہر حال لشکر کو بنتے سنورتے دیر لگتی ہے، اتنے میں ہمارا کام ہو جائے گا، تو کیا مقابلہ ہوگا اس لیے آگے فرمایا کہ: ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ ۔ تم فرشتوں کے لشکر کو لے رہے ہو یہ

⓵ پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۹۵۔

زمین بھی تو ہمارا لشکر ہے اگر اس کو ہم زلزلے سے دھنسا دیں اور سب دھنستے ہی چلے جاؤ۔ تو کسی فرشتے کے بھی آنے کی ضرورت نہیں جو زمین فرش بنی ہوئی تھی وہی منٹ بھر کے اندر قبر بن جاتی ہے۔ اسی میں آدمی دفن ہو جاتا ہے تو ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ. کیا آسمان والے سے تم بے پرواہ ہو گئے؟ اگر زمین کو ہم زلزلے میں ڈال دیں اور لگے موجیں مارنے اور جگہ جگہ اس میں دراڑ کھل جائیں اور پناہ نہ ملے تب کیا ہوگا؟ فرشتوں کو آتے آتے اگر بالفرض دیر بھی لگی تو لشکر اوپر کا کیا آئے گا۔ یہ تو نیچے ہی لشکر موجود۔

اور میں کہتا ہوں زمین بھی بعد کی چیز ہے ایک چیونٹی کو مسلط کر دے، کان میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے...... ایک کیڑا مکوڑا ناک میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے...... تو ایک چیونٹی جسے ختم کر سکتی ہے وہ قادر مطلق کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھے گا کہ فرشتے آویں گے، مقابلہ ہوگا، دیکھی جائے گی، فرشتے تو بعد آویں گے جو تمہارا فرش خاک ہے وہی تمہارے لیے مقابلہ کا لشکر ہے اس کی پیداوار میں ایک چیونٹی تمہارا مقابلہ کر سکتی ہے۔

قادر مطلق تکبر و نخوت کو جس طرح چاہے توڑ دے...... نمرود جیسے عظیم بادشاہ کو جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کا دماغ نیچے آتا ہی نہیں تھا، وہ تو کہتا تھا کہ میں رب ہوں، اس کو کیسا نیچا دکھایا کہ ایک مچھر اس کی ناک میں گھس گیا اور دماغ میں جا کر لپٹ گیا اور وہ پھڑ پھڑ کرتا تھا، اب وہ بے چین، تو اس نے طریقہ یہ رکھا تھا ایک خادم مقرر کر رکھا تھا کہ وہ جوتے سر پر مارتا تھا، جب جوتے پڑتے تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا مچھر اور جہاں جوتے الگ ہوتے پھر پھڑ پھڑایا، پھر اس نے خادم کو بلوایا تو جن پر خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا انہیں کے ہاتھ سے سر پر جوتے پڑوا دیئے، تو مطلب یہ ہے کہ چیونٹیاں بھی بعد کی چیز ہیں، خود انسان ہی کو مسلط کر دے تمہارے اوپر جس کو تم اپنا بندہ جانتے ہو خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو اسے ہی جوتیاں دے کر تمہارے سر پر مسلط کر دے تو کیا کرو گے، تو خالق سے بچ کر کہا جائے گا آدمی، تو زمین ہے، زمین کی پیداوار ہے اور خود انسان ہے، وہ تمہارے حق میں مد مقابل آ جائیں گے اور ایک فوج انسانوں کی کھڑی کر دے اور وہ تلواریں لے کر آ جائے تو سارا کر و فر رہ جاتا ہے۔ تو انسان ہی انسان کو بتلا دیتا ہے وہ درحقیقت خدا کی طرف سے لشکر مسلط ہوتا ہے۔ تا کہ متکبروں کا غرور توڑ دیا جائے نخوت شعاروں کی نخوت توڑ دی جائے، انسان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ بہر حال ایک وقت آنا ہے کہ ہماری طرح آؤ گے اور آنے کے سلسلے میں موت بھی قبول کرنی پڑے گی۔

اسباب موت ہزاروں ہیں!...... اور موت کے اسباب ہزاروں ہیں، جانور کاٹ لے، ہارٹ فیل ہو جائے، زمین میں دھنس جائے، کوئی اوپر سے مصیبت آ پڑے، ہزاروں اسباب ہیں کہ جن کے ذریعے سے ہم تک آؤ گے، تو اس وقت کو بھی یاد رکھو کہ سدا یہ وقت نہیں رہے گا کہ بلڈنگ بھی ہے، دولت بھی ہے، کام چل رہا ہے۔ یہ سب وقتی چیزیں ہیں اصل وہی وقت ہے کہ جو آنے والا ہے وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ اسی کی طرف تمہیں پھیل کر جانا ہے۔ توءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ. زمین ہی میں دھنسا دے تو کیا ہوگا؟ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ

الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۔ کیا تم مطمئن ہو مامون ہو آسمان والے سے اگر پتھر برسا دے آسمان سے، بادل آئیں اور بجائے پانی برسنے کے پتھر برسنے لگیں اور میں کہتا ہوں کہ یہ اولے جو پڑتے ہیں پتھر ہی تو ہیں اسی پانی کو منجمد کر کے جما کر پتھر کی شکل دے دیتے ہیں۔ اگر وہ بڑھ جائیں دو دو سیر کا ایک اولہ پڑنے لگے تو پناہ نہیں مل سکتی، مکان ٹوٹ جاتے ہیں، ڈھ جاتے ہیں، انسان تو بجائے خود ہے کمزور تو کس چیز نے تمہیں مطمئن بنا رکھا ہے، مالک کی طرف سے کون سی پناہ گاہ ہے کہ اس سے بچ کر تم اس میں پناہ پالو گے اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۔①

اگر تم بڑے بڑے سنگین قلعوں میں بڑے بڑے پتھر کے برجوں میں، لوہے کے برجوں میں رہو گے موت وہیں جا پکڑے گی، یہ نہیں ہے کہ موت میدان میں آتی ہے اگر برجوں کے اندر تم کوئی منفذ ہی نہ رکھو، ہوا کا راستہ نہیں تو حبس دم ہو کر آدمی ختم ہو جائے، ہوا کا راستہ رکھو تو بھی بہر حال ختم ہو سکتا ہے تو فرشتے موت کے ان کے یہاں نہ سنگین کوئی چیز ہے نہ لوہے کے قلعے کوئی چیز ہیں۔ جیسے بجلی جب آتی ہے تو کتنا ہی بڑا لوہا ہو وہ تو اس کے جگر میں سما جاتی ہے۔ تو ملائکہ تو بجلی سے بھی زیادہ لطیف ہیں۔ وہ ہر چیز میں سما کر اندر دخول کرتے ہیں تو موت کے فرشتے وہیں پہنچ جائیں گے۔

تو فرماتے ہیں کہ زمین بھی سبب موت بن سکتی ہے پانی بھی سبب موت بن سکتا ہے، بادل بھی سبب موت بن سکتے ہیں، اولے برس جائیں، پتھر برس جائیں..... آخر لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے اور کیوں برسائے گئے اس لیے کہ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا، جائز طریقہ دیا گیا تھا کہ نکاح سے عورتوں کی طرف آؤ انہوں نے لڑکوں کو استعمال کیا، اس لواطت کے جرم میں آسمان سے پتھر برسائے گئے اور کوئی پناہ نہیں پا سکے۔ قوم ثمود، ان کو تباہ کر دیا گیا، ایک چنگھاڑ سے جبرئیل علیہ السلام نے ایک ڈانٹ دی، گھر کی دی، کلیجے پھٹ گئے، قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا کہ سات دن تک ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں۔ اس طرح سے کہ جو مکان گہری گہری بنیادوں کے تھے مع بنیادوں کے ہوا نے اکھاڑا اور اوپر لے جا کر پٹخا نیچے کی طرف حدیث میں ہے کہ جب مکان اوپر جاتے تھے تو جانوروں کی آوازیں اوپر سے سننے میں آتی تھیں فضا سے مع جانوروں کے مکان اوپر گئے اور لے جا کر پٹخ دیئے گئے۔ تو وہی ہوا جس سے ہم زندگی حاصل کرتے ہیں وہی موت کا ذریعہ بن جاتی ہے وہی زمین جو فرش تھا ہمارے لیے بوہی قبر بنا دی جاتی ہے۔ وہی بادل جو پانی برساتے تھے اور زندگی کا سامان ہوتا تھا وہی ذریعہ موت کا بنے..... تو ہم تو زندگی کے اسباب کو چاہیں تو موت کا سبب بنا دیں پھر تم مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ گئے، کس طرح سے غفلت میں پڑے، اس واسطے ادھر توجہ دلائی کہ زمین کا ملک بے شک تمہارے لیے ہم نے کیا، مگر دیکھو دینے والے کو مت بھلاؤ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ زمین میں دھنسا دیئے جائیں اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ

① پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۷۸۔

يُّرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبًا ۔۔ یا پتھر برسا دیئے جائیں آسمان سے فَسَتَعۡلَمُوۡنَ كَيۡفَ نَذِيۡرِ. اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ڈرانے والے کا ہے سے ڈراتے تھے۔اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ انبیاء علیہم السلام نے جن چیزوں سے ڈرایا تھا وہ معاذ اللہ! واہی تباہی باتیں نہیں تھیں۔وہ ایک امر واقعہ تھا جو ہونے والا تھا تو اس وقت نذیروں کی نذارت کا پتہ چلے گا، ڈرانے والوں کے ڈرانے کا پتہ چلے گا اس وقت تم ایمان لاؤ گے کہ سچ کہتے تھے وہ، لیکن اس وقت ایمان لانے سے کیا فائدہ کہ جب موت سر پر آ گئی۔موت سے پہلے پہلے درجہ ہے ایمان کا بھی اور ڈرنے کا بھی۔

تصدیق وتکذیب کا انجام ......اس میں فرماتے ہیں کہ پھر دو قسم کے لوگ ہوں گے، ایک وہ کہ جنہوں نے تصدیق کی اور جو کچھ انبیاء نے فرمایا انہوں نے امنا کہہ کر دل میں جگہ دی اور ان کے طریق پر چلے دنیا بھی بن گئی۔ اور آخرت بھی ان کے لیے۔ایک جھٹلانے والے تھے، جنہوں نے تکذیب کی اپنے غرور میں آ کر کسی نے دولت کے گھمنڈ میں کسی نے رسمی علم کے گھمنڈ میں کسی نے اپنی تھوڑی سے عقل کے گھمنڈ میں وحی کو نہ مانا، انبیاء کی باتوں کو جھٹلایا وَلَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ . اس وقت وہ لوگ کہ جو جھٹلانے والے تھے جب وہ انجام بد سامنے آئے گا تب وہ کہیں گے کہ واقعی جو نکیر کی جا رہی تھی وہ اب سامنے آئی۔ بالکل ایسی اس کی مثال ہے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں نو مہینے سے اندر پرورش پا رہا ہے اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری زمین اور آسمان بس یہی ہے ماں کا پیٹ۔اس کا دھیان ہی آگے نہیں جاتا ایک آنے والا وہاں خبر دے کہ جس عالم میں بسر کر رہا ہے یہ تو مہا گندا عالم ہے۔ بہت تھوڑا سا عالم ہے۔ایک عالم ہے دنیا، بڑا بھاری عالم ہے۔ماں کے پیٹ جیسے مکان کروڑوں بن سکتے ہیں اس کے اندر، تو وہ یوں کہے گا کہ یہ واہی باتیں کہہ رہا ہے۔ بھلے اس سے بڑھ کر کوئی اور عالم ہو سکتا ہے، حیض کا خون مل رہا ہے کھانے کو اور پانی کے اندر میں تیر رہا ہوں کتنا اعلیٰ مکان ہے اس کے بساط میں ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو سمجھے اس نے دنیا کو جھٹلا دیا، لیکن جب پیدا ہوا اور دنیا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ماں کے رحم جیسے تو کروڑوں عالم بن سکتے ہیں اس دنیا میں، وہاں غذا ملتی تھی گندے خون کی۔ یہاں اعلیٰ درجے کی مٹھائیاں ہیں، غذائیں ہیں، تو کہنے والا سچ کہتا تھا۔میں نے جھٹلایا اب وہ نادم ہے، لیکن جب اس دنیا میں آ گئے تو اسی آنے والے نے پھر کہا، اب ایک دفعہ تو جھٹلا چکا ہے اب میں خبر دیتا ہوں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور بہت بڑا عالم آنے والا ہے جس کو عالم برزخ کہتے ہیں اور وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیائیں جیسی کروڑوں بن سکتی ہیں اس کے اندر، جب ایک میت کے سامنے قبر وسیع کی جائے گی اور حد نظر تک ایک عالم نظر آئے گا تو ایک ایک برزخ والے کو اتنا بڑا ملک ملے گا جیسی ایک دنیا۔

تو دنیائیں کروڑوں بن سکتی ہیں عالم برزخ میں سے، اتنا بڑا عالم ہے تو آنے والا کہتا ہے کہ ایک دفعہ تو نہیں سمجھا، مگر اب سمجھ جا، اس کے بعد ایک عالم آنے والا ہے اور اس کے بعد ایک اور آنے والا ہے جس کو عالم جنت کہتے ہیں۔تو یہ برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں سے بن جائیں، وہاں ادنیٰ جنتی کا حصہ دس دنیا کے برابر ہوگا

یہاں تو ایک ہی دنیا کے برابر ہے۔ تو جھٹلانے والے تو اخیر تک جھٹلاتے چلے جائیں گے اور تصدیق کرنے والے ابتداء سے ہی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بھی سچ کہا کہنے والے نے، اگلی بات بھی سچ کہی، اس سے اگلی بھی سچ کہی، تو تصدیق کرنے والا امن میں ہے اس لیے کہ جسے مان لیا تھا وہ چیز آ گئی اس کی آنکھوں کے سامنے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: وَ نَادٰٓی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا اہل جنت کہیں گے ہم نے تو اللہ نے جو وعدے کیے تھے، ٹھیک اس کے مطابق پا لئے، تمام انعامات ہمیں مل گئے، تمہیں بھی وہ چیز مل گئی جس کا تم سے کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانو گے تو جہنم ملے گی تو تمہیں مل گیا اللہ کا وعدہ۔ قَالُوْا نَعَمْ ج کہیں گے، ہاں اب ہم اقرار کرتے ہیں کہ مل گیا لیکن اس وقت کا اقرار کام نہیں دے گا۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ. (1) ایک نداء کرنے والا نداء کرے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت جو، اب آ کر سمجھے ہیں وہاں ایمان نہیں لائے۔

قبولیت ایمان کا وقت...... تو بعد میں ایمان لانا وہ ایمان نہیں ہے وہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔ جب موت کے فرشتے سامنے آ گئے اور آنکھوں سے نظر آ گئے اب کوئی کہے میں ایمان لاتا ہوں وہ ایمان نہیں۔ ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کو ماننا، غیب کی خبر اس نے نہیں مانی تو وہ فرعون کا سا ایمان ہے، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی، جب غرق کیا گیا اور گلے گلے پانی آیا تو اس وقت کہا کہ میں ایمان لایا موسیٰ کے خدا پر، بنی اسرائیل کے خدا پر اس وقت فرمایا گیا: آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (2) اب ایمان لایا اور چار سو برس تک زمین میں فساد پھیلایا، وہاں تو موسیٰ کی بات نہ مانی اب کہتا ہے کہ میں ایمان لایا، تو وہ ایمان مجبوری کا ہے، جب آنکھوں کے سامنے عذاب آ گیا تو اب بھی ایمان نہیں لائے گا؟ تو اسے ایمان تھوڑا ہی کہتے ہیں تو وقت کے بعد کسی چیز کو سمجھنا وہ ایسا ہی ہے جیسے مثل مشہور ہے فارسی کی:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد

دشمن نے جب آ کر گھیر لیا اور سب ہتھیار بے کار ہو گئے اس وقت کہا کہ افوہ! قلعے میں فلاں ہتھیار بھی تو رکھا ہوا ہے۔ تو اب اس ہتھیار کو اپنے منہ پر مارنا چاہیے دشمن تو قابض ہو گیا۔ تو بعد از وقت جو چیز یاد آتی ہے وہ بے کار ہوتی ہے اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ نعمتوں کے زمانے میں ہمیں یاد کرو۔ جب مصیبت آ پڑی اس وقت کا یاد کرنا یاد نہیں کہلائے گا۔

یاد خداوندی کا وقت...... ایک حدیث میں ہے: حدیث قدسی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں بندوں سے خطاب کرتے ہیں کہ ”اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانہ میں مجھے یاد کرتا کہ تیری بیماری کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے تو اپنی نعمت کے زمانہ میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مصیبت کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں۔

(1) پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۴۴۔ (2) پارہ: ۱۱، سورۃ: یونس، الآیۃ: ۹۱۔

اور اپنی زندگی میں مجھے یاد کر، تاکہ تیری موت کے وقت میں تیری دست گیری کروں۔'' جب اس وقت یاد نہ کیا تو موت کے وقت کیا یاد کرے گا اور جب نعمت میں یاد نہ کیا تو مصیبت کے وقت کیا یاد کرے گا؟ تو یاد کرنا وہ ہے کہ آدمی قبل از وقت یاد کرے۔

سات قسم کے آدمی قیامت کے دن عرش الٰہی کے سائے میں ہوں گے...... اسی واسطے فرمایا گیا حدیث شریف میں کہ سَبۡعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ ① '' سات قسم کے افراد ہوں گے کہ جن کو قیامت کے دن عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ نہیں ہوگا بجز اللہ کے'' سائے کے، ان میں سے ایک قسم فرمائی گئی کہ شَابٌّ نَشَأَفِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وہ نوجوان جس نے نوجوانی میں اللہ کو یاد کیا اور عبادت میں وقت گزارا، اس لیے کہ بڑھاپے میں اگر عبادت کرے وہ زیادہ عجیب بات نہیں، جب قبر میں پیر لٹکا چکا آدمی دنیا کی قوتیں جواب دے گئیں، جذبات سرد پڑ گئے امنگ باقی نہیں رہی، کھٹے میٹھے کی طرف کوئی توجہ نہیں رہی، اب بھی اگر اللہ کو یاد نہ کرے گا تو اور کون سا وقت آئے گا تو وہ مجبوری کا یاد کرنا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یاد کرنا وہ ہے جو جوانی کے زمانہ میں یاد کر لے آدمی جبکہ امنگوں کے سبز باغ سامنے ہیں، امنگیں سامنے ہیں، دنیا کی بہاریں سامنے ہیں، قوت اندر موجود ہے، اس وقت ہر چیز سے کٹ کر آدمی متوجہ ہو اللہ کی طرف وہ زیادہ عجیب چیز ہے تو وقت آنے سے پہلے پہلے یاد کر لے، یہی یاد کہلاتی ہے اور وقت آجانے کے بعد یاد کرے وہ یاد، یاد نہیں ہے۔

قیامت کے حساب سے پہلے اپنا حساب کر لیں...... اس لیے اس آیت میں توجہ دلائی گئی وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ زمین سے فائدہ اٹھاؤ، چلو پھرو ہمارے خزانوں سے منتفع ہو مگر اسے یاد رکھو کہ لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے اور حساب دینا پڑے گا اور ایک ایک چیز کا، ایک ایک ذرہ کا حساب دینا ہوگا، اس کو ایک جگہ فرمایا گیا قرآن کریم میں کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ② پھر قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائے گا تم سے، کہاں سے کمایا کس طرح استعمال کیا۔

نعیم کی تفسیر...... اور نعیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سردی کے زمانہ میں گرم پانی بھی نعیم ہے۔ پوچھا جائے گا کہ سردی میں ہم نے گرم پانی دیا تم نے کیا شکر ادا کیا اور گرمیوں کے زمانہ میں ٹھنڈا پانی نعیم میں داخل ہے تو سوال کیا جائے گا کہ برستی ہوئی آگ میں ہم نے ٹھنڈا پانی دیا تم نے الحمد للہ کہا یا نہیں؟ تم نے توجہ کی ہماری طرف یا نہیں؟ وہاں ایک ایک ذرہ کا سوال کیا جائے گا، ایک ایک چیز کا اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ یہ ساری اربوں کھربوں مخلوق ہر ایک سے اس کی اربوں کھربوں چیزوں کا حساب لیا جائے گا اور حق تعالیٰ سوال کر لیں گے اور پچاس ہزار برس کا دن رکھا ہے قیامت کا تاکہ ساری امتوں کا حساب اس دن آجائے تو ایک ایک چیز کا سوال کیا جائے گا تو اس سے پہلے کہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الزكوٰة، باب فضل اخفاء الصدقة ج:۲ ص:۵۱۰، رقم:۱۰۲۱.

② پارہ:۳۰، سورۃ: التكاثر، الآية:۸.

وہاں سوال کیا جائے یہیں اپنے ذہن سے کیوں نہ سوال کرو، حدیث میں ہے کہ حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا ① قبل اس کے کہ حساب لیا جائے قیامت کے دن تم ہی اپنا کچا چٹھا کیوں نہیں درست کر لیتے یہاں، پہلے ہی اپنا حساب کیوں نہیں لے لیتے۔

مراقبہ کے ذریعہ روز کا روز حساب ......ایک معمولی سا عمل ہے اگر اسے ہی کر لے آدمی تو ساری زندگی درست ہو جائے۔ آپ بہر حال دن بھر کام کاج کر کے رات کو پڑ کے سوتے ہیں، چار پائی پر لیٹ کر ایک دس منٹ مراقبہ کر لے آدمی یہ سوچے کہ آج دن بھر میں میں نے کتنی اللہ کی اطاعت کی ہے، کتنی نافرمانی کی، نعمتوں پر کتنا شکر ادا کیا کتنا غفلت میں گزارا، جتنی چیزیں غفلت میں گزریں، جتنی چیزیں معصیت کی ہوں، گناہ کی ہوں، سچے دل سے توبہ کرے اور فرمایا گیا اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، اگر حقوق العباد ہیں تو سوچ لے رات کو پڑ کے کہ کس کس کی حق تلفی کی ہے، مال کی حق تلفی، کسی کو گالی دی ہے، کسی کو تیز جملہ کہا ہے کسی کا دل دکھایا ہے، یہ بھی حق تلفی ہے، اگلے دن اس سے معذرت کر لے کہ بھئی وقتی بات تھی جذبہ آ گیا تھا، میں نے تمہیں یہ کہہ دیا تم اللہ کے لیے معاف کرو، کچا چٹھا صاف ہو گیا کسی کی چیز زبردستی جھپٹ لی ہے واپس دے دو، اگر وہ خود تمہیں رضا سے دیدے رکھ لو، معاملہ صاف ہو گیا۔ کسی کو گالی دی ہے اس سے معافی مانگ لو معاملہ صاف ہو گیا۔ تو قبل اس کے کہ ان گالیوں کا ان معصیتوں کا وہاں حساب لیا جائے اس سے پہلے ہی کیوں نہ حساب لیا جائے۔

تو اگر روزانہ آدمی سوتے وقت ایک دس منٹ سوچ لے، تو دن بھر کی تو ساری باتیں یاد رہتی ہیں کہ کتنی نیکیاں کیں، کتنی بدیاں کیں، جتنی بدیاں کی ہیں ان سے توبہ کر لیں، جتنی نیکیاں کیں کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، میں تو اس قابل نہیں تھا کہ یہ نیکی انجام دوں، تیری توفیق بخشی سے انجام دیں تو شکر پر وعدہ ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ جتنا شکر کرو گے نعمت پر نعمتوں کو میں بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکیوں پر شکر کیا تو نیکیاں بڑھتی جائیں گی اور بدی سے توبہ کی تو وہ مٹتی رہے گی، تو روزانہ اگر آدمی چٹھا صاف کر لے، بدیاں مٹا دے، نیکیوں میں اضافہ کر لے یہ کونسی مشکل بات ہے اگر پانچ دس منٹ سوچ لیا کرے چار پائی پر لیٹ کر تو روز کا روز حساب ہوتا رہے گا۔ اور اگر نہیں سوچتا اور اس غرضے (چکر) میں ہے کہ جب موت کا وقت آئے گا جب کر لوں گا اکٹھی توبہ، تو اول تو جسے آج توفیق نہیں ہوئی کیا ضروری ہے کہ کل کو توفیق ہو گی۔

کل جب آئے گی تو کہے گا کہ کل کو کر لوں گا، پھر وہ کل آئی تو کل کل میں گزر جائے گی، اسے موقعہ ہی نہیں ملے گا، اور اگر موقعہ بھی ملا موت سے قبل تو اس وقت کہاں اتنا موقعہ ہے کہ اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور جو

---

① المصنف لابن ابی شیبۃ ج:۷ ص:۹۶ رقم: ۳۴۴۵۹۔ (یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔)

② المعجم الکبیر للطبرانی ج:۸ ص:۴۹ رقم: ۱۰۱۲۸۔ مجمع الزوائد، باب التوبۃ علی الذنب ج:۱۰ ص:۹۹۔

چیزیں کی ہیں ان کی تلافی کرے وہ تو مرنے کا وقت ہے، اس واسطے قبل از موت کرے،

آسان محاسبہ...... اس میں سہولت یہ کہ روز کا روز حساب کرتا رہے نامۂ اعمال درست ہوتا رہے گا۔ جیسے ایک سرکاری ملازم ہو اگر وہ روز کا روز اپنا حساب دیکھ لے، کاغذات درست کرلے وہ مطمئن رہے گا کہ چیکر جس وقت بھی آجائے گا میں پیش کردوں گا یہ میرا حساب صاف ہے۔ ہر وقت اسے امید لگی ہوئی ہوگی اور وہ چاہتا ہوگا کہ کوئی چیکنگ کرنے کے لیے آئے تاکہ میرا صاف ستھرا حساب دیکھے تو میری ترقی ہوگی اور گورنمنٹ سے میرا اعزاز ہوگا۔ اور ایک وہ ملازم ہے کہ اپنا وقت آرام سے گزار رہا ہے اس نے کہا غلطیاں ہیں مہینہ کے ختم پر کرلوں گا اکٹھی لیکن مہینہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ بیچ میں چیکر آگیا اب جو چیکنگ کی تو معلوم ہوا سارا حساب غلط ہے، تو سوائے برخواستگی کے، سوائے جرمانے کے، سوائے جیل خانہ کے اور کیا ہوگا اس کے لیے....؟ تو بہترین شخص وہ ہے جو روز کا روز حساب اپنا درست کرلے تاکہ انجام کے وقت مطمئن ہوکر چلا جائے کہ میرا چٹھا تو صاف ہے:

آں راکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک

جس کا حساب صاف ہے اس کو محاسبہ اور چیکنگ سے کوئی بھی ڈر نہیں ہوگا وہ تو تمنا میں رہے گا کہ کاش کوئی چیکنگ کرے تو میرا انعام بڑھے میری ترقی ہو۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ مہینہ اور سال کو چھوڑ کر اگر روز کا روز سوتے وقت ایک دس منٹ آدمی غور کرلیا کرے کہ کتنی میں نے حق تلفیاں کیں اور کتنی حقوق کی ادائیگیاں کیں۔ جتنی ادائیگی اللہ کے حقوق کی، بندوں کے حقوق کی ہوئی شکر کرے، حمد کرے اور کہے کہ یا اللہ! یہ تیری توفیق سے ہوا میں تو اس قابل نہ تھا اور جتنی غلطیاں ہوئیں فوراً معافی مانگ لے جو اہل حقوق ہیں ان سے معاف کرالے، وہ صاف ستھرا رہے گا، پھر اس کے قلب میں تشویش نہ ہوگی، طمانیت ہوگی، بشاشت ہوگی، بادشاہوں کی مانند اس کی زندگی ہوگی کہ میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں، کسی کا دَیندار (مقروض) نہیں ہوں۔ وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرے گا، یہ بہتر ہے کہ ایک آدمی فقیر، پریشان پراگندہ حال کی طرح زندگی بسر کردے، یا یہ بہتر ہے کہ بادشاہ بن کر زندگی بسر کرے، جس کا قلب صاف ہے وہ بادشاہت میں ہے اور جس کے قلب میں بے چینی ہے وہ فقیر ہے پریشان حال ہے تو اس پریشانی کو دور کرنے کی صورت شریعت نے محاسبہ رکھی کہ روزانہ اپنا حساب لے لیا کرے اس لیے فرمایا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ نعمتوں کے استعمال سے ہم نہیں روکتے، مگر دو باتیں چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ حدود میں استعمال ہو، حد سے گزرا ہوا نہ ہو اور ایک یہ کہ موت کو یاد کرتے رہو، بے فکر ہو کر مت رہو۔

کارآمد عبادت...... تو گویا مسلمان کی حقیقت نکلی متفکر، وہ فکر میں رہے کہ میرے سے کسی کی حق تلفی نہ ہوجائے، ہر وقت فکر لگی ہوئی ہو، اسی کو حدیث میں فرمایا گیا ہے: تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ . [1] ایک گھڑی فکر

---

[1] علامہ عجلونیؒ امام فاکھانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت سری سقطیؒ کا قول ہے، نیز فرماتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابودرداءؓ سے ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: فکرۃ ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ دیکھئے: کشف الخفاء ج:۱ص:۳۱۰۔

کرنا اپنے معاملے میں یہ ایک برس کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔

اس لیے کہ صحیح فکر سے ایک برس کی عبادت کا راستہ درست ہو جاتا ہے، کھل جاتا ہے تو بے فکری عبادت کارآمد نہیں ہے، فکر مندانہ عبادت ہوگی وہ کارآمد ثابت ہوگی، اس لیے اِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ سے توجہ دلائی گئی ہے کہ حساب آتا ہے اور ہماری طرف پہنچنے والے ہو، تم اس وقت کو پیش نظر رکھ کر کرو، جو تمہارا جی چاہے کرو، چاہے اسلام اختیار کرو چاہے کفر کرو مگر یہ سمجھ لو کہ آکر حساب دینا ہے۔

صوبۂ زمین کے احکام کا حاصل ...... اور اگر یہ کہو کہ ہمارے فرشتے وقت پر نہیں آئیں گے۔ اوّل یہ خام خیالی ہے لیکن اگر یہ ہو بھی تو فرشتوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ زمین ہی کافی ہے تمہارے لیے بادل ہی کافی ہیں، ایک مچھر ہی کافی ہے۔ وَمَا يَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ. اللہ کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا کہ کہاں کہاں ہیں۔ چاہے مچھروں سے کام لے لے، چاہے چیونٹیوں سے کام لے لے، چاہے بادلوں سے کام لے لے چاہے زمین سے کام لے لے۔ وَاِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ پہلے سے پہلے نذیروں کے ڈرانے کو یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ وقت کے وقت پر تمہیں یاد آئے تو کہو کہ واقعی ڈرانے والے صحیح کہہ رہے تھے ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس وقت کا اعتراف کارآمد ثابت نہیں ہوگا، تو یہاں تک حق تعالیٰ نے گویا زمین کا جو صوبہ ہے اس کی حکومت کا، اس کے متعلق ایک اجمالی صورت بیان فرمائی کہ نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی، حدود بتلا دیں۔ اب دوسرا علاقہ جو ہے وہ جو اور فضا کا ہے جس کو آگے شروع کیا گیا ہے۔

فضا پر خدائی حکومت...... اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقۡبِضۡنَ ؕمَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍۢ بَصِيۡرٌ ‏o اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِىۡ غُرُوۡرٍ ‏o اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ يَرۡزُقُكُمۡ اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ بَلۡ لَّجُّوۡا فِىۡ عُتُوٍّ وَّنُفُوۡرٍ ‏o اَفَمَنۡ يَّمۡشِىۡ مُكِبًّا عَلٰى وَجۡهِهٖۤ اَهۡدٰٓى اَمَّنۡ يَّمۡشِىۡ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ

"اور کیا نہیں دیکھتے ہوا اڑتے جانوروں کو اپنے پر کھولے ہوئے اور پر جھپکتے ہوئے۔ ان کو کوئی نہیں تھام رہا رحمان کے سوا، اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری، مدد کرے تمہاری رحمٰن کے سوا منکر پڑے ہیں برے بہکائے میں۔ بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی، کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں، شرارت اور بدکنے پر۔ بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر"۔

حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں...... میں نے عرض کیا تھا کہ حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں جو اس سورۃ میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور ایک سمٰوٰت، آسمان اور اس کی مخلوق اور اس پر حکمرانی کا انداز اور ایک زمین اور زمینی مخلوق اور اس پر حکومت کا انداز اور ایک جو اور فضا جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے، اس

پر حکمرانی کا طریق تو دو علاقوں کے بارے میں میں نے بقدر ضرورت تفسیر عرض کی۔ یہ تیسرا علاقہ ہے جو اور فضا کا جس کو اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَھُمْ صٰفّٰتٍ وَّ یَقْبِضْنَ ۔ سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی بنا یہ ہے کہ زمینی مخلوق میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی حکومت کو مانیں اور اس کے قانون پر چلیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان پر بلیات اور فتنے برسیں گے اور وہ مصائب میں مبتلا ہوں گے، منجملہ ان کے دو چیزیں بیان فرمائی گئی تھیں کہ کیا تم آسمان والے سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ گے کہ زمین تمہیں دھنسا دے اور خسف کر دیئے جاؤ یا یہ کہ آسمان سے پتھر برسا دیئے جائیں اور ان سے انسانوں پر پتھراؤ ہو جائے ،اس پر انسان اگر سلامتی کے ساتھ غور کرے اور اطاعت شعاری کے جذبے سے غور کرے تو بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔

انسانی روگ، عقل کا بے جا استعمال ......مگر انسان میں ایک روگ یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے اور اس خود رائی کا منشاء ہوتا ہے عقل۔ تو عقل تو دی گئی تھی اس لیے کہ اللہ کے احکام کو سمجھے اور غور کرے اور کوئی شبہ پیش آئے تو عقل سے اس شبہ کو صاف کر لے ،اس نے عقل کو استعمال کیا معارضہ میں اور حق تعالیٰ کے مقابلے میں، عقل کو اللہ کے احکام میں طرح طرح کے شبہات نکالنے کا، شکوک پیدا کرنے کا اور اس میں الجھنے کا ذریعہ بنایا، تو قلبِ موضوع ہو گیا۔ عقل اس لیے دی گئی تھی کہ احکام کو سمجھے اور کوئی شبہ طبعی طور پر پیش آئے تو عقل سے اس کو دفع کر لے۔ اس نے کیا یہ کہ عقل کو لڑائی کا ذریعہ بنایا اللہ سے اور اس کے احکام میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات نکالنے شروع کئے اور معارضہ شروع کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ گویا یہ احکام معاذ اللہ عقل کے خلاف ہیں، پھر میں انہیں کیوں مانوں؟....

تو اپنی برأت ذمہ کے لیے اس نے عقل کو حق کے مقابلہ میں استعمال کیا حالانکہ عقل دی گئی تھی حق کی اطاعت کے لیے کہ پوری طرح سے سمجھو تو یہاں بھی انسان نے یہی کیا کہ جب فرمایا کہ ہم آسمان سے پتھر برسا دیں گے تو اس نے کہا بھلے یہ کیسے ہو سکتا ہے، پتھر تو ایک وزنی چیز ہے اور وزن دار چیز ہمیشہ نیچے کی طرف کو آتی ہے۔ زمین مرکز ثقل ہے اور وہ اپنی طرف کھینچتی ہے، اسے اوپر نہیں جانے دیتی تو آسمان میں پتھر کہاں ہیں جو وہاں سے برسیں ، یہ عقل کے خلاف ہے کہ وزنی چیزیں اوپر جائیں۔

خالق طبیعت کو خلافِ طبیعت بھی قدرت ہے...... حالانکہ اگر وہ اس پر غور کرتا کہ جس خالق نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان میں طبعی رفتار رکھی ہے تو طبیعت کا پیدا کرنے والا بھی تو وہی ہے، اگر وہ طبیعت کو بدل دے تو اس کے اختیار میں ہے، اتنا تو اس کا اختیار سمجھا کہ وہ طبیعت کے مطابق بنا دے اور یہ نہ سمجھا کہ طبیعت ان کے خلاف کرے ، حالانکہ جو طبیعت کا خالق ہے وہ طبیعت کو ادھر بھی چلا سکتا ہے ادھر بھی چلا سکتا ہے۔ طبیعت کے خلاف کرے تو طبیعت اس پر حاکم تو نہیں ہے، حاکم تو طبیعت کے اوپر وہ ہے۔

ایک درخت جب پیدا ہوتا ہے اور آپ منوں مٹی کے نیچے بیج ڈال دیتے ہیں، اس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے

،کونپل اتنی کمزور ہے کہ اگر چٹکی سے مسلیں تو مسل دی جائے۔لیکن اللہ نے اس کو اتنا طاقت ور بنایا کہ منوں مٹی کے جگر کو چیر کر اوپر کی طرف آتی ہے۔حالانکہ طبیعت یہ تھی کہ نیچے کی طرف کو جائے ،پتے کو اگر آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے جائے گا،اوپر نہیں جائے گا،لیکن وہی پتا جب بیج سے نکلتا ہے تو وہ جاتا ہے اوپر کی طرف ،اول تو منوں مٹی کو چیرتا ہے،اس کے جگر کوشق کر کے باہر نکلتا ہے پھر باہر نکل کر بھی یہ نہیں کہ نیچے کی طرف جائے وہ چڑھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے اور ایک بڑا اتنا درخت بن جاتا ہے۔ یہ طبیعت کو کس نے بدل دیا،طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ درخت نیچے کی طرف آئے لیکن نیچے کے بجائے اسے اوپر کی طرف لے گئے تو قدرت ہے مالک کی۔وہ اس طبیعت کے خلاف حکم جاری کر دے ،طبیعت کو اپنے خلاف چلنا پڑے گا ،طبیعت کے موافق اگر حکم دے موافق چلنا پڑے گا ۔طبعی چیز یہ ہے کہ آدمی اگر نقش ونگار بنائے تو کاغذ پر بنا سکتا ہے اور پتھر پر بنا سکتا ہے لکڑی پر نقش ونگار بنا سکتا ہے ،لیکن کیا یہ کسی کو قدرت ہے کہ پانی کے اوپر نقاشی کر دے مگر اس کی قدرت یہ ہے کہ ایک گندے پانی کے قطرہ کے اوپر ایسے نقش ونگار بناتا ہے کہ انسان بن جاتا ہے۔

تو ایک پانی کے قطرے پر نقاشی کرنا یہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن اللہ کی قدرت کے خلاف تو نہیں تو جب قدرت والے کو قدرت والا مان لیا تو مان کر پھر اسے مقید کرنا کہ آپ ادھر کو چلیں ادھر کو نہ چلیں ۔یہ انسان کی کج فطرتی کی بات ہے۔ ورنہ وہ یوں کہتا کہ طبیعت کو چلا دیا ادھر یہ بھی اس کی قدرت ہے اور طبیعت کو اس کے خلاف چلا دیا یہ بھی اس کی قدرت ہے، پتھروں کے نیچے ڈال دے ......یہ بھی اس کی قدرت ہے اور اوپر اٹھا کر ے جائے یہ بھی اس کی قدرت ہے تو پہلے تو غور کرنا چاہیے تھا کہ عقل سے مگر عقل کو اللہ کی قدرت کے مقابلہ پر استعمال کیا اور اپنی موافقت کے گویا عقل میری ہے اور میری تائید کرے گی ،آپ کے خلاف کرے گی اور یہ نہ جانا کہ عقل بھی انہی کی پیدا کی ہوئی اور تم بھی انہی کے پیدا کئے ہوئے ،تمہیں حق کیا ہے کہ مالک کے خلاف چلو اور اپنے آلات اور قویٰ کو اس کے خلاف میں استعمال کرو،تو یہ تو ہے ایک عقلی چیز۔

خلاف طبیعت پر قدرت کی تاریخی مثال......لیکن حق تعالیٰ نے جواب دیا دو طرح پر ایک تاریخ پیش کی ،اور ایک حسی مثال پیش کی ،تاریخ کی طرف تو اشارہ کیا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ پچھلوں نے بھی اعتراضات کیے لیکن پچھلوں پر تاریخ شاہد ہے کہ پتھر برسائے گئے ،تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسا دیئے گئے ۔ایک تاریخی واقعہ ہے اور سچی تاریخی حقیقت ہے اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے۔تو اسی کو دیکھ کو عبرت پکڑ و تھوڑی سی کہ جس نے ایک قوم پر پتھروں کو برسا دیا وہ آج بھی برسا سکتا ہے ،گنہگار جب بھی تھے اور آج بھی ہیں تو جس نوع کے گناہ پر پچھلے دور میں پتھر برس سکتے ہیں تو اس دور میں اس قسم کے گناہ پر آج کے دور میں کیوں نہیں برس سکتے ۔

یہ تو رحمۃ للعالمین کا فضل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کا فضل ہے کہ اس قسم کے عام عذابوں میں امت کو مبتلا نہیں کیا گیا ،لیکن اس کی نفی بھی نہیں کی گئی کہ اگر ضرورت پڑی تو اس امت پر بھی ہم عذاب

نازل کریں گے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: لَیْسَ عَذَابُ اُمَّتِی الْخَسفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْمُ اِنَّ عَذَابَ اُمَّتِی الْفِتَنُ وَالْقَتْلُ وَالزَّلَازِلُ۔

میری امت کا عام عذاب یہ نہیں ہوگا کہ ان کی صورتیں مسخ کردی جائیں جیسے پچھلی امتوں کو بندر بنادیا گیا، بعضوں کو خنزیر بنادیا گیا۔ اس امت پر یہ رحمت ہے کہ عام طور سے نہیں ہوگا، لیکن جزوی طور پر اگر ہوجائے کسی کو مسخ کر کے خنزیر کی صورت بنادیا جائے یا کسی کو بندر کی صورت دے دی جائے تو یہ آج بھی ممکن ہے اور واقعات پیش آئے ہیں۔

امم سابقہ کے اجتماعی عذاب کی جزوی صورت آج بھی ممکن ہے!...... آپ نے سنا ہوگا کہ اخبارات میں ایک واقعہ آیا، بھوپال میں یہ قصہ گزرا اور وہ یہ کہ ایک عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو اس نے کسی سادھو سے رجوع کیا اور کہا کہ کوئی تدبیر ایسی بتلایئے کہ میرے اولاد ہوجائے۔ اس کم بخت نے کہا کہ قرآن شریف کو نیچے رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ کر تو غسل کر تو تیرے اولاد ہوجائے گی، حالانکہ وہ مسلمان عورت تھی۔ لیکن بعض دفعہ عورتیں اولاد کی طمع میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیتی ہیں اور اس قسم کے ٹونے اور ٹوٹکوں میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ اس ظالم نے یہ حرکت کی اور ایمان کو پس پشت ڈال کر قرآن شریف پر بیٹھی اور وہاں سے اٹھ کر جب آئی تو اس کی صورت خنزیر کی سی تھی۔ بال وال تو تھے سر پر جس سے یہ پہچانا گیا کہ وہ انسان تھی لیکن شکل مسخ ہوگئی۔ یہ واقعہ اخبارات میں بھی آگیا۔

اور بعضوں کو شبہ ہے کہ صاحب، اخبار میں کیوں اس واقعہ کو لکھ دیا اس سے تو معاذ اللہ! اسلام کی توہین ہوئی کہ ایک مسلمان بدک گیا، میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف میں واقعات اس قسم کے کیوں بیان کئے کہ پچھلی امتیں مومن ہوتے ہوئے جب حق کے مقابلہ پر آئیں تو انہیں خنزیر کی صورت دے دی گئی، اگر اس سے اس دور کے اسلام کی توہین نہیں تھی تو آج بھی اگر اس قسم کا واقعہ آئے اور وہ عام کیا جائے تو اس میں اسلام کی توہین نہیں۔

یہ تو کفر کی توہین ہے کہ اسلام چھوڑ کر جب کفر اختیار کیا تو صورت مسخ ہوئی اگر عیاذ اُباللہ! یہ ہوتا کہ اسلام قبول کرنے پر تلاوت قرآن کرنے پر معاذ اللہ صورت بگڑ جاتی تو اسلام کی توہین تھی۔ لیکن اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف آنے میں جب صورت بگڑی تو اسلام کی عظمت نمایاں ہوئی، کفر کی اہانت اس میں واضح ہوئی تو یہ اسلام کی توہین نہیں بلکہ کفر کی توہین ہے اور اسلام کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے اور اگر اس میں اہانت تھی تو حق تعالیٰ قرآن کریم میں ایسے واقعات ہی بیان نہ فرماتے، تو اگر آج کے لوگوں نے اس قسم کے واقعات کو نقل کردیا ہے تو قرآن کی پیروی کی کہ اللہ نے پچھلے واقعات نقل کیے انہوں نے سامنے کا واقعہ نقل کردیا۔ اسلام کی عظمت اس سے نمایاں ہوگئی۔

امم سابقہ کے تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کی جائے...... بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ خسف یا مسخ یہ عام تو نہیں ہوگا رحمۃ للعالمین کی اس امت میں لیکن خاص خاص طور پر ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض طبقات زمین کے اندر دھنسا دیئے جائیں گے۔ اس امت کے اندر بھی ایسے

واقعات ہونگے، تو اگر ایسا واقعہ پیش آئے معاذ اللہ! اس کو نقل کر دے مسلمان، تو یہ ڈرانا ہوگا اس سے کہ دیکھو تقدیر کے خلاف کرنے میں یہ وبال پڑتا ہے، لہٰذا تقدیر کی حمایت کرو اسلام کے مطابق چلو تا کہ اس قسم کے وبال سے بچ جاؤ۔ تو قرآن کریم نے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ پچھلے دور میں ایسا ہو چکا ہے وہ ہوا ہے پورے طبقے کے طبقے مسخ کر دیئے گئے پوری امت ڈرا دی جائے یا پوری امت دھنسا دی جائے، اس واسطے کہ یہ امت دوامی اور ابدی ہے اور اس کے مٹنے کے بعد کوئی اور امت آنے والی نہیں اس لیے قیامت تک یہ امت رہے گی اور ایک طبقہ حق پر رہے گا، خلاف کرنے والوں پر اس قسم کے عذابات آئیں گے اور اس قسم کے وبال ڈالے جائیں گے۔ تو اشارہ دیا قرآن کریم نے کہ جنہوں نے پہلے تکذیب کی تھی ان پر یہ واقعہ ہوا، لہٰذا تم بچو اس قسم کی تکذیب سے کہ تم نہ کہیں مبتلا کر دیئے جاؤ، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ تاریخی واقعات سے عبرت پکڑو، لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ . ①

قرآن کریم نے جو پچھلی امتوں کے واقعات بیان کیے ہیں وہ قصہ کہانی کے طور پر نہیں ہیں کہ وقت گزاری کے لیے تفریح طبع کے لیے کچھ قصے سنا دیئے۔ وہ بیان کیے گئے عبرت کے لیے تا کہ آدمی غور کرے کہ پچھلوں کی ان حرکتوں پر جب یہ عذاب آیا تو آج اگر وہ حرکتیں ہوگئیں تو آج بھی عذاب آ سکتا ہے، یہی معنیٰ اعتبار کے اور عبرت پکڑنے کے ہیں تو ایک جواب تو دیا ہے تاریخی۔

قدرت خداندی کا حسی ظہور...... اور دوسرا جواب ہے حسی اور وہ یہ کہ: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ یا تم اللہ کی قدرت نہیں دیکھتے کہ یہ پرندے فضا کے اندر اڑ رہے ہیں وہ بھی تو اجسام ہیں پتھر جسم ہے، وہ بھی تو مٹی کے بنے ہوئے پرندے ہیں، لیکن ہزاروں گز اوپر ہوا میں ان کو تھام رکھا ہے تو کس نے تھاما ہے ان کو...؟

اگر آپ یہ کہیں کہ ان میں قوت ایسی تھی کہ وہ تھم گئے تو سوال یہ ہے کہ وہ قوت کس نے ان کے اندر رکھی۔ اس لیے فرمایا ان کو تھامنا یہ اللہ کی قدرت ہے اور جب چاہتے ہیں انہیں گرا دیتے ہیں، بعض دفعہ اڑتا اڑتا جانور ایک دم نیچے آ پڑتا ہے، وہ قوت اس وقت اس میں سے سلب کر لی جاتی ہے۔ چھین لی جاتی ہے۔ تو جب ایک جسم کو حق تعالیٰ ہزاروں گز فضا کے اندر اڑا کر تھامتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ ایک پتھر جسم کو اڑا دیں اور وہ چلا جائے نیچے اور اسے ڈال دیں نیچے پہلے تو اوپر جائے اور ر کے فضا میں اور پھر نیچے آ جائے۔

اگر اس پر یوں کہا جائے کہ صاحب ہوسکتا ہے کہ ایک جانور بے چارہ ہوا اڑا کر لے گئی اور وہ چلا گیا وہ ہوا کی طاقت سے اڑ گیا۔ ہوا بیچ میں سے نکل گئی وہ نیچے آ پڑا تو یہ ہوا کہ کارستانی ہے قدرت کی تھوڑا ہی ہے۔ عیاذ أباللہ اگر کوئی (کہے) تو اس بارے میں فرماتے ہیں اور اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ تمہارے سروں پر یہ پرندے اڑ رہے ہیں اور صف ..... ٹکڑیاں اور جماعتیں بن بن کر اڑ رہے ہیں، اگر ہوا اٹھا کر لے جاتی تو ایک کو دو کو چار کو ایک اتفاقی

① پارہ: ۱۳، سورۃ: یوسف، الآیۃ: ۱۱۱.

واقعہ پیش آتا، لیکن یہ تو ترتیب وار صف بندی کر کے جانور اڑتے ہیں، یہ تو ان کے شعور اور ارادہ کا دخل ہوا وہ اللہ نے ان کے اندر پیدا کیا تو یَـقْبِـضْـنَ خدا کے سوا کسی نے روک رکھا ہے انہیں اور وہ صف بن کر اڑتے ہیں جیسے مرغابیاں اڑتی ہیں تو ہمیشہ مثلث کی صورت پر اڑتی ہیں دو ٹکڑیاں ہوتی ہیں مثلث، آگے ان کا سردار ہوتا ہے، وہ آگے آگے چلتا ہے اور پیچھے وہ چلتی ہیں جیسے پریڈ کرتی ہوئی فوج جاتی ہے، ترتیب وار، تو مرغابیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں بطخیں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں۔ چھوٹی چڑیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار ٹکڑیاں بن بن کر اڑتی ہیں، تو سارے نمونے دکھلا دیئے، انفرادی طور پر بھی پرندے اڑتے ہیں صف باندھ کر بھی اڑتے ہیں، ٹکڑیاں بن کر بھی اڑتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محض طبعی کارخانہ نہیں ہے بلکہ فاعل مختار کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں کہ کسی کو اس طرح بنا دیا، کسی کو اس طرح۔ اگر طبعی بات ہوتی تو طبیعت کی ایک رفتار ہوتی جب جانور گرا نیچے آ پڑتا، لیکن ترتیب وار اڑنا قاعدہ سے اڑنا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص نظام کے تحت وہ اڑ رہے ہیں، کسی اختیار کے تحت وہ اڑتے ہیں صفیں باندھ کر،

کوئی اگر یوں کہے کہ صاحب پر چونکہ ان کے بنائے ہوئے ہیں وہ کھول دیئے، لہٰذا اڑ رہے ہیں تو پروں کی کارستانی ہے تو فرماتے ہیں ویـقبضن ایسا بھی تو ہے کہ پر سمیٹ لیتے ہیں اور پھر جا رہے ہیں دور تک، تو اب کیوں جا رہے ہیں؟ اگر پروں کی کارستانی تھی تو پروں کو سمیٹ کر بھی بہت سے جانور اڑتے ہیں۔ بہت سے پر پھیلا کر اڑتے ہیں۔ بہت سے پروں کو سمیٹ کر اڑتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ایک مسافت تک پر کھولے ہوئے ہیں اور ایک مسافت میں پر سمیٹ لیے اور چلے جا رہے ہیں تو اگر پروں کی وجہ سے اڑ رہے ہیں تو وہاں بھی پروں کو سمیٹ لیا گیا اب کیسے اڑ رہے ہیں....؟ اب کس نے تھام رکھا ہے انہیں؟ تو پروں سے بھی اڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ کر بھی اڑتے ہیں۔ یہ طبعی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کے اختیار اور قدرت کی بات ہے۔ وَیَـقْبِضْنَ اور ان پر کو وہ سمیٹ دیتا ہے وہ پھر بھی اڑتے ہیں اور فضا میں معلق ہو جاتے ہیں بہت دیر تک، بعضے جانور نہیں اڑتے لٹکے ہوئے ہیں فضا میں۔ مَـا یُـمْسِـکُـھُـنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ رحمٰن کے سوا کون ہے جس نے تھام رکھا ہے تو جو ان پرندوں کے اجسام کو اوپر تھام سکتا ہے وہ اگر پتھروں کو تھام دے تو تمہاری عقل اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ عقلیں یہاں لڑائی تھیں لیکن انہی کی طبعی رفتار نے تمہاری عقلوں کو کند کر دیا ہے. جواب دے دیا تو پتھر کے بارے میں بھی سمجھ لو کہ تمہاری عقلیں کند ہیں قدرت اللہ کی تابع نہیں ہے، تمہاری عقلوں کے یا تمہارے ڈالے ہوئے وسوسوں کے وہ تو اپنی قدرت سے کام کرتا ہے تو مَـا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ حاصل یہ نکلا کہ تاریخ دیکھو تب واقعات ثابت، پھر کیوں نہیں مانتے انہیں؟ تاریخ پر نظر نہ کرو تو محسوسات پہ نظر کرو جو ہر وقت تمہارے سامنے ہیں اس کو سامنے رکھو اب اگر تم نہ اُسے مانو نہ اِسے مانو تو معلوم ہوا مقصود مقابلہ ہی ہے حق تعالیٰ کا یہ عقل کا نام محض حیلے کے طور پر لے رکھا ہے ورنہ عقل تو سمجھا رہی ہے کہ جب یہ واقعہ پرندوں میں پیش آ سکتا ہے تو پتھر میں بھی پیش آ سکتا ہے۔

عقل پرست طبقہ سے ایک سوال ......اگر میں کہوں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ جب آپ اینٹ پھینکتے ہیں تو بیس گز تک چلی جاتی ہے حالانکہ اینٹ کی طبعی رفتار کا تقاضا ہے کہ نیچے آئے مگر آپ کے ارادہ کی قوت اسے اوپر پھینک دیتی ہے، جب آپ کے ارادہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اصلی رفتار پہ آ کر اینٹ نیچے آ جاتی ہے۔تو آپ کے ارادہ میں تو یہ طاقت ہو کہ اینٹ کی طبیعت کے خلاف اسے اوپر پہنچا دے اور اللہ کے ارادہ میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اس کو طبیعت کے خلاف اوپر پہنچا دے تمہارا ارادہ زیادہ سے زیادہ پچاس گز تک اس کی قوت جاسکتی ہے اللہ کا ارادہ لامحدود ہے۔وہ اگر پچاس ہزار گز سے اوپر اڑا دے تو اس کی طاقت سے بعید نہیں۔تو معلوم ہوا کہ باہر کی طاقت لے جاسکتی ہے اوپر اشیاء کو اور جتنی طاقت ہوگی اتنا لے جائے گا۔انسان کی طاقت محدود کہ اس نے بیس گز پھینک دیا ڈھیلا اور اللہ کی طاقت لامحدود ہے۔اس نے پچاس ہزار گز سے اوپر پھینک دیا پتھر کو اور پھر نیچے ڈال دیا۔تو مطلب یہ ہے کہ حسی طور پر دیکھو، عقلی طور پر دیکھو، تاریخی طور پر دیکھو، کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے سوائے ڈھٹائی کے، سوائے سرکشی کے، اس واسطے فرمایا کہ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ. س واسطے کہ وہ ہر چیز کو بصیرت سے جانتا ہے اس لیے کہ وہی تو پیدا کرنے والا ہے، اسے تو معلوم ہے کہ کس چیز میں میں نے کتنی قوت رکھی ہے اور کس طرح میں اسے استعمال کروں گا تو اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ. تم پتھر پھینکتے ہو تو تمہیں بصیرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے اندر کیا قوت ہے کیا نہیں ہے؟ تم نے تو اٹھا کر ڈھیلا پھینک دیا۔چلا گیا، وہ بصیرت کے ساتھ اپنی طاقت کے ساتھ لے جائے اس پر تو اعتراض....اور تم جو بے بصیرتی کے ساتھ ایک حرکت کر گزرو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو یہ سوائے عصبیت اور جہالت کے اور کیا چیز ہے کوئی عقلی دلیل تو نہیں ہے کہ انکار کرو۔

مخلوق، مخلوق کے ذریعہ خالق سے کیا مقابلہ کرے گی؟...... حاصل اس کا یہ نکلا کہ تمہیں تو اللہ میاں سے لڑنا ہی مقصود ہے۔نہ عقل سے کام لینا، نہ حس سے کام لینا، نہ تاریخ سے عبرت پکڑنا، لڑنا مقصود، تو فرمایا کہ اچھا آؤ لڑو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ یہ کون ہے جو خدا کے مقابلے پر وہ لشکر آئے گا تمہاری مدد کرے گا اس لشکر کو بھی ہمیں بتا دو وہ کون سا لشکر ہے؟

یہ لشکر جتنا تم لاؤ گے اس مخلوق میں سے لاؤ گے، یہ تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہے تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے ہی مقابلہ پر تھوڑا ہی آسکتی ہے۔تمہاری کوئی بنائی ہوئی چیز ہو، وہ تمہارے مقابلہ پر نہیں آتی تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے مقابلے پر کیسے آجائے گی؟ اور تم جو بھی لشکر لاؤ گے وہ مخلوق میں سے لاؤ گے اس لیے کہ خالق سے تو تم نے تعلق پیدا نہیں کیا کہ اس کے تابع بنتے ،اس کی طاقت کو لیتے ،اس سے تو لڑائی ٹھان لی اب مقابلہ کرو گے تو اپنی طاقت سے اور مخلوق کی طاقت سے تو بتلاؤ وہ کون سی مخلوق ہے جو ہمارے مقابلے پر آئے گی۔ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ’’وہ کون ہے جو رحمٰن کے

مقابلے پہ تمہاری مدد کرے گا''۔ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ سوائے اس کے کہ تم دھوکے میں پڑے ہوئے ہو اور بہکے ہوئے ہو اور کیا کہا جائے۔ عقل کی تم نہیں کہتے ،حس کی تم نہیں کہتے ،تاریخ کی تم نہیں کہتے ،کوئی قوت تمہارے ہاتھ میں نہیں کہ خدا کا مقابلہ کرو اور لڑنے کے لیے تیار، بقول شخصے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لڑنے کو موجود اور نہ ہاتھ اور ہاتھ میں تلوار، اور پھر وہ قوتیں بخشی ہوئی خدا کی ہیں تو اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کے مقابلہ پر لانا اس سے زیادہ حماقت کی بات اور کیا ہوگی تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ

اللہ سے مقابلہ کی سوچ صرف انسان کی ہے...... اب آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ صاحب، سامان اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں، ہم بجلی کی مدد سے کام لیں گے۔ ہم گیس کی طاقت سے کام لیں گے، ہم راکٹ سے کام لیں گے، ان چیزوں کو لائیں گے مقابلہ پہ، تو اول تو ظاہر ہے کہ یہ تو مخلوقات خداوندی ہیں، ان میں یہ جراءت کہاں ہے کہ اپنے خالق کا مقابلہ کریں۔ یہ حماقت تو انسان ہی پر سوار ہے کہ وہ خالق کا مقابلہ کرتا ہے، نہ پتھر مقابلے پہ ہیں نہ درخت مقابلے پہ ہیں نہ پہاڑ نہ دریا، کوئی چیز مقابلے نہیں کرتی یہ چیزیں حق ہیں: اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ① ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ عبد اور بندہ (غلام) بن کر اللہ کے سامنے آیا ہوا ہے''۔

ڈھٹائی پر یہی انسان ہے کہ مقابلہ کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ ہم نے کچھ طاقتیں دے دی تھیں کچھ عقل کی طاقت دے دی تھی کچھ وسائل دے دیئے تھے تو سوال یہ ہے کہ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ .وہ رزق دینے والا ان سامانوں کا وہ کون ہے؟ تم نے خود پیدا کر لیے تھے؟ بجلی تم نے پیدا کی ہے؟ پیدا اللہ نے کی ہے۔ کام اس سے تم لے لیتے ہو۔ زمین اللہ نے پیدا کی ہے، کام تم اس سے لے لیتے ہو، بیج کا درختوں کو اگانے کا، لیکن نہ درخت تم نے پیدا کیا، نہ بیج تم نے پیدا کیا، نہ زمین تم نے پیدا کی، تمہاری بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں استعمال کرنے کی کچھ قوت ہے تمہارے اندر، تو حاصل یہ نکلا کہ رزق دینے والے حق تعالیٰ ہیں، وہ دانے کا رزق ہو، کیڑے کا رزق ہو، عقل کا رزق ہو، قوتوں کا رزق ہو، ہتھیار کا رزق ہو، دینے والے وہ ہیں۔

اچھا اگر وہ اپنے رزق کو چھین لیں پھر تم کیا کرو گے، تمہارے قبضے میں تو نہیں، ایک بارش رک جائے، دانہ نہ ہو، بیٹھ جاتے ہیں حضرت انسان، اب آگے کچھ نہیں، بارش صرف روک دے اور بارش تو خیر سال بھر میں آتی ہے ہر وقت آپ دھوپ سے اور ہوا سے کام لیتے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے وہ اپنی ہوا نکال لے، اب کیا ہوگا؟ بس سانس گھٹ کر ختم ہو جائے گا انسان، یہ کل آپ کی طاقت ہے تو اسی کے دیئے ہوئے رزق پر غرہ اور اسی کا مقابلہ

① پارہ: ۱٦، سورۃ: المریم، الآیۃ: ۹۳.

کرنا اس سے زیادہ حماقت اور سفاہت کیا ہوگی، کوئی اپنی چیز لاتے جو خدا کے مقابلے پر استعمال کرتے تو اپنی چیز تو کیا ہوتی تم خود بھی اپنے نہیں، تم نے خود بنالیا ہے اپنے آپ کو؟ بنانے والے نے بنایا ہے تم کون ہو، تو جب تم خود نہیں بنے اپنے آپ تو بقیہ چیزیں تم کیا بنا سکتے ہو، جو کچھ ہے وہ رزق دیا ہوا ہے اللہ کا تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ''اگر اللہ اپنا رزق روک لے تو وہ کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں آ کر تمہیں رزق دے گا''۔ اچھا، ہم بارش روک لیتے ہیں اور ساری مخلوق کو اکٹھا کرلو کہ وہ تمہیں رزق دے تو کہاں سے دے دے گی اس لیے دارومدار بارش پہ اور وہ قبضے میں ہے اس کے، ہم نے رزق روک لیا تو جس کا رزق ہم روکنا چاہیں وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے دے، ہم نے رزق روک لیا تو کون ہے جو دروازے رزق کے تمہارے او پر کھول دے تو اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ بات کیا ہے بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ

سوائے اس کے کہ یہ بدک رہے ہیں، سوائے اس کے کہ سرکشی پر ہیں اور ڈھٹائی پر جمے ہوئے ہیں۔ ہٹ دھرمی کے سوا کوئی حجت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے نہ عقل کی، نہ حس کی، نہ طبع کی، نہ قویٰ کی، کوئی چیز ان کے قبضے میں نہیں ہے، ڈھٹائی پر آمادہ ہیں اور وہ ڈھٹائی انہی کے انجام کو خراب کرے گی، اللہ میاں کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اپنے آپ کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ بل لجوا فی عتو ونفور .

منزل مقصود پر پہنچنے والا کون ہوسکتا ہے؟...... تو اب ان کی مثال ایسی ہوگی کہ جیسے ایک شخص تو وہ ہے کہ سیدھے راستے پر دیکھتی آنکھوں چل رہا ہے اور منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے اور ایک وہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا راستہ اور اوندھا لیٹ گیا اس کے اوپر، آنکھ بھی کام نہیں کرتی، ہاتھ پیر بھی کام نہیں کرتے اور چاہتا یہ ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے تو کون پہنچے گا منزل مقصود پر؟ وہ پہنچے گا کہ جو سیدھے راستے پر جا رہا ہے، عقل سے کام لے رہا ہے، محسوسات کو دیکھ رہا ہے، اپنی قوتوں کو خالق کی راہ میں اختیار اور استعمال کر رہا ہے، راستہ دیکھ کر چل رہا ہے، وہ پہنچے گا یا وہ پہنچے گا کہ جو اوندھا لیٹ گیا ہے اور ہاتھ پیر بھی چھوڑ دیئے، آنکھیں بھی زمین میں دھنسا دیں، نہ رستہ سامنے نہ منزل سامنے۔

تو تمہاری مثال وہی ہوگئی کہ رستہ کے اوپر ہو مگر اوندھے لیٹ کر، نہ آنکھ سے دیکھتے ہو، نہ دل سے سوچتے ہو، نہ غور وفکر کرتے ہو اور چاہتے ہو منزل پر پہنچ جائیں تو منزل پر تو وہی پہنچیں گے جو متبعین انبیاء علیہم السلام ہیں کہ راستے پر پڑے ہوئے ہیں چل رہے ہیں ہاتھ پیر استعمال کر رہے ہیں، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں،

عقل سے حق کا راستہ معلوم کر رہے ہیں اس کی تائید کر رہے ہیں وہ پہنچیں گے منزل پر تم نہیں پہنچو گے تو تمہاری مثال اس شخص کی ہے کہ زمین کا راستہ سامنے ہے۔ بجائے چلنے کے اوندھا لیٹ جائے سب قویٰ کو بے کار کر دے، ہاتھ پیر کو بے کار، اس لیے کہ جب کسی قوت سے بھی کام نہیں لیتے تو اور کیا مثال ہے تمہاری یہی مثال بن سکتی ہے تو اس کو فرمایا کہ: اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ '' آیا وہ شخص جو چل رہا ہے اوندھا چہرہ کے اوپر الٹا پڑا ہوا ہے۔ وہ ہدایت پائے گا یا وہ پائے گا جو سیدھے

راستے پر سیدھا سیدھا چل رہا ہے''؟ تو جو سیدھے چلنے والے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام ہیں، ان کے متبعین ہیں، ان کے پیروکار ہیں کہ علم وحی سامنے آیا کانوں سے سنا، آنکھوں سے دیکھا، عقل سے سوچا اور چل پڑے راستے کے اوپر، وہی پہنچیں گے منزل پر، وہ نہیں کہ آنکھ بھی بند کر لی، یعنی اوندھے لیٹ گئے، دل کو بھی بے کار کر لیا یعنی عقل سے بھی نہ سمجھا، ہاتھ پیروں کو الٹا ڈال دیا کہ چلنے کے قابل نہ رہے اور مدعی اس کے ہیں کہ ہم پہنچیں گے منزل مقصود پہ تو سوائے اس کے کہ اندھا پن کہا جائے اور کیا کہا جائے گا۔ وہ راستے پر پہنچے گا یا یہ راستے پر پہنچے گا۔

اپنی ذات میں مشاہدہ کی دعوت ...... اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ہے سامان سا ہی، مختلف چیزیں ہم نے دیں، عقل دی، سب کچھ دیا۔ لیکن خود تم اپنے اوپر غور کرو تم کہاں سے آئے؟ آیا تمہیں اللہ نے بنایا یا خود بخود بن گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود بخود تو بنے نہیں، اگر خود بخود بن جاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وجود تمہارے ہاتھ میں ہے تو اگر وجود ہاتھ میں تھا تو یہ موت کیوں قبول کرتے ہو جبراً؟ کس کا جی چاہتا ہے کہ مر جائے تو اگر وجود ہاتھ میں ہے تو ملک الموت کو واپس کر دیا کرو کہ صاحب، ہم زندگی دینا نہیں چاہتے آپ کو یہ خود ہمارے قبضہ میں تھی وہاں تو چپ پڑے رہتے ہو، وہاں تو سانس چلنے لگتا ہے، جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہو، معلوم ہوتا ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں تو جب روکنا زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ تو لانا بھی زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے ‏ ‏ ‏ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے،

جب ہم پیدا ہو رہے تھے تو ہماری درخواست نہیں تھی، خواہش نہیں تھی اللہ کو دینا تھا جان تو لینی پڑی، مجبوراً آنا پڑا، چاہے ہمارا جی چاہتا تھا آنے کو یا نہیں چاہتا تھا اور جب لے جائیں گے تو جانا پڑے گا، چاہے ہمارا جی چاہے نہ چاہے۔

عقل کے اندھے ...... تو وجود تو آپ کا یہ ہے کہ نہ حیات پر قبضہ نہ اپنے وجود پہ قبضہ۔ اور دعوے یہ ہیں کہ اللہ کے احکام میں (''مــــن'' میخ نکالنا کہ ہم یوں کر ڈالیں گے اور قدرت کے چیلنجوں کو منظور کرتے ہیں، یہ جو درمیان میں بہت سے سیلاب آئے اور انہوں نے بستیوں کو غرقاب کیا ہزاروں آدمی مارے گئے تو بعض عقل کے اندھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نے بند لگانے شروع کر دیئے ہیں اور قدرت کے چیلنج کو ہم نے قبول کر لیا ہے، ہم مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ جو بند باندھے اگلے ہی سال اس میں شق واقع ہو گئے دراڑ واقع ہو گئے، پھر مرمت شروع ہوئی اور خدا جانے کب تک وہ مرمت کام دے گی۔ خدانخواستہ وہ پھٹ پھٹا گئے تو پھر ساری بستیاں اور جلدی غرق ہونگی۔

بعض عقل کے نابینا وہ بھی ہیں کہ وہ قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے چیلنج مان لیا، ہم مقابلہ کریں گے اور طاقت یہ ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنے ہاتھ میں نہیں، اپنی قوت بھی نہیں اپنے ہاتھ میں۔ تو فرماتے ہیں قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ . جن قویٰ پر تم نازاں ہو آنکھ پہ ناک پہ یہ دینے والا کون ہے اَنْشَاَكُمْ وہی ہے جس نے تمہیں ابتداء میں بنایا اور از سر نو بنایا اور وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ تم میں سننے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات سن کر حاصل کرو، آنکھوں میں دیکھنے کی

طاقت رکھی کہ کچھ معلومات دیکھ کر حاصل کرو، دل میں بوجھنے کی طاقت رکھی تا کہ غور وفکر سے کچھ معلومات میں اضافہ کرو۔ یہ ساری قوتیں حق تعالی نے دیں اور عجیب صناعی کے ساتھ دیں۔

قلبی بینائیاں ......اللہ نے قلب کو ایک عجیب کائنات بنایا، اس قلب کے اندر جیسے محققین لکھتے ہیں کہ دو دروازے ہیں، ایک نیچے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی ہے قلب میں ایک اوپر کی طرف۔ اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو عالم غیب کے مشاہدات کرتا ہے وحی اور الہام ربانی اور جمالات اور کمالات خداوندی کو دیکھتا ہے۔ عالم غیب منکشف ہوتا ہے اور نیچے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے تو محسوسات نظر پڑتے ہیں، دریا اور پہاڑ اور جنگل، تو محسوسات کو نیچے کے سوراخ سے دیکھتا ہے اور مغیبات کو اوپر کے سوراخ سے دیکھتا ہے قلب ایک ہی ہے، لیکن اس میں بینائیاں دو قسم کی رکھیں۔ ایک اوپر کے دیکھنے کی ایک نیچے کے دیکھنے کی۔ ایک ظاہری چیزیں دیکھنے کی، ایک باطنی چیزیں دیکھنے کی۔ ظاہری چیزوں کے دیکھنے کے لیے آلات بنائے قلب کے لیے، آنکھ بنائی تا کہ شکلیں اور صورتیں دیکھے، کان بنائے تا کہ آوازوں کو سنے، زبانیں دیں تا کہ ذائقوں کو چکھے، ناک دی تا کہ خوشبو اور بدبو کو سونگھے، تو کسی شی کی صورت بھی انسان دیکھتا ہے کسی شئی کو خوشبو، بدبو کا بھی ادراک کرتا ہے کسی۔ شئی کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ آوازیں سن کر بچاؤ بھی کرتا ہے اپنے کام بھی نکالتا ہے اگر شیر کی دھاڑ سنی تو بچنے کی کوشش کرتا ہے تو کان ذریعہ بنتے ہیں بچنے کا اور اگر آواز سن لی کسی اچھے خوشنما پرندے کی تو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کی زینت بناؤں گا۔

تو کان ذریعہ بنا منافع حاصل کرنے کا بھی اور مضار کی مضرتوں سے بچنے کا بھی۔ اسی طرح سے آنکھ ذریعہ بنتی ہے چیزوں کے لینے کا بھی اور چیزوں سے بچنے کا بھی۔ اگر صورت دیکھ لے سانپ کی تو بھاگتا ہے آدمی، اگر صورت دیکھ لے کسی اچھے خوشنما پتھر کی سونے کی چاندی کی، دوڑتا ہے اس کے اٹھانے کے لیے۔ اگر آنکھ نہ ہوتی تو نہ نفع حاصل کر سکتا نہ مضرت سے بچ سکتا۔ تو آنکھ کو اللہ نے ذریعہ بنایا دور سے دیکھ کر منافع حاصل کرنے کا اور مضرتوں سے بچنے کا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سامنے نہیں ہیں، ان کی آواز بھی نہیں آتی، لیکن ان کی بدبو اور خوشبو سے سمجھ لیتا ہے کہ یہاں فلاں چیز موجود ہے۔ شیر کے منہ میں بدبو ہوتی ہے اگر وہ سامنے بھی نہیں تو اس کے منہ کی بدبو دور تک آدمی سونگھ سکتا ہے، سمجھ لیتا ہے کہ یہاں شیر موجود ہے، وہاں سے بھاگتا ہے اور اگر دوسرا جانور ہے اس کی بو آئی اور وہ استعمال کا ہے تو شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناک ذریعہ بنتی ہے بہت سی چیزوں سے بچنے کا اور بہت سی چیزوں کے حاصل کرنے کا، اسی طرح سے ذائقہ بعضی چیزوں کو چکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ مضر ہوں گی، اس کا ذائقہ بتلا رہا ہے کہ یہ مضر ہے بعض ذائقے ہیں جو فرحت بخشتے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قوت قلبیہ کے اِدراک ......تو آنکھ، ناک، منہ یہ تمام چیزیں آلات ہیں مگر حقیقت میں ان ساری چیزوں کا ادراک کرنے والا قلب ہے۔ یہ سب خدام ہیں اس کے۔ آنکھ حقیقتاً خود نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہ عینک چڑھی ہوئی ہے دل کے اوپر آنکھ، آنکھ خود نہیں دیکھتی، بسا اوقات آپ کسی بازار میں چلے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے اعلیٰ

مناظر، بڑی بہترین دکانیں اور روشنیاں ہیں، گھر آ کر دوسرا کہتا ہے کہ بھئی بڑے بڑے تماشے تھے آج تو بازار میں تو آپ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں پڑتا، کہتا ہے میاں آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں، افوہ! میں تو فلاں خیال میں غرق تھا، مجھے تو کچھ نہیں نظر آیا۔ معلوم ہوا آنکھ دیکھنے والی نہیں ہے دل دیکھنے والا ہے۔ جب دل متوجہ ہے دوسری طرف کچھ نہیں نظر آتا۔ آپ کسی دھیان میں پڑے ہوئے ہیں اور زور سے گھنٹہ بجا، آپ کو پتہ بھی نہ چلا تو دوسرے نے کہا کہ میاں تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ گھنٹہ جو بج گیا تھا اور تم نے افطار نہیں کیا وہ اتنا بڑا گولہ چھوٹا تھا۔ اے ہے! میں نے تو سنی ہی نہیں، اے میاں! بڑے زور سے بجا ہے، کہتے ہیں افوہ میں تو فلاں خیال میں ڈوبا ہوا تھا مجھے تو دھیان ہی نہ آیا، معلوم ہوا کہ دل سنتا ہے کان نہیں سنتا، جب دل متوجہ ہے تو کان سنیں ...... اور دل متوجہ نہیں تو کھلے ہوئے کان نہیں سنتے، اسی طرح سے ذائقہ کی بات ہے بعض دفعہ دھیان نہیں ہوتا تو نہ کھٹے کا ذائقہ آتا ہے نہ میٹھے کا۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سالے تھے حاجی مقبول صاحب، بڑے بزرگ لوگوں میں سے تھے تو حضرت کے یہاں رہتے تھے، کھانا وانا سب وہیں تھا، اتفاق سے دو تین دن سے روزانہ چنے کی دال پک رہی تھی، تو انہوں نے بہن سے شکایت کی کہ روز چنے کی دال، کوئی اور دال بھی پکا لیا کرو۔ خیر انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکالی، کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے آج بھی وہی چنے کی دال پکائی تھی، انہوں نے کمر میں دو ہتڑ ماری، اندھے یہ دال چنے کی ہے ماش کی؟ کہا کہ افوہ! مجھے وہی دھیان رہا جو تین دن سے تھا، اسی دھیان میں کھاتا رہا، مجھے وہی مزا آتا رہا جیسے چنے کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے زبان نہیں چکھتی بلکہ دل چکھنے والا ہے اگر دل متوجہ ہو جائے تو آدمی متوجہ ہو کر سب کچھ چکھ لیتا ہے۔ دل متوجہ نہ ہو نہیں چکھتا۔ تو اصل میں دیکھنے والا بھی دل ہے، سننے والا بھی دل ہے، چکھنے والا بھی دل ہے اور صورتیں دیکھنے والا بھی دل ہے تو دل عجیب چیز نکلا وہ ان تمام خدام کو استعمال کرتا ہے۔ محسوسات کو دیکھتا ہے۔

ادراکات کا تحفظ ...... اچھا اب اس کے بعد پھر ایک عجیب کائنات دل کی یہ بھی ہے کہ ان ساری چیزوں کے ذریعے اس نے دیکھ بھی لیا، سن بھی لیا، چکھ بھی لیا، چکھنے کے بعد وہ ذائقہ غائب ہو جانا چاہیے تھا، دیکھنے کے بعد صورت غائب ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن دل نے اتنا قبول کیا کہ اب وہ شئی سامنے نہیں ہے لیکن ذرا آپ نے گردن جھکائی تو شئی دل کے سامنے ہے، یہ کہاں موجود ہے، یہ آنکھ میں تو موجود نہیں اگر آنکھ میں ہوتی موجود تو دوسری چیز دیکھنے کے قابل نہ رہتے، وہ چیزیں ہی ٹکراتی رہتیں تو آنکھ کہاں سے دیکھتی، آنکھ دیکھ کر فارغ ہوئی قلب نے فوٹو اتار لیا اور قلب کے اندر وہ نقشہ موجود ہے، اب جب چاہیں گے آپ دیکھ لیں گے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار　　　اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

پس جہاں مراقبہ کیا اور سامنے موجود چیز، جہاں غور کیا چیز موجود، تو دل فقط دیکھتا ہی نہیں بلکہ نگلتا بھی ہے۔ ان چیزوں کو۔ دیکھنے میں تو یہ ہے کہ دیکھ لیا باہر باہر کی چیز ہے، دیکھ کر اس کی صورت کو نگلتا ہے اپنے اندر اور اس کا

نقشہ کھینچ لیتا ہے، فوٹو لے لیتا ہے تو دل ایک بڑا زبردست کیمرہ بھی ہے تو اس میں صورتیں بھی موجود ذائقے بھی موجود، ذائقے جو چکھے تھے وہ بھی موجود، آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کے یہاں میں نے ایسا عجیب وغریب سالن کھایا کہ آج تک ذائقہ میری زبان میں موجود ہے، وہ زبان میں نہیں دل میں ذائقہ موجود ہے۔ اگر زبان میں وہ ذائقہ ہوتا تو دوسرا ذائقہ مل ملا کے کوئی ذائقہ باقی نہیں رہتا خلط ملط ہو جاتا تو زبان چکھ کرا لگ ہوئی اس نے پہنچا دیا قلب کے اندر، تو درحقیقت ہرکارے اور اور خدام ہیں، جو صورتیں، آوازیں، ذائقے بٹور کر قلب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں گویا یہ ایک سی آئی ڈی ہے کہ جس کے ذریعے سے قلب تمام چیزوں کے احوال معلوم کرتا ہے، صورتوں کے بھی، آوازوں کے بھی، ذائقوں کے بھی، خوشبو بدبو کے بھی قلب ہے حامل۔

قلب کے ظاہری وباطنی پانچ پانچ دروازے ...... تو قلب ایک عجیب کائنات نکلی تو اس نے پانچ دروازے رکھے حواس خمسہ کے، ان کے ذریعہ محسوسات کو دیکھ کر اپنے اندر لے لیتا ہے اور پانچ ہی پھر حواس ہیں باطنی، قوت وہم اور قوت خیال اور قوت متفرقہ اور قوت عاقلہ، تو ان کے ذریعہ سے وہ غیبی چیزیں دیکھتا ہے۔ علوم میں جب غور کرتا ہے تو نئے نئے علوم اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بدن کے اندر نہیں ہے روح میں ہے، اور روح کا کنکشن ہے روح اعظم سے تو وہاں سے علوم اترتے ہیں، تو قلب ہی کے اندر یہ خاصہ ہے کہ جب غیب کی طرف متوجہ ہو تو وہاں سے علوم اور کمالات لیتا ہے، تو عجیب کائنات اللہ نے بنائی ہے۔ تو اتنی سی ڈبیہ گاجر کی شکل کی سینے کے بائیں جانب پڑی ہوئی ہے لیکن ایک بطن اس کا وہ ہے جو اوپر کی چیزیں منکشف ہے اور ایک بطن وہ ہے جو نیچے کی چیزیں منکشف۔

تو اگر انسان اوپر کے دروازے کو بند کر دے اور صرف نیچے کی چیز دیکھے نہ علم ہو، نہ کمال ہو، نہ اللہ کا اعتقاد ہو، وہاں سے علوم ہوں تو وہ اندھا ایسے ہی کام کرے گا جس کی شکایت کی جا رہی ہے کہ وہ آنکھیں بھی بند کر لے، ہاتھ بھی سکوڑ لئے، کچھ بھی نہیں کر رہا۔ اور ایک وہ لوگ ہیں جو محسوسات کو بھی دیکھتے ہیں اور ساتھ میں مغیبات کے علوم بھی ان کے قلب میں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے وہ ان علوم کے ذریعہ سے وہ ان ساری محسوسات کو اپنی اپنی حد پر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس محسوس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے اور کہاں نہیں اور کہاں جائز ہے، کہاں ناجائز ہے۔ کہاں حرام ہے کہاں حلال۔

حلال وحرام کا مدرک بھی قلب ہے ...... تو حرام وحلال کی تمیز علم غیب سے ہوتی ہے، ان محسوسات سے نہیں ہوتی، اور وہ سمجھنے والا صرف قلب ہے، آنکھ، ناک، کان یہ حق اور باطل دونوں چیزیں قبول کرتے ہیں آنکھ اگر آپ جائز چہرے پر ڈالیں جب بھی لذت لے گی اور حرام چہرے پر ڈالیں جب بھی آنکھ لذت لے گی، ہاتھ اگر آپ جائز مال پر ڈالیں اسے بھی گرفت کر لے گا اور اگر رشوت کا مال لیں تو وہ چھیے گا نہیں، ہاتھ میں اسے بھی قبضہ کر لے گا۔ اسی طرح سے کان ہے اگر آپ کسی ناجائز آواز پر گانے بجانے پر متوجہ کر دیں اس سے بھی کانوں کو لذت ہوگی

اور جائز آوازیں ہیں، تلاوت قرآن ہو رہی ہے، ذکر اللہ ہو رہا ہے۔ وہ بھی کان لے لیں گے۔

تو آنکھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتی، ہاتھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا لیکن قلب وہ ہے کہ وہ امتیاز کرتا ہے حق اور باطل میں، اگر غلط چیز آئی تو کھٹکتا رہے گا قلب، جب تک کہ سچی بات سامنے نہیں آئے گی مطمئن نہیں ہوگا، ناجائز مال آئے گا قلب کے سامنے کھٹکتا رہے گا۔ چور کے دل میں کبھی اطمینان نہیں ہوگا ضمیر ملامت کرتا رہے گا کہ برا کیا، چاہے نفس مانے نہ مانے، تو قلب احساس کرتا ہے حرام کا بھی، حلال کا بھی، جائز کا بھی ناجائز کا بھی۔

لیکن یہ کس طرح سے، یہی علوم غیب کے ذریعے وہی جو اوپر سے ضمیر میں آ رہی ہے چیز، اوپر سے اس کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز ہوتا ہے۔ صورتوں اور شکلوں میں امتیاز نہیں ہوتا حق و باطل کا، تو جن لوگوں نے اوپر کا دروازہ بند کر دیا قلب کا، نہ انبیاء علیہ السلام کی بات سنی نہ علم وحی کو قبول کیا، نہ اللہ کے احکام کو لیا، ان کے سامنے صرف محسوس زندگی رہ گئی یہی اینٹ ڈلا، پتھر، خوشبو یہی چیزیں رہ گئی، اب اس پر چاہے غرور کرے وہ بھی جہالت ہوگی کیوں کہ اوپر کا علم نہیں ہے عظمت خداوندی سامنے نہیں ہے۔ اسے غلط استعمال کرے تو کر سکتے ہیں اس لیے کہ اوپر کا علم سامنے نہیں ہے جو غلط کو غلط بتاتا ہے اور صحیح کو صحیح بتاتا ہے، تو ان کی آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود اندھی ہیں، ان کان کھلے ہونے کے باوجود بہرے ہیں نہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

تو صورتوں کا دیکھ لینا کمال نہیں، جانور بھی دیکھتا ہے، بیل بھی دیکھتا ہے صورتیں، ان صورتوں میں یہ امتیاز کرنا کہ یہ دیکھنے کے لائق ہیں یا نہیں، یہ حلال یا حرام یہ قلب کا کام ہے مگر وہی قلب جس کے اندر ایمان کی روشنی ہو، جس میں انبیاء کی اطاعت کا جذبہ ہو، ان لوگوں نے جب وہ جذبہ کھو دیا تو ظاہر بات ہے کہ صرف محسوسات رہ گئیں اسی کے چکر میں پڑے رہے نہ عقل کام دے گی نہ علم کام دے گا۔

حقیقت علم...... مجازی طور پر آپ سائنس کو، فلسفے کو علم کہہ دیں مگر یہ علم نہیں ہے یہ حس ہے یعنی محسوسات کو دیکھنا، تجربات سے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے رہنا۔ یہ بس دیکھنا ہے اور دست کاری..... علم کہتے ہیں مغیبات کو یعنی ایسی چیز جاننے کو کہ جو آنکھ اور کان سے نہ دیکھی جا سکے، اس چیز کا نام ہے علم۔ اور وہ علم اللہ کا ہے جو وحی کے ذریعے آتا ہے تو علم کہلانے کا مستحق وہ ہے۔ یہ حسی چیزیں ہیں حس سے تصرفات کریں گے۔ یہ احساسات سے تعلق رکھتے ہیں، اسے حس کہیں گے علم نہیں کہیں گے اور حس جانور میں بھی ہوتی ہے اور انسان میں بھی، جانور کے لاٹھی مار دو گے وہ بھی تکلیف پائے گا۔ انسان کی خصوصیت نہیں، اس کو ڈھیلا مارو، وہ بھی جذبہ میں آ جائے گا یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا، طبیعت سے تعلق رکھتا ہے۔ حس سے تعلق رکھتا ہے تو یہ جتنی چیزیں ہیں یہ احساسات ہیں علوم نہیں ہیں۔ علوم کا تعلق ہے مغیبات سے اور وہ جبھی آتا ہے جب قلب کے اوپر کا دروازہ کھلے اور اس دروازے میں وہاں سے علم کی آمد شروع ہو جائے۔ اس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ انہوں نے اوپر کا دروازہ بند کر لیا ہے قلب کا، اور وہ کام نہیں لیتے جو قلب کا کام ہے کہ جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں، صورتیں دیکھنے پر قناعت کر رہے ہیں تو پھر

کہاں سے انہیں منزل مقصود نظر آئے گی اور پھر یہ سامان بھی جتنا ہے دیکھنے کا یہ بھی ہمارا ہی تو دیا ہوا ہے، اس نے خود کہاں پیدا کیا ہے، اگر ہم روک لیں تو دیکھ بھی نہ سکے، چکھ بھی نہ سکے، تو ان طاقتوں کے بل بوتے پر ہمارے مقابلے پر آ رہا ہے جس کے خالق ہم ہیں۔ تو حماقت اور جہالت واضح فرمائی گئی۔

انسانی ذوات وصفات کی معطی ایک ہی ذات ہے ......اس کو فرمایا: قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ کہہ دیجئے اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ وہی ہے اللہ جس نے تمہیں پیدا کیا، پیدا کرنے والا وہ ہے اور پیدا بھی کیا اس شان سے کہ جن قوتوں پر ناز کرتے ہو وہ اس نے رکھیں۔ سننے کی طاقت اس نے رکھی، دیکھنے کی طاقت اس نے رکھی، بوجھنے کی طاقت اس نے رکھی، دل دیا، آنکھ دی، کان دیئے مگر قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ بہت کم ہیں جو شکر گزار ہیں اللہ کے، کہ ان نعمتوں کو نعمت سمجھیں بس یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری ملکیت ہے کون ہے دینے والا؟

تو نہ شکر کا کام ہے نہ حمد کا کام ہے، تو جب حمد وشکر نہیں اس واسطے اس کا استعمال بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ ادھر عقل لڑاتے ہی نہیں قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ یہ تو ہیں قویٰ اور فرماتے ہیں یہ جو قوتیں ہیں اب خود اپنی ذات کو دیکھ لو جس میں یہ قوتیں رکھی گئیں، وہ ذات کہاں سے آئی؟ وہ بھی تو اللہ ہی نے بنائی ہے، تم تو خود ہی نہیں بنے تو اس کو فرمایا قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ آپ فرما دیجئے! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں بکھیر دیا عجیب اعجازی شان سے کہ ایک نفس واحد کو پیدا کیا آدم علیہ السلام کو، اور اس کے ذریعے سے اربوں کھربوں انسان پوری زمین میں بکھیر دیئے تو یہ بکھیرنے والے ہم ہیں یا تم ہو؟

ہم نے ہی تو تمہاری ذات کو دنیا کے اندر بھیجا تو ذات جب ہم نے بھیجی تو ذات میں جو کرامات رکھی ہیں سننا، دیکھنا، عقل، یہ بھی تو ہم ہی رکھنے والے ہیں جو ذات کا دینے والا ہے وہ صفات کا دینے والا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذات تو تم بناؤ اور صفات میں ہم تمہارے تابع ہو جائیں یا ذات ہم بنائیں اور صفات تم رکھ لو جو ذات بنائے گا وہی صفات بنائے گا۔

سارے بیان کا حاصل ......تو حاصل یہ نکلا کہ اگر اللہ کی قدرت پر غور کرو تب بھی جواب موجود ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اور عبرت پکڑو اور اگر عقل سے غور کرو تو عقل بھی بتلاتی ہے کہ دینے والا جو ہے اس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اگر حس پر غور کرو تو، پرندوں کو دیکھ لو وہی ہے اوپر لے جانے والا، وہ پتھروں کو اوپر لے جا کر برسا سکتا ہے، اگر تاریخ پر غور کرو تو پچھلوں میں ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں، لیکن جب نہ تاریخ سامنے رکھو، نہ آنکھ، کان کھول کر دیکھو، نہ عقل سے دیکھو، نہ ایمان لاؤ تو سوائے ہٹ دھرمی کے اور کیا ہے......؟

انسان کی کٹ حجتی ......اس کا حاصل یہ ہے کہ تم گویا مستعد بن رہے ہو ہمارے عذاب اٹھانے کے لیے تو ہم عذاب بھیجنے والے ہیں۔ ہم نے دنیا میں بھی عذابات دیئے ہیں قیامت کا دن بھی رکھا ہے کہ اس میں آخری طور پر

عذاب دیں گے۔ اب آگے جبکہ یہ بات ہوئی تو فرمایا کہ گویا جب تم عذاب ہی چاہ رہے ہو تو اچھا تیار رہو عذاب کے لیے مگر مصیبت یہ ہے کہ انسان کی کٹ حجتی پر کہ تیار ہونے کے باوجود پھر تیار نہیں وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ . اجی صاحب! وہ عذاب کب کو آئے گا، وہ قیامت کب آئے گی؟.... اب اس پر بھی یقین نہیں کہ آنے والا ہے اس لیے کہ یقین کا سبب اور اسباب تو پیدا کیے نہیں۔ اس سے کام نہیں لیا تو قیامت کی دھمکی دی تو اب قیامت مانگنے کو تیار کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ......

اثباتِ قیامت...... یہاں سے پھر آگے قیامت کا اِثبات شروع کیا کہ آخری سزا کے لیے قیامت کا دن تیار ہے، دنیا میں جب تک گزار رہے ہو گزار لو، یہاں بھی عذاب آئے گا، اور وہاں بھی عذاب آئے گا، یہاں کے عذاب کو ممکن ہے کہ تھوڑا بہت اسباب کے ذریعے ٹال لو گو وہ ٹلے گا نہیں، لیکن قیامت کے دن تو کوئی صورت ہی نہیں ہے ٹلنے کی، وہ تو آنے والا ہے چاہے اسے مانگو تم، چاہے نہ مانگو، اس واسطے آگے قیامت کے ثبوت اور قیامت کے اثبات پر بحث فرمائی ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ○

”اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو تو کہہ! خبر تو ہے اللہ کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آ لگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے تو کہہ! بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے تو کہہ! وہی رحمٰن ہے، ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا، سو، اب تم جان لو گے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک، پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا“۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو قیامت سے ڈرایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ پوری دنیا ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوگی تو اُس زندگی کے لیے اس زندگی میں کچھ کر لیا سامان تو اگلی زندگی...... راحت سے کٹے گی اور اگر نہ کیا یا برا سامان مہیا کیا تو اگلی زندگی تکلیفوں میں کٹے گی۔ اور چونکہ وہ اگلی زندگی دوامی اور ابدی ہے۔ اس لیے راحت کا سامان کیا تو راحت بھی دوامی ہوگی اور مصیبتوں کے سامان کر لیے تو وہ مصیبتیں بھی دوامی اور ابدی رہیں گی، جو کاٹے نہیں کٹیں گی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کو پیش

فرمایا، تو اس پر قوم نے جھٹلایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کی شکایت فرمائی حق تعالیٰ نے کہ وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ٥

یہ جو آپ لوگ قیامت سے ڈراتے ہیں، وعدہ دیتے ہیں وہ کب کو آئے گی، وہ آ کیوں نہیں جاتی قیامت؟ اگر ہو تو اسے لے آیئے جلدی سے، برسوں برس سے صدیوں سے ہزاروں برس سے وعدے دے رکھے ہیں آپ نے کہ دنیا ختم ہو گی تب وہ آئے گی تو اسے اگر آنا ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آجاتی تاکہ آپ کو بھی ہمیں جھٹلانے کا موقع نہ رہے۔ قیامت سامنے آجائے تو مجبور ہو کر ہم یقین کر لیں۔ یہ سوال کیا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ کب آئے گی وہ قیامت؟

قیامت کے سوال کا منشاء...... اس سوال کا منشاء دو ہو سکتے ہیں اور تھے بھی دو، ایک تو یہ کہ بعضے قیامت ہی کے منکر تھے کہ کوئی زندگی اگلی آنے والی نہیں ہے..... ان کے مزاجوں میں دہریت تھی، نہ وہ اس عالم کی ابتداء کے مقر تھے نہ انتہا کے مقر تھے کہ بس یونہی چلا آرہا ہے قصہ، یونہی چلتا جائے گا ابد الآباد تک مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ

یہ زندگی ہماری، مر رہے ہیں، جی رہے ہیں یونہی دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ یونہی دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے تو زمانہ ہمیں زندگیاں دے رہا ہے زمانہ ہی آتا ہے، وقت گزرتا ہے موت آجاتی ہے، یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ نہ قیامت ہے نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، تو کچھ دہریہ مزاج تھے کہ جو شروع ہی سے منکر تھے قیامت کے۔

منکرین قیامت...... جیسا کہ فلاسفۂ یونان، وہ بھی منکر ہیں قیامت کے، وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے دنیا اور ہمیشہ اسی طرح چلی جائے گی، نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، نہ کوئی انتہا ہے اس عالم کی۔

فلاسفۂ ہند یہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ابتداء بھی نہیں ہے اور انتہاء بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی انتہاء تو وہ انتہائیں بھی ہزاروں آئیں گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اتنے ارب اتنے کھرب اتنے کروڑ اتنے لاکھ برس تک یہ قائم رہتی ہے دنیا اور پھر پرلو آجاتی ہے۔ قیامت آجاتی ہے، عالم مٹ جاتا ہے اور پل بھر میں پھر از سر نو بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اور چار بیسی یعنی جو سب سے اول پیدا ہوتے ہیں تبت کے پہاڑ وہ ہیں، ان پر ریت اترتا ہے۔ پھر دنیا چلتی ہے اور چار ارب اور چار کھرب اور چار کروڑ برس تک پھر چلتی رہے گی۔ پھر پرلو آئے گی اور پھر از سر نو، تو ارواح ان کے یہاں گنتی کی متعین ہیں وہی لوٹ پھیر کر آئے جاتی ہیں۔ وہ مختلف جون بدلتی رہتی ہیں تو ابتداء وانتہاء کے یہ بھی قائل نہیں اور فلاسفۂ یونان بھی قائل نہیں یعنی جتنے بھی بندگان عقل ہیں وہ قائل نہیں ہیں قیامت کے۔ ان کا خدا ان کی عقل ہے، ان کے نظریات ان کے عقائد ہیں۔ اس واسطے ان کے عقائد میں یہ چیز آئی نہیں کہ اس عالم کی ابتداء ہے، تو وہ درحقیقت خدا کے وجود کے بھی منکر ہیں اور کائنات کی انتہاء کے بھی منکر ہیں تو ایک نمونہ عرب میں موجود تھا جو قیامت کے منکر تھے، تو ایک منشاء تو ان کے سوال کا استہزا اور مسخرہ پن ہے کہ جو چیز آنے

والی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اس سے ڈرا رہے ہیں، نہ قیامت آوے، نہ عالم ختم۔

بعض قائل تھے قیامت کے مگر اس کے مقصد سے واقف نہیں تھے کہ حقیقت کیا ہے قیامت کی۔ اس کی جہالت کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا تمسخر آمیز کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ کب کو آئے گی وہ قیامت۔ تو قیامت کی حقیقت پیش نظر نہیں یعنی یہ پیش نظر نہیں تھا کہ ایک زندگی ختم ہو کر اس کے ثمرات اگلی زندگی میں نکلیں اور اس کے لیے لازمی ہے کہ ایک عالم ختم کیا جائے اور دوسرے عالم کی بنیاد ڈالی جائے۔ تا کہ مجموعۂ بنی آدم کی نتائج دیکھنے کا موقعہ ملے اچھے اور برے۔ یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک جہان بدل کر دوسرے جہان نہ لایا جائے، تو بعضے اس حقیقت کے منکر تھے تو قیامت کے قائل تھے مگر حقیقت سے لاعلم تھے اس واسطے یہ سوال کیا کہ کب کو آئے گی وہ قیامت؟

تعدد قیامت...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا انکار ہو یا قیامت کے مقصد کا انکار ہو، یہ اپنی بھی تکذیب ہے، اور مشاہدات کی بھی تکذیب ہے، خود اپنے دیکھے کو جھٹلانا ہے اس واسطے کہ قیامت ایک ہی نہیں ہے بلکہ کئی ہیں قیامتیں، ایک قیامت شخصی ہے اور ایک قیامت قرنی ہے، اور ایک قیامت کلی ہے۔ شخصی قیامت ہر شخص کی موت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ تو یہ شخصی قیامت ہے کہ ہر شخص کے اوپر آ رہی ہے یعنی ایک زندگی ختم ہوتی ہے اگلی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ تو شخصی زندگی ہے، شخصی موت ہے اور شخصی قیامت بھی۔

دوسری قیامت ہے قرنی، یعنی ایک نسل کا اختتام جس کا اندازہ تخمینہ سو برس ہے، سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نسل کا آغاز ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی فرد کی عمر اتفاق سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ سو دو سو برس ہو جائے تو ایک فرد کا نام زمانہ نہیں ہوتا، زمانہ کہتے ہیں اکثریت کو کہ ایک نسل کی نسل آ جائے اور نسل کی نسل ختم ہو جائے، ایک آدھ فرد رہ جائے تو اس سے نسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایک صدی گویا رکھی گئی ہے ایک نسل کے لیے تخمینی طور پر۔ اسی واسطے حدیث میں تجدید کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے کہ دین کو تازہ بہ تازہ کیا جائے گا۔ تو ہر صدی کے اوپر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس امت میں تو نبی نہیں آئے گا۔ اس امت میں یہ نبوت آخری ہے لیکن مجددین آئیں گے ہر سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ مجدد پیدا کریں گے کہ لوگ اپنی خود رائیوں سے دین میں جو خلط ملط کریں گے، کچھ بدعات ملا دیں گے، کچھ منکرات، مجدد آ کر پھر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر دے گا اور پھر از سر نو دین تازہ بہ تازہ ہو جائے گا..... اس لیے وعدہ دیا گیا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ اس امت میں حق پر رہے گا کبھی حق منقطع نہیں ہوگا اس سے وہی ایک بیج کی مانند ہوگا اس میں سے کونپلیں پھوٹیں گی اور نئی شاخیں پھر ابھر آئیں گی اور مجددین آ کر دین کی تجدید کریں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا. ①

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائة ج: ١١ ص: ٣٦٢.

اللہ تعالیٰ تازہ بہ تازہ کرے گا اس دین کو ہر صدی پر، ہر صدی پر مجدد آئیں گے ....تو ہر سو برس کے بعد مجدد کا وعدہ اس لیے کیا گیا ہے کہ سو ہی برس ہوتے ہیں ایک نسل کے جب نئی نسل آتی ہے تو کچھ نظریات بھی نئے ہوتے ہیں کچھ خیالات نئے ہوتے ہیں، زمانے میں کچھ ترقی ہوتی ہے، ان ترقیات سے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے دین کے (بارے میں) مجدد آ کر اس قرن کی ضروریات کو سامنے رکھ کر دین کی جب تجدید کرتا ہے تو پھر دین قلوب میں تازہ بہ تازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ایک نسل کے آغاز اور ایک نسل کے اختتام کا عمومی طور پر اندازہ سو برس ہے اسی لیے سو برس پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا حاصل نکلا کہ ہر سو سال بعد ایک قیامت قائم ہوتی ہے۔ یعنی ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ چھوڑتی ہے، اسے قیامت قرنی کہتے ہیں۔

اور ایک تیسری قیامت ہے جو قیامت کلی ہے کہ پورے عالم پر موت طاری ہو جائے آسمان سے لے کر زمین، پہاڑ دریا حتی کہ ملائکہ علیہم السلام ارواح مقدسہ کوئی چیز باقی نہ رہے اور احدیتِ مطلقہ کا ظہور ہو، صرف ایک اللہ کی ذات قائم رہے۔ تو جیسے اس کا نام واحد ہے کہ وہ ایک ہے ایسے ہی اس کا نام احد بھی ہے کہ وہ یکتا ہے اور بے مثل اور بے مثال، تو یکتائی کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز مٹ کر تنہا ذات واحد نہ رہ جائے۔

یہ عالم اللہ نے بنایا ہے اپنی صفات کے اظہار کے لیے تو تمام صفات ظاہر ہوں گی رحمانیت بھی ظاہر ہو رہی ہے غفوریت بھی ظاہر ہو رہی ہے، رزاقیت بھی ظاہر ہے۔

احدیت کا ایسا ظہور ہو کہ کوئی نہ ہو اور وہ ہو۔ یہ جب ہی ہو گا جب پورے عالم کا نظام ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر ایک نیا نظام لایا جائے۔ تو احد کی صفت کے ظہور کے لیے قیامت قائم کی گئی ہے۔

جس عالم کے اجزاء قیامت کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس کے مجموعہ میں بھی یہ صلاحیت ہو گی ......تو ایک قیامت شخصی ہوئی۔ ایک قرنی ہوئی، ایک قیامت کلی ہوئی، دو قیامتیں وہ ہیں جو ہر شخص انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہر انسان جب مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوئی۔ یہ ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے ہے، تو جس عالم کے اجزاء پر قیامتیں آ رہی ہیں کیسے ممکن ہے کہ اس کے کل پر قیامت نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فنا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے جبھی تو ہر ہر جزء اس کا موت کی طرف جاتا ہے، اگر اس عالم میں صلاحیت نہ ہوتی موت کے قبول کرنے کی تو ایک فرد بھی اس کا نہ مرتا۔ ایک جز میں بھی تغیر نہ ہوتا۔ سارے اجزاء علیٰ حالہ باقی رہتے لیکن جب ایک جز موت کی طرف جاتا ہے تو مجموعہ بھی یقیناً موت کی طرف جائے گا۔ ان اجزاء کے مجموعہ ہی کا نام تو عالم ہے۔ اب انفرادی طور پر یہ اجزاء جتنے ہیں ایک وقت آئے گا کہ مجموعہ مل کر مٹ جائے گا، پورے عالم پر موت طاری ہو جائے گی تو جس کے ایک جز میں یہ خاصیت ہے وہ کل کے اندر بھی ہو گی ورنہ اجزاء میں وہ بات پیدا نہ ہوتی اجزاء میں خاصیت نہ آتی۔ تو موت شخصی قیامت شخصی ہر فرد پر ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔

انکارِ قیامت، انکارِ مشاہدہ ہے ......انسان ہی نہیں جانور بھی مرتے ہیں اور جانور ہی نہیں تمام اجزاء مرتے

ہیں، ایک پتھر رکھا صحیح سالم وہ ٹوٹ گیا، اس کی ہیئت کذائی مٹ گئی، درخت ہیں ان پر موت طاری ہوتی ہے۔ بعضے درخت کی عمر سال بھر ہے۔ جیسے پپیتہ سال بھر میں اگا، اس کے بعد نئی شاخ پھوٹ آئی۔ یا کیلا ہے سال بھر رہا ہے اس کے بعد مٹ گیا بعضے درختوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ بعضوں کی سو سو برس ہوتی ہے۔ تو جس طرح سے یہ بنی آدم میں عمریں مختلف ہیں نباتات میں بھی مختلف ہیں۔ تو نباتات بھی مرتے ہیں، جمادات بھی مرتے ہیں حیوانات بھی مرتے ہیں انسان بھی مرتے ہیں، تو جب اس عالم کے سارے اجزاء موت کو قبول کرتے ہیں تو عقل بتلاتی ہے کہ مجموعہ بھی قبول کرے گا اور اس کے اندر موت آنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تو جو لوگ روزانہ دیکھتے ہیں قیامت کو آتے ہوئے وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں مجموعۂ قیامت کا یہ تو اپنے مشاہدہ کو جھٹلانا ہے۔

تو قیامت کا انکار کرنا خود اپنی تکذیب کرنا ہے اپنا انکار کرنا ہے۔ ورنہ جو منکر ہیں قیامت کے انہیں چاہیے کہ وہ مرا نہ کریں اور ملک الموت کا مقابلہ کریں اور کہہ دیں کہ ہم میں موت آنے کی صلاحیت نہیں ہے، ہم میں تو ابدالآباد تک رہنے کی صلاحیت ہے لہٰذا ہم مرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اس پر قادر ہوتے تو عالم کے بارے میں بھی دعویٰ کر سکتے تھے کہ اس عالم پر بھی موت نہیں آئے گی، جب اس کے اجزاء پر بھی نہیں آتی تو کل پر بھی نہیں آئے گی لیکن جب آتی ہے اجزاء پر کل پر آنا ممکن ہے اس واسطے یہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے۔

شخصی قیامت کے تعین نہ ہونے کے باوجود اگلے سامان کرتے ہو تو عالمی قیامت کے تعین نہ ہونے پر بھی اگلے سامان کرنا چاہیے

......اب دوسری چیز یہ ہے کہ قیامت کا مقصد پیش نظر نہیں ان کے جس سے وہ انکار کرتے ہیں.........قیامت کا مقصد یہ ہے کہ پہلی زندگی میں کچھ سامان کیا جائے تا کہ اگلی زندگی میں وہ کارآمد ثابت ہو، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس موت کا علم بھی ہو، یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی ختم ہوگی تو آدمی اگلی زندگی کا سامان کرے گا۔

مثلاً ایک شخص مرتا ہے تو کیا وہ اپنی زندگی میں اس کی فکر نہیں کرتا کہ میں اپنی اولاد کے لیے کچھ کر جاؤں تا کہ کل کو آنے والے مجھے برا بھلا نہ کہیں، اس واسطے آدمی جائیداد خریدتا ہے، تجارتیں قائم کرتا ہے، کمپنیاں بناتا ہے کہ میں ہی نہیں میری اولاد کے کام آئے یہ، اس کو یقین ہے کہ میں اس عالم سے گزر جاؤں گا تو میری نسل مصیبت میں نہ پڑے۔ احادیث میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''تم بجائے اس کے کہ مرتے وقت اولاد کے ہاتھ میں بھیک کا ڈھوگہا دے جاؤ، یہ بہتر ہے کہ ایسا سامان کر جاؤ کہ تمہاری اولاد خوشحالی کی زندگی بسر کرے''

یعنی تنہا اپنی فکر نہ کرو بلکہ اپنی اولاد کی بھی کرو، تو اولاد کی فکر آدمی اسی زندگی میں تو کرتا ہے اور کرتا ہے اگلی زندگی کے لیے کہ جب میں نہ ہوں جب بھی، تو کیا وہ یہ پوچھا کرتا ہے کہ صاحب! پہلے یہ بتلا دو کہ کون سے دن، کون سی تاریخ میری موت آئے گی، جب میں اولاد کے لیے سامان کروں وہاں مطلقاً اتنا کافی ہے کہ موت کا علم ہو کہ آئے گی ضرور کب آئے گی؟ کون سی تاریخ؟.....

یہ ضروری نہیں جبکہ تم اپنی شخصی زندگی کو جانتے ہو کہ ایک زندگی میرے بعد آئے گی، مجھے نیک نامی کا سامان کرنا چاہیے اوراس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ موت کے وقت کا علم ہو تو مجموعۂ عالم کی موت میں کیوں سوال کرتے ہو کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ یہ کون سی تاریخ کو آئے گی قیامت؟؟ بھئی جیسے تمہیں شخصی قیامت کے وقت کا علم نہیں ہے۔اسی طرح اگر مجموعۂ قیامت کا بھی علم نہ ہو دن تاریخ کا تو اس میں کیا نقصان بیٹھتا ہے؟ وہاں بھی بلا تاریخ کے علم کے اگلے سامان کرتے ہو، یہاں بھی تم اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کا سامان قیامت کے دن کے لیے کرو، وہاں تاریخ نہیں پوچھتے یہاں کیوں پوچھتے ہو؟

وہاں کیوں نہیں کہتے کہ صاحب! موت کب آئے گی، پہلے مجھے یہ علم ہو کہ جنوری کی فلاں تاریخ میں میرا انتقال ہوگا جب تو میں اپنی اولاد کے لیے کچھ آئندہ کا سامان کروں اور اگر یہ علم نہ ہو تو مرنے دو، اولاد کو بھی جانے دو، جب وہاں سوال نہیں کرتے یہاں بھی سوال نہیں کرنا چاہیے۔اسی طرح سے قرنی قیامت قائم ہوتی ہے، ایک نسل ختم ہوتی ہے دوسری نسل آتی ہے یہ نسل بھی تو سامان کرتی ہے کہ ہماری اگلی نسلیں ٹھیک رہیں، اگر کسی نسل میں حکومت ہے تو وہ اپنے دم بھر صحیح کرے گی کہ میرے خاندان میں باقی رہے یہ حکومت میری قوم میں باقی رہے، دوسری قوم اس پر غالب نہ آئے تو کیا وہ یہ پوچھا کرتی ہے کہ ایک صدی کی کون سی تاریخ، کون سے منٹ پر ہماری قوم ختم ہوگی جب تو ہم سامان کریں اگلی نسل کے لیے اور جب معلوم نہ ہو تاریخ تو نہ کریں، کوئی اس کی فکر نہیں کرتا، اسے اتنا معلوم ہے کہ سو برسوں میں اندازاً ایک نسل گزر جائے گی اسے اگلی نسل کی فکر کرنی چاہیے، وہاں وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ . یہ کب کو آئے گی، کون سی تاریخ ہوگی؟ جب وہاں بلا تاریخ کے علم کے اگلی نسلوں کا بندوبست کرتے ہو تو یہاں بلا علم تاریخ کے کیوں نہیں کرتے قیامت کا بندوبست؟ قیامت کے بعد کی زندگی کی کیوں نہیں فکر کرتے، معلوم ہوا کہ سوال تمہارا مہمل ہے، محض ٹال مٹول کے لیے یہ سوال کر رہے ہو، کوئی معقول سوال نہیں ہے، اگر معقول ہوتا تو شخصی موت میں یہ بھی سوال کرتے اور قرنی موت میں بھی یہ سوال کرتے لیکن وہاں نہیں کرتے۔اسے غیر معقول جانتے ہو تو کلی قیامت میں اس سوال کو کیوں تم نے معقول سمجھا؟ یہاں بھی غیر معقول۔

مقصد قیامت...... تو اصل میں قیامت کے مقصد کا علم نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس زندگی میں کچھ کر جاؤ تا کہ اگلی زندگی میں کام آئے یہ ایک مقصد ہے۔یہ شخصی قیامت میں بھی ہے قرنی قیامت میں بھی ہے۔کلی قیامت میں بھی ہے تو یا تو اس کا علم نہیں یا جان بوجھ کر اپنے کو جاہل بنا رکھا ہے۔ٹال مٹول کر کے دعوے کو رد کرنا ہے۔اس واسطے سوالات کرتے ہو، تو حاصل یہ نکلا کہ قیامت کا آنا یہ آنکھوں دیکھی چیز ہے۔روزانہ قیامتیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جب مشاہدہ ہے تو پھر انکار کرنا اس کا، جھٹلانا ہے اپنے مشاہدے کو وہ اپنی تکذیب ہے، وہ خدا کی تکذیب نہیں، اللہ کا وعدہ اپنی جگہ سچا ہے وہ اس درجہ کا ہے ہی نہیں کہ کوئی جھٹلا سکے۔اسے جھٹلانے والا اپنے کو جھٹلا رہا ہے۔ جیسے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ . یہ جو اللہ کو جھٹلا رہے ہیں درحقیقت

اپنے نفسوں کو جھٹلا رہے ہیں اپنے کو دھوکے میں ڈال رہے، تو مشاہدہ کا انکار وہ خود اپنا انکار ہے جب آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ قیامتیں روزانہ ہیں۔ تو پھر قیامت کا انکار وہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلانا یہ اپنے کو جھٹلانا ہے خدا کو جھٹلانا نہیں، وہ بری ہے اس سے کہ کوئی جھٹلائے اس کو، یہ تو مشاہدہ ہے۔

قیامِ قیامت کا عقلی ثبوت ......اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو عقل بھی اس کی مؤید ہے کہ قیامت آنی ہے، عقل خود شاہد ہے اس واسطے کہ یہ ایک عقلی قاعدہ ہے کہ جو چیز مخلوط ہوتی ہے چند اجزاء سے جب تک کہ اسے توڑ کر اجزاء الگ الگ نہ نکالے جائیں وہ نفع نہیں دیتی، جب تک کہ الگ الگ چیزوں کو نفع پہنچاتے ہیں تو مجموعہ کو توڑ پھوڑ کر جب تک اجزاء الگ الگ نہیں کر دیئے جائیں گے وہ نفع بخش ثابت نہیں ہوں گے۔

اس کی مثال کھیتی ہے۔ ایک کسان نے کھیتی بوئی جو، اور چھ مہینے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، چھ مہینے کے بعد کھیتی لہلہا اٹھی، آنکھیں بھی اس کو دیکھ کر مسرور ہو رہی ہیں اور کاشتکار کا دل بھی خوش ہے کہ اب میرے لیے موقع آ گیا ہے۔ میرا گھر بھرے گا، بہت خوش، لیکن جب کھیتی پک گئی اور دانے پختہ ہو گئے تو وہی کسان جس نے خون پسینہ ایک کر کے اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا۔ درانتی لے کر خود ہی اسے کاٹنا شروع کر دیا اور ساری کھیتی کو اجاڑ کے رکھ دیا ۔کاٹ ڈالا پھر اسی پر بس نہیں کہ کھیتی کو کاٹ کر کھلیان میں جمع کیا اور اس کے بعد بیل چلا کے اسے چکنا چور کرنا شروع کیا، ریزہ ریزہ کر دیا........ پھر اسی پر بس نہیں کرتے کسان کہ بھئی کاٹا تھا کاٹنے کے بعد خود اپنے پیروں سے نہیں بلکہ بیلوں کے پیروں سے روندوایا، اس کے بعد تھال میں لے کر اڑاکے ہیں جو ساری بکھر کر الگ الگ ہو جائے......اگر کوئی کاشتکار سے یوں کہے کہ بے وقوف! چھ مہینے کی خون پسینہ کی کمائی تیری، تو نے ہی تو اسے آباد کیا تھا، پروان چڑھایا تھا، اور بے وقوف اپنے ہی ہاتھ سے اس کو اجاڑ دیا، یہ تو نے بڑی غلطی کی، غیر معقول بات کی، اپنی پروان چڑھائی ہوئی کھیتی کو کاٹ ڈالا اور ریزہ ریزہ چکنا چور کر دیا، تو وہ یہ کہے گا کہ بے وقوف تم ہو سوال کرنے والے، میں نے عقل مندی کا کام کیا اس لیے کہ میری کھیتی میں بھوسہ اور جو مخلوط تھے۔ بھوسہ غذا ہے بیلوں کی اور جو غذا ہے انسانوں کی، جب تک میں کاٹ کر اسے چکنا چور نہ کروں بھوسہ الگ نہیں ہو سکتا تھا دانے سے، جب میں نے الگ کر دیا تو بھوسہ تو گیا جانوروں کے پیٹ میں اور دانہ گیا انسانوں کے پیٹ میں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہر چیز پہنچ گئی۔ مجموعی کھیتی اگر نہ توڑی جاتی، نہ چکنا چور کی جاتی تو ہر ایک کو اپنی اپنی غذا نہیں مل سکتی تھی۔ یہ جواب معقول ہوگا اس کا اور سوال نامعقول ہوگا۔

فرماتے ہیں "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" ① یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، اس میں کفر اور اسلام، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ سب رلا ملا چل رہا ہے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ایک دوسرے کے منافی ہیں مگر یہاں رلی ملی چل رہی ہیں ایک حقانی دلائل پیش کرتا ہے، ایک باطل پسند کچھ ملمع سازی کر کے حق کو رلا کر باطل میں ملا کر پیش کرتا ہے،

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

وہ اپنے باطل کو حق ثابت کر رہا ہے بہت لوگ جو زیرک ہیں دانش مند ہیں وہ تو اصلیت کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ مگر ہزاروں بہک بھی جاتے ہیں اور پھر دلائل کو ایسی ملمع سازی سے پیش کریں گے لوگ کہ اہل حق تو بے چارے بیٹھے رہ جائیں گے اور باطل کو فروغ ہو جائے گا تو دنیا میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، اخلاص اور نفاق، کفر اور اسلام سب خلط ملط چل رہا ہے اور ہر ایک مدعی ہے کہ میں حق پر ہوں، الگ نہیں ہے کہ دودھ الگ ہو، پانی الگ ہو، عقل لڑا کر غور کرو تو الگ ہوتا ہے ورنہ دیکھنے میں بالکل یکساں ہیں، ہیرا بھی یکساں ہے اور کنچ کا ٹکڑا بھی یکساں ہے۔ اب جوہری تو کم ہوتے ہیں جو ہیرے کو الگ کر دیں اور کنچ کے ٹکڑوں کو الگ سارے تو جوہری نہیں وہ کہیں گے بھئی یہ جو نقلی ہے، یہ بھی وہی ہے اصلی ہے وہ بھی ہمیں تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ تو دنیا میں دونوں چیزیں چل رہی ہیں خلط ملط، حق تعالیٰ نے اس دنیا کی کھیتی کو پروان چڑھایا، ہزاروں ہزار برس سے اس کو پانی دیا، سینچا لہلہا اٹھی اور قیامت کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ چکنا چور کر کے تباہ و برباد کر دیں گے، آسمان نیچے گر پڑے گا، چاند سورج کے ٹکڑے، زمین کے ٹکڑے، پانی، یہ مٹی سب گڈ مڈ ہو کر خلط ملط ہو جائے گا۔

اگر کوئی حق تعالیٰ سے سوال کرے کہ آپ ہی نے تو اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا، ہزار ہا ہزار برس آپ کی قدرت نے اسے سینچا اور بنایا اور اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا، فرمائیں گے اس میں کفر اور اسلام، حق و باطل ملا ہوا تھا، اس میں حق اور حقانی لوگ یہ غذا ہیں جنت کی اور کفر اور کفر والے لوگ یہ غذا ہیں جہنم کی، جب تک اس کھیتی کو کاٹ کر اجزاء الگ الگ نہ کئے جائیں تو جنت کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، جہنم کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، تو میں نے اسے پروان چڑھایا تاکہ پک جائے، پکنے کے بعد اب غذا دینی ہے۔ جنت اپنی غذا مانگ رہی ہے۔

تو اسلام اور صاحب اسلام اس کو دیئے جائیں گے۔ اور کفر اور صاحب کفر جہنم کو دیئے جائیں گے، کھیتی اگر یونہی برقرار رہتی تو جنت بھی خالی رہتی، جہنم بھی خالی رہتی، حالانکہ اس عالم کو بھی بھرنا ہے، تو آج جنت خالی ہے، جہنم بھی خالی ہے، مگر دونوں مانگ رہے ہیں کہ میری غذا دیجئے، جنت بھی رات دن سوال کر رہی ہے کہ مجھے بھیجئے لوگ اور وعدہ ہے اللہ کا کہ ہم بھر دیں گے ....اور جہنم بھی پکار رہی ہے کہ مجھے بھر دیجئے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ ہاں بھر دیں گے، لیکن ذرا بھوک کو کامل ہونے دو، ایک وقت گزر جائے، جب تکمیل کو پہنچ جائے گی بھوک تب غذا دیں گے تاکہ تمہارے اندر سرور پیدا ہو، بلا بھوک کے اگر کھا لیا تو وہ ہضم نہیں ہوگا اور اس کے لطف بھی محسوس نہیں ہوں گے، جب معدہ پوری طرح کامل بن جائے اس وقت غذا دی جائے تو فرحت، سرور اور قوت کا باعث ہوتا ہے اور اگر اشتہاء صادق نہ ہو اشتہاء کاذب ہو، مانگتا رہے معدہ اور بھرتے رہیں گے تو بیماریاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ تو کامل بھوک کے وقت جو چیز دی جاتی ہے وہ پچتی بھی ہے کھپتی بھی ہے اور مسرت کا باعث ہوتی ہے اس کے لیے ہم نے ایک وقت رکھا ہے اس وقت اس کھیتی کو کاٹ کر چکنا چور کر کے دانہ الگ نکال دیں گے، بھوسہ الگ نکال دیں گے بھوسہ جائے گا جہنم میں دانہ جائے گا جنت میں اس جہان میں دانہ ہے حق اور اہل حق اور بھوسہ ہے کفر اور اہل کفر،

وہ جہنم کی غذا ہیں یہ جنت کی غذا ہیں تو جس طرح سے ایک کاشتکار اپنی کھیتی کو ہر چھٹے مہینے پامال کرتا ہے تاکہ الگ الگ غذا کرے حق تعالیٰ شانہٗ اس پورے عالم کی کھیتی کو ایک دن چکنا چور کر کے اجزاء الگ الگ کر دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ قیامت کا ماننا گویا عقلاً ضروری ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایک عالم آنا چاہیے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو کر نکھر جائے، اسی کا نام قیامت ہے۔

قیامت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے...... تو قیامت حقیقت میں تخریب کا نام نہیں ہے کہ عالم کو اجاڑ دو، تعمیر کا نام ہے بس اتنا ہے کہ اگر کسی پرانے مکان کی جگہ آپ نیا مکان بنائیں تو قاعدہ ہے کہ اسے ڈھا کر جو اچھے اجزاء ہیں وہ لے لیتے ہیں، بقیہ پھینک دیتے ہیں اور نئی تعمیر کرتے ہیں، کوٹھی دار پرانے اجزاء پھینک دیتے ہیں اور کارآمد ملبہ مٹیریل لے کر نئی تعمیر بناتے ہیں تو قیامت درحقیقت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے مگر وہ بن نہیں سکتا جب تک کہ اس پرانے عالم کو ڈھانہ دیا جائے اور ڈھانے کے بعد جو مٹیریل عمدہ اور مضبوط ہے وہ تو ادھر لے لیں گے اور جو خراب خستہ ہے اسے پرے پھینک دیں گے۔ اس طرح سے ایک نئے عالم کی تعمیر ہوگی تو قیامت درحقیقت تعمیر کا نام ہے۔ تخریب کا نام نہیں ہے مگر تعمیر ہوتی نہیں جب تک تخریب نہ کی جائے، جب تک ڈھانہ دیا جائے بوسیدہ عمارتوں کو اس وقت تک جگہ خالی نہیں ہوتی اور نیا عالم نہیں بنتا تو اب جب قیامت کا مقصد واضح ہو گیا کہ پرانی چیزوں کو ختم کر کے نئے عالم کی تعمیر ہو اور اس پرانے میں بھی دودھ الگ کر دیا جائے، دانہ الگ۔ بھوسہ الگ اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کی تخریب کر کے چکنا چور کرو پھر نئے عالم کو بساؤ، یہ ایک ایسی معقول چیز ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جب یہ معقول ہے تو قیامت کا آنا کیوں غیر معقول اور جب وہ غیر معقول نہیں ہے تو یہ سوال کیسا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت......؟

نادانی کا سوال...... یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک کاشتکار نے بیج بویا اور کونپلیں نکل آئیں اور اس نے کہا کہ مجھے توقع یہ ہے کہ اس کھیتی میں دانہ لگے گا اور ہزاروں روپے ہوں گے دوسرا جھٹلا دیتا ہے کہ دانہ نکال کیوں نہیں دیتا یعنی آج تو کھیتی بوئی ہے اور کل کو وہ کہے کہ بھئی لے آنا وہ دانا کہاں ہے؟ اگر نہیں لاتا تو یہ جھوٹ موٹ باتیں کر رہا ہے تو کاشتکار کہے گا یہ احمق ہے۔ نہ اسے کھیتی کی خبر، نہ اسے یہ پتہ کہ کتنے دنوں میں اگتی ہے؟

نہ یہ پتہ کیا کہ کیا انداز ہے کھیتی کا؟

بس اس نے تو دانہ کا نام سن کر آج ہی مانگنا شروع کر دیا کہ اگر تو سچا ہے تو لے دانہ حالانکہ آج ہی تو کونپل نکلی ہے اور کونپل بھی نکلے گی، چار مہینے میں ذرا بڑا ہو گا، اور کوئی یوں کہے گا کہ لاؤ نا بھئی وہ کہاں ہے دانہ؟ تو کہے گا احمق ذرا ٹھہر جا تھوڑے دن یہ تو طبعی رفتار ہے چھ مہینے میں دانہ پختہ ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں ہوتا تو جو اس چھ مہینے کو نہ مانے اور دو ہی مہینے بعد مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تو سچا ہے تو دکھلا وہ دانہ۔

وہی کفار کی مثال ہے کہ قیامت اپنے وقت پر آئے گی، انہوں نے جھٹلا کے کہا کہ صاحب آنی ہے تو آج ہی

کیوں نہیں آجاتی تو معلوم ہوا کہ یہ سوال بالکل غیر معقول ہے اور جہالت پر مبنی ہے۔ معقول پسندی پر مبنی نہیں ہے صرف ڈھینگا ڈھانگی ہے ہٹ دھرمی ہے کہ ماننا ہی نہیں ہے پیغمبر کی بات، صرف ادھرادھر کے سوالات میں الجھادو، لیکن اللہ کے معاملات میں الجھاوا چلتا نہیں فوراً دودھ الگ ہو جاتا ہے پانی الگ۔

اس لیے کہ دین فطرت کا دین ہے اس کی تمام منقول چیزیں معقول بھی ہیں، جب عقل اور نقل سے ثابت ہو تو دوسرا مجبور ہو کر چپ ہوگا اونا معقول ہی اس کا قائل ہوگا، تو قرآن کریم میں پہلے تو ان کا سوال نقل کیا وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ. کہتے ہیں کہنے والے کہ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت؟ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو تو بتلا ؤنا کب کو آئے گی کوئی تاریخ بتلا ؤیا آج ہی لے آؤ اس قیامت کو، حق تعالیٰ نے ان کو دفع کرنے کے لیے جواب دیا کہ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ. اے پیغمبر فرما دیجئے بھئی مجھے کچھ خبر نہیں کب آئے گی، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ آئے گی، کب آئے گی، کون سی تاریخ میں آئے گی تو یہ علم اللہ کو ہے، یہ مجھے علم نہیں۔

کلی قیامت کا علم نہ دینا ہی قرین مصلحت ہے ...... اور اس کی ضرورت بھی نہیں، اس واسطے کہ اگر قیامت کا علم دے دیا جاتا کہ دس ہزار برس کے بعد آئے گی تو جتنی نسلیں اس سے پہلے ہوتیں وہ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتیں کہ بھئی ہمارے اوپر تو قیامت آئے گی نہیں، جن پر آئے گی وہ بھگت لیں گے لہٰذا ہم تو آزاد ہیں جو چاہے کریں، حرام ہو حلال ہو، جائز ہو ناجائز ہو، پھر اس درجہ ڈھٹائی میں مبتلا ہوں گے کہ کسی کو عمل صالح انجام دینے کا ہوش نہیں ہوگا۔

سوائے اس کے کہ کچھ فکر اس نسل کو ہو شاید جس کے اوپر قیامت آتی، تو ایک تو اس میں یہ مضرت تھی کہ قیامت کی تاریخ بتلا دینے میں جو تاریخ سے بعید لوگ تھے، وہ بے فکر ہو کر دنیا کی زندگی کو تباہ کر لیتے اور عمل صالح کی انہیں توفیق نہ ہوتی۔ لیکن جبکہ ان کو اتنا علم ہے کہ آئے گی تاریخ کا علم نہیں تو ہر وقت ایک خطرہ لگا ہوا ہے کہ معلوم نہیں کہ کب قیامت قائم ہو جائے، اور جب قیامت آنے والی ہے تو بھئی اپنی زندگی کو درست کر لو، اس کی فکر کرو۔

اس کے لیے کچھ سامان کرو، تو علم نہ دینے ہی کے اندر مصلحت ہے کہ انسان نیکی کرنے میں آمادہ رہے، علم ہو جانے کے بعد یا نیکی چھوڑ دیتا یا اتنا خائف ہوگا کہ نیکی سے معطل ہو جائے گا۔

قیامت شخصی کا علم دے دیا جاتا تو دنیا کی ترقی موقوف ہو جاتی جیسے ہر انسان کی قیامت! ...... حق تعالیٰ کی بڑی حکمت اور مصلحت ہے کہ کسی کو اس کی موت کا علم نہیں دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ (1) کسی نفس کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں کب مروں گا اور کہاں انتقال کروں گا، اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اگر ہر انسان کو مطلع کر دیا جاتا کہ تیری عمر ساٹھ برس کی ہے تو اول تو اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی، ہر روز گنتا کہ آج ایک دن کم ہو گیا، آج دو دن کم ہو گئے۔ پھر نہ نیکی کرتا نہ بدی

(1) پارہ: ۲۱، سورۃ: لقمان، الآیۃ: ۳۴.

کرتا، وہ تو ہر وقت لرزتا رہتا کانپتا رہتا اور زندگی اجیرن ہو جاتی اس کی ۔ نہ کھانے میں لطف، نہ پینے میں لطف، تو جب سارے ہی انسان ایسے ہی ہو جاتے تو نظامِ عالم تباہ ہو جاتا، نہ ترقی کی سوجھتی نہ تمدن کی سوجھتی نہ دنیا کو آباد کرنے کی سوجھتی، بس ہر شخص بیٹھا ہوا کانپتا رہتا لرزتا رہتا، کسی کے پاس جاتے کہ بھئی کیوں کانپ رہے ہو؟ کہ بھئی میری زندگی کے ایک سو انچاس دن رہ گئے ہیں دوسرا کہتا کہ میاں میرے تو چالیس ہی رہ گئے ۔ تیسرا کہتا میرے تیس ہی رہ گئے تو ایک دوسرے سے دکھڑا رو کر رونے میں گزارتے ۔ نہ عمل ہوتا نہ دنیا آباد ہوتی اور منشاء خداوندی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلے اور دنیا سے تمدن بھی چلے ۔ اس تمدن میں رہ کر ہی تم دین بنا سکتے ہو اس لیے دنیا کی آبادی ضروری ہے اور وہ ہو نہیں سکتی تھی جبکہ موت کے وقت سے تمہیں غافل نہ بنایا جائے، یہ علم تو رہے کہ آنے والی ہے یہ نہ ہو کہ کب آنے والی ہے، تم سے وقت کا اور تاریخ کا چھپانا ہی مصلحت ہے اسی طرح سے قیامت کلی کے وقت کو چھپانا مصلحت تھا اتنا علم دے دیا جانا ضروری تھا کہ آئے گی قیامت اور یہ جہان ایک دن ختم ہو جائے گا تو جتنا علم دیا وہ بھی معقول اور جتنا نہیں دیا وہ بھی معقول۔

انکارِ معقول اپنی ہی تکذیب ہے...... اور ظاہر بات ہے کہ معقول کا انکار وہ اپنی عقل کا بھی انکار ہے وہ اپنے کو بھی جھٹلانا ہے وہ حق تعالیٰ کی تکذیب نہیں بلکہ اپنی تکذیب ہے وہ تو بری ہے تکذیب سے ان کا ہر دعویٰ سچا ہے تو اپنے کو جھٹلا رہا ہے آدمی جبکہ ایک معقول بھئی علم کب آئے گی؟ یہ اللہ کے پاس ہے جب پیغمبروں کو بھی خبر نہیں دی گئی اس کی تو میری اور آپ کی حقیقت کیا کہ ہمیں اس کا علم دیا جائے آگے فرمایا۔ وانما انا نذیر مبین علم اللہ کے پاس ہے میں تو ڈرانے والا ہوں ۔ اتنا علم مجھے دیا گیا ہے کہ آئے گی قیامت تو اسے پیش کر کے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں کہ جب آنے والی ہے تو کچھ سامان کر لو اس کے لیے۔

عقل کی گمراہی...... جیسے کہ فرمایا گیا ہے کہ "اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهِ وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهِ" ①

دنیا کے لیے اتنا سامان کر، جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے، آخرت کے لیے اتنا سامان کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے ۔ دنیا میں رہنا ہے چند دن تو یہاں تھوڑا بھی کافی ہے ۔ آخرت میں رہنا ہے ابدالآباد تک تو وہاں کے لیے لمبا سامان کرنا چاہیے ۔ انسانوں نے الٹا کر دیا کہ جہاں ابد تک رہنا ہے وہاں کا تو کوئی سامان نہیں کر رہے اور جہاں چند دن رہنا ہے وہاں کے سارے سامان کر رہے ہیں، تو یہ عقل کی گمراہی ہے، عقل کا کھوٹ ہے ۔ ہونا چاہیے تھا برابر، تو آپ نے فرما دیا کہ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ علم تو اللہ کے پاس ہے کہ کونسی تاریخ ہے قیامت کی، میں تو ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اس لیے کہ مجھے آنے کا علم دیا گیا ہے وہ علم میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور وہی علم مصلحت بھی ہے، تاریخ اور وقت کا علم تمہارے لیے مصلحت نہیں ہے۔

① یہ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے ۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج: ۳ ص: ۷۳ ا.

کفار پر قیامت کے آثار......اور اس کے بعد فرمایا کہ تم جو مانگ رہے ہو کہ جلدی آجائے قیامت فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تم کیا سمجھے ہوئے ہو قیامت کو جب آئے گی قریب تو حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے، منہ سیاہ ہو جائیں گے تمہارے۔ کفار کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ بڑی آسانی سے تم مانگ رہے ہو، آجائے قیامت، جب وہ آئے گی تو کیا حال ہوگا تمہارا؟ یہ تھوڑا ہی ہوگا جیسے آج مگن بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہو کہ صاحب! لے آؤ قیامت کو، جب آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے، حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے۔

قیام قیامت آناً فاناً ہوگا......اور وہ آئے گی، یہ نہیں ہے کہ کوئی بڑے مقدمات اس کے چلیں گے کہ چھ مہینے پہلے کچھ اطلاعات دی جائیں اور چھ مہینے پہلے کوئی گڑگڑاہٹ ہو۔

وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ② قیامت کا آنا كَلَمْحِ الْبَصَرِ جیسے نگاہ جھپکتی ہے اتنے میں آجائے گی، کوئی پتہ پہلے سے نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دو آدمی کپڑا سکھا رہے ہوں گے رنگریز، ایک پلہ ایک ہاتھ میں ہوگا ایک پلہ دوسرے کے ہاتھ میں وہ اسے سکھا رہے ہوں گے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ ایک عورت آٹا گوندھ رہی ہوگی گھر میں، اس کا ہاتھ آٹے میں ہوگا کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی، پل بھر میں قائم ہوگی۔

نفخ صور کی کیفیت......صور جب پھونکا جائے گا جو عالم کی تباہی کا سبب ہوگا۔ ابتداء بہت ہلکی آواز ہوگی کسی کو وہم بھی نہیں گزرے گا، کہیں گے کوئی چیز ہے کوئی باجا ہے کوئی چیز ہے بج رہی ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہو جائے گی۔ جب آواز بڑھے گی تو اب لوگ چونکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے۔ تو ادھر ادھر دیکھیں گے پھر کچھ کام میں لگ جائیں گے۔ اس کے بعد اس میں درد کی سی آواز پیدا ہوگی۔ تو اب حیران ہوں گے، پریشان ہوں گے، درد بیک دم ہوتا ہے یہ تو تدریجی طور پر بڑھتا جا رہا ہے جب زیادہ درد ہوگی تو اب اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگی، جنگلوں سے گھروں میں آئیں گے، گھروں سے جنگلوں میں جائیں گے۔

جانور انسانوں میں، انسان جانوروں میں، کوئی کسی کو اپنی حالت کی خبر نہیں ہوگی اور اس کے بعد جب وہ انتہائی بڑھے گی۔ حدیث میں ہے کہ جیسے سو گرجوں کے برابر ایک گرج ہوتی ہے مسلسل تو پھر کلیجے پھٹنے شروع ہوں گے۔ گرنے شروع ہوں گے۔ اور یہاں تک تو جائیں گے جب زیادہ آواز بڑھے گی تو پہاڑ پھٹنے شروع ہوں گے۔ سب چیزیں ریزہ ریزہ ہو کر گڈمڈ ہو جائیں گی، دنیا میں بھی جب کوئی بم پھٹتا ہے تو دیواریں ہلتی معلوم ہوتی ہیں اور کھڑکیوں کے کواڑ ٹوٹ جاتے ہیں۔ انسان بعضے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو اس کی بنا یہ ہے کہ اصل میں روح جو ہے یہ اللہ نے پیدا کی ہے قوت ہوائی اور آواز جو ہے یہ بھی ہوائی۔ یہ سانس زیادہ نکلتا ہے۔ وہی آواز کہلاتی ہے۔ تو

① یہ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج: ۳ ص: ۱۷۳۔

سانس کے ٹھونکنے کا نام آواز ہے، ظاہر بات ہے کہ جب آواز اور ہوا زیادہ گرجتی ہوگی تو وہ جذب کرے گی چھوٹی ہوا کو تو یہ ارواح چونکہ ہوا سے پیدا کی گئی ہیں جب اصل مادہ زوروں پر آئے گا اور وہ آواز اور ہوا ہے تو روحوں کو جذب کرنا شروع کرے گا، روحیں ہلنی شروع ہوں گی تو عرض قیامت قائم ہوگی صور پھونکنے سے۔

اور صور بتدریج پھونکے گا تو جب وہ پھونکا جانا شروع ہوگا اور آواز آئے گی تو یہ نہیں کہ پہلے سے کچھ اطلاعات ہوں گی۔ یا پہلے خطرات ہوں گے۔ وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَـآ اَمْـرُ السَّـاعَةِ اِلَّا كَـلَـمْـحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَ اَقْرَبُ...... جتنی دیر میں نگاہ جھپکاتے ہو بلکہ اس سے بھی کم میں ایک دم اچانک آ جائے گی جیسے موت انسان کی اچانک ہی آتی ہے، یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے سے اطلاعات دی جائیں، بیمار بھی اگر آدمی ہوتا ہے تو یہ اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلے منٹ میں موت آ جائے گی، چل رہا ہے بیماری جب آتی ہے تو ایک دم نزع شروع ہو گیا، لوگ بھی سمجھ گئے کہ بھئی مرنے کا وقت آ گیا تو شخصی قیامت بھی اچانک آتی ہے، کلی قیامت بھی اچانک آئے گی۔ اس کا علم دے دیا گیا۔

عمل کے لیے جتنا قیامت کا علم ضروری تھا وہ دے دیا گیا...... تو فرمایا: انما العلم عند الله اس کے دن تاریخ کا علم تو اللہ کو ہے ہمیں نہیں ہے۔ ہمیں تو اتنا علم ہے کہ وہ آئے گی اور وہ ہی کافی ہے ہمارے عمل کے لیے وَاِنَّمَـآ اَنَـا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اور تم جو سہولت سے کہہ رہے ہو کہ لے آؤ اس قیامت کو تو فَلَـمَّـا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـئَتْ وُجُوْهُ الَّـذِيْـنَ كَفَرُوْا جب وہ آ جائے گی اچانک تو تمہارے حلیے بگڑ جائیں گے، چہرے بگڑ جائیں گے، تم اس حالت میں نہیں ہو گے جس حالت میں آج ہو کہ سہولت سے مانگ رہے ہو، قیامت کو تم سمجھ نہیں رہے کہ ہے کیا قیامت؟ اس واسطے بڑے اطمینان سے مانگ رہے ہو۔ جیسے آدمی گھبرا کر بعض اوقات کسی مصیبت سے تنگ آ کر موت کی دعا کرنے لگتا ہے تو یہی جواب اس کا ہوتا ہے کہ بیوقوف پتہ نہیں ہے کہ موت کیا چیز ہے۔ وہ یوں سمجھ رہا کہ یہ مصیبت تو ہے بہت بری اور موت بڑی معمولی چیز ہے کہ موت آ جائے گی تو مصیبت ٹل جائے گی۔ موت تو سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے بڑھ کر مصیبت ہے یہ تیری حماقت اور غلطی ہے کہ اس مصیبت سے تنگ آ کر موت مانگ رہا ہے غالب شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

اب تو گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔۔۔ اور مر کر بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

تو یہ سمجھ لینا کہ موت ہلکی چیز ہے یہ دنیا کی مصیبتیں بڑی ہیں یہ غلط ہے یہ ساری مصیبتیں اولین آخرین کی جمع کر دی جائیں تب ایک موت بنتی ہے، تو موت سرچشمہ ہے سارے مصائب کا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے بارے میں سوال...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا ملک الموت سے کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں کیفیت کیا بتلاؤں جو جس پہ گزرے گی وہ جانے گا مگر میں ایک مثال کے ذریعے کچھ فہم کے قریب کر دوں گا،

اصلیت نہیں سمجھا جا سکتا وہ تو گذرنے کی چیز ہے۔

تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سمجھو کہ انسان کے بدن میں تار ڈالا جائے ایڑی سے لے کر چوٹی تک اور جتنی رگیں ہڈیاں ہیں اتنی شاخیں ہوں اس تار میں اور ہر ہر شاخ ایک ایک رگ میں پیوست کی جائے اور ان شاخوں میں کانٹے بھی ہوں لوہے کے، وہ کانٹے دار تار ہر ہر رگ کے اندر پیوست (ہو) تو اب گویا ایک تار انسان کے اندر گیا ہوا ہے اور اتنی شاخیں ہیں جتنی رگیں ہیں، پٹھے ہیں اور ہر تار میں ہر شاخ میں کانٹے ہیں اور وہ پھٹ گیا، اس کے بعد اس کو کھینچنا شروع کرو تو یوں معلوم ہوگا کہ رگ رگ درد سے بھرپور ہے بھری ہوئی ہے۔

اور گویا ساری رگیں کھینچ آئیں گی اوپر، فرمایا کہ یہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اور جان کنی کی اور جیسے رگ رگ کے اندر کانٹوں دار تار ڈال کر اسے کھینچا جائے اوپر تو جو اذیت ہے۔ محسوس کر سکتا ہے آدمی وہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اذیت کی، تو موت کوئی آسان چیز تھوڑا ہی ہے کہ ذرا سی مصیبت میں گھبرا کر آدمی موت مانگنے لگے موت کوئی آسان بات نہیں ہے عظیم چیز ہے۔

مؤمن وکافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی صورت ......حدیث میں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا ملک الموت سے کہ تم کس شکل میں آکر روح قبض کرتے ہو۔ فرمایا کہ مؤمن کے آگے تو نہایت اعلیٰ اور باجمال صورت ہے اس میں میں آتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر جمال نہیں ہوسکتا، اور کفار کے آگے انتہائی بھیانک شکل میں آتا ہوں کہ جس سے بڑھ کر ڈراؤنی صورت نہیں ہوسکتی، کہا مجھے دکھلا دو وہ صورت، کہا آپ تحمل نہیں کر سکیں گے مگر اصرار کیا تو حدیث میں ہے کہ اس شکل میں آئے جس سے مؤمن کی روح قبض کرتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اگر اللہ کوئی بھی نعمت نہ دے مؤمن کو صرف یہ شکل دکھلا دے تمہاری تو سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، اس کو دیکھ کر قلب میں فرحت اور سرور بھر جاتا ہے، اس کے بعد کہا کہ اب وہ شکل بھی دکھلاؤ، کہا آپ تحمل نہیں کریں گے، کہا نہیں دکھلاؤ۔ اس شکل میں آئے تو دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔ برداشت نہیں کر سکے۔ اس کے بعد ہوش آیا تو کہا کہ اگر کوئی بھی مصیبت نہ آئے کافر پر، فقط یہ شکل دکھلا دی جائے تو ہزار مصیبتوں کی یہ ایک مصیبت ہے۔

اس کی کچھ شکل حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ ملک الموت جس شکل میں آتے ہیں، کفار کے آگے وہ ایک عجیب بھیانک شکل ہے، ایک شخص کی، سیاہ فام اور ہر بدن پر جو رواں ہے وہ مثل نیزوں کے ہے اور ہر نیزے میں ایک شکل بنی ہوئی ہے انسان کی شکل یا جانور کی۔

تو اس طرح سے گویا لاکھوں شکلیں صورتیں ایک شخصیت میں نمایاں ہوتی ہے جتنی گویا ڈراؤنی شکلیں ہیں ہیبت ناک وہ سب سامنے ہوتی ہیں۔ تو وہ دیکھ کر خود ہی خون خشک ہو جاتا ہے وہ مستقل مصیبت ہے۔

تو بہر حال موت کوئی سہل چیز نہیں الا یہ کہ حق تعالیٰ ہی سہل فرما دیں کسی کے لیے، اسے سب کچھ قدرت ہے۔

ساری شدت بھی گزرے اور محسوس بھی نہ ہونے دے۔

موت کے آسان ہونے کی صورت...... جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی صورت فرمائی، فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ "مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآئَهُ" ① جو شخص اس کا خواہش مند ہے کہ میں کب ملوں اپنے اللہ سے ہر وقت منتظر ہے شوق لگ رہا ہے عالم آخرت میں جانے کا اور:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں برویم　　　تادر میکدہ شاداں وغزل خواں برویم

ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ ہم غزل خواں، شاداں وفرحاں اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اس اجڑے ہوئے عالم کو چھوڑیں گے تو جن لوگوں کے دلوں میں شوق ہے اللہ سے ملنے کا۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے یہاں بھی شوق ہے، وہ بھی منتظر ہیں کہ یہ بندہ کب ملے مجھ سے آ کے تو ادھر سے بھی شوق ادھر سے بھی شوق، مرنے کا جب وقت آتا ہے اس مؤمن پر وہ شوق وغلبہ کے ساتھ قلب پر ہجوم کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح جلدی پہنچوں، لگا ہوا ہے اس شوق میں، اس شوق کے اندر اتنا منہمک ہوتا ہے کہ ساری تکلیفیں بھی گزر رہی ہیں اور کچھ بھی نہیں گزر رہیں، اسے پتہ بھی نہیں چلتا سب کچھ گزر رہا ہے مگر وہ اتنا شوق میں غرق ہے کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کیا تکلیف گزر رہی ہے اور کچھ محسوس بھی ہوتا ہے تو نعمتیں سامنے اتنی ہیں کہ وہ کہتا ہے اس سے دوگنی بھی مصیبت گزر جائے یہ سامنے نعمتیں موجود ہیں، اب میرے پاس آنے والی ہیں پل بھر کی بات ہے۔

اخروی نعمتوں کے حصول میں دنیوی مصائب کو روح ازخود قبول کر لیتی ہے...... مثلاً آپ کو ایک گورنمنٹ یہ کہے کہ یہاں سے پانچ میل پر جو اسٹیشن ہے وہاں ایک پانچ لاکھ کا بنگلہ آپ کے لیے گورنمنٹ نے تیار کیا ہے اور اس میں خزانہ بھی ہے دس لاکھ روپے کا، ابھی پہلی گاڑی سے جاؤ اور اس پر جا کر قبضہ کر لو، آپ خوشی خوشی چلے ریل میں گئے تو وہاں بیٹھنا تو بجائے خود کھڑے ہونے کی جگہ نہیں، تھرڈ کلاس میں جا کر کھڑے ہوئے اور اتنا ہجوم کہ ہڈی اور پسلی چور ہو جائے تو انتہائی تکلیف میں ہے مگر شوق لگا ہوا ہے کہ پانچ منٹ کی بات ہے، اب گئے اور دس لاکھ کے بنگلے پر قبضہ ہو گیا تو ذرہ برابر آپ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا، کہیں گے چاہے اس سے دوگنی آ جائے بس پانچ منٹ کی تو بات ہے، اب گئے اور جائیداد ملی لاکھوں کی۔ تو جیسا کہ ایک دنیا کی ایک معمولی جائیداد کے شوق میں بڑی سے بڑی تکلیف آپ بھگت جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا تو ابد الآباد کی نعمت اور وہ نعمتیں جن کا یہاں کبھی تصور نہیں ہو سکتا، وہ سامنے کی جائیں تو لاکھوں من بھی اگر تکلیف کا بوجھ پڑا ہوا ہوگا بھاری نہیں ہوگا کہ منٹ بھر کی بات ہے، اب یہ نعمتیں مل رہی ہیں۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب من احب لقاء اللہ احب اللہ لقائہ، ج:۴ ص:۲۰۶۵ رقم:۲۶۸۳۔

اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ مؤمن کی قبض روح کے وقت ملائکہ علیہم السلام جنت کے کچھ تحائف لے کر آتے ہیں، وہاں کے پھل اور وہاں کے کپڑے اور وہاں کے کفن اور خوشبوئیں، ایک دم روح اس طرح سے گذر جاتی ہے کہ بس یوں کہتی ہے کہ میں پہنچ جاؤں پل بھر میں چاہے ہزار کانٹوں میں سے گزرنا پڑے۔

تو خود قبول کرتی ہے اس تکلیف کو کہ جتنی بھی تکلیف آئے مجھے بھگتنی ہے اس لیے کہ سامنے وہ نعمت موجود ہے، تو اس وقت مشاہدہ ہوتا ہے نعمت کا، انبیاء علیہم السلام اور اکمل اولیاء اللہ ان کو آنکھ سے دیکھنے سے زیادہ یقین ہوتا ہے اللہ کے وعدوں پر، ہر وقت ان کے سامنے وہ نعمتیں ہیں۔ اس واسطے کوئی تکلیف ان کے یہاں تکلیف نہیں ہوتی ، ہزاروں ابتلاءات ، ہزاروں مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر گزرتی ہیں اور ان کے قلوب مبارکہ پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ کے وعدہائے حق سامنے ہیں اس لیے کہ یہ چند دن کی تکلیف ہے اب وہ نعمتیں آرہی ہیں۔

تو انبیاء اپنی ایمانی قوت سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ہم آنکھ سے دیکھ کر جتنا یقین کرتے ہیں اس سے زیادہ قوی یقین انبیاء کا اللہ کے وعدوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ساری تکالیف جھیل جاتے ہیں، ورنہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون ہے تکلیفیں اٹھانے والا، لیکن ان کے قلوب پر ذرہ برابر اثر نہیں، قلب مگن اور مطمئن، اس لیے کہ وعدہائے خداوندی اندر موجود ہیں۔ تو بہر حال مؤمن باوجودیکہ موت اتنی شدید ہے باوجودیکہ اتنی ایذاءدہ ہے لیکن مؤمن اس سے گھبرائے گا نہیں، خوشدلی سے برداشت کرے گا، اگر خدانخواستہ کوئی وعدہ سامنے نہ ہوتا تو مرنا بھی موت ہو جاتا۔ لیکن چونکہ نعمتیں موجود ہیں اب تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس واسطے وہ کہتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں چلو، چاہے مصیبتوں میں کانٹوں میں جائیں مگر وہ نعمت ہے ابھی میں پہنچ جاؤں گا دومنٹ بعد، اس لیے ہوتی بھی ہے تکلیف اور نہیں بھی ہوتی، بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی شدید قسم کا آپریشن کیا جائے کسی کا تو پہلے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر لیتے ہیں اس کے بعد اس کا سر کاٹ دو، پیر کاٹ دو، اسے کچھ خبر نہیں، تو گزر رہی ساری تکلیف مگر احساس باطل ہو گیا کہ جس سے اس کی اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے موت کی اذیت جب گزرے گی تو محبت خداوندی کا کلوروفارم سونگھا دے گی اس میں وہ اتنا مؤثر و مگن ہو گا کہ اس تکلیف کا ادنیٰ برابر اسے احساس بھی نہیں ہو گا اور محسوس بھی ہو تو بھاویں بھی نہیں ہوں گی تو نعمتوں کے آگے کیا چیز ہے تکلیف تو پھر ان شاء اللہ مؤمن کے لیے راحت ہے باوجود اذیت کے۔

کیفیت موت اور قوت ایمانی کا سہارا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا کہ یہ کیفیت ہے کہ آدمی کو بیچ میں رکھ کر دو پہاڑوں کو ملا دیجئے۔ اس میں جو اذیت ہے بس وہ موت میں ہے۔ اور بعض انبیاء نے مثال دی کہ جیسے ایک نہایت ہی جابر قسم کا قصائی ہو ذبح کرنے والا اور بھی بڑا قوی اور ایک بکری کا بچہ اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ کانٹ چھانٹ کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ بس یہ حالت ہے موت کی ملک الموت کے سامنے، اس طرح سے ہو گا اس وقت آدمی، تو باوجود اس اذیت کے وہ جو قوت ایمانی ہے وہی

سنبھالتی ہے۔بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے تو تکلیف معلوم بھی نہیں ہوتی وہی قوت ایمانی وہاں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی قبر میں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی حشر کے اندر سنبھالے گی، ہر جگہ تکلیف آدمی جھیل جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے تھے مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے ہولناک حالات بیان فرمارہے تھے، تو لوگ لرز رہے تھے، کانپ رہے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ تمام لوگ لرزاں، ترساں اور آپے سے باہر ہوگئے ہیں۔عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہماری عقل بھی صحیح سالم ہوگی قبر میں، فرمایا ہاں عقل رہے گی، کہا تو اب کوئی فکر کی بات نہیں بس نمٹ لیں گے۔تو عقل سے مراد یہ عقل معاش نہیں تھی جو موٹر بنانے کی عقل ہے، ہوائی جہاز بنانے کی عقل ہے عقل معاد تھی جو آخرت کی عقل ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان بھی رہے گا، فرمایا رہے گا۔تو بس اب جھیل جائیں گے۔

قوتِ ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کردیتی ہے تو اصل چیز ایمان ہے، دنیا کی مصیبتوں میں بھی جب آدمی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، توکل اور صبر سے تو مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔یہ اللہ جانے جو کچھ ہوگا، ہو رہے گا، مجھے تو خدا پر بھروسہ ہے تو دنیا کی مصیبتیں بھی اللہ ہی کا یقین اور ایمان سہل کرتا ہے۔موت کی مصیبت یہی ایمان سہل کرے گا قبر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا حشر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا۔اور ان سب سے گزر کے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائے گا وہی جو راحتوں کا ٹھکانہ ہے جس کا نام جنت ہے۔تو کافر کے لیے یہاں سے لے کر وہاں تک اور ابد تک مصیبت ہی مصیبت ہے اس لیے کہ وہ جو مصائب میں ڈھارس دینے والی چیز ہے وہ اس نے کھودی، وہ ایمان ہے جب وہ نہ رہا تو اب سہارا کوئی باقی نہیں اس واسطے اس کے لیے ہر تکلیف تکلیف ہے مؤمن کے لیے کوئی تکلیف تکلیف نہیں اس کو فرمایا کہ جو قیامت مانگ رہے ہو تم جب وہ آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے ہوکس ہوا میں اس واسطے کہ وہ قوت تو ہے نہیں جس سے سہارا لیتے تم۔

یعنی ایمان کی قوت وہ تو ہے نہیں اور جب وہ نہیں ہے تو مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں حلیے بگڑ جائیں گے، کہاں مانگ رہے ہو اور جس میں ایمان ہے وہ کبھی نہیں مانگے گا قیامت کو۔وہ کہے گا جب آئے گی آئے گی میں تو اللہ کے وعدے کو سچا جانتا ہوں کہ آنے والی ہے، مجھے تو عمل صالح کرنا ہے، وہ نہ مانگے گا قیامت، فرمایا کہ جب وہ آجائے گی تو ''سِيْـئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کفار کے حلیے اور چہرے بگڑ جائیں گے......اور اس وقت کہا جائے گا کہ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ وہ جو مانگتے تھے یہ ہے، اب اسے بھگتو، وہ آگئی قیامت، لے لو اسے۔

اپنی فکر اوّل ہے......قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ تو مختلف سوالوں سے کفار لانا چاہتے تھے عقائد تو پہلا تو یہی سوال کردیا مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. کہاں ہے صاحب وہ وعدہ؟ اس کا تو جواب دے دیا گیا تو اس کے بعد جب اس میں چپ ہوئے تو ایک دوسرا سوال شروع کردیا وہ یہ کہ صاحب! جب قیامت آئے گی نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، تو فکر کی کیا بات ہے تم بھی ہلاک ہوگے اگر تم پر قیامت آئی، تو تم ہی ہوگئے تو کیا......

اس کا جواب دیا حق تعالیٰ نے فرمایا پیغمبر سے کہ تم کہہ دو کہ بھئی! مجھے یا میرے ساتھیوں کو اگر اللہ ہلاک کریں یا مجھ پر رحم کریں اور ہلاک نہ کریں کوئی بھی صورت ہو تمہیں کیا فائدہ اس سے؟ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہوں یا میں اور میرے ساتھی نجات پائیں تو تمہیں کیا فائدہ پہنچا تم پر جو گذرنی ہے گزرے گی اپنی فکر کرو، ہماری فکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو، تم ہم چاہے ہلاک ہوں چاہے نجات پائیں تم تو اپنی فکر کرو.....

اس لیے کہ قیامت تو آنے سے ٹلے گی نہیں اور جب وہ آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی۔ تو اب کوئی شخص یوں کہے کہ چونکہ تم پر آئے گی اس واسطے مجھے کوئی فکر نہیں اس سے زیادہ کون احمق ہے۔ بھئی تیرے اوپر بھی آئے گی، دوسرے پر کچھ بھی گزرے تو فرمایا قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ بھلا بتلایئے کہ اللہ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو یا ہلاک کرے اَوْ رَحِمَنَا یا ہم پر رحم کرے فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ. کفار کو عذاب سے بچانے والی کون سی چیز ہے؟ اگر ہمیں ہلاک ہی کر دیا تو تم بچ گئے عذاب سے؟

تو تم نے اپنی فکر کرنے کے بجائے ہماری فکر شروع کر دی کہ نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، بھئی ہم رہیں نہ رہیں تو تمہارا کیا بنے گا، تم اپنی فکر کرو تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی سوال مہمل ہے اور یہ سارے سوال اسی لیے ہوتے ہیں کہ عقیدہ کو رلا ملا کر ختم کر دیں، ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال کر اور ضائع کر دیں، اس چیز کو قرآن میں ایک ایک چیز کو پکڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ دیجئے کہ.....

اعتقاد صحیح اور عمل صحیح ہی کار آمد ہے..... قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا. ہم تو رحمٰن پر ایمان لے آئے ہیں اور اس پر بھروسہ کر لیا ہے اور اس کی وجہ سے ہم عمل صالح کر رہے ہیں..... اور ہمیں اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ راحتیں ملیں گی اس عالم میں، تو ہم مطمئن ہیں، تم اپنی فکر کرو تم کس چیز پر اطمینان رکھتے ہو، نہ ایمان نہ تم میں توکل اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا. ہم تو ایمان بھی لے آئے، عقیدہ بھی درست ہو گیا، توکل کیا تو عمل درست ہو گیا تو ہمارا ایمان بھی درست، عمل بھی درست، ہمیں یقین ہے کہ انجام ہمارا نیک ہو گا، اب تم اپنی فکر کرو نہ ایمان، نہ توکل تو تم کہاں جاؤ گے؟ باتیں بنانے سے عذاب ٹلنے والا نہیں، ایمان لانے سے ٹلنے والا ہے اور تم باتیں بنا بنا کے چاہے ٹلا دو عذاب کو، اس طرح نہیں ٹلا کرتا "فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" عنقریب تم جان لو گے کہ کون گمراہی میں تھا اور کون حق پر تھا... جب نتائج سامنے آئیں گے تو پتہ چل جائے گا تو دنیا میں تو ہم نے تمہیں عقل سے بھی سمجھا دیا۔ مشاہدہ سے بھی سمجھا دیا، عقل صحیح سے بھی سمجھا دیا، اب اگر نہیں سمجھتے مشاہدہ ہی چاہتے ہو تو عنقریب وقت آنے والا ہے، تمہیں پتہ چل جائے گا کون ہدایت پر تھا، کون ضلالت پر، جب برے نتائج آئیں گے سامنے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ تم گمراہی میں تھے اور جب ہمارے سامنے اچھے نتائج آئیں گے تو ہم بھی سمجھ جائیں گے کہ ہم ہی حق پر تھے.....

دنیا کے ساز و سامان کی حیثیت..... اب آگے تمہیں زیادہ سے زیادہ بھروسہ اس دنیا کے سامانوں پر ہے،

اول تو یہ وہاں نہیں جائیں گے لیکن اگر وہاں نہ بھی جائیں یہ تو بعد کی بات ہے۔ دنیا میں بھی رہنا تو کوئی لازمی بات نہیں ہے۔ سامان ہوتے ہیں اور پھر چھین لیے جاتے ہیں ہزاروں امیر غریب بنتے دیکھے گئے، ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے ہیں، ہزاروں امراء ہیں کہ دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور چین میسر نہیں، حالانکہ دولت کا مقصد یہ ہے کہ چین ہو تو بہت سے دولت مند ہیں چین نصیب نہیں ہیں، کوئی گھن لگ گیا قلب پر، کوئی فکر لگ گئی تو لاکھوں روپیہ رکھا ہوا ہے مگر وہ جو گھن لگا ہوا ہے ساری زندگی کری کری ہوگئی۔

اس سے تو جن سامانوں پر تم بھروسہ کر رہے ہو، آخرت تو بعد کی چیز ہے دنیا میں بھی نفع دینے والے نہیں کہ سامان ہوتے ہیں اور چین میسر نہیں ہوتا۔

سکون کا راستہ ایک ہی ہے...... چین اگر آتا ہے تو پھر وہی ایک رستہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرے آدمی، توکل اور اعتماد اور ایمان، چین اسی سے ملے گا۔ ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' ① اللہ کے ذکر سے ہی دل چین پا سکتے ہیں۔ سامانوں سے چین نہیں پا سکتے۔ سامان ہیں وہ خود بے چینی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جتنا زیادہ ہوگا سامان، زیادہ مصیبت پڑے گی وہ کسی عربی کے شاعر نے کہا ہے ؎

زیادہ دولت، زیادہ مصائب......

اِذَا اَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً ۔۔۔ وَاِنْ اَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

''دنیا جب جاتی ہے تو حسرتیں چھوڑ کر جاتی ہے برسوں روتا ہے آدمی اور جب آتی ہے تو سینکڑوں مصیبتیں ساتھ لاتی ہے'' کہیں محافظ کی فکر، کہیں سنتری کی فکر کہیں چور کی کہیں ڈاکو کی ایک مصیبت میں مبتلا اور ایک وہ ہے کہ بقدر ضرورت ہے کھانے پینے کو تو؟ ''کس نیاید بخانہ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ'' درویش کے گھر کوئی نہیں آتا کہ بھئی ٹیکس ادا کرو، خراج ادا کرو، وہ اپنا بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔

تو جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والی نہیں بیچ میں جواب دے جاتی ہے بے وفائی کرتی ہے تو ایسی بے وفا پر تم بھروسہ کیے ہوئے ہو آخرت کے بارے میں، آخرت تو بعد میں ہے تم دنیا تو سنبھال لو وہ سنبھلنی لازمی نہیں ایک چیز چھن جائے اللہ کی طرف سے تو ساری زندگی ختم۔

اللہ کے مقابل دعویٰ بڑی نادانی ہے...... وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ○

فرمایا کہ ہم مثال دیتے ہیں پانی کی، پانی کنوؤں میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ پانی کو نیچے کر دیں، خشک سالی کے زمانے میں ایسا ہوتا ہے کہ کنوئیں خشک ہو جاتے ہیں، پانی نیچے چلا جاتا ہے،'' اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا''. اگر

① پارہ: ۱۳، سورۃ: الرعد، الآیۃ: ۲۸.

گہرائیوں میں پانی چلا جائے تو تم کھدائی کر کے نہیں پہنچ سکتے۔ " فَمَنْ يَّأْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ" پھر پانی لانے والا تمہارے واسطے کون ہے، یہ سامان تھا اس پر بھروسہ تھا، اللہ نے ذرا پچاس گز نیچے کر دیا اب بیٹھے ہوئے ہیں، نہ کھدائی کر سکتے ہیں، اور اگر کھودیں گے اور نیچا ہو جائے گا، اور نیچا تحت الثریٰ تک، تو کھودنے سے رہے وہ کھودے جاؤ تو کھودتے رہو گے، مرتے رہو گے زندگی دینے والا کوئی نہیں ہے تو ایک پانی کی مثال دی کہ اسے اگر گہرائیوں میں اتار دے تو زندگی کا کوئی سامان نہیں دریا خشک ہو جائیں اور قحط سالیوں کے زمانے میں ہوتا ہے کہ آسمان تو برسانا بند کر دیتا ہے، دریاؤں میں خشکی آجاتی ہے، کنوئیں نیچے اتر جاتے ہیں تو ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں تو ایک پانی پر جب اس کا قبضہ نہیں ہے.......وہ آدمی بھروسہ کرے گا کہ قیامت میں اچھی طرح سے ہوں گا اور قیامت آجائے تو میں نمٹ لوں گا، تم ان چیزوں سے نمٹو گے جو تمہارے ہر وقت موجود، اگر آفتاب کے اندر گرمی نہ رکھی جائے تو ساری دنیا برف کی طرح جم کر رہ جائے۔ اس کی حرارت ہے جس نے پگھلا رکھا ہے۔ ہوا اگر منٹ بھر کے لیے روک دی جائے سانس لینے بند ہو جائیں تو زندگی ختم ہو جائے۔ تو آگ نہ رہے جب ختم آدمی، پانی نہ ہو جب ختم، ہوا نہ رہے جب ختم، مگر اور چیزیں تو خیر اوپر کی ہیں پانی تو ہر وقت کا ہے جس کو کھودا اور نکال لیا اس کو نیچے اتار دیں تب اس پر قبضہ نہیں تو آخر کون سی چیز پر تمہارا قبضہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو کہ صاحب لے آؤ قیامت کو جیسے معلوم ہو بڑا لشکر جرار ان کے ہاتھ میں ہے کہ قیامت آئے گی یہ مقابلہ کریں گے اسے دھکیل کر پرے کر دیں گے تم اپنی عمر کے ایک سال کو دھکیل سکتے نہیں، زندگی جاتی ہوئی روک نہیں سکتے۔ آتی ہوئی تو نہیں روک سکتے تو کون سی طاقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے دو اللہ سے لڑنے کا ارادہ کیا تو " قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ"

فرما دیجئے کہ اگر اس حالت میں تم صبح کرو کہ پانی کنوؤں کے نیچے اتر جائے تو پانی لانے والا کون ہے تمہارے پاس، تو یہ ایک مثال ہے سارے عناصر کو اس پر قیاس کر لو اور پانی پر آگ کو بھی ہوا کو بھی مٹی کو بھی جب ہاتھ پلے کچھ نہیں تو دعوے مت کرو، غالب اور قوی خدا کے سامنے جھک جاؤ یہی پناہ کی صورت ہے لڑنا صورت پناہ کی نہیں۔ بس دعا کیجئے، ایک سورت ختم ہو گئی، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

حررہٗ

۱۶/۱۲/۱۱

وقت اشراق۔

افادات علم وحکمت

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز مدارس کی صورت حال پر ایک فکر انگیز انٹرویو، پس منظر

آج سے بیس سال قبل ۱۳۹۴ھ (مطابق ۱۹۷۴ء) میں جب احقر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیرِ تعلیم تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ مدینہ پاک تشریف لائے تو احقر کو بحمداللہ ان کی خدمت میں حاضری اور صحبت کی سعادت میسر آئی، اس موقع پر محترم ومکرم جناب قاری بشیر احمد صاحب دام مجدھم کے مکان پر (جو اس زمانہ میں پاک وہند کے بزرگوں کی اقامت گاہ تھی) حضرت رحمہ اللہ سے مدارس عربیہ کی موجودہ صورتحال پر مجھے ایک انٹرویو ٹیپ کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، خیال تھا کہ اسے کاغذ پر منتقل کر کے ''البلاغ'' میں اشاعت کے لیے دوں گا، مگر تقدیر خداوندی کہ یہ انٹرویو کاغذ پر پوری طرح منتقل نہ کیا جا سکا اب بیس سال گزر جانے کے بعد یہ کیسٹ دوبارہ ہاتھ میں آئی اور اسے سننے کا موقع ملا تو اس کی اہمیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہوا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہی نہیں بلکہ جملہ اکابرین دیوبند کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے مزاج اور مذاق کے امین بھی تھے، اور تقریباً ساٹھ سال تک وہ دارالعلوم دیوبند جیسی نامور دینی درس گاہ کے مہتمم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اس لیے مدارس کی صورت حال اور ان سے متعلق اصلاحی تدابیر پر حضرت قاری صاحب کی رائے گرامی انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور بیس سال کی مدت گزرنے کے باوجود اس انٹرویو کی تازگی، نافعیت اور شفابخشی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، بلکہ مدارس کی موجودہ فضا میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اس انٹرویو کو کیسٹ سے کاغذ پر منتقل کرتے وقت تحریری انداز اختیار کرنے کے بجائے کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اور فقرے بعینہٖ نقل ہوں تاکہ ان کے مفہوم اور تاثر میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

امید ہے کہ متعلقہ حلقوں میں اسے پوری توجہ سے پڑھا جائے گا اور اساتذہ وتلامذہ اس کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کر سکیں گے۔ (واللہ الموفق)

احقر: محمود احمد عثمانی

۵۔۵۔۱۴۱۵ھ

نصاب تعلیم

س: کیا جناب مدارس کی موجودہ صورتحال سے مطمئن ہیں؟

ج: جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، جزوی ترمیم اور تغیر البتہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، البتہ اصول وہی ہیں جو نہیں بدل سکتے، جیسے صحاح ستہ، قرآن کی تعلیم، باقی جتنے فنون آلیہ ہیں، مبادی ہیں ان میں جزوی طور پر تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے۔ نوعی طور پر نصاب وہی باقی رہا، اس لیے جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے۔

طرز تعلیم ...... دوسری چیز ہے اصل میں طریقہ تعلیم وہ تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ اور میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کا اثر استعدادوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانے کے حضرات اساتذہ ایجاز اور اختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشین ہو جاتی تھی، اور جب طالب علم نے کتاب دیکھی مطلب سامنے آ گیا، اب لوگ اس مسئلہ کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، لمبی لمبی تقریریں، اس سے استعداد خراب ہوتی ہیں، ایک تو یہ فرق پڑ رہا ہے جن سے استعدادیں کمزور ہو رہی ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سے یہ عوامیت کے نام پر جمہوریت چلی اس میں سارے عوام الناس آزاد ہو گئے، طلبہ بھی بہر حال جوان ہیں، لڑکے ہیں ان پر بھی اثر پڑا، وہ جو عوام کا یا خوردوں (چھوٹوں) کا بزرگوں سے ربط تھا اس میں کمی ہو گئی۔ اس سے علمی قوت میں کمی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ خورد کا تلمیذ کا تعلق استاذ سے قوی ہو، اس میں ادب بھی ہو، تعظیم بھی ہو، اعتماد کامل بھی ہو، اس میں جتنی کمی پڑے گی، استعداد میں اتنی ہی کمی پڑے گی۔

تو موجودہ حالات کی وجہ سے ایک اخلاقی کمی ہو رہی ہے اور ایک طرز تعلیم کے بدلنے سے نفس تعلیم (اصل تعلیم) میں کمی ہو رہی ہے تو اس کا استعدادوں پر خراب اثر پڑ رہا ہے، باقی جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ بحمد اللہ قابل اطمینان ہے، اور مدارس میں عامۃً جو بڑے مدارس ہیں ان میں اساتذہ بھی ذی استعداد ہیں اور چھوٹے مدارس میں تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔

معلم کا اثر ......س: بعض حلقوں کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اور ہم نے اس پر عملدرآمد بھی کر لیا ہے جدید قسم کے جو علوم وفنون جن سے

عقائد کے اوپر اثر پڑ رہا ہے خواہ وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے پڑے مگر پڑ رہا ہے۔ جیسے مبادیات سائنس ہیں، فلسفۂ جدید ہے، ہیئت جدیدہ ہے اس کو لوگ ذریعہ بناتے ہیں دینیات کی تردید کا، حالانکہ وہ ذریعہ ہیں تقویت دین کا، سائنس جتنی بڑھے گی میں سمجھتا ہوں اسلام کو اتنی تقویت ملے گی، اس لیے کہ اسلام نے عقائد ونظریات کے لحاظ سے جو دعوے کیے ہیں ان کے دلائل سائنس مہیا کر رہی ہے، تو دعویٰ ہم کرتے ہیں مگر دلائل وہ لوگ مہیا کرتے ہیں جو اس کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھ سے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے سائنس ''منافی تو کیا ہوئی'' معین ومددگار ہے...... خرابی درحقیقت ماحول کی ہے، کیوں کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں جو غلط نظریات اور غلط فکر لیے ہوئے ہے اس لیے ان فنون کا اثر بڑا برا پڑتا ہے لیکن اگر صحیح پڑھانے والے ہوں، تو وہی ذریعہ بن جائیں تقویت دین کا.... آخر یہ قدیم فلسفہ منطق ہیئت ریاضی پڑھاتے ہیں اس کا برا اثر کیوں نہیں پڑا اور موجودہ فنون کا کیوں پڑ رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں کہ دین ان میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے اس لیے عقائد پر ذرا برابر برا اثر نہیں پڑتا اور موجودہ زمانے میں عموماً پڑھانے والے وہ ہیں کہ نہ ان کی اخلاقی حالت درست، نہ ماحول درست، اس کا اثر برا پڑتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کا اثر برا ہے حالانکہ وہ دراصل عالم کا اثر ہے جو برا پڑ رہا ہے ورنہ اسلام میں تنگی نہیں، اسلام نے تو ہر علم وفن کی تحقیق کی اجازت دی ہے سوائے مخصوص چند علوم کے کہ جن سے روکا ہے کیوں کہ وہ علوم نافع نہیں ہے۔ عام طور سے فرمایا گیا ہے: كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَآلَّةُ الْحَكِيمِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا . ① ''کہ حکمت کی بات دانا کی گمشدہ چیز ہے، جب وہ اسے پالے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے''۔ ان جیسی روایتوں نے بتلایا ہے کہ علم بہرحال جہل سے بہتر ہے۔ سوائے ان علوم کے کہ جو مضر ہیں کہ ان کا عام علم ہی رکھنا فضول ہے کیوں کہ وہ فی الحقیقت ضائع ہیں۔

تو علم کسی بھی فن کا ہو وہ برا اثر نہیں ڈالتا، وہ معلم کا اثر پڑتا ہے۔ معلم اگر صاحب قال، صاحب حال، صاحب اخلاق ہے تو اسی سے اخلاق پیدا کر دے گا اور اگر خود بد اخلاق ہے، بدفکر ہے تو وہ قرآن وحدیث سے بھی بدفکری ذہن میں ڈالے گا، اس لیے نئے علوم میں سے اگر اس حد تک کے لیے جائیں کہ جس حد تک وہ معین بنتے ہوں دین کے حق میں یا جو ذریعہ بنے ہوئے ہیں دین پر اعتراضات کا تو میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ انہیں ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

طلبہ کی اخلاقی حالت ...... س: حضرت! ابھی آپ نے طلبہ کی اخلاقی حالت کا ذکر فرمایا ہے تو ہم یہ بات اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ مدرسہ اور خانقاہ کوئی علیحدہ علیحدہ چیز نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک ہی چیز ہے، مدرسہ خانقاہ بھی ہوتا تھا، طلبہ کو تعلیمی طور پر بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی درست کیے جاتے تھے، تو اب یہ صورتحال کیوں بدل گئی اور اس کی اصلاح کی کیا تدابیر ہیں؟

ج: یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا..... نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھلا رہے ہیں یا طریقت سکھلا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرز عمل، ان کا کردار، کریکٹر وہ

تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہو جاتے تھے۔ تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے، اور کمی کی بناء پر جو کچھ بھی ہو، مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیۂ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے۔

رابطہ کا فقدان...... س: حضرت کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان اب ربط نہیں رہا؟.....

ج: میں تو سمجھتا ہوں کہ فتن اس کی بنیاد ہیں، حالات اتنے بگڑ چکے اور مزاج اتنے فاسد ہو چکے ہیں کہ وہ جو ایک رجحان اور ایک عقیدت اور ایک محبت اساتذہ سے ہوتی تھی وہ نہیں ہے، کچھ تو حالات کا اثر ہے۔

اور مثل مشہور ہے "کچھ لوہا کھوٹا، کچھ لوہار کھوٹا" کی تھوڑی بہت اساتذہ میں بھی آئی ہے، ان کو جس درجہ کا معیاری ہونا چاہیے نئے اساتذہ میں وہ چیز کم ہے تو طلبہ پر اثر پڑنا لازمی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اساتذہ چند سالوں کے بعد پرانے بن کر کسی اونچے مقام پر پہنچ جائیں، لیکن ابتدائی حالت اساتذہ کی، نوجوان اساتذہ کی وہ نہیں ہے جو ان کے اساتذہ کی تھی۔

اساتذۂ کرام کا معیار...... ہم لوگوں نے تعلیم پائی، اس وقت اساتذہ علمی اعتبار سے بھی معیاری تھے اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے بھی معیاری تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) پر اتباع سنت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کے طرز عمل کو دیکھ کر ہم مسئلہ معلوم کر لیتے تھے، اور وہی مسئلہ نکلتا تھا جو ان کا طرز عمل تھا، اس درجہ گویا وہ منہمک تھے اور ہمہ وقت انہیں فکر آخرت ضرور رہتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دوپہر کو چھوٹی مسجد میں آ کے قیلولہ کرتے تھے تو عموماً گھٹنے پیٹ میں دے کر لیٹا کرتے، یعنی سکڑ کے، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پیر پھیلا کے لیٹے ہوں، تو میرے خسر مولوی محمود صاحب رامپوری مرحوم، طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب کے ساتھ چھوٹی مسجد ہی میں رہتے تھے تو ابتداء میں وہ یہ سمجھے کہ امر اتفاقی ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ عادت ہی یہ ہے تو انہوں نے ایک دن پوچھا کہ آپ پیر پھیلا کے کبھی نہیں سوتے فرمایا کہ "بھائی پیر پھیلا کے سونے کی جگہ قبر ہے، دنیا نہیں۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ہر وقت فکر آخرت سوار تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ ہے، جلالین شریف ہم نے ان کے یہاں پڑھی آیت یہ آئی کہ "لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى" آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے سعی کی ہے، یہ نہیں کہ کسی غیر کی سعی اس کے کام آ جائے........ ادھر تو یہ آیت اور ادھر روایت میں ایصال ثواب ثابت، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی سعی کام آ گئی، اب آیت اور روایت میں ایک قسم کا تعارض، جب یہ آیت پہنچی تو حضرت مفتی صاحب نے کتاب میں مثبت پہلو میں مطلب سمجھا دیا اور بعد میں یہ فرمایا کہ میں اس میں الجھا ہوا ہوں اور ابھی رفع تعارض کی صورت سمجھ

① السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، ج:۵ ص:۵۱ رقم:۲۶۸۷.

میں نہیں آئی کہ حدیث بتلاتی ہے کہ دوسرے کی سعی کارآمد ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ قطعاً کارآمد نہیں، تو فرماتے تھے کہ کتابیں دیکھیں، رجوع کیا کتابوں کی طرف، مگر تشفی نہیں ہوئی، ایک دن گھر تشریف لائے، رات کا وقت، گرمی کا زمانہ، چارپائی پر لیٹے تو خیال یہ بندھ گیا کہ تجھے ایک آیت میں شک ہے، اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو آیتِ خداوندی میں شک لے کر جائے گا تو تیرا ایمان کہاں رہے گا؟ یہ تو ''ریب'' کی کیفیت ہے۔ پس یہ جذبہ آنا تھا کہ اسی وقت کھڑے ہو گئے اور پیدل سفر شروع کر دیا گنگوہ کا کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس جا کر تحقیق کروں کا پہلا جذبہ تو اس سے معلوم ہوا فکرِ آخرت کہ وہ (اس علم کو) محض ریسرچ یا تحقیق نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی آخرت سمجھتے تھے، جب آیت میں ایک قسم کا شک ہے تو وہ ریب ہوا، اور اگر ایمان میں ذرا سا بھی ریب ہو تو ایمان کی بقاء مشکل ہے۔ یہ جذبہ تھا اصل میں محض علمی تحقیقات نہیں تھیں، پیدل سفر کر لیا گنگوہ کا، ساری رات پیدل چلتے رہے، حالانکہ پیدل سفر کرنے کی عادت نہ تھی، آخر شب میں گنگوہ پہنچے، صبح کی نماز کا وقت تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وضو فرما رہے تھے، انہوں نے سلام کیا فرمایا: کون؟...

عرض کیا کہ عزیز الرحمن فرمایا کہ اس وقت! کیا رات آئے تھے؟ کہا کہ رات بھر سفر کیا بس ابھی پہنچا ہوں، فرمایا ایسی کیا ضرورت پیش آئی جو ساری رات سفر کیا۔ انہوں نے کھڑے کھڑے وہ اشکال پیش کر دیا کہ حضرت، یہ ایک اشکال ہے کہ آیت میں نفی ہے کہ کسی کی سعی کسی کے کام نہیں آئے گی اور احادیث میں اثبات ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آجائے گا ایصالِ ثواب کی صورت میں۔ یہ تعارض رفع نہیں ہو رہا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ ''لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى''. میں سعی ایمانی مراد ہے۔ یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا یعنی نجات کا ذریعہ نہیں بنے گا، عمل کی نفی نہیں، تو حدیث ثابت کر رہی ہے عمل کو کہ عمل کا فائدہ پہنچے گا اور آیت نفی کر رہی ہے سعی ایمانی کی کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا، اس میں کوئی تعارض نہیں تو یہاں ایمان مراد ہے وہاں عمل مراد ہے۔ آیت میں جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے حدیث میں اس کا اثبات نہیں اور حدیث جسے ثابت کر رہی ہے قرآن میں اس کی نفی نہیں تو تعارض کہاں سے آ گیا؟......

تو مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے یہ معلوم ہوا کہ جیسے علم کا ایک دریا میرے اندر سے پھوٹ گیا، تو یہ غزیر (وسیع) اور گہرا علم تھا ان اکابر کے ایک ایک لفظ میں۔

کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟...... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت حدیث میں بدعت کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ **من احدث فی امرنا هٰذا ما ليس منه فهو رد.** ① جو ہمارے دین میں احداث کرے اور دین کے ذوق کی چیز نہ ہو تو وہ چیز مردود ہے۔''

① الصحيح لمسلم، كتاب الاقضية، باب نقض احكام الباطلة ورد محدثات الامور ج: ۳ ص: ۳۴۳ رقم: ۱۷۱۸.

اس پہ کسی نے کہا کہ پھر یہ مدارس بھی مردود ہونے چاہئیں، یہ قرن اول میں کہاں تھے؟ اور یہ مدرسوں کے لیے گھنٹوں کا تعین اور گھنٹا بجانا یہ کہاں تھا؟ اور یہ جماعت بندی (کلاس بندی) یہ سارے بدعات ومحدثات ہیں تو حدیث کی رو سے ممنوع ہونے چاہئیں حضرت نے ایک مختصر سا جواب دیا، فرمایا کہ: ''اِحْدَاثٌ فِی الدِّیْنِ کی ممانعت ہے، ''اِحْدَاثٌ لِلدِّیْنِ کی ممانعت نہیں'' ان دولفظوں میں (مسئلہ) کھول دیا، یعنی یہ احداث جو ہے، لِتَقْوِیَةِ الدِّیْنِ، لِاِعَانَةِ الدِّیْنِ، لِنُصْرَةِ الدِّیْنِ '' ہے عین دین کے اندر اضافہ نہیں ہے کسی مدرسہ میں صبح کے گھنٹے مقرر ہیں کسی میں شام کے، یہ نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ رہے ہیں کہ یہی چار گھنٹے ہونے چاہئیں، دوسرے نہ ہوں۔ ایک تدبیر ہے، ایک معالجہ ہے، تو احداث للدین اور فی الدین کے فرق سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سارے اشکالات رفع فرمادیئے۔

اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے...... اسی پر مجھے یاد آیا کہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کوئی عرب ہندوستان پہنچ گئے، تو ہندوستان میں عربوں کی آمدورفت اس زمانہ میں نہیں تھی، کوئی عرب آ گیا تو لوگ چیلوں کی طرح سے اس کے پیچھے دوڑتے تھے کہ عرب صاحب، عرب صاحب! اور عقیدت ومحبت سے ہر ممکن طرح مدارت کرتے تھے، ان عرب صاحب کا بھی خیر مقدم ہوا، شافعی تھے، اتفاق سے کسی مسجد میں جہاں سارے جاہل جمع تھے، انہوں نے نماز پڑھی اور رفع یدین کیا جیسا شوافع کرتے ہیں، وہاں سارے جاہل جمع تھے، وہ سمجھے کوئی بددین ہے اسے نماز پڑھنی نہیں آتی، تو نماز کے بعد تو تو میں میں شروع ہوئی حتی کہ ان عرب پر ہاتھ ڈالا اور انہیں پیٹ دیا اب وہ مہمان تھے، مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کو خبر ہوئی ہے، غصہ آیا، فرمایا کہ اول تو زدوکوب! پھر عرب سے آیا ہوا مہمان جو واجب التعظیم ہے، حکم دیا کہ آج سے ہماری ساری مسجدوں میں رفع یدین ہوا کرے گا، ترک رفع ختم، اب صاحب، تمام مسجدوں میں رفع یدین شروع ہو گیا، کئی دن گذرے تو کہیں رفع یدین اور کہیں ترک رفع، ایک عجیب فتنہ بپا ہوا۔ (ہنس کر فرمایا) اور حقیقی معنی میں رفع یدین شروع ہو گیا، ہاتھا پائی، مارکٹائی میں بھی رفع یدین ہی ہوتا ہے۔ غرض بہت فتنہ ہوا تو لوگ گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ حضرت! وہ آپ کے بھتیجے نے بڑا فتنہ برپا کر دیا اور حکم دے دیا ہے کہ ہر مسجد میں رفع یدین ہوگا تو بڑی مصیبت ہوگئی اور فتنہ پھیل گیا ہے، آپ انہیں سمجھائیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی! اسمٰعیل کی ذہانت اور ذکاوت سے تم واقف ہو، وہ میرے سے زیر نہیں ہوسکے گا، وہ ذہین اور طباع ہے، میں ایک چیز بیان کروں گا وہ بیس احتمال نکال کر مجھے ہی بند کر دے گا، خود اس کی اصلاح کیا ہوگی۔ اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ خاندان میں شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب عظمت کرتے ہیں، چھوٹے اور بڑے، حالانکہ وہ سب سے چھوٹے بھائی تھے، مگر بڑے بھائی بھی ان کے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ان کی عظمت کرتے تھے، چالیس برس اعتکاف کیا ہے اکبری مسجد میں اور سوائے قرآن کے اور

کوئی شغل نہیں تھا، اور جس دن ان کی وفات ہوئی ہے تو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر منکشف ہوا کہ دلی کے سارے قبرستانوں سے آج عذاب قبر اٹھالیا گیا ہے، ان کی آمد کے احترام میں، تو اس درجہ کے تھے شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

تو شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے لوگوں نے کہا کہ آپ کے بھتیجے نے فتنہ برپا کر دیا ہے، کہا بلاؤ اسمٰعیل کو۔ خیر مولانا اسمٰعیل شہید حاضر ہوئے، فرمایا: میاں اسمٰعیل! تم نے حکم دیا ہے کہ رفع یدین ہوا کرے ؟ کہا جی حضرت! فرمایا کیوں؟ کہا حضرت یہ سنت اتنی مردہ ہو چکی تھی کہ اس کے عمل درآمد کرنے پر لوگ پیٹے جانے لگے اور حدیث میں ہے: مَنْ اَحْيَا سُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ. (1) جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ تو میں نے احیائے سنت کیا ہے، اس درجہ مردہ ہو گئی یہ سنت کہ عمل کرنے پر لوگ مارے پیٹے جانے لگے، اس لیے میں نے حکم دیا کہ یہ سنت زیر عمل آجائے۔ فرمایا کہ میاں اسمٰعیل! ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نے حدیث کچھ سمجھ کر پڑھی ہوگی، تمہیں تو مس بھی نہیں فہم حدیث سے، کیا مطلب ہے احیاءِ سنت کا؟

فرمایا کہ احیاءِ سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت ختم ہو کر بدعت اس کی جگہ لے لے گا، وہ احیاءِ سنت ہے جو ماتہ شہید کے برابر ہے، اور یہاں تو سنت کے مقابلہ میں خود سنت موجود ہے، رفع یدین اگر سنت ہے تو ترک رفع بھی سنت ہے اگر ایک امام ادھر گیا ہوا ہے، ایک ادھر، احیاءِ سنت کا یہ موقعہ کون سا ہے؟ احیاءِ سنت وہاں ہے کہ سنت ختم ہو اور بدعت اس کی جگہ آجائے، یہاں کون سی بدعت ہے؟ کہا حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی، پھر ساری مسجدوں میں خود کہتے پھر رہے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، لوگ اسی طرح ترک رفع کے ساتھ نماز پڑھیں...

تو یہ بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ ان اکابر کے یہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں ایک جملہ سے مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ استعداد نہایت قوی اور استحضار ہو علوم کا .... اب محنتیں تو ہیں نہیں قوی بھی ویسے نہیں، استحضار وہ نہیں ہے علوم کا، جو کچھ کتاب میں دیکھا وہ صبح کو بیان کر دیا، وہ نقل اور سرد روایت ہوتا ہے جو وہ قلبی کیفیت ہے وہ شامل نہیں ہوتی، اس لیے استعدادوں پر برا اثر پڑا ہے، تو نہ تو نصاب میں خرابی ہے اور نہ کسی اور چیز میں، بلکہ کچھ طرز تعلیم کی، اور کچھ اساتذہ کے ترقی نہ کرنے کی، کہ وہ پڑھ رہے ہیں کہ بس پڑھا دیں گے، پیشہ سا سمجھ لیا ہے، یہ وجہ ہو رہی ہے استعدادوں کی کمی کی۔

طلبہ کی سیاسیّات میں شرکت کے آثار ...... اور ادھر طلبہ، کہ ملک کے حالات جمہوریت کے نام پر ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ جو یکسوئی تھی وہ باطل ہو گئی، ہر طالب علم کو فکر کہ تھوڑا سا سیاسیات میں شریک ہو اور تھوڑا سا اجتماعیات میں۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "اَلْعِلْمُ لَا يُعْطِيْكَ بَعْضَهٗ حَتّٰى تُعْطِيَهٗ

(1) المعجم الاوسط للطبراني، باب الميم، من اسمه: محمد ج: ۱۲ ص: ۱۵۰.

کُلَّکَ "، علم اپنا بعض اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا کل اسے نہ دے ڈالو، اب تو تم جز ودواور اس کا کل لینا چاہو تو یہ ہوگا کیسے تو طالب علم کہیں ادھر متوجہ، کہیں ادھر متوجہ، کہیں معاش اور کیا کیا، اسی میں ضمناً اس نے علم کی طرف بھی توجہ کر لی تو استعداد بنے گی کہاں سے؟....

اس لیے میں نے عرض کیا کہ " کچھ لوہا کھوٹا کچھ لوہار کھوٹا" کچھ اساتذہ آگے نہیں بڑھنا چاہتے، کچھ طالب علموں میں محنت کی کمی، اب وہ قصور بتادیتے ہیں نصاب کا...... حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ بہت مختصر گو تھے، کسی نے ان سے ذکر کیا کہ حضرت! نصاب میں کچھ تغیر تبدل ہونا چاہیے، تو جیسے ان کی عادت تھی، ایک لمبی سی "ہوں" کرکے فرمایا: دیکھو تعلیم کے سلسلہ میں تین چیزیں ہیں۔ 1 ایک اساتذہ 2 ایک تلامذہ 3 ایک نصاب تعلیم تو اساتذہ کی جماعت تو ہے بڑوں کی جماعت، چھڑی ہاتھ میں، کوئی بولے تو اسی وقت گردن زدنی قرار پائے اور طلبہ اس زمانے کے، بھائی وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں، کوئی انہیں چھیڑے گا تو وہ آکے لپٹ جائیں گے، آدمی ڈرتا ہے، بس صاحب اب بے چارہ بے زبان نصاب رہ گیا ہے، اسی میں کتر بیونت کرتے رہو، نصاب میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

کمی ہے استاد میں اور طالب علم میں، نصاب میں کمی نہیں ہے، مگر بے زبان چیز ہے، اسی پر سب مشق آزمائی کرتے رہتے ہیں، تو یہ ہے اصل میں بنیاد.... بہر حال کچھ جدید معلومات کی تو ضرورت ہے کہ طلباء نابلد نہ رہیں۔

فکر معاش نے علمی ترقی روک دی ......س: حضرت! تیسرا سوال یہ تھا کہ محسوس یہ کیا جارہا ہے کہ جو طلباء مدارس سے فارغ ہوتے ہیں ان میں کام کرنے کا وہ جذبہ نہیں جو پہلے موجود ہوتا تھا باطل سے ٹکرانے، خود اعتمادی اور خود آگے بڑھ کر کام کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ اب نظر نہیں آتی، اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج: اول تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: اَلنَّاسُ كَابِلٍ مِائَةٍ لَاتَكَادُ تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً. ①

سو اونٹوں کی ایک جماعت ہے، دانتوں ہیں سارے، تو سواری کے قابل ایک ہی نکلتا ہے۔

تو ان پچاس ہزار طلبہ میں یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی جوہر قابل نہ ہو، لیکن سو میں سے ایک آدھ نکلے گا تو وہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دے گا تو اب بھی ایسے نکلتے ہیں جو اپنی استعداد پر کام کرتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے چونکہ وہ ننانوے ہیں جو اپاہج بن کر پھوہڑ رہتے ہیں، تو ان کی قدر و منزلت بھی جاتی رہتی ہے جو کام کرنے والے ہیں، مگر ہیں، اگر نہیں ہیں تو اس وقت (دین کا) یہ کام کیسے چل رہا ہے، بحثیں بھی ہیں، مناظرے بھی ہیں، باطل پرستوں کا مقابلہ بھی ہے، لوگ کام کررہے ہیں اور اس میں نوجوان بھی کرنے والے ہیں، مگر بہت کم ہیں، گنے چنے۔

زیادہ تر اس کی بنا یہ ہے کہ معاشی حالات ایسے کمزور ہو چکے ہیں کہ طالب علم کو پڑھنے کے زمانے میں فکر یہ

① الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب قول النبی ﷺ الناس کابل مائة لاتجد فیها راحلة ج:۴ ص:۱۹۷۳ رقم:۲۵۴۷.

ہے کہ جلدی سے پڑھوں تا کہ گھر کا بندوبست کرسکوں باپ ضعیف ہوگیا، ماں کا انتقال ہوگیا، فلاں گزر گیا، چار پیسے کماؤں تو بچوں کو کھلاؤں، فکر تو یہ رہتی ہے تو وہ ترقی کہاں سے کرے؟ اکثر و بیشتر اسی میں مبتلا ہیں۔

پست فکر بھی علمی ترقی نہیں کرسکتا...... اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مدارس میں آنے والے بلند فکر کم ہیں، زیادہ تر وہ ہیں جن کی فکر کی حالتیں پست ہیں، انہوں نے دیکھا کہ روٹیاں ادھر بھی ملتی ہیں آٹھ نو برس یہاں کچھ مل جائے گا۔ وہ نصاب پر عبور تو کر لیتے ہیں مگر جتنی دماغ کی افتاد ہے، ساخت ہے اس سے باہر تو نہیں جاسکتے، وہ جو، ان کی پست فکری ہے وہ علم کو بھی پست بنا دیتی ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں بتلاؤں کہ اس علم کی ذلت کا کون سا وقت ہوگا؟ عرض کیا گیا، فرمایئے فرمایا کہ جب اراذل ناس اس کو حاصل کرنے لگیں جو خود پست ہیں اور پست فکر ہیں، وہ جب عمل کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کی پستی علم میں نمایاں ہوگی اور علم بھی پست نظر آئے گا، ورنہ بلند فکر اور اونچے طبقہ کے لوگ اگر علم حاصل کریں تو وہ آج بھی وہ کام کریں گے جو پچھلے کرتے تھے۔

علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا کر دیتا ہے...... س: حضرت! جو بلند فکر ہیں اور اچھی سمجھ والے ہیں اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے بچوں کو ادھر نہیں بھیجتے، ان طلبہ کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے......؟

ج: بات یہ ہے کہ دنیا غالب آچکی ہے، پہلے فکر آخرت غالب تھی اب جو بلند فکر ہیں وہ یہ چاہتے ہیں حکومت میں کرسی ملے، عہدہ ملے، وہ سارے ادھر متوجہ ہیں، ادھر آتے ہیں کم، ادھر وہ لوگ آتے ہیں جو ادھر کی استعداد نہیں رکھتے انہوں نے سوچا کہ چلو دین ہی استعداد بناؤ، مدارس میں تو بھائی دین ہے جو آئے گا ہم سکھا دیں گے، وہ جس درجہ کا بھی ہے، لیکن سلف کے زمانہ میں پرکھتے تھے کہ اسے کس علم سے مناسبت ہے، جس فن سے مناسبت ہوتی تھی اس میں ترقی دیتے تھے تو وہ طبعی رفتار ہوتی تھی اس لیے اس علم وفن کے اندر وہ ماہر ہو جاتے تھے۔

میں جب افغانستان گیا تو سردار نعیم وزیر معارف (تعلیم) تھے، انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ صاحب، ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا، مگر ہماری تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، میں نے کہا صاحب! وہ کیا؟

انہوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی عالم دین کو وزیر خارجہ بنائیں، وزیر داخلہ بنائیں، وہ چلتا نہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو میں بعد میں دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ میں نے جواب میں دوسری لائن اختیار کی ورنہ سیدھا جواب یہ تھا کہ بھائی آج کل کی سیاست تو مستقل فن ہے، جو اسے حاصل کرے گا وہ چلے گا، مگر میں نے یہ جواب اختیار نہیں کیا،...... میں نے کہا آپ کی یہ تمنا میرے خیال میں کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ''کیوں؟'' میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جو افغانستان سے طلبہ بھیجتے ہیں وہ معلوم نہیں کون سے جنگل سے پکڑ کے بھیجتے ہیں، کھٹل دماغ کے، کہ دس برس چاہئیں ان کا ذہن بدلنے کے لیے پھر دس

برس چاہئیں انہیں پڑھانے کے لیے، اگر آپ وزارت کے خاندان، شاہی خاندان اور شاہی کنبہ کے افراد بھیجتے تو ہم آپ کو دکھلاتے کہ علم کیا چیز ہے؟ اب آپ نے جنگل سے پکڑ کر بھیج دیئے جنگلی اور پہاڑی لوگ، ان پر علم کیا اثر کرے گا؟ صدر عالم کہنے لگے۔ جناب مولانا حق می فرمائید، حق می فرمائید۔

اس کے بعد میں نے کہا، میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کیسے ہیں آپ کی نظر میں؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر اور ہندوستان میں انہوں نے وہ وہ کام کیا، میں نے کہا کہ وہ دارالعلوم کے فاضل ہیں کسی یونیورسٹی سے گریجویٹ نہیں. میں نے کہا کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ کہنے لگا سبحان اللہ! بہت اونچا مقام ہے، میں نے کہا دارالعلوم کے طالب علم ہیں کسی یونیورسٹی کے فاضل نہیں ہیں. مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو پاکستان چلے گئے؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر ہیں میں نے کہا وہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں، میں نے دس بیس نام گنوادیئے تو میں نے کہا کہ یہ لوگ بلند فکر تھے، تو علم نے ان کی فکر کو اور زیادہ بلند کر دیا، تو علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا، جو پیدہ شدہ چیز ہے انہیں اجاگر کر دیتا ہے...... اب اگر کسی میں پستیاں ہی بھری ہوئی ہوں۔ وہ اجاگر ہو جائیں گی بلندیاں بھری ہوئی ہوں وہ اجاگر ہو جائیں گی، علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرے گا، تو صدر عالم نے کہا بالکل حق بات ہے۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ اب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شاہی گروپ اور وزارتی گروپ کے ہر سال گیارہ طلبہ بھیجیں گے، میں نے کہا پھر ہم آپ کو دکھلائیں گے کہ ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مگر اب مجھے فکر یہ ہوئی کہ وہ جو بادشاہی خاندان کے آئیں گے ان کی خادمی کون کرے گا؟ ان کا تمدن، ان کی معاشرت علیحدہ اور یہاں غریب طلبہ کی جگہ ہے تو ان کی مہمانداری کے لیے سینکڑوں روپیہ چاہئے، کوئی وزیر کا بیٹا ہوگا کوئی بادشاہ کا بیٹا...... یہ فکر پڑی تو میں نے یہ فقرہ کہا کہ ہم ان کو اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے؟ کہنے لگے نہیں نہیں آپ کو خرچ اٹھانے کی ضرورت نہیں حکومت برداشت کرے گی۔ میں نے دل میں کہا اور مجھے کیا چاہیے تھا میں نے اسی لیے کہا تھا...... اس کے بعد میں نے کہا نہایت مبارک خیال ہے، ہم ان کو تعلیم دیں گے اب ہماری ایک اور درخواست ہے، گیارہ لڑکے ہم آپ کے یہاں بھیجیں گے، اس لیے کہ آپ کے یہاں مختلف زبانوں کے مختلف کالج ہیں، افغانستان میں نجات کالج خالص جرمنی زبان کا کالج ہے، استقلال کالج یہ خالص فرانسیسی زبان کا کالج ہے، کاکول پے طب یہ خالص ترکی زبان کا کالج ہے، اور انگریزی زبان کا مستقل کالج ہے، تو میں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب مبلغ تیار ہوں تو غیر ممالک میں جا کر تبلیغ کریں مگر زبان سے عاجز ہیں آپ کے یہاں کالج ہیں تو گیارہ لڑکے آپ بھیجیں گے اور گیارہ لڑکے ہم بھیجیں گے آپ انہیں زبان سکھلائیں گے، کہنے لگے ہم مستقل بندوبست کریں گے اور اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے اور نصاب بھی مختصر مقرر کر دیں گے کہ زیادہ وقت بھی نہ لگے اور زبان میں مہارت پیدا ہو جائے، یہ ہمارا اور ان کا معاہدہ ہو گیا مگر وہ جنگ چھڑ گئی تو سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

طبعاً ہی فکری قوت کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں...... تو بات مجھے اس بات پر یاد آئی تھی کہ ذی استعداد تو پیدا ہوتے ہیں مگر استعداد ہی گھٹی ہوئی ہو تو اس کا کیا علاج ،فکری طاقت ہی کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں ، تو زیادہ تر وہ آتے ہیں جو فکر کے پست ہیں ،اور جو بلند فکر ہے وہ ہزار میں ایک دو آتا ہے مگر جو آجائے تو وہ بلند ہو کر چل پڑتا ہے ۔جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ. (۱) ''جو جاہلیت میں اونچا تھا وہ اسلام میں بھی آکر اونچا رہے گا'' ۔جو وہاں نیچا تھا وہ یہاں بھی پست رہے گا، دین سب میں آجائے گا، مگر بلند فکری وہ خلقی چیز ہے ، یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے ،اب سوائے اس کے کہ لوگ محنت کریں ،وعظ اور ترغیب ترہیب سے ہوتا نہیں ،آپ لاکھ وعظ کریں کہ بھائی تم آؤ، نہیں آئیں گے ، ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ وہ مجبور ہو کر علم دین سیکھنے کے لیے آئیں اور ادھر جھلکیں جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔

فضلاء کرام کی اپنی مادر علمی سے وابستگی کی ضرورت...... عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں عام طور سے علماء بے چارے بے کس تھے ،کوئی پوچھنے والا نہیں تھا ،لوگ دنیا داری کی طرف ،عہدوں کی طرف متوجہ ہو گئے تو علم دین کوئی حاصل نہیں کرتا تھا ،حکومت کے عہدے اور اقتدار نگاہوں میں تھے ، رہ گئے بے چارے علماء ۔عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ چونکہ خود عالم تھے ،انہیں احساس ہوا ،انہوں نے نہ ایک فرمان جاری کیا نہ کوئی نصیحت نامہ لکھا ،ایک دن حکم دیا کہ ہم وضوء کریں گے ،فلاں والی ملک ہمیں وضو کرائے ۔ تو ان صاحب نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی ، بادشاہ کو وضوء کرائیں گے ، وہ آفتابہ لے کر پہنچے ۔عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ، وضو میں کتنی سنتیں ہیں؟ واجبات کتنے ہیں؟ اب انہوں نے کبھی وضو کیا ہو تو بتائیں ، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حیرت ہے ، آپ ایک بڑے والی ملک ہیں ، ہزاروں پر حکمرانی کر رہے ہیں اور مسلمان ہیں آپ کو یہ پتہ نہیں کہ وضو میں فرائض کتنے ہیں ۔؟ بس صاحب اتنا ان سے کہہ دیا...... اگلے دن کہا فلاں امیر ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں ، وہ افطار میں شریک ہوئے تو اورنگ زیب نے کہا روزہ میں مفسدات کتنے ہیں؟ مکروہات کتنے ہیں؟ انہیں کچھ پتا نہیں ،تو کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے والی اور تمہیں یہ پتہ نہیں؟......

کسی سے کچھ اور پوچھا ،نتیجہ یہ ہوا کہ اب مولویوں کی تلاش شروع ہو گئی کہ مسئلے معلوم کرو ، اگر بادشاہ سلامت یونہی پوچھتے رہے تو بڑی تذلیل ہو جائے گی ہماری ، صاحب مولوی کسی قیمت پر نہیں ملتے ،مولویوں نے نخرے شروع کر دیئے صاحب ،ہم پانچ سو سے کم تنخواہ نہیں لیں گے ، ایک نے کہا ہزار سے کم نہیں لیں گے انہوں نے کہا کہ بھائی دو ہزار دیں گے مگر تم آؤ تو ، سارے مولوی لگ گئے ،تو وعظ و تلقین سے کچھ نہ ہوتا ،تدبیر تھی ارباب اقتدار کی ،تو اگر کوئی صورت ایسی بن جائے کہ حکومت ادھر توجہ کر کے ایسے قوانین بنا دے کہ وہ مجبور ہو جائیں تب تو چلے گی یہ بات ، محض وعظ و نصیحت سے نہیں چلے گی۔

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ام کنتم شهداء ج:۳ ص:۱۲۳۵ رقم:۳۱۹۴.

حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں دین آ سکتا ہے...... س: حضرت جو طلبہ دینی مدارس سے نکلتے ہیں وہ نکلنے کے بعد متفرق ہو جاتے ہیں، متفرق ہو کر اپنی اپنی جگہ کام میں لگتے ہیں، بعض دینی کام میں لگ جاتے ہیں بعض دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں، جو دینی کام کرتے ہیں وہ بھی متفرق طور پر کرتے ہیں کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہر مدرسہ سے جو طلبہ نکلیں وہ ایک خاص نظام کے تحت اجتماعی طور پر کام کریں؟ اور مدرسہ کی طرف سے انہیں وقتاً فوقتاً ہدایات ملتی رہیں، جو مختلف مسائل ملک میں پیش آتے رہیں، ان کے بارے میں مدرسہ کی جانب سے، مدرسہ کے اکابر کی جانب سے ان کو ہدایات جاری ہوتی رہیں اس طرح وہ سارا کا سارا نظام لگا بندھا ہوگا، اور اس سے یہ فائدہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ طلبہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس نہ ہوں گے جب وہ ایک نظام کے تحت ہوں گے تو ان کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ انہیں مساجد و مدارس میں بھی کام میں لگایا جا سکتا ہے اور دوسرے کاموں میں بھی، اس تجویز کے بارے میں جناب کی رائے کیا ہے؟...

ج: یہ صحیح ہے ایسا ہونا بھی چاہیے مگر کس طرح سے ہو؟ دو ہی قوتیں ہیں جن سے کسی ایک مرکز پر جمع کیا جا سکتا ہے، ایک تو قوت قہری کہ اقتدار ہاتھ میں ہو اور آپ ملک بھر میں کسی کو نمٹنے نہ دیں، حکمرانی کی قوت ہو تو یہ قہری قوت ہے۔ ایک قوت ارادت ہے کہ عقیدت مندی کسی شخصیت سے اتنی ہو کہ وہ اشارہ کرے تو سب اس کے اشارے پر چل پڑیں، اس وقت دونوں چیزوں کی کمی ہے ایک کا تو فقدان ہے، قوت قہری تو ہے نہیں آپ کے ہاتھوں میں، اب رہ گئی قوت ارادت اور قوت عقیدت اس میں خال خال افراد ملتے ہیں، بعض تو وہ ہیں کہ مدارس سے تعلق نہیں، شخصی طور پر لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور مدارس میں بھی ہیں ایسے لوگ مگر خال خال...... تو جب تک کہ کوئی قوت نہ ہو جو مرکز سے ہٹنے نہ دے، خواہ قوت معنوی ہو یا مادی، اس کے بغیر یہ کام نہیں چل سکتا۔ آپ کے یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کام شروع کیا گیا وفاق المدارس میں اس کی کیا صورت ہے؟...

س: وہ تو تمام مدارس کا ایک مجتمع نظام ہے، میری مراد یہ ہے کہ ہر مدرسہ اپنے طرز پر ایک نظام بنا دے کہ اس کے مدرسہ سے جو طلبہ فارغ ہوں وہ لگے بندھے نظام کے تحت اپنے مدرسہ سے وابستہ ہوں۔

ج: یہ فی الجملہ آسان ہے...... بہ نسبت اس کے سارے مدارس ایک نقطہ پر آئیں، وہ تو مشکل ہے مگر سوائے اس کے کہ تحریک کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دی جائے، اور اس کے فوائد و منافع ہیں، انہیں قلمبند کر کے انہیں سامنے رکھا جائے، جو مضرتیں پہنچ رہی ہیں وہ دکھلائی جائیں......

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی خیر خواہی کر رہے ہیں، اپنی غرض پیش نہیں کر رہے کہ اگر تم نے اس طرح طلبہ کو مربوط کر لیا تو تمہارا وقار اس میں بلند ہوگا، تمہاری ہی قوت اس میں زیادہ ہوگی...... یہ تجویز ٹھیک ہے، توجہ دلائی جائے اور ذمہ داروں کو متوجہ کیا جائے...... اب آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ جو تجویز ہو پہلے عوام کو متوجہ کیا جائے، خواص جن کے ہاتھ میں عوام ہیں انہیں توجہ دلائی جائے، عوام خود بخود آ جائیں گے، مدارس کے لوگ ہیں یا

بااثر شخصیتیں ہیں ان کو جمع کر کے تحریک کی جائے۔

اکابر کے خواب کی تعبیر......س: حضرت! یہ تو مدارس سے متعلق چند سوالات تھے، اب مسلمانوں سے متعلق دو سوال، ایک تو یہ کہ سرزمین پاکستان میں قادیانیوں سے متعلق قرارداد (اسمبلی میں) پاس کی گئی ہے، اس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے اور جناب کا کیا تبصرہ ہے؟

ج: ہم اس بارے میں بیان جاری کر چکے ہیں اور اس میں بہت زیادہ سراہا گیا وہاں کے علماء کو بھی اور حکومت کو بھی۔ یہ بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے، جو حکومت پاکستان نے کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تو ہمارے بزرگوں ہی کا خواب تھا جس کی تعبیر ملی ہے۔ یہی جذبہ رکھتے تھے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ کسی طرح سے یہ التباس ختم ہو کہ یہ مسلم نام سے کام کر رہے ہیں، یہ تلبیس ہے، مگر انگریزوں کا زمانہ تھا، انہیں غیر مسلم کیسے قرار دیا جائے، تو اللہ نے اب آ کر یہ خواب پورا کیا۔ ادھر تو مڈل ایسٹ کی ۳۲، انجمنوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ داخل ہی نہیں ہو سکتے اور ادھر پاکستان نے اس کے اوپر مہر کر دی، تو یہ عالمگیر مسئلہ بن گیا اور وہ جو ایک تلبیس اور التباس تھا وہ ختم ہو گیا۔

اب رہیں قادیانی دنیا میں ہزاروں باطل فرقے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر کام نہیں کر سکتے، تو میں نے پاکستانی اسمبلی کی قرارداد کی تائید میں بیان دیا پھر کلکتہ اور متعدد جگہوں سے خطوط آئے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جگہوں میں لوگوں نے کہا کہ پھر یہ ہمارے قبرستانوں میں کیوں دفن ہوں، مسلم کو کافر سے کیا تعلق؟ تو مسلمانوں میں یہ چیز پیدا ہو رہی ہے کہ پھر قادیانی ہمارے قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے۔ مگر قبرستانوں کی تولیت ہے گورنمنٹ کے ہاتھ میں تو یہ روک نہیں سکتے، تو اب مسلمانوں میں یہ جذبہ ہے کہ ہم حکومت سے لڑیں گے، مطالبہ کریں گے اور فتاویٰ بھی دکھائیں گے کہ قبرستان میں حصے الگ الگ کر دو، ان کا خط الگ متعین کرو، ہم اپنے پاس دفن نہیں کریں گے ......اور بھی بہت سے مسائل سامنے آئے مثلاً پہلے قادیانی مسلمانوں کی مساجد میں آ جاتے تھے، بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سو کے قریب قادیانی تائب ہو گئے .... مجھے وہاں کے لوگوں نے لکھا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک سوسائٹی قائم کریں جس کے ذریعہ ان قادیانیوں کے شکوک وشبہات رفع کریں جو اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ادھر آنا چاہتے ہیں، تو میں نے انہیں لکھا تھا کہ سوسائٹی ضرور قائم کرو لیکن جماعتی طور پر یا مجمعوں میں رفع شکوک کا کوئی سلسلہ ہرگز نہ قائم کیا جائے، اس میں تلبیس ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب مجمع ہوں گے، شکوک پیش کئے جائیں گے تو ردوکد میں اور بحث ومناظرہ میں انہیں رستہ نکل آئے گا پیر رکھنے کا...... ہاں انفرادی طور پر رفع شکوک کرو، لیکن مجالس عامہ منعقد ہوں رفع شکوک کرنے کے لیے تو یہ ہرگز نہ کیا جائے، اس بات کو انہوں نے مانا بہر حال اس کا (پاکستان اسمبلی کی قرارداد کا) بہت ہی اچھا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان

پر_ا.....حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ العزیز سے یہ انٹرویو محترم مولانا محمود اشرف عثمانی نے لیا، مرتبِ خطبات نے عنوانات کے اضافے اور ان کے شکریہ کے ساتھ خطبات کی زینت بنا دیا۔

(از مرتب غفرلنا)

(بمقام مدینہ منورہ ۱۹۷۴ء)

صدیق حمیم

ورفیق قدیم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

''البلاغ'' کا ''مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر'' ایک مدت تک حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مضمون کے انتظار میں روکا رہا، خیال یہ تھا کہ آپ کی تحریر کے بغیر حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ نہایت تشنہ و ناتمام رہے گا، بالآخر جب حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر مضمون ملنے سے ناامیدی ہوئی تو حضرت کی سابقہ تحریروں سے ایک مضمون مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا گیا لیکن نمبر کی اشاعت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون موصول ہوا جو ذیل میں بصد افتخار شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

معیت ورفاقت...... مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دم سامنے آ گئی جس میں اس احقر اور مفتی صاحب نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحب سے جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی، ویسی کسی دوسرے ہم درس وہم سبق کے ساتھ نہیں رہی، یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی بلکہ حقیقی اور معنوی تھی جس کی قدر و قیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از پیش ترقی پذیر رہی جس کا تسلسل برس ہا برس قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب کے انتقال مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متأثر نہیں ہوئی حتیٰ کہ اپنے مکان میں بیٹھ کر بہت دیر تک آنسوؤں سے روتا رہا۔ گھر والوں نے گھبرا کر پوچھا کہ آج کیا کوئی حادثۂ اہم پیش آ گیا ہے جو خلاف عادت اتنے گریہ و بکا کا سبب بن گیا ہے؟ تب مفتی صاحب کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

رفاقت تعلیم...... ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس ورفیق رہے، آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فارسی کے مسلمہ استاذ وقطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیق درس تھے، تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ بھی مشترک ہی تھے، اساتذہ کی غیر معمولی عنایات وتوجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے...... عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، عالم ربانی حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور محدث وقت حضرت الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور استاذ المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب اور حضرت علامہ

ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین علم خوش بختی سے ہمیں ملے، اس طرح آغاز تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلیمی اور تدریسی رفاقت مسلسل رہی۔ یادنہیں پڑتا کہ اس رفاقت ومعیت میں کبھی کوئی فکری وذہنی انقطاع رونما ہوا ہو..... اگر چہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی مصروفیات اور مشاغل علم میں مسابقت، ان کے کسی ہم درس ورفیق کے بس کی بات نہ تھی، وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے۔

رفاقت تدریس...... تعلیمی دور ختم ہو جانے پر بھی یہ رفاقت اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقعہ ملا، احقر کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً انتظامی امور سے تعلق ہوا، اور مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً افتاء سے تعلق ہوا۔

رفاقت سلوک...... پھر یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مسترشدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک وتوافق سامنے آیا کہ ہم ہی خانقاہ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوض اشرفیہ کے خوشہ چین بنے۔ اور اس میں بھی معیت ورفاقت اس درجہ رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ' کی عنایات وافاضات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر مقامات طے کرتے چلے گئے، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے سبب اس راہ سلوک میں اتنا تیز رونہ بن سکا، گو حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرما کر تسلی بھی فرمادیا کرتے تھے کہ ان مشاغل میں نیت مجاہدے کی کرلی جائے۔ تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر شغل پر ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ، لیکن بہر حال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا۔ تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدت پر مشتمل ہے۔

رفاقت خدمت...... جب احقر کو نیابت اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کی بناء پر صدارت افتاء تک جا پہنچے جو دارالعلوم کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزازات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ممدوح رحمۃ اللہ علیہ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء وتفقہ پر جتنا کام تن تنہا انہوں نے کیا در حقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا، حتی کہ اپنی ان خدمات کی بدولت رائے عامہ نے آپ کو ''مفتیٔ اعظم پاکستان'' کا لقب عطا کیا جو یقیناً ان کے شایان شان تھا۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ ملاقات میں پہل فرماتے۔ اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم شرافی گوٹھ کورنگی میں لے جانا اور علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی، خود ان جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سنتے اور غیر معمولی طور پر محظوظ محسوس ہوتے تھے۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھیں جو سینے میں محفوظ ہیں اور سینے سے سفینے پر قلم برداشتہ آگئیں، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظر ثانی نہیں فرما سکے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے فتاویٰ پر نظر ثانی کے لیے حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) ہی کا انتخاب کیا تھا، اس سے ان کی دقت نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں انہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔

ان کی زندگی کا آخری شاہکار ''تفسیر معارف القرآن'' ہے یہ ایک ایسی عظیم و رفیع قرآنی خدمت ہے، اگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت و رفعت اور عند اللہ مقبولیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی ہر علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام و خواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے اور ہر اہل علم مفتی صاحب کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دارالعلوم دیوبند کے مکمل ترجمان، علمائے حق کی سچی نشانی اور خانقاہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قابل فخر نمائندے تھے، ان کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے صف اول کے علمائے دیوبند میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا بلکہ خود دارالعلوم دیوبند کے لیے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جسے وہ بالخصوص ایسے موقعہ پر شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ وہ اپنے اجلاس صد سالہ اور تقریب دستار بندی کے اہتمام میں مصروف ہے، جس میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کی شرکت اجلاس کو چار چاند لگا دیتی، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق و جذبہ سے اس میں شرکت کے لیے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا تعلق تو یقیناً مرتے دم تک رہے گا، البتہ جو بات قابل رشک اور لائق اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لائق اخلاف چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ مولانا محمد تقی عثانی اور مولانا محمد رفیع عثانی و اخوانہم سلمہم اللہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زندہ کارنامے ہیں جو الولد سر لابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔ جنہیں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نسبی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجا طور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ ان شاء اللہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کا شجر طوبیٰ زیادہ سے زیادہ برگ و بار لائے گا اور ارباب علم و فضل اس کی گھنی چھاؤں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ احقر اس وقت بیرونی سفر کے لیے پابرکاب ہے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علم و فضل اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقعہ نہیں۔ دفعۃً ذہن پر جو یاد کی پرچھائیں آئیں، وہ قلم بند کر دیں، ورنہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کا مصداق ہوتا!

رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

والسلام: حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

(۲۷ رجب ۱۳۹۹ھ)

حضرت لاہوریؒ کی علمی یادگار مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب کی تشریف آوری

(ابن منظور کے قلم سے)

۲۴راپریل ۷۴ء پیر کا دن مدرسہ قاسم العلوم کے لیے ایک خوشگوار اور پر بہار دن تھا جو اپنے جلو میں مسرتوں اور خوشیوں کو سمیٹ لایا، راقم ایک کام کے سلسلہ میں مدیر خدام الدین کی معیت میں جب دفتر خدام الدین پہنچا تو پردۂ سماعت سے ایک خوش کن خبر ٹکرائی کہ آج خانوادۂ قاسمی کے چشم و چراغ، علم وفضل کے روشن مینار ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی کے سربراہ جناب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند بلند بخت سے ملنے اور اس ادارہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازنے کے لیے پہنچ رہے ہیں، یہ سنتے ہی عقل وشعور کے پردوں میں مسرت وانبساط کی ایک لہر دوڑ گئی، افسردگی شگفتگی میں بدل گئی۔

ابھی آنے والے پرکیفیت لمحات کا تصور ہی کر رہا تھا کہ جناب قاری صاحب آپہنچے، چہرے پر نظر پڑتے ہی بے تاب نگاہوں نے اپنی تشنگی سیرابی میں بدلتے دیکھی، دل حزیں نے اپنے پہلو میں شبنم کی سی ٹھنڈک محسوس کی، جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انورؔ، مدیر خدام الدین اور سابق مدیر ''تبصرہ'' مرزا جانباز اور دیگر حضرات نے آپ کو خوش آمدید کہا، اس موقعہ پر حضرت انور نے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کا ورود مسعود ہمارے لیے باعث افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر رکھے۔

محفل میں شریک ہر چہرہ شاداں اور ہر دل فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کیوں نہ ہو جبکہ ان کی نگاہوں کے سامنے اکابر واسلاف کی آخری نشانی حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کاروان حیات کا آخری راہی شہیدان بالاکوٹ کے لشکر کا ایک عظیم سپاہی جلوہ افروز تھا، جو حقائق ومعارف کی تعبیر اور شرافت و بزرگی کی تصویر بنے بیٹھا تھا، ملفوظات طیبات سننے کے لیے ہر ایک ہمہ تن متوجہ تھا، نجانے یہ سعادت پے پایاں اور یہ ساعت درافشاں پھر نصیب ہو کہ نہ ہو۔

دوران گفتگو جب مرد مجاہد حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت وانس کا تذکرہ ہوا تو حضرت انور نے اپنا ایک چشم دید واقعہ سنایا جو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا قاری صاحب سے محبت والفت کا مظہر اور خود حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی وبے باکی کا ایک بین ثبوت ہے۔ جانشین شیخ التفسیر یوں گویا ہوئے کہ

پہل پہل حکومت پاکستان نے سی آئی ڈی کی ضبط پورٹنگ کی وجہ سے قاری صاحب کو یہاں آنے کی اجازت نہ دی، صورت حال کا علم جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو باوجود یکہ والد صاحب جو کبھی حاکموں کی رہگذر کے قریب بھی جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ فوراً حاکم پنجاب فیروز خان نون کے پاس پہنچے، ملاقات ہوئی مقصد کا اظہار کیا، فیروز خان لیت ولعل کرنے لے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قاری صاحب کی آمد سے کوئی گڑ بڑ نہ ہوگی، بفرض محال ایسا ہوا بھی تو احمد علی جیل کی صعوبت جھیلنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کردے گا، چنانچہ اجازت دے دی گئی اور دوسرے روز قاری صاحب ہمارے مہمان تھے۔

مولانا کہنے لگے کہ اس دوران ایک پریشان کن واقعہ ہوا، ہوایوں کہ فیروز خان نون کی ایک بیوی انگریز تھی جو اسلامی طرز معاشرت سے ناواقف تھی، فیروز خان نون نے جب تعارف کرایا تو اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ روکے رکھا تو وہ سخت چیں بجبیں ہوئی۔ لیکن فیروز خان نون نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر اسے انگریزی میں سمجھایا تو وہ کہنے لگی مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہ جان کر کہ یہ اسلام کے پاکیزہ اصولوں میں سے ایک اصول ہے بہت خوشی ہوئی اور آپ کی احسان مند ہوں وگرنہ اس سے قبل کسی مسلمان نے میری رہنمائی نہیں کی،

کتنے عظیم تھے وہ لوگ جن کی وجہ سے حق وصداقت کے چراغ روشن رہے، جو شاہ وگدائی کی تمیز سے ناواقف اظہار حق میں کوئی باک اور کسی مصلحت کا شکار نہ ہوتے تھے، الغرض تقریباً ایک گھنٹے کی یہ پروقار اور سدا بہار تقریب سعید چائے کے گرم گرم گھونٹوں اور مٹھائی کے شیریں لقموں پر ختم ہوئی اور وہ محفل جو کچھ دیر پہلے ابرار وانوار سے معمور اور علم وحکمت کے موتیوں سے لبریز تھی پل کی پل میں سونی ہوگئی۔

تم کیا گئے رونق بہار گئی

دارالعلوم رحیمیہ ملتان کے بارے میں

حضرت محترم صدر دارالعلوم کراچی کے تاثرات وارشادات

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ.

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ ملتان، (پیر کالونی ۱) میں آج حاضری تو پہلی بار ہوئی۔ اور یہاں ایک عظیم اجتماع سے جو مدرسہ کے احاطے میں منعقد کیا گیا تھا خطاب کا بھی موقع ملا۔ لیکن اس بابرکت مدرسہ سے ناچیز بہت پہلے سے غائبانہ واقفیت رکھتا ہے کیوں کہ اس دارالعلوم کے بانی ومہتمم جناب قاری محمد ادریس ہیں جو میرے استاذ محترم شیخ القراء حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید ہونے کے علاوہ میرے بہت ہی کرم فرما بزرگ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب (ہوشیار پوری) رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار صاحبزادے ہیں جو دارالعلوم کراچی میں ناچیز کے ساتھ تقریباً بیس سال تک درس نظامی کے درجہ عالیہ کے استاذ رہے ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ کے ہونہار بانی ومہتمم جناب قاری محمد ادریس صاحب (ہوشیار پوری) اور ان کا گھرانہ خاص طور پر خدمت قرآن کا ایک والہانہ انداز رکھتا ہے۔ ان کی ہمشیرہ نے دارالعلوم کراچی میں برس ہا برس کی محنت وخدمت سے حافظات وقاریات کی ایک بڑی کھیپ ایسی تیار کردی ہے کہ کراچی میں جگہ جگہ انہوں نے مکاتب قرآنیہ اپنے گھروں میں قائم کرلیے ہیں۔ اور دارالعلوم کراچی کے مدرسۃ البنات میں بھی ایسی کئی حافظات وقاریات تدریس کی باقاعدہ خدمت انجام دے رہی ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ ماشاء اللہ اب تقریباً دو برس سے ایک بہت بڑے رقبۂ زمین میں منتقل ہوگیا ہے جو بارہ کنال سے زیادہ ہے یہاں طلبہ وطالبات کی الگ الگ تعلیم قرآن کریم حفظ وناظرہ کا نہایت معیاری کام شیخ القراء حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ کے طرز پر ہورہا ہے تقریباً ۵۸۰ طلبہ وطالبات حفظ قرآن باتجوید کی تکمیل کرکے فارغ ہوچکے ہیں (۸ھ میں تکمیل کرنے والے ۷۰ اطلباء کرام کو شامل کرنے کے بعد کل تعداد بفضلہٖ تعالیٰ ۶۸۷) ہوجاتی ہے اس وقت اس مدرسے اور اس کی شاخوں میں تقریباً ۶۷۵ طلباء وطالبات قرآن کریم ناظرہ وحفظ کی تعلیم سے فیضیاب ہورہے ہیں جن میں سے ۲۱۵ طلبہ مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ کے دارالطلبہ میں مقیم ہیں ان کے قیام وطعام کا مفت انتظام اہل خیر کے مالی تعاون سے اللہ تعالیٰ کرا رہے ہیں۔

دو سال سے اس دارالعلوم میں درس نظامی کے ابتدائی درجات کی تعلیم بھی بحمد اللہ شروع ہوگئی ہے جس میں

اس وقت ساٹھ طلبہ زیرِ تعلیم ہیں اوران سب کے قیام وطعام کا انتظام بھی احاطہ مدرسہ میں موجود ہے۔اساتذہ اور معلمات کی تعداد سترہ ہے۔ماہانہ خرچ کا اوسط تعمیرات کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ہے جو زکوٰۃ وصدقات اورعطیات سے ہوتا ہے۔تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے جس میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس عظیم مدرسے کے ساتھ اہل خیر دل کھول کر اتنے بڑے پیمانے پر تعاون فرمائیں کہ اس دارالعلوم کی تعمیرات کی ضروریات بھی تیز رفتاری سے پوری ہوسکیں اور طلبہ وطالبات کی تعداد میں بھی اضافہ برابر جاری رکھا جاسکے۔

ترسیلِ زر کے لیے: قاری محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

مدیر دارالعلوم رحیمیہ پیر کالونی نمبر ا سورج کنڈ روڈ۔ک شاہ عباس ملتان

نیشنل بنک ٹمبر مارکیٹ اکاؤنٹ نمبر ۵/۷/۱۵۲ ملتان شہر۔

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۸/۶/۶ھ

کلام

از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نبی اکرم ﷺ، شفیع اعظم ﷺ دکھے دلوں کا پیام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو
قدم قدم پر ہے خوف رہزن زمین میں بھی دشمن، فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن، تمہیں محبت سے کام لے لو
شکستہ کشتی ہے تیز دھارا، نظر سے روپوش ہے کنارا
نہیں کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام ﷺ لے لو
کبھی تقاضا وفا کا ہم سے کبھی مذاق جفا ہے ہم سے
تمام دنیا خفا ہے ہم سے خبر تو خیر الانام ﷺ لے لو
یہ کیسی منز ل پہ آگئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا ﷺ امام اپنے غلام لے لو
یہ دل میں ارماں ہے اپنے طیبؔ مزار اقدس پہ جا کے ایک دن سناؤں
ان ﷺ کو میں حال دل کا، کہوں میں ان سے سلام لے لو

حضرت حکیم الاسلام کی یہ وہ نعت پاک ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر کہی اور ان کے تکیہ کے نیچے سے ملی۔

تفسیر سورۂ قلم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم دعوت...... بزرگان محترم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت دینی شروع کی، قوم کو ابھارا اور للکارا۔ نیز جب آپ کو نبوت کی بشارت کی گئی اور فرمایا گیا کہ تبلیغ اور دعوت شروع کرو۔ تو آپ نے دعوت الی اللہ شروع کی۔ انبیاء علیہم السلام کا عزم اور ان کی دعوۃ الی اللہ سے ایک لگن اور دھن اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم کا تو کیا مقام ہو سکتا ہے وہ یہ تھا کی آپ صبح وشام دعوت میں مصروف، جہاں کوئی موقع ملا قوم کے کچھ افراد جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے تھے۔ عرب میں دو بازار لگتے تھے سوق عکاظ، اور سوق مجنہ بڑی مارکیٹ لگتی تھی دور دور کے قبائل خرید وفروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ جہاں کوئی میلہ منعقد ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے، مجمعوں میں دعوت دیتے۔ لوگوں کے خیموں پہ جا کے دعوت دیتے۔ غرض کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ آپ دعوۃ الی اللہ کے کام میں مصروف نہ ہوں۔ اس پر قوم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں انہیں تو ایک جنون سوار ہے کہ جب دیکھو ایک ہی چیز زبان پر اور ایک ہی بات ہے کہ اللہ کی طرف آؤ۔ دیکھو انہیں جنون ہو گیا ہے اور معاذ اللہ عقل سلب ہو گئی ہے ہر وقت ایک ہی لگن ہے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ زمانہ نہ وقت۔ جب دیکھو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

کفار کے الزام کی تردید..... حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی بریت بیان فرمائی کہ آپ مجنون نہیں بلکہ کامل العقل

ہیں، اور اتنی عظیم عقل ہے کہ پوری امت میں جتنی عقل ہو سکتی ہے وہ تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں آگے تصریحات بھی آئیں گی، غرض حق تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کی تکذیب کی کہ وہ غلط کہتے ہیں کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں ہمارے رسول مجنون نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل اور دانش کے حامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال دانش مندی اور خدائی دعویٰ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانش منداور جنون سے بری ہونے کا دعویٰ حق تعالیٰ شانہ نے قسم کھا کر فرمایا: اول تو اللہ کا دعویٰ اس کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ پھر اوپر سے قسم بھی کھائی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اور مؤکد ہو جاتا ہے، تو حق تعالیٰ نے قلم اور قلم سے لکھی ہوئی چیزوں کی قسم کھا کر دعویٰ فرمایا کہ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! آپ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور برکتوں سے بالکل مجنون نہیں ہیں اور ان کے دعوے بالکل غلط ہیں۔ یہ جھوٹے ہیں تو نٓ اور قلم کی قسم کھائی اور قسم بمنزلہ گواہ کے ہوتی ہے، قسم کھا کر آدمی جو دعویٰ کیا کرتا ہے کہ خدا کی قسم یہ ہے بات تو وہ اللہ کو گواہ اور شاہد بناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب خدا میرا گواہ اور شاہد ہے تو اس بات کے جھوٹا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو قسم بمنزلہ شاہد اور گواہ کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا اصول یہ ہے: "اَلْبَیِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَ الْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ." (1) مدعی جب کوئی دعویٰ کرے تو دو گواہ پیش کرے تا کہ وہ دعویٰ ثابت ہو اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعیٰ علیہ سے قسم دلائی جاتی ہے کہ تو قسم کھا کر کہہ دے کہ مدعی جو کہہ رہا ہے وہ غلط کہہ رہا ہے۔ میں اس دعویٰ سے بری ہوں۔ تو مدعیٰ علیہ پر یمین اور قسم کا رکھنا دراصل اس پر گواہ قائم کرنا ہے کہ مدعی کے دو گواہ ہیں اس کا ایک گواہ ہے مگر وہ اصل ہے تو قسم اٹھا کر دعویٰ کرے کہ مدعی کی بات غلط ہے تو اس کا دعویٰ متروک ہو جائے گا۔

نٓ اور قلم کی گواہی...... بہر حال جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس چیز کو گواہی میں پیش کرتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے گواہی میں نٓ اور قلم کو پیش کیا نون ایک حرف ہے اور اس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس حرف میں اتنے عجائبات چھپے ہوئے ہیں کہ مرکب کلمات میں وہ عجائبات نہیں ہیں جو ان مقطعات حروف میں ہیں، باقی انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان حروف کے اندر کیا معانی چھپے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نون ایک حرف ہے کوئی اس کے معنیٰ نہیں ہو سکتے کوئی کلمہ ہو، کوئی مرکب ہو، کسی معنی پر دلالت کرے تو کہا جائے گا کہ اس کے کوئی معنیٰ ہے۔ لیکن الف، نون، میم، اس کے کوئی معنیٰ نہیں، تو کیسے سمجھا جائے کہ اس میں کوئی معنیٰ ہے۔؟ اس لئے عام لوگ نہیں سمجھتے مگر انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان کے حقائق کیا ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علوم دینے آتے ہیں...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب پانچ برس کی عمر ہوئی تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں مکتب میں بٹھلایا۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں آتے، بلکہ تعلیم دینے کے لئے آتے ہیں۔ ان کے صدقے سے دنیا عالم بنتی ہے تو وہ کسی سے کیا علم لیں؟

(1) السنن للدارقطنی، الحدود والدیات ج:۷ ص:۴۸۴ رقم:۳۲۳۷. السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۸ ص:۱۲۳.

لیکن والدہ ماجدہ کو کیا خبر تھی کہ یہ پیغمبر ہیں انہوں نے انہیں مکتب میں بٹھلایا جیسے بچوں کو بٹھلاتے ہیں۔ تو استاذ نے کہا کہو الف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا الف کے کیا معنٰی ہیں۔ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنٰی ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ تو مہملات اور بے معنی چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو کاہے کا استاذ ہے کہ تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ جس چیز کو تو سکھا رہا ہے اس کے معنے کیا ہیں؟ مہمل چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے تجھے شرم کرنی چاہئے۔ اَب وہ بے چارہ حیران ہوا کہ آج تک دنیا میں کسی نے الف کے معنٰی نہیں پوچھے، یہ بچہ الف کے معنی پوچھ رہا ہے۔ استاذ نے کہا مجھے تو الف کے معنی معلوم نہیں، کیا تجھے معلوم ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں مجھے معلوم ہیں۔ تو اس نے کہا بتاؤ۔ فرمایا تب بتاؤں گا جب تو اپنی جگہ چھوڑ کر شاگردوں کی لائن میں بیٹھ اور میں تیری جگہ بیٹھوں گا پھر بیان کروں گا۔ آخر مجبور ہو کر استاذ کو گدی چھوڑنی پڑی اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام استاذ کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی فطرتیں اس طرح سے بلند ہوتی ہیں، وہ پست ہو کر نہیں آتے، وہ عالی رتبہ ہوتے ہیں، تو یہ گوارا نہیں کیا کہ میں کسی کا شاگرد بنوں، حالانکہ پانچ برس کی عمر ہے اور یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ صورۃً بھی میں شاگرد رہوں اور شاگردوں کے لائن میں بیٹھوں خود جا کر مسند درس کے اوپر بیٹھے اور اسے سامنے بٹھلایا۔ اس کے بعد الف کے معنٰی بیان کرنے شروع کئے۔ تو حرف کی خاصیتیں، ان کے معانی، عجائبات اور وہ علوم دقیقہ بیان کئے کہ استاذ دنگ تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ پانچ برس کا بچہ اور حقائق بیان کر رہا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بلندی فطرت...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ یہ تو پانچ برس کی عمر میں نکات بیان کر رہے تھے، جب پیدا ہوئے ہیں اور یہود نے آ کر حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ: ﴿یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ○ یٰٓاُخْتَ ھٰرُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْکِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا ○﴾ ① اے مریم! یہ تو نے کیا کیا، بلا باپ کا بچہ؟ معاذ اللہ! تو کوئی ناجائز کام کر کے آئی ہے؟ تیرا باپ بھی بُرا نہیں تھا۔ تیری ماں بھی بُری نہیں تھی۔ تو کس سے پیدا ہوئی کہ یہ حرکت کی کہ یہ بغیر باپ کے بچہ لے کر آئی؟ شادی تیری نہیں ہوئی؟ آج تک کسی مرد سے تو نہیں ملی۔ آخر یہ بچہ کہاں سے آ گیا؟ مریم علیہا السلام جانتی تھیں کہ میں پاک ہوں اور یہ بچہ خدا کی دَین ہے اور بطور معجزہ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، تو انہیں یقین تھا کہ یہی بچہ میری بریت بیان کرے گا۔ تو فرمایا کہ مجھ سے نہ پوچھو بلکہ بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو: ﴿فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا﴾ ہم اس سے کیسے بات چیت کریں جو گود میں پڑا ہوا ہے، دودھ پیتا بچہ ہے کہ وہ ہماری سمجھے گا نہ سمجھا سکے گا۔ ہم کیسے بات کریں؟ تو اشارہ کیا کہ جو کچھ کہے گا یہی کہے گا، مگر بہر حال خود کچھ نہیں بولیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گود میں سے کہا:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ○ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ

① پارہ: ۱۶، سورۃ: مریم، الآیۃ: ۲۷، ۲۸.

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ اِلٰی قَوْلِه...... وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾ فرمایا: میں عبداللہ ہوں، اللہ کا بندہ، اللہ نے مجھے کتاب عطا کی ہے، وہ کتاب آنے والی تھی۔ جو چیز یقیناً آنے والی تھی، وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ گویا وہ آ گئی وہ کتاب انجیل مقدس ہے۔ مجھے پیغمبر بنایا۔ مجھے برکت والا بنایا میں جہاں بھی ہوں۔ ماں کے پیٹ میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں، گود میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں گود سے باہر جاؤں جب بھی بابرکت ہوں۔ زمین کے کسی حصے پر چلا جاؤں برکات میرے ساتھ ہیں۔ اور اللہ نے مجھے نماز پڑھنے کی وصیت کی ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں ان عبادات کے اندر رہوں اور میں اپنی والدہ کی بریت بیان کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میری والدہ ان الزامات سے پاک ہے جو تم لگا رہے ہو۔ اور مجھے اللہ نے شقی بنا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ سعید اور مبارک بنا کر بھیجا ہے۔ اور مجھ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ جس دن پیدا ہوا، اس دن بھی، جس دن انتقال کروں اس دن بھی اور جس دن محشر میں اٹھوں اور پھر زندہ ہوں اس دن بھی، تو میرے لئے مرکزیت سلامتی ہی سلامتی ہے۔ جب میں بابرکت اور باسلامت ہوں۔ تمہارا کوئی الزام مجھ پر نہیں لگ سکتا۔ جب میں پاک بن کر اپنی پاک ماں کے پیٹ سے آیا ہوں تو میری ماں پر کوئی الزام نہیں آ سکتا میری ماں بھی اس الزام سے بَری ہے جو تم اس پر لگا رہے ہو غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ ان کی عمر مکتب میں پانچ برس کی تھی۔ مگر گود میں جب عبادات کے حقائق، توحید، رسالت، نبوت اور عبادات کے سلسلے بیان کئے۔ تو اس وقت پانچ دن کی بھی عمر نہ تھی۔ اسی وقت پیدا ہی ہوئے تھے۔ تو اس استاذ کے سامنے مکتب میں استاذ کی مسند پر بیٹھ کر حروف کے معانی علوم اور عجائبات بیان کرنے شروع کر دیئے تو لوگ حیران تھے۔

علوم الہامیہ...... مطلب یہ ہے کہ یہ حروف بے معنی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر بڑے بڑے عجائبات اور علوم چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے لئے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان علوم تک پہنچنے کا حصہ دیا ہے۔ تو ان علوم کو یا انبیاء علیہم السلام جانتے ہیں یا اولیاء اللہ ان سے واقف ہیں، یہ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتے ان پر ان کا انکشاف ہوتا ہے اور الہام ربانی سے یہ علوم آتے ہیں۔ میں نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہمارے جدامجد اور دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔ تو ان کے تمام تلامیذ نے جو دارالعلوم دیوبند کے مدرسین تھے۔ سب نے مل کر عرض کیا کہ! حضرت ایک تفسیر کی کتاب ہمیں پڑھا دیجئے۔ حالانکہ ساری کتابیں پڑھ چکے تھے۔ مگر مزید علوم حاصل کرنے کے لئے درخواست کی، حضرتؒ نے وہ قبول فرمائی اور ﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس پر پہلی تقریر کی، حروف مقطعات کے وہ علوم وعجائبات بیان کیے کہ یہ تمام بڑے بڑے علماء جو خود آئمہ فنون تھے۔ حیران تھے یہ علوم کہاں سے آ رہے ہیں۔ غرض یہ علوم یا تو انبیاء علیہم السلام کو معلوم ہوتے ہیں یا حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خزانہ غیب سے اپنے مخصوص اولیاء کرام کو دیتے ہیں۔

تاثراتِ حُروف...... شیخ محی الدین ابن عربیؒ جو امام الصوفیاء اور امام المحققین ہیں انہوں نے اپنی کتاب

"فتوحات مکیہ" میں دعویٰ کیا ہے کہ عالم میں جتنی کارگذاریاں ہورہی ہیں وہ سب حروف کے ثمرات ہیں، ہر حرف کی خاصیت ہے کہ کسی حرف سے مل کر اپنا کام کررہے ہیں، کسی حرف کی خاصیت سے دنیا کی زمین کام کررہی ہے۔ فضا کام کررہی ہے، یہ سب حروف کی تاثیرات ہیں۔ اور یہ سارا عالم دو حروف سے ہی تو پیدا ہوا ہے اور وہ ہیں :کُنْ حق تعالیٰ نے فرمایا: کُنْ ہوجا، تو کاف اور نون دو حروف تھے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ عالم بن کر کھڑ ہوگیا۔ تو عالم کی زندگی اور وجود فی الحقیقت ان دو حرفوں میں تھی۔

چنانچہ شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں حروفِ مقطعات ہیں جیسے الٓمٓ، یا طٰسٓمٓ. یاحٰمٓ عٓسٓقٓ. یا حٰمٓ ان کے اندر دنیوی اقوام کی تاریخیں چھپی ہوئی ہیں اور اس کے کچھ قواعد بیان فرمائے ہیں کہ اگر ان قوعد سے تاریخیں نکالیں تو پورے عالم کی تاریخ نکل آئے گی۔ چنانچہ اس کی کچھ اصطلاحات ذکر کی ہیں مگر وہ فن اٹھ گیا۔ آج کسی کو پتہ نہیں کہ ان اصطلاحات کے کیا معنےٰ ہیں وہ کس طرح سے معلوم ہوتی ہیں۔

نٓ اور قلم کی وجہِ قسم...... بہر حال حروف کے اندر علوم اور عجائبات چھپے ہوئے ہیں تو حق تعالیٰ نے نٓ کی بلاوجہ قسم نہیں کھائی اور نہ ہی بے وجہ قلم کی قسم کھائی ہے بلکہ ان کے علوم کو شاہد بنایا ہے کہ ہمارا رسول مجنوں نہیں ہے بلکہ اعلیٰ ترین دانش اور اعلیٰ ترین عقل کا حامل ہے اس میں جنون کے کیا معنیٰ ہیں۔ غرض دو چیزیں پیش فرمائی ہیں ایک حرف نون اور ایک قلم۔ یہ اس لئے کہ دونوں چیزوں کو انبیاء علیہم السلام سے مناسبت ہے نون (نٓ) کو نبوت سے مناسبت ہے اور قلم کو نبی کی ذات سے مناسبت ہے تو نبوت کی حقیقت بھی بیان ہوگئی اور ذات نبوی کی حقیقت بھی بیان ہوگئی تو نٓ کو نبوت سے مناسبت کاملہ ہے۔ مثلاً تین حروف ایسے ہیں کہ وہ اپنی ابتداء میں بھی خود ہیں اپنی انتہا میں بھی خود ہی ہیں۔ ان تین حرفوں کے سوا اور حرفوں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ حروف یہ ہیں:۔ نون۔ میم، اور واؤ (ن۔ م۔ و) نون جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی نون آخر میں بھی نون۔ میم جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی میم اور آخر میں بھی میم اس طرح واؤ جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی واؤ اور آخر میں واؤ۔ تو تین لفظ ایسے ہیں کہ اوّل وآخر میں وہ خود بولے جاتے ہیں، گویا اوّل بھی آخر بھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ اوّل بھی ہے آخر بھی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ موجود نہیں تھا۔ اللہ موجود تھے جب کائنات کو پیدا کردیا۔ ایک وقت آئے گا جب کوئی ذرہ کائنات کا باقی نہیں رہے گا اور اللہ موجود ہوگا۔ تو اللہ ہی اوّل ہے اور اللہ ہی آخر ہے۔ چیزیں آئیں گی، جائیں گی، پیدا ہوں گی، ختم ہوں گی، مگر وجودِ حق ہر وقت موجود ہے، اوّل میں بھی اور آخر میں بھی۔

یہی شان جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلوقات میں ہے، کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی اول ترین مخلوق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَوّلُ ما خلق اللّٰہ نوری سب سے اول حق تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا۔ اور نور سے مراد حقیقت محمد یہ ہے۔ گویا سب سے پہلے میری حقیقت کو بنایا تو اولین مخلوق

میں ہوں۔ اس کے بعد اس کے آثار اور طفیل میں اور چیزیں بننا شروع ہوئیں، مگر اولین مخلوق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ کائنات نہیں بنی تھی اور آپ بنائے جا چکے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات میں اول ہیں۔ اسکے بعد خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) بنا کر آپ کا ظہور ہوا تو انبیاء علیہم السلام تمام منقلب ہو چکے تھے، کوئی نبوت دنیا میں باقی نہیں تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ تو آپ ہی اخیر میں بھی نبی ہیں اور آپ ہی شروع میں بھی نبی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ'' میں اس وقت نبی تھا جس وقت آدمؑ کا پتلا ہی بنایا جا چکا تھا۔ ابھی ان کی مٹی کا خمیر کیا جا رہا تھا۔ اور میں نبی بنایا جا رہا تھا۔ یعنی میری حقیقت میں علم ڈال دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ نبوت کی حقیقت وحی ہے۔ اس لئے نبی اس کو کہتے ہیں کہ جس پر اللہ کی وحی آئے، اور وحی کی حقیقت علم کے سوا اور کیا ہے؟ واقعات اور احکام کی وحی کی جاتی ہے۔ وحی کی حقیقت علم ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات سے پہلے نبی تھی۔ اور نبوت کی حقیقت وحی ہے اور وحی حقیقت علم ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اللہ نے میری حقیقت کو علم سے بنایا یعنی میری حقیقت کے اندر علم گوند دیا گیا تو جب تک میری حقیقت ہے میرے اندر علم ہے، تو آپ کے اول میں بھی علم اور آخر میں بھی علم ہے تو اول میں بھی آپ نبی کہ سب سے پہلے بنائے گئے اور جب سارے انبیاء علیہم السلام دنیا سے اٹھالئے گئے تو آخر میں پھر آپ نبی ہیں۔ غرض اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوۃ اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے جیسے حق تعالیٰ کی الوہیت اول میں بھی ہے آخر میں بھی ہے، تو نون (ن) کے حرف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت ہے کہ آپ اول میں بھی ہیں آخر میں بھی ہیں۔ اس طرح حرف نون ہے کہ نون اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے۔ واؤ کو بھی یہی مناسبت ہوسکتی ہے اور میم کو بھی۔ کیونکہ اول اور آخر میں نون والی کیفیت یہاں بھی ہے۔

کمال ''ن'' سے کمال نبوت پر استدلال ......لیکن علماء لکھتے ہیں کہ ان تینوں حروف میں نون افضل ترین ہے، اس واسطے کہ واؤ اگر ترقی کرے گی تو آواز اوپر کو اٹھ جائے گی۔ ایک خلاء پیدا ہو جائے گا۔ اور میم ترقی کرے تو نیچے کی طرف جائے گی۔ کیونکہ میم کی آواز نیچے کی طرف جھکتی ہے اور نون بیچ میں متوسط ہے کہ اس میں آواز اٹھتی ہے نہ جھکتی ہے۔ بالکل بیچ بیچ کا ایک حصہ ہے تو ''خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا'' ''بہترین چیز وہ ہے جو متوسط اور معتدل ہو۔'' نہ اوپر نہ نیچے بلکہ اپنے موقف پر ہو۔ ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمالات بھرپور ہیں۔ افراط وتفریط سے بری، کمالِ اعتدال کے مطابق ہیں۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شان جلال غالب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں جمال کی شان غالب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کمال کی شان غالب ہے، اور کمال اعتدال کو کہتے ہیں نہ ادھر جھکا ہوا نہ ادھر، بلکہ اپنے موقع پر فٹ ہے اور سیدھا اپنے موقع پر چسپاں ہے۔ تو کمال اعتدال سے ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھرپور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت انتہائی عدل واعتدال پر ہے جبھی تو

نبی بھی کمال اعتدال پر ہے غرض نون میں بھی یہی کمال اعتدال ہے۔

کمال نبوت سے کمال اعتدال پر استدلال...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جُسّہ مبارک کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت طویل تھے نہ قصیر تھے۔ بلکہ معتدل قامت تھے ایسی معتدل اور میانہ قیامت کہ آدمی دیکھ کر یوں کہے کہ یہ اتنی ہی ہونی چاہیے تھی نہ اس سے زیادہ ہو سکتی تھی نہ اس سے کم ہو سکتی تھی۔

یہ آگے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ سب میں اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے تھے صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے طویل القامت لوگ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ دو آدمی کے برابر ان کا تنہا قد تھا۔ بیٹھتے تھے تو دو تین آدمی کی جگہ گھیرتے تھے یہ تو جُثہ تھا۔ مجلس مبارک میں لمبے لمبے صحابہ کرام بھی بیٹھے ہیں مگر اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آتے تھے، تو یہ بزرگی اور اعزاز تھا۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوقامت میں بھی اعتدال تھا نہ افراط ہے نہ تفریط۔

اسی طرح آپ کے علوم وکمالات میں بھی اعتدال ہے کہ ان میں نہ افراط ہے نہ تفریط ہے اور یہی شان لفظ نون کی ہے کہ اس میں بھی نہ افراط ہے نہ تفریط ہے، اس واسطے حق تعالیٰ شانہٗ نے لفظ نون کو شہادۃ میں پیش کیا کہ جیسے نون میں حد کمال ہے اسی طرح ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بابرکات میں بھی کمال ہے۔ اور جس کا کمال کمال اعتدال لئے ہوئے ہو اسے جنون سے کیا واسطہ؟ جنون تو اسے ہی کہتے ہیں کہ یا عقل بالکل نہ رہے کہے کہ میں مجنوں ہو گیا یا اتنی بڑھ جائے کہ حد عقل میں نہ رہے اسے بہزار کہتے ہیں وہ بھی ایک قسم کا جنون ہے۔ لیکن کمال اعتدال جب ہو گا اس میں ظاہر بات ہے کہ جنون کا کوئی شائبہ نہیں آسکتا۔ تو نون کو شاہد بنا کر پیش کیا۔

خصوصیت نُون (ن) سے خصوصیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال...... اسی طرح سے نون (ن) کی کچھ اور بھی خصوصیات ہیں۔ جو لوگ عربیت سے واقف ہیں نیز صرف اور نحو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ نون جب فعل کے آخر میں آتا ہے تو تاکید کا کام دیتا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں۔ لَاَفْعَلَ کَذَا میں ایسا کروں گا لیکن اگر نون ملا کر یوں کہیں لَاَفْعَلَنَّ کَذَا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسا ضرور کروں گا۔ تو فعل کی تاکید کر دیتا ہے۔ غرض فعل پر داخل ہوتا ہے تو نون تاکید کا ذریعہ بنتا ہے اور جب حرف پر داخل ہو تو حرف کے اندر تحسین اور آواز کی خوبی پیدا کر دیتا ہے۔ آواز کو جب گناتے ہیں تو غنہ بیچ میں آئے گا تو آواز کی خوبی پیدا ہو گی تو حسن صَوت اس سے متعلق ہے اور جس کی آواز اچھی ہوتی ہے اس میں اس قسم کا غنا ہوتا ہے۔ غِنا اور غُنّہ ایک چیز ہے۔ نون غنہ ہے۔ نون غنہ جب آئے گا تو آواز میں گونج ہو گی۔ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور سینہ کی نالیاں کچھ بند ہو جاتی ہیں۔ غنہ باقی نہیں رہتا اس لئے خوش آوازی نہیں رہتی۔ جیسے مجھ جیسا آدمی۔ کہ آواز بہت عمدہ تھی بڑھاپے نے آکر نالیاں کچھ بند کر دیں، گونج باقی نہیں رہی اس لئے حسنِ صوت نہیں رہی۔ جیسے آپ نے باجے دیکھے ہوں گے مثلاً ہارمونیم ہے اس میں ایک سُر بہت اونچا ہوتا ہے۔ ایک اس سے کم اور معتدل اور ایک بالکل اخیر میں، ان تینوں کو ملائیں گے تو ایک ساز پیدا ہو جاتا ہے اس سے گانے بجانے میں خوش نمائی سی پیدا ہو جائے گی اگر ایک ہی آواز رہ جائے تو

ہارمونیم میں کوئی خوبی نہیں اوپر نیچے بیچ تینوں جمع ہو جائیں تو خوشنمائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض نون کے اندر خصوصیت سے یہ بات دیکھی گئی ہے کہ جس حرف میں اس کو ملا دو اس میں غنہ پیدا ہوتا ہے اور غنہ سے غنہ پیدا ہوتا ہے تو حسنِ صَوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس کو اسم کے ساتھ ملا دیں اس کے اندر ایک خوبی پیدا ہو جاتی ہے، غرض فعل سے ملائیں تو تاکید ہو جائے، حرف سے ملائیں تو حسنِ صَوت بن جائے گا۔ اور اسم کے ساتھ ملا دیں تو اس میں خوشنمائی اور فخر و مباہات پیدا ہو جائے گی۔ یہی شان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کے ہاں کچھ افعال ہیں کچھ حروف ہیں، کچھ اسماء ہیں حق تعالیٰ شانہٗ کے جو افعال ہیں وہ درحقیقت ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام بمنزلہ فعلِ حق کے ہیں، نہ جیسے دست و بازو ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا گیا ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ ① عالم کی تدبیریں ملائکہ کے ذریعے ہو رہی ہیں۔ بنانے والے حق تعالیٰ ہیں۔ لیکن اس فعل کا واسطہ ملائکہ ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم نے لکھا۔ لکھا تو ہم نے لیکن لکھنے کا واسطہ ہمارا ہاتھ بنا۔ مگر ہاتھ ہمارے قلب کے خلاف نہیں کر سکتا جب لکھنے کا ارادہ کریں گے ہاتھ حرکت کرے گا۔ تو ہاتھ کو کہا جائے گا کہ یہ ہمارا آلہ فعل ہے۔ اسی طرح آنکھ ہمارا آلہ ابصار ہے کہ اس کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں۔ دیکھنے والا قلب ہے مگر آنکھ اس کے لیے راستہ بنتی ہے۔ دل جب چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پیر حرکت کرنے لگتے ہیں تو پَیر گویا قلب کے چلنے کا آلہ ہے۔ وہ اس کے واسطے سے چلتا ہے۔ غرض ہاتھ پیر آنکھ ناک کان یہ تمام وسائل فعل ہیں اور افعال کا تعلق قلب سے ہے۔ فعل قلب کا ہوتا ہے، مگر اعضاء اس کے لئے واسطہ ہوتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں بھی یہی ہے کہ ماں کے رحم پر ملائکہ مقرر ہیں جو بچے کو بناتے ہیں، تو بنانے والے حق تعالیٰ ہیں مگر وہ ملائکہ بمنزلہ ہاتھ کے ہیں جن کے ذریعہ بنایا جا رہا ہے، جب زندگی چھینی جاتی ہے تو ملائکہ موت آتے ہیں موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں مگر حضرت ملک الموت اور ان کے اعوان و انصار اس کے لئے واسطہ بنتے ہیں۔ کھیتی اُگتی ہے تو ملائکہ مقرر ہیں جو بیج میں سے کونپل کو نکالتے ہیں کونپل بڑھا کر اوپر لے جاتے ہیں، تو بڑھانے والے حق تعالیٰ ہیں لیکن ملائکہ علیہم السلام واسطہ بنے ہوئے ہیں، غرض ملائکہ بمنزلہ فعل حق کے ہیں۔ اس لئے جب وہ فعل تمام ہو جاتا ہے، اور ملائکہ اس کا ذریعہ بنتے ہیں تو پھر ان کو ترقی دی جاتی ہے اور عروج دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ افعال خداوندی بواسطہ ملائکہ کے ہیں اور ملائکہ کا عروج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ آتا ہے تو وہ بڑھ جاتے ہیں اور ان کو ترقی ہوتی ہے، مثلاً حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ''اِنَّ لِلّٰہِ مَلٰٓئِکَۃً سَیَّاحِیْنَ'' اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی ایک جماعت بنائی ہے جو اربوں اور کھربوں میں ہے، اللہ ہی ان کی تعداد جانتا ہے، یہ اس لئے ہیں کہ وہ دنیا میں گھوم کر دیکھیں کہ ذکر اللہ کہاں ہو رہا ہے، اللہ کا نام کہاں لیا جا رہا ہے، اس کے احکام کہاں بیان کئے جا رہے ہیں، تو جب کوئی جلسہ یا مجلس

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۵.

تعلیم دین کی، تعلیمِ قرآن کریم، تعلیم حدیث کی یا وعظ و پند کی منعقد ہوتی ہے، تو یہ اربوں کھربوں ملائکہ جو اسی ٹوہ میں رہتے ہیں یہ اس مجلس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اس مجلس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، پھر اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں کہ: ''هَلُمُّوْآ اِلٰى مَقْصَدِكُمْ'' دوڑو تمہارا مقصد اس مجلس میں ہو رہا ہے، وہ اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں اور وہ اپنے سے پچھلوں کو، تو اس مجلس کے اردگرد ملائکہ کا اتنا ٹھٹ لگ جاتا ہے کہ آسمان تک ملائکہ ہی ملائکہ ہوتے ہیں، غرض مجلس کے اردگرد اربوں کھربوں ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں، جب یہ مجلس ختم ہوتی ہے تو ان کو عروج ہوتا ہے اور وہ آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، اور حق تعالیٰ ان سے سوال کرتے ہیں کہ کہاں گئے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہاں گئے تھے، مگر سوال حکمت ہے، پوچھتے ہیں کہاں گئے تھے؟ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں میں گئے تھے، اور ان کی ایک مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ بندے کیا کر رہے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کیا کر رہے تھے، مگر ان کی زبان سے اقرار کرانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بندے آپ کی یاد میں مشغول تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے، آپ کی جہنم سے خائف تھے، رحمت مانگ رہے تھے، غضب سے ڈر رہے تھے؟ آپ کے پیغمبروں کی زبان سے سنا ہے اور ایمان لائے ہیں، فرماتے ہیں کیا انہوں نے جہنم کو دیکھا ہے جو اس سے ڈر رہے تھے، عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں ہے، آپ کے پیغمبروں کے کہنے پر ایمان لائے ہیں، گویا اشارہ اس طرف ہے کہ: اے ملائکہ! اگر تم ہم پر ایمان رکھتے ہو رات دن جنت اور جہنم کو آنکھ سے دیکھتے ہو، تو تمہارا ایمان عجیب نہیں ایمان ان کا ہے کہ دیکھا تو ہے نہیں، مگر یقینِ قطعی کے ساتھ مان رہے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: اے ملائکۃ اللہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے موجود تھے، جو وہ مانگتے تھے میں نے ان کو دیا، اور جس چیز سے پناہ مانگتے تھے، پناہ دی، میں نے ان کی مغفرت کر دی، ملائکہ عرض کرتے ہیں، یا اللہ! اس مجلس میں بہت سے آدمی بیٹھے تھے مگر کچھ راستہ چلتے ایسے ہی کھڑے ہو گئے تھے ان کا مقصد مجلس میں آنا نہیں تھا مگر انہوں نے دیکھا کہ ایک اجتماع ہے ذرا دیکھیں کیا ہو رہا ہے، تماشہ دیکھنے کو ٹھہر گئے تھے تو وہ شرکاء مجلس نہیں تھے، محض مجلس دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے، کیا ان کی بھی مغفرت ہے؟ فرمایا: ''هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ'' ① (اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْاَرْضِ) اس مجلس میں بیٹھنے والے ایسے ہیں کہ ان کے پاس کھڑے ہونے والے بھی محروم نہیں رہ سکتے۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ اس مجلس میں آنے کے سبب سے ملائکہ کو عروج ہوتا ہے اور اتنی قبولیت ہوتی ہے کہ عرش تک پہنچتے ہیں، مجلس میں آنے سے پہلے عرش تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس مجلسِ خیر کی برکت سے انہیں عرش تک رسائی ہوتی ہے، اور اتنا عروج اور قریب ہونا نصیب ہوتا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ یہ قرب اور عروج کس

① السنن للترمذی، كِتَابُ الدَّعْوَاتِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَابُ مَاجَاءَ، باب ماجاء ان لله ملائكة سياحين فی الارض ج: ۱۲ ص: ۲۷ رقم: ۳۵۲۴.

چیز پر مرتب ہوا؟ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے، آپ کی تو بتائی ہوئی باتیں مجلس میں بیان کی جارہی تھیں، ذکر اللہ کرے گا تو آپ کے تلقین فرمودہ کلمات ہیں، وعظ ہیں تو آپ کی تلقین کردہ ہے، احکام بیان کریں تو آپ کی تعلیم کردہ چیز ہے، عبرتیں بیان کریں تو آپ کی فرمودہ چیز ہے، تو ملائکہ یہی کچھ سننے کے لئے آئے ہیں، اس کے سننے سے وہ قبولیت اور عروج ہوا، تو معلوم ہوا کہ فرشتوں کو قربِ خداوندی میں ثبات اور استقلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے نصیب ہوتا ہے۔ تو جیسے نون کے ملا دینے سے فعل کے اندر قوت پیدا ہو جاتی تھی تو ملائکہ بمنزلہ (قوت) افعالِ حق کے ہیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کا ذکر مل گیا تو ان کی قبولیت میں ثبات واستقلال کی تاکید پیدا ہوگئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر افعالِ الٰہیہ سے ملتے ہیں تو ان کی عبادت اور قرب کا تأکد ہو جاتا ہے، جیسے نون فعل سے ملا تو فعل موکد ہو گیا تھا۔ اسی طرح سے اسماء الٰہیہ تمام کائنات کے لئے ظِلّ ہیں، اسماء الٰہیہ کے تصرف سے یہ تمام چیزیں بنی ہیں، فرمادیا: کُن، ہو گئیں، کسی کو زندہ ہونے کا فرمایا تو زندگی مل گئی، کسی کے لئے موت کا فرمایا تو موت آ گئی، غرض عالم میں جتنے تصرفات اور تغیرات ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اسماء سے ہو رہے ہیں، اور اسماء الٰہیہ کا مورد اور محل وہ بنی آدم، جنات، حیوانات، اور نباتات ہیں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی اسم الٰہی لگا ہوا ہے، جس کے ذریعہ وہ چل رہا ہے، اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو انسانوں اور جنوں نے قبول کیا وہ اللہ کے اسماء کا مظہر ہیں تو وہ اللہ کے اسماء کے تصرفات کا ذریعہ بن گئے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقبولیت کی علامت ہے، تو افعال (ملائکہ) سے ملے تھے تو قرب مرتب ہو گیا تھا، ملائکہ عروج پر آ گئے تھے، اسماء سے ملے، تو ہمارے اندر خیر و برکت پیدا ہو گئی، اسی طرح سے کائنات کے اندر جتنی معدنیات ہیں، جتنے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں سونا ہو، چاندی ہو، تیل ہو پٹرول ہو یہ درحقیقت حروف ہیں، حرف کے معنی کنارے کے ہوتے ہیں، اس عالم کے ہر کنارے میں کوئی نہ کوئی معدن رکھا ہوا ہے، کسی کنارے میں تیل ہے، کسی کنارے میں سونا ہے، تو یہ حروف ہیں، یہ حروف کب نمایاں ہوئے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوگئی، اور آپ کو بنا دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں یہ حروف نمایاں ہوئے اور ان کو فخر کا موقع ملا، سونا کہے گا کہ میں ایسی فخر کی چیز ہوں کہ لوگ مجھے سر پر جگہ دیتے ہیں اور چاندی کہے کہ بازار مجھ سے آباد ہیں، یہ فخر کہاں سے نصیب ہوا، اس لئے کہ انہیں زندگی دی گئی، زندگی کہاں سے نصیب ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طفیل ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ افعال خداوندی کے ساتھ ذات بابرکات نبوی لگی تو ان میں ثبات واستقلال پیدا ہوا، اسماء الٰہیہ کے ساتھ آپ ملے تو ان کا تصرف ہو گیا، حروف کائنات کے ساتھ آپ ملے تو ان کو فخر ومباہات کا موقع مل گیا، تو جیسے نون تھا کہ فعل سے ملے تو موکد بنا دے، اسم سے ملے تو اس میں زینت پیدا کر دے، حرف سے ملے تو اس میں غنہ پیدا کر دے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے کہ افعالِ الٰہیہ سے ملی تو ان میں ثبات ہوا، اسماء

الٰہیہ سے ملی تو ان میں تصرفات نمایاں ہوئے، حروف سے ملی جو اللہ کے حروف ہیں، تو ان میں زینت اور فخر ومباہات پیدا ہوگئی، غرض نون (ن) کو نبوت سے کمال درجہ مشابہت حاصل ہے اور نبوت کا کمال درحقیقت نبی کا کمال ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے ن کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بیان کرنے کے لئے کیا۔

''ن'' سے نفی جنون اور کمالِ عقل وعلم پر استدلال......اور سارے کمالات کی بنیاد علم ہے اور علم کی زمین عقل ہے، اگر عقل نہیں ہوتی تو علم کتنا ہی ڈال دیں وہ نمایاں نہیں ہوسکتا، چنانچہ سینکڑوں پوسٹر لکھ کر دیوار پر لگا دیں اس پر کوئی اثر نہیں، اس لئے کہ اس میں کوئی عقل وشعور ہی نہیں، ایک لکڑی کے اندر یا جزدان میں آپ پورا قرآن شریف رکھ دیں، جو علم کا خزانہ ہے، لیکن جزدان کو کوئی خبر نہیں، اس لئے کہ اس میں عقل تو ہے ہی نہیں، عقل ہوتی تو علم نمایاں ہوجاتا۔ یا ایک انسان ہے مگر وہ بے وقوف ہے اس پر اگر کوئی علم ڈال دے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے لکڑی کے اوپر ڈال دیا، کچھ بھی اثر نہیں ہوگا، لیکن اگر عقل موجود ہے تو وہ اس علم کو سمجھے گا، اور زیادہ عقل ہے تو اور زیادہ سمجھے گا گہری عقل ہے تو گہرائی سے سوچے گا تو علم کا دارومدار عقل کے اوپر ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کو عقل بھی اعلیٰ دی جاتی ہے، کیونکہ ان کے اوپر علم اعلیٰ ڈالا جاتا ہے، اور علم کی زمین عقل ہے، وہ نہ ہو تو علم جمتا نہیں، اس لئے لازمی ہے کہ نبی کو عقل اتنی دی جائے کہ امتوں میں اتنی عقل نہ ہو، پوری امت کے برابر تنہا نبی کی عقل ہو، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس درجہ کا ہے کہ حروف سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں، افعال سے ملے تو وہ باکمال بن جائے اسماء سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں اتنا بڑا علم ہوا، تو اس کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ عقل بھی اتنی ہی بڑی دی گئی، تو جاہل اور مجنون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کہتے ہیں؟ (نعوذ باللہ) اس سے تو خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اتنی کامل ہے کہ جنون کا وہاں شائبہ بھی نہیں ہوسکتا، تو نون کو گواہی میں پیش کیا اس لئے کہ حرفِ نون کو نبوت سے مناسبت تھی۔

حرکاتِ قلم سے علوم نبوت پر استدلال......اس کے بعد قلم کی قسم کھائی، قلم کی قسم کھا کر کہا کہ آپ اپنے رب کی نعمت وفضل سے مجنون نہیں ہیں، اور ہم قلم کو گواہی میں پیش کرتے ہیں، اس واسطے کہ قلم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مناسبت ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قلم کو جب دیکھا جائے تو کبھی تو کاغذ کے اوپر ہے کبھی دوات کے اندر ہے کبھی وہاں سے ہٹا کر اوپر کی طرف ہے، کبھی سیاہی کم ہوگئی تو اُسے جھکا دیتے ہیں، اگر کوئی بے عقل آدمی قلم کی یہ حرکتیں دیکھے گا، تو قلم کو مجنون ہی تو کہے گا کہ یہ کیا بے عقلی ہے کہ کبھی اوپر جارہا ہے کبھی نیچے آرہا ہے، کبھی ادھر کبھی ادھر تو جاہل اگر قلم کو دیکھے گا تو وہ مجنون کہے گا، عقل مند دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ تو کوئی علیٰ درجہ کی چیز ہے، اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کہ کفار دیکھیں گے تو مجنون کہیں گے، اور دانش مند دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ان سے بڑا کوئی عاقل نہیں ہے، تو قلم نے یہ بات سمجھا دی کہ قلم کی حرکات ظاہر میں مجنونانہ ہیں، لیکن ان حرکات کے اندر علوم اور کمالات چھپے ہوئے ہیں۔

اعجازِ قلم سے اعجازِ نبوت پر استدلال...... قلم ایک لکڑی کی چیز ہے، ایک کِلک ہے یا پلاسٹک ہے جس کی کوئی وقعت نہیں، لیکن علوم وہ لکھتا ہے کہ اگلوں اور پچھلوں کی خبر دیتا ہے، ظاہر بات ہے کہ قلم انتہا درجے کی اعجازی چیز یعنی معجزہ ہوا، قلم کو کاٹ کر آپ نظر اُدیکھو کہیں بھی کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن جب حرکت کرتا ہے تو ہزاروں علوم لکھتا چلا جاتا ہے، آج ماضی کی لاکھوں چیزیں قلم کی بدولت ہی تو ہمارے علم میں آئی ہے، اور مستقبل کی چیزیں جو آج لکھ دی ہیں وہ قلم ہی کی بدولت تو ہوں گی، اور حال میں جو چیزیں حوادث وواقعات کے سلسلہ میں ہیں وہ قلم ہی تو لکھتا ہے، تو قلم کی ذات کو دیکھو تو وہ محض ایک لکڑی ہے یا پلاسٹک ہے اور آثار کو دیکھو تو کروڑوں علوم، اسی طرح سے اگر ہمارے نبی کو دیکھو تو ظاہر میں تو بشر ہی ہے، جیسے اور انسان ہوتے ہیں، لیکن ان کی حرکات سے جو علوم نمایاں ہیں تو اگلے اور پچھلوں کی سب چیزیں کھلتی چلی گئیں، تو قلم کو ہم گواہی میں پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنون نہیں ہے، ورنہ پھر قلم کو مجنون کہو اور قلم کو مجنون کہو گے تو یہ تمہارے پاس علم کہاں سے آیا......؟ یہ قلم ہی کے تو طفیل سے آیا، تو دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہیں۔

قلم اَربوں علوم کے ظہور کا ذریعہ ہے...... پھر تیسری ایک بات اور بھی ہے کہ قلم کو آپ الگ رکھ دیں نہ حرکت کرے گا نہ ہلے گا نہ لکھے گا نہ علم ظاہر کرے گا، لیکن کاتب اپنے ہاتھ میں لے لے، اس سے سینکڑوں علوم ظاہر ہوتے چلے جائیں گے، معلوم ہوتا ہے کہ قلم خود اپنے قبضے میں نہیں بلکہ کاتب کے قبضہ میں ہے، جو وہ لکھتا ہے وہ لکھتا ہے اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے تو قلم میں کچھ بھی نہیں، اس سے حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ ہمارا پیغمبر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ قلم ہے ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہم لکھا رہے ہیں لکھتا چلا جا رہا ہے اس کا کیا ہوا ہمارا کیا ہوا ہے خود قلم کی ذات میں کچھ نہیں ہے اسی کو فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ① ہمارا پیغمبر ہوائے نفسانی سے بات نہیں کرتا، وحی سے بات کرتا ہے، وحی بھیجنے والے ہم ہیں ہم چلا رہے ہیں، اس لئے قلم چل رہا ہے تو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام بشر ہے، حقیقت میں دیکھو تو سارے بشر ایک طرف اور وہ تنہا ایک طرف، اس لئے کہ وہ بمنزلہ قلم حق تعالیٰ کے ہیں وہ چلاتے ہیں تو چلتا ہے مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی سے کوئی حرکت نہیں ہوتی، ہماری مرضیات کے مطابق حرکت ہوتی ہے، جدھر ہم چلاتے ہیں چلتے ہیں، ہم کہہ دیں کہ جان دے دو تو وہ میدانِ جہاد میں کود پڑیں گے، ہم کہہ دیں گے کہ گھر میں آرام کرو تو سونے کے لئے آ جائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ بیویوں کے پاس جاؤ تو وہ وہاں چلے جائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ اولاد کی پرورش کرو تو اولاد کی پرورش کرنے لگیں گے، غرض وہ اپنی من مانی سے کچھ نہیں کرتے، جو ہم کراتے ہیں وہ کرتے ہیں۔

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی جُنون کے لئے قلم کی شہادت...... تو ہمارا پیغمبر قلم کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، جدھر کو چلائے چل پڑے، ایسا ہی ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے

① پارہ:۲۷، سورة: النجم، الآية:۳، ۴.

ہاتھ میں ہے، ان کی ساری حرکات وسکنات ہماری مرضیات کے مطابق ہیں، اس کو اگر تم نے مجنوں کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمیں مجنوں کہہ رہے ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس علم نہیں، تو درحقیقت پیغمبر کو برا کہنا اللہ کی ذات میں گستاخی کرنا ہے، پیغمبر کی تعریف کرنا اللہ کی تعریف کرنا ہے۔ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ تو ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اسی لئے ایک جگہ فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ① غزوۂ بدر میں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں ماری تھیں اور ایک کنکری جس کے سر پر پڑی تو پاش پاش کرتی ہوئی ٹخنوں تک نکل گئی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں بشر کی طاقت نہیں کہ کنکری مارے اور جس کو لگے اس کو پاش پاش کرتی ہوئی جسم کے پار ہو جائے، یہ تو ہماری طاقت ہے، ہم کنکر مار رہے تھے، ہاتھ پیغمبر کا تھا طاقت ہماری تھی، جب پیغمبر بولتے ہیں تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے، کلام ہمارا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قلم کو پیغمبر کی ذات کے ساتھ بہت مناسبت ہے۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا: قلم کی قسم کھاتے ہیں اور قلم کو گواہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنوں نہیں ہے، اس لئے کہ قلم بھی ظاہر میں ایک لکڑی کی چیز ہے، مگر علوم وہ بیان کر رہا ہے جو مجنوں بیان نہیں کر سکتا، تو جیسے قلم کو مجنوں نہیں کہہ سکتے نبی کو بھی مجنوں نہیں کہہ سکتے۔

افعال وحرکاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی علوم ہیں...... اسی کے ساتھ ساتھ قلم کی اور خصوصیت بھی ہے، قلم ایک دم روشنائی کے اندر جا کر غرق ہو جائے گا اور اس کے بعد لکھنا شروع کرے گا اور لکھنے میں کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کو حرکت کرے گا یہ مثال ایسی ہے کہ گویا دوات کی روشنائی سے قلم وضو کرتا ہے، وضو کرنے کے بعد کاغذ کے مصلّے پر عبادت کرتا ہے، اور سجدے کرتا ہے، ہمارے پیغمبر ایک طرف وضو کرتے ہیں اس کے بعد کبھی اٹھتے ہیں، کبھی بیٹھتے ہیں یہ ہماری عبادت کے لئے کرتے ہیں اگر پیغمبر کو دیکھنا ہے تو قلم کو دیکھ لیں تو قلم جیسے روشنائی کے اندر جا کر غسل کرتا ہے اس میں غرق ہوتا ہے اور استغراق ہوتا ہے اس کے بعد آ کر اس سے لکھتا ہے جس سے علوم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے پیغمبر کامل الطہارت ہیں اور طہارت بھی اعلیٰ ہے اس طہارت کے بعد جو عبادت کرتے ہیں وہ عبادت طرح طرح کے علوم کا ذریعہ بنتی ہے۔

آج جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر کریں گے، روزہ کا ذکر کریں گے یا حج کا ذکر کریں گے، اسی سے تو مسائل نکلتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں علوم چھپے ہوئے ہیں، بظاہر تو حرکات ہی ہیں کہ سجدہ کیا، رکوع کیا، لیکن اس سجدے اور رکوع سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے اس رکوع سے اور سجدے سے کتنے حقائق پیدا ہوئے التحیات میں بیٹھنے سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے، یہ جو فقہ کی ہزاروں کتابیں بھری پڑی ہیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال ہی کا مجموعہ ہے، اور آپ کا فعل اس لئے ہے کہ آپ حق تعالیٰ میں مستغرق ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم

① پارہ: ۹، سورۃ: الانفال، الآیۃ: ۱۷.

علم الٰہی میں غرق ہوتے ہیں پھر وہاں سے تر ہو کر آتے ہیں تو افعال واقوال بنتے ہیں جس سے علوم پھیلتے ہیں، جیسے قلم روشنائی میں جا کر سرنگوں ہوتا ہے سر کا غوطہ دے کر پھر جو آتا ہے تو طرح طرح کے علوم وعجائبات اس سے ظاہر ہوتے ہیں، تو اگر قلم کو دیکھ کر تم اسے مجنوں کہہ دو گے کہ کبھی اوندھا ہو کر روشنائی میں گر گیا، کبھی سیدھا ہو کر باہر آ گیا، یہ مجنوں نہیں ہے بلکہ یہ تو ہزاروں عقل مندوں کو بنانے والا ہے، تو ہمارا پیغمبر بھی ہزاروں عقل مندوں کو دنیا میں وجود دینے والا ہے، تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں جنوں ہو تو نہ علم کا پتہ رہے نہ عقل وشعور کا پتہ رہے تو عقلیں علم سے جلا پاتی ہیں، اور علم پیغمبر لے کر آتے ہیں۔

عقول کے لئے جلا بخش علوم لانے والے نبی مجنوں ہو سکتے ہیں؟...... دیہات کے اندر یہ نہیں کہ لوگ عقل مند نہیں ہوتے بلکہ دیہات میں بعض ایسے ذکی الطبع ہوتے ہیں کہ شہر والے بھی ایسے نہیں ہوتے، لیکن چونکہ تعلیم نہیں ہوتی اس لئے عقلیں کندرہ جاتی ہیں جلا نہیں پاتیں، عقلوں کو چلنے کا راستہ نہیں ملتا، تعلیم کے ذریعہ عقل کو چلنے کا راستہ ملتا ہے تو علم حقیقت میں عقل کو چلانے والا ہے یہ سارے عقلاء جو ہیں، ان کی عقلیں کُند تھیں، جب علم سامنے آیا تو گویا چلے، اور علم حضرات انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، لوگ جسے علم کہتے ہیں، وہ تخیلات اور اوہام کا مجموعہ ہے، دماغ میں کچھ پریشان خیالات آ گئے، آپ نے سمجھا عالم ہو گئے، علم وہ ہے جو پیغمبر سے منقول ہو کر آئے، اس سے عقلوں کو جلا ملتی ہے، آج یورپ والے علم نہیں رکھتے، مگر عقلیں اتنی بڑی ہیں کہ دنیا کو جگمگا رکھا ہے، مگر عقل معاد نہیں ہے، کہ انجام بینی کریں یا انجام کو سوچیں، اس لئے کہ اس علم کو قبول نہیں کیا جس سے عقلِ معاد جلا پاتی تھی، اور آخرت منکشف ہوتی تھی، غرض عقل مندوں کی عقلیں علم سے روشن ہوتی ہیں، اور علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں تو جو ہزاروں مجنونوں کو عقل مند بنا دیں اسے تم مجنوں کہتے ہو......؟ تمہاری عقل میں یہ بات نہیں آتی، تو پوری طرح سے رد کر دیا کہ تم جاہل ہو تم پہچانتے نہیں ہو کہ پیغمبر کیا ہوتے ہیں......؟ کیا کسی مجنوں کا یہ کام تھا کہ اتنی عظیم الشان کتاب لا کر پیش کر دے، کہ دنیا کے عقل مند حیران ہو جائیں، صدیاں گزر جائیں جس میں ایک شوشے کی ترمیم وتنسیخ کی گنجائش نہ ہو اتنے بڑے عجائبات اتنے بڑے علوم، اتنا بڑا دستور اور اتنا بڑا قانون پیش کر دینا کہ عقل مند مجبور ہو کر کہیں کہ اس سے زیادہ بہتر ممکن نہیں، یہ کسی مجنوں کا بنایا ہوا کلام ہے یا کسی مجنوں میں صلاحیت تھی کہ اتنا بڑا قانون دنیا کے آگے پیش کرے، اس واسطے آثار کو دیکھیں تب بھی تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ مجنونوں سے یہ آثار نمایاں نہیں ہو سکتے۔

جو خود مسلوب العقل ہیں وہ نبی کو مجنوں کہتے ہیں...... حدیث کا ذخیرہ دیکھو، اتنا عظیم عقل ودانش کا ذخیرہ ہے کہ عقلا نے سپریں ڈال دیں کہ اس سے زیادہ دانش کی باتیں نہیں ہو سکتیں اس سے زیادہ فصاحت اور بلاغت نہیں آ سکتی، جو کلام کرنے والا انتہائی فصاحت وبلاغت سے کلام کرے اور فصیح وبلیغ کلام میں وہ اصول پیش کرے کہ دنیا جھکنے پر مجبور ہو، کیا یہ مجنوں کا کام ہے کہ اتنے بڑے اصول دنیا کو دے دے؟ کروڑوں انسان اس کی راہ پر

چل کر جنت میں پہنچ گئے، تو حق تعالیٰ نے ان کی انتہادرجے کی تردید فرمادی کہ تم اتنے بیوقوف ہو کہ تمہیں اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی......؟اب اگر کوئی دن کے وقت نصف النہار پر سورج ہو اور یہ کہنے لگے کہ صاحب! اندھیرا پھیلا ہوا ہے، سورج میں روشنی کا نشان نہیں ہے تو دنیا اس کو کیا کہے گی، یہی کہے گی کہ تو اندھا ہے، ساری دنیا کو سورج نظر آرہا ہے، ہر طرف چاندنا پھیلا ہوا ہے اور تو کہتا ہے کہ نہیں ہے تو سوائے اس کے یا تو اندھا یا تو مجنوں ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ نبوت ہیں، جن کی نبوۃ کا آفتاب نصف النہار پر ہے، عرب وعجم میں پھیل گیا، اور تمہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ مان لو، بلکہ یہ کہا کہ آپ تو مجنوں ہو، ایسا ہی ہے جیسے کوئی آفتاب کے بارے میں کہہ دے کہ یہ ظلمتِ محض ہے اس میں روشنی کا کوئی نشان نہیں تو دنیا اسے مجنوں کہے گی، تو جنونی خود بن گئے ہو، اور ہمارے پیغمبر کو مجنوں کہتے ہو، عقل تم میں نہیں اور بے عقلی کا الزام ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے ہو......؟

دوسرے کو مجنوں بتلانا خود کے مجنوں ہونے کی علامت ہے......اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو زیادہ مجنوں اور بیوقوف ہو وہ یوں سمجھا کرتا ہے کہ ساری دنیا مجنوں ہے، میں ہی عقل مند ہوں، پاگل خانے میں کبھی جانے کی نوبت آئی ہو، خدا کرے نہ آئی ہو اور آئندہ بھی نہ آئے، مگر سیر وتفریح کے لئے بھی جانا پڑ جائے تو قسم قسم کے مجنوں دکھائی دیتے ہیں، بعض مجنوں نہایت سنجیدہ گفتگو کرتے ہیں، لوگ حیران ہوتے ہیں کہ انہیں کیوں پاگل خانے میں بھیج دیا یہ تو بڑی سنجیدہ باتیں کر رہے ہیں، ساری باتیں کر کے اخیر میں کہیں گے کہ دنیا ساری مجنوں ہوگئی جو مجھے مجنوں کہتی ہے حالانکہ ساری دنیا میں مجنوں ہیں، مگر میرے اندر کوئی جنون نہیں ہے، اسی میں قلعی کھول دی ، مجنوں ساری دنیا کو مجنوں سمجھتا ہے اور اپنے کو عقل مند سمجھتا ہے۔ یہی کیفیت ان مجنونوں کی ہے کہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور جو سید العاقلین ہے انہیں مجنوں بتلا رہے ہیں، یہ ان کی عقل کی بات ہے یا ان کے جنون کی بات ہے......؟اس لئے فرمایا: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ ''نٓ'' کو دیکھ لو، اس سے نبوت کی حقیقت واضح ہوگی، اس کو نبوت سے مناسبت ہے، قلم کی اور وہ جو سطور لکھتا ہے ان کی بھی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبرؐ! اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ساتھ آپ کبھی مجنون نہیں ہو سکتے یہ جھوٹے ہیں، جو تمہیں مجنوں کہہ رہے ہیں، کسی مجنوں پر یہ (وحی وعلم) کی نعمتیں اترتی ہیں؟ سب سے بڑی نعمت علم کی ہے، مجنوں کبھی علم قبول ہی نہیں کر سکتا، اور اگر پہلے تھوڑا بہت اس میں علم ہو تو بے ترتیب بیان کرے گا، نہ سر نہ پیر اس واسطے کہ عقل تو ہے ہی نہیں جو کلام مرتب کرے، تو خداوندی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت علم کی ہے وہ اللہ کی صفت ہے وہ بندے کو دی، وہ انسان کو دی جاتی ہے، علم سے ہی دنیا اور آخرت کے بھی راستے کھلتے ہیں۔ آج دنیا میں تمدن اور معاشرت کی جو جگمگاہٹ ہے یہ علم ہی کا طفیل ہے، یہ جاہلوں نے تھوڑا ہی کیا ہے، کسی گدھے گھوڑے نے تھوڑا ہی تمدن بنایا ہے۔؟ انسانوں نے بنایا اور انسانوں میں سے پاگلوں اور مجنونوں نے تھوڑا ہی بنایا عقلمندوں

نے بنایا، اور عقل مندوں میں سے انہوں نے بنایا جن کی عقلوں کو علم نے جلا دی تو یہ ساری جلوہ گری علم کی ہے، علم سے راستے نکلتے ہیں تو دنیا آپ کی بچی تو علم سے اور آخرت آپ کی بچی تو وہ بھی علم سے، تو ساری نعمتوں کا اور کمالات کا دارومدار علم کے اوپر ہے، جہالت پر نہ کبھی کوئی اچھا ثمرہ مرتب ہوا نہ قیامت تک کبھی ہوگا، غرض سب سے بڑی نعمت علم ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اللہ نے آپ کو نعمت علم دی ہے، آپ مجنون ہو سکتے ہیں؟ مجنوں سے یہ علم اترتا ہے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، مجنوں وہ ہیں جو اس علم کے قابل نہیں ہیں اور جن میں اس علم کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، تو سب سے بڑی نعمت علم ہے۔

اخلاقِ عظیم کے حامل بھی مجنون نہیں ہو سکتے...... اور اس کے بعد دوسری بڑی نعمت اخلاق ہے وہ کامل ترین اخلاق اور اعلیٰ ترین اخلاق جن سے دنیا مسخر ہو جائے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے اخلاق دیئے گئے کہ دنیا قدموں کے اوپر جھک گئی، دنیا نے ہار مان لی، اسلام اخلاق کے زور سے پھیلا، وہ اخلاقِ نبوت ہی تو تھے، تو جس ذات میں اتنے اخلاق کی نعمت بھری جائے وہ مجنوں ہو سکتا ہے؟

عملِ صالح اور دوام بھی نفی جنوں پر دال ہے...... اور تیسری نعمت عمل صالح ہے، تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ عمل صالح کرنے والا کون ہے؟ ان کا کوئی وقت عمل صالح سے خالی نہیں ہوتا، حدیث میں آپ کی شان فرمائی گئی: ''كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ'' ① آپ کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے فارغ نہیں ہوتا تھا، ہر وقت کبھی عملی ذکر، کبھی زبان کا ذکر کبھی قلب کا ذکر، کبھی دماغ کا ذکر، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل، فراست، قوتِ قلب اور قوتِ ید الغرض تمام قوتیں ذکر اللہ میں لگی رہتی ہیں اپنے اپنے مناسب عمل کرتے ہیں، دماغ سوچ بچار کا عمل کرتا ہے، قلب اخلاق کا عمل کرتا ہے، ہاتھ پیر حرکات کا عمل کرتے ہیں، نبی کا ہاتھ نبی کا قلب و دماغ سب اللہ کے عمل میں محو ہوتا ہے، ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف، تو جس کو ذکر اللہ اور عملِ صالح کی نعمت مل جائے، کیا وہ مجنون ہوتا ہے؟ یا وہ وحی اور ایسی چیزیں قبول کر سکتا ہے؟

مجنوں بھی اصلاح عالم کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟...... تو نعمتیں یہ ہیں، علم کی نعمت، عمل کی نعمت، اخلاق کی نعمت، اور اس کے بعد عظیم نعمت ''اصلاح عالم'' اور دعوۃ الی اللہ کی نعمت ہے، تو ایک ذات بابرکات نے کروڑوں کے اندر رُوح پھونک دی، کروڑوں کو صحیح راستہ پر لگا دیا، کروڑوں بچھڑے ہوؤں کو اللہ کی بارگاہ سے جا ملایا، تو یہ اصلاحِ عالم کیا مجنوں کا کام ہے۔

اِجتماعیت عالم کی نعمت مجنوں کے ذریعہ ممکن نہیں...... اس کے بعد پانچویں نعمت دیکھی جائے تو اجتماعیت عالم ہے، پورے عالم کو ایک نکتہ پر ڈال کر ساری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا، اخوت اسلامیہ پھیلا دی کہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں جہاں جہاں مسلمان ہیں، اگر وہ صحیح معنی میں مسلمان ہیں، تو وہ سب ایک دوسرے سے ملے

① الصحیح لمسلم، كِتَابُ الْحَيْضِ، بَابُ ذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِيْ حَالِ الْجَنَابَةِ وَغَيْرِهَا ج: ۱۲ ص: ۲۹۷ رقم: ۵۵۸.

ہوئے ہیں، اخوۂ اسلامی اور اسلامی برادری کا رشتہ ان کے اندر قائم ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا: ''مَثَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَرَجُلٍ وَّاحِدٍ اِذَا اشْتَكٰى عَيْنُهُ اشْتَكٰى كُلُّهُ وَاِذَا اشْتَكٰى رَأْسُهُ اشْتَكٰى كُلُّهُ'' ① سارے مسلمانوں کی مثال ایک بدن کی سی ہے، اگر اس ایک بدن میں سر میں درد ہوگا سارا بدن بے چین ہوگا، آنکھ میں کھٹک ہوگئی تو سارے بدن میں بے چینی ہوگی، انگلی میں زخم ہوگیا، سارے بدن میں بے چینی ہوگی، نیند نہیں آئے گی، زخم انگلی میں لگا ہے اور نیند آنکھ کو ختم ہوگئی، آنکھ کہہ سکتی تھی، مجھے کیا تعلق؟ زخم تو انگلی میں لگا ہے، مگر وہ بے چین ہے۔ اس لئے کہ سارے اعضا میں حیات کا رشتہ مشترک ہے، اوپر سے نیچے تک حیات پھیلی ہوئی ہے، تو ایک مادہ اشتراک کی وجہ سے بدن کا ایک جز دوسرے جز پر راحت کا ہو یا کلفت کا ہو اثر ڈالتا ہے، اسی طرح سارے مسلمان ایک جسم واحد کی طرح سے ہیں، ان میں ایمان اور اسلام کا رشتہ پھیلا ہوا ہے اگر ایک مسلمان کو مغرب میں چوٹ لگے گی تو مشرق والا مسلمان بے چین ہوگا کہیں دعا کر رہا ہے، کہیں چندے دے رہا ہے، کہیں اعانت کی فکر کر رہا ہے۔ عربوں پر، ترکوں یا مصریوں پر مصیبت آتی ہے، اور ہندوستانی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، کہیں چندے کر رہے ہیں، کہیں انجمنیں بنا رہے ہیں، کوئی کہے کہ بھائی! تمہیں کیا تعلق؟ تم ہندوستان میں وہ مصر میں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وطنیت کوئی چیز نہیں، اصل چیز اسلامیت ہے، وہ رشتہ مشترک ہے کوئی کہیں کا مسلمان ہو اسے ایذاء پہنچے ہمارے دل کو ٹھیس لگے گی، جہاں اسلامی رشتہ ہی کمزور پڑ جائے وہاں وطنیت غالب آتی ہے، پھر وہ دوسرے وطن کی رعایت نہیں کر سکتے، لیکن جہاں اسلامی اخوت غالب رہتی ہے اور وطنی جذبات مضمحل ہو کر نیچے پڑ جاتے ہیں تو مسلمانوں میں مشرق و مغرب ایک ہو جاتا ہے، یہ نعمت کس ذات کی برکت سے آئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ ایسا دین لا کر دیا کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کو ایک کر دیا، تو نعمتوں کی کوئی حد ہے؟ علم کی نعمت انتہائی، اخلاق کی نعمت دیکھیں تو انتہائی، اخلاق عمل صالح کی نعمت دیکھو تو انتہائی، عمل صالح، اصلاحِ عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، اصلاح اجتماعیت عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، غرض کون سی معنوی نعمت ہے جو انہیں نہیں دی گئی۔

عالمی سلطنت وخلافت کی عظمت نفی جنوں کی مستقل دلیل ہے...... اب ظاہری نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت سلطنت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سلطنت دی گئی کہ عالم میں اتنی بڑی سلطنت کسی کی بھی نہیں ہوئی، جہاں جہاں مسلمان نظر آ رہے ہیں یہ آپ ہی کی سلطنت ہے، آپ کے زمانہ خیر و برکت میں پورا حجاز پورا نجد اور پورا بحرین اسلامی فتوحات میں شامل ہو چکا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں دائرہ اور وسیع ہوا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شام، مصر اور تمام دوسرے ممالک تک پہنچا، حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے

---

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تراحم المسلمين وتعاطفهم وتعاضدهم ج: ۱۲ ص: ۴۷۰ رقم: ۴۶۸۷.

زمانے میں آدھی دنیا پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرانے لگا، یہ خلافتِ نبوت نے نبوت ہی کے کاموں کی تکمیل کی، تو یہ سلطنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، اگرچہ بتدریج ظاہر ہوئی، آپ حدیث میں فرماتے ہیں کہ: مجھ پر اللہ تعالیٰ نے مشرق اور مغرب سب روشن کر دیئے اور میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک میری نگاہوں نے دیکھ لیا ہے اور میں نے مشرق و مغرب کو دیکھ لیا ہے، وقت آئے گا کہ یہ امت پوری کائنات پر غالب ہوگی، اور پورے عالم میں دینِ واحد ہو جائے گا، تو سلطنت کی نعمت کو دیکھا جائے تو اتنی بڑی سلطنت کی حدِ تکمیل تک پہنچ جائے، باقی یہ سلطنت جب بھی بنتی ہے پہلے چھوٹی ہوتی ہے پھر بڑھتی ہے، پھر بڑھتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کی ابتداء مدینہ منورہ سے ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ فتح ہوا، اس کے بعد آگے کام چلا، اس کے بعد آپ کے خلفاء کی فتوحات ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں بارہ خلفاء ہوں گے۔ (1) آخری خلیفہ مہدی علیہ السلام ہیں، اور مہدی علیہ السلام کے وقت میں پورے عالم میں دینِ واحد ہو جائے گا، تو میرے خلفاء پورے عالم میں اسلام کی حقیقت کو پھیلا دیں گے، تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حکومت ہوگی، خلافت وہی کام کرتی ہے جو اصل کام کرتی ہے، تو آپ کے خلفاء کا پورے عالم میں پھیل جانا اور سلطنت قائم کر دینا یہ درحقیقت آپ ہی کی سلطنت ہے، تو علم کی جتنی بڑی نعمت تھی سلطنت کی بھی اتنی ہی بڑی نعمت آپ کو عطا کی گئی تو علم میں، عمل میں، ذکر میں اخلاق میں اجتماعیت میں اور سلطنت و خلافت میں غیر معمولی طور پر آپ کو نوازا گیا، ہر چیز میں شانِ غالبیت نمایاں ہے۔ تو اتنی نعمتوں پر فرمایا گیا کہ آپ مجنوں ہوں گے ایسی ایسی نعمتیں کیا مجنونوں کو دی جاتی ہیں، سارے عالم کی اصلاح فرماویں، سارے عالم میں علم پھیلائیں، عالم میں اخلاق پھیلائیں، کیا یہ مجنوں کا کام ہے؟ تو فرمایا: ﴿مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ﴾ اے پیغمبر! اپنے رب کی نعمتوں کے ساتھ آپ مجنوں نہیں ہو سکتے یہ نعمتیں مجنوں کے لئے آ ہی نہیں سکتیں، مجنوں وہ ہیں جو ان نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں، نہ ان کے پاس علم ہے نہ ان کے پاس عمل ہے، نہ ذکر اللہ ان کے پاس نہ اجتماعیت ان کے پاس نہ حکومت و اخوت ان کے پاس وہ مجنون ہیں نہ کہ وہ جس کے پاس یہ ساری نعمتیں ہوں۔

غرض ن شہادت میں پیش کیا، قلم کو شہادت میں پیش کیا اور جو قلم لکھے اس کو شہادت میں پیش کیا، پھر نعمتوں کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا کہ: آپ مجنون نہیں ہیں۔ تو ن اور قلم کی تو حسّی مثالیں پیش کر دیں جس سے نبی اور نبوت کو سمجھا جا سکے اور نبی کے لئے نعمتوں کی ایک جنس بتلا دی جس میں ساری نعمتیں شامل ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے نبی مجنون نہیں ہو سکتا، عیاذاً باللہ اگر نبی مجنون ہو تو پھر سارے عالم میں عقل کہیں نہیں ہو سکتی، عالم میں سارے بیوقوف ہوں گے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کی عقل ساری امتوں کے عقل کے برابر بلکہ برتر ہوتی ہے، تو حق تعالیٰ نے یہ دعویٰ فرمایا، اور ان کے دعویٰ کو رد فرمایا۔

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الامارہ، باب الناس تبع لقریش ج: ۹ ص: ۳۳۳ رقم: ۳۳۹۳.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزامات کا دفعیہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا......اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت ہے کہ اور انبیا علیہم السلام پر تہمتیں لگائی گئیں۔ انہوں نے خود اپنا دفعیہ کیا چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو قوم نے کہا کہ تمہارے اندر تو ضلالت اور گمراہی ہے تو خود فرمایا: ﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① میرے اندر ضلالت نہیں، میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول بھی کبھی گمراہ ہوتا ہے رسول تو ہدایت لے کر آتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو قوم کی طرف سے کہا گیا کہ آپ میں سفاہت اور بد عقلی ہے، انہوں نے خود دفعیہ کیا۔ ﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② مجھ میں بد عقلی نہیں میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول تو کامل العقل ہی کو کہتے ہیں، میں بد عقل کہاں؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی تہمتیں لگائی گئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں فرمایا کہ آپ اپنی مدافعت خود کرلو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود مدافعت فرمائی،، چنانچہ لوگوں نے کہا کہ آپ شاعر ہیں، تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ ③ ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھلائے اور نہ آپ کی شایانِ شان ہے کہ آپ شاعر بنیں یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں میں شاعر نہیں ہوں بلکہ خود دعویٰ فرمایا ہمارا نبی شاعر نہیں، تم لوگ جھوٹ بولتے ہو، انہوں نے کہا کہ اس نبی کے اندر گمراہی ہے، تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہمارا نبی گمراہی پر نہیں ہوسکتا، ہمارا نبی صحیح راستہ پر ہے۔ لوگوں نے کہا یہ نبی مجنون ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ آپ مجنون نہیں ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ جتنی تہمتیں قوم نے لگائیں، حق تعالیٰ نے آپ آگے بڑھ کر دفعیہ کیا کہ آپ پیچھے رہیں ہم دفعیہ کریں گے آپ کو لڑنے کی ضرورت نہیں، ہم لڑنے کے واسطے کافی ہیں، آپ ہمارا نام اونچا کیے جایئے، دعوت الی اللہ کا کام کرتے جایئے، تہمتیں جو لگائے گا، وہ خود بھگت لے گا، ہم ان سے از خود نمٹ لیں گے، آپ کو آگے آنے کی ضرورت نہیں، یہ ایک انتہائی محبت اور انتہائی خصوصیت کی بات ہے جس سے آپ کی محبوبیت واضح ہوتی ہے کہ اس درجہ حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ وہ اس میں پھانسنا ہی نہیں چاہتے کہ آپ اپنی مدافعت خود کریں یہ کام آپ ہم پر چھوڑ دیں، آپ تو ہمارا وہ کام کریں جو ہم نے آپ کو سونپا ہے، آپ ذکر اللہ میں لگیں، علم میں لگیں، عمل میں لگیں، اصلاح عالم کریں، اجتماعیت پیدا کریں، لوگ برا بھلا کہیں گے تو ہم بھگت لیں گے، چنانچہ ایک جگہ خود فرمایا ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا﴾ ④ یہ جو جھٹلانے والے ہیں انہیں اور مجھے چھوڑ دیں، آپ اپنا کام کریں، ہم ان جھٹلانے والوں سے نمٹ لیں گے۔ ﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا﴾ ⑤ اے پیغمبر! آپ مجھے چھوڑ دیں اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا اس کو چھوڑ دیں، ہم یہ نمٹتے رہیں گے آپ اپنا

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۶۱۔ ② پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۶۷۔ ③ پارہ: ۲۳، سورۃ: یٰس، الآیۃ: ۶۹۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ: المزمل، الآیۃ: ۱۱۔ ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ: المدثر، الآیۃ: ۱۱۔

کام کریں اس درجہ گویا حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ کسی چیز میں آپ کو پھانسنا نہیں چاہتے کوئی اعتراض کرے، تو خود اعتراض کا جواب دینے کے لئے آگے تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ اپنا کام کیجئے آپ ان قصوں میں نہ پڑیئے۔

محبوبِ حق اور مجنون؟......اگر آپ کو اس سے گھٹن پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا تو خود تسلی دی فرمایا: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ① آپ کو ہم نے کوتوال بنا کر تھوڑا ہی بھیجا تھا، ڈرانے والا بنا کر بھیجا تھا آپ ڈراتے رہیں، کوئی نہ مانے تو جھک مارے گا آپ غم مت کریں، ہدایت اور گمراہی ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم جس کو چاہیں گے دے دیں گے، آپ اپنا کام کریں، اور فرمایا ﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ﴾ ② آپ کہہ دیجئے مجھے وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا، مجھے تو داعی الی اللہ بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ دعوت دیں وکالت نہ کریں، کوتوالی نہ کریں، تو جب حق تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ذرہ برابر اعتراض وجواب کے اندر آپ کو پھانسیں، اس کی کفالت خود ذمہ لے لی، کہ اگر کوئی اعتراض کرے گا جواب ہم دیں گے، تو یہ انتہائی محبوبیت کی علامت ہے، اور حق تعالیٰ جسے محبوب بنائیں وہ مجنون ہوسکتا ہے؟ کیا اللہ کو مجنون ہی سے محبت ہوسکتی ہے، جبکہ وہ کمالات اور برکات وخیرات کا سرچشمہ ہے، تو اور کسی طرف جھکے گا جس کے اندر خود خیر اور برکت ہو، خیر کے اندر علم عقل اور کمال یہ ہے، جہاں عقل نہ ہو جنون ہو وہ سرچشمہ کمالات کا نہیں ہے، حق تعالیٰ اس سے محبت نہیں فرماتے اس واسطے دعویٰ دلائل کے ساتھ نہایت مبرہن ہو کر ثابت ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں ہیں۔ اب عقل مندی کے آثار کیا ہیں؟ وہ اگلی آیت میں ارشاد فرمائے گئے ہیں: ﴿وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دو الزامات لگائے تھے، ایک یہ کہ آپ مجنون ہیں اور یہ کہ معاذ اللہ آپ کی عقل اور اخلاق ٹھکانے نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے ان دونوں کا رَد کیا، دعویٰ ایک ہی تھا بعضوں کا خیال تھا کہ معاذ اللہ آپ کو جنون کی بیماری ہے جس کی وجہ سے آپ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، اور یہی الزام ہمیشہ کفار کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر لگایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں تشریف لے گئے اور توحید خداوندی اور نبوت کی دعوت دی اور آیتیں اور نشانیاں بھی بیان کیں، تو اس نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ آپ کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اس نے کہا تھا کہ ﴿إِنِّيْ لَأَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا﴾ ③ اے موسیٰ! میں سمجھتا ہوں تم پر سحر کر دیا گیا ہے، تم جادو زدہ ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿إِنِّيْ لَأَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ ④ اے فرعون! میں سمجھتا ہوں تو ہلاکت زدہ اور تباہ شدہ ہے جو ایسی بہکی بہکی اور بیہودہ باتیں کر رہا ہے کہ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ: الغاشیۃ، الآیۃ ۲۲۔ ② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۶۶۔

③ پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۱۰۱۔ ④ پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۱۰۲۔

اللہ کے نبی پر سحر زدہ اور جادو زدہ ہونے کا الزام لگا رہا ہے، جب دلیل ہاتھ میں نہیں ہوتی تو معاندین اس وقت اسی قسم کے الزامات دیا کرتے ہیں کہ یہ گمراہ ہے یا ان کو جنون ہوگیا ہے، یا ان پر کسی نے سحر کرا دیا ہے، اس لئے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جنون کا الزام لگایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کا جواب دیا کہ آپ ہرگز مجنون نہیں، اور اس پر دلیل کے طور پر چند شواہد اور آثار پیش کئے جن کی طرف ن کے لفظ سے اشارہ کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دلیلیں پیش فرمائیں جن کی طرف قلم سے اشارہ کیا کہ قلم میں جو بات ہے وہی ہمارے پیغمبر میں ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ معاذ اللہ ان کو جنون ہوگیا ہے، جنونی وہ ہیں جو ایسے دانا اور دانش مند پیغمبر کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح دلائل کی طرف نعمت کے لفظ سے اشارہ کیا تھا کہ جب ہم نے نعمتِ علم دی، نعمتِ عمل دی، نعمتِ اخلاق دی، نعمتِ اصلاح دی، اور نعمتِ تربیت دی، تو یہ مجنون کا کام نہیں ہوتا کہ وہ عالم کو تربیت دیدے، عالم کے سامنے بہترین علم وکمال کے نمونے پیش کرے، گویا مختلف قسم کے دلائل سے ان کا دعویٰ رد کر دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعقل الانبیاء علیہم السلام ہیں...... اس کے ساتھ ساتھ محض اصول سے سمجھا دینا اس وقت تک دلوں میں نہیں بیٹھتا جب تک تاریخی طور پر کچھ مثالیں بھی نہ پیش کر دی جائیں، یہ کام جنون کا نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل کا ہے، تو میں نے عرض کیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جہاں علم کامل ہوتا ہے، وہیں عقلِ کامل بھی ہوتی ہے، اور اتنی بڑی عقل کہ پوری امت کو وہ عقل میسر نہیں ہوتی، اور جنابِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری نبوتوں اور کمالات کا منتہیٰ ہیں ان کی تو عقل بھی سارے انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہونی چاہئے۔ چنانچہ وہب بن منبہ جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور کتبِ سابقہ کے بہت بڑے عالم تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ۷۱ کتابیں سابقہ انبیاء علیہم السلام کی پڑھی ہیں اور ساری کتابیں پڑھ کر میں نے ایک نتیجہ نکالا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب عقل پیدا کی تو اس کے سو حصے کئے، ایک حصہ پورے عالم کو دیا اور ۹۹ حصے تنہا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے، تو جلیل القدر تابعی ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک سارے انبیاء اور اولیاء اگلے پچھلے ان سب سے زیادہ اکمل اور اعلیٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی فیصلے سے سردارانِ عرب کی تلواریں میان میں چلی گئیں......

چنانچہ حضور علیہ السلام کی عقل مبارک پر بھی مختلف کتابیں لکھی گئیں، ایک تو آپ کا وحی کا علم ہے، وہ تو اپنی جگہ مسلّمہ ہے، اس کے لئے قرآن کریم اور حدیث پاک سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن جہاں تک آپ کی عقل مبارک کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی کتابیں لکھی گئیں، اور ایسے واقعات درج کئے گئے ہیں کہ آپ نے کیسے کیسے فیصلے محض عقل مندی سے فرمائے، اور کتنے بڑے بڑے جھگڑوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹوں میں سلجھا دیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی، جوانی کا زمانہ

تھا، اور نبوت ملنے میں بھی ابھی پندرہ برس باقی تھے، تو اس وقت مکہ مکرمہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں ایک بہت بڑا اسیلاب آیا، اور مکہ مکرمہ چونکہ نشیب میں ہے تو اِدھر اُدھر کا پانی جمع ہو کر حرم شریف میں جمع ہو گیا، جس کی وجہ سے بیت اللہ شریف کی دیواروں میں شق پڑ گئے، حجر اسود اپنی جگہ سے ہل گیا، اور قریب تھا کہ پوری عمارت گر جاتی، سیلاب جب ہٹ گیا اور قریش نے مشورہ کیا کہ بیت اللہ شریف کو از سرِ نو بنانا چاہئے اور ساتھ میں مشورہ میں یہ بھی طے پایا کہ یہ اللہ کے گھر کی عمارت ہے، اور ہم لوگ ڈکیتیاں بھی ڈالتے ہیں، غصب بھی کرتے ہیں، لوٹ مار بھی کرتے ہیں تو ناجائز مال اس پاک عمارت میں نہیں لگنا چاہئے، اس لئے ہر ایک اپنی دانست میں جو اس کی بہت ہی حلال کمائی ہو اس میں سے روپیہ دے، لوٹ مار یا ناجائز مال کا اس میں کوئی دخل نہ ہو، چنانچہ چندہ کیا گیا، وہ اتنا نہیں تھا کہ پورے بیت اللہ شریف کو بنائے ابراہیمی پر قائم کر دے، اس میں زیادہ مال لگتا تھا، اس لئے حطیم کا حصہ چھوڑ دیا گیا، وہ اگرچہ بیت اللہ کا جُز ہے، مگر تعمیر میں ہم اس کو نہیں لا سکتے، اتنا پیسہ ہمارے پاس نہیں ہے، بہر حال تعمیر شروع ہوئی، اس کا واقعہ تو طویل ہے کہ کس انداز سے تعمیر کرتے تھے، تعمیر جب قدِ آدم کے قریب پہنچی اور حجرِ اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا معاملہ پیش آیا تو یہ ایک بہت بڑی فضیلت تھی کہ حجر اسود کس کے ہاتھ سے رکھا جائے اس لئے کہ جو بھی اس کو وہاں رکھ دیتا، تاریخ میں قیامت تک اس کا نام رہتا، تو قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ میں اس کا مستحق ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں مستحق ہوں، غرض اس میں تکرار شروع ہوئی، اور اس درجے تک بات پہنچی کہ تلواریں نکل آئیں اور بیت اللہ کی تعمیر رک گئی، اور اس پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ پر کون رکھے؟

جھگڑا کرنا اور لڑنا یہ اہل عرب کی سرشت میں تھا، بہادر لوگ تھے، کوئی تھوڑی سی رنجش ہوتی تھی، وہ باتوں میں آ کر ایک جنگ کی صورت اختیار کر جاتی تھی، چنانچہ یہاں تلواریں کھنچ گئیں اور قریب تھا کہ کشت وخون شروع ہو جائے، تو ایسے میں ابوسفیان نے کہا کہ: بھائی لڑو مت اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہاتھ کو روک لو، اور کل صبح کو یہاں جمع ہو جاؤ سب سے پہلے جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ جو فیصلہ کر دے اس پر راضی ہو جاؤ، خواہ کسی سردار کے حق میں بھی فیصلہ کر دے۔ اس پر سب آمادہ ہو گئے، چنانچہ جب جمع ہوئے تو انتظار شروع ہوا کہ جو داخل ہو وہ فیصلہ کر دے، تو سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے، سب ایک دم چلا پڑے کہ جَاءَ مُحَمَّدُ نِ الْاَمِيْنُ محمد امانت والے آ گئے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ وہ نوجوان ہے کہ ان کی عقل پر سب کو اطمینان اور اعتماد ہے اور قریش میں اتنا بڑا دانش مند کوئی پیدا نہیں ہوا، جتنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یہ حق فیصلہ کریں گے۔ جس سردار کو یہ کہیں گے وہ سردار حجر اسود رکھے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سردارانِ قریش نے آ کر معاملہ پیش کیا، اور کوئی سردار اس پر تیار نہیں کہ وہ اس فضیلت سے پیچھے ہٹے ہر ایک چاہتا ہے کہ میں حجر اسود رکھوں، اور اپنی اپنی وجوہِ استحقاق بھی بیان کر رہا ہے۔

آپ نے معاملہ سن کرایسا عجیب وغریب فیصلہ فرمایا کہ حجرِ اسود کوخود اپنے دست مبارک سے رکھا، اور سب کو رسمی شریک کرلیا، کسی کولڑنے کا موقعہ نہیں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک بچھادی اور حجراسوداس کے اوپر رکھ دیا اورفرمایا سارے سردارمل کراس چادر کواٹھائیں، سب نے مل کراٹھایا، گویا اٹھانے میں سب شریک ہوگئے، اس کے بعدفرمایا تم سب مل کر مجھے وکیل بنادو کہ میں تم سب کی طرف سے اٹھا کررکھ دوں، سب نے وکیل بنادیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھا کر حجراسود رکھ دیا، تو ان پاک ہاتھوں سے پتھر رکھا گیا جو حقیقۃً مستحق تھے، اور سب کی وکالت جو کی تو سب کے سب شریک ہوگئے، سب راضی ہوگئے لڑائی جھگڑا سب ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ آپ نے دانش سے ہی فرمایا تھا، اس وقت وحی کا تو قصہ ہی نہیں تھا، نبوت ملنے میں پندرہ برس باقی تھے، تو یہ محض کمالِ عقل سے فیصلہ تھا، تو اتنے بڑے بڑے سرداران اور دانش مندوں کا مجمع تھا، سارے مل کر وہ مسئلہ نہ سلجھا سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں سلجھا دیا، اور سب کو شریک کرکے خود ان کے سردار بن گئے، اور ان کو اپنے تابع کرلیا، لڑائی کا موقع نہ آیا، محض عقل ودانش سے یہ فیصلہ فرمایا تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل ودانش کا اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بڑی عقلِ مبارک تھی کہ سب بڑے بڑے دانش مندوں کی لڑائی اور جھگڑے کو آپ نے سلجھادیا، یہ ایک واقعہ ہے۔

دوسرا عقلی فیصلہ...... ایک واقعہ اور یہ پیش آیا کہ ایک شخص کے بھائی کو کسی نے قتل کردیا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا کہ کسی نے میرے حقیقی بھائی کو قتل کردیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ دِیّت لے لے، یعنی قاتل سے اتنا مال لے لے جتنا ایک نفس کا بدل ہوا کرتا ہے، تو اس زمانے میں سواونٹ ایک نفس کے بدلے میں دیئے جاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو دیت اور خون بہالے لے اس نے کہا میں اس پر تیار نہیں، فرمایا پھر معاف کردے اس نے کہا میں اس کے لئے بھی تیار نہیں، فرمایا پھر قاتل کو قتل کردے، یہ تجھے حق حاصل ہے، وہ اس پر راضی ہوگیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ قتل ہو، مگر اس کا یہ قانونی حق تھا، کیونکہ وہ نہ دیت لینے پر آمادہ تھا نہ معاف کرنا چاہتا تھا، تو تیسری صورت یہی تھی کہ قاتل کو قصاصاً قتل کردیا جائے تو وہ تلوار لے کر اس کو قتل کرنے چلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشادفرمایا کہ یہ قتل کرکے ایسا ہی ہوگا جیسا قاتل ہے، قاتل کے اوپر یہ ناراض ہے اس لئے کہ اس نے قتل کیا، جب یہ قتل کرے گا یہ بھی ویسا ہی ہوجائے گا، لوگوں نے اس کے کانوں میں ڈال دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ تونے اگر قتل کیا تو تو بھی قاتل کے درجے میں ہوجائے گا، ایک فعل بد اس نے کیا ایک تو کرے گا۔ اس نے کہا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں، اور میں قتل کرکے قاتل کے زمرے میں شامل ہوجاؤں گا، اس نے کہا میں خدا کے واسطے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کردیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، آپ نے فرمایا: میرا مطلب یہ تھا کہ قتل کرنے والا وہ قاتل ہی جیسا ہوگا، یہ مطلب نہیں تھا کہ جیسا وہ گناہ گار ہے ویسا تو

بھی ہو جائے گا، اس نے اگر قتل کیا تو گناہ کیا، تو جب قصاص میں قتل کرتا ہے تو گناہ گار نہیں، مگر قتل کرنے والے کے مشابہہ ہو جائے گا تو میری مراد صرف یہ تھی کہ تو مشابہہ ہو جائے گا، یہ نہیں تھی کہ تو گنہگار بھی ہوگا، مگر اب معاف کر چکا تھا، اس لئے قاتل بچ گیا، تو آپ نے ایک جملہ سے اس کو بچا لیا، اور بچایا بھی اس طرح کے اس کی رضا مندی بھی شامل ہوگئی، اس لئے کہ وہ مقتول کا وارث تھا، اس لئے اگر وہ معاف نہ کرتا تو بچنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قتل نہ ہوتا، تو اُسے قتل سے بھی بچا دیا، اور دوسرے کو معافی بھی دِلا دی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء بھی پورا ہو گیا کہ وہ قتل نہ ہو۔ تو ایک جملہ بول کر کتنی چیزیں فائدے کی حاصل کیں، کہ اس کو قتل ہونے سے بچا لیا، دوسرے کو معافی دلا دی، آپ کا منشاء مبارک بھی پورا ہو گیا، یہ گویا دوسرا واقعہ ہے۔

تیسرا عقلی فیصلہ...... تیسرا واقعہ یہ ہے کہ غزوہ بدر کے اندر کفار کا لشکر پہاڑی کے اس طرف تھا، اور مسلمانوں کا لشکر ادھر تھا، کفار کا لشکر ایک ہزار سے کچھ زائد افراد پر مشتمل تھا، اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے، کفار کے پاس سواریاں گھوڑے وغیرہ سب کچھ تھا اور مسلمانوں کی ابتدائی حالت تھی، نہ دولت پاس تھی نہ پیسہ تھا نہ کیل کانٹے سے لیس تھے، بس دین اور جہاد کا جوش تھا، تو یہاں سامان کچھ نہیں تھا، چند گھوڑے چند اونٹ، باقی سب پیدل، تلواریں بھی با قاعدہ نہ تھیں، کسی کے پاس تلوار اور کسی کے پاس خنجر اور کسی کے پاس نیزہ، با قاعدہ اگر کوئی چیز وہاں تھی وہ جوش ایمانی کی چیز تھی، سامان کوئی با قاعدہ نہیں تھا، اس بے سروسامانی میں اللہ والوں کا یہ مختصر قافلہ ایک طرف تھا، اور وہ دشمنانِ خدا پوری طرح کیل کانٹے سے لیس دوسری طرف تھے، مشرکین کی فوج کا کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کرام کی طرف آ نکلا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسے پکڑ لیا اور اس کو پوچھنا شروع کیا کہ بتاؤ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں، تاکہ ہم اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں، اس نے کہا وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بھاری جمعیت اور اکثریت ہے یہ رعب ڈالنے کے لئے اس نے کہا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین عدد پوچھنا چاہتے تھے، وہ عدد بتاتا نہیں تھا، اس پر دباؤ ڈالا سختی کی کہ کسی طرح سے یہ بتلا دے کہ کفار کے لشکر کی کتنی تعداد ہے مگر وہ بھی پکا آدمی تھا، بول کے نہیں دیا، اور یہ کہتا رہا۔ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بڑی جمعیت اور بڑا ساز و سامان ہے، تاکہ مسلمانوں کو مرعوب کر دے، اس میں جب ذرا آوازیں بلند ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا: کیسا شور ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی ادھر آ پھنسا ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ دشمن کی تعداد معلوم کریں اور وہ بتاتا نہیں۔ ارشاد فرمایا چھوڑ دو، کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کیا ہے، اسے چھوڑ دیا، وہ بھی بے چارہ ممنون ہوا، ورنہ اسے اندیشہ تھا کہ قتل کر دیتے اور جائز بھی تھا اس لئے کہ دشمن کا آدمی تھا اور مباح الدم تھا، اس کو جنگ میں قتل کر دو یا ویسے قتل کرو، دونوں طرح جائز تھا اس لئے کہ وہ اسلام کا مدِّ مقابل تھا تو چھوٹنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ادھر ادھر کی ایک دو بات کر کے فرمایا: تمہارے لشکر میں روز کتنے اونٹ میں ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں، فرمایا معلوم ہو گیا ہزار آدمی ہیں اس لئے کہ ایک اونٹ

سو آدمی عادۃً کھانا کھا سکتے ہیں، تو نہ کوئی جھگڑا ہوا نہ کوئی قصہ ہوا، اسی سے کہلوا دیا کہ ایک ہزار کی جمعیت ہے، صحابہ بھی خوش ہو گئے، تعداد بھی معلوم ہو گئی اور اسے چھوڑ دیا کہ اس پر احسان بھی ہوا کہ جا اپنے لشکر میں بھاگ جا اور یہ اثر لے کر گیا کہ مسلمان کریم النفس ہیں کہ دشمن آدمی قبضے میں آجائے پھر بھی اس کے ساتھ عنایت کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کریمانہ اثر مان کر وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا، اب اس نے وہاں جا کر جو کچھ بھی کہا ہوگا بہرحال اس کی جان بچ گئی، لشکر کی تعداد بھی معلوم ہو گئی، کوئی جھگڑا اور سختی بھی نہ ہوئی یہ محض دانش مندی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم فرمایا، وحی کے ذریعہ سے علم نہیں بھیجا گیا تھا، تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی دانش وری بڑی ہوتی ہے اور وہ منٹوں میں اپنی دانش سے فیصلے کر لیتے ہیں۔

چوتھا عقلی فیصلہ...... چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر آئیں ایک بچے پر دو عورتوں کی لڑائی تھی، ایک کہتی تھی میرا بچہ ہے دوسری کہتی تھی میرا بچہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کچھ قرائن سے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا کہ بچہ اس کا ہے، جب وہ چلنے لگی تو چھوٹی عورت راضی نہ ہوئی جس کا واقعی میں بچہ تھا، اس نے کہا ہم سلیمان علیہ السلام سے فیصلہ کرائیں گے ان کے فیصلے زیادہ دانش مندانہ ہوتے ہیں، تو دونوں وہاں حاضر ہوئیں، اور وہی دعویٰ پیش کیا اور بڑی نے کہا کہ لکھئے حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ بھی کر دیا کہ میرا بچہ ہے، مگر چھوٹی کا اصرار تھا کہ میرا بچہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقت میں کس کا بچہ ہے تو اس کی ایک تدبیر اختیار فرمائی، فرمایا ایک چھری منگواؤ بچے کو کاٹ کر آدھا آدھا تقسیم کر دو، چھری کا نام سنتے ہی تو بڑی عورت پر اس کا کوئی زیادہ اثر نہ ہوا اس لئے کہ اس کا بچہ نہیں تھا، مگر چھوٹی تلملا گئی اس نے کہا آپ اسے قتل نہ کریں، اسے ہی دے دیں، یہ زندہ رہے گا تو میں کبھی کبھی دیکھ تو لیا کروں گی، تو بڑی پر اثر نہ ہوا، اور چھوٹی کی اس کیفیت سے اندازہ ہو گیا کہ چھوٹی اس کی ماں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بچہ اسے دے دیا اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیا، یہ محض دانش مندی سے فیصلہ کیا، ایک ایسی تدبیر فرمائی اور ایسا جملہ کہہ دیا کہ چہرے سے معلوم ہو گیا کہ یہ ماں ہے اور یہ ماں نہیں ہے، ماں کا چہرہ بتلا دیتا ہے کہ واقعی میں اس کی اولاد ہے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کو جیسے کمالِ علم دیا جاتا ہے ویسے ہی کمالِ عقل بھی دی جاتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، تو جتنی بڑی نبوت ہے، اتنی بڑی عقل بھی ہونی چاہئے۔

عقل علم کے لئے اور طبیعت عمل کے لئے محل نزول ہے...... اس لئے کہ انسان میں دو چیزیں ہوتی ہیں عقل اور طبیعت، یہ دو طبعی چیزیں ہیں جو انسان میں پیدائشی ہیں، علم جتنا اترتا ہے وہ انسان کی عقل پر اترتا ہے، وہ اسے قبول کرتی ہے، تو جتنی بڑی عقل ہوتی ہے، اتنا ہی علم بڑا ہو کر پھیل جاتا ہے، وہی علم اگر کسی بیوقوف کے اوپر پیش کیا جائے تو ذرّہ برابر نہ وہ پھیلے گا نہ اس کے دل میں جمے گا اس لئے کہ علم کے لینے والی طاقت وہ عقل ہے، وہ اس میں نہیں ہے غرض عقل پر تو علم اترتا ہے، اور طبیعت پر عمل اترتا ہے، اس لئے کہ طبیعت کے جذبات

ہیں، طبیعت میں سوجھ بوجھ نہیں ہے جذباتی چیز ہے، جذبے سے عمل کرتی ہے، نہ وہاں دلیل کا دخل ہوتا ہے نہ سوجھ بوجھ کا۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو کیا آپ دلیلوں سے بھوک لگاتے ہیں کہ کچھ دلائل قائم کریں کہ مجھے بھوک لگنی چاہئے اور بھوک لگ گئی، ہزار دلیلیں آپ قائم کریں کہ بھوک نہ لگے مگر وہ ایک طبعی جذبہ ہے وہ تو لگ کے رہے گی تو بھوک عقل سے نہیں آتی وہ طبعی جذبے سے آتی ہے، پیاس طبعی جذبے سے آتی ہے، آدمی استنجا کرنے طبعی جذبے سے جاتا ہے، یہ نہیں کہ پہلے دلائل قائم کرتا ہے کہ مجھے اب عقلاً استنجاء کے لئے جانا چاہئے، اور اتنا وقت مجھے لگانا چاہئے، اور اگر دلیل میں کچھ خلل ہو گیا تو بیٹھ گئے کہ ابھی دلیل مکمل نہیں ہوئی اس لئے مجھے ٹھہر جانا چاہئے، تو استنجاء کے لئے جانے پر آپ ہزار دلیلیں قائم کریں، مگر وہ طبعی جذبہ ہے، وہ تو اندر سے جذبہ اٹھے گا، تو طبیعت کے اندر عقل، شعور اور سمجھ نہیں ہے، اس کے اندر جذبات ہیں، اور عمل کے لئے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، اگر جذبہ نہ ہو تو آدمی عمل نہیں کر سکتا، تو اللہ نے طبیعت کو عمل کی دلیل بنایا ہے اور عقل کو علم کی دلیل بنایا ہے، طبیعت پر عمل اترتا ہے اور عقل راستہ بتلاتی ہے کہ اس جذبے کو یوں استعمال کرو، تو دو چیزیں ہوتی ہیں ایک عقل اور ایک طبع، تو نبی کی عقل بھی تمام امت کی عقل سے زیادہ کامل ہونی چاہئے تاکہ اتنا بڑا علم اس کے اوپر اُتر سکے جس سے پوری امت کی تربیت ہو، اور طبیعت اتنی مضبوط ہونی چاہئے کہ بڑے سے بڑا عمل سامنے آئے تو کوئی رکاوٹ اور تامل نہ ہو، جذبہ اتنا صادق اور قوی ہو کہ بڑے سے بڑا عمل کر گذرے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی قویٰ بھی تمام امت کے قوی سے افضل اور اونچے تھے، اور عقلی قویٰ بھی تمام امت کے قویٰ سے افضل اور اونچے تھے، انہی قویٰ عقلیہ کے اوپر اتنا اونچا علم اترا جس سے پورے عالم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت فرمائی۔

پڑوسی کی ایذاء رسانی سے تحفظ کی عقلی تدبیر...... اسی میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ایک شخص کا پڑوسی تھا، اور وہ بہت تنگ کرتا تھا، تکلیفیں پہنچاتا تھا ایذائیں دیتا تھا، اس شخص نے خوشامدیں کیں، اور منتیں بھی کیں اور کہا خدا کے لئے مجھے مت ستا، میں نہ تجھے تکلیف دیتا ہوں نہ ستاتا ہوں اپنے گھر میں رہتا ہوں، مگر وہ باز نہیں آتا تھا، ہر قدم کے اوپر تکلیف کا سامان اور ایذاء رسانی زبان سے عمل سے، غرض یہ شخص عاجز آ گیا اور شکایت لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ یا رسول اللہ! پڑوسی نے مجھے عاجز کر دیا ہے، میں نے منت سماجت اور خوشامد میں کسر نہیں چھوڑی، لیکن وہ ایسی گندی طبیعت کا آدمی ہے کہ بس ستائے جاتا ہے باز نہیں آتا، میں کیا کروں؟ آپ نے تدبیر بتلائی، فرمایا سارا سامان نکال کر اور عورتوں بچوں کو نکال کر گھر کے سامنے بٹھلا دے، اور گھر خالی کر دے، اگر کوئی آ کر پوچھے کہ بھائی! تمہارا گھر موجود ہے، یہ سڑک پہ سامان کیوں ڈالا؟ بیوی بچوں کو سڑک پہ کیوں بٹھایا؟ تو کہہ دینا کہ پڑوسی ستاتا تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! گھر چھوڑ کر سڑک کے اوپر بیٹھ جا۔ اس نے جا کر یہی کیا، سارا سامان لے کر سڑک پہ رکھ دیا، بیوی بچوں کو لا کر بٹھا دیا، اب لوگ آئے کہ بھائی! تمہارا تو گھر موجود ہے سڑک پہ کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا کیا کروں پڑوسی

ستاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھر چھوڑ دے، سڑک کے اوپر بیٹھ جا، لوگوں نے کہا اس مردود کے اوپر لعنت ہے، اس کے بعد ایک دوسری جماعت آئی کہ بھائی کیوں باہر بیٹھے ہو؟ اس نے کہا پڑوسی ستاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باہر بیٹھ جا، انہوں نے کہا لعنت ہے اس مردود کے اوپر، اب جو جماعت آرہی ہے، صبح سے شام تک لعنت لعنت اور سارے مدینہ میں لعنت لعنت کا شور ہوا، اور ہر گھر میں اس پر لعنت چلی آرہی ہے، وہ پڑوسی بے چارہ عاجز آگیا اس نے آکر ہاتھ جوڑے کہ اللہ کے واسطے تو گھر چل میں عہد کرتا ہوں کہ قیامت تک تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا، اس نے کہا نہیں بھائی! میں نہیں جانا چاہتا، مگر وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ اللہ کے واسطے چل، تو نے تو مجھے ملعون بنا دیا، ساری دنیا کی زبان پر لعنت لعنت آگیا، غرض زبردستی اس کا سامان لے جا کر رکھا، جگہ جگہ قرینے سے لگایا، اور عہد کیا کہ میں عمر بھر کبھی نہیں ستاؤں گا، چنانچہ پھر کبھی نہیں ستایا بلکہ خادم بن کے رہا، یہ تدبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے نہیں فرمائی تھی بلکہ عقل و دانش سے تدبیر فرمائی پڑوسی بھی تائب ہو گیا ، برائیوں سے بچ گیا گھر والا اپنے گھر میں آباد ہو گیا، اور اسے سزا بھی ایسی مل گئی کہ عمر بھر اس نے کبھی ایسی سزا نہ دیکھی ہوگی کہ ساری زبانوں پر ملعون بن گیا، یہ دانش کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا، کہ گھر مالک سے آباد ہو گیا، اور پڑوسی خادم بن گیا، اس کی بد عادتیں چھوٹ گئیں تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ تدابیر ایسی فرماتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم سے بھی توبہ کرے اور ساتھ میں جو صاحبِ حق ہے اس کا کام بھی بن جائے۔ اسی طرح جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے علم و عقل اور عمل میں زیادہ رتبہ والے ہوتے ہیں، ان میں بھی یہی عقل کامل آتی ہے جس سے وہ فیصلے کرتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''کتاب الاذکیا'' ہے یعنی جو بڑے بڑے اذکیاء گزرے ہیں ان کی ذکاوت اور ذہانت کے واقعات کہ عقل سے انہوں نے کیا کیا کام کئے اور ان کے مقولے لکھے ہیں۔

مجموعہ عالم کے لئے حماقت بھی نعمت ہے...... اسی طرح ایک ''کتاب الحمقاء'' لکھی ہے کتاب الاذکیاء میں دانش مندوں کے واقعات جمع کئے ہیں اور کتاب الحمقاء میں بے وقوفوں کے واقعات جمع کئے ہیں اس لئے کہ جب تک بے وقوفوں کی بے وقوفیاں نہ معلوم ہوں دانش مندوں کی دانشمندی نہیں کھلتی وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ ایک ضد سے ہی دوسری ضد پہچانی جاتی ہے۔ اگر دنیا میں بے وقوف نہ ہوتے تو عقل مندوں کی عقل کبھی نمایاں نہ ہوتی، تو حقیقت میں بے وقوفوں کا وجود بھی دنیا میں بہت غنیمت ہے، خدا انہیں سلامت رکھے اگر یہ بیوقوفی نہ کریں تو عقل نہیں کھل سکتی، تو جہاں مجموعہ عالم کے لئے عقل نعمت ہے، وہاں حماقت بھی نعمت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں پارٹیاں پیدا کیں، ذہینوں کی بھی اور بلیدوں کی بھی، ذکیوں کی بھی اور احمقوں کی بھی دونوں کا ٹکراؤ رہتا ہے اور دونوں کے ٹکراؤ سے حقیقت کھلتی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلندی عقل...... امام ابو حنیفہؒ ان کی دانش مشہور ہے، اور تمام علماء کرام ان کی

عقل ودانش کے قائل تھے،علم تو تھا ہی مگر عقل بھی بہت اونچی تھی ،ایک دفعہ دمشق کی جامع مسجد میں امام ابی حنیفہؒ نے نماز پڑھی ،سلام پھیرا تو ایک ہجوم ان کے ارد گرد آ گیا،کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی مصافحہ کر رہا ہے،امام مالکؒ ایک طرف کھڑے ہوئے تھے ،ساری مخلوق امام ابی حنیفہؒ پر جھک گئی ،ایک شخص نے امام مالکؒ سے پوچھا یہ کون شخص ہے کہ ساری دنیا اس پر گر رہی ہے،اور اس پر جھکی جا رہی ہے،اور نثار ہونا چاہتی ہے،کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی پاؤں پڑ رہا ہے،امام صاحبؒ نکلنا چاہتے ہیں مگر لوگ نکلنے نہیں دیتے ہر طرف بے شمار آدمی ہیں؟

امام مالکؒ نے فرمایا تو نہیں جانتا یہ کون شخص ہے؟اس نے کہا میں تو واقف نہیں ،ارشاد فرمایا یہ وہ شخص ہے اگر جامع دمشق کے اس پتھر کے ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو ثابت کر دے گا اور دنیا ماننے پر مجبور ہوگی کہ یہ واقعی سونے کا ہے، یہ ایسا شخص ہے۔اس لئے امام صاحبؒ کے عجیب عجیب واقعات ہیں، جو دانش مندی سے انہوں نے طے فرمائے ، جھگڑے یا مقدمات تھے،ان میں مسئلہ سے باہر نہیں نکلے مگر عقل ودانش سے معاملات کا فیصلہ فرما دیا۔ چنانچہ ایک شخص کی اپنی بیوی سے کچھ لڑائی رہتی تھی، آپس میں دونوں کی بنتی نہیں تھی ، بیوی خاوند کو منہ لگانا نہیں چاہتی تھی خاوند اس پر سو جان سے عاشق تھا مگر کچھ مزاج سے بھی مجبور تھا،اس لئے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی ،تو ایک دن دونوں چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے ،بات چیت ہو رہی تھی تو اس نے کوئی جملہ ایسا کہہ دیا جس سے عورت کا دل دکھا اور وہ صدمے کی وجہ سے چپکی ہو کے بیٹھ گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس نے ہر چند کہا کہ بولتی کیوں نہیں؟اب وہ بولتی نہیں،اس نے کہا اگر صبح کی اذان سے پہلے نہ بولی تو تیرے اوپر طلاق، وہ تو بولنا نہیں چاہتی تھی ، خاوند بلوانا چاہتا تھا،وہ چپ بیٹھی تھی،اس نے کہا اچھا چپ بیٹھی رہ،اگر تو صبح سے پہلے نہ بولی ،اسی طرح ثابت رہی صبح کی اذان تک تو تیرے اوپر طلاق۔عورت کے ہاتھ میں بات آ گئی اس نے سوچ لیا کہ اب میں صبح کی اذان تک بولوں گی نہیں، تا کہ میں مطلقہ ہو جاؤں اور اس کے پنجے سے چھوٹوں۔اب یہ بے چارہ کہہ تو گذرا،مگر یہ اب اور زیادہ چپ ہو کر بیٹھ گئی، خاوند نے کہا اگر واقعی یہ نہ بولی اور اذان ہوگئی ،تو یہ ہاتھ سے نکل جائے گی اس نے منتیں کی اور ہاتھ جوڑے ،مگر اس نے کہا اب تو بات قبضے میں آ گئی ،الغرض خاوند نے منتیں کیں خوشامدیں کیں جب کسی طرح راضی نہ ہوئی اور مایوس ہو گیا کہ صبح کی اذان ہوئی اور یہ میرے ہاتھ سے نکلی،تو علماء کا دروازہ جھانکنا شروع کیا اور آئمہ فتویٰ کے گھروں پہ آیا کہ یہ صورت ہو گئی ہے،انہوں نے کہا بہر حال اگر وہ بول پڑی تو تیرے قبضے میں رہے گی ورنہ تیرے قبضے سے نکل جائے گی ، وہ بہت بے چارہ حیران ہوا اور اب اسے یقین ہو گیا کہ بیوی میرے ہاتھ سے گئی ،آخر امام ابی حنیفہؒ کے پاس پہنچا،حضرت یہ قصہ ہے اور میں خود اپنے قول کی وجہ سے مبتلا ہو گیا، میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر تو صبح کی اذان تک چپ رہی تو تیرے اوپر طلاق ہے وہ تو چپ ہو کر بیٹھ گئی تو طلاق پڑ جائے گی ،فرمایا کہ طلاق نہیں پڑے گی ، جا اپنے گھر جا کے آرام کر،اور گھر والی کو بولنے پر آمادہ کر،لیکن اگر نہ بھی بولی تو بھی طلاق نہیں پڑے گی ،اس نے کہا کیسے نہیں پڑے گی ،فرمایا تو جا، جا کر بلوانے کی کوشش کر، وہ پھر گھر

آیا،اس نے ہر چند منتیں کیں، گد گدیاں اٹھائیں،ہنسی میں کہا،مگر وہ عزم کر کے بیٹھی ہوئی ہے کہ میں اب نہیں بولوں گی اور مجھے طلاق ہو جائے گی،اور فرمایا تھا کہ جاگتے رہنا،اور کوشش جاری رکھ شاید بول پڑے۔امام ابوحنیفہؒ چلے رات کے تین بجے ہوں گے اور مسجد میں آ کر اذان دے دی،وہ سمجھی کہ صبح کی اذان ہے،اس نے کہا دیکھا اذان ہوگئی ہے اب میں تجھ سے جدا ہوگئی ہوں،اب یہ بے چارہ حیران کہ طلاق تو ہوگئی،مگر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھئی غلطی ہوگئی کہ یہ صبح کی اذان نہیں تھی یہ تہجد کی اذان تھی،اب یہ بے چاری پچھتائی تو امام صاحبؒ نے دانش مندی سے ان کی بیوی بچادی،یہ مسئلہ کی بات نہیں تھی،یہ دانش مندی اور عقل مندی کی بات تھی،اسی بات کو مسئلہ کے اندر لیا،مسئلہ سے باہر نہیں ہوئے مگر فضا ایسی پیدا کر دی کہ طلاق سے بچ جائے۔

حضرات اہل اللہ عقل میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں......تو جیسے حضرات اہل اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں خلیفہ ہوتے ہیں ویسے ہی عقل ودانش میں بھی خلیفہ ہوتے ہیں،امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں ایک شخص حاضر ہوا کرتا تھا،ایک روز مجلس میں رو رہا تھا،ایک دن وہ اپنے گھر جا کر سویا،مال دار آدمی تھا،تو رات کو گھر چور آ گئے،سارا مال واسباب انہوں نے سمیٹنا شروع کیا،تو یہ پڑا ہوا دیکھتا رہا،چور بہت تھے،یہ تنہا تھا،لیکن جب سارا مال واسباب سمیٹ کر جانے لگے تو اس نے کچھ ایسی حرکت کی وہ سمجھ گئے کہ یہ جاگ رہا ہے،چوروں نے مال واسباب کو چھوڑا اور آ کر اس کے گلے پر چھری رکھی،اور کہا خبردار جو بولا،اب یہ بے چارہ جان بچانے کی خاطر دب گیا،ورنہ چلاتا تو شور ہوتا،محلّہ والے جمع ہو جاتے چور پکڑے جاتے،مگر چوروں نے زبردستی اس کو چپکا کرا دیا،اس کے منہ میں روئی وغیرہ دے دی اور مال بٹورتے رہے،ہاتھ پیر اس کے باندھ دیئے،جب یہ جانے لگے تو چوروں کو یہ فکر ہوئی کہ جب صبح ہوگی تو آ کر اس کے منہ سے کوئی تو روئی نکالے گا،یہ ہمیں پہچان چکا،ہیں تو ہم محلّہ ہی کے،اور صبح یہ خبر دے گا بات وہیں کی وہیں رہی پھر پکڑے گئے،تو کسی نے کہا اسے قتل کر دو،تو کہا کہ چوری کا جرم تو کیا ہے قتل ناحق کا بھی جرم سر لو،یہ صحیح نہیں۔اس زمانے کے چور بھی آدھے مولوی تھے،اس لئے کہ فقہاء کا دور تھا،تو انہوں نے آ کر اسے یہ کہا کہ تو اس بات کا عہد کر کہ ہمارا پتہ نشان کسی کو نہیں بتلائے گا،اس نے جان بچانے کی خاطر عہد کیا،مگر چوروں کو یہ شبہ تھا کہ اس نے عہد تو کر لیا،لیکن اگر یہ عہد شکنی کرے پکڑے تو پھر بھی جائیں گے،کسی ایسے انداز سے باندھ دو کہ یہ ہمارا پتہ نہ دے سکے،تو چوروں نے یہ کہا کہ تو طلاقِ مغلظہ کی قسم کھا کہ:اگر میں نے تمہارا کسی کو پتہ دیا تو میری بیوی کو تین طلاق۔اس نے جان بچانے کے لئے طلاقِ مغلظہ کا حلف اٹھا لیا،اب چور مطمئن ہو گئے،اس واسطے کہ وہ جانتے تھے دیانت کا زمانہ ہے جھوٹا حلف اٹھانا قتل ہو جانے سے اہم سمجھا جاتا ہے تو یہ جھوٹ نہیں بولے گا،اگر بولے گا تو بیوی ہاتھ سے جائے گی،سزا بھی بھگتے گا،حلف ہی ایسا تھا،اب چور مطمئن ہو کر مال لے کر چلے گئے،اور یہ بے چارہ بندھا ہوا بیٹھا ہے،چوروں کو جانتا ہے مگر بتا نہیں سکتا،اس لئے کہ اگر بتاتا ہے تو بیوی پر طلاق پڑتی ہے،عجیب کیفیت میں مبتلا ہے۔فقہاء کے

دروازوں پہ گیا اور کہا یہ قصہ ہے، چوروں کو جانتا ہوں مگر بتلا نہیں سکتا، اس لئے کہ بتلاؤں گا تو بیوی پر طلاق پڑ جائے گی، تو سارے فقہاء نے یہ کہا کہ بھائی! یا مال رکھ لے یا بیوی رکھ لے، اگر تو پتہ بتلا دے گا تو بے شک بیوی ہاتھ سے نکل جائے گی مگر مال مل جائے گا، اور اگر نہیں بتلاتا تو مال نہیں ملے گا، مگر بیوی تو قبضہ میں ہے، دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں کہ مال بھی مل جائے اور بیوی بھی رہے ایک چیز پسند کر لے، غرض یا لاکھوں روپے کا مال جاتا ہے یا لاکھوں کی بیوی جاتی ہے۔

اخیر میں بے چارہ بہت پریشان اور دم بخود ہو کر امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ مجلس میں پریشان بیٹھا ہوا تھا، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم آج بہت اداس ہو اور غمگین نظر آتے ہو۔ انہوں نے کہا، جی ہاں! کچھ واقعہ ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا واقعہ ہے؟ بولوں گا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا، آپ نے فرمایا بندۂ خدا کچھ تو بتا کیا ہوا، عرض کیا: حضرت! یہ قصہ پیش آیا کہ چور آ گئے مال لے گئے، اور مجھے طلاقِ مغلظہ کا حلف دے گئے، اور اب میں چوروں کو جانتا ہوں لیکن بتلاتا ہوں تو بیوی ہاتھ سے جاتی ہے، اور نہیں بتلاتا تو مال ہاتھ سے گیا۔

امام صاحبؒ سمجھ گئے فرمایا: تو اطمینان رکھ مال بھی نہیں جائے گا، بیوی بھی رہ جائے گی اور تو بتا بھی دے گا، اس نے کہا حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا: تو فکر نہ کر، ہو جائے گا۔ فرمایا: تو ایسا کر کہ اپنے محلّہ میں اعلان کر دے کہ کل امام ابوحنیفہؒ میرے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھیں گے، اور چوروں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ اعلان ہوا، تو ہزاروں آدمی جمع ہوئے اس لئے کہ معاملہ ایسا سنگین تھا کہ دو چیزوں میں سے ایک چیز رکھ سکتا تھا، دور کھنے کے کوئی معنی نہیں تھے، اور شہرت یہ ہو گئی کہ امام صاحبؒ نے مسئلہ کوئی ایسا بتا دیا ہے کہ مال بھی ہاتھ آ جائے بیوی بھی نہ جائے اور پتہ بھی بتلا دے، تو تمام فقہاء نے غم و غصہ کا اظہار کیا، کیا ابوحنیفہؒ حرام کو حلال بنانا چاہتے ہیں؟ جب وہ بتائے گا تو یقیناً بیوی مطلقہ ہو جائے گی۔ امام صاحبؒ نے مقررہ وقت پر آ کر نماز پڑھی تو محلّہ ہی کے چور تھے وہ بھی آئے، ہزاروں کا مجمع ہو گیا کہ امام صاحبؒ اجتماعِ ضدین کا مسئلہ کیسے حل کریں گے، امام صاحبؒ کھڑے ہو گئے، اور اس شخص کو بھی کھڑا کیا، اور فرمایا لوگ مجمع بن کر مسجد سے نہ نکلیں ایک ایک آدمی نکلے اور اس سے یہ کہا کہ جب آدمی گزرے تو یہ کہنا کہ یہ چور نہیں ہے، یہ چور نہیں ہے اور جب چور آ جائے تو چپ کھڑے ہو جانا، تو آدمی جب گذرے تو یہ کہتا رہا کہ یہ چور نہیں، اور جب چور آئے تو یہ چپکا کھڑا تو چور پکڑے گئے اور اس نے بتلا بھی دیا کہ یہ چور ہے مگر اس طرح نہیں بتلایا کہ یہ چور ہے اس طرح بتاتا تو بیوی پر طلاق پڑتی، مگر وہ چپ رہا تو چپ رہنے سے تو طلاق نہیں پڑتی وہ تو بولنے سے پڑتی ہے، تو امام صاحبؒ نے چپ رہنے سے چور کا پتہ چلا لیا، اور بیوی کو طلاق سے بچا لیا، تو یہ کمالِ دانش تھی کہ چور بھی پکڑے گئے، مال بھی مل گیا، بیوی بھی ہاتھ سے نہ گئی، اور مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا، مسئلہ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا، تو یہ کمالِ دانش تھی یہ حقیقت میں اس کے اندر عقلیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

تھوڑے علم کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہے...... مثل مشہور ہے کہ ''یک من علم رادہ من عقل می باید'' ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ علم من بھر ہو اور عقل بیس سیر ہو تو علم اوندھا ہو جائے گا، الٹا ہوگا، تو محض عالم بننے سے کام نہیں چلتا، جب تک قلب کے اندر ذکاوت نہ ہو اور تمام چیزوں کو اپنی اپنی حد کے اندر رکھنے کا سلیقہ نہ ہو تو عالم مطلقاً علم سے کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر عقل کا جوہر نہ ہو اور دماغ میں کوئی سلیقہ نہ ہو، اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ'' (1) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو دعا دی، ہے جو آپ کی احادیث یاد کرے آپ کے کلامِ مبارک کو ذہن میں لے، تو فرمایا اللہ اس شخص کا چہرہ تر و تازہ رکھے جو میرے کلام کو اپنے دل میں جگہ دے رہا ہے، اور اسے محفوظ کر رہا ہے، اور اپنے اندر جگہ دے رہا ہے اور اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، اور فرمایا بہت سے علم و فقہ کے اٹھانے والے غیر فقیہ ہوتے ہیں، ان میں سمجھ نہیں ہوتی، ان کا کام یہ ہے کہ کسی عالم کے سامنے اس کلام کو نقل کر دیں، اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں، اس لئے کہ ان میں اتنی ذکاوت نہیں ہے، کہ وہ مسئلہ نکالیں اور وہ صحیح بھی ہو، اس لئے وہ نقل پر قناعت کریں، مسئلہ نہ بیان کریں، ان میں چونکہ کلام سے مسئلہ استنباط کرنے کا مادہ نہیں ہے، اس واسطے مسائل نکالنے کی کوشش نہ کریں ورنہ الٹے سیدھے مسائل نکالیں گے اور دنیا حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہوگی، تو نفسِ کلام نقل کر دیں مگر اس کے اندر سے مسائل کا استخراج نہ کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض علماء وہ ہوں گے کہ علم اور فقہ ان کے اندر ہے مگر سمجھ ان کے اندر نہیں ہے، اور بعض وہ ہوں گے کہ علم تھوڑا ہے، مگر سمجھ بہت ہے لیکن تھوڑے کو اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے زیادہ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے امام ابی حنیفہؒ پر الزام لگایا ہے کہ انہیں کل سترہ احادیث یاد تھیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، امام ابی حنیفہؒ رواۃِ حدیث میں سے ہیں اور روایاتِ حدیث کی ایک مستقل کتاب مسند ابی حنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے، اس میں اپنی روایت سے سینکڑوں حدیثیں نقل فرمائی ہیں تو تاریخی طور پر یہ دعویٰ غلط ہے، لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ اس دعوے کو مان لیا جائے تب بھی اس سے امام ابی حنیفہؒ کی ذکاوت ثابت ہوگی کہ کل سترہ احادیث سے اتنی بڑی فقہ کو مدوّن کر دیا کہ ہزار ہا مسائل آ گئے، یہ تو کمالِ دانش کا ثبوت ہے، اور ایسے مسائل کہ حدیث و قرآن کے مخالف نہیں ہوئے، بلکہ حدیث و قرآن سے نکل رہے ہیں، تو ایسے شخص کی دانش کی کیا انتہا ہے بہرحال عالم کے لئے جیسے علم کمال ہے اس سے زیادہ ضرورت عقلی کمال کی ہے عقل کے بغیر علم چلتا نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام کی عقل سے زیادہ ہے...... تو چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پورے عالم کے لئے مربی ہوتے ہیں، اور سید الانبیاء والمرسلین عالمین کے لئے مربی ہیں، اس لئے سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر آپ میں عقل بھی ہونی چاہئے، اس لئے کہ سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر

(1) السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من بلغ علما ج: ۱ ص: ۲۶۷.

آپ کو علوم عطا کئے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث میں فرماتے ہیں: ''اوتیت علم الاولین والآخرین'' مجھے اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم عطا کر دیئے گئے، یہ تو اجمالی دعویٰ ہے احادیث میں تفصیلی دعوے بھی موجود ہیں، فرماتے ہیں، شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ''اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَسْمَاءِ کُلِّهَا کَمَا اُوْتِیَ اٰدَمُ عِلْمَ الْاَسْمَاءِ کُلِّهَا'' قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا﴾ ① حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلائے گئے، تو آپ فرماتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے مجھے بھی ساری چیزوں کے نام سکھلائے گئے غرض آدم علیہ السلام کا جو علم ہے وہ مجھے عطا کیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کو جو صور و اشکال کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو عطا کیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو بھی عطا کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تفصیلاتِ احکام کا علم دیا گیا، وہ تفصیلات احکام آپ کو بھی عطا کی گئیں، اور اس سے بڑھ کر وہ علم عطا کیا گیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد آپ ہی کی خصوصیت ہے وہ یہ کہ بندہ اور خدا میں کیا ربط ہے، ان نسبتوں کے جو علوم عطا کئے گئے ہیں، وہ تمام علوم سے بڑھ کر علوم ہیں، تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم آپ کو دیئے گئے اور آپ کے مخصوص علم بھی آپ کو دیئے گئے، اس لئے قدرتی طور پر جتنی عقلیں سارے انبیاء علیہم السلام کو دی گئیں وہ ساری آپ کے اندر ہونی چاہئے، تبھی تو آپ ان علوم کا تحمل فرما سکیں گے غرض آپ کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام دانشوروں سے بالا ہے۔

اعتدالِ مزاج سے اعتدالِ عقل، علم اور اخلاق ہوگا...... ابن سینا مسلمانوں کا بہت بڑا طبیب ہے، اور علم طب کا موجد سمجھا جاتا ہے، اس کو معلم ثانی کہتے ہیں، فارابی کو معلم اول کہا جاتا ہے اور ابن سینا کو معلم ثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے گویا طب کی تجدید اور اس کو از سرِ نو زندہ کیا، اور بہت سے مسائل اپنی طرف سے بڑھائے، وہ کہتا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عالم میں اتنا معتدل مزاج کسی کا نہیں جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، مزاج کے اندر کمالِ اعتدال، کمال عقل کی دلیل ہوتی ہے، اگر مزاج کے اندر اعتدال نہ ہو، بلکہ افراط اور تفریط ہو اتنی ہی مزاج میں کمی اور زیادتی ہو جاتی ہے، لیکن مزاج معتدل ہوگا تو عقل بھی معتدل ہوگی اس لئے اس کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل العقل ہیں۔ اور جس کی عقل کامل ہے اس کے اخلاق بھی کامل ہیں اس کا علم بھی کامل ہوگا، اس کے معاملات بھی کامل ہوں گے اس کی دیانت بھی کامل ہوگی، ابنِ سینا چونکہ عقلاء اور حکماء کی لائن کا آدمی ہے اس لئے عقل و حکمت کی لائن سے اس نے دعویٰ کیا کہ جب عقل کامل ہے کیونکہ مزاج کامل ہے اس لئے علم بھی آپ ہی کا کامل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ اعتدال مزاج سے اعتدال عقل پیدا ہوتا ہے۔

ارسطو کے اعتدالِ مزاج اور سکندر رُومی کی خرابیِ مزاج کا عجیب واقعہ...... اس پر مجھے ارسطو اور سکندر

① پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۳۱.

رومی کا واقعہ یاد آ گیا، سکندر رومی بہت بڑا بادشاہ گذرا ہے، اور اس کا وزیر اعظم ارسطو تھا، ارسطو یونان کا بہت بڑا حکیم ہے اور یوں کہنا چاہئے کہ طب کا بہت بڑا مجتہد ہے، سکندر رومی کو بارہ مہینے سر کے درد کا عارضہ رہتا تھا، اور سر میں ٹیس اٹھتی رہتی تھی، ارسطو نے ہر چند علاج کئے، ہر قسم کی دوائیں استعمال کرائیں مگر فائدہ نہیں ہوتا تھا، تو سکندر تنگ آ گیا اور اس نے کہا مجھ جیسا بادشاہ اور تجھ جیسا طبیب اور پھر مجھے شفا نہ ہو، یہ تو حیف اور افسوس کی بات ہے، اب اگر تجھے علاج کرنا ہے تو کر، مگر دوا ایسی ہو کہ نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی ہو، اور میرا درد جاتا رہے، ارسطو نے کہا، یا اللہ! یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے کہ نہ کھانے نہ پینے نہ لگانے نہ سونگھنے کے دائرہ کی دوا ہو، یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے، میں جادوگر تھوڑا ہی ہوں، میں تو طبیب ہوں اب ایسی دوا کہاں سے لاؤں، تو سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے سکندر سے کہا کہ مجھے تین مہینے کی مہلت دو تا کہ ایسی دوا سوچوں، اس نے کہا ہم نے تجھے تین مہینے کی مدت دے دی، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا، اس لئے کہ اس زمانے میں طب کا سب سے زیادہ زور ہندوستان میں تھا اور مؤرخین کہتے ہیں فن طب ہندوستان سے ہی شروع ہوا ہے، اس لئے کہ فن طب حضرت ادریس علیہ السلام کے اوپر نازل ہوا ہے وہ اس علم کے موجد تھے اور وحی کے ذریعہ ان پر نازل ہوا ہے اور ہندوستان میں ہی علم طب کو فروغ ہوا ہے تو علم طب یونان وہ درحقیقت علم طب ہندوستان ہے یونانی ہندوستانیوں کے شاگرد ہیں، اور ہندوستان سے یونان کے اندر طب کو لے کر گئے ہیں، پھر اسلام آنے کے بعد یونان سے عربوں کے اندر آئی ہے تو ابتداء ہندوستان سے ہوئی ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا نابینا طبیب تھا، تمام اطباء پر اس کو سبقت حاصل تھی پورے ملک میں اُسے حاذق شمار کیا جاتا تھا، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا کہ ایسی دوا تو نابینا طبیب ہی بتا سکے گا کہ نہ لگانے کی ہو، نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، اور درد جاتا رہے، میری عقل تو کام کرتی نہیں، ممکن ہے یہ نابینا طبیب کچھ بتا دے۔

اس نابینا طبیب کا قاعدہ تھا کہ مریضوں کی لائن لگا کر کھڑی کردی جاتی تھی اور وہ ایک طرف سے چلتا تھا، اور مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا، حال پوچھا اور ساتھ کے لوگوں سے کہہ دیا کہ یہ نسخہ مرتب کردیں، غرض نبض دیکھتا ہوا ایک طرف سے ترتیب وار چلتا تھا، اس میں بڑے چھوٹے، امیر فقیر کا فرق نہیں تھا، ابتداء میں جو آ جائے فقیر آ جائے تو وہی سہی، تو ارسطو کا اس نابینا طبیب سے کوئی تعارف تو تھا نہیں تو مریضوں کی لائن میں سب سے آخر میں جا کے کھڑا ہو گیا کہ اس وقت میں اپنا عرض حال کردوں گا، ویسے تو ارسطو معروف تھا، دنیا جانتی تھی مگر اس طبیب سے خصوصی تعارف نہیں تھا، تو مریضوں کی لائن میں جا کے بیٹھ گیا، نابینا طبیب مریضوں کو دیکھتا اور نسخے بتاتا ہوا جب آخر میں پہنچا تو ارسطو کا ہاتھ لیا، اور نبض دیکھی، نبض دیکھتے ہی کہا ہے کہ ارسطو؟ ارسطو اسی وقت بول پڑا کہ جی

ہاں ارسطو......تو معانقہ کیا اور بغل گیر ہوا، اور کہا کہ آپ جیسا اتنا بڑا طبیب مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا! اس نے کہا چونکہ آپ سے ملنا تھا تو میں کہاں اطلاع کراتا اس لئے مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا، تو بہت ہی مدارات کے ساتھ وہ نابینا طبیب ارسطو کو اپنے مکان پر لے آیا اور کہا کہ یونان سے ہندوستان کا اتنا بڑا سفر کیسے کیا......؟

ارسطو نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلا سوال یہ ہے کہ اس طب میں کون سا اصول ہے کہ نبض دیکھ کر نام بھی معلوم کرلو، نبض دیکھ کر مزاج معلوم ہوتا ہے، اس کا اتار چڑھاؤ معلوم ہوتا ہے، بیماری معلوم ہوتی ہے، نبض دیکھ کر نام معلوم ہو جائے میں نے تو یہ اصول کہیں پڑھا نہیں، اس نے کہا ہاں یہ اصول طب کا نہیں مگر اس وقت ایک اصول میں نے طب کا لیا اور ایک اپنی عقل سے سمجھا، دونوں ملا کر میں نے نام معلوم کرلیا، وہ یہ کہ جب میں نے آپ کی نبض پہ ہاتھ رکھا اتنی کامل اعتدال کے ساتھ نبض چل رہی تھی کہ میں نے اتنی معتدل نبض دنیا میں کسی کی نہیں دیکھی، ہزاروں مریض آئے، ہزاروں لوگ آئے مگر اتنا صحیح المزاج اور قوی الاعتدال مزاج میں نے نہیں دیکھا، یہ تو میں نے نباضی کے اصول سے معلوم کیا، آگے میرے دل نے شہادت دی کہ ایسا کامل المزاج اس دور میں اگر کوئی ہوسکتا ہے تو ارسطو ہوسکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے میں نے ذہن سے حکم لگا یا دیا کہ یہ ارسطو ہے۔

اب اس نے پوچھا کہ آپ کیسے آئے......؟ ارسطو نے کہا کہ یہ قصہ ہے کہ میں سکندر رومی کا معالج ہوں بارہ مہینے اسے سر کا درد رہتا ہے ساری دوائیں دیتا دیتا تھک گیا ہوں اب اس نے یہ شرط لگائی کہ دوا نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو، نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی اور مجھے فائدہ ہو جائے، تو میرے پاس ایسی کوئی دواء نہیں ہے، اور نہ میں نے طب میں پڑھی ہے۔ اس نابینا طبیب نے کہا کہ میرے پاس ایسی دوائی ہے جو نہ کھائی جائے گی، نہ پی جائے گی، نہ سونگھی جائے گی، نہ مالش کی جائے گی اور فائدہ ہو جائے گا، اور میں وہ دوا بنوا کے دیتا ہوں چنانچہ اس نے دوا بنوائی، اور دوا کا کئی سیر کا مجموعہ تیار ہوا اسے پسوایا اور پسوا کر اتنا باریک کر دیا جیسے سرمہ ہوتا ہے۔

اس نابینا طبیب نے کہا اس کی شکل یہ ہوگی کہ چھوٹی چھوٹی ڈھولکیاں اور طبلے بنائے جائیں اور ان میں یہ تھوڑی تھوڑی دوا بھر دی جائے اور سکندر رومی کے سامنے ناچ رنگ اور گانے بجانے کی محفل منعقد کی جائے، اور یہ طبلے اور ڈھولکیاں بجائی جائیں ان کے بجنے سے دوائی کا ایک ذرہ بھی فضا سے اڑ کر سکندر کے ناک میں چلا گیا تو اس کے سر کا درد جاتا رہے گا، اور اسے پتہ بھی نہ چلے گا، یہ دوا نہ کھانے کی، نہ لگانے کی، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، بس ایک ذرہ ناک میں پہنچ گیا تو درد جاتا رہے گا۔

چنانچہ ارسطو نے آ کر اس دوا کے استعمال کے لئے طبلے اور ڈھولکیاں بنوائیں، اور ان میں دوائی بھری، اور اس کے بعد وہ محفل ناچ رنگ اور گانے بجانے کی منعقد کی اور طبلوں پر تھاپ پڑنی شروع ہوئی لکڑی اور کانے سے ان طبلوں اور ڈھولکیوں کو بجانا شروع کیا، اور ان کے بجانے سے ان کے اندر تموج ہوا، اس کی وجہ سے وہ ذرات خارج ہوئے اور مجلس میں معمولی سا خوشبودار غبار خارج ہوا مجلس میں عام خوشبوئیں تھیں، اگر بتیاں جل رہی تھیں، اور بھی

خوشبو تھی تو ان خوشبوؤں میں شامل ہو کر یہ خوشبو بھی اس کے ناک میں پہنچی اور کچھ اس دوائی کے اجزاء سکندر کے ناک میں پہنچ گئے، اسی وقت درد بند ہو گیا، صبح دیکھتا ہے تو بالکل تندرست ہے اور برسہا برس کا درد جاتا رہا۔

تو ارسطو سے کہا آج تو میرا درد بالکل جاتا رہا، اس نے کہا میں نے علاج کیا ہے، یوں ہی تھوڑا جاتا رہا۔ سکندر نے کہا تو نے کیا علاج کیا؟ کوئی دوائی تو تو نے پلائی نہیں، وہ تو آپ نے کہا تھا کہ دوائی ایسی ہو جو نہ کھانے کی ہو نہ پینے کی ہو نہ سونگھنے کی ہو نہ لگانے کی ہو، بادشاہ نے کہا وہ کیا تھی؟ اس سے آپ کو کیا غرض؟ باقی درد تو نہیں رہا؟ اس نے کہا درد تو نہیں رہا، بہر حال بہت خوش ہوا، اور یہ کہا کہ ایک ترازو منگوا کر ایک پلڑے میں ارسطو کو بٹھایا اور ایک پلڑے میں سونا رکھوایا، سونا اس کے برابر تلوا کر اس کو انعام دیا۔

چنانچہ پانچ برس گذر گئے ذرہ برابر درد نہیں ہوا، چھ برس کے بعد پھر سر میں کچھ چبک محسوس ہوئی، تو ارسطو کو بلوایا اور کہا کہ سر میں دوبارہ چبک محسوس ہوئی، اس وقت جو تم نے علاج کیا تو اب دوبارہ کرو، اب وہ دوا ختم ہو چکی تھی، اور دوسرے اس کا نسخہ معلوم نہیں تھا، اس نے حیلے بہانے کئے کہ وہ دوائی تو تین چار ماہ سے کم میں تیار نہیں ہوتی، اس نے کہا کوئی مضائقہ نہیں تین مہینے کی آپ کو رخصت ہے آپ دوائی بنائیں۔

اَب ارسطو کا کمال ہے کہ اس کے پاس نسخہ تو نہیں تھا جو اس کے پاس تھوڑی سی دوا باقی رہ گئی تھی تو اسے چکھ چکھ کر سارے اجزاء معلوم کر لئے اور نسخہ لکھ لیا، نسخہ لکھ کر پھر وہ دوائیں بنائیں اور نسخہ مکمل تیار ہو گیا۔ پھر اسی طرح ناچ رنگ کی محفل منعقد کی، اگلے دن درد پھر غائب ہو گیا، ارسطو نے چکھ کر نسخہ کے تمام اجزاء معلوم کر لئے اور اس کا اثر بھی ہو گیا، مگر اس درجے کا فائدہ نہیں ہوا جو پہلی مرتبہ ہوا تھا، ارسطو نے کہا چونکہ دوائی پرانی تھی اس لئے اثر کم ہوا، اور تین ماہ کی مہلت دیں، نئی دوائی بنے گی تو پھر اثر زیادہ ہوگا، سکندر نے کہا آپ نئی دوائی بنائیں، تین ماہ کی مہلت ہے۔ پھر ارسطو سفر کر کے ہندوستان پہنچا، اور اب بھی طبیب کے گھر نہیں گیا، اور مریضوں کی لائن میں حسب سابق بیٹھ گیا، اور وہ نابینا طبیب آیا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معانقہ کیا اور کہا کہ ارسطو تو پھر آ گیا؟ اب کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا آپ نے دوا دی تھی اور واقعی وہ کارگر ہوئی اور چار پانچ برس تک بالکل درد نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد پھر سکندر نے درد محسوس کیا ہے، اب میرے پاس وہ دوا چند تولے رہ گئی تھی، اس سے کام نہیں چلتا تھا، تو میں نے چکھ چکھ کر اجزاء معلوم کئے اور یہ نسخہ لکھا۔

اس نابینا طبیب نے ارسطو کی پیشانی چوم لی کہ تو نے ساری دوائیں لکھ دیں ایک بھی تو نے نہیں چھوڑی، یہ تیرا کمال ہے کہ تو نے چکھ چکھ کر سارا نسخہ معلوم کر لیا، اس نے کہا میں نے وہ نسخہ بنایا، اور حسب سابق سکندر کو استعمال بھی کرایا فائدہ مکمل نہیں ہوا۔ اس نابینا طبیب نے کہا آپ دواؤں کی کاشت کس طرح سے کرتے ہو، اس نے کہا جیسے اور کھیت ہوتے ہیں، اسی طرح دوائیں بھی بوتے ہیں۔ اس نے کہا بس یہی غلطی ہوئی ہے۔

سمجھئے ہر دوا میں کسی نہ کسی سیارے کا اثر ہے جب اس سیارے کے طلوع کا وقت ہو اس وقت وہ دوا کاشت

کی جانی چاہئے یہ فنِ نجوم کا اصول ہے آپ نے موقع بموقع کاشت کی، ستاروں کے عمل کے مطابق نہیں کی، اس نے کہا جیسے چنے گیہوں بوتے ہیں اسی طرح دوائیں بھی بوئیں، اس نے کہا بس یہی فرق ہے۔

میں ہر دوا کو جس میں اس سیارے کا عمل ہے اس سیارے کے طلوع کے وقت اس کو بوتا ہوں تو کامل اثر ہوتا ہے، کسی دوا میں مشتری کا اثر ہے، کسی میں زُحل کا اثر ہے، کسی میں مریخ کا اثر ہے جس وقت جو سیارہ طلوع ہوتا ہے تو اس وقت میں تخم ریزی کرتا ہوں، گویا فنِ طب اور فنِ نجوم میں چولی اور دامن کا ساتھ ہے، جب تک فنِ نجوم سے واقف نہ ہو، اس دور میں طبیب ماہر نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اب فن نجوم تو بجائے خود ہے طب ہی پوری طرح نہیں پڑھتے، اردو میں کتابیں آگئیں بس کچھ مطالعہ دیکھا طبیب بن گئے، اور سند لے لی، اسی واسطے نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جو مرض آ جاتا ہے، جانے کا نام نہیں لیتا، عمر بھر مرض بھی قائم دوا بھی قائم، غذا کی طرح دوا کھانی پڑتی ہے، اور عطاروں نے رہی سہی بھی کسر نکال دی۔

ہمارے ہاں ایک عطار طبیب تھے، نور الدین ان کا نام تھا، نورد بہرہ کے نام سے پکارے جاتے تھے، بہرے بھی تھے، مگر بے بہرہ نہیں تھے، لیکن چوں کہ بہرے تھے اس لیے "نورد بہرہ" کہا کرتے تھے، انہوں نے ایک بڑا بھاری مٹکا رکھا ہوا تھا اس میں پانی بھرا ہوا تھا، سونف کے اس میں کچھ دانے ڈالے ہوئے تھے، کوئی عرق مکوہ لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق گاؤزبان لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق سونف لینے آئے تو اس میں سے دے دیا، ساری دنیا کو وہی پانی دے کر نمٹا دیتے تھے، ایک موقع پر راز کھل گیا تو لوگوں نے کہا خدا کے بندے! یہ کیا کر رکھا ہے یہ تو بالکل ناجائز اور حرام ہے تو لوگوں کی جان کے درپے ہے، اس نے کہا بھئی! طبیب تو اصل اللہ میاں ہے پانی میں شفا تھوڑا ہی ہے، میں نے بھی اس کے نام پر چند دانے سونف کے ڈال دیئے ہیں کہ طبیب خود دیکھ لے گا، شفا دینے والا تو وہ ہے لوگ اپنے اعتقاد سے شفا پاتے ہیں، میرے پیسے بن جاتے ہیں، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟ تو جب عطار ایسے رہ جائیں اور طبیب ایسے رہ جائیں تو پھر مریضوں کا ناس نہیں مارا جائے گا تو اور کیا ہوگا؟ کہاں تو یہ کہ فن نجوم سے واقفیت ہو، اور ان نجوم کے طلوع کے وقت کی مناسبت سے دواؤں کی کاشت ہو، اور کہاں یہ کہ دواؤں کی شناخت نہ ہو، بہت سے اناڑی طبیبوں کو دیکھا کہ عناب کی جگہ بیر اٹھا کے دے دیئے، اس لئے کہ شکل ایک ہی ہوتی ہے، اسی طرح آپ زعفران خریدنے جائیں گے تو اس کی جگہ بھٹوں کا ریشہ اٹھا کے دے دیتے ہیں، اب زعفران کی جگہ جب یہ ریشہ کھایا جائے گا تو کہاں سے فائدہ ہوگا اور شفا ہوگی، اور اچھے خاصے مریں گے، سیاہ مرچ لینے جاؤ تو پپیتہ کے بیج اس میں ملے ہوئے ہوں گے تو پپیتے کے بیج کھا کے سیاہ مرچ کا فائدہ تھوڑا ہی ہوگا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ طب تو رہی ہی نہیں تھی، اور اوپر سے یہ ملاوٹ بھی ہوگئی تو مریض بیچارے اچھے ہوں بھی تو کہاں سے؟ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی تعداد مریضوں سے زیادہ ہے اور جتنے ڈاکٹر بڑھتے جاتے ہیں اتنے ہی امراض بڑھتے جاتے ہیں، جتنے ہسپتال کھل رہے ہیں اتنی ہی بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میں تو عرض کرر ہا تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے واقعات کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کا جتنا علم کامل ہوتا ہے، اتنی ہی عقل بھی کامل ہوتی ہے، اسی طرح جتنے اہل اللہ ہیں ان کی بھی اتنی ہی عقل کامل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل گویا اس درجے کی ہے کہ اولین وآخرین میں ایسی عقل کسی کو نہیں دی گئی، بلکہ سارے اولین وآخرین کو جتنی عقل دی گئی ہے وہ تنہا ایک ذاتِ واحد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے، اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء علیہم السلام بنایا گیا، تو اس کامل عقل کے ہوتے ہوئے بھی کفار کہیں کہ آپ مجنون ہیں، یہ ان کے مجنون ہونے کی علامت ہے کہ ان کے اندر عقل نہیں ہے کہ آپ کی عقل کو پہچانتے تو قرآن قرآن کریم نے کفار کے اس قول کو رد کیا، اور اس ذیل میں میں نے کچھ تاریخی واقعات بیان کئے، کل تو اصولی بحث تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل ہے، دلیل کی رو سے اور فلاں دلیل کی وجہ سے اور آج اس کمالِ عقل کے آثار میں چند واقعات بیان کئے اور ایسے ہزاروں واقعات ہیں، تو حق تعالیٰ شانہ نے آپ سے جنون کی نفی کی کہ: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ہوتے ہوئے آپ مجنون نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ خود مجنون ہیں، جس کو اتنا بڑا علم دیا گیا جس کو ایسی عظیم الشان تربیت دی گئی جس کو اتنا بڑا اصلاح عالم کا جذبہ دیا گیا جس کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا، کیا معاذ اللہ وہ مجنون ہوگا؟ مجنون بھی ایسی تربیت کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک تیسری دلیل پیش فرمائی: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ اور سب چیزوں کو چھوڑ دو، آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ لو، کیا مجنون ایسے اخلاق برتا کرتے ہیں؟ تو اخلاق کو ثابت کر کے آپ کے لئے خلقِ عظیم ثابت کیا، اب خلقِ عظیم کی بحث انشاء اللہ کل ہوگی۔

یہاں صرف یہ بحث تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنون سے بری ہیں، یہ لوگ جو ایسے دعوے کرتے ہیں وہ خود مجنون ہیں، اخلاق کا عظیم ہونا، جنون کی نفی کی دلیل ہے اس کا بیان انشاء اللہ کل ہوگا، اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عقلِ سلیم بھی دے، اور اخلاقِ صحیح بھی دے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِىْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِنِىْ لِاَحْسَنِهَآ اِلَّآ اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنَّا سَيِّءَ الْاَخْلَاقِ لَا يَصْرِفُ عَنَّا سَيِّئَهَا اِلَّآ اَنْتَ، اَنْتَ رَبُّنَا وَنَحْنُ عِبَادُكَ فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ٥ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ٥ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ٥ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ٥ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ٥ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ٥ اَنْ كَانَ ذَامَالٍ وَّبَنِيْنَ ٥ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ٥ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾

کمالِ اخلاق سے نفیِ جنون...... بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی نفی کرتے ہوئے جو دلائل ارشاد فرمائے ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو اخلاق عظیم دیئے گئے ہیں، یعنی اخلاق کی جو انتہائی حد ہے کہ بشریت میں اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی، وہ آخری حد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی آپ نے اخلاق کا وہ آخری حد کا نمونہ پیش فرمایا کہ عالم بشریت میں اس سے زیادہ نمونہ ممکن نہیں۔ تو اس سے دلیل پکڑتے ہوئے فرمایا: جس کے ایسے پاکیزہ اخلاق ہوں کہ دنیا کو مسخر کرلے، ان اخلاق کے ہوتے ہوئے کیا انہیں مجنون کہا جاسکتا ہے، کیا دنیا میں کبھی کسی مجنون نے بھی ایسے اخلاق پیش کئے، تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شان بیان فرمائی گئی۔ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلقِ عظیم پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خُلق عظیم عطا فرمائے ہیں خلق عظیم کے کیا معنی ہیں؟ خلق عظیم کسے کہتے ہیں؟

مراتبِ اخلاق اور آثارِ اخلاق...... یہ اس وقت تک صحیح سمجھ میں نہیں آئے گا، جب تک اخلاق کے مراتب بیان نہ کئے جائیں کہ اخلاق کے درجے کیا ہیں؟ اور ان میں سے وہ کون سا آخری درجہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان اخلاق کے آثار کیا ہیں؟ کہ ان اخلاقِ عظیمہ سے آپ سے کس قسم کے افعال سرزد ہوئے کہ جس سے دنیا آپ کے قدموں پر جھک گئی، اور دنیا میں عرب کا خطہ جو حد سے زیادہ سرکش تھا اور انہوں نے کسی کی اطاعت قبول نہیں کی، وہ بھی اگر پانی پانی ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

ہوئے، تو وہ کیا آثار ہیں جن کی بناء پر ایک قوم کی قوم مسخر ہوگئی، اور پھر اس قوم نے ان خلاق کو دنیا کی طرف پھیلایا تو پوری دنیا مسخر ہوگئی، اور اب صدیاں گذر گئیں، آج بھی کوئی ان اخلاق کا ذکر سنتا ہے تو وہیں گردن جھکا دیتا ہے تو مراتبِ اخلاق میں سے وہ کون سا آخری مرتبہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ تو ہم نے جہاں تک غور کیا، اور ہمارا غور ہی کیا، بہر حال اساتذہ کرام اور شیوخ کی دی ہوئی روشنی میں جہاں تک دیکھا اور غور کیا تو اس میں اخلاق کے تین مرتبے محسوس ہوئے۔

اخلاقِ حسن...... پہلے درجہ کا نام اخلاقِ حسنہ ہے، حسنِ اخلاق یعنی اچھے اخلاق سے دنیا سے پیش آؤ، دوسرا درجہ اخلاق کریمہ کا ہے، کہ کریم النفس بنو، کریم الاخلاق بنو، اپنے اندر کریمانہ اخلاق پید کرو، اور تیسرا مرتبہ اخلاقِ عظیمہ کا ہے کہ برتر اور سب سے جو اونچے اخلاق ہیں ان کو دنیا کے سامنے پیش کرو، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ① میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ دنیا کے سامنے اخلاق اعلیٰ کے نمونے پیش کروں، آپ نے اپنے مبعوث ہونے کی دو غرضیں ظاہر فرمائیں، ایک فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ② میں دنیا میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ، اعمالِ صالحہ، احوالِ صادقہ اور آخرۃِ حسنہ کی تعلیم پیش کر دی۔ تو پہلا درجہ اخلاقِ حسنہ کا ہے، جسے حُسنِ اخلاق کہتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''یَا خَلِیْلِیْ حَسِّنْ خُلُقَکَ وَلَوْ مَعَ الْکُفَّارِ'' ③ اے میرے خلیل! اخلاق حسنہ سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے پیش آئیں، اس وقت بھی اخلاق کو مت چھوڑو، پاکیزہ اخلاق کے ساتھ ان سے بات چیت کرو اور معاملہ کرو، اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ اخلاق کا ایک درجہ ''خلق حسن'' ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ان کی تفصیل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو اخلاقِ حسنہ کی تربیت دی، یعنی یہود بنی اسرائیل کو اخلاقِ حسنہ پر تربیت دی، جو اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حسنِ اخلاق کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں: اَلْوَفَاءُ بِالْعَدْلِ یعنی حقوق کے اندر دوسرے کو پورا پورا حق دو جو اس کا حق ہے، اپنا بھی پورا پورا حق لو جو تمہارا حق ہے، اس میں نہ کمی کرو نہ بیشی کرو، بھلائی ہو یا برائی ہو، حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھو، کہ دوسرے کا ایک رتی بھی حق مارا نہ جائے اور تم بھی بے شک ایک رتی بھی اپنا حق نہ چھوڑو، مثلاً اگر کوئی شخص تمہیں ایک پیسہ بھر نفع پہنچائے تو تمہارا فرض ہے کہ ایک پیسہ بھر تم بھی نفع پہنچادو اگر تم نے اس ایک پیسے میں کمی کی تو یہ بداخلاقی ہوگی، پورے پورے اخلاق سے پیش آؤ۔

اسی طرح سے برائی کے اندر اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی تو اس درجے کی برائی تم بھی اس کے

---

① السنن الکبریٰ للبیهقی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیها ج: ۱۰ ص: ۱۹۲.
② السنن لابن ماجه، المقدمة، فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج: ۱ ص: ۲۶۵.
③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه: محمد ج: ۱۴ ص: ۲۷۲ رقم: ۱۱۱۵.

ساتھ کر سکتے ہو، تا کہ دوسرے کو معلوم ہو کہ بداخلاقی سے پیش آنا کیا نتیجہ رکھتا ہے، دوسرے کو بداخلاقی سے تکلیف پہنچانا جب کہ اتنی ہی تکلیف اسے پہنچائی جائے گی تو وہ سمجھے گا کہ میں نے کیا تکلیف پہنچائی تھی، اور اگر آپ نے تکلیف نہ پہنچائی وہ یہ سمجھے گا کہ جو بھی کسی کے ساتھ کچھ کرلو، اس کا ثمرہ تو کچھ نکلتا نہیں اس واسطے بداخلاقی سے پیش آتے رہو، نیکی ہو یا بدی، بھلائی یا برائی مگر حقوق کی رعایت رکھو نہ لینے میں کمی کرو نہ دینے میں کمی کرو، اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کوئی ذرہ برابر برائی سے پیش آئے تو تم پر واجب ہے کہ اتنی ہی ذرہ برابر برائی سے پیش آؤ، شریعت موسوی میں معاف کرنا جائز نہیں تھا، شریعت موسوی جلال کی شریعت تھی اور سخت شریعت تھی، بدلہ لینا اور بدلہ دینا یہ واجب تھا، برائی کے اندر معاف کرنا یہ جائز نہیں تھا، بلکہ انتقام لینا واجب تھا، چنانچہ قرآن کریم میں تورات کی تعلیم بیان فرمائی گئی۔

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ہم نے بنی اسرائیل پر واجب کر دیا تھا اور ان کے اوپر لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی نفس کو قتل کرے تو فرض ہے کہ تم بھی قتل کرو، معاف کرنا جائز نہیں، اگر کوئی تمہاری آنکھ پھوڑ دے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑو، عفو و درگزر ہرگز جائز نہیں، انتقام ضروری ہے، اگر کوئی تمہاری ناک کاٹ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کی ناک کاٹ دو کوئی تمہارا کان پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا کان پھوڑ دو، کوئی دانت توڑے تم پر واجب ہے کہ تم بھی اس کے دانت توڑ دو، اور اگر کوئی زخم لگائے تو اتنا ہی برا زخم تم بھی لگاؤ، شریعت موسوی کے اندر یہ جائز نہیں تھا کہ درگذر کرو یا معافی دو، بلکہ واجب تھا کہ انتقام لیا جائے، تو یہ خلقِ حسن ہے کہ اپنے حق میں کمی نہ کرو، دوسرے کے حق میں بھی کمی نہ کرو، کوئی بھلائی کرے تو تم پر واجب ہے کہ تم بھی بھلائی کرو اور اتنی ہی کرو، اس سے کم کی تو بداخلاقی شمار ہوگی، یا بدلے میں کچھ زیادہ بدلہ لے لیا تو یہ بداخلاقی ہوگی۔ اگر کسی نے تھپٹر مارا تمہارا فرض ہے تم بھی تھپٹر مارو، اگر تم نے مکا مار دیا تو یہ بداخلاقی ہوگی، دنیا کہے گی بڑی زیادتی ہوئی اس نے ایک تھپٹر مارا، تھا اس نے مکا مار دیا، ایک شخص نے لاٹھی ماری، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاٹھی مارو، اگر تلوار اٹھائی تو یہ بداخلاقی ہوگی اور حدود سے گزرنا ہوگا ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (1) کوئی تمہارے اوپر زیادتی کرے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کرو، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تعلیم تھی اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی سخت اور تند خو قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جس کی جبلّت کے اندر سختی اور تشدد گھسا ہوا تھا، تو انہیں اگر نرمی کی تعلیم دی جاتی تو وہ دین پر نہ آتے، وہ سمجھتے کہ یہ دین تو بزدلی کا دین ہے، اس لئے واجب قرار دیا گیا کہ بدلہ پورا پورا لو، اور تمہارے لئے معاف کرنا جائز نہیں بہر حال یہ خلقِ حسن ہے اس کے معنی وفا بالعدل کے ہوں گے کہ اپنا بھی پورا پورا حق لو اور پورا پورا دوسرے کو بھی حق دو، اگر اس میں کمی زیادتی کی تو یہ خلقِ

---

(1) پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۴.

حسن کے خلاف ہوگا، غرض اخلاق حسنہ کے اندر عدل اور اعتدال پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے اپنا کلمہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا کر دیا کہ انہیں کمالِ عدل کی تعلیم دی اور انصاف پسندی کی تعلیم دی، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے جسے خلقِ حسن کہتے ہیں۔

خلقِ کریم...... اس سے آگے دوسرا درجہ خلق کریم کا ہے جس کے معنی ایثار کے ہیں کہ دوسرے کا حق پورا پورا دو، اور اپنا حق چھوڑ دو، اس میں ایثار اور قربانی کرو، ایک شخص نے تمہارے تھپڑ مارا ہے تمہیں حق تھا کہ تم بھی تھپڑ مارو، مگر ایثار کا تقاضا ہے کہ تم مت مارو، بلکہ معاف کرو اور درگزر کرو، یہ پہلے مرتبہ سے اونچا مرتبہ ہے، وہاں بدلہ لینا واجب تھا، یہاں معاف کرنا واجب ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہے، ان کے یہاں ایثار کی تعلیم دی گئی ہے، انجیل کا ایک اصول ہے کہ اگر تمہارے کوئی بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کرو کہ بھئی! ایک اور مارتا چل خدا تیرا بھلا کرے، میں تو بدلہ نہیں لوں گا، باقی تو یہ بُری حرکت کر رہا ہے یہ تیرے لئے ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ﴾ ② فرمایا: دوسرے کی برائی کو اپنی بھلائی سے دفع کرو، تمہاری بھلائی کا نتیجہ یہ ہوگا اگر باہم عداوت بھی ہوگی تو دوسرا فریق عداوت کو چھوڑ دے گا کہ میں برائی کر رہا ہوں، اور یہ شخص میرے ساتھ بھلائی کر رہا ہے، اس نے اپنا حق (بدلے کا) چھوڑ دیا، اسے حق تھا کہ یہ بھی اتنا ہی بدلہ لیتا، مگر اس نے بدلہ نہیں لیا، درگزر کیا اور معاف کر دیا، غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں معاف کرنا واجب تھا، انتقام لینا جائز نہیں تھا، اور یہ بالکل شریعتِ موسوی کے برعکس ہے، وہاں انتقام واجب تھا یہاں معاف کرنا واجب ہے، وہاں معاف کرنا جائز نہیں تھا، یہاں انتقام لینا جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے حق کو ترجیح نہ دینا اور اپنے کو گرا دینا، اس سے یہ ہوتا ہے کہ عداوتیں ختم ہو جاتیں ہیں، بدلہ لینے میں بے شک یہ ضرور ہوگا کہ عام لوگ یہ کہیں گے کہ بھائی بدلہ لے لیا، اس کا حق تھا لیکن قدرتی اثر یہ ہے کہ دلوں کے اندر اس سے لوچ نہیں پیدا ہوگا، دلوں میں نرمی نہیں آئے گی، بلکہ اگر قلوب ایسے ہیں کہ حدود پر نظر نہیں ہے تو عداوت اور زیادہ بڑھ جائے گی، مگر بہر حال خلق کریم خلق حسن سے اونچا مقام ہے جس کا معنی ہیں کہ اپنا حق چھوڑ دو اور ایثار دکھلاؤ تو اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تعلیم دی کہ ایثار پیشہ بنو، اپنے حقوق کی رعایت مت کرو، ہمیشہ دوسرے کے حق کو سامنے رکھو۔

خلقِ عظیم...... تیسرا درجہ خلق عظیم کا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرا جب برائی کرے تو نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لو، نہ صرف یہ کہ معاف کر دو، بلکہ اس کے اوپر الٹا احسان کرو کہ وہ برائیاں کرے تم احسان کرو جیسا کہ حدیث شریف میں آپ نے فرمایا: "صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ" "جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے جوڑ لگاؤ، جو تم پر ظلم کرے تم معافی اور درگذر کی صورت اختیار کرو اور جو تم سے برائی کرے تم اس

① پارہ: ۹، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۱۳۷۔ ② سورۃ فصلت: ۳۴۔

کے ساتھ بھلائی سے پیش آوٗ'' تو ایک درجہ انتقام کا ہے ایک درجہ ایثار کا ہے، مگر ایک درجہ احسان کا ہے کہ دوسرا برائی کرے تو تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، یہ بہت ہی اعلیٰ مرتبہ ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ ① ''یہ وہی کرسکتا ہے جو صابر ہو، جو صبر اور ضبط سے کام لے، آپے سے باہر نکل جانے کی خو نہ ہو''، دوسرے نے گالی دی، آپے سے باہر نہیں نکلا، اسے دعائیں دینی شروع کیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق تھا، کہ دوسرے گالیاں دے کر رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ یہ کہ صرف معاف فرمار ہے ہیں بلکہ ان کے لئے ہدایت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ غزوہ احد کے اندر آپ کے بہت ہی چہیتے اور پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، شہید کرنے کے بعد غیظ وغضب کے اظہار کے لئے کفار نے ان کی ناک کاٹ لی، کان کاٹ دیئے، ان کی ہیبت کو بے ہیبت بنایا، پھر ہندہ شقیہ نے ان کا جگر کاٹ کر نکالا اور غیظ وغضب میں اس کو چبایا اور خون پیا، گویا اس قدر غیظ کا اظہار کیا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے گئے، سر مبارک پر چوٹ آئی، خون سر سے بہہ کر منہ پر آیا، دندانِ مبارک شہید ہوگئے، ایسی حالتوں کو دیکھ کر صحابہؓ بے چین ہوئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! ان کفار کے حق میں بددعا فرمایئے، اس درجہ یہ حدود سے گذر گئے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہ برتاوٗ کہ پتھروں سے الگ مارا، خون الگ بہایا، چہیتے چچا کو الگ شہید کیا، اب کون سا موقعہ باقی ہے جو آپ بددعا نہ فرمائیں، اس لئے بددعا فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنِّیْ بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ② ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں ہدایتیں دینے کے لئے آیا ہوں بددعائیں دینے کے لئے نہیں آیا'' اور فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' ③ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ جاہل ہے، نبی کے رتبہ کو نہیں پہچانتے اس لئے جاہلانہ حرکتیں کررہے ہیں، تو ان کے حق میں دعائیں دینا شروع کیں، یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن کریم میں آپ کی شان کے بارے میں فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ ④

فرماتے ہیں اے پیغمبر! اللہ نے جو رحمت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، تمہیں رحمۃ اللعالمین بنایا ہے اس کی وجہ سے تمہارا دل نرم ہے، پگھل جاتے ہو، دوسرے کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی، اگر سخت دل ہوتے غیظ القلب ہوتے یہ سب لوگ ارد گرد سے اٹھ کر بھاگ جاتے، آپ کے اخلاق نے انہیں مسخر کررکھا ہے، آپ کے اخلاق کی کشش نے انہیں آپ کی ذات سے جوڑ رکھا ہے، کہ یہ جاہلانہ حرکتیں کرتے ہیں اور آپ پھر بھی دعائیں

① سورة فصلت: ۳۵. ② الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والاداب، باب النهى عن لعن الدواب وغيرها ج: ۱۲ ص: ۴۹۴ رقم: ۴۷۰۴. ③ شعب الايمان للبيهقى، فصل فى حدب النبى صلى الله عليه وسلم على امته ورأفته ج: ۳ ص: ۴۸۴ رقم: ۱۴۲۸. ④ پاره: ۹، سورة: آل عمران، الآية: ۱۵۹.

دیتے ہیں، یہ اس رحمت کا اثر ہے جو ہم نے آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر رکھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا فرض ہونا چاہئے، پہلا فرض یہ ہے کہ آپ معاف کریں یعنی دوسرے جاہلانہ حرکتیں کریں، سختیاں کریں، گالم گلوچ کریں، اور کیا کچھ نہیں کیا، ساحر آپ کو کہا، کذّاب آپ کو کہا، مجنون آپ کو کہا، اَبتر آپ کو کہا، پتھر آپ کو مارے گئے، سحر آپ پر کرایا گیا، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، نماز پڑھتے ہوئے اونٹ کا اوجھ آپ پر ڈال دیا گیا، تو کون سی حرکت ہے جو نہیں کی، تو کیا کچھ نہیں کیا، مگر اس کے باوجود یہ نہیں فرمایا: ''فَانْتَقِمْ مِنْهُمْ'' ''آپ ان سے بدلہ لیں'' بلکہ ابتدائی درجہ یہ فرمایا فَاعْفُ عَنْهُمْ آپ ان کو معاف فرمادیں، ان جاہلوں کی باتوں کا کوئی خیال نہ کریں، اور ایک موقع پر فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ يَضِيْقُ صَدْرُکَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ٥ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ٥ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰى يَاْتِيَکَ الْيَقِيْنُ﴾ اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ ان کی بے ہودہ حرکتوں سے آپ کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، گھٹن آتی ہے، مگر آپ کی شان بہت بلند ہے، آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتقدیس میں لگیے، کافروں کی بات کا خیال نہ کیجئے رکوع وسجود اور عبادت میں لگیے، ان کی بے ہودگیوں کی طرف دھیان بھی مت دیجئے اور یہی نہیں کہ یہ کام اسی وقت کیجئے، عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ موت کا وقت آپہنچے مسلسل اس پر آپ قائم رہیے، تو یہ وہ خلقِ عظیم ہے کہ دوسرے برائی کریں اور آپ نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لیں نہ صرف یہ کہ آپ معاف کردیں بلکہ انہیں دعائیں دیں ان کے ساتھ خوش خلقی کا معاملہ کریں، ابتداء یہاں سے فرمائی گئی کہ آپ انہیں معاف کردیں، آپ معافی کی خُو ڈالیں، آپ کے اندر انتقامی جذبات نہ ہوں اور یہ بھی آپ کے رتبہ سے کم ہے، ایک درجہ اور اوپر بڑھیئے آپ سے جو زیادتی کرتے ہیں ان کے لئے مغفرت کی دعائیں بھی کیجئے، اب ظاہر بات ہے کہ ایک شخص تو گالیاں دے رہا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، وہ بے ہودگیاں کررہا ہے آپ اس کے لئے مغفرت کی دعائیں کررہے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ یہ بھی کم درجہ ہے، آپ ایک درجہ اور اس سے آگے بڑھیں، انہی لوگوں کو بلا کر کبھی مشورہ بھی کرلیا کیجئے، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ ہمیں اپنا جانتے ہیں، تو وہ لوگ غیروں کو غیر بنانے کی کوشش کررہے ہیں اور آپ اپنوں کی اپنائیت پر آرہے ہیں، آپ انہیں بلاتے ہیں۔

مشاہد وآثار کی عظمت...... سردارانِ قریش جو گالیاں دینے میں کسر نہیں چھوڑتے تھے، اور آپ کی قتل وغارت کی فکر میں تھے، لیکن چند قریش کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے اپنی ردا مبارک اتاردی، اور اس پر ان لوگوں کو بٹھایا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی ردا مبارک بچھا کر ان کو اس پر بٹھایا، یہ چادر مبارک ہمارے عقیدے کے لحاظ سے عرش وکرسی سے بھی بہتر ہے، اس واسطے کہ عرش وکرسی حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہٗ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے بری ہیں، اور چادر مبارک وہ ہے جو جسم مبارک سے لگی ہوتی ہے تو اس میں جو برکات کے آثار ہیں، وہ دوسری چیز میں نہیں ہوسکتے۔ اسی واسطے اسلام میں مشاہد

اور آثار کی عظمت کی گئی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے بدنِ مبارک سے کوئی چیز لگی ہوئی ہو اس کی عظمت اور توقیر کرو، اس واسطے کہ بدن مبارک سے لگی ہوئی چیز آثار اور برکت سے محروم نہیں رہ سکتی۔ اور اس سے علماء نے اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے بدن سے چھوتی ہوئی چیزوں سے برکت حاصل کرو، لوگ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا پہنا ہوا کپڑا دے دیں، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس بدن میں جو عبادت کی جارہی ہے اس کو جو کپڑا لگے گا اس میں بھی اس عبادت کی برکت کے آثار آئیں گے، نبی زمین کے جس حصے پر بیٹھ گئے ہیں، اس میں بھی برکت کے آثار پیدا ہوں گے، اہل اللہ کے اندر آثار ہیں ان چیزوں پر آثار آجاتے ہیں جہاں ان کے بدن لگتے ہیں، اس واسطے کہ اصل چیز ان حضرات کی روح ہے، جو اصل برکتوں کا خزانہ ہے چونکہ یہ روح اس بدن میں گذارہ کررہی ہے، تو اس بدن میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، اس بدن کو کپڑا لگ گیا تو اس میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، وہ کپڑا کسی بدن کو لگ جائے گا تو اس میں برکت کے آثار پیدا ہو جائیں گے، تو اثر در اثر پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

وجوہِ عظمت...... آپ آج بیت اللہ کی تعظیم کرتے ہیں، تو بیت اللہ کوئی شاندار عمارت نہیں، آپ کے ہاں بمبئی میں کروڑوں روپوں کی عمارتیں ہیں، بیت اللہ تو سیاہ پتھروں کا ایک کوٹھ بنا ہوا ہے، پھر اس کی عظمت کیوں ہے؟ اس لئے کہ تجلیات ربانی اس کے اندر سمائی ہوئی ہیں، انوارِ خداوندی اس میں آئے ہوئے ہیں، ان انوار کے اثرات سے وہ پتھر بھی متبرک بن گئے کہ کروڑوں روپوں کی عمارتیں چاہے یاقوت لور جواہرات سے بنادی جائیں، ان میں وہ برکت کا اثر نہیں جو ان کالے پتھروں میں ہے، اس لئے کہ تجلیات ربانی نے ان کو اپنا مورد بنا رکھا ہے، ان پر تجلیات وارد ہوتی ہیں، تو ان میں برکت آگئی اس لئے آپ بیت اللہ کے پتھروں کو چومتے ہیں، برکت حاصل کرتے ہیں، نیز بیت اللہ کو جو غلاف چھو جاتا ہے، اس کی تعظیم کرتے ہیں، ہزاروں روپوں میں ملے تو اس کا ٹکڑا خرید کر لاتے ہیں، لوگ وصیت کرتے ہیں کہ میرے کفن میں رکھ دیا جائے، کوئی وصیت کرتا ہے کہ میری آنکھوں پر رکھ دیا جائے، نیز غلاف شریف کا کوئی ٹکڑا آجاتا ہے تو لوگ سر پر رکھتے ہیں آنکھوں پر لگاتے ہیں حالانکہ سب خود ہی تو اس کو بیٹھ کر بنارہے ہیں، ہم ہی نے تو اس کو بُنا تھا، اور آج اُسے ہم سر پر رکھ رہے ہیں، اس لئے کہ جب ہم اسے بُن رہے تھے، وہ ہماری چیز تھی، جب بیت اللہ پر ٹانگ دی، اب اس میں وہ اثرات آگئے، جو تجلیات خداوندی کے تھے، اس لئے وہ مبارک اور متبرک بن گئی، تو ہم آنکھوں پر لگاتے ہیں، سر پر لگاتے ہیں۔ بلکہ جو حاجی حج کرنے جاتا ہے اور وہ اس غلاف اور بیت اللہ کو چھو کر آتا ہے لوگ اس سے توقیر سے مصافحہ کرتے ہیں کہ یہ ہاتھ غلاف شریف سے لگے ہوئے ہیں، ان ہاتھوں کو چوم لیں، غرض آثار واسطہ در واسطہ ہو ہو کر چلے آتے ہیں۔

حدیثِ مسلسل بالمصافحہ سے استدلال...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اپنی جگہ ہے، اگر آپ سے کسی نے مصافحہ کرلیا، ہم سمجھتے ہیں کہ اس ہاتھ کو چھونا دارین کی سعادت ہے، اور اس ہاتھ کو جس ہاتھ نے چھوا اس کو ہم سعادت مند سمجھتے ہیں اور یہ کہ اس سے سعادت حاصل کرو، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

"صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هٰذِهٖ كَفَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہتھیلی سے مصافحہ کیا ہے، اور میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی گئی، تو آپ کے تابعی شاگرد کہتے ہیں کہ میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ دیجئے اور مجھ سے بھی مصافحہ کیجئے، اس کے بعد اس تابعی نے اپنے شاگرد کو حدیث سنائی تو اس نے کہا میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھتا ہوں آپ اپنی ہتھیلی میری ہتھیلی پر رکھ دیجئے، اور آگے شاگردوں کا سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے یہاں تک یہ حدیث مسلسل بالمصافحہ کے نام سے آج تک محدثینِ کرام میں چلی آ رہی ہے۔

سندِ عالی کی فضیلت و برکات...... حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ ہمارے اساتذہ اور اکابر میں سے ہیں، حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا فیض، ان کا علم بلکہ مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور انڈیا) انہی کی برکات کا خزانہ ہے، اور خزانہ ماشاء اللہ چل رہا ہے، جب میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ سے حدیث پڑھ لی، تو اتفاق سے میرٹھ کا ایک سفر پیش آیا جس میں سہارن پور کے بزرگوں کو بھی اور دیو بند کے اکابر کو ایک تقریب میں مدعو کیا گیا تھا، تو سہارن پور سے ان بزرگوں کے ساتھ ہم دیو بند والے بھی اسی گاڑی میں سوار ہوئے، اس میں میں بھی ساتھ تھا، تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ سے مصافحہ ہوا۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: آپ حدیث پڑھ چکے ہو، اس وقت پوری جماعت میں میری سند سب سے زیادہ عالی ہے، میری احادیث کم واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہوئی ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی اجازت دوں، تاکہ تیری سند بھی عالی ہو جائے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے لئے آپ کو سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے کہا، حضرت میں اس کے لئے حاضر ہوں گا، انشاء اللہ دل میں تو یہ بات رہی مگر لڑکپن کا زمانہ تھا، بھول بھال گیا اور ایک برس گذر گیا اتفاق سے پھر حضرت سے سفر کا ساتھ ہوا، فرمایا: آپ حدیث کی اجازت لینے آئے نہیں؟ میں شرمندہ ہوا، میں نے عرض کیا حضرت میں حاضر ہوں گا۔ اس کے بعد پھر بھول بھال گیا، اور ایک برس پھر گذر گیا، اس کے بعد پھر ایک سفر میں ساتھ ہوا، تو پھر حضرت نے یاد دلایا کہ آپ اب تک نہیں آئے پھر یہ چیز نہیں ملے گی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حضرت سہارن پوری ہجرت کے ارادہ سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں، اب مجھے فکر ہوئی، کہ اب اجازت حدیث لے لینی چاہئے، ورنہ اس سعادت سے محرومی ہو جائے گی تو میں پہلی گاڑی سے سہارن پور پہنچ گیا بہت خوش ہوئے ویسے بھی اپنے بزرگ تھے نیز عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی، رشتہ میں میرے تایا ہوتے تھے، بہر حال بڑی شفقت سے پیش آئے اور مولانا زکریا رحمہ اللہ صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ کو فرمایا کہ مظاہر العلوم کے کتب خانے میں حدیث کی جتنی کتابیں رکھی ہیں سب اٹھوالو، چنانچہ ساری منگوائیں بعض کتابوں کی اول حدیث خود پڑھی اور بعض کی مجھ سے پڑھوائیں اور اس میں حدیث کی اجازت دی اور یہ فرمایا کہ: اس وقت عام طور سے حدیث کی جو سند ہے وہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی ہے۔

یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرت شاہ عبدالغنی کے شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اس طرح ان بزرگوں اور شاہ اسحاق صاحبؒ کے درمیان ایک واسطہ ہے، اور میری حدیث کی سند یہ تھی کہ میں نے حضرت انور شاہ صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، انہوں نے حضرت مولانا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے حدیث پڑھی، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی تو شاہ اسحاق صاحب اور ہم تک بیچ میں چار واسطے ہیں، اور چار واسطوں سے گذر کر گویا ہم شاہ اسحاق صاحب تک پہنچتے ہیں، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے حدیث کی اجازت مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، انہوں نے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، تو چونکہ ایک واسطہ بیچ میں رہ جاتا ہے، تو سند بہت زیادہ بلند ہو جاتی ہے، اس سند سے حضرت سہارن پوریؒ نے مجھے تمام احادیث کی اجازت دی۔ اس کے بعد مسلسلات کی کتاب منگوائی، یعنی وہ احادیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً مسلسل چلی آ رہی ہیں، اس میں دو حدیثوں کی عملاً اجازت دی، ایک حدیث مسلسل بالمصافحہ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ اوپر سے ہر شاگرد مصافحہ کرتا ہوا چلا آ رہا ہے، تو حضرت سہارنپوریؒ نے حدیث سنا کر مجھ سے مصافحہ کیا کہ میں نے اس ہتھیلی سے مصافحہ کیا مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانویؒ سے اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے مصافحہ کیا اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے مصافحہ کیا ،حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے مصافحہ کیا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کیا شیخ ابو طاہر مدنی سے اور انہوں نے اپنے استاذ سے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی تو صرف حدیث کی سند نہیں پہنچی بلکہ مصافحہ کی سند بھی پہنچی۔

حدیث مسلسل بالماء والتمر سے استدلال...... اسی طرح سے حدیث مسلسل بالماء والتمر کی اجازت دی، وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی مہمان نوازی اور ضیافت کی، اس طرح سے کہ کھجور کھا کے بقیہ بچی ہوئی کھجور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھلائی، اور پانی پی کر بچا ہوا پانی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پلایا، پھر فضیلت بیان کی کہ جو پانی اور کھجور کی دعوت کرے اس کے لئے یہ مراتب اور درجات ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح اپنے شاگرد کو کھجور کھلا کر اور پانی پلا کر فضیلت بیان فرمائی، انہوں نے اپنے شاگرد کو اور آگے سلسلہ در سلسلہ یہاں تک کہ سند حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ تک پہنچ گئی، انہوں نے اسی طرح مجھے کھجور کھلا کر اور زمزم کا پانی منگوا کر پی کر پلایا اور فرمایا: میں تجھے اس حدیث کی بیان کرنے کی اجازت دیتا ہوں اور اس عمل کو مسلسل چلانے کی۔ تو یہ کیا چیز تھی؟ ایک بدن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کو مس کیا تھا، یعنی حضرت انس رضی اللہ

عنہ کی ہتھیلی نے، اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھا تو فرمایا کہ: میں نے ریشم میں وہ ملائمت نہیں دیکھی اور کسی چیز میں نہیں دیکھی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک میں تھی، ریشم سے بھی زیادہ صاف ملائم ستھری اور چکنی تھی، اور اس کے بعد اپنے شاگرد سے مصافحہ کیا، تو جو برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی کی حضرت انسؓ کی ہتھیلی میں آئی تھی، وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی، ان کے شاگرد سے وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی، ان کے شاگرد سے ان کے شاگرد میں یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئی۔ تو یہ آثار کو کیوں محفوظ رکھتے ہیں، کہ جسم سے جسم مل جائے تو روحانیت کے آثار آتے ہیں، تو بیت اللہ کے اندر جو تجلیات ربانی ہیں وہ پتھروں میں آئیں۔ اور پتھروں سے غلاف میں آئیں، اور غلاف سے غلاف چھونے والوں میں آئیں، یقیناً وہ متبرک ہیں اور وہ برکات ان میں آئی ہیں چاہے انہیں احساس ہو یا نہ ہو، شعور ہو یا نہ ہو، مگر وہ برکات میں متبرک ہو چکے ہیں، وہ برکات یقیناً ان کے اندر راسخ ہوگئی ہیں، جنہوں نے غلاف شریف کو عقیدت ومحبت سے چھوا ہے، یقیناً وہ آثار سے متاثر ہیں اور وہ بلاشبہ اس قابل ہیں کہ اگر ان کا ہاتھ اس نیت سے چوما جائے تو بے شک برکت پیدا ہوگی، الغرض اس طرح علماء اسلام نے برکات وآثار کی حفاظت کی ہے۔ بہر حال میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار خیر و برکت وہ صحابہؓ میں آئے، صحابہؓ سے تابعین میں آئے، تابعین سے تبع تابعین میں آئے، سلسلہ بسلسلہ ہوتے ہوئے وہ عالم میں اور اس عالم سے جو متعلق ہیں، ان لوگوں میں پہنچے اس طرح سے پوری امت کے اندر آثارِ خیر و برکت پھیلے ہوئے ہیں۔

خُلق عظیم کے آثار...... تو خلق عظیم کے معنی یہ نکلے کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی حدود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائیں، اور اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایثار سے بھی اونچا درجہ احسان کا ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، کوئی ظالم ہے تو تم اس کو دعا دو۔ ظاہر بات ہے کہ اس خلق کے استعمال کے بعد لڑائی جھگڑا نہیں پیدا ہو سکتا، کوئی بہت ہی نابکار ہوگا اور بہت بد طینت ہوگا کہ اس کے بعد بھی لڑائی پر آمادہ ہو وہ گالیاں دے رہا ہے آپ بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اگر وہ واقعی بھیڑیا نہیں ہے انسان ہے تو یقیناً اس کے قلب میں نرمی پیدا ہوگی کہ میں تو گالیاں دے رہا ہوں اور یہ مجھے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اور دعائیں دے رہے ہیں تو جھگڑے قطع ہو جائیں گے جھگڑا ہمیشہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آدمی انتقامی جذبات سے دوسرے کے مدمقابل آئے وہ ایک گالی دے تو یہ دو گالیاں دے اور وہ دو دے تو یہ تین دے، تو گالی مٹتی نہیں بلکہ ڈبل ہو جاتی ہے، لیکن اگر گالی کا جواب گالی سے نہ دیا جائے بلکہ دعا سے دیا جائے تو اس کی گالی مٹ گئی، اور دعاء کی برکت سے تم بھی صحیح ہو گئے، وہ بھی صحیح ہو گئے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلق عظیم پر عمل اور اس کے آثار...... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے واقعات میں ہے کہ کسی نے برسرِ بازار ان کو برا بھلا کہا، اور ایسی تہمتیں ان کی طرف منسوب کیں جو ان کے اندر نہیں تھیں، ہر زمانے میں

ایسے نانہجار پیدا ہوئے ہیں جو اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، نہ ان کے علم وفضل کی قدر کرتے ہیں بلکہ بد زبانی بدکلامی اور بدگمانی کرتے ہیں، ہر دور میں ایسے کچھ لوگ رہتے ہیں، تو امام صاحبؒ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے، غرض اس شخص نے برسر بازار امام صاحب کو بہت برا بھلا کہا، گالیاں دیں، جھوٹی تہمتیں آپ پر تھوپ دیں جو حضرت امامؒ میں نہ تھیں۔ اب امام صاحبؒ کو حق تھا کہ وہ بھی ایک آدھ گالی دے دیتے لیکن امام صاحبؒ کی ایمانی کیفیت، ایسے حضرات تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہوتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خلقِ عظیم دیا گیا، وہ خلقِ عظیم سے کیسے ہٹ سکتے تھے، تو امام صاحبؒ کو جب معلوم ہوا کہ مجھے برا کہا، جب یہ سنا کہ فلاں شخص نے مجھے گالیاں دیں تو ایک جگہ ریشم کے بہت سارے قیمتی تھان رکھے تھے تھانوں کی ڈھیریاں لگائیں، دراہم ودنانیر کی بھری ڈھیریاں لگائیں کچھ کوزے کی مسری اسی طرح اس زمانے کے جو تحائف تھے وہ بھی جمع کیے، ان تمام چیزوں کو اپنے کندھے پر ڈال کر اس شخص کے گھر پہنچ گئے، یہ اس کو گالیوں کا بدلہ دینے تشریف لے گئے، اس کے گھر پہنچ کر آواز دی، وہ باہر آیا دیکھا کہ امام ابو حنیفہؒ اور سر پر خوان، وہ شخص گھبرا گیا کہ حضرت! آپ اور میرے گھر پر؟ فرمایا: میں نے سنا کہ آپ نے میرے اوپر کچھ احسانات کیے ہیں؟ اس نے کہا حضرت! احسانات میں نے تو گالیاں دی تھیں اور تہمتیں آپ کی طرف منسوب کی تھیں جو جھوٹی بھی تھیں۔ فرمایا: یہی تو احسانات تھے، اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب کوئی شخص کسی پر جھوٹی تہمت دھرتا ہے کہ وہ عیب اس کے اندر نہیں مگر برائی اس پر تھوپ دی تو قیامت کے دن اس تہمتیں لگانے والے کی جتنی نیکیاں ہیں وہ اسے دیدی جائیں گے جس پر تہمتیں لگائیں، جس پر تہمت لگی ہے اس کے جو واقعی عیب تھے وہ اس تہمت لگانے والے پر لاد دیئے جائیں گے، وہ تو جنت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گا اور یہ جہنم میں پہنچ جائے گا، تو فرمایا: اس سے بڑا احسان کیا ہوگا کہ مجھے جنت دینے کے لئے آپ نے جہنم مول لے لی، اپنی عاقبت خراب کر لی اس سے بڑا ایثار کیا ہوگا کہ محض میری بھلائی کے لئے اپنی عاقبت اور آخرت بگاڑ لی کہ مجھے جنت مل جائے، اس احسان کا میں کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، یہ چند ہزار روپے کے کوئی معمولی تھان ہیں اور کچھ دراہم اور دینار ہیں آپ کے احسان کا یہ حقیر سا بدلہ لے کر آیا ہوں،، اس کی حالت یہ تھی کہ جیسے اس کو الٹی چھری سے ذبح کر دیا گیا ہو، کبھی نیچے دیکھتا ہے کبھی قدم پکڑتا ہے اور کہتا ہے کہ: حضرت! آپ نے تو مجھے بغیر چھری کے ذبح کر دیا۔ فرمایا: اس کی ضرورت نہیں بس یہ ہدیہ قبول کرلو، یہی سب سے بڑا احسان ہوگا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے توبہ کی ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا کہ آج سے میں کسی کو بھی گالی نہیں دوں گا، تو امام صاحبؒ کے خلق نے اس شخص کو بدی کو نہیں مٹایا بلکہ دنیا سے ایک بہت بڑی بدی کا خاتمہ کر دیا کہ کم از کم اس کی نسل تو اس بدی پر نہیں چلے گی جس کے اوپر اس کے اثرات ہیں وہ تو کبھی گالم گلوچ نہیں کرے گا۔ گالی مٹانے کی صورت یہ نہیں ہے کہ ایک گالی کے بدلے میں دو گالیاں دے، یہ تو تین گالیاں جمع ہو گئیں گالی مٹی کہاں؟ گالی کے بدلے میں جب دعا دیں گے اور احسان کریں گے تو گالی بھی مٹ گئی اور احسان غالب آ گیا اس واسطے فرمایا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ

فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ ① دوسروں کی برائیوں کو اپنی بھلائیوں سے دفع کرو، عداوت بھی ہوگی وہ دوستی میں تبدیل ہو جائے گی، عداوت ختم ہو جائے گی محبت پیدا ہو جائے گی مگر آگے یہ فرمایا: ﴿وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا﴾ ② یہ وہی کرسکتا ہے جس میں صبر وضبط کا مادہ ہو، اور اگر کسی کے اندر صبر نہ ہو، کسی نے ایک گالی دی اور وہ باہر نکل کر دس گالیاں دے، وہ یہ کام نہیں کرسکتا، یہ بڑے صابر اور ضابط انسان کا کام ہے کہ بیس گالیاں بھی دی جائیں تو وہ پی جائے ۔ اور یہ پینا لوجہ اللہ ہو کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ میں اس کی اصلاح کروں اور اپنی بھی اصلاح کروں، تو یقیناً وہ گالی اور برائی مٹ جائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خلق دیا گیا تھا۔

علمی و عملی قرآن کریم...... بعض لوگوں نے صدیقہ عائشہؓ سے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا؟ فرمایا: ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ'' ③ آپ کے اخلاق یہ قرآن کریم ہے، قرآن کریم اوّل سے لے کر آخیر تک پڑھ لو، جس چیز کو قرآن نے اچھا کہا وہ تمام اچھائیاں آپ کے اندر ہیں جن چیزوں کو بُرا کہا آپ کی ذات بابرکات اس سے بری الذمہ ہے، تو پورا قرآن کریم آپ کے خلق کا نمونہ ہے، قرآن جو کہتا ہے وہی آپ کر کے دکھلاتے ہیں، جو آپ کر کے دکھلاتے ہیں، قرآن کریم اس کی تائید کرتا ہے، تو قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مطابق ہیں اللہ کا ایک قرآن علمی ہے جو کاغذوں میں ہے اور ایک قرآن عملی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے جو چیزیں قرآن کریم میں قال کی صورت میں ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں حال کی صورت میں ہیں۔

وہاں کلام کی صورت میں ہیں یہاں اعمال کی صورت میں ہیں، یہ دونوں قرآن ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہیں، ایک اللہ کا کلام ہے اور ایک اللہ کا کام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کے مورد بنے ہوئے ہیں وہ گویا اخلاقِ خداوندی کا نمونہ ہے حق تعالیٰ کے بھی تو یہی اخلاق ہیں کتنے لوگ ہیں جو اللہ کو برا کہتے ہیں کتنے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں، کتنے ہیں جو حق تعالیٰ کے صریح مدمقابل آئے ہوئے ہیں حتی کہ یہی بدکردار انسان ڈھٹائی کے ساتھ ''اینٹی خدا اور اینٹی رسول'' انجمنیں قائم کرتا ہے، یعنی خدا اور رسول کے مقابلے کے لئے انجمنیں قائم کرتے ہیں، مالک الملک کی شان میں اتنی گستاخیاں مگر اس کے باوجود حلم کا یہ حال ہے کہ نہ بارشیں بند ہوتی ہیں نہ آفتاب کا طلوع وغروب ہونا بند ہوتا ہے، نہ موسم آنے بند ہوتے ہیں، نہ موسموں کے غلے پھل بند ہوتے ہیں دوست بھی کھا رہے ہیں دشمن بھی کھا رہے ہیں، گالیاں بھی دے رہے ہیں اور مالک کا دیا ہوا کھا بھی رہے ہیں ایسے ناہنجار ہیں کہ محسن کا احسان تو کیا مانتے، الٹا برا بھلا کہہ رہے ہیں، فائدہ اسی کی نعمتوں سے اٹھا رہے ہیں یہ حق تعالیٰ کا حلم ہے جس کو عارف رومی نے کہا: شو مغرور بر حلم خدا...... یہ جو تم گالیاں بک رہے ہو، یہ جو برا بھلا کہہ رہے ہو، اور عذاب نہیں آتا، تو اللہ کے حلم پر مت مغرور ہو، معلوم نہیں اخیر میں کیا نتیجہ نکلے گا؟ کیا بدلہ دیا جائے گا؟ یہ تو حلم خداوندی

---

① سورة فصلت: ٣٤. ② سورة فصلت: ٣٥.

③ مسند احمد، حديث السيدة عائشه رضى الله عنها ج: ٥٠ ص: ٢١١ رقم: ٢٣٤٦٠.

ہے کہ صبر کیا جارہا ہے، لیکن جہاں وہ صابر ہیں اور صبور ان کا نام ہے غفور ان کا نام ہے وہیں جبار اور قہار بھی ان کا نام ہے، ان کا قہر جب آتا ہے تو پھر کوئی چیز اس کو روکنے والی نہیں ہوتی، تو: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ الْحَلِيْمِ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں حلیم کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں، وہ حلم کرتا ہے مگر جب غضب ناک ہوتا ہے تو پھر غضب کی کوئی حد نہیں رہتی، بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کے اخلاق کا نمونہ تھے، جیسے دشمنوں کی دشمنی دیکھ کر پھر بھی اپنا رزق بند نہیں کرتے، وہی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ دشمن گالیاں بھی دے رہے ہیں، برا بھلا کہہ رہے ہیں، قتل وغارت بھی کررہے ہیں، پتھر بھی مار رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، تو صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق دیکھنے ہیں تو اول سے لے کر اخیر تک قرآن کریم پڑھ لو جتنی چیزیں اس میں بھلائیوں کی بیان کی ہیں، وہ سب ایک ایک کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں موجود ہیں، اور جن جن برائیوں سے روکا ہے، حضور علیہ السلام ان برائیوں سے پاک ہیں غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کا نمونہ ہیں۔

تمسخر پر اہلِ حق کی خاموشی کا نتیجہ......اور بعض صحابہؓ نے کہا اگر آپ کے اخلاقِ عظیمہ دیکھنے ہیں تو اس آیت کو پڑھ لیں۔﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ① اے پیغمبر! معافی کی خو اختیار کرو، اور امر بالمعروف کرتے رہو، لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلاتے رہو، ان کی ناہنجاریوں پر مت جاؤ، اگر یہ جاہلانہ حرکت بھی کریں تو درگذر کیجئے بالکل خیال ہی نہ لائیے، ان کی جاہلانہ حرکات خود بخود بند ہوجائیں گی۔ جیسا کہ متقی حضرات کی شان قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ② ایک صالح، نیک بندہ عارف باللہ گزر رہا ہے، اور مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ تمسخر کررہے ہیں نام لے کر پھبتیاں کس رہے ہیں، لیکن اولیاء کرام کی شان کیا ہے؟ ایسی لغو مجلسوں سے نظر نیچی کر کے گذر جاتے ہیں، دھیان بھی نہیں لاتے کہ یہ کیا بک رہے ہیں، یہ نہیں کہ متاثر ہوں اور خم ٹھونک کے کھڑے ہوجائیں کہ تم نے مجھے برا بھلا کیوں کہا؟ صبر وضبط اور درگزر کو اختیار کرتے ہیں اور آنکھ نیچی کر کے گزر جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بدکردار کے مقابلہ میں حق تعالیٰ آجاتے ہیں، آپ کو مقابلہ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ: ''مَنْ اٰذٰى لِىْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ'' ③ جس نے میرے ولی اور دوست کو ستایا میں اس کو الٹی میٹم دیتا ہوں وہ مجھ سے نمٹے، میں اس سے مقابلہ کروں گا، اس ولی کی طرف نہ جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو چھوڑ دیتے ہیں کہ تم اپنے کام میں لگے رہو ہم تمہارے دشمنوں سے ہم خود ہی نمٹیں گے۔ پھر اس جنگ کا نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اس کی آل اولاد اور مال پر آفت پڑتی ہے۔

---

① پارہ: ۹، سورة: الاعراف، الآية: ۱۹۹۔ ② پارہ: ۱۹، سورة: الفرقان، الآية: ۷۲.

③ الصحيح للبخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع ج: ۲۰ ص: ۱۵۸ رقم: ۶۰۲۱.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ!

نفیِ جنون کے دو طریقے..... بزرگانِ محترم حق تعالیٰ شانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی تہمت اٹھاتے ہوئے اور اس کی نفی کرتے ہوئے دو طریقے اختیار فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کمالات حق تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں ان کمالات کا ذکر فرمایا اور نعمت کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ فرمایا بتلانا یہ تھا کہ جس ذاتِ بابرکات میں یہ کمالات موجود ہوں اس کو مجنون کہنا بہت زیادہ نادانی اور حماقت کی بات ہے اس طرح جنون کی نفی ہوگئی، اور کفار کی تہمت سے بریت ثابت ہوگئی۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ جنون کی تہمت رکھنے والے کے آثار بیان کئے کہ ان کے احوال پر ذرا غور کیا جائے پیغمبر کو مجنون کہنے والے کون ہیں؟ اس واسطے کہ تہمت لگانے والی شخصیت اگر باوقعت ہو اور بڑے درجہ کا آدمی ہو تو وہ تہمت تقابل التفات بھی ہے اگرچہ تہمت بڑا لگائے چھوٹا لگائے حماقت ہے، لیکن بہرحال اگر کوئی سنجیدہ اور متین شخص اور مخلوق میں مقبول ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اس پر غور کرلیا جائے کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، لیکن اگر کہنے والا ایسا ہے کہ انسانیت کی جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ ساری اس کے اندر موجود ہوں تو اس کی تہمت بہت ہی بے وقعت ہے، جو قابلِ توجہ بھی نہیں ہے تو جن پر تہمت لگائی گئی ان کے آثار کمال دیکھو اور ایک طرف تہمت لگانے والے کی برائیوں پر نظر ڈالو، تو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تہمت محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، تو یہ تہمت سب سے پہلے جس نے لگائی اور اسے لے کر کھڑا ہوا، وہ ولید بن مغیرہ ہے، یہ سردارانِ قریش میں سے ایک سردار ہے اس نے اپنی دشمنی اور عناد میں آکر کہا کہ:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں، معاذ اللہ ان کی بات کا تو کوئی اعتبار نہیں، سوال یہ ہے کہ اس تہمت لگانے والے کے کیا اوصاف ہیں۔

تہمت جنون لگانے والے کی عرفی حیثیت......تو حق تعالیٰ نے دس اوصاف اس کے بیان کئے کہ یہ دس برائیاں اس کے اندر ہیں جو ایک انسان کے ذلیل وخوار ہونے کے لئے کافی ہیں مزید کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تو اس نے صرف ایک برائی بلکہ تہمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی تھی، کہ معاذ اللہ آپ مجنون ہیں، تو حق تعالیٰ نے دس برائیاں ثابت کیں اور فرمایا: جس کے اندر یہ حرکتیں موجود ہیں، اس کی بات بھی کوئی قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے؟ اور یہ عجیب نہیں کہ اس بناء پر ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مداح اور ستائش کرنے والے آپ پر جو درود شریف بھیجتے ہیں تو درود بھیجنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو اس درجہ محبت کے مقام پر مانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں، چنانچہ فرمایا گیا: ''مَنْ صَلّٰی عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا'' (۱) جو شخص ایک دفعہ ہمارے نبی پر درود بھیجے گا تو اللہ اس پر دس دفعہ رحمت بھیجے گا، تو اس کا مطلب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رحمت کی دعا کرنے والا دس مرتبہ اللہ کی رحمت کا مستحق بنے گا، تو اللہ جس بندے کو دس خوبیاں اور نیکیاں دے ظاہر بات ہے کہ اس سے بڑھ کرامت میں اور کون ہوگا جس کو حق تعالیٰ سراہیں اور اس پر رحمت نازل فرمائیں ٹھیک اس کے بالمقابل جو ایک دفعہ برائی کرے گا حق تعالیٰ اس کی دس دفعہ برائی بیان کریں گے وہ ایک تہمت عائد کرے گا تو حق تعالیٰ نے اس کی تہمتیں اس پر عائد کیں اس نے ایک جھوٹی تہمت لگائی تھی حق تعالیٰ نے اس کی سچی دس تہمتیں بیان فرمادیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو ایسا ہو تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی بات سنی جائے؟

دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس بری خصلتیں......فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّھِیْنٍ﴾ پہلی بات یہ ہے کہ وہ حلّاف ہے، یعنی کثرت سے قسمیں کھانے والا ہے اور تجربہ یہ ہے کہ جو زیادہ قسمیں کھاتا ہے بار بار قسمیں کھاتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اُسے خود بھی اپنی بات پر اعتماد نہیں ہے، اس لئے قسمیں کھا کھا کر زبردستی اپنی بات کو مخلوق کے دل میں ٹھونسنا چاہتا ہے، بات میری قابل اعتبار تو نہیں ہے، قسمیں کھانے سے ممکن ہے کوئی اعتبار کرے تو اس کو حلاف کہا گیا ہے تو یہ خود ایک برائی ہے کہ آدمی بات بات پر قسم اٹھائے شریعت نے اس کو مکروہ سمجھا ہے قسم کسی ضرورت کے لئے ہوتی ہے، کوئی دعویٰ ثابت کرنا ہو یا کوئی معاملہ ہو اور معاملہ پکا نہیں ہو رہا ہے تو اس کے لئے آدمی قسم کھائے، لیکن جس شخص کا قسم تکیہ کلام بن جائے، بات بات پر حلف اٹھائے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوتی ہے، اس لئے مسئلہ شرعی یہ ہے کہ: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ﴾ (۲) اللہ کے نام کو کھلونا مت بناؤ، تھوڑی تھوڑی بات کے لئے اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی بڑا اہم معاملہ ہو تو اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی وقف کا معاملہ ہو کوئی اور کارِ خیر سرانجام دے رہا ہو اس کا حلف اٹھائے، اللہ کو بیچ میں لائے چھوٹی چھوٹی

(۱) الصحیح لمسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد التشھد ج: ۲ ص: ۳۷۶ رقم: ۶۱۶۔ (۲) پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۴۔

اور خسیس خسیس باتیں اور بار بار اللہ کے نام کو بیچ میں لا رہا ہے تو یہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی ہے اس واسطے شریعت نے روکا ہے کہ بار بار قسم مت کھاؤ، کوئی بڑا معاملہ آ جائے، عدالت میں کوئی معاملہ آ جائے یا لاکھوں روپوں کا معاملہ ہو، یا کوئی دین کا معاملہ ہو تو آدمی کہے کہ میں حلف کرتا ہوں، میں نے آج کھانا کھایا تھا، مجھے خدا کی قسم ہے قسم ہے اللہ کی میں نے کپڑے پہنے تھے، یہ کوئی قسم کھانے کی بات ہے، بھائی تو نہ پہنتا تو کیا تھا اور پہن لئے تو کیا ہو گیا، غرض اللہ کے نام کو کھلونا نہ بنائے شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے، تو وہ (ولید) بار بار قسم کھاتا ہے، تو اسے اپنی بات پر بھی اعتماد نہیں ہے تو جو شخص خود بھی اپنے کو جھوٹا سمجھتا ہو اس کی بات کیا قابل اعتبار ہے؟ اور اس ذات اقدس پر تہمت لگائے جو پورے عالم سے بڑھ کر مقدس ہے۔

تو خود جھوٹا، قسم کھانا اس کی علامت ہے اور اس عظیم شخصیت کے اوپر تہمت لگائے تو دو وجہوں سے یہ بات اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اوپر اعتماد کیا جا سکے، غرض پہلی بات حلاف سے بیان کی۔ دوسری بات، مھین ...... یہ بے وقعت آدمی ہے، یعنی ملک میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں، بار بار قسمیں اٹھانے سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹا اور معاند ہے اور اپنی بات پورا کرنے کے لئے قسمیں کھاتا ہے تو...... حلاف، مھین ...... یعنی ذلیل اور بے وقعت ہے لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت وعظمت نہیں ہے، پھر ساتھ میں ھمّاز بھی ہے، یعنی عیب چینی اس کی عادت ہے، عرب والے اس سے تنگ ہیں، یعنی واقعی ناواقعی کسی میں کوئی برائی ہو اس کی زبان پر آ جاتی ہے کہ فلاں میں یہ عیب ہے تو ساتھ میں ھماز بھی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿مَشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ چغلخور بھی ہے، اس کی بات اس کو لگا دی اس کی بات اس کو لگا دی، اور دونوں میں لڑائی کرا دی، تفریق ڈلوا دی، یہ گویا اس کا بڑا کمال ہے۔

مدعی جنون کے اوصاف اہل جہنم جیسے ہیں ...... انسانوں میں کمال یہ سمجھا گیا ہے کہ دو لڑتے ہوؤں کو آپس میں جوڑ دے عناد کرنے والوں میں محبت پیدا کر دے یہ کوئی کمال ہے کہ دو محبت کرنے والوں کو توڑ دے یہ شیطانی وصف ہے، شیطان دنیا میں اسی لئے آیا ہے کہ جڑے ہوئے دلوں کو توڑ دے، محبت والوں میں تفریق پیدا کر دے، جبکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں مقصد یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے دلوں کو ملائیں۔

تو برائے وصل کردن آمدی ۔۔۔ نے برائے فصل کردن آمدی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں وصل کرنے کے لئے آئے ہیں، جو بندے آپس میں ٹوٹ گئے ہیں، انہیں آپس میں ملائیں، جو بندے خدا سے ٹوٹ گئے ہیں، انہیں خدا سے جوڑ دیں، جن خاوند بیویوں میں جھگڑا ہے ان کو آپس میں جوڑ دیں جن کے کنبوں میں تفریق ہے ان کو ملا دیں اگر قوم میں لڑائی ہے تو اس میں اتحاد پیدا کر دیں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کا دعویٰ فرماتے ہی پہلا کام یہ کیا ہے کہ عربوں میں جو صدیوں سے لڑائی چلی آ رہی تھی اور باہم رقیب تھے اور ایک ایک لڑائی پر سو سو برس گذر چکے تھے، ان کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا جس کو

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ ① اے عربو! تم لڑلڑ کر جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ذلیل ورسوا بن گئے تھے، دنیا کی قوموں میں تمہارا کوئی وقار باقی نہیں تھا، کوئی عربوں کو اونٹوں کے چرانے والے کہتا تھا کوئی مینگنیوں میں کھیلنے والے کہتا تھا، کوئی ذلیل لوگ کہتا تھا، غرض دنیا کی قوموں اور حکومتوں میں عربوں کی بے وقعتی تھی ذرا ذرا سی بات پر جنگیں ہوتی تھیں، پانی پینے پلانے پر جھگڑا تھا، فلاں نے کنویں میں پہلے کیوں ڈول ڈال دیا، میرا ڈول پہلے کیوں نہ گرا، لڑائی شروع ہوئی اور تلواریں کھنچ گئیں۔

حدیث میں ایک واقعہ میں فرمایا گیا کہ ایک شخص کے کھیت میں کسی کی اونٹنی جا گھسی اس نے تیر مارا تو اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ کھیت کی رکھوالی کرنیوالی عورت تھی، اونٹنی والے کو غصہ آیا، اس نے آکر عورت کا پستان کاٹ دیا، بس یہاں سے جنگ شروع ہوئی اور سو برس تک جنگ جاری رہی، مرنے والے وصیت کر کے جاتے تھے کہ صلح مت کرنا، ورنہ خاندان کی ناک کٹ جائے گی، ہزاروں آدمی قتل ہو گئے محض اس لئے کہ اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اور اس میں ایک صدی گذر گئی حربِ فجار و حرب یسوو غیرہ پچاس برس تک چلتی رہی، اسی طرح کوئی دس برس چلتی رہی۔

اہل جنت اور اہل جہنم کے اخلاق...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر سب کو ایسا شیر وشکر کر دیا کہ حقیقی بھائیوں میں وہ محبت نہ ہوگی جو صحابہؓ کے اندر محبت پیدا ہوئی ان کی شان یہ بیان کی گئی: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ② وہ کفار پر شدید تھے اور آپس میں رحیم تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے پانی پانی تھے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ③ باہم محبتیں اللہ کے لئے کرتے تھے غرض کی محبت نہ تھی، اغراض کی خاطر نہ تھیں اللہ کے لئے تھیں۔ تو وہ کفار کے اوپر عزیز اور غالب تھے لیکن باہم پست اور چھوٹے بن جاتے تھے، ایمان والوں میں سے جسے دیکھو تواضع کر رہے تھے، یہ کیفیت ہے جیسے شاگرد استاذ کے سامنے ہوتا ہے، یا مرید اپنے پیر کے سامنے، گویا سب خادم تھے جو کمال تواضع کی دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اور جلیل القدر صحابی ہیں، یہ حضرت زید بن ثابتؓ کے شاگرد ہیں، علم فرائض اور دوسرے علوم حضرت ابن عباسؓ نے انہی سے حاصل کئے ہیں، زید بن ثابتؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خصوصی وصف ارشاد فرمایا کہ: ''اَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ'' ④ یعنی فرائض کے سب سے زیادہ عالم حضرت زید بن ثابتؓ ہیں، تو ابن عباسؓ حضرت زید بن ثابتؓ سے فتاویٰ اور مسائل پوچھتے تھے، ایک دن حضرت زید بن ثابتؓ نکلے، گھوڑا تیار تھا اس پر سوار ہوئے تو ابن عباسؓ نے رکاب تھام لی، انہوں

① پارہ: ۴، سورۃ: آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳. ② پارہ: ۲۶، سورۃ: الفتح، الآیۃ: ۲۹. ③ پارہ: ۶، سورۃ: المائدۃ، الآیۃ: ۵۴. ④ السنن للترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت رضی اللہ عنہما ج: ۱۲ ص: ۲۶۲.

نے کہا: اے ابن عم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا غلط کام کر رہے ہو، میری رکاب کیوں تھام رہے ہو؟ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہو، تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہے تم واجب التعظیم ہو، ایسا کیوں کرتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے استاذوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جائے جو میں کرر ہا ہوں۔ اس کے بعد ابن عباسؓ کسی گھوڑے پر سوار ہونے لگے تو حضرت زید ابن ثابتؓ نے جا کر ان کے پاؤں پکڑ لئے اور رکاب پر ہاتھ رکھ دیا، وہ گھبرائے اور عرض کیا: اے زید! یہ آپ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: ہمیں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے کہ اہل بیت رسول اللہ کے ساتھ یہی ادب کا معاملہ کریں، اہل بیت رسول اس قابل ہیں کہ ان سے محبت کی جائے ان کی عظمت کی جائے، اور ان کی محبت کو جزوِ ایمان سمجھا جائے۔

تو زید ابن ثابتؓ استاذ ہیں مگر ابن عباسؓ کے پاؤں تھام رہے ہیں اور ابن عباسؓ اہل بیت میں سے ہیں مگر زید ابن ثابتؓ کے پیر تھام رہے ہیں غرض اسلام نے اس درجہ محبت پیدا کر دی تھی کہ بڑے چھوٹے کا امتیاز معاملات کے اندر نہیں رہا تھا، ہر ایک یوں سمجھتا تھا کہ یہی سب سے زیادہ بڑے ہیں اور دوسرا یوں سمجھتا تھا کہ زیادہ بڑے یہ ہیں، تو یہ کمالِ تواضع محبت باہمی کا منشاء بنا، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے تشریف لائے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے کو ملا دیں، تفریق شدہ لوگوں کو باہم میل ملاپ کرا دیں، اس لئے نہیں آئے تھے کہ آپ دلوں کو توڑیں، باہم تفریق پیدا کریں اور گروہ بندی پیدا کر دیں، گروہوں کو مٹانے کے لئے آپ تشریف لائے تھے، اور جو تہمت لگانے والا ہے وہ چغل خور ہے کہ رات دن اس کا کام باہم تفریق ہے یہ تفریق کرانا حقیقت میں اہل جہنم کے اخلاق میں سے ہے، ملانا اور قلب میں یکسانی پیدا کرنا یہ اہل جنت کے اخلاق میں سے ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں اہل جہنم کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں فرمایا گیا: ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا﴾ ① جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی تو جو پہلے سے وہاں موجود ہوگی وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے وہ کہیں گے تمہارے اوپر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے، تو لعن طعن کا شور ہوگا کہ جہنم کا عذاب تو ایک طرف یہ مستقل ایک عذاب ہوگا کہ وہ اسے گالی دے رہا ہے وہ اسے گالی دے رہا ہے، وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے، تو لعنتیں درحقیقت اہل جہنم کے اوصاف میں سے ہیں۔ اور اہل جنت کے اوصاف میں فرمایا گیا: ﴿إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ ② بڑی بڑی مسندوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے جیسے حقیقی بھائیوں کے، ایک کی محبت دوسرے کے اندر جاگزیں ہوگی، تو بڑے بڑے شاہانہ تخت پر بیٹھے ہوں گے۔ اس جگہ پر قید لگائی ﴿مُتَقَابِلِينَ﴾ یعنی بڑے سے بڑا بھی مجمع ہوگا تو ایک دوسرے کو پشت نہیں دے گا، بالکل آمنے سامنے ہوں گے۔ اس لئے کہ جنت میں جگہ کی تو

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۴۷۔

کوئی کمی نہیں، یہ جو ہم ایک دوسرے کو پشت دیتے ہیں یہ جگہ کی کمی ہے، اگر ایک دائرہ بنا کے بیٹھیں اور آمنے سامنے ہوں اور فرض کیجئے ایک ہزار یا دس ہزار آدمی ہوں تو گھر کے لئے اتنا بڑا میدان کہاں سے لائیں کہ دس ہزار آدمی ہوں اور کسی کی کسی کو پشت نہ ہو، پھر یہ کہ آواز نہیں پہنچ سکتی بات نہیں ہوسکتی اگر چار پانچ میل کا ایک دائرہ بن گیا تو آواز تو بجائے خود ہے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکیں گے، لیکن جنت میں یہ چیزیں نہیں ہیں، آواز پچاس ہزار میں سنو تو ایسی ہوگی جیسے پاس بیٹھے ہوں اور وہاں آمنے سامنے چہروں کی روشنی ایسی مصفّٰی ہوگی کہ پچاس ہزار میل کا فاصلہ ہو تب بھی ایسا ہی نظر آئے گا جیسے آدمی پاس بیٹھا ہو۔

احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمین سے بڑی ہے، اوپر کی جنت والے نیچے والوں کو ایسے نظر آئیں گے جیسے ستارے چمک رہے ہیں، نگاہیں اتنی تیز کردی جائیں گی کہ زمین و آسمان جسے بھی زیادہ فاصلہ ہوگا اور وہاں کی چیزیں ایسے نظر آئیں گی جیسے پاس پڑی ہوئی ہیں تو جنت کے اندر جگہ کی بھی کمی نہیں اور یہ جو مسافتوں کی وجہ سے دیکھنے یا آواز کے سننے میں دشواری ہوتی ہے یہ بھی نہیں ہوگی اس واسطے فرمایا گیا ﴿اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴾ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے، پشت کا وہاں سوال نہیں ہوگا کہ کسی کو پیٹھ دے کر بیٹھے، نہ دیکھنے میں کوئی چیز حارج ہوگی نہ بات کرنے میں اور نہ سنانے میں حارج ہوگی، تو تعظیم یہ بتلائی گئی کہ دلوں میں محبت جاگزیں ہوگی اور بیٹھنے میں ایک دوسرے کے پشت نہیں دیں گے تو تواضع بھی ہوگی، محبت بھی ہوگی ایک دوسرے کی توقیر اور تعظیم بھی ہوگی، یہ اہل جنت کے اوصاف ہیں۔

اور اہل جہنم کے بارے میں فرمایا گیا جو جماعت جائے گی وہ ان پر لعنت کرے گی اور پہلے والے ان پر لعنت بھیجیں گے، تو لعن طعن کا بازار گویا گرم ہوگا، تو فرمایا گیا کہ رسول کی شان تو یہ ہے کہ اس نے گویا بچھڑے ہوئے کو ملا دیا اور اس کی شان جو جنون کی تہمت لگا رہا ہے یہ ھمّاز بھی اور مشاء بنمیم بھی ہے، یعنی عیب چین بھی ہے اور ساتھ میں چغل خور بھی ہے اس کی اس سے اور اس کی اس سے لگا دی باہم ٹوٹ اور تفریق پیدا کردی، اور ساتھ میں ﴿مناع للخیر﴾ بھی ہے خیر کے ہر کام میں روڑے اٹکانے والا بھی ہے، کوئی اچھی سے اچھی چیز لے کے کھڑے ہوں، اس پر اعتراض کرنا اس کو چلنے نہ دینا اس کو روک دینا یہ اس ولید بن مغیرہ کی شان تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مومن کی شان کیا ہونی چاہئے؟ ''مِفْتَاحًا لِّلْخَیْرِ وَمِغْلَاقًا لِلشَّرِّ'' (1) ہر خیر کی کنجی ہے، جیسے کنجی سے تالا کھل کر اندر رکھی ساری چیزیں نمایاں ہوجاتی ہیں، گویا خیر کو ایک محل فرض کیا گیا اس پہ تالا پڑا ہوا ہے مومن اس کی چابی ہے، تالا کو کھول دیا تو ہر خیر نمایاں ہوگئی اور ہر بھلائی سامنے آگئی اور جہاں شر نکلتی ہو اس کا تالا بند کردے وہاں تالا ڈال دے کہ یہ شر نہ مجھے لگے نہ دوسرے کو لگے، تو مومن کی شان یہ ہے اور یہ ﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ﴾ ہو کہ نبی کے اوپر تہمت دھرتے ہیں، جن کی ذات ایسی بدنما ہو تو کیا ان کی بات قابل اعتبار ہوگی۔؟ پھر یہ کہ ساتھ میں ﴿مُعْتَدٍ﴾ بھی ہے یعنی حدود سے تجاوز

(1) السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من كان مفتاحا للخير ج: ١ ص: ٢٧٥ رقم: ٢٣٤.

کرنے والا بھی ہے، کسی حد پر قائم نہیں ہے کوئی اچھی حد قائم کردو، اس سے آگے گذر جائے گا نیکی کی ایک حد قائم کی، اس سے گذر کر آگے پہنچے گا حتیٰ کہ شر کے اندر پہنچ جائے گا، خیر کی کسی چیز کی حد باقی نہیں رکھتا، ہر چیز کی حدود سے تجاوز کرتا ہے، ظلم و تعدی اور زیادتی میں گزر جانے والا ہے، اور اوپر سے گناہ گار۔ ﴿اَثِیۡمٍ﴾ رات دن فسق و فجور میں مبتلا چنانچہ ولید ابن مغیرہ کی شان بتلائی گئی کہ زنا کار یہ تھا، بدکار یہ تھا، مَنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ یہ تھا، مُعۡتَدٍ اور اَثِیۡمٍ یہ تھا، اور پھر :عُتُلٍّ اُجڈ بھی تھا یعنی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، بات کی گویا لاٹھی ماری، یعنی کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، کوئی اچھی بات بھی کہے گا تو لاٹھی ماری بات کہے گا کہ خواہ مخواہ اس سے دل ٹوٹ جائیں گے، تو بالکل اُجڈ گنوار جنگلی قسم کا آدمی ہے کہ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، کوئی سلیقہ نہیں اعلیٰ درجہ کا بدتہذیب ہے، پھر فرمایا ﴿بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ﴾ پھر یہ کہ ولد الزنا بھی ہے، یعنی حلال کا نطفہ نہیں ہے، تیس چالیس برس تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس کا باپ کون ہے، تیس برس گذرنے کے بعد مغیرہ نے کہا کہ میں نے اس کی ماں کے ساتھ بدکاری کی تھی اس سے یہ پیدا ہوا، اس وقت کھلا کہ مغیرہ اس کا باپ ہے، تو ان تمام عیبوں کے ساتھ اوپر سے والد الزنا بھی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جس کا خون ہی ناپاک ہو، جس کی ابتداء ہی ناپاک ہو اس میں اچھے اخلاق کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اس میں بھلائی کہاں سے پیدا ہو جائے گی؟ اس کی تو بنیاد ہی خراب ہے۔

بعض اوقات بدکردار لوگوں کو اولاد و اموال کی کثرت دی جاتی ہے...... اِن تمام خرابیوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ﴿اَنۡ کَانَ ذَامَالٍ وَّبَنِیۡنَ﴾ اوپر سے کچھ اولاد اللہ نے زیادہ دے دی اور دولت بھی زیادہ دے دی تو کریلا اور نیم چڑھا بن گیا، تو یہ ساری بدعملیاں اور بداخلاقیاں تھیں، دولت کی وجہ سے لوگ اس سے دبتے تھے، اور وہ لوگوں کے سر پر سوار ہوتا تھا کہ کسی میں لڑائی کرادی کسی کو گالی دیدی، کسی کو برا کہہ دیا، تو چوبیس گھنٹے اس شخص کا مشغلہ ہی یہ ہے کوئی خیر کی بات کہتا ہے نہ کرتا ہے۔ اور ایسوں کو اللہ میاں ڈھیل دینے کے لئے زیادہ دے بھی دیتے ہیں، تاکہ اچھی طرح حجت قائم ہو جائے۔

قرآن کریم میں جب یہ آیت اُتری: ﴿عَلَیۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ﴾ (1) کہ جہنم میں انیس داروغہ ہیں، اور وہ اتنے سخت ہیں کہ ان کے دل میں رحم نہیں ڈالا گیا، وہ جہنمیوں پر ہر وقت عذاب ہی دینے کے لئے تیار رہیں گے، تو یہ آیا اور کہنے لگا کوئی پرواہ کی بات نہیں، میرے انیس بیٹے ہیں ہر داروغہ کے مقابلہ میں ایک کو پیش کردوں گا، یہ جہالت کی حالت ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں اللہ سے لڑنے کو تیار ہے، اور اللہ کے بنائے ہوئے داروغہ ملائکہ کے مقابلہ میں اپنے بیٹوں کو لا رہا ہے کہ جو ملائکہ اس کے بیٹوں کی آ کر روح قبض کریں گے ان کے مقابلہ کے لئے پیش کر رہا ہے، تو جہالت کی بھی انتہا ہے اور گنوار پن کی بھی انتہا ہے، غرض یہ دس چیزیں بیان فرمائیں، ان دس بدعملیوں اور بداخلاقیوں کے بعد اس کی حالت بیان فرمائی کہ: ﴿اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ

(1) پارہ: ۲۹، سورۃ: المدثر، الآیۃ: ۳۰.

الْاَوَّلِیْنَ﴾ جب اس کے سامنے کوئی اللہ کی آیت پڑھو تو کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں پچھلی باتیں ہیں، وہ پچھلے کہتے چلے گئے انہوں نے بھی نقل کر دیں، تو کسی خیر کی توقع نہیں، اور کوئی شر نہیں جسے اس نے چھوڑ دیا ہو، تو خیر کے پیچھے تو لاٹھی لئے پھرتا ہے اور شر جہاں ملتی ہے اسے سینے سے لگاتا ہے، یہ ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر تہمت لگانے والے کہ نہ ان کی اپنی قوم میں وقعت نہ ذاتی اوصاف اچھے، مگر چونکہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں مشترک تھے، اس واسطے جو یہ کہتا تھا اسے لوگ لے اڑتے تھے اور گھر میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ جھوٹا مکّار ہے، بدی کر رہا ہے اور بے ہودگی کر رہا ہے، مگر آواز میں آواز ملا دیتے تھے کیونکہ ان سب کی غرض اس طرف ہوگئی تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی جائے تو جو اس کے ساتھی تھے، وہ بھی اس کی وقعت نہیں کرتے تھے، یہ لوگ گویا کفار بھی تھے اور منافق بھی تھے۔

ابوجہل نے چندروزہ دنیا کی خاطر آخرت برباد کرلی...... ابوجہل جو ان کا ساتھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا تھا، سب وشتم کرتا تھا اور برا بھلا کہتا تھا، ایک دفعہ اس ولید نے تنہائی میں ابوجہل سے پوچھا کہ: کیا واقعی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی جانتا ہے، جیسا ظاہر میں کہتا ہے، اس نے کہا واللہ واللہ! میں جانتا ہوں دنیا میں سب سے زیادہ سچے یہی ہیں۔ اس نے کہا کم بخت علی الاعلان کیوں برائی کرتا ہے، بات مانتا کیوں نہیں؟ اس نے کہا سرداری جاتی رہے گی، قوم مخالف ہو جائے گی، جائیداد چھن جائے گی گھر بار چھن جائے گا، اسلئے میں برائی کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ میں دل سے جانتا ہوں کہ دنیا میں ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں، یہ کیفیت تھی تو جاہ و مال اور سرداری کے لئے اور چندروزہ زندگی کے لئے ایمان دین دیانت سب چھوڑنے کو گوارہ۔ تو فرمایا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تو یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی کمالات دیئے، اخلاقی کمالات دیئے، اصلاحِ عالم کے کمالات دیئے، تربیتِ عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمائی، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا سردار بنایا، اوران کو مجنون کہنے والا کون؟ ھماز، حلاف، مشاءٍ بنمیم، زنیم وغیرہ ذالک دو ہی طریق سے ایک بات کو رد کیا جاتا ہے، جب کسی عظیم شخص کی برائی بیان کی جائے تو اس کے فضائل بیان کر دیئے جائیں، دفعیہ ہو جاتا ہے کہ وہ تہمت ان پر ثابت نہیں، یا یہ ہے کہ تہمت رکھنے والے کی حقیقت کھول دی جائے، حق تعالیٰ شانہ نے دونوں راستے اختیار فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب جامع بیان فرمائے اور تہمت لگانیوالوں کی حقیقت کھول دی۔

سردارانِ قریش کا مشورہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب...... ﴿وَدُّوْا لَوْتُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ اس آیت کا شانِ نزول اور اس کے نازل ہونے کا سبب یہ پیش آیا کہ سردارانِ قریش میں سے چار بڑے بڑے سردار ایک ولید ابنِ مغیرہ ایک ابوجہل ابن ہشام، ایک اخنس بن شریق ایک اسود ابن عبد یغوث یہ بڑے سردار تھے اور دولت مند بھی تھے، اوران کی بات بھی مانی جاتی تھی، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے دیتے تھک گئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشن برابر چل رہا ہے، لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کی عظمت دنیا میں پھیلتی جارہی ہے جب کوئی صورت نہ دیکھی تو اب یہ ایک تجویز اختیار کی کہ چاروں مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے پیار اور محبت سے کہا: ''اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جو یہ باتیں کرر ہے ہو، اگر معاذ اللہ تمہارے دماغ میں واقعی کوئی خلل ہے کوئی بیماری ہے تو بہر حال ہم تمہارے عزیز قریب ہیں رشتہ دار ہیں علاج کرائیں گے، چاہے لاکھوں روپیہ خرچ ہوجائے، مگر تمہارا علاج کرائیں گے، اور اگر آپ کو عورت مقصود ہے اور تعیش مقصود ہے، تو عرب کی بہتر سے بہتر لڑکیاں لاکر ہم تمہارے سامنے پیش کردیں گے، اور اگر تمہیں دولت مقصود ہے تو ہم سب خزانوں کے منہ کھول دیں گے جتنی ہماری دولت ہے سب آپ قبضہ کرلو، اور اگر سرداری مقصود ہے تو آج سے ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں، آپ حسب ونسب میں یقیناً ہم سب سے بڑھے ہوئے ہو، اس کے ساتھ حسن وجمال اور سیرۃ وکمال میں یقیناً اعلیٰ ہو، ہم بادشاہ ماننے کو تیار ہیں ہمیں کوئی عار نہیں کہ ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرلیں، مگر اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ان بتوں کو برامت کہو اور جو ہم ان کی عبادت کرتے ہیں اس میں طعنہ مت دو، اب زیادہ سے زیادہ آپ اپنے معبود کی عبادت کرو گے، ہم وعدہ کرتے ہیں ہم بھی آپ کے معبود کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کریں گے، نہ تمہاری عبادت پر کوئی طعن کریں گے تم اپنا کام کئے جاؤ ہم اپنا کام کئے جاتے ہیں، آپ ہمارے بادشاہ دولت بھی تمہارے لئے حسن وجمال بھی تمہارے لئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان میں سے کوئی چیز درکار نہیں، نہ مجھے حسن وجمال چاہئے نہ دولت چاہئے نہ عورت چاہئے نہ مجھے بادشاہت چاہئے، میں تو اللہ کی بندگی کو دنیا میں پھیلانے کے لئے آیا ہوں، کہ سب کو اللہ کا بندہ بنادوں۔'' اس پر انہوں نے کہا، بہت اچھا ہم اسے بھی مانتے ہیں آپ یہ جاری رکھیئے بس اتنا کیجئے کہ ہم جن بتوں کی پرستش کرتے ہیں آپ ان کو برا نہ کہیئے، ان کی تکذیب نہ کریں۔

ردِّ شرک کے بغیر توحید نامکمل ہے...... مگر انبیاء علیہم السلام شرک کی برائی نہ بیان کریں تو لوگ توحید کی طرف کیسے آئیں گے؟ اگر اللہ کے ساتھ دشمنی کرنے کی برائی بیان نہ کریں، تو اللہ کی دوستی لوگ کیسے پیدا کریں گے۔ اس لئے دو چیزیں ہیں، ایک مثبت اور ایک منفی، ایک لا الہ ہے کہ کوئی معبود نہیں، ایک الا اللہ ہے کہ اللہ ایک ہے، تو اللہ کی وحدانیت ثابت نہیں ہوسکتی جب تک لا الہ سامنے نہ ہو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں کسی کو بھی معبود بنائیں اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ اس کی پوجا کی جائے، اس کی عبادت کی جائے تو سب کی معبودیت کی نفی کردیں تو اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اثبات ہوگا تو کلمۂ طیبہ جس پر دین کا مدار ہے اس میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں ایک نفی اور ایک اثبات ہر غیرِ حق اور فرضی معبود کی نفی اور جو واقعی معبودِ واحد اور حقیقی معبود ہے اس کا اثبات غرض جب تک ردِ شرک نہ کیا جائے توحید مکمل نہیں ہوتی، اگر ردِّ شرک نہیں ہوگا اور توحید مان لی تو توحید میں سو قسم کے شرک ملادیں گے ، اور دعویٰ کریں گے کہ یہ بھی توحید ہے تو وہ توحید ہمرنگِ شرک بن جائے گی، اس لئے شرک کی نفی کی جائے۔

تمام درجاتِ شرک کی نفی...... اور شرک کی نفی ایسی کہ شرکِ جلی، شرکِ خفی شرکِ وہمی اور شریک ابہامی سب کی

نفی کی جائے، تب جا کر توحید کا کمال ثابت ہوگا، شرک جلی تو یہ ہے کہ کوئی دو معبود مان لے اس کی نفی کرنی پڑے گی کہ معبود دو نہیں، معبود ایک ہی ہوتا ہے، ایک معبود مان کر صفات میں شریک کرے کہ عبادت کے لائق تو ایک ہی ہے، مگر ہوسکتا ہے کہ نیچے اس کے بہت سے معبود ہوں کوئی بیٹا دینے والا کوئی رزق دینے والا کوئی صحت دینے والا، کوئی نعمت کا اوتار کوئی مصیبت کا اوتار اس طرح سے مختلف اوتار ہوں جن میں اللہ حلول کئے ہوئے ہوں، اور اس نے اپنے اوتار اور پیکر بنادیئے ہوں، تو ذاتِ بابرکات ایک ہی ہے مگر اس کے جو مختلف کمالات ہیں ان کے جلوں نے دوسروں کو معبود بنادیا، یہ شرک جلی نہیں بلکہ شرک خفی ہوگا۔ اور ایک یہ ہے کہ ذات میں بھی آدمی شرک نہ کرے، صفات میں بھی شرک نہ کرے، عبادت میں شرک کردے، اگرچہ یوں کہے کہ اللہ ایک اور یکتا ہے، مگر جب عبادت کرنے بیٹھے تو کسی بت کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ تک پہنچانے والی چیز ہے، کسی تصویر کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرنے والی ہے تو یہاں ذات وصفات میں شریک نہیں کیا مگر عبادت میں شریک کردیا، اس کا بھی رد کیا جائے گا یہ شرک خفی ہے۔ اور ایک شرکِ صورتی ہے کہ حقیقۃً شرک نہیں مگر صورۃً شرک ہے اس سے بھی بچنا پڑے گا، جیسے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہ کسی میدان میں نماز پڑھتے تھے، چونکہ مسئلہ ہے کہ سترہ رکھ لیا جائے تا کہ لوگ اس سے باہر کو گزریں اندر سے نہ گزریں تو وہ ایک پتھر رکھ لیتے تھے، مگر پتھر کو ناک کی سیدھ پر نہیں رکھتے تھے کبھی دائیں مونڈھے کے مقابلے میں کبھی بائیں مونڈھے کے بالمقابل رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے بیچوں بیچ کیوں نہیں پتھر رکھ لیا، فرمایا ناک کے مقابل رکھوں گا تو صورت ایسی بن جائے گی، جیسے میں اس پتھر کی پوجا کررہا ہوں میں صورتِ شرک سے بھی بچتا ہوں، اگرچہ میرا قلب شرک سے پاک ہے مگر میں صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہتا کہ شرک پیدا ہو تو یہ شرک صوری ہے شریعت نے اس کو بھی دفع کیا ہے، اور ایک شرک ابہامی ہے کہ وہموں میں گزر جائے کہ فلاں آدمی شرک کررہا ہے اس سے بھی روکا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، اور نیت یہ ہے کہ میں مخلوق کو دکھلاؤں کہ میں بہت بڑا نمازی ہوں اور عبادت گذار ہوں یہ بھی فی الحقیقت شرک ہے کہ یہ اللہ کی عبادت نہیں ہے بندوں کی عبادت ہے، حالانکہ ظاہر میں کوئی شرک نہیں ہے اس کے دل میں ہے، شریعت نے اس کو بھی رد کیا ہے کہ توحید میں اس سے بھی خلل پڑے گا۔

اور ایک اس سے بھی زیادہ دقیق شرک ہے وہ یہ کہ نہ ذات میں شرک مانتا ہے نہ صفات میں مانتا ہے نہ عبادت میں مانتا ہے نہ شرک کی صورت پیدا کرتا ہے نہ دل کے اندر وہم ہے کہ دوسروں کو دکھلانے کیلئے عبادت کرے مگر پھر بھی شرک کا اندیشہ ہے، اور وہ یہ کہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے کوئی آدمی سامنے نہیں کہ یوں کہا جائے کہ دکھلانے کے لئے پڑھ رہا ہے، لیکن دل میں یہ خیال ہے کہ ایسی نماز پڑھ رہا ہوں کہ شاید ہی کسی نے پڑھی ہو مجھ سے بڑا کون عبادت گذار ہے، یہ عجیب ہے، یعنی اپنے نفس کو دکھلانا ہے کہ میں بڑا عابد ہوں زاہد ہوں فرمایا: یہ بھی شرک میں داخل ہے، عبادت کرتے وقت یہ وہم نہ آنا چاہئے، کہ میں کوئی بڑی عبادت کررہا ہوں، تو ناز تفاخر

اور اتراہٹ اس کے اوپر نہ ہو، اگر اتراہٹ پیدا ہوئی اور آدمی یہ سمجھا کہ میری عبادت بڑی ہے اور دوسرے کی حقیر ہے تو یہ کبر پیدا ہوگیا اور توحید کے ساتھ کبر جمع نہیں ہوتا، توحید کے معنی یہ ہیں کہ کبریائی اور عظمت صرف ایک ذات کے لئے مان رہا ہے، اپنے اندر کوئی کبر اور خودی نہیں ہے، غرض توحید کا کمال حاصل نہیں ہوسکتا جب تک شرک کی تمام اقسام نہ رد کردی جائیں، تو حق تعالیٰ نے روکا کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہو، اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ، تو انبیاء علیہم السلام جیسے اپنے رب کی عبادت کے لئے آتے ہیں، ویسے غیر اللہ کی عبادت کو روکنے کے لئے بھی تو آتے ہیں، اگر وہ نہیں روکیں گے تو تبلیغ آدھی رہ جائے گی، تو ممکن تھا کہ آپ کے دل میں یہ خیال گذر جائے کہ بس اتنی سی تو بات ہے میں ان کے بتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا، میں اپنے معبود کی تبلیغ کئے جاؤں گا، چلو فتنہ ختم ہو جائے گا، حق تعالیٰ شانہ نے روکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اثبات وحدانیت کے ساتھ ساتھ نفی شرک کے لئے بھی آئے ہیں، یہ تو کرنا پڑے گا، اور آپ ان سے ذرا بھی نہ دبیں، یہ اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں ماننے والے مانیں گے اگر یہ دس نہیں مانتے تو ہزار پیدا ہوں گے جو آپ کی بات کو مانیں گے، آپ گویا یہ سمجھتے ہیں اگر انہوں نے مان لیا تو گویا مشن کامیاب ہوگیا اور اگر انہوں نے میری بات کو نہ مانا تو گویا ناکامی ہوئی، آپ کسی حالت میں ناکام نہیں ہیں، اگر یہ چند ناهنجار نہیں مانتے تو ان کی نسلوں میں ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کے کلمہ کو مانیں گے، آپ اسی قوت سے شرک کا رد بھی کریں اور توحید کا اثبات بھی کریں اور فرمایا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ آپ اس بارے میں ان کی قطعاً اطاعت نہ کریں کہ آپ ذرا دبے ہوکر چلیں، آپ اسی طرح قوت سے رد شرک کریں جس قوت سے آپ اثباتِ وحدانیت کرتے ہیں، تو آپ ہرگز ان تکذیب کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں، یہ ان کی ایک چال ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے ردِ شرک سے روک دیں اور جب رک گئے تو ان کا مقصد پورا ہوگیا، اور یہ کہ آپ کو مان لیں یہ کبھی نہیں ہوگا، تو آپ اپنے مشن میں ناکام رہ جائیں گے، یہ کامیاب ہو جائیں گے ان کو کامیاب نہ ہونے دیں آپ اپنے مشن کو کامیاب بنائیں اور قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ مانتے ہیں یا نہیں۔

اندازِ تفہیم...... مگر ہاں جو کچھ بھی آپ فرمائیں وہ رحمۃ للعالمین کی شان سے فرمائیں یعنی کوئی سخت کلامی درشت کلامی نہ ہو، پیار اور محبت سے برائی کو برائی اور بھلائی کو بھلائی واضح کردیں اور شفقت کے ساتھ انہیں سمجھائیں، مگر شفقت کے ساتھ سمجھانے میں دونوں چیزیں آنی چاہئیں، جن خرافات میں یہ پڑے ہوئے ان کی برائی بھی آپ سمجھادیں اور جس نیکی کی طرف یہ نہیں آرہے اس کی بھلائی بھی آپ سمجھادیں، جب دونوں چیزیں سمجھائیں تب یہ آئیں گے اور اگر آج یہ نہیں آتے تو کل کو آئیں گے کل کو نہیں آئیں گے تو پرسوں کو آئیں گے نہیں آئیں گے تو ان کی نسلیں آئیں گی، آپ ہر صورت میں کامیاب ہیں اس لئے آپ اپنے مقصد کو مضبوطی کے ساتھ آگے چلائیں، قطعاً ان کی اطاعت نہ کریں، یہ تو ایک چال سے آپ کو اپنے مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں اور ڈھیلا بنانا

چاہتے ہیں تا کہ اپنے لئے نہ ہو لیکن ایک آڑل جائے گی کسی کی پرواہ نہ کریں۔ ﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾ یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں اور وہ ظاہری رواداری کر رہے کہ میل ملاپ قائم رکھو، حق و باطل کے امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو انبیاء علیہم السلام اس لئے نہیں آتے کہ ظاہرداری کا میل میلاپ کرلیں وہ تو حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے بعد خصوصیت سے فرمایا کہ کسی حلّاف کی ہرگز اطاعت نہ کریں، جو غلط قسمیں کھا کھا کر اپنے دعوے کو ثابت کرے، اور مہین و بے وقعت ہو، خود قوم کے اندر بھی اس کی کوئی حیثیت نہ ہو، ہماز و عیب چین ہو اور نکتہ چین ہو، چغل خور ہو ہر خیر کا دروازہ بند کرنے والا بھی ہو، بہت اُجڈ اور گنوار بھی ہو اور زنیم بھی ہو اور اوپر سے اولاد اور دولت کی کثرت سے اس کے اندر کبر و رعونت بھی آچکا ہو، اس کی تو آپ بالکل اطاعت نہ کریں، وہ تو محض ظاہرداری کے لئے اور آپ کو آپ کے راستے سے ہٹانے کے لئے ایک چال چل رہا ہے تو آپ کو کسی چال میں آنے کی ضرورت نہیں، آپ تو اللہ کے صریح حکم کو پہنچاتے رہیں۔

رسول خدا کو مجنوں کہنے والے کی جنگ بدر میں حذیفہؓ کی تلوار سے ناک کٹ گئی...... اور یہ اس کی حالت ہے کہ: ﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ جب اللہ کی کوئی آیت پڑھی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو وہی لکیر کے فقیر ہیں، جو پچھلی غلط باتیں آگئی ہیں جو سارے نبی کہتے چلے گئے ہیں یہ بھی وہی کہنے والے ہیں نہ انہیں عقل سے کوئی سروکار ہے نہ دنیا کی ترقی کو دیکھتے ہیں، نہ تمدن کو دیکھتے ہیں، بس انہیں تو ایک رٹ لگی ہوئی ہے کہ ایک اللہ کو ایک مانو اور اللہ کی ہی عبادت کرو، نہ تمدن کا خیال ہے نہ دنیا کی ترقیات کا خیال ہے یہ تو باتیں کیا کرتے ہیں، پہلے بھی کرتے آرہے ہیں، یہ بھی کررہے ہیں، یہ سب عیاذ اًباللہ بھولی بھولی سی باتیں ہیں۔ اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ﴾ خرطوم سُونڈھ کو کہتے ہیں، ہاتھی اور خنزیر کی ناک کو خرطوم کہتے ہیں ہر جانور کی ناک کچھ نہ کچھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی ہے، انسان کی ناک بھی نہایت خوشنمائی کے ساتھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہے، لیکن ہاتھی کی ناک سب سے زیادہ نیچے کو لٹکی ہوئی ہوتی ہے، گویا بالکل زمین پر ہی ہوتی ہے، اور ایسے ہی خنزیر کی ناک بھی پچکی ہوئی ہوتی ہے، اُبھری ہوئی نہیں ہوتی ناک ہی عزت کی جگہ ہے، تو ہاتھی چونکہ متکبر ہوتا ہے تو اللہ نے اس کی ناک نیچی کردی، اور خنزیر چونکہ بد جانور ہے اس لئے اس کی ناک نیچی کردی، تو ناک نیچے ہونا ذلت کی طرف کنایہ ہوتا ہے، تو فرمایا اس کا جو خرطوم ہے، بڑی اونچی ناک لئے پھرتا ہے، اسی پر ہم ضرب لگائیں گے اور اس کی ہم نے ناک نیچی کرنی ہے۔

چنانچہ جنگِ بدر کے اندر حضرت حذیفہؓ کی تلوار اس ولید ابن مغیرہ کے ناک کے اوپر لگی اور اس کی ناک کٹ گئی، پھر اس نے سینکڑوں علاج کروائے کہ کسی طرح اچھی ہوجائے، مگر اس کے اندر کیڑے پڑے اور بدبو ہوگئی، اور اسی میں مرگیا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا اس کی تو ناک پر ہم نے ضرب لگائی ہے اس واسطے کہ یہ ناک ہی

اسے لئے پھر رہی ہے، یہ ظاہری عزت کا دعویٰ یہی اسے بے چین کئے ہوئے ہے، تو اسی عزت کو پامال کرنا ہے اور وہ یہ کہ اس متکبر کی ناک نیچی کرنی ہے، چنانچہ ناک پر ہی بنی اور ناک ہی کے مرض سے دنیا سے گیا۔

انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں دنیا وآخرت میں عزت اور نافرمانی میں ذلت...... اس سے گویا معلوم ہوگیا کہ متبعینِ انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی بلند ہوتے ہیں، اور آخرت میں بھی اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی ختم کردیئے جاتے ہیں، اور آخرت میں بھی ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی، آج نہ ابوجہل کا نشان ہے نہ ولید ابن مغیرہ کا نشان ہے، نہ اخنس بن شریق کا نشان ہے نہ اسود بن یغوث کا نشان ہے، تو دنیا سے بے نشان ہوکر مٹ گئے، اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ پاک زبانوں پہ الگ، قلوب میں الگ دماغوں میں الگ، اور عرش پہ الگ، فرش پہ الگ، تو انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے جیسے خلفاء اربعہ ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ ہیں، آج ان کا نامِ نامی آجاتا ہے تو رضی اللہ عنہ کہتے کہتے زبانیں تھک جاتی ہیں، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو لوگ ان پر لعنت بھیجتے ہیں، تو متبعین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی باعزت تھے اور آخرت میں بھی، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی پامال اور آخرت میں بھی پامال، کسی جگہ بھی کوئی ان کی وقعت وعزت نہیں ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر مسلمان دنیا میں ابوجہل کی وقعت نہیں کرتے تو کیا کفار میں کوئی اس کی وقعت کرنے والا؟ کوئی ولید ابن مغیرہ کو سراہنے والا یہود ونصاریٰ میں کسی اور مذہب میں؟ کہیں موجود نہیں، جو بھی کہے گا یہی کہے گا انہوں نے بڑی غلط حرکت کی، مسلمان ان پر لعنت بھیج دیں گے، دوسرے کہیں گے بڑی غلط حرکت کی، غرض انبیاء علیہم السلام کی اطاعت میں عزت ہے اور ان کی تکذیب میں ذلت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود نے مقابلہ کیا تو مچھر سے ختم کرادیا گیا، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام امام للناس ہیں، ہر دل میں وقعت اور ہر دل میں عظمت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر فرعون ہے، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور اگر کہیں تذکرہ ہے تو لعنت سے یاد کیا جاتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نامِ پاک زبانوں پہ آتا ہے تو علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھا جاتا ہے، الغرض اوپر سے نیچے تک یہی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین صحابہ کرامؓ اس کے بعد تابعینِ کرام ہیں، اس کے بعد تبع تابعین کرام ہین اس کے بعد اہل اللہ، حضراتِ صوفیاء کرام، حضراتِ علماء کرام حضراتِ فقہاء کرام، حضراتِ مجتہدین عظام ایک ایک شخصیت کا نام آتا ہے تو رحمۃ اللہ علیہ کہتے کہتے زبانیں تھکتی ہیں، اور مکذبین میں سے کسی کا نام آتا ہے تو لعنۃ اللہ علیہ کہنے کے لئے زبانیں سوکھتی ہیں، تو یہ فرق ہے۔

عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے...... الغرض عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات پاک ہے، اس کے بعد عزت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو بنایا ہے، اور اس کے بعد ایمان والوں کو سرچشمہ بنایا، جو تصدیق کرنے والے ہیں، جس کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ

﴿وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① ''عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی ہے اور ایمان والوں کی ہے اور منافقین اس عزت کو نہیں جانتے۔'' اور ایک جگہ انتہائی اصلیت کو بھی فرمایا کہ: ﴿فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ② ''عزت صرف ایک اللہ کی ہے'' جو اس سے وابستہ ہو گیا اسی میں عزت آ گئی سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام وابستہ ہیں تو سب سے زیادہ ان کی عزت کی ہے، ان کے بعد ان کے اصحاب وابستہ ہیں ان کی عزت ہے۔

اب صحابہ کرامؓ میں ایک ایک نام لیں، صدیقؓ کا نام لیں، فاروقِ اعظمؓ کا نام لیں، عثمانِ غنیؓ کا نام لیں، علی المرتضیٰؓ کا نام لیں، ایک ایک کا نام آنے پر دل عقیدت و عظمت سے جھک جائیں گے، جس کو نسبتِ نبوی علیہ السلام مل گئی، عقیدت و عظمت قائم ہو گئی، اہلِ بیت کرام ہیں انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے اس کی وجہ سے ان کی محبت دل میں ایمان کا درجہ رکھتی ہے، آج اگر کوئی انہیں خدانخواستہ برا کہے تو یقیناً اس کے ایمان میں خلل ہے، اس شخص کو اپنے ایمان کی اصلاح کرنی چاہئے جو اپنے دل میں اہل بیت سے محبت نہیں رکھتا، یا عظمت نہیں رکھتا، تو یہ نسبت ہی تو ہے۔

جتنی نسبت قائم ہو گی اسی نسبت سے عظمت قائم ہو گی، نسبی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، روحانی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، بہرحال اس آیت نے بتلا دیا کہ مکذبین کی کوئی وقعت نہیں، نہ عند اللہ نہ عندالناس، اور مصدقین کی وقعت عنداللہ بھی ہے، اور عندالناس بھی ہے، اس واسطے ہر ایک اپنے دل کو ٹٹولے کہ میں اپنے دل میں اللہ و رسول کی عزت رکھتا ہوں یا نہیں اگر رکھتا ہے تو وہ خوش ہو، اگر نہیں رکھتا یا کمی ہے تو اس کمی کو دور کر دے، اپنے قلب کے اندر عزت عظمت بڑھائے، اور اپنے ایمان کو تازہ کرے تاکہ دنیا و آخرت میں اس کو درجات ملیں۔

① پارہ: ۲۸، سورۃ: المنافقون، الآیۃ: ۸۔ ② پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۱۳۹۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿اِنَّا بَلَوْنٰھُمْ کَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّۃِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّھَا مُصْبِحِیْنَ ٥ وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ ٥ فَطَافَ عَلَیْھَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّکَ وَھُمْ نَآئِمُوْنَ ٥فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ ٥ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ ٥ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ ٥ فَانْطَلَقُوْا وَھُمْ یَتَخَافَتُوْنَ ٥ اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّھَا الْیَوْمَ عَلَیْکُمْ مِّسْکِیْنٌ ٥ وَّغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ٥ فَلَمَّا رَاَوْھَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ٥بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ٥ قَالَ اَوْسَطُھُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ٥قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ٥ فَاَقْبَلَ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ ٥قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ ٥ عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْھَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ٥ کَذٰلِکَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ [1]

بزرگانِ محترم! کفارِ مکہ کی سرکشیوں اور کا ذکر چل رہا ہے اور ادھر سے حضرتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل کا ذکر ہے،تو ان مشرکین کو عبرت دلانے کے لئے پچھلی امتوں کا ایک واقعہ حق تعالیٰ شانہ نے بیان فرمایا،گویا اس واقعہ کو سامنے رکھ کر یہ عبرت پکڑیں،اوراس کا تجزیہ کریں اس کے اجزاء الگ الگ کر کے اپنے واقعات پر منطبق کریں، پھراندازہ کریں کہ یہ اسی بُری راہ پر چل رہے ہیں جس بری راہ پر یہ لوگ چلے اور عذاب میں مبتلا ہوئے،تو تمہارے اوپر بھی عذاب آئے گا اوراسے پھر روکنے والا کون ہوگا؟

اس دنیوی عذاب سے قیاس کرو کہ آخرت کا عذاب کتنا شدید ہوگا اوراسے کون روکنے والا ہے تو اس کی ایک مثال وہ واقعہ سنا کر بیان فرمائی ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم میں جو جو واقعات پچھلی امتوں کے بیان کئے گئے

[1] پارہ: ۲۹، سورۃ:قلم، ۷ا تا ۳۳.

ہیں وہ محض قصہ اور کہانی نہیں ہیں، یا محض تاریخ بیانی نہیں ہے، بلکہ وہ عبرت دلانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں، جیسا کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى﴾ ① یہ جو کچھ ہم واقعات بیان کرتے ہیں یہ عبرت کے لئے ہیں تاکہ اپنے کو ان پر قیاس کر کے وہی نتیجہ اپنے لئے نکالو جوان کے حق میں نکل چکا ہے۔

فوائد تمثیل و واقعہ......اور یہی انسان کی فطرت ہے کہ وہ اصول سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا واقعات سے متاثر ہوتا ہے، مثال سے آدمی کو جتنا جلد سمجھ میں آتا ہے، بہت سی معنوی اور باریک چیزیں جو دلائل سے سمجھنے میں نہیں آتیں، وہ مثال سے بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہیں اور معنوی امور کو جب آدمی محسوس چیزوں پر قیاس کرتا ہے چونکہ محسوسات آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں تو معنویات کو بھی جلد سمجھ جاتا ہے۔

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آگیا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے ہاں تمثیل بہت زیادہ تھی، اور بڑے بڑے دقیق امور کو معمولی مثالوں سے ایک جاہل کے ذہن میں اتار دیتے تھے، تو حضرتؒ کی مجلس نشینوں میں ایک شخص اللہ دین تھا، قصائیوں میں سے تھا، مگر آدمی فہیم تھا اور اسے دین کی سمجھ تھی۔ ایک دن حضرتؒ کی مجلس تھی، گرمی کا زمانہ تھا ایک شخص پنکھا جھل رہا تھا اور یہ خود پنکھا جھلنے والوں میں ہے، اس نے سوال کیا۔ حضرت! یہ جو بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ میت کو اہل اللہ کے قریب دفن کرنا چاہئے اس سے کیا فائدہ ؟ اس لئے کہ اگر اس دفن ہونے والے کے پاس نیکیاں ہیں چاہے میدان میں دفن کردو وہاں بھی اس کی نیکیاں کام آئیں گی، اگر اس کے پلے عمل صالح نہیں ہے تو کہیں بھی دفن کر دیں اس کی بدعملی اس کے سامنے آئے گی، تو اس کا کیا فائدہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس دفن کیا جائے؟ اس سے کوئی اعمال بدل جاتے ہیں؟

یہ اس نے ایک سوال کیا، اب سوال کرنے والا محض ایک جاہل اور عامی آدمی ہے، اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے، اور عالم برزخ کے ایک بڑے دقیق مسئلہ کا اب اگر دلائل سے سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، حضرت نے خاموشی اختیار فرمائی، اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پنکھا تو جھل ہی رہا تھا فرمایا: میاں اللہ دین! آپ پنکھا کسے جھل رہے ہو، اس نے کہا حضرت آپ کو، فرمایا ان مجلس والوں کو تو نہیں جھل رہے عرض کیا، نہیں صاحب! میں انہیں کیوں جھلتا نہ یہ میرے پیر نہ میرے استاذ؟ میں تو آپ کو جھل رہا ہوں ارشاد فرمایا انہیں بھی ہوا لگ رہی ہے یا نہیں؟ کہا جی ہاں ہوا تو لگ رہی ہے فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے اس لئے اہل اللہ کے پاس دفن کرتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں تو مقصود وہ ہوتے ہیں مگر آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے تو رحمت کے نیچے سب آجاتے ہیں، برکات سے وہ بھی مستفیض ہوتے ہیں۔

تو مسئلہ بہت دقیق تھا مگر ایک معمولی مثال سے اس کے ذہن میں بات بیٹھ گئی، اور اگر دلائل سے سمجھاتے تو

① پارہ: ۱۳، سورۃ: یوسف، الآیۃ: ۱۱۱.

اسے خاک سمجھ میں نہ آتی اس کا ذہن ہی اس قابل نہیں تھا، تو بعض دفعہ مثال کے ذریعہ سے مسئلہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور جب مثال اپنے معاملہ پر منطبق ہو جاتی ہے تو آدمی عبرت بھی پکڑتا ہے۔

اصحاب الجنۃ کا واقعہ...... اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے ایک مثال بیان فرمائی اور مثال بھی محض فرضی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے، تو واقعہ پر جو ثمرہ مرتب ہوا چونکہ تمہارا واقعہ بھی ویسا ہی ہے تو وہی ثمرہ تمہارے اوپر بھی مرتب ہوگا اور وہ واقعہ اصحاب الجنۃ کا ہے، یعنی باغ والوں کا۔ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے تین میل کے فاصلہ پر یہ باغ تھا، یہ ایک شخص کا باغ تھا جو نیک اور صالح آدمی تھا، اور بہت ہی بہترین باغ تھا اس کا ''باغ ذردان'' نام تھا، قسم قسم کے پھل فروٹ اور جگہ جگہ انگوروں کی بیلیں پھیلی ہوئی، اور بڑے میدان میں وہ کھیتی بھی کرتا تھا، یوں غلہ بھی ہوتا تھا تو ہزار ہا روپے کا فائدہ تھا، اس باغ کی وجہ سے بہت مالدار آدمی تھا۔

اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب پھل توڑتا تو دسواں حصہ اسی وقت غرباء پر تقسیم کر دیتا تھا، اس کے بعد جب کھیتی کاٹتا تو کاٹنے میں جتنا غلہ وصول ہوتا ادھر ادھر کا بکھرا ہوا وہ سب غریبوں کا تھا وہ خود نہیں اٹھاتا تھا، کھلیان میں جتنا جمع ہوگیا وہ لے لیتا تھا، اور جو کھیتوں میں بکھر گیا اس کی غرباء کو عام اجازت تھی کہ وہ لے جائیں، چنانچہ وہ اٹھا کے لے جاتے تھے، پھر جب غلے کو گھر لاتا تھا تو پھر اس میں سے دسواں حصہ غرباء کے لئے نکالتا تھا، اس سے ہزاروں غریب پلتے تھے، پھر گھر میں جب کھانا پکتا تو جتنی روٹیاں پکتیں اس میں سے دسواں حصہ پھر غریبوں کو تقسیم کرتا، غرض ہر جگہ اس نے عشر اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا، میوے کو توڑتے وقت، کھلیان میں پہنچتے وقت، جمع کرتے وقت گھر لاتے وقت، اس کو پکاتے وقت، ہر ایک موقع پر وہ غریبوں کا دسواں حصہ نکالتا تھا، جس سے ہزاروں غریب پلتے تھے اس وجہ سے ہزاروں فقراء اس کے باغ کے اردگرد جمع رہتے تھے، اور جانتے تھے کہ بس یہ ہمارا مائی باپ ہے اور ہمیں اس کے ذریعہ سے ہزاروں روپے کا فائدہ ہے منوں غلہ اور منوں پھل کا فائدہ ہے، تو جو پھل وہ کبھی بھی خرید کر نہیں کھا سکتے تھے وہ ہر قسم کے پھل انہیں مفت میں مل جاتے تھے، بہر حال یہ اس شخص کا طریقہ تھا۔

غرباء کا حصہ نہ دینے کا فیصلہ اور منجھلے بھائی کا مشورہ...... اس شخص کا انتقال ہوگیا، اس کے پانچ بیٹے تھے، انہوں نے باہم یہ سوچا کہ بہت سا ہمارا مال یہ غریب کھا جاتے ہیں، اگر سارا مال گھر میں جمع رہے تو کتنا مال زیادہ ہوگا، لاکھوں روپے مسافر مسکین لے جاتے ہیں اسے کسی طرح سے بند کرنا چاہئے یہ مسکین گویا ہمارے گلے پڑ گئے تو بھائیوں میں باہم بات چیت ہوئی تو منجھلے بھائی نے کہا کہ بھائی! یہ مت کرو، خیرات سے نفع ہی نفع ہوتا ہے، اول تو یہ کہ غرباء کا مال میں حق بھی ہے، ایک تو حقِ واجب ہے جیسا آپ نے زکوٰۃ دی یا صدقہ واجبہ دیا یا صدقہ فطر دیا یا قربانی کی، یہ تو حق واجب ہے، لیکن حدیث میں فرمایا گیا: ''اِنَّ فِی مَالِ الْمَرْءِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ'' ① آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی غریبوں کے حقوق ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے ایک مال کے اندر

① السنن للترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ ج: ۳ ص: ٦٧.

ہزاروں غرباء کو شریک کیا ہے یہ ان کا فضل ہے کہ اس آدمی کو غریبوں کو دینے کا ذریعہ بنا دیا ہے، اگر ابتداً ہی حق تعالیٰ برابر تقسیم فرماتے اور کوئی امیر نہ ہوتا، تو حق تو سب کو پہنچ جاتا، مگر امراء کو جو اجر وثواب کا فائدہ پہنچتا تھا اس سے وہ محروم ہو جاتے اس لئے ایک ایک امیر کو سینکڑوں غریبوں میں مال تقسیم کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا، تا کہ حصہ بھی برابر ہو جائے اور ساتھ میں اجر وثواب بھی مل جائے۔

اور اس کے ساتھ ایک شخص کو ہزاروں دعا گو بھی مہیا ہو جائیں گے اس لئے کہ جتنے غرباء کو فائدہ پہنچے گا وہ دعائیں مانگیں گے، ان کی دعاؤں سے اس کے مال میں اور برکت ہوگی، تو دنیا بھی اس کی بڑھے گی اور آخرت بھی بڑھے گی، تو غریب کے لئے امیر کو ذریعہ بنا کر امیر کے فائدے بہت کئے کہ بہت دعا گو مہیا کئے، دنیا میں اس کو رزق کی وسعت دی، آخرت میں اجر کا سامان کیا فرض کی ادائیگی کی توفیق دی تو اس ایک طریقہ سے سینکڑوں فرائض ادا ہوئے سینکڑوں برکات ہوئیں، اس واسطے حق تعالیٰ نے اوپر سے ہی برابر حصے نہیں بانٹ دیئے بلکہ امراء کو حکم دیا کہ تم برابری اور توازن کے ساتھ تقسیم کرو تا کہ تمہارے لئے اجر ہو، اور تمہارا فرض ادا ہو۔

تو ان بھائیوں نے ادھر خیال نہ کیا کہ اللہ نے ہمیں خیر کا ذریعہ بنایا ہے ہمیں مفتاح للخیر بنایا ہے ہم خیر کی کنجی بنے ہوئے ہیں، ہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ہمارا واسطہ ڈالے بغیر دے دیتے، تو ان کو تو حق مل جاتا ہم محروم رہ جاتے۔ تو کہا کہ ایسی صورت کرو کہ غریبوں کا ایک جتھہ اور مجمع ہو جاتا ہے اور ہمارا بہت سا مال چلا جاتا ہے تو یہ نہیں ہونا چاہئے اس کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جب پھل کاٹنے کا وقت آئے تو بالکل سویرے سویرے فقیروں کا مجمع ہونے سے پہلے پہلے جا کر پھل کاٹ کر گھر لے آؤ، اس لئے کہ اگر وہاں جمع ہو گئے تو پھر شرما شرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، جب پچاسوں آدمی مانگیں گے تو آدمی شرمائے گا، تو وہی کی وہی بات پھر ہوگی، اس لئے سویرے جا کر پھل کاٹ لو اور وہ تمام پھل دانے وغیرہ لاد کر اپنے گھر لے آؤ، یہاں گھر میں رکھ لیں گے یہاں کوئی آئے گا نہیں۔

اور اگر کوئی آئے گا بھی تو دروازے پر کوئی آدمی بھلا دیں گے اسے کہہ دیں گے کہ اگر کوئی فقیر آئے تو اسے دھکے دے دو، اور کہہ دیں گے تمہارا حق اس میں کچھ نہیں ہے اس طرح سے ہمارا مال بچ جائے گا، تو منجھلے بھائی نے کہا یہ مناسب نہیں ہے تم اللہ کی تسبیح کرو، تسبیح کا مطلب یہ کہ اس کی پاکی ثابت کرو یعنی اس پر بے اعتمادی کا اظہار مت کرو اس لئے کہ اگر تم نے غریبوں کا حق مار دیا گویا اس کا منشا اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ تمہارا لے لیا اور وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا، یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرے، ہر صورت وہی اعتماد اور بھروسہ کے لائق ہے، اس واسطے یہ منصوبہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے، تو تم تسبیح وتہلیل میں لگو اور اللہ پر بے اعتمادی نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقہ دینے سے مال میں کمی نہ آنے کی قسم...... حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین باتیں بیان فرمائیں اور حلف اٹھا کے بیان فرمائیں، اور قسم اس لئے کھائی کہ

ظاہری طور پر وہ چیز عقل میں نہیں آتی جو آپ نے بیان فرمائی اس لئے قسم کھا کے فرمایا کہ تمہاری عقل میں آئے نہ آئے مگر یہی ہوگا اس لئے اطمینان کرلیں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ ① صدقہ دینے سے مال میں کبھی نقصان نہیں ہوگا، مال میں کبھی کمی نہیں آئے گی، ظاہر میں تو اس کے خلاف ہے، اس لئے کہ جب آپ نکال دیں گے تو وہ کم تو ہوگیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ کمی نہیں آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ ② جس مال میں سے جتنا خرچ کروگے جگہ خالی ہوگی، اللہ اس کو بھریں گے، ضرور بھر کر رہے گی یہ نہیں ہوسکتا کہ بندہ محروم کردیا جائے، تو ظاہر میں تو مال کم ہو رہا ہے، مگر حقیقت میں بڑھ رہا ہے، نہ صرف اسلئے بڑھ رہا ہے کہ اجر و ثواب ملے گا وہ تو آخرت کا بڑھنا ہے، مگر دنیا میں بھی خالی شدہ جگہ پر مال آئے گا اور جگہ پُر ہوگی، یہ وعدہ خداوندی ہے کہ خرچ شدہ مال کا خلف آئے گا، ہمارے وعدے پر اطمینان رکھو اور یقین رکھو، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا۔

صدقہ دینے سے کمی بیشی کا مفہوم...... آدمی جب صدقہ نہیں دیتا یا خرچ نہیں کرتا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے کہ کسی کو نہیں دیا، گھر ہی میں آرہا ہے، لیکن وہ بڑھنا بالکل ایسا ہے جیسے آدمی کے بدن پر ورم چڑھ جائے، تو ظاہر میں تو وہ پہلوان بن رہا ہے بہت جلد موٹا تازہ ہو رہا ہے مگر حقیقت میں یہی موت کا پیغام ہے، چند دن کے بعد یہ ریت کی دیوار اس طرح بیٹھے گی کہ نہ وہ رہے گا بلکہ اس کی ہڈیاں تک ختم ہوجائیں گی، اس لئے کہ وہ جو موٹاپا ہے وہ ورم اور بیماری کا ہے، اصلی صحت کا موٹاپا نہیں ہے، تو صدقہ نہ دینے سے جو مال بڑھتا ہے، وہ ورم رسیدہ ہے، اس کو مت یہ سمجھو کہ یہ بڑھ رہا ہے وہ ایک دن اتنا گھٹے گا کہ راس المال کو بھی لے ڈوبے گا اور صدقہ دینے سے جو مال گھٹتا ہے، اس گھٹنے کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی بیماری کے بعد مُسہل لے لے، تو مسہل لینے سے اندر کا تمام ملبہ اور فاسدہ چیزیں نکل جاتی ہیں اور آدمی ضعیف ہوجاتا ہے، مگر یہ ضعف صحت کا پیش خیمہ ہے، ساری الا بلا نکل گئی، بادی بلغم چھٹ گیا، تو ظاہر میں ضعیف ہوگیا مگر حقیقت میں وہ قوی ہے، چند دن کے بعد صحت ترقی کرے گی، تو اصل قوت بڑھے گی تو مال نکالنا صدقہ دینا ایسا ہے جیسے مُسہل دے دینا کہ ظاہر میں آدمی ضعیف ہوتا ہے حقیقت میں وہ قوت کا پیش خیمہ ہے اس میں سے نہ دینا حقوق نہ نکالنا گو مال بڑھتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے جیسا ورم آگیا، تو ورم آنے سے بڑھتا نہیں ہے بلکہ اس سے اصل بھی گھٹ جاتا ہے۔

تواضع سے رفعت پر حلفِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم...... تو اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَا تَوَاضَعَ عَبْدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ'' ③ آدمی کسی کے سامنے اللہ کے لئے جھکتا ہے، تو اللہ اسے ضرور سر بلند کرتا ہے، ظاہر میں تو یہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ذلت اختیار کر رہا ہوں، دوسرے کے آگے جھک رہا ہوں، اسکی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع ج: ۱۲ ص: ۴۷۴ رقم: ۴۶۸۹.

② سورة السباء: ۳۹. ③ شعب الایمان للبیهقی، فصل فی ترک الغضب وفی کظم الغیظ والعفو... ج: ۶ ص: ۳۱۹

تو قیر کر رہا ہوں حالانکہ میرا رتبہ ایسا تھا اور ویسا تھا، اور میں جھک گیا تو ظاہر میں تو ذلت قبول کی اور حقیقت میں یہ عزت ہے جتنا لوجہ اللہ یہ جھکے گا اتنا ہی حق تعالیٰ اسے بلند فرمائیں گے، اور جو جتنا لوجہ النفس سر ابھارتا ہے اتنا ہی اس کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اسے ذلیل کر دیتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست　　　اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

کوئی اکڑتا ہے تو اسے پست کر دیتے ہیں اور کوئی جھکتا ہے تو اسے اونچا کر دیتے ہیں، میں تو مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ پہاڑ پر کبھی چڑھے ہوں تو جب چڑھتے ہیں تو جھک کر چڑھتے ہیں، اکڑ کر چڑھے تو آدمی پیچھے کو جا پڑے گا اور جب اترتے ہیں تو اکڑ کر اترتے ہیں اس لئے کہ اگر جھک کر اترے گا، تو آدمی اوندھے منہ گرے گا۔

تو یہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اونچائی پر چڑھنا چاہتے ہو تو جھک کر چلو، اونچا پہنچتے چلے جاؤ گے اور اگر اکڑ کر چلو گے تو نیچے کی طرف آتے چلے جاؤ گے تو پستی کی طرف جاؤ گے، تو آدمی اکڑتا ہے تو گرتا ہے اور اگر جھکتا ہے، تو اسے اونچا کر دیتے ہیں۔

بہر حال یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، ظاہر میں چونکہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا کہ واللہ! یہ چیز ہونے والی ہے اس کا یقین کرو، غرض منجھلے بھائی نے اِدھر توجہ دلائی اور کہا کہ تم جو فقیروں کا حق مار رہے ہو تو یہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ پر یہ بے اعتمادی کا اظہار ہو، پھر اس کا ثمرہ تمہارے حق میں بُرا نکلے۔

فقراء سے مال بچانے کے لئے اندھیرے میں تیز رفتاری..... مگر بھائیوں نے ڈرا دھمکا کے اسے دبا دیا کہ اچھی بات ہے تو بھی فقراء کی ہاں میں ہاں ملانے لگا، غرض یہ بات پختہ ہوگئی کہ صبح کو سویرے سویرے چلیں گے اور جا کے ایک دم پھل وغیرہ کاٹ کر جمع کریں گے اور سارا کچھ لے کر ایک دم گھر میں لے آئیں گے، فقیروں کے لئے دروازوں پر آدمی بٹھا دیئے تا کہ کوئی آدمی نہ آنے پائے جب صبح ہوئی تو: ﴿وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قَادِرِيْنَ﴾ تو انہوں نے اس حالت میں صبح کی کہ اپنی ضد کے اوپر بالکل اڑے ہوئے تھے، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم بالکل قادر ہیں جو چاہیں کر گذریں گے، باغ ہمارا اور ہماری ملک جو ہم کریں گے کوئی اس میں رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ صبح اٹھے تو ایک دوسرے کو جلدی اٹھایا کہ چلو جلدی چلو، کہیں چاندنا نہ ہو جائے اور فقیر مسکین جمع نہ ہو جائیں، جو کرنا ہے وہ جلدی کرو، چنانچہ سویرے سویرے چلے، اور کس چال سے چلے؟ کہ صبح صبح ایک دوسرے کو پکارتے تھے کہ جلدی چلو، ایسا نہ ہو دیر ہو جائے، اور سورج طلوع ہو جائے۔ ﴿فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ٥ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ﴾ اگر تمہیں پھل کاٹنے ہیں تو سویرے سویرے پہنچ جاؤ، ورنہ پھر ہجوم ہو جائے گا اور شرما شرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، دیر ہو جائے گی، اس لئے جلدی کرو۔

حق تعالیٰ شانہٗ پر بے اعتمادی کا نتیجہ..... ﴿فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ٥ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ﴾ تو وہ چلے جا رہے تھے اور آپس میں گھسر پھسر کرتے ہوئے کہ دیکھ بھائی جلدی چلو، ادھر سے

فقیر آتے ہیں، یہاں سے جلدی نکل جاؤ، ادھر سے فقیر آتے ہیں، جلدی نکل جاؤ، تو آپس میں ایک دوسرے کو چپکے چپکے سمجھا بھی رہے تھے، تو ایک ضد اور ہٹ دھرمی تھی، گویا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہماری تدبیر کامیاب ہے، اور ہم اس تدبیر پر قادر ہیں کوئی ہمیں روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے، گویا حق تعالیٰ پر انتہائی بے اعتمادی ظاہر کی، ایک تو یہ کہ اتفاقاً کوئی بات ہوجائے کہ آدمی کسی مسکین سے بچنے کے لئے جلدی چھپ کر پہنچ جائے، کہ واجب تو ادا کرتا ہی ہوں کیا ضروری ہے کہ نفل بھی ادا کروں، اتفاقاً ہوجائے تو یہ بات کمزوری کی ہوتی ہے، یا تھوڑے بہت گناہ کی ہوتی ہے، لیکن عزم باندھ کر مشورے کر کے چلنا یہ گویا حق تعالیٰ شانہ کا معارضہ اور مقابلہ ہے، اپنی قدرت کی داد دینا ہے کہ ہم ہی ہر طرح سے قادر ہیں جو چاہیں کر گزریں گے، تو یہاں حق تعالیٰ سے مقابلہ کی صورت پیدا ہوگئی تھی، گویا طے یہ کیا تھا کہ اللہ کی نہ چلنے دو جس طرح سے ہو اپنی چلاؤ۔ ﴿وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ﴾ پھل کاٹ کر لائیں گے اور ساتھ میں انشاء اللہ بھی نہ کہا، گویا اپنی تدبیر پر اتنا یقین تھا کہ یہ تک نہ کہا کہ اگر اللہ چاہے گا تو ہم کرلیں گے، تو سمجھتے تھے کہ انشاء اللہ کی بھی ضرورت نہ تھی، ہمیں پوری قدرت حاصل ہے، گویا اس میں پورا حق تعالیٰ کا مقابلہ تھا، فقط ایک گناہ ہی نہیں کر رہے تھے، گناہ کا ملزم اور اس میں حق تعالیٰ کو مانع بھی سمجھ رہے تھے، اس لئے انشاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ نہ باغ ہے نہ کچھ ہے، جلی ہوئی چیز کا ڈھیر لگا ہوا ہے، تو سمجھے کہ شاید ہم راستہ بھول گئے، یہ ہمارے باغ کا راستہ نہیں یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ ایک ہرا بھرا باغ اور پھلا پھولا باغ اور وہ بالکل مٹ جائے، تو وہاں جا کے دیکھا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ﴾ جب باغ کو دیکھا تو وہاں نہ باغ نہ درخت نہ پھل، بلکہ تمام کھیتی کچومر بنی ہوئی پڑی ہے، جیسے کھلیان میں بیلوں سے روند کر چکنا چور کر دیا جاتا ہے، تو سمجھ مین نہ آیا کہ یہ ہمارا باغ ہے، تو یہ سمجھے کہ ہم راستہ بھول گئے، لیکن جب آگے چلے تو کہا: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ باغ تو یہ ہمارا ہی ہے، اس کا تو وجود ہی نہیں رہا، اس کا تو نشان ہی باقی نہیں رہا، یہ کیا قصہ ہوا؟ ﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ﴾ اب بات سمجھ میں آئی، اُسی منجھلے بھائی نے کہا میں نے کہا نہیں تھا کہ تم اللہ کی پاکی کے خلاف کر رہے ہو، تم نے بے اعتمادی کا اظہار کیا، کہ فقیر کو دے کر اللہ تعالیٰ تمہارا مال گھٹا دیں گے، حالانکہ فقیر کو دینے سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے، تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا اور تم نے نہیں مانا، میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہ پر بے اعتمادی کا اظہار یہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے۔ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ اب سمجھ میں آیا کہ حقیقۃً ہم نے بہت بڑا جرم کیا، اور حقیقۃً ہم نے غلطی کی کہ اپنی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دی، ذرا سی بے اعتمادی کی اور حق تعالیٰ کا مقابلہ کیا تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ چھوٹا موٹا نقصان نہیں بلکہ باغ کا باغ ہی اجڑ گیا، رات کو بجلی گری یا آگ برسی کہ تمام باغ چکنا چور ہوگیا، نہ درخت رہے نہ کھیتی رہی نہ دانہ رہا، کچھ بھی باقی نہیں رہا، تو ابتدا ابتدا میں تو چونکے جب منجھلے نے کہا کہ اسی دن کے لئے میں

نے تمہیں کہا تھا مگر تم نے مجھے ورغلا دیا، اور مجھے تمہاری تائید کرنی پڑی، مگر بات وہی تھی جو میں کہہ رہا تھا۔

باغ کے اجڑنے کے بعد ایک دوسرے کو ملامت...... ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾ اب ایک دوسرے کو ملامت کرنی شروع کی کہ ہم نے کہا نہیں تھا؟ ایک نے کہا میں نے یہ نہیں کہا تھا، غرض اب سب ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگے اور ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اس لئے کہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگ جب مل کر جرم کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بد سامنے آتا ہے پھر ایک دوسرے کو ملامت کرتا ہے کہ پہلا مشورہ اس کم بخت نے دیا تھا، دوسرے نے کہا میں نے دیا تھا تم نے مانا کیوں تھا؟ تیسرے نے کہا میں تو نہیں مانتا تھا مگر اس نے یہ کہا غرض ایک دوسرے پر وہ اس طرح ڈال رہے تھے مگر آخر میں سمجھ میں آیا کہ حقیقت میں ہم نے گناہ کیا ہے اور برا کیا ہے، تو اقرار کیا: ﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ﴾ کہنے لگے بے شک سرکشی اور غلطی ہم سے ہی ہوئی، ہم نے ہی اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کیا، اسکا نتیجہ آنا ہی تھا، اب متنبہ ہوئے، ندامت ہوئی اور کہا: ﴿عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ اب ہم نادم ہیں قصور کا اعتراف کرتے ہیں اے اللہ! ہم سے غلطی ہوئی آپ معاف فرمادیں، اور جب آپ معاف فرمادیں گے تو ہمیں توقع ہے کہ ہمیں اس سے بھی اچھا باغ عطا ہوگا، اور اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خیر ہوگی۔

ندامت وتوبہ کے بعد رحمتِ حق کی توجہ...... حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ رحمت ہے کہ کتنا ہی بڑے سے بڑا جرم کر کے جب اخیر میں ندامت کا اظہار کرے پھر رحمت متوجہ ہو جاتی ہے، کبھی یہ نہیں ہوتا کہ اس پر الزام قائم کریں کہ ابھی اس کو اچھی طرح بھگت، جب ندامت ہوگئی تو گویا توبہ ہوگئی، حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ'' ① پشیمانی آجانا بس یہی توبہ ہے منفعل ہو جائے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ابھی زبان سے بھی نہیں کہا، فرماتے ہیں بس توبہ ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی بڑا جرم کیا اور اس کے بعد اسے ندامت ہوئی اور مغفرت کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھا اور کہا: یَا رَبِّ! یَا رَبِّ! تو فرماتے ہیں: ''اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا'' اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کر سکتا ہے اور جب جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے ہم پہلے ہی مغفرت کئے دیتے ہیں اس لئے کہ یہ بارگاہِ کریمی ہے، فقط ندامت درکار ہے آدمی منفعل ہو جائے توبہ واقرار کرلے، تو ہمارے ہاں کمی نہیں ہے ہم جو روکتے ہیں تمہاری مصلحت سے روکتے ہیں نہ اس لئے کہ ہمارے خزانے میں کوئی کمی ہے، جب معترف ہوگئے اور مان گئے مقصد پورا ہوگیا، تو پھر مانگنے سے پہلے ہم تمہیں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اس شخص کی مغفرت فرمادی، مگر اس نے جا کر پھر وہی گناہ کیا، مگر پھر ندامت ہوئی اور معافی مانگنے کی نیت سے بیٹھا اور عرض کیا یارب۔ اے رب پھر وہی فرماتے ہیں: ''اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا'' ② اچھا

---

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه احمد، ج: ۱ ص: ۱۰۴۔

② الصحیح لمسلم، کتاب التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب وان تکررت ج: ۱۳ ص: ۳۲۱۔

یہ جان گیا اس کا کوئی رب ہے تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے ، پہلے ہی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ بخشتے بخشتے نہیں تھکے گا، اس لئے کہ تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے، تم محدود ہو، مگر رحمت کی کوئی حد نہیں، مانگنے والا ہونا چاہئے۔ صداقت کے ساتھ پورا عالم مانگے وہ بھی مل کے رہتا ہے، کوئی مانگنے والا نہیں ہے، مانگ کر پھر دیکھو نہ ملے تو پھر شکایت کرو، مگر اخلاص ہو اضطراب اور بے چینی ہو، اپنے گناہ پر ندامت اور اعتراف ہو، پھر مانگتا ہے تو ضرور ملتا ہے، یا وہی چیز ملتی ہے یا اس سے بڑھ کر مل جاتی ہے، یا کوئی دوامی نعمت مل جاتی ہے، یہ نہیں ہے کہ آدمی محروم رہ جائے۔ ایک انسان جو ذرا اچھا سمجھا جاتا ہے کریم النفس ہے اس سے اگر کوئی مانگتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ واپس کرے تو جو کریم الکرما ہے جو کریم کا بخشنے والا اور رحم و کرم کا سرچشمہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس سے کوئی صداقت سے مانگے اور محروم چلا آئے ضرور لے کر آتا ہے۔ ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ مانگنے میں اضطراب اور بے چینی ہونی چاہئے، خلوص کامل ہونا چاہئے، پھر انسان کبھی محروم نہیں ہوتا۔

ندامت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے باغِ حیوان کا عطیہ...... ان پانچوں بھائیوں نے بھی پوری ندامت کے ساتھ گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: ﴿قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ﴾ بلاشبہ ہم نے سرکشی کی، ہم نے بہت بڑی غلطی کی۔ ﴿عَسٰی رَبُّنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ممکن ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی اس سے بھی بڑا باغ دے دے، اب تو ہم اسی کی طرف جھکتے ہیں اور غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا صلہ یہ دیا کہ جب یہ محروم ہو کر ہاتھ پاؤں شکستہ ہو کر اور دل ٹوٹا ہوا روتے ہوئے واپس ہوئے تو لوگوں میں چرچا ہوا، اور لوگوں کو پتہ چل گیا، کہ یہ تو عجیب حادثہ پیش آیا، باغ کا باغ ان لوگوں کا اجڑ گیا، کوئی آگ برسی بجلی گری، صفحۂ ہستی پر باغ کا نشان باقی نہیں رہا، صبح سے صبح بادشاہِ وقت کو خبر پہنچی، معلوم ہوا کہ یہ بڑے رئیس تھے، اور آج ایک دم قلاش بن گئے، کہ ان کی روزیوں کا بھی گھاٹا، بادشاہ کو رحم آیا کہ یہ لوگ قابل توجہ ہیں، بن کر جو بگڑتا ہے وہ زیادہ قابل رحم ہوتا ہے، جو شروع سے ہی گرا ہوا ہو اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، عزت دار ہو کر ذلت میں گرفتار ہو جائے، مالدار ہو کر ایک دم مفلس بن جائے، سب کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، تو بادشاہ وقت کی توجہ منعطف ہوئی تو کہا کہ: شاہی باغوں میں ایک پورے کا پورا باغ انہیں دے دو، جو ان کے باغ سے کہیں بڑھ کر تھا اور اس کا نام ''باغِ حیوان'' یعنی زندگی کا باغ تھا، وہ ان کے باغ سے چوگنا زیادہ تھا بے حد بے شمار اس میں پھلوں کے درخت تھے، اور اس کی آمدنی اس سے کہیں زیادہ تھی تو ایک دم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان پانچوں بھائیوں کو باغ دے دیا جائے، تو انہوں نے حق تعالیٰ شانہ کے سامنے سرکشی کی تو باغ کو سرے سے اجاڑ دیا، جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور جب ایک دم ندامت کے ساتھ متوجہ ہوئے تو اتنا بڑا باغ بنا بنایا دے دیا، یہ بھی نہیں کوئی دس بیس برس ان سے کوئی محنت لی ہو، پھر باغ دیا ہو، اس سے زیادہ بہتر دے دیا، وہ باغ ذروان تھا، یہ باغ

حیوان ہے، تو زندگی کا باغ عطا کیا، اب پھر نہایت ہی راحت سے فراغت حالی وفراغت بالی سے زندگی گزاری۔

اے اہلِ مکہ باغِ دین کے اجاڑنے سے ڈرو...... یہ حق تعالیٰ نے مثالی دی فرمایا: اے اہل مکہ! تمہارے سامنے بھی اللہ کا رسول آیا، اور اس نے ایک بہترین جنت کا باغ تمہارے سامنے پیش کیا، اور دین کا باغ پیش کیا، تم نے نافرمانی کی، ناقدری کی اور حق کے مقابلے پر آگئے، وہ فقیروں کو روکتے تھے کہ باغ میں نہ آئیں میوہ نہ کھانے پائیں، تم اس باغِ دین سے غرباء کو روک رہے ہو کہ کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے پائے، ہر ایک کو بہکاتے ہو کوئی راہِ راست پر آجاتا ہے تو اس کے دل میں شکوک وشبہات ڈالتے ہو، کہ کہیں یہ دل سے دینِ حق کو قبول نہ کرے، تو جیسے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں کے فقیروں کے اوپر دروازے بند کردیئے تھے، انہوں نے باغ دین کے دروازے بند کررکھے ہیں کہ جگہ جگہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مبارک یہ تھی کہ جہاں کوئی مجمع دیکھا، کوئی میلہ دیکھا، آپ دعوت الی اللہ کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے آپ جارہے ہیں اور فرمارہے ہیں: اے لوگو! قیامت سے ڈرو، اللہ کے دین کو اختیار کرو شرک اور بت پرستی چھوڑو۔

اور پیچھے پیچھے ابو جہل جارہا ہے اور کہتا جاتا ہے لوگو! اس کی بات مت مانو، (معاذ اللہ) یہ مجنون آدمی ہے، ان کی عقل بہک چکی ہے، باپ دادا کے دین میں یہ شخص رخنہ ڈالنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے، اس نے برادری میں تفریق ڈال دی، اس کی بات مت سنو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جارہے ہیں کہ لوگوں کو باغِ دین میں داخل کردیں، اور ابو جہل ولید ابن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث اور اخنس بن شریق یہ سردارانِ قریش پیچھے پیچھے ہیں کہ لوگوں کو روک رہے ہیں کہ کسی کے دل میں حق نہ آجائے، کوئی معترف نہ ہوجائے، تو جس طرح سے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں سے فقراء کو محروم کرنا چاہا اسی طرح سے اے مشرکینِ مکہ! تم لوگوں کو باغِ دین سے محروم کرنا چاہ رہے ہو، تو اپنے انجام کو سوچو، ان بھائیوں کے حق میں نتیجہ یہ ہوا کہ باغ سرے سے اجڑ گیا تمہارے حق میں نتیجہ آنے والا ہے، غزوۂ بدر کا سال آرہا ہے، فتح مکہ کا سال آرہا ہے جس میں مشرکین کی کمریں توڑ دی جائیں گی، جس میں ان کی طاقتیں گھٹ جائیں گی، اور ان کی پیش نہیں چل سکے گی، تمہارا ایسا بیج مارا جائے گا کہ بعد میں تمہارا کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہوگا، یہ تمہاری جائیدادیں یہ تمہارے باغات یہ تمہاری تجارتیں یہ سب منٹوں میں ملیامیٹ ہوجائیں گی اگر تم نے اسی طرح حق کا مقابلہ جاری رکھا یہ سب کچھ ختم ہوجائے گا۔

باغِ ایمان قبول کرنے کی دعوت ...... لیکن اگر باغِ ذردان کے مالکوں کی طرح اخیر میں ندامت کا اظہار کیا، اخیر میں سرکشی کا اعتراف کیا تو اللہ نے کتنا زیادہ بہتر پہلے سے بھی زیادہ بہتر دے دیا، تم بھی اگر اعتراف کرو کہ ہم سے جو بھی غلطی ہوئی ہم اس پر دل سے نادم ہیں اب ہم دینِ حق کو قبول کرتے ہیں تو دنیا میں تمہاری

سرداریاں قائم رہیں گی اور آخرت میں بھی تم ہی تم ہو۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے دینِ حق کو قبول کیا، فاروقِ اعظمؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ باندھ کر چلے تھے، اور حق کا مقابلہ کرنے چلے تھے، لیکن اخیر میں قلب کے اندر نرمائی آئی ندامت ہوئی اور جا کر اسلام قبول کیا تو کیا ہوا؟ فاروقِ اعظمؓ کی سرداری دنیا میں قائم رہی آج ابوجہل کا نام لینے والا کوئی نہیں اور فاروقِ اعظمؓ کا نام لے کر رضی اللہ عنہ کہتے ہوئے زبانیں تھک جاتی ہیں، دلوں کے اندر عظمت بڑھتی ہے، آج عثمانِ غنیؓ علی المرتضیٰؓ خالد بن ولیدؓ، جنہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو قتل اور شہید کیا، اخیر میں اللہ کی طرف رجوع ہوئے تو خطاب ملا: سیف من سیوف اللہ ''خالد بن ولیدؓ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے'' تو خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ پر بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے تو جنہوں نے اعتراف کیا، کیا ان کی سرداری ختم ہوگئی؟ یا اتنی بڑی سرداری ملی کہ قیامت تک ان کا نام روشن ہے، اور ان کے نامِ نامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے یہ تو دنیا میں ملا، اور آخرت یہ ہے کہ بہت سے حضرات عشرہ مبشرہ میں داخل ہوئے کہ انہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دیدی گئی، تو دنیا ہی میں جس نے جنتیوں کو دیکھنا ہو وہ ان حضرات کو دیکھ لے کہ یہ جنتی پھر رہے ہیں تو دنیا میں بشارتیں ملیں، خلافت ایسی ملی کہ بڑے بڑے بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے، ان کی اتنی ہیبت اور دبدبہ ہوتا تھا۔

تو اگر ان کے ایک باغ کی سرداری جس کو وہ اپنے زعم میں اپنا باغ سمجھتے تھے، وہ مٹا دی گئی، اس کے بعد ایک عظیم سرداری اللہ کی طرف سے دی گئی یہاں باغِ ذردان کے بعد باغِ حیوان دیا گیا تھا اور وہاں باغِ جنان دے کر باغِ ایمان عطا کیا گیا جس باغِ ایمان کی وجہ سے دنیا بھی درست ہوگئی اور آخرت بھی درست ہوگئی، مگر کب؟ جب اعتراف کرلیا اور نادم ہوگئے کہ اب تک ہم نے غلطیاں کیں، یہ مثال دے کر مشرکینِ مکہ کو عبرت دلائی گئی کہ باغ والوں سے عبرت پکڑو، کہ ان کی ابتداء کیسی ہوئی؟ اور اعترافِ قصور کے بعد ان کی انتہا کیسی ہوئی کہ دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی، اسی طرح سے تم بھی اعتراف کرو، اعتراف کرنے کے بعد پھر سب کچھ تمہارے لئے ہے، لیکن انہوں نے نہیں مانا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے باغ وغیرہ سب مٹ گئے، آج ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ ①

کوئی بات بھی ان کی شنوائی نہیں دیتی، کوئی ان کا نام لینے والا موجود نہیں اگر نام ہے بھی تو وہ بھی قرآن و حدیث کی بدولت ہے، اس میں ان کا ذکر ہے تو نام چل رہا ہے مگر لعنت کے ساتھ چل رہا ہے رحمت کے ساتھ نہیں چل رہا، تو ساری چیزیں مٹ مٹا کر ختم ہوئیں۔

اعترافِ ندامت کے بعد باغِ اسلام کی عظیم الشان سرداری دی گئی...... جنہوں نے ندامت اور اعتراف کے ساتھ اسلام میں داخلہ لیا ان کو عظیم الشان سلطنتیں دی گئیں، عربوں کی شوکت قائم ہوئی تو اتنی بڑی

① پارہ: ۱۶، سورۃ: مریم، الآیۃ: ۹۸.

شوکت قائم ہوئی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، سلطنت بھی شوکت بھی اور ساتھ میں دیانت بھی ہے، سرداری بھی ہے عبدیت بھی ہے اور عبادت بھی ہے کہ تختِ سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن دین و دیانت کا پلّہ ہاتھ میں ہے۔

فاروقِ اعظمؓ سلطنت پر ہیں، صدیق اکبرؓ تخت سلطنت پر ہیں اور عبادت کا یہ حال ہے کہ عام آدمی میں اور ان میں فرق معلوم نہیں ہوتا، ایک ایسی دیانت اور مساوات کی حکومت ہے کہ امیر المومنین اور ایک عام مسلمان حقوق میں برابر ہیں۔

فاروق اعظمؓ سے ایک اعرابی کا مکالمہ...... مالِ غنیمت کی چادریں آئیں ایک ایک چادر بانٹ دی گئیں، فاروقِ اعظمؓ کے حصہ میں بھی ایک ہی چادر آئی، آپ خطبہ دینے کے لئے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کھڑے ہوئے تو دو چادریں بدن پر تھیں اس میں وعظ فرما رہے تھے۔ تو فرمایا: اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا میں امیر المومنین ہوں میری بات سنو اور میری اطاعت کرو، ایک اعرابی کھڑا ہوا اور کہا۔ لَا نَسْمَعُ وَلَا نُطِیْعُ نہ ہم تمہاری بات سنیں گے نہ ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔

تو یہ نہیں تھا کہ اسی وقت گرفتار کر لیا جاتا کہ اس نے حکومت کے خلاف کہا اور بر سر منبر امیر المومنین سے گستاخی کی۔ فاروقِ اعظمؓ فوراً ڈھیلے ہو گئے، فرمایا بھائی کیوں؟ جب مجھے امیر المومنین بنا دیا پھر کیوں اطاعت نہیں کرتے، اس نے کہا تم نے خیانت کی ہے؟ اس لئے کہ مالِ غنیمت میں سے ایک ایک چادر ایک شخص کا حق تھا، تمہارے بدن پر دو چادریں ہیں، تو تم نے ایک چادر زیادہ لے لی تو تم نے مسلمان کے مال میں خیانت کی اس لئے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری بات سنی جائے اور تمہاری اطاعت کی جائے۔

فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ بن عمرؓ دے گا، عبداللہ ابن عمرؓ کھڑے ہوئے، اور فرمایا: والد صاحب کے حصہ میں ایک ہی چادر آئی تھی اور ایک میرے حصہ کی چادر تھی، فاروقِ اعظمؓ ڈیل ڈول کے آدمی تھے، تو ایک چادر میں نے اپنے حصہ کی انہیں دے دی تو اس طرح دو چادریں تھیں، فاروق اعظمؓ نے از خود دو چادریں نہیں لیں۔ تو وہ اعرابی پھر کھڑا ہوا اور کہا: نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ ہم سنیں گے بھی اور ہم اطاعت بھی کریں گے۔ تو سلطنت تھی مگر ایسی سلطنت جس میں کوٹ کوٹ کر دینداری دیانتداری اور خوفِ خدا بھرا ہوا ہے، مساوات کے ساتھ حکومت ہے امیر المومنین کا وہی حصہ ہے جو ایک غریب عامی کا حصہ ہے، ان کا کوئی زیادہ حصہ نہیں ہے۔

حقِ خلافت...... پھر یہ کیفیت کہ اگر اپنی غلطی پر کوئی عامی آدمی متنبہ کرے تو اسی وقت ڈھیلے پڑ جاتے تھے، اس کے سامنے معافی چاہتے تھے، یہ امیر المومنین کی حالت تھی۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، فاروق اعظمؓ رات کو گھوم رہے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، گویا مسلمانوں کا امیر محض ٹیکس وصول کرنے کا امیر نہیں یا محض خزانے بھرنے کا امیر نہیں، بلکہ اخلاقی حالتیں درست کرنے کا بھی ذمہ دار بنایا گیا اس لئے فاروق اعظمؓ راتوں کو گھومتے تھے کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، منظر عام پر آ کر یہ لوگ بے شک گناہ نہیں کرتے لیکن

ممکن ہے گھروں میں چھپ چھپا کر یہ لوگ کچھ کرتے ہوں، تو رات کو نگاہ ڈالتے تھے کہ لوگوں کے گھریلو اخلاق کیا ہیں، چنانچہ ایک گھر کے قریب سے گذرے تو ایک عورت کی آواز سننے میں آئی کہ گنگنا کر کچھ اشعار پڑھ رہی ہے اور بڑے درد آمیز آواز کے ساتھ کچھ عاشقانہ مضامین کے اشعار ہیں، چونکہ عورت کی آواز تھی تو فاروقِ اعظمؓ چونکے کہ یہ کون گھر میں اس طرح عاشقانہ اشعار پڑھ رہی ہے اور آواز باہر بھی آ رہی ہے، تو خطرہ اور خدشہ پیدا ہوا کہ کوئی اندر برائی تو نہیں ہو رہی، فوراً دروازے پر دستک دی یہ عورت کون ہے جو اس طرح گا کر اشعار پڑھ رہی ہے، وہ جو لڑکی گا رہی تھی امیر المومنین کی آواز پہچان کر سہم گئی، اس میں جرأت نہ رہی کہ بتلا سکے کہ اندر کون ہے، کوئی جواب اندر سے نہ آیا۔ اب ان کا شبہ اور قوی ہوا کہ اگر کوئی برائی نہیں تھی تو وہ عورت کہہ دیتی کہ کوئی برائی نہیں، آپ اطمینان رکھیں، مگر یہ چپ ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔ پھر زور سے دروازے کو کھٹکھٹایا، اب وہ اور ڈر گئی، چنانچہ پھر بھی دروازہ نہیں کھولا چنانچہ فاروقِ اعظمؓ چھلانگ مار کے اندر پہنچے اور بحیثیت امیر المومنین یہ ان کا حق تھا جیسے پولیس چھاپہ مارتی ہے، اسی طرح امیر المومنین کا حق ہے کہ اگر وہ کوئی خدشہ یا خطرہ محسوس کریں تو وہ چھاپہ ماریں دیکھیں کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہے چھلانگ مار کے اندر پہنچے فرمایا کون ہے جو اس طرح سے عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی، ایک عورت کو کیا تعلق ہے کہ وہ عاشقانہ اشعار پڑھے۔

اب اس لڑکی کو جرأت پیدا ہوئی، اس نے کہا امیر المومنین! مجھے آپ کیوں عاشقانہ اشعار سے روکتے ہیں؟ فرمایا ایسے اشعار گناہ ہیں اور عورت کی آواز بھی گناہ ہے تو ایک گناہ میں مبتلا ہوئی، اس نے کہا میں نے تو ایک گناہ کیا آپ نے تو تین گناہ کئے اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی۔ بس فاروقِ اعظمؓ وہیں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ جوش وخروش ختم ہو گیا، فرمایا: بہن میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اگر تو مجھے مطلع کردے کہ میں نے کیا گناہ کئے ہیں تو میں ممنون ہوں گا، اس نے کہا ایک نہیں تین صریح گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی، اسی وقت فاروقِ اعظمؓ سہم گئے اور خوف زدہ ہو گئے اور کہا کہ مجھے مطلع کرو۔ اس نے کہا قرآن کریم میں صاف ارشاد موجود ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ① اہلِ ایمان کسی غیر کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ تم اس سے اجازت نہ لے لو، اور سلام کر کے داخل ہو۔ آپ بغیر میری اجازت کے میرے گھر میں داخل ہوئے، بلا اجازت اور بلا سلام آپ داخل ہوئے آپ کو ایسا کرنے کا کیا حق تھا؟ فرمایا میرے سے یہ غلطی ہوئی کہا ایک غلطی نہیں دوسری اور بھی ہوئی۔ قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ② گھروں میں دروازوں سے داخل ہو، آپ دروازے کی بجائے دیوار پھلانگ کے داخل ہوئے، آپ کو کیا حق تھا؟ یہ قرآن کریم کی خلاف ورزی ہے، اب اور زیادہ ڈر گئے کہ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کہا تیسری غلطی یہ ہے کہ صریح حدیث

① پاره ۱۸، سورة: النور، الآية: ۲۷. ② پاره: ۲، سورة: البقرة، الآية: ۱۸۹.

میں حکم دیا گیا ہے کہ اجنبیہ کے خلوت کدے میں مت داخل ہوں، کسی اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ جائز نہیں ہے، میں یہاں اپنے گھر میں تنہا ہوں، آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے خلوت کدے میں آ کودے۔ اب ایک دم فاروقِ اعظمؓ کپکپانے لگے، اللہ کا ڈر غالب آیا۔ فرمایا: بہن مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف فرمادیں۔ اس نے کہا میں کون ہوں معاف کرنے والی جس کا گناہ کیا ہے اس سے معافی چاہو، قرآن کریم کا گناہ کیا، حدیث کا گناہ کیا، اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی چاہو، میں کون ہوں معافی دینے والی۔ چنانچہ آ کر بقیہ رات نوافل وتوبہ استغفار میں گذاری، رات بھر روتے رہے، حالانکہ یہ گناہ نہیں تھا امیر المومنین کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر کسی گھر پر شبہ ہو تو اس میں چھاپہ مارے، پولیس کو بھیجے کہ کوئی بدکاری تو نہیں ہورہی، یہ امیر کے حق میں جائز ہے، مگر اس سب جائز کو بھول گئے، صرف ذہن میں یہ رہ گیا کہ واقعی تین حکموں کی خلاف ورزی کی میں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا، بلا اِذن داخل ہوا اور ایک عورت کے خلوت کدے میں داخل ہوا، غرض تمام رات روئے استغفار کیا، صبح کو قلب میں انشراح پیدا ہوا کہ میری غلطیاں معاف ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ نے میری معافی کو قبول فرمالیا بہت منشرح ہوئے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس عورت کو دربارِ خلافت میں حاضر کیا جائے چنانچہ وہ حاضر ہوگئی۔ فرمایا بہن! میں تیرا ممنون ہوں تو نے مجھے میرے گناہوں پر مطلع کیا، میں نے رات بھر توبہ استغفار کیا، اب مجھے اخیر میں انشراح اور اطمینانِ قلب حاصل ہوگیا کہ اللہ نے میرے گناہوں کو معاف کردیا میں مطمئن ہوں کہ مجھے معافی مل گئی۔

اب بحیثیت امیر المومنین یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ گانا بجانا کیسا تھا؟ اس طرح کے تجھے اشعار پڑھنے کا کیا حق تھا، وہ کیا واقعہ تھا؟ اس نے کہا امیر المومنین! میں زانیہ عورت ہوں نہ بدکار ہوں، میں ایک عفیفہ عورت ہوں، صورتِ واقعہ یہ ہے کہ میری شادی کو پندرہ دن ہوئے ہیں، میں بھی بھرپور جوانی رکھتی ہوں، میرا خاوند بھی بھرپور جوان ہے شادی کو پندرہ دن ہوئے تھے فلاں جنگ میں آپ نے میرے خاوند کو بھیج دیا، اور اس کو روانہ کردیا، اس کے فراق اور جوش جوانی میں کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

فرمایا تو سچ کہتی ہے بیشک یہی واقعہ ہے اور تو بدکار نہیں ہے اس کے بعد اس کو عزت کے ساتھ واپس کیا اور شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد گھر میں جا کر اہلیہ محترمہ سے پوچھا! اگر عورت بھی بھرپور جوان ہو اور مرد بھی بھرپور جوان ہو اور ان میں جدائی کردی جائے، تو وہ کتنے دن جدائی کا تحمل کرسکتے ہیں اگر اس سے زیادہ دن ہوجائیں تو وہ زنا یا بدکاری میں مبتلا ہوجائیں گے اور صبر نہ کرسکیں گے، کتنی مدت ہوسکتی ہے۔ اہلیہ محترمہ نے جواب دیا اگر مرد وعورت میں بھرپور جوانی ہو تو تین مہینوں سے زیادہ ان کو جدا نہ کیا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہوجائیں گے اور صبر نہ کرسکیں گے۔

یہ الگ بات ہے کہ اللہ کے ڈر سے عفت وپاکیزگی طبع سے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، لیکن دنیا ہے تو عالم اسباب میں بھرپور جوانی مرد وعورت تین مہینے سے زیادہ صبر نہیں کرسکتے، اسی وقت آ کر سرکاری طور پر آرڈر جاری کیا کہ جس

شادی شدہ شخص کو جنگ کے لئے بھرتی کیا جائے، تین مہینے کے اندر اندر اسے پھر واپس گھر لایا جائے، اس کی جگہ دوسرا جوان بھیجا جائے تین مہینے سے زیادہ صرف نہ کئے جائیں، تو ان حضرات کی یہ بادشاہت نہ تھی بلکہ خلافت تھی کہ اقتدار بھی پورا اور ایسا کہ سلاطین دنیا کا نہیں، اور خوف خدا بھی پورا اور دیانت بھی پوری، اور اپنے نفس کا مراقبہ بھی پورا، اور یہ بھی خطرہ کہ ہم کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، تو حقیقت میں خلافت کا حق انہیں حضراتِ اکابر نے ادا کیا۔ تو پہلے فاروقِ اعظمؓ کفر میں مبتلا تھے، لیکن جب توبہ کی تو پچھلی سرداری کیا چیز تھی، جو بعد میں اللہ نے دنیا میں سرداری دی، اور آخرت کی یہ سرداری کہ دنیا ہی میں ان حضرات کو جنت کی بشارت دے دی، تو ان سے زیادہ کون خوش نصیب تھا کہ دنیا میں بھی سرداری پائی اور آخرت میں بھی سرداری پائی۔

دو جہاں کی سرداری کا راستہ...... تو اسی طرح سے مشرکینِ مکہ کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ باغ والوں کے قصے سے عبرت پکڑو، انہوں نے اگر حق تعالیٰ سے بغاوت کی تو کیا نتیجہ نکلا کہ باغ کی جڑ بنیاد ختم ہو گئی، اس کے بعد اطاعت کی اور ندامت کا اظہار کیا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس سے بہتر باغ مل گیا، تم بھی آج بغاوتِ حق پر آمادہ ہو، اللہ کے دین پر خود بھی نہیں آتے اور دوسرے کو بھی آنے سے روکتے ہو اس باغِ دین سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے، اگر تم توبہ کرلو تو اس سے بڑھ کر باغ دیا جائے گا اور سرداری دی جائے گی، تو جن کی قسمت میں تھا، انہیں سرداری مل گئی اور جن کی قسمت میں نہیں تھا ان سے یہاں سے بھی چھن گئی وہاں سے بھی چھن گئی دونوں جہاں سے محروم ہو گئے گویا عبرت کے لئے قصہ بیان فرما دیا گیا کہ اس طرح سے اگر چلو گے کہ اگر گناہ ہو جائے تو آدمی فوراً نادم ہو جائے، فوراً توبہ کرے استغفار کرے آدمی اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرے، اللہ کے ہاں یہی چیز قبول ہوتی ہے۔

یہ مقصود نہیں ہے کہ کوئی گناہ کسی طرح سے نہ کرے، آدمی جب ہی بخشا جائے گا کہ بالکل گناہوں کا استیصال کر دیا، اسلئے کہ یہ تو ممکن نہیں انسان اور بشر جسے کہتے ہیں وہ تو خطا اور نسیان کا پتلا ہے، بشریت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے، غلطی بھی ہوگی کوتاہی بھی ہوگی گناہ بھی ہوگا گناہوں کا استیصال مقصود نہیں ہے، اس لئے کہ انسان میں جب گناہ کا مادہ رکھا ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ تو کرے گا مقصد یہ ہے کہ گناہ کر کے اس پر اصرار نہ کرو، نادم ہو کر اس سے ہٹ جاؤ، پھر گناہ ہو پھر توبہ کرلو، تو یہ نہیں کہا جا رہا کہ گناہ کا مادہ اپنے اندر سے نکال دیں، یہ انسان کے بس میں ہی نہیں جیسے خیر کا مادہ انسان میں رکھا گیا ہے، شر کا بھی ہے۔

خیر و شر کا تصادم علامتِ بشریت ہے...... حدیث میں ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک داعیہ خیر کا پیدا کیا گیا ہے ایک داعیہ شر کا پیدا کیا گیا ہے، ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور قلب کی بائیں جانب شیطان بٹھلایا گیا ہے، فرشتہ خیر کے خطرے ڈالتا ہے اور شیطان شر کے وسوسے ڈالتا ہے، انسان دو پہلوانوں کے بیچ میں ہے، ادھر سے فرشتہ چاہ رہا ہے کہ نیکی کرے شیطان چاہ رہا ہے کہ بدی کرے یہ جو آپ کسی وقت دیکھتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ فلاں برائی کرلوں پھر طبیعت ذرا رکتی ہے کہ بھائی دیکھ اللہ کے خلاف ہوگا، پھر

اس کے بعد آمادگی ہوتی ہے کہ توبہ کرلیں گے اس وقت تو کرلو، پھر اس کے بعد آدمی رکتا ہے کہ بھائی خدا تو دیکھ رہا ہے یہ تردّد فی الحقیقت شیطان اور فرشتے کے مقابلے سے ہوتا ہے، فرشتہ خیر کا خطرہ ڈال رہا ہے تو آدمی خیر کی طرف چلتا ہے اور شیطان شر کا وسوسہ ڈال رہا ہے تو آدمی شر کی طرف چل رہا ہے، ان دو پہلوانوں میں جو غالب آجائے، اسی راہ پر انسان چل پڑتا ہے مادے خیر کے بھی موجود ہیں شر کے بھی موجود ہیں، نیکی بھی کرے گا اور کبھی نہ کبھی بدی بھی کرے گا، بہتر سے بہتر آدمی صالح ہونا چاہئے۔ لیکن کبھی نہ کبھی بدی سرزد ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس کا مادہ رکھا ہوا ہے، تو حق تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ جنت اس وقت دیں گے جب تم سے ایک گناہ بھی نہ ہو، بالکل پاک بن جاؤ، یہ شان حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہے وہ معصوم ہوتے ہیں یا اولیاء اللہ کی ہے کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں، عام بشر چاہے کتنی ہی نیکیاں کرے مگر کسی نہ کسی وقت کمزوری سرزد ہو ہی جائے گی، بشریت موجود ہے اس لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ گناہوں کی جڑ بنیاد کاٹ دو، اور بالکل مقدس ہو کر آؤ، یہ فرمایا گناہ تو ہوں گے، مگر اصرار مت کریں توبہ بھی کرلیں، نادم بھی ہو جائیں، ہزار دفعہ گناہ کرلو، پھر توبہ کرلو، معاف کرنے کو موجود ہیں۔

"مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ" ①

جس نے توبہ کرلی وہ اپنے گناہ کے اوپر مُصر نہیں سمجھا جائے گا، مُصر وہ ہے کہ گناہ کرتا جائے اور توبہ نہ کرے اور اس کے دل میں ندامت نہ آئے معلوم ہوا نفسِ گناہ مُصر نہیں ہے، گناہ پر اصرار کرنا، نادم نہ ہونا یہ مُصر ہے۔ بلکہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا کہ:۔

"لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَجَآءَ اللّٰهُ قَوْمًا يُّذْنِبُوْنَ" ② اگر تم بالکل گناہ کرنا چھوڑ دو، تو اللہ تعالیٰ ایک قوم پیدا کریں گے کہ وہ گناہ کرے، تا کہ اس کی شانِ غفاری ظاہر ہو۔

دوزخ کر ابسوزد گر بولہب نباشد

جیسے دوزخ کے لئے ابولہب کی ضرورت ہے کہ اگر ابولہب نہ ہو تو جہنم کہاں سے بھرا جائے، اسی طرح جنت کے لئے نیکوں کی ضرورت ہے، اب اہل جنت میں نیک بھی ہیں گناہ گار بھی ہیں نیکوکار فضل سے جائیں گے اور گناہ گار مغفرت سے جائیں گے، اگر گناہ کرنا ہی چھوڑ دیں تو شانِ غفاری کیسے ظاہر ہوگی؟ تو مغفرت کے لئے ضرورت ہے کہ گناہ کا کام ہو۔

عُجب، گناہ سے بھی زیادہ مہلک ہے...... اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً گناہ کرنا شروع کر دیں کہ بھائی ہم تو اللہ کی مغفرت چاہ رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ گناہ کا مادہ ہے خواہی نخواہی کبھی نہ کبھی گناہ کر گذرے گا، لیکن گناہ کر کے مایوس نہ ہو جائے کہ اب رحمت کی کوئی صورت میرے لئے نہیں، رحمت کی صورت ہے اور وہ

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۷۱.

② الصحیح لمسلم، کتاب التوبة، باب سقوط الذنوب بالاستغفار توبة ج: ۱۳ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۹۳۶.

توبہ ہے، فرماتے ہیں کہ گناہ اتنا مضر نہیں ہے، جتنا گناہ کر کے توبہ نہ کرنا اور اس پر جمنا مضر ہے، اگر تم سب گناہ چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ گار ہو تا کہ اس کی شانِ مغفرت ظاہر ہو، بلکہ ایک روایت میں ہے: خَیْرُ الْعِبَادِ الْخَطَّآءُ وْنَ التَّوَّابُوْنَ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جو گناہ گار ہیں، مگر توبہ کرنے والے ہیں، اس واسطے کہ ایک شخص تو وہ ہے جو کبھی گناہ نہیں کرتا، اس کا احتمال ہے کہ اس کے دل میں غرور پیدا ہو جائے کہ میں بڑا متقی ہوں کبھی گناہ ہی نہیں کیا، تو یہ خیال آنا اس کے لئے مہلک ہے، یہ بھی اللہ کی رحمت سے بعید کرنے والا ہے، اگر ناز پیدا ہو گیا اتراہٹ پیدا ہو گئی کہ میں بڑا نیک ہوں کبھی گناہ نہیں کرتا، یہ اللہ کی رحمت سے بعید ہو جائے گا، لیکن گناہ کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے، پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، اس کے دل میں کبھی خطرہ نہیں آئے گا کہ میں بڑا مقدس آدمی ہوں اس لئے کہ گناہ سامنے ہے، اس کا دل ٹوٹا ہوا رہے گا کہ میں تو گنہگار ہوں اور دل شکستہ ہونا یہی رحمت خداوندی کو جذب کرتا ہے، اس سے زیادہ رحمت متوجہ ہوتی ہے، اس لئے فرمایا: ''خَیْرُ الْعِبَادِ الْخَطَّآءُ وْنَ التَّوَّابُوْنَ'' ① بہترین بندے وہ ہیں جو گنہگار ہیں مگر توبہ کرتے ہیں توبہ سے غافل نہیں ہیں، تو جو کبھی گناہ نہیں کرتے ان کے اندر کبر اور غرور کا احتمال ہے لیکن جو گناہوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں مگر توبہ کرتے ہیں ان کے اندر کبھی کبر نہیں ہو سکتا کہ ہم تو بہت گنہگار آدمی ہیں ہر دم گناہ ان کے پیش نظر رہیں گے، قلبی شکستگی گناہ سے ہوتی ہے، اور وہی شکستگی بارگاہِ حق میں مطلوب ہے جو رحمت کو کھینچتی ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ احیاناً گناہ سرزد ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے، یہ مطلب نہیں ہے کہ جری ہو کر گناہ شروع کر دو کہ اللہ کے بہترین بندے تو وہی ہیں جو گناہ گار ہیں لہٰذا خوب گناہ کرو۔

رحمتِ حق سے مایوسی کی ممانعت ہے......خوب گناہ کرنے کے باوجود بھی فرماتے ہیں کہ مایوس مت ہو یہ نہیں فرماتے کہ خوب گناہ کیا کرو، تو یہاں یاس کی نفی کی جارہی ہے، کہ کتنے ہی گناہ کرو مایوس مت ہوؤ، وہاں توبہ ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست	صد بار گر توبہ شکستی باز آ

فرماتے ہیں، باز آجا باز آجا، نادم بن جاؤ، اگر کافر گبر اور بت پرست بھی ہو تب بھی مایوس نہ ہو باز آجاؤ، پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں اس لئے کہ ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے سو مرتبہ بھی اگر گناہ کرو گے اور پھر آؤ گے پھر بھی توبہ قبول کرنے کو تیار ہیں، پھر بھی رحمت کرنے کو تیار ہیں ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا ہے ﴿لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ﴾ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو، کتنی بھی برائیوں کے اندر مبتلا ہو، یاس لے کر مت آؤ، مومن کا کام ہی مایوسی نہیں ہے، پھر متوجہ ہو جائے پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں۔ اور سچی

① السنن للترمذی، کتاب صفة القیامة والرقاق والورع، باب منہ ج: ۹ ص: ۳۰ رقم: ۲۴۲۳.

توبہ ایسی چیز ہے کہ ستر برس کا کفر بھی اگر سچے دل سے توبہ کرلی جائے تو مٹا دیتی ہے، گناہ تو کفر سے ہلکی چیز ہے، جب سو برس کا ایک کافر آ کر توبہ کرے تو کفر مٹ جاتا ہے اور ایسا مٹتا ہے کہ: ''اِنَّ الْاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ'' ① اسلام سے پہلے جو کچھ بھی کیا تھا وہ سب ختم ہو جاتا ہے، آج وہ ایسا بن گیا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ گناہ سے پاک ہوتا ہے تو گناہ سے توبہ کرنے کے بعد کیوں نہیں پاک بنے گا۔

اس لئے فرمایا: ''اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ'' ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں تھا، اس کو پاک بنا دیا جاتا ہے۔

حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے...... اِلَّا یہ کہ حقوق العباد ہوں تو وہ توبہ سے معاف نہیں ہوتے، کسی کو گالی دے دی، کسی کی آبرو گرائی، کسی کا خون ناحق کیا، کسی کا مال جھپٹ لیا، چرالیا، قرض لے کر نہیں دیا، امانت میں خیانت کی، کتنی ہی توبہ کرے یہ معاف نہیں ہوں گے جب تک کہ صاحبِ حق معاف نہ کردے، یہ حق تعالیٰ کی بارگاہ کا عدل وانصاف ہے، حالانکہ مالک الکل وہ ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ یہ ہمارا گناہ نہیں، اس نے اپنے بھائی کا گناہ کیا ہے وہی معاف کرے گا تو معاف ہوگا، ہمیں معاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہم معاف نہیں کریں گے، حالانکہ اگر وہ معاف کردیں تو بندے کیا کر سکتے ہیں، لیکن یہ عدلِ کامل ہے کہ ہم معاف نہیں کریں گے، جس کا قصور کیا اس سے معافی چاہو۔

اگر کسی کی غیبت کی ہے کسی کو برا بھلا کہا ہے، پشت پیچھے اس کے عیب بیان کئے ہیں آدمی اس کے پاس تنہائی میں جا کر کہے، بھائی! میں نے تیرے ساتھ برائی کی ہے، میں نے غلطی کی تیرے عیب بیان کئے، اللہ کے لئے مجھے معاف کردے، وہ معاف کردے گا معاملہ صاف ہو جائے گا، کسی کا قرض دبالیا ہے آدمی وہ جا کر دیدے کہ اب تک مجھ سے غلطی ہوئی اب میں ادا کروں گا، اگر بالفرض دینے کو نہیں رہا لیکن اقرار کرلیا کہ بے شک آپ کا پیسہ مجھ سے کھایا گیا میں نے خطا کی لیکن اب میں معترف ہوں کہ جب میرے پاس ہوگا پہلے میں تجھے دوں گا، اب اس مستعد ہونے پر آدمی قائم رہے، اگر پانچ روپے ہیں تو ایک حصہ اس کو جا کر دیدے، کہ بہرحال مجھے یہ ادا کرنا ہے صرف کھانے کے لئے اتنا رکھ لے کہ فاقہ نہ ہو، بقیہ سب اس کو دے دے جب اس طرح سے کوئی ادائے قرض میں ہمت باندھے گا تو پھر اللہ کی طرف سے بھی مدد ہوتی ہے، ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ اسے جلدی سبکدوش کردیتے ہیں، غرض کسی کی غیبت کی ہو آبروریزی کی ہو، مال چھینا ہو تو مومن کا کام یہ ہے کہ بے تکلف جا کے کہہ دے کہ بھائی! مجھے معاف کردے بس معاملہ صاف ہو گیا، اسی طرح اللہ کا حق مارا تو اللہ سے توبہ کرلے، وہ تو کریم ہیں معاف کردیں گے، بہرحال یہ ندامت اور توبہ ایسی چیز ہے کہ اس سے کفر تک مٹ جاتا ہے، اس واسطے

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب كون الاسلام يهدم ماقبله وكذا الهجرة والحج ج: ١ ص: ٣٠٤ رقم: ١٧٣. ② السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة ج: ١٢ ص: ٣٠١ رقم: ٤٢٤٠.

فرمایا گیا کہ باغ والوں کی مثال سامنے رکھو کہ انہوں نے جب سرکشی کی تو اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ باغ جڑ بنیاد سے ختم ہو گیا، اور جب کہا ﴿اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ﴾ ہم اللہ کی طرف جھک رہے ہیں، ہم نے سرکشی کی ہم اس سے توبہ کرتے ہیں اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ انہیں باغِ حیوان دے دیا گیا۔

بغاوت اور توبہ کے ثمرات...... تو اے مشرکین مکہ! آج تک تم بغاوت کر رہے ہو اس کا ثمرہ بھی تمہارے سامنے آ گیا کہ غزوۂ بدر کے اندر تمہارے بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے، فتح مکہ کے اندر سب کے گھروں پر تالے پڑ گئے، یعنی ان کی ریاستیں ختم ہو گئیں اور جنہوں نے توبہ کر لی اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کوئی امیر المومنین بنا، کوئی خالد سیف اللہ بنا، کوئی ابو تراب بنا، کوئی ذی النورین بنا، حق تعالیٰ کی حکومت سے خطابات دیئے گئے۔ اس کا بھی ثمرہ سامنے آیا، تو دونوں چیزیں سامنے رکھو اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو اور اس سرکشی کو ترک کرو، اس واقعہ پر جن کی قسمت میں سعادت تھی وہ تائب ہو گئے، جن کی قسمت میں نہیں تھی، وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے دعا کیجئے حق تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمائے۔

مشرکینِ مکہ کو تنبیہ...... ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۝ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ﴾

بزرگانِ محترم! جیسا کہ آپ معلوم کر چکے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے مشرکین مکہ کو عبرت دلانے کے لئے باغ والوں کی ایک مثال بیان فرمائی اور جو کچھ سانحہ گذرا تھا وہ ارشاد فرمایا کہ اس طرح سے ان پر آ کر آفت پڑی، اور پھر یہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، تو انہیں نعم البدل دے دیا گیا، تو یہ مثال عبرت کے لئے ان کے سامنے پیش کی گئی کہ تم بھی اسی حالت میں ہو جیسے اصحاب الجنۃ تھے، تم پر ایک مصیبت آنے والی ہے، یعنی یوم بدر آنے والا ہے، اس میں تمہارے سردار قتل ہونگے تمہاری طاقت ٹوٹ جائے گی، قحط سالی آنے والی ہے جس کے اندر تم کئی برس تک مبتلا رہو گے یہ ساری آفتیں آئیں گی، اگر تم نے ان آفات سے عبرت پکڑی اور اللہ کی طرف رجوع کیا پھر اس کے بعد بہترین ثمرہ بھی اسی طرح آئے گا جس طرح باغ والوں کے لئے آیا۔

اس واقعہ کو بیان فرما کر بطور نتیجہ کے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ کہ آفت یا مصیبت اسی طرح آیا کرتی ہے کہ اچانک آ پڑتی ہے، آفت یا مصیبت دستک دے کر نہیں آیا کرتی کہ وہ پہلے دروازے پر آ کر اطلاع دے اور دو چار دن پہلے سے تیار کرے، وہ عذاب ہی کیا ہو جس کی استعداد پہلے سے تیار

کی جائے، اس طرح تو آدمی سنبھل جاتا ہے کہ مجھے مصیبت کے لئے تیار ہونا ہے، تو مصیبت حقیقت میں وہی ہوتی ہے جو اچانک آتی ہے، اور آفات کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اچانک ہی آتی ہیں، چنانچہ سب آفتوں کی جڑ بنیاد موت ہے تو وہ بھی اچانک آتی ہے، پہلے سے کسی کو کوئی اطلاع نہیں ہوتی، بالفرض اگر کوئی بیمار بھی ہو، بہت شدید بیمار ہو جائے اور مایوس بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا ہے کہ موت قریب ہے مجھ سے کوئی دور نہیں ہے، لیکن یہ کہ کب آ جائے گی؟ جب آئے گی تو اچانک ہی آئے گی بغتۃً ہی آتی ہے۔

قلبی قساوت کا انجامِ بد...... اور دنیوی مصائب تو اچانک ہی آتے ہیں، جب اقوام اور افراد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمام وسائل دنیا ہمارے ہاتھ میں آ گئے ہیں اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر آفت آئے، انہی پر زیادہ آتی ہے اور اچانک آتی ہے، اسوقت حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ یہ کدھر سے آ گئی، جس کا نقشہ بھی قرآن کریم نے ایک جگہ کھینچا ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ آپ سے پہلے ہم نے دنیا کی اقوام کو جانچا، ان میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھیجے، اپنا قانون بھیجا تا کہ وہ اس پر چلیں، جب وہ نہ چلے، خلاف ورزیاں کیں اور فطرت کے خلاف چلے معصیتوں میں مبتلا ہوئے تو پھر ہم نے ڈرانے والے بھیجے کچھ آفات بھیجیں، تا کہ وہ سنبھلیں، کبھی مصیبتیں اور کبھی خوفناک چیزیں بھیج کر ان کو متنبہ کرنا چاہا، تا کہ وہ ہماری طرف رجوع کریں تضرع زاری، اللہ کی طرف جھکنا اور عجز وانکسار پیدا کریں لیکن ایسا نہ ہوا ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ آگے بطور شکایت فرماتے ہیں ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا﴾ آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟ جب ہم نے آفت بھیجی تو وہ سمجھ جاتے؟ آفت کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ آدمی کے اندر رجوع الی اللہ پیدا کرتی ہے، بہت ہی کوئی قساوۃ قلب رکھتا ہو کہ اس پر آفتوں پر آفتیں آئیں پھر بھی اس میں رجوع الی اللہ پیدا نہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کا قلب دنیوی مسائل اور اسباب کے ساتھ اٹک چکا ہے، مسبب الاسباب کی طرف رجوع رہا ہی نہیں، مصائب اور خوفناک مسائل پیش آنے کے باوجود یہ لوگ کیوں نہ جھکے؟ ﴿وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ان کے دلوں میں سختی پیدا ہو گئی تھی، یہ جو دل میں نرمائی اور دل میں رقت ہوتی ہے جس سے آدمی اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے وہ مادہ ہی ان میں باقی نہیں رہا وہ استعداد ہی انہوں نے فنا کر دی۔ ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور جو کچھ ان کی خرافات اور عمال تھے، وہ شیطان نے کچھ ایسے مزین کر دیئے کہ اسی میں الجھ کر رہ گئے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہی اسباب ہیں تو یہ بھی ہمارے قبضے میں ہیں اور ہمارے پاس سارے جمع ہیں۔ لیکن فرماتے ہیں: ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ جو کچھ انہیں نصیحتیں کی گئیں عبرتیں دلائی گئیں، وہ سب کچھ وہ بھلا چکے تو ہم نے بھی پھر راحتوں اور آسائشوں کے دروازے کھول دیئے، کہ اچھا چلو کہاں تک چلتے ہو، اور جب دروازے کھل گئے تو انہوں نے دنیا اور اسباب دنیا پر مزید اطمینان کر لیا کہ اب تو ساری چیزیں ہمارے قبضے میں آ گئیں، وسائل رزق

ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائل نقل وحمل بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائل علم وخبر بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں جس کو جو چاہیں ہم اطلاع پہنچائیں، دوسری کوئی اطلاع دی نہیں جاسکتی کہ پبلک میں بدگمانیاں پیدا ہوں، اسی طرح وسائل حمل ونقل بھی کہ ہم ہی سواریوں پر لے جاسکتے ہیں، ہمارے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے حتی کہ پبلک کی روشنی اور پانی بھی ہمارے قبضے میں ہے، جب چاہیں اندھیرا کردیں اور جب چاہیں پانی بند کردیں، تو ہم تمام وسائل دنیا پہ قابض ہیں، اب آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟ آفتوں کے دروازے تو ہم نے بند کردیئے ہیں تو فرمایا: ﴿حَتّٰىٓ اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا﴾ جب وہ مطمئن ہوجاتے ہیں، اتراہٹ میں آجاتے ہیں کہ اب سب کچھ قبضہ میں آگیا۔ ﴿اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً﴾ اچانک ہماری مصیبت کا پنجہ ان کے سروں پر گرتا ہے۔ ﴿فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ اب حیرت زدہ ہوکررہ جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آن پڑی،؟ ہم نے تو چہار طرف سے راستے بند کردیئے تھے اور پوری طرح ناکہ بندی کردی تھی پھر آفت کہاں سے آئی۔؟ اب حیرت میں پڑجاتے ہیں۔

ظلم کا انجام...... اب کمیشن بیٹھے ہیں کہ اسباب پر غور کیا جائے کہ کہاں سے یہ صورت پیدا ہوئی، اگر عیاذ اًباللہ کوئی ہوائی جہاز گر گیا تو بجائے اس کے رجوع الی اللہ کرے کمیشن بیٹھتا ہے کہ اسباب پر غور کرے کہ مشین میں کیا خرابی تھی، تو مشینوں ہی میں دل الجھا ہوا ہے اس طرف ذہن جاتا ہی نہیں کہ مشینوں سے بالاتر بھی کوئی طاقت ہے، قلوب میں سکت باقی نہیں ہے، اب بھی انہیں اسباب کے جھروکے میں گھر کر اسی پر غور کرتے ہیں، ہم اچانک مصیبت بھیجتے ہیں اور اسباب سمجھ میں نہیں آتے تو حیرت زدہ ہوکررہ جاتے ہیں ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

پھر ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے، ان کا بیج باقی نہیں رہتا، نہ وہ رہتے ہیں نہ ان کی حیرت باقی رہتی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ مصیبت جب آتی ہے تو وہ اطمینان دلا کر نہیں آتی، اچانک آتی ہے لوگ مطمئن ہوتے ہیں کہ اب کوئی چیز آنے والی نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ بیماریوں پر ہم نے قبضہ پالیا، دوائیں ایجاد کرلیں سواریوں پر ہم نے قبضہ پالیا، مشینیں ہمارے قبضہ میں ہیں، رزق دانے اور پھل پھول سب ہمارے قبضے میں ہیں، اب آخر آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

آفاتِ آخرت کا تدارک بھی نہیں...... یہ ان کے علم میں نہیں کہ آفات کا پیدا کرنے والا تمہارے سے زیادہ عالم ہے وہ تمہارے سے زیادہ راستے جانتا ہے، جیسے اس کو نعمت کا دینا آتا ہے اس کا چھیننا بھی آتا ہے، سب اسی کے قبضے میں ہے تم تھوڑے سے قبضہ پر آکر اتراہٹ میں آکر اپنی اصلیت کو بھی بھول گئے کہ ہم کیا تھے، اور ہماری طاقت کیا تھی ایسی قوموں کے لئے جب اچانک مصیبت آتی ہے تو جڑ کٹ جاتی ہے، اگر اس میں کوئی سعادت مند ہے اور وہ رجوع الی اللہ کر گیا تو اس کے لئے نیک نتیجہ آجاتا ہے، ورنہ قوم کی قوم کا اقتدار اور اس کی زندگی ختم کردی

① پارہ:۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۴۵.

جاتی ہے، اسی کوفرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ اسی طرح آفت آیا کرتی ہے، اور دنیا کی آفت جب آتی ہے تو کوئی اس کا ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾ پھر آخرت کا عذاب جو ہوگا تو اس کو کون ٹال سکتا ہے؟ دنیا میں انسان سوچ بچار تو کرتا ہے کہ کیا وجہ پیش آئی جو یہ مصیبت پیش آئی آخرت میں سوچ بچار کا بھی راستہ نہیں ہے وہاں براہ راست مسبب الاسباب سے واسطہ ہے وہاں اسباب نہیں ہیں، اس لئے وہاں سوچ اور فکر کا دخل نہیں ہے۔ اس واسطے عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی آفت آئے تو اس سے عبرت پکڑو اور آخرت کی آفت کو پیش نظر رکھو کہ اس کا تو کوئی تدارک بھی نہیں۔

آفاتِ دنیا کو کم کرسکتا ہے مگر آفاتِ آخرت کو نہیں...... یہاں کم سے کم یہ تو ہے کہ جب آفت آئے تو توبہ کا دروازہ تو بند نہیں ہے، آدمی توبہ کر کے آفت کو ٹال سکتا ہے، مگر آخرت میں تو توبہ بھی قبول نہیں وہاں نہ توبہ کا وقت ہے نہ عذاب کم کرنے کا وقت ہے اور نہ انفعال وندامت کا وقت ہے یہ سب چیزیں یہاں کام آتی ہیں، تو کوئی سبب اس کو ٹالنے کا باقی نہیں ہوگا، اس واسطے فرمایا: ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾ جب دنیا کی آفت کو کوئی ٹالنے والا نہیں باوجودیکہ رجوع کے اسباب موجود ہیں، وہاں تو یہ بھی نہیں ہوگا، عذاب بہت سخت ہوگا، یہ وقتی ہے وہ دوامی ہے، یہ تھوڑے وقت کے لئے آتا ہے، وہ ابد تک کے لئے آتا ہے، اس لئے وہ زیادہ ڈر کی چیز ہے تو دنیا کی مصیبتوں کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا کہ ان سے عذاب آخرت کو سمجھو۔

دنیا کے مصائب میں بہرحال کچھ نہ کچھ اسباب موجود ہیں کہ آدمی مصیبت کو ہلکی کرسکتا ہے، اور ارباب باطن نے ادھر توجہ دلائی ہے کہ اگر آدمی غور کرے تو مصیبتوں کو ہلکا کرنے کی صورتیں ہیں۔

مصیبت ٹالنے کے لئے حضرت علیؓ کی تدبیر...... چنانچہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ایک جملہ فرمایا جس سے مصیبت بڑی ہلکی ہوسکتی ہے، فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، تدبیر کئے جاؤ مگر اتنی جدوجہد نہ کرو کہ آج ہی اُسے ٹال دیں، وہ تو اپنے وقت پر ہی جا کے ٹلے گی، تسلی کے لئے کچھ تدبیر کرنا اسباب فراہم کرنا درست ہے، مگر اتنی جلدی کرنا کہ آج ہی ٹل جائے، اس طرح مصیبت میں الجھ کر بعض اوقات مصیبت کی عمر دراز ہوجاتی ہے اگر آدمی پر بیماری آئی ہے تو طبعی طور پر جو تدبیر ہے آدمی کرلے، لیکن بعض لوگ گھبرا کر صبح کو ایک ڈاکٹر دوپہر کو دوسرا اور شام کو تیسرا، ایک طوفان باندھ دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض الجھ کر دودن کی بجائے ہفتہ بھر میں جاتا ہے۔ اس واسطے کہ گویا وہ تقدیرِ خداوندی کا مقابلہ ہوتا ہے، اگر طے شدہ ہے کہ مصیبت ہفتہ بھر کی ہے تو جو دودن ٹلانا چاہے تو وہ ہفتہ کی بجائے چودہ دن کی ہوجائے گی، اس واسطے طبعی تدابیر اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرے اور اسی کی طرف رجوع کرے، تو مصیبت آسان ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

''اَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوْا عَلَيْهِ''[1]

---

[1] السنن لابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في طلب المعيشة ج: ٥ ص: ٣٧٨ رقم: ٢١٣٥.

طلب کے اندر جمال پیدا کرو، اسباب فراہم کرو مگر جمال کے ساتھ اتنا گلو اور انہماک کہ بس اسباب ہی کے بندے بن جاؤ، یہ نہیں ہونا چاہئے حکم خداوندی سمجھ کر تدبیر کے درجے میں اسباب اختیار کرو مگر بھروسہ حق تعالیٰ کے اوپر کرو کہ دراصل وہی ٹالنے والا ہے، اسباب ٹالنے والے نہیں ہیں، طبیب مرض کو رفع نہیں کر سکتا، اللہ ہی دفع کرے گا۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلطَّبِیْبُ ھُوَ اللّٰہُ وَالطَّبِیْبُ ھُوَا لرَّفِیْقُ'' طبیب محض ایک رفیق ہے، مگر حقیقت میں طبیب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مرض کو دور فرماتے ہیں۔ دافع امراض، حل مشکلات اور دافع مشکلات صرف حق تعالیٰ ہیں، طبیب صرف رفاقت کرتا ہے، کچھ تسلی دے دیتا ہے اور کچھ اسباب کی طرف توجہ دلا دی، لیکن وہ اسباب مرض کو دفع نہیں کرتے اس لئے کہ ان میں تاثیر رکھنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں، اگر وہ تاثیر کھینچ لیں تو وہ سبب ہی کیا کرلے گا؟ اس لئے موثر حقیقی موثر بالذات وہ ذاتِ بابرکات حق ہے اس لئے اسباب اختیار کرو، مگر مسبب الاسباب کو مت بھولو، اطمینان ان پر نہ کرو، اطمینان اللہ کی ذات پر کرو، اس کی صورت یہی ہے کہ اسباب میں غلو اور مبالغہ کر کے مصیبت کی مدت مت بڑھاؤ!

تو حضرت علیؓ نے کیسی حکمت کی بات بتلائی کہ ہر مصیبت ایک وقت لے کر آتی ہے اور اسی وقت پہ وہ ٹلے گی، اس لئے طبعی طور پر اسباب اختیار کرو، مگر غلو مت کرو، اللہ پر چھوڑ دو، تھوڑے بہت اسباب اختیار کرو، اور اللہ پر توکل کرو۔

مصیبت پر حضرت عمرؓ کا قول...... اس کے علاوہ ایک دوسری عجیب وغریب تدبیر حضرت عمر فاروقؓ نے بیان فرمائی۔ فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو پہلے یہ سوچو کہ یہ مصیبت میری دنیا پر آئی ہے یا میرے دین کے اوپر آئی ہے، آیا کوئی میرا عقیدہ بگڑا یا میرا عمل خراب ہوا، یا خدا نہ کرے میرا قلب اللہ سے منحرف ہو گیا، کوئی ایسی صورت تو نہیں ہوئی بلکہ دنیا پر مصیبت آئی فرمایا اگر یہ بات یقین میں آگئی کہ مصیبت دنیا پر آئی ہے اور دین محفوظ ہے تو اطمینان حاصل کرو کہ ایسی چیز پر مصیبت آئی کہ جو زائل ہونے والی ہی تھی بس دو دن پہلے زائل ہو گئی مال ہو فقر ہو، غنا ہو فقر ہو، ایک دن سب ختم ہو جانے والا ہے یہ دوامی چیز نہیں ہے۔ نہ ایک لکھ پتی کی دولت دواماً باقی رہے گی نہ ایک فقیر کا فقر وفاقہ باقی رہے گا، یہ چند روزہ بہار ہے، اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں، تو اگر دولت پر یا جائیداد پر بنی، فرمایا اطمینان حاصل کرو، دین محفوظ ہے جو کچھ بنا دنیا کے اوپر بنا، اس سے ایک تسلّی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

مصیبت میں بھی نعمت کا پہلو ہے...... لیکن بہر حال دین محفوظ ہے مگر دنیا تو گئی، تو اس کے بعد اس پر غور کرو کہ اگر یہ دنیا گئی تو تو نے ضرور کوئی حرکت کی ہوگی، اس کی پاداش میں یہ ایک مصیبت پڑی، تو یہ مصیبت تمہارے لئے کفارے کا ذریعہ بن رہی ہے، کہ جو پچھلے گناہ تھے اس کو مٹا رہی ہے پھر یہ مصیبت مصیبت نہ رہی یہ تو نعمت بن گئی کہ جس نے گناہوں کو مٹانا شروع کیا، روح کے اندر کا میل کچیل ختم کرنا شروع کیا، مصائب کے اندر یہی ہوتا ہے کہ جوں جوں آدمی صبر کرتا ہے ویسے ویسے اس کی روح کے اندر اخلاق کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اور مصیبت وغفلت کا میل کچیل ٹوٹتا

ہے اور کتنا ہے پھر روح کے اندر پاکی آتی ہے تو دین تو محفوظ رہا کہ دنیا پہ مصیبت آئی اور وہ مصیبت گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ بنی تو وہ معصیت کیا وہ تو بڑی عمدہ نعمت بن گئی جس سے میل کچیل ڈھل گیا، تو یہ مصیبت نہ ہوئی بلکہ اللہ نے دھوبی لگا دیا کہ روح کو بھگو بھگو کر مار کر میل کچیل سے پاک اور صاف کر دیا، تو یہ دوسری وجہ تسلی کی ہوئی۔ غرض جو مصیبت آئی تو یہ غور کرو کہ دین پر تو نہیں آئی، دنیا پہ آئی تو ایک تسلی تو یہ ہوئی کہ الحمد اللہ دین محفوظ ہے، اب اگر دنیا پہ آئی تو غور کرو کہ اگر آئی ہے تو گناہوں کا کفارہ بن گئی، تو یہ دوسری تسلی حاصل ہوئی، اگر چند پیسے اور چند سامان چلے بھی گئے تو جو کچھ روح کے اندر آتا ہے وہ کتنی بڑی دولت ہے کہ ایمان تازہ ہو گیا اور معصیتوں سے پاک ہو گیا۔

علم دین اور دنیوی بادشاہت کا تقابل...... کہتے ہیں کہ ایک بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے پاس نہ سامان نہ کچھ زیادہ اسباب وسائل بس پھٹے پرانے کپڑے، مگر بہر حال یہ لوگ قلوب کے بادشاہ ہوتے ہیں اور ظاہر سے مسکین نظر آتے ہیں، اس معمولی حالت میں ایک بڑے شہر سے گذر ہوا، اس زمانے میں شہر کے ارد گرد دیوار ہوتی تھی، جسے شہر پناہ کہتے تھے تو ایک بہت بھاری قلعہ تھا اور اندر شہر تھا، تو دیکھا کہ قلعے کے سارے دروازے بند ہیں، نہ اندر کی گاڑیاں باہر آ رہی ہیں اور باہر ہزاروں گاڑیاں مال واسباب سے لدی کھڑی ہیں، جو شہر میں جانے والی تھیں وہ سب رُکی کھڑی ہیں اور شہر کے دروازے چاروں طرف سے بند ہیں۔

انہوں نے پوچھا کہ اتنا بڑا شہر دن میں دروازے بند کر دیئے، تو معلوم ہوا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز گم ہو گیا یہ ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے شکار کرتے ہیں، اس نے کہا شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ نکل جائے، انہوں نے کہا لاحول ولاقوۃ عجیب قسم کا بادشاہ ہے کہ باز کو روکنے کے لئے دروازے بند کر رہا ہے حالانکہ وہ اڑنے والی چیز ہے اگر جال ڈلوا دیتا تو خیر ایک امید بھی تھی کہ وہ اڑ نہ سکے رک جائے دروزوں پر تالے ڈلوا دیئے بھلا باز کیسے رکے گا۔؟ ان کو بڑی ہنسی آئی اور عرض کیا۔

یا اللہ! آپ کے عجیب حکمت کے کارخانے ہیں اس کندۂ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ پرندے کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے، یا دروازے بند کرنے چاہئیں، اور مجھ جیسے فاضل کو جس میں علم اور معرفت ہے، جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں نہ سواری ہاتھ میں نہ وسائل ہاتھ میں نہ کوئی پوچھنے والا ہے تو آپ کی عجیب شان ہے کہ اس کندہ ناتراش کو بادشاہ بنا دیا اور مجھ جیسے فاضل کو محروم رکھا۔

جیسے وہ تلخیص والے نے کہا ؎

کَمْ عَاقِلٍ عَاقِلٍ اَعْيَتْ مَذَاهِبُهٗ   وَكَمْ جَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلْقَاهُ مَرْزُوْقًا

هٰذَا الَّذِیْ تَرَکَ الْاَوْهَامَ حَائِرَةً   وَجَعَلَ الْعَالِمَ النِّحْرِيْرَ زِنْدِيْقًا

جس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت سے عقل مند اور دانش مند ان کو تم دیکھو گے کہ وہ بالکل مفلس قلاش اور بے وسیلہ پھر رہے ہیں جوتیاں چٹخار ہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اور بہت سے جاہل جنہیں بات کرنے کی تمیز

نہیں، کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں تو دنیا کا عجیب کارخانہ ہے کہ فضلا جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں اور جہلاء اس طرح کمائیں اور کروڑ پتی بن جائیں۔تو شاعر کہتا ہے کہ وہ چیز ہے جس نے عقلوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ یا اللہ! تیری قدرت کہ ان عقل والوں کو کہاں پہنچا دیا اور کہاں یہ جاہل ان کو کہاں تک پہنچا دیا۔

غرض اسی طرح سے اس بزرگ کے دل میں بھی گویا ایک گونہ شکایت کا پہلو آیا، اگر چہ وہ وسوسہ کے درجے میں تھا، اس لئے کہ اہل اللہ کبھی اللہ کی شکایت نہیں کرتے تو تحیُّر کا اظہار کیا کہ یا اللہ یہ کیا بات ہے؟ کہ مجھ جیسے فاضل کی تو یہ حالت اور یہ کندۂ ناتراش بادشاہ، تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ: کیا آپ اس کے لئے تیار ہو کہ اس بادشاہ کی ساری دولت ملک و مال سب چھین کر تمہیں دے دیں، اور تمہارا ایمان اور علم و معرفت چھین کر بادشاہ کو دے دیں، کیا اس سودے پر تیار ہو؟ تھرّا گئے کہ یا اللہ! نہیں، فرمایا تمہیں اتنی بڑی دولت دی ہے کہ اس دولت کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی، اور تم اس چندروزہ دولت پر حرص کرنے لگے تمہیں ایمان، علم معرفت توکل صبر دیا، حضرات انبیاء علیہم السلام کے اخلاق دیئے، اب بھی آپ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں مفلس ہوں، مفلس وہ ہے جس کے پاس ایمان نہ ہو، یہ چندروزہ مفلس ہے دوامی مفلس وہ ہے جس کا قلب ایمان اور علم سے خالی ہو، اس لئے جس کو علم اور معرفت کی دولت دی گئی، وہ اتنی بڑی دولت ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی آجائے تو اس دولت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

دولتِ ایمان اور دولتِ دنیا کی تقسیم میں عدلِ خداوندی...... حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، یہ تین بزرگ ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مرزا مظہر جان جاں، اور حضرت شاہ غلام علی رحمہم اللہ تینوں بڑے پائے کے بزرگ ہیں، رنگ تینوں کے الگ الگ ہیں، تو شاہ غلام علیؒ سے ٹونک کے نواب میر خاں بیعت تھے، شاہ غلام علیؒ کے ہاں مہمان داری اتنی تھی کہ چار چار سو مہمان ایک ایک وقت میں ہوتے اور ظاہر میں نہ کوئی تجارت نہ ملازمت تھی نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ تو نواب میر خاں نے سوچا کہ شیخ کو بڑی مصیبت پیش آتی ہوگی، مہمان داری کی کثرت ہے اور گھر میں کچھ ہے نہیں، کوئی جائیداد نہیں کوئی تجارت نہیں، گویا شیخ صاحب پر بڑا رحم آیا، تو انہوں نے اپنی ریاست کا ایک پورا ضلع اس کے بارے میں ایک پیتل کے پتے کے اوپر لکھ کر بھیجا کہ آج سے اس کو آپ کے نام کرتا ہوں یہ پورا ضلع آپ کی مِلک ہے اس کی لاکھوں روپے سال کی آمدنی ہے تو آپ کے لئے مہمانداری اور ضیافت میں آسانی ہوگی، اور وہ بھی کاغذ پہ نہیں لکھ کر بلکہ پیتل کے پتے کے اوپر پختگی کے ساتھ کہ آج سے یہ پورا ضلع میں نے آپ کے حوالے کر دیا، حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس یہ پتہ پہنچا، تو نواب صاحب تو یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے بہت بڑی چیز پیش کی ہے اور حضرت شاہ غلام علیؒ کے تو گویا جان میں جان آجائے گی کہ اس نے بڑے وقت پہ خبر گیری کی کہ میرے مہمان تھے یہ مصیبت پڑتی تھی ایک ضلع دے دیا تو اب آسانی سے مہمانوں کی مدارات کروں گا، تو یہ اپنے ذہن میں سوچ رہے تھے۔لیکن جب یہ

پیتل کا پتہ پہنچا تو اسی وقت اسی پیتل کے پتے کی پشت پر جواب لکھا اور شعر لکھ کر بھیج دیا، نہ القاب و آداب نہ محبت وکشر یہ کہ آپ نے لاکھوں روپے کی مالیت کا ضلع دیا، کچھ نہیں صرف ایک شعر لکھ کر بھیج دیا وہ شعر کیا تھا؟

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم ۔۔۔ بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر وفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے، میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقرر ہے جو آسمان سے آرہی ہے، تیرے ضلع کے ہم محتاج نہیں ہیں یہ قناعت ہے، تو یہ دولت اتنی ہے کہ اتنی بڑی مالیت کا ضلع وہ قوت نہیں رکھتا تھا جو صبر وتوکل توجہ الی اللہ اور اللہ پر بھروسہ میں ہے، سارے اعتماد کی جڑ بنیاد تو ہاتھ میں ہے اور کیا نعمت چاہئے؟

بہر حال حق تعالیٰ کے ہاتھ عدل ہے کسی کو دولتِ ایمان اور دولت علم دیتے ہیں، وہاں دولت دنیا کم دیتے ہیں اور جہاں دولتِ دنیا زیادہ ہوتی ہے وہاں ان دولتوں کی کمی ہوتی ہے، ایک تو کفار ہیں ان کی بات نہیں ایمان والوں میں ہی جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے تو طبعی طور پر ہی ایمانی اور علمی قوت کم ہوتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ساری توجہ تو اسی کے بڑھانے کی طرف رہتی ہے ایمان وعلم کی طرف توجہ کم ہوتی ہے تو طبعاً یہ چیز گھٹ جاتی ہے اور وہ بڑھ جاتی ہے اور جن کو علم دیا جاتا ہے ان کی ساری توجہ علم کے بڑھانے کی طرف ہوتی ہے، انہیں دنیا بڑھانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔؟ تو صورت یہ کہ ان کی دنیا کے لئے تو حق تعالیٰ دلوں میں ڈالتے ہیں کہ لوگ ان کی خدمت کریں اور ان کے دلوں میں غیرت ایمانی کی کمی ہے تو اہل علم کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے علم سے ان کی خدمت کریں، تو دونوں کے لئے کچھ سہارے لگا دیئے ہیں، مگر یہ طبعی چیز ہے، کہ اگر ادھر کی دولت زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے، ادھر کی زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے جامع ہستیاں کم ہیں کہ علم بھی پورے کا پورا اور دولت بھی پوری کی پوری مالدار بھی بہت اور عالم بھی بہت ایسے افراد گنے چنے ہیں ورنہ عام طور پر یہی ہے کہ دولت دین زیادہ تو دولت دنیا کم ہے، اور دولت دنیا زیادہ تو دولت دین کم، دونوں چیزیں ترازو کے پلّے کی طرح سے ہیں، ایک جھکتا ہے تو دوسرا اونچا ہو جاتا ہے، دوسرا جھکا تو ادھر کا اٹھ گیا، حاصل یہ نکلا دولت ایمان بہت بڑی دولت ہے، توکل صبر وقناعت حق تعالیٰ جس کو دے دیں یہ عظیم نعمت ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسری دولت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حق تعالیٰ پر بھروسہ کر لیتا ہے تو: ''اَتَتِ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ'' ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی ذلیل بن کر اس کے قدموں میں آکر گرتی ہے، خود بخود آتی ہے وہ دھکے بھی دے تب بھی وہ آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کام بھی پورے کر دیتا ہے، چنانچہ وعدہ خداوندی ہے: ﴿وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ﴾ ② جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، تو اللہ اسکے لئے کافی ہو جاتا ہے وہ اس کا کام بنا دیتا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے ''مَنْ اَصْلَحَ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ اَصْلَحَ اللّٰہُ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْخَلْقِ'' ③ جو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ صاف اور سچا کرے، تو

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا ج:١٢ ص:١٢٨ رقم:٤٠٩٥. ② پارہ:٢٩، سورة: الطلاق، الآية:٣. ③ كنز العمال، الديلمي، عن قدامة بن عبدالله بن عمار رجل له صحبة ج:١٥ ص:٧٩٨ رقم:٤٣١٢٦.

اللہ اس کے اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ سچا کر دیتا ہے، اس کے معاملات صحیح ہوتے ہیں، اگر کہیں پھنس جاتا ہے تو غیب سے اس کے لئے مخرج پیدا ہو جاتا ہے اور راہیں نکل آتی ہیں، حاصل یہ نکلا کہ اصل تو دولت دین کو سمجھا جائے، اس کو مقصود زندگی بنائے اور دنیا کو بھی کمایا جائے اس لئے کہ حکم ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھو، بس اولیت اور ثانویت کے درجے کا فرق ہو، اولیت دولتِ دین کو حاصل ہو اور ثانوی درجہ دولت دنیا کو ہو، دونوں چیزیں رہیں گی کسی وقت بھی آدمی محروم نہیں رہے گا، اب جتنا جس کی قسمت میں ہے اس کا مقدر اس کو مل جائے گا، تو خلاصہ یہ نکلا کہ آفت یا مصیبت اچانک آتی ہے، وہ اطلاع دے کر نہیں آتی، اس وقت کوئی ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی مصیبت کا ٹالنے والا کوئی نہیں، اللہ ہی ٹالے تو ٹال سکتا ہے، تو آخرت کی مصیبت کو تو کوئی ٹالنے والا ہے ہی نہیں، صرف اللہ کی ذات ہے وہی ٹالے تو ٹل سکتی ہے، اس لئے اس سے عبرت پکڑیں، مگر فرماتے ہیں ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ یہ جاہل جانتے، مگر یہ تو ادھر دل لگاتے ہی نہیں کہ یہ کوئی اصول کی بات سمجھیں، یہ تو عناد، تعصب، برائی اور نبی کے مقابلے میں ہیں کہ کسی طرح انہیں نیچا دکھاؤ، نہ انہیں عقل سے تعلق نہ علم سے تعلق کہ بات کو سمجھیں۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ یہ جانتے۔

مطیع و باغی برابر نہیں ہو سکتے...... اور اگر جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اوندھی سمجھتے ہیں، ہر سیدھی بات کو الٹا کر کے سمجھیں گے ایسا سمجھا تو کیا سمجھا؟ گویا عجیب و غریب نتیجہ نکالا چنانچہ کہتے ہیں۔ آپ کے خدا نے باغ والوں کی مثال بیان کی ہے، اور وہ پانچ بھائی تھے، ایک نے کہا کہ دیکھو ایسا مت کرو، فقیروں کا راستہ مت بند کرو، خیرات جاری رکھو، برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے اس کی نہیں سنی، لیکن جب مصیبت آئی تو نیک مشورہ دینے والا بھی اس میں مبتلا ہوا، یہ نہیں ہوا کہ اس کا حصہ بچ گیا ہو اور باقی بھائیوں کا تلف ہوا ہو، تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بھی تمہارے نبی کو نہیں مانتے تمہارے دین کو نہیں مانتے، لیکن اگر کوئی قحط وغیرہ کی مصیبت آئی تو تم بھی مبتلا ہو گے ہم بھی مبتلا ہوں گے، کوئی ہمارے دروازے کو دیکھ کر تھوڑا ہی قحط آئے گا، تم بھی اس میں شریک ہو گے، تو جب ہم تم یہاں مصیبت میں شریک ہیں تو کیا فائدہ کہ ہم تمہارے رسول کے اوپر ایمان لائیں، یہاں بھی برابر وہاں بھی برابر، یہاں کی برابری آنکھ سے دیکھ لی وہاں کی برابری قیاس سے سمجھ لیں، جیسے خدا نے یہاں برابر کیا، وہاں بھی برابر ہو جائیں گے، گویا طبعی مصیبت میں اور انتقامِ خداوندی میں فرق کرنے کی ان کے اندر سکت ہے ہی نہیں۔

اس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تو ہدایتِ عقل کے خلاف ہے جو تم سوچ رہے ہو۔ اس لئے کہ مثلاً دنیا میں ایک شخص کے دو غلام ہیں، ایک سرکش ہو اور ایک مطیع ہو، تو کیا آقا ان دونوں کو برابر سمجھتا ہے، مطیع غلام کو ہمیشہ انعام دے گا اور سرکش کو ہمیشہ نیچا دکھائے گا، ایک گورنمنٹ کے دو ملازم ہیں، ایک کام چور ہے اور ایک نہایت محنت سے کام کرتا ہے، ایک بغاوت کرتا ہے ایک اطاعت کرتا ہے تو کیا گورنمنٹ دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھے گی؟ جو باغی ہے اس کو سزائیں دے گی، جو مطیع ہے اس کو انعامات دے گی اور ترقیات دے گی، دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو انتقامی طور

پر مصیبت آتی ہے وہ باغی کے اوپر آتی ہے، مطیع کے اوپر نہیں آتی، زیادہ تر باغی کے اوپر آتی ہے، تو عقل اس کے اوپر شاہد ہے کہ اگر کوئی بغاوت کر رہے ہوں تو قحط اگر ان پر آئے گا تو وہ سزا ہوگی جس سے بچنا مشکل ہوگا، مطیع اگر قحط میں آئیں گے تو چونکہ اللہ پر بھروسہ ہوگا تو ہمارے دلوں میں کوئی پراگندگی یا تشویش نہیں ہوگی، چند دن کے بعد وہ رفع ہو جائے گا اور جب تک رہے گا ہمارے دلوں میں کوئی تشویش نہیں ہوگی اور تم مرنے سے پہلے ہی مر جاؤ گے، جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اس پر اگر مصیبت آتی بھی ہے تو اس کے دل میں پراگندگی نہیں ہوتی حق تعالیٰ پر مطمئن رہتا ہے کہ یہ چند روزہ ہے، فاسق اور ملحد مرنے سے پہلے مر جاتا ہے اسلئے کہ اس کا بھروسہ ہی اسباب کے اوپر ہوتا ہے، اور اسباب کے درجے میں راحت کی کوئی چیز نہیں ہے، غرض یہ فرق رہتا ہے کہ ایک چیز آفت کی مطیع پر بھی آتی ہے، اور باغی پر بھی، مطیع اپنی اطاعت کی وجہ سے مطمئن القلب ہوتا ہے اور باغی اپنی بغاوت کی وجہ سے ہر وقت پراگندہ قلب رہتا ہے، اور مصیبت نام دل کی پراگندگی کا ہے اسبابِ مصیبت کا نام مصیبت نہیں ہے دل میں پریشانی کا اثر ہو یہ مصیبت ہے، کوئی آفت آجائے تو مومن کے دل میں کبھی پریشانی نہیں ہوگی، اس کی نگاہ اللہ پر ہوگی، اور ملحد کا دل کبھی مطمئن نہین ہوگا اس کی نگاہ اسباب پر ہے اور اسباب کے درجہ میں مصیبت آگئی ہے، فرمایا کہ یہ ہدایت عقل کے خلاف ہے جو تم نے نتیجہ نکالا مطیع اور باغی برابر نہیں ہوسکتے اسی کو فرمایا: ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ﴾ کیا ہم مسلمین کو مجرمین کے برابر کردیں گے، جو ہمارے ماننے والے ہیں اور جو ہمارے باغی ہیں کیا ان کو ایک درجہ میں رکھیں گے؟ ﴿مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ تمہیں ہوا کیا ہے تم کیسا حکم لگا رہے ہو، عقل کے خلاف، فراست کے خلاف اور فطرت کے بھی خلاف، تو ایک جواب تو عقلی دے دیا۔

دنیا میں اجتماعی عذاب کے باوجود آخرت میں مؤمن و کافر کا فرق ہوگا...... اس کے بعد ممکن تھا وہ یہ کہتے کہ صاحب! عقلاً تو چاہے یہی جواب ہے مگر نقل تو یہی بتاتی ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مصیبت آتی ہے تو سب پر یکساں ہی آتی ہے اور جب یہاں یکساں ہے تو آخرت میں بھی جب مصیبت آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی؟ وہاں بھی برابر ہو گئے۔ اس کا جواب آگے دیا کہ یہ جو تم عقل کو چھوڑ کر نقل لے رہے ہو تو فرمایا ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ﴾ یہ تم نے جو نقلی روایت بیان کی کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے یا پچھلے ادیان کا کوئی نوشتہ تمہارے پاس رکھا ہوا ہے؟ جس میں دیکھ کر تم نے دعویٰ کیا کہ قیامت میں مسلم اور مجرم برابر ہو جائیں گے، عقلاً تو برابر نہیں ہوتے، اب تم نقل کا دعویٰ پیش کرتے ہو؟ تو کوئی کتاب دکھلاؤ کوئی آسمانی نوشتہ دکھلاؤ، جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ اللہ کے ہاں مطیع اور باغی دونوں برابر ہوتے ہیں، دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈال جاؤ، کیا حضرت موسیٰ اور فرعون کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجے میں رکھا، موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون کو غرق کیا، کیا حضرتِ ابرہیم اور نمرود کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجہ میں رکھا، نمرود کو مچھر سے پٹوا دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام عالم بنا دیا، غرض حق تعالیٰ نے ہر زمانے میں مطیع اور مجرم دونوں کو یکساں نہیں رکھا، مطیعوں کو سر بلند کیا اور مجرموں کو سزائیں

دیں، لیکن اگر تم کہتے ہو کہ مطیع و باغی کو اللہ نے یکساں کیا تو یہ تمہارے پاس کہاں سے خبر آئی؟ کوئی وحی آئی، کوئی کتاب آئی؟ ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ﴾ کوئی کتاب ہے جس کا تم درس دے رہے ہو؟ اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر کوئی الہام آ گیا ہے۔ ﴿اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ﴾ اس کتاب میں لکھا ہوگا کہ جو تم چاہتے رہو گے وہی ہوتا رہے گا، جو تم الٹے سیدھے اصول بیان کرو گے وہی کتاب میں نکلتا رہے گا کیا ہے ایسی کوئی کتاب؟ نہیں ہے تو نہ تمہاری بات کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ نقل تسلیم کرتی ہے۔ ﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ اچھا اگر نوشتہ نہیں ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تمہیں آخرت میں مصیبت کے اندر برابر کردے گا، تو کیا اللہ نے کوئی قسم کھا رکھی ہے کہ اگر دنیا میں تم پر قحط بھیجے تو آخرت میں بھی سب پر یکساں مصیبت بھیجے گا؟ کیا ہم نے کوئی حلف اٹھایا ہے کہ قیامت تک اور اس کے بعد تک یہ حالت رکھیں گے، دنیا کے اندر جب ہم نے قحط اتارا تو مصلحتاً مسلم اور مجرم دونوں کو برابر کیا، طاعون آیا تو سب کے اوپر آیا، لیکن کیا اللہ نے یہ عہد کیا ہے کہ قیامت میں بھی یہی صورت رہے گی، صاف صاف فرمادیا کہ اگر وبائی امراض میں برابر سرابر مریں تو ظاہر میں سب مر رہے ہیں، مگر آخرت میں سب کے درجات الگ الگ ہیں، ایک مقبول ہے اور ایک غیر مقبول ہے ایک پر طاعون آتا ہے وہ شہید ہوتا ہے اور ایک پر طاعون آتا ہے تو وہ معذّب ہوتا ہے، تو کفار کے حق میں طاعون عذاب ہے، اور مومن کے حق میں شہادت اور ترقی درجات کا ذریعہ ہے، تو یہ اندازہ تم نے کہاں سے لگایا کہ اگر ہم نے انہیں دنیا میں بیماری میں برابر کردیا تو نتائج میں بھی برابر کردیں گے آخرت میں مطیع اور مجرم میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کوئی حلف اور کوئی نوشتہ دکھلاؤ کیا ہم نے تمہارے سامنے کوئی قسم کھائی ہوتو اسے دکھلاؤ۔

اخذ نتائج میں غلطی ...... اچھا اگر یہ نہیں (یعنی حلف اور نوشتہ نہیں) یہ جو تمہارے شرکاء ہیں جن کو تم اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک کرتے ہو، یہ جو تم نے بت رکھے ہوئے ہیں جن کو تم نے کرتا دھرتا مان رکھا ہے اور سارے عالم کی باگ دوڑ انہیں دے رکھی ہے، ذرا ان سے پوچھ لیں یہی جواب دے دیں کہ انہوں نے تمہارے کان میں کوئی بات کہہ دی، ان میں بولنے کی طاقت نہیں ان میں سننے کی طاقت نہیں، کل یہ پتھر پڑے ہوئے تھے، تم نے خود ہی آج ان کو گھڑ گھڑا کے رکھ لیا، آج خدا بنالیا، تو کیا خدا بن گئے؟ اور سارے جہاں کی باگ ڈور کے مالک ہو گئے؟ اگر چہ ایسا نہیں ہے، لیکن بہر حال تم نے انہیں خدا کا شریک ٹھہرایا ہے تو چلو انہیں سے پوچھ لو، کیا انہوں نے تمہارے دماغ میں ٹھونس دیا ہے کہ قیامت میں جا کے دونوں (مسلم، مجرم) برابر رہیں گے؟ اگر دنیا کی مصیبت یا وباء میں مومن و کافر مشترک ہو گئے تو آخرت میں بھی برابر ہوں گے؟ اسی کو فرمایا: اپنے ان شریکوں کو ہمارے سامنے لے آؤ، خدا کے مقابلے میں لا کے پیش کرو یہ اپنا دعویٰ ثابت کریں۔ ﴿سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ﴾ تم میں سے جو اس کا لیڈر بننا چاہے اسے بنا کے ساتھ لے آئے، لات ہو یا عزیٰ ہو یا کوئی بڑے سے بڑا ہو، اگر سب نہ آئیں تو ایک وکیل بن جائے اور آ کر اپنا دعویٰ ثابت کرے۔

الغرض یہ کہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو اس باغ والے قصے سے تم نے الٹا سمجھا تو نہ تو عقل اس کا ساتھ دیتی ہے نہ نقل اس کا ساتھ دیتی ہے، نہ یہ شرکا ہی زعیم بن کے آگے آتے ہیں، نہ ہم نے تمہارے سامنے کوئی حلف ہی اٹھایا ہے، پھر آخر حجت کیا ہے؟

قرآن کریم اصولی کتاب ہے وہ نہ کسی چیز کو بلا حجت منوانا چاہتا ہے نہ خود بلا حجت کچھ مانتا ہے اس لئے جو دعویٰ کیا اس کے لئے دلائل پیش کئے، اور اگر کوئی دوسرا دعویٰ کرے تو فرماتے ہیں: ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ ① کوئی حجت اور دلیل عقل سے نقل سے، تاریخ سے لاؤ، کسی دلیل سے آپ نے کوئی معقول دعویٰ ثابت کیا تو ہم مان لیں گے، دعوے کی پشت پر نہ تو عقل ہو تاریخ ہو نہ کوئی زعیم اور لیڈر ہو جو دعوے کی ذمہ داری لے کہ میں دعوے کو ثابت کروں گا، آخر اس دعوے کو کیوں مانا جائے؟ دعوے کے لئے ماننے کی چیز دلیل ہوتی ہے جو دعوے کو منواتی ہے نہ نقل نہ عقل بلا دلیل دعویٰ ماننے کو کوئی تیار نہیں کوئی آدمی دعویٰ کر دے کہ ساری بمبئی کا میں مالک ہوں، اس سے پوچھا جائے گا کہ بھائی کیا وجہ ہے کوئی دلیل بھی ہے؟ کوئی پرچہ اور دستاویز لکھی ہوئی ہے کہ پچھلے لوگ کہہ گئے ہیں کہ تم بمبئی کے مالک بنا دیئے جاؤ گے تو کہتا ہے کہ نہیں ان میں سے تو کوئی بات نہیں بس میں کہتا ہوں تو کہا جائے گا کہ تو کیا چیز ہے جو تو کہتا ہے تیرے تخیل میں اگر آ گیا کہ میں ساری دنیا کا مالک ہوں بس ہو گیا مالک، نہیں بلکہ حجت اور دلیل مانگی جائے گی جب دلیل نہیں تو دعویٰ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

تو یہاں تک گویا یہ واضح فرمایا گیا کہ ان کفار میں تو عقل ہے نہیں، کہ واقعات اور حوادث کو دیکھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں، اگر ان پر غور کرنے کو کہا تو الٹے نتائج نکالنے شروع کر دیئے اور وہ بھی اپنی ہی من مانی کی اور بات آگے چلا دی کہ صاحب جب باغ والے واقعہ میں سب برابر ہو گئے وہ بھی برابر ہو گیا جس نے کہا تھا کہ فقیروں کے راستے مت روکو، اس کا بھی حصہ گیا اور ان کا بھی گیا جو فقیروں کے راستے بند کرتے تھے، تو ایسے ہی اگر دنیا کا ہمارا حصہ قحط میں جائے گا تو تمہارا بھی جائے گا، جب دنیا میں یہ ہوا تو آخرت میں بھی ہم تم برابر ہیں، اگر مصیبت آئی تو نتائج میں سب شریک رہیں گے، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے رد کر دیا کہ اگر دنیا میں کبھی مصائب میں سب یکساں نہیں ہوتے، مومن کے قلب کو ایمان اور توکل کی وجہ سے ایک ڈھارس رہتی ہے مصیبتیں آ جاتی ہیں تو وہ اثر نہیں لیتا، جبکہ ملحد کے قلب کے اندر ہر وقت تشویش اور پراگندگی رہتی ہے تو مصیبت کے اندر یہاں بھی برابر نہیں بھلا آخرت کے اندر تو کیا برابر ہوں گے، اور اگر کوئی دعویٰ کرتے ہو تو دلیل لاؤ، دلیل ہے نہیں، لہٰذا تمہارا دعویٰ نامعقول ہے، اس لئے بات وہی رہی کہ حوادث سے عبرت پکڑو، اس سے اپنے حالات درست کرو، ان کو دیکھ کر سمجھو کہ یہ منجانب اللہ واعظ ہیں اور نصیحتیں ہیں جو منجانب اللہ کی جارہی ہیں تاکہ اپنا مستقبل درست کریں۔

ہر کرّہ کا تغیّر کسی جابر قوت کی نشاندہی کرتا ہے...... حق تعالیٰ شانہ نے جیسے وہ واعظ مقرر کئے ہیں جو زبان

① پارہ: ۱، سورة: البقرة، الآية: ۱۱۱.

سے وعظ کہتے ہیں ،اسی طرح سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو واعظ بنا دیا ہے، ہر چیز میں انقلاب اور تغیر ہے وہ زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ کوئی چیز یہاں برقرار نہیں ہے، کسی چیز کو ثبات نہیں آفتاب جیسی بڑی چیز جس کو لوگوں نے خدا تک کہہ دیا ہے، ایک دم چمکا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ عروج والا کوئی نہیں ہے اور زوال کے بعد جب بجھنا شروع ہوتا ہے تو مغرب تک اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے، تو بتلا دیا جاتا ہے کہ اتنا عظیم کرہ بھی اپنے آپے میں نہیں اس کے اوپر کوئی جابر طاقت ہے جس نے مجبور کی طرح اسے نچا رکھا ہے یہی حالت چاند اور ستاروں کی ہے یہی زمین کی کہ کبھی دن ہے کبھی رات ہے کبھی دکھ ہے کبھی سکھ ہے کبھی بیماری کبھی صحت ہے، کبھی غربت ہے کبھی امارت ہے تو عالم یکساں نہیں رہتا کوئی چیز برقرار نہیں ہے تو نہ کوئی دولت والا اس گھمنڈ میں رہے کہ بس یہ تو برقرار ہی رہے گی نہ غربت والا اس مایوسی میں رہے کہ اس کے جانے کی کوئی صورت نہیں ایک ہی صورت ہے کہ رجوع الی اللہ کرے، اللہ کی طرف سے یہ تغیرات آرہے ہیں، اس کی طرف رجوع کرے وہی راستے صحیح کرنے والا ہے یہ گویا نصیحت اور عبرت اس مضمون کے مقام سے نکلی اس کے بعد ان شاء اللہ کل بیان ہوگا، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں علم وعمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَدَا عِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴿ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ٥ خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ ، وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سَالِمُوْنَ٥ فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَاالْحَدِیْثِ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾

جوازِ شرک کی غلط تاویل...... بزرگانِ محترم! جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ کوفرمایا کہ ان بتوں کی پرستش مت کرو، صرف ایک خدائے واحد کی پوجا کرو، اسی میں تمہاری دنیا کا بھی بھلا ہے اور آخرت میں بھی نجات ہے ورنہ دنیا میں بھی مصائب اور فتن ہوں گے اور آخرت میں بھی عذاب اور ہلاکت واقع ہو گی۔

اس پر انہوں نے اپنے شرک کی ایک تاویل کی، اور کہا کہ ہم توحید کے تو قائل ہیں، باقی یہ جو ہم شرک کرتے ہیں اس لئے کہ یہ بت جو ہیں ان کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمالات کا ظہور ہو رہا ہے اس لئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو براہ راست دیکھ نہیں سکتے اس واسطے ہم ان محسوس خداؤں کو سامنے رکھتے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ سے ہم اس تک پہنچ جائیں۔﴿لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی﴾ ① کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے، تو قرب حاصل کرنے کے لئے ہم ان کی پوجا کرتے ہیں، اصل مقصود حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے، گویا مذاہب کی بنیاد توحید ہے، توحید کا کسی درجے میں انہیں انکار نہیں تھا، توحید کو مان کر پھر شرک کرتے تھے، محض اس لئے کہ یہ قرب کا ذریعہ ہے۔

شرک کی تاریخ...... یہ شرک سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا ہے، نوح علیہ السلام کی قوم میں جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا، اس وقت شرک کے شروع ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ قوم نوح میں پانچ بزرگ اولیائے کاملین میں سے تھے، جن کے نام قرآن کریم میں ذکر کئے گئے ہیں۔

ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ ان بزرگوں کے پانچ نام تھے، ان کی مجالس میں لوگ بیٹھتے تھے تو اللہ یاد آتا تھا، وہ توحید کی بات کرتے تھے، اللہ کی صفات اور اس کے کمالات بیان کرتے تھے، تو ان کی باتیں سن کر ان کی

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۳۔

مجلس سے فیضِ محبت حاصل کر کے توجہ الی اللہ پیدا ہوتی تھی، جب ان پانچوں بزرگوں کی وفات ہوگئی، تو قوم سوچ میں پڑ گئی کہ اب کس کی مجلس میں بیٹھا کریں کہ اللہ کو یاد کریں اور ذکر اللہ کے لئے کہا جائے اور اللہ کی پہچان کے لئے کہا جائے، اس فکر میں وہ مستغرق تھے، تو شیطان ایسے موقعوں کو تاکتا ہے کہ اس وقت یہ ان بزرگوں اور کابر کو یاد کر رہے ہیں کہ ان کی مجلس قُرب خداوندی کا ذریعہ بنتی تھی۔

اس وقت اس قوم کے جو رئیس تھے، اور بڑے تھے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ صورت تو اب بھی ممکن ہے اگر وہ بزرگ موجود نہیں تو ان کی تصویریں اور بت بنا کر عبادت گاہوں میں رکھ لو، وہ شکلیں دیکھ دیکھ کر تمہیں وہ بزرگ یاد آئیں گے، اور یہ اس یاداشت کا ذریعہ بن جائیں گے، اس واسطے ان کی پوجا تو نہ کریں گے مگر انہیں قرب اور توجہ کا ذریعہ بنائیں گے، اس طرح ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلسیں یاد آجائیں گی اور وہ باتیں یاد آجائیں گی، چونکہ کوئی راہنما نہیں تھا اور ایسے موقعوں پر وساوس بہت دفعہ حالات کو خراب کر دیتے ہیں، حقیقی معنی میں جو راہِ خدا کا سالک ہو بعض اوقات اس کے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اگر راہنما نہ ہو تو وہ شرک میں فسق اور فجور اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا، ان کے دل نے اس وسوسہ کو راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے قبول کر لیا، تو انہوں نے ان بزرگوں کی تصویریں بنالیں، اور ان کی صورتیں پتھروں پر کندا کر کے بلکہ پتھروں کو تراش کر ان کی شکلوں کے قریب کر لیا اور عبادت گاہوں میں رکھ لیا، یہ لوگ چونکہ نیک نیت تھے، اور حقیقت میں توجہ الی اللہ ہی چاہتے تھے، اس لئے ان کی موجودگی میں وہ بت توجہ کا محض ذریعہ اور واسطہ رہے، جیسے کسی تصویر کو سامنے رکھ کر آدمی اصل کو یاد کرلے، تو تصویر کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ محض اصل کی طرف توجہ کا ذریعہ بنتی ہے، جب تک اس قوم کے افراد موجود رہے تو انہوں نے ان بتوں اور تصاویر کو محض توجہ الی اللہ اور توجہ الی الاکابر کا ذریعہ بنائے رکھا، لیکن جب وہ نسل گذر گئی اور اس کے بعد دوسری نسل آئی، اس کے دل میں وہ معرفت نہیں تھی، اس لئے کہ پہلی نسل تو پھر بھی بزرگوں کو دیکھی ہوئی تھی، تو ان کے دلوں میں ایک پہچان، یاد، معرفت اور عرفان کا مادہ موجود تھا اور نئی نسل میں یہ چیز تھی نہیں اس لئے ان کے دلوں میں کچھ بتوں کی عظمت بیٹھ گئی کچھ وہ اللہ کو بھی یاد کرتے تھے، لیکن بہر حال ایک مخفی سا شرک رہا، کھلا ہوا شرک نہ ہوا۔

پھر جب یہ نسل بھی گذر گئی اور تیسری نسل آئی اس میں سرے سے علم کا نشان نہیں رہا تھا، وہ صورتیں صرف سامنے رہ گئیں، اور حقیقت دلوں سے اوجھل ہوگئی تو انہوں نے انہی بتوں ہی کی پرستش شروع کر دی، کہ بس کرتا دھرتا یہی ہیں، اور انہی کے ذریعے سے ساری مرادیں پوری ہوں گی، تو انہی بتوں کے سامنے انہوں نے منتیں بھی ماننا شروع کیں، نذر و نیاز بھی پیش کرنا شروع کیں، قربانیاں بھی انہی بتوں کے نام پر دینے لگے، خدا کی ذات تو بالکل اوجھل ہوگئی اور محسوس خدا سامنے رکھ لئے اور انہیں کے ہو کر رہ گئے، یہاں سے کھلا شرک شروع ہوگیا۔

اس شرک کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام بھیجے گئے، اور انہوں نے

کہا: تمہارے بزرگوں نے تو ذریعہ بنایا تھا، اس کے بعد کی نسل نے کچھ خلط ملط کر دیا، اور تیسری نسل بالکل شرک میں مبتلا ہوگئی، پھر اللہ سے دور پڑ گئے، یہی بت اللہ سے دور ہٹانے کا ذریعہ بن گئے، اب تمہاری ساری توجہ انہیں میں الجھ کر رہ گئی، اس واسطے انہیں ختم کرو، اور اصل خدا کی طرف توجہ کرو جو نفع وضرر کا مالک ہے۔

لیکن چونکہ ایک صدی گذر گئی تھی وہ اس بت پرستی سے مانوس ہوگئے تھے، اور باپ دادا کا دین یہی بتوں کی پوجا ٹھہر گیا تھا اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی بات نہ مانی، ساڑھے نو سو برس تک حضرتِ نوح علیہ السلام نصیحت کرتے رہے، مگر قوم نے مان کر نہیں دیا، اور وہ انہیں محسوس خداؤں میں الجھ کر رہ گئے، تو یہاں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے تصویر اور بت شرک کا ذریعہ بنے ہیں۔

تصویر اسباب شرک میں سے ہے...... اس لئے شریعتِ اسلام نے جہاں شرک کو رد کیا وہاں اسباب شرک کو بھی ختم کیا، قوم کو سرے سے تصویر کی ممانعت کردی اور تصویر حرام قرار دے دی، کیونکہ یہ شرک کا ذریعہ بنی ہے، تو اس کی جڑ کاٹنی چاہئے تاکہ آئندہ شرک کا ذریعہ نہ بنے، تو ممانعت فرمادی کہ تصویر نہ رکھی جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جس مکان کو ٹھڑے میں تصویر ہوگی اس میں ملائکہ رحمت داخل نہیں ہوں گے، گویا اس طرح شرک اور اسبابِ شرک کی جڑ کاٹی تو مشرکینِ مکہ کی شرک کی تاویل یہی تھی جو قوم نوح کی پرانی بات تھی کہ یہ تقریب کا ذریعہ ہیں، حالانکہ یہ محض لفظوں میں بات تھی، وہ ذریعہ نہیں رہے تھے بلکہ بتوں کی ہی پوجا ہو رہی تھی اور انہی کو اصل مان لیا تھا زبان سے یہ کہتے تھے کہ یہ مظاہر ہیں کمالات الہیہ کے ظہور کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اس لئے ہم ان کو پوجتے ہیں۔

مشرکین کی دلیل تسلیم کرنے سے عابد کا وجود ختم ہو جاتا ہے...... لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ حجت بہت ہی بودی اور بہت ہی کمزور قسم کی حجت تھی، اس لئے کہ دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جو مظہر صفاتِ خداوندی نہیں ہے، ہر چیز میں کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی وصف ظاہر ہو رہا ہے، آسمانوں کو دیکھو تو ان سے رفعتِ خداوندی نمایاں ہے اللہ رفیع ہے بلند و برتر ہے، اس کی بلندی کی نمائش آسمانوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے تو پھر آسمانوں کو بھی پوجنا چاہئے۔

اسی طرح سے ملائکہ علیہم السلام مظہر قدرت ہیں، حق تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ پل بھر میں جو چاہیں فرمادیں، فرشتوں میں اس قدرت کا ظہور ہو رہا ہے کہ پل بھر میں آسمان سے زمین پر زمین سے آسمان پر، پلوں میں وہ لاکھوں میل کی مسافت طے کر لیتے ہیں، تو قدرت الہیہ کا ظہور ہو رہا ہے، وہ مظاہر قدرت ہیں پھر ملائکہ کی بھی پوجا ہونی چاہئے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت ذی المعارج ہے یعنی وہ تمام چیزوں کو بتدریج چلاتے ہیں، نطفہ کو نو مہینوں میں تربیت دے کر وہ انسان بناتے ہیں، انسان کو چودہ برس میں تربیت دے کر عاقل بالغ بناتے ہیں، تو آہستہ آہستہ تدریجی طور پر کمالات کا ظہور ہے، یہ نشو ونما درختوں میں ظاہر ہوئی، غرض اللہ تعالیٰ کی تدریجی قدرت درختوں

کے ذریعے ظاہر ہو رہی ہے پھر درختوں کی بھی پوجا ہونی چاہیئے۔

رحمت کو اگر دیکھا جائے تو اس کا مظہر پانی ہے کہ پانی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی نرمی اور رحمت نمایاں ہے، تو پانی مظہر رحمت ہے، اس واسطے پانی کو بھی پوجنا چاہیئے، تو دنیا کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی جو معبود نہ بن جائے، اس لئے محققین یہی لکھتے ہیں کہ یہ سارا عالم مظہر صفات ہے کسی میں کوئی صفت ظاہر ہو رہی ہے کسی میں کوئی صفت پھر تو ہر چیز قابل عبادت ہونی چاہیئے، اور سب سے زیادہ قابل عبادت انسان ہونا چاہیئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے جامع کمالات انسان کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہیں علم کو دیکھو تو انسان کے ذریعے ظاہر ہوا، تو انسان مظہر علم ہے، قدرت کو دیکھو تو انسان کے ذریعے قدرت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس میں وہ قدرت نمایاں ہے کہ پتھروں اور جامد چیزوں کو اس نے مشینوں کے ذریعے سے چلتا اور پھرتا کر دیا، اس طرح سے اعلیٰ درجہ کی قدرت نمایاں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ مصوّری بھی ہے، تو انسان تصویر بناتا ہے، تو صفت تصویر کا مظہر ہوا، غرض انسان کمالات خداوندی کا جامع ہے، علم قدرت حیات ارادہ اور مشیت وغیرہ، یہ سب انسان کے ذریعے ظاہر ہو رہا ہے اس لئے سب سے زیادہ معبود بننے کے لائق تو انسان ہی ہوا، اور جب انسان کی جنس معبود بن گئی تو عابد کون بنے گا؟ ظاہر ہے کہ درخت تو عبادت نہیں کر سکتے، پتھر عبادت نہیں کر سکتے، جنات میں اتنی عقل نہیں ہے تو معبود ہی معبود رہ گیا، دنیا میں عابد کوئی بھی نہ رہا غرض یہ ایسی غلط تاویل ہے کہ اس کے تسلیم کرنے سے عابد اتنے نہیں رہیں گے جتنے معبود بن جائیں گے اربوں کھربوں اور ہر مخلوق گویا معبود بنے گی، تو عقلی طور پر یہ انتہائی کمزور تاویل اور دلیل ہے جو وہ دیا کرتے تھے کہ ہم توحید کے تو قائل ہیں، مگر یہ بت مظاہر ہیں، اس لئے انہیں پوج رہے ہیں۔

مظہر صفات معبود بننے کے لائق نہیں...... دوسری بات یہ ہے کہ ظاہر تو کمال ہوتا ہے وہ تو کامل ہے، مگر مظہر ہمیشہ ناقص ہوتا ہے، جیسے انسان کی روح بدن کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، مگر بدن ناقص ہے بدن کے اندر کمزوری بھی ہے، تغیّرات بھی ہیں، تبدل بھی ہے، بیماری صحت مرض نجاست طہارت سب اس بدن میں واقع ہیں تو بدن مظہر ہے اور روح ظاہر ہے، تو روح پاکیزہ ہے مگر مظہر ناقص ہے، اس لئے اگر مظاہر کی عبادت کی گئی تو ناقص کو پکارا جائے گا جن میں عیب بھی ہوں گے، جن کے اندر برائیاں بھی ہوں گی، جو کھانے پینے کے محتاج ہوں گے اور طرح طرح کی حاجت مندیاں بدن کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، تو خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، بدن والی چیز محتاج در محتاج ہوگی، اس واسطے وہ معبود بننے کے لائق نہیں، تو مظہر معبود بن ہی نہیں سکتا۔

مظہر محتاج ہے معبود نہیں...... عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی، یہی کہہ کر کہ وہ مظہر کمالاتِ خداوندی ہیں، حق تعالیٰ نے ایسا لفظ کہہ کر رد فرمایا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معبودیت کا رد ہوگیا فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ ① حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ صاحبہ کھانا کھایا کرتی

① پارہ: ٦، سورۃ: المائدۃ، الآیۃ: ٧٥.

تھیں، ظاہر بات ہے کہ جو کھانا کھائے گا وہ اتنا محتاج ہوگا کہ وہ صرف کھانے کا نہیں بلکہ لاکھوں چیزوں کا محتاج ہوگا، اس لئے کہ دانا پانی پیدا نہیں، ہوسکتا جب تک زمین نہ ہوتو آدمی زمین کا محتاج ہوا، دانہ نہیں بن سکتا جب تک بادل بارش نہ برسائیں، تو بادلوں کا محتاج ہوا، کھیتی نہیں پک سکتی جب تک سورج اپنی گرمی نہ ڈالے تو جو کھانے کا محتاج وہ سورج کا بھی محتاج ہوا، اسی طرح سے کھانے میں رطوبت نہیں پیدا ہوسکتی جب تک ہوا نہ ہو، تو کھانے کا محتاج ہو، ہوا کا محتاج ہوا، تو آگ، مٹی، ہوا، پانی، سب کا وہ محتاج ہوگا جو کھانے کا محتاج ہوگا۔

پھر کھانے کے بعد بول و براز ہے، نجاست ہے، گندگی ہے، یہ سب چیزیں نکلیں گی، ان کا بھی محتاج ہوا، ظاہر بات ہے کہ جو اتنی چیزوں کا محتاج ہو وہ خدا بن سکتا ہے! خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، ہر چیز سے بالاتر ہو، ہر چیز کا بنانے والا ہو، اور ظاہر بات ہے کہ انسان اپنا کھانا بھی بنا تا ہے نہ اسے کسی چیز پر قدرت ہے، نہ اس کے اندر علم ہے یہ محتاج ہی محتاج ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے معبود بن سکتے ہیں جو کھانے پینے کے محتاج ہوں، جب کھانے کے محتاج ہوئے تو آسمان کے، زمین کے، پانی کے ان سب چیزوں کے محتاج ہوئے، غرض جو اتنا محتاج ہو وہ معبود بننے کے لائق ہے! تو ایک ہی دلیل پیش فرمائی تو مظاہر جنہیں کہا جاتا ہے وہ محتاج درمحتاج ہیں، اس لئے کہ ظہور کسی بدن میں ہوگا، اور بدن کھانے کا محتاج اور جو کھانے کا محتاج وہ ہر چیز کا محتاج ہے، تو مطلب یہ کہ تمہاری یہ دلیل نہایت ناقص اور بودی دلیل ہے۔ یہ تم توحید کا نام لے کر شرک کے اوپر پردہ ڈالتے ہو، یہ شرک توحید بن ہی نہیں سکتا، اس لئے تمہاری یہ دلیل غلط ہے۔

روزِ حشر انکشافِ حقائق کا دن...... آج اگر تمہاری یہ دلیل کسی جاہل کے آگے چل بھی جائے، تو قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ سب پردے ہٹ جائیں گے، اس دن تم پھر میدان میں کھڑے رہ جاؤ گے اور واضح ہوجائے گا کہ جنہیں معبود سمجھا تھا، وہ معبودیت اور عبادت کے لائق نہ تھے وہ تو خود محتاج تھے۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ﴾ اس دن جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی، اس دن ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی، قیامت کا دن وہ ہے کہ جس دن چھپی ہوئی حقیقتیں کھل جائیں گی، جو چھپے ہوئے بھید تھے اس روز وہ سامنے آجائیں گے، ہر ہر عمل نمایاں ہوجائے گا، جو سات پردوں میں چھپا کر بھی آئے وہ سامنے آجائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ٥ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّـرَهٗ﴾ [1] ذرہ برابر خیر بھی ہے وہ بھی کھل جائے گی، ذرہ برابر شر ہے کتنے ہی اچھے پردے ڈالے ہوں وہ کھل کر سامنے آجائے گا، تو قیامت کا دن وہ ہے کہ ساری چیزیں کھل جائیں گی، بہرحال اس آیت کریمہ میں ساق کا لفظ لایا گیا۔ ساق کا لفظ یا تو حق تعالیٰ کی کوئی اصطلاح ہے، گویا اس سے ارادہ کیا گیا ہے کہ قیامت کا دن حقائق کے کھلنے کا دن ہے، پنڈلی کھول دی جائے گی تو پنڈلی سے مراد حقائق کا کھلنا ہے، ایک ساق کے یہ معنی لئے گئے ہیں۔

---

[1] پارہ: ۳۰، سورة: الزلزال، الآية: ۷، ۸.

مراتب تجلّی......دوسرے معنی ساق کے یہ ہیں کہ اس کے معنی پنڈلی کے لئے جائیں، جیسے انسان کی پنڈلی ہو اور وہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی کہ جب وہ اپنی پنڈلی کھول دیں گے تو اس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ واضح نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی تفسیر نہ بیان کی جائے کہ پنڈلی کھولنے کا کیا مطلب ہے۔

تو پنڈلی کھولنے کا یہ مطلب ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدمی جب نماز پڑھتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ درحقیقت اللہ پر ہوتی ہے گو ظاہر میں چٹائی پر ہو، تو اس کی نگاہ حق تعالیٰ کی پنڈلی پر ہوتی ہے، گو ظاہر میں چٹائی پر پڑ رہی ہو، گویا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی جو تجلیات ہیں ان میں مراتب ہیں ایک اوپر کی تجلی اور ایک نیچے کی، تو سب سے نچلی تجلی کہلاتی ہے پنڈلی کی، تجلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب عبادت کرتا ہے تو ابتدائی تجلی اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوتی ہے، آج وہ پنڈلی نمایاں نہیں، قیامت کے دن وہ واضح ہو جائے گی۔

روزِ امتیاز......اور قیامت کے دن وہ کس طرح سے واضح ہوگی، قیامت کا دن اصل میں ہر چیز میں امتیاز کردے گا، اچھائی برائی سب کھل کے الگ الگ ہو جائے گی، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے اولین و آخرین جب میدانِ محشر میں جمع ہوں گے تو ایک فرشتہ ندا کرے گا: اے لوگو! دنیا میں جو جس کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے چلا جائے، یہ ایک اعلانِ عام کردیا جائے گا جو جس کی عبادت کرتا تھا اس کے پیچھے چلا جائے تو جو لوگ بتوں کی عبادت کرتے تھے تو بتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے، تو وہ لوگ اپنی قلبی کشش سے ادھر متوجہ ہو جائیں گے، جو چاند اور سورج کی عبادت کرتے تھے تو حدیث میں ہے کہ چاند اور سورج سامنے ہوں گے ان کا نور تو چھین لیا جائے گا، لیکن ان کے اجسام سامنے ہوں گے چونکہ عمر بھر ان کی طرف جھکتے رہے ہیں اس لئے اپنے قلب کی کشش سے ادھر جھک جائیں گے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے وہ اپنی قلبی کشش سے ادھر چلے جائیں گے، اور کوئی حضرت عزیر علیہ السلام کی صورت میں فرشتہ نمایاں ہوگا کچھ اس کی طرف چلیں گے، اس طرح تمام لوگ اپنے اپنے معبودوں کی طرف چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو اللہ کو پوجتے تھے، نہ سورج کی پرستش کرتے تھے، نہ بتوں کی، نہ درختوں کی، نہ پانی کی، ایک خدائے واحد کی پوجا کرتے تھے اور اسی کے آگے جھکتے تھے وہ رہ جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کیوں اپنے معبود کے پیچھے نہیں جاتے؟ وہ عرض کریں گے کہ جب ہمارا معبود سامنے آئے گا تو ہم اس کی طرف جائیں گے تو حق تعالیٰ نمایاں ہوں گے، تجلّی ڈالی جائے گی، ایک عکس نمایاں ہوگا، تو اللہ فرمائیں گے: اَنَا رَحْمٰنُ میں رحمان ہوں یہ سب کہیں گے "نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ" عرض کریں گے تو ہمارا معبود کیوں ہو؟ ہم پناہ مانگتے ہیں۔ فرمائیں گے: تمہارے معبود کی کوئی علامت ہے؟ عرض کریں گے، ایک علامت ہے، وہ یہ کہ جب ہم سجدے کرتے تھے تو ہمارا سر اللہ تعالیٰ کے قدموں میں پڑتا تھا، اور پنڈلی سامنے ہوتی تھی، اس پنڈلی کی جب تجلّی کھلے گی تب ہم سمجھیں گے کہ ہمارا معبود سامنے ہے کیونکہ عمر بھر سجدے کر کے اسی سے مناسبت پیدا کی تھی۔ وہی چیز اندر چھپی ہوئی تھی، جب وہ نمایاں ہوگی تو ہم اس کے

سامنے جھکیں گے، اس وقت حق تعالیٰ اس پنڈلی کی تجلی کو نمایاں فرمائیں گے، تو یہ سب کے سب لوگ ایک دم سجدے میں جا پڑیں گے کہ بے شک ہمارا معبود یہ ہے لیکن بہت سے وہ لوگ جو منافق تھے اوران مسلمانوں میں شامل تھے کیونکہ وہ بھی ظاہر میں اللہ ہی کو پوجتے تھے اور سجدے کرتے تھے، لیکن چونکہ دلوں میں ایمان نہیں تھا اس لئے دنیا میں تو وہ جھک گئے لیکن وہاں ان کی کمریں تختے کی طرح سخت کردی جائیں گی، تو وہ بجائے سجدے میں جانے کے پشت کی طرف الٹے جا پڑیں گے، تو ملائکہ علیہم السلام ان کو یہاں سے نکال دیں گے، تو مشرکین پہلے الگ ہو گئے تھے، منافقین شامل تھے، وہ اب جدا کردیئے جائیں گے صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو واقعۃً حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے تھے، اسی کو سجدہ کرتے تھے، اب صورت یہ بنے گی کہ یہ پنڈلی والی تجلی آگے آگے ہے اور یہ اربوں کھربوں مخلوق اس کے پیچھے ہے، وہ آگے آگے جارہی ہے اور یہ مخلوق پیچھے پیچھے جارہی ہے ان کو ایسے میدان میں پہنچایا جائے گا جہاں اتنا اندھیرا ہوگا کہ وہاں چاندنی اور نورانیت کا نشان نہیں رہے گا اس وقت وہاں ایک پل قائم کیا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں، اور کہا جائے گا کہ تم جنت میں جاؤ، مگر اس پل کے اوپر سے گذرنا پڑے گا، یہ پل جہنم کے اوپر تانا ہوا ہے۔

نورِ ایمان کا ظہور...... اس وقت اندھیرے میں ایمانوں کا نور ظاہر ہوگا، جتنا جس درجے کا جس کا ایمان ہے وہ کھل کر سامنے آئے گا، اس کی روشنی میں لوگ راستہ طے کریں گے جس کو ایک موقع پر قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ① لوگ اپنے نور ایمان کی روشنی میں چلیں گے، گویا نورِ ایمان ظاہر ہوگا، دائیں بائیں آگے پیچھے وہ نور احاطہ کئے ہوئے ہوگا، اس کی روشنی میں وہ راستہ طے کریں گے، بعض کا نور اتنا شدید ہوگا جیسے عظیم پہاڑ ہوتا ہے وہ اس پل سے اس طرح گذریں گے جس طرح بجلی لحہ بھر میں ادھر سے ادھر کوندتی ہے، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، یعنی پل بھر میں اس پل کو طے کریں گے اور یہ پل چھوٹا موٹا نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ اس پل کی مسافت پندرہ ہزار برس کی ہے، پانچ ہزار برس چڑھائی اور پانچ ہزار برس اتار اور پانچ ہزار برس برابری ہے، تو حضرات انبیاء علیہم السلام اس پل کو اس روشنی میں اتنی قوت سے طے کریں گے جیسے بجلی کوندتی ہے، اس لئے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مضبوط ایمان کس کا ہو سکتا ہے۔

اور بعض کا ایمان ایسا ہوگا جیسے عظیم الشان درخت ہوتا ہے کہ دور تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، یہ مخصوص اولیاء اللہ ہوں گے کہ انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں ان کا نور ایمان اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہوگا کہ وہ اس پل کو اس طرح سے طے کریں گے جیسے ہوا کا جھونکا گذر جاتا ہے جہنم کا کوئی اثر ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بعض کا اس سے کم، بعض کا اس سے کم، حتی کہ بعض کا ایسا ہوگا جیسے ناخن کے اوپر جو ذرا سا ستارہ سفیدی آجاتا ہے تو اس میں وہ

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ: التحریم، الآیۃ: ۸.

ٹٹول ٹٹول کر چلیں گے، رستہ پورا دکھلائی نہیں دے گا۔

پُل صراط ،شریعت کی صورتِ مثالی......اور پل صراط ایسا ہوگا کہ بال سے باریک ہے اور نازک جگہ ہے اور اس کے نیچے ہوں گے کلالیب، یعنی لوہے کے آنکڑے، وہ اچھل اچھل کر پیروں میں ڈالنے کی کوشش کریں گے، جن کے پاس نور کم ہوگا نوکیلے شکنجے کی وجہ سے وہ زخمی ہوں گے اور بجائے چلنے کے وہ گھسٹتے ہوئے چلیں گے، اور سست چلیں گے، ہزار ہا ہزار برس میں جا کر راستہ طے ہوگا اور بعض کا نور اتنا کم ہوگا کہ وہ اتنے آنکڑوں کے ذریعے سے زخمی ہو جائیں گے اور راستہ طے نہیں کر سکیں گے، کٹ کر کے جہنم میں جا پڑیں گے جب تک حق تعالیٰ کو منظور ہوگا وہ اندر رہیں گے، یہ پل صراط حقیقت میں شریعت کی صورت مثالی ہوگی، شریعت کو ایک شکل دی جائے گی، جو یہاں شریعت پر تیز چلے ہیں وہ وہاں بھی پل صراط پر تیز چلیں گے جو یہاں سست چلے ہیں وہاں بھی سست چلیں گے اور یہ جو نیچے آنکڑے ہوں گے پیروں میں شکنجے ڈالیں گے یہ فتنوں اور خواہشات نفس کی صورتِ مثالی ہوگی، نفس کی راحت کے لئے جس پر چلتے رہے تھے کسی کی نماز نہیں ہے، کسی کا روزہ نہیں ہے، کوئی زکوٰۃ نہیں دے رہا، کوئی اعتقادی وساوس میں گرفتار ہے کوئی مال کی زیادتی اور اضافے کے مرض میں مبتلا ہے، کوئی زکوٰۃ وصدقات سے قاصر ہے کوئی نماز نہیں پڑھتا، کوئی حج نہیں کرتا اور زکوٰۃ نہیں دیتا ہے، قلبی وساوس سے جاہ کی کوشش مال کی خواہش کے فتنے آنکڑوں کی صورت میں نمایاں ہوں گے تو جو یہاں ان فتنوں میں گر گئے وہ وہاں ان فتنوں میں گر جائیں گے، جنہوں نے یہاں راستہ صحیح طے نہیں کیا وہاں بھی راستہ طے نہیں کر سکیں گے، یہ تو جہنم میں شریک تھے ادھر جھکا تو جہنم، ادھر جھکا تو جہنم، تو سامنے جنت کا راستہ ہے بہر حال اس طرح سے مشرک پہلے الگ کر دیئے جائیں گے، منافق بعد میں الگ کر دیئے جائیں گے، اب مومن رہ جائیں گے ان کے درجات الگ الگ ہو جائین گے، کامل الایمان جو ہیں، وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو ضعیف الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو بالکل ناقص الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے تو ہر ہر چیز الگ الگ ہو جائے گی، ہر ایک کا رتبہ ودرجہ اس پر واضح کر دیا جائے گا تو یہ آیت کی تفسیر ہے کہ میدان محشر میں لوگ درجہ بدرجہ کھل کر نمایاں ہوں گے۔

تو اس میں وہ پنڈلی والی تجلی نمایاں ہوگی کہ جس کی عمر بھر عبادت کرتے رہے یعنی جس کے سامنے جھکتے رہے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو ظاہر میں اس کی پیشانی پڑتی ہے چٹائی پر حقیقت میں اللہ کے قدموں میں پڑی ہوئی ہے اور جب سجدہ گاہ کی طرف دیکھتا ہے تو پنڈلی سامنے ہوتی ہے، اور جب فاتحہ پڑھنے کے لئے اور سورت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ اللہ کے چہرے پر ہوتی ہے، تو درجہ بدرجہ تجلیات ربانی اس کے سامنے آتی ہیں، بحالتِ قیام اونچی تجلی سامنے ہوتی ہے، بحالت رکوع نچلی تجلی سامنے ہوتی ہے، اور سجدے میں جا کر سب سے نچلی تجلی قدموں کی نمایاں ہوتی ہے، تو تمام تجلیات ربانی سے وہ نماز اور عبادت کے اندر مستفیض ہوتا ہے، لیکن نمایاں جو تجلی ہے جس پر زیادہ نظر پڑے گی وہ پنڈلی والی تجلی ہے، جو نیچے کی تجلی ہے اس سے آدمی

مانوس ہوگا جب وہ کھل جائے گی تو اللہ کی محبوبیت نمایاں ہو جائے گی۔

عابدِ مظاہر نا آشنائے حقیقت رہے گا...... تو فرمایا گیا کہ تم مظاہر کو پوجتے ہو تو جو موحد تھے مظاہر ان کے سامنے بھی تھے مگر وہ دھیان بھی کرتے تھے تو حق تعالیٰ شانہ کی طرف جاتے تھے، اور تم ان صورتوں میں ہی الجھ کر رہ گئے تو وہاں بھی تم صورت ہی میں الجھ کر رہ جاؤ گے حقیقت کا تمہیں وہاں بھی پتہ نہیں چل سکے گا، تو فرمایا کہ آج تم تاویل کر کے پردے ڈال لو، اپنی مشرکانہ عبادت کو تم موحدانہ کہہ لو، لیکن یہ حقیقت میں عبادت نہیں ہے، یہ دھوکہ ہے جس میں تمہیں شیطان نے ڈال رکھا ہے۔ اور وہاں جا کر کھلے گا کہ ایک مومن عبادت کرتا ہے اگرچہ نظر اس کی پنڈلی پر ہے مگر وہ حقیقت میں تجلی ربانی کے سامنے ہے، تو جیسی حقیقت یہاں اس پر واضح ہے قیامت کے دن بھی اس پر حقیقت واضح ہوگی، وہ یہاں بھی نور میں ہے وہاں بھی نور میں ہوگا، جو یہاں ظلمت میں ہے وہاں بھی ظلمت میں ہوگا، حقیقت ان پر منکشف نہیں ہوگی، تو: ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ﴾ جب پنڈلی والی تجلی کھولی جائے گی اور دعوت دی جائے گی کہ سجدہ کرو تو سب سجدے میں جا پڑیں گے، لیکن یہ لوگ جو شرک میں مبتلا تھے یہ اتنی استطاعت نہیں رکھیں گے کہ وہاں جھک سکیں، اس لئے کہ یہاں بھی نہیں جھکے ہوں گے، جب یہاں نہیں جھکے تو وہاں بھی نہیں جھکیں گے۔

دُنیا کی ظلمت آخرت میں بھی حقیقت سے حجاب کا باعث ہوگی...... ﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی ندامت اور ذلت کے سبب سے، ذلت اور رسوائی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہوگی ان کے چہروں سے ظاہر ہوگا کہ یہ خائب و خاسر ہیں اور نامراد ہیں تو نامرادی کی سیاہی ان کے چہروں پر ہوگی ، اور ذلت و رسوائی چھائی ہوئی ہوگی ﴿فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ﴾ وہ جھکنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

﴿وَقَدْ كَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ دنیا میں انہیں بلایا جا رہا تھا سجدے کی طرف جبکہ ان کی فطرت بھی صحیح تھی، جبکہ ان کا ضمیر بھی صحیح تھا، لیکن انہوں نے لبیک نہیں کہا، یہاں تک کہ اپنی فطرت شرک اور بدعملی کی بدولت مسخ کر دی۔

جب فطرت ہی خراب ہوگئی، استعداد ہی باقی نہ رہی ایمان کی، تو ظاہر ہے کہ پھر عمل کہاں سے ہوگا، پھر عبادت کہاں سے ہوگی، اور جب وہ نہ ہوئی اور وہاں اس پنڈلی کے آگے نہ جھکے تو آج یہاں اس پنڈلی کے آگے کیا جھکیں گے، تو حقیقت میں دنیا اس لئے ہے کہ آدمی مشق کر لے اپنی اطاعت و عبادت کی۔ آج غائب جو چیزیں ہیں کل کو وہی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور کھل جائیں گی، تو اس وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ پنڈلی کھول دی جائے گی۔ تو پنڈلی سے مراد حقائق کا عالم ہے کہ حقیقتیں کھل جائیں گی، عاملِ شریعت اور تارکِ شریعت نمایاں ہو جائیں گے۔

ساق متشابہات میں سے ہے...... پنڈلی سے مراد متشابہات میں سے ایک صفت ہے کہ اللہ کی پنڈلی اسی

طرح فرمایا گیا، جیسے حق تعالیٰ کی طرف ہاتھ منسوب کیا گیا ہے ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب کے ہاتھوں کے اوپر ہے یا جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ﴾ ② لوگ ارادہ کر رہے ہیں اللہ کے چہرے کا۔ تو چہرہ بھی اللہ کی طرف منسوب ہوا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اَلْقُلُوْبُ بَیْنَ اِصْبَعَیِ الرَّحْمٰنِ'' ③ تمام دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، تو انگلیاں ثابت کی گئیں۔ حدیث میں فرمایا کہ: جب اللہ نے رحم اور امانت کو پیدا کیا تو رحم اور امانت اللہ کی کوکھ سے لپٹ گئے اور بولے کہ: ''اَلا مَنْ وَصَلَنَا وَصَلَهُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَنَا قَطَعَهُ اللّٰہُ'' ④ آپ یہ چیز واضح کر دیجئے کہ جو ہمیں ملائے یعنی صلہ رحمی کرے اور امانت داری کرے آپ کے لئے تو آپ اسے اپنے ساتھ کر لیجیے اور اگر رحم قطع کر دیا، امانت قطع کر دی تو آپ بھی اسے اپنے سے قطع کر دیں، تو حق تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی، تو اس سے کوکھ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''رَأَیْتُ رَبِّیْ فِیْ اَحْسَنِ صُوْرَتِهٖ'' میں نے خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا، بڑی پاکیزہ صورت تھی۔ حق تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ: ''فِیْمَ یَخْتَصِمُ مَلَأُ الْاَعْلٰی'' ملاء اعلیٰ کے لوگ یعنی ملائکہ مقربین کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا، میں تو واقف نہیں ہوں اس چیز سے، پھر فرمایا حق تعالیٰ نے دوبارہ کہ ''فِیْمَ یَخْتَصِمُ مَلَأُ الْاَعْلٰی'' ملاء اعلیٰ کے ملائکہ کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ میں تو نہیں جانتا نہیں پہچانتا۔ تین دفعہ جب فرمایا اور میں نے اقرار کیا کہ میں نہیں جانتا تو حق تعالیٰ نے میری پشت پر ہاتھ رکھا حتّٰی برد ت...... ⑤ میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنے قلب کے اندر محسوس کی اور اس طور پر شرح صدر ہوا کہ ساری چیزیں منکشف ہوگئیں جن کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا کہ کس بارے میں جھگڑتے ہیں، ملاء اعلیٰ والی ساری چیزیں مجھ پر کھل گئیں، تو پورے بھی ثابت کئے گئے، بہر حال یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئیں، ہاتھ بھی پورے بھی انگلیاں بھی، قدم بھی پنڈلی بھی، کوکھ بھی، لیکن اہل حق اس میں یہی لکھتے ہیں کہ ان تمام چیزوں پر ایمان لاؤ مگر ساتھ یہ کہو کہ ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا وہ راز ہے کیا کیفیت ہے! ہم کیفیت نہیں جانتے، جیسے اللہ کی ذات بے چون بے چگوں ہے، کوئی اس کی مثال نہیں، ایسے ہی اس کا ہاتھ ہے، مگر ہاتھ اس کیفیت کی بنی ہوئی شکل نہیں ہے، وہ شکل وصورت سے پاک ہے، حقیقت کو ہم نہیں جانتے تو اس طرح کے تمام متشابہات پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ کہ وہ اپنی حقیقت پر ہیں، لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے جیسے ذات اس کی بے چون و بے چگوں ہے ایسے ہی

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ: الفتح، الآیۃ: ۱۰۔ ② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۵۲۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب القدر، باب تصریف اللہ القلوب کیف شاء ج: ۱۳ ص: ۱۱۹۔ ④ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا ج: ۱۲ ص: ۴۰۷ رقم: ۴۶۳۵۔

⑤ السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، ومن سورۃ ص ج: ۱۱ ص: ۲۷ رقم: ۳۱۵۷۔

اس کی صفات بھی بے چوں و بے چگوں ہیں، اس طرح سے پنڈلی بھی متشابہات میں سے ایک متشابہ ہے کہ ظاہر میں لفظ پنڈلی کا ہے، جیسے ہماری پنڈلی مگر کیفیت اس کی مجہول ہے ہم نہیں جانتے، حق تعالیٰ جسم سے بری ہیں حق تعالیٰ حدود سے بری ہیں، اس لئے اس کی پنڈلی ویسے ہوگی جیسے اس کی شان ہے جیسے اس کی ذات ہے اس کا ہاتھ ویسا ہوگا جیسی اس کی ذات ہے اس کی کوکھ ویسی ہوگی، جیسی اس کی ذات ہے ہم اپنی کوکھ پر اور ہاتھ پر قیاس نہیں کرسکتے، ہم محدود ہیں وہ لامحدود ہے، ہم جسمانی ہیں وہ جسم وروح سے بری وبالا ہے، اس لئے ہم کوئی کیفیت نہیں بیان کرسکتے تو مراد یہاں ساق سے اشارہ اس طرف ہے کہ آج تم چھپالو چیزوں کو آج پردے ڈال لو دلیلوں پر تاویلوں کے پردے ڈال لو، لیکن حقیقتیں کھلنے والی ہیں، اہل معرفت پر یہیں کھل جاتی ہیں عوام پر وہاں جا کر کھل جائیں گی، تو یہ محض بناوٹی دلیلیں تھیں، اور تمہارا ضمیر بھی شاہد ہوگا کہ ہم نے اپنے نفس کو دھوکہ ہی دیا تھا اور مخلوق کی حقیقت کچھ نہیں تو فرمایا کہ ان چیزوں میں مت پڑو، پیغمبر جس چیز کو لاکر پیش کررہے ہیں اس پر ایمان لاؤ، جو راستہ دکھار ہے ہیں اس پر چلو، حقیقت اسی کے اندر رہے، بے جا تاویلات اور آبائی تقلید پر نیز رسم ورواج پر نہ چلو، یہ چیزیں نجات دلانے والی نہیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کی سنتیں نجات دلائیں گی، جو طریقہ انبیاء علیہم السلام نے بتلایا ہے، وہ ہدایت ہے اسی سے نجات کا تعلق ہے، نہ رواج کا نام شریعت ہے نہ پچھلوں کی ریت پر جمے رہنے کا نام شریعت، شریعت تو نکھری ہوئی چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی اور صحیح سند سے آئی اور وراثت سے آئی واسطہ در واسطہ سندِ صحیح کے ساتھ پہنچ گئی، اسی کو مانیں اسی کے اندر نجات ہے، تو فرمایا: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ﴾ وہاں اطاعت کی طرف بلائی گئی مخلوق جو ایمان والے تھے، وہ جھک گئے جو یہاں نہیں جھکے وہاں بھی نہیں جھکیں گے، جو یہاں جھکے ہیں وہاں بھی جھک جائیں گے، جن کی یہاں نجات ہوئی وہاں بھی نجات ہوگی، وہاں وہ استطاعت نہیں رکھیں گے جھکنے کی جو یہاں نہیں جھکے، اور ان کے چہروں پر ذلت اور پھٹکار ورسوائی برستی ہوگی۔ ﴿وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ اس وقت انہیں دعوت دی گئی سجدوں کی جب ان کی فطرت صحیح سالم تھی، صحیح سالم تھے لیکن دعوت پر لبیک نہیں کہا تو فطرت کو مسخ کردیا ان کے اندر استعداد صلاحیت سب فوت ہوگئیں، تو اب کیا ہوسکتا ہے، آخرت تو دنیا کے کئے دھرے کا ثمرہ ہے، جب دنیا میں ہی کوئی چیز نہیں ہوئی تو ثمرہ بھی مرتب نہیں ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دنیا آخرت کی کھیتی ہے، آخرت میں آدمی پھل کاٹے گا، دنیا میں کھیتی بوئے گا محنت کرے گا تو جو یہیں نہیں بوتا، یہیں بیج نہیں ڈال رہا ہے، یہیں کھیتی کو پانی نہیں دے رہا ہے، تو وہ ثمرہ اسے کیسے ملے گا، وہاں جا کر محروم ہوجائے گا، اس واسطے ان کی محرومی فرمایا حق تعالیٰ نے: ﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ﴾ اے پیغمبر! ان کی فکر میں آپ نہ پڑیں، آپ دعوت دیتے رہیں باقی ان کی ہدایت کی فکر نہ کریں انہیں مجھ پر چھوڑ دیں یہ تکذیب میری کررہے ہیں، میں ان سے خود نمٹ لوں گا، اور ظاہر میں اس تکذیب پہ تاویلوں کے

پردے ڈال رکھے ہیں، یہ ہم نے ان کی دلوں کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے یہ اسی اندھیرے میں چلتے رہیں گے۔

خود وہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑے اچھے راستے پر ہیں، جب نتیجہ نکلے گا تو معلوم ہوگا کہ گمراہی کے اوپر تھے، تو یہ ہماری ایک خفیہ تدبیر ہے جس سے ہم ہلاکت والوں کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں اور آنکھیں ان کی بند کر دی گئیں ہیں ظاہری بھی باطنی بھی، نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں نہ وہ سمجھتے ہیں، جب فطرت ضائع کر دی تو اب سمجھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ہم ڈھیل دے رہے ہیں انہیں اور یہ پہنچ گئے ہیں اس ہلاکت کی طرف گو ان کو سمجھ میں نہ آئے۔

بلا دلیل اتباع میں نجات ہے...... تو اس میں عبرت دلائی گئی ہے ایمان والوں کو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو کھلا ہوا راستہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ فرائض ہیں، یہ واجبات ہیں یہ عبادت کا طریقہ ہے، یہ توحید کا طرز ہے، یہ نبوت کے ماننے کا طرز ہے۔ اسی میں نجات کا تعلق ہے جہاں آدمی خود درائی کو اور عقل پسندی کو دخل دے گا وہیں دین کے اندر دخل پڑ جائے گا، دین کی بنیاد اتباع کے اوپر ہے کہ آدمی ہر چیز سے کٹ کر اتباعاً پیروی کی طرف جائے اسی کے اندر نجات ہے، صحابہ کرامؓ اس درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے تھے کہ اس اتباع کے مقابلے میں اپنی عقل کو بھی جھٹلانے کے لئے تیار تھے، اپنے مشاہدے کو بھی رد کرنے کے لئے تیار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مقابلے میں نہ اپنی آنکھ کا اعتبار کرتے تھے نہ اپنی عقل کا نہ اپنے مشاہدے کا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا صحابہؓ سے کہ: اَیُّ یَوْمٍ هٰذَا یہ کون سا دن ہے؟ سب جانتے تھے کہ عرفہ کا دن ہے نویں تاریخ ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ نویں تاریخ ہے مگر صحابہ کرامؓ نے کیا جواب دیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا دن ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَیُّ شَهْرٍ هٰذَا'' مہینہ کون سا ہے؟ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، حج ہو رہا ہے مگر جواب دیتے ہیں۔ ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔'' ① اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے کون سا مہینہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اَیُّ بَلَدٍ هٰذَا سب کو معلوم تھا کہ مکہ ہے وہیں سے آئے تھے مگر جواب میں کہتے ہیں کہ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ جواب دیا گیا تو ان صحابی سے ان کے شاگرد نے پوچھا کہ آپ تو جانتے تھے کہ مہینہ ذی الحج کا ہے، نویں تاریخ ہے، عرفہ کا دن ہے شہر مکہ کا ہے، تو سیدھا جواب یہ ہے کہ مکہ ہے ذی الحج کا مہینہ ہے نویں تاریخ ہے عرفہ کا دن ہے یہ آپ نے کیا جواب دیا ہے: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

تو صحابہؓ کہتے ہیں اس کے جواب میں ہم نے یہ اس لئے کہا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا کہ نویں تاریخ نہیں بارہویں تاریخ ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہمارا علم غلط تھا

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی ج: ٦ ص: ٢٢٨ رقم: ١٦٢٥.

حق یہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمادیں کہ مکہ نہیں مدینہ ہے تو ہم کہیں گے کہ بلا شبہ مدینہ ہے ہماری آنکھیں غلط دیکھ رہی تھیں کہ یہ مکہ ہے، اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ مہینہ ذوالحجہ کا نہیں محرم کا ہے، تو ہم کہیں گے کہ بے شک محرم کا ہے، ہمارا علم غلط ہے، تو یہ درجہ تھا اتباع کا کہ اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنے علم کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی تاریخ کو غلط کرنے کے لئے تیار قولِ رسول کے مقابلے میں تو جب تک اتنا اتباع نہ ہو کہ آدمی اپنی عقل، مشاہدہ، نگاہ سب کو چھوڑ کر قولِ رسول کی طرف نہ جائے، حقیقت میں اس وقت تک ایمان کا کمال نصیب نہیں ہوسکتا۔

عظمتِ خداوندی کا عالم...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا ایک شخص کو کہ دن دیہاڑے چوری کررہا ہے تو اس سے فرمایا کہ ارے کم بخت دن دیہاڑے چوری کرتا ہے؟ اس نے کہا: ''وَاللهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَا اَسْرِقُهٗ'' قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے چوری نہیں کی۔ حالانکہ آنکھوں کے سامنے تو چوری کررہا تھا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ''صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَکَذَّبْتُ عَیْنَیَّ'' اس نے اللہ کا نام لے کر قسم کھائی تو میں اللہ کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں بے شک تو نے چوری نہیں کی اللہ کا نام سچا ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ اللہ کا نام جب آجائے تو اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی عقلوں کو جھٹلانے کو تیار خدا کے مقابلے میں، اسی عظمت کی وجہ سے تو حضرت آدم علیہ السلام مبتلا ہوگئے، حق تعالیٰ نے جب جنت میں بھیج دیا اور فرمایا کہ دیکھو اس درخت کو مت کھانا، ابلیس نے آکر دھوکہ دیا، جانتے تھے کہ ابلیس ہے مگر: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① شیطان نے قسم کھائی خدا کی قسم! میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آدم علیہ السلام کے دل میں فریب نہیں، سچا قلب ہے آدم علیہ السلام کا اور جنت مقامِ کریمہ ہے، وہاں ایک شخص قسم کھائے اللہ کا نام لے کر انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے، بھلا اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا اس درجہ عظمت تھی کہ ذہن میں نہیں آیا کہ یہ کم بخت شیطان ہے، جھوٹی قسم کھا رہا ہے، کیونکہ قلب اتنا سچا تھا کہ ان کے دل میں آیا ہی نہیں کہ خدا کا نام لے کے بھی کوئی جھوٹا حلف کرسکتا ہے، تو یقین آگیا اور اس عظمت کے سبب سے آدم علیہ السلام مبتلا ہوگئے، اس واسطے کہ جب آدمی خود پاک اور سچا ہوتا ہے تو دوسرا بھی ویسے ہی نظر آتا ہے، اس کے دل میں برائی بیٹھتی ہی نہیں سچے آدمی کے سامنے اگر آپ جاکے بات کریں تو وہ اپنے جیسا سمجھے گا کہ بھلا اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

مولانا اصغر کے نانا حضرت شاہ صاحب کی مادہ لوحی...... ہمارے بزرگوں میں سے آپ نے حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ کو تو دیکھا ہی ہوگا سب جانتے ہیں، میاں صاحبؒ کے نانا تھے حضرت شاہ صاحبؒ بہت ہی بزرگ لوگوں میں سے تھے اور اس درجہ کے بزرگ کہ ان کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مقولہ یہ تھا

---

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

کہ انہیں عمر بھر کبھی صغیرہ گناہ کا تو تصور بھی نہیں آیا، کرنا تو کجا؟ تصور بھی نہیں آیا بالکل سادہ سچی طبیعت اور معصوم صفت، تصور بھی کبھی گناہ کا نہیں آیا، کرنا تو کجا، ہر وقت حق تعالیٰ میں مستغرق رہتے تھے، انہیں اپنا نام تک یاد نہیں رہتا تھا، اولاد کے نام یاد نہیں رہتے تھے، بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کا شغل رکھتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے نہیں ایک کھونٹی ڈال رکھی تھی جب دھوپ وہاں تک پہنچ گئی تو بچوں نے کہہ دیا کہ حضرت وقت ہو گیا تو فرما دیتے بھئی چھٹی، تو بعض دفعہ لڑکوں نے شرارت کر دی کہ کھونٹی آدھ گز دور گاڑ دی تو دھوپ جلدی پہنچ گئی اور بچوں نے کہہ دیا کہ اجی میاں صاحب وقت ہو گیا، اچھا بھائی جاؤ چھٹی ہو گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ جھوٹ بول رہے ہیں انہوں نے شرارت کی ہے، کھونٹی آگے ڈال دی ہے، فرماتے ہیں مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا اس درجہ معصوم صفت تھے، بالکل سیدھی اور سچی طبیعت کہ بچے جھوٹ نہیں بول سکتے کیونکہ سوائے سچائی کے ان کے قلب میں اس کا تصور ہی نہیں تھا، کہ کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، شاہ صاحب کا دوسرا واقعہ ایک دفعہ بیمار ہوئے آنکھوں میں بیماری ہوئی اور پڑ گئے تو کسی نے آکر کہہ دیا کہ اس مرض میں آنکھ جاتی رہتی ہے، نگاہ باقی نہیں رہتی تو یقین آگیا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے تو آنکھ باندھ کے بیٹھ گئے، جو آیا پوچھنے کہ میاں صاحب کیسی طبیعت ہے کہ جی میری آنکھیں جاتی رہیں کہ فلاں صاحب آئے تھے وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں بینائی رہا نہیں کرتی تو اس کا یقین آگیا ایک مہینہ گزر گیا اور بیٹھے ہوئے ہیں آنکھ باندھ کے کہ میری آنکھ جاتی رہی۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس تھے، فقط عالم نہیں بلکہ عارف باللہ اور صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، تو مولانا کے علم میں آیا سمجھ گئے کہ کسی نے جا کر کہہ دیا اور یقین آگیا ہے، کہ آنکھوں میں بینائی نہیں رہی تو مولانا خود پہنچے اور جا کر پوچھا، میاں جی صاحب کیا حال ہے؟ فرمایا حضرت جی میری آنکھیں جاتی رہیں، وہ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں آنکھیں رہا نہیں کرتیں تو میری بینائی جاتی رہی، مولانا نے فرمایا کہ میاں صاحب میں پانی پڑھ کے دیتا ہوں اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب آنکھ کو چھینٹا دیا جائے تو بینائی فوراً آجاتی ہے کہا اللہ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے ضرور پانی پڑھ کے دیجئے، مولانا نے وہیں الحمد وغیرہ کچھ پڑھ کے چھینٹا دیا کہ میاں صاحب بینائی آگئی ہے آنکھ کھول دیں انہوں نے آنکھ کھول دی، بینائی تو تھی ہی، کوئی گئی تھوڑا ہی تھی؟ سینکڑوں دعائیں دیں اللہ آپ کو جزائے خیر دے، دیکھو میری بینائی آگئی ہے۔

اور اس سے بڑا لطیفہ یہ ہوا کہ اگلے دن مولانا جو کہ چھتّے کی مسجد میں رہتے تھے، بہت سے اندھے مسجد میں دوڑتے دوڑتے چلے آرہے ہیں، گاڑیوں میں بیٹھ کر آرہے ہیں کہ مولانا ایسا پانی پڑھتے ہیں کہ بینائی آجاتی ہے، تب مولانا نے کہا بھائی میرے پاس نہ کوئی پانی پڑھ کے دینا آتا ہے اور نہ اور کچھ، وہ تو میاں صاحب سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہی ہے انہیں اس کا یقین ہو گیا تو میں نے بھی یقین دلا دیا، یہ نہیں میں کہہ سکتا تھا کہ

اس نے جھوٹ بولا یہ ان کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ کوئی جھوٹا ہو سکتا ہے اس لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی میں جانتا تھا کہ بینائی تو موجود ہے، ایک حیلے کی ضرورت ہے آنکھ کھلوانے کے لئے تو میں نے یہ حیلہ کیا، مجھے کوئی پانی وانی پڑھنا نہیں آتا، تو وہ بیچارے اندھے رخصت ہوئے، ورنہ سینکڑوں اندھے موجود جو ٹھیلوں میں گاڑیوں میں چلے آرہے ہیں، تو نہایت معصوم صفت بزرگ تھے۔

محبوب اختر کا میاں جی کی خدمت میں گندستی کی شکایت کرنا...... ہمارے عزیزوں میں سے ایک صاحب تھے، محبوب اختر ان کا نام تھا، بیچارے بہت غریب تھے، اور ان پر فاقے ہونے لگے تو وہ میاں جی کی خدمت میں آئے کہ حضرت جی دعاء کردو میرے واسطے کہ فاقوں کی نوبت آگئی ہے، کچھ بھی گھر میں باقی نہیں رہا، میاں صاحب نے فرمایا گھر بیٹھ کر روٹی؟ سفر کرو، کہا کہ کہاں کا سفر کروں؟ کہا جہاں کا جی چاہے کرلو ملے گا سفر ہی میں، اب وہ بیچارے حیران ہوئے اعتقاد پختہ تھا وہ میاں صاحب کے ہاں سے اٹھے تو سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے، اب کچھ خبر نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں کون سی منزل ہے، وہ اسٹیشن پہنچ گئے، مظفر نگر کی ریل تیار تھی، دو آنے کا ٹکٹ ملتا تھا، تو دو آنے کا ٹکٹ لیا اور ریل میں بیٹھ گئے، اب ریل میں بیٹھ کے سوچ رہے ہیں کہ کل چار آنے میرے پاس تھے، دو آنے کا تو ٹکٹ لے لیا اور وہاں کوئی میری جان پہچان نہیں، کس کے ہاں اتروں گا؟ کہاں کھانا کھاؤں گا؟ اور اگر دو آنے کا کھانا کھالیا تو پھر واپسی کا ٹکٹ نہیں گھر کیسے آؤں گا؟ اب بیچارے پریشان ادھر میاں صاحب نے کہہ دیا تھا اعتقاد پورا تھا صبر وشکر کر کے بیٹھ گئے کہ اللہ مالک ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا اسٹیشن پر جا کر اترے تو ابھی باہر نہیں نکلے تھے کہ ایک سپاہی نے آ کے ہاتھ پکڑا کہ چلو صاحب بلا رہا ہے، پولیس کا انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، وہ تمہیں بلا رہے ہیں، اب یہ بیچارے بہت گھبرائے کہ جیل تیار ہے، خیر وہ سپاہی لایا تو اسٹیشن پر وہ انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، میز لگی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا، یہ جا کے پیش کئے گئے اس نے کہا کہ بھائی تو ملازمت کرے گا؟ جی ہاں کروں گا، انہوں نے کہ میں تو سمجھا تھا کہ جیل بھجوائے گا مگر یہاں تو معاملہ دوسرا ہو رہا ہے۔ اسے ضرورت تھی کہ سپاہیوں میں بھرتی کرے تو اس نے کہا مسافروں میں جس کو طلب دیکھو بلا کر اسے لے آؤ، تا کہ ہم بھرتی کریں انگریزوں کا نیا نیا زمانہ تھا، بھرتی ہو رہی تھی تو ان کو کہا گیا ملازمت کرو گے؟ کہا جی ہاں کروں گا، اس نے سینہ ناپا جو اس زمانے کا دستور تھا اور کہا کہ آج سے تم ملازم ہو گئے اور تمہاری تنخواہ اٹھارہ روپے ہو گی اس زمانے کے ۱۸ روپے ایسے تھے جس طرح آج کے ہزار روپے ہیں۔

اس کے بعد ان سے کہا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا میں دیو بند کا رہنے والا ہوں اور میں تو گھر سے آیا ہوں گھر والوں کو ملازمت کی اطلاع نہیں ہے، اس نے حکم دیا کہ آدھی تنخواہ نو روپے انہیں دے دو، اور کہا تم گھر والوں کو اطلاع کر کے پرسوں یہاں آ کر حاضری دو یہ نو روپے لے کر اب دوسری ریل پر واپس ہوئے، پھر نو روپے اس زمانے میں ایسے تھے جیسے ۹۰۰ روپے ہاتھ آ گئے اس قدر ہشاش بشاش اور منفرح اور خوش کہ انہوں نے

برسہابرس ۹ روپے نہیں دیکھے تھے فاقوں کی نوبت تھی، دیوبند پہنچے تو چار آنے کی جلیبیاں خریدیں، اور میاں صاحب کے پاس ہدیہ کے طور پر لے گئے اور کہا، اجی میاں صاحب! ملازم ہو گیا، ۱۸ روپے مہینے پر! فرمانے لگے میاں دیکھو ہم کہتے نہیں تھے کہ گھر بیٹھ کے نہیں روٹی ملتی، باہر جا کے ملے گی تو ایسے معصوم صفت بزرگ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی پہلی اینٹ رکھنے والے میاں جی اور ان کے داماد کا حال...... دارالعلوم دیوبند کی جب بنیاد رکھی گئی ہے تو سب سے پہلی اینٹ انہی سے رکھوائی ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور یہ فرمایا کہ ایسے شخص سے اینٹ رکھوا رہا ہوں کہ جسے عمر بھر صغیرہ گناہ کا تصور تک کبھی نہیں آیا کبیرہ گناہ تو دور کی بات ہے، تو ایسے لوگوں نے بنیاد رکھی جو بالکل معصوم صفت ہیں، تو ان کی سچائی کی کیفیت ان کی پاکیزگی قلب یہ تھی کہ ہروقت مستغرق رہتے تھے۔

چنانچہ ان کے داماد تھے ان کا نام تھا ''اللہ بندہ'' جب داماد آتے فرماتے کون ہو تم؟ فوری پہچانتے نہیں تھے، اس درجہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ تھی کہ ادھر کی طرف دھیان نہیں تھا پوچھتے کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی میں ہوں اللہ بندہ فرماتے ارے بھائی نام بتاؤ، اللہ بندے تو سارے ہی ہیں، ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، اجی اس نے کہا کہ میرا نام یہی ہے، فرماتے بھلے یہ کیا نام ہوا؟ ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، انہوں نے کہا جی میں ہوں آپ کا داماد، اچھا اچھا اب سمجھے، بات چیت کر کے واپس چلے گئے۔

اگر دس منٹ کے بعد آ گئے پھر وہی سوال بھائی کون ہو تم؟ اب پھر اللہ بندے پہ بحث ہو رہی ہے تو نہ اپنا نام یاد رہتا تھا نہ اولاد کا نام یاد رہتا تھا، ہروقت استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی، تو اس درجہ معصوم صفت تھے تو ان کے سامنے جا کر کوئی بات کہتا تو ان کے دھیان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، جیسے سچے خود ہیں ایسے ہی دوسرے کو سچا سمجھتے تھے، اور اگر کوئی قسم کھا کے کہتا تب تو یقین کرنے میں کوئی مانع نہ تھا، تو جب انبیاء علیہم السلام کے امتیوں میں ایسے سچے ہیں جو نبی نہیں ہیں، مگر قلوب میں سچائی ہے تو انبیاء کے قلوب کی سچائی کا کیا عالم ہو گا؟

تو آدم علیہ السلام سچوں سے بڑھ کر سچے پیغمبر اور ہیں جنت میں، ابھی دنیا کی ہوا بھی نہیں کھائی، تو جہاں فریب کا تصور تک نہیں وہاں کم بخت شیطان نے قسم کھائی جا کے کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں، اور اس درخت کے کھا لینے میں آپ کے لئے بڑی برکات اور فوائد ہیں تو یقین آ گیا کہ بھلا اللہ کا نام لے کر کون جھوٹ بول سکتا ہے، تو عظمتِ خداوندی مبتلا ہونے کا باعث ہوئی، تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ قلوب کے اندر جب سچائی ہوتی ہے تو دوسرے کے جھوٹ کو بھی آدمی نہیں سمجھتا، اور مبتلا ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات بھلے لوگ زیادہ اسی میں مارے جاتے ہیں کہ دوسرے نے قسم کھائی چپڑی باتیں کیں مبتلا ہو گئے لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ نیک لوگ اگر مبتلا بھی ہو جائیں عظمت الٰہی کے سبب سے کسی کو جھوٹا نہ سمجھیں اور وہ جھوٹا آدمی پھانس لے تو آخیر میں پھر نتیجہ اسی کے حق میں برا نکلتا ہے یہ بری کر دیئے جاتے ہیں، اللہ کے ہاں سے ان کی مضرت نہیں پہنچتی نیت کی سچائی کی وجہ سے تو نبی علیہ السلام کے سامنے صحابہ کرامؓ کی یہ حالت تھی

کہ اتباع اور پیروی میں اس درجہ آگے تھے کہ اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اور آنکھوں دیکھی چیزیں جھٹلانے کو تیار مگر پیغمبر کا قول جھٹلانے کو تیار نہیں تو اصل حقیقت یہی ہے۔

معیارِ اتباع...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جمعہ پڑھنے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور کچھ دیر ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر پہنچ گئے خطبہ شروع ہوگیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ جب خطیب ممبر پر پہنچ جائے ''اِذَا خَـرَجَ الْاِمَـامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ'' جب امام اٹھ کر چلنے لگے ممبر کی طرف تو اب نہ نماز پڑھنی جائز ہے، اور نہ بات چیت کرنی جائز ہے بلکہ سکوت کے ساتھ خطبہ سننے کے لئے تیار ہو جائے، اگر کسی نے پہلے سے نماز شروع کردی تھی اور امام کھڑا ہوگیا تو فرمایا گیا کہ اگر چار رکعت کی نیت کی تو دو پر سلام پھیر دے، لمبی نہ کرے، نماز جلد مکمل کرے بعد میں پھر قضا کرلے، مگر اس وقت سلام پھیر دے، اس وقت کی بڑی عبادت یہی ہے کہ خطبہ سنا جائے، تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے اور خطبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف لا چکے تھے، جب یہ دروازے میں داخل ہوئے تو ارادہ کر رہے تھے کہ نماز کے لئے کھڑے ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممبر پر فرمایا اِجْلِسُ بیٹھ جاؤ، مطلب یہ تھا کہ جا کر نماز نہ پڑھو خطبہ شروع ہوگیا ہے بیٹھ جاؤ تو مسجد میں نہیں پہنچے مسجد کے دروازے سے باہر تھے، آواز کانوں میں پڑی وہیں (سڑک) کے اوپر بیٹھ گئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آگیا تو اب تاخیر اطاعت میں جائز نہیں، حالانکہ ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ مسجد میں آکر نماز نہ پڑھو خطبہ سنو مگر لفظ تھا اِجْلِسْ کا کہ بیٹھ جاؤ تو جہاں کان میں آواز پڑی وہیں بیٹھ گئے، سڑک کے اوپر بیٹھ گئے کہ اب اطاعت میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اطاعت کا اخروی فائدہ...... جب تک یہ درجہ اطاعت کا نہ آجائے کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام خداوندی کے بارے میں کہ ہر چیز سے قطع نظر کر کے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کے جھک جائے، اس وقت تک آدمی کی نجات کی صورت نہیں ہوتی، تو کہاں وہ صحابہ کرامؓ کہ اپنے مشاہدے کو اطاعت نبوی میں جھٹلانے کے لئے تیار اور کہاں مشرکین کہ خدا اور رسول کے کلام کو اپنے وسوسوں کے مقابلے میں جھٹلانے کے لئے تیار ہیں، وہاں نجات کا کیا کام تھا، تو یہی تقابل دکھلایا گیا ہے کہ آج وہ لوگ اطاعت نہیں کرتے اور فرضی چیزوں میں پڑے ہوئے ہیں، وہ قیامت کے دن بھی اطاعت نہیں کریں گے انہیں چیزوں کے اندر مبتلا ہوں گے اور ہلاکت کی طرف جائیں گے، اور جو یہاں مان گئے ہیں وہ وہاں بھی مانیں گے جو یہاں پنڈلی کے آگے جھک گئے وہ وہاں بھی سجدے میں گریں گے، اور ان کے لئے وہاں نجات ہوگی۔

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ٥ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ٥ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ٥ لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ٥ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ٥ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

بزرگانِ محترم! کفارِ مکہ کو دعوت دینے کے سلسلے میں کیونکہ ان کی طرف سے انکار اور غفلت کا اظہار ہوتا تھا تو اندیشہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بمقتضی بشریت غم وغصہ پیدا ہو، اور اس میں ممکن ہے کہ آپ کوئی بددعا کر دیں کہ دعوت وارشاد تو اس قوم کو پہنچ گئی ہے اس واسطے تسلی دینے کے لئے آپ کے قلب مبارک کو ثابت رکھنے کے لئے یہاں سے کچھ چیزیں ارشاد فرمائیں۔

ارشاداتِ نبوت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں...... حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ ایک سچی بات کو جب ایک سچے انسان کے کہنے پر نہ مانا جائے، تو اس کی عالم اسباب میں دو وجہیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ سچ بات کہنے والے پر خود غرضی کا شبہ ہو کہ اس کی اپنی کوئی غرض پوشیدہ ہے تو خود غرض آدمی اگر کوئی سچی بات بھی کہتا ہے تو اس کا اثر نہیں ہوتا نہ ماننے کو جی چاہتا ہے، جیسے عموماً کوئی پیشہ ور واعظ ہو باتیں سچی کہے اور اخیر میں پیسے مانگنے شروع کر دے، تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ ساری سچی باتیں اس پیسے کے لئے کہی جارہی تھیں، اس سے لوگوں کی طبیعت ہٹ جائے گی اور کہیں گے کہ ایسی باتیں پیسے مانگنے کے لئے ہیں خدا کے لئے نہیں۔ بات صحیح تھی واقعات بھی صحیح بیان کئے مگر چونکہ اپنی غرض آ گئی اس واسطے بات بھی بے اثر بن گئی، جیسے عارف رومیؒ نے کہا کہ:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

جب غرض آجاتی ہے تو ہنر چھپ جاتا ہے! سب کمال بے کمالی ہو کر رہ جاتی ہے، کبھی تو اس وجہ سے آدمی سچی بات نہیں مانتا کہ کہنے والے میں خود غرضی کا شبہ ہوتا ہے، اور کبھی اس لئے نہیں مانتا کہ بات گو سچی ہو مگر اس کے خلاف قطعی علم سے آدمی جانتا ہے کہ اصل تو وہ ہے یہ خوانخواہ کہہ رہا ہے، اور اس پہلی بات پر مطمئن ہے کہ وہ واقعی من جانب اللہ ہے اور صحیح ہے اور معقول دلائل پر مبنی ہے، جب میرے پاس دلیل وحجت ایک چیز کی موجود ہے تو کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کی بات مان لوں میرے پاس خود بات موجود ہے مدلل، مثبت، برہان، حجتیں تو یہی دو وجہیں ہوتی ہیں کہ یا آدمی مطمئن ہو کسی دلیل سے، یا یہ کہ اپنی بات صحیح نہیں دوسرے کی صحیح ہے، مگر معاذ اللہ وہ خود غرض ہے تو اثر نہیں ہوگا، اس لئے فرمایا کہ: جب یہ دو وجہیں نہیں ہوں گی تو نہ تو کہنے والا خود غرض ہے نہ اس کے پاس کوئی حجت ہے اب جو انکار ہے وہ محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس واسطے اس عناد کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے کہ ہٹ دھرمی ہے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ تو اس کو فرمایا گیا کہ آپ جو نصیحت فرمارہے ہیں اور رات دن دعوت دے رہے ہیں اور پھر بھی نہیں مانتے تو: ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ کوئی اجرت چاہتے ہیں ان سے یا آپ کی کوئی وابستہ ہے کہ آپ اسکی وجہ سے یہ ڈر رہے ہیں کہ اگر بات سن لی تو پھر آپ کی غرض پوری کرنی پڑے گی اور ان کو خواہ مخواہ ڈنڈ بھرنا پڑ جائے گا بوجھل ہو جائینگے۔

اس واسطے نہیں سنتے کہ اخیر میں ان کی غرض سامنے آئے گی ہم اس کے اندر بوجھل پڑ جائیں گے۔ آپ کوئی ان سے اجرت چاہتے ہیں کہ جس کے تاوان میں یہ دبے جارہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بات ہی نہ سنو اگر بات مان لی تو پھر یہ سوال کریں گے وہ پورا کرنا پڑیگا پیسے کا دولت کا اس واسطے اچھا ہے کہ مانو ہی نہ سنو ہی نہ تو کیا یہ بات ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے آپ سے زیادہ سچا کون، اللہ سے زیادہ سچا کون، اللہ کے رسول سے زیادہ سچا کون، رسول کا معنی ہی یہی ہے کہ جو کہے وہ سچ کہے وہاں غلط بول کا نشان ہی نہیں ہے۔

رسول سچا ہی ہوا کرتا ہے...... حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے اپنے مرید کو جو حد کمال کو پہنچ گیا تھا اجازت اور خلافت عطا کی، جاتے ہوئے خلیفہ نے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمایئے! فرمایا: دو باتوں کا خیال رکھنا ایک تو خدائی کا دعویٰ مت کرنا، ایک نبی ہونے کا دعویٰ مت کرنا، بے چارے کو بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا حضرت آپ کو مجھ سے یہ خطرہ تھا کیا میں خدائی کا دعویٰ کرونگا؟...... صلاح وتقویٰ بھی ثابت ہے فرمایا: ایسا ہو جاتا کہ خدائی کا دعویٰ کرونگا اور اس سے بڑھ کر نبوت کا دعویٰ کرونگا یہ تو کسی مسلمان کا بھی کام نہیں چہ جائیکہ ایک صالح مرشد راشد کا کام ہو...... فرمایا پہلے اس کے معنی سمجھ لو کہ خدائی کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں اور نبوت کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں؟

اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو، یہ درحقیقت خدائی کا مدعی ہے، اس لئے کہ خدا ہی وہ ذات ہے جو وہ چاہے وہی ہو کر رہے گا، اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، اگر کوئی انسان اس درجہ میں آجائے کہ جو میں کہوں وہی

پوراہواس کا مطلب یہ ہے کہ وہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ بشریت اور انسانیت کی حد سے نکل گیا ہے۔ بشر کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو چاہے کبھی پورا ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، وہ تو محتاج ہے عاجز اور بے چارہ ہے۔ اگر ہر چیز ہماری مرضی کی پوری ہونے لگے کبھی خلاف نہ ہو تو بشر میں اور خدا میں فرق کیا رہے گا؟ خدا کے یہ معنی کہ جو وہ چاہے وہ اٹل ہو، بشر کے معنی کہ جو چاہے اگر اللہ چاہے تو پورا کر دے نہ چاہے تو نہ پورا کرے، اس کے قبضے میں کچھ نہیں، تو جو بشر بشر ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ جو میں چاہوں وہ ہو وہ لفظوں میں نہیں کہہ رہا مگر دعویٰ خدائی کا کر رہا ہے۔ تو مطلب یہ تھا حضرت سید جیلانی قدس اللہ سرہٗ کا کہ کبھی اپنی بات پر اتنی ضد اور اصرار مت کرنا کہ جو میری مرضی ہے وہی ہو، جب چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں تو تم بھی اپنی کہہ دو دوسرے بھی کہیں کہ جو صورت بھی ہوگی اسے مان لینا، کسی کا یہ کہنا کہ جو میں چاہوں وہی ہو یہ اصرار اور دعویٰ خدائی ہے، چاہے لفظ نہ ہو اس میں، اور فرمایا کہ جو شخص یوں کہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اسکے سوا سب باطل، وہ در پردہ نبی ہونے کا مدعی ہے، کیونکہ نبی کی ذات ہوتی ہے جو کہہ دے وہ حق ہو، وہ کبھی غلط نہیں کہہ سکتا۔ تو نبی کے معنی ہی یہی ہیں کہ جو وہ فرمائیں زبان سے وہ عین سچ ہو اور حق ہو، اس میں غلطی کا شائبہ بھی نہ ہو، کذب اور جھوٹ کا خطرہ ہی نہ ہو، اس کے اندر وہی معنی نبوت کے ہیں کہ نبی صادق اور مصدوق ہوتے ہیں کہ خود بھی سچے اور ان کے سچے ہونے کی تصدیق اللہ سچے کی طرف سے کی جاتی ہے۔ تو بہر حال جب اس میں استفہام انکاری ہے: ﴿أَمْ تَسْـَٔلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ﴾ کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں؟ نہیں اجرت نہیں مانگتے، جب آپ نہیں مانگتے اور پھر بات سچی فرما رہے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے تو یہ معلوم ہوتا ہے ان میں ہٹ دھرمی ہے ضد پر اڑے ہوئے ہیں، کوئی حجت نہیں ہے ان کے پاس، اچھا دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی انکار کی کہ کہنے والا بیشک سچائی سے کہہ رہا ہے، اخلاص سے کہہ رہا ہے، مگر اس کے خلاف حجت ہمارے پاس موجود ہے خدا کی طرف سے کوئی دلیل آ گئی ہمارے ہاتھ میں، غرض اس کو کیوں مانیں؟ گو کہنے والا سچا ہے، بے غرض ہے، مخلص ہے، مگر ہماری ایک حجت سامنے ہے اسے کیوں مانیں؟ ظاہر بات ہے کہ حجت تو کوئی تھی نہیں ان کے پاس اس واسطے کہ حجت میں جو چیز ہوتی ہے وہ تو وہ ہے جو نبی کے ذریعے آئی ہو، وہ حجت ہی ہوتی ہے تو وہاں دین ابراہیمی علیہ السلام کو ختم کر چکے تھے مشرکین مکہ، وہ دین آسمانی ہی پر باقی نہیں تھے، یہودیت، نصرانیت کی طرف وہ بھی مائل تھے، اور ان میں بھی تحریف ہو چکی تھی، اور دین ابراہیمی باقی نہیں رہا تھا تو سوائے اوہام اور خیالات کے اور تھا کیا ان کے پاس؟ حجت دلیل کہاں تھی؟ کیا حجت، دلیل انھیں بتلاتی تھی کہ پتھر کی مورتیوں کے آگے جھکا کرو؟ کیا حجت اور دلیل کا کام تھا کہ وہ ننگے اور برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے، یہ کس دلیل سے سمجھا تھا انھوں نے، کیا یہ حجت اور دلیل کی بات تھی کہ نکاحوں کی چار قسمیں بنا رکھی تھیں، ایک تو اصلی نکاح جو... یت یہ کہ اگر کسی کے ہاں اولاد بدصورت ہوتی ہو تو کسی خوبصورت آدمی کے ہاں بیوی بھیج دیتا وہاں سے اولاد حاصل کرے وہ میری اولاد کہلائے گی، یہ ان کے ہاں جائز تھا۔ وہ

عقدِ نکاح کر لیتے تھوڑی دیر کے لئے اس کو کر لیا اور پھر اس کو الگ کر دیا، یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک نے نکاح کر لیا اور کئی بھائیوں کے لئے ایک بیوی ہی کافی ہوگئی یہ حجت اور دلیل کی بات تھی؟

اس کا نہ عقل ساتھ دے اور نہ نقل ساتھ دے، تو مطلب یہ کہ اللہ کے رسول نے جو حکم دیا ہے اگر اس لئے نہیں مانتے کہ ہمارے پاس پہلے سے کوئی سچی بات موجود ہے تو وہ کیا ہے لاؤ؟ وہ سچائی پیغمبر سے آئی ہوتی تو تمہارے ہاں دین ابراہیمی ختم ہو چکا، پیغمبر کا واسطہ ہی نہیں رہا، وہ ہے کہاں سچی بات؟ تو جب نہ کہنے والے میں خود غرضی کا شائبہ ہے اور نہ تمہارے پاس کوئی حجت ہے، اور پھر بھی نہیں مانتے سچی بات کو، تو سوائے ہٹ دھرمی عناد اور ضد کے علاوہ کیا چیز ہے؟ اور جب ثابت ہو گیا کہ یہ محض عناد سے انکار کر رہے ہیں، تو دل میں غیض پیدا ہوتا ہے یا تو ان کم بختوں کے لئے بددعا کر دیا یہ کہ ان سے بات کرنی چھوڑ دو ممکن تھا کہ قلب مبارک میں خیال آجاتا کہ میاں چھوڑو انھیں، یا یہ کہ بددعا کر دیتے کہ نہیں مانتے کم بخت یہ آپ کے بلند مرتبے سے مناسب نہیں تھا، اس لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرماتے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی یاددہانی کرائی جا رہی ہے۔

ثباتِ قلب کی ترغیب...... اس مقام پر آ کر آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا، یہ ارشاد ہے حضرت یونس بن متی علیہ السلام کی طرف جن کو مچھلی کے پیٹ میں قید کیا گیا تھا کہ انھوں نے قوم کے حق میں غصہ میں آ کر بددعا کر دی اور عذاب کا وعدہ دے دیا تھا آپ ایسا نہ کیجئے گا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی بڑی اعلیٰ بستیاں جو تھیں وہ اردن اور فلسطین میں آباد تھیں زرخیز خطہ تھا، آج بھی ہے، اس زمانے میں شام کا ملک عام تھا، اس میں فلسطین، اردن یہ سب شامل تھے، آج وہ حصے (بخرے) ہو گئے، اردن الگ ہو گیا، شام کا حصہ الگ ہو گیا، سینا کا حصہ کٹ گیا، لیکن اصل جغرافیے میں شام کا ملک عام تھا، جس میں اردن، فلسطین صحرائے سینا شامل تھے، یہی بنی اسرائیل کا مسکن تھا، تو بنی اسرائیل آباد تھے، اس زمانے میں اولوالعزم پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے، اور اس زمانے کا بادشاہ تھا حزقیہ اور وہ تابع تھا حضرت یوشع علیہ السلام کے، ان کا نام حضرت یوشع یا یشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام۔

بنی اسرائیل میں نبوت و ملوکیت کی ترتیب...... بنی اسرائیل میں حق تعالیٰ کی سنت کریمہ یہ تھی کہ ایک خاندان میں نبوت چل رہی تھی اور ایک خاندان میں بادشاہت چل رہی تھی، نبی احکام بھیجتے تھے، اور بادشاہ ان احکام کو نافذ کرتا تھا، بادشاہ اپنی طرف سے حکم نہیں بھیجتا تھا بس قوت نافذہ اس کے ہاتھ میں تھی اور قوت آمرہ پیغمبروں کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے کہا کہ اللہ کا یہ حکم ہے انھوں نے ملک میں قوت سے نافذ کر دیا، یا کوئی مشکل پیش آئی تو انبیاء کے آگے شکایت کر دی، انھوں نے تدبیر بتلائی بادشاہوں نے نافذ کر دی، تو شرافت کا یہ طریق تھا بنی اسرائیل میں کہ ایک سلسلہ نبوت کا تھا اور ایک سلسلہ بادشاہت کا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ احسان جتایا گیا بنی اسرائیل پر: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ ① موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو کہا کہ اے قوم احسان مانو اللہ کا اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ﴾ تم میں نبی بھی پیدا کئے، ملوک اور سلاطین بھی پیدا کیے، ایک مستقل خاندان کے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام آ رہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل میں پیغمبر آئے ہیں، اور ایک شاخ بادشاہت کی طرف چل رہی ہے اور پے در پے سلاطین اور بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ آ رہے ہیں تو بادشاہ تابع ہوتے تھے انبیاء کے، انبیاء احکام شریعت دیتے تھے، وہ اس کو نافذ کرتے تھے۔

یوشع علیہ السلام اور حذقیہ بادشاہ کا واقعہ...... تو اس زمانے کے اولوالامر پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے، اور حذقیہ بادشاہ تھا، اس طرح سے سلطنت چل رہی تھی، اور نبوت بھی تھی تو شام اور عراق کے درمیان میں چند بستیاں تھیں موصل اور نینوا، اس میں کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی آباد تھے اور ان کی اپنی حکومت تھی، وہ موقع پا کر چڑھ دوڑے بنی اسرائیل کے اوپر اور اردن کے اوپر انھوں نے حملہ کیا سرحدیں ملی ہوئی تھیں اس حملے میں بنی اسرائیل کا نقصان ہوا، وہ بہت زیادہ مال، اسباب لے گئے، ہزاروں آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئے، عورتوں اور بچوں کو بھی اور شکست دے دی حذقیہ جو بادشاہ تھے وہ پریشان ہوئے اس لئے کہ ملک ویران ہو گیا، ہزاروں آدمی قیدی بن کر چلے گئے، بنی اسرائیل میں انھوں نے آ کر شکایت کی حضرت یوشع علیہ السلام سے کہ یہ صورت حال پیش آئی، ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اس قوم پر حملہ کریں اور چھڑا لائیں اپنی قوم اور بستی کو، مگر ایک ڈر یہ ہے کہ ہمارے ہزاروں آدمی قید ہیں، جب ہم حملہ کریں گے وہ ان سب کو ذبح کر دیں گے، تو کسی کا باپ مارا جائیگا کسی کا بیٹا، کسی کا بھتیجا، ہزاروں کے رشتہ دار ختم ہو جائینگے، یہ مصیبت ہمیں پیش آ رہی ہے ورنہ ہم حملہ کر دیں، اس کی کیا صورت ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قوم کی آزادی کے لئے انتخاب...... حضرت یوشع علیہ السلام نے فرمایا کہ: ایک دم حملہ مت کرو، حجت تمام کرو اور وہ یہ ہے کہ اپنے میں سے کسی پیغمبر کو بھیجو کہ وہ جا کر ہدایت کرے اور نصیحت کرے، اور یہ کہے کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو کہ تم نے ظلماً ان کو قیدی کیا اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم پر عذاب خداوندی آئے گا، اگر وہ مان گئے اور بنی اسرائیل کو حوالے کر دیا تب تو ہمارا مقصد حاصل، پھر لڑنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ مانے تو حجت تمام ہو گئی، اس کے بعد اگر جنگ ہو گی تو برمحل ہو گی، انھیں کوئی الزام دینے کا موقع نہیں رہے گا تو بادشاہ کی سمجھ میں آ گیا عرض کیا کہ کسے بھیجیں فرمایا کہ اس وقت پانچ پیغمبر ہیں اور پیغمبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ سچے ہیں صادق اور کامل الاخلاص ہیں ان میں سے ایک کو مامور کر دو کہا کہ حضرت آپ ہی کسی کا انتخاب فرما دیں، محض بادشاہ کا حکم پیغمبروں میں چلے یہ بے ادبی کی بات ہے کہ جرأت کروں کہ میں پیغمبروں سے کہوں کہ آپ جایئے، آپ اولی الامر پیغمبر ہیں اسلئے آپ فرما دیں، تو انھوں نے انتخاب کر لیا کہ میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ یونس بن متی علیہ السلام کو بھیجیں وہ بہت بڑے امانت دار قوی الحوصلہ اور صاحب عزم ہیں وہ صاحب عزم

① پارہ: ۶، سورہ: المائدہ، الآیۃ: ۱۹۔

ہیں وہ جا کر نصیحت کریں گے، اور یہ بھی ان میں قوت ہے کہ اگر نصیحت نہ مانے تو وہ کوئی معجزہ دکھائیں کوئی کرامت دکھلائیں، اس سے متاثر کریں، پھر بھی نہ مانے تو تمھیں حق ہوگا کہ فوج کشی کریں۔

میرے نزدیک یہی بہتر ہے کہ یونس بن متی کو بھیجو، تو حزقیہ نے گھر کا آدمی بھیجا حضرت یونس علیہ السلام تشریف لائے، حزقیہ بادشاہ نے کہا کہ حضرت اس طرح آپ کا انتخاب ہوا ہے اور حضرت یوشع نے انتخاب کیا ہے میں تو واسطہ ہوں، میری عرض یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں اور جا کے نصیحت کریں، اس قوم کو جو ہمارے بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے لے گئی ہے، فرمایا کہ یہ وحی کے ذریعے ہے؟ فرمایا انھوں نے امر خداوندی ہے، فرمایا اگر یہ امر الٰہی ہے تب تو ہر صورت میں جاؤنگا، تعمیل مجھ پر فرض ہے، اور اگر محض رائے کی بات ہے تو میرے اوقات میں خلل پڑے گا، معمولات بگڑ جائیں گے، صبح شام عبادت کے میرے معمولات ہیں تو میرا سارا نظام بگڑ جائے گا، اس لئے کسی اور کا انتخاب کیا جائے، حزقیہ نے کہا کہ یہ وحی سے تو نہیں کیا مشورہ ہے (یونس علیہ السلام) نے کہا پھر مجھے چھوڑ دو، اس نے کہا کہ آپ کے سوا کسی اور کا انتخاب نہیں ہوا، جانا آپ کو پڑے گا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی بنی اسرائیل کی آزادی کے لئے روانگی...... جب مجبور کیا تو رنجیدہ ہوئے مگر کہا کہ بہت اچھا میں تعمیل حکم کرتا ہوں، اس لئے کہ تم بادشاہت میں امر کر رہے ہو پیغمبر کی طرف سے وہ اولوالامر پیغمبر ہیں، لہٰذا مجھ پر اطاعت واجب ہے چاہے وہ رائے و مشورہ ہی ہو حکم اور وحی نہ ہو لیکن بہر حال عظمت تو ہے ہی انبیاء کرام کی مشورہ بھی دیں تو وہ سو حکم سے بڑھ کر ہے ہمارے لئے، اس لئے بہر حال میں جارہا ہوں۔ بادل نخواستہ سفر کی تیاری کی اور چونکہ عرصہ لگتا طویل اس لئے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور روانہ ہو گئے، اس قوم کا جو دارالسلطنت تھا وہاں پہنچے اور وہاں جا کر دربار شاہی سے اجازت چاہی تو اجازت مل گئی، جا کر حضرت یونس علیہ السلام نے نصیحت کی اور کہا کہ: "بے وجہ تم نے ہماری قوم پر حملہ کیا، چلو حملہ ہو گیا تھا، مگر قیدی بنا کر لائے، یہ پیغمبر زادے ہیں واجب الاحترام ہیں تم نے انھیں قیدی بنالیا تو کچھ تو شرم کرنی چاہیئے، اول تو مجرم بنایا، بے وجہ جرم عائد کیا اور بے وجہ جو صاحب احترام تھے انھیں گرفتار کیا، یہ ہرگز مناسب نہیں چھوڑ دو بنی اسرائیل کو' بادشاہ نے اور درباروالوں نے مذاق اڑایا کہ ایک بزرگ سفید پوش آ گیا، اس نے مجنونانہ آ کر کہہ دیا کہ ان کو چھوڑ دو اتنی محنت سے ہم نے جنگ کی اتنے آدمی ہمارے مارے گئے لاکھوں روپیہ خرچ ہوا اور جب قیدی بنا کر لائے گئے تو ان کے کہنے سے چھوڑ دیں یہ حکومت ہے کھیل تھوڑا ہی ہے کہ کسی نے آ کر کہہ دیا: چھوڑ دو اور چھوڑ دیا۔ تو مذاق اڑایا اور تمسخر کیا، اگلے دن آپ پھر تشریف لے گئے یونس بن متی علیہ السلام، پھر نصیحت کی، انھوں نے پھر تمسخر کیا، استہزا کیا بات نہیں مانتے تھے، تیسرے دن پھر نصیحت کے لئے گئے اور پھر جا کر کہا انھوں نے نہیں مانا فرمایا: کہ نہیں مانتے تو اب میں کہتا ہوں کہ تمہارے اوپر عذاب خداوندی آئے گا۔

بادشاہ کا آزادی دینے سے انکار اور حضرت یونس علیہ السلام کی تنبیہ...... فرمایا: تم میں سے ایک بھی

زندہ نہیں بچے گا سب ہلاک ہو جائیں گے، یہ ملک بھی ویران ہو جائیگا، اس دن یہ کہہ کر چلے گئے، وہاں لوگوں میں جو ذمہ دار تھے حکومت کے، انھوں نے کہا کہ صاحب اس عذاب کی کوئی میعاد ہے؟ فرمایا: ہاں! چالیس دن کے اندر اندر آ جائیگا...... یہ کہہ دیا، انھوں نے مذاق اڑایا، تمسخر کیا اب حضرت یونس علیہ السلام نے دعاء کی کہ: اے اللہ! میں چالیس دن کہہ چکا ہوں میری لاج رکھ لیجئے، ورنہ میں ذلیل ہو جاؤنگا، اور اگر چالیس دن میں عذاب نہ آیا تو اس قوم کا قاعدہ یہ ہے کہ جھوٹے کو قتل کر دیتے ہیں، تو میں جان سے بھی جاؤنگا، آبرو بھی جائیگی اس واسطے چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیجئے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ کس نے کہا تم سے چالیس دن کی میعاد دے دو، تم نے محض اپنی رائے سے (مدت) رکھی گویا لازم کر دی، یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے، تم نے غلط حرکت کی اب نادم اور شرمندہ مگر دعا یہ مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! عذاب بھیجئے اس قوم پر ورنہ میں رسوا ہو جاؤنگا جب پچیس دن گزر گئے اور عذاب کے آثار نہ نمایاں ہوئے تو مایوس ہو کر بستی سے کافی دور جا کر ٹھہرے کہ عذاب تو آ نہیں رہا اور میں جھوٹا بنوں گا اور میری خفت ہوگی۔ ممکن ہے میری جان بھی جاتی رہے اور پھر یہی درخواست کہ یا اللہ عذاب بھیجئے، فرمایا: کہ کیسے بھیج دوں کیوں تم نے کہا ہم چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیں جب ہم نے تم پر منکشف نہیں کیا وحی نہیں بھیجی از خود تم نے کیسے چالیس دن کا وعدہ دے دیا؟ اب بہت پریشان ہوئے لیکن بہر حال پیغمبر کا قول تھا سچوں کی بات اللہ سچی بھی کرتا ہے۔

آثار عذاب اور قوم کی توبہ...... اس کے بعد جب ۳۵ دن گزرے ادھر تو حضرت یونس علیہ السلام مایوس ہو گئے کہ عذاب نہیں آئے گا اور میں جھوٹا بنوں گا، تو اس ملک کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور ادھر حق تعالیٰ نے عذاب کے آثار بھیجے اور قوم نے دیکھا کہ آسمان سے سیاہ قسم کے بادل تہہ در تہہ ہو کر آ رہے ہیں اور اسمیں سے دھواں نکل رہا ہے اور وہ دھواں قریب ہوتا جا رہا ہے اب لوگوں کو یقین ہوا کہ بیشک پیغمبر تھے جو بات کہی وہ سچی کہی یہ تو عذاب آیا اور یہ کہ آ گیا تو ایک نہیں بچے گا اب فکر پڑی بادشاہ کو بھی وزراء کو بھی امرائے دولت کو بھی اور قوم کو بھی، تو بادشاہ کی طرف سے اعلان ہوا کہ نکل کر میدان میں جائیں اور اپنے گریبان کھول کر کے اللہ کے سامنے فریاد کرنی شروع کر دو اور روؤ پیٹو حق تعالیٰ کے سامنے کہ یہ تو آ گیا عذاب۔ چنانچہ ساری قوم شہر سے باہر نکلی ننگے سر، ننگے پیر، بادشاہ بھی ساتھ، وزراء بھی ساتھ، ننگے سر، ننگے پیر، گریبان کھلے ہوئے، بال بکھرے ہوئے، روتے ہوئے آ کے سجدے میں گرے، اور کہا کہ: اے اللہ! ہم سے غلطی ہوگئی، تیرے نبی نے جو وعدہ دیا تھا، وہ سچا تھا، اور آپ اس عذاب کو اٹھا دیں تو ہم بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، اور جو علاقہ لیا وہ بھی چھوڑ دیں گے، دو تین دن تک مسلسل اسی طرح شہر سے باہر آ کے روتے رہے، حق تعالیٰ کو یہ عجز وانکسار پسند آیا اور وہاں تو عجز وانکسار ہی پسند ہے کبر ونخوت پسند نہیں ہے، کبر اور کبریائی یہ اسی کا خاصہ ہے کسی بندے کو حق نہیں ہے تکبر کرنے کا، بندے کا حق یہی ہے کہ وہ عجز اور فروتنی اور خاکساری اور جھکنا ہی اختیار کرے، حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور تین دن رہ گئے تھے

چالیس دن ہونے میں کہ وہ دھواں اوپر اٹھنا شروع ہوا اور چند گھنٹے میں پورا آسمان صاف ہوگیا، جو کئی دن سے سیاہی پھیلی ہوئی تھی آسمان پہ اور دھواں پھیل رہا تھا وہ سب صاف ہوگیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش......اب یہ مطمئن ہوئے تو بادشاہ نے آدمی دوڑائے کہ اس گدڑی پوش فقیر کو پکڑ کر لاؤ کہ اس کے آگے بھی ہاتھ جوڑیں اور ان سے کہیں کہ تم بھی دعاء کرو اور بنی اسرائیل کو ان کے حوالے کریں اور جو جوانھوں نے کہا تھا اس کی تعمیل کریں، اور ان پر ایمان لائیں انہی کے مطابق سب چلیں۔ یونس علیہ السلام ملک چھوڑ کر جا چکے تھے کہ جب عذاب نہیں آ رہا تو میری خفت ہوگی، تو میں اس ملک میں نہیں رہ سکتا، ادھر بادشاہ نے اعلان کیا کہ ڈھونڈ واس فقیر کو جہاں بھی ہو، حتی کہ یہ اعلان کیا کہ جو لے آئیگا انھیں تو ایک دن کے لئے پوری سلطنت کا مالک بنا دوں گا، اس ایک دن میں وہ جو چاہے خرچ کرے، جو چاہے اپنے لئے لے لے اس کارخانے میں سے جو چاہے لے، جاگیریں، املاک ایک دن کے لئے ملک اس کا۔ تو سینکڑوں آدمی نکل گئے ڈھونڈنے مگر پورے ملک میں ڈھونڈ لیا لیکن یونس علیہ السلام کا پتہ نہ چلا، یونس علیہ السلام نے سوچا اور کچھ دیہاتیوں سے معلوم ہوا کہ کچھ آثار عذاب کے آئے تھے اور وہ رفع ہوگیا، اور آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں یہ یوں سمجھے کہ عذاب نہیں آیا تو میرے قتل کرنے کے لئے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام پر آثار عتاب کا آغاز......تو میں وہاں جا کر جان خواہ مخواہ جوکھوں میں ڈالوں، میری بات تو ہوئی نہیں اور سخت مغموم اور رنجیدہ کہ میری بات تو رہی نہیں، اللہ نے مجھے وہاں ذلیل کر دیا حالانکہ وہاں تو ان کی انتہائی عزت ہو رہی ہے اور انھیں پتہ نہیں، اور یہ سوچ رہے ہیں کہ میں وہاں گیا تو اور ذلت ہوگی میری، اور ادھر شام کی طرف بھی نہیں لوٹے کہ اپنوں میں جب جاؤں گا تو وہ الگ مجھے ذلیل سمجھیں گے کہ تجھے بھیجا تھا اصلاح کے لئے وہ تو نہ ہوسکی وعدے دیئے وہ پورے نہ ہوئے اور اللہ کے ہاں بھی تم ملزم قرار پاگئے، تو تمھاری کوئی وقعت نہیں تو نہ وہاں وقعت ہوگی اور نہ یہاں تو میں کسی تیسری جگہ جاؤں اور یہ کہہ کے قدم بڑھایا اور دل میں آ گیا کہ میں حق تعالیٰ کی نظر سے گر گیا ہوں اور میرے سے غلطی ہوئی اور میں نے بلا مرضی حق چالیس دن کا وعدہ دے دیا جو مجھے حق نہیں تھا، غلطی کا احساس ہوا اور وہ وجہ عتاب بنی، جب روانہ ہوئے تو صورت حال یہ ہوئی کہ تشریف لے جا رہے تھے بیوی بچے پیدل ساتھ، ایک درخت کے نیچے بیوی کو بھی بٹھلا دیا اور بچوں کو بھی، اور خود کھانا تلاش کرنے گئے وہاں کوئی شہزادہ نکل رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین وجمیل عورت دو بچوں کو لئے بیٹھی ہے اس نے حکم دیا کہ اس عورت کو گرفتار کر کے ہمارے محل میں داخل کر دو اس کی طبیعت مائل ہوگئی، عورت بیوی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ تو گرفتار ہو کر شہزادے کے ساتھ چلی گئی، اب جو آئے تو دیکھا کہ بیوی نہیں ہے تو دیہات والوں نے بیان کیا کہ اس طرح ایک بادشاہ زادہ آیا اور وہ آپ کی بیوی کو لے گیا، سمجھ گئے کہ یہ عتاب کے آثار شروع ہوگئے صبر وشکر کیا دو بچوں میں سے ایک کو کندھے پہ لیا اور ایک کا ہاتھ پکڑا اور دریا کے

پار ہونا چاہا دریا ایسا تھا کہ کشتی کی ضرورت نہیں تھی، دریا میں اترے تو ایک بچے کو چھوڑ دیا کنارے پہ کہ ایک کو اس کنارے چھوڑ کر پھر اس کو لے جاؤں گا جب بیچ منجھدار پہنچے تو بھیڑیا آ کر اس بچے کو اٹھا لے گیا اس کی پریشانی میں جب دوڑے بچانے کو تو جو کندھے پر تھا وہ پانی میں گر پڑا وہ بہہ گیا بیوی بھی گئی، بچے بھی گئے اب سمجھ گئے کہ میں اس وقت زیر عتاب ہوں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ چیزیں بطور عتاب کے بطور سزا کے مجھ پر مسلط ہیں استغفار کر رہے ہیں رو رہے ہیں اسی طرح روانہ ہوئے۔

کشتی میں سواری......اب بالآخر ایک بڑا دریا آ گیا تو کشتی میں بیٹھے اور اس سے کہا کہ بھائی کرایہ تو میرے پاس ہے نہیں میں مفلس ہوں، تم لوجہ اللہ مجھے بٹھالو، تو کشتی والے نے کہا کہ آپ کو ضرور بٹھلائیں گے آپ کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑے صالح اور نہایت ہی عابد اور زاہد لوگوں میں ہیں، تو ہماری کشتی میں برکت ہو جائے گی، میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا، آپ تشریف رکھیں بڑے احترام سے بٹھلایا، جب بیچ منجدھار کے کشتی پہنچی تو ایک دم طوفان نے آ کر کشتی کو گھیرا اور کشتی کا ملاح پریشان ہوا کہ کیا صورت ہو گی، تو اس زمانے میں چونکہ لوگ نیک دل ہوتے تھے، اور محض پیسے کے پجاری نہیں تھے، بلکہ کچھ تعلق مع اللہ بھی ہوتا تھا، تو کپتان نے آ کر کہا کہ صاحب! تجربہ یہ ہے کہ جس قسم کا طوفان ہے یہ جب آتا ہے کہ جب میری کشتی میں کوئی ایسا شخص ہو کہ جو اپنے مالک کا نافرمان اور آقا سے بھاگا ہوا غلام ہو، یہ اس قسم کا طوفان آ رہا ہے تو اس وقت کشتی میں کوئی ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو آقا کا نافرمان ہے اور اپنے مالک کا نافرمان غلام ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ یہ خاص نوعیت کا طوفان ہے اور یہ جبھی آتا ہے جب کوئی عبدِ آبق بھاگا ہوا غلام آ جائے جس سے آقا راضی نہ ہو، تو اس نے کہا کہ جو ہو دیانۃً وہ اپنے کو ہمارے حوالے کر دے ہم اسے دریا میں ڈبو دیں گے ایک کی جان چلی جائے آسان ہے بنسبت اس کے کہ ایک کی وجہ سے ساری کشتی تباہ ہو جائے اور کئی آدمی ضائع ہوں تو ایک اپنے کو حوالے کر دے، اس کے بغیر یہ طوفان ٹلنے والا نہیں، میرا تجربہ یہ ہے۔ یونس علیہ السلام اٹھے اور کہا کہ میں وہ غلام ہوں جو آقا سے بھاگ گیا ہے اور نافرمانی کی ہے میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں بھائی مجھے غرق کر دو تا کہ سب کشتی والوں کی جان بچ جائے وہ عبد آبق میں ہوں بھاگا ہوا غلام، لوگوں نے کہا کہ معاذ اللہ آپ ایسے نہیں ہو سکتے آپ کے چہرے پر بزرگی کے آثار ہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں تواضعاً کہہ رہے ہیں آپ جیسا نافرمان ہو گا تو پھر فرماں بردار کہاں رہے گا دنیا میں؟ آپ تو اضعاً کہہ رہے ہیں۔

کشتی میں قرعہ اندازی......ہم قرعہ ڈالتے ہیں پوری کشتی میں جو نکل آئے تو قرعہ ڈالا تو قرعہ میں جب دانہ اٹھایا تو نام یونس علیہ السلام کا نکلا، اب کشتی والے حیران ہوئے سمجھے کہ ہمارا قرعہ غلط ہو گیا، یونس علیہ السلام ایسی مقدس صورت والا آدمی عبد آبق بھاگا ہوا غلام کیسے ہو سکتا ہے، دوبارہ قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام آیا، پھر یقین نہ آیا کشتی والوں کو، تیسری دفعہ پھر قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام نکلا تب عاجز ہو کر بیٹھ گئے یونس علیہ السلام نے فرمایا: کہ میں

حقیقتاً اپنے مالک کا بھاگا ہوا غلام ہوں میں زیرِ عتاب ہوں۔

مچھلی کے پیٹ میں...... میں اپنی وجہ سے تمہاری جانیں ختم کرنا نہیں چاہتا میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں، تم مجھے ڈبودو، تاکہ کشتی والوں کی جان بچ جائے، مجبور ہو کر ڈبودیا اور ڈال دیا دریا میں، ایک دم طوفان ہٹ گیا اور کشتی آگے روانہ ہوگئی، وہاں ایک مچھلی منہ کھولے ہوئے کھڑی تھی، ایک بڑی مچھلی وہ بھوکی تھی، اسے غذا کی ضرورت تھی، اس نے لپک کے یونس علیہ السلام کو پکڑا اور اپنے پیٹ میں لے لیا، حق تعالیٰ نے اس کے قلب میں القاء فرمایا کہ یہ ہمارے پیغمبر ہیں ان کو کوئی اذیت نہ پہنچے، ہم نے تیرے پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کے لئے یہ غذا کے لئے اور غذا کے طور پر نہیں ڈال رہے تیرے پیٹ میں، بلکہ اس لئے ڈال رہے ہیں کہ کچھ سزا دینی ہے، بس پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کو اسی میں رکھ، بیچاری نے بے چبائے نگل لیا اسے من جانب اللہ حکم تھا، اور اس کی ساخت اس وقت اللہ نے ایسی کردی کہ وہ جیل بن گئی، وہ انتڑیاں وَنتڑیاں جو تھیں وہ فراخ ہوگئیں، اور یہ بہت بڑی مچھلی تھی باطمینان یونس علیہ السلام اس کے پیٹ میں گئے، اب بہرحال وہاں بند ہیں حق تعالیٰ نے سانس کا سامان سب کچھ کیا مگر نہ غذا، نہ روٹی۔

القاء دعاء...... چالیس دن گزر گئے مچھلی کے پیٹ میں اخیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے قلب میں حق تعالیٰ نے وہ دعاء القاء فرمائی جو نجات کا ذریعہ بنی، وہ دعاء یہ تھی: ﴿لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ ① جسکو ہم آیت کریمہ کہتے ہیں یہ دعاء ہے یونس علیہ السلام کی، یہ پڑھی یونس علیہ السلام نے اس کی برکت سے اس مچھلی کو ایک امتلاء اور غثیان پیدا ہوا، جیسے متلی ہوتی ہے اور اس نے ایک کنارے پر آ کر تے کی تو یونس علیہ السلام باہر نکل آئے اور وہ روانہ ہوگئی۔

مچھلی کے پیٹ سے نجات، لباس اور غذا کا سامان...... یونس علیہ السلام چونکہ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے ہو، ابھی بند تھی، غذا بھی نہیں تھی، اس لئے کمزور بھی ہوگئے تھے اور بدن اتنا نرما گیا تھا کہ اگر چیونٹی بھی بیٹھتی تھی تو یوں معلوم ہوتا جیسے تیر لگا ہو، مکھی بھی بیٹھتی تو یہ معلوم ہوتا جیسے برچھا لگ گیا، بہت اذیت ہوتی تھی، حق تعالیٰ نے وہیں ایک کدو کی بیل لگائی چوڑے چوڑے پتے اتنے ان کے اردگرد پھیل گئے کہ وہ بمنزلہ لباس کے بن گئے، اور اس کے قریب نہ مکھی آتی تھی نہ مچھر آتا تھا اس نے مثل لباس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیا تو بدن کی حفاظت حق تعالیٰ نے اس طرح سے فرمائی کہ یقطین کدو کی بیل اگادی، اب بھوک کی وجہ سے بے تاب تھے، چالیس دن کچھ بھی نہ ملا تھا، اور خود ہلنے کی سکت نہ تھی اور کچھ کرتے بھی تو وہ بیل کدو کی لپٹ گئی چاروں طرف سے حفاظت کے لئے حق تعالیٰ نے ایک ہرنی کے قلب میں القاء کیا، اس نے آ کر ان کے منہ کے قریب اس طرح اپنے تھن کئے کہ تھن منہ میں پہنچ گئے، چوسا تو دودھ آنا شروع ہوگیا، وہ روز آتی اور روز آ کر کے دودھ پلا جاتی، تو بیس پچیس دن جتنے اللہ کے علم میں ہیں وہ ہرنی دودھ پلا جاتی اور کدو کے پتے سے بدن سخنا گیا۔ پچیس، تیس دن

① پارہ: ١٧، سورة: الانبياء، الآية: ٨٧.

میں اب اس قابل ہو گئے کہ اٹھ سکیں اس وقت حق تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کے دعا کی کہ اے اللہ! بیشک مجھ سے غلطی ہوئی مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ وعدہ دوں چالیس دن کا، بغیر آپ کی منشا اور فرمان کے مجھ سے غلطی سرزد ہوئی آپ ہی معاف فرمانے والے ہیں اور بہت روئے اور استغفار کیا حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور معاف فرمایا۔

منصبِ رسالت کا اعزاز......اور اب تک نبوت تھی اب رسالت اور اصلاح کا عہدہ بھی دیا کہ تمہیں ہی مبعوث کیا جارہا ہے اس قوم کی طرف کہ جس کی طرف تم گئے تھے اور تم جاؤ اس کی طرف، اب اطمینان سے انشراح کے ساتھ چلے تو ایک درخت کے نیچے جب پہنچے تو دیکھا کہ کچھ دیہاتی کھڑے ہیں ایک عورت کو لئے ہوئے، یونس علیہ السلام نے دیکھ کر پوچھا کہ بھائی یہ کون ہے تو دیہاتیوں نے کہا کہ یہ ایک عورت ہے جس کو شہزادہ لے گیا تھا پکڑ کے یہ کسی بزرگ کی بیوی تھی لیکن لے جاتے ہی جب اس نے بری نیت کا اظہار کیا تو وہ اس دن سے آج تک اتنا مریض ہے کہ چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہیں پیٹ میں اس کے درد ہے، اس وجہ سے اس نے باحترام اس عورت کو رکھا اور اس کا احترام کیا عزت کی وہ اپنی عبادت میں لگی رہی۔

آثارِ رضا......اب وہ شہزادہ اس ٹوہ میں ہے کہ وہ بزرگ کہیں سے مل جائیں جن کی بیوی کو میں لے گیا تھا، میں ان سے دعا کراؤں گا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی یہ میری ہی بیوی ہے اور میں وہی شخص ہوں کہ جس کی بیوی کو لے گیا تھا انہوں نے کہا حضور وہ شہزادہ مر رہا ہے وہ تو آپ کی تلاش میں ہے، یونس علیہ السلام گئے اور اس کے لئے دعاء کی اس کو اللہ نے اچھا کیا تو بیوی مل گئی، اس کے بعد کشتی میں بیٹھے ایک کنارے پر پہنچے تو کچھ لوگ ایک بچے کو لئے ہوئے کھڑے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ صاحب یہ ایک بچہ تھا جس کو ایک بھیڑیا لے گیا تھا، ہم نے بمشکل بھیڑیے کو مار مار کے بچے کو حاصل کیا، یہ زخمی ہو گیا تھا تو ہم نے علاج کیا دوا کی اب یہ بالکل تندرست ہے، یہ یوں کہتا ہے کہ میرا ایک بوڑھا باپ میرے ساتھ تھا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ باپ میں ہی ہوں یہ بچہ میرا ہے، بچہ حق تعالیٰ نے دے دیا کچھ آگے چلے تو چند دیہاتی اور ملے کہ جی یہ بچہ دریا میں بہتا ہوا جارہا تھا موجوں میں، ہم نے اسے پکڑا، پکڑ کے اس کا پیٹ ویٹ صاف کیا، پانی نکالا یہ کسی لاوارث کا بچہ معلوم ہوتا ہے لاوارثہ ہے، فرمایا کہ نہیں یہ بچہ میرا ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ کو مبارک ہو بچہ بھی مل گیا۔ اب اس کے بعد یونس علیہ السلام آگے بڑھے اور حق تعالیٰ کی رضا کے آثار آنا شروع ہوئے تو آزمائش بھی بہت ہوئی ہے کہ جب کوئی عہد دیتے ہیں تو پھر جانچ بھی خوب کی جاتی ہے، دوستی کو بھی پرکھا جاتا ہے جب جاکر فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو یہ سامنے گاؤں آرہا ہے، فلاں کمہار ہے جو برتن پکاتا ہے، اس نے آج ہی اپنا آوا نکالا ہے، سینکڑوں قسم قسم کے برتن رکھے ہیں اس سے جاکے یوں کہو کہ لاٹھی لے کر سارے برتنوں کو پھوڑ دو یہ اس سے کہو، اگر وہ پھوڑ دے تب تو ٹھیک اور نہ پھوڑے تو جو جواب دے وہ آکر ہماری جناب میں عرض کرو یونس علیہ السلام گئے اور وہ آوا کھول کر کے اس نے برتن ٹکائے، گھڑے اور مٹکے، طرح طرح کی صراحیاں پیالے ٹکا کر

رکھے ہوئے تھے، اسے امید بندھ گئی تھی کہ اب یہ پکیں گے تو گزر چلے گا، یونس علیہ السلام پہنچے کہ لاٹھی لے کر پھوڑ کیوں نہیں دیتے انہیں، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے اتنی محنت سے میں نے بنائے چالیس دن تک آگ میں رہے پکا کے اب امیدیں برلانے کا وقت آیا تو کہتا ہے کہ پھوڑ دے، دنیا میں کہیں ایسا ہوا، واپس آئے نماز پڑھی سجدے میں عرض کیا یا اللہ یہ جواب دیا، فرمایا کہ ایک کمہار چالیس دن میں چند برتن بناتا ہے، اس کا دل اتنا اٹکا ہوا ہے کہ پھوڑنا گوارا نہیں تم نے جو ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے حق میں چالیس دن کا وعدہ دے دیا کہ ہم عذاب نازل کر دیں تو کیا ہمیں تم نے یہ سمجھا تھا کہ بیکار بنایا ہے ہم نے اس مخلوق کو اور ہم اپنے ہاتھ سے پھوڑ دیں، جبکہ ہمارے علم میں تھا کہ ایمان لاسکتی ہے وہ قوم اور اس کے دل میں نرمی آنے والی ہے، ہم کیسے ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دیں۔

پھر توبہ اور استغفار کی کہ بے شک اے اللہ مجھ سے غلطی ہوئی اس کے بعد آگے چلے تو ایک شہر میں گزرے تو بڑی بھاری بلڈنگ بنائی تھی کسی تاجر نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بڑا عالیشان محل بنایا، کہا کہ اس سے جا کے یوں کہو کہ سارے محل کو کدال لے کر ڈھا دے، اور جو جواب دے وہ ہمیں آ کر کہنا تو جا کر اس تاجر سے کہا کہ کتنے میں بنایا تو اس نے کہا کہ اتنے لاکھ روپے لگے ہیں اتنے ہزار کا فرنیچر ہے، یہ سامان ہے، بولے: دیا سلائی لگا کر جلا کیوں نہیں دیتا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، کہا کہ تو پاگل آدمی ہے اتنے برسوں میں میں نے محل بنایا لاکھوں روپیہ خرچ کیا محنت کی مزدوری کر کے بنایا اور میں اپنے ہاتھ سے ضائع کر دوں، آ کر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ اینٹ گارے کا ایک محل ایک مالک اپنے ہاتھ سے برباد کرنا نہیں چاہتا اور ہم نے یہ اشرف المخلوقات ڈیڑھ لاکھ بنائی تم نے کیسے وعدہ دے دیا کہ ہم اپنے ہاتھ سے ضائع کر دیں پھر شرمندہ ہوئے پھر دعا پھر استغفار پھر توبہ کی۔

پھر ایک باغ سے گزر ہوا تو بڑا عالی شان ہرا ابھرا، فرمایا اس کے مالک سے یوں کہو کہ ابھی دیا سلائی لگا کے سارے باغ کو پھونک دے جتنے مویشی ہیں سب ختم کر دے، اور جو وہ جواب دے ہمیں آ کر سناؤ پھر گئے اور مالک باغ کو جا کر کہا، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے، برسہا برس محنت کرنے سے میرا باغ پلا درخت پھل دینے کے قابل ہوئے اور اب میں تیرے کہنے سے دیا سلائی دکھا دوں کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے آ کر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ باغ والا تو چار تنکے ضائع نہیں کر سکتا، اور تم نے چالیس دن یہ دعا مانگی کہ میں ان ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دوں جب کہ ان کے اندر استعداد تھی ایمان قبول کرنے کی وہ عذاب کے قابل بھی نہیں تھے، غرض پھر توبہ اور استغفار کی۔

اسی طرح جا رہے تھے ادھر سے وہ لوگ ملے موصل اور نینوا کے اور وہ دیکھ کر لپکے یونس علیہ السلام کی طرف تو پہلے تو ڈرے کہ مجھے قتل کرنے تو نہیں آ رہے اس لئے کہ میں نے وعدہ دیا تھا عذاب کا وہ تو آیا نہیں عذاب مجھے جھوٹا سمجھنے لگے مگر معلوم ہوا کہ وہ تو اعزاز و اکرام کے ساتھ، مروّت کے ساتھ آ رہے ہیں، غرض انہوں نے آ کر یونس علیہ السلام کو پہچانا تعظیم و تکریم کی، کہا کہ آپ نے جو وعدہ دیا تھا تو چالیس دن کے اندر اندر عذاب کے آثار نمایاں

ہو گئے تھے، لیکن ہم نے توبہ کی استغفار کی اللہ نے وہ عذاب رفع کیا، اس دن سے آج تک آپ کی فکر میں ہیں کہ آپ کہاں ملیں آج آپ ملے تو پھر بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو وہ پورے اہتمام کے ساتھ استقبال کے لئے لے گیا اور ساری قوم نے ایمان قبول کیا، یونس بن متّی علیہ السلام کے ہاتھ پر اور یقین دلایا اطاعت کا حق تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ منصبِ رسالت بخشا کہ اب اس قوم کی اصلاح کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقصودِ تمثیل...... تو اس کو فرمایا جا رہا ہے کہ: ﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ اے پیغمبر! مچھلی والے کی طرح مت ہو جانا کہ انہوں نے غصہ میں آ کر تین دن کے بعد عذاب کی دھمکی دی، اور ساتھ میں وعدہ دے دیا چالیس دن کی میعاد مقرر کر دی، اور یہ سب غصہ ہو کر کہا جذبات میں آ کر جس سے کتنے معتوب ہوئے، کتنی ان کی آزمائش ہوئی، کتنی تکلیفیں اٹھائیں لیکن وہ آزمائش میں پورے اترے پھر ہم نے انہیں رتبہ دیا، منصبِ رسالت سے نوازا مگر بہر حال ابتداً وہ جذبات دکھا گئے غصہ سے مغلوب ہو گئے بددعا کی، قوم کے لئے عذاب مانگا، آپ کو ہم نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے آپ بددعا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، اگر یہ نہیں مانتے باوجود یہ کہ جانتے ہیں کہ آپ خود غرض نہیں کوئی غرض متعلق نہیں، کوئی اجرت نہیں چاہتے، کمال اخلاص سے انہی کی خیر خواہی کے لئے آپ ہدایت فرما رہے ہیں، اور ساتھ ہی ان کے پاس کوئی حجت بھی نہیں تو ممکن تھا کہ آپ کی طبیعت میں ضیق پیدا ہو، مگر آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں آپ تو ہدایت کئے جائیں، اور مچھلی والے کی طرح غصہ میں آ کر کبھی بددعا نہ کریں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔

تو اپنے نبی کے دین کو تھا مو دلائل کی رو سے بھی اصول کی رو سے بھی اور تاریخ کی وجہ سے بھی تاریخ کی رو سے واقعہ سنایا یونس بن متّی علیہ السلام کا اور دلائل کی رو سے دو چیزیں پیش کیں کہ سچی بات سے انکار کی وجہ دو ہو سکتی ہیں یا کہنے والے کی خود غرضی محسوس ہو یا اپنے پاس حجت ہو تو فرمایا کہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں کہ ﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ﴾ کیا آپ ان سے سوال کریں گے اجرت کا کہ اس میں یہ دبے جا رہے ہیں کہ اجرت ادا نہ کرنی پڑے۔ ﴿أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ﴾ یا کوئی غیب سے خبر آ گئی ہے ان کے پاس یا کوئی حجت آئی ہے جسے لکھ رکھا ہے اس لئے آپ کی بات نہیں مانتے، جب یہ بات (کھل گئی) تو محض ہٹ دھرمی اور عناد ہے اس میں ممکن ہے کہ آپ کے دل میں جوش اور جذبہ آ جائے تو فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ اپنے رب کے حکم پر آپ جمے رہیے صبر کیجئے اور مچھلی والے کی طرح سے نہ ہو جایئے کہ غصہ میں آ کر بددعا کر دیں آپ کی شان بہت بالا ہے۔ ﴿إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ﴾ جبکہ انہوں نے نداء کی تھی کہ اے اللہ! عذاب بھیج دے اور غصہ میں وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ جوش آ رہا تھا قوم کے اوپر کہ یہ کم بخت مان نہیں رہے تھے۔ اور تین دن میں یا تین مہینے میں یا تین برس میں آپ ان کی باتیں ہٹ دھرمی میں سن سن کر (گھبرا گئے) گویا کہ آپ کی یہی شان تھی کہ دوسروں نے فرمائش کی غزوۂ احد کے موقع پہ کہ یا رسول اللہ بددعاء

کیجئے فرمایا کہ: "اِنِّیْ بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا" ① میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں عذاب بنا کے نہیں بھیجا گیا، بددعائیں کرنے والا بنا کے نہیں بھیجا گیا۔

آگے فرمایا: ﴿لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ﴾ اگر اللہ کی نعمت اور اس کا لطف و کرم تدارک نہ کرتا یونس علیہ السلام پر تو وہ ضائع ہو چکے ہوتے مچھلی کے پیٹ میں یا ریگستان میں یا دریا میں سینکڑوں آفتیں آئیں ہمارے ہی لطف و کرم نے تو نکالا مصیبتوں سے تو تدارک کیا اگر حق تعالیٰ تدارک نہ فرماتے تو غضب میں مغلوب ہو کر وہ اپنے کو ضائع کر چکے ہوتے مگر ہم نے تھام لیا، ادھر ان کی بات قوم میں بھی رکھی کہ عذاب کے آثار بھی نمایاں کر دیئے کہ اس کے دل میں جو سچائی رہی اور انجام کتنا ہم نے بہتر کیا ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ پھر اللہ نے انہیں منتخب کیا اور صالحین میں سے بنایا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گویا تسلی دی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ثبات و استقلال دینے کے لئے اصول اور تاریخ دونوں چیزیں پیش کر دی گئیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ علم نافع عمل صالح اخلاق فاضلہ اور انجام صحیح عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن لعن الدواب وغيرها ج: ١٢ ص: ٣٩٣ رقم: ٣٧٠٣.

مقاصدِ شریعت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ صدق الله العظيم ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس وقت مجھے اس آیت کی تفسیر کرنا یا اس آیت کے مضامین پر گفتگو کرنا مقصود نہیں بلکہ اس آیت سے تین مقاصد مستنبط کرنے ہیں جو دین کے مقاصد ہیں انہیں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، یہ مقاصد الگ الگ بھی آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور واضح طریقے پر بیان کئے گئے ہیں، لیکن عربیّت کا ایک قاعدہ ہے: الکنایة ابلغ من التصریح جو چیز کنایہ یا اشارہ سے ادا ہوتی ہے بہ نسبت صراحت وہ زیادہ بلیغ ہوتی ہے، اس واسطے خیال ہُوا کہ ان تینوں مقاصد کو اس آیت کی روشنی میں عرض کیا جائے اور ساتھ ہی اس بناء پر کہ ان تینوں مقاصد کی طرف اس آیت میں اشارہ بھی ہو رہا ہے اس طرح ایک جگہ مجتمع ہو کر وہ تینوں مقاصد آ جاتے ہیں، تو بجائے تین آیتیں الگ الگ پڑھنے کے اسی ایک آیت کی تلاوت کو کافی سمجھا گیا کہ وہ تینوں مقصد اس آیت میں آ جائیں گے۔

تعیینِ مقاصد...... وہ شریعت کے تین مقاصد کیا ہیں! تو اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام تین تعلقات کو درست کرنے کے لئے آئی ہے، وہ تین تعلقات اگر درست ہو جائیں تو وہی آدمی شریعت کی اتباع میں کامل سمجھا جائے گا، ایک تعلق میں بھی اگر کمی رہ گئی تو اتنا ہی اس کے دین میں اور اس کے اسلام میں کمی رہ جائے گی تو وہ تین تعلقات جن کی تکمیل کے لئے جن کی اصلاح کے لئے شریعتِ اسلام دنیا میں بھیجی گئی، کیا ہیں؟

① پارہ: ا، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۱، ۲۲.

ایک تعلق مع اللہ کہ بندہ کا اپنے خدا سے کیا تعلق ہے؟ اس کی کیا نوعیت ہے، دوسرا تعلق مع الخلق کہ بندوں کا اپنے بھائیوں سے اور مخلوق سے کیا تعلق ہے، تیسرا تعلق مع النفس کہ خود اپنے نفس سے اس کا کیا تعلق ہے؟

یہ تین تعلقات ہیں جن کو صحیح کرنا مقصود ہے اور اسی پر شریعت کے تمام احکام پھیلے ہوئے ہیں، بندہ خدا تعالیٰ سے کس طرح سے رابطہ پیدا کرے، بندہ بندوں سے کس طرح معاملہ کرے؟ اور بندے کو اپنے نفس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے، اگر یہ تین معاملے درست ہو گئے تو وہ کامل انسان سمجھا جاتا ہے، ان میں اگر خلل رہ گیا تو اُتنا ہی خلل اس کے دین و دیانت میں رہ جائے گا اور کہا جائیگا کہ مسلمان ہے مگر ناقص مسلمان، اس لئے کہ تینوں تعلقات اس کے صحیح ہونے چاہئیں تھے۔

تعلّق مع اللہ کی بنیاد "عبدیت"...... تعلق مع اللہ کی بنیاد عبدیت پر ہے کہ بندہ اپنی عبدیت کو پہچان لے اور اللہ کی معبودیت کو پہچان لے، یہ نسبت درست ہو جائے کہ وہ معبود ہے، میں عابد اور عبدیت کی شان اس میں آجائے، اس وقت کہا جائے گا کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو گیا، عبدیت ہو یعنی جتنی بھی بڑائی اور عظمت ہے وہ اللہ کے لئے مخصوص سمجھے۔ ﴿وله الكبرياء في السموات والارض وهو العزيز الحكيم﴾ ساری بڑائیاں آسمانوں میں اور زمینوں میں اللہ ہی کے لئے ہیں، وہی ہے عزیز و حکیم، عزت والا بھی وہی ہے حکمت والا بھی وہی ہے، تو عزت کا کوئی شائبہ بمقابلہ حق اپنے اندر نہ ہونا چاہئے، بلکہ عزت کے مقابلہ میں پوری ذلت اپنے نفس کی ہونی چاہئے اور کمالِ عزت حق تعالیٰ کی ذہن میں ہو، تب وہ نسبتِ عبدیت درست ہوگی، اگر کبر ذرا سا بھی باقی رہ گیا تو نسبت عبدیت میں فرق آجائے گا۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ" ① جنت میں وہ داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نے حق تعالیٰ کی کبریائی کو نہیں سمجھا اور جب اس کی کبریائی اور عظمت کو نہ جانا تو اپنی ذلت کو نہ سمجھا اور اپنے اندر تکبر کیا تو کبریائی اور عظمت یہ ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص ہے، دنیا میں بندہ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا، تو اس کی چال میں ڈھال میں قال میں، حال میں ہر چیز میں عبدیت ہونی چاہئے، جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ ② چال میں اپنی میانہ روی اور نرمی پیدا کرو، اکڑ کر چلو گے تو چال میں کبر آجائے گا جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، یعنی ایسی چال سے چلو جس میں تواضع بھی ہو، کبر نہ ہو اور ساتھ میں ضعف بھی نہ ہو، یعنی نہ تو بیماروں کی چال چلو، کہ آدمی بالکل جھک کے چلے جیسے معلوم ہو کہ مریض ہے یہ بھی چال پسند نہیں کی گئی، حدیث

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبر وبيانه ج: ١ ص: ٢٤٧ رقم: ١٣١. ② سورة لقمان: ١٩.

میں فرمایا گیا: ''اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَّاَحَبُّ اِلَی اللهِ مِنَ الضَّعِیْفِ'' ① قوی مسلمان بہتر ہے ضعیف مسلمان سے، تو چال میں قوت ہونی چاہئے، ضعف نہ ہونا چاہئے، تو نہ تو اس طرح سے چلے، جیسے کوئی بیمار اور مریل قسم کا آدمی آرہا ہو اور نہ اکڑ کر چلے کہ جس سے معلوم ہو کہ کوئی متکبر آرہا ہے، تو چال کے اندر فرمایا کہ قصد واقتصاد اور میانہ روی اختیار کرو کہ چال میں کبر بھی نہ ہو چال میں ضعف بھی نہ ہو۔

آثارِ عبدیت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ ''کَانَ یَمْشِیْ تَقَلُّعًا'' آپ زمین پر اس طرح قوت سے چلتے تھے جیسے زمین کو کھود ڈالیں گے۔ اس قوت سے پیر پڑتا تھا، اور ساتھ میں تواضع اور انتہائی خاکساری اور نرمی بھی چال میں ہوتی تھی، تو قوت بھی ملی ہوئی ہو اور قوت کے ساتھ تواضع بھی ملی ہوئی ہو، قوت میں اگر کبر آگیا تو تکبر کی چال ہے اور اگر کمزوری آگئی تو ضعیفوں کی چال ہے اور دونوں چالوں سے روکا گیا۔ ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ﴾ ② تو چال کے اندر بھی میانہ روی بتلائی گئی۔ اسی طرح سے قال کے اندر، بولے آدمی تو تحکمانہ لب ولہجہ نہ ہو، جیسے کوئی حاکم بول رہا ہے، بلکہ مصالحانہ رویہ برادرانہ رویہ، بھائی بندی اور ملنساری کی آواز نکلنی چاہئے، اس میں حاکمانہ، متکبرانہ شان نہ ہونی چاہئے تو جیسے حال میں تکبر برا سمجھا گیا ہے قال میں اور بولنے میں بھی تکبر برا سمجھا گیا ہے، اسی طرح سے آدمی کے حال میں اور تمام چیزوں میں کبر نہ ہونا چاہئے، تبھی آدمی کی بندگی صحیح ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ممکن ہے کسی کو پیدا ہوا کہ قرآن کریم سے اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی صفات اختیار کرو اور اس کے کمالات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرو، چنانچہ فرمایا گیا: ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ'' اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو رحمت اور کرم دوسرے کے اوپر عطا اور جود واحسان اور علم یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ اپنے اندر پیدا کرو، اسی طرح اللہ کی صفت تکبر بھی ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ اللهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ﴾ تو یہ تکبر بھی اختیار کرنا چاہئے اس لئے کہ جب اللہ کے اخلاق اختیار کرو گے رحم اور کرم اور کریمی تو پھر متکبر بننے میں کیا حرج ہے، بلکہ متکبر بننا چاہئے تو یہاں جو فرمایا جا رہا ہے کہ تکبرہ ذرہ برابر ہوگا تو وہ شخص جنتی نہیں، اور یہاں ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی متکبر بنے، تکبر اللہ کی شان ہے بڑا بول بولنا اس ہی کا مقام ہے تو ہم بھی خوب بڑے بول بولیں اور خوب تحکمانہ کلام کیا کریں، اس حدیث کی رو سے یہ ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر بری چیز نہیں ہے، تکبر تو اعلیٰ ترین صفت ہے، جو اللہ کی شان ہے، کون تکبر کو برا کہہ سکتا ہے،؟ پھر تکبر سے کیوں روکا گیا ہے؟ اس لئے نہیں روکا گیا کہ تکبر بری چیز ہے، تکبر بہترین چیز ہے مگر

---

① الصحیح لمسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز والاستعانة باللہ ج:۱۳ ص:۱۴۲ رقم:۴۸۱۶. ② پارہ:۲۱، سورۃ: لقمان، الآیۃ: ۱۹.

جھوٹ بولنا بری چیز ہے، جھوٹ سے روکا گیا ہے اس لئے کہ اللہ کے سوا جو یوں کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹا ہے، سچا اللہ ہی ہے جو کہے کہ میں بڑا ہوں، مجھ سے بڑا کوئی نہیں، جو انسان یہ کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹ بول رہا ہے تو جھوٹ بولنا بری بات ہے، تکبر کرنا تو بری بات نہیں خدا کے سوا جو متکبر بنے گا جھوٹا ہوگا۔

تو جھوٹ بولنا انسان کی شان کے خلاف ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ تکبر مت اختیار کرو، جھوٹے مت بنو، تکبر اسی کے لئے زیبا ہے، اور بڑائی اسی کے واسطے ہے۔ ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (1)

تو عبدیت اختیار کرو، اب ہر چیز میں عبدیت آئے گی، جب دل میں ایک چیز بیٹھ گئی تو دل تو سلطان الاعضاء ہے، تو تمام اعضاء کا بادشاہ ہے تو ساری رعایا اسی کی پیروی کرے گی، جب دل میں تواضع، انکساری اور خاکساری بیٹھ گئی تو انکساری پیروں میں بھی آئے گی، ہاتھ میں بھی آئے گی، زبان میں بھی آئے گی، ہر چیز میں وہی کسر و انکسار تواضع و خاکساری پیدا ہو جائے گی، صحت میں بھی انکساری، بیماری میں بھی انکساری۔

عبدیت کے رنگ ...... مجھے واقعہ یاد آیا، میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت یہ تھی کہ تھوڑا بھی بیمار ہوں تو بہت زیادہ کھولتے کراہتے اور ہائے ہائے کرتے جیسے کوئی بڑی چیز آ گئی، مکان کو سر پر اٹھا لیا، چھوٹی سی بیماری بالکل معمولی اور ہائے ہائے زیادہ تو میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے ان سے عرض کیا، رُعب ان کا غالب تھا کہ آپ جو یوں زیادہ ہائے ہائے کرتے ہیں، یہ تو رضا اور توکل کے خلاف ہے بندہ ہو کر ذرا سی بیماری آئی اور زیادہ کھولنا اور کراہنا یہ تو رضا کے خلاف ہے بندہ پر جو کیفیت آئے اسے راضی ہونا چاہیئے، زیادہ ہائے ہائے کرنے کا کیا مطلب؟ جیسے بیماری ٹالنا چاہتے ہیں، یہ تو رضا کے خلاف ہے تو کل کے خلاف ہے، ہنس کے فرمایا کہ نالائق! ہمیں نصیحت کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد فرمایا بیٹھ جا میں بیٹھ گیا۔ فرمایا میں نے اپنے تین بزرگوں کی زیارت کی ہے اور زیارت ہی نہیں کی بلکہ ان کو برتا ہے اور ان کی پوری زندگی پائی ہے۔ سب سے پہلے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ ان سے خلافت بھی حاصل کی تھی، فرمایا میں نے ان کی زندگی دیکھی ہی نہیں بلکہ برتی ہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ دوسرے فرمایا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وہ میرے استاذِ حدیث ہیں، تو ان کی خدمت میں بھی حاضر رہا ہوں۔ اور تیسرے فرمایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند، وہ تو میرے والد ہیں، ان کی زندگی بھی میں نے دیکھی اور ان کی صحبت اٹھائی، ان تینوں بزرگوں کے میں نے تین رنگ پائے۔ فرمایا حاجی صاحب پیر و مرشد کا تو یہ عالم تھا کہ ذرا سی بیماری آتی تو ہائے ہائے کرتے مکان کو سر پر اٹھا لیتے۔ ایک صاحب نے عرض کیا حضرت! یہ تو بندگی، رضا اور توکل کے خلاف ہے، ذرا سی بیماری آئی اور ہائے ہائے شروع کی۔ فرمایا کیا میں اپنے اللہ کے مقابلے میں بہادر بنوں اور یہ دعویٰ کروں زبانِ حال سے کہ آپ جو کچھ بھیجیں گے میرے اندر طاقت ہے میں اُسے برداشت کروں گا، میں

(1) پارہ: ۲۵، سورۃ: الجاثیۃ، الآیۃ: ۳۷.

تھوڑی سی بیماری میں ہائے ہائے کر کے عرض کر دیتا ہوں کہ میں اتنا کمزور ہوں مجھے آزمائیے نہیں، فضل سے بخش دیجئے، میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ بخار کا تحمل کروں، بندہ ہوں اور ضعیف ہوں تو میں ہائے ہائے کر کے اپنے ضعف کو ظاہر کر دیتا ہوں، اپنے عجز کو ظاہر کرتا ہوں، فرمایا یہی ہے عبدیت اور بندگی کی شان کہ اپنا عجز اور اپنی بے طاقتی، عاجزی ہر طرح سے ظاہر کر دو۔

فرمایا حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہائے وائے تو نہیں کرتے تھے مگر علاج کا اہتمام (بہت کرتے تھے) ذرا بیماری آئی طبیب کو بلاؤ اور ڈاکٹر کو بلاؤ اور دوا دارو اور پرہیز، تو بعض نے عرض کیا حضرت اسباب میں اتنا غلو کرنا تو بندگی کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں کہ مسبب الاسباب پہ نظر نہیں، بس دواؤں پہ نظر ہے ڈاکٹر پہ نظر ہے، علاج پہ نظر ہے۔

فرمایا علاج کرنا مسنون ہے اور اتباع سنت ہی سب سے بڑی عبدیت ہے، ان کے یہاں بھی عبدیت تھی، مگر عبدیت کا یہ روپ تھا ہر چیز میں سنت کی پیروی کی جائے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ ہم کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علاج فرمایا، تو علاج مطلوب ہو گیا تو سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ تو صحت کی سنتیں اور ہیں بیماری کی سنتیں اور ہیں، بیماری میں یہی سنت ہے آدمی معالجہ کی طرف متوجہ ہو اپنی حیثیت کے مطابق کوئی بڑا آدمی ہے وہ علاج کرانے بھی جرمنی جائے گا اور چھوٹا ہے وہ مقامی ڈاکٹر کو دکھلا دے۔

مگر بہر حال علاج کی طرف توجہ کرنا یہ سنت کی پیروی ہے اس لئے کہ یہ ہمارا بدن یہ سرکاری ملک ہے اور اللہ کی ملک ہے، ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں، بیمار ہوں تو دوا کریں، ایسے موقعوں پر نہ جائیں جہاں ہلاکت یقینی ہو، یہ سواری ضائع نہ ہو جائے، اسی سواری پر سوار ہو کر روح مقامات طے کرتی ہے اور عرشِ عظیم تک پہنچتی ہے، جب سواری نکمی ہو جائے گی تو سفر کیسے طے ہو گا؟

اس واسطے اس کو گھاس دانہ بھی دینا چاہئے، اسے غذا بھی دینی چاہئے یہ بیمار ہو تو اس کا علاج بھی کرنا چاہئے، تو فرمایا بیماری میں علاج کرنا سنت کی پیروی ہے اور سنت کی پیروی کی یہی عبدیت ہے اسی کو بندگی کہتے ہیں تو حضرت (حاجی صاحبؒ) کے یہاں بھی بندگی تھی اور ان کے یہاں بھی عبدیت تھی اس کا روپ اور تھا اس کا رنگ اور۔ فرمایا میرے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کیفیت یہ تھی، بڑی سے بڑی بیماری آجائے تو اُف نہیں کہتے تھے، کسی پہ ظاہر نہیں ہوتا تھا بیمار ہیں، مہینوں، برسوں کے بعد اتفاق سے زبان سے نکل گیا تو پتہ چلتا تھا کہ اتنی بڑی بیماری آئی ہے، اور بالکل دم بخود لوگوں نے عرض کیا حضرت بیماری آئی ہے آپ کسی سے فرماتے بھی نہیں، کچھ ظاہر بھی نہیں کرتے کہ کوئی دوا دارو یا علاج کرتے فرمایا:

''ہر چیز از دوست می رسد نیکوست''

مالک کی طرف سے جو آئے گردن جھکانی چاہئے تو وہی میرے لئے خیر ہے وہی میرے لئے برکت

ہے، اگر وہ بیماری دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے تندرست ہونا چاہئے، اور اگر وہ تندرستی دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے بیمار ہونا چاہئے۔

''ہر چیز از دوست می رسد نیکوست''

دوست اور محبوب کی طرف سے جو آئے سر جھکا دینا چاہئے۔ فرمایا یہی عبدیت ہے اور یہی بندگی کی شان ہے کہ دوست کی ہر منشاء کے اوپر آدمی راضی برضا ہو جائے۔

عبدیت کا تقاضا...... جیسے حدیث میں ارشاد ہے کہ ''عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءٌ شَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءٌ صَبَرَ'' ① مؤمن کی کوئی کل بری نہیں، ایمان کے ساتھ کوئی حالت بری نہیں اگر بیماری آتی ہے تو صبر کرتا ہے، صبر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اگر نعمت آتی ہے تو شکر کرتا ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے، تو بیماری بھی اس کے لئے خیر ہے اور تندرستی بھی اس کے لئے خیر ہے، تندرستی کے اور لوازم ہیں، بیماری کے اور لوازم ہیں سب پر ایمان کا قانون لاگو ہے، اسی راستے سے آدمی اللہ تک جا پہنچتا ہے۔ تو فرمایا حق تعالیٰ شانہ جو بھی کیفیت بھیجیں نعمت کی ہو یا مصیبت کی، تنگی کی ہو یا راحت کی، تموّل کی ہو یا تنگ دستی اور محتاجگی کی، جس حالت میں ہو بندہ راضی اور شاکر رہے کہ میرے لئے یہی خیر ہے جو میرے مالک نے تجویز کیا ہے میں کون ہوں اس کے خلاف کرنے والا یا خلاف بولنے والا! کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ وہ اسی مقام کے تھے یعنی راضی برضا کے مقام کے، کہا کیا حال پوچھتے ہو اس شخص کا جس کی مرضی پر دو جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس درجہ کے ہیں کہ آپ کی مرضی پر زمین و آسمان کے سارے کارخانے جاری ہیں؟ کہا الحمدللہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا، یہ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں، اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فناء کر دیا ہے، جو اس کی مرضی وہ میری مرضی، اس لئے جو بھی عالم میں پیش آتا ہے میں اس پر راضی ہوں کہ ٹھیک ہے، کوئی پیدا ہوتا ہے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہیئے تھا، مجھے کیا حق ہے کہ بیٹھ کر ماتم کروں اور بیٹھ کر واویلا کروں، اس کے معنی ہیں کہ اللہ کے حکم میں میں مداخلت کر رہا ہوں اور من میخ نکال رہا ہوں کہ آپ نے کیوں موت بھیج دی فلاں کے لئے، تو کیا میں اس لئے آیا ہوں کہ اللہ سے لڑوں اور مقابلہ کروں؟ وہ موت دے دے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی مناسب وہ زندگی دے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی مناسب ہے وہ بیماری دے، میں کہتا ہوں بے شک یہی مناسب ہے، اس لئے جہاں میں کوئی چیز بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتی، یہ سب میری مرضی پر چل رہے ہیں۔

عبدیت کا اعلیٰ مقام ''تفویض''...... تو حقیقت میں رضا بہ قضاء کے یہی معنی ہیں کہ اس مقام پر آجائے کہ جو

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب المؤمن امرہ کلہ خیر ج: ۱۴ ص: ۲۸۰ رقم: ۵۳۱۸.

بھی ہو آدمی اس پر راضی ہو، اور ظاہر ہے کہ جب اس مقام پر آجائے گا تشویشات ساری ختم ہو جائیں گی، یہ جو تشویش اور الجھن پیدا ہوتی ہے، یہ اپنی تجویز سے پیدا ہوتی ہے ہم نے یہ تجویز کر لیا کہ ہمیں مالدار بننا چاہئے، اب اگر مالدار نہ بنے یا مال چھن گیا تو اب بیٹھ کے رو رہے ہیں۔

یہ کیوں رو رہے ہیں؟ پریشانی کیوں ہوئی کہ خود ہم نے تجویز کیا تھا کہ مالدار ہونا چاہیئے یا بننا چاہیئے، بیماری آئی تو پریشانی میں گھٹ رہے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ تجویز یہ تھی کہ ہونا چاہئے ہمیں تندرست تو کیوں بیمار بنے۔

ان ساری مصیبتوں کی جڑ اپنی تجویز ہے، لیکن اگر تفویض ہو جائے کہ میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا اللہ کے جو بھی کیفیت پیش آئے وہ خیر ہے، اب ظاہر ہے کہ نفس کے خلاف کوئی چیز ہو گی نہیں تشویش اسی کو کہتے ہیں کہ طبیعت کے خلاف ہو، جب ہر چیز کو طبیعت کے موافق بنا لے تو اب پریشانی باقی نہیں رہے گی، تو تشویشات بھی ختم، ساری پراگندگیاں بھی ختم، پریشانیاں بھی ختم، تو اہل اللہ در حقیقت تفویض کے مقام پر ہوتے ہیں، اس لئے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، کسی حالت میں ہوں مطمئن اور مگن اور اہل دنیا جو خود مجوِّز ہیں اپنے لئے کہ ہمیں یوں ہونا چاہیئے وہ ہر وقت پریشان رہیں گے، اس لئے کہ نفس کا ہر منصوبہ پورا ہونا ضروری نہیں اور جب کسی تجویز کے خلاف ہو گا تو روئیں گے بیٹھ کے بہکیں گے، تو ہر وقت پریشانی میں اس لئے اعلیٰ ترین مقام کہ جس میں سکونِ کامل ہو، پریشانی رفع ہو، وہ یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرے، اپنے کو بدل دے جو پیش آئے کہے یہی میرے حال کے مناسب تھا۔

اسی پر راضی ہو جائے تشویش ختم ہو جائے گی، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاداری بہترین چیز ہے اور اسی میں سکون ہے، یا سمجھتے ہیں کہ مصیبت سب سے بڑی چیز ہے یا نعمت سب سے بڑی چیز ہے، حالانکہ بیماری ہو یا تندرستی، مالداری ہو یا دست نگری وہی سکون کا ذریعہ ہے تو اللہ کی تجویزوں پر، اس کی تقدیرات پر راضی ہو جانا یہ سکون کا ذریعہ ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (1) اللہ کے ذکر ہی سے دل چین پاتے ہیں۔ تو ذکر کا لفظ یہ مطلب نہیں کہ مسجد میں بیٹھ کر اللہ، اللہ کر لے، ذکر اور یادداشت کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی من جانب اللہ پیش آئے اس پر رضا کا اظہار کرے، بیمار ہے تب راضی، تندرست ہے جب راضی، مالدار ہے جب راضی، اور نادار ہے تب راضی۔

موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا واقعہ...... یہ معنی ہیں ملکہ یادداشت کے کہ ہر تقدیر پر آدمی راضی ہو جائے، مجھے اس پر افلاطون کا ایک واقعہ یاد آ گیا، ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ افلاطون یونان کے حکماء میں سے ایک حکیم اور فلسفی ہے، لیکن شیخ عبدالحکیم بہت بڑے عالم اور بہت بڑے محقق گزرے ہیں، انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے "اَلْاِنْسَانُ الْكَامِلُ" کہ انسانِ کامل کسے کہتے ہیں، اس میں اصول وقواعد شرعی بیان کئے ہیں۔

اس میں لکھتے ہیں کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا تو انوار و برکات سے میں نے اس کی قبر کو ڈھکا ہوا پایا، اس سے

---

(1) پارہ: ۱۳، سورۃ: الرعد، الآیۃ: ۲۸۔

ہم یہ سمجھے کہ یہ مقبولانِ الٰہی میں سے تھا محض فلسفی اور بندگان عقل میں سے نہیں تھا جیسا کہ شہرت ہے بلکہ مقبول خدا وندی شخص ہے محض فلسفی اور بندگان عقل میں سے نہیں انہوں نے لکھا ہے یا کسی دوسرے نے یہ یاد نہیں رہا بس اتنا ضرور لکھا ہے کہ افلاطون مقبولان الٰہی میں سے ہے، افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے، تعارف نہیں تھا، ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں تھے نام سنا تھا، افلاطون بھی جانتا تھا کہ ایک اسرائیلی اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جانتے تھے کہ افلاطون ایک شخصیت ہے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا تھا، کبھی تعارف نہیں ہوا تھا، اتفاق سے ایک سڑک پر آمنا سامنا ہوا، پہچان تو تھی نہیں، لیکن افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر انوار و برکات اور جلالتِ نبوت کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم اور عارف باللہ ہیں ۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور ‏ کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

وہ جو قلب کے اندر اشراق اور چمک ہوتی ہے، اس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں تو چہرہ چغلی کھالیتا ہے کہ اندر کیا کیفیت موجود ہیں، تو موسیٰ علیہ السلام کے چہرۂ مبارک پر جلال اور جمالِ نبوت چمک رہا تھا، تو اس نے سمجھا کہ کوئی بڑی عظیم شخصیت ہیں، آ کے مصافحہ کیا اور یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کوئی بہت بڑے حکیم ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم ربانی اور عارف باللہ ہیں، ایک میرا سوال ہے جس کو اب تک کوئی حل نہیں کرسکا، بڑے بڑے عقلاء کے سامنے پیش کیا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا، گمان یہ ہے کہ آپ وہ سوال حل کردیں گے، آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ نورانیت آپ کے قلب میں ہے۔

فرمایا: کیا سوال ہے؟ کہا، سوال یہ ہے کہ ''اگر آسمان کو کمان فرض کرلیا جائے اور جو یہ مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کیا جائے اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کیا جائے اور صورت ایسی بنے کہ اللہ میاں آسمان کی کمان سے مصیبتوں کے تیر برسا رہے ہیں تو بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

''ظاہر بات ہے کہ بچاؤ کی صورت عقل میں نہیں آتی اس لئے کہ اس زمین کو چھوڑ کر آدمی کہیں نہیں جاسکتا اور اگر فرض کیجئے: چلا بھی جائے تو یہ جو آسمان کا گھیرا پڑا ہوا ہے اس کے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتا اور مان لو کہ اس سے بھی نکل جائے تو اللہ میاں جب تیر مارنا چاہیں تو ان کی گرفت سے نکل کر کہاں جائے گا، وہ تو زمینوں اور آسمانوں سے ماوراء بھی ان کی حکومت ہے، تو عقل اس کو سمجھتی نہیں۔''

عقل یہی کہے گی کہ کوئی صورت بچنے کی نہیں، اسی واسطے کوئی عالم جواب نہیں دے سکا کہ زمین چھوڑ کر جانا مشکل کُروں کے محاذات سے نکلنا مشکل، آسمان کے نیچے سے نکل جانا مشکل اور مالک الملک کی گرفت سے نکلنا مشکل اور ناممکن، تو کوئی صورت بچاؤ کی نہیں، جب مصیبتوں کے تیر برسیں گے تو وہ بھگتنا پڑیں گے، مصیبت اٹھانی ہی پڑے گی، تو یہ سوال کیا جو واقعی مشکل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت آسان بات ہے، اس میں کوئی اشکال ہی نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا، معمولی بات ہے اب یہ بھی متوجہ ہوا کہ جس کو کوئی حل نہیں کرسکا یہ کہہ رہے ہیں معمولی بات ہے، فرمایا کہ بچاؤ کی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیر مارنے والا جب تیر مارنے کا ارادہ کرے اس کی محاذات سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آ کھڑا ہو تو تیر لگے گا ہی نہیں، بس یہ اس کا طریقہ ہے کہ تیر پھینکنے والے کے بغل میں آ جائے گا، وہ کتنی زور سے تیر مارے گا، تیر نہیں لگے گا، کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس نے ہاتھ چومے، کہا معلوم ہوتا ہے آپ پیغمبر ہیں، اس کو صاحب معرفت کے سوا دوسرا نہیں بتا سکتا تھا محض عالم کا کام نہیں ہے کہ اس کا جواب دے یہ تو عاشق کا کام ہے، عارف باللہ کا کام ہے جو اپنے دل میں معرفت رکھتا ہو۔

عبدیت ہی عشق و معرفت کی راہیں دکھلاتی ہے...... اس لئے کہ عشق جو راہیں کھولتا ہے علم نہیں کھول سکتا اور وہ راہیں، وہ کہتا ہے ناں ایک شاعر کہ

عقل گوید شش جہت راہے، حدے بیش نیست

عقل کہتی ہے کہ چھ ہی جہتیں ہیں، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سامنے پیچھے، اور کوئی جہت نہیں، تو

عقل گوید شش جہت راہے حد بیش نیست

اس کے سوا کوئی جہت نہیں

عشق گوید ہست راہے بارہا من رفتہ ام

عشق نے کہا کہ نہیں اور بھی رستہ ہے میں بارہا گیاں ہوں۔ عشق چھ جہات میں محدود تھوڑا ہی ہے، یہ تو عقل کی حد بندی ہے عشق اس سے بالاتر ہے وہ دور دور پہنچتا ہے تو عشق جب مالک سے ملا دیتا ہے اور سرچشمہ کمالات سے ملا دیتا ہے تو عقل تو ایک اس بارگاہ کی باندی ہے، عقل بے چاری کیا کرے گی، عقل کا دائرہ محسوسات کے اندر محدود ہے، اور عشق ماورائے محسوسات کی باتیں پاتا ہے، وہ عرش کی باتیں لاتا ہے، تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسرائیلی پیغمبر ہیں، اس وقت بات کھلی کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہاتھ چومے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جانا کہ یہ کوئی حکیم معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ: اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ گہرا سوال کرنا بھی علم کے بغیر نہیں، جاہل محض سوال بھی نہیں کرسکتا، مطلق جاہل ہو وہ سوال کر نہیں سکتا، کرے گا تو بے ڈھنگا کرے گا، جواب دینے والے کو بھی الجھا دے گا، اس لئے سوال کرنا بھی علم والے کا کام ہے، جاہل کا کام نہیں ہے جو ڈھنگ کا سوال کرے۔ اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سوال کرنے والا بھی آدھا عالم ہوتا ہے، بغیر اس کے سوال نہیں کرسکتا، تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بھی حکیم معلوم ہوتے ہو، سوال ایسا گہرا کیا کہ وہ بے علم کے سوال نہیں ہوسکتا۔ بہر حال اس وقت تعارف ہوا افلاطون کو اور موسیٰ

علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب اللہ کو فرض کیا جائے کہ وہ تیر چلا رہے ہیں اور آسمان کی کمان سے تیر برسا رہے ہیں تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ تو بچنے کی صورت یہ ہے کہ تیر چلانے والے کے پہلو میں آ کھڑا ہو، تیر نہیں لگے گا۔

قضائے الٰہی پر راضی رہنے سے تشویش ختم ہو جاتی ہے...... اللہ کا پہلو کیا ہے؟ وہ تو جسم سے بری ہے، وہاں کوئی پہلو نہیں کوئی آگا پیچھا نہیں وہ تو ہر جہت سے اونچے اور بالاتر ہیں، پہلوئے خداوندی درحقیقت ذکر اللہ ہے کہ یادِ خداوندی قلب کے اندر آ جائے، حق تعالیٰ کا پہلو یہ ہے کہ اس کی یاد بغل میں موجود ہو، جب اس کی یاد موجود ہے تو گویا آدمی ان کے پہلو میں ہے اس لئے کہ پہلو کے معنی یہی تو ہوتے ہیں کہ بچاؤ کر لے، کوئی حملہ کرے تو آپ بچے کو پہلو میں لے لیتے ہیں کہ حملہ آور حملہ نہ کر سکے، عورت جا رہی ہو اس کو پہلو میں لے لیتے ہیں تا کہ اس پر کوئی حملہ آور نہ ہو، تو پہلو کے معنی بچاؤ کے اور ذریعے کے لینے کے ہیں۔

حرز میں آ جائے تحفظ میں آ جائے، تو اللہ کے تحفظ میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد قلب کے اندر آ جائے وہی ذکر اللہ ذریعہ حرز بنتا ہے تو پہلوئے خداوندی ذکر ہے، تو حاصل یہ نکلا کہ اگر قلب کے اندر ذکر الٰہی موجود ہے تو تیر بے شک آئیں گے، لیکن اثر نہیں کریں گے، اس لئے کہ اطمینان ہے اپنے مالک کے اور مگن اور مطمئن ہے، نہ بیماری کی پرواہ ہے نہ تندرستی کی جو وہ دے رہے ہیں حکمت سے دے رہے ہیں، اور میرے لئے مصلحت اور مناسب ہے جب یہ رضا پیدا ہو گئی تو تشویش کہاں رہی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر کرنے والا کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوگا، ذکر کرنے والے بلکہ اہل اللہ پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں، فساق و فجار پر کم آتی ہیں، کفار پر ان سے بھی کم آتی ہیں، مومن اور جتنا مخلص ہوگا زیادہ مصیبت آئے گی، جانچ اسی کی کی جائے گی۔ تو یہ مطلب نہیں کہ مصیبت نہ آئے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَشَدُّ بَلَاءً ءِ الْاَنْبِیَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ'' ① سب سے زیادہ شدید بلاؤں میں انبیاء گرفتار کئے جاتے ہیں، حد سے زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں پھر جو ان سے زیادہ قریب یا مشابہ ہے وہ اتنا ہی زیادہ مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، یہ نہیں ہے کہ اہل اللہ پر مصیبتیں نہیں آتیں، فقر و فاقہ نہیں ہوتا، وہ نادار نہیں بنتے، گھر میں کوئی آگ نہیں لگ جاتی، بیمار نہیں پڑتے، ساری مصیبتیں آتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا کہ محبت ہے، فرمایا دیکھو سمجھ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! واقعی مجھے محبت ہے، آپ نے فرمایا: اگر محبت ہے تو فقر و فاقہ کے لئے تیار ہو جاؤ، مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تو اللہ والوں پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں۔

رضاء بر قضاء ذریعہ سکون ہے...... مگر فرق کیا ہے؟ کہ مصیبتیں آتی ہیں مگر اعضاء رفتہ و بے کار نہیں ہوتے، ان کے دل میں پریشانی نہیں ہوتی، دل مگن اور مطمئن رہتا ہے کہ یہ مصیبت مالک الملک نے بھیجی ہے

① السنن للترمذی، کتاب الزهد باب ماجاء فی الصبر علی البلاء ج: ۸ ص: ۴۱۷ رقم: ۲۳۲۲.

ہمارے لئے یہی مصلحت ہے تو ہم اس میں راضی ہیں۔تو مصیبت درحقیقت آدمی کے قلب کی صفت کا نام ہوا، کہ وہ تشویش میں مبتلا ہو یہ مصیبت ہے، اور تشویش دل سے نکل جائے تو وہ مصیبت ختم ہے تو مصیبت نام بیماری کا نہیں ،مصیبت نام تنگدستی کا نہیں یہ تو اسبابِ مصیبت ہیں خود مصیبت نہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ تنگدستی سے پریشان ہو جائے اور اگر کوئی تنگدستی پر راضی اور مطمئن ہو جائے تو اس پر کیا مصیبت آئے۔ بہت سے اہل اللہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جتنی چیزیں ہمارے پاس ہیں یہ چلی جائیں تو اچھا ہے تا کہ ہم یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوں تو ساری چیزیں چھین لو اور زیادہ ان کا اطمینان بڑھ جاتا ہے، حالانکہ نادار ہو گئے تو ناداری مصیبت نہیں بلکہ ناداری سے پریشانی کا اثر لینا یہ قلب کی صفت ہے،تو مصیبت قلب کی شان نہیں بیماری مصیبت نہیں، یہ تو سببِ مصیبت ہے، ناداری مصیبت نہیں یہ سبب مصیبت ہے۔تو راحت اور مصیبت قلب کی صفت ہے، اگر قلب کو آدمی درست کر لے اور قلب کو اپنے مرکز سے وابستہ کر دے تو پھر مصیبت کا کوئی اثر نہیں، چاہے بیمار ہو، چاہے نادار ہو چاہے تنگدست ہو، تو اصل چیز ہے قلب کی توجہ اور راضی بہ رضا ہو جانا کہ اسی میں ساری راحتیں ہیں۔

یہی شریعت اسلام کہتی ہے کہ اگر تم مصیبت سے بچنا چاہتے ہو، اگر تم سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو سکون نہ تمہیں کوٹھیوں میں ملے گا، نہ تجوریوں میں ملے گا، سکون تمہیں ملے گا تعلق مع اللہ میں، جب اس کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ گے، سکون تام حاصل ہو جائے گا، پریشانی ختم، جزع ختم ہو جائے گی، یہ چیزیں سکون کا ذریعہ نہیں ہیں یہ ہے بنیادی چیز۔ ذکر اللہ ہی سے قلوب چین پاتے ہیں، اس میں اگر بادشاہ بھی بن جائے تب بھی راضی اور فقیر بن جائے جب بھی راضی۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ثبات قدمی کا واقعہ...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مکہ معظمہ میں ہجرت فرما گئے، تو انہوں نے خود یہ واقعہ میرے والد مرحوم کو سنایا، انہیں پیار میں بیٹا کہا کرتے تھے، عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی اور بیٹا فرماتے تھے۔تو اپنا واقعہ خود سنایا کہ: بیٹا! جب میں مکہ مکرمہ میں ہجرت کر کے چلا ہوں ۱۸۵۷ء میں اور جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا نانوتویؒ سب کے وارنٹ جاری ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی۔ فرمایا جب میں نے کراچی کی بندرگاہ سے جہاز میں قدم رکھا تو میں نے اللہ سے ایک عہد کر لیا کہ آپ کے گھر جا رہا ہوں میں کسی کے دروازے پر نہیں جاؤں گا، کسی سے مانگوں گا نہیں، آپ کھلائیں گے کھا لوں گا ماریں گے مر جاؤں گا، جان میری نہیں ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ‏ ‏ ‏ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو اگر آپ جان لیں گے تو وہ میری جان کب ہے، وہ بھی آپ کی ہے میں کسی گھر کو نہیں دیکھوں گا، میں تو آپ کے گھر جا رہا ہوں، یہ ایک عہد کیا (والد صاحب) فرماتے تھے جب حاجی صاحب مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو ان کے پاس کوئی رقم نہیں تھی، کوئی سرمایہ نہ نہیں تھا معمولی کچھ پیسے اور ناشتہ داشتہ تھا، وہ دو تین دن میں ختم

ہو گئے، اب فاقے شروع ہوئے اور یہ عہد باندھ لیا تھا کہ نہ مانگوں گا نہ کسی کے در پہ جاؤں گا بیٹھ گئے، ایک وقت کا فاقہ دو وقت کا فاقہ، تین وقت کا فاقہ۔

فاقوں پہ فاقہ ہو رہا اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، اور کسی سے تعارف نہیں ہے، فرماتے تھے کہ جب چار پانچ وقت کا فاقہ ہوا تو کچھ ضعف بڑھنا شروع ہوا، اب حرم شریف میں حاضری ذرا مشکل ہوگئی بہت آہستہ چل کر آنا پڑتا تھا، فرماتے ہیں: مگر میں ہمت کر کے حرم شریف میں حاضر ہوتا تھا، طواف بھی کرتا تھا، نماز بھی پڑھتا تھا، پھر فرماتے ہیں کہ جب پانچ چھ وقت کا فاقہ ہو گیا اور ضعف زیادہ طاری ہوا تو ایک مزید چیز اور پیش آگئی کہ میں طواف کر رہا تھا، اتفاق سے کسی بدوی کی لنگی پر میرا پیر پڑ گیا اور وہ کھلتے کھلتے رہ گئی اس نے جذبہ میں آ کر ایک دھول مارا۔ تو حضرت حاجی صاحبؒ کی بڑھاپے کی کمزوری، اور چھ وقت کا فاقہ، تو گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے، اسی میں فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا گویا نیم بیداری ہے۔ کشف کی سی کیفیت کہ بیت اللہ کے ایک طرف حضرت جبرئیل علیہ السلام کھڑے ہوئے ہیں اور ایک طرف حضرت میکائیل علیہ السلام جبرئیل کہتے ہیں میکائیل سے کہ: بندہ تو بڑا صابر نکلا، میکائیل کہتے ہیں ابھی تھوڑی سی کسر اور ہے۔ جب آنکھ کھلی تو میں سمجھا کہ مجھے تسلی دی گئی ہے، میں نے پھر عہد کی تجدید کی یا اللہ! کچھ بھی گزر جائے میں کسی غیر سے مانگنے والا نہیں ہوں، آپ زیادہ سے زیادہ جان لے لیں گے تو جان تو آپ ہی کی ہے میری کب ہے۔

اب یہ کہتے تھے کہ جب دس وقت کا اور گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا، اب چلنا پھرنا دشوار ہو گیا حتیٰ کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنی دشوار ہو گئی بیٹھ کر نماز پڑھنے لگا، مگر ہر نماز کے بعد عہد کی تجدید کر دیتا تھا کہ پکا ہوں اس سے ہٹوں گا نہیں، آپ دیں گے کھا لوں گا، نہیں دیں گے نہیں کھاؤں گا۔

فرماتے تھے، جب گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا تو کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے کہا کہ بھائی آجاؤ! وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں چینی کا ایک قاب تھا، وہ میرے سامنے رکھ دیا میں نے کھولا تو مرغ کا پلاؤ اس میں پکا ہوا تھا، دل میں یہ خیال گزرا کہ میں نے تو عہد کیا تھا کہ غیر اللہ سے نہیں مانگوں گا اور یہ غیر اللہ ہی تو لے کر آیا ہے، اللہ نے تو بھیجا نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے عہد میں اس غیر سے لے کر فرق آجائے۔

یہ دل میں خطرہ گزرا تھا تو وہ لانے والا کہتا ہے جو چیز بلا طلب آتی ہے وہ من جانب اللہ آتی ہے، کھایئے شوق سے میں نے کھانا شروع کر دیا خوب شکم سیر ہو کر کھایا، نصف کے قریب باقی رہ گیا تو خطرہ یہ گزرا کہ رات کے لئے رکھ لوں، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ جس نے گیارہ وقت میں مجھے فراموش نہیں کیا، کیا وہ رات کو بھول جائے گا، یہ بھی ایک قسم کی اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ رات کے لئے رکھوں، قاب ڈھک دی۔

وہ شخص اٹھا اور قاب اٹھاتے ہوئے بولا کہ بہت اچھا ہوا جو رات کے لئے نہیں رکھا، اگر رات کے لئے رکھتے تو ساری عمر فاقے میں مارے جاتے، فرماتے ہیں کہ مجھے خبر نہیں کہ وہ کون تھا، کوئی آدمی تھا، کوئی جن تھا، کوئی

فرشتہ تھا مگر پھر میں نے اسے نہیں دیکھا وہ چلا گیا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ بیٹا! وہ دن ہے اور آج کا دن ہے دنیا کثرت سے میرے گھر میں آ رہی ہے کہ بانٹتے بانٹتے تنگ آ گیا ہوں لیکن دنیا ہے کہ آ رہی ہے، نقد میں نقد، کپڑے میں کپڑا، کھانے میں کھانا، اور فرمایا کہ یہ گھر ہے اس میں ہزار درہم اور دینار تو پڑے ہوئے ہیں صندوقچی کے اندر اور اتنے تھان کپڑوں کے رکھے ہوئے ہیں، اتنے برتن ہیں بانٹتا بانٹتا تنگ آ گیا ہوں، پھر آ جاتے ہیں۔

یہ حضرت کی کیفیت تھی، خیر تو مجھے سنانا یہ تھا کہ بہر حال حضرت کا پھر سلسلہ چلا، ہزاروں بیعت ہوئے اور گھر میں بہت کچھ اللہ نے دیا۔

حاجی امداد اللہؒ کے گھر چور...... چنانچہ چوروں نے دیکھ لیا کہ بھئی ایک مولانا حاجی صاحبؒ ہیں ان کے گھر میں بہت کچھ ہے، یہاں اگر چوری کی تو بہت کچھ ملے گا، رات چور آ گئے اور حضرت حاجی صاحبؒ تہجد پڑھ رہے تھے، چوروں کو پتہ نہیں تھا کہ نماز میں مصروف ہیں، حاجی صاحبؒ نے دیکھ لیا انہوں نے سارے گھر کا سامان بٹورا، کپڑے اور برتن وغیرہ ان کی گٹھڑیاں باندھیں جب لے جانے لگے تو حضرت نے فرمایا: احمقو! بے وقوفو! تمہیں چوری بھی کرنی نہیں آئی، جو چرانے کی چیز ہے وہ تو نہیں لی، نقد تو وہاں کئی ہزار روپیہ رکھا ہوا ہے، وہ چور بھی شرمندہ اور نادم کہ کس کے گھر میں چوری کرنے آ گئے، خود ہی دینے کو تیار ہے وہاں جا کر اس کوٹھڑی کو دیکھا تو کئی ہزار روپیہ نقد ملا، بہر حال وہ روپیہ اور نقد چیزیں لے کر چور چل دیئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے کیا کیا جب سارا گھر خالی کر کے وہ چلے گئے تو مصلے پر دو رکعت نماز نفل پڑھی اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ اس وبال کو تو نے ہٹا دیا اب میں تیرے لئے فارغ ہوں، رات دن عبادت میں مصروف رہوں گا، بڑا شکر ادا کیا کہ مال چلا گیا۔

چونکہ حضرت کا تعارف حکومت میں بھی ہو چکا تھا، پبلک میں بھی ہو چکا تھا لہٰذا یہ شہرت ہوئی کہ چوری ہو گئی! تو چوروں نے جب مال نیلام گاہ پر لے جا کر رکھا تو سینکڑوں مریدین نے پہچان لیا کہ یہ تو حضرت کا مال ہے وہ سارے چور پکڑے گئے اور گرفتار ہوئے اور ایک ایک پائی حکومت نے چوروں سے وصول کر لی، اور پھر سارا مال لا کر حضرت کو دیا، وہی تھان، وہی کپڑے، وہی نقدی، جب وہ ساری آ گئی تو مصلی بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی کہا "یا اللہ! تیرا شکر ہے میری چیز میرے پاس آ گئی۔"

یہ ان حضرات کا مقام ہے کہ چیز چلی جائے جب شکر گزار اور آ جائے جب شکر گزار، یہ علامت اس کی ہے کہ ان کی نگاہ نعمت اور مصیبت پر نہیں ہوتی، مصیبت بھیجنے والے پہ ہوتی ہے نعمت دینے والے پہ ہوتی ہے کہ دینے والا کون ہے؟ وہ وہ ہے جو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہے تو اس نے اگر مصیبت بھیجی تو یقیناً ہماری خیر خواہی کے لئے بھیجی ہے، نعمت بھیجی ہے، یقیناً ہماری مصلحت کے لئے بھیجی ہے، تو ان لوگوں کی نگاہ نہ نعمت پر ہے نہ مصیبت پر ہے، نعمت دینے والے پر ہے، منعم پر ہے مصیبت بھیجنے والے پر ہے مصیبت پر نہیں۔

منعم سے نگاہ ہٹنا ہی مصیبت ہے۔...... اس سے اندازہ ہوا کہ ساری مصیبتوں کی جڑ نعمت اور مصیبت کے

اوپر نگاہ ہے، اہل اللہ اسے چھوڑ کر مصیبت بھیجنے والے پر نگاہ رکھتے ہیں، اس لئے ان کے قلب میں نہ کوئی پریشانی ہے، نہ کوئی پراگندگی ہے، وہ منعم سے تعلق قائم کرتے ہیں، نعمت سے نہیں، نعمت چلی جائے جب بھی نماز پڑھیں گے، شکر ادا کریں گے کہ الحمد للہ فارغ ہو گئے، آ جائے پھر نماز پڑھیں گے شکر ادا کریں گے کہ اللہ نے پھر ہمارا گھر بھر دیا، وہ ہر حالت میں راضی یہی ہے وہ چیز جسے میں نے عرض کیا تھا، حدیث میں ہے کہ: ''عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءٌ شَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءٌ صَبَرَ'' مومن کی کوئی کل بری نہیں، عجیب شان ہے کہ نعمت آتی ہے تو شکر گزار ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے، مصیبت آتی ہے تو صبر کر رہا ہے اور صبر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے۔

غرض اس کے یہاں روکنے والی چیز نعمت ہے نہ مصیبت، جس پر اس کی نگاہ ہے وہ نعمت کے راستے سے بھی پہنچ جاتا ہے اور مصیبت کے راستے سے بھی وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

علامہ اکثمؒ اور ان کی حسین بیوی...... ہمارے علماء سلف میں ایک عالم گزرے ہیں اکثم یہ فن نحو کے امام تھے، نحو اور صرف ایک فن ہے جس سے عربی کے قواعد سمجھے جاتے ہیں اسکے بہت بڑے عالم اور امام تھے، تو وہ اس قدر بدصورت تھے کہ جتنی بدصورتی کی علامتیں تھیں ساری ان کے بدن میں موجود، رنگ بھی انتہائی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھیں بھی کرنجی، دانتوں پہ زردی۔

غرض یہ بدصورتی کی ساری چیزیں جمع تھیں، بس علم اللہ نے دے دیا تھا، اور بیوی جو ملی تو صوبوں میں اس کی مثال نہیں تھی، حسن و جمال میں وہ اس قدر حسین و جمیل، جب دونوں آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھوپ اور چھاؤں آمنے سامنے ہے ایک طرف دھوپ کھل رہی ہے اور ایک طرف ظلمانی سایہ۔ تو اپنی بیوی سے کہا کرتے کہ ''میں یقیناً جنتی تو بھی یقیناً جنتی'' اس نے کہا آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ فرماتے: اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے تو تجھ جیسی بیوی ملی اس کی مثال صوبوں میں موجود نہیں، تو میں شکر کرتا ہوں اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچوں گا اور تجھے مجھ جیسا خاوند ملا کہ جس سے زیادہ بدصورت کوئی نہیں تو تو صبر کرتی ہے کہ میری قسمت میں یہی تھا، تو صابر ہے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی، تو میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ تو خیر وہ تو حسّی طور پر جنتی ہے، مگر اہل اللہ معنوی طور پر جنتی بنتے ہیں، نہ نعمت پہ ان کی نظر ہے نہ مصیبت پہ، بھیجنے والے پر نظر ہے تو نعمت آ جائے جب بھی مطمئن، چلی جائے تب بھی مطمئن، یہی وجہ ہے کہ کفار سے اگر ان کا سامان چھین لیا جائے تو مرنے سے پہلے مر جاتے ہیں، اس لئے کہ جن چیزوں سے ان کا سکون متعلق تھا جب وہ چھن گئیں تو وہ پریشان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سلب ہو گئی، بے آرام ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے سکون قائم کیا تھا سامانوں سے اور اللہ والوں کے پاس سے سارا سامان نکل جائے ان کے سکون میں فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ ان کے سکون کا تعلق ان چیزوں سے تھا ہی نہیں، وہ تو بھیجنے والے سے تعلق تھا اور وہ بدستور موجود ہے۔

حالت رضا کا غلبہ...... جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہؓ پریشان تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، مغلوب الحال ہوگئے اور تلوار لے کر کھڑے ہوگئے کہ اگر کسی نے یوں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں اس کی گردن اڑادوں گا، یہ غلبہ حال میں ایک کیفیت پیدا ہوئی گویا غم کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ ہر چیز فراموش ہوگئی۔ اور یہ ہوتا ہے کہ جب کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے، تو قطعی اور یقینی چیزیں بھی دل میں رہتی تو ہیں مگر دب جاتی ہیں اوپر نہیں آتیں حالانکہ ان پر یقین ہے یقین ہے فاروق اعظم رضی اللہ کو کہ انبیاء علیہم السلام بھی وفات پانے والے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں صراحۃً فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ ① دب کر رہ گیا یقین تو غلبہ حال جب ہوتا ہے تو بہت سی یقینی چیزیں مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، دب جاتی ہیں۔

تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر ایک حال طاری ہوا اور وہ حال تھا شدتِ تعلق کا کہ انبیاء علیہم السلام بھلا کہاں مرتے ہیں، اتنا قدیم اور مضبوط تعلق تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں شک ہوگیا کہ وفات ہوئی یا نہیں، یہ غلبہ حال تھا یہ نہیں کہ معاذ اللہ۔ ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ پر یقین نہیں تھا۔ اس وقت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اور فرمایا کہ بھلے مانس بیٹھ جائیں، وہ (فاروق اعظمؓ) تو جوش میں تلوار لئے کھڑے تھے اور لوگ ڈر رہے تھے کہ اگر ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کیا تو یہ گردن اڑا دیں گے، صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھلے مانس! میرے پاس بیٹھ جا، بیٹھ گئے، اب صدیق اکبرؓ نے فرمایا: ''مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُاللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ''②

فرمایا: اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے تو وہ وفات پاگئے غلبہ جب حالت کا ہوتا ہے محبت کے غلبہ میں بعض دفعہ ایسی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہمیں زیادہ محبت ہے اور وہ گزر جائے تو ہفتوں، دنوں یقین نہیں آتا کہ کیا واقعی گزر گیا، برسہا برس کی صحبت کے بعد جب گذر جائے تو دل میں ایک قسم کا ریب اور ارتیاب پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو گویا مرنے والی چیز ہی نہیں تھی، کہاں سے مر گیا یہ شخص؟

تو ہفتوں اس میں گزرتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جیسے کہتے ہیں یقین نہیں آتا، یقین بھی ہے مگر اس کے باوجود ایک شک سا رہتا ہے، شدت تعلق کی بناء پر تو صحابہؓ سے زیادہ کس کو شدید تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، فاروقِ اعظمؓ کے ذہن میں شدت تعلق کی بناء پر جمتا ہی نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۳۰۔

② الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ ج: ۱۳ ص: ۳۶۲ رقم: ۴۰۹۷۔

تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔

علماء یہی لکھتے ہیں کہ غلبہ حال تھا اور غلبہ حال میں یقینی چیزیں ڈھک جاتی ہیں دب کر رہ جاتی ہیں۔

اس کی حسّی نظیر یہ ہے کہ آپ چڑیا گھر میں تو گئے ہوں گے، یہاں لندن میں بھی ایک باغ ہے جس کے اندر جانور، درندے، شیر، بھیڑیئے پلے ہوئے ہیں، آپ شیر دیکھنے کے لئے گئے، موٹی موٹی سلاخوں میں آپ نے دیکھا کہ شیر بند ہے، قطعی یقین ہے آپ کو کہ یہ باہر نہیں آسکتا نہ مجھ پر حملہ کر سکتا ہے اسلئے آپ سلاخ کے قریب کھڑے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ دھاڑ کر آئے تو آپ ڈر کے مارے ڈیڑھ گز پیچھے جاتے ہیں، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ آپ کا یقین ختم ہو گیا اور شیر سلاخیں توڑ کر نکل آئے گا؟ نہیں خوف کی وجہ سے خوف کا حال اتنا غالب ہوا کہ وہ جو یقین تھا کہ نہیں آسکتا وہ خوف کے غلبہ سے دب گیا، زائل نہیں ہوا، بعینہ یہی غلبہ محبت تھا فاروق اعظمؓ پر، موت کا یقین تھا، غلبہ محبت ہوا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ آپ کی وفات ہوگئی، مگر صدیق اکبرؓ نے فرمایا اگر تم اللہ کی عبادت کرتے تھے تو اللہ آج بھی زندہ ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین آگے باقی نہ رہے، دین چلے گا اور صدیوں چلے گا اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت پڑھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو تھے اللہ کے اور ہزاروں رسول گزر چکے ہیں اگر یہ بھی گزر جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فاروقِ اعظمؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا جیسے آج اتری ہے یہ آیت اور میں نے کبھی یہ آیت پڑھی ہی نہیں تھی۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے قلب کا تصرف تھا، ایک ایسی کیفیت فاروقِ اعظمؓ کے قلب پر طاری ہوئی کہ یہ معلوم ہوا، گویا یہ آیت آج اتر رہی ہے، اور آج میر اعقیدہ بن رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وفات ہونے والی ہے۔ تو غلبہ حال میں بعض دفعہ یقینی چیزیں بھی مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح سے آدمی کے اوپر اگر حالتِ رضا کا غلبہ ہو جائے کہ جو کچھ ہے وہ سب من اللہ ہے کوئی سبب کچھ نہیں کر سکتا، کرنے والا مسبب الاسباب ہے تو پھر اسباب کی طرف سے نظر اٹھ جاتی ہے، باوجودیکہ اسباب کا ہی مشاہدہ ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود نگاہ مسبب الاسباب کے اوپر ہو جاتی ہے اسباب نگاہ میں کالعدم سے ہو جاتے ہیں۔

اسباب نہیں کرتے، مسبب الاسباب کرتا ہے...... حقیقت یہی ہے کہ اسباب کچھ نہیں کرتے، یہ آلات ہیں، کرنے والی چیز قدرتِ خداوندی ہے، اور مشیتِ الٰہی ہے، پانی نہیں ڈبوتا، مشیت ڈبوتی ہے، اگر مشیت نہ چاہے، پانی ہو، موجیں آسمان کے برابر چلی جائیں آدمی نہیں ڈوب سکتا، اور مشیت چاہے گی تو ڈوب جائے گا۔ دریائے قلزم کے اندر بنی اسرائیل بھی کودے اور فرعون بھی کودا، بنی اسرائیل پار نکل گئے، پانی نے کوئی اثر نہیں کیا بلکہ راستے بن گئے اور فرعون اور فرعونیوں کو ڈبو دیا، تو پانی ڈبونے والا نہیں تھا، مشیت ڈبونے والی تھی، مشیت متعلق ہوئی کہ یہ ڈوبیں تو ڈوب گئے، اور ان سے مشیت متعلق تھی کہ یہ پار ہو جائیں تو یہ پار ہو، تو یہ تر گئے۔ آگ نہیں جلاتی بلکہ مشیت جلاتی ہے، مشیت نہ ہو آگ کچھ نہیں کر سکتی، آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، مشیت نہیں تھی

کہ آگ جلائے وہی باغ و بہار بن گئی، کچھ نہیں کر سکی۔ چھری نہیں کاٹتی، اس کی دھار نہیں کاٹتی بلکہ مشیت خداوندی کاٹتی ہے، اگر مشیت نہ ہو دھاردار چھری ہو کام نہیں کرے گی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری پھیری، چھری پھر رہی ہے، چھری کاٹ نہیں رہی، اس لئے کے مشیت خداوندی نہیں تھی، تو کاٹنے والی چھری نہیں تھی، ڈبونے والا پانی نہیں تھا یہ ڈبونے کے اسباب ہیں یہ ذبح ہونے کے اسباب ہیں۔

اصل میں ان میں مسبب کی طرف سے تاثیر آتی ہے، تو اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو تا کہ بندگی واضح ہو، مگر انہیں موثر بالذات مت سمجھو کہ انہی میں سب کچھ رکھا ہوا ہے، موثر حقیقی ذات خداوندی ہے وہ اسباب میں سے تاثیر نکال دے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

آدمی اولاد چاہتا ہے، بیوی کے پاس جاتا ہے، پچاسیوں دفعہ گیا نہیں ہوئی، تمنا ہے بچوں کی، بقول شخصے کہ چڑیا کا بچہ ہی ہو جائے مگر نہیں ہوا اور بعض وہ ہیں کہ نہیں چاہتے کہ اولاد ہو ہر سال ایک بچہ، ہر سال ایک بچہ، تنگ آجاتے ہیں کہ کہاں تک انہیں پالوں اور پرورش کروں، تو تمنا کیوں نہیں پوری ہوتی، حالانکہ اسباب سارے پورے ہو رہے ہیں، اس واسطے کہ مشیت نہیں ہے، مشیت کیوں نہیں؟ اس لئے کہ حکمت کے خلاف ہے یہی مصلحت ہے اس بندے کے لئے کہ اولاد نہ ہو، اس کے لئے یہی مصلحت ہے کہ اولاد ہو۔

تو اہل اللہ کی مشیت اور مرضی الٰہی پر نظر ہو جاتی ہے، جب اس پر نظر ہوئی تو اسباب نہیں ہیں، مگر دھیان دوسری طرف ہوتا ہے، تو جب اس پر دھیان ہو جائے گا اور تعلق مع اللہ مضبوط ہو جائے گا، پھر تشویش بھی ختم پریشانیاں بھی ختم، دل کی بے سکونی بھی ختم، قلب کے اندر ٹھنڈک پیدا ہو جائیگی۔

دُنیوی سطح پر تعلق مع اللہ کی ضرورت...... اس سے معلوم ہوا کہ تعلق مع اللہ صرف آخرت ہی کے لئے ضروری نہیں ہے دنیا کے لئے بھی ضروری ہے، دنیا کا سکون بھی چاہتے ہو تو تعلق مع اللہ ہونا چاہئے جو لوگ صاحب وسائل ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلوں میں قطعاً وہ سکون نہیں جو اہل اللہ کے دل میں ہے، باوجودیکہ سامان نہیں ہے ان کے پاس وہ ہر وقت مگن اور مطمئن ہیں، اصل یہ ہے کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو اور قلب کا مرکز صحیح بن جائے، ظاہر بات ہے کہ جب قلب کا مرکز صحیح ہو جائے گا، تعلق حق تعالیٰ سے قائم ہو جائے گا تو ادھر کے کمالات بھی آنا شروع ہوں گے ادھر سے اوصاف کمال بھی اس کے اندر آئیں گے، آخرت کی زندگی کے لحاظ سے بھی ضروری؟ ایک ہی سرچشمہ ہے، کہ جس سے لگ کر آدمی پریشانیوں سے اور گھٹن سے بچ سکتا ہے اور اگر ہر وقت آپ اس فکر میں ہیں کہ یہ مرے یا جیے میرا فائدہ ہو جائے یہ تو خود مطلبی خود غرضی ہے اس کا نام خدمت نہیں، خدمت کرنے والا اپنے نفس کو بھلا کر اپنے بھائی کی خدمت کرے گا کہ اس کا نفع ہو میرا چاہے نفع ہو یا نہ ہو تو اسلام نے خود غرضی کو مٹا کر ایثار پیدا کیا ہے کہ خدمت خلق اللہ اپنے اندر پیدا کرو، اس کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔

ایمان کی دو بنیادیں...... ایمان کی جو تعریف کی ہے علماء نے وہ دو ہی چیزوں سے کی ہے کہ ایمان کسے کہتے

ہیں؟ اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفْقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ اللہ کے اوامر کی عظمت دل میں ہو اور مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ دل میں ہو، ان دو چیزوں کا نام ایمان ہے۔ یعنی ان کے مجموعہ کا، اگر ایک شخص خادم شخص ہے مگر اللہ کے قانون کی عظمت نہیں کرتا، وہ بھی درحقیقت ایماندار نہیں ہے، اللہ پر بھروسہ بھی ہے مگر خدمت خلق کے بجائے خلق کو ایذا رسانیاں کرر ہا ہے تکلیفیں پہنچا رہا ہے تو درحقیقت اس کے ایمان میں خلل ہے، ایمان کی دو بنیادیں ہیں کہ تعظیم ہو اوامرِ الٰہیہ کی اور جذبہ خدمت ہو خلق اللہ کے لئے ان دو چیزوں سے ایمان مضبوط ہوتا ہے تو مخلوق کے ساتھ تعلق جب قائم ہو سکتا ہے جب احسان اور ایثار اور خدمت کے جذبات ہوں اور مساوات کا جذبہ ہو کہ یہ میرا بھائی ہے اسے بھی نفع پہنچنا چاہئے اگر میرے پاس ایک روٹی ہے دوسرے کے پاس نہیں تو میں آدھی بانٹ لوں گا تا کہ دونوں کے پیٹ میں کچھ نہ کچھ پہنچ جائے، تنہا کھالینا خودغرضی ہوگی، جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے اگر کسی کی دیوار کے نیچے پڑوسی پر فاقے گزر رہے ہیں اور وہ پیٹ بھر کر کھار ہا ہے اس کی نمازیں بھی قبول نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ پڑوسی کی رعایت نہ کرے اور اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش نہ کرے، تو آدمی یہ سمجھے کہ میں اتنی تلاوت کرتا ہوں اتنی نمازیں پڑھتا ہوں اور خدمت خلق کا یہ عالم کہ دیوار کے نیچے لوگ فاقہ بھر رہے ہیں تو کہا جائے گا کہ اس نے ایمانداری کا فی الحقیقت ثبوت نہیں دیا اور یہ نماز وذکر وعبادت کارآمد نہیں ہوں گی جب تک اس کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا نہیں ہو جائے گا، کہ میرا بھائی بھی بھوکا نہیں رہنا چاہئے، بہرحال یہ جذبہ پیدا کیا جائے۔ اصول فرمادیا گیا کہ: "اَحِبَّ لِاَخِیْکَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ" ① (اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو) اور جو چیز اپنے لئے بری جانتے ہو اپنے بھائی کے لئے بھی بری جانو جب تک مساوات معاملے کی نہیں ہوگی ایمانداری مضبوط نہیں ہو سکے گی، اگر آپ یہ چاہتے ہیں اور آپ کو برا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی گالی دے تو آپ بھی کبھی کسی کو گالی نہ دیں جو اپنے لیے برا سمجھتے ہیں وہ اپنے بھائی کے لئے برا سمجھیں، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو آپ بھی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ نہ ڈالیں جب تک یہ نہیں کریں گے آپ کی ایمانداری مضبوط نہیں ہوگی۔

زمین خریدنے والے ایک صحابی کی زمین سے سونا نکلنا..... فرق یہی ہے کہ ہم لوگ لڑتے ہیں اپنی اغراض کی خاطر کہ مجھے یہ مل جائے چاہے دوسرا فاقے سے مرجائے حضراتِ صحابہؓ میں ایثار وہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ لڑتے تھے اس پر کہ دوسرے کو مل جائے مجھے نہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے زمین خریدی دوسرے صحابیؓ نے اس کو جو کھدوایا تو اس کے اندر سے ایک بہت بڑا پتیلا نکلا پیتل یا تانبے کا جس میں سونا بھرا ہوا تھا، لاکھوں روپے کا سونا، انہوں نے کہا یہ بند کا بند رہنے دو اور وہ پیتل کا پتیلا لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی کہ یہ آپ کی چیز ہے آپ رکھیں، انہوں نے کہا

① مسند احمد، حدیث اسد بن کرز جد خالد القسری رضی اللہ عنہ ج: ۳۳ ص: ۴۸۶ رقم: ۱۶۰۵۷۔

کیا مطلب ہے؟ کہا میں نے جو زمین خریدی ہے اس میں سے نکلا ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین بیچ دی تو زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ ہے وہ بھی بیچ دیا یہ تو آپ کا ہے میرا کب ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین خریدی تو اس میں اس کا ذکر نہیں تھا، اب وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، اس پر لڑائی ہو رہی ہے۔ ہم تو اس پر لڑتے ہیں کہ ہمارا ہے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں ثابت کرتے ہیں کہ یہ زمین ہماری ہے، وہ ثابت کرنے کی فکر میں تھے کہ میری نہیں میرے بھائی کی ہے، جب جھگڑا ختم نہ ہوسکا تو مقدمہ پہنچا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک، جب دیکھا کہ یہ نہیں سمجھتے تو فرمایا تمہارے کوئی اولاد بھی ہے؟ ایک نے کہا لڑکا ہے، ایک نے کہا میرے ہاں لڑکی ہے، فرمایا دونوں کی شادی کردو اس میں اس مال کو خرچ کردو، تو خوش ہو کر چلے گئے، گویا اس پر کوئی تیار نہیں ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرے، وہ راضی ہوئے نہ یہ راضی ہوئے تو اولاد پر خرچ کردیا اس پر راضی ہو گئے، یہ وہی جذبہ خدمت اور جذبہ ایثار تھا کہ دینے کے اوپر لڑائی ہوتی تھی۔ ہماری لڑائی لینے پر ہوتی ہے اس لیے کہ دنیا کی محبت گھسی ہوئی ہے، ان کے دلوں میں اللہ اور رسول کی محبت ہوتی تھی، دنیا ان کے تابع تھی تو وہ لینے پہ نہیں جھگڑتے تھے دینے پہ جھگڑتے تھے، ہمارے دل میں تو گھٹن جب ہوتی ہے جب پیسہ پاس نہ رہے، ان کے دل میں گھٹن جب ہوتی تھی جب پیسہ بڑھ جائے۔

حضرت جابرؓ اور ان کی بیویؓ کا ایک رات میں چھ لاکھ درہم خیرات کرنا...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ لکھ پتی صحابہ میں ہیں ایک دن آئے تو چہرہ اداس تھا، بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ آج آپ غمگین کیوں ہیں؟ کہا خزانہ میں روپیہ بہت جمع ہو گیا دل پہ بوجھ ہو رہا ہے، انہوں نے کہا بوجھ ہو رہا ہے تو غریبوں میں تقسیم کردو اس بوجھ کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کہا واقعی بات تو ٹھیک کہی میرے ذہن ہی میں نہیں آئی، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ غریبوں میں تقسیم کردو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں یتیموں کو بیواؤں کو مفلسوں کو مال تقسیم ہوتا رہا، صبح کو جب حساب لگایا تو چھ لاکھ درہم تقسیم ہوئے رات بھر میں، صبح کو بیوی کا شکریہ ادا کیا کہا "اللہ تجھے جزائے خیر دے میرا دل ہلکا ہو گیا، سارا بوجھ ختم ہو گیا" تو ہم پہ تو بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی کمی آجائے، وہاں بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی زیادتی ہو جائے، فرق یہی تھا کہ ہم میں تعلق مع اللہ کمزور ہے، ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے اس لیے ان کی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہیں تھی، ہمارا تعلق انہی چیزوں سے ہے یہ گھٹ جائیں تو دل میں پریشانی بڑھ جاتے تو دل میں سکون کی بجائے اس کے کہ توکل علی اللہ کریں، کسی نے توکل علی الدولت کر رکھا ہے، کسی نے توکل علی العورت کر رکھا ہے، کسی نے توکل علی البلڈنگ کر رکھا ہے، مختلف توکلات ہیں اور نہیں توکل تو اللہ کے اوپر نہیں ان کا توکل بھروسہ اور اعتماد حق تعالیٰ کے اوپر تھا اس لیے ان چیزوں کی اہمیت کوئی نہیں تھی، یہ ضروریاتِ زندگی تھیں۔

ذرائع رزق سے تعلق کی نوعیت...... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی آج سے کمانا چھوڑ دے، ملازمت بھی چھوڑ دے، جائیداد تجارت بھی چھوڑ دے کہ صاحب میں تو ان پر نظر نہیں رکھتا یہ بھی غلط ہے یہ افراط ہے وہ تفریط، کمانا

بھی ضروری ہے، لازم قرار دیا ہے اسلام نے۔ "كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ" ① (پاک اور حلال کمائی کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح سے نماز پڑھنا فرض ہے) اپنی قوت بازو سے کماؤ بھک منگے مت بنو کہ دوسرے سے مانگ کر کھاؤ، ایسے بنو کہ دس کو کھلا کر کھاؤ، قوت بازو سے کماؤ، تو کسبِ حلال کو فرض قرار دیا گیا ہے، کیوں کماؤ؟ تاکہ زندگی آسودگی سے گزرے، کیوں زندگی آسودگی سے گزرے؟ تاکہ اللہ کی عبادت کرسکو، بندگی کے فرائض انجام دے سکو تو مقصودِ اصلی کمانا نہ ہوا، بلکہ بندگی اور عبدیت ہوئی، اس کے وسائل میں سے ہے کمانا تو اسے لازم قرار دے دیا گیا، کہ کماؤ، تو حاصل یہ کہ میرے پاس اتنا ہو جائے کہ میں دوسرے سے مانگنے کے لائق نہ بنوں، لیکن اس میں اگر حق تعالیٰ برکت دے اور سو سے تم ہزار پتی ہو جاؤ اور ہزار سے لکھ پتی تو یہ نہیں کہ اس دولت کو سمندر میں بہادو، جا کر اس کی حفاظت کرو اور اس میں سے حقوق ادا کرو، اولاد کا حق، بیوی کا حق، رشتہ داروں کا حق، غریبوں کا حق۔ یہ ادا کرو تو کمانا برا نہیں ہے، حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے، جب وہ کمائی پاک بنے گی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ پر توکل کر کے ان چیزوں کو آدمی ترک کردے، ملازمت، زراعت سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ دے بلکہ سب چیزیں اختیار کرلے اور اللہ ہی کے کہے کے مطابق انہیں خرچ کرے، پھر یہ ساری چیزیں اطاعت وعبادت میں داخل ہو جائیں گی، تو صحابہ کرامؓ میں لکھ پتی بھی ہیں، کروڑ پتی بھی ہیں، اگر دنیا کمانا مضر ہوتا تو صحابہ ملازمت کرتے نہ تجارت کرتے نہ صنعت وحرفت میں پڑتے لکھ پتی ہونا تو بعد کی چیز ہے، لیکن وہ لکھ پتی بھی تھے۔

عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی مالداری اور خشیتِ خداوندی...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ لکھ پتی صحابہؓ میں ہیں ان کی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تو کیفیت برکت کی یہ تھی کہ ان کا مال غیر ممالک میں بھی سپلائی ہوتا تھا، نفع کا روپیہ جب آتا تھا تو یہ نہیں کہ کوئی ایک دو آدمی جیب میں ڈال کر چلے آئیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کے لیے کوئی صندوق کوئی پٹارہ نہیں رہتا تو تنگ آ کر کہتے گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو، روپے اشرفی کا ڈھیر اس طرح لگ جاتا تھا، جیسے کاشتکار کے گھر میں غلہ کا ڈھیر لگ جاتا ہے کہ زمین سے غلہ آیا انہوں نے کہا گھر میں ڈھیر کردو، یہ کیفیت تو دولت کی تھی۔

لیکن اس دولت کے ساتھ قلب کی کیفیت کیا تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمان داری تھی چار چار سو مہمان ایک وقت میں ہوتے تھے، دسترخوان بچھتا کئی کئی کھانے اس پہ چنے جاتے جب دسترخوان چن دیا گیا مہمان کئی سو بیٹھے اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیٹھے، اب بیٹھ کر رونا شروع کیا بے اختیار گریہ طاری ہوا اور کہا اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر تو کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰن کے دسترخوان پر اتنے کھانے کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو ختم نہیں کی جارہیں، یہ کہہ کر آبدیدہ ہوتے سارے مہمان روتے اور بے کھائے پئے دسترخوان اٹھ جاتا۔

کسی کے اندر یہ ذوق نہ رہتا کہ کھانا کھائیں، غمِ آخرت میں مبتلا ہو گئے، شام کو دسترخوان بچھا بیٹھے اور عبدالرحمٰن

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب الاجاره، باب كسب الرجل وعمله بيديه ج:٦ ص:١٢٨.

بن عوفؓ کو نعمتیں دیکھ کر پھر گریہ طاری ہوا اور کہا کہ: اے اللہ! تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ نے اس حالت میں انتقال فرمایا کہ کفن کے لیے چادر پاس نہیں تھی، چھوٹی چادر تھی سر ڈھانپتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے، پیر ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا آخر کار سر ڈھانپ دیا گیا پیروں پر گھاس ڈال دی گئی اور قبر میں دفن کر دیا گیا تو عمِ رسول ،رسول کے چچا تو اس ناداری میں اور عبدالرحمٰن کے دستر خوان پر اتنی نعمتیں، کہیں میری جنت دنیا میں تو ختم نہیں کی جارہی کہ وہاں میں محروم رہ جاؤں اور مجھے کہہ دیا جائے ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ ① (کہ تم دنیا میں نعمتیں ختم کر چکے ہو اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟) کہیں ایسا تو نہیں ہوگا؟ تو دستر خوان سے بے کھائے اٹھ جاتے، تین تین وقت کے فاقے تھے۔ تو لکھ پتی بھی ہیں اور قلب کا یہ حال ہے۔

مقامِ تفویض میں مال رکاوٹ نہیں ہوسکتا..... تو اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کماؤ مت، یہ کہتا ہے کہ اسے معبود مت بناؤ اس مال کو مخدوم مت بناؤ، گویا قلب کا تعلق قائم کر دیا۔ تمہاری شان یہ ہونی چاہئے کہ:

دل بیار دست بکار

''ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوں، دل یار کے اندر لگا ہوا ہو'' ہاتھ پیر دولت میں مصروف اور دل اللہ میں مصروف، مسلمان کی یہ شان ہونی چاہئے، بھک منگا اور مفلس ہونا مسلمان کی شان نہیں ہے، غنی ہونا مومن کی شان ہے، غنی وہی ہو کہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہو اور پھر وہ بے پرواہ ہو۔

''خَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ'' ② بہترین غنا یہ ہے کہ نفس غنی بن جائے۔ خزانہ بھرا ہوا ہے مگر نفس غنی ہے ،ایسے غنی بن کر جو صرف کرے گا تو اس سے ہزاروں کے منافع ہوں گے، تو مفلس بنانا اسلام کا مقصد نہیں ہے، غنی بنانا اسلام کا مقصد ہے اور غنی بنانے کے یہ معنی ہیں کہ ساری دولت دنیا کو خادم سمجھو ضرورت ہے، ضرورت کے لئے آدمی کرتا ہے سب کچھ کراہت بھی رکھو مگر اس کے باوجود اس سے خدمت بھی لو آخر آدمی پاخانہ میں بھی جاتا ہے، تو کوئی رغبت سے جاتا ہے کہ اسے بڑا شوق ہے پاخانہ جانے کا کراہت سے بیٹھتا ہے، مگر جانا بھی ضروری ہے، یہ بھی نہیں کرسکتا کہ نہ جائے تو ضرور جائے گا بیٹھے گا، مگر کراہت بھی رہے گی اسی طرح سے ہاتھ پیر سے کما بھی رہا ہے، سب کچھ ہے مگر کراہت یوں ہے کہ کہیں یہ حارج نہ ہو جائے میری آخرت میں، تو چوکنا رہنا ہے کہ یہ دشمن بھی ہے کہیں دشمنی پر آمادہ نہ ہو اس کی نکیل میرے ہاتھ میں رہنی چاہئے، تو صحابہ اور حضرات اہل اللہ کی یہی شان تھی کہ اہل اللہ میں بڑے بڑے مال دار بھی گزرے ہیں لیکن بزرگی میں کوئی فرق نہیں، ٹھاٹ دار بھی گزرے ہیں کہ بادشاہوں کے وہ ٹھاٹ نہیں تھے، جو بعض اولیاء کرام کے تھے۔

اولیاء اللہ کا دُنیوی کروفر اور مرزا مظہر جانِ جاناں اور بادشاہ کا واقعہ..... خواجہ عبید اللہ احرارؒ مسندیں لگی ہوئی ہیں، خُدام کھڑے ہوئے ہیں دروازوں پر نقیب ہیں۔ بادشاہ وقت بھی آنا چاہے تو پہلے وقت لے گا منٹ

① سورۃ الاحقاف: ۲۰. ② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس ج: ۲۰ ص: ۷۹ رقم: ۵۹۶۵.

مقرر رہوں گے تب آسکیں گے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اولیاء میں سے ہیں اور اکابر اولیاء میں سے ہیں، لیکن مزاج میں لطافت و نزاکت تھی تو مسندیں جو سلتی تھیں چھ چھ مہینے میں تیار ہوتی تھیں، کہیں اونچ نیچ نہ ہو جائے، طبیعت میں کوئی تکدر نہ پیدا ہو، مسند لگی ہوئی ہے، خدام ہیں، بادشاہ وقت جو مغل ایمپائر کا بادشاہ تھا اس نے اجازت چاہی تو اجازت نہیں ملتی تھی آخر بادشاہ نے خدام کو ہموار کیا کہ خادم ذرا دل میں گھر کیے ہوئے ہوتے ہیں، اس کی خوشامد کی کہ مجھے پانچ منٹ کی اجازت دلا دے۔ خادم نے جب عرض کیا تو اجازت ہوئی کہ بادشاہِ سلامت پانچ منٹ کے لیے آجائیں، تو مغل بادشاہ آیا بڑے ادب سے سلام کر کے مؤدب بیٹھ گیا، چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے، حضرت مرزا صاحب کو کچھ پیاس معلوم ہوئی تو خادم کھڑا ہوا تھا فرمایا کہ پانی لاؤ، بادشاہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں پانی پیش کروں، وہ خادم بیٹھ گیا، بادشاہ سلامت پانی لینے کے لئے گئے، گھڑونچی پر گھڑا رکھا ہوا تھا، پانی انڈیل کر اس کے اوپر جو ڈھانکنے کا ڈھکنا تھا، وہ ٹیڑھا رکھا گیا، بس تکدر پیدا ہو گیا مزاج میں، جب بادشاہ آیا، فرمایا تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں بادشاہت کیا کرتے ہو گے؟ وہ بے چارہ بادشاہ بھی نادم ہوا، تو بادشاہوں کے وہ کرّ وفر نہیں تھے جو ان اہل اللہ کے تھے اور بزرگی پھر بھی قائم ہے۔ تو بزرگی نام کپڑوں کا نہیں ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے والے بزرگ ہوتے ہیں اور جو فاخرہ لباس پہن لیا بزرگی ختم ہو گئی، بزرگی قلب کی صفت ہے بعض دفعہ وہ ریاست کے چولے میں نمایاں ہوتی ہے، بعض دفعہ فقر و فاقہ کے چولے میں آتی ہے، حضرت عیسیٰ کا زُہد اور یوسف و سلیمان علیہم السلام کی بادشاہت نبوت سے زیادہ بزرگی تو نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جن کے زہد کا یہ عالم ہے کہ کل دنیا کی دو چیزیں ان کے ہاتھ میں تھیں ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چمڑے کا تکیہ جہاں موقعہ ملا تکیہ رکھا سو گئے، جہاں ضرورت پڑی وہ پیالہ ہاتھ میں ہے، اُسی سے وضو کر لیا اسی سے کھانا کھا لیا۔

ایک دفعہ دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے تو کہا اللہ اکبر! معلوم ہوتا ہے دنیا ضرورت سے زائد ہے، بلا تکیہ بھی کام چل سکتا ہے تو وہ تکیہ بھی اسی وقت پھینک دیا، کہنی رکھ کر سونے لگے، پھر ایک شخص کو دیکھا کہ ایک تالاب پر کھڑا ہوا چلو سے پانی پی رہا ہے تو کہا افسوس یہ پیالہ بھی زائد لے رکھا ہے بغیر اس کے بھی کام چل سکتا ہے، وہ پیالہ بھی اٹھا کر پھینک دیا تو یہ کیفیت زہد کی ہے، اور ترکِ دنیا کی ہے ایک طرف تو یہ ہے نبوت کی شان اور ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں کہ شاہانہ محلات ہیں، تختِ شاہی بچھا ہوا ہے اور جن و انس حاضر ہیں بڑا بھاری دربار ہے اور کرّ و فر اور نبوت موجود ہے، تو نبوت کا تعلق کپڑوں سے نہیں قلب سے ہے، شاہانہ ٹھاٹھ میں بھی نبوت رہ سکتی ہے، اور فقیرانہ لباس میں بھی اسی طرح ولایت شاہانہ لباس میں بھی رہ سکتی ہے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی رہ سکتی ہے، تو ولایت اور بزرگی نام کپڑے کا نہیں ہے، قلب کے تعلق مع اللہ کا نام بزرگی ہے، کہیں چولے میں ہوتی ہے ریاست کے اور کہیں چولے میں ہوتی

ہے فقر و فاقہ کے، عوام یوں سمجھتے ہیں کہ بزرگ وہ ہے جو فاقہ مست ہو، نہ لباس پاس، کپڑے پھٹے ہوئے اور پرانے وہ بزرگ ہے، لیکن خواص سمجھتے ہیں کہ بزرگی کپڑوں کا نام نہیں، قلب کا تعلق اگر اللہ سے صحیح ہے مضبوط ہے نسبت مضبوط ہے وہ بزرگ ہے، لباس کچھ ہی پہن لے، غرض انبیاء علیہم السلام کی شانیں بھی الگ الگ ہیں کہ ٹھاٹھ بھی ہیں اور فقر و فاقہ بھی ہے، اولیاء کی بھی یہی شانیں ہیں۔

دنیاداروں پر مالدار انبیاء اور اولیاء کے ساتھ حجت قائم ہوگی...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل دولت حاضر ہوں گے اور ان کی غفلتیں پیش کی جائیں گی کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟ وہ عذر پیش کریں گے کہ آپ نے ہمیں دولت دی تھی کاروبار دیا تھا، اب اس میں لگتے یا ہم مسجد میں بیٹھتے، اس میں لگتے یا ہم نمازیں پڑھتے اور فرائض ادا کرتے، آپ کی دی ہوئی نعمت تھی اس میں لگ گئے، اس میں لگنے سے فرائض رہ گئے تو نظیر میں ایسے اہل اللہ کو اور انبیاء علیہم السلام کو پیش کیا جائے گا جن کو سلطنتیں دی گئی تھیں، فرمائیں گے کہ سلطنت کے کاروبار میں رہ کر بھی ان کی عبادت میں فرق نہیں آیا اور چند ہزار روپے لے کر تمہاری عبادت میں فرق آ گیا، ان میں فرق کیوں نہیں آیا؟ یہ بھی تو انسان تھے تو ان لوگوں پہ حجت تمام کی جائے گی، بہر حال حاصل یہ ہے کہ بزرگی نام قلب کی صفت کا ہے، بزرگی نام لباس کا نہیں ہے، پیسہ کا نہیں، پیسہ کمانے کا نہیں۔

اس لیے شریعت یہ نہیں کہتی کہ کہ تم کمانا چھوڑ دو، پیسہ تمہارے ہاتھ میں نہ رہے یہ نہیں کہتی، سب کچھ کرو، تم تجارت بھی کرو زراعت بھی کرو اور اللہ تمہیں لکھ پتی بنائے تو لکھ پتی بھی بنو اور کروڑ پتی بنائے تو کروڑ پتی بھی بنو، مگر قلب کا ناس مت مارو اس کا تعلق اپنے مالک کے ساتھ قائم رکھو، اور یہ سمجھو کہ ہم اس دولت کے حق میں امین ہیں، ہم خزانچی ہیں، تو خزانچی اتنا ہی خرچ کرے گا جتنا مالک آرڈر دے گا، خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر جتنا چاہے خزانے کو لٹا دے، یا دبا کر بیٹھ جائے، ایک پائی نہ دے، وہ انتظار کرے گا، مالک کس کے لیے کہتا ہے۔

مالک نے کہا دس ہزار اسے دے دو، خزانچی کا فرض ہے دے دے، مالک کہے گا فلاں کو مت دو تو روک لے گا، اس لیے کہ خزانچی مالک نہیں ہے وہ تو امانت دار ہے مالک وہ ہے جس کی رقم ہے، اس لیے جتنی بھی دولت ہمارے ہاتھ میں ہے حقیقتاً مالک حق تعالیٰ ہیں ہم امین ہیں، وہ یوں کہیں کہ اس طرح خرچ کرو اسی طرح خرچ کرنا پڑے گا۔

ایک غریب بیوہ آئی آرڈر دیا گیا کہ خرچ کرو، اور سینما تھیٹر سامنے آ گیا تو آرڈر یہ ہے کہ ہرگز ایک پائی خرچ نہ کرو، ورنہ تمہارا حرام خرچ ہوگا، لہو و لعب میں مت خرچ کرو، طاعت و عبادت میں خرچ کرو، مالک کو حق حاصل ہے جہاں چاہے خرچ کرائے ہم کون ہیں کہ اپنے ارادے سے خرچ کریں! اپنی مرضی سے خرچ کریں! مرضی مالک کی چلے گی، تو اہل اللہ باوجود مالدار ہونے کے ان کی نگاہ اصل مالک پر رہتی ہے کہ ان کا حکم کیا ہے! اس کے مطابق ہم چلیں، بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کمائیں بھی، آپ لکھ پتی بھی بنیں مگر اپنے غریب بھائیوں کو

نہ بھلائیں، خدمتِ خلق آپ کا شیوہ ہونا چاہئے، اگر کوئی نادار ہے تو آپ اس کو سہارا دیں، کوئی پریشان حال ہے تو آپ قال سے حال سے اس کو سہارا دیں، کہ اس کی پریشانی رفع ہو، اگر دو کلمہ کہہ کر آپ تسلی دے سکتے ہیں تو آپ دریغ نہ کریں، چار پیسے خرچ کر کے تسلی دے سکتے ہیں تو خرچ میں دریغ نہ کریں، غرض دامے درمے قدمے سخنے قلمے کسی طرح سے آپ تسلی دیں وہ آپ کے فرائض میں داخل ہے۔

اعلیٰ ترین عبادت...... حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اعلیٰ ترین عبادت انسان کی کیا ہے؟ ''اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ'' سب سے زیادہ محبوب اللہ کو کیا ہے۔ اِلْقَاءُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُسْلِمٍ کسی مسلمان کے دل میں خوشی پیدا کر دینا یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ انسان کے لئے کوئی کلمہ ایسا کہہ دیا کہ دل خوش ہو گیا، کوئی خدمت ایسی کر دی کہ آدمی مطمئن ہو گیا، کوئی بات کی اور ڈھنگ ایسا اختیار کیا کہ فرحت پیدا ہو گئی، فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی طاعت وعبادت یہ ہے، تو طاعت وعبادت محض مسجد ہی میں نہیں، یہ بھی طاعت وعبادت ہے: ''اِلْقَاءُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُسْلِمٍ'' کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی فضیلت بیان کی کہ صدقہ دینے میں یہ فضیلت ہے، یہ برکت ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر پیسہ پاس نہ ہو؟ فرمایا پیسہ پاس نہیں ہے تو چند کلمے ہی خیر کے کہہ دو وہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہو گا تو عرض کیا کہ اگر کہنا بھی نہ آتا ہو؟ فرمایا کم سے کم تکلیف مت پہنچاؤ، یہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہے غرض خدمت مسلم خدمتِ خلق اللہ یہ بڑا اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے مسلمان کا، یہ ایمان کا ایک بٹہ دو ہے، آدھا حصہ ایمان کا خدمتِ خلق ہے اور آدھا حصہ تعظیم الامر اللہ ہے اس لیے میں نے عرض کیا کہ سب سے بڑی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ اس کے بغیر قلبی سکون نہیں مل سکتا اور دوسری چیز کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ بغیر ایثار کے بغیر خدمت کے یہ چیز نہیں بن سکتی۔

تربیت نفس کے درجات...... اب تیسری چیز یہ ہے کہ اپنے نفس سے کیا تعلق ہے! تو بھئی نفس جو ہے یہ شرور کا منبع ہے یعنی ہر برائی نفس سے ابھرتی ہے، ہر بداخلاقی نفس سے ابھرتی ہے تو نفس درحقیقت آدمی کا دشمن ٹھہرا، اور یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے، فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ'' ① تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یعنی تمہارا نفس ہے، مثل مشہور ہے ہمارے یہاں، اپنا آپا دشمن ہوتا ہے کوئی کسی کا دشمن نہیں تو نفس درحقیقت دشمن ہے اس لیے کہ جتنی ذلت اور رسوائی متعلق ہے وہ نفس کی خواہشات سے متعلق ہے نفس کی خواہشات کو روک دیں، ذلت نہیں ہو گی، آپ بازار میں گئے اور دیکھا کہ دکان پر بڑی عمدہ مٹھائیوں کی لگن لگی ہوئی ہے، کھانے کا جی چاہا نفس نے چاہا کہ مٹھائیاں کھاؤں اب ظاہری بات ہے کہ پیسہ تو ہاتھ پلے تھا نہیں آپ نے جلدی سے جھپٹا مارا اور بھاگے

① کنز العمال، باب الجهاد الاکبر من الاکمال ج: ۴ ص: ۴۳۱ رقم: ۱۱۲۶۳۔ علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواه البيهقى فى الزهد باسناد ضعيف وله شاهد من حديث انسؓ.... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۴۳۔

اور دکاندار اٹھ کر آپ کے پیچھے، آپ نے جلدی سے کچھ منہ میں رکھا اور کچھ جیب میں رکھا یہاں تک کہ اس نے آ کے پکڑا اور جوتیاں مارنی شروع کیں اور پولیس آ گئی معلوم ہوا کہ یہ تو جھپٹا مار کر غصب کر کے لے گئے تھے تو مقدمہ چلا جیل گئے، مار پٹائی ہوئی جیل گئے اور ذلیل ہوئے۔

کس نے ذلیل کیا؟ اس نفس کی خواہش ہی نے تو کیا، اور اگر اللہ کی مرضی پر اور عقل پر چلتے تو عقل یہ کہتی تھی کہ غیر کے مال پر بلا اس کی مرضی کے ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، دیکھنا بھی مناسب نہیں تھا، نگاہ نیچی کر کے جاتے وقار کا تقاضا یہ تھا، یہ کر کے جاتے تو دکاندار کے دل میں بھی عزت ہوتی، گورنمنٹ کے دل میں بھی عزت ہوتی کہ باوقار آدمی ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس کی پیروی کرنے میں ذلت ہے اور نفس کے خلاف کرنے میں عزت ہے، نفس نے خواہش کی جذبہ آ گیا کہ مار کھاؤ پٹائی ہو لہٰذا مار کٹائی شروع ہوگئی اور عقل یہ کہتی تھی صبر وتحمل سے کام لو یہ موقع نہیں ہے، عقل کی سنتے تو وقار بڑھ جاتا، مار پٹائی شروع ہوئی تو بلوہ قائم ہوگیا اور مقدمہ بازی، ذلت اور رسوائی شروع ہوئی، تو جتنا آدمی نفس کی پیروی کرے گا اتنا ہی ذلت میں پڑے گا، ہاں البتہ اس نفس کو اگر آپ نے سدھا کر تربیت سے مزکیٰ اور مصفّٰی بنا لیا اب اس نفس کے اشاروں پر چلیں کوئی مضائقہ نہیں تو نفس ابتدا میں نفسِ امارہ ہوتا ہے، ہر برائی کا حکم دیتا ہے اور اخیر میں جا کر بنتا ہے نفس مطمئنہ، جب وہ مطمئن ہو جائے اللہ کی تقدیرات پر، تو ابتدائی حالت میں نفس کی پیروی ذلت اور رسوائی ہے اور نفس کو مطمئن بنا کر اس کی پیروی کرنا وہ حق کی پیروی ہوگی، کیونکہ نفس مطمئن وہی چاہے گا جو اللہ چاہتا ہے، اس میں ذلت نہیں بلکہ عزت ہوگی اس کا انجام یہ ہے:

﴿يَـٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي ٥ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ اے نفس مطمئنہ! يَـٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف، تو ادھر سے گیا تھا پیدا ہو کر لوٹ اپنے رب کی طرف ﴿ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ﴾ کس حالت میں؟ ﴿رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ تو اللہ سے راضی اللہ تجھ سے راضی ﴿فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي ٥ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (1) میرے خاص بندوں میں داخل ہو، میری جنت میں جا داخل ہو۔ تو ایک نفس مطمئنہ ہے جو تابع حق بن جاتا ہے اس کی مرضی پر چلنا حق کی مرضی پر چلنا ہے اور ایک نفس امارہ ہے جس کے اندر برائی ہے ابھی تربیت نہیں ہوئی، اس کی مرضی پر چلنا ذلت اور رسوائی کی راہ پر چلنا ہے، تو نفس کو مُزکیٰ کیا جائے محنت سے عبادت سے ریاضت سے، اور وہ پاک صاف بن جائے، اولیاء کا نفس ہو جائے، انبیاء علیہم السلام کے نفس کے نقشِ قدم پر چلنے لگے، وہ فی الحقیقت حق پر راضی ہوتا ہے، بلکہ حق کی مرضی اس میں ہوتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ" حضرت عمرؓ کی شان فرمائی کہ جدھر عمرؓ جھکتے ہیں حق بھی ادھر جھک جاتا ہے، بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا تھا کہ جدھر حق چلتا ہے حضرت

---

(1) پارہ: ۳۰، سورۃ: الفجر، الآیۃ: ۲۷، ۳۰۔

عمرؓ ادھر جھکتے ہیں اور کہا جا رہا ہے جدھر کو حضرت عمرؓ چلتے ہیں ادھر کو حق چلتا ہے تو ایک مقام ہے مبتدی کا اور ایک مقام ہے منتہی کا، مبتدی کا مقام تو یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر کو یہ چلے تابع بنے اور جب کمال کی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر حق ادھر کو چلے گا جدھر کو یہ چلے گا، اس لیے کہ اتنا پاک بن جائے گا کہ اس کے اندر جو مرضی آئے گی وہ مرضی حق ہوگی، نفس کی ہر خواہش حق کے مطابق ہوگی، خلاف ہو نہیں سکتی جدھر یہ چلے گا حق ادھر کو جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی شان عجیب ہے "اِنَّ رَبَّکَ یَسْرَعُکَ فِیْ هَوَاکَ" ①

آپ کا پروردگار آپ کے نفس کی خواہش پوری کرنے میں اتنی جلدی کرتا ہے کہ ادھر دل میں آیا کہ یہ ہوا ادھر ہوگئی وہ چیز۔ تو یہ وہی مقام ہے انتہائی کہ جدھر نفس چلے گا حق ادھر چلے گا اس لیے کہ نفس فنا ہو گیا ہے حق کے اندر تو اس میں کوئی خواہش ابھرے گی ہی نہیں خلافِ حق اور جب حق کے مطابق خواہش ابھری تو حق ہی چلا ادھر ہی شان حضرت عمرؓ کی فرمائی گئی۔ "دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَیْثُ دَارَ" حق بھی ادھر کو ہی گھوم جاتا ہے جدھر کو عمرؓ گھومتے ہیں، یہ انتہائی مقام ذکر کیا گیا ہے جو سالک کا انتہائی مقام ہے، نفس اتارہ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر کو حق چلے۔ جی چاہے یا نہ چاہے اس کی پیروی کرے تب جا کر اس کے اندر صفائی پیدا ہوگی، تب جا کر اس کے اندر جلا پیدا ہوگی تو نفس بہر حال اپنی ابتدائی حالت میں آدمی کا دشمن ہے "اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ" تمہارے دو پہلوؤں میں جو بیٹھا ہے وہ ہے تمہارا دشمن، تو جتنی مصیبتیں آتی ہیں وہ اس نفسِ امارہ کی خواہشات پوری کرنے پر آتی ہیں حقیقت میں یہ بنیاد ہوتا ہے، ظاہر میں آپ کچھ عذر پیش کریں کہ فلانے نے مجھے مارا فلاں نے ظلم کیا، حقیقت میں ظلم آپ نے خود کیا دوسرا ذریعہ بنا اس ظلم کا قرآن کریم میں بھی یہی ہے کہ قیامت کے دن یہی کہا جائے گا ﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ ② اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا یہ تو آدمی نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔

تو آدمی ظالم اپنے نفس کے لئے خود بنتا ہے دوسروں پر وبال خواہ مخواہ وہ ڈالتا ہے، اور اس کی مثال بالکل ایسی واضح ہے کہ ایک شخص کو مثلاً پھانسی دی گئی اس کی لاش ٹنگی ہوئی تھی تو چند عقلاء جمع ہوئے کہ بھئی اس کی موت کا سبب کیا ہوا؟ ایک نے کہا کہ کھلا سبب موجود ہے گلے میں پھندا پڑا ہوا ہے، پھندا پڑنے سے سانس گھٹ گیا، موت واقع ہوگئی، دوسرے نے کہا تم نہیں سمجھے اصلیت، پھندا خود بخود تھوڑا ہی پڑ گیا اصل میں اس کی موت کا سبب وہ تختہ ہے جو پاؤں کے نیچے تھا، وہ بھنگی نے کھینچ لیا تو پھندا پھنسا اور پھندا پھنسا تو جان نکل گئی، تو موت کا سبب پھندا نہیں بلکہ تختہ ہے، تیسرے نے کہا کہ تو بھی بے وقوف احمق ہے، تو بھی نہیں سمجھا تختہ کیسے مٹ گیا وہ تو بھنگی نے سرکایا ہے، جب

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الرضاع، باب جواز هبتها نوبتها لضرتها ج:۷ ص:۳۸۵ رقم: ۲۶۵۹.

② پارہ:۱۴، سورة: النحل، الآية: ۳۳.

بھنگی نے تختہ کھینچا تو پھندا لگا اور پھندا لگنے سے سانس گھٹا اور موت واقع ہوئی، تو موت کا سبب نہ پھندا ہے نہ تختہ ہے بلکہ بھنگی ہے، چوتھے نے کہا تو بھی بے وقوف ہے بھنگی کو کوئی ذاتی عداوت تھی کہ خواہ مخواہ اس نے تختہ کھینچ لیا مجسٹریٹ کا حکم اسے ملا تھا اس آرڈر کے سبب سے بھنگی نے تختہ کھینچا اور تختہ کھینچنے سے پھندا پڑا پھندا پڑنے سے جان نکلی تو موت کا سبب، مجسٹریٹ کا حکم ہے، پانچویں نے کہا تم بھی اصلیت کو نہیں پہنچے، مجسٹریٹ کو کوئی ذاتی عداوت تھی، کوئی عداوت تھوڑی ہی تھی، اس کو اصل میں مجسٹریٹ نے اس لیے حکم دیا کہ اس نے قتل ناحق کیا تھا، اور پشتینی ثابت ہو گیا کہ یہ قاتل ہے، مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ اسے بھی پھانسی دے دو تو موت کا سبب یہ خود ہے، نہ مجسٹریٹ ہے نہ بھنگی ہے نہ تختہ ہے، نہ پھندا ہے اصل میں یہ خود ہے موت کا سبب، تو جتنا بھی آدمی کے اوپر وبال آتا ہے وہ کسی کو بھی سبب بنائے کسی پر بھی اس کا وبال ڈالے حقیقت میں انجام کار نکلے گا کہ وہ خود ظالم ہے اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

تعلیم وتربیت کے آثار...... تو اس نفس ظالم کو اگر آپ عادل بنا دیں اور بے رُخ ہو کر عدل پیدا کر دیں وہی نفس کامل ہو جائے گا، اسی کو کامل بنانے کے لیے شریعتیں آئیں کہ نفس کا ظلم ہٹا کر اس میں عدل پیدا کیا جائے، نفس کا جہل مٹا کر اس میں علم پیدا کیا جائے، ایک طرف تعلیم کا سلسلہ جاری ہو جس سے علم آئے ایک طرف تربیت کا سلسلہ جاری ہو جس سے اعتدال عمل اور اخلاق میں پیدا ہو، دنیا کی چیزیں تعلیم اور تربیت نکل آئیں جس قوم میں تعلیم نہیں ہے یقیناً تنزل اور پستی میں گرے گی، دنیا کی کوئی قوم کبھی عروج نہیں پا سکتی جب تک کہ اس کے اندر تعلیم اور ٹریننگ نہ ہو، کوئی دنیا کو مقصد بنا لے تو دنیاوی تعلیم لے گا، دنیوی طور پر ٹریننگ کرے گا، کوئی دین کو مقصد بنا لے تو دینی تعلیم لے گا، دینی تربیت حاصل کرے گا، بہر حال جو قوم تعلیم میں نہیں پڑتی وہ ذلت اور رسوائی کی طرف جاتی ہے۔

اس لیے کہ دل ودماغ بنانے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے، تعلیم سے جس طرح چاہو ڈھال دو دل ودماغ کو اچھی تعلیم دو گے اچھے بن جائیں گے دل ودماغ کو بری تعلیم دو گے برے بن جائیں گے، جب انگریزوں کا ابتدائی تسلط ہوا ہندوستان میں تو مسلمانوں کو عام طور سے تنفر تھا اور نفرت کی بناء بھی ظاہر تھی کہ ان کے ہاتھ سے حکومت چھیننے والے تو انگریز ہی تھے، تو ان کے دل میں کب گنجائش ہو سکتی تھی، ایک تنفر قائم تھا اس کے لاکھ جتن کیے کہ نکل جائے نفرت نہیں نکلی، میکالے نے تدبیر بنائی کہ میں تعلیم سکیم لے کر چلتا ہوں، اس تعلیم سے ان کے دل ودماغ بدل دو تو نفرت آپ ہی نکل جائے گی، پھر تو تمہارا کلمہ پڑھیں گے تو تعلیم سکول اور کالج کی شروع ہوئی، اب اس نے اعلان کیا کہ ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل ودماغ کے لحاظ سے فرنگستانی ہوں“ تو تعلیم کامیاب ہوئی دل ودماغ بدل گئے اور اس درجہ بدلے کہ نظریات ہی بدل گئے، قلوب کا رخ ہی بدل گیا پھر وہ ہر چیز انگریز ہی کی پسند کرنے لگے، تو غلط طریق ہوا کہ انگریزوں کی جو صنعت وحرفت تھی، ترقیات تھیں ٹیکنیکل ترقیات اور مکینکل ترقیات وہ عملی چیزیں حاصل کرتے مگر نظریات اسلامی قائم رکھتے، الٹا کر دیا کہ نظریات تو ان کے لیے اور عملیات ان کے ترک کر دیئے تو پستی میں پڑ گئے، دین کے لحاظ

سے بھی دنیا کے لحاظ سے بھی، دنیوی ترقیات میں ان کے طریق عمل کو لیتے اور نظریات واعتقادیات دین کے مطابق رکھتے الٹا قصہ کر دیا کہ تعلیم پا کر نظریات تو وہ ہو گئے جو ان کے تھے اور عمل اپنا ختم ہو گیا کہ ان کے عمل سے کوئی عبرت نہ پکڑی بہر حال میکالے نے یہ ایک اعلان کیا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔

اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ یہ بزرگ کھڑے ہوئے انہوں نے دار العلوم دیو بند کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت میں ہزار ہا مدارس ملک میں قائم کئے اور انہوں نے بھی اعلان کیا کہ: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل و دماغ کے اعتبار سے عربستانی اور اسلامستانی ہوں۔'' تو ایک کنبہ کو بچا لے گئے ورنہ بہہ پڑا تھا یہ سیلاب اور پورا ہندوستان بہہ جاتا، مگر ایک بڑا کنبہ بچ گیا ان لوگوں کے اعلان سے۔

تعلیم بقاءِ مذہب کا ذریعہ ہے...... انہوں نے دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جس سے آج ہم اور آپ اسلامی صورت لیے ہوئے ہیں، اسلام کا نام لیتے ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان میں مدارسِ دینیہ نہ ہوتے تو شرک و بدعت کے سوا ہندوستان میں کچھ نہ ہوتا کوئی مسئلہ بتانے والا نظر نہ آتا، یہ ان مدارس اور ان علماء کے طفیل ہے کہ آج مسئلہ بتلانے والے موجود ہیں، تو دین کا تحفظ مذہب کا تحفظ اس کی تعلیم کے تحفظ سے ہوتا ہے جس مذہب کی تعلیم گم ہو جاتی ہے وہ مذہب گم ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضروری ہمارے انگلستانی بھائیوں کے لیے یہ ہے کہ اگر وہ اپنے دین کو سنبھالنا چاہتے ہیں تو اپنا تعلیمی نظام درست کریں ایسے مدارس قائم کریں کہ جن میں اللہ اور رسول کا قانون ان کے ذہنوں میں جمے وہ دوسری تعلیم بھی پائیں اس سے کوئی انکار نہیں ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ سائنس حاصل نہ کریں آپ فلسفہ حاصل نہ کریں سب کچھ حاصل کیجئے، مگر اپنی بنیاد تو قائم کر لیجئے، بنیاد آپ اپنی قائم نہ کریں اور دوسرے کی بنیاد پر آپ تعمیر کریں تو کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ زمین میری ہے ملبہ اٹھاؤ یہاں سے، آپ کے ہاتھ میں نہ زمین رہے گی نہ ملبہ رہے گا، لیکن اگر آپ کی بنیاد اپنی ہے اور تعمیر کر رہے ہیں تو دوسرے کی مجال نہیں ہے کہنے کی کہ ملبہ اٹھاؤ زمین میری ہے، آپ کہیں گے زمین ہماری ہے، اپنی بنیاد پر قائم ہو جائے پھر دوسرے کی ترقیات سے چیزیں لیجئے، کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسلام کوئی مانع نہیں ہے، وہ بنیاد تو قائم کیجئے، اور بنیاد بلاشبہ قائم ہوتی ہے تعلیم سے، نہ پروپیگنڈہ سے قائم ہوتی ہے نہ کسی اور سلسلہ سے دل و دماغ کی تعمیر ہمیشہ تعلیم نے کی ہے، تو تعلیم کا نظام مضبوط کیجئے، مدارس قائم کیجئے علماء پیدا کیجئے جب تک پیدا نہ ہوں بلایئے علماء کو ان کو رکھیئے، ان کے ذریعے سے علماء بنایئے، یہاں سے بچے بھیجئے کہ وہ عالم بن کر آئیں اور دین کی تعلیم دیں جب تک یہ سلسلہ نہیں کریں گے تعمیر ممکن نہیں ہے آپ کے دل و دماغ اور ذہن نہیں بنے گا آپ کا ذہن تو بنتا ہے تعلیم سے، آج میں تقریر کر رہا ہوں، تقریر کرنے سے فائدہ ہے، ضرور ہے کچھ بھولا ہوا سبق یاد آ جائے گا، لیکن

ذہن بن جائے وہ تو تربیت سے بنے گا، تقریریں ذہن نہیں بناتیں وہ تو بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہیں، لیکن سبق پڑھانا یہ مقرر کا کام نہیں یہ معلم کا کام ہے کہ سبق پڑھا کر دل میں جمائے ایک چیز کو اور تربیت کر کے اس کو ابھارے، یہ مربی کا اور معلم کا کام ہے۔

عبادت بلا علم...... تو جب تک آپ اپنا تعلیمی نظام درست نہیں کریں گے نہ تعلق مع اللہ صحیح ہوگا نہ تعلق مع الخلق صحیح ہوگا نہ تعلق مع النفس صحیح ہوگا تینوں تعلقات کی اُستواری جبھی ہوگی جب قرآن وحدیث کی تعلیم آپ کے اندر عام ہو، قرآن سے مسائل بھی آپ حاصل کریں، دلائل بھی آپ حاصل کریں، فضائل بھی آپ حاصل کریں، حدیث کے مضامین لیں، فقہ سے استفادہ کریں، سلف کا اتباع کریں دل بن جائے گا، ذہن بن جائے گا، اس واسطے تعلیم وتربیت انتہائی ضروری ہے اور اسی پر مبنی ہے، ان تینوں تعلقات کا درست ہونا خواہ تعلق مع اللہ ہو یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع النفس ہو، یہ نفس دشمن قابو میں نہیں آ سکتا، جب تک کہ اس کی چالوں اور داؤ سے واقف نہ ہوں آپ اس کی مکاریوں سے کیسے واقف ہوں، وہ شریعتِ اسلام سکھلائے گی، حدیث میں فرمایا ہے کہ: **فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** (1) ایک عالم دین سمجھ دار شیطان پر بھاری ہے ہزار عابدوں سے۔

ہزار عابد عبادت کر رہے ہیں مگر دینی علم یا بصیرت نہیں تو ان پر شیطان بے ڈھانتی سوار ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کے داؤ بھات سے واقف نہیں ہے، لیکن ایک عالم کے سر پر سوار ہوگا تو وہ ایک راستے سے آئے گا، وہ دس رستوں سے اس کی کاٹ کر دے گا، اس لیے کہ علم رکھتا ہے، نفس ہی کسی عالم کا مغلوب ہو جائے اور خود نفسی میں مبتلا ہو وہ تو الگ بات ہے لیکن راستہ بند نہیں ہوگا، عابد نیک نیتی سے شیطان کے راستوں پر چلے گا، اس لیے کہ اس کے مکر وفریب سے واقف نہیں، عالم اگر چلے گا نفسیانیت سے چلے گا، مگر راز سے واقف ہے، کاٹ کا راستہ جانتا ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ **فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** ایک فقیہ، ایک دین کا عالم ہزاروں عابدوں سے بھاری ہے شیطان پر۔ اور وہ اس لیے بھاری ہے کہ ایک عالم اپنے علم اور تعلیم سے دل ودماغ کو بنا دیتا ہے، واقف کر دیتا ہے شیطان کے مکر سے اور اس کے راستوں سے کہ یہ مداخل ہیں جن سے داخل ہوتا ہے، اور یہ مخارج ہیں جن سے دھکیلا جاتا ہے شیطان کو اگر وہ قادر ہو جائیں اور عابد پر وہ بے ڈھانتی سوار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ بے چارہ عبادت میں لگا ہوا ہے، مگر مکر وفریب کے راز سے اور اس کی کاٹ سے واقف نہیں، تو نیک نیتی کے راستے اسے تباہ کر دیتا ہے۔

احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے، سیر کی کتابوں میں ہے، حدیث کی متداول کتب میں تو نہیں ہے، سیر کا کہو تاریخ کا کہو کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، زاہد تھا اور بہت بڑا عابد اور رہبان تھا، مگر نہایت عبادت گزار، رات دن مصروف اور اس کی جھاڑ پھونک میں بھی اثر تھا، ہزاروں آدمی اس کے پاس آتے اور کوئی پانی پڑھوا کر کوئی تعویذ لکھوا کر

---

(1) السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۵.

لے جاتا اورلوگوں کو فائدہ ہوتا، دو حقیقی بھائی تھے جن کو ایک تجارتی سفر پیش آیا اوران کی ایک بہن تھی جوان، انہوں نے کہا کہ اس جوان بہن کو کس کی نگرانی میں دیں، رائے یہ ہوئی کہ اس عابد اور رہبان کی نگرانی میں دے جاؤ وہ دونوں بھائی حاضر ہوئے، اورادب سے عرض کیا کہ ہماری بہن جوان ہے اسے آپ نگرانی میں لے لیں۔

فرمایا یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا کسی اور کے سپرد کرو میں خانقاہ کا بیٹھنے والا ہوں، میں عورت کی نگرانی کیسے کروں گا، مجھ سے نہیں ہوگا، انہوں نے منت کی، کہا یہ ممکن نہیں میں نہیں رکھوں گا وہ چار پانچ دن لگے رہے غرض منت خوشامد کر کے راضی کر لیا کہا اچھا میں اس طرح سے راضی ہوں کہ اس خانقاہ میں جو سب سے کنارے کا حجرہ ہے، اس میں اپنی بہن کو چھوڑ کر تالی باہر ڈال دو، اندر سے بند کر لے، میرا کام اتنا ہوگا کہ میں سیڑھیوں پر کھانا رکھ آؤں گا وہ اٹھا لے جایا کرے گی، برتن وہاں رکھ دے گی میں برتن اٹھا لوں گا، اس سے زیادہ میرا کوئی واسطہ نہیں، انہوں نے کہا بس اتنا کافی ہے، بس آپ کی نگرانی میں ہے، چنانچہ یہ ہوا وہ اس حجرے میں چھوڑ گئے، یہ عابد کھانا لے کر جاتا اور سیڑھیوں پر رکھ آتا وہ کھا پی کر برتن سیڑھیوں پر رکھ دیتی، یہ اٹھا لاتا، یہ روز کا معمول ہو گیا، برس دو برس اس میں گزرے تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ وہ تیری مہمان ہے تو اچھوتوں کی طرح سے کھانا رکھ آیا اور برتن اٹھا لیے اور لے آیا یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے اچھوت اقوام میں سے ہو کہ اس کے سائے سے بھی بچنا اس مہمان کے دل پر کیا گزرے گی، یہ بری بات ہے کم سے کم کھانا اسے خود پکڑا دینا چاہئے، یہ نہیں کہ سیڑھیوں پر رکھ آیا وہ بے چاری لے گئی، نیک نیتی سے یہ خیال جمایا۔ اب یہ کیا اس نے کہ بجائے سیڑھی پر رکھنے کے دستک دی وہ عورت آئی اس کے سپرد کر دیتا وہ لے جاتی برتن لینے آتا وہ عورت برتن دے دیتی ایک آدھ سال اس میں گزرا، اس کے بعد شیطان نے پھر وسوسہ ڈالا، یہ بھی احترام پورا نہیں ہے، مہمان کی بات تو جب ہے کہ کم سے کم میزبان ساتھ تو کھاوے، اگر ساتھ نہ کھاوے تو کم سے کم اس وقت تک پاس تو بیٹھا رہے جب تک وہ کھانا کھائے تا کہ اسے معلوم ہو کہ میری کچھ آؤ بھگت میری کچھ مدارت ہوئی، اب یہ خیال جما تو بجائے اس کے کھانا پکڑا دے کھانے کا دستر خوان بچھا تا اور وہ کھاتی رہتی اور اس کے بعد یہ برتن لے کر آتا، اس کے بعد ایک دوسرا وسوسہ یہ پیدا ہوا کہ میزبان کا حق تو یہ ہے کہ ساتھ کھائے بیٹھ کر یہ تو یہ معنی ہو گئے کہ گویا مہمان کوئی اچھوت ذات ہے کہ اس کے پاس کے کھانے کو بھی ہاتھ نہ لگائے، یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے کم سے کم مل کر کھانا تو کھالینا چاہئے۔ عرب میں تو عام دستور ہے کہ اگر دستر خوان بچھ جائے تو پہلے میزبان ابتدا کرتا ہے، مہمان ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک پہلا لقمہ میزبان نہ کھائے، احترام اسی کو کہتے ہیں، اب اس نے ساتھ مل کر کھانا شروع کیا، اب ظاہر ہے کہ ساتھ مل کر کھانا کھانے میں وقت خلوت بھی میسر ہوئی اور جب کچھ عرصہ بڑھا تو تعلقات بڑھے روابط بڑھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عابد اس عورت کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہو گیا جب بدکاری میں مبتلا ہوا تو اب سوچا کہ اگر باہر آ کر اس نے کہہ دیا تو میری تو ساری زندگی رکر کری ہو جائے گی یہ لوگ جو عقیدت مند ہیں کہیں گے کہ یہ تو بڑا بدکار ہے تو

اس نے چھری سے قتل کیا اس عورت کو اور اپنی خانقاہ کے قریب دفن کیا اس کے بعد چند دن کے بعد اس کے بھائی آ پہنچے وہ آئے بہن کو لینے، کہا بہن کہاں ہے، اس نے کہا اس کا تو انتقال ہو گیا اور میں نے دفن کر دیا۔

بھائی بے چارے بہت روئے پریشان ہوئے مگر جہاں شیطان نے یہ وسوسہ ڈال کر اسے مبتلا کیا تھا، وہاں ان بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ اگر وہ مرتی تو دو چار دس آدمی اس کے لیے دعا کرتے کوئی نماز پڑھتا کوئی چرچا ہوتا فلاں کی بہن مری، یہ کیسی موت ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں وہ مر بھی گئی دفن بھی ہو گئی۔ خانقاہ کے جس آدمی سے پوچھتے ہیں اسے کچھ پتہ نہیں ان کے دل میں کھٹکا گزرا، انہوں نے کہا کہ قبر کھود کر دیکھنی چاہئے، قبر جو کھودی تو کٹی ہوئی لاش نکلی، اب ثابت ہوا کہ اس عابد نے مارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اطلاع دی گئی، اس عابد کے پیروں میں رسی باندھ کر سارے شہر میں اسے گھمایا اور اس کے بعد اس کو قتل کیا گیا، انتہائی رسوائی اور ذلت ہوئی تو عابد زاہد تھا، مگر علم نہیں رکھتا تھا تو اسی کے رستے سے شیطان نے ورغلایا نیک نیتی کے رستے سے، آج یہ نیک نیتی پیدا ہوئی کہ ساتھ کھائے، پھر نیک نیتی پیدا ہوئی کہ اس کے پاس بیٹھے اور وہ بد نیتی نہیں تھی، مگر نتیجہ نکلا کہ وہ مبتلا ہو گیا، لیکن اگر عالم ہے اور جانتا ہے کہ خلوتِ اجنبیہ حرام ہے صورت دیکھنا بھی نامحرم کی ناجائز ہے اس کے حق میں، اسے نہیں آنا چاہیے پاس تو بہر صورت اس کا علم اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ نیک نیتی کے لاکھ خیال آتے وہ کہتا کہ نیک نیتی صحیح مگر قواعد شرعیہ کے خلاف ہے نبوت کی تعلیم کے خلاف ہے، یقیناً میں خطا میں مبتلا ہوں گا اور پھر بچ جاتا، لیکن اس بے چارے کو علم تھا نہیں، نیک نیتی تھی عبادت کا جذبہ تھا، اسی جذبہ عبادت میں حسنِ نیت کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تو تعلیم اور علم ہی ہے جو انسان کے دل و دماغ کو بناتا ہے، یہ نہ ہو گا تو مذہب کی جو حدود ہیں، اب اخلاق کے ہر خلق کی ایک حد ہے ہر عمل کی ایک حد ہے، حدود کا پتہ نہیں چل سکتا ان کی وجوہات سامنے نہیں آسکتیں، وہ ذوق پیدا نہیں ہو سکتا اس واسطے تعلق مع اللہ ہو، یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع النفس ہو ان تینوں کے لیے تعلیم اور تربیت ضروری ہے اور اس کا نظام قائم کرنا ضروری ہے اور امید یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان کر لیں گے، ہم جب ارادہ کر رہے تھے یہاں آنے کا تو یہ تصور بھی نہیں تھا ہمارے ذہن میں کہ اتنے مسلمان ہوں گے ہم سمجھتے تھے کہ سو دو سو میں کوئی ایک آدھ رلا ملا جائے گا، ماشاءاللہ یہاں بستیاں کی بستیاں ہیں، ہزاروں کی تعداد اور مدارس بھی الحمد للہ قائم کر رکھے ہیں اور سلسلہ جاری ہے اس سلسلہ کو بڑھایا جائے تعلیم مکمل کی جائے۔

دینی ذوق کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے..... آج ابتدائی تعلیم ہے اس کو بڑھا کر اتنی کیجئے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم شروع ہو جائے اور دلوں کے اندر وہ نورانیت اور وہ ذوق پیدا ہو اور اس کے ساتھ آپ دنیوی عصری تعلیم کچھ بھی پائیں اسلام اس میں حارج نہیں ہے، وہ تو اس وقت حارج ہو گا جس وقت کوئی چیز دین کے اندر حارج بننے لگے وہ روکے گا، لیکن جب تک حارج نہیں آپ کوئی بھی فن حاصل کریں مگر بنیاد اپنی قائم کر لیں، تو یہ تین مقصد مجھے عرض کرنے تھے، تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق، تعلق مع النفس، اور یہ آیت اس لیے اختیار

کی کہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں تینوں مقاصد، فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ اے لوگوں عبادت اپنے رب کی کرو۔ معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ تعلق بغیر عبادت کے نہیں جڑ سکتا اور عبادت جب تک کہ نسبتِ عبودیت نہ ہو کہ بندہ اپنے کو سمجھے عابد اور اپنے خالق کو سمجھے معبود اور عابد اور معبود کے درمیان کے راستے کے راز کو سمجھے اس وقت تک نسبتِ عبودیت قائم نہیں ہوگی تو ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ سے اور وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے تو نسبت عبودیت نکلتی ہے، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾

تقویٰ کسے کہتے ہیں...... تقویٰ کہتے ہیں نفس کو بچا دینا اس کی خواہشات سے، اگر نفس کی خواہشات پر چل پڑے یہی فجور کہلاتا ہے، اس سے بچ گیا تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اِنْتِهَاءُ النَّفْسِ عَنْ مَرَاغِبِهَا نفس کو روک دینا اس کے مالوفات سے اس کے مرغوبات یہ ہے تقویٰ تو ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ سے تعلق مع النفس کا پتہ چلا اور بیچ میں ہے وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ تم عبادت کرو اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہارے آباؤ اجداد کو تمہارے بھائی بندوں کو، تو معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ بندگی کرنے میں ہم سب کے سب برابر کے شریک ہیں اور جب کسی ایک مرکز سے سب جڑ جاتے ہیں تو ان کے ساتھ تعلق اور ربط خود بخود قائم ہوگا اور شفقت کا تعلق قائم ہوگا تو ﴿اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ﴾ سے تقویٰ نکلا اور وہ ہے بنیاد نفس کی اصلاح کی اور ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ سے نسبتِ عبودیت نکلی جو بنیاد ہے، بندے اور خدا کے درمیانی تعلق کی اور وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ساری مخلوق کو ملا کر ایک سے مربوط کرنے کا باہمی ربط نکلا تو تعلق مع الخلق کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اس لیے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ یہ سارے مضامین صراحتاً الگ الگ آیتوں میں بھی موجود ہیں، لیکن ایک جگہ جڑے ہوئے ہوں بلاغت کے ساتھ کنایۃً اور اشارہ سے ہوں وہ زیادہ بلیغ سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ آیت میں نے تلاوت کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آیت کی بقدرِ ضرورت کچھ تشریح ہوگئی اس لیے کہ کما حقہ، اس کے علوم کو ادا کرنا یہ تو کسی بڑے عالم کا کام ہے ہم جیسے طالب علم کا کام نہیں ہے، جن کے اندر علم سے زیادہ جہل غالب ہو وہ کیا قرآن کی تشریح کریں گے، لیکن بالا جمال اپنی بساط اور اپنی استطاعت کے مطابق جتنی تفسیر ہو سکتی تھی وہ ایک درجہ میں تفسیر بھی ہوگئی تو حق تو ادا نہیں ہوا قرآن کا اور کون کر سکتا ہے، مگر اپنا حق تو ادا ہوگیا کہ جتنا ہمارا فرض تھا سامعین کا تھا انہوں نے سنا تو ہم نے بھی بول کر حق ادا کر دیا، آپ نے بھی حق ادا کر دیا، اور اس پر عمل نصیب ہو جائے تو ہمارے لیے سعادت ہے اور خوش قسمتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو علم اور عمل اور حال اور کمال اخلاق کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارے سارے تعلقات حق تعالیٰ درست فرمائے اور شرعی اصول کی ہمیں رہنمائی فرمائے اور علومِ الٰہیہ سے ہمیں بیگانہ نہ رکھے، آشنا بنائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَاوَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ اَللّٰھُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَامَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

آثارِ صحبت اوراس کی ضرورت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!

تاثیرِ صحبت غیر اختیاری ہے...... ایک حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا ذوق اور رنگ ہے کہ وہ کس طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی طبائع کا کیا رنگ ہے، اصل میں مسلمان کو وہ رنگ حاصل کرنا مقصود ہے وہ بغیر صحبت کے حاصل نہیں ہوتا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔انسان کو دیکھ کرانسان رنگ پیدا کرتا اور قبول کرتا ہے، پھر یہ چیز انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے میں صحبت کا اثر قدرتی بات ہے آپ کپڑے میں گلاب کے پھول ڈال کر رکھ دیں تین دن کے بعد نکالیں گے تو پورے کپڑے سے خوشبو آئے گی، محض گلاب کے پھول کی صحبت سے کپڑے نے بھی وہ رنگ و بو قبول کرلیا جو گلاب کے پھول میں تھی، سردیوں میں آپ اون کے کپڑوں میں تمباکو بھر کے رکھ دیتے ہیں کہ کیڑا نہ لگے جب آپ اگلی سردیوں میں نکالتے ہیں تو پورے کپڑوں میں تمباکو کی بھنک سی آتی ہے، تو کپڑے نے تمباکو کا اثر قبو کرلیا، لوہار کی بھٹی میں آپ لوہا ڈال دیں، بیس منٹ بعد آپ نکالیں گے تو لوہا بھی آگ بنا ہوا ہوگا، حتی کہ آگ کی صورت بھی قبول کرلے گا، اس میں اور آگ کے انگارے میں کوئی فرق نہیں ہوگا، کام بھی وہی کرے گا جو انگارا کرتا ہے، محض اس لئے کہ اسے آگ کی صحبت میسر آ گئی اوراس نے اس کا اثر قبول کرلی۔آپ کسی ایسی بستی میں رہتے ہوں جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہوتو قدرتی طور پر مزاج میں رطوبت آجائے گی، ایسے ریگستان میں رہتے ہوں جہاں میل و میل پانی نہ ہوتو مزاج میں ایک قسم کی خشکی اور گرمی ہوگی، کوہستان میں آپ رہتے ہوں جہاں پتھر ہی پتھر ہوں تو مزاج میں ایک قسم کی خشونت اور سختی ہوگی جیسے پہاڑی لوگوں میں ہوتی ہے، الغرض ہر چیز کا قدرتی طور پر اثر ہے، تو حجارات بھی اثر قبول کرتے ہیں، نباتات بھی اثر قبول کرتے ہیں، حیوانات بھی اثر قبول کرتے ہیں ایک طوطے کو آپ اپنے پاس رکھ لیں چند دن کے بعد وہ ویسے ہی بولیاں بولنے لگے گا، جیسے آپ بولتے ہیں، چاہے سمجھے نہ سمجھے اثر قبول کرلے گا، جو

جانور انسانوں کے پاس مکانوں میں رہتے ہیں، ان میں وہ وحشت باقی نہیں رہتی جو جنگلی جانوروں میں ہوتی ہے، یہ تبدیلی محض صحبت کے اثر سے ہوتی ہے، اُنس جو انسانیت کا خاصہ ہے اگر کسی انسان کو آپ جنگل میں پرندوں کے پاس چھوڑ دیں، وحشت پیدا ہو جائے گی، انسانوں سے اُنس باقی نہیں رہے گا، وہ حیوانات کی صحبت کا اثر قبول کر لے گا۔

ذوقِ دین...... الغرض ہر چیز کی صحبت کا ایک اثر ہے، تو دین بھی بہر حال فقط ایک راستے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک کیفیت ہے ایک ذائقہ ہے ایک مزہ ہے، جب تک اسے استعمال نہ کیا جائے اس کا مزہ نہیں آئے گا، اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا مَنْ رَّضِيَ بِاللهِ رَبًا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا وَّنَبِيًّا ① اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ سے بحیثیت رب ہونے کے راضی ہو گیا، اسلام سے بحیثیت رسول اور پیغمبر ہونے کے راضی ہو گیا، یعنی ان تمام حیثیتوں سے وہ راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے راضی تو ہوا لیکن رب ہونے کی حیثیت ہونے سے نہیں بلکہ فلاسفہ کی طرح علت تامہ ہونے کی حیثیت سے راضی ہوا، اس لئے کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت تامہ ہیں جیسے سورج دن کے نکلنے کے لئے علت تامہ ہے، علت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے، وہ شی اس علت پر مرتب ہوگی، چنانچہ جب سورج نکلے گا تو سورج ارادہ کرے یا نہ کرے دن کا نکلنا لازمی ہے تو سورج کو دن کی علت کہیں گے، وہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ ہیں اسی وقت سے عالم چل رہا ہے، جب تک رہیں گے جب تک عالم چلے گا، ان کے ارادہ سے عالم کی پیدائش کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان کی ذات سے عالم سرزد ہو رہا ہے وہ ارادہ کریں یا نہ کریں، حتی کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میں صفات نہیں ہیں، نہ ارادہ ہے نہ مشیت ہے نہ قدرت ہے، بلکہ وہ سورج کی طرح سے ہیں کہ ان کے لئے مخلوقات لازم ہیں وہ ارادہ نہیں کرتے مخلوقات ان سے سرزد ہوتی ہیں جیسے دھوپ آفتاب سے سرزد ہوتی رہتی ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی بلحاظ علت ہونے کے راضی ہوا تو وہ مسلم نہیں ہو سکتا، وہ مسلم ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب ہونے کے بحیثیت خالق ہونے کے، بحیثیت رحمٰن ہونے کے بحیثیت صاحب ارادہ ہونے کے راضی ہو یعنی صفات کو بھی مانے، وہ اللہ تعالیٰ کا ماننے والا سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اسلام سے کوئی شخص بلحاظ ایک لاء اور قانون ہونے کے راضی ہو، جیسے آج دنیا میں ہزاروں قانون ہیں، اسلام بھی ایک قانون ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ اسلام ایک لاء اور قانون ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا کر دیا ہے، جیسے چند قانون دانوں نے بیٹھ کر تعزیراتِ ہند وضع کر لی ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع کر کے قانون مسلمانوں کو دیا ہے تو کوئی شخص اسلام سے بلحاظ قانون ہونے کے راضی ہوا، مگر بلحاظ دین ہونے کے راضی نہیں۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الدليل على من رضي بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبياً ج: ١ ص: ١٣٧ رقم: ٤٩.

دین اور قانون کا باہمی فرق......اس لئے کہ دین اور قانون میں فرق یہ ہے کہ دین وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بھیجے اور قانون فقط افعال پر بریک لگاتا ہے، کوئی چوری کرے گا قانون کی دفعہ لگ جائے گی چوری کا فعل بند کر دیں گے، کوئی زنا کرے گا قانون کی دفعہ لگے گی اور جیل بھیج دیں گے تاکہ یہ فعل رک جائے، لیکن قانون سے جذبات پر اثر نہیں پڑتا کہ دل میں بھی زنا و چوری سے نفرت پیدا ہو جائے، دین وہ ہے جو افعال کو بھی روکتا ہے اور دل میں بھی گناہوں اور معصیت سے نفرت بھی پیدا کر دیتا ہے، تو دین ظاہر اور باطن دونوں پر لاگو ہوتا ہے، اور قانون فقط ظاہری افعال پر لاگو ہوتا ہے قلب سے اسے کوئی تعلق نہیں، گھر میں بیٹھ کر کوئی جتنے بھی جرائم کرے حکومت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر گھر میں بیٹھ کر تنہائی میں کوئی جرم کرے گا، دین اسے ٹوکے گا کہ یہ کیا حرکت کی؟ کوئی دیکھنے والا نہیں اللہ تو دیکھ رہا ہے، تو خدا کا قانون انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر عائد ہوتا ہے اور دنیوی بادشاہوں کے قوانین فقط ظاہر پر لاگو ہوتے ہیں، افعال کو تو روکتے ہیں مگر اخلاق سے ان کا کوئی تعلق نہیں، تو آدمی میں جب دین آئے گا تو قلب اس کا رنگ قبول کرے گا، اخلاق بھی بدل جائیں گے اعمال بھی بدل جائیں گے۔

مقصدِ دین الفاظِ محض نہیں ذوقِ نبوت پیدا کرنا ہے......تو دین اسے کہتے ہیں کہ رنگ پیدا کرے اور رنگ بلا صحبت کے پیدا نہیں ہوتا بغیر معیت کے پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نیک لوگوں میں رہیں گے کوئی علم نہ ہو پھر بھی قدرۃً نیکی کے راستے پر چل پڑیں گے، نیک لوگوں کی صحبت کا یہی اثر ہے، بری سوسائٹی میں رہیں گے آپ کو ان کی معلومات حاصل ہوں یا نہ ہوں برے افعال خود بخود سرزد ہوں گے، بری سوسائٹی اور صحبتِ بد کا اثر ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک صحبت کو عطار کی دکان سے تشبیہ دی ہے کہ عطر فروش کی دکان پر کوئی جائے اور عطر نہ بھی خریدے کم از کم دماغ میں خوشبو آ ہی جائے گی آدمی کچھ نہ کچھ معطر ہو کے ہی اٹھے گا، اور بری صحبت کی مثال لوہار کی بھٹی سے دی ہے کہ اگر آدمی اس کی دکان پر چلا جائے تو کپڑوں کو کچھ نہ کچھ سیاہی لگ ہی جائے گی، پتنگا ہی لگ جائے گا، ناک کو کچھ بدبو ہی آ جائے گی، الغرض کوئی نہ کوئی مضرت ہی لے کر آئے گا، جیسے عطار کی دکان سے تھوڑی بہت قلبی راحت ہی لے کر آئے گا، نیک کی صحبت میں بیٹھ کر اگرچہ علم بھی نہ ہو، کم از کم دین کا نفع لے کر ہی اٹھتا ہے، اس صحبت کا قدرتی اثر ہے، الغرض دین کا مقصد علم کے الفاظ یاد کرنا نہیں بلکہ وہ رنگ قبول کرنا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا رنگ ہے اور سلسلہ بسلسلہ چلا آ رہا ہے، اس لئے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

صحبت کا اثر دل پر اور الفاظ کا دماغ پر ہوتا ہے......ایک بات یہ بھی ہے کہ صحبت سے عمل کی امنگ پیدا ہوتی ہے، آپ ہزار نصیحتیں کر لیں آدمی اسے عقلاً اچھا سمجھے گا کہ واقعی بڑی اچھی بات ہے، لیکن دل قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جائے، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن نیک عالم یا کسی باخدا کی صحبت میں بیٹھئے وہ کچھ بھی نہ کہے، خواہ مخواہ دل چاہے گا کہ وہ ایسا ہی کرے دل پر دباؤ پڑے گا تو صحبت کا اثر براہ راست جا کر دل پر ہوتا ہے، علم کا اثر دماغ پر ہوتا ہے کہ ایک اچھی چیز سامنے آ گئی، عقلی طور پر اچھی معلوم ہونے لگی، آدمی کرے نہ کرے لیکن صحبت میں عقلاً کچھ سمجھے نہ

سمجھے عمل کرنے کو دل چاہے گا کہ یہ کام کرنے کا ہے، یہ صحبت سے اثر پڑتا ہے اس واسطے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

مدارِ دین صحبتِ اہل اللہ ہے ......اور دین کا دارومدار ہی صحبت ہے، آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی سب سے زیادہ اونچی تھی، اورامت کا اس پر اجماع ہے کہ امت میں کتنا ہی بڑا کوئی غوث، قطب بن جائے، ولایت کے مقامات طے کرے، مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، کیوں؟ اس لئے کہ صحابی صحبت یافتہ کو کہتے ہیں جس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، اپنی ان آنکھوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلمکے چہرہ مبارک کا دیدار کیا ہو، اپنے اِن کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام سنا ہو اور تاثیر کلام نبوت کی اس کے قلب میں ہے اس درجہ میں بعد والوں کے قلب میں نہیں ہوسکتی، جتنا اس کے قلب میں نبوت کی عظمت ہے اتنی دوسرے میں نہیں ہوسکتی، کیونکہ نبوت کو آنکھوں سے دیکھا معجزات کو دیکھا اور سن کر ایمان لائے ہیں دیکھ کر ایمان لائے ہیں، غرض دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے تو صحبت کا اثر ہے کہ صحابہ کرامؓ کا دین اتنا مضبوط ہوگیا کہ عالم میں کسی بھی جماعت میں خواہ کتنی بڑی سے بڑی ہو، وہ مضبوطی دین میں نہیں ہوگی جو حضرات صحابہ کرامؓ کو نصیب ہے یہ محض صحبت کا اثر ہے۔

علم نہیں بدلا صحبت بدلتی رہی ......علم آج بھی وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث کا صحابہ کرامؓ کو سکھلایا، لیکن صحبت محفوظ نہیں، راہِ راست وہی مگر وہ رنگ محفوظ نہیں آخر کوئی تو فرق ہے۔؟ چنانچہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ہم تدفین میں مشغول تھے۔ ابھی ہم نے پوری طرح مٹی بھی نہیں دی تھی کہ اَنْکَرْنَا قُلُوْبَنَا قلوب میں دین وایمان کی وہ کیفیت باقی نہ رہی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں ہوتی تھی۔ تو علم تو وہی تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا، اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی، مگر صحبت میں کمی آئی تھی جس کو قلب نے محسوس کیا کہ کوئی چیز تھی جو کم یا گم ہوگئی؟

صاحبِ صحبت کے فقدان کے آثار ...... مجھے یاد ہے کہ جب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی وفات ہوئی ایک دم یہ محسوس ہوا کہ وہ جو آثارِ صحبت تھے، ان میں نمایاں کمی ہوئی جو جماعت اہل حق کی اہل اللہ کی، دارالعلوم دیوبند یا مظاہر العلوم سہارنپور کے حضرات پر مشتمل تھی عام طور پر ان سب بزرگوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک خاص کیفیت جو نورِ ایمان کی تھی، اس میں کوئی پھیکا پن پیدا ہوگیا ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب کوئی ربانی عالم دنیا سے اٹھتا ہے تو عام قلوب دین کی کمی اور رنگ کا پھیکا پن محسوس کرتے ہیں جو قلوب میں قوت ایمانی ہوتی ہے اس میں قدرے ضعف محسوس ہونے لگتا ہے، اسی کو صحابہ کرامؓ فرمارہے ہیں کہ ابھی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی بھی پوری نہیں دی تھی کہ اَنْکَرْنَا قُلُوْبَنَا کہ قلوب متغیر ہوگئے اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تھی، یہ وہی صحبت کی قلت کا اثر تھا یا صحبت کے گم ہوجانے کا اثر تھا۔ بعینہ یہی بات حضرات تابعینؒ فرماتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صحبت یافتہ

ہیں کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اٹھ گئے تو ہم نے اس عالم کی وہ نبض نہیں دیکھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں تھی!

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ جب چودھویں صدی شروع ہوئی، حضرت مولانا کی وفات ۱۳۰۱ھ میں ہے، مولانا مزاجاً کچھ مجذوب تھے، تو صدی کے آغاز میں آسمان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا: اس وقت پوری دنیا میں انوارِ صحابیت گم ہو گئے۔

یعنی اب تک صحابہؓ کا نور محفوظ تھا، خواہ وہ صحابی جنات میں موجود ہوں مگر صحابیؓ دنیا میں موجود تھا، فرمایا اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صحابیت کی نورانیت ختم ہو گئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جنات سے بہت سابقہ پڑتا تھا کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی جنات میں موجود ہو اس کی برکات وانوار پورے عالم میں چھائے ہوئے تھے فرمایا آج وہ نوعیت مجھے معلوم نہیں ہوتی جو صحابیت کے انوار کی تھی۔

عالم ربانی کی صحبت اور کیسٹ کے بول کا فرق...... صحبت کا اثر ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اب یہی ریڈیو ہے، آپ ریڈیو سے دینی تقریر سنیں جو ایک عالم ربانی نے کی ہے، قلب پر وہ اثر نہیں پڑے گا جو آپ براہ راست اس کی زبان سے سنیں، مشین بولے گی مگر اس میں وہ رنگ اور کیفیت نہیں ہوگی، یہ تو صرف الفاظ نقل ہوں گے جب متکلم بولے گا اس کے الفاظ میں اثر ہوگا، کیونکہ زبان قلب کی ترجمانی کرتی ہے قلبی کیفیات بھی زبان سے ادا ہو رہی ہیں، الفاظ کے اندر لپٹ کر آرہی ہیں اور قلب میں پہنچ رہی ہیں، تو یہ کیفیت لفظوں کے ذریعہ پہنچی، تو وہ برکت اور نورانیت مشین کے بول میں نہیں ہوتی بس کانوں کو حظ حاصل ہو جاتا ہے کہ بہرحال کلمات تو خیر ہی کے ہیں، کوئی اہل دل ہو تو اسے اپنی کیفیات کا استحضار ہو جاتا ہے، ریڈیو کے اندر سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آتی، بلکہ ان الفاظ سے اپنی کیفیات یاد آجاتی ہیں، اور تازگی دل میں پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ہم قرآن کریم اس سے سنیں تو اس سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آئے گی، الفاظ قرآن سن کر اپنی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اجاگر ہو جائے گی، بخلاف ایک عالم اور ایک درویش ربانی کے کہ وہ جب کلام کرے گا تو اس کے اندر سے نکل کر ہمارے قلب میں پیوست ہوگا وہ اس کی قلبی کیفیات ہوں گی جو لفظوں کے واسطے اور زبان کے واسطے سے ہمارے دلوں میں پہنچیں گی، یہ چیز سوائے صحبت کے نہیں آسکتی، مشین کی صحبت سے وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی جو متکلم کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔

تاثیر محبت میں مواجہت کا اثر...... حتیٰ کہ یہاں تک فرق ہے کہ ایک مجلس میں سو آدمی بیٹھے ہوئے ایک عالم کا کلام سن رہے ہیں جو سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس کے قلب پر جو تاثیر ہوگی پشت پر بیٹھے ہوئے کی نہیں ہوگی، یہ قدرتی چیز ہے، اس لئے کہ قلب کا قلب سے مواجہ ہوتا ہے جب کیفیت براہ راست ٹکر کھاتی ہے، وہ زیادہ متاثر ہوتا ہے اور پچھلا آدمی ریڈیو کی طرح الفاظ سن رہا ہے، پوری طرح کیفیات منتقل نہیں ہو رہی ہیں اس لئے اس پر وہ اثر نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے واقعات میں ہے کہ جو ذہین طلباء کرام ہوتے تھے، انہیں فرماتے کہ وہ سامنے بیٹھیں، جو غبی

اور کند ذہن ہوتے، انہیں پیچھے بھیج دیتے تھے خدانخواستہ اگر وہ نہ بھی قبول کریں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، اس سلسلہ میں دلیل یہ بیان فرمائی کہ زبان جس چیز کو ادا کرے گی وہ قلبی کیفیات ہوں گی اور قلب کا قلب سے مواجہ ہوگا تو کیفیات ٹکر کھائیں گی، تو وہ براہِ راست جا کر قلب میں اتر جائیں گی، پشت پیچھے بیٹھنے سے کیفیت نہیں ٹکراتی صرف آواز ٹکراتی ہے تو کان میں معمولی سی کیفیت پیدا ہوگی، یہ بھی صحبت کی بات ہے۔

صحبت سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب سے نہیں پیدا ہوتا...... اس واسطے قرآن کریم نے تاکید فرمائی ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ① اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو، معلوم ہوا سب سے بڑی موثر چیز معیت وصحبت ہے، ماحول سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب وکاغذ سے پیدا نہیں ہوتا، اسلام نے جہاں عظیم الشان قانون پیش کیا ہے وہاں ایک ماحول بھی بنایا اس لئے کہ ماحول کے دائرے میں جو آجاتا ہے وہ دین کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔

① پارہ: ١١، سورة: التوبة، الآية: ١١٩.

حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے چشم دید تین ماحول

اوران کے آثار میں نے اپنی زندگی میں تین ماحول دیکھے اور تینوں کے مختلف اثرات دیکھے

گنگوہ کا ماحول...... سب سے پہلے حضرت اقدس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کا ماحول، اس وقت میری عمر سات آٹھ برس تھی، کوئی زیادہ شعور نہیں تھا بچپن کی بات تھی کوئی زیادہ تمیز نہیں تھی لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، یہ کیفیت طاری ہوتی تھی، خانقاہ کے سامنے ایک تالاب تھا اب بھی ہے، اور بڑا تالاب ہے، شہر بھر کے کپڑے دھوبی اسی تالاب میں دھوتے تھے کوئی پچاس ساٹھ دھوبی ہوتے، اور ہر دھوبی کا ایک لکڑی کا پٹڑا لگا ہوا ہوتا جس پر وہ کپڑوں کو دے دے کر مارتے ہیں اور دھوتے ہیں تو روزانہ پچاس ساٹھ دھوبی کپڑے دھوتے ہیں، تو میں نے یہ خود سنا دھوبی ان پڑھ جاہل، کوئی شعور انہیں نہیں، بس سیدھے سادھے مسلمان تھے، لیکن کپڑے پٹڑے پر دے کر مارتے ہیں، اور الا اللہ الا اللہ کی ضربیں زبان سے نکل رہی ہیں اور اللہ کے ذکر سے تالاب گونج رہا ہے، ہر کپڑے کی ضرب کے ساتھ ایک ضرب الا اللہ کی بھی ہے تو دور تک آواز آتی تھی کہ ذکر اللہ ہو رہا ہے، لوگ یہ سمجھے کہ یہ ذکر خانقاہ میں ہو رہا ہے، حالانکہ وہ خانقاہ سے باہر دھوبی ہیں، مگر خانقاہ کے ماحول کا اثر ان دھوبیوں پر بھی ہے، اس لئے کہ خانقاہ میں ہر وقت چونکہ ذکر اللہ ہوتا تھا ذاکرین وشاغلین جمع ہوتے اور اللہ اللہ کر رہے ہوتے، تلاوت میں مشغول ہوتے، ان کے اثرات ان پر بھی پڑتے تو ان کی زبان سے بھی اللہ اللہ نکل رہا ہے اور الاّ اللہ کی ضربیں لگا رہے ہوتے۔ بہرحال یہ ماحول کا اثر ہے غرض ایک ماحول میں نے اپنی زندگی میں ابتدائی دور بچپن میں یہ دیکھا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ کے وصال کے اثرات...... جب حضرت امام ربانی گنگوہی قدس اللہ سرہ کا وصال ہو گیا تو حضرت شیخ الہندؒ میرے والد مرحوم، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا میاں اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہم، یہ سب حضرات گنگوہ روانہ ہوئے اور ایک ٹٹو کرایہ کا لے لیا کہ باری باری سے اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، سادہ زندگی تھی، گنگوہ دیوبند سے بائیس کوس ہے، غرض یہ بڑے بزرگوں کا قافلہ چلا کہ میل بھر یہ سوار ہوں گے پھر یہ اتر جائیں گے میل بھر فلاں سوار ہوں گے، مجھے بھی ساتھ لیا اور یہ طے پایا کہ اس بچے کو اپنے آگے بٹھا دیا جائے، میری عمر نو برس ہوگی، اور اس وقت زیادہ بچہ بھی نہیں تھا، مگر بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بائیس کوس تک میں ہی بیٹھا رہا، سارے اکابر پیدل ہی چلتے رہے، کوئی بیٹھا ہی نہیں، خیر گنگوہ پہنچے، خانقاہ میں جب قدم رکھا تو میرے بچپن کی

بات تھی، مگر میں نے پریشان ہو کر کہا کہ: ابا جان! خانقاہ کو کیا ہو گیا؟ فرمایا! ہاں ہاں کیا ہوا بھائی؟ میں نے کہا کہ اس میں یوں معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی روکھا پن ہو، کوئی رونق ہی نہیں رہی، کہ برکت ہی معلوم نہیں ہوتی؟ ان بزرگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا دیکھو حضرت کے وصال کا اثر اس بچے نے بھی محسوس کیا کہ کسی چیز کی خانقاہ میں کمی ہو گئی، اینٹیں وہی ہیں حجرے وہی ہیں، مدرسہ بھی ہے مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز گم ہو گئی، تو یہ اس بچے تک کا احساس ہے تو بڑے کتنا محسوس کرتے ہوں گے، صاحب دل کتنا احساس کرتے ہوں گے وہ فی الحقیقت اسی ماحول کا اثر تھا جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا، برس دن کے بعد آ کر دیکھا تو رنگ پھیکا پڑ چکا تھا، تو اس عمر میں مجھے بھی احساس ہوا کہ یہاں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے، یہ تو تھا وہاں کے ماحول کا اثر کہ ذکر اللہ کی توفیق خود بخود ہوتی۔

تھانہ بھون کے ماحول کے آثار...... دوسرا ماحول تھانہ بھون کا دیکھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے یہاں معاملات کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا کہ دیانت کو ملحوظ رکھا جائے، تنہائی ہو مجمع ہو، اصول شریعت کے مطابق جو معاملات کی روش ہو وہ ہونی چاہئے، ہر شخص یہ چاہتا کہ میرے سے کسی کو اذیت نہ ہو، ہر معاملہ میں سچائی ہو، مجھے یاد ہے کہ ایک شخص اپنا رومال مسجد کے صحن میں بھول گیا تین دن رومال وہیں پڑا رہا، اس کی اجازت بھی نہیں تھی کہ اٹھا کر حفاظت سے رکھو، ممکن ہے مالک آئے اسے یاد آئے کہ وہاں چھوڑا تھا اور نہ ملے تو اسے چیز کے نہ ملنے سے اذیت ہو، تو تین دن تک وہیں پڑا رہا، یہ قلب کی دیانت کا اثر تھا کہ کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر کہیں رکھ دے، خانقاہ میں جتنے حجرے تھے کبھی کسی حجرے میں تالہ نہیں لگتا تھا، زنجیر نہیں لگتی تھی سامان رکھا ہے، صندوق کھلے پڑے ہیں، زنجیریں کھلی پڑی ہیں، طلبہ باہر گئے ہوئے ہیں، مریدین موجود نہیں ہیں، کسی چوری چکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، ماحول کے اثرات سے اتنی دیانت قلوب میں تھی کہ نہ کسی کی کوئی چیز گم ہوتی تھی اور نہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا باعث بنتا تھا غرض یہ ماحول تھانہ بھون کا دیکھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ماحول کے آثار...... تیسرا ماحول دارالعلوم دیوبند کا دیکھا، وہاں اعمال پر زیادہ توجہ ہے اخلاق پر توجہ بالواسطہ ہے، بلا واسطہ جیسے خانقاہوں میں تربیتِ اخلاق ہے وہ رنگ نہیں، مگر اعمال کے واسطے سے اصلاح اخلاق کی تربیت کرتے ہیں بہرحال اعمال کا زور ہے، اس ماحول میں رہ کر کوئی چاہے نہ چاہے مگر اسے نماز پڑھنی پڑے گی، جب ڈیڑھ ہزار آدمی اذان ہوتے ہی حجروں سے نکل کر ایک دم مسجد میں پہنچیں گے تو ایک آدمی کیسے بیٹھا رہے گا، اسے بھی مسجد میں جانا ہی پڑے گا، بقول مولانا سعید احمد صاحب مرحوم جب مجلس شوریٰ میں آئے تو ٹھنڈی جگہ تہہ خانہ قیام تھا، ظہر کی اذان ہوئی تو میں نے کہا حضرت! چلئے نماز کے لئے، نماز کو آ گئے دو گھنٹہ بعد عصر کی اذان ہوئی، تو میں نے کہا چلئے نماز کے لئے، پھر مغرب نماز کا وقت آیا، میں نے کہا چلئے نماز کے لئے کہنے لگے! بھائی! تمہارے ہاں جو پچاس نمازیں معراج میں فرض ہوئی تھیں، ساری کی ساری یہاں باقی ہیں، جب دیکھو نماز کو کہو، غرض ایک ماحول کا اثر ہے کہ نماز کے لئے طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے، وہ اس ایریا اور ماحول کا

اثر ہے، بہرحال تین قسم کے ماحول دیکھے اور تینوں کے اثرات جدا تھے، اور وہ اثرات طبیعت پر پڑتے تھے، دیو بند آ کر نمازی بننے کا شوق ہوتا تھا، تھانہ بھون جا کر صفائی معاملات کا شوق ہوتا تھا، گنگوہ پہنچ کر ذکر اللہ کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اس لئے کہ تینوں جگہوں کے ماحول کے یہی اثرات ہیں اور وہی قلوب پر پڑتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دین کی مضبوطی نبوی ماحول کی وجہ سے تھی...... اس لئے قرآن کریم نے جہاں تقویٰ وطہارت کی تعلیم دی ہے وہاں یہ بھی فرمایا کہ ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ سچوں کی معیت اور صحبت اختیار کرو اور ماحول ایسا بناؤ کہ خواہ مخواہ دین تمہارے اندر رچ جائے، دین کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے، بہرحال سب سے بڑی چیز اسلام میں ماحول ہے، حضراتِ صحابہ کرامؓ کا دین اسی لئے مضبوط تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماحول میں رہے ہوئے ہیں اور رنگ اٹھائے ہوئے ہیں، سیکھے ہوئے ہیں۔

حضراتِ متقدمین کے ہاں صحبتِ شیخ کا درجہ...... اسی واسطے سلف کے زمانے میں یہ اصطلاح نہیں تھی جو ہمارے دور میں ہے کہ فلاں استاذ ہیں اور یہ ان کے شاگرد ہیں، بلکہ شاگردوں کو صاحب کہتے تھے اصحابِ ابی حنیفہؒ، اصحابِ شافعیؒ، اصحابِ عبداللہ بن مسعودؓ، اصحابِ ابن عباسؓ اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ کہ جو شاگرد صحبت نہیں اٹھائے ہوئے تھے، ان کے علم کا بھی سلف میں اعتبار نہیں کیا جاتا تھا کہ معلوم نہیں صحیح سمجھا ہے کہ نہیں؟ اس نے صحبت تو اٹھائی نہیں، محدثین کے ہاں جو سند بیان کی جاتی ہے اور سند میں افراد کے نام آتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے روایت کی اس نے مجھ سے کی، اس نے مجھ سے، تو امام بخاریؒ کے ہاں شرط یہ ہے کہ جس کو اپنے استاذ اور شیخ سے صحبت زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی حدیث زیادہ قابل اعتبار اور قابل قبول ہوگی، اور جس نے محض کانوں سے سنا اور صحبت نہیں اٹھائی اس کی روایات کم درجے کی سمجھتے ہیں، امام بخاریؒ قبول نہیں کرتے، تو صحبت یافتہ ہونے سے وہ جو قلبی کیفیات ہیں وہ قلب کے اندر منتقل ہو جاتی ہیں اور دور سے آدمی سنے تو علم کے الفاظ منتقل ہوتے ہیں، قلب کی کیفیات منتقل نہیں ہوتیں۔

صحبت سے قلبی کیفیات پیدا ہو کر محرک عمل بنتی ہیں...... اور عمل کا تعلق انہی قلبی کیفیات سے ہے جن سے جذبات عمل پیدا ہوتے ہیں، اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ صحبت اختیار کی جائے ملازمت اور معیت کو اپنایا جائے جو زیادہ صحبت یافتہ ہوگا اس کا دین زیادہ پکا ہوگا، جو کم صحبت یافتہ ہوگا اس کے دین میں کمی آئے گی اور اگر صحبت بالکل نہیں تو اور زیادہ کمی رہے گی۔

غیر صحبت یافتہ علماء ظہور فتن کا سبب بنتے ہیں...... تجربہ ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہیں جس سے مذاہب اور پارٹیاں بن جاتی ہیں یہ زیادہ تر ان علماء سے پھیلتے ہیں جو صحبت یافتہ نہیں ہوتے، فقط قرآن وحدیث کے الفاظ ان کے سامنے ہوتے ہیں اسلاف کا وہ رنگ ان کے قلوب میں نہیں ہوتا جو بزرگوں میں ہوا کرتا ہے اس لئے ان

سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے، اور جو عالم زیادہ صحبت یافتہ ہوگا، زیادہ دیانت قائم کیے ہوئے ہوگا اس سے فتنہ نہیں پھیلے گا، زیادہ فتنہ پردازوہ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس علم موجود ہے۔ صحبت میسر نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، اخلاق کے اندر پختگی نہیں پیدا ہوتی، تو ان کے کلمات سے زیادہ تر بے ادبی اور گستاخی کا فتنہ پھیلتا چلا جاتا ہے، یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مصر، شام یا عراق ہو اول تو وہاں علم کی ہی کمی ہے لیکن اگر علم بھی ہے تو چونکہ صلحاء اور اہل اللہ کی صحبت میسر نہیں وہ علم اور وبالِ جان اور مارِ آستین ان کے حق میں بنا ہوا ہے، بقول حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ۔

علم را برتن زنی مارے بود　　　علم را بردل زنی یارے بود

علم کو نوک زبان پر رکھو گے تو سانپ اور بچھو ہے، یہ ڈسے گا اور علم کو دل میں اتارو گے تو یار اور دوست بن جائے گا جو آخرت تک پہنچائے گا۔

بلاصحبت علم زبان تک رہتا ہے...... اس لئے کہ دل میں علم ہوتا تو دل کی کیفیات دل کے اخلاق تک کو درست کردے گا، اور اگر علم کا دل پر اثر نہیں زبان پر ہے تو وہ علم کی نمائش ہے، جیسے آدمی لباس سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، یہ اپنے کلمات سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، تو وہ علم تجمل کے لئے ہے نمائش کے لئے ہے دل کی اصلاح کے لئے نہیں ہے، اصلاح جب ہوگی جب علم کو دل کے اندر اتار لیا جائے، اخلاق درست کئے جائیں، وہ بلاصحبت اور بلامعیت کے نہیں ہوتے۔

تکمیل علم کی سند بغیر صحبت نہیں ملتی تھی...... ہمارے طالب علمی اور بچپن کے زمانے میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نو دس سال رہ کر ایک طالب علم نے علم حاصل کرلیا، لیکن اکابر اس کو سند نہیں دیتے تھے، جب تک جماعت کے بزرگوں میں سے کسی کے پاس چھ مہینے رہ کر اپنی اصلاح نہ کرائے، اور صحبت یافتہ ہو کر اس کا رنگ نہ قبول کرلے، اس کے بغیر وہ سند نہیں دیتے تھے، کیونکہ صحبت کے بغیر محض ایک نمائش اور گرمی بازار اور گرمی محفل کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

ازالہ شبہات میں تاثیرِ صحبت، حضرت تھانویؒ کا واقعہ...... ایک دفعہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ کے یہاں ایک شخص کا خط پہنچا، اس نے لکھا کہ میں ایم، اے ہوں اور لندن میں رہا ہوں، کیمبرج یونیورسٹی میں میں نے پڑھا ہے، مجھے اسلام کے بعض مسائل میں شبہ ہے، یا تو آپ انہیں حل کردیں ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں گا۔ حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ایسی باتوں کے تفصیلی جوابات تحریر میں نہیں آسکتے، اگر کبھی اس لائن سے گذر ہو تو آپ چند گھنٹوں کے لئے تھانہ آجائیں تو زبانی بات چیت ہوگی، اس میں کچھ عرض کروں گا، حضرتؒ نے یہ جواب دے دیا، ہفتہ بھر نہیں گذرا تھا کہ ایک شخص آپ سے ملنے سوٹ بوٹ میں ہیٹ لگائے ہوئے بالکل انگریز صورت اچانک تھانہ بھون آگیا، حضرتؒ کو اطلاع کرائی گئی، کسی نے کہا حضرت! کوئی گریجویٹ ہے بالکل انگریز کی صورت ہے فرمایا، بلالو اور مجلس میں وہ حاضر ہوئے، اس نے آکر سلام علیکم کہا، اور سلام کرتے ہی کہا کہ میں وہی ہوں جس نے خط لکھا تھا کہ میں نے ایم اے کیا ہوا ہے یا تو میرے سوالات کا جواب دیا جائے ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں

گا، حضرتؒ نے فرمایا اچھا بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا حضرتؒ کے ہاں مختلف علمی مسائل کا تذکرہ ہو رہا تھا وہ سنتا رہا، جب وہ مجلس ختم ہوئی تو حضرتؒ نے فرمایا: ہاں اب آپ فرمایئے کیا کہنا ہے؟ تو بجائے اس کے وہ کوئی شبہ ذکر کرتا پھر وہی جملہ کہا کہ صاحب! مجھے اسلام پر شبہات ہیں یا تو آپ انہیں حل کر دیں، ورنہ میں عیسائی ہوتا ہوں، اور کچھ زور سے کہا، حضرتؒ کو غصہ آیا، اس زور سے کے طمانچہ رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا، فرمایا: مردود! اگر تو عیسائی ہو گیا تو تیرے عیسائی ہونے سے اسلام میں کمی آجائے گی، دور ہو جا، چاہے یہودی بن چاہے عیسائی! اسلام کو تیری کوئی پرواہ نہیں، تو اسلام پر دباؤ ڈالتا ہے۔

بہرحال اس زور سے مارا کہ اس کا منہ پھر گیا، حالانکہ حضرتؒ کی عمر بڑھاپے کی اور وہ جوان آدمی، بہرحال اس زور سے مارا اس نے سوائے اس کے کہ رونا شروع کیا اور کچھ نہیں بولا، اور حضرتؒ نے فرمایا اس کو نکال دو یہاں سے خدام نے نکال دیا اب وہ خانقاہ کی سیڑھیوں میں بیٹھا رو رہا ہے، صبح کا وقت تھا گیارہ بجے حضرتؒ مجلس سے اٹھے، اور وہاں سے گذرے تو وہ وہاں رونے میں مشغول، حضرتؒ دیکھ کر چلے گئے حضرتؒ نے کچھ نہیں فرمایا، مکان چلے گئے، گرمی کی دوپہر تھی، ظہر کے وقت جب حضرت آئے تو وہ وہیں سیڑھیوں کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، خیر ظہر کی نماز ہوئی پھر مجلس شروع ہوئی تو فرمایا کہ اسے بلاؤ۔ اب وہ آئے، بٹھلا کے فرمایا، کیا شبہات ہیں؟ اس نے کہا ایک بھی شبہ نہیں اسلام حق ہے، بالکل میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اسلام ہی حق ہے، اس کے سوا کوئی چیز حق نہیں ہے اور اب مجھے کوئی شبہ نہیں ہے، بس وہ ایک ہی تھپڑ میں سارا کام ہو گیا، پھر حضرتؒ نے نصیحت فرمائی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض تھپڑ نہیں مارا، بلکہ روحانی لحاظ سے کوئی توجہ فرمائی جس میں کوئی باطنی تصرف بھی شامل تھا، ورنہ اگر نفسانی جذبے سے مارتے تو اسے جوش اٹھتا کہ صاحب! آپ کو کیا حق تھا، یہ کون سی تہذیب کی بات ہے کہ ایک آدمی مفتی کے پاس سوال کرنے آئے، فتویٰ پوچھنے آئے وہ تھپڑ مارے، اگر نفسانی جذبہ سے ہوتا تو وہ دس تختیں نکالتا، چونکہ روحانی جذبہ تھا اور مقصود اس کی تربیت تھی ایذاء نہیں تھی، تو اس تصرف کا اس پر یہ اثر پڑا کہ اس نے رونا شروع کیا، ورنہ ایک تھپڑ کھا کے آدمی چھ گھنٹے بیٹھ کے روئے، اور اس درجہ میں اس کا باطن پاک ہو جائے کہ اسے کوئی شبہ ہی باقی نہ رہے، نفسانی جذبے سے یہ تاثیر ممکن نہیں۔ اس کے بعد پھر حضرتؒ نے اس کو نہایت شفقت سے نصیحت فرمائی، اور فرمایا کہ انسان کو شبہ طبعی طور پر پیش آتا ہے لیکن یہ صورت اختیار نہیں کرنی چاہیئے کہ یا شبہ حل ہو ورنہ میں اسلام سے پھر جاؤں گا، بسا اوقات شبہ اتنا قوی ہوتا ہے، یا شیطان کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ جواب بن نہیں پڑتا، مگر دل مطمئن ہوتا ہے، کہ بہرحال دین حق یہی ہے گو شبہ بھی اپنی جگہ قائم ہے شبہ اوپر اوپر ہوتا ہے دین دل کے اندر گھسا ہوا ہوتا ہے ہزاروں وسوسے پیش آتے ہیں، ان کو آدمی اس طرح پیش کرے کہ یا تو جس طرح میں چاہوں حل ہوں ورنہ میں دین سے پھر جاؤں گا یہ بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے، پھر وہ صاحب وہاں سے ایسے دیندار بن کے واپس ہوئے کہ نہ ان کی وہ کرّ وفر رہی

، نہ گریجویٹی رہی، نہ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے آثار رہے، ایک سچے دیندار بن گئے۔ پھر انہوں نے حضرتؒ کے ہاں وقتاً فوقتاً آنا شروع کیا، خاصا اس کا دین مضبوط ہوگیا، تو یہ آثار کتاب کے پڑھنے سے نہیں ہوتے، صحبت سے ہوئے، اور صحبت میں تھپڑ کھانے سے ہوئے، وہ بھی دراصل صحبت ہی تھی، الغرض سب سے بڑی چیز دین کی پختگی ہے وہ صحبت سے ہی آتی ہے۔

سو برس کی عبادت سے چند لمحات کی صحبت کیوں افضل ہے؟...... اس وجہ سے حضرت مولانا رومی نے کہا کہ ؎

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

سو برس تک بلا ریاکاری عبادت کرے، اس سے ایک گھنٹہ کی اہل اللہ کی صحبت بہتر ہے، تو اس کی بناء یہی ہے کہ اس ایک گھنٹے کی صحبت میں قلب کا راستہ اتنا صحیح ہو جاتا ہے کہ سو برس کی عبادت کی لائن بچھ جاتی ہے، اس لئے اس کو افضل کہا گیا۔

ہمارے بھائی ادریس، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہیں، مولانا ادریس کاندھلویؒ میرے بے تکلف ساتھیوں میں سے ہیں، ہم ایک ہی ساتھ میں مولوی بدر عالمؒ، مولوی ادریسؒ اور مفتی شفیعؒ ہم چار آدمیوں کی بہت دوستی تھی، ایک ہی ساتھ پڑھتے تھے، تو مولوی ادریسؒ نے ایک رسالہ مسئلہ تقدیر پر لکھا، اور بڑے عالمانہ انداز سے لکھا، حضرت اقدس تھانویؒ کی خدمت میں دکھلانے کے لئے لے گئے، اور یہ سمجھ کے لے گئے کہ یہ نہیں کہ فقط حضرت والا تائید فرمائیں گے، بلکہ کہیں گے کہ بھائی ایسا لکھا کہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا، اب جا کے حضرتِ اقدسؒ کی خدمت میں لکھا ہوا پیش کیا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی فرصت میں دیکھوں گا، دوپہر کو جب آؤں گا تو مطالعہ کروں گا، پھر کچھ لکھ دوں گا، حضرتؒ نے دوپہر کو مطالعہ فرمایا، ظہر کے بعد سب لوگ جمع ہوئے اور مولوی ادریسؒ بھی موجود تھے، حضرتؒ نے فرمایا مولوی ادریس! یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ کہا حضرت! میں نے لکھا ہے فرمایا اتنا غلط کہ اوّل سے لے کر آخیر تک سرتا پا غلط، اہلسنت کا یہ مسلک ہی نہیں، تم جیسا فاضل آدمی اتنا غلط لکھے؟ اس کے بعد حضرتؒ نے اغلاط سمجھائیں، تو واقعی ان پر منکشف ہوا کہ یہ یہ اغلاط ہیں، اس پر حضرتؒ نے فرمایا اس کو یوں بدلو، پھر مجھے دکھلاؤ، پھر انہوں نے صحیح کیا، اس پر حضرت اقدسؒ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ بھائی! نظر تمہاری وسیع ہے، ہماری نظر اتنی وسیع نہیں، مگر تم بڈھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے، فرمایا جو تم بیس برس میں کتابیں کھنگال کر رائے قائم کرو گے، بڈھوں کے ہاں وہ تجربہ شدہ منٹوں میں مل جائیں گی، تم بڈھوں سے مستغنی نہیں بن سکتے کتنے ہی بڑے عالم بن جاؤ۔ اس میں اشارہ ہی صحبت کی طرف تھا کہ کتاب سے علم کے الفاظ حاصل ہوں گے، اور صحبت سے حقائق حاصل ہوں گے علم کی کیفیات قلب میں پیدا ہوں گی۔

تو دین کی بنیاد صحبت سے پیدا ہوتی ہے، اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو قرآن کریم اتار دیا جاتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں نہ بھیجا جاتا، کیا اہل عرب قرآن کریم نہیں سمجھ سکتے تھے۔؟ پیغمبروں کو ہر کتاب کے ساتھ بھیجا کہ وہ صحبت کے ذریعے ان کیفیات کو دل کے اندر اتار کر دین پیدا کریں، بہر حال صحبتِ اہل اللہ جڑ اور بنیاد ہے دین کی، بلا صحبت دین کی بنیاد نہیں ہوتی، وہ کسی وقت بھی متزلزل ہو سکتا ہے، اس میں پائیداری ناممکن ہے اس لئے الفاظ علم سے بھی زیادہ ضروری صحبتِ اہل حق ہے۔

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ
کی علمی خدمات کتابیاتی جائزہ

مرتبہ
حافظ قاری بشیر حسین حامد صاحب
(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان، ایبٹ آباد کے شکریہ کے ساتھ

محترم المقام بھائی بلال صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے، ''خطبات حکیم الاسلام'' (گیارہ جلدوں میں) بلاشبہ آپ کے ادارے کا عظیم کارنامہ ہے، واقعی علوم قاسمیہ کی اشاعت میں آپ کا بہت حصہ ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائیں، حضرت قاری صاحب کے علوم بحر ذخار کی مانند ہیں، جن کا احاطہ ہم جیسے بے مایہ انسانوں کے بس سے باہر ہے، ان خدمات کا احاطہ (جن میں آپ کی تصنیفات/ تقاریر وخطبات، تقاریظ ومقدمات، مکتوبات وملفوظات شامل ہیں) ایک مستقل کام ہے، اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے چند سالوں کی کوشش وسعی سے یہ کام انجام کو پہنچا، میں اگرچہ اس کی جامعیت ومانعیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، مگر میں نے اپنی بساط کے مطابق بہت تلاش وجستجو کے بعد یہ مواد اکٹھا کیا تاکہ کم ازکم حضرت قاری صاحب پر کام کرنے والوں کے سامنے ان کی خدمات کا ایک خاکہ موجود ہو، اللہ تعالیٰ اس حقیری کوشش کو قبول فرما کرآخرت کا ذخیرہ بنادیں۔ اگر آپ حضرات کا مشورہ اس مسودہ کی طباعت کے بارے میں ہوجائے تو یہ یقیناً بندۂ ضعیف پر احسان عظیم ہوگا۔ اس کے علاوہ حضرت قاری صاحب کے مختلف کتابوں پر جو مقدمات/ تقاریظ/ پیش لفظ/ تصدیقات تحریر فرمائے ہیں وہ بھی اکٹھے کئے گئے ہیں ۲۵/۳۰/ کے لگ بھگ ہوں گے، ان کی فہرست اسی مسودہ کے ص:۸ پر موجود ہے، ان کی اشاعت بھی یقیناً حضرت قاری صاحب کی روح کی ٹھنڈک کا سامان ہوگی۔ دعاؤں کا متمنی

والسلام......بشیر حسین حامد

حافظ قاری بشیر حسین حامد

(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان (ایبٹ آباد)

تاریخ......۲۱/۲/۹۸ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی اَمَّا بَعۡدُ!

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وجود مسعود اس امت کیلئے باعث رأفت ورحمت تھا وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک جماعت تھے، اکیلے آپ نے اپنی زندگی میں جتنا کام کیا وہ مستقل ایک ادارے کے بس کا بھی نہیں تھا وہ ایک عہد آفرین اور عہد ساز شخصیت تھے، جنہوں نے نہ صرف پورے عالم میں دار العلوم کا تعارف کرایا بلکہ علمائے دیوبند کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی علمیت وثقاہت کا لوہا منوایا، پورے عالم اسلام میں فکر ولی اللہی اور حکمت قاسمیہ کے ترجمان کی حیثیت سے پہچانے گئے، انھوں نے ہر لائن میں چاہے وہ تصنیف وتالیف کا شعبہ ہو، درس وتدریس کا فن ہو، تقریر وخطابت کا میدان ہو یا اہتمام وانصرام کا دائرہ ہو، اپنی خداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عزم وہمت، بصیرت ودانائی، طبعی حلاوت، مٹھاس اور شخصی کشش وجاذبیت، قدرتی فہم وذکا اور آبائی نسبت کی بدولت ایسے جوہر دکھلائے کہ صدیوں ان کا مثیل پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں علمی دنیا میں ان کا نام نہ ذہنوں سے بھلایا جاسکتا ہے، نہ زبانوں سے مٹایا جاسکتا ہے، وہ تو عالم اسلام کے علمی حلقوں میں اپنا مقام منوا چکے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ اتنی عظیم شخصیت پر حلقہ علماء اور خصوصاً حلقہ دیوبند میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا اس وقت میرے سامنے آپ کی شخصیت وسوانح پر چند کتب ورسائل میں شامل چھوٹے بڑے مضامین کے علاوہ صرف دو کتب ہیں۔ 1 تذکرہ طیب، مرتبہ محمد ابوبکر غازی پوری، المکتبہ الاثریہ، قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پور (انڈیا) 2 ذکر طیب مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور (پاکستان) میری اس حقیری کوشش وکاوش کا مقصود یہ تھا کہ تحریر وتقریر کے میدان میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمات کا ایک ایسا خاکہ (جسے کتابیات کا نام بھی دیا جاسکتا ہے) سامنے لایا جائے جس میں حضرت قاری صاحبؒ کی تصانیف کی فہرست، آپ کے مقدمات، تصدیقات وتقاریظ، آپ کے مطبوعہ خطوط، آپ کے خطبات وتقاریر (چاہے وہ کتابی شکل میں طبع ہوچکی ہوں یا رسائل میں) نیز وہ مختلف مضامین وتحریریں جو مختلف کتب ورسائل میں شامل ہوں وہ سب یکجا ہوجائیں تاکہ آپ پر کام کرنے والوں کے لیئے سہولت کا سبب ہو۔ میں اپنی کوتاہی وسائل کے پیش نظر ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا (وہ اگرچہ کئی سالوں کی جستجو وتلاش کا ثمرہ ہے) حضرت قاری صاحب کی تحریری وعلمی خدمات کی تمام

جہتوں پر حاوی ہے، کیونکہ ہندوستان کے پریس سے حضرت قاری صاحب سے متعلق جو کچھ طبع ہوا یا وہاں کے ماہناموں اور ہفت روزوں میں آپ کے مضامین و خطبات طبع ہوئے وہ تمام تر مواد پاکستان میں نہیں پہنچ پاتا، جس کی وجہ سے تحقیق و جستجو کا حق ادا نہیں ہو سکتا، البتہ جو کسی ذریعے سے پاکستان پہنچ پایا، اس سے ضرور استفادہ کیا گیا، امید ہے اس جہت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ حقیر سی کوشش سنگ میل کا کام دے گی۔ ابتدا میں حضرت قاری صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے تا کہ حیات طیب کی تقریباً پون صدی پر محیط جدو جہد کا دوسرا رخ بھی سامنے آ جائے، اور کام کرنے والے ہر رخ، اور ہر عنوان پر مستقل کام کر سکیں، یہ پون صدی کی جدو جہد اپنے دور کی عکاس ہے اور اگر حضرت قاری صاحب کی زبان سے یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھو ۔۔۔ ان میں اک دور کی تاریخ نظر آئے گی

حافظ بشیر حسین حامد عفی عنہ

حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحبؒ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلامؒ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیرِ نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان